اردو

دائرۂ معارفِ اسلامیہ

زیر اہتمام

دانش گاہِ پنجاب، لاہور

جلد نمبر ۵

(بوزنطیہ ...... پتانگ)

۱۳۹۰ھ/۱۹۷۱ء

بار دوم: ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ (پنجاب)	رئیس ادارہ
سید محمد امجد الطاف، ایم اے (پنجاب)	سینئر ایڈیٹر
پروفیسر عبدالقیوم، ایم اے (پنجاب)	سینئر ایڈیٹر
عبدالمنان عمر، ایم اے (علیگ)	ایڈیٹر
ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ایم اے، ڈی لٹ (پنجاب)	معتمد ادارہ
خان محمد چاولہ، ایم اے (پنجاب)	ایڈیٹر ۱
پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشانی، ایم اے (پنجاب)	ایڈیٹر ۲

۱۔ از ۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء ۲۔ از ۱۱ فروری ۱۹۷۱ء

مجلسِ انتظامیہ

۱۔ پروفیسر محمد علاء الدین صدیقی، ایم اے، ایل ایل بی، ستارۂ امتیاز، وائس چانسلر، دانش گاہ پنجاب (صدر مجلس)
۲۔ جسٹس ڈاکٹر ایس۔ اے۔ رحمٰن، ہلال پاکستان، سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ پاکستان، لاہور
۳۔ لیفٹیننٹ جنرل ناصر علی خاں، سابق صدر پبلک سروس کمیشن مغربی پاکستان، لاہور۔
۴۔ جناب معز الدین احمد، سی۔ ایس۔ پی (ریٹائرڈ)، ۳۳۳۔ شارع طفیل، لاہور چھاؤنی
۵۔ جناب الطاف گوہر، سابق سی۔ ایس۔ پی، تمغۂ پاکستان، ستارۂ قائداعظم، ستارۂ پاکستان، ہلال قائداعظم، لاہور
۶۔ معتمد مالیات، حکومت مغربی پاکستان، لاہور
۷۔ سید یعقوب شاہ، ایم اے، سابق آڈیٹر جنرل، پاکستان و سابق وزیر مالیات، حکومت مغربی پاکستان، لاہور
۸۔ جناب عبدالرشید خاں، سابق کنٹرولر پرنٹنگ اینڈ سٹیشنری، مغربی پاکستان، لاہور
۹۔ پروفیسر محمد علاء الدین صدیقی، ایم اے، ایل ایل بی، ستارۂ امتیاز، صدر شعبۂ علوم اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور
۱۰۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ، پروفیسر ایمریطس، سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور
۱۱۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر، ایم اے، پی ایچ ڈی، سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور
۱۲۔ سید شمشاد حیدر، ایم اے، رجسٹرار، دانش گاہ پنجاب، لاہور
۱۳۔ جناب ایم۔ اے۔ شہید، بی کام، ایس اے ایس، خازن، دانش گاہ پنجاب، لاہور

بار اول۔ فروری ۱۹۷۱ء

ناشر: سید شمشاد حیدر، رجسٹرار، دانش گاہ پنجاب، لاہور

طابع: امجد رشید منہاس، ایم پی ڈی (لیڈز) ناظم مطبع

مطبع: پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور

بار دوم: رجب المرجب ۱۴۲۵ھ ستمبر ۲۰۰۴ء
زیر نگرانی: پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن عارف

اختصارات و رموز وغیرہ

اختصارات

(الف)

عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ کتب اور ان کے تراجم اور بعض مخطوطات، جن کے حوالے اس موسوعہ میں بکثرت آئے ہیں

آ آ = اردو دائرۂ معارف اسلامیہ

آ آ، ت = اسلام انسائیکلوپیدیسی (= انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ترکی)

آ آ، ع = دائرۃ المعارف الاسلامیہ (= انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، عربی)

آ آ، لائیڈن، ۱ یا ۲ = Encyclopaedia of Islam (= انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، انگریزی)، بار اوّل یا دوم، لائیڈن۔

ابن الابار = کتاب تکملۃ الصلۃ، طبع کودیرا F. Codera، میڈرڈ ۱۸۸۷ تا ۱۸۸۹ء (BAH, V-VI)۔

ابن الابار = تکملہ = M.Alarcony Palencia - C.A.Gonzalez: Apendice a la adicion Codera de Tecmila، در Misc de estudios y textos arabes، میڈرڈ ۱۹۱۵ء۔

ابن الابار، جلد اوّل = ابن الابار = تکملۃ الصلہ، Texte arabe d'apres un ms.de Fes, tome I, completant les deux vol. edites par F. Codera، طبع A. Bel و محمد ابن شنب، الجزائر ۱۹۱۸ء۔

ابن الاثیر ۱ یا ۲ یا ۳ = کتاب الکامل، طبع ٹورنبرگ C.J.Tornberg، بار اول، لائیڈن ۱۸۵۱ تا ۱۸۷۶ء، یا بار دوم، قاہرہ ۱۳۰۱ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۰۳ھ، یا بار چہارم، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ۹ جلدیں۔

ابن الاثیر، ترجمہ فانیان = Annales du Maghreb et de l'Espagne، ترجمہ فانیان E.Fagnon، الجزائر ۱۹۰۱ء۔

ابن بشکوال = کتاب الصلۃ فی اخبار ائمۃ الاندلس، طبع کودیرا F. (Codera)، میڈرڈ ۱۸۸۳ء (BAH, II)۔

ابن بطوطہ = تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار (Voyages d' Ibn Bato cota)، عربی متن، طبع فرانسیسی مع ترجمہ از C.Defremery و B.R.sanguinetti، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۵۳ تا ۱۸۵۸ء

ابن تغری بردی = النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ، طبع W. Popper، برکلے و لائیڈن ۱۹۰۸ تا ۱۹۳۶ء۔

ابن تغری بردی، قاہرہ = وہی کتاب، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ببعد۔

ابن حوقل، کریمرز ـ وائٹ = ابن حوقل، ترجمہ J.H.Kramers and G. Wiet، بیروت ۱۹۶۴ء، دو جلدیں۔

ابن حوقل = کتاب صورۃ الارض، طبع J.H.Kramers، لائیڈن ۱۹۳۸ تا ۱۹۳۹ء (BGA,II، بار دوم)، ۲ جلدیں۔

ابن خرداذبہ = المسالک والممالک، طبع ڈخویا (M.J.de Goeje) لائیڈن ۱۸۸۹ء (BGA, VI)۔

ابن خلدون: عبر (یا العبر): کتاب العبر ودیوان المبتداء والخبر .....، بولاق ۱۲۸۴ھ۔

ابن خلدون: مقدمہ = Prolegomenes d'Ebn Khaldoun، طبع E.Quatremere، پیرس ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۸ء (Notices et l'Extraits, XVI-XVII)۔

ابن خلدون: روزنتھال = The Muqaddimah، مترجمہ Franz Rosenthal، ۳ جلدیں، لنڈن ۱۹۵۸ء۔

ابن خلدون: مقدمہ، دیسلان = Les Prolegomenesd' Ibn Khaldun، ترجمہ و حواشی M.de Slane، پیرس ۱۸۶۳ تا ۱۸۶۸ء، (طبع دوم) ۱۹۳۴ء۔

ابن خلکان = وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان، طبع وستنفلٹ (F.Wustenfeld)، گوٹنجن ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۰ء (حوالے شمار تراجم کے اعتبار سے دیے گئے ہیں)۔

ابن خلکان = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۸ جلد، بیروت ۱۹۶۸ تا ۱۹۷۲ء۔

ابن خلکان = کتاب مذکور، مطبوعہ بولاق ۱۲۷۵ھ، قاہرہ ۱۳۱۰ھ۔

ابن خلکان، ترجمہ دیسلان Biographical dictionarol

دیسلان: کتاب وفیات الاعیان، ترجمہ M. de Slane، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۴۲ تا ۱۸۷۱ء.

ابن رستہ = الاعلاق النفیسہ، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۲۹۲ تا ۱۸۹۲ء (BGA, VII).

ابن رستہ، ویت Les Atours precieux:Wiet، مترجمہ G.wiet، قاہرہ ۱۹۵۵ء.

ابن سعد: کتاب الطبقات الکبیر، طبع زخاؤ (H.Sachau) وغیرہ، لائیڈن ۱۹۰۴ء تا ۱۹۴۰ء.

ابن عذاری: کتاب البیان المغرب، طبع کولن (G.S.Colin) و لیوی پروونسال (E.Levi-provencal)، لائیڈن ۱۹۴۷ تا ۱۹۵۱ء؛ جلد سوم، پیرس ۱۹۳۰ء.

ابن العماد: شذرات = شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، قاہرہ ۱۳۵۰ تا ۱۳۵۱ء (سنین وفیات کے اعتبار سے حوالے دیے گئے ہیں).

ابن الفقیہ: مختصر کتاب البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۸۶ء (BGA. V).

ابن قتیبہ: شعر (یا الشعر) = کتاب الشعر والشعراء، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۹۰۲ تا ۱۹۰۴ء.

ابن قتیبہ: معارف (یا المعارف) = کتاب المعارف، طبع وستنفلت، گوٹنگن ۱۸۵۰ء.

ابن ہشام: کتاب سیرۃ رسول اللہ، طبع وستنفلت، گوٹنگن ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۰ء.

ابو الفداء: تقویم = تقویم البلدان، طبع رینو (J.T.Reinaud) و دیسلان (M.de Slane)، پیرس ۱۸۴۰ء.

ابو الفداء: تقویم، ترجمہ = Geographie d' Aboulfeda traduite de l' arabe en franciaz، ج ۱ و ۲/۱، از رینو، پیرس ۱۸۴۸ء و ج ۲/۲، از St Guyard، ۱۸۸۳ء.

الادریسی: المغرب = Description de l' Afrique et de Espagne، طبع ڈوزی R. Dozy و ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء.

الادریسی، ترجمہ جوبار = Geographie d' Edrisi، مترجمہ P.A.Jauber، ۲ جلد، پیرس ۱۸۳۶ تا ۱۸۴۰ء.

الاستیعاب = ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۲ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۸، ۱۳۱۹ھ.

الاشتقاق = ابن درید: الاشتقاق، طبع وستنفلت، گوٹنگن ۱۸۵۴ء، (انا ستاتیک).

الاصابہ = ابن حجر العسقلانی: الاصابہ، ۴ جلد، کلکتہ ۱۸۵۶ تا ۱۸۷۳ء.

الاصطخری = المسالک والممالک، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۷۰ء، (BGA, I) و بار دوم (نقل بار اول) ۱۹۲۷ء.

الاغانی ۱، یا ۲، یا ۳: ابو الفرج الاصفہانی: الاغانی، بار اول، بولاق ۱۲۸۵ھ، یا بار دوم، قاہرہ ۱۳۲۳ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۴۵ھ ببعد.

الاغانی، برونو = کتاب الاغانی، ج ۲۱، طبع برونو R.E.Brunnow، لائیڈن ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ء.

الانباری: نزہۃ = نزہۃ الالباء فی طبقات الادباء، قاہرہ ۱۲۹۴ھ

البغدادی: الفرق = الفرق بین الفرق، طبع محمد بدر، قاہرہ ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء.

البلاذری: انساب = انساب الاشراف، ج ۴ و ۵، طبع M.Schlossinger و S.D.F.Goitein، بیت المقدس (یروشلم) ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء.

البلاذری: انساب، ج ۱ = انساب الاشراف، ج ۱، طبع محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء.

البلاذری: فتوح = فتوح البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء.

بیہقی: تاریخ بیہق = ابو الحسن علی بن زید البیہقی: تاریخ بیہق، طبع احمد بہمنیار، تہران ۱۳۱۷ش.

بیہقی: تتمہ = ابو الحسن علی بن زید البیہقی: تتمہ صوان الحکمۃ، طبع محمد شفیع، لاہور ۱۹۳۵ء.

بیہقی، ابو الفضل = ابو الفضل بیہقی: تاریخ مسعودی Bibl. Indica.

ت۱۱ = تکملہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ

تاج العروس: محمد مرتضی بن محمد الزبیدی: تاج العروس.

تاریخ بغداد = الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۱۴ جلدیں، قاہرہ ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۱ء.

تاریخ دمشق = ابن عساکر: تاریخ دمشق، ۷ جلدیں، دمشق ۱۳۲۹ء/ ۱۹۱۱ء تا ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۱ء.

تہذیب = ابن حجر العسقلانی: تہذیب التہذیب، ۱۲ جلدیں، حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء تا ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء.

الثعالبی: یتیمۃ = الثعالبی: یتیمۃ الدہر، دمشق ۱۳۰۴ھ۔

الثعالبی: یتیمۃ، قاہرہ = کتاب مذکور، قاہرہ ۱۹۳۴ء۔

جوینی = تاریخ جہاں کشا، طبع محمد قزوینی، لائڈن ۱۹۵۶ تا ۱۹۳۷ء (GMS XVI)

حاجی خلیفہ: جہاں نما = حاجی خلیفہ: جہاں نما، استانبول ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء۔

حاجی خلیفہ = کشف الظنون، طبع محمد شرف الدین یالتقایا (S.Yeltkaya) و محمد رفعت بیلگہ الکلیسلی (Rifat Bilge Kilisli)، استانبول ۱۹۴۱ تا ۱۹۴۳ء۔

حاجی خلیفہ، طبع فلوگل = کشف الظنون، طبع فلوگل (Gustavus Flugel)، لائپزگ ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۸ء۔

حاجی خلیفہ: کشف = کشف الظنون، ۲ جلدیں، استانبول ۱۳۱۰ تا ۱۳۱۱ھ۔

حدود العالم = The Regions of the World، مترجمہ منورسکی V.Minorsky، لنڈن ۱۹۳۷ء (GMS, XI، سلسلہ جدید)۔

حمداللہ مستوفی: نزہۃ = حمداللہ مستوفی: نزہۃ القلوب، طبع لی سٹرینج (Le Strange)، لائیڈن ۱۹۱۳ تا ۱۹۱۹ء (GMS, XXIII).

خواند امیر: حبیب السیر، تہران ۱۲۷۱ھ، بمبئی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء۔

الدرر الکامنۃ = ابن حجر العسقلانی: الدرر الکامنۃ، حیدرآباد ۱۳۴۸ھ تا ۱۳۵۰ھ۔

الدمیری = الدمیری: حیوٰۃ الحیوان (کتاب کے مقالات کے عنوانوں کے مطابق حوالے دیے گئے ہیں)۔

دولت شاہ = دولت شاہ: تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن E.G. Browne، لنڈن و لائیڈن ۱۹۰۱ء۔

ذہبی: حفاظ = الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۴ جلدیں، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۵ھ۔

رحمان علی = رحمان علی: تذکرۂ علمائے ہند، لکھنؤ ۱۹۱۴ء۔

روضات الجنات = محمد باقر خوانساری: روضات الجنات، تہران ۱۳۰۶ھ۔

زامباور، عربی = عربی ترجمہ، از محمد حسن و حسن احمد محمود، ۲ جلدیں، قاہرہ ۱۹۵۱ تا ۱۹۵۲ء۔

زبیری، نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع پروونسال، القاہرہ ۱۹۵۳ء۔

الزرکلی، اعلام = خیر الدین الزرکلی: الاعلام قاموس تراجم لاشہر الرجال والنساء من العرب والمستعربین والمستشرقین، ۱۵ جلدیں، دمشق ۱۳۷۳ تا ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۹ء۔

السبکی = السبکی: طبقات الشافعیۃ، ۶ جلد، قاہرہ ۱۳۲۴ھ۔

سجل عثمانی = محمد ثریا: سجل عثمانی، استانبول ۱۳۰۸ تا ۱۳۱۶ھ۔

سرکیس = سرکیس: معجم المطبوعات العربیۃ، قاہرہ ۱۹۲۸ تا ۱۹۳۱ء۔

السمعانی، عکسی = کتاب الانساب، طبع باعتناء مرجلیوث D.S.Margoliouth، لائیڈن ۱۹۱۲ء (GMS, XX).

السمعانی، طبع حیدرآباد = کتاب مذکور، طبع محمد عبد المعید خاں، ۱۳ جلدیں، حیدرآباد ۱۳۸۲ھ، ۱۴۰۲ھ/۱۹۶۲_۱۹۸۲ء۔

السیوطی: بغیۃ = بغیۃ الوعاۃ، قاہرہ ۱۳۲۶ھ۔

الشہرستانی = الملل والنحل، طبع کیورٹن W.Cureton، لنڈن ۱۸۴۶ء۔

الضبی، الضبی = بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس، طبع کودیرا (Codera) و ربیرا (J.Ribera)، میڈرڈ ۱۸۸۴ تا ۱۸۸۵ء (BAH, III).

الضوء اللامع = السخاوی: الضوء اللامع، ۱۲ جلد، قاہرہ ۱۳۵۳ تا ۱۳۵۵ھ۔

الطبری: تاریخ الرسل والملوک، طبع ڈخویا وغیرہ، لائیڈن ۱۸۷۹ تا ۱۹۰۱ء۔

عثمانلی مؤلفلری = بروسہ لی محمد طاہر، استانبول ۱۳۳۳ھ۔

العقد الفرید = ابن عبد ربہ: العقد الفرید، قاہرہ ۱۳۲۱ھ۔

علی جواد = علی جواد: ممالک عثمانیہ نین تاریخ و جغرافیہ لغاتی، استانبول ۱۳۱۳_۱۳۱۷ھ/۱۸۹۵ء تا ۱۸۹۹ء۔

عوفی: لباب = لباب الالباب، طبع براؤن، لنڈن و لائیڈن ۱۹۰۳ تا ۱۹۰۶ء۔

عیون الانباء = طبع ملر A.Muller، قاہرہ ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء۔

غلام سرور = غلام سرور، مفتی: خزینۃ الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۴ء۔

غوثی ماندوی: گلزار ابرار = ترجمہ اردو موسوم بہ اذکار ابرار، آگرہ ۱۳۲۶ھ۔

فرشتہ = محمد قاسم فرشتہ: گلشن ابراہیمی، طبع سنگی، بمبئی ۱۸۳۲ء۔

فرہنگ = فرہنگ جغرافیائی ایران، از انتشارات دائرۂ جغرافیائی ستاد ارتش، ۱۳۲۸ تا ۱۳۲۹ھ ش۔

فرہنگ آنندراج = منشی محمد پادشاہ: فرہنگ آنندراج، ۳ جلد، لکھنؤ ۱۸۸۹ تا ۱۸۹۴ء۔

فقیر محمد = فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیہ، لکھنؤ ۱۹۶۰ء۔

فلٹن و لنگز: Alexander S. Fulton و Martin Lings: *Second Supplementary Catalogue of Arabic printed Books in the British Museum*، لندن ۱۹۵۹ء۔

فہرست (یا الفہرست) = ابن الندیم: کتاب الفہرست، طبع فلوگل، لائپزگ ۱۸۷۱ تا ۱۸۷۲ء۔

(ابن) القفطی = ابن القفطی: تاریخ الحکماء، طبع لیپرٹ J. Lippert، لائپزگ ۱۹۰۳ء۔

الکتبی، طبع بولاق، فوات = ابن شاکر الکتبی: فوات الوفیات، ۲ جلد، بولاق ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء۔

الکتبی، فوات طبع عباس = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۵ جلد، بیروت ۱۹۷۳ تا ۱۹۷۴ء۔

لسان العرب = ابن منظور: لسان العرب، ۲۰ جلدیں، قاہرہ ۱۳۰۰ تا ۱۳۰۸ھ۔

م آ = مختصر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ۔

مآثر الامراء = شاہنواز خان: مآثر الامراء، Bibl. Indica۔

مجالس المؤمنین = نور اللہ شوستری: مجالس المؤمنین، تہران ۱۲۹۹ھ ش۔

مرآۃ الجنان = الیافعی: مرآۃ الجنان، ۴ جلد، حیدر آباد (دکن) ۱۳۳۹ھ۔

مسعود کیہان = مسعود کیہان: جغرافیائی مفصل ایران، جلد، تہران ۱۳۱۰ و ۱۳۱۱ھ ش۔

المسعودی: مروج: مروج الذہب، طبع باربیہ ینارد (C. Barbier de Meynard) و پاوہ دکورتی (Pevet de Courteille)، پیرس ۱۸۶۱ تا ۱۸۷۷ء۔

المسعودی: التنبیہ = المسعودی: کتاب التنبیہ والاشراف، طبع ڈخویہ، لائیڈن ۱۸۹۴ء (BGA, VIII)۔

المقدسی = المقدسی: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، طبع ڈخویہ، لائیڈن ۱۸۷۷ء (BGA, VIII)۔

المقری: Analectes = المقری: نفح الطیب فی غصن الاندلس الرطیب، *Analectes sur l' histoire et la litterature des Arabes de l' Espagne*، لائیڈن ۱۸۵۵ تا ۱۸۶۱ء۔

المقری، بولاق = کتاب مذکور، بولاق ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء۔

منجم باشی: صحائف الاخبار، استانبول ۱۲۸۵ھ۔

میر خواند: روضۃ الصفاء، بمبئی ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء۔

نزہۃ الخواطر = حکیم عبدالحی: نزہۃ الخواطر، حیدر آباد ۱۹۴۷ء، ببعد۔

نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع لیوی پروونسال، قاہرہ ۱۹۵۳ء۔

الوافی = الصفدی: الوافی بالوفیات، ج ۱، طبع رٹر (Ritter)، استانبول ۱۹۳۱ء؛ ج ۲ و ۳، طبع ڈیڈرنگ (Dedering)، استانبول ۱۹۴۹ و ۱۹۵۳ء۔

الہمدانی = الہمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، طبع ملر (D.H. Muller)، لائیڈن ۱۸۸۴ تا ۱۸۹۱ء۔

یاقوت طبع وستنفلت: معجم البلدان، طبع وستنفلت، ۵ جلدیں، لائپزگ ۱۸۶۶ تا ۱۸۷۳ء (طبع اناستاتیک ۱۹۲۴ء)۔

یاقوت: ارشاد (یا ادباء) = ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب، طبع مرجلیوث، لائیڈن ۱۹۰۷ تا ۱۹۲۷ء (*GMS*, VI)؛ معجم الادباء، (طبع اناستاتیک، قاہرہ ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء)۔

یعقوبی (یا الیعقوبی) = الیعقوبی: تاریخ، طبع ہوتسما (W. Th. Houtsma) لائیڈن ۱۸۸۳ء؛ تاریخ الیعقوبی، ۳ جلد، نجف ۱۳۵۸ھ؛ ۲ جلد، بیروت ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء۔

یعقوبی: بلدان (یا البلدان) = الیعقوبی: (کتاب) البلدان، طبع ڈخویہ، لائیڈن ۱۸۹۲ء (*BGA*, VII)۔

یعقوبی، ویت = Wiet: *Yaqubi, Les pays*، مترجمہ G. Wiet، قاہرہ ۱۹۳۷ء۔

(ب)

کتب انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، جدید ترکی وغیرہ کے اختصارات، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

Al-Aghani:*Tables=Tables Alphabetiques du Kitab al-aghani, redigees par I. Guidi*, Leiden 1900.

Babinger= F. Babinger: *Die Geschichtschreiber der Osmanen und ihre Werke*, 1st ed.,Leiden 1927.

Barkan: Kanunlar= *Omar Lutfi Barkan: XV ve XVI inci Asirlarda Osmanli. Imparat orlugunda Zirai Ekonominin Hukuki ve Mali Esaslari, I. Kanunlar*, Istanbul 1943.

Blachere: *Litt.*=R. Blachere: *Histoire de la Litterature arabe, i*, Paris 1952.

Brockelmann, I, II=C. Brockelmann: *Geschichte der Arabischen Litteratur, Zweite den Supplement-banden angepasste Auflage*, Leiden 1943-1949.

Brockelmann, *SI*, II, III=*G.d A.L., Erster (Zweiter, Dritter), Supplementband*, Leiden 1937-42.

Brown i = E.G.Brown: *Al literary History of Persia, from the earliest times until Firdowsi* London 1902.

Browne, ii=*A Literary History of Persia, from Firdowsi to Sadi*, London 1908.

Browne, iii=*A History of Persian Literarture under Tartar Dominion*, Cambridge 1920.

Browne, iv=*A History of Persian Literature in Modern Times*, Cambridge 1924.

Caetani: *Annali*=L. Caetani: *Annali dell' Islam*, *Milano* 1905-26.

Chauvin: *Bibliographie*=V. Chauvin: *Bibliographie des ouvrages arabes et relatifs aux Arabes*, Lille 1892.

Dorn: *Quelen*=B. Dorn: *Muhammedanische Quellen zur Geschichte der sudlichen Kustenlander des Kaspischen, Meeres*, St. Petersburg 1850-58.

Dozy: *Notices*=R. Dozy: *Notices sur quelques manuscrits arabes*, Leiden 1847-51 and D.S. Margoliouth, London 1937.

Dozy :*Recherches*= R. Dozy : *Recherches sur l'histoire et la litterature de l' Espagne Pendant le maoyen-age*, 3rd ed., Paris-Leiden 1881.

Dozy, *Suppl.*=R.Dozy :*Supplement aux dictionnaires* arabes, 2nd ed., Leiden-Paris 1927.

Fagnan :*Extraits* =E. Fagnan: *Extraits inedits relatifs au Maghreb*, Alger 1924.

Gesch. *des Qor.*=Th. Nöldeke: *Geshichte des Qorans*, new edition by F. Schwally, G. Bergstrasser and O. Pretzl, 3 vols., Leipzig 1909-38.

Gibb: *Ottoman Poetry*= E.J.W. Gibb: *A History of Ottoman Poetry*, London 1900-09.

Gibb-Bowen= H.A.R. Gibb and Harold Bowen: *Islamic Society and the West*, London 1950-57.

Goldziher:*Muh.St.*=I.Goldziher: *Muhammedanische Studien*, 2 Vols., Halle 1888-90

Goldziher :*Vorlesungen*= I Goldziher :*Vorlesungen uber den Islam*, Heidelburg 1910.

Goldziher:Vorlesungen^2 =2nd ed., Heidelberg 1925.

Goldziher: Dogme= *Le dogme et la loi del Islam*, tr. F. Amin, Paris 1920.

Hammer-Purgstall: GOR=J.von Hammer (purgstall) : *Geschichte des Osmanischen Reiches*, Pest 1828-35.

Hammer-Purgstall:*GOR*^{2}=the same, 2nd ed., Pest 1840.

Hammer-Purgstall,:*Histoire*=the same, trans by J.J. Hellert, 18 vol., Bellizard (etc.), Paris (etc.)

1835-43.

Hammer-Purgstall:*Staatsverfassung*=J. von Hammer: *Des Osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung*,2 vols., Vienna 1815.

Houtsma: *Recueil*= M.Th. Houtsma: *Recueil des textes relatifs a l'histoire des Seldjoucides*. Leiden 1886-1902.

Juynboll: Handbuch=Th. W. Juynboll; *Handbuch des islamischen Gesetzes*, Leiden 1910.

Juynboll: *Handleiding= Handleiding tot de kennis der mohammedaansche wet*, 3rd ed., Leiden 1925.

Lane=E.W. Lane: *An Arabic-English Lexicon*, London 1863-93 (Reprint, New York 1955-56).

Lane-Poole: *Cat*=S. Lane-Poole: *Catalogue of Oriental Coins in the British Museum*, 1877-90.

Lavoix: Cat.=H. Lavoix: *catalogue des Monnaies Musulmanes de la Bibliotheque Nationale*, Paris 1887-96.

Le Strange=G Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate* 2ne ed., Cambridge 1930 (Reprint, 1966).

Le Strange: *Baghdad*=G. Le Strange: *Baghdad during the Abbasid Caliphate*, Oxford 1924.

Le Strange: Palestine=G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*, London 1890 (Reprint, 1965).

Levi-Provencal:Hist. Esp. Mus.=E.Levi-Provencal: *Histoire de l' Espagne Musulmane*, nouv. ed., Leiden-Paris 1950-53, 3 vols.

Levi-Provencal: Hist.Chorfa=E. Levi-Provencal: Les *Historiens des Chorfa*, Paris 1922.

Maspero-Wiet: *Materiaux*=J Maspero et G. Wiet: *Materiaux pour servir a la Geographie de l'Egypte*, Le Caire 1914 (Mifao, XXXVI).

Mayer: Architects= L.A. Mayer: *Islamic Architects. and their Works*, Geneva 1958.

Mayer: Astrolabists=L.A. Mayer; *Islamic Architects and their Works*, Geneva 1956.

Mayer:Metalworkers=L.A. Mayer: *Islamic Astrolabists and their Works*, Geneva 1959.

Mayer: Woodcarvers=L.A. Mayer: *Islamic Woodcarvers and their Works*, Geneva 1958.

Mez: Renaissance= A. Mez: *Die Renaissance des Islams*, Heidelberg 1922, (Spanish Translation by s. vila, Madrid- Granadal 1936).

Mez: *Renaissance*, Eng. tr.=the same, English translation by Salahuddin Khuda Bukhsh and D.S Margoliouth Londen 1937.

Nallino: Scritti=C.A. Nallino: *Raccolta di Scritti editi e inediri*, Roma 1939-48.

Pakahn=Mehmet Zeki Pakahn: *Osmanli Tarih Deyimleri ve Terimleri Sozlugu*, 3 vols., Istanbul 1946 ff.

Pauly-Wissowa=*Realenzyklopaedie* des klassischen Altertums.

Pearson=J.D. Pearson: *Index Islamicus*, Cambridge 1958.

Pons Boigues=*Ensayo bio-bibliografico sobre los historiadores y geografos arabio-espanole*, Madrid 1898.

Rypka, *Hist of Iramican litteratuare*= J.Rypka et alii, *History of Iramian literature*, Dordrecht 1968.

Santillana: *Istituzioni*=D. Santillana: *Istituzioni di diritto musulmano malichita*, Roma 1926-38.

Schlimmer=John L. Schlimmer: *Terminologie medico-Pharmaceutique et Anthropologique*, Tehran 1874.

Schwarz: *Iran*=P. Schwarz: *Iran im Mittelalter nach den arabischen Geographen*, Leipzig 1896.

Smith=W.=Smith: *A Classical Dictionary of Biography, Mythology and Geography*

Hurgronje: *Verspr. Ged Geography*, London

1853.

Snouck Hurgronje: *Verspr. Geschr.*=C. Snouck Hurgronje: *Verspreide Geschriften* Bonn Leipzig-Leiden 1923-27.

Sources ined=Comte Henri de Castries: *Les Sources inedites de l' Histoire du Maroc*, Paris 1905, 1922.

Spuler: *Horde*= B. Spuler: *Die Golaene Horde* eipzig 1943.

Spuler: Iran=B.Spuler: *Iran in fruh-Islamischer Zeit*, Wiesbaden 1952.

Spuler: Mongolenz=B. Spuler: *Die Mongolen in Iran*, 2nd. ed, Berlin 1955.

SNR=Stephan and Naudy Ronart:*Concise Encyclopaedia of Arabic Civilization*, Djambatan Amsterdam 1959.

Storey=C.A. Storey: *Persian Litrerature: a biobibliographical survey*, London 1927.

Survey of Persian Art = ed.by A.U.Pope,Oxford 1938.

Suter=H.Suter: *Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke*, Leipzig 1900.

Taeschner:*Wegenetz*=F.Taeschner: *Die Verkehrslage und den Wegenetz Anatoliens im Wandel der Zeiten*, Gotha 1926.

Tomaschek=W.Tomaschek: *Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter*, Vienna 1891.

Wensinck: *Handbook*=A.J. Wensinck: *A Hand book of Early Muhammadan Tradition*, Leiden 1927.

Wiel: *Chalifen*=G.Weil: *Geschichte der Chalifen, Mannheim*-Stuttgart 1846-82.

Zambaur=E.de Zambaur: *Manual de de genealogie et de chronologie pour l'histoire de l'Islam*. Hanover 1927 (anastatic reprint, Bad Pyrmont 1955).

Zinkeisen=J. Zinkeisen:*Geschichte des Osmanischen Reiches in Europa*, Gotha 1840-83.

Zubaid Ahmad=*The Contribution of India to Arabic Literature*, Allahbad 1946 (reprint, Lahore 1968).

(ج)

مجلات، سلسلہ ہائے کتب، وغیرہ، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

AB=Archives Berbers.

Abh. G. W. Gott–Abhandlungen der Gesellschaft der Wissenschaften zu Gottingen.

Abh. K.M.–Abhandlungen f.d. Kunde des Morgenlandes.

Abh. Pr. AK. W.= Abhandlungen d. preuss. Akad. d. Wiss.

Afr. Fr.–Bulletin du Comite de l'Afrique francaise.

Afr. Fr. RC=Bulletin du Com. de l' Afr. franc., Renseignements Coloniaux.

AIEO Alger=Annales de l' Institute d' Etudes Orientales de l' Universite d' Alger.

AIUON=Annali dell' Instituto Univ. Orient. di Napoli.

AM–Archives Marocaines.

And–Al Andalus.

Anth=Anthropos.

Anz. wien=Anzeiger der philos-histor. Kl. d. Ak. der Wiss. Wien.

AO–Acta Orientalia.

Arab.–Arabica

ArO=Archiv Orientalni

ARW=Archiv fur Religionswissenschaft.

ASI=Archaelogical Survey of India.

ASI, NIS=the same, New Imperial Series.

ASI, AR=the same, Annual Reports.

AUDTCFD=Ankara Universitesi Dil ve arihcografya Fakultesi Dergisi.

As. Fr. B= Bulletin du Comite de l' Asie Francaise.

BAH=Bibliotheca Arabico-Hispana.

BASOR=Bulletin of the American School of Oriental Research.

Bell=Turk Tarih Kurumu Belleten.

BFac. Ar. = Bulletin of the Faculty of the Egyptian University.

BEt. Or. = Bulletin d' Etudes Orientales de l'Institut Francaise Damas.

BGA=Bibliotheca geographorum arabicorum.

BIE=Bulletin de l' Institut Egyptien.

BIFAO=Bulletin de l' Institut Francais d' Archeologie Orientale du Caire.

BIS=Bibliotheca Indica series.

BRAH=Boletin de la Real Academia de la Historia de Espana.

BSE=Bolshaya Sovetskaya Entsiklopediya (Large Soviet Encyclopaedia), Ist ed.

BSE^2*=the Same, 2nd ed.*

BSL(P)=Bulletin de la Societe de Linguistiq (de Paris).

BSO(A)S–Bulletin of the School of Oriental (and African) Studies.

BTLV=Bijdragen tot de Taal, Lond-en Volkenkunde (van Ned Indie).

BZ=Byzantinische Zeitschrift.

COC=Cahiers de l' Orient Contemporain.

CT=Cahiers deTunisie.

EI^1*=Encyclopaedia of Islam, 1st edition.*

EI^2*=Encyclopaedia of Islam, 2nd edition.*

EIM=Epigraphia Indo-Moslemica.

ERE=Encyclopaedia of Religion and Ethics.

GGA=Gottinger Gelehrte Anzeigen.

GJ=Geographical Journal.

GMS=Gibb Memorial Series.

Gr. I. ph=Grundriss der Iranischen Philologie.

GSAI=Giornale della Soc. Asiatica Italiana.
Hesp.=Hesperis.
IA=Islam Ansiklopedisi (Turkish).
IBLA=Revue de l'Institut des Belles Letters Arabes, Tunis.
IC=Islamic Culture.
IFD=Ilahiyat Fakultesi.
IG=Indische Gids.
IHQ=Indian Historical Quarterly.
IQ=The Islamic Quarterly.
IRM=International Review of Missions.
Isl.=Der Islam.
JA=Journal Asiatique.
JAfr. S=Journal of the African Society.
JAOS=Journal of the American Oriental Society.
JAnthr. I=Journal of the Anthropological Institute.
JBBRAS=Journal of the Bombay Branch of the Royal Asiatic Society.
JE.=Jewish Encyclopaedia.
JESHO=Journal of the Economic and Social History of the Orient.
JNES=Journal of Near Eastern Studies.
JPak.HS=Journal of the Pakistan Historical Society.
JPHS=Journal of the Punjab Historical Society.
JQR=Jewish Quarterly Review.
JRAS=Journal of the Royal Asiatic Society.
J(R)ASB=Journal and Proceedings of the (Royal) Asiatic Society of Bengal.
J(R)Num.S=Journal of the (Royal) Numismatic Society.
JRGeog.S=Journal of the Royal Geographical Society.
JSFO=Journal de la Societe Finno-ougreine.
JSS=Journal of Semetic studies.
KCA=Korosi Csoma Archivum.
KS=Keleti Szemle (Revue Orientale).
KSIE=Kratkie Soobshceniya Instituta Etnografiy (Short Communications of the Institute of Ethnography).
LE=Literaturnaya Entsiklopediya (Literary Encyclopaedia).
Mash.=Al-Mashrik.
MDOG=Mitteilungen der Deutschen Orient- Gesellschaft.
MDVP= Mitteilungen und Nachr. des. Deutschen Palistina- vereins.
MEA=Middle Eastern Affairs.
MEJ=Middle East Journal.
MFOB=Melanges de la Faculte Orientale de Beyrouth.
MGG Wien=Mitteilungen der geographischen Gesellschaft in Wien.
MGMN=Mitt. Geschichte der Medizin und der naturwissenshaften.
MGWJ=Monatsschrift f. d. Geschichte u. Wissenschaft des Judentums.
MI=Mir Islama.
MIDEO=Melanges de l' Institut Dominicain d' Etudes Orintales du Caire.
MIE=Memoires de l' Institut d' Egyptien.
MIFAO=Memories publies par les members de l' Inst. Franc d' Aracheologie Orientale du Caire.
MMAF=Memoires de la Mission Archeologique Franc au Caire.
MMIA=Madjallat al-Madjmaal-ilmi al Arabi Damascus.
MO=Le Monde oriental.
MOG=Mitteilungen zur osmanischen Geschichte.
MSE=Malaya Sovetskaya Entsiklopediya-(Small Soviet Encyclopaedia).
MSFO=Memoires de la Societe Finno-ougrienne.
MSL=Memoires de la Societe Linguistique de Paris.

MSOS Afr.=Mitteilungen des Sem. fur Oriental. Sprachen Afr. Studien.
MSOS As.=Mitteilungen des Sem. fur Oriental Sprachen Westasiatische Studien.
MTM=Mili Taebbuler medjmuasi.
MVAG=Mitteilungen der Vorderasiatisch-agyptischen Gesellschaft.
MW=The Muslim World.
NC=Numismatic Chronicle.
NGW Gott.=Nachrichten von d. Gesellschaft d. Wiss. zu Gottingen.
OA=Orientalisches Archiv.
OC=Oriens Christianus.
OCM=Oriental College Magazine, Lahore.
OCMD=Oriental College Magazine, Damima, Lahore
OLZ=Orientalistische Literaturzeitung.
OM=Oriente Moderno.
Or.=Oriens.
PEFQS=Palestine Exploration Fund Quarterly Statement.
PELOV=Publications de l' Ecole des langues orientales vivantes.
Pet.Mitt.=Petermanns Mitteilungen.
PRGS=Proceedings of the R. Geographical Society.
QDAP=Quarterly Statement of the Department of Antiquities of Palestine.
RAfr.=Revue Africaine.
RCEA=Repertoire Chronologique d'Epigrapie arabe.
REI=Revue des Etudes Islamiques.
REJ=Revue des Etudes Juives.
Rend. Lin.=Rendiconti della Reale Accad. dei Lincei, Cl. di sc. mor. stor. e filol.
RHR=Revue de l' Histoire des Religions.
RI=Revue Indigene.
RIMA=Revue de l' Institut des manuscrits Arabes.
RMM=Revue du Monde Musulman.
RO=Rocznik Orientalistyczny.
ROC=Revue de l' Orient Chretien.
ROL=Revue de l' Orient Latin.
RRAH=Rev. de la R. Academia de la Histaira, Madrid.
RSO=Rivista degli Studi Orientali.
RT=Revue Tunisienne.
SBAK. Heid.=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Heidelberg.
SBAK. Wien=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Wien.
SBBayr. AK.=Sitzungsberichte der Bayrischen Akademie der Wissenschaften.
SBPMS Erlg.=Sitzungsberichte d. Phys. medizin Sozietat in Erlangen.
SBPr. AK. W.=Sitzungsberichte der preuss. AK. der wiss. zu Berlin.
SE=Sovetskaya Etnografiya (Soviet Ethnography).
SI=Studai Islamica.
SO=Sovetkoe Vostokovedenie (Soviet Orientalism).
Stud. Isl.= Studia Islamica.
S.Ya.=Sovetskoe Yazikoznanie (Soviet Linguistics).
SYB=The Statesman's Year Book.
TBG=Tijdschrift van het Bataviaasch Genootschap van Kunsten en Wetenschappen.
TD=Tarih Dergisi.
TIE=Trudi instituta Etnografih (Works of the Institute of Ethnography).
TM=Turkiyat Mecmuasi
TOEM=Tarikh i Othmani (Turk Tarikhi) Endjumeni medjmu asi.
TTLV=Tijdschrift. v. Indische Taal. Land en Volkenkunde.
Verh. Ak. Amst.=Verhandelingen der Koninklijke

Akademie van Westenschappen te Amsterdam.

Versl.Med. AK. Amst = Verslagen en Mededeelingen der Koninklijke Akademie van wetenschappen te Amsterdam.

VI=Voprosi Istority (Historical problems).

WI=Die Welt des Islams.

WI.NS=the same, New Series.

Wiss. Veroff. DOG=Wissenschaftliche Veroffentlichungen der Deutschen Orient-Gesellschaft.

WMG=World Muslim Gazetteer, Karachi.

WZKM=Wiener Zeitschrift fur die Kunde des Morgenlandes.

ZA=Zeitschrift fur Assyriologie.

Zap.=Zapiski.

ZATW=Zeitschrift fur die alttestamentliche Wissenschaft.

ZDMG=Zeitschrift der Deutschen Morgenlandischen Gesellschaft.

ZDPV=Zeitschrift des Deutschen Palasatinavereins.

ZGErdk. Berl.=Zeitschrift der Gesellschaft fur Erdkunde in Berlin.

ZK=Zeitschrift fur Klonialsprachen.

ZOEG=Zeitschrift f. Osteuropaische Geschichte.

ZS=Zeitschrift fur Semitistik.

علامات و رموز و اعراب

(۱)

علامات

× مقالہ ترجمہ از آ، لائیڈن

⊛ جدید مقالہ برائے اردو دائرہ معارف اسلامیہ

[ ] اضافہ از ادارہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

(۲)

رموز

ترجمہ کرتے وقت انگریزی رموز کے مندرجہ ذیل اردو متبادل اختیار کیے گئے ہیں:

بعد = f.,ff.,sq.,sqq.
بذیل مادہ (یا کلمہ) = s. v.
دیکھیے: کسی کتاب کے حوالے کے لیے = see; s.
رک بہ (رجوع کنید بہ) یا رک باں (رجوع کنید بآں): آ آ کے کسی مقالے کے حوالے کے لیے = q.v.
بمواضع کثیرہ = passim.

کتاب مذکور = op.cit.
دیکھیے لغوی مفہوم (تقارب یا تقابل) = cf.
ق۔م (قبل مسیح) = B.C.
م (متوفی) = d.
محل مذکور = loc. cit.
کتاب مذکور = ibid.
وہی مصنف = idem.
ھ (سنہ ہجری) = A.H.
ء (سنہ عیسوی) = A.D.

(۳)

اعراب

(ا)

Vowels

فتحہ (ـَ) = a
کسرہ (ـِ) = i
ضمہ (ـُ) = u

(ب)

Long Vowels

ا، آ = ā (aj kal: آج کل)
ی = ī (Sim: سیم)
و = ū (Hārūn al-Rashid: ہارون الرشید)
اے = ai (Sair: سیر)

(ج)

ـٖ = e آواز کو ظاہر کرتی ہے (پین: pen)
ـٗ = o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (مول: mole)
ـٗ = ŭ کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (ترکیہ: Turkiya)
ـہ = ō کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (کول: kōl)
ـٓ = ā کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (آذرجب: ārādjāb: آذرجب: radjab)
ـْ = علامت سکون یا جزم (بسمل: bismil)

متبادل اردو عربی حروف

ب = b
بھ = bh
پ = p
پھ = ph
ت = t
تھ = th
ٹ = t
ٹھ = ṭh
ث = th
ج = dj
جھ = djh
چ = č
چھ = ch

ح = ḥ
خ = Kh
د = d
دھ = dh
ذ = ḋ
ڈ = ḍ
ڈھ = dh
ر = r
رھ = rh
ڑ = ṛ
ڑھ = ṛh
ز = z
ژ = ž, zh

س = s
ش = sh, ch
ص = ṣ
ض = ḍ
ط = ṭ
ظ = ẓ
ع = ،
غ = gh
ف = f
ق = ḳ
ک = k
کھ = kh

گ = g
گھ = gh
ل = l
لھ = lh
م = m
مھ = mh
ن = n
نھ = nh
و = w
ہ = h
ء = ء
ی = y

متبادل اردو عربی حروف

b = ب
bh = بھ
p = پ
ph = پھ
t = ت
th = تھ
ṭ = ٹ
ṭh = ٹھ
th = ث
dj = ج
djh = جھ
č = چ
ch = چھ

ḥ = ح
Kh̲ = خ
d = د
dh = دھ
ḋ = ذ
ḍ = ڈ
ḍh = ڈھ
r = ر
rh = رھ
ṛ = ڑ
ṛh = ڑھ
z = ز
ž, z̲h̲ = ژ

s = س
s̲h̲، c̲h̲ = ش
ṣ = ص
ḍ = ض
ṭ = ط
ẓ = ظ
ʻ = ع
g̲h̲ = غ
f = ف
ḳ = ق
k = ک
kh = کھ

g = گ
gh = گھ
l = ل
lh = لھ
m = م
mh = مھ
n = ن
nh = نھ
w = و
h = ہ
ʼ = ء
y = ی

بوزنطیہ: یا روماے نو (جسے مسلمان رُوم کہتے ہیں) غیر عیسائی رومیوں کی سلطنت اور شہر روما (اطالیہ) کا مسیحی جانشین یورپ کی سیاسی اور ثقافتی روایات کا ۳۲۴ سے ۱۴۵۳ء تک پشت و پناہ تھا۔ اس کے پاے تخت قسطنطینیہ (زمانۂ حاضر کے استانبول) کی بنیاد قسطنطینوس (Constantine) اعظم نے دو وجہوں سے رکھی تھی: ایک تو یہ کہ قدیم روما کی غیر مسیحی اور جمہوری اور دورِ متأخر کی نیم پارلیمانی اور شاہی روایت سے قطع روابط کیا جائے، دوسرے یہ کہ سب سے زیادہ مخدوش سرحدوں کے نزدیک ایک محفوظ تر پاے تخت کی ضرورت بھی تھی۔

ارتقا کی درمیانی منزلیں: رومی قلمرو پہلے شہنشاہ اغسطس Augustus (۲۷ ق م تا ۱۴ء) ہی کے ماتحت بوزنطی سلطنت کے سانچے میں ڈھلنا شروع ہو گئی تھی، یعنی ملوکیت کا آغاز ہو چکا تھا گو ابھی پارلیمانی شکل و صورت کا بھیس باقی تھا۔ طرایانوس Traianus (۹۸ تا ۱۱۷ء): پہلا غیر اطالوی شہنشاہ؛ ھدریانوس Hadrianus (۱۱۷ تا ۱۳۸ء): یونانی اور مشرقی ولایات کے ساتھ مساوی سلوک۔ مشرقی عقائد مذہبی کا سرکاری طور پر اعتراف؛ مشرقی فن کے رجحانات گنبد اور طاق کی ترویج کا آغاز۔ انطونیوس Antonius Pius (۱۳۸ تا ۱۶۱ء): فلاح عوام پر مبنی سلطنت سے استبدادیت کی طرف انتقال؛ قومدوس Commodus (۱۸۰ تا ۱۹۲ء): مشرقی عقائدِ دینی کا غلبہ؛ سپتیموس سیوروس Septimius Severus (۱۹۳ تا ۲۱۱ء)، کاراکلا Caracalla (۲۱۲ تا ۲۱۷ء)، الاگبال Elagabal (۲۱۸ تا ۲۲۲ء)، سیوروس الاسکندر Severus Alexander (۲۲۲ تا ۲۳۵ء)، فلپوس عربی Philippus Arabus (۲۴۴ تا ۲۴۹ء): مشرقی نسلوں کے شہنشاہ، پہلے بربری، پھر شامی اور آخر میں شرق اردن کا ایک بدوی۔ کاراکلا کے ماتحت مقتدر رومی شہریوں اور رومی رعایا کے درمیان امتیازات کا خاتمہ ہو گیا، الاگبال کے عہد میں شام کے سورج دیوتا اور شمالی افریقہ کی چندر دیوی کی پوجا روما کے اہم سرکاری عقائد دینی میں شمار ہونے لگی۔ شامی صوبے اور غسّانیوں کی سرحدی عرب ریاست روز بروز خوش حال ہوتی گئی۔ اوریلیانوس Aurelianus (۲۷۰ تا ۲۷۵ء): ایرانی دیوتا متھراس Mithras (آفتاب غیر مغلوب) کی پوجا سرکاری طور پر دینی عقیدہ بن گیا اور شہنشاہ ہی کو یہ دیوتا سمجھا جانے لگا۔ تدمر (Palmyra) کے عربوں نے ملکہ زنوبیہ Zenobia کے ماتحت ایشیائی صوبوں میں ایک مشرقی سلطنت قائم کرنے کی جو کوشش کی تھی (۲۶۷ تا ۲۷۳ء) اسے آخر کار اوریلیانوس Aurelianus نے کچل دیا۔ اب فوجیں زیادہ تر سرحد کے بربری باشندوں میں سے بھرتی کی جانے لگیں۔ دیوقلیسیانوس Diocletianus (۲۸۴ تا ۳۰۵ء)، شہنشاہوں (Augusti) اور ولی عہدوں (Caesers) کے ماتحت قلمرو کی باقاعدہ تنظیم کی گئی تاکہ شعوب تیوتونیہ (Teutons) (جنہیں وسط ایشیا کے طوائف ھنوں Huns نے مغرب کی طرف دھکیل دیا تھا) اور قوم پرست ساسانی خاندان (۲۲۶ تا ۶۳۶ / ۶۴۲ء) کے ماتحت ایرانیوں کے مسلسل حملوں سے ملک کا دفاع بوجہ احسن کیا جا سکے۔ درباری رسوم و آداب اور نظمِ حکومت کے اوضاع قدیم مشرق کے اسلوب پر مرتب کیے گئے۔ مسیحیوں پر ظالمانہ تشدّد کیا گیا جو عام طور پر ناکام رہا۔

۲۔ مسیحی رومی سلطنت: مدت کی مسلسل خانہ جنگیوں (۳۰۸ تا ۳۲۴ء) کے بعد قسطنطین الاوّل الکبیر لیکینیوس Licinius کی شرکت میں (۳۱۲ء) اور پھر بلا شرکت غیرے (۳۲۴ تا ۳۳۷ء) شہنشاہ بن گیا۔ ۳۱۳ء میں میلان Milan کا

فرمان صادر ہوا، جس کی رو سے مسیحیت کو تسلیم کر لیا گیا۔ ۳۲۵ء میں نیقیا (Nicaea) کی کونسل نے مسیحی اعتقادنامہ مرتب کیا۔ مرتد یولیانوس Julian (۳۶۱ تا ۳۶۳ء) نے قدیم تر مذہب کو اصلاح کردہ شکل میں دوبارہ زندہ کیا۔ تھیوڈوسیوس Theodosius (الاول الکبیر) (۳۷۹ تا ۳۹۵ء) نے ۳۸۰ء میں مسیحیت کو سلطنت کے واحد مذہب کی حیثیت دے دی، اور ۳۹۲ء کے فرمان سے بت پرستی کی سختی سے بیخ کنی کر دی۔

۳۲۴ء میں قسطنطین نے قدیم یونانی شہر بوزنطیہ (Byzantium) کے محلِّ وقوع پر ایک نیا پایۂ تخت قسطنطینیہ کے نام سے تعمیر کیا، جس میں ایک اعلیٰ درجے کی قدرتی بندرگاہ "شاخ زریں" (Golden Horn) تھی۔ یہ مقام ایشیا اور یورپ کی بڑی سڑکوں اور بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم کے بحری راستوں کے نقطۂ تقاطع پر واقع تھا۔ خشکی کی طرف سے اس کی حفاظت آسان تھی، کیونکہ یہ ایک جزیرہ‌نما پر تعمیر کیا گیا تھا اور سمندر کی طرف سے شمال میں آبنائے باسفورس Bosphorus اور جنوب میں بحیرۂ مرمرہ Marmora اور حلقِ ینطس Hellespontus (در دانیال) کی آبناؤں نے اسے محفوظ کر رکھا تھا۔ اس کی اندرونی فصیلیں قسطنطین نے تعمیر کیں اور ۴۱۳ء میں تھیوڈوسیوس ثانی (۴۰۸ تا ۴۵۰ء) نے اس کی بیرونی سہ گونہ شہر پناہیں تیار کیں۔ انہی استحکامات کی وجہ سے اس عظیم الشان شہر نے صدیوں تک بہت سے محاصروں کا مقابلہ کیا، اور اسی لیے وہ ایک ایسا مرکز بنا رہا جہاں سے رومی سلطنت ہمیشہ اپنے چھنے ہوئے علاقوں کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی رہی۔ بندرگاہ کی تجارت خوب پھلی پھولی تھی اور صنعتوں نے بے حد ترقی کی تھی، جن کی وجہ سے اعلیٰ درجے کی اشیائے تعیش آس پاس کے ملکوں میں بھیجی جاتی تھیں اور ہر طرف سے دولت و ثروت کھنچی چلی آتی تھی۔ اس مال و دولت کی وجہ سے ایک اعلیٰ درجے کی مسلح فوج رکھی جا سکتی تھی، جسے بربری قوموں کے بے شمار مستاجر عسکریوں کی امداد بھی حاصل تھی؛ خطرناک دشمنوں کو روپیہ دے کر لوٹایا جا سکتا یا اپنے ساتھ ملایا جا سکتا تھا اور غیر مہذب وحشی قوموں کو بہت غور و فکر سے ایجاد کردہ درباری رسوم کے جاہ و جلال سے مرعوب کیا جا سکتا تھا۔ تعلیم کا معیار اعلیٰ تھا، جس کی وجہ سے صرف قدیم یونانی اور رومی فن اور ادب ہی کا احیا نہ ہو رہا تھا بلکہ علمی فن حرب کی بنیادیں بھی مضبوط کی جا رہی تھیں۔ اعلیٰ درجے کی ترقی یافتہ فوجی انجینئرنگ (مثلاً آتش یونانی جسے کلینیکوس Kallinikos نے ایجاد کیا تھا اور جو آج کل کے آتش پاش (flame-thrower) کی ابتدائی صورت تھی)، نفسیاتی اسلوب جنگ اور دقیق سیاست بھی رو بہ ترقی تھی۔ ان تمام کامیابیوں کی بدولت بوزنطی بڑی بڑی آفات کا مقابلہ کامیابی سے کر سکتے تھے اور نہایت ناموافق حالات سے بچ نکلتے تھے، لیکن اس کے باوجود ایک مسلسل (گو سست رفتار) انحطاط ناگزیر ثابت ہوا، کیونکہ بربروں کے حملوں سے صوبوں کی حالت کبھی پوری طرح درست نہ ہوئی۔ ان کے یونانی آبادکاروں کی جگہ مشرقی آبادیاں (شمالی افریقہ، مصر اور شام کی) یا (ایشیائے کوچک، بلقان، اطالیہ اور ہسپانیہ کے) نئے بربری مہاجر غالب آتے گئے اور جب ۱۲۰۴ء میں چوتھی صلیبی جنگ کے یورپی سورماؤں نے مکاری سے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا تو بوزنطی قلمرو کی کمر ٹوٹ گئی۔

— مغربی قلمرو کا ہاتھ سے جاتے رہنا: قسطنطینی، تھیوڈوسیوسی اور یوسطینیانوسی خاندانوں (حدود ۳۰۰ تا ۶۰۰ء) کے ماتحت رومی قلمرو کے مغربی

نصف حصہ ہاتھ سے جاتا رہا ۔ قسطنطین کے پوتے یولیانوس کی موت (۳۶۳ء) کے بعد قلمرو دوبارہ تقسیم ہو چکی تھی (مشرق میں یوبانوس Jovianus اور والنس Valens اور مغرب میں ویلنتینیانوس Valentinianus اول، گراتیانوس Gratianus اور ویلنتینیانوس دوم) ۔ تھیوڈوسیوس اول کبیر (۳۷۹ - ۳۹۵ء) نے اپنی حکومت کے آخری برسوں میں قلمرو کو ازسر نو متحد کیا، لیکن اس کی وفات کے بعد وہ ایک بار پھر تقسیم ہو گئی ۔ اس کا بیٹا آرقادیوس Arcadius قسطنطینیہ پر حکمران ہوا، اس کے بعد تھیوڈوسیوس دوم، مرقیانوس Marcianus، لیو اوّل، زینون Zenon، انسطاسیوس Anastasius اول اس کے جانشین ہوئے ۔ اس کا دوسرا بیٹا انوریوس Honorious راونّہ Ravenna میں تخت نشین ہوا، (۴۰۲ء سے پو Po کی دلدلوں کی وجہ سے محفوظ)، اور اس کا جانشین ویلنتینیانوس سوم ہوا، جس کے بعد مغربی قلمرو پارہ پارہ ہو گئی ۔ ایشیا میں ایرانیوں سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جنگیں ہوتی رہیں، جن کے دوران میں ارمینیہ نے، جو سابقاً سلطنت پارتھیا Parthia کی ایک ولایت تھا، عیسائیت قبول کر لی اور ۳۸۷ء میں بوزنطیہ کی سیادت تسلیم کر لی ۔ لیکن حقیقی مسئلہ یہ تھا کہ شمالی سرحد کو مختلف توتونی قبائل اور وسط ایشیائی ہُن قبیلوں نے آتّیلا Attila (۴۳۴ تا ۴۵۳ء) کی زیر قیادت پامال کر دیا تھا ۔ جب قدیم رومی فوج کے پیشہ ور فوجی دستوں (legions) کو قوطیوں (Goths) کے ساز و سامان سے لیس گھوڑ سواروں نے ادرنہ (۳۷۸ء) کے مقام پر شکست فاش دے دی تو اس کے بعد شہنشاہ اپنی قلمرو کا دفاع صرف ہُنوں، قوطیوں اور دوسرے جرمن مستاجر سپاہیوں ہی کی مدد سے کر سکتے تھے ۔ چونکہ یہ نئے آبادکار بغایت ناقابلِ اعتماد تھے لہٰذا قلمرو کا شمالی حصہ بالکل تاخت و تاراج ہو گیا ۔ آرکادیوس (۳۹۵ تا ۴۰۸ء) کے ماتحت قوطی مستاجر سپاہیوں نے قسطنطینیہ پر تقریبًا قبضہ ہی کر لیا تھا ۔ اس طرح قسطنطینیہ کے شہنشاہوں نے بربر قبیلوں کو شہر کے بجائے مغربی رومی قلمرو پر حملہ کرنے کی ترغیب دی اور راونّہ Ravenna کے شہنشاہوں نے انہیں اطالیہ کے جنوبی اور مغربی صوبوں کی طرف پیش قدمی کرنے پر آمادہ کیا ۔ ان تمام صوبوں کے کھو بیٹھنے کو کچھ مدت تک یوں چھپانے کی کوشش کی گئی کہ ان حملہ آور قبائل کے سرداروں کو بڑے بڑے رومی خطابات و اعزازات دے دیے گئے ۔ اس طریقے سے (۴۰۰ء کے قریب) ڈینیوب کے صوبوں گال Gaul، برطانیہ، ہسپانیہ اور (۴۲۹ء میں) شمالی افریقہ پر قوطوں، فرانکوں، برغندیوں Burgundians اور وندالوں Vandals نے قبضہ کر لیا ۔ ۴۵۱ء میں قطلونیہ Catalaunia کے میدانوں (موجودہ فرانس) میں ایک بہت بڑی جنگ ہوئی، جس میں ان نئے آبادکاروں کی امداد سے ہُنوں کو شکست فاش دے دی گئی، مگر تھوڑی ہی مدت بعد توتونی قبائل نے بھی رومی سیادت کی ظاہری علامات کو بھی خیرباد کہہ کر اطالیہ پر حملہ کر دیا، لیکن روما اور راونّہ دونوں کا دفاع ان وحشی قبائل نے کیا جو رومیوں کی حمایت پر آمادہ کر لیے گئے تھے ۔ مغربی رومی قلمرو کے حکمران سٹیلیخو Stilicho، ایتیوس Aetius، ریکیمر Ricimer اور اودواکار Odovakar جیسے توتونی تھے ۔ روما کو الاریخ Alarich نے ۴۱۰ء میں اور گایزریخ نے ۴۵۵ء میں تاخت و تاراج کیا ۔ ۴۷۶ء میں اودواکار مغربی رومی سلطنت کے آخری شہنشاہ کو تخت و تاج سے معزول کر کے خود اطالیہ کا بادشاہ بن بیٹھا ۔ ۴۹۳ء میں مشرقی قوطی سلطنت کی بنیاد رکھ دی گئی ۔ مشرقی رومی

شہنشاہ یوسطینیانوس Justinianus اول (۵۲۷ تا ۵۶۵ء) نے مغربی رومی صوبوں کو دوبارہ حاصل کرنے کی آخری کوششیں کی (شمالی افریقہ ۵۳۳ تا ۵۴۸ء، اطالیہ ۵۳۵ تا ۵۵۴ء، ہسپانیہ ۵۵۰ء)، لیکن ان جنگوں نے سلطنت کو، جس کی آبادی وبائی امراض سے پہلے ہی کم ہو چکی تھی، بالکل ہی درماندہ کر دیا۔ ہسپانیہ پر مغربی قوطوں (۵۸۵ء) نے قبضہ کر لیا، اطالیہ پر لومبارد (Lombards) قابض ہو گئے (۵۶۸ء)، شمالی افریقہ بربروں کے حصے میں آیا، بلقان کے ملکوں پر صقالبہ (Slavs) کا عمل دخل ہو گیا اور ترک اوار (Avars) نے قسطنطینیہ تک کو خطرے میں ڈال دیا۔

ایشیا مسلمانوں کے قبضے میں: اب تک ایرانیوں کے ساتھ جو تصادم ہوتا رہا تھا اس کی شدت اس وجہ سے کم ہو گئی تھی کہ قلمرو ساسانیہ پر بھی وسط ایشیا کے خانہ بدوش قبائل خصوصاً سفید ہن (White Huns) حملہ آور ہو گئے تھے، لیکن ۵۳۰ء میں آخر الذکر لوگوں کو ہندوستان میں شکست فاش ہوئی اور ۵۳۲ء میں ایرانیوں اور ترکوں کی متحدہ فوجوں نے انھیں بالکل ہی پامال کر دیا۔ اس واقعے سے جو اطمینان کی صورت پیدا ہوئی اس سے فائدہ اٹھا کر خسرو انوشیروان (۵۳۱ تا ۵۷۹ء) نے شام، ارمینیہ اور قفقازی صوبوں کو تاخت و تاراج کر دیا، مگر ایک گرانقدر خراج دے کر اس سے پیچھا چھڑایا گیا (۵۶۲ء)۔ تاہم ایرانیوں نے خسرو ثانی (۵۹۰ تا ۶۲۹ء) کے عہد میں ۵۹۰ - ۵۹۱ء میں اور پھر ۶۱۰ تا ۶۳۰ء میں از سر نو حملے کیے۔ ارمینیہ، شام، فلسطین، مصر بلکہ بحیرۂ مرمرہ تک ایشیائے کوچک بھی ہاتھ سے نکل گئے اور یروشلم اور مسیحیوں کے مقدس ترین تبرکات بھی ایرانیوں کے ہاتھ آئے، مگر ہرقل Heraclius (۶۱۰ تا ۶۴۱ء) نے زیرکی سے عین ایران کے قلب میں حملے کر کے ایرانیوں کو شکست دے دی۔ خسرو دوم قتل کر دیا گیا اور سلطنت ساسانی پارہ پارہ ہو گئی، لیکن بوزنطیہ پر بھی آوار نے عقب سے حملہ کر دیا (۶۲۶ء)۔ [مزید تفصیل کے لیے دیکھیے تفاسیر قرآن بذیل آیت غُلِبَتِ الرُّوْمُ (۳۰ [الروم] : ۱)]۔

. . . [عہد اسلامی میں] ساسانی قلمرو تو اسی دن پاش پاش ہو گئی جب اس کا آخری طاقتور سپہ سالار رستم (جو نو عمر یزدگرد سوم کا نائب السلطنت تھا) جنگ قادسیّہ (۶۳۶ء) میں شکست کھا کر مقتول ہوا اور بوزنطیہ کے ہاتھ سے شرق اردن کا شہر بُصریٰ (۶۳۴ء) اور دمشق (۶۳۵ء) بھی نکل گئے۔ جنگِ یرموک میں ان کی شکست (۶۳۶ء) کے بعد پورا شام، بیت المقدس (۶۳۷ تا ۶۳۸ء) اور مصر و اسکندریہ (۶۴۱ تا ۶۴۲ء) رومیوں کے ہاتھ سے چھن گئے۔ ان کی مقامی فوج بد حال تھی اور مقابلے کے لیے تیار نہ تھی۔ ان کے سپہ سالار آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ عام آبادی تاجروں، افسروں اور بڑے زمینداروں کے یونانی یا نیم یونانی طبقۂ اعلٰی کو ظالم اور ملحد سمجھتی تھی اور اس لیے ان سے سخت نفرت کرتی تھی۔ مقامی نسطوری اور قبطی کلیساؤں پر مظالم روا رکھے جاتے تھے کیونکہ وہ تثلیث کے بجائے خدائے واحد پر ایمان رکھتے تھے، اس لیے ملکی لوگ عربوں سے ہمدردی رکھتے تھے، کیونکہ وہ ان کی زبان کو بھی سمجھتے تھے، اور ان کے مذہب کو بھی محض اپنے مذہب کی ایک دوسری شکل خیال کرتے تھے۔ ۶۵۰ء تک بالائی عراق، ایشیائے کوچک اور بوزنطی شمالی افریقہ کے بعض حصے بھی جاتے رہے۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد قبرص (Cyprus)، اقریطش (Crete)، روڈس (Rhodes)، صقلیہ (Sicily)، بحیرۂ ایجین Aegaean کے سواحل پر بھی مسلمانوں کے حملے شروع

ہو گئے ۔ ۶۹۸ء میں شمالی افریقہ اور (قرطاجنہ Carthage) بھی ہاتھ سے نکل گیا اور ۷۱۱ء میں شَرِیش (Jerez de la Frontera) کی لڑائی کے بعد ہسپانیہ نے بھی ہتھیار ڈال دیے ۔ کچھ عرصے تک بوزنطی اپنے میں اس دباؤ کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہ پاتے تھے ۔ قسطنطین ثالث (۶۴۱ تا ۶۶۸ء) نے اپنا پایۂ تخت صقلیہ کے شہر سرقوسہ Syracuse میں منتقل کر دیا، لیکن وہ وہاں قتل کر دیا گیا ۔ قسطنطین رابع (۶۶۸ تا ۶۸۵ء) کے عہد میں عربوں نے اپنے بحیرۂ مرمرہ کے مستقر سیزیکوس Cyzicus سے قسطنطینیہ پر بھی حملہ کر دیا (۶۷۴ تا ۶۷۷ - ۶۷۸ء)، لیکن آتش یونانی اور طوفان سے سخت نقصانات اٹھا کر بالآخر پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے ۔ تاہم ایشیاے کوچک کو مَسْلَمَہ نے پامال کیا اور بلقانی ریاستوں پر بلغاری چڑھ دوڑے، جنھوں نے ۶۷۹ء میں قسطنطین چہارم کو شکست دے دی ۔ ۷۱۳ء میں عربوں نے دردانیال کو عبور کیا اور ۷۱۶ تا ۷۱۷ء میں پھر خشکی اور تری دونوں طرف سے قسطنطینیہ کا محاصرہ کر لیا، لیکن شدید سردی، بھوک، آتش یونانی اور بلغاریوں کی مزاحمت نے انھیں پھر پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

بوزنطیہ کا سنہری دور: ایسَوری (Isaurian، ۷۱۷ تا ۸۰۲ء)، فریجیائی (Phrygian، ۸۲۰ تا ۸۶۷ء) اور مقدونی (Macedonian، ۸۶۷ تا ۱۰۵۶ء) خاندانوں کے ماتحت بوزنطیہ نے ایشیاے کوچک اور ریاستہاے بلقان کو مسلمانوں، صقلابیوں اور شمال کے ترک حملہ آوروں سے بچائے رکھا، گو صقلیہ اور اطالیہ قبضے سے نکل گئے ۔ لیو ثالث (۷۱۷ تا ۷۴۱ء) نے افیون قرہ حصار (Acroinon) کے مقام پر عربوں کو شکست دی اور قسطنطین خامس (۷۴۱ تا ۷۷۵ء) نے امویوں اور عبّاسیوں کی باہم کشمکش کے دوران میں ایشیاے کوچک پر پھر قبضہ کر لیا، کیونکہ سابقہ عرب حملے کے مصائب نے یونانیوں اور بلغاریوں میں وحدت کا سلسلہ پیدا کر دی تھی، لیکن اس کے بعد سیاسی اور مذہبی افتراق (افتراقِ بت شکنی، دیکھیے نیچے)، مغرب میں شارلمان کی بحیثیت شہنشاہ تخت نشینی (۸۰۰ء) اور بلغاریوں کے ساتھ لڑائیوں کی وجہ سے سلطنت بے حد کمزور ہو گئی اور انھیں لڑائیوں میں نقفور (Nicephorus) اول قتل ہو گیا (۸۱۱ء) ۔ خلیفہ المَہْدی (۷۸۲ تا ۷۸۳ء) کے ماتحت ہارون الرّشید کی سرکردگی میں ایک حملہ ہوا جس سے آئرین Irene (نائبۃ سلطنت براے قسطنطین سادس (۷۸۰ تا ۷۹۰ء) اور بعد میں ملکہ (۷۹۷ تا ۸۰۲ء) نے مجبور ہو کر صلح کی استدعا کی ۔ پھر ہارون الرّشید کے تحت ایک اور حملہ ہوا جس سے خَراج میں اضافہ ہو گیا (۷۹۸ء) ۔ اس اثنا میں بوزنطیوں نے سرحد عرب کے ساتھ ساتھ استحکامات کا ایک مضبوط خط قائم کر دیا کیونکہ وہاں ہمیشہ جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری رہتا تھا، لیکن یہ خط بالکل بیکار ثابت ہوا کیونکہ گرفتار شدہ صقلابی آبادکاروں نے سرحدی پہرہ داروں کی حیثیت سے بت شکنوں اور بت پرستوں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر طامس Thomas کے ماتحت علم سرکشی بلند کیا ۔ طامس کو المامون کی مدد سے انطاکیہ میں شہنشاہ بنا دیا گیا، لیکن میخائل (Michael) ثانی (۸۲۰ تا ۸۲۹ء) نے بلغاریوں کی امداد سے اسے شکست دے دی ۔ تھیوفیلوس Theophilus اول (۸۲۹ تا ۸۴۲ء) کو مسلمانوں نے شکست دی (۸۳۰ء)، لیکن کلیکیا Cilicia میں اسے فتح حاصل ہوئی ۔ ۸۳۱ء میں اسے دوبارہ ہزیمت ہوئی؛ تاہم اس نے پھر حملہ کر دیا، لیکن چونکہ المعتصم نے اپنی فوج بھیج دی تھی اس لیے ۸۳۸ء

میں اس کے ہاتھ سے عموریہ (Ammorium) چھن گیا (جو فریجیا میں اس خاندان کا مسکن تھا)۔ معاملات اس قدر خراب ہو گئے کہ بوزنطیوں نے پہلی دفعہ یہ سوچا کہ مغربی ممالک سے امداد کی استدعا کریں، لیکن عربوں کو اپنی بعض داخلی مشکلات کی وجہ سے واپس جانا پڑا، اور بعد میں امیر ملطیہ (Melitene) عمر نے بحیرۂ اسود پر آمیسوس Amisus (صامسون) کے خلاف جو مہم بھیجی بوزن Poson کے مقام پر اسے تباہ کر دیا گیا (۸۶۳ء)۔

مصر اور شمالی افریقہ کے عربوں نے جنوب اور مغرب سے قلمرو پر متوازی حملے کیے؛ چنانچہ اقریطش چھن گیا (قندیہ، ماخوذ از خندق کی بنیاد رکھی گئی)۔ صقلیہ میں بادشاہت کے ایک مدعی یوفیموس Euphemius نے مسلمانوں کو بلا لیا تھا؛ چنانچہ یہ بھی سیراقوزہ Gyracorse کے سوا سب کا سب ہاتھ سے نکل گیا۔ جنوبی اطالیہ پر عربوں کے حملے ہونے لگے، روما خطرے میں پڑ گیا اور باری Bari پر عربوں کا قبضہ ہو گیا۔

اسی زمانے میں بلغاریوں نے ریاستہاے بلقان میں ایک بڑی سلطنت قائم کر لی، لیکن انھوں نے بورس Boris (۸۵۲ تا ۸۸۹ء) کے زمانے میں دین مسیحی قبول کر لیا (۸۶۴ء)، اور بالآخر روسیوں نے (یعنی روس کے نارمن Norman فاتحوں نے) ۸۶۰ء میں قسطنطینیہ پر سمندر کی طرف سے حملہ کیا۔

یہ وہ دور تھا جس میں تقریباً تمام مسلمان ملکوں میں بحرانی کیفیت رونما ہو گئی، اس لیے بازل اوّل Basil (۸۶۷ تا ۸۸۶ء) کے عہد میں بوزنطیوں نے کسی قدر اطمینان کا سانس لیا۔ جنوبی اطالیہ میں باری اور تارینت Tarent دوبارہ فتح کر لیے گئے، لیکن صقلیہ کا باقی حصہ (۸۷۸ء میں) اور مالٹا دونوں ہاتھ سے نکل گئے۔ لیو سادس (دانشمند) (۸۸۶ تا ۹۱۲ء) بحیرۂ ایجین Aegean میں عربوں کے حملوں کو پسپا کرنے میں کامیاب ہوا، کیونکہ اس کے امیرالبحر ہمیریئس Himerius کو (۹۰۶ء میں) فتح حاصل ہوئی؛ لیکن قسطنطین سابع Constantine (۹۱۳ تا ۹۵۹ء) اور رومانوس اوّل لیقپینوس Romanus Licapenus (۹۱۹ تا ۹۵۹ء) نے مسلمانوں پر کئی فتوحات حاصل کیں اور بالآخر الجزیرہ کے سرحدی علاقے میں پر ملیتینه (ملطیہ) (۹۳۴ء) اور الرُّہا (Edessa) پر قبضہ کر لیا (۹۴۴ء)۔ رومانوس ثانی (۹۵۹ تا ۹۶۳ء) نے کریٹ (اقریطش) اور بنو حمدان کے پایۂ تخت حلب (باجگزار ریاست) پر، نقفور (Nicephorus) ثانی نے فوقاس Phocas (۹۶۳ تا ۹۶۹ء)، کلیکیا Cilicia، قبرص اور انطاکیہ پر قبضہ کر لیا (۹۶۹ء)۔ یوحنا زیمسزیس (John Tzimisces) (۹۶۹ تا ۹۷۶ء) نے دمشق، لبنان اور فلسطین (باستثناے یروشلم) فتح کر لیے۔ اسی زمانے میں بوزنطیوں کو ریاستہاے بلقان میں ایک شدید جدوجہد کا سامنا کرنا پڑا، جہاں بلغاریوں نے قسطنطینیہ کو خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ لیوسادس نے مجاروں (Hungarians) کو بلغاریوں کی سرکوبی پر مقرر کیا اور پھر بجنق Pechenegs کو مجاروں پر چھوڑ دیا، لیکن بلغاریہ نے اپنی قوت دوبارہ بحال کر لی، پھر یوحنا زیمسزیس نے اسے فتح کر لیا۔ اس ملک میں دوبارہ علم بغاوت بلند ہوا، لیکن اسے پھر مغلوب کر لیا گیا۔ بجنگ قومان Cumans اور اوزہ ترکوں سے لڑائیاں ہوئیں، اور بالآخر کیف کے روسیوں نے ۹۰۷، ۹۴۱ اور ۹۴۴ء میں قسطنطینیہ پر حملے کیے۔

ان مسلسل و متواتر جنگوں کا نتیجہ ایک معاشرتی انقلاب کی صورت میں رونما ہوا۔ لوج اور بڑے زمینداروں نے دفتری حکومت کو بے دخل کر دیا، جو اب تک بڑے اقتدار کی حامل چلی

آ رہی تھی۔ انجام یہ ہوا کہ بوزنطیوں کی حکومت اپنی فوج سے بدگمان ہو گئی اور قسطنطین عاشر دوکاس Ducas (۱۰۵۹ تا ۱۰۶۷ء) کے عہد میں ایشیاے کوچک کے باہر کی تازہ فتوحات سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ ۱۰۷۰ء میں بیت المقدس گیا، پھر انطاکیہ رخصت ہوا۔ سلجوقیوں کے دوسرے سلطان آلپ ارسلان [رک باں] نے ارمینیہ، کلیکیا اور قباذق (Cappadocia) (مشرقی ایشیاے کوچک) کو فتح کر لیا اور ملازگرد (ارمینیہ) کی جنگ (۱۰۷۱ء) میں بوزنطی فوج کاملاً تہس نہس ہو گئی۔ قیصر رومانوس رابع دیوجانس Romanus Diogenes (۱۰۶۷ تا ۱۰۷۱ء) قید کر لیا گیا۔ ایشیاے کوچک کا پورا داخلی علاقہ چھن گیا، جہاں سلیمان بن قتلمش نے ایقونیم Iconium، یعنی قونیہ (روم) کی سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ سلجوقوں نے سمرنا بھی لے لیا اور بحیرۂ ایجین Aegean کے بعض جزائر اور بحیرۂ مرمرہ Marmora پر کیزیقوس Cyzicus اور نیقیا Nicaea [= ازنیق] بھی چھین لیے، اور مغرب میں نارمنوں نے رابرٹ گسقرد Guiscard کے ماتحت جنوبی اطالیہ پر قبضہ کر لیا (۱۰۷۱ء) اور پچنق Pechenegs اور اوزہ ترکوں نے ریاستہاے بلقان کو تاخت و تاراج کر دیا۔

حروب صلیبی کا زمانہ (۱۰۸۱ تا ۱۲۶۱ء): کومنانوں (Comnenes) (۱۰۵۹-۱۰۸۱ تا ۱۱۸۵ء) اور انگیلیوں Angeli (۱۱۸۵ تا ۱۲۰۳ء) نے جس قلمرو پر حکمرانی کی اس میں صرف جنوبی بلقان اور ایشیاے کوچک کے سواحل شامل تھے۔ انہیں وسط ایشیا کے خانہ بدوشوں کی طرف سے تو اطمینان ہو چکا تھا کیونکہ وہ مستقل طور پر آباد ہو چکے تھے اور عیسائی مذہب بھی اختیار کر چکے تھے، لیکن اب انہیں شمال سے افرنجی Frank (یعنی فرانسیسی، جرمن، انگریز، ہسپانوی اور نارمن) صلیبیوں کی طرف سے خطرہ لاحق ہو گیا جو مسیح کے ملک فلسطین اور بالخصوص شہر بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننا چاہتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ھی مشرق میں اپنی نئی ریاستیں قائم کرنے کے خواب بھی دیکھ رہے تھے۔ بوزنطیوں نے اس تحریک کو اپنے مقصد کی خاطر ایک خاص راستے پر لگانے کی کوشش کی (تاکہ ایشیاے کوچک اور شام پر دوبارہ قبضہ ہو جائے)، لیکن کسی قدر ابتدائی کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ خود بھی اسی رجحان کا شکار ہو گئے۔ انھوں نے افرنجی (یا لاطینی) شاہی خاندانوں کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کر لیے اور بوزنطی سلطنت کی حمایت کے لیے لاطینی سورماؤں کی خدمات بھی حاصل کر لیں۔ اور ان اقدامات کی وجہ سے خود بوزنطی دربار بھی "نیم مغربی" سا ہو گیا۔ الکسیس Alexius اول [کومنان] (۱۰۸۱ تا ۱۱۱۸ء) کے ماتحت نارمنوں نے بلقان میں سے گزر کر قسطنطینیہ پر حملہ کر دیا، اور بوزنطیہ کو وینس کی جمہوریہ کے لیے وسیع امتیازات و رعایات منظور کرنا پڑیں، تاکہ وہ رابرٹ گسقرد Robert Guiscard کے بحری رسل و رسائل کو مسدود کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ آخر رابرٹ کی موت (۱۰۸۵ء) نے قسطنطینیہ کو بچا لیا، لیکن ۱۰۹۰ تا ۱۰۹۱ء میں پچنق اور ترکی قازق طاخس Tachus نے اس کے تخت کا محاصرہ کر لیا۔ پچنق کو تو کومانوں Cumans نے تباہ کر دیا اور طاخس کو سلطان قونیہ نے تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ پہلی حرب صلیبی (۱۰۹۶ تا ۱۰۹۹ء) کے دوران میں سلجوقیوں کو اسکی شہر [رک باں] کے مقام پر شکست ہوئی۔ مغربی ایشیاے کوچک پر پھر قبضہ بحال ہو گیا، بجائیکہ براے نام بوزنطی سیادت کے ماتحت انطاکیہ، الرھا، طرابلس اور بیت المقدس

میں لاطینی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ یوحنا ثانی قلویان Calojan (۱۱۱۸ تا ۱۱۴۳ء) نے ایشیاے کوچک اور ارمینیاے کوچک (کلیکیا) کے صوبوں کو دوبارہ فتح کیا اور انطاکیہ کے حاکم کے اظہارِ اطاعت کو بھی قبول کیا، لیکن مانوئیل Manuel اول (۱۱۴۳ تا ۱۱۸۰ء) کے ماتحت، جو ایک افرنجی سورما کی سی زندگی بسر کرتا تھا، الرُّہا پر موصل کے اتابک [عمادالدین] زنگی (۱۱۴۴ تا ۱۱۴۶ء) نے قبضہ کر لیا۔ سلجوقیوں نے ایشیاے کوچک پر دوبارہ اقتدار بحال کرنے کے لیے بڑی کوشش کی۔ دوسری صلیبی جنگ ناکام ہو گئی۔ جرمن سورماؤں کو سلجوقیوں نے تلوار کے گھاٹ اتار دیا، اور فرانسیسی بھی نہایت تباہ کن نقصانات کے بعد ہی ارض مقدس تک پہنچ سکے۔ ۱۱۵۸ء اور ۱۱۷۵ء کے درمیان بوزنطیہ کو پھر شام کی لاطینی ریاستوں کی سیادت حاصل ہو گئی، لیکن موریوکیفلون Myriocephalon کے مقام پر اسے تباہ کن شکست کھانا پڑی، جس میں پوری بوزنطی فوج تباہ ہو گئی اور ایشیاے کوچک ہمیشہ کے لیے قبضے سے نکل گیا۔ تیسری صلیبی جنگ بھی ناکام تو ہوئی، لیکن بالکل تباہی سے بچ گئی۔ اب گویا بوزنطیہ الکسیس Alexius ثانی (۱۱۸۰ تا ۱۱۸۳ء) اور اندرونیقوس Andronicus اول (۱۱۸۳ تا ۱۱۸۵ء)، قسطنطینیہ کے "رچرڈ سوم" کے درمیان کشمکش کی وجہ سے ایسا کمزور ہوا کہ اس کا وجود بالکل ہی مجاہدین صلیبی کے رحم و کرم پر موقوف رہ گیا۔ دوسری بلغاری سلطنت کی بنیاد ۱۱۸۶ء میں رکھی گئی۔ قبرص آزاد ہو گیا اور اس کے بعد لوسنیان Lusignan خاندان کے ماتحت (۱۱۹۲ء میں) ایک لاطینی بادشاہت بن گیا۔ نارمنوں نے بلقانی صوبوں پر حملہ کیا اور ہوھنشتاؤفن Hohenstaufen کا ایک حملہ بڑی ہی دقت سے روکا جا سکا۔ آخر کار الکسیس رابع (۱۲۰۳ - ۱۲۰۴ء) نے چوتھی صلیبی جنگ کے بندقی، فرانسیسی اور جرمن سورماؤں کو طلب کر لیا۔ جب الکسیس Alexius خامس مورزوفلس Mourtzouphles کے عہد میں ایک قومی بغاوت کو فرو کیا جا چکا تو صلیبی سپاہیوں نے (۱۲۰۴ء) میں قسطنطینیہ کو تاخت و تاراج کیا اور سلطنت آپس میں تقسیم کر لی۔ متعدد باجگزار ریاستوں، مثلاً تِسالونیک Thessalonica، ایپرس Epirus، آتنہ (ایتھنز) اور سوریہ پر بالڈوِن فلانڈری کو شہنشاہ بنا دیا گیا اور اہلِ بندقیہ (وینس) نے بھی ایک عمدہ مستعمرانہ قلمرو حاصل کر لی۔ جب ادرنہ کی جنگ (۱۲۰۵ء) میں بلغاریوں نے لاطینی سورماؤں کا قریب قریب قلع قمع کر دیا تو بعد میں تسالونیک اور ایپرس کا بیشتر حصہ بھی انہوں نے فتح کر لیا (۱۲۳۰ء)، لیکن ۱۲۳۵ء میں یونانیوں نے قسطنطینیہ کا محاصرہ کر لیا، اور بالآخر ۱۲۶۱ء میں اس پر قابض ہو گئے۔

بوزنطیہ کی آخری سلطنت: (۱۲۰۴ تا ۱۲۶۱ تا ۱۴۵۳ء) نیقیا Nicaea (ازنیق)، طرابزون اور ایپرس میں چھوٹی چھوٹی بوزنطی ریاستیں ابھی تک محض اس لیے مغلوب و مفتوح ہونے سے محفوظ رہیں کہ مغول نے سلجوقیوں پر اور بلغاریوں نے لاطینیوں پر فتح پائی تھی۔ نیقیا Nicaea (ازنیق) کے لاسکاریسی (Lascarid) خاندان (۱۲۰۴ تا ۱۲۶۱ء) کے ایک جرنیل میخائیل Michael ثامن (۱۲۶۱ تا ۱۲۸۲ء) نے قسطنطینیہ کے آخری حکمران خاندان کی بنیاد رکھی۔ جسے پالیولوغس Palaeologues کہتے تھے۔ قسطنطینیہ پر قابو پانے کی غرض سے اسے اہلِ جنوآ Genoa کی امداد کی ضرورت تھی، چنانچہ اس کے بعد سلطنت کی تجارت اطالویوں کے ہاتھ میں چلی گئی جلد ہی وہ بھی تباہ و برباد ہو گئی۔ قسطنطینیہ ۱۲۰۴ء کی تاخت کے بعد کبھی نہ پنپ سکا۔ اس کے بعد یہ ایک

مفلس، لیکن متمدن شہر رہ گیا ۔ اس کی آخری شان و شوکت محض ظاہری ٹیپ ٹاپ ھی تک محدود تھی ۔ مزید برآں یوحنّا خامس (John) (۱۳۵۱ تا ۱۳۹۱ء) اور یوحنّا ثامن (۱۴۲۵ تا ۱۴۴۸ء) نے اپنی اندرونی زورآزمائی میں ترکانِ آلِ عثمان سے اعانت بھی طلب کر لی تھی ۔ یوحنّا سادس (۱۳۴۱ تا ۱۳۵۴ء) کو اپنی ایک بیٹی سلطان کے حرم میں بھیجنا پڑی اور مانویل Manuel ثانی (۱۳۹۱ تا ۱۴۲۵ء) مدت دراز تک ترکوں کے پاس بطور یرغمال رہا ۔ ادھر تو مانویل ثانی اور یوحنّا ثامن امداد کی بھیک مانگنے کے لیے یورپ کا دورہ کر رہے تھے اور ادھر سلاطینِ عثمانی نے برسہ، نیقیا (ازنیق) اور نیقومیدیا Nicomedia [= ازمید] (۱۳۲۵ تا ۱۳۳۰ء) اور باقی ایشیاے کوچک ۱۳۴۰ء میں لے لیا ۔ اسی طرح ۱۳۵۴ء میں دردانیال کے کنارے گلیپولس (گیلی بولی) اور تراکیا (Thrace) ۱۳۸۹ء میں، سلطنت سربیا، جس نے ۱۳۳۰ء سے بلغاروں کی جگہ لے لی تھی، اور ۱۳۹۳ء میں بلغاریا ان کے قبضے میں آ گیا ۔ یورپ چونکہ ''موت اسود'' (Black Death = طاعون) سے بے حد کمزور ہو رہا تھا اس لیے کافی امداد نہ دے سکتا تھا ۔ پانچویں صلیبی جنگ، شاہِ ہنگری سجسمنڈ Sigismund کی سرکردگی میں لڑی گئی، لیکن اس کا انجام یہ ہوا کہ دریاے ڈینیوب کے کنارے نیقوپولس Nicopolis کے مقام پر ترکوں کو فتح حاصل ہوئی ۔ اس وقت قسطنطینیہ محض اس لیے بچ گیا کہ تیمور سمرقندی کو انقرہ کے سلطان بایزید پر فتح حاصل ہو گئی تھی (۱۴۰۲ء)، لیکن تیمور ۱۴۰۵ء میں فوت ہو گیا اور سلطنت عثمانی کو پھر ہوش آ گیا ۔ آخر کار وہ حربِ صلیبی جس کی قیادت پولینڈ اور ہنگری کے بادشاہ کر رہے تھے وارنہ Varna کے مقام پر ناکام ہو گئی (۱۴۴۴ء) ۔ قسطنطین حادی عشر (۱۴۴۹ تا ۱۴۵۳ء) کے ماتحت یونان میں آخری مقبوضات بھی چھن گئے، چونکہ سلطان محمد ثانی نے مستحکم قلعوں اور عظیم توپوں سے دردانیال اور باسفورس دونوں کو بند کر دیا تھا اس لیے قسطنطینیہ کا تعلق بیرونی دنیا سے منقطع ہو گیا تھا ۔ اپریل ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد ثانی نے محاصرہ شروع کر دیا ۔ قسطنطین نے اہل وینس اور اہلِ جنوآ Genoa سے، خصوصاً گووانی گستینیانی Giovanni Giustiniani سے، امداد حاصل کر لی ۔ اگرچہ اہلِ اطالیہ نے ترکی بیڑے کو ایک معمولی شکست تو دے دی لیکن سلطان محمد نے خشکی کے راستے سے اپنے جہازوں کو ''شاخ زرین'' کی بندرگاہ میں پہنچا دیا اور عیسائیوں کے بیڑے کا قلع قمع کر دیا ۔ پاے تخت کی فصیلیں ٹوٹی پھوٹی ہوئی اور قابلِ مرمت تھیں (کیونکہ جب کبھی انھیں مرمت کرنے کی کوشش کی جاتی تھی ترک ہمیشہ بوزنطی یرغمالوں کو تہ تیغ کر دینے کی دھمکی دیا کرتے تھے) اور ترکوں کی اژدردم توپوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں ۔ ۲۹ مئی کو باب سان رومانوس St. Romanus توڑ دیا گیا ۔ شہنشاہ اور گستینیانی مارے گئے ۔ شہر تاخت و تاراج ہوا اور اس کے بعد ترکی کا پاے تخت قرار پایا ۔

ثقافتی اہمیت : بوزنطیہ اپنی تاریخ کی ایک ہزار سال سے زیادہ مدت میں یونانی رومی ثقافت اور ابتدائی مسیحی تہذیب کے بہترین ورثے کا حامل و محافظ رہا ۔ اس ورثے کی نوعیت قدیم ترین یونانی ۔ رومی زمانے کے ورثے کی سی نہ تھی، بلکہ بحیرۂ روم اور ایشیا کے عناصر کا ایک امتزاج تھا جو بعد کے زمانے میں وجود میں آیا ۔ اس کے فن کو پارتھیانی (Parthian) اور سوریانی اثرات نے نئے سانچے میں ڈھال دیا تھا ۔ اس کا ادب تصوف اور مذہب کا آمیزہ تھا اور اس کے اسلوب زندگی پر پہلے ساسانی ایران اور اس کے بعد وسط ایشیا

کے اثرات نمایاں تھے۔ بوزنطی کلیسا اور اس کے گنبد ساسانی ایرانی فن تعمیر ہی سے ترقی پا کر بنے تھے۔ ایا صوفیا کی شاندار عمارت، جو ۵۳۲ تا ۵۳۷ء میں قسطنطینیہ میں تعمیر ہوئی تھی، حقیقت میں کئی صدیوں تک دنیا بھر کی سب سے بڑی عمارت شمار ہوتی رہی اور اس کا گنبد بھی وسعت کے اعتبار سے عدیم المثال تھا۔ بوزنطیہ کی نقاشی، خصوصاً خاتم کاری (Mosaic) فطرت کو جہانِ آئندہ کی سنجیدگی کی روح کے ساتھ ایسے فنی اسلوب میں ڈھالتی تھی جو علامتی معانی سے لبریز ہوتا تھا۔ اس کے فنونِ عملی قیمتی ہونے کے لحاظ سے اور نازک صناعی کے اعتبار سے بے نظیر تھے (خصوصاً ہاتھی دانت کا کام، چاندی اور سونے کی تکفیت اور میناکاری وغیرہ)۔ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں ایک بت شکن تحریک وجود میں آئی جو کلیساؤں میں اشکال و صور کی نقاشی کو ممنوع کر دینے کی حامی تھی۔ ۔ ۔ لیو ثالث نے بتوں کو تباہ کرنے کا جو فرمان صادر کیا وہ خلیفہ یزید ثانی کے اسی قسم کے ایک فرمان کے تین سال بعد صادر ہوا تھا، چنانچہ مؤرخ تھیوفانیس Theophanes اسی بنا پر اسے ''عربی ذہنیت'' کا بادشاہ قرار دیتا ہے۔ بوزنطی تہذیب کے اثرات بہت گہرے اور وسیع تھے۔ روس، ارمینیہ، بلغاریا اور سرویا (یوگوسلاویا) بوزنطی روایات ہی کے وارث ہیں۔ مغربی یورپ نے قرونِ وسطٰی کے آغاز میں بوزنطیوں ہی کے فن، لباس اور ادب کی نقالی کی تھی۔ دمشق اور قرطبہ کے امویوں نے بوزنطی صناعوں سے بھی کام لیا تھا (بیت المقدس میں قبۃ الصخرہ، جامع دمشق، شرقی اردن میں قُصَیر عمرہ، اندلس میں مسجد قرطبہ) سامرا میں عباسیوں کے محلات و قصور میں بوزنطی نقاشی کے نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔ خلیفہ المنصور اور المامون کی سرپرستی میں یونانیوں کے علمی کتب و رسائل کا ترجمہ جرجیس، قسطا بن لوقا، حنین بن اسحق اور اس کے بھتیجے حبیش نے کیا۔ الکندی، الفارابی اور الخوارزمی کی کتابوں میں بلکہ ان کے مخطوطات کی تصویروں سے بھی بوزنطی اثرات نمایاں ہیں۔ تاریخ عرب کے بعد کے دوروں میں بھی بوزنطی نمونے واضح ہیں۔ زمانۂ مابعد کے ترکانِ عثمانی کی گنبد دار مسجد بھی بوزنطی فن تعمیر کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ دورۂ تجدید علم و ادب (Renaissance)، یعنی پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں بوزنطیہ کے مہاجر اہلِ علم نے اطالیہ میں علوم قدیمہ کے مطالعے کا شوق از سرِ نو زندہ کیا، اور اس طرح ان تصورات اور اصولوں کی حوصلہ افزائی کی جو زمانۂ حاضر کی فکری ترقیات پر منتج ہوئے۔

مآخذ: (الف) سلطنت بوزنطیہ: (۱) H. I. Bell: *Egypt from Alexander the Great to the Arab Conquest*، آکسفرڈ ۱۹۴۸ء؛ (۲) R. Byron: *The Byzantine Achievement*، لندن ۱۹۲۹ء؛ (۳) Charles Diehl: *Byzance, Grandeur et Décadence*، پیرس ۱۹۲۰ء؛ (۴) وہی مصنف: *Histoire de l'Empire Byzantin*، پیرس ۱۹۱۹ء؛ (۵) R. Grousset: *Histoire des Croisades et du Royaume Franc de Jérusalem*، تین جلدیں، پیرس ۱۹۳۴-۱۹۳۶ء؛ (۶) M.V. Lechvenko: *Histoire de Byzance*، پیرس ۱۹۴۹ء؛ (۷) F. Lot: *Le Fin du Monde Antique et les Debuts du Moyen-Age*، پیرس ۱۹۲۷ء؛ (۸) C. W. Oman: *Byzantine History in the Early Middle Ages*، لندن ۱۹۰۰ء؛ (۹) E. Pears: *The Destruction of the Greek Empire and the Story of the Capture of Constantinople by the Turks*، لندن - نیویارک ۱۹۰۳ء؛ (۱۰) A. Pernice: *L' Imperatore Eraclio*، فلورنس ۱۹۰۵ء؛ (۱۱) A. A. Vasiliev: *History of the Byzantine Empire*، ص ۲۰۸ تا ۲۹۳،

،بجلیس ۱۹۰۲ء؛ (۱۲) A. Wächter : Der Verfall des
Griechentums in Kleinasien im 14 Jahrhundert، لنڈن
۱۹۰۳ء؛ (۱۳) V. Worth : Catalogue of the Imperial
Byzantine Coins in the British Museum، دو جلدیں،
لنڈن ۱۹۰۸ء؛ (ب) بوزنطی ثقافت: (۱۴) J.H. Breasted :
Oriental Forerunners of Byzantine Painting، شکاگو
۱۹۲۳ء؛ (۱۵) O. M. Dalton : Byzantine Art and
Archaeology، آوکسفرڈ ۱۹۱۱ء؛ (۱۶) N. P.
Kondakov : Les Costumes Orientaux a' la Cour
Byzantine (Byzantion 1, 7, 1924)؛ (۱۷) Steven
Runciman : Byzantine Civilization، لنڈن ۱۹۳۳ء؛
(۱۸) D. Talbot Rice : Byzantine Art، آوکسفرڈ
۱۹۳۰ء؛ (۱۹) J. Strzygowski : Ursprung und Sieg
der altbyzantinischen Kunst، وی انا ۔ (ج) اسلامی
دنیا سے روابط : (۲۰) H. F. Amedroz : An
Embassy from Baghdad to the Emperor Basil II،
در Journal Royal Asiatic Society، لنڈن ۱۹۱۴ ۔
۱۹۱۵ء؛ (۲۱) E. Amélineau : La Conquête de
l'Egypte par les Arabes، در Revue Historique
۱۱۹ : ۲۷۳، ۱۹۱۵ء؛ (۲۲) E. W. Brooks : Byzantines
and Arabs in the Times of the Early Abbasides،
در English Historical Review، ۱۵ : ۷۲۸،
۱۹۰۰ء؛ (۲۳) M. Butler : The Arab Conquest of
Egypt، آوکسفرڈ ۱۹۰۲ء؛ (۲۴) M. Canard : Les
Expeditions des Arabes contre Constantinople، در
Journal Asiatique، ۲۰۸ : ۶۱، ۱۹۲۶ء؛ (۲۵)
R. Dussaud : Les Arabes en Syrie avant l' Islam،
پیرس ۱۹۰۷ء؛ (۲۶) W. Eichner : Die Nachrichten
über den Islam bei den Byzantinern, (Islam)، ۲۳ :
۱۳۳، ۱۹۷، ۱۹۳۶ء؛ (۲۷) K. Güterbock : Der
Islam im Lichte Byzantinischer Polemik، برلن
۱۹۱۲ء؛ (۲۸) J. Laurent : Byzance et les Turcs
Seljoucides dans l' Asie Occidentale jusqu'en 1081،
نینسی ۔ پیرس ۱۹۱۳ ۔ ۱۹۱۴ء؛ (۲۹) وہی مصنف :
Byzance et l' origine du sultanat de Roum (Malanges
Charles Diehl)، پیرس ۱۹۳۰ء؛ (۳۰) W.H. Ramsay :
The Attempts of the Arabs to Conquer Asia Minor
(641-694) and the causes of Their Failure، در
Belletin de l' Academie Roumaine، باب تاریخ، ۹،
۱۹۲۳ء؛ (۳۱) M. Silberschmidt : Das Orientalische
Problem zur Zeit der Entstehung des Türkischen
Reiches، لائپزگ و برلن ۱۹۲۳ء؛ (۳۲) A.A. Vasiliev:
Byzance et les Arabes، دو جلد، برسز ۱۹۳۵ تا
۱۹۵۰ء؛ (۳۳) وہی مصنف : Hārūn ibn Yahyā and His
Description of Constantinople، در Annales Institut
Kondakov، ج ۵، ۱۹۳۲ء؛ (۳۴) J. Wellhausen :
Die Kämpfe der Araber mit den Römern in der
Zeit der Omaijaden، گوٹنگن ۱۹۰۱ء؛ (۳۵) E. Diez :
The Mosaics of the Dome of the Rock at Jerusalem،
در Ars Islamica، ص ۲۳۵، ۱۹۳۴ء؛ (۳۶) H.Grégoire :
L'Epopée Byzantine et ses Rapports avecs l'Epopee
Turque et l'Epopee Romane, Bruxelles (Académie)،
۱۹۳۰ء؛ (۳۷) وہی مصنف : Echanges (Byzantion)
Epiques Arabo-Grecs، جلد ۷، ۱۹۳۲ء؛ (۳۸) وہی
مصنف و R. Goossens : Byzantinisches Epos und
arabischer، در ZDMG، ۸۸ : ۲۱۳، ۱۹۳۴ء؛ (۳۹)
E. Herzfeld : Die Malereien von Samarra، برلن
۱۹۲۷ء؛ (۴۰) Eustace de Lorey : L' Hellénisme et
l'Orient dans les Mosaiques de la Mosquée des
Omaiyades, (Ars Islamica)، ۱ : ۲۲، ۱۹۳۴ء؛ (۴۱)
A. Musil : Kuseir Amra، دو جلد، وی انا ۱۹۰۷ء؛
(۴۲) J. Strzygowski : Amra und seine Malereien،
در Zeitschrift für Bildende Kunst، جلد ۱۸، ۱۹۰۸ء؛
(۴۳) Kurt Weitzmann : The Greek Sources of
Islamic Scientific Illustrations، در Archaeologica

Orientalia in Memoriam Ernst Herzfeld، نیو یارک ۱۹۵۲ء، ص ۱۴۳۔

(H. Goetz)

بُوسْتان: اس کی مخفف صورت "بُستان" بھی ہے۔ فارسی کا لفظ ہے (مگر عربی میں بھی مستعمل ہے، جس کی جمع عربی قاعدے کی رو سے بَساتین ہے)۔ یہ لفظ "بو" اور "ستان" کا مرکب ہے اور عموماً ترکاری باغ (ترکی میں) اور کبھی کبھی پھولوں کے باغ کے لیے استعمال ہوتا ہے، عربی میں عام باغ کے لیے مستعمل ہے۔ الجزائر کی بولی میں اس کے معنی سرو کے ہیں (Beaussier) اور بیروت میں توت (Mulberry) کے درختوں کے کنج کے ہیں۔ مشرقِ وسطٰی میں یہ بہت سے جغرافیائی ناموں کا حصہ ہے۔ ایران کے مشہور شاعر سعدی [رَكَ بآں] کی معروف کتاب کا نام بھی بوستان ہے، جو ۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء میں شیراز میں لکھی گئی۔ اس کتاب کی حیثیت کلاسیکی ہے اور ان تمام ملکوں میں جہاں فارسی کا رواج ہے، خصوصاً ایران، ہندوستان، وسطِ ایشیا اور عثمانی ترکی میں یہ درس میں شامل رہی ہے۔ پاک و ہند کے مصنفوں نے اس کی متعدد شرحیں لکھی ہیں۔ علاوہ بریں ترکی میں بھی اس کی شرحیں لکھی گئی ہیں، ان میں شمعی اور سودی کی شرحیں بہت مشہور ہیں (یہ دونوں سولھویں صدی کے اواخر میں لکھی گئیں)۔ فاضل سعدالدین مسعودی تفتازانی [رَكَ بآں] نے ۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء میں اس کا ترجمہ ترکی [نظم] میں کیا (A : E. J. W. Gibb، *History of Ottoman Poetry*، ۱ : ۲۰۲)۔ کئی دوسری زبانوں مثلاً بنگالی، سندھی اور پنجابی میں بھی اس کے ترجمے ہوئے۔ یورپی زبانوں میں اس کے خاص خاص ترجمے یہ ہیں: Forbes Falconer کا انگریزی ترجمہ (*Selections*، لنڈن ۱۸۳۸ء)؛ جرمن میں Graf منظوم ترجمہ (*Sa'di's Lustgarten*، Jena ۱۸۵۰ء) اور اسی زبان میں Baron Schlechta-Wssehrd کا ترجمہ (وی انا ۱۸۵۲ء)؛ Barbier de Meynard کا ترجمہ فرانسیسی میں (پیرس ۱۸۸۰ء) اور Constantin Čaikin کا ترجمہ روسی نظم میں (ماسکو ۱۹۳۵ء)۔ قدیم ترین مخطوطات میں اس کتاب کا نام سعدی نامہ ہے۔ [بوستان (= باغ) کی ترتیب و آرائش اور اس کے فنون اور مختلف اسلامی ملکوں میں اس کی ترقی کے کوائف کے لیے رَكَ بہ باغ؛ نیز رَكَ بہ برزی انصاری: بوستان، در وو، بارِ دوم، لائڈن]۔

(سعید نفیسی)

بُو سَعِید: [= البُوسَعِیدی]، عُمان اور زنجبار کا حکمران خاندان، جو اَزدی نسل سے ہے۔ [دولت بوسعیدیہ] کا بانی احمد بن سعید عُمان کے یَعْرُبی امام سَیف بن سلطان ثانی کے تحت صُحار کا والی ہو گیا تھا۔ اس نے صُحار کو نادر شاہ کے سپہ سالار محمد تقی خان شیرازی کے حملے کے وقت کامیابی کے ساتھ بچایا اور شیرازی نے چند شرائط پر صلح کر لی۔ پھر اپنی جنگی طاقت اور حکمت عملی کی بدولت یہ احمد عمان کا مالک بن بیٹھا۔ شاہِ [ایران] ترکوں سے ایک لڑائی میں الجھا ہوا تھا اور اس نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا۔ احمد نے امام کا لقب کب اختیار کیا، یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ عموماً اسے ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء کا واقعہ بتایا جاتا ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا؛ [۱۱۶۷ھ کے حق میں اچھی شہادت موجود ہے؛ دیکھیے الزرکلی]۔ وہ طبعاً ایرانیوں کے مقابلے میں ترکوں کا طرفدار تھا اور اس نے ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں بصرے کو بچانے میں ترکوں کی مدد بھی کی۔ اس نے تجارت کو فروغ دیا اور ہندوستان کے سمندری ڈاکوؤں کے دبانے میں مدد دی۔ اس کا بیٹا سعید ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۳ء میں

اس کا جانشین ہوا، لیکن ہر دلعزیزی حاصل نہ کر سکا اور کنارہ کش ہو کر الرستاق چلا گیا۔ اس نے اختیارات اپنے لڑکے حامد کے سپرد کر دیے، لیکن امام کا لقب اپنے پاس رکھا۔ اس کے بعد اس خانوادے کے کسی فرد نے یہ لقب اختیار نہیں کیا بلکہ بعد کے فرمانروا سیّد کہلاتے تھے، اگرچہ ملک کے باہر عموماً سلطان مشہور تھے۔ سعید ۱۲۲۶ھ/ ۱۸۱۱ء میں بقید حیات تھا اور بعد کے دس سال کے اندر فوت ہوا۔ حامد (م ۱۲۰۶ھ/ ۱۷۹۱-۱۷۹۲ء) کے بعد اس کا چچا مسمّی سلطان اس کا جانشین ہوا اور اسی نے چاہبار، ہرمز، کشم، بندرعبّاس اور بحرین کو مسخّر کیا۔ ایران چاہبار اور بندرعبّاس بوسعید کو ٹھیکے پر دینے پر رضامند ہو گیا۔ گوادر پہلے ہی اس کے قبضے میں تھا۔ ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۸ء میں اس نے ایک معاہدہ کر کے برطانیہ کو اجازت دی کہ وہ بندرعبّاس میں ایک کارخانہ بنائے اور اسے مورچہ بند کر لے اور وعدہ کیا کہ فرانسیسیوں کو یا ولندیزیوں کو، جب تک وہ برطانیہ سے جنگ کرتے رہیں گے، اپنے علاقے میں کارخانے قائم کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ اپنی عمر کے آخری ایّام میں اس کو وہابیوں کے حملے کا ہمیشہ خطرہ رہتا تھا۔ ۱۲۱۹ھ/ ۱۸۰۴ء میں وہ لنگہ کے قریب ایک بحری لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے بعد تخت سلطنت حاصل کرنے کے لیے جو لڑائی ہوئی وہ بدر بن سیف نے وہابیوں کی مدد سے جیت لی، مگر اسے سعید بن سلطان نے قتل کرا دیا اور پھر خود اپنے بھائی سالم کے ساتھ مل کر (۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰-۱۸۲۱ء) تک اور سالم کی وفات کے بعد خود اکیلا حکومت کرتا رہا۔

سعید اپنے خاندان میں سب سے ممتاز فرمانروا گزرا ہے، لیکن عرب میں اس کی حکومت اکثر مخدوش ہو جاتی تھی اور اس کا سبب یا تو خاندانی نزاع یا وہابیوں کا حملہ ہوتا تھا۔ باہمی نزاع کی وجہ سے صُحار کا علاقہ قیس بن احمد کے خاندان کی قیادت میں کچھ مدّت کے لیے خود مختار ہو گیا اور وہابیوں سے کبھی تو کچھ دے دلا کر پیچھا چھڑایا جاتا تھا اور کبھی وہ برطانیہ کی مداخلت کا خوف دلانے سے رک جاتے تھے۔ سعید برطانیہ کا پکّا حلیف تھا اور اس نے خلیج فارس کے قواسم کے خلاف برطانیہ کی مہموں میں مدد دی۔ . . . . ۱۲۳۸ھ/ ۱۸۲۲ء میں اس نے لونڈی غلاموں کی تجارت پر سخت پابندی لگا دی، چنانچہ ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء میں افریقہ سے لونڈی غلام درآمد کرنے کی ممانعت ہو گئی۔ سعید کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ اس نے اپنے افریقی مقبوضات کو ترقی دے کر ایک تجارتی مملکت بنا دیا، جس کی تقویت بحری طاقت سے کی۔ افریقہ میں یعربی اماموں کی مفتوحات کا بڑا حصّہ اس وقت ہاتھ سے نکل گیا تھا جب عمان پر ایرانیوں نے یورش کی۔ سعید جب تخت پر بیٹھا تو اس کے زیرِ اقتدار فقط زنجبار، پمبا کا ایک حصّہ اور شاید مافیا Mafia اور لامو Lamu رہ گئے تھے، نیز کلوہ، جسے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد دوبارہ حاصل کر لیا گیا تھا۔ سعید نے رفتہ رفتہ اپنی حکومت عرب اور سواحلی نوآبادیوں پر مقدشو Mogadishu سے راس ڈلگاڈو Delgado تک قائم کر لی۔ سب سے کڑی مقاومت ممباسہ [رک بآں] پر ہوئی۔ حامی اور بنٹو قبائل نے برّعظیم پر اس کے اقتدار کو برائے نام ہی مانا۔ بڑے بڑے جزیروں میں بھی سعید کو قبیلہ وہادمو Wahadimu (Mwenyi Mkuu) واپمبا (Diwani) اور وٹمبتو (Sheha) کے سردار صرف خراج ادا کرتے تھے۔ اس صدی کے اواسط میں ونگا Vanga سے پنگانی Pangani تک باستثنائے تنگا Tanga سارا ساحل سعید اور اسمبرا Usambara کے بادشاہ کے مشترک قبضے میں تھا، یعنی یہ بادشاہ

اپنے عمّال نامزد کرتا اور سعید ان کی توثیق کرتا تھا۔ سعید کی نوسی بی Nossi Bé کو لے لینے کی کوشش، فرانسیسیوں نے نہیں چلنے دی۔ ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ - ۱۸۵۴ء میں سعید نے جزائر کوریا موریا Kuria Muria برطانیہ کے حوالے کر دیے۔

سعید کی وفات (۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء) کے بعد اس کا بیٹا ثوینی مسقط پر اور ایک اور بیٹا ماجد زنجبار پر قابض رہے۔ یہ جھگڑا لارڈ کیننگ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کے فیصلے کے مطابق ماجد کا زنجبار پر قبضہ تو بحال رہا، لیکن وہ بطور معاوضہ ایک رقم سال بہ سال ثوینی کو ادا کرتا تھا، جس کی بابت بصراحت کہہ دیا گیا تھا کہ یہ خراج نہیں ہے۔ ماجد کا جانشین برغش ہوا، جس نے سعید کی وفات پر اور اس کے چند سال بعد پھر حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت برطانیہ کے نمائندے سر جان کرک Sir John Kirk کا بہت زور ہو گیا تھا اور ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں غلاموں کی تجارت بالکل بند کر دی گئی۔ مشرقی افریقہ میں جرمنوں کا نفوذ ہو جانے کی وجہ سے ایک انگریزی، فرانسیسی، جرمن تحقیقاتی جماعت مامور کی گئی تا کہ بو سعیدی مملکت کی حدود متعین کر دی جائیں۔ اس جماعت کے فیصلے کے مطابق برغش کو زنجبار، پمبا، چھوٹے چھوٹے جزیرے جو ان سے بارہ میل کے فاصلے کے اندر ہوں، جزیرہ نماے لامو، تنگی Tungi سے کیپنی Kipini تک کا ساحلی علاقہ دس میل اندر تک، کسمیو Kismayu، براوا Barawa، مرکہ، مقدشو اور ورشیخ کا حاکم تسلیم کر لیا گیا۔ آگے چل کر لامو Lamu برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کو اور شمالی بندرگاہیں اٹلی کے حوالے کر دی گئیں۔ ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ - ۱۸۹۰ء میں ایک اور انگریزی۔ جرمنی سمجھوتے کے تحت دریاے امبا Umba کے شمالی جانب کے مقبوضات جرمن نے خرید لیے اور باقی تقریباً سارے کا سارا علاقہ انگریزوں کے زیرِ سیادت آ گیا۔ اس کے بعد بڑی اقطاع پٹے پر اٹھا دیے گئے۔ ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۱ - ۱۸۹۲ء میں ملکی انتظام کو نئے سرے سے منظّم کیا گیا اور ایک انگریز وزیرِ اعلیٰ (جنرل لائڈ میتھیوز Gen. Lloyd Mathews) مقرر کر دیا گیا۔ خالد بن برغش نے ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ - ۱۸۹۳ء اور ۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۵ - ۱۸۹۶ء میں اقتدار چھین لینے کی کوشش کی۔ اس کی دوسری بار کی کوشش کے زمانے میں ایک انگریزی جنگی جہاز نے اس کے محل پر گولہ باری کی۔ ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ - ۱۸۹۷ء میں غلامی کی قانونی حیثیت بالکل ختم کر دی گئی۔ علی بن حمّود (۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء تا ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کی صغر سنی میں انگریز وزیر اس کا نائب السلطنت رہا۔ ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۳ء میں زنجبار کی ذمّے داری برطانوی محکمۂ خارجہ سے محکمۂ مستعمرات کی طرف منتقل کر دی گئی۔

ثوینی کو، جو کیننگ کے فیصلے کے مطابق عمان پر قابض رہا تھا، قتل کر دیا گیا۔ اس کے بیٹے سالم پر قتل کی سازش میں شریک ہونے کا شبہہ تھا اور وہ تھوڑے ہی دن حکومت کرنے پایا تھا کہ عزّان بن قیس نے اسے نکال باہر کیا۔ اور یہ عزّان خود خانہ جنگی میں مارا گیا۔ ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء میں ترکی اس پر راضی ہو گیا کہ عزّان کے بھائی ابراہیم کے ساتھ مل کر عمان کو آپس میں تقسیم کر لے۔ صحّار ابراہیم کے حصّے میں آیا، لیکن دو سال بعد اسے ترکی نے چھین لیا۔ اس بد عملی کے زمانے میں ایران نے بندر عبّاس کو دوبارہ اجارے پر لے لیا (۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۲ء) اور چاہبار Čahbar پر بھی دوبارہ مسلّط ہو گیا۔ ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء کے قریب عیسیٰ بن صالح کے زمانے میں اندرونِ ملک میں ایک مخالفانہ تحریک

کا آغاز ہوا۔ ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ - ۱۹۱۳ء میں سالم الخرّوصی کو امام منتخب کیا گیا اور ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۴ - ۱۹۱۵ء میں باغیوں نے مسقط پر حملہ کر دیا، جسے ایک ہندوستانی دستۂ فوج کی مدد ہی سے بچایا جا سکا۔ ۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ - ۱۹۲۰ء میں سالم کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے جانشین محمد بن عبداللہ نے سید تیمّور سے سمجھوتا کر لیا، جس کی رو سے اندرونِ ملک کے قبائل کو داخلی خود مختاری مل گئی۔ جدید عمان میں ظُفار داخل ہے، اور سلطان کِشم اور راس الخیمہ کے شیخ کے علاقے اور صحرا اس کی سرحدیں ہیں۔ قبیرہ کے گردا گرد ساحل پر ایک محافظ قلعہ ایک علیحدہ "ماسون" (trucial) ریاست ہے [جس میں از روے معاہدہ جنگ نہیں ہوتی]۔ اس خاندان کا شجرۂ نسب ذیل میں درج ہے۔ عربی اعداد عمان اور زنجبار دونوں کا، رومن ہندسے فقط عمان کا اور حروف تہجی فقط زنجبار کا حاکم ہونا ظاہر کرتے ہیں۔ تاریخیں ہر حکمران کی تخت نشینی کی دی گئی ہیں۔ [شجرۂ ذیل کو بائیں سے دائیں پڑھیے]۔

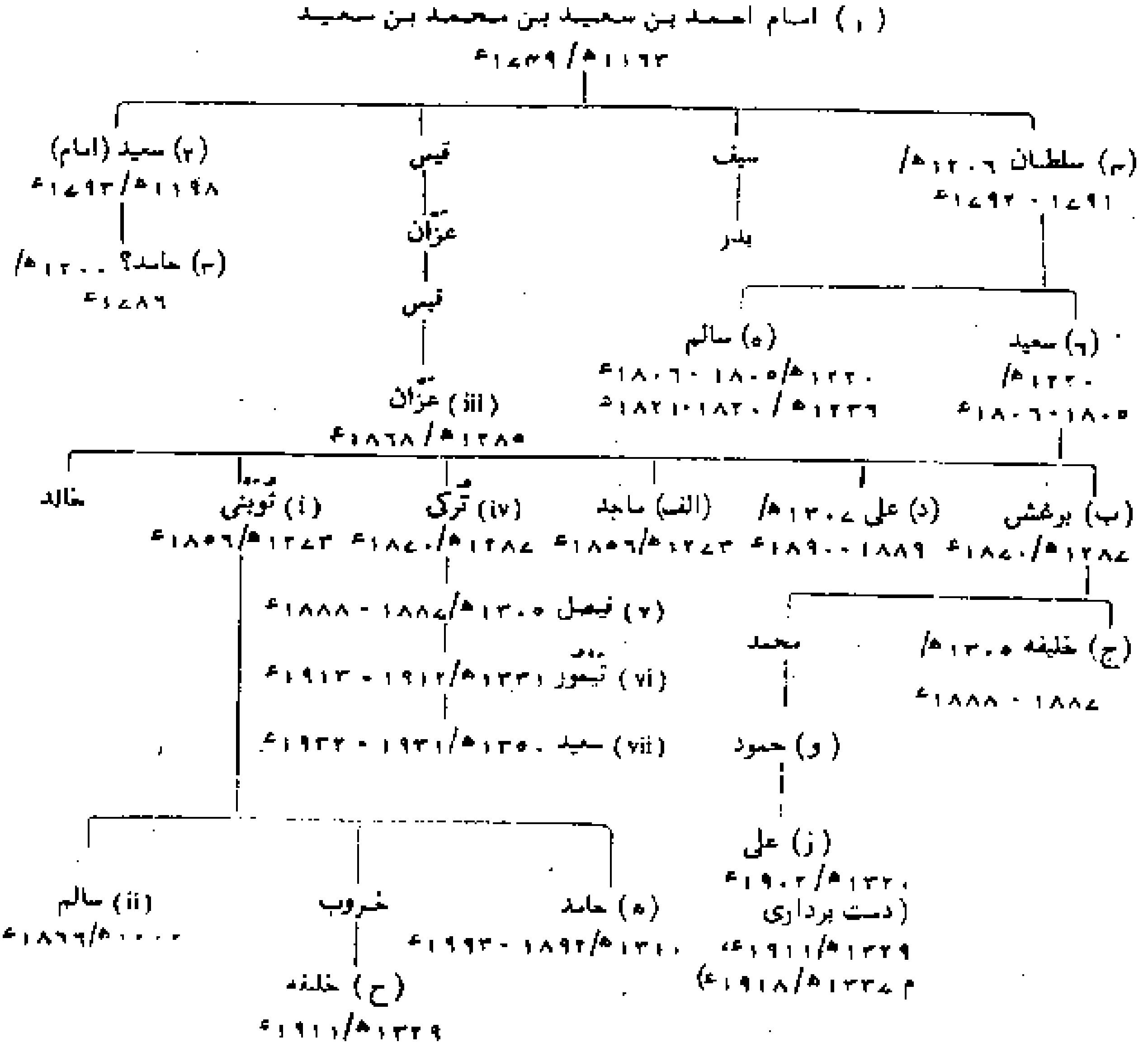
(۱) امام احمد بن سعید بن محمد بن سعید
۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹ء
(۳) سلطان ۱۲۰۶ھ/
۱۷۹۱ - ۱۷۹۲ء
سیف
بدر
قیس
عزّان
قیس
(iii) عزّان
۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء
(۲) سعید (امام)
۱۱۹۸ھ/۱۷۹۳ء
(۳) حامد؟ ۱۲۰۰ھ/
۱۷۸۶ء
(۶) سعید
۱۲۲۰ھ/
۱۸۰۵ - ۱۸۰۶ء
(۵) سالم
۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ - ۱۸۰۶ء
۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۰ - ۱۸۲۱ء
(ب) برغش
۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء
(د) علی ۱۳۰۷ھ/
۱۸۸۹ - ۱۸۹۰ء
(الف) ماجد
۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء
(iv) ترکی
۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء
(i) ثوینی
۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء
خالد
(۷) فیصل ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ - ۱۸۸۸ء
(vi) تیمور ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ - ۱۹۱۳ء
(vii) سعید ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ - ۱۹۳۲ء
(ج) خلیفه ۱۳۰۵ھ/
۱۸۸۷ - ۱۸۸۸ء
محمد
(و) حمود
(ز) علی
۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء
(دست برداری
۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء
م ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء)
(ه) حامد
۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ - ۱۸۹۳ء
خروب
(ح) خلیفه
۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء
(ii) سالم
[illegible]ھ/۱۸۶۶ء

مآخذ: (۱) سیّد سعید کی وفات تک کے لیے سب سے بڑا عربی مستند مآخذ ابن رزیق کی "وقائع" ہے جس کا ترجمہ جی - پی - بیجر G. P. Badger نے History of the Imāms and Sayyeds of Oman کے نام سے کیا ہے، Hakluyt Society، ۱۸۷۱ء - اصل عربی کتاب طبع نہیں ہوئی اور اس وقت اس کا مخطوطہ کیمبرج یونیورسٹی میں محفوظ ہے زیر عدد Add. ۲۸۹۲، لیکن ابن رزیق تاریخوں کا زیادہ خیال نہیں رکھتا - ان میں سے بعض کی تصحیح ایک گمنام مصنّف کے مخطوطے سے کی جا سکتی ہے، جو موزۂ برطانیہ میں موجود ہے، زیرعدد Add. ۲۳۳۹۳ - امام احمد کی تاریخوں کے لیے دیکھیے: (۲) C. F. Beckingam، در JRAS، ۱۹۴۱ء؛ (۳) عبداللہ بن حمید السّالمی: تحفۃ الاعیان بسیرۃ اهل عمان، قاہرہ ۱۳۵۰ھ؛ (۴) R. Coupland: East Africa and its Invaders، اور The Exploitation of East Africa؛ (۵) L. W. Hollingsworth: Zanzibar Under the Foreign Office؛ (۶) W. H. Ingrams: Chronology and Geneologies of Zanzibar Rulers، زنجبار ۱۹۲۶ء؛ (۷) B. Thomas: Arab Rule under the Āl Bū Sa'īd Dynasty of Oman، در Proceedings of the British Academy، ج ۲۴؛ (۸) R. Said-Ruete: Said bin Sultan (1791-1856), ruler of Oman and Zanzibar، لنڈن ۱۹۲۹ء؛ (۹) وہی مصنّف: Dates and references of the History of Al Bū Sa'īd Dynasty، لنڈن (؟) ۱۹۳۲ء؛ (۱۰) وہی مصنّف، در Isl.، شمارہ ۲۰ (۱۹۳۲ء): ص ۲۳۷ تا ۲۴۶؛ (۱۱) C. U. Aitchison: A Collection of Treaties, Engagements and Sanads، ج ۱۲، حصّہ ۲، ج ۱۳، حصّہ ۴؛ نیز دیکھیے مآخذ بذیل مادّۂ بحر فارس اور زنجبار۔

(C. F. Beckingham)

بُوسْنَہ: (بوسنیا اور ہرزگووینا)۔

(۱) عام خاکہ: بوسنیا اور ہرزگووینا، جن کا کل رقبہ اکاون ہزار ایک سو انتیس کیلو میٹر ہے، ۴۲ درجے ۲۶ ثانیہ اور ۴۵ درجے ۱۵ ثانیہ عرض بلد شمالی اور ۱۵ درجے ۴۳ ثانیہ اور ۱۹ درجے ۴۱ ثانیہ طول بلد مشرقی کے اندر واقع ہے۔ یہ اس طرح یوگوسلاویا کے مغربی — زیادہ‌تر کوہستانی — خطے کو گھیرے ہوئے ہے، جس میں معدنی ذخائر، قوت آبی اور جنگلات بکثرت ہیں۔ یہ دو جغرافیائی اور تاریخی خطّوں، یعنی بوسنیا اور ہرزگووینا پر مشتمل ہے - بوسنیا کا نام ملک کے نسبۃً زیادہ بڑے شمالی حصّے پر دلالت کرتا ہے، جب کہ ہرزگووینا دریائے نِرِتوا Neretva کے طاس سمیت جنوبی اضلاع پر مشتمل ہے - بوسنیا نام دریائے بوسنا سے ماخوذ ہے (بوسنا کے معنی غیر یقینی ہیں، لیکن بلاشبہہ یہ اصلاً الیری زبان کا لفظ ہے)، جو ملک کے وسطی حصّے میں بہتا ہے - اسی دریا کے منبع اور بالائی طاس کے ارد گرد ایک ضلع کے آثار دریافت ہوئے تھے جو بوسنہ کہلاتا تھا (اس کا سب سے پہلے ذکر Constantine Poryphyrogenitus نے کیا، جس نے اسے سربیا میں شامل خیال کیا) اور قدیم آباد کار اسلاوی قبائل کے افراد اس میں آباد تھے۔ پے در پے ملکی اور غیرملکی حکمرانوں کے پیدا کردہ تغیّرات کے بعد یہ خطّہ آخر ایک نئی مملکت کا مستقل جزو بن گیا، جو اسی (بوسنہ) نام سے موسوم ہوئی - بادشاہ تورتکو (Tvrtko) اوّل (۱۳۵۳ تا ۱۳۹۱ء) کے عہدِ حکومت میں یہ مملکت شمال مغرب کے ایک چھوٹے سے ضلعے کو چھوڑ کر نہ صرف بوسنیا اور ہرزگووینا کے موجودہ علاقے پر بلکہ ساحل ادریاتیک Adriatic کے بڑے حصّے اور اس کے نواح میں جنوب اور جنوب مشرق کے اضلاع پر بھی مشتمل تھی۔ ترکوں کی حکومت میں بوسنیا عثمانی سلطنت کا ایک سنجاق تھا اور ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء سے ایک ایالت، جس میں موجودہ

بوسنیا اور ہرزگووینا کی بہ نسبت زیادہ رقبہ شامل تھا۔ یہ صورت نہ صرف پہلے بلکہ بارھویں صدی ہجری کے دوسرے عشرے / سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں کچھ علاقہ چھن جانے کے بعد بھی رہی۔ ہرزگووینا کا نام پندرھویں صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے، جب ایک امیر "" Stjepan Vut Kosača نے اپنے وقت کے شاہ بوسنیا کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور اپنے سینٹ ساوہ کا ''ہرزگ'' (یعنی ڈیوک یا امیر) ہونے کا اعلان کیا۔ یہ خطہ بعد میں ہرس گوینا (ہرزگ کی سرزمین) کہلانے لگا اور ترکی میں ہرسِک ایالی یا ہرسک سنجاقی۔ بوسنیا اور ہرزگووینا کا موجودہ علاقہ تقریباً اس رقبے کے مطابق ہے جو آسٹریا کی حکومت کے تحت (۱۸۴۸ سے ۱۹۱۸ء) اسی نام کے صوبے اور (۱۹۱۸ء) سرب، کروٹ اور سلووین کی مشترکہ مملکت کا ایک حصہ ہو گیا تھا۔ اس خطے کی حدود اور وسعت میں نئی مملکت کے (جو نام نہاد Vidovdan آئین کے تحت بنی) زیرِ انتظام کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یوگوسلاویا میں پارلیمانی حکومت کی بساط الٹ جانے کے بعد (۱۹۲۹ء) وہاں ایک آمرانہ حکومت نمودار ہوئی۔ یہ ان نو بڑی بڑی انتظامی وحدتوں پر مشتمل تھی جو banovina کہلاتی تھیں۔ اس تقسیم نے ملک کی حدود کو بدل ڈالا، کیونکہ دو ایسے banovina یا صوبوں کے مع اپنے صدر مقاموں کے جو بوسنیا اور ہرزگووینا کے اندر تھے (یعنی سراجیوو اور بنالوقہ) اب ہمسایہ علاقے کے حصے بن گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بوسنیا اور ہرزگووینا کے علاقے کے بعض حصے اس صوبے میں شامل ہو گئے جس کا صدر مقام سپلٹ Split تھا، بحالیکہ ہرزگووینا کا ایک حصہ اس صوبے میں شامل کر دیا گیا جس کا صدر مقام مونٹنگرو Montenegro میں تھا۔ زمانۂ حال کے یوگوسلاویا میں روایتی تاریخی حدود کے اندر ایک علٰحدہ عوامی جمہوریۂ بوسنیا و ہرزگووینا بنا دی گئی ہے۔

یوگوسلاویا کی ایک جمہوریہ کی حیثیت سے بوسنیا [= بوسنہ] اور ہرزگووینا [= ہرسک] کی معاشرتی اور سیاسی تنظیم ان آئینوں پر مبنی ہے: وفاقی عوامی جمہوریۂ یوگوسلاویا کا تحریری آئین، جو ۳۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو منظور ہوا؛ عوامی جمہوریۂ بوسنیا و ہرزگووینا کا آئین مؤرخہ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۶ء؛ ۱۳ جنوری ۱۹۵۳ء کا آئینی قانون، جو وفاقی عوامی جمہوریہ یوگوسلاویا کی معاشرتی اور سیاسی تنظیم کے اساسی اصولوں اور حکومت کے وفاقی اجزا کے متعلق ہے؛ اور ۲۹ جنوری ۱۹۵۳ء کا آئینی قانون جو عوامی جمہوریۂ بوسنیا اور ہرزگووینا کی معاشرتی اور سیاسی تنظیم اور حکومت کے جمہوری اعضا سے متعلق ہے۔

عوامی جمہوریۂ بوسنیا و ہرزگووینا کی، یوگوسلاویا کی دوسری جمہوریتوں کی طرح اپنی ایک عوامی مجلس قانون ساز ہے، جس کی مجلس عاملہ اور اعلٰی سرکاری دفاتر (= سکریٹریٹ) سراجیوو Sarajevo [= سرای] میں ہیں، جو اس جمہوریہ کا صدر مقام ہے۔ ملک کو بارہ اضلاع اور ایک سو چونتیس پرگنوں (Communes) میں تقسیم کیا گیا ہے (۱۹۵۸ء)۔

بوسنیا اور ہرزگووینا کی آبادی [۳۱ مارچ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق] بتیس لاکھ ستر ہزار نو سو اڑتالیس ہے۔ یہاں کے لوگ سربو کروٹ Serbo-Croat زبان بولتے ہیں (بجز قلیل التعداد سلووینی اور مقدونی آبادکاروں اور قومی اقلیتوں کے)، لیکن قومیت کے اعتبار سے یہ اس طرح بٹے ہوئے ہیں: سرب (جن کی اکثریت مشرقی کلیسا سے تعلق رکھنے والے عیسائیوں کی ہے اور بقیہ مسلمان ہیں)، کروٹ Croats (جو زیادہ تر رومن کیتھولک عیسائی اور بقیہ مسلمان

ہیں) اور تیسرے وہ لوگ ہیں جو اپنی قومیت واضح نہیں کرتے (ان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے).

۱۹۵۳ء کی سر شماری کے ابتدائی نتائج کی رو سے بوسنیا اور ہرزگووینا میں آبادی کا تناسب یہ تھا : ۳۱ء۳ فیصد بغیر قومیت کے ؛ ۴۴ء۳ مشرقی کلیسا کے عیسائی؛ ۲۱ء۳ فیصد رومن کیتھولک عیسائی، ۳۲ء۳ فیصد مسلمان. اور ۰ء۹ دوسری قومیتوں کے افراد.

۱۹۵۳ء کی سر شماری کے آخری اور سرکاری نتائج جو اب طبع ہو چکے ہیں مفصلۂ ذیل ہیں : سرب بارہ لاکھ چونسٹھ ہزار تین سو بہتر — ۴۴ء۴ فیصد (جس میں . . . مسلمانوں کی تعداد شامل ہے) کروٹ چھے لاکھ چوّن ہزار دو سو انتیس — ۲۳ء۰ فیصد (جس میں . . . مسلمانوں کی تعداد شامل ہے) - غیر اعلان کردہ یوگوسلاوی آٹھ لاکھ اکانوے ہزار آٹھ سو — ۳۱ء۳ فیصد (جن میں آٹھ لاکھ ساٹھ ہزار چار سو چھیاسی مسلمان تھے) - دوسرے لوگ سینتیس ہزار تین سو نواسی — ۱ء۳ فیصد.

یہاں کے باشندے اپنی مشترکہ زبان اور گہرے نسلی روابط کے باوجود تین گروہوں میں منقسم ہیں ، جس کا سبب تاریخی اثرات بھی ہیں، لیکن سربوں اور کروٹوں کے درمیان قومی اختلافات کی تشکیل کرنے کے ذمے دار زیادہ تر مختلف مذہبی اعتقادات ہیں - بوسنیا اور ہرزگووینا صدیوں تک سلطنت عثمانیہ کا سرحدی علاقہ رہے اور مشرق و مغرب کے عین کنارے پر واقع تھے جہاں دونوں طرف کے اثرات پڑتے رہے - اب ان کے قبول اسلام سے ایک اور نیا عنصر پیدا ہو گیا - آسٹریا - ہنگری کی حکومت کے تحت بوسنیا اور ہرزگووینا کی آبادی کی جماعت بندی سرکاری طور پر بلحاظ قومیت کی گئی (بجز ان قلیل التعداد آبادکاروں کے جن کی قومیت کی باقاعدہ علیحدہ تصریح کر دی جاتی تھی)، حالانکہ پوری آبادی کی اکثریت میں قومی وحدت کا شعور پیدا ہو رہا تھا، چنانچہ مشرقی کلیسا کے عیسائیوں نے سرب ہونے کا اور رومن کیتھولک عیسائیوں نے کروٹ ہونے کا ادّعا کیا - دوسری عالمگیر جنگ شروع ہونے تک بلغراد Belgrade اور زگرب Zagreb دونوں ہی بوسنیا کے مسلمانوں کے ساتھ قومی رشتہ رکھنے کے مدعی تھے، چنانچہ مسلم آبادی کے ایک حصے نے، جو زیادہ‌تر تعلیم یافتہ شہری طبقے پر مشتمل تھا، مذکورہ علاقوں میں بالترتیب اپنے سرب اور کروٹ ہونے کا اعلان کر دیا.

بایں ہمہ بوسنیا اور ہرزگووینا میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت غیر متأثر رہی اور انہوں نے اپنے آپ کو سرب یا کروٹ ظاہر کرنے سے احتراز کیا - جدید یوگوسلاویا میں قومیت کے مسئلے پر شخصی رائے اور احساسات کا کامل طور پر لحاظ رکھا گیا ہے - نتیجۃً سربوکروٹ زبان بولنے والے مسلمان اس معاملے میں آزاد ہیں کہ اپنے آپ کو سرب ظاہر کریں یا کروٹ، یا اپنی قومیت کو ظاہر ہی نہ کریں - دیگر اسباب کے علاوہ یہ واقعہ کہ بوسنیا اور ہرزگووینا میں سربوکروٹ بولنے والے مسلمانوں کی کثیر تعداد ایسی ہے جو اپنی قومیت کی تعیین نہیں کرتے، بوسنیا اور ہرزگووینا کو یوگوسلاویا میں ایک جداگانہ جمہوریہ بنانے میں فیصلہ کن ثابت ہوا.

ترکوں کی چار سو برس کی حکومت (۸۶۷ھ / ۱۴۶۳ تا ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء) کا نتیجہ نہ صرف یہ نکلا کہ آبادی کا ایک بڑا حصہ مشرف باسلام ہو گیا بلکہ پورے ملک میں اس کا ایک نقش بھی باقی رہ گیا - بوسنیا اور ہرزگووینا میں مسلمانوں اور غیر مسلموں سبھی کی زبان سربوکروٹ ہے - نتیجۃً مشرقی ثقافت کے عناصر نہ صرف مسلمانوں بلکہ بوسنیا اور ہرزگووینا کی کل آبادی کے انداز اور طریق معاشرت میں مضبوطی

سے جڑ پکڑ چکے ہیں . . . .

یہ عالمگیر جنگ ثانی اور یوگوسلاویا کی نئی حکومت کی انقلابی تدابیر انجام دینے کے بعد کی بات ہے کہ ملک کی بڑھتی ہوئی صنعت‌کاری کی وجہ سے بوسنیا اور ہرزگووینا کے قدرتی وسائل سے پورا پورا کام لیا گیا - ١٩٤٥ء سے متعدد صنعتی کارخانے اور ادارے قائم کیے گئے ہیں - چھوٹے بڑے برقابی اور حربرقی (thermo-electric) قوت پیدا کرنے کے مقامات بنائے گئے اور صنعت کان کنی کو عہد جدید کے مطابق بنا کر وسعت دی گئی - ١٩٤٧ سے ١٩٥٣ء تک کے عرصے میں بوسنیا اور ہرزگووینا کی صنعتوں اور کان کنی میں جو سرمایہ لگایا گیا اس کی مجموعی رقم ٢٣٦٣٩٣٠ لاکھ دینار یا کل زیر عمل سرمائے کا ٦١٫٣ فیصد ہے - ملک کو بدرجۂ اتم صنعتی بنانے کے اس دور کے بعد سرمایہ لگانے کی حکمت عملی میں قدرے ردّ و بدل اور حسب حال درستی کرنا پڑی - ١٩٥٧ء میں جو سرمایہ لگایا گیا اس کی مجموعی رقم پچھتر ارب چھیاسٹھ کروڑ ستر لاکھ بنتی ہے، جس میں سے تین لاکھ اڑتیس ہزار چار سو ساٹھ صنعت اور کان کنی پر صرف ہوئے - ملک کو اس تیزی سے صنعتی بنانے کے نتائج بوسنیا اور ہرزگووینا کی زراعت پیشہ آبادی کے تناسب کی بابت سرکاری اعداد و شمار کی باضابطہ اطلاعات سے بھی مترشح ہوتے ہیں جو حسب ذیل تھا :-

	١٨٩٥ء	١٩١٠ء	١٩٢١ء	١٩٤٨ء	١٩٥٣ء
کاشتکاری - جنگل‌بانی اور ماہی گیری کا کام کرنے والے :	٨٨٫٣	٨٦٫٦	٨٣٫٣	٧٦٫٧	٦٣٫٥
دوسرے کام کرنے والے :	١١٫٧	١٣٫٣	١٦٫٥	٢٣٫٣	٣٦٫٥

قومی معیشت کے دوسرے شعبوں میں خصوصاً زرعی زمین کے استعمال اور مویشیوں اور بھیڑوں کی پرورش کے لحاظ سے ترقی کی شرح اتنی تیز نہیں رہی، لیکن زرعی حکمت عملی میں حالیہ رجحانات کے نتیجے میں اب زیادہ زور زمین کی کاشت اور زراعت کی دوسری اقسام پر دیا جانے لگا ہے - ١٩٥٧ء میں بوسنیا اور ہرزگووینا میں زرعی زمین ٢٦١٣٠٠٠ ہیکٹر (ہیکٹر = ٢٫٤٧١ ایکڑ) تھی، جس میں سے ٦٣٫٧ فیصد قابل کاشت تھی اور بقیہ چراگاہیں اور کوہستانی مرغزار (٣٠ فیصد) اور دلدل اور نیستان (٠٫١ فیصد) کی اراضی تھی۔

جہاں تک ذرائع مواصلات کا تعلق ہے بوسنیا و ہرزگووینا ابھی تک اپنے پچھلے نامساعد حالات کا خمیازہ بھگت رہا ہے، خصوصاً ریل کی پٹری بچھانے کے معاملے میں - ١٩٥٧ء میں اس ملک میں دو ہزار ایک سو گیارہ کیلومیٹر ریل کی پٹری تھی، جس میں سے ایک ہزار تین سو اتالیس معیاری چوڑائی (چار فٹ آٹھ انچ) کی تھی اور اس کے مقابلے میں ایک ہزار تین سو اتالیس کیلومیٹر چھوٹی پٹری (چار فٹ آٹھ انچ سے کم) کی تھی۔

١٩٥٦ء کے دوران میں بوسنیا اور ہرزگووینا کی قومی پیداوار کی مجموعی مالیت ٢١٥٦٣٩٠ لاکھ دینار تھی - بڑے بڑے ذرائع اور رقوم (لاکھ کے شمار میں) جو ہر ایک ذریعے سے حاصل ہوئیں، مندرجۂ ذیل تھیں:

صنعت اور کان کنی	١٠٨٣٣٦٠
زراعت	٣٦٨٢٨٠
تعمیرات	١١١٥٣٠
مواصلات	١٩٨٧٧٠
جنگلات	١٠٠٣١٠
دستکاریاں	٥٦٥٣٠
تجارت اور سربراہی	١٣٦٣٠٠

ملک کی کم ترقی یافتہ معاشی حالت کی طرح

لوگوں کی خصوصاً دیہاتی علاقوں میں تہذیبی پسماندگی بھی موجود ہے۔ آسٹریا ۔ ہنگری کی حکومت نے فرقہ وارانہ مدارس کا خاتمہ کیے بغیر سرکاری نگرانی میں ابتدائی مدارس قائم کیے۔ ۱۹۱۱ء میں لازمی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا، پھر بھی ۱۹۱۲ - ۱۹۱۳ء میں بوسنیا اور ہرزگووینا میں صرف تین سو چوہتّر سرکاری نگرانی کے ابتدائی مدارس تھے۔ سرکاری نگرانی والے اور فرقہ وارانہ مدارس کی تعداد اتنی قلیل تھی کہ ان میں پڑھائی کے قابل عمر کے بچوں کی فقط ۱۸٫۰۰ فیصد کو تعلیم دی جا سکتی تھی۔ مملکت یوگوسلاویا کی حکومت صرف سرکاری ابتدائی تعلیم کے مدارس کو تسلیم کرتی تھی، مگر پھر بھی پڑھائی کے قابل عمر کے بچوں میں سے بمشکل ایک تہائی ہی داخل ہو سکتے تھے۔ ۱۹۳۸ - ۱۹۳۹ء میں ابتدائی تعلیم کے مدارس کی تعداد صرف ایک ہزار بانوے تھی، اس لیے اس وقت تک بڑے پیمانے پر ناخواندگی پھیلی رہی۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد مدارس کی تعداد بڑھانے اور بالغوں کی ناخواندگی کم کرنے کی عظیم مساعی کے باوجود ۱۹۵۳ء کے سرکاری اعداد و شمار مظہر ہیں کہ بوسنیا اور ہرزگووینا میں دس برس کی عمر سے زائد کل اکیس لاکھ سولہ ہزار اشخاص میں سے دو لاکھ پچیس ہزار ناخواندہ مرد اور چھے لاکھ پندرہ ہزار ناخواندہ عورتیں تھیں۔

۱۹۵۰ء اور اس کے بعد کے سنین میں بوسنیا اور ہرزگووینا میں خواندگی اور تعلیم کا معیار بلند کرنے کی خصوصی کوششیں کی گئیں، چنانچہ ۱۹۵۷ء میں کل دو ہزار چار سو چھے ابتدائی تعلیم کے مدارس (جن میں تسلسلی اور ہشت سالہ تعلیم کے مدارس شامل ہیں)، سینتیس بڑے مدارس (ثانوی کلاسیکی یا گرامر سکول)، ایک سو انسٹھ پیشہ ورانہ، تربیتی مدارس اور ستائیس دوسرے مدارس تھے۔ بالغوں کے لیے چھبیس دوسالہ ابتدائی مدارس، دس ثانوی مدارس، کارکنوں کے لیے بارہ پیشہ ورانہ مدارس، انیس مدارس تربیت یافتہ کاریگروں کے لیے اور گیارہ دیگر مدارس تھے۔ جنگ کے کچھ عرصے بعد سراجیوو میں سات شعبوں پر مشتمل ایک یونیورسٹی نیز ایک موسیقی کی اکادمی اور کئی سائنس کے ادارے قائم کیے گئے۔ مزید برآں بوسنیا اور ہرزگووینا میں اب اساتذہ کے تین تربیتی کالج، متعدد بڑے (پیشہ ورانہ) تربیتی کالج، چھے تھیئٹر، ساٹھ سائنس کے کتب خانے، تین سو پچیس عوامی کتب خانے، اٹھارہ عجائب گھر اور ایک ریڈیو نشرگاہ ہے [بوسنہ کے تازہ حالات کے لیے دیکھیے انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا بذیل مادہ]۔

مآخذ: (۱) *Statistički godišnjak FNRJ za 1958*، بلغراد ۱۹۵۸ء؛ (۲) *Rezultati popisa stanovništva 1953*، کتاب ۱، *Vitalana i etnička obeležja* (عوامی جمہوریۂ یوگوسلاویا کا آفاقی دفتر اعداد و شمار انگریزی اور فرانسیسی میں اعداد و شمار مہیا کر دیتا ہے) *Informativni podaci o srezovima i opštinama*، (جسے بوسنیا اور ہرزگووینا کے دفتر اعداد و شمار نے شائع کیا)، سراجیوو ۱۹۵۸ء؛ (۳) *Enciklopedija Jugoslavije*، جلد ۲، S.V. Bosna i Hercegovina، Zagreb ۱۹۵۶ء۔

۲ ۔ ترکی حکومت کے تحت بوسنیا اور ہرزگووینا کی تاریخ:

(الف) ترکوں کے زمانۂ عروج میں:

بوسنیا اور ہرزگووینا میں اسلام کا تمکّن ترکی حکومت کے قائم اور مضبوط ہونے کے ساتھ وابستہ ہے۔ ترکی کا پہلا حملہ ۷۸۸ھ / ۱۳۸۶ء میں بوسنیا کے پہلے بادشاہ تورتکو (Tvrtko) ۱۳۵۳ تا ۱۳۹۱ء، بادشاہ از ۱۳۷۷ء) کے عہد

حکومت میں ہوا جب کہ اس کی قوت اوج کمال پر تھی ۔ دوسرا حملہ ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء میں ہوا، جب ترکی فوجیوں کو Vojvoda Vlatko Vuković کے ہاتھوں شکست ہوئی ۔ دوسرے ہی سال بوسنیا کی فوج نے سربیا کے والی (ڈیوک) لازار Lazar کی طرفداری سے Vlatko Vuković کی قیادت میں جنگ قوصوہ Kossovo میں حصّہ لیا ۔ دورانِ جنگ میں سلطان مراد کو کاری زخم آیا اور وہ لڑائی کے خاتمے پر جاں بحق ہو گیا ۔ پھر بھی شہزادۂ بایزید فتح پانے اور ڈیوک لازار کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ جنگ قوصوہ کے بعد ڈیوک کے جانشینوں کو ترکوں کی سیادت تسلیم کرنا پڑی ۔ سربیا کے باج گزار ہو جانے سے بوسنیا کی حیثیت بہت کمزور ہو گئی ۔ شاہ تورتکو کا جانشین صرف ان علاقوں پر حکومت کرنے کا مجاز ٹھیرا جو واقعی اس کی ملکیت تھے، جبکہ بوسنیا کا بیشتر حصّہ آزاد امرا کے زیر اقتدار تھا، جن میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے علاقے پر پورا اقتدار حاصل تھا ۔ ۷۹۳ھ / ۱۳۹۱ - ۱۳۹۲ء میں ترکوں کی فتح سکوپ (Skopje) سے ایک ایسے سرحدی علاقے کی تشکیل عمل میں آئی جس کے ڈانڈے بوسنیا اور سربیا سے ملتے تھے ۔ سکوپ پہلے سنجاق بے پاشا یگِت کا صدر مقام بنا، اس پاشا کا جانشین اس کا بیٹا اسحٰق ہوا ۔ ۸۱۸ھ / ۱۴۱۵ء سے ترک یہاں بار بار تاخت کرتے رہے، جس کے نتیجے میں ملک کے اندرونی معاملات میں اور بوسنیا کے جاگیردار نوابوں اور تخت کے مدعیوں کی باہمی روزافزوں مخاصمتوں میں ترکیہ کا اثر و نفوذ بھی برابر بڑھتا ہوا محسوس کیا جانے لگا ۔ تورتکو ثانی (۱۴۲۰ تا ۱۴۴۳ء) نے اپنی تخت نشینی کے تھوڑے دن بعد ترکیہ کی سیادت کو تسلیم کر لیا، پھر ترکوں نے شاہانِ بوسنیا کو خراج ادا کرنے کا پابند بنا لیا (از ۸۳۲ھ/۱۴۲۸ - ۱۴۲۹ء) ۔ وہ چند موقعوں پر کئی شہروں میں عارضی طور پر قابض ہو گئے اور ان میں حفاظتی فوج متعین کر چکے تھے، لیکن نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں جا کر ہودی‌جد Hodidjed اور اس کے نواحی علاقے، یعنی سراجیوو کے موجودہ ضلع میں انھوں نے اپنے پاؤں مضبوطی سے جما لیے، اور یہاں ایک سرحدی (عسکری) صوبے کی تشکیل ہوئی جس کا نظم و نسق والی، سکوپ عیسٰی بے بن اسحٰق بے کے ہاتھ میں تھا اور وہ براہِ راست ایک اعلٰی ترکی عہدےدار کے ماتحت تھا جس کا خطاب وویوودا voyvoda (= رئیس) تھا ۔ نظم و نسق کے لحاظ سے اس خطّے میں دوعملی تھی، اس لیے کہ نواحی اضلاع کے بوسنوی رئیس ترکوں کے باج گزار تھے ۔ یہ انتظامی علاقہ ترکی کے ۸۰۹ھ / ۱۴۰۰ء کے دفتر جمع بندی میں باقاعدہ مندرج ہے لیکن اس میں سرای اووسی Saray Ovasi نامی بستی کے بندوبست کا کوئی ذکر نہیں گو اسی نام کے ایک ضلع کا اندراج موجود ہے ۔ بہر نوع سراجیوو کی بنا پڑنے کی تاریخ مملکت بوسنیا کے زوال سے پہلے تک جاتی ہے، اس لیے کہ سرای اووسی کے قبضے کا اندراج ۸۶۶ھ / ۱۴۶۱ - ۱۴۶۲ء میں ہوا ہے ۔ اس زمانے میں Stjepan Tomaš (۱۴۴۳ تا ۱۴۶۱ء) تخت بوسنیا کا مالک تھا ۔ اس نے مغربی ممالک کی مدد پر بھروسا کیا، لیکن ترکوں کو خراج دینے کی پابندی سے اپنے آپ کو آزاد نہ کرا سکا ۔ اس موقع پر پاپاے روم نے نہ صرف بادشاہ کے کیتھولک مذہب اختیار کرنے کا بلکہ "الحاد" کے انسداد کرنے کا بھی مطالبہ کیا ۔ الحاد سے مراد (عیسائیوں کا) وہ نیا فرقہ تھا جو جبر و تعدی کے باوجود مضبوطی سے جڑ پکڑ چکا تھا اور ایک مستقل مذہب بن گیا تھا ۔ آخرکار بادشاہ نے بادلِ ناخواستہ ان

ملاحدہ کی دار و گیر کے احکام صادر کر دیے اور انھوں نے ترکی کے مقبوضہ اضلاع اور اس علاقے میں پناہ لی جو آگے چل کر ہرزگووینا بنا۔ ترکوں کو نہ صرف اس مملکت کے مذہبی مناقشات سے بلکہ آبادی کے طبقاتی اختلافات سے بھی فائدہ پہنچا۔ مملکت بوسنیا اور سربیا کی آمرانہ حکومت کو بادشاہ کے بیٹے Stjepan Tomašević اور سربیا کی ایک شہزادی کے درمیان شادی ٹھیرا کر متحد کرنے کی کوشش کی گئی، مگر یہ اس آمرانہ حکومت اور اس کے دارالحکومت سمدریوو Smederevo کے سقوط پر منتج ہوئی (۱۴۵۹ء)۔ Stjepan Tomašević (۱۴۶۱-۱۴۶۳ء) بوسنیا کا آخری بادشاہ اپنے باپ سے کہیں زیادہ مغربی ممالک کی امداد کا دست نگر ہوتا چلا گیا۔

۸۶۷ھ / ۱۴۶۲-۱۴۶۳ء میں جب بادشاہ نے خراج ادا کرنے سے انکار کیا تو ترکی فوجوں نے خود سلطان کی قیادت میں بوسنیا پر حملہ کر دیا اور اسے بہ سرعت فتح کر لیا، مگر ترکی فوجوں کے اس ہٹ جانے کے تھوڑے دن بعد ہی ہنگری کے بادشاہ کوروینس Matthias Corvinus نے بوسنیا پر چڑھائی کر دی اور شہر ججسی Jajce اور ملحقہ اضلاع پر قبضہ جما لیا۔ دوسرے سال ہنگری کی فوجوں نے سربرنک Srebrenik مسخر کیا اور دو "باناتیں" (سرحدی ضلعے جن پر بان Bana حکمرانی کرتا تھا) قائم کر دیں، جن میں سے ایک کا صدر مقام ججسی میں اور دوسرے کا سربرنک میں تھا۔ ان دونوں کو ملا کر ہنگری کا ایک سرحدی عسکری صوبہ بنا دیا گیا، جس میں ساوہ Sava کے جنوب کی پٹی کا اضافہ کر دیا گیا۔ نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے دوران میں یہاں سے متعدد یلغاریں ہوئیں جن کی انتہا سراجیوو کا سہ روزہ قبضہ تھا۔ شاہ Matthias نے اپنے ایک جاگیردار کو بوسنیا کا برائے نام بادشاہ بھی بنا دیا تھا۔ ادھر ترکوں نے اس سے بھی پیشتر مملکت کے مفتوحہ اضلاع سابق خاندان شاہی کے ایک عمزاد بھائی کو دے کر ایک برائے نام بادشاہت قائم کر دی تھی جو صرف ۸۸۱ھ / ۱۴۷۶ء تک قائم رہی۔

بوسنیا کا پہلا سنجاق بے محمد بے بنت اوغلو تھا۔ ہرزگووینا کی سنجاق کی بنیاد ۸۷۴ھ / ۱۴۶۹-۱۴۷۰ء میں رکھی گئی (ہرزگووینا کا بقیہ حصہ ترکوں نے ۸۸۶ھ کے اختتام / ۱۴۸۲ء کے آغاز میں فتح کیا تھا)۔ بعد میں ایک اور سنجاق قائم ہو گئی، جس کا صدر مقام زورنک Zvornik میں تھا۔ "بانات سربرنک" ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء میں ترکوں کے قبضے میں آ گئی، جنھوں نے مہاج Mohács کی جنگ (۱۵۲۷ء یا ۱۵۲۸ء) کے بعد ججسی اور بنالوقہ (Banjaluka) [رلہ رآن] پر بھی قبضہ کر لیا۔ بوسنیا سے ترک لیکا Lika میں پہنچے اور انھوں نے دالماطیہ Dalmatia کا بیشتر حصہ بشمول حصار کلس Klis قبضے میں لے لیا۔ سلاوونیا Slavonia کی فتح میں بوسنیا کا سنجاق بے بھی شریک تھا۔

بوسنہ کی سنجاق کا صدر مقام سراجیوو میں تھا (دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے وسط تک) جہاں سنجاق بے غازی خسرو بے نے بہت سی شاندار عمارات تعمیر کرائیں۔ خسرو بے وہاں ۹۲۶ھ/۱۵۱۹-۱۵۲۰ء میں حاکم سنجاق کی حیثیت سے آیا اور ۹۴۸ھ / ۱۵۴۱ء میں فوت ہوا۔ اس وقت تک سراجیوو کا شہر ایک وسیع اور اہم مقام بن چکا تھا۔ تاہم سنجاق کا صدر مقام بنالوقہ میں منتقل کر دیا گیا (دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب)، جس کا تعمیری نقشہ اور تعمیر بحیثیت ایک اسلامی شہر کے فرہاد سوکولووچ Sokolović (صوقوللو) کے

هاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ فرهاد صوقوللو، جو بوسنیا کا والی تھا، پورے صوبے کا پہلا پاشا (= بیلربے) هو گیا تھا۔ ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء میں بوسنیا کی ''ایالت'' کی تشکیل هوئی، جس کا صدر مقام بنالوقه [رک بآں] مقرر هوا، جو ان سات سنجاقوں پر مشتمل تھا: (بوسنیا، هرزگووینا، کلس، کرکه، پکرج، زوورنک اور پوزغا)۔ بوسنیا اور هرزگووینا کے موجودہ رقبے کے علاوہ اس ایالت میں سلاوونیا، لیکا اور دالماچه کے اقطاع نیز سربیا کے سرحدی اضلاع شامل تھے۔ گیارھویں صدی هجری کے اوائل، یعنی سولھویں صدی عیسوی کے اواخر میں یه ایالت آٹھ سنجاقوں سے مرکب تھی، اور گیارھویں صدی هجری کے پہلے عشرے کے اختتام / سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں پوزغا کی سنجاق کو کنزیا Kanizsa کی ایالت میں شامل کر دیا گیا تھا۔

ترکی فتح سے بوسنیا اور هرزگووینا کی عمرانی هیئت میں بڑی تبدیلیاں واقع هوئیں۔ اس زمانے میں جب بوسنیا ترکی کے قبضۂ اختیار میں آیا، سلطنتِ عثمانیه کی عمارت کی بنیادیں اور تنظیم بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔

ترکوں نے جب یه ملک فتح کر لیا تو پھر اس میں اپنا معاشرتی نظام بھی رائج کرنا شروع کیا، جو مبنی ہے ایک مرکزی حکومت اور ان کے اپنے عسکری اور جاگیرداری آئین پر مشتمل تھا۔ اس سے نتیجةً معاشی اور معاشرتی معاملات میں بہت سی تبدیلیاں واقع هوئیں۔ کان کنی، جو زراعت کے بعد سابقه بوسنیا کے معاشی اشغال کی اهم‌ترین شاخ تھی، نئے حکمرانوں نے خود لے لی اور تمام کانیں سلطان کی ملکیت بن گئیں۔ اعلٰی مرتبے کے طاقتور جاگیردار رئیسوں کا، جو اپنے اپنے علاقے کے مالک هوتے تھے، دور ختم هو گیا۔ زمینداری کے طریقوں میں نظامِ تیمار [رک بآں] کا آئین جاری کیا گیا، جس کی باگ ڈور ایک مرکزی محکمے کے هاتھوں میں تھی۔ سنجاقوں کا انتظام ان کے والیوں کے هاتھ میں تھا، جو براہِ راست سلطان کی نگرانی میں هوتے تھے اور جن کی آمدنی بادشاهوں کے بعد سب سے زیادہ هوتی تھی۔ والیوں کی تبدیلیاں بہت جلد جلد هوا کرتی تھیں۔ دوسری طرف کسانوں پر سے دباؤ دور هو گیا اور بھیڑوں کی پرورش میں ترقی هونے لگی۔ دیہاتی علاقوں میں عام طور پر برادری کے بزرگوں کی سرداری کے دستور چلتے تھے اور ایک حد تک اندرونی خود مختاری نظر آتی تھی۔

اسی زمانے میں عظیم مذهبی اور نسلی تغیّرات رونما هوئے، جنھوں نے کل آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وسیع پیمانے پر اسلام کی ترویج هوئی، بعض کوهستانی، خصوصاً هرزگووینا کے اضلاع میں پرورش حیوانات میں نمایاں طور پر ترقی هوئی اور بھیڑیں پالنے والوں کو سرسبز زراعتی اضلاع میں، جو جنگوں وغیرہ کے سبب ویران هو گئے تھے، دوبارہ آباد کیا گیا۔ زرخیز علاقوں میں بس جانے کے بعد ایسے هزاروں بھیڑیں پالنے والے زراعت کی طرف متوجه هو گئے اور اس طرح ویران علاقوں کی بہتری کے لیے کام کرنے والے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد فراهم هو گئی۔ اس بات کے پیش نظر که آبادکاروں کی حیثیت سے انھیں بڑی اهمیت حاصل تھی، گلّه پروروں کی حیثیت سے جو مراعات پہلے انھیں دی گئی تھیں وہ بھی بحال رکھی گئیں۔ تاهم جاگیرداری نظام اور مستقل آبادکاری کی ترقی کے ساتھ یه آبادکار کثرت سے مزارع یا ''رعایا'' بن گئے۔ ان میں چونکه بیشتر کلیسائے یونان کے پیرو سرب تھے لهٰذا بہت سے اضلاع، جن میں پہلے کوئی سرب آبادی نه تھی، اب ان سے آباد هو گئے۔

دوسری طرف اسلام کے پھیلنے کی وجه سے

حکمران مذہب کو تمام طبقوں، یعنی کسانوں، جاگیرداروں اور شہری لوگوں میں سے اپنے پیرو اور طرف دار حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی۔ بوسنیا اور ہرزگووینا میں اشاعتِ اسلام کے موضوع کا ابھی تک جامع انداز میں مطالعہ نہیں کیا گیا، اس لیے یہ ابھی ایک حل طلب مسئلہ ہے۔ پہلی عالمگیر جنگ سے پہلے عام مسلّمہ رائے یہ تھی کہ عیسائیوں کے ایک فرقے کے متبعین، جو بگومل Bogumils کہلاتے ہیں، کی پوری جماعت حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئی۔ جس کا سبب اخلاقی قوانین میں نظریات کی یکسانی اور کلیسائے روم کی طرف سے ان پر سابقہ جور و تعدّی بتایا گیا ہے۔ آج بھی کئی محقّق (A. Solovjev و دیگر) یہ رائے رکھتے ہیں۔ امرائے بوسنیا چونکہ سارے کے سارے اکھٹے مشرف بہ اسلام ہوے تھے، لہٰذا انھیں اپنی جاگیریں بدستور رکھنے کی اجازت دے دی گئی اور اس طرح بوسنیا اور ہرزگووینا میں زمین کے دوامی حقِ کاشت کے روایتی طریقے میں تیرھویں صدی ہجری / انیسویں صدی عیسوی تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ نظامِ تیمار محض بالائی ڈھانچے کے طور پر رائج کر دیا گیا۔ پہلی عالمگیر جنگ سے قبل اس نظریے کے بڑے بڑے مؤیدوں میں سے ایک Truhelka تھا۔ Ć. Truhelka اور دوسروں کے قول کے مطابق بوسنیا کو بالکل ابتدا ہی سے سلطنتِ عثمانیہ میں ایک جداگانہ حیثیت حاصل تھی۔

دونوں عالمگیر جنگوں کے درمیانی زمانے میں یوگوسلاویا کے بعض مؤرّخوں (V. Čubrilović اور V. Skarić) نے ان نظریات کو بے بنیاد ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ان کی رائے یہ تھی کہ (الف) اسلام کی ترویج بتدریج ہوئی تھی؛ (ب) فتح کے بعد نظامِ تیمار قائم ہو جانے کے سبب امرائے بوسنیا کے پاس ان کی جاگیریں باقی نہیں رہی تھیں اور (ج) دوامی حقِ کاشت کا آئین، جیسا کہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں رائج تھا اور بعد کی صدی میں جاری رہا، اس نے صرف پرانے زمینداری نظام کے قالب کے اندر ہی بتدریج نشو و نما پا کر یہ صورت اختیار کی تھی۔

جدید یوگوسلاوی مؤرّخوں نے اوّل درجے کے ترکی مآخذ کی طرف توجّہ دلائی ہے، خصوصاً جمع بندی کے دفاتر کی طرف، جن سے زیرِ بحث زمانے میں یوگوسلاوی لوگوں کی تاریخ پر روشنی پڑنے کا امکان ہے، تاہم ان تحقیقات کے سارے نتائج ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئے . . . .

بوسنیا کے جاگیردار شروع ہی میں ترکوں کی طرف آنے لگے تھے، جب کہ انھیں اپنے مناقشات کے تصفیے کے لیے بارسوخ ترکوں کا سہارا لینا پڑتا تھا، چنانچہ پفلووچ Pavlovic کے ڈیوک خاندان کی زمین کا اندراج ۹۰۸ھ / ۱۵۰۲ - ۱۵۰۳ء کی جمع بندی میں یکمشت خراج (مقاطعہ) ادا کرنے والی زمین کی حیثیت سے ہوا تھا (دیکھیے باش وکالت آرشیوی، مالیہ دفتری، ص ۳۳۵)۔ Herzeg Stjepan کی روش خاصی مدّت تک ترکوں پر مکمل اعتماد کی رہی۔ اس کے بیٹوں کو بھی اسی طرح کچھ عرصے تک ترکوں پر اعتماد کرنا پڑا۔ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا ترکوں کی طرف چلا گیا، اس نے اسلام قبول کر لیا اور ہرسک زادہ احمد پاشا کے نام سے بایزید ثانی اور سلیم اوّل کی حکومتوں میں پانچ مرتبہ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہا۔ بوسنیا اور ہرزگووینا کے باشندوں کی ایک معقول تعداد، جو نومسلم جاگیردار خاندانوں سے تعلق رکھتی تھی، نیز قانون ''دیوشیرمہ'' Devshirme کے ذریعے ''رعایا'' سے فراہم کیے ہوے اور دربارِ سلطانی کے تعلیم یافتہ نوجوان آگے چل کر وزیر یا وزیر اعظم کے عہدوں پر فائز ہوا کرتے تھے۔

محمد پاشا سکولووچ (صوقوللو) جو ممتاز ترین عثمانی مدبروں میں سے تھا اور ۹۷۲ھ / ۱۵۶۵ء سے ۹۸۷ھ / ۱۵۷۹ء تک وزیر اعظم رہا، بوسنیا کے ایک معزز سربی خاندان سے تھا جس کے عیسائی رشتہ دار پیچ Pec کی بطریقی کی بحالی (۱۵۵۷ء) کے بعد سربیا کے بطریق ہوئے۔ بوسنیا نژاد اشخاص کے، جو جلیل القدر عہدوں پر فائز تھے، اور ان کے اقارب کے درمیان خون کے رشتوں نے بوسنیا کے بعض (مسیحی) خاندانوں کو جاہ و دولت دلوانے میں بڑی مدد دی . . . .

عیسائی "سپاہیوں" کی مسلمان اولاد اور نو مسلم خاندانوں کے افراد جنھوں نے ترکی حکومت کے تحت اپنی حالت کو سنوار لیا تھا بعد میں "سپاہی" اور "زعیم" کی حیثیت میں نیز حصاروں کے دزداروں [قلعہ داروں] اور دیگر اعلٰی عہدہ داروں کی حیثیت میں ملتے ہیں۔ بوسنیا کو سرحدی علاقہ ہونے کی وجہ سے جو اہمیت حاصل تھی، اس سے وہاں کے اصلی مسلمان باشندوں کو اثر و رسوخ اور قوت حاصل کرنے میں مدد ملی۔ یہ سچ ہے کہ ترکی افواج کی ظفریابی اور حکومت ہنگری کے ماتحت علاقوں پر حملے کے بعد کثیر التعداد سپاہیوں کو نئے مفتوحہ علاقوں میں آباد ہونے کا حکم دیا گیا، لیکن اس کے بعد وہ نتائج ظہورپذیر نہیں ہوئے جو سربیا میں ہوئے تھے، جہاں ترکی کے ہنگری پر حملہ کرنے کے ساتھ ہی اشاعت اسلام کا سلسلہ عملاً ختم ہو گیا۔ بوسنیا اور ہرزگووینا میں اشاعت اسلام کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان وسیع پیمانے پر نہ صرف شہری لوگوں میں سے بلکہ دیہاتی لوگوں میں سے بھی ہونے لگے۔

ترکی حکومت کے قیام کے بعد بوسنیا کے شہر ترقی کرنے اور بڑھنے لگے۔ ترکی کاریگری، خصوصاً مشرق قریب کی صناعی کی خصوصیات بوسنیا کے پہلے دور کی دستکاری کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ نتیجۃً بوسنیا اور ہرزگووینا میں ترکی حکومت کی پہلی دو صدیوں میں دستکاریوں اور اہل حرفہ کی برادریوں نے بہت ترقی کی۔ چرم سازی، زرگری اور ان صنعتوں میں جو عسکری ساز و سامان تیار کرنے اور شہری لوگوں کی ضروریات مہیا کرنے سے تعلق رکھتی تھیں بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ اس کے برعکس عثمانی صنعت کان کنی بوسنیا یا سربیا کی بہ نسبت کم ترقی یافتہ تھی جہاں سیکسنی Saxon آبادکاروں نے کان کنی کے اپنے فنی طریقے اور قواعد رائج کیے تھے۔ کانوں کے علاقوں میں، جو شاہی جاگیروں ("خاص") میں مدغم ہو گئے تھے، ترکی حکام کے دفتر شاہی ضوابط کے اجرا سے صنعت کان کنی کو ترکی حکومت کی ابتدائی صدی میں دھکا لگا اور اس کے نتیجے میں پیداوار کم ہو گئی خصوصاً قیمتی پتھروں کی پیداوار، لیکن لوہے کی پیداوار میں خفیف سا اضافہ ہوا۔ ان اسباب کی بنا پر بوسنیا اور ہرزگووینا میں شہروں کی ترقی، عسکری وجوہ کے علاوہ جو شہروں کے محل وقوع کے انتخاب اور بنانے کے لیے اہم ترین عنصر تھیں، صنعت کان کنی کے ساتھ وابستہ نہیں تھی، بلکہ دستکاریوں کی ترقی اور ان کی متعلقہ تجارت کے ساتھ وابستہ تھی۔ ترکوں کے بنائے ہوئے تمام شہر ایسے مقامات پر واقع ہوتے تھے جہاں رسل و رسائل کے مواقع لازماً اچھے ہوتے تھے۔ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف کے بعد بوسنیا کے قدیم کان کنی کے شہروں میں اشاعت اسلام کا سلسلہ شروع ہوا، لیکن سست رفتار رہا اور ان کی آئندہ ترقی کے لیے اتنا سازگار نہ تھا جتنا ان شہروں میں جو ترکوں نے سابقہ منڈیوں کے مقامات پر بنائے۔ من جملہ دوسرے شہروں کے اس کی ایک عمدہ مثال

سراجیوو اور بنالوقہ کے شہر ہیں جو ترکی حکام اور چھاؤنیوں کے صدر مقامات ہونے کی حیثیت سے وسیع ہوئے اور صنعتی مرکزوں اور تجارتی نوآبادیوں کی شکل میں ترقی کر گئے۔ مسلم دفتری ملازمین اور فوجی سپاھیوں کے علاوہ، ایسے شہروں کی آبادی، مسلمانوں کے مختلف مقامات سے یہاں آ جانے کے سبب بڑھتی چلی گئی۔ یہ مسلمان مشرقی رسوم اور آداب زندگی اپنے ساتھ لائے۔ بہرحال شروع میں علاقۂ دبرونک Dubrovnik کے تجّار ہی یہاں بڑے پیمانے پر تجارت کرتے تھے۔

بوسنیا اور ہرزگووینا میں اہم‌ترین شہروں کی بنا انفرادی والیوں کی ذاتی اپچ کی مرہونِ منت تھی۔ ان شہروں میں اور ان کے اردگرد ہی والیوں کی ذاتی املاک، کارخانے، مکانات، حمّام اور دکانیں ہوا کرتی تھیں، جنھیں وہ اپنی زندگی ہی میں مذھبی اور رفاھی مقاصد کے لیے وقف کر جاتے تھے۔ اس طرح مسجدیں، تکیے اور دینی مدارس کثرت سے تعمیر ہوئے، نیز کتب خانے بنے، جو مساجد یا مدارس کے ساتھ ملحق ہوتے تھے، اور درویشی سلسلوں نے ایسی تقریبات و رسوم جاری کیں جو شہری آبادی کی دل‌کشی کا موجب ہوں۔ غرض بوسنیا کے شہر ترکی قوت کے حصار اور اسلامی ثقافت کا رکن رکین بن گئے۔ شہروں سے دیہاتی علاقے بھی متاثر ہوئے، جہاں سے کسان اور دوسرے لوگ کثرت سے شہر کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ شہروں میں نقل مکانی کرنے والوں میں اکثریت کسانوں کی تھی جو مشرف باسلام ہو چکے تھے، اور شہری غیرمسلم بھی جلد ہی حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے، چنانچہ شہروں میں عیسائی اور یہودی باشندے بہت قلیل تعداد میں رہ گئے تھے۔

بوسنیا اور ہرزگووینا کی سنجاقوں کے سب سے پہلے ترکی جمعبندی کے دفاتر سے ایسی تحریری شہادت ملتی ہے جو اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ ابتدا میں شہروں اور ان کے مضافات کے باشندے جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اس عہد کے آغاز میں، جیسا کہ سرکاری کاغذات سے عیاں ہے، بوسنیا کی سنجاق میں نومسلم کہاں صرف سراجیوو کے شہر کے ارد گرد ہی پائے جاتے تھے۔ ۸۹۴ھ / ۱۴۸۹ء میں اس سنجاق میں پچیس ہزار سے زائد عیسائیوں کے مکانات اور تیرہ سو سے کچھ اوپر عیسائی بیواؤں کے مکانات تھے اور چار ہزار سے زائد غیرشادی‌شدہ مسیحی مرد تھے۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کے تقریباً چار ہزار پانچ سو مکانات اور دو ہزار تین سو سے زائد مجرد ذکور تھے (قپّو باشی وکالت آرشیوی، تاپو دفتری عدد ۲۴)۔ ہرزگووینا کی سنجاق کے سب سے پرانے جمعبندی کے دفتر برائے سال ۸۸۲ھ / ۱۴۷۷ء سے صاف طور پر واضح ہے (تاپو دفتری عدد ۵)، اور اسی طرح دوسرے دفاتر سے بھی عیاں ہے کہ اسلام آناً فاناً نہیں پھیلا تھا اور نہ اس مفروضے کے ثبوت میں کوئی شہادت موجود ہے کہ بےقاعدہ فوج کے مسیحی سپاھی جو بوسنیا کے الحادی کلیسا سے تعلق رکھتے تھے، فاتحین سے جوق در جوق مل گئے تھے۔ صرف ہرزگووینا کے بعض کوھستانی دیہاتوں ہی میں، جیسا کہ دفاتر سے مترشح ہے، ''بوسنیا کے کلیسا کے مخلص ماننے والے'' (Krstjani) پائے جاتے تھے۔ نیز کاغذات میں یہ بھی ہے کہ بوسنیا کے کلیسا کے کچھ ماننے والے بوسنیا کی سنجاق کے ایک دور افتادہ گاؤں میں بھی رہتے تھے۔ ان کی موجودگی کی یہ واحد نظیر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ Stjepan Tomaš اور بادشاہ Stjepan Tomašević کے عہد حکومت میں عیسائی ملاحدہ پر بیس برس تک جو تعدّی ہوتی

رہی اس کے سبب بوسنیا کا الحادی کلیسا درہم برہم ہو گیا۔ Herzeg Stjepan Vukčić کے راسخ العقیدہ فرقے میں دوبارہ آ جانے نے بھی ہرزگووینا میں بوسنیا کے الحادی یا جداگانہ کلیسا کی حیثیت کو کمزور کر دینے میں ضرور حصّہ لیا ہوگا۔ ترکی حکومت نے سربیا کے کلیسائے یونانی (قدیم) کو تسلیم کر لیا تھا۔ سلطان کی برات (رك بآں) [فرمان] کے ماتحت اس کلیسائے قدیم (Orthodox) کو بہت سے حقوق و مراعات حاصل تھے۔ کیتھولک کلیسا کو بھی سلطان محمد ثانی فاتح کی طرف سے بعض مراعات حاصل ہوئیں۔ جمعبندی دفاتر کے اعداد و شمار سے یہ بات عیاں ہے کہ ”بوسنیا کے کلیسا کے مخلص پیرو“ (یعنی نام نہاد الحادی فرقے کے عیسائی) ہرزگووینا کے دورافتادہ الگ تھلگ اضلاع میں چلے گئے تھے۔ اس بات کی کوئی تحریری شہادت موجود نہیں ہے کہ اس زمانے میں ملک کے ان اضلاع میں اسلام کی اشاعت ہوئی یا لوگ مشرف باسلام ہوئے، لہٰذا اس سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ بوسنیا کے مسیحی ملاحدہ بیشتر علاقوں میں پہلے ہی سے (یونانی یا کیتھولک کلیسا) میں واپس آ چکے تھے۔ اس سے اس بات کا امکان نہیں رہتا کہ یہ ملاحدہ یا بوسنیا کے کلیسا کے پیرو جوق در جوق مشرف باسلام ہوئے تھے۔

بایں ہمہ یہ قرین قیاس ہے کہ کیتھولک کلیسا کی سابقہ جور و تعدّی اور ساتھ ہی (راسخ العقیدہ) یونانی کلیسا کے دباؤ سے، جسے کلیسائی محصولات وصول کرنے کا حق حاصل تھا، بوسنیا کے کلیسا کے قدیم متبعین کے قبول اسلام کے لیے حالات سازگار بن گئے ہوں۔ بہر حال اسلامی مراکز کے طور پر شہروں کی نشوونما اور ملحقہ دیہاتی علاقوں پر ان کے اثر و نفوذ کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسلام بعض علاقوں میں بہت پہلے، یعنی نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی ہی میں مستقل طور پر دیہاتیوں میں پھیلتا چلا گیا۔ اس طرح دھقانوں میں وسیع پیمانے پر اشاعت اسلام کی بنیاد پڑی۔ اسلام لانے والے دھقانوں کو پوتور [یعنی نومسلم] کا امتیازی نام دیا گیا۔ ان کا مذہب اسلامی اور دیگر عناصر، یعنی نیم عیسائی جاہلی اور عیسائی نیز ملحد عیسائیوں کے عقائد سے مرکب تھا۔ اسی بنا پر مسلمان جاگیردار اور مذہبی اہل علم ان مسلمان دھقانوں کو اپنے برابر سمجھنے پر مائل نہ تھے۔

سلطان سلیمان قانونی کے عہد کے دوران میں جاگیردار طبقے کی، جو اس وقت تک کامل طور پر مسلمان ہو چکا تھا، روزافزوں قوت کو روکنے کے لیے اقدامات کیے گئے۔ بوسنیا کے ”سپاہیوں“ کو نئے مفتوحہ علاقوں کی طرف بھیج دیا گیا اور ان کے خالی کردہ ”تیمار“ دوسرے اضلاع کے ”سپاہیوں“ کو تفویض کر دیے گئے۔ چفتلکوں کی ہیئت بدل دی گئی اور انھیں ”رعایا“، یعنی کاشتکاری اراضی بنا دیا گیا۔ اس عہد میں اور زیادہ تر آئندہ زمانے میں متعدد درباری ناجائز وسائل اور رشوتوں کے ذریعے بوسنیا میں جائدادیں حاصل کرنے لگے۔ پھر بھی دفاعی ضروریات خصوصاً سرحدی علاقوں کے دفاع کے پیش نظر اور کثیر اراضی کے ویران و خراب ہو جانے کے باعث یہاں کے لیے رعایتیں دینا پڑتی تھیں۔ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے آخری نصف کے بعد جاگیردار رئیسوں اور فوجی حکام کے پاس جو ”چفتلک“ اراضی تھیں ان کی تعداد بالخصوص سرحدی علاقوں میں بدستور بڑھتی چلی گئی۔ قپودان (کپتان) کا عہدہ پہلے سرحدی علاقوں کے دریاؤں کی نگہداشت سے متعلق تھا، اب وہ اضلاع کے قلعوں اور دفاعی استحکامات کی نگرانی کا عہدہ ہو گیا اور اس کے دفتر سے مقامی

جاگیرداروں کا طبقہ ہمیشہ مؤثر امداد حاصل کرنے کا یقین رکھ سکتا تھا۔ بوسنیا کی جداگانہ ایالت، یعنی صوبہ داری قائم ہوئی تو وہاں کے ملکی طبقۂ امرا کی روز افزوں اہمیّت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کا آخری نصف بوسنیا کے خاص خاص شہروں کے بڑی تیزی سے نمو پانے اور ترقی کرنے کا زمانہ ثابت ہوا۔ اس کے نتیجے میں اطالوی شہروں کے ساتھ مقامی حوصلہ مند تجّار اور Dubrovnik سوداگروں کی تجارت میں بھی مستقل اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مسلمان باشندے چونکہ اکثریت میں تھے، اس لیے انھیں بعض مراعات حاصل تھیں اور وہ عیسائی آبادی سے علیحدہ خاص محلّوں میں رہتے تھے۔ نوواردوں کے ھجوم کے سبب بعض اہل حرفہ کی جماعتوں نے ان پر اپنا دروازہ بند کر دیا، لہٰذا مسلمان آبادی ساوہ سے پرے کے شہروں اور مقامات میں نقل مکانی کر گئی۔

(ب) ترکی قلمرو میں بحران کا زمانہ اور عثمانی ترکوں کی عسکری شکستیں:

بوسنیا کی ایالت کے انتظامی ڈھانچے اور حدود نے گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں جو متعیّن صورت اختیار کر لی تھی، تقریباً اس صدی کے اواخر تک اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہوا۔ ان دنوں ایالت کے والی کا لقب وزیر ہوتا تھا اور دارالحکومت ۱۰۴۹ھ / ۱۶۳۹ء میں بنالوقہ سے سراجیوو میں تبدیل ہو گیا تھا . . . .

بوسنیا کے ''سپاہیوں'' کے مطالبات کو جنوبی صوبہ دار (پاشا) کی تائید حاصل تھی، تسلیم کرتے ہوئے سلطان احمد (۱۶۰۳ تا ۱۶۱۷ء) نے ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے ''تیماروں'' کو خاندانی وراثت کے حقوق (''اوجاق لق'') مل گئے۔ مرحوم کے بیٹے، بھائی یا خاندان کے ساتھ رہنے والے دیگر رشتے دار وارث ہوتے تھے۔

زمین کے حقِ کاشت اور معاشی حکمت عملی میں تغیّرات سے زیادہ تر عیسائی کسان ہی متاثر ہوتے تھے، مسلمان کسانوں کی زمینوں میں شاذ و نادر ہی مداخلت کی جاتی تھی۔ بڑھے ہوئے محصولات اور استحصال زر نے کسانوں کے ان دو طبقوں میں اور زیادہ فرق پیدا کر دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ عیسائی کسان کثرت سے سرحد کے پار بھاگ کر جاتے لگے اور ایسے اشتہاری مجرموں (ترکی میں ہایدوت) [معرب شکل حیدوت، جمع حیادید] کی تعداد بڑھ گئی جو رہزن بن کر شاہراہوں کے امن و امان کے لیے خطرہ بن گئے۔

زراعت اور قومی معیشت کے دیگر شعبوں میں ترقی کے رجحانات جو ابتدائی عہد میں واضح تھے، دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کے دوران میں اور زیادہ نمایاں ہو گئے۔ صنعتِ کان کنی بدستور زوال پذیر رہی اور اس صدی کے اواخر میں وہ اپنی انتہائی پستی کو پہنچ گئی تھی۔ سولھویں صدی کے نصف آخر اور سترھویں صدی کے نصف اول میں بڑھتی ہوئی تجارت اور کاروبار کے سبب شہر بڑھتے اور ترقی کرتے رہے۔ بندر ڈبرونک Dubrovnik کی حریف بندرگاہ سپلٹ Split کا ۱۵۹۲ء میں کھل جانا بوسنیا کی تجارت کے لیے بڑی اہمیت کا واقعہ ثابت ہوا۔ شہروں کے اہل حرفہ کی جماعتیں کلیۃً ینی چری سپاہیوں کے زیر تسلّط آئیں اور اس سے یہ اور بھی محدود تنظیمات کی صورت میں بدل گئیں۔ شہری اعیان [رک بآں] اور ذی اثر ''آغا'' روزافزوں تعداد میں نمودار ہوئے۔ تاہم شہروں کی آبادی کا ایک حصّہ عیسائی تھا، جس میں سے کچھ

اہل حرفہ اور دکان‌دار تھے ۔ دیہاتی لوگوں کے کثرت کے ساتھ شہروں میں نقل مکانی کر کے آ جانے سے متروکہ زمینوں پر لگان بہت زیادہ بڑھ گیا ۔ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اور گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں بعض شہر وسعت و اہمیّت میں بڑھ گئے، خصوصاً شہر سراجیوو، مگر جمع شدہ سرمائے کی بہتات سودخواری کے رواج کو فروغ دینے کا باعث ہوئی ۔ مسلمانوں کی خوشحال جماعت کے علاوہ شہروں میں امیر تاجروں اور سوداگروں کے عیسائی خاندان بھی تھے اور یہ عیسائی سودخوار تھے ۔ شہری معاشرت کی ہیئت سے مترشح ہوتا تھا کہ دولتمند اور سیاسی لحاظ سے بارسوخ طبقے اور شہری غربا کے ادنٰی طبقے کے درمیان زیادہ نمایاں فرق ہوتا جاتا ہے ۔ گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی میں سراجیوو کے مفلوک‌الحال لوگوں میں، جو زیادہ‌تر مسلمان تھے، شدید قسم کی شورشیں اور بلوے ہوئے ۔

گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں یورپ میں ”تیس سالہ جنگ“ ترکوں کے خلاف کسی بڑی عسکری کارروائی میں مانع رہی، لیکن اس صدی کے نصف آخر میں دو طویل جنگیں بڑے مصائب لائیں اور انھوں نے ایالت بوسنیا کی معاشی اور معاشرت کا معیار پست کر دیا ۔ وینس کے خلاف جنگ (۱۶۴۵ تا ۱۶۶۹ء) اور ہبس‌برگ Habsburgs کے خلاف نسبۃً مختصر جنگ (۱۶۶۳ تا ۱۶۶۴ء) دونوں ان علاقوں میں ہوئیں جو ایالت بوسنیا سے تعلق رکھتے تھے اور یہاں بار بار یورشیں واقع ہوئیں ۔ اس وجہ سے عیسائی آبادی سرحد پار چلی گئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پناہ‌گیروں میں سے بیشتر لوگ، جو اسکوجی کہلاتے تھے، وینس کی فوج میں بھرتی ہو گئے ۔ ہرزگووینا میں بھی بے چینی تھی اور لوگوں نے شورشیں برپا کیں ۔ جنگوں کے بعد چودہ برس تک خوش‌آئند امن کا دور دورہ رہا اور اس کا نتیجہ مجموعی طور پر ترکی قوت کے استحکام کی صورت میں نکلا ۔ وی‌انا پر حملے سے ”اتحاد مقدّس“ (Holy Alliance) کے ساتھ نئی جنگ کا آغاز ہوا، جو بہت عرصے تک رہی (۱۶۸۳ تا ۱۶۹۹ء) ۔ ایک مرتبہ ساوہ کے جنوب میں بوسنیا کا علاقہ اصل میدان کارزار بننے سے تو بچ گیا لیکن بوسنیا کے ایک لشکر کو جنگ میں حصّہ لینا اور سرحدوں کی مدافعت کرنا پڑی ۔ ۱۶۸۸ء میں آسٹریا کے فوجی دستے ساوہ کے جنوب میں چند اضلاع پر عارضی طور پر قابض ہو گئے اور نو سال بعد شہزادۂ یوجین Eugene نے جنگ سنتا Senta کے بعد سراجیوو تک پیش‌قدمی کی اور ۱۱۰۹ھ / ۱۶۹۷ء میں اسے جلا ڈالا ۔ عیسائی آبادی خصوصاً رومن کیتھولک ترک وطن کر گئے اور حملہ‌آور فوج کے ساتھ پسپا ہو گئے ۔ یہ طویل جنگیں اپنے پیچھے طاعون کی وبا چھوڑ گئیں ۔

کرلووِکی Karlovci کے صلح نامے (۱۱۱۰ھ / ۱۶۹۸ - ۱۶۹۹ء) کی شرائط کے تحت بوسنیا کی ”ایالت“ میں معمولی ردّ و بدل کے ساتھ شمال مغرب کی جانب بوسنیا اور ہرزگووینا کی موجودہ سرحدیں قائم رہیں . . . .

مسلمان مہاجرین، جو ہنگری کو حوالے کیے ہوئے علاقوں، سلاوونیا، کروٹیا اور دالماچیہ سے بوسنیا کی متروکہ یا کم‌آباد زمینوں پر آباد ہونے کے لیے آئے، انھیں چفتلک کی حیثیت سے یہ زمینیں قبضے میں رکھنے کی اجازت دے دی گئی ۔ یہ آبادکار عیسائی حکومتوں اور عیسائی بغاوت کرنے والوں سے سخت ناراض تھے اور اسی بات نے مسلمانوں اور عیسائیوں میں اور زیادہ اختلافات اور تفرقہ پیدا کیا ۔ نو آبادکاروں کی کچھ تعداد

شہروں میں آ گئی جن میں بیشتر تاجر، صنعت‌کار اور فوجی لوگ تھے۔

ایالت بوسنیا کے معرض خطر میں ہونے کے سبب مسلمان آبادی کو بڑی جانفشانی کرنا پڑتی تھی۔ پژاروک Požarevac کے صلح نامے (۱۱۳۰ھ / ۱۷۱۷-۱۷۱۸ء) کے تحت ساوہ کے جنوب میں ایک پٹی آسٹریا کے حوالے کر دی گئی تھی اور مغربی سرحد کے گرد و پیش کی کچھ علاقے بھی آسٹریا اور وینس کے قبضے میں چلے گئے تھے، مگر طاعون کی تباہ کاریوں، ساتھ ہی فصلوں کی خرابی کے تسلسل اور بھاری جانی نقصان کے باوجود، جو بوسنیا کے ''سپاہیوں'' کو اٹھانا پڑے تھے، حکیم اوغلو علی پاشا کی قیادت میں ایک بوسنیائی فوج نے ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء میں آسٹریا کی فوج کو بنالوقہ کے مقام پر فیصلہ کن شکست دی۔ معاہدۂ بلغراد (۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء) نے آسٹریا کو بجز قلعۂ قُربان کے باقی ان تمام علاقوں سے بے دخل کر دیا جو معاہدۂ پژاروک کی رو سے اس کے قبضے میں آ گئے تھے۔ ۔ ۔ ۔

بوسنیا کے صوبے دار (وزرا) دولت حاصل کرنے کی خاطر اور ان محصولات اور رشوتوں کے عوض جنھیں وہ یہ عہدہ حاصل کرنے کے لیے دیتے تھے صوبے میں نئے نئے محاصل یا رسوم و مواجب جاری کرتے یا ان کی شرحیں بڑھا کر اپنا تاوان وصول کر لیتے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ محصولات کی تاریخ ادائی سے چھے تا نو ماہ بیشتر ہی بارہا ان کی پیشگی ادائی کے طور پر کچھ سامان رکھوا لیا جاتا تھا۔ انھیں باتوں سے مشتعل ہو کر مفلوک‌الحال شہری اور مسلم کسان بارھویں صدی ہجری / اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب دس برس تک بغاوتیں اور شورشیں برپا کرتے رہے۔ ان حالات نے شہر اور مضافات دونوں کی تجارت پر یکساں مضر اثرات ڈالے اور ملک کی اقتصادی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بن گئے۔

آسٹریا اور ترکی کے درمیان جنگ (۱۷۸۸ء تا ۱۷۹۱ء) میں سرحدی اضلاع کی مدافعت کی ذمے داری بوسنیا کی افواج پر تھی۔ بعض سرحدی قلعوں پر قبضہ کرنے (۱۷۸۸ء تا ۱۷۹۱ء) کے سوا آسٹریا کی فوجوں کو بہت ہی کم کامیابیاں ہوئیں۔ سوِشتو Svishtov کے صلح نامے (۱۷۹۱ء) کی شرائط کے تحت ترکی اپنے علاقے کے ایک قلیل حصے سے دستبردار ہو گیا اور آسٹریا نے مفتوحہ قلعوں کو خالی کر دیا۔

تیرھویں صدی ہجری کے شروع / اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں سلطان سلیم ثالث نے زیادہ‌تر ینی‌چریوں کی قوت کو کچل دینے کے لیے مختلف تدابیر و اصلاحات کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ ان مجوّزہ اصلاحات کا منشا مسلم طبقۂ امرا کی جمی جمائی بنیادوں اور ان کے چھائے ہوئے اثر و نفوذ نیز بوسنیائی ایالت کے شہروں کی مسلم آبادی کی امتیازی حیثیت کے سراسر خلاف جاتا تھا۔

(ج) ترکی کا عہدِ اصلاحات اور بوسنیا میں بغاوتیں:

ترکی کی نئی اصلاحات نے بوسنیا کے مسلمانوں میں لازماً غصہ پیدا کیا اس لیے کہ وہ سپاہ عسکری نظام میں مداخلت کرتی تھیں، نیز وہ ینی‌چریوں اور 'سپاہی' فوج کے خلاف جاری کی گئی تھیں۔ سربیا میں شورش پسندوں کے خلاف کئی مہموں میں بوسنیا کے 'بے' آغا اور کثیرالتعداد شہری شامل ہوئے۔ تاہم بوسنیائی فوج کو میشر Mišar کے مقام پر ۱۸۰۶ء میں شکست ہوئی۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد بوسنیا میں سربی کسانوں نے کئی بار بغاوتیں کیں، لیکن

انھیں جلد ھی فرو کر دیا گیا۔ ھرزگووینا میں ''دروبنجکوں'' (Drobnjaks) کی بغاوت کو کاملاً فرو کرنے کے لیے مقابلۃً کہیں زیادہ سعی کرنا پڑی۔ بوسنیا کے مسلمانوں نے بھی ۱۸۱۳ء میں سربیا کی بغاوت فرو کرنے میں حصہ لیا۔

نپولین کی براعظم یورپ کی ناکابندی کے زمانے میں نقل و حمل کی تجارت ترقی کر گئی۔ اس عہد میں زیادہ‌تر بوسنیا کی سڑکیں روئی کی نقل و حمل کے لیے استعمال ھوتی تھیں۔ یہ کاروبار زیادہ‌تر سربی اور یہودی سوداگر کرتے تھے جو نتیجۃً خوب دولت‌مند ھو گئے۔ شہروں کے مسلم تاجر اپنی خوشحالی کے لیے مراعات اور حقوق خصوصی پر تکیہ کرتے تھے۔ سراجیوو نے، جو اھم‌ترین شہر تھا، وزرا (= صوبہ‌داروں) کے معاملے میں بہت حد تک آزادی حاصل کر لی تھی۔ وزرا اور شہریوں کے درمیان سنگین اختلافات و تنازعات کے واقعات اکثر و بیشتر رونما ھوتے رھتے تھے جو کبھی کبھی مسلح مقابلے کی صورت بھی اختیار کر لیتے تھے۔ ۱۸۲۰ء میں جلال الدین پاشا کے تقرر اور آمد کے بعد جانوں کی بہت سی قربانیوں کے بعد کہیں جا کر امن و امان بحال ھوا۔ ینی‌چریوں کی جماعت کا ختم کر دیا جانا عوام کی ایک اور بغاوت کا سبب ھو گیا، خصوصاً سراجیوو میں جسے عبدالرحمٰن پاشا نے فرو کیا۔ پھر بھی عام بے‌چینی اور اصلاحات کی مزاحمت برابر جاری رھی۔ ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء میں جب اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے اور فوج کی تشکیلِ نو کرنے کی کوششیں کی گئیں تو حسین قپودان گراداسچوچ Gradaščević [= کرادچک] کی قیادت میں بوسنیا کے مسلم امرا میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ باغی بوسنیا اور ھرزگووینا کی مکمل خوداختیاری اور اپنا وزیر آپ منتخب کرنے کے حق کا مطالبہ کرتے تھے۔ بوسنیا کو صرف سالانہ خراج سلطان کو ادا کرنا ھوتا۔ اگر یہ مطالبات تسلیم کر لیے جاتے تو اس سے امرا کے امتیازات اور موجودالوقت عسکری نظام کا تحفظ ھو جاتا، مگر لڑائی کے آغاز ھی سے ھرزگووینا کے ''قپودانوں'' نے علی آغا رضوان بگووچ کی قیادت میں اس تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی۔ حسین قپودان کی شاھی افواج پر فتح اور وزیراعظم کے ساتھ مفاھمت ھو جانے کے باوجود اس سردار کی (جو جمادی الاولی ۱۲۴۷ھ کے اوائل / ۸ تا ۱۱ اکتوبر ۱۸۳۱ء کو بطور وزیر منتخب ھوا) ذاتی ھوس جاہ اور بوسنیا کے رھنماؤں کی رقابتوں کی وجہ سے ابتدائی بڑی بڑی کامیابیاں بھی بہت جلد اکارت گئیں۔ یہ بغاوت (۱۸۳۲ء میں) فرو کر دی گئی اور علی پاشا موصوف کی حکومت میں ھرزگووینا کے ''پاشالق'' ھونے کا اعلان کر دیا گیا (۱۸۳۳ء)۔

شورش فرو کر دینے کے بعد موروثی قپودانی عہدہ (۱۸۳۵ء میں) ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ ''مُسَلّم لِق'' نے لے لی۔ بہت سے قدیم ''قپودان''، ''اعیان'' اور ''سپاھی'' بھی (اس طبقے کی منسوخی کے بعد) ''مسلّم'' مقرر ھو گئے اور انھیں سپہ سالاروں کی اسامیاں دے دی گئیں۔ عثمانی حکومت نے بوسنیا کے امرا اور خودسر شورش‌پسندوں کے ساتھ جس طریقے سے برتاؤ کیا وہ بظاھر تلطف آمیز، لیکن حقیقت میں سخت تھا۔ تاھم تنازعات پھر بھی جاری رھے، خصوصاً اھالیانِ سراجیوو اور وزرا کے درمیان۔ اس مزاحمت کو بالآخر عمر پاشا نے فرو کیا، جو پہلے آسٹریا کا ایک ماتحت فوجی سردار تھا۔ وہ لیکا (کروشیا) میں پیدا ھوا تھا۔ جب اسے ایک خاصی بڑی فوج کا سردار بنا کر اور خصوصی اختیارات دے کر بوسنیا بھیجا گیا (۱۸۵۰ تا ۱۸۵۲ء) تو وہ بوسنیا کے طبقۂ امرا کا سیاسی اثر و رسوخ زائل کرنے اور اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے میں

کامیاب ہو گیا۔ اس نے علی پاشا کو مروا ڈالا اور ہرزگووینا کی "پاشالق" منسوخ کر دی۔ بوسنیا چھے "قائم مقام لقوں" اور ہرزگووینا تین "قائم مقام لقوں" میں تقسیم کر دیا گیا۔ سراجیوو کا شہر "وزیر" کی سرکاری سکونت گاہ بن گیا۔

ان اصلاحات و اقدامات نے ملکی معاشیات کے بعض شعبوں کی ترقی میں مدد دی۔ تجارت اور کاروبار کو فروغ ہوا، لیکن منڈیوں کے فروغ سے پیشہ وروں کی "برادریاں" معرض خطر میں پڑ گئیں۔ بہت سے شہری سربی خاندان خوشحال ہو گئے اور اس کے نتیجے میں ان کا اثر و نفوذ دیہاتی اضلاع میں بھی محسوس ہونے لگا۔

تاہم اصلاحات اتنی وسعت و گیرائی نہیں رکھتی تھیں کہ زرعی نظام کی روح اور اس کے مسائل کو متاثر کر سکتیں۔

طاہر پاشا، وزیر بوسنیا نے (۱۸۴۸ء میں) زرعی مسئلے کے تصفیے کا بیڑا اٹھایا۔ اس کی نئی تجویز کے تحت مالکان "چفتلک" سالانہ فصل کا ایک تہائی وصول کرنے کے مجاز ٹھہرے۔ بیگار ختم کر دی گئی، بجز ہرزگووینا کے جہاں "کمت" (= کاشتکار) کو فصل کا ایک تہائی سے بڑی رقم دینا ہوتا تھا۔ ضلع سراجیوو میں چفتلک کے مالک بعض شرائط، مثلاً اپنے "کمت" کو بیج، بیل اور مکان مہیا کرنے کے پابند تھے۔ اب ان شرائط کا اطلاق بوسنیا کے تمام اضلاع پر ہونا قرار پایا۔ بایں ہمہ مالکان "چفتلک" ہر جگہ فصل کی ایک تہائی تو وصول کرنے لگے، لیکن بیگار لینے پر مصر رہے، اور وہ اپنی ذمے داریاں بھی پوری نہیں کرتے تھے۔ اس سے کسانوں میں بہت بے اطمینانی کا ظہور ہوا اور خود مالکان "چفتلک" بھی مطمئن نہ تھے۔ اس مسئلے کا قطعی تصفیہ ہو جانے سے پہلے کئی ناکام کوششیں کرنا پڑیں، تاآنکہ وہ زرعی قانون (رمضان ۱۲۷۵ھ کے دوران میں) منظور ہوا جس کا اجرا صفر ۱۲۷۶ھ / ستمبر ۱۸۵۹ء میں بذریعۂ فرمان کیا گیا اور جس کی رو سے "کمت" سے متعلق مروّجہ طریقوں ہی کو قانونی حیثیت دے دی گئی۔ پھر بھی محصولات اور دوسرے واجبات کے لیے کل بوسنیا اور ہرزگووینا میں کوئی یکساں اصول عائد کرنے کا قاعدہ نہیں بنایا گیا۔ جہاں تک زمین کے حقوقِ کاشت کاری کا تعلق ہے مذکورۂ بالا قواعد ۱۹۱۸ء تک نافذ رہے۔

ان غیر تسلی بخش حالات سے، انیسویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب کسانوں کی شورشوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۸۷۵ء کی بڑی بغاوت میں جوق در جوق عیسائی کسانوں کے ساتھ "آغاؤں" اور "بیگوں" کے کاشتکار بھی شریک ہو گئے، اور جب سربیوں کی شہری آبادی نے بھی حصہ لیا تو خاص طور پر سربیا اور مونٹے نگرو کے ترکی کے خلاف جنگ میں شامل ہو جانے کے بعد اس شورش کو سیاسی رنگ دے دیا گیا۔ یہ سچ ہے کہ ہرزگووینا میں بغاوت عامۃ الناس نے اٹھائی تھی، لیکن بوسنیا میں صرف سرحدی علاقے ہی اس میں شامل تھے۔ اس بغاوت کے موقع پر دولِ یورپ نے مداخلت کی۔ سان سٹفانو San Stefano کے معاہدے میں یہ بات واضح طور پر قرار پائی کہ ترکی بوسنیا اور ہرزگووینا کو حکومتِ خود اختیاری عطا کرے گا۔

مؤتمر برلن کی شرائط کے تحت بوسنیا اور ہرزگووینا کو آسٹریا۔ ہنگری کی امانت میں دے دیا گیا۔ آسٹریا۔ ہنگری کی جن افواج کو ملک پر قبضہ جمانے کے لیے بھیجا گیا تھا ان کا غیر متوقع طور پر بوسنیا کے مسلمانوں نے مقابلہ کیا۔ ان باغیوں کی قیادت ادنیٰ طبقات کے افراد کر رہے تھے، کیونکہ ممتاز بوسنیائی ترکی حکام اور فوج کے

واپس چلے جانے کے بعد ترقی میں حصہ لینے پر رضامند نہ تھے؛ چنانچہ انھوں عوامی سرگروہوں نے حملہ آوروں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے اور سراجیوو میں عوام کی حکومت قائم کرنے پر لوگوں کو آکسایا تھا۔ یہ قبضہ ۲۹ جولائی کو شروع ہوا اور ۲۰ اکتوبر ۱۸۷۸ء کو مکمل ہوا۔ بعض مقامات پر خصوصاً سراجیوو کے شہر اور گرد و نواح میں جو سخت مزاحمت کی گئی اس کا قلع قمع کرنے کے لیے بہت سخت قسم کی تدابیر اختیار کی گئیں۔

مآخذ: بوسنا اور ہرزگووینا میں ترکی عہدِ حکومت کے متعلّق تواریخی مطالعات بہت ہی غیرمکمل ہیں، گو حال ہی میں بہت ترقی ہوئی ہے۔ اس عہد پر روشنی ڈالنے والا بہت سا متعلقہ تاریخی مواد ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اس مواد کی فراہمی و تصحیح کا کام اورینٹل انسٹی ٹیوٹ سراجیوو کے ذمّے ہے۔ اس عہد کے ابتدائی حصّے کے خصوصی اہمیّت رکھنے والے ترکی دفاتر مساحت (مع ''قانون نامے'') استانبول میں باش وکالت آرشیوی میں رکھے ہیں۔ ''وقف نامے'' (جن پر F. Spaho، H. Kerševljaković، G. Elezović، Š. Sabanović اور دوسروں کی رودادیں درج ہیں) نیز سترھویں صدی کے ''قاضی سجلّ'' مع جزوی یادداشتوں کے از سولھویں صدی عیسوی اور سرکاری یادداشتیں اہم ہیں (اورینٹل انسٹی ٹیوٹ خسرو بے لائبریری وغیرہ)۔ بوسنا کی ''ولایت'' کی بعض سرکاری یادداشتیں (انیسویں صدی عیسوی کے وسط سے) سراجیوو کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ ہیں۔ بعد کے زمانے کی قابل قدر معلومات غیر مطبوعہ وقائع بعنوان تاریخ دیار بوسنہ مرتبۂ صالح صدقی افندی حاجی حسنووچ Hadžihusejnović میں پائی جاتی ہیں، جو مُوَقّت کے نام سے معروف تھا۔ یہ کتاب انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں لکھی گئی تھی اور اس کا قلمی نسخہ سراجیوو کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ ہے۔

مآخذ کے زیادہ اہم مجموعے حسب ذیل ہیں: (۱) C. Truhelka: *Tursko-slovjenski spomenici dubrovačke arhive*، Glasnik Zem. muzeja Bosnia and Herzegovina، ۱۹۱۱ء؛ (۲) H. Šabanović: *Najstarije vakufname u Bosni*، *Prilozi za orijentalnu filologiju*، جلد دوم (۱۹۵۱ء)، جلد سوم و چہارم (۱۹۵۲ء)؛ (۳) *Monumenta Turcica historiam Slavorum Mer. illustrantia, I, Kanuni i Kanunname*، جلد ۱ (طبع اورینٹل انسٹی ٹیوٹ سراجیوو)، سراجیوو ۱۹۵۷ء؛ (۴) J. Matasović: *Fojnička regesta Spomenik Srpske Akademije Nauka*، جلد ۹۲ (۱۹۳۰ء)؛ (۵) بوسنا میں دریافت ہونے والے مشرقی زبانوں میں کتبے طبع از M. Mujezinović، در *Prilozi za orijentalnu filologiju*، ج ۲، ۱۹۵۱ء، جلد ۳، ۴ (۱۹۵۲ - ۱۹۵۳ء) وغیرہ۔ اہم سفرناموں میں سے جو قابل قدر معلومات اور اعداد و شمار (سترھویں صدی عیسوی سے) کے حامل ہیں وہ ہیں جو Kuripešić (۱۵۳۰ء) اور اولیا چلبی کے لکھے ہوئے ہیں۔ وہ مآخذ جن کا تعلّق ۱۸۷۵ء کی بغاوت کے آغاز سے ہے انھیں H. Hadžibegić نے شائع کیا ہے: *Turski dokumenti o početku ustanka u Hercegovini i Bosni 1875*، *Prilozi za orijentalnu filologiju*، ج ۱ (۱۹۵۰ء)۔

بوسنا کی عام تواریخ: (۱) S. Bašagić: *Kratka uputa u prošlost Bosne i Hercegovine*، سراجیوو ۱۹۰۰ء؛ (۲) M. Prelog: *Povijest Bosne u doba osmanlijske vlade*، ج ۱ - ۲، سراجیوو ۱۹۱۲ - ۱۹۱۳ء، دونوں ہی تاریخی اعتبار سے پرانی ہوچکی ہیں؛ (۳) V. Ćorović: *Historija Bosne*، بلغراد ۱۹۴۰ء (فقط پہلی فصل ہی ۱۴۶۳ء تک شائع ہوئی ہے)؛ (۴) *Istorija naroda Jugoslavije*، بلغراد ۱۹۵۳ء، ص ۵۱۳ تا ۵۷۲ (نیز ۱۸۷۸ء تک)؛ (۵) ترکی حکومت کے

تحت بوسنیا اور ہرزگووینا کی تاریخ کا مجمل بیان اس
کتاب میں پایا جاتا ہے : Istorija naroda Jugoslavije،
جزء ۲ (مطبوعہ نسخے موجود ہیں)، پندرھویں، سولھویں،
سترھویں صدی عیسوی کا مؤلف N. Filipović، اٹھارھویں
صدی عیسوی کا مؤلف H. Kreševljaković اور تاریخ
ثقافت کا مؤلف H. Šabanović ہے۔ ترکی زبان کا غیر
مطبوعہ تاریخی مواد استعمال کیا گیا ہے، خصوصاً دفاتر
ساحت کا؛ نیز مآخذ اور کتابیات کے حوالے دیے گئے
ہیں۔ مخصوص موضوع کی کتابیں اور رسالے : (۱)
Pitanje turske vlasti u Bosni do : H. Sabanović
pohoda Mehmeda II 1463 god ; Godišnjak : Ist.
društva Bosne i Hercegovine vii (1956)؛ (۲) وہی
Bosanski pašaluk do kraja XVII : مصنّف
vijeka postanak i upravna podjela (تحقیقی مقالہ،
Kapetanije u Bosni : H. Kreševljaković (۳)؛ (زیر طبع
i Hercegovini، سراجیوو ۱۹۰۵ء؛ (۴) M. Handžić :
Pogled na sudstvo u Bosni i Hercegovini za vrijeme
turske vlasti، سراجیوو ۱۹۳۰ء؛ (۵) Ć. Truhelka :
Historička podloga agrarnog pitanja u Bosni،
V. (۶) ؛(۱۹۱۵ء) Glasnik Zem. muzeja xvij
Porijeklo muslimanskog plemstva u Bosni : Čubrilović،
časopis اول Jug. ،(۱۹۳۵ء)؛ (۷) M. Handžić :
Islamizacija Bosne i Hercegovine i porijeklo
bosanskohercegovačkih muslimana، سراجیوو ۱۹۴۰ء؛
Nestanak bogumilstva i islamizacija : A. Solovjev (۸)
društva Bosne i Hercegovine ; Bosna، جلد ۱، ۱۹۴۹ء؛
Pogled na osmanski feudalizam : N. Filipović (۹)
(s posebnim obzirom na agrarne odnose) Godišnjak
Ist. društva Bosne i Hercegovine، ج ۴، ۱۹۵۲ء؛ (۱۰)
O vojnucima sa osvrtom na razvoj : B. Djurdjev
turskog feudalizma i na pitanje bosanskog agaluka،
Glasnik Zem. muzeja، ج ۲، ۱۹۴۷ء؛ (۱۱) N. Filipović :

Prilozi در ،Odžakluk timari u Bosni i Hercegovini
za orijentalnu filologiju، ج ۵ (۱۹۵۴-۱۹۵۵ء)؛
Gradska privreda i esnafi : H. Kreševljaković (۱۲)
u Bosni i Hercegovini, Godišnjak Ist. društva Bosne
i Hercegovine (۱۹۴۹ء)؛ (۱۳) Stara : V. Skarić
rudarsko pravo i tehnika u Srbiji i Bosni، بلغراد
Sarajevo i njegova okolina : V. Skarić (۱۴) ؛۱۹۳۹ء
od najstarijih vremena do austro-ugarske okupacije،
سراجیوو ۱۹۳۷ء؛ (۱۵) Bosanski name : A. Handžić
Prilozi za orijentalnu در ،jesnik Hekimoglu Ali-paša
filologiju، جلد ۵ (۱۹۵۴-۱۹۵۵ء)؛ (۱۶) F. Spaho :
Pobuna u tuzlanskom srezu polovicom osamnaestog
vijeka، در Glasnik zem. muzeja، ج ۳۴ (۱۹۲۲ء)؛
Bosanski namjesnik Mehmedpaša : A. Bejtić (۱۷)
Kukavica i njegove zadužbine u Bosni (۱۷۵۲ تا
۱۷۵۶ء، ۱۷۵۷ تا ۱۷۶۰ء)، در Prilozi za orijentalnu
filologiju، ج ۶ و ۷ (۱۹۵۶-۱۹۵۷ء)؛ (۱۸)
Iz prošlosti Bosne i Hercegovine XIX : V. Skarić
vijeka، در Godišnjak Ist. društva Bosne i Hercego-
vine، ج ۱ (۱۹۴۹ء)؛ (۱۹) Die letzten : L. Ranke
Unruhen in Bosnien 1820-1832، در Histpolitische
Zeitschrift، ج ۲ (۱۹۳۵ء)؛ (۲۰) V. Popović :
Agrarno pitanje u Bosni i Hercegovini، turski neredi
za vreme reforme Abdul-Medžida (۱۸۳۹ تا
۱۸۶۱ء)، بلغراد ۱۹۳۹ء؛ (۲۱) J. Koetschet :
Erinnerungen aus dem Leben des Serdar Ekrem
Omer Pascha، سراجیوو ۱۸۸۵ء؛ (۲۲) J. Koetschet :
Osman pascha der letzte grosse Wesir Bosniens und
seine Nachfolger، سراجیوو ۱۹۰۹ء؛ (۲۳) V.
Hercegovački ustanak 1875-1878 : Čubrilović، بلغراد
۱۹۳۰ء۔

۳۔ بوسنیا اور ہرزگووینا میں اسلامی

ثقافت:

ترکی فتح کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بوسنیا اور هرزگووینا کی آبادی کا ایک حصہ مشرف باسلام ہو گیا اور اسلامیت نے پورے ملک کی طرز زندگی اور ثقافت پر اپنا نقش ثبت کر دیا۔ بوسنیا اور هرزگووینا میں مسلمانوں کی قومی اور نجی دونوں قسم کی طرزِ زندگی ترکی حکومت کے عہد میں خصوصاً شہروں میں بہت حد تک ویسی ہی ہو گئی جیسی کہ سلطنت عثمانیہ کے دوسرے صوبوں میں تھی۔ ان ولایات میں اسلامی ثقافت کا فروغ شہری آبادیوں کی بدولت ہوا۔ اس لیے کہ اس ثقافت کے واضح خد و خال اپنی خصائص و حدود کے اعتبار سے زیادہ‌تر شہری تھے، اگرچہ مسلمان کسانوں کی طرزِ زندگی میں خود ان کی بعض واضح خصوصیات بھی تھیں۔ یورپ کی تقلید کی وجہ سے بلاشبہہ مشرقی ثقافت کے عناصر — خصوصاً عیسائیوں میں — ترکوں کے عہد کے بعد زائل ہونے لگے تھے اور جب یہ ملک یوگوسلاویا کا ایک حصہ بن گیا تو پھر وہ افزوں طور پر زائل ہونے لگے۔ بایں ہمہ مشرقی ثقافت کے خصوصی عناصر آج تک بھی معدوم نہیں ہوئے۔ مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ عیسائی آبادی تک میں بھی وہ نابید نہیں ہوئے۔ مشرقی طریق زندگی کے بہت سے خد و خال، مثلاً رہن سہن، گھر کے ساز و سامان، کھانا پکانے، کھانے پینے کی عادات اور بعض پرانی رسموں میں ابھی تک نظر آتے ہیں۔ زرگری، قالین بافی اور عملی صنعت و حرفت کی دوسری بہت سی انواع میں مشرقی طریقے ابھی تک اکثر مستعمل ہیں۔

اسلامی ثقافت کے اثر و نفوذ کے سب سے زیادہ دیر پا نقوش فنِ تعمیر اور شہری منصوبہ بندی کے میدان میں پائے جاتے ہیں۔ مشرقی شہروں کے نقشے کے بعض اصولوں کا اطلاق اس لیے بلا دقت ہوا کہ جگہ جگہ بلند سطح کے قطعات موجود تھے۔ بوسنیا کے بہت سے شہر اب بھی سابقہ خاص طرز کے نقشے کی نشاندہی کرتے ہیں جن میں دو حصے ہوتے تھے، یعنی "چارشو" (کاروباری یا تجارتی مرکز) اور "محلے" (سکنی محلّے)۔

ترکی حکومت کے زمانے کی شہری منصوبہ‌بندی اور عام تعمیر کے تین مراحل قرار دیے جا سکتے ہیں: (الف) ابتدائی عہد تقریباً سولھویں صدی عیسوی کے اختتام تک، (ب) دوسرا عہد، سترھویں صدی کے اختتام تک اور (ج) تیسرا عہد، بوسنیا اور هرزگووینا میں ترکی حکومت کے اختتام تک۔ مسلم شہری آبادیوں کے ابتدائی نشو و نما کے عہد میں یہ صدر، والی اور ترک عمائد تھے جنھوں نے وہ عبادت‌گاہیں اور سرکاری عمارات بنوائیں جو یادگاری تعمیرات کی نمائندہ مثالیں تھیں۔ اسی عہد سے بوسنیا اور هرزگووینا میں فنِّ تعمیر کی اسلامی طرز کی نفیس‌ترین یادگاروں کا آغاز ہوتا ہے، مثلاً فوچہ Foča کی مسجدِ اَلَدْژَہ (۱۵۵۰ء)، مسجد غازی خسرو بے (۱۵۳۰ء)، سراجیوو کی مسجد علی پاشا (۱۵۶۱ء)، بنالوقہ کی مسجد فرہاد پاشا (۱۵۷۹ء)، مدرسۂ غازی خسرو بے (۱۵۳۷ء)، جو سِلْژُکیہ Seldzukija اور بعد میں کُرشُملیجہ موسوم ہوا، مع حمّام غازی خسرو بے (قبل ۱۵۳۷ء) اور سراجیوو کا برسہ بِزِستان [مسقّف بازار] (۱۵۵۱ء)، نیز بہت سی اور یادگاریں۔ عہدِ ثانی میں اہل حرفہ کی برادریوں کے قیام اور تیز رفتار ترقی کے باعث یہ زیادہ‌تر دکاندار اور سوداگر تھے جنھوں نے تعمیراتِ عامّہ کی ذمے داری لی۔ اس عہد سے تعلق رکھنے والی مثالیں ظاہری صورت میں نسبۃً کم عالی شان ہیں، بجز معدودے چند عمارتوں کے جن کی تعمیر صدر، والیوں یا بعض عالی مرتبت ترکی عمائد کے ہاتھوں ہوئی ہے، مثلاً سراجیوو کا تکیۂ حاجی سنان (۱۶۴۰ء)۔ تیسرے

عہد کے فن تعمیر سے تنزّل کے آثار اور بعد کے زمانے میں وہ یورپی اثرات اور ان طرزوں کی نقّالی نمایاں ہے جو ترکی کے شہروں میں رواج پا گئی تھیں۔ بلا واسطہ اثر و نفوذ کی بعض علامات بھی موجود ہیں۔ تاہم اس عہد نے نئی جدّت کی بہت سی دلچسپ مثالیں پیش کی ہیں۔ وزیر کی سرکاری جاے سکونت ہو جانے کی حیثیت سے شہر تراونک Travnik کی نشو و نما اس عہد کی خصوصیت کی آئینہ دار ہے۔ مسجد سلیمانیہ (موجودہ عمارت کی تاریخ تعمیر ۱۸۱۶ء ہے) ایک ''پرستان'' کے اوپر تعمیر ہوئی۔ اس عہد میں متعدد قدیم مساجد کی مرمت کر کے انہیں دوبارہ اصل حالت پر لایا گیا۔ عالی شان تعمیراتِ عامّہ کی ساخت میں مسلمان ماہرینِ تعمیر نے ترکی صنّاعی کے بنیادی عناصر کی نمائش کی ہے، اگرچہ اس کی تمام اوضاع اور خصوصیات کا اظہار بوسنیا اور ہرزگووینا میں نہیں ہوا۔ چھوٹی مسجدوں اور وقف کی عمارات نیز سکنی مکانوں کو مقامی ماہر فن معمار بناتے تھے، لہٰذا ان عمارات میں فنّ تعمیر کی بعض انفرادی [مقامی] خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ترکی حکومت کے بعد کے زمانے میں اسلامی فنّ تعمیر میں صریحی انحطاط کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آسٹریا-ہنگری کی حکومتوں نے مغربی عربی (Moorish) طرز کی نقل کر کے اسلامی فن تعمیر کی خصوصیات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اس طرز کی عمارات بوسنیا اور ہرزگووینا میں اسلامی فن تعمیر کے ابتدائی نمونوں اور آسٹریا کی حکومت کے آخری زمانے کے نمونوں دونوں سے الگ نظر آتی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ نہ تو بوسنیا کے اندرونی علاقوں کے مناظر سے ہم آہنگ ہیں اور نہ آب و ہوا کے لحاظ سے موزوں ہیں۔ غرض مذکورہ طرز کی عمارات ناکام ثابت ہوئیں۔ اس طرز کی سب سے بڑھ کر نمائندہ مثال سراجیوو کا ایوانِ بلدیہ ہے۔ بوسنیا اور ہرزگووینا کا طرز تعمیر جہاں تک اس کا اطلاق سکنی مکانوں پر ہوتا ہے بالکل مفقود ہو جانے سے پہلے کچھ مزید مدّت تک قائم رہا۔

ترکی، عربی اور فارسی اصل کے الفاظ و محاورات کی بہت بڑی تعداد بوسنیا اور ہرزگووینا میں روزمرّہ کے استعمال میں ہے اور بہ نسبت دوسرے علاقوں کے جہاں سربی کروٹ بولی جاتی ہے اس خطّے میں زیادہ رائج ہیں؛ ابتدائی ادبی اسلوب میں بھی ان مستعار الفاظ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا، مگر جب سے معیاری سربی کروٹ زبان کو ترقی ہوئی اور اس کے اثرات پھیلے، یعنی ۱۸۷۸ء سے اور زیادہ تر ۱۹۱۸ء سے، تب سے یہ ترکی الاصل الفاظ اور جملے روز بروز متروک ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ترکی حکومت کے دوران میں بوسنیا اور ہرزگووینا کے مسلمانوں (خصوصاً مقامی مسلم امرا کے درمیان، نجی خط و کتابت میں ایک شکستہ سریلی (Cyrillic، قدیم سلاوی خط جو سینٹ سرل سے منسوب ہے) رسمِ خط رائج تھا۔ سربی کروٹ زبان کی ادبی کتابوں میں، جنہیں بوسنیا اور ہرزگووینا کے مسلمان تیار کرتے تھے، عربی حروف استعمال ہوتے تھے۔ بعض سربی کروٹ مذہبی درسی کتب میں بھی، جو آسٹریا کے دور میں اور قبل جنگ یوگوسلاویا کے عہدِ حکومت میں لکھی گئیں، یہی عربی رسم خط استعمال میں رہا۔ ان حروف میں چھپی ہوئی کتابیں ابھی تک دستیاب ہوتی ہیں۔ الفاظ کے ہجے شروع شروع میں تو من مانے رہے، مگر رفتہ رفتہ ان کے مسلّم قواعد بن گئے۔ بایں ہمہ ۱۹۱۰ء سے یہ عربی حروف مذہبی درسی کتب میں بھی شاید ہی کبھی استعمال ہوے ہوں۔

بوسنیا یا ہرزگووینا کے مسلمانوں کی سربی کروٹ یا مشرقی زبانوں میں ادبی تصانیف کا جامع مطالعہ ابھی تک نہیں کیا گیا۔

عوامی گیتوں اور عام پسند شاعری کے ذوق شوق میں بوسنیا اور ہرزگووینا کے مسلمانوں میں اپنے ہم‌وطن عیسائیوں سے بہت ہی کم فرق تھا۔ بوسنیا اور ہرزگووینا کے ''گسلروں'' (guslars) کی قدیم رزمیّہ تبالغات سربی۔ کروٹ رزمیہ نظموں کی تمام بنیادی خصوصیّات کی حامل ہیں۔ ان میں اختلاف ہے تو محض مختلف مذہبی اور سیاسی انداز فکر کا، یا ترکی محاوروں کے نسبۃً بکثرت استعمال کا یا بڑی رزمیہ نظموں سے ہٹ کر قطعات یا چوبولوں (ballads) کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔ ''حسن آغینچہ'' Hasanaginica ایک مقبول بوسنیائی نظم دنیائے ادب میں بہت معروف ہے۔ ابتدائی قسم کی عوامی رزمیہ نظمیں بوسنیا اور ہرزگووینا کے جنوب میں محفوظ ہیں۔ بعد کی مسلم رزمیہ نظم کی ایک صنف مغربی سرحدی ضلع کے لوگوں میں تیار ہوئی جسے ''کرجینہ'' Krajina کہتے ہیں۔ ایسی نظموں کو ''تمبوریجہ'' (چھوٹا طنبورہ، Mandolin) کی سنگت میں ترنّم سے پڑھا جاتا تھا اور وہ ''گسلروں'' (guslars) کی عام پسند نظموں سے کئی لحاظ سے مختلف ہوتی تھیں۔ بوسنیا اور ہرزگووینا کے مسلمانوں کی عوامی عشقیہ شاعری کا جب ان کے ہم‌وطنوں کی اس صنف کے ساتھ تقابل کریں تو وہ بھی بلکہ دوسری اصناف سے بڑھکر اپنی جداگانہ خصوصیات کے متعدّد پہلو رکھتی ہیں۔ ان میں سب سے معروف اور مقبول عام عشقیہ نظمیں وہ ہیں جنھیں سِودالنکہ sevdalinkas کہتے ہیں۔ زبان، بنیادی موضوعات اور موسیقیت کے مشرقی اثرات سے قطع نظر، جو ان تالیف میں ہویدا ہیں، وہ صحیح معنوں میں بوسنیا اور ہرزگووینا کے مسلمانوں کی مخصوص نظمیں ہیں اور سارے یوگوسلاویا میں پسند کی جاتی ہیں اور ان سے لطف اٹھایا جاتا ہے۔

ان مطالعات کے نتائج سے جو اب تک شائع ہو چکے ہیں اندازہ کریں تو کہا جا سکتا ہے کہ بوسنیا اور ہرزگووینا کے جن مسلم شعرا نے مشرقی زبانوں میں طبع آزمائی کی انھوں نے زیادہ‌تر ترکی میں، اس سے کم فارسی میں اور بہت ہی کم عربی میں لکھا ہے۔ ترکی زبان کے مصنّفین میں سے کئی بوسنیا کے باشندے تھے اور ان میں سے بعض ممتاز شعرا گزرے ہیں، مثلاً درویش پاشا بن بایزید آغا (۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء میں قتل ہوا)، جو موستر Mostar (ہرزگووینا) میں پیدا ہوا تھا، اور مشہور و معروف صاحب طرز شاعر ہے، محمد نرگسی (م ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء)، جس کی ولادت سراجیوو کی تھی۔ صرف یہی نہیں کہ یہ دونوں بوسنیا اور ہرزگووینا میں پیدا ہوے، بلکہ وہ مدّت مدید تک وہاں عہدوں پر متمکن بھی رہے ــــ درویش پاشا، بوسنیا کے پاشا کی حیثیت سے اور محمد نرگسی مدرّس اور قاضی کی حیثیت سے۔ اسی طرح احمد سودی بوسنوی الاصل (م ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶-۱۵۹۷ء) ایرانی ادب عالیہ کا مشہور شارح تھا [اس نے مثنوی مولانا رومی کی شرح لکھی ہے]۔ فارسی زبان کے بہت ہی پرگو شاعروں میں سے ایک موستر کا شیخ لوزی (م تقریباً ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء) ہے، جو ترکی میں بھی شعر کہتا تھا۔ احمد وحدتی (م ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۸-۱۵۹۹ء) جو وشگراڈ کے قریب ڈبرون Dobrun کا رہنے والا تھا، . . . سراجیوو کا حسن قائمی (م ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱-۱۶۹۲ء) اور اُسکوفی بوسنوی، جسے ہوائی بھی کہتے ہیں (م تقریباً ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۰-۱۶۵۱ء)، جو تزلہ دنجہ Tuzla Donja میں پیدا ہوا، نیز متعدّد بوسنوی اور ہرزگوینی شعرا ترکی اور سربی۔ کروٹ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اسکوفی بوسنوی نے ترکی نظم میں سربی۔ کروٹ زبان

کی نعت تک ہی تھی۔ تیرھویں و چودھویں صدی ھجری/انیسویں و بیسویں صدی عیسوی میں زمانۂ حال تک متعدد شاعر ھوئے ھیں جنھوں نے ایسی مذھبی نظمیں لکھیں، جن میں دیرینہ روایات کی روح پائی جاتی ھے۔ اس طرز کی شاعری میں قابل لحاظ وہ نعتیہ نظمیں ھیں جو میلادِ نبی (حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی صفت و ثنا میں لکھی گئی ھیں؛ ورنہ ابتدائی عہد کی ایسی نظمیں محض تراجم ھوتے تھے جن میں ترکی اصل کی نقّالی کی جاتی تھی، اگرچہ آگے چل کر بعض طبعزاد تخلیقات بھی معرضِ ظہور میں آئیں۔

بوسنیا اور ھرزگووینا کے مسلمان اھل قلم کی تذبیہ نثر زیادہ‌تر عربی میں تھی اور یہ کتابیں بڑی تعداد میں دینیات کے مضامین، شرعی قوانین، نظم و نسق حکومت اور تاریخ سے تعلق رکھتی ھیں۔ ان مصنّفوں میں بہت سے اگرچہ بوسنیا اور ھرزگووینا کے باشندے تھے تاھم استانبول اور سلطنتِ عثمانیہ کے دیگر حصّوں میں رھتے اور کام کرتے تھے، مثال کے طور پر عبداللہ بوسنوی (م ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء) فلسفۂ تصوّف پر رسالوں کا مصنّف اور ابن العربی کی فصوص الحکم کا شارح، حسن کافی جو فقہ اور سیاسیات پر ایک ممتاز مصنّف تھا، پروسک (آق حصار Akhisar) میں پیدا ھوا اور اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے آبائی وطن ھی میں اسے عمر بھر کے لیے "قاضیلک" کا منصب (عہدۂ قضا) حاصل ھوا اور وھیں اس نے ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں وفات پائی۔ وہ اپنی دوسری تصنیفوں کے علاوہ مشہور و معروف کتاب نظام العالم کا مصنّف بھی تھا۔ ایسے چالیس کے قریب مصنّفوں کا نام لیا جا سکتا ھے جو بوسنیا اور ھرزگووینا کے عہدِ علمی میں مذھبی اور فقہی مطالعات کے میدان میں سرگرم عمل تھے۔ ترکی مؤرخوں کی ایک خاصی تعداد بوسنوی مسلم خاندانوں کی اولاد سے ھوئی ھے (مثلاً ابراھیم پیچوی)، لیکن خود بوسنیا اور ھرزگووینا میں ترکی زبان میں تاریخ نویسی بعد کے زمانے کی پیداوار ھے۔ بارھویں صدی ھجری / اٹھارھویں صدی عیسوی کا ایک ممتاز بوسنوی تاریخ نویس، جو ترکی میں لکھتا ھے، قاضی عمر نوی تھا جو غزوات حکیم اوغلو علی پاشا کا مصنّف ھے۔ یہ کتاب بوسنیا میں از اوائل محرّم ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء تا اواخر جمادی الاولٰی ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء کے تاریخی واقعات سے بحث کرتی ھے۔ اس کتاب کی پہلی طباعت ابراھیم متفرقہ کے ھاتھوں ھوئی۔ بعد ازاں دوبارہ طبع ھوئی اور اس کا ترجمہ انگریزی اور جرمن میں ھوا۔ بارھویں صدی ھجری / اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر اور تیرھویں صدی ھجری/انیسویں صدی عیسوی کے اوائل کے چند ممتاز وقائع نویسوں (مصطفٰے باش اسکی صالح صدقی) کے نام محفوظ ھیں، جنھوں نے اپنے عہد کے واقعات قلمبند کیے۔ ان مؤرخوں میں جنھوں نے ترکی حکومت کے متأخر عہد اور ملک پر آسٹریا کے قابض ھو جانے کے بعد کے حالات لکھے ھیں مندرجۂ ذیل ھیں: صالح صدقی افندی حاجی حسینوچ Hadzihusejnovic (م ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۷ - ۱۸۸۸ء)، محمد انوری کَنچ (۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۴ - ۱۸۵۵ء تا ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ - ۱۹۳۱ء) تاریخی مواد کا جامع جس کی اس نے اپنے ھاتھ سے کتابت کی (۲۸ جلدیں، مخطوطے کا ایک نسخہ غازی خسرو لائبریری سراجیوو میں رکھا ھوا ھے)۔ دیرینہ وقائع‌نویسی کے فن میں عبوری تبدیلی شیخ سیف الدّین افندی کیمورہ (م ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۷ء) کی تصنیفات میں نمایاں ھے۔ اسی طرح ابتدائی اسلامی علوم کی بعض خصوصیات اور ابتدائی وقائع نویسوں کے بعض تصوّرات ڈاکٹر صفوت بے باش آغچ (۱۸۷۰ تا ۱۹۳۴ء) کی تصنیفات میں بھی ھویدا ھیں، جو

ترکی عہد کا پہلا جدید مؤرّخ اور بوسنیا و ہرزگووینا کا پہلا مستشرق عالم اور شاعر بھی تھا۔ بایں ہمہ افسانوی (romantic) مکتب سے قطع نظر، جو ابھی تک پرانے مسلکوں کا دامن تھامے ہوئے ہے (ڈاکٹر صفوت باشی آغچ اس کا ممتاز نمائندہ ہے)۔ سنہ ۱۸۷۸ء اور خصوصیت سے ۱۹۰۸ء کے بعد سے بوسنوی مسلمانوں کی ادبی سرگرمیوں کا رجحان زیادہ سے زیادہ سرب اور کروٹ ادبیات میں مدغم ہو جانے کی طرف رہا ہے۔ اے۔ ایف۔ دزابچ Dzabić (م ۱۹۱۸ء)، مفتی موستر اور مذہبی آزادی کے مجاہد نے ترکی میں عربی زبان و ادبیات کے استاد کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ نیز اس نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے معاصرین کی منتخب نظموں کا مجموعہ بھی شائع کیا۔

بوسنیا اور ہرزگووینا میں اسلامی تعلیم و ثقافت کے گہوارے دوسرے ترکی صوبوں کی طرح "مکتب"، "مدرسے" اور مذہبی ادارے (مسجدیں، "تکیے" وغیرہ) ہوا کرتے تھے۔ عام دستور یہ تھا کہ ہر مسجد سے ملحق ابتدائی تعلیم کے مکاتب قائم ہوتے، جن میں قرآن مجید کی تعلیم، نوشت و خواند اور مذہب کے ضروری مبادی پڑھائے جاتے تھے۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی درس گاہیں "مدرسہ" کہلاتی تھیں اور وہ بھی ترکی نمونے کے مطابق قائم کی گئی تھیں۔ سراجیوو میں قدیم ترین "مدرسہ" کی تاریخِ بناء، جس کی تحریری شہادت محفوظ ہے، دسویں صدی ہجری کے ربع اول / سولھویں صدی عیسوی کے آغاز سے تعلق رکھتی ہے۔ ۹۴۳ھ / ۱۵۳۶ - ۱۵۳۷ء کے "وقف نامے" کی رو سے غازی خسرو بے مدرسے کی اس کے کتب خانے سمیت، بوسنیا کے سنجاق بے نے بنیاد رکھی تھی۔ اس کی عمارت دوسرے برس پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور ابھی تک مسجدِ خسرو بے حرم کے داخلے کے دروازے کے بالمقابل کھڑی ہے۔ مدرسے کے کتب خانے آگے چل کر غازی خسرو بے کے وقف کا ایک مستقل رفاہی ادارہ بنا دیا گیا تھا اور اسی وقف نے اس حدودِ عمل کو وسیع کرنے میں مدد دی۔ اس موجودہ اثاثے کی فہرست میں مشرقی زبانوں کی کتابیں، جو ابتدائی ذخیرے میں تھیں اور مزید برآں بعد کے جمع کردہ نسخوں کی کثیر تعداد اور وہ مخطوطات اور ترکی دستاویزات ہیں جنھیں اوقاف، مدارس اور نجی کتاب خانوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ مدارس کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ پھر بھی ان میں سب سے مشہور مدرسۂ غازی خسرو بے رہا، جس سے اب مضامین دینیات کی تعلیم کے لیے ثانوی درس گاہ کا کام لیا جاتا ہے۔ کئی درویشی سلسلے تصوّف کی تعلیم میں اور فارسی زبان کے مطالعات میں مصروفِ کار تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلا درویشی "تکیہ" بوسنیا کے آخری سقوط سے پہلے بنا تھا۔ غازی خسرو بے کی تعمیر کردہ "خانقاہ" میں بعض لائق ملاحظہ عمارتی جزئیات ہیں۔ اس کی نگہداشت اور مذہبی اور عام تعلیم کے اخراجات "وقف" سے ادا ہوتے تھے۔

سرکاری طور پر دی جانے والی تعلیم کی عام ترقی اور تعلیمی عمارتوں کی ابتدا طوپال عثمان پاشا کی وزارت (= صوبیداری کے زمانے) سے ہوتی ہے جب اس نے پہلا "رشدیہ" اور "مکتبِ حقوق" (انتظامی قانونی مدرسہ) قائم کیے، جن کے بعد عام دارالمطالعے کی بزم اور دفترِ طباعت کا افتتاح ہوا۔ تعلیمی قانون (۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء) کی دفعات کے تحت تعلیمی ملازمتوں اور مدارس کی نگرانی و کفالت حکومت کے ذمے ہوتی تھی۔ نجی یا مختلف جماعتی نوعیت کے اداروں میں مداخلت نہیں کی گئی لیکن وہ بھی سرکار کے زیرِ نگرانی تھے۔ اس قانون کی دفعات کا نفاذ بوسنیا اور ہرزگووینا میں پورے

پر نہیں ہوا۔ گو ''صبیان مکتبی'' اور ''رشدیات'' نیز فنی اور تربیتی مدرسے قائم کیے گئے۔ سرکاری اعداد و شمار کی رو سے ترکی حکومت کے اختتام کے قریب نو سو سترہ مکتب، تینتالیس مدرسے اور انٹھائیس رشدیے تھے۔ اس کے علاوہ سراجیوو میں ادنی درجے کا ایک مدرسۂ حربیہ، استادانِ مکتب کے لیے ایک تربیتی درس گاہ اور ایک تجارتی مدرسہ قائم تھا۔

فرقہ دارانہ مدرسوں میں مداخلت کیے بغیر آسٹریا۔ ہنگری کے حکام نے خود اپنا سرکاری نظام تعلیم رائج کرنے سے ابتدا کی؛ سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم لازمی تھی۔ ''مکتب'' اور ''مدرسے'' بدستور مذہبی تعلیم گاہوں کی حیثیت سے جاری رہے۔ ۱۹۰۹ء کے قانون نافذہ کے ضوابط کے تحت مسلمان بچوں کی ''مکتبوں'' میں حاضری لازمی تھی اور کوئی مسلمان بچہ پہلے ''مکتب'' میں پڑھے بغیر ثانوی مدرسے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ''ان 'مکاتب'' کی اصلاح کے لیے بعض اقدام کیے گئے، لیکن اکثر صورتوں میں ان پر عمل در آمد نہ ہوا۔ ۱۹۰۹ء میں تقریباً ایک ہزار پرانے ''مکتب'' (''صبیان مکتبی'') اور بانوے اصلاح شدہ طرز کے (''مکتب ابتدائیہ'') تھے۔ مسلمان بچوں کے مکتبوں میں رشدیہ کا بھی شمار تھا اور انہیں اس حیثیت سے نصاب تعلیم کی تبدیلی کے ساتھ باقی صرف دیہات اور ایک چھوٹے قصبے برچ میں رہنے دیا گیا تھا۔ ''مدرسے'' ادنی مذہبی ملازموں کے لیے تربیت گاہوں کا کام دیتے تھے اور ۱۸۸۲ء میں شرعی قانون اور شرعی عدالتوں کے ہونے والے قاضیوں کے لیے ایک درس گاہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ مجلس اوقاف نے ۱۸۹۲ء میں استادان ''مکتب'' کی تربیتی درس گاہ کی بنیاد رکھی۔ سراجیوو کے سرکاری گرامر سکول کے مسلمان شاگردوں کو اس بات کا اختیار تھا کہ انہیں کلاسیکی یونانی پڑھائی جائے یا عربی۔

عالمگیر جنگِ اول کے بعد یوگوسلاویا کی مسلسل حکومتوں کے دوران میں فقط سرکاری ابتدائی مدارس ہی تسلیم کیے گئے، گو ان کی قلیل تعداد قابلِ تعلیم عمر کے بچوں کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔ ابتدائی مدارس میں پڑھنے والے سب بچوں کے لیے مذہبی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ مکاتب ابتدائی تیاری کے یا صرف قرآن مجید پڑھانے کے غیر تعلیمی ادارے بن گئے۔ تمام ثانوی مدارس میں بھی دینیات پڑھائی جاتی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں ایک سرکاری شرعی ثانوی مدرسہ سراجیوو میں کھولا گیا۔ شرعی قاضیوں کی تربیت کا مدرسہ ۱۹۳۷ء تک بدستور قائم رہا جبکہ شریعت اور اسلامی دینیات کی ایک اعلی درس گاہ جامعہ کے درجے کی قائم کر دی گئی۔ مجلس اوقاف استادانِ مکتب کے تربیتی ادارے اور ''مدرسوں'' کو۔۔ جو اب زیادہ تر دینیاتی مضامین کی تعلیم کے ثانوی مدارس ہیں۔۔ چلانے کے مصارف کی کفیل ہوئی۔ مدرسوں کے متعلق ابتدائی اصلاحات ۱۹۳۳ء میں نافذ کی گئیں اور ۱۹۳۹ء میں ایک معین لائحۂ عمل اختیار کیا گیا، جس کا منشا انہیں نیچے کے ثانوی سکولوں کی مانند جامع قسم کا بنانا تھا۔ غازی خسرو بے کا مدرسہ اس اعتبار سے مستثنی تھا، کیونکہ اس میں اعلی ثانوی نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ بوسنیا اور ہرزگووینا کے متعدد مسلمانوں کے متعلق معلوم ہے کہ انہوں نے مشرقی یونیورسٹیوں سے سند فضیلت حاصل کی۔ مسلمان شاگردوں اور طلبہ کو وظائف دینے، نیز اقامتی مدارس کے چلانے، ان کے اہتمام اور دیگر تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانے کا کام، جو وقف سے مختص تھا، کم از کم غیر دینی تعلیم کے معاملے میں بھی ایک مسلم مجلسوں گجرت، روزدنیکہ وغیرہ نے رفتہ رفتہ خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

نئے یوگوسلاویا میں مذہبی جماعتیں اور مجالس حکومت سے علیحدہ کر دی گئی ہیں، لیکن حکومت مذہبی فرقوں کو امداد دے سکتی ہے۔ (۱۹۵۳ء کے مذہبی فرقوں کے قانون کی دفعات کے تحت) مذہبی تعلیم صرف معابد کے بالکل قرب و جوار ہی میں دی جا سکتی ہے، تاہم مذہبی فرقے اپنے مذہبی عمّال اور عملے کی تربیت کے لیے سکول کھولنے کے مجاز ہیں۔ مکاتب جن میں مذہبی مسلم فرقے کے نزدیک مسلمان بچوں کی حاضری لازمی تھی، ۱۹۵۰ء تک موجود تھے؛ اس کے بعد کُل بوسنیا اور ہرزگووینا میں بند کر دیے گئے۔

آسٹریا۔ہنگری کے نظم و نسق کے دوران میں اور قبل جنگ، یوگوسلاویا میں علم کے ان اسلامی شعبوں کی تعلیم جن کا تعلّق دین اور مشرقی زبانوں سے ہوتا تھا متذکرۂ بالا مدارس و کلّیات کی سرگرمیوں سے گہرا تعلّق رکھتی تھی۔ اسی زمانے میں سراجیوو کا Zemaljski Muzej (= موزہ یا متحف) ترکی کے سرکاری محافظ‌خانوں سے مشرقی مخطوطات اور تاریخی دستاویزیں فراہم کرنے میں منہمک تھا۔ عجائب گھر کے عملے میں متعدّد کام کرنے والے مشرق کی ادبی اور تاریخی دستاویزوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں اس میدان میں جدید تحقیقاتی مطالعات کی ترقی کے مناسب حالات پیدا کیے گئے (C. Truhelka، V. Skarić، F. Spaho، R. Muderizović و دیگر)۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد گذشتہ برسوں میں بوسنیا اور ہرزگووینا میں مسلمانوں سے متعلق مشرقی علوم کی طرف زیادہ توجہ مبذول کی گئی ہے۔ چنانچہ سراجیوو کے گرامر سکول میں مشرقی اور مغربی کلاسیکی علوم دونوں قسم کا درسی نصاب پڑھانے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ جامعۂ سراجیوو میں، جس کی بنیاد ۱۹۴۹ء میں رکھی گئی تھی، مشرقی لسانیات (ترکی، عربی اور فارسی زبانوں اور ادبیات) کا ایک شعبہ ہے، نیز ترکی عہد حکومت کے دوران میں یوگوسلاویا کے لوگوں کی تاریخ کے مطالعات کی طرف خصوصی توجہ دینے کے ساتھ تاریخ کے شعبے میں ترکی کا درس بھی دیا جاتا ہے۔ سراجیوو اورینٹل انسٹی‌ٹیوٹ میں، جس کی بنیاد ۱۹۵۰ء میں رکھی گئی تھی، مشرقی مخطوطات اور ترکی تاریخی مواد کا گراں قدر ذخیرہ موجود ہے، جو سب کا سب وہاں کے Zemaljski Muzej سے حاصل کیا گیا ہے۔ اپنا سال‌نامہ شائع کرنے کے علاوہ اورینٹل انسٹی‌ٹیوٹ ترکی مآخذ اور مخطوطات کا جو یوگوسلاوی لوگوں کی تاریخ سے خاص تعلّق رکھتے ہیں، ایک باقاعدہ ذخیرہ جمع کرنے میں مصروف ہے (Monumenta turcica historiam Slavorum Meridionalium illustrantia)۔ چنانچہ مطالعات کا ایک وسیع میدان، جو ترکی، عربی اور فارسی زبانوں، ترکی عہد حکومت میں یوگوسلاوی لوگوں کی تاریخ اور علم کی بہت سی دوسری اسلامی شاخوں سے تعلق رکھتا ہے اور جو پہلے مذہبی اداروں اور جماعتوں کے احاطۂ عمل میں تھا، اب غیر مذہبی ہاتھوں میں آ گیا ہے۔

مآخذ: (۱) A. Hangi: Die Moslims in Bosnien-Hercegovina—ihre Lebensweise, Sitten and Gebräuche، سراجیوو ۱۹۰۷ء؛ (۲) A. Bejlić: Spomenici osmanlijske arhitekture u Bosni i Hercegovini, Prilozi za orijentalnu filologiju، ج ۳ تا ۴، سراجیوو ۱۹۵۲ - ۱۹۵۳ء؛ (۳) A. Skaljić: Turcizmi u narodnom govoru i narodnoj književnosti Bosne i Hercegovine، ج ۱ تا ۲، سراجیوو ۱۹۵۷ء؛ (۴) K. Hörman: Narodne pjesme muslimana u Bosni i Hercegovini، ج ۱ تا ۲، سراجیوو ۱۹۳۳ء؛ (۵) Hrvatske narodne pjesme—skupila Matica Hr-

vatska، ج ۳ تا ۴؛ Junačke pjesme (muhamedovske)
Zagreb ۱۹۳۳ء؛ (۶) A. Nametak : Narodne
junačke muslimanske pjesme، سراجیوو ۱۹۳۳ء؛
(۷) H. Dizdar : Sevdalinke—Izbor iz' bosansko-
hercegovačke narodne lirike، سراجیوو ۱۹۴۴ء؛
(۸) M. Murko : Die Volksepik der bosnischen
Mohammedaner، در Zeitschr. d. Vereins f.
Volkskunde، ج ۹ (۱۹۰۹ء)؛ (۹) وہی مصنف:
Tragom srpsko-hrvatske narodne epike-Putovanja u
godinama ۱۹۳۰ تا ۱۹۳۳ء، ج ۱ تا ۲ (طبع
Jugoslavenska akademija znanosti i umjetnosti)،
Zagreb ۱۹۵۱ء؛ (۱۰) A. Schmaus : Studije
o krajinskoj epici (طبع Jugosl akad znanosti i
umjetnosti)، Zagreb، ۱۹۵۳ء؛ (۱۱) Kemura :
Ćorović : Serbo-kroatische Dichtungen bosnischer
Moslims aus dem XVII., XVIII. und XIX. Jh.،
سراجیوو ۱۹۱۲ء؛ (۱۲) D.M. Korkut : Mokbul-i arvf
(Potur Šahidija) Usküfi Bosnevije، Glasnik Hrv. zem.
muzeja liv، سراجیوو ۱۹۳۳ء؛ (۱۳) محمّد بن محمّد...
الخانجی البوسنوی: الجوہر الاسنٰی فی تراجم علماء و شعراء
بوسنة، قاہرہ ۱۳۴۹ھ؛ (۱۴) M. Handžić : Književni
rad bosansko hercegovačkih muslimana، سراجیوو
۱۹۳۳ء؛ (۱۵) M. Malić : Bulbulistan du Shaikh
Fewzi de Mostar, poète herzegovinien de langue
persane، پیرس ۱۹۳۰ء؛ (۱۶) M. Braun : Die
Anfänge der Europäisierung in der Literatur der moslemischen Slaven in Bosnien und Herzegowina، لائپزگ
۱۹۳۴ء؛ (۱۷) F. Bajraktarević : O našim mevludima،
بلغراد ۱۹۲۷ء؛ (۱۸) O. Sokolović : Pregled
štampanih djela na srpskohrvatskom jeziku muslimana Bosne i Hercegovine od 1878-1948 god.
Glasnik Vrhovnog starješinstva za)، سراجیوو ۱۹۵۷ء؛
(1955-57 g.)؛ (۱۹) Dj. Pejanović : Srednje i stručne
škole u Bosni i Hercegovini، سراجیوو ۱۹۵۳ء:

۴ - بوسنیا اور ہرزگووینا میں ۱۸۷۸ء کے بعد سے ملّت اسلامیہ کا حال:

بوسنیا اور ہرزگووینا پر سلطان کے شاہی حقوق ۱۹۰۸ء تک تسلیم کیے جاتے تھے، یہاں تک کہ آسٹریا۔ہنگری نے یہ صوبہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ تاہم اس دو عملی حکومت میں بوسنیا اور ہرزگووینہ کی حیثیت زیادہ تر آسٹریا۔ہنگری کے دورنگے آئین کے سبب غیر متعیّن رہی۔

یہ صوبے ایک دہرے اقتدار کے ماتحت تھے جسے الحاق سے پہلے بھی اور بعد میں بھی آسٹریا کی وزارتِ خزانہ استعمال کرتی تھی۔ دونوں حکومتوں میں سے ہر ایک انتظامی حکمت عملی، ریلوے لائنوں کی تعمیر اور ملک کی تجارت اور مالیات سے تعلق رکھنے والے امور کے متعلق متعیّنہ حقوق رکھتی تھی۔

اس سارے عہد میں بوسنیا اور ہرزگووینا میں آسٹریا۔ہنگری کا نظم و نسق دفتر شاہی تھا اور اس میں پولیس مسلّط رہی۔ حاکمِ اعلٰی ایک فوجی سپہ سالار ہوتا تھا۔ محکموں کی تعداد چار تھی، جو بعد میں چھ ہو گئی۔ ۱۸۲۲ء میں گورنر کا دیوانی نائب (civil adlatus) مقرر کیا گیا اور دیوانی عمّال پوری طرح اس کے ماتحت آ گئے۔ انتظامی مقاصد کی خاطر ملک چھ ''اوکرگوں'' (Okrugs) (ولایات) میں منقسم تھا۔ بنالوقہ، بہاچ Bihać، موستر Mostar، سراجیوو، تراونک Travnik اور طوزلہ، اور پھر یہ ''اوکرگ'' ''سرزوں'' (Srezes = اضلاع) اور اسپوستاوزوں (Ispostavas = سب سے چھوٹی انتظامی وحدتوں) میں منقسم تھے۔ ۱۹۰۶ء میں جا کر عدلیہ کو ملکی حکومت سے علیحدہ کیا گیا۔ الحاق کے بعد ہی ۱۹۱۰ء میں

ایک آئین مع ''سابور'' (Sabor = مجلس ملکی) عطا کیا گیا۔ ''سابور'' بہتّر مندوبین اور بیس نامزد (بہ حیثیت عہدہ) اراکین پر مشتمل ہوتی تھی۔ نامزد اراکین کچھ تو مذہبی نمائندے ہوتے تھے (مسلمانوں میں رئیس العلماء، ناظم محکمۂ اوقاف اور تین مفتی) اور کچھ اعلٰی عہدے دار۔ مندوب اپنے رتبے کے مطابق تین شعبوں (curiae) کے لیے منتخب ہوتے تھے، جن میں سے پہلا دو گروہوں پر مشتمل تھا اور بڑی جائدادوں کے مسلمان مالکوں کا تعلق پہلے گروہ سے ہوتا تھا۔ انتخابی حلقے فرقہ وارانہ بنیاد پر شعبوں کی تشکیل کرتے تھے۔ اس آئین نے حکومت کے بارے میں ''سابور'' کے اختیارات کو بہت ہی محدود کر دیا تھا اور دوسری طرف آسٹریا۔ ہنگری کی وزارتِ مالیات کے بارے میں حکومت کے اختیارات پر بھی بہت سی قیود عائد کر دی تھیں۔

۱۹۱۲ء میں گورنر کو دیوانی محکموں سے متعلق کچھ مزید اختیارات سونپ دیے گئے۔ ''سابور'' معطّل کر دی گئی اور پہلی عالمگیر جنگ کے دوران میں اس کا کوئی اجلاس نہ ہوا۔

اس حقیقت کے باوجود کہ آسٹریا۔ ہنگری کی حکومت نے نظم و نسق میں جدید آئین رائج کیے، تجارت اور بالخصوص کان کنی اور چوب کی صنعت کو فروغ دیا، سڑکیں اور ریل کی پٹڑیاں بنائیں، نیز سکول اور متعدد سائنسی ادارے قائم کیے، لیکن معاشرے کی ہیئت ترکیبی میں کسی لحاظ سے کوئی فرق نہ آیا۔ یہ سچ ہے کہ آسٹریا۔ ہنگری کے حکّام اس طریق سے مسلم طبقۂ امرا کے بیشتر حصے کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، تاہم زرعی مسئلے کے حل نہ ہونے کے باعث زراعت میں جمود پیدا ہو گیا اور اس کا اثر کسانوں پر بالخصوص کمتوں kmets پر (جو زیادہ تر یونانی کلیسائے قدیم کے پیرو تھے) بہت ہی مضر پڑا۔ اور ۱۹۱۱ء سے قانون گروہی واگزاشت اراضی (Facultative Redemption of Land Act) کی منظوری سے بھی زرعی مسئلے کا کوئی حل نہ ہوا۔ اس قانون کی رو سے زمیندار اور مزارع کے رائج الوقت تعلقات میں فقط معمولی سی تبدیلیاں کر دی گئی تھیں۔

۱۸۸۲ سے ۱۹۰۳ء تک بوسنیا اور ہرزگووینا میں آسٹریا۔ ہنگری کی حکمت عملی کے سلسلے میں بڑا کردار B. Kallay نے ادا کیا، جو اس دہری سلطنت کا وزیرِ مالیات تھا اور دوسری طرف ایک مشہور و معروف مؤرخ بھی تھا۔ بوسنیا اور ہرزگووینا کو اس دہری بادشاہی کے تحت ایک جداگانہ وحدت کی حیثیت سے رکھنے کی خاطر اور سربی و کروٹی وطن پرستی کی تحریک کو روکنے کے لیے کیلے نے ایک بوسنوی قوم اور بوسنوی زبان پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ حکمتِ عملی ملکی باشندوں میں حامیوں کی کافی تعداد فراہم کرنے میں ناکام رہی، کیونکہ سرب اور کروٹ قومی لحاظ سے باشعور ہو چکے تھے اور مسلمانوں کی اکثریت، جس نے اپنی قومیت کا اعلان نہیں کیا تھا، اپنا اصلی وطن ترکی کو خیال کرتی تھی۔ مزید برآں بہت سے مسلم خاندان ترکی میں آباد ہو گئے تھے اور مسلم رہنما ہمیشہ بوسنیا اور ہرزگووینا پر عثمانی سلطان کے حقوق سلطانی پر زور دیتے تھے۔ غرض مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور زمینداروں کے طبقے کے ایک بہت ہی قلیل حصے نے بوسنوی قومیت کے اصول کو اپنایا۔

سربیا کی سیاسی تحریک نے اپنی بیشتر مساعی کو کلیسائی معاملات اور سربی قومی مدارس کو چلانے میں آزادی حاصل کرنے میں صرف کیا۔

آسٹریا۔ ہنگری کے حکام کے بعض اقدامات کے متعلق مسلمانوں میں روز بروز بدظنی پیدا ہوتی گئی۔ مسلمانوں کے مذہبی اداروں کو اپنی نگرانی میں لے آنے کی غرض سے حکومت نے ۱۸۸۲ء میں

''رئیس العلما'' کا عہدہ اختراع کیا، جو بوسنوی ہرزگوینی مسلمانوں کا سب سے بڑا مذہبی سرگروہ ہوتا تھا۔ نیز ایک سب سے اعلٰی مذہبی جماعت (Ulema Medžlis = مجلسِ علما) قائم کی، جس کی صدارت رئیس العلما کرتا اور اس کے ساتھ چار ارکان ہوتے تھے۔ یہ تنظیم اتنی بڑھی کہ اس نے مجلسِ اوقاف کے اختیارات کو بھی اپنی زیرنگرانی کر لیا۔ مسلمانوں نے پریشان و خوفزدہ ہو کر (۱۸۸۶ء میں) شہنشاہ کو ایک عرضداشت پیش کی جس میں ''اوقاف'' کے معاملات میں آزادی کا مطالبہ کیا۔ ۱۸۹۹ء میں مفتی موستر جابچ A.F. Džabić کی قیادت میں بوسنیا و ہرزگووینا میں تمام مسلمانوں کے لیے مذہبی اور تعلیمی آزادی کے حصول کے لیے زبردست جد و جہد شروع ہوئی۔ یہ جد و جہد کلیسائے یونان کی (سربی) تحریک سے وابستہ ہو گئی۔ جابچ زیادہ سے زیادہ مراعات کے مطالبے پر اصرار کرتا تھا، لیکن رائے شماری میں ہار گیا۔ ۱۹۰۰ء میں وزیر کیلے کے سامنے ملت اسلامیہ کے لیے ایک مسودہ قانون پیش کیا گیا، جس میں بوسنیا اور ہرزگووینا میں سلطان کے شاہی حقوق پر خصوصی زور دیا گیا تھا، لیکن یہ اصول آسٹروی۔ ہنگروی حکام تسلیم کرنے پر رضا مند نہ تھے۔ جب مفتی موستر جابچ سلطان سے مشورہ کرنے کے لیے استانبول روانہ ہوا تو اسے بوسنیا و ہرزگووینا میں دوبارہ داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی۔ ۱۹۰۶ء سے اور اس کے بعد اس تحریک نے زیادہ منضبط و متعیّن صورت اختیار کر لی۔ علی بیگ فردوس کی صدارت میں تنظیم ملّتِ اسلامیہ کی جماعت منتظمہ منتخب ہوئی۔ یہ تنظیم اگرچہ جائداد رکھنے والے طبقوں کے مفادات کی حمایت کرتی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے مذہبی آزادی عطا کیے جانے کے لیے بھی حکومت سے مذاکرات شروع کر دیے۔ یہ مذاکرات التوا میں پڑے رہے، کیونکہ آسٹریا۔ ہنگری کے حکام کوئی بات جس میں سلطان کے شاہی حقوق کا اشارہ ہو سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ البتہ صوبے کے سلطنت میں الحاق کے بعد جب شہنشاہ نے بوسنیا اور ہرزگووینا میں مسلمانوں کے مذہبی معاملات کی خوداختیاری حکومت کے متعلق قانون (Vekf-Mearaf = وقفِ معارف) کی منظوری دے دی تو شرائط تسلی بخش طور پر طے ہو گئے۔ اس قانون کے تحت اوقاف، اور مدارس و کلیات کے اوقاف کے متعلق اعلٰی انتظامی اختیارات ''وقف معارف'' کی ایک مجلس (Sabor) کو تفویض کر دیے گئے، جو آٹھ نامزد سرکاری (بہ حیثیت عہدہ) ارکان (رئیس العلما، چھے مفتی اور ناظم مجلس اوقاف) اور چوبیس غیر سرکاری اراکین پر مشتمل تھی، جنھیں مجالس ضلع کی جماعتیں منتخب کرتی تھیں۔ اس کا صدر رئیس العلما جماعت (بہ حیثیت عہدہ) ہوتا تھا۔ ''وقف معارف'' کمیٹی سابور کی مجلسِ انتظامیہ اور مجلسِ عاملہ کا کام کرتی تھی۔ ''وقف معارف'' بورڈ کی ثانوی درجے کی انجمنیں اضلاعی کمیٹیاں تھیں، جنھیں اضلاعی مجلسیں منتخب کرتی تھیں اور مؤخّر الذکر میں جماعت džamat اسمبلیاں اور ''جماعت'' مجلسیں ہوتی تھیں۔ ارفع ترین مذہبی اختیار ''مجلس علما'' کو حاصل تھا جو چار ارکان پر مشتمل ہوتی تھی اور جس کا صدر ''رئیس العلما'' ہوتا تھا۔ رئیس العلما اور ان ارکان کا انتخاب ایک جداگانہ انتخابی جماعت کرتی تھی جو چھے مفتیوں اور چوبیس نامزد ارکان پر مشتمل ہوتی تھی۔ انتخابی جماعت رئیس العلما کی اسامی کے لیے تین (منتخب) امیدواروں کے نام شہنشاہ کے سامنے پیش کرتی، جن میں سے ایک کو شاہی فرمان کے ذریعے رئیس مقرر کیا جاتا تھا۔ رئیس اسی

صورت میں اپنے فرائض سر انجام دینا شروع کرتا جب وہ مذہبی فرائض ادا کرنے کے لیے استانبول کے ''شیخ الاسلام'' سے ''منشورہ'' (= اجازت نامہ) حاصل کر لیتا ۔ متعلقہ درخواست آسٹریا۔ ہنگری کے توسّط سے استانبول میں پیش کرنا پڑتی تھی ۔ ''مجلس علما'' میں کوئی اسامی خالی ہو جاتی تو وزارت مالیات دو نامزد ارکان میں سے کسی ایک کو نامزد کر کے اسے پر کرتی تھی ۔ ہر ''آکرگ'' (ولایت یا قسمت) کا اپنا ایک مفتی ہوتا تھا، جسے حکومت ان امیدواروں میں سے نامزد کرتی جنھیں ''مجلس علما'' پیش کرتی تھی ۔ اعلٰی مذہبی عمال اور شہری ملازموں کی تنخواہیں صوبائی میزانیے سے ملتی تھیں ۔ اس قانون نے مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مدارس نیز شرعی حاکمان عدالت کے بارے میں مذہبی عمّال کے حقوق کے سوال کا بھی فیصلہ کر دیا۔

بوسنیا اور ہرزگووینا کے یوگوسلاویا میں شامل ہو جانے کے ساتھ ہی مسلمانوں کی مذہبی ملّت کا مسئلہ پھر سامنے آ گیا۔ مزید براں بوسنیا اور ہرزگووینا کے باہر یوگوسلاویا میں بھی مسلمان موجود تھے ۔ تاہم ۱۹۰۹ء کا قانون بوسنیا اور ہرزگووینا میں ۱۹۳۰ء تک نافذ رہا ۔ مسلمانوں کی ایک علٰیحدہ مذہبی تنظیم تھی جو سربیا، مقدونیا اور مونٹنگرو پر حاوی تھی ۔ زرعی اصلاح پر عمل درآمد سے مسلمان مالکانِ جائداد کو بوسنیا اور ہرزگووینا میں ''اوقاف'' کی بہ نسبت زیادہ نقصان پہنچا کیونکہ ''اوقاف'' کی زیادہ‌تر جائداد دیہاتی علاقے میں ہونے کے بجائے شہری قطعات پر مشتمل تھی ۔ اس کے باوجود بوسنیا اور ہرزگووینا میں ''وقف'' کی تنظیم میں لامرکزیت نیز مالیاتی انتظام میں ابتری اور بدعنوانیوں نے ''وقف'' کی جائداد کو بھی بہت نقصان پہنچایا۔

یوگوسلاویا میں پارلیمانی حکومت کی منسوخی کے بعد ۱۹۳۰ء میں اسلامی مذہبی فرقے اور سلطنت یوگوسلاویا میں اس کے آئین کے متعلق ایک قانون منظور کیا گیا ۔ اس طرح پہلی با اختیار مسلم مذہبی جماعتیں ایک ہی رئیس، یعنی ''رئیس العلما'' اور ایک ہی بالا دست جماعت، یعنی ''مجلس علما'' کے ماتحت یکجا کر دی گئیں ۔ آخرالذکر میں ''رئیس العلما'' کے ساتھ صرف سابقہ صدر مجلس علما شامل ہوتے تھے ۔ ''رئیس العلما'' کی سرکاری سکونت‌گاہ اور اسلامی مذہبی فرقے کے بورڈ کا دفتر بلغراد میں منتقل ہو گئے، تاہم ان کے علاوہ دو ''علما مجلس'' اور دو ''وقف معارف'' کی کونسلیں مع اپنی انتظامی کمیٹیوں کے اور تھیں جن کے مرکزی دفاتر سراجیوو اور سکوبجے Skoblle میں تھے ۔ نسبۃً کم‌اختیار والے مفتی، اضلاعی ''وقف معارف'' بورڈ، جس کا رئیس شرعی حاکم عدالت ہوتا تھا اور ''مجلس جماعت'' تھے جس کا صدر ''امام جماعت'' ہوتا تھا ۔ اس قانون اور آئین کی اہم خصوصیات اس حقیقت میں دیکھی جا سکتی ہیں کہ بیشتر اسامیوں پر تقرر نامزدگی کے ذریعے کیا جاتا تھا ۔ اور ''رئیس العلما'' کا عہدہ ''مجلس علما'' پر بھی فوقیت رکھتا تھا ۔ ''رئیس'' فی الحقیقت مملکت میں ایک متّحدہ اسلامی ملّت کا سردار اور نشان تھا، مگر نظم و نسق میں دو عملی تھی (سراجیوو اور سکوبجے) ۔ رئیس ''مجلس علما'' کے ارکان اور مفتیوں کی اسامیوں کے امیدوار کا انتخاب بھی خاص خاص ضابطوں سے منضبط کیا گیا تھا ۔ انتخابی مجلس سے توقع کی جاتی تھی کہ رئیس کے عہدے کے لیے تین امیدوار چنے گی جن میں سے ایک وزیر انصاف اور وزیر اعظم کی سفارش پر شاہی فرمان کے ذریعے نامزد ہوتا تھا ۔ نیز وزیر انصاف کی سفارش پر شاہی فرمان کے ذریعے ہی مجلس علما کے ارکان اور مفتی نامزد

ہوتے تھے۔

۱۹۳۶ء میں ایک نیا قانون اور آئین منظور ہو جانے کے ساتھ تبدیلیاں تو کی گئیں لیکن ان سے نہ تو اس وحدت میں جس کا مظہر رئیس کا عہدہ تھا اور نہ دوسری مجالس کی دو عملی میں کوئی فرق پڑا۔ اسلامی مذہبی فرقے کے بڑے نمائندے مفصلۂ ذیل تھے: مجلس جماعت، اضلاعی وقف کمیشن، سراجیوو اور سکوپجے میں مجلس علما، وقف معارف کی بڑی مجلس (Sabor)، سراجیوو اور سکوپجے میں، جس کے ساتھ مجلس کی کمیٹیاں، وقف بورڈ اور پھر رئیس العلما مع چیدہ یا پوری کونسل کے۔ رئیس کی سرکاری سکونت گاہ سراجیوو میں تھی۔ مفتی کا عہدہ منسوخ کر دیا گیا۔ ضوابط کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ منتظم مجالس اور عمّال کے تقرر میں سرکاری نامزدگی کا دخل تھا اس لیے کہ مجلس علما کے ارکان کے انتخاب کے لیے ہر ایک اسمبلی دس ارکان کا انتخابی حلقہ منتخب کرتی تھی جو ''رئیس'' کے امیدواروں کے انتخاب کے لیے خود ایک انتخابی مجلس کی تشکیل کرتے تھے۔ پھر پہلے کی طرح امیدواروں میں سے ایک (عموماً وہ جسے زیادہ ووٹ ملتے تھے) وزیرِ انصاف کی سفارش پر شاہی فرمان کے ذریعے ''رئیس'' مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ تنظیم تھی جس کے ذریعے ''یوگوسلاوی مسلم آرگنائزیشن'' نے، جس کی قیادت M. Spaho کے ہاتھ میں تھی، مسلمانوں میں اپنے لیے ایک مقام حاصل کیا۔

نئے یوگوسلاویا میں اسلامی مذہبی فرقے کی حیثیت اور حقوق کا تحفظ آئین میں ضروری دفعات کے ذریعے کر دیا گیا ہے اور مختلف مذہبی فرقوں کے متعلق ۱۹۵۳ء کے قانون کے ذریعے وہ منضبط بھی ہو گیا ہے۔ مذہبی تنظیمات حکومت سے علٰیحدہ کر دی گئی ہیں، کیونکہ مذہبی معتقدات کو ایک نجی معاملہ سمجھا گیا ہے۔ مذہبی فرقے اپنے مذہبی عمّال اور عملے کی تربیت کے لیے سکول چلا سکتے ہیں۔ حکومت بھی مذہبی فرقوں کو امداد دے سکتی ہے۔

یوگوسلاویا میں اسلامی مذہبی فرقے پر حکومت ''وفاقی جمہوریۂ عوام یوگوسلاویا'' کے اس آئین کے ضوابط کے ذریعے کی جاتی ہے جسے اعلٰی ''وقف'' اسمبلی نے مسلمانوں کے لیے ۱۹۴۷ء میں بنایا اور منظور کیا تھا۔ اس عرصے میں بعض دفعات تبدیل کر دی گئی ہیں اور بعض کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس آئین نے یوگوسلاویا میں مسلمانوں کی مذہبی تنظیم کی وحدت کو نہ صرف ''رئیس العلما'' کے عہدے بلکہ اعلٰی وقف اسمبلی کے قیام کے ذریعے عملی صورت دی ہے۔ ساتھ ہی سلطنت کی وفاقی ساخت کا بھی ان ''مجالس علما'' اور ''وقف اسمبلیوں'' کے ذریعے لحاظ رکھا گیا ہے جو چار جمہوریتوں میں قائم کی گئی ہیں جہاں مسلم آبادی کی معقول تعداد موجود ہے۔ سب سے اعلٰی اختیار ''رئیس'' اور ''وقف اسمبلیوں'' کے چار ارکان کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ ''رئیس العلما'' اور اعلٰی اختیار کے ان چار ارکان کو اعلٰی وقف اسمبلی منتخب کرتی ہے [رکّ بہ یوگوسلاویا]۔

مآخذ: (۱) V. Skarić و O. Nuri Hadzić و N. Stojanović: *Bosna i Hercegovina pod austro-ugarskom upravom, Srpski narod u XIX veku*، بلغراد ۱۹۳۸ء؛ (۲) A. I. Balagija: *Uloga vakufa u verskom i svetovnom prosvećivanju naših muslimana*، بلغراد ۱۹۳۳ء؛ (۳) M. Begović: *Legislation relative à l'organisation des affairs réligieuses des musulmans en Yougoslavie*, *Annuaire de l'Association Yougosl. de droit int.*، بلغراد - پیرس ۱۹۳۳ء؛ (۴) *The Statute of 1909 concerning autonomous government of Islamic re-*

ligious and Vakf Mearif affairs in Bosnia and Herzejovina ؛ (۵) Law of January 31st 1930 concerning the Islamic Religious Community in the Kingdom of Yugoslavia ؛ (۶) Constitution of the Islamic Religious Community in the Kingdom of Yugoslavia (۹ جولائی ۱۹۳۰ء) ؛ (۷) Law of March 25th 1930 concerning the Islamic Religious community in the Kingdom of Yugoslavia ؛ (۸) Constitution of the Islamic religious community in the Kingdom of Yugoslavia، ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۶ء ؛ (۹) Law of May 27th 1953 concerning the legal position of religious Communities ؛ (۱۰) Constitution of the Islamic Religious Community in the FPR of Yugoslavia (Glasnik Vrhovnog Islamskog starješinstva) (FNRJ, br. 1-3 s 1957)، Enciklopedija Jugoslavije، ج ۳، Begović : Islam u Jugoslaviji (زیر طبع) ؛ [(۱۰) وہ مآخذ جو Encyclopaedia Brit. کے مقالہ Bosnia کے آخر میں درج ہیں].

(BRANISLAV DJURDJEV)

بوسنہ سرای : رک بہ سرای.

بُوشَنج : المعروف بہ فُوشَنج، فارسی زبانِ وسطٰی میں غالباً پُوشنگ، قدیم ایرانی شہر، جو دریاے ہری رُود کے جنوب میں اور ہرات سے، جو دریا کے شمال میں ہے، مغرب جنوب مغرب میں دس فرسنگ (ایک یوم کی مسافت) پر واقع تھا (یاقوت، ۱ : ۷۵۸)۔ یہ شہر زمانۂ قبل از اسلام میں موجود تھا اور افسانوی روایت کی رو سے اس کی بنیاد یا تو (اس کے نام کو دیکھتے ہوئے) قصے کے مرکزی کردار پَشَنگ (افراسیاب کا بیٹا اگرچہ قدیم رزمیات میں اس کا باپ بتایا گیا ہے) نے رکھی تھی یا ساسانی بادشاہ شاپور اوّل (۲۴۲ تا ۲۷۲ء) نے (G. Marquart : Erānshahr، ص ۶۳)۔ ۸۸ ء میں اس شہر کا ذکر نسطوری اسقف کے صدر مقام کے طور پر ملتا ہے (وہی کتاب، ص ۳۰۶؛ تاہم Jean Dauvillier : Les Provinces Chaldéennes "de l'Extérieur"، در Mélanges Cavallera، Toulouse ۱۹۴۸ء، ص ۲۷۹ تا ۲۸۲)؛ Wilh. Tomaschek : Zur historischen Topographie von Persien، ۱، ویانا ۱۸۸۳ء : ۷۸) نے اس کا رشتہ Theophrastus کے Πισάγγαι سے جوڑا ہے۔

یہ شہر ۶۵۰ء کے لگ بھگ مسلمانوں کے قبضے میں آیا اور دو سو برس تک عربوں اور مشرقی ایران کے کوہستانی علاقوں کے درمیان، جو ابھی پوری طرح مفتوح نہیں ہوئے تھے، سرحد کا شہر رہا۔ انھیں کوہستانی علاقوں سے اسے اس موقع پر امداد حاصل ہوئی جب اس نے ۴۱ھ / ۶۶۰ - ۶۶۲ء میں اور پھر ۱۶۰ھ / ۷۷۶ - ۷۷۷ء میں عربوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ۹۲ھ / ۷۱۱ء سے ۹۵ھ / ۷۱۳ء تک یہ مقام خوارج کے زیرِ تسلط رہا۔ اس شہر کے پُرسکون دور کا آغاز اس وقت ہوا جب آلِ طاہر [رک بآں] کے عہد میں اس علاقے کو اسلامی رنگ میں رنگنے کا کام بڑی حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ خاندان طاہریہ کا بانی اسی شہر کا باشندہ تھا۔ آگے چل کر بوشنج کا تعلق سیستان سے ہو گیا اور ۳۹۳ھ / ۱۰۰۳ء میں وہ خاندان غزنویہ کی حکومت کے ماتحت آ گیا (قب B. Spuler : Iran in früh-islamischer Zeit، لائپزگ ۱۹۵۲ء، ص ۱۹، ۲۵، ۵۱، ۵۳، ۷۱ ببعد، ۱۱۱، ۲۰۳ مع حوالہ جات دربارۂ مآخذ)۔

اس زمانے میں بوشنج کا رقبہ ہرات سے نصف کے قریب ہوگا۔ قرونِ وسطٰی کی پوری مدت میں یہ ایک مستحکم قلعے کے طور پر مشہور رہا۔ اس کے تین دروازے تھے۔ اقتصادی اعتبار سے اس کی اہمیت کی وجہ یہ تھی کہ یہ ہرات سے نیشاپور اور ہرات سے کوہستان جانے والی سڑکوں کے

سنگوم پر واقع تھا (الاِصْطَخْری، ص ۲۹۷، آخری سطر؛ ۲۹۸، سطر ۸؛ ابن رُسْتہ، ص ۱۷۳، س ۱۷ ببعد؛ حدود العالم، ص ۹۴، ۱۰۳، ۳۲۷؛ حَمْد اللہ المُسْتَوفی: نزہۃ، ص ۱۵۲ ببعد، ۱۷۷ تا ۲۲۰، ترجمہ ص ۱۵۱، ۱۷۱، ۲۱۲)۔ مزید برآں بُوشَنْج میں عمارتی لکڑی اور چوبی کام کی صنعتیں تھیں جو قریبی جنگلوں سے لکڑی کی بہم رسانی کے باعث جاری رہتی تھیں (المُقَدَّسی، ص ۳۰۷ ببعد (مبنی بر الاِصْطَخْری)؛ Spuler: کتاب مذکور، ص ۴۰۸؛ Le Strange، ص ۴۳۱)۔

چنگیزی مغول کی فتح کے بعد ان کے باجگزار شاہانِ کُرْت (یا کَرْت [رک بآں] ۱۲۴۵ تا ۱۳۸۹ء کے عہد میں بُوشَنْج پر ایک نسبۃً پُرسکون دور گزرا، تا آنکہ وسط ذوالحجہ ۷۸۲ھ / مارچ ۱۳۸۱ء میں تیمور نے اسے فتح کر کے بڑی سختی سے تباہ و برباد کر دیا، لیکن تھوڑا ہی عرصہ گزرنے پایا تھا کہ یہ از سر نو تعمیر کر لیا گیا۔ پندرھویں صدی میں (حافظ اَبْرُو [رک بآں] کے ہاں) اس کا ذکر بار بار آیا ہے۔ ۸۹۷ھ / ۱۴۹۱-۱۴۹۲ء میں لوگ اس کے قریب ایک رباط دکھاتے تھے جس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ سے منسوب کی جاتی تھی [معین الدّین الزّمجی] الاَسفِزاری: روضات [الجنات] فی [تاریخ] ہرات، مطبوعہ در JA، ۵: ۱۶ [جولائی تا دسمبر ۱۸۶۰ء]، ص ۴۹۳ ببعد)۔ اس کے بعد یہ مقام تاریخ کے صفحات سے محو ہو جاتا ہے؛ قیاس ہے کہ یہ ازبکوں اور ترکمانوں کی تاختوں سے تباہ و برباد ہو گیا۔ بقول W. Tomaschek: *Topographie*، ۱: ۷۸ موجودہ شہر غُوریان اسی کے محلِّ وقوع پر واقع ہے۔

([B. SPULER و] W. BARTHOLD)

بُوشَہر: (بُوشیر)، ایران کے اُستانِ ہفتم (فارس) کا ضلع اور شہر۔ شہر کا محلِ وقوع ۲۸ درجہ ۵۹ دقیقہ عرض بلد شمالی اور ۵۰ درجہ ۵۲ دقیقہ طول بلد مشرقی (گرینچ) ہے۔ بوشہر ایک طویل اور تنگ جزیرہ نما کے شمالی سرے پر بُھربُھرے پتھر کی آگے بڑھی ہوئی ایک نیچی پہاڑی پر واقع ہے۔ جزیرہ نما کو اندرونی ملک سے ملانے والی یہ خاکنائے اتنی نشیب میں ہے کہ جب سمندر میں جوار بھاٹا آتا ہے تو بعض اوقات یہاں سیلاب آ جاتا ہے؛ اسی لیے یہاں ایک بلند پشتے کا راستہ بنا دیا گیا ہے تا کہ ایسے موقعوں پر بُوشہر اور ملک کے اندرونی علاقوں کے درمیان سلسلۂ مواصلات قائم رہے۔ جزیرہ نما کے جنوبی سرے پر بوشہر سے ساڑھے سات میل پر رِیشَہر کے قدیم شہر کے کھنڈر واقع ہیں جہاں سے بابل کے زمانے کے مُردوں کی راکھ رکھنے کے مٹکے اور خطِ میخی میں لکھے ہوئے کتبے برآمد ہوئے ہیں۔ ری شہر کو غالبًا وہی "یونانی شہر" (*Ἰώνακα) سمجھنا چاہیے جس کا ذکر چَرَکْس Charax کے مصنّف اِیسِیڈور Isidore نے کیا ہے۔ ساسانی بادشاہ اَرْدشیر نے اسے از سرِ نو بسایا اور اس کا نام رِیو اَرْدشیر رکھا۔ ری شہر اسی کا مخفّف ہے۔ دسویں، سولھویں اور گیارھویں۔ سترھویں صدیوں میں یہاں پرتگیزوں کی ایک نو آبادی اور قلعہ تھا۔

بوشہر کے نام کے اشتقاق کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا، چونکہ "ابو شہر" (شہر کا باپ) سے کوئی موزوں مفہوم برآمد نہیں ہوتا اس لیے "ری شہر" کے مفروضے کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ اس کا اصل نام "بخت آردشیر" ("اردشیر نے بخش دیا") ہوگا۔ یہ اشتقاق ممکن ہونے کے باوجود مشکوک ہے۔ اٹھارھویں صدی میں برطانوی ملاحوں نے اس کا نام بگاڑ کر "Busheer" اور "Bushire" کر دیا۔

بوشہر کا سب سے پہلے ذکر بظاہر یاقوت (۱ : ۵۰۳) کے ہاں ملتا ہے۔ اس کی حیثیت ۱۷۳۴ء

تک ایک گاؤں سے زیادہ نہ تھی، تا آنکہ نادر شاہ [رک بآں] نے اسے خلیج فارس میں اپنی بحریہ کا مستقر بنایا اور بندر نادریہ کا نام دیا (دیکھیے انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی *Gombroon Diary*، بابت پنجم / شانزدہم جولائی ۱۷۳۴ء، در *Persia and the Persian Gulf Records*، انڈیا آفس لائبریری، و L. Lockhart: *Nadir Shah*، لنڈن ۱۹۳۸ھ، ص ۹۲ تا ۹۳)۔ بعد ازاں بوشہر میں ایک بہت بڑا جنگی جہاز تعمیر کرنے کی ایک ناکام کوشش کی گئی۔ اس کے لیے لکڑی خشکی کے راستے مازندران کے جنگلوں سے لائی گئی تھی جس پر بے انتہا محنت اٹھانا پڑی۔ جب ۱۸۱۱ء میں سر ڈبلیو۔ اوسلی Sir W. Ousley بوشہر کے ساحل پر اترا تو اس نے وہاں اس جہاز کی باقیات دیکھی تھیں (رک بہ Sir W. Ouseley: *Travels in Various Countries of the East, more particularly Persia*، لنڈن ۱۸۱۹ء، ۱: ۲۸۸)۔ اگرچہ جہاز بنانے کا یہ تجربہ تو ناکام رہا، تاہم بوشہر کی طرف نادر شاہ کی توجہ مبذول ہونے کے باعث یہ خوب پھلنے پھولنے لگا۔ مزید برآں آگے چل کر جب انگریزی اور ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنیوں نے بندر عباس [رک بآں] سے اپنے کارخانے یہاں منتقل کر لیے تو اسے تجارتی اعتبار سے بڑا فائدہ پہنچا۔ بوشہر کی ترقی کی ایک اور بہت اہم وجہ یہ تھی کہ کریم خان زند [رک بآں] کے عہد میں ایران کا دارالحکومت شیراز قرار پایا جس کے ساتھ بوشہر ایک تجارتی شاہراہ کے ذریعے ملا ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بوشہر نے ملک کی مرکزی بندرگاہ کی حیثیت سے بندر عباس کی جگہ لے لی اور یہ مقام اسے ڈیڑھ صدی تک حاصل رہا۔ ابراہام پارسنز Abraham Parsons، جو ۱۷۷۰ء میں بوشہر گیا تھا، بیان کرتا ہے کہ جب وہ سمندر کے راستے بوشہر کے قریب پہنچا تو اسے زمین دکھائی دینے سے پہلے وہاں کے مکانات نظر آئے۔ وہاں سمندر اس قدر اتھلا تھا کہ بڑے جہاز ساحل سے کوئی تین میل پرے لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔ اس کے اندازے کے مطابق وہاں کی آبادی معمولی حالات میں تقریباً بیس ہزار تھی، لیکن جن دنوں وہ وہاں گیا تھا، تقریباً دو تہائی آبادی بصرے [رک بآں] کے محاصرے پر گئی ہوئی تھی۔ دیکھیے اس کی تصنیف *Travels in Asia and Africa*، لنڈن ۱۸۰۸ء، ص ۱۸۷ تا ۱۸۸۔

انیسویں صدی میں بطور بندرگاہ کے بوشہر کی اعلٰی حیثیت آسانی سے قائم رہی۔ برطانیہ اور ایران کی مختصر سی جنگ کے دوران میں برطانوی فوج نے دسمبر ۱۸۵۶ء میں شہر پر قبضہ کر لیا جو آئندہ مارچ صلحنامے پر دستخط ہونے تک برقرار رہا۔ بوشہر کے ساتھ برطانیہ کا تعلق، جو پہلے صرف تجارتی تھا، لیکن بعد ازاں سیاسی بھی ہو گیا (کیونکہ یہ خلیج فارس میں پولیٹیکل ریذیڈنٹ کا صدر مقام بن گیا تھا)، وقت گزرنے پر زیادہ اہم ہوتا گیا۔ اس تعلق کے باعث شہر کی تجارت میں دوسرے ممالک نے بھی حصہ لیا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں تجارت کی تفصیلات و جزئیات اور جہازوں کی آمد و رفت کا حال برطانوی ریزیڈنٹ کی انتظامی رودادوں (Administrative Reports) میں ملتا ہے، جو ۱۸۷۶ء کے بعد سے برابر لکھی جاتی رہیں۔ یہ رودادیں کلکتے میں *Selections from the Records of the Government of India Foreign Department* میں شائع ہوئی تھیں (Freihetr M. von Oppenheim کی تصنیف *Vom Mittelmeer zum persischen Golf*، برلن ۱۹۰۰ء، ۲: ۳۱۰ تا ۳۱۷ میں جو جدولیں ۱۸۹۳ سے ۱۸۹۷ء تک کے عرصے سے متعلق ہیں وہ انہیں مطبوعات پر مبنی ہیں)۔

بیسوی صدی کے ربع اول میں بوشہر بدستور خوشحالی کی راہ پر گامزن رہا، لیکن ۱۹۲۸ء میں

ٹرانس ایرانین ریلوے کی تکمیل اور بندر شاپور اور خرّم شہر کے ترقی پانے کے باعث اسے ملک کی بڑی بندرگاہ کی حیثیت حاصل نہ رہی ۔ بوشہر کے برعکس بندر شاپور اور خرّم شہر دونوں میں مال کی گودیاں اور جہاز سے بندرگاہ تک جانے والے پشتے تعمیر کیے گئے ہیں اور وہاں بڑے بڑے جہاز آ کر ٹھیر سکتے ہیں ۔ علاوہ ازیں یہ دونوں بندرگاہیں ریلوے کے ذریعے تہران اور اندرونِ ملک کے دوسرے شہروں سے ملی ہوئی ہیں ۔

۱۹۳۶ء میں بوشہر کی آبادی پندرہ ہزار تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ ایرانی منصوبہ‌بندی کا ادارہ (Persian Plan Organisation) بندرگاہ کو ترقی دینے اور شہر کو دوسری سہولتیں بہم پہنچانے کا قصد رکھتا ہے، لیکن اگر اس منصوبے پر پوری طرح عمل درآمد ہو جائے تو بھی قرینہ نہیں ہے کہ بوشہر بطور بندرگاہ اپنی سابقہ اعلٰی حیثیت کبھی دوبارہ حاصل کر لے گا۔

مآخذ : (۱) C. Niebuhr : Voyage en Arabie et en d'autres Pays circonvoisins، ایمسٹرڈم ۱۷۸۰ء، ۲ : ۷۵ - ۷۶؛ (۲) James Morier : A Second Journey through Persia، لندن ۱۸۱۸ء، ص ۳۸ تا ۵۰؛ (۳) J. B. Fraser : Narrative of a Journey into Khorasān، لندن ۱۸۲۵ء، ص ۳۵ تا ۵۸؛ (۴) J. R. Wellsted : Travels to the City of the Caliphs، لندن ۱۸۴۰ء، ۱ : ۱۲۰ تا ۱۲۶؛ (۵) W. A. Shepherd : From Bombay to Bushire and Bussora، لندن ۱۸۵۷ء، ص ۱۲۳ تا ۱۵۳؛ (۶) H. Petermann : Reisen im Orient، لائپزگ ۱۸۶۱ء؛ (۷) F. Spiegel : Erānische Altertumskunde، لائپزگ ۱۸۷۱ء، ۱ : ۹۰؛ (۸) C. Ritter : Erdkunde، ۶ : ۷۱۴ و ۸ : ۷۷۹ تا ۷۹۸؛ (۹) J. de. Morgan : Mission scientifique en Perse, étude géographique، پیرس ۱۸۹۴ء، ۲ : ۳۰۰ تا ۳۰۲؛ (۱۰) W. Tomaschek، در SBAk. Wien، ج ۱۲۱، مقالہ ۸ (۱۹۰۸ء)؛ ۶۱ تا ۶۳؛ (۱۱) G. N. Curzon : Persia and the Persian Question، لندن ۱۸۹۲ء، ۲ : ۲۳۰ تا ۲۳۶؛ (۱۲) E. Sachau : Am Euphrat und Tigris، لائپزگ ۱۹۰۰ء، ص ۱۲ تا ۱۳؛ (۱۳) A. T. Wilson : The Presian Gulf، آوکسفرڈ ۱۹۲۸ء، ص ۳۱، ۶۰، ۶۳، ۱۴۶، ۱۶۸، ۱۸۳، ۱۸۵، ۲۰۳، ۲۳۷، ۲۴۰، ۲۷۵، ۲۸۳؛ (۱۴) رزم آراء و نوتاش، فرہنگ جغرافیای ایران، ۷ : ۳۰؛ (۱۵) راہنمائے ایران (مطبوعۂ شعبۂ جغرافیۂ ایرانی جنرل سٹاف، تہران ۱۹۵۱ء)، ص ۳۰ (نقشہ شہر، ص ۶۱)۔

(L. LOCHART)

بُوشَیر : رَكَ بہ بُوشہر۔

بُوصِیر : یا اَبُوصِیر، مصر میں واقع کئی مقامات کا نام ۔ یہ ایسے مقامات کا نام ہے جہاں اوسیرس Osiris دیوتا کو خاص طور پر مقدس سمجھا جاتا تھا۔

ابوصیر کا نام اسکندریہ کے مغرب کے مضافات کے وسیع علاقے میں ملتا ہے اور Taposiris Magna کے محلِ وقوع کی یاد تازہ کرتا ہے ۔

بوصیر دریائے نیل کی شاخ دمیاط (Damietta) کے مغربی کنارے پر الغربیّہ کے صوبے میں واقع ہے ۔ قرونِ وسطٰی میں یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اور ایک قریبی بستی بنا سے ملا ہوا تھا، اسی لیے اسے ”بوصیر بنا“ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا ۔ بوصیر قدیم زمانے میں مشہور تھا ۔ یہاں ایک اسقف رہتا تھا اور یہ کُورۃ (pagarchy) کا صدر مقام تھا ۔

بوصیر السِّدر، صوبۂ الجیزۃ میں واقع ہے جہاں ابھی تک بعض اہرام موجود ہیں ۔ عبداللطیف نے اس کا جو حال قلمبند کیا ہے وہ ایک اعلٰی درجے کی دستاویز ہے، یہی بات ان اکتشافات کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جن کا ذکر اس نے اس

قصبے کے قبرستان کے سلسلے میں کیا ہے۔

وہ بوصیر جسے قرونِ وسطٰی میں بوصیر۔ قوریدس کہا جاتا تھا اور جو کم از کم گیارھویں / سترھویں صدی سے بوصیر الملق کے نام سے مشہور ہے، مصر متوسّط کی مغربی پٹی کے اندر صوبۂ فیوم کے منخل پر واقع ہے۔ چونکہ بہت سے مقامات کا نام بوصیر ہے اس لیے عرب مصنّفین کو اس امر کے تعین میں بہت دشواری پیش آئی ہے کہ [آخری] اموی خلیفہ مروان [ثانی] جہاں فوت ہوا اس بوصیر کا صحیح محلِ وقوع کون سا تھا۔ زیادہ قرین قیاس یہی ہے، اور مقامی روایت سے بھی اس کی مزید تائید ہوتی ہے کہ مروان نے اپنے آخری ایام بوصیر الملق میں گزارے تھے۔ قدامۃ نے پہلے ہی یہ اطلاع دے دی ہے۔ اس قصبے کے ارد گرد ایک چند روزہ صوبہ بوصیریہ وجود میں آ گیا تھا جو صوبجات اطفیح اور بہنسا کے درمیان واقع تھا۔

اس دستاویزی ثبوت کے مخالفین پر مشتمل مصنّفین کی ایک اور جماعت کی رائے میں امویوں کو آخری شکست بوصیر نام ہی کے اس مقام پر ہوئی تھی جو اشمونین کے بالمقابل، دریاے نیل کے دوسرے کنارے، بوصیر الملق سے تقریباً ۱۸۰ کیلومیٹر جنوب میں واقع تھا۔ اسی علاقے کے بارے میں دعوٰی کیا جاتا تھا کہ یہ فرعون کے ساحروں کا وطن تھا۔ بقول الادریسی اس کے زمانے میں بھی یہاں کے باشندے جادوگری میں کچھ نہ کچھ شہرت رکھتے تھے۔ اس خاص بوصیر کا اب کوئی نشان باقی نہیں رہا۔

اور آخر میں ایک بوصیر۔ دفدنو صوبۂ فیوم میں واقع ہے۔

مآخذ: (۱) الیعقوبی: بلدان، ص ۳۳۱، ترجمہ Wiet، ص ۱۸۰؛ (۲) قدامۃ، ص ۲۴۷؛ (۳) الادریسی: Descr. de l'Afrique، ص ۳۳، ۱۳۰، ۱۰۰؛ (۴) عبداللطیف، ص ۱۲۱، ۲۰۲ تا ۲۰۶؛ (۵) ابن مماتی، ص ۱۱۳، ۱۱۷، ۱۱۸؛ (۶) یاقوت، ۱: ۷۶۵؛ (۷) المسعودی: التنبیہ، ص ۳۲۸، ۳۳۱؛ (۸) Avertissement، ص ۴۲۳، ۴۲۷؛ (۹) ابوالفداء: تقویم، ترجمہ ۱ (الف)، ص ۱۳۸؛ (۱۰) ابن دقماق، ۴: ۱۳۱، ۵: ۱۱۰؛ (۱۱) Vattier: L'Égypte de Murtadi، طبع جدید از Wiet، دیباچہ ص ۱۰۰ تا ۱۰۱؛ (۱۲) المقریزی، طبع Wiet، ۲: ۱۹۳، ۳: ۷، ۱۲۹، ۵: ۹۶-۹۷ (جہاں مروان کی وفات کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے)؛ (۱۳) ابن جیعان، ص ۱۹۳، ۴۷، ۱۳۹، ۱۵۰، ۱۵۱؛ (۱۴) علی پاشا، ۸: ۲۰؛ ۱۰: ۶ تا ۱۱؛ (۱۵) Amélineau: Géographie، ص ۷ تا ۱۱؛ (۱۶) Salmon: Répertoire، در BIFAO، ۱: ۶۰؛ (۱۷) Breccia: Alexandrea ad Aegyptum، ص ۱۲۳ تا ۱۳۰؛ (۱۸) J. Maspero و G. Wiet: Matériaux pour servir à la géographie de l'Égypte، ص ۴۲ تا ۵۹۔

(G. Wiet)

⊗ **اَلْبُوْصِیْرِی:** ابو عبداللہ شرف الدّین محمّد [بن سعید] بن حمّاد بن محسِن (بن عبداللہ بن صنہاج ابن ہلال)۔ عربی شاعر [اور صوفی]، جن کا قصیدہ ''بُردۃ'' خاص طور پر مشہور ہے، بربری نسل سے تھے، ان کا تعلق قبیلۂ صنہاجۃ کی ایک شاخ بنو حبنون سے تھا۔ ان کے باپ مصر کے قصبۂ بوصیر (واقع میان فیوم و بنی سُویف) کے تھے اور والدہ دلاص (دریاے نیل کی مغربی جانب) کی۔ انہیں مختلف وجوہ سے ان کی نسبتیں ''الصّنہاجی'' اور ''الدّلاصی'' اور دلاص۔ بوصیر ملا کر ''الدّلاصیری'' بھی آتی ہیں، لیکن البوصیری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ یکم شوال سنہ ۶۰۸ھ (المقریزی نے سنہ ۶۰۸ یا ۶۱۰ھ بھی لکھا ہے) / ۷ مارچ سنہ ۱۲۱۲ء سہ شنبہ کو پیدا ہوئے۔ بچپن اور تعلیم کی بابت کم معلومات

ہیں ۔ بعد کو بلبیس میں [الشرقیہ کے] کاتب، یعنی محرّر (= مُبَاشِر) کے عہدے پر مامور ہوئے اور حسابی کام انجام دیتے رہے، لیکن کوئی نمایاں حیثیت نہیں حاصل کی ۔ [کچھ عرصہ بیت المقدس، مدینۂ منورہ اور مکۂ معظمہ میں بھی رہے] ۔ آخر عمر میں پنڈلی ٹوٹ جانے کی وجہ سے معذور ہو گئے تھے اور قاہرہ میں قیام پذیر ہو گئے ۔ وہیں سنہ ۶۹۶ / ۱۲۹۶ - ۱۲۹۷ء (السیوطی اور حاجی خلیفہ نے بالترتیب ۶۹۵ھ / ۱۲۹۵ - ۱۲۹۶ء اور ۶۹۴ھ / ۱۲۹۴ - ۱۲۹۵ء بھی لکھا ہے) میں انتقال کیا اور امام الشّافعی کے مقبرے کے جوار میں مدفون ہوئے ۔

البوصیری نے حفظِ قرآن کا ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی کھولا تھا ۔ انہیں سیرت سے خاص شغف تھا، اس کے ساتھ ہی عیسائیوں اور یہودیوں سے مناظرے کا بڑا شوق رکھتے تھے، اسی غرض سے انہوں نے انجیل اور توراۃ کا براہِ راست مطالعہ کیا اور جیسا کہ ان کے اشعار شاہد ہیں، مخالفین کا ردّ خود انہیں کی مقدس کتابوں سے کیا ۔ خطّاطی میں بھی بڑی مہارت اور شہرت حاصل کی ۔ [البوصیری کو تصوف اور شعر و شاعری سے بڑا لگاؤ تھا ۔ شعری حسن و لطافت، عذوبتِ الفاظ، ترکیبوں کے بانکپن کی وجہ سے ان کی شاعری کی بڑی داد دی جاتی ہے] ۔ جب الصاحب زین الدّین یعقوب بن [الزبیر] کا قرب حاصل ہوا [تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم کی مدح میں شاندار قصیدے لکھنے شروع کیے اور یہی قصائدِ نعتیہ ان کی شہرت کا باعث ہوئے، بالخصوص قصیدۂ بردہ] ۔ صوفیہ کے یہاں البوصیری کا بڑا درجہ ہے، اور انہیں بسا اوقات مرتبۂ ''غوثیۂ کبریٰ'' تک پہنچا دیا جاتا ہے ۔ انہوں نے ابوالحسن الشّاذلی کے خلیفہ ابو العبّاس المرسی (وفات بمقام اسکندریہ سنہ ۶۸۶ھ) سے طریقت سیکھی تھی ۔

البوصیری کی شاعری کو دو دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے : اوّل قبل سفر حج (جو ۶۵۴ھ کے بعد کا واقعہ ہے)، دوم بعد واپسی حج ۔ پہلے دور کے دو اہم قصیدے ہیں : ایک اللّامیۃ فی الردّ علی النصاری و الیہود، دوسرا ''ذُخْرُ المَعاد فی مُعَارَضَۃِ بَانَتْ سُعَاد'' ۔ یہ دوسرا قصیدہ، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے حضرت کعبؓ بن زُہیر کے مشہور قصیدے (وَلَکَ بہ بانت سعاد) کے مقابلے میں ہے، البتہ غزل اور تشبیب سے عاری ہے، وعظ و ارشاد اور محاسبۂ نفس ہی سے ابتدا کی گئی ہے ۔

دوسرے دور کا سب سے مشہور کارنامہ وہی قصیدۂ بُردۃ ہے جس کا اصلی عنوان ''الکواکب الدُّرِّیۃ فی مَدْحِ خَیْرِ البَرِیَّۃ'' ہے [اس مشہور قصیدے کا پس منظر یہ ہے کہ البوصیری اتفاق سے بعارضۂ فالج بیمار ہو گئے جس سے ان کے جسم کا نصف حصّہ بالکل بیکار ہو گیا ۔ البوصیری کہتے ہیں کہ میں نے بیماری کی حالت میں یہ قصیدہ ترتیب دینا شروع کیا ۔ جب یہ مکمل ہو گیا تو میں اسے بار بار پڑھتا، خدا کے حضور میں رو رو کر گڑگڑاتا، عاجزی اور تضرّع سے دعائیں مانگتا اور اللہ تعالی سے اس قصیدے کی بدولت صحت کے لیے درخواست کرتا ۔ اسی حالت میں ایک رات سو گیا تو خواب میں حضرت نبی کریم صلّی اللہ علیہ و سلّم کو دیکھا ۔ آپؐ نے اپنا دست مبارک میرے مریض جسم پر پھیرا اور ایک چادر (= بُرْدَہ) مجھ پر ڈال دی ۔ جب میں بیدار ہوا تو میں نے اپنے آپ کو صحت یاب پایا ۔ میں اٹھا اور گھر سے باہر نکل گیا ۔ پھر آہستہ آہستہ یہ قصہ مشہور ہو گیا اور دوسرے لوگوں کو بھی اس قصیدے کی برکت سے صحت و شفا نصیب ہونے لگی (فوات الوفیات، ۲ : ۴۱۸ ببعد) ۔ یہ قصیدہ ۱۶۲ ابیات پر مشتمل ہے، مطلع ۱۲ ابیات، نفس اور خواہشات نفس ۱۶، نعت رسولؐ

۳۰، مولد النبیؐ ۱۹، معجزات و دعوت ۱۰، مدح القرآن ۱۷، معراج النبیؐ ۱۳، جہاد النبیؐ ۲۲، استغفار ۱۴، مناجات ۹۔ اس شہرۂ آفاق قصیدے کا اردو، انگریزی، لاطینی، المانی، فارسی، ترکی اور بربری زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور ایک سو کے قریب عربی، فارسی، ترکی اور بربری زبانوں میں شرحیں لکھی گئیں۔ عبیداللہ بن یعقوب الفناری، ابن ہشام النحوی، خالد بن عبداللہ الازہری اور شہاب الدین القسطلانی (شارح البخاری) کی شروح خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بہت سے شعرا نے قصیدۂ بردہ کی تثلیث، تخمیس، تسبیع اور تشطیر رقم کی ہیں]۔ یہ قصیدہ بعض حلقوں میں بکثرت پڑھا جاتا ہے اور ان کے عقیدے میں اس کے مختلف ابیات مختلف بیماریوں اور تکلیفوں سے نجات دلانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ [عبدالسلام بن ادریس المراکشی نے اسی موضوع پر ایک کتاب بعنوان خواص البردۃ فی برء الداء لکھی ہے)۔ ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب [رک باں] نے اس قصیدے سے متعلقہ اوہام سے بیزاری اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

البوصیری کا ایک اور نعتیہ قصیدہ "الہمزیۃ فی المدائح النبویۃ" بڑی خاصا مقبول ہے۔ البوصیری کی شاعری پر عام نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مداح شعرا خاص طور پر حضرت حسانؓ بن ثابت اور حضرت کعبؓ بن زہیر کی پیروی کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ الفاظ کی ترکیب گتھی ہوئی اور عبارت چست ہے۔ نعت رسولؐ کے علاوہ دوسرے قصائد میں ملازمین حکومت کے احوال کا بیان اور ان کی نااہلی، بدخلقی اور رشوت ستانی کی شکایت غالب ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ان کے ہاں مفادِ عامہ کا ایک تصور پایا جاتا ہے اور وہ اسی کی وکالت کرتے ہیں۔

البوصیری کا دیوان ۱۹۵۵ء میں مصر سے شائع ہوا ہے۔ دیوان البوصیری (طبع محمد سعید کیلانی، مطبوعۂ مصطفٰی البابی الحلبی، قاہرہ) کا متن دارالکتب المصریہ کے دو قلمی نسخوں (۲۳۱۱ ادب و التیموریہ، ۸۲۸ شعر، مؤخرالذکر نسخے کو السید محمود شکری الآلوسی نے اپنے لیے نقل کرایا تھا) پر مبنی ہے۔

مآخذ: (۱) ابن شاکر الکتبی: فوات الوفیات (طبع محمد محی الدین عبدالحمید)، مصر ۱۹۵۱ء، ۲ : ۳۶۲ تا ۳۶۹؛ (۲) السیوطی: حسن المحاضرۃ، القاہرہ ۱۲۹۹ھ، ۱ : ۲۹۰؛ (۳) ابن تغری بردی: المنہل الصافی (مخطوطۂ دارالکتب المصریہ، عدد ۱۱۱۳، تاریخ)، ۳ : ۱۰۸ تا ۱۰۹؛ (۴) المقریزی: المقفی (مخطوطۂ دارالکتب المصریۃ، عدد ۲۷۲۳، تاریخ)؛ (۵) براکلمان، ۱ : ۲۶۴ تا ۲۶۷؛ تکملہ، ۱ : ۴۶۷ تا ۴۷۲؛ (۶) البستانی: دائرۃ المعارف، بذیل مادۂ بردۃ، بوصیر؛ (۷) وہی، بذیل مادہ؛ (۸) ابن العماد: شذرات الذہب، ۵ : ۴۳۲؛ (۹) علی پاشا مبارک: الخطط الجدیدۃ، ۱۰ : ۸]۔

(سید محمد یوسف [و ادارہ])

بُوعَبْدَل: رک بہ نصر، بنو۔

بوعلی قلندر: رک بہ ابوعلی (بوعلی) قلندر۔

بوعلی سینا: رک بہ ابن سینا۔

بوغا الشرابی: رک بہ بغا الشرابی۔

بوغا الکبیر: رک بہ بغا الکبیر۔

بوغاز: [رک بہ بوغاز ایچی (Bogaz-ici)]۔

بوغاز ایچی: (Bogaz-ici = بوغازیچی)، یعنی آبنائے کا اندرونی حصہ؛ ایک اصطلاح جو ترکی میں باسفورس کے لیے اور بالخصوص ان سواحل، قطعاتِ آب، خلیجوں اور راسوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو باسفورس کے درمیانی حصے میں داخل ہیں۔ باسفورس کا نام (یونانی Βόσπορος،

لاطینی: Bosporus، Bosphorus) تھریسی اصل کے کسی لفظ سے مشتق ہے (قب Pauly-Wissowa)۔ یہ تنگ آبنائے، یعنی تھریسی باسفورس (جو اس نام سے اس لیے پکاری جاتی ہے کہ سِمّیری (Cimmerian) باسفورس سے اس کی تمیز ہو سکے جو بحر آزوو Azov اور بحر اسود کے درمیان ہے اور آبنائے کِرچ Kertch کہلاتی ہے) بحیرۂ مارمورا (جسے زمانِ قدیم میں Propontis کہتے تھے اور ترک میں مرمرہ دِنِزی Marmara Denizi کہلاتی ہے) اور بحیرۂ اسود (جو قدیم زمانے میں Pontus Euxinus کہلاتا تھا اور جسے ترک قرہ دِنِز کہتے ہیں) کو ملاتی ہے۔ بوزنطی اس کا ذکر کرتے وقت اکثر اسے صرف τὸ Στενόν، یعنی ''آبنائے'' کہتے تھے اور یہ لاطینی لوگوں میں صلیبی جنگوں کے زمانے میں "brachium S. Georgii" کے نام سے مشہور تھی (قب Tomaschek)۔ ترکی ماخذ میں اسے بہت سے مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے، مثلاً خلیج بحرِ سیاہ، خلیج قسطنطینیہ، قسطنطینیہ بوغازی، استانبول بوغازی وغیرہ۔ لفظ بوغاز کے معنی ترکی میں گلے یا حلقوم کے ہیں، لیکن جغرافیائی ناموں میں اس کا مفہوم ''تنگنائے'' یا ''آبنائے'' ہوتا ہے (قب مثلاً کُولِک بوغازی Külek Boghazi یعنی Clician Gates) یا چَناق قلعہ بوغازی Čanak-Kal'e Boghazi در دانیال (Dardanelles).

باسفورس کی اوسط لمبائی تیس کیلومیٹر ہے اور اس کی چوڑائی مختلف مقامات پر تقریباً سات سو میٹر سے لے کر تین ہزار پانچ سو پچاس میٹر تک ہے۔ اس گزرگاہ آب کے درمیان پانی کی ایک بڑی تیز دھار (تین سے پانچ کیلومیٹر تک فی گھنٹہ) بحیرۂ اسود سے بحیرۂ مارمورا کی طرف بہتی ہے، لیکن اس کے مقابل ایک اَور دھار سطح آب کے نیچے اور سواحل کے ساتھ ساتھ بالکل مخالف سمت میں بہتی ہے۔ ان مشہورتر مقامات کے جو اس آبنائے کے کناروں پر پائے جاتے ہیں نام حسب ذیل ہیں (یہ نام ان کی رائج الوقت ترکی شکلوں میں دیے گئے ہیں): یورپ کے ساحل پر جنوب سے شمال کی طرف علی الترتیب یہ مواضع موجود ہیں: توپ خانہ (بوزنطی Argyropolis)، بِشِک طاش (بوزنطی Diplokionion)، اورتہ کوی (بوزنطی Hagios Phokas)، آرناود کویی (بوزنطی Anaplous)، بِبِک (بوزنطی Challai)، روم ایلی حصاری (بوزنطی Phoneus)، اِستینیہ (بوزنطی Sosthenion)، ینی کوی (بوزنطی Neapolis)، طرابیہ (بوزنطی Therapeia)، بویوک دره (بوزنطی Kalos Agros) اور روم ایلی قواغی۔ ایشیائی ساحل پر علی الترتیب شمال سے جنوب کی طرف یہ مقامات ہیں: آنادولو [=آناطولی] قواغی (بوزنطی Heiron)، بے کوز، پاشا باغچہ سی، چبوقلو (بوزنطی Irenaeon)، قانلیجہ، آناطولی حصاری، قندیللی (بوزنطی Brochthoi)، چِنگل کویی، بیلربی، قوزغون جُق، (Kuzguncuk، بوزنطی Chrysokeramos) اور اسکودار (سقوطری، بوزنطی Chrysopolis جو Skoutarion میں ایک شاہی محل تھا)۔ زمانۂ قدیم کے خیال کے مطابق اصلی باسفورس اس جگہ ختم ہو جاتی ہے جہاں آج کل روم ایلی قواغی اور آناطولی قواغی واقع ہیں اور اس خط کے باہر شمال کی جانب کے سمندر کو بحیرۂ اسود کا حصہ خیال کیا جاتا تھا۔

بوزنطیوں نے باسفورس کے شمالی سرے کو روم ایلی قواغی اور آناطولی قواغی کے علاقے میں مستحکم کیا تھا جہاں آبنائے کی چوڑائی تنگ ہو کر تقریباً ایک ہزار میٹر رہ جاتی ہے۔ بوزنطی قلعے کے نشانات اب بھی روم ایلی قواغی کے شمال میں پہچانے جا سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک روایت چلی آتی ہے کہ عثمانی سلطان محمد ثانی نے اس پرانے قلعے (اِسکی قلعہ) کو مسمار کر دیا اور اس کا ملبہ ۸۵۶ھ / ۱۴۵۲ء میں روم ایلی حصاری کی تعمیر میں

کام آیا (قب Gabriel، ص ۷۷ اور ۸۱)۔ آناطولی قواغی میں بھی ایک بوزنطی قلعہ پایا جاتا تھا، جسے ترک یوروس قلعہ سی کہتے تھے (قب Byz. Hieron) یا جنویز قلعہ سی۔ مؤخرالذکر نام اس واقعے سے نکلا ہے کہ ۱۳۵۰ء میں جنیوا والوں نے باسفورس کے شمالی حصے کی دفاع کی قیادت بوزنطیوں سے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

باسفورس کا ساحلی علاقہ مسلمانوں کی حکومت میں اس وقت آیا جب چودھویں اور پندرھویں صدی میں عثمانلی ترکوں کی سلطنت بڑھی اور پھیلی۔ عثمانلی سلطان بایزید اول (۷۹۱ھ/ ۱۳۸۹ء تا ۸۰۵ھ/ ۱۴۰۳ء) نے آبنائے کے ایشیائی ساحل پر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا جسے آناطولی حصاری کہتے ہیں (یہ گوزلجہ حصاری کے نام سے بھی معروف ہے)۔ سلطان محمد ثانی نے ۸۵۶ھ/ ۱۴۵۲ء میں اس میں جا بجا اضافے اور اصلاحیں کیں۔ آناطولی حصاری کے مقابل یورپی ساحل پر اور اس مقام پر جسے بوزنطی Phoneus (یونانی Φωνεύς نیز Φονέας اور Φωνεας) کہتے تھے، محمد ثانی نے اسی سال روم ایلی حصاری تعمیر کیا (اسے اکثر بوغاز کیسن بھی کہتے ہیں، یعنی جو گلا کاٹتا ہے یا جو آبنائے کو قطع کرتا ہے)۔ سلطان نے ان دونوں قلعوں کو توپخانوں سے آراستہ کیا جن سے باسفورس کے، جو یہاں سب سے زیادہ تنگ ہو گئی ہے (تقریباً ۷۰۰ میٹر)، مقابل کے کنارے پر گولہ باری ہو سکتی تھی۔ ۸۵۷ھ/ ۱۴۵۳ء میں جب قسطنطینیہ فتح ہو گیا تو بحیرۂ اسود درحقیقت ایک ترکی جھیل بن کر رہ گیا۔ ۸۶۵ھ/ ۱۴۶۱ء اور ۸۸۰ھ/ ۱۴۷۵ء میں سلطان محمد ثانی نے بحیرۂ اسود پر جنیوا والوں کے سابق اقتدار کو ختم کر دیا۔ علاوہ بریں ۸۸۰ھ/ ۱۴۷۵ء ہی میں قرم (کریمیا) کے تاتاریوں کا خانۃ آخر کار عثمانی ترکوں کا باج گذار بن کر رہ گیا۔ اب روم ایلی حصاری اور آناطولی حصاری اور اسی کے ساتھ ہی بوزنطیوں کے وہ سارے قدیم استحکامات جو باسفورس کے شمالی سرے میں باقی رہ گئے ہوے اپنی سابقہ اہمیت کھو بیٹھے۔

سکون و اطمینان کی ایک طویل مدت کے بعد بالآخر شمال کی جانب سے ایک خطرے کے ڈراؤنے آثار اس وقت نمودار ہوے جب قازق Cossack بحری لٹیروں نے ۱۰۲۳ھ/ ۱۶۱۴ء میں بحیرۂ اسود کے جنوبی کنارے پر سنوپ Sinope کو لوٹ لیا۔ اس کے دس سال بعد ۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۳-۱۶۲۴ء میں انہوں نے خود باسفورس کو بھی قتل و غارت کا نشانہ بنایا اور یورپی ساحل کے مقامات صاری یر، بویوک درہ طرابیہ اور ینی کوی کو تباہ کر ڈالا۔ اس خطرے کو دور کرنے کے لیے سلطان مراد رابع کے عہد (۱۰۳۲ھ/ ۱۶۲۳ء تا ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۴۰ء) میں دو نئے قلعے بنائے گئے، ایک روم ایلی قواغی کے علاقے میں اور دوسرا آناطولی قواغی کے نزدیک۔ ان دو قلعوں کا ذکر (جنھیں باسفورس کے اس حصے کے دفاع کے لیے بوزنطیوں کے انتظامات کے ساتھ خلط ملط نہ کرنا چاہیے) اولیا چلبی (۱ : ۴۶۱) نے ”قلعۂ کلید البحر“ کے نام سے کیا ہے، یعنی وہ قلعے جو قرہ دنیز، یعنی بحیرۂ اسود کے لیے چابی کا کام دیتے تھے۔ اب ان کے آثار باقی نہیں، کیونکہ یہ دونوں انیسویں صدی کے دوران میں منہدم کر دیے گئے تھے (Gabriel، ص ۸۲)۔

جب عثمانی ترک ۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۸ء تا ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء میں روس کے خلاف لڑائی میں ناکام رہے تو انہوں نے باسفورس کے دفاع کی نئے سرے سے تنظیم کی، چنانچہ ۱۱۸۷ھ/ ۱۷۷۳-۱۷۷۴ء میں بحیرۂ اسود کے یورپی ساحل پر قلعۂ بغداد جق (Kilyos) اور مشرقی ساحل پر قلعۂ

ریواند جق کے مقام پر جو آبنائے سے ذرا ہی باہر تھا، اور اسی طرح آبنائے سے شمال کی سمت جانے کے راستے پر واقع فنر روم ایلی اور فنر آناطولی کے نزدیک نئے استحکامات بنا دیے گئے۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد یورپی ساحل پر غریب چہ اور بویوک لیمان کے مقام پر اور ایشیائی ساحل پر روم ایلی اور آناطولی قواغی سے اوپر پویراز لیمانی میں مزید قلعے تعمیر کیے گئے۔ دفاع کے اس نظام کا نام ''قلاع سَبعہ'' (''سات قلعے'') رکھا گیا۔ سلطان سلیم ثالث کے عہد (۱۲۰۳ھ/ ۱۷۸۹ء تا ۱۲۲۲ھ/ ۱۸۰۷ء) میں باسفورس کے اس جدید نظام دفاع کی توسیع اور تکمیل کی کوشش برابر جاری رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان قدیم استحکامات کی مرمت اور تجدید ہوتی رہی جو باسفورس خاص کی حدود کے اندر داخل تھے اور روم ایلی اور آناطولی قواغی کے جنوب میں واقع تھے اور بحیرۂ مارمورا کی سمت میں تھے۔ تاہم اسی زمانے میں ''مشرقی سوال'' کا اس کی جدید شکل میں ظہور بھی ہوا، دردانیال اور باسفورس پر قبضہ اور اس کا دفاع اب نہ صرف سلطنت عثمانیہ ہی کے لیے بلکہ یورپ کی بڑی طاقتوں کے لیے بھی ایک اہم مسئلہ بن گیا جنھوں نے انیسویں اور بیسویں صدی میں اس آبنائے پر ایک بین الاقوامی اقتدار قائم کر دیا جو بہت کچھ معرض نزاع میں رہا ہے اور جس میں اکثر تغیر ہوتا رہتا ہے۔

مآخذ: (۱) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، ۱، استانبول ۱۳۱۴ھ: ۴۰۳ ببعد؛ (۲) حاجی خلیفہ: جہان نما، ص ۶۶۳؛ (۳) P. Gyllius: *De Bosporo Thracio*، Lyon ۱۵۶۱ء؛ (۴) Baron de Tott: *Mémoires sur les Turcs et les Tartares*، Maestricht ۱۷۸۵ء، حصّہ ۳: ص ۱۲۲ ببعد؛ (۵) J.B. Lechevalier: *Voyage de la Proponside et du Pont-Euxin*، پیرس ۱۸۰۰ء؛ (۶) Ch. Pertusier: *Promenades Pittoresques dans Constantinople et sur les rives du Bosphore*، پیرس ۱۸۱۵ء تا ۱۸۱۷ء؛ (۷) J. Von Hammer-Purgstall: *Constantinopolis und der Bosporos*، Pesrth ۱۸۲۲ء؛ (۸) Comte Andréossy: *Constantinople et le Bosphore de Thrace*، پیرس ۱۸۲۸ء؛ (۹) J. Ebersholt: *Constantinople Byzantine et les Voyageurs du Levant*، پیرس ۱۹۱۸ء؛ (۱۰) W. Tomaschek: *Zur historischen Topograqphie von Kleinasien im Mittelalter* (SBAk. Wien، Phil-Hist-Cl., Bd-CXXIV)، ویانا ۱۸۹۱ء، ص ۲ تا ۳؛ (۱۱) R. Janin: *Constantinople Byzantine: Développement Urbain et Répertoire Topographique* (Institut Francais d'Études Byzantines: Archives de l'Orient Chrétien, No. 4)، پیرس ۱۹۵۰ء، ص ۴۲۶ تا ۴۴۴؛ (۱۲) وہی مصنّف: *d'Eglise Byzantine sur les rives du Bosphore* (Côte Asiatique)، در *Revue des Études Byzantines*، جلد ۱۲، پیرس ۱۹۵۴ء: ص ۶۹ تا ۹۹؛ (۱۳) S. Toy: *The Castles of the Bosporus*، آوکسفرڈ ۱۹۳۰ء؛ (۱۴) A. Gabriel: *Châteaux Turcs du Bosphore* (*Mémoires de l'Institut Français d'Archéologie de Stamboul*)، شمارہ ۲، پیرس ۱۹۴۳ء؛ (۱۵) E. Chaput: *Voyges d'études géologiques . . . . en Turquie*، پیرس ۱۹۳۶ء، ص ۱۰۱ ببعد، ۲۲۷ ببعد، ۲۸۷ ببعد؛ (۱۶) A. Merz: *Hydrographische Untersuchungen in Bosporus und Dardanellen* (*Veröffentlichungen des Instituts für Meereskunde*، Neue Folge, Reihe A, Heft 18) beorb. L. Möller، beorb. L. Möller برلن ۱۹۲۸ء؛ (۱۷) P. Ullyot and Orhan Ilgaz: *The Hydrography of the Bosphorus*، در 2 *Geographical Review*، ج ۳۶، شمارہ ۱، ۱۹۴۶ء،

ص ۴۴ ببعد؛ (۱۸) Pauly-Wissowa، ج ۳/۱ (۱۸۹۷ء)، بذیل مادۂ Bospors؛ عمود ۷۴۱ تا ۷۵۷؛ (۱۹) وُوٓ، ترک بذیل مادۂ بوغازایچی Bogaziçi (از بسیم دارکوت و اسم ۔ طیّب گوک بلگین)؛ (۲۰) اٹھارھویں سے بیسویں صدی تک باسفورس کی بین الاقوامی حیثیت کے لیے قب A. Sorel: *La Question d'Orient au XVIIIᵉ siècle*، پیرس ۱۸۸۹ء؛ (۲۱) S. Goriainov: *Le Bosphore et les Dardanelles*، پیرس ۱۹۱۰ء؛ (۲۲) E. Driault: *La Question d'Orient depuis ses origines jusqu'à la paix de Sèvres*، پیرس ۱۹۲۱ء؛ اور (۲۳) *La Question d'Orient*، پیرس ۱۹۲۸ء؛ (۲۴) P. P. Graves: *The Question of the Straits*، لنڈن ۱۹۳۱ء؛ (۲۵) جمال توکین Cemal Tukin: عثمانلی امپراطورلغی دورنده بوغازلر مسئلہ سی، استانبول ۱۹۴۷ء؛ (۲۶) *Constantinople et les Détroits, documents secrets*، ماسکو ۱۹۳۲ء؛ (۲۷) E. Brüel: *International Straits: A Treatise on International Law*، ج ۲، حصہ ۳ (ترک آبنائیں)، کوپن ہیگن ۔ لنڈن ۱۹۴۷ء؛ (۲۸) *The Problem of the Turkish Straits*، ریاستہائے متحدہ امریکہ کا دارالطباعت، واشنگٹن ۱۹۴۷ء.

(V. J. PARRY)

• **بُوق**: اسم جنس ہے اور ہر قسم کے قرنا، نرسنگا یا نفیری کے لیے بولا جاتا ہے ۔ پھونک سے بجنے والے کُل آلات جو پیالی کی شکل کے ایک دہانے کے ذریعے بجائے جاتے ہیں دو قسموں میں منقسم ہو سکتے ہیں: (۱) نرسنگا یا مخروطی نلکی کی نوع کے آلات اور (۲) تُرم یا اسطوانی نلکی کے قسم کے آلات.

نرسنگا کی نوع کے آلات: خواہ وہ "صُور" ہوں یا "ناقُور" جو قرآن حکیم میں مذکور ہیں ۶ [الانعام]: ۷۳؛ ۷۴ [المدّثر]: ۸؛ ۷۸ [النّبا]: ۱۸) سب نرسنگے ہیں، امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ / ۸۵۵ء) اور الجوہری (م حدود ۳۹۶ھ / ۱۰۰۵ء) فرماتے ہیں کہ قدیم ایرانی اور عرب یقیناً جانوروں کے سینگ کی طرح کے ایک مخروطی نلکی کے قسم کے آلے سے واقف تھے ۔ اس کی مثال چوتھی صدی قبل مسیح کے یونانی فن میں بھی مل سکتی ہے، جس میں ایک ایشیائی فوجی سپاہی کو ایک ایسا ہی آلہ بجاتے ہوئے دکھایا گیا ہے، جب کہ ایک یونانی فوجی سپاہی ایک سیدھی تُرم بجا رہا ہے (Gerhard: *Apulische Vasen*، لوح ۲) ۔ معلوم ہوتا ہے کہ عرب قَرْن کی طرح کے ایک ہلالی شکل کے نرسنگے سے واقف تھے (Seybold: *Glossarium Latino - Arabicum*، ص ۵۱۹)، اس کے ہم مخرج الفاظ آشوری زبان میں "قرنُو" اور عبرانی زبان میں "قِرِن" کی شکل میں ملتے ہیں؛ یہ آلہ ایران میں ابھی تک سیلانی درویش استعمال کرتے ہیں ۔ ترکی روایت کے مطابق "درویش بُرُوسُو" (بُوری‌سی) (درویشی نرسنگا) کی ایجاد ایران کے افسانوی بادشاہ منوچہر نے کی تھی (اولیا چلبی، ۱ / ۲ : ۲۳۸)، اس آلے کے نمونے کے لیے دیکھیے Advielle، ص ۹ اور Lavignac، ص ۳۰۷۷، جو اسے غلطی سے "نفیر" کہتے ہیں ۔ حقیقی نمونے عجائب گھروں میں دیکھے جا سکتے ہیں، مثلاً The Crosby Browne Collection، نیویارک، عدد ۲۳۵۴ ۔ چوتھی تا چھٹی صدی ہجری / دسویں تا بارھویں صدی عیسوی کا ایک بہت بڑا ہسپانوی مُوری ہاتھی دانت کا نرسنگا وکٹوریا و البرٹ میوزیم لنڈن میں موجود ہے (عدد ۲۹۵۳ / ۱۸۶۲) ۔ اس سے بڑے بڑے آلات بھی استعمال ہوتے تھے ۔ ابن بطّوطہ (م ۷۷۹ھ / ۱۳۷۷ء) نے سوڈان میں ہاتھی دانت کے بنے ہوئے ایک ایسے ہی آلے کا ذکر کیا ہے (*Voyages*، ۴ : ۴۱۱) ۔ اسی سے عاجی نرسنگے (Oliphant horn) کی اصطلاح وضع ہوئی ہے ۔

ایک اندلسی عرب الشقندی (م ۶۲۹ھ / ۱۲۳۱ء) ایک دیوهیکل قرن یا نرسنگے کا ذکر کرتا ہے جو ''ابوقرون'' (نرسنگوں کا باوا) کے نام سے معروف ہے، جیسا کہ المقری نے بیان کیا ہے (نفح الطیب، ۲ : ۱۴۴)، جو دیوهیکل نرسنگے (''البوق انکبیر'') کی مانند ہوگا، یعنی قد آدم، جس کا ذکر محمد الصغیر نے کیا ہے (تذکرة النسیان، ص ۴۵).

جزیرہ نمائے عرب کے رہنے والوں کو دوسری صدی هجری / آٹھویں صدی عیسوی میں ایک ایسے نرسنگے کا حال معلوم تھا جو گھونگے کا بنا ہوا تھا۔ اللیث بن المظفر لکھتا ہے کہ اسے آٹا پیسنے کی چکیوں والے استعمال کرتے تھے، اور یہ ''منقاف'' یعنی کوڑی کے مشابہ بل کھایا ہوا گھونگا تھا، جو بظاہر هندوستان کے ''سنکھ'' سے ملتا جلتا تھا (Day: Music and Musical Instruments of Southern India، ص ۱۰۱)۔ اسی آلۂ موسیقی کو عرب بوق کہا کرتے تھے۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں یہ جنگ میں کام آنے والا آلہ نہیں تھا، اس لیے کہ اس زمانے میں عرب لڑائی میں سنکھ یا قرم استعمال نہیں کرتے تھے (ابن خلدون : مقدمة، ۱۷ : ۴۴)۔ ایک شاعر، جس کا بیان الاصمعی (م ۸۲۸ء) نے نقل کیا ہے، لکھتا ہے کہ بوق اس مقصد کے لیے نصرانی استعمال کیا کرتے تھے، اور بقول الجوهری عربوں نے اس کا جنگی استعمال انہیں سے سیکھا ہے۔ حقیقت میں لفظ بوق کا اشتقاق یا تو یونانی لفظ ''Bwxávn'' یا لاطینی ''buccina'' سے ہے (ڈوزی : suppl.)، گو تاج العروس میں اس کا اشتقاق فارسی لفظ بوری سے بیان کیا گیا ہے جو صریحاً بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے (Lane : Lexicon)۔ آٹھویں صدی میلادی میں اخوان الصفاء نے صوتیات پر بحث کرتے ہوئے مثال کے طور پر ''بوق'' کا ذکر کیا ہے۔ اسی زمانے سے ''بوق'' تمام بلاد اسلامیہ میں جنگی اور جلوسوں کی موسیقی میں اہم کردار ادا کرنے لگا (دیکھیے طبل خانہ)۔ الف لیلة و لیلة (طبع میکناٹن Macnaghten، ۱ : ۸۰؛ ۲ : ۳۸۲، ۳۰۲) میں ان مقاصد کے لیے وہ مستقل استعمال کیا جاتا ہے، حالانکہ ''نفیر'' یا ''قرم'' کا ذکر صرف ایک ہی مرتبہ آیا ہے (۲ : ۵۰۶)؛ تاهم یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ''بوق'' کی اصطلاح ان تمام آلاتِ موسیقی کے لیے استعمال ہوتی تھی جو مخروطی نلکی کی طرح ہوتے تھے، چاہے ان کی شکل هلالی ہوتی یا سیدھی، اور اس بات کا لحاظ نہیں تھا کہ وہ گھونگے، سینگ یا دھات کی بنی ہوتی ہے۔ ضمناً دھات کے سینگ (ترکی ''بورو'') کے متعلق یہ دعوٰی کیا جاتا ہے کہ اسے پانچویں صدی هجری / گیارھویں صدی عیسوی کے سلجوقیوں نے رائج کیا تھا (اولیا چلبی، ۱/۲ : ۲۳۸)، لیکن اس بات کے پیش نظر کہ دھات کے آلاتِ موسیقی ایرانی اور بوزنطی اس سے بہت پہلے استعمال کرتے تھے یہ بیان تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ فارسی میں ''بوق'' کا ذکر فردوسی (م ۴۱۱ھ/۱۰۲۰ء) کے زمانے سے چلا آتا ہے اور قیاس یہ ہوتا ہے کہ وہ آلۂ موسیقی، سیدھے سینگوں سے ذرا مختلف تھا جنہیں طاقِ بستان کے مجسموں (۵۹۰ تا ۶۲۸ء) میں دکھایا گیا ہے اور وہاں یہ قسم ابھی تک پائی جاتی ہے (Advielle، ص ۹؛ Lavignac، ص ۳۰۷۵)۔ اسلامی اندلس میں الحکم ثانی (م ۳۶۶ھ/۹۷۶ء) کے بوقات پر سونے کے پترے چڑھائے جاتے تھے۔ اسی فرمانروا نے یہ اختراع کی کہ نلکی میں سوراخ کیے تاکہ ان پر انگلیاں حرکت کر سکیں اور اسے بجانے کے لیے منہ کی جانب کاسہ نما منہنال کے بجائے ایک نے داخل کی اور یوں سکسوفون کی قسم کا ایک آلۂ موسیقی ایجاد کیا [رک بہ مزمار]۔ هسپانوی alboque البوق اسی کی یادگار ہے.

"بوق" کا ترکی اور ایرانی مترادف "بُورُو" ("بُورِی") تھا (حاجی خلیفہ: ۱ : ۳۰۰؛ بشکی، بذیل مادّۂ "بوق"؛ اولیا چلبی، ۱ / ۲ : ۲۳۸؛ Toderini، ۱ : ۲۳۸) - یہ لفظ جدید مصری اور شامی عربی میں بھی ملتا ہے (ایمری: English-Arabic Vocabulary، بذیل مادّۂ Bugle؛ Ronzevalle، در MFOB، ۹ : ۲۹) - بلقان کی زبان میں یہ لفظ "بُورُو" bore اور بوریہ Boriye ہو گیا ہے (قب سنسکرت کا "بھریا" Bhariya اور گھانا زبان کا بورو buro) - چغتائی زبان میں "بُرغُو" یا "بُورغُو" ایک ایسے بڑے نرسنگے کو کہتے ہیں جس کا رواج مغل اور تاتاری حکمرانوں کے زمانے میں اسلامی لشکروں میں ہو گیا تھا - ابن غَیبی (م ۱۴۳۵ء) لکھتا ہے کہ یہ آلہ نفیر یا تُرم سے زیادہ لمبا ہوا کرتا تھا، اور ہندوستان میں بُرگُہ Buruga کے نام سے اب تک باقی ہے (Day، ص ۱۰۳؛ Lavignac، ص ۳۰۸)، جہاں اسے "کرنا" [= قرنا] بھی کہتے ہیں؛ اسی نوع کا ایک اور آلۂ موسیقی، جس کا ذکر عرب مصنّفین نے کیا ہے، "شَبُّور" ہے - الجوہری لکھتا ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ نہیں اور مجد الدین ابن الأثیر (م ۱۲۱۰ء) نے صحیح طور پر قیاس کیا ہے کہ یہ عبرانی زبان کے "شوفر" سے مستعار لیا گیا تھا - فردوسی "شیپور" کو قدیم عسکری آلاتِ موسیقی میں سے شمار کرتا ہے - A. X. Idelsohn نے جس عربی لفظ "شفر" کی موجودگی کا ذکر کیا ہے (*Jewish Music*، ص ۳۹۵، اور J. Reider در *J Q R*، جنوری ۱۹۳۴ء) اسے بغیر تصدیق کے تسلیم نہیں کرنا چاہیے - Fetis "شَبُّور" کے نام کے تحت ایک جدید عربی تُرم کا ذکر کرتا ہے (*Hist. gén.*، ۲ : ۱۰۴) لیکن دیکھیے Mahillon (۱ : ۱۸۳؛ نیز *Saturday Review*، جون ۱۸۸۲ء، ص ۶۹۶).

(۳) تُرم کے نمونے کے آلات: بیلن کی شکل کے نالی والے آلات میں سب سے بڑا آلہ "نفیر" ہے؛ گو یہ نام اکثر اوقات سنکھ کی قسم کے بالکل سیدھے آلے کے لیے استعمال ہوتا ہے (دیکھیے Host: *Nachrichten von Marokos og Fes*، لوحہ ۳۱)؛ اس ضمن میں "نفیر" کا نام پہلے پہل پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوقیوں کے زمانے میں آتا ہے، گو اس زمانے سے پہلے کے لوگ بھی اس قسم کے آلۂ موسیقی سے واقف ہو سکتے ہیں - Kurt Sachs (*Reallexikon der Musik-instrumente*، بذیل مادّہ) غلطی سے اس لفظ کو "نَفَخَ" بمعنی پھونک مارنا سے مأخوذ سمجھتا ہے - اس اصطلاح "نفیر" کے اصلی معنی لڑائی کی طرف بلانے کے تھے اور اس لیے جو تُرم اس مقصد کے لیے وہ استعمال کرتے تھے اسے "بُوق النَّفیر" یعنی ایک جنگی سنکھ یا تُرم کہنے لگے؛ ابن الطِّقطَقی: **الفخری**، ص ۳۰ میں ایک بڑے بُوق کا ذکر کرتا ہے جو بوق النَّفیر کے مشابہ تھا، جس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عام بُوق بہ نسبت نفیر کے حجم یا لمبائی میں چھوٹا ہوا کرتا تھا - نفیر کی تیز و شوخ آواز، جو غالباً اس کی بیلن نما شکل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، فوج کو ہدایت دینے کے لیے بُوق کی بھدّی آواز سے، جو اس کی مخروطی نلکی سے نکلتی ہے، کہیں بہتر ہوتی ہے - اُن دونوں آلات کا فرق ان افعال سے واضح ہو جاتا ہے جو ان کے بجانے کے لیے عربی زبان میں استعمال ہوتے ہیں، مثال کے طور پر ہم پڑھتے ہیں کہ بُوقی نے اپنا بُوق پھونکا (نَفَخَ)، لیکن نفیر کے بجانے کے لیے لفظ "صَاحَ" (یعنی چنگھاڑا) استعمال ہوتا ہے، مختلف قسم کے نفیروں اور بوقوں کے لیے، جو فوجی باجوں میں استعمال ہوتے ہیں، رک بہ طبل خانہ - ابن غیبی کے زمانے میں نفیر کی لمبائی ایک سو اڑسٹھ سنٹی میٹر یعنی

دو گز کے برابر ہوتی تھی،

بقول ابن غیبی کَرْنا [= قرنا]، ایک قسم کا تُرم تھا جو اپنی نلکی کے درمیان میں 'S' کی شکل میں مڑا ہوا تھا۔ ان میں سے بعض کی لمبائی بہت ہی زیادہ ہوتی تھی۔ فارسی لغات میں اس لفظ کا املا ''کَرّنائے'' لکھا ہے اور شاہنامۂ فردوسی میں بھی تلفظ اختیار کیا گیا ہے۔ عام طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے (Buhle، ص ۲۸؛ Schlesinger، ص ۲۷؛ ۳۲٦، ۳۵۳؛ Galpin، ص ۲۰۰) کہ بیلن جیسے نلکی کے آلاتِ موسیقی مشرق سے مستعار لیے گئے تھے۔ شاید Buccins Turcs اور cors Sarrasinois میں، جو صلیبی جنگوں کے وقائع نویسوں کے نوشتوں میں محفوظ ہیں، ''نفیر'' اور ''کرنا'' بھی شامل تھے؛ شاہ رچرڈ (Richard Coeur de Lion) تیسری صلیبی جنگ (۱۱۸۹ تا ۱۱۹۲ء) میں tubae، litui، corni اور buccinae سے اچھی طرح لیس تھا، لیکن ہم مقابلہ میں مسینہ Messina کے مقام پر ایک ایسے تُرم کے متعلق پڑھتے ہیں جو tuba سے مختلف تھا۔ کیا یہ اس جزیرے میں Hohenstaufen مسلمانوں کے لشکر کی ''نفیر'' ہو سکتی ہے؟ پھر بھی اگر مغرب بیلن نما نفیر کے لیے مشرق کا مرہونِ منت تھا تو اس احسان کا بدلہ بھی اتار دیا گیا تھا، چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ مراکش میں سلطان المنصور (۱۵۷٦ تا ۱٦۰۲ء) کے تحت ''طُرُنبطہ'' (ہسپانوی زبان میں Trompeta)، جو پیتل کا بنا ہوتا تھا، استعمال ہوتا تھا اور نفیر جتنا لمبا تھا (تذکرۃ النسیان، ص ۱۷، مترجم ''نفیر'' لکھتا ہے)۔ ترک بھی یورپی تُرم (Türumpata borusu) تیز انگریزی تُرم (ingiliz borusu) سے واقف تھے۔ انگریزی تُرم گلے میں ڈالنے والا جدید آلۂ موسیقی ہے (اولیا چلبی، ۱/ ۲ : ۲۳۸)۔ Niebuhr اور Villoteau دونوں نے سترھویں تا انیسویں صدی عیسوی کے آلاتِ موسیقی کے فنی نقشے اور تفصیلات دی ہیں۔

مآخذ: (۱) ابن غیبی [: جامع الالحان]، Bodleian مخطوطہ (Marsh، عدد ۲۸۲، ورق ۸۰)؛ (۲) ابوالفضل: آئینِ اکبری، طبع Blochmann، کلکتہ ۱۸۷۳ء؛ (۳) Advielle: *La musique chez les Persans*، پیرس ۱۸۸۵ء؛ (۴) الف لیلۃ و لیلۃ، طبع Macnaghten، کلکتہ ۱۸۳۹ - ۱۸۴۲ء؛ (۵) Amery: *English - Arabic Vocabulary*، قاہرہ ۱۹۰۵ء، بذیل مادّۂ بگل Bugle؛ (٦) آرنلڈ: *The Legacy of Islam*، آوکسفرڈ ۱۹۳۱ء؛ (۷) *Ars Asiatica*، جلد ۱۲، پیرس ۱۹۲۹ء، لوحہ ۱؛ (۸) Bonanni: *Gabinetto armonico*، روم ۱۷۲۲ء؛ (۹) P. Brown: *Indian Painting Under the Mughals*، آوکسفرڈ ۱۹۲۴ء؛ (۱۰) Buhle: *Die musikalischen Instrumente in den Miniaturen des frühen Mittelalters*، لائپزگ ۱۹۰۳ء؛ (۱۱) *Catalogue of the Crosby Brown Collection of Musical Instruments*، نیویارک ۱۹۰۳ - ۱۹۰۵ء؛ (۱۲) Chardin: *Voyages .... en Perse*، ایمسٹرڈم ۱۷۳۵ء؛ (۱۳) Day: *The Music and Musical Instruments of Southern India ....*، لنڈن ۱۸۹۱ء؛ (۱۴) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، لنڈن ۱۸۳۴ء؛ (۱۵) فارمر Farmer: *Studies in Oriental Musical Instruments*، سلسلۂ دوم، لنڈن ۱۹۳۹ء؛ (۱٦) *Minstrelsy of the Arabian Nights*، لنڈن ۱۹۴۵ء؛ (۱۷) Fétis: *Histoire générale de la musique*، پیرس ۱۸٦۹ - ۱۸۷٦ء؛ (۱۸) Galpin: *Old English Instruments of Music*، لنڈن ۱۹۱۰ء؛ (۱۹) حاجی خلیفہ: کشف الظنون، طبع Flügel، لائپزگ ۱۸۳۵ء؛ (۲۰) Höst: *Nachrichten von Marokos og Fez*، کوپن ہیگن ۱۷۷۹ء؛ (۲۱) ابن بطوطۃ: *Voyages...*، مترجمۂ *C. Defrémery*، پیرس ۱۸۵۳ - ۱۸۵۸ء؛

(۲۲) ابن خلدون : Notices et extraits، پیرس ۱۸۵۸ء؛ (۲۳) رسائل اخوان الصفاء، بمبئی ۱۸۸۷ - ۱۸۸۹ء؛ (۲۴) Kaempfer : Amoenitatum exoticarum، لیمگو ۱۷۱۲ء؛ (۲۵) Lavignac : Encyclopédie de la musique، جلد ۱، پیرس ۱۹۲۲ء؛ (۲۶) Mahillon : Catalogue . . . du Musée Instrumental du Conservatoire Royal de Musique de Bruxelles، جلد ۱، Ghent ۱۸۹۳ء؛ (۲۷) وہی مصنف : La Trompette, son histoire، برسلز ۱۹۰۷ء؛ (۲۸) المقری : نفح الطیب، لائڈن ۱۸۵۵ - ۱۸۶۱ء؛ (۲۹) مارٹن Martin : Miniature Painting and Painters of Persia, India and Turkey، لنڈن ۱۹۱۲ء؛ (۳۰) Pedro de Alcala : Art . . . la lengu a araviga، غرناطہ ۱۵۰۵ء؛ (۳۱) Niebuhr : Voyage en Arabie، ایمسٹرڈم ۱۷۷۶ - ۱۷۸۰ء؛ (۳۲) Survey of Persian Art؛ (۳۳) Ribera : La Musica de las Cántigas، میڈرڈ ۱۹۲۲ء؛ (۳۴) Sachs : Real Lexikon der Musik-instrumente، برلن ۱۹۱۳ء؛ (۳۵) Schiapatelli : Vocabulista in Arabico، Firenze ۱۸۷۱ء؛ (۳۶) Schlesinger : مقالہ Trumpet در Encyclopaedia Britannica، نیو یارک ۱۹۱۰ - ۱۹۱۱ء؛ (۳۷) Seybold : Glossarium Latino-Arabicum، برلن ۱۹۰۰ء؛ (۳۸) Toderini : Letteratura Turchesca، وینس ۱۷۸۷ء؛ (۳۹) Villoteau : La Description de l'Egypte, état moderne، پیرس ۱۸۰۹ - ۱۸۲۶ء۔

(H. G. Farmer)

* **بُوْقا** : شمالی شام کا ایک مقام، جو اب باقی نہیں رہا ۔ اس کا نام غالباً ایک سریانی اصل کا لفظ ہے جس کے معنی "مچھر" کے ہیں، اسی سے لامنز H. Lammens نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ دلدلی علاقہ تھا ۔ اس کا ذکر اسلام کی ابتدائی صدیوں کی تحریروں میں آتا ہے ۔ اس کی زیادہ قدیم تاریخ کا کوئی علم نہیں، مگر ابوعبیدہ کی انطاکیہ اور قنسرین کی فتوحات کے تذکروں میں اس کا نام آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بنو امیہ کے عہد میں اسے کچھ نہ کچھ اہمیت حاصل تھی ۔ اس وقت یہ جراجمۃ [زک بان] کے علاقے کے قریب تھا، جسے البلاذری نے جبل اللکام (امانوس Amanus) کے اندر بیاس اور بوقا کے درمیان بتایا ہے ۔ پھر یہ ان مقامات میں سے ایک ہے جنھیں امیر معاویہؓ نے اموی خلیفہ الولید کے زمانے میں ملک سندھ کے زط [زک بان] یعنی جاٹوں کے بسانے کے لیے منتخب کیا گیا تھا؛ چنانچہ وہ عراق سے آئے اور اپنی بھینسوں سمیت وہاں آباد ہو گئے ۔ آگے چل کر بوقا کے حفاظتی انتظامات خلیفہ ہشام نے اور مضبوط کر دیے اور وہاں ایک قلعہ بنا دیا ۔ Leo Phocas کے شام پر حملے کے دوران میں بوزنطیوں نے ۳۳۸ھ/ ۹۴۹ - ۹۵۰ء میں اس کا محاصرہ کر لیا ۔ اس زمانے میں بوقا عواصم [زک بان] کے علاقے میں شامل تھا، لیکن چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی میں ابن شداد اور یاقوت نے اس کا جس طرح ذکر کیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ باتیں اس سے بھی پہلے زمانے میں واقع ہوئیں ۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ کن حالات کے زیر اثر اس پر تباہی آئی یا کب اسے چھوڑ دیا گیا، مگر صلیبی جنگوں کے زمانے میں یہ اپنی پہلی اہمیت کھو چکا تھا ۔ لامنس H. Lammens (آآ، لائڈن، بار اول) نے اپنے قیاس سے، جس کی بنیاد کتابی ماخذ پر تھی، اس کا وہ محل وقوع متعین کیا ہے جو عمق [زک بان] نام کے نشیب میں واقع تھا اور انطاکیہ کی جھیل سے کچھ زیادہ دور نہ تھا ۔

مآخذ : (۱) البلاذری : فتوح، ص ۱۳۹، ۱۵۹، ۱۶۲، ۱۶۷، ۱۶۸؛ (۲) BAG، اشاریات؛ (۳) ابن شداد، مطابق Ch. Ledit : Machriq، ۳۳ (۱۹۳۴ء) :

ج ۰ ببعد؛ (۴) یاقوت، ۱ : ۷۶۲؛ (۵) G. Le Strange: Palestine under the Moslems، لندن ۱۸۹۰ء، ص ۴۲۳؛ (۶) M. Canard: Histoire de la dynastie des Hamdanides، ۱، الجزائر ۱۹۵۱ء؛ ۲۲۴، ۲۲۹، ۲۳۲، ۲۶۲ -

(J. SOURDEL-THOMINE)

بُوقَلا : ایک اصطلاح جو الجزائری عربی (قب Βαύκαλις) میں مستعمل ہے - اس سے مراد ایک دو دستے والا مٹی کا برتن ہے، جسے عورتیں اعمالِ استخارہ کے دوران میں استعمال کرتی ہیں جو اسی کے نام سے موسوم ہو گئے ہیں - اس عمل کی بنیاد یہ تھی کہ عمل کرنے والی ایک مخصوص دعا کے بعد فی البدیہہ شعروں پر مشتمل ایک مختصر سی نظم کہی جاتی تھی، اسے بھی بوقلا کہتے تھے اور اس سے فال لی جاتی تھی - یہ اعمال ایسے زمانے میں جب کہ بحری قزاقی اپنے عروج پر تھی خاصے مقبول رہے کیونکہ عورتیں اپنے مردوں کی خیریت معلوم کرنا چاہتی تھیں جو بحری سفر پر گئے ہوئے تھے اور آگے چل کر ایک گھریلو کھیل بن گئے - حال ہی میں ابن شنب S. Bencheneb نے AIEO، الجزائر ۱۹۵۶ء، ص ۱۹ تا ۱۱۱، میں اسے ایک بہت عمدہ مقالے کا موضوع بنایا ہے (اس میں کئی متون کا ترجمہ بھی شامل ہے).

(ادارہ)

بُوقَلَمُون : رَکَ بہ ابُو قَلَمُون.

بُوقُبَیر : رَکَ بہ ابوقیر.

بوکریش : [= بُکَرِش] رَکَ بہ بخارسٹ.

بوکووینا : Bukovina رَکَ بہ خَتِن Khotin .

بُوگرا : مشرقی پاکستان کا ایک شہر جو اسی نام کے ضلع کا صدر مقام بھی ہے - اس کا عرض بلد ۲۴ درجے ۵۰ دقیقے شمالی اور طول بلد ۸۹ درجے ۲۳ دقیقے مشرقی ہے اور یہ دریاے کراتویہ Karatoya کے مغربی کنارے پر واقع ہے - ۱۹۰۱ء میں ضلع کی آبادی بارہ لاکھ پانچ سو اٹھاسی اور شہر کی آبادی پچیس ہزار تین سو تین تھی - شہر کی غالب آبادی مسلمان ہے؛ تقسیم ہند (۱۹۴۷ء) سے پہلے بھی سارے بنگال کے اندر اس شہر میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی - ان میں زیادہتر اگرچہ وہ نو مسلم ہیں جو پہلے کوچ Kōč یا راج بنسی کہلاتے اور شمالی علاقوں میں آباد تھے اور بعد میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، تاہم یہاں کچھ پٹھان اور سیّد بھی پائے جاتے ہیں - اس ضلع اور شہر میں طوفان اور سیلاب آتے رہتے ہیں جو بعض اوقات بڑے ہولناک ہوتے ہیں - ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء میں طوفان نے اس ضلع کے بہت سے مکان اور درخت تباہ و برباد کر ڈالے - ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء میں جب ڈیڑھ گھنٹے کی مختصر مدّت میں اٹھارہ انچ بارش ہوئی تو یہ شہر تقریباً غرقاب ہوگیا تھا، یہاں شدید زلزلے بھی اکثر آتے رہے ہیں - ۱۸۸۵، ۱۸۸۸ اور ۱۸۹۷ء کے شدید زلزلوں سے جان و مال کا بڑا نقصان ہوا - ۱۸۹۷ء کے زلزلے میں شہر کے پختہ اینٹوں کے بہت سے مکان تباہ ہو گئے.

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ضلع کے باشندے ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں کثرت سے مسلمان ہوگئے ہوں گے، کیونکہ بہت سے دیہات کے نام ابھی تک ہندوانہ ہیں، مگر وہاں کوئی ہندو باشندہ نہیں ہے - ۱۰۰۵ھ / ۱۵۹۶ء میں راجہ مان سنگھ نے، جو مغل بادشاہ کا نائب تھا، اس ضلع کو دوبارہ فتح کیا تو اس نے شیرپور میں مٹی کا ایک کچا قلعہ تعمیر کیا اور اس کا نام جہانگیر کے نام پر سلیم نگر رکھا - ایک قلعہ مہاستھان Mahast'han میں بھی تعمیر کیا گیا تھا جو اب ویران پڑا ہے - شیرپور، شیرخان

کا بسایا ہوا ہے، جو بنگال کا افغان حاکم تھا (تقریباً ۶۶۶ھ / ۱۲۶۸ء تا ۶۷۰ھ / ۱۲۷۲ء)۔ ان دونوں مقامات میں آثارِ قدیمہ کثرت سے ہیں، مگر خود شہر کے اندر صرف "بوگرا محل" ہی، جو اب چودھری خاندان کی قیام گاہ ہے، ایک ایسی جگہ ہے جو کسی قدر قدیم اور دلچسپ ہے [جدید تاریخی و معاشرتی حالات کے لیے رک بہ پاکستان (مشرقی)]۔

مآخذ : (۱) *Statistical Account of Bengal*، کلکتہ ۱۸۷۶ء، ج ۸؛ (۲) S. S. Day : *Final Report on the Survey and Settlement of Jaypur Estates*، کلکتہ ۱۸۹۹ء؛ (۳) *Imperial Gazetteer of India*، آوکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ۸ : ۲۵۶ تا ۲۶۳؛ (۴) *History of Bengal* (مسلم عہد)، طبع جادو ناتھ سرکار، ۲، ڈھاکہ ۱۹۴۸ء : ۲۰۲ تا ۲۰۳، ۲۱۱، ۲۲۰؛ (۵) J. N. Gupta : *Bogra*، الہ آباد ۱۹۱۰ء۔

(بزمی انصاری)

بُولاق : مملوک عہد اور ترکی زمانے کے قاہرہ کے بالکل قریب ایک چھوٹا سا شہر اور جنوبی مصر سے قاہرہ کی تجارت کی دریاے نیل پر واقع بندرگاہ۔ یہ اس ریت پر تعمیر کیا گیا تھا جو دریاے نیل اس وقت پیچھے چھوڑ گیا تھا جب [سلطان] صلاح الدین [ایوبی] کے عہد سے آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کے دوران میں اس کا راستہ ایک سے ڈیڑھ کیلومیٹر مغرب کی طرف ہٹ گیا تھا [رک بہ قاہرہ]۔ اسے قاہرہ سے ناصری نہر جدا کرتی تھی، جسے سلطان محمد بن قلاؤن نے ۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء میں بنایا تھا اور اصحابِ ثروت کو یہ ترغیب دی تھی کہ وہ بولاق میں اپنے مضافاتی (Villas) مکان (مَنْظَرَة) بنوائیں، جن کے ساتھ بعد میں مسجدیں اور حمّام وغیرہ شامل کر دیے گئے۔ دفترِ محصولات کو قاہرہ سے وہاں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۲۰۰ھ کے قریب بولاق کی آبادی تقریباً چوبیس ہزار تھی اور یہاں چوبیس مسجدیں (بشمول مسجد ابوالعلاء جو ایک زیارت گاہ اور مقام عرس (مولد) ہے)، اوکیل Okells، زرعی پیداوار کے گودام، جہازسازی کے کارخانے وغیرہ تھے۔ محمّد علی [پاشا] نے وہاں اور کارخانے اور بھٹیاں تعمیر کیں، جن کا مقصد مصری زندگی کو موجودہ زمانے کے مطابق بنانا تھا۔

بولاق اپنے مطابع کے لیے مشہور ہے۔ یہ مصر کے اولین مطابع ہیں جو نپولین بونا پارٹ کی سہم کے چند روزہ مطبعوں کے بعد مصر میں قائم کیے گئے۔ ایک مختصر مصری جماعت، جس کی تربیت میلان Milan میں ہوئی تھی، ۱۸۲۱ء میں چھاپے کی مشینیں اپنے ساتھ لے کر واپس آئی اور ۱۸۲۲ء میں مطبع بولاق لبنانی الاصل نقولا المسابکی (م ۱۸۳۰ء) کی نگرانی میں اپنی پوری گنجائش کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہو گیا۔ یہ مطبع حکومت کی ملکیت تھا اور کئی مرتبہ نئی ایجادات کے مطابق بنایا گیا۔ ۱۸۶۲ء میں اسے (عبدالرحمٰن رُشدی پاشا کی اور پھر ۱۸۶۵ء میں خدیو اسمٰعیل کے ایک بیٹے کی) نجی ملکیت میں دے دیا گیا۔ ۱۸۸۰ء میں حکومت نے اسے دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ۱۸۹۴ء کے بعد سے انگریزی اہتمام و نگرانی میں اسے مزید ترقی دی گئی۔ اور بعدازاں دوبارہ مصری نگرانی میں اس کی بنیاد فوجی ضروریات (دستی کتب وغیرہ) اور ملکی نظم و نسق (سرکاری مجلّہ الوقائع المصریّة) کے لیے رکھی گئی تھی۔ یہ مطبع زمانۂ حال کے ادبی احیا کا ایک بڑا سبب ہے۔ اس نے اپنے طور پر با مخصوص افراد کے لیے ترجمے اور عربی، ترکی اور فارسی کی بہت سی مستند (Classical) تصانیف اور یورپی زبانوں کی بعض کتابیں بھی شائع کیں۔ نجی مطابع کی تیز رفتار ترقی کی وجہ سے، جس نے قاہرہ کو عربی کتابوں کی تجارت کا مرکز بنا

دیا، بالآخر یہ اس عملی اجارہ داری سے محروم ہو گیا جو اسے حاصل تھی۔

زمانۂ حال میں بولاق کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ موجودہ شہر قاہرہ کا ایک محلّہ ہے۔

مآخذ : (۱) المقریزی : الخطط، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ۳ : ۲۱۲ تا ۲۱۵، ۲۲۳؛ (۲) Description de l'Egypte، ۱۸ (حصّہ ۲)، پیرس ۱۸۲۹ء : ۳۷۳ تا ۳۷۶؛ (۳) J.W. McPherson : *The Maulids of Egypt*، قاہرہ بدون تاریخ (۱۹۴۰ء کے بعد کی)؛ (۴) ابوالفتوح رضوان : تاریخ مطبعۃ بولاق، قاہرہ ۱۹۵۳ء، جس میں مکمل حوالے مل سکیں گے؛ [زیدان : تاریخ آداب اللغۃ، ۲ : ۳۰۶ ببعد]۔

(J. JOMIER)

بُولُو : (بولی = قدیم بثینیم Bithynium کے قریب، جو بعد میں کلاڈیو پولس Claudiopolis کہلایا) اس کا عرض بلد ۴۰ درجے ۱۵ دقیقے شمالی اور طول بلد ۳۱ درجے ۳۰ دقیقے مشرقی ہے، آناطولی کی ایک شمال مغربی ولایت کا صدر مقام ہے، جس میں جنگلات بہت ہیں۔ بلندی سات سو دس میٹر اور رقبہ گیارہ ہزار ایک سو چالیس مربع کیلومیٹر ہے، اس کا محلِّ وقوع دریاے نہاریہ کے خم اور بحر اسود کے درمیان ہے۔ ۱۹۵۵ء میں شہر کی آبادی گیارہ ہزار آٹھ سو چوراسی اور صوبے کی آبادی تین لاکھ اٹھارہ ہزار چھے سو بارہ تھی۔ بولو ایک میدان میں دریاے بولو صُوبو [= بولی صوبی] کے کنارے پر واقع ہے، جہاں سخت زلزلے آتے رہتے ہیں، جن میں ۲۶ مئی ۱۹۵۷ء کا زلزلہ خصوصیت رکھتا ہے۔ یہ شہر ایک شاہراہ پر واقع ہے اور استانبول سے دو سو ترسٹھ کیلومیٹر اور انقرہ سے دو سو آٹھ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اسے یہ فخر حاصل ہے کہ اس میں چھتیس مسجدیں، ایک حمام جو ۷۹۱ھ/۱۳۸۸-۱۳۸۹ء میں تعمیر ہوا، ایک درسگاہ براے تربیتِ معلمات، سکول براے تعلیم حفاظتِ جنگلات اور دیگر ابتدائی اور ثانوی سکول، ایک ہسپتال اور جدید کوئلے کی ربت (briquette) اور لکڑی کے کارخانے ہیں۔ بولو کوراوغلو Köroghlu، عاشق دِردلی Ashik Derdali اور اچھے باورچیوں کا وطن ہے۔ آبنت کی جھیل اس کے جنوب مغرب میں سینتیس کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اتاترک نے بولو میں ۱۷ تا ۱۹ جولائی ۱۹۳۴ء قیام کیا اور [عصمت انونو نے ۵ سے ۷ اگست ۱۹۳۹ء تک۔ اس کی قضائیں آق چقوجہ Ak-chakodja، بولو Bolu، دُوزجہ Düzdje، گِردہ Gerede، گوای نواک Göynük، قبرسجق Kibrisdjik، منگن Mengen (جہاں ۱۹۵۹ء سے پتھر کا گندمی رنگ کا کوئلا (lignite) نکالا جا رہا ہے، مُدُرنُو mudurnu، سِبِن Seben اور ینِلجہ Yeghildja ہیں۔ بولو ۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء کے قریب ترکوں کے قبضے میں آیا، اور ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء تا ۸۲۷ھ/۱۴۲۴ء اسفندیار اوغللری کے زیرِ فرمان رہا۔ اس کے بعد ترکوں نے اسے دوبارہ لے لیا اور شاہزادہ سلیمان نے اس پر حکومت کی (۹۱۴ - ۹۱۵ھ/ ۱۵۰۹ء) اور ۱۳۳۸ھ/ اپریل ۱۹۲۰ء میں ناکام خلافت اوردوسی کا صدر مقام رہا (تاریخ، ۴ : ۹۷، ۳۰۳؛ نطق، ص ۱۱)۔ بولو ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء تک آناطولی کی ایالت کا ایک ضلع (سنجاق) رہا اور ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء تک مُحَصِّلِق، ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء تک ایک مستقل سنجاق اور ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء تک قسطمونی Kastamonu سے ملحق رہا۔ اس کے بعد اسے ایک مستقل لواء کی حیثیت دی گئی، یہاں تک کہ ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء میں اسے ایک ولایت بنا دیا گیا۔

مآخذ : (۱) R. Aker : *Bolu Gezisi*، استانبول ۱۹۴۹ء؛ (۲) G. Arnakis : Οἱ πρῶτοι Ὀθωμανοί، ایتھنز ۱۹۴۷ء، ص ۷۴ ببعد، ۱۰۰؛ (۳) برکان : قانونلر، ص ۲۸ ببعد؛ (۴) بولو لواسی سالنامہ سی، بولو ۱۹۲۵ء؛ (۵) Cuinet : *Turquie d' Asie*، ۴ : ۳۶۶ تا ۳۹۱، ۵۰۶

تا ۹۳؛ (۶) زیڈ۔ دانشمان : جانلر و گوللر اولکہ سی بولو، استانبول ۱۹۳۵ء؛ (۷) دوکوسان آیلر مجموعہ، عدد ۳، ''بولو'' ص ۱ تا ۱۰؛ (۸) Iller Bankasi : بولو امار بلانی، انقرہ ۱۹۵۸ء [پیمانہ] = ۱ : ۲۰۰۰؛ (۹) T. Z. Isitman : بولو جغرافیاسی، استانبول ۱۹۳۸ء؛ (۱۰) M. Z. Konrapa : بولونک عثمانلی ترکہ سنہ گیریسی، در تدریسات مجموعہ سی، عدد ۱۰ (اپریل ۱۹۵۲ء) : ص ۳۰ تا ۳۳ نیز عدد ۸ اور ۹ : ۳۴ تا ۳۶؛ (۱۱) A.D. Mordtmann : *Anatolien* ......، Hanover ۱۹۲۵ء، ص ۲۶۷ تا ۲۷۵؛ (۱۲) L. V. de St. Martin : *Description .... de l'Asie Mineure*، پیرس ۱۸۵۲ء، ۱ : ۳۰۳، ۳۶۲، ۳۹۵ تا ۳۹۶، ۳۱۸، ۴۴۳ بعد؛ ۲ : ۳۹۱ تا ۳۹۵، ۶۸۲، ۷۱۲ تا ۷۱۹؛ (۱۳) K. Sapmaz : بولو... اورمانلق... عائلہ زراعت...، انقرہ ۱۹۵۶ء؛ (۱۴) S. Saribay : استقلال صوائشدہ بدرنو۔ بولو۔ دوزجہ، آیدین ۱۹۳۳ء؛ (۱۵) F. Taeschner : *Anatolisches Wegenetz* ....، لائپزگ ۱۹۲۴-۱۹۲۶ء، ۱ : ۹۱، ۱۹۰، ۱۹۳ تا ۱۹۹، جدول ۳۲ تا ۳۶؛ ۲ : ۲۲، ۳۰ تا ۳۳، ۵۳، ۵۶، ۶۳؛ (۱۶) ترک انسیکلوپیدی سی، ۷ : ۳۷۴ تا ۳۸۰؛ (۱۷) ترکیہ ببلیوگرافیاسی، استانبول ۱۹۲۸ء، مواضع کثیرہ؛ (۱۸) ترکیہ قلاووزو، انقرہ ۱۹۳۹ء، ۱ : ۳۸۶ تا ۳۹۰ (تصویر اور ۱ : ۲۰۰۰۰۰۰ پیمانے کا نقشہ)؛ (۱۹) ترکیہ یلللغی ۱۹۴۷ء، استانبول ۱۹۴۸ء، ص ۱۲۱، ۱۲۹، ۳۷۸، ۴۱۳، ۲۸۹؛ مطبوعہ ۱۹۴۸ء، ص ۸۶ تا ۸۷؛ (۲۰) وطن مملکت علاوہ لری، ۱، استانبول ۱۹۵۳ء، عدد بولو ۳ : ۱ تا ۲۱؛ (۲۱) مزید حوالوں کے لیے رک بہ، بذیل مادہ (از B. Darkot)۔

(H. A. Reed)

بُولُوادِین : (بعض اوقات کرنبک، قدیم پولی بوتم Polybotum)، ۳۸ درجے ۴۴ دقیقے عرض بلد شمالی، ۳۱ درجے ۳ دقیقے طول بلد مشرق میں، افیون قرہ حصار [رك بان] کی ولایت میں ایک بلدیہ اور قضا، جس میں یہ خود اور اسحاقلی ناحیہ شامل ہیں اور چھبیس گاؤں ہیں (اس کا سابق ناحیہ چای، جس میں بیس گاؤں ہیں ۱۳۷۷ھ/ یکم اپریل ۱۹۵۸ء کو ایک علیحدہ قضا بن گیا)۔ ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء میں اس شہر کی آبادی بارہ ہزار چھے سو چار اور پورے ضلع کی اکتیس ہزار دو سو اسی تھی؛ بلندی نو سو میٹر، رقبہ دو ہزار چار سو بیس کیلومیٹر۔ بولوادین افیون کے مشرق میں پینتالیس کیلومیٹر کے فاصلے پر چای نامی ریلوے سٹیشن کے آٹھ میٹر شمال میں، سازلی اور ایبر جھیلوں اور آقارچای سے سیراب ہونے والے ایک زرخیز میدان کے شمال میں پرانی شاہراہ بغداد اور نئی شاہراہ اسکی شہر۔ قونیہ پر واقع ہے۔ بولوادین ۷۰۲ھ/ ۱۳۰۲ء تا ۷۲۲ھ/ ۱۳۲۵ء کے قریب اشرف اوغللری [رك بان] کے زیر نگین تھا، اسے مراد اوّل نے فتح کر لیا تھا، مگر ۸۰۵ھ/ ۱۴۰۲ء کے بعد اسے گرمیان اوغللری نے واپس لے لیا، پھر مراد ثانی نے ۸۳۲ھ/ ۱۴۲۸-۱۴۲۹ء میں دوبارہ لیا، اور [مشہور معمار] سنان نے سلیمان اوّل کے عہد میں اسے جزوی طور پر تعمیر کیا (مسجد، رستم پاشا کا حمّام اور فوارہ، قبّہ اوزون چارشیلی : کتابہ لر، ج ۲)۔ ۱۳۱۰ھ/ ۱۹۰۵ء میں یہ چند روز کے لیے باغی اوزون خلیل کے تصرّف میں آ گیا تھا۔ یہ قصبہ اگست ۱۹۲۲ء میں اہل یونان کے خلاف قوم پرستوں کے جوابی حملے سے پہلے ایک بہت اہم عسکری صدر مقام تھا۔

مآخذ : (۱) جمہوریتک ۲۵ ییلی ایچندہ افیون، استانبول ۱۹۴۸ء؛ (۲) آئی۔ ایچ۔ دانشمند : *Kronology* کرانولوجی...، مواضع کثیرہ؛ (۳) ہیمر Hammer : *Staatsv*..، ۲ : ۲۷۵؛ ۲۰۵ تا ۲۰۶؛ (۴) کپر F. Kiper : افیون قرہ حصار، والیک نوتلرمدن برقاچ خاطرہ، استانبول ۱۹۴۰ء؛ (۵) *Murray's Handbook for Travellers in*

Asia Minor...، طبع Sir Charles Wilson، لنڈن ۱۸۹۰ تا ۱۹۰۵ء، ص ۳۲۲؛ مطبوعہ ۱۸۳۰ء، ص ۳۰۲؛ مطبوعہ ۱۸۷۷ء، ص ۳۶۶؛ (۶) آلی، اوکدای : اَفیون قرہ حصاری گزتہ لری، قلیے ۱۹۳۷ء؛ (۷) سالنامۂ، برائے خداوندگار ولایتی، سال ۱۲۹۶ھ، ۱۳۰۱ھ، ص ۳۷۷، ۱۳۰۲ھ، ۱۳۱۰ تا ۱۳۱۶ھ، ۱۳۲۱ تا ۱۳۲۳ھ؛ (۸) L. V. de St. Martin : *Description... de l'Asie Mineure*، پیرس ۱۸۵۲ء، ۲ : ۵۰۹، ۶۱۱؛ (۹) W. Shepherd : *Hist. Atlas*، مواضع کثیرہ؛ (۱۰) M. Y. Suslu : اشرف اوغللری تاریخی ے شہر قلاؤزو، قونیہ ۱۹۳۳ء؛ (۱۱) F. Taeschner : *Anatolisches Wegenetz...*، ۱ : ۱۰۲، ۱۲۶، جداول ۷ تا ۸، ص ۱۹۷ ببعد؛ (۱۲) وہی مصنف : جہان نما، طبع ایم، تشری، ۱ : ۲۳۹ و ۲ : ۱۷۱؛ (۱۳) ترک انسکلوپیدی سی، ۷ : ۲۵۰؛ (۱۴) ترکیہ بیلیو گرافیاسی، ۱۹۲۸ء، مواضع کثیرہ؛ (۱۵) ترکیہ قلاؤزو، انقرہ ۱۹۳۹ء، ۱ : ۳۷، ۵۷ تا ۶۰، نقشہ (پیمانہ) ۱ : ۱۰۰۰۰۰۰، مقابل ص ۷۰؛ (۱۶) ترکیہ ییلگی، استانبول ۱۹۳۷ء، ص ۱۳۸؛ مطبوعہ ۱۹۳۸ء، ص ۸۲؛ (۱۷) اسمعیل حقی اوزون چارشیلی : اَفیون قرہ حصار، صندقلی، بولوادین ... دہ کی کتابہ لر، استانبول ۱۹۲۹ء؛ (۱۸) وہی مصنف : عثمانلی تاریخی، انقرہ ۱۹۴۷ء، ۱ : ۱۲ تا ۱۳، ۱۶۹، ۲ : ۹۳؛ (۱۹) اؤا، بذیل مادہ (بسیم دارکوت)، مزید حوالوں کے لیے۔

(H. A. Reed)

* **بولور طاغ** : رکّ بہ بامیر۔

* **بُولُوک**: (= بولک، فعل بولمک bölmek سے) جس کے معنی ہیں، ایک حصّہ، ایک جز یا ایک قسم۔ مشرقی ترکی اور فارسی میں ایک صوبے یا ایک علاقے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر اناطولی کی ترکی زبان میں تنظیمات [رکّ بآں] کے بعد اس لفظ سے پیدل یا سوار فوج کے دستے مراد لیے جانے لگے، جو ایک یوزباشی (کپتان) کے ماتحت ہوں۔ عثمانی فوج کی قدیم تنظیم میں لفظ بولوک قپوقولی Kapi-Kulu [رکّ بآں] اوجاقوں odjaks نیز صوبے کی فوجوں اور اعلٰی فوجی افسروں کے خدم و حشم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بولوک کی تعداد یکساں نہیں ہوتی تھی، مثلاً ینی چری اوجاق میں جو ایک ہزار جوانوں پر مشتمل ہوتا تھا، سو سو جوانوں کے دس بولوک ہوا کرتے تھے۔ بولوک کا افسر یا یاباشی (پیدل فوج کا سردار) کہلاتا تھا۔ گیلی بولو (گیلی پولی) کے عجمی اوغلان [رکّ بآں] اوجاق میں جس میں پہلے چار سو آدمی ہوتے تھے، پچاس پچاس جوانوں کے آٹھ بولوک ہوتے تھے۔ ان بولوکوں پر ایک افسر مقرر ہوتا تھا، جسے چورباجی کہتے تھے۔ ینی چری اوجاق کی تعداد بعد میں اتنی بڑھا دی گئی تھی کہ ایک اوجاق ایک سو ایک بولوک پر مشتمل ہونے لگا، جسے جماعت اور اورتا orta بھی کہتے تھے۔ ہر بولوک کا نام اور کام الگ الگ ہوتا تھا، مثلاً بولوک ۱ تا ۳ جماعتِ شتربان (اونٹ ہانکنے والوں کی جماعت) کہلاتے تھے، اٹھائیسواں بولوک امام حضرت آغا کا بولوک تھا، بولوک ۶۰ تا ۶۳ صولاق اورتاسی Solok-ortasi (یا صولاق محافظوں کا اورتا) کہلاتے تھے۔ سگبان (شاہی شکاری کتوں کے محافظوں) کا ۱۴۵۱ء تک ایک مستقل اوجاق تھا، لیکن اس سنہ میں سلطان محمد ثانی نے اسے ینی چری کے اوجاق میں بطور پینسٹھویں اورتا کے شامل کر دیا۔ تاہم ان کی ایک مستقل تنظیم پھر بھی باقی رہی، جس میں چونتیس بولوک تھے۔ ہر بولوک کی تعداد اور نام اور کام بھی الگ الگ تھے۔ جب بایزید ثانی یا سلیم اوّل کے عہد میں ینی چری کے آغا نے ایک منظّم بغاوت کر دی تو نصر شاہی نے ایک اور آغا کا

تقرر کیا، جس کی اپنی علیحدہ تنظیم تھی اور اس تنظیم میں ''آغا کے بولوک'' اکسٹھ کی تعداد میں مقرر کیے گئے، اس امید پر کہ اس سے اوجاق میں قوتوں کا توازن قائم ہو جائے گا، چنانچہ بولوک کا لفظ جب استعمال ہوتا تھا تو عموماً اس سے یہ بولوک مراد ہوتے تھے۔ بصورت دیگر اگر بولوک سے زرہ ساز، توپچی، اور توپیں کھینچنے والوں کے کسی اوجاق کا بولوک مراد ہوتا تھا تو اس کا اور اس کے اوجاق کا نام مذکور ہوتا تھا۔ قپوقولی کے سوار اوجاق میں چھے بولوک تھے۔ ان کے افراد ''بولوک خلقی'' (چھے بولوک کے لوگ) کہلاتے تھے، سپاہیوں اور سلاحداروں کو مستثنٰی کر کے انھیں ''بولوکات اربعہ'' (چار بولوک) کہتے تھے۔ مصر کے سات عثمانی اوجاق ''بولوکات سبعہ'' (یعنی سات بولوک) کہلاتے تھے۔ ان مختلف بولوکوں کے افسروں کی تنخواہوں کی شرح الگ الگ ہوتی تھی اور ان کی ترقی کے قواعد بھی الگ الگ تھے۔ اوجاقوں کی طرح بولوکوں کی اہمیت بھی حکومت کی نظروں میں وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی تھی۔ بولوکوں اور اوجاقوں کے مفصل حالات کے لیے دیکھیے اسمٰعیل حقّی اوزون چارشیلی: عثمانلی دولتی تشکیلاتندن قپوقولی اوجاقلری، ج ۱، ۱۹۴۳ء اور Gibb، اور Bowen، ج ۱، بمدد اشاریہ۔

(اسمٰعیل حقّی اوزون چارشیلی)

* **بُولُوک باشی**: ایک لقب جو مملکت عثمانیہ کی سیاسی تنظیم میں عمّال کے مختلف گروہوں کے سرداروں کو دیا جاتا تھا۔ قدیم عثمانی فوجی تنظیم میں ینی چری کے اوجاق میں بولوک کے سردار عام طور پر بیر یا یاباشی یا سربیادہ کہلاتے تھے، لیکن عجمی اوغلان کے بولوک میں سرداروں کو چورباجی Çorbadji کہا جاتا تھا۔ صرف ''آغا کے بولوکوں'' [رک بہ بولوک] کے سرداروں کا لقب بولوک باشی ہوتا تھا، اور ان کا سب سے اعلٰی افسر ''باش بولوک باشی'' کہلاتا تھا۔ بولوک باشی گھڑ سوار ہوتے تھے اور ان کے گھوڑے کی زین سے ایک لوہے کا گرز اور ایک ڈھال بندھی رہتی تھی۔ جب سلطان قصر سے نکل کر کسی مسجد کی طرف جاتا تھا تو بولوک باشی اس کے ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ یہ مزیّن لباس پہنے ہوئے ہوتا تھا اور اس کے ہاتھ میں نیزے کے بجائے ایک سرکنڈا ہوتا تھا۔ سلطان سلیمان قانونی کے عہد حکومت میں ''آغا کے بولوکوں'' کے اٹھاون بولوک باشی تھے۔ ان کی روزانہ تنخواہ نو اسپر (Aspers) تھی۔ بعد کے زمانے میں ان کی تعداد اور تنخواہ دونوں بڑھ گئی تھیں۔ باش بولوک باشی کو ترقی دے کر نیچے درجے کا ''آغائے اوجاق'' بنایا جاتا تھا اور اس کا لقب ''قطار آغالری'' ہوتا تھا (یعنی قطاروں یا کاروانوں کے آغا)۔ آغا کے بولوکوں کے بولوک باشی کو جب کوئی ''تیمار'' [رک بآن] (جاگیر) عطا کی جاتی تھی تو ان کا شمار محافظانِ قلعہ میں ہوتا تھا اور انھیں عمر بھر کے لیے آٹھ ہزار سے لے کر پندرہ ہزار اسپر ملتے تھے۔ ینی چری اوجاق کے علاوہ قپوقولی [رک بآن] کے سواروں کے بھی اپنے بولوک باشی ہوتے تھے اور ایسے ہی سگبانوں (محافظانِ سگانِ سلطان)، لوند (levends) یعنی بے قاعدہ فوج اور تفنگچیوں (بندوق برداروں) کے بھی اپنے اپنے بولوک باشی ہوتے تھے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے اسمٰعیل حقّی اوزون چارشیلی Uzunçarsili: عثمانلی دولتی تشکیلاتندن قپوقولی اوجاقلری، ج ۱، ۱۹۴۳ء اور Bowen & Gibb، ج ۱، بمدد اشاریہ۔

(اسمٰعیل حقّی اوزون چارشیلی)

بُون: Bone رک بہ المثابة.

بُونَة: رک بہ المثابة.

البُونی : مُحیی الدّین ابوالعبّاس احمد بن علی البُونی (یعنی باشندہ بُونہ) کا شمار ہر اسرار علوم [سحر و طلسمات وغیرہ] کے اہم ترین عرب مصنّفین میں ہوتا ہے۔ اس نے ۶۲۲ھ / ۱۲۲۵ء میں وفات پائی۔ وہ کہانت اور غیب دانی کے موضوع پر کتاب سرّالحکم کا مصنّف ہے اور اس نے بَسْمَلَة کے فضائل اور اسمائے حُسْنٰی و حروفِ ابجد پر چھوٹی چھوٹی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان رسائل میں کراماتی تعویذوں، پُراسرار (Cabalistic) حروف اور دیگر طلسماتی علامات کا ذکر ہے۔

ان مسلمانوں میں جو جادو اور تعویذوں کا کاروبار کرتے ہیں البُونی کی تصانیف آج بھی سب سے زیادہ مستعمل ہیں۔ مغرب میں بعض مصنفوں نے ان کتابوں سے بہت کام لیا ہے، مثلاً Reinaud : *Monuments Arabes, Persans et Turcs, du cabinet de M. le Duc de Blacas*، ۲ جلدیں، ۱۸۲۸ء، کے اس حصّے میں جس میں اس نے سحرزدگی سے بحث کی ہے، اور M. Doutte : *Magic et Religion dans l'Afrique du Nord*، کے کئی حصّوں میں۔

جادو پر ایک دلچسپ مخطوطہ، جو پیرس کی قومی لائبریری (Bibliothèque Nationale) (شمارہ ۲۶۶۲) میں موجود ہے، جزوی طور پر البُونی کی تصانیف پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں البُونی کا حوالہ صریحاً غلطی سے شرف الدین کے نام سے دیا گیا ہے (دیکھیے (۱) Carra de Vaux : *Notes sur les Talismans et conjuration arabes*، *Journ. As.*، ۱۹۰۶ء، ۱ : ۲۹۵؛ (۲) وہی مصنف : مقالہ *Charms and Amulets (Muhammadan)*، در *Encyclopaedia of Religion and Ethics*، نیز مآخذ (۳) براکلمان : *Geschichte der Arabischen Literatur*، ۱ : ۴۹۷).

(B. Carra De Vaux)

بونیوال : رکّ بہ احمد پاشا بونیوال۔

بوھرہ : (Bohoras، Bohras، Buhrah)، مغربی ہند کا ایک مسلم فرقہ (جو زیادہ تر ہندو نسل سے ہے اور جس میں کسی قدر بعض عربوں کے خون کی آمیزش ہے)۔ یہ لوگ بیشتر اسمٰعیلی فرقے کے شیعہ ہیں اور اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو مصر کے فاطمی خلفا میں سے المُستعلی [۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء تا ۴۹۵ھ / ۱۱۰۱ء] کے اس دعوے کی حمایت کرتی ہے کہ وہی اپنے باپ المُستنصر کے بعد تخت نشینی کا جائز حقدار تھا (فاطمیوں کی تاریخ کے لیے رکّ بہ فاطمیہ اور اسمٰعیلیہ)۔ المُستعلی نے اپنے بھائی نِزار کی مخالفت کی تھی، جس کے حامیوں (حشیشیوں Assassins) کے ہندوستان میں نمائندے خوجے (Khodjas) [رکّ بآں] کہلاتے ہیں۔ بوھرہ کے معنی تاجر یا بیوپاری کے ہیں (یہ گجراتی لفظ وھوروو vohōrvo سے لیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں بیوپار کرنا، تجارت کرنا)۔ اس لفظ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ [ہندوستان کے] جو لوگ دائرۂ اسلام میں سب سے پہلے داخل ہوئے ان کا پیشہ کیا تھا۔ یہ بات ایک عربی تصنیف الترجمة الظاهرة . . . . . میں صاف طور پر مذکور ہے (دیکھیے بیانِ آئندہ اور مآخذ آصف اے۔ اے۔ فیضی : *Ismaili Law of Wills*، آوکسفرڈ ۱۹۵۳ء، ۳، حاشیہ ۲)؛ مگر یہ نام مسلمانوں ہی تک محدود نہیں ہے۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے کاغذات میں چھبیس ہزار چھے سو باون ہندوؤں اور پچیس جین مت کے پیروؤں نے اپنے آپ کو بوھرہ لکھوایا۔ ان کی صحیح تعداد کسی قدر مشکوک ہے، کیونکہ ہندو بوھروں، سنّی بوھروں (جو گجرات میں اور خاص طور پر راندیر میں پائے جاتے ہیں) اور جینی بوھروں کو کبھی کبھی اسمٰعیلی بوھروں کے ساتھ شامل کر دیا جاتا ہے۔ ۱۹۰۱ء میں مسلم

بوہروں کی تعداد ایک لاکھ چھیالیس ہزار دو سو پچپن بتائی گئی تھی، جن میں سے ایک لاکھ اٹھارہ ہزار تین سو سات بمبئی پریزیڈنسی [بھارت] میں رہتے تھے - فرقوں کے تحت بوہروں کی مندرجۂ ذیل تعداد دی گئی ہے :-

بوہرہ

۱۹۱۱ء	۱۹۲۱ء	۱۹۳۱ء
۹۲۰۸۱	۱۰۸۱۵۰	۱۱۰۱۲۳

۱۹۳۱ اور ۱۹۵۱ء کی سر شماری کی روداد میں فرقوں کی تقسیم نہیں دی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاک و ہند میں اس وقت ان کی صحیح تعداد بتانا ناممکن ہے - آبادی کی فطری افزائش کا لحاظ رکھتے ہوئے پاک و ہند میں ان کی تعداد ڈیڑھ لاکھ اور تمام دنیا میں دو لاکھ کے قریب ہوگی، جن میں سیلون اور مشرقی افریقہ کے کاروباری لوگ داخل ہیں۔

بوہرے دو بڑی جماعتوں میں منقسم ہیں، ان میں سے بڑی جماعت، جو سب کے سب تاجر ہیں، شیعوں کی ہے، دوسری جماعت سنیوں کی ہے، جس میں زیادہ تر کسان اور کاشتکار ہیں - راندیر (گجرات) کے کچھ سنّی بوہرے برما میں کاروبار کرتے ہیں اور وہاں انہوں نے خوب دولت اکٹھی کر لی ہے - اسمٰعیلی بوہروں کے کچھ خاندان اس بات کے مدعی ہیں کہ وہ ان لوگوں کی اولاد ہیں جنہوں نے عرب اور مصر سے نکل کر ہند میں پناہ لی تھی - اس دعوے کا ثابت کرنا مشکل ہے - لیکن باہمی رشتہ ناتا، خصوصاً یمن کے مستعلیہ لوگوں سے شادی بیاہ کی متعدد مثالیں موجود ہیں - حال ہی میں سلیمانی بوہروں کے ہاں سنیوں، اثناعشری شیعوں، ہندوؤں یہاں تک کہ یورپ والوں سے بھی باہمی شادی بیاہ کے رشتے قائم ہوئے ہیں، لیکن بوہروں کی اکثریت اپنے گروہ کے باہر شادی نہیں کرتی .

اس میں شک نہیں کہ بوہروں کی غالب تعداد ہندو نسل سے ہے، جن کے آبا و اجداد کو اسمٰعیلی مبلغوں نے اسلام میں داخل کیا تھا - عام روایت یہ ہے کہ ان میں سے پہلا مبلغ عبداللہ نامی ایک شخص تھا، جسے فرقۂ مستعلیہ کے امام نے یمن سے بھیجا تھا - اس مبلغ کی بابت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ۳۰۰ھ / ۱۰٦۷ء میں کھمبایت (Cambay، *جنوبی ہندوستان) میں اترا اور سرگرمی کے ساتھ اپنے مذہب کی اشاعت کرنے لگا - یہ قصہ مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے - ان میں سے ایک روایت عربی کے ایک رسالے الترجمة الظاهرة لفرق البورهة (کذا؟ البوهرة) الباهرة میں مذکور ہے - اس کا ایک نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی بمبئی کی شاخ میں موجود ہے اور جھاویری (K. M. Jhaveri) نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے (*A Legendary History of the Bohoras*، در *Journal Bombay Branch Royal Asiatic Society*، *1933*، سلسلۂ جدید، ۹ : ۳۷ تا ۵۲) - اس کا اصل متن ایچ - ایم - فخر (طالب) نے *Journal Bombay Branch Royal Asiatic Society, 1940*، سلسلۂ جدید، ۱٦ : ۸۸ میں شائع کر دیا ہے - دیگر روایات کے مطابق مستعلیوں کے پہلے مبلغ کا نام محمد علی تھا، جس کی قبر آج تک کھمبایت میں موجود ہے (م ۵۳۲ھ / ۱۱۳۷ء) - اس وقت انہلواڑہ کا چالوکیہ خاندان گجرات پر حکومت کر رہا تھا - معلوم ہوتا ہے کہ اس ہندو حکومت نے اسمٰعیلی مبلغوں کو اپنے مذہب کی اشاعت کی اجازت دے رکھی تھی اور اس نے ان کے تبلیغی کام میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کی، جس سے ان مبلغوں کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی - ۱۲۹۷ء میں یہاں کی مقامی ہندو حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ایک صدی تک گجرات کم و بیش دہلی کی حکومت کے زیر نگین رہا -

بہر حال گجرات کے آزاد حکمرانوں کے زمانے میں (۱۳۹۶: تا ۱۵۷۲ء)، جو سنی عقائد کی اشاعت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، بوهروں کو چند موقعوں پر سخت دار و گیر سے دو چار ہونا پڑا۔

۹۴۶ھ / ۱۵۳۹ء تک اس فرقے کا پیشوا یمن میں رہتا تھا اور بوهرے اس کی زیارت کرنے وہاں جاتے تھے، آمدنی کا عُشر اسے ادا کرتے تھے اور اپنے قضیے فیصلے کے لیے اس کے سامنے پیش کرتے تھے۔ اس کے بعد ۹۴۶ھ میں یوسف بن سلیمان ترکِ وطن کر کے یمن سے ہندوستان آ گیا اور سدھ پور (ریاست بمبئی) میں سکونت اختیار کی۔ اس کے تقریباً پچاس سال بعد جب ۹۹۶ھ / ۱۵۸۷ - ۸۸ء میں داعی داؤد بن عجب شاہ کا انتقال ہو گیا تو اس فرقے میں کچھ باهمی اختلاف پیدا ہو گیا۔ گجرات کے بوهروں نے، جو اس فرقے کی اکثریت تھے، داؤد بن قطب شاہ کو اس کا جانشین منتخب کیا اور اس کے تقرر کی خبر (عربی: نصّ) اپنے ہم مذہبوں کو یمن بھیجدی۔ مگر مؤخّرالذکر نے، جن کے ساتھ اس فرقے کے تھوڑے سے ہندوستانی بھی شامل تھے، ایک شخص سلیمان نامی کے دعاوی کی تائید کی، جو کہتا تھا کہ جانشینی کا حق اسے پہنچتا ہے، کیونکہ داؤد ابن عجب شاہ نے اس کی بابت اسے تحریری حکم دے دیا تھا۔ یہ وثیقہ ابھی تک سلیمانی "دعوت" کے قبضے میں موجود ہے (اس فرقے کے جماعتی انتظام کو "دعوت" کہتے ہیں اور اس کی آخری تا کا تلفظ کرتے ہیں)، لیکن اس کی صحت کی علمی، تنقیدی یا قانونی طور پر کبھی چھان بین نہیں کی گئی۔ سلیمان کی وفات احمد آباد میں ہوئی، جہاں اس کی قبر کا اور اس کے حریف داؤد بن قطب شاہ کی قبر کا ان دونوں کے ماننے والے اپنے اپنے طور پر احترام کرتے ہیں۔ جو لوگ سلیمان کے دعاوی کو تسلیم کرتے ہیں وہ سلیمانیہ کہلاتے ہیں اور ان کا داعی یمن میں رہتا ہے۔ ہندوستان میں اس کا کارندہ "منصوب" کہلاتا ہے اور سلیمانی "دعوت" کا صدر مقام بڑودہ ہے جہاں اسمٰعیلی مخطوطات کا ایک بڑا کتب خانہ ہے۔ ان دونوں میں ایک اور فرق یہ ہے کہ داؤدی گجراتی زبان کی ایک شکل استعمال کرتے ہیں، جو عربی الفاظ اور جملوں سے معمور ہے۔ یہ لوگ اس زبان کو عربی خط میں لکھتے ہیں اور اسی میں اپنے انتظامی فرامین جاری کرتے ہیں اور خطبے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس سلیمانی ان تمام اغراض کے لیے اردو استعمال کرتے ہیں۔

داؤدی بوهروں کا پیشوا عموماً بمبئی میں رہتا ہے، لیکن اس کا صدر مقام سورت میں ہے اور "ڈیوڑھی" کے نام سے مشہور ہے۔ دونوں جگہ اسمٰعیلی مخطوطات کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ سورت میں ایک عربی مدرسہ ہے، جو "درسِ سیفی" کے نام سے مشہور ہے اور جس کا نام آج کل کے داعی سیّدنا طاہر سیف الدین کے نام پر رکھا گیا ہے [ان کا انتقال ہو چکا ہے اور اب ان کے جانشین ان کے بیٹے ہیں]۔ ان کا دفتری لقب الداعی المطلق ہے۔ عام طور پر لوگ انہیں "ملّاجی صاحب" یا "سیّدنا صاحب" کہتے ہیں اور ان کے مرید ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ ان کے حضور میں ان کے گروہ کی ایک بڑی تعداد ایک مخصوص انداز میں اظہار عجز و نیاز کرتی ہے، جسے "تقبیل الأرض" [زمین بوسی] کہتے ہیں۔ بظاہر یہ رسم فاطمیوں کے زمانے سے چلی آتی ہے اور اس میں اور سجدے کی مقرّرہ شکل میں بہت کم فرق ہے۔ شادی اور موت کی رسموں اور مقررہ نمازوں کے ادا کرنے میں مقامی عہدےدار عوام کی بخوبی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ عہدےدار "عامل" کہلاتے ہیں، جنھیں ملّاجی صاحب مقرر کرتے ہیں اور

''دعوت'' کے ملازم ھوتے ھیں۔ ان کے فرائض وھی ھیں جو سنیوں کے ھاں ''قاضی'' انجام دیا کرتے ھیں۔ اس کے علاوہ وہ ملاجی صاحب کے سامنے مختلف جھگڑے فیصلے کے لیے پیش کرتے ھیں اور ان کا اپنے حلقے والوں پر بہت زیادہ اثر و رسوخ ھے۔ بوھرہ جماعت کی ایک خصوصیت، جو پاک و ھند اور دیگر مقامات میں پائی جاتی ھے، یہ ھے کہ یہ پیشوں (یا محلّوں) کے لحاظ سے اپنے الگ الگ جتھے (guilds) بنا لیتے ھیں اور دوسروں کے ساتھ تعلقات کم رکھتے ھیں۔ یہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ شادی بیاہ نہیں کرتے اور دیگر مذاھب کے متّبعین کے ساتھ تو ایسے تعلقات کا سوال ھی پیدا نہیں ھوتا، اور عوامی امور میں بہت کم حصّہ لیتے ھیں۔ عام طور پر یہ لوگ تجارت پیشہ ھی ھیں، لیکن پاک و ھند، سیلون اور مشرقی افریقہ کے کچھ حصّوں میں خصوصاً سلیمانی فرقے کے لوگ عوامی زندگی میں داخل ھونے لگے ھیں اور سرکاری ملازمت بھی قبول کرنے لگے ھیں۔

داؤدی فرقے سے کٹ کر دو چھوٹے چھوٹے فرقے اَور بن گئے ھیں، لیکن انھیں زیادہ اھمیت حاصل نہیں ھے، مگر یہاں ان کا ذکر مناسب ھے: (۱) علیّہ بوھرے، جنھوں نے ۱۶۲۴ء میں بڑے ملّا شیخ آدم کے پوتے علی کی گدی نشینی کے دعوے کی حمایت کی۔ ان کے مقابلے میں شیخ طیّب تھے، جنھیں خود شیخ آدم اپنا جانشین نامزد کر گئے تھے؛ (۲) ناگوشیے، جو علیّہ فرقے سے تقریباً ۱۷۸۹ء میں علیحدہ ھو گئے تھے۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاھر ھوتا ھے وہ گوشت‌خوری کو گناہ قرار دیتے ھیں۔ جعفری بوھروں کا بڑا حصّہ داؤدی بوھروں کی اولاد ھے، جو مظفّرشاہ (۸۱۰ھ / ۱۴۰۷ء تا ۸۱۳ھ / ۱۴۱۱ء) کے عہد حکومت اور اس کے بعد کے گجرات کے بادشاھوں کے زمانے میں سنی ھو گئے تھے۔ اگرچہ ان کی تعداد میں اضافہ ھندو نومسلموں کی بدولت ھوا۔ انھوں نے اپنا نام ایک صوفی پیر سیّد احمد جعفر شیرازی (پندرھویں صدی) کے نام پر رکھا ھے، جن کی اولاد کو وہ اپنا روحانی پیشوا مانتے ھیں اور ان کی تعظیم و تکریم بجا لاتے ھیں۔

بوھرے اپنی مذھبی کتابوں کو مخفی رکھتے ھیں، لیکن حال ھی میں ان کی بعض فقہ کی (جیسے دعائم الاسلام [و کتاب الاقتصار])، تاریخ کی (جیسے سیرة سیّدنا المؤیّد) اور فلسفے کی (جیسے راحة العقل اور الرّسالة الجامعة) کتابیں چھاپ دی گئی ھیں۔ اس کی مزید تفصیل ان مآخذ میں ملے گی جن کا ذکر W. Ivanow کی 'Guide to Ismaili Literature'، لنڈن ۱۹۳۳ء، میں کیا گیا ھے، جسے دوسری بار طبع کرنے کا ارادہ کیا جا رھا ھے۔ ان کے مذھب اور عقائد کے لیے دیکھیے: زاھد علی: ھمارا اسمٰعیلی مذھب اور اس کی حقیقت (اردو) حیدرآباد (دکن)، ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء۔ اس کتاب میں ''حقائق'' (یعنی اسمٰعیلیہ کی مخفی تعلیم) کی پوری تشریح خود اس فاضل بوھرے نے کی ھے۔ حال ھی میں آصف فیضی نے مستعلیہ اسمٰعیلی فرقے کے مخطوطات کا ایک مجموعہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانے کو دیا ھے۔ ان کتب کی تعداد ایک سو ساٹھ ھے۔

مآخذ: عام تصانیف: (۱) نور اللہ بن شریف الشُّشتری: مجالس المؤمنین (مجلس دوم الخ)؛ (۲) علی محمد خان: مرآت احمدی، بمبئی ۱۳۰۷ھ، ۲: ۸۷؛ (۳) A. K. Forbes: *Ras Mala or Hindoo Annals of the Province of Goozerat*، ۱: ۳۲۳ تا ۳۳۳ (لنڈن ۱۸۵۶ء)؛ (۴) *Gazetteer of the Bombay Presidency*، ج ۹، بمبئی ۱۸۹۹ء، حصّہ ۲: ص ۲۴ ببعد؛ (۵) D. Menant: *Les Bohoras du Guzarate*، در *RMM*، ۱: ۴۶۵ ببعد؛ نیز رک بہ (۶) مقالات ''قاضیہ''، ''اسمٰعیلیہ'' اور ''قاضی نعمان''؛ (۷) زاھد علی: ز

کتاب مذکور بالا؛ (۸) Sh. T. Lokhandwalla: The Bohoras, a Muslim Community of Gujarat، در St. Islamica، ۱۹۵۵ء، ص ۱۱۷ تا ۱۳۰؛ (۹) عباس حسین الحمدانی: The Ismaili Da'wa in Northern India، قاہرہ ۱۹۵۶ء۔

تاریخ دعوت: ابھی تک بوھروں کی علمی طرز پر کوئی مفصّل تاریخ نہیں لکھی گئی پھر بھی ایک عربی تصنیف، جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی، دیکھنا چاہیے یعنی مُنْتَزَع الأَخْبار (۲ جلد، دیکھیے W. Ivanow: Guide عدد ۳۲۰)، جس پر ایک گجراتی تصنیف کی بنیاد رکھی گئی ہے، جو عربی رسم الخط میں سنگی طباعت پر ہوئی: موسم بہار فی اخبار الدعاۃ الأَخْیار، ۳ جلد از (میاں صاحب) محمد علی بن جیوا بھائی، بمبئی، بدون تاریخ۔

اسمٰعیلی دعوت پر ادب کا بیشتر حصّہ ابھی تک طبع نہیں ہوا، لیکن W. Ivanow نے اس کا ذکر کر دیا ہے (کتاب مذکور مع اضافہ از Paul Kraus در REI، ۱۹۳۲ء، ص ۴۸۳ تا ۴۹۰)؛ مزید مآخذ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے دیکھیے: A. A. A. Fyzee: Materials for an Ismaili Bibliography، ۱۹۲۰ - ۱۹۳۴ء، در Journal of Bombay Branch of the Royal Asiatic Society، ۱۹۳۵ء، ص ۵۹ تا ۶۵ اور مجلّۂ مذکورہ، ۱۹۴۰ء، ص ۹۹ تا ۱۰۱۔ بعض اہم مُتون حال ہی میں ڈاکٹر محمد کامل حسین نے طبع کر کے شائع کیے ہیں (قاہرہ)۔

فقہ: القاضی النُّعمان [بن محمّد]: دَعائِم الاسلام، ج ۱، طبع آصف فیضی، قاہرہ ۱۹۵۱ء، اس کی دوسری جلد بھی [چھپ چکی ہے، نیز دیکھیے وہی مصنّف: کتاب الاقتصار، طبع محمد وحید میرزا، دمشق ۱۹۵۷ء]۔

(آصف فیضی)

بُوَیْہ (بنو): ان تمام حکمران خاندانوں میں اہم‌ترین خاندان، جنھوں نے پہلے ایران کی سطح مرتفع اور پھر عراق میں، خراسان اور ماوراء النّہر کے سامانیوں کے دوش بدوش حکومت کی اور جو ابتدائی اسلام کے عرب اقتدار اور پانچویں صدی ھجری/گیارھویں صدی عیسوی کی ترکی فتوحات کے درمیانی عہد میں بقول منورسکی "ایرانی شغلے" (Iranian Intermezzo) کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس خاندان کا نام بُوَیْہ یا بُوْیَہ سے ماخوذ ہے، جو ان تین بھائیوں کے والد کا نام تھا جو اس خاندان کے بانی ہیں۔ ان تینوں بھائیوں کے نام یہ ہیں: علی، الحسن اور سب سے چھوٹا احمد۔ یہ لوگ دَیْلَمیوں [رک بآں] کی آبادی میں شامل تھے، جنھوں نے نیا نیا اسلام (شیعی) قبول کیا تھا اور ان دنوں بڑی تعداد میں مشرقی مسلمان افواج میں، جن میں خلیفہ کی فوج بھی شامل تھی، بھرتی کیے جا رہے تھے۔

کسی حد تک یہ دیلمی ہی تھے جنھوں نے بویہیوں کی آمد پر اقتدار حاصل کیا اور نظام حکومت پر اپنا رنگ چڑھا دیا۔ جو دیلمی دَیلَم میں رہ گئے انھوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنا لیں، جو بعض اوقات پھیل کر آذربیجان تک پہنچ گئیں، لیکن جو دیلمی ایران اور عراق میں تھے انھوں نے ترقی کر کے ایک اہم سیاسی حیثیت حاصل کر لی۔ بُوَیہی شروع میں تو اپنے ایک ہم وطن ماکان بن کاکی کے پیرو رہے، جو سامانیوں کا ملازم ہو گیا تھا، اور پھر ان کے گیلانی حلیف مرداویج [رک بآں] کے ساتھ مل گئے تاکہ دونوں مل کر اپنے مشترک دشمن، طبرستان کی زیدی ریاست (جو کبھی رَےّ تک پھیلی ہوئی تھی) سے مقابلہ کریں۔ یہ لوگ اس وقت بھی اسی گیلانی مَرْداویج کے تابع تھے جب اس نے وسط ایران میں اپنی ایک وسیع خود مختار

ریاست قائم کی لیکن کچھ عرصے بعد انہوں نے اس کے ساتھ کسی قدر سرکشانہ رویہ اختیار کیا۔ جب علی کچھ دن کے لیے اصفہان کا مالک ہوا اور پھر مستقل طور پر فارس کا حکمران ہو گیا تو اس نے مَرْداویج کے پنجے سے نجات حاصل کرنے کے لیے، باوجود شیعہ ہونے کے، خلیفہ کی منظوری حاصل کر لی کہ اس صوبے پر اس کی حکومت قائم رہے گی۔ خلیفہ نے آسانی سے یہ منظوری اس لیے دے دی کہ عباسی لشکر میں اسی صوبے کو دوبارہ فتح کرنے کی قوت نہیں تھی۔ علی اس وقت بھی اس صوبے پر قابض تھا جب ۳۲۳ھ / ۹۳۵ء میں مَرْداویج قتل ہوا۔ بویہیوں کا سب سے بڑا بھائی علی، سامانیوں کے حلیفوں یا ان مختلف قبائل سے جن کا خلیفہ پر اثر تھا، لڑائیاں لڑتا رہا [رَکَ بہ عمادالدّولة، معزّالدولة اور رُکن الدولة] اور اس نے صوبۂ فارس پر اپنا قبضہ قائم رکھا۔ اس کے بھائی الحسن نے سارے الجبال پر اپنا قبضہ جما لیا اور سب سے چھوٹے احمد نے ایک طرف تو کرمان پر اور دوسری طرف خوزستان پر قبضہ کر لیا۔ ان مستحکم قلعوں پر اور بالخصوص مؤخّرالذکر مقامات پر قبضہ ہو جانے کی وجہ سے بویہی دوسری جماعتوں کے ساتھ حصول اقتدار کی اس کشمکش میں شریک ہو گئے جو عراق اور دیگر ممالکِ خلافت میں، جو یکے بعد دیگرے کسی نہ کسی امیرالامرا کے زیرِ انتظام چلے آ رہے تھے، چل رہی تھی۔ اس بات کا پتا دقیق مطالعے ہی سے چل سکتا ہے کہ ان سازشوں اور بغاوتوں کے موقع پر جن کا سلسلہ ہر طرف جاری تھا بویہی کسی خاص فرقے کے ساتھ اتحاد رکھتے تھے یا نہیں۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو احمد ۳۳۴ھ / ۹۴۵ء میں بغداد میں داخل ہو گیا اور جو نظامِ حکومت اس نے وہاں قائم کیا وہ ۴۴۷ھ / ۱۰۵۵ء تک چلتا رہا۔ اس دورِ جدید کا افتتاح ناموں کے فوری تغیّر سے ہوا۔ احمد، علی اور الحسن نے خلیفہ سے علی الترتیب معزّالدولة، عمادالدّولة اور رُکن الدولة کے القاب حاصل کر لیے اور آئندہ تاریخ میں وہ انہیں القاب سے مشہور ہوے۔ کچھ عرصے بعد عماد الدّولة (علی) کی وفات ہو گئی، چونکہ اس کی کوئی اولاد نہ تھی اس لیے فارس کا فرماں‌روا اس کا بھتیجا عَضُدُ الدّولة ہوا جو رُکن الدّولة (الحسن) کا بیٹا تھا۔ جب معزّالدّولة (احمد) کی وفات کے بعد رُکن الدولة (الحسن) کا بھی انتقال ہو گیا (۳۶۶ھ / ۹۷۷ء) تو عَضُدُالدّولة سارے خاندان بویہ کا سردار قرار پایا۔ اس نے اپنے بھتیجے عزّالدولة بختیار کو عراق کی حکومت سے برطرف کر دیا اور فقط اپنے بھائی مؤیِّدُ الدّولة کو ایران کے باقی‌ماندہ حصے پر، جو بویہیوں کے زیرِ اقتدار تھا، حکومت کرنے کی اجازت دی، اس لیے کہ اسے اس کی وفاداری پر اعتماد تھا۔ عَضُدُ الدّولة نے، جو خاندان بویہ کی سب سے ممتاز اور نمایاں شخصیت ہے، خاندان میں مکمّل اتفاق اور اتحاد قائم کیا [دیکھیے اورینٹل کالج میگزین، اگست ۱۹۲۸ء].

عراق کے باہر جو جدید ولایتیں بنیں ان سے صرف ولایتوں کی اس تعداد ہی میں اضافہ ہوا جو ایک صدی سے مملکتِ عبّاسیہ کے اندر پیدا ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ عراق کی ولایت نے، جو بویہیوں کے تحت تھی، اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ خلافتِ عباسیہ کی اس آخری مستحکم پناہ‌گاہ میں حکومت کا وہی طرز جاری رہنے دیا جو دیگر مقامات پر مقبولیت حاصل کر چکا تھا، لیکن اس ولایت عراق کو ایک اہم خصوصیت یہ بھی حاصل تھی کہ بغداد خلافت کا مرکز تھا۔ یہ سچ ہے کہ بویہیوں نے اس پر قبضہ کر کے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ ان حالات پر مہرِ توثیق ثبت کر دی جن کی بدولت خلافت عملاً ان فوجی سپہ سالاروں کے

زیرِ اقتدار جا چکی تھی جنھیں ترقی دے کر امیرالامرا بنا دیا گیا تھا، لیکن اس صورت میں یہ فرق البتہ تھا کہ وہ شیعہ مذہب کے پیرو تھے اور اس لیے یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ آیا وہ ایسی خلافت کو ختم کرنے کے خواہاں نہ ہوں گے جس کا جواز ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا، لیکن اس طرح کی کوئی بات پیش نہیں آئی ۔ بلاشبہہ معزّالدولۃ جانتا تھا کہ شیعہ اقلیت میں تھے اور یہ کہ اگر اس نے خلافت کو بغداد میں ختم بھی کر دیا تو وہ کسی اُور جگہ نمودار ہو جائے گی، اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے اپنے اقتدار میں رکھا جائے تاکہ اس کی ولایت میں جو سنّی ہیں ان پر اس کے اقتدار کا جواز باقی رہے اور دوسرے بیرونی دنیا سے اس کے سیاسی تعلقات مضبوط ہو جائیں، اس لیے کہ سنّی حکمرانوں کی اب بھی عزت کی جاتی تھی اور اخلاقی اعتبار سے ان کا اقتدار تسلیم کیا جاتا تھا ۔ حقیقت تو یہی تھی کہ خلافت ہی نے بویہیوں کو ان کی سرکاری حیثیت عطا کی تھی اور انھوں نے اپنا ظاہری طرزِ عمل ہمیشہ ایسا رکھا جیسے وہ سچے دل سے خلافتِ عبّاسیہ کے جواز کو تسلیم کرتے تھے.

اُس کے علاوہ خلافت کے ساتھ بویہیوں کے تعلقات کی بنیاد ان کے مذہبی عقائد پر بھی تھی ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بویہی زیدی تھے اس لیے کہ دیلم انھیں زیدیوں کے داعیوں کا میدان رہ چکا تھا جنھوں نے طبرستان میں اپنے سیاسی اثرات اور اپنے قوی حلقے قائم کر رکھے تھے اور ادھر خود دیلم کی عین سرحدوں پر ان کے حریف الاُطْرُوش [رَکّ بآں] کے کارندوں نے ۹۰۰ء کے قریب اپنا حلقۂ اثر قائم کر لیا تھا ۔ تاہم دیلم میں اسمٰعیلی بھی تھے (مِسْکُوَیہ، ۲ : ۲۳ تا ۵۳) اور اطروش یا اس کے جانشینوں کے حلقۂ مُتبعین میں اثنا عشری بھی موجود تھے، اور مرداویج، شاید اسمٰعیلی پروپیگنڈے سے متأثر ہو کر، سامانی سنّیوں کے ساتھ مل کر طبرستان کے زیدیوں سے لڑا تھا ۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ابھی اثنا عشری عقائد کی تبلیغ کا آغاز ہی ہوا تھا اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ متأخر بویہی معاشرے پر زیدی عقائد اور معتزلی اثرات اتنے نمایاں تھے، لیکن بویہی فاتحین سیاست کو مذہب پر ترجیح دیتے تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ معزّالدولۃ کے دل میں ایک مرتبہ یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ خلافت کو اپنے لواحقین میں سے ایک شخص زیدی علوی کے سپرد کر دے، لیکن محض اس خوف سے کہ اگر اسے خلیفہ بنا دیا گیا تو اس کی اطاعت مذہبًا واجب ہو جائے گی اس کے بعد یہ خیال اس کے دل میں پھر کبھی پیدا نہیں ہوا ۔ شیعوں کی مختلف شاخوں کا باہمی فرق اب تک زیدی ریاستوں کے باہر (بہ استثنائے جماعت اسمٰعیلیہ) واضح اور معیّن نہیں ہوا تھا اور اثنا عشری میلان، عراق میں اور غالبًا وسطِ ایران میں یقینی طور پر شیعیت کا غالب میلان تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سلطنت کا اختیار بویہیوں کے قبضے میں آ رہا تھا (اور کیا یہ محض اتفاقی بات تھی؟) تو یہ عقیدہ عام ہوتا جا رہا تھا کہ اس عہد کے بعد جس میں اماموں میں سے کوئی امام بذاتِ خود موجود ہو اور اس کے آگے کے عہد کے بعد جس میں اس کا وکیل اس کی جگہ کام کر رہا ہو ایک زمانہ غیبوبتِ کبریٰ کا آئے گا جس میں اماموں یا ان کے وکیلوں میں سے کسی کے متعلق کوئی علم نہیں ہوگا ۔ اس لیے اگرچہ عباسی خلیفہ شیعوں کے نزدیک صحیح معنوں میں برحق نہیں بھی تھا لیکن شیعی مذہب سے رواداری برتتا تھا تو کم از کم اس کی خلافت کو برداشت کرنے میں کوئی مضائقہ نہ تھا [اگرچہ بویہیوں نے بلا امتیاز شیعوں اور معتزلیوں کو اپنے اندر قبول کیا، لیکن سیاسی لحاظ سے وہ اثنا عشری رہے].

فرمانروایان بنو بویہ

سنہ ہجری	عراق	فارس	کرمان	جبال	
۳۲۰				[عمادالدولة	
۳۲۲		عمادالدولة		(عہد انتشار)	
۳۲۴			[معزالدولة	[رکن الدولة	
۳۳۴	معزالدولة		(عہد انتشار)	(عہد انتشار)	
۳۳۵				رکن الدولة	
۳۳۸		عضدالدولة	[عضدالدولة		
۳۵۶	عزالدولة بختیار		عضدالدولة		
۳۶۶				اصفہان و ہمذان	رّی
				مؤیدالدولة	فخرالدولة
۳۶۷	عضدالدولة				
۳۶۹					مؤیدالدولة
۳۷۲	صمصام الدولة	شرف الدولة	صمصام الدولة		
۳۷۳				فخرالدولة	فخرالدولة
۳۷۶	شرف الدولة				
۳۷۹	بہاء الدولة				
۳۸۰		صمصام الدولة			
۳۸۷				شمس الدولة	مجدالدولة
۳۸۸		بہاءالدولة	بہاءالدولة		
۴۰۳	سلطان الدولة	سلطان الدولة	قوام الدولة		
۴۱۲	مشرف الدولة	مشرف الدولة		سماع الدولة	
				[بعد ازاں بنو کاکویہ]	
۴۱۵		ابوکالیجار			
۴۱۶	جلال الدولة				
۴۱۹			ابوکالیجار		
۴۲۰					فتح غزنویہ
۴۳۵	ابوکالیجار				
۴۴۰	الملک الرحیم	الملک الرحیم	فولادستون		

۴۴۷	بغداد پر طغرل بیگ کا قبضہ اور الملک الرحیم کی اسیری
۴۴۸	[فضلویہ کا قبضہ]

قبضہ یک وقت ←——→
ایک ہی شخص کا قبضہ،
مگر مختلف زمانوں میں ←.........→
جزوی اور متنازع فیہ قبضہ [ ]

عراق اور فارس کے متحد رہنے کا زمانہ: ۳۶۷ تا ۳۷۲ھ؛ ۳۷۶ تا ۳۷۹ھ؛ ۳۸۸ تا ۴۱۵ھ اور ۴۳۵ تا ۴۴۷ھ۔

عراق اور کرمان کے متحد رہنے کا زمانہ: ۳۳۴ تا ۳۵۶ھ اور ۳۸۰ تا ۳۸۸ھ۔

کرمان اور فارس کے متحد رہنے کا زمانہ: ۳۲۸ تا ۳۶۷ھ (۳۷۲ھ تک عراق کے ساتھ متحد رہا)؛ ۳۸۰ تا ۴۰۳ھ، ۴۱۹ تا ۴۴۰ھ۔

کرمان سب سے الگ رہا: ۴۰۳ تا ۴۴۶ اور ۴۴۰ تا ۴۴۸ھ۔

عراق سب سے الگ رہا: ۳۳۴ تا ۳۶۷ھ؛ ۳۷۹ تا ۳۸۰ھ؛ ۴۱۶ تا ۴۳۵ھ۔

فارس سب سے الگ رہا: ۳۲۲ تا ۳۲۸ھ؛ ۳۷۲ تا ۳۸۰ھ۔

عراق، فارس اور کرمان کے مابین اتحاد رہا: ۳۶۷ تا ۳۷۲ھ؛ ۳۸۸ تا ۴۰۳ھ؛ ۴۳۵ تا ۴۴۰ھ۔

الجبال، اس خاندان کے ابتدائی دور سے قطع نظر، ہمیشہ سب سے الگ رہا۔

عمان ہمیشہ فارس سے متحد رہا، سوائے اس مختصر مدت کے جب یہ بعہدِ صمصام الدولۃ عراق سے متحد ہو گیا تھا۔

بصرہ اور اھواز، عضدالدولۃ کے بعد، اکثر عراق سے الگ رہے یا سلطنت عراق کے قلب میں ان کی خود مختار حکومت قائم رہی؛ بسا اوقات انہیں سلطنت فارس میں شامل کر لیا گیا۔

مکمل شجرۂ نسب کے لیے دیکھیے زمباور Zambaur، ص ۲۱۲ تا ۲۱۶ و Q۔

بویہیوں نے کبھی یہ منصوبہ نہیں بنایا کہ شیعہ سنیوں پر ظلم و ستم کریں۔ یہ دونوں فرقے ان کی فوج میں شامل تھے اور دراصل ان کی خواہش یہ تھی کہ شیعیت نہ صرف اس بنا پر بویہیوں کی مرہونِ منّت ہے کہ انہوں نے اسے ایک تنظیم کی صورت دی بلکہ انہوں نے کسی حد تک ان کے عقائد کا ایک ڈھانچا بھی تیار کیا۔ دولت مند شیعیوں اور ”شریفوں“ کو عباسی عہد کے آخری دنوں میں جو اہمیت حاصل ہوئی اس کا علم سب کو ہے۔ یہی دو جماعتیں تھیں جن پر، فوج سے قطع نظر، بویہی حاکموں اور مقامی آبادی کے معاشری روابط کا انحصار تھا۔ اس نظامِ حکومت نے علویوں، یا جیسا کہ انہیں عام طور سے کہا جاتا ہے، طالبیوں کو ایک ایسی مستقل منظّم جماعت بنا دیا جو عبّاسیوں کی ہم پایہ ہو، حالانکہ اس سے پہلے یہ خاندان عبّاسیوں کے بڑے خاندان کا محض ایک جز تھا اور عبّاسیوں کو اس پر ایک طرح کا غلبہ حاصل تھا۔ عقائد کی سطح پر، اوّل تو اس وجہ

ہے کہ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی تک خود اماموں کی موجودگی اور اس حقیقت نے کہ اثنا عشری مدت دراز سے ایک منفیانہ انداز میں شیعوں میں ایک ایسی جماعت بن کر رہ گئے تھے جس نے کسی عملی بغاوت میں حصہ نہیں لیا تھا علماے حدیث و نظریات کے کام میں رکاوٹ ڈال رکھی تھی ۔ بویہیوں نے آ کر اس ضائع کردہ وقت کی تلافی کر دی ۔ الکُلینی [رکّ باں] تو، جسے فقہاے شیعہ میں پہلا بڑا عالم مانا گیا ہے اور جسے اثنا عشریوں نے خاص طور پر اپنا عالم تسلیم کیا ہے، بویہی اقتدار کے شروع ہی میں ایران میں وفات پا چکا تھا، لیکن دوسری اس سے زیادہ اہم شخصیت ابن بابویہ (بابُوَیْه) [رکّ باں] کی تھی، جس نے اس صدی کے تیسرے ربع میں الکُلینی کی جگہ سنبھالی ۔ بویہیوں نے اس کے کام کی بڑی حوصلہ افزائی کی ۔ اس کے بعد اور شیعی علما تھی جن میں علویوں کے قدیم مرکز قُم کے رہنے والے عرب بھی شامل تھے اور جن کی اہمیت ایرانی شیعیت میں بھی مسلّم ہے بغداد میں دو بھائی الرَّضی اور المُرتضٰی شریف تھے ۔ وہ گیارھویں صدی عیسوی کے ربع اوّل میں شہر کے اصل مالک تھے اور بویہیوں، خلیفہ اور عوام کے درمیان واسطے کی حیثیت رکھتے تھے اور غلاوہ بریں شیعوں میں محدّث اور فاضل کی حیثیت سے بھی بزرگ سمجھے جاتے تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت جب کہ سنّی اپنے چار مسلکوں (مذاہب اربعہ) کو مسلم مسلک تسلیم کرانے پر زور دے رہے تھے یہ دونوں بھائی اس بات کے خواہشمند تھے کہ شیعیت کو بھی ایک پانچویں مسلم مسلک کی حیثیت سے امت کے نظام میں داخل کر لیا جائے ۔ بویہی نظام حکومت میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ ان مذہبی رسوم کی تشکیل یا تائید ہے جو آج تک شیعیت کی خصوصیات چلی آتی ہیں ۔ شاید دیلمیوں کے رواج سے متاثر ہو کر معزّالدولة نے ''عاشوراء'' کے ماتم کی رسم کھلم کھلا جاری کی یا اسے ایک مذہبی فریضہ قرار دیا ۔ اسی نے عید ''غدیرِ خُم'' کی بنا بھی ڈالی ۔ علوی مشہدوں کو آراستہ اور مزیّن کیا گیا اور عضدالدولہ وہاں دفن ہوا ۔ شیعی مدرسے بنائے گئے، مثلاً وزیر سابور کا دارالعلم، جس کے لیے اوقاف قائم کیے گئے، جو فاطمیہ یونیورسٹی [الازہر] (۳۹۳ھ / ۹۹۳ء) کی نقل تھا اور سلجوقیوں کی سنّی ''نظامیہ'' یونیورسٹی سے کہیں پہلے بنایا گیا تھا ۔ مسجدوں میں شیعی طریقے سے عبادت کی جانے لگی اور اذان کا بھی وہی طریقہ جاری کیا گیا.

حالات کی نوعیت کو دیکھتے ہوے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ تسلیم شدہ خلیفہ مؤثر انداز میں حکومت کر سکے ۔ ناصرالدولة کے لقب کی طرح، جو ہمدانیوں کو دیا گیا تھا اور اپنی نوعیت کا پہلا لقب تھا، بویہیوں کے القاب سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کے اقتدار کو قانونی حیثیت خلیفہ ہی کے حکم سے حاصل ہوتی تھی لیکن در حقیقت عملی طور پر سارا اقتدار انہیں کے ہاتھ میں تھا ۔ خلیفہ المُستکفی، جس نے ان کا خیر مقدم کیا، ان سے پہلے اور بہت سوں کو اقتدار میں اپنا شریک کر چکا تھا ۔ اس کے بعد اس کا جانشین اس کا ذاتی دشمن المُطیع ہوا، جسے خود انیس سال کے بعد اپنا تخت الطّائع کو دینا پڑا، اس لیے کہ معزّالدولة کے وارثوں کی باہمی جنگ میں وہ غلط فریق کی حمایت کر بیٹھا تھا ۔ الطّائع کو بھی آگے چل کر القادر کے لیے تخت چھوڑنا پڑا، لیکن بویہیوں کے عہد میں، جس میں ایک صدی کے اندر تین سے اوپر حکمرانوں نے حکومت کی، خلفا کی مدتِ خلافت اپنے پیش رووں کے مقابلے میں خاصی طویل رہی ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی حکومت

برائے نام تھی، رہے القاب تو ان کی کیفیت یہ تھی کہ جوں جوں ان کی قدر گھٹتی گئی ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، چونکہ خاندان شاہی کا ہر ایک شہزادہ اور پھر رفتہ رفتہ دوسرے خاندانوں کا ہر ایک شہزادہ لقب کا دعویدار بن گیا، اس لیے اس کی ضرورت آ پڑی کہ بویہیوں کے سب سے بڑے سردار کو دو دو لقب بلکہ بعد میں تین تین لقب تک دیے جائیں، مثلاً عَضُدالدَّولة کا لقب تاج الملّة وغیرہ بھی تھا ۔ بویہیوں کا آخری حکمران تو اس میدان میں اتنا آگے نکل گیا کہ اس نے اپنے لیے ایسا لقب اختیار کر لیا جس کا آخری لفظ ''دین'' تھا ۔ یہ ایک ایسا اقدام تھا اور اس میں ایک ایسا پہلو مضمر تھا کہ خلیفہ اسے کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا ۔ اسی طرح عَضُدالدولة کے بعد سے یہ دستور ہو گیا کہ جو شہزادہ اقتدار میں سب سے بڑا ہوتا تھا وہ ''امرا'' پر اپنی فوقیت جتانے کے لیے اپنے آپ کو ''مَلِک'' کہتا اور کہلواتا تھا، یہاں تک کہ ایران میں تو اس نے ساسانیوں کا قدیم لقب شاهنشاہ اختیار کر لیا تھا اگرچہ عراق میں ایسا نہیں ہوا ۔

جہاں تک اقتدار کے عملی پہلو کا تعلق ہے اس سلسلے میں یہ بات خصوصیت سے توجہ طلب ہے کہ بغداد میں حکومت کا کوئی ایسا ادارہ باقی نہیں رہا تھا جو اپنے قیام کے لیے قانونی اعتبار سے بھی خلیفہ پر انحصار رکھتا ہو ۔ اگرچہ تھوڑے زمانے تک، ناصرالدّولة کے عہد میں، یہ صورت قائم رہی ۔ ہر چیز اور خصوصیت سے وزارت کی حیثیت ایک ایسے ادارے کی تھی جس کا ''امارت'' سے براہِ راست تعلق تھا، حالانکہ اس تغیر سے فرائض کی تقسیم میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی ۔ اگر تعین مقام کیا جائے تو کہا جائے گا کہ بغداد میں ہر چیز اس وقت دارالمملکة (دیکھیے بیان آئندہ) کی تحویل میں تھی ۔ اس زمانے کے دوران میں کہ جب وزارت یا امارت کو، نظامِ حکومت (خلافت) کی طرف سے کسی حد تک ثبات اور استقلال عطا ہوا بویہیوں کے وزیروں کی حالت یہ تھی کہ وہ اقتدار میں خلافت کے بڑے سے بڑے وزیر سے بھی کسی طرح کم نہ تھے اور وہ اپنے عہدے پر بھی زیادہ مدت تک فائز رہتے تھے ۔ انھیں وزیروں میں سے معزّالدّولة کے تحت المُهلّبی، رکن الدّولة کے تحت ابن العَمِید، مؤیّدالدّولة اور فخرالدولة کے تحت صاحب ابن عبّاد تھے ۔ یہ تینوں خوب شائستہ اور مہذّب ہونے کے علاوہ بڑے مدبّر اور منتظم بھی تھے ۔ پھر بھی بعض بویہی، خصوصاً عَضُدالدّولة، جو ان سب میں زیادہ عظیم الشان تھا، اس بات کو ترجیح دیتے تھے کہ سلطنت کے محکموں کا آخری نظم و اختیار عملاً اپنے ہاتھ میں رکھیں ۔ عملی اعتبار سے وزیروں کا کام دو یا تین خاص اشخاص کے سپرد کر دیا جاتا تھا، جو کبھی القاب کے ساتھ اور کبھی القاب کے بغیر کام کرتے تھے ۔ بویہی چونکہ عربی زبان سے اچھی طرح واقف نہ تھے اس لیے اقتدار کے پہلے دور میں ان کے لیے صرف یہی ممکن تھا کہ وہ اپنے سے زیادہ قابل وزرا کے کام سے فائدہ اٹھائیں ۔ آخری بویہیوں کے عہد میں وزارت زیادہ کمزور ہو گئی تھی، حالانکہ وزیر اکثر ایک ہی گھرانے کے لوگ ہوتے تھے ۔ اس میں شک نہیں کہ خلیفہ کے پاس اب بھی انتظامی اور قضائی محکمے موجود تھے، لیکن یہ محکمے یا تو ایسے امور کے انتظام میں مصروف رہتے تھے جن کا تعلق خاص خلیفہ کی ذات سے ہوتا تھا اور یا امیروں کی طرف سے بین الاقوامی خط و کتابت کا کام انجام دیتے تھے ۔

خلیفہ کے فرائض یہ تھے کہ مال و متاع اور

سامان کا انتظام کرے اور محل کا نظم و نسق درست رکھے۔ اپنی ذات اور محل سے باہر خلیفہ کے ذمّے یہ کام تھا کہ وہ خیراتی کاموں کی نگرانی کرے اور سنّیوں کی شرعی اور مذہبی زندگی کی دیکھ بھال کرے۔ شہر بغداد کے انتظام میں بھی اس کی تھوڑی سی اخلاقی ذمے داری تھی۔ خلیفہ کی آمدنی، خاندانی اور ذاتی ذرائع سے الگ، اب وہ نہیں تھی جو وہ پہلے حکومت کے مالیے میں سے اپنے لیے علیحدہ رکھ لیا کرتا تھا، اس لیے کہ اب اجرتوں اور تنخواہوں کا فیصلہ خلیفہ کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اس کے برخلاف، جیسا کہ ناصر الدّولۃ کے زمانے میں تھا، امیر خزانۂ عامّہ سے کچھ رقم اسے جیب خرچ کے طور پر دے دیا کرتا تھا حالانکہ پہلے زمانے میں خزانے کا سارا اختیار اسی خلیفہ کو حاصل تھا۔ خلیفہ کو جو کچھ اب ملتا تھا وہ پہلے کے مقابلے میں تو کم تھا لیکن اب بھی وہ اس کی شان اور مرتبے کے مناسب تھا، یعنی بویہیوں کے ابتدائی حکمرانوں کے عہد میں اس کی مقدار دو لاکھ یا تین لاکھ دینار تھی۔ وہ کثیر التعداد تحائف جو اسے ساری اسلامی دنیا اور خارجی سلطنتوں کے سفیر دیا کرتے تھے اور وہ رقم جو اسے بویہیوں سے تیوہاروں اور سرکاری تقریبوں پر ملتی تھی اس کے علاوہ تھی، لیکن اس کے مقابلے میں چندوں کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے جو سخت ملکی ضرورتوں کے وقت بویہی اس سے زبردستی وصول کر لیا کرتے تھے۔ خلیفہ کے شرعی اور مذہبی اختیارات میں یہ چیزیں داخل تھیں: مسجدوں کے اماموں اور خدّام کا تقرّر اور نگرانی، خاص طور سے بغداد میں جہاں خلیفہ القادر نے اپنی بے بسی اور بے اختیاری کی کمی اس طرح پوری کی کہ بویہی حکومت کی مرضی کے خلاف سنّی رسوم و قانون کو زبردستی رائج کرنے کا حکم نافذ کیا۔

حکومت کے خلافت کے ہاتھ سے نکل کر امارت کے ہاتھ میں چلے جانے سے حکومت کے طور طریقے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ عملاً بویہی حکومت نے سلطنت پر پورا عسکری تسلط اور اقتدار قائم کر دیا تھا، لیکن ساتھ ساتھ انتظام عامّہ کے عام فرائض کا ادا کرنا بھی ضروری تھا، اس لیے اس عسکری اقتدار کے معنی یہ ہوئے کہ ایک لحاظ سے فوجی اختیار اور اقتدار ان محکموں میں بھی دخل انداز ہو گیا جو پہلے اس کے احاطۂ اقتدار سے باہر تھے۔ تبدیل شدہ صورت حال میں سب سے زیادہ خطرناک نتائج ''اِقْطاع'' [رَكَ بآں] کے نظام میں پیدا ہوئے۔ مدت دراز سے وفادار حامیوں اور پھر زیادہ کثرت کے ساتھ فوجی سرداروں کو خلیفہ انعام کے طور پر سرکاری زمینوں کا ایک حصّہ عارضی طور پر دے دیا کرتا تھا، لیکن تقریباً پچھلی ایک صدی سے انعام کا یہ ذریعہ مسدود اور ناکافی ہو گیا، اس لیے اعلٰی فوجی افسروں کو کبھی کبھی یہ اختیار دے دیا جاتا تھا کہ وہ ایک خاص علاقے سے محصول وصول کر لیں۔ اس رعایت کے بدلے میں انھیں حکومت کے خزانے میں اسلامی عُشر [رَكَ بآں] کے سوا اَور کچھ داخل نہیں کرنا پڑتا تھا۔ بویہی نظام نے حمدانیوں کا اتباع کرتے ہوئے اس طریقے کو زیادہ وسعت دی اور اس رواج کو سختی سے جاری کیا۔ بہت سے اضلاع اسی نئی نوعیت کے ''اقطاعات'' کی صورت میں باقاعدہ تقسیم کیے جانے لگے اور اب عُشر ادا کرنے کی شرط بھی اٹھا دی گئی۔ مِسْکَوَیہ اور اس سے پہلے ثابت بن سنان نے اس نظام کے کچھ نتائج کا حال کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مرکزی نظم و نسق کے نقطۂ نظر سے اس کے معنی یہ تھے کہ ملک کے ایک حصّے میں مالی معاملات طے کرنے کا اختیار حکومت کے ہاتھ سے نکل گیا، اور اس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ

حکومت کو اس کا علم بھی نہیں رہا کہ کس طرح کا لگان اور کتنا لگان وصول کیا جاتا ہے۔ اگر متفرق اضلاع کی سالی قیمت کا اندازہ سرسری طور پر ممکن بھی ہو تو یہ اندازہ کرنا اب دیوان الخراج کے دائرۂ عمل میں نہ تھا، بلکہ فوجی لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ جب ''دیوان الخراج'' نے دیکھا کہ اس کے بہت سے فرائض اس کے ہاتھ سے نکل گئے تو اس نے اپنے عملوں اور شعبوں کی تعداد میں کمی کر دی، لیکن بویہیوں کے یہ ''اقطاعات'' بطور جاگیر نہیں دیے جاتے تھے، بلکہ انہیں تنخواہوں کا بدل سمجھا جاتا تھا۔ اگر صاحب اقطاع کو اپنے ضلع سے یہ رقم وصول ہونے کی توقع نہ ہوتی یا کوئی اور معقول سبب ہوتا تو وہ اپنی مرضی سے یا حکومت کی اجازت سے اس کا کسی اور سے مبادلہ کر سکتا تھا۔ یوں اقطاعی ضلع سے اس کا کوئی مستقل تعلق نہ ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس عارضی ملکیت کی ترقی سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس عارضی ملکیت کو محض مستقل جائداد بنانے کا ایک ذریعہ سمجھتا تھا، لیکن ابھی تک یہ لوگ صوبائی حکومت کے اقطاع پر قابض نہیں تھے۔ اگر وہ کسی وقت اس طرح کے فرائض انجام دیتے تو اس کا معاوضہ انہیں معمول کے مطابق مل جاتا۔ وہ اس کے بھی پابند نہ تھے کہ اقطاع کی آمدنی سے فوجیں رکھیں۔ ہر سپاہی کو اس کی تنخواہ براہ راست خزانۂ عامّہ سے ملتی تھی خواہ وہ کسی شکل میں ملے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ تنخواہ کا ایک غیر معینہ حصّہ ابھی تک جنس کی شکل میں ملتا تھا اور زمین کے ایک حصّے کا انتظام اب بھی پرانے طریقے کے مطابق سرکاری عہدیدار ہی کرتے تھے، جیسا کہ اس عہد کی حساب کتاب کی ان کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے جو ہم تک پہنچی ہیں۔

ان تحققات کے ساتھ، معاشری اور اقتصادی حیثیت سے فوجی افسروں پر مشتمل ایک نیا اور زیادہ طاقتور طبقۂ شرفا، متوسّط طبقے کے لوگوں، بڑے تاجروں، شہری زمینداروں اور اعلٰی افسروں کے اس بر سرِ انحطاط طبقۂ شرفا پر غالب آتا جا رہا تھا جو عباسیوں کے عہد اقتدار میں اپنے انتہائی عروج پر تھا، لیکن بویہیوں کے بڑے حکمرانوں کے عہد میں امرا نے اس نوخیز طبقے پر نمایاں اقتدار حاصل کر لیا اور اس بات کو بڑی اہمیت دی کہ یہ نیا طبقۂ شرفا شُرطہ (= پولیس)، امنِ عامّہ (حمایہ) اور محاصِل پر بھی ان کے اقتدار کو پوری طرح تسلیم کرے۔ ان حالات میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کسی کے ساتھ لگان کے معاملے میں کوئی رعایت کی جائے، اس لیے کہ فوجوں کے اخراجات کا انحصار انہیں لگانوں پر تھا۔ اس اصول کا اطلاق تنخواہ اور اِقطاع پر یکساں ہوتا تھا۔ لگان ادا کرنے والوں کے لیے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ لگان کون وصول کرتا ہے۔ نامور بویہی وزیروں نے فتوحات کے اس دور کے بعد اس بات کی کوشش کی کہ ملک میں صحیح نظم و نسق قائم کریں۔ اس دور میں جہاں نئے محصول لگائے گئے وہاں بعض محصول معاف بھی کیے گئے۔ ابتدائی بویہی حکمرانوں کے زمانے میں سکّے کی حالت بھی مستحکم تھی، لیکن ساتھ ہی اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جب عضُدالدّولۃ کے جانشینوں نے کپڑا بُننے والوں پر محصول لگانے کی کوشش کی، جن کی صنعت پر بغداد میں رہنے والے ہزاروں کاریگروں کی روزی کا انحصار تھا، تو بغداد میں شورشیں اور ہنگامے ہوئے۔ ان بویہی حکمرانوں کے عہد میں سلطنت کی مالی آمدنی اس آمدنی سے کسی قدر زیادہ

تھی جو خلافت کے تحت اتنے ہی رقبے سے حاصل ہوتی تھی ۔ جہاں تک زراعت کا تعلق ہے ان شورشوں اور فسادوں سے جو بویہیوں کی فتح کے پہلے واقع ہوئے تھے آبپاشی کے نظام میں بہت خلل آ گیا تھا ۔ ان ذمّے داریوں کے علاوہ اس نظام کی درستی اور مرمت اور جدید نہریں بنانے کے کام کا بوجھ بھی بویہی حکومت کے سر پر پڑا ۔ انھوں نے ان سڑکوں اور پلوں کو بھی نئے سرے سے درست کیا جن کے راستے تجارتی آمد و رفت ہوتی تھی، اور بغداد، شیراز اور اصفہان کے شہروں کو حکمرانوں کے وہاں موجود رہنے کی وجہ سے بہت فائدہ پہنچا ۔ انھوں نے ان شہروں میں شاندار محل بنوائے ۔ مشرقی بغداد میں ان تمام عمارتوں کا مجموعہ بجائے دارالخلافۃ کہلانے کے دارالمملکۃ کے نام سے موسوم ہوا ۔ شیراز کے شہری دروازوں پر کُرد فنّا خُسرو کے پاس عضدالدّولۃ نے جو عمارتیں بنائیں انھیں دیکھ کر المُقدّسی وجد میں آ گیا ۔ عراق اور فارس کے قریبی ارتباط کا نتیجہ یہ ہوا کہ عراقی طریقوں کو فارس میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی، مگر ان دونوں میں انتظامی اتحاد کبھی نہ ہو سکا ۔ یہ ارتباط، جس سے ممکن ہے مقامی صنعتوں کو کچھ فائدہ پہنچا ہو، اس ارتباط سے بالکل مختلف تھا جو اس عہد کے پہلے اور اس کے بعد پیدا ہوا اور جس نے عراق اور ایران کے باہمی ارتباطات کا رخ وسطی سطح مرتفع کے پار خراسان کی طرف پھیر دیا ۔

ثقافتی اعتبار سے شروع کے بویہی تعلیم سے بے بہرہ اور ناتراشیدہ تھے، لیکن ان کے اخلاف نے ایرانیوں کے تہذیبی اثرات قبول کیے ۔ سامانیوں کے قدیم ایران کے مقابلے میں وہ ایران جو بویہیوں کے زیرِ اقتدار تھا ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے عرب اثرات کا نمونہ معلوم ہوتا تھا ۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ شروع کے بویہیوں کو، جن کے وزیر ابن العَمید اور ابن عَبّاد تھے، عربیت کے اسی رجحان کی بدولت اس عہد کے دو معروف فاضلوں کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ۔ اس کے علاوہ ان کے دربار میں عربی شعرا کا ایک جمگھٹا تھا ۔ بویہیوں ہی کے زمانے میں ابوالفَرَج الاِصْفہانی نے کتاب الاغانی اور ابن النّدیم نے الفہرست تصنیف کی جو عربی ادب کے دو بیش بہا خزانے ہیں ۔ گو ابو اسحاق الصّابی کو عَضُدالدّولۃ کے خلاف شکایتوں کا موقع ملا تھا تاہم اس کے پوتے مؤرّخ ہلال الصّابی نے آخری بویہیوں کے زیرِ سایہ بغداد میں آرام و آسایش کی زندگی بسر کی، اور فلسفی اور مؤرّخ مِسْکَوَیہ کی سرپرستی بھی انھیں نے کی ۔ بالعموم بویہیوں نے علما کی قدردانی کی، بالخصوص ان علما کی جن کا علم عملی فوائد کا حامل تھا ۔ اس قسم کے علما میں علوم دینیہ کو چھوڑ کر ذیل کے لوگوں کے نام قابل ذکر ہیں : جغرافیہ‌دان الاِصْطَخری، ریاضی‌دان ابوالوفاء البوزجانی؛ النَّسوی جس نے ’’اعداد‘‘ کو رواج دیا، وہ ہیئت‌دان جن کے لیے شرف‌الدّولۃ نے بغداد میں ایک رصد گاہ بنوائی، اطبا (جیسے المَجوسی) جن کے لیے یہ بات باعث مسرت و فخر تھی کہ عضدالدولۃ نے ان کے لیے بغداد کے قدیم قَصرالخُلد میں ایک مشہور شفاخانہ قائم کیا اور شیراز میں بھی اسی طرح کا ایک شفاخانہ [رَکَ بہ بیمارستان] بنوایا ۔ مختلف بویہی حکمرانوں نے شیراز، رَے اور اصفہان میں جو کتب خانے قائم کیے ۔ ان کی تعریف ساری دنیا نے کی ہے ۔ یہ بات سب کے علم میں ہے کہ شمس الدّولۃ کے عہد میں ابن سِینا نے ایک درسگاہ قائم کی اور ترقی کر کے ایک اونچے منصب (وزارت) پر پہنچا ۔ ان بادشاہوں کے اولو العزم وزیر بھی اپنی فیاضیوں میں کسی سے پیچھے نہ رہتے تاوقتیکہ انھیں یہ شبہہ نہ ہوتا کہ

جس کی سرپرستی وہ کر رہے ہیں وہ آگے چل کر ان کا حریف بن جائے گا (جیسا کہ ابن عبّاد کے مقابلے میں ابو حیّان التوحیدی) ۔ ابن البوّاب، جو ایک بلند مرتبہ بویہی تھا، نسخی خوش نویسی کے موجدوں میں سے ایک تھا .

بویہیوں اور ان کے وزیروں نے ان روایتی علوم و فنون کی سرپرستی کے علاوہ جن کی نوعیت خالص عربی تھی جدید قسم کے فارسی ادب سے بھی پوری دلچسپی لی ۔ اگرچہ پہلی دیلمی نسل کے لوگ اتنے مہذب نہیں تھے جو اس قسم کا کوئی ادّعا کرتے، لیکن ان کے اخلاف صحیح معنوں میں دیلمی ہونے کی بہ نسبت پوری طرح ایرانی تھے ۔ یہ بات بلا سبب نہ تھی کہ انہوں نے شاہنشاہ کا لقب اختیار کیا، جس کا خواب مرداویج دیکھا کرتے تھے ۔ انہوں نے اپنے لیے ایک ساسانی شجرۂ نسب بھی تیار کرایا ۔ اگرچہ ادبی میدان میں ان کے کارناموں کا مقابلہ سامانیوں کے کارناموں سے نہیں کیا جا سکتا پھر بھی ان کے دربار میں ان کے اپنے فارسی شعرا تھے اور فردوسی کی بہاءالدّولة کے دربار میں بڑی آؤ بھگت ہوئی ۔ زرتشتی مذہب کا مستقل زوال، جب کہ یہ مذہب بویہی حکومت کے ابتدائی دور میں صوبۂ فارس میں خاصے عروج پر تھا، غالباً کسی حد تک اسی بات کا نتیجہ تھا کہ آئندہ کے لیے یہ خیال کر لیا گیا تھا کہ ایک قومی حکومت کے زیر سایہ خود مسلمانوں کے اندر ایک جداگانہ مذہبی حلقہ قائم کیا جا سکے .

اگر زیادہ معتبر شہادت میسّر آ سکے تو ممکن ہے یہ ثابت ہو جائے کہ ایرانی فنون کی تاریخ میں بویہی عہد کا مقام بھی خاصا شاندار تھا ۔ ان کی عمارتوں کا ذکر اس سے پہلے کسی اور ضمن میں کیا جا چکا ہے، جن میں عبادت گاہوں کی تعداد محلّوں، قلعوں اور شفاخانوں کے مقابلے میں بہت کم ہے ۔ حال ہی میں جو کپڑا دستیاب ہوا ہے اس سے اس بات کا امکان ہو گیا ہے کہ ایرانی دستکاری کے اس شعبے کا مطالعہ علمی حیثیت سے کیا جائے ۔ بویہی عہد کے فنون اور صنعت و حرفت پر حال ہی میں ایک کتاب E. Kühnel کی چھپی ہے (دیکھیے مآخذ)، قارئین سے اس کے مطالعے کی سفارش کی جاتی ہے .

بحیثیت مجموعی یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ دوسرے مقامات کی طرف بویہیوں کے عہد میں بھی علاقائی ولایات کے قائم ہو جانے اور اس طرح جگہ جگہ نئی عدالتیں اور نئے تہذیبی مرکز بن جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تہذیبی سرگرمیاں اب بغداد کے باہر بھی پھیلنا شروع ہو گئیں ۔ اس وقت تک تو بغداد تہذیب و تمدن کا کم و بیش تنہا ثقافتی مرکز تھا ۔ نیز روحانی زندگی کی ترقی اور اشاعت ہوئی اور اسے مختلف لوگوں کی ضروریات سے مرتبط کر کے اس میں ایک نئی طرح کی توانائی پیدا کر دی گئی.

بویہیوں کی خارجہ حکمت عملی ان کے عقائد سے بالکل متأثر نہیں ہوئی ۔ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں ایران میں ان کے بڑے بڑے حریف سامانی اور ان کے باجگذار زیاری (مرداویج کے اخلاف) اور صفّاری (سیستان کے حاکم) تھے ۔ قدرتی طور پر انہوں نے سامانیوں کے مقابلے میں، خراسانی باغیوں خصوصاً سیمجوریوں کا ساتھ دیا اور اس صدی کے آغاز میں غزنویوں کے عروج اور بالآخر سامانیوں کے قطعی زوال سے پورا فائدہ اٹھایا ۔ شمال مغرب میں ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ دیلمیوں کے چھوٹے چھوٹے خاندانوں پر اپنا مبہم سا تسلط قائم رکھیں، تاکہ جب کبھی زیاریوں سے یا کُردوں سے ان کی لڑائی ہو تو یہ خاندان ان کا ساتھ دیں ۔ کُردوں سے ان کا مقابلہ دو حیثیتوں سے

تھا: خارجی حکمت عملی کے تحت آذربیجان کی سمت میں اور داخلی امن و امان کے یعنی بہتر نظم و نسق عامّہ کے سلسلے میں ''انجبال'' کے علاقے کی طرف (حسنُویہی کرد) ۔ یہی کیفیت ان لڑائیوں کی بھی تھی جو عَضُدالدّولة کے عہد کے بڑے حصے میں قُفص کے اور کرمان اور مکران کے بلُوچوں سے جاری رہیں ۔ اس سلسلے میں آخری کڑی عُمان کا قبضہ تھا، جو جنگی اعتبار سے اس علاقے کا نہایت اہم ساحلی مقام تھا ۔ اس پر کبھی فارس کے بویہی قبضہ کر لیتے تھے اور کبھی عراق کے، اور یہ قبضہ اقتصادی مصلحتوں کی بنا پر ہوتا تھا ۔ بصرے کے بریدیوں کے خاتمے کے بعد عراق عرب میں بویہیوں کی پہلی دو نسلوں کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ پہلے حمدانیوں کو غیر جانب دار رکھیں اور پھر بالآخر انھیں ختم کرنے کی کوشش کریں، جو انھیں کی طرح شیعہ ہونے کے باوجود عرب تھے اور بغداد میں کچھ عرصہ پہلے سے ان کے حریف کی صورت میں سامنے آئے تھے ۔ حالات کا فطری تقاضا یہ تھا کہ عرب کی سرحدوں پر، عراق میں بطیحہ میں اور نیز خلیج فارس میں امن قائم رکھنے کے لیے بحرین کے قرامطہ سے چھوٹے پیمانے پر ایک طرح کی دائمی جنگ جاری رکھی جائے ۔

۹۶۸ء میں جب فاطمی [رک بآں] مصر میں اور پھر شام میں نمودار ہوے تو دوسرے دور کے بویہیوں اور ان کے وارثوں کو ایک ایسے مسئلے سے دوچار ہونا پڑا جو پہلے دور کے بویہیوں کے سامنے نہیں تھا ۔ اس نئے خاندان کا دعوی یہ تھا کہ وہ علوی النّسل ہیں اور یہ بات شیعیوں میں دلچسپی پیدا کرنے کا ایک مؤثر وسیلہ ثابت ہوئی ۔ اس خاندان کے ارادے اقتدار حاصل کرنے کے تھے ۔ اسی ارادے اور دعوے کو تقویت دینے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی مملکت میں توسیع کی کوشش کریں، لیکن اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ تمام شیعی فرقے اسمٰعیلی عقائد کو قبول کریں، اس لیے کہ حکومت فاطمیہ کے سرکاری عقائد بھی تھے ۔ علاوہ بریں یہ بات بھی مشکل تھی کہ ان دو قوتوں میں لڑائی نہ ہونے پائے جو مصر اور عراق کے درمیانی علاقوں پر اپنا تسلّط جمانے کی کوشش میں مصروف تھیں ۔ جب قرامطہ نے فاطمیوں سے لڑنا شروع کیا تو بویہیوں نے کبھی ان کا ساتھ دیا اور کبھی ان عرب قبائل کے ساتھ شریک ہو گئے جو ایک محاذ پر فاطمیوں سے لڑ رہے تھے اور حمدانیوں اور ان کے جانشینوں کی مدد کی جو دوسرے محاذ پر فاطمیوں سے لڑ رہے تھے ۔ اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ خلیفہ القادر نے فاطمیوں کے خلاف جو محضر تیار کیا تھا (۴۰۲ھ / ۱۰۱۱ء) اس میں بویہیوں کی حکمت عملی کا کہاں تک دخل تھا اور کہاں تک اس کے پیچھے یہ مقصد کام کر رہا تھا کہ اسمٰعیلیوں کے اثر کو ملک میں پھیلنے سے روکا جائے ۔ بہر حال اس نظریے کی تائید کہیں سے نہیں ہوتی کہ یہ محضر بویہیوں کی مرضی کے خلاف تیار کیا گیا تھا اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس پر سنّی اور اثنا عشری داناؤں کے دستخط تھے ۔ خاندان بُویہ کے خاتمے کے قریب جا کر یہ صورت پیش آئی کہ ایک بویہی ابو کالِیجار نے المؤیّد الشیرازی اسمٰعیلی داعی کے بیانات کو کسی قدر توجہ کے ساتھ سنا، گو کم سے کم سرکاری طور پر، اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا البلخی : سیرۃ الشیرازی، ص ۱۱۸؛ ابو شجاع ص ۲۳۲) اور اس واقعے کو کہ جب بغداد میں آل بویہ کا اقتدار ختم ہو چکا تھا تو ان کے ترکی سپہ سالار البَساسیری [رک بآں] نے سلجوقی فاتحین کے خلاف فاطمی خلافت سے اتحاد کا اعلان کیا، اگرچہ

زمانِ اقتدار میں وہ اس بات کے سخت خلاف تھا؛ اس لیے کہ ایک وہی قوت تھی جو اس حالت میں بویہیوں کی مدد کو آ سکتی تھی، آل بویہ کی عام پالیسی کا مظہر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

آل بویہ کی حکومت شروع سے کتنی ہی قوی اور مضبوط نظر آتی رہی ہو اور اس کے بعض کارنامے کتنے ہی شاندار رہے ہوں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس میں بعض کمزوریاں بھی تھیں۔ ان میں سے کچھ کمزوریاں تو ایسی تھیں جو عموماً دوسری سلطنتوں میں بھی ہوتی ہیں، لیکن بعض انھیں کے ساتھ خاص تھیں۔ پھر کچھ کمزوریاں ایسی بھی تھیں جو اندر سے نہیں پیدا ہوئیں تھیں بلکہ باہر سے آئی تھیں۔ کمزوریوں کی مؤخرالذکر قسم میں سمندری تجارت کا وہ اضطراب انگیز انقلاب تھا جس کا بویہی اقتدار کے ختم کر دینے میں بڑا ہاتھ تھا۔ یہ بات یقینی ہے کہ سنہ ۱۰۰۰ء کے قریب بحرِ ہند کی طرف سے مغرب سے جو تجارت جاری تھی اس کا راستہ خلیج فارس کے راستے سے نہیں رہا، بلکہ اس کا رخ بحر قلزم کی طرف بدل گیا (دیکھیے B. Lewis : *The Fatimids and the Route to India*، در *Revue de la Fac. de Sc. Econ. d'Istanbul*، ۱۹۵۳ء)۔ جس طرح زیرین عراق کی مسلسل مضطربانہ حالت اور بحرین میں قرامطہ کا وجود، جن پر بویہی کبھی پوری طرح قابو نہ پا سکے، اس صورت حال کا ذمے دار تھا اسی طرح فاطمی اور بوزنطی فتوحات سے عراق اور شام کے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو جانے کو بھی یقیناً اس میں بڑا دخل ہوگا، لیکن غالباً جو چیزیں ان سب باتوں سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئی ہوں گی ان میں سے ایک فاطمیوں کا اقتصادی غلبہ تھا اور دوسرے وہ مساعد حالات جنھوں نے اطالیہ کے تجارتی جہازوں کو اس طرف متوجہ کیا۔ ایک طبعی آفت نے سیراف کو، جو اس وقت تک خلیج فارس کی بڑی بندرگاہ تھا (سنہ ایک ہزار عیسوی کے لگ بھگ)، تباہ کر دیا اور شہر پھر دوبارہ تعمیر نہ ہوا۔ سیراف کی تباہی کے بعد سے خلیج پر جزیرۂ کیش کے سردار کا تسلط جم گیا، جس کی حیثیت کم و بیش ایک سمندری سردار (corsair chieftain) کی تھی۔ گو صحیح طور پر ان نتائج کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا جو ان واقعات کی وجہ سے رونما ہوئے، لیکن یہ کہنا بھی غالباً صحیح نہ ہوگا کہ ایک طرف تو تاجروں کے طبقے پر، جو بڑھتے ہوئے فوجی اقتدار کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ رکھتے تھے، اور دوسری طرف بویہی حکومت کی اندرونی اقتصادی حالت پر اور اس کے نتیجے میں ان کی عام قوت استحکام پر اس کا اثر برا نہیں پڑا۔ ۱۰۰۰ء سے پہلے ہی بویہیوں کی مالی حالت یہ ہوگئی تھی کہ انھیں اپنے نقرئی سکّے کی قیمت کم کرنا پڑی تھی اور غالباً یہی وجہ تھی کہ گیارھویں صدی عیسوی میں اس غرض کے لیے سونے کا استعمال برابر بڑھتا رہا، گو یہ باعث استعجاب ہے کہ آخر یہ سونا ان کے پاس آتا کہاں سے تھا۔ بویہی محصول (ضریبہ) بڑھانے پر مجبور ہوے، یہاں تک کہ انھیں دوسروں کو محصول وصول کرنے کا ٹھیکہ دینے اور املاک کو فروخت کرنے وغیرہ کے محکمے قائم کرنے پڑے۔

ان سب کمزوریوں سے بڑھ کر وہ خانگی اور خلقی کمزوری تھی جو بویہیوں کے علاوہ اس زمانے کی مشرق قریب کی بہت سی حکومتوں میں مشترک تھی اور جو خلافت کی تباہی کا باعث بنی تھی۔ اس کے باوجود کہ بویہی فوج کو تنخواہ کے علاوہ اقطاع بھی عطا کیے جاتے تھے لیکن خلیفہ کی فوج کی طرح وہ بھی خوش اور مطمئن نہیں تھی۔ خلیفہ کی فوج کی طرح بویہی فوج کو بھی اس کا

احساس تھا کہ وہ حکومت کا بنیادی پتھر ہے لیکن فوج میں اتحاد نہیں تھا ۔ اصلی دیلمی فوج زیادہ دن تک کام نہ دے سکی اور مُرداویج کی طرح بویہیوں کو، بغداد کی فتح سے پہلے ہی اپنے فوجی دستوں میں ترکمانی غلاموں کو بھرتی کرنا پڑا، جن کا وجود مشرق کی ہر مسلمان فوج کے لیے ناگزیر سا تھا ۔ یہ ترکی غلام ایک طرف تو دیلمیوں کی وقتاً فوقتاً ہونے والی بغاوتوں کو فرو کرنے کے کام آتے اور دوسری طرف اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ان میں اکثر گھوڑسوار تھے ۔ ان کے مقابلے میں دیلمی، جو پہاڑوں اور جنگلوں کے رہنے والے تھے، پیادہ فوج کے سپاہی تھے ۔ کبھی کبھی کُرد اور قُفص وغیرہ بھی فوج میں بھرتی کیے جاتے تھے ۔ ان مختلف گروہوں کے درمیان جو رقابت تھی اس کے علاوہ ایک آوز بات یہ بھی تھی کہ بویہیوں نے خلافت سے جو تُرک لیے تھے وہ سنّی تھے ۔ بالآخر یہ ہوا کہ نامعلوم اسباب کی بنا پر دیلمی فوجوں کی بھرتی آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی گئی اور ان بویہیوں کے آخری اخلاف جنہوں نے دیلمیوں کی مدد سے حکومت حاصل کی تھی تمام و کمال ترکی سپاہیوں میں گھر کر رہ گئے ۔

زوال کا تیسرا سبب، جو بویہی خاندان کے ساتھ مخصوص ہے، قوت کا انتشار ہے ۔ ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ ابتدا ہی سے بویہیوں کی تین الگ الگ ریاستیں تھیں اور وہ ایک متحدہ حکومت نہ تھی ۔ یہ صورت حال ان حالات کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے جن کے تحت فتوحات عمل میں آئیں، لیکن اس کا ایک سبب ضرور یہ بھی ہوگا کہ ان لوگوں میں اقتدار کا تصوّر گھرانے یا خاندان کے اقتدار پر منحصر تھا ۔ قوت اور اتفاق دونوں کی مدد سے عضدالدّولة نے سلطنت میں مکمّل اتحاد پیدا کر لیا، لیکن اسلاف کی طرح اس نے بھی اسے مستقل بنانے کی کوشش نہیں کی، چنانچہ [اس کی موت کے بعد] یہ اتحاد پارہ پارہ ہو گیا ۔ قوت کا یہ انتشار، جو بویہی خاندان کو قراخانی اور سلجوقی ترک خاندانوں سے پہلے کے تمام مسلم خاندانوں سے ممتاز کرتا ہے، تینوں بھائیوں کے مرتے ہی، جو اس سلطنت کے بانی تھے، اندرونی کشمکش اور نزاع کا باعث بن گیا ۔ فوج اور تمام مفسدہ پرداز لوگوں نے اس حالت سے اس حد تک فائدہ اٹھایا کہ خاندانی نظام کی اس خرابی نے آگے چل کر فوجی اقتدار اور نظام حکومت کی دیگر کمزوریوں سے پیدا ہونے والی برائیوں کو کئی گنا بڑھا دیا ۔ شہری باشندوں کی شورشیں، جو ابتدائی بویہیوں کے لیے سخت خطروں کا پیش خیمہ بنی تھیں، دوبارہ شروع ہو گئیں؛ اصْطَخر کی بغاوت قدیم دارالسلطنت کی تباہی کا باعث ہوئی، اور بغداد پر بعض اوقات عیّاروں [رک بآں] کا قبضہ رہنے لگا ۔ اگر قُتُوۃ کی متأخّر اسناد کو معتبر سمجھا جائے تو ابو کالیجار بھی انہیں میں سے ایک تھا ۔ مذہبی توازن کے جس طریقے پر بویہی عامل تھے اس سے صرف یہ نتیجہ نکلا کہ بغداد میں اور اس کے علاوہ دوسرے شہروں میں شیعوں اور سنّیوں کے درمیان جھگڑے شروع ہو گئے، اور غالی حنبلیوں نے تو اس حد تک زیادتی کی کہ بعض اکابر ائمہ کے مشہد اور بویہیوں کی قبروں کو آگ لگا دی ۔ متأخر بویہی، خصوصاً عراق میں، اتنی بھی قوت نہ رکھتے تھے کہ کسی کو اپنا تابع فرمان بنا سکیں ۔

بویہیوں کی کمزوری اور بے بسی نے کسی حد تک خلافت کو فائدہ پہنچایا ۔ خلیفہ کو، جو کبھی کبھی ان کے خاندانی جھگڑوں میں حکم بنتا تھا، کسی حد تک اس کا کھویا ہوا اقتدار اور اثر واپس مل گیا، کم سے کم عراق کے مسائل کی

حد تک تو یہ بات بالکل درست تھی۔ تقریباً ایک صدی کے بعد یہ صورت پیدا ہوئی کہ خلیفہ القائم نے اپنے لیے ایک وزیر مقرر کیا۔ اس کا نام ابن المُسلمہ تھا اور وہ کٹر سنّی تھا۔ ایک ادارے کی حیثیت سے خلافت کے دوبارہ زندہ ہو جانے کی امید اب ایک موہوم خیال سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ اس کے لیے نمونۃً قاضی الماوردی کا رسالہ الاحکام السلطانیۃ دیکھیے، جو سیاسی حکمت عملی کے سلسلے میں خلیفہ کا بہت مقرّب تھا۔ سنّیوں کے حلقوں میں یہ امید بھی ظاہر کی جانے لگی کہ ایک بے دین سلطنت کا سایہ ان کے سروں سے اٹھ جائے گا۔ یہ درست ہے کہ محض بویہی اقتدار کا ضعف ایسی چیز نہیں تھی کہ اس کی بنا پر خلافت میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی کہ وہ ایک خودمختار حکومت قائم کر سکے، لیکن کم سے کم اس بات کی توقع کی جا سکتی تھی کہ شاید لوگوں کو ایک راسخ الاعتقاد اور زیادہ قابلِ احترام محافظ میسّر آ جائے۔

بویہیوں کی جگہ لینے کے لیے امیدواروں کی کمی نہ تھی۔ ان میں سے بعض تو صرف مقامی اقتدار کے طالب تھے اور بعض اپنے مفاد کی خاطر مشرق کے بلاد اسلامیہ کو متحد کرنا چاہتے تھے۔ حمدانیوں کے زوال کے کوئی بیس سال بعد، دیار بکر کے مروانی کردوں سے نمٹنے کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ الجزیرہ میں عُقیلی عربوں کی حکومت کو تسلیم کر لیا جائے۔ جبال کے حسنویہی خاندان کے زوال کے بیس سال بعد اسی علاقے میں عنّازی کردوں کی سیادت کو تسلیم کرنا پڑا۔ وہ مختلف بدوی قبائل اس کے علاوہ ہیں جن کا عراق عرب یا عراقی شامی سرحدی علاقوں پر قبضہ تھا اور جو اس تقریباً خود مختار ریاست کی سرحدوں پر بھی چھائے ہوئے تھے جو بغداد کے دروازوں کے قریب بطیحہ کے دلدلی علاقے میں واقع تھی۔

ایران میں ایک گھرانا بویہیوں کے رشتہ داروں کا تھا، اور اسی وجہ سے وہ کاکُویہی یا کاکُوئی کہلاتے تھے، (یہ کاکُویہ سے بنا ہے جس کے معنی دیلمی زبان میں ماموں کے ہیں)۔ اس نے پہلے اصفہان اور پھر ہمذان پر قبضہ کر لیا، لیکن سب سے بڑا خطرہ مشرق کی جانب سے پیش آیا۔ یہاں غزنویوں کی قوت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور محمود غزنوی نے کھلم کھلا خلافت کو آزاد کرنے کے عزم کا اعلان کر دیا تھا۔ اسی دوران میں بویہیوں کے باہمی جھگڑوں اور نادانیوں سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنے فرزند مسعود کو رَےّ پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ اس کی فوجوں نے بویہی حریفوں کو تہ تیغ کر دیا (۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء)۔ محمود کی وفات کے بعد سلجوقیوں نے مسعود کو شکست دی اور باقیماندہ بویہیوں کو ذرا سانس لینے کا موقع ملا۔ لیکن سلجوقیوں کی کامیابی نے ان کے حوصلے بڑھا دیے اور انہوں نے ایک سنّی حکومت قائم کرنے کا ایک منظّم منصوبہ بنایا۔ خلافت کے حامیوں میں بہت سے ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بویہیوں نے ناچار سلجوقیوں کے اقتدار کو تسلیم کیا، لیکن اس سے انہیں کوئی نفع نہیں پہنچا۔ ۱۰۵۵ء میں طُغرل بیگ بغیر مزاحمت کے بغداد میں داخل ہو گیا اور بویہی المَلِک الرّحیم کو گرفتار کر لیا۔ شیراز میں فوجوں کے اجتماع اور استحکام کے باوجود فارس بھی مطیع اور فرمانبردار ہو گیا، کیونکہ اس پر شمال اور کرمان دونوں جانب سے حملہ کر دیا گیا تھا۔ اس وقت بویہی خاندان کی سلطنت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

مآخذ: مصادر: خوش قسمتی سے ہمارے قبضے میں سرکاری مراسلات اور وثائق کے تین ذخیرے ہیں:

ایک تو خلیفہ المطیع اور الطّائع کے کاتب ابو اسحٰق الصّابی کا ذخیرہ، جو تاریخ سیاست دول کے مطالعے کے لیے از حد مفید ہے (اس کے کچھ اقتباسات ۱۸۹۸ء میں شکیب ارسلان نے طبع کیے، بیشتر حصّہ غیر مطبوعہ ہے)؛ دوسرا وزیر صاحب ابن عبّاد کا ذخیرہ (صرف وہ کاغذات محفوظ ہیں جن کا تعلق مؤیّدالدّولۃ کے عہد سے ہے، طبع عبدالوہّاب عزّام و شوقی ضیف، قاہرہ ۱۹۴۷ء)، یہ اندرونی انتظام مملکت کے مطالعے کے لیے بہت مفید ہے: تیسرا عبدالعزیز بن یوسف کا جو عضدالدّولۃ کے تحت سلطنت کا ایک بڑا عہدے دار تھا، ذخیرہ (خلاصہ از Cl. Cahen در ... *Studi Orientallistici in onore G. Levi della Vida*)۔ یہ تینوں ذخیرے چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے ہیں؛ نیز دیکھیے القلقشندی: صبح الاعشٰی، ۱۳: ۱۲۹ و ۱۳۹ ۔

تاہم بڑے مآخذ کتب تاریخ ہیں ۔ اس کے لیے بنیادی کتاب تاریخ ثابت بن سنان ہے، جسے ہلال الصّابی نے مکمل کر کے ۴۴۷ھ تک پہنچا دیا ہے ۔ اس کے علاوہ جو کچھ بویہی عہد کی بابت محفوظ ہے وہ ایک اقتباس ہے جس کا تعلق ۳۸۹ھ کے اواخر سے لے کر ۳۹۳ھ کے اوائل کے درمیانی زمانے سے ہے، مگر اس کا عام مضمون بعد کی تواریخ میں لے کر اسے آگے جاری رکھا گیا ہے، جن تاریخوں نے اس سے کام لیا ان میں سے پہلی تاریخ مسکویہ اور اس کے خلف ابو شجاع کی کتاب تجارب الامم [رک بہ ابن مسکویہ] ہے، جس کا واحد مخطوطہ ہلال الصّابی کی کتاب کے حصّے کے ساتھ منسلک ہے (مکمل کتاب طبع و ترجمہ Margoliouth: *The Eclipse of the Abbaside Caliphate*، ۷ جلد، ۱۹۲۰ - ۱۹۲۱ء)۔ اس کے ساتھ ہی ذیل کی تواریخ بھی ہیں: محمد بن عبدالملک الہمذانی: تکملۃ التّجارب، جس میں تجارب [الامم] کو مکمل کیا گیا ہے اور اس کی تصحیح بھی کی گئی ہے (فقط ۳۹۷ھ تک کے واقعات تک محفوظ و دستیاب ہے طبع کنعان، در مشرق، ۱۹۰۰ تا ۱۹۰۸ء)؛ ابن الأثیر: الکامل؛ سبط ابن الجوزی: مرآۃ الزّمان (اس کا وہ حصّہ جو اس عہد سے متعلق ہے غیر مطبوعہ ہے، یہ اس کے سلف ابن الجوزی کی المُنتظَم سے زیادہ مکمل ہے، جس میں سے اس نے مواد لیا ہے)، یہ ان آخری تین مآخذ میں ۳۹۳ھ کے بعد کے واقعات درج ہیں ۔ ابو اسحٰق الصّابی نے ایک معذرت نامہ بشکل تاریخ (اپنے آپ کو قید سے چھڑانے کے لیے) لکھا تھا، جس کا نام الکتاب التّاجی (بنام عضدالدّولۃ تاج الملّۃ) تھا۔ اس کا ابتدائی حصّہ جو حال ہی میں یمن میں دوبارہ دستیاب ہوا ہے Dr. Minovi کے پاس ہے (مگر اس تک میری رسائی نہیں ہو سکی)؛ معلوم ہوتا ہے یہ کتاب متأخّر مؤرخوں کو معلوم تھی ۔ ان کے علاوہ عربی تواریخ کے ذخیرے میں سے مندرجۂ ذیل قابل ذکر ہیں: المسعودی: مروج، ۹: ۱ تا ۳۴ (حسب و نسب)؛ یحیی الأنطاکی؛ ابن ظافر: الدُّوَل المنقطعۃ (فاطمیوں کے ساتھ تعلقات، غیر مطبوعہ مگر وسٹنفلٹ: *Geschichte der Fatimiden-Chalifen*، نے اس سے کام لیا ہے؛ ابن خلّکان (معزّ، رکن اور عماد الدّولۃ)؛ ابن طقطقی [کتاب الفخری] (آخر زمانے کی۔ مگر شیعی روایات)؛ العتبی: (غزنویوں کے ساتھ تعلقات)؛ اور ماری بن سلیمان: *Nestorian History*، طبع Gismondi، روم ۱۹۰۳ء، جسے بلاوجہ نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔

فارسی تواریخ ہمارے سامنے سب سے پہلے مجمل التّواریخ کی شکل میں آتی ہیں (طبع بہار، ۱۹۳۰ء)، جس کے مصنّف کا نام معلوم نہیں ۔ یہ بویہی تاریخ کے لحاظ سے الہمذانی کے ساتھ مرتبط ہے اور نیز سرحدی ریاستوں کے وقائع سے بھی تعلق رکھتی ہے، یعنی غزنوی (گردیزی، بیہقی) زیاری اور بحر خزر کے جنوب کے دیگر خاندان (ابن اسفند یار)، اس کے علاوہ چند اہم مقامی تواریخ فارسی میں ہم تک پہنچی ہیں، مثلاً حسن بن محمد قمّی کی تاریخ قم، طبع جلال الدین تہرانی، ۱۹۳۴ء، اور نامعلوم مصنّف کی تاریخ سیستان،

طبع بہار ۱۹۳۶ء.

تاریخ سے ملتے جلتے ادب میں بعض اطلاعات التنوخی کی نِشْوار (ص ۱۴۱، ۱۰۱، ۱۰۷، ۱۶۹، نیز مطبوعہ دمشق کے ۱۹۳۰ء کی جلد میں ص ۱۰۰) میں ملیں گی۔ کتب سیر کے اندر فاطمی داعی المؤیَّد الشّیرازی کی خود نوشت سیرۃ، طبع کامل حسین، قاہرہ ۱۹۴۹ء (جس کا تعلق ابو کالیجار کے وقت کی دعوت سے ہے)، قابل ذکر ہے، ایسے شاعروں کے دواوین اور مجموعہ ہائے اشعار جیسے الثّعالبی : (یتیمۃ)، الباخَرْزی : دُمیۃ، التّوحیدی (خصوصاً کتاب الامْتاع) بھی مفید ہیں، بعض اصلی معلومات یاقوت : اِرْشاد، ۲ : ۲۷۳ ببعد؛ ۳ : ۱۸۰ ببعد؛ ۵ : ۳۳۷ ببعد؛ ۶ : ۲۰۰ ببعد وغیرہ.

جغرافیے کے تین بڑے مشہور ماہرین الاِصْطَخری، ابن حَوْقَل اور المُقَدَّسی — تینوں بویہیوں کے ہم عصر ہیں اور پہلا تو ان کی رعایا ہی میں سے ہے — کی تصانیف کے ساتھ ناصر خُسْرو کے سفرنامہ کا اور بعض ان معلومات کا جو یاقوت کی معجم البُلْدان (خصوصاً ۳ : ۱۲۹، مقالہ سابیْران) میں اور ابن بَلْخی کے فارس نامہ (طبع نکلسن، تاریخی بیانات، ص ۱۱۷ تا ۱۱۹) میں موجود ہیں، اضافہ کیا جا سکتا ہے.

قانونی نظام سے متعلق تصانیف میں یہ کتابیں کام کی ہیں : الماوَرْدی : الاحکام السلطانیۃ، اس کا ضمیمہ بھی دیکھنا چاہیے، جو حال ہی میں الازہر میں دستیاب ہوا ہے؛ رسوم دارالخلافۃ، جو ہلال الصّابی یا اس کے فرزند محمد کی تصنیف ہے اور جس کا موضوع ”خلافت کا طرز عمل اور قوانین قضا بویہیوں کے عہد تک“ ہے (مجھے یہ کتاب پروفیسر دوری، بغداد، کی عنایت سے دستیاب ہوئی) ۔ بویہیوں کے عہد کی تاریخ مالیہ کا مطالعہ ابوالوَفاء البوزجانی کے رسائل پر حساب مالیہ (غیر مطبوعہ) اور ایک گمنام مصنّف کی کتاب الحاوی [اور نظام الملک کا سیاست نامہ] (طبع Schefer) خصوصاً ص ۱۸۳ کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔

مذہبی تاریخ کے لیے دیکھیے وہ تصانیف دینیہ جن کا اوپر ذکر آیا ہے ۔ خاص طور پر ابن بابویہ کی کتابیں.

کتبات کی بابت معلومات *RCEA* (۵ : ۱۸۳۱ تا ۱۸۳۲، ۱۸۷۷، ۱۹۹۶؛ ۶ : ۲۰۴۹، ۲۱۷۷؛ ۷ : ۲۰۷۷) میں ملتی ہیں۔ ان معلومات کی تکمیل G. Wiet : *Soieries Persanes* (جس سے اقتباس ذیل میں دیا گیا ہے) سے کرنی چاہیے۔ سکوں کی بابت معلومات کے لیے، جو ناقص طور پر مطبوعہ ہیں، علاوہ Lane-Poole : *Catalogue of the British Museum*، کے دیکھیے G. C. Miles : *A Numismatic History of Rayy*، ۱۹۳۸ء.

زمانۂ حال کی دراسات (مطالعے، تحقیقات) : بویہیوں کے حالات کا کوئی تفصیلی اور جامع مطالعہ موجود نہیں، اس کے لیے کچھ معلومات V. Minorsky: *La domination des Daylamites*، پیرس ۱۹۳۲ء، میں ملیں گی، جن سے آگے کا راستہ معلوم ہوگا۔ اس کے علاوہ قارئین کو B. Spuler : *Iran in früh-Islamischer Zeit*، ۱۹۵۲ء، اور A. Mez : *Die Renaissance des Islams* کے ان حصوں سے مدد لینا چاہیے جو خاص طور پر بویہیوں کے لیے وقف ہیں۔ زیادہ خصوصی حالات سے ذیل کی تصانیف میں بحث کی گئی ہے : محسن عزیزی : *La domination arabe et l'épanouissement du sentiment national en Iran*، ۱۹۳۸ء؛ *Survey of Persian Art*، ج ۲ اور ۳؛ G. Wiet : *Soieries Persanes*، ۱۹۴۸ء، ص ۹۹ تا ۱۷۸ (اس سے کہیں زیادہ وسیع معلومات پر مشتمل ہے جو کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے)؛ A. Duri دوری : تاریخ العراق الاقتصادی فی القرن الرابع الہجری، بغداد ۱۹۴۸ء؛ C. Elgood : *A Medical History of Persia*، ۱۹۵۱ء؛ Donaldson: *The Shi'ite Religion*، ۱۹۳۳ء؛ R. Strothmann :

Die Zwölfer-Schi'a، ۱۹۲۰ء (جس کا خلاصہ وو، لائڈن، بار اول میں بذیل مادۂ شیعہ دیا گیا ہے)؛ H. Laoust کا دیباچہ بر La Profession de Foi d'Ibn Batta، ۱۹۵۸ء؛ Cl. Cahen: L'évolution de l'ikta، در Annales ESC، ۱۹۵۳ء؛ اور E. Tyan: Institutions de droit public musulman، ج ۲، ۱۹۵۶ء، فصل ۱ (مگر قب Arabica، ۱۹۵۸ء، ص ۷۰ ببعد)۔ مفروق کبیر نے اپنے لنڈن یونیورسٹی کے غیر مطبوعہ مقالۂ علمیہ سے جس کا عنوان The Buwahid dynasty of Baghdad from the accession of Izz al-dawla to the end ہے، چند مقالات نکال کر، بالخصوص مقالہ Cultural Development under the Buwayhids of Baghdad، در Journal of the Asiatic Society of Pakistan، جلد ۱، ۱۹۵۶ء چھپوا دیے ہیں۔

خصوصی مطالعجات جو لائق توجہ ہیں حسب ذیل ہیں: H. Bowen: The Last Buwayhids، در JRAS، ۱۹۲۹ء؛ N. Abbott: Two Buyid Coins (جس کے ساتھ مفصّل تاریخی شرح ہے)، در AJSL، ج ۵۶، ۱۹۳۹ء؛ Cl. Cahen: Notes pour l'histoire de la himaya، در Mélanges Massignon، ج ۱؛ Amedroz: Three years of Buwayhid Rule، در JRAS، ۱۹۰۱ء؛ وہی مصنّف: Der Vizier Ibn al-Amid، در Der Islam، ج ۳؛ M. H. Al-Yāsin: الصّاحب ابن عبّاد، بغداد ۱۳۷۶ھ / ۱۹۵۷ء (ثقافتی نقطۂ نظر سے)؛ E. Kühnel: Die Kunst Persiens unter den Buyiden، در ZDMG، ۱۹۵۶ء؛ کورکیس عوّاد: الدّار المعزّی فی بغداد، در Sumer، ج ۱۰، ۱۹۵۰ - ۱۹۵۳ء۔ خارجی تعلقات کی بابت محمد ناظم: The life and times of Mahmud of Ghazna، ۱۹۳۱ء؛ M. Canard: Les Hamdanides، ج ۱، ۱۹۵۱ء؛ اے۔ کسروی: شہریاران گمنام، تہران ۱۳۳۵ھ/۱۹۲۸ء (بر آذربیجان در قرن رابع ہجری مطابق قرن عاشر عیسوی، قرن خامس ہجری مطابق قرن حادی عشر عیسوی)۔

(CL. CAHEN)

* **به آفرید بن فَرْوَرْدِین**: ایران کا ایک مذہبی فتنہ گر، جو عہدِ بنو امیہ کے اواخر میں۔۔۔ تقریباً ۱۲۹ھ / ۷۴۷ء کے درمیان — نیشاپور کے ضلع میں خَوَاف کے مقام پر ایک نئے نبی ہونے کا مدعی ہوا۔ اس نے اپنے گرد بہت سے مرید اکھٹے کر لیے۔ ۱۳۱ھ / ۷۴۹ء میں ابو مسلم کے حکم سے اسے اور اس کے مریدوں کو قتل کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے وہ سات سال تک چین میں رہا اور وہاں سے واپسی پر اس نے بعض لوگوں کے سامنے ظاہر کیا کہ اسے دوبارہ زندہ کر کے آسمان سے بھیجا گیا ہے۔ ایک کہانی یہ بھی ہے کہ وہ حیلے سے مردہ بن کر ایک سال تک قبر میں رہا جو اس نے خود اپنے واسطے بنائی تھی۔ اس نے اپنے عقائد کی فارسی زبان کے ایک صحیفے میں شرح کی، اور دعوی کیا کہ وہ صحیح معنوں میں زرتشتی ہے، مگر آگے چل کر بظاہر اسلامی تعلیم کے اثر سے اس نے بعض شعائر اور محرّمات کو اختیار کر لیا۔ ان میں سے، شراب، غیر شرعی ذبیحہ اور محرمات سے ازدواج کی ممانعت تھی۔ اس نے زمزمہ [زَکّ بَاژ] کو موقوف کر دیا تھا اور سورج کی طرف منہ کر کے دن میں سات نمازیں اور زکوۃ کے لازماً ادا کرنے کا حکم دیا تھا۔

اس مدارات سے بلاشبہہ اس کا مقصد اپنے پرانے مذہب کو نئی زندگی کا پروانہ عطا کرنا تھا لیکن موبدوں نے ابومسلم کو اس کے خلاف اکسایا کیونکہ انھیں اپنے مذہب کی یہ اصلاح پسند نہ تھی۔ اس کے علاوہ ابو مسلم نے دیکھا کہ یہ تحریک تو مسلموں کے لیے موجب خطر ہو سکتی ہے۔ اس نے بہ آفرید کو مجبور کیا کہ وہ اسلام

کی طرف رجوع اور عباسیوں کے مقصد کے حصول میں امداد دے، لیکن اس کے باوجود چونکہ یہ مدعی برابر اپنے مذہب کی تبلیغ کرتا رہا اسے آگے چل کر سزائے موت دی گئی۔ اس کے عقائد کے پیرو، جو دنیا میں اس کے دوبارہ ظہور کا انتظار کرتے رہے، چوتھی صدی ہجری/دسویں عیسوی تک پائے جاتے تھے۔

مآخذ: (۱) الفہرست، ص ۳۴۴؛ (۲) الخوارزمی: مفاتیح العلوم، طبع Van Vloten، ص ۳۸؛ (۳) البغدادی: الفرق، ص ۲۴۷؛ (۴) الشہرستانی [کتاب الملل و النحل]، ص ۱۸۷؛ (۵) البیرونی [الآثار الباقیۃ]، طبع Sachau، ص ۲۱۰؛ *Chronology* [ص ۱۹۳ تا ۱۹۴]؛ (۶) الثعالبی: کتاب الغرر؛ (۷) M. Th. Houtsma: *WZKM*، ۳، ۱۸۸۹ء: ۳۰ تا ۳۷؛ (۸) G. H. Sadighi: *Les Mouvements religieux iraniens*، پیرس ۱۹۳۸ء، ص ۱۱۱ تا ۱۳۱؛ (۹) S. Moscati: *Lin.*، ۱۹۵۹ء، ص ۲۴۷ ببعد؛ (۱۰) B. Spuler: *Iran in frühislamischer Zeit*، Wiesbaden ۱۹۵۲ء، ص ۱۹۹۔

(D. Sourdel)

⊗ **بَہاءُ اللّٰہ**: اصل نام میرزا حسین علی نوری، بہائی مذہب کا بانی اور میرزا عباس المعروف بہ میرزا بزرگ کا، جو ایران کے قصبۂ نور کا باشندہ تھا، بڑا بیٹا۔ اس کے پیرو اسے عام طور پر جمال مبارک اور جمال قِدَم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بہاءاللہ کا لقب اسے اس کے مقتدا علی محمد باب (رک بہ باب) نے دیا تھا۔ عباس بن بزرگ کی نو بیویاں تھیں، جن سے تیرہ بچے پیدا ہوئے۔ جن میں (۱) میرزا یحیٰی صُبح اَزل، (۲) میرزا حسین علی بہاءاللہ، بھی تھے۔

بہاءاللہ کی پیدائش ۲ محرم ۱۲۳۳ھ / ۱۲ نومبر ۱۸۱۷ء کو تہران میں ہوئی اور وفات ۲ مئی ۱۸۹۲ء کو عکّہ (فلسطین) میں۔ اس کی پیدائش کے متعلق ایک روایت یہ ہے کہ قصبۂ نُور میں ہوئی تھی۔ الزِرکلی نے اسے مستعرب ایرانی، قرار دیا ہے (الاعلام، ۲: ۱۰۲، بار دوم)۔ اپنے والد کی وفات کے وقت بہاءاللہ کی عمر بائیس سال کی تھی۔ اس کے بعد ۱۸۴۴ء میں جب علی محمد باب (۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء تا ۱۲۶۶ھ / ۱۸۵۰ء) نے دعویٰ الہام و ماموریت کیا تو بہاءاللہ نے اسے ابتدا ہی میں تسلیم کر لیا تھا، لیکن باب کے ابتدائی ماننے والے اٹھارہ چوٹی کے اکابرین میں، جنہیں باب نے حروفِ حی کا نام دیا تھا، بہاءاللہ کا نام شامل نہیں (رک بہ باب)۔ تاہم اس نے جلد ہی بابی تحریک میں اہم مقام حاصل کر لیا۔ ملا حسین بشرویہ کے ذریعے بہاءاللہ کے پاس باب کی توقیعات پہنچتی تھیں۔

قلعۂ شیخ طَبَرسی کی جنگ میں، جو بابیوں اور حکومت ایران کے فوجی دستوں کے درمیان ہوئی تھی، شرکت کے لیے بہاءاللہ نے اپنے ساتھیوں اور بھائی صُبحِ ازل کے ساتھ محرم ۱۲۶۵ھ / دسمبر ۱۸۴۸ء میں بغداد کا رخ کیا، جو اس وقت ترکی کی قلمرو میں شامل تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ باب کی بیان کردہ "مَن یُظھِرُہُ اللّٰہ" کی پیشگوئی بابیوں میں پھیل چکی تھی اور ہر شخص مَن یُظہِرُ اللّٰہ ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا (نقطۃ الکاف پر براؤن کی تعلیقات ص P.M)۔ خود بہاءاللہ کے کان بھی اس سے شناسا تھے۔ بغداد پہنچنے کے کوئی ایک سال بعد ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء میں بہاءاللہ اکیلا کردستان کے صحرائے سُلیمانیہ کے پہاڑ سرگلو پر چلا گیا اور زندگی کے دو سال وہاں بڑی عسرت اور تنگی میں بسر کیے، چنانچہ وہ خود لکھتا ہے: "کتنی ہی راتیں ہمیں کھانا نہ ملا اور کتنے ہی دن ہمارے بدن کو آرام میسر نہ ہوا" (ایقان)۔ اس عرصے میں اس نے اپنے ساتھیوں سے خط و کتابت جاری رکھی (*Materials for the study* *of Babi Religion*) ۔ آخر صُبحِ ازل نے بہاء اللہ کے بھائی موسیٰ کے خُسر شیخ سلطانی کو بھجوا کر اسے بغداد واپس بلوا لیا ۔ یہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ صُبحِ ازل کی سربراہی میں بابی تحریک گویا سٹ چکی ہے (*The Dawn Breakers*، ص ۵۸۵) ۔ وقت آ چکا تھا کہ بہاء اللہ مَن یُظْہِرہ اللہ ہونے کا دعوٰی کر دے (نقطۃ الکاف پر براؤن کی فارسی زبان میں تعلیقات)، چنانچہ اس نے بابی تحریک کی زمام عملاً اپنے ہاتھ میں لے کر بابی تحریک میں نئے سرے سے جان ڈال دی اور تحریک کے معاملات کو اپنے نہج پر چلانا چاہا جو ایرانی حکومت کے لیے نقصان دہ تھا ۔ اسی زمانے میں برطانوی حکومت کی طرف سے بہاء اللہ کو برطانوی شہری بننے، اپنی امان میں لینے اور ہندوستان بھجوا دینے کی پیش کش ہوئی (بحوالۂ سابق، ص ۱۱) ۔ حالات کو مخدوش ہوتا دیکھ کر ایرانی حکومت کے ایما سے ایرانی قونصل جنرل مقیم بغداد نے ترکی کی حکومت کو لکھا کہ بہاء اللہ کو بغداد سے، جو ایرانی سرحدوں سے قریب ہے، کسی دوسری جگہ بھیج دیا جائے ۔ پروفیسر براؤن نے ایرانی حکومت کا وہ خط مؤرخہ ۱۲ ذوالحجّہ ۱۲۷۸ھ شائع کر دیا ہے ۔ اس میں لکھا ہے کہ میرزا حسین نوری (بہاء اللہ) اپنے زمانۂ قیام بغداد میں خفیہ طور پر جاہل اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کو گمراہ اور خراب کرنے کی مسلسل کوشش کرتا رہا ہے ۔ بعض دفعہ اس نے بغاوت برپا کرنے کی سعی بھی کی ہے اور قتل کی ترغیب و تحریص میں بھی اس کا ہاتھ رہا ہے، چنانچہ ملاّ آقا دربندی پر قاتلانہ حملے میں بھی اس کا ہاتھ تھا (براؤن Browne: *Materials for the Study of the Babi Religion*، ص ۲۷۹ ببعد)؛ چنانچہ دونوں حکومتوں کے مشورے سے فیصلہ ہوا کہ بہاء اللہ کو بغداد سے قسطنطنیہ منتقل کر دیا جائے ۔ اس فیصلے کے مطابق بہاء اللہ ۲۲ اپریل ۱۸۶۳ء کو اپنی دونوں بیویوں، تین بچوں (اَغصانِ ثلاثہ: عباس، محمد علی، مہدی) اور کچھ متبعین اور بھائی میرزا موسیٰ کے ساتھ قسطنطنیہ کے لیے روانہ ہو گیا ۔ راستے میں شطّ العرب کو عبور کر کے بغداد کے قریب ہی نجیب پاشا کے ایک باغ میں پہلا پڑاؤ کیا، اور ۲ مئی تک بارہ دن وہاں سکونت رکھی ۔ بقول میرزا جواد انھیں ایام میں بہاء اللہ نے دعوٰی کیا کہ وہ مَن یُظْہِرہ اللہ (بحوالۂ کتاب مذکور، ص ۳۲) اور وہ موعود ہے جس کے ظہور کی باب نے بشارت دی تھی، لیکن زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ مَن یُظْہِرہ اللہ کا دعوٰی بہاء اللہ نے ۱۸۶۷ء میں کیا تھا ۔ پروفیسر براؤن بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہے (نقطۃ الکاف پر براؤن کی تعلیقات، ص ۱۱ ببعد) ۔ نبیل کہتا ہے کہ اس دعوے کے وقت بہاء اللہ کی عمر پچاس سال تھی، جب کہ بہاء اللہ کی پیدائش ۱۲ نومبر ۱۸۱۷ء کو ہوئی تھی، اس طرح اس دعوے کی تاریخ ۱۸۶۷ء ہی بنتی ہے ۔ یہ باغ جس میں بہاء اللہ نے قسطنطنیہ جاتے ہوئے بارہ دن قیام کیا بہائیوں میں باغِ رِضوان کے نام سے مشہور ہے اور یہ ایّام ان کے ہاں ایام عید رضوان کہلاتے ہیں ۔ اگست میں یہ قافلہ کَرکُوک، مُوصِل اور دیارِ بکر ہوتا ہوا قسطنطنیہ پہنچا ۔ وہاں چار ماہ قیام رہا ۔ پھر اس قافلے کو ادرنہ بھجوا دیا گیا، جسے بہائی اَرضُ السِّر کا نام دیتے ہیں ۔ پروفیسر براؤن نے لکھا ہے: "ادرنہ میں بابیوں کے عارضی قیام کا یہ زمانہ تھا جب بہاء اللہ نے حقیقتِ نفس الامری کے چہرے سے نقاب الٹ دیا اور اپنے وہ مخفی ارادے واشگاف کر دیے جنھیں وہ بلا شبہہ دیر سے دل میں جگہ دیے ہوئے تھا ۔ ضروری سامان جمع کر لینے اور اس راستے کو ہموار کر لینے کے بعد اس نے مَن یُظْہِرہ اللہ ہونے کا دعوٰی کر دیا

اور خصوصاً بابیوں کو دعوت دی کہ اس دعوے کو قبول کر لیں'' (نقطۃ الکاف پر براؤن کی تعلیقات، ص mb)۔

صبح ازل اور بعض دوسرے بابیوں نے اس دعوے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ صبح ازل قدامت پسند تھا، لیکن بہاءاللہ کی روح ترقی پسند تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ باب کی مہدویت سے اب کام نہیں چلے گا۔ اس کے متبعین میں وہ پہلا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔ نئی والہیت کے لیے نئے دعووں کی ضرورت ہے۔ بہر حال یہ وہ وقت تھا کہ بابی تحریک کے دونوں عمائدین کے اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ بہائیوں کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ باب کا اصلی قائم مقام تو بہاءاللہ ہی تھا لیکن حکومت اور عوام کو دھوکا دینے کے لیے باب کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنا نائب بہاءاللہ کے بجائے صبح ازل کو نام زد کر دے تاکہ لوگوں کی توجہ بہاءاللہ سے ہٹ جائے اور وہ محفوظ رہے (*Materials for the study of the Babi Religion*، ص ۲۰)۔

یہ اختلافات روز بروز بڑھتے گئے۔ بابیوں میں باہم قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ ایک دوسرے کو زہر دینے کی کوششیں کی گئیں اور حالات نے ناگفتہ بہ صورت اختیار کر لی (نقطۃ الکاف پر براؤن کی تعلیقات، ص mj؛ *Materials for the study of the Babi Religion*، ص ۲۲ ببعد؛ *The Episode of the Bab*، ص ۳۰۹؛ ہشت بہشت)۔

جب ترکی حکومت نے دیکھا کہ یہ اختلافات بڑھ کر امن عامّہ کے منافی ہو گئے ہیں تو اس نے صبح ازل کو قبرص اور بہاءاللہ کو عکّہ (فلسطین) منتقل کر دینے کا فیصلہ کر دیا۔ ۵ اگست ۱۸۶۸ء کو روانہ ہو کر بہاءاللہ اور اس کے بہتّر ساتھی ۳۱ اگست کو عکّہ پہنچ گئے۔ جہاں قلعۂ عکّہ میں انھیں قید کر دیا گیا۔ پھر ان کے قیام کے لیے متعدد جگہیں بدلی گئیں اور ۱۸۷۷ء تک قید و بند کے شدائد قائم رہے۔ آخر ۱۸۸۰ء کو بہجی میں ٹھکانا ملا۔ ۱۰ مئی ۱۸۹۲ء کو بہاءاللہ بیمار ہوا اور ۲۸ مئی کو پچھتر سال کی عمر میں رحلت کی۔ بہاءاللہ کے آخری ایام بڑی تلخی اور رنج و اندوہ میں گزرے (*Materials for the study of the Babi Religion*، ص ۶۰)۔

بہاءاللہ کی دو بیویاں تھیں، جن میں سے ہر ایک سے چھ چھ بچے پیدا ہوئے۔ پہلی شادی اٹھارہ برس کی عمر میں نوّاب نام ایک عورت سے ہوئی۔ اس کے بطن سے ذیل کے بچے پیدا ہوئے (۱) صادق، جو چار سال کی عمر میں فوت ہو گیا، (۲) عباس افندی عبدالبہاء (۱۸۴۱ء میں پیدا ہوا۔ اس کی چار بیٹیاں تھیں؛ کوئی نرینہ اولاد نہ تھی)؛ (۳) بہیّہ خانم، (۴) علی محمد، سات سال کی عمر میں فوت ہو گیا، (۵) مہدی، (۶) علی محمد، دو سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔

۱۸۴۹ء میں بہاءاللہ نے اپنی چچا زاد بہن مہدِ عُلیا سے شادی کی۔ اس سے پیدا ہونے والوں بچوں کے نام یہ ہیں : (۷) محمد علی، جو ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوا، (۸) صمدیّہ خانم، (۹) علی محمد، جو دو سال کی عمر میں فوت ہو گیا، (۱۰) ایک لڑکی، جو دو سال کی عمر میں فوت ہو گئی، (۱۱) ضیاءاللہ، (۱۲) بدیع اللہ، پیدائش ۱۸۶۸ء۔ ان بچوں میں سے پہلی بیوی کے سب سے بڑے بیٹے عباس افندی کو بہاءاللہ نے غصن اعلٰی کا لقب دیا تھا اور دوسری بیوی کے سب سے بڑے بیٹے محمد علی کو غصن اکبر کا۔ دونوں اغصان کے باہمی جھگڑوں نے بہائی تحریک کو بہت نقصان پہنچایا۔

بہاءاللہ کی وفات کے نو دن بعد نو بہائیوں کی موجودگی میں اس کی وصیت کھول کر سنائی گئی؛ لیکن عبدالبہاء عباس افندی نے اس وصیت

کا ایک حصّہ مخفی رکھا اور جس حصّے میں اس کی جانشینی کا ذکر تھا اسے ظاہر کر دیا (*Materials for the study of the Babi Religion*، ص ۷۵)۔ اس پر محمد علی غصنِ اکبر نے عباس افندی کے مقابلے میں گدی کا دعوی کیا اور مطالبہ کیا کہ بہاء اللہ کی وصیت کا جو حصّہ مخفی رکھا گیا ہے اسے ظاہر کیا جائے، لیکن عبدالبہاء عباس افندی نے آخر وقت تک اس مخفی حصے کو ظاہر نہ کیا۔ ہر چند کہ یہ اختلاف ایک مذہبی مناقشے سے زیادہ خاندانی اقتدار کے لیے تھا، لیکن آہستہ آہستہ اس میں بعض دوسرے بہائی عمائد بھی ملوث ہو گئے۔ میرزا جواد، جس کا مقام بہاء اللہ کی اپنی تحریرات کے مطابق اغصان کے بعد سب سے بڑا تھا اور جو ان نو منتخب بہائیوں میں سے تھا جنھیں بہاء اللہ کی وصیت کو سب سے پہلے دیکھنے کا اعزاز بخشا گیا اور امریکہ میں بہائیت کا سب سے پہلا مبلغ ڈاکٹر جارج خیراللہ، جسے عبدالبہاء نے بہاء اللہ کا پطرس قرار دیا تھا اور جناب خادم اللہ میرزا جانی کاشانی اور آخر میں حاجی عبدالکریم عبدالبہاء، عباس افندی کے خلاف ہو گئے اور انھوں نے محمد علی کا ساتھ دیا۔ اس طرح بہائی تحریک بہاء اللہ کی وفات کے بعد دو حصوں میں منقسم ہو گئی: (۱) عبدالبہاء عباس افندی کے پیرو، جنھیں ان کے مخالف مارقین کہتے ہیں؛ (۲) محمد علی کے پیرو، جنھیں ان کے مخالف ناقضین کہتے ہیں اور وہ اپنے کو موحّدین کہتے ہیں۔ یہ اختلاف اسی قسم کا تھا جس طرح باب کے بعد اس کی جماعت ازلیوں اور بہائیوں میں منقسم ہو گئی تھی۔

غصنِ اعظم اور غصنِ اکبر کے درمیان اختلافات نے جلد ہی ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور دشمنی کی شکل اختیار کر لی اور عباس افندی نے اپنے متبعین کو حکم دیا کہ وہ محمد علی اور اس کے ساتھیوں کا معاشرتی مقاطعہ کر دیں۔ اسی طرح اس نے خاندانِ مقدّس کے لیے جو نذرانے آتے تھے ان سے اپنی سوتیلی والدہ کی اولاد کو محروم کر دیا (*Material for the study of the Babi Religion*، ص ۸۰)۔ یہ اختلافات اتنے شدید تھے کہ ۱۸۹۸ء میں جب بہاء اللہ کا بیٹا ضیاء اللہ، جو محمد علی کا چھوٹا بھائی تھا، فوت ہوا تو عباس افندی اور اس کے مرید اس کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہوے، بلکہ میرزا جاوید نے تو یہاں تک الزام لگایا ہے کہ عباس افندی ضیاء اللہ کی بیوہ کو اغوا بھی کرنا چاہتا تھا، لیکن میرزا جانی کاشانی اور بعض دوسرے لوگوں کی بر وقت مداخلت سے یہ حادثہ ٹل گیا۔ بعد میں خود عباس افندی نے بہاء اللہ کے عزیز مرید جناب خادم اللہ کو زد و کوب کر کے ننگے پیر گھر سے نکال دیا (کتاب مذکور، ص ۱۵۹) اور اس کے متروکات کو ناجائز طور پر اپنے قبضے میں رکھا۔ مئی ۱۸۹۷ء میں جناب خادم اللہ کے ساتھ بہجی میں جو بدسلوکی ہوئی اور پھر اسے قتل کر دیا گیا اس کی تفصیلات کے لیے دیکھیے واقعۂ ہائلۂ خادم الٰہی در روضۂ مبارکۂ علیا۔ ڈاکٹر خیر اللہ نے بعض خطوط شائع کر کے عباس افندی پر الزام لگایا ہے کہ اس کے متبعین نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے خفیہ طریقوں اور قتل و غارت سے بھی پرہیز نہیں کیا، چنانچہ جدّے کے مشہور تاجر میرزا یحیٰی کا قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھا جاتا ہے (*Materials for the study of the Babi Religion*، ص ۱۵۷)۔ میرزا حسن خراسانی نے، جو عباس افندی کا معتقد تھا، صاف لفظوں میں ڈاکٹر خیر اللہ سے کہا کہ اگر عباس افندی مجھے حکم دے تو میں بلا توقف تمھاری آنکھیں نکال دوں اور تمھیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے قتل کر دوں (کتاب مذکور، ص ۱۵۳)۔

عباس افندی پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا ہے کہ اس نے امن و سلامتی کے جذبات کے بجاے، جن کی تلقین بہاءاللہ نے کی تھی، ذاتی مفاد کے لیے خود اپنی قوم کے اندر تعصب اور دشمنی کی فضا پیدا کر دی اور بہائیوں میں باہم مجلسی مقاطعہ اور معاشرتی عدم تعاون کو رائج کیا (کتاب مذکور، ص ۸۰؛ مجلسی مقاطعے کے لیے نیز دیکھیے ص ۱۰۰، ۱۰۵ ببعد)، بہاءاللہ نے کتاب اقدس (ص ۶۳) میں باہمی اختلافات کو مٹانے کا جو طریقہ پیش کیا تھا اسے نظر انداز کر دیا، بہائیوں کی وفات پر خوشیاں منائیں (ص ۸۶) اور ڈاکٹر خیر اللہ کی بیٹی بہیّہ کے ذریعے اپنے بعض امریکی مریدوں کو غلط بیانی کی تلقین کی (ص ۱۰۷).

عبدالبہاء نے گدی سنبھالنے کے بعد امریکہ میں اپنے مسیح اور امن اللہ ہونے کا اعلان کیا اور ہندوستان میں ایک تقریر کرتے ہوے کہا کہ زرتشتی مذہب کا بہرام موعود وهي ہے (Materials for the study of the Babi Religion، ص ۷۷) - اس کے مرید اسے بہاءاللہ کی تحریرات کا مستند شارح، ترجمان، اس کا حقیقی جانشین، میثاق کا مرکز اور بہائی زندگی کا مثالی نمونہ سمجھتے ہیں۔ بہاءاللہ کی وفات کے بعد بھی اس کے خاندان کی نظر بندی قائم رہی - آخر ۱۹۰۸ء میں جب ترکان احرار (Young Turks) کی حکومت قائم ہوئی تو عفو عام کا اعلان ہوا اور اس طرح عبدالبہاء نے قید سے رہائی پائی - ۱۹۱۰ء میں اس نے اپنے تبلیغی سفروں کا آغاز کیا - پہلا سفر مصر کی طرف ۱۹۱۰ء میں، دوسرا پیرس اور لنڈن کی جانب ۱۹۱۱ء میں اور تیسرا امریکہ اور یورپ کی طرف ۱۹۱۲ء میں کیا - ۱۹۲۰ء میں برطانوی حکومت نے اسے کے بی ای [Knight of the Order of British Empire] کا خطاب دیا (Encyclopaedia Britannica، ۱۹۵۰ء، ۲ : ۹۲۸) - عبدالبہاء نے بہاء اللہ کے بعد انتیس برس تک بہائی دنیا کی قیادت کی اور ۲۸ نومبر ۱۹۲۱ء کو حَیْفَة (فلسطین) میں وفات پائی اور باب کے مقبرے میں اس کی قبر کے پاس دفن ہوا - یہ مقبرہ ۱۹۵۷ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا.

عبدالبہاء کی نرینہ اولاد نہ تھی، صرف تین لڑکیاں تھیں؛ چنانچہ اس نے اپنی وصیت میں شوقی افندی کو، جو اس کی بڑی بیٹی کا سب سے بڑا بیٹا تھا، اپنا جانشین اور ولیِ امر اللہ مقرر کیا۔ شوقی نے ۱۹۳۶ء میں ایک امریکی خاتون میری میکسویل Mary Maxwell سے شادی کی .

مآخذ : بعض مآخذ متن مقالہ میں بیان ہو چکے ہیں - بقیہ مآخذ کے لیے دیکھیے مقالۂ بہائیت.

(عبدالمنان عمر)

بہاءالحق : رَكّ بہ بہاءالدین زکریّا.

بہاءالدّولة : رَكّ بہ بُوَیہ (بنو).

بہاءالدین زکریا : عام طور سے بہاءالحق کے نام سے مشہور ہیں؛ سہروردی سلسلے کے ایک درویش ولی - فرشتہ کے بیان کے مطابق آپ ۵۷۸ھ/ ۱۱۸۲-۱۱۸۳ء میں ملتان کے قریب کوٹ کَرُور کے مقام پر پیدا ہوے - آپ شیخ شہاب الدّین سُہرَوَردی (رَكّ باں) کے نہایت ممتاز خلفا میں سے تھے اور ہندوستان میں سہروردی سلسلے کے بانی ہیں - کوٹ کرور میں قرآنِ مجید کی ساتوں قراءتوں کی تکمیل کے بعد آپ نے مروّجہ علوم کی تکمیل کی غرض سے خراسان، بخارا، مدینۂ منوّرہ اور فلسطین کے بڑے بڑے علمی مرکزوں کا سفر کیا - مدینۂ منوّرہ کے قیام کے دوران میں اپنے زمانے کے نہایت ممتاز محدّث شیخ کمال الدین یمنی سے حدیث کی تکمیل کی اور پھر کئی سال حضرت رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و سلّم کے روضۂ مُطہّرہ پر ذکر و فکر میں گزارے - فلسطین میں انبیاے بنی اسرائیل کی قبور کی زیارت کے بعد آپ بغداد گئے اور شیخ

شہاب الدین سہروردیؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔ اس وقت ان کی حالت بقول اپنے مرشد کے ایک چوب خشک کی سی تھی جو آگ پکڑنے کے لیے مستعد تھی اور اس لیے صرف سترہ دن کی تربیت کے بعد شیخ نے انہیں اپنا خلیفہ مقرر کر دیا اور ملتان میں ایک سہروردی خانقاہ قائم کرنے کا حکم دیا۔ آپ ملتان میں نصف صدی سے کچھ زائد عرصے تک کام کرتے رہے۔ ان کی خانقاہ جو ایک شاندار عمارت ہے اور جس میں مقیمین اور زائرین کے رہنے کے لیے الگ الگ جگہیں ہیں، قرونِ وسطی کے ہندوستان میں صوفیانہ تلقین کا ایک بہت بڑا مرکز بن گئی تھی۔ آپ کا انتقال ۷ صفر ۶۶۱ھ/ ۲۱ دسمبر ۱۲۶۲ء کو ملتان میں ہوا۔

شیخ بہاء اللہؒ کے سلسلے کو زیادہ‌تر سندھ اور پنجاب میں فروغ حاصل ہوا، اگرچہ ان کے مریدین ہرات، ہمدان اور بخارا میں بھی تھے۔ بطور صوفی ان کی شہرت ان کے ''نفس گیرا'' (وجدانی ذہانت) کی بنا پر تھی جس سے وہ اپنے مریدوں کے دلوں کو مسخر کر لیتے تھے۔ وہ بہت سی باتوں میں اپنے ہم‌عصر چشتی صوفیہ سے مختلف تھے: (۱) وہ ہر طرح کے لوگوں کو اپنے گرد جمع نہیں ہونے دیتے تھے، اور جوالقوں اور قلندروں کی شاذ ہی ان تک رسائی ہوتی تھی؛ چنانچہ ان سے یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ مجھے عام لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں؛ (۲) وہ امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتے تھے اور ان کی خانقاہ میں غلّے کے ذخیرے بھی تھے اور مال و دولت بھی؛ (۳) وہ مسلسل روزے رکھنے کے عادی نہ تھے؛ (۴) گو سلسلۂ چشتیہ میں زمین‌بوسی عام تھی، مگر وہ کسی کو اپنے سامنے جھکنے نہیں دیتے تھے؛ (۵) وہ فرمانرواؤں اور ان کے عہدے داروں سے گہرے روابط رکھنے کے قائل تھے؛ (۶) وہ سماع کے قائل نہیں تھے۔

بہاءالدین زکریاؒ کا قرون وسطی کی سیاسیات پر گہرا اثر و رسوخ تھا، چنانچہ ملتان پر اقتدار قائم رکھنے میں انہوں نے اِلتُتمِش (۶۰۷ھ/ ۱۲۱۰ء تا ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۵ء) کو بڑی مدد دی اور اس کا دیا ہوا اعزازی لقب ''شیخ الاسلام'' بھی قبول کیا۔ ۶۴۳ھ/ ۱۲۴۶ء میں جب منگولوں نے ملتان کا محاصرہ کر لیا اور ہرات کا حکمران بھی ان کے ساتھ مل گیا تو شیخ نے اپنے پاس سے حملہ‌آوروں کو ایک لاکھ دینار کی رقم پیش کی اور انہیں محاصرہ اٹھا لینے پر راضی کر لیا۔

شیخ ملتان میں ایک بڑے شاندار مقبرے میں مدفون ہیں۔ اس پر نصف دائرے کی شکل کا گول گنبد ہے، جسے چینی کی خوبصورت کاشی سے مزیّن کیا گیا ہے۔

مآخذ: سولھویں صدی عیسوی کے اوائل تک شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے متعلق کوئی سہروردی تذکرۂ احوال نہیں ملتا، تاآنکہ ۱۳۱۱ھ میں شیخ جمالی نے اپنی کتاب سیرُ العارفین (دہلی) میں جس قدر احوال انہیں چشتیہ ذرائع سے مل سکے جمع کر دیے۔ اصلی ذرائع کے لیے دیکھیے (۱) حسن سجزی: فوائدُ الفؤاد، مطبوعۂ نول کشور ۱۳۰۲ھ، ص ۵، ۶، ۱۰، ۲۹ ببعد؛ (۲) حمید قلندر: خیرالمجالس، طبع کے۔ اے۔ نظامی، علیگڑھ ۱۹۵۹ء، ص ۱۳۱، ۱۳۷، ۲۸۳؛ (۳) میر خورد: سیرالاولیاء، دہلی ۱۳۰۲ھ، ص ۷۷، ۹۱، ۱۵۸؛ (۴) سیف بن محمد: تاریخ نامۂ ہرات [طبع محمد زبیر صدّیقی]، کلکتہ ۱۹۴۴ء، ص ۵۹ تا ۱۵۸؛ (۵) جامی: نفحاتُ الاُنس، نولکشور ۱۹۱۵ء، ص ۵۰۴؛ نیز دیکھیے (۶) عبدالحق محدّث: اَخبار الاَخیار، دہلی ۱۳۰۹ھ، ص ۲۶ تا ۲۷ [اردو ترجمہ از اقبال الدین احمد، کراچی ۱۹۶۳ء، ص ۸۵ بعد]؛ (۷) غوثی: گلزار اَبرار، طبع Ivanow، مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، ص ۹۸ بعد؛ ۱۰۸؛ (۸) عبدالرحمٰن چشتی: مرآۃ الاَسرار (مخطوطہ در

ذاتی مجموعه، ص ۳۰۳ تا ۳۰۷)؛ (۹) غلام معین الدین: معارج الولایة، (ذاتی مجموعه)، ۱: ۲۸۹ تا ۳۹۸؛ (۱۰) E.D. Maclagan: *Gazetteer of the Multan District*، لاهور ۱۹۰۲ء، ص ۲۲۹ ببعد؛ [(۱۱) محمد شفیع: مقالات دینی و علمی، لاهور ۱۹۶۰ء، ۱: ۲۲۹ تا ۲۳۱؛ (۱۲) انوار اصفیاء، لاهور، ص ۱۸۷ ببعد؛ (۱۳) مرزا محمد اختر: تذکرۂ اولیائے هند، دہلی ۱۹۲۸ء، ص ۱۳۳ تا ۱۳۸]۔

(کے ۔ اے ۔ نظامی)

بہاءالدّین زُہَیر: ابوالفضل بن محمد بن علی المہلّبی الأزدی (بالعموم البہاء زهیر کے نام سے معروف ہے)۔ عہد ایوبی کا مشہور عربی شاعر، جو ۵ ذی الحجه ۵۸۱ھ / ۲۷ فروری ۱۱۸۶ء کو مکۂ مکرّمہ میں پیدا ہوا۔ بہت ہی چھوٹی عمر میں وہ مصر چلا گیا جہاں قُوص (بالائی مصر) میں اس نے قرآن کریم اور ادب پڑھا۔ ۶۲۵ھ/۱۲۲۷ء کے قریب وہ مستقل طور پر مصر میں سکونت پذیر ہوگیا۔ البہاء زہیر سلطان الکامل کے بیٹے (شاہزادہ) الصّالح کی ملازمت میں رہا اور ۶۲۹ھ/ ۱۲۳۱-۱۲۳۲ء میں شام اور بالائی عراق عرب کی مہم پر اس کے ساتھ گیا۔ جب الصّالح اپنے والد کے انتقال کے بعد ۶۳۷ھ / ۱۲۳۹ء میں مصر سے واپس آ رہا تھا تو نابلس کے مقام پر اس کی فوج نے اس کے ساتھ غدّاری کی اور اسے اس کے چچازاد بھائی ناصر داؤد کے حوالے کر دیا، جس نے اسے قید کر دیا۔ زُہیر مصیبت کے ان دنوں میں بھی اپنے آقا کا وفادار رہا اور کچھ زمانہ نابلس ہی میں گزارا۔ جب الصّالح مصر کے تخت پر بیٹھا، تو اس نے زہیر کو اپنا وزیر مقرر کر لیا اور اس پر انعام و اکرام کی بارش کی۔ ۶۴۶ھ / ۱۲۴۸ء میں جب بادشاہ المنصورة کے مقام پر ساتویں صلیبی جنگ (سینٹ لوئس) لڑ رہا تھا تو ہم اسے اپنے آقا کے پہلو بہ پہلو پاتے ہیں۔ ایک غلط فہمی کی بنا پر وہ بادشاہ کا معتوب ہوا اور اپنے آقا کی موت پر وہ شام چلا گیا۔ یہاں اس نے دمشق کے بادشاہ الناصر یوسف کی خدمت میں بہترین قصیدے پیش کیے، لیکن اس کا مقصد بر نہ آیا۔ مایوس ہو کر وہ قاہرہ واپس چلا آیا اور زندگی کے باقی دن عزلت و عُسرت میں گزار دیے۔ بالآخر ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں انتقال کیا۔

اس کا دیوان پیرس میں (مخطوطه، در کتاب خانۂ ملیه، عدد ۳۱۷۴) اور بعض دوسرے مقامات پر محفوظ ہے اور اسے قاہرہ میں طبع کیا گیا ہے (۱۳۱۴ھ)۔ پامر Palmer نے انگریزی ترجمے کے ساتھ اس کا ایک نہایت عمدہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔ یہ دیوان زہیر کے شاعرانہ خلوص اور اس کی شاعری کی موسیقیت اور ترنّم کا مظہر ہے۔ الفاظ، ہیئت، بحر اور اسلوب بیان کے معاملے میں، حسن انتخاب اور کلام کے آہنگ و ترنّم میں، ہر جگہ اس کے ذوق کی پختگی نمایاں ہے۔ باوجودیکہ وہ اپنے عہد کی شاعرانہ رسوم کا پابند ہے اور اس کے کلام میں صنائع بدائع کی کثرت ہے، اس کی شاعری میں کبھی تصنّع کا رنگ پیدا نہیں ہوا۔

مآخذ: ابن خلّکان، بولاق ۱۲۹۹ھ، ۱: ۳۳۵؛ (۲) ابن العماد: شذرات، قاهره ۱۳۵۰ھ، ۵: ۲۷۶؛ (۳) السُّیوطی: حسن المحاضرة، قاهره ۱۲۹۹ھ، ۱: ۳۲۷؛ (۴) المقریزی: سلوک، قاهره ۱۹۳۴ء، ص ۳۳۳؛ (۵) E. H. Palmer: *The Diwan of Baha al-Din Zuhayr*، کیمبرج ۱۸۷۶ء؛ (۶) S. Guyard: *Le Diwan de Bahā'ad-Din Zoheir, Variantes au texte arabe*، پیرس ۱۸۸۳ء؛ (۷) مصطفى السقّا: ترجمة بهاء الدّين زهير، قاهره ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۹ء، (۸) مصطفى عبدالرزّاق: البهاء زُهير، قاهره ۱۹۳۰ء؛ (۹) جودت رکابی: *La poésie profane sous les Ayyūbides*، پیرس ۱۹۴۹ء؛ (۱۰) براکلمان Brockelmann، ۱: ۲۶۳ و تکمله، ۱: ۴۶۵۔

(جودت رکابی)

- **بہاءالدین العاملی**: رک بہ العاملی۔
- **البہائی**: رک بہ العاملی۔
- **بہائی محمد افندی**: عثمانی فقیہ اور عالم دین۔ ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵-۱۵۹۶ء میں استانبول میں پیدا ہوا۔ وہ روم ایلی کے قاضی عسکر عبدالعزیز افندی کا بیٹا اور سعد الدین مؤرخ کا پوتا تھا۔ مذہبی درس گاہ میں مختلف مدارج ترقی طے کرنے کے بعد وہ مدرس اور ملّا بن گیا اور پہلے سالونیکا میں اور بعد ازاں ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۳-۱۶۲۴ء میں حلب کا قاضی مقرّر ہوا۔ وہ تمباکو پینے کا بہت زیادہ عادی تھا، چنانچہ بیلر بے احمد پاشا کی شکایت پر، جس کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہ تھے، ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴-۱۶۳۵ء میں اسے موقوف کر کے بطور سزا قبرص میں جلا وطن کر دیا گیا، کیونکہ ان دنوں تمباکو نوشی ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا۔ ۱۰۴۵ھ کے اواخر (۱۶۳۶ء کے اوائل) میں اس کا قصور معاف ہوا اور محرم ۱۰۴۸ھ/مئی-جون ۱۶۳۸ء میں اسے شام کا ملّا بنا دیا گیا۔ صفر ۱۰۵۴ھ/اپریل ۱۶۴۴ء میں اسے ادرنہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ ربیع الاول ۱۰۵۵ھ/مئی ۱۶۴۵ء میں اسے استانبول کا قاضی بنا دیا گیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ وہ آناطولی اور روم ایلی کا قاضی عسکر رہا۔ اور رجب ۱۰۵۹ھ/جولائی-اگست ۱۶۴۹ء میں پہلی دفعہ شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز ہوا۔ قرا چلبی زادہ اس کا حریف تھا، چنانچہ اس نے یہ رائے ظاہر کی کہ اس عہدے پر اس کے تقرر کی وجہ یہ تھی کہ مسکرات کے کثرتِ استعمال نے اسے بے حد ضعیف کر دیا تھا اور وزیر اعظم اور والدہ سلطان کا خیال تھا کہ وہ اس سے اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق کام نکالتے رہیں گے، لیکن اس کی قوت عمل نے اور وزیر اعظم اور والدہ سلطان کے بعض مطالبات کے سامنے اس کی استقامت اور پختگی نے قرا چلبی زادہ کے متذکرۂ صدر الزام کو غلط ثابت کر دکھایا۔ اس نے درویشوں کے مولویہ اور خلوتیہ سلسلوں کو جو مراعات دیں ان کی وجہ سے راسخ العقیدہ طبقے کے لوگ اس کے مخالف بن گئے۔ انھوں نے تمباکو اور قہوے کے استعمال سے شیخ الاسلام کی مسامحت نیز درویشوں کے سماع و رقص کے بارے میں اس کی رواداری پر بڑی اعتراضات کیے، لیکن اس کے زوال میں ان کی کوشش کو دخل نہ تھا بلکہ اس کی وجوہات کچھ اور تھیں۔ جمادی الاولی ۱۰۶۱ھ/اپریل-مئی ۱۶۵۱ء میں جب حلقۂ اختیار کے سوال پر ازمیر [سمرنا] کے قاضی اور وہاں کے برطانوی قونصل کے درمیان تنازعہ رونما ہوا تو بہائی افندی نے استانبول کے برطانوی سفیر کو اس کے مکان میں نظربند کر دیا۔ سفارتی مراعات کی اس خلاف ورزی پر اس کی موقوفی عمل میں آئی اور اسے جلاوطن کر کے مدلّی بھیج دیا گیا۔ بہر کیف وہ گیلی پولی اور لمپسجہ میں مقیم رہا، تاآنکہ رمضان ۱۰۶۳ھ/اگست ۱۶۵۳ء میں اسے اپنے عہدے پر دوبارہ بحال کر دیا گیا، اور اپنی موت تک، جو ۱۳ صفر ۱۰۶۴ھ/۳ جنوری ۱۶۵۴ء کو بعارضۂ خناق واقع ہوئی، وہ اسی عہدے پر فائز رہا۔ اسے قبرستان فاتح میں دفن کیا گیا۔

بہائی شاعر اور عالم دونوں حیثیتوں سے معروف ہے۔ اس نے اپنے پیچھے اپنی نظمیں اور فتاوی چھوڑے ہیں۔ اس کا مشہورترین فتوی وہ ہے جس میں اس نے تمباکو نوشی کو جائز قرار دے کر سترھویں صدی عیسوی کے اوائل کے امتناعی احکام اور سختی کا خاتمہ کر دیا۔ وہ خود تمباکو کا رسیا تھا۔ اس کا معاصر حاجی خلیفہ لکھتا ہے کہ اگر وہ اس عادت میں مبتلا نہ ہوتا تو اس کا شمار ملک کے ممتازترین علما میں کیا جاتا۔ بہر کیف

حاجی خلیفہ کا بیان یہ ہے کہ بہائی نے تمباکو کے جواز کا جو فتوی دیا وہ اس بنا پر نہیں تھا کہ وہ خود اس کا شکار تھا بلکہ اس لیے کہ یہ نہ صرف لوگوں کے مناسب حال تھا بلکہ اسے یہ بھی یقین تھا کہ شرع اسلام کا بنیادی قانون ''اباحتِ اصلیہ'' ہے اور بس۔

مآخذ: (۱) نعیما: سال ۱۰۵۹ھ، ۱۰۶۱ھ، ۱۰۶۲ھ، ۱۰۶۳ھ؛ (۲) حاجی خلیفہ: میزان الحق، استانبول ۱۲۹۰ھ، ص ۳۲ تا ۳۳ (= *The Balance of Truth*، ترجمہ G.L. Lewis، لنڈن ۱۹۵۷ء، ص ۵۶ تا ۵۷)؛ (۳) اسعد رفعت: دوحۃ المشائخ، استانبول بدون تاریخ، ص ۵۵ تا ۵۷؛ (۴) علمیہ سالنامہ سی، استانبول ۱۳۳۴ھ، ص ۴۵۸ (اس کی تحریر کے نمونوں کے ساتھ)؛ (۵) عثمانلی مولف لری، ۲: ۱۰۱؛ (۶) سجل عثمانی، ۲: ۲۹؛ (۷) Hammer-Purgstall، بمدد اشاریہ؛ (۸) اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی: عثمانلی تاریخی، ج ۳/ حصۂ اول، انقرہ ۱۹۵۱ء، بمدد اشاریہ؛ (۹) Gibb: *Ottoman Poetry*، ۳: ۲۹۳ تا ۲۹۷؛ (۱۰) اس کے متعدد فتاوی عثمانی قوانین شائع شدہ در *MTM*، ج ۱، میں درج ہیں۔

(B. Lewis)

⊗ **بہائیت:** اس مذہب کی بنیاد مرزا حسین علی نوری نے رکھی، جسے اس کے مقتدا علی محمد باب (رک بہ باب) نے بہاء اللہ (رک باں) کا لقب دیا تھا۔ باب نے اپنے بعد ایک ایسے شخص کی بعثت کی خبر دی تھی جسے اس نے من یُظہِرُہُ اللہ کا نام دیا تھا۔ اور ایک بیان میں اس کا زمانہ بہت ہی قریب بتایا تھا۔ آخر بابیوں میں سے ایک شخص ''جناب دیّان'' مرزا اسد اللہ خوئی نے من یُظہِرُہُ اللہ کا دعوی کر دیا، لیکن مرزا یحیی (صبح ازل) اور مرزا حسین علی (بہاء اللہ) نے اس کی شدید مخالفت کی۔ یہ شخص سریانی اور عبرانی زبانیں بھی جانتا تھا۔ آخر یہ قتل ہو گیا۔ اس کے متبع اسدی کہلاتے ہیں۔ جناب دیّان کے بعد اور بہت سے بابیوں نے بھی من یُظہِرُہُ اللہ کا مصداق ہونے کا دعوی کیا، جیسے مرزا عبداللہ غوغا، حسین میلانی المعروف حسین جان، حسین ھندیانی، مرزا محمد زرندی۔ براؤن نے تو یہاں تک لکھا کہ دعووں کا یہ سلسلہ اتنا بڑھ گیا کہ جو شخص بھی نیند سے بیدار ہوتا وہ یہی دعوی کرنے لگتا (نقطۃ الکاف پر براؤن کا دیباچہ، ص m)۔ بہاء اللہ ۱۲۶۵ھ میں جنگ قلعۂ شیخ طبرسی میں شرکت کے لیے جاتے ہوئے راستے ہی میں گرفتار ہو گیا۔ حکومت نے مزید تحقیقات کے لیے پورے قافلے کو آمل کی طرف روانہ کر دیا۔ راستے میں موقع پا کر بہاء اللہ نے اپنے ساتھیوں کو، جب وہ ایک دریا کے کنارے پر تھے، اشارہ کیا کہ ان تمام تحریرات کو جو ان کے پاس ہیں دریا برد کر دیں (*The Down Breakers*، ص ۲۶۹)۔ آمل پہنچ کر بہاء اللہ نے مختلف بیانات دے کر اپنے بعض ساتھیوں کو حکومت کی قید سے رہا کروا لیا۔ اپنے ایک ساتھی ملّا باقر کے متعلق کہا کہ اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں، یہ تو اپنے کام سے مشہد جا رہا تھا، اسے بلا وجہ ہمارے ساتھ گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میرزا جانی کاشانی کے متعلق کہا کہ یہ تو محض ایک تاجر ہے اور میرے پاس صرف بطور مہمان قیام پذیر تھا۔ صبح ازل کو اپنا نوکر ظاہر کیا۔ تاہم بہاء اللہ خود قید میں رہا۔ یہ اس کی دوسری گرفتاری تھی۔ اس سے پہلے اسے قُرّۃ العین (رک بآں) کے خسر ملا تقی قزوینی کے قاتلوں کی امداد کے سلسلے میں تہران میں گرفتار کیا گیا تھا۔ تیسری گرفتاری اس وقت ہوئی جب ۲۸ شوال ۱۲۶۸ھ / ۱۵ اگست ۱۸۵۲ء کو شاہ ایران نصیرالدین شاہ پر چند بابیوں نے قاتلانہ حملہ کیا۔ اس موقع پر جن بابیوں کو گرفتار کیا گیا ان میں بہاء اللہ بھی تھا۔ بہاء اللہ نے خود اس گرفتاری

کا حال لکھا ہے ۔ (لوح ابن ذئب) ۔ یہ قید چار ماہ رہی ۔ اس کے بعد بہاءاللہ نے اکتوبر ۱۸۵۲ء، ۱۸۶۷ء میں یا بقول مشہور بہائی مصنف مرزا جواد ۱۸۶۳ء میں دعوی کیا کہ در اصل وہی من یظہرہ اللہ ہے ۔ صبح ازل اور بعض دوسرے بابیوں نے اس دعوے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، لیکن بابیوں کی اکثریت نے بہاءاللہ کے دعوے کو تسلیم کر لیا۔

بہائیت اسلام کا کوئی فرقہ نہیں بلکہ ایک الگ مذہب ہے اور اس کے ماننے والے، اپنے خیال میں اسے دیگر مذاہب سے بہتر مانتے ہیں ۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ قانون ارتقا کا ایک طبعی نتیجہ ہے کہ جو بعد میں آتا ہے پہلے سے بہتر اور افضل ہوتا ہے ۔ بہائی تعلیمات اور معتقدات کا بہت بڑا حصہ اسمٰعیلی عقائد و تعلیمات سے مماثل ہے۔

بہاءاللہ کا دعوی کیا تھا؟ اس سوال، کا جواب دینا آسان نہیں ۔ باب کے دعوے کی طرح بہاءاللہ کا دعوی بھی خاصا الجھا ہوا ہے اور اسے سمجھنا آسان کام نہیں ۔ بہاءاللہ کے بارے میں بہائی کچھ اسی قسم کا تصور رکھتے ہیں کہ گویا بہاءاللہ خود خدا تھا جو انسانی شکل اور انسانی حوائج کے ساتھ ظہور پذیر ہوا ۔ بہائی لٹریچر میں پہلے انبیا کو بھی ظہورِ الٰہی قرار دیا گیا ہے، اور خود بہاءاللہ بھی خدا تھا، جس نے انسانیت کا جامہ پہن لیا ۔ بہاءاللہ نے لوح اشراقات میں معصومیت کی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دوسری قسم کی معصومیت وہ ہے جس کے بارے میں قرآن مجید میں ہے : لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ ھُمْ یُسْئَلُوْنَ (۲۱ [الانبیاء] : ۲۳) قرآن مجید میں اسے صفاتِ الٰہیہ میں سے قرار دیا گیا ہے اور ان کے خیال میں بہائیوں کے نزدیک یہی معصومیت بہاءاللہ کو حاصل تھی، کیونکہ بہاءاللہ کو من یظہرہ اللہ ہونے کا دعوی تھا اور باب نے من یظہرہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ لا یسئل عما یفعل کا مصداق ہوگا (بیان، ۳ / ۱) ۔ پھر لکھا ہے : وہ زندگی کا میدان ہے (بیان، ۳ / ۱۳)، وہ الٰہ ہے (بیان، ۳ / ۱۳، ۸ / ۱) ۔ پھر لکھا ہے : بیان کا اصل مصنف وہی من یظہرہ اللہ ہے (بیان، ۲ / ۱) ۔ تمام الٰہی اسماء و صفات کا وہ منبع ہے (بیان، ۵ / ۹)۔ پھر بہاءاللہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خود ہی ذاکر اور خود ہی مذکور تھا (الاقدس، ص ۱۷۰) ۔ اسی طرح بہاءاللہ نے خود کو مکلّم طور (= جو طور پر بولا) کہا ہے (نعوذ باللہ)۔

پروفیسر براؤن کی یہی تحقیق ہے کہ بہاءاللہ کا دعوی خدا ہونے کا تھا ۔ ان کے نزدیک بہاءاللہ کا دعوی ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے God in Flesh اور Devine incarnation (دیکھیے نقطۃ الکاف پر براؤن کی تعلیقات) ۔ بہائیوں کی بہت بڑی تعداد بھی اس کا یہی مقام مانتی ہے (دیکھیے مشہور بہائی مصنف مرزا محمد جواد قزوینی کی عربی کتاب کا انگریزی ترجمہ از پروفیسر براؤن، در *Materials for the Study of the Babi Religion*، ص ۱۱۱) ۔ امریکہ میں بہائی مذہب کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا مبلغ ڈاکٹر ابراہیم جارج خیراللہ، جسے عبدالبہاء نے بہاءاللہ کا پطرس اور دوسرا کولمبس قرار دیا، (*Materials for the Study of the Babi Movement*، ص ۹۹؛ ڈاکٹر خیراللہ کے بقیہ حالات کے لیے دیکھیے کتاب مذکور، ص ۹۳ ببعد) بہاءاللہ کو بطورِ خدا ہی پیش کرتا تھا ۔ امریکہ میں مس اے ۔ ایچ، جو ڈاکٹر خیراللہ کے اس بہائی کے متعلق خطبات کے ایک پورے سلسلے میں حاضر تھی، پروفیسر براؤن کے نام اپنے خط میں لکھتی ہے : ڈاکٹر خیراللہ کے نزدیک بہاءاللہ خود خدا تھا (Baha was God himself) ۔

ڈاکٹر خیراللہ نے بتایا کہ ''۱۸۵۲ء میں خدائے مجسم، یعنی بہاءاللہ ظاہر ہوا'' (حوالۂ سابق) ۔ امریکہ میں بہائی بننے کے لیے جو بیعت فارم شائع کیا گیا اس کے الفاظ یہ ہیں: ''اے اعظم (یعنی عبدالبہاء) خدا کا نام لے کر میں بڑی عاجزی کے ساتھ اپنے خالق برتر و توانا خدا کی توحید کا اقرار کرتا ہوں اور خدا کے انسانی شکل میں ظاہر ہونے پر میرا ایمان ہے In God's name, the Greatest Branch, I humbly confess the oneness and singleness of the Almighty God, my Creator, and I believe in his appearance in the human form... (بحوالۂ سابق) اور بہائی میگزین کا موقف یہ ہے کہ بہاءاللہ کا دعویٰ خدا ہونے کا نہ تھا ۔ بہائی کتابوں میں باقی نبیوں کے زمانے بڑے بڑے ادوار میں مربوط کیے گئے ہیں، لیکن بہائیوں کے نزدیک باب اور بہاءاللہ کی آمد پر بعث انبیاء کا دور جو آدم سے شروع ہوا تھا ختم ہو گیا۔

بہائی جملہ انبیا کے ادیان کو اساساً برحق مانتے ہیں، لیکن ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اب بہائی مذہب بہترین مذہب ہے اور اب گزشتہ شریعتوں پر نہیں بلکہ بہائی شریعت پر عمل سے نجات ملے گی۔[۱]

بہائیوں میں اگرچہ اجتماعی عبادت کی کوئی صورت نہیں پائی جاتی، لیکن کتاب الاقدس میں ''مشرق الاذکار'' (= وہ جگہ جہاں صبح صادق کے وقت اسم الٰہی کا ذکر کیا جائے) تعمیر کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ اس عمارت کو ایک قسم کی عبادت گاہ سمجھنا چاہیے، گو اس سے بعض دوسرے معاشرتی معاملات بھی منسلک کیے گئے ہیں۔ اس کے نقشے کے بارے میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ مدور ہو، جس کے اوپر نو حصوں پر مشتمل ایک بڑا گنبد بنایا جائے۔ ۱۰ مئی ۱۹۱۲ء کو عبدالبہاء نے شکاگو کے قریب جھیل مشی گن کے کنارے دلمیا (Illynos) میں ایک ''مشرق الاذکار'' کا سنگ بنیاد رکھا۔ ۲ جون ۱۹۵۳ء کو ولی امراللہ شوقی آفندی کی امریکن بیوی کی موجودگی میں اس کا افتتاح ہوا۔ اس سے پہلے ۱۹۰۲ء میں بھی عشق آباد (روس) میں ایک ''مشرق الاذکار'' تعمیر ہوا تھا۔

بہائی شریعت کے معاشرتی مسائل اس طرح ہیں کہ بلا امتیاز مذہب و ملت بلکہ مشرکین سے بھی شادیاں جائز ہیں، ایک وقت میں دو بیویاں رکھی جا سکتی ہیں۔ کتاب الاقدس میں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے۔ خود بہاءاللہ کی دو بیویاں تھیں، لیکن اب بہائی تعدد ازدواج کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ عبدالبہاء نے اس اجازت کو منسوخ کر دیا ہے۔ مہر پچانوے مثقال سونے سے زیادہ مقرر کرنا جائز نہیں۔

قبلہ عکہ ہے۔ روزے انیس جو طلوع شمس سے غروب شمس تک ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ کے نصاب کے ذکر کا کتاب الاقدس میں وعدہ دیا گیا، لیکن اس میں یہ نصاب کہیں نہیں ملا۔ بہائی شریعت میں بعض تعزیرات بھی ملتی ہیں، مثلاً مکانوں کو نذر آتش کرنے والے کو جلا دیا جائے یا پھر حبس دوام۔ زنا کی سزا صرف نو مثقال (ایک مثقال = ۶۰ گرین تقریباً) جرمانہ ہے۔ دوسری دفعہ اس جرم کے ارتکاب پر اٹھارہ مثقال۔

انیس کے عدد کو امر بہائی میں بڑی اہمیت، عظمت اور تقدس حاصل ہے۔ حروف حی کو بھی امر بہائی میں بڑا تقدس حاصل ہے۔ بہائی تعلیمات میں اخفائے راز کو ہمیشہ اہمیت دی گئی ہے۔ ''ذَہَبک، ذَہَابک و مَذہَبک''، یعنی اپنی دولت، اپنے سفر کی منزل مقصود اور اپنے مذہب کے چھپانے کی تلقین ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہے۔

بہائیوں کی مجالس مقدرہ دو قسم کی ہیں۔

انتظامی اور ارشادی ـ انتظامی مجالس انتخاب کے ذریعے بنتی ہیں اور ارشادی مجالس ایسے اشخاص اور گروہوں پر مشتمل ہوتی ہیں جن کی نامزدگی مرکز کی طرف سے ہوتی ہے ۔ یہ دونوں قسم کے نظام جماعتی تنظیم کی اعلٰی ترین سطح، یعنی ولی الامر کی شخصیت میں پہنچ کر ایک ہو جاتے ہیں ۔

ولی امراللہ کا عہدہ موروثی ہے، لیکن باپ کے بعد لازماً اس کے بڑے بیٹے کو اس کا جانشین نہیں بنایا جاتا ۔ وہ اپنی زندگی میں اپنے خاندان کے کسی فرد کو اس عہدے کے لیے نامزد کر دیتا ہے ۔ بہر حال یہ ضروری ہے کہ بہائی مذہب کا رئیس اعلٰی ہمیشہ بانی مذہب بہاء اللہ کی اولاد میں سے ہو اور اس خاندان کا اقتدار اعلٰی ہمیشہ قائم رکھا جائے ۔

نظم و نسق کے اس پورے نظام کو بہائی منزّل من اللہ خیال کرتے ہیں ۔ اور "بیت العدل" کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ اللہ تعالٰی کی حفاظت میں کام کرتا ہے ۔ وہ کہتے ہیں : ایسے امور جو بہائی شریعت میں موجود نہیں اللہ تعالٰی "بیت العدل" کو الہام کرے گا ۔ گویا "بیت العدل" شریعت بھی بنا سکتا ہے اور ضرورت اور اقتضاے وقت پر شریعت میں ترمیم و تنسیخ بھی کر سکتا ہے ۔

بہائی سال میں پانچ عیدیں مناتے ہیں: (۱) ظہور بہاء اللہ پر عید رضوان؛ (۲) عید بعثت باب؛ (۳) عید میلاد بہاء اللہ؛ (۴) عید میلاد باب؛ (۵) عید نو روز ۔

بہائیوں کو انیس دن کے روزے رکھنے کے لیے کہا گیا ہے، یعنی بابی تقویم کے ماہ اعلٰی میں جو ۲ مارچ سے شروع ہو کر ۲۰ مارچ کو ختم ہو جاتا ہے، جب بہائیوں کی عید نو روز ہوتی ہے ۔

مآخذ: (۱) بہاء اللہ کی تالیفات؛ (۲) باب کی تالیفات؛ (۳) صبح ازل کی تالیفات، مثلاً ذیل بیان، فارسی، مستیقظ، آثار ازلیہ، احکام بیان، الواح ازل، ریاض المہتدین، صحائف ازل، کتاب الحیوۃ، کتاب نور، لمعات الازل، مرآۃ البیان، کتاب الہیاکل؛ (۴) عبدالبہاء عباس افندی کی تالیفات، مثلاً (۱) اسرار الغیبیۃ لاسباب المدنیۃ (فارسی)، بمبئی ۱۸۹۳ء، عربی ترجمہ الرسالۃ المدنیۃ، قاہرہ ۱۹۱۱ء، انگریزی ترجمہ *The Mysterious Forces of Civilization*، شکاگو ۱۹۱۸ء؛ (ب) الالواح و الوصیۃ، قاہرہ ۱۹۲۳ء، جانشینی کے بارے میں اہم دستاویزات، (ج) النور الابہی، عبدالبہاء کے ملفوظات، قاہرہ ۱۹۲۰ء، انگریزی ترجمہ *Some Answered Questions*، لنڈن ۱۹۰۸ء، فرانسیسی ترجمہ، پیرس ۱۹۲۹ء؛ (د) الالواح، انگریزی ترجمہ *Tables of Abdul Baha*، نیویارک ۱۹۳۰ء؛ (ہ) مکاتیب عبدالبہاء، قاہرہ ۱۹۱۰ - ۱۹۲۱ء؛ (و) Wilmette : *Selected Writings of Abdul Baha*، ۱۹۴۲ء؛ (۵) *Abdul Baha on Divine Philosophy*، بوسٹن ۱۹۱۸ء؛ (۶) M. H. Phelps : *Life and Teaching of Abbas Effendi*، لنڈن ۱۹۱۲ء، جرمن ترجمہ، شٹٹ گارٹ ۱۹۲۲ء؛ (۷) شوقی افندی کی تالیفات، مثلاً (الف) *God Passes by*، ۱۹۴۴ء؛ (ب) *The Dispensation of Bahaullah*؛ (ج) *Bahai Administration*؛ (د) *The Hidden Word*، لنڈن ۱۹۳۲ء؛ (ہ) لوح قرن، مکتوب جو امر بہائی کی پہلی صد سالہ جوبلی کے موقع پر ۱۹۴۴ء میں لکھا گیا؛ (و) *Prayers and Meditation*، نیویارک ۱۹۳۸ء؛ (۸) فضل الدین وکیل : بہائی مذہب کی حقیقت، قادیان ۱۹۳۰ء؛ (۹) محمد علی لاہوری : *History and Doctrines of Bahi Movement*، لاہور ۱۹۳۳ء؛ (۱۰) Edward G. Browne : *Materials for the study of the Babi Religion*، کیمبرج ۱۹۱۸ء؛ (۱۱) وہی مصنف، در *JRAS*، ۱۸۸۹ء، ۱۸۹۲ء، ۱۸۹۲ء؛ (۱۲) وہی مصنف : *Study of Babi Religion*، کیمبرج ۱۹۱۸ء؛ (۱۳) وہی مصنف : *The Babi's of Persia*؛ (۱۴) وہی مصنف : *A Year Amongst the Persians*، ۱۸۹۳ء؛ (۱۵) وہی مصنف : *The Personal Reminis-*

cences، ۱۸۵۰ء؛ (۱۶) مقالۂ سیاح، انگریزی ترجمہ از براؤن The Traveller's Narrative، مع تعلیقات، کیمبرج ۱۸۹۱ء؛ (۱۷) مرزا جانی کاشانی: نقطة الکاف، انگریزی ترجمہ مع تعلیقات از پروفیسر براؤن؛ (۱۸) ابو الفضل الجرباذقانی: کتاب الفرائد، قاہرہ؛ (۱۹) محمد تقی ہمدانی: احقاق حق، بدون تاریخ؛ (۲۰) مرزا ابوالفضل: الفوائد، قاہرہ ۱۳۱۵ھ؛ (۲۱) حسین قلی: منہاج الطالبین، بمبئی ۱۳۲۰ھ؛ (۲۲) نامعلوم ازلی مصنف: تذکرة الغافلین؛ (۲۳) مرزا محمد مہدی خان: تاریخ البابیة، قاہرہ ۱۹۰۳ء؛ (۲۴) ابوالفضائل: الحجج البہیة، قاہرہ ۱۹۲۵ء، انگریزی ترجمہ The Babi Proofs؛ (۲۵) وہی مصنف: مجموعۂ رسائل، قاہرہ ۱۹۲۰ء؛ (۲۶) نبیل زرندی: تاریخ نبیل، انگریزی ترجمہ از شوقی آفندی The Dawn Breakers، نیویارک ۱۹۳۲ء؛ (۲۷) تاریخ جدید، انگریزی ترجمہ New History of the Bab، کیمبرج ۱۸۹۳ء؛ (۲۸) محمود زرقانی: بدائع الآثار، بمبئی ۱۹۱۳ - ۱۹۲۱ء؛ (۲۹) نبیل آفندی: تاریخ صعود حضرت بہاءاللہ، قاہرہ ۱۹۲۳ء؛ (۳۰) القول الفصل، ۱۹۰۲ء (مرزا محمد علی کی تائید میں)؛ (۳۱) جواب پروفسر الثانی دکتور فورل، قاہرہ ۱۹۲۲ء؛ (۳۲) مرزا بدیع اللہ (ابن بہاءاللہ): رسالہ (۷۰ صفحات جس میں اس نے اپنے بھائی محمد سے علیحدگی کے اسباب بیان کیے ہیں)؛ (۳۳) واقعۂ ہائلۂ خادم الٰہی در روضۂ مبارکۂ علیا؛ (۳۴) مرزا جانی کاشانی: رسالہ، مرزا محمد علی کی تائید میں؛ (۳۵) تبیان الدلیل لمن یرید الاقبال الی سواء السبیل، قاہرہ ۱۹۰۰ء؛ (۳۶) مائدۂ آسمانی، تہران ۱۹۴۷ء؛ (۳۷) الزرکلی: الاعلام، بار دوم، ۲ : ۱۷۲؛ (۳۸) Whence. : Arthur Pilsbury Why, Wither، میساچیوسٹس (امریکہ)؛ (۳۹) Hippolyte : Dryfus The Universal Riligion، لنڈن ۱۹۰۲ء؛ (۴۰) Charles Mason : The Bahai Movement، واشنگٹن ۱۹۱۲ء؛ (۴۱) Miss Ethel Rosenberg : A Brief Account of Bahai Movement، لنڈن ۱۹۱۱ء؛ (۴۲) Samual Graham Wilson : Bahaism and its Claims، نیویارک ۱۹۱۵ء؛ (۴۳) Lady Blomfield : The Chosen Highways، لنڈن ۱۹۴۰ء؛ (۴۴) M. Hainfurd Ford : The Oriental Rose، نیویارک ۱۹۱۰ء؛ (۴۵) Ibrahim George Khayrullah : Dab-ed-Din، شکاگو ۱۸۹۷ء؛ (۴۶) وہی مصنف: Bahaullah، شکاگو ۱۹۰۰ء؛ (۴۷) وہی مصنف: The Door to True Religion، شکاگو ۱۸۹۷ء؛ (۴۸) وہی مصنف: Facts for Behaists، شکاگو ۱۹۰۱ء؛ (۴۹) وہی مصنف: The Three Questions، مقام و تاریخ طبع ندارد؛ (۵۰) Encyclopaedia Religion and Ethics، تحت باب؛ (۵۱) Encyclopaedia Britannica، ۱۹۲۰ء، ۲ : ۹۲۸ ببعد؛ (۵۲) Hastings : Dictionary of Religions؛ (۵۳) مجلہ Ninetheenth Century and after، فروری ۱۹۱۵ء؛ (۵۴) مجلہ American Journal of Theology، جنوری ۱۹۰۲ء؛ (۵۵) مجلہ Bahi News، جو شکاگو سے ۱۹۱۰ء کو ہر انیس دن کے بعد نکلنا شروع ہوا۔ ایک دفعہ انگریزی میں اور دوسرا فارسی میں جس کا نام پہلے پیامبر باختر اور بعد میں نجم باختر تھا؛ (۵۶) New York Herald، ۱۹۰۰ء؛ (۵۷) The Babai Words، ۲۲ مجلدات از ۱۹۲۵ تا ۱۹۵۷ء؛ (۵۸) احمد کرمانی روحی: ہشت بہشت؛ (۵۹) رضا قلی خان: تتمۂ روضات الصفا؛ (۶۰) لسان الملک: ناسخ التواریخ؛ (۶۱) دائرة المعارف (عربی) مقالہ از سید جمال الدین؛ (۶۲) محمد مہدی خان: مفتاح باب الابواب، قاہرہ ۱۳۲۱ھ؛ (۶۳) حاجی عبدالرحمٰن: رجم الشیطٰن فی رذائل البیان، نورح ۱۸۹۲ء؛ (۶۴) اخبار کوکب ہند کے قائل جو پہلے آگرے اور پھر دہلی سے نکلتا تھا، مدیر محفوظ الحق علمی؛ (۶۵) بہائی میگزین، لاہور، مدیر محفوظ الحق علمی۔

(عبدالمنان عمر)

بہادر: یہ لفظ التائی زبانوں میں عام طور سے مروّج ہے اور ترکی، مغولی اور تنگز بولیوں میں بھی اتنا ہی عام ہے ۔ اس کے توصیفی معنی "شجاع اور بہادر" کے ہیں، لیکن یہ عام طور پر 'بطل' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ بسا اوقات اس کا استعمال خاندانی لقب یا اعزازی خطاب کے طور پر بھی ہوتا ہے ۔ یہ لفظ سب سے پہلے سوئی خاندان کی چینی تاریخ میں ملتا ہے، جو ساتویں صدی کے شروع میں لکھی گئی تھی ۔

چینی تحریر میں اس کی آواز mo. ho. to کی ہے ۔ جس سے تین جزئی لفظ Bayatur کا سراغ ملتا ہے، جو نویں صدی میں جدید بلغرون میں Bayaτoúp کی صورت میں لکھا جاتا ہے ۔ ایک اویغور رُونی (runic [قدیم سکنڈے نیوین حروف]) مخطوطے میں، جو آٹھویں سے دسویں صدی تک کا ہو سکتا ہے، باتُر bātur کا لفظ موجود ہے اور یہ دو جزئی صورت ترکی بولیوں میں بہت عام ہے، مثلاً عثمانی ترکی میں باتور (batur)، قازق اور باشکر (Bashkir) میں باتر (batir)، ازبک میں بتیر (botir)، تووِن میں ماذیر، چواش Chuvash میں پتار (Pattar) وغیرہ ۔ بعض ترکی بولیوں میں سہ جزئی صورتیں بھی موجود ہیں، مثلاً کومن میں بایاتور، لیکن قیاس کہتا ہے کہ وہ مغول بولی سے مستعار لی گئی ہیں ۔ مذکورۂ بالا شکل کے علاوہ ازبک میں بقودر baqqodir کی شکل بھی ملتی ہے ۔

اس لفظ کی توثیق قدیم ترین مغولی دستاویزات (تیرھویں صدی) سے ہوتی ہے، جہاں یہ ہمیشہ ایک سہ جزئی لفظ کی صورت میں لکھا جاتا ہے ۔ اگرچہ مغولی عہد کے چینی ماخذ اسے ہمیشہ bādu(r) کے بجائے pa-lu لکھتے ہیں ۔ کلاسیکی مغولی میں اس کی شکل بایاتور bayatur ہے اور اس کی مختلف بدلی ہوئی شکلیں قریب قریب سب بولیوں میں موجود ہیں، مثلاً قلموق میں باتُر bātr، جدید ادبی خلخہ میں بتار Bataar، منگور Monguor میں باتاور Bāt'ur ۔ تنگوزی Tunguz بولیوں میں سے مانچو Manchu میں اس کی شکل baturu ہے، اوِنکی Evenki میں بہاتِر bahatir اور اوِن Even میں باگتِر bagtir اور بکاتر bukatir.

یہ فیصلہ دشوار ہے کہ کونسا لفظ کس نے کس سے مستعار لیا، لیکن قیاس کہتا ہے کہ ترکی یا مغولی سہ جزئی شکلیں اصل تھیں اور تنگوزی شکلیں دراصل مغولی سے مستعار لیے ہوئے الفاظ ہیں ۔ ایک ہی گروہ کی بولیوں میں یہ باہمی لین دین ضرور عام طور سے ہوا ہوگا ۔

بہادر کا لفظ بدیہی طور پر تہذیب و تمدن کے عہد کا لفظ ہے ۔ اس نے زمانے میں دور تک سفر کیا اور ہمیں یہ سائبیریا اور یورپ کی متعدد زبانوں میں ملتا ہے، مثلاً اوستیاکی Ostiak میں مَتُر Matur اور ہنگری زبانوں میں hé ar (گیارھویں صدی)۔ یہ اور بعض سلاوی شکلیں، مثلاً روسی کا بوگاتیر bogatir ترکی یا مغولی سے مستعار ہے ۔ فارسی کا "بہادر" جو مغولی سے لیا گیا ہے مسلمان حکمران خاندانوں میں خطاب یا عرف کے طور پر کثرت سے استعمال ہوتا تھا، چونکہ یہ لفظ [پاک و ہند کے] عظیم مغلوں کے ہاں بھی کرائج تھا اس لیے انگریزی شہد میں بھی آ گیا اور ایسے مغرور اور نمایشی شخص کے معنی میں بولا جانے لگا جو اپنے عارضی اختیار کو اپنی برتری کے شدید احساس کے ساتھ استعمال کرتا ہو (Hobson-Jobson : Yule).

یہ لفظ مغربی یورپی ماخذ میں بھی داخل ہو گیا، چنانچہ وارد Varad کا پادری (canon) راجر Roger، ۱۲۴۴ء میں لکھتے ہوئے ایک مغول جرنیل کا نام بوختور Bochetor بتاتا ہے جس نے

ہنگری کے خلاف ایک مہم میں حصہ لیا تھا۔ تیمور کے دربار میں حکومت پرتگال کے سفیر کلاویژو Clavijo (۱۴۰۳ء) کے ہاں بہادر کا لفظ ہے۔

(D. SINOR)

- **بہادر خان**: رک بہ [فاروقی (خاندان)] بہادر شاہ۔

- **بہادر شاہ**: رک بہ نظام شاہی۔

- **بہادر شاہ اوّل**: محمد معظّم، اورنگ زیب عالمگیر کا دوسرا بیٹا، یہ اس کی دوسری بیوی رحمت النساء عرف نواب بائی، کے بطن سے تھا، جو راجوڑی (کشمیر) کے والی راجا راجُو کی بیٹی تھی۔ نواب بائی شاہزادۂ محمد سلطان کی بھی ماں تھی، جس کا انتقال ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء میں قید خانے میں ہوا اور بدرالنساء بیگم (۱۶۴۷ تا ۱۶۷۰ء) کی بھی جو حافظ قرآن تھی، اس کا انتقال ۱۶۹۱ء میں ہوا۔ معظّم ۳۰ رجب ۱۰۵۳ھ/۱۴ اکتوبر ۱۶۴۳ء کو برہان پور (حیدر آباد دکن) میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے پورے القاب یہ تھے: ابو نصر سیّد قطب الدین محمد شاہ عالم بہادر شاہ بادشاہ۔ ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء سے جب کہ اس کا بڑا بھائی اورنگ زیب کے خلاف شاہ شجاع سے جا ملا تھا اسے تخت و تاج کا وارث سمجھا جاتا، اور ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء میں محمد سلطان کی موت پر اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ شعبان ۱۰۸۶ھ/اکتوبر ۱۶۷۵ء میں اسے شاہ عالم کا خطاب ملا۔

۱۶۶۳ء کے بعد اس کے والد نے اسے دکن میں مامور کر دیا اور سلطنت بیجاپور کے خلاف مہم میں اس سے کام لیا۔ ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۳-۱۶۸۴ء میں وہ ایک لشکر کا سردار ہو کر کونکن کے راستے گوا گیا، جس کا مرہٹہ راجا شمبھا جی نے محاصرہ کر رکھا تھا، لیکن چونکہ اس کا پرتگیزوں سے بگاڑ ہو گیا لہٰذا اس کا سامان رسد وغیرہ کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اسے نہایت خراب و خستہ حالت میں مراجعت کرنا پڑی۔ اس کے بعد اسے بیجاپور اور گولکنڈے کے قطب شاہی خاندان کے خلاف مہم پر مامور کیا گیا۔ اورنگ زیب کا دل شاہزادۂ معظّم کی طرف سے صاف نہیں تھا اس لیے کہ اس نے اپنے بیٹے اکبر کی بغاوت پر غم و غُصہ کا اظہار نہیں کیا تھا لہٰذا اس نے شہزادہ معظّم اور گولکنڈے کے ابوالحسن کے درمیان مصالحت کی کوشش کو اپنے خلاف ایک سازش سے تعبیر کیا۔ معظم، جو اب شاہ عالم کے نام سے معروف تھا ۴ مارچ ۱۶۸۷ء کو مع اپنے بیٹوں کے گرفتار کر لیا گیا۔ شروع شروع میں تو اس کے ساتھ شدید سختی کی گئی، لیکن یہ سختی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی، یہاں تک کہ اپریل ۱۶۹۵ء میں اسے رہا کر کے آگرے کا صوبیدار مقرر کر دیا گیا۔ ۱۶۹۹ء میں اسے صوبۂ کابل کا والی بنا دیا گیا، اور اس منصب پر وہ اپنے باپ کی وفات تک فائز رہا۔ اس دوران میں اس کے بڑے بیٹے ٹھٹّے اور ملتان کے حاکم رہے۔

۱۸ ذی الحجّہ ۱۱۱۸ھ/۲۲ مارچ ۱۷۰۷ء کو اپنے باپ کی وفات کی خبر سن کر شاہزادۂ معظم بڑی تیزی سے دہلی کی طرف روانہ ہوا لاہور کے قریب پہنچ کر اس نے بہادر شاہ کا لقب اختیار کیا اور اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا، باپ کی وصیت کے احترام میں دکن کے صوبے اپنے بھائی اعظم شاہ کے سپرد کر دیے اور ۱۲ جون کو آگرے کے قریب پہنچا۔ ۱۸ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ/۱۸ جون ۱۷۰۷ء کو اعظم شاہ اور اس کا بیٹا بیدار بخت جاجو کے قریب ایک خونریز لڑائی میں مارے گئے، اور بہادر شاہ پوری سلطنت کا واحد مالک ہو گیا۔ اورنگ زیب کے سب سے چھوٹے بیٹے کام‌بخش نے ۳ ذوالقعدہ ۱۱۲۰ھ/۱۳ جنوری ۱۷۰۹ء کو حیدر آباد دکن کے قریب شکست کھائی اور مارا گیا۔

بہادر شاہ کے مختصر سے عہد حکومت میں

تین مسئلے اس کی الجھن اور پریشانی کا سبب بنے رہے: مرہٹوں کا مسئلہ، راجپوتوں کا مسئلہ اور سکھوں کا مسئلہ۔ ذوالفقار خان کے مشورے پر شیواجی کے پوتے شاہو کو رہا کر دیا گیا اور اسے هفت هزاری کا مغل منصب دے کر مہاراشٹرا واپس بھیج دیا گیا۔ اس کے وہاں پہنچتے ہی اس کے اور اس کے چچا راجہ رام کی بیوہ تارابائی کے حامیوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

۱۷۰۷-۱۷۰۸ء کی سردیوں میں بہادر شاہ نے امبر کے سلسلۂ جانشینی کو مرتب و منظم کر دیا اور جودھ پور کے راجپوت راجہ کو اپنا مطیع بنا لیا۔ لیکن کام بخش کے خلاف مہم جاری تھی کہ بغاوت کی آگ پھر بھڑک اٹھی۔ ۱۷۱۰ء میں واپسی پر بادشاہ کو سکھوں کی بغاوت سے دو چار ہونا پڑا، چنانچہ وہ راجپوتوں سے مصالحت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ آخری سکھ گورو، گوبند سنگھ، بہادر شاہ کا معاون تھا، لیکن وہ ۱۷۰۸ء میں دکن میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد شمال میں بندا نامی ایک شخص نے سکھوں کی بغاوت کو از سر نو زندہ کر دیا۔ اس نے وزیر خان کو قتل کر کے سرهند پر قبضہ کر لیا اور مشرقی پنجاب میں تہلکہ مچا دیا۔ بہادر شاہ نے لوہگڑھ پر دھاوا بول دیا اور ۱۷۱۰-۱۷۱۲ء میں بندا کو شکست دی، لیکن اسے گرفتار نہیں کر سکا۔ زندگی کے آخری چند مہینے لاہور میں گزار کر بالآخر ۲۰ محرم الحرام ۱۱۲۴ھ/ ۲۷ فروری ۱۷۱۲ء کو اس نے یہیں وفات پائی۔ اس کے مرتے ہی اس کے چاروں بیٹوں، معزالدین جہاندار شاہ، عظیم الشان، رفیع الشان اور جہان شاہ میں تخت کے لیے لڑائی شروع ہوئی جس میں بالآخر معزالدین کو کامیابی ہوئی۔

اروِن Irvine بہادر شاہ کے متعلق لکھتا ہے: ''گرچہ وہ بہت بڑا بادشاہ نہ تھا . . . لیکن خاصا کامیاب تھا''۔ وہ خلیق، عالم و فاضل، پرہیزگار، بہادر اور متحمل مزاج انسان تھا۔ وہ فیاض بھی تھا اور کسی کی درخواست کو رد کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اپنی اس عادت کی وجہ سے وہ ''بے خبر'' یا بے پروا کہلاتا تھا۔ بہادر شاہ کی گھریلو زندگی کا زیادہ حال معلوم نہیں، البتہ یہ ضرور معلوم ہے کہ اس کی تین بیویاں تھیں: مہرالنّساء بیگم، جو اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ دہلی آئی؛ عزیزالنساء خانم اور نورالنّساء بیگم۔

مآخذ: (۱) عبدالحمید لاهوری: پادشاہ نامہ (در Bibliotheca Indica، کلکتہ ۱۸۶۸ء)؛ (۲) محمد ساقی مستعد خان: مآثر عالمگیری (در Bibliotheca Indica، کلکتہ ۱۸۷۱ء)؛ (۳) دانشمند خان علی: جنگ نامہ، مطبوعۂ نولکشور، چاپ سنگی؛ (۴) دانشمند خان: بہادر شاہنامہ، موزۂ بریطانیہ، مخطوطہ، عدد ۲۴ .Or؛ (۵) بھیم سین: دلکشا، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد ۲۳ .Or؛ (۶) کام راج: اعظم الحرب، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد Or. ۱۸۹۹؛ (۷) جگجیونداس: منتخب التواریخ، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد ۲۶، ۲۵۳؛ (۸) ارادت خان واضح: Memoirs، (در Jonathan Scott: History of the Deccan، جلد دوم، حصۂ چہارم (۱۷۹۴ء)؛ (۹) محمد قاسم لاهوری: عبرت نامہ، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد ۱۹۳۳ .Or؛ (۱۰) کامور خان: تذکرۂ سلاطین جغتائی، جلد دوم، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، مخطوطہ، عدد ۷۹؛ (۱۱) خافی خان: منتخب اللباب، (در Bibliotheca Indica)؛ (۱۲) خوشحال چند: نادر الزمانی (در Königliche Bibliothek)، برلن، مخطوطہ عدد ۴۹۵؛ (۱۳) محمد علی خان: تاریخ مظفری، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد ۴۶۶ .Or؛ (۱۴) وارد، محمد شفیع: مرآت واردات، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد ۶۵۷۹ .Add؛ (۱۵) W. Irvine: *The Later*

Mughals، جلد ۱، کلکتہ ۱۹۲۲ء؛ (۱۵) J. Sarkar: *History of Aurangzib*، جلد چہارم، بار دوم، کلکتہ ۱۹۲۰ء؛ (۱٦) *The Cambridge History of India*، جلد چہارم، باب نہم، کیمبرج ۱۹۳۷ء.

(T. G. P. SPEAR)

بہادر شاہ ثانی: ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی، ہندوستان کا آخری تاجدار، ۲۷ شعبان ۱۱۸۹ھ / ۲۳ اکتوبر ۱۷۷۵ء کو دہلی میں پیدا ہوا اور ۱۳ جمادی الاولی ۱۲۷۹ھ / ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو نظر بندی کی حالت میں رنگون میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوا۔ وہ اکبر شاہ ثانی (۱۲۲۱ھ/۱۸۰٦ء تا ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء) اور لال بائی کا دوسرا بیٹا تھا۔ اس کا سلسلۂ نسب گیارھویں پشت میں جا کر شہنشاہ بابر سے ملتا ہے.

وہ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء کو قلعۂ دہلی میں تخت نشین ہوا اور ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء تک برائے نام بادشاہ رہا۔ اس زمانے میں اس کی حیثیت در حقیقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے وظیفہ‌خوار کی سی تھی اور اس کا اقتدار محض لال قلعے یا قلعۂ معلی دہلی کی چار دیواری کے اندر تک محدود تھا۔ بہادر شاہ کے قبضے میں اس وقت لال قلعے کے علاوہ کچھ خالصہ جاگیریں اور شہر میں چند مکانات تھے، جن کی مجموعی آمدنی ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ تھی اور ایک لاکھ روپیہ ماھانہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے بطور وظیفہ ملتا تھا۔ انگریز اس مغل اقتدار سے، جس کی بنا پر انھوں نے ۱۷٦۵ء کے بعد سے بنگال پر قبضہ جمائے رکھا، باقاعدہ طور پر کبھی منکر نہیں ہوے، لیکن ۱۸۳۳ء کے چارٹر ایکٹ کی رو سے مقبوضہ علاقوں پر ان کی حکمرانی مسلّم ہو گئی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلے ہی سے اپنے سکّے جاری کر رکھے تھے، جن میں بادشاہ کا نام شامل نہ تھا۔ گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی جانب سے نذروں کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ ۱۸۵۰ء میں لارڈ ایلنبرا نے ایجنٹ کی جانب سے بھی نذر کی ممانعت کر دی۔ بادشاہ کے احتجاج پر نذر کے عوض آٹھ سو تینتیس روپے ماھوار ملنے لگے۔ بہادر شاہ نے اپنے وظیفے میں اضافے کے لیے جد و جہد کی، مگر کمپنی اس شرط پر اضافہ کرنے پر تیار تھی کہ وہ بادشاہ کا لقب ترک کر دے اور قلعے کے باھر ایک وظیفہ خوار شہری کی حیثیت سے رہنے لگے۔ بادشاہ کا حلقۂ اقتدار گو لال قلعے تک ھی محدود تھا (جس میں شاھی خاندان اور متعلقین و متوسلین آباد تھے اور جن کی مجموعی تعداد ۱۸۴۸ء میں ۲۱۰۴ تھی)، لیکن اس نے یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا۔ بایں همه بادشاہ اپنے درباریوں کو خطابات سے سرفراز کیا کرتا تھا.

منجملہ اور معاملات کے ولی عہد کے معاملے میں بھی بادشاہ اور انگریزوں کے درمیان شکر رنجی پیدا ہو گئی۔ دارابخت اور شاہرخ کے انتقال کے بعد بہادر شاہ اپنے چھوٹے بیٹے جواں بخت کو ولی عہد بنانا چاھتا تھا، مگر انگریز پہلے مرزا فخرالدین کو، پھر اس کے انتقال (۱۱ جولائی ۱۸۵٦ء) پر محمد قویش شکوہ کو ولی عہد بنانا چاھتے تھے، اس لیے کہ ان دونوں شہزادوں کو بجائے بادشاہ کے شہزادے کا لقب اختیار کر کے قلعے سے باھر قطب صاحب کے نزدیک بہادر شاہ کے بنوائے ہوے محل میں رہنا منظور تھا۔ بالآخر انگریزوں نے اس جھگڑے کو بادشاہ کے مرنے تک معرضِ التوا میں رکھنا مناسب سمجھا۔ اسی سال افواہ اڑی کہ بادشاہ نے پیرزادہ حسن عسکری شیعی کے اثر سے مذھب تبدیل کیا ہے اور شاہ ایران سے مدد کی درخواست کی ہے۔ مارچ ۱۸۵۷ء میں دہلی کی جامع مسجد کے دروازے پر لوگوں نے ایک اشتہار چسپاں دیکھا کہ ایرانی فوج اعانت کے لیے پہنچ رہی ہے.

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی ہندوستانی فوج نے، جو انگریزوں کی ملازمت میں تھی، انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے علمِ آزادی بلند کیا اور حریت پسند اپنے انگریز افسروں کو تہ تیغ کرنے کے بعد دہلی چلے آئے اور بادشاہ کو اپنا سربراہ بنا کر انگریزوں سے معرکہ آرا ہونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ بادشاہ انگریزوں کی روزافزوں دست درازی سے نالاں تھا اور اسے معلوم تھا کہ شاہ عالم ثانی سے انگریزوں کا جو عہد نامہ اس برائے نام بادشاہت کے لیے ہوا تھا، وہ اس کے انتقال کے بعد کالعدم کر دیا جائے گا؛ چنانچہ تیموری خاندان کی عظمت پارینہ کے احیا اور ہندوستان کو غیر ملکی استیلا سے بچانے کے لیے بہادر شاہ ظفر نے حریت پسندوں کی سرپرستی قبول کر لی اور ہندوستان کے تمام رؤسا اور والیانِ ریاست کو دعوت دی کہ وہ غیر ملکی حکمرانوں کو ملک بدر کرنے کے لیے متحدہ اقدام کے لیے تیار ہو جائیں اور باہمی اختلافات کا فیصلہ ملک کی آزادی کے حصول تک ملتوی کر دیں۔ بعض زمینداروں اور رئیسوں نے یہ دعوت قبول کر لی، لیکن بعض نے انکار کر دیا اور آزادیِ ہند کی جنگ میں بہادر شاہ ظفر اور اس کے حلیفوں کا ساتھ نہ دیا۔ مؤخرالذکر جماعت میں مشرقی پنجاب کے سکھ والیانِ ریاست، یعنی پٹیالہ، نابھہ اور جیند کے حکمران، بھی شامل تھے، جنھوں نے مغلیہ سلطنت کی آخری نشانی کو ختم کرنے اور ہندوستان کو غیر ملکی استعمار کے حوالے کرنے کے لیے انگریزوں کی ہر ممکن امداد کی۔ اگرچہ بہادر شاہ کی بادشاہت کا دہلی میں اعلان ہو چکا تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حریت پسند لشکریوں پر اس کا پورا قابو نہ تھا۔ یہ فوج نوجوان شہزادوں اور بالخصوص مرزا مغل کے زیر اثر تھی؛ چنانچہ دہلی میں انگریزوں کو لوٹنے اور قتل کرنے کے جو واقعات رونما ہوئے انہیں بادشاہ پسند نہ کرتا تھا۔ دہلی میں حریت پسند فوجوں نے انگریزوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، مگر غداروں کی وطن فروشی کے سبب ان کی کوئی پیش نہ گئی۔ دہلی کے مسلمان جرنلوں میں جنرل بخت خاں قابلِ ذکر ہے۔ یہ شخص بہادر تھا اور انگریزی فوج کا سابق رکن ہونے کے سبب جدید اسلوبِ حرب سے واقف تھا۔ آخرکار ۲ ستمبر کو انگریزی فوج حریت پسندوں کو شکست دینے کے بعد دہلی پر قابض ہوئی تو بخت خاں فرار ہوا، لیکن مرزا الٰہی بخش کے بہکانے پر بہادر شاہ نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ مرزا الٰہی بخش شاہی خاندان کا فرد تھا، لیکن انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ اس نے بادشاہ کو بخت خان کے ہمراہ جانے سے اس لیے روکا کہ وہ آسانی سے گرفتار کر لیا جائے اور جنگِ آزادی کا جلد خاتمہ ہو جائے، ورنہ بخت خان بادشاہ کے نام پر مدت تک جنگ جاری رکھ سکتا تھا۔ بادشاہ نے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی۔ انگریز میجر ہڈسن نے اطلاع پا کر مقبرے کا محاصرہ کر لیا۔ ۲۲ ستمبر کو بادشاہ نے جان بخشی کے وعدے پر اپنے آپ کو ہڈسن کے حوالے کر دیا۔ بادشاہ، اس کے چہیتے فرزند مرزا جواں بخت اور زینت محل کی جان تو بچ گئی، لیکن ہڈسن نے باقی شہزادوں کو قتل کر دیا۔

سر جان لارنس نے بادشاہ کو ایک برس تک ذلت و خواری کے ساتھ قید رکھا، بوڑھے بادشاہ کی خدمت کے لیے بجائے دس کے صرف دو ہی ملازموں کی اجازت دی اور اس کے اور زینت محل کے رہنے کے لیے دو کمروں سے زیادہ نہ دیے۔

۱۸۵۸ء میں لارنس نے ناحق بادشاہ پر بغاوت کا مقدمہ چلایا۔ الزامات یہ لگائے گئے کہ اس نے حریت پسند (یا بعض مؤرخوں کے بقول باغی) بخت خان کی اعانت کی، جنگ آزادی (یا بقول بعض مؤرخین

بغاوت) میں مرزا مغل کی مدد کی؛ انگریزی حکومت کے خلاف اپنی بادشاہی کا اعلان کیا اور یہ کہ وہ انچاس فرنگیوں کے قتل کا ذمے دار ہے، جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ الزامات تو غلط تھے ہی، لیکن بالفرض صحیح بھی ہوتے تو بہادر شاہ کی حیثیت بادشاہ کی تھی اور کسی قاعدے یا معاهدے کی رو سے وہ انگریزی عدالت کے سامنے جواب‌دہ نہ تھا۔ ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء سے ۷ مارچ ۱۸۵۸ء تک مقدمہ چلتا رہا اور بالآخر ۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو اسے قید کرکے رنگون بھجوا دیا گیا۔ بادشاہ کے ساتھ دو بیویوں، دو بیٹوں مع جواں‌بخت اور چند متعلقین و متوسلین نے بھی جلا وطنی اختیار کی۔ شاہزادوں کی اولاد میں کچھ لوگ اب تک وہاں موجود ہیں.

مؤرخوں کا بالاتفاق بیان ہے کہ مغل بادشاہوں میں بہادر شاہ نہایت مہذب، شائستہ اور نیک تھا۔ ۱۸۳۲ء میں چارلس مٹکاف Metcalf نے، جو اس وقت دہلی میں ریذیڈنٹ تھا، اس کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ''وہ شہزادوں میں سب سے زیادہ قابلِ احترام اور سب سے زیادہ لائق شہزادہ ہے''۔ اس کے دربار کی تہذیب سارے ملک کے لیے نمونہ سمجھی جاتی تھی۔ بےتعصبی کے سبب وہ ہر قوم و ملت کے لوگوں میں ہر دلعزیز تھا.

بہادر شاہ کا قد لمبا اور بدن چھریرا تھا؛ رنگ سانولا اور چہرے کے نقوش انتہائی نمایاں اور تیکھے تھے۔ اپنے دادا شاہ عالم کی طرح وہ اچھا شاعر تھا اور ظفر تخلص کرتا تھا۔ شاعری میں اس کے استاد محمد ابراہیم ذوق تھے اور میرزا غالب اس کے درباریوں میں سے تھے۔ اس کی پر سوز غزلیں مدتوں زبان زد خلائق رہیں اور اب تک ہیں۔ وہ اعلیٰ درجے کا خطاط اور ماہرِ موسیقی بھی تھا اور عمارتوں کی تعمیر اور باغوں کی ترتیب میں اس کا مذاق مانجھا ہوا تھا۔ دربار کے روزنامچے سے ظاہر ہے کہ اکثر اس کا سارا دن لکھنے پڑھنے اور تلاوت قرآن مجید میں گزرتا تھا۔ اس کی تصانیف میں شرح گلستان اور اردو کے چار دیوان اب تک مقبول ہیں.

مآخذ: (۱) Parliamentary Returns، عدد ۱۲۲، متعلقۂ سال ۱۸۵۹ء ایسٹ انڈیا کمپنی (شاہ دہلی)؛ (۲) شہادت، جو شاہ دہلی کے مقدمے کے سلسلے میں اس عدالت میں دی گئی جو اس مقدمے کی سماعت کے لیے مقرر کی گئی تھی، لنڈن ۱۸۸۹ء؛ (۳) J.W. Kaye و G. B. Malleson: *History of the Indian Mutiny*، مرتبۂ ۱۸۹۷ء، جلد ۲ و ۳؛ (۴) M. Garcin de Tassy: *Histoire de la litterature Hindouie et Hindoustanie*، پیرس ۱۸۷۱ء، ۳: ۳۱۷ ببعد؛ (۵) سکسینہ R.B. Saksena: *History of Urdu Literature*، الہ آباد ۱۹۲۷ء، ص ۹۹ تا ۹۷؛ (۶) T.G.P. Spear: *Twilight of the Mughuls*، کیمبرج ۱۹۵۱ء؛ (۷) H.L.O Garrett: *The Trial of Muhammad Bahadur Shah*، لاہور ۱۹۳۲ء؛ (۸) امیر احمد علوی: بہادر شاہ ظفر، لکھنؤ ۱۹۵۵ء؛ (۹) عشرت رحمانی: بہادر شاہ ظفر، لاہور ۱۹۵۸ء؛ (۱۰) بہادر شاہ کا مقدمہ (بہادر شاہ ظفر کے مقدمے کی کارروائی کا اردو ترجمہ)، دہلی ۱۹۲۰ء؛ (۱۱) H.G. Keene: *History of India*، ایڈنبرا ۱۹۱۰ء، ۲: ۲۲۹ و بمواضع کثیرہ؛ (۱۲) رئیس احمد جعفری: بہادر شاہ ظفر، لاہور بدون تاریخ؛ (۱۳) وو، بذیل مادۂ بہادر شاہ ثانی؛ (۱۴) J.W. Kaye: *A History of the Sepoy war in India* (۱۸۵۷ تا ۱۸۵۸ء)، ج ۲، لنڈن ۱۸۷۰ء؛ (۱۵) *Two Historic Trials in Red fort*، طبع موتی رام، دہلی ۱۹۴۶ء، ص ۲۸۸ تا ۳۲۲؛ (۱۶) منشی فیض الدین دہلوی: بزم آخر، دہلی ۱۹۶۵ء؛ (۱۷) ایڈورڈ ٹامسن Edward Thomson: *The other side of the Medal*، اردو ترجمہ: انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ، از

شیخ حسام الدین؛ (۱۸) سیّد احمد خان: آثار الصنادید، مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء؛ (۱۹) عرشی تیموری: قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں، دہلی حدود ۱۹۳۷ء؛ (۲۰) امیر احمد علوی: بہادر شاہ ظفر، لکھنؤ ۱۹۵۵ء؛ (۲۱) سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی: داستانِ غدر، لاہور (۲۲) خواجہ حسن نظامی: دہلی کی جان کنی، دہلی ۱۹۲۳ء؛ (۲۳) وہی مصنّف: غدر کے اخبار، دہلی ۱۹۳۰ء؛ (۲۴) بہادر شاہ کا روز نامچہ، مرتبۂ خواجہ حسن نظامی، دہلی ۱۹۳۰ء؛ (۲۵) میاں محمد شفیع، ۱۸۵۷ء؛ (۲۶) فغانِ دہلی (= آشوب دہلی (نظموں کا مجموعہ)).

(حسن عسکری و [ادارہ])

• **بہادر شاہ گجراتی**: گجرات کا سلطان (۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء تا ۹۴۳ھ/۱۵۳۷ء)۔ وہ مظفر شاہ ثانی (۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء تا ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء) کا دوسرا بیٹا تھا۔ اپنے بڑے بھائی سکندر سے اس کی لڑائی تھی، اس لیے اس نے ۹۳۱ھ/۱۵۲۵ء میں گجرات کو خیرباد کہا اور چتوڑ اور میوات سے ہوتا ہوا ابراہیم لودھی کے دربار میں پہنچا اور سلطانِ دہلی اور بابر کے درمیان پانی پت کی جو لڑائی ہوئی اس میں ایک تماشائی کی حیثیت سے موجود تھا۔

اپنے باپ کی موت اور سکندر کے تخت نشین ہونے کی اطلاع ملتے ہی بہادر شاہ نے تیزی سے گجرات کا رخ کیا اور جب وہ چتوڑ پہنچا تو اس نے یہ خبر سنی کہ سکندر کو خوش قدم عمادالملک نے قتل کر دیا ہے، اس نے تیزی سے گجرات کے مسلمان سرداروں کی مدد حاصل کر کے ۲۶ رمضان المبارک ۹۳۲ھ/۶ جولائی ۱۵۲۶ء کو انہلواڑہ پٹن کے مقام پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

بہادر شاہ آزاد و خود مختار گجرات کا آخری طاقتور تاجدار تھا۔ ۹۳۵ھ/۱۵۲۸ء میں اس نے خاندیش کے محمد ثانی اور برار کے علاءالدین عمادالملک سے مل کر احمدنگر کے بُرہان نظام شاہ پر حملہ کر دیا اور ۹۳۶ھ/۱۵۲۹ء میں احمدنگر پر قبضہ کر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظام شاہ نے کم از کم ۹۳۸-۹۳۹ھ/۱۵۳۲ء تک گجرات کا تفوق و اقتدار تسلیم کر لیا تھا، لیکن عربی اور فارسی کی تاریخوں کے ان بیانات کی تصدیق برآمد شدہ سکّوں سے نہیں ہوتی کہ وہ گجرات کے سلطان کے نام کا خطبہ پڑھواتا تھا اور اس کے نام کے سکّے جاری کیے تھے۔

۹۳۷ھ/۱۵۳۰-۱۵۳۱ء میں بہادر شاہ نے مالوے کے محمود ثانی پر حملہ کر کے منڈو پر قبضہ کر لیا۔ ۹۳۸ھ/۱۵۳۱-۱۵۳۲ء میں اس نے اجّین، بھیلسا اور رایسین کے راجپوت قلعوں پر قبضہ کر لیا اور ان کے سردار سلہادی کو گرفتار کر لیا۔ رمضان المبارک ۹۴۱ھ/ مارچ ۱۵۳۵ء میں گجرات کی فوجوں نے دوسرے حملے میں چتوڑ پر قبضہ کر لیا۔

اسی دوران میں، یعنی ۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء کے موسم خزاں میں، بہادر شاہ اور مغل بادشاہ ہمایوں کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی تھی۔ بہادر شاہ نے لودھی افغانوں اور بابر کے داماد محمد زمان میرزا کو، جو ہمایوں کی اسیری میں سے قلعۂ بیانہ سے فرار ہو گیا تھا، اپنے پاس پناہ دی تھی۔

اسے منداسور اور منڈو کے مقامات پر مغلوں کے ہاتھوں شکست ہوئی اور صفر ۹۴۲ھ/ اگست ۱۵۳۵ء میں چمپانیر کی تسخیر کے بعد ہمایوں نے اس کے بہت سے خزانے پر قبضہ کر لیا تو بہادر شاہ نے پرتگیزوں سے مدد مانگی۔

۹۳۷ھ/۱۵۳۱ء میں پرتگیزی گوا کے گورنر Nuno da Cunha کے زیر قیادت دیو Diw کو فتح کرنے کی کوشش میں شکست کھا چکے تھے۔ تاہم جمادی الآخرہ ۹۴۱ھ/ دسمبر ۱۵۳۴ء میں پرتگیزوں کو مغلوں کے خلاف بہادر شاہ کی

مدد کرنے کے وعدے پر قلعۂ سین مل گیا اور اکتوبر ۱۵۳۵ء میں انھیں دیو کے اس مقام پر جہاں خود بہادر شاہ نے پناہ لی تھی قلعہ بنانے کی اجازت مل گئی۔ گجرات کے بادشاہ کو پرتگیزوں سے جو برائے نام اعانت ملی اس کے باوجود ہمایوں نے بہادر شاہ کے دارالسلطنت احمد آباد پر قبضہ کر لیا۔

۹۴۲ھ / ۱۵۳۶ء میں ہمایوں نے شیر شاہ کے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے گجرات سے مراجعت کی تو بہادر شاہ کو اس کا موقع مل گیا کہ وہ مغل فوجوں سے، جو اب غیر متحد، منتشر اور غیر مؤثر تھیں، اپنی سلطنت کے اکثر حصّے واپس لے لیے۔

اس کے بعد بہادر شاہ نے اپنی توجہ پرتگیزوں سے ان حقوق کے واپس لینے کی طرف مبذول کی جو وہ انھیں دیو میں دے چکا تھا۔ ایک ایسی فضا میں جو باہمی بد اعتمادی اور بے وفائی سے معمور تھی بہادر شاہ بلا سوچے سمجھے Nuno da Cunha سے ملنے اس کے جہاز پر چلا گیا۔ وہاں اس نے غدّاری اور بے وفائی کا رنگ دیکھا تو الٹے پاؤں لوٹا، لیکن پرتگالی فوجوں نے اس کا پیچھا کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس نے ۳ رمضان ۹۴۳ھ / ۱۳ فروری ۱۵۳۷ء کو وفات پائی۔

مآخذ: (۱) فرشتہ، ۲: ۲۰۳ تا ۲۱۲، ۴: ۱۳۱ تا ۱۴۷، ۲۳۰ تا ۲۴۴؛ (۲) ابوالفضل: اکبر نامہ، ۱: ۱۲۶ تا ۲۳۱؛ (۳) عبداللہ محمد بن عمر المکی الآصفی الغ خانی: ظفر الوالہ بمظفر و آلہ، ۳ جلد، طبع E. D. Ross، لنڈن ۱۹۱۰ - ۱۹۲۸ء، ج ۳ بمدد اشاریہ؛ (۴) سکندر بن محمد منجھو: مرآۃ سکندری، بمبئی (چاپ سنگی) ۱۸۹۰ء، ص ۱۸۸ تا ۲۵۹؛ (۵) میر ابو تراب ولی: تاریخ گجرات، طبع راس E. D. Ross، کلکتہ ۱۹۰۹ء، ص ۱ تا ۳۰؛ (۶) نظام الدین احمد: طبقات اکبری، ۳، کلکتہ ۱۹۳۱ - ۱۹۳۵ء، ۳: ۱۰۹ تا ۲۳۳؛ (۷) علی بن عزیز اللہ طباطبا: برہان مآثر، حیدر آباد (مطبوعۂ دہلی) ۱۹۳۶ء، ص ۲۰۶ تا ۲۸۱؛ (۸) حاجی خلیفہ: تحفۃ الکبار فی اسفار البحار، مترجمۂ J. Mitchell، لنڈن ۱۸۳۱ء، ص ۵۹ تا ۶۶؛ (۹) Gaspar Correa: *Lendas da India*، چار جلد، لزبن ۱۸۵۸ - ۱۸۶۴ء، بمدد اشاریہ، ۱۰، بذیل Badur (Soltão, rei de Cambaya)؛ (۱۰) Fernão Lopez de Castanheda: *Historia do descomirimento e conquista du India pelos Portuguezes*، لزبن ۱۸۳۳ء، کتاب ۸، ابواب ۶۲ تا ۶۳، ص ۹۶ تا ۱۸۵، باب ۶۷، ص ۱۸۰، باب ۸۳، ص ۲۰۳، باب ۹۳ تا ۱۰۲، ص ۲۲۹ تا ۲۳۶، باب ۱۲۱، ص ۲۸۵، باب ۱۵۱ - ۱۵۳، ص ۳۴۹ تا ۳۵۷، باب ۱۶۳ تا ۱۶۵، ص ۳۸۳ تا ۳۹۰؛ (۱۱) Joao de Barros: *Decadas da Sua Asia*، لزبن ۱۷۷۷ - ۱۷۷۸ء، بمدد اشاریہ، بذیل Badur Chan ou Soltão Badur، ص ۳۶؛ (۱۲) Diogo de Couto: *Da Asia*، لزبن ۱۷۷۹ - ۱۷۸۸ء، بمدد اشاریہ، بذیل (Soltão) Badur، ص ۴۷؛ (۱۳) بمبئی گزیٹیر (گجرات) (بمبئی ۱۸۹۶ء)، ص ۱/۱: ۳۴۷ بعد؛ (۱۴) M. S. Commissariat: *History of Gujarat*، ج ۱، ۱۹۳۸ء۔ اس کی اس سفارت کے بارے میں جو اس نے ۱۵۳۶ء میں بودھی شہزادہ برہان بیگ کی معیت میں استانبول بھیجی تھی دیکھیے: (۱۵) Hammer-Purgstall، بار دوم، ۲: ۱۰۵ تا ۱۰۷؛ [(۱۶) S. K. Banerji: *Humāyūn Bādshāh*، ج ۱، لکھنؤ ۱۹۳۸ء، بمدد اشاریہ].

(P. HARDY)

بہار: رکّ بہ تکّین.

بہار: ہندوستان (بھارت) کا ایک صوبہ، جو ۲۳ درجے ۴۸ دقیقے اور ۲۷ درجے ۳۱ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۸۳ درجے ۲۰ دقیقے اور ۸۸ درجے ۳۲ دقیقے طول بلد شرقی کے درمیان واقع ہے۔ اس کے مغرب میں اتر پردیش، شمال میں نیپال، مشرقی میں

بنگال اور مشرقی پاکستان اور جنوب میں اڑیسہ ہے۔ اس کا رقبہ چوٹا ناگپور کو ملا کر ۶۷،۱۶۳ مربع میل اور آبادی تین کروڑ ستاسی لاکھ چوراسی ہزار ہے۔ ہندو اکثریت کی بولیاں، بھوج پوری، میتھلی اور ماگھی "بہاری" کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ اور وہ بہ نسبت ہندی کے بنگال سے زیادہ قریب ہیں۔ [مسلمانوں کی زبان اردو ہے۔ بہار میں اردو ادب کو بڑی ترقی ہوئی؛ دیکھیے اختر اورینوی: بہار میں اردو ادب کا ارتقا] لیکن انتظامی کاروبار اور تعلیم کی سرکاری زبان ہندی ہے۔ آج کل اس علاقے کی اقتصادی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے، اس لیے کہ اس میں کوئلے کی کانیں اور لوہے کے بڑے بڑے صنعتی کارخانے ہیں۔

[بہار کو دورِ اسلامی میں علمی و ثقافتی لحاظ سے ایک مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس کے علمی مراکز اور مدارس کے لیے دیکھیے: سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی؛ مناظر احسن گیلانی: ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، ندوۃ المصنفین، حیدر آباد دکن ۱۹۴۳ء؛ ابویحییٰ امام خان: علمائے حدیث ہند].

اس صوبے کا نام شہر بہار کے نام سے موسوم ہوا، گو خود یہ شہر، جس کے ارد گرد بدھ مت کی خانقاہیں (سنسکرت Vihara) تھیں، آج کل کسی اہمیت کا مالک نہیں رہا۔ یہ سارا صوبہ انگریزوں کے زمانے میں ۱۷۶۵ء سے بنگال کے لفٹیننٹ گورنر کے علاقے میں رہا۔ اس کے بعد انتظامی حیثیت سے اڑیسہ [رک باں] سے اس کا الحاق کر دیا گیا۔ اب ایک الگ مستقل صوبہ ہے۔ بہار کے صوبے کی حدود اربعہ حال ہی میں نئے سرے سے مقرر کی گئی ہیں۔ اس کی آزادانہ حیثیت کا فقدان اس کے محلِ وقوع کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج کی ابتدا ہی سے اس کی یہی حالت رہی اور اس کی تاریخ یہاں کے انفرادی صوبےداروں اور شہروں کی تاریخ ہے، جس میں موروثی خانوادوں یا بڑے علاقوں کا ذکر نہیں آتا، مثلاً مونگھیر اختیارالدین محمد ابن بختیار خلجی کی بہار پر تاختوں کے دوران میں ۵۸۹ھ / ۱۱۹۳ء میں فتح کیا گیا اور وہ قطب الدین ایبک سلطانِ دہلی کے زیرِ سیادت اسی اختیارالدین کے قبضے میں رہا۔ ۷۳۰ھ / ۱۳۳۰ء میں محمد بن تغلق نے اسے دہلی میں شامل کر لیا۔ ۷۹۹ھ / ۱۳۹۷ء میں یہ جون پور سے ملحق ہوا۔ ۸۹۳ھ / ۱۴۸۸ء میں سکندر لودھی کے حملے کے بعد پھر دہلی میں شامل کر لیا گیا اور کچھ مدت بعد، جب تک کہ بنگال پر مغلوں کا تسلّط نہ ہوا، یہ شاہانِ بنگال کے قبضے میں رہا۔ ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں بہار کے کچھ حصّوں کو انتظامی وحدت کی حیثیت حاصل رہی ہے (۶۲۲ھ / ۱۲۲۵ء میں شمس الدین التتمش نے بہار میں ایک صوبےدار مقرر کر دیا تھا)۔ اکبری عہد میں ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء میں یہ ایک صوبہ قرار دیا گیا، جس میں آٹھ "سرکاریں" تھیں اور یہ صوبۂ بنگال کے ماتحت تھا۔ اس کا صدر مقام شہر بہار ہی رہا، یہاں تک کہ شیر شاہ نے نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی میں اس کے بدلے پٹنہ مقرر کیا۔ یہ علاقہ سلطنت مغلیہ بننے سے قبل اودھ اور بنگال کے درمیان حدِّ فاصل کا کام دیتا تھا، لیکن جب مغل آئے تو اسے اودھ اور بنگال کے درمیان ذریعۂ مواصلات ہونے کی اہمیت حاصل ہو گئی، جیسے مغلیہ نائبانِ شاہ کے بنائے ہوئے بہت سے نفیس پل ثابت کر رہے ہیں۔

یادگار عمارتیں: ہندوستان کے اسلامی فنِ تعمیر میں کوئی خاص بہاری طرز نہیں ہے۔ سب سے زیادہ نفیس عمارتوں کا مجموعہ سہسرام میں ہے، جن میں شیر شاہ کا مقبرہ بجا طور پر

شہرۂ آفاق ہے (کتبہ ۹۵۲ھ / ۱۵۴۵ء)۔ یہ ایک عظیم مصنوعی جھیل کے بیچ میں پچاس میٹر بلند کھڑا ہے۔ اس کا معمار علی‌وال خان دہلی کے لودھیوں کے عہد حکومت میں بہت بڑا ماہر تعمیرات تھا، مگر اس نے جو کاریگری اس مثمن مقبرے کے بنانے میں دکھائی وہ لودیوں کے عمارتی تصوّرات سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ شیر شاہ نے رھتاس گڑھ کا قلعہ اس کے ہندو راجا سے ۹۴۶ھ / ۱۵۳۹ء میں لیا اور جامع مسجد کی تعمیر شیر شاہ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ قلعے کے دوبارہ تعمیر شدہ استحکامات، محلات، حبشی خان کا مقبرہ اور مسجد وغیرہ سب اکبر کے نائب السلطنت راجا مان سنگھ کی عملداری کے زمانے (۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء تا ۱۰۰۸ھ / ۱۶۰۰ء) میں تعمیر ہوئے۔ راج محل کے قریب ہدف کی مسجد بھی راجا مان سنگھ سے منسوب ہے۔ طویل اسطوانی محراب، جو اس قدیم مغلیہ عمارات کے "ایوان" کے باہر نکلے ہوئے اس کے وسطی دالان میں عرضاً وسطی حصے کو کاٹتی ہوئی جاتی ہے، جونپور [رک بآں] کے طرز کی یاد دلاتی ہے۔ مونگھیر کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ پران کے قلعے کی نسبت مشہور ہے کہ بنگال کے بادشاہوں نے بنایا تھا، لیکن اس کا طرزِ تعمیر مغلوں کا معلوم ہوتا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ راجا ٹوڈرمل نے اس کے استحکامات کی ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء میں مرمت کرائی۔ پالامو کے دونوں قلعے، جو مقامی جیرو Cero راجاؤں نے گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی میں بنائے تھے، مغل حاکم داؤد خان قریشی نے لے لیے اور ایک مسجد (۱۰۷۰ھ / ۱۶۶۰ء) اور کچھ اور عمارتیں بھی بنوائیں۔ نیا قلعہ اپنے شاندار ناگپوری دروازے پر نازاں ہے، جو جہانگیری طرز پر بنایا گیا ہے۔ مخدوم شاہ دولت کا مزار (چھوٹی درگاہ)، جسے صوبے دار ابراھیم خان نے (۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء تا ۱۰۲۶ھ/۱۶۱۷ء) میں بنوایا، خاصا لائق تحسین ہے۔ دیگر عمارات کے لیے دیکھیے ایم۔ ایچ قریشی کا مضمون جس کا حوالہ ذیل میں دیا گیا ہے۔

مآخذ: مختلف تاریخی واقعات کے لیے جن کا بہار سے تعلق ہے دیکھیے: (۱) *Cambridge History of India*، ج ۳، (۱۹۲۷ء) اور ج ۴، (۱۹۳۷ء) (مآخذ کی مکمّل فہرست)؛ (۲) نیز *Imperial Gazetteer of India*، ج ۷، آوکسفرڈ ۱۹۰۸ء؛ مقامی تاریخوں کے لیے: (۳) *Bihar and Orisa District Gazetteers*، پٹنہ حدود ۱۹۳۰ء کی متعلقہ جلدیں دیکھیے؛ اس کے بعد کے واقعات کا بیان سابق *Bengal District Gazetteer* کے بیانات سے بعد ترمیم و تنقیح لیا گیا ہے؛ شیر شاہ سوری کے آثار کے لیے دیکھیے: (۴) A. Cunningham: *ASI Report*، ج ۱۱، ۱۸۸۰ء؛ (۵) Percy Brown: *Indian Architecture* (عہد اسلامی)، بمبئی، بدون تاریخ، باب ۱۶؛ (۶) H. Goetz: *The Mausoleum of Sher Shah at Sasaram*، در *Ars Islamica*، ج ۵، ۱: ۹۷؛ دیگر آثار کے لیے نیز دیکھیے: (۷) *ASI Annual Report*، ۱۹۲۲-۱۹۲۳ء، ص ۳۴ تا ۴۱؛ اور (سب سے اہم جس میں آثار کا پورا بیان اور ان کی تاریخ ہے) (۸) محمد حمید قریشی: *List of Ancient Monuments in Bihar and Orisa*، *ASI*، *NIS*، ۵۱، کلکتہ ۱۹۳۱ء: ۵۳ تا ۵۹، ۱۲۹ تا ۱۳۱، ۱۳۶ تا ۱۹۱، ۱۹۷ تا ۲۰۲، ۲۰۷ تا ۲۱۹۔

(I. BURTON-PAGE)

بہار: میرزا محمد تقی ملک الشعراء بہار، ۱۲ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء شہر مشہد میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ملک الشعراء میرزا محمد کاظم صبوری، خراسان میں اپنے وقت کے فضلا میں شمار ہوتا تھا۔ بہار نے اپنے آبا و اجداد کے متعلق

لکھا ہے:

یک نیا عابد و عارف مشرب   یک نیا لشکری و دیوانی
پدرم شاعر و من زین نسب   شاعر و لشکری و روحانی

اس نے ابتدائی علوم اپنے والد سے پڑھے اور فنِ شعرگوئی میں بھی اسی سے تربیت حاصل کی۔ باپ کی وفات پر میرزا عبدالجواد ادیب نیشاپوری سے اصلاح لیتا رہا۔ اس نے مدرسۂ نواب میں فارسی و عربی علوم کی تکمیل کی اور مشہور فلسفی و ریاضی‌دان میرزا عبدالرحمن سے علومِ عقلی حاصل کیے۔

بہار نے تیرہ چودہ سال کی عمر میں اشعار کہنے شروع کر دیے تھے، لیکن اس کے والد نہیں چاہتے تھے کہ اس کا بیٹا شاعری کا پیشہ اختیار کرے اور وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ کوئی شخص مستقبل میں شاعری سے روٹی نہیں کما سکے گا، اس لیے تجارت اور صنعت کی طرف توجہ دینی چاہیے، لیکن بہار اپنے فطری ذوق اور طبع سرشار کی وجہ سے اس طرف مائل نہ ہو سکا۔ بہار نے آہستہ آہستہ شعرگوئی میں اتنی مہارت پیدا کر لی کہ ابتدا میں فضلا یقین نہیں کرتے تھے اور کہتے کہ باپ کے اشعار اپنے نام سے پڑھتا ہے۔ آخر لوگوں نے اپنے سامنے شعر کہنے کی فرمائش کی اور ایک مرتبہ کہا کہ ایک رباعی کہو جس میں تسبیح، چراغ، نمک اور چنار آئے، چنانچہ اس نے چند منٹ میں یہ رباعی کہی:

با خرقہ و تسبیح مرا دید چو یار
گفتا ز چراغ زہد ناید انوار
کس شہد ندیدہ است در کانِ نمک
کس میوہ نچیدہ است از شاخ چنار

ایسے امتحانات کے بعد مخالفین اس کی شاعری کے معترف ہو گئے۔ جب مشہد میں مظفرالدین شاہ کے آنے کی خبر ہوئی تو اس نے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے اپنی زندگی کا پہلا قصیدہ لکھا اور اس میں کہا:

پس از صبوری اینک منم کہ شعر مرا
برد بہدیہ بجای متاع بازرگان
بخردسالی آنسان چکامہ بسرایم
کہ سالخوردہ سخندان سرودنش نتوان

آصف الدولہ غلام رضا خان شاہسون حاکمِ خراسان کے توسط سے مظفر الدین شاہ کی جانب سے اسے ملک الشعراء کا خطاب ملا اور سالانہ وظیفہ مقرر ہوا۔

بہار اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے کہ میں نے علوم جدیدہ حاصل کرنے کے لیے یورپ جانے کا ارادہ کیا، لیکن باپ کی وفات کے بعد ماں، بہن اور دو چھوٹے بھائیوں کی سرپرستی سر پر آ پڑی اور دو سال بعد، یعنی ۱۳۲۴ھ میں ایران میں انقلاب کی ایسی ہوا چلی جس نے ہر سر میں شورش پیدا کر دی؛ اور میں بھی چپکے چپکے آزادی‌خواہوں میں شامل ہو گیا۔ اس نے ۱۳۲۴ سے ۱۳۲۶ھ کے درمیان روزنامہ خراسان میں، جو مخفی طور پر چھپتا تھا، سیاسی اور اجتماعی موضوعات پر اشعار لکھنے شروع کیے، جس کا بہت اچھا اثر ہوا۔ ۱۳۲۸ھ میں محمد علی شاہ کے استبداد کے خلاف ڈمکرٹ [= جمہوری] پارٹی تشکیل پذیر ہوئی تو بہار بھی اس کا رکن بنا اور اس نے نوبہار کے عنوان سے اپنا اخبار شائع کیا، جس میں اس نے ایرانی امور میں حکومتِ روس کی دخل‌اندازی کے خلاف تیز و تند مقالات لکھے۔ ایک سال بعد ربیع الاول ۱۳۲۹ھ میں روسیوں کے دباؤ پر پرچہ بند کر دیا گیا۔ بہار نے ذوالحجہ ۱۳۲۹ھ میں ایک اور ہفت روزہ اخبار تازہ بہار کے نام سے جاری کیا۔ یہ بھی محرم ۱۳۳۰ھ میں بند کر دیا گیا اور بہار کو پارٹی کے چند سرگرم کارکنوں کے ہمراہ تہران میں جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۳۳۱ھ میں مشہد میں واپسی پر پھر نوبہار

جاری کیا، لیکن نو مہینے کے بعد حکومت کی طرف سے جبراً اس کی اشاعت روک دی گئی۔

پہلی عالمگیر جنگ میں بہار روس اور انگلستان کے خلاف تھا اور جرمن کی فتوحات کے متعلق آب و تاب سے لکھتا تھا، چنانچہ ایک قصیدہ میں اس نے لکھا:

قیصر گرفت خطۂ ورشو را
درہم شکست حشمتِ اسلو را

خراسان میں بہار کی رزم آرائیوں کا بڑا اثر ہو رہا تھا، چنانچہ وہ درگز، کلات اور سرخس کے حلقے سے تیسری مجلس شورٰی ملّی کے لیے نمائندہ منتخب ہوا۔ ۱۳۳۵ھ میں روسی افواج تہران پر حملہ کرنے والی تھیں۔ بہار نے مہاجرین کے ہمراہ قم کی طرف ہجرت کی، لیکن وہاں اس کا بازو ٹوٹ گیا، اس لیے تہران واپس آنا پڑا۔ اس نے ''دشمن حملہ کرد'' کے عنوان سے مظالمِ روس کے خلاف ایک زبردست مقالہ لکھا، جس کی وجہ سے عمّالِ روس کے اشارے پر اسے بجنورد میں نظربند کر دیا گیا۔ اہلِ شہر کے مصائب میں اس کی ہمدردیوں کی وجہ سے وہ اسی شہر سے چوتھی مجلس کا نمائندہ منتخب ہوا اور تہران میں پھر سے روزنامہ نوبہار جاری کیا، جو محرم ۱۳۳۴ھ میں بند کر دیا گیا۔ ۱۳۳۵ھ میں اس نے زبان آزاد کے نام سے ایک روزنامہ شائع کیا، جو نوبہار کے خریداروں کے نام بھیجا جاتا تھا۔

۱۳۳۶ھ میں اس نے انجمن ادبی دانشکدہ کی بنیاد رکھی اور دانشکدہ کے نام سے ایک ادبی و اجتماعی مجلّہ جاری کیا۔ اس میں دانشگاہ کے استاد اور دوسرے ادیب تحقیقی مقالات لکھتے رہے اور اسی میں یورپی زبانوں کی نگارشات کے ترجمے بھی شایع ہوتے رہے۔

بہار پانچویں مجلس میں ترشیز سے اور چھٹی مجلس میں تہران سے نمائندہ منتخب ہوا۔ بہار کی پارٹی اقلیت میں تھی، اس لیے سیاسی مسائل پر حکومت سے سخت تصادم ہوتا رہا۔ اس دوران میں بہار کی ادبی و سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ وہ لکھتا ہے: وہ حزب اقلیت کے تمام اخبارات کو چلاتا تھا۔ ادبی مقالات کے علاوہ اسے ایک رات میں سات سات اداریے لکھنے پڑتے تھے۔

چھٹی مجلس کے اختتام پر بہار نے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی، رضا شاہ کبیر کے اصرار پر علمی و ادبی خدمات پر مامور ہو گیا اور تاریخ ادبیات ایران پر درس دیتا رہا۔ ایک سال تک دارالمعلمین عالی میں درس و تدریس میں مشغول رہا اور تصنیف کا کام بھی جاری رکھا۔ دانشگاہ تہران میں سبک شناسی کا ایک نیا موضوع داخل نصاب کیا اور اس کی تدریس کو رواج دیا۔ اسی عرصے میں اتّہامات کی بنا پر وہ چودہ ماہ تک اصفہان میں نظربند رہا۔ اس قید و بند کی مدت میں اس نے بلند پایہ نظمیں لکھیں۔

سترہ سال کی سیاسی علیٰحدگی کے بعد شہریور ۱۳۲۰ ھش کے واقعات پیش آئے۔ اس نے ڈمکرٹ [= جمہوری] پارٹی کی تجدید حیات کے لیے مقالات لکھے اور نوبہار کو از سر نو شائع کیا۔

۱۳۲۴ ھش میں وہ احمد قوام کی کابینہ میں وزیر تعلیم مقرر ہوا، لیکن چند مہینوں سے زیادہ یہ منصب نہ چل سکا، چنانچہ اس نے اس روحانی عذاب سے نجات کے لیے استعفیٰ دے دیا۔

بہار اگرچہ پندرھویں مجلس میں تہران سے نمائندہ منتخب ہوا لیکن بیماری اور باہمی اختلافات کے سبب اس سے خاص کام نہ ہو سکا۔ اب اس کی صحت گر رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ تپ دق کا گھن لگ گیا ہے۔ وہ ۱۳۲۶ ھش میں علاج کے لیے سوئٹزرلینڈ گیا، لیکن کچھ زیادہ

افاقہ نہ ہوا۔ ۱۳۲۸ ھش میں ایران واپس آ گیا۔ اس کی آخری اجتماعی سرگرمی انجمن حامیانِ صلح کی صدارت تھی۔ اس کا قول تھا کہ امن کا مطالبہ انسان کی حقیقی آرزو ہے۔ ایک سال کے بعد مرض کا شدت سے حملہ ہوا اور وہ یکم اردی بہشت ۱۳۳۰ ھش/۲۲ اپریل ۱۹۵۱ء کو وفات پا گیا۔

بہار بڑا مہمان نواز تھا اور اس کا دسترخوان ہمیشہ دوستوں کے لیے کھلا رہتا تھا۔ تندی طبع کے باوجود لطیفہ گو، خوش‌بیان اور خندہ‌جبین تھا۔ عمدہ نفیس لباس پہنتا تھا، گفتگو اور بحث میں استدلال سے کام لیتا تھا، لیکن مغالطہ اور قیاسِ باطل سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ دوستوں کی مجالس میں تو اس کی گفتگو نرم و شیریں ہوتی، لیکن اس کی سیاسی تقریریں بڑی تند و تلخ ہوتیں۔ اس کا حافظہ قوی تھا اور اسے بے شمار اشعار، حکایات اور واقعات یاد تھے۔

اسے پھولوں سے محبت تھی، وہ فرصت کے اوقات پھولوں کی آبیاری و پرورش میں گزارتا؛ اسے کبوتروں سے بہت انس تھا اور اس کے مکان میں رنگا رنگ کے کبوتر خاصی تعداد میں موجود رہتے تھے۔

بہار نہ صرف ایک بلندفکر شاعر، قابل اخبارنویس اور عمدہ نثرنگار تھا بلکہ وہ ایک فداکار انقلابی بھی تھا، جس نے اپنے قلم اور زبان سے اپنے وطن کی ترقی اور برادرانِ وطن کی آگاہی اور بیداری کے لیے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں اور تکالیف برداشت کیں۔

بہار ایک جامع کمالات شاعر تھا۔ بہار نے سبک خراسانی کا تتبع کیا ہے۔ متانت اور جزالت کے اعتبار سے اس کے قصائد متقدمین اساتذہ کے برابر رکھے جا سکتے ہیں۔ سیاسی و اجتماعی مضامین کی رعایت سے اس نے سبک معاصر سے بھی کام لیا، چنانچہ مستزادوں، مسمطوں، قطعات، رباعیات اور عوام‌پسند غزلیات میں موضوع کے مطابق ہر سبک کو اپنایا ہے۔ ترانہ‌ہائے ملی اور تصانیف میں کمال مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی نظمیں دقتِ نظر، لطفِ تخیل اور حسنِ اسلوب کی وجہ سے بلندپایہ شمار ہوتی ہیں۔

تالیف و تصانیف

الف۔ تصانیف تحقیقی: ۱۔ تاریخ مختصر احزاب سیاسی یا انقراض قاجاریہ؛ ۲۔ رسالہ در احوال مانی؛ ۳۔ رسالہ در شرح حالِ حکیم ابوالقاسم فردوسی؛ ۴۔ رسالہ در ترجمہ و احوال محمد بن جریر طبری؛ ۵۔ سبک شناسی یا تطور نثر فارسی، سہ جلد؛ ۶۔ تاریخ تطور نظم۔

ب۔ ادبی: رمان نیرنگ سیاہ یا کنیزان سفید،

ج۔ مقالات تحقیقی و علمی: ۱۔ نقاشی و تذہیب‌کاری در ایران؛ ۲۔ خط و زبانِ پہلوی در عصرِ فردوسی؛ ۳۔ ادبیات ہند؛ ۴۔ بازگشت ادبی۔

ان کے علاوہ متعدد ادبی، علمی، سیاسی اور اجتماعی مقالات مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔

د۔ مندرجۂ ذیل کتابیں تصحیح و تحشیہ کے بعد شائع کیں: ۱۔ مجمل التواریخ و القصص؛ ۲۔ جوامع الحکایات و لوامع الروایات؛ ۳۔ تاریخ سیستان؛ ۴۔ رسالۃ النفس ارسطاطالیس، ترجمۂ بابا افضل الدین؛ ۵۔ ترجمۂ تاریخ طبری؛ ۶۔ دستور زبان فارسی بمشارکت استادان دیگر۔

ہ۔ بہار نے تین سال تک پروفیسر Hertzfeld کے پاس فارسی قدیم اور پہلوی کا مطالعہ کیا اور خطوط سغدی، آرامی اور پہلوی سیکھی اور مندرجۂ ذیل پہلوی کتابوں کے ترجمے فارسی میں شائع کیے: ۱۔ یادگار زریران؛ ۲۔ اندرز آذر بد مار سپندان؛ ۳۔ رسالہ مادیگان شترنگ (و چارش چترنگ)؛ ۴۔ شہ وہرام ورجاوند (قصیدۂ دوازدہ ہجائی)؛ ۵۔ قطعہ

داروک خرمندیہ؛ ۹ ۔ رسالہ ماتیکان ہپت اسپر سپنت۔

۱۰ ۔ دیوان، جو قصیدہ، غزل، مثنوی، ترکیب بند وغیرہ پر مشتمل ہے ۔ کل اشعار کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ ہوتی ہے۔

مآخذ: (۱) براؤن E. G. Browne: *Press and Poetry of Modern Persia*، کیمبرج ۱۹۱۴ء؛ (۲) جلال ہمائی: رسالہ ملک الشعراء بہار، انتشارات دانشگاہ تہران؛ (۳) بہار، محمد تقی: تاریخ احزاب سیاسی، تہران، ۱۳۲۱ ہش؛ (۴) نیکو ہمت: زندگی و آثار بہار، ۲ جلد، کرمان ۱۳۳۳ ہش؛ (۵) عبدالحمید عرفانی: شرح احوال و آثار ملک الشعراء محمد تقی بہار، تہران ۱۳۳۵ ہش؛ (۶) ناظم الاسلام کرمانی: تاریخ بیداری ایران، تہران؛ (۷) احمد کسروی: تاریخ مشروطۂ ایران، تہران ۱۳۳۰ ہش؛ (۸) براؤن، ایڈورڈ: انقلاب ایران، ترجمہ و حواشی از احمد پژوہ، تہران؛ (۹) یحیٰی دولت آبادی: تاریخ معاصر، تہران؛ (۱۰) حسین مکی: تاریخ بیست سالۂ ایران، جلد سوم، ۱۳۳۵ ہش۔

(ظہور الدین احمد)

⊗ **بہار بانو بیگم**: شاہنشاہ جہانگیر (رک بآں) کی بیٹی، ستمبر ۱۵۹۰ء میں پیدا ہوئی ۔ وہ شاہزادۂ پرویز سے چھوٹی اور شاہزادۂ خرم سے بڑی تھی ۔ اس کی ماں کرمسی عہدِ اکبری و جہانگیری کے ایک وفادار راجپوت سردار راجا کیشوداس راٹھور (تزک جہانگیری میں کیشوداس مارو) کی بیٹی تھی ۔ بہار بانو اپنے چچا شاہزادۂ دانیال کے بیٹے طہمورث سے بیاہی گئی، جو ۲۳ جنوری ۱۶۲۸ء کو شاہ جہاں (رک بآں) کے حکم سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔ بہار بانو کا سال وفات معلوم نہیں۔

بیل Beale نے لکھا ہے کہ جہانگیر کی دو اور بیٹیوں، دولت النسا اور بیگم سلطان، کا لقب بھی بہار بانو تھا، لیکن وہ صغر سنی ہی میں وفات پا گئیں۔

مآخذ: (۱) تزک جہانگیری، مترجمۂ Rogers، لنڈن ۱۹۰۹ء، ص ۱۹؛ (۲) Beale: *An Oriental Biographical Dictionary*، لنڈن ۱۸۹۴ء، ص ۹۵، ۹۶، ۲۱۰؛ (۳) بینی پرشاد: *History of Jahangir*، بار سوم، الہ آباد ۱۹۳۰ء، ص ۲۷، ۳۷۲۔

(سیّد امجد الطاف)

بہارِ دانش: رک بہ عنایت اللہ کنبو۔ *

بہارِستان: رک بہ جامی۔ *

بہارلو: ایران کے ایک ترک قبیلے کا نام ۔ *
اس نام کا اطلاق خاص طور پر ترکمان قبائل کے وفاق قرا قویونلو کے حکمران خاندان پر ہوتا ہے (یہ خاندان بارانی کے نام سے بھی معروف ہے) ۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ نام (معنی "بہار والے") موضع بہار (ابن الاثیر، ۱۰ : ۳۰۹، "وہاں" کو وہار پڑھیے) سے تعلق رکھتا ہو، جو ہمدان سے تیرہ کیلومیٹر کے فاصلے پر جانب شمال واقع ہے ۔ حمداللہ مستوفی: نزہۃ، ص ۱۰۷ (انگریزی ترجمہ، ص ۱۰۶) کے بیان کے مطابق بہار کا قلعہ سلیمٰن شاہ بن برچم ایوائی کا مسکن تھا، جو بعد ازاں خلیفہ المستعصم کے تین وزراے اعظم میں سے ایک وزیر بنا اور ہلاکو خان کے مغول کے ہاتھ سے مارا گیا (۲ صفر ۶۵۶ھ / ۸ فروری ۱۲۵۸ء)؛ قب الجوینی (تکملہ)، ۳ : ۱۹۰، نیز محمد قزوینی: وہی کتاب، ۳ : ۴۰۳ تا ۴۶۴ میں سلیمٰن شاہ کے خاندان کے متعلق مفصل بحث خاص طور سے دیکھیے ۔ ایوائی کی نسبت واضح طور پر اوغز کے ایک بنیادی قبیلے ایوا (یا ایوا) کے ساتھ سلیمٰن شاہ کے تعلق کو ظاہر کرتی ہے، دیکھیے محمود کاشغری: دیوان لغت الترک، ۱ : ۵۶ ۔ ہمیں وہ اسباب معلوم نہیں جن کی بنا پر سلیمٰن شکوہ نے بہار کی ریاست سے بغداد کی طرف نقل مکانی کی، لیکن اس بات کے قطعی اظہارات موجود ہیں کہ مغول کی آمد سے بھی پہلے ایوا قبیلے کے لوگ شمال

میں اِربل اور مراغہ کی طرف پھیل چکے تھے ۔ جلال الدین خوارزم شاہ [رک بآں] کو تبریز کو جانے والے راستوں پر ان لوگوں کی ترکتاز کی سرکوبی کرنا پڑی تھی (۶۲۳ھ/ ۱۲۲۶ء کا موسم سرما)، دیکھیے ابن الاثیر، ۱۲ : ۳۰۲؛ نسوی، ص ۱۲۶ ۔ ایک ایوائی قبیلے کی موجودگی کا تذکرہ خلاط میں بھی ملتا ہے (۶۲۷ھ/ ۱۲۳۰ء) ۔ یہ مراحل ہمیں اس علاقے کی طرف لے جاتے ہیں جہاں قبائل کا وفاق قرا قویونلو معرض وجود میں آیا ۔ قرا قویونلو کے بعض سکوں پر کندہ علامتی نشان بھی ایوا کے ایک قبائلی تمغے کی یاد دلاتے ہیں ۔ دوسری جانب ہمدان کے ساتھ قرا قویونلو حکمرانوں کے تعلق کی تصدیق ان بچے کھچے لوگوں سے ہوتی ہے جو اس قبیلے کے اسلاف میں سے ان اقطاع میں باقی رہ گئے ۔ ہمدان کا علاقہ ایک طویل عرصے تک قرا قویونلو کے ایک اہم امیر کے نام پر قلمرو علی شکر کہلاتا رہا ۔

ان دنوں بہارلو قبیلے کے افراد منتشر صورت میں سارے جنوبی ایران میں جا بجا پھیلے ہوئے ہیں، دیکھیے Sykes : *Ten thousand miles*، ص ۸۱، ۳۰۲ ۔

مآخذ : (۱) V. Minorsky : *The clans of the Qara-qoyunlu rulers*، در *Mélanges F. Köprülü*، ۱۹۵۳ء، ص ۳۹۱ تا ۳۹۵؛ (۲) *BSOAS*، ۱۹۵۵ء، ج ۱۷، حصّۂ اول : ص ۶۹ تا ۷۱ ۔

(V. MINORSKY)

⊗ **بہاری** : (ملّا) غلام یحیی بن نجم الدین البارھوی البہاری صوبۂ بہار کے ایک گاؤں "باڑہ" میں پیدا ہوئے ۔ تاریخ پیدائش کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ البتہ ان کی کتاب لواء الہدٰی فی اللیل والدجی میں ۱۰۹۰ھ کے قریب تاریخ ولادت کا اندازہ لگایا گیا ہے ۔ ابتدائی کتب درسیہ مختلف مدارس میں پڑھیں اور [مدرسۂ منصوریہ میں مولانا باب اللہ جونپوری سے تکمیل علوم کی اور قرآن مجید حفظ کیا ۔ شیخ بدرالعالم سادامری سے طریقت حاصل کی ۔ مدرسۂ لکھنؤ میں درس دینا شروع کیا اور مدتوں پڑھاتے رہے ۔ پھر دہلی جا کر میرزا مظہر جانجاناں سے نقشبندی طریقہ اخذ کیا، پانچ سال تک ان کی خدمت میں رہے اور خلافت پائی ۔ پھر لکھنؤ واپس آ کر شیخ پیر محمد لکھنوی کے زاویے میں، جو مسجد شیخ محمود قلندر کے قریب ہے، مقیم ہوے اور تدریس علم ظاہر ترک کر دی، بلکہ علوم عقلیہ کو بھول ہی گئے (نزهة الخواطر اور رسالہ شاہ غلام علی) ۔ ان کی تصانیف میں سے دو رسالے بہت مشہور ہیں اور درس نظامیہ کے نصاب میں داخل ہیں ۔ اپنے مرشد جناب میرزا صاحب کی زندگی ہی میں وفات پائی ۔ سنہ وفات ۱۱۲۸ھ [از روے نزهة الخواطر ۱۱۸۰ھ (۶ : ۲۱۶)] ہے ۔ رحمٰن علی اور اس کے متبعین نے ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء دیا ہے (رحمٰن علی، محلِّ مذکور) ۔ مخدوم شرف الدین احمد بہاری کے مزار کے احاطے میں دفن ہوے ۔ ان کی تصانیف یہ ہیں :-

(۱) حاشیۂ شرح سلّم العلوم، ملّا احمد علی سندیلوی کی شرح کا حاشیہ ۔

(۲) لواء الہدٰی فی اللیل والدجی، یعنی محمد زاہد الہروی کی شرح الرسالۃ القطبیۃ پر حاشیہ ۔ لواء الہدٰی کے لیے دیکھیے فہرست ایلس (Ellis)، عمود ۵۷۸ و فہرست رامپور، ۱ : ۳۳۱ ببعد، جہاں اس کتاب کے متعدّد قلمی نسخے درج ہیں، جن میں سے ایک ۱۱۹۶ھ میں نقل ہوا ہے ۔ [چھاپ سنگ، کانپور ۱۲۸۷ھ]؛ [(۳) کلمۃ الحق، جس میں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے مبحث میں شاہ ولی اللہؒ کی تطبیق پر اعتراض کیا گیا ہے] ۔

مآخذ : (۱) شاہ غلام علی : رسالہ، در بیان حالات و مقامات حضرت مرزا مظہر جانجاناں، مطبع احمدی (دہلی؟) ۱۲۶۹ھ، ص ۹۳؛ (۲) عبدالحی : نزهة الخواطر، نرن

دوازدہم، ۶ : ۲۱۵ تا ۲۱۶؛ (۳) رحمٰن علی: تذکرۂ علمائے ہند، لکھنؤ ۱۹۱۴ء؛ (۴) J. W. Beale: *Oriental Biographical Dictionary*، کلکتہ ۱۸۸۱ء، ص ۹۷؛ (۵) براکلمان: تکملہ، ۲ : ۹۱۳؛ (۶) معجم المطبوعات، عمود ۵۹۳؛ (۷) A. G. Ellis: *Cat. of Arabic Books* در موزۂ بریطانیہ، لنڈن ۱۸۹۴ء، عمود ۵۷۷ ببعد؛ (۸) محمد حسین آزاد: آب حیات، لاہور ۱۹۰۰ء، ص ۱۲۳ ببعد (مرزا مظہر جان جاناں سے بحث ہونے کا قصہ)؛ (۹) زبید احمد: *The Contribution of India to Arabic Literature*، الہ آباد ۱۹۴۶ء، ص ۱۳۱ و ۳۰۴، [بار دوم، لاہور ۱۹۶۸ء، بمدد اشاریہ].

(فصیح الدین بلخی)

* **البہاری:** مُحبّ اللہ بن عبدالشکور العثمانی الصدیقی الحنفی موضع کڑا میں پیدا ہوئے، جو بھارت کے صوبۂ بہار میں مُحبّ علی پور کے قریب واقع ہے۔ یہ مَلِک برادری سے تھے۔ یہ لوگ باہر سے آ کر یہاں آباد ہو گئے تھے اور ابھی تک ان کی اصل و نسل کے بارے میں یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم قطب الدین انصاری سہالوی سے حاصل کی اور کچھ کتابیں قطب الدین الحسینی شمس آبادی سے پڑھیں۔ درس کی تکمیل کے بعد وہ دکن چلے گئے، جہاں اس وقت اورنگ زیب مقامی حکمرانوں کے مقابلے میں معرکہ آرائی میں مصروف تھا۔ اورنگ زیب نے اُن کی علمی لیاقت بالخصوص فقہ کی مہارت سے متاثر ہو کر انھیں لکھنؤ کا قاضی مقرر کر دیا۔ ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶-۱۶۸۷ء میں، جب اورنگ زیب کے ہاتھوں ابوالحسن تانا شاہ والیِ گولکنڈہ کو شکست ہوئی، مُحبّ اللہ البہاری کو حیدر آباد میں متعین کر دیا گیا، پھر بعد میں انھیں شاہ عالم بن اورنگ زیب کے لڑکے رفیع القدر کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ ۱۱۰۹ھ/۱۶۹۷ء میں جب شاہ عالم کو صوبۂ کابل کا صوبہ دار بنا دیا گیا تو مُحبّ اللہ البہاری بھی اپنے شاگرد کے ساتھ کابل چلے گئے۔ ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶-۱۷۰۷ء میں شاہ عالم بہادر شاہ اوّل نے تخت نشین ہونے کے بعد انھیں اپنی مملکت کا قاضی القضاۃ بنا دیا اور ''فاضل خان'' کا خطاب عطا کیا۔ ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں مُحبّ اللہ موصوف نے وفات پائی۔ وہ حسبِ ذیل کتابوں کے مصنّف ہیں: (۱) سُلّم العلوم، جو منطق کی ایک مشہور درسی کتاب ہے؛ (۲) مُسلّم الثبوت، جو اصولِ فقہ کی ایک مستند کتاب ہے؛ (۳) الجوھر الفرد، الجزء الذی لایتجزی پر ایک علمی مقالہ ہے۔ یہ تینوں کتابیں پاکستان و ہند کے دینی مدارس میں داخل نصاب ہیں اور ان کی شروح و حواشی اور حواشی الحواشی بہ کثرت لکھے گئے ہیں؛ (۴) رسالۃ المغالطۃ العامۃ الورود؛ اور (۵) رسالۃ فی اثبات ان مذھب الحنفیۃ ابعد عن الرای من مذھب الشافعیۃ.

مآخذ: (۱) آزاد بلگرامی: مآثر الکرام، حیدرآباد دکن ۱۹۱۰ء، ۲۱۱؛ (۲) وہی مصنّف: سُبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، بمبئی ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء، ص ۷۶؛ (۳) صدیق حسن خان قنّوجی: ابجد العلوم، بھوپال ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء، ص ۹۰۰؛ (۴) رحمٰن علی: تذکرۂ علمائے ہند، لکھنؤ ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء، ص ۱۷۵؛ (۵) براکلمان، ۲ : ۴۲۰؛ تکملہ، ص ۶۲۲ تا ۶۲۳؛ (۶) JASB، (۱۹۱۳ء)، ص ۱۹۰ ببعد؛ (۷) زبید احمد: Contribution of India to Arabic، جالندھر ۱۹۴۶ء، ص ۵۶ تا ۵۹، ۱۲۶ تا ۱۳۰ [بار دوم، لاہور ۱۹۶۸ء بمدد اشاریہ]؛ (۸) عبدالحی: نُزہۃ الخواطر، حیدر آباد دکن ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۷ء، ۶ : ۲۰۰ تا ۲۰۲؛ (۹) فقیر محمد: حدائق الحنفیۃ، لکھنؤ ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء، ص ۴۳۴؛ (۱۰) فضل امام خیر آبادی: تراجم الفضلاء (انگریزی ترجمہ بزمی انصاری)، کراچی ۱۹۵۶ء، ص ۴۸ تا ۵۳.

(بزمی انصاری)

بہاول پور : مغربی پاکستان کا ایک شہر جس کی آبادی ساٹھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ شہر دریاے ستلج کے بائیں کنارے کے قریب کراچی سے کوئی پانچ سو میل جانب شمال واقع اور ریلوے کے ذریعے اس سے ملا ہوا ہے۔ اس شہر میں ایک عجائب گھر، ایک کتب خانہ اور متعدد تعلیمی ادارے موجود ہیں اور یہ شہر اپنے علاقے کا انتظامی، تجارتی اور تعلیمی مرکز ہے۔

پہلے یہ شہر ریاست بہاول پور کا صدر مقام تھا، جس کی بنیاد سندھ کے داؤد پوتا خاندان نے رکھی تھی۔ خود اس شہر کی بنیاد اس خاندان کے دوسرے حکمران محمّد بہاول خان نے ۱۷۴۸ء میں رکھی تھی۔ حکمران خاندان کو بعض اوقات ایک مقامی مورثِ اعلٰی عباس کی نسبت سے عبّاسیہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس نام کا بغداد یا مصر کے عبّاسیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ حکمران خاندان اٹھارھویں صدی کے اواخر میں افغان بادشاہوں کی سیادت سے آزاد ہو گیا اور اس نے ۱۸۳۸ء میں انگریزوں سے معاہدہ کر لیا۔ اس ریاست کا رقبہ پندرہ ہزار نو سو اٹھارہ مربع میل تھا، جو دریاے ستلج، پنج ند اور سندھ کے بائیں کنارے پر تین سو میل تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کا عرض اوسطًا چالیس میل تک صحرا میں پھیلا ہوا تھا۔ اس ریاست کی اہم فصلیں گندم، چاول، کپاس اور باجرا تھیں اور اب بھی یہی ہیں۔ ان فصلوں کا انحصار اس کے سرحدی دریاؤں سے آبپاشی کے انتظام پر ہے۔ ۱۹۴۱ء کی سر شماری کے مطابق اس ریاست کی کل آبادی تیرہ لاکھ اکتالیس ہزار دو سو نو تھی اور باشندوں کی اکثریت جاٹ، راجپوت اور بلوچ اقوام کے مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ریاست بہاول پور کا جداگانہ سیاسی وجود ۱۹۵۵ء میں ختم ہو گیا، جب کہ اسے مغربی پاکستان میں مدغم کر لیا گیا۔

مآخذ : (۱) شہامت علی : *The History of Bahawalpur*، لنڈن ۱۸۴۸ء؛ (۲) *Panjab States Gazeteers*، Bahawalpur State، ج ۳۶، لاہور ۱۹۰۴ء؛ (۳) دولت رام : مرآۃ دولت عباسیہ، امرتسر ۱۸۰۱ء؛ (۴) م ـ عزیز الرحمٰن : صبح صادق، بار دوم ۱۹۴۳ء؛ (۵) م ـ اعظم ہاشمی : جواہر عباسیہ؛ (فارسی ـ تاحال بصورت مخطوطہ)؛ (۶) ایچیسن C. H. Aitchison : *Collection of Treaties, Engagements and Sandas relating to India*، ج ۹، کلکتہ ۱۸۹۲ء۔

(شیخ عنایت اللّٰہ)

بہجت مصطفٰی اِفندی : عہدِ آلِ عثمان کا عالم اور طبیب، وزیر اعظم خیر اللّٰہ افندی کا پوتا اور خواجہ محمد امین شکوھی کا بیٹا، ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں پیدا ہوا۔ وہ دینی درسگاہوں میں تعلیم پا کر ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱-۱۷۹۲ء میں مدرّس بنا۔ اس نے علم طب میں خصوصی مہارت حاصل کی اور بڑی تیزی سے ترقی کی منازل طے کرنے لگا۔ چنانچہ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں وہ سلطان کا اعلٰی طبیب (حکیم باشی یا بہ القاب رسمی رئیسِ اِطبّاے سلطانی) بن گیا۔ ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں وہ اپنے منصب سے معزول کر دیا گیا، لیکن ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء میں اس کا تقرر دوبارہ ہو گیا۔ ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱-۱۸۲۲ء میں وہ معتوب ہوا اور جلا وطن کر دیا گیا۔ لیکن اسی سال پھر اسی منصب پر فائز ہوا۔ ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵-۱۸۲۶ء میں ینی چریوں کی تباہی کے بعد وہ مجلسِ محلّاتِ سلطانی کا رکن بنا، جس کا صدر محمود ثانی تھا۔ اس کے علاوہ وہ متعدّد اہم مذہبی اور قانونی منصبوں پر مامور ہوا، مثلاً ملّاے ازمیر (۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء)، ملّاے مصر (۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰-۱۸۲۱ء)، قاضی عسکرِ آناطولی (۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱-۱۸۲۲ء) اور قاضی عسکرِ روم ایلی (۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱-۱۸۲۲ء)۔ اس نے ذوالقعدہ ۱۲۴۹ھ/مارچ ـ اپریل ۱۸۳۴ء میں وفات

باثی اور اسکو دار [رک بآن] میں دفن ہوا۔

بہجت افندی طب قدیم کے دبستان کے آخری اطبا میں سے تھا، جس میں طب کا مطالعہ دینیات اور فقہ و قانون کے مطالعے سے مربوط کیا جاتا تھا اور طبیب کے لیے علمی زندگی اختیار کرنا بھی ضروری متصور ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ترکی میں یورپی طرز کی طب جدید کے پیشروؤں میں سے بھی تھا۔ اس کی اور اس کے بھائی حکیم باشی عبدالحق ملّا کی نگرانی میں ایک جدید ہسپتال بنایا گیا اور نیا میڈیکل سکول کھولا گیا، جس میں یورپی اساتذہ باہر سے بلوا کر مقرر کیے گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے حکومت کے ترجمانِ اعلٰی یحیٰی افندی کے زیرِ نگرانی یورپی زبانیں بھی سیکھیں، اگرچہ اس کی اپنی تصانیف، جن کی ایک مثال ہزار اسرار ہے، زیادہ تر روایتی رہیں۔ تاہم اس نے مغرب کی طبّی اور سائنسی کتابوں کے متعدد اہم تراجم کیے، جن میں چیچک کا ٹیکہ لگانے پر جینّر Jenner کا کتابچہ، بفّون Buffon کی تاریخِ طبیعی، اور ہیضہ، آتشک اور خارش کی موضوعات پر کتابیں شامل ہیں۔ مغرب سے اس کی دلچسپی اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ اس نے مصر پر فرانس کے قبضے کی تاریخ الجبرتی : مظہر التقدیس بذھاب دولة الفرنسیس [رک بہ الجبرتی] کا ترکی میں ترجمہ [بعنوان تاریخ مصر، استانبول ۱۲۸۲ھ] کیا۔

مآخذ : (۱) سجلِ عثمانی، ۲ : ۳۱؛ (۲) عثمانلی مؤلف لری، ۳ : ۲۰۹ ببعد؛ (۳) فطین : تذکرہ، ص ۲۹ ببعد؛ (۴) سہیل انور : عثمانلی طبابتی و تنظیمات ھنگمندہ بنی نوتلر، در تنظیمات، ۱، استانبول ۱۹۴۰ء : ۹۳۶ تا ۹۳۹؛ (۵) عدنان ادیور : عثمانلی ترک لرندہ علم، استانبول ۱۹۴۳ء، ص ۱۹۴ تا ۱۹۵؛ (۶) عثمان ارگن : ترکیہ معارف تاریخی، ۲، استانبول ۱۹۴۰ء : ۲۸۰ ببعد۔ معاصرین کے تأثرات کے لیے دیکھیے : (۷) Record of Travels in Turkey etc. : Adolphus Slade، ۱، لنڈن ۱۸۳۳ء : ۳۳۳ تا ۴۳۳۔

(B. Lewis)

بہدینان : (= بادینان) کُردی علاقہ، جو موصل کے میدان سے شمال اور شمال مشرق کی طرف واقع ہے۔ عباسی خلافت کے آخری برسوں یعنی تقریباً چھٹی صدی ھجری/بارھویں صدی عیسوی سے لے کر تیرھویں صدی ھجری / انیسویں صدی عیسوی تک اس رقبے کو ایک امارت کی حیثیت حاصل رہی، جس کا صدر مقام عمّادیہ [رک بآن] (کُردی زبان میں آمیدی) تھا۔ اس میں مشرق کی طرف عقرہ (کردی میں آکرے)، شوش اور دریاے زاب کلاں پر کی اراضی موسومہ زیباری اور مغرب میں دہوک اور وقتاً فوقتاً زاخو کے علاقے شامل تھے۔ اس کی شمالی سرحد پر بوھتان حکاری کی امارتیں اور جنوب میں سوران کی اور امارت واقع تھی۔

اس امارت کا مسمّٰی بہ خاندانِ بہاءالدین اصلاً شمس الدینان (کردی : شمدینان [رک بآن] سے آیا تھا۔ شرف الدین بِتلیسی : شرف نامہ، ۱ : ۱۰۶ ببعد میں اس امارت کی شاہ رخ تیموری کے عہد سے لے کر ۱۰۰۵ھ / ۱۵۹۶ء تک دو صد سالہ تاریخ بیان کی گئی ہے۔ امیر حسن نے شاہ اسمٰعیل صفوی کے زیرِ حمایت اپنے حلقۂ اقتدار کو زاخو کے شمال میں دہوک اور سندی کے رقبے تک وسیع کر لیا۔ اس کے بیٹے سلطان حسین کے اقتدار کے جواز پر ترکی سلطان سلیمٰن پُر شکوہ نے مُہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ حسین کے بیٹے قباد کو مزوری قبیلے کے ایک لشکر نے معزول کر دیا اور مار ڈالا، لیکن اس کے بیٹے سیدی خان نے ترکوں کی مدد سے پھر حکومت حاصل کر لی۔ گیارھویں صدی ھجری / سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اردلان کے والی نے، جو شاہ عباس (صفوی) کے ماتحت تھا، کچھ مدت کے لیے

عمادیہ میں اپنا حاکم مقرر کر دیا۔ اس کے بعد سو سال تک پھر اس ریاست کے بارے میں کوئی تحریر نہیں ملتی۔ عثمانیوں کے زیرِ سیادت یہ خاندان پاشاے اعظم بہرام کے دورِ حکومت (۱۱۳۸ھ/ ۱۷۲۶ء تا ۱۱۸۱ھ / ۱۷۶۷ء) میں بام عروج تک پہنچ گیا۔ بہرام کے بیٹے اسمٰعیل پاشا (۱۱۸۱ھ/ ۱۷۶۷ء تا ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۸ء) کو اپنے باغی بھائیوں کی سرکشی سے عہدہ برآ ہونا پڑا، جنھوں نے مختلف اوقات میں زاخو اور عقرہ میں قدم جما لیے تھے۔ اسمٰعیل کے بیٹے مراد خان کو اس کے عمزاد بھائی قباد نے سلیمانیہ کے بابان پاشا کی مدد سے عمادیہ سے نکال دیا۔ ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں مزّوری قبیلے نے قباد کا اقتدار ختم کرنے کے لیے علمِ بغاوت بلند کیا اور موصل کے جلالی پاشا نے اسمٰعیل کے بیٹے عادل پاشا کی حکومت کی بنیادیں مضبوط کر دیں۔ ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں اس کا بھائی زبیر اس کا جانشین بنا۔ ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں رواندز کے محمد پاشا کورہ (نابینا پاشا) نے عقرہ اور عمادیہ پر قبضہ جما لیا اور امیر سعید پاشا کو معزول کر کے زاخو کی طرف پیشقدمی کی۔ اس کی حکومت اگرچہ چند ہی سال قائم رہی لیکن بہدینان کا اقتدار پوری طرح پھر کبھی قائم نہ ہو سکا۔ بالآخر ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء میں یہ علاقہ موصول کے سنجاق میں شامل کر لیا گیا۔

بہدینان کا نام اب بھی اس علاقے کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں کردوں کے حسب ذیل بڑے قبیلے آباد ہیں: برواری، دوسکی، گُلّی، مزّوری، ریکانی، سلیوانی، سندی اور زیباری.

مآخذ: (۱) S. H. Longrigg: *Four Centuries of Modern Iraq*، آکسفرڈ ۱۹۲۵ء؛ (۲) صدیق الدملوجی: امارت بہدینان الکردیہ، موصل ۱۹۵۲ء.

(D. N. MACKENZIE)

بَہْراء: (نسبت بہرانی)، قبائل قُضاعہ میں سے ایک قبیلہ، جسے کبھی قبیلۂ جُذام کا ایک حصّہ سمجھا گیا ہے، جس نے پہلے شمال کی جانب دریاے فُرات کی طرف کوچ کیا اور وہاں سے حِمْص کے میدان میں آیا۔ اپنے فراتی ہمسایوں تَغْلِب اور تَنُوخ کی طرح یہ قبیلہ بھی عیسائی ہو گیا، لیکن انھوں نے تغلب کے بعد غالبًا ۵۸۰ء کے لگ بھگ عیسائیت قبول کی۔ ۹ھ/ ۶۳۰ء میں ان کا ایک وفد مدینۂ منوّرہ آ کر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و سلّم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کیا۔ ۸ھ / ۶۲۹ء میں بہراء ان عربوں میں شامل تھے جنھوں نے ہرقل کے ساتھ مل کر غزوۂ مُؤتہ میں مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ ۱۲ھ / ۶۳۳ء میں خالد بن ولیدؓ کے حملے کے وقت انھیں دُومَۃ الجَنْدَل کے لوگوں کی مدد کے لیے بلایا گیا۔ یہ لوگ ۱۳ھ / ۶۳۴ء میں کَلْب، سَلِیح، تَنُوخ، لَخْم، جُذام اور غسّان کے ساتھ بوزنطی فوجی وفاق میں بھی شامل تھے، لیکن جب شام فتح ہو گیا تو وہ سب مسلمان ہو گئے.

مآخذ: (۱) الہمدانی، ص ۱۳۲؛ (۲) المُفَضَّلِیّات، ص ۲۷۴، ۳۲۷؛ (۳) الطبری، ۱: ۱۶۱۱، ۲۰۶۰، ۲۰۸۱، ۲۱۱۳، ۲۱۲۲؛ (۴) Wellhausen: *Skizzen*، جلد ۴، عہد نامہ عدد ۱۵؛ (۵) الواقدی (طبع ولہاوزن)، ص ۳۲۵، ۳۱۱؛ (۶) ابن خَلِّکان، عدد ۳۴؛ (۷) R. Dussaud: *Topographie historique de la Syrie*، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۲۴۶؛ [(۸) ابن حزم: جمہرۃ انساب العرب، بمدد اشاریہ؛ (۹) عمر رضا کحالہ: معجم قبائل العرب، ۱: ۱۱۰].

(C. E. BOSWORTH)

بہرام: (پہلوی کے لفظ ورہران Varahrān سے ماخوذ ہے، جو خود اوستا کے لفظ ویرث رگنا Verethragna

سے نکلا ہے) زردشتیوں میں فتح و ظفر کے دیوتا کا نام ہے (قب Benveniste و Renou : Vrtra et Vrtragna، باب ۱، بالخصوص ۶ و ۲۲)، ایران کے بڑے آتشکدوں میں سے ایک آتشکدے کا نام ورہران Varhrān یا (زیادہ تر قریب کے زمانے میں) وہرام Vahrām اسی دیوتا کے نام پر رکھا گیا ہے (وہی کتاب، ص ۲۷)۔ یہ دیوتا اپنے نام کے شمسی مہینے کے بیسویں دن پر حکومت کرتا ہے اور البیرونی کی رقم کردہ تقویم ایران میں اس کی یہی حیثیت قائم رکھی گئی ہے (وہی کتاب، ص ۸۳؛ البیرونی : Cronol، ص ۵۳)۔

ساسانی خاندان میں بہرام یا وہرام نام کے پانچ حکمران گزرے ہیں (چوتھا، پانچواں، چھٹا، بارھواں اور چودھواں)۔ وہرام اول (۲۷۳ تا ۲۷۶ء) کے عہد حکومت کا بہت کم حال معلوم ہے۔ اس نے زردشتی مذہب کے پیشواؤں کو مانی کے خلاف کلّی اختیار دے دیا، جسے موت کی سزا دے کر ۲۷۶ء میں قتل کر دیا گیا۔ شاپور کے ایک ابھرواں نقش میں وہرام کی تخت نشینی کا نقشہ کھینچا گیا ہے (A. Christensen : L'Iran sous les Sassanides، بار دوم، ص ۲۲۶ تا ۲۲۷)۔ اس کے بیٹے اور جانشین وہرام دوم (۲۷۶ تا ۲۹۳ء) کے عہد میں روم اور ایران کے درمیان پھر لڑائی ہوئی، لیکن قیصر کیرس Carus کی اچانک موت نے، جو مدائن تک پہنچ گیا تھا، رومیوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے باوجود وہرام نے ارمینیہ اور عراق انھیں دے دیے (۲۸۳ء) تاکہ صلح ہو جائے اور وہ اس سے فارغ ہو کر اپنے بھائی کی بغاوت کو فرو کرے، جو خراسان کا گورنر (کُشان شاہ) تھا اور اپنے لیے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہرام دوم کا عکس کئی ابھرواں تصویروں میں ملتا ہے (Christensen، وہی کتاب، ص ۲۲۸ ببعد)۔ اس کے فرزند اور جانشین وہرام سوم کو اس کی چار مہینے کی حکومت کے دوران میں اس کے تایا نے شکست دی (۲۹۳ء)۔ وہرام چہارم (۳۸۸ تا ۳۹۹)، جو شاپور اعظم ثانی کا بیٹا تھا، اپنے چچا اور بڑے بھائی کی طرح، جو اس کے پیش رو تھے، کمزور حکمران تھا۔ جاگیردار امرا نے پھر وہی اقتدار حاصل کر لیا جس سے شاپور ثانی نے انھیں محروم کر دیا تھا۔ وہرام چہارم کے عہد میں ارمینیہ کو روم اور ایران کے درمیان تقسیم کر دیا گیا اور بڑا حصّہ ایران کے قبضے میں آیا۔ وہرام پنجم (۴۲۰ تا ۴۳۸ء) نے، جس کا لقب اس کی جسمانی قوت کی وجہ سے گور (حمار وحشی) تھا، جس نے حیرہ کے لخمی عرب بادشاہ المنذر اول کے زیر سایہ تربیت حاصل کی تھی اسی بادشاہ کی مدد سے ان امرا سے ایران کا تخت واپس لیا جنھوں نے اس کے بڑے بھائی کو قتل کر کے خاندان کے کسی دُور کے رشتے دار کو تخت پر بٹھا دیا تھا۔ بہرام گور نے اپنی فیاضی اور محصولوں کی تخفیف، شجاعت و مردانگی، عشق و محبت کی زندگی اور سیر و شکار کے کارناموں کی بدولت (جنھیں شاعروں اور مخطوطات کے مطلّاکاروں نے یادگار بنا دیا) بڑی ہر دلعزیزی حاصل کی۔ اس نے مملکت کے انتظامی امور زیادہ‌تر بڑے بڑے معزز رئیسوں (خصوصاً مہر۔ نرسا) کے ہاتھ میں رکھے۔ مرو کے علاقے کے وحشی لوگوں کے خلاف ایک مہم کی قیادت اس نے خود کی۔ اس ظلم و ستم کی وجہ سے بہت سے عیسائیوں نے ترک وطن کر کے بوزنطی سلطنت میں پناہ لی۔ اس بنا پر ایران اور بوزنطی سلطنت کے درمیان ایک مختصر جنگ ہوئی، جس میں ایران نے شکست کھائی، چنانچہ عہد نامۂ صلح (۴۲۲ء) کی رو سے ایران میں عیسائیوں کو مذہبی رسوم ادا کرنے کی آزادی مل گئی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بہرام گور

قدرتی موت مرا یا شکار کا کوئی حادثہ اس کی وفات کا سبب بنا۔

ان پانچ بادشاہوں کے علاوہ ایک غاصب بھی گزرا ہے، جس کا نام وہرام چوبین تھا۔ یہ اپنے آپ کو اشکانی حکمرانوں کی اولاد سے بتاتا تھا اور ۵۸۹ء میں ہرمزد چہارم کے عہد حکومت میں ایک بڑی بغاوت کا سرغنہ بنا۔ ہرمزد ایک ممتاز حکمران تھا، جو مذہبی معاملات میں تو حد درجہ روادار تھا، لیکن اس نے جاگیردار امراء کو اس لیے اپنا مخالف بنا لیا تھا کہ ان کے مقابلے میں اس نے پوری قوت سے اپنے حقوق شاہی کی حفاظت کی۔ بہرام چوبین ایران کے شمال اور مغرب کے لوگوں کے مقابلے میں جنگی کامیابیاں حاصل کر چکا تھا، لیکن بوزنطیوں نے اسے شکست دی، اور اسے فوج سے برطرف کر دیا گیا۔ چنانچہ اس نے بغاوت کر دی اور بادشاہ کو قتل کرکے اقتدار حاصل کر لیا۔ ہرمزد کے فرزند نے بوزنطیوں، ارمینیوں اور ایران کے کچھ لوگوں کی مدد سے بہرام کی طول و طویل مقاومت کو توڑا۔ بہرام نے بھاگ کر ترکوں میں پناہ لی، لیکن تھوڑے ہی دن کے بعد مار ڈالا گیا۔ اس کی پُر زور اور توانا شخصیت نے اس کی شہرت کو دوام بخشا۔ پہلوی زبان کے ایک عوامی رومان میں اسلامی مؤرخین اور شعرا سے پہلے ہی اس کے شجاعت کے کارنامے بیان ہو چکے تھے (دیکھیے A. Christensen: *Romanen om Bahrâm Tschôbîn, Et Rekonstruktionsforsog*، کوپن ہیگن ۱۹۰۷ء)۔ بہرام نام کی اور بھی کچھ شخصیتیں گزری ہیں (Christensen: *Sassanides*، اشاریہ، بذیل مادّہ Vahrâm)۔

مآخذ: (۱) Christensen کی کتاب اس سے پہلی کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے، جن سے وہ اپنے حاشیوں کے لکھنے میں کام لیتا ہے اور ان سے نقل کرتا ہے۔ نظم میں تاریخ بہرام گور کے لیے دیکھیے: (۲) فردوسی: *Le Livre des Rois*، ترجمہ J. Mohl، ۱۸۷۸ء، ۵ : ۳۳۲ تا ۵۵۸؛ ۶ : ۱-۹۳؛ (۳) نظامی: ہفت پیکر، ترجمہ C.E. Wilson، لنڈن ۱۹۲۳ء؛ بہرام چوبین پر دیکھیے: (۴) فردوسی: وہی کتاب، ۶ : ۴۶۰ تا ۵۶۸، ۶ : ۱۱۹؛ (۵) ابھروان تصاویر کے عکس، در Dieulafoy: *L'art antique de la Perse*، پیرس ۱۸۸۴ء، جلد ۵؛ (۶) *Survey of Persian Art*، ۴، لوحہ ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۲؛ (۷) [الدینوری: الاخبار الطوال، بمدد اشاریہ بذیل مادہ]۔

([H. Massé ‹ J] Cl. Huart)

بہرام: ایک ارمنی عیسائی سپہ سالار، جو مصر میں فاطمیوں کا ملازم تھا اور ۵۲۹ھ/۱۱۳۵ء تا ۵۳۲ھ/۱۱۳۷ء سے خلیفہ الحافظ (۵۲۵ھ/۱۱۳۰ء تا ۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء) کا وزیر السّیف رہا۔

اس بات کا علم نہیں کہ وہ فاطمیوں کی ملازمت میں کن حالات میں اور کب داخل ہوا۔ پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی میں بہت سے ارمنی اس بنا پر مصر چلے گئے کہ یہاں کی وزارت کئی بار ارمنی الاصل وزیروں کے ہاتھ میں رہی، مثلاً بدرالجمالی (۴۶۶ھ/۱۰۷۴ء تا ۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء)، اس کا بیٹا الافضل (۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء تا ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء)، الافضل کا بیٹا (۵۲۵ھ/۱۱۳۰-۱۱۳۱ء) اور اس کا بیٹا یانس (۵۲۶ھ/۱۱۳۱-۱۱۳۲ء)۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں حالات کے تحت بہرام بھی مصر آیا ہو۔ روایت کی رو سے اس کا تعلق ایک ایسے علاقے سے تھا جہاں حلب کے شمال مشرق میں تل باشر نام کی ایک مشہور ارمنی نوآبادی قائم ہو چکی تھی۔ وہ خود تل باشر کا ایک رئیس تھا اور ایک انقلاب برپا ہو جانے کی وجہ سے اسے ملک چھوڑ کر باہر جانا پڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی شریف ارمنی خاندان سے تھا، جو اپنا سلسلۂ نسب پہلوونی Pahlavuni خاندان سے ملاتا تھا اور یہ کہ وہ

مصر کے ارمنی کیتھولک گریگوری کا بھائی تھا، جو مصر آ گیا تھا اور وہاں ۱۰۷۷ یا ۱۰۷۸ء میں ایک مذہبی عہدےدار ہو گیا تھا ۔ مختصر یہ کہ بہرام نے فوجی زندگی اختیار کی اور پہلے ایک ارمنی دستے کا کمانڈر اور اس کے بعد نیل کے ڈیلٹا کے مغربی صوبے الغربیہ کا گورنر مقرر ہوا .

خلیفہ کے بیٹوں حیدر اور حسن میں رقابت پیدا ہو گئی اور حسن نے وزیر کی حیثیت سے اقتدار حاصل کر لیا، تو ایک فوجی بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی۔ حسن اسے دبا نہیں سکا، اس لیے اس نے بہرام کو اپنی مدد کے لیے بلایا، لیکن جب بہرام اپنی ارمنی فوج لے کر پہنچا تو حسن قتل ہو چکا تھا ۔ اس کے باوجود کہ بہرام عیسائی تھا خلیفہ نے وزارت اس کے سپرد کر دی (جمادی الآخرہ ۵۲۹ھ/ مارچ ۱۱۳۵ء) یہ اہم بات ہے کہ ایک عیسائی وزیر السیف اور پورے قاہرہ کا واحد مالک ہو، اور سیف الاسلام اور تاج الدولہ اس کے القاب ہوں۔ بہرام کی اس جانب دارانہ روش کا ردِّ عمل کہ اس نے اپنے ہم وطنوں کو آزادی سے مصر میں آ کر بسنے کا موقع دیا اور انھیں اعلٰی عہدوں پر فائز کیا عوام پر اچھا نہیں ہوا اور الغربیہ کے گورنر رضوان کے تحت ایک فوجی بغاوت شروع ہو گئی۔ بہرام کی فوج کے مسلمان سپاہیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور بہرام کو قاہرہ سے بھاگنا پڑا (جمادی الاولٰی ۵۳۱ھ / فروری ۱۱۳۷ء) ۔ وہ وہاں سے قوص چلا گیا، جہاں اس کا بھائی واسک Vasak گورنر تھا، لیکن وہاں کے باشندے واسک کو پہلے ہی قتل کر چکے تھے۔ بہرام نے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لوگوں سے بڑی بے دردی سے لیا اور قوص چھوڑ کر چل دیا۔ رضوان نے، جو اس دوران میں وزیر ہو چکا تھا، ایک فوج اس کے تعاقب میں بھیجی، لیکن کچھ ایسا انتظام ہو گیا جس سے بلاشبہہ خلیفہ بھی بے خبر نہ تھا: بہرام کو اِخْمِیم کے قریب ایک خانقاہ میں عزلت گزیں ہونے کی اجازت دے دی گئی اور وہ ۵۳۳ھ / ۱۱۳۸، ۱۱۳۹ء تک وہاں رہا ۔ چونکہ خلیفہ رضوان سے ناراض تھا اس لیے اس نے بہرام کو، جو اس وقت بیمار تھا، دوبارہ قاہرہ بلایا اور اسے رضوان کی جگہ دے دی ۔ اس سے برابر مشورے لیتا تھا، لیکن اس مرتبہ اس نے اسے وزیر کا لقب نہیں دیا ۔ رضوان بھاگ جانے پر مجبور ہوا .

بہرام نے قصر شاہی میں ۲۲ ربیع الآخر ۵۳۵ھ / ۷ دسمبر ۱۱۴۰ء کو وفات پائی ۔ خلیفہ الحافظ کو اس کے مرنے کا بہت رنج ہوا اور وہ اس کے جنازے کے ساتھ ڈچ Ditch کی خانقاہ تک گیا، جو قاہرہ سے باہر تھی ۔ بہرام کو یہیں دفن کیا گیا .

مآخذ: (۱) ابن مُیَسَّر: *Ann. d'Egypte*، ص ۷۸ تا ۸۰، ۸۲ تا ۸۳؛ (۲) ابن القلانسی: تاریخ دمشق، ص ۲۶۲؛ (۳) ابن الاثیر، X. s. a.، ص ۲۰۱؛ (۴) ابوصالح: *Churches and Monasteries*، طبع و ترجمہ Evetts، ص ۹ الف، ۲۸ الف؛ (۵) ابن خلدون: کتاب العبر، ۴: ۷۲ تا ۷۳؛ (۶) ابن تَغْرِی بِرْدی، قاہرہ، ۵: ۲۲۹ تا ۲۳۰، ۲۴۲-۲۴۳ تا ۲۴۴؛ (۷) المقریزی، ۱: ۵۰، ۲۰۲، ۲: ۵۰۰؛ (۸) القلقشندی: صُبح الاعشٰی، ۹: ۳۵۴ تا ۳۹۳، ۸: ۲۹۰ تا ۲۹۲، ۱۳: ۲۲۲ تا ۲۲۳؛ (۹) السیوطی: حُسن المُحاضرۃ، مطبوعہ ۱۳۲۱ھ، ۲: ۱۲۱؛ (۱۰) *Michael the Syrian*، فرانسیسی ترجمہ از Chabot، ۳: ۲۳۰؛ (۱۱) Renaudot: *Historie des Patriarches d'Alexandrie*، ص ۵۰۰ تا ۵۰۷، ۵۰۹؛ (۱۲) Wüstenfeld: *Geschichte der Fatimiden*، ص ۳۰۷؛ (۱۳) S. Lane-Poole: *A History of Egypt in the Middle Ages*، ص ۱۶۸ تا ۱۶۹؛

(۱۴) G. Wiet : *Précis de l'Hist. d'Egypte*، ص ۱۹۲ تا ۱۹۳، ۲۲۷؛ (۱۵) وہی مصنّف : *L'Egypte arabe (Hist. de la nation égyptienne)*، ۳ : ۲۷۳ تا ۲۷۵؛ (۱۶) De Lacy O'Leary : *A short history of the Fatimid Khalifate*، ص ۲۲۳؛ (۱۷) حسن ابراہیم حسن : الفاطمیون فی مصر، ص ۱۹۲ تا ۲۱۷؛ (۱۸) M. Canard : *Un vizir chrétien à l'époque fatimite, l'Arménien Bahrām*، در AIEO، الجزائر ۱۹۵۴ء/۱۲ : ۸۴ تا ۱۱۳؛ (۱۹) وہی مصنّف : *Une lettre du calife fātimite al Hafiz ... à Roger II, Atti del Convegno Internazionale di Studi Ruggeriani*، Palermo ۱۹۵۵ء، ص ۱۲۶ ببعد؛ (۲۰) وہی مصنّف : *Notes sur les Arméniens en Egypte à l'époque fātimite*، در AIEO Algiers، ۱۳ (۱۹۵۵ء) : ۱۴۳ تا ۱۵۷.

(M. CANARD)

• **بہرام شاہ** : ابن طغرل شاہ سلجوقی کو اتابک مؤید الدین ریحان نے کرمان میں تخت پر بٹھایا، جو اس کے باپ کی وفات (۵۶۵ھ / ۱۱۷۰ء) کے بعد خالی ہو گیا تھا، لیکن تھوڑے ہی دن میں اسے اپنے بڑے بھائی ارسلان شاہ [ارک بان] کے حق میں تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس کے بعد دونوں بھائیوں میں جنگ ہوئی اور کبھی ایک اور کبھی دوسرے کو فتح حاصل ہوتی رہی، یہاں تک کہ بہرام شاہ نے ۵۷۰ھ/ ۱۱۷۴ - ۱۱۷۵ء میں وفات پائی.

مآخذ : (۱) افضل الدین کرمانی : بدائع الأزمان فی وقائع کرمان، طبع محمّد مہدی بیانی، تہران ۱۹۴۷ء، ص ۵۰ ببعد؛ (۲) Houtsma : *Receuil*، ۱ : ۳۰ ببعد؛ (۳) *ZDMG*، ۳۹ : ۳۷۸ ببعد.

(ادارہ)

⊗ **بہرام شاہ غزنوی** : یہ سلطان مسعود سوم (م ۵۰۸ھ/ ۱۱۱۴ - ۱۱۱۵ء) کا بیٹا اور ملک ارسلان [ارک بان] کا بھائی تھا۔ طبقات ناصری (کلکتہ ۱۸۶۴ء، ص ۲۳) میں اور عباس پرویز : از طاہریان تا مغول (۱ : ۵۰۹) میں اسے ملک ارسلان کا چچا لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ مؤخر الذکر کی ولدیت عثمان مختاری (م ۵۴۴ھ/ ۱۱۴۹ء) نے یوں لکھی ہے :

ابوالملوک ملک ارسلان بن مسعود
طرازِ ملکِ جہان پادشاہِ ملک طراز

(مخطوطۂ بانکی پور، ق ۷ ب)

اور بہرام شاہ کی ولدیت سنائی (م ۵۴۵ھ / ۱۱۵۰ء) نے یوں لکھی ہے :

شاه بہرام شاه بن مسعود
کہ بنازد بہ عدل او محمود

(حدیقہ، مطبوعۂ لکھنؤ، ص ۶۲۵)

متعدد تاریخوں (مثلاً روضة الصفا، لکھنؤ ۱۸۷۴ء، ۴ : ۹۹۷) میں بہرام شاہ کی والدہ کا نام مہد عراق (بنتِ جغری بیگ داؤد، م ۵۰۴ھ) لکھا ہے، جو غالباً صحیح نہیں ہے۔ وہ ملک ارسلان کی والدہ ضرور تھی جیسا کہ مسعود سعد سلمان (م ۵۱۵ھ/ ۱۱۲۱ء) نے اس کی مدح میں لکھا ہے:

تویی ز گوہرِ محمود و گوہرِ داؤد
کدام شاه نسب دارد از چنین دو نژاد

(دیوان مسعود، تہران، ص ۱۱۳)

لیکن اسی شاعر نے بہرام شاہ کے متعلق صرف محمودی نسب ظاہر کیا ہے:

گویند هفت کشور زیر نگین کند
شاہے ز اصل و نسل یمینی و این تویی.

(وہی کتاب، ص ۵۹۰)

اسی لیے جب بہرام شاہ نے سلطان سنجر سے امداد چاہی تو پہلے اسے ”بیگانہ“ ہی کہا گیا۔ آداب الحرب (مطبوعۂ لاہور، ص ۳۲)

میں ہے: ''امّا سلطان (سنجر) می اندیشید کہ اگر او (بہرام شاہ) را یاری دہد و سلطان ملک ارسلان را از تخت ملک بر کند مردمان زبان دراز کنند و گویند کہ بیگانہ را معونت فرمود و خویش و نزدیک را از مملکت دور کرد'' ۔ تاریخ فرشتہ (مطبوعۂ لکھنؤ ص ۴۸) میں ہے کہ سلطان ابراہیم نے مہد عراق کے ساتھ مسعود سوم کی شادی کے بعد ہندوستان کی طرف توجہ کی اور قلعہ اجودھن (پاک پٹن) فتح کیا ۔ ابن الأثیر نے اس فتح کی تاریخ ۲۰ صفر ۴۷۶ھ/ ۹ جولائی ۱۰۸۳ء لکھی ہے، یعنی اس سنہ سے پہلے وہ شادی ہوئی ہوگی ۔ ابن خلدون (۱۴ : ۲۴، اردو ترجمۂ احمد حسین) میں ہے کہ سلطان ملک شاہ سلجوقی کی ایک بیٹی کی شادی ۴۷۴ھ میں ہوئی تھی، چنانچہ خیال ہوتا ہے کہ سلطان ابراہیم کا سفیر سہتر رشید جو ملک شاہ کے یہاں مسعود سوم کی شادی کے سلسلے میں گیا ہوا تھا اس سے اس سنہ کے بعد ہی ملک شاہ نے کہا ہوگا کہ ''من دختر ندارم اما عمتے ہست مرا بہ عراق دختر چغریبگ داؤد'' (آداب الحرب، ق ۶۶ الف) ۔ اس لیے وہ شادی ۴۷۴ھ کے بعد اور ۴۷۶ھ سے پہلے، یعنی ۴۷۵ھ میں ہوئی ہوگی اور اس کے بعد ملک ارسلان پیدا ہوا ہوگا اور بہرام شاہ چونکہ اس سے چھوٹا تھا (گو کہ دوسری ماں سے تھا) اس لیے وہ اس کے بھی بعد پیدا ہوا ہوگا۔

مسعود سوم کے انتقال (شوال ۵۰۸ھ / مارچ ۱۱۱۵ء) پر اس کی وصیت کے مطابق اس کا بیٹا شیرزاد تخت نشین ہوا، لیکن اس کے بھائیوں نے خانہ جنگیاں شروع کر دیں، اس لیے وہ خود تو اسپہبد علاءالدولہ علی بن شہریار بن قارن باوندی کے پاس طبرستان چلا گیا اور اس کی اعانت سے حج کے لیے روانہ ہوگیا (ابن اسفندیار، ترجمۂ براؤن، ص ۵۸ تا ۵۹)، لیکن واپسی پر جب غزنہ پہنچا تو ملک ارسلان نے اسے قتل کرا دیا اور خود تخت نشین ہو گیا (طبقات ناصری، راورٹی، ص ۱۴۸) ۔ بہرام شاہ اس وقت تکین آباد میں تھا ۔ ملک ارسلان کی تخت نشینی (چہارشنبہ ۴ شوال ۵۰۹ھ / ۲۲ فروری ۱۱۱۶ء) پر مسعود سعد سلمان (دیوان، ص ۲۱۷ تا ۲۱۸) نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع یہ ہے :

بہ عون ایزد بشش روز رفتہ از شوّال
بر آمد از فلک دولت آفتاب کمال

بہرام شاہ تکین سے کرمان گیا ۔ وہاں ارسلان شاہ بن کرمان شاہ بن قاورد بن چغری بیگ داؤد نے (محمد بن ابراہیم: تواریخ آل سلجوق کرمان، ص ۲۰ تا ۲۲، مطبوعۂ برلن) اس کی بڑی قدر کی اور سنجر سے فوجی امداد کے لیے سفارش کی ۔ بہرام شاہ نے سنجر کو اپنے محاسن اخلاق و شجاعت سے بہت متاثر کیا ۔ آداب الحرب (ص ۳۲ تا ۴۴) کے بیان کے مطابق اس نے ایک مرتبہ ایک ہی تیر سے دو پرندوں کا شکار کیا جو اوپر نیچے اڑ رہے تھے ۔ سنجر نے اسے خلعت بخشا اور ایک لشکر جرّار کے ساتھ ۵۱۰ھ میں بہرام شاہ کو لے کر خود بھی غزنین کو روانہ ہوا ۔ بست کے مقام پر سیستان کا حاکم تاج الدین اور اس کا بھائی فخرالدین بھی ساتھ ہو گیا ۔ اس طرح خراسان اور سیستان کی فوجوں نے ملک ارسلان کی فوجوں کو شکست دی ۔ تاریخ ابوالخیر خانی (بانکی پور، ق ۱۳۶، الف) میں تاج الدین کے درباری شاعر خواجہ صاعد مستوفی کی ایک مثنوی اس واقعے کی یادگار ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے :

گفتی از صف کشیدہ پیل و گروہ
کوہ صحرا شدہ‌است و صحرا کوہ

عبدالواسع جبلی (م ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء) نے ایک طویل قصیدہ اس موقع پر لکھا تھا، جس کا مطلع یہ ہے :

چہ جرم است این برآوردہ سر از دریاے موج افگن

به کوه اندر دمان آتش به بحر اندر کشان دامن

ابن الاثیر (۱۰ : ۱۷۸، مصر ۱۳۰۳ھ) میں ہے کہ (یک شنبہ) ۲۰ شوال ۵۱۰ھ / ۲۵ فروری ۱۱۱۷ء کو سنجر غزنہ میں داخل ہوا اور بہرام شاہ کو تخت نشین کرا دیا۔ غزنوی سلاطین کے تمام خزانے سنجر نے حاصل کر لیے اور بہرام شاہ پر ایک ہزار دینار یومیہ خراج مقرر کیا۔ طبقات ناصری (راورٹی، ص ۱۰۹) میں ہے کہ سیّد حسن غزنوی نے ایک قصیدہ سنجر کی موجودگی میں پڑھا، جس کا مطلع یہ ہے:

منادی برآمد ز ہفت آسمان
کہ بہرام شاہ است شاہِ جہان

طبقات کے مترجم راورٹی (ص ۱۱۰، حاشیہ ۱) نے لکھا ہے کہ یہی شعر بہرام شاہ کے بعض سکّوں پر نقش تھا، جن میں ۵۱۴ھ کو اس کا پانچواں سال جلوس کہا گیا ہے۔

سنجر کی واپسی پر ملک ارسلان نے ہندوستان کی فوجوں کے ساتھ بہرام شاہ پر حملہ کیا اور وہ مقابلے کی تاب نہ لا کر قلعۂ بامیان میں چھپ گیا۔ پھر سنجر نے ۵۱۱ھ میں بلخ سے اس کی مدد کے لیے فوج بھیجی، جس نے ملک ارسلان کو قید کر لیا۔ بہرام شاہ نے کچھ عرصے کے بعد اسے رہا کر دیا، لیکن پھر بغاوت کے آثار دیکھ کر اسے قتل کر دیا۔ مسعودِ سعدِ سلمان (ص ۷۰ تا ۷۱) اور سنائی (حدیقہ، لکھنؤ، ص ۶۶۳ تا ۶۶۶) نے ان واقعات کو نقل کیا ہے۔ سیّد حسن (مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد ۴۵۱۴، ق ۱۲۴ ب - ۱۲۵ الف) کے اشعار میں بہرام شاہ کی ''کنیت'' اور ''القاب'' اس طرح آئے ہیں:

سلطان ابوالمظفر بہرام شہ علاء دنی و دین خسرو زمین و زمان اور یمین دولت و دین و امین ملت و ملک۔

سنائی اور سیّد حسن کے بیان کے مطابق بہرام شاہ کا عَلَم اپنے بزرگوں کی طرح اور عبّاسیوں کی تقلید میں سیاہ تھا (مخطوطۂ انڈیا آفس عدد ۹۳۱، ق ۱۱۰ ب)، (حدیقہ، مطبوعۂ بمبئی، ص ۳۴۰)۔ عَلَم میں شیر کی تصویر تھی اور ہلال بھی بنا ہوا تھا۔ بہرام شاہ کا چتر سیاہ تھا اور تاج سفید۔ مسعود سوم کی طرح (آداب الحرب، ص ۹) بہرام شاہ کے چتر میں باز کی تصویر تھی۔

بہرام شاہ کی تخت نشینی پر ملک ارسلان کا والیِ پنجاب محمد ابو حلیم باغی ہو گیا اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ بہرام شاہ نے فوج کشی کی اور لاہور میں اسے ۲۷ رمضان ۵۱۲ھ / ۱۱ مئی ۱۱۱۹ء کو گرفتار کر لیا (فرشتہ، ۵۰)، لیکن اس کی دانائی اور تجربہ کاری کی وجہ سے معاف کر دیا اور غزنہ کو واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد محمد ابوحلیم نے ناگور (سوالک، پنجاب) میں ایک قلعہ تعمیر کیا اور مختلف سرکش راجاؤں کو مطیع بنایا۔ اس وجہ سے غرور پیدا ہو گیا اور بہرام شاہ کے خلاف پھر اعلانِ بغاوت کر دیا۔ بہرام شاہ دوبارہ حملہ آور ہوا اور طولانی کشتیوں میں دریائے سیحون (سندھ) وغیرہ کو عبور کیا، جیسا کہ سنائی نے (حدیقہ، مطبوعۂ لکھنؤ، ص ۶۵۶ تا ۶۵۹) کہا ہے:

بر کرانِ آبہا از آسمان سیمائے او
بستہ کشتیہائے طولانی ز راہِ کہکشان

آداب الحرب (ص ۴۵ تا ۴۷) میں اس جنگ کی پوری تفصیل ہے۔ غالباً بیاس اور ستلج کے مخلوط چشمے ''نورنی'' یا اُچ [زکّ بان] کے قریب میدانِ کارزار تھا۔ محمد ابوحلیم اور اس کے بیٹے مارے گئے۔ ۵۱۳ھ کی خزاں (۲۱ ستمبر ۱۱۱۹ تا ۲۰ دسمبر ۱۱۱۹ء) میں یہ فتح حاصل ہوئی۔ پھر حسین ابن ابراہیم علوی پنجاب کا والی مقرر ہوا۔ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ بہرام شاہ کی تخت نشینی پر سنجر نے ایک ہزار دینار

یومیہ خراج مقرر کیا تھا، چونکہ یہ بہت زیادہ تھا لہذا ۵۲۹ھ/۱۱۳۴ - ۱۱۳۵ء) میں اس نے بند کر دیا۔ سنجر کو معلوم ہوا تو عازم غزنہ ہوا۔ بہرام شاہ بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر بمشکل معافی ہوئی اور ۵۳۰ھ میں سنجر نے دوبارہ غزنہ اس کے سپرد کر دیا (ابن الاثیر، ۱۱: ۱۱)۔ اس کے بعد غوریوں سے بہرام شاہ کی جنگیں چھڑیں۔ عزالدین حسین غوری، جسے مسعود سوم (غزنوی) نے غور کی گورنری دی تھی، اس کے بیٹوں میں سے قطب الدین محمد، جو "ملک الجبال" کے لقب سے مشہور ہوا، ۵۴۳ھ/۱۱۴۸ء میں غزنہ آیا۔ بہرام شاہ نے اپنی لڑکی سے اس کی شادی کر دی تو وہ تخت حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگا، چنانچہ ایک دن اسے زہر دے دیا گیا۔ اس کا بھائی سیف الدین سوری، جو اس کے ساتھ ہی ٹھہرا ہوا تھا، بھاگ کر فیروز کوہ (دارالحکومتِ غور) گیا اور اپنے دو بھائیوں (بہاء الدین سام اور علاء الدین حسین) کو لے کر غزنہ پر حملہ کر دیا۔ بہرام شاہ بھاگ کھڑا ہوا۔ سوری نے (ابن الاثیر، ۱۱: ۵۰) جمادی الاولیٰ ۵۴۳ھ/ستمبر ۱۱۴۸ء میں غزنہ پر قبضہ کر کے سلطان کا لقب اختیار کر لیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب اس کے دونوں بھائی اور غوریوں کی فوج واپس ہو گئی اور برف باری کا زمانہ آ گیا اور غور کی طرف کے راستے بند ہو گئے تو اہلِ غزنہ نے بہرام شاہ کو بلا بھیجا۔ وہ یکایک ایک رات حملہ آور ہوا اور نہ صرف سوری کو بلکہ اس کے وزیر کو بھی گرفتار کر کے سولی پر چڑھا دیا۔ سید حسن غزنوی نے اس موقع پر ایک قصیدہ لکھا تھا۔ یہ فتح ۲ محرم ۵۴۴ھ/ ۱۲ مئی ۱۱۴۹ء کو ہوئی، لیکن سوری کا بھائی علاء الدین حسین جب غور کا حاکم ہوا تو جلد ہی وہ ایک بڑی فوج لے کر حملہ آور ہوا اور بہرام شاہ کو شکستِ فاش دی۔ طبقات ناصری (راورٹی، ص ۳۵۰ تا ۳۵۹) وغیرہ میں اس جنگ کی اور غزنہ کی تباہی و بربادی کی تفصیل ملتی ہے۔ یہیں سے علاء الدین حسین کو "جہاں سوز" کا عرف ملا۔ یہ جنگ ۵۴۶ھ کے موسم سرما میں ہوئی ہوگی، جیسا کہ آداب الحرب (ص ۴۸ تا ۵۰) سے ظاہر ہوتا ہے۔ راحت الصدور (ص ۱۷۶) میں ہے کہ اس کے بعد علاء الدین حسین نے سنجر سے بدلہ لینے کا عزم کیا کیوں کہ اس نے بہرام شاہ کی مدد کی تھی۔ سنجر سے ہرات کے قریب اوبہ میں جنگ ہوئی اور علاء الدین گرفتار کر لیا گیا۔ آخر کار جب غز ترکوں سے سنجر کی جنگ ہوئی (۵۴۸ھ) تو اس سے کچھ پہلے وہ رہا کر دیا گیا۔ علاء الدین کی گرفتاری کے زمانے میں تقریباً ایک سال کے بعد ۵۴۷ھ میں بہرام شاہ پھر غزنہ واپس آیا۔

بانکی پور کی بعض قلمی تاریخوں میں، مثلاً تاریخ صدرِ جہاں (ق ۲۸۱ ب)، جنات الفردوس (۶۳ الف)، روضۃ الطاہرین (۱۶۳ الف)، لب التواریخ وغیرہ میں بہرام شاہ کی تاریخ وفات ۵۴۴ھ ہے، لیکن وہ غلط ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء میں اس نے پھر ایک مرتبہ غزنہ پر قبضہ کیا تھا۔ حدیقۂ سنائی کے مقدمے میں (جو سنائی کے شاگرد محمد بن علی الرقا نے لکھا تھا) بہرام شاہ کے متعلق دعائیہ کلمات "خلّد اللہ ملکہٗ" آئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت وہ زندہ تھا، لیکن اسی مقدمے میں امام برہان الدین علی غزنوی کو، جو بغداد میں تھے اور جن کے پاس سنائی نے حدیقہ بھیجا تھا، "رحمۃ اللہ علیہ" کہا گیا ہے۔ ان کا ذکر سید حسن کے اس ترجیع بند میں بھی آتا ہے (راحت الصدور، ص ۲۰۱ ببعد)، جو سنجر شاہ بن محمود بن محمد بن ملک شاہ کی تخت نشینی (۵۴۷ھ/ ۱۱۵۲ء) پر لکھا گیا تھا:

بر درِ بغداد گفتم خواجۂ برہانِ دین
کے ملک تا پنج مہ سلطان شوی اینک شود

بہر حال ۵۴۷ھ کے بعد بہرام شاہ ۵۵۲ھ تک زندہ رہا۔ راورٹی (ترجمۂ طبقات ناصری، ص ۱۱۲) نے بہرام شاہ کے بیٹے خسرو شاہ کے ایک سکّے کا ذکر کیا ہے جو ۵۵۲ھ کا ہے اور اس سنہ میں خسرو شاہ کا پہلا سال جلوس دکھایا گیا ہے۔

بہرام شاہ کے دربار میں بڑے بڑے شعرا اور اہلِ قلم جمع تھے: (۱) سید حسن غزنوی (م ۵۵۶ھ / ۱۱۶۰، ۱۱۶۱ء)؛ (۲) سنائی (م ۵۴۵ھ / ۱۱۵۰ء)؛ (۳) مسعودِ سعد سلمان (م ۵۱۵ھ / ۱۱۲۱ء)؛ (۴) ابوالمعالی نصراللہ (مترجم کلیہ و دِمنہ)؛ (۵) سید الشعراء ابوبکر بن محمد بن علی روحانی؛ (۶) محمد ابن ناصر علوی؛ (۷) حسن بن ناصر علوی؛ (۸) علی ابورجاغزنوی (م ۵۸۶ھ)؛ (۹) فخر الدین محمد بن محمود بن احمد نیشاپوری؛ (۱۰) محمد بن عثمان؛ (۱۱) سعد الدین مسعود؛ (۱۲) شمس الدین مبارک شاہ (لباب الالباب، ۲ : ۲۸۶، ۲۹۱ تا ۳۴۸)۔ طبقات ناصری (راورٹی، ص ۱۱۱) میں بہرام شاہ کے دس بیٹوں کے نام ملتے ہیں۔

وزرا میں ایک ابو محمد حسن بن ابو (نصر) منصور قائنی تھا (حبیب السیر، جلد ۲، حصہ ۴ : ص ۳۴)، جس کے متعلق سیّد حسن کے مختلف اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابو محمد حسن بن ابو نصر منصور بن سعید بن احمد بن حسن میمندی تھا۔ ۵۲۴ھ میں جب حدیقہ لکھا گیا تو اس میں (ص ۷۴۳، مطبوعہ لکھنؤ) اسے ''نائب دستور'' کہا گیا ہے۔ غالباً اس (حسین بن ابراہیم علوی) کے بعد وہ ہندوستان میں رہا، کیونکہ سیّد حسن نے اس کی مدح میں ابتدا اس طرح کی ہے:

عمرے مرا ہوائے لہاوور بودہ بود
ہمت برآن سعادت مقصور بودہ بود

(مخطوطہ، انڈیا آفس، عدد ۹۲۱، ق ۳۹، الف)

وزرا میں عبدالحمید (بن احمد بن عبدالصمد) کے بعد احمد اور پھر غالباً اسی احمد کا بیٹا قوام الدین حسن بن احمد بن حسین وزیر ہوا، جو ۵۴۴ھ / ۱۱۴۹ء) تک اس عہدے پر فائز رہا کیونکہ اس سال جب بہرام شاہ نے سیف الدین سوری سے غزنہ کا تخت واپس لیا تھا تو اس وزیر کی مدح میں سید حسن نے قصیدہ لکھا تھا، جس میں ایک شعر یہ تھا:

بس چشم شور و روے ترش بود منتظر
تا چشم شان سپید شد و روے شان سیاہ

(وہی مخطوطہ، ق ۷۴ ب)

حسن بن احمد کے بعد اس کا بیٹا حسین وزیر ہوا۔ اسی شاعر نے کہا:

فرزانہ حسینِ حسنِ احمدِ خاصہ
آن کردہ خدایش ز ہمہ خلق خلاصہ

(وہی مخطوطہ، ق ۴۴ الف)

روحانی کے سوگندنامہ (مونس الاحرار، ص ۲۱۰ تا ۲۱۵، کتبخانہ حبیب گنج) میں بھی اسی وزیر کا ذکر آتا ہے اور غالباً یہ آخری وزیر تھا۔

مآخذ: (۱) سنائی: حدیقہ، لکھنؤ ۱۳۰۴ھ، ص ۶۲۵، ۶۲۶ تا ۶۲۸، ۶۳۸ تا ۶۴۱، ۶۵۶ تا ۶۵۹، ۶۶۳ تا ۶۶۶؛ (۲) طبقات ناصری، کلکتہ ۱۸۶۴ء، ص ۲۲ تا ۲۴؛ (۳) طبقات ناصری، (مترجمۂ راورٹی، کلکتہ ۱۸۸۱ء، ص ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۳۸، ۳۴۷ تا ۳۵۰، ۳۵۸ تا ۳۶۱، ۴۲۲ تا ۴۲۸؛ (۴) عباس پرویز: از طاہریان تا مغول، تہران، ۱ : ۵۰۹؛ (۵) تاریخ فرشتہ، لکھنؤ ۱۲۸۱ھ، ص ۴۹ تا ۵۰، ۵۵؛ (۶) ابن الاثیر (قاہرہ ۱۳۰۳ھ)، ۱۰ : ۳۶، ۵۱، ۵۷، ۱۲۷، ۱۲۸ تا ۱۲۹، ۱۱ : ۵۱، ۵۷، ۹۲؛ (۷) فخر مدبّر: آداب الحرب، در ضمیمۂ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، مئی ۱۹۳۸ء، ص ۷، ۸، ۲۴، ۳۱ تا ۳۳، ۴۴ تا ۴۸، ۵۱، ۵۳، ۵۸؛ (۸) راوندی: راحت الصدور، (گب میموریل)، لنڈن

۱۹۲۱ء، ص ۱۶۸، ۱۷۵، ۲۰۱؛ (۹) حبیب السیر، بمبئی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء، جلد ۲، جزء ۴: ص ۳۳؛ (۱۰) سید حسن غزنوی: دیوان (مخطوطۂ انڈیا آفس، عدد ۹۳۱)، اوراق: ۸ ب، ۲۰ ب، ۲۱ ب، ۲۴ الف، ۲۸ ب، ۳۶ الف، ۴۳ الف تا ۴۴ الف، ۴۸ الف، ۵۳ الف، ۶۹ ب تا ۷۰ الف، ۷۳ الف تا ۷۵ الف، ۸۱ الف، ۸۳ الف، ۸۸ ب، ۹۵ الف، ۱۱۰، ۱۱۱ ب، ۱۱۲ الف، ۱۱۴ الف، ۱۱۵ ب تا ۱۱۶ الف، ۱۱۷ الف، ۱۲۸ ب، ۱۳۲ الف، ۱۵۸ الف ـ ب؛ (۱۱) احمد بن محمد کلاتی: مونس الاحرار (مخطوطۂ کتبخانہ حبیب گنج)، ص ۲۰۰ تا ۲۱۵، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۹۱، ۳۰۷ تا ۳۴۷؛ (۱۲) فیض اللہ بنبانی: تاریخ صدر جہان (مخطوطۂ کتبخانہ بانکی پور) ق ۲۸۱ ب؛ (۱۳) طاہر محمد ابن عماد الدین حسن: روضۃ الطاہرین (مخطوطۂ کتبخانہ بانکی پور) ق ۱۶۲ ب، ۱۶۳ الف؛ (۱۴) محمد یوسف کتمانی: منتخب التواریخ (مخطوطۂ کتبخانہ بانکی پور)، ق ۳۱۶ الف، ۳۱۸ ب؛ (۱۵) یحیٰی قزوینی: لب التواریخ (مخطوطۂ کتبخانہ بانکی پور)۔

(غلام مصطفیٰ)

بہرام شاہ: الملک الامجد [مجدالدین] بن فرخ [=فرّوخ] شاہ بن شاہنشاہ بن ایوب، [سلطان] صلاح الدین کے بھانجے یا بھتیجے کا بیٹا۔ صلاح الدین نے اس کے والد کی وفات کے بعد اسے ۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء میں بعلبک میں اس کا جانشین بنایا (عماد الدین الاصفہانی: البرق الشامی، مخطوطۂ بوڈلین، مجموعۂ مارش، عدد ۴۲۵، ورق ۳۶ راست، جس کا ابو شامہ: روضتین، بار اول، قاہرہ، ص ۳۲ تا ۳۴ نے اتباع کیا ہے)۔ صلاح الدین ایوبی کی وفات کے بعد جب اس کی مملکت تقسیم ہوئی تو بعلبک بہرام شاہ ہی کے پاس رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد سے برابر وہ دمشق کی ایوبی سلطنت کا وفادار باج گزار رہا (ابن واصل: مفرّج [الکروب]، سال ۵۹۹، ۳ [illegible] ۶۱۸ [illegible] ۶۲۳ھ)، لیکن آخری عمر میں اسے بعض دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا، جنھیں بانیاس کے الملک العزیز عثمان بن الملک العادل کی جاہ طلبی نے ابھارا تھا۔ دمشق کے الناصر داؤد نے ان دشمنوں کے خلاف اس کی مدد کی، مگر جب الملک الکامل اور الملک الاشرف نے داؤد سے دمشق چھین لینے کی خاطر اپنے جھگڑے طے کر لیے تو اس کا خمیازہ بہرام شاہ کو بھگتنا پڑا۔ دس مہینے تک بعلبک کا محاصرہ کرنے کے بعد الاشرف نے اسے اپنی مملکت میں شامل کر لیا اور بہرام شاہ دمشق چلا گیا (۶۲۶ھ/۱۲۲۸-۱۲۲۹ء)۔ اس سے اگلے سال ایک غلام نے، جو اس سے عناد رکھتا تھا، اسے قتل کر دیا (ابن واصل: ۶۲۶ھ تا ۶۲۷ھ؛ سبط ابن الجوزی: مرآۃ الزمان، طبع Jewett، ص ۴۴۱)، [نیز قب فوات الوفیات، ۱: ۱۰۵؛ البدایۃ و النہایۃ، ۱۳: ۱۳۱]۔

اپنے ہم عصروں میں بہرام شاہ اپنے بادشاہ ہونے کی وجہ سے اتنا مشہور نہیں تھا جتنا ایوبیوں میں ایک ممتاز ادیب اور عالم ہونے کی حیثیت سے۔ اس نے عالموں فاضلوں کی ایک چھوٹی سی مجلس قائم کر رکھی تھی اور صاحب دیوان شاعر تھا۔ یہ دیوان محفوظ ہے، لیکن شائع نہیں ہوا (J. Rikabi: *La poésie profane sous les Ayyubides*، ص ۲۲۱ اور حاشیہ ۴) [ابن کثیر اور ابن شاکر نے شعروں کے نمونے درج کیے ہیں]۔

مآخذ: [(۱) ابن شاکر: فوات الوفیات (طبع محمد محی الدین عبدالحمید)، مصر، ۱: ۱۰۵؛ (۲) ابن کثیر: البدایۃ و النہایۃ، مکتبۃ المعارف، بیروت ۱۹۶۶ء، ۱۳: ۱۳۱؛ (۳) ابن العماد: شذرات الذہب، ۵: ۱۲۶؛] (۴) ثانوی مآخذ کے لیے قب مقالہ ایوبیہ (= بنو ایوب) جدید تصانیف؛ (۵) H. Gottschalk: الملک الکامل، ۳: ۲۰۹ تا ۲۳۰، مع حواشی۔

(CL. CAHEN [و ادارہ])

- **بہر سیر** : [= بہ اَرْدشیر] رَكْ بہ المدائن.

- **بہروز** : (امیر)، امیر رستم کا فرزند اور اسی کی طرح دُنبلی Donboli کا امیر تھا - اُس نے صفویہ کے وفادار حلیف کی حیثیت سے شاہ طہماسپ اور سلطان سُلیمٰن قانونی کے درمیان ۹۴۵ھ / ۱۵۳۸ء کی جنگ میں حصہ لیا - اس کی وفات نوّے سال کی عمر میں ۹۸۵ھ / ۱۵۷۷ء میں ہوئی - وہ پچاس سال بر سرِ اقتدار رہا - اس کا لقب سُلیمٰن خلیفہ تھا.

(B. NIKITINE)

- **بہروز خان** : بن تہمتندر خان، امیر دُنبلی - وہ سلیمٰن خان الثانی کے نام سے معروف تھا - سلطان مراد کے آذربیجان پر حملے کے وقت اس نے شاہ صفی کی فوج میں نام پیدا کیا - وہ ۱۰۴۱ھ / ۱۶۳۱-۱۶۳۲ء میں فوت ہوا.

مآخذ : (۱) زکی M. E. Zaki : مشاہیر الکرد و کردستان، ص ۱۴۴ ؛ (۲) تاریخ الدّول و الامارۃ الکردیۃ، ص ۳۸۶، ۳۸۷.

(B. NIKITINE)

- **بہزاد** : استاد کمال الدین بہزاد، ایران کا سب سے مشہور میناتوری مصوّر.

بہزاد کی ان فنی تخلیقات کی بنا پر جو اس وقت موجود ہیں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کی پیدائش ۸۵۴ھ / ۱۴۵۰ء اور ۸۶۵ھ / ۱۴۶۰ء کے درمیان ہوئی تھی [سال پیدائش کی مزید بحث کے لیے اس مقالے کا تعلیقہ دیکھیے جو آگے آ رہا ہے] - میرزا محمد حیدر دوغلات [: تاریخ رشیدی]، دوست محمد [: حالات ہنروران] اور قاضی احمد [: گلستان ہنر] اسے امیر روح اللہ المعروف میرک نقّاش ہراتی کا شاگرد بتاتے ہیں، جو سلطان حسین بایقرا کا کتاب دار تھا - میرک نے اس کی بحالت یتیمی پرورش کی تھی، مگر فنون میں، ترک مؤرخ مصطفٰی عالی کہتا ہے کہ، اس کا استاد پیر سید احمد تبریزی تھا [نیز دیکھیے تعلیقہ] - پھر جہانگیر لکھتا ہے کہ بہزاد نے ایک فنکو خلیل میرزا [شاہرخی] کی طرز میں مصوّری کی (تُوزک جہانگیری [طبع سیّد احمد خان، ص ۲۸۵] ترجمہ از Rogers و Beveridge، ۲ : ۱۰۲) - بہزاد کی ہنروری کا اعتراف قدر شناسوں نے بہت جلد کیا اور اپنے پہلے سرپرست میر علی شیر نوائی اور ۸۹۳ھ / ۱۴۸۸ء سے کچھ پہلے سے لے کر بعد کے زمانے تک تیموری سلطان حسین بایقرا کی عنایت سے اسے تخلیقی صلاحیت کے بہت زیادہ مواقع میسّر آئے - سلطان حسین کا دربار، جو ہرات میں تھا، اس زمانے کے منتخب روزگار علما و فضلا اور فنکروں سے معمور تھا اور نوائی، جامی اور خواند امیر اس بزم کے گویا صدر نشین تھے - محمّد خان شیبانی کے ہاتھوں اس خاندان کی تباہی (۱۵۰۷ء) کے بعد بھی بہزاد ہرات ہی میں مقیم رہا - [اس سلطان کے بارے میں، مذمت کے انداز میں] بابر کہتا ہے کہ یہ سلطان قلم لے کر اپنے زعم میں بہزاد کی تصویروں کی اصلاح کرتا - بعد میں شاہ اسمٰعیل صفوی نے جب ہرات کو فتح کر لیا تو بہزاد اس کے ساتھ تبریز چلا گیا، جو صفویوں کا دارالحکومت تھا - شاہ اسمٰعیل بہزاد پر بڑا لطف و کرم کرتا تھا، اس کا ثبوت عالی مصطفٰی کی اس روایت سے ملتا ہے جو اس نے شاہ اسمٰعیل کے متعلق بیان کی ہے - روایت یہ ہے کہ سلطان سلیم اوّل کے خلاف ۱۵۱۴ء کی مہم میں [جنگ چالداران کے موقع پر] شاہ کو بہزاد کے متعلّق بڑی تشویش رہی - مزید ثبوت یہ ہے کہ ۲۷ جمادی الاولٰی ۹۲۸ھ / ۱۵۲۲ء کو اسے شاہی کتابخانے کے کتاب دار [کلانتر] کا منصب عطا ہوا [نامۂ نامی، مخطوطۂ جامعہ پنجاب میں فرمان کی تاریخ ۹۲۸ھ ہے] اور ساتھ ہی کتابخانۂ شاہی کے ملازموں اور ممالک محروسہ کے تمام کاتبوں، نقّاشوں، مذہّبوں،

جدول کشوں، حل کاروں، زر کوبوں اور لاجوردشوہوں وغیرہ کی کلانتری بھی اسی کے سپرد کر دی گئی۔ یہ دستاویز قاضی احمد کے اس بیان کی تردید کرتی ہے کہ بہزاد شاہ طہماسپ (۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء) کے اوائل حکومت تک ہرات ہی میں مقیم رہا۔ شاہ طہماسپ کے عہد میں بھی بہزاد کو بہت سے اعزاز ملے، وہ سلطان محمد اور آقا میرک کے ساتھ شاہی کتب خانے میں کام کرتا رہا۔ سلطان محمد (فخری بن امیری) : لطائف نامہ، تقریباً ۹۲۷ھ/ ۱۵۲۰ء، نسخۂ موزۂ بریطانیہ، عدد ۷۶۶۹ .Add، ورق ۹۸ [نیز طبع اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۳۲ء، ص ۲۵۵] میں ایک قصہ مذکور ہے، جس سے بڑھاپے میں بہزاد کے فنی طریق کار کا حال معلوم ہوتا ہے : اس نے درویش محمد نقاش خراسانی کو، جو ترک تھا [قب مجالس النفائس، طبع علی اصغر حکمت، تہران ۱۳۲۳ ھش، ص ۱۵۴، جو ''ترکیت'' بھی رکھتا تھا] اور اس کے لیے رنگ تیار کیا کرتا تھا، اپنا شاگرد بنا لیا اور اس کی تربیت کی اور آخر اپنے کام اس کے سپرد کرنے لگا [مذکورہ نسخۂ حکمت : ''و در اندک فرصتے کامل شد''، ''حالا استاد، کار خود باو رجوع می کند'']۔ حیدر میرزا [: تاریخ رشیدی] اس کے دوسرے شاگردوں، یعنی شبیہ نگار قاسم علی، مقصود اور ملّا یوسف کا ذکر کرتا ہے، اسی طرح مصطفی عالی نے [مناقب ہنروران] شیخ زادۂ خراسانی اور آقا میرک کا ذکر کیا ہے۔ مزید براں قاضی احمد [گلستان ہنر] نے دوست دیوانہ اور مصور مظفر علی کے والد کا تذکرہ کیا ہے اور بہزاد کو یاری [محمد] مُذَہّب ہراتی کا ہمعصر بتایا ہے اور اس کی تائید اس واقعے سے ہوتی ہے کہ ان دونوں نے مل کر ۸۹۳ھ کے نسخۂ بوستان پر، جو قاہرہ میں ہے، کام کیا تھا (دیکھیے نیچے)۔ قاضی احمد [: گلستانِ ہنر] نے درویش اور قاسم علی کا زمانہ بہزاد سے ذرا پہلے مقرر کیا ہے، جس سے استادی و شاگردی کا تعلق مشکوک ہو جاتا ہے۔ اخیر میں اسکندر منشی (عالم آرای، ص ۱۲۷) کہتا ہے کہ مظفر علی اس کے شاگردوں میں سے تھا۔ امیر دوست محمد ہاشمی کے بیان کردہ مادۂ تاریخ [''خاکِ قبر بہزاد''] کی رو سے بہزاد کا سنہ وفات ۹۴۲ھ/۱۵۳۵-۱۵۳۶ء ہے (مقدمۂ دوست محمد [حالاتِ ہنروران] بر مرقع بہرام میرزا) اور وہ تبریز میں [فارسی کے معروف] شاعر شیخ کمال خُجندی کے پہلو میں مدفون ہوا۔ دوسری روایت کے مطابق وہ اس سے ایک دو سال پہلے ۹۴۰ھ/۱۵۳۳-۱۵۳۴ء میں فوت ہوا۔ ایک اور روایت کی رُو سے، جو قاضی احمد [: گلستانِ ہنر] سے مروی ہے، بہزاد ہرات میں فوت ہوا اور اسے کوہ مختار کے قرب و جوار میں تصاویر اور نقش و نگار سے آراستہ ایک احاطے میں دفن کیا گیا۔ استانبول کے کتاب خانۂ یلدز میں اس کی میناتوری شبیہ [جو شاید خیالی ہے] موجود ہے، جس میں سن رسیدہ بہزاد کو صفوی لباس میں سادہ اور بظاہر ایک شرمیلا سا آدمی دکھایا گیا ہے (A. Sakisian : *La miniature persane*، پیرس و برسلز ۱۹۲۹ء، شکل ۱۳۰)۔

فن کار کی حیثیت سے بہزاد کے متعلق ہماری آگاہی کے لیے قدیم تر ماخذ بہت کم معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ تاہم وہ اسے اپنے عہد کا عظیم ترین فنکار سمجھتے اور بے حد تعریف کرتے ہیں، مثلاً خواند امیر اپنی مبالغہ آمیز زبان میں اس کی انتہائی نفاست، کمال راسخ، اور جیتی جاگتی شبیہ بنانے کی قوت پر بہت زور دیتا ہے۔ حیدر میرزا اس کا موازنہ اوّل تو اس کے استاد میرک سے کرتا ہے، جس کے فن میں پختگی تو زیادہ مگر نفاست نسبۃً کم ہے، اور پھر شاہ مظفر سے مقابلہ کرتا ہے، جس کی [بہ حیثیت فن کار] عزت و تکریم اس کے برابر برابر

تھی اور بہزاد کو اس پر قلم کی گرفت، خاکہ کشی اور صورتگری میں فوقیت حاصل تھی، اگرچہ وہ اس کی سی نفاست و نزاکت حاصل نہ کر سکا۔ قاضی احمد اس کے احساس تناسب پر زور دیتا ہے اور پرندوں کی تصویر بنانے میں اس کے کمال کا ذکر کرتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ وہ کوئلے سے خاکہ کشی میں بڑا مشّاق تھا۔ بابر اس کے فن کی تعریف میں کہتا ہے کہ وہ بڑا ہی 'نازک قلم' ہے، اور خصوصاً اس امر پر زور دیتا ہے کہ اس نے با ریش چہروں کی تصویریں تو قابلِ تحسین بنائی ہیں مگر اس کی بے ریش تصویریں اتنی اچھی نہیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس نے غبغب کی لمبائی میں مبالغے سے کام لیا ہے۔ بابر کے جانشین بھی اس کے مدّاحوں میں سے تھے اور اپنے کتب خانوں کے لیے اس کے فن پاروں کو حاصل کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ وہ عموماً ان قیمتوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو انھوں نے [مختلف فن پاروں کے سلسلے میں] ادا کیں (تین ہزار سے پانچ ہزار روپے تک)۔ لیکن بہزاد کے فن پاروں کی بڑی تعداد پہلے ہی جمع ہو چکی تھی اور اس کی کچھ تصویریں صفوی امیر سلطان ابراہیم میرزا (م ۹۸۴ھ/ ۱۵۷۶-۱۵۷۷ء) کے مرقّع (البم) میں شامل ہو چکی تھیں۔ جہانگیر پہلا ہنرشناس تھا جس نے یہ کہا (جیسا کہ کسی اور موقع پر بھی ذکر آیا ہے) کہ بہزاد جنگی مناظر کی تصویر کشی میں خاص طور پر ممتاز تھا۔ بہزاد کو جو عظمت حاصل تھی اس کی وجہ سے اس کا نام انجام کار ضرب المثل بن گیا۔ خواند امیر کی رائے میں اسے مانی کی صف میں رکھنا چاہیے جس کے شاہکار بے عدیل ہیں۔ قاضی احمد مزید غلو سے کام لیتے ہوئے کہتا ہے: "اگر مانی بہزاد کے زمانے میں ہوتا تو وہ بھی اس کی نقالی کرتا"۔ لیکن [مصطفٰی] عالی اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ بہزاد کی کامیابی کسی حد تک اس کے سرپرستوں کے اثر و رسوخ کی رہینِ منّت تھی؛ مگر یہ بھی واضح ہے کہ اس کے خلاف کچھ رقابتیں بھی کام کر رہی تھیں۔ اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ صفوی سلطان سام میرزا نے تحفۂ سامی میں ایرانی نقّاشوں اور کاتبوں کا جو تذکرہ کیا ہے اس میں بہزاد کو اس کے شایانِ شان مقام نہیں دیا گیا (ایم۔ محفوظ الحق: *Persian Painters, illuminators and Calligraphers, etc. in the 16th century, A. D.*، در *Journal and Proceedings, Asiatic Society of Bengal, New Series*، جلد ۲۸، ۱۹۳۲ء، ص ۲۳۹ تا ۲۴۲).

جدید تحقیق زیادہ تر بہزاد کے اصلی فن پاروں کی شناخت ہی سے سروکار رکھتی ہے اور اسے ایک حد تک کامیابی بھی نصیب ہوئی ہے، بالخصوص ۱۹۳۱ء سے، جب لنڈن میں ایرانی فن کی نمائش منعقد ہوئی، جس میں ان تصاویر کی اچھی خاصی تعداد جمع کر دی گئی تھی جو بہزاد سے منسوب کی جاتی ہیں۔ تاہم بہزاد کی فنکارانہ عظمت اور اس کے فن کے امتیازی اوصاف کا قطعی طور پر تعین اس لیے نہیں ہو سکتا کہ ابھی فن پاروں کی خاصی بڑی تعداد کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ ان میں سے کتنے اس کے ہیں اور کتنے اس کے پیشروؤں اور معاصرین کے ہیں۔ یہ مسئلہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ اُلجھ گیا ہے کہ بہزاد کی [غیر معمولی] شہرت کی بنا پر اس کے دستخطوں کو صدیوں تک جعلی طور پر مینا توری تصاویر (miniatures) پر ثبت کر دیا جاتا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا مالی منفعت کی خاطر کیا جاتا ہو یا کسی جمع کنندہ کے لیے ایک مشہور مصوّر کی طرف منسوب کوئی ورق مہیا کرنے کی غرض سے ہو، یا پھر اس کے فن پاروں کی اس کے دستخطوں سمیت کلّی یا جزوی طور پر نقل

تیار کی گئی ہو ، یا اس کی وفات کے بعد ان کی تکمیل یا تجدید کی گئی ہو ۔

بہزاد کے فن کے متعلق ہماری قطعی معلومات کی اساس اس مخطوطۂ بوستان کی تصاویر پر ہے جو ہرات میں رجب ۸۹۳ھ/ جون ۱۴۸۸ء میں مکمل ہوا اور مصری کتب خانۂ قومی قاہرہ میں موجود ہے۔ یہ نسخہ سلطان علی کاتب نے سلطان حسین بایقرا کے لیے لکھا تھا، اس کی مذہب کاری [محمد] نے کی تھی اور اس میں سرورق پر دو صفحوں کی ایک تصویر (جس پر اب دستخط مٹ چکے ہیں) اور [اندر] چار یک صفحی تصویریں ہیں، جن پر ۸۹۳ اور ۸۹۴ھ کی تاریخیں مرقوم ہیں۔ ان میں سے آخری دو تصویروں میں بہزاد کا نام عمارتی آرائش میں موجود ہے۔ لہٰذا ممکن نہیں کہ یہ اضافہ بعد کا ہو اور دوسرے دو دستخط ایسے بے واضح مقام پر اور ایسے سادہ انداز میں ہیں کہ وہ بھی اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ چھ تصویریں چونکہ ایک ہی طرز اور یکساں معیار کی حامل ہیں، لہٰذا انھیں قریب قریب متفقہ طور پر اس استاد کی مستند تخلیقات تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یہ تصویری طرز کے کمال کا اظہار کرتی ہیں۔ یہ تصویریں بڑی ہنرمندی سے اور ہم آہنگی کے ساتھ بنائی گئی ہیں، جس میں متن کی ان عبارتوں کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے جو بیچ بیچ میں آ گئی ہیں۔ اشخاص کی شبیہوں کو، جو زیادہ بڑی نہیں ہیں، حدود تصویر کے اندر اس زمانے کے تخیلات کے مطابق مناسب و موزوں مقامات میں خوبی کے ساتھ ادھر ادھر پھیلا دیا گیا ہے۔ خوش نما رنگوں کا بڑا تنوع ہے اور انھیں بہت ترقی یافتہ انوکھے طریقوں سے استعمال کیا گیا ہے۔ ان تصویروں سے منکشف ہوتا ہے کہ بہزاد بظاہر مجموعی طور پر ٹھنڈے رنگوں، مثلاً نیلے اور سبز کو ترجیح دیتا تھا، خصوصاً اندرونی مناظر میں، لیکن ان کا توازن ہمیشہ ان کے جوڑ کے گرم رنگوں خصوصاً شوخ نارنجی رنگ سے کیا گیا ہے۔ خاکے کی سادہ وحدانی مجموعی تصویر بڑے حسن انداز سے موزوں بنتی تھی، جس کی تکمیل بڑے کمال کے ساتھ کی گئی ہے۔ درختوں کی شگوفہ دار شاخوں پر نقش و نگار کشی کے نہایت مرصّع نمونوں اور قالینوں کے نقشوں سے فنکار کی تزئینی حس اور لطافت طبع کا خاص طور سے پتا چلتا ہے۔ بہ ایں ہمہ ان کی واقعہ نگاری انھیں عہد ماضی کی تصاویر سے ممیز کرتی ہے۔ یہ بات اس صورت گری سے واضح ہو جاتی ہے جو خالصۃً درباری طرز کی نہیں اور نہ اصلی طور پر بادشاہوں کے شجاعانہ کارناموں اور ان کے عشق و محبت ہی کے لیے مخصوص ہے، بلکہ اس میں روزمرّہ کے واقعات کو بھی اسی سطح پر دکھایا گیا ہے (مثلاً کسی مے خوار بادشاہ کی عجیب و غریب حرکات، مسجد میں وضو، اور چراگاہ میں گھوڑیوں کا اپنے بچھیروں کو دودھ پلانا وغیرہ)۔ نیز اس میں معاشرتی تعلقات سے کمتر درجے کے اشخاص کے افعال کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے (مثلاً دربان گھر میں داخل ہونے والے کسی غیر شخص کو سزا دیتے ہوئے یا ملازم کھانا لاتے ہوئے یا کسان کام کاج کرتے ہوئے وغیرہ وغیرہ)۔ اس کے علاوہ یہ تصویریں محض مثالی نمونے پر مصنوعی چہروں والی کٹھ پتلیاں نہیں ہیں، بلکہ ان میں انفرادیت پیدا کر دی گئی ہے اور انھیں بالعموم اضطراری حرکات سے معمور یا ڈرامائی حرکتوں کے احساس کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ انھیں جب سکون کی حالت میں دکھایا گیا ہے تب بھی ان کا رویہ فطری ہے۔

چونکہ بہزاد سے منسوب کسی دوسرے مرقعے کے بارے میں قابل اعتماد دستخط نہیں ہیں [لیکن رک بہ تعلیقہ] کو ان میں سے بعض کو سولھویں صدی عیسوی کے نصف اول سے اس کی طرف منسوب

کیا جاتا رہا ہے، اس لیے صرف ان کا طرز ہی (یعنی تزئینی اور حقیقت پسندانہ صفات کا عجیب امتزاج) اس کی دوسری اصلی تصاویر کی طرف ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس کام میں کسی قدر مزید مدد اس سے مل جاتی ہے کہ اس عہد میں لوح نقش ساز (stencil) سے نقشی کرنے کا رواج تھا، اور اس طرح بعض ان شکلوں کا چربہ جو بہزاد کی کسی مستند تصویر کی سمجھی جاتی تھیں دوسری نسبۃً زیادہ مشکوک تصویروں میں اتار لیا جاتا تھا اگرچہ یہ عمل ایک طالب علم بھی کر سکتا تھا۔ بدقسمتی سے ہمیں چونکہ بہزاد کی ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء سے پہلے اور ۹۰۶ھ / ۱۵۰۰ء کے بعد کی تصاویر کے متعلق فی الحال کچھ علم نہیں ہے، [لیکن دیکھیے تعلیقہ]، لہٰذا ہم اس استاد کے زمانۂ شباب و پیری کے تخلیقی عمل کے بارے میں بھی شک میں ہیں۔ اتنے شبہات کے ہوتے ہوئے علما کا بعض انتسابات کے متعلق اتفاق رائے نہ رکھنا فطری امر ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر مفصلہ ذیل فن پارے سب کے سب خود اس استاد کے نہ بھی ہوں تب بھی کم از کم وہ اس کے دبستان کے ضرور ہیں۔

(۱) میر علی شیر نوائی: خمسہ، مؤرخہ ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء، مرقومہ برائے بدیع الزمان بن سلطان حسین بایقرا، ۴ جلدوں میں، در کتاب خانۂ Bodleian (مخطوطات ایلیٹ Elliot عدد ۲۸۷، ۳۰۸، ۳۱۷، ۳۳۹) اور ایک جلد در کتب خانۂ John Rylands، مانچسٹر (ترکی مخطوطہ ۳)۔ (۲) امیر خسرو دہلوی: خمسہ، جسے محمد بن ازہر نے ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں لکھا [اس میں] چار تصویریں بہزاد کی طرز سے بہت ملتی جلتی ہیں (مارٹن F. R. Martin: *Les miniatures de Behzad dans un manuscrit persan, date 1485*، میونخ ۱۹۱۲ء، لوح ۹، ۱۶، ۱۸ و ۲۱)۔

(۳) گلستان، تحریر سلطان علی کاتب، محررہ ۸۹۱ھ/جنوری ۱۴۸۶ء، *M. De Rothschild Collection*، پیرس۔ ایک تصویر ("سعدی و جوان کاشغر") غالباً بہزاد کی ہے۔ ۱۴۸۵ تا ۱۴۸۶ء کے ان تین مخطوطات کی تصاویر اگر واقعی بہزاد کی ہیں تو وہ جوانی کے زمانے کا نمونہ سمجھی جائیں گی جن میں وہ بات پیدا نہیں ہوئی جو قاہرہ کے مخطوطۂ بوستان کی تصاویر میں پائی جاتی ہے۔

(۴) دہری تصویر: "سلطان حسین بایقرا باغ میں اپنے حرم و خدم و حشم کے ساتھ"، تقریباً ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء تا ۹۰۰ھ/۱۴۹۴-۱۴۹۵ء، تہران، کتب خانۂ قصر گلستان۔ بہزاد کے اسلوب سے بہت ہی مشابہت رکھتی ہے اور کم از کم جزوی طور پر تو اس تک ضرور پہنچتی ہے۔

(۵) نظامی: خمسہ، متن مؤرخہ ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء، موزۂ بریطانیہ، شمارہ ۲۵۹۰۰ [۲ : ۷۵۰]۔ بعد کے زمانے کی ۱۹ [۲۰] تصاویر، جن میں سے ایک پر تاریخ ۸۹۸ھ/۱۴۹۳ء مرقوم ہے، جو بہزاد کی طرز کی چار تصاویر کی تخمینی تاریخ ہے۔ ان میں سے تین تصویروں پر چھوٹے حروف میں بہزاد کا نام ہے، جو غالباً اصلی ہے (اوراق ۱۲۱ V°، ۱۶۱ r°، ۲۳۱ V°) [لیکن دیکھیے ریو: فہرست مخطوطات فارسی موزۂ بریطانیہ: جہاں اوراق مختلف ہیں] اور چوتھی جو ورق ۱۱۴ r° پر ہے ("مجنوں کعبے کے سامنے") اور جس پر کوئی دستخط نہیں ہیں، اتنی بلند پایہ ہے کہ وہ بھی بہزاد کی ہو سکتی ہے۔

(۶) نظامی: خمسہ، جو امیر علی فارسی برلاس کے لیے لکھا گیا، ایک تصویر مؤرخہ ۹۰۰ھ/۱۴۹۴-۱۴۹۵ء، موزۂ بریطانیہ نمبر Or. ۶۸۱۰۔ سولہ تصاویر جنھیں جہانگیر نے بہزاد کی طرف منسوب کیا ہے اور غالباً یا تو وہ اسی کی ہیں (اوراق ۳ V°، ۱۳۵ V°، ۱۹۰ r°، ۲۱۴ r°، ۲۲۵ V°، ۲۳۳b)، یا اس کے شاگردوں کی (اوراق ۲۲b، ۴۲b، ۹۳a، ۱۰۶b، ۱۲۸b، ۱۳۷a، ۱۴۳b، ۱۵۲b، ۱۵۶a، ۱۷۵a)۔

(۷) شرف الدین علی یزدی: ظفر نامہ، غالباً سلطان حسین بایقرا کے لیے لکھا گیا، ایک بعد کی عبارت کی رو سے ۸۷۲ھ/ ۱۴۶۷ء میں شیر علی نے مکمل کیا، لیکن چھ دہرے صفحے کی تصاویر ۱۴۹۰ تا ۱۵۰۰ء کی ہیں۔ Johns Hopkins University Library, Baltimore (مجموعۂ R. Garret) ۔ آنھ (کذا) میناتوری تصاویر جنہیں جہانگیر بہزاد کے ابتدائی عہد سے منسوب کرتا ہے۔ تمام تصویریں بہزاد ہی کی ہیں، گو ممکن ہے کہ ان کے بعض حصے اس کی اور اس کے شاگردوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہوں؛ بعض سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں ترمیم و اصلاح بھی کی گئی ہے، غالباً مغل نقاشوں کی طرف سے۔

(۸) منوّر میناتوری تصویر ''پیر و برنا پری منظر میں'' ایک بیاض اشعار مؤرخہ ۹۳۰ھ/ ۱۵۲۳ء میں، جو وزیر خواجہ ملک احمد کے لیے لکھی گئی تھی، واشنگٹن Freer Gallery of Art، شمارہ ۳۲، ۸۴۔ یہ تصویر جو ہو سکتا ہے کہ مخطوطے سے زیادہ پرانی ہو، نمبر ۲ [خمسۂ امیر خسرو] کی ایک تصویر کی ہو بہو نقل معلوم ہوتی ہے۔ اس کتاب کے مقدمے کی رو سے اس تصویر کا مالک، جو صفوی دربار کا ایک بلند مرتبت عہدے دار تھا، اس بات جب کہ بہزاد زندہ تھا اور شاہی کتب خانے سے منسلک تھا، اسے اصلی فن پارہ سمجھتا تھا۔ لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ استاد کے عہدِ پیری کا کارنامہ ہے اور یہی امر اس تکرار و کمزوری کی توجیہ بھی کرتا ہے جو اس تصویر میں پائی جاتی ہے۔ بصورت دیگر یہ بہزاد کی نگرانی میں کسی شاگرد کی اتاری ہوئی نقل ہو سکتی ہے اور اسی لیے اسے بہزاد کا اپنا ذاتی کارنامہ سمجھ لیا گیا۔

(۹) اکیلی تصویر ''دو اونٹوں کی لڑائی اور تماشائی'' تہران، کتب خانۂ قصرِ گلستان۔ اس پر مندرجہ عبارت کی رو سے یہ تصویر بہزاد نے بنائی تھی جب وہ ستّر برس کا تھا۔ ۱۰۱۷ھ/ ۱۶۰۸ء میں جہانگیر نے اسے ایک مستند تصویر سمجھا۔ اسی موضوع کی ایک پندرھویں صدی کے وسط کی تصویر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اپنی اصل سے معیار میں بہت کم تر درجے کی ہے (R. Ettinghausen: *Some paintings in four Istanbul albums*، در *Ars Orientalis*، عدد ۱، ۱۹۵۴ء، ص ۱۰۲، اشکال ۳ و ۳۹)۔ لہٰذا ۸ اور ۹ نمبر کی تصویروں کو بہزاد کے زمانۂ انحطاط کا کارنامہ تصور کرنا ممکن ہے۔

وہ تصویریں جن کا ذکر کتابوں میں تو آتا ہے، مگر اب ملتی نہیں، یہ ہیں: خمسۂ نظامی، جسے مولانا محمود نیشاپوری نے شاہ طہماسپ کے لیے لکھا تھا؛ تیمور نامہ، مصنفۂ سلطان علی مشہدی اور وہ تصاویر جو چھوٹی تصویروں کے مرقّع میں ہیں، جن کے لیے خواند امیر نے دیباچہ لکھا اور اس مرقع میں جو سلطان ابراہیم میرزا کی ملکیت تھا۔

بہزاد کا اثر سب سے پہلے اس کے شاگردوں میں نظر آتا ہے، جن میں سے بعض مثلاً قاسم علی اور آقا میرک تقریباً اپنے استاد کے درجے تک پہنچ گئے تھے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ صفویوں کے عہد میں بہت جلد طرز نقاشی میں ایک زور تغیر رونما ہو گیا تھا، دسویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی کے پہلے تیس برسوں میں ایک ایسا عبوری اسلوب رائج رہا جس میں بہزاد کے فن کی بہت سی خصوصیات نمایاں ہیں۔ اس کی ایک مخصوص مثال علی شیر نوائی کا ۱۵۲۶ء کا مخطوطہ ہے (Bibl. Nat. Suppl. turc، ص ۳۱۶)۔ ہرات کے مصوّر بہزاد کی طرز کو بخارا لے گئے، جسے وہاں

شیبانی دربار میں اپنا لیا گیا۔ عصّار کی مہر و مشتری کا ایک مخطوطہ، جسے ۹۲۹ھ / ۱۵۲۳ء میں بخارا کے مقام پر نقل کیا گیا تھا، اس بات کی ایک عمدہ مثال ہے کہ وہاں بہزاد کی طرز بہ نسبت تبریز کے بہت زیادہ اصلی حالت میں محفوظ تھی (Freer Gallery of Art، عدد ۳۲، ۵ - ۳۲ - ۸)۔ یہاں بہزاد اور ہرات کے دبستان کی روایت سولھویں صدی عیسوی کے وسط کے بعد تک باقی رہی۔ ان مرکزوں سے، جو زیادہ تر بہزاد کے اثر و رسوخ کے تحت تھے، فنکاروں کے نقل مکانی کی وجہ سے ہرات کی طرز اور بہزاد کی روایت برصغیر پاکستان و ہند میں بھی پہنچ گئی۔

اسلوب کی عمومی ترقی سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ بہزاد کی تصویروں اور ان کے موضوعات کی کم و بیش ہو بہو نقل سترھویں صدی تک ہوتی رہی، مثلاً ''دارا و اسپان'' کی تصویر، جو بوستان کے نسخۂ قاہرہ میں ہے، بوستان کے مخطوطات مؤرخہ ۱۵۲۵ء (پیرس Cartier collection) اور ۱۵۵۶ء (Bibl. Nat. Suppl. Pers.، عدد ۱۱۸۷) وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ ''اڑتے ہوئے اونٹ'' پاکستان و ہند کی متعدد چھوٹی تصاویر میں بار بار نظر آتے ہیں اور ایک ایرانی قالین پر، جس میں مختلف جانوروں کے نمونے کی تصاویر ہیں (برلن، سابق Schloss-Museum) اور تقریباً سولھویں صدی کی ایک سبز روغنی بوتل پر بھی یہ تصویر موجود ہے (لنڈن، وکٹوریا اور البرٹ میوزیم)، جبکہ ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء اور ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء ایسے مؤخر زمانے میں رضای عباسی ایسے نمونوں کی نقل کرتا ہے جو بہزاد کی تخلیق سمجھے جاتے ہیں (پیرس Vignier collection و کتبخانۂ قصر گلستان ایران)۔

مآخذ : [اس کی زندگی کے بڑے بڑے ماخذ یہ ہیں : (۱) خواند امیر : حبیب السیر، بمبئی ۱۸۵۷ء، ۳ : ۳۵۰ ؛ (۲) وہی مصنف : نامۂ نامی (Bibl. Nat. Ms. Suppl. Pers. 1842، نیز مخطوطۂ جامعۂ پنجاب) کی دو دستاویزیں، یعنی بہزاد کے ترتیب دیے ہوئے خطاطی اور کتابی تصاویر کے مرقع پر دیباچہ اور اس کے کتب خانۂ شاہی کا کلانتر بنائے جانے کا فرمان؛ (۳) محمد قزوینی و L. Bouvat : *Deux documents inedits relatifs a behzad*، در *RMM*، ۱۹۱۸ء، ۲۶ : ۱۴۶ تا ۱۶۰؛ (۴) بیست مقالہ، تہران ۱۳۱۳ ھش، ص ۲۰۵ ببعد؛ (۵) بابر نامہ، طبع Beveridge، لنڈن ۱۹۲۱ء، ص ۲۷۲، ۲۹۱، ۳۲۹ ؛ (۶) مرزا محمد حیدر دوغلات : تاریخ رشیدی (آرنلڈ T.W. Arnold، در *BSOS*، ۵، ۱۹۳۰ء : ۶۷۲ تا ۶۷۳ [نیز دیکھیے مخطوطۂ جامعۂ پنجاب]؛ (۷) دوست محمد بن سلیمن ہراتی : [حالات ہنروران، طبع عبداللہ چغتائی ۱۹۳۶ء [*Account of past and present painters of the Year 951/1544-[? 950]* در مرقع بہرام میرزا، کتابخانۂ طوپ قو سرائے، استانبول، نیز Binyon-Wilkinson-Gray : *Persian Miniature Painting*، آوکسفرڈ ۱۹۳۳ء، ص ۱۸۶؛ (۸) مصطفٰی عالی : مناقب ہنروران (۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء)، استانبول ۱۹۲۶ء، ص ۳۷، ۶۳ تا ۶۵، ۶۷؛ (۹) قاضی احمد بن میر منشی : گلستان ہنر (۱۱۰۵ھ/۱۶۰۶ء)، Calligraphers and painters...، ترجمہ از منورسکی V. Minorsky، ۱۹۵۹ء، ص ۱۵۹، ۱۷۹، ۱۸۰ تا ۱۸۳)؛ (۱۰) اسکندر منشی : تاریخ عالم آرای عباسی، (نیز آرنلڈ : *Painting in Islam*، ص ۱۳۱)؛ (۱۱) Cl. Huart : *Les calligraphes et les miniaturistes de l'orient musulman*، ۱۹۰۸ء، ص ۲۲۲، ۲۳۹، ۲۳۰ ببعد؛ (۱۲) مارٹن F. R. Martin : *The miniature painting and painters of Persia, India and Turkey*، ۱۹۱۲ء، ص ۳۰ ببعد، شکل ۹، ۱۳ لوح ۷۳ تا ۹۳؛ (۱۳) وہی مصنف : *Les miniatures de Bihzad dans un*

Ms. persan daté de 1485، ۱۹۱۲ء؛ (۱۴) وهی مصنّف اور آرنلڈ T. W. Arnold: *The Nizami-Ms. in the British Museum*، عدد Or. ۶۸۱۰، ۱۹۲۶ء؛ (۱۵) G. Marteau-H. Vever: *Miniatures persanes*، ۱۹۱۳ء، شکل ۲۰۹؛ (۱۶) E. Blochet: *Les peintures des manuscrits orientaux de la Bibliothèque Nationale*، ۱۹۱۴ تا ۱۹۲۰ء، ص ۱۷۵، ۱۸۷ ببعد، ۲۷۷ تا ۲۸۸، لوح ۳۴ تا ۳۹؛ (۱۷) وهی مصنّف: *Les enluminures des manuscrits orientaux—turcs, arabes, persans—de la Bibliothèque Nationale*، ۱۹۲۶ء، ص ۸۹ ببعد، ۹۶، ۱۰۰، لوح ۳۲، ۳۸؛ (۱۸) وهی مصنّف، در *Bulletin de la Société Française de reproductions de manuscrits à peintures*، ۱۰، ۱۹۲۶ء: ۸ تا ۹ اور ۱۲، ۱۹۲۸ء: ۶۸، ۸۵ ببعد؛ (ان تمام عبارات کا اشاریہ جو **Blochet** کی تصانیف میں مندرج هیں)؛ (۱۹) E. Kühnel: *Miniaturmalerei im islamischen Orient*، ۱۹۲۳ء، ص ۲۷ تا ۳۹، ۴۷، لوح ۴۸ تا ۵۴؛ (۲۰) وهی مصنّف: *History of miniature painting and drawing*، در *A Survey of Persian Art*، طبع پوپ A. U. Pope، لنڈن - نیویارک ۱۹۳۹ء، جلد ۳، ۱۸۵۸ تا ۱۸۷۲ء، جلد ۵، لوح ۸۸۵ تا ۸۹۱؛ (۲۱) وهی مصنّف: "بهزاد"، در *Mémoires, IIIe Congrès Internat. d'Art et Archéologie Iraniens*، ۱۹۳۵ء، ماسکو - لینن گراڈ ۱۹۳۹ء، ص ۱۱۳ تا ۱۱۸، لوح ۵۳؛ (۲۲) آرنلڈ T. W. Arnold: *Painting in Islam*، ۱۹۲۸ء، ص ۳۳، ۳۴ ببعد، ۳۹ ببعد، ۷۱، ۷۷، ۱۲۹، ۱۵۰ ببعد؛ (۲۳) وهی مصنّف: *Bihzād and his paintings in the Zafar-Nāmah Ms.*، ۱۹۳۰ء؛ (۲۴) A. Sakisian: *La miniature persane*، ۱۹۲۹ء، ص ۴۷ تا ۵۰، ۶۲ تا ۸۰، ۸۵ تا ۸۷، ۱۰۳ تا ۱۰۵، لوح ۴۲، ۴۷، ۴۶ تا ۵۹، ۵۹ تا ۶۲، ۷۲ تا ۷۵؛ (۲۵) وهی مصنّف: *La miniature à l'exposition d'art persan de Burlington House*، در *Syria*، ۱۲، ۱۹۳۱ء: ۱۶۹ تا ۱۷۱؛ (۲۶) A. K. Coomaraswamy: *Les miniatures orientales de la collection Goloubew au Museum of Fine Arts de Boston*، ۱۹۲۹ء، شماره ۶۲ تا ۶۳، ۷۱؛ (۲۷) M. S. Dimand: *A Handbook of Mohammedan decorative Arts*، ۱۹۳۰ء، ص ۳۲ تا ۳۶، شکل ۱۱؛ (۲۸) وهی مصنّف: *A guide to an exhibition of Islamic Miniature painting and book illumination in the Metrop. Museum of Arts*، ۱۹۳۳ء، ج ۲۹ تا ۳۳، شماره ۱۸ تا ۲۰، ۲۱؛ (۲۹) B. Gray: *Persian Painting*، ۱۹۳۰ء، ص ۵۷ تا ۶۶، لوح ۷؛ (۳۰) وهی مصنّف: *Persian Painting from miniatures of the XIII-XVI centuries*، نیویارک - ٹورنٹو ۱۹۴۰ء، ص ۱۲، لوح ۸؛ (۳۱) J. V. S. Wilkinson: *Fresh light on the Herat painters*، در *Burlington Magazine*، فروری ۱۹۳۱ء، ص ۶۲ تا ۶۷؛ (۳۲) مینورسکی V. Minorsky: *Two unknown Persian manuscripts*، در *Apollo*، فروری ۱۹۳۱ء؛ (۳۳) I. Stchoukine: *Les miniatures persanes au Louvre*، ۱۹۳۲ء، ص ۴۱ ببعد و لوح ۹؛ (۳۴) وهی مصنّف: *Un Gulistān de Sa'dī illustré par les artistes timourides*، در *Revue des Arts Asiatiques*، ۱۰، ۱۹۳۶ء: ۹۲ تا ۹۶، لوح ۳۴، ۳۵؛ (۳۵) وهی مصنّف: *Les peintures de la Khamseh de Nizami du British Museum*، عدد Or. ۶۸۱۰، در *Syria*، ۲۷، ۱۹۵۰ء: ۳۰۱ تا ۳۱۲؛ (۳۶) وهی مصنّف: *Les peintures des manuscrits timûrides*، پیرس ۱۹۵۴ء، ص ۱۲ تا ۲۵، ۶۸ تا ۸۶، ۹۵، ۱۰۱، ۱۰۳ تا ۱۰۴، ۱۱۰ تا ۱۱۱، ۱۲۰ تا ۱۳۱، لوح ۷۲ تا ۸۸ (یه جامع‌ترین اور بهترین تنقیحی بیان هے، جس میں اس سے

بھلے کی بڑی بڑی مطبوعات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے)؛ (۳۷) L. Binyon و J. V. S. Wilkinson و B. Gray : Persian Miniature Painting، ۱۹۳۳ء، باب ۳ و ۵، لوح ۶۲ تا ۶۴، ۷۸، ۸۱، ۸۶ ببعد؛ (۳۸) G. Wiet : L'exposition persane de 1931، ۱۹۳۳ء، ص ۳۷ تا ۷۸، لوح E ۳۳ تا ۳۶؛ (۳۹) E. Kühnel و H. Goetz : *Indische Buchmalerei, aus dem Jahāngir Album der Staatsbibl. zu Berlin*، ۱۹۲۴ء، ص ۴۴، لوح ۲، ۳۱، ۳۳؛ (۴۰) E. de Lorey : *Behzād le Gulistān Rothschild*، در *Ars Islamica*، جلد ۴، ۱۹۳۷ء، ص ۱۲۲ تا ۱۴۳؛ (۴۱) وہی مصنّف : *Behzad*، در *Gazette des Beaux-Arts*، ۲۰، ۱۹۳۸ء : ۲۵ تا ۴۴؛ (۴۲) E. Schroeder : *The Persian Exhibition and the Bihzad problem*، در *Bull. Fogg. Museum of Art*، ۷، ۱۹۳۷ء : ۳ تا ۱۴؛ (۴۳) R. Ettinghausen : *"Six thousand years of Persian art". The exhibition of Iranian Art*، نیویارک ۱۹۴۰ء، در *Ars Islamica*، ۷، ۱۹۴۰ء : ۱۱۱، شکل ۱۶؛ (۴۴) B.W. Robinson : *A descriptive catalogue of the Persian paintings in the Bodleian Library*، آوکسفرڈ ۱۹۵۸ء، ص ۶۰ تا ۹۷؛ (۴۵) R. H. Pinder-Wilson : *Persian painting of the fifteenth century*، لندن ۱۹۵۸ء، ص ۵، ۲۳، لوح ۴ تا ۹.

(R. ETTINGHAUSEN)

[تعلیقہ :

بہزاد : سوانح : سالِ پیدائش کی قطعی تعیین نہیں ہو سکی، لیکن دوست محمد نے حالاتِ ہنروران میں بہزاد کا سالِ وفات ۹۴۲ھ / ۱۵۳۵ء دیا ہے اور ساتھ ھی یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک سو سال زندہ رہا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ۸۴۲ھ / ۱۴۳۸-۱۴۳۹ء کے قریب کے زمانے میں پیدا ہوا ہوگا ۔ بہزاد کے خاندان یا اس کے آبا و اجداد کے حالات کا کہیں پتا نہیں چلتا؛ قاضی احمد نے گلستانِ ہنر میں اتنا بیان کیا ہے کہ بہزاد ہرات کا باشندہ تھا اور اپنے والدین سے بچپن ھی میں محروم ہو گیا تھا؛ استاد میرک نقّاش نے اس کی پرورش کی تھی ۔ اس کے ایک خواہر زادہ مولانا رستم علی خراسانی (م ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲-۱۵۶۳ء) خطّاط کا ذکر بھی ملتا ہے، جو سلطان علی مشہدی کا تلمیذ تھا اور بہرام میرزا اور پھر اس کے بیٹے ابوالفتح سلطان ابراہیم میرزا (ولادت ۱۵۴۳-۱۵۴۴ء) کے کتاب خانے میں ایّامِ پیری میں بھی ملازم تھا (منورسکی V. Minorsky : *Caligraphers and Painters*، واشنگٹن ۱۹۵۹ء، ص ۱۴۷) ۔ یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے ماموں بہزاد کے ہمراہ تبریز میں رہتا تھا ۔ اسی طرح رستم علی کا ایک بھانجا مظفر علی تھا، جس کا والد بہزاد کا شاگرد تھا اور اہلِ نظر اسے فن میں بہزاد کے برابر تصوّر کرتے تھے، وہ نستعلیق میں بڑی مہارت رکھتا تھا، نیز بہزاد کے چند ان عزیزوں کا حال بھی ملتا ہے جو خود بھی فن کار تھے .

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہزاد نے سلطان ابوسعید گورگان کا زمانہ بھی دیکھا ۔ اس کے بعد اُسے سلطان بایقرا کی سر پرستی نصیب ہوئی ۔ پھر جب شیبانی خان کا ہرات پر قبضہ ہو گیا تو اس نے بھی بہزاد کی قدر کی ۔ اس کے قتل کے بعد شاہ اسمٰعیل صفوی اسے تبریز لے گیا ۔ پھر شاہ اسماعیل کی وفات پر اس نے اس کے فرزند شاہ طہماسپ کا دور بھی دیکھا .

بہزاد کے اساتذہ : بعض کتابوں میں بہزاد کے استادوں کا ذکر آیا ہے ۔ دوست محمّد نے حالاتِ ہنروران میں روح اللہ میرک نقّاش کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ بہزاد کا استاد تھا ۔ تاریخِ رشیدی میں حیدر دوغلات نے بھی اس کا ذکر کیا

ہے۔ قاضی احمد نے بھی گلستانِ ہنر (استانبول ۱۹۲۶ء، ص ۶۳ تا ۶۵) میں یہی لکھا ہے، مصطفیٰ عالی افندی نے اپنی ترکی تالیف مناقبِ ہنروران میں کچھ اشارے کیے ہیں۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بہزاد نے استاد روح اللہ میرک اور استاد سید احمد سے فنِ مصوری کی تربیت پائی، اور بہزاد کے والدین کے فوت ہو جانے کے بعد اوّل الذکر ہی نے اس کی پرورش کی۔ ان اساتذہ کے توسط سے بہزاد وسط ایشیائی اور عراقی روایتِ فن مصوری سے مستفید ہوا۔

اتفاق سے استانبول کے کتاب خانۂ طوپ قپو سرائے میں تین چار قدیم مرقعات موجود ہیں جن میں خطاطی اور مصوری کے اہم اور قدیم نمونوں کو بالکل بے ترتیب طور پر جمع کر دیا گیا ہے، ان میں بہت سے ایسے شاہکار ہیں جن پر بہزاد کا نام یا قریبی حوالے ملتے ہیں، چنانچہ مرقع عدد ۲۱۵۴ (ورق ۱۴ / ۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ بہزاد نے ریشم پر شاہین کی ایک تصویر بنائی، جو فن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس پر لکھا ہے: "این باز کارِ استاد بہزاد است" (ورق ۵۵/۲) پر مرقوم ہے: "قلم سیاہی نادر العصر استاد بہزاد"، نیز ایک اور خاکے پر لکھا ہے: "این قلم سیاہی استاد میرک استاد بہزاد است"، جس سے واضح ہے کہ یہ بہزاد کے استاد میرک کے قلم کا خاکہ ہے۔ سیکسیان Sakisian نے ایرانی مصوری سے متعلق اپنی تالیف میں اسی مجموعے سے ایک چھوٹا سا خاکہ چھاپا ہے۔ یہ خرگوش اور پھولوں کا منظر ہے۔ جس کے اوپر دائیں کنارے پر نستعلیق میں مندرجۂ ذیل عبارت لکھی ہے:

"نقل از کار مولانا ولی صوّرہ العبد بہزاد"

(دیکھیے *Le Miniature Persane*: Armeng Bey Sakisian *de XII au XVII*، پیرس ۱۹۲۹ء، شکل ۱۴۴)، اور یہ "مولانا ولی" یا "ولی اللہ" مصور وہی شخص ہے جس کا ذکر دوست محمد نے روح اللہ میرک کے استاد کے طور پر کیا ہے۔ استاد ولی کے دیگر فنی کارنامے بھی طوپ قپوسرائے استانبول میں موجود ہیں۔ عجائب خانۂ طوپ قپوسرائے استانبول میں خمسۂ نظامی کا ایک نسخہ ہے، جس کا بہت اہم ترقیمہ یہاں ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"این خمسۂ مبارکہ بخط مولانا سلطان علی مشہدی کہ کتابت شدہ۔ ۹۰۰ھ در اوانے کہ شاہ جم جاہ عالیشان خسرو خسروان صاحب قران شاہ اسمٰعیل بہادر خان خلدت خلافتہ از خزانۂ شاہیک گرفتہ بفرید عصر مولانا یاری تذہیب ۹۱۶ھ، بنادرالعصر استاد بہزاد، تصویر ۹۱۸ھ، رجوع شدہ اتمام یافت" (عدد G ۲۸۸ و ۷۷ II)۔

میں نے اس اہم نسخۂ خمسہ کا خود مطالعہ کیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ شاہ اسمٰعیل صفوی نے اسے شیبانی خان کے اموال سے حاصل کیا تھا اور ۹۰۸ھ / ۱۵۱۲ء میں تصویر کے لیے بہزاد کے سپرد کیا، جس نے اسے مکمل کیا۔ اس نسخے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بہزاد شیبانی خان کی جنگ اور قبضۂ ہرات کے فوراً بعد شاہ اسمٰعیل صفوی کی ملازمت میں داخل ہو کر تبریز میں آ گیا تھا۔ اس نسخے میں جو تصاویر ہیں ان میں صفوی عنصر بالکل واضح ہے۔

ایران اور ترکیہ کے درمیان جنگ چالدران ایک پریشان کن واقعہ تھا۔ یہ جنگ ۹۲۰ھ / اگست ۱۵۱۴ء میں تبریز کے باہر چالدران نامی مقام پر لڑی گئی۔ روایت ہے کہ جب اس جنگ کے خطرات بڑھ گئے تو شاہ اسمٰعیل صفوی نے بطریق دور اندیشی کمال الدین بہزاد مصور اور شاہ محمود نیشاپوری کاتب کو ایک گڑھے میں چھپا دیا تاکہ وہ محفوظ رہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ اسمٰعیل بہزاد کو بے حد عزیز رکھتا تھا۔

جنگ چالدران کے بعد شاہ اسمعیل نے کئی بار خراسان پر فوج کشی کی اور ازبکوں کے خلاف اسے فتح بھی نصیب ہوئی ۔ ۲۷ جمادی الاولی ۹۲۸ھ / ۱۵۲۲ء [نامۂ نامی، مخطوطۂ جامعہ پنجاب کی رو سے ۹۲۲ھ / ۱۵۱۶ء] میں اس نے بہزاد کے نام ایک فرمان (منشور کلانتری کتاب خانہ) جاری کیا، جو نامۂ نامی (خواند امیر) میں محفوظ ہے، جس کی رو سے اس کے سپرد خدمت کتابداری ہوئی ۔ محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے یہ فرمان شائع کر دیا ہے، جس کا عنوان یہ ہے : ''نشان کلانتری کتاب خانۂ ہمایون باسم کمال الدین بہزاد نوشت'' ۔ اس فرمان میں اس کے فرائض کتابداری کی تفصیل اور دیگر امور مذکور ہیں (مرزا محمد قزوینی : *Deux Documents inedits Relatifs a Behzad*، در *RMM*، ۱۹۱۴ء، ص ۱۴۶ تا ۱۶۱)۔

بہزاد ۹۴۲ھ / ۱۵۳۵ - ۱۵۳۶ء میں تبریز میں بعہد شاہ طہماسپ فوت ہوا، جیسا کہ اس کی تاریخ وفات ''بخاک قبر بہزاد'' سے ثابت ہے ۔ اسے باغ شیخ کمال تبریز کے قبرستان میں دفن کیا گیا ۔ اعتماد السلطنۃ نے منتظم ناصری میں دوست ہاشمی کا قطعۂ ذیل دیا ہے، جو اس کے مزار کے سنگ لوح پر کندہ ہے :

وحید عصر بہزاد آن کہ چون او
ز بطن مادر ایّام کم زاد
اجل چون صورت عمرش بپرداخت
قضا خاک وجودش داد برباد
ز من صورتگری تاریخ پرسید
بدو گفتم جواب از جان ناشاد
اگر خواہی کہ تاریخش بدانی
نظر افکن بہ (خاک قبر بہزاد)

۹۴۲ھ

(دیکھیے مجلۂ ارمغان، تہران ۱۳۰۸ ھش، شمارہ ۴ : ص ۲۵۸)۔

اس کے برعکس قاضی احمد نے لکھا ہے کہ بہزاد کا انتقال ہرات میں ہوا، اور اسے کوہ مختار کے قرب و جوار میں ایک منقّش احاطے میں دفن کیا گیا (منورسکی : *Calligraphers and Painters*، ص ۱۸۰) ۔ میرے خیال میں بہزاد اپنے آخری ایّام زندگی میں تبریز ہی میں مقیم تھا اور وہیں اس کا انتقال ہوا، اور وہیں اسے دفن کیا گیا. واللہ اعلم بالصواب.

فنّی ارتقا (تصویری نمونوں کے حوالے سے) : بہزاد نے اپنی ساری عمر معاصر سلاطین کے درباروں میں گزاری ۔ اس کا سب سے اوّل دریافت شدہ کارنامہ ظفر نامۂ تیموری کا مصوّر نسخہ ہے، جو ۸۷۲ھ / ۱۴۶۷ - ۱۴۶۸ء میں لکھا گیا ۔ ہرات کی تاریخ میں یہ سال بہت اہم ہے ۔ اس سال سلطان ابو سعید قتل ہوا اور اس کے فوراً بعد اسی سال سلطان حسین میرزا بایقرا تخت نشین ہوا ۔ بظاہر یہ مصوّر نسخہ سلطان حسین میرزا کے لیے تیار ہوا، مگر قیاس یہ ہے کہ یہ نسخہ جب تیار ہو رہا تھا اس وقت سلطان ابو سعید زندہ تھا اور بہزاد اس کے دربار سے منسلک تھا، پھر وہ سلطان حسین میرزا کے دربار سے منسلک ہو گیا ۔ بہر حال اسے بہزاد کے فنی ارتقا کا نقطۂ آغاز سمجھنا چاہیے.

دبستان ہرات : ہرات اس زمانے میں علوم و فنون کا مرکز تھا ۔ اسی سے ایک نیا ماحول پیدا ہوا، اور مصوری بھی اس سے متأثر ہوئی ۔ اس ماحول میں اس فن نے جو انداز پیدا کیے، اور وہ اسی مرکز سے مخصوص تھے، ان سب کو دبستان ہرات کا نام دیا جاتا ہے ۔ دبستان ہرات کے خصائص پر مفصّل بحث کی یہاں گنجائش نہیں، البتہ چند اشارے ممکن ہیں ۔ بہزاد اس دبستان سے اس

قدر متأثر ہوا کہ اس کی تقلید کرنے لگا، چنانچہ جب جہانگیر نے شاہ ایران کی سوغات کے طور پر بھیجی ہوئی خلیل میرزا شاہرخی کی تصاویر دیکھیں تو اسے ان پر بہزاد کی تصاویر کا گمان ہوا، جس کا اظہار اس نے تُوزُکِ جہانگیری (مطبوعۂ نولکشور، لکھنؤ، ص ۲۸۷ تا ۲۸۸) میں کیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ جہانگیر کے زمانے میں طرز ہرات مشخص ہو چکی تھی اور بہزاد ہی کو اس طرز کا نمائندۂ اعظم سمجھا جاتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ تصاویر بہزاد کی نہیں بلکہ خلیل میرزا شاہ رخی کی بنائی ہوئی تھیں، جن پر اس کے اپنے دستخط بھی ثبت تھے، اور ظاہر ہے کہ فن کار میر خلیل شاہ رخ کے زمانے کا آدمی تھا، اور اس کی تربیت بھی شاہ رخ میرزا ہی کے زمانے میں ہوئی تھی، اور اسی لیے تُوزُک میں اسے ''شاہ رخی'' لکھا گیا ہے، لیکن جہانگیر نے بہزاد کا ذکر اس لیے کیا کہ وہ خلیل شاہ رخی اور بہزاد دونوں کو دبستانِ ہرات کا نمائندہ خیال کرتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہرات میں ان ماہرین نے جن میں سابقاً خلیل شاہ رخی بھی شامل تھا، ایک خاص طرز پیدا کر لی تھی جو مشہور زمانہ ہو چکی تھی اور بہزاد کو اس طرز کا نقطۂ عروج سمجھا جاتا تھا، اسی وجہ سے جہانگیر نے ان شاہکاروں کے سلسلے میں بہزاد کا نام لیا۔ جہانگیر سے پہلے بابر بھی اپنی تُوزُک (۹۲۰ھ) میں طرزِ ہرات کے خصائص کی گفتگو کرتا ہے اور کہتا ہے کہ: استاد بہزاد اور مظفر مصوّری میں علی شیر بیگ ہی کی توجہ سے اتنے مشہور و معروف ہوئے۔ بہزاد بڑی باریک مصوّری کرتا تھا، مگر مرد کا چہرہ بغیر ریش اچھا نہ بناتا تھا، زنخدان کو بہت بڑھا دیتا تھا۔ شاہ مظفر بہت عمدہ مصوّر تھا، اس کی عمر نے وفا نہ کی، ابھی ترقی کر رہا تھا کہ چوبیس ہی سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ وہ خاص کر سیاہ قلم، یعنی خاکہ بنانے میں سلطان ابو سعید میرزا کے عہد کا بہترین مصور شمار ہوتا ہے (اس کے فن کا ایک نمونہ ۱۹۳۱ء میں ایرانی فن کی بین الاقوامی نمائش لندن میں آیا تھا، اس سیاہ قلم نمونے میں براق کی تصویر بنائی گئی ہے)۔

بہر حال تیموری شہزادوں کی ہنرپروری و علم شناسی کے طفیل جو دبستان مصوّری قائم ہوا اسے عام طور پر اپنے خاص اوصاف کی وجہ سے دبستانِ ہرات کا نام دیتے ہیں، جسے بہزاد نے بامِ عروج پر پہنچا دیا۔

بہزاد کے فنی کارنامے (کتابوں کے مصوّر کی حیثیت سے): بہزاد کی ایک تصویر اور اسی تصویر کی ایک نقل جہانگیر کے فرمان سے اس کے دربار کے ایک مصوّر مسمی نانہا نے ۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء میں بنائی تھی۔ یہ دونوں تصویریں ۱۹۳۱ء میں ایرانی فن کی بین الاقوامی نمائش لنڈن میں تہران کے عجائب گھر قصرِ گلستان سے آئی تھیں اور اس نمائش کی فہرست میں طبع بھی ہو چکی ہیں۔ بہزاد کی اصل تصویر پر اوپر دائیں کونے میں مندرجۂ ذیل تحریر ثبت ہے: ''این رقمیست بدیع مشعر از مضمون ''افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت'' کہ شکستہ نہاد فقیر نامراد بہزاد بعد از وصول عمر بدرجۂ ہفتاد و تجربۂ قوی در این امر افتاد۔ و المسئون من اللہ العفو فی المعاد''۔ اس تصویر کا موضوع یہ ہے کہ اس میں دو اونٹوں کو ان کے ساربان ان کی نکیلوں کو اپنے ہاتھوں میں سنبھالے آپس میں لڑا رہے ہیں، اور یہ نظارہ بڑا دلکش ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ بہزاد نے یہ تصویر اپنی عمر کے سترویں سال میں بنائی تھی، اس پر تکمیل تصویر کی تاریخ درج نہیں ورنہ ہم اس سے اس کا سال پیدائش یقینی طور پر معلوم کر لیتے، اگرچہ بعض

محققین کے نزدیک یہ تصویر اس زمانے میں جب وہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء میں تبریز میں آ چکا تھا بنائی تھی، مگر قرائن سے یہ تصویر اس سے بہت پہلے کی معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ یہ تصویر بہزاد کے سترویں سال کی ہے اور ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء ہی میں بنی ہے تو اس حساب سے اس کا ابتدائی کام زیادہ سے زیادہ ۸۸۰ھ / ۱۴۷۵ء کے لگ بھگ ظہور میں آنا چاہیے، اس اعتبار سے اس کا سال پیدائش ۸۶۲ھ / ۱۴۵۸ء ہوگا، اگرچہ اس سلسلے میں یقینی طور پر بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بہر حال بہزاد کی محوّلۂ بالا تصویر اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔

شبیہات: بہزاد کے کارناموں میں کتابی تصویروں کی طرح بعض اہم معاصر اشخاص کی شبیہات بھی ہیں، اور یہ فن پارے مصوّری کی تاریخ میں اہم ہیں۔ اس سلسلے میں چند شبیہات کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) سلطان حسین میرزا بایقرا کی اکثر شبیہات بہزاد کی مصور کی ہوئی بعض کتابوں میں ملتی ہیں؛ (۲) شیبانی خان کی شبیہ (*Catalogue, International Exhibition of Persian Art*، لنڈن ۱۹۳۱ء، ص ۳۸، ۷۷، ۹۵)؛ (۳) شہزادۂ غریب میرزا بن سلطان حسین میرزا کی تصویر (کتاب خانۂ یلدیز، استانبول)؛ (۴) مولانا عبداللّٰہ ھاتفی کی تصویر (کتاب خانۂ سلطنتی، تہران)؛ (۵) شبیۂ بہزادِ خود (یہ تصویر استانبول یونیورسٹی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے)؛ (۶) ایک درویش کی تصویر، طبع ڈاکٹر مارٹن (F. R. Martin: *Miniature Painting and Painters of Persia, India and Turkey*، لنڈن ۱۹۱۲ء، لوحہ ۸۵)؛ (۷) قیدی کی تصویر (طبع Bunyan: *Catalogue, International Exhibition of Persian Art*، لنڈن ۱۹۳۱ء، عدد ۸۲)؛ (۸) ایک امیر، یعنی سلطان محمد ثانی (ترکی) کی تصویر طبع مارٹن (؛ وهی کتاب، لوحہ ۱۱۳)؛ (۹) درویش بغداد کی تصویر طبع مارٹن (؛ وهی کتاب، لوحہ ۳۸۶)۔

بہزاد تعمیراتی نقاشی کی حیثیت سے: میرزا طاهر زادہ ایرانی نے سر آمدانِ هنر میں لکھا ہے کہ بہزاد اعلیٰ نقشہ نویسِ عمارات تھا۔ اس نے مسجدِ سمرقند کا نقشہ خود تیار کیا تھا (دیکھیے عبداللّٰہ چغتائی: ''کمال الدین بہزاد''، در کاروان، لاهور ۱۹۳۲ء)۔ اس کے زمانے کی طرزِ عمارت کا اندازہ لگانے کے لیے اس مسجد کا مشاهدہ کافی ہے۔ اس کے علاوہ بہزاد جس طرح اپنی تصاویر میں عموماً کاشی کاری اور نقش و نگار کا استعمال کرتا ہے اسی طرح وہ عمارتی نقشوں میں اس هنر کا مظاهرہ کرتا ہے (دیکھیے مجلۂ کابل، سالِ اوّل، شمارہ ۶ و ۷)۔ بہزاد نے هرات کے باغِ بہشت کے گنبد کے دور کا حاشیہ کھینچا تھا۔ اس ضمن میں مصوّر نسخۂ خمسۂ نظامی (موزۂ بریطانیہ، عدد Or. ۶۸۱۰) میں بہزاد کی ایک تصویر ملتی ہے، جس میں ایک مسجد زیرِ تعمیر ہے، اس میں محراب کا حصّہ خصوصی طور پر دکھایا گیا ہے: اسے قالب کیا ہوا ہے اور معمار اسے بنا رہے ہیں، اس محراب میں باڑ برابر تین حصوں میں لگی ہوئی ہے؛ مصالحہ الگ تیار ہو رہا ہے اور اسے سیڑھی کے ذریعے مزدور اوپر پہنچا رہے ہیں۔ یہ غیر معمولی تصویر عملی فنِ تعمیر کا مکمّل منظر پیش کرتی ہے اور یہ منظر فقط ایک عملی مہندس ہی دکھا سکتا ہے۔ ساتھ ہی وہ مہندس خود بھی اس تصویر میں هدایات دیتا دکھایا گیا ہے۔ بہزاد کی یہ تصویر عملی طور پر اس قدر مفید اور کارآمد ثابت ہوئی کہ جہانگیر نے اسے پسند کیا اور اس کے دربار کی ایک مصوّرہ شفیعا بانو نے اس کی ایک نقل تیار کی۔ اس تصویر کے اوپر بائیں جانب کے دریچے کو بہزاد نے اشعار سے مزیّن کیا ہے۔

بہزاد کے دستخط : مصوّر عام طور پر اپنے فنّی کارناموں پر اپنا نام لفظ ''عمل'' سے ترکیب دے کر لکھا کرتے تھے اور یہ رواج ابتدائی زمانے ھی سے ھو گیا تھا۔ بہزاد کے زمانے میں بھی یہی سلسلہ تھا، مگر بعض اوقات ان پر جعلی دستخط بھی کر دیے جاتے تھے اور غلط انتساب ھو جاتا تھا۔ گو بعض مصوروں نے دستخط کی ضرورت محسوس نہیں کی، پھر بھی ان کے کارنامے عموماً انھیں سے منسوب ھوے، لیکن اس کی وجہ سے غلط انتساب بھی ھو جاتے تھے۔ شاھی دربار میں انتساب کو صحیح رکھنے کے لیے عموماً مستقل اھلکار ھوتے تھے جو مصوّر یا خطّاط کا نام فوراً لکھ دیتے تھے، یہی وجہ ھے کہ بہزاد کے فنی کارناموں پر اس کا نام اکثر مل جاتا ھے۔ اس سے یہ بھی واضح ھوتا ھے کہ یا تو وہ خود اپنے نام کا التزام کرتا تھا یا کوئی ایسا شخص لکھتا تھا جو اس کام پر متعین ھوتا تھا، اور وہ بہزاد کا نام بڑے احترام سے لکھتا تھا، اور نام کے ساتھ بعض عزت و تکریم کے الفاظ بھی لکھ دیتا تھا، چنانچہ ذیل میں ھم بہزاد کے دستخط کی مختلف صورتیں درج کرتے ھیں:

(۱) العمل حضرت بہزاد (در A.B. Sakisian: *Le Miniatures Persane de XII au XVII Scicle*، پیرس ۱۹۲۹ء، شکل ۱۳۳)؛ (۲) کارِ اعلی استاد بہزاد (کتاب مذکور، لوحہ ۷۵، شکل ۸۳)؛ (۳) عملِ استاد بہزاد (کتاب مذکور، شکل ۱۰)؛ (۴) صورہ العبد بہزاد (کتاب مذکور، شکل ۸۶)؛ (۵) العبد بہزاد (کتاب مذکور، شکل ۹)؛ (۶) نقش نامراد بہزاد (طوپ قپو سرائے، استانبول، مرقع ۲۱۵۳، ورق ۵۳/۲)؛ (۷) کمترین بہزاد (طوپ قپو سرائے، استانبول، مرقع ۲۱۵۳، ورق ۵۰/۱)؛ (۸) بہزاد (موزۂ برطانیہ، عدد Or. ۶۸۱۰)؛ (۹) مصوّر بہزاد (طوپ قپو سرائے، استانبول، عدد H ۸۱۱)؛ (۱۰) استاد بہزاد (طوپ قپو سرائے، استانبول، مرقع ۲۱۵۳، ورق ۵۵/۲)؛ (۱۱) قلم سیاھی نادرالعصر استاد بہزاد (طوپ قپو سرائے، استانبول، مرقع ۲۱۵۳، ورق ۵۵/۲)؛ (۱۲) پیر غلام بہزاد (عجائب گھر لوور Louvre، پیرس)؛ (۱۳) عمل العبد بہزاد *Persian Miniature*، طبع C.L. Binyon، لوحہ ۷۰؛ (۱۴) صوّرہ العبد بہزاد المذنب اصلح اللہ (در E. Blochet: *Le Peintures de la Collection Pozzi*، پیرس ۱۹۲۸ء، لوحہ ۶۸).

بہزادقلم : بیان ھوچکا ھے کہ بہزاد کی وجہ سے ھرات کا دبستانِ مصوّری مشہور ھو چکا تھا اور اس کی طرز خاص کو کبھی کبھی ''بہزادقلم'' سے بھی تعبیر کیا گیا ھے، چنانچہ ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں داستانِ امیر حمزہ کے مصوّر نسخے کے ضمن میں، جو اکبر کے دربار میں تیار ھوا تھا، بہزاد کے دبستانِ مصوّری کو ''بہزادقلم'' کے الفاظ سے یاد کیا ھے۔ اسی طرح ترکیہ میں کتابی مصوری کا جو دبستان قائم ھوا اس کے بعض شاھکاروں کو ''بہزاد قلم'' کہا گیا ھے۔

بہزاد کے تلامذہ اور مقلّد : بہزاد کی طویل عمر اور اس کے علاوہ اس کا مختلف درباروں سے منسلک ھونا اور اس دوران میں مختلف قسم کے اشخاص اور ماحول سے واسطہ پڑنا، یہ سب واقعات اس امر کی دلیل ھیں کہ اس کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا، اور اس لحاظ سے اسے ھر جگہ اور ھر ماحول میں ایسے تلامذہ بھی میسّر آئے جو اس کی روایاتِ فن کی ترویج کرتے رھے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ھمیں درویش محمد کا ذکر (بحوالۂ مجالس النفائس) ملتا ھے۔ اسی زمانے میں بخارا میں میر علی ھروی الکاتب اور محمود مذھّب کی مساعی سے ایک دبستانِ فن قائم ھوا، جو ایک طرح سے بہزاد ھی کی روایات کا فروغ تھا؛ اور جب میرزا بدیع الزمان ترکیہ گیا تو بہزادقلم فن کاروں کو اپنے ھمراہ لے

گیا جن کے ذریعے بہزاد کے اثرات ترکیہ میں پہنچے۔ علیٰ ھذا جب ھمایوں تبریز سے چند مصوّر اور کاتب اپنے ھمراہ ھندوستان لے گیا اور ان کے ساتھ چند مصور کتابیں بھی تھیں تو اس طرح برصغیر پاک و ھند میں بھی بہزادقلم پہنچا، جیسا کہ ابوالفضل نے خود بھی آئین اکبری میں لکھا ھے.

بہزاد کے نقاد: بہزاد کے فن پر بہت سے یورپی محقّقین نے تنقید کی ھے، جن میں سے مندرجۂ ذیل خاص کر قابلِ ذکر ھیں: (۱) I. Stchoukine: *Les Peintures des Manuscrites Timūrides*، پیرس ۱۹۵۴ء، ص ۶۹ تا ۷۰؛ (۲) E. Blochet: *Les Enluminures des Manuscrites Orientaux—turcs, arabes, persanes—de la Bibliothèque Nationale*، پیرس ۱۹۲۶ء؛ (۳) A. Sakisian: *L' ecole de minature de Herat au XVe Siecle*، در *La Renaissance*، اپریل و جون ۱۹۳۱ء؛ (۴) L. Binyon، J.V.S. Wilkinson اور B. Gray: *Persian Miniature Paintings*، لنڈن ۱۹۳۳ء، ص ۱۳۹؛ اور (۵) M. Eustache de Lorey: *Behazad*، در *Gazette des Beaux—Arts*، پیرس ۱۹۳۸ء، ص ۲۵ تا ۴۴.

دیگر کوائف: یہ مشاھدے میں آیا ھے کہ بہزاد نے عمارتوں کے کتبات بھی لکھے، جن میں موقع و محل کے لحاظ سے موزوں آیاتِ قرآنی کا استعمال کیا ھے، ان کا خط عموماً نسخ ھے۔ وہ مُو قلم سے نازک اور باریک خطوط میں مکمل تصویر پیدا کر دیتا ھے، خاص کر لباس کے انداز اور جسم کی پھرتی اور چستی کو خوب ظاھر کرتا ھے۔ وہ مناظر و سراپا کی تصاویر کو بھی صحیح پیش کرنے میں یدِ طولٰی رکھتا ھے.

میناتوری مصوّری: بہزاد کی بیشتر فنی سرگرمی کتابی مصوّری سے متعلق ھے، جسے اس زمانے کی بہترین مصوّری کہا جا سکتا ھے۔ عہد اسلام کی اس مشرقی صنفِ مصوّری کو میناتوری [رکّ بآں] (چھوٹی کتابی تصاویر) سے تعبیر کیا جاتا ھے۔ بہزاد نے اس فن میں بھی کمال پیدا کیا.

مآخذ: متن میں مذکور ھیں.

(عبداللہ چغتائی)

بِہِسْتُون: رکّ بہ بیستون. *

بَہْمَنی: رکّ بہ بہمنی. *

بِہِشْت: رکّ بہ جنّۃ. *

بِہِشْتی: ایک عثمانی (ترکی) شاعر اور مؤرّخ کا تخلّص، جس کا نام احمد تھا۔ وہ ۸۷۱ھ / ۱۴۶۶-۱۴۶۷ء کے قریب پیدا ھوا، اور سلیمن بے نامی ایک شخص کا بیٹا تھا۔ وہ تیرہ سال کی عمر میں بایزید کی ملازمت میں ایک خدمتگار کی حیثیت سے داخل ھوا، لیکن کسی قصور کی بنا پر دربار سے نکالا گیا اور بھاگ کر ھرات چلا گیا۔ اسے بعد میں معاف کر دیا گیا، لیکن دوبارہ شاھی سرپرستی میں نہیں لیا گیا۔ بایزید کی حکومت کے آخری سال (۹۱۷ھ / ۱۵۱۱-۱۵۱۲ء) میں وہ اپنی تاریخ لکھ رھا تھا اور غالباً اسی سال اس کی وفات ھو گئی. *

بہشتی کی بابت کہا گیا ھے کہ اس نے عثمانی ترکی میں پہلا خمسہ (رکّ بآں) لکھا۔ اس کی مثنویوں میں سے مندرجۂ ذیل محفوظ ھیں: لیلے و مجنون، مخزن الاسرار، مہر و مشتری، اسکندر نامہ اور ھفت پیکر۔ اس کی تاریخ، جس کے اسلوب بیان میں قدرے لفاظی سے کام لیا گیا ھے، اصل میں ''آٹھ کتب'' (حصّوں) پر مشتمل تھی اور عثمان سے لے کر بایزید دوم تک ھر سلطان کے حالات میں ایک ''کتاب'' تھی۔ موزۂ بریطانیہ میں شمارہ Add. ۷۸۶۹ اور Revan Köşkü میں شمارہ ۱۲۷۰ میں اسی مخطوطے کے دو حصّوں میں ۷۹۱ سے ۹۰۸ھ تک کے سارے سال آ گئے ھیں۔ Add. ۲۳،۹۹۵ موزۂ بریطانیہ میں بعد کے زمانے کی ایک

تالیف زیادہ تر بہشتی کی تاریخ پر مبنی ہے، جس میں غالباً پہلی تین جلدوں کا جن کے اصل متن مکمل دستیاب نہیں ہوے، مواد لیا گیا ہے۔ یہ تاریخ جس میں ادریس بدلیسی (رک باں) کی ہشت بہشت کا پورا پورا تتبع کیا گیا ہے، نہ تو اتنی قدیم ہے اور نہ اتنی اہم ہی ہے جتنی پہلے خیال کی جاتی تھی۔

مآخذ: (۱) Babinger، ص ۴۴ اور وہ مآخذ جن کا وہاں ذکر ہے، خصوصاً Rieu: *C.T.M.*، ص ۴۴ و ۴۷؛ (۲) S. Nüzhet Ergun: *Türk Şairleri*، بذیل مادّہ؛ (۳) R. İlter: *Bihişti ve Leyli vü mecnun'u*، غیر مطبوعہ مقالۂ امتحانی، عدد ۳۸۶، در *Türkiyat Enstitüsü Library* (استانبول یونیورسٹی لائبریری میں ترکی مخطوطہ ۵۵۹۱ کا ایک مطالعہ)؛ (۴) ایک مخطوطہ ڈرہم Durham کے Ushaw College میں ہے؛ اس میں متذکرۂ بالا پانچوں نظمیں موجود ہیں۔

(V. L. MÉNAGE)

* **بِہ قُباذ:** خلفاے عبّاسیہ کے زمانے میں صوبۂ عراق کے تین اضلاع (اُستان، عربی کُورہ) کے مجموعے کا نام (جو ساسانی ایرانیوں کی انتظامیہ کو اختیار کرنے کے ساتھ ان سے لیا گیا تھا)؛ یہ سب ضلعے دریاے فرات کی مشرقی شاخ پر (جو آج کل ہندیہ کہلاتی ہے) واقع تھے۔ اس نام کے معنی ہیں "قباذ کی خوبی" (یا اچھی اراضی؟)۔ قباذ ایک ساسانی بادشاہ کا نام ہے جو پانچویں صدی عیسوی میں حکومت کرتا تھا۔ یہ اضلاع جنوب کی جانب کوفے کے ضلع سے اور فرات کے زیرین حصّے کی بڑی دلدل سے ملے ہوے تھے۔ یہ تین ضلعے بالائی، وسطی اور زیرین بہ قباذ تھے، جنھیں کبھی کبھی مجموعی طور پر "بہ قباذات" کہا جاتا تھا۔ بالائی ضلع میں ۶ تحصیلیں یا پرگنے (طَسّوج) شامل تھے، جن میں سے ایک تو موضع بابل اور اس کے کھنڈروں کا پرگنہ تھا اور باقی خُطَرنیہ، بالائی اور زیرین التلوجہ، [= الفلوجة؟] عین التمر اور ایک اور پرگنہ تھے۔ وسطی بہ قباذ میں نہر البداۃ، سورا و بربیسما، باروسما اور نہر الملک چار پرگنے تھے۔ زیرین بہقباذ کی پانچ تحصیلوں میں البداۃ [کوفہ]، فرات بدعلہ [= بادقلی؟] اور نِستَر شامل تھے۔

مآخذ: (۱) *BGA*، مواضع کثیرہ، خصوصاً ۲: ۲۳۳؛ ۶: ۷، ۲۳۶؛ (۲) یاقوت، ۱: ۷۷۰؛ (۳) مراصد الاطلاع (طبع Juynboll)، ۱: ۷۵، ۱۸۳؛ ۲: ۱۹۸، ۳۱۲ ببعد؛ (۴) البلاذری: فتوح، ص ۲۷۱، ۳۶۶؛ (۵) M. Streck: *Babylonien nach den arab. Geographen* (۱۹۰۰ء)، ۱: ۱۶-۲۰؛ (۶) J. Marquart: ایرانشہر = *Abh. G. W. Gött.*، سلسلۂ جدیدہ، جلد ۳، عدد ۲ (۱۹۰۱ء)، ص ۱۶۲، ۱۶۳ ببعد؛ (۷) Le Strange، ص ۷۰، ۸۱۔

(S.H. LONGRIGG و M. STRECK)

بُہلُول (امیر): M. E. Zakī (مشاہیر، ص ۱۴۴) کے بیان کے مطابق تین نہایت معروف و مشہور کردی شخصیتوں کا نام: (۱) سلیمانیہ خاندان کا ایک رکن، میافارقین شاخ کا امیر، الوند بے بن شیخ احمد کا فرزند۔ وہ ایک طویل مدت تک دیار بکر کے والی اسکندر پاشا کی ملازمت میں رہا۔ بعد ازاں وہ کچھ عرصہ الاسکندریہ کے قلعے (الحلّہ اور بغداد کے مابین) کا حاکم رہا۔ اس کے بعد سلطان یاوز سلیم نے میافارقین کا قلعہ اس کی تحویل میں دے دیا۔ یہ بہلول بڑا بہادر اور جری تھا اور شاہسوار بے کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا؛ (۲) دنبولی قوم کے رئیس امیر جمشید کا بیٹا اور طورس کا باشندہ، ۷۶۰ھ/ ۱۳۵۹ء میں وفات پائی؛ (۳) امیر فریدون کا صاحبزادہ، نیز دنبولی کا رئیس و نخجستان اور دغستان کا حاکم؛ شیخ حیدر صفوی کا ہم عصر اور اس کا نہایت باوفا مدد و معاون، شیخ خلیل

آق قویونلو اور حیدر کی باھمی لڑائی (۸۸۰ھ/۱۴۷۵-۱۴۷۶ء) میں کام آیا۔ ان کے علاوہ ایک بہلول پاشا بھی گزرا ھے، جو ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰-۱۸۲۱ء تک ترکوں کی طرف سے بایزید کا گورنر رھا۔ اسی سال اسے ملازمت سے بر طرف کر دیا گیا اور اس کے چار سال بعد اس کا انتقال ھو گیا۔ ویگنر Wagner (۲ : ۲۹۷ ببعد) نے اس کی مدح و ستائش کے لیے کئی صفحے وقف کیے ھیں۔

مآخذ: (۱) M. E. Zaki زکی: مشاهیر الکرد و کردستان، بغداد ۱۹۴۵ء؛ (۲) M. Wagner: *Reise nach Persien und dem Lande der Kurden*، لائپزگ ۱۸۵۲ء۔

(B. NIKITINE)

⊗ **بُہْلُول لُودھی**: سلطنت دہلی کا ایک فرمانروا (۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء تا ۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء) لودھی خاندان شاھی کا بانی۔ (لودھی افغانوں کے قبیلے کے لیے رک بہ مادّہ)۔ اس خاندان کے لوگ خلجیوں اور تغلقوں کے زمانے میں، افواج شاھی میں بکثرت بھرتی ھو کر ایک خاص مقام حاصل کر چکے تھے۔ بہلول کے دادا نے تجارت میں حیثیت پیدا کی اور سپاہ کے علاوہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ھوا۔ بہلول، ملک کالا کا بیٹا (دیکھیے فرشتہ، ۱ : ۳۱۶)، سلطان شاہ لودھی (جو سرھند کا گورنر بھی ھوا) کا بھتیجا تھا۔ سلطان شاہ، بہلول کی قابلیت سے اتنا متأثر تھا کہ اس نے اپنے بعد اسے اپنا جانشین بنایا، چنانچہ اس کے بعد وھی سرھند کا گورنر مقرر ھوا۔ اسلام خان نے اپنی بیٹی کی شادی بھی اسی سے کر دی اور اسے اپنا وارث قرار دیا۔ بہر حال بہلول اپنی قابلیت اور فہم و فراست اور تدبر و شجاعت کے طفیل سادات سلاطین کے ھاں کافی رسوخ پیدا کر چکا تھا۔ خاندانِ سادات کے سلطان محمد شاہ (بن فرید خان بن خضر خان) کے زمانے میں بہلول نے خدمات شائستہ انجام دیں۔ محمد شاہ کے زمانے میں مالوے کے محمود خلجی نے دہلی پر حملہ کیا، لیکن جلد پسپا ھوا۔ بہلول لاھور اور سرھند کا گورنر تھا، وہ دہلی کو بچانے کے لیے آگے بڑھا اور مالوے تک حملہ‌آور کا تعاقب کیا۔ محمد شاہ نے خوش ھو کر اسے خان خاناں کا خطاب دیا اور بےحد عزت و تکریم کی۔

اس اثنا میں جسرتھ کھوکھر (گکھڑ) کی ریشہ دوانیوں کے باعث بہلول کی نیت بدل گئی، چنانچہ چند افغان امرا کو ساتھ ملا کر اس نے دہلی پر حملہ کر دیا، مگر پسپا ھونا پڑا۔

۸۴۹-۸۵۰ھ/۱۴۴۵ء میں محمد شاہ کا انتقال ھو گیا۔ امرا نے اس کی جگہ اس کے بیٹے کو علاءالدین عالم شاہ کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا۔ بہلول نے اس بادشاہ کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اپنا اثر و رسوخ بڑھایا۔ ۸۵۱ھ/۱۴۴۷ء میں عالم شاہ نے امرا کے مشورے کے برعکس دہلی کو خیرباد کہہ کر بدایوں کو (جسے وہ اپنی صحت کے زیادہ موافق سمجھتا تھا یا اسے زیادہ محفوظ مقام خیال کرتا تھا) مستقر بنا لیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بہلول نے دہلی پر قبضہ جما لیا۔ علاءالدین عالم شاہ نے بھی تن بہ‌تقدیر سلطنت بہلول کے حوالے کر دی اور ۱۴۷۸ء تک بدایوں میں گوشہ‌نشینی کی زندگی بسر کر کے اسی سن میں وفات پا گیا۔

بہلول نے (حمید خان وزیر کی مدد سے) سلطنت کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ بعد میں حمید خان کو ایک منصوبے سے اپنے راستے سے ھٹا دیا۔ اس کے باوجود، بعض عناصر بہلول کے خلاف کام کرتے رھے؛ انھوں نے علاءالدین عالم شاہ کو بھی اکسایا، مگر وہ آمادہ نہ ھوا۔ پھر محمود شاہ شرقی کو بلایا جس نے دہلی پر چڑھائی کی، مگر شکست کھائی۔ اس کے بعد بھی

جون‌پور کے شرقی فرمانرواؤں سے مقابلہ ہوتا رہا، تاآنکہ آخری فرمانروا سلطان حسین شرقی نے شکست کھانے کے بعد بنگالے کا رخ کیا اور اس طرح بہار تک بہلول کی حکومت قائم ہو گئی (۸۸۳ھ / ۱۴۷۸ء)۔ ۸۹۴ھ / ۱۴۸۸ - ۱۴۸۹ء میں جبکہ وہ گوالیار کے سرکش راجا کے خلاف مہم سے واپس آ رہا تھا راستے میں ملاولی کے مقام پر فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا نظام خان سکندر لودھی (رک بآں) کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

جملہ معاصر مؤرخین بہلول کی شجاعت و تدبیر کے علاوہ اس کی سادگی، انصاف‌پسندی اور علم‌پروری کی تعریف کرتے ہیں۔ بہلول نے ایک مرتبہ پھر سلطنت دہلی کی مرکزیت بحال کی اور نظم و نسق کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔

مآخذ: (۱) بداؤنی: منتخب التواریخ، اصل فارسی سے ترجمہ و طبع Ranking و Haig و Lowe، ۳ جلد، کلکتہ ۱۸۹۸ء؛ (۲) John Briggs: *History of the rise of the Mahomedan Power in India till the Year A.D. 1612*، اصل فارسی تصنیف از محمد قاسم فرشتہ سے ترجمہ، ۴ جلد، کلکتہ ۱۹۱۰ء؛ (۳) Dorn: *History of the Afghans*، مخزن افغانی کا ترجمہ، لنڈن ۱۸۰۹ء؛ (۴) Elliot and Dowson: *The History of India as told by its own Historians*، طبع John Dowson، ۸ جلد، لنڈن ۱۸۶۷ء؛ (۵) محمد قاسم فرشتہ: تاریخ، لکھنؤ؛ (۶) Stanley Lane Poole: *Mediaeval India under Muhammadan rule* (سلسلہ *The Story of the Nations*)، لنڈن ۱۹۱۰ء؛ (۷) نظام الدین احمد: طبقات اکبری (طبع Bibliotheca Indica)، کلکتہ ۱۹۱۳ء؛ (۸) تاریخ داؤدی، مخطوطہ بانکی پور پٹنہ و دیگر مقامات؛ (۹) تاریخ مبارک شاہی، مخطوطۂ مملوکۂ پروفیسر سر جادو ناتھ سرکار [و مطبوعۂ کلکتہ ۱۹۳۱ء]؛ (۱۰) ذکاء اللہ: تاریخ ہندوستان، ج ۲؛ (۱۱) سید ہاشمی فرید آبادی: تاریخ پاکستان و بھارت، کراچی، ج ۱؛ (۱۲) ایشوری پرشاد: *History of Medieaval India*، الہ آباد ۱۹۲۵ء۔

[ادارہ]

بُہلول: المجنون الکوفی، کوفہ کے ایک مجذوب کا نام؛ ہمیں اس کا ذکر سب سے پہلے الجاحظ کی البیان میں ملتا ہے (طبع ہارون، ۲: ۲۳۰ تا ۲۳۱) جہاں وہ اس کا یہ نقشہ کھینچتا ہے کہ وہ ایک سادہ لوح شخص، راستہ چلنے والوں کے سوقیانہ تمسخر کا ہدف تھا اور اسے قطعی شیعی فرقے سے بتاتا ہے (یتشیّع)۔ ممکن ہے بہلول ۱۸۸ھ / ۸۰۴ء میں ہارون الرشید سے کوفے میں ملا ہو جیسا کہ ابن الجوزی سے مروی ہے (الاذکیاء، طبع ۱۲۷۷ء، ص ۱۸۰ ببعد؛ دیکھیے JRAS، ۱۹۰۷ء، ص ۵۳)، اور شاید اس نے [خلیفہ] ہارون کو کچھ نصیحتیں بھی کی تھیں (الشعرانی: طبقات، ص ۵۸)، مگر اتنی بات یقینی ہے کہ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی سے یا ہو سکتا ہے اس سے بھی پہلے سے افسانہ گویوں نے اس کے نام پر قبضہ کر کے اس کو ایسے لوگوں کا نمونۂ اوّلین قرار دے دیا جنھیں دانش‌مند دیوانے (العقلاء المجانین) کہا جاتا ہے اور اس سے بعض ناصحانہ اشعار کے علاوہ طرح طرح کے محاضرات، سبق آموز اور مذہبی حکایات منسوب کر دیں (دیکھیے Chauvin: *Bibl ar.*، ۷: ۱۲۶ ببعد، مخطوطۂ برلن، مواضع کثیرہ؛ کتاب خانۂ ملّی، پیرس، ص ۹۲۳، عدد ۳۶۵۳)۔ اسی طرح دعوی کیا گیا ہے کہ اس نے کچھ حدیثیں بھی روایت کیں (الذہبی، ابن تغری بردی)، مگر غالب گمان یہ ہے کہ اسے بعض اور اشخاص کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا ہے، جن کا نام بھی بہلول تھا اور جن میں بعض واقعی محدّث بھی پائے جاتے ہیں (دیکھیے خصوصاً ابن حجر: لسان المیزان،

بذیل مادّہ)۔ انھیں میں سے ایک البہلول بن راشد ولایتِ افریقیہ کے باشندے تھے اور ان کی وفات ۱۸۳ھ/۷۹۹ء میں ہوئی۔ اسی سے شاید اس متواتر روایت کی بڑی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے (دیکھیے ابن تغری بردی، ۱ : ۵۱۸؛ ZDMG، ۴۳ : ۱۱۵)، جس میں بہلول اور ہارون الرشید کے افسانوی فرزند السبتی کو ایک ہی شخص بتایا گیا ہے (دیکھیے Chauvin : *Bibl. ar.*، ۹ : ۹۳، اور مآخذ جن کا حوالہ دیا گیا ہے)۔

بغداد میں بہلول کی قبر کا بیان Niebuhr (*Reisebesch*، ۲ : ۳۰۱ ببعد؛ Le Strange : بغداد، ص ۳۰۵) نے کیا ہے اور کتبہ مؤرخہ ۵۰۱ھ/۱۱۰۷-۱۱۰۸ء اسے "مجذوبوں کا سلطان" قرار دیتا اور ایک "نفسِ مُطَمَّسَہ" یعنی مبہم دھندلی روح بتاتا ہے۔ لوگ عام طور پر اسے "بہلول دانا" (ہشیار دیوانہ) کہتے تھے اور اسے وہ الرشید کا ایک رشتہ‌دار اور اس کا مسخرہ بتاتے اور قہوہ‌خانوں میں اس کی ظرافت اور نکتہ سنجی کی حکایات بیان کرتے رہتے تھے۔ بہلول کے افسانے کا ارتقا نقطۂ عروج پر اس وقت پہنچا جب اسے عشقیہ کہانیوں کا ہیرو قرار دیا گیا، جیسے النِفزاوِی (آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی) کی الروض العاطر (مطبوعہ ۱۳۱۵ء، ص ۹) میں؛ جس میں اسے المامون کا ہم‌عصر ٹھیرایا گیا ہے (نیز دیکھیے Meissner : *Neurab. Geschichten*، ۵ : ۷۳ تا ۸۳)۔

عربی لغات میں "بُہْلُول" کے معنی "ہنسوڑ"، "خوش طبع" (عربی : ضحّاک) اور "السید الجامع لکل خیر" دیے گئے ہیں اور اب تک بھی Redhouse (ترکی - انگریزی لغت، ص ۳۱۶ الف) اور ڈوزی Dozy (Bocthor کا تتبع کرتے ہوئے) اس کے یہی معنی دیتے ہیں، اگرچہ ڈوزی "گاؤدی" اور "احمق" وغیرہ معنی کی طرف توجہ دلانے سے نہیں چوکا اور یہ معنی ابن بطوطہ (۲ : ۹۸) اور ابن خلدون (مقدمہ، طبع Quatremère، ۱ : ۲۰۱ ببعد) کے ہاں پہلے ہی موجود ہیں۔ آج کل اور خصوصاً شمالی افریقہ میں اس کے معنی عام طور پر "سادہ لوح" "ننھا بچہ" وغیرہ کے لیے جاتے ہیں اور H. Wehr : *Wörterbuch* اس کے معنی "دل لگی باز، نقال، مسخرہ" دیتا ہے۔ اس حقیقت سے کہ لفظ بہالیل، بہلولات ابھی تک بعض اوقات انتہائی سرور و بہجت (دیکھیے Doutté : *Marabouts*) پر دلالت کرتے ہیں D.B. Macdonald (آؤ، لائڈن، بار اوّل، بذیل مادّہ) یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اس لفظ کا موجودہ استعمال اس کے لفظی مفہوم پر بھی مبنی ہے، اس پر نہیں کہ کوئی شخص بہلول نامی واقعی گزرا ہے۔ بلاشبہہ یہ ممکن ہے کہ الفاظ "ھَبالی / بُہالی" کے ساتھ جو اس معنی میں مستعمل ہیں کچھ التباس ہو گیا ہو، لیکن غالب یہی ہے کہ موجودہ معنی اسمِ علم (بہلول) ہی سے مأخوذ ہوئے ہیں۔

مآخذ : متنِ مقالہ میں جو مآخذ دیے گئے ہیں ان میں (۱) براکلمان : تکملہ، ۱ : ۳۰۰؛ [(۲) فوات الوفیات، ۱ : ۸۲؛ (۳) نزہۃ الجلیس، ۱ : ۳۸۰] کا اضافہ کیا جائے۔

(ادارہ)

بَہْمَن : رک بہ تاریخ۔

بہمنی سلطنت : سلطان محمد بن تغلق کے عدم تدبر، عُجلت اور دکن کے امیرانِ صدہ میں اس سے پیدا ہونے والی بےچینی کی وجہ سے وہاں ایک آزاد ریاست کا قیام ہوا، جس کے پہلے حکمران اسمٰعیل مُخ کو سلطان ناصر، یعنی اسمٰعیل شاہ کے لقب سے ۱۳۴۵ء میں منتخب کر لیا گیا، لیکن اسمٰعیل اس منصب سے عہدہ برآ نہ ہو سکا اور بہت جلد اسے جری شجاع حسن گنگو کے لیے جگہ خالی

کرنی پڑی۔ حسن کو دولت آباد میں قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی تعمیر کردہ مسجد میں تاجِ خسروی پہنایا گیا اور اس نے سلطان علاءالدین حسن بہمن شاہ کے لقب سے عنانِ حکومت سنبھالی۔ یہ واقعہ ۲۴ ربیع الآخر ۷۴۸ھ / ۳ اگست ۱۳۴۷ء کا ہے۔ بہمنی سلاطین کے جلوس کی تاریخ وار جدول درج ذیل ہے:

(الف) سلاطین جن کا مستقر احسن آباد، گلبرگہ تھا:

(۱) علاءالدین حسن بہمن شاہ، ۲۴ ربیع الآخر ۷۴۸ھ / ۳ اگست ۱۳۴۷ء۔

(۲) محمد شاہِ اوّل، ۳ ربیع الاوّل ۷۵۹ھ / ۱۱ فروری ۱۳۵۸ء*۔

(۳) علاؤالدین مجاہد شاہ، ۱۹ ذوالقعدہ ۷۷۶ھ / ۲۱ اپریل ۱۳۷۵ء۔

(۴) داؤد شاہِ اوّل، ۱۷ ذوالحجّہ ۷۷۹ھ / ۱۶ اپریل ۱۳۷۸ء۔

(۵) محمد شاہ ثانی، ۲۲ محرّم ۷۸۰ھ / ۲۱ مئی ۱۳۷۸ء [قبّ لین پول: *The Mohammadan Dynasties*، ص ۳۱۸، محمود شاہ اول]۔

(۶) غیاث الدین تہمتن شاہ، ۲۱ رجب ۷۹۹ھ / ۲۰ اپریل ۱۳۹۷ء۔

(۷) شمس الدین داؤد شاہ ثانی، ۱۷ رمضان ۷۹۹ھ / ۱۴ جون ۱۳۹۷ء۔

(۸) تاج الدین فیروز شاہ، ۲۴ صفر ۸۰۰ھ / ۱۶ نومبر ۱۳۹۷ء۔

(ب) سلاطین جن کا دارالحکومت محمد آباد، بیدر تھا:

(۹) شہاب الدین احمد شاہ اول، ۵ شوال ۸۲۵ھ / ۲۲ ستمبر ۱۴۲۲ء۔

(۱۰) علاءالدین احمد شاہ ثانی، ۲۹ رمضان ۸۳۹ھ / ۱۷ اپریل ۱۴۳۶ء۔

(۱۱) علاءالدین ہمایوں شاہ، ۲۲ جمادی الآخرہ ۸۶۲ھ / ۷ مئی ۱۴۵۸ء۔

(۱۲) نظام الدین احمد شاہ ثالث، ۲۸ ذوالقعدہ ۸۶۵ھ / ۴ ستمبر ۱۴۶۱ء۔

(۱۳) شمس الدین محمد شاہ ثالث لشکری، ۱۳ ذوالقعدہ ۸۶۷ھ / ۳۰ جولائی ۱۴۶۳ء۔

(۱۴) شہاب الدین محمود شاہ، ۵ صفر ۸۸۷ھ / ۲۶ مارچ ۱۴۸۲ء۔

(۱۵) احمد شاہ رابع، ۴ ذوالحجّہ ۹۲۴ھ / ۷ دسمبر ۱۵۱۸ء۔

(۱۶) علاؤالدین شاہ، ۱۷ محرم ۹۲۷ھ / ۲۸ دسمبر ۱۵۲۰ء۔

(۱۷) ولی اللہ شاہ، ۱۷ ربیع الآخر ۹۲۹ھ / ۴ مارچ ۱۵۲۳ء۔

(۱۸) کلیم اللہ شاہ، ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵-۱۵۲۶ء۔

بہمن شاہ ایک اولوالعزم حکمران تھا اور اس کی نیّت یہ تھی کہ دہلی سمیت تغلقوں کی سلطنت کو اپنے زیرِ نگین کرے، لیکن اس لاحاصل جرأت آزمائی سے اسے وزیر اعظم ملک سیف الدین غوری نے باز رکھا اور اسے مشورہ دیا کہ پہلے دکن پر اپنا قبضہ جمائے۔ تھوڑے عرصے میں قندہار، کوٹ گر، مرام اور اکل کوٹ فتح کر لیے گئے اور کلیانی یا کلیان بھی، جو چلوکیوں کی قدیم سلطنت کا دارالحکومت تھا، سلطنت میں شامل کر لیا گیا اور اس کا نام دارالامان رکھا گیا۔ مالکھیر پر بھی قبضہ کر لیا گیا اور اس کے باشندوں کو جان اور عزت کی پوری امان دی گئی۔ گلبرگہ، جو بعد میں

---

* اس تاریخ کا تعیّن اپنے ہاں کے وقائع سے لیا گیا ہے، لیکن *JASB*، ۱۹۲۰ء، ص ۴۶۷ پر بہمن شاہ کے ایک سکّے پر ۷۶۰ھ/ ۱۳۵۹ء کا حوالہ ملتا ہے اور اس حساب سے محمد شاہ کا سنِ جلوس ایک سال آگے ہونا چاہیے۔

دارالسلطنت قرار پایا، فتح کر لیا گیا اور مدھول کی فتح کے بعد وہ اس کے حکمران نرائن کو واپس کر دیا گیا، جو بعد میں سلطان کا دستِ راست بن گیا۔ بہمن شاہ نے گوا پر بھی چڑھائی کی اور کامیاب رہا، لیکن جنوب مشرق میں نیلور کی مہم اتنی کامیاب نہ رہی، وہاں راجا آنڈا وڈو نے اسے شکست دے دی تھی، اسی لیے اسے تلنگانہ کے صرف ایک ہی حصّے پر قناعت کرنا پڑی۔ اس کا انتقال اڑسٹھ سال کی عمر میں ۳ ربیع الاوّل ۷۵۹ھ/ ۱۱ فروری ۱۳۵۸ء کو ہوا اور اس کا بیٹا محمد شاہ اس کا جانشین ہوا۔

تنظیم ریاست: یہ سعادت محمد شاہ اوّل کو ارزانی ہوئی تھی کہ وہ ریاست کو ایک واقعی منظّم کُل کی شکل میں مربوط کرے۔ جب اس کی والدہ ۷۶۱ھ/ ۱۳۶۰ء میں حج کے لیے گئی تو اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خلیفۂ مصر المعتضد باللہ سے اس امر کی رسمی سند حاصل کر لی کہ وہ اپنے نام کا سکّہ جاری کرے اور خطبۂ جمعہ میں اس کا نام لیا جایا کرے۔ وہ بالالتزام شاہانہ شان و شکوہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اور اپنے روزمرہ کے دربار کا تزک و احتشام ایک عظیم الشان سلطنت کے حکمران کی حیثیت کے مطابق قائم رکھتا تھا۔ اپنے عہدِ حکومت کی ابتدا میں تو وہ صرف اسی نقرئی تخت پر قائم رہا جو اس کے والد سے اسے ترکے میں ملا تھا، لیکن مارچ ۱۳۶۳ء میں اس کی جگہ شاندار تختِ فیروزہ نے لے لی، جو راجہ تلنگانہ نے اسے تحفۃً بھیجا تھا۔ اس خاندان کے اختتام تک یہی تخت سلاطینِ بہمنی کی نشستگاہ رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے وزیر اعظم نے، جو اس کا خُسر بھی تھا، ایک رسالہ موسوم بہ نصائح الملوک تصنیف کیا تھا، جس میں نظامِ حکومت کے احوال بیان کیے گئے تھے؛ مرکزی حکومت تین محکموں پر منقسم تھی: ملکی (سول)، فوجی اور عدالتی۔ ملکی محکمے کی مرکزی شخصیت وکیلِ سلطنت یا وزیر اعظم تھا، جس کی امداد کے لیے وزیر اور دبیر (سکرٹری) تھے۔ اسی طرح عدالتی محکمہ قاضیوں اور مفتیوں پر مشتمل تھا۔ شہروں میں امنِ عامّہ کے قیام اور حفاظت کی ذمّے داری کوتوال (کمشنر پولیس) اور محتسب (ناظرِ اخلاقِ عامّہ) سے متعلق تھی۔ فوجی حصّے میں سپہ سالار کے ماتحت مستقرِ حکومت میں متعدد ماتحت عہدیدار ہوتے تھے، مثلاً (۱) بار برداری کا افسرِ اعلیٰ۔ ان بار برداروں کا کام یہ تھا کہ فوری ضرورت کے وقت بے قاعدہ افواج کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائیں؛ (۲) بخشی (یا مامور پرداخت Paymaster)؛ (۳) خاصہ خیل یا سلطان کی حفاظتی فوج (باڈی گارڈ) کے افسر۔ یہ گارڈ مکمل طور پر اسلحہ بند اور تربیت یافتہ چار ہزار فوج کا ایک دستہ ہوتا تھا؛ اور (۴) دو سو یکّہ جوانان یا سلحداروں کا افسرِ اعلیٰ۔ یہ جماعت سلطان کے ذاتی اسلحہ کی ذمّے دار تھی۔ بادشاہ کے متعلق اسی رسالے میں لکھا ہے کہ اسے اخلاقِ عالیہ کا مالک ہونا چاہیے۔ اس میں اس بات کا ملکہ ہونا چاہیے کہ وہ مختلف کاموں کے لیے صحیح اشخاص کا انتخاب کرے، سہل انگار اور تعیش پسند افراد کی صحبت سے احتراز کرے اور علما اور اربابِ فہم و ذوق کے مشورے قبول کرنے کے لیے تیار رہے۔

تمام ملک کو چار اطراف یا صوبہ جات میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر طرف یا صوبہ ایک طرفدار یا گورنر کے ماتحت تھا۔ طرفدار شروع میں اپنے صوبے کے ملکی اور فوجی دونوں طرح کے معاملات کے لیے ذمّے دار تھا اور قلعہ دار یا قلعوں کے کمانڈر اس کے ماتحت تھے۔ ان چار صوبوں کے مرکز دولت آباد، برار، احسن آباد گلبرگہ، اور محمدآباد بیدر تھے۔ بیدر میں تلنگانہ کا وہ حصّہ بھی

تھا جو ابتداءً بہمنی سلطنت میں شامل تھا۔ ان میں سے گلبرگہ کا صوبہ، جس میں دارالحکومت واقع تھا، قدرتی طور پر سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا اور اس کا طرفدار عموماً وہ شخص ہوتا تھا جسے حکمران کا پورا اعتماد حاصل ہو۔

بارود [آرگ بان] کی دریافت کے بعد مدافعت کے طریق کار میں بہت بڑا تغیّر واقع ہوا۔ اس بھک سے اڑ جانے والے مادّے کا ذکر ہماری تاریخوں میں سب سے پہلے ۷۶۷ھ / ۱۳۶۵-۱۳۶۶ء میں محاصرۂ ادونی کے سلسلے میں آتا ہے۔ بیضا واقع ہسپانیہ میں ۱۳۲۵ء میں بارود کا اوّلین استعمال ہوا تھا؛ محاصرۂ ادونی اس سے بمشکل چالیس سال بعد کا واقعہ ہے اور اس کی تاریخ تقریباً اکتالیس سال اس تاریخ سے پہلے جب چینی سیّاح Ma-Haun ۱۴۰۶ء میں بنگال میں فنِ آتش‌بازی کے وجود کا ذکر کرتا ہے۔ بارود کی دریافت کے ساتھ ہی مدافعتی آلات کے تخیّل میں بنیادی تبدیلی رونما ہوئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ بھدّی دیواروں کے قلعوں کی جگہ عظیم الشان قلعے تعمیر ہوئے، جن کی دیواریں بہت موٹی تھیں اور ان میں فصیلوں کے بُرجوں کے درمیان مضبوط دیواریں (curtains) قائم کی گئی تھیں، جن میں سوراخ، بُرج اور بازو تھے۔ اس قسم کے جو قلعے پہلے پہل تعمیر کیے گئے ان میں سے ایک کا نام ”پناہِ اسلام“ تھا۔ یہ مقام بھنگر میں واقع تھا اور ۷۷۶ھ/۱۳۷۴-۱۳۷۵ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔

سطح مرتفع دکن کے مخصوص وسطی محلِّ وقوع کا اقتضا ہے کہ وہ مختلف تہذیبوں کی جاے اتصال ہو۔ بہمنی سلاطین تغلقوں کی روایت کے موروثی حامل تھے، جو شمال سے آئی تھیں، مگر دکن کے توطّن کے بعد وہ دہلی کی سلطنت سے منقطع ہوگئے، کچھ تو اس لیے کہ اس نئی ریاست کی بنا ہی شمال کے ساتھ اختلاف پر ڈالی گئی تھی، کچھ اس لیے بھی کہ حکومت دہلی کے ساتھ کوئی مشترک سرحد نہ تھی، بلکہ نئی ریاستیں، مثلاً خاندیش، مالوہ اور اڑیسہ دونوں کے درمیان حائل تھیں۔ ان حالات میں بیرونی اثر اگر کوئی ہوتا بھی تو وہ قریب کے مشرقی ممالک کے تارکینِ وطن ہی کا ہو سکتا تھا۔ تغلقوں کے اثر کا سب سے نمایاں مظہر بہمنی دور کے ابتدائی سکّے اور ان کی عمارات ہیں۔ گلبرگہ کی بغایت اختصاصی عمارت، یعنی قلعے کی عظیم الشان جامع مسجد کے علاوہ دو اور بہمنی یادگاریں ایسی ہیں جنھیں مثالی کہا جا سکتا ہے، یعنی مسجد شاہ بازار کا ایوان اور پہلے دو بہمنی سلاطین کے مقبرے؛ ان میں اسی قسم کی دو مخروطی دیواریں، چاروں کونوں پر پتھر کے گلدستے اور چپٹے گنبد نظر آتے ہیں، جن سے دہلی کی ان تاریخی عمارات کی یاد تازہ ہوتی ہے جو تغلقوں کے عہد کی یادگار ہیں۔ جامع مسجد بجاے خود ایک مخصوص صنف کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی تعمیر ۷۶۹ھ/۱۳۶۷ء میں ہوئی۔ یہ رفیع بن شمس قزوینی کے تیار کردہ نقشے کے مطابق تیار کی گئی، شرقاً جنوباً یہ دو سو سولہ فٹ ہے اور شمالاً جنوباً ایک سو چھہتر فٹ۔ یہ امر بھی قابلِ ملاحظہ ہے کہ اس عمارت ہی سے مترشح ہوتا ہے کہ عہدِ تغلق کی روایات کو خیر باد کہہ دیا گیا ہے۔ ہندوستان کی دوسری مساجد کے برعکس یہ تمام کی تمام مسقّف ہے، اور بلاشبہہ جس فن کار نے اس کی تعمیر کی ہے اس کا طرز اندلسی روایات کا منّت پذیر تھا، جہاں مساجد تقریباً سر بسر مسقّف ہوتی تھیں۔ اس مسجد میں دیواریں عمودی ہیں اور گنبد خاصی بلند سطح پر تعمیر کیے گئے ہیں۔ اس عمارت کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ جن ستونوں پر عظیم الشان چھت کھڑی ہے ان کی اس طرح ترتیب دی گئی ہے کہ جماعت کا ہر نمازی خواہ وہ مسجد

کے کسی حصے میں ہو، امام کو منبر پر اچھی طرح سے دیکھ سکتا ہے، نیز چونکہ مسجد میں کھڑکیاں نہیں ہیں اور وہ چاروں طرف سے بالکل کھلی ہے، سال کے بارہ مہینے ہر طرف سے کھلی ہوا کے جھونکے اندر آتے رہتے ہیں۔

سلطان محمد کو جنوب میں وجیانگر اور مشرق میں تلنگانہ کی حکومتوں سے نبردآزما ہونا پڑا۔ اس خاندان کی حکومت اپنی ابتدا ہی سے وجیانگر کے ''رایان'' (rāyas) سے برسرِ پیکار رہی۔ ان کا نزاع کچھ تو اس لیے تھا کہ کرشن تنگ بھدر کے شاداب دوآبے پر کون قابض ہو، لیکن زیادہ تر اس بنا پر کہ دکن میں ان دونوں طاقتوں میں سے کس کی بالا دستی مسلّم ہو۔ ان دونوں ریاستوں کی بنیاد تقریباً ایک ہی وقت میں رکھی گئی تھی، اور یہ نزاع، جس کی ابتدا سلطان محمد اوّل کے عہد میں ہوئی، تقریباً پورے بہمنی دور میں جاری رہا۔ بہمنی حکومت کا مطالبہ تھا کہ ریاست وجیانگر اسے خراج ادا کرے اور اس مطالبے کو تسلیم کرانے کے لیے اسے عسکری طاقت کو کام میں لانا پڑا، لیکن اس کا جواب وجیانگر نے بارہا دوآبے پر جوابی حملے سے دیا اور اب بکّا نے دوآبے پر اپنا حق جتایا۔ مشرق کی جانب ونایک راؤ حاکم تلنگانہ نے کولاس پر چڑھائی کر دی، لیکن اسے گرفتار کر لیا گیا؛ پھر چونکہ بادشاہ کے خلاف اس نے نازیبا کلمات استعمال کیے لہٰذا بعد میں اسے قتل کر دیا گیا۔ ونایک کے باپ کرشن نے صلح کی درخواست کی اور اسے گولکنڈہ بہمنی سلطنت کے حوالے کرنا پڑا۔ اسی موقع پر تختِ فیروزہ سلطان محمد کی نذر کیا گیا۔ جنوبی سرحد پر ایک دلچسپ واقعے نے وجیانگر سے مخاصمت کا آغاز کیا۔ سلطان محمد دوآبے پر رائے کے مطالبے سے پیچ و تاب کھا ہی رہا تھا؛ اس نے اطمینان سے وجیانگر کے خزانے کے نام ایک ہنڈی بھیجی جس کی ادائی ان قوّالوں کو ہونی تھی جو دہلی سے گلبرگہ کے دربار میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے آئے تھے۔ ہنڈی ادا تو کون کرتا، الٹا ان گویوں کو جنوبی حکومت کے دارالسلطنت میں گدھوں پر سوار کر کے تشہیر کیا گیا۔ اس پر جنگ ہوئی، اس طرح کہ ایک محاذ پر ایک فریق جیتا تو دوسرے پر دوسرا، لیکن بالآخر میدان بہمنی فوج کے ہاتھ رہا۔ یہ مہم اس لحاظ سے مشہور ہے کہ اس کے دوران میں ہم پہلی دفعہ بہمنی توپخانے کے سپاہیوں میں رومیوں اور فرنگیوں کو موجود پاتے ہیں؛ اور بظاہر یہ پہلا موقع ہے کہ کسی ہندوستانی والیِ ریاست نے یورپ کے باشندوں کو اپنی ملازمت میں لیا۔

جانشینی کے جھگڑے : سلطان محمد اوّل کی وفات اور تاج الدین فیروز کے سریر آرائے سلطنت ہونے کا درمیانی عرصہ فترت کا زمانہ ہے، جس میں سلطان محمد ثانی کے طویل اور پُر امن عہد کے سوا باقی تمام زمانہ حصولِ تخت کے لیے ایک طویل کشمکش کا دور ہے، جو قتل و غارت سے پُر ہے۔ اس کے برعکس سلطان محمد ثانی کا عہد اس کی نمایاں قابلیت، امن پسندی اور ثقافت دوستی کا آئینہ دار ہے۔ وہ بہمنی خاندان کے قابل ترین سلاطین میں سے تھا، جس نے دکن کو علوم و فنون کا مرکز بنانے کی پوری سعی کی۔ اس نے شیراز کے مشہور عالم شاعر خواجہ شمس الدین حافظ کو دکن آنے کی دعوت دی اور اگر خواجہ حافظ بحری سفر کرنے سے متنفّر نہ ہوتے تو وہ آتے اور دکن کو اپنا وطن مالوف بنا لیتے۔ حافظ کی مشہور غزل کا مندرجۂ ذیل شعر فارسی ادب کے طالب علم کو ہمیشہ اس دعوت کی یاد دلاتا رہے گا جو سلطان محمد ثانی نے اسے دکن آنے کے لیے دی تھی:

بس آسان می نمود اول غم دریا ببوے سود
غلط گفتم کہ یک موجش بصد گوہر نمی ارزد

سلطان محمد ثانی کا عہد اس لحاظ سے یادگار ہے کہ اس میں ماوراء النہر کے وسطی ایشیاء ایران اور ملک عرب کے جری اور تنومند انسانوں کی ایک رَو آئی، جن کے نصیب میں تھا کہ بالآخر اس سرزمین کی آبادی کا ایک ممتاز عنصر بن جائیں؛ ادیب، علما، دستکار، تاجر، سپاہی اور ماہرینِ فنِ تعمیر سب کے سب دکن کی طرف کھچے چلے آ رہے تھے؛ انہیں غریب الدیار یا آفاقی کہا جاتا تھا (ان دونوں ناموں سے طنز کی بو آتی ہے) ۔ دکن میں ان کی موجودگی مستقبل قریب میں ایک اہم سیاسی مسئلہ بن جانے والی تھی، خصوصاً اس لیے کہ اپنے تازہ خون اور جرأت مندانہ اندازِ طبع کے باعث وہ زندگی کے تمام شعبوں میں سرگرم حصہ لینے لگے تھے ۔ ان نو واردوں کا اثر زیادہ‌تر ایرانی خصائص کا حامل تھا، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے پہلو بہ پہلو مقامی ہندو تہذیب بھی اب دخیل ہونے لگی تھی ۔ اس خانوادے کے تیسرے سلطان علاءالدین مجاہد کو ان کی رعایا ”بلونت“ کے خاص ہندوانہ خطاب سے یاد کیا کرتی تھی، اور یہ اثر مسلمانوں کے اکثر متبرک مقامات، مثلاً مقابر اور مساجد کے فنِ تعمیر میں بھی نمایاں ہے مثلاً بیدر (محمد آباد)۔

حکومت گلبرگہ کا یہ دور، جسے زمانۂ فترت کہہ سکتے ہیں، دو بھائیوں فیروز اور احمد کے ہاتھوں اختتام پذیر ہوا ۔ یہ دونوں بہمن شاہ کے پوتے اور سلطان محمد ثانی کے داماد تھے ۔ سلطان محمد ثانی کی وفات کے بعد فساد کی جڑ ”تغلچین“ تھا، جس نے سلطان موصوف کے جانشین غیاث‌الدین تہمتن کی آنکھیں نکال دی تھیں اور خود آمرانہ اختیارات کے ساتھ وزیر اعظم کا منصب سنبھال لیا تھا ۔ فیروز نے موقع ملتے ہی دارالحکومت پر دھاوا بول دیا ۔ تغلچین کے آوردہ داؤد ثانی کو تخت سے اتار کر خود تاج الدین فیروز شاہ کے نام سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔

مختلف ثقافتوں کا امتزاج: یوں تو سلطان فیروز کا پورا عہدِ حکومت وجیانگر کے راجے اور اس کے اتحادی سردارانِ راجمندری اور کھیڑلا سے نبرد آزمائی میں صرف ہوا لیکن یہ اس قابلِ ذکر ہے کہ اس عہد کی ایک خصوصیت مختلف ثقافتوں کا امتزاج تھی ۔ وجیانگر سے آویزش کا نتیجہ دو دلچسپ واقعات تھے، جن کے اثرات لازماً دکن کی ثقافت پر مرتب ہوئے ہوں گے ۔ ایک تو سلطان کی اپنی شادی وجیانگر کی شہزادی کے ساتھ ہوئی، جو نہایت دھوم دھام کے ساتھ رچائی گئی اور دوسرے شہزادہ حسن خان کا بیاہ پرتھال کے ساتھ ہوا ۔ پرتھال بہمنی مملکت کے ایک علاقے مدگل کے رہنے والے ایک زرگر کی بیٹی تھی اور کہا جاتا ہے کہ وہ صرف ایک نامور مغنیہ ہی نہ تھی بلکہ اپنی خوش گفتاری کے لیے بھی شہرت رکھتی تھی۔

فیروز شاہ کی دلی خواہش تھی کہ وہ مغربی اسلامی ممالک سے بہترین اشخاص کو اپنے ہاں بلوائے ۔ چنانچہ اس غرض کے لیے اس نے مصطفی آباد، دابل اور چول کی بندرگاہوں سے بہمنی جہاز روانہ کیے تاکہ علما کو ملک دکن میں لائیں اور اس طرح اس حکمران نے اپنے خُسر کی روش کو جاری رکھا ۔ ان نئے غیر ملکی آبادکاروں کے اثر کو خالص ہندوانہ اثر کے مقابلے میں استعمال کیا گیا، اور دکنی تہذیب کی شاندار عمارت انہیں دو ثقافتوں کے امتزاج سے بنی، جو اس ملک کی تاریخ میں قطب شاہی اور آصف شاہی دور میں بھی قائم رہی ۔ فیروز خود بھی ایک نہایت اچھا خوش نویس تھا اور تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، طبیعیات اور اصطلاحاتِ تصوف پر اسے پورا عبور حاصل تھا ۔ ان علوم میں

اس کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر ہفتے وقت نکال کر منتخب طلبہ کو چند گھنٹے درس دیا کرتا تھا۔ وہ شعر بھی اچھا کہہ لیتا تھا اور فیروزی اور عروجی تخلّص کرتا تھا۔ اس کا تحصیلِ السنہ کا ملکہ بیحد قوی تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ تلیگو، کنڑی، مراٹھی، گجراتی، بنگالی اور کئی اور زبانوں کا ماہر تھا، اور ساکنانِ محل کے ساتھ، جن کی یہ مادری زبانیں تھیں، ان زبانوں میں بے تکلّف گفتگو کیا کرتا تھا۔ اس کے رفاہ عامّہ کے کاموں میں سے ایک یہ تھا کہ ۸۱۰ھ / ۱۴۰۸ء میں اس نے اورنگ آباد کے قریب کے سلسلۂ کوہ پر ایک رصد گاہ بنانے کا تہیہ کیا۔ اس کی تعمیر سید محمود گازرونی اور حکیم حسن گیلانی کے زیرِ اہتمام شروع ہوئی، لیکن ایسا معلوم ہوتا کہ یہ عمارت حکیم گیلانی کی موت کی وجہ سے شرمندۂ تکمیل نہ ہوسکی۔ اس کے علاوہ وہ عمارات کی تاسیس کا بھی بے حد شائق تھا۔ احسن آباد گلبرگہ میں اس کا اپنا مقبرہ اور دریائے بھیما کے کنارے فیروز آباد میں اس کے قلعے والے محل کا جو حصّہ ابھی باقی ہے اس کے اس ذوق و شوق پر شاہد ہیں۔ ان عمارات کا امتیازی نشان یہ ہے کہ ان میں ایرانی اور دکنی خصوصیّات کو بڑی قابلیت سے سمویا گیا ہے اور یہی امتزاج دکن میں بہمنی فنِ تعمیر کا طغرائے امتیاز ہے۔ یہ خصوصیّت اس عہد کی مشہور عمارات میں سے دو میں بہت نمایاں ہے: یعنی مقبرۂ فیروز شاہ اور مزار خواجہ گیسودراز میں۔ مقبرۂ فیروز شاہ کی بہمنی محرابیں خالص ہندو طرز کے بازووں پر استادہ ہیں۔ اسی طرح چھجے کو سہارا دینے والی بریکٹیں (brackets) خالص ہندوآنہ طرز کی ہیں، اور اس کے ساتھ ہی اس مقبرے کے دو گنبدوں میں سے ایک کے جوف کے اندر نقش و نگار اور کتبات کی پیچیدہ پٹیاں قطب مینار دہلی کے بیرونی حصّے کی یاد کو تازہ کرتی ہیں۔

بادشاہ کے عہد کے آخری ایام دکن کی ایک نہایت واجب الاحترام ہستی حضرت محمد الحُسینی المعروف بہ بندہ نواز گیسو دراز سے مناقشت میں بسر ہوئے۔ یہ بزرگ ۱۳۲۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۴۱۳ء میں جب وہ دکن پہنچے تو ان کی عمر نوے سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ یہاں وہ خوش منظر خانقاہ میں فروکش ہوئے، جو قلعۂ گلبرگہ کے نواح میں واقع ہے۔ شروع شروع میں سلطان نے آپ کی رعایت ملحوظ رکھی، لیکن جلد ہی شکوک و شبہات کا دور شروع ہو گیا؛ کشیدگی بڑھتی گئی اور سلطان نے آپ کو پیغام بھیجا کہ وہ کسی اور جگہ جا کر فروکش ہوں، کیونکہ ان کے معتقدین کا شور و غل ذاتِ شاہی کے کانوں پر گراں گزرتا ہے؛ مگر سلطان کے برعکس اس کے بھائی احمد کو اس بزرگ ہستی کے کمالاتِ روحانی و اخلاقی پر بہت اعتقاد تھا اور وہ ان کے ساتھ پوری طرح سے وابستہ رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فیروز کے پاؤں تلے سے زمین آہستہ آہستہ نکلتی گئی اور بالآخر اسے اپنے بھائی سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس کے بھائی نے اسے شکست دی اور شہاب الدین احمد اوّل کے نام سے وارثِ تخت و تاج بنا۔

دارالحکومت کی تبدیلی: غالباً سب سے پہلا کام جو نئے سلطان نے کیا وہ یہ تھا کہ دکن کا دارالحکومت بیدر میں تبدیل کر دیا اور اس کا نام محمّد آباد رکھا۔ گلبرگہ کی سیاسی فضا میں شاہ کشی اور خونریزی کی وجہ سے فضا مکدر ہو گئی تھی اور دارالحکومت میں متعدّد ایسے اشخاص تھے جو نئے حکمران کو غاصب تصوّر کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی سلطان احمد کے مرشد خواجۂ گیسودراز کے انتقال کا اثر بھی بادشاہ کے دل پر ہوا ہو گا، اور دارالسلطنت کی تبدیلی کی وجوہ میں سے یہ بھی

ایک ضرور ہوگی (مزید تفصیل کے لیے رک بہ بیدر [= محمد آباد]).

بیدر کا قلعہ سلطان احمد شاہ اوّل کی غیر معمولی ذکاوت کی زندہ یادگار ہے۔ اس کی بنیادیں ایک قدیمی قلعے کے مقام پر اٹھائی گئی ہیں۔ چار ہزار پانچ سو گز کی دیوار اس کا احاطہ کیے ہوے ہے اور یہ سطح مرتفع بیدر کے کنارے پندرہ سو فٹ کے عمودی نشیب پر واقع ہے۔ قلعے کی سب سے قدیم عمارت سولہ کھمب مسجد ہے، جو اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس کی چھت پر ایک ذخیرۂ آب ہے، جس سے مسجد اور ارد گرد کے محلّات کو پانی مہیا کیا جاتا تھا۔ ایوانِ بارِ عام اور ایوانِ بارِ خاص، جس کے ستونوں اور دیواروں کے بقایا ابھی تک موجود ہیں، اور شاندار تخت محل (شاہی تخت گاہ)، ان تمام کا مجموعی اثر نہایت دلکش ہوتا ہوگا۔ ان عمارات میں ایرانی اثر صاف نظر آتا ہے۔ چنانچہ تخت محل کی کاشی اینٹوں (tiles) اور محرابوں میں اور پچی کاری کی ہوئی شیر و طلوعِ آفتاب کی تصویر میں، جو آج بھی دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں، یہ اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ قلعے سے دو میل کے فاصلے پر سلاطینِ بہمنیہ کے مقبرے ہیں، جن میں سب سے شاندار مقبرہ احمد شاہ کا ہے، جسے مسلم اور غیر مسلم یکساں طور پر ولی مانتے تھے۔ اس مقبرے کی تعمیر گلبرگہ میں فیروز شاہ کے مقبرے کی تعمیر سے محض بارہ سال بعد عمل میں آئی، لیکن اس کا طرزِ تعمیر مقبرۂ فیروز شاہ سے بالکل مختلف ہے اور اس میں ایرانی اثر اپنی پوری قوت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ بیضوی گنبد کی اندرونی جانب جو کتبات ہیں وہ تقریبًا ان جملہ طرزہاے خطّاطی کے نمونے ہیں جو مشرق اوسط میں مروّج ہیں۔ اگرچہ بہمنی سلاطین سُنّی عقیدہ رکھتے تھے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علی رض کا اسم مبارک مختلف طرزہاے نگارش میں گنبد کے گرداگرد نہایت دلکش حروف میں مرقوم ہے۔ یہ اس دلچسپی سے خالی نہیں کہ وجیانگر کی حکومت بھی، جو بہمنیوں سے ساتھ ہمیشہ برسرِ پیکار رہی، فنِ تعمیر میں ان کا تتبّع کیے بغیر نہ رہ سکی اور اب بھی ہمپی کے کھنڈروں میں دیکھنے والے کو ان عمارات میں خالص ایرانی۔بہمنی محراب کی موجودگی ورطۂ تحیّر میں ڈال دیتی ہے، مثلًا زنانہ احاطے کے دیدبان، دناٹک کا احاطہ، پہرہ داروں کی اقامت گاہیں، فیل خانے، تلاری گٹو کی شاہراہ کا دروازہ، کنول محل اور چند دیگر اہم عمارات.

فیروز شاہ کے عہد حکومت کے اواخر میں بہمنی فوجوں کو وجیانگر کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔ اب احمد شاہ نے اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے جنوب کی طرف فوج کشی کی۔ بے ترتیب جھڑپوں اور طویل چھاپہ مار جنگ سے بہمنی فوج کا پیمانۂ صبر لبریز ہونے ہی والا تھا کہ احمد شاہ نے تنگبھدرا کے جنوب کی جانب ایک دم مکمّل فوج کشی کا حکم دے دیا۔ ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ سلطان اپنی فوج سے بچھڑ گیا اور غنیم کی فوج کے ایک دستے کے ہتّے چڑھ گیا اور صرف ایک چال کے ذریعے بھیس بدل کر ایک کسان کے غلّے کی کوٹھی کے اندر پناہ لینے میں کامیاب ہوا۔ صورت حال ایسی نازک تھی کہ اگر فوج کے مستقر سے بروقت امداد نہ پہنچتی تو وہ قتل کر دیا جاتا۔ اس موقع پر جس بات نے شاہ کو سب سے زیادہ متأثر کیا وہ یہ تھی کہ اس کے جان بچانے والوں میں اکثریت ''آفاقی'' افسروں اور سپاہیوں کی تھی۔ اس بنا پر اس نے احکام جاری کر دیے کہ اس کی ذاتی محافظ فوجی دستے میں صرف وہ سپاہی لیے جائیں جنھیں سمندر پار سے فوج میں بھرتی کیا گیا ہو اور اپنے

ندیم خاص خلف حسن بصری کو، جو خود ایک آفاقی تھا، ملک التّجار کا منصب عطا کیا۔ اس کے بعد احمد شاہ نے وجیانگر کی افواج کا بہت جلد خاتمہ کر دیا اور دارالحکومت کے پھاٹک تک پہنچ گیا اور ''رائے'' کو اس رقم کے ادا کرنے پر مجبور کیا جو سلطان کے نزدیک خراج کی بقایا اس کے ذمّے تھی۔ مشرقی محاذ پر بہمنی افواج نے امّا پوتے دیما کو، جو وجیانگر کا طرفدار تھا، شکست دی اور وہ مظفر و منصور ورنگل میں داخل ہو گئیں۔

اسی عہد میں مالوے اور گجرات میں بھی پہلی دفعہ میدانِ کارزار گرم ہوا۔ مالوے کا حکمران اس زمانے میں ہوشنگ غوری (۱۴۰۶ تا ۱۴۳۵ء) تھا اور اس کا دارالحکومت منڈو یا منڈوگڑھ میں تھا، جس کا مشہور نام شادی آباد تھا۔ ہوشنگ کھیڑلا کی سرحدی چوکی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کا سردار نرسنگھ دو رخی چال چل رہا تھا۔ کبھی تو وہ احمد شاہ سے طالبِ امداد ہوتا تھا اور کبھی سلطانِ مالوہ سے ربط و ضبط بڑھاتا تھا۔ شروع شروع میں ہوشنگ کامیاب رہا، یہاں تک کہ سرحد عبور کر گیا؛ لیکن بالآخر ایک معرکے کی لڑائی میں، جو بہمنی علاقے کے اندر لڑی گئی، اسے شکست کھا کر واپس جانا پڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کامیابی نے احمد شاہ کا حوصلہ بڑھا دیا اور اس نے ٹھان لی کہ اس وقت گجرات سے بھی دو دو ہاتھ ہو جانے چاہییں۔ گجرات کا حکمران اس وقت ایک نہایت ہوشیار شخص نصیرالدین احمد شاہ بانی احمد آباد (۱۴۱۱ تا ۱۴۴۲ء) تھا۔ جب راجا جھلاور نے گجرات کی قیادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو بہمنی سلطان کو بہانہ مل گیا اور اس نے راجا کی اعانت کے لیے فوج بھیج دی، لیکن اسے بندر بار پر شکست ہوئی۔ اور جب بہمنی افواج کے سردار خلف حسن بصری نے جزیرۂ مہائم (ماہم) پر قبضہ کیا تو گجراتیوں نے پلٹ کر بہمنیوں کے قلعۂ تھانہ میں قدم جما لیے اور ملک التّجار کو جزیرۂ بمبئی کی جانب پسپائی پر مجبور کر دیا۔ بہمنیوں کی خوش قسمتی تھی کہ سلطانِ گجرات نے ایک عہدنامے پر دستخط کر دیے، جس کی رو سے فریقین موجودہ حالت کو برقرار رکھنے پر متفق ہو گئے۔ اپنی فائدہ رسانی کے علاوہ یہ عہدنامہ تاریخ دکن میں ایک خاص اہمیّت رکھتا ہے، کیونکہ آئندہ یہ طویل مدت تک فریقین کے لیے ان کے مستحکم عقیدے کا ایک جُز بنا رہا۔

معرکۂ ماہم اختلاف کی اس خلیج کے اور زیادہ وسیع ہونے کا باعث بن گیا جو دکن کے دو بڑے گروہوں، یعنی دکنی اور آفاقی کے درمیان پہلے ہی موجود تھی۔ وجہ یہ ہوئی کہ کسی نے یہ افواہ اڑا دی کہ اس معرکے میں جب آخری دفعہ فریقین کا جم کر مقابلہ ہو رہا تھا تو دکنی جان بوجھ کر پیچھے ہٹ گئے اور فوج کے باقی ماندہ پچھلے حصے کو گجراتیوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس افواہ نے باہمی اختلاف کو اور ہوا دی جس کے نتائج آئندہ عہد میں نہایت خطرناک صورت میں ظاہر ہوئے۔

دکن میں ایک ملی جُلی ثقافت کی ترویج و ترقی دینے میں احمد شاہ نے اپنے پیش رو کی تقلید کی۔ اس ملی جلی ثقافت کی ایک واضح مثال وہ طور و طریق ہے جس سے سلطان کا، جسے دکن میں ولی کا رتبہ حاصل ہے، عرس منایا جاتا ہے۔ عرس کی ابتدا تقویم ہجری کے مطابق نہیں بلکہ ہندو جنتری کے حساب سے ہوتی ہے؛ چنانچہ جس قمری مہینے میں ہولی کا تہوار منایا جاتا ہے اس کی بیس تاریخ کو عرس منایا جاتا ہے۔ اس کا ذکر بھی باعث دلچسپی ہوگا کہ رسومِ عرس کا افتتاح جنگم یا لنگایت فرقے کا سردار

خاص گلبرگہ کے ایک گاؤں میں کرتا ہے اور پھر یہی سردار وہاں سے اپنے تین سو ساتھیوں کی معیت میں واردِ بیدر ہوتا ہے اور یہی جنگم سب سے پہلے شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ مقبرے میں داخل ہوتا ہے، سنکھ بجاتا ہے اور خالص ہندوانہ انداز میں ناریل توڑتا اور اس کا پانی پیتا ہے۔ یہ عرس اس مہینے کی ۲۹ تاریخ تک جاری رہتا ہے اور عوام کے تمام طبقے بلا امتیازِ فرقہ و ملت، اس سلطان کی بارگاہ میں نذرِ عقیدت پیش کرتے ہیں جو چار سو سال پہلے ان پر حکمران تھا۔

زندگی کے ہمہ گیر اور روادارانہ تصوّر کی جھلک اس وصیّت میں بھی نظر آتی ہے جو سلطان نے اپنے بیٹوں کو کی۔ اس میں ہدایت کی گئی ہے کہ وہ پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ، جو علم کے خزانہ دار ہیں، عہدہ دارانِ سلطنت کے ساتھ، جنہیں عوام کے ساتھ، بھلائی کرنے کی قدرت حاصل ہے، شاہی مشیروں کے ساتھ، جو سلطنت کی حکمت عملی کے مؤسّس ہوتے ہیں، اور کاشتکاروں کے ساتھ، جو سب کے لیے خوراک مہیا کرتے ہیں، مہر و ملاطفت کا برتاؤ کریں۔

رعایا کی جسمانی تربیت کی طرف بھی پوری توجہ کی جاتی تھی اور دارالحکومت کو اسی مقصد کے لیے چار ”تعلیمات“ یا جسمانی تربیت گاہ کے چار مساوی اکھاڑوں پر تقسیم کیا گیا تھا، جن میں سے ہر اکھاڑا ہندوؤں کی ایک قدیم تاریخی عمارت سے، جو عین شہر کے وسط میں واقع تھی، شروع ہو کر پھیلتا تھا۔ ہر ”تعلیم“ (اکھاڑے) کی اپنی ایک ورزش گاہ تھی اور ہر ایک میں کم سے کم ایک مدرسہ ہوتا تھا اور ایک مسجد، جہاں متعلقہ اکھاڑے کے نوجوان ”تعلیم“ کی مجلسِ منتظمہ کے زیرِ نگرانی جسمانی تربیت اور دنیوی و دینی درس حاصل کرتے تھے۔ اگرچہ ان ”تعلیمات“ (اکھاڑوں) کو عزاداریِ محرّم کے ساتھ خاص نسبت تھی) لیکن ان کے دروازے بلا امتیاز رعایا کے ہر مرد کے لیے کھلے رہتے تھے اور اپنی تنظیم میں یہ اکھاڑے مکمّل طور پر جمہوری انداز کے علمبردار تھے۔

احمد شاہ اوّل ہی کے عہدِ حکومت میں مصر کے مشہور نحوی محمّد بن ابوبکر المخزومی الدمامینی نے علمِ نحو پر اپنی شہرۂ آفاق تصنیف موسوم بہ المنہل الصافی فی شرح الوافی پایۂ تکمیل کو پہنچائی۔ یہ عالمِ نحو اسکندریہ میں ۷۶۳ھ / ۱۳۶۲ء میں پیدا ہوئے اور انھوں نے گلبرگہ میں ۸۲۷ھ/۱۴۲۴ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

گروہوں کا باہمی نزاع : علاءالدین احمد کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد مسلمانوں کے دو گروہوں میں اختلاف کی خلیج اور بھی وسیع ہو گئی۔ اس نے اپنے دورِ حکومت کی ابتدا ہی میں آفاقیوں کی جنبہ داری شروع کر دی اور یہ ایک فطری بات تھی کیونکہ اس کی تین بہنیں آفاقیوں سے بیاہی جا چکی تھیں۔ وجیانگر پر مبیّنہ خراج کی عدم ادائی کی پاداش میں دو مختصر فوجی حملوں میں، نیز راجا سنگھ ایشوز [سنگیسر؟] پر ایک حملے میں بہمنی افواج تحیاب ہوئیں۔ وجیانگر کا معرکہ اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ اس کے نتیجے کے طور پر وجیانگر کی افواج میں مسلمان سپاہی بھی بھرتی ہونے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ دیو رائے نے اپنے مشیروں سے افواج وجیانگر کی پے در پے شکستوں کے بارے میں تبادلۂ خیالات کیا۔ ان میں سے بعض کے منہ سے یہ نکلا کہ خدائے برتر نے تیس ہزار سال تک مسلمانوں کی ہندوؤں پر برتری کا فیصلہ کر دیا ہے۔ بعض نے کہا کہ مسلمان شہسواری اور تیراندازی میں ہندوؤں پر قطعاً فائق ہیں۔ ان آرا کو سُن کر دیو رائے نے

احکام جاری کر دیے کہ مسلمانوں کو آزادی کے ساتھ افواج میں بھرتی کیا جائے۔ اس نے نہ صرف یہ کیا کہ دارالحکومت میں ایک مسجد تعمیر کی بلکہ مسلمان افواج کے مصارف کے لیے انھیں بڑی بڑی جاگیریں بھی عنایت کیں۔ اس نے حکم دیا کہ قرآن حکیم کا ایک نسخہ ایک بخوبی آراستہ کرسی پر ٹھیک اس کے سامنے رکھا جائے تا کہ مسلمان رسوم کورنش اصولِ اسلام کی خلاف ورزی کیے بغیر ادا کر سکیں۔

لیکن اس جدید نمونے کی فوج کے باوجود دیو راے کو بہمنیوں کے مقابلے میں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ گو وہ دوآبہ تک پہنچ گیا اور اس نے مدگل کو بھی تسخیر کر لیا، لیکن جلد ہی اسے دوآبہ خالی کرنا پڑا اور خراج کی بقایا رقم ادا کرنی پڑی۔

بہر حال مہاراشٹر کی منحوس مہم میں بہمنی افواج کو غداری اور سازش کے ہاتھوں روزِ بد دیکھنا پڑا۔ ۱۴۴۷ء میں سلطان نے خلف حسن بصری کو شوریدہ پشت مرہٹہ سرداروں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ ان سرداروں نے مغربی گھاٹ کی تنگ گھاٹیوں کو اپنی جولانگاہ بنا رکھا تھا۔ ان میں سے ایک سردار شنکر راؤ شرکے نے ظاہر کیا کہ وہ مشرف بہ اسلام ہو چکا ہے، اور حملہ آور فوج کو ایک گھنے جنگل میں لے گیا، لیکن ساتھ ہی راجا سنگم ایشور کو خفیہ پیغام بیجا کہ اچانک حملے کے لیے یہ وقت نہایت موزوں ہے۔ راجا نے اس پیغام کے پہنچتے ہی ایک مضبوط لشکر روانہ کیا، جس نے بہمنی افواج کو گھیر لیا اور جہاں تک اس سے ہو سکا جنگی سپاہ کو بے دردی سے تہ تیغ کیا۔ انھیں میں بہادر خلف حسن بصری بھی تھا، جو اس وقت پیچش کی بیماری میں گرفتار تھا۔ بہمنی فوج کے بقیۃ السیف سپاہی سراسیمگی کے عالم میں چاکن کی طرف بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔

ان پریشان کن حالات میں بھی دکنیوں اور آفاقیوں کی عداوت ایک نئے روپ میں ظاہر ہوئی اور ایک انتہائی خفیہ چال سے تقریباً تمام آفاقی مرد و زن کو بے دردانہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان حالات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نسلی عداوت کا سرطان سلطنت کے سیاسی جسم کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا اور اگر محمود گاواں اس وقت منصۂ شہود پر آ کر فرقہ دارانہ توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش نہ کرتا تو اپنے وقت سے پہلے یہ سلطنت معدوم ہو چکی ہوتی۔

محمود گاواں کا اثر: اس عظیم جرنیل، منتظم اور مدبّر کی زندگی کا ایک خاکہ کسی دوسری جگہ دیا گیا ہے [رک بہ محمود گاواں]۔ علاء الدین ہمایوں شاہ کے عہدِ حکومت ہی میں اس کی شہرت کی ابتدا ہو چکی تھی۔ فرشتہ نے ہمایوں کو بے رحم کے لقب سے یاد کیا ہے، لیکن اس کی موت سے قبل کے چند مہینوں کے سوا اس کا تمام دورِ حکومت عفو و ترحم کا آئینہ دار ہے، اور یہ صورتِ حال اس خود مختار فرمانروا کی خودسری اور خودرائی دیکھتے ہوئے یقیناً تعجب انگیز ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس کے مشیر علی الدوام اس کی فرزانہ بیوی مخدومۂ جہاں نرگس بیگم اور محمود گاواں تھے۔ اس کا بیٹا، جو نظام الدین احمد ثانی کے نام سے سریرآراے سلطنت ہوا، اپنی تخت نشینی کے وقت صرف آٹھ سال کا تھا اور اس کے پورے دورِ حکومت میں انتظامِ مملکت مجلسِ ارکانِ ثلاثہ مشتمل بر خواجۂ جہاں ترک، محمود گاواں اور ملکہ کے ہاتھ میں رہا۔ حقیقت میں مجلس کی صدارت خود ملکہ کرتی تھیں اور وہی امورِ سلطنت کی سر انجام دہی کا اپنی ایک رازدار عورت ماہ بانو کے توسّط سے اہتمام کرتی تھیں۔ اور یہ مجلس نظام الدین کے

جانشین شمس الدین محمد ثالث کی حکومت کے پہلے تین سال میں بھی قائم رہی۔

اس سے پیشتر کہ ہم آگے کے حالات بیان کریں اس امر کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ آفاقی ایرانیوں کو خواہ کتنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا پھر بھی اس میں شک نہیں کہ ان کا اثر دکن کی فنی اور عام ثقافتی زندگی پر بہت قوی تھا۔ بیدر سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ایک خوبصورت ہشت پہلو بے گنبد مقبرے میں مشہور ولی شاہ نعمت اللہ کرمانی کے فرزند شاہ خلیل اللہ مدفون ہیں۔ یوں تو اس مقبرے کی عمارت کئی لحاظ سے بے نظیر ہے لیکن اس کی سب سے نمایاں خصوصیت شاید مغیث شیرازی کا وہ خوشنما کتبہ ہے جو ہندوستان کے اندر خط "ثلث" میں لکھا ہوا غالباً سب سے پہلا کتبہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کتبے کی ایک اور بے عدیل خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر حرف کا طول کو پندرہ انچ تک پہنچتا ہے، لیکن وہ ہر طرح سے پورے پورے متوازن اور متناسب ہیں۔ ایرانی اثر اس بلند مینار میں بھی نمایاں ہے جو اس پہاڑی کے دامن میں ہے، جس پر دولت آباد واقع ہے۔ ایسے ہی بیدر کے اندر مدرسۂ محمود گاواں کے اس بچے کھچے تنہا مینار میں یہ اثر ظاہر ہے۔

سیاسی پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ سلطنت کی تقریباً تمام سرحدوں پر پورے دس سال سے بدامنی کا دور دورہ قائم تھا۔ اڑیسہ کا والی اس وقت کپل ایشور تھا (۱۴۳۵ تا ۱۴۷۰ء)، جو گجپتی خاندان شاہی کا ایک نہایت حوصلہ مند حکمران تھا؛ بار بار لشکر کشی کے بعد کپل ایشور بڑی دلیری سے تلنگانہ میں گھس آیا اور مارچ ۱۴۶۰ء میں سچ مچ ورنگل پر قبضہ جما بیٹھا اور اسی زمانے میں اس کے حلیف دیو بنتہ کے راجا لنگا نے راج محل ہتھیا لیا۔ ورنگل ایک سال سے زائد مدت تک کپل ایشور کے قبضے میں رہا، لیکن احمد شاہ ثالث کے عہد میں اسے ہزیمت و پسپائی ہوئی اور تاوانِ جنگ ادا کرنا پڑا۔ کہتے ہیں کہ نوجوان سلطان نے کپل ایشور کو اس موقع پر تحریر بھیجی تھی کہ اچھا ہوا کہ تو خود ہی دکن آگیا، ورنہ لامحالہ بہمنی فوج کو لے کر خود مجھے اڑیسہ پر تحصیل خراج کی غرض سے چڑھائی کرنی پڑتی۔ اس کے تھوڑی ہی مدت بعد محمود خلجی والیِ مالوہ نے احمد شاہ ثالث کی نوعمری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۸۶۶ھ / ۱۴۶۱ - ۱۴۶۲ء میں اڑیسہ اور خاندیش کی عملی امداد حاصل کر کے دکن پر حملہ کر دیا اور بغیر کسی اہم مزاحمت کے بڑھتا چلا آیا، حتیٰ کہ دارالحکومت بیدر سے صرف بتیس میل کے فاصلے پر رہ گیا۔ نوجوان سلطان احمد شاہ ثالث، محمود گاواں اور خواجہ جہاں ترک کی معیت میں چیدہ بہمنی افواج کے لاؤ لشکر کے ساتھ مقابلے کے لیے بڑھا اور مقام قندھار پر دشمن سے نبرد آزما ہوا۔ بہمنی افواج فتح سے ہمکنار ہونے ہی کو تھیں کہ ان کا ایک ہاتھی پیچھے کو مڑا اور اس نے ہڑبڑاہٹ ڈال دی۔ سلطان کی جان کو خطرے میں پا کر ایک بہمنی فوجی افسر نے اسے گھوڑے سے اتارا اور اسے لے کر دارالحکومت کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب پانسہ پلٹ چکا تھا۔ محمود خلجی فاتحانہ بیدر کی طرف بڑھا، اور بیدر، بیڑ اور دولت آباد پر قابض ہو گیا۔ بیوہ ملکہ دارالحکومت کو خیرباد کہہ کے اپنے بیٹے سلطان کو لے کر فیروزآباد چلی گئی۔ محمود گاواں نے اب اس عہد نامے کی پناہ لی، جو سلطان احمد اوّل کے عہد میں والیِ گجرات سے کیا گیا تھا، اور اس نے محمود شاہ بیگڑہ والیِ گجرات (۱۴۵۸ء تا ۱۵۱۱ء) کو احمد شاہ ثالث کا ایک دستخطی خط امداد کی درخواست کے ساتھ بھیجا۔ سلطانِ گجرات نے اس درخواست کا

خاطر خواہ جواب دیا اور خود ایک بڑی فوج لے کر بہمنی سرحد کی طرف روانہ ہوا ۔ محمود خلجی اب چاروں طرف سے گھر گیا تھا ۔ آخر کار اسے گونڈوانہ کے جنگلوں کو چیرتے ہوئے اپنے وطن کی راہ لینی پڑی۔

اس طرح مجلس ارکانِ ثلاثہ نے، جو ہمایوں کی وفات پر قائم کی گئی تھی، اپنا فرض ادا کیا اور جب ۱۴۶۶ء میں خواجہ جہاں ترک کے قتل کے بعد محمود گاواں وزیر اعظم بنا تو اس نے اس مجلس کا کام جاری رکھا ۔ اس کی وزارت کے زمانے میں بہمنی سلطنت کو وہ عروج حاصل ہوا جو اسے پہلے کبھی حاصل نہ ہوا تھا ۔ اس نے مشرقی محاذ پر اپنی شاندار معرکہ آرائی سے، جس میں اس نے تمام ساحلی عقبی علاقہ کونکن سے لے کر گوا تک فتح کر لیا، یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک بہت بڑا سپہ سالار اور دکن کے عظیم ترین فوجی قائدین میں سے ہے ۔ رنگنہ کا قلعہ اس نے ۲۰ محرم ۸۷۵ھ/ ۱۹ جولائی ۱۴۷۰ء، سنگمیشور ۲۰ جمادی الآخرہ ۸۷۶ھ/ ۱۳ دسمبر ۱۴۷۱ء اور ہندوستانی جزیروں اور قلعوں کا باعثِ رشک مقام گوآ ۲۰ شعبان ۸۷۶ھ / یکم فروری ۱۴۷۲ء کو فتح کیا ۔ محمد ثالث کے عہد میں خاندانِ بہمنی کے متعلق اس کے وہ خواب بھی پورے ہوئے جو وہ مشرق کی بابت دیکھا کرتا تھا، یعنی سواحلِ خلیج بنگال تک سمندر کے کنارے کنارے کے تمام علاقے کا سلطنت بہمنی کے ساتھ الحاق ہو گیا ۔ اس کا موقع دو بغاوتوں کی وجہ سے میسر ہوا، جن میں سے پہلی ۸۸۲ھ / ۱۴۷۷-۱۴۷۸ء میں ہوئی اور دوسری مقام راہون پر ۸۸۵ھ / اکتوبر - نومبر ۱۴۸۰ء میں؛ ان دونوں موقعوں پر فوجوں کی قیادت سلطان کے اپنے ہاتھ میں تھی اور محمود اس کا دستِ راست تھا ۔ چونکہ باغیوں نے اڑیسہ سے امداد حاصل کی تھی اس لیے بہمنی افواج اڑیسہ کے علاقے میں بھی گھس گئیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام علاقہ جو بہمنی علاقے کے متصل تھا راجمندری تک ملحق کر لیا گیا ۔ دوسری بغاوت میں باغیوں نے وجیانگر سے امداد حاصل کی تھی اور بنا بریں سلطان نے نہ صرف دریائے کرشنا کے مثلث دہانے کا الحاق کر لیا بلکہ جنوب کی طرف کنجی یا کنجی پورم تک کا علاقہ بھی اس کے ہاتھ لگ گیا، جہاں وہ ۱۱ محرم ۸۸۶ھ/ ۱۲ مارچ ۱۴۸۱ء کو پہنچا ۔ یہ امر قابلِ التفات ہے کہ جب سلطان کنجی پورم میں تھا اس کی غیر حاضری میں محمود گاواں کے خلاف ایک سازش ہوئی، نتیجۃً وہ ۸۸۶ھ/ ۵ اپریل ۱۴۸۱ء کو قتل کر دیا گیا ۔ اڑیسہ اور وجیانگر دونوں نے اس تبدیل شدہ صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا جو بساطِ سیاست پر اس بطلِ عظیم کے موجود نہ رہنے سے پیدا ہو گئی تھی؛ اور اگر اس وقت تلنگانہ کے نئے والی سلطان قلی قطب الملک ہمدانی کی ہوشیاری آڑے نہ آتی تو پورا تلنگانہ ہاتھ سے نکل گیا ہوتا ۔ اس سلطان قلی نے بعد میں قطب شاہی خاندان [رک بآں] کی بنیاد رکھی۔

اندرونی معاملات میں محمود گاواں نے نہ صرف دکنیوں اور آفاقیوں میں توازن بر قرار رکھنے بلکہ ہندو آبادی کے قلوب کو مسخر کرنے کی بھی پوری کوشش کی ۔ سلطان شمس الدین محمود کو اس کا یہ مشورہ کہ وہ بلگام کے ”پرکیتہ“ Parketa کے ناشائستہ افعال پر قلمِ عفو کھینچ دے نہایت مناسب تھا اور ضرور اسی وجہ سے مرہٹی قوم سے مصالحت کی راہ ہموار ہوئی، جس کے وافر ثمرات مغربی اضلاع پر بیجاپور کی قیادت کے زمانے میں حاصل ہوئے ۔ ہندوؤں کے ساتھ خوشگوار تعلقات کا ایک اور ثبوت ”مدھول“ کے سردار کے ان کارناموں سے بھی ملتا ہے جو اس سے مغربی مہمات

کے دوران میں ظاہر ہوئے۔ ۱۴۷۰ء کی برسات میں جب محمود گاواں کولہاپور میں تھا تو سدھول کے کرن سنگھ نے اس کی امداد کے لیے گھاٹوں پر کچھ محافظ مقرر کیے کہ وہ وہاں پیڑا گوھوں (فارسی سوسمار یا ھندی گھوڑ پھوڑ) کی تاک میں رہیں اور جتنی ہاتھ آئیں پکڑ لیں۔ جب گوھیں مہیا ہو گئیں تو اس نے ان کی کمر کے گرد رسّیاں باندھ کر آدھی رات کے وقت ان کو ''کھیلنا'' کی فصیلوں پر چڑھا دیا، جن پر چڑھنا اور ذرائع سے ناممکن تھا، ان پیڑا گوھوں نے قلعے کی دیواروں پر اس مضبوطی سے قدم جمائے کہ کرن سنگھ کا لڑکا بھیم سنگھ اور اس کی مرھٹی افواج ان رسّیوں کے ذریعے جو ان کی کمر سے بندھی تھیں فصیل پر چڑھ گئے اور محافظانِ قلعہ کو تہ تیغ کر دیا۔

سلطان محمد شاہ اول نے ایک صدی پہلے جو نظامِ حکومت قائم کیا تھا وہ کم و بیش ایک جاگیردارانہ تنظیم تھی، کیونکہ ملکی اور عسکری عہدیداروں کی تنخواہیں جاگیروں اور منصبوں کی آمدنی سے ادا کی جاتی تھیں، جو طرف داروں اور قلعہ داروں کو عطا کیے گئے تھے۔ اس خاندان کی حکومت کے قیام کے سو سال بعد سلطنت میں بہت توسیع ہوئی اور یہ بالآخر ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک پھیل گئی، چنانچہ محمود گاواں نے، جو وزیر اعظم تھا، نہ صرف مملکت کی دوبارہ تقسیم کی بلکہ تمام صوبجاتی نظام کی اصلاح پر بھی اپنی توجہ مرکوز کی۔ اوّلاً اس نے تمام مملکت کو بجائے چار کے آٹھ اطراف میں تقسیم کیا۔ برار کی دو نظامتیں قائم کیں، یعنی گاوِل اور ماھور۔ جنار [=جنیر] کے ارد گرد کے کچھ علاقے کو صوبۂ دولت آباد سے علیحدہ کر کے ایک نئی ''طرف'' کی بنیاد رکھی۔ راجمندری کو تلنگانہ کے باقی حصّے سے علیحدہ کر کے ایک نیا صوبہ بنایا اور قدیمی صوبۂ گلبرگہ میں سے بیجاپور کو نکال کر ایک مستقل حیثیت دے دی۔ طرف داروں کے اختیارات میں بھی نمایاں کمی کی گئی۔ اس سے قبل طرفدار اپنے صوبے کے ملکی اور عسکری دونوں امور کا نگرانِ اعلیٰ ہوتا تھا اور اسے نہ صرف قلعہ داروں کی تقرری کے اختیارات حاصل تھے بلکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق مستقل فوجی سپاہیوں کی تعداد گھٹا بڑھا بھی سکتا تھا اور اس طرح اس جاگیر کی آمدنی میں جو عسکری اخراجات کے لیے مخصوص تھی جتنا جی چاہے خرچ کر سکتا یا بچا سکتا تھا۔ محمود گاواں نے طرف داروں کے اختیارات بڑی حد تک کم کر دیے۔ اس نے حکم جاری کیا کہ آئندہ قلعہ داروں کا تقرر مرکزی حکومت کیا کرے گی اور ایک طرف دار کا صرف ایک قلعے پر بلا واسطہ تسلّط رہے گا۔ علاوہ بریں ہر وہ شخص جس کے ذمّے سپاہ کی تنخواہ کی بانٹنا ڈالا گیا ہو اس روپے کے حساب کا ذمےدار ہوگا جو اس نے جاگیر یا منصب سے اس غرض کے لیے لیا ہوگا۔ غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ جاگیرداروں کو بادشاہ کے سامنے حسابات کے لیے جوابدہ بنایا گیا۔ ایک اَور طریقہ جس سے سلطان کو صوبجاتی امور کے ساتھ بلا واسطہ منسلک کر دیا یہ تھا کہ ہر صوبے میں ایک قطعۂ زمین ''شاہی املاک'' کے نام سے علیحدہ کر لیا گیا۔ اراضی کی باضابطہ پیمائش، ممالکِ محروسہ کی حد بندی، فردِ حقیت کی تیاری اور محاصل کی تعیین کے لیے بھی احکام نافذ کیے گئے۔ یہ اصلاحات مغل شہنشاہ اکبر [رک بآں] کی اصطلاحات سے دو سو سال پہلے نافذ ہو چکی تھیں، لیکن محمود گاواں کے قتل کے ساتھ ہی ان تمام منصوبوں کا گلا گھونٹ دیا گیا اور ترقی کی رفتار کا رخ پیچھے کی طرف پھر گیا۔ اس سے تیس سال بعد، یعنی ۹۰۱ھ/ ۱۴۹۵-۱۴۹٦ء میں وزیر قاسم برید نے، جو بیدر کے

بریدشاہی [رُکِ بآں] خاندان کا مورثِ اعلیٰ تھا، اسی نہج پر ایک اور سعی کی۔ ان اصلاحات کی بنا پر چھوٹے منصب‌داروں کو ذاتی شاہی محافظ فوج میں بھرتی ہونے کا حکم دیا گیا، اس کے بعد سے ان کا لقب ''سرکردہ'' یا ''حوالدار'' ہو گیا۔ یہ اقدام بے دلی سے کیا گیا تھا، لہٰذا اس کا اثر چھوٹے جاگیرداروں اور منصب‌داروں سے آگے نہیں بڑھا اور مقتدر امرا اس کی زد سے کلیۃً محفوظ و مصئون تھے۔ انحلالِ سلطنت اور اس کی جگہ بیجاپور، احمدنگر، گولکنڈہ، برار اور بیدر [رُکِ بآں] کی پانچ ریاستوں کا قیام جن اسباب کی بنا پر وجود میں آیا ان میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ سابقہ اصلاحات کے کالعدم ہو جانے کی وجہ سے طرفدار اپنی عظیم قوت و اقتدار سے برابر متمتع ہوتے رہے۔

یہ عہد محمدآباد۔ بیدر (دکن کے دارالحکومت) کا دور عروج و شباب تھا اور روسی سیّاح نکیتان Athana sius Nickiten، جو مشرق میں خواجہ یوسف خراسانی نام اختیار کر کے سفر کرتا رہا، اس کا حال ''اسلامی ہندوستان کے سب سے بڑے شہر'' کے طور پر بیان کرتا ہے۔ یہ شہر پندرہ میل مربع میں پھیلا ہوا تھا اور گھوڑے، کپڑے، ریشم، سیاہ مرچ اور دوسری اشیاے تجارت کی اس میں فراوانی تھی۔ وہ عظیم الشان مدرسہ جس کی بنیاد ۱۳۷۲ء میں رکھی گئی تھی آج بھی اس عظیم دارالحکومت کی اندوہ‌انگیز یادگاروں میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی سہ منزلہ عمارت، اس کی پیشانی جو ہزارہا رنگ کی ٹائلوں سے مزیّن تھی، اس کے کشادہ کمرے، اس کی بھاری بھاری دیواریں، اس کے اساتذہ کا عملہ، جس میں ہندوستان اور ماوراءالبحر کے مستند علما شامل تھے، ان چیزوں نے یقیناً اسے ان تشنگانِ علم و دانش کا ملجا و ماوٰی بنا دیا ہوگا جو یہاں جاری کردہ سرچشمۂ علم سے سیراب ہونا چاہتے ہونگے۔

منجملہ ان نامور علما کے جن سے محمود گاواں کا سلسلہ مراسلت قائم تھا ذیل کے مشاہیر بھی تھے: مولانا جامی، امیر تیمور کا سیرت نگار علی الیزدی اور مقدّس صوفی حضرت عبیداللہ الاحرار۔ علاوہ بریں نامور ماہرینِ سیاستِ اسلام جیسے فاتح قسطنطینیہ محمد ثانی اور سلاطینِ گیلان، عراق اور مصر سے بھی اس کی خط و کتابت رہتی تھی۔

۵ صفر ۸۸۶ھ / ۵ اپریل ۱۳۸۱ء کو یہ وزیر قتل ہوا تو اس کے ساتھ ہی اس خاندان کا زوال شروع ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ خواجہ کے قتل کے بعد ایسا کوئی نہ تھا جو اس قوت نو پر قابو رکھ سکتا جو توازنِ اقتدار کی حالیہ حکمتِ عملی کے سبب معرض وجود میں آئی تھی۔ خواجہ کے قتل کے ٹھیک ایک سال بعد محمد ثالث کی وفات ہوئی اور اس کے جانشین شہاب الدین محمود شاہ کی سستی اور کاہلی نے مرکز سے علیحدہ ہو جانے والی قوتوں کو کھلی چھٹی دے دی، نتیجۃً سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ بیدر میں ملک حسن نظام الملک ہی فقط ایک ممتاز قائد باقی رہ گیا تھا، جس کی بات پر لوگ کان دھرتے تھے، اس کی آنکھ بند ہوتے ہی فی‌الواقع تمام باقی‌ماندہ قابل امرا دارالحکومت چھوڑ کر چلتے بنے تا کہ اپنی اپنی عملداریاں علیحدہ علیحدہ قائم کریں اور بے چارے سلطان کو تن تنہا بے‌اصول قاسم برید ترک کے چنگل میں چھوڑ گئے۔ ان لامتناہی معرکوں نے، جو سالہا سال تک بیجاپور، احمدنگر، برار، گلبرگہ اور تلنگانہ (گولکنڈہ) کے صوبہ‌داروں کے مابین جاری رہے، بہمنی مرکز کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ ان جاگیرداروں کی قانونی حیثیت جو کچھ بھی ہو وہ سلطان کی براے نام سیادت کو تسلیم کرتے ہوے اپنے اپنے علاقوں میں عملاً خود مختار تھے۔

مگر جنوب میں ذرا فاصلے پر ایک ایسا واقعہ

پیش آ رہا تھا جس کے سامنے ان تمام مقامی طوفانوں کا ماند پڑ جانا مقدر ہو چکا تھا اور جس سے بالآخر ہندوستان کی صورت ہی کچھ اور ہو جانے والی تھی۔ یہ واقعہ بہمنی سلطنت کے مغربی ساحل پر پرتگالیوں کا ورود تھا۔ جیسا کہ اچھی طرح معلوم ہے ۲۰ مئی ۱۴۹۸ء کو واسکو ڈ گاما راس امید (Good Hope) کا چکر کاٹ کر مشہور جانباز مسلم جہازراں حسین بن شیخ ماجد [رک بہ ابن ماجد] کی مدد سے کالی کٹ کی بندرگاہ پر پہنچا۔ اس مہم کے شروع میں پرتگالیوں نے بہمنی ریاست سے کوئی تعرض نہ کیا اور اس سے آگے گزر کر کالی کٹ کے حکمران زمورن اور راجا کوچین سے مراسم محبت استوار کرنے کی کوشش کی، لیکن بہت دن نہ گزرنے پائے تھے کہ کارخانے بدل کر قلعے ہو گئے اور محبت نے عداوت کی شکل اختیار کر لی۔ دکن سے پہلی آویزش اس وقت ہوئی جب مصر اور گجرات کے متحدہ بیڑے نے امیر البحر امیر حسین کے زیر کمان فروری ۱۵۰۹ء میں بہمنی بندرگاہ چول سے کچھ فاصلے پر پرتگالیوں کو شکست دی، لیکن بیرونی حملہ آوروں (پرتگالیوں) نے خفیہ ترکیبوں سے ۲۵ نومبر ۱۵۱۰ء کو بندرگاہ گوآ پر قبضہ کر لینے کے بعد ہزارہا زن و مرد اور بچے موت کے گھاٹ اتار دیے پھر عدالت استیصال الحاد (Inquisition) کا قیام عمل میں آیا، جس کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کو بکثرت رومن کیتھولک مذہب کا پابند بنایا گیا۔

احمد نگر اور بیجاپور میں ایک اور ثقافتی انقلاب رونما ہو رہا تھا اور یہ ایران سے شیعہ عقائد کی دکن میں ریل پیل تھی۔ اس امر کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ مدت دراز سے دکن میں ایرانیوں نے آ کر بسنا شروع کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی شیعہ عقائد کے اثرات عوام میں اور نیز دربار شاہی میں نفوذ کرتے جا رہے تھے۔ جون ۱۵۰۳ء میں عادل شاہی خاندان کے سب سے پہلے حکمران یوسف عادل نے خود شیعہ مذہب اختیار کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے تین سال بعد حکم دیا کہ جامع مسجد بیجاپور کے منبر سے شیعہ خطبہ پڑھا جائے اور جیسے کہ توقع کی جا سکتی تھی اس رجحان کی پشتیبانی اسمٰعیل صفوی اوّل [رک بآں]، شاہ ایران (۱۴۹۹ تا ۱۵۲۴ء) نے کی، چنانچہ اس نے یوسف کے جانشین اسمٰعیل عادل کے پاس بیش تحائف دے کر اپنا خاص ایلچی بھیجا اور اسے شاہ کا خطاب عطا کیا، لیکن واقعہ یہ تھا کہ اس سے قبل ہی مرکز اقتدار بیدر سے صوبجاتی دارالحکومتوں کی طرف منتقل ہو چکا تھا، اور خاندان بہمنی کے کلیۃً معدوم ہونے سے بہت پہلے بہمنی سلاطین کا اثر عوام پر سے زائل ہو چکا تھا۔ بہمنی ثقافت کی قائم مقام ثقافتیں مختلف المراکز تھیں اور بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ کی ثقافتوں میں نمایاں اختلافات پائے جاتے تھے، لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک یہ تھی کہ اس کے بجائے کہ ان پر ایرانی اثر بڑی حد تک غلبہ پذیر ہو ان کی آئندہ تاریخ میں یہ بات درج ہونے والی تھی کہ ان میں خالص ہندو عنصر کی بلا واسطہ آمیزش کے اصول کی اور زیادہ ترقی ہوگی اور جو کام فیروز شاہ بہمنی نے پندرھویں صدی کے اوائل میں شروع کیا تھا اب وہ پروان چڑھے گا۔

مآخذ: (۱) Briggs: *History for the Rise of the Mahomedan Power in India*؛ (۲) King: *History of the Bahmani Dynasty*؛ (۳) Sherwani: *The Bahmanis of the Deccan, an Objective Study*؛ (۴) فرشتہ؛ گلشن ابراہیمی؛ (۵) طباطبائی: برہان مآثر؛ (۶) E.E. Speight: *Coins of the Bahmani Kings of the*

Deccan، در Islamic Culture، حیدرآباد (دکن) ۱۹۳۵ء، ۹ : ۱۶۸؛ نیز رک بہ احسن آباد، گلبرگہ، محمد آباد بیدر اور محمود گاواں۔

(ہارون خان شیروانی)

⊗ **بہمنیار** : ابن المرزبان، ابوالحسن، کیا رئیس (م ۴۵۸ھ/۱۰۶۶ء)، ابن سینا کا ایک نامور شاگرد۔ ابن سینا کی کتاب المباحثات بیشتر ان فلسفیانہ مسائل کی بحث پر مشتمل ہے جو بہمنیار نے اٹھائے تھے۔ وہ آذربیجانی الاصل اور مجوسی الملّت تھا۔ اس کی عربی دانی اعلٰی پائے کی نہ تھی۔ بہمنیار نے ابن سینا کے فلسفے کی ایک جامع تفسیر، جو دانش نامۂ علائی پر مبنی ہے، تین حصوں میں لکھی ہے (۱۔ منطق، ۲۔ ما بعد الطبیعۃ، ۳۔ فی الموجودات)۔ اس کا نام کتاب التحصیل (یا کتاب التحصیلات) ہے۔ [یہ کتاب اس نے اپنے ماموں ابو منصور بن بہرام بن خورشید بن بردباز المجوسی کے لیے تألیف کی تھی۔ خوانساری] ۔ یہ کتاب ۱۳۲۹ھ میں قاہرہ میں چھپ چکی ہے (اس کے قلمی نسخوں کے لیے دیکھیے براکلمان : تکملۃ، ۱ : ۸۲۸)۔ بہمنیار نے ایک اور کتاب نفوس اور عقول فعّالہ پر لکھی تھی، جس میں سے صرف ایک فصل موجود ہے (دیکھیے براکلمان : تکملۃ، محلّ مذکور)۔ بیہقی نے تتمۂ صوان الحکمۃ، مطبوعۂ لاہور ۱۹۳۵ء میں اس کی ایک کتاب الزّینۃ کا ذکر کیا ہے، جو منطق پر تھی۔ بیہقی ہی نے لکھا ہے کہ بہمنیار نے ایک کتاب بہجت و سعادت پر اور ایک موسیقی پر لکھی اور اس کے علاوہ کئی رسائل قلمبند کیے تھے۔ ان میں سے رسالتان فی ما بعد الطبیعۃ (یعنی ۱۔ رسالۃ فی مراتب الموجودات؛ ۲۔ رسالۃ فی موضوع العلم المعروف فیما بعد الطبیعۃ) لائپزگ میں ۱۸۵۱ء اور قاہرہ میں ۱۳۲۹ھ میں یکجا طبع ہوئے۔ ان رسالوں کا المانی زبان میں ترجمہ از S. Popper اسی طباعت کے ہمراہ موجود ہے [براکلمان، ۱ : ۴۵۸؛ معجم المطبوعات، عمود ۵۹۸۔ ایک مختصر سا شخصی رسالہ جو ابن سینا نے اس کے نام لکھا، برلن میں موجود ہے (قنواتی : مؤلفات ابن سینا، قاہرہ ۱۹۵۰ء، ص ۳۱۰)۔ بہمنیار ابوالعباس اللوکری کا استاد تھا، جس کے ذریعے علومِ حکمت کی خراسان میں اشاعت ہوئی (تتمہ، ص ۱۲۰)]۔

مآخذ : مذکورۂ بالا کتب کے علاوہ دیکھیے :
(۱) نظامی عروضی : چہار مقالہ، طبع قزوینی، ص ۱۵۲؛
(۲) ابن ابی اُصَیبعہ : عیون الانباء (بامداد اشاریہ)؛
[(۳) خوانساری، ص ۱۲۹]۔

(فضل الرحمٰن [و ادارہ])

اَلْبَہْنَسا : قرونِ وسطٰی میں وسطی مصر کا ایک مشہور شہر، جو بحرِ یوسف اور کوہستانِ لیبیا کی زیریں پہاڑیوں کے مابین بنی مزار سے پندرہ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور قاہرہ کے جنوب میں ایک سو اٹھانوے کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک ریلوے سٹیشن ہے۔ قبطی میں اس کا نام Oxyrhynchus ہے۔ بوزنطی عہد میں یہ ایک نہایت بارونق شہر تھا اور اپنے گرجوں اور اپنی خانقاہوں کے لیے مشہور تھا۔ قبطی روایت کے مطابق جب حضرت مریمؑ اور ان کے بیٹے حضرت مسیحؑ مصر سے واپس آئے تو انھوں نے اسی شہر میں قیام کیا تھا...

عرب حملوں کے وقت یہ ایک نہایت مستحکم جگہ تھی۔ اس کے چاروں طرف موٹی موٹی دیواریں تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یونانی محصورین نے دفاع میں نہایت زبردست مزاحمت کی، جس کی یاد مدتوں تازہ رہی اور اس نے ایک دلچسپ رومان کی صورت اختیار کر لی، جس کا نام ”فتح بہنسا“ تھا۔

ابتداءً قرونِ وسطٰی میں بحیثیت ایک بستی کے مرکز کے اس شہر کو بے حد خوشحالی حاصل تھی۔ پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی کے

اواخر میں اس کے نظم و نسق کو از سرِ نو مرتب کرتے وقت فاطمی وزیر بدر الجمالی کے حکم سے اس صوبے کا نام بہنسا قرار پایا۔ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق یہ ایک بڑا شہر تھا، جو چاروں طرف سے بے شمار باغوں سے گھرا ہوا تھا۔ خلیل ظاہری اپنے وقت میں بھی اسے شہر بتاتا ہے، لیکن یہ بات حد درجہ غور طلب ہے کہ ابن الجیعان، جو پورے صوبے سے واقف تھا، اس شہر کا قطعی ذکر نہیں کرتا۔ اس کے بعد سے اس کی حیثیت کبھی ایک معمولی شہر سے زیادہ نہیں ہوئی اور اسے پہلے منیہ اور اس کے بعد انیسویں صدی میں بنی سویف کے صوبے میں شامل کر دیا گیا۔ یہ شہر ریت کے تودوں میں دب چکا تھا۔ تقریباً ۱۸۹۰ء میں ہر قسم کا کوڑا کرکٹ، سرخ پتھر کے ستون، ستونوں کے بالائی حصوں کے مجسموں، برتنوں اور اینٹوں وغیرہ کے ٹکڑے وہاں بکھرے پڑے تھے۔ حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کے بیان کے مطابق یہ کھنڈروں کے ایک بے ترتیب اور بڑے ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہیں۔

یہ افسوسناک صورت حال بظاہر اس علاقے میں جنگلات کے بتدریج تباہ ہوتے چلے جانے کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ فاطمیوں اور ایوبیوں کے دورِ حکومت میں جنگلات ریاست کی باقاعدہ جاگیر سمجھے جاتے تھے اور ملک کی انتظامیہ ان سے بحری تعمیرات کے لیے لکڑی حاصل کرتی تھی۔ المقریزی یہاں ابن مماتی کے بیان کو قابلِ اعتماد قرار دیتا ہے مگر یہ اضافہ کرتا ہے: ”یہ نظام اس وقت کامل طور پر مفقود ہو چکا ہے اور اب کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا۔ لوگوں نے نجی طور پر جنگلات کے درخت کٹوا لیے ہیں“۔

ان سب چیزوں سے زیادہ شہر کی خوشحالی پارچہ بافی کی صنعت کی وجہ سے تھی۔ وہاں ہر قسم کا کپڑا تیار ہوتا تھا۔ نہایت بیش قیمت ریشمی کپڑے سے لے کر، جن پر سنہری تصاویر ہوتی تھیں، نہایت معمولی کپڑوں تک، مثلاً پردے، خیموں کے کپڑے، جہازوں کے بادبان، بڑے عرض کے کپڑے، اون، کتان اور روئی سے تیار کیے جاتے تھے، جن پر پکے رنگوں سے تصاویر بنائی جاتی تھیں اور ان میں ”کیڑے سے لے کر ہاتھی تک“ ہر قسم کے جانور شامل ہوتے تھے۔ الادریسی کہتا ہے کہ بہنسا میں جو کپڑے تیار ہوتے تھے ان پر اس کا نام بنا ہوتا تھا اور یہ امر واقعہ ہے کہ قاہرہ میں مسلم فنون کے عجائب خانے میں اس وقت بھی بے شمار رنگوں کا اونی کپڑا موجود ہے، جس پر چھوٹے چھوٹے خرگوشوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، جن کے سر انسانوں جیسے ہیں، جن پر بہنسا کا نام اب بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ ابن بطوطہ آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں بھی اس کے نہایت عمدہ کپڑوں کی بڑی تعریف کرتا ہے۔

مآخذ: (۱) J. Maspero اور Wiet: *Matériaux pour servir à la géographie de l' Égypte*، ص ۵۱، ۱۷۳ تا ۱۹۱، میں جن مصنفوں کے حوالے دیے گئے ہیں ان کے علاوہ دیکھیے: (۲) ابن حوقل، بار دوم، ص ۱۵۹؛ (۳) الادریسی: المغرب، ص ۵۰ تا ۵۱؛ (۴) ابن المماتی، ص ۸۱، ۳۳۳ تا ۳۴۰؛ (۵) الیعقوبی، ترجمہ Wiet، ص ۱۸۶؛ (۶) المقریزی، طبع Wiet، ۱: ۹۲ تا ۹۳، ۳۰۷، ۳۱۰، ۳۱۲؛ ۲: ۱۰۳، ۱۰۸ تا ۱۰۹؛ ۳: ۱۱۶؛ (۷) Jean Maspero: *Histoire des patriarches d' Alexandrie*، ص ۵۵؛ (۸) مصنف مذکور: *Organisation militaire de l' Egypte byzantine*، ص ۲۰، ۱۳۰؛ (۹) الہروی: زیارات، ۲: ۳۳، ترجمہ Sourdel-Thomine، ص ۲۶، ۱۰۱؛ (۱۰) القلقشندی، ۳: ۳۸۱ تا ۳۹۷؛ (۱۱) الظاہری، ص ۳۲، ترجمہ،

ص ۵۰؛ (۱۲) Isambert : *Itinéraire de l 'Orient*، *Egypte*، ص ۲٦۷؛ (۱۳) Baedeker Guidebook، فرانسیسی اڈیشن ۱۹۰۸ء، ص ۱۹۹ تا ۲۰۰؛ (۱۴) علی باشا مبارک، ۱۱: ۲ تا ۵؛ (۱۵) وو، بار اوّل، فرانسیسی اڈیشن، تکملہ ص ۲۲٦؛ (۱٦) *RCEA*، جلد ۳، عدد ۹۳۹ .

(G. WIET)

* **بَہْو** : (ع) اس کے معنی ہیں وہ وسیع خالی جگہ جو دو چیزوں کے درمیان حد بندی کرے، [گھروں اور خیموں کے سامنے وہ جگہ جو مہمانوں کی فرودگاہ ہو، لسان]؛ مگر اس نے مغربی اسلامی دنیا کی عمارات میں کسی قدر مختلف معانی اختیار کر لیے ہیں، اگرچہ وہ اس کے اصلی بنیادی معنوں سے نسبت ضرور رکھتے ہیں [اور یہ لفظ کمرۂ ملاقات کے لیے استعمال ہوتا ہے اس کی جمع ہے أبْهاء، بُهُوّ اور بُهِيّ].

بَہْو اس خیمے یا کوشک خانے کو بھی کہتے ہیں جو اوروں سے الگ واقع ہو اور اپنے سے پہلے خیمے سے محل وقوع، وسعت اور بلندی میں مختلف ہو.

اس لفظ کے استعمال کی ایک مثال، اس بیان میں ملتی ہے جو البکری نے قیروان کی جامع مسجد کے متعلق تحریر کیا ہے ۔ اس نے ''قُبّة باب البہو'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جس کا de Slane ''کوشک کے دروازے کی چھتری'' ترجمہ کرتا ہے ۔ ہمیں اس چھتری کو شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ یہ وہی گنبدی ہے جو مقصورے کی غلام گردش کے وسطی رواق پر بنی ہوئی ہے ۔ یہ رواق ستون دار ہے اور صحن کی طرف کھلا ہوا ہے، لیکن اس کا یوں ترجمہ کرنا زیادہ موزوں و مناسب ہوتا کہ ''وہ قبہ جو وسطی دالان کے داخلے پر بنا ہوا ہے''، اور اس طرح لفظ ''بہو'' کا مفہوم بھی سمجھ میں آ جاتا کہ اس سے عرضًا وسطی دالان مراد لیا گیا ہے جو محرابِ مسجد کو جاتا ہے ۔ یہ فراخی میں دوسرے دالانوں سے صریحًا ممتاز ہے اور اس کی حد پر سب سے بڑا دروازہ ہے اور شروع میں قبّہ یا چھتری بنی ہوئی ہے . . . .

یہ اصطلاح اب بھی تونس میں مستعمل ہے اور اس سے مراد جامع مسجد کا مرکزی دالان ہی ہے جو عرضًا بنا ہوا ہے ۔ اس دالان سے پہلے جو دروازہ ہے اسے ''باب البحور'' کہتے ہیں، جو غالبًا اسی اصل اصطلاح کی مسخ شدہ صورت ہے .

معلوم ہوتا ہے اَنْدَلُس میں ''بہو'' کا استعمال اس قدر محدود معنی میں نہیں رہا ۔ یہ لفظ المقّری کے اموی محل کے بیان میں ملتا ہے جو عبدالرحمن ثالث نے مدینة الزّہراء میں تعمیر کیا تھا ۔ محل کی اصلی عمارت پانچ وسیع دالانوں پر مشتمل تھی، جو طولاً تعمیر کیے گئے تھے ۔ ان میں وسطی دالان چاروں سے بڑا تھا اور ایک دروازے پر ختم ہوتا تھا جسے ''باب البہو'' کہتے تھے ۔ اسی دالان کے سرے پر شاہی تخت تھا اور اسی جگہ بادشاہ باریابی دیتے تھے ۔ یہیں خلیفہ الحکم ثانی نے شاہ آرڈونو چہارم (Ordono IV) کو شرف باریابی بخشا تھا اور اسے اپنے سامنے بٹھایا تھا ۔ بہرحال ساتھ کے دالانوں کو بھی، جو اس بڑے درباری دالان میں شامل سمجھے جاتے تھے، بظاہر شہ‌نشین والے دالان سے ملتبس کر دیا جاتا تھا اور کبھی کبھی انہیں بھی اسی لفظ ''بہو'' سے یاد کرتے تھے .

یہ التباس ابن بَشْکُوال کے ہاں بہت نمایاں ہو گیا ہے، جس کے جامع قرطبہ کے متعلق بیان کا المقّری نے اقتباس دیا ہے ۔ ابن بشکوال لفظ ''بہو'' کا اس عظیم مسجد کے جملہ انیس دالانوں پر بطور استثنٰی اطلاق کرتا ہے، اگرچہ اس نے احتیاطًا صراحت کر دی ہے کہ انہیں معمولاً ''بَلاط'' کہتے ہیں؛ اور فی الواقع مسجد کے دالان کے

واسطے عموماً ''بلاط'' ہی بولا جاتا ہے۔ المقری نے اقلیش Ueles [دیکھیے عنایت اللہ: اندلس کا تاریخی جغرافیہ، حیدر آباد (دکن) ۱۹۲۷ء، ص ۱۱۰ تا ۱۱۱] کی مسجد کے ذکر میں وسطی دالان کے لیے ''البلاط الاوسط'' ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔

دالان کا یہ تخیل کہ وہ طولاً بنایا جائے اور اس سے درباری دیوان کا کام لیا جائے، جیسا کہ اموی محل کے تذکرے سے مترشح ہوتا ہے، اس بات کی توجیہ ہے کہ ''بہو'' کی اصطلاح میں دیوانِ شاہی یا درباری کے معنی کس طرح پیدا ہوے۔ قرطبہ کے محل میں بھی ایسے دو رواق یا شہ نشین تھے جن کے لیے ابن الخطیب یہی لفظ استعمال کرتا ہے۔ التیجانی کے بیان کے مطابق قابس Gabès میں ابن مکی نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا اس میں دیوانِ عام کے ساتھ ایک بہو بھی تھا، جس میں محل کا مالک متمکن ہوتا تھا۔ قدرتی طور پر ہم اس عزت کے مقام کو وہ وسطی القبہ قرار دے سکتے ہیں جو عراق میں ایجاد ہوا اور ''ایوان'' کہلاتا تھا۔ طولونی عہد میں فسطاط کے مکانوں میں بھی بہو پایا جاتا ہے اور مشرقی ولایات بربر میں بھی چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں متعارف تھا۔ بڑے کمرے کی عقبی دیوار میں اندر کے رخ ایک وسیع شاہ نشین یا القبہ تونس اور الجزائر کے مکانوں میں اب بھی پایا جاتا ہے۔ تونس میں اسے ''قبو'' بولتے ہیں، مگر الجزائر میں بہو کا لفظ آج بھی غیر معروف نہیں۔

مآخذ: خاص طور سے دیکھیے: (۱) A. Dessus Lamare: *Étude sur le bahwu, organe d'architecture musulmane*، در *JA*، ۱۹۳۶ء، ۲: ۵۲۹ تا ۵۴۷، جو ایک مکمل و جامع تصنیف ہے؛ اصلی اہم مآخذ: (۲) البکری: *Description de l'Afrique septentrionale*، طبع و ترجمۂ de Slane، ۱۹۱۲-۱۹۱۳ء؛ (۳) المقری: *Analectes*، طبع Dozy، Dugat، Krehl و Wright، ۱ : ۲۵۱ ببعد؛ (۴) ابن الخطیب: الاحاطة، قاہرہ ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱-۱۹۰۲ء۔

(G. Marçais)

البہوتی: شیخ منصور بن یونس البہوتی، جسے اکثر اوقات البہوتی المصری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، عموماً گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کے نصف اول کے نامور ترین حنبلی علما میں شمار ہوتا اور مصر میں حنبلی مذہب کا آخری زبردست نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ مدیریۂ غربیہ میں ایک گاؤں بہوت کا باشندہ اور اس خاندان کا چشم و چراغ تھا جس نے چند اور ایسے حنبلی علما بھی پیدا کیے . . .۔ اس کے معروف ترین اساتذہ میں سے مندرجۂ ذیل کا ذکر ملتا ہے: محمد المرداوی (م ۱۰۲۶ھ / ۱۶۱۷ء، مختصر، ص ۹۶)، یہ بھی مصر کے ایک حنبلی تھے، اور محدث اور فقیہ؛ عبدالرحمن البہوتی (مختصر، ص ۱۰۴)، جو چاروں بڑے مذاہب فقہ میں ماہر ہونے کی شہرت رکھتے تھے۔ منصور البہوتی ایک شافعی عالم عبداللہ الدنوشری کو بھی اپنے اساتذہ میں شمار کرتا تھا۔ اس کی زندگی کے حالات کم معلوم ہیں۔ وہ قاہرہ میں فقہ کی تعلیم دینے میں منہمک رہا اور اس نے کثیر تعداد میں شرعی فتوے دیے۔ اس کے سوانح نویس اس کے زہد و تقوی اور کریمانہ اخلاق کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اسلوب تعلیم بہت مقبول تھا، چنانچہ نہ صرف مصر بلکہ شام و فلسطین سے بھی بے شمار تلامذہ اس سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے آتے تھے۔ اس کے بڑے تلامذہ میں سے خود اس کے خاندان کے دو افراد محمد البہوتی اور محمد ابن ابی السرور البہوتی اور شام کے ابوبکر بن ابراہیم الصالحی کے نام لیے جاتے ہیں۔ شیخ منصور نے ربیع الآخر ۱۰۵۰ھ/جولائی ۱۶۴۰ء میں بمقام قاہرہ

بظاہر خاصی بڑی عمر میں وفات پائی اور مجاوروں کی تربۃ (قبرستان) میں دفن ہوا۔

منصور البہوتی کی کتاب ابھی تک مصر میں فقہ حنبلی کے نصاب درس میں شامل ہے۔ فقہ حنبلی کی تاریخ میں اسے موسی الحجّاوی (م ۹۶۸ھ / ۱۵۶۰ء) کی (قب براکلمان، ۲، ۳۲۵ اور تکملہ، ۲ : ۴۴۷) اور شیخ تقی الدین الفتوحی المعروف بہ ابن النجار (م ۹۸۰ھ / ۱۵۷۲ء، قب براکلمان : تکملہ، ۲ : ۴۴۷) کی تصنیف کے تکملے کا مرتبہ حاصل ہے۔ الحجّاوی فلسطینی نے، جو دمشق میں مفتی تھا جہاں وہ عُمَریّۃ اور جامع امویّۃ میں درس دیتا رہا، موفق الدین بن قدامہ (م ۶۲۰ھ / ۱۲۲۳ء) کی کتاب المقنع کا خلاصہ زاد [= المستقنع] کے نام سے تیار کیا تھا، نیز الاقناع کے نام سے ایک شرعی دستور العمل لکھا تھا، جو آخر زمانے کے حنابلہ کے ہاں ایک مستند اور مسلّم تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ محمّد [صحیح منصور] البہوتی نے ان میں سے اول الذکر کتاب کی الروض المربع بشرح زاد المستقنع [المختصر من المقنع] کے نام سے شرح لکھی (قاہرہ ۱۳۵۲ھ، دو جلد)۔ اس نے الاقناع کی ایک شرح [کشاف القناع عن الاقناع] بھی پیچھے چھوڑی ہے (جو قاہرہ سے تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے)۔ شیخ تاج الدین الفتوحی نے، جس نے قاہرہ میں تربیت پائی تھی، الموفق بن قدامہ کی المقنع اور حسن المرداوی (م ۹۱۰ھ / ۱۵۰۳-۱۹۰۵ء، مختصر، ص ۷۷-۷۸) کی کتاب التنقیح کو منتہی کے نام سے ایک واحد دستور العمل میں جمع کر دیا، جسے بہت جلد خاصی قبولیت حاصل ہوگئی۔ اس کتاب (: المنتہی) پر ایک شرح (قاہرہ، تین جزء) اور اسی کے متن پر ایک حاشیے کے لیے بھی ہم منصور البہوتی کے ممنون احسان ہیں۔

اس نے محمد بن علی المقدسی (م ۸۲۰ھ / ۱۴۱۷ء، مختصر، ص ۶۵) کی المفردات کی شرح بھی لکھی۔ یہ ایک طویل نظم ہے، جس میں فقہ حنبلی کے مخصوص عقائد کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس شرح کو ۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۴ء میں قاہرہ کے مطبع سلفیہ نے شائع کیا (اور اصل متن کو انھیں ناشروں نے اگلے سال البہوتی کی شرح سے مختصر حواشی لے کے دوبارہ طبع کیا)۔ آخر میں المقنع کی ایک شرح بھی البہوتی سے منسوب کی جاتی ہے (قب RAAD، ۱۲ : ۹۳)۔

مآخذ : متن مقالہ میں جن مآخذ کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ (۱) المحبّی : خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر، بولاق تاریخ ندارد، ۴ : ۴۲۶؛ (۲) جمیل الشطّی : مختصر طبقات الحنابلۃ، دمشق ۱۳۳۹ھ، ۱۰۴ تا ۱۰۶؛ (۳) براکلمان [۲ : ۴۲۴، تکملہ ۲ : ۴۴۷]؛ (۴) H. Laoust : *Le Précis de droit d'Ibn Qudāma*، بیروت ۱۹۵۰ء، ص liii؛ [(۵) سرکیس : معجم المطبوعات، عمود ۵۹۹؛ (۶) الزرکلی : الاعلام، ۸ : ۲۴۹]۔

(H. LAOUST)

بے : رک بہ بیگ۔

بے اوغلو : رک بہ استانبول۔

بے لک : (بیگ لک) ایک کلمہ، جو وصفی اور اضافی لاحقہ لک کو بے (بیک، بیگ) سے ملا کر بنایا گیا ہے۔ بے ایک قدیم ترکی لقب تھا (رک بہ بیگ)۔ بے کو عربی امیر کے مترادف مانا جاتا ہے اور بے لک کو امارۃ کے ہم معنی قرار دیا گیا ہے، اس طرح لفظ بے لک بے کا لقب عہدہ یا فرض منصبی بھی ظاہر کرتا ہے اور بے کے ماتحت علاقے کو بھی بے لک کہتے ہیں۔ بعد میں اس کے معنی وسیع ہوگئے اور یہ ریاست اور حکومت کے معنی بھی ظاہر کرنے لگا اور اسی کے ساتھ ایسی سیاسی یا انتظامی وحدت جو بعض اوقات کسی قدر خودمختاری بھی رکھتی تھی۔ جب عثمانی سلطنت قائم ہوئی تھی تو اس خانوادے کے بانی عثمان بے کو

سلجوقی سلطنت کا سلطان بے کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ اسی طرح جو علاقے اس نے بوزنطی سلطنت سے فتح کیے تھے وہ بطور بے لک یا امارۃ اس کے نام منظور کر لیے گئے تھے۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایشیاے کوچک میں جو ترکی ریاستیں (ملوک طوائف) تھیں انھیں بھی عموماً بے لک ہی کہتے تھے۔ آگے چل کر جب ترکی سلطنت زیادہ وسیع ہو گئی تو ملک کو "سنجاق بے لک" نام کے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، جو سب سے بڑی فوجی اور انتظامی وحدت تھی۔ ان وحدتوں کو دوبارہ جاے وقوع کے لحاظ سے ملا کر ایک ضلع یا صوبہ بنایا جاتا تھا جو کسی بیلر بے کے زیرِ حکومت ہوتا تھا۔ نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی سے بلقان کے وہ ممالک جو عثمانی سلطنت کی فوجی اور سیاسی سیادت تسلیم کرتے تھے لیکن پوری اندرونی خود مختاری سے بہرہ اندوز تھے بے لک کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، مثلاً ڈینیوب Danube کی بے لک، افلاق Eflak بے لک، بوغدان Bogdan بے لک، اردل Erdel بے لک۔ کچھ آگے چل کر وہ ممالک بھی جنھوں نے عثمانی سلطنت سے کچھ خاص حقوق حاصل کر لیے اور ایک حد تک خود مختاری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے بے لک ہی سمجھے جاتے تھے، مثلاً بے لک سیسام (= ساموس)، بے لک بلغارستان (بلغاریا)۔ پھر اس اصطلاح کے معنی میں مزید وسعت کی نوبت آئی اور اسے اسم صفت کی طرح استعمال کیا جانے لگا جس سے حکومت کی مقبوضہ جگہیں اور اشیا مراد ہوتی تھیں، مثلاً بے لک اراضی (میری اراضی)، اراضی شاملۂ بے لک (املاک بے لک)، بے لک قشلا [ق] (بے لک کا سرمائی مقام)، بے لک چشمہ (بے لک کا چشمہ)، بے لک آخور (بے لک کا اصطبل) بے لک گمی (بے لک کا جہاز) وغیرہ۔ ترکی کی کچھ ضرب الامثال بھی ہیں جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، مثلاً "ایک دن کی بے لکی بھی بے لک ہے" (بر گونلک بیلغی بیلکدر)۔ سلطنت کے مرکزی نظام کے ایک عہدے دار کا نام اسی لفظ سے مشتق کیا گیا تھا، یعنی بے لک جی (بیگ لک جی Beglikdji)۔ یہ محکمۂ "دیوان ہمایوں" [رک بآن] کا صدر ہوتا تھا۔

(M. Tayyib Gökbilgin)

II۔ (ب)۔ یہ لفظ شمالی افریقہ میں المغرب کے ان علاقوں میں استعمال کیا جاتا ہے جن پر پہلے ترکوں کا قبضہ تھا، مگر مراکش اور صحرا میں جہاں ترکی حکومت کا اثر کبھی محسوس نہیں کیا گیا یہ لفظ مستعمل نہیں۔ جیسے مراکش میں مخزن کا لفظ مستعمل ہے۔ اسی طرح بے لک بھی حکومت اور انتظامی اختیارات کے ہر درجے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا استعمال اسی وقت سے شروع ہوا ہوگا جب سے ترکی کا قبضہ اور بلربیوں (Beyler beys) کی حکومت کا وہاں آغاز ہوا، یا ممکن ہے کہ اس کے کسی قدر بعد کے زمانے سے شروع ہوا ہو۔ اگر یہ مانا جائے کہ بعد کے زمانے میں شروع ہوا تو پھر بلاشک اس سے اس رسوخ کی یاد تازہ ہوتی ہے جو قسنطینہ، تیٹری Titeri اور المغرب کے مقامی بیوں نے حاصل کر لیا تھا، کم از کم اتنی ہی جس قدر کہ شہر الجزائر کے بڑے بے کے رسوخ کی۔ علاوہ بریں ۱۶۷۱ء کے بعد تو آخر الذکر کی جگہ ایک دوسرے لقب کے حاکم داے Dey نے سنبھال لی تھی۔ ہماری اطلاعات اس قدر کم ہیں کہ ان سے کوئی نتائج اخذ نہیں کر سکتے۔

طرابلس الغرب، تونس اور الجزائر میں بے لک کے لفظ سے جو طریق تنظیم و نسق ظاہر ہوتا ہے

وہ عملاً وهي تها، البتہ یہ کہ تونس میں حکومت کے عہدے بہت جلد موروثي هو جانے کا رجحان رکھتے تھے ۔ یہ حالت کہیں اور نہیں تھی .

چونکہ ہر مقام میں حکومت کی شکل عثماني تھی اور اس کی وضع میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا اور اگر ہوا بھی تو محض برائے نام، لہٰذا اکثر حالات میں جو الفاظ مرکزی عہدوں کے لیے مستعمل تھے وہ ترکی زبان ہی کے تھے، لیکن شمالی افریقہ میں ترکی اداروں کی جڑیں زیادہ مضبوط نہ ہو سکیں اور وہ صوبائی سطح سے آگے نہ بڑھنے پائیں ۔ اس میں شک نہیں کہ مرکزی حکومت عملاً بتمامہ ترکی تھی اور صوبائی حکومت کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے ۔ ان معنوں میں کہ ہر ایک صوبہ کسی ترکی والی کے زیرِ اقتدار تھا یا ترکی نظامِ حکومت سے وابستہ تھا اور تمام اہم شہر، یعنی چھاؤنی والے شہر، بھی انھیں عمّال کے زیرِ حکومت تھے جنھیں مرکزی یا صوبائی حکومت مقرر کرتی تھی ۔ بے لک کا اختیار اس کے آگے نہ جاتا تھا ۔ چھوٹے شہر جہاں فوج متعیّن نہ ہوتی، نیز دیہات اور قبائل کا انتظام ان کے اپنے عمال کے ہاتھ میں تھا ۔ مرکزی یا صوبائی حکومت انھیں تسلیم کر لیتی تھی اور وہ والی اور عوام کے درمیان معاملات طے کرنے کا واسطہ اور انھیں باہم جوڑنے والی کڑی تھے .

ایک با اثر مرکزی قوت ہونے کی حیثیت سے بے لک عوام کے دلوں میں مختلف جذبات پیدا کرتی تھی، یعنی خوف اور شبہہ، جن کا نتیجہ عام مخاصمت اور مخالفت ہوتا تھا، لیکن ساتھ ہی مصیبت اور ذاتی پریشانی کے وقت لوگ اس پر اعتماد بھی بے حد کرتے تھے ۔ ایسے موقعوں پر بے لک اگر چاہتی تو پروردگار کی نیابت بھی کر سکتی تھی .

مآخذ : اس مبحث سے متعلق کوئی خاص تصنیف موجود نہیں، مگر بے لک کے نظام کے مختلف پہلوؤں کی بابت اطلاعات متعدد تصانیف میں مل سکتی ہیں، مثال کے طور پر ذیل کی کتابوں کا حوالہ دیا جاتا ہے: (۱) R. P. Dan: *Histoire de Barbarie et de ses corsaires*، پیرس ۱۶۳۷ء؛ (۲) Venture de Paradis: *Alger au XVIIIe siecle*، طبع Fagnan، الجزائر ۱۸۹۸ء؛ (۳) H. de Grammont: *Histoire d'Alger sous la domination turque*، پیرس ۱۸۸۷ء؛ (۴) Ch. A. Julien: *Histoire de l'Afrique du Nord*، بار دوم، ج ۲ (بہ نظر ثانی و تکمیل تا زمانۂ حال از R. Le Tourneau)، پیرس ۱۹۵۲ء.

(R. LE TOURNEAU)

بیابانک : وسط ایران کے صحرا (دشتِ کویر [کبیر]) کے ایک حصّے کا نام، جس میں تقریباً بارہ نخلستان ہیں ۔ یہ علاقہ ذیل کی حدود کے اندر ہے : طول بلد مشرقی (گرینچ) ۵۴ درجے ۱۵ دقیقے و ۵۵ درجے ۱۵ دقیقے اور عرض بلد شمالی ۳۳ درجے ۵ دقیقے و ۳۴ درجے ۱۰ دقیقے ۔ کھجور کے درختوں اور زمین دوز چشموں نے، جن میں کچھ گرم ہیں، مگر سب کے سب شور ہیں، اسے اس قابل کر دیا ہے کہ باقی ایران سے الگ تھلگ رہ کر بھی خوشحال رہ سکے ۔ یہ نام غالباً اسم تصغیر ہے، جس کے معنی ہیں ''چھوٹا سا بیابان''، لیکن سولھویں صدی (Tavernier) سے پہلے یہ کہیں مذکور نہیں ہے .

اسلام سے پہلے اس علاقے کا کوئی حوالہ نہیں ملتا، اگرچہ مقامی روایت میں دعوی کیا گیا ہے کہ ساسانیوں کے زمانے میں یہاں ان مجرموں کو بھیجا جاتا تھا جنھیں جلا وطنی کی سزا دی جاتی تھی ۔ اس علاقے کے مختلف مقامات کے نام، مثلاً آتشکدہ (مہرجان کے نخلستان سے جنوب کی جانب چھے کیلومیٹر کے فاصلے پر)، اس بات کی دلیل ہیں کہ اسلام سے پہلے یہ جگہ آباد تھی .

یزد کی ایک تاریخ (دیکھیے نیچے) میں دعوی کیا گیا ہے کہ عرب یزد جرد کا تعاقب کرتے ہوئے مرکزی صحرا کے علاقے میں سے گزرے تھے اور وہاں کے مقامی باشندوں نے ان کی اطاعت قبول کر لی تھی، لیکن یہ قول صرف طَبَس پر منطبق ہو سکتا ہے کیونکہ مقامی روایتوں میں تصریح موجود ہے کہ بیابانک میں اسلام کہیں تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی میں امام علی الرّضا کے زمانے میں جا کر پھیلا۔ ابن حَوْقَل نے لکھا ہے کہ نائین سے تین منزل کے فاصلے پر تین گاؤں اس سڑک پر واقع ہیں جو صحرا سے خراسان کو جاتی ہے۔ ان گاؤوں کے نام بیاذق، جَرْمَق اور آرابہ ہیں اور یہ اتنے قریب قریب ہیں کہ ایک گاؤں سے دوسرا گاؤں دکھائی دیتا ہے۔ اس جگہ کھجوروں کے درخت بالخصوص جاذب توجہ ہیں۔ ناصر خسرو ایک گاؤں گَرْمہ کا ذکر کرتا ہے جو نائین سے تینتالیس فرسخ کے فاصلے پر تھا اور لکھتا ہے کہ پہلے اس علاقے میں کوفیجان (قُفص) کا ہجوم تھا، لیکن اس کے زمانے (پانچویں صدی ہجری / گیارھویں عیسوی) میں طَبَس کے امیر گیلکی نے اس علاقے کو ان کے وجود سے پاک کر دیا تھا۔ اس کے کچھ مدت بعد ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان یہ علاقہ بلوچوں کے حملوں سے نقصان اٹھاتا رہا۔ بظاہر خوزستان کے عرب قبائل بھی اس علاقے پر حملے کرتے رہے کیونکہ گزشتہ صدی کے مغربی سیّاح اطلاع دیتے ہیں کہ وہاں عرب بھی رہتے ہیں، اور مقامی روایات میں بھی موجود ہے کہ ایک عربی قبیلے، اہل بسیری نے قاجاروں کے زمانے میں اس علاقے میں خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا۔

آج کل ان نخلستانوں میں غالبًا دس ہزار نفوس آباد ہیں۔ ان میں سے نو بڑے بڑے نخلستانوں کے نام حسب ذیل ہیں: جَنْدَق، فرخی، جَرْمَق، اَردیب، اِیرج، مِہرجان، بَیاذہ، چوپانان اور انتظامی صدر مقام خُور۔ ہر ایک نخلستان کی اپنی اپنی الگ بولی ہے، البتہ جَنْدَق میں فارسی بولی جاتی ہے۔ ان نخلستانوں کے باشندوں کا گزارہ زیادہ تر کھجور کے باغات پر ہے۔

مآخذ: (۱) J. B. Tavernier: *Voyages*، پیرس ۱۷۲۴ء، ۲: ۴۴۹؛ (۲) C. M. MacGregor: *Narrative of a Journey through Khorassan*، لنڈن ۱۸۷۹ء، ۱: ۹۱؛ (۳) W. Tomaschek: *Zur historischen Topographie von Persien II*، در *SBAk. Wien.*، عدد ۱۰۸ (۱۸۸۵ء)، ص ۶۱۶ تا ۶۲۲؛ (۴) عبدالحسین آیتی: آتشکدۂ یزد، یزد ۱۹۳۹ء، ص ۶۷؛ (۵) A. Gabriel: *Die Erforschung Persiens*، وی انا ۱۹۵۲ء، بذیل مادّہ Bijabanak؛ (۶) ابن حَوْقَل، ۲: ۴۰۵؛ (۷) Frye: *Biyabanak, The Oases of Central Iran*، در *Central Asian Journal*، ۵، ۱۹۶۰ء؛ (۸) حبیب یغمائی: شرح حال یغما، تہران ۱۹۵۵ء، ص ۸ تا ۱۲؛ (۹) رزم آرا: فرہنگ جغرافیائی ایران، تہران ۱۹۵۴ء، جلد ۱۰۔

(R. N. FRYE)

بیاتلی یحیٰی کمال: رَكّ بہ یحیٰی کمال بیاتلی۔

بَیان، عربی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں وضاحت اور ابانت، یعنی وہ وسائل جن کے ذریعے وضاحت پیدا کی جائے، لہٰذا کلام یا تعبیر کا واضح ہونا اور وہ ملکہ جس سے یہ وضوح میسّر ہو اصطلاحًا بیان، بلاغت سے جو (تقریبًا) اس کا مترادف ہے ترقی کر کے اس کی ایک خاص شاخ بن گیا؛ چنانچہ علم البلاغۃ میں علم البیان ایک شاخ کے طور پر شامل ہے۔ تاہم بیان عام استعمال میں مختلف اور وسیع تر معانی میں بھی بولا جاتا رہا ہے (قبّ نیز اس قسم کے جملے جیسے باب بیان ... اور در بیان ... جن میں بیان کا مفہوم ”فی“ یا ”در“ سے زیادہ کچھ

ترین ہوتا) ۔ کبھی کبھی تبیان کا لفظ مفہوم میں کسی فرق کے بغیر بیان کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً الخطّابی (م ۹۹۶ یا ۹۹۸ھ) : کتاب بیان اِعجاز القرآن، مخطوطۂ لائڈن، عدد ۱۶۵۳ (Cod. Warner 655)، ورق ۵ (ب) تا ۶ (الف) : کلام کی مختلف اصناف کا مرتبہ اس کے 'تبیان' کے لحاظ سے الگ الگ ہوتا ہے؛ وہی کتاب، ورق ۸ (ب) : لوگ تقریباً مترادف الفاظ کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے وہ 'بیان' جیسے عبارت میں ادا کرنا مقصود ہو یکساں طریقے پر ادا ہو سکتا ہے۔

''بیان'' کی ماہیت کے بارے میں قدیم ترین قسم کے بیانات بظاہر توصیفی کہاوتوں کا درجہ رکھتے ہیں ۔ انھیں بیان کی تعریفیں نہیں کہا جا سکتا، [مثلاً] ''عقل روح کی رہنما ہے، علم عقل کا رہ نما ہے اور بیان علم کا ترجمان ہے'' (سہل بن ہارون، مشہور شُعوبی (م ۲۱۵ھ / ۸۳۰-۸۳۱ء) منقول در ابن عبد ربّہ : العِقد الفرید، قاہرہ ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۵ء، ۱ : ۲۲۱؛ نیز ابو ہلال العسکری : دیوان المعانی، قاہرہ ۱۳۵۲ھ، ۱ : ۱۳۱؛ اسی طرح الحُصری القیروانی : زہرالآداب، بر حاشیۂ العِقد الفرید، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ۱ : ۱۳۳) ۔ ابن المعتز (م ۹۰۸ھ) : آداب، طبع I.J. Kratchkovsky : *M.O.*، ۱۹۲۳ء، ص ۱۱۱، نے بیان کی مدح میں ایک طویل عبارت رقم کی ہے اور کہا ہے بیان ''قلب کا ترجمان'' ہے (یہاں زہر الآداب، ۱ : ۱۱۳ کی عبارت نقل کی گئی ہے)، ''صیقل ذہن'' ہے اور ''دافع شک'' ہے، اسی قسم کا ایک قول العِقد الفرید، ۱ : ۲۲۱ میں درج ہے : ''بدن کا ستون روح ہے، روح کا ستون علم ہے اور علم کا ستون بیان ہے'' ۔ اسے دوسروں نے بھی دہرایا ہے، مثلاً ابن رَشیق نے (العُمدۃ، قاہرہ ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۳ء، ۱ : ۲۱۳)۔

بعض سوابق پر بیان کا اوّلین تعلق فصاحت سے بتایا گیا ہے، جیسے الجاحظ [رک بآں] : کتاب البیان و التبیین، طبع السندوبی، بار دوم، قاہرہ ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء، ۱ : ۲۲۲، جس میں کہا گیا ہے کہ حسن البلاغۃ کا مطلب تلفظ کی صحت و روانی ہے؛ ابو ہلال العسکری : کتاب الصناعتین، قسطنطینیہ ۱۳۲۰ھ، ص ۷ س ۳، جہاں فصاحت کو بیان کا کامل آلہ (وسیلہ) قرار دیا گیا ہے؛ ابن الاثیر : المثل السائر، قاہرہ ۱۳۱۲ھ، ص ۵۹ : ''فصاحت کے معنی ہیں واضح کر دینا، صفائی کے ساتھ تشریح کر دینا، یعنی بیان نہ کہ ابہام و اخفاء'' ۔ تاہم بالعموم بیان کا تصور بلاغۃ کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے ۔ النُّوَیری، نہایۃ الارب، قاہرہ ۱۳۲۲ھ ببعد، ۷ : ۱۰ نے سہل بن ہارون کے قول کی ایک زیادہ مفصّل روایت نقل کی ہے ۔ ''بیان فکر کا ترجمان اور قلب کی تربیت ہے؛ اور بلاغت وہ ہے کہ [مطالب کو] عوام سمجھ جائیں اور خواص مطمئن ہو جائیں ...'' ۔ ابن رشیق : العمدۃ، ۱ : ۲۱۵ تا ۲۱۹، بلاغت کی دو تعریفیں بتاتا ہے جن میں سے ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ''وہ اس قوت بیان اور واضح تشریح کا نام ہے جو خوش اسلوبی کے ساتھ مربوط ہو'' اور دوسری تعریف کہ ''بلاغت عِیّ کی ضد ہے اور عِیّ قدرتِ بیان (یعنی اپنا مطلب صاف طور پر سمجھا دینے) کے فقدان [عجز] کو کہتے ہیں'' ۔ التوحیدی (م ۱۰۲۳ھ) تکلّف یعنی آورد سے بچنے کی ہدایت کرتے ہوئے رسالۃ فی العلوم (در رسالتان، قسطنطینیہ ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء، ص ۲۰۶) میں بیان کو عملاً بلاغت کے مترادف کے طور پر استعمال کرتا ہے ۔ الجاحظ : کتاب البیان، ۱ : ۹۵ بلغاء، خطباء اور ابیناء (جمع کثرت بیّن) سب کو ایک ہی سطح پر رکھتا ہے یعنی وہ لوگ جن کی تقریر شستہ اور استادانہ ہو ۔ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کا مالکی

فقیہ اور شاعر احمد بن المعذّل کی بابت اس رائے سے کہ وہ عربی لغة، بیان، ادب اور حلاوة (بذلہ سنجی) میں یکساں مہارت رکھتا تھا (زَهرُ الآداب، ۲ : ۲۷۶) ظاہر ہوتا ہے کہ بیان کا مفہوم بلاغت سے کس قدر قریب ہے؛ قب نیز وہ تعریف جو الحسن بن وَهْب (م تقریباً ۸۶۰ھ) نے ابو تمّام کی بربنائے بیانِ ''نظم'' نگارش کی ہے (وہی کتاب، ص ۱۵۳) ۔ غیر اصطلاحی معنی میں لفظ بیان کے بعد کے زمانے میں استعمال کا ایک نمونہ ابن قیّم الجوزیّه [رک بآں] : کتاب الفوائد، قاہرہ ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء، ص ۵ میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں فصاحة، جزالة (ادبی شان)، بیان، غوامضُ اللّسان (زبان کی باریکیاں) اور حسنِ کلام سب کا ایک ہی جگہ ذکر کر کے کہا ہے کہ اللہ عزّو جلّ نے یہ امتیازی صفات قرآن مجید میں جمع کر دی ہیں.

مخصوص معنی میں بیان کی تعریف العقد، ۱ : ۲۲۲ میں دی گئی ہے اور ابو طاہر البغدادی (م ۱۱۲۳ء) نے قانون البلاغة (در رسائل البلغاء، طبع محمد کرد علی، بار سوم، قاہرہ ۱۹۳۲ء، ص ۴۳۲) میں خفیف تغیّر کے ساتھ بھی کہا ہے کہ ''جو چیز ایک مستور خیال (معنی) کے چہرے سے اس طرح نقاب اٹھا دے کہ ذہن (عقل) اسے اچھی طرح سمجھ کر قبول کر لے وہی بیان ہے'' ۔ تشریح کا بھی راستہ بیان کی اس زیادہ مبسوط تعریف میں جو جعفر البرمکی (م ۸۰۳ء) سے منسوب ہے اختیار کیا گیا ہے، البیان، ۱ : ۱۱۸ (نیز ابن قتیبه : عیون الأخبار، قاہرہ ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۵ء - ۱۳۴۸ھ / ۱۹۳۰ء، ۲ : ۱۷۳؛ زہر الآداب، ۱ : ۱۲۶): ''بیان سے مراد یہ ہے کہ لفظ (اسم، جسے بعد کے زمانے میں کلام کہا گیا ہے) تمہارے (مخاطب کے) خیال کا پورے طور پر احاطہ کر لے اور مقصد کو (مکمل طور پر) ادا کر دے اور اسے ابہام (شِرْکة) سے اس طرح الگ کر دے کہ کسی کو (اصل منشا سمجھنے کے لیے) تامّل اور سوچ بچار کی ضرورت نہ پڑے ۔ بیان، تکلّف یعنی آورد سے خالی اور صَنْعَة (تصنّع) سے دور ہونا چاہیے ۔ اس میں کوئی الجھن (تعقید) نہ ہونی چاہیے، اور بغیر تاویل آسانی سے سمجھ میں آ جانا چاہیے'' (ترجمہ از عیون اور زہر بیان سے متعلق عبارت کسی قدر طویل ہے ۔ العمدة، ۱ : ۲۲۵ میں بھی بیان کی اسی قسم کی تعریف درج ہے جس کا مفہوم یہی ہے لیکن عبارت مختلف ہے).

فنّ خطابت کے نظام میں بیان کی مناسب جگہ مقرر کرنے کی پہلی کوشش، جہاں تک مجھے معلوم ہے، ابن القِرّیه (م ۸۴ھ / ۷۰۳ء) کی تحریر میں محفوظ ہے، جو اس نے حرف، کلمہ اور کلام پر لکھی تھی ۔ اس میں کلام کو دس ''ابواب'' میں منقسم کیا گیا ہے، جن میں سے سات باب فواتح (ابتدائیات) اور تین باب جوامع پر مشتمل ہیں ۔ اس فہرست میں بیانُ الکلام فواتح میں چوتھا باب ہے اور اس کے لوازم جیسے ''بولنے کی جرأت''، ''کھنکھارنے اور گلا صاف کرنے سے پرہیز'' اور بات کو مرضی کے مطابق شروع اور ختم کرنے کے قابل ہونا ابتدائیہ میں شامل ہیں (منقول از قانون البلاغة، ص ۴۳۳).

الجاحظ : کتاب الحیوان، قاہرہ ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء، ۱ : ۱۷، میں لکھتا ہے کہ انسان اور دوسرے ذی حیات ''قوت دلالت'' یعنی مافی الضمیر کے اظہار کی قابلیت رکھتے ہیں، مگر قوتِ استدلال فقط انسان ہی میں ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ دلالت کے ساتھ سوچ کر نتیجے نکالنے کی قوت بھی رکھتا ہے؛ مگر الجاحظ کی رائے میں بیان کا لفظ دونوں قسم

کی دلالت پر حاوی ہے ۔ اب انسانی دلالت یا بیان کی پانچ صورتیں ہیں : (۱) لفظ، (۲) کتابت، (۳) انگلیوں یا ان کے جوڑوں پر شمار (عقد، یہ لفظ عَقد نہیں ہے جیسا کہ السندوبی نے بیان، ۱ : ۷۶ میں سہواً ضبط کیا ہے)، (۴) اشارۃ اور (۵) نِصبہ یعنی بیتّرا یا روِنہ (یہ لفظ نُصْبَۃ نہیں ہے جیسا کہ کتاب مذکور، ص ۱۱ میں سہواً ضبط کیا گیا ہے)، نِصْبَۃ کی بابت دیکھیے Nallino، در *RSO*، ۱۹۱۹ تا ۱۹۲۱ء، ص ۶۳۷ تا ۶۳۸، جس نے ص ۶۳۰ تا ۶۳۱ پر ان متأخر نحویوں کی فہرست دی ہے جنھوں نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے ۔ بیان کی پانچ قسموں کا یہ ضابطہ الجاحظ نے اپنی کتاب الحیوان، ۱ : ۳۳ میں اور پھر البیان، ۱ : ۷۶ میں دہرایا ہے ۔ ابن المدبّر (م ۸۹۳ء) : رسالۃ العذراء، طبع زکی مبارک، قاہرہ ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء، ص ۴۰ الجاحظ کی انواعِ خمسۂ بیان کو نقل کرتا ہے اور اس پر اپنا یہ قولِ فیصل اضافہ کرتا ہے کہ نِصْبَۃ کا تصور ارسطاطالیس تک جاتا ہے (جس کا ساتواں "مقولہ" τὸ κεῖσθαι ہے) الحُصْری (م ۱۰۶۱ء) : زَہْر، ص ۱۲۳ تا ۱۲۵، الجاحظ کی راے پر بحث کرتا ہے، لیکن اس کے ممکن مأخذ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا ۔ ابوطاہر : قانون، ص ۳۲۳، محض الجاحظ کے قول کی بالاختصار تکرار پر اکتفا کرتا ہے ۔ الرُّمّانی (م ۹۹۴ء) : کتاب النُّکت فی إعجاز القرآن، طبع عبدالعلیم، دہلی ۱۹۳۳ء، ص ۲۶، جس نے بیان کی تقسیم کلام، حال، اشارہ اور علامۃ میں کی ہے، الجاحظ ہی کے سابقہ قول کا پیرو معلوم ہوتا ہے ۔ اس میں جو ترمیمات ہوئیں ان کی اصل ابھی تک واضح نہیں کی گئی ۔ بعد کے زمانے میں الجاحظ کے نظریے کا اور کوئی حوالہ میرے علم میں نہیں آیا۔

اسحٰق بن ابراہیم بن وَہب نے ۳۳۵ھ/ ۹۴۶ - ۹۴۷ء کے بعد اپنی کتاب البرہان فی وجوہ البیان لکھی (یعنی بیان کے مختلف طریقوں کی توضیح)۔ (یہ کتاب حال کے زمانے تک غلطی سے قُدامہ بن جعفر کی طرف منسوب کی جاتی رہی ہے اور اسی کے نام سے اس کتاب کو نقد النثر نام دے کر طٰہٰ حسین اور العبّادی نے طبع کیا ہے) ۔ اسحٰق کی غرض اس کتاب کی تصنیف سے ان خامیوں کو دور کرنا ہے جو اس موضوع کو بیان کرنے میں الجاحظ سے ہو گئی تھیں ۔ اسحٰق بن ابراہیم اظہار کے چار جداگانہ طریقے بتاتا ہے : (۱) چیزیں اپنی اصل (ذوات) ہی سے سمجھ میں آ جائیں (یعنی ان کا ایسا ہونا ہی جیسی کہ وہ ہیں انھیں قابلِ فہم بنا دے)، خواہ وہ الفاظ بھی جو عام طور پر انھیں ظاہر کرتے ہیں استعمال نہ کیے جائیں؛ (۲) عقل و فکر کے ذریعے ذہن میں ان کا مفہوم آ جائے (غالباً اسی کو الجاحظ استدلال کہتا ہے)؛ (۳) زبان کی آوازوں کو جوڑ کر ملفوظ کرنے سے معنی سمجھ میں آئیں؛ اور اخیراً (۴) بذریعۂ کتابت، جس سے فاصلے پر موجود لوگوں کو یا انھیں جو (ابھی) پیدا نہیں ہوے (اور بعد میں آنے والے ہیں) سمجھایا جا سکے (قُدامہ بن جعفر الکاتب البغدادی کی کتاب نقد الشعر کا ترجمہ از **S.A. Bonebakker**، لائڈن ۱۹۵۶ء، ص ۱۶؛ قوسین میں جو لفظ یا عبارت ہے وہ کاتب مقالہ کی ہے) ۔ یہ بآسانی دیکھا جا سکتا ہے کہ اسحٰق کا تصورِ بیان اس تصور سے جو الجاحظ نے متعیّن کرنے کی کوشش کی تھی بہت مختلف ہے اور ایک لحاظ سے اس سے وسیع تر اور ایک دوسرے لحاظ سے اس سے تنگ تر ہے ۔ جس طرز سے اسحٰق اپنے تصوّرِ بیان کا اپنے موضوع پر اطلاق کرتا ہے اسے سمجھنے کے لیے یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ (۳) کی بحث کے تحت (از ص ۴۰ تا ۴۶) وہ مولہ "اقسام العبارۃ" (یعنی

الفاظ میں اظہار کی اقسام) کی فہرست دیتا ہے جن میں بغیر مزید تقسیم کے اصناف ذیل شامل ہیں: صنعت اشتقاق (*Figura etymologica*)، تشبیہ، رمز، استعارہ، تمثیل، لُغز اور تقلیب.

الرُّمّانی نے جو بلاغة کی تقسیم دس قسموں میں کی ہے وہ ایک بالکل جداگانہ سلسلۂ فکر پر مبنی ہے: ایجاز، تشبیہ، استعارہ وغیرہ اور ان سب کے آخر کی یعنی دسویں قسم "حسن البیان" (= خاطر خواہ مطلب واضح کرنا) ہے۔ اسی سلسلۂ فکر کے مطابق ابن رَشیق [م ۴۵۶ھ / ۱۰۶۴ء] نے العمدة، ۱ : ۲۲۵ تا ۲۲۸ میں بیان پر ایک باب مرتب کیا ہے (اور موقع کے مطابق الرُّمّانی سے دو مفید مطالب اقتباس بھی دے دیے ہیں) اور کہنا چاہیے کہ قسم بندی کی اسی سطح کے متوازی بلاغت، ایجاز، نظم، مجاز (بدلے ہوئے معنی)، استعارہ، المُختَرع والبدیع (ایجاد و جدت) وغیرہ پر ابواب تجویز کیے ہیں۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی میں "بیان" کے ساتھ، خصوصًا "بدیع" کے مقابلے میں، اس طرح کے معاملے کا اشارہ نہیں پایا جاتا جو زمانۂ ما بعد میں غالب نظریہ بننے والا تھا۔ الآمدی [رک بآں] نے اپنی کتاب الموازنة بین ابی تمام و البحتری، قسطنطنیہ ۱۲۸۷ھ، ص ۲ میں بدیع کی قسمیں حسب ذیل قرار دی ہیں: استعارہ، تجنیس اور طباق (صنعت تضاد)۔ ابو ہلال العسکری (م ۱۰۰۵ء) اپنی کتاب صناعتین (مثلاً ص ۲۰۵ اور ۲۹۰) میں استعارہ اور کنایہ کو دیگر جملہ صنائع کے برابر جگہ دیتا ہے۔ ایسے ہی الباقلانی [رک بآں]، الخفاجی [رک بآں] اور ابو طاہر اپنے زمانے تک استعارہ اور کنایہ کو "بدیع" کے تحت میں لاتا ہے۔ تنون، ص ۳۲۵ تا ۳۵۹ (خصوصیت کے ساتھ صنائع کلام کی بیالیس اصناف، ص ۳۴۳)، لیکن ان میں سے کسی نے بھی علم البلاغہ یا "علم البیان" کی، جیسا کہ عبدالقاہر الجُرجانی [رک بآں] (دلائل الاعجاز، قاہرہ ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۳ء، ص ۳) اپنے وقت تک کہنا زیادہ پسند کرتا تھا اور اسے تمام علوم سے بزرگ تر قرار دیتا تھا، اساسی ترتیب کے ارتقا میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ الجُرجانی، جس کے اور باتوں کے علاوہ ہم اس لیے بھی مرہون منت ہیں کہ اس نے معنًا استعارہ کا جمالیاتی نقطۂ نظر سے بہت ہی مؤثر تجزیہ کیا ہے، دلائل الاعجاز، ص ۳۴۹ تا ۳۵۰ میں لکھتا ہے کہ علم الفصاحه و البیان کا ارتقا دوسرے علوم کے ارتقا سے دو باتوں میں مختلف ہے: (۱) اس علم کے قدیم ماہرین نے اس کے بجائے کہ انہیں جو کچھ کہنا تھا وہ صراحةً براہ راست کہتے اس سے متعلق اپنے خیالات کو اشارات و استعارات کے پردے میں ظاہر کیا؛ (۲) علاوہ بریں قدما کی آرا پر دوسرے علوم کے مقابلے میں بہت کم نقد و جرح کی اور اس علم کی معلومات کو نقل در نقل کرتے چلے گئے۔ الجُرجانی بیان کے نظریات سے دلچسپی نہیں رکھتا بلکہ اس کی جدت طرازی ادب کے تجزیے کی ایک اور سطح سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ حقیقت فخر الدین الرّازی (م ۱۲۰۹ء) کی کتاب نہایة الایجاز فی درایة الاعجاز، قاہرہ ۱۳۱۷ھ سے بھی عیاں ہے۔ اس کتاب کو خود الرّازی نے (ص ۳ تا ۵ پر) الجُرجانی کی دلائل اور اسرار البلاغة کو مربوط کرنے کی کوشش بتایا ہے (طبع H. Ritter، استانبول ۱۹۵۴ء، جرمن ترجمه Wiesbaden، ۱۹۵۹ء) مگر اس میں "بیان" پر صراحةً کوئی بحث ہی نہیں ملتی۔

جب ابن الاثیر [رک بآں] نے المثل السائر فی ادب الکاتب و الشاعر لکھی تو اس وقت سے "بیان" کے متعلق فکر میں ایک تبدیلی نظر آتی ہے۔ خود ابن الاثیر کا اس تبدیلی میں کس قدر

حصّہ ہے، اس کے متعلق قطعی رائے قائم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ۔ ابن الأثیر نے (ص ۲) علم البیان کا انشاے نظم و نثر سے وہی تعلق قائم کیا ہے جو علم اصول الفقہ کو انفرادی احکام یا فقہی قوانین سے ہے (ص ۱۱۰ ببعد وہ اس علم کے نمائندوں کو علماء البیان کا لقب دیتا ہے) ۔ اس نے اپنی کتاب کے تین حصّے کیے ہیں : ایک مقدمہ، جس میں اصول علم البیان، یعنی اس علم کے بنیادی امور سے بحث کی ہے ۔ باقی کے دو حصّوں میں سے ایک میں الفاظ سے کام لینے (الصناعة اللفظیة) کی اور دوسرے میں معنوی خوبیوں (الصّناعة المعنویة) کی تفصیل ہے ۔ علم البیان کا موضوع فصاحت اور بلاغت قرار دیا ہے، اپنی کتاب میں لفظی اور معنوی اعتبار سے وہ انھیں دونوں کے اجزاے ترکیبی سے بحث کرتا ہے ۔ الفاظ کس کس طور سے معنی ادا کرتے ہیں، وہ اس کا خاص لحاظ رکھنے میں نحویوں کا ہم نوا ہے، لیکن نحویوں کا مقصد یہیں تک ہے اور ہمارا مصنّف آگے بڑھ کر اداے مطالب کے مختلف طریقوں میں حسن و خوبی کے اوصاف بوی تلاش کرتا ہے ۔ اس کا ناقد ابن الحدید (م ۱۲۵۷ء) : الفلک الدائر علی المثل السّائر، بمبئی ۱۳۰۸، ص ۱۳ تا ۴۲ (المثل، ص ۳۸ س ۲۲ تا ص ۳۹ س ۸) میں اس کی بابت اپنی راے ان الفاظ میں بیان کرتا ہے : ”ابن الاثیر کا علم البیان بنیادی طور پر ایک علم معقول (علم عقلی) ہے جو اصول عامہ سے بذریعۂ علم و ذوق استدلال کرتا ہے ۔ اس کے فیصلوں کی بنیاد ادبِ عربی سے استقرا (”بالاستقراء من اشعار العرب“) پر نہیں ہے ۔ (”ذوق“ کی بابت نیز قب ابن خلدون : مقدمة، طبع Quatremère، پیرس ۱۸۵۸ء، ۳ : ۳۱۲ تا ۳۲۷، ۳۴۹ تا ۳۵۰؛ ترجمہ از F. Rosenthal، نیویارک ۱۹۵۸ء، ۳ : ۳۵۸ تا ۳۶۲، ۳۹۶ تا ۳۹۸) ۔ ابن الاثیر کے نزدیک علم البیان کی جان، حقیقت اور مجاز کا مسئلہ ہے، یعنی لفظ اپنے اصلی معنی میں مستعمل ہے یا کسی متبدّل معنی میں (ص ۲۳) ۔ اس کی طرز بحث کا طبعی تقاضا یہ ہوا کہ وہ تشبیہ، استعارہ اور مجاز مُرْسَل اور دیگر صنائع بدائع کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا ۔ حالانکہ یہی فرق محاسن کلام عربی کے اس نظام کی جو ابن الاثیر کے وقت سے رائج ہوا نمایاں خصوصیت بننے والا تھا .

اس مذھب کی ابتدا ابن الاثیر کے ہمعصر السّکّاکی (م ۱۲۲۹ء) سے ہوئی، جو اپنی کتاب مِفتاح العُلوم، قاہرہ بلا تاریخ (تقریباً ۱۸۹۸ء)، ص ۲ تا ۳ میں لکھتا ہے کہ اس کتاب سے اس کا مقصد تمام انواع ادب، یعنی علم ادب کی جملہ اقسام یا عناصر سے بہ استثناے علم اللّغة، بحث کرنا ہے ۔ یہ انواع حسب ذیل ہیں : (الف) علم الصّرف (تغییر اشکالِ الفاظ)؛ (ب) علم النّحو (ترکیب کلام کے اصل قواعد) جس کی تعریف میں اس نے ذیل کے علوم شامل کیے ہیں : (۱) علم المعانی (جملے کے اقسام اور ان کا محل استعمال) اور اسی کے ساتھ ”تعریف“ اور ”استنباط“ کو بھی ضم کر دیا ہے ۔ (۲) علم البیان، یعنی فصیح و بلیغ اظہار کا فن، جس کے لیے ضمنی شاخوں کے طور پر عروض و قوافی کا علم ضروری ہے ۔ علم البیان کے بنیادی مباحث تین ہیں : تشبیہ، مجاز (و حقیقت) اور کنایہ ۔ بقیہ محاسنِ کلام کو کتاب کے آخر میں (ص ۴۲۲ تا ۴۲۹) رکھ دیا ہے اور اس حصّے کا عنوان ”البدیع“ رکھا ہے .

قیاس یہ ہے کہ السّکّاکی کے اس اصولِ بلاغت کی جسے آج تک مستند سمجھا جاتا ہے پوری طرح باقاعدہ تبویب و ترتیب اس کے شارح القزوینی (م ۱۳۳۸ء) اور القزوینی کے شارح التفتازانی (م ۱۳۸۹ء) کی بدولت ہوئی ۔ القزوینی علم ادب سے

بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتا۔ اس کے نزدیک خطابت کے لیے بحیثیت مجموعی بلاغت موزوں نام ہے۔ اس علم کو (محاسنِ کلام کے اصول کی حیثیت سے) وہ تین قسموں میں منقسم کرتا ہے: علم المعانی، علم البیان اور علم البدیع (رک بہ مادۂ بلاغۃ)۔ اب علم البیان سے مراد اس سے زیادہ نہیں نہ اس سے کم کہ وہ ایک علم ہے جو ایک ہی مطلب کے ادا کرنے کے ممکن طریقوں سے بحث کرتا ہے کہ ان میں سے کون کون کس حد تک صفائی کے ساتھ اور برمحل یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ چونکہ جو لفظ بھی استعمال کیا جائے وہ یا تو پورے معنی ادا کرے گا یا جزوی طور پر، اور یا پھر معنی مراد کو کسی ایسے بیرونی لفظ کی مدد سے ادا کیا جائے گا جس کی دلالت سے مخاطب آگاہ ہے، پس متکلم کو ادائے مطلب کے لیے متعدد پیرائے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ لفظ اور معنی کے باہمی تعلق کی اساسی صورتیں بھی تین ہیں: ان کے جواب میں تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل ہیں، جو اپنی قوتِ بیانیہ سے انھیں ادا کرنے کا فرض پورا کرتے ہیں۔ اسی لیے انھیں دیگر علم محاسنِ کلام سے، جن سے علم بدیع میں بحث کی گئی ہے، علیحدہ رکھا گیا ہے (القزوینی کی یہ توجیہ جزئی طور پر اس کی کتاب تلخیص المفتاح، قاہرہ ۱۳۴۲ھ/ ۱۹۲۳ء، ۳: ۲۵۶ تا ۲۹۱ سے اخذ کرکے پیش کی گئی ہے؛ نیز در A.F. Mehren: *Die Rhetorik der Araber*، کوپن ہاگن اور ویانا ۱۸۵۳ء، متن عربی، ص ۶ تا ۷؛ جرمن عبارت کا ترجمہ، ص ۳۵ تا ۴۵؛ اور جزئی طور پر کتاب تلخیص کے مجموعی سیاق سے ملخصًا لی گئی ہے۔ قزوینی کے تصورِ بیان کے اس سے مفصل تر خلاصے کے لیے دیکھیے: وہی کتاب، ص ۲۰ تا ۴۲)۔

النویری (م ۱۳۳۲ء): نہایۃ، ۷: ۱۳۵، البلاغۃ کی تین قسمیں: علم المعانی، علم البیان اور علم البدیع کو تو پہلے مان لیتا ہے، لیکن محاسن کلام کو اس تقسیم کے مطابق مرتب نہیں کرتا۔ اس کے مقابلے میں ابن قیم الجوزیۃ: فوائد میں جس کا مقصد قرآن مجید کے اعجاز یعنی اس کے لاثانی اور مطلقاً بےنظیر ہونے کی تحقیق ہے، علم البیان کو بلاغت کے مجموعی معنی ہی میں استعمال کرتا ہے، اور اس کی شرح احوال کو فصلوں میں تقسیم کرکے پیش کرتا ہے: (الف) فصاحۃ، بلاغۃ، حقیقت اور مجاز، استعارہ، تشبیہ، تمثیل (مثالوں کے ذریعے مطلب ادا کرنا، انطباق)، ایجاز اور تقلیب الفاظ؛ (ب) اصل علم البیان جسے وہ (الف) ۸۳ صنائع کبیرہ میں تقسیم کرتا ہے (جن میں سترھویں صنعت مجاز مرسل ہے) اور (ب) ان کے علاوہ چوبیس دیگر صنائع ان کے ساتھ ضم کرتا ہے۔ وہ (ص ۲۱۸ پر) لکھتا ہے کہ حصہ (ب) کے ان آخری چوبیس صنائع کو البدیع بھی کہتے ہیں۔ ابن قیم کی طرح ابن خلدون (م ۱۴۰۶ء) کی رائے میں بھی علم البیان اسی بنا پر قابلِ قدر ہے کہ وہ اعجاز القرآن کے سمجھنے میں رہنمائی کرتا ہے۔ وہ بھی علم البیان کو، جو اس ذیلی شعبے کا نام ہے جسے عرب ناقدین نے پہلے پہل منکشف کیا، اظہار مطالب کے مجموعی علم کا اصطلاحی نام دیتا ہے، مگر اس نے اس علم کا نظام قائم کرنے میں جو سختی برتی ہے وہ اسے ابن قیم سے ممیز کر دیتی ہے۔ بیان، یعنی اظہارِ خیال، یا تو بذریعۂ زبان ہوتا ہے یا بذریعۂ کتابت (مقدمۃ، ۳: ۲۳۲ تا ۲۳۳؛ ترجمۂ دیسلان، پیرس ۱۸۶۲ تا ۱۸۶۸ء، ۳: ۲۶۳ تا ۲۶۵؛ ترجمہ از Rosenthal، ۳: ۲۸۱ تا ۲۸۲)۔ علم البیان میں بلاغۃ کے تین علم شامل ہیں اور ابن خلدون کی تشریح کے مطابق ان تین، یعنی علم معانی، بیان اور بدیع کے ساتھ علم صرف و نحو بھی علم البیان کا ایک حصہ ہے۔ ابن خلدون یہ بھی کہتا ہے کہ مشرق کے لوگ بیان کی طرف

خاص توجہ کرتے ہیں اور مغرب (اسلامی مغرب) کے بدیع میں خاص دلچسپی لیتے ہیں (مقدمة، ۳: ۲۸۹ تا ۲۹۳؛ ترجمۂ ڈیسلان ۳: ۳۲۳ ببعد؛ Rosenthal، ۳: ۳۳۲ تا ۳۳۹) - ابن خلدون، السکّاکی اور القزوینی کی اہمیت کا اعتراف کرتا ہے جن کی تصانیف سے وہ بخوبی واقف ہے اور جن کا مستند اور ثقہ ہونا اس وقت تک اتنا مسلّم ہو چکا تھا کہ اس میں کسی کو چون و چرا کرنے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔

مآخذ: مقالے کے متن میں آ گئے ہیں۔

(G.E. VON GRUNEBAUM)

بَیان بن سَمْعان التَّمِیمی: کوفے کا شیعی رہنما (اکثر غلطی سے بَنان لکھ دیا جاتا ہے جو درست نہیں؛ النوبختی کے نزدیک النہدی) - وہ بھوسے کی تجارت کرتا تھا۔ النوبختی کے بیان کے مطابق وہ ابن کَرِب کے تلمیذ حمزۃ بن عمّارۃ کا شاگرد تھا۔ یہ لوگ محمدؒ بن الحنفیہ کی امامت کے متعلق غلو آمیز نظریات رکھنے میں مشہور تھے۔ اس نے محمد کے بیٹے ابو ہاشم (م تقریباً ۹۹ھ/۷۱۷ء) [رک بآں] کی امامت قبول کی اور امام محمد الباقرؒ کا مخالف ہو گیا۔ وہ قرآن پاک کے لفظی تشبیہی (یا تجسیمی) معنی سکھایا کرتا تھا، مثلاً خدا ایک نورانی ذات ہے، چہرے کے سوا جس کے تمام اعضاء و جوارح بالآخر معدوم ہو جائیں گے (قرآن ۲۸ [القصص]: ۸۸، کُلُّ شَیْءٍ هَالِکٌ اِلَّا وَجْهَهٗ) - جب امام محمد الباقرؒ کی وفات پر المُغیرۃ بن سعید [رک بآں] نے ان کی جماعت کو چھوڑ دیا تو وہ اور بیان بظاہر متفق ہو گئے۔ پھر ایک واقعے کے بعد، جو ممکن ہے جبری اور قبل از وقت شورش ہو، یہ دونوں مٹھی بھر متبعین سمیت گرفتار کر لیے گئے اور ۱۱۹ھ/۷۳۷ء میں ہشام کے والی خالد القسری نے انہیں جلا دیا (ان کی موت کے متعلق کئی ایک قیاسی، مگر باہم متضاد بیانات ہیں) - الاصفہانی نے الاغانی میں قرائن کے بالکل خلاف اس خروج کو امام جعفر الصادقؒ سے منسوب کیا ہے (۵: ۱۲۱؛ لیکن قب ۱۹: ۵۸) - الواقدی اس بغاوت کو محمد بن عبداللہ کی طرف منسوب کرتا ہے، جس نے چھبیس سال بعد المنصور کے خلاف خروج کیا تھا۔ اور یہ بھی امکان ہے (قب الطّبری و ابن حزم) کہ اس کا تعلق عبّاسیوں سے ہو جو جملہ اہلِ بیت کے نام پر کوفے میں ابو ہاشم کی جماعت کے وارث ہو گئے تھے۔

بیان کے معتقدین نے بظاہر ایک جماعت بیانیّہ (یا بنانیّہ یا سمعانیة) تشکیل کر لی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اماموں کی نبوّت کو نورِ ربّانی کے ایک ذرۂ باطنی سے منسوب کرتے تھے، موت کے بعد بہت سے مذہبی بزرگوں کی بازگشت کا اعتقاد رکھتے تھے اور خدائے تعالٰی کے ''اسم اعظم'' پر بحث کرتے تھے [الفَرق بین الفِرق، ص ۲۲۷: ''اسم اعظم'' جاننے کا دعوی کرتے تھے]۔ کہتے ہیں بعض لوگ بیان کو (۳ [آل عمران]: ۱۳۸، ھذا بیانٌ لِلنّاسِ . . . الآیة) کی سند پر امام سمجھتے تھے۔ دوسرے شیعی گروہوں کی طرح یہ بھی، کم از کم عبّاسیوں کی فتح و کامرانی کے بعد، محمد بن عبداللہ کے طرف دار ہو گئے تھے۔

مآخذ: (۱) الاغانی، حوالۂ بالا؛ (۲) النوبختی: فرق الشیعة، نجف ۱۳۳۵ھ/۱۹۳۶ء، ص ۲۸، ۳۳؛ (۳) الواقدی، کتاب العیون و الحدائق، طبع M. J. de Goeje و P. de Jong، *Fragmenta Historicorum Arabicorum*، ج ۱، لائڈن ۱۸۶۹ء، ص ۲۰۳ تا ۲۲۱؛ (۴) ابن قتیبہ: عیون الاخبار، قاہرہ ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۸ء، ۲: ۱۳۸؛ (۵) الکشّی: معرفة اخبار الرّجال، بمبئی ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء، بذیل مادۂ ابوالخطّاب، بالخصوص ص ۱۹۹؛ (۶) الطّبری، ۲: ۱۶۱۹ ببعد؛ (۷) الاشعری: مقالات الاسلامیین، قاہرہ ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء، ۱: ۶۶؛ (۸)

البغدادی: الفَرْقُ بَیْنَ الفِرَق، قاہرہ ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء، ص ۴۷، ۱۳۸، ۱۵۰؛ (۹) الشہرستانی [الملل و النحل]، ص ۱۱۳؛ (۱۰) ابن حَزْم، در I. Friedländer : *JAOS*، ۲۸ (۱۹۰۷ء) : ۶۰ تا ۶۱؛ ۲۹ (۱۹۰۸ء) : ۸۸ .

(M.G.S. Hodgson)

* **بَیَنْدُر** : [= بایندر] اُوغُوز (ترکمان) قبائل میں سے ایک قبیلہ۔ آق قویونلو [رک بآن] جو اسی نام کے خاندانِ شاہی کے بانی تھے، اسی بیندر قبیلے کی ایک شاخ تھے، چنانچہ بعض تاریخ نویس خاندان آق قویونلو کا نام بایندر خان اوغلانلری یا آل بایندریہ لکھتے ہیں، اور آق قویونلو کی ریاست کو دولت بایندریہ کہتے ہیں۔ اس بات کا امکان ہے کہ بیندر قبیلے نے سلجوقوں کی فتح آناطولی [رک بآن] میں حصہ لیا ہو۔ نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی اور دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں وسطی اور مغربی ترکی میں بہت سے مقامات ان کے نام سے منسوب تھے۔ کوئی شک نہیں کہ ان سے اکثر مقام بیندر کے قبضے میں آ گئے تھے، جنھوں نے آناطولی کی فتح میں حصہ لیا تھا۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں ہم بیندر کو شام کے ترکمانوں میں بھی پاتے ہیں۔ اس قبیلے کی شاخ آق قویونلو اسی صدی میں دیار بکر میں سیاسی سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ بیندر کی سب سے ممتاز شاخ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں علاقۂ طرسوس میں تھی اور اس کا شغل زراعت تھا۔ طرابلس شام اور حلب کے علاقوں میں نیز سیواس کے جنوب میں بنی ایل میں بیندر کی دوسری شاخیں تھیں۔ حلب کے بیندر کو سلطنت عثمانیہ نے آسٹریا پر ۱۶۹۰ء کی فوج کشی میں شریک ہونے کے لیے بلوایا تھا۔ اَسْتَرآباد [رک بآن] کے علاقے میں بھی بیندر کی ایک شاخ گوکلی (Göklen) ترکمانوں کے درمیان آباد تھی۔ آق قویونلو خانوادے کے افراد یقین رکھتے تھے کہ وہ بیندر کی اولاد ہیں جو بیندر قبیلے کا مورثِ اعلیٰ تھا، اور اس کا نشان اپنے سکوں، یادگار عمارتوں اور فرامین پر بھی ثبت کیا کرتے تھے۔ گزشتہ زمانے میں ایران اور ترکی میں بیندر ایک شخصی نام کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔

مآخذ : فاروق سومر Farük Sümer : بایندرہ، بیچنک و بیورگرلر، در دل و تاریخ ـ جغرافیہ فاکولتہ سی درگیسی، ج ۱۱، عدد ۲ تا ۴: ص ۳۱۷ تا ۳۲۲ .

(Farük Sümer)

* **بِیبان** : (دروازے) Tellian Atlas (= ''تلی اطلس'' یعنی کوہستان اطلس کے پست پہاڑیوں والے حصے) کے ایک سلسلۂ کوہ میں سے گزرنے کے درے۔ یہ پہاڑیاں جرجرہ کے متوازی واقع ہیں جو وادی سہل کے نشیبی میدان کے جنوب میں ہے۔ فرانسیسیوں نے ان دروں کا ترکی نام دمیر قپو (= آہنی دروازے) باقی رکھا ہے۔ شہر الجزائر سے قسنطینہ تک سڑک اور ریل کا راستہ دونوں بڑے دروازے [درے] الباب الکبیر سے گزرتے ہیں جو شبّہ (Chebba) ندی نے پہاڑیوں کو کھود کھود کر بنا دیا ہے۔ چھوٹے دروازے الباب الصغیر کے جو ۳۰۰ کیلومیٹر مشرق کی جانب ہے، آر پار بوکتون ندی گزرتی ہے۔ یہ دونوں دروں میں زیادہ تنگ ہے۔ یہ ''دروازے'' قدیم رومیوں کی سڑکوں کے جال اور عربوں کے راستوں میں شامل نہیں تھے بلکہ انھیں سولھویں صدی عیسوی سے ترک فوجوں نے شہر الجزائر سے قسنطینہ کی طرف سفر کرنے کے لیے استعمال کیا۔ تاہم ان فوجوں کو اس علاقے کے تندخو باشندوں کو کچھ نہ کچھ روپیہ دینا پڑتا تھا تا کہ وہ انھیں اس علاقے سے بلا گزند گزرنے دیں۔ ۲۸ اکتوبر ۱۸۳۹ء کو آٹھ ہزار فرانسیسی سپاہیوں کا ایک لشکر، جس کا سپہ سالار مارشل Marshal والی

(Valée) الجزائر کا گورنر جنرل تھا اور جس کے ہمراہ ڈیوک آف اورلینز بھی تھا، الباب الصغیر کے درّے سے بغیر کسی قسم کی مزاحمت کے گزر گیا، کیونکہ اس علاقے کے پہاڑی قبائلیوں نے اپنا مقررہ نذرانہ مجّانة کے باش آغا مُکرّانی کے حسنِ وساطت سے پہلے ہی وصول کر لیا تھا جسے فرانسیسیوں کا طرف دار بنا لیا گیا تھا ۔ یہ فوجی مہم، جسے آہنی دروازوں کی مہم کہا جاتا ہے، ایک درخشاں جنگی کارنامہ اور تحسین و آفرین کی سزاوار ہے لیکن یہی فرانسیسیوں اور عبدالقادر کے درمیان قطع تعلق کا آخری سبب ہوئی کیونکہ اس فعل کو امیر موصوف نے عہدنامۂ تفنہ (Tafna) کی خلاف ورزی قرار دیا ۔

جغرافیہ نویسوں نے لفظ بِیبان کو وسعت دے کر اس میں اس سارے مخالف سمت میں ڈھلوان (anticlinal) سلسلۂ کوہ کو شامل کر دیا ہے جو درّہ ہائے آہنی کو قطع کرتے ہیں، ایک ہزار سے چودہ سو میٹر سے زائد تک بلند ہیں اور اُومیلہ Aumale سے گوئر گور (Lafayette) Guergour تک پھیلے ہوئے ہیں ۔ اس طرح یہ پہاڑ وادیِ ساحل اور زیرین بوسلّام کی معاون ندیوں کے نشیبی علاقے کو اونوغا (Ouennougha)، مزیتہ Mzita اور متنن Metnen کی مخلوط بناوٹ کے پہاڑوں سے اور برج بو اُرّیج Bordj bou Arreridj کے طاس سے جدا کرتے ہیں ۔ یہ پہاڑ جن کی زمین چونے، کھتیلی (marle) اور پرتیلی (schistose) مٹّی کی ہے کچھ بہت زیادہ زرخیز نہیں ہیں ۔ بِیبان کے سلسلۂ کوہ کے کچھ حصّے میں حلبی صنوبر کے درختوں کا جنگل ہے ۔ اس کے مغرب میں عرب اور وسط میں قبائلی بربر Kabyle Berbers آباد ہیں اور یہ پہاڑی خطّہ مشرق کی جانب اس علاقے کی جنوبی سرحد بناتا ہے جس میں قبائلی بربر بولیاں بولی جاتی ہیں (رک بہ عبدالقادر، الجزائر، اطلس، قبائلیہ Kabylia) ۔

(G. YVER (J. DESPOIS))

* **بیبرس : (سیرت)**، عوامی کہانیوں کی ایک ضخیم عربی کتاب جسے مملوک سلطان بیبرس اوّل (۱۲۶۰ تا ۱۲۷۷ء) کی سوانحِ حیات بتایا جاتا ہے ۔ اس سیرت میں بہت سے اشخاص اور واقعات تاریخی ہیں، لیکن اس کا مجموعی کردار اور اکثر جزئی بیانات افسانوی ہیں ۔ اس کی تاریخی اہمیت صرف اس قدر ہے کہ اس سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ قرونِ وسطٰی کے اواخر اور بعد کی صدیوں میں قاہرہ کی مسلم آبادی کے اکثر حصّے کس قسم کی ذہنی غذا قبول کرتے تھے ۔ اس کی حقیقی دلچسپی زیادہ تر علمِ معاشرت، عوامی ادب اور تاریخ ادب کے میدانوں سے متعلق ہے ۔

اس قصے کی ابتدا ایّوبی عہد کے خاتمے کے اور مملوک عہد کے آغاز کے ذکر سے ہوتی ہے جو بیبرس کی تخت‌نشینی تک آتا ہے ۔ بعد کے ابواب میں اس بطل کے بہادرانہ کارہائے نمایاں بیان کیے گئے ہیں بالخصوص اس کی وہ لڑائیاں جو عیسائیوں (بوزنطی اور صلیبیوں) اور ایرانیوں (منگولوں) سے ہوئیں ۔ خاتمے کے قریب آ کر یہ قصہ قسمت آزمائی، جادوگری اور حیلہ و فن کی ایک اَور بھی زیادہ عجیب و غریب داستان بنتا جاتا ہے ۔ اس میں بعض روایتی حکایات اور موضوعات سے کام لیا گیا ہے جو اس قسم کی دیگر عربی کتابوں، مثلاً الف لیلۃ و لیلۃ میں پائی جاتی ہیں (اور بعض ایسی بھی جو ایرانی میں موجود ہیں) ۔ بیبرس کا مکّار مگر دل سے وفادار خادم عثمان جو آدھا سائیس اور گرہ کٹ اور آدھا ولی تھا اور (قصے کے آخری حصّے میں) ایک ہشیار اسمٰعیلی بہروپیا شیحہ نامی بھی بہت کچھ حصہ لیتے ہیں ۔ شیحہ ہر وقت گھومتا اور ٹوہ لگاتا پھرتا ہے، مسلمان قیدیوں کو رہا کرتا ہے، اور اپنے حیلہ و تدبیر سے دشمنوں کو زک پہنچاتا یا کم سے کم انہیں سراسیمہ کرتا رہتا ہے ۔ عیسائیوں کی طرف

اس کا مدّ مقابل خطرناک گُوان Guwān اس کا اصل نام گُرگِس (= جرجیس) دیا گیا ہے جو اسلام کا جانی دشمن ہے۔ مملوکوں کے علاوہ شام کے اسمٰعیلی (یعنی حشیشین Assassins اگرچہ کتاب میں ان کا یہ نام کہیں نہیں لیا گیا) بھی ہیں، جو لڑائیوں میں حصّہ لیتے ہیں۔ اس سیرت کے مطبوعہ نسخوں کے خاتمے پر عہد ممالیک سے لے کر آج تک مصر کی مختصر تاریخ بھی دی گئی ہے؛ یہ بعد کا اضافہ ہے جسے اصل قصّے سے کوئی تعلق نہیں۔

تاریخی واقعات اسی رنگ میں پیش کیے گئے ہیں جیسے کہ وہ متوسط طبقے کے نقطۂ نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان سوداگروں یا کاریگروں کا خاص ہمدردی سے ذکر کیا گیا ہے جو مفلس اور قلاّش ہوگئے تھے۔ قاہرہ کے کوچہ و بازار کی زندگی کے جو نقشے کھینچے گئے ہیں وہ خصوصیت کے ساتھ جاذب توجہ ہیں۔ مملوک فوج کے درمیان . . . بیبرس ایک عادل بادشاہ کی حیثیت سے نظر آتا ہے جو اپنی رعایا کا محافظ اور اخلاقی خرابیوں سے بر سر جنگ ہے۔ کتاب میں بھونڈے لطیفے، پھبتیاں اور ایسے مضحکہ‌خیز مناظر پیش کیے ہیں جو عام مذاق کے نہایت مناسب ہیں (غالبًا سیرت کی عبارتوں کو ایک مخصوص لحن کے ساتھ ادا کیا جاتا تھا محض پڑھ کر نہیں سنایا جاتا تھا)۔ مذہبی جوش ہر جگہ مضمر ہے۔ ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے نہایت سخت برتاؤ کرتے ہیں، مگر اس کے مقابلے میں شریفانہ کارناموں کی تحسین و آفرین بھی جیسی چاہیے، کی گئی ہے۔ شراب سے پرہیز کرنے پر بڑا زور دیا گیا ہے، بدکاری کی سخت مذمت کی گئی ہے اور اولیاء اللہ کا اکثر ذکر آتا ہے۔ بیبرس کے ابتدائے جوانی کے حالات میں احمد البدوی کا بھی ذکر ہے۔ سیرت کے آخری حصّوں میں سب سے زیادہ نمایاں ولی سیدی عبداللہ المغراوی ہیں۔ یہ مسلمانوں کی تمام مصیبتوں میں مدد کرتے ہیں، خصوصًا سمندر پار کے سفروں میں (Wangelin، ص ۳۶۰ تا ۳۶۲)۔

سیرت بیبرس کا اسلوب بیان اسی نمونے کا ہے جیسے اور عوام عربی افسانوں کا۔ منثور قصے کے بیچ بیچ میں مقفّی اور مسجّع جملے داخل کر کے اسے دلچسپ بنایا گیا ہے اور جابجا اشعار بھی آ گئے ہیں، لیکن یہ اشعار (جن میں سے کچھ تو منقول ہیں اور کچھ معیاری بحروں میں یا دو بولوں (strophic) کی صورت میں کتاب کے لیے موزوں کیے گئے ہیں) کہیں کم اور کہیں زیادہ ہیں، ان کا ابھی تک بغور مطالعہ نہیں ہوا (قب Wangelin، ص ۳۰۷)۔ زبان، خصوصًا قلمی نسخوں میں، ایک حد تک عام بول چال کی ہے۔

سیرت بیبرس کا ذکر ادب میں پہلی مرتبہ، اگرچہ ضمنی طور پر، ابن ایاس [رک بآں] کے ایک حاشیے میں آیا ہے جو اس نے سولھویں صدی کے شروع میں لکھا تھا (Wangelin، ص ۳۰۷)۔ U. J. Seetzen، E. W. Lane اور J. G. Wetzstien کے کہنے کے مطابق دمشق و قاہرہ میں انیسویں صدی میں سیرت بیبرس کا مجمع عام میں پڑھا جانا بہت مقبول تھا۔ طٰہٰ حسین اپنے ایام شباب کے تذکرے (الایام، قاہرہ ۱۹۲۹ء، ص ۲۱ اور ۸۳) میں ایسے انشادات اور مصری فلاّحین (کسانوں) میں سیرت کے مطبوعہ نسخوں کی (یا اس کے کچھ حصّوں کی) فروخت کا ذکر کرتا ہے۔ لین E. W. Lane نے اپنی کتاب *The Manners and Customs of the Modern Egyptians* میں اس قصے کے کچھ حصّوں کا ترجمہ دیا ہے۔ ایسے ہی کچھ ترجمہ G. Weil کے *The Thousand and One Nights* کے ترجمے کی طبع اوّل میں بھی دیا گیا ہے۔

W. Ahlwardt نے سیرت کے برلن کے بعض مخطوطات کا تفصیلی بیان دیا ہے؛ Helmut Wangelin نے اس قصے پر پہلا مکمل مقالہ لکھا ہے جس میں اس کے مضامین کی ایک طویل فہرست دی ہے جو ١٩٠٨-١٩٠٩ء کے پہلے مطبوعہ نسخے پر مبنی ہے۔

سیرت کے مخطوطات نسبۃً قریب زمانے کے لکھے ہوے ہیں۔ Levi Della Vida نے *Biblioteca Vaticana* میں اس کے ایک نسخے کی کیفیت لکھی ہے، جس کی تاریخ کتابت دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی ہے اور جس میں دوسرے نسخوں کے برخلاف تقریباً ٥٠٠ صفحات ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ نسخہ قصے کی تدریجی تکمیل کا کوئی ابتدائی مرحلہ دکھاتا ہو۔ اس کے برعکس Ahlwardt نے عدد ٩١٦٣ اور ٩١٦٤ کے تحت جن دو نسخوں سے اقتباسات دیے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد کے اور زیادہ مختصر نسخے ہیں۔ اس بیان کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان میں سے وہ گیت سرے سے غائب ہیں جو متداول نسخے میں جا بجا داخل کر دیے گئے ہیں۔ سیرت کے ارتقا اور تکمیل کی تاریخ غالبًا اس وقت زیادہ صاف اور واضح ہو سکتی ہے جب مختلف مخطوطات کی قسم بندی کر کے ان کا بالتفصیل باہم مقابلہ کیا جائے۔

مآخذ: (١) W. Ahlwardt: *Verzeichnis der arabischen Handschriften*، ج ٨ (= Handschriften-verzeichnisse der Kgl. Bibliothek zu Berlin، ج ٢٠)، برلن ١٨٩٦ء، ص ١١٣ تا ١٣٣ (عدد ٩١٥٥ تا ٩١٦٤)؛ (٢) Ch. Rieu: *Supplement to the Catalogue of the Arabic Manuscripts in the British Museum*، لنڈن ١٨٩٤ء، ص ٧٤٥ تا ٧٤٩ (عدد ١١٨٦ تا ١١٩٦)؛ (٣) W. Pertsch: *Die arab. Hss. der Hzgl. Bibl. zu Gotha*، ج ٤، Gotha ١٨٨٣ء، ص ٣٨٧ تا ٣٩٣ (عدد ٢٩٠٠ تا ٢٩٢٩)؛ (٤) Mac Guckin de Slane: *Catalogue des manuscrits arabes* (Bibliothèque Nationale)، پیرس ١٨٨٣-١٨٩٥ء، ص ٦٢٧ ببعد (عدد ٣٩٠٨ تا ٣٩٢٠)؛ (٥) G. Levi Della Vida: *Elenco dei Manoscritti Arabi Islamici della Biblioteca Vaticana* (= *Studi e Testi*، ص ٦٧)، The Vatican ١٩٣٥ء، ص ٢٣٠ (Codici Barberiniani Orienali، ص ١٥)؛ (٦) مطبوعہ متون (٥٠ حصے، در ١٠ جلد)، قاهره ١٣٢٦ - ١٣٢٧ھ/١٩٠٨ - ١٩٠٩ء، ١٣٤١ - ١٣٤٤ھ/١٩٢٣ - ١٩٢٦ء؛ (٧) E. W. Lane: *Manners and Customs of the Modern Egyptians*، بار سوم، لنڈن ١٨٦٠ء، ص ٤٠٠ تا ٤١٢ (باب ٢٢)؛ (٨) G. Weil: *1001 Nacht, arab. Erzählungen zum ersten Male aus dem Urtext treu übersetzt*، ج ٤، Pforzheim ١٨٤١ء، ص ٧٤٣ تا ٩٣٣؛ (٩) D. B. Macdonald: *The Romance of Baibars*، در وٓو انگریزی طبع اول؛ (١٠) Helmut Wangelin: *Das arabische Voksbuch vom König aẓẓāhir Baibars*، Stuttgart ١٩٣٦ء (= *Bonner Orientalistische Studien*، ص ١٧)۔

(R. PARET)

بیبرس الاول: الملک الظاہر رکن الدین الصالحی، مملوک دولت البحریۃ [رک باں] کا چوتھا سلطان؛ کہا جاتا ہے کہ وہ ٦٢٠ھ/١٢٢٣ء میں پیدا ہوا تھا اور ان قبچاق ترک غلاموں کی جماعت میں سے تھا جنھیں ایوبی سلطان الملک الصالح نے خریدا تھا۔ اس کا پہلا آقا [امیر علاءالدین] ایدکین بندقدار تھا اور اسی لیے اس کا لقب بندقداری ہو گیا اور اسی سے مارکو پولو Marco Polo کی تصنیف (طبع Hambis، جلد ٢) میں مندرج عبارت: بندقداری Bondocdaire، سلطان بابل کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔ تاریخ میں اس کا ذکر سب سے پہلے ٦٣٦ھ/١٢٣٩ء میں اپنے

آقا الملک الصالح کے ساتھ کرک میں ایک قیدی کی حیثیت سے آتا ہے ۔ کئی مہینے بعد وہ سلطانِ مصر کی طرف سے شام میں مصروفِ پیکار نظر آتا ہے، جہاں علاوہ ایوبی شاہزادوں کی ان ریشہ دوانیوں کے جو اس کے تصور کے لیے ایک تاریک مثال پیش کرتی تھیں، اسے سخت فوجی تربیت کا زمانہ گزارنا پڑا ۔ اس کا پہلا جنگی کارنامہ منصورہ کے میدانِ جنگ میں مصری فوج کی قیادت سنبھالنا تھا، جو فارس کور کی فیصلہ کن فتح اور فرانس کے بادشاہ لوئی Louis نہم کی گرفتاری پر منتہی ہوئی ۔ اسی موقع پر اس کی شہ سے ۶۴۸ھ / ۱۲۵۰ء میں توران شاہ کا قتل عمل میں آیا اور اس قتل کی سازش کو دشمن کے خلاف مزاحمت کے رنگ میں پیش کیا گیا ۔

اس قتل سے کسی بات کا فیصلہ نہ ہوا ۔ کمزوری عام تھی ۔ اس کی ذمے داری بلا شبہہ بیبرس کے سر رہی اور اسی کمزوری کی حالت میں مملوک سلطنت کا آغاز ہوا ۔ شروع کا زمانہ خونریزی میں گزرا اور جب سلطان قطز نے اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا تو شام کے ملک پر مغول لشکروں کی یلغار شروع ہو چکی تھی، فلسطین میں عین جالوت [رِک بآں] کے مقام پر ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں سلطان قُطُز اور مغول سپہ سالار (جو مارا گیا) دونوں نے نہایت بہادری دکھائی ۔ مصریوں کی کامیابی نمایاں تھی، کیونکہ نامساعد حالات کے باوجود سلطان ایک بڑی فوج میدانِ جنگ میں لے آیا تھا ۔ اس موقع پر بیبرس اوّل ہراول دستے میں لڑ رہا تھا ۔

ہمیں ان واقعات کے تسلسل کا کوئی علم نہیں جن کی بدولت [الملک المظفر] قُطُز کو اس کے خیمے میں قتل کر دیا گیا اور بیبرس "الملک الظاہر" کا لقب اختیار کر کے تخت مصر پر جلوہ افروز ہوا (۶۵۸ھ / ۱۲۶۰ء)۔

[سلطان بیبرس بڑا بہادر، جرأت‌مند اور اولوالعزم حکمران تھا اور جنگوں میں بنفس نفیس شرکت کرتا تھا] ۔ اس کے عہدِ حکومت سے [سلطان] صلاح الدین [ایوبی] کے عہد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔ [سلطان] بیبرس نے ایک طرف تو عالم اسلامی کو متحدہ قیادت عطا کی اور دوسری جانب فرنگیوں کے خلاف فاتحانہ جنگ لڑی ۔ اس نے جاگیردارانہ نظامِ حکومت کی بیخ کنی کی ۔ بیبرس کے حملے بھرپور، تیز اور غیرمتوقع ہوتے تھے اور وہ مفتوحہ علاقے کے ایک ایک چپے کو فوراً دفاع کے قابل بنا دیتا تھا ۔

اندرونی طور پر ملک کی از سرِ نو تنظیم میں غیر معمولی ہم آہنگی اور توازن پایا جاتا ہے ۔ اپنے ان کارناموں کے علاوہ جن کی تصدیق اس کے کاموں اور واقعات کی تاریخوں سے ہو سکتی ہے، بیبرس ایک ایسا انسان معلوم ہوتا ہے جو تمام واقعات پر ایک غیر متزلزل رجائیت کے ساتھ غالب آ جاتا ہے ۔

۶۵۹ھ / ۱۲۶۱ء سے نئے سلطان نے اپنی آئندہ جارحانہ کارروائیوں کے کلیدی مقامات کو مستحکم کرنا شروع کر دیا ۔ چنانچہ حمص سے لے کر حوران تک ہر اس قلعے کو جسے منگولوں نے تباہ کر دیا تھا مرمت کر کے قابل استعمال بنا لیا اور اسے سامانِ رسد اور اسلحہ مہیا کیا گیا ۔

اس کی نظر میں یہ فوجی پیش‌بندیاں بھی ناکافی تھیں ۔ اسے اصرار تھا کہ ہر قسم کی اطلاعات اس کے پاس جلد از جلد پہنچیں اور وہ خود بھی اسی تیزی و سرعت سے اپنے احکام بھیج سکے ۔ چنانچہ [سلطان] بیبرس نے ڈاک کا ایک باقاعدہ نظام قائم کیا اور سلطنت کے ہر حصے سے اسے ہفتے میں دو مرتبہ اطلاعات ملتی رہتی تھیں ۔ معمولی حالات میں کسی مراسلے کو قاہرہ سے دمشق جانے میں چار دن لگتے تھے ۔ زیادہ عجلت طلب خبریں

کبوتروں کے ذریعے بھیجی جاتی تھیں اور بلا تاخیر سلطان تک پہنچا دی جاتی تھیں، بلکہ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ سلطان بیبرس غسل خانے میں خبریں وصول کرتا تھا۔ اس ماحول کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس کے عمال کی مستعدی اور تن دہی اور بڑھ جاتی تھی۔

اس نے اسلحہ خانوں کو نئے سرے سے تعمیر کیا اور جنگی اور باربردار جہاز بنوائے۔

سلطان نے ایوبی شاہزادوں کے مقبوضات کی قطع و برید سے آغاز کار کیا: شہر شوبک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے عامل مقرر کر دیا اور یہ کام بغیر لڑے بھڑے ہو گیا۔ سلطان خود حلب گیا، انطاکیہ کے نواح میں فرنگیوں کی ٹوہ لی اور دمشق میں اس مہم کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ قاہرہ میں ایک سال گزارنے کے بعد ۶۶۱ھ / ۱۲۶۳ء میں سلطان نے عکّہ کے سینٹ جین Saint Jean d' Acre کو تنبیہ کرنے کے بعد کرک کا رُخ کیا اور اس طرح ایک ایوبی ریاست کو ختم کر کے دمشق واپس چلا گیا۔ یہاں سے وہ آخرکار مصر میں داخل ہوا اور شہر اسکندریہ کا معائنہ کیا۔ ۶۶۲ھ / ۱۲۶۴ء میں سلطان نے حمص کے علاقے کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا کیونکہ یہاں کا حکمران بغیر کوئی جانشین چھوڑے فوت ہو گیا تھا۔ اب اس نے زور شور سے فوجی تیاریاں شروع کر دیں اور ایک لشکرِ جرّار میدانِ جنگ میں لے آیا۔

بکم ربیع الآخر ۶۶۳ھ / ۲۱ جنوری ۱۲۶۵ء کو یہ زبردست فوج سلطان کے زیرِ قیادت قاہرہ سے فرنگیوں کے خلاف جنگ کے پہلے مرحلے کے لیے روانہ ہوئی، جو ۶۷۰ھ / ۱۲۷۱ء سے پہلے ختم نہ ہو سکا۔ ان کے مستحکم مقامات کو ایک ایک کر کے فتح کر لیا گیا۔ ۶۶۳ھ / ۱۲۶۵ء میں بندرگاہ قساریہ کی فتح سے فرنگیوں کے جنوبی مقبوضات ایک دوسرے سے منقطع ہو گئے اور یافہ گھر کر رہ گیا۔ زیادہ شمال کی جانب عثلیت اور حیفہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ ان شہروں کو تباہ کر دیا گیا تاکہ ہزیمت کی صورت میں وہ دشمن کے لیے باعثِ تقویت نہ بن سکیں۔ پھر فوج جنوب کی سمت بڑھی اور اس نے ارسوف کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا۔ ۶۶۴ھ / ۱۲۶۶ء میں محاذِ جنگ پر بیک وقت کئی حملے کیے گئے، لیکن بڑے حملے کا رخ صفد کی جانب تھا، جو جھیل طبریہ کے شمال مغرب میں واقع تھا۔ اس مقام کو زبردست محاصرے کے بعد سر کر لیا گیا۔ ۶۶۶ھ / ۱۲۶۸ء میں سلطان بیبرس یافہ کے اس علاقے کی جانب متوجہ ہوا جو مملکت غیر سے گھرا ہوا تھا اور وہ ایک دن بھی مقابلہ نہ کر سکا۔ فلسطین میں رملہ کی جامع مسجد کے صدر دروازے پر اس کارنامے کا حال ابھی تک کندہ ہے اور اسے پڑھا جا سکتا ہے: ''اس نے یافہ کو طلوع آفتاب کے وقت محاصرے میں لیا اور خدائے تعالٰی کے حکم سے اسی روز تین گھڑی دن گزرے اسے سر کر لیا''۔ چند ہفتوں کے بعد ایک نئے خطِّ دفاع کو بھی توڑ دیا گیا، یعنی دریائے لیتانی Litani اور Beaufort کے قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا جو صور (Tyre) کے بالمقابل واقع تھا۔ مسلمان فوجیں اب اچانک لاطینی سلطنت کے شمالی سرے کے پاس نمودار ہو گئیں اور انطاکیہ نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس فتح کی صدائے بازگشت بہت دور رس ثابت ہوئی، شاید اس سے بھی زیادہ جتنی کہ سلطان صلاح الدین کی فتح بیت المقدس کی۔ صلیبی جنگوں کے آغاز سے لے کر اب تک انطاکیہ ایک دفعہ بھی فرنگیوں کے ہاتھ سے نہ نکلا تھا۔ اب قرب و جوار کے قلعے بھی مزاحمت کے قابل نہ رہے اور سلطان نے صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ارمینیۂ صغریٰ کے بادشاہ سے معاہدۂ صلح طے کر لیا، جسے مجبوراً اپنی مملکت کا ایک حصہ سلطان کو نذر کرنا پڑا۔ ایک

آخری پیش قدمی کی بدولت جو حمص سے شروع ہوئی طرابلس کے دور افتادہ استحکامات منقطع ہو گئے، صَفیتَہ کے مستحکم مقامات اور کرک اور عکّار کے قلعے ٦٦٩ھ/ ١٢٧١ء کے دوران دو مہینے کے عرصے میں فتح کر لیے گئے.

اس اثنا میں سلطان، جو معمولاً کبھی قاہرہ میں اور کبھی دمشق میں وقت بسر کرتا تھا، ٦٦٧ھ/ ١٢٦٩ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہو چکا تھا۔ ٦٦٨ھ/ ١٢٧٠ء میں گفت و شنید کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسمٰعیلی قلعوں کے حکمران نے سلطان کو خراج دینا منظور کر لیا۔ سلطان اس زمانے میں سینٹ لوئی Saint Louis کی تونس کی مہم کے بارے میں متفکر تھا اور کچھ عرصے تک مسلمان مغربیوں کی امداد کے لیے جانے کا ارادہ کرتا رہا، لیکن جب اسے اطمینان ہو گیا تو وہ اسمٰعیلی قلعوں کی تسخیر کی غرض سے دوبارہ روانہ ہوا، بعد ازاں قاہرہ لوٹ گیا۔ ٦٧٠ھ/ ١٢٧٢ء کا سال ملک شام کے ایک عام معاینے میں صرف ہوا۔ مؤرخین اپنے بیانات میں اس پر متفق ہیں کہ سلطان کہیں غیر متوقع طور پر پہنچ جاتا تھا اور اثنائے راہ میں اپنا رخ بدل لیتا تھا تاکہ کسی کو پہلے سے یہ علم نہ ہو جائے کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔ ٦٧١ھ/ ١٢٧٣ء میں دمشق سے وہ بیرہ جِک روانہ ہوا اور اس کے قریب ایک مغول دستۂ فوج کو مغلوب کیا۔ مصری فوج کے اَور دستے نوبہ، برقہ کے علاقے اور ارمینیہ میں مصروفِ پیکار تھے اور اس طرح آخر کار فرنگیوں کو ذرا دیر کی مہلت مل گئی تھی۔ ایک سال کی خاموشی کے بعد ٦٧٣ھ/ ١٢٧٥ء میں بیبرس پھر ارمینیہ پہنچ گیا اور سِیس اور آیاس دو شہروں پر قبضہ کر لیا۔ ٦٧٣ھ کا نمایاں واقعہ نوبہ کی مہم تھی، جس کی قیادت سلطان کے فوجی افسروں نے کی۔ ٦٧٥/١٢٧٦ء میں سلطان بیبرس ایشیائے کوچک میں تھا، جہاں سلجوقیوں اور ان کے مغول حلیفوں کو شکست دینے کے بعد اس نے قاپادوکیہ Cappadocia کے شہر قیساریہ کو سر کر لیا۔ بعد ازاں وہ دمشق واپس آیا، جہاں اس نے خاصی عمر کو پہنچ کر ٦٧٦ھ/ ١٢٧٧ء کے شروع میں وفات پائی.

صلیبیوں نے پھر کبھی سنبھالا نہ لیا۔ سلطان بیبرس کے انتقال کے وقت فرنگی سلطنت کے علاقائی نقصانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے: انطاکیہ کی ریاست اب حقیقۃً باقی نہ رہی تھی؛ جنوب کی سمت اس کی سرحد سمٹ کر یافہ سے عکّا پہنچ گئی تھی۔ بحیثیت مجموعی صلیبیوں کے پاس ساحل کی محض ایک تنگ پٹی رہ گئی تھی، بحالیکہ تمام پہاڑی چوٹیاں سلطان بیبرس کے قبضے میں تھیں.

سلطان بیبرس کے سترہ سالہ عہدِ حکومت میں مجموعی طور پر شام میں اڑتیس دفعہ فوج کشی کی گئی۔ مغولوں سے جو نو لڑائیاں ہوئیں اس میں سے صرف آخری کی ابتدا سلطان کی جانب سے ہوئی اور باقی آٹھوں کی نوعیت جوابی حملوں کی سی خیال کی جاتی ہے۔ ارمینیۂ صغریٰ سے پانچ اہم آویزشیں ہوئیں۔ اسمٰعیلی بدعتوں، یعنی حشیشیین (Assassins) کو پانچ حملوں سے سابقہ ہوا۔ فرنگیوں کو، جو سب سے زیادہ موردِ عتاب تھے، مصری فوجوں نے اکیس شکستیں دیں.

سلطان کی فوجی سرگرمی صرف ان احکام کا نتیجہ نہ تھی جو وہ جاری کرتا رہتا تھا، بلکہ پندرہ جنگوں میں اس نے کمان اپنے ہاتھ میں رکھی اور اگر ضرورت پڑی تو اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ چند اعداد سے سلطان بیبرس کے مختلف سمتوں میں سفر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے عہدِ حکومت کا نصف سے زائد عرصہ اپنے دارالسلطنت قاہرہ میں نہیں

گزارا؛ وہ وہاں سے چھبیس دفعہ باہر گیا اور اس نے یقیناً چالیس ہزار کیلومیٹر سے زیادہ کا سفر کیا۔

سلطان بیبرس کے عہدِ حکومت میں ہمیں مستعدی کی ایک شاندار مثال نظر آتی ہے، جس سے ایک غیر متوقع سیاسی بحالیِ اقتدار ظہور میں آئی۔ اس غیر معمولی قائد کی تحریک سے مصر نے، جو ذرا دیر پہلے ایک اندرونی انقلاب سے دو چار ہو چکا تھا اور زبردست دشمنوں — صلیبیوں، مغول اور اسمٰعیلیوں — کی آماجگاہ رہا تھا، اچانک مشرقی ممالک پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ بغداد میں خلافتِ عباسی کے سقوط سے جو انتشار پیدا ہوا؛ صلیبیوں اور مغول میں باہمی اتحاد کے اشارات، معزول و بے دخل شدہ ایّوبی شہزادوں کی زبردست ریشہ دوانیاں اور بلند مرتبہ مملوک امرا کی ذاتی امنگیں، یہ سب اس افسوسناک اجتماعی صورت حال کے ایسے عناصر ہیں جن سے بیبرس کی کامیابی اس قدر غیر معمولی بن جاتی ہے۔ اس نے بہت عقل مندی کا ایک کام یہ کیا کہ ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں مغول کے تباہ کن حملے کے بعد عبّاسی خاندان کے ایک پناہ گزین کا خیر مقدم کیا اور اسے قاہرہ میں خلیفہ تسلیم کر لیا۔ سلطان کے پیش نظر بعض فوری اور مادّی نتائج بھی تھے، یعنی حجاز کے مقامات مقدسہ پر سیّادت کا حق، کیونکہ اس کے بعد سے بالآخر مصری حکومت اپنے آپ کو "سلطنتِ اسلامی" کہنے کی مستحق ہو گئی۔

اس فوق العادت دلیر سپاہی کے کارناموں نے اسے اس کی زندگی ہی میں ایک داستان بنا دیا تھا، بلکہ بیبرس کی داستان اس کی حقیقی سیرت سے بہت کمتر ہے۔ اس کی زندگی درحقیقت قسمت آزمائی کی ایک کہانی ہے: اور بطل کا زہر کے اس پیالے کو پی جانا جو کسی اور نے تیار کیا تھا اس مکمل قصے کا محض ایک حصہ ہے۔

مآخذ: بیبرس کی زندگی کے بارے میں دو بڑے ابتدائی مآخذ ابن عبد الظاہر اور ابن شدّاد کے سوانح ہیں جو دونوں ہی مکمل شکل میں موجود نہیں ہیں۔ (۱) ابن عبدالظاہر کی سیرت کے ایک نسخے کے مخطوطے کو جو موزۂ بریطانیہ میں ہے اور جس میں ۶۶۳ھ/۱۲۶۵ء کے آغاز تک کے زمانے کے حالات ہیں، مسز ایس۔ ایف۔ صادق نے بعنوان *Baybers I of Egypt*، مع انگریزی ترجمے کے ۱۹۵۶ء میں ڈھاکے سے شائع کیا تھا؛ (۲) اسی نسخے کے ایک زیادہ مکمّل مخطوطے کو جو کتاب خانۂ فاتح میں موجود ہے، مسٹر اے۔ اے۔ خویطر Khowaitir طبع کر رہے ہیں؛ دیکھیے نیز (۳) B. Lewis، در *Speculum*، ۲۷، ۱۹۵۲ء: ۴۸۸؛ (۴) Cl. Cahen، در *Arabica*، ۵، ۱۹۵۸ء: ۲۱۱ تا ۲۱۲؛ (۵) P. M. Holt، در *BSOAS*، ۲۲، ۱۹۵۹ء: ۱۳۳ تا ۱۴۰؛ (۶) ابن شدّاد کی سیرت بیبرس کا ایک یگانہ مگر ناقص نسخہ، جو ۶۷۰ھ/ ۱۲۷۲ء تا ۶۷۶ھ/ ۱۲۷۸ء کے واقعات پر مشتمل ہے، یلتقایا S. Yeltkaya کو ادرنہ میں ملا تھا اور اس نے اس کا ایک مختصر ترکی ترجمہ شائع کیا تھا (بیبرس تاریخی، استانبول ۱۹۴۱ء)، لیکن اس کے ساتھ اصل عربی متن نہ تھا۔ مزید معلومات عام تاریخی مآخذ (۷) المقریزی [: السلوک، ۱: ۴۳۶ تا ۶۴۱]؛ (۸) الذہبی [: دول الاسلام، حیدر آباد دکن ۱۳۶۵ھ، ۲: ۱۲۳ تا ۱۲۴]؛ (۹) ابن تغری بردی، [: النجوم الزاہرۃ، ۷: ۹۲ ببعد] وغیرہ میں مل سکیں گی۔ دیکھیے نیز (۱۰) E. Quatremère: *Sultans Mamlouks*، ص ۱ ببعد؛ (۱۱) محمد فؤاد کوپرولو: "بیبرس"، در وآت؛ (۱۲) [محمد جمال الدین سرور: الظاہر بیبرس، قاہرہ ۱۹۳۸ء اور؛ (۱۳) G. Wiet کی تصنیف کردہ قرونِ وسطی کے مصر کی عام تواریخ (*Histoire de la Nation égyptienne*، ۴، بیبرس، بدون تاریخ: ۳۶۷ تا ۳۸۲، ۴۰۳ تا ۴۳۸)؛

نیز (۴) لین پول S. Lane-Poole : A History of Egypt in the Middle Ages، بار دوم، لنڈن ۱۹۱۴ء، بمدد اشاریہ؛ [(۵) ابن شاکر: فوات الوفیات، ۱: ۸۵ ببعد؛ (۶) ابن ایاس : تاریخ مصر، ۱: ۹۸ ببعد؛] (۷) کتبات کے لیے دیکھیے RCEA، ج ۱۱، عدد ۲۲۲۱، ۳۳۳۳؛ ج ۱۲، عدد ۴۳۲۹ تا ۴۳۷۸، ۴۴۸۵، ۴۵۰۱، ۴۵۲۸، ۴۵۵۲، ۴۵۵۳، ۴۵۵۶، ۴۵۵۷، ۴۵۶۲، ۴۵۶۵، ۴۵۸۶، ۴۵۸۸، ۴۵۸۹، ۴۵۹۳، ۴۶۰۰، ۴۶۰۸، ۴۶۱۱، ۴۶۱۲، ۴۶۲۳ تا ۴۶۲۶، ۴۶۳۸، ۴۶۶۰ تا ۴۶۶۲، ۴۶۷۳، ۴۶۸۶، ۴۶۹۰، ۴۶۹۲، ۴۷۱۴، ۴۷۲۲، ۴۷۲۳، ۴۷۲۶ تا ۴۷۲۸، ۴۷۳۰، ۴۷۳۲ تا ۴۷۳۵، ۴۷۳۷ تا ۴۷۴۰، ۴۷۴۶، ۴۷۵۰ مکرر، ۴۷۵۱، ۴۷۵۲ ۔ مزید مآخذ G. Wiet : Les Biographies du Manhal Safi، عدد ۸۰۷ میں ملیں گے ۔

(G. WIET)

بیبرس ثانی: الملک المظفر رکن الدین المنصوری جاشنکیر [چاشنیگیر]، مصر کا مملوک سلطان جو شاید چرکسی نسل کا تھا اور جس کا تعلق سلطان [المنصور] قلاوون کے مملوکوں سے تھا ۔ سلطان محمد بن قلاوون کے پہلے عہد حکومت (۶۹۳ھ/۱۲۹۳ء تا ۶۹۴ھ/۱۲۹۴ء) میں اس کا تقرر استاذدار [استاددار، داروغۂ خانہ] کی حیثیت سے ہوا ۔ سلطان کتبغا نے ترقی دے کر اسے ایک ہزار سواروں کا سپہ سالار بنا دیا اور یوں اس کی طاقت میں اضافہ ہوا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے حریف سالار کی طاقت میں بھی اضافہ ہوا، چنانچہ جب ۶۹۸ھ/۱۲۹۸ - ۱۲۹۹ء میں سلطان لاجین قتل ہوا تو یہ دونوں یکساں طور پر زمام حکومت سنبھالنے کے لیے تیار تھے ۔

انھوں نے دوسری مرتبہ نوجوان محمد بن قلاوون کو تخت پر بٹھا دیا ۔ ان دونوں میں کسی قسم کے گہرے دوستانہ مراسم ہرگز نہیں تھے، لیکن وہ ایک دوسرے سے اس قدر خائف تھے کہ اپنے باہمی اختلافات کو طول نہیں دینا چاہتے تھے، چنانچہ ان دونوں نے اس پر قناعت کی کہ بادشاہ کے نام پر جو صرف چودہ سال کا تھا مشترکہ حکومت کرتے رہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں جو بھی اہم اقدام ہوا اس کا ذکر کرتے ہوئے عرب مؤرخین اسے ان دونوں امیروں کی جانب منسوب کرتے ہیں؛ مثلاً وہ سخت احکام جو ۷۰۰ھ/۱۳۰۱ء میں عیسائیوں اور یہودیوں کے خلاف صادر ہوئے ۔ یہ دونوں امیر مغول غازان کے حملے کی زبردست مزاحمت کرنے میں کامیاب ہوئے ۔ انھوں نے بالائی مصر کے عرب قبیلوں کی، جنھوں نے اپنے دو سرداروں کو بیبرس اور سلار کے لقب دے کر اپنا امیر منتخب کر لیا تھا، یک بغاوت کو بے مثل سختی سے کچل ڈالا ۔ دس برس بعد محمد ان کی سر پرستی سے تنگ آ کر تخت سے دست بردار ہو گیا ۔

بیبرس کے پاس چونکہ سلار کے مقابلے میں زیادہ مملوک تھے اس لیے وہ شوال ۷۰۸ھ/اپریل ۱۳۰۹ء میں اکیلا ہی سلطنت کا وارث بننے میں کامیاب ہو گیا اور جبھی اس کی اصل کمزوری ظاہر ہوئی ۔ ہوا یہ کہ سلطان محمد نے کرک کے قلعے سے، جہاں وہ پناہ گزین ہو گیا تھا، ایک فوج تیار کر لی اور اگلے ہی سال [۷۰۹ھ] کے رمضان/فروری ۱۳۱۰ء میں وہ تیسری بار تخت حکومت پر قابض ہو گیا ۔ بیبرس فرار ہو گیا تھا، لیکن اسے گرفتار کر کے قاہرہ لایا گیا اور ۱۵ ذوالقعدہ ۷۰۹ھ/۱۶ اپریل ۱۳۱۰ء کو اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا ۔

مآخذ : (۱) ابن تغری بردی : [النجوم الزاہرۃ] قاہرہ، ۸ : ۲۲۲ تا ۲۸۲؛ (۲) المنہل الصافی، شمارہ ۷۰۹؛ (۳) Hautecoeur et Wiet : Les Mosquees du Caire، ص ۵۴ تا ۵۵؛ (۴) Wiet : Histoire de la nation Égyptienne، ۴ : ۴۶۸ تا ۴۷۷؛ [(۵) المقریزی :

السلوک، ۲: ۴۴ تا ۷، ۸۰؛ (۶) الذہبی: دول الاسلام، ۲: ۱۶۲ تا ۱۶۳]۔

(G. WIET)

بَیْبَرس المَنْصُوری: مملوک سپہسالار اور مؤرخ، جس نے اپنی عملی زندگی کی ابتدا الملک المنصور قلاوون کے غلام کی حیثیت سے کی (اسی بنا پر اس کی نسبت المنصوری ہے)۔ بیبرس نے قلاوون کی فوج کے ساتھ ۶۶۳ھ / ۱۲۶۴ - ۱۲۶۵ء میں شامی فرنگیوں کے خلاف بیبرس اوّل کی مہم میں، ۶۶۴ھ / ۱۲۶۵ - ۱۲۶۶ء میں شام اور کیلیکیا سے سلیشیا کی مہموں میں، ۶۶۶ھ / ۱۲۶۷ - ۱۲۶۸ء میں انطاکیہ کے محاصرے میں اور ۶۷۳ھ / ۱۲۷۴ - ۱۲۷۵ء میں کیلیکیا کی ایک اور مہم میں حصّہ لیا۔ قلاوون نے، جو مصر و شام کا سلطان ہو گیا تھا، ۶۸۵ھ / ۱۲۸۶ء میں بیبرس کو الکَرَک کے صوبے کا گورنر مقرر کر دیا۔ اس کے بیٹے اور جانشین الملک الاشرف خلیل نے ۶۹۰ھ / ۱۲۹۱ء میں بیبرس کو اس عہدے سے بر طرف کر دیا۔ اس کے بعد وہ مصر لوٹ آیا اور اس نے عکّا اور ایشیاے کوچک میں قلعۃ الرُّوم کے محاصروں، نیز اگلے برس مغولوں کے خلاف دو مہموں میں حصّہ لیا۔ جب محرم ۶۹۳ھ/دسمبر ۱۲۹۳ء میں الملک النّاصر محمّد سلطان منتخب ہوا تو اس نے بَیْبَرس کو سپہسالار (مُقَدَّم اَلْف = یک ہزاری) مقرر کر دیا اور "دَوادار" [= الدویدار: دواتدار] (رئیسِ عدالت) کا اعلیٰ عہدہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس وقت سے بیبرس کی زندگی اس فرمانروا کے ساتھ وابستہ ہو گئی جو دو بار معزول اور بحال ہوا۔ جب ملک النّاصر محمّد کے بجاے الملک المنصور لاجین سلطان ہوا تو اس نے بَیْبَرس کو اس عہدے سے ہٹا دیا، لیکن ۶۹۸ھ / ۱۲۹۸ - ۱۲۹۹ء میں جب الملک النّاصر دوبارہ تخت پر بیٹھا تو بیبرس کو اس کے منصب پر بحال کر دیا۔ اس کے بعد وہ کئی برس تک عسکری اور انتظامی خدمات انجام دیتا رہا، یہاں تک کہ ۷۰۴ھ / ۱۳۰۴ء میں اسے اس "دوادار" کے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ اس اثنا میں الملک النّاصر محمد [بن قلاوون] کا حکومت پر کوئی اقتدار باقی نہیں رہا تھا اور وہ دو طاقتور سپہ سالاروں کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلی بن کر رہ گیا تھا۔ آخر کار وہ خود ہی تخت سے دستبردار ہو گیا۔ بَیْبَرس المَنْصُوری اس شہزادے کا بڑا ہی پرجوش حمایتی تھا، چنانچہ اس نے اسے بحال کرانے کے لیے سخت جد و جہد کی اور جب ۷۰۹ھ / ۱۳۱۰ء میں شہزادہ پھر تخت پر متمکن ہوا تو اس نے بہت سے انتظامی امور بیبرس کے سپرد کر دیے۔ ۱۷ جُمادی الاُولٰی ۷۱۱ھ / یکم اکتوبر ۱۳۱۱ء کو اسے مصر میں نائب السّلطنت بنا دیا گیا۔ یہ عہدہ سلطان کے بعد سب سے اہم تھا۔ بیبرس اس عہدے پر ایک سال سے کم مدت تک فائز رہا۔ ربیع الآخر ۷۱۲ھ / اگست ۱۳۱۲ء میں اسے معزول کر کے اسکندریہ کے سرکاری قیدخانے میں بھیج دیا گیا، جہاں وہ پانچ برس رہا۔ اس نے ۲۵ رمضان ۷۲۵ھ / ۴ ستمبر ۱۳۲۵ء کو تقریباً اسّی برس کی عمر میں وفات پائی۔

بیبرس ایک متّقی مسلمان تھا اور اسے کتبِ دینی کے مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ اپنے عسکری اور سیاسی مشاغل کے علاوہ وہ تاریخی کتابیں لکھنے کے لیے بھی وقت نکال لیتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ۷۲۴ھ / ۱۳۲۴ء تک کی ایک عام تاریخ اسلام ہے، جس کا نام زُبْدَۃُ الفِکْرَۃ فِی تاریخ الھجرۃ ہے۔ یہ ضخیم تالیف [گیارہ جلدوں میں ہے] جسے مؤلف نے صدی‌وار مرتب کیا ہے۔ اس کے ابتدائی حصّے ابن الأثیر کی الکامل پر مبنی ہیں، لیکن اس کا آخری حصّہ ممالیک بحریہ کی تاریخ کا ایک اہم مأخذ ہے، اس لیے کہ مؤلف

نے اس حصے میں ان مہمات اور سیاسی واقعات کا حال بیان کیا ہے جن میں وہ خود شریک تھا۔ بیبرس المنصوری کے ذاتی تاثرات کا رنگ زبدة الفکرة کے اس حصے میں خاص طور سے نمایاں ہے جس میں اس نے مصر کی تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر اور چودھویں صدی عیسوی کے شروع کی سیاسی تاریخ لکھی ہے اور جہاں اس نے الملک الناصر محمد [بن قلاوون] کے حق میں اپنے شدید میلان کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کی تالیف سے دوسرے مؤرخین نے بہت استفادہ کیا ہے، جن میں العینی کا نام خاص طور پر لینا چاہیے۔ بعد کے ایک مؤلف نے اس تاریخ کی تلخیص کی اور اس کے سلسلے کو جاری رکھا اور اس کی یہ کتاب مخطوطے کی شکل میں کتاب خانۂ بوڈلین [آوکسفرڈ] (۱ : ۴۰۷) میں محفوظ ہے۔ بیبرس المنصوری نے خود بھی ممالیک بحریہ کی ایک مختصر تاریخ لکھی اور اس کا نام التحفة الملوکیة فی الدولة الترکیة رکھا۔ یہ کتاب، جو جزوی طور پر مقفّی نثر میں لکھی گئی ہے، سلوکوں کی ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ - ۱۳۱۲ء تک کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ السخاوی تاریخ خلفاء پر بھی اس کی ایک تالیف کا ذکر کرتا ہے، جس کا نام اللطائف فی اخبار الخلائف تھا۔

مآخذ : (۱) براکلمان ۲ : ۴۴ و تکملہ، ۲ : ۴۴؛ (۲) Rosenthal : *History of Muslim Historiography*، ص ۷۵، ۱۲۷، ۳۳۵، ۴۱۸۔

(E. Ashtor)

* **بیبلون** : رک بہ بابل و بابلیون۔

* **بی بی** : مشرقی ترکی زبان کا لفظ، جس کے معنی ''چھوٹی بوڑھی ماں''، دادی، نانی، اونچے درجے کی خاتون اور معزز عورت ہیں۔ عثمانی ترکی کی قاموس لغت دیشیشی (*Lughat-i-Deshtshi*)، میں جو ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰-۱۵۸۱ء میں تالیف کی گئی تھی، اسے ''خاتون'' سے تعبیر کیا ہے، جس میں ''مرتبہ رکھنے والی عورت'' کا مفہوم ملحوظ ہے۔ آناطولی ترکی میں بی بی کے معنی ''بھبی'' کے بھی ہیں۔ فارسی میں یہ لفظ خاصے قدیم زمانے سے مستعمل ہے اور اس سے کدبانوی خانہ، خاتون یا [نیک و پارسا عورت] مراد لیتے ہیں۔ یہ لفظ انوری (بارھویں صدی عیسوی) کے ایک شعر میں، جسے فرہنگ ناصری میں سنداً نقل کیا گیا ہے، مل سکتا ہے: [ع در حضر خاتون و بی بی، در سفر اسفندیار]۔ تیرھویں صدی عیسوی میں یہ لفظ خراسان میں معزز و ممتاز عورتوں کے لقب کے طور پر استعمال ہوتا تھا، مثلاً ایشیائے کوچک کے مصنف تاریخ سلاجقہ الحسین بن محمد بن علی الجعفری الرغدی کو ابن بی بی [رک بآن؛ نیز وہاں ابن بی بی کا نام ناصر الدین یحیی بن مجد الدین محمد غلط لکھا گیا ہے۔ اس کی تصحیح کر لی جائے] المنجّمة (= معزز خاتون ماہرۂ علم ہیئت کا فرزند) کہتے تھے۔ شیخ صفی (رک : صفی الدین) کی دو بیویوں میں سے ایک کا نام بی بی فاطمہ تھا۔ آخری ساسانی بادشاہ یزد جرد سوم کی دختر کا مقبرہ، جو تہران کے نزدیک واقع ہے، بی بی شہر بانو کے نام سے مشہور ہے۔

مآخذ : (۱) شیخ سلیمان بخاری : لغة چغتائی و ترکی عثمانی، استانبول ۱۲۹۸ھ، ص ۸۸؛ (۲) تانیکلری ایلہ ترمہ سوزلغو، انقرہ ۱۹۵۴ء، ۳ : ۱۱۰، ۹۰؛ (۳) ترمہ درگیسی، استانبول ۱۹۳۴ء، ۲ : ۹۰۹؛ (۴) برہان قاطع بہ ذیل مادہ؛ (۵) H. W. Duda : *Die Seltschukengeschichte des Ibn Bibi*، کوپن ہیگن ۱۹۵۹ء؛ (۶) Browne، ۱ : ۱۳۰ و ۴ : ۴۴؛ (۷) الیعقوبی، ۲ : ۲۹۳۔

(H. W. Duda)

* **بیت** : ایک اوغوز (ترکمانی) قبیلہ۔ بیت کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے سلجوقیوں کی فتح آناطولی میں حصہ لیا تھا۔ ۵۱۲ -

۵۱۳ھ/۱۱۱۹ء میں سلجوقی فرمانروا آق سنقر البخاری کا بصرے میں جو نمائندہ متعین تھا اسے سنقر البیاتی کے عربی نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ اسے بھی اس قبیلے سے کوئی مناسبت تھی۔ نویں اور دسویں صدی ہجری (پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی) میں وسطی اور مغربی ترکی میں بہت سے مقامات بیت [بیات] یا بید [بیاد] کے ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ ان میں سے بہت کم آج باقی ہیں۔ ان مقامات کے اکثر نام بلاشبہہ قبیلۂ بیت ہی سے تعلق رکھتے تھے، جس نے آناطولی کی فتح میں شرکت کی تھی۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں شمالی شام میں ترکمانوں کے اندر بھی بیت موجود تھے۔ ان کا ایک اہم اور ممتاز گروہ تھا جو ''شام بیدی'' کے نام سے موسوم تھا اور دوسرے ترکمان قبائل کی طرح موسم گرما میں سیواس اور بزک Bozok (یوزغاد Yozgot) کے علاقوں میں چلا جاتا تھا۔ نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد سے آق قویونلو کی سرگرمیوں میں شمالی شام کے بیت کا نام آنا شروع ہوا۔ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی میں حلب اور یوزغاد (= شام بیدی) کے قرب و جوار کے علاوہ دیار بکر، کوتاھیہ اور طرابلس الشام کی ولایات میں بیت قبیلے کی چھوٹی چھوٹی برادریاں موجود تھیں۔ اسی صدی کے اندر وہ ایران میں بھی، بالخصوص ہمدان کے جنوب میں نزاز اور کرہ رود میں بھی موجود ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً دس ہزار خیمے تھی اور شاید زیادہ قریبی زمانے میں، اور غالباً ملک کے باقی بیت سے ممیز کرنے کے لیے، ''آق بیت'' کہلاتے تھے۔ آق بیت بہت ہی اعلیٰ قسم کے گھوڑے پالتے تھے، جو انھیں کے نام پر ''بیتی نژاد'' کہلاتے تھے۔ شاہ عباس ان گھوڑوں کو تحفۃً ہندوستان کے فرمانروا کو بھیجا کرتا تھا۔ بیاتی سُر (مقام) جو ترکی یا ایران کے پکّے راگ میں نظر آتا ہے، اس کی اصل اسی قبیلے کے گیت ہیں۔

اغلب یہ ہے کہ آق قویونلو کی فتح کے وقت یہ بیت شام سے ایران چلے آئے تھے۔ بیت کے بعض ایرانی قبائل خراسان میں اقامت پذیر ہیں اور یہ باقی ماندہ قبائل سے متمیز کرنے کے لیے قرہ بیت کہلاتے ہیں۔ مشہور و معروف قاچار قوم کا ایک قبیلہ شام سے تعلق رکھتا تھا۔ اس واقعہ یہ ہے، جیسا اس کے قبائل کے ناموں سے ظاہر ہے کہ قاچار قوم ترکی الاصل ہے۔ کچھ بیت عراق میں بھی ملتے ہیں، بالخصوص کرکوک کی نواح میں۔ بغداد کے جنوب میں جو قلعہ بیت کہلاتا ہے، اغلب یہی ہے کہ انھیں کے نام پر ہوگا۔ اس قبیلے میں بعض مشہور آدمی بھی پیدا ہوے۔ دِدِہ قُور قُود اور فضولی اسی قبیلے سے تھے۔ حسن بن محمود بیاتی، مصنّف جام جم آئین، جو عثمانی شہزادہ جم سے معنون ہے، اسی بیت قبیلے سے تھا، جیسا کہ اس کی نسبت سے ظاہر ہے۔

مآخذ: (۱) فاروق سُمَر Faruk Sumer: *Bayatlar*، در *Türk Dili ve Edebiyati Dergisi*، استانبول ۱۹۵۲ء، ۴/۴: ۳۷۳ تا ۳۹۸۔

(Faruk Sumer)

* **بَیْت**: جائے رہائش کے لیے عام [عربی] لفظ، جو خانہ بدوشوں کے خیمے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور مستقل مکینوں کے (پتھر، لکڑی یا اینٹ کے) مکانوں کے لیے بھی۔ بعض اوقات یہ مقدس مقام یا حرم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، چنانچہ عربی میں الف، لام کے اضافے کے ساتھ (البیت) اس کا اطلاق مکّۂ معظّمہ کے بیت اللہ کے لیے بھی ہوتا ہے، جیسے احترام کے طور پر البیت الحرام (مقدس گھر) یا البیت العتیق (قدیم اور مقدس گھر) بھی

کہتے ہیں۔ ایسے جغرافیائی نام بھی عام ہیں جن کے شروع میں بیت آتا ہے۔ شامی فلسطینی ناموں میں ''بیت'' کے سابقے کو محض ''ب'' تک محدود کر دیا گیا ہے، جو آرامی (شامی) ''بی'' (Bē) سے مشتق ہے، لیکن انجیلی عبرانی میں اس کی جو متعدد مثالیں (''بیشان'' Bē-Shān وغیرہ) ملتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کنعانی زبان سے بھی مشتق ہو سکتا ہے۔

عرب علمائے لغت نے جو تعریفات کی ہیں ان میں اس اصطلاح کو ہمیشہ اوسط رقبے کے ایسے گھر کے لیے مخصوص سمجھا گیا ہے جو ایک خاندان کے لیے موزوں ہو۔ اس لفظ میں ''خاندان'' کا مفہوم تمام سامی زبانوں میں واضح طور پر ملتا ہے۔ [خاندان نبوی کی بحث کے لیے رک بہ اھل البیت۔ بیت کا لفظ قبیلے کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ بیت کی جمع بیوت اور جمع الجمع بیوتات ہے۔ بیوتات بالخصوص بہت معزز گھرانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے]۔

(J. Lecerf)

* **بَیْت**: رک بہ عروض۔

⊙ **بیت اللّٰہ**: رک بہ کعبہ۔

* **بَیْت جِبْرِیْن**: (جسے بعض اوقات بیت جبریل بھی کہا جاتا ہے) شفلۃ کا ایک بڑا فلسطینی گاؤں، جو یہودیہ کے چونے کے پہاڑوں اور ساحلی میدان کی سرحدوں پر بیت المقدس کے جنوب مغرب میں ۲۸۷ میٹر کی بلندی پر ایک ایسے خطے میں واقع ہے جہاں شکار اور آثار قدیمہ بکثرت ہیں اور اس لیے یہ ہمیشہ عرب مصنفین کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز رہا ہے۔ جوزیفس Josephus نے اسے ادومیہ Idumaea کا ایک گاؤں قرار دیتے ہوئے اس کا ذکر بیغبری Begabri کے نام سے کیا ہے۔ بطلیموس [رک باں] اور *Tabula Peutingeriana* نے اسے بیتوغبری Betogabri [= بیت جبری] کے نام سے موسوم کیا اور اس کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ شہر مَرِیشہ (مَرِسَہ) کا قائم مقام ہے، جس کا ذکر عہد نامۂ عتیق میں اکثر ملتا ہے، جو بارتھیوں کے ہاتھوں ۴۰ ق م میں برباد ہو گیا تھا اور جس کے محلِ وقوع کی تصدیق آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے ہو گئی ہے۔ اس کا دوسرا نام ''مدینۃ اصحاب الکہف'' ہے، جو اس کے اصلی باشندوں حوریوں (Hurrites) کا دیا ہوا ہے، جو ادوم سے پسپا ہونے سے پہلے اس خطے پر قابض تھے اور جن کا نام قریب قریب ''اصحاب الکہف'' کے مترادف تھا۔ Septimus Severus نے ۲۰۰ء میں جب اس علاقے کی صحیح نشان دہی کی تو الفاظ کے ہیر پھیر سے یونانی زبان میں اس شہر کے نام کا ترجمہ مدینۃ الاحرار کیا گیا۔ ازمنۂ وسطی میں اسے اس کا اصلی نام دوبارہ ملا جو تالمودی تحریرات میں بیت جُبرِن (Beth Gubrin) کی صورت میں ملتا ہے اور جسے صلیبی مبارزوں نے توڑ مروڑ کر بتھ گبرم، بتھگبلن یا گبلن بنا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عربی ''جبرین'' (جبّارین) کے لفظوں میں ابہام پیدا کر کے اسے اور ''مدینۃ الجنّۃ'' کو ایک سمجھ لیا گیا۔ ایک حدیث کی رو سے، جسے الہروی نے روایت کیا ہے، (حضرت) موسیٰؑ کے اس قصے کی جائے وقوع اسی مقام کو بتایا گیا ہے جو قرآن مجید (۵ [المائدۃ]: ۲۱ تا ۲۶) میں بیان ہوا ہے۔

مدینۃ الاحرار، جس کا اپنا سکّہ تھا اور جس کا ایک بڑے وسیع خطے پر تسلّط تھا، قدیم زمانے میں بڑا ہی خوش حال علاقہ تھا، جیسا کہ رومی اور بوزنطی مرصّع مرقعوں (Mosaics) سے، جو حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں، ثابت ہو چکا ہے۔ باوجودیکہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں عمرو بن العاص کی فتح کے بعد

بھی یہ شہر بدستور اَجنادِ فلسطین کے اندر ایک ضلع کا دارالحکومت اور بیت المقدس و غزّہ کی درمیانی شاہراہ پر ایک تجارتی مقام بنا رہا۔ عربوں کے زمانے میں اس کی اہمیت کم ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خطّے میں جبران الیعقوبی کی رُو سے زیادہ‌تر قبیلۂ جذام کے لوگ [رَكّ باں] ھی آباد تھے ایک شدید لڑائی ہوئی تھی اور مارسابا کے ایک راہب سٹیفن Stephen کے بیان کے مطابق مدینۃ الاحرار ۷۹۶ء میں عرب قبائل کی ایک باہمی جنگ میں بالکل تباہ و برباد ہو گیا تھا (Fr. Buhl)۔ یہ روایت ایسی ہے کہ اسے تسلیم تو ضرور کر لینا چاہیے، لیکن قدرے احتیاط کے ساتھ۔ اس کے کچھ ہی مدت بعد اَلمقدسی بیت جبرین کا ذکر ضلع داروم [رَكّ باں] کے ایک تجارتی مرکز کی حیثیت سے کرتا ہے اور اس کے محل وقوع کی عسکری اہمیت پر زور دیتا ہے جو صلیبی مبارزوں کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ ۱۱۳۴ء کے قریب صلیبی مبارزوں نے پہلے تو اسے بالکل تباہ و برباد کر دیا اور پھر وہاں ایک قلعہ تعمیر کیا جو عسکری راہبوں (Knights Hospitallers) کی نگرانی میں دے دیا گیا تاکہ مصر کی جانب مملکت بیت المقدس کی سرحد کی حفاظت اور مسلمانوں کے ان حملوں کی روک تھام ہو سکے جو زیادہ‌تر عسقلان [رَكّ باں] کی سمت سے ہوا کرتے تھے۔ جب سلطان صلاح الدین نے ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں اسے دوبارہ فتح کیا تو کچھ نقصانات کے باوجود بھی یہ عہد مملوک میں قلعہ‌بند قصبہ تھا اور براہ‌راست صوبۂ دمشق کے ساحلی سرحدی علاقے میں ضلع غزہ کے نائب کے تابع تھا۔

مآخذ: (۱) F. M. Abel: *Géographie de la Palestine*، پیرس ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۸ء، خصوصاً ۲: ۲۷۲ (بذیل مادّۂ Beth Gubrin) اور ۳۷۹ (بذیل مادّۂ مریشہ)؛ (۲) Stephanus: *Acta Sanctorum Martyrum*، ۳: ۱۶۷۹؛ (۳) G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۴۱۲؛ (۴) A. S. Marmardji: *Textes Géographiques*، پیرس ۱۹۵۱ء، ۲۲ تا ۲۳؛ (۵) Caetani: *Annali*، بامداد اشاریہ (۲: ۱۲۸۹ و ۴: ۳۲)؛ (۶) البلاذری: فتوح، ص ۱۳۸؛ (۷) طبری، بامداد اشاریہ؛ (۸) ابن الاثیر، خصوصاً ۹: ۳۶۱؛ (۹) *Or. Cr. Hist.*، بامداد اشاریہ؛ (۱۰) *BGA*، بامداد اشاریہ؛ (۱۱) الھروی: کتاب الزیارات، مرتبۂ Sourdel-Thomine، دمشق ۱۹۵۳ء، ص ۳۲ (ترجمہ دمشق ۱۹۵۷ء، ص ۷۴ تا ۷۵)؛ (۱۲) یاقوت، ۱: ۷۷۶؛ (۱۳) R. Grousset: *Hist. des Croisades*، پیرس ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۶ء، بامداد اشاریہ، خصوصاً ۲: ۱۵۷ تا ۱۰۸؛ (۱۴) M. Gaudefroy-Demombynes: *La Syrie a l' epoque des Mamelouks*، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۵۰.

(J. SOURDEL-THOMINE)

بیتُ الجَوزۃ: رَكّ بہ علم نجوم.

البیتُ الحرام: رَكّ بہ مسجد و المسجد الحرام.

بیتُ الحکمۃ: ایک علمی ادارہ، جس کی بنیاد خلیفہ المامون نے جندے سابور کی قدیم درسگاہ کی طرز پر بغداد میں رکھی تھی۔ اس کا بنیادی کام یہ تھا کہ ان فلسفیانہ اور علمی تصانیف کا یونانی سے ترجمہ کیا جائے جنھیں ایک روایت کی رو سے خلیفہ کا بھیجا ہوا ایک وفد مُلکِ روم سے لایا تھا۔ اس ادارے کے ناظم سہل بن ہارون اور سلم تھے اور سعید بن ہارون ان کا معاون تھا۔ ان کے علاوہ یہاں کا عملہ مترجمین کی ایک اہم جماعت، جن میں مشہورتر بنو المنجم تھے؛ نیز خوشنویسوں اور جلدسازوں پر مشتمل تھا.

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کتب خانے، جنھیں اکثر خزانۃ الحکمۃ بھی کہتے تھے، قبل ازیں ہارون الرشید اور برامکہ [رَكّ باں] کے زمانے میں بھی

موجود تھے جنھوں نے یونانی علوم کا ترجمہ شروع کیا تھا۔ مامون نے محض اس تحریک میں زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کی جس کا مقصد اسلامی فکریات کا فروغ تھا (رَكَ به غریبه مادّه ب سوم ۱)۔

اس ادارے سے فلکیات کی رصدگاہیں (مراصد) بھی ملحق تھیں، ان میں سے ایک بغداد میں اور دوسری دمشق میں قائم کی گئی، جہاں مسلم علما نے بطلیموس [رَكَ بآں] کی تیار کردہ قدیم تقویم کی تصحیح کی اور خاص طور پر نئی تقاویم (= زیج [رَكَ بآں]) ایجاد کیں.

المتوکّل کے زمانے میں جو نیا ردّ عمل ہوا تھا اس کی وجہ سے بیت الحکمة کے وجود کی اصلی صورت باقی نہ رہی، اگرچہ بعد ازاں عراق میں تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے دوران میں بہت سے علمی کتب خانوں کا ذکر ملتا ہے جو مختلف افراد کی ذاتی کوششوں کے مرہونِ منّت تھے۔ علاوہ ازیں اس امر کا بھی پتا چلتا ہے کہ المعتضد نے ایسے کئی علما کے کام کی ہمت افزائی کی جنھیں اس نے اپنے محل میں مقرر کر رکھا تھا۔ آگے چل کر صرف فاطمیوں نے اس قسم کے سرکاری اداروں کی بنیاد رکھی جن میں سے اہم ترین وہ دارالحکمة تھا جسے الحاکم نے ۳۹۵ھ/۱۰۰۵ء میں قائم کیا تھا۔

مآخذ: (۱) الفہرست، ص ۵، ۱۰، ۱۲، ۱۰۲، ۲۴۳، ۱ ۳۰۴، ۲۷۴؛ (۲) یاقوت: ارشاد، ۵: ۴۵۸ تا ۴۵۹، ۵: ۶۶ تا ۶۸؛ (۳) القفطی، طبع Lippert، ص ۹۸ تا ۱۰۳، ۱۲۴ تا ۹۸؛ (۴) ز۔ ف الرفاعی: عصرالمامون، قاہرہ ۱۹۲۸ء، ۱: ۳۷۴ تا ۳۷۶؛ (۵) O. Pinto: *Le biblioteche degli Arabi nell, eta degli Abbassidi*، فلورنس ۱۹۲۸ء، ص ۱۲ تا ۱۴؛ (۶) ک۔ عوّاد: خزائن کتب العراق العامّة، در سومر، ج ۲/ ۲، ۱۹۴۶ء: ص ۲۱۳ تا ۲۱۸؛ [(۷) R. Briffault: *The Making of Humanity*، لندن ۱۹۱۹ء، باب ۵، Dar Al-Hikmet (دارالحکمة): ص ۱۸۳ تا ۲۰۲].

(D. SOURDEL)

بیتُ الدّین: رَكَ به بِتْدین.

بَیت رَاس: مشرق اردن میں ایک گاؤں، جس کا ذکر عرب جغرافیہ دانوں نے بھی کیا ہے۔ یہ گاؤں عجلون [رَكَ بآں] کے ضلع میں اربد سے تقریباً تین کیلومیٹر شمال میں پانچ سو نواسی میٹر کی بلندی پر واقع ہے اور چاروں طرف سے ان کھنڈروں سے گھرا ہوا ہے جو قدیم کیپی تولیا Capitolia کے ویران شدہ محلِّ وقوع کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ڈیکاپولس Decapolis کا یہ شہر، جس کا نام اس کے عربی نام سے ملتا ہے، جو اس کے بعد بھی قائم ہے اور بلاشبہہ کم پہاڑی علاقے میں اس کی نہایت نمایاں حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔ قدیم سفرناموں میں اس کا ذکر اَذرِعات (ذرع)، اَبلہ (تلّ ابل) اور گدرا (امّ کایہ) کے مقامات کے ساتھ آیا ہے، جو اس کے آس پاس آباد تھے۔ پہلے یہ گاؤں نبطیوں کے قبضے میں تھا۔ رومنوں کے عہد میں اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ عرب فتوحات کے آغاز میں شرحبیل بن حسنہ نے اس پر قبضہ کر کے اسے اجناد اردن میں شامل کر لیا۔ بنو امیّہ کے دورِ حکومت میں بھی اسے خاص شہرت حاصل تھی اور اس کی تصدیق شاعروں اور سوانح نگاروں کے بہت سے تذکروں سے ہوتی ہے۔ بعض شاعروں نے یہاں کی شراب کا ذکر اپنے اشعار میں کیا ہے، قبّ یاقوت، بذیل مادہ۔ جب اموی فرمانرواؤں نے البلقاء [رَكَ بآں] کے علاقے میں رہنا شروع کر دیا، جہاں آثار قدیمہ کی کثرت ہے اور جنھیں انھیں فرمانرواؤں سے منسوب کیا گیا ہے تو اس کی شہرت میں نہایت تیزی سے کمی آنی شروع ہو گئی، اور جگہ بالکل خالی اور ویران ہو گئی؛ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ ان کھنڈروں کو جو اس وقت تک موجود ہیں، اور جن کا سیاحوں نے ذکر بھی کیا ہے کبھی سنجیدگی

سے تحقیق کا موضوع نہیں بنایا گیا کہ اس کی قدیم عمارتوں کے درمیان بنو امیّه کے کسی مستقر کے نشانات کا سراغ مل سکتا۔

مآخذ: (۱) F. M. Abel: *Géographie de la Palestine*، پیرس ۱۹۳۳ - ۱۹۳۸ء، ۲: ۲۹۴ تا ۲۹۵ (بذیل مادّهٔ Capitolias)؛ (۲) G. Schumacher: *Northern 'Ajlun*، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۱۵۴ تا ۱۶۸؛ (۳) G. Schumacher و G. Steuernagel: *Der 'Adschlun*، لائپزگ ۱۹۲۷ء، ۴۷۸ ببعد؛ (۴) G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*، لنڈن ۱۸۹۰ء، ۴۲۲، ۴۱۵؛ (۵) A. S. Marmardji: *Textes géographiques arabes sur la Palestine*، پیرس ۱۹۵۱ء، ص ۴، ۲۹، ۲۳؛ (۶) Caetani: *Annali*، ۲: ۱۱۲۶ (سال ۱۲ ہجری)، ۳: ۲۹۶ (سال ۱۵ ہجری)؛ (۷) H. Lammens: *Études sur la siecle des Omeyyades*، بیروت ۱۹۳۰ء، ۱۲۱، ۲۱۳، ۲۰۳؛ (۸) النابغة الذبیانی: دیوان، مرتّبهٔ Dérenbourg، ص ۲۶، ۱۹۵ تا ۱۹۶؛ (۹) البلاذری: فتوح، ص ۱۱۶؛ (۱۰) ابن خُرّداذبه، ص ۷۸؛ (۱۱) البکری [معجم ما استعجم]، ۱: ۱۸۹؛ (۱۲) یاقوت، ۱: ۲۰۰، ۷۷۶ تا ۷۷۷۔

(J. SOURDEL-THOMINE)

بَیْتُ الْفَقِیْه: (یعنی فقیه کا گھر)، دس ہزار آبادی کا ایک شہر، جو تہامة الیمن میں ۱۴ درجے ۳۰ ثانیے شمال، ۴۳ درجے ۱۶ ثانیے مشرق میں واقع ہے۔ اس شہر کو بیت الفقیه ابن عُجَیل سے، جو ایک فقیه کے نام سے موسوم ہے اور جس کے مقبرے کے گرد یه شہر آباد ہے، زبِیْدیه یا بیت الفقیه الکبیر سے، جو شمال میں باجل کے قریب واقع ہے، ممیّز کرنے کے لیے بیت الفقیه الصغیر بھی کہا جاتا ہے۔ نیز مشہور ولی الفقیه ابن عجَیل [م ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء] کی نسبت سے، جس کے مقبرے کے گرد یه شہر آباد ہے، اسے بیت الفقیه ابن عجیل کہتے ہیں۔ یه شہر ۱۹۴۳ء میں بیت الفقیه کی قضا (دائرۂ اختیارات عدالتی) کا صدر مقام تھا، جو الحُدَیدہ کے صوبے (لواء) میں چار ضلعوں (ناحیات) پر مشتمل تھا اور وہ چار ضلعے یا ناحیات یه ہیں: ناحیة لِجان، ناحیة الحسینیه، ناحیة بنی سعید اور ناحیة بیت الفقیه۔ ان میں سے ہر ایک پر ایک عامل حکومت کرتا تھا جو اگر سیّد نه ہوتا تو اسے ''قاضی'' کے رسمی لقب سے یاد کرتے تھے۔ الحدیدۃ کا صوبه کسی شہزادے کے زیرنگیں ہوتا تھا۔

ظہورِ اسلام سے پہلے کی تاریخ میں شہر بیت الفقیه کا تاریخی ربط قبیلۂ اَزْد کی اس ہجرت سے وابسته کیا جا سکتا ہے جو مارِب کا بند ٹوٹنے کے بعد پیش آئی تھی۔ ایک روایت سے پتا چلتا ہے که قبیلۂ [ازد] چشمۂ غسّان کے قریب، جو غالباً وادی رِمَع اور وادی زَبِید کے درمیان واقع ہے، عارضی طور پر آباد ہو گیا تھا۔ بعد ازاں قبیلۂ ازد کا ایک گروہ شامی سرحدوں کی طرف کوچ کر گیا اور وہاں ریاست غسّان قائم کی۔ آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی میں ابن بطّوطه مقبرۂ ابن عُجَیل کے قریب غسّانه نام کے ایک گاؤں کا ذکر کرتا ہے، لیکن آج کل وہاں اس نام کا کوئی گاؤں موجود نہیں۔ قدیم عرب جغرافیه‌نگار نه غسّانه کا ذکر کرتے ہیں نه بیت الفقیه کا، [البته عین (= چشمۂ) غسّان کا ذکر موجود ہے]۔ بیت الفقیه کا موجودہ گاؤں، فقیه ابوالعبّاس احمد بن موسٰی بن علی بن عمر بن عُجَیل کی وفات (۶۹۰ھ / ۱۲۹۱ء) کے فوراً بعد ہی اس کی قبر کے زائرین اور کرامات کی وجه سے وجود میں آیا ہو، جو ان کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی میں بندرگاہ موشه کے لیے قہوے کا مرکز ہونے کے باعث اس شہر کی خوش‌حالی زیادہ ہو گئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک گماشتے رونگٹن Revington نے ۱۹۵۹ء میں وہاں ایک کارخانه قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔

بارھویں صدی ہجری/اٹھارھویں صدی عیسوی کے دوران میں امام یمن مونسه اور بیت الفقیه سے مجموعی طور پر ڈیڑھ ہزار پونڈ ماہوار مالیه لیا کرتے تھے اور یه رقم ہندوستانی جہازرانی کے مہینوں میں بڑھ جاتی تھی۔ ہملٹن کا اندازہ ہے که بیت الفقیه میں قہوے کی سالانہ فروخت بائیس ہزار ٹن تھی، لیکن اسی زمانے میں لنکا اور نصف کرۂ مغربی میں قہوے کی کاشت کی ترقی کے سبب یمنی تجارت میں زوال آیا اور بیت الفقیه نے جنوبی عرب میں پر آشوب سیاسی حالات کے دوران میں پھر اپنی صوبائی علمی زندگی کی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔

اس خطّے کی غیر مستقل اور بدلتی ہوئی حالت کی ذمّے داری زیادہ‌تر قبیلۂ الزرانیق کی وہ جزوی آزادی ہے جس کا مرکز بیت الفقیه ہے۔ اپنی دس ہزار کی جنگی قوت کے باعث اس قبیلے نے ایک مدت تک کسی حکومت کے نظم و ضبط کی پابندی قبول نہیں کی۔ یہاں تک که ۱۹۱۳ء میں اس کی قوت اتنی زیادہ تھی که اس نے عثمانی پیدل فوج سے راہ عبور کرنے کا محصول وصول کیا اور ۱۹۳۷ء میں اس نے امام کی بھیجی ہوئی ایک تعزیری فوج کے ایک ایک آدمی کو تہ تیغ کر دیا۔

مآخذ: (۱) الهمدانی؛ (۲) ابن بطوطه: Voyages d'Ibn Batoutah، ترتیب و ترجمه از Defrémery و Sanguinetti، پیرس ۱۸۹۳ء؛ (۳) الخزرجی: History of the Resuli Dynasty of Yemen، طبع و ترجمه از J.W. Redhouse، لائڈن و لنڈن ۱۹۰۸ء؛ (۴) عمارة: Yaman, its early mediaeval history، طبع و ترجمه H. C. Kay، لنڈن ۱۸۹۲ء؛ (۵) یاقوت؛ (۶) Admiralty: Western Arabia and the Red Sea، آوکسفرڈ ۱۹۴۶ء؛ (۷) G. W. Bury: Arabia Infelix، لنڈن ۱۹۱۵ء؛ (۸) W. Foster: The English Factories in India, 1655-1660، آوکسفرڈ ۱۹۲۱ء؛ (۹) A. Hamilton: A New Account of the East Indies، ایڈنبرا ۱۷۲۷ء؛ (۱۰) W. B. Harris: A Journey Through the Yemen، ایڈنبرا و لنڈن ۱۸۹۳ء؛ (۱۱) G. Heyworth-Dunne: الیمن، قاہرہ ۱۹۵۲ء۔

(R. L. HEADLEY)

بَیْتُ لَحْم: فلسطین کا ایک بہت بڑا گاؤں اور مشہور و معروف زیارت‌گاہ، جو جودیه کے چونے والے پہاڑوں کے درمیان بیت المَقْدِس سے تقریباً دس کیلومیٹر کے فاصلے پر سطح سمندر سے آٹھ سو میٹر کی بلندی پر واقع ہے اور بائیبل کے قدیم بیت لحم Bethlehem سے مطابقت رکھتا ہے۔ چوتھی صدی عیسوی سے برابر وہ مسیحیوں کی زیارت‌گاہ ہے اور آگے چل کر یه جگه حضرت عیسٰی بن مریمؑ [رک بآں] کا مولد ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی نظر میں بھی مقدس اور محترم بن گئی۔ عرب جغرافیه‌نویسوں نے بھی اس واقعے کا ذکر بلا اِستثنا کیا ہے اور اکثر اس بوزنطینی محل (جو قسطنطین نے ۳۲۵ء میں تعمیر کیا اور ۵۲۹ء میں جسٹینین نے اسے ازسرِ نو درست کرایا) کی جو وہاں تعمیر کیا گیا تھا، نہایت تعریف کی ہے۔ انھوں نے کھجور کے درخت کا، جس کا ذکر قرآن پاک (۱۹ [مریم]: ۲۳، ۲۵) میں آیا ہے، نیز حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی ان قبور کا بھی برابر ذکر کیا ہے جن کی نشان دہی عیسائی روایت حضرت مسیح علیه السلام کے غار میں کر چکے تھے اور امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللّٰه تعالٰی عنه کی محراب کا بھی جو روایت کے مطابق وہ مقام ہے جہاں خلیفۂ ثانیؓ نے فتح فلسطین کے بعد، اس طرف سے گزرتے وقت نماز ادا کی تھی، لیکن بیت لحم کو مذہبی نقطۂ نظر سے جو شہرت حاصل ہے اس کے باوجود بھی وہ اتنی اہمیت حاصل نه کر سکا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بیت المقدس کے بہت قریب ہے ۔ پہلی صلیبی جنگوں میں جرمنوں نے اس کے الحاق کے بعد اس کی طرف تھوڑی بہت توجہ کی اور ۴۹۲ھ / ۱۰۹۹ء میں یہاں ایک قلعہ بنایا اور پھر ۱۱۱۰ء میں یہاں ایک مسیحی مرکز بنانے کی اجازت حاصل کی ۔ اس زمانے میں اس گاؤں میں زندگی کی ایک ہلکی سی لہر پیدا ہوئی اور ختم ہوگئی ۔ ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء میں [سلطان] صلاح الدین [ایوبیؒ] نے فلسطین کو از سرِ نو فتح کرنے کے بعد اس گاؤں پر قبضہ کر لیا ۔ اس وقت یہ گاؤں یافا کی ہنگامی واپسی کے اس معاہدے میں شامل تھا جو الملک الکامل اور فریڈرک دوم کے درمیان ہوا تھا ۔ اس وقت سے برابر اس شہر پر مردنی سی چھائی رہی، لیکن یہاں کی عیسائی آبادی اور مغرب کے باہمی روابط و تعلقات کے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو جانے کی وجہ سے اسے وہ حیثیت حاصل ہوگئی جو آج کل ہے، یعنی یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس میں مسلمانوں کی ایک بے اثر اقلیت رہتی ہے ۔ ۱۸۳۴ء میں ابراہیم پاشا [رک بآں] کے خلاف بغاوت کرنے کے بعد مسلمان جس قدر جور و تشدد کا ہدف رہے اس کے بعد سے ان کی حالت پھر کبھی نہیں سنبھلی ۔ یہاں مذہبی ادارے اور جدید قسم کے مکانات کثرت سے ہیں، جو مشہور قلعے کے گرد ایک نصف دائرے کی شکل میں پہاڑی کی ایک جانب ہندی پر ایک خاص ترتیب سے بنے ہوئے ہیں ۔ اس جگہ کی اثری اہمیت کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں ۔ چنانچہ اسی بنا پر اصلاح اور تجدید کے نقطۂ نظر سے یہ توجہ کا مرکز رہا ہے، یہاں تک کہ صرف مرکزی حصّے کی قدیم نظم و ترتیب اور ستونوں کی چار قطاریں نو جوں کی توں باقی رہ گئی ہیں لیکن باقی حصّوں میں خاصی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے ۔ خصوصاً نقش و نگار اور آرائش و زیبائش میں جس سے اس سلسلے میں بڑی بیش قیمت شہادت ملتی ہے کہ پچی کاری اور مینا کاری کے فن نے قرونِ وسطٰی میں کس طرح ارتقائی منزلیں طے کیں ۔

مآخذ : (۱) F. M. Abel : Géographie de la Palestine، پیرس ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۸ء، بالخصوص ۲ : ۲۷۶ (بذیل مادّۂ Bethléem)؛ (۲) G. Le Strange : Palestine under the Moslems، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۲۹۸ تا ۳۰۰؛ (۳) A. S. Marmardji : Textes Géographiques، پیرس ۱۹۵۱ء، ص ۳۲ تا ۳۶؛ (۴) Caetani : Annali، بامداد اشاریہ (۶ : ۳۴)؛ (۵) BGA، بامداد اشاریہ؛ (۶) الھروی [: کتاب الزّیارات]، طبع Sourdel-Thomine، دمشق ۱۹۵۳ء، ص ۲۹ (ترجمہ دمشق ۱۹۵۷ء، ۶۹ تا ۷۰)؛ (۷) یاقوت، ۱ : ۷۷۹؛ (۸) ابن الاثیر، بالخصوص ۱۱ : ۳۶۱؛ (۹) R. Grousset : Hist. des Croisades، پیرس ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۶ء، بامداد اشاریہ؛ (۱۰) Vincent اور Abel : Le Sanctuaire de la Nativité، پیرس ۱۹۱۴ء؛ (۱۱) H. Stern : Les représentations des conciles dans l'église de la Nativité a Bethléem، در Byzantion، ۱۱ (۱۹۳۶ء) : ۱۰۱ تا ۱۵۲، ۱۳ (۱۹۳۸ء) : ۴۱۵ تا ۴۵۹ اور Nouvelles recherches sur les représentations، در Cahiers archéologiques، ۳ (۱۹۴۸ء) : ۸۲ تا ۱۰۵ ۔

(J. SOURDEL-THOMINE)

بیتُ المال : (لغوی معنی مال یا دولت کا گھر)، مگر شرعی اصطلاح میں اس کے معنی کسی مسلم ریاست کے "خزانے" کے ہیں ۔

۱ ۔ قانونی حیثیت : [آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے سے بیت المال کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا، یعنی جب اور جتنا مالِ غنیمت، چندے یا صدقات وغیرہ آتے آپؐ اپنے صحابہؓ کرام میں تقسیم فرما دیتے ۔ عہدِ نبوی میں مال جمع کرنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی، لہٰذا اس کے لیے کوئی الگ

مکان نہ بنایا گیا، بلکہ سب کچھ مسجد نبوی میں ڈھیر کر دیا جاتا اور مستحق لوگوں کو دے دیا جاتا؛ یہی صورت عہدِ صدیقی میں رہی۔ باقاعدہ بیت المال حضرت عمرؓ کے زمانے میں وجود میں آیا۔] حضرت بلالؓ اور ان کے رفقا نے حضرت عمرؓ ابن الخطاب سے کہا کہ عراق اور شام سے آئے ہوئے مال غنیمت کو تقسیم فرما دیجیے جس طرح دوسرا مال غنیمت تقسیم ہوتا ہے، بالکل اسی طرح زمینیں ان لوگوں کو دے دیجیے جنھوں نے انھیں فتح کیا ہے، لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی درخواست کو مسترد کرتے ہوئے فرمایا: ''اللہ تعالٰی نے ان کی زمینوں میں ان لوگوں کا حصہ بھی رکھا ہے جو ان فاتحین کے بعد آئیں گے (کتاب الخراج، ص ۲۳؛ *Le Livre de l'Import Foncier*، ص ۳۷)۔ حضرت عمرؓ کے اس فیصلے میں یہ حقیقت پوشیدہ تھی کہ عمومی ملکیت اور انفرادی ملکیت دو بالکل جداگانہ چیزیں ہیں، اور اموال اور جاگیروں کا مقصد بحیثیت مجموعی قومی مفاد کا تحفظ ہے۔ جب بیس ہجری میں ''دیوان'' [رک بآں] کا ادارہ یا محکمہ بھی اس میں شامل ہو گیا تو اس سے بیت المال کا ایک نیا مفہوم، یعنی سرکاری خزانے کا تصور پیدا ہوا۔ قبل ازیں بیت المال کا لفظ اس محفوظ جگہ یا مقام کے لیے بولا جاتا تھا جہاں اموال یا اسباب کو انفرادی مالکوں یا حقداروں کے درمیان تقسیم کرنے سے پہلے عارضی طور پر رکھا جاتا تھا (دیکھیے Tyan: *Institutions du Droit Public Musulman*، ۱: ۲۱۶)۔

نظم و نسق: تمام سرکاری عہدے داروں کو ان کے اختیارات امام (جو ''بیت المال'' کا رئیس بھی ہوتا تھا) کی طرف سے تفویض ہوتے تھے۔ اہلِ السنۃ و الجماعۃ کے نزدیک امام کے یہ اختیارات بحیثیت امام جماعت کے ہوتے ہیں، کسی ذاتی [ترجیحی] یا شخصی اقتدار و اختیار [کا نتیجہ نہیں ہوتے اور ان دونوں کے] درمیان واضح اور سخت حدِ فاصل قائم ہے (دیکھیے Tyan، کتاب مذکور، ۱: ۳۹۱ ببعد و ۲: ۱۹۵؛ نیز عملی حیثیت کے لیے Mez: *Renaissance*، ص ۱۱۳ تا ۱۱۶؛ انگریزی ترجمہ، ص ۱۲۰ تا ۱۲۲)۔ یہ امتیاز شیعہ قانون میں اس حد تک موجود نہیں؛ بعض قسم کی جاگیروں کا حقِ ملکیت جو اہل السنت کے نزدیک پوری قوم کے لیے مخصوص ہے [شیعہ کے نزدیک] مُلہَم من اللہ ہونے کی حیثیت سے امام کو حاصل ہوتا ہے (دیکھیے Querry: *Droit Musulman*، ۱: ۱۷۸، ۳۳۷؛ Baillie: *Imameea Code*، ص ۱۶۲)۔

ریاست کے محاصل کی وصولی اور تقسیم کا ذمے دار ''صاحب بیت المال'' ہوتا تھا، جو ان تمام عہدے داروں کا سربراہ اور نگران ہوتا تھا جن کے سپرد ریاست کے مداخل کے ان مختلف صیغوں کی ذمے داری ہوتی تھی جن کی تفصیل نیچے دی گئی ہے۔ اس قسم کے تقررات کے لیے مسلمان ہونا، آزاد ہونا، عادل ہونا [رک بہ عدل] اور قابل ہونا ضروری شرائط ہیں۔ مزید برآں ان عہدوں کے لیے جہاں عہدے دار کو لگان کی تشخیص یا مصارف کے اختیاراتِ تمیزی حاصل ہوں وہاں اجتہاد [رک بآں] کا وصف بھی ناگزیر ہے۔ ماتحت اہلکار جو وصولی یا حوالگی پر مامور کیے جائیں غلام یا ذمی بھی ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ان کا معاملہ اپنے ہی ہم مذہبوں کے ساتھ ہو۔ بیت المال کے کاغذات اور حساب کتاب کے کھاتے ایک خاص انتظامی صیغے کی تحویل میں ہوتے تھے جو ''کاتب الدیوان'' کے زیر نگرانی کام کرتا تھا۔ اس منصب پر کام کرنے والے کے لیے عدالت اور پیشہ ورانہ مہارت دو ضروری اوصاف تھے۔

اسی ڈھانچے کے اندر رہ کر مختلف عہدوں

کی نوعیت اور ان کے کام کی حدود کا فیصلہ امام کے ذاتی اختیار اور صوابدید پر منحصر تھا۔ شریعت نے عام نوعیت کے عہدوں اور مخصوص منصبوں [پر تقرر یا ان کے لیے ضروری اوصاف کے بارے] میں [تفصیلی] تشریح نہیں کی (ابن فرحون: تبصرۃ الحکام، ۲: ۱۳۱، ۱۵۸).

محاصل کے ذرائع: ریاست کے تمام محاصل خزانۂ عامرہ کی املاک (یا حقوق بیت المال) نہیں ہوتے۔ اس مؤخرالذکر کے ضمن میں وہ اموال آتے ہیں جو بحیثیت مجموعی تمام امت کی ملکیت ہوں۔ انہیں کسی مقصد پر صرف کرنے کا اختیار بھی امام یا اس کے مقرر کیے ہوے نمائندے کو حاصل تھا.

یوں گویا [مال] غنیمت [رک بآں] کا وہ حصّہ جو بیت المال کے حصّوں میں سے ایک ہے "خُمس" ہے (اس اصطلاح کے ضمن میں کانوں سے نکلا ہوا مال و اسباب اور دفائن اراضی پر لگان یا محصول شامل ہے)، جو اللہ اور اس کے رسول کا حصّہ ہے اور جو تمام امت کے مجموعی مفاد کی خاطر صرف کیا جائے گا۔ اس خُمس کے بقیہ حصّے کے لیے خاص گروہ مخصوص ہیں۔ آلِ رسولؐ، یتامٰی، مساکین اور مسافر اور یہ اس لحاظ سے گویا امام کی مرضی یا صوابدید پر موقوف نہیں۔ اسی طرح صدقہ یا زکوٰۃ [رک بآں] سے وصول شدہ رقوم امت کے خاص خاص گروہوں کے لیے مخصوص ہیں اور اگرچہ مالِ غنیمت کی طرح یہ اموال بھی خزانے کے عہدے داروں کی نگرانی میں رکھے جا سکتے ہیں یا خزانے کی عمارت میں اس وقت تک بغرض حفاظت رکھے جا سکتے ہیں جب تک ان اموال کے مخصوص حقداروں (حصہ داروں) کا تعیّن نہ ہو جائے۔ ان اموال کے مالک ان کی ادائی کے وقت سے وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس کے مستحق لینے والے ہیں، بیت المال اس کا مالک نہیں۔ حنفی فقہا بھی، جن کے نزدیک امام کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی سے صدقے کی رقم محض کسی ایک یا اس سے زیادہ گروہوں میں تقسیم کر دے اور دوسروں کو اس میں سے کچھ نہ دے، مال الصدقہ اور مال المسلمین میں واضح امتیاز اور فرق کرتے ہیں (دیکھیے کتاب الخراج، ص ۸۰، ۱۳۹، ۱۸۷)۔ بیت المال کے ابتدائی ذرائع آمدنی گویا صرف وہ محاصل ٹھیرے جنھیں مجموعی طور پر فَیْء کہا جاتا ہے، یعنی خراج [رک بآں]، اور جزیہ [رک بآں]۔ عُشر [رک بآں] کے محصول کی کیفیت کچھ مبہم سی ہے۔ بعض فقہا اسے فَیْء ہی قرار دیتے ہیں اور دوسرے اسے "صَدَقَہ" کہتے ہیں، اور ایک اور گروہ کے نزدیک اگر اس کے ادا کنندگان مسلمان ہوں تو اسے "صَدَقَہ" کہا جائے گا اور اگر یہ غیر مسلموں سے ملے تو اسے "فَیْء" کہیں گے.

آمدنی کے دوسرے ضمنی ذرائع میں مندرجۂ ذیل مدّات شامل ہیں:

۱۔ ایسی جائداد جس کے مالک کا علم نہ ہو، مثلاً مفرور غلام جب وہ پکڑ لیے جائیں یا وہ مال جو گرفتار شدہ قزّاقوں اور چوروں کے پاس سے نکلے۔ اگر جائداد منقولہ ہو تو اس کی فروخت سے وصول شدہ رقم اور اگر غیر منقولہ ہو تو اس سے حاصل کیا ہوا نفع یا آمدنی بیت المال میں جائے گی.

۲۔ مُرتدّین کی جائداد: اگرچہ فقہا کی بہت بڑی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ مُرتدّین سے حاصل کی ہوئی جملہ جائداد بیت المال کا حصّہ ہے لیکن حنفی فقہا نے اس مسئلے کے متعلق جو آرا ظاہر کی ہیں ان میں اختلاف نمایاں ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس جائداد کا کوئی حصّہ بھی بیت المال میں نہیں جا سکتا اور دوسرے

گروہ کے نزدیک جائداد کا صرف وہ حصہ بیت المال میں جانا چاہیے جو مرتد نے ارتداد کے بعد پیدا کیا ہے۔

۳ - مرنے والوں کی جائدادیں [ترکہ بے میراث]: مالکی فقہ کی رو سے بیت المال اسی صورت میں مرنے والے کا جائز وارث قرار پائے گا جب اس کے جائز عصبہ یا قرآن مجید کی رو سے ایسے وارث باقی نہ رہیں جو اپنے حصص سے متوفی کی پوری جائداد کو اپنے قبضے میں نہ لے لیں - جب کسی قسم کا کوئی وارث باقی نہ رہے تو جائداد کا کم سے کم دو تہائی سرکاری خزانے میں چلا جائے گا - میت کی وصیتوں کی مجموعی تعداد جائداد کے ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہو سکتی - دوسرے مکاتب فقہ کی رائے میں قرآن مجید کی رو سے کسی وارث یا خون کے رشتے کی موجودگی میں سرکاری خزانے کا کوئی حصہ نہیں ہوگا - حنفی فقہ کی رو سے ایسے وارثوں کی عدم موجودگی کی صورت میں پوری جائداد وصیت کے ذریعے ہبہ کی جا سکتی ہے - اس صورت میں لاوارث کے مال پر خزانۂ عامرہ کا قبضہ ناجائز اور جابرانہ ہوگا۔

مخارج: الماوردی کے بیان (الاحکام السلطانیۃ، ص ۲۱۳ ببعد) کے مطابق بیت المال پر جو مطالبات واجب ہیں انہیں دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

۱ - وہ مدّات جن کے متعلق بیت المال کی ذمے داری قطعی اور حتمی ہے - یہ مدّات یا تو ان خدمات کے صلے میں ہیں جو کسی نے ریاست کے لیے انجام دی ہوں، مثلاً شاہی افواج کی تنخواہیں، سلطنت کے عہدے داروں کے مشاہرے، خرید کردہ ساز و سامان کی قیمت، یا وہ اخراجات جن کی برداشت کرنا ریاست کے مخصوص وظائف میں داخل ہے، مثلاً اپنے قیدیوں کی نگہداشت اور دیکھ بھال - ان مطالبات کی مکمل ادائی بیت المال کے اولین فرائض میں سے ہے اور ان کی ادائی میں تعویق و تاخیر صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ خزانہ دیوالیہ ہو جائے (جیسے ایک عام مقروض کی صورت میں) - صاحب بیت المال کی صوابدید پر ان مطالبات کی ادائی کے لیے قرضے بھی لیے جا سکتے ہیں۔

۲ - وہ مطالبات جن کی ادائی کی ذمے داری بیت المال پر اسی صورت میں عائد ہوتی ہے کہ اس میں پہلی قسم کے اخراجات کے ادا کرنے کے بعد اس میں کافی روپیہ ہو جس سے یہ مطالبات ادا ہو سکیں - یہاں (اس مدّ میں) اخراجات کا تعلق فلاح و بہبود یا مفاد عامّہ سے ہوتا ہے، مثلاً سڑکوں کی تعمیر و مرمت، پانی کی بہم رسانی، "خراج" اراضی کے نقصانات کی تلافی۔

تمام اہم ادائیوں سے فارغ ہو جانے کے بعد جو رقم خزانے میں بچ جائے اس کے متعلق حنفی فقہا کا فیصلہ تو یہ ہے کہ اسے مستقبل میں پیدا ہونے والی اتفاقی ضروریات کے لیے محفوظ کر لیا جائے جب کہ شافعی فقہا کا موقف یہ ہے کہ اسے بھی عوام کے مفاد کی خاطر فوراً خرچ کر دیا جائے - شریعت عام اصول و قواعد پیش کر دینے کے بعد مفاد عامّہ کی تفصیلی تعیین کے معاملے کو امام کی صوابدید پر چھوڑتی ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ بیت المال کی رقم کسی ایسے مصرف میں صرف نہیں کی جا سکتی جو شرعاً ناجائز یا حرام ہو، مثلاً جوا، گانا بجانا وغیرہ۔

طریق کار: "دیوان" کے نظم و نسق کے سلسلے میں (جس کا تجزیہ الماوردی نے کیا ہے، الاحکام السلطانیۃ، ص ۲۰۳ تا ۲۱۳) تین اہم قانونی سوال پیدا ہوتے ہیں:

(۱) قانونی ثبوت: اگرچہ شریعت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ عموماً محض تحریری شہادت کافی نہیں لیکن خزانے کے محکمے میں یہی دستور

ہے کہ سرکاری دستاویزوں اور رجسٹروں کو فیصلے اور تحکیم کی کافی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ شافعی فقہ تو خاص حقوق (الحقوق الخاصّہ) اور عام حقوق (الحقوق العامّہ) میں واضح امتیاز کرتی ہے اور اس طریق عمل کو صحیح قرار دیتی ہے، لیکن حنفی فقہ کے نزدیک خزانے کی دستاویزات کو صرف اسی صورت میں عمل کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے کہ ان کی صحت کی تصدیق زبانی شہادت سے بھی ہو جائے۔ اسی طرح محاصل کے داخلے یا ادائی کے ثبوت کے لیے محصِّل کی تحریری رسید کافی ہے، لیکن قانونی ضابطے کی رو سے یہ ضروری ہے کہ محصِّل زبانی اس بات کی شہادت دے کہ یہ دستخط اسی کے ہیں؛ مزید برآں یہ کہ حنفی فقہ کی رو سے اس قسم کی مصدقہ تحریری رسید کے ساتھ ساتھ زبانی تصدیق بھی ہونی چاہیے۔ آخری بات یہ کہ خزانے سے رقم وصول کرنے کے لیے تحریری اختیار نامے خزانے کے حساب و کتاب کے لیے کافی سمجھے جاتے ہیں، تاہم فقہا کے نزدیک مستحسن صورت یہ ہے کہ اصلی رسید کے ساتھ ساتھ وصول کنندہ زبانی طور پر بھی اس کا اقرار کرے۔

تنازعات کی صورت میں طریق کار: فریقین کو مدعی اور مدعیٰ علیہ کی حیثیت دینے کے اہم اور بنیادی مسئلے میں شریعت کے عملی اصولوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ مدعی پر قانون کی رو سے ثبوت کی فراہمی کا بار ہے اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے تو فیصلے کا دار و مدار مدعیٰ علیہ کے حلف انکار پر ہوگا، مدعی وہ فریق ہے جس کا دعویٰ قانون کے اس ابتدائی قیاس کے خلاف جاتا ہے جو دعوے سے متعلق ہے۔ گویا ان تمام مقدمات میں جو دیوان کے عہدےداروں کے سرکاری حسابات کے معائنے کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں (ان افسروں کے لیے جن کا تعلق محاصلِ فیٔ کی تحصیل و تقسیم سے ہے لازم ہے کہ وہ اپنے حسابات دیوان کے سامنے پیش کریں)۔ "دیوان" کے محاسب کی حیثیت مدعی کی ہوتی ہے بشرطیکہ تنازع خزانے کی آمدنی سے متعلق ہو اور اگر مقدمہ خرچ سے متعلق ہے تو اس کی حیثیت مدعیٰ علیہ کی ہوتی ہے۔

اختیارِ سماعت: عام شہریوں اور افسرانِ خزانہ کے مابین تنازعات کا اختیارِ سماعت "صاحب الدیوان" کو حاصل ہے، بشرطیکہ اس کی تقرری کے شرائط میں اسے واضح طور پر اس اختیار سے محروم نہ کر دیا گیا ہو۔ ایسی عدالتی صلاحیت قدرتی طور پر اسی منصب یا عہدے کو حاصل ہو سکتی ہے جس کا بڑا فرض یہ دیکھنا ہے کہ مالیات کے قوانین و قواعد کا صحیح اطلاق و اجرا ہو رہا ہے۔ افسران خزانہ اور دیوان کے عہدےداروں کے مابین تنازع کی صورت میں، جہاں حقیقۃً "صاحب الدیوان" خود ایک فریق ہو، یہ اصول کام کرتا ہے کہ کوئی شخص اپنے مقدمے میں خود منصف اور قاضی نہیں ہو سکتا اور اس صورت میں اختیارِ سماعت عام عدالتوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

بنیادی طور پر شریعت کا تعلق انسان اور اس کے خالق کے باہمی رشتے سے ہے، اس لیے وہ انسان اور ریاست کے باہمی تعلق کے معاملے میں محض ایک عام انداز میں دخل دیتی ہے، وہ اس سے آگے نہیں بڑھتی کہ وہ دونوں فریقوں سے بعض متعلقہ اصولوں کی پابندی کی توقع اور مطالبہ کرے۔ شریعت کا یہ رویّہ فوجداری قانون کے میدان میں خاص طور پر نمایاں ہے، جہاں ان جرائم کے علاوہ جو حدّ کے جرائم کہلاتے ہیں (اور جن میں انسان کے اللہ تعالٰی کے حضور میں جوابدہی کا تصوّر غالب ہے)، جرم کا تشخّص اور اس کی سزا کی تعیین حاکمِ وقت کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے۔ مالیات کے قانون کے متعلق بھی یہی صورت ہے . . . .

مآخذ: قانون شریعت پر مختلف فقہی مکاتب کی مستند کتابیں: (۱) امام ابو یوسف: کتاب الخراج، قاہرہ ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ - ۱۸۸۵ء، مترجمہ و محشی از E. Fagnan: *Le Livre de l'Impot Foncier*، پیرس ۱۹۲۱ء؛ (۲) الماوردی: الاحکام السلطانیۃ، طبع M. Enger، ۱۸۵۳ء؛ (۳) امام ابن تیمیہ: السیاسۃ الشرعیۃ (ترجمہ H. Laoust: *Le Traité du Droit Public d'Ibn Taimiyya*، بیروت ۱۹۴۸ء)؛ (۴) N. P. Aghnides: *Mohammedan Theories of Finance*، ۱۹۱۶ء؛ (۵) R. Levy: *The Social Structure of Islam*، کیمبرج ۱۹۵۷ء؛ (۶) A. Mez: *Renaissance*، انگریزی ترجمہ از خدابخش و Margoliouth؛ (۷) D. Santillana: *Istituzioni di Diritto Musulmano*، ۲ جلد، روم ۱۹۲۶ء و ۱۹۳۸ء؛ (۸) E. Tyan: *Institutions du Droit Public Musulman*، ۲ جلد، پیرس ۱۹۵۴ء و ۱۹۵۷ء؛ [(۹) ابو یعلی: الاحکام السلطانیۃ، ۱۹۳۸ء؛ (۱۰) ابو عبید القاسم بن سلام: الاموال، قاہرہ ۱۳۵۳ھ؛ (۱۱) ابن القیم: احکام اہل الذمۃ، دمشق ۱۹۶۱ء؛ (۱۲) محمد ضیاء الدین الریس: الخراج و النظم المالیۃ، قاہرہ ۱۹۶۱ء]۔

(N. J. Coulson)

۲۔ تاریخ: بیت المال کی موجودگی کا پتا تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی ملتا ہے، اس لیے کہ آپ کے زمانے میں بھی ملت کے خزانے کا کچھ نہ کچھ تصور بہر حال موجود تھا، جس میں مختلف ذرائع سے روپیہ آتا اور جمع ہوتا تھا، لیکن اس کی باقاعدہ بنیاد اس وقت پڑی جب ایک سلطنت کے فاتح کی حیثیت سے ملت کے سامنے نئی نئی ضروریات آئیں اور سابقہ ان مالیاتی اداروں سے آن پڑا جو مفتوحہ ریاستوں میں پہلے سے موجود تھے۔ یہ روایت کہ اس سلسلے کے بہت سے ضروری اور ابتدائی اقدامات امیرالمؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائے بالکل صحیح ہے۔ حضرت عمرؓ کے سامنے فوری مسئلہ عطیات [رک بہ عطایا] کے نظام اور بحیثیت مجموعی خود مالی نظام کو منظم و مرتب کرنے اور محاصل کی وصولی کا تھا، جو اس وقت پوری طرح مقامی آبادی کے ہاتھوں میں تھا۔ آگے چل کر جب ایک دستوری اور مرکزی ریاست وجود میں آئی اور آہستہ آہستہ اس کی ترقی شروع ہوئی تو محاصل کے ایک مخصوص نظام اور اس کے مختلف اجزا و عناصر کی تشکیل و تنظیم کی ضرورت پیش آئی۔ ہمارے لیے اس جگہ بیت المال کی مکمل تاریخ پیش کرنا ممکن نہیں؛ خصوصاً اس وقت کے بعد سے جب کہ اسلامی دنیا مختلف اور علیحدہ علیحدہ ریاستوں میں بٹ گئی اور باہمی اختلافات روز بروز زیادہ تیز اور نمایاں ہوتے چلے گئے۔ اس لیے ہم چند ایسے عام نوعیت کے اشارات کرنے پر ہی اکتفا کریں گے جن کی صحت و صداقت عام طور پر مسلّم ہے اور جن سے تحقیق و جستجو کی مناسب راہیں بھی کھل سکتی ہیں۔

ابتدائی دور میں مسلمانوں کے سیدھے سادے محاصل اپنی نظری بنیادوں کے لحاظ سے مذہبی، لیکن بہ حیثیت مجموعی اور عملی نقطۂ نظر سے ان ریاستوں کے زیادہ پیچیدہ قسم کے محاصل کے مشابہ، قرار دیے جا سکتے تھے جو مسلمانوں کے قبضے میں آئیں اور جن کے صیغۂ مال کی ساخت اور انتظام کا عربوں نے بھی دوسری فاتح قوموں کی طرح احترام کیا۔ اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں سابق بوزنطی علاقے (جو باہم دگر مختلف تھے) اور سابق ساسانی علاقے (مغرب کو چھوڑ کر) مالیاتی نظم و نسق کے اعتبار سے واضح طور پر الگ تھلگ رہے۔ اس کے علاوہ بالکل شروع ہی سے ان شہروں کے درمیان جو بزور شمشیر فتح کیے گئے تھے اور براہ راست اسلامی محاصل اور مسلم اہلکاران محاصل کے

ماتحت تھے، اور ان بلادِ ''عہد'' کے درمیان، جو خراج کی مقررہ مقدار ادا کرتے اور آزادانہ خود ھی فراھم کر لیتے تھے ایک واضح امتیاز موجود تھا ۔ پھر ان دو باھم مختلف طریقوں کے درمیان بلادِ ''صلح'' تھے، جہاں محاصل تو اسلامی ھی تھے لیکن ان کی وصولی مقامی انتظامیہ کرتی تھی ۔ تقریباً ایک صدی کے دو تہائی عرصے تک تمام مالی حساب کتاب مقامی زبانوں میں لکھے جاتے تھے، لیکن بالآخر [خلیفہ] عبدالملک (۶۸۵ تا ۷۰۵ء) نے حکم جاری کیا کہ تمام اسامی دستاویزات کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے (مصری کاغذ کے نمونے سے پتا چلتا ہے کہ نیچے کی سطح کے نظم و نسق میں عربی زبان نے بڑی آھستہ رفتار سے رواج پایا).

عمل اور قیاس دونوں کی بنا پر بہت جلدی مندرجۂ ذیل محاصل اور ان کے ذرائع سامنے آ گئے ۔

بنیادی محصول تو زمین کا لگان، یعنی خراج تھا، جو شروع میں تو غیر مسلم ملکی باشندوں کی تمام زمینوں سے وصول کیا جاتا تھا لیکن جب اصلی باشندوں کی آبادی کا بہت بڑا حصہ مذھب تبدیل کر کے مسلمان ھو گیا تو بعض شکوک و شبہات کے باوجود خزانے کو تباھی سے بچانے کے لیے یہ فیصلہ ناگزیر ھو گیا کہ مالک کے مذھب کی تبدیلی سے اراضی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور ان پر پہلے کی طرح خراج قائم رھے گا ۔ اسلامی احکام کی رُو سے خراج کی حیثیت ایک مستقل کرائے (لگان) کی ھے، جو اُمّت مسلمہ کے فائدے کے لیے، جو دراصل زمین کی مالک اعلٰی تھی، وصول کیا جاتا تھا ۔ یہ حکم ''فَیء'' کا تھا، جس میں وہ تمام غیر منقولہ جائدادیں شامل تھیں جو بذریعۂ فتح حاصل کی گئی تھیں، اور جو اُمّت کی آنے والی نسلوں کی منفعت کے لیے ایک دوامی بنیاد تھی ۔ اس کے برعکس منقولہ (مالِ غنیمت) اموال فتح کے بعد فوراً تقسیم کر دیے جاتے تھے ۔ ملک کی اصل آبادی کے نقطۂ نظر سے خراج قبل از اسلام کا لگان تھا جو جاری رکھا گیا ۔ خراج کے علاوہ غیر مسلم کے لیے ایک حفاظتی محصول بھی واجب الادا تھا جسے جزیہ [رکَ بآن] کہتے تھے اور جو اس کے قبول اسلام کے بعد اس سے نہیں لیا جاتا تھا ۔ خراج اور جزیے کا باھمی فرق نظری طور پر تو بہت نمایاں معلوم ھوتا ھے لیکن اصطلاحی لحاظ سے یا عملی طور پر ھمیشہ ایسا نہیں رھا ۔

علاوہ ازیں رضاکارانہ خیرات، زکوٰۃ جو صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص تھی یا صدقہ تھا، جو منقولہ اور غیر منقولہ دونوں طرح کی جائدادوں سے وصول کیا جاتا تھا ۔ جہاں تک زمینی جائداد کا تعلق تھا اس میں ایک طرف تو عربوں کی جائدادیں (بالخصوص سر زمینِ عرب میں) شامل تھیں اور دوسری طرف وہ اراضی (اِقطاع) جو حکومت کی ملکیت تھیں اور عرب سرداروں کو ریاست کی طرف سے دی جاتی تھیں اور آگے چل کر ہر قوم و نسل کے فوجی سرداروں کو عطا کی جاتی تھیں . . . .

ان محاصل کے علاوہ خزانے کے لیے مندرجۂ ذیل محاصل کا بھی اضافہ کر دیا گیا : (۱) مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ (خُمس)؛ (۲) کانوں سے یا سمندر سے نکلی ھوئی معدنیات؛ (۳) ''مَوارِثِ حَشریہ''، یعنی ایسے لوگوں کا ورثہ جن کی موت کے بعد ان کا کوئی قانونی وارث نہ ھو .

اس کے علاوہ ان سرکاری زمینوں (صوافی) سے بھی، جو بطور ''اقطاع'' نہ دی گئی ھوں اور ان سے استفادہ کرنے کا طریقہ خواہ کچھ بھی ھو، محاصل اسی طرح وصول ھوتے تھے جیسے نجی زمینوں سے؛ علاوہ بریں ریاست ان رقموں کو بھی کام میں لاتی تھی جو عدالتی جرمانوں سے وصول ھوتی تھیں .

نظری طور پر صرف وھی محاصل قانوناً جائز

سمجھے جاتے تھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا، لیکن عملاً متعدد دوسرے محاصل یا تو پیدا کیے گئے یا خود بخود پیدا ہو گئے ۔ ان میں سے بعض محاصل وہ اضافے تھے جو اخراجات کی ادائی یا کسی دوسری غرض کے لیے متداول محاصل پر لیے جاتے تھے (''اصل'' محصول کے مقابلے میں ''فروع''، ''توابع'') ۔ بعض دوسرے محاصل تجارتی سرگرمیوں کی متعدد اور متنوع صورتوں پر عائد کیے جاتے تھے (''ضَرَائب''، ''رُسُوم'') ۔ ان محاصل کے بارے میں فقہا نے اختلاف کیا ہے جو اکثر اوقات تجارتی اداروں سے وابستہ تھے اور مُکُوس کہلاتے تھے ۔ بعض نیک دل فرمانرواؤں نے انھیں منسوخ کرنے کی کوشش بھی کی، گو یہ منسوخی کبھی دیرپا ثابت نہیں ہوئی ۔ پولیس اکثر اوقات ایک خاص قسم کی ''حِمایَہ'' کی ادائی کا مطالبہ کرتی تھی اور پھر حکومت اکثر اوقات بڑے بڑے عہدےداروں کو، جو ضبطیوں (مُصَادَرَة) کے ذریعے دولت کماتے تھے، سزائیں دیا کرتی تھی۔

ہر ٹیکس (محصول) کی تشخیص اور اس کی وصولی کی خصوصیات کا حال ان کے مخصوص عنوانوں کے ضمن میں بیان کیا جائے گا، لہٰذا اس سلسلے میں یہاں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

عام طور سے محاصل کی وصولی یا تو براہِ راست انتظامیہ (= عامل) کے ذریعے کی جا سکتی ہے، یا ٹھیکے (ضَمان) کے ذریعے ۔ محاصل کو ٹھیکے کے ذریعے وصول کرنے کا طریق بھی قدیم ایّام سے بالکل اسی طرح مروّج تھا جس طرح ان کی براہ راست وصولی کا، لیکن جوں جوں خلافتِ عباسیہ رو بہ تنزل ہوتی گئی یہ طریقہ [ضَمان] زیادہ رائج ہوتا چلا گیا، لیکن اسی حد تک کبھی عمل درآمد نہیں ہوا جتنا ان لوگوں کا خیال ہے جو ''ضَمان''، ''قَبَالَہ'' اور ''جَہْبَذَہ'' میں امتیاز نہیں کر سکے، جو اس کے باوجود کہ ان کا استعمال غلط طریقوں سے ہوتا رہا ہے ایک دوسرے سے بالکل مختلف چیزیں ہیں ۔ ''قبالہ'' صرف وہاں عمل میں آتا ہے جہاں محصول دینے والوں کی ایک جماعت اجتماعی طور پر محصول کی ادائی کی ذمّےدار ہو ۔ اس جماعت اور بیت المال کے نمائندے کے درمیان باہمی گفتگو سے یہ فیصلہ ہو سکتا ہے، جیسا کہ سلطنتِ روم کے آخری ایّام میں ہوتا تھا کہ محاصل کوئی ایک فرد یا چند با حیثیت افراد مل کر ادا کر دیا کرتے اور بعد کو دوسروں سے یہ رقم تھوڑے سے اضافے کے ساتھ وصول کر لیا کرتے، لہٰذا ''قبالہ'' نہ تو محصول کی اس رقم میں کوئی تبدیلی کرتا ہے جو ریاست کسی جماعت سے وصول کرتی ہے اور نہ اس بات میں کوئی رکاوٹ پیدا کرتا ہے کہ حکومت کے نمائندے اس جماعت سے براہ راست محاصل وصول کر لیں ۔ اس کے برعکس محاصل کا ٹھیکیدار (ضامن) وہ فرد واحد ہوتا ہے جو ایک ہی وقت میں ایک یا ایک سے زائد صوبوں کی طرف سے چند مقررہ سالوں تک ایک طے شدہ رقم ریاست کو سالانہ ادا کرتا ہے جو تشخیص کردہ لگان سے کم ہوتی ہے اور پھر بجائے خود اس رقم کی وصولی کا انتظام اپنے ذمے لیتا ہے اور اس کی رقم مع منافع اسے واپس مل جاتی ہے ۔ اس طریقے کے اختیار کرنے میں گو ریاست کا یہ فائدہ ہے کہ اسے چند دولت مند آدمیوں سے فوری طور پر یک مشت پوری رقم مل جاتی ہے، لیکن اس طریقے میں ریاست کا ایک نقصان یہ ہے کہ جو رقم اصل محصول دینے والوں سے وصول ہوتی ہے اس کا صرف کچھ حصہ اس کے ہاتھ میں آتا ہے اور دوسرا نقصان یہ کہ ٹھیکے کی مدت میں ریاست اور رعایا کے درمیان براہ راست تعلق قائم نہیں رہتا ۔ جہاں تک ''جَہْبَذَہ'' کا تعلق ہے تو وہ ''ضامن'' بھی ہو سکتا ہے، لیکن اسے بیک وقت

سرکاری افسر زرمبادلہ اور ضامن کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ وہ بذریعۂ مبادلہ ان کھوٹے اور کورے سکوں کی صحت کی تصدیق بھی کرتا ہے جو بطور لگان ادا کنندہ ادا کرتا ہے اور انھیں ایک معیار پر بھی لاتا ہے اور اس کام کے لیے اسے محاصل کی کچھ فی صد رقم ملتی ہے، جو محاصل ادا کرنے والوں سے بطور اضافی محصول کے وصول کی جاتی ہے۔

مزید برآں ان علاقوں کے باہر جن پر معمولی لگان عائد تھے، خواہ وہ براہ راست وصول کیے جاتے تھے یا ٹھیکے کے ذریعے، کچھ علاقے ایسے بھی تھے جہاں حکومت نے اپنے بنیادی حقوق میں سے کچھ چیزیں چھوڑ بھی رکھی تھیں۔ بعض علاقوں (اِغار) میں ریاست اپنے محصّل نہیں بھیجتی تھی اور وہاں کی تحصیل فوجی سالار پر چھوڑ دی جاتی تھی تاکہ وہ اس سے اپنی فوج کے اخراجات پورے کر سکے۔ دوسرے علاقوں (مُقاطعہ: یاد رہے کہ یہ "اقطاع" [رک بآں] سے بالکل علیحدہ چیز ہے) میں ریاست صرف اسی محصول پر اکتفا کرتی تھی جس کا باہمی تصفیہ ہو جاتا اور محاصل کے نظری اصولوں کو نظر انداز کر دیتی تھی۔ یہ صورت حال دورِ قدیم کے "عہد" کے مطابق تھی اور اس کا اطلاق خصوصیت سے ان علاقوں کے باجگزار فرمانرواؤں پر ہوتا تھا جو پورے طور سے مطیع نہیں ہوئے تھے۔ اقطاع کی حیثیت کسی مالی نظام کی نہیں تھی، بلکہ اپنی اصلی شکل میں سرکاری اراضی پر ایک قسم کی رعایت تھی جو عُشر کی ادائی کے تابع ہوتی تھی، لیکن آگے چل کر "خراج" والے اضلاع میں ریاست کے مالی حقوق فوجی افسروں کے نام منتقل کر دیے گئے جو ان کے مشاہروں کے برابر تھے۔ شروع میں حقوق کی یہ منتقلی اس شرط پر تھی کہ یہ لوگ "عُشر" ادا کریں گے لیکن بعد میں اس کے لیے فوجی ملازم ہونے کے علاوہ ہر شرط اٹھا لی گئی (دیکھیے Cl. Cahen : '*L'évolution de l'iqtâ*'، در *Annales ESC*، ۱۹۵۳ء)۔ سرکاری مالگزاری کے انتقال کے ان مختلف طریقوں کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ خزانے کے مداخل میں کمی آ گئی، لیکن آمدنی کی کمی کے ساتھ ساتھ اخراجات میں بھی اتنی تخفیف ہو جاتی تھی کہ مجموعی طور پر صورت حال سابق سے کچھ مختلف نہیں ہوتی تھی، اس لیے کہ بہر صورت کسی صوبے کے وصول شدہ محاصل صوبے کے مقامی اخراجات منہا کیے بغیر بیت المال کو نہیں بھیجے جاتے تھے۔ ریاست کو اس سے یہ نقصان پہنچتا تھا کہ مختلف علاقوں میں انتقال مالگزاری کے ان مختلف طریقوں پر جس حد تک عملدرآمد ہوتا اسی حد تک مالیاتی اعتبار سے اس کا اثر اور اقتدار وہاں کم ہوتا جاتا اور اس کے لیے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں رہتا تھا کہ کسی علاقے کی آمدنی کے وسائل میں کیا اضافہ ہو گیا ہے۔

لیکن ریاست اس نقصان اور خطرے سے بچنے کی معقول تدبیریں کرتی تھی۔ وسائل کے گھٹنے بڑھنے کا اندازہ اوّل تو مجموعی میزانیہ سے ہو جاتا تھا اور دوسرے روز مرّہ کے ان اجتماعات میں جہاں قدیم رواج کے مطابق زمینوں کی تفصیلی تشخیص، مالگزاری اور ان کی مالیت سے بحث کی جاتی تھی۔ یہی صورت جزیہ اور غالباً زکوٰۃ کے ادا کرنے والوں کے معاملے میں بھی پیش آتی تھی۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس جو بہترین مثال محفوظ ہے وہ ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں "قُسُوم" کی ہے (*Arabica*، ۱۹۵۶ء)، لیکن ہمیں مجموعی طور پر ایران میں صوبۂ قُمّ کے "عراقی سواد" کے متعلق اور اس کے نظم و نسق کے طریقوں کے متعلق جو کچھ معلوم ہے اسے دیکھ کر کسی قسم کا شک و شبہہ باقی نہیں رہ جاتا کہ عبّاسی دور میں ہر جگہ انھیں کے متوازی انتظامات

موجود تھے ۔ ہر مالی وحدت کی قیمت پر نظر ڈالی جاتی اور اس کی تشخیص (''عِبْرہ'') ہوتی تھی جو نظر ثانی ہونے تک سند کا کام دیتی تھی، اگرچہ قدرتی طور پر نظم و نسق کو بھی سال بہ سال ہونے والی تبدیلیوں پر نظر رکھنا پڑتی تھی ۔ مختلف تصانیف مثلاً مفاتیح العلوم اور مصری اوراقِ بردی سے ایک بالکل دوسرے طریق پر ہمیں ان محاصل کی جو روزانہ واپس کیے جاتے تھے اور ان مراعات کی جو محاصل ادا کرنے والوں کی دی جاتی تھیں صحت کا پتا چلتا ہے ۔ بقایا پوری احتیاط کے ساتھ رجسٹروں میں درج کیے جاتے اور انھیں آئندہ سالوں میں وصول کیا جاتا، حالانکہ عملی طور پر یہ بھی ہوتا تھا اور ایسا ہونا ضروری تھا کہ جب بقایا کی رقم بہت زیادہ ہو جاتی تو اس کا تصفیہ باہمی سمجھوتے سے کر لیا جاتا۔

محاصل کی وصولی کے لیے دو مختلف قسم کی تقویموں میں امتیاز ضروری سمجھا گیا تھا اس لیے کہ صرف شخصی محاصل یا ٹھیکے سے تعلق رکھنے والی ادائیاں تو قانونی طور پر قمری تقویموں کے مطابق ہو سکتی تھیں، لیکن زمین اور اس کی پیداوار پر عائد شدہ محاصل لازماً ایرانی یا مصری شمسی تقاویم کے مطابق وصول کیے جاتے تھے۔

ان طریقوں کی وجہ سے جو کُتّاب اور حُسّاب کے لیے باعث فخر تھے خلافت عباسیہ کو چوتھی صدی ہجری/دسواں صدی عیسوی کے شروع تک، اور بعض علاقائی فرمانرواؤں کو اس تاریخ کے بعد بھی، یہ آسانی تھی کہ وہ کم از کم وصولیوں کا صحیح اور مکمل میزانیہ تیار کر سکیں (بعض فرمانروایان وقت خرچ کے سلسلے میں اتنے بے اصولے اور مُسرف تھے کہ تخمینہ قائم کرنا ناممکن ہو جاتا تھا) ۔ چار عباسی میزانیے خاص طور سے اب بھی محفوظ ہیں جو بلا شبہہ نہایت محفوظ سرکاری دستاویزات پر مبنی ہیں ۔ ان میں باہمی توافق یہ ثابت کرتا ہے کہ تمام تفصیلات میں نہ سہی لیکن اکثر ضروری چیزوں میں ان کی صحت اور درستی پر یقین کیا جا سکتا ہے ۔ ان میزانیوں سے خلافت کی جملہ وصول کا پتا نہیں چلتا، اس لیے کہ جزیہ، زکوٰۃ اور مُکُوس کا ذکر ان میں صرف کہیں کہیں کیا گیا ہے (کیونکہ ایک تو ان کی حیثیت میں خاصا اختلاف ہے دوسرے وہ بظاہر ایک شعبے سے جاری نہیں کیے گئے) ۔ میزانیے جس صورت میں ہم تک پہنچے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں کل آمدنی چالیس کروڑ درہم سے زیادہ تھی، جو آئندہ صدی کے شروع میں کم ہو کر تیس کروڑ درہم رہ گئی؛ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے آغاز میں یہ ایک کروڑ پینتالیس لاکھ دینار تھی، جو قریب قریب اکیس کروڑ درہم کے برابر ہوتی ہے ۔ محاصل کی وصولی میں یہ کمی اس لیے نظر آتی ہے کہ علاقے برابر خلافت کے ہاتھ سے نکلتے رہے ۔ یہ کمی، بہ استثنائے بعض بحرانی حالات، صوبوں میں سرکاری مالگزاری میں کمی آ جانے کی وجہ سے نہیں تھی؛ لہٰذا خلافت کی بڑھتی ہوئی مالی مشکلات کسی عظیم اقتصادی حادثے کا نتیجہ نہیں تھیں ۔ ہمارے علم میں کوئی ایسی بات نہیں جسے ہم اس مفروضے کی بنیاد بنا سکیں ۔ اس کی وجہ مقابلۃً ضروری اخراجات اور خاص کر فوجی اخراجات میں اضافہ تھا، جنھیں صوبائی آمدنی کی کمی کے تناسب کے لحاظ سے کم کرنا ناممکن تھا ۔ یہاں ہم خلافت کے فوجی نظام کی تمام تفصیلات دیے بغیر اس اقتصادی بوجھ کی طرف اشارہ کریں گے جو فوج کی خاطر اسے برداشت کرنا پڑا ۔ عام طور سے ایک پیادہ سپاہی کی تنخواہ ایک ہزار درہم سالانہ تھی ۔ سوار کی اس سے دو چند

تھی۔ یوں گویا پچاس ہزار فوجیوں کی صرف تنخواہ ہی تنخواہ ساڑھے سات کروڑ درہم سالانہ بنتی تھی۔ اس رقم میں فوجی افسروں کے غیر معمولی مشاہروں، عطایا و انعامات؛ فوج کو ساز و سامان سے مسلح رکھنے اور کھانے پینے اور قلعہ بندی کے مصارف بھی شامل کر لیجیے۔ ایک مصنّف کا کہنا ہے کہ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے وسط میں افواج کا خرچ بیس کروڑ درہم تھا۔ اس کے معنی یہ ہوے کہ اس وقت تمام شہری اخراجات کے لیے اس رقم کا صرف نصف بچتا ہوگا (ان میں وہ محاصل شامل نہیں جن کا میزانیے میں ذکر نہیں ملتا)۔ یہ خرچ کتنا تھا، اس کا پتا چلانا مشکل ہے، اگرچہ ہمیں عباسی اور فاطمی حکومتوں اور عدلیہ کے بڑے [illegible] مشاہروں کا علم ہے (دیکھیے بالخصوص صابی: الوزراء؛ المقریزی: خطط، ۲: ۱۰۴).

مرکزی نظام مالیات کے متعدد شعبوں کی تفصیلات بیان کرنا مشکل ہے، اس لیے کہ ان کے ذکر میں اکثر اوقات مختلف اصطلاحوں کو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور مختلف عنوانات کے تحت مختلف چیزوں کے ذکر نے انہیں آپس میں خلط ملط کر دیا ہے۔ مالیاتی نظم و نسق بنیادی طور پر ''دیوان'' کا فریضہ تھا اور بعد میں جب وزارت نے ایک منظّم اور واضح صورت اختیار کر لی تو عام طور سے یہ کام اس کے ذمّے ہو گیا؛ لیکن کسی ایک محکمے یا شعبے کے لیے یہ بات ممکن نہیں تھی کہ وہ بیک وقت دو طرح کے کاموں سے عہدہ برآ ہو سکے اور تشخیص و تحصیل کے بنیادی قواعد (اصول) اور آمد و خرچ کے روزمرہ حسابات صحیح طرح رکھ سکے۔ گو اس معاملے میں اختلاف ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ ''دیوان الزِّمام'' کا ادارہ، جسے آئندہ چل کر مشرق میں ''اَسْتِیفاء'' کا نام ملا (اس کا سربراہ ''مستوفی'' کہلاتا تھا)، دفتر محاسبہ سے مطابقت رکھتا ہے۔ المہدی کے عہد سے وہ نہ صرف ان تمام احتسابی خدمات کا نگران ہوا کرتا تھا جو ہر ''دیوان'' سے متعلق اور وابستہ تھیں بلکہ ان خدمات کا بھی جو صوبائی نظم سے متعلق تھیں۔ اخراجات ایک الگ دیوان کا دائرۂ عمل تھا، جو ''دِیْوانُ النَّفَقات'' کہلاتا تھا۔ فوج سے تعلق رکھنے والے اخراجات ''دیوانُ الجَیْش'' کی تحویل میں تھے۔ مالی ''اقطاع'' کے نظام کے اجرا کے ساتھ اس مؤخر الذکر دیوان کے پاس محاصل کی وصولی کی رسیدوں کے مثنّے بھی رہتے تھے۔ ''بیت المال'' کو یہ نام اس لیے دیا گیا تھا کہ تمام آمدنی اس کے سپرد کی جاتی تھی اور جس میں سے تمام اخراجات کے لیے روپیہ حاصل کیا جاتا تھا۔ ان دفتروں میں کارکنوں کی بہت بڑی تعداد کام کرتی تھی، جنھیں ''کُتّاب'' اور ''حُسّاب'' کہتے تھے۔ ان میں سے بعض دوسروں کے زیر نگرانی کام کرتے تھے اور فنِ احتساب کی وہ تمام مصطلحات استعمال کرتے تھے جو بنو بُوَیہ کے عہد کے عالمانہ رسائل کے ذریعے ہمارے علم میں آئی ہیں۔ اعداد و شمار کے بجاے یہ لوگ وہ حروف استعمال کرتے تھے جو ''دیوانی رسم الخط'' کے نام سے موسوم تھے۔ یہ رسم الخط حروف اور بعض مخصوص علامتوں سے مرکب تھا جو اعداد کے ناموں کو مختصر کر کے بنائی گئی تھیں اور جو عربی اعداد کے بجاے آج بھی بعض ممالک میں مستعمل ہیں [مثلاً عــــ = عشرہ = دس].

خدمات اس کے علاوہ بھی مختلف شاخوں میں منقسم تھیں، خصوصاً جہاں تک زمینوں کے محاصل وصول کرنے کا تعلق تھا؛ مثلاً ملازموں کی ایک قسم وہ تھی جو ''خراج'' کے لیے مخصوص تھی اور دوسری وہ جو ''ضِیاع'' کے لیے مخصوص تھی۔ اس کے

علاوہ ایک علاقہ وار تقسیم بھی پیدا ہو گئی تھی جس کی مثال ہمیں ''دیوان سَواد'' (بغداد کا صوبہ) کی صورت میں ملتی ہے اور یہ یہی مشرق اور مغرب کے عرب علاقوں میں منقسم ہے۔ ضبط شدہ جائدادوں کا انتظام ایک الگ محکمہ کرتا تھا۔ ان جائدادوں میں سے بعض واپس کر دی جاتی تھیں اور بعض تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ مزید برآں جو ادائیاں جنس کی شکل میں کی جاتی تھیں، جو تحائف اور عطایا وصول ہوتے تھے، طراز وغیرہ کی بیش قیمت پیداواریں، خزائن یا مخازن میں جمع کی جاتی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کے بعد کے نظم و نسق میں ''مخزن'' کی عمومی اصطلاح نے ''بیت المال'' کی جگہ لے لی تھی۔ نام کی یہ تبدیلی بلاشبہہ واضح طور پر ظاہر کرتی ہے کہ نقدی کی شکل میں مالی وصولی میں کمی آ گئی تھی اور اسی نسبت سے اجناس کی شکل میں وصولی بڑھ گئی تھی۔

بہر کیف مسلم ریاست میں یہ امتیاز قائم رہا کہ خلیفہ یا سلطان کے شخصی خزانے کو ''بیت مال الخاصہ'' اور خزانۂ عامرہ کو ''بیت مال المسلمین''، یا صرف ''بیت المال'' کہا جاتا تھا؛ لیکن یہ امتیاز بہت زیادہ سخت نہ تھا، کیونکہ شخصی خزانے میں فرمانروائے وقت کی ذاتی جائدادوں سے وصول ہونے والی رقموں کے علاوہ بعض عمومی محاصل بھی داخل کر دیے جاتے تھے، مثلاً جرمانے، ضبطیاں، اور انفرادی محاصل اور وہ محاصل جو جنوبی ایران کے بعض صوبوں سے وصول ہوتے تھے۔ یہ بات اوّل تو اس لیے کی جاتی تھی کہ ضروریات دربار اور کارہائے خیر کے لیے، جو خلیفہ یا اس کے جانشینوں کو سر انجام دینے ہوتے تھے، روپے کی ضرورت ہوتی تھی۔ خلیفہ کی حیثیت خواہ کچھ بھی ہو، عملاً اس کا ذاتی یا خاصہ کا روپیہ خزانۂ عامرہ کے لیے ایک طرح کے محفوظ سرمائے کا کام دیتا تھا، جس میں سے پیشگیاں نکالی جاتی تھیں، خواہ وہ بعد میں ادا کی جائیں یا نہ کی جائیں (W. Fischel : *'Le Bayt Māl al-Khāṣṣa'* در *'Actes du 20e Congrès des Orientalistes'*، ۱۹۳۸ء، ص ۳۲۸ تا ۵۳۱)۔

چھوٹے پیمانے پر ہر صوبے کا ایک علیحدہ نظام تھا، جس کا ڈھانچا مرکزی حکومت کے نظام کے مطابق ہوتا تھا۔ صوبے اپنی ساری کی ساری آمدنی مرکز کو نہیں بھیجتے تھے بلکہ مقامی ضروریات تسلی بخش طور پر پوری کرنے کے بعد جو رقم بچ نکلتی بھیج دی جاتی تھی۔ دوسرے یہ کہ صوبے یہ بقایا رقم بھی وصولی کے ساتھ ساتھ مرکز کو نہیں بھیجتے رہتے تھے بلکہ جب بہت سی جمع ہو جاتی تو بھیج دیتے تھے اور جب ریاست کو کوئی فوری اور شدید ضرورت پیش آ جاتی تو ''عامل'' ہنڈیاں بھیج دیتا اور رقوم موصولہ کی ادائی کا ضامن ہوتا اور ''دیوان'' ان ہنڈیوں کی بنیاد پر اپنے قرض خواہوں سے تصفیہ کر لیتا۔ صوبائی مالی انتظام کی مکمل آزادی ان اسباب میں سے ایک ہے جن سے پتا چلتا ہے کہ خود مختار حکومتیں مختلف علاقوں میں کیونکر بغیر کسی دقت اور پیچیدگی کے اپنے آپ کو مضبوط بنیادوں پر قائم و استوار کر لیتی تھیں۔

ریاست، ماتحت حکمرانوں اور محصول ادا کرنے والوں کے مفادات کی بنا پر مختلف اوقات او مختلف مقامات میں نقد ادائیوں اور ان ادائیوں کے تناسب میں جو جنس کی صورت میں ادا کی جاتی تھیں فرق واقع ہوتا رہا۔ مزید برآں بلادِ مشرق تو اپنے محاصل چاندی کی شکل میں ادا کرتے تھے اور بحیرۂ رو کے کنارے کے علاقے سونے کی شکل میں۔ اس نتیجہ یہ ہوا کہ مالیاتی دفاتر کی ابتدائی حساب دار

دو مختلف شکلوں میں رکھی جاتی تھی۔ تیسری صدی ھجری / نویں صدی عیسوی کے اواخر میں سونے کے معیار کی بنیاد پر ایک متحدہ حساب داری کا نظام قائم کرنے کی کوشش کی گئی اور قانونی طور پر درھم کے مبادلے کی شرح بھی مقرر کر دی گئی اور مختلف اجناس کی قیمتوں کی فہرست بھی مرتب ھوئی۔ اس طرح میزانیے کے تخمینے زیادہ صحت کے ساتھ تیار کیے جا سکتے تھے۔

چونکہ تشخیصِ محاصل کے اصول کی بنیاد تحصیل محاصل کے وہ طریقے تھے جو امّت مسلمہ کے ابتدائی زمانے میں رائج تھے اس لیے نظری طور پر کبھی یہ اصول تسلیم نہیں کیا گیا کہ مالیے کی تمام کی تمام رقم بلا امتیاز ہر قسم کے اخراجات پر خرچ کی جا سکتی ھے؛ مثلاً اسی نظریے کی رو سے زکوٰۃ، جو ایک خالص اسلامی ٹیکس تھا، صرف قرآن مجید کی بیان کردہ مدات پر، جیسے خیرات، جہاد، مسلمان غلاموں کے آزاد کرانے اور مساکین اور مسافروں کو سہولتیں بہم پہنچانے پر خرچ ھونی چاھیے۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ھے کہ اس تفریق یا امتیاز کو عملاً کس حد تک قائم رکھا جاتا تھا اور ایسے حالات میں کہ ملک و ملّت کسی نازک صورت حال سے دو چار ھو ان کے قائم رکھنے کی کیا صورت ھوتی تھی۔ آمدنی کے جن ذرائع کے متعلق یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ھے کہ وہ شریعت یا قانون کے احکام کے مطابق خرچ کیے جاتے تھے وہ ''اوقاف'' اور ''حبوس'' وغیرہ تھے، جن کی حیثیت عطیات کی تھی۔ گو ان مدّات کا تعلق خزانۂ عامرہ کے محاصل سے نہ تھا لیکن حکومت ان پر کڑی نگرانی رکھتی تھی اور اس سلسلے میں قاضی کا توسط اختیار کیا جاتا تھا تاکہ ان کا غلط یا بےجا استعمال نہ ھو۔

چوتھی صدی ھجری/دسویں صدی عیسوی سے مالی ''اقطاع'' کے نظام میں پھیلاؤ پیدا ھونا شروع ھوا تو مالی نظام کی اھمیت میں کمی آتی گئی۔ اس سے ریاست کے براہِ راست ذرائع آمدنی کو بھی بہت نقصان پہنچا۔ یہاں ان مسلم آزاد ریاستوں کی تاریخ بیان کرنا بے محل ھے جو خلافت عباسیہ کے بعد وجود میں آئیں۔ صرف اتنا بتا دینا کافی ھوگا کہ عہدِ حاضر تک ان تمام ممالک میں جو مغول کے حملے سے متاثر نہیں ھوئے محصول دینے کا طریقہ اور نظام قریب قریب وھی رھا اور ریاست کے حقوق میں صرف جزوی طور پر تبدیلی ھوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ تشخیص اور میزانیے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور قائم اور باقی رھا۔ جو ممالک ساتویں صدی ھجری / تیرھویں صدی عیسوی میں مغل سلطنت میں شامل ھو گئے (حکومت میں بعد کو جو تبدیلیاں ھوتی رھیں ان کو چھوڑ کر) وھاں مالیاتی نظم و نسق کا ایک ایسا نظام رائج ھوا جو سلطانوں کی روایات اور ان جدید نظریات کا مرکب تھا جو فاتحین سے ان ملکوں کو ملے۔ اسی قسم کے نظریات کا رواج ایشیائے کوچک میں بھی ھوا، جہاں اس کے علاوہ اب تک کچھ بوزنطی روایات بھی موجود تھیں جو سلجوقیوں کے مقامی قوانین و ضوابط میں شیر و شکر ھو گئی تھیں؛ ان تینوں چیزوں نے مل کر مستقبل کے عثمانی اداروں کی ترکیب یا ساخت پر اثر ڈالا، گو یہ اثر ایک ایسے انداز سے پڑا کہ اس کا پتا چلانا آسان نہیں۔ ان سے مالی مداخل کی کمی اور اس سے پیدا ھونے والے اقتصادی انحطاط کا اندازہ لگایا گیا ھے، لیکن ان اعداد و شمار سے واضح طور پر جو نتیجے نکلتے ھیں وہ یہ ھیں: اولاً براہ راست ریاست کو وصول ھونے والے محاصل اور مختلف افراد کے نام منتقل کیے گئے محاصل

میں باہمی تناسب کیا تھا اور دوسرے رائج الوقت سکے کی قیمت اور اشیا کے بازاری نرخ کیا تھے؟ لیکن مناسب یہی ہے کہ اس موقع پر کوئی مثبت نتیجہ نکالنے کے بجائے سکوت اختیار کیا جائے۔

مآخذ: یہاں ہم قدرتی طور پر اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے کہ بعض ایسے مآخذ کا ذکر کر دیں جو خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مآخذ کے لیے حوالجات Caetani کی *Annali*، ۳: ۳۶۸ تا ۳۱۷ میں ملیں گے؛ نیز ابو عُبَید بن سلّام کی کتاب الاموال میں (دیکھیے عطاء)۔ ان حوالوں میں سے بیشتر "خراج" پر لکھی ہوئی تصانیف سے لیے گئے ہیں، جو عباسی دَور کی پہلی صدی میں ابو یوسف اور یحیٰی بن آدم نے تالیف کی تھیں (جن کا انگریزی میں موشّح ترجمہ از A. Ben Shemesh، ۱۹۵۸ء میں لائڈن سے شائع ہوا)، اور بعد میں بلاذری کی کتاب الفتوح سے؛ قُدامة کی کتاب الخراج سے (جو تمام کی تمام محفوظ نہیں)، طبع A. Makki: ایک ٹائپ شدہ مقالہ، Sorbonne پیرس؛ اور خوارزمی کی مفاتیح العلوم میں منتشر معلومات چوتھی / دسویں صدی سے بعد کی، اور ماوردی کی الاحکام السلطانیہ، پانچویں / گیارھویں صدی کے بعد کی۔ میزانیے، جن کا A.V. Kremer نے اپنی *Kulturgeschichte des Orients*، ج ۱، باب ۷ اور *Das Einnahmebudget . . . vom Jahre 306* (*Denkschr. d. k. Akad. d. W. Wien, Ph.-Hist. Kl.*، ۱۸۸۸ء) (قدیم ترین اب الجہشیاری Djahshiyari کی کتاب الوزراء، طبع Mzik، ص ۱۷۹ تا ۱۸۲ یا قاہرہ ۱۹۳۸ء، ص ۲۸۱ تا ۲۸۸ میں مل سکتے ہیں) مطالعہ کیا ہے، متعدد سرگزشتوں یا تواریخ سے حاصل کیے گئے ہیں۔ بنو بویہ کے عہد سے متعلق بوزجانی کے مالیاتی ریاضی پر عالمانہ رسائل ہیں (یہ صالح العلی، بغداد کے زیر تصنیف و تحقیق ہیں) اور کتاب الحاوی کا جس کا مصنّف نا معلوم ہے (اس کا تجزیہ اور تحشیہ میں نے AEIO، جلد ۱۰، ۱۹۵۲ء میں کیا ہے)۔ مصری کاغذات، طبع A. Grohmann سے خاص معلومات مل سکتی ہیں، دیکھیے: *Archiv Orientalny*، جلد ۵ تا ۶، ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں مقالات پر اس کے حواشی اور تبصرے اور ZDMG میں C. Leyerer کے حواشی۔ تاریخی سوانح اور تصانیف میں سب سے زیادہ بیش قیمت ابن مسکویہ: تجارب الامم، مع ضمیمہ از روذروری Rudhrawari؛ ہلال الصّابی: کتاب الوزراء اور حسن بن محمد قُمّی: تاریخ قم، جن سے A.K.S. Lambton نے اپنی کتاب *Landlord and Peasant in Persia*، آکسفرڈ ۱۹۵۳ء میں بہت استفادہ کیا ہے، بالخصوص باب دوم میں۔ بعض سرکاری رسائل، جیسے بویہی وزیر ابن عبّاد کے رسائل، طبع عبدالوہاب عزّام و شوقی ضیف، ۱۹۴۷ء کا مطالعہ خاصہ منفعت بخش رہے گا۔ اس سے بعد کے دَور کے لیے جدید تصنیفات کافی ہوں گی۔ ایّوبی عہد کے لیے ابن مَمّاتی: قوانین الدواوین (طبع عطیہ، ۱۹۴۳ء) کے علاوہ عثمان ابراہیم النابلسی کی چھوٹی چھوٹی تصانیف *Description of Faiyum*، دیکھیے میرا تجزیہ، در *Arabica*، ۱۹۵۶ء، اور لُمع القوانین، جس کا اڈیشن میں نے ہی تیار کیا ہے)، منگولوں کے لیے عبداللہ بن کیا المازندرانی: "رسالۂ فلکیہ، طبع S.W. Hinz، اور اس کا جائزہ وہی مصنف، در *Der Islam*، جلد ۲۹، ۱۹۴۹ء؛ یمن کے لیے R.B. Serjeant اور راقم مقالہ مل کر نویں/پندرھویں صدی کی ایک بیش قیمت کتاب ملخّص الفِطَن شائع کریں گے (قب *Arabica*، ۱۹۵۷ء، ۴: ۲۳ ببعد)۔ مصر کے لیے بالعموم اور مملوکوں کے عہد کے لیے بالخصوص مقریزی: خطط اور قلقشندی: صبح الاعشٰی پر زور دینے کی ضرورت نہیں۔

اسلامی دنیا کی کوئی مالیاتی تاریخ موجود نہیں ہے؛ لیکن جزوی مطالعے کی چیزیں ضرور موجود ہیں۔ اصول کے عہد کے لیے خاص طور پر دیکھیے: *Conversion and the Poll-Tax in* : D. C. Dennett *early Islam*، ۱۹۵۰ء؛ جملہ کلاسیکی عہد کے لیے

دیکھیے: Fr. Lokkegaard کی *Islamic Taxation in the classic Period*، ۱۹۵۱ء (ایک عظیم دستاویزی اور نئی کوشش لیکن سب کی سب یکساں قابل اعتماد نہیں) ان کے ان کاموں کا ذکر کرتی ہے جو ان کے وقت میں تو ضرور اہم تھے لیکن اب متروک ہو چکے ہیں؛ C. Becker وغیرہ کی اور Mez کی باب ۸ (قب ۶)، در *Renaissance*؛ D. Sourdel کا سوربون یونیورسٹی میں *Le vizirat 'abbaside* پر مقالہ جب وہ شائع ہو جائے تو مفید معلومات حاصل ہونگی۔ مزید مخصوص علمی چیزوں میں علاوہ ان کے جن کا ذکر اس مقالے کے دوران میں آ چکا ہے دیکھیے: W. Fischel : *Origin of Banking in Medieval Islam*، در *JRAS*، ۱۹۳۳ء اور H. Gottschalk : *Die Madarāiyyūn*۔ کلاسیکی اصول کی شرح مثلاً S. A. Siddiqi : *Public Finance in Islam*، کراچی ۱۹۴۸ء، سے معلوم کی جا سکتی ہے [نیز اردو میں سید یعقوب شاہ: اسلام کا مالیاتی نظام، لاہور]۔

سلطنت عثمانیہ میں سلطان کے ذاتی خزانے (''خزانۂ اندرون'' یا اِچ خزانہ) اور حکومت کے خزانے (''خزانۂ امیریّہ''، ''خزانۂ دولت''، ''خزانۂ عامرہ'' وغیرہ) کے درمیان بڑی احتیاط سے امتیاز قائم رکھا جاتا ہے۔ عثمانی خزانے اور مالیات کے متعلق رِک بہ دفتردار، خزانہ اور مالیہ۔ خزانۂ عامرہ کے لیے عام طور سے ''میری'' کی اصطلاح (''امیری'' سے) استعمال کی جاتی تھی، جو زیادہ وسیع معنوں میں سرکاری جائداد کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی (قب بیلک Beylik)۔ عثمانی نظم و نسق سے تعلق رکھنے والی دستاویزات میں خزانے کو عام طور سے ''بیلک المال'' نہیں کہا جاتا اگرچہ یہ بھی اصطلاح عام طور سے ''بیت المال مسلمین'' یا ''بیت المال عامّہ'' کی شکل میں ملتی ہے (مثلاً ابو السّعود کے قانونی فیصلوں میں، جنہیں عمر لطفی برکن نے تنظیمات، استانبول ۱۹۴۰ء، ص ۳۳۳، ۳۳۹، ۳۴۳ میں نقل کیا ہے، اور بعض قانون ناموں میں جو برکن Barkan : *Kanunlar*، ص ۲۹۷، ۳۰۰، ۳۲۹ میں شائع ہوئے ہیں۔ ان سب موقعوں پر زمین کی دوسری اقسام مثلاً ''ارضِ میری'' یا ''ارضِ مملکت'' کے مقابلے میں ''بیت المال'' کے حقوق کا ذکر آیا ہے۔ عام عثمانی استعمال میں ''بیت المال'' کی اصطلاح محاصل کی صرف بعض قسموں کے لیے مستعمل تھی، جو قانوناً خزانۂ عامرہ کی ملکیت ہوتے تھے۔ اس میں ضبط شدہ جائدادیں، لاوارث جائدادیں اور ایسی جائدادیں شامل تھیں جن کا کوئی دعویدار نہ ہو۔ جائداد کی ان قسموں کا ذکر اور تفصیل بہت سی سرکاری دستاویزات میں ملتی ہے۔ ان میں زیادہ اہم مفقود الخبر اور غائب لوگوں کی جائدادیں تھیں (''مالِ غائب'' اور ''مالِ مفقود'') یا ایسی جائدادیں جن کا کوئی دعویدار اور وارث نہ ہو (''مخلّفات''، ''متروکات'')؛ مفرور غلام یا بھٹکے ہوئے مویشی (''عبدِ آبق''، ''کچکون''، ''یاوہ'') بھی اسی ضمن میں آتے تھے۔ ان جائدادوں کی نگہداشت اور ان کی آمدنی کا جمع کرنا ایک خاص افسر کے سپرد ہوتا تھا جو ''امین بیت المال'' یا ''بیت المالجی'' کہلاتا تھا۔ بیشتر قانونی ماخذ اس پر متفق ہیں کہ ایسے ورثے جن کا کوئی دعویدار نہ ہو ایک وقت خاص تک محفوظ رکھے جائیں گے۔ وہ مختلف ناموں سے امانت متصوّر ہوں گے تاکہ ورثہ کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنا حقِ وراثت ظاہر اور ثابت کریں۔ صرف حق ثابت نہ کر سکنے کی صورت میں نقدی یا جائداد خزانے کی ملکیت متصوّر ہوگی۔ اس طرح کی اکثر شکایات موجود ہیں کہ ان قواعد کی پابندی نہیں ہوتی تھی اور جائداد پر بہت جلد اور بلا تفتیش و تحقیق قبضہ کر لیا جاتا تھا (مثلاً لطفی

باشا : آصاف نامہ، طبع و ترجمہ R. Tschudi، برلن ۱۹۱۰ء، متن ص ۱۰، ترجمہ ص ۱۲؛ قب سری محمد پاشا : نصائح الوزراء، طبع و ترجمہ W. L. Wright، پرنسٹن ۱۹۳۵ء، ص ۷۱.

عثمانی قانون ناموں میں ان جائدادوں کا دعوی کرنے اور ان سے حاصل شدہ منافع کو قانونی طور پر کسی کے نام منتقل کرنے کے متعلق نہایت واضح اور مفصل ہدایات موجود ہیں ۔ جن جائدادوں کے متعلق بیت المال کی طرف سے دعوی کیا جاتا تھا وہ اکثر اوقات ''عاملوں''، ''سنجاق بیگوں'' اور ''سپاہیوں'' تک کے نام پر منتقل کر دی جاتی تھیں ۔ محمد ثانی کا ایک فرمان مورخہ ۸۸۳ھ/ ۱۴۷۹ء موجود ہے، جس میں دس ہزار اسپروں (Aspers) سے کم قیمت کی جائدادوں اور دس ہزار سے زائد قیمت کی جائدادوں کے انتقالات میں فرق کیا گیا ہے ۔ پہلی قسم کی جائدادیں عاملوں یا محاصل کے افسروں کو دی جاتی تھیں اور مؤخر الذکر شاہی خزانے (بیلک Beylik) کے لیے مخصوص کر دی جاتی تھیں (Halil Inalcik : *Fatih* "*Sultan Mehmed*" *in Fermanlari Bell*، عدد ۴۴، ۱۹۴۷ء: ص ۶۹۹ تا ۷۰۰) ۔ اسی طرح کا ایک امتیاز پندرھویں صدی کے آخر کے قانون نامے میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے (Anhegger-Inalcik، ص ۷۰ تا ۷۱) اور سولھویں صدی سے بعد کے قانون ناموں اور رجسٹروں میں عام طور پر ملتے ہیں ۔ عام قاعدہ یہ تھا کہ اس قسم کی جائدادیں یا واجب الادا قیمتیں اگر ان کے صحیح دعویدار پیدا ہو جاتے تو خزانۂ عامرہ کی ملکیت سمجھی جاتی تھیں ۔ فی الواقع خزانے کا حصہ یا تو ان مدات تک محدود تھا جو دس ہزار اسپر یا اس سے زائد مالیت کی تھیں اور یا اس جائداد تک جو سلطان کے سپاہیوں اور دوسرے ملازمین سلطان کا ترکہ ہوتی تھیں ۔ اس سے پہلے کے زمانے میں اس فہرست میں ینی چری (Janissaries) بھی شامل تھے ۔ بقیہ جائدادیں سنجاق بیگ کے ''خاص'' کا حصہ سمجھی جاتی تھیں ۔ اس تقسیم میں بعض مستثنیات بھی تھیں ۔ ''آزاد تیماروں'' (serbest timār) میں بیت المال کے مداخل تیمار دار کے لیے مخصوص ہو جاتے تھے اور عام تیماروں کی طرح سلطان یا گورنر کے خاص کے لیے مخصوص نہیں ہوتے تھے ۔ وقف کی بعض زمینیں، بالخصوص جو حرمین کے حق میں ہوتی تھیں، وقف کی آمدنیوں میں داخل کی جاتی تھیں ۔ سولھویں صدی کے بعد سے تو ینی چریوں کا اپنا ایک خاص افسر ہوتا تھا جو اوجاق بیت المالجیسی (Odjak Bayt al-māldjīsī) کہلاتا تھا ۔ یہ گویا ایک طرح کا فوجی خازن ہوتا تھا، جس کے فرائض میں سے ایک فریضہ یہ بھی تھا کہ وہ لاوارث ینی چریوں (عجمی اوغلان) کے ''مخلّفات'' کی تشخیص اور تحصیل کرے ۔ یہ تحصیلات اور اسی طرح کی دوسری رقمیں فوجی صندوق میں رکھی جاتی تھیں (Ismail Hakkı Uzunçarsılı : *Osmanlı Devleti teşkilatın dan Kapukulu Ocakları*، انقرہ ۱۹۴۳ء، ص ۳۱۱ تا ۳۲۰) ۔ اجتماعی استحقاق کی ایک اور دلچسپ مثال بیت المقدس میں ملتی ہے، جہاں مغربی مجاوروں کے زاویے کو اجتماعی طور پر یہ استحقاق حاصل تھا کہ وہ اپنے میں سے کسی ایسے شخص کی مخلّفات (متروکات) کو جو لاوارث مر جائے اپنے قبضے میں رکھ سکتے تھے ۔ یہ حق انہیں سلطان صلاح الدین نے دیا تھا اور مملوک اور عثمانی سلاطین نے اس کی توثیق کی تھی (Basvekalet Arşivi, lapu register No. 427 of 932؛ قب A. S. Tition کی *Materials on Muslim Education in the Middle ages*، لنڈن ۱۹۵۷ء، ص ۱۲۳) ۔ اسی طرح کی رعایت غالباً ماؤنٹ ایتھاس

Mount Athos کے راہبوں کو بھی حاصل تھی (P. Lemerle و P. Wittek: *Recherches sur l'histoire et le statut des monastères athonites sous la domination turque, Archives du droit oriental*، ۱۹۳۸ء، ۳: ۲۳۳، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۶۵)۔

مآخذ: (۱) *Kânûnnâme-i Sulṭânî ber Mûceb-i ʿOsmânî*، طبع R. Anhegger و Halil Inalcik، انقرہ ۱۹۵۶ء، ص ۷۰ تا ۷۱؛ (۲) قانون نامۂ آلِ عثمان، در *TOEM*، تکملہ، ۱۳۲۹ھ، ص ۲۱، ۵۸، ۷۰ تا ۷۱؛ (۳) عثمانلی قانون نامہ‌لری، در *MTM*، ۱: ۷۵، ۹۱، ۳۲۱، ۳۳۳؛ (۴) احمد رفیق: عصرِ مجددیہ استانبول حیاتی، استانبول ۱۳۳۳ھ، ص ۹۱، ۱۰۲ تا ۱۱۱؛ (۵) Omer Lutfi Barkan: *Kanunlar*، بمدد اشاریہ؛ (۶) عبدالرحمان وفیق: تکالیف قواعدی، استانبول ۱۳۲۸ھ، ۱: ۶۶ تا ۶۸؛ (۷) D'Ohsson: *Tableau de l'Empire Ottoman*، ۷: ۱۳۴، ۲۳۰، ۲۶۰، ۳۱۸؛ (۸) Hammer: *Des osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung*، وی انا ۱۸۱۵ء، ۱: ۲۸۹ و بمدد اشاریہ؛ (۹) L. Fekete: *Die Siyaqat-Schrift*، جلد ۱، بوڈاپسٹ ۱۹۵۵ء، بمدد اشاریہ۔

(B. Lewis)

المغرب: جب تک المغرب اور الاندلس براہ راست بنو امیّہ اور خلفاے عباسیّہ کے نظم و نسق کے ماتحت رہے وہاں مالی نظم و نسق سے متعلق کسی طرح کے مسائل پیدا نہیں ہوے۔ مقامی بیت المال کی حیثیت دمشق یا بغداد کے مرکزی بیت المال کی ایک شاخ کی تھی؛ لیکن جب مسلم مغرب کا کوئی حصّہ مشرقی خلافت کے قبضے اور اقتدار سے باہر نکل جاتا تو وہاں جداگانہ نظم و نسق قائم ہو جاتا۔

مقدّمۂ ابن خلدون کے چند ابواب کے سوا، جو صرف نظم و نسق کے لیے مخصوص ہیں (مقدّمہ، مطبوعۂ قاہرہ، ص ۱۹۶)، کسی ایسے علمی رسالے کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی جس میں مالیاتِ عامّہ کے نظم و نسق یا کسی خاص وقت یا کسی خاص مقام کی مالی حالت کو پوری باقاعدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہو، لہٰذا ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ تاریخی سرگزشتوں اور منتشر دستاویزات میں جو معلومات ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں ان کی بنا پر ایک ہلکا سا تصور یا خاکہ پیش کریں۔

ب - الاَنْدَلُس: لیوی پروونسال E. Lévi-Provençal کی کتاب سے پتا چلتا ہے کہ اسلامی اندلس میں ''بیت المال'' کا لفظ ہمیشہ نہایت محدود معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس اصطلاح سے، جو حقیقت میں بَیْتُ مَالِ الْمُسْلِمِیْن کی شکل میں ملتی ہے، وہ خزانہ مراد ہے جس میں اوقاف کی آمدنی داخل ہوتی ہے اور یہ خزانہ حقیقت میں اس خزانۂ عامرہ سے بالکل الگ ہے جسے عام طور سے خزانۃ المال اور بہت ہی کم بیت المال بھی کہا جاتا ہے۔ قدرتی طور پر مقدّس اداروں (اَوقاف) کی آمدنی قاضی کے زیر نگرانی ہوتی تھی، جو اس کے نظم و نسق کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ یہ خزانہ کسی مذہبی عمارت میں رکھا جاتا تھا، مثلاً قُرْطُبَہ میں اس کی جگہ جامع مسجد کا ''مقصورہ'' تھا (ابن عذاری: البیان، ۲: ۹۸)۔ اس میں جو رقوم داخل ہوتی تھیں وہ زیادہ تر ان مقدّس اداروں (اوقاف) سے وصول ہوتی تھیں جو مقررہ اخراجات کے لیے مخصوص ہوتے تھے، لیکن اس میں بعض وہ بے ضابطہ آمدنیاں بھی رکھی جاتی تھیں جنھیں ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا تھا، بالخصوص غائب لوگوں کا مال، یعنی ایسے مسلمانوں کا مال جو کسی نہ کسی وجہ سے اپنے اموال چھوڑ گئے ہوں، لیکن ان کے انتظام وغیرہ سے متعلق کسی قسم کی کوئی قانونی یادداشت نہ چھوڑی ہو۔

صوبوں میں قاضی کی مدد کے لیے ناظر الاوقاف (انسپکٹر) متعین تھے۔ قاضی صرف اخراجات کے جواز کا فیصلہ کرتا تھا۔ یہ روپیہ صرف ان مقاصد میں صرف کیا جا سکتا تھا جو ان کے مُعْطِیوں نے بتلائے ہوں، لیکن اگر مقاصد مبہم یا غیر واضح الفاظ میں بیان کیے گئے ہوں تو یہ روپیہ رفاہ عامّہ یا مذہبی کاموں میں صرف ہوتا تھا، جیسے قلاّشوں یا فلاکت‌زدہ لوگوں کی اعانت، مساجد کی نگہداشت اور انتظام، اور ان کے عملے کو مشاہروں کی ادائی، تعلیمی درسگاہوں کی تعمیر اور اساتذہ کے مشاہرے وغیرہ۔ قاضی کو اختیار حاصل تھا کہ وہ نیک کاموں کے لیے خزانۂ عامرہ سے پیشگی رقمیں نکلوائے، مثلاً کفار کے خلاف کسی فوجی مہم کی تیاری یا دارالسلام کی سرحدوں پر فوجی دفاع کی بحالی کے لیے۔

یہ نظام جیسا کہ "حِسْبَہ" پر ابن عَبْدون کے مُعْنبَے (طبع و ترجمہ E. Lévi-Provençal) سے ظاہر ہے چھٹی صدی هجری / بارھویں صدی عیسوی کے آغاز یعنی المرابطون کے قبضے کے زمانے تک جاری تھا (دیکھیے مآخذ)۔

۲۔ المغرب: کسی بھی بنا پر یہ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ المغرب میں بیت المال کی اصطلاح اس محدود مفہوم میں استعمال ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے خزانۂ عامرہ کے وسیع‌تر معانی میں استعمال کیا جاتا تھا اور ساتھ ہی یہ مالیاتِ عامّہ کے نظم و نسق کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی۔

اب تک مسلم مغرب کی مختلف ریاستوں کے مالی نظام کو باقاعدہ مطالعے کا موضوع نہیں بنایا گیا۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ جو معلومات عربی سوانح اور سرگزشتوں کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں وہ بہت کم ہیں اور ہمارے لیے کارآمد بھی نہیں؛ اس لیے ہم مجبوراً اس موضوع کے متعلق عام انداز کی باتیں بیان کرنے پر اکتفا کریں گے۔

اَلْقَیْرَوان کے بنو اغلب نے اس معاملے میں بظاہر کسی طرح جدّت سے کام نہیں لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد (۱۸۴ھ / ۸۰۰ء) انہیں جو نظام ملا انہوں نے اسی کو اپنا لیا۔

اگرچہ فاطمیوں نے محاصل کے نظم و نسق اور ان کے تسمیہ کے سلسلے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کی، لیکن ابن حوقل کی مہیا کردہ معلومات کے مطابق (مرتبۂ ڈ خویہ، ص ۶۹) انہوں نے محاصل میں حیرت انگیز اضافہ کیا اور اس مدّ سے ان کی سالانہ آمدنی ستّر سے اسّی لاکھ دینار تک پہنچ گئی۔ زیریوں نے اپنے پیشرووں کے قائم کیے ہوئے اعلٰی نظام کو برقرار رکھا، مگر اسے کوئی ترقی نہ دے سکے۔

ہمیں المرابطون کے مالی نظام کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں اس کے سوا کہ ان کے پہلے فرمانروا یوسف بن تاشفین کو محض "قانونی محاصل پر اکتفا کرنی پڑی"۔ اس کے جانشین اس کی روش پر قائم نہیں رہ سکے۔ اور اندلس میں انہوں نے وهی نظام بحال رکھا جو انہوں نے وهاں رائج پایا۔

المُوحّدون سے متعلق ہمیں جو واضح اشارہ ملتا ہے وہ یہ ہے کہ عبدالمؤمن نے ۵۵۵ھ/ ۱۱۶۰ء میں ایک قسم کا مالگزاری نظام مقرر کیا تھا، جس کا اطلاق پورے مغرب پر ہوتا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ زمینی محصول (خراج) کی تشخیص میں ممدّ و معاون ہو (روض القرطاس، طبع Tornberg، ص ۱۲۹، ۱۷۳)۔

بنو حَفْص کے متعلّق R. Brunschvig's نے علمی تحقیقات کی ہیں ان میں ساتویں صدی هجری تیرھویں صدی عیسوی سے نویں صدی هجری پندرھویں صدی عیسوی کے درمیان مغربی مراکش کے مالگزاری نظام متعلق تمام تفصیلات (اور

متابعۃً بہت تھوڑی ہیں) موجود ہیں۔ اس کام کی نگرانی کرنے والا افسر ''صاحب الاشغال'' کہلاتا تھا، اور یہ اصطلاح ابن خلدون (موضع مذکور) نے بھی استعمال کی ہے۔ آگے چل کر اس کے لیے ''مُنفذ'' کا لفظ استعمال ہونے لگا۔ اس نظام کے کامیاب ہونے کا یہ ثبوت ہے کہ حفصی خزانہ قریب قریب ہمیشہ بھرا رہتا تھا۔

بنو عبدالواد کے متعلق صحیح معلومات موجود نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ M. Mougin جو مقالہ مرتب کر رہا ہے اس سے اس موضوع پر کچھ روشنی پڑے۔

مرینیوں کے مالی نظم و نسق کے متعلق تھوڑی سی اور منتشر معلومات ابن فضل اللہ العمری: مسالک الابصار (ترجمہ M. Gaudefroy-Demombynes، در BGA، جلد ۲، پیرس ۱۹۲۷ء) اور ابن مرزوق: مسند (طبع و ترجمہ E. Lévi-Provençal، در Hesp.، ۱۹۲۵ء) میں موجود ہیں۔ یہ سب معلومات ابوالحسن کے دور حکومت (چودھویں صدی عیسوی کے وسط) سے متعلق ہیں۔

الافرانی (: نزھۃ الحادی، طبع Houdas، ص ۸۳ تا ۸۴، ترجمہ ص ۱۴۰ تا ۱۴۵) کے متن میں سعدی دور کے آغاز کے مالی معاملات اور ایک جدید محصول کے نفاذ کے متعلق، جس کا نام ''النائبہ'' تھا، نہایت دلچسپ معلومات ملتی ہیں۔ آخر میں E. Michaux-Bellaire کی کتاب میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں علوی خاندان کے مالی نظام کی بالکل صاف اور واضح تصویر ملتی ہے۔

توقع کی جا سکتی ہے کہ ان ترکی دستاویزات میں جو تونس اور الجزائر میں محفوظ ہیں المغرب میں ترکی کی مالی حکمت عملی کے متعلق کم از کم اٹھارھویں صدی عیسوی کے بعد کے دور کے متعلق وافر مواد موجود ہوگا۔ [اسلامی ہندوستان کے سلسلے میں دیکھیے تعلیقہ]۔

مآخذ: (۱) E. Lévi-Provençal: Hist. Esp.، ۳ toms.، ۳: ۱۲ تا ۱۳۳؛ (۲) وہی مصنف: Séville au XIIe siècle، ص ۱ تا ۲؛ (۳) M. Vanderheyden: La Berbérie or. sous la dynastie des Benou, l-Arlab، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۱۷۰ تا ۱۷۱؛ (۴) H. Terrasse: Hist. du Maroc، ۲ جلد، کاسابلانکا ۱۹۴۹ تا ۱۹۵۰ء، مواضع کثیرہ؛ (۵) R. Brunschvig: La Berbérie or. sous les Hafsides، ۲، پیرس ۱۹۴۷ء: ۶۸ تا ۶۹؛ (۶) E. Michaux-Bellaire: Les impots marocains، در AM، ۱: ۵۶ تا ۹۶؛ (۷) وہی مصنف: L'organisation des finances au Maroc، در AM، ۱۱: ۱۷۱ تا ۲۰۱؛ (۸) J. F. P. Hopkins: Medieval Muslim Government in Barbary، لنڈن ۱۹۵۸ء۔

(R. LE TOURNEAU)

[تعلیقہ: اسلامی ہندوستان کے نظام حکومت میں دو مختلف سلسلے مل جل کر سامنے آتے ہیں: (۱) مسلمان فاتحین اپنے ہمراہ عرب اور ایران و توران سے اسلامی تصورات کے زیر اثر تمدنی تجربات لائے، اور (۲) مقامی دستور اور قاعدے جنھیں مسلمان حکومتوں نے اپنا لیا۔ اسلامی ہندوستان سے متعلق مختلف مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بیت المال کی اصطلاح کا زیادہ رواج نہیں ہوا۔ اس کے بجائے خزانہ یا خزانۂ عامرہ کا لفظ استعمال ہوا۔

البتہ اسلامی ہندوستان کے سرکاری کاغذات میں مال کا لفظ موجود ہے اور اس کے معنی عموماً سرکاری محاصل اور ذرائع آمدنی، مثلاً خراج اور جزیہ (مطالبات) وغیرہ لیے جاتے ہیں۔ عسکری کاغذات میں اس سے مراد مال غنیمت بھی ہے، لیکن اس کا اطلاق عموماً سرکاری آمدنی کی مختلف مدات ہی پر ہوتا تھا۔ ''مال واجبی'' سے مراد

"مطالبہ" اور مال گزاری سے مراد مطالبے کی ادائی ہے [نیز رک بہ مال؛ مالیات]۔ اس سلسلے کی چند اور اصطلاحیں یہ ہیں: بازخواست، بازیافت، محصول، حاصل، جمع، جمع دامی، جمع مملکت، جمع پرگنات، جمع ولایت، جمع قصبات و قریات، اقطاع، مُقطع وغیرہ (تفصیل کے لیے دیکھیے: W.H. Moreland : *The Agrarian System of Moslem India*، کیمبرج ۱۹۲۹ء).

ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے زمانے میں وزیر اور دیوان دو عہدے، کبھی مختلف اور کبھی ایک ہی معنی میں، نظر آتے ہیں۔ اس عہدےدار کا کام مالیات کا انصرام تھا اور خزانے کا انتظام بھی کرتا تھا۔ وہ مدّات جن سے خزانۂ شاہی تکمیل پاتا تھا بہت سی تھیں؛ ان میں مالیہ، لگان وغیرہ کے علاوہ زکوٰۃ بھی شامل تھی۔ بقول جادوناتھ سرکار شاہانِ وقت مسلمانوں سے زکوٰۃ لے کر دینی رفاہی کاموں میں خرچ کرتے تھے، مثلاً مسجدیں تعمیر کرنا، اولیا و علما و صلحا کو وظائف دینا، ان کے مزارات و مقابر پر خرچ کرنا، نادار مسلمان لڑکیوں کے لیے جہیز فراہم کرنا وغیرہ وغیرہ۔ زکوٰۃ زمین کے مالیے کی طرح ہی خزانے میں چلی جاتی تھی اگرچہ بعد کے زمانے میں زکوٰۃ کے خرچ میں بے اعتدالی ہونے لگی؛ چنانچہ بادشاہوں کے ذاتی یا عام انتظام پر بھی خرچ ہو جاتی تھی۔ بہر حال وزیر کا عہدہ سب سے اونچا سمجھا جاتا تھا اور مالیاتی امور عموماً اسی کے سپرد ہوتے تھے، لیکن یہ اس وجہ سے کہ دیوان یعنی خزانے کا مہتمم اعلی بھی وہی ہوتا تھا [اس منصب کے فرائض اور طریق کار کے لیے دیکھیے جادوناتھ سرکار: *Mughal Administration*، کلکتہ ۱۹۲۰ء، ص ۳۱ ببعد]۔ بعض ایسے وزیر بھی ملتے ہیں جو دیوان نہ تھے لہٰذا خزانے کا اہتمام ان کے سپرد نہ ہوتا تھا، ایک اور عہدےدار ہوتا تھا جسے بخشی کہا جاتا تھا۔ بخشی فوج کے حسابات کا مہتمم اعلی ہوتا تھا اور اس کے ماتحت کبھی کبھی دو تین بخشی اور بھی ہوتے تھے (بحوالۂ مصنّف مذکور).

مالیہ لگانے والے اور وصول کرنے والے اور اس کا حساب رکھنے والے محکمے میں دوسرے اور تیسرے درجے کے عہدےدار بھی ہوتے تھے، مثلاً امین، کروڑی، قانون گو، سیاہہ‌نویس وغیرہ وغیرہ (دیکھیے وہی کتاب و نیز Ibn-i-Hasan : *Central Structure of the Mughal Empire*، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۳۶ء؛ رنچھوڑداس: دقائق الانشا (مخطوطۂ دانش‌گاہ پنجاب)؛ عبدالعزیز: *Mansabdari System of the Mughals*، لاہور؛ Ed. Thomas : *Revenue resources of the Mughal Empire*، کیمبرج؛ ابوالفضل: آئینِ اکبری اور دستور العمل نام کی کتابیں بھی ملاحظہ ہوں۔ مغلوں سے پہلے کے نظام سلطنت اور خزانے کے لیے دیکھیے القلقشندی: صبح الاعشٰی؛ ضیاء برنی: تاریخ فیروزشاہی؛ ابن بطوطہ: عجائب الاسفار وغیرہ].

[ادارہ]

بیتُ المِدْراس: یا بیت المدراش، درس کے لغوی معنی ہیں نشان (المفردات، بذیل مادۂ درس)، اور درس مخفی اور مٹے ہوئے راستے کو بھی کہتے ہیں (لسان) اور دَرس کے معنی ہیں پیسا۔ اسی سے دَرَسْتُ الکتاب ہے جس کے معنی ہیں: میں نے بار بار پڑھنے کی وجہ سے کتاب ازبر کر لی۔ کہتے ہیں حضرت ادریس کا یہ نام اس وجہ سے تھا کہ آپ کتاب اللہ کی بکثرت تلاوت کرتے تھے۔ مِدْرَس یا مِدْراس، معلّم اور پڑھنے والے کو کہتے ہیں۔ مِدْراس الیہود کے معنی ہیں: بیت تدریس التوراۃ، یعنی وہ جگہ جہاں تورات کی تعلیم دی جاتی ہے (لسان، بذیل مادّہ).

بیت المدراس کے الفاظ حدیث میں بھی آتے ہیں (البخاری، کتاب الجزیة، باب ۶؛ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، باب ۱۸؛ کتاب الاکراه، باب ۲؛ کتاب الیہود، باب ۲۵؛ احمد بن حنبل: مسند، ۲ : ۴۵۱) اور اس کی تشریح میں ابن الاثیر اور صاحب لسان نے لکھا ہے: هو البیت الذی یدرسون فیه (نہایة؛ لسان، بذیل د ر س)، یعنی (مدینۂ منورہ میں) ان کے درس و تدریس کی جگہ تھی۔

بیت المدراس کا ابتدائی مفہوم خصوصاً یہ تھا کہ وہ جگہ جہاں مقدس صحیفوں کی تفسیر و تشریح اور ان کے گہرے مطالب کی تلاش و تحقیق کا کام ہوتا ہے۔ اس طرح اس سے مراد ہے عہدنامۂ عتیق کا دارالمطالعہ اور تحقیق گاہ۔ مدراس یا مدرس کا لفظ بائبل میں بھی موجود ہے (۲۔ اخبار الایام، ۳۴ : ۲۲؛ ۲۴ : ۲۷)، لیکن شاید وہاں اس کا مفہوم اس سے کچھ مختلف ہے جو اس لفظ نے بعد میں اختیار کر لیا۔ عہد نامۂ عتیق کے اردو تراجم میں 'مدرس' کے لفظ کو چھوڑ کر ایک مقام پر اس کی جگہ 'تفسیر کی کتاب' کے الفاظ لکھے ہیں (۲۔ تواریخ، ۳۴ : ۲۲) اور دوسری جگہ اس کا ترجمہ کیا ہے: ”تواریخی دفتر“ (۲۔ تواریخ، ۲۴ : ۲۷)۔

مآخذ: متن میں آ گئے ہیں۔

(عبدالمنان عمر)

- **بیت المقدس**: رک بہ القدس۔
- **بیتاب**: رک بہ ڈراما (اردو)۔
- **بیت لحم**: رک بہ بیت لحم۔
- **بیچ**: (بیچ) ترکوں کے ہاں شہر وی انا کا نام۔ سرب اور کروٹ قوموں کی طرح ترکوں نے بھی یہ لفظ ہنگری زبان سے لیا ہے، جہاں اس کے معنی ”نواح شہر“ یا ”شہر کی بیرونی آبادی“ اور مضافات کے ہیں (ہنگری میں külváros؛ اسی وجہ سے اولیا چلبی، ۷ : ۲۵۱ نے اس کی تشریح külwar سے کی ہے) جہاں یہ لفظ غالباً باعتبار اصل کومان پیچنک Kuman-Pečenek (شاید اوار Avar بھی) beč کی طرف راجع ہوتا ہے (Gombócz-Melich : *Magyar Etymologiai Szótár*، Budapest ۱۹۱۴ء، بذیل مادہ)۔ ترکوں کی جغرافیائی تصنیفات اور سفیروں کی رودادوں میں اس شہر کی بابت اطلاعات محض قلیل اور سطحی ہیں (قب Hammer-Purgstall کا ترجمہ ابوبکر بن بہرام سے در *Archiv f. Geographie, Historie, Staats und Kriegskunst*، ۱۸۲۲ء، ص ۲۸ ببعد؛ نیز Hammer-Purgstall، ۷ : ۲۱۵؛ Fr. Kraelitz : *Bericht über den Zug des Grossbotschafters Ibrahim Pascha nach Wien im Jahre 1719*، در *SBA Wien*، ۱۹۰۷ء)، اگرچہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں وی انا پر سلطان سلیمان اعظم اور صدر اعظم قرا مصطفی پاشا کی زیر قیادت دو شدید حملے کیے گئے (قب Sturminger : *Bibliographie und Ikonographie der beiden Türkenbelagerungen Wiens 1529 und 1683*، وی انا ۱۹۵۵ء؛ اس کی شرح و تفسیر در *WZKM*، ص ۵۲؛ اور R. Kreutel : *Kara Mustafa vor Wien*، Graz ۱۹۵۵ء)۔ اولیا چلبی کا دلچسپ بیان ان سب سے الگ ہے۔ وہ ۱۶۶۵ء میں سفیر قرا محمد پاشا کے مصاحبین کے ہمراہ وی انا جانے کا دعوٰی کرتا ہے (قب *WZKM*، ۵۱، ص ۱۸۸ ببعد)۔ اس نے اس شہر کا جو طویل بیان دیا ہے (سیاحت نامہ، ۷ : ۲۴۰ تا ۳۲۹؛ ترجمہ R. Kreutel : *Im Reiche des Goldenen Apfels*، Graz ۱۹۵۷ء) اس میں بہت سی سخیف اور بیکار باتیں ہیں مگر ان کے ساتھ ہی متعدد صحیح ملاحظات بھی ہیں۔ انیسویں صدی کے نصف اول (عہد تنظیمات) میں ترکی مصنفات میں بیچ (Beč) کی جگہ وی انا کا نام ملتا ہے، اور آج کل بھی اس کے نام کی یہی صورت بالعموم مروج ہے۔

(R. F. Kreutel)

بیجاپور : بھارت میں ریاست (= صوبہ) میسور کے ضلع بیجاپور کا صدر مقام اور شہر، جو ۱۶ درجے ۴۹ دقیقے شمال اور ۷۵ درجے ۴۳ دقیقے مشرق میں بمبئی سے ساڑھے تین سو میل جنوب میں واقع ہے۔ ۱۹۵۱ء میں یہاں کی آبادی پینسٹھ ہزار سات سو چونتیس تھی۔ ۵۸۶ھ/ ۱۱۹۰ء تا ۶۹۳ھ/ ۱۲۹۳ء تقریباً ایک صدی سے زائد مدت تک یہ شہر یادوا Yadava راجاؤں کا صدر مقام رہا تا آنکہ ۶۹۳ھ/ ۱۲۹۳ء میں اسے علاء الدین خلجی نے اپنے چچا جلال الدین خلجی [رک بآں] بادشاہ دہلی کے لیے فتح کیا۔ ۸۹۰ھ/ ۱۴۸۵-۱۴۸۶ء میں ایک شخص یوسف نام نے، جو ترک سلطان مراد ثانی کا بیٹا سمجھا جاتا ہے، بیجاپور کی مسلم حکومت کی بنیاد ڈالی اور قلعہ تعمیر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ یوسف اپنے بھائی محمد ثانی کی تخت نشینی کے وقت اپنی والدہ کی ایک تدبیر کے ذریعے موت سے بچ گیا تھا [قب فرشتہ، ۲ : ۲] (لیکن ترک مؤرخوں کو اس قصے کا علم نہیں ہے، قب خلیل ادھم : دولت اسلامیہ، ص ۴۹۵)۔

ترکی مؤرخ منجم باشی نے (جس نے اپنی کتاب جامع الدول میں عادل شاہیوں کے حالات شامل کیے ہیں) یوسف کو ترکمانی الاصل قرار دیا ہے (اس بحث کے لیے مزید دیکھیے اسماعیل حکمت ارتایلان Ertaylan : عادل شاہی لر، استانبول ۱۹۵۳ء، ص ۳ ببعد [اور فرشتہ، ۲ : ۲]۔ یوسف نے گوا پر بھی قبضہ کیا اور اسے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اس نے عادل شاہ کا لقب اختیار کیا جو خاندانی لقب بن گیا اور یہ خاندان بیجاپور کا عادل شاہی خاندان کہلایا۔ اس کے بعد اس کے تین جانشین اس کی طرح دانا نہ تھے۔ ۹۶۵ھ/ ۱۵۵۷ء میں علی عادل شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے بیجاپور کی شہر پناہ، جامع مسجد اور پختہ گزرگاہیں (نہر آب) تعمیر کرائیں اور رفاہ عامہ کے دوسرے کام کیے۔ ۹۷۲ھ/ ۱۵۶۵ء میں بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ کے متحدہ فوجی دستوں نے تالی کوٹہ کی لڑائی میں وجیانگر کی فوجوں کو شکست دی۔ علی عادل شاہ نے ۹۸۷ھ/ ۱۵۷۹ء میں انتقال کیا۔ اس کی وفات پر اس کا کم سن بھتیجا ابراہیم عادل شاہ مشہور و معروف خاتون چاند بی بی کی زیرِ نگرانی تخت نشین ہوا اور سینتالیس سال تک خود مختار حکومت کرنے کے بعد ۱۰۳۶ھ/ ۱۶۲۶ء میں فوت ہوا۔ اس کا جانشین محمد عادل شاہ ہوا۔ اس کے عہدِ حکومت میں مرہٹوں کے قائد شیواجی نے زور پکڑا۔ شیواجی کا باپ شاہ جی بھونسلے، سلطان بیجاپور کا ایک معمولی عہدیدار تھا۔ شیواجی نے بیجاپور ہی کے نمک پر پرورش پانے کے بعد حق نمک یوں ادا کیا کہ بیجاپور کے علاقے پر حملہ کر دیا اور ۱۰۵۶ھ/ ۱۶۴۶ء اور ۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۸ء کے مابین بہت سے اہم قلعوں پر قبضہ جما لیا۔ ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۶-۱۶۵۷ء میں اورنگ زیب نے شہزادگی ہی کے زمانے میں بیجاپور پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن شاہجہان ک شدید علالت کی خبر سن کر اسے محاصرہ اٹھا ک آگرے جانا پڑا۔ تیس سال بعد ۱۰۹۷ھ/ ۱۶۸۶ء م خاندان عادل شاہی کے آخری فرمانروا سکندر عاد شاہ (۱۰۸۳ھ/ ۱۶۷۲ء تا ۱۰۹۷ھ/ ۱۶۸۵-۱۶۸۶ کے زمانے میں اورنگ زیب بیجاپور کو زیر کر میں کامیاب ہوا۔ سکندر عادل شاہ قید ہ اور اورنگ زیب نے اس کا وظیفہ مقرر ک دیا۔ اس نے ۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۹-۱۷۰۰ء م وفات پائی۔ ۱۱۰۰ھ/ ۱۶۸۸ء میں زہریلے ق کی گلٹی دار طاعون کی وبا پھوٹ پڑی، اورنگ ز کی ایک حرم اورنگ آبادی محل سمیت ایک لا پچاس ہزار نفوس اس وبا کی نذر ہو گئے اور ا

وبا میں اورنگ زیب کے ایک بڑے امیر غازی الدین فیروز جنگ کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی۔ اورنگ زیب نے اپنی حکومت کے آخری زمانے میں اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کام بخش کو بیجاپور کی حکومت پر متعین کیا۔ اورنگ زیب کی وفات پر کام بخش نے بیجاپور میں ''دین پناہ'' کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء میں بیجاپور نظام حیدر آباد کی قلمرو میں شامل تھا، لیکن ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء میں ساٹھ لاکھ روپے کے عوض مرہٹوں کے حوالے کر دیا گیا۔ ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں پیشوا کی معزولی پر انگریزوں نے بیجاپور پر قبضہ کر کے یہ علاقہ راجا ستارہ کو سونپ دیا۔ ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۸ء تک یہ علاقہ اسی کے قبضے میں رہا۔ پھر ریاست کے ختم ہو جانے پر بیجاپور برطانوی مقبوضات کا حصہ بن گیا۔ ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں بیجاپور ایک الگ ضلع قرار پایا، بہت سے پرانے محلات میں سرکاری دفاتر قائم کیے گئے جو بعد میں دوسری جگہوں پر منتقل ہوئے۔

عادل شاہی سلاطین فن اور علم و ادب کے بڑے سر پرست تھے۔ ملک قمی شاعر اور دو فارسی کلاسیکی کتابوں، سہ نثر اور مینا بازار کا مانا ہوا مصنف ظہوری [مینا بازار کا ظہوری سے انتساب مشکوک ہے] ایک مدت تک ابراہیم عادل شاہ [ثانی] کے درباری شاعر رہے۔ ابراہیم عادل شاہ خود بھی شاعر تھا اور دکنی اردو میں شعر کہتا تھا۔

۱۱۰۰ھ/۱۶۸۸ء کی طاعون کی متعدی وبا کے علاوہ بیجاپور میں دو خوفناک قحط بھی پڑے۔ پہلا قحط ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷-۱۷۱۸ء میں پڑا اور برابر چھے سال تک شہر کی آبادی کو فنا کرتا رہا۔ اس قحط کو آج تک کھوپڑیوں کے قحط کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کیونکہ اس قحط میں غیر مدفون لاشوں کے سروں سے زمین اٹ گئی تھی۔ دوسرا قحط ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸-۱۸۱۹ء میں ہوا، جس نے ایک اچھے خاصے بستے ہوئے شہر کی آبادی گھٹا کر اسے چند ہزار نفوس پر مشتمل ایک معمولی سے قصبے میں بدل دیا۔ اس وقت سے اب تک یہ شہر غیر آباد محلات اور تاریخی کھنڈروں کا ایک شہر ہے۔ شدید قحط سالی کے دوسرے ادوار یہ تھے: ۱۲۳۰ھ/۱۸۲۴-۱۸۲۵ء، ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲-۱۸۳۳ء، ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳-۱۸۵۴ء، ۱۲۶۰ھ/۱۸۶۳-۱۸۶۴ء اور ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶-۱۸۶۷ء۔

مآخذ: (۱) بشیر الدین احمد: واقعات مملکت بیجاپور (اردو میں)، ۳ جلدیں، حیدر آباد ۱۹۱۴ء (کتاب کے دیباچے میں مصنف اردو، فارسی اور انگریزی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کے مفصل مآخذ دیتا ہے)؛ (۲) وہی مصنف: تاریخ بیجانگر، ۱۹۱۱ء؛ (۳) غلام مرتضی المعروف بہ صاحب حضرت: بساتین السلاطین، حیدر آباد بدون تاریخ طباعت؛ (۴) محمد ابراہیم: روضۃ الاولیاء بیجاپور (مطبوعۂ سید روشن علی)، حیدر آباد ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۶ء؛ (۵) Storey، ۱/۱: ص ۷۴۲ تا ۷۴۶؛ ۲/۱، ص ۱۰۹ (۶۶)، ۱۳۳۱ھ؛ (۶) *A History of the Freedom Movement*، ج ۱، کراچی ۱۹۵۷ء، بمدد اشاریہ؛ (۷) *Imp. Gazetteer of India*، آکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ۸: ۱۷۰ تا ۱۸۸؛ (۸) Henry Cousens: *Guide to Bijapur*، بمبئی ۱۹۰۵ء؛ (۹) محمد ساقی مستعد خان: مآثر عالمگیری (Bibliotheca Indica)، بمدد اشاریہ؛ (۱۰) خوافی خان: منتخب اللباب (Bibliotheca Indica)، ۲: ۷۸۰ ببعد؛ (۱۱) جادو ناتھ سرکار: *A History of Aurangzib*، ۵ جلدیں، بمدد اشاریہ؛ (۱۲) ہارون خان شروانی: *The Battle of Tālikōtā*، در *Journal of the Pakistan Historical Society*، کراچی ۳/۵ (جولائی ۱۹۵۷ء)؛ (۱۳) معارف (اعظم گڑھ)، ۴۷/۳ و ۴۷/۵؛ [(۱۴) فرشتہ: تاریخ (کانپور

سـ ۱۸۸۴ء) ۲ : ۳ تا ۹۲]۔

(بزمی انصاری)

یادگار عمارات: عادل شاہیوں نے فنِ تعمیر کو [دکن کے] دوسرے تمام حکمرانوں سے زیادہ ترقی دی۔ ان کا فنِ عمارت ساخت اور جمالیاتی اعتبار سے تمام دکنی فنونِ تعمیر میں سب سے زیادہ خوش آئند ہے۔ اسی لیے دہلی کے سوا ہندوستان کے ہر شہر کے مقابلے میں ان کے دارالحکومت بیجاپور کی نہایت عالیشان اور نادر عمارات عجب آب و تاب کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ بیجاپور کا طرزِ تعمیر بذاتِ خود جامع ہے اور اس کے دو بڑے ادوار میں تدریجی ارتقا پایا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ قابلِ ذکر یہاں کی دلآویز کروی ساخت کی گنبدسازی ہے، جس میں آرائش کے طور پر غایت درجہ اعلٰی قسم کی مینا کاری و گلدستہ کاری پائی جاتی ہے۔ بالخصوص یہاں کی تعمیر کے پہلے دور میں نمایاں چیز کنگنی دار کارنسی چھجے اور نہایت مضبوط و مستحکم مسالے کا استعمال ہے۔ اس میں جو مسالا برتا گیا ہے وہ کنکری پلستر کاری یا گچ پر مشتمل ہے۔ عمارت میں مقامی پتھر استعمال ہوا ہے، جو سیاہ رنگ کا بے لوچ اور سخت (دیول پتھر) ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ معمار شمالی ہند سے بلائے گئے تھے اور مقامی ہندو کاریگروں سے بھی بہت کام لیا گیا تھا۔

عادل شاہیوں سے پہلے کے چند عماری کام یہ ہیں: (۱) مکّہ مسجد میں سادہ مینار (اذانہ مینار) جس میں چوبی غلام گردش بنی ہوئی ہے؛ (۲) مسجد کریم الدین (کتبہ ۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء)۔ یہ ستون کڑی دار عمارت کی نجرہ دار دیوار کی طرح دریچوں سے ابھری ہوئی کڑیوں کے بنے ہوئے ہیں، ایسے دیکھ کر گجرات [illegible] [illegible] کی یاد تازہ ہوتی ہے؛ (۳) بہمنی وزیر خواجہ جہاں کی مسجد (نواح ۸۹۰ھ / ۱۴۸۵ء) بھی اسی میں ہے لیکن اس میں روزنی نجرہ دار دیوار نہیں ہے۔

عادل شاہیوں کے زمانے کی کوئی بھی عمارت یقینی طور پر یوسف کے دورِ حکومت سے منسوب نہیں کی جا سکتی۔ سب سے قدیم عمارت میں، جس کا سنۂ تعمیر معلوم ہے اور جو جامع مسجد یوسفی کہلاتی ہے، مابعد کے اونچے گول قبے پر تعمیر شدہ نصف کروی مینار کی جھلک صاف طور پر پائی جاتی ہے۔ اس مینار کی بنیاد عمودی گلکاری کے ایک حلقے میں گھری ہوئی ہے۔ یوں یہ پورا مینار پتیوں والے غنچۂ گل سے مشابہ نظر آتا ہے۔ سامنے کی محرابیں دو مرکزوں سے نکلتی ہیں؛ (محرابوں کے) یہ خم تاج سے کچھ فاصلے پر رکنے کے بعد خم کے مماس سے گزرتے ہوئے چوٹی تک چلے جاتے ہیں۔ (اس عمارت کے) ۹۱۸ھ / ۱۵۱۲ - ۱۵۱۳ء کے کتبے سے پتا چلتا ہے کہ سلطان محمود شاہ ابن محمد شاہ بہمنی کے دورِ حکومت میں خواجہ سنبل نے اسے نصب کیا تھا۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ عادل شاہیوں کی علیحدگی کے بعد بھی کچھ مدت تک بہمنی سیادت تسلیم کی جاتی تھی۔ ابراہیم کے دورِ حکومت کی یادگار وسیع دکنی عیدگاہ (جو اب شہر پناہ کے اندر واقع ہے) اور متعدد چھوٹی چھوٹی مساجد ہیں، جن میں سے ایک مسجد (مسجد اخلاص خان) میں محراب کے سروں پر چوکھٹے کے دو بالائی حصے کو تمغہ نما الواح سے پُر کر دیا ہے، جو قوسی شکل کی تکنیک کے سہارے استادہ ہیں۔ بعد میں یہ نمونہ ایک عام آرائشی چیز بن گیا۔ اس دور کی صرف ایک مسجد (ابراہیم ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ - ۱۵۲۶ء) گنبد والی مسجد ہے۔

علی اول کے طویل دورِ حکومت میں تعمیری کام بڑی مستعدی اور تیزی سے ہوتے رہے۔ حصارِ شہر خصائص کے اعتبار سے غیر متوازن ہے۔ کیونکہ اس کے ہر حصے کی تعمیر کا ذمے دار ایک

علیحدہ سردار تھا ۔ اس کی تکمیل ۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء میں ہوئی ۔ اس میں پانچ بڑے دروازے تھے، جن کے اوپر ایک جانب بنے برجوں میں سوراخ کیے ہوئے تھے؛ ان برجوں تک خندق کے اوپر سے متحرک پلوں کے ذریعے سے آ جا سکتے تھے ۔ اس کے پیچھے باہر کی طرف والا پشتہ اور ایک خفیہ راستہ ہے (بہت سے برجوں میں ترمیم کر دی گئی ہے تاکہ بھاری توپوں کے متحمل ہو سکیں؛ کتبات محمد و علی ثانی) ۔ گگن (آسمان) محل ایک ایوانِ مجلس ہے، جس میں چوبی منبت کاری کا بہت سا کام کیا گیا ہے ۔ سید علی شہید پیر کی ایک یادگاری مسجد، جو رقبے میں چھوٹی (۱۰۵۸ میٹر مربع) ہے، لیکن اس کا دو تہائی سے زیادہ حصّہ پلستر کے ٹکڑوں (Cut-Plaster) سے مزیّن کیا گیا ہے ۔ عمارت کے روکار کے متوازی ڈھلوان اسطوانی شکل کی قوسی چھتیں ہیں اور محراب کے اوپر تنگ دُود کش کی طرح کا گنبد بنا ہوا ہے، جس سے باہر آنے کے لیے ایک دروازہ بھی ہے.

شاہ پور کے نواحی علاقے: بیجا پور سے باہر شاہ درگ (۹۶۶ھ/۱۵۵۸ء)، دھارواڑ (۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء)، شاہ نور اور بانکپور (۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء) کے قلعے، علی کا اپنا نہایت سادہ مقبرہ اور اس کی جامع مسجد ہے، جس کی تعمیر بالعموم ۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء بتائی جاتی ہے ۔ یہ مسجد ایک عمدہ وسیع (۱۳۷۰۲ در ۸۲۰۳ میٹر) عمارت ہے، جو پوری طرح سے مکمل نہیں ہے (صرف پشتہ بندی موجود ہے جس پر بلند مینار ابھی تعمیر ہونے باقی تھے ۔ سامنے والے حصّے پر کوئی کنگرہ نہیں)؛ اس کی بہت کم زیبائش و آرائش کی گئی ہے ۔ ایوان کے سامنے کے حصّے کی سات محرابوں میں سے صرف درمیانی محراب ہلال نما ہے ۔ اس محراب کے سروں اور چوکھٹوں کے درمیانی حصّے کو کشیدہ تمغوں سے مزین کیا گیا ہے ۔ مربع شکل کی مسقف غلام گردش کے اوپر ایک بڑا نصف کروی گنبد ہے، جس پر ہلال کا نشان ہے ۔ یہ نشان دکنی حکمران خاندانوں میں صرف عادل شاہیوں کے ہاں مروج تھا [جو ان کے ترک سلاطین کی نسل سے ہونے کا ایک ثبوت ہے] ۔ کارنسی چھجا سابق کانسوں پر ایک اچھا اضافہ ہے، جس میں ہر پشتے میں ایک یکساں قطار کے بدلے قدرے زیادہ گہری قوسیں نمایاں ہوتی ہیں ۔ گنبدنما طرز تعمیر کا انحصار متقاطع محرابوں پر ہوتا ہے ۔ محرابوں کے دو متقاطع مربعے گنبد کے نیچے سے پشتوں کے درمیان ایوان کے آر پار جاتے ہیں، جن کے ملنے سے ایک مثمّن شکل بنتی ہے؛ اسی پر گنبد قائم ہے ۔ اس طرح سے یہ گول مثلثیں ہال کے اوپر معلق ہیں اور گنبد کو کسی ایک طرف جھک جانے سے روکتی ہیں ۔ بیرونی دیواریں سادہ محرابوں والی زیریں منزل کے راستے پر ختم ہوتی ہیں ۔ اس راستے پر کھلی محرابوں کا ایک چھجا ہے.

ابراہیم ثانی کے عہدِ حکومت میں عمدہ سنگ تراشی نے سابقہ کنکری پلستر کاری کی جگہ لے لی ۔ محل کے مختلف حصوں (سات منزلہ اناج کا گودام، چینی محل) میں ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء کی تاریخیں ملتی ہیں ۔ سنگ تراشی سے بنی ہوئی پہلی عمارت (۹۹۳ھ/۱۵۸۵-۱۵۸۶ء) ملکۂ جہاں کی مسجد ہے، جس سے ایک نئی شکل ایجاد ہوتی ہے؛ وہ یوں کہ گل کاری سے اوپر ایک گنبد بنا ہوا ہے جو تین چوتھائی دائرے کی شکل کا ہے ۔ بخاری مسجد اور نواحِ شاہ پور کی تین اور مسجدیں ایک سی ہیں ۔ عادل شاہیوں کی غالباً سب سے بڑی عمارت ابراہیم روضہ ہے (جہاں ابراہیم ثانی اور اس کے کنبے کے مزار ہیں) ۔ اس میں بھی سنگ تراشی کا کام کیا گیا ہے ۔ ۱۳۷۰۲ میٹر مربع کے احاطۂ باغ میں عام سطح پر ایک مقبرہ اور مسجد واقع

ہیں۔ مقبرے کے (جو کتبات کی تحریر کے مطابق خاص ملکۂ تاج سلطانہ کے لیے بنایا گیا تھا) ستون اور دوسرے آثار ناہموار ہیں۔ تعویذ تبر ہندسی اور خطّاطی کے نمونوں سے مزیّن ہے۔ مشہور ہے کہ قرآن حکیم کا پورا متن اس پر درج ہے۔ مسجد کے ستون ترتیب سے ہیں۔ مسجد کی پوری ساخت میں ایک کامل تناسب ہے اور تعمیر سے قبل اس کے نقشے کو نہایت غور و فکر سے بنایا گیا ہے۔ ایک کتبے سے بحساب ابجد اس کی تاریخ بنا ۱۰۳۶ھ/ ۱۶۲۶ء نکلتی ہے۔ اس عہد کے محلّات میں آنند محل، جو عیش و تفریح کے لیے تعمیر کیا گیا تھا (بساتین السلاطین) اور آثار محل (۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۱ء) بھی شامل ہیں۔ آثار محل کو چوبکاری سے مزیّن کیا گیا ہے۔ اس میں کچھ چوبی تصویر کشی کا کام بھی ہے، جسے اطالوی کاریگروں کا کام خیال کیا جاتا ہے۔ اندا مسجد (۱۰۱۷ھ/ ۱۶۰۸ء) اوپر کی منزل میں واقع ہے۔ یہ غالبًا مستورات کے لیے مخصوص تھی۔ اس کے نیچے ایک سرائے ہے۔ تعمیر کا کام نہایت صاف ستھرا اور جوڑدار ہے اور اس کے اوپر ایک ڈاٹ‌دار گنبد ہے۔ ۱۰۸۸ھ/ ۱۶۷۷ء میں ابراھیم نے بیجاپور سے کوئی پانچ کیلومیٹر مغرب کی طرف صدر مقام بدلنا تجویز کیا تھا۔ اس جگہ آب‌رسانی کا انتظام نسبۃً بہتر تھا؛ لیکن نیا شہر نورس‌پور ۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۴ء میں مکمل ہونے سے پہلے ہی ملک عنبر کے ہاتھوں تاراج ہو گیا اور اب کچھ باقی نہیں ہے۔ دوسرے آثار میں نوگنبد نامی مسجد بھی شامل ہے۔ یہ بیجاپور کی واحد مسجد ہے جس میں بہت سے گنبد ہیں۔ حمید اور لطیف اللہ قادری (م ۱۰۱۱ھ/ ۱۶۰۲ء و ۱۰۲۱ھ/ ۱۶۱۲ء) پیر بھائیوں کا عمدہ لیکن نامکمل مزار بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ اسی دور کی آخری تعمیرات کا اعلٰی نمونہ مہتر محل ہے جو دراصل شہر کی ایک مسجد کے اندرونی صحن میں جانے کا صدر دروازہ ہے۔ اس کا سامنے کا تنگ حصّہ ایک دُھرے عمودی مربع پر بنا ہوا ہے۔ اس پر پتھر کی ماہی‌پشت نقاشی خوب کی گئی ہے۔ اس پر ایک جھروکہ بنا ہوا ہے، جس کے سہارے کے لیے نقش و نگار والے پتھروں کی لمبی لمبی آڑیں بنی ہوئی ہیں۔ ان کا آرائشی کام چوب‌کاری کے نمونوں سے ملتا جلتا ہے بلکہ فی الحقیقت اس سے بھی زیادہ موزوں ہے۔ اندر کو عمدہ چوبی تختوں کی چھتیں ہیں اور باہر کی طرف کارنسی چھجے اور کامل مینار ہیں جن پر کثرت سے نقاشی کا کام کیا ہوا ہے۔

کتبات اور تاریخی معلومات نہ ہونے کے سبب محمد کے دورِ حکومت کے تعمیراتی کاموں کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہے۔ مصطفٰی خان کی مسجد سادہ ہے۔ اس کے رُوکار کی درمیانی محراب پہلو کی محرابوں سے زیادہ چوڑی ہے۔ اس کی تعمیر میں بہت سے پرانے محلّات کے نمونوں کا اتباع کیا گیا ہے؛ مصطفٰی خاں کی سرائے (کتبہ ۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۰-۱۶۴۱ء)، عین‌پور کے مقام پر ایک محل؛ وزیر نواز خاں (م ۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۸ء) کے مقبرے اور کئی دوسرے پیروں کے مزارات میں دوسری منزل بنا دینے اور عمارتوں کے مقابلے میں گنبد چھوٹے رکھنے کے باعث فنِ تعمیر کا روبہ‌زوال ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ افضل خان کے مزار اور مسجد کی دوسری منزل کی بلندی ناکافی ہے۔ بیجاپور میں صرف یہی ایک دو منزلہ مسجد ہے۔ بالائی ’’ایوان‘‘ [دالان] بھی ایک منبر کے سوا زیریں منزل کا مثنّٰی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ حصّہ افضل خان کے زنانخانے (= زنانہ) کے لیے ہو، جس کے ۶۳ افراد کے مزارات ایک کیلومیٹر رقبے میں جنوب کی طرف واقع ہیں (کتبۂ مزار: ۱۰۴۴ھ/ ۱۶۳۴-۱۶۳۵ء)۔ اسی دور کا اہم اور بڑا تعمیری کام محمد کا اپنا مزار گول گنبد ہے، جو

ساخت کے اعتبار سے فنِ تعمیر میں مسلمانوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس کے گنبد کی تعمیر مع مقبرے کے اجزا کے بظاہر سادہ ہے۔ نصف کروی گنبد، جس کا بیرونی قطر ۴۳٫۹ میٹر ہے، تقریباً ۴۷٫۵ میٹر مربع مکعب تودے پر کھڑا ہے اور جس کے ہر زاویے پر ایک مثمن بنا ہوا ہے۔ ایک ہی گنبد سے چھتا ہوا ۱۶۹۳ مربع میٹر کا یہ رقبہ دنیا بھر کے مسقف رقبوں میں سب سے بڑا ہے۔ باہر کی طرف کی آرائش سادہ ہے، جو ۳٫۰ میٹر چوڑی چار دیوارگیریوں پر استادہ بڑے چھجے، گوشوں پر بنی ہوئی برجیوں کے موکھوں، روزنوں کے درمیان واقع فصیل کے حصے اور میناروں تک محدود ہے۔ گنبد جامع مسجد کی طرح اندر کی طرف سے محرابوں کے ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے مربعوں پر کھڑا ہے۔ جنوبی دروازے کے کتبے سے محمد کی تاریخ وفات بحساب ابجد ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۶ء نکلتی ہے۔ اس وقت پر شاید تعمیر کا کام رک گیا تھا کیونکہ پلستر کا کام نامکمل ہی رہ گیا ہے۔ عین پور میں اس کی حرم جہاں بیگم کا مقبرہ بھی نامکمل ہے۔ اس کی بنیادیں، پشتے اور مثمن برج، گول گنبد کے معروف و متعارف پیمانے کے مطابق ہیں، لیکن یہاں گنبد تو درمیانی ایوان پر بنانے کی تجویز تھی۔

علی ثانی کے دورِ حکومت کے حصار قلعہ کے شہ نشین (جسے پانی محل کہتے تھے) اور مکہ مسجد، دونوں کی تعمیر کا کام نہایت عمدہ ہے۔ ان پر نہایت عمدہ قسم کی نقاشی کی گئی ہے؛ یاقوت دابلی کے مقبرے کی عمارات میں مسجد غیر معمولی طور پر مقبرے سے زیادہ بڑی ہے۔ علی کے اپنے نامکمل مزار میں بیجا پور کی مخصوص محراب کے بجائے چار مرکزوں سے نکراتی ہوئی محرابیں ہیں۔ جامع مسجد میں اورنگ زیب کے بنائے ہوئے مشرقی دروازے کے سوا بعد کی دوسری عمارتیں معمولی قسم کی ہیں۔ عادل شاہیوں کے عمارتی جوش و خروش کا خاتمہ خورد سال شہزادہ سکندر کے مقبرے پر ہوتا ہے، جو کھلی فضا میں محض ایک (معمولی سی) قبر کی صورت میں ہے۔

مآخذ: بنیادی مصادر کے علاوہ بالخصوص دیکھیے: (۱) تاریخ فرشتہ اور (۲) ابراہیم زبیری: بساتین السلاطین؛ (۳) J. Fergusson و P.D. Hart: *Architectural illustrations of the principal Mahomedan buildings at Beejapore*، ۱۸۵۹ء؛ (۴) Meadows Taylor و Fergusson: *The architecture at Beejapoor*، ۱۸۶۶ء؛ ان دونوں سے پہلے (۵) H. Cousens: *Bijāpūr and its architectural remains* (= *ASI 'NIS*، ج ۳۷)، بمبئی ۱۹۱۶ء؛ نیز (۶) Fergusson: *The great dome of Sultan Mohammed*، در *Trans. RIBA*، سلسلۂ اوّل، ج ۵، ۱۸۵۴-۱۸۵۵ء۔ کتبات کے لیے: (۷) M. Nazim: *Bijapur in Inscriptions* (= *MASI*، ج ۴۹)، دہلی ۱۹۳۶ء۔ عام طرز تعمیر کے لیے: (۸) Percy Brown: *Indian Architecture* (اسلامی دور)، بمبئی بدون تاریخ طباعت، لیکن پیمانے صحیح نہیں دیے ہیں؛ استحکامات کے لیے: (۹) Sidney Toy: *The stronghold of India*، لنڈن ۱۹۵۷ء (اس میں تاریخی معلومات غیر معتبر ہیں)؛ (۱۰) کچھ تفصیلی خاکے اور نقشے، در C. Batley: *The design development of Indian architecture*، لنڈن ۱۹۵۳ء۔

(J. BURTON-PAGE)

بیجان، احمد: صلاح الدین الکاتب کا بیٹا (لہٰذا المعروف بہ یازیجی اوغلو احمد) اور مشہور یازیجی اوغلو محمد کا چھوٹا بھائی، جو ایک ترکی صوفی مصنف اور "مشہور معلم" گزرا ہے۔ اس نے نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں زندگی پائی۔ انقرہ کے حاجی بیرم (رک بآں) کی

زیر نگرانی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تمام بھائیوں نے گیلی بولی میں فراغت کی زندگی بسر کی۔ احمد نے اتنی ریاضت و عبادت کی اور وہ اس قدر دبلا پتلا ہو گیا تھا کہ لوگ اسے "بے جان" یعنی مردنی کہا کرتے تھے اور وہ خود بھی اپنی کتابوں میں اپنے آپ کو اس لقب سے یاد کرتا ہے۔ منتہی (دیکھیے نیچے) کی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ احمد یقیناً ۸۷۰ھ / ۱۴۶۵-۱۴۶۶ء تک زندہ رہا ہوگا۔ وہ گیلی بولی میں اپنے بھائی کے قریب ہی دفن ہوا، جہاں ان کی تربت ایک مقبول عوام زیارت گاہ تھی (قب اولیا چلبی، ۵: ۳۲۰ و ۳: ۱۰۱؛ جہاں اولیا چلبی یہ بھی لکھتا ہے کہ احمد کچھ عرصے صوفیہ میں بھی رہا)۔

اس کی تصانیف حسب ذیل ہیں: (۱) انوار العاشقین (حاجی خلیفہ، طبع فلوگل، عدد ۱۴۱۱): یہ کتاب احمد کے بھائی کی ایک عربی تصنیف مغارب الزمان کا ترکی زبان میں منثور ترجمہ ہے (حاجی خلیفہ عدد ۱۲۳۶۲)۔ اس کتاب کو اس نے محرم ۸۵۵ھ / فروری ۱۴۵۱ء میں مکمل کر لیا تھا۔ یہ تصوف کی ایک معیاری کتاب ہے (اس کے مضامین کو Hammer نے *S.B. Ak. Wien. Phil.-Hist. Kl.*، ۳: ۱۲۹ ببعد میں بیان کیا ہے)، جسے خاص شہرت حاصل ہوئی۔ فہمی قرہ‌تای: استانبول یونیورسٹی کتب خانہ، ترکچہ باصمہ لر (*Ist. Ün. Küt. Turkče Basmalar*)، ۱۹۵۶ء میں اس کی بارہ مطبوعہ اشاعتوں کا ذکر ہے۔

(۲) در مکنون (حاجی خلیفہ، عدد ۴۸۷۳): اس کتاب کا موضوع احوالِ عالم اور مدعائے تصنیف قدرتِ الٰہی کا بیان ہے۔ یہ کتاب بھی مغارب الزمان پر مبنی ہے۔ (۳) عجائب المخلوقات (حاجی خلیفہ عدد ۸۰۷۰): یہ کتاب قزوینی کی تصنیف کا خلاصہ ہے (قب Rieu: *CTM*، ص ۱۰۶)، ۸۵۷ھ / ۱۴۵۳ء میں تکمیل کو پہنچی (مطبوعہ قازان ۱۸۸۸ء)۔ ان تینوں کتابوں کے متعدد قلمی نسخے بھی پائے جاتے ہیں۔ (۴) منتہی: عقیدہ و عمل کی بہترین تصنیف ہے۔ اس میں تفسیرِ آیاتِ قرآن، سیر انبیا اور اقوال صلحا وغیرہ بھی شامل ہیں (اس کتاب کا قلمی نسخہ استانبول یونیورسٹی لائبریری (خالص افندی)، عدد Ty (ترکیات) ۳۴۰۳، میں ہے)۔ یہ کتاب گیلی بولی میں ۸۷۰ھ / ۱۴۶۵-۱۴۶۶ء میں لکھی گئی تھی (ورق ۲ ب)۔ موصوف کی تمام تصانیف سادہ واعظانہ رنگ میں ہیں اور ان کا اب و لہجہ انکسار و خلوص کی پاکیزگی پر مبنی ہے۔

تصنیف احمدیہ، جو اب تک مقبول عام ہے اور بعض اوقات احمد بیجان سے منسوب کی جاتی ہے، در حقیقت احمد مُرنیدی کی تصنیف ہے (اس کے لیے دیکھیے *OM*، ۱: ۳۳)۔

مآخذ: (۱) لطیفی، ص ۹۵؛ (۲) سعد الدین، ۲: ۴۹۰؛ (۳) عالی: کنہ، ۵: ۲۳۷؛ (۴) سجلّی: شقائق، ص ۱۲۸؛ (۵) Hammer-Purgstall، ۱: ۱۳۷، ۱۶۰؛ (۶) وہی مصنف: *GOD*، ۱: ۱۲۷ ببعد؛ (۷) Rieu: *CTM*، ۱۷ ب، ۱۰۵ ب و ۱۰۶ الف اور اس میں مندرج حوالہ جات؛ (۸) Gibb: *Ottoman Poetry*، ۱: ۳۸۹؛ (۹) *OM*، ۱: ۱۶ و ۱۹۴ تا ۱۹۶؛ (۱۰) آآ - انگریزی، طبع اوّل، بذیل مادہ بیجان (بلا نام مصنف — احمد بیجان Ahmad Bican، در آآ - ترکی، و بابنجی اوغلو (Fr. Babinger ؟)؛ (۱۱) Fr. Taeschner: *Die geog. Lit. der Osmanen*، در *ZDMG*، ۷۷ (۱۹۲۳ء)، ۳۶ ببعد؛ (۱۲) E. Rossi: *Elenco dei Manoscritti Turchi della Bibl. Vaticana*، ۱۹۵۳ء، نیز اس میں مندرجہ دوسری فہارس کتب کے حوالہ جات۔

(V.L. MÉNAGE)

• **بیجا نگر:** رک بہ وجیا نگر.

⊗ **بیجر:** [= باجر]، پورا نام جارج پرسی بیجر George Percy Badger، ایک انگریز مستشرق جو ۱۸۱۵ء میں چیمز فورڈ میں پیدا ہوا اور جس نے مالٹا [= مالطه] اور ارض شام میں تعلیم پائی۔ وہ مالٹی (= مالطی) اور عربی زبانوں کا ماہر تھا اور ۱۸۴۰ء میں کلیسائے انگلستان میں شامل ہوا۔ وہ بہت عرصے تک انگریزی حکومت کی ملازمت کرتا رہا۔ اس کی ملازمت کا زیادہ تر زمانہ ہندوستان، مغربی ایشیا اور مشرقی افریقہ میں گزرا۔ *The Nestorians and their Rituals*، ۱۸۵۲ء، *History of Imāms and Sayyids of Omān*، ۱۸۷۱ء اور انگریزی عربی لغت (*English-Arabic Lexicon*، ۱۸۸۱ء [بار دوم، بیروت ۱۹۶۷ء] اس کی مشہور تصانیف ہیں۔ بیجر کا انتقال ۱۸۸۸ء میں ہوا.

مآخذ: (۱) Joseph Thomas: *Universal Pronouncing Dictionary of Biography and Mythology*، فلاڈلفیا و لنڈن ۱۹۱۵ء؛ (۲) *New Century Cyclopedia of Names*، نیویارک.

(سید نذیر نیازی)

• **بیجوان:** رک بہ باجلان.

⊘ **بیجہ:** [= بجه]: رک بہ باجه.

• **بَیحان:** (بیحان) جنوبی عرب [یمن] میں ایک وادی [ادی] اور ایک علاقہ جو وادی حریب (رک بآں) کے جو اس کی مغربی جانب ہے اور وادی مرخہ کے (جس میں نسیین کی سطح مرتفع بھی ہے) جو اس کے مشرق میں ہے، درمیان واقع ہے (قب مقالۂ عولقی)۔ یہ طویل وادی جو دور عوذلة (قب مقالۂ عوذلی) سے تخمیناً ۱۰۰ کیلومیٹر (۶۰ میل) شمال کی جانب چلی گئی ہے یہاں تک کہ اس کا خشک ''سناتی دہانہ'' (delta) رملة سبعتین کے ریگستان میں گم ہو جاتا ہے کسی زمانے میں عہد قدیم کی ریاست قتبان (رک بآں) کا مرکز تھی۔ امریکہ سے ۱۹۵۰ء میں جو تحقیقی جمعیت آئی اس کی بدولت بیحان اس وقت جنوبی عرب کے تمام اضلاع میں سب سے زیادہ جانا پہچانا ضلع ہے.

قتبانی کتبوں میں ''ب ی ح ن'' فقط ایک قبیلے (ذو بیحان) یا ایک معبد کے معنی رکھتا ہے۔ یہ حقیقت اشتقاق سے مطابقت نہیں رکھتی جو لینڈبرگ Landberg نے لکھا ہے (*Arabica*، ۵: ۳) جس کی رو سے اس لفظ کے معنی (حمٰی کے خلاف) ''مشترک چراگاہ'' کے ہیں۔ سبائی متون سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ایک اور بیحان بھی ہے جو علاقۂ جوف کے اندر ایک مقام ہے (Ryckmans، ۱: ۳۲۳؛ Grohmann، ۱: ۱۴۷؛ دیکھیے Wissmann و Hofner، ۱۵: ۷۷)۔ الہمدانی: صفة جزیرة العرب کے مطابق بیحان کی آبادی ردمان اور حمیر سے ہوتی تھی لیکن پینے کا پانی وادی صدارة سے حاصل ہوتا تھا۔ آبادی کا اکثر حصہ بنو مراد میں سے تھا جن میں آل مکرمان کا سردار قبیلۂ مذحج میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ یاقوت نے بیحان کو جنوبی عرب [یمن] کے اضلاع (مخلاف) کی اپنی دی ہوئی فہرست میں شامل کیا ہے.

بیحانی اضلاع بھی تین ہیں جن میں باہم فرق کرنا چاہیے: (۱) بیحان الدولة (بیحان الاعلیٰ)، اس وادی کا تنگ، بنجر اور کہیں کہیں آباد وہ بالائی حصہ ہے جو وادی کے شروع سے لے کر بیحان القصاب کی سرحد پر واقع ناطع تک چلا گیا ہے۔ علاقۂ بنیر [رک بآں] کی طرح یہ بھی پہلے سلطنت رصاص کا ایک حصہ تھا لیکن اس وقت مملکت یمن میں شامل ہے۔ آب و ہوا مضر صحت ہے اور اس کی وجہ غیل کا ساکن و متعفن پانی ہے۔ اس ضلع کا صدر مقام البیضاء (رک بآں) جنوب میں ہے۔ (۲) بیحان القصاب جو وادی کے بیچ کا

سرسبز اور زرخیز خطّہ ہے۔ (دیکھیے مقالہ آئندہ)۔ (۳) بیحان الاسفل وادی کا بقیہ شمالی حصہ، کہیں کہیں سے آباد میدان ہے جو رفتہ رفتہ آگے چل کر چوڑا بن جاتا ہے۔ اس کے چار اقطاع (حصو الشّقاط، حقبہ، عسیلان) میں اولادِ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ [و] سلّم کا غلبہ رہا، پہلے دو میں سادات کا اور آخری دو میں اشراف کا، اسی لیے اس پورے علاقے کا لقب "بلاد السادۃ / الاشراف" پڑ گیا۔ اس کا صدر مقام نُقُوب ہے جہاں ہوائی جہازوں کے اترنے کا میدان ہے۔ یہاں بہت سے بدوی بھی رہتے ہیں جن میں سے اکثر بلحارث [بنو الحارث] ہیں۔ اسی قبیلے کے قبضے میں ایادیم کی نمک کی کانیں ہیں جو صحرا کے اندر دور جا کر واقع ہیں اور بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

کاروانوں کے موجود ہونے کی بدولت قدیم زمانے میں یہ علاقہ کثرت سے زیر کاشت تھا۔ صدیوں تک قتبان کی شاہی حکومت نے یہاں اپنا مرکز شبوۃ (رکّ بآں) اور مأرب (رکّ بآں) کے درمیان شاہراہ بخور (incense road) کے کنارے رکھا تھا۔ خاص توجہ کی جگہ تلِ حَجَر کُحلان ہے جو عسیلان کے تھوڑا سا جنوب مغرب میں ہے۔ یہاں کے کتبات کی مدد سے Rhodokanakis پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں تِمنع یا تُمنع (Thomna : Pliny) قتبان کا دارالسلطنت واقع تھا۔ ۱۹۵۰ء میں یہاں جو چیزیں دریافت ہوئیں خصوصاً رومن اریٹائن Roman Arretine ظروف ان سے شہر کی آتش زدگی سے بربادی کی تخمینی تاریخ ۱۰ء مقرر کی جا سکتی ہے۔ ے ف ن (امفنی) اور ح د ث (ح د ث) نام کے دو محلوں کی کھدائیوں میں ڈھیروں کے نیچے سے نکلے شہزادی ب ر ء ت ک کانسی کا مجسمہ اور دو یونانی نمونے کے نفیس برنجی شیر بھی یہاں سے نکلے ہیں جن پر بچے سوار ہیں۔ حُمید بن عقیل میں تمنع کا قبرستان ملا اور اسی کے کچھ حصّے کا تفحّص بھی کر لیا گیا۔ جنوب کی جانب آگے بڑھ کر حصنُ العِجر اور حَجَر بن حُمید میں بھی قدیم کھنڈر ملے۔ یہاں وادی بیحان اور وادی سُبلقہ کے مقامِ اتصال پر ایک طبق بر طبق سمہ ٹیکرے کو وارپار بہت دور تک گہرا کھودا گیا اور اس سے یہ رائے قائم کرنے کی گنجائش نکل آئی کہ یہاں قدیم سے کوزہ گری ہوتی تھی۔ جس کی ابتدا کا سراغ تقریباً ۱۰۰۰ ق۔ م تک چلا جاتا ہے، جب کہ اس شہر میں سب سے پہلے مکانات بنائے گئے تھے۔ پھر بارہ سو سال کے زمانے میں یعنی اس وقت تک کہ آب پاشی کا نظام متروک ہوا۔ میدان کی سطح تقریباً آٹھ میٹر بلند ہو گئی (یعنی ہر ڈیڑھ سال میں ایک سنٹی میٹر کے حساب سے)۔ حجر بن حُمید کے مقام کی کھدائیوں میں سب سے اونچی جگہ وہ ہے جہاں جنانی کے بارہ دروں کی بنی ہوئی ایک عمارت تھی جو غالباً پہلی صدی عیسوی میں تعمیر کی گئی تھی۔

مآخذ: (۱) الہمدانی: صفۃ، طبع Müller، ص ۱۹۸ و مواضع کثیرہ؛ ترجمہ از Forrer ص ۱۵۸؛ (۲) یاقوت، ۱: ۲۸۴، ۳: ۳۳۳؛ (۳) عمارۃ [: اخبار الیمن]، ۵ ببعد، ۱۳۱، ۳۴۱؛ (۴) ابن المجاور: تاریخ المستبصر (طبع مقالہ نگار)، ص ۸۶ ببعد، ۱۹۹، ۲۰۲، ۲۳۹؛ (۵) A. Grohmann: *Südarabien als Wirtschaftsgebiet*، مواضع کثیرہ؛ (۶) G. Ryckmans: *Les noms propres sud-sémitiques*، ۱: ۲۸۶، ۳۳۳، ۲: ۷۵؛ (۷) A. Sprenger: *Die alte Geographie Arabiens*، ص ۱۸۸ ببعد، ۲۰۵؛ (۸) C. Landberg: *Arabica*، ۴: ۱ تا ۷۸؛ (۹) H. v. Wissmann و M. Höfner: *Beiträge zur histor. Geographie des vorislam. Südarabien (1952)*، ص ۱۹۵، ۳۲ تا ۶۰، ۷۷؛ (۱۰) W. Phillips: *Qataban and Sheba (1955)*، ص ۳۱ تا

۱۳۰، ۱۳۰ تا ۱۷۷، ۲۰۹ تا ۲۱۸؛ (۱۱) D. Ingrams: *Survey of social and economic conditions in the Aden protectorate (1949)*، ص ۴۳، ۴۷، ۱۲۶ ببعد، ۱۴۷، ۱۴۸؛ (۱۲) R. Le Baron Bowen و *Archaeological Discoveries* in: F. P. Albright، *South Arabia (1958)*، حصہ ۱ (ص ۱ تا ۲۱۲)، مع نقشہ جات)؛ عام نقشہ: v. Wissmann: جنوبی عرب، لوح ۱ (۱۹۵۷ء)، پیمانہ ۱ : ۵۰۰،۰۰۰)۔

(O. LÖFGREN)

بَیْحان القَصاب: وادی بَیْحان کا درمیانی حصّہ (دیکھیے مقالۂ بالا) بیحان الدولۃ (جنوب) اور بَیْحانُ الأسْفَل (شمال) کے درمیان واقع ہے۔ اسی میں وادی الخِرّ بھی شامل ہے جو جنوب میں شروع ہو کر وادی بیحان کے مغرب کی طرف گئی ہے یہاں تک کہ شہر القصاب کے قریب آخر الذّکر میں سے آ ملتی ہے۔ بَیْحان القَصاب اور بَیْحان الأَسْفَل دونوں مل کر آج کل خود مختار مملکت بیحان بن گئے ہیں جو مغربی عدن کے علاقے میں شامل ہے۔ اس مملکت کی جنوب مغربی اور شمال مغربی سرحدیں اسی خط کا ایک حصّہ ہیں جو ۱۹۳۴ء میں یمن اور علاقۂ زیر حمایت کے درمیان بدستور رہنے دیا گیا۔ باقی سرحدیں یہ ہیں، مشرق میں کوہستان عَوالِق کا بالائی حصّہ، شمال مشرق میں قبائل کُرَب اور الرُّبع الخالی (غیر آباد خطّے) کے کنارے۔

بیحان القصاب (آبادی تقریباً ۸۰۰۰) میں زیرِ زمین پانی کی افراط ہے اور اکثر چند گز زمین کھودنے ہی سے پانی نکل آتا ہے۔ دو سو سے خاصے زیادہ کنویں چلتے ہیں اور آبپاشی کا کافی انتظام ہے۔ بارش باقاعدہ نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ برسوں بارش نہیں ہوتی۔ اس سر زمین میں کھجور اور عِلْب (ایک قسم کی سخت جنگلی لکڑی کا درخت) کے درختوں کے جھنڈ اور دیگر سبزیوں کی کثرت ہے۔ بڑی پیداوار اور فصلیں یہ ہیں: کھجور، نَبِق (ایک میٹھی پھلی)، انجیر، انگور، گندم، جو، باجرا، جوار، دخن (مکئی)، تل، نیل اور کپاس۔ بھیڑ بکریوں کے لیے بہت اچھی چراگاہیں ہیں اور یہ سر زمین اونٹوں کی ایک خاص نسل کی پرورش کے لیے مشہور ہے۔ آبادی قبیلہ المُصْعَبِین پر مشتمل ہے اور جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے اس کی دو بڑی شاخیں ہیں: آل احمد اور آل عُرَیف۔ یہ لوگ بہت سے دیہات میں آباد ہیں۔ بڑا شہر قصاب ہے جسے حِصْن عبداللہ بھی کہتے ہیں۔ یہ اس علاقے کا بڑا تجارتی مرکز اور نظم و نسق کا ایک اہم مقام ہے۔ القصاب میں ہوائی اڈا اور لاسلکی کا ایک مرکز بھی ہے۔

اشراف اور سادات کا کوئی الگ قبیلہ نہیں ہے۔ جب شریف احمد بن محسن نے برطانیہ سے ۱۹۰۳ء میں معاہدہ کیا تو انھیں بَیحان الأَسْفَل کے بلحارث اور المُصْعَبِین کے ایک گروہ آل احمد کی تائید برابر حاصل تھی۔ بعد میں جب ملک میں اندرونی حالات بدلنا شروع ہوے اور اس علاقے پر یمن نے اپنا حق ظاہر کیا اور بیحان کے باشندوں سے اپنی اطاعت کرانا چاہی تو حفاظتی مصالح کا تقاضا ہوا کہ زیر حفاظت علاقے کے مقامی برطانوی عمّال کی مدد سے سارے علاقے اور مغربی بیحان پر تسلّط کے لیے "رئیس مُعاھد" (Chief Treaty) کی قوت مضبوط کی جائے۔ ۱۹۴۴ء میں بیحان کے صغیرالسّن شریف کے اتالیق نے برطانیہ سے ایک اور معاہدہ کیا، جس کی رو سے اس نے اپنے ملک کے انتظام میں اور مالیات کے اخراجات میں برطانیہ کے مشورے کے مطابق چلنے کا اقرار کیا۔ شریف کا دارالحکومت النُّقُوب میں ہے، جہاں

طیارے اترنے کا ایک میدان ہے ۔ حال ہی میں المصعبین کو نیم خود مختار مان لیا گیا ہے اور ان سے ایک چھوٹا سا معاہدہ ہو گیا ہے کہ وہ ایک ہوائی اڈے کی حفاظت کریں گے ۔ یہاں ایک شرعی اور ایک قانون عام (عرف) کی عدالت ہے، اور بیحان میں لڑکیوں کے دو ابتدائی مدرسے ہیں.

مآخذ : (۱) C. Landberg : *Arabica*، ۵ : ۱ تا ۳۲؛ (۲) A. Hamilton : *The Kingdom of Melchoir*، لنڈن ۱۹۴۹ء، مواضع کثیرہ؛ (۳) D. Ingrams : *A Survey of Social and Economic Conditions in the Aden Protectorate*، ۱۹۴۹ء، مواضع کثیرہ (مع نقشہ)؛ (۴) F. Balsan : *A Travers l'Arabie Inconnue*، ۱۹۵۴ء، مواضع کثیرہ؛ (۵) W. Phillips : *Qataban and Sheba*، ۱۹۵۵ء، مواضع کثیرہ.

(M.A. GHUL)

● **بیدپای** : رک بہ کلیلہ و دمنہ.

⊗ **بیدر (محمد آباد)** : کا محلِّ وقوع عرض البلد ۱۷° ۵۵' شمالی اور طول البلد ۷۷° ۳۰' مشرق میں ہے ۔ یہ آج کل ریاست حیدر آباد (دکن) کے ایک ضلع کا صدر مقام ہے اور کسی زمانے میں بہمنی اور بریدی سلاطین کا پایۂ تخت رہا ہے ۔ تاریخی آثار سے پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کے قبضے سے پہلے بھی یہ شہر کافی اہمیت کا حامل تھا، لیکن اس کے صحیح اور مسلسل حالات کسی جگہ چودھویں صدی عیسوی سے پہلے نہیں ملتے ۔ ۱۳۲۲ء میں اُلُغ خان نے اس پر قبضہ کیا اور سلطنتِ دہلی سے اس کا الحاق ہو گیا ۔ الغ خان اس واقعے کے تین سال بعد محمد بن تغلق شاہ کے خطاب سے دہلی کے تخت پر بیٹھا اور تقریبًا تمام جزیرہ نمائے ہند کا فرمانروا بن گیا ۔ لیکن دکن کی فتح محمد بن تغلق کے لیے مبارک ثابت نہیں ہوئی اور اسے پے در پے بغاوتوں کا مقابلہ کرنا پڑا، جن میں سے اہم امیرانِ صدہ کی بغاوت تھی ۔ آخر کار ستمبر ۱۳۴۶ء میں دکنی سرداروں نے امیر اسمٰعیل مُخ کو سلطان ناصر الدین اسمٰعیل شاہ کا خطاب دے کر اپنا فرمانروا منتخب کیا اور دولت آباد میں اپنے تخت پر بٹھایا، لیکن بہت جلد یہ محسوس ہونے لگا کہ ایک اور امیر صدہ یعنی حسن گنگو، جسے محمد بن تغلق نے ظفر خان کا خطاب دیا تھا، قابلیت اور جنگی اہلیت میں ناصر الدین اسمٰعیل سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے، اور جب ظفر خان نے دشمن کو بیدر کے مقام پر شکست فاش دی تو اس کا دکن کی سلطنت پر ایک طرح کا حق پیدا ہو گیا، چنانچہ واقعات اور حالات سے مجبور ہو کر اسمٰعیل شاہ نے اگست ۱۳۴۷ء میں تخت سے دستبرداری دے دی اور اس کی جگہ حسن گنگو سکندر ثانی علاء الدنیا والدین ابوالمظفر بہمن شاہ کے لقب سے بادشاہ منتخب ہوا.

اس واقعے سے ٹھیک پچھتر سال بعد یعنی ۸۲۵ھ / ۱۴۲۲ء شہاب الدین احمد شاہ اول نے بہمنی سلطنت کا پایۂ تخت احسن آباد گلبرگہ [رک بآں] سے بیدر منتقل کر دیا اور اپنے بیٹے شاہزادۂ محمد کے نام پر بیدر کا نام محمد آباد رکھ دیا ۔ کہتے ہیں کہ احمد شاہ ایک روز شکار کھیل رہا تھا کہ اسے ایک لومڑی ایک کتے کا تعاقب کرتی نظر آئی ۔ اسے یہ بڑا اچنبھا معلوم ہوا اور اس نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ یہ کون سا مقام ہے کہ اس کی آب و ہوا کے اثر سے لومڑیاں کتوں کے پیچھے بھاگتی ہیں ۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ بیدر کا علاقہ ہے تو اس نے سوچا کہ جب جانوروں کی یہ حالت ہے تو انسانوں کی توانائی اور چستی پر یہاں کے پانی کا کیا کچھ اثر نہ ہوگا اور اسی خیال سے اس نے اپنے پایۂ تخت کو بیدر منتقل کر دیا، لیکن تقریبًا اسی قسم کی روایتیں بعض دوسرے مقامات کے متعلق بھی پڑھنے

میں آتی ہیں اور من گھڑت معلوم ہوتی ہیں۔ یوں تو بیدر صدیوں پرانا شہر تھا مگر بہمنی دور کے ابتدائی زمانے میں بھی یہ کافی اہمیت لیے ہوئے تھا۔ چونکہ یہ سطح سمندر سے ۲۳۳۰ فٹ بلند سطح مرتفع پر واقع ہے، اس لیے فوجی اعتبار سے اس کا محل وقوع ہمیشہ بہت اہم رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ احمد شاہ کو اس کی عمدہ آب و ہوا اور پانی کی بہتات کی وجہ سے اور اس وجہ سے بھی کہ وہ گلبرگہ کے جھگڑوں اور خانہ جنگیوں سے اپنے آپ کو نکال لینا چاہتا تھا، اپنی تخت نشینی کے بعد ہی سے یہ خیال ہو گیا تھا کہ بیدر ہی کو بہمنی سلطنت کا پایۂ تخت بنائے اور بظاہر اس فیصلے میں کسی لومڑی اور کتے کے تعاقب کا کوئی اثر نہ پڑا ہو گا۔

بیدر (محمد آباد) میں آٹھ بہمنی سلاطین نے حکومت کی، لیکن اس شہر کو علما و فضلا کا مرکز بنانے اور بقول ایک روسی سیاح کے، جس نے اس زمانے میں ہندوستان کا سفر کیا تھا، اسلامی ہند کا سب سے بڑا مرکز بنانے میں شمس الدین محمد شاہ سوم کے وزیر با تدبیر خواجہ عماد الدین محمود گاواں کا نام نہایت ممتاز ہے۔ محمود گاواں سلطنت کی فرقہ بندیوں اور ذاتی عناد کی قربان گاہ پر ۸۸۶ھ/ ۱۴۸۱ء میں بھینٹ چڑھ گیا اور اس واقعۂ ہائلہ کے بعد سلطنت میں کوئی ایسا شخص باقی نہ رہا جو مرکز گریز قوتوں سے اسے بچا سکے۔ بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈہ اور برار کے طرفدار (صوبہ دار) اپنے اپنے صوبے میں خود مختار بن بیٹھے اور خاص پایۂ تخت محمد آباد بیدر میں برید الممالک محمد قاسم برید سلطان محمود شاہ بہمنی پر اتنا حاوی ہو گیا کہ خود اپنا ہی "کوس لمن الملک" بجانے لگا؛ لیکن بہمنی خاندان کے کارناموں کا لوگوں پر اتنا رعب تھا کہ کسی صوبے دار کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اپنی آزادی کا اعلان کر دے، چنانچہ بیدر میں بھی قاسم برید کا پوتا علی برید پہلا بریدی فرمانروا تھا جس نے (شاید آخری بہمنی فرمانروا کلیم اللہ کے انتقال کے بعد) اپنی سلطنت کا اعلان کیا۔ بیدر پر بریدی بادشاہ [رک بہ برید شاہی] ۱۶۱۹ء تک حکومت کرتے رہے۔ اس سال ابراہیم عادل شاہ نے بیدر پر قبضہ کر لیا اور یہ ۱۶۵۶ء تک سلطنت بیجاپور کا جزو بنا رہا۔ ۱۶۵۶ء میں اس کا سلطنت مغلیہ سے الحاق ہو گیا اور جب نظام الملک آصف جاہ اول نے ۱۷۲۴ء میں مبارز خان کو شکر کھیڑے کے مقام پر شکست دے کر اپنا پرچم دکن کے صوبوں پر اڑایا تو بیدر بھی آصف جاہی عملداری میں آ گیا۔

بہمنی بادشاہوں کا ذکر دوسری جگہ کیا گیا ہے [رک بہ بہمنی سلطنت]؛ یہاں بریدی فرمانرواؤں کی فہرست دی جاتی ہے:

۱۔ قاسم برید الملک، وزیراعظم ۸۹۸ھ/ ۱۴۹۲ء۔

۲۔ امیر برید، وزیر اعظم ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء۔

۳۔ علی برید شاہ، تخت نشینی ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء۔

۴۔ ابراھیم برید شاہ، تخت نشینی ۹۸۷ھ/ ۱۵۷۹ء۔

۵۔ قاسم برید شاہ، تخت نشینی ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء۔

۶۔ امیر برید شاہ، تخت نشینی ۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۲ء۔

۷۔ مرزا علی برید شاہ، تخت نشینی ۱۰۱۰ھ/ ۱۶۰۱ء۔

۸۔ مرزا امیر برید شاہ، تخت نشینی ۱۰۱۸ھ/ ۱۶۰۹ء (واضح ہو کہ آخری تین فرمانرواؤں کے متعلق ہمیں بہت کم معلومات حاصل ہیں بلکہ یہ بھی پورے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے پہلے کون گدی پر بیٹھا اور کون اس کے بعد)۔

چونکہ بیدر (محمد آباد) میں یکے بعد دیگرے بہمنیوں، بریدیوں، مغلوں اور آصف جاہیوں کے پرچم لہرائے، اس لیے ایک اعتبار سے یہ شہر دکن کے مختلف تمدنوں کا گہوارہ رہا ہے اور اس میں ان چاروں ادوار کی عمارتیں ملتی ہیں۔ سب سے پہلے تو قلعے کو لیجیے جس کے داخلے کے دروازوں میں پہلا اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے کا، دوسرا غالبًا سلطان محمود شاہ بہمنی (۱۴۸۲ء تا ۱۵۱۸ء) کے زمانے کا اور تیسرا شہاب الدین احمد شاہ اول (۱۴۲۲ء تا ۱۴۳۶ء) کے عہد کا ہے۔ دوسرے دروازے کو شرزہ دروازہ کہتے ہیں اور اس کی محراب پر خود سلطان محمود شاہ بہمنی کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ ذرا آگے بڑھ کر بائیں جانب چند بریدی ایوان نظر آتے ہیں، جن میں شاید سب سے ممتاز رنگین محل ہے۔ اس محل کے برآمدے کی چھت لکڑی کے خوبصورت بیل پایوں پر استادہ ہے جن سے قدیم جالوکی مندروں کے بیل پایوں کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ رنگین محل کا بیشتر حصہ علی برید شاہ نے تعمیر اور مرتب کیا تھا۔ اس فرمانروا کو فن تعمیر سے خاص شغف تھا، چنانچہ اس نے اپنے شہ نشین کو سیپ کے کام کے نہایت خوبصورت نقش و نگار سے آراستہ کیا اور یہ اپنے زمانے کے فن کے بہترین نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شہ نشین کے اندرونی دروازے پر:

هر دُرِ ثمین کہ در صدف دارد عشق
از بہر نثار در گرہ دارد عشق
عاشق شود آنکس کہ درآید ز درت
گویا ز در و بام تو می بارد عشق

کھڑکی پر:

اے منظر دیدہ از جمالت روشن
وے کردہ چو دُر در صدف سینہ وطن
بمحرم بنشستنی خموش کہ دل
گشتہ بہر تو آراستہ شد ای گلشن

یہاں سے ذرا آگے بائیں ہاتھ کی طرف سولہ کھمبا مسجد ملتی ہے جس پر ۷۲۷ھ / ۱۳۲۶ء کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ اس مسجد کی چھت پر ایک بہت بڑا ذخیرۂ آب ہے، جو نہ صرف مسجد کے لیے بلکہ اکثر محلات کے لیے بھی پانی فراہم کرتا تھا۔ یہاں سے کچھ ہی دور ایوان بار عام اور ایوان بار خاص کے کھنڈر ہیں اور ان سے ملا ہوا تخت محل ہے، جس کی بیرونی روکار پر شیر و خورشید کی شبیہیں اس کا ثبوت دیتی ہیں کہ ان ایوانوں کے مکینوں پر ایرانی تمدن کا کتنا اثر تھا۔

لیکن بیدر (محمد آباد) کی عمارتوں کا سرتاج قلعہ نہیں بلکہ خواجہ عماد الدین محمود گاواں کا مدرسہ ہے، جسے اس نے ۸۷۷ھ / ۱۴۷۲ - ۱۴۷۳ء میں تعمیر کیا تھا۔ یہ مدرسہ سہ منزلہ ہے اور اس میں بیسیوں وسیع ہال اور چھوٹے بڑے کمرے اب بھی موجود ہیں۔ مدرسے کی بیرونی روکار پر چینی کی پچی کاری میں قرآن مجید کی آیت سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ (۳۹ [الزمر]: ۷۳) آج بھی معلمین و متعلمین کو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہے۔ اس مدرسے کے دونوں طرف اونچے اونچے ایرانی نمونے کے دو مینار تھے، جن میں سے ایک مینار اور مدرسے کی ایک پوری سمت بارود کے دھماکے سے ۱۱۰۷ھ / ۱۶۹۶ء میں اڑ گئی؛ چنانچہ صرف ایک مینار باقی ہے۔

بیدر کے مغرب میں اشٹور نامی گاؤں میں بہمنی بادشاہوں کے اور مشرق میں بریدی فرمانرواؤں کے مقبرے ہیں۔ بہمنی مقبروں میں سب سے حسین مقبرہ شہاب الدین احمد شاہ ولی کا ہے۔ اس مقبرے کے اندر نیچے سے اوپر تک گونا گوں اور بوقلموں رنگ آمیزی، طغرے، نقش؛ نسخ اور نستعلیق کتبات بھرے ہوئے ہیں اور جگہ جگہ حضرت شاہ نعمت اللہ کرمانی کے

اشعار نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو تین اشعار درج کیے جاتے ہیں:

تا محیطِ دیدہ بر زد موجِ عشق
ہفت دریا را چو سیلے دیدہ ام
نعمت اللہ یافتم در ہر وجود
با ہمہ عشقی و میلی دیدہ ام
نعمت اللہ در ہمہ عالم یکیست
لا تجدْ بِمثلی و مِثلی لا تجد

اس قسم کے صوفیانہ اشعار کے علاوہ جگہ جگہ آیاتِ قرآنی، حمد و نعت اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم اور حضرت علی رضؓ کے اسمائے مبارک طرح طرح سے لکھے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی ازمنۂ وسطٰی کے فن تعمیر میں احمد شاہ ولی کے مقبرے کا بہت اونچا مقام ہے۔

برید شاہی مقبروں میں سب سے نمایاں مقبرہ علی برید شاہ کا ہے، جسے خود صاحبِ مقبرہ نے ۹۸۳ھ/۱۵۷۶ء میں بنوایا تھا۔ اس مقبرے سے نظر کو بڑا دھوکا ہوتا ہے۔ گو اس کی کرسی سات فٹ بلند ہے اور ہر سمت ۷۵، ۷۵ فٹ طویل ہے اور گنبد کا بالا ترین حصّہ سطح زمین سے ۱۰۶ فٹ بلند ہے، تاہم ہر حصہ اس قدر متناسب ہے کہ قریب سے دیکھنے پر بھی اس کی وسعت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ مقبرہ چاروں طرف سے کھلا ہوا ہے اور اندرونی روکار قرآن مجید کی آیتوں اور خواجہ فرید الدین عطارؒ کے اشعار سے مزیّن ہے۔ مقبرے کی تاریخ ان اشعار سے نکلتی ہے:

بانیِ ایں گنبدِ گردوں مثال
شاہ فرخندہ بریدِ نیک خو
مصرعِ آخر کہ تاریخ بناست
"نام گنبد قبّۃ الانوار گو"
۹۸۳ھ

آخر میں یہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بیدر کا نام کئی مرتبہ بدلا گیا ہے۔ احمد شاہ ولی نے جب اسے اپنا پایۂ تخت بنایا اس کا نام محمد آباد رکھا، اورنگ زیب عالمگیر نے اسے ظفر آباد نام دیا اور اب اسے محمد آباد بیدر یا صرف بیدر کہتے ہیں اور احمد شاہ ولی کی نسبت سے بعض مرتبہ اسے بیدر شریف بھی کہا جاتا ہے۔

مآخذ: (۱) بشیر الدین احمد: تاریخِ مملکتِ بیجاپور، حصۂ سوم؛ (۲) عزیز مرزا: سیرۃ المحمود؛ (۳) *Cambridge History of India. Vol. III*؛ (۴) غلام یزدانی: *Antiquities of Bidar*؛ (۵) وہی مصنف: *Bidar: its History and Monuments*؛ (۶) ہارون خان شروانی: *Mahmud Gawan, the great Bahmani Wazir*؛ (۷) وہی مصنف: *The Bahmanis of the Deccan—an objective study*؛ (۸) Major: *India in the fifteenth Century*؛ (۹) [فرشتہ: تاریخ، ۲: ۱۷۶-۱۷۷؛ (۱۰) وؤ۱، لائڈن، بذیل مادہ].

(ہارون خان شروانی)

بَیذق: رک بہ شطرنج.

بیدل: میرزا عبدالقادر نام، ابوالمعانی لقب، عہدِ عالمگیری کے مشہور فارسی گو شاعر، عارفِ کامل اور عظیم مفکر؛ تورانی الاصل، قبیلہ چغتائی ارلاس [یا برلاس]؛ پیدائش: ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء بمقام پٹنہ؛ وفات: ۴ صفر ۱۱۳۳ھ / ۵ دسمبر ۱۷۲۰ء بمقام دہلی۔ آبا و اجداد کا پیشہ سپہگری تھا۔ والد میرزا عبدالخالق اوائل عمر سے ترکِ ماسوا کر کے گوشہ نشین ہو گئے اور سلسلۂ قادریہ کے ایک بزرگ شیخ کمال سے نسبت رکھتے تھے۔ خود بھی صاحبِ ارشاد تھے۔ بیدل کی تربیت میں اور بزرگوں کے علاوہ شیخ کمال کا بڑا حصّہ ہے۔ بیدل کے والدین ان کے بچپن میں وفات پا گئے۔ ان کے چچا میرزا قلندر [م ۱۰۷۶/۱۶۶۵ء] نے ان کی پرورش کی۔ میرزا قلندر اگرچہ اُمّی محض تھے مگر پاکیزہ علمی اور ادبی ذوق

رکھتے تھے۔ بیدل بھی جوان ہو کر چچا کی طرح شجاع بنے اور ساتھ ہی تصوف اور شاعری میں کمال حاصل کیا۔ کچھ عرصہ بیدل اپنے ماموں میرزا ظریف، ماہر تفسیر و حدیث، کے زیر اثر بھی رہے اور ان سے تفسیر کے کچھ اسباق پڑھے۔ ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۴ء میں ماموں نے وفات پائی۔ چچا پہلے بنگالہ جا چکے تھے۔ تنہائی اور بیکسی سے گھبرا کر بیدل دہلی چلے گئے۔ وہاں مشاعروں میں حصہ لیا اور بلندی فطرت اور ذوق سلیم کی بنا پر بہت جلد عاقل خان رازی سے راہ و رسم پیدا ہو گئی، جو نواب موصوف کی زندگی تک برابر قائم رہی۔ نواب عاقل خان رازی کے داماد نواب شکر اللہ خان [خاکسار] بھی بڑے سخن فہم اور سخن سنج تھے۔ بیدل کے ان سے بھی گہرے روابط پیدا ہو گئے۔ نواب شکر اللہ خان کے تینوں فرزند نواب لطف اللہ، نواب عنایت اللہ شاکر خان اور نواب کرم اللہ عاقل خان بھی بیدل کے نیاز مند تھے۔ عاقل خان رازی اور شکر اللہ خان دونوں علم تصوف میں بڑی دسترس رکھتے تھے، اس لیے تصوف کے کئی اسرار و رموز ان کی وجہ سے بیدل پر منکشف ہوئے۔ سادات خواف سے ان گہرے مراسم کے باوجود بیدل دہلی میں اقامت گزین نہ ہوئے، بلکہ ۱۰۹۶ھ/۱۶۸۵ء تک شاہجہان آباد، اکبر آباد، اور اسلام آباد متھرا میں آتے جاتے گزارے۔ ایک بار سیر و سیاحت کی غرض سے سرائے نکودر سے گزرتے ہوئے لاہور اور حسن ابدال بھی گئے۔ ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۹ء میں شادی کی۔ شادی کے بعد شاہزادہ اعظم شاہ کی فوج میں ملازم ہو گئے اور پنج صدی عہدہ ملا، مگر جب قصیدہ کہنے کی فرمائش ہوئی تو مستعفی ہو گئے۔ جن دنوں فوج میں ملازم تھے مولانا عبدالعزیز عزت سے اصلاح لیا کرتے تھے، جو علوم معقول و منقول میں ماہر ہونے کے علاوہ فن انشا و شعر گوئی میں بھی اپنی نظیر آپ تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے دکن میں مصروف ہونے کی بنا پر جب اکبر آباد اور متھرا کے نواح میں جاٹوں نے فسادات شروع کیے تو بد امنی سے تنگ آ کر بیدل مستقل طور پر دہلی چلے آئے۔ وہاں رہتے ہوئے ایک بار نواب شکر اللہ خان کے ساتھ بیراٹ کے کوہستانی علاقے میں بھی گئے۔ برسات کا موسم وہیں گزارا اور وہاں کے قدرتی مناظر کی تعریف میں اپنی بے نظیر مثنوی طور معرفت لکھی۔ دہلی میں مستقل اقامت کا زمانہ بیدل کے عروج کا زمانہ ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے ان کے دیوان کا مطالعہ کیا اور ان کے اشعار اپنے رقعات میں درج کیے۔ شاہ ولی اللہؒ کے والد شاہ عبدالرحیمؒ نے نظم و نثر میں ان کی تعریف کی۔ نظام الملک آصف جاہ اور امیر الامرا حسین علی خان کے علاوہ ہر طبقے کے بے شمار ہندو اور مسلم ان کے شاگرد تھے۔ نواب ذوالفقار خان، قطب الملک نواب حسن علی خان اور کئی اور ہفت ہزاری اور پنج ہزاری امرا ارادت مند تھے۔ شاہ عالم بہادر شاہ [رک بآں] اور شہنشاہ فرخ سیّر نے اپنے اپنے عہد میں ان کی قدردانی کی۔ جب امیر الامرا حسین علی خان اور قطب الملک حسن علی خان سادات بارھہ [رک بہ بارہ سیّد] نے ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء میں شہنشاہ فرخ سیّر کو بڑے عذاب دے کر قتل کرا دیا تو ان سے مخلصانہ مراسم کے باوجود بیدل نے یہ تاریخ کہی:

دیدی کہ چہ با شہ گرامی کردند
صد جور و جفا ز راہ خامی کردند
تاریخ چو از خرد بجستم فرمود
"سادات بوے نمکحرامی کردند"
۱۱۳۱ھ

سادات بارھہ نے انتقام لینا چاہا تو میرزا بیدل متوحش ہو کر لاہور میں نواب عبدالصمد خان کے پاس چلے آئے۔ جب سادات کے اقتدار کا خاتمہ

ہوا تو دہلی آئے اور وفات پائی ۔ پرانے قلعے کے سامنے حضرت بار پرانؒ کے مزار کے قریب اپنی حویلی کے صحن میں دفن ہوئے ۔ اور شعرائے دہلی کوئی پون صدی تک ان کا عرس باقاعدگی اور اہتمام سے مناتے رہے ۔

بیدل کی تصنیفات نظم و نثر پر مشتمل ہیں ۔ ان کے اشعار کی تعداد کم و بیش ایک لاکھ ہے ۔ غزلیات کے ساٹھ ہزار سے زائد اشعار ہیں ۔ ان کی چھے مثنویاں موجود ہیں : محیطِ اعظم، طلسمِ حیرت، طورِ معرفت، عرفان، تنبیہ المہوسین اور ایک بیانیہ مثنوی ۔ ان مثنویوں کے اشعار کی تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ ہے ۔ نواب شکر اللہ خان کے نام ایک رقعے میں وہ ایک اور مثنوی گلِ زرد کا بھی ذکر کرتے ہیں جو اب نایاب ہے ۔ ان کے قصائد کی تعداد اُنیس ہے جن میں دو ہزار اشعار ہیں ۔ قصائد تقریباً تمام کے تمام حضور سرور کائنات صلّی اللہ علیہ و سلّم اور حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کی تعریف میں ہیں ۔ کتاب خانۂ معارف، کابل میں غلام حسین کابلی کی لکھی ہوئی جو کلّیات بیدل موجود ہے اس میں صفحہ ۱۰۰۱ پر بیدل کا ۶۶ شعروں کا ایک قصیدہ ترکی زبان میں بھی درج ہے ۔ وہ مشہور رباعی گو بھی تھے، چنانچہ ان کی رباعیات کے سات ہزار سے زائد بیت ہیں ۔ علاوہ بریں انہوں نے کوئی بینتالیس کے قریب مخمّسات، ایک ترکیب بند، ایک ترجیع بند اور متعدد قطعات لکھے اور بہت سی پہیلیاں کہیں ۔

نثر میں چہار عنصر اور رقعات ان کی دو مشہور تصانیف ہیں ۔ کلّیات صفدری کے دیباچۂ رقعات سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے نثر میں فنِ رمل پر ایک رسالہ تالیف الاحکام بھی لکھا تھا، مگر وہ گم ہو چکا ہے ۔ دیباچۂ رقعات کی طرح بیدل نے اپنی چند ایک اور تصنیفات، مثلاً دیوانِ قدیم، محیطِ اعظم اور تالیف الاحکام کے پیش لفظ بھی نثر میں تحریر کیے ۔ علاوہ ازیں موزۂ بریطانیہ، لندن میں ان کی ایک بیاض موجود ہے جس میں متقدمین اور معاصرین کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے ۔ نیز انہوں نے اپنی نثری تصنیف چہار عنصر کے پرمغز حصوں کو یکجا کیا اور انہیں نکات کے نام سے موسوم کیا اور ان نکات سے متعلق اپنی مثنویات کے بعض حصے منتخب کیے اور ان کا نام اشارات و حکایات رکھا ۔

ان کی تصنیفات کے قلمی نسخے وسط ایشیا، برصغیر پاک و ہند اور یورپ میں ملتے ہیں ۔ انسائیکلوپیڈیا آو اسلام (لائڈن) اور ڈاکٹر ایتھے Dr. Ethe کے بیان کے مطابق کلّیات بیدل کا ایک ایڈیشن لکھنؤ میں ۱۲۸۷ھ میں چھپا، مگر جیسا کہ خود ڈاکٹر ایتھے کہتے ہیں وہ کلّیات در اصل بیدل کا دیوانِ قدیم ہے جو انہوں نے اپنی وفات سے کوئی تیس برس پہلے مرتب کیا تھا اور مطبع والوں نے اس میں نکات، رقعات، اور چہار عنصر کو شامل کر لیا ہے ۔ کلّیات بیدل حقیقی معنوں میں ۱۲۹۹ھ میں مطبع صفدری بمبئی میں طبع ہوا جو بیدل کی نظم و نثر کا بےنظیر مجموعہ ہے ۔ رقعات، چہار عنصر، اور غزلیات کو علیحدہ علیحدہ بھی پاک و ہند اور وسط ایشیا کے مختلف مطابع نے شائع کیا، مگر بیدل کا جو دیوانِ غزلیات ردیف د تک کابل میں امیر حبیب اللہ خان کے زمانے میں چھپا تھا وہ مطبع صفدری کی کلّیات بیدل کی طرح صحت الفاظ، تعداد اشعار و غزلیات، حُسنِ ترتیب و طباعت کے لحاظ سے بےمثال ہے ۔

میرزا بیدل مزاج کے مستغنی، بلندحوصلہ اور درویش‌منش تھے ۔ ان کے ہزاروں قدردان اور عقیدت مند تھے، مگر ان تمام کے جذبۂ نیاز مندی کا جواب پُرخلوص تعلقات کی صورت میں دینے کے

باوجود انھوں نے بے نیازی کی زندگی بسر کی، اپنے جذبۂ عشق کی پرورش کی اور اسے دلپذیر حکیمانہ انداز میں نظم و نثر میں بیان کیا ۔ ان کا فن ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے ۔ اس میں بھی وہی خلوص، وہی حُسن اور اسی طرح کی گہرائی اور عظمت موجود ہے جو ان کی جامع شخصیت کا خاصہ ہے ۔ ان کی تعلیمات انھیں اصولوں کا تذکرہ ہیں جن پر وہ عمر بھر عمل پیرا رہے ۔ وہ تصوف کو بہترین لائحۂ حیات سمجھتے تھے، اس لیے ان کے کلام میں صوفیوں کے احوال و مقامات اور ان کے اخلاق حسنہ کو اس خوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ باتیں خود بخود دل میں گھر کر جاتی ہیں ۔ وہ فقر کے بنیادی اصولِ توکّل پر پوری طرح عامل ہونے کے باوجود تصوف کے اس مکتبِ خیال سے تعلق رکھتے تھے جو جد و جہد، عزم و ہمت اور اثبات ذات کا قائل ہے، اس لیے ان کی تعلیمات حرکی عناصر سے لبریز ہیں ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ تمام ائمۂ تصوّف سے متاثر ہوئے، مگر ان کا علم تصوّف زیادہ تر ابن العربی کا مرہونِ منت ہے ۔ ابن العربی کے فلسفۂ تنزّلات کو وہ بڑی فکری گہرائی اور زورِ بیان اور پوری خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں ۔ اور انسان کو 'کونِ جامع' کا خطاب دیتے ہیں ۔ بیدل کے کلام میں انسان کی عظمت، اس کے بے پایاں امکانات، اور اس کے جمال و جلال کو اس عمدگی سے بیان کیا گیا ہے کہ فارسی ادب میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے ۔ بیدل کے سارے زورِ فصاحت اور ان کی تمام فلسفیانہ معلومات کا مقصد صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں انسان کی عظمت کو ثابت کیا جائے ۔ انھیں ذاتِ الٰہی سے بے پناہ محبت ہے ۔ اس کے بغیر وہ سب کچھ بیکار سمجھتے ہیں، مگر ان کے نزدیک یہ جذبۂ محبت بھی انسان کے ارتقاے ذات کا سبب ہے ۔

فارسی کے تمام اساتذہ کا کلام بیدل کی نگاہ سے گزرا ۔ قدما میں سے بالخصوص سعدی، حافظ اور رومی کے بڑے مدّاح تھے ۔ [وہ طرز جسے سبک ہندی کہا جاتا ہے بیدل نے اس میں خاص رنگ پیدا کیا ۔ ان کے فلسفانہ فکر کی وجہ سے ان کی غزلیات میں دقیق اشعار بھی موجود ہیں، جن کی علامہ اقبال نے کئی موقعوں پر تعریف کی ہے]، مگر ان کے صاف اشعار حسنِ بیان اور علوِّ خیال کا شاہکار ہیں.

نثر بیدل نثر ظہوری کے انداز پر ہے اگرچہ دونوں کے اپنے اپنے خصائص بھی ہیں ۔ کابل، وسط ایشیا اور ہندوستان میں بے شمار شعرا نے ان کا اتباع کیا ۔ اردو میں ان کے اشعار صرف چار مل سکے ہیں، مگر ان کے شاگردوں میں سے اوروں کے علاوہ خان آرزو اور آنند رام مخلص اردو گو شاعر بھی تھے ۔ جب تک دہلی میں بیدل کا عرس منایا جاتا رہا اس میں اردو کے شعرا بھی شامل ہوتے رہے ۔ غالب اور اقبال دونوں کے بیان میں بیدل کے بیّن اثرات ملتے ہیں [اور غالب نے ان کا واضح اعتراف کیا ہے]، اس لیے بالواسطہ ادب اردو کی تاسیس و تشکیل اور تزئین میں بیدل کا بہت بڑا حصّہ ہے ۔ [بیدل کی بحور بڑی مترنّم، پُرجوش اور رواں دواں ہوتی ہیں ۔ ان کی تراکیب کچھ تو اپنی اختراع کردہ ہیں، مگر بہت سی ایسی بھی ہیں جو متأخرین کے ہاں موجود تھیں ۔ ان کا شعری اسلوب پُرشکوہ اور پُرشوکت ہے ۔ ان کے کلام میں ایہام و اغلاق بھی ہے اور مروج صوفیانہ علامتوں، مثلاً بحر، موج، قطرہ، دریا، وغیرہ میں نئے معانی پیدا کیے ہیں ۔ طلسم اور آئینہ بھی ان کے خاص استعارات میں ہیں ۔ وہ افغانستان اور ماوراء النہر میں بہت مقبول ہوئے اگرچہ برصغیر ہند و پاکستان میں بھی ان کا بہت اعتراف ہوا ہے].

مآخذ: (۱) چہار عنصر بیدل (کلیات بیدل)، مطبع

صفدری، بمبئی ۱۲۹۹ھ؛ (۲) رقعاتِ بیدل، مطبع صفدری، بمبئی ۱۲۹۹ء؛ (۳) غلام علی آزاد بلگرامی: خزانۂ عامرہ، کانپور ۱۸۷۱ء؛ (۴) وہی مصنف: سروِ آزاد، حیدر آباد ۱۹۱۳ء؛ (۵) درگاہ قلی خان: مرقعِ دہلی، مطبوعۂ دکن؛ (۶) میر تقی میر: نکات الشعراء، بدایوں؛ (۷) محمد افضل سرخوش: کلمات الشعراء، لاہور؛ (۸) شیر خان لودھی: مرآۃ الخیال، کلکتہ ۱۸۳۱ء؛ (۹) سیّد علی محمد شاد: نوائے وطن، عظیم آباد ۱۸۸۵ء؛ (۱۰) فہرست عربی و فارسی مخطوطات اورینٹل پبلک لائبریری، بانکی پور، جلد سوم، مطبوعۂ کلکتہ ۱۹۱۲ء، مخطوطہ نمبر ۳۸۱؛ (۱۱) فہرست عربی، فارسی مخطوطات موزۂ بریطانیہ، لنڈن، ۱۸۸۱ء، ص ۴۰۶ الف تا ۴۰۷ الف، ۴۳۷ الف تا ۴۳۸ ب؛ (۱۲) مجلّۂ معارف، اعظم گڑھ، مئی ۱۹۳۲ء، جولائی ۱۹۳۲ء و اگست ۱۹۳۶ء (ذکر سفینۂ خوشگو ولد بیدل)؛ (۱۳) عبد الغنی: *Life and Works of Bidil*، مخطوطۂ کتاب خانۂ دانشگاہ پنجاب؛ (۱۴) عبدالغنی: تذکرۂ بیدل، در اورینٹل کالج میگزین ۱۹۰۳ء؛ (۱۵) یٰس خان نیازی: میرزا بیدل، در اورینٹل کالج میگزین، ۱۹۳۲-۱۹۳۳ء؛ (۱۶) وا، لائڈن بذیل مادہ؛ (۱۷) فہرست فارسی مخطوطات انڈیا آفس لائبریری، جلد اول، مطبوعۂ آکسفرڈ ۱۹۰۳ء، ذکر مخطوطہ نمبر ۱۶۴۷؛ (۱۸) کلّیاتِ بیدل، مخطوطہ نمبر ۴۰۵، و کاتب غلام حسین کابلی، مقبوضۂ کتابخانۂ معارف کابل ـ محرّرۂ ۱۳۰۹ھ؛ [(۱۹) عبدالوہّاب افتخار: تذکرۂ بینظیر، الٰہ آباد ۱۹۴۰ء؛ (۲۰) علی قلی والہ داغستانی: ریاض الشعراء، مخطوطۂ کتاب خانۂ دانشگاہ پنجاب، عدد ۱۳۸۳]؛ (۲۱) عبّادُ اللہ اختر: بیدل، لاہور ۱۹۵۲ء؛ (۲۲) عبدالغنی: *Life and Works of Abdul Qadir Bedil, Lahore, 1960*؛ (۲۳) عبدالغنی: روحِ بیدل، لاہور ۱۹۶۸ء۔

(عبدالغنی)

بَیْدُو: [= بائیدو، بائدو، بایدو]، ایران کے مغل ایلخانیوں میں [چھٹا] فرمانروا جو اس خاندان کے بانی ہلاکو کا پوتا تھا۔ اس کو فقط چند ماہ سلطنت کرنا نصیب ہوئی کیونکہ اس کا پیشرو گیخاتو بروز پنجشنبہ ۶ جمادی الآخرہ [۶۹۴ھ]/۲۱ اپریل ۱۲۹۵ء کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا اور اسی سال بروز چہار شنبہ ۲۳ ذوالقعدۃ/۵ اکتوبر کو خود وہ (یعنی بَیْدُو) قتل کر دیا گیا۔ چونکہ گیخاتو نے اس کی اہانت کی تھی لہٰذا بَیْدُو جو بظاہر ایک بے وقعت سا نوجوان شہزادہ تھا اس باغیانہ سازش میں ملوّث ہو گیا جو مغل امرا نے ایلخان موصوف کے خلاف برپا کی اور اس کے نتیجے میں گیخاتو تخت سے اتار دیا اور قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد باغیوں نے بیدو کو تخت نشینی کی دعوت دی۔ مگر اس کا دوسرا چچیرا بھائی غازان (رَکْ بآں) جو ایلخان ارغون کا بیٹا اور گیخاتو کا بھتیجا تھا بلا تاخیر اس نئے ایل خان کی مخالفت میں خراسان سے لشکر لے کر چڑھ دوڑا تاکہ اپنے چچا کا انتقام لے۔ اگرچہ ان چچیرے بھائیوں میں ناقابلِ اطمینان سی عارضی صلح ہو گئی تھی، لیکن کچھ دن بعد جب دوبارہ جنگ شروع ہوئی تو خوش قسمتی سے اس قضیے کا فیصلہ غازان کے حق میں ہو گیا اور خونریزی کی نوبت نہ آنے پائی۔ اس کامیابی کا سہرا غازان کے سپہ سالار نوروز کے سیاسی تدبر اور موقع شناسی کے سر رہا اور سب سے بڑھکر یہ تدبیر کارگر ہوئی کہ غازان نے نوروز کی تحریک سے اسلام قبول کر لیا جس سے اسے مسلمانوں کی اعانت حاصل ہو گئی۔ بیدو کے طرفداروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور نَخْجِیْوان (آج کل ''نخچوان'' جو آذربیجان کی اشتمالی ریاست میں ہے) میں جب وہ جان بچا کر بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا اس کا کام تمام کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ اپنے مختصر زمانۂ حکومت کے اندر اس نے

عیسائیوں پر خصوصیت کے ساتھ عنایت کی نظر رکھی، جس سے مسلمانوں کو ناراض کر لیا۔ اگرچه ابن العبری (Bar Hebraeus) نے لکھا ہے کہ بیدو نے دین اسلام اختیار کر لیا تھا.

مآخذ : (۱) C. d'Ohsson : *Histoire des Mongols depuis Tchinguiz-Khan jusqu'a Timour Bey ou Tamerlan* (بار دوم)، ج ۴، ہیگ اور ایمسٹرڈم ۱۸۳۵ء، [ص ۱۰۰ تا ۱۰۶]؛ (۲) B. Spuler : *Die Mongolen in Iran* (بار دوم)، برلن ۱۹۵۵ء.

([J.A. BOYLE] W. BARTHOLD)

* **البَیْذَق** : ابوبکر بن علی الصنہاجی، تاریخ الموحدین کے وقائع ابتدائیه کا مصنف۔ اس کا نام فقط ان اقتباسات کے ذریعے معلوم ہوا جو ابن خلدون نے اپنی کتاب العبر میں اور ایک مجہول الاسم مصنف نے اپنی کتاب الحلل الموشیة [تونس ۱۹۱۱ء، رباط ۱۹۳۶ء] میں دیے ہیں، نیز ان مختلف عبارات سے جو ابن القطان مصنف نظم الجمان نے البیذق سے لے کر اپنی کتاب میں نقل کی ہیں۔ اسکوریال کے کتاب خانے میں کاغذوں کا ایک بنڈل E. Lévi-Provençal کے ہاتھ لگ گیا جو بعد میں *Documents inédits d'histoire almohade* (عدد ۱۹۱۹) کے اندر چھپا، اس طرح البیذق کا نام جو قعر گمنامی میں پڑا ہوا تھا گویا چور دروازے سے نکل کر روشنی میں آیا۔ اس کی کتاب میں ہم "ایک ایسے شخص کے آنکھوں دیکھے واقعات کی یادداشتیں پاتے ہیں جن میں لکھنے والے نے خود عملی حصه لیا اور جو بالکل ابتدا ہی سے الموحدون میں شامل معلوم ہوتا ہے۔ پہلی ہی نظر بتا دیتی ہے کہ یہ وقائع معمولی قسم یا شکل کے نہیں ہیں۔ ہر صفحے پر نئی معلومات اور ان کی مستند نوعیت تقریباً ہمیشه ہمیں شمالی افریقه کے الموحدون کی بابت اپنے علم کو جو اب تک تشنه رہا تھا عجیب طرح مکمل کرنے کے قابل بنا دیتی ہیں۔ مخطوطے کے ۲۶ صفحوں میں متن کے اندر تو کوئی بیاض نہیں ہے، لیکن افسوس ہے کہ ابتدائی حصه غائب ہو گیا اور کتاب کا نام بھی کچھ نہیں دیا گیا ہے۔ خود البیذق کے حالات جو ہمیں معلوم ہوے وہ فقط اس قدر ہیں جتنے اس نے اپنی تصنیف میں دیے ہیں، مگر وہ اس قدر مبہم ہیں کہ اس کی پوری سوانح کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ ہم اسے المہدی کے متبعین میں دیکھتے ہیں جس وقت کہ المہدی تونس پہنچا۔ اسی طرح وہ عبدالمؤمن کے ساتھ رہا اور ان دونوں کی قربت اسے حاصل تھی اور وہ ان دونوں کے خادم کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اسی حیثیت میں وہ صرف ان واقعات کو قلمبند کرتا ہے جو درحقیقت اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے کانوں سے سنے۔ یہ جوشیلا نیا مرید ان واقعات کے ساتھ جو اس نے قلمبند کیے ہیں ایسے خارق عادت قسم کے سب حوادث بھی بیان کرتا ہے جن سے اس کی تصدیق ہو کہ ابن تومرت [رك بآں] ایک مقدس خدمت انجام دینے کے لیے اللہ کی طرف سے مامور تھا اور عبدالمؤمن [رك بآں] کو قضا و قدر نے پہلے ہی اس منصب کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ بہر حال بیذق کا لفظ جو فارسی سے عربی میں آیا آج تک بھی جنوبی بربروں میں شطرنج کے پیادے کے معنی میں مستعمل ہے۔ یہ بات تو وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ البیذق کی مادری زبان "بربر" تھی اور وہ عربی اچھی طرح نہ جانتا تھا۔ یہ بات اس سے ثابت ہوتی ہے کہ اپنے تذکرے میں وہ روزمرہ بہ کثرت استعمال کرتا ہے اور اس کے بیان میں بربری فقرے آ جاتے ہیں۔ اس نے اپنی پوری عمر گمنامی میں ایک وفادار اور جان نثار خادم کی حیثیت سے بسر کی، کسی بڑے سرکاری عہدے کی تمنا نہ کی، المہدی اور عبدالمؤمن کا خدمت گزار رہا بلکه

یوسف اول کی بھی خدمت گزاری کی، جس کے عہد تک کے بعض جستہ جستہ حالات ان وقائع میں ملتے ہیں جو اس نے قلمبند کیے تھے۔ اس کے بعد وہ الموحدون کی محفل سے اسی طرح چپ چاپ نام بتائے بغیر اچانک غائب ہو گیا جیسے اچانک ظاہر ہوا تھا۔

مآخذ: (۱) E. Lévi-Provençal: *Documents inédits d'histoire almohade*، ج ۹ تا ۱۱؛ (۲) G. Marcy، در *Hesperis*، ۱۹۳۲ء، ص ۶۱ ببعد۔

(A. HUICI MIRANDA)

* **بِئْر**: (جدید اور کچھ قدیم بولیوں میں اس کا تلفظ بِیْر بھی ہے۔ اس کی جمع: بِئَار، اَبْئُر اور آبار) کنووں کے لیے عربی زبان میں سب سے جامع لفظ ہے، جو (قَلیب، رَکِیّہ اور ایسے ہی دوسرے) متعدد مترادف الفاظ کے لیے اسم جنس کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے اور اس کی مختلف صفات کی اچھی خاصی تعداد ہے۔

یہ لفظ دوسری سامی زبانوں میں بھی استعمال ہوتا ہے، مثلاً اکدی زبان میں بیرو bēru، عبرانی زبان میں بئر be'ēr، آرامی زبان میں بیرا bērā۔ دوسری سامی زبانوں کی طرح عربی میں بھی یہ لفظ مؤنث مستعمل ہے (البتہ بعض جدید عربی بولیاں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس سلسلے میں ملاحظہ ہو Fleischer: *Kl. Schriften*، ۱: ۲۹۵؛ Bräunlich: *Well*، ص ۲۳۰، بر دوم)؛ تاہم لفظ بئر میں عام طور پر انگریزی زبان کے لفظ Well سے کہیں زیادہ وسیع مفہوم موجود ہے۔ بئر کے معنوں میں حوض یا ذخیرۂ آب بھی شامل ہو سکتا ہے (قب عبرانی *Bōr*)، کوئی گڑھا یا سوراخ بھی مراد ہو سکتا ہے، جو زمین میں کھودا گیا ہو، خواہ اس میں پانی ہو یا نہ ہو، مثلاً ابن ہشام: سیرت، ص ۷۰، س ۷ میں مذکور ہے کہ زمانۂ قبل اسلام میں خانۂ کعبہ کے تحائف جمع رکھنے کے لیے گڑھے کو بئر کہتے تھے۔ الاغانی (بار اول، ۴: ۱۰۹، س ۴) اور عریب [القرطبی: صلۃ تاریخ الطبری] (طبع ڈخویہ) ص ۵، س ۶ میں اس لفظ کے معنی، مردے دفن کرنے کے لیے ایک وسیع گڑھا بتائے گئے ہیں۔ کریمر (*Beitr. zur arab. Lexikogr*، ۱ (۱۸۸۳ء): ۱۹۲) اس لفظ کا ایک ایسی بھٹی کے معنی میں ذکر کرتا ہے جس میں گوشت بھونا جاتا ہے، مگر اس مضمون میں بئر سے صرف "کنواں" ہی مراد ہے۔

(۱) قدیم عرب

چونکہ جزیرۂ عرب میں نہ تو تمام سال بہنے والے دریا ہیں اور نہ بڑی بڑی مستقل جھیلیں، لہذا یہاں کے باشندوں، بالخصوص اہل بادیہ کا انحصار جزیرہ‌نما کے زیر زمین آبی ذخیروں پر ہے۔ یہ زیر زمین آبی ذخائر ارضیاتی کیفیت کے مطابق کبھی تو پہلے سے موجود اور بالائی طبقۂ ریگ سے چند فٹ نیچے نکل آتے ہیں اور یا ستر میٹر یا اس سے زیادہ گہرائی پر جا کر ملتے ہیں۔ ان تک پہنچنے کے لیے کنویں کھودنے والوں کو زمین گودم یا بیلن (کے پیٹے) کی شکل میں کھودنی پڑتی ہے (قصبۂ جراب)، جس کے پہلوؤں کو عام طور پر کیچڑ یا سنگریزے سے، جنھیں طَیّ کہتے ہیں، لیس کر مضبوط کیا جاتا ہے (قب بخاری، ۱: ۲۸۴، س ۷؛ ۲: ۲۲۳، س ۵، جہاں دوزخ کو "مطویۃ کطی البئر" کہا گیا ہے)۔ پانی اس گڑھے کی تہ میں جمع ہوتا ہے اور کوئیں کی دیواروں سے بھی رستا رہتا ہے۔ کنویں کے منہ (فم، نیز راس البئر) تک پانی کو چمڑے کے تھیلوں یا خاصے بڑے بڑے ڈولوں (غَرْب، دَلْو) کے ذریعے اوپر کھینچتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چرسے زیادہ تر دو (متقابل جوان) اونٹوں کی کھال سے بنائے جاتے ہیں (اس صورت میں ڈول کو "ابن اَدِیمَین" بھی کہہ سکتے ہیں)۔ ڈول یا چرسے

کھینچنے کی رسیاں (اَرْشیہ، واحد رِشاء، یا اَشْطان، واحد شَطَن) ابتدا میں پتلے چمڑے کے تسموں کی ہوتی تھیں، جنھیں بٹ لیا جاتا تھا لیکن یہ پانی میں رہنے سے جلد گل جاتی تھیں (قب لبید، طبع خالدی، ۳۹، ۱، شعر ۴) اس لیے کوئی زیادہ پائدار چیز، عام طور پر کھجور کی چھال (خُلّب) بٹ کر، کم سے کم رسی کے نچلے حصے میں، جوڑی جاتی ہے۔ بھاری بھاری ڈول کھینچنے کے تھکا دینے والے کام میں آسانی پیدا کرنے کی خاطر عام طور پر آب کشی کا ایک آلہ (ے عَلَق) جو ایک حد تک بدویت کی یادگار ہے، کنوئیں کے دہانے پر نصب کیا جاتا ہے۔ یہ آلہ جو ڈول اور رسیوں کی طرح قافلے والے اپنے ساتھ ساتھ اٹھائے پھرتے ہیں (ورنہ ضائع ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے) یا تو لکڑی پر آڑی لکڑی (نعامہ) ہوتا ہے یا ذرا زیادہ ترقی یافتہ صورت میں چوبی چرخی (محور) جسے کدو کوبی گول لکڑی (مَحالہ، بَکْرہ نیز قامہ) میں جڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے اوپر رسی ایک نالی (مجزّ، قَبّ) میں جاتی ہے۔ ساری چرخی اور دہرا شہتیر یا پتھر یا مٹی کے بنے ہوئے دو سہاروں (قرنان، زُرْنوقان، دعامتان، عمودان) پر یا پھر ایک تنہا دو شاخہ ڈنڈے (قامہ جمع [قِیَم]، قب الاخطل (طبع صالحانی)، ۲، ۳؛ یاقوت، ۴ : ۲، ۲، س ۲۱) پر رکھ دیا جاتا ہے۔ پھر ڈول ہاتھ سے اوپر کھینچا جاتا ہے۔ یہ سخت کام جانوروں زیادہ تر اونٹوں (سوانی، واحد سانیہ) سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ ان کے ساتھ ایک ہانکنے والا (سائق) ہوتا ہے۔ یہ کنوئیں کے آگے اور واپس دہانے تک تھکا دینے والا چکر لگاتے رہتے ہیں (قب *Arabum Proverbia* [= المیدانی: امثال العرب]، طبع Freytag، ۱ : ۶۲۲، عدد ۴۹، سَیْرُ السّوانی سَفَرٌ لا یَنْقَطِعُ، یعنی کنوئیں کا پانی نکالتے ہوئے چکر لگانے والے اونٹ کا سفر ختم نہیں ہوتا)۔ کنوئیں سے آگے مویشیوں کے پینے کی کنڈالیوں (جِفان، واحد حَوض) وغیرہ میں پانی گرتا ہے۔ ٹوٹی ہوئی کنڈالیوں کا اکثر عربی اشعار میں نقشہ دکھایا گیا ہے (دیکھیے Nöldeke، معلّقۂ زہیر، ۵)۔ قدیم زمانے میں چکّی، کوئی یا زیادہ پیچیدہ آبی آلات کے ذریعے پانی کے رہٹ چلانے کے طریقے لوگوں کو معلوم نہ تھے۔ بیک وقت اترنے اور چڑھنے والے دوہرے ڈول کا طریقہ (جیسے الحماسۃ (طبع Freytag)، ص ۹۳۴، شعر ۵ میں سوار کی دو رکابوں سے تشبیہ دی گئی ہے) دیسی نہ تھا اور یقیناً بہت کمیاب ہوگا۔

عربوں کی زندگی میں کنوئیں کو جو خاص اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ ان کثیر التعداد اقوال، مختلف القاب یا اوصاف یا چرخی، دہرے اور ڈول وغیرہ سے پیدا ہونے والی آوازوں کے اسماء (دیکھیے Bräunlich : *Well*، اشاریہ، ص ۹۱۵ تا ۹۲) سے لگایا جا سکتا ہے جو کنوئیں کے متعلق ملتے ہیں۔ اسی طرح کنوئیں کے اجزا اور اغراض سے متعلق کثیر الاستعمال تشبیہات، تمثیلات اور استعارات بھی خاصی مفید معلومات مہیا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر نیزوں کو اکثر کنوئیں کی تنی ہوئی رسیوں سے تشبیہ دی گئی ہے (قب Nöldeke، عنترہ، معلّقہ ۶۶ و *Delectus*، ص ۴۵، س ۶؛ ص ۷۰، س ۲)؛ سوار کے تیر چلانے کو ان مزدوروں سے مشابہ قرار دیا گیا ہے جو کنوئیں سے پانی کھینچنے والی رسی کے ٹوٹ جانے پر بے تحاشا آ[illegible] کی طرف بھاگتے ہیں (دیوان ہذیل (طبع Kosegarten ۱۹۳، ۳۶)۔ مردے کو قبر میں اتارا جانا ایسا ہے جیسے ڈول کنوئیں میں جاتا ہے (ابو ذؤیب [الہذلی] قصیدہ ۴۲، شعر ۱۱ بعینہٖ الحماسۃ، ص ۹۳۴، شعر ۵؛ الحطیئۃ، ص ۵۳، س ۳)؛ "تقتّف بعناوره" "اس کے دہرے پھندے سے نکل گئے" کا مطلب ہے اس کا معاملہ بگڑ گیا (Lane، ص ۷۶۹ الف)۔ آخری مثال یہ [illegible] اپنی بات کے سمجھے اور ذہن کے پکے آدمی کی ای[illegible] مرثیے میں یوں تعریف کی گئی ہے کہ "ایسا آد[illegible]

کہ جب کبھی بات منہ سے نکلتا ہے تو (چاہ کن کی طرح) تحت الثرٰی سے پانی نکال لاتا ہے (الحماسۃ، ص ۳۸۶، شعر ۲)۔

مآخذ: (۱) E. Bräunlich: The Well in Ancient Arabia، در Islamica، ۱: ۱۹۲۴ تا ۱۹۲۵ء، ص ۴۱ تا ۷۶، ۲۸۸ تا ۳۴۳، ۴۵۴ تا ۵۲۸ (ایک جامع مقالہ جو اس تمام لغوی و ادبی مواد پر مبنی ہے جو اس سلسلے میں دستیاب ہے۔ موجودہ مقالہ بھی بڑی حد تک اسی کا مرہونِ منّت ہے)؛ (۲) W. Wiedemann: Beiträge zur Geschichte der Naturwissenschaften، ۱۰، Erlangen ۱۹۰۶ء، ص ۳۱۵، ۳۳۰ تا ۳۳۷ (تفاصیل ازمنۂ وسطٰی سے لی گئی ہیں)؛ (۳) H. G. Guthe: Kurzes Bibelwörterbuch، ۱۹۰۳ء، ص ۲۸۶، بذیل مادّہ Jakobs-brunnen و J. J. Hess، در Der Islam، ۴: ۱۹۱۳ء، ص ۳۱۷ ببعد (پر از معلومات! نیز دیکھیے یورپی سیاحوں، مثلاً Doughty، Euting، Musil وغیرہ کی کتابیں)؛ (۴) مشہور ماہر لسانیات ابن العربی (م ۲۳۱ھ/۸۴۶ء) کی ایک تصنیف کتاب البئر قاہرہ میں محفوظ ہے، جس کا عرب ماخذ نویسوں کے ہاں تذکرہ نہیں ملتا (دیکھیے براکلمان: تکملہ، ۱: ۱۸۰)۔

(J. Karaemer)

(۲) جدید عرب

مشرقی عرب کے خطّوں، میں، جہاں معدودے چند دریا ہیں یا سرے سے ہیں ہی نہیں، لوگوں کا دار و مدار چشموں اور کنووں پر ہوتا ہے۔ (بگھٹ (مَوْرِد یا محض لفظ ماء، جمع میاہ) اور اس کی متعدد مقامی اشکال جیسے جنوبی عرب میں بی) کا وجود اور نوعیت حضری اور بدوی زندگی کی تعین میں بہت مدد دیتے ہیں۔ چشموں (عین جمع عُیون) کا رواں پانی، عام طور پر نخلستان کی آبادیوں کی گزر اوقات کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ کنووں (بئر مقامی بولی میں بیر، جمع ابیار، جس کا عرب میں زیادہ استعمال ہے یا قلیب جمع قُلبان) کا پانی جو کھینچ کر نکالا جاتا ہے، چشموں کے پانی کی کمی کو پورا کرتا ہے اور کئی موقعوں پر تو بڑے بڑے قصبوں کے لیے بھی کافی ہو جاتا ہے (یہاں تک کہ سعودی عرب کے دارالحکومت الرِّیاض کی ضرورت کا قریب قریب سارا پانی تھوڑی مدت پیشتر تک کنووں ہی سے کھینچا جاتا تھا)۔ کئی ایک مثالیں ایسی بھی ہیں کہ جہاں ریگستانی علاقوں میں دور دور تک پھیلے ہوئے کنووں سے پانی لایا جاتا ہے۔ اگر کہیں ریگستانی کنویں ناپائدار ذرائع، جیسے نمی یا چٹانوں میں پانی کے ذخائر، کے مقابلے میں زیادہ پائدار بھی ہوں تو بھی آبپاشی کے لیے بمشکل ہی گنجائش نکل سکتی ہے اور کنووں پر وارد ہونے والے زیادہ‌تر خانہ‌بدوش یا راہگیر ہوتے ہیں۔ مستقل آباد کار نہیں ہوتے۔

نخلستانوں میں کنووں کا انفرادی ملکیت ہو جانا دستور سا بن گیا ہے۔ مالک زمین یا مزارع اپنی فصلوں کی آبیاری اسی پانی سے کرتے ہیں جو کسی نہ کسی کی ملکیت ہوتا ہے۔ البتہ بڑے بڑے کنویں شاملات یا مشترکہ ملکیت ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر فلبی Philby علاقۂ تیماء میں الحدّاج کے ایک خاص کنویں میں تقریباً تیس حصوں کا اندازہ لگاتا ہے، جس سے اونٹوں کے ذریعے پانی کھینچنے کے لیے ہر حصے میں کم و بیش تین چرخیاں موجود تھیں۔

صحرا میں ایک خانہ بدوش کو سب سے پہلے پانی کی فکر ہوتی ہے اور دوسرے درجے پر اس پانی کی قابل دسترس ہونے کی اور پھر اس پانی کے پینے کے قابل ہونے کی۔ ڈاؤٹی Daughty نے شہر کے ذمین اور ہوشیار پیشہ‌ور کنویں کھودنے والوں کی تفصیل دی ہے، مگر بدو کو تو پانی تلاش کرنے اور کنویں کھودنے کے بغیر چارۂ کار ہی نہیں۔

انھیں قدرت نے بڑی حیرت انگیز فراست ودیعت کی ہے کہ وہ ایسی جگھوں میں بھی پانی کے سرچشمے کا کھوج لگا لیتے ہیں جہاں کسی ناواقف کو پانی کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ پانی نکالنے کا محل وقوع بالکل نیا ہونا چاہیے (ایسے کنویں کو اکثر بَدِیع جمع بُدوع یا بَدِیع جمع بَدائع کہتے ہیں) یا کوئی دبا ہوا پرانا کنواں (مَندُفنہ)[نیز معطّلہ] مردہ (مَیِّتہ) کنواں بھی ہو سکتا ہے۔ پانی سطح سے قریب یا کبھی بہت گہرا نکلتا ہے۔ بدو کبھی کبھی ایک سو میٹر یا اس سے بھی زیادہ گہرا کھودتے ہیں۔ گہرائی عربی پیمانے (باع، یعنی انسان کے کھلے بازوؤں کی لمبائی سے، یا قامہ، یعنی قد آدم: قریب پانچ فٹ چھے انچ بلندی کے حساب سے ناپی جاتی ہے۔ کئی بلی گہرا کنواں بجائے عَمِیقہ کے طَوِیلہ (جمع طِوال) کہلاتا ہے۔ اب مشرقی بڑے الربع الخالی جیسے خشک ترین ریگستانی علاقوں میں بھی خاصی زیادہ گہرائی تک پہنچتے ہیں (ایسے کنووں کو قَلَمہ عام بولی میں قَلَم کہتے ہیں) زیادہ مستعمل کنویں یا جن کنووں کے کنارے اندر دب جانے کا اندیشہ ہو ان کی دیواروں کو پتھر یا کسی دوسرے مسالے سے پختہ کرتے ہیں (ایسے استر کے کنویں کو مَطوِیّہ کہتے ہیں اور جس کی گولائی پتھر سے بنی ہو اسے مرصوصہ کہتے ہیں)۔ پانی میں معدنیات کے تناسب سے اس اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے کہ آیا پانی میٹھا (حلو) ہے یا کھاری (ملیح)۔ اگرچہ بدوی دوسرے لوگوں کی نسبت معدنی اجزا زیادہ برداشت کر لیتے ہیں لیکن وہ ریگستان کے بعض [کھاری] کنووں (خَور، جمع خِیران) کا پانی نہیں پی سکتے۔ ایسی صورتوں میں ان کا مستقل ساتھی اونٹ شورہ پی جاتا ہے اور ایسا دودھ دیتا ہے جس سے نمک چھن کر نکل جاتا ہے۔

صحرائی کنووں کے کاملاً ذاتی ملکیت میں ہونے کا رواج نہیں۔ اگرچہ کنویں کے ساتھ کسی آدمی کا نام شامل ہو جیسے الربع الخالی میں بئر ہادی (مرحوم ہادی بن سلطان المری سے منسوب ہے) تو یہ عام طور پر کنواں پہلی بار یا دوبارہ کھودنے والے کا نام ہوتا ہے جسے کام کی وجہ سے کنویں پر کچھ نہ کچھ حق بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ کسی قبیلے کے علاقے (دیرہ) میں کنواں واقع ہو تو وہ اس قبیلے کی ملکیت تصور ہو سکتا ہے۔ لیکن پانی پھر بھی دوسرے قبیلوں کے (جن کی کنویں کے مالکوں سے جنگ نہ ہو) بدویوں کو لینے کی آزادی ہوتی ہے۔ غیر آباد ریگستان میں پانی اس قدر قیمتی چیز ہے کہ اس کا کوئی مول نہیں ہو سکتا۔

موسم گرما میں جب ریوڑوں کے لیے صحرا کی چراگاہوں میں کوئی سبزہ وغیرہ نہیں ہوتا تو خانہ بدوش بدو ہفتوں یا مہینوں اپنے دلپسند کنووں پر ڈیرے ڈالے پڑے رہتے ہیں اور بعض اوقات سینکڑوں خیمے اکٹھے ڈال کے رہتے ہیں۔ کنویں چونکہ گرمی اور بعض اوقات سردی کے موسم میں بھی اکٹھے ہونے کی جگہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے بارہا ان کنووں کو جنگ حملوں اور قبائلی جنگوں کا میدان بننا پڑا۔

مآخذ: (۱) C. Doughty: *Arabia Deserta*، نیویارک بدون تاریخ؛ (۲) H. Philby: *The Land of Midian*، لنڈن ۱۹۵۷ء؛ عربی اور مغربی زبانوں کے اکثر سفرناموں میں کنووں سے متعلق تفصیلات دی ہوئی ہیں؛ (۳) E. Bräunlich: *The Well in Ancient Arabia*، لائپزگ ۱۹۲۵ء، جدید و قدیم معلومات کے حوالے دیتا ہے۔

(G. RENTZ)

(۳) مغرب

مختلف قسم کے کنووں کو بئر کے عام نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ استرکاری والے کنووں کو ہمیشہ تو نہیں لیکن عام طور پر یہ نام دیا جاتا ہے (ان کنووں کی اندر کی چنائی بہت کم پتھر سے ہوتی ہے لیکن اکثر اوقات چونے گچ کے بغیر جما دیے جاتے ہیں۔ صحرا کے خاص خاص علاقوں میں کھجور کے تنوں کا استر دیا جاتا ہے، جس کے باعث یہ کنویں بعض اوقات مربع شکل میں ہوتے ہیں)۔ بئر کے نام سے ان کنووں کو بھی موسوم کر سکتے ہیں جن میں استرکاری نہ کی گئی ہو۔ اس طرز کے کنویں صحرا میں عام پائے جاتے ہیں، جہاں زمین صرف نرم کر کے طاس کی شکل میں کھود لی جاتی ہے جس کی تہ میں پانی کی سطح نکل آتی ہے (قَزّان)۔ لیکن بئر کے علاوہ دوسری اصطلاحات بھی استعمال ہوتی ہیں۔ حاسی (جمع حَسْیان) کا لفظ اکثر اوقات مخصوص اصطلاح کے طور پر صحرا کے اتھلے کنووں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو زیادہ تر کسی چنائی یا دہانے کی منڈیر کے بغیر بنے ہوتے ہیں، مگر دوسرے مقامات پر اس اصطلاح کے معنی محض ایک بل یا گڑھا ہے جو (تونس اور طرابلس کے نیم صحرائی علاقوں میں) وادی میں کھودا گیا ہو۔ لفظ "عُکلہ" (عُقلہ) صحرا میں کسی وادی کے ساتھ ایک عارضی جوہڑ کو کہتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ غدیر کے مترادف ہے۔ تونس کے نیم صحرائی علاقے میں اس لفظ کے معنی ایسا کنواں بھی ہو سکتے ہیں جو کئی میٹر گہرا ہو اور اس میں کوئی استرکاری یا کنارے نہ ہوں اور جو کسی نشیب کی نچلی تہ میں کھودا گیا ہو، جہاں زیرِ زمین پانی سطح کے قریب ہوتا ہے۔ اسی طرح کے کنویں بعض اوقات صحرا (تُنْدُوف) میں پائے جاتے ہیں، جہاں وادیوں کے بہنے میں عُقلے واقع ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب اور صحرائے اعظم، کم از کم مصر کے مغرب کے علاقے میں واقع کنویں تین بڑی قسموں میں شامل کیے جا سکتے ہیں: (۱) وہ کنویں جو انسانوں کے استعمال اور جانوروں کو پانی پلانے کے لیے ہیں، ان میں چنائی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ بعض اوقات ان کے دہانے کے منعطف کنڈالی تو بنی ہوتی ہے مگر اور کوئی بالائی عمارت نہیں ہوتی، یا زیادہ سے زیادہ تین شاخیں ہوتی ہیں جن پر لکڑی یا لوہے کی چرخی رکھی جا سکے۔ پانی ہاتھ سے کسی مشک یا چمڑے کے ڈول کے ذریعے، جو رسی کے ایک سرے پر لٹکا رہتا ہے، نکالا جاتا ہے؛ (۲) ایسے کنویں مختلف قسم کے ہوتے ہیں، جن میں پانی کھینچنے کا کسی قسم کا آلہ بھی ہوتا ہے جو باغات اور نخلستانوں کی آبیاری کا کام دے؛ (۳) چشموں والے کنویں، جو بالخصوص گزشتہ زمانوں میں نہایت محدود قطعۂ زمین میں واقع تھے اور لازماً آبپاشی کے لیے استعمال ہوتے تھے، چونکہ ان کا پانی خود ابلتا ہے اس لیے ان پر کوئی بالائی عمارت بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

آلات آبکشی والے کنووں میں سب سے زیادہ عام وہ ہیں جن میں جانور پانی کھینچتے ہیں اور چرخی لگی ہوتی ہے۔ انھیں بعض اوقات سانیہ کہتے ہیں۔ پانی ایسے چرس کے ذریعے نکالا جاتا ہے جو بیل یا بکری کے چمڑے کا بنا ہوتا ہے اور جس میں پندرہ سے پینتیس سیر تک پانی آتا ہے۔ اس کے نیچے ایک لچکدار نالی بھی ہوتی ہے، جو پانی نکالتے وقت پیچھے کو لپیٹ دی جاتی ہے۔ ڈول اوپر لا کر اسے کھولتے یا سیدھا کر دیتے ہیں تا کہ پانی ایک چھوٹے سے گڑھے میں داخل ہو جائے، جہاں سے وہ نالیوں (ساقیہ) میں چلا جاتا ہے۔ سہارے، جن

پر چرخی کا محور ہوتا ہے، بعض اوقات پتور یا مٹی کے لیکن زیادہ تر لکڑی کے تنے سے بنے ہوتے ہیں۔ کھینچنے کا کام بیل یا گدھے اور بعض اوقات (تونس میں) اونٹ سے لیا جاتا ہے، لیکن کبھی کبھی (ساحل تونس میں) یہ کام خچر سے بھی لیا جاتا ہے۔ اوپر سے آنے اور پھر جانے کا راستہ ڈھلوان ہوتا ہے جس پر کوئی بڑا آدمی یا بچہ اس جانور کو ہانکتا ہوا لے جاتا ہے اور ساتھ ہی اس ڈوری سے کام لیتا ہے جو ڈول یا چرسے کو خالی کرنے کے لیے کھلتی اور پھر بند ہوتی ہے۔ کنویں اور ان کے اوپر کی عمارت مشترکہ ملکیت بھی ہو سکتی ہے، لیکن ہر ایک کے پاس پانی نکالنے کے لیے رسہ، ڈوری اور ڈول یا چرس اپنا ہوتا ہے اور ہر ایک اپنے اپنے جانور سے پانی کھینچتا ہے۔ جانوروں کے ذریعے چلائے جانے والے ایسے کنویں ہندوستان سے لے کر بحر اوقیانوس تک اور مشرقی تونس میں، خاص طور پر بنزرت (= بنزرت) [رک بآں] سے جربہ تک، ساحل طرابلس اور مراکش کے علاقے حوز میں، شمال مغربی صحرا (تافیلالت، مزاب) میں، طوارق کے دیہاتی علاقے میں، پھر جنوبی سیرنکا (= برقہ [رک بآں]) کے نخلستانوں میں، جنوبی صحرا کے حصے میں، بالخصوص زیریں موریتانیا اور مغربی سوڈان کے سرحدی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔

مصری شادوف کی طرح کے ڈھینکلی والے کنویں کے مختلف نام ہیں: خطارہ (جمع خطاطیر) فزان اور سوف میں اور غرغر زیبان اور قرارہ کے علاقوں میں۔ ڈھینکلی پتلی تنی کی بناتے ہیں اور وہ ایک چھوٹی دیوار یا لکڑی کے ڈنڈے پر، جو دو ستونوں پر قائم ہوتا ہے، رکھی جاتی ہے اور اوپر اٹھتی ہے۔ اس کے زیریں سرے پر دباؤ کے لیے کوئی وزن کی چیز اور اگلے سرے پر پانی کھینچنے کے لیے کسی قسم کا خالی برتن ہوتا ہے (فزان میں اسے حکمہ اور قرارہ میں جنینہ کہتے ہیں)۔ اس برتن میں صرف پانچ سے دس لٹر [= میٹر] تک پانی سماتا ہے۔ ڈول کی بہ نسبت یہ تیزی سے کام کرتا ہے لیکن عام طور پر چند سو مربع میٹر سے زیادہ رقبے کی آبپاشی کے قابل نہیں ہوتا، کیونکہ یہ صرف انہیں جگہوں میں استعمال ہوتا ہے جہاں زیر زمین پانی کی سطح (چند میٹر سے) زیادہ گہری نہیں ہوتی اور پانی بہت کم کھینچتا ہے۔ اصل میں یہ غریب طبقے کا کنواں ہے، جسے ایک آدمی کھود سکتا اور ڈھینکلی لگا کے چلا سکتا ہے۔ اس میں نہ تو جانور کے جوتنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ کسی مہنگے چرس یا ڈول کی۔ ایسا کنواں نہ صرف یورپ میں بلکہ چین تک کے دور دراز خطوں میں عام طور پر مروج ہے، لیکن مراکش اور ساحل لیبیا میں اس نمونے کے کنویں بہت شاذ ہیں۔ پھر بھی صحرائے اعظم زیریں درا (مراکش) میں تندوف کے علاقے سنجیرہ میں اور جنوبی موریتانیا کے اضلاع ملوان اور قرارہ، اوزلہ، الجوابیہ اور غدامس میں، فزان کے شمال اور جنوب دونوں طرف نیز برقہ (= سیرنکا) میں کفرہ کے نخلستانوں میں اور اسی [رک بآں]، نبستی اور برقہ کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔

نوریہ یا رھٹ (ناعورہ اور بعض اوقات سانیہ) ایک ایسا آلہ ہوتا ہے جس کے ڈونگے ایک گھومتی زنجیر میں بندھے ہوتے ہیں۔ یہ رھٹ ایک بڑے پہیے کے ذریعے چلتا ہے جسے گھوڑا، خچر یا اونٹ کھینچتا ہے۔ روایتی قسم کا رھٹ لکڑی کا بنا ہوتا ہے (اکثر اوقات زیتون کی لکڑی کا)۔ اس میں مٹی کے لوٹے رسیوں سے بندھے ہوتے ہیں۔ اب اس قدیم رھٹ کی جگہ آہستہ آہستہ لوہے کے بنے ہوئے رھٹ استعمال ہونے لگے ہیں، جن میں کسی دھات کی زنجیر اور ڈبے ہوتے ہیں۔ یہ آلات کم از کم مراکش، الجزائر اور شمالی تونس کے ساحلی میدانوں [نیز رک

و ہند] میں تیل یا بجلی کی موٹر سے چلتے ہیں۔ ان علاقوں میں ایسے کنووں سے بعض اوقات سواحلِ بحر متوسط کے فرنگی، جنھوں نے تجارتی باغ لگائے ہیں، کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے آبائی وطن میں بھی اس قسم کے آلات سے کام لینے کے عادی تھے۔ وہاں اس رہٹ کو آب کشی کے مختلف نلوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ صحراے اعظم میں یہ صرف شمالی علاقوں، مثلاً تافیلالت، اُوِدْ رِغ Oued Righ اور طرابلس الغرب میں پایا جاتا ہے۔ مراکش میں بڑے بڑے چرخ، جن کے گھیرے کنویں پر لگے ہوتے ہیں اور انھیں پن چکیاں چلاتی ہیں، یہ بھی ناعور (norias) کہلاتے ہیں۔ یہ صرف فاس کے قرب و جوار میں استعمال ہوتے ہیں۔

جہاں تک فوارے کی قسم کے کنووں کا تعلق ہے وہ صرف کسی زمانے میں اوِدْ رغ کے علاقے میں پائے جاتے تھے (۱۸۵۶ء میں ان میں سے دو سو بیاسی کنویں کام کر رہے تھے)۔ نیز الشاطی (فزّان) کے مشرقی حصوں میں، جہاں انھیں عیون (واحد عین) کہتے ہیں، تھوڑی تعداد میں موجود تھے۔ یہ کنویں ماہر کاریگر کھودتے تھے اور بہت کمزور ساخت کے ہوتے تھے۔ الجوابد اور ورقلہ سے لے کر زیبان تک اور ہدنہ سے لے کر جرید اور نفزاوہ تک پورے زیریں صحرا میں ان کنووں کی تعداد بڑھ گئی ہے لیکن آج کل یہ کنویں جدید طریقوں سے برمائے اور کام میں لائے جاتے ہیں۔ کچھ کنویں طرابلس اور فزّان میں بھی برمائے گئے ہیں۔

مآخذ: (۱) G.S. Colin: *La noria marocaine*،
در *Hepéris*، ۱۹۳۲ء؛ (۲) R. Capot-Rey: *Le Sahara*،
(1953)؛ (۳) J. Despois: *La Tunisie Orientale*، بار
دوم، ۱۹۵۵ء؛ (۴) وہی مصنف: *Le Fezzan (1946)* اور
Le Hodna (1953)؛ (۵) E. Laoust: *Mots et choses*
berbères، ۱۹۲۰ء؛ (۶) Ch. Monchicourt: *La Steppe*
Tunisienne، در *Bull. de la Dir. de l'Agr.*، تونس ۱۹۰۶ء؛
(۷) *Il Sahara Italiano, Fezzan e oasi di Gat*،
۱۹۳۷ء؛ (۸) E. Scarin: *Le oasi del Fazzan*،
۱۹۳۳ء؛ (۹) *Le oasi cyrenaiche del 29° parallelo*،
۱۹۳۷ء؛ (۱۰) J. Lethielleux: *Le Fezzan, ses jardins,*
ses palmiers، در *IBLA*، تونس ۱۹۴۸ء؛ (۱۱) J. Bisson:
Le Gourara، ۱۹۵۷ء؛ (۱۲) S. Isnard: *La culture*
des primeurs sur le littoral algerois، ۱۹۳۵ء۔

(J. DESPOIS)

بئر زمزم: رک بہ زمزم۔

بئر السبع: جنوبی فلسطین کے ایک مقام بیر سبا (شیبا) کا معرب۔ اس جگہ وہ چشمے تھے جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خود اپنے ہاتھ سے کھودے تھے۔ ان چشموں کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی سے یہ جگہ غیر آباد پڑی تھی، آخر ترکوں نے اپنی جنوبی مملکت کے لیے اسے اداری مرکز بنا کر ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء میں اسے پھر سے آباد کیا۔ اس اقدام کی وجہ مصری۔ فلسطینی سرحد کے متعلق وہ اختلاف تھا جو حکومت برطانیہ سے پیدا ہوا اور ضرورت پیدا ہوئی کہ جنوبی قبائل پر مرکزی نگرانی رکھی جائے۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو بئر السبع پر ترک اور برطانوی فوجوں کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی [اور یہ علاقہ برطانیہ کی نگرانی میں چلا گیا]۔ برطانیہ کے زیرِ انتظام بئر السبع کی تحصیل فلسطین کے تقریبًا نصف علاقے پر مشتمل تھی اور اس کے بدویوں کی آبادی کا اندازہ پچھتر ہزار سے ایک لاکھ نفوس تک کیا گیا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں شہر کی آبادی تین ہزار تھی، جن میں سے نصف کے قریب خانہ بدوش تھے۔ جدید اکتشافات میں اس جگہ سے متعدد یونانی کتبے

برآمد ہوئے ہیں ۔

مآخذ : یاقوت : معجم البلدان، ۵ : ۱۳؛ (۲) Le Strange : *Palestine under the Moslems*، لندن ۱۸۹۰ء، ص ۳۰۲ ببعد؛ (۳) Robinson : *Biblical Researches*، ۱ : ۲۳۰؛ (۴) Guérin : *Judée*، ۲ : ۲۷۶ تا ۲۸۳؛ (۵) Nöldeke : *Sieben Brunnen*، در *ARW*، ۷ : ۳۴۰ تا ۳۴۳، ۱۹۰۳ء؛ (۶) A. Legendre : *Bersabée*، در *Dic. de la Bible*، ۱/۲ : عمود ۱۶۲۹ تا ۱۶۳۳؛ تکملہ، ۱ : ۹۶۳؛ تا ۹۶۸؛ (۷) عارف العارف : *Bedouin Love, law and Legend*، یروشلم ۱۹۴۴ء؛ (۸) وہی مصنف : تاریخ بئر السبع و قبائلہا، یروشلم ۱۹۳۴ء؛ (۹) ابن بطوطہ، طبع Defrémery و Sanguinetti، ۱ : ۱۲۶ ۔

(E. HONIGMANN)

⊗ **بِئْر مَعُوْنَہ** : علاقۂ بنو عامر اور حرۂ بنو سُلَیم کے درمیان ایک کنواں جو بنو سُلَیم کی ملکیت تھا اور ان کے قریب تر بھی ۔ اس کے آس پاس کا علاقہ بھی بئر معونہ کہلاتا ہے ۔ ویسے تو مدینۂ منورہ اور اس کے گرد و نواح میں بہت سے کنویں اور چشمے تھے جو مختلف ناموں سے پکارے جاتے تھے جن کی تفصیلات انساب الاشراف، جمہرۃ انساب العرب، السمہودی : وفاء الوفاء، معجم البلدان وغیرہ میں موجود ہیں، لیکن تاریخ اسلام میں بئر معونہ کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ کفار نے سازش اور غداری سے بہت سے بلند مرتبت، فضیلت مآب، بزرگ اور حفاظ و قرا صحابۂ کرام رض کو شہید کر دیا تھا (زاد المعاد، ۲ : ۱۱۰)۔

جنگ احد کے بعد کفار اور منافقین کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ اسلام کو مٹانے کے لیے سازشیں کرنے لگے ۔ مسلمانوں بالخصوص حفاظ قرآن اور علمائے دین کو غداری اور دھوکے سے قتل کرنے کے منصوبے تیار کیے گئے ۔ اسی منصوبے کی ایک کڑی یوم الرجیع (رک باں) کے شہدا تھے (دیکھیے جوامع السیرۃ، سیر اعلام النبلاء، پہلی جلد، ابن خلدون، وغیرہ)، اور دوسری کڑی شہدائے بئر معونہ ۔

ماہ صفر ۴ھ میں بنو عامر کا ایک معزز سردار ابو براء عامر بن مالک الکلابی، مُلاعب الاسنّۃ (نیزوں سے کھیلنے والا) رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و سلّم کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ آپ ؐ نے اسے اسلام کی دعوت دی، لیکن نہ وہ اسلام لایا اور نہ انکار کیا ۔ پھر اس نے کہا کہ اے محمد ؐ! اگر آپ اپنے کچھ صحابہ کو اہلِ نجد کی طرف بھیجیں جو انھیں اسلام کی طرف بلائیں تو مجھے امید ہے وہ اسلام لے آئیں گے ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم نے فرمایا کہ مجھے اہل نجد کی طرف سے ان کے بارے میں خدشہ ہے ۔ ابو براء نے کہا کہ میں ان کا حامی و ضامن ہوں، چنانچہ آپ ؐ نے ایک سردار قبیلہ کی حمایت و ضمانت پر اعتماد کرتے ہوے حضرت المنذر بن عمرو بن خُنَیس الساعدی، الخزرجی، العقبی، البدری، النقیب کی سرکردگی میں ستر صحابہ کا ایک وفد روانہ کیا (زاد المعاد، صحیح البخاری) ۔ کتاب المحبر میں تعداد تیس درج ہے جن میں سے چھبیس انصار اور چار مہاجرین تھے (ص ۱۱۸) ۔ جوامع السیرۃ (ص ۱۷۹) اور انساب الاشراف (۱ : ۲۷۵) میں چالیس یا ستر مرقوم ہے ۔ جب یہ وفد بئر معونہ کے علاقے میں فروکش ہوا تو انھوں نے حضرت حرام بن مِلْحان النجاری کو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم کا خط دے کر بنو عامر کے سردار عامر بن الطفیل بن مالک کے پاس بھیجا ۔ عامر نے خط پڑھے بغیر قاصد کا سر قلم کر دیا، اور اپنے قبیلے کو مسلمانوں کے اس وفد پر حملہ کرنے کو کہا، مگر انھوں نے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ ابو براء نے مسلمانوں کو اپنی حمایت و ضمانت میں لے رکھا تھا ۔ ادھر سے ناکام ہو کر عامر بن الطفیل نے بنو سُلیم کو حملہ

کرنے پر اکسایا تو بنو سُلَیم کے قبائل میں سے بنو عُصَیّة بن خُفاف، بنو رِعل بن مالک، بنو ذکوان بن رفاعة مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ یہ دیکھ کر مسلمان بھی آرام گاہوں سے نکل آئے اور تلواریں نکال لیں اور مقابلہ کرتے ہوئے سارے شہید ہو گئے۔ البتہ حضرت کعب بن زید النّجاری یوں بچ گئے کہ کفار نے اپنے زعم میں انہیں قتل کر کے پھینک دیا، لیکن ان میں رمق باقی تھی، چنانچہ وہ زخموں سے نڈھال گرتے پڑتے بچ نکلے اور بعد میں غزوۂ خندق میں شہید ہوئے (سیر اعلام النبلاء، ۱ : ۳۷۱)۔

اتفاق کی بات ہے کہ اس وفد کے دو رکن حضرت عمرو بن اُمیّہ الضمری اور المُنذر بن محمد بن عُقبہ بن اُحَیحة بن الجُلاح الانصاری، البدری اپنے اونٹوں کو چرانے نکلے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی قیام گاہ کے اوپر پرندے منڈلا رہے ہیں تو حالات معلوم کرنے کے لیے وہ اپنی قیام گاہ کی طرف لپکے۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے سارے ساتھی شہید کر دیے گئے ہیں اور حملہ آور گھوڑ سوار ابھی وہیں کھڑے ہیں۔ جوشِ غیرت میں ان دونوں نے حملہ کر دیا۔ المنذر تو وہیں شہید ہو گئے، اور الضمری گرفتار کر لیے گئے۔ جب عامر بن الطفیل کو معلوم ہوا کہ عمرو بن امیہ قبیلۂ مضر سے ہیں تو اس نے ان کی پیشانی کے بال کاٹ لیے اور یہ کہہ کر آزاد کر دیا کہ میری ماں کے ذمے ایک غلام آزاد کرنا تھا، سو میں اس کی طرف سے تجھے آزاد کرتا ہوں۔

اب حضرت عمروؓ بن امیہ نے مدینۂ طیبہ کا رخ کیا۔ راستے میں بنو سلیم کی ایک گھاٹ قرقرة الکدر نامی پر ایک درخت کے نیچے آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ وہیں بنو کلاب یا بنو سلیم کے دو آدمی آ فروکش ہوئے۔ ان کے پاس آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم کا معاہدہ تھا، مگر حضرت عمروؓ بن امیہ کو اس کا علم نہ تھا۔ جب وہ سو گئے تو اپنے شہید ساتھیوں کا انتقام لینے کے خیال سے حضرت عمروؓ نے دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور مدینۂ منورہ پہنچ کر آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم کی خدمت میں سارا ماجرا کہہ سنایا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم نے دو ایسے آدمیوں کو قتل کر دیا ہے جن کا خون بہا مجھے ادا کرنا پڑے گا، چنانچہ آپؐ نے ان دونوں کا خون بہا ان کے قبیلے میں بھیجدیا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم اور صحابۂ کرامؓ کو شہدائے بئر معونہ کا بڑا دکھ ہوا۔ اس سے کچھ دن پہلے یوم الرّجیع میں دس (البخاری؛ ابن سید الناس) اور بقول دیگر سات (الواقدی) بہترین قاری صحابہ کی شہادت کا واقعہ پیش آ چکا تھا، اس کا بھی آپؐ کو بڑا صدمہ تھا، چنانچہ آپؐ تقریبًا ایک مہینہ ہر نماز میں شہدائے بئر معونہ اور الرّجیع کے قاتلوں کے لیے بد دعا کرتے رہے۔

بئر معونہ کا سانحہ ۲۰ صفر کو پیش آیا (المحبّر، ص ۱۱۸)۔ شہدا کے چند ہی نام مل سکے ہیں جو درج ذیل ہیں: (۱) سعدؓ بن عمرو بن کعب النّجاری، الخزرجی، الانصاری (جمهرة، ۳۴۹)؛ (۲) الحارثؓ بن الصِّمّة بن عمرو النّجاری، البدری (جمهرة، ۳۴۹؛ سیر اعلام النبلاء، ۱ : ۳۷۱)؛ (۳) قُطبةؓ بن عبد عمرو النجاری (جمهرة، ۳۵۰)؛ (۴) سُلَیمؓ بن مِلحان النجاری، البدری (جمهرة، ۳۵۰)؛ (۵) حرامؓ بن مِلحان النجاری (جوامع السیرة، ۱۷۹؛ سیر، ۱ : ۳۷۱)؛ (۶) خالدؓ بن ابی مَعصعة النجاری (جمهرة، ۳۵۲)؛ (۷) المُنذرؓ بن محمد بن عُقبة الاَوسی، الانصاری (جمهرة، ۳۳۵)؛ (۸) رافعؓ بن وَرقاء الخُزاعی (سیر، ۱ : ۳۷۱)؛ (۹) عُروةؓ بن اسماء بن الصّلت السلمی (سیر، ۱ : ۳۷۱؛ ابن هشام ۳ : ۱۹۳)؛ (۱۰) حکمؓ بن کیسان (انساب الاشراف، ۱ : ۳۷۲)؛ (۱۱) نافعؓ

ابن بُدَیل بن وَرقاء الخُزاعی (جمهرة، ۲۳۹؛ جوامع السیرة، ۱۷۹)؛ (۱۲) عامر بن البکیر (ماں: عفراء بنت عبید، المحبّر، ۴۵۹)؛ (۱۳) المنذر بن عمرو بن خُنیس الخزرجی، الساعدی، البدری، العقبی، النقیب، الانصاری (المحبّر، ۲۷۱؛ جمهرة، ۳۶۶؛ انساب الاشراف، ۱: ۲۵۰)؛ (۱۴) عامر بن فُہَیرة، البدری، حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ کے آزاد کرده غلام (جمهرة، ۲۸۶)؛ ان کے قاتل جبّار بن سَلْمٰی بن مالک کا بیان ہے که جب میں نے اسے نیزه مارا تو کسی نے اس کو میرے نیزے سے اچک لیا، میں نے کسی اور شخص کو تو دیکھا نہیں، لیکن میرے دیکھتے دیکھتے وه آسمان کی طرف اٹھا لیا گیا اور اس کی نعش نہیں ملی ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیه و سلّم نے فرمایا که عامر کو فرشتے لے گئے اور ان کی نعش کو دفن کر دیا (انساب الاشراف، ۱: ۱۹۴).

مآخذ: (۱) ابن حزم: جمهرة انساب العرب (طبع عبدالسلام هارون)، قاهره ۱۹۶۲ء؛ (۲) وهی مصنّف: جوامع السیرة (طبع احسان عباس)، ص ۱۷۰ تا ۱۸۰، قاهره ۱۹۵۶ء؛ (۳) ابن حبیب: المحبّر، ۱۱۸، ۲۷۴، حیدر آباد (دکن) ۱۳۶۱ھ؛ (۴) ابن خلدون: تاریخ ابن خلدون (اردو ترجمه از ڈاکٹر عنایت اللہ)، ۱: ۳۴۳ تا ۳۴۴، لاهور ۱۹۶۰ء؛ (۵) ابن سعد: الطبقات، ۲/۱: ۳۶، ۳/۲: ۱۷، ۳/۱: ۱۸۳، ۳/۲: ۸۹؛ (۶) ابن سید الناس: عیون الاثر، ۲: ۴۶ ببعد، قاهره ۱۳۵۶ھ؛ (۷) ابن القیم: زاد المعاد، ۲: ۱۰۹ تا ۱۱۰، مصر ۱۹۲۸ء؛ (۸) ابن کثیر: البدایة والنهایة، ۴: ۷۱ تا ۷۴، مصر و بیروت؛ (۹) ابن هشام: السیرة (طبع مصطفٰی السقا وغیره)، ۳: ۱۹۳ تا ۱۹۹، مصر ۱۹۳۶ء؛ (۱۰) البخاری: الصحیح، کتاب الجهاد، باب ۹، ۱۸۴، کتاب المغازی، باب ۲۸؛ (۱۱) ابو داؤد الطیالسی: المسند (تبویب جدید، طبع احمد عبدالرحمٰن البنا الساعاتی)، ۱: ۲۰۱، مصر ۱۳۷۲ھ؛ (۱۲) البلاذری: انساب الاشراف (طبع محمد حمید اللہ)، ۱: ۱۹۳، ۲۵۰، ۳۴۲، ۳۷۵، قاهره ۱۹۵۹ء؛ (۱۳) الذهبی: سیر اعلام النبلاء (طبع صلاح الدین المنجد)، ۱: ۱۷۳، قاهره؛ (۱۴) وهی مصنّف: العبر فی خبر من غبر (طبع صلاح الدین المنجد)، ۱: ۶، الکویت ۱۹۶۰ء؛ (۱۵) الدیار بکری: تاریخ الخمیس، ۱: ۴۵۱؛ (۱۶) الطبری: تاریخ، ۳: ۳۳؛ (۱۷) القسطلانی: المواهب اللدنیة، ۱: ۱۳۳؛ (۱۸) المقریزی: امتاع الاسماع، ۱۷۰؛ (۱۹) الزرقانی: شرح المواهب اللدنیة، ۲: ۷۴ تا ۷۹، طبع مصر ۱۳۲۵ھ؛ (۲۰) یاقوت: معجم البلدان (مادۂ بئر).

(عبدالقیوم)

بئر میمون: نواح مکۂ مکرمه میں ایک کنوا جو اسلام کے ابتدائی زمانے میں مشهور و معر تھا، مگر اب مکۂ مکرمه کے علاقے میں یه سننے میں نہیں آتا ۔ دستیاب مآخذ سے یه وضا نہیں هوتی که آیا بئر میمون برباد هو گیا یا کسی دوسرے نام سے اب بھی جاری ہے قدیم کنویں کا محل وقوع بھی غیر یقینی ہے بہت سے شواهد اس کا جائے وقوع مسجد الحرام منی کے درمیان، منی سے قدرے قریب تر قرار د هیں ۔ الطبری (۳: ۲۵۶) نے بئر میمون کے ۱۵۸ھ / ۷۷۵ء میں خلیفه المنصور کی وفات حالات لکھے هیں، ان سے اندازه هوتا ہے که کنواں حدود حرم کے اندر تھا، نیز خیال پیدا ہے که وه عراق سے آنے والے حاجیوں کی راه پر تھا (ایک اور روایت کے مطابق المنصور کی و الحجون کی پہاڑی پر واقع هوئی تھی نه که بئر م کے مقام پر؛ دیکھیے Wüstenfeld : *h. der Stadt Mekka*، لائپزگ ۱۸۶۱ء، ص ۱۶۰) ۔ ایک تاریخی شهادت کے مطابق بئر میمون مکے کے میں مرّ الظهران (جسے اب وادی فاطمه کہتے هیں پاس تھا [قرب المنتقی، ص ۲۳۰] ۔ الهمدانی، ۱:

کے قول کے مطابق بئر میمون دنیا بھر کے دو قدیم ترین کنووں میں سے ایک تھا۔ البکری (: معجم، قاہرہ ۱۹۴۵-۱۹۵۱ء، ۴ : ۱۲۸۵) کے قول کے مطابق یہ کنواں چاہ زمزم سے کہیں زیادہ قدیم تھا، لیکن [عہد نبوی میں یہ کنواں میمون بن الحضرمی کی ملکیت تھا (ابن حزم : جمہرۃ، ص ۳۶۱]۔ اگر یہ کنواں اتنے قدیم زمانے کا تھا تو اسے شروع میں لازماً [حضرت] العلاءؓ بن الحضرمی کے بھائی میمون سے بھی پہلے کسی شخص نے کھودا ہوگا۔ یہ میمون اسی نام کے کسی چاہ کھودنے والوں میں سے ایک تھا۔ قطبی کی لکھی ہوئی مکّے کی تاریخ الاعلام (مکہ بدون تاریخ طباعت، ص ۲۸۲) میں لکھا ہے کہ بئر میمون مکّے کے لیے آب رسانی کے اس بڑے نظام سے وابستہ تھا جو سب سے پہلے ملکۂ زبیدہ نے تیار کرایا۔ [حاکم اربل المظفر نے ۶۰۳ھ میں مرمت کے بعد اس کنویں کو از سر نو آباد کیا (المنتقی، ص ۱۲۳)]۔ بعض مفسروں نے بئر میمون کو وہ پانی قرار دیا ہے جو قرآن کریم کی سورۃ الملک [۶۷] کی آخری آیت (فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ) میں مذکور ہوا ہے۔

مآخذ : (۱) الہروی : الزیارات، دمشق ۱۹۵۳ء، ص ۸۹؛ (۲) الفاسی : شفاء الغرام، قاہرہ ۱۹۵۶ء، ۱ : ۳۳۳؛ (۳) السباعی : تاریخ مکّہ، قاہرہ ۱۳۷۲ھ، ص ۹۶؛ [(۴) کتاب المنتقی فی اخبار ام القری، لائپزگ ۱۸۵۹ء، ص ۱۲۳]۔

(G. Rentz)

بَیْرام : معلوم نہیں کہ ترکوں نے کس زمانے میں لفظ بَیرام کو مسلمانوں کے دو بڑے تیوہاروں [عیدین] کے لیے استعمال کرنا شروع کیا، نہ اس امر کی کوئی صریح شہادت موجود ہے کہ ترکوں میں اسلام سے پہلے مسلّمہ مذہبی تیوہاروں پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا تھا۔ محمود کاشغری نے لکھا ہے کہ گیارھویں صدی میں اُوغُز (= اوغوز) ترک یوم عید کو ''بیرام'' کہتے تھے اور وہ کہتا ہے کہ اس لفظ کے معنی اس کی ابتدائی شکل ''بَذْرَم'' کی طرح، ''یوم مسرّت و تفریح'' کے آتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اسے اس لفظ کی اصل معلوم نہیں اور اس نے اسے ایرانیوں کے ہاں سنا ہے وہ مزید بیان کرتا ہے کہ ''پھولوں اور چراغوں سے آراستہ'' جگہ کو ''بذرم یِر'' کہا جاتا ہے، یعنی ایک ایسی جگہ جہاں دل کو سکون حاصل ہوتا ہے'' (دیوان لغات التّرک، ۱ : ۱۰۳؛ ۳ : ۱۳۳)، لیکن ہمیں اتنا پتا تو ملتا ہے کہ مابعد صدیوں میں یہ لفظ اپنے پورے اسلامی معنی میں استعمال ہونے لگا (ابن مُہنّا : طبع کلیسلی رفعت، ص ۱۸۳)، اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تیرھویں صدی سے یہ شخصی ناموں میں بھی استعمال ہوتا تھا۔ قومان Kumans ترکوں کی تقویم میں ایک مہینے موسوم بہ قُربان بایرام کی موجودگی ہمارے لیے صرف اس امر کا مظہر ہونے کی وجہ سے اہم ہے کہ اسلام ہی نے اس لفظ کی اشاعت کی (طبع *Codex Cumanicus*، G. Kuun، ۱۱۶)۔ لفظ ''بیرام'' کا اشتقاق اور ابتدائی مادّہ ہنوز نامعلوم ہیں۔ اگر ترکوں کے ہاں عید سے مطابقت رکھنے والا لفظ ''بیرام'' کا محمول موجود نہ ہوتا تو اوغز قوم میں اس لفظ کو بلا تامّل یہ معنی نہ دیے جاتے۔

محمود کاشغری کے اس بیان کا کہ اسلام سے قبل ترکوں کا کوئی یوم عید نہ تھا (۳ : ۱۳۳)، ظاہر ہے کہ صرف یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ ان کے ہاں اسلامی تیوہار نہ تھے۔ ''بیرام'' سے ہمارا مطلب بعض رسوم و تفریحات کا ایک مجموعہ ہے، جو سال میں مقررہ اوقات پر منائی جاتی ہیں اور وہ یا تو مذہبی ہیں، یا اگر وہ مذہبی نظر نہیں آتیں تو بھی بہر حال ابتداءً مذہبی قسم کی تھیں۔

اگر اس امر کو ملحوظ خاطر رکھیں تو پھر اس میں کوئی شبہہ نہیں رہتا کہ شمنی مذہب کے ماتحت ترکوں کے ہاں بھی اپنے خاص "بیرام" ہوتے ہونگے، گو ہمیں فی الواقع معقول معلومات پر دسترس نہیں، لیکن بعض تاریخی دستاویزات سے جو اس مضمون سے متعلق ہیں، استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ چینی ماخذ کے مطابق، گوک۔ ترک امرا ہر سال اوتوکن Otüken غار کو جہاں سے ان کے اجداد برآمد ہوے تھے جایا کرتے تھے اور رسوم تقدیس ادا کیا کرتے تھے، گو یہ معلوم نہیں کہ عوام بھی اس دن کو تیوہار کے طور پر مناتے تھے یا نہیں، لیکن اسی ماخذ میں یہ بیان بھی موجود ہے کہ پانچویں مہینے کے نصف آخر میں سب لوگ ایک بڑا تیوہار منایا کرتے تھے، جس میں گوک تنری (آسمان کے دیوتا) کے اور ارواح ارضی کے لیے قربانیاں دی جاتی تھیں (St. Julien: *Documents*، در *JA*، ۱۸۶۴ء، ۳: ۳۳۵؛ E. Chavannes: *Documents*، پیٹرزبرگ ۱۹۰۳ء، ص ۱۵؛ A. Remusat: *Recherches sur les Langues tartars*، ۱: ۲۲۷؛ W. Eberhard: چینگ شمالی قومشولری، انقرہ ۱۹۴۲ء، ص ۶۷)۔ ان رسوم کا نہایت قریبی تعلق گوک ترکوں کی اصل سے متعلق چینی ماخذ کے افسانوں سے ہے اور وہ مسلم ماخذ میں بھی مذکور ہیں۔ افسانۂ Ergenekon کے مطابق، جو تاریخ گوک۔ ترک کا ایک افسانوی عکس ہے، ترک (دیکھیے زکی ولیدی طوغان: مغول‌لر، چنگیز و ترک لک، استانبول ۱۹۴۰ء)، ہر سال کے آغاز میں خاقان کی ایادت میں رسوم ادا کرتے اور تیوہار منایا کرتے تھے جس میں Ergenekon سے برآمد ہونے کی یاد میں سرخ لوہے کی سندان پر کوٹا جاتا تھا (جامع التواریخ، کتابخانہ طوپ قپی، مخطوطہ، ورق ۱۴ الف؛ نصیر الدین طوسی: زیج ایلخانی، کتابخانۂ نور عثمانیہ، مخطوطہ، عدد ۲۹۳۳؛ رضا نور: شجرۂ ترک *Shejere-i-Turk*، ترجمہ ص ۳۸)۔ یہ روایت، جو گوک ترکوں کی ابتدا اور ان کے پیشۂ حدادی اختیار کرنے پر مبنی ہے، بعینہ اسی صورت میں کنز الدرر میں مذکور ہے (رک بہ حسام الدین: اماسیہ تاریخی، ۲: ۱۲)۔ آغاز سال کے موقع پر وسطی ایشیا میں مغلوں کی قورولتای (Kurultay) کی تقریب (جوینی: جہان گشای، ۳: ۱۴؛ تاریخ مبارک غازانی (بسلسلۂ یادگار گب) ص ۱۴۳، ۱۵۴) کا تعلق بھی اسی تہوار کے ساتھ معلوم ہوتا ہے، بحالیکہ تیوہاروں کی یہ روایت گوک ترکوں کی تاریخی زندگی سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس امر کا امکان بھی موجود ہے کہ انھیں یہ رسم ھیونگ نو قوم سے ملی تھی اور وہ ہر اعتبار سے اسی قوم کے آئندہ سلسلے میں تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ھیونگ نو حکومت کے اکابر ہر نو روز کے موقع پر تزیو کے مستقر پر اکٹھے ہوتے تھے اور زمین اور آسمان کے دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں دیتے تھے اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اس طرح پانچویں مہینے میں ایک مقام پر جو غالبًا اوتوکن سے متصل تھا قربانیاں دے کر بڑا تیوہار منایا کرتے تھے (De Groot: *Die Hunen der Vorchristenzeit*، ص ۵۹؛ Deguignes، ترجمہ H. Cahid: ۱: ۱۰۲؛ W. Eberhard: کتاب مذکور، ص ۶۷)۔

چینی اور مسلم ماخذ میں بعض ترکی قبائل کے تیوہاروں کے جو مبہم حوالے درج ہیں (W. Eberhard: *TM*، ۷: ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۴۷؛ یاقوت: معجم، ۳: ۸۴۴) ان کے متعلق فی الحال یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ زیادہ مطلب خیز نہیں ہیں صرف عوامی تاریخ کے مواد کا کام دے سکتے ہیں۔

زمانۂ قبل از اسلام کے "بیراموں" کی توضیح کا احاطہ کرنے کے لیے ہم ان معلومات سے استفادہ کر سکتے ہیں جو طوی (یا طوہ) [جشن]

متعلق ملتی ہیں ۔ ان تقریبات نے اسلامی عہد میں ایک حد تک اپنا مذہبی رنگ کھو دیا، تاہم ابھی تک ان کا ذکر قومی رزمیہ نظموں اور افسانوں میں باقی ہے ۔ کتاب دده قورقوت میں یہ بیان کہ بایندرخان ہر سال ایک طُوی منعقد کیا کرتا تھا (طبع اورخان شائق Orhan Saik، ص ۵) ذہن کو اس طرف منتقل کرتا ہے کہ طُوی بھی، بیراموں کی مانند، ایسی رسوم تھیں جو اوقات مقرّرہ پر ادا کی جاتی تھیں۔ اس کے برعکس یہ امر کہ لفظ طوی (بعض اوقات "شوان") کا خان کی تخت نشینی، اور رسوم متعلقہ پیدائش سے جو "یُغ" [رسوم جنازہ وُکہ ۔ اس کے یہ معنی معلوم ہوتے ہیں کہ رسوم مرگ کی طرح پیدائش پر بھی خاص جلسے اور دعوتیں ہوتی تھیں] سے مطابقت رکھتی تھیں (مثلاً آغز خان کے بچوں کی پیدائش کے موقع پر، رك به اوغوز کاغان داستانی، طبع Rahmeti L, W. Bang، ص ۵؛ چنگیز کی پیدائش کی تقریب پر (جامع التواریخ، ۲۷ الف)، ذلّی دمرول کی پیدائش کی تقریب پر، (دده قورقوت، ص ۱۶)، نیز اس سے کہ یہ لفظ مسرّت کے جلسوں اور ان رسوم کے لیے استعمال ہوتا تھا جو کسی عظیم الشان فتح کے بعد یا شادی کے موقع پر منائی جاتی تھیں ۔ ظاہر ہوتا ہے کہ اسے پورے طور پر "بیرام" کا ہم معنی قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ گو اسلام نے صرف اپنے ہی "بیراموں" کو اہمیت دی تھی اور بت پرستانہ روایات اس کی نظر میں مستحسن نہ تھیں، تاہم جزوًا دنیوی روپ اختیار کر کے وہ بعض خطّوں مثلاً مصر، شام اور ایران (قبّ: جشن) میں جاری رہیں، اسی طرح ترکی بیرام کی روایات بھی ایک طویل عرصے تک زندہ رہیں، بلکہ بعض قدیمی ترکی رسوم اسلامی بیراموں میں بھی داخل ہو گئیں ۔ آلتون اردو یا لشکر زرّیں (Golden Horde) میں بیرام سے متعلق جن رسوم کا ذکر ابن بطوطہ نے کیا ہے ان سے ان اثرات کا کچھ پتا چل سکتا ہے (رك به ترجمہ ایم ۔ شریف، ۱ : ۳۸۲).

گو ترکوں نے مشرّف باسلام ہونے کے بعد اپنی قدیمی بیرام کی رسوم قائم رکھیں لیکن انھوں نے اسے ایک فریضۂ مذہبی سمجھا کہ وہ اسلام کے مقرر کردہ بڑے "بیراموں" رمضان بیرامی اور قربان بیرامی کو اہم اور مقدّس تصوّر کریں، لیکن مسلم ترکوں کے مخصوص بیراموں کے متعلق جو واضح اور مفصّل معلومات ہمیں حاصل ہیں وہ صرف سلطنت عثمانیہ کے دور کی ہیں ۔ فی الحال جو دستاویزات ہمیں میسّر ہیں ان کی بنا پر ہمیں لازمًا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فاتح سلطان محمّد اگر رسوم و جشن ہائے بیرام کا بانی نہیں تھا تو کم از کم قانونًا اسی نے انھیں منضبط و مدوّن کیا ۔ اس کا تحریری ثبوت موجود ہے کہ قانون نامہ کے مطابق، جو اس سے منسوب ہے، سلطان موصوف نے حکم دیا تھا کہ بیرام کے ایام میں تخت شاہی میدان دیوان میں بچھوایا جائے، سلطان اس پر جلوہ افروز ہو اور اعلٰی عہدے داروں کو اجازت ہو کہ وہ اس کے ہاتھ کو بوسہ دیں (قانون نامۂ آل عثمان، در *TOEM* ضمیمہ ۳، استانبول، ۱۳۳۰ھ، ص ۲۵) ۔ وہ دقیق اور پیچیدہ رسوم جو بعد کے قانون ناموں، تواریخ اور آداب و رسوم کی کتابوں میں بہ تفصیل مذکور ہیں سلطنت کے آخری ایّام تک جاری رہیں اور ان میں کوئی اصولی تغیر نہیں کیا گیا.

چونکہ استانبول میں یہ معمول تھا کہ رمضان بیرامی کی تقریب پر آنے والوں کی تواضع مٹھائیوں سے کی جائے اس لیے اس تیوہار کو شکر بیرامی (یعنی میٹھی عید) کہا جانے لگا؛ ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا ہوتا، ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد دی جاتی اور بڑی عمر کے لوگ بچّوں کو رومال

تحفے کے طور پر دیتے تھے۔ قربانِ بیرامی (= عید قربان) کی تقریب پر قربانی کے جانوروں کا گوشت مساکین اور ہمسایوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور اسی طرح کی مبارکباد کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں، لہٰذا رمضان بیرامی، جسے ''بیرام کوچک'' کہا جاتا ہے، سرکاری تقریبات کے اعتبار سے بڑی عید کے رتبے کی ہوتی ہے (بیرام سے متعلق احکام مذہبی، اس کی ابتدا اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں بیرام سے متعلق رک بہ عید).

عہدِ جمہوریہ میں ان تقریباتِ بیرام کے موقع پر ایک دوسرے کو مبارکباد دینے کا رواج ایک قومی روایت کے طور پر زندہ ہے۔ اعلانِ آئین کی سالگرہ کو ترکیا میں سب سے پہلے غیر مذہبی بیرام کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا، عہدِ جمہوریہ میں اس نے ''بیرام جمہوریہ'' (۲۹ اکتوبر) کی شکل اختیار کر لی ہے۔ انقرہ میں جب صدرِ جمہوریہ مجلس ملیۂ کبیر میں مندوبین، اعلٰی حکّام اور سفرا کی مبارکباد لے چکتے ہیں تو ایک بڑی فوجی نمائش ہوتی ہے؛ شہروں میں شہر کے اعلٰی انتظامی عہدہ دار کو مبارکباد پیش کی جاتی ہے اور فوجی قواعد (پریڈ) کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ جس میں عسکری مدارس کے طلبہ حصہ لیتے ہیں۔ بیرام کی یہ تقریبات تین دن تک جاری رہتی ہیں۔ ترکیۂ جدید میں دوسرے درجے کے غیر مذہبی بیرام دو ہیں: ۲۳ اگست، جب کہ مجلس ملیۂ کبیر قائم ہوئی اور ۳۰ اگست، جب کہ عساکر ترکیہ کو فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی۔ ان بیراموں کے علاوہ یکم جنوری، سال نو کی تقریب کو بھی سرکاری تعطیل کا دن قرار دیا گیا ہے۔

مآخذ: مقالے میں مندرجہ تصانیف کے علاوہ دیکھیے: (۱) اسعد آفندی: تشریفاتِ قدیمہ، بمواضع کثیرہ؛ (۲) منیر الیاس: تاریخ اندرون، ۱۲۷۶ھ، ص ۵۰، ۵۳ تا ۶۰، ۹۱ تا ۹۵؛ (۳) عطاء: تاریخ، ۱: ۲۲۰ تا ۲۵۰؛ (۴) D'Ohsson: *Tableau général de l'Empire Othoman*، (پیرس ۱۷۸۸ء)، ۲: ۲۲۲ تا ۲۳۱، ۲۴۳ تا ۲۴۴؛ (۵) اے۔ جاوید بے: *Etat Militaire Ottoman* (استانبول ۱۸۸۲ء)، ص ۹۰ تا ۱۰۲؛ (۶) محمد زکی: اصطلاحِ بیرام تبریکاتی (TOEM، ۳۶: ۳۵۷)؛ (۷) کوپرولو زادہ محمد فؤاد: ترک ادبیاتنگ منشائی (MTM، جلد ۱، بمواضع کثیرہ)؛ (۸) عبدالقادر: اورن و اولوش (تورک حقوق و اقتصاد تاریخی مجموعہ سی)؛ (۹) عثمان توران: اون ایکی حیوانلی تورک تقویمی (استانبول ۱۹۴۱ء)، ص ۳۳ تا ۳۴، ۴۷ تا ۴۸، ۸۰، ۱۲۲۔

(عثمان توران)

بیرامیہ: ایک طریقہ جو خلوتیہ سے نکلا ہے اور جس کی بنیاد آٹھویں نویں صدی ہجری/چودھویں پندرھویں صدی عیسوی میں حاجی بیرام ولی نے انقرہ میں رکھی۔ صوفی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو ''ذکرِ خفی'' کا حکم دیا اور حضرت علیؓ کو ''ذکرِ جلی'' کا۔ بیرامیہ ذکرِ خفی کو ترجیح دیتے ہیں اور اس بات میں نقشبندی بھی ان کے ہمنوا ہیں، لیکن سلسلۂ مؤخر الذکر کے ساتھ اس کا تعلق بہت تھوڑا ہے اور ذکرِ خفی کی مشق ان میں ملامتی اثر کے تحت آئی۔

اپنے بانی کی موت پر یہ طریقہ دو حصوں میں منقسم ہوگیا۔ ایک شاخ نے ذکرِ جلی کو اختیار کر لیا اور آق شمس الدین کے پیرو ہونے کی بنا پر بیرامیہ شمسیہ کہلانے لگے۔ دوسری شاخ نے بُرسہ کے عمر دده کے زیرِ سرکردگی ذکر، ورد، اپنا تشخصی لباس اور تکیہ سب کچھ ترک کر دیا اور ملامیۂ بیرامیہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ بعد ازاں عزیز محمود ہدائی (م ۱۰۳۸ھ/ ۱۶۲۸-۱۶۲۹ء) کے تحت ایک تیسری شاخ پیدا ہوئی جو جلوتیہ کہلائی۔

عقیدے کے اعتبار سے اس طریقے کی سب سے

بڑی خصوصیت جو اس کے ملامی الاصل ہونے کی دوسری دلیل ہے یہ ہے کہ اس حلقے میں داخل ہونے والے کو اس کی روحانی زندگی کے آغاز ہی سے وحدۃ الوجود کے تصور سے روشناس کر دیا جاتا تھا، حالانکہ دوسرے طریقوں میں یہ بات بالکل آخر میں ہوتی ہے۔ اسے سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ تمام افعال خدا کی طرف سے ہیں (توحید افعال یا فنائے افعال)، اس کے بعد یہ کہ افعال صفات کے مظہر ہیں جو سب خدا کی صفات ہیں (توحید صفات یا فنائے صفات) اور سب سے آخر میں یہ کہ صفات روح کے مظاہر ہیں، وجود صرف ایک ہی ہے اور یہ کہ تمام اشیا اَعیانِ علمیہ کے مظاہر ہیں، جو خدا کے علم میں ہیں (توحید ذات یا فنائے ذات)۔

اس طریقے کا سر کا لباس سفید نمدے کی ایک شش گوشہ ٹوپی ہوتی تھی جو گویا شش جہات (اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، آگے، پیچھے) کی نشان دہی کرتی تھی اور اس سے اس بات کا اظہار مقصود تھا کہ اس کا پہننے والا تمام اشیائے موجودہ کی حقیقت سے آشنا ہے۔

شروع ہی سے اس طریقے کے تعلقات اپنے اصل ملامتیہ سے بہت زیادہ مضبوط و پختہ تھے؛ چنانچہ ملامتیہ کئی بیرامی شیوخ کو قطب زمان تسلیم کرتے تھے۔

۱۹۲۵ء میں جب ترکی میں یہ سب طریقے توڑے گئے تو اس وقت اس طریقے کے مرکز استانبول، انقرہ، اِزمید، اور قسطمونی میں قائم تھے۔

مآخذ: دیکھیے وا، ت میں عبدالباقی گول پنار کا طویل مقالہ ''بیرامیہ''؛ یہ مقالہ اسی کا ایجاز و اختصار ہے۔

(G. L. Lewis)

• **بیرجند**: فارس کے نویں آستان میں ایک ضلع اور شہر۔ شہر ۵۹ دقیقے ۱۳ ثانیے مشرقی عرض بلد (گرینوچ) اور ۳۲ دقیقے ۵۲ ثانیے شمالی طول بلد پر واقع ہے۔ یہ شہر ایک خشک و بے گیاہ وادی کی شمالی طرف ایسی دو پہاڑیوں پر بنا ہوا ہے جن کے درمیان ایک پہاڑی نالے کی گزرگاہ ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی چودہ سو نوّے میٹر ہے۔

قدیم عرب جغرافیہ‌نویسوں کے ہاں بیرجند کا کوئی حوالہ موجود نہیں اور یاقوت (۱ : ۵۸۳) بظاہر پہلا شخص ہے جس نے اس کا ذکر کیا (نواح ۶۲۳ھ / ۱۲۲۶ء)۔ وہ اسے کوہستان کے، جو اس وقت بڑے صوبۂ خراسان کا ایک حصّہ تھا، نہایت عمدہ شہروں میں سے ایک شہر قرار دیتا ہے۔ حمد اللہ المستوفی نے تقریباً ۷۳۰ - ۷۳۱ھ / ۱۳۳۰ء میں لکھا ہے (نزہۃ، ص ۱۳۳) کہ بیرجند ایک صوبائی شہر تھا، جس کے نواح میں کثرت سے زعفران اور کچھ غلّے کی کاشت ہوتی تھی۔ آس پاس کے دیہاتوں میں انگور اور دوسرے میوے پیدا ہوتے تھے۔ قائن [رک بآں] کے شہر کی طرح، جو نوّے کیلومیٹر شمال میں واقع ہے، بیرجند کچھ مدت تک حشیشین [باطنیوں] کے زیر اقتدار رہا۔ یہ مقام شاعر نزاری کا مولد تھا اور جیسا کہ اس نام سے پتا چلتا ہے وہ اسمٰعیلی تھا۔ وہ ۷۱۹ - ۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء کے قریب فوت ہوا۔

بیرجند ایک طویل مدت تک قائن کے سامنے ماند رہا، لیکن انیسویں صدی میں اس نے کوہستان کے صدر مقام کی حیثیت سے قائن کی جگہ لے لی۔ اور اب بیرجند اور قائن کے اضلاع (شہرستانہا) کا انتظامی مرکز ایک فرماندار یا حاکم کے ماتحت ہے۔ ۱۹۴۶ء میں یہاں کی آبادی تیئیس ہزار چار سو انہاسی تھی، لیکن اب اس سے کم ہے کیونکہ یہاں کے کچھ باشندے نقل مکان کر کے مشہد اور دوسرے مقامات میں جا بسے۔ شہر میں نلوں سے

آب رسانی کا بندوبست ہے ۔ پانی کچھ تو جنوب کے کوہ بگران سے آنے والی قنات [کاریزوں] سے اور کچھ خود شہر کے ایک گہرے کنویں سے حاصل کیا جاتا ہے.

قدیم زمانے کی طرح آس پاس کے علاقے میں کثرت سے زعفران اور ہر قسم کے گری‌دار میووں کی کاشت ہوتی ہے ۔ یہ ضلع مدت سے اپنے غالیچوں اور قالینوں کی عمدہ نوعیت کے لیے مشہور چلا آ رہا ہے ۔ یہ مصنوعات زیادہ‌تر موضع دُرَخْش میں بنتی ہیں، جو آسّی میٹر شمال مشرق میں واقع ہے ۔ اور اپنے برکوں (اونٹ کی اون سے بنے ہوئے پارچوں) کے لیے بھی مشہور ہے ۔ مشہد اور زاھدان کے مابین شاھراہ پر واقع ہونے کے باعث بھی بیرجند کو کچھ خوش‌حالی میسر ہے ۔ یہ شہر سڑک کے ذریعے کرمان سے بھی ملا ہوا ہے.

مآخذ : مقالے میں مذکورہ حوالوں کے علاوہ : (۱) Major E. Smith : *The Perso-Afghan Mission*، ۱۸۷۱ تا ۱۸۷۲ء، در *Eastern Persia, an Account of the Persian Boundary Commission* 1870, 71, 72، لندن ۱۸۷۶ء، ۱ : ۳۳۳ تا ۳۳۷؛ (۲) E. Reclus : *Nouv. géogr. Univ.* (1894)، ۹ : ۲۲۸ تا ۲۲۹؛ (۳) Le Strange، ص ۳۶۲؛ (۴) Sykes : *Ten Thousand Miles in Persia*، لندن ۱۹۰۲ء، ص ۳۹۹؛ (۵) رزم آرا اور نوتاش : فرہنگ جغرافیای ایران، ۹ : ۱۵.

(L. LOCKHART)

- **بَیرَق** : رَكَ بہ عَلَم.
- **بَیرَق‌دار** : فارسی زبان کی ایک اصطلاح، جس کے معنی عَلَم‌بردار ہیں ۔ عثمانی دورِ سلطنت میں اس اصطلاح کا اطلاق جاگیردارانہ اور مستقل ہر دو فوجوں کے متعدّد عہدیداروں نیز البانیہ کے کچھ موروثی سرداروں پر ہوتا تھا ۔ جاگیرداری فوج میں ہر صوبے کے آلای بیگی Alay-beyi کے ماتحت ایک بیرق‌دار ہوتا تھا اور مستقل فوج میں سوار فوج کے ہر بولوک کے اور ینی چری فوج کے ہر ''اورتہ'' [دستۂ فوج] کے افسروں میں سے ایک اس کا علمبردار ہوتا تھا عام طور پر بیرق‌دار کہتے تھے، یا پھر ''علم‌بردار'' بھی کہہ دیتے تھے (کیونکہ عربی زبان کا علم ترکی زبان کے بیرق بمعنی ''جھنڈا'' کا مرادف ہے) ۔ سلطان کا اپنا علمبردار ملازمینِ محل میں سے کوئی اعلٰی عہدیدار یا آغایانِ رکاب میں سے ہوتا تھا، لیکن عام طور پر اسے بیرق‌دار نہیں بلکہ میرِ عَلَم (امیر العلم) کہتے تھے ۔ علٰی ھٰذا القیاس بہت سی سابقہ مسلم ترکی حکومتوں میں حکمران اسی طرح سے اپنے ذاتی علم کی دیکھ بھال کسی اعلٰی عہدیدار کے سپرد کر دیتے تھے ۔ یہ عہدیدار یا تو ''بیرق‌دار'' کے نام سے معروف ہوتا تھا یا کسی دوسرے ہم‌معنی لقب، مثلاً ''سنجاق دار'' سے ملقّب ہوتا تھا.

مآخذ : (۱) اُ دٔ - ت، مادۂ بیرق (کوپرولو)؛ (۲) Gibb اور Bowen : *Islamic Society and The West*، جلد ۱، حصّۂ اول، بمدد اشاریہ.

(H. BOWEN)

بَیرَق‌دار مصطفٰی پاشا : رَكَ بہ مصطفٰی پاشا بیرق‌دار.

بیرم خان، (محمد) : خان خاناں (امیر الامراء)، جسے اکبر بادشاہ [رَكَ باں] اپنی نابالغی کے زمانے میں محبت اور عزت کی بنا پر عام طور سے خان بابا یا ''بابا ام'' (باباہم) کہا کرتا تھا ۔ وہ بہارلو قوم کا ترکمان تھا، جو قرا قویونلو کی ایک شاخ تھی، جس نے ملک شاہ سلجوقی [رَكَ باں] کی وفات کے بعد دیارِ بکر میں نمایاں کارنامے انجام دیے ۔ بیرم خان کے آبا و اجداد میں سے ایک شخص علی شکور بیگ کے پاس، جس کے بیٹے ابو سعید مرزا

کی ملازمت میں اور ۸۲۷ھ / ۱۴۲۳ - ۱۴۲۴ء میں اوزون حسن کے ہاتھوں میرزا ابو سعید کی ہزیمت کے بعد اس کے بیٹے محمود میرزا (بابر نامہ، مترجمۂ A. S. Beveridge، ۱ : ۴۹) کی ملازمت میں رہے؛ ہمذان، دینور اور کردستان میں ان کی بڑی بڑی جاگیریں تھیں ۔ جس خاندان سے بیرم خان کا تعلق تھا وہ ہمیشہ بادشاہوں اور شاہزادوں کی ملازمت میں رہا ۔ اس کا دادا پار علی بیگ، جس نے بدخشان میں سکونت اختیار کر لی تھی، بابر کے ہاں ملازم تھا (بابر نامہ، مترجمۂ A. S. Beveridge، ۱ : ۹۱، ۱۸۹) ۔ اس کا باپ سیف علی بیگ (تاریخ فرشتہ، مطبوعہ بمبئی، ص ۲۵۰) کے بیان کے مطابق غزنہ کا گورنر تھا اور بابر کی وفات کے بعد اس نے ہمایوں کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔

بیرم خان بدخشان میں (بعض کے نزدیک غزنہ میں جو زیادہ اغلب ہے) پیدا ہوا ۔ خورد سالی ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ اس کے بعد وہ بلخ چلا گیا ۔ یہیں اس نے تعلیم حاصل کی ۔ اس کی زندگی کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم نہایت صحیح اور مکمل ہوئی تھی ۔ بیرم خان نہایت وسیع المطالعہ اور درباری آداب میں پوری طرح تربیت یافتہ تھا ۔ وہ صرف سولہ سال کی عمر میں ہمایوں کی ملازمت میں داخل ہوا، جسے بابر نے ۹۳۶ھ / ۱۵۲۹ء میں بدخشان کی گورنری پر مامور کر دیا تھا ۔ اتفاق سے اس وقت ہمایوں کابل میں تھا ۔ بیرم خان ہمایوں کے ساتھ ہندوستان چلا آیا اور اس کے ساتھ چوسا (۹۴۶ھ / ۱۵۳۹ء) اور قنوج (۹۴۷ھ / ۱۵۴۰ء) کی تباہ کن لڑائیوں میں شریک ہوا، جن میں ہمایوں کی فوجیں تباہ و برباد ہو گئیں ۔ دشمن کے نہایت شدید تعاقب سے پریشان ہو کر اس نے سنبھل کے ایک زمیندار کے ہاں پناہ لی، جو ہمایوں کا تعلقہ دار تھا ۔ شیر شاہ سوری کے آدمیوں نے اس کی پناہ گاہ کا پتا لگا لیا اور اپنے افغان سردار کو اطلاع کر دی ۔ شیر شاہ نے اس سے کہلا بھیجا کہ یا تو وہ اس کی ملازمت اختیار کر لے ورنہ سنبھل سے چلا جائے ۔ بیرم خان اس کی ملازمت اختیار کرنے پر راضی نہ ہوا اور گجرات کی طرف بھاگ گیا ۔ اس کے ایک رفیق میر ابوالقاسم کی ہوشیاری سے، جو اس وقت گوالیار کا حاکم تھا، وہ گرفتاری اور ذلّت سے محفوظ رہا، لیکن اس سودے میں ابوالقاسم کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے ۔ بیرم گجرات کے بادشاہ سلطان محمود کے دربار میں رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا، جس نے اسے نہ صرف پناہ دی بلکہ اسے ملازم بھی رکھ لیا ۔ لیکن بیرم نے یہاں محض وقت گزاری کی اور حج کو جانے کے لیے اسے سورت جانے کی اجازت مل گئی ۔ اس سہولت سے فائدہ اٹھا کر اس نے راجپوتانہ کا رخ کیا اور راجپوتانہ کے صحرا کو عبور کر کے وہ (۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ء میں) جُون کے مقام پر، جو اب بربادی کی حالت میں ہے، اپنے آقا ہمایوں سے جا ملا ۔ ہمایوں اس وقت اپنے کھوئے ہوئے تخت کو دوبارہ حاصل کرنے کی جان توڑ کوششوں میں لگا ہوا تھا ۔ جب ہمایوں ۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ء میں اپنے بھائی مرزا عسکری سے مدد حاصل کرنے کے لیے قندھار گیا تو بیرم اس کے ساتھ تھا اور اس نے تردی بیگ کا وہ وحشیانہ اور سفیہانہ سلوک اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جو اس نے اس بے تخت و تاج بادشاہ کے ساتھ اس وقت کیا تھا جب اس نے اپنی ملکہ حمیدہ بانو بیگم کی سواری کے لیے، جو شیرخوار اکبر کی ماں تھی، اس نامہربان شہر سے فرار ہونے کے لیے گھوڑا مانگا تھا۔

ایران کے شاہ طہماسپ نے، جس کی مالی، مادی اور فوجی مدد ہمایوں نے اپنا کھویا ہوا تاج و تخت واپس لینے کے لیے طلب کی تھی، جب بیرم کے حسب

سب اور خاندانی روابط سے متأثر ہو کر اسے اپنی ملازمت کی پیش کش کی تو بیرم نے اسے قبول نہیں کیا اور یوں اپنے بدنصیب آقا کے ساتھ اپنی غیر متزلزل وفاداری کا ثبوت دیا۔ ہندوستانی مہموں کے دوران میں بیرم خان نے شاہی افواج کے سالار اعظم کی حیثیت سے ہمایوں کے لیے بہت سی فتوحات حاصل کیں (۹۹۱ھ / ۱۵۴۳ ، ۱۵۵۵ء)، لیکن ان مسلسل فتوحات میں سب سے بڑی وہ فتح تھی جو (۹۶۲ھ / ۱۵۵۵ء) میں سرھند کے قریب ماچھی واڑے کے مقام پر سکندر شاہ سوری کو شکست فاش دے کر حاصل کی۔ اس وقت کے مروجہ دستور کے خلاف بیرم خان نے حکم دیا کہ شکست خوردہ افغانوں کے بیوی بچوں کو نہ تو کسی قسم کی ایذا پہنچائی جائے اور نہ انھیں غلام بنایا جائے، اس لیے کہ یہ دونوں باتیں اسلامی شعار کے خلاف تھیں۔ اس فتح نے ہمایوں کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا اور اسے تخت و تاج کے واپس ملنے کا یقین ہو گیا۔ اور یہ بات بہت بڑی حد تک بیرم خان کی وفا شعاری اور خلوص کا نتیجہ تھا جسے بظاہر اس کی ان قابل ستایش خدمات کے صلے میں ۹۶۲ھ / ۱۵۵۴ - ۱۵۵۵ء میں شاہزادۂ اکبر کا، جو اس وقت صرف تیرہ سال کا تھا، اتالیق مقرر کر دیا گیا اور اسے سرکاری طور پر خان بابا کا خطاب مرحمت ہوا۔ اس کے بعد بیرم خان شاہزادۂ اکبر کے ساتھ پنجاب چلا گیا، جسے وہاں کا گورنر مقرر کر دیا گیا تھا۔ جب ہمایوں کی ناگہانی موت (۱۵۵۶ء) کی اطلاع پنجاب پہنچی تو بیرم خان کلانور (ضلع گورداسپور، بھارت) میں سکندر شاہ سوری کی ہزیمت خوردہ فوج کے بقیۃ السیف کے خلاف مہموں میں مصروف تھا۔ اس نے بہر صورت حال کو سنبھالا اور بلا تاخیر اکبر کی شہنشاہی کا اعلان کر دیا۔ اس نے اینٹوں کا عارضی تخت بنا کر اس کی تاجپوشی کر دی۔ یہ تخت اب بھی کلانور میں موجود ہے۔ اس کے کچھ ہی مدت بعد ہیمو نے، جو دراصل الور کے متصل واقع ریواڑی کا ایک بقال تھا اور جو سوری کی فوجوں کا سپہ سالار تھا، دہلی پر حملہ کر دیا۔ تردی بیگ، جو وہاں کا مغل گورنر تھا، بغیر کسی مزاحمت کے وہاں سے نکل بھاگا۔ بیرم خان نے، جو اب پوری طرح صاحب اقتدار تھا، تردی بیگ کے قتل کا فرمان جاری کر دیا۔ اس حکم کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو، لیکن غالباً اس کی غرض یہ تھی کہ جو توہین اس نے ہمایوں کی اس مصیبت کے وقت کی تھی جب وہ قندھار سے بھاگ رہا تھا اس کا انتقام لیا جائے۔ فرشتہ اس قتل کو سیاسی بنا پر حق بجانب قرار دیتا ہے۔ ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء میں جب پانی پت کے میدان پر ہیمو کی فوجوں کی شاہی افواج کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی تو بیرم خان کو نمایاں فتح حاصل ہوئی۔ اس نے بادشاہ کی خاموش رضامندی پا کر زخمی سپہ سالار کو قتل کر دیا۔ بیرم خان نے شکست خوردہ دشمن کے ساتھ جو سنگدلانہ سلوک کیا اسے اعتراض کی نظر سے دیکھا گیا ہے، لیکن اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس وقت ایسی تمام حکومتوں میں قتل ایک عام مروجہ دستور تھا، بالخصوص باغیوں، تاج و تخت کے حریفوں اور سلطنت کے دشمنوں کے معاملے میں؛ علاوہ بریں بیرم خان سے ایک ایسے نیچ ذات نو دولتیے کے لیے جس کے سر میں بادشاہ بننے کا سودا سمایا ہوا تھا اور جس نے خود بادشاہ کے مقابل کھڑے ہونے کی جسارت کی تھی کسی طرح کے رحم کی توقع بیکار ہے۔ ہیمو کی شکست اور افغان فوجوں کے انتشار اور خاتمے کے بعد ہندوستان کا تاج پکے ہوئے سیب کی طرح اکبر کی گود میں آ گرا۔ بیرم خان اس وقت اقتدار و اختیار کے انتہائی عروج پر تھا اور

وہ کم‌سن اکبر کی طرف سے پوری سلطنت پر حکومت کر رہا تھا؛ لیکن اکبر کی طرف سے اپنے اتالیق کی جانب ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا شروع ہو گیا تھا، اس لیے کہ بیرم اکبر کی تفریحات میں مخلّ ہوتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ شاہانہ انداز اختیار کرے۔ ۹۶۵ھ / ۱۵۵۷ء میں سلیمہ سلطان بیگم سے بیرم کی شادی ہو گئی، جو ہمایوں کی بہن گل رخ کی بیٹی اور اکبر کی پھوپھی‌زاد بہن تھی اور یوں وہ گویا شاہی خاندان کا ایک باقاعدہ فرد بن گیا، جس سے اس کی شخصی عظمت اور اقتدار میں اور بھی اضافہ ہوا۔ یہ شادی نہایت شان و شوکت سے جالندھر [رک بآں] میں اس وقت ہوئی جب بیرم خان مان کوٹ (اب رام کوٹ جو جمّوں میں واقع ہے) سے واپس آ رہا تھا۔ مان کوٹ وہی مقام ہے جہاں بیرم اسی سال کے شروع میں اکبر کے ساتھ مشترکہ قیادت میں طویل محاصرے کے بعد سکندر سوری کو شکست دے چکا تھا۔ سلیمہ کے ساتھ شادی سے پہلے، جو خالص سیاسی نوعیت کی شادی تھی، وہ ایک میواتی سردار جمال خان کی بیٹی سے بھی شادی کر چکا تھا، جس سے اس کے ہاں اس کی موت سے صرف چار سال قبل مرزا عبدالرحیم خان خانان [رک بآں] پیدا ہوا۔ میوات کا علاقہ، جو تردی بیگ کو تفویض تھا، بیرم خان پہلے ہی اپنے ایک معتمد خادم ملّا پیر محمد شروانی کو عطا کر چکا تھا۔

اس دوران میں بیرم خان سے ایک سیاسی غلطی ہوئی اور وہ یہ کہ اس نے دہلی کے رہنے والے ایک شخص شیخ گدائی کمبوہ کو ۹۶۶ھ / ۱۵۵۸-۱۵۵۹ء میں صدرالصّدور مقرر کر دیا۔ یہ بات لوگوں کے لیے اور تورانی سرداروں کے لیے سخت ناراضی کا سبب بنی؛ اور البداؤنی (انگریزی ترجمہ، ۲ : ۲۲ تا ۲۴) نے اس واقعے کو محور بنا کر بیرم خان کے خلاف سخت طنز آمیز اور زہر آلود باتیں لکھی ہیں۔ علاوہ بریں بیرم خان کے بعض اور ایسے ناعاقبت اندیشانہ افعال تھے، مثلاً تردی بیگ کا قتل، بادشاہ کے جیب خرچ کے مقرر کرنے میں کوتاہی اور بے توجہی جس کی ضروریات عمر کے ساتھ تیزی سے بڑھ رہی تھیں، شاہی خاندان کے لوگوں کے لیے بہت معمولی وظیفے مقرر کرنا، اور اپنی خدمات کا مبالغہ آمیز اندازہ اور احساس اور حد درجہ متکبّرانہ طرز عمل، ان سب باتوں نے اس کی طرف سے اکبر کے خیالات اور رویّے میں تبدیلی پیدا کر دی اور وہ بیرم کی اتالیقی اور ولایت کی قید و بند سے آزاد ہونے کا موقع تلاش کرنے لگا۔ اکبر کی انّا (ماہم انگہ) بھی، جو محلِ شاہی کے خدّام کے ایک چھوٹے سے مگر با اثر گروہ کی سرغنہ تھی، خفیہ طور پر بیرم کی تباہی کی کوشش میں مصروف تھی اور اکبر اور بیرم کے باہمی تعلقات میں کشیدگی پیدا کرنے کا بڑا سبب بنی۔ بیرم نے، یہ محسوس کر کے کہ حالات کا رخ اس کے خلاف ہے اس قضیے کو لڑائی کے زور سے ختم کرنا چاہا اور اپنے گھر والوں کو بھٹنڈے کے قلعے میں چھوڑ کر مکّۂ معظمہ جانے کے بہانے جالندھر آ گیا۔ اس کی نیّت جالندھر پر قبضہ کرنے کی تھی۔ اس کی اور شاہی فوجوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی اور شاہی فوجوں نے اسے شکست دی اور اس سے اس کے منصب کا نشان چھین لیا۔ اپنے منصب اور خان خانان کے خطاب سے محرومی کے بعد اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ بادشاہ سے معافی مانگ لے۔ اکبر نے اسے معاف کر دیا۔ بیرم کا منصب اور خطاب اب منعم خان کو عطا ہوا؛ لیکن انتقام کے بجائے ایک افغان دشمن مبارک خان لوحانی نے، جس کا باپ ماچھی‌واڑے کی لڑائی (۹۶۲ھ / ۱۵۵۵ء) میں مارا گیا تھا، دھوکے سے اسے قتل کر دیا۔ بیرم ۱۴ جمادی الاولی ۹۶۸ھ /

۳۱ جنوری ۱۵٦۱ء کو قتل ہوا۔ اس وقت وہ پٹن (انہلواڑہ) کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ اس کا خیمہ لوٹ لیا گیا اور اس کے اہل و عیال، جس میں اس کا چار سالہ بچہ مرزا عبدالرحیم خان بھی تھا، بالکل خالی ہاتھ احمد آباد پہنچے۔ پٹن کے فوجی سالار موسٰی خان پولادی نے، جس نے بیرم خان کا استقبال بڑی شان کے ساتھ کیا تھا مرنے والے بہادر کی، جو کبھی بےحد دولتمند تھا، تجہیز و تکفین بھی اچھی طرح نہیں کی۔ چند غریب و خدا ترس لوگوں نے سابق خان خانان کی تجہیز و تکفین کر دی اور اس کی وصیت کے مطابق اس کی لاش ۹۷۱ھ / ۱۵٦۳-۱۵٦۴ء میں دہلی سے، جہاں اسے عارضی طور پر سپردِ خاک کر دیا گیا تھا، مشہد منتقل کر دی گئی اور اب وہ امام موسٰی رضاؑ کے روضے کے متصل ایک اونچے گنبد کے مقبرے میں مدفون ہے۔

بیرم خان ایک بلندپایہ عالم و فاضل، ترکی اور فارسی زبانوں کا اچھا شاعر، فنونِ لطیفہ کا قدرشناس اور آزاد خیال تھا۔ وہ فی الحقیقت ایک بڑا آدمی تھا۔ وہ عالموں، فاضلوں، حتّٰی کہ شاعروں، مصوروں، مغنیوں، موسیقاروں اور اہلِ صنعت و حرفت کا بڑا قدردان اور سرپرست تھا۔ البداؤنی جیسے نکتہ چین نقاد نے بھی اس کی ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کی جی کھول کر تعریف کی ہے۔ اس کا دیوان ۱۹۱۰ء میں کلکتے سے طبع ہوا۔

اکبر نے جو اپنے باپ کی طرح خود اپنے تاج و تخت کے لیے بھی بیرم خان کا مرہونِ منت تھا اپنی ناسپاسی کی تلافی اس طرح کی کہ اول تو بیرم خان کے یتیم بچے مرزا عبدالرحیم کی پرورش کی (جسے بعد میں خان خانان کا خطاب ملا اور جو تاریخ میں اپنے باپ سے زیادہ معروف و مشہور ہے) اور دوسرے بیرم کی بیوہ سلیمہ سلطان بیگم سے شادی کر لی . . . .

مآخذ: شیخ فرید بھکری: ذخیرۃ الخوانین (مخطوطہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، عدد ۱)؛ (۲) صمصام الدولہ شاہ نواز خان: مآثر الامراء (Bib. Ind.)، ۱: ۳۷۱ تا ۳۸۳ (یہ حالات بیشتر ذخیرۃ الخوانین پر مبنی ہیں)؛ (۳) عبدالباقی نہاوندی: مآثر رحیمی (Bib. Ind.)، بمدد اشاریہ؛ (۴) نور اللہ شُشتری: مجالس المؤمنین، تہران ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۲ء، ۳۲۱ تا ۳۲۲ (اس نے بیرم خان کا سلسلۂ نسب تعمّدًا غلط دیا ہے)؛ (۵) محسن الدین الحسینی العاملی: اعیان الشیعۃ، دمشق ۱۹۳۹ء، ۱۳: ۲۲۲؛ (٦) عبدالحیّ: نزہۃ الخواطر، حیدر آباد ۱۳۳۷ھ / ۱۹۰۳ء، ۳: ٦۳ تا ٦٦؛ (۷) Camb. Hist. of India، ج ۴، بمدد اشاریہ؛ (۸) علی شیر قانع: مقالات الشعراء (طبع حسام الدین راشدی)، کراچی ۱۹۵۷ء، ص ۹۸ تا ۱۰۲، نیز بمدد اشاریہ؛ (۹) البداؤنی: منتخب التواریخ (ترجمہ Lowe)، ج ۲ بمدد اشاریہ و ج ۳: ۲٦۵، نیز بمدد اشاریہ؛ (۱۰) محمد حسین آزاد: دربارِ اکبری (بزبان اردو)، لاہور ۱۸۹۸ء، بذیل مادّہ؛ (۱۱) V. A. Smith: *Akbar the Great Mogul*، آکسفرڈ ۱۹۱۹ء، بمدد اشاریہ؛ (۱۲) محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ: گلشن ابراہیمی (تاریخ فرشتہ)، بمبئی ۱۸۳۱ء، ص ۲۰۰؛ (۱۳) ابوالفضل: آئین اکبری، ج ۱ (مترجمۂ Blochmann)، کلکتہ ۱۸۷۳ء، ص ۳۱۵ تا ۳۱۷؛ (۱۴) تذکرۃ الواقعات (اردو ترجمۂ معین الحق)، کراچی ۱۹۵٦ء، بمدد اشاریہ، (عہدِ ہمایوں میں بیرم خان کی سرگرمیوں اور اس کی صحرانوردیوں پر بیش قیمت معلومات کا ذخیرہ)؛ (۱۵) امین احمد رازی: ہفت اقلیم، (۱٦) قدرت اللہ گوپاموی: نتائج الافکار، بمبئی ۱۳۳۳ھ ش، ص ۱۰۲ تا ۱۰۳؛ (۱۷) آزاد بلگرامی: خزانۂ عامرہ، کانپور ۱۹۰۰ء، ص ۳۵۸ تا ۳۵۹؛ (۱۸) علی کوثر چاند پوری: محمد بیرم خان ترکمان، آگرہ ۱۹۳۱ء؛ [(۱۹) علی قلی والہ: تذکرہ ریاض الشعراء، مخطوطہ کتاب خانۂ دانش گاہ پنجاب].

(بزمی انصاری)

• **بیرم علی** : ماوراے خزر ریلوے پر مرو سے تقریباً ۴۷ میٹر (۷۵ کیلومیٹر) مشرق میں ایک مقام، جہاں فارسی زبان بولنے والے آباد ہیں اور جو اب اشتراکی جمہوریۂ ترکمانستان کے ضلع مرو میں واقع ہے۔ یہ قدیم مرو کے اس نخلستان کے بالکل قریب ہے جو دریاے مرغاب [رک بآں] کے باعث وجود میں آیا تھا اور اٹھارھویں صدی عیسوی تک موجود رہا۔ اس کے کھنڈر تقریباً پچاس مربع کیلومیٹر کے رقبے میں پھیلے ہوے ہیں۔ انیسویں صدی میں یہ علاقہ شہنشاہ کی ذاتی املاک کا ایک حصّہ بن گیا تھا اور ۱۹۱۷ء تک اسی حیثیت میں رہا۔ ان دنوں بیرم علی میں ایک زرعی تحقیقاتی مرکز اور ایک زرعی فنی سکول قائم ہے۔ یہاں انگور کے اور دوسرے میوہ دار درختوں کے باغ ہیں، نیز ریشم کے کیڑے اور قراقلی بھیڑیں پالی جاتی ہیں.

مآخذ : (۱) Brockhous-Yefron : Enciklopedi-českiy Slovar'، ۱۸۹۱ء، ۳ (دوم الف) : ۷۲۲؛ (۲) Bolshaya Sovetskaya Enciklopediya، بار دوم، ۴ (۱۹۵۰ء) : ۵۴.

(B. SPULER)

• **بیرم علی خان** : شاہزادۂ مرو، ۱۱۹۷ھ/ ۱۷۸۳ء تا ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۶ء؛ خاندان قاچار کی فرمانروا شاخ کا ایک رکن، جس نے عباس اول [رک بآں] کے زمانے سے وہاں حکومت کی۔ اپنے زمانے میں وہ ایک بہادر جنگجو سپاہی کی حیثیت سے مشہور تھا۔ مراد بی (شاہ معصوم) بخاری کے خلاف لڑائی کے دوران میں دشمنوں نے گھات لگا کر اسے قتل کر دیا۔ مرو میں اس کا منجھلا لڑکا محمد کریم اس کا جانشین ہوا۔ اس کے بڑے لڑکے محمد حسین نے اپنی زندگی مشہد میں علوم و معارف کے لیے وقف کر دی اور اسے اپنے زمانے کا افلاطون سمجھا جاتا تھا.

مآخذ : (۱) میر (سید) عبدالکریم بخاری : Histoire de l'Asie Centrale، طبع Schefer، ج ۱ (متن)، پیرس ۱۸۷۶ء : ص ۷۰ و ۲ (ترجمہ) : ۱۵۷ ببعد؛ (۲) V. Žukovskiy : Razvalini Starago Merva (The Ruins of Old Marw)، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۴ء، ص ۸۳ ببعد.

(B. SPULER و W. BARTHOLD)

بَیْرُوت : (جسے آج کل Beirut یا Beyrouth لکھا جاتا ہے) جمہوریۂ لبنان کا صدر مقام ہے۔ اس کا عرض بلد ۳۳ درجے ۵۴ دقیقے شمالی اور طول بلد ۳۵ درجے، ۲۸ دقیقے شرقی ہے۔ شروع شروع میں یہ ایک راس کے شمالی رخ پر آباد ہوا، مگر اب یہ اس کی پوری سطح پر پھیل چکا ہے۔ لفظ بیروت کے اشتقاق کے متعلق عرصے سے اختلاف چلا آتا ہے۔ بہر حال اس میں شبہہ نہیں کہ اس کا مأخذ عبرانی لفظ بئیروت (be'erot) ہے، جو [عربی لفظا] "بئر" (= کنواں) کی جمع ہے۔ رومیوں کے عہد تک کنویں مقامی طور پر پانی کی بہم رسانی کا واحد ذریعہ تھے۔ انسانی مسکن کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس قطعۂ زمین پر زمانۂ قبل از تاریخ میں بھی لوگ آباد تھے، کیونکہ یہاں سے اشولین (Acheulian) اور لیوالوزین (Levalloisian) دَور کے آثار بھی ملے ہیں۔ تلّ العَمارنہ میں چودھویں صدی قبل مسیح کی جو تختیاں دستیاب ہوئی ہیں ان میں اس کا نام "بروتہ" کی صورت میں ساحل فینیقیہ کی ایک بندرگاہ کے طور پر آتا ہے۔ اس زمانے میں یہاں ایک معمولی سی آبادی تھی، جس کی رونق ایک عرصے سے جُبَیل (Byblos) کے مقابلے میں ماند پڑ چکی تھی۔ بارہ صدیوں کے دوران میں، جس کی تاریخ مبہم ہے، بروتہ مصر یا عراق سے آنے والی فوجوں کی گزرگاہ بنا رہا۔ تیرھویں صدی قبل مسیح میں رامیسس Ramses دوم اس راستے سے آیا اور ساتویں صدی قبل مسیح میں اسور کے بادشاہ اسارحدون

Asarhaddon کا بڑی بہجت سے گزر ہوا تھا۔

۲۰۰ء کے قریب انطیوخوس Antiochus سوم الاعظم نے بطلموس (Ptolemy) پنجم پر فتح پائی اور بیروت کو سلوقی (Seleucid) سلطنت اور شام کی ولایت میں شامل کر لیا گیا۔ ۱۴۰ ق م کے قریب یہ شہر، جو کچھ عرصے لاذقیۂ کنعان (Laodicea of Canaan) کے نام سے بھی موسوم ہوا، سوریہ کے غاصب تریفون Tryphon کے ہاتھوں تباہ ہو گیا؛ مگر اس تباہی کے باوجود دیلوس Delos رومیوں اور اطالویوں کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم ہونے کی وجہ سے اس بندرگاہ کو خاصی ترقی ہوئی اور مشرق و مغرب کے درمیان ایک رابطے کی حیثیت سے بیروت کی اہمیت اجاگر ہو گئی۔

رومی شہنشاہ آگسٹس Augustus کے نام پر جب مارکس اگرپا Marcus Agrippa شہر بیروت پر قابض ہوا تو یہ شہر دوبارہ تعمیر ہوا۔ بڑی عمارتوں سے اس نے زینت پائی اور آزمودہ کار رومی سپاہی یہاں آباد کیے گئے۔ ۱۴ قبل مسیح میں اسے بیریتوس کے نام سے ایک رومی نوآبادی (Colonia Julia Augusta Felix Berytus) کا درجہ دیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں بیریتوس Berytus رومی حکومت کا ایک بڑا انتظامی مرکز بن گیا (چنانچہ ہیروڈ اعظم اور اس کے جانشین یہیں رہتے تھے)۔ اس کے علاوہ اسے تجارت اور مبادلے کے اعتبار سے ایک اہم منڈی اور علم کے لحاظ سے ایک بارونق علمی مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ تیسری صدی عیسوی میں خاص طور سے یہاں کی جامعۂ قانون کی شہرت چاردانگ عالم میں پھیل گئی اور علم و دانش کے اعتبار سے یہ شہر ایتھنز، اسکندریہ اور قیساریہ Caesarea کا ہم پایہ سمجھا جانے لگا۔ یہاں کی آبادی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور بالآخر پانی کی بہم رسانی کے لیے ماگوراس Magoras کی وادی (نہر بیروت) میں ایک نہر (قناطر زبیدہ) کی تعمیر ضروری سمجھی گئی۔

چوتھی صدی کے آخر میں بیروت (یا بیریتوس) کا شمار فینیقیہ کے اہم ترین شہروں میں ہوتا تھا اور یہ اسقف کا صدر مقام بھی بن گیا۔ جولائی ۵۵۱ء میں ایک شدید زلزلے کے ساتھ ایک سیلاب بھی آیا، جس نے بیروت کو تباہ کر دیا۔ جسٹینین Justinian نے اس کے کھنڈروں پر نئے سرے سے عمارتیں بنوائیں، لیکن اسے پہلی سی شان و شوکت حاصل نہ ہو سکی، چنانچہ جب ۱۴ھ / ۶۳۵ء میں حضرت ابوعبیدہؓ [ابن الجراح] کی فوجیں اس شہر میں، جو بلاد مشرق میں رومی تہذیب و تمدن کا بہترین نمونہ تھا، داخل ہوئیں تو اس کے ارد گرد کوئی فصیل نہ تھی۔

مسلمانوں کے عہد حکومت میں بیروت کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اموی خلیفہ امیر معاویہؓ نے ایران سے آبادکاروں کو بلایا اور انہیں بیروت اور اس کے گرد و نواح میں بسا کر اس علاقے کو دوبارہ آباد کیا۔ ریشم سازی کی صنعت پھر سے ترقی کرنے لگی اور تجارتی روابط ایک بار پھر پہلے اندرون ملک (دمشق) اور بعد ازاں مصر سے قائم ہوئے۔ اسلامی عہد کی پہلی چند صدیوں میں بیروت کو ایک رباط سمجھا جاتا تھا، چنانچہ شام کے امام الاوزاعی نے یہاں ۱۵۷ھ / ۷۷۳ - ۷۷۴ء میں سکونت اختیار کی۔ ۳۶۴ھ/۹۷۵ء میں جان زمسکز John Tzimisces نے بیروت کو فتح کر لیا، لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد اسے فاطمیوں نے بوزنطیوں سے واپس لے لیا۔ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری / دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی کے تمام عرب جغرافیہ دان لکھتے ہیں کہ شہر بیروت کے ارد گرد فصیل تھی اور یہ دمشق کے صوبے (جُند) کا ایک حصہ تھا۔

صلیبی جنگوں نے بیروت کے لیے تازہ پریشانیاں

پیدا کر دی۔ ۴۹۳ھ / ۱۰۹۹ء میں شمالی سمت سے ساحل کے راستے آنے والے صلیبی محاربین نے محض اتنا کیا کہ بیروت میں ٹھہر کر رسد فراہم کی اور بیت المقدس کی فتح کے بعد وہ یہاں واپس چلے آئے۔ ۵۰۳ھ / ۱۱۰۹-۱۱۱۰ء میں بالڈون اول اور برٹرینڈ آو سینٹ گلز Bertrand of St. Gilles نے خشکی اور سمندر دونوں جانب سے بیروت کی ناکہ بندی کی۔ ایک مصری بیڑے نے محصورین کو رسد مہیا کرنے کا اہتمام کیا، لیکن پیزا Pisa اور جنوآ Genoa کے جہازوں کی کمک پہنچنے کی وجہ سے وہ شہر پر حملہ کرنے کے قابل ہو گئے، چنانچہ انہوں نے ۲۱ شوال ۵۰۳ھ / ۱۳ مئی ۱۱۱۰ء کو اسے فتح کر لیا۔ ۱۱۱۲ء میں یہاں پہلے لاطینی اسقف بالڈون، باشندۂ بولون Boulogne، کی نامزدگی عمل میں آئی اور اس نے بیت المقدس کے بطریق کو سبکدوش کر دیا، کیونکہ بیروت گیارھویں صدی کی یونانی کلیسائی تنظیم کے دوران میں انطاکیہ کے ماتحت تھا۔ یہاں اسبتاریہ (Hospitallers) نام راہبوں کی مجلس نے سینٹ یوحنّا اصطباغی (St. John the Baptist) کا گرجا تعمیر کرایا جو بالآخر مسجد العُمَری کی صورت میں تبدیل ہوا۔ ربیع الآخر ۵۷۸ھ / اگست ۱۱۸۲ء میں صلاح الدین ایوبی نے منصوبہ بنایا کہ بیروت کو دوبارہ فتح کر کے طرابلس کے علاقے کو بیت المقدس کی سلطنت سے جدا کر دیا جائے۔ پہلی مرتبہ تو اسے کامیابی نہ ہوئی، لیکن دوسری مرتبہ جمادی الآخرہ ۵۸۳ھ / اگست ۱۱۸۷ء میں اس نے بیروت فتح کر لیا۔ ذوالقعدہ ۵۹۳ھ / ستمبر ۱۱۹۷ء میں لوسیگن کے امالرک Amalric of Lusigan نے اسے فتح کیا اور سلطان صلاح الدین کی فوجیں وہاں سے پسپا ہو گئیں۔ آئبیلنز Ibelins نے بیروت کو مستحکم کیا اور مشرق کے تمام لاطینی ممالک میں اس کی شان و شوکت کو دوبارہ زندہ کیا۔ ۱۲۳۱ء میں شہنشاہ فریڈرک دوم کی طرف سے رکاردو فلنگاری Ricardo Filanghiari شہر بیروت پر قابض ہو گیا، لیکن بیروت کے قلعے تک اس کی رسائی نہ ہو سکی۔

قاہرہ میں مملوک حکمران تخت نشین ہوئے تو تھوڑے ہی عرصے میں بیروت کے امرا اس بات پر مجبور ہو گئے کہ دوسرے فرنگی (Franks) حکمرانوں کے مقابلے میں اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی خاطر ان سے عہد و پیمان کریں۔ ۶۶۷ھ / ۱۲۶۸-۱۲۶۹ء میں بیبرس نے امن کی ضمانت دی۔ ۶۸۳ھ / ۱۲۸۰ء میں سلطان قلاؤن نے ان سے معاہدۂ صلح کیا، جس سے انہیں تجارتی سرگرمیاں دوبارہ جاری کرنے کی اجازت مل گئی۔ بالآخر ۲۳ رجب ۶۹۰ھ / جولائی ۱۲۹۱ء کو امیر سنجر [= سنقر] ابو شُجاعی دمشق سے آیا اور الملک الاشرف خلیل کی طرف سے بیروت پر قابض ہو گیا۔

مملوک حکمرانوں کے عہد میں بیروت صوبۂ (جُند) دمشق کی ایک اہم ولایت تھی، اور ایک امیرِ طبل خانہ یہاں کا حاکم ہوتا تھا۔ قرونِ وسطٰی میں بیروت پر قبضہ کرنا بڑی اہم بات سمجھی جاتی تھی کیونکہ یہاں جنگی اہمیت کی دو کمیاب چیزیں لکڑی اور لوہا پایا جاتا تھا۔ لکڑی شہر کے جنوب میں صنوبر کے جنگلات سے حاصل ہوتی تھی اور لوہا قریبی کانوں سے نکلتا تھا۔

آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں بیروت کی بندرگاہ باشندگانِ جنوآ (Genoese) اور کتلانیوں (Catalans) کی باہمی رقابت کا نشانہ بنی۔ اس سے تجارت کو ضعف پہنچا۔ مملوک شہزادوں نے بیروت کا دفاع مضبوط کیا، چنانچہ امیر تُنکز (۷۴۴ھ / ۱۳۴۳ء) اور [سلطان] برقوق (۷۸۴ھ / ۱۳۸۲ء تا ۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء) دونوں نے

یہاں ایک ایک برج تعمیر کرایا۔ نویں صدی ہجری/ پندرھویں صدی عیسوی میں بیروت پہلے کی طرح مغربی تاجروں کی منڈی بن گیا۔ یہ تاجر ریشم کی تلاش میں آیا کرتے تھے۔ یہاں سے پھل اور برف قاہرہ کے دربار میں بھیجی جاتی تھی۔

فخرالدین (۱۵۹۵ تا ۱۶۳۴ء) کا عہد حکومت بیروت کے لیے درخشاں ثابت ہوا اور اس کے وینس Venice کے ساتھ دوبارہ روابط قائم ہو گئے۔ یہاں سے سنگتروں کی بہ نسبت ریشم زیادہ مقدار میں برآمد کیا جاتا تھا۔ چاول اور سوتی کپڑا یہاں مصر سے آتا تھا۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط میں طرابلس کے بعد سب سے زیادہ آباد بندرگاہ بیروت تھی۔ آبادی کے لحاظ سے مرکزی حیثیت مارونیوں (Maronites) کی تھی، جنوبی دروزی امرا کی حمایت حاصل تھی۔ روسیوں اور ترکوں کی جنگ میں بیروت کو جوابی حملوں کا نشانہ بننا پڑا۔ اس پر کئی بار بمباری ہوئی اور آخر کار اکتوبر ۱۷۷۳ء میں اسے روسیوں نے فتح کر لیا اور فروری ۱۷۷۴ء تک انہی کے قبضے میں رہا۔ ۱۸۲۱ء کے بعد [امیر] بشیر دوم (اعظم) نے (۱۷۸۸ تا ۱۸۵۰ء) نہایت عمدگی سے نظم و نسق قائم کیا تھا، لیکن ابراہیم پاشا کی مہموں میں اہل آسٹریا، انگریزوں اور ترکوں کے بحری بیڑوں نے متحدہ طور پر بیروت پر بمباری کی، جس سے یہاں کی تجارت تباہ ہو گئی۔ ۱۸۶۰ء میں یہاں ایک نیا دور شروع ہوا۔ شام [کے سیاسی حالات سے تنگ آ کر] عیسائی بہت بڑی تعداد میں ہجرت کر کے بیروت آ گئے اور بیس ہزار کی آبادی کے اس مختصر سے شہر پر مسیحیت کے نہایت گہرے نقوش ثبت ہو گئے۔ بیروت کی ترقی کا دور، جو ایک صدی قبل شروع ہوا تھا، اب تک جاری ہے۔ اس شہر میں پچھلے کئی سال سے اس تیزی سے ترقی ہوئی کہ رومی عہد کی شان و شوکت پر بھی سبقت لے گئی۔ فرانسیسی انتداب (۱۹۲۰ - ۱۹۴۳ء) کے دوران میں جب بیروت فرانس کے ہائی کمشنر برائے ریاست ہائے لیوانٹ Levant کی قیام گاہ بنا تو اسے ایک خود مختار ریاست کے دارالحکومت، پارلیمان کے مقام اجلاس اور ملک کے اداری صدر مقام کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ یہاں کی آبادی مختلف قوموں پر مشتمل ہے۔ ان میں عربوں کی اکثریت ہے۔ یہاں کی کل آبادی دو لاکھ (۱۹۵۸ء) ہے اور اتنی ہی تعداد آس پاس کے علاقوں سے روزانہ آنے والے دیہاتیوں، مزدوروں اور تاجروں کی ہے۔

بیروت میں تین یونیورسٹیاں قائم ہیں: امریکی، فرانسیسی اور لبنانی۔ ہر قوم کے اپنے متعدد علمی ادارے ہیں۔ یہاں ایک ملی کتاب خانہ بھی ہے۔ یہ شہر اب مشرق وسطی کے عرب ممالک میں ایک بڑا علمی اور فکری مرکز سمجھا جاتا ہے۔ تجارت اور مبادلے کے لحاظ سے بھی اسے مرکزیت حاصل ہے۔ چونکہ یہاں کی بندرگاہ میں لگاتار توسیع ہو رہی ہے اور ریلوے کے ذریعے یہ بندرگاہ شام اور اردن سے ملی ہوئی ہے، لہذا تجارتی میدان میں حیفا اور حال ہی میں شام کی بندرگاہ لاذقیہ (Lattakia) کے مقابلے کے باوجود ۱۹۵۰ء میں پچیس لاکھ ٹن مال و اسباب کی تجارت ہوئی۔ اسی بھاری تجارت کی بدولت مزاید وجود میں آیا اور بڑے بڑے بین الاقوامی بنکوں کی شاخیں کھلیں۔ ایک بین الاقوامی درجے کا ہوائی مستقر ہونے کی وجہ سے اس کا تعلق ساری دنیا سے قائم ہے۔ اب یہ تجارتی منڈی بن گیا ہے۔ بیروت اپنے قدرتی محل وقوع کی بدولت مشرق اور مغرب کے درمیان ایک رابطے کا کام دیتا ہے۔

مآخذ: (۱) الادریسی، طبع Joubert، ۱: ۳۵۵؛

(۲) یاقوت، ۱ : ۷۸۵؛ (۳) صالح بن یحیٰی: تاریخ بیروت، ۱۹۲۷ء؛ (۴) لوئس شیخو: بیروت، تاریخہا و آثارہا، ۱۹۲۵ء؛ (۵) ابن القلانسی (طبع Le Tourneau)، ص ۹۳ تا ۹۵؛ (۶) C. Enlart: *Les monuments des Croisés*، ۲ : ۶۸ تا ۸۲؛ (۷) G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*، ۱۸۹۰ء، ص ۴۰۸ تا ۴۱۰؛ (۸) Du Mesnil du Buisson: *Les Anciennes défenses de Beyrouth*، Syria، ۲ (۱۹۲۱ء): ۲۳۸ تا ۲۵۷، ۳۱۷ تا ۳۲۷؛ (۹) P. Collinet: *Hist. de l'École de Droit de Beyrouth*، ۱۹۲۵ء، باب ۱؛ (۱۰) R. Dussaud: *Topographie Historique de la Syrie*، ۱۹۲۷ء، ص ۵۸ تا ۶۰؛ (۱۱) R. Grousset: *Histoire des Croisades*، ۱۹۳۴ - ۱۹۳۶ء، ۱ : ۲۵۳ تا ۲۵۶ و ۲ : ۱۰۷ تا ۱۱۳ و ۳ : ۱۵۵ تا ۱۶۰؛ (۱۲) J. Lauffray و R. Mouterde: *Beyrouth Ville romaine*، ۱۹۵۲ء؛ (۱۳) Dresch و Birot: *La Méditerranée et le Moyen Orient*، ۲ (۱۹۵۵ء): ۴۱۵۔

(N. ELISSÉEFF)

• **بیروں**: (فارسی، بمعنی باہر) عثمانی شاہی محل کے بیرونی محکموں اور شعبوں کا نام؛ اس کے مقابلے میں داخلی محکموں کا نام ''اندرون'' [رک بآں] تھا۔ اس طرح بیروں دربارِ شاہی اور حکومت کے عمّال کا مقام اتصال تھا اور اس میں محل کے عہدیداروں کے علاوہ اعلٰی حکّام و عمائد بھی شامل ہوتے تھے، جو سلطنت کے انتظامی، عسکری اور مذہبی امور سے تعلق رکھتے تھے۔

مآخذ: (۱) D'Ohsson: *Tableau général de l'Empire Othoman*، پیرس ۱۸۲۴ء، ۷ : ۱ تا ۳۳؛ (۲) اسماعیل حقی اوزون چارشیلی: عثمانلی دولتنن سرای تشکیلاتی، انقرہ ۱۹۴۵ء، ص ۳۵۸ ببعد؛ (۳) گب و بوون، ۱/۱ : ۸۲ ببعد، ۳۴۶ ببعد؛ نیز رک بہ سرای۔

(B. LEWIS)

⊙ **البیرونی**: البیرونی کے حالاتِ زندگی کے ماخذ بہت محدود ہیں۔ اس ضمن میں اس کی اپنی تحریریں مسامرہ خوارزم [جس کا نام یاقوت نے معجم الادباء میں ''کتاب المسامرہ فی اخبار خوارزم'' لکھا ہے] اور تاریخ سلطان محمود و ابیہ اب ناپید ہیں۔ اول الذکر کا کچھ حصہ ابوالفضل بیہقی کے قلم سے ہم تک پہنچ سکا ہے۔ [البیرونی کے ایک مکتوب سے بھی، جو اس نے ۴۲۷ھ میں اپنے ایک دوست کو اپنی اور ابوبکر الرازی کی تصانیف کے بارے میں لکھا تھا، اس کے سوانح حیات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ مکتوب مع اس کی شرح کے، جو ابراہیم التبریزی (م ۶۹۲ھ / ۱۲۹۳ء) نے قلم بند کی تھی، لائڈن کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ اصل رسالہ M. Krause کے زیرِ اہتمام ۱۹۳۶ء پیرس میں چھپ بھی چکا ہے۔ اسی طرح ایک قصیدے میں، جو اس نے ابوالفتح البستی کی تعریف میں لکھا ہے، اس کے حالات کے متعلق بعض لطیف اشارے ملتے ہیں]۔ البیرونی کا اپنا طرزِ بیان اتنا ادق، مختصر، پر مغز اور مسئلۂ درپیش پر حاوی ہے کہ اس کا سمجھنا ایک مبتدی کے بس کی بات نہیں؛ اس لیے ہر کس و ناکس کی دسترس اس تک نہیں ہو سکتی۔ ابن خلکان نے البیرونی کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ البیرونی کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد کی تحریریں غلطیوں سے لبریز ہیں۔

زمانۂ حال میں جس مغربی مصنف نے اس کے حالات زندگی پر سب سے پہلے قلم اٹھایا ہے وہ المانوی فاضل ایڈورڈ زخاؤ E. C. Sachau ہے، جس نے البیرونی کی دو کتابوں: تحقیق ما للہند [یعنی *Alberuni's India*، لنڈن ۱۹۱۰ء] اور ''الآثار الباقیۃ'' [یعنی *The Chronology of Ancient people (Vestiges of the Past)*] کی تدوین اور انگریزی میں ان کے ترجمے کی اشاعت کی ہے [لیکن جب تحقیق ما للہند کا زخاؤ نے ترجمہ کیا تو البیرونی کی اس کتاب کا پورا مخطوطہ اس کے پیش نظر

نہ تھا، اس لیے یہ دراصل اس کے محض ایک حصے کا ترجمہ ہے ۔ اس کے نزدیک البیرونی فکری اعتبار سے دنیا کا بلند ترین انسان تھا] ۔ البیرونی کے حالاتِ زندگی جو کچھ بھی ہمیں اب تک معلوم ہوئے ہیں وہ اس کی اپنی تصانیف میں یا تو ضمناً اس نے خود بیان کیے ہیں یا اس کی تحریرات و مشاہداتِ فلکی کے متن پر مبنی ہیں ۔ جیسے جیسے اس کی کتابیں معرضِ ظہور میں آ رہی ہیں اس جلیل القدر مصنف کے تبحر، جدّتِ طبع، حق جوئی اور حق گوئی کا پتا دیتی ہیں ۔

اس کا پورا نام برہان الحق ابوالریحان محمد ابن احمد البیرونی ہے ۔ السمعانی نے اپنی کتاب الانساب میں اس کے نام البیرونی کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ اس کی سکونت شہر کے بیرونی حصے میں تھی، اس لیے عام طور پر البیرونی مشہور ہو گیا [نیز دیکھیے یاقوت، جو یہی وجہ تسمیہ بیان کرتا ہے؛ لیکن صاحبِ عیون الانباء نے لکھا ہے کہ یہ نسبت سندھ کے ایک قصبے بیرون کی طرف ہے] ۔ یہ خوارزم کے پایۂ تخت کاث میں ۳ ذوالحجہ ۳۶۲ھ/۴ ستمبر ۹۷۳ء کو ایک گم نام گھرانے میں پیدا ہوا (کاث اب دریا برد ہو چکا ہے اور اس کی جائے وقوع روسی (سوویٹ) ترکستان کے شہر خیوا پر تھی اور اب یہ البیرونی کا شہر کہلاتا ہے) ۔ [منجم ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد التبریزی الغضنفر (المولود ۶۳۰ھ / ۱۲۳۱ء) نے البیرونی کے حالاتِ زندگی سے اس کی پیدائش کے گوشے اور سنہ متعین کیے ہیں ۔] البیرونی نے اپنے اساتذہ میں سے صرف ابو نصر منصور ابن علی بن عراق کا ذکر کیا ہے، جو پرانے خوارزم شاہی خاندان کا ایک فرد تھا۔

البیرونی نے اپنی زندگی کے پہلے پچیس سال خوارزم شاہی خاندان کی خدمت میں گزارے ۔ جب ۳۸۵ھ/۹۹۵ء میں وہ تیئیس برس کا تھا تو ابو عبداللہ محمد خوارزم شاہ اور محمد بن مامون کے مابین، جس کا پایۂ تخت گرگنج [یا کہنہ اُرگنج (جرجانیہ)] دریائے جیحون کے اس پار تھا، لڑائی چھڑ گئی ۔ اس میں محمد بن مامون کامیاب ہوا اور البیرونی کو نقل مکانی کرکے جرجانیہ آنا پڑا؛ لیکن اسے وہاں بھی ٹھیرنا نصیب نہ ہوا اور وہ کچھ عرصہ قید و بند کی سختیاں جھیلتا اور حوادثِ زمانہ کے تھپیڑے کھاتا ہوا آبائی وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گیا ۔ ۳۸۷ھ/۹۹۷ء میں اس نے مازندران یا طبرستان کے اسپہبذ مرزبان بن رستم بن شروین کے دربار میں رسائی حاصل کر لی ۔ اسی اسپہبذ کے نام پر اس نے اپنی سب سے پہلی تصنیف مقالید علم الہیئة ما یحدث فی بسیط الکرة معنون کی ہے ۔ لیکن اسی سال اسپہبذ مذکور اور فخرالدولہ بویہی کے انتقال پر حالات کچھ ایسے ناسازگار ہوئے کہ البیرونی اپنے نئے وطن کو بھی خیرباد کہنے پر مجبور ہو گیا اور نہایت خستہ حالت میں شہر رَی میں رہنے لگا۔ ۳۸۸ھ میں جب زیّاری سلطان قابوس بن وشمگیر سترہ سالہ جلاوطنی کے بعد طبرستان میں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت پر قابض ہوا تو البیرونی کو پھر اپنے نئے وطن میں لوٹ کر آنے کا موقع مل گیا، جہاں اس نے اپنی دوسری تصنیف الآثار الباقیة عن القرون الخالیة، اس علم پرور اور عالم فرمانروا کے لیے (۳۹۰-۳۹۱ھ/۱۰۰۰-۱۰۰۱ء میں) لکھی ۔ وشمگیر کی خواہش اور اصرار کے باوجود البیرونی کا قیام جرجان میں زیادہ عرصہ نہ رہ سکا اور ۳۹۳ھ/۱۰۰۲-۱۰۰۳ء میں سات سال کی جلاوطنی کے بعد اپنے آبائی وطن میں علی بن مامون کے دربار میں پہنچا اور ۳۹۷ھ/۱۰۰۶-۱۰۰۷ء میں اس شاہزادے کے انتقال کے بعد اس کے بھائی مامون بن مامون کے سایۂ عاطفت میں رہنے لگا؛ لیکن ۴۰۷ھ/۱۰۱۷-۱۰۱۸ء میں

جب یہ شاہزادہ اپنی ہی فوج کے سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا تو یہ ملک سلطان محمود غزنوی [م ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء]، کے قبضے میں آ گیا، جس کی بہن مقتول شاہزادے کے عقد میں تھی۔ محمود نے مامونوں کے لشکر کو شکست دے کر اپنے سردار التونتاش کو وہاں کا گورنر بنا دیا اور خود غزنہ واپس چلا گیا۔ البیرونی بھی دوسرے ارکانِ شاہی کے ساتھ اپنے تین ہمراہیوں، یعنی ابو نصر منصور بن علی ابن عراق، ابوالخیر خمّار اور عبدالصمد اوّل سمیت غزنہ پہنچ گیا [اس وقت اس کی عمر پینتالیس سال تھی۔ اس سے پہلے بھی البیرونی غزنہ دیکھ چکا تھا، جب اسے سلطان خوارزم کی طرف سے بطورِ سفیر یہاں بھیجا گیا تھا]۔

غزنہ پہنچنے کے بعد البیرونی کی علمی زندگی کا زرّیں دور شروع ہوتا ہے۔ یہاں اس نے اپنی کتاب تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافات المساکن مرتب کی۔ اس کتاب کا واحد نسخہ غالبًا اس کے اپنے قلم کا ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء کا لکھا ہوا دستیاب ہو چکا ہے۔ البیرونی نے اپنی زندگی کے غالبًا بارہ تیرہ سال شاہی نگرانی میں ہندوستان میں گزارے، اس اثنا میں اس نے یہاں سنسکرت بھی سیکھی اور ہندو مذہب، تہذیب و تمدّن، رسم و رواج، عادات و توہّمات کا مطالعہ کیا۔ یہ معلومات اس نے ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب تحقیق ما للہند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل او مرذولۃ میں درج کی ہیں۔

اس نے ایک سال قبل، یعنی ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں، اپنی تصنیف کتاب التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم ریحانہ بنت حسن خوارزمی کے لیے لکھی۔ اس کی کتاب ما للہند اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچی جب سلطان محمود کا ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں انتقال ہو چکا تھا، لیکن جب اس کا بیٹا مسعود اپنے بھائی محمد سے کچھ عرصہ نبرد آزما رہ کر تخت سلطنت کا وارث ہوا تو البیرونی اپنی شاہکار تصنیف القانون المسعودی فی الہیئۃ والنجوم، جو ریاضی و ہیئت، علم احکام النجوم اور جغرافیے پر ہے، مرتب کر چکا تھا؛ چنانچہ اس نے اپنی یہ تصنیف سلطان مسعود کے نام پر معنون کی۔

البیرونی ہندوؤں کے علوم کا اس قدر دلدادہ اور شوقین تھا کہ وہ اپنی بیشتر تصانیف میں نہ صرف ان علوم کا بالتفصیل ذکر کرتا ہے بلکہ اس نے وراہا مہیرا Veraha Mahira کی دو تصانیف برہت سمہتا اور لاگھو جاتکم اور برہم گپتا کی برہم اسپھٹ سدھانت اور کتاب پاتنجلی (سنسکرت) کا پاتنجلی فی الخلاص من الارتباک کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بھگوت گیتا کا بڑا مدّاح تھا۔ اسی کے تتبع میں اس نے کپلا کی سانکھیا کا ترجمہ عربی میں اور بطلمیوس کی کتاب المجسطی، تحریر اقلیدس اور اپنی کتاب صنعت اسطرلاب کا سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ [بجیانند بنارسی کی] جیوتش پر ایک کتاب کرن تلک کا، جس کا حال ہی میں انکشاف ہوا ہے، اس نے غرۃ الزیجات [یا غرّۃ الازیاج] کے نام سے نہ صرف تحت اللفظ ترجمہ کیا ہے بلکہ اس کے نفس مضمون کی اپنی طرف سے مثالیں دے کر وضاحت بھی کی ہے [غرّۃ کا مخطوطہ کتاب خانۂ شاہ پیر محمد، احمد آباد میں موجود ہے]۔ بالآخر البیرونی نے [جو "اپنے ہاتھ کو قلم سے، آنکھ کو دیکھنے سے اور دل کو فکر سے کبھی خالی نہیں رکھتا تھا" (یاقوت)] غالبًا غزنہ ہی میں [بروز جمعہ ۲ رجب] ۴۴۰ھ/[۱۱ ستمبر] ۱۰۴۸ء کو [بعمر ۷۷ سال ۷ ماہ] داعیِ اجل کو لبیک کہا؛ لیکن اپنی کتاب الصیدلۃ (یا الصیدنۃ) کے مقدمے میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے: میری عمر اسّی سال قمری سے متجاوز ہے [اسی لحاظ سے اس کا سالِ وفات [illegible]

ہو گا]۔ اس کے شاگرد ابوالفضل سرخسی کا بیان ہے کہ میں نے شیخ کی ایک کتاب کے حاشیے پر یہ عبارت دیکھی ہے کہ وہ جمعے کی شب بوقت عشاء ۲ رجب ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸ء راہی ملک عدم ہو گیا۔ وفات کے وقت کا ایک حیرت انگیز واقعہ فقیہ ابوالحسن علی بن عیسی الولوالجی نے بیان کیا ہے: ”میں ابو ریحان کے پاس گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دم توڑ رہا ہے۔ اسی حال میں اس نے مجھ سے کہا کہ تم نے ایک روز جدات فاسدہ [نانیوں کی وراثت] کا مسئلہ مجھے کس طرح بتایا تھا۔ میں نے از راہ شفقت کہا کہ کیا میں تمھاری اس حالت میں بتاؤں؟ اس نے جواب دیا: ”میں اس مسئلے کو جاننے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہونا چاہتا ہوں“۔ میں نے اس مسئلے کو دہرایا اور اس نے یاد کر لیا۔ اس کے بعد میں اس سے رخصت ہوا اور ابھی میں راستے ہی میں تھا کہ میں نے اس کی وفات پر رونے پیٹنے کی آواز سنی۔

البیرونی کی فضیلت اور اس کا علمی رتبہ:

البیرونی اسلام کے عظیم عالموں اور محققوں میں سے ہے۔ وہ اپنی آزاد خیالی، ادبی جرأت، تحقیق، بیباک تنقید اور اصابت رائے میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی ہمہ گیری، اس کے مذاق کا تنوع اور پھر اس پر اس کے علم کی گہرائی بےنظیر ہے۔ اس کی تنقیدی روح اور طرز بیان سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی زمانۂ حال کا مصنف ہے۔ اس کی یہ خوبی بھی قابل ذکر ہے کہ وہ بہت سی زبانوں کا ماہر تھا۔ اس کی مادری زبان سغدی یا خوارزمی ہے، جو ایرانی کی ایک شاخ بتائی جاتی ہے، جسے وہ کسی علم کے اظہار کے ناقابل پاتا ہے۔ وہ صرف عربی زبان کو اہل سمجھتا ہے۔ وہ اپنی کتاب الصیدلۃ [الصیدنۃ] میں یوں رقمطراز ہے: ”دنیا کے جملہ ممالک کے علوم عربی میں منتقل اور ہمارے دلوں میں راسخ و جاگزیں ہو گئے ہیں اور اس زبان کی خوبیاں ہمارے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکی ہیں، اگرچہ سب قوموں کی نظر میں ان کی اپنی زبانیں، جو ان کے ہاں رائج ہیں اور جن کے وہ عادی بن چکے ہیں اور جن میں وہ اپنے ہم عصروں اور ہمجولیوں سے تبادلۂ خیالات کرتے ہیں، خوبصورت اور بولی نظر آتی ہیں؛ اس کا اندازہ میں اپنی ذات سے کرتا ہوں۔ میں اپنی زبان کا خوگر ہو چکا ہوں، جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی علم اس زبان میں مستقل طور پر محفوظ کر لیا جائے تو یہ ویسا ہی عجیب و غریب نظر آئے گا جیسا کہ کسی نالی میں گرا ہوا اونٹ، یا یوں کہیے کہ ایک زرافہ جو شریف النسل عرب گھوڑوں میں مل جل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں فارسی و عربی کی طرف مائل ہوا ہوں اور ان دونوں میں میری حیثیت ایک اجنبی اور دخیل کی سی ہے اور مجھے ان کے استعمال میں اچھی خاصی دشواری پیش آتی ہے“۔ اس نے اپنی کتاب التفہیم عربی اور فارسی میں لکھی ہے۔ ان زبانوں کے علاوہ وہ سنسکرت اور یونانی بھی جانتا تھا اور سریانی اور عبرانی زبانوں میں قدرے مہارت رکھتا تھا۔

البیرونی بیک وقت سیاح، ریاضی دان، ماہر فلکیات، جغرافیہ دان اور مؤرخ، معدنیات، طبقات الارض اور خواص الادویہ کا ماہر اور آثار قدیمہ کا عالم تھا۔ وہ اپنے ہم عصروں میں نمایاں نظر آتا ہے، حتی کہ اس کے استاد ابو نصر منصور اور رفیق کار ابوسہل المسیحی نے، جس سے اس کی ملاقات غالباً جرجان میں ہوئی، فرداً فرداً اس کے نام پر اپنی کئی مختلف نظریات پر مرتبہ بارہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مشہور طبیب و فلسفی ابو علی ابن سینا سے کئی مرتبہ مختلف اوقات پر اس کے مناظرے ہوئے۔ ان سے متعلق متعدد رسائل ہم تک پہنچے ہیں۔

البیرونی نے ارسطو کے فلسفے پر مبنی ”سما اور طبیعیات“ پر کوئی اٹھارہ سوال ابن سینا پر کیے ہیں اور اس کے جواب خاطرخواہ نہ پا کر خود ان کے جواب الجواب لکھے ہیں ۔ ابو سہل ویجن بن رستم الکوہی، ابوالحسن کوشیار الجیلی، محمد بن اللیث ابو الجود، ابو محمود الخجندی، ابو سعید احمد بن محمد عبدالجلیل السجزی اور ابو الوفاء محمد بن محمد البوزجانی سے مختلف علمی مسائل پر اس کی خط و کتابت رہی ہے ۔ ایک مرتبہ کشمیر کے ہندو فضلا نے اس سے دس سوالات کیے، جن کا اس نے خاطرخواہ جواب دیا ۔ ان سب باتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ”مقدمۂ تاریخ علوم“ *(Introduction to the History of Science)* کا مصنف جارج سارٹن حق بجانب تھا کہ وہ چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر اور پانچویں صدی کے نصف اول کو ابن سینا کے بجائے البیرونی کے نام پر نامزد کرے ۔

ابن سینا کے ارتفاع قمر سے طول البلد دریافت کرنے کے طریق پر بحث کرتے ہوئے البیرونی لکھتا ہے کہ یہ مقصد تک پہنچنے کا ایک اجتہادی طریقہ ہے، جو سہل ہے اور جو حد امکان سے باہر نہیں، مگر یہ کہ ابوعلی باوجود اپنی تیزی فہم و فراست اور جدّتِ طبع کے اس مسئلے میں ناقابل اعتبار ہے؛ اس کی تحقیق تقلید پر مبنی ہے اور خاص کر اس زیر بحث کی تلاش کے لیے ۔ البیرونی اسی مسئلے کے متعلق ایک دوسری جگہ لکھتا ہے کہ جرجان کا طول اس کے قریب ہے جو ابو علی سینوی نے اپنے ایک خط میں زرّین کِیس بنت شمس المعالی کو لکھا ہے اور یہ کہ ابو علی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ۔

علم المثلثات میں اس کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے: ایک دائرے میں منتظم نو اور دس اضلاع کی شکل کھینچنا اور اسی طرح دس اضلاع کی شکل کھینچ کر ۴۰ اور ۳۶ درجے کے زاویے کے بالمقابل وتر دریافت کرنا ہے اور اسے دو مرتبہ نصف کر کے ایک درجے کا وتر اور نصف اور چوتھائی درجے کی جیب دریافت کرنا اور اس پر جدول الجیوب کی بنیاد رکھنا، دائرے کے محیط و قطر کی نسبت π کا تین درجے اعشاریہ تک صحیح اندازہ کر لینا، جیوب و اظلال کے شمار کا قاعدہ اور دوسرے درجے کے فرقوں سے واقفیت اور خانہ پری ضابطہ (Interpolation formula)، جو آگے چل کر جیب کی قدر میں تفاعل (function) کی ایجاد کا باعث ہوا، اور اس سلسلے میں ایک عام قاعدے کی پیہم تلاش و جستجو، اور سب سے بڑھ کر کروی مثلثات کے دریافت شدہ ضوابط کی مدد سے کروی ہیئت کے مسائل کا حل کر لینا جو اعلٰی درجے کی جدّت پسندی و اختراع و ابداع کا نمونہ پیش کرتے ہیں ۔ اس طرح زاویوں کی جیب و ظل کے جداول میں دائرے کے نصف قطر کو اکائی قرار دینا اور دوسرے درجے کے فرقوں کا استعمال خاص طور پر قابل ذکر مسائل ہیں ۔ سمت قبلہ کی دریافت کا ایک صحیح و سہل طریقہ اور اس کے لیے کروی سطح کی سطحِ مستوی پر تسطیح بھی اسی کی ایجاد ہے ۔

حساب میں ہندوؤں کے طریقۂ شمار و اعداد کی وضاحت، یعنی اکائی، دہائی، سینکڑہ، ہزار وغیرہ کا تخیّل اور ان کا استعمال قابلِ قدر ہے ۔ شطرنج میں ہندسی سلسلۂ اعداد (Geometrical Progression) کی مدد سے ۱۸۴۴۶۷۴۴۰۷۳۷۰۹۵۵۱۶۱۹ = ۱ - $(۱۶)^{۱۶}$ کلیے کی دریافت، صرف پرکار کی مدد سے ایک زاویے کو تین برابر حصوں میں تقسیم کرنا اور اسی طرح کے دوسرے مسائل کا حل (جو مغرب میں ”مسائل بیرونی“ کہلاتے ہیں) قابلِ تعریف ہے ۔ عرض البلد اور طول البلد سے سطح ارضی پر فاصلوں کی پیمائش اور اس کے برعکس عرض البلد اور

طول البلد کی دریافت کا عمل سب اسی کے طفیل ہم تک پہنچا ہے۔

اپنی کتاب استیعاب الوجوہ الممکنۃ الخ میں وہ ابو سعید السجزی کی اصطرلاب زورقی کے ذکر میں لکھتا ہے: ”مہندسین اور علماے ہیئت میری تحریر پر طعنہ‌زن نہ ہوں کیونکہ حرکت شبانہ روز کو خواہ وہ حرکت ارض کے باعث ہو خواہ حرکت سماء کی وجہ سے، دونوں صورتوں میں ان کے حساب میں کوئی فرق نہیں آ سکتا اور یہ مسئلہ ایسا ہے جو بالآخر طبیعین ہی حل کر سکتے ہیں۔“ یہ ایک ایسی محیّر العقول پیش گوئی ہے جس کی تصدیق صدیوں بعد فوکے کے رقاص (Foucault's pendulum) کی حرکت سے ہوئی۔

بعض حالیہ تذکرہ‌نگاروں نے قلعۂ نندنہ (تلہ بالا ناتھ، ضلع جہلم، پاکستان) پر البیرونی کی پیمائش قطر ارضی کو اس کی طرف بطور موجد منسوب کیا ہے، جو صحیح نہیں؛ چنانچہ اپنی کتاب التحدید الخ میں، جو ۴۱۶ھ / ۱۰۲۵ء میں اس نے تصنیف کی، وہ لکھتا ہے: ”بعینہ اسی طریقے سے مامون نے زمین کا قطر دریافت کیا تھا (ورق ۱۴۲، مخطوطۂ فاتح)، علاوہ بریں یہ طریقہ عملی طور پر زیادہ صحیح نہیں۔ بحوالۂ کتاب الاسطرلاب وہ خود کہتا ہے: ”زمین کا قطر دریافت کرنے کا یہ طریقہ قابل تصور اور مبنی بر دلائل ہونے کے باوجود بمشکل قابل عمل ہے۔“ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس مقدار کے ناپ پر یہ مبنی ہے وہ بیحد چھوٹی ہے اور اس کے لیے جو آلات استعمال کیے گئے ہیں وہ بھی اپنی قامت میں چھوٹے ہیں اس لیے اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خود کہتا ہے: ”میں نے یہ طریقہ محض مامون کے زمانے کی ایک درجہ عرض البلد کی پیمائش کے متعلق دو مختلف روایتوں کے آزمانے کے لیے اختیار کیا تھا۔“ ان میں سے اس نے حبش بن الحاسب کی بیان کردہ قدر (۵۶ میل) سے اتفاق کیا ہے (Islamic Culture، اپریل ۱۹۲۹ء)۔

علامہ اقبال ریاضی کی اصطلاح ”تفاعل“ (function) کے تصور پر البیرونی کی ایجاد کا حال ڈاکٹر ضیاءالدین کی زبانی یوں بیان کرتے ہیں: ”البیرونی نے اپنی کتاب قانون مسعودی میں نیوٹن کے ضابطۂ خانہ‌پری (Interpolation Formula) کو مثلثاتی تفاعل کی قدروں کے ناپنے میں استعمال کیا ہے، جیسے اس نے اپنے جداول جیوب میں ان زاویوں کے لیے دیا ہے جو ۱۵ دقیقے کے وقفے پر ہیں۔ اس نے اس خانہ‌پری ضابطے کا ہندسی ثبوت بھی دیا ہے۔ آخر میں وہ لکھتا ہے کہ یہ برہان ہر تفاعل کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، جو اصل کے گھٹنے بڑھنے پر گھٹتا یا بڑھتا ہے۔ اس نے تفاعل کی اصطلاح کا ذکر نہیں کیا، لیکن اس تصور کا عمومی اطلاق بتایا ہے جو مثلثاتی تفاعل ہی تک محدود نہیں۔

اٹھارہ جواہر اور دھاتوں کی کثافت اضافی کی صحیح صحیح قدروں کی دریافت بھی البیرونی نے کی ہے۔ آواز کی رفتار کے مقابلے میں روشنی کی رفتار حد درجے تیز ہے اس حقیقت کی نقاب کشائی بھی اسی نے کی ہے۔ اسی طرح قدرتی چشموں اور مصنوعی زیر زمین چشموں (Artesian Wells) سے پانی کے اپنے آپ اوپر ابھر آنے کی توجیہ آج کل کے مائی سکونیات (Hydrostatis) اصولوں پر کرنا اسی کا کام ہے۔ خرق عادت تولید کا مسئلہ، جس میں سیامی توأم (Siam's twins) کا مسئلہ بھی شامل ہے، اسی کا بیان کردہ ہے۔ پھولوں کی پنکھڑیوں کا شمار ۳، ۴، ۵، ۶ یا ۸ ہونا اور کبھی ۷ یا ۹ نہ ہونا اسی کا مشاہدہ ہے۔ دریاے سندھ کے طاس کا کسی زمانے میں زیر آب ہونا اور زمانۂ مابعد میں اس کا مٹی اور ریگ سے پر ہو کر زرخیز میدانوں میں تبدیل ہو جانا اسی کی دریافت ہے۔ سمندر کے پانی کے نمکین ہونے

کی توجیہ اسی کے ذہن رسا کا حصہ ہے ۔

ہندوؤں کے علوم و فنون، ان کے رسم و رواج، تمدن و تہذیب اور مذہب و فلسفہ میں اس کی نظر ایسی گہری ہے جس کے مقابلے میں ہیون سانگ، میگس تھنیز اور ابن بطوطہ کے سفرنامے بچوں کے لیے لکھی ہوئی کہانیوں کے مترادف ہیں ۔ مغربی مستشرقین اسے ہندوستان کے دروازے پر افلاطون (Plato)، مسلمانوں کا بطلیموس (Ptolemy) یا اپنے زمانے کا پلینی Pliny اور لیونار د ونسی (Leonard de Vinci) اور لائبنتز Leibnitz شمار کرتے ہیں ۔ زخاؤ الآثار الباقیۃ اور کتاب الہند کے دیباچوں میں لکھتا ہے کہ البیرونی کی تصانیف میں اس کی تحقیق کی وسعت اس قدر ہے کہ اس کے بیان کے لیے کئی نسلیں درکار ہوں گی ۔ ۱۸۷۸ء سے اب تک اس کی کئی تصانیف معرض ظہور میں آ چکی ہیں، لیکن اس کام کے پورا ہونے کے لیے نہ معلوم کتنا عرصہ اور درکار ہوگا ۔

البیرونی کی قومیت اور اس کا مذہب : مغرب و مشرق کے سب مستشرقین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ ایرانی النسل تھا ۔ بعض حلقوں میں اس بات کے ثابت کرنے کی بیکار کوشش کی گئی ہے کہ وہ ترک نسل سے تھا، کیونکہ قرائن و شواهد اس کے برعکس ہیں ۔ وہ ایک فراخ دل، قومی عصبیت سے ماورا، سچا اور راسخ العقیدہ مسلمان تھا، جو تنگ نظری اور تعصب سے کوسوں دور تھا ۔

البیرونی کی تصنیفات : پروفیسر زخاؤ نے وہ خط جو البیرونی نے طبیب محمد بن زکریا الرازی کی کتابوں کے متعلق اپنے کسی دوست کو (۴۲۷ھ / ۱۰۳۵-۱۰۳۶ء) لکھا ہے، شائع کیا ہے ۔ اس میں اس نے اپنی ان تصانیف کی فہرست دی ہے جو وہ اس سنہ (پینسٹھ قمری سال کی عمر) تک لکھ چکا تھا؛ ان کی تعداد ایک سو تیرہ ہے ۔ ان کے علاوہ وہ کتابیں ہیں جو ابو نصر منصور بن علی بن عراق نے اس کی طرف منسوب کی ہیں؛ ان کی تعداد بارہ ہے ۔ اسی طرح وہ کتب جو ابوسہل عیسیٰ بن یحیی المسیحی نے اس کے لیے لکھیں ان کی تعداد بھی بارہ ہے ۔ ایک کتاب ابو علی الحسن ابن علی الجیلی نے اس کی طرف منسوب کی ۔ یہ کل ملا کر ایک سو اڑتیس کتب ہوئیں؛ لیکن اس تعداد میں اس کی کتاب القرعۃ المثمنۃ لاستنباط الضمائر المخمنۃ کی ایک تشریح، جو خود البیرونی نے شرح مزامیر (مضامیر) القرعۃ المثمنۃ کے نام سے لکھی تھی، شامل نہیں ۔ اس طرح اس کی مصنفہ کتب کی تعداد ایک سو انتالیس ہو جاتی ہے ۔ اسی طرح اس فہرست میں مندرجۂ ذیل کتب کا بھی ذکر نہیں :-

۱ ۔ ''الآثار الباقیۃ میں برسبیل تذکرہ جن کا بیان ہے ۵

۲ ۔ کتاب الہند میں برسبیل تذکرہ جن کا بیان ہے ۷

۳ ۔ جن کا ذکر حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں کیا ہے ۸

(کشف الظنون میں در اصل کل پندرہ کتب کا ذکر ہے، لیکن جیسا کہ زخاؤ نے لکھا ہے ان میں سے بعض کتب بعینہ یا معمولی سی تبدیلی کے ساتھ وہی ہیں جو اوپر کی تعداد میں شامل ہیں اور بعض کتب اس کی طرف غلط طور پر منسوب ہو گئی ہیں اس طرح حاجی خلیفہ کی بیان کردہ کتب کی تعداد صرف آٹھ رہ جاتی ہے) ۔

۴ ۔ غلام حسین جونپوری نے جامع بہادر خانی میں البیرونی کی ایک کتاب لمعات کا ذکر کیا ہے جو علم المناظر و انعکاس پر لکھی گئی تھی

۵ ۔ تاریخ خوارزم، جس کا ذکر ابوالفضل

نے تاریخ بیہقی میں کیا ہے ۱

۶۔ وہ کتب جن کا ذکر یاقوت نے معجم الادباء میں کیا ہے ۷

۷۔ وہ کتب جن کا ذکر کسی قدیم کتاب میں نہیں، لیکن جو اس وقت دنیا کے کتب خانوں میں موجود ہیں، یعنی (۱) کتاب الدرر فی سطح الاکر؛ (۲) نزہۃ النفوس والافکار فی خواص المولید الثلاثۃ المعادن و النبات و الاحجار؛ یہ دونوں کتب بوڈلین لائبریری میں محفوظ ہیں ۲

۸۔ وہ تصنیفات جن کے مسودے البیرونی کے پاس محفوظ نہ رہے تھے ۵

۳۶

اس طرح البیرونی کی تالیفات کی کل تعداد ۱۷۵ ہو جاتی ہے]؛ علاوہ ازیں وہ کتب ہیں جن کا ذکر D.J. Boilot نے *L'œuvre de l'Beruni* (= کتب البیرونی) میں کیا ہے۔ اسی طرح کتاب کرن تلک [= غرۃ الزیجات] ہے، جس کا اب تک کسی شائع شدہ فہرست میں ذکر نہیں۔ یوں البیرونی کی کل مصنفہ اور مترجمہ کتب کی تعداد ایک سو اکاسی تک پہنچ جاتی ہے۔ [یاقوت نے لکھا ہے کہ میں نے البیرونی کی تصانیف کی ایک فہرست جامع مرو کے کتاب خانے میں ساٹھ ورق پر گنجان خط میں لکھی ہوئی دیکھی تھی۔

البیرونی کی مصنّفات کے مخطوطے دنیا میں کہاں کہاں پائے جاتے ہیں، اس کے لیے دیکھیے بروکلمان: تکملہ؛ H. Suter: *Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke* (عرب علمائے ریاضی و ہیئت اور ان کی تصنیفات)؛ ابو ریحان البیرونی، مطبع ادارۂ تصنیف و تالیف ص ۸۰ ببعد].

البیرونی کی جو کتب چھپ چکی ہیں یا زیر طبع ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ القانون المسعودی، ۴ جلد، ۱۹۵۴ء ببعد؛ (۲) الآثار الباقیۃ، طبع زخاؤ، متن، لائپزگ ۱۸۷۶ء، و انگریزی ترجمہ؛ (۳) کتاب الہند، طبع زخاؤ، لندن ۱۸۸۷ء، و انگریزی ترجمہ؛ (۴) پاتنجلی، طبع رٹر Ritter؛ تہران؛ (۵) مقالۃ فی استخراج الاوتار فی الدائرۃ بخواص الخط المنحنی فیہا؛ (۶) تمہید المستقر لتحقیق معنی الممر، (انگریزی ترجمہ از E.S. Kenedy)؛ (۷) افراد المقال فی امر الظلال؛ (۸) فی راشیکات الہند؛ (۹) رسائل ابی نصر منصور بن علی بن عراق، جو اس نے البیرونی کے لیے لکھے (مندرجۂ بالا پانچوں کتابیں حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی ہیں)؛ (۱۰) کتاب الجماہر فی معرفۃ الجواہر، طبع کرینکو ۱۹۳۶ء؛ تقی الدین الہلالی نے اس کا مقدمہ اور حواشی شائع کیے، لائپزگ ۱۹۴۱ء؛ (۱۱) کتاب التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم، عربی متن، طبع رامسے رائٹ و فارسی متن، طبع آقا جلال ہمائی، تہران ۱۹۴۰ء؛ (۱۲) تحدید نہایات الاماکن، طبع محمد بن تاویت الطنجی، انقرہ ۱۹۶۲ء و طبع بولنجاکوف، قاہرہ ۱۹۶۴ء و عربی متن مع انگریزی ترجمہ از محمد فضل الدین قریشی، جو ابھی شائع نہیں ہوا؛ (۱۳) کرن تلک (= غرۃ الزیجات)، مع انگریزی ترجمہ و حواشی از محمد فضل الدین قریشی، لاہور ۱۹۷۰ء؛ (۱۵-۱۶) نہایات الاماکن اور الصیدنۃ فی الطب، انگریزی و اردو ترجمہ از فضل الدین قریشی، زیر سرپرستی پنجاب یونیورسٹی لاہور، پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے؛ (۱۷) صفۃ المعمورۃ کے نام سے زکی ولیدی طوغان نے مطبوعات آثار قدیمۂ ہند، شمارہ ۵۳، نئی دہلی ۱۹۴۱ء میں اس کی چار کتابوں: قانون مسعودی، نہایات الاماکن، الجماہر اور الصیدنۃ کے کچھ اقتباسات شائع کیے تھے؛ (۱۸) مقالید علم الہیئۃ کے عکس حاصل کرنے کے بعد اس کی تہذیب کا کام، از محمد فضل الدین قریشی، ایک حد تک مکمل ہو چکا ہے؛ (۱۹) ان کے علاوہ

یورپ کے مستشرقین مثلاً ویدمن، سی-شاے، ڈلس، میکس مایرھاف، میکس کراؤزے اور ان کے رفقاے کار نے البیرونی کے بعض رسائل کے اقتباس مغربی زبانوں میں شائع کیے ھیں.

مآخذ: (۱) ظہیرالدین علی بن زید البیہقی: تاریخ حکماء الاسلام، کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص ۲۷ (= تتمہ صوان الحکمۃ، طبع محمد شفیع، لاھور ۱۹۳۵ء)؛ (۲) الغافقی: کتاب المفردات، طبع Max Meyerhof و صبحی، قاھرہ ۱۹۳۲ء، ص ۱۲ تا ۲۸؛ (۳) السیوطی: بغیۃ الوعاۃ، مصر ۱۳۲۶ھ؛ (۴) یاقوت: ارشاد، مطبوعۂ مصر، ۱۷: ۱۸۰ تا ۱۹۰؛ (۵) ابن ابی اُصَیبِعَہ: عیون الانباء، مصر ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء، ۲: ۲۱ تا ۲۳؛ (۶) السمعانی: کتاب الانساب؛ (۷) الخوانساری: روضات الجنات، ۱: ۶۸ و ۴: ۱۷۹؛ (۸) ابن العبری: تاریخ مختصر الدول، ص ۳۲۴؛ (۹) طوسی: الذریعۃ، ۱: ۷۰۵ و ۲: ۲۰؛ (۱۰) الفہرس التمہیدی، مطبوعۃ الادارۃ الثقافیۃ، مصر، ص ۴۸۷؛ (۱۱) جرجی زیدان: آداب اللغۃ، ۲: ۳۳۵؛ (۱۲) فہرس الخزانۃ التیموریۃ، مصر ۱۹۴۸ء، ۳: ۳۳؛ (۱۳) ابن الاثیر: اللباب، ۱: ۱۶۰؛ (۱۴) محمد مسعود، در الاھرام، ج ۲ (۱۹۳۵ء)، شمارہ ۶؛ (۱۵) الھاشمی: نظریات الاقتصاد عندالبیرونی، در *MMIA*، شمارہ ۱۵، ص ۳۵۶؛ (۱۶) الزرکلی: الاعلام، بار دوم، ۶: ۲۰۵؛ (۱۷) سرکیس: معجم المطبوعات، ۱: عمود ۶۱۵؛ (۱۸) الغضنفر التبریزی (م ۶۹۲ھ): کتاب الفہرست مع المشاطۃ، طبع Max Krause، پیرس ۱۸۳۶ء؛ (۱۹) ابوالفداء: تقویم البلدان؛ (۲۰) الشہرزوری: نزھۃ الارواح؛ (۲۱) میر خواند: روضۃ الصفا؛ (۲۲) خواند امیر: حبیب السیر؛ (۲۳) رشید الدین فضل اللہ: جامع التواریخ؛ (۲۴) نظامی عروضی سمرقندی: چہار مقالہ، طبع قزوینی، لائڈن ۱۹۰۹ء؛ (۲۵) الواعظ الکاشفی: لطائف الطوائف؛ (۲۶) مرزا محمد قزوینی: چہار مقالہ، مترجمہ و طبع براؤن، لنڈن ۱۹۲۱ء؛ (۲۷) علی اکبر دہ خدا: ابوریحان، تہران ۱۳۲۴ھ ش؛ (۲۸) ابوالفضل: آئین اکبری؛ (۲۹) قاضی احمد غفاری: نگارستان، بمبئی ۱۲۷۵ھ؛ (۳۰) عبداللہ خان: مشاھیر عالم، لاھور ۱۹۲۹ء؛ (۳۱) سید حسن برنی: البیرونی، بار دوم، علی گڑھ ۱۹۲۷ء؛ (۳۲) وھی مصنف: صفۃ المعمورۃ، در معارف، اعظم گڑھ، ۴۹/۶: ۴۹۵؛ (۳۳) ارمغان، پاکستان سائنس کانفرنس، اجلاس نہم، پنجاب یونیورسٹی، لاھور ۱۹۶۷ء؛ (۳۴) حمید عسکری: نامور مسلم سائنسدان، مطبوعۂ مجلس ترقی ادب، لاھور ۱۹۶۲ء؛ (۳۵) ابو ظفر ندوی: ابو ریحان بیرونی کی ایک نئی کتاب، در معارف، اعظم گڑھ، ۲۲/۳: ۲۱۴؛ (۳۶) سید عبداللہ: قدیم عربی تصانیف میں ھندوستانی الفاظ، در اوریئنٹل کالج میگزین، لاھور، مئی ۱۹۳۳ء، ص ۳۴ تا ۴۳؛ (۳۷) سید حسن برنی: *Ibn Sina and al-Beruni, A study in Similarities and Contrasts*، در *Avicenna Commemoration Volume*، کلکتہ ۱۹۵۶ء؛ (۳۸) ضیاء الدین و F. Krenkow، در *Islamic Culture*، ج ۶، جولائی تا اکتوبر ۱۹۳۲ء؛ (۳۹) F. Krenkow، در مجلۂ مذکور، ۱۹: ۲۲۲ تا ۲۲۸؛ (۴۰) ایران سوسائٹی: *Al-Biruni Commemoration Volume*، کلکتہ ۱۹۵۱ء؛ (۴۱) محمد نظام الدین: مقالہ ”البیرونی اور اس کے کارنامے“، جو مؤتمر مستشرقین، منعقدہ ماسکو، اگست ۱۹۶۰ء، میں پڑھا گیا؛ (۴۲) مقدمۂ کتاب الصیدنۃ، عربی متن و حواشی و جرمن ترجمہ از Max Meyerhof، برلن ۱۹۳۲ء و اردو ترجمہ از فضل الدین قریشی (زیر ترتیب)؛ (۴۳) Max Krause: *Albīrūnī ein iranischer Forscher*، در *Islam*، شمارہ ۲۶، ص ۱ تا ۱۵؛ (۴۴) C. Schoy: *Aus der Mathematischen Geographie der Araber (nach dem Kānūn al Masʿūdī) etc.*، در ISIS، ۱۹۲۲ء، ۵: ۵۱ تا ۷۵؛ (۴۵) وھی مصنف: *Die Bestimmung der Geographischen Breite der Stadt Ghazna durch al-Bīrūnī*، در *Annalen der*

Hydregraphie، ۱۹۲۵ء، ص ۱۴ تا ۸۴؛ (۴۶) وہی مصنف: *Die Trignometrischen Lehren des persischen Astronomen Abu'l Raihān Muh. Ibn Ahmad al-Bīrūnī*، ہنوور ۱۹۲۷ء؛ (۴۷) G. Sarton: *Introduction to the History of Science*، بالٹی مور ۱۹۲۷ء، ۱: ۷۰۷ تا ۷۰۹؛ (۴۸) *H. Beveridge*، در *JRAS*، ۱۹۰۲ء، ص ۳۳۳ تا ۳۳۵؛ (۴۹) براکلمان، ۱: ۶۲۶ ببعد و تکملہ، ۱: ۸۷۰ ببعد؛ (۵۰) Cara de Vaux: *Penseurs de l' Islam*، پیرس ۱۹۲۱ء، ۲: ۷۵ تا ۸۷، ۲۱۵ تا ۲۱۷؛ (۵۱) E. Schau: *Chronology* (= الآثار الباقیۃ) کا دیباچہ (جرمن ترجمہ از H. Suter و E. Wiedmann، در *SBPMS Erlg.*، ۵۲–۵۳ (۱۹۲۰ـ ۱۹۲۱ء): ۷۱ تا ۷۹؛ (۵۲) L. Leclerc: *Histoire de la médecine arabe*، پیرس ۱۸۷۶ء؛ (۵۳) عبداللہ یوسف علی، در *Islamic Culture*، جنوری ـ اپریل ـ دسمبر ۱۹۲۷ء؛ (۳۰) علامہ اقبال، در مجلۂ مذکور، اپریل ۱۹۳۰ء؛ (۵۴) سید حسن برنی: ... *Kitāb al-Tahdīd*، در مجلۂ مذکور، اپریل ۱۹۵۷ء؛ (۵۵) H. Ritter: *Werke al-Bīrūnī's*، در *Orientalia*، استانبول ۱۹۳۳ء، ۱: ۷۳ تا ۷۸؛ (۵۶) زکی ولیدی طوغان: *New geographische und ethnographische Nachrichten*، نیز در *Geographische Zeitschrift*، ۱۹۳۳ء، ص ۲۶۳ ببعد؛ (۵۷) Max Meyerhof: *Études de Pharmacologie arabe*، در *BIE*، ۱۹۴۰ء، ص ۱۲۳، ۱۳۳ تا ۱۵۲؛ (۵۸) Wüstenfeld، در *Lüddes teitschr.*، ۱: ۲۹۶؛ نیز در *Die Arab. Ärzte*، عدد ۱۲۹، و در *Die Geschichsschreiber der Araber*، عدد ۱۹۵؛ (۵۹) Romsay Wright: *Book of Instruction* (= کتاب التفہیم) کا مقدمہ، لنڈن ۱۹۳۴ء؛ (۶۰) F. Taeschner، در *ZDMG*، شمارہ ۷۷، ص ۳۱ ببعد؛ (۶۱) *Bīrūnī*، مطبوعۂ Academy of Sciences, USSR، شعبۂ تاریخ و فلسفہ، ماسکو و لینن گراڈ ۱۹۵۰ء؛ البیرونی کی تصنیفات کے لیے نیز دیکھیے (۶۲) E. Wiedemann: *Beitr. XVIII, Astronomische Instrumente, Trignometrische Grössen, Geodaetische Messungen*، در *SBPMS Erlg.*، ۴۱ (۱۹۰۹ء): ۲۶ تا ۷۸؛ (۶۳) وہی مصنف: *Ein Instrument, das die Bewegung von sonne und Mond darstelt nach al-Bīrūnī*، در *Isl.*، ۴ (۱۹۱۳ء): ۵ تا ۱۳؛ (۶۴) وہی مصنف: *Über die verschiedenen, bei der Mondfinsternis auftretenden Farben nach al-Bīrūnī*، در *Eders Jahrbuch für Photographie* ۱۹۱۳ء؛ (۶۵) وہی مصنف: *Über Erscheinungen bei der Dämmerung und bei Sonnenfinsternissen nach arabischen Quellen*، در *Archiv für Geschichte der Medizin*، ۱۵ (۱۹۲۳ء): ۴۳ تا ۵۲؛ (۶۶) وہی مصنف: *Meteorologisches aus der Chronologie von al-Bīrūnī*، در *Meteorolog. Zeitschr.*، ۱۹۲۲ء، ص ۱۹۹ تا ۲۰۳؛ (۶۷) وہی مصنف: *Über Gesetzmässigkeiten bei Pflanzen nach al-Bīrūnī*، در *Biolog. Zentralblatt*، ۴۰ (۱۹۲۰ء): ۳۱۳ تا ۳۱۶؛ (۶۸) وہی مصنف: *Beitr. XXVII, Geographisches aus al-Bīrūnī*، در *SBPMS. Erlg.*، ۴۴ (۱۹۱۲ء): ۱ تا ۲۳؛ (۶۹) E. Wiedemann و J. Frank: *Beitr. LXI, Allgemeine Betrachtungen von al-Birumi in Seinem Werk über Astrolabien*، در مجلۂ مذکور، ۵۲–۵۳ (۱۹۲۰–۱۹۲۱ء): ۹۷ تا ۱۲۱؛ (۷۰) E. Wiedemann و J. Heil: *Beitr. XXIX, Geographisches aus dem mas'ūdischen Kanon von al-Bīrūnī*، در مجلۂ مذکور، ۴۴ (۱۹۱۲ء): ۱۰۹ تا ۱۲۵؛ (۷۱) E. Wiedemann: *Beitr. LXVIII, Über die Waage des Wechselns (nach al Khāzinī) und die Lehre von den Proportionen nach al-Bīrūnī*، در *SBPMS Erlg.*، ۵۲ (۱۹۱۹ء): ۱ تا ۱۵؛ (۷۲) J. Ruska: *al-Bīrūnī als Quelle für das Leben und* die Schriften al-Rāzīs، در Isis، ۵ (۱۹۲۲ء) : ۲۶ تا ۵۰؛ (۷۲) H. Suter : Das Buch der Auffindung der Sehnen im Kreise von Abu'l-Raihān Muhammed al-Bīrūnī، در Bibl. math.، سلسلہ ۳، ۱۱ (۱۹۰۹ - ۱۹۱۰ء) : ۱۱ تا ۷۸؛ (۷۳) وہی مصنف : Der Verfasser des Buches "Grunde der Tafeln" des Chowārezmī (namlich al-Bīrūnī)، در مجلۂ مذکورہ ۳ (۱۹۰۳ء) : ۱۲۷ تا ۱۲۹؛ (۷۵) وو، لائڈن، بار دوم، بذیل مادہ؛ نیز رک بہ میزان.

(محمد فضل الدین قریشی [و ادارہ])

البِیرہ : عام طور پر ان اضلاع کی جہاں کبھی آرامی زبان بولی جاتی تھی متعدد جگہوں کا نام ہے (البیرہ آرامی لفظ بیرتا، بمعنی قلعہ، حصن، کا ہم معنی ہے : الجزیرہ کے شمال مغرب میں دریاے فرات کے مشرقی کنارے پر واقع البیرہ (موجودہ بیرہ جک [رک باں]) سب سے زیادہ مشہور ہے۔ البیرہ نام کے دوسرے مقامات کے لیے قب یاقوت: معجم (طبع Wüstenfeld)، ۱ : ۷۸۷؛ Nöldeke، در Nachr. der Götting. Ges der Wiss.، ۱۸۷۶ء، ص ۱۱ تا ۱۲؛ ڈخویہ، در BGA، ۴ (حاشیہ و فرہنگ)؛ Le Strange : Palestine under the Moslems، ۱۸۹۰ء، ص ۴۲۳۔

(M. STRECK)

بِیرہ جک : عراق میں دریاے فرات کے بائیں کنارے پر ایک قصبہ۔ بیرہ جک (مقامی لوگوں میں بلہ جک، نیز (قب Sachau کے بیان کے مطابق حلبی بولی میں بیراجک) کے معنی بیرہ کوچک یعنی "چھوٹا قلعہ" ہیں (یہ عربی زبان کے لفظ "بیرہ" اور ترکی زبان کے لاحقۂ تصغیر "جک" سے مرکب ہے)۔ عربی نام البیرہ [رک باں] بعد کے شامی مصنفوں کے ہاں بیرہ Bireh آرامی زبان کے بیرتا birthā (بمعنی قلعہ) سے مشتق ہے۔ بیرہ جک، جو رومنوں کے ہاں (Cumont کے بیان کے مطابق) Birtha مشہور تھا، وہی Makedonopolis نام کا قصبہ ہے جس کا ذکر بعض بوزنطی ماخذ میں آتا ہے۔ محاربات صلیبی سے متعلق لاطینی تاریخوں میں اس قصبے کو بالعموم Bile موسوم کیا گیا ہے۔

بیرہ جک کے مقام پر شمالی شام سے عراق کو جانے والی ایک بڑی شاہراہ دریاے فرات کو عبور کرتی ہے۔ اس مقام پر دریا پہاڑوں سے نکل کر شام و عراق کے میدانوں میں بہتا ہے۔ اسی مقام پر دریاے فرات طوروس کے پہاڑوں سے گزرتے ہوے اُن آبشاروں کو پیچھے چھوڑنے کے بعد جو اس میں بنتے ہیں پہلی مرتبہ جہازرانی کے قابل ہوتا ہے۔ یہاں دریا میں سے چونے کے پتھر کی ایک تن تنہا مخروطی پہاڑی بیرہ جک کے قریب یکایک بلند ہوتی ہے، جسے زمانۂ قدیم سے دریاے فرات کے اس اہم معبر کی حفاظت کی غرض سے قلعہ بند کیا جاتا رہا ہے۔ سلوقی خاندان کے زمانے میں یہاں کشتیوں کا ایک پل موجود تھا، جو دریا کے دائیں کنارے پر زیوجما Zeugma سے بائیں کنارے پر افامیہ Apamea (= بیرتا) تک بنا ہوا تھا (سلوقی نام افامیہ شاید کبھی عام طور پر مستعمل نہیں رہا اور آرامی بیرتا کے مقابلے میں غائب ہو گیا۔ افامیہ، جو ابتدا میں زیوجما کی ایک نواحی بستی تھا، [illegible] ہونے کی بدولت رفتہ رفتہ زیوجما سے کہیں زیادہ اہم بن گیا، اور زیوجما کا نام و نشان مٹ گیا)۔ اس بات کا ثبوت ملتا ہے (قب خلیل الظاہری) کہ پندرھویں صدی کے نصف آخر تک بیرہ جک کے مقام پر دریاے فرات کے راستے پر ایک پل موجود تھا۔

قدیم تر عربی جغرافیائی تصانیف میں البیرہ کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ یہ نام تیرھویں صدی کے وسط میں ایسے رسالوں (مثلاً الدمشقی اور ابوالفداء)

میں پہلی مرتبہ آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی ادب میں البیرہ کے حوالے صلیبی جنگوں کے زمانے میں نمودار ہوئے۔ الرّہا (Edessa) کے لاطینی امرا ۴۹۲ھ / ۱۰۹۸ - ۱۰۹۹ء سے لے کر ۵۴۵ھ / ۱۱۵۰ء تک اس شہر پر قابض رہے، لیکن ۵۳۹ھ / ۱۱۴۴ء میں جب الرّہا کو مسلمانوں نے فتح کر لیا تو عیسائی اسے اپنے قبضے میں رکھنے کے قابل نہ رہے اور انھوں نے اسے بوزنطیوں کے حوالے کر دیا؛ مگر جلد ہی ماردین کے ارتقی امیر نے اسے بوزنطیوں سے چھین لیا۔ تیرھویں صدی میں مغول کے حملوں کے دوران میں البیرہ اپنے تقریبًا ناقابل تسخیر قلعے کے باعث مسلمانوں کے لیے ایک مضبوط دفاعی حصار تھا۔ شام اور مصر کے مملوکوں کو سلطان قایتبای کے دور حکومت میں اوزون حسن کے زیر قیادت آق قویونلو ترکمانوں کے مقابلے میں البیرہ کی مدافعت کرنا پڑی۔ قایتبای نے ۸۸۲ھ / ۱۴۷۷ - ۱۴۷۸ء میں دریاے فرات کے کنارے کے قلعوں کا معائنہ کیا اور کچھ مدت بعد ۸۸۷ھ / ۱۴۸۲ء میں البیرہ کے برج و بارہ کی مرمت اور استحکام کی طرف توجہ کی۔ البیرہ کے حصار پر چھے عربی کتبے ہیں۔ قدیم ترین کتبہ مملوک سلطان برکۃ خان (۶۷۶ھ/۱۲۷۷ء تا ۶۷۸ھ/۱۲۷۹ء) کے زمانے کا ہے، اور قریب ترین زمانے کا کتبہ سلطان قایتبای کے دور حکومت کے سنین ۸۸۷ھ / ۱۴۸۲ء تا ۸۸۸ھ / ۱۴۸۳ء کا ہے۔ سلطان سلیم اوّل کی ۹۲۰ھ / ۱۵۱۴ء تا ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء کی جنگی مہمات کے نتیجے میں البیرہ ترکوں کے زیر حکومت آ گیا اور اسے اُرفہ کی سنجاق میں شامل کر لیا گیا، جو ایالت حلب کا ایک حصہ تھا۔ عثمانی ترک فرات میں اپنے دریائی بیڑے کی ضروریات بہم پہنچانے کے لیے بیرہ جک کے مقام پر ایک چھوٹا سا دریائی مخزن (یا سلاح خانہ) قائم رکھتے تھے۔ ۱۱ ربیع الآخر ۱۲۵۵ھ / ۲۴ جون ۱۸۳۹ء کو بیرہ جک کے قریب ہی نسیب کے مقام پر مصری فوجوں نے ابراہیم پاشا کی سپہ سالاری میں ترکوں پر ایک فیصلہ کن فتح حاصل کی۔ بیرہ جک، جہاں قدیم قلعوں کے کھنڈر اب بھی نظر آتے ہیں، آج کل موجودہ جمہوریۂ ترکیہ کی حدود میں واقع ہے۔ ۱۹۴۵ء میں اس قصبے کی آبادی قریب قریب دس ہزار آٹھ سو نفوس تھی۔

مآخذ: (۱) الدمشقی، ص ۲۰۶ و ۲۱۳؛ (۲) *Gregorii Abulfaragii Histor. Oriental* (= مختصر الدّول)، طبع E. Pococke، آوکسفرڈ ۱۶۶۳ء، ص ۲۰۵ و ۲۱۱؛ (۳) ابوالفداء: تقویم، ص ۲۶۹؛ (۴) مراصد الاطّلاع، طبع A.W.T. Juynboll، Lugduni Batavorum ۱۸۵۰ تا ۱۸۶۴ء، ۱: ۱۸۹؛ (۵) خلیل الظّاہری: زبدۃ کشف الممالک (R. Hartmann: Tübinger Dissert.، ۱۹۰۷ء)، ص ۶۵ و ۸۳؛ (۶) *Beiträge zur Geschichte der Mamlüken-sultane in den Jahren 690-741*، طبع K.V. Zettersteen، لائڈن ۱۹۱۹ء، ص ۴۱۲ (اشاریہ)؛ (۷) ابن ایاس: بدائع الزھور، مرتّبۂ P. Kahle و محمد مصطفیٰ، ۳ (استانبول ۱۹۳۶ء): ۷۷ ببعد و بمواضع کثیرہ؛ (۸) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، استانبول ۱۳۱۴ھ، ۳: ۱۳۵ ببعد؛ (۹) *Relation d'un. Voyage du Sultan Qâitbay en Palestine et en Syrie*، ترجمۂ R. L. Devonshire در *BIFAO*، قاہرہ ۱۹۲۲ء، ۲۰: ۱ تا ۴۰؛ (۱۰) L. Rauwolff: *Aigentliche Beschreibung der Raisz..... inn die Morgenländer*، Laugingen ۱۵۸۳ء، ص ۱۳۸؛ (۱۱) J. B. Tavernier: *Les Six Voyages ..... en Turquie, en Perse, et aux Indes*، پیرس ۱۶۷۶ء، ۱: ۱۶۲ تا ۱۶۳؛ (۱۲) H. Maundrell: *An Account of the Author's Journey from Aleppo to the River Euphrates*، در *A Journey from Aleppo to Jerusalem*، آوکسفرڈ ۱۷۱۴ء، ص ۳ تا ۵؛ (۱۳) R. Pococke:

A Description of the East، ج ۲، لنڈن ۱۷۴۵ء، حصۂ اول، ص ۱۶۰ ببعد؛ (۱۳) J. Otter : Voyage en Turquie et en Perse، پیرس ۱۷۴۸ء، ۱ : ۱۰۸ تا ۱۰۹؛ (۱۵) C. Niebuhr : Reisebeschreibung nach Arabien، کوپن ہیگن ۱۷۷۸ء، ۲ : ۳۱۲؛ (۱۶) J. S. Buckingham : Travels in Mesopotamia، لنڈن ۱۸۲۷ء، ۱ : ۴۵ ببعد؛ (۱۷) C. Sandreczki : Reise nach Mosul und Urmia، Stuttgart ۱۸۵۷ء، ۲ : ۱۱۳ ببعد؛ (۱۸) H. Petermann : Reisen im Orient، لائپزگ ۱۸۶۱ء، ۲ : ۱۷ ببعد؛ (۱۹) J. Oppert : Expédition Scientifique en Mesopotamie، پیرس ۱۸۶۳ء، ۱ : ۴۳ ببعد؛ (۲۰) C. E. Sachau : Reise in Syrien und Mesopotamien، لائپزگ ۱۸۸۳ء، ص ۱۸۰ ببعد؛ (۲۱) H. von Moltke : Briefe über Zustände und Begebenheiten in der Turkei aus den Jahren 1835 bis 1839، برلن ۱۸۷۷ء، ص ۲۰۳، ۲۲۲ تا ۲۲۶، ۲۳۳ تا ۲۳۴، ۲۶۶ ببعد؛ (۲۲) Fr. Spiegel : Eranische Altertumskunde، لائپزگ ۱۸۷۱ء، ۱ : ۱۳۵ ببعد؛ (۲۳) G. Le Strange : Palestine under the Moslems، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۴۲۲؛ (۲۴) V. Chapot : La Frontière de l'Euphrate، پیرس ۱۹۰۷ء، ص ۲۷۴ ببعد؛ (۲۵) F. Cumont : Études Syriennes، پیرس ۱۹۱۷ء، ص ۱۲۰ ببعد، ۱۴۳ ببعد؛ (۲۶) M. Gaudefroy-Demombynes : La Syrie à l'époque des Mamelouks، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۱۰۲، ۱۰۸؛ (۲۷) F. Taeschner : Das anatolische Wegenetz nach osmanischen Quellen (Türkische Bibliothek، ج ۲۲)، لائپزگ ۱۹۲۶ء، ۱ : ۱۹۰؛ (۲۸) R. Dussaud : Topographie Historique de la Syrie Antique et Médiévale، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۴۸۵ (اشاریہ)؛ (۲۹) Cl. Cahen : La Syrie du Nord à l'époque des Croisades، پیرس ۱۹۴۰ء، ص ۱۲۲؛ (۳۰) A History of the Crusades، طبع K. M. Setton، ج ۱ (M. W. Baldwin : The First Hundred Years)، فلاڈلفیا ۱۹۵۵ء، ص ۷۶۶ (اشاریہ)؛ (۳۱) اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی : عثمانلی دولتنن مرکز و بحریہ تشکیلاتی (Turk Tarih Kurumu Yayinlarindan، سلسلہ ۸، عدد ۱۶)، انقرہ ۱۹۴۸ء، ص ۳۰۳ تا ۳۰۵؛ (۳۲) M. van Berchem : Arabische Inschriften، در Beiträge zur Assyriologie und semitischen Sprachwissenschaft، لائپزگ ۱۹۰۹ء، ۷/۱ : ۱۰۱ تا ۱۰۷؛ (۳۳) V. Cuinet : La Turquie d'Asie، پیرس ۱۸۹۱ء، ۲ : ۱۱۳، ۱۲۲، ۲۳۸، ۲۶۵ تا ۲۶۹؛ (۳۴) سامی : قاموس الاعلام، ۲ : ۱۳۰۶ و ۱۳۳۳؛ (۳۵) علی جواد : تاریخ و جغرافیا لغتی، استانبول ۱۳۱۳ – ۱۳۱۴ھ، ص ۲۲۳ تا ۲۲۴؛ (۳۶) لا ۔ انگریزی، بار دوم و لا ۔ ترکی، بذیل مادہ ابراہیم پاشا (۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں نسیب کے مقام پر لڑائی سے متعلق ماخذی اشارات کے لیے)؛ (۳۷) M. Streck، در لا ۔ انگریزی بار اول و عربی بذیل مادہ بیرہ جک۔

([V. J. Parry] و M. Streck)

بیزا : رک بہ باسہ۔

بیزبان : رک بہ (ذلبسز)۔

بیزرہ : [= بزدرۃ (ع)]، پرندوں سے شکار کھیلنے کے فن پر دلالت کرتا ہے، اور فقط باز کے شکار تک محدود نہیں ہے (اس کی فارسی اصل ''باز'' [کے لیے] نیچے دیکھیے) بلکہ ''شاہین پروری کے فن'' کے مفہوم سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ اسے ''بیزار'' (باز پالنے والا) سے مشتق اور فارسی کے ''بازیار'' یا ''باز دار'' کا معرب ہونے کی بنا پر ''بازدر'' کی مثنی صورت پر ترجیح دی جاتی تھی۔ ''بازنۃ'' اور ''بیازہ'' کے الفاظ اسلامی بلاد مغرب میں بہت ہی کم مستعمل تھے۔ اسلام سے پہلے عربوں کو

شکار کرنے والے پرندوں (کاسر، جمع: کواسر) کا استعمال بحیثیت شکاری درندوں (جارح، جمع: جوارح) کے معلوم تھا، چنانچہ امرؤ القیس نے اپنی ''ایام الصید'' میں پرندوں سے شکار کھیلنے کے کچھ نقشے کھینچے ہیں۔ بایں ہمہ شاہین بازی نے ان عظیم اسلامی فتوحات کے بعد ہی عربوں میں اہمیت حاصل کی جن کی وجہ سے ان کا رابطہ ایرانیوں اور بوزنطیوں سے قائم ہوا۔ یہ شکار جلد ہی نئے قائدین میں مقبول ہو گیا، جنھوں نے اس میں تفریح اور اپنے جذبۂ شہسواری کی پر امن تسکین کے امکانات دیکھے۔ خلفا اور عالی رتبہ مسلم حکّام اپنے شوق صیدافگنی کے ساتھ اس قسم کے شکار کو بھی ایک ادارے کے مرتبے تک بلند کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت کرنے لگے، جس کا باقاعدہ ناظم یا داروغۂ شکار (امیر الصید) اور آگے چل کر ''امیر شکار'' مقرر کیا جانے لگا۔ اموی خلیفہ یزید بن معاویہؓ (۶۸۰ تا ۶۸۳ء) اُن سب سے پہلے اشخاص میں تھا جنھوں نے پرندوں سے شکار کھیلنے میں اپنے والہانہ شوق کا ثبوت دیا۔ عربی زبان کے مؤرخوں، سوانح نگاروں اور وقائع نویسوں میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے عہد اور ملک کی شاہین بازی کے مروجہ طریقوں کے متعلق معلومات بہم پہنچائی ہیں اور موقع کے مطابق اس میدان میں خاص خاص ملوک و امرا کے نہایت دلچسپ محاضرات نقل کیے ہیں (دیکھیے الطّبری، ابن الاثیر، السیوطی، المقریزی، ترجمۂ Quatremere، در J. Sauvaget: *Introduct. al'hist. de l'Orient Musulman*)۔ بیزرہ کے متعلق اس سے بھی کہیں زیادہ گرانقدر معلومات بعض ایسی قاموسی کتب میں پائی جاتی ہیں جو ادب یا فقہ اللغہ کے مقاصد کے لیے مرتب کی گئی ہیں، مثلاً الجاحظ: کتاب الحیوان (قاہرہ ۱۹۴۷ء)، ابن سیدہ: المخصص (اسکندریہ ۱۹۰۴ء)، ج ۸ اور ایم۔ طالبی کے تیار کردہ اشاریات، تونس، ۱۹۵۶ء)، القلقشندی: صبح الاعشٰی (قاہرہ ۱۹۱۳ء، ج ۲) اور المسعودی: مروج الذھب۔

المغرب، مسلم ھسپانیہ اور علی ھذا بلاد مشرق میں شکاری پرندوں سے شکار کھیلنے کے شائقین موجود تھے۔ اغلبی افریقیہ میں محمد ثانی (۸۶۴ تا ۸۷۵ء) کو ابوالغرانیق [واحد غرنوق = سارس یا کلنگ] بلا وجہ نہیں کہتے تھے۔ فی الواقع پرندوں سے شکار کھیلنے (لعب) کے اس شوق میں اس نے بے دریغ روپیہ خرچ کر کے سرکاری خزانہ خالی کر دیا تھا (دیکھیے ابن عذاری: البیان، ترجمہ Fagnan، الجزائر ۱۹۰۱ء، ص ۱۴۷ تا ۱۴۸)۔ بعد میں بنو حفص بھی شاہین بازی میں مبتلا ہو گئے تھے اور سامانی بادشاہوں کی طرح المستنصر (۱۲۴۹ تا ۱۲۷۷ء) بنزرت [ارک بان] کے قریب ایک وسیع شکارگاہ (مُصَیَّد) میں ہاتھ پر شکرا لیے چلنے میں خوش ہوتا تھا (دیکھیے ابن خلدون: کتاب العبر، ترجمہ De Slane و Casanova، ۲: ۳۳۸)۔ پندرھویں صدی میں اس کی اولاد میں عثمان (۱۴۳۵ تا ۱۴۸۸ء) ہفتے میں کئی روز اسی تفریح میں گزارا کرتا تھا (دیکھیے R. Brunschvig: *Deux récites de voyage inédits*، پیرس ۱۹۳۶ء، ص ۲۱۲)۔ قرطبہ کے اموی دربار میں امیر شکار (صاحب البیازرہ) فرمانروا کے مقربین میں بڑا عہدے دار ہوتا تھا (دیکھیے ابن عذاری: کتاب مذکور، در E. Levi-Provencal, X's.، پیرس ۱۹۳۲ء، ۱۹۵۵ء)۔ ازمنۂ وسطی میں شاہین بازی کا عام رواج ممالک اسلامی میں بہت سے لوگوں کی روزی کا ذریعہ تھا یہ رواج کسی ممتاز طبقے تک محدود نہ تھا، جیسا کہ مسیحی دنیا میں دستور تھا، بلکہ مسلمانوں میں دیہاتی آبادی اور خانہ بدوش بدوی تک برابر شکار کے گرویدہ رہے اور انھوں نے اس روایت کو بیسویں صدی عیسوی کے

آغاز تک قائم رکھا ۔ اسی حقیقت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شکاری پرندوں کا مسلمانوں کی معاشی زندگی میں کیا حصّہ تھا، خصوصاً ازمنۂ وسطٰی میں جب کہ اس کام نے ایک تجارت کی شکل اختیار کر لی، نیز اس بات سے کہ کتنے اشخاص اس کام کے اہتمام و انصرام کے لیے درکار ہوتے تھے (دیکھیے A. Taias : *La vie économique aux II ème and III ème Siècles de l' Hégire*، عربی میں در مجلۃ المجمع العراقی، ۱۹۵۲ء، ۲ : ۱۷۲ تا ۲۰۱؛ الجاحظ (؟) : کتاب التبصّر بالتجارۃ طبع عبدالوہاب، قاہرہ ۱۹۳۵ء، ص ۳۴ تا ۳۵، ترجمۂ Ch. Pellat، در *Arabica*، ۱ / ۲، ۱۹۵۴ء ص ۱۶۰ تا ۱۶۱)۔

واقعہ یہ ہے کہ باز پالنے والی جماعت کا سردار اکثر و بیشتر اصطلاحی مفہوم میں خود شاہین باز نہیں ہوا کرتا تھا۔ وہ شکار کے دوران میں فقط دستانے (دستبان؛ المغرب : قفّاز) پہن لیا کرتا تھا۔ بازگھر (بیت الطُّیور) کی دیکھ بھال کا کام امیر شکار کے معاونین (غلام، جمع : غلمان) کے سپرد ہوتا تھا، جو بازگھر کو کبوتروں اور دیگر کھانے کے پرندوں سے اچھی طرح معمور رکھنے کے علاوہ بازوں اور شکروں کو سدھانے اور کھلانے پلانے کا کام انجام دیتے تھے۔ باز فن "بیزرہ" کی عام اصطلاح ہے، لیکن ان شکاری پرندوں کی مختلف قسمیں ہوتی تھیں اور ہر قسم کے لیے اس کے سدھانے والے کی خاص قابلیت دیکھنا پڑتی تھی؛ اسے بازیار (جمع : بیازرہ) کہتے تھے (بازیار کی لفظ بیّاز پر ترجیح کے لیے دیکھیے ابن سعید الاکفانی : ارشاد المقاصد، ص ۲۹؛ بیّاز، بیّازی، بیازہ، بازی اور بیزاری کی اصطلاحات شاہین باز کے عام مفہوم میں ہسپانوی مغرب کی ہیں اور اکثر اوقات شکرہ باز (صقّار) کے لیے صقّاز کی اصطلاح ان کی جگہ لے لیتی تھی)۔ ان دونوں قسم کے استادوں کی معاونت اکثر کلاّبازی، یعنی شکاری کتوں کا داروغہ کیا کرتا تھا، جو اپنے تازی کتوں (سلوقی، جمع سلوقیّۃ) کو ہرن یا خرگوش پر چھوڑتا اور بڑا شاہین، گاہے گاہے جرّہ (عربی صقر) بلکہ عقاب بھی منڈلاتا رہتا، ادھر شکاری اپنے کتوں کو ٹھیک فاصلوں پر رکھ کے شکار پر چھوڑتا تھا۔

مشرق میں قابلِ تربیت شکاری پرندوں (فراوہ یا فراہم) کی روایتی طبقہ‌بندی کی بنیاد پردۂ چشم کے سیاہ یا زرد رنگ پر ہوتی تھی، جو امتیازی قوت بصارت پر دلالت کرتا ہے۔ یہ طبقہ‌بندی جدید علم الطیور کے نظام سے عین مطابقت رکھتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "سیاہ‌چشم" پرند صرف طیور شکاری کی ایسی صنف ہی میں پائے جاتے ہیں جنکی آنکھیں ترچھی ہوتی ہیں اور فقط انھیں کی آنکھ کا پردہ سیاہ ہوتا ہے۔ یہ "لمبے پروں اور سپاٹا بھرنے والے" یا لمبی چونچ کے پرند ہیں جو بلندپروازی کے عادی ہوتے ہیں، یعنی بگلے (بلشون) کی پرواز، علٰی ہذا کرکی یا غرنیق کی، کووں (غربان) کی اور وقتاً فوقتاً عقاب، چیل (حداء) اور جنگلی مرغابی (طیرالماء) کی پرواز شامل ہے۔ شکاری پرندوں کی اصطلاحات کی کثرت کو دیکھ کر ایک عربی خوان عموماً پریشان ہو جاتا ہے، مگر اصطلاحات کی یہ کثرت انواع کی بہتات کی وجہ سے اتنی نہیں ہے جتنی اسمائے صفت کی بہت زیادہ بوقلمونی کے باعث ہے جو پرندے کے پروں کے بیشمار طرح طرح کے رنگوں کو ظاہر کرتے ہیں، حالانکہ یہ رنگ پرند کی جنس، عمر اور مسکن کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ اہل عرب نے ایک ہی پرند کی مختلف انواع خیال کر لیں بحالیکہ وہ ایک ہی خاندان کے الگ الگ پرندوں کا سوال تھا اور ان میں نابختہ، بچے، جوان، نر یا مادہ کا بھی امتیاز نہیں کیا۔ تاہم ان ناموں کے انبار میں، انسان دو امدادی طریقوں سے ہر نوع

کے پرندوں کے اسم جنس کا پتا چلا سکتا ہے، اول تو ہر ملک کے طیور کی فہرست سے جو جدید علمی تحقیقات سے مرتب کی گئی ہیں اور دوسری طرف ان تشریحات کی مدد سے جنہیں بڑے بڑے مسلم علمائے طبیعیات نے فراہم کر دیا ہے، مثلاً القزوینی (۱۲۰۳ تا ۱۲۸۳ء) نے اپنی کتاب عجائب المخلوقات میں، الدمیری (۱۳۴۱ تا ۱۴۰۵ء) نے کتاب حیات الحیوان میں، اور خصوصاً ان مصنفین نے جنہوں نے شکار کھیلنے کے فن پر کتابیں لکھی ہیں (دیکھیے نیچے).

چنانچہ صقاران بازوں کے سدھانے والے کو کہتے تھے جو فقط (الف) "روسی باز" (Ger-Falcon، سنقور، شنقور، شنقار) کو سدھاتے تھے۔ یہ قسم بلاد عرب میں ناپید تھی اور بہت خرچ کر کے سائبیریا سے درآمد کرنا پڑتی تھی۔ اور سفیروں کے تبادلے کے موقع پر رسمی تحائف میں اکثر یہ بھی نمایاں ہوا کرتی تھی؛ (ب) جرّہ (صقر، صقر الغزال، شرق، the Saker Falcon)؛ (ج) شاہین شکاری (the Peregrine Falcon)، جس کی تین ذیلی مشرقی اصناف تھیں: شہباز (Perigrinator)، عراقی باز (Babylonicus) اور سفید باز (Calidus) (موسمی باز کے لیے شاہین یا بحری)؛ (د) سیاہ پروں کی چیل Elanus Caeruleus) زرق، صقر ابیض اور فارسی میں کوہی)؛ (ہ) باشق (the Merlin، بوہ، بیوہ، جلم)؛ (و) کونج (the Hobby)؛ (ز) عاسوق (the Kestrel)؛ (ح) عویسق (Lesser Kestrel)؛ (ط) لذیق یا سرخ یا باز (دیکھیے امین معلوف: معجم الحیوان، قاہرہ ۱۹۳۲ء، لیکن ایسے علمی مواد میں جو عموماً قدامت کی وجہ سے بیکار ہو جاتا ہے، بے شمار اغلاط ہونے کی بنا پر اس کتاب کا مطالعہ بڑی احتیاط سے کرنا چاہیے).

اسلامی مغرب میں اس قسم کی شاہین بازی میں شکاری پرندوں کے صرف چار خاندان ہی معروف تھے: صقر یا شکرا (نبلی یا لبلی، اندلسی شہر لبلہ Niebla سے منسوب، جو دخیل لفظ ہونے کی غمازی کرتا ہے)؛ برنی (the Barbary Lanner Falcon)، جو مسیحی بازبازوں کے ہاں Alphanet کہلاتا تھا؛ ترکلی (the barbary Falcon) اور بحری (Falcon eleonorae)؛ دیکھیے (۱) Leo Africanus: *Il Viaggio*، وینس ۱۸۳۷ء، ص ۱۹۶؛ (۲) L. Mercier: *La chasse et les sports chez les Arabs*، پیرس ۱۹۲۷ء، باب پنجم: *La Fauconnerie*، ص ۸۱ تا ۱۰۶ و ماخذ؛ (۳) E. Daumas: *Les chevaux du Sahara*، پیرس ۱۸۵۳ء، مع *Réflexions de l'Emir Abdelkader*، ص ۲۵۹ تا ۲۷۲۔ مذکورۂ بالا چار قسم کے باز المغرب میں "حُر" (یعنی شریف النسل) بتائے گئے ہیں۔ یہ زردچشم طیور جو صرف بازباز ہی تیار کر سکتے ہیں تو ان کی قسم شکار میں کثرت سے استعمال کی جاتی ہے۔ وہ سبھی "بلند پرواز، کوتاہ پر" یا "ہاتھ کے شکرے" (fist-hawks) ہوتے ہیں، جنہیں "نیچی پرواز" کی تربیت دی جاتی ہے۔ یہ نوع زیادہ تر شکرے (accipiter) کی اقسام پر مشتمل ہوتی ہے اور ایران و ترکی کے بعض حصوں میں شاہین خرد (smaller "aquilidae") کو بھی اسی نوع میں شمار کرتے ہیں۔

جرہ (بڑا باز) ہی بلاشبہ ایک ایسا پرندہ ہے جو مشرق کے ہر ملک میں عہد قدیم سے سب سے بڑھ کر مقبول رہا ہے۔ اس کی ذیلی انواع میں باز یا شہباز ہیں۔ یہ بلاد عرب کے طیور سے رشتہ نہیں رکھتی تھیں، لہذا انہیں سوداگر یونان، ترکستان، ایران اور ہندوستان سے درآمد کیا کرتے تھے۔ اسلامی مغرب انہیں بہت ہی کم جانتا تھا۔ اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ باز (جرہ) پیدا ہی فن پرواز کے لیے ہوا تھا۔ اس کا

فارسی نام "باز" اسلام سے پہلے عربی میں آ چکا تھا اور اس کا اطلاق، بظاہر لاعلمی کے باعث، ہر شکاری پرند پر ہوتا تھا۔ اور "بیزرۃ" کی اصطلاح، جس کے معنی ماہرین کے نزدیک شاہین سدھانے کا فن تھے، اسے عام طور پر شکار کھیلنا مراد لیتے تھے۔ اس کے برخلاف یورپ میں شاہین (Falcon) کو (باز اور) جرّے پر فوقیت حاصل تھی لہٰذا وہاں اسے سدھانے کا سارا فن Falconry (بازیاری) کی اصطلاح کے اندر آ جاتا تھا۔ باز کی تعریب کے لیے اس کا ثلاثی (سہ حرفی) مادّہ نکالنا ضروری ہوا تو علمائے لسانیات اور لغت‌نویسوں کو خاصی دقّت پیش آئی۔ اس کے لیے تین متبادل صورتیں تجویز کی گئیں: (الف) ب ز و۔ ب ز ی، ان سے بروے اشتقاق بازٍ البازی، بازیّ اور جمع بُزاۃ، بواز، البوازی اور بِزّان؛ (ب) ب و ز۔ ب ی ز: اس کے مشتقات بنے: باز، جمع أبواز، بِیزان؛ (ج) ب ء ز۔ سے بأز جمع بِئزات، أبْؤز، بُؤوز، بِئزان، بَئز، بِئز۔ باز کے بعد "باشَق" "عُلام" "طُوط" (Sparrow-hawk) Nisus Accipiter چڑی‌مار) تھا اور اس کی چھوٹے پاؤں والی ذیلی قسم جسے "شکرا" ("بیدَق") کہتے ہیں، Accip. badius brevipes جسے اس کی تربیت‌پذیری اور وسیع رقبے میں ہر جگہ ہونے کے باعث ترجیح دی جاتی تھی۔ اس کی مادہ "صاف" تونس میں کیپ‌بون کے مقام پر ابھی تک موسم بہار میں بٹیروں پر چھوڑے جانے میں استعمال ہوتی ہے (دیکھیے D.M. Mathis: *La chasse au Faucon en Tunisie*، در *Bull. Société Sc. Natur. de Tunisie*، ۲: ۳ تا ۴؛ تونس ۱۹۴۹ء، ص ۱۰۷ تا ۱۱۸؛ اور تصاویر؛ وہی مجلہ، در A. Boyer و M. Planiol: *Traité de Fauconnerie et Autourserie*، پیرس ۱۹۴۸ء، ص ۲۳۲ تا ۲۳۸ - L. Lavauden: *La chasse et la faune cynégétique en Tunisie*، تونس ۱۹۲۰ء، ص ۲۰ تا ۲۱: اللطائف، عربی میں، تونس مئی ۱۹۵۵ء، ص ۲۴ تا ۲۷، اور تصاویر)۔

جہاں تک عقابوں کا تعلق ہے انہیں فی الواقع "عِتاقُ الطَّیر" (شکاری پرند) کا درجہ نصیب نہیں ہوا۔ تاہم ایرانی اور ترک "طُغرُل" (Spizaetus cirhatus = Crested Hawk Eagle) اور "زُمّاج" کو (جو Hieraetus fasciatus = Bonelli's Eagle اور H. Pennatus = Booted Eagle دونوں کے لیے آتا ہے) سدھانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ "سرزاہ" (Harriers مارخور شکرہ) اور "سقاوا" (Buzzards چھوٹا عقاب) اپنی ناقابل تربیت تندی کے سبب نظرانداز کر دیے گئے تھے؛ اسی طرح "نسر" (چیل اور گدھ) کو بھی ان کے ذوق مردارخوری کے باعث نہیں سدھاتے تھے۔ ایرانی فن تربیت کو "بُومہ" (Eagle owl بڑا الّو) تک لے جا چکے تھے جو دوسرے شکاری پرندوں کو لگا لانے کا کام کرتا تھا۔ تمام "زردچشم پرند"، "سُمانی"، "سَلوی" (= بٹیر)، "حَجل" (= تیتر)، "قَبج" (= چکور) اور "طَیہوج" (= تیہو)، "قَطا" (= سنگخوار)، "حُباری" (= تغدار)، "عَنقُود" (Ruddy Shieldrake مصری هنس) اور دیگر میدانی اور صحرائی طیور کو مار لانے کے لیے مخصوص کر دیے گئے تھے۔

بیزرہ کی مناسبِ حال فنی تدابیر پر مسلمانوں کے ابتدائی دور میں متعدّد رسائل تصنیف ہوئے، مگر ان میں سے اکثر اب موجود نہیں ہیں۔ ابن النّدیم فہرست میں ایسے دس رسالوں کا ذکر کرتا ہے۔ دوسری طرف مخطوطات کی ایک بڑی تعداد کا، جو یورپ اور مشرق کے ذاتی اور عوامی کتاب‌خانوں میں ہے، ابھی تک مطالعہ نہیں ہوا (قب براکلمان ابواب، بعنوان "Naturwissenschaft" و "Jagged")۔ بایں ہمہ وہ فنی تدابیر، ان کئی ایک تصانیف کے طفیل جن کی پہلے ہی تصحیح اور طباعت

ہو چکی ہے، ہمیں نسبۃً بخوبی معلوم ہو چکی ہیں ۔ ان میں سے قدیم‌ترین کتب کے اصل متن، جو بازیاری پر بحث کرتے ہیں، عجب نہیں کہ روم کے ان لاطینی (مترجمہ) نسخوں کی بنا ہوں جن کی ابھی تک شناخت نہیں ہو سکی، لیکن جنھیں Moamin اور Ghatrif سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ (دیکھیے ان کتابوں کی تصحیح کردہ بہترین ناقدانہ طباعت از تجرنیلڈ H. Tjerneld، سٹاک ہالم و پیرس ۱۹۴۵ء) ۔ کچھ عرصہ ہوا کہ کرد علی شامی کو ''البیزرۃ'' نام کا ایک رسالہ شائع کرنے کا پسندیدہ خیال آیا (دمشق ۱۹۵۳ء) جو خاص فاطمی خلیفہ العزیز باللہ (۹۷۵ تا ۹۹۶ء) کی شاہین‌بازی کے حالات پر لکھا گیا تھا ۔ اس کا نامعلوم مصنف بازیاری میں اپنے طویل تجربے، نیز ماہرین فن بیزرہ (لُعّاب) کے تجربات کے مواد کو ہمارے سامنے اس انداز سے پیش کرتا ہے جو غیر متعلق عبارت آرائی سے معرا ہے ۔ اشعار کی نظیریں بھی صرف ایک خاص باب میں جمع کر دی گئی ہیں ۔ یہ کتاب ان تمام کتب میں سب سے زیادہ قابل قدر ہے جو عربی میں [پرندوں کو] سدھانے کے طریقوں پر اب تک ہمیں دستیاب ہوئیں ۔ اس کتاب کی اشاعت ہی کے قریبی زمانے میں اسعد طلس نے عربی کی قدیم‌ترین معلومہ کتاب المصاید و المطارد، جو مشہور شاعر الکُشاجم (م ۹۶۱ء یا ۹۷۱ء) کی تصنیف ہے، تصحیح کر کے شائع کی (بغداد ۱۹۵۴ء) (قب براکلمان، ۱: ۸۵ و تکملہ، ۱: ۱۳۷، طلس، در مجلۃ [المجمع العلمی العراقی ۲: ۲۸۸]، ... و مقدمہ کتاب المصاید، تحلیل و تجزیۂ کتاب) ۔ شکار اور بازیاری پر یہ جامع رسالہ ان مآخذ میں ہے جن سے صیدافگنی کی کتب کے متاخر مصنفین نے سب سے زیادہ استفادہ کیا ۔ بدقسمتی سے اس کتاب میں ''ادب'' کے ساتھ حد سے زیادہ توغل مترشح ہے، جس نے اسے عملی اہمیت سے محروم کر دیا ہے ۔ بخلاف اس کے اسامہ بن منقذ (م ۱۱۸۸ء) کی کتاب الاعتبار (طبع فلپ حتی، پرنسٹن ۱۹۳۰ء، باب سوم، ص ۱۹۲ تا ۲۲۹) میں ''بازیاری کی یادیں'' ہیں، جو نہیں زیادہ شگفتہ اور مفید ہیں ۔ یہ کتاب صلیبی جنگوں کے زمانے میں تالیف ہوئی تھی (دیکھیے Derenbourg : Vie d'Ousâma، ... اور متون پیرس ۱۸۸۵ اور ۱۸۹۳ء) ۔ مملوک محمد [بن] منکلی کی کتاب انس الملا بوحش الفلا ۱۳۷۱ء میں لکھی گئی (قب براکلمان، ۲: ۱۳۶ و تکملۃ، ۲: ۱۶۷) اور Florian Pharaon کے معمولی درجے کے فرانسیسی ترجمے کے ساتھ شائع ہوئی (پیرس ۱۸۸۰ء)، لیکن جب سے کشاجم کا رسالہ دستیاب ہوا ہے اس کی زیادہ قدر و قیمت باقی نہیں رہی ۔ اس کے علاوہ ''بیزرۃ'' کا بند آمیز نظموں میں بھی ذکر آتا ہے، مثلاً المغربی الفحیمی (م ۱۰۳۰ء) کے ۲۱۳ اشعار کے قصیدے میں (براکلمان، ۲: ۳۶۱)، اور عیسی الازدی (دسویں صدی عیسوی؟) نامی ایک شخص کی الجمہرۃ فی البیزرۃ (مخطوطۂ اسکوریال، شمارہ ۹۰۳) میں جس کا منکلی اکثر حوالہ دیتا ہے ۔ یہ نظمیں اس قابل ہیں کہ انھیں شائع کر دیا جائے، اگرچہ L. Mercier پہلے ہی ان سے نقل اٹھا چکا ہے (کتاب مذکور) ! مزید برآں اس نے الفاکہی (م ۱۳۵۱ء) اور الاشعری (۱۳۳۳ء) کے مخطوطات بھی استعمال کیے ہیں (مخطوطات پیرس، بی۔ این شمارہ ۲۸۳۱ اور ۲۸۳۳) ۔ طلس (مجلۃ) نے اصل متن مذکور کے ساتھ پرندوں سے شکار کھیلنے کے موضوع پر ابن نُباتہ (۱۲۸۷۔۱۳۶۶ء) کا نفیس ارجوزہ بعنوان فرائد السلوک فی مصاید الملوک بھی شامل کر دیا ہے ۔

ان سب عربی متنوں کے پڑھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر نوع کے شکاری پرندوں کو

پھانسنے اور سدھانے کے تقریبًا ایک ہی جیسے طریقے تھے ۔ باز کے بچے کو اس کے گھونسلے سے ایسی حالت میں پکڑتے جب وہ بے بال و پر یا کچی چونچ کا (غطراف یا غطریف) ہوتا، یا گھونسلا چھوڑ کر شاخ پر بیٹھنے والا (ناہض) ہوتا ۔ سرخ باز (فرخ) یا وحشی (haggard نوگرفتار شکرہ)، بلدی (= مقامی) یا قاطع یا راجع (= موسمی پردیسی) ہوتا تو اسے لاسے یا پھندوں والے جال کے ذریعے اور زیادہ تر ’’بازک‘‘ (شکار پھانسنے والی چڑیا) کے ذریعے پکڑتے تھے (قب ابن منقذ: کتاب مذکور میں جھونپڑی کا طریقہ، ص ۲۰۰ تا ۲۰۱ ؛ M. Planiol : کتاب مذکور، ص ۱۵۴ تا ۱۵۶) ۔ جب اسے پکڑ لیا جاتا تو اسے سدھایا جاتا (تعبیر ۔ تہذی) اس کے پپوٹوں کو سی دیا جاتا (خبط) اور اسے بھوکا رکھ کر (: تجویع، تنقیص)، دھیما کیا جاتا، گھٹایا جاتا اور پھر بتدریج اس کے پپوٹوں کو کھولا جاتا اور اسے ترغیب دی جاتی کہ وہ اپنی مرضی سے کلائی پر آ جائے ۔ یہ ترغیب اسے ’’تلقیم‘‘ (لقمے دے کر) اور ’’تلقف‘‘ (زندہ شکار کے گوشت) کا لالچ دے کر دی جاتی تھی ۔ جب وہ رام ہو جاتا اور بلانے پر مٹھی یا کلائی پر بیٹھنے لگتا تو اسے ڈوری (طلوالۃ) میں باندھ دیا جاتا اور پھر اس کے مختلف قسم کے شکار پر جھپٹنے کی تربیت کا آغاز ہوتا ۔ اس کے سامنے سدھانے کے پرند (ضریۃ) چھوڑنے سے اس کی جبلت گوشت خوری اور لپکنے کا شوق (ضراوۃ) ترقی کر جاتا تھا ۔ یہ ترغیبی پرند ان انواع سے منتخب کیے جاتے تھے جن کے شکار کے لیے انہیں سدھایا جاتا تھا ۔ ان مشقوں کو ترتیب کے ساتھ اور ہر دفعہ دور تر فاصلے سے برابر دہراتے رہتے تھے ۔ جب وہ شکار کے پیچھے چھوڑنے کے قابل (مستوی الارسال) ہو جاتا تو پھر اس ’’شاگرد‘‘ کے بازوؤں میں سیے (سلاذان) اور گھنگرو (اجراس ’’جلاجل‘‘) ڈال دیے جاتے ۔ اور وہ اپنے سر پر چمڑے کی ٹوپی (برقع، کمۃ؛ مغرب میں: کنبل) اور ’’شکاری پوشش‘‘ (= قباء) پہننے کا عادی ہو جاتا تھا اور بازاروں اور منڈیوں کی بھیڑ بھاڑ میں گھنٹوں تک لیے پھرنے سے اسے انسانوں سے قدرے انس ہو جاتا تھا ۔ جب وہ ایک بار آدمیوں، گھوڑوں، کتوں، اور پالتو جانوروں سے مانوس ہو جاتا تو اسے شکار گاہوں میں لے جاتے اور پوری آزادی دے کر مرغابیوں اور چڑیوں پر چھوڑتے تھے ۔ وہ ڈھول کی آواز پر جو شکاری کی زین سے منسلک ہوتا لوٹ کر آ جاتا (دیکھیے L. Mercier : کتاب مذکور، ص ۹۸) اور اسے اپنے شکاروں میں سے کسی ایک سے لطف اندوز ہونے کی اجازت دے دی جاتی تھی۔

اسلامی مغرب میں تربیت نفاست کے اس درجے تک نہیں دی جاتی تھی بلکہ شہباز پرندے کو ہمیشہ اس کی جوانی میں پکڑا جاتا اور تھوڑی سی ضروری تربیت دے کر جاڑوں میں شکار پر چھوڑا جاتا تھا (قب L. Mercier : کتاب مذکور، ص ۹۶ تا ۱۰۴) ۔ باز کے سستانے کی خاطر اسے لکڑی کے کندے (حمولۃ، قفاز) یا چھتری (عارضۃ، کندرۃ) پر بٹھا دیا جاتا اور اس کے نہانے کی کنڈالی کے قریب اسے دھوپ (تشریق) بھی دی جاتی تھی ۔ اس کے کرپر کرنے (قرنصۃ، تکریز) کے زمانے میں اسے ہر آواز سے دور رکھا جاتا تھا اور اس کے چرنے (ذرق، رجیع) کی نگرانی رکھی جاتی تھی ۔ اس طرح اسے پورا تندرست رکھنے کا اطمینان کیا جاتا تھا ۔ بیزرہ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں طویل باب شکاری پرندوں کے مخصوص امراض کی تشخیص اور ان کے علاج کے لیے وقف ہیں اور ان میں اکثر ٹوٹکے اور وحشیانہ قسم کی تدابیر کے ساتھ حفظانِ صحت کے متعلق نصائح

بھی شامل ہیں۔

پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقت سے یہ سوال اٹھایا جاتا رہا ہے کہ آیا قرآن مجید کی رو سے ایک سدھائے ہوئے شکاری پرند (باز، شکرہ) کے ذریعے پکڑے ہوئے شکار کا کھانا حلال ہے یا نہیں؟ سوال یہ تھا کہ پرندے کو شریعت کے مطابق ذبح کرنا واجب ہے یا نہیں؟ ـ ابن رشد: بدایۃ المجتہد . . . (قب ابن رشد: Le livre de la chasse، بدایۃ کا اقتباس، ترجمہ اور متن مع حواشی از F. Viré در Revue Tunisienne de Droit، شمارہ ۳ تا ۴، تونس ۱۹۵۴ء، ص ۲۲۸ تا ۲۵۹) فقہ کے چاروں مذاہب میں سے ہر ایک نے جو موقف اختیار کیا ہے اس کا واضح حال بیان کرتا ہے۔ بازیاری اور شکار پر جتنی بھی کتب ہیں ان میں بھی مسئلہ مقدمۂ کتاب کی صورت میں ہوا کرتا ہے۔

دوسری طرف نظر کیجیے تو بیزرہ شعر گوئی کا خاص محرک بن گیا اور بنو امیہ کے عہد سے شکار پکڑنے کے شوق کے ساتھ مقبول عام رجز کی نظموں کے بڑے بڑے موضوعات میں سے ایک موضوع ہو گیا۔ دراصل "ارجوزہ" جو رسمی قسم کے معیاری قصیدے سے زیادہ سلیس و شگفتہ صنف تھی، اس نے الشماخ (م ۲۲ھ / ۶۴۲ - ۶۴۳ء)، العجاج (م ۸۹ھ / ۷۰۷ - ۷۰۸ء)، اس کے بیٹے رؤبۃ (م ۱۴۵ھ / ۷۶۲ء) اور بعض شاعروں کے ہاں تھوڑے ہی دن میں "طردیۃ" (یعنی صیدافگنی کی شاعری) کی مخصوص صورت اختیار کر لی۔ متاخرانہ طرز کو، جو بنوعباس کے عہد میں نہایت مقبول و مروج تھی، شاعری کے بڑے بڑے استادوں، ابو نواس، ابن المعتز، کشاجم، اور الناشی نے [illegible] غریب الفاظ داخل کر لانے اور اس طرح اپنی [illegible] دکھانے کا موقع فراہم کر دیا (Ch. Pellat : Langue et Littérature Arabes، پیرس ۱۹۵۳ء، ص ۱۰۸ تا ۱۰۹) ("طردیات" پر دیکھیے وہی مصنف: Le milieu basrien، ص ۱۶۰ ببعد و حواشی۔ ("طردیات" (شکارنامے) شعرا کے دیوانوں میں پائے جاتے ہیں؛ الجاحظ نے اپنی کتاب الحیوان میں بیشتر ابو نواس کے طردیات کے شعر نقل کیے ہیں)۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ عنعنیت کی اس نمائش نے ان لوگوں کو جو اس کے شائق تھے ایسی زبان اختیار کرنے پر مائل کر دیا جو خود شائقین شکار کی زبان سے بہت ہی کم ملتی تھی۔ ہسپانیہ کے مسلم دور حکومت میں شاعر خصوصاً گیارھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد زیادہ تر بازیاری کے موضوع سے خوب خوب کام لیتے رہے، کیونکہ ایسی چیز ان کی فطری فطرت پرست نگاہ سے نہ بچ سکتی تھی۔ وہ اس میں ایسا جذباتی رنگ بھرنے میں بھی کامیاب ہو گئے جس سے مشرقی شعرا آشنا نہ تھے (قب H. Pérès : Poésie Andalouse، پیرس ۱۹۵۳ء، ص ۲۳۶ تا ۲۳۹)۔ عالمانہ زبان میں ان تخلیقات کے علاوہ بڑے بڑے عرب بدویوں کی بازیاری پر ایک طولانی اور محفوظ شاعری عظیم بدوی گروہوں کی خود اپنی مقامی بولیوں میں تھی۔ اس ضمن میں یہ لکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ قبائل طوارق (Touaregs) بازیاری کے فن سے کبھی آشنا نہیں ہوئے (قب H. Lhote : La chasse chez les Touaregs، پیرس ۱۹۵۱ء)۔ شعرا کے کلام کو منتخب کرنے والے عرب علما "کوارئی" بولی کو حقیر سمجھتے تھے، اس بات نے ان بدوی "گیتوں" سے ہمیں محروم کر دیا جن کی بالکل قریبی زمانے تک صحرا کے دور دراز علاقوں میں بڑی توقیر ہوتی تھی۔ ان میں شکرے کی پرواز اور اس کے شکار کی کیفیت ایسی حقیقت پسندی سے بیان کی گئی ہے کہ اساتذہ کے معیاری کلام میں اس کی نظیر ملنا دشوار ہے (قب

M. Sidoun : Chants sur la chasse au faucon attribués à El-Hadj Aissa, Chérif de Laghouat، در R. Afr.، شمارہ ۵۲ تا ۵۳، ۱۹۰۸ء؛ ص ۲۷۴ تا ۲۹۶ (متن، تراجم اور حواشی)۔

شکاری پرندے نے مسلمانوں کے فنون جمیلہ میں اثر آفرین موضوع کی حیثیت سے جو بڑا کردار ادا کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فی الواقع اظہار کے ان فنکارانہ طریقوں میں، جیسے مرقع کشی، پتھر، گچ، لکڑی اور ہاتھی دانت کے نقش و نگار، بلور اور تانبے میں کندہ کاری، کانسی، مینے اور قیمتی دھاتوں میں آرائشی حاشیے، کوزہ گری، غالیچہ بافی، زربافی، یہ سب اپنے بیش بہا کارناموں میں بہت کچھ شاہین کے موضوع کے مرہون منت ہیں۔ بلاشبہ اسی موضوع اور اس کی بےشمار تعبیرات ہی سے مشرق و مغرب کے مسلمانوں کے فنون نے اپنی بہت سی خصوصیات حاصل کی ہیں (قب A. U. Pope : A survey of Persian Art، آکسفرڈ ۱۹۳۹ء؛ G. Migeon : L'Art Musulman، پیرس ۱۹۵۷ء؛ G. Marçais : L'Art del'Islam، پیرس ۱۹۴۶ء)۔ آخر میں ہم اس بات کا اضافہ کرتے ہیں کہ اسی موضوع سے بعد میں مملوک سلاطین کی تزئینات اور شاہی نشانات میں نہایت کثیر شمار میں فائدہ اٹھایا گیا ہے (قب L. A. Mayer : Saracenic Heraldry، آکسفرڈ ۱۹۳۳ء؛ Artin Pacha : Cont. a l'étud du blason en Orient، لنڈن ۱۹۰۲ء)۔

مآخذ : متن میں دیے ہوئے حوالوں کے علاوہ (۱) D. C. Phillott : The Bāz Nāma-i-Nāṣirī, A Persian Treatise on falconry، لنڈن ۱۹۰۸ء؛ (۲) L. Mercier : La Parure des Cavaliers et l'Insigne des Preux، ابن هُذَیل الاندلسی کی کتاب حلیة الفرسان کا فرانسیسی ترجمہ، پیرس ۱۹۲۴ء، ص ۲۰۰ تا ۲۰۳ و ماخذ؛ (۳) ز۔ ایم۔ حسن : Hunting as practised in Arab countries of the Middle Ages، گورنمنٹ پریس، قاہرہ ۱۹۳۷ء؛ (۴) R.F.E. : La chasse au faucon dans les Hauts du Constantinois، در Rev. "TAM"، ص ۳۲، الجزائر ۱۹۴۸ء؛ (۵) G. Dementieff : La Fauconnerie en Russie, Esquisse historique، در Rev. Française d'Ornithologie، ج ۱۱۵، ۱۹۴۵ء، ص ۹ تا ۳۹۔

(F. VIRÉ)

بیزستان : رک بہ قیصریہ۔

بیزور : رک بہ بازہر۔

بیزیتا : رک بہ ددو (Dido)۔

بیسان : دریائے اردن کی وادی میں ایک چھوٹا سا فلسطینی قصبہ جو جھیل طبریہ کے جنوب میں اٹھارہ میل (تیس کیلومیٹر) کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ سطح سمندر سے اٹھانوے میٹر کی بلندی پر ایک مسطح مقام پر واقع ہے اور اس نشیبی زمین سے ۱۲۰ میٹر اونچا ہے جس میں ہو کر کچھ فاصلے پر دریائے اردن گزرتا ہے۔ اس طرح یہ منطقۂ حارہ کی اس شدید گرمی سے محفوظ ہو گیا ہے جس کا شکار غور (رک بآں) کے علاقے کا ہر مقام ہے۔ اس کے باوجود اس کی آب و ہوا گرم اور مرطوب ہے جس کا ذکر عرب جغرافیہ دان ہمیشہ برائی کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے خراب پانی کا ذکر بھی انھی کے ساتھ کرتے ہیں (تاہم انھوں نے عین الفلوس نامی اس چشمے کا ذکر بھی کیا ہے جس کے متعلق عام طور سے یہ مشہور ہے کہ وہ جنت کے چار چشموں میں سے ایک ہے)۔ پہلے زمانے میں آب پاشی کی مدد سے دھان کی کاشت ہوتی تھی جو المقدسی کے عہد میں ملک کی ایک دولت سمجھی جاتی تھی۔ رہے وہ نخلستان جن کا ذکر روایتوں میں آیا ہے تو جغرافیہ دان یاقوت تو ساتویں

صدی هجری / تیرهویں صدی عیسوی میں وهاں صرف دو کهجور کے درخت نظر آئے تهے ۔ ان سب باتوں کے باوجود بیسان کی خوش‌قسمتی یه هے که وه آمد و رفت کی اس خاص آبی شاهراه پر جو دمشق اور اندرون شام کو گیلیلی Galilee سے، اور پهر مصر اور ساحل روم سے ملاتی هے، ایک شاندار تجارتی اور فوجی اهمیت کے مقام پر واقع هے اور اس لیے بے شمار تاریخی انقلابات کے باوجود اس کی شهری حیثیت آج تک محفوظ هے۔

تل الحصن کی کهدائیوں سے جو دهات کی سطح تک پهنچ گئی هیں یه بات ثابت هو چکی هے که یه شهر تین هزار سال پهلے بهی موجود تها ۔ همیں اب اس بات کا بهی علم هے که بت شان (Bethšan) یا بت شعان (Bethše'an) میں مصریوں کے مفاد موجود تهے اور اس کا نام انهوں نے بدل کر ب ت ش ع ر رکهه دیا تها اور جو Megiddo کے میدانوں میں Thutmoses سوم کی فتح کے بعد تین صدی تک ان کے قبضے میں رها، چنانچه ان کے اس قبضے کے متعدد آثار باقی هیں ۔ اس کے بعد یه اهم گاؤں جس پر فلسطینی، اسرائیلی اور مدائنی سب کی للچائی هوئی نظریں پڑتی تهیں اور جو ایک زمانے میں [حضرت] سلیمانؑ کی سلطنت کا ایک حصه تها اور همیشه یهودیت کا دشمن رها ۔ یونانیوں اور رومیوں کے زمانوں میں سکائی تهوپولس Scythopolis کے نام سے ڈکاپولس Decapolis کے اهم ترین شهروں میں شمار هونے لگا ۔ یونانیت وهاں خوب پهولی پهلی اور آگے چل کر عیسائیت نے یهاں جو فتح حاصل کی وه متعدد کنیسا اور خانقاهیں بن جانے سے مسلم هو گئی ۔ اس کا اسقف فلسطین ثانیه کا اسقف اعظم تها اور انبیائے کرام اور اولیاء الله کی سوانح عمریوں کا معروف مصنف سکائیتهوپولس کا باشنده سِرِل Cyril اسی جگه پیدا هوا تها۔

اولین عرب حملوں کا رخ اسی طرف تها، چنانچه ۱۳ھ / ۶۳۴ء میں حضرت خالدؓ بن ولید کے لشکر نے جب ایک بوزنطی فوج پر حمله کر کے اس کا خاتمه کر دیا تو شهر کو اس کا پرانا دیسی نام مل گیا اور اس نے آهسته آهسته بیسان کی صورت اختیار کر لی ۔ ۱۵ھ / ۶۳۶ء میں جب حضرت شرحبیلؓ بن حسنة نے اردن کے علاقے کو فتح کیا تها تو اس شهر پر یقیناً قبضه هو چکا تها اور اسے حضرت ابو عبیدةؓ بن جراح، جن کا مزار بعض مصنفین کے بیان کے مطابق یهیں واقع هے یقیناً دیکهه چکے تهے ۔ معلوم هوتا هے که جند الاردن کے اضلاع میں سے ایک ضلعے کا انتظامی مرکز هونے کی وجه سے باغوں سے گهرا هوا یه شهر بڑے سکون اور اطمینان سے ترقی کرتا رها، یهاں تک که پهلی صلیبی جنگ میں فرنگیوں نے اس پر حمله کیا اور جب Tancred نے ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء میں اس پر قبضه کر لیا تو اسے بیت المقدس کی لاطینی سلطنت سے ملحق کر دیا گیا ۔ انهوں نے بیسان کی نوابی جاگیرداری (barony) تو قائم کر دی، لیکن اسقفی حکومت کو ناصره (Nazareth) منتقل کر دیا ۔ اس کی تاریخ اسی طرح برابر پرآشوب رهی ۔ جب صلاح الدین نے ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء میں اسے دوباره فتح کیا تو مسلمانوں کے حملوں کا بهی خاتمه هو گیا ۔ بعد ازاں پانچویں صلیبی جنگ میں فرنگیوں نے اس پر پهر یلغار کی اور ۶۱۴ھ / ۱۲۱۷ء میں اسے تاخت و تاراج کر دیا ۔ اسے مغولوں کے حملے سے بهی کاری ضرب لگی جنهیں ۶۵۸ھ / ۱۲۵۹ - ۱۲۶۰ء میں اس قصبے کے قریب عین جالوت (رلڈ بان) کے مقام پر شکست هوئی، لیکن آگے چل کر مملوکوں کے عهد میں یه شهر صوبهٔ دمشق کے دوسرے جنوبی سرحدی ضلع میں ایک "ولایة" کا دارالحکومت بن گیا ۔ اسی

عہد میں اس کے بالکل قرب و جوار میں موجودہ ریلوے لائن کے راستے پر سلار کی کارواں سراے تعمیر ہوئی۔ اس سراے کو گھوڑ سوار قاصد استعمال کیا کرتے تھے۔ امیر وزارت ابن فضل اللہ کی کوشش سے ۷۴۱ھ / ۱۳۴۰ء میں ان قاصدوں کی گزرگاہ میں تبدیلی کی گئی۔

مآخذ: (۱) F.M. Abel: *Géographie de la Palestine*، پیرس ۱۹۳۳ء - ۱۹۳۸ء، خصوصاً ۲: ۲۸۰ تا ۲۸۱ (رک بہ Bethšan) بحوالہ Rowe: *Beth-Shan Topography and History*، ۱۹۳۰ء و متعدد مقالات در *Revue Biblique*، خصوصاً ۱۹۲۲ء اور ۱۹۳۰ء کے برسوں کے درمیان؛ (۲) G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*، لنڈن ۱۸۹۰ء، خصوصاً ص ۴۱۰ تا ۴۱۱؛ (۳) A. S. Marmardji: *Textes géographiques*، پیرس ۱۹۵۱ء، ص ۲۷ تا ۲۸؛ (۴) Caetani: *Annali*، بمدد اشاریات (۲: ۱۲۸۹ اور ۶: ۳۲)؛ (۵) وہی مصنف: *Chronographia*، ص ۱۰۰، تا ۱۰۱، ۱۲۹؛ (۶) البلاذری: فتوح، ص ۱۱۶؛ (۷) الطبری: بامداد اشاریہ خصوصاً ۱: ۲۱۰۷ تا ۲۱۰۸؛ (۸) ابن الأثیر: بامداد اشاریہ؛ خصوصاً ۲: ۳۹۱؛ (۹) *Hist. Or. Cr.*، بمدد اشاریات؛ (۱۰) ہروی: کتاب الزیارات، طبع Sourdel-Thomine، دمشق ۱۹۵۳ء، ص ۱۲ (ترجمہ دمشق ۱۹۵۷ء، ص ۳۵)؛ (۱۱) یاقوت ۱: ۷۸۸؛ (۱۲) البکری: معجم ما استعجم، طبع وسٹنفلٹ Wüstenfeld، ص ۱۸۸؛ (۱۳) ابوالفداء: تقویم، ص ۲۴۳؛ (۱۴) R. Grousset: *Hist. des Croisades*، ۱۹۳۴ء، ص ۳۹، بمدد اشاریہ؛ خصوصاً ۱: ۱۲۹ تا ۱۸۱ و ۲: ۲۰۱ تا ۲۰۳؛ (۱۵) M. Gaudefroy-Demombynes: *La Syrie à l'époque des Mamelouks*، پیرس ۱۹۲۳ء، خصوصاً ص ۳۹ اور ۱۲۹؛ (۱۶) J. Sauvaget: *La poste aux chevaux*، پیرس ۱۹۴۱ء، ص ۳۷ تا ۵۷۔

(J. SOURDEL-THOMINE)

بِیسُتُون: (عرب جغرافیہ نویسوں کے ہاں بہستون، موجودہ مقامی محاورہ میں بیستون)، بغداد سے ہمدان جانے والی شاہراہ پر کرمانشاہ سے تقریباً ۳۰ کیلومیٹر مشرق میں ایک پہاڑ ہے۔

یہ نام یونانی مآخذ میں (Diodorus ۲: ۱۳، ۱) اور Charax کے Isidore کے ہاں τὸ Βαγίστανον ὄρος کی شکل میں، ابتدائی اسلامی دور کے مصنفین (مثلاً الخوارزمی اور حمزۃ الاصفہانی) کے ہاں بغستان کے متروک نام سے اور قدیم فارسی میں باغستانہ (دیوتاؤں کا مقام) کے نام سے ملتا ہے۔ بعد کے مسلمان مصنفین کے ہاں اس نام کی صورت بہستون (بہستون) ہے جو موجودہ زمانے میں بیستون (بیستون) بن گیا۔ عراق سے خراسان جانے والی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے اس کا ذکر عربی ادبیات میں بہت سی جگہ آیا ہے۔

سڑک سے بہت بلندی پر داراے اعظم کا مشہور منقش کتبہ ہے جس پر تین زبانوں، یعنی قدیم فارسی، اکدی (Accadian) اور عیلامی (Elamite) میں میخی خط کی (cuneiform) تحریریں ہیں۔ نیچے کی شاہراہ کے برابر پارتھی بادشاہ گودرز (Gotarzes) کی فوجی قیامگاہ تھی، لیکن بد قسمتی سے ایک جدید فارسی کتبے کی وجہ سے یہ تحریر مٹ چکی ہے۔

مسلمان بیستون کو عجائب عالم میں سے ایک سمجھتے تھے۔ ان مصنفوں کی کتابوں میں جنھوں نے ابو زید بلخی کا تتبع کیا ہے ان کتبوں کا مختصر ذکر ملتا ہے، لیکن یہ بیان محض خیالی ہے، اس لیے کہ بیستون کے مجسموں اور قریب کے طاق بستان کے مجسموں کے درمیان التباس پیدا ہو گیا ہے۔ (خیال کیا جاتا ہے کہ یہ خسرو پرویز ثانی اور اس کے گھوڑے کا مجسمہ ہے جو قطوس بن سنمار کا تراشا ہوا ہے)۔ ابن حوقل نے دارا اور اس کے قیدیوں کے مجسموں کی

عجیب و غریب توجیہ کی ہے اور انہیں استاد اور شاگردوں کے مجسمے بتایا ہے ۔ اکثر مسلم مصنفوں کا خیال ہے کہ یہ مجسمے شیریں اور خسرو ثانی کے ہیں۔

دارا کا مثلث شکل کا کتبہ تمام میخی کتبات کے پڑھنے میں ممد ثابت ہوا۔

مآخذ: (۱) Le Strange، ص ۱۸۷؛ (۲) الخوارزمی (طبع Vloten)، ص ۱۱۱؛ (۳) عرب جغرافیہ نویسوں کا اختصار Schwarz : Iran im Mittelalter، جلد ۴، لائپزگ ۱۹۲۱ء، ص ۴۸۷ بعد میں دیا ہے؛ (۴) قدیم فارسی کتبات کے لیے تب R. G. Kent : *Old Persian*، New Haven ۱۹۵۳ء، ص ۱۰۸؛ (۵) عکسی تصاویر کے لیے دیکھیے F. Sarre و E. Herzfeld : *Iranische Felsreliefs*، ص ۱۸۹ تا ۱۹۸، الواح ۳۳ تا ۵۰؛ [(۶) بطرس البستانی: دائرة المعارف، بذیل بہستون].

(E. Herzfeld و (R. N. Frye))

- **بِیستی** : رَکَ بہ سکّہ۔
- **بِیشة** : مغربی عرب میں ایک نخلستان جو اسی نام کی ایک وادی [= ندی] کے کناروں پر ۲۰ درجے شمالی عرض بلد کے متصل شمال میں تقریباً پچیس میل تک پھیلا ہوا ہے ۔ اس وادی کے سر چشمے عسیر کے خطۂ مرتفع میں ابہا کے مشرق میں ہیں اور یہ ندی وادی رنیة سے جا ملنے کے مقام تک جانب شمال تقریباً چار سو میل تک چلی گئی ہے جہاں سے یہ دونوں ندیاں مل کر وادی تثلیث اور وادی الدواسر کے اندرونی علاقے کی طرف بڑھ جاتی ہیں (رک بہ الدواسر) ۔ اس کے معاون ہرجاب اور ترج علی الترتیب اور مغرب سے آتے ہیں اور نخلستان بیشہ کے جنوب میں وادی بیشہ میں آ کر گرتے ہیں، اور وادی تبالة (رک بہ تبالة) وادی بیشہ سے نخلستان کے عین وسط میں آ کر ملتی ہے ۔ متقدم شعرا بیشہ کا اکثر و بیشتر ذکر کرتے ہیں، لیکن کاہے کہ بیشی نام کی وادی اور بیشی کے ساتھ جو تہامة عسیر میں ہے اسے ملتبس کر دیتے ہیں (دیکھیے A. Sprenger : *Die alte Geogr. Arabiens*، برن Bern ۱۸۷۵ء).

نخلستان بیشة اپنی کھجوروں کے لیے مشہور ہے، جنھیں جیزان تک لے جایا جاتا ہے اور گرد و نواح کے بدوی سفید اونٹوں کی ایک مشہور نسل پالتے ہیں جو اوارک (یعنی اراک کے پتے کھانے والے) کے نام سے معروف ہے ۔ بیشة، الطائف اور الریاض سے ابہا، نجران اور تمام جنوب مغربی عرب کو جانے والے راستوں کے مقام اتصال پر ہونے کی وجہ سے بخور، حج اور حملہ‌آوروں کے راستوں پر ایک اہم منزل ہے ۔ نمران اور الروشن (یاقوت کا روشان؟) اس نخلستان کے بڑے قصبے ہیں، نمران اس خطے کی اہم‌ترین منڈی اور الروشن جہاں قلعۂ بیشة واقع ہے جہاں سعودی عرب کا امیر ضلع اقامت رکھتا ہے ۔ الروشن، روشن آل مہدی اور روشن بنی سلول میں منقسم ہے ۔ اس کی دوسری بستیوں اور دیہات میں الدحو، عقاف الجبرة، الرتیطا، النقیم، الشقیقة اور الجنینة شامل ہیں۔

یاقوت نے بیشة کے قبیلوں کی یہ فہرست مرتب کی ہے ۔ خثعم، ہلال، سواءة بن عامر بن صعصعة، سلول، عقیل، الضباب اور قریش کے بنو ہاشم ۔ آج کل شہران اور اکلب (یہ دونوں ہی خثعم کی شاخیں ہیں) کے بعض عناصر، بنی سلول اور قحطان کا غلبہ ہے۔

مآخذ: الہمدانی اور یاقوت کے علاوہ: (۱) فؤاد حمزة: فی بلاد عسیر، قاہرة ۱۹۵۱ء؛ (۲) محمد بن بلیہد: صحیح الاخبار، قاہرة ۱۳۷۰ - ۱۳۷۳ھ؛ (۳) عمر رضا کحالة: جغرافیة شبه جزیرة العرب، دمشق ۱۳۶۴ھ؛ (۴) برطانوی امارت بحری: *A Handbook of Arabia*، لندن ۱۹۱۶-۱۹۱۷ء؛ (۵) H. Philby: *Arabian Highlands*، Voyage : M. Tamisier (۶)؛ ۱۹۰۲ء؛ نیویارک ،Ithaca Die : Sprenger (۷)؛ [illegible] Arabie ،alte Geographie Arabiens : Ritter (۸)؛ ص ۲۸۷؛ Erdkunde، جلد ۱۲، ص ۲۰۰، ۳۴۹ ببعد؛ (۹) حافظ وہبہ : جزیرۃ العرب فی القرن العشرین، ص ۳۳ تا ۳۴].

(W.E. Mulligan)

• **بیشرع** : (فارسی)، ایک اصطلاح جو کمتر مستعمل ہے، اور وہ بھی زیادہ تر تضحیک آمیز مفہوم کے لیے۔ یہ فارسی کے منفی سابقے "بی" (بمعنی بغیر) اور عربی کے لفظِ شرع، (اسلامی شرعی قانون) سے مرکب ہے۔ یہ اصطلاح خصوصیت سے ان صوفیہ کے لیے مستعمل ہے جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ احکام شرعی ان کے لیے نہیں ہیں جنھیں تصوف کے ذریعے نور معرفت حاصل ہو چکا ہو (یعنی آزاد قلندروں کے لیے)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک حد تک عوامی بول چال کی اصطلاح اصل میں صوفی فرقۂ ملامتیہ کے ان پیروں پر دلالت کرتی تھی جو اپنی عبادت کے طریقے خفیہ رکھتے اور شرعی رسوم کے ترک کرنے کے عادی تھے۔ یہ اصطلاح تصوف کی فنی مصطلحات میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

(سعید نفیسی)

• **بیشہر** : (بے شہری)، [= بکشہری (قاموس الاعلام)] آج کل ایک قضا کا صدر مقام ہے۔ یہ صوبہ قونیہ میں اسی نام کی ایک جھیل کے جنوب مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ قدیم لوگوں میں یہ کرالیس کے نام سے مشہور تھی (ایک گاؤں قیرایلی کہلاتا ہے، جو آج کل بھی اس کے شمال مشرقی ساحل کے متصل پایا جاتا ہے)۔ قدیم زمانے میں شہر کرالیا، جو پامفیلیا Pamphylia کے علاقے میں تھا، وہ بھی اسی جھیل کے قریب واقع تھا۔ خود بیشہر کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ سلجوقی سلطانِ روم علاء الدین اول (۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء تا ۶۳۴ھ/۱۲۳۷ء) کے زمانے میں اس کی بنیاد اس وقت رکھی گئی جب ترک ۱۳۰۰ء کے آس پاس ایشیائے کوچک کے مغربی حصے پر چھا گئے تھے۔ اس وقت بیشہر حمید کے بیگوں کے قبضے میں آ گیا جنھیں مختلف موقعوں پر قرامان Karāmān کے ہمسایہ بیگوں کے مقابلے میں اس کی مدافعت کرنی پڑتی تھی۔ عثمانی سلطان مراد اول نے ۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء میں بیشہر اور بعض دیگر شہر دولت حمیدیہ کے بیگ کمال الدین حسین سے خرید لیے۔ جنگ انقرہ (۸۰۴ھ/۱۴۰۲ء) کے بعد بیشہر قرامان کے زیر اقتدار آ گیا۔

سلطان محمد (۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء تا ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء) کے زمانے میں بیشہر عثمانیوں نے دوبارہ لے لیا، لیکن اس شہر پر ان کا قطعی قبضہ ۸۴۷ھ/۱۴۴۳ء سے پہلے نہیں ہوا۔ آج کل کا بیشہر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، جس کی آبادی ۱۹۳۵ء میں ۲۹۶۰ تھی۔

مآخذ : (۱) حاجی خلیفہ : جہان نما، استانبول ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء، ص ۶۱۰؛ (۲) W. M. Ramsay : A Historical Geography of Asia Minor (Roy. Geogr. Soc. Supplementary Papers، ج ۴)، لندن ۱۸۹۰ء، ص ۳۹۰؛ (۳) F. Sarre : Reise in Kleinasien، برلن ۱۸۹۶ء، ص ۱۱۸ ببعد؛ (۴) Hammer-Purgstall، ۱ : ۱۸۰؛ (۵) اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی : آناطولو بکلری، استانبول ۱۹۳۷ء، ص ۵۱ ببعد؛ (۶) S.S. Üçer و M. M. Koman : Konya ili köy ve yer adlari üzerinde bir deneme، Konya halkevi tarih, müze komitesi Yayinlari، سلسلہ ۱، عدد ۳، قونیہ ۱۹۳۹ء، ۲ (حاشیہ ۳)؛ (۷) V. Cuinet : La Turquie d'Asie، ۱، پیرس ۱۸۹۰ء، ۸۲۳ ببعد؛ (۸) سامی : قاموس الاعلام، ۲، استانبول ۱۳۰۶ھ، ۱۳۴۳؛ (۹) علی جواد : تاریخ و جغرافیہ لغتی، استانبول ۱۳۱۳ھ، ص ۱۸۷؛ (۱۰) W. Tomaschek : Zur Historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter، SBAk. Wien Phil. Hist. Cl.، عدد ۱۲۴

وی آنا ۱۸۹۰ء، ص ۱۰۰؛ (۱۱) Pauly Wissowa : ۲/۱۰ (۱۹۱۹ء)، بذیل مادّہ Karalleia, و Karallis شود ۱۹۲۶ تا ۱۹۲۷ء؛ (۱۲) وو، ت بذیل مادّہ بیشہر (از Besim Darkot)؛ (۱۳) نیز قب Y. Akyurt : *Beyşehri Kitabeleri ve Türk Tarii. Arkeologya ve Etnografya Dergisi, Esrefoğlu Camii ve Türbesi*، عدد ۴، استانبول ۱۹۴۰ء : ص ۹۱ تا ۱۲۹.

(V. J. PARRY)

⊗ **البَیْضاء** : مملکت لیبیا کا دارالحکومت، سلسلۂ صوفیۂ سنوسیہ کے بانی سیدی محمد بن علی السنوسی المجاہری الحسنی الادریسی (رک بہ السنوسی) نے ۱۸۴۳ء میں درنہ کے قریب جبل اخضر میں الزاویۃ البیضا کے نام سے اپنا ایک "زاویہ" قائم کیا جس نے بعد میں ایک خود کفیل بستی کی شکل اختیار کر لی ۔ مملکت لیبیا کے موجودہ حکمران سید محمد ادریس المہدی انھیں کے پوتے ہیں۔

البیضاء علاقۂ برقہ (رک بآں) یعنی قدیم سرینکا Cyrenaica میں واقع ہے ۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء میں برطانیہ طرابلس الغرب اور برقہ میں اور فرانس فزان میں اپنے اختیارات سے دست بردار ہو گئے اور لیبیا کی وفاقی حکومت ظہور میں آئی ۔ طرابلس اور بنغازی (رک بآں) باری باری اس حکومت کے صدر مقام ہوا کرتے تھے ۔ دسمبر ۱۹۶۲ء میں لیبیا کے آئین میں بعض بنیادی تبدیلیاں کی گئیں اور وفاقی حکومت کی جگہ ایک مرکزی حکومت نے لے لی، جس کا صدر مقام البیضاء قرار پایا۔

البیضاء کی آبادی ۳۰،۹۸ ہے اور ساری کی ساری مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

مآخذ : (۱) *World Muslim Gazetteer*، کراچی ۱۹۶۵ء، ص ۲۲۱ ببعد؛ (۲) *Statesman's Year Book*، بابت ۱۹۶۷ء، ص ۱۲۳۳ ببعد؛ (۳) *The World Almanac*، بابت ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۶ ببعد؛ (۴) ممدوح حقی : لیبیا العربیۃ، بار اول، ۱۹۶۹ء، دمشق ص ۲۶ تا ۶۲؛ (۵) وو، لائڈن، طبع اوّل، مادّہ ہاے برقہ، السنوسی.

(سیّد اسجد الطاف)

البَیْضاء : "سفید شہر (قصر)"، ایک عام عربی اسم موضع، جو عرب دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوے مختلف مقامات کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ الہمدانی : صفۃ اس نام کے چار مقامات کا ذکر کرتا ہے ۔ یاقوت نے اس نام کی سولہ مختلف جگہیں شمار کی ہیں ۔ ان سب میں اہم ترین ایرانی شہر "البیضاء" ہے، جو صوبۂ فارس میں شیراز کے شمال اور اصطخر کے مغرب میں واقع ہے ۔ اس کا اصلی نام نسا تھا ۔ ضلع کام فیروز کا سب سے بڑا شہر ہونے کے باعث چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں یہ اتنا ہی بڑا تھا جتنا اصطخر، اور زرخیز مرغزاروں سے گھرا ہوا تھا ۔ متعدد اہل علم اس شہر سے منسوب ہیں [رک بہ البیضاوی] ۔ الحلاج [رک بآں] بھی اسی جگہ پیدا ہوا تھا ۔ عرب کے جنوبی شہر البیضاء کے لیے، جو بالائی بیحان کا صدر مقام ہے، رک بہ بیحان.

مآخذ : (۱) اِصْطَخْری، ص ۱۲۶، ۱۹۷؛ (۲) ابن حوقل، ص ۱۹۷؛ (۳) ابن خُرْداذْبہ، ص ۴۹ ببعد؛ (۴) المقدسی، ص ۴۳، ۴۳۲؛ (۵) یاقوت، ۱ : ۷۹۱ ببعد، مشترک، ص ۷۷؛ (۶) Le Strange، ص ۲۸۰؛ (۷) H. von Wissmann و Höfner : *Beiträge zur histor. Geogr. des vorislamischen Südarabien*، ص ۴۱، ۴۳، ۵۸، ۶۲، ۶۶.

(C. LÖFGREN)

البَیْضاوی : [امام] عبداللہ بن عمر بن محمد بن علی، ابوالخیر [نیز ابو سعید]، ناصر الدین، شافعی مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور شیراز کے قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہے ۔ ان کی شہرت ایک جید اور متبحر عالم کی حیثیت سے بہی ہے؛ انھوں نے تفسیر قرآن،

قانون، فقہ، علم الکلام اور صرف و نحو جیسے متعدد موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں ۔ عام طور پر ان کی تصنیفات کی بنیاد دوسرے مصنفین کی تصنیفات پر ہے ۔ البتہ ان کی شہرت اس بنا پر ہے کہ انہوں نے مختلف موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے وہ اختصار اور ایجاز سے لکھا ہے ۔ ان کی بہت مشہور تالیف ان کی تفسیر انوار التنزیل و اسرار التاویل ہے، جو زیادہ تر زمخشری کی الکشاف کی تلخیص اور ترمیم شدہ صورت ہے ۔ الکشاف کو زبردست علمیت کی آئینہ دار ہے، لیکن اس پر معتزلی نظریات کا رنگ چڑھا ہوا ہے جن میں اصلاح پیدا کرنے کی کوشش میں البیضاوی نے بعض اوقات انہیں مسترد اور بعض اوقات حذف کر دیا ہے، لیکن کبھی کبھی البیضاوی نے ان تصورات کی اہمیت کو غالباً نظر انداز کرتے ہوئے انہیں جوں کا توں بھی رہنے دیا ہے ۔ اپنے مقدمے میں [فاضل مفسر] نے اس کے اوریجنل ہونے کا دعوی نہیں کیا بلکہ یہ لکھا ہے کہ میری مدت سے آرزو تھی کہ میں کوئی ایسی کتاب لکھوں جو ان بہترین افکار کا مجموعہ ہو جو میں نے نامور صحابۂ کرام رض، مقتدر علمائے تابعین اور دیگر سلف صالحین سے حاصل کیے ہیں ۔ اس کتاب میں وہ ان عمدہ نکات اور دلچسپ لطائف کو بھی شامل کرنا چاہتے تھے جو ان کے پیش رووں اور خود ان کی تحقیقات کا حاصل تھے ۔ اس کتاب میں انہوں نے آٹھ مشہور اماموں (کیونکہ البیضاوی، قرآن کے قاریوں کی سات کی مروجہ تعداد میں یعقوب البصری کا بھی اضافہ کر لیتے ہیں) کی بعض قراءتوں اور مستند قاریوں کی ان قراءتوں کو بھی شامل کیا ہے جو کسی نہ کسی قراءت کے ساتھ مخصوص ہیں ۔ اس کا نتیجہ ایک ایسی کتاب، کی صورت میں ظاہر ہوا جو ہمیشہ بے حد مقبول رہی ہے اور اسی بنا پر کئی بار شائع ہو چکی ہے ۔ اس پوری کتاب کی یا اس کے مختلف حصوں کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں ۔ براکلمان نے ان کی تعداد تراسی بتائی ہے اور ان کی فہرست مرتب کی ہے ۔ اس کے بعد وہ دو کتابوں کا ذکر کرتا ہے جن میں ان دو مقامات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جہاں البیضاوی نے الزمخشری کے اعتزال کا رد نہیں کیا ۔ اس کتاب کی کثیر اشاعتوں میں سے ایک تو H. O. Fleischer (لائپزگ ۱۸۴۶ تا ۱۸۴۸ء، دو جلد) کی ہے، جس میں اشاریے W. Fell (لائپزگ ۱۸۷۸ء) کے ہیں اور دوسری قاہرہ کی (دو جلدوں میں چار حصے)، جو الخطیب الکازرونی کی شرح کی حامل اور ازہر کے چھٹے سال کے طلبہ کے نصاب میں داخل ہے ۔ دوسری اشاعتوں کا ذکر براکلمان اور سرکیس Sarkis میں ملتا ہے ۔

البیضاوی کی دیگر مطبوعہ یا مخطوطہ شکل میں موجود تصانیف میں سے منہاج الوصول الی علم الاصول (فقہ)، الغایة القصوی (دستاویز قانون)، لب الالباب فی علم الاعراب (صرف و نحو)، مصباح الارواح اور طوالع الانوار من مطالع الانظار (علم کلام) ہیں، انہوں نے ایک کتاب نظام التواریخ (مرتبۂ سید منصور مع اردو حواشی، حیدر آباد (دکن) ۱۹۳۰ء) فارسی میں بھی لکھی ہے، جو ۶۷۴ھ/۱۲۷۵ء تک کی تاریخ عالم سے بحث کرتی ہے ۔ السیوطی نے الصفدی کے حوالے سے لکھا ہے کہ البیضاوی نے ۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء میں وفات پائی ۔ وہ کہتا ہے کہ السبکی نے سنہ وفات ۶۹۱ھ/۱۲۹۲ء لکھا ہے، لیکن السبکی اپنی طبقات میں کوئی تاریخ نہیں لکھتا، الیافعی کے نزدیک ۶۹۲ھ/۱۲۹۳ء ہے ۔ ریو Rieu (تتمہ فہرس مخطوطات عربی، در موزۂ بریطانیہ، ص ۶۸) ایک قول کا حوالہ دیتا ہے، جس کی رو سے ان کا انتقال ۷۱۶ھ/

۱۳۱۹ء میں ہوا۔

مآخذ: (۱) السُّبکی: طبقات الشافعیة الکبریٰ، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ۵: ۵۹؛ (۲) السیوطی: بغیة الوعاة، قاہرہ ۱۳۲۰ء، ص ۲۸۶؛ (۳) الیافعی: مرآة الجنان، حیدرآباد (دکن) ۱۳۳۷ تا ۱۳۳۹ھ، ۴: ۲۲۰؛ (۴) براکلمان، ۱: ۵۳۰ ببعد؛ تکملہ، ۱: ۷۳۸ ببعد؛ (۵) سرکیس: معجم المطبوعات العربیة، قاہرہ ۱۹۲۸ تا ۱۹۳۰ء، ص ۶۱۶ ببعد؛ (۶) Margoliouth: *Chrestomathia Baidawiana*، لنڈن ۱۸۹۴ء؛ (۷) Th. Nöldeke: *Geschichte des Qorans*، بار دوم، لائپزگ ۱۹۰۹ تا ۱۹۳۸ء، ۲: ۱۷۶؛ ۳: ۲۴۳؛ [(۸) طاش کبری زادہ: مفتاح السعادة، ۱: ۴۳۶؛ (۹) العباس الموسوی: نزهة الجلیس، ۲: ۸۷؛ (۱۰) صدیق حسن خان: الاکسیر فی اصول التفسیر]۔

(J. Robson)

بَیطار: یہ لفظ عام طور سے حیوانات کے نشتر (سرجن) کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ιππιατρος، کی معرّب صورت ہے اور اس واقعہ یہ ہے کہ اس کی زیادہ صحیح صورت بَیطَر [بر وزن ہِزَبر] اور بَیطار بھی قدیم شاعری میں ملتی ہے [لسان العرب، بیروت ۱۹۵۵ء، ۴: ۶۹ تا ۷۰، مادہ بطر]۔ مشرقی زبانوں میں اصلی یونانی شکل بارھویں صدی تک باقی رہی، *Midrash Numeri rabba 9* میں אפטרוס واضح طور پر لکھا ہوا ہے، لیکن اگر البیرونی: الجماہر فی معرفة الجواہر، ص ۱۰۱، میں جس Heraclides کا اقتباس دیا گیا ہے اس سے Tarentum کا رہنے والا Heraclides (تقریباً ۷۰ قبل مسیح) مراد ہے، جس نے منجملہ دوسری کتابوں کے ایک کتاب گھوڑوں کے علاج معالجے پر بھی لکھی تھی (قب M. J. Haschim: *Die Quellen des Steinbuches des Bērūnī*، تحقیقی مقالہ، Bonn ۱۹۳۵ء، ص ۴۴)، تو بہرحال مسلمان علاج اسپاں سے متعلق یونانی تصانیف سے آشنا تھے۔ اس موضوع پر ایک نام نہاد کتاب، جس کا نام *De Curationibus infirmitatum aequorum* ہے، جس کا ترجمہ موسیٰ نامی ایک یہودی نے، جو بالرمو [= پلرمو، پلرم] کا رہنے والا تھا، انجو کے چارلس اول کے لیے (۱۲۶۶ تا ۱۲۸۵ء) کیا تھا اور بولونہ میں ۱۸۶۵ء میں P. Delprato: *Trattati di mascalcia attribuiti ad Ippocrate tradotti dall 'araba in latino* میں چھپا ہے۔

بیطاری پر قدیم ترین عربی کتاب ابن ابی اُصَیبعہ (۱: ۲۰۰، سطر ۲۶) نے حنین ابن اسحٰق کی طرف منسوب کی ہے۔ اس مضمون پر یہ واحد کتاب ہے جس کا حوالہ طاش کوبرزادہ: مفتاح السعادہ، ۱: ۲۷۰، نے دیا ہے اور اسے "کافی" بتایا ہے۔ حُنین کا ہمعصر ابو یوسف یعقوب بن اخی حِزام، جو المعتصم اور المعتضد (تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کا نصف آخر) کا داروغۂ اصطبل تھا (قب براکلمان: تکملہ، ۱: ۴۳۳ ببعد، جہاں اس نے مزید مآخذ کے حوالے دیے ہیں) پہلا شخص تھا جس نے علاج اسپاں پر کتابیں لکھیں، جو محفوظ ہیں۔ H. Ritter نے علی بن عبدالرحمٰن بن ہذیل الاندلسی: *La parure des cavaliers*، طبع L. Mercier، ۱۹۲۲ء پر تبصرے کے سلسلے میں متعدد مصنفین کی کتابوں کے مخطوطات کی فہرست دی ہے (*Der Islam*، ۱۸، ۱۹۲۹ء: ۱۱۹ تا ۱۲۶)۔ بیطار اور بیطرہ کے الفاظ ہسپانوی زبان میں آج بھی مستعمل ہیں (albéitar اور albeitería)۔ بدویوں کی حیوانی ادویہ پر ایک فرانسیسی مقالے کا ترجمہ Père Anastase نے عربی میں کیا تھا (المشرق، ۱، ۱۸۹۸ء: ۶۸۴، ۹۳۲)۔

مآخذ: (متن میں جن کتابوں کا ذکر آ چکا ہے ان کے علاوہ) (۱) تاج العروس، بذیل مادّہ؛ (۲) الاصمعیات، طبع Ahlwardt، ص ۲۸؛ (۳) الفرزدق، طبع Hell،

ص ۱۳۸۳؛ (۴) S. Fraenkel : Aram. Fremdwörter، ۶۱۰؛ (۵) M. Sterinschneider : Übers. a. d. Arab.، ۴، ۱۹۰۳ء، عدد ۸۶؛ (۶) W. Cohn : Jüdische Übersetzer am Hofe Karl. I. von Anjou, Königs von Sizilien، در Monatsschrift f. Gesch. u. Wiss. d. Judentums، ۶۹، ۱۹۳۵ء: ۲۷۶ ببعد؛ (۷) G. Sarton : IHS، ۲: ۸۹، ۶۹۳، ۱۰۹۱، ۱۰۹۳؛ ۳: ۲۸۳، ۱۲۱۶، ۱۲۲۸، ۱۸۳۴ ببعد؛ (۸) E. Leclainche : Hist. de la méd. vét.، ۲ (méd. vét. arabe)، ۱۸۹۶ء۔

(M. PLESSNER)

⊛ **بَیع** : (ع)، لسانؔ میں ہے : البیعُ ضدُّ الشِّراء، یعنی بیع (فروخت کرنا)، شِراء (خریدنا) کی ضد ہے ۔ والبیعُ شِراءٌ ایضًا وھُو مِن الاضداد —اور بیع شراء کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہ اضداد میں سے ہے، یعنی دو متضاد معنے دیتا ہے، لیکن باب افتعال سے ابتیاع کے معنی فقط خریدنے کے ہوتے ہیں ۔ اسی طرح شِراء بھی اضداد میں سے ہے، اس کے معنی خریدنے کے علاوہ فروخت کرنا بھی ہیں (کشاف اصطلاحات الفنون، بذیل مادہ).

قرآن مجید میں لفظ بیع اور متعلقہ مشتقات پندرہ مرتبہ وارد ہوے ہیں بصورت بیع، بایعتم، بایعنک، یبایعون، یبایعونک، فبایعھن، تبایعتم، بیعکم، (دیکھیے محمد فؤاد عبدالباقی: المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، بذیل مادہ).

بیع کے اصل معنی معاہدے کے اختتام پر ہاتھ ملانے کے ہیں اور بیعۃ بھی اسی سے ہے ۔ اور شری کے معنی منڈی کی چہل پہل کے ہیں.

بیع اسلامی قانون کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب خرید و فروخت کا معاملہ ہے، اس کے لیے ایجاب و قبول ضروری ہے ۔ قرآن مجید میں بیع بمعنی تجارت (رک بآن) بھی آیا ہے : اِذَا نُودِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِن یَّومِ الجُمُعَۃِ فَاسعَوا اِلٰی ذِکرِ اللّٰہِ وَذَرُوا البَیعَ (۶۲ [الجمعۃ]: ۹) میں تجارت کو ملتوی کرنے کا ذکر آیا ہے اور رِجَالٌ لَّا تُلھِیھِم تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیعٌ عَن ذِکرِ اللّٰہِ (۲۴ [النور] : ۳۷) میں تجارۃ اور بیع کے الفاظ میں ترادف بھی ہو سکتا ہے یا ترادف مع معنی زائد بھی ۔ اسی طرح آیت وَاَحَلَّ اللّٰہُ البَیعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (۲ [البقرۃ] : ۲۷۵) میں بیع عمومی طور پر بمعنی تجارت ہے اور خصوصی طور پر بمعنی خرید و فروخت ۔ شرع میں معاہدۂ بیع سے مُبادلۃ مالٍ بمالٍ بِتَراضٍ (رضامندی سے مال کا مبادلہ مال سے) مراد ہے ۔ اس لحاظ سے بیع کی بحث دو طرح ہو سکتی ہے : (۱) محدود معنی میں تملیک کا معاہدہ؛ (۲) تجارت کے سلسلے میں معاہدہ اور اس کی صورتیں، اگرچہ دونوں میں معاہدے کی اخلاقی بنیادیں یکساں ہیں، یعنی فریقین کی طرف سے ایسا معاملہ جو فرد یا جماعت کی نقصان رسانی اور فریب دہی کے شوائب سے پاک ہو اور اس میں ایسی قطعیت ہو کہ نزاع مابعد کا ہر امکان رفع ہو جائے ۔ بیع کا تملیک کے تین ذرائع (احراز (جیسے احیاے موات)، خلف اور نقل) میں سے مؤخرالذکر سے تعلق ہے اور یہ معاہدات اور عقد سے متعلق ہے اور اس میں علل اربعہ، یعنی علت فاعلی، علت مادی، علت صوری اور علت غائی پائی جاتی ہیں ۔ اسلام میں دیگر تمدنی عہدناموں کی طرح تملیکی یا تجارتی عہد و پیمان بھی ایک دینی فریضہ ہے، اور اس کی اساس بھی معاملات میں سچائی، خوف خدا اور خلق خدا کے ساتھ دیانت دارانہ سلوک اور قانون عدل پر رکھی گئی ہے تاکہ باہمی تعلقات کی فضا خوشگوار رہے اور اجتماعی زندگی میں خلل اور فساد واقع نہ ہو.

بیوع کی تفصیلات جملہ کتب فقہ میں موجود ہیں ۔ ان کی چند اہم انواع یہ ہیں:

(الف) سامانِ تجارت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو فقہا نے ایسی بیع کی چار اقسام بیان کی ہیں:

(۱) مُقَایَضَہ (barter)، یعنی سامان کے بدلے سامان؛ (۲) صَرْف (exchange)، یعنی نقد کا نقد سے تبادلہ، جیسے سونے کا سونے سے یا چاندی کا چاندی سے اس طرح تبادلہ کیا جائے کہ تعداد کے لحاظ سے دونوں طرف کی اشیا یکساں ہوں جیسے اصطلاح میں ''مُبادَلَة'' کہتے ہیں اور اگر دونوں طرف کی اشیا میں وزن میں برابری کو مد نظر رکھا جائے تو اسے اصطلاح میں ''مُراطَلَة'' کہتے ہیں؛ (۳) سَلَم جسے بعض فقہا نے سَلَف کے لفظ سے بھی تعبیر کیا ہے، جس میں قیمت نقد وصول کر لی جاتی ہے اور جنس بعد میں ادا ہوتی ہے؛ (۴) بیع مطلق، یعنی دست بدست قیمت (ثمن) اور مال تجارت (مبیعہ) کا تبادلہ۔ اس طرح اگر مال تجارت موجود ہو تو وہ بیع حاضر کہلاتی ہے ورنہ بیع غائب۔

(ب) باعتبار صحت و عدم صحت بیع کی چار اقسام ہیں (۱) بیع صحیح؛ (۲) بیع باطل؛ (۳) بیع فاسد؛ (۴) بیع مکروہ۔ بیع کی چند مشہور اقسام جن کی شریعت نے اجازت نہیں دی یہ ہیں: ''بیع الحبل''، یعنی یہ سودا کرنا کہ فلاں مادہ کے پیٹ میں جو بچہ ہے اسے بیچ دیا جائے۔ اس کی ایک صورت ''حَبَلُ الحَبَلَة'' ہے۔ ''بیع الحصاة''، یعنی کنکر وغیرہ پھینکنا اور وہ جس چیز پر گرے وہ پہلے سے طے شدہ قیمت پر فروخت ہو جائے۔ اس کی ایک صورت ''بیع المنابذة'' ہے۔ ''بیع المضامین''، یعنی نر کی پشت میں جو منی ہے اس کی فروخت۔ ''بیع المزابنة'' اس پھل کا جو ابھی درخت میں ہے اترے ہوئے اور خشک شدہ پھل کے مقابل میں سودا۔ ایسی ہی ایک صورت ''بیع المحاقلة'' کی ہے۔ ''بیع المنابجة'' کوئی سودا اس شرط سے طے کرنا کہ اگر یہ سودا ہو جائے تو اس سے پہلے لیا ہوا فلاں بیعہ از خود ختم ہو جائے گا۔ ''احتکار'' (ذخیرہ اندوزی)، یعنی مال تجارت کو اس غرض سے روکے رکھنا کہ اس کی ضرورت بڑھ جائے اور قیمت چڑھ جائے تو پھر فروخت کیا جائے۔ ''نجش''، یعنی نیلام میں محض بولی بڑھانے کی خاطر بولی دیتے جانا بھی منع ہے۔ السوم علی سوم الغیر، یعنی کوئی شخص سودا کر رہا ہے اور دوسرا شخص اس میں دخل دے کر خود سودا کرنے لگے، نیز تمام ایسے سودے اسلام میں ناجائز ہیں جن میں سود، میسر یا غرر کا دخل ہو۔

فقہا نے شروط بیع کو چار اقسام پر منقسم کیا ہے اگر وہ نہ پائی جائیں تو بیع باطل یا فاسد یا مکروہ ہو جاتی ہے۔

۱۔ شروط انعقاد بیع، مثلاً بائع اور مشتری کے لیے ضروری ہے کہ وہ عاقل ہوں، یا مبیعہ معدوم نہ ہو۔ فقہ حنفی میں ان شروط کی بارہ اقسام ہیں، جن میں سے تین کا تعلق بائع اور مشتری کے ساتھ ہے، ایک کا بیع کے عقد و قیام کے ساتھ، پانچ کا مال تجارت کے ساتھ، ایک کا ثمن اور مبیعہ یعنی مال تجارت کے ساتھ، ایک کا سماع کلام کے ساتھ، یعنی سودے کے وقت جو گفتگو ہو رہی ہے وہ فریقین سن اور سمجھ رہے ہوں اور ایک کا مقام بیع کے ساتھ ہے۔

۲۔ شروط النفاذ بیع، مثلاً یہ کہ مال تجارت پوری طرح فروخت کنندہ کی ملکیت اور قبضے میں ہو، مثلاً بیع الطیر فی الھواء، ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے یا سمندر میں پڑی ہوئی مچھلی کا سودا نہیں ہو سکتا۔

۳۔ شروط صحت بیع، مثلاً بیع موقت نہ ہو، ثمن اور مبیعہ یعنی مال تجارت کی مکمل تعیین ہو (المبیع معلوما والثمن معلوما)۔

۴۔ شروط لزوم بیع، مثلاً ہر قسم کا خیار (خیار مجلس، خیار شرط، خیار عیب، خیار رؤیت، خیار تغریر) کالعدم نہ قرار دے دیا جائے یا مثلاً سودا طے پا

مجبور نابالغ نہ ہو.

بیع کی وہ صورت جو تجارت کہلاتی ہے وہ بھی انہیں پاکیزہ اصولوں کی پابند ہے جن کا ذکر محدود انفرادی لین دین کے سلسلے میں اوپر ہو چکا ہے۔ قرآن مجید کی رو سے تجارت طیّب عمل ہے، لیکن وہ عام طریقے جن سے تمدن کو نقصان پہنچتا ہے، مثلاً احتکار وغیرہ، یا ایسے سودے جن میں سود اور قمار کا دخل ہوتا ہے ممنوع ہیں.

تجارت میں بھی فریقین کی رضامندی ضروری ہے، جب معاملہ طے ہو جائے تو ضروری ہے کہ اسے بائع یا مشتری نبھائیں گو بعض شرائط کے ماتحت وہ اسے فسخ بھی کر سکتے ہیں۔ تجارت میں قسمیں کھانے کو بھی منع کیا گیا ہے، حجت و تکرار اور جھگڑے کو بھی ناپسند کیا گیا ہے۔ کم تولنے کی تو سخت ممانعت اور وعید ہے اور ملاوٹ کے لیے سخت وعید آئی ہے۔ شراب، خنزیر، بت اور میتۃ، کی تجارت کو بھی منع کیا گیا ہے۔ پانی کو انسانوں کا مشترک مال سمجھا گیا ہے اس کا بیچنا بھی درست نہیں۔ غرض وہ تمام سودے جن میں مذکورۂ بالا شرائط کو مدّ نظر نہ رکھا جائے ممنوع ہیں (تفصیل کے لیے رک بہ تجارت).

مآخذ: (۱) کتب لغت، مثلاً لسان العرب، بذیل مادّہ ب ی ع؛ تاج العروس، بذیل مادّہ؛ راغب: مفردات؛ ابن الأثیر، نہایۃ؛ (۲) کتب حدیث، مثلاً صحاح ستّہ؛ صحاح اربعہ؛ مالک: موطأ، بذیل کتاب البیوع؛ (۳) کتب فقہ، مثلاً الشافعی: کتاب الام؛ السحنون: المدونۃ الکبرٰی؛ الہدایۃ؛ درالمختار؛ عبدالرحمٰن الجزیری: کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، ۲: ۱۴۷؛ (۴) الغزالی: کیمیاے سعادت، مطبوعۂ تہران، ۱: ۲۰۹؛ (۵) شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغۃ، بذیل طلب الرزق، المبادلۃ؛ (۶) نذیر احمد: الحقوق والفرائض، ۳: ۳۰۳، آداب البیع؛ (۷) عبدالرحیم: *Muhammaden Jurisprudence*، لاہور ۱۹۵۸ء، ص ۲۸۱، Sale (اردو ترجمہ: اصول فقہ اسلامی)؛ (۸) التہانوی: کشّاف اصطلاحات الفنون، بذیل بیع.

(ادارہ)

بَیْعَۃ: (ع)، اصطلاح میں اس سے ایسا عمل مراد ہے جسے انجام دے کر کوئی شخص یا جماعت کسی دوسرے شخص کے اقتدار کو تسلیم کر لے، چنانچہ خلیفہ کی بیعت وہ عمل ہے جس سے اس امر کا اعلان و اعتراف مقصود ہوتا ہے کہ وہ اسلامی حکومت کا سربراہ ہے . . .

۱۔ اشتقاق: "بیعۃ" کی اصطلاح بیع سے نکلی ہے، جس کے لغوی معنی ہیں بیچ دینا۔ بیعت در اصل اس حرکتِ جسمانی کو کہتے ہیں جو عرب قدیم میں دو شخصوں کے مابین کسی معاہدے کے طے پا جانے کی علامت تھی اور جس میں ہاتھ سے ہاتھ ملایا جاتا تھا (قب بعض مغربی ممالک کی پرانی قانونی اصطلاح Manumissio)۔ کسی کام کے لیے تبایع علی الامر کے معنے "کسی کام میں معاہدہ طے پا جانے" ہی کے ہیں (قب: صفقۃ، لغوی معنی Manumissio = معاہدہ = باہمی اقرار)۔ بیعت میں معاہدے کی علامت مصافحہ تھی اور چونکہ ایک سردار کا انتخاب (اور اس کی حاکمیت کو تسلیم کر لینے کا عہد) ہاتھ سے ہاتھ ملا کر کیا جاتا تھا لہٰذا اس کے لیے وہی لفظ (بیعت) بولا جانے لگا [اور بیعت کرتے وقت بھی بیعت لینے والا اپنا ہاتھ بیعت کرنے والے کے ہاتھ پر رکھتا ہے۔ بلکہ صوفیہ کے بعض سلسلوں میں پیر مرید کا ہاتھ تھام کر بیعت لیتا ہے].

بیعت کے دو بڑے مقاصد ہیں: ایک تو اصولاً کسی عقیدے سے وابستگی اور کسی شخص کی تعلیم کو قبول کرنا؛ دوسرے معنی کسی کی حاکمیت کو تسلیم کرنا۔ وہ بیعت جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم اور ان پر ایمان لانے والوں

کے مابین ہوتی تھی وہ اسی قسم کی تھی (۴۸ [الفتح]: ۱۰ و ۱۸ ؛ ۶۰ [الممتحنة]: ۱۲) ۔ بیعت کا یہ مقصد بھی ہوتا تھا کہ کسی شخص کی قائم‌شدہ حکومت کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت کی جائے ۔ کسی نئے خلیفہ کے حق میں . . . اسی قسم کی بیعت ہوتی تھی [صوفیہ کے ہاں ایک 'بیعت ارشاد' ہوتی ہے، یعنی جب وہ اپنے کسی مرید سے خوش ہوتے ہیں اور اسے مراتب سلوک میں اور بلند لے جانا چاہتے ہیں تو اس مرید سے بیعت ارشاد لیتے ہیں]۔

(۲) قانونی نوعیت: قانونی نقطۂ نظر سے کا تجزیہ کریں تو بیعت ایک قرارداد اور ایک معاہدہ ہے ۔ اس میں ایجاب و قبول اور باہمی رضامندی ضروری ہے، یعنی ایک طرف انتخاب کرنے والوں کی رضامندی یا ارادہ جس کا امیدوار کو نامزد کرنے میں اظہار ہوا اور جس میں ان کی استدعا بھی شامل ہے اور دوسری طرف منتخب ہونے والے کا اظہار رضامندی جسے اس کی طرف سے "قبولیت" سمجھنا چاہیے ۔ یہ تجزیہ قابل تسلیم ہے بشرطیکہ اسے اس حد تک نہ لے جایا جائے کہ عمل بیعت قانونی نوعیت کے معمولی معاہدوں کی سطح پر آ جائے ۔ کیونکہ بیعت ایک مختص النوع رضاکارانہ عمل ہے جس میں جمہور شامل ہوتے ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ اس بیعت میں اطاعت کا عہد بھی شامل ہو ۔ کیونکہ اس کا تعلق اصلاً انتخابی کارروائی سے ہے، نہ کہ اطاعت سے ۔ بیعت انتخاب کے ساتھ غیر مشروط پر اطاعت لازمی نہیں کیونکہ ایسا کرنے سے آزادی فیصلہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ۔ تاہم اکثر اوقات بیعت میں اطاعت کا مفہوم شامل ہی ہوتا ہے [حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبۂ خلافت میں فرمایا تھا کہ جب تک میں اللہ اور رسول کی اطاعت کروں تم پر میری اطاعت فرض ہے . . . یہ انداز فکر و خطاب بھی اجتماعی بیعت کے مترادف ہے]۔

اب سوال یہ ہے کہ انتخابی بیعت میں انتخاب کرنے والوں (اہل الاختیار) کی کتنی تعداد ہونی چاہیے جس سے عمل بیعت شرعاً درست ہو جائے ۔ اس باب میں متعدد رائیں ہیں جن میں باہم وسیع اختلاف ہے اور ایک انتہا سے دوسری انتہا تک پہنچتی ہیں، چنانچہ ایک طرف یہ نظریہ ہے کہ بیعت کا پوری سلطنت کے تمام صالحین کی طرف سے اظہار ضروری ہے ۔ اور دوسری طرف یہ ہے کہ صرف ایک فرد کا بیعت کر لینا کافی ہے [لیکن یہ حقیقت واضح ہے کہ انتخاب کرنے والے دراصل جمہور ہوتے ہیں، خواہ وہ اس کا اظہار اہل العقد و الحل کے ذریعے کریں یا براہِ راست [نیز دیکھیے الماوردی: الاحکام السلطانیہ]۔

بیعت کی تکمیل صرف 'قبول' سے ہو جاتی ہے ۔ اس کے جواز یا محض ثبوت کے لیے نہ تو جسمانی اشارہ و حرکت (Manumissio) کی شرط ہے اور نہ حلف اٹھانے کی ۔ اظہار رضامندی کے لیے کسی خاص رسم کی انجام‌دہی بھی ضروری نہیں ۔ اتنا ہی کافی ہے کہ اس کا اظہار کسی واضح اور قطعی صورت میں کر دیا جائے۔

ایک ہی شخص کی بیعت کے عمل کی رسم کو دو یا زیادہ جلسوں میں سر انجام دیا جا سکتا ہے، چنانچہ بعض دفعہ اس کا پہلا قدم بیعت الخاصّہ کے ذریعے اٹھایا جاتا ہے، جس میں نہایت محدود تعداد میں حکومت کے مقتدر عمّال [اہل العقد] حصّہ لیتے ہیں، بعد ازاں بیعت العامّہ ہوتی ہے ۔ مزید برآں بیعت کے لیے بعض اوقات باضابطہ اجلاس مختلف صوبوں کے مرکزی مقامات میں منعقد کیے جاتے ہیں.

عہد بنو امیّہ سے ایک اور رسم "تجدید البیعة" کا رواج ہوا، جس کے ذریعے خلیفہ یا بادشاہ

اپنے عہد حکومت میں از سر نو بیعت لے کر اپنے یا اپنے ولی عہد کے حق میں تائید حاصل کرتا تھا۔ یہ بیعت دو یا زیادہ مرتبہ بھی ہوتی تھی۔ حکمران وقت اسے رعایا کے دل میں وفاداری کے جذبے کو مستحکم کرنے کی غرض سے استعمال کرتا تھا۔

(۳) بیعت کے خواص: بیعت انتخاب کے باب میں ایک مخصوص سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ بیعت اولوالامر یا حاکم کو اختیار تفویض کرتی ہے یا اختیار کی صرف تصدیق کرتی ہے۔ اس عقیدے سے یہ عام طور پر مسلم ہو گیا ہے کہ تفویض اختیار منجانب اللہ ہوتا ہے [جمہور کی طرف سے بیعت کا مطلب اس اختیار کی تصدیق ہے].

بیعت قطعی طور پر بیعت کرنے والوں اور ان کے مؤیدوں کو پابند کر دیتی ہے۔ بیعت نے دور عباسیہ کی ابتدا ہی سے مذہبی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس نے اس پابندی کو اور بھی سخت کر دیا۔ اس کی وجہ سے اقتدار کا مسئلہ دینی نوعیت اختیار کر گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اولوالامر کے ساتھ بیعت (معاہدہ) کو خدا کے ساتھ معاہدہ سمجھا جانے لگا۔ پھر چونکہ بیعت کی خلاف ورزی کی دنیوی انتہائی سزا (یعنی موت) رکھی گئی [اس لیے بیعت ایک نازک ذمے دارانہ دینی عمل بن گئی]۔ بیعت کی پابندی شخصی اور مدت العمر کے لیے ہوتی ہے۔ دراصل محدود الوقت بیعت کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ تاہم شریعت نے ایک طرح خلفا کی معزولی پر ایک شرط بھی لگا دی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس کی بیعت کی جائے وہ احکام الٰہی پر پوری طرح کاربند رہے گا جس کے یہ معنے ہیں کہ اگر صاحب امر ان احکام الٰہی پر قائم نہ رہے تو بیعت کرنے والے بھی پابندی سے آزاد ہو جائیں گے [قب خطبۂ خلیفۂ اولؓ]۔ لیکن اس فسخ بیعت کے لیے تقوی، عدل اور محض لوجہ اللہ اور لدین اللہ کی شرط ہے اور اس میں بڑی چھان بین کی ضرورت ہے تاکہ فسخ بیعت اور بغی میں امتیاز رہے۔ [نیز بیعت لینے والا خود بھی اپنے آپ کو معزول کر سکتا ہے جیسا کہ حضرت امام حسنؓ نے کیا یا حضرت علیؓ نے تحکیم کے فیصلے کے مطابق معزول ہونے پر آمادگی کا اظہار فرما دیا].

مآخذ: (۱) الفرّاء: الاحکام السلطانیة، قاہرہ [۱۹۳۸ء]؛ (۲) فیروز آبادی: القاموس المحیط، بذیل مادۂ بیع؛ (۳) ابن خلدون: المقدمة، بیروت ۱۹۰۰ء (ترجمۂ انگریزی از Rosenthal، نیویارک ۱۹۰۹ء، ۱: ۳۲۸ ببعد)؛ (۴) الماوردی: الاحکام السّلطانیة، ترجمۂ E. Tyan: *Institutions du droit public musulman*، پیرس ۱۹۵۴ء، ۱: ۳۱۵ ببعد؛ ۱۹۵۷ء، ۲: ۶۰۰، ۱۲۹ ببعد (حوالوں سمیت)؛ (۵) Dozy: *Suppl.*، بذیل مادۂ بیع [بیعت کے سلسلے میں مزید تاریخی، دینی اور شرعی نوعیت کی معلومات کے لیے مفتاح کنوز السنة (مصر ۱۹۳۴ء) تعریب محمد فؤاد عبدالباقی، ص ۸۰ تا ۸۹ (مادۂ البیعة) کے حوالے دیکھیے].

(E. TYAN)

بیعه: رک به کنیسه.

بیغا: (یونانی: Πηγαί) ایشیاے کوچک کے شمال مغرب میں ایک قصبہ جو آج کل صوبۂ چناق قلعہ کی ایک ''قضا'' کا صدر مقام ہے، قوجه چای (دریا) پر، جو زمانۂ قدیم میں گرینیکوس (Granicus) کہلاتا تھا۔ بحیرۂ مرمرہ سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ قوجه چای کے دہانے پر قرہ بیغا واقع ہے (قدیم یونانی عہد کا Πρίαπος)، جو بیغا کی بندرگاہ (اسکلہ) ہے۔ ترکوں کی سلطنت میں بیغا مختلف زمانوں میں ایالت بحر سفید (قپودان پاشا، یعنی عثمانی بیڑے کے امیر البحر اعلی کے صوبے) کا سنجاق پھر ولایت خداوندگار (بروسہ) کا سنجاق اور اس کے بعد کے

زمانے میں بیغا کی متصرفلق کی ایک قضا رہا ہے (اگرچہ اس متصرفلق کا نام بغا تھا، لیکن صدر مقام قصبۂ بیغا نہ تھا، بلکہ قلعۂ سلطانیہ، یعنی چناق قلعہ تھا) ۔ اس قصبے کی مردم شماری ۱۹۳۵ء میں ۸۱۵۰ تھی۔

مآخذ: (۱) حاجی خلیفہ: جہان نما، استانبول ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء، ص ۶۶۷؛ (۲) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، استانبول ۱۳۱۵ھ، ۵: ۲۹۹ تا ۳۰۰؛ (۳) P. A. von Tischendorf: *Das Lehnswesen in den moslemischen Staaten*، لائپزگ ۱۸۷۲ء، ص ۷۱؛ (۴) W. Tomaschek: *Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter* (در *SBAk. Wien, Phil.-Hist. Cl., Bd. 124*)، Wein ۱۸۹۱ء، ص ۱۳ اور ۱۹؛ (۵) F. Taeschner: *Das anatolische Wegenetz nach osmanischen Quellen* (*Türkische Bibliothek, Bd. 23*)، لائپزگ ۱۹۲۴ء، ۱: ۱۰۸ اور ۲: ۷۰؛ (۶) Ö. L. Barkan: قانونلر، ۱: ۱۹ تا ۲۱ (Biga Livâsi Kanunu)؛ (۷) V. Cuinet: *La Turquie d'Asie*، ۳، پیرس ۱۸۹۴ء؛ ۷۰۳ ببعد؛ (۸) Pauly-Wissowa، ۷ / ۲ (۱۹۱۲ء)، بذیل مادّہ Granikos، عمود ۱۸۱۰ تا ۱۸۱۱؛ (۹) سامی: قاموس الاعلام، ۲، استانبول ۱۳۰۸ھ؛ ۱۳۴۴؛ (۱۰) علی جواد: تاریخ و جغرافیۂ لغتی، استانبول ۱۳۱۳ھ تا ۱۳۱۴ھ، ص ۲۲۳ تا ۲۲۵؛ (۱۱) ا ت (ترکی)، بذیل مادّہ بیغا Biga (Besim Darkot).

(V. J. PARRY)

- **بیغہ:** رک بہ مساحۃ.
- **بَیْقَرا:** [= بیقرہ]، رک بہ بایقرا.
- **بَیکَل:** [= بایغال اور بیکال]، مشرقی ترکی میں (عوامی اشتقاق سے) "مایہ دار جھیل" اور مغولی میں Dalai nor "سمندر جھیل" ۔ یہ دنیا کی عمیق ترین جھیل (۱۷۴۱ میٹر) اور سب سے بڑی پہاڑی جھیل ہے ۔ جو مابین ۵۱ درجے ۲۹ دقیقے اور ۵۵ درجے ۴۶ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۱۰۳ درجے ۴۴ دقیقے اور ۱۱۰ درجے ۴۴ دقیقے طول بلد مشرقی، بلند پہاڑی سلسلوں میں محصور، ۶۳۵ کیلومیٹر طویل ہے ۔ عرض مختلف مقامات پر پندرہ کیلومیٹر سے تواسی کیلومیٹر تک اور کل رقبہ ۳۱۵۰۰ مربع کیلومیٹر ہوتا ہے ۔ اس میں سلنگا Selenga، برگوزن Barguzin اور بالائی آنغارہ Angara کی ندیاں آ کر گرتی ہیں اور بینی سے کے مقام پر آنغارہ Angara اس سے نکلتا ہے ۔ جھیل بیکل ریلوے (۲۰۳ کیلومیٹر لمبی، جس میں چالیس سرنگیں ہیں اور ٹرانس سائبیرین ریلوے کی ایک شاخ تھا ۔ اس جھیل کے جنوبی حصے کے گرد ۱۹۰۴ء کے خزاں میں مکمل کی گئی تھی (یعنی وہ حصہ جو آنغارہ کے منبع اور سلنگا کے دہانے کے درمیان ہے).

معلوم ہوتا ہے مغول کے عہد میں مسلم جغرافیہ نویسوں کو جھیل بیکل کا علم نہ تھا ۔ صرف رشید الدین نے جامع التواریخ میں اس کا ذکر کیا ہے (طبع Berezin، ۳: ۱۸۰، Trudi) (Vost. otd. Imp. Arkheol. Ob-va XIII ۔ جو لوگ اس جھیل کے کناروں پر آباد ہیں وہ یہاں برقوت کہلاتے ہیں (مغول زبان میں آخر میں "ت" جمع کی علامت ہے) اور اس کے گرد کا علاقہ برقوجین (تو نوم) کے نام سے موسوم ہے ۔ یہ نام دریائے برگوزن کی صدائے بازگشت ہے ۔ جھیل مذکور کا علم روسیوں کو سترھویں صدی کے نصف اول میں ہوا اور اس کے تھوڑے عرصے بعد مغربی یورپ کو.

مآخذ: (۱) Brockhaus Efron: *Enciklop. Slovar*، (۳۳) IIA: ۷۰۱ تا ۷۱۴؛ (۲) *Bol'shaya Sovetskaya Enciklopediya*، بار دوم، ۴ (۱۹۵۰ء): ۹۳ تا ۱۰۲ (دونوں جغرافیائی کتب حوالہ ہیں سے مزید جغرافیائی لٹریچر ماخذ کے؛

(۳) H. Johansen: *Der Baikal-See*، در *Mitt. Geogr. Ges. München* ۱۸ / ۱۹۲۵ء، ۱ تا ۲۰۲؛ (۴) W. Leimbach: *Die Sowjetunion* (۱۹۵۰ء)، ص ۱۱۶ تا ۱۱۸؛ (۵) Th. Shabad: *Geography of the USSR* (۱۹۵۱ء)؛ نقشے کے لیے: *Bol'shaya Sov. Encikl.* و *Leimbach*۔

(B. Spuler)

بیگ: (= بک، بے)، ایک ترکی اعزازی لقب، جو کئی مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی تمام شکلیں، جو مختلف مقامی بولیوں میں مستعمل ہیں (بیگ، بیک، بگ، بے، بی، بائی بگ وغیرہ)، سب قدیم ترکی لفظ بیک سے مشتق ہیں جیسا کہ اورخون Orkhon کے کتبات سے (آٹھویں صدی) اور اسی زمانے کے ترک اور منگولیا سے متعلق چینی منقولات سے ظاہر ہے۔ یہ لفظ آلتای (آلتون طاغ) گروہ السنہ سے تعلق نہیں رکھتا (مغولی زبان کا لفظ بیگی بعد میں ترکی سے مستعار لیا گیا ہے)؛ ترکی بیرک، بیک اور مغولی بیرکا، بکی (طاقتور آواز وغیرہ کا قدیم لفظ ترکی بیگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس سے ان سب کو علیحدہ رکھنا چاہیے۔ یہی حال ترکی بگو، بگ (خردمند، ساحر)) اور منگولی بوگے، بو، ''شمن'' (بت پرست) کا ہے؛ دیگر القاب کی طرح بیگ (بمعنی لاہوتی، مقدس، جو قدیم لفظ باگ ''خدا'' سے لیا گیا ہے، قب بگداد [بغداد]) ایک مستعار لفظ ہے جو غالبًا ایرانی سے لیا گیا ہے اور ساسانی بادشاہوں کا لقب تھا۔

اورخان [رک بآں] کے کتبات میں ایک مرکب اصطلاح بیگلر طبقۂ اشراف کے لیے استعمال ہوئی ہے، یعنی ''بیک'' کی جماعت، جس کا ضد لفظ بودون Bodun (اخلاط، عوام الناس) ہے۔ ان کی عبارات میں لفظ ''بیگ'' اونچے درجے کے لوگوں میں دوسرے درجے کا طبقہ ظاہر کرتا ہے۔ بالآخر یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک برس بیگ Bars Bag آگے چل کر خان بنا دیا گیا اور ترکی ''خان اعظم'' کا سالا بھی ہو گیا۔ لفظ کے ان مختلف استعمالات سے عیاں ہے کہ ''بیگ'' کا لقب (جسے بعد میں بیگ یا بک بھی) کسی خاص عہدے یا منصب کی طرف اشارہ نہیں کرتا بلکہ اصلاً ایک تعظیمی اور اعزازی لقب ہے۔ اسی لیے بہت سی ترکی بولیاں اسے سب سے بڑے بھائی کے نام کے ساتھ لگا دیتی ہیں۔ آغا (بیگ آغا، یا آغا بیگ — قدیم عثمانی لفظ آغا بے (معظم برادر کلاں)۔ بعض ترکی گروہوں میں یہ لفظ اونچے درجے کے لوگوں کے لقب کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے، بعض دیگر گروہ اسے وسیع عام معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور رئیس و سردار، آقا، خاوند اور جناب کی جگہ کام میں لاتے ہیں۔ اس کے خاص معین معنی اسی وقت واضح ہو سکتے ہیں جب استعمال کرنے والوں کے معاشرتی اور اداری حالات اور اصطلاحات کا علم ہو۔ زیادہ تر ایک مرکب لفظ کے آخری حصے کے طور پر (اون بیگی ''دس کا افسر'' دفعدار؛ آلتون اردو (Golden Horde) عثمانی اصطلاح سنجاق بے (بائی) وغیرہ) یا بطور لقب جب کسی خاص نام کے ساتھ استعمال کیا جائے اس وقت یہ آخر میں بڑھایا جاتا ہے۔ برس بیگ، محمد بک، مؤنث خطاب بیگم [رک بآں] بیگ کے مرکب اضافی واحد متکلم کی ایک سادہ شکل ہے (بیگ ام ''میرے آقا'' اور اس کے بعد ''میری محترمہ'' قب خان ام (خانم) جو اسی طرح کی ایک اضافی ترکیب ہے جو آگے چل کر مؤنث کے لیے مخصوص ہو گئی)۔

(L. Bazin)

(ب) مسلمانوں کے زمانے میں یہ لفظ قراخانیوں میں ایک بڑے عہدےدار کے لیے بطور لقب استعمال ہوتا تھا۔ پہلے پہل یہ خطاب طغرل اور اس کے بھائی چغری نے اختیار کیا، جو

سلجوقی سلطنت کے بانی تھے۔ سلجوقیوں اور بعد کی دیگر ترکی حکومتوں میں جب ترکی الفاظ سرکاری طور پر مروجہ عربی اور فارسی الفاظ کے ساتھ ساتھ استعمال ہونے لگے تو "بیگ" عربی لفظ "امیر" کا مترادف قرار دیا گیا، جیسا کہ خطابات بیگلر بیگی یا بیلر بائی جو امیرالامراء کا ہم پلہ قرار پایا اور سنجاق بیگی جو امیر لواء کے برابر ٹھیرا۔ انھیں حکومتوں کے اندر جہاں بڑے بادشاہوں کو خاقان، خان یا سلطان کہتے تھے وہاں چھوٹے فرمانرواؤں کو، جیسے اناطولی [رک بآن] کی ریاستوں کے حکمران سلجوقیوں کے اخلاف، قرا قویونلو، اور آق قویونلو کو بیگ کہتے تھے۔ تیمور اعظم بھی در حقیقت بیگ ہی تھا۔

ایلخانوں کے زمانے میں بیگ کبھی کبھی مستورات کے لیے استعمال ہوتا تھا اور ہندوستان کے مغلوں میں مؤنث کے لیے عام صورت بیگم تھی۔ صفویوں میں اعلیٰ حکمران کا لقب شاہ قرار پایا، اس لیے کمتر شخصیتوں کو بجائے بیگ کے خان حتی کہ سلطان کہنے لگے۔ دوسری جانب عثمانیوں میں یہ لفظ قبیلوں کے سرداروں، بڑے بڑے انتظامی اور فوجی عہدےداروں اور سربرآوردہ لوگوں کے فرزندوں کے لیے خاص کر پاشاؤں کی نرینہ اولاد کے لیے استعمال ہوتا رہا۔

مآخذ: (۱) وو، لائڈن، مقالۂ بیگ از Barthold؛ (۲) وو، ت، مقالۂ "بیگ" از کوپرولو؛ (۳) Redhouse: *Turkish English Lexicon*، بذیل مادہ.

(H. Bowen)

بیگدلی: اوغوز (ترکمان) اقوام کی شاخ بوزاوق Boz-Ok کے ایک قبیلے کا نام ہے۔ خاندان خوارزم شاہی کے مورث اعلیٰ انوشتگین کو بعض اوقات خاندان کا ایک فرد قرار دیا جاتا ہے۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں بیگدلی کی ایک بڑی جماعت شام کے ترکمانوں میں پائی جاتی تھی۔ اس زمانے میں ان کی قیادت تشخون (تشکون) اوغلاری کے ہاتھ میں تھی۔ نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی میں اس جماعت کو ترکمانوں کے سب سے زیادہ زوردار قبائل میں سے سمجھا جاتا تھا۔ اسی قبیلے کی ایک اور اہم شاخ اسی صدی کے اندر صوبۂ ایچ ایل میں ضلع گلنار Gulnar کے چودہ دیہات میں بستی تھی۔ ان کے سرداروں کے پاس جاگیریں (دِرلک) تھیں۔ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی میں شام کے بیگدلی حلب کے علاقے کے اندر ترکمان قبیلوں میں سب سے بڑا قبیلہ تھا۔ اس صدی کے نصف اول میں ان کے چالیس خاندان تھے۔ علاقۂ دیار بکر میں بھی بنی اینل اور بوز اولوس کے درمیان شامی بیگدلی کے اہم خاندان تھے۔ انھیں بیگدلی کی ایک اور شاخ قزلباش شاملو قبیلے کے ہمراہ ایران پہنچی۔ دیار بکر اور حلب کے درمیان نفیس ترین چراگاہیں گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی میں انھیں کے قبضے میں تھیں، مگر خسرو پاشا نے بغداد پر حملے کے دوران میں (۱۰۳۹ھ / ۱۶۳۰ء) انھیں اس قصور پر کہ انھوں نے ٹیکس دینے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے مویشی سے مقامی لوگوں کے کھیتوں کو ویران کرا دیا تھا خوب سزا دی۔ اسی صدی کے نصف ثانی میں اندازہ کیا گیا تھا کہ ان لوگوں کے بارہ ہزار خیمے نصب تھے۔ بہت سے دیگر قبیلوں کی طرح بیگدلی قبیلے سے بھی ۱۱۰۱ھ / ۱۶۹۰ء میں مطالبہ کیا گیا کہ وہ آسٹریا پر حملے کرنے کی مہم میں حصہ لیں۔ اس کے چند سال بعد حکومت نے کوشش کی کہ بیگدلی اور دیگر ترکمان قبیلوں کو، جو اس کے آس پاس رہتے تھے، رقہ کے علاقے میں بسا دے۔ اس کے بعد کچھ بیگدلی رقہ میں جا بسے اور باقی ماندہ حلب اور عین تاب کے علاقوں میں رہ گئے۔ قبیلے ذکر ہو چکا ہے

کہ شامی بیگدلی کی ایک شاخ شاملو کے ساتھ ایران چلی گئی تھی۔ صفوی عہد میں بہت سے سپہ سالار اور حاکم اسی قبیلے سے تھے۔ بیگدلی کی ایک شاخ استرآباد کے علاقے میں گوکلان ایلی Goklen Ili کے درمیان بسی جاتی ہے۔

مآخذ: (۱) Faruq Sumer : Bozoklu Oğuz Boylarına Dair، در Dil ve Tarih ve Coğrafya Fakültesi Dergisi، ۱۱/۱، انقرہ ۱۹۵۳ء۔

(FARUK SÜMER)

• **بیگلر بیگی**: بگلربای، ترکی لقب، جس کے معنی ہیں ''بیگوں کا بیگ'' یعنی ''اَمیرُ الاُمراء''۔ دیگر القاب کی طرح اسے بھی رفتہ رفتہ تنزل کا منہ دیکھنا پڑا۔ ابتدا میں اس لقب سے مراد ''سپہ سالار اعظم'' ہوتا تھا۔ اس کے بعد یہ صوبے کے حاکم کے معنی تک محدود ہو گیا اور آخر کار اس کا مطلب سوائے ایک اعزازی مرتبے کے اور کچھ نہ رہا۔ پہلے معنی میں اسے روم کے سلاجقہ نے استعمال کیا اور اسے ''مَلِکُ الاُمَراء'' کے مساوی قرار دیا۔ ایلخانیوں نے بھی اسے استعمال کیا اور اس سے چار اُمَراءُ الاُلُوس کا سردار مراد لیا۔ آلتون اردو (Golden Horde) کی سلطنت میں یہ تمام اُمَراءُ الاُلُوس کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مصر کی مملوک حکومت میں یہ اتابک العساکر کے لیے استعمال ہوتا تھا (مآخذ کے حوالوں کے لیے دیکھیے M. F. Köprülüzade : Bizans Müesseselerinin Osmanli Müesseselerine Te'siri، استانبول ۱۹۳۱ء، ص ۱۴۰ تا ۱۹۰ [اطالوی ترجمہ ... Alcune osservazioni، Pubblicazioni dell' Instituto per l'Oriente di Roma ۱۹۵۳ء] اور اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی: Osmanli Devleti Teşkilâtina Medhal، اول، ۱۹۴۱ء، مطبوعہ استانبول؛ نیز قب D. Ayalon، در BSOAS، ۱۹۵۴ء)، ۱۶ : ۵۹)۔

عثمانیوں میں بھی اس لقب سے ابتدا میں ''سپہ سالار اعظم'' مراد لیا جاتا تھا (سعد الدین، ۱ : ۹۶، نے اسے اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے)۔ کہا جاتا ہے کہ جب مراد اول ادرنہ [رک باں] پر قبضہ کر کے بُرُوسہ [= بُرُوسہ، رک باں] واپس گیا تھا تو اس نے یہ خطاب سب سے پہلی بار لالا شاہین Lala Shahin کو عطا کیا تھا (Anon. : Giese، ص ۲۲، س ۱۹ = Urudj، ص ۲۲، س ۹)۔ لالا شاہین کی جگہ تیمرتاش آیا، جو بظاہر اسی کی طرح ایک بیگلربیگی تھا۔ اسے آناطولی (= آنا دولو) کی حفاظت کے لیے بایزید اول اس وقت چھوڑ گیا تھا جب خود بایزید نے مرچہ Mirčea پر فوج کشی کی (عشری [Taeschner]، ۱ : ۸۶)۔ زمانۂ اضطراب میں جب موسیٰ نے یورپی ملکوں پر قبضہ کر لیا تو اس نے ایک وزیر، ایک قاضی عسکر اور ایک بیگلربیگی مقرر کیا (Anon. : Giese، ص ۴۳، س ۲۳، مگر ''روم ایلی کا بیگلربیگی'' در Urudj، ص ۹۰، س ۱۳ اور عاشق پاشازادہ [Giese]، فصل ۹۶)۔ اواخر عہد محمد اول کے اندر سب سے آخر میں علاقائی اعتبار سے دو بیگلربیگی موجود تھے: ایک روم ایلی کا اور ایک آناطولی کا (قب عاشق پاشازادہ، فصل ۸۱ : ''اناطولیہ کا بیگلربیگی'' اور فصل ۸۳ : ''روم ایلی کا بیگلربیگی''؛ متأخر مؤرخوں کے ہاں اس سے قدیم‌تر زمانوں کے لیے ایسے حوالے تاریخی واقعات کے تسلسل کی غلطیاں قرار دینی چاہییں)۔ مراد ثانی کے عہد میں صاف طور پر یہی صورت تھی، کیونکہ اس کے زمانے میں روم ایلی اور آناطولی کے بیگلربیگی ان دونوں صوبوں کے گورنر جنرل تھے۔ ان کے بڑے فرائض یہ تھے: نہ سنجاق بیگیوں (رک باں) کی معرفت جاگیروں کی اس سپاہ کی نگہبانی کریں جس کے سپہ سالار لڑائی

کے وقت وہ خود ہوتے تھے۔ جب سلطنت عثمانیہ کی حدود میں وسعت ہوئی تو نئے صوبے پیدا ہو گئے، یہاں تک کہ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی میں بگلربیگیوں کی تعداد چالیس تک پہنچ گئی تھی۔ روم ایلی کا بگلربگی (جو ۹۴۲ھ / ۱۵۳۶ء سے "دیوان" میں داخل کر لیا گیا تھا، قب فریدون، بار دوم، ۱ : ۵۹۵) ہمیشہ سب سے مقدم سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے بھی اسی درجے کے ہوتے (دیکھیے بیان آئندہ) تو ان کا مرتبہ ان کے صوبوں کی فتح کی تاریخ کے لحاظ سے مقرر کیا جاتا تھا۔ وزیر اعظم کا روم ایلی کے بگلربیگی کا عہدہ خود سنبھال لینا بھی کوئی غیر معروف بات نہ تھی۔

محمد ثانی کے قانون نامہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسی کے زمانے میں بیگلربگی ایک اعزازی مرتبہ بھی ہو گیا تھا (جیسا کہ سلاجقۂ روم کے زمانے میں ہو گیا تھا، قب کوپرولوزادہ، کتاب مذکور، ص ۱۹۲) جس کے حاصل کرنے والے وزیر کے بعد سب سے مقدم سمجھے جاتے تھے۔ گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کے ختم ہوتے روم ایلی کے بیگلربیگی کا عہدہ بھی ایک اعزازی مرتبہ ہو گیا تھا، اگرچہ اس سے والیِ گورنر جنرل ہونا بھی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی سے اہم صوبوں کے بیگلربیگی کا عہدہ انہیں عطا کیا جاتا تھا جو وزارت کا مرتبہ حاصل کیے ہوئے تھے۔ انہیں ارد گرد کے صوبوں کے بیگلربیگیوں پر امتیاز حاصل ہوتا تھا۔ وزیر تین تغ (Tughs) کا اور بیگلربیگی دو تغ کا مستحق ہوتا تھا۔ وزیر اور بیگلربیگی دونوں کا خطاب پاشا ہوتا تھا اور اسی وجہ سے جس سنجاق میں بیگلربیگی بودوباش رکھتا تھا اسے پاشا سنجغی کہتے تھے۔

بیگلربگی کو نائب السلطنت (سلطنت وکیلی) سمجھا جاتا تھا۔ اس کی اپنی ایک چھوٹی سی کچہری ہوتی تھی اور وہ اپنے "دیوان"، یعنی مجلس مشاورت کی خود صدارت کرتا تھا۔ پہلے پہل اسے تیماریں اور زعامتیں عطا کرنے کا پورا اختیار حاصل تھا اور اس کے مقرر کردہ عہدےداروں کے تقرر کی بلاتأمل منظوری دے دی جاتی تھی، مگر ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء کے بعد وہ اپنے حکم (برات) سے فقط چھوٹے چھوٹے (تذکرہ سز) تیمار عطا کر سکتا تھا۔

بارھویں صدی ہجری / اٹھارھویں صدی عیسوی میں یہ اصطلاح اور بھی زیادہ ملتبس ہو گئی، کیونکہ (۱) گورنر جنرلوں کو زیادہ تر "والی" کا لقب دیا جانے لگا اور بیگلربیگی کا استعمال اس معنی میں متروک ہو گیا (روم ایلی اور آناطولی کے بیگلربیگیوں کے سوا، جیسا کہ D'Ohsson : *Tableau général*، ۷ : ۲۷۸ سے سمجھا جاتا ہے)؛ (۲) فارسی میر میران [رک بان] جو اس سے پہلے (عربی کے امیر الامراء [رک بان] کی طرح) بلا تمیز استعمال ہوتا تھا اور بیگلربگی کا ہم معنی سمجھا جاتا تھا، اب بیگلربگی کے اعزازی مرتبے کے لیے زیادہ تر مستعمل ہونے لگا اور اسی اعتبار سے سنجاقوں کے گورنروں کو دیا جانے لگا۔ جب صوبوں کا انتظام حسب قانون ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء بالکل جدید طریقے سے منضبط ہو گیا تو صوبے کے گورنر کا لقب سرکاری طور پر "والی" قرار پایا (قب A. Heidborn : *Droit public et administratif de l'Empire Ottoman*، وی انا ۔ لائپزگ ۱۹۰۸ء، ص ۱۴۷ ببعد)۔ اس کے بعد فقط روم ایلی بیگلربیگی، میر میران اور میر امراء کے خطابات باقی رہ گئے اور وہ بھی محض اعزازی القاب کے طور پر۔

مملکتِ صفویہ میں بیگلربیگیوں کا صوبائی گورنروں کے چار طبقوں میں سے دوسرا طبقہ تھا

(تذکرۃ الملوک، ترجمہ اور شرح از V. Minorsky، در سلسلۂ یادگار گب (جدید)، ۱۶، لنڈن ۱۹۴۳ء، ص ۲۵، ۳۳، ۱۶۳).

مآخذ: (۱) Hammer-Purgstall: Staats.، بمواضع کثیرہ؛ (۲) P. A. von Tischendorf: Das Lehnswesen in den Moslemischen Staaten، لائپزگ ۱۸۷۲ء؛ (۳) J. Deny: Sommaire des Archives Turques du Caire، قاہرہ ۱۹۳۰ء، ص ۴۱ تا ۵۲ و رک بہ ''پاشا'' و ''تیمار''، در وآ، لائڈن؛ (۴) W. L. Wright: Ottoman Statecraft، پرنسٹن ۱۹۳۵ء، بمدد اشاریہ؛ (۵) اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی: Osmanli Devletinin Saray Teşkilâtı، انقرہ ۱۹۴۵ء، بمدد اشاریہ؛ (۶) وہی مصنف: Osmanli Devletinin Merkez ve Bahriye Teşkilâtı، انقرہ ۱۹۴۸ء، بمدد اشاریہ؛ (۷) M. Z. Pakalın: Osmanli Tarih Deyimleri ve Terimleri Sözlüğü، بذیل مادۂ Beylerbeyi؛ (۸) H. A. R. Gibb و H. Bowen: Islamic Society and the West، آکسفرڈ ۱۹۵۰ء، ۱/۱، خصوصاً ص ۱۳۷ ببعد، اور جو مآخذ وہاں مذکور ہیں۔ اس لفظ کے مرکبات مستعملہ کے لیے دیکھیے Deny: Gr.، فصول ۱۱۱۵ تا ۱۱۱۷.

(V. L. MÉNAGE)

بیگم: (ہندوستانی فارسی میں بگم؛ ترکی: بیگم)، بیگ [رک باں] کی تانیث۔ تاریخ ہند کے مغلیہ عہد میں اس کا استعمال تعظیم کے طور پر شہزادیوں ہی تک محدود تھا۔ جہاں آرا بیگم [رک باں] کا لقب، جو شاہجہان [رک باں] کی چہیتی بیٹی تھی، اپنے باپ کے عہد میں سرکاری طور پر ''بادشاہ بیگم'' تھا، جس سے شاہجہان کی معزولی اور قید کے بعد بھی وہ بدستور ملقب رہی۔ [انھیں بیگم صاحب، یا صاحبہ کہا جاتا تھا]۔ اکبر کے دور حکومت میں بیگمات (بادشاہ کی بیویاں اور شہزادیاں) ذاتی خرچ کے طور پر ۱۰۲۸ روپے سے لے کر ۱۶۱۰ روپے سالانہ تک لیا کرتی تھیں۔ جہانگیر کی وفات کے بعد اس کی بیوہ نور جہاں کو دو لاکھ روپے سالانہ ملتے تھے جس کی منظوری اسے شاہجہان نے دے رکھی تھی۔ شاہجہان کی ملکہ ممتاز محل شاہی خزانے سے دس لاکھ روپے سالانہ لیتی تھی، جب کہ بادشاہ بیگم کو چھے لاکھ روپے سالانہ وظیفہ ملا کرتا تھا جو نصف زر نقد اور نصف زمینوں کی صورت میں ہوتا تھا۔ پاکستان کے قیام (۱۹۴۷ء) سے پہلے ہندوستان کے اعلٰی، معزز اور شریف خاندانوں کی مسلم خواتین کو ''بیگمات'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اب پاکستان میں تمام شادی شدہ عورتیں، بجز غریب طبقوں سے تعلق رکھنے والیوں کے ''بیگمات'' کہلاتی ہیں، جو ''خانم''، ''مسز'' Mrs. یا ''میڈم'' Madame کا مترادف ہے۔ عربی اور فارسی بولنے والے ممالک اس لفظ کو اس مفہوم میں قطعاً نہیں جانتے۔ شوہر خلوت و جلوت میں اکثر اپنی بیویوں کے اصلی نام لینے سے بچنے کا لحاظ رکھتے اور انھیں بیگم کے لفظ سے مخاطب کرتے ہیں۔ بھارت اور پاکستان میں مسلمان گھرانوں کے گھریلو ملازم اور خادمائیں اپنی مالکاؤں کو عموماً بیگم کے لفظ سے پکارتے ہیں۔ رسمی طور پر نوزائیدہ لڑکی کے نام کے ساتھ اس لفظ کو لاحقے کے طور لگا دیا جاتا ہے، لیکن اب یہ رواج بڑی تیزی کے ساتھ ناپید ہو رہا ہے۔

مآخذ: (۱) ہوبسن جوبسن Hobson-Jobson، بذیل مادہ؛ (۲) آصف اللغات، بذیل مادہ؛ (۳) سید احمد: فرہنگ آصفیہ، بذیل مادہ؛ (۴) عبدالحمید لاہوری: بادشاہ نامہ، مطبوعۂ Bib. Ind.، ۱: ۹۶ و بمدد اشاریہ؛ (۵) آئین اکبری (انگریزی ترجمہ)، ۱: ۶۱۵.

(بزمی انصاری)

بنگن پلّے: ۱۹۴۸ء میں صوبۂ مدراس مے

ختم ہو جانے سے پہلے جنوبی ہند کی ایک چھوٹی سی ریاست ۔ ریاست کا یہ خصوصی امتیاز تھا کہ تنگ بھدرا کے جنوب میں یہ واحد ریاست تھی جس کا فرمانروا مسلمان تھا ۔ ۱۹۳۸ء میں اس کا رقبہ ۲۷۵ مربع میل اور اس کی آبادی ۴۴،۶۳۱ تھی ۔ ریاست مذکور ۱۵ درجے ۳ دقیقے اور ۱۵ درجے ۲۹ دقیقے عرض البلد شمالی ۷۷ درجے ۵۹ دقیقے اور ۷۸ درجے ۲۲ دقیقے طول البلد شرقی کے درمیان واقع تھی۔

بنگن پلے کی تاریخ بڑی بوقلموں ہے، اس کا فرمانروا اپنا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے شاہ ایران شاہ عباس ثانی کے ایک وزیر اور ماں کی طرف سے شاہ عالمگیر سے ملاتا ہے ۔ خاندان کے جد اعلٰی میر طاہر علی ترکِ وطن کر کے ایران سے بیجاپور آئے، کچھ خاندانی جھگڑے پیدا ہوے اور وہ انھیں میں مارے گئے ۔ میر طاہر علی کی بیوہ اور چار لڑکوں نے ارکاٹ کے مغل فوجدار سے پناہ طلب کی۔ اس کے بیٹوں میں سے ایک نے بنگن پلے کے جاگیردار کی پوتی سے شادی کر لی اور یوں گویا اس کا تعلق اس ماحول سے ہو گیا جو آئندہ اس خاندان کا مسکن و مستقر بننے والا تھا۔

بنگن پلے مختلف وقتوں میں مختلف لوگوں کے قبضے میں آتا جاتا رہا ۔ ۱۶۳۲ء میں وجیانگر کی ریاست کے ایک بڑے حصے کے ساتھ وہ بیجاپور کے زیر اقتدار آ گیا، لیکن جلدی ہی بیجاپور پر مغلوں کا اقتدار قائم ہو گیا اور یہاں آصف جاہی حکومت قائم ہو گئی ۔ جاگیردار حسین علی نے شاہ میسور حیدر علی کی اطاعت قبول کر لی اور اس کے زیر سایہ کئی جنگیں لڑیں، لیکن جب سلطان ٹیپو اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھا تو اس نے جاگیر اس سے واپس لے لی ۔ حسین کی وفات پر اس کی بیوہ نے نظام حیدرآباد (دکن) کے یہاں جا کر پناہ لی اور کہا جاتا ہے کہ خاندان کے کسی ایک شخص نے ۱۷۹۰ء میں سلطان ٹیپو کے فوجدار کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا ۔ سرنگاپٹم کے معاہدے کی رو سے جاگیر مذکور ۱۸۰۰ء میں برطانیہ کے زیر اقتدار آ گئی، یہ ۱۸۳۹ء تک احاطۂ مدراس کے ماتحت رہی اور اس سال سے حکومت ہند نے اسے براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

۱۸۶۲ء کی سند کی رُو سے کسی فرمانروا کے بے اولاد مر جانے کی صورت میں برطانوی حکومت نے اسلامی قانون کے مطابق حق توریث تسلیم کر لیا ۔ ۱۸۶۷ء کو جاگیردار کو نواب کا خاندانی لقب دیا گیا ۔ ۱۸۶۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کی تقرنی جبلی کے موقع پر نواب مذکور کو ہزہائی نس کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ۔ آخری فرمانروا نواب میر فضل علی خان ریاست کے مدغم ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد فوت ہو گئے اور خطاب ان کے بڑے لڑکے غلام علی خان کو مل گیا۔

مآخذ: A. Vadivelu: *The Aristocracy of Southern India*، مدراس ۱۹۰۳ء؛ (۲) *Imperial Gazetteer of India*؛ (۳) *The Indian Year Book and Who is Who*، ۱۹۳۸ء؛ (۴) *Banganapalle State, its Ruler and Method of Administration*.

(ہارون خان شروانی)

بَیْلَان: (نیز Belen)، ایک گاؤں، جو کوہسار امانوس Amanus (= الماطاغ [آرك باب]) میں اس شاہراہ پر واقع ہے جو اسکندرون سے مشرق کی جانب شمالی شام کی طرف چلی گئی ہے ۔ حکومت اسلامیہ کی ابتدائی صدیوں میں اس مقام کو بظاہر کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی اور ان دنوں مقامی علاقے کا مشہور شہر بَغْراس (Πάγραι) تھا ۔ متعلقہ درۂ بَیْلان (یعنی قدیم Σύριαι Πύλαι یا Ἀμανίδες Πύλαι) شمالی سوریا کے عواصم میں شامل تھا ۔ اسلامی اقتدار کے طویل دور میں یہ متعدد

ناموں سے موسوم رہا ہے، مثلاً عُقبۃ النساء (البلاذری)، ''مضیق بغراس''، باب اسکندرون (قب وو، ت، بذیل مادۂ Belen اور بغراس بیلی (حاجی خلیفہ)۔ ولایت حلب کے ایک سالنامے مؤرخہ ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ - ۱۹۰۳ء کے مطابق عثمانی سلطان سلیمان قانونی نے بیلان میں ۹۶۰ھ / ۱۵۵۲ء - ۱۵۵۳ء میں ایک مسجد، ایک خان (سرائے) اور حمام بنوایا تھا۔ اسی مأخذ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبدالرحمن پاشا کی کوششوں سے، جو اس وقت اَدَنَہ کی سنجاق کا نگران تھا، ۱۱۸۳ھ / ۱۷۶۹ - ۱۷۷۰ء میں بیلان کی آبادی بڑھ گئی تھی۔ جولائی ۱۸۳۲ء میں عثمانیوں نے، مصری فوجوں کے مقابلے میں، جن کی کمان ابراہیم پاشا کے ہاتھ میں تھی، شکست کھائی۔ اس واقعے کو اس بات کی توجیہ میں پیش کیا جاتا ہے درۂ مذکور کو بعض اوقات مقامی طور پر توپ بولو یا توپ بوغازی کہا جاتا ہے (قب وو، لائڈن، بار اول، بذیل مادۂ Beilan و وو، ت، بذیل مادۂ Belen)۔ بیلان یا بیان نام کا تسمیہ واضح کرنے کے لیے کئی ایک اشتقاق بتلائے گئے ہیں، مثلاً یہ کہ یہ ایک یونانی لفظ Πύλαι سے نکلا ہے یا کہ یہ ترکی لفظ bel یا beyl سے مشتق ہے (کسی پہاڑ کی پیٹھ پر کوئی غار) یا bil یا bayl سے مأخوذ ہے (دو پہاڑیوں کے درمیان ایک اونچا راستہ) (قب وو، ت، بذیل مادہ Beilan)۔ اولیا چلبی کہتا ہے کہ Belen کا لفظ ترکمانوں کی زبان میں نہایت عمودی چڑھائی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بیلان Baylan، جو عثمانی عہد حکومت میں حلب کی ولایت میں ایک قضا کا مرکز تھا، اب صرف ایک ''ناحیہ'' ہے جو ہتائے Hatay کی ولایت میں اسکندرون کی قضا کے ماتحت ہے۔ ۱۹۴۰ء میں اس کی آبادی گیارہ سو ترپن اور پورے ناحیے کی آبادی پانچ ہزار تین سو تہتر تھی۔ اناج، پھل، ریشم اور شراب اس علاقے کی زیادہ قابل ذکر پیداوار ہیں۔

مآخذ: (۱) البلاذری: فتوح، ص ۱۶۶، ۱۶۷؛ (۲) یاقوت، ۳: ۶۹۲؛ (۳) ابن الشحنہ: الدُّرُّ المنتخب، طبع یوسف بن الیان سرکیس، بیروت ۱۹۰۹ء، ص ۲۲۱؛ (۴) Ch. Ledit: الاعلاق الخطیرہ (مخطوطۂ ابن شدّاد)، در المشرق، ۳۳/۲، ۱۹۳۵ء، ص ۲۰۳ تا ۲۰۴؛ (۵) حاجی خلیفہ: جہان نما، ص ۵۹۷؛ (۶) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، ج ۳، استانبول ۱۳۱۴ھ، ص ۳۸؛ (۷) R. Pococke: *A Description of the East and some other countries*، ج ۲، لنڈن ۱۷۴۵ء، ص ۱۷۳ ببعد، لوحہ ۱؛ (۸) G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۷۲؛ (۹) M. Hartmann: *Das Liwa Haleb*، در *ZGErdk Berl*، ۲۹، ۱۸۹۴ء، ص ۷، ۱۰، ۱۱، ۲۶، ۳۲ تا ۷۲، ۸۷ تا ۸۸؛ (۱۰) Cl. Cahen: *La Syrie du Nord à l'époque des Croisades*، پیرس ۱۹۴۰ء، ص ۱۴۰ ببعد؛ (۱۱) M. Canard: *Histoire de la Dynastie des Hamdanides de Jazira et de Syrie*، ج ۱، پیرس ۱۹۵۳ء، ص ۲۲۹؛ (۱۲) Pauly-Wissowa، بذیل مادۂ Σύριαι Πύλαι و Ἀμανίδες Πύλαι؛ (۱۳) V. Cuinet: *La Turquie d'Asie*، ج ۲، پیرس ۱۸۹۱ء، ص ۲۲۲ تا ۲۳۳؛ (۱۴) E. Honigmann: *Historische Topographie von Nord-Syrien im Altertum*، در *ZDPV*، ج ۴۷، لائپزگ ۱۹۲۳ء، ص ۵۹، و بمدد اشاریہ؛ (۱۵) R. Dussaud: *Topographie Historique de la Syrie Antique et Médiévale*، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۴۴۲ تا ۴۴۶، ۴۴۳ تا ۴۴۴؛ (۱۶) وو، ت، بذیل مادۂ *Belen* (از Besim Darkot)؛ نیز دیکھیے وو، لائڈن، بار دوم، بذیل مادۂ بغراس و الماطاغی۔ درۂ بیلان کی لڑائی ۱۸۳۲ء پر قب مآخذ بذیل مادۂ ابراہیم پاشا، در وو، لائڈن، بار دوم و وو، ت۔

(V. J. PARRY)

* **بیلقان** : اران (البانیہ) کا ایک قدیم شہر، جو قفقاز کے جنوب میں واقع ہے۔ کہتے ہیں اس کی بنیاد قباد ساسانی نے رکھی تھی۔ بیلقان دوسری عرب خزر جنگ میں میدان کارزار بنا اور ۱۱۲ھ/ ۷۳۰ء میں مسلمان جرنیل سعید بن عمرو الحرشی نے یہاں خزروں پر بڑی اہم فتح حاصل کی۔

مآخذ : D. M. Dunlop : History of the Jewish Khazars، پرنسٹن ۱۹۵۴ء۔

(D. M. DUNLOP)

* **البیلمان** : رک بہ مجلس۔

* **بیلن** : رک بہ بیلون۔

* **بیلو** : (= بلوس)، رک بہ بالیوس۔

* **بیلہ جک** : رک بہ بلجک۔

* **بیلین** : (Beleyn) چرواہوں اور مزارعوں کے ایک جتھے کا نام، جو صوبۂ کرن واقع ارتریا [رک باں] (= اریتریا) کے جنوبی حصے میں بود و باش رکھتا ہے۔ یہ لوگ آپس میں بوگوس Bogos کے نام سے مشہور ہیں اور ان کی تعداد کوئی تیس ہزار ہے۔ جتھابندی کی رو سے ان کے دو بڑے قبیلے ہیں، بیت ترکی Bait Tarké اور بیت توکی Bait Tawké، جن میں تمدنی اور معاشرتی لحاظ سے باہم غایت درجہ یگانگت ہے، اگرچہ نسلاً (جو محض افسانوی تخیل ہے) باہم مختلف ہونے کے مدعی ہیں۔ درحقیقت ایک خاص قسم کا آقا اور غلام کا سا باہمی تعلق ان کے اندر قدیم الایام سے موجود ہے، لیکن اب حکومت کے براہ راست اقتدار نے بہت کچھ قبائلی منصب کی جگہ لے لی ہے۔ کرن کے علاقے پر مصری قبضہ ہونے تک (۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء تا ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء) بیلین کے لوگ بالعموم عیسائی مذہب کے پیرو رہے، اس کے بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

بیلینی زبان، جو اور کہیں نہیں بولی جاتی Kushitic (حامی) زبانوں کی شاخ اگاؤ Agau کی بولی ہے جسے سامی زبان نہیں بتایا جا سکتا ہے، نیز ان کی معاشری ڈھانچے اور عوامی کہان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے آبا و اجداد خا اگاؤ Agau عناصر سے تعلق رکھتے تھے۔ ار میں ان کا وجود اس (غیر اثرپذیر) اگاؤ عنصر کا ر منت ہے جو دسویں۔ گیارھویں صدی ہجری/سولھو سترھویں صدی عیسوی میں شمالی حبشہ سے تر وطن کر کے اس علاقے میں آئے جہاں کے لو تمدن اور طاقت میں ان سے کم درجے کے تھے۔

مآخذ : (۱) W. Munzinger : mdisull' Africa Orientale، روما ۱۸۸۲ء؛ (۲) C. Conti Rossini : Principi di diritto Consuetudinario dell' Eritrea ۹ ۱۹۱۶ء؛ (۳) A. Pollera : popolazioni indigene dell' Eritrea، Bologna ۱۹۳۵ء؛ (۴) H. Longrigg : Short History of Eritrea، آوکسفرڈ ۱۹۴۵ء؛ (۵) itish Military Administration of Eritrea : (S. F. Nadel) ces and Tribes of Eritrea، Asmara Eritrea ۱۹۴۳ء۔

(S. H. LONGRIGG)

بیمارستان : (کبھی بالتخفیف "مارستان")، فا کلمۂ "بیمار" اور لاحقہ "ستان" (بمعنی جگہ) مرکب ہے، بمعنی ہسپتال۔ جدید محاو میں بیمارستان کا اطلاق خصوصاً پاگل خانے ہوتا ہے۔

(۱) ابتدائی دور اور اسلامی مشرق

خود عربوں کے قول کے مطابق (قب المقریز الخطط، ۲ : ۴۰۵ [بمصر ۱۳۲۶ھ، ۴ : ۲۵۸])، سب پہلے ہسپتال کی بنیاد یا تو مصر کے ایک اسا [قبطی] بادشاہ مناقیوش [بن اشمون] نے رکھی تھی یا بقراط نے۔ مؤخر الذکر کے متعلق کہا ہے کہ اس نے اپنے گھر کے پاس ایک

میں بیماروں کے لیے ایک قیام گاہ آکسنودوکیئن Xenodokeion بنائی تھی، جس کا لفظی ترجمہ ''پردیسیوں کی اقامت گاہ'' ہے۔ اس بیان کی سند میں ابن ابی اُصَیبعة (عیون، طبع ملر Müller، ۱: ۲۶ تا ۲۷)، جالینوس Galen کی کتاب فی اخلاق النفس، مقالۂ سوم (Peri Ethon) پیش کرتا ہے۔ یہ کتاب اب یونانی زبان میں ناپید ہے [عیون، محل مذکور سے واضح نہیں ہوتا کہ بیمارستان کی ایجاد جالینوس نے بقراط کی طرف منسوب کی ہے]۔ عہدِ عتیق میں ہسپتال چونکہ لوگوں کی زندگی میں کوئی نمایاں حیثیت نہ رکھتے تھے لہذا مذکورۂ بالا حوالوں سے ان کے آغاز کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ الولید ابن عبدالملک (۸۶ھ / ۷۰۵ء تا ۹۶ھ / ۷۱۵ء) پہلا شخص تھا جس نے عالمِ اسلام میں بیمارستان تعمیر کیا اور اس میں اطبا رکھے اور ان کے لیے وجہ معاش [ارزاق] مقرر کی (المقریزی، محل مذکور)، لیکن اس امر کے باوجود کہ ابن الفقیہ جیسے قدیم مصنف نے بھی، جس کا سنہ تقریباً ۲۸۹ھ / ۹۰۲ء (ص ۱۰۶ تا ۱۰۷) ہے، اس کا ذکر بالکل ایسے ہی الفاظ میں کیا ہے (البیمارستانات للمرضی، یعنی بیمارستان مریضوں کے لیے ہوتے ہیں)، پھر بھی اس واقعے میں شک و شبہہ کی گنجائش باقی ہے۔ بقول الطبری (۲: ۱۱۹۶)، الولید نے کوڑھیوں کو [علیحدہ رکھنے کا حکم دیا اور ان کے لیے عام لوگوں سے اختلاط ممنوع قرار دیا] اور ان کے لیے مدد معاش مقرر کر دی۔ یہ ایک مختصر سا بیان ہے جو ایک اور مقام پر قدرے زیادہ تفصیل سے دیا گیا ہے (۲: ۱۲۷۱)، جس میں الطبری لکھتا ہے کہ الولید نے کوڑھیوں کو عطیے دیے اور بھیک مانگنے سے منع کیا۔ اس نے ہر اپاہج کے لیے ایک خادم اور ہر اندھے کے لیے ایک عصا کش (رہنما) مقرر کر دیا تھا۔ ابن الاثیر (بذیل سنہ ۸۸ھ / ۷۰۷ء) بھی مختصراً یہی کہتا ہے (نیز دیکھیے الذہبی: تاریخ الاسلام، ۳: ۶۷)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ ایسے اقدامات کا ذکر ہے جو بیماروں کو باقی آبادی سے علیحدہ رکھنے سے متعلق کیے گئے۔ تقریباً اسی طرح جیسا کہ بعد میں مسلم ہسپانیہ میں کیا گیا، جہاں قرطبہ کا پورا ایک محلہ ''رَبَضُ المَرضٰی'' (بیماروں کی بستی) کے طور پر معروف تھا (قب E. Lévi-Provençal: *Hist. Esp. mus.*، ۳: ۳۸۱ تا ۳۸۲، ۴۳۴)۔

اسلام میں ہسپتالوں کے قیام میں خوزستان میں جُندیشاپور [رک باں] کے مدرسۂ طب اور ہسپتال کا اثر بھی پڑا۔ اس ادارے نے، جس کی بنیاد ساسانیوں نے رکھی تھی، اپنی شامی، ایرانی اور ہندی اور آخر میں یونانی روایات کو عربوں کے عہد تک برقرار رکھا۔ اور جس وقت دارالحکومت العراق میں منتقل ہو گیا، اس نے طب عربی کے ارتقا پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ جہاں تک ہسپتالوں کا تعلق ہے، جُندیساپور سے رابطے کے ثمرات ہارون الرشید (۱۷۰ھ / ۷۸۶ء تا ۱۹۳ھ / ۸۰۹ء) کے عہدِ حکومت میں ظاہر ہوئے، جس نے جبرائیل بن بُختیشوع کو جو اس (جندیساپور) کے مدرسے کا عیسائی طبیب تھا بغداد میں ایک بیمارستان کے قائم کرنے کا کام سپرد کر دیا۔ اسی موقع پر جندیساپور کے بیمارستان کے ایک ماہر دواساز کو بغداد بھجوا دیا گیا۔ اسی شخص کا بیٹا یوحنا (یحیی) بن ماسویہ بعد میں اس بیمارستان کا رئیس بن گیا (ابن القفطی: تاریخ الحکماء، طبع لپرٹ Lippert، ص ۳۸۳ تا ۳۸۴؛ ابن ابی اُصیبعہ، ۱: ۱۷۴ تا ۱۷۵)۔ بغداد کا اصلی ہسپتال جنوب مغربی مضافات شہر میں نہر کرخایا پر واقع تھا، یہی وہ جگہ ہے جہاں

جندیسابور کی ادارانہ روایات کے تتبع میں یحیی بن خالد البرمکی کی فرمائش پر منکہ ہندی نے سنسکرت کی طبی تصنیف سُشرُتہ ۔ سمہتا suśruta samhitā کا فارسی میں ترجمہ کیا (الفہرست، ص۳۰۳) اور بعض روایات کے مطابق الرازی (Rhazes) نے بھی وہاں درس دیا۔

یہ بات واضح نہیں کہ ہارون کا بیمارستان کب تک تنہا چلتا رہا۔ بہر حال ہم یہ سنتے ہیں کہ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے شروع میں یا اس سے ذرا پہلے سے بغداد میں نئے بیمارستانوں کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ ایک بیمارستان کی بنیاد بدر المعتضد (۲۷۹ھ/۸۹۲ء تا ۲۸۹ھ/۹۰۲ء) کے غلام المعتضدی نے دریاے دجلہ کے مشرقی کنارے پر المخرّم کے علاقے میں رکھی تھی (ابن ابی اُصَیبعة، ۱: ۲۲۱؛ قب ۳۰۲)۔ ایک اور بیمارستان علاقۂ الحربیہ میں، شہر المنصور کے شمال میں تھا، جس کے لیے ۳۰۲ھ/۹۱۴ء میں نیک وزیر [ابوالحسن] علی بن عیسی نے ایک وقف مقرر کر دیا تھا۔ اسی وزیر نے نہ صرف اس ہسپتال بلکہ بغداد، مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ کے تمام ہسپتالوں کی نگرانی ابو عثمان سعید بن یعقوب الدمشقی کے سپرد کی تھی۔ [ابو عثمان مذکور اس لیے بھی فاضل طبیب ہے کہ اس نے طب کی بہت سی کتابیں عربی میں منتقل کیں] (ابن ابی اُصیبعہ، ۱: ۲۳۴)؛ بیمارستان السیّدہ [دجلہ کے] مشرقی کنارے پر تھا جسے سنان بن ثابت نے محرم ۳۰۶ھ/جون ۹۱۸ء میں بنایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بغداد اور دیگر مقامات کے ہسپتالوں کے منتظم عمومی کی حیثیت سے ابو عثمان الدمشقی کا جانشین مقرر ہوا تھا (ابن ابی اُصیبعہ، ۱: ۲۲۱ تا ۲۲۲)؛ البیمارستان المقتدری، باب الشام میں [۳۰۶ھ] کے قریب ہی کے عہد میں تعمیر ہوا (ابن ابی اُصیبعہ، ۱: ۲۲۲)؛ اور بیمارستان ابن الفرات، دَرْبُ المُفضَّل میں؛ کہتے ہیں کہ اسے ۳۱۳ھ/۹۲۵ء میں ثابت بن سنان کی نگرانی میں دے دیا گیا تھا (ابن ابی اُصیبعہ، ۱: ۲۲۳)۔ ان ہسپتالوں کی آمدنی کا ذریعہ وہ اوقاف ہوتے تھے جنھیں اربابِ اختیار اور اہلِ ثروت اس مطلب کے لیے قائم کر دیا کرتے تھے۔ یہ اوقاف متولیوں کے ہاتھوں میں ہوتے تھے جو شاید بعض صورتوں میں اپنے فرائض کا پورا خیال نہیں رکھتے تھے ([قب] ابن ابی اُصیبعہ، ۱: ۲۲۱)۔ ہسپتالوں کی وسعت کا اندازہ ان کے ماہانہ اخراجات سے لگایا جا سکتا ہے۔ بیمارستان مُقتدری کا خرچ دو سو دینار ماہانہ؛ بیمارستان سیّدہ کا چھے سو دینار ماہانہ (علیٰ ھذا القیاس)۔ مریضوں کی آسائش کے لیے جاڑے میں کمبلوں [اور لباس] اور کوئلے [اور غذا] کا انتظام بھی ہوتا تھا، اور بعض اوقات تو اسی قسم کی سہولتیں اور بھی زیادہ وسیع پیمانے پر مہیا کی جاتی تھیں (دیکھیے سطور ذیل)۔

صوبائی ہسپتالوں کے متعلق ہماری معلومات نسبۃً کم ہیں، لیکن کچھ ہسپتال چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی سے پہلے یقیناً موجود تھے۔ الرّی کا بیمارستان، جس کا الرازی بغداد آنے سے پہلے ناظم تھا، جہاں اس نے ۳۲۰ھ/۹۳۲ء کے قریب ایک ہسپتال کے ناظم کی حیثیت سے وفات پائی (ابن القفطی، ص ۲۷۲)، ایک بڑا ادارہ تھا (قب ابن القفطی، ص ۲۷۳؛ ابن ابی اُصیبعہ، ۱: ۳۱۰ تا ۳۱۱) اور غالباً کچھ عرصے سے قائم تھا۔ ایک پاگل خانہ واسط اور بغداد کے درمیان دیر ہِزقل کے مقام پر تھا، جسے المبرّد نے المتوکل کے عہدِ خلافت میں دیکھا تھا، یعنی ۲۳۲ھ/۸۴۷ء اور ۲۴۷ھ/۸۶۱ء کے درمیان (المسعودی: مروج، ۷: ۱۹۷ بعد [العقد، طبع ۱۳۲۱ھ، ۳: ۲۶۰

و تبارس و حواشی؛ ابن جُبَیر (رحلہ، ص ۲۸۳) نے چھٹی صدی ہجری میں دمشق کے دارالمجانین میں علاج مجانین کا بھی ذکر کیا ہے]۔

سنان بن ثابت (م [ذوالحجہ] ۳۳۱ھ / ۹۴۳ء، الفہرست، ص ۳۰۲)، کے زمانے میں علی بن عیسی مذکور کے حکم کے مطابق اطبا روزانہ جیل خانوں کا معائنہ کرتے تھے۔ بیمار قیدیوں کی دوا دارو کی جاتی تھی اور [حسب ضرورت ان کے لیے مزوّرات بھی (یعنی طعام بے گوشت کہ جس میں دھنیا وغیرہ ڈال کر بیماروں کے لیے پکاتے ہیں) تیار کیے جاتے تھے] (ابن ابی اُصَیبعہ، ۱: ۲۲۱)۔ اسی زمانے میں اطبا اور اُن کے ہمراہ ایک کشتی شفاخانہ (خِزانۃ الأدْوِیَۃ و الأشْرِبَۃ) کو سواد (یعنی عراق زیریں) کے دیہات میں بھیجا جاتا تھا۔ اس کشتی شفاخانے کے متعلق سنان اور وزیر کے درمیان خط و کتابت سے مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بلا امتیاز غیر مسلموں اور مسلموں دونوں کا علاج بیمارستانوں میں ہوتا تھا (ابن ابی اُصَیبعہ، کتاب مذکور)۔

عضدالدولہ بویہی نے دریاے دجلہ کے موڑ پر مغربی بغداد میں جب "بیمارستان عَضُدی" کی بنیاد رکھی تھی تو اس وقت بغداد کے مذکورۂ بالا بیمارستانوں میں سے کم از کم پانچ بہرحال موجود تھے۔ عضدالدولہ کا یہ ہسپتال عضدالدولہ کی وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے، یعنی ۳۷۲ھ / ۹۸۲ء میں قائم ہوا (الذہبی: دول الاسلام، ۱: ۱۶۷) اور بغداد کا سب سے زیادہ شاندار ہسپتال سمجھا جاتا تھا اور الرازی کا نام اسی ہسپتال کے سلسلے میں بار بار لیا جاتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ الرازی نے اسی ہسپتال کی جگہ اس طریقے سے منتخب کی کہ اس نے بغداد کے، دونوں حصوں کے ہر ناحیے میں گوشت کا ایک ایک ٹکڑا لٹکوا دیا، اور جہاں گوشت میں بدبو نسبۃً دیر میں پیدا ہوئی وہ جگہ ہسپتال کے لیے منتخب کر لی؛ نیز یہ کہ عضدالدولہ نے الرازی کو ایک سو سے زائد اطبا میں سے اس نئے ادارے کا مہتمم اعلی (اصل میں لفظ "ساعُور" ہے جو سریانی سے ماخوذ ہے) منتخب کیا تھا (ابن ابی اُصَیبعہ، ۱: ۳۰۹ تا ۳۱۰)، لیکن الرازی پچاس برس پہلے فوت ہو چکا تھا۔ اس اختلاف زمانی کی توجیہ، جس کی طرف ابن ابی اُصَیبعہ (: کتاب مذکور) پہلے ہی توجہ دلا چکا ہے، یہ ہو سکتی ہے کہ بیمارستان عضدی اور بیمارستان معتضدی کے املا میں مماثلت پائی ہے؛ بیمارستان معتضدی کی بنیاد المعتضد نے الرازی کی زندگی ہی میں رکھی تھی (دیکھیے اوپر)۔

جب عضدالدولہ نے بغداد میں بیمارستان بنایا تو اس میں چوبیس اطبا تھے (ابن القفطی، ص ۲۳۵ تا ۲۳۶)۔ ماہرین خصوصی کی متعدد جماعتوں کا ذکر آتا ہے: طبائعیوں (ماہرین عضویات)، کحّالوں (ماہرین امراض چشم)، جرّاحوں (surgeons) اور مجبّروں (ہڈی بٹھانے والے bone-setters) (ابن ابی اُصَیبعہ، ۱: ۳۱۰)۔ جبرائیل بن عبیداللہ کے کام کرنے کے مقررہ اوقات ہفتے میں دو دن اور دو راتیں ہوتی تھیں، اور اس کی تنخواہ ماہانہ تین سو درہم تھی (ابن القفطی، ص ۱۴۸)۔ عضدی ہسپتال میں لیکچر دیے جاتے تھے (ابن ابی اُصَیبعہ، ۱: ۲۳۹، ۲۴۴)، اور اسی طریقے سے جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں ان میں سے بعض کا ہمیں علم ہے، مثلاً سابور بن سہل جندیساپوری کی اقراباذین (Antidotarium) (الفہرست، ص ۲۹۷؛ قب براکلمان، ۱: ۲۳۲)، جس کے بجاے بالآخر ابن التلمیذ کی اسی نام کی کتاب استعمال میں آنے لگی۔ ابن التلمیذ بعد میں عضدی ہسپتال کا صدر (ساعور، اوپر دیکھیے) تھا (ابن ابی اُصَیبعہ، ۱: ۳۰۹، ۳۱۰)؛ [مگر الفہرست

اور عیون میں صرف یہ لکھا ہے کہ سابور کی اقراباذین بیمارستان میں اور صیادلہ کی دکانوں میں معمول علیہ تھی خصوصاً ابن التلمیذ کی مؤلفہ اقراباذین سے پہلے] ۔ جب ۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء میں ابن جبیر بغداد آیا تو یہ جگہ ایک بڑے قلعے کی مانند تھی، جس میں آب رسانی کا انتظام دریائے دجلہ سے تھا اور شاہی محلات کا پورا ساز و سامان موجود تھا (رحلۃ، طبع ڈخویہ De Goeje، ص ۲۲۵ تا ۲۲۶).

مسلمانوں کے ازمنۂ وسطٰی کے بڑے بڑے ہسپتالوں کے سلسلے کے ایک اور ہسپتال کی بنیاد نور الدین بن زنگی (۵۴۱ھ / ۱۱۴۶ء تا ۵۶۹ھ / ۱۱۷۴ء) نے دمشق میں رکھی تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ نوری ہسپتال ایک فرنگی بادشاہ کے زر فدیہ سے تعمیر ہوا تھا جس کا نام نہیں بتایا گیا ۔ المقریزی : خطط، ۲ : ۴۰۸ [بمصر ۱۳۲۶ھ، ۳ : ۲۶۲] ۔ ہسپتال کے ملازمین رجسٹروں میں مریضوں کے نام اور وہ اخراجات بھی درج کرتے تھے جو ہر ایک مریض کی غذا اور دواؤں وغیرہ کے لیے روزانہ کیے جاتے تھے ۔ یہ تمام کیفیت ابن جبیر (رحلۃ، ص ۲۸۳) نے ہمیں بتائی ہے ۔ نوری ہسپتال کے کسی سر برآوردہ طبیب کی زندگی کے ایک مثالی دن میں یہ چیزیں شامل تھیں : بیماروں کا پھر کر معائنہ کرنا [اور ان کا حال پوچھنا]، ہر مریض کے لیے نسخے اور ہدایات ("المداواۃ و التدبیر") تجویز کرنا، نجی مریضوں کا معائنہ کرنا اور شام کو واپس ہسپتال [کے بڑے ہال (الایوان الکبیر) میں بیٹھ کر جہاں لائبریری بھی تھی اطبا اور طلبہ کی جماعت کے ساتھ تین گھنٹے تک طبی مباحث اور درس میں اشتغال اور مطالعۂ کتب] (ابن ابی اصیبعہ، ۲ : ۱۵۵) ۔ حلب میں بھی ایک نوری ہسپتال تھا (راغب الطباخ : تاریخ حلب ۲ : ۷۷).

جب احمد بن طولون نے ۲۵۹ھ / ۸۷۲ء تا ۲۶۱ھ / ۸۷۴ء میں بیمارستان بنایا، تو اس وقت تک مصر میں کوئی بیمارستان موجود نہ تھا (المقریزی : خطط، ۲ : ۴۰۵ [بمصر ۱۳۲۶ھ، ۳ : ۲۵۸] ۔ یہاں یہ قاعدہ تھا کہ کسی فوجی سپاہی یا غلام کو اس میں بغرض معالجہ داخل نہیں کیا جاتا تھا ۔ اس ادارے میں مردوں اور عورتوں کی آسائش کے لیے وافر سامان مہیا تھا ۔ بیمارستان ناصری سلطان صلاح الدین نے تعمیر کیا تھا، لیکن المنصور قلاؤن کا عظیم الشان بیمارستان جو ۶۸۳ھ / ۱۲۸۴ء میں گیارہ ماہ [اور کچھ دن] میں مکمل ہوا [خطط، طبع مصر ۱۳۲۶ھ ۳ : ۲۶۰]، یہ مصر میں اپنی قسم کا سب سے زیادہ شاندار ہسپتال تھا، اور شاید ان سب ہسپتالوں سے زیادہ مکمل جو دنیائے اسلام میں اس وقت تک دیکھنے میں آئے تھے ۔ [عمارت مکمل ہوئی تو ملک منصور قلاؤن نے] تقریباً دس لاکھ درہم سالانہ کے اوقاف اس ہسپتال سے متعلق کیے (المقریزی، خطط، ۲ : ۴۰۶؛ بمصر ۱۳۲۶ھ محل مذکور) ۔ اس میں مردوں اور عورتوں دونوں کو داخل کیا جاتا تھا ۔ کسی کو رد نہیں کیا جاتا تھا۔ اور نہ ہی معالجے کی مدت کی کوئی حد مقرر تھی ۔ منصوری ہسپتال میں جو پہلے فاطمیوں کا محل تھا، آٹھ ہزار نفوس کے لیے جگہ تھی؛ علیحدہ علیحدہ ایوان یا وارڈ تھے، جن میں حُمّیات (یعنی بخاروں کے لیے)، آشوب چشم، سوادِ عمل جراحی، اسہال کے مریضوں کے لیے الگ الگ ایوان تھے جہاں مریضوں کا علیحدہ علیحدہ علاج ہوتا تھا، اس میں ادویہ سازی کا شعبہ، نسخے بنانے کا کمرہ اور مخازن تھے، ہر دو صنف کے خدمت گزار، کثیر التعداد انتظامی عملہ، لیکچروں کے لیے انتظامات، غرض وہاں بیماروں کی شفایابی کے لیے ہر وہ

چیز موجود تھی جو اس عہد کے بہترین تجارب کی رو سے ضروری تھی۔ ان امور کا حال جو المقریزی (خطط، ۲ : ۴۰۶ تا ۴۰۸) نے بیان کیا ہے وہ گویا ایک مؤثر خراجِ تحسین ہے جو قرونِ وسطٰی کے اسلامی علم بیمارستان کو پیش کیا جا رہا ہے۔

ہسپتالوں کے متعلق کتابیں تصنیف ہوئیں، مثلاً الرازی کی کتاب فی صفات البیمارستان (ابن ابی اصیبعہ، ۱ : ۳۱۰)، جو بیمارستان پر بہترین کتاب ہے (قب ابن القفطی، ص ۲۷۲ = ابن جلجل، طبع فؤاد سیّد، ص ۷۷)؛ جو زاهد العلماء الفارقی کی کتاب البیمارستانات کی طرح اب ناپید ہے (ابن ابی اصیبعة، ۱ : ۲۵۳)۔ [الفارقی پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی کے ماہر طبیبوں میں سے تھا، جس نے نصیرالدولہ بن مروان کے حکم سے میّافارقین میں بیمارستان بنایا جس میں نہایت عمدہ سامان موجود تھا]۔ ان سے ذرا مختلف یہ کتابیں ہیں: ابن التلمیذ: مقالة امینیة فی الأدویة البیمارستانیة اور ابن ابی البیان: الدستور البیمارستانی؛ یہ دونوں تصنیفات قرابادین (دستور دوا سازی) کی قسم کی ہیں جن کا ذکر Paul Sbath نے کیا ہے (الفہرست، قاہرہ ۱۹۳۸ء، ۱ : ۱۰، ۵۷)۔ الدستور البیمارستانی اس نے طبع بھی کی ہے (*Bulletin de l' Institut d' Egypte*، ۱۵، ۱۹۳۲ تا ۱۹۳۳ء : ۱۳ تا ۷۸)۔

مآخذ: (۱) W. Leclerc: *Histoire de la Médecine arabe*، پیرس ۱۸۷۶ء، ص ۵۵۷ تا ۵۶۷؛ (۲) E. G. Browne: *Arabian Medicine*، کیمبرج ۱۹۲۱ء، ص ۵۵ تا ۶۴، ۶۵، ۱۰۱ تا ۱۰۲؛ (۳) امین أ۔ خیراللہ: *Outline of Arabic Contributions to Medicine and the Allied Sciences*، بیروت ۱۹۴۶ء، ص ۵۹ تا ۶۳ (اس میں چند غلطیاں پائی جاتی ہیں)؛ (۴) C. Elgood: *A Medical History of Persia and the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۵۱ء، بمدد اشاریہ (اس میں المغرب کے اسلامی ممالک کے متعلق بھی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں)؛ (۵) G. Le Strange: *Baghdad during the Abbasid Caliphate*، آکسفرڈ ۱۹۰۰ء، بار دوم ۱۹۲۴ء، ص ۶۲، ۱۰۳ تا ۱۰۵؛ (۶) E. W. Lane: *Cairo Fifty Years Ago*، لنڈن ۱۸۹۶ء، ص ۹۲ تا ۹۴ (گذشتہ صدی میں منصوری ہسپتال کی زبوں حالی)؛ (۷) M. W. Hilton-Simpson: *Arab Medicine and Surgery*، آکسفرڈ ۱۹۲۲ء، ص ۱۳ (الجزائر جدید میں دیہاتی ہسپتال)؛ (۸) احمد عیسٰی بک: *Histoire des bimaristans (hôpitaux) à l'époque islamique*، قاہرہ ۱۹۲۸ء؛ (۹) وہی مصنف: تاریخ البیمارستانات فی الاسلام، دمشق ۱۹۳۹ء؛ (۱۰) J. Sauvaget: *Alep*، متن، ۱۲۶ حاشیہ ۱، اور مرقع، لوح ۶۱۔

(D. M. DUNLOP)

۲۔ المغرب کے اسلامی ممالک۔

شمالی افریقہ میں پہلا بڑا ہسپتال، جس کے متعلق کوئی شہادت موجود ہے، قاہرہ کے بڑے ہسپتال کے قیام سے تقریباً ایک صدی پہلے سلطان یعقوب المنصور الموحدی (۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء تا ۵۹۵ھ / ۱۱۹۹ء) کے ہاتھوں مراکش میں تعمیر ہوا تھا۔ اس سلطان کو عمارتیں بنانے کا بہت شوق تھا، چنانچہ جب وہ اپنے وقت کے مشہور ہسپانوی اطبا کو، مثلاً ابن طفیل، ابن رشد، ابن زُہر الحفید اور اس کے بیٹے کو اپنے دربار میں کھینچ لایا تو اس نے غیر ملکی غریب و امیر مریضوں کے لیے اپنے دارالحکومت میں ایک عظیم الشان ہسپتال بنوایا، جس کی کیفیت عبدالواحد المراکشی نے بیان کی ہے (قب المعجب، طبع محمد الفاسی، ۱۹۳۸ء، ص ۱۲۶ تا ۱۲۷ [= طبع ڈوزی، ص ۲۰۹])۔ اسی سلطان نے اپنی سلطنت کے

مختلف حصوں میں پاگلوں، کوڑھیوں اور اندھوں کے لیے بھی ہسپتال تعمیر کیے (قب القرطاس، مطبوعۂ فاس، ۱۳۰۵ھ، ص ۱۵۷؛ ترجمہ Beaumier، ص ۳۰۶)۔

عظیم مرینی سلطانوں [رک بآں]، مثلاً ابو یوسف یعقوب، ابوالحسن اور ابو عنان نے ان ہسپتالوں کو بدستور قائم رکھا بلکہ ان کی تعداد میں اضافہ بھی کیا (قب القرطاس، فاس ۱۳۰۵ھ، ص ۲۱۳؛ الذخیرة السنیة، طبع ابن شنب، ص ۱۰۰؛ ابن مرزوق: المسند، طبع Lévi Provençal، در *Hesperis*، ۵ (۱۹۲۵ء): ۳۶؛ ابن بطوطہ: رحلة، طبع Defremery اور Sanguinetti، ۳: ۳۰۷)۔ زمانۂ بعد کے سلاطین نے ان محاصل کو جو ہسپتالوں پر صرف ہونے چاہییں تھے اپنے تصرف میں لے لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہسپتالوں کی حالت خراب ہو گئی یا بند ہو گئے۔

دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں [الحسن بن محمد الوزّان] (Leo Africanus) نے فاس کے ہسپتال کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بالکل انحطاط کی حالت میں تھا، اور اسے بنیادی طور پر خطرناک پاگلوں کے قید خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس ہسپتال سے ابھی تک یہی کام لیا جاتا ہے اور یہ زنانے جیل خانے کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے (قب Leo Africanus: *Description de l'Afrique*، ترجمۂ Schefer، ۲: ۷۸؛ ترجمۂ Épaulard، ۱: ۱۸۸؛ Le Tourneau: *Fès*، ص ۲۵۵ تا ۲۵۷)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مراکش میں مشہور الموحدی ہسپتال اس طرح غائب ہوا کہ اس کا کوئی نشان بھی باقی نہ رہا، اور وہاں جو ہسپتال سلطان عبداللہ الغالب باللہ السعدی (۹۶۵ھ / ۱۵۵۷ء تا ۹۸۱ھ / ۱۵۷۴ء) نے تعمیر کیا تھا، وہ عورتوں کا جیل خانہ بن گیا (قب الناصری: کتاب الاستقصاء، ترجمہ ۵: ۶۲)۔

۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ - ۱۸۲۲ء میں علوی سلطان مولای عبدالرحمٰن نے سالی Salé کے مقام پر سیدی ابن عاشر کی درگاہ سے متصل ایک ہسپتال تعمیر کیا تھا۔ اس ہسپتال میں جو ابھی تک موجود ہے، اطبا سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔ ان کے بجائے مریض اپنی شفایابی کے لیے اس ولی کی "برکت" پر بھروسا کرتے تھے۔ پرانے ہسپتالوں کی یاد، جو اب ناپید ہو چکے ہیں یا استعمال میں نہیں رہے ہیں، مراکش کے بعض شہروں، مثلاً رباط اور القصر میں ابھی تک باقی ہے (قب برونو L. Brunot: *Textes arabes de Rabat*، جلد ۲، فرہنگ ص ۷۵۳) اور اسی طرح طنجہ میں بھی۔

کوڑھیوں کو، جنھیں حسن تعبیر سے جذامی کے بجائے "مرضٰی" کہتے تھے، شہروں سے باہر "الحارة" نام کے ایک خاص محلے میں رکھا جاتا تھا۔ فاس میں انھیں ابتدا میں باب الخوخة کے باہر تلمسان جانے والی سڑک پر آباد کیا گیا تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں انھیں باب الشریعة کے باہر غاروں میں منتقل کر دیا گیا، پھر ۶۵۸ھ / ۱۲۶۰ء میں انھیں باب الجیسه (الجیزة) کے باہر دوسرے غاروں میں رکھ دیا گیا۔ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں وہ سوق الخمیس کے قریب ایک قصبے میں رہا کرتے تھے (قب القرطاس، رباط ۱۹۳۶ء، ۱: ۵۲ تا ۵۳؛ الحسن بن محمد الوزان Leo Africanus: *Description de l'Afrique*، ترجمۂ Epaulard، ۱: ۲۲۹)۔ مراکش میں "الحارة" ابتدا میں باب آغمات کے باہر تھا۔ یہاں تک کہ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے اختتام پر سلطان المنصور السعدی نے انھیں باب دکالہ کے باہر منتقل کر دیا۔

تونس میں سلطان ابو فارس الحفصی نے ''مفلس، غریب الدیار اور بیمار مسلمانوں'' کے لیے پہلے ہسپتال کی بنیاد رکھی، جو ۸۲۳ھ / ۱۴۲۰ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا (قب الزرکشی: تاریخ الدولتین، تونس ۱۲۸۹ھ، ص ۱۰۲)۔ غرناطہ میں بنو نصر کے سلطان محمد پنجم نے ''بیمار اور غریب مسلمانوں'' کے لیے ایک شاندار ہسپتال بنایا، جو ۷۶۸ھ / ۱۳۶۷ء میں مکمل ہوا۔ اس کے سنگ بنیاد پر یہ عبارت مرقوم ہے: ''ان علاقوں میں اسلام کے اثر و نفوذ کی ابتدا سے لے کر آج تک اس قسم کا کوئی ادارہ قائم نہیں ہوا''۔ ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد سے بلنسیہ کی Vocabulista میں ہسپتال Hospitale کا ترجمہ مقامی بولی، یعنی مروجہ روزمرہ میں ''مَرِسْتان'' اور ''مَارِسْتان'' کیا جاتا رہا ہے (قب ابن الخطیب: الاحاطہ، قاہرۃ ۱۳۱۹ھ، ۲: ۹۲؛ Lévi Provençal: *Inscriptions arabes d'Espagne*، ص ۱۶۴؛ L. Seco de Lucena: *Plano de Granada arabe*، ص ۳۵).

'بیمارستان' (Hospital، جو مریضوں کے لیے ہوتا تھا) اور 'منزل' (hospicess، مسافروں کے ٹھہرنے کی جگہ) کے درمیان امتیاز کرنا ضروری ہے۔ المغرب (بلاد المغرب) میں جن بادشاہوں نے اکثر ہسپتال تعمیر کیے، انھوں نے ایسی منازل بھی بڑے بڑے شہروں کے باہر بنائیں جن کا نام ''زاویۃ'' [رک بآں] ہو گیا (قب G. S. Colin: *La Zaouya mérinite d'Anemli, a Taza*، در *Hespéris*، ۱۹۳۵ء، ۲: ۱)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الخفاجی نے اس بیان میں اپنے زمانے سے پہلے کی ایک غلطی کو دہرایا ہے کہ سب سے پہلا بیمارستان بقراط نے قائم کیا تھا، جس نے اسے ''کْسِنُدُوکِیُون'' (ξενοδοχεῖον)، یعنی (مسافروں کی قیام گاہ) کے نام سے موسوم کیا (قب شفاء الغلیل، قاہرۃ ۱۲۸۲ھ، ۵۶۲) (قب مسطور بالا، حصہ اول).

المعجب کا مراکشی مصنف (قب مسطور بالا) ہی فقط ایسا المغرب (شمالی افریقہ) کا مصنف ہے جس نے ۶۲۱ھ / ۱۲۲۴ء میں اپنی کتاب بغداد میں لکھتے ہوئے صحیح عربی صورت: ''بیمارستان'' استعمال کی ہے، ورنہ دوسرے سبھی ''مارستان'' ہی کا لفظ استعمال کرتے ہیں، یعنی بحذف جزء اول کلمہ (بی)۔ مارستان کے پہلے الف ممدود کو بہت جلد حذف کر دیا جانے لگا۔ ہسپانوی بولیوں میں رَ کے بعد زیر کی آواز ہوتی تھی (*Vocabulista*: *Marastān* و *Malastan*؛ P. de Alcalá: *Marastèa*)۔ الخفاجی کے بیان سے ظاہر ہے کہ گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی میں مصر میں ابھی یہ لفظ رائج تھا (قب شفاء، قاہرۃ ۱۲۸۲ھ، ص ۲۰۶)۔ آج کل قاہرہ میں اس لفظ کا تلفظ مُرِسْتان کیا جاتا ہے.

المغرب کی جدید بولیوں میں اس لفظ میں کچھ حلقیت (Velarisation) آ گئی ہے، یعنی ان میں اس کی شکل مُرِسْطان ہو گئی ہے۔ اس صوتی تبدیلی کا سبب شاید جذباتی ہے۔ تطوان [رک بہ تِطّاوین] میں اس کا تلفظ مِرِسْطان ہے، اور پورے المغرب میں اس کے معنی ''خطرناک پاگلوں کا شفاخانہ'' ہے (قب W. Marçais: *Textes arabes de Tanger*، ص ۴۶۳)۔

(G. S. Colin [کولن])

۳ - ترکی

پہلا سلجوقی دارالشفاء (ہسپتال) اور مدرسہ ۶۰۲ھ / ۱۲۰۶ء میں قیصری کے مقام پر قائم ہوا۔ اس کے بعد سیواس Sivas، دیوریکی Divriği، چانکیری Çankiri، قسطمونی Kastamonu، قونیہ Konya، توقاد Tokat، ارزروم Erzurum، ارزنجان Erzincan، ماردین Mardin اور اماسیہ Amasya میں

ہسپتال ہیں۔ اناطولی کے ہسپتالوں کو آج کی طرح اس زمانے میں بیمارستان، مارستان، تیمارخانہ، دارالشفاء یا دارالعافیۃ کہتے تھے۔ وہ عام ہسپتال تھے، ان معنی میں کہ ان میں ہر قسم کے مریضوں کو داخل کر لیا جاتا تھا، اور ان کے عملے میں جراح، اطباء، دواساز اور امراض چشم کے ماہر ہوا کرتے تھے۔ ان کے مصارف کے لیے علیحدہ روپیہ رکھا تھا، اور ان کی تنظیم ان کی جائے وقوع کی وسعت، اہمیت اور مخصوص ضروریات کے مطابق ہوا کرتی تھی۔

اناطولی میں پہلا عثمانی بیمارستان، برسہ کا دارالشفائے یلدرم تھا۔ جب عثمانیوں نے ۷۲۶ھ/ ۱۳۲۶ء میں برسہ کو سر کیا، تو اس میں کوئی ہسپتال نہ تھا۔ پہلے عثمانی سلطانوں (سلطان اورخان، مراد اول، یلدرم بایزید) نے شہر کو بھی وسعت دی اور کچھ ادارے قائم کیے جن میں سے ایک دارالشفائے یلدرم تھا، جس کا افتتاح ۸۰۲ھ/۱۳۹۹ء میں ہوا۔ اس ادارے کی جو "یلدرم عمارتی" (ایک مخصوص مرکز جو ہسپتال، حمام اور مسافروں کی آرامگاہ پر مشتمل تھا) کا ایک جزو تھا، متعدد دفعہ مرمت کی گئی۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں اس کی جگہ وبائی ہیضہ ہسپتال نے لے لی۔ اب یہ شکستہ ہو چکا ہے۔

یہ کوڑھی خانہ جو مراد دوم (۸۲۴ھ/ ۱۴۲۱ء تا ۸۵۵ھ/ ۱۴۵۱ء) کے عہد میں ادرنہ میں تعمیر ہوا تقریباً دو صدیوں تک چلتا رہا۔ اس کوڑھی خانے سے پہلے، ترک اناطولی میں سیواس Sivas، قسطمونی (Kastamonu) اور قیصری کے مقامات پر دوسرے کوڑھی خانے بنا چکے تھے۔

دارالشفائے فاتح، جس کا افتتاح ۸۷۵ھ/ ۱۴۷۰ء میں ہوا، محمد دوم الفاتح (۸۵۵ھ/ ۱۴۵۱ء تا ۸۸۶ھ/ ۱۴۸۱ء) نے تعمیر کیا تھا اور وہ اس کے کلیہ (کالج) کا ایک حصہ تھا۔ اگرچہ متعدد بڑی بڑی آتش زدگیوں کے باعث یہ ہسپتال اب کھنڈر ہو گیا ہے، تاہم اس کی عمارتوں سے گزشتہ صدی تک کام لیا جاتا رہا تھا۔ اس کے وقف نامے (وقفیۃ) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اطباء کے عملے کے علاوہ طلبہ کی بھی ایک بڑی جماعت موجود رہتی تھی۔ اسلامی ہسپتالوں میں طب کے طلبہ کو تربیت دینے کا یہ روایتی طریقہ تھا۔

اسی صدی میں بایزید دوم (۸۸۶ھ/ ۱۴۸۱ء تا ۹۱۸ھ/ ۱۵۱۲ء) نے ادرنہ میں دریائے تنجہ کے کناروں پر ایک اور "عمارت" قائم کی۔ اس ادارے کا ایک حصہ ہسپتال تھا، جو اسی سلطان کے نام سے موسوم تھا۔ اس کی تعمیر ۸۹۱ھ/ ۱۴۸۶ء میں شروع ہوئی، اور آٹھ برس میں مکمل ہوئی، لیکن وقف (وقفیۃ) ۸۹۸ھ/ ۱۴۹۳ء تک قائم نہیں ہوا تھا، گو اب یہ ادارہ کھنڈر بن چکا ہے، اس کا وسیع عملہ اس صدی کے آغاز تک عوام کی خدمت بہت خوبی سے کرتا رہا۔ بقول اولیا چلبی اس میں دس موسیقاروں کا ایک عملہ جو کسی کسی وقت بیماروں کو ساز بجا کر سنایا کرتے تھے۔ اس ادارے کی عمارت کے نقشوں میں، جنھیں C. Gurlitt نے بڑی عجلت سے بنایا تھا، بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں، (قب گرلٹ: *Die Baukunst Konstantinopels*، برلن ۱۹۱۲ء، دو جلدیں)۔

سولھویں صدی کے دوران میں بڑے بڑے تین ہسپتال استانبول میں قائم ہوئے اور ایک منیسہ میں، خاصکی کا بیمارخانہ ۹۴۶ھ/ ۱۵۳۹ء میں، خرم سلطان زوجۂ سلطان سلیمان اعظم کے نام پر استانبول میں تعمیر ہوا تھا؛ سلیمانیہ کا دارالشفاء اور اس کا مدرسۃ الطب، ۹۶۳ھ/ ۱۵۵۶ء میں خود سلطان کے نام پر استانبول میں تعمیر ہوئے۔ حافظہ سلطان کا دارالشفاء ۹۴۶ھ/ ۱۵۳۹ء میں سلطان

کی والدہ کے اعزاز میں مَنیسہ کے مقام پر تعمیر ہوا۔ خاصکی کے بیمارخانے کو زلزلوں اور آتش زدگیوں نے جزوی طور پر تباہ کر دیا تھا، لیکن اسے دوبارہ تعمیر کر لیا گیا ہے اور اب وہ مرکز صحت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مَنیسہ کا بیمارستان پہلی عالمگیر جنگ کے اختتام تک کام کرتا رہا، لیکن اب وہ خالی پڑا ہے۔

چوتھا ہسپتال، طوپ طاشی Toptaşi کا بیمارخانہ ۹۹۱ھ / ۱۵۸۳ء میں نوربانو سلطان، والدۂ مراد ثالث (۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء تا ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۵ء) کے نام پر استانبول میں تعمیر ہوا، یہ ادارہ ہسپتال کے طور پر ۱۹۲۷ء تک کام کرتا رہا۔

سترھویں صدی میں احمد اول (۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء تا ۱۰۲۶ھ / ۱۶۱۷ء) نے اپنی مشہور مسجد کے قریب، بوزنطی گھڑ دوڑ کے میدان (Hippodrome) کے عقب میں ایک بہت وسیع ہسپتال تعمیر کرایا۔ ہسپتال کا افتتاح ۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء میں ہوا تھا، اور ابھی حال ہی میں ایک نئے سکول کے لیے جگہ بنانے کی خاطر اسے مسمار کر دیا گیا ہے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے دوران میں صحت اور معاشرتی امداد سے متعلق عثمانی اداروں کی تأسیس میں تنزل پیدا ہو گیا، لیکن انیسویں صدی عیسوی میں، فوجی ملازمت، لباس کی وضع قطع، تعلیم وغیرہ کو عثمانی سلطنت میں جدید شکلوں میں ڈھال دیا گیا۔ ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء میں استانبول میں ادرنہ قپی Edirne Kapi کے مقام پر مہر ماہ سلطان کے مدرسے میں غربا کے لیے ہسپتال قائم ہوا۔ جس زمانے میں بزم عالم والدہ سلطان، مادرِ سلطان عبدالمجید اس ہسپتال کی تجدید کر رہی تھی تو کئی اور نئی طرز کے عسکری ہسپتال اور ایک جدید طرز کا طبی مدرسہ بھی قائم ہو چکا تھا۔ یہ ادارے نئی فوج کی طبی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بنائے گئے تھے۔ ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء میں سلطان محمود ثانی (۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء تا ۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء) نے استانبول میں ایک نیا مدرسۃ الطب و الجراحت قائم کیا، جہاں شروع میں اطالوی زبان میں تعلیم دی جاتی تھی، لیکن ۱۸۳۹ء میں وہاں آسٹریا سے کچھ قابل اساتذہ کے آ جانے پر اطالوی کے بجائے فرانسیسی میں تعلیم دی جانے لگی۔ اس مدرسے کی توسیع، سلطان عبدالمجید، سلطان عبدالعزیز اور سلطان عبدالحمید ثانی کے ہاتھوں ہوتی رہی، اور آخرکار اس میں کتے کے کاٹے (Rabies) کا ایک ادارہ، ایک اور ادارہ تحقیق جراثیم سے متعلق، اور ٹیکہ لگانے کا ایک مرکز شامل کر دیے گئے۔ متعدد اطبا نے جو مغربی زبانوں اور جدید طبی اسالیب کا علم رکھتے تھے اس مدرسے سے سند فضیلت حاصل کی۔ وہ آناطولی چلے گئے، جہاں انھوں نے جدید ہسپتالوں کی بنیاد رکھی۔ یہاں کتے کے کاٹے اور چیچک سے محفوظ کرنے کے انتظامات تقریبًا اسی وقت شروع ہو گئے جب وہ یورپ میں شروع کیے گئے تھے۔ عثمانی حکومت ان حکومتوں میں سے ایک ہے جنھوں نے پاسٹوری [لوئی پاسٹور Louis Pasteur] فرانسیسی سائنس دان، جس نے دوسرے امراض بالخصوص کتے کے کاٹے کا اور اس مرض سے بچاؤ کا علاج ٹیکے کے ذریعے کرنے کی طرح ڈالی، ادارے کے قیام میں امداد دی۔

بچوں کا شیشلی [شیشہ لی [illegible] خستہ خانہ] ہسپتال جو استانبول کے بڑے بڑے ہسپتالوں میں سے ایک ہے، سلطان عبدالحمید ثانی نے ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء میں قائم کیا تھا۔

یہ ہسپتال عثمانی سلطنت کے اہم ترین ہسپتالوں میں سے تھے؛ اگرچہ اور بہت سے دوسرے ہسپتال بھی ہیں جو ترکیہ کے اطراف و جوانب میں پائے جاتے ہیں، لیکن انھیں یہاں شامل کرنے کی

گنجائش نہیں ہے۔ ترکوں نے پانچ صدیوں میں صرف استانبول ہی میں تقریباً ستر ہسپتال قائم کیے۔

(Bedi N. Şehsuvaroğlu)

⊗ **بیمه** : رک به معاقل.

* **بینکنگ** : رک به جہبذ، صیرفی و بیت المال.

* **بینورت** : ایک مسلم رہنما، جس نے ۴۶۴ھ / ۱۰۷۲ء سے ۴۷۹ھ / ۱۰۸۶ء تک مشرقی صقلیہ [رک بآں] میں مسلمانوں کو نارمنوں کی مقاومت کرنے کا جوش دلایا۔ نارمنوں کے مؤرخ ملترا Malaterra کے بیان میں اس کا نام بینورت Benavert یا بینوث Benaveth کی شکل میں آتا ہے۔ اس شخص نے، جس کا مسلم مآخذ میں کوئی ذکر نہیں، کونٹ روجر Count Roger کے لڑکے کو ۴۶۷ھ / ۱۰۷۵ء میں کتانیہ Catania کے قریب شکست دی اور ۴۷۴ھ / ۱۰۸۱ء میں اس شہر پر قبضہ کر لیا، پھر ۴۷۸ھ / ۱۰۸۵ء میں یہیں سے کلابریا Calabria کی مہمات پر روانہ ہوا۔ اس سے اگلے سال روجر نے سیراکیوز میں اسے محصور کر لیا اور اس قلعے کو بینورت کے قبضے سے نکال لینے کی انتہائی کوشش کی کیونکہ بظاہر وہی اس کی قوت کا گڑھ بن گیا تھا۔ ۸ صفر ۴۷۹ھ / ۲۵ مئی ۱۰۸۶ء کو وہ اس بحری لڑائی میں مارا گیا جو اس بندرگاہ میں ہوئی۔ صقلیہ میں اسلام کے اس بطل کا اصلی عربی نام ابن عبّاد تھا۔ اس کا تذکرہ ہمیں فقط اس کے دشمنوں کے ذریعے پتا لگتا ہے جو اس کی ہمت و جرأت کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ تقریباً پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس محمد ابن عبّاد کے اسلاف میں سے تھا جس نے ڈیڑھ صدی بعد صقلیہ کے مسلمانوں کی فریڈرک دوم کے خلاف آخری سب سے بڑی بغاوت کی قیادت کی اور فریڈرک نے اسے قتل کرا دیا۔

مآخذ : M. Amari : *Storia dei Musulmani di Cicilia*، بار دوم، ۳ : ۱۵۰ تا ۱۹۹۔

(F. Gabrieli)

بَیْنُون : جنوبی عرب کے ایک قدیم قلعے اور قصبے کا نام۔ ہمدانی (صفۃ جزیرۃ العرب، ص ۲۰۳) نے اسے مشہور یمنی قلعوں (محافد) میں شمار کیا ہے۔ اس نے اس کا حال کتاب الاکلیل، جزء ۸ (طبع ملر، ص ۳۱، ۸۹ ببعد؛ کرملی، ص ۶۶ ببعد؛ فارس، ص ۵۳ ببعد) میں بیان کیا ہے۔ بینون کے متعلق اساطیری روایات میں ہے کہ اسے غمدان (غ م د ن)، اور سلحین (س ل ح ن) کی طرح، جو صنعاء [رک بآں] اور مارب [رک بآں] کے قلعے ہیں، جنوں نے حضرت سلیمانؑ کے لیے تعمیر کیا تھا۔ ہمدانی نے بینون کا محلِ وقوع بلاد عنس (ابن مذحج) کے مشرقی علاقے میں بتایا ہے۔ یہ قصبہ حرۂ کومان کے مقابل واقع ہے (حرۂ مذکور کوہ اسبیل کے شمال مغرب میں چھے گھنٹے کی مسافت پر ہے)۔ اس کے کھنڈر اس جگہ ملتے ہیں جہاں اب ہیاوہ آباد ہے اور Glaser کو یہیں سے دس کتبے ملے تھے۔

بینون دو زمین دوز راستوں کی وجہ سے مشہور تھا، جو چٹانوں میں سرنگیں کھود کر بنائے گئے تھے۔ حمیری بادشاہ اسعد تُبّع (ابو کرب اسعد، نواح ۳۸۵ تا ۴۲۰ء) باری باری سے کبھی یہاں اور کبھی ظفار [رک بآں] میں قیام کیا کرتا تھا۔ بینون کو غمدان اور سلحین کے ساتھ ہی حبشیوں نے ارباط کی کمان میں ۵۲۵ء (کے حدود) میں تباہ کر دیا تھا۔ بینون کو بطلمیوس کے نقشے پر (۸۴ درجے ۳۰ ثانیے، ۱۴ درجے ۱۵ ثانیے) حضرموت وادی دوعن [رک بآں] کے آس پاس تلاش کرنا چاہیے۔ ممکن ہے وہ کیئون Kaynun کی تصحیف ہو۔

مآخذ : (۱) الہمدانی، محل مذکور؛ (۲) نشان، طبع عظیم الدین، ص ۱۴۶؛ (۳) ابن المجاور، ص ۲۰۱ ببعد؛ (۴) یاقوت، ۱ : ۸۰۱؛ (۵) سپرنگر Sprenger : *Die alte*

Geographie Arabiens، ص ۱۶۳؛ (۶) H. von Wissmann و Höfner: *Beitrage zur historischen Geographie des vorislam Südarabien*، ص ۳۰، ۹۹؛ (۷) C. Conti Rossini: *Storia d' Etiopia*، ص ۱۷۸۔

(O. Löfgren)

* **بَیِّنَه** : رَكَ به بیّنه۔

* **بُیُورُلْدی** : نیز بیورلتی، بیُورُدی وغیرہ [ترکی]، وہ حکم جو وزیر اعظم، وزیر بیگلربیگی، دفتردار یا دیگر اعلیٰ افسروں کی طرف سے کسی ماتحت افسر کو دیا جائے۔ یہ لفظ "بیورلدی" سے بنا ہے جو سرکاری فرمان کے خاتمے پر لکھا جاتا تھا اور جس کے معنی ہیں حکم دیا گیا۔ بعد ازاں یہ اصطلاح ہر حکم کے لیے استعمال ہونے لگی۔ بیورلدی (احکام) کی دو بڑی قسمیں ہیں: (ا) وہ حکم جو کسی وصول نامہ عرضی یا اطلاع نامے کے حاشیے پر (در کنار) لکھا جائے۔ اس میں اکثر اس بات کی ہدایت کی جاتی تھی کہ اس غرض خاص کے حصول کے لیے ایک فرمان (یا برات وغیرہ) جاری کیا جائے (قب قانون نامۂ آل عثمان، *TOEM*، ضمیمہ، ۱۳۳۰ھ، ص ۶۱)؛ (ب) وہ احکام جو براہ راست (رأساً، بیاض اُزرینی beyad Üzerine جاری کیے جائیں۔ ان احکام کی شکل سلطانی فرمان [رک بہ فرمان] کی سی ہوتی تھی۔ اس طرح کے بہت سے احکام پر ایک مہر لگا دی جاتی تھی، یا طغرا کی شکل کے دستخط، جو پنجے (Pençe) کہلاتے تھے، ثبت کر دیے جاتے تھے۔ بعض اوقات ثبوت اور توثیق کے لیے لفظ "صح" (یعنی یہ ٹھیک ہے) بڑھا دیا جاتا تھا۔ بیورلدی بہت سی انتظامی اغراض کے لیے جاری کیے جاتے تھے، خصوصاً ملازمت عطا کرنے، جاگیر بخشنے، آمد و خرچ کی بابت ضوابط بنانے اور امن و امان کے ساتھ سفر کرنے کے لیے۔ اصل بیورلدی ترکی اور دیگر ممالک کے بہت سے دفترخانوں میں محفوظ ہیں۔ استانبول کی لائبریری باش وکالت آرشیوی [رک بآں] میں بھی بیورلدی کی نقول کی متعدد جلدیں موجود ہیں۔ دوسرے بہت سے بیورلدیوں کے اصل نسخے انشا کی کتابوں میں ملتے ہیں (مثلاً کتبخانۂ Türk Tarih Kurumu، انقرہ، مخطوطہ عدد ۲۰؛ کتاب خانۂ ملّی Bibl. Nat.، پیرس، ضمیمہ turc، مخطوطہ عدد ۹۰)، نیز شریعت کی عدالتوں کے سجلات میں بھی موجود ہیں۔

مآخذ : (۱) اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی کے مقالات در *Belleten*، ۴ (۱۹۴۰ء): ۳۹۷ ببعد؛ ۵ (۱۹۴۱ء): ۱۰۱ تا ۱۰۷، ۲۸۹ تا ۳۱۸ (فوٹو سمت) اور اس کی مرکزی و بحریہ تشکیلاتی، انقرہ ۱۹۴۸ء، بمدد اشاریہ؛ (۲) L. Fekete: *Einführung in die osman.-türk. Diplomatik*، بوڈاپسٹ ۱۹۲۶ء، ص ۵۳ تا ۵۵؛ (۳) J. Deny: *Sommaire des archives turques du Caire*، قاہرہ ۱۹۳۰ء، ص ۱۲۷ تا ۱۳۸؛ (۴) U. Heyd: *Ottoman Documents on Palestine 1552-1615*، آکسفرڈ ۱۹۶۰ء، بمدد اشاریہ؛ نیز رک بہ سرکاری دستاویزات (Diplomatic) بذیل عثمانی سلطنت۔

(U. Heyd)

بیول : (Frantz Buhl)، ڈنمارک کا ایک مشہور مستشرق، ۱۸۵۰ء میں بمقام کوپن ہیگن Copenhagen پیدا ہوا۔ اس نے وہیں تعلیم پائی اور ۱۸۷۴ء کے بعد عبری نحو اور تاریخ لغات سامیہ میں تخصص کی غرض سے پروفیسر فلائشر Fleischer اور پروفیسر ڈلیتس Delitzsch سے استفادہ کیا اور ۱۸۷۸ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لینے کے بعد اس نے کوپن ہیگن کی یونیورسٹی میں عہدنامۂ عتیق (Old Testament) سے متعلقہ علوم پڑھانے کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔

۱۸۸۹ء میں بیول کو مصر، فلسطین، شام اور ترکیہ کے سفر کا موقع ملا۔ ۱۸۹۰ء میں واپس آنے پر اسے لائپزگ (جرمنی) کی یونیورسٹی میں عہدنامۂ عتیق

کے پروفیسر کا منصب عطا کیا گیا۔ یہاں اس نے Gesenins کی شہرۂ آفاق قاموس عبری پر استدراکات لکھے۔ ۱۸۹۸ء میں وہ اپنے وطن کوپن ہیگن کی یونیورسٹی میں السنۂ سامیہ کے پروفیسر کی حیثیت سے بلا لیا گیا۔ اس عرصے میں اس نے ڈنمارک کی زبان میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کی زندگی پر ایک کتاب *Mohammeds Liv* (۱۹۰۳ء) لکھی جس کا جرمن ترجمہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا۔ نیز اموی دور کی تحریک شیعہ سے متعلق اس کا ایک مقالہ ۱۹۱۰ء میں، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کی تعلیمات کے بارے میں اس کی ایک تالیف ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔

۱۹۱۱ء میں بیول کو کوپن ہیگن یونیورسٹی کا ریکٹر Rector بنا دیا گیا اور یہیں ۳ ستمبر ۱۹۳۲ء کو بیاسی سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔

بیول کی اکثر تالیفات یروشلم اور فلسطین قدیم کے جغرافیے سے متعلق ہیں۔ مشاہیر اسلام اور اہم مقدس مقامات کے جغرافیائی حالات کے بارے میں بھی اس کے متعدد مقالات انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، لائڈن میں شائع ہوئے ہیں۔

مآخذ: (۱) مجلة المجمع العلمي (۱۹۳۲ء)، ۱۲: ۲۸۲؛ (۲) نجیب العقیقی: المستشرقون، ۱۹۴۷ء، ص ۱۸۱ - ۱۸۷؛ (۳) براکلمان، بامداد اشاریہ؛ (۴) الزرکلی: الاعلام، بذیل مادۂ فرانتس؛ (۵) انسائیکلوپیڈیا امریکانا، ۱۹۶۰ء، بذیل مادہ۔

(احسان الٰہی رانا)

- **البیہسیۃ**: رک بہ ابو بیہس۔

- **بیہق**: پہلے نیشاپور کے مغرب کی جانب خراسان میں ایک ضلع کا نام تھا۔ آل طاہر کے زمانے میں اس میں ۳۹۰ گاؤں شامل تھے، جن کی سالانہ آمدنی تقریباً دو لاکھ چھبیس ہزار درہم تشخیص ہوتی تھی۔ اس کے بڑے شہر سبزوار اور خسرو جرد تھے۔ اس شہر کو ۳۰ھ/ ۶۵۰ تا ۶۵۱ء میں ایک عرب فوج نے سپہ سالار عبداللہ بن عامر کی زیر قیادت فتح کیا تھا۔ ۴۹۶ھ/ ۱۱۰۳ تا ۴۹۷ھ/ ۱۱۰۴ء میں اسے بنالتگین نے تاراج کیا۔ حمداللہ مستوفی کہتا ہے کہ اس کے باشندے اثناعشری شیعہ تھے۔ اس کی مشہور شخصیتوں میں نظام الملک جو الپ ارسلان اور ملکشاہ کا وزیر تھا، ابوالفضل محمد بن حسین بیہقی مصنف تاریخ البیہقی اور عبدالرزاق بانی خاندان سربدار گزرے ہیں۔ پہلے زمانے میں یہاں کانوں سے سنگ مرمر نکالا جاتا تھا۔

مآخذ: (۱) ابن فندق: تاریخ بیہق؛ (۲) المقدسی: ۳۱۸، ۳۲۶؛ (۳) حمداللہ مستوفی: نزہۃ، ۱۴۹ تا ۱۵۰؛ (۴) محمد حسن خان: مرآۃ البلدان، ۱: ۲۷۲؛ (۵) دولت شاہ، ص ۲۷۷؛ (۶) Barbier de Meynard: *Dictionnaire de la Perse*، ص ۱۲۰۔

(A. K. S. LAMBTON)

⊗ **بیہقی، ابوالفضل**: (ابوالفضل) محمد بن الحسین کاتب (فارسی: دبیر) البیہقی، پانچویں صدی ہجری کے نصف اول کا مشہور ایرانی مؤرخ، سرزمین بیہق اور سبزوار کے خطے میں، جو آج کل خراسان میں ہے، حارث آباد نامی گاؤں میں پیدا ہوا۔ جوانی میں تحصیل علم کے لیے نیشاپور گیا، جو اس دور میں ایران کے عظیم ترین علمی مراکز میں سے ایک علمی مرکز تھا۔ تھوڑی ہی مدت بعد اسے غزنویوں کے دربار میں باریابی ہوئی اور اس کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی ماحول میں گزرا۔ وہ ان دبیروں میں تھا جو غزنویوں کے محکمۂ مراسلات (سکرٹیریٹ) کے صدر، [الشیخ العمید] خواجہ ابو نصر [بن] مشکان کے ماتحت کام کرتے تھے۔ وہ تمام دبیروں سے زیادہ رئیس ادارہ کا مقرب تھا۔ کبھی کبھی دربار کے اہم خطوط وہ خود تیار کرتا تھا اور

کبھی ان کی تحریر و تصحیح اسے کرنی پڑتی تھی۔ ابو نصر کی موت کے بعد مسعود غزنوی کے دربار میں ابو سہل زوزنی کے ماتحت وہ اسی عہدے پر فائز رہا، لیکن ابو سہل کی اس سے کچھ زیادہ نہ بنی۔ بعد میں عبدالرشید کے زمانے میں وہ محکمۂ مراسلات کا مہتمم اعلٰی ہو گیا، لیکن کچھ مدت کے بعد معزول ہو گیا اور بادشاہ کے حکم سے نوبان نامی ایک غلام نے اس کی جائداد قرق کر لی؛ بعد میں اسے اس الزام میں کہ اس نے اپنی بیوی کا مہر ادا نہیں کیا بحکم قاضی گرفتار کر لیا گیا۔ جب غزنویوں کے ایک مفرور غلام طغرل برار نے عبدالرشید کو قتل کر کے خزانہ پر قبضہ کر لیا تو اس وقت بیہقی کو دوسرے درباریوں کے ساتھ زندان قاضی سے قلعے میں بھیج کر وہاں بند کر دیا گیا۔ اس قید و بند سے نجات حاصل کرنے کے بعد پھر اس نے کسی سرکاری محکمے میں ملازمت نہیں کی، تاآنکہ صفر ۴۷۰ھ / اگست ۱۰۷۷ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ابوالفضل بیہقی فارسی زبان کا سب سے بڑا مؤرخ ہے اور اس نے اپنے زمانے کے واقعات کو، جنھیں اس نے بہت قریب سے دیکھا تھا، انتہائی سچائی، حق گوئی اور دیانت کے ساتھ فصیح ادبی زبان میں پیش کیا ہے اور ہر جگہ معتبر اسناد اپنی کتاب میں درج کی ہیں اور جزئی واقعات کے ساتھ ہر ایک کا دن، مہینہ اور سال سبھی ذکر کیا ہے۔ اس کی سب سے اہم تصنیف ایک بے حد ضخیم کتاب تھی، جسے لوگوں نے مختلف نام دیے ہیں جیسے جامع التواریخ اور جامع فی تاریخ سبکتگین، تاریخ آل محمود (در تاریخ بیہقی، ص ۲۰)، تاریخ ناصری، تاریخ آل سبکتگین، مگر ثابت شدہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تیس جلدیں تھیں اور سب کو ملا کر اسے جامع التواریخ یا تاریخ آل سبکتگین کہتے تھے [از روے تتمۂ صوان الحکمۃ]۔ اس کتاب کے ہر حصے کا بھی الگ الگ نام تھا جو کسی غزنوی بادشاہ کے نام پر جس کا اس میں ذکر تھا رکھا گیا تھا، پہلا حصہ تاریخ ناصری تھا، جس میں ناصرالدین سبکتگین کے حالات تھے، دوسرا حصہ تاریخ یمینی یا مقامات محمودی جو (سلطان) محمود کے بارے میں تھا اور تیسرا حصہ تاریخ مسعودی تھا جس میں مسعود کے حالات تھے، اس کے بعد کے حصوں کے نام معلوم نہیں کیا کیا تھے۔ شروع کی بیس جلدوں میں سے چار جلدیں جو تاریخ ناصری اور تاریخ یمینی پر مشتمل تھیں مفقود ہیں، فقط پانچویں سے دسویں جلد تک ہی وہ جلدیں ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں جو تاریخ مسعودی پر مشتمل ہے۔ گیارھویں سے بیسویں جلد تک نابود ہو چکی ہیں۔ وہ چھے جلدیں بھی جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں اور تاریخ بیہقی کے نام سے موسوم ہیں ان کی بابت کچھ بھی کہا نہیں جا سکتا کہ ان کے درمیان کے کچھ حصے گم ہو چکے ہیں یا نہیں، اس لیے کہ بعض مقامات پر سلسلۂ بیان و کلام ٹوٹ جاتا ہے اور واقعات کے سیاق و سباق منضبط نہیں رہتے۔ گیارھویں سے تیسویں جلد تک مسعود کے جانشینوں کی تاریخ ہے۔ ابراہیم بن مسعود کی سلطنت کے آغاز تک، یعنی مودود، مسعود دوم، ابوالحسن علی، عبدالرشید اور فرخ زاد کی تاریخ اور ۴۳۲ھ / ۱۰۴۰-۱۰۴۱ء سے ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹-۱۰۶۰ء تک انیس سال کے واقعات بیان ہو گئے ہیں، لیکن تاریخ مسعودی، جو اس وقت موجود ہے مسعود کے عہد کے تمام واقعات پر مشتمل نہیں ہے اور ۴۳۲ھ / ۱۰۴۰-۱۰۴۱ء ہی تک اختتام پذیر ہو جاتی ہے نیز مسعود کی سلطنت کا آخری ایک سال اس میں مذکور نہیں۔ اس حصے کو اس نے اپنے ذاتی مکتوبی یادداشت میں سے مسعود کی سلطنت کے بعد لکھا ہے، چنانچہ تاریخ مسعودی میں اس نے پانچ جگہ صراحت کر دی ہے کہ اس حصے کو

اس نے ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ - ۱۰۶۰ء میں لکھا اور ایک جگہ کہتا ہے کہ وہ بیس سال تک غزنویوں کی ملازمت میں رہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۳۱ھ / ۱۰۳۹ - ۱۰۴۰ء میں وہ غزنویوں کے دربار میں داخل ہوا اور اس وقت اس کی عمر چھیالیس برس تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ - ۱۰۶۰ء میں اس کتاب کی طرف متوجہ ہوا اور ان اسناد اور یادداشتوں کی مدد سے جو اس کے پاس موجود تھیں اس نے اپنے عہد کے چوالیس سال کی، یعنی غزنویوں کی حکومت کے ابتدائی سال ۳۳۳ھ / ۹۴۴ - ۹۴۵ء سے لے کر ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ - ۱۰۶۰ء تک کی تاریخ مرتب کر دی ہے۔ تاریخ مسعودی کے آخر میں مشہور فاضل روزگار ابوالریحان البیرونی کی کتاب المسامرۃ فی اخبار خوارزم کو، جس کا نشان کسی دوسری جگہ نہیں ملتا، بعینہ نقل کر دیا ہے۔ بدقسمتی سے چونکہ تاریخ بیہقی کی دسویں جلد نابود ہو چکی ہے اس لیے یہ کتاب (المسامرۃ) بھی جو نہایت درجہ اہم ہے ہم تک ناقص شکل میں پہنچی ہے۔ علاوہ جامع التواریخ یا تاریخ آل سبکتگین جیسی ضخیم کتاب کے، جس کی صرف پانچ جلدیں ناقص حالت میں ہم تک پہنچی ہیں، ابوالفضل البیہقی کی دو اور تصنیفیں ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام مقامات ابو نصر مشکان ہے اور جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس میں وہ تاریخی وقائع درج تھے جنھیں مؤرخ نے اپنے رئیس اور استاد ابو نصر مشکان، محمود و مسعود کے محکمۂ مراسلات کے مہتمم، سے سن رکھا تھا۔ انھیں کے بعض اجزاء بعض کتابوں میں باقی رہ گئے ہیں۔ دوسری کتاب زینة الکتاب یا رتبة الکتاب ہے اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ کتاب انشاپردازی اور نامہ نویسی کے فن پر تھی۔ تاریخ ناصری کے گم شدہ اجزا میں جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ محمد عوفی کی کتاب جوامع الحکایات و لوامع الروایات اور منہاج الدین بن سراج الدین جوزجانی کی طبقات ناصری اور محمد بن علی بن محمد شبانکارہی کی مجمع الانساب میں موجود ہے۔ تاریخ یمینی میں سے جو حصہ بچا ہے وہ جوامع الحکایات و لوامع الروایات تالیف محمد عوفی میں مذکور ہے۔ مقامات ابو نصر مشکان کے جو اجزا ہم تک پہنچے ہیں وہ بھی جوامع الحکایات و لوامع الروایات اور عقیلی کی آثار الوزراء میں باقی ہیں۔ امام ابوالحسن بیہقی نے تاریخ بیہق [ص ۱۷۵] میں وضاحت کر دی ہے کہ "تاریخ ناصری کی جلدیں تیس سے زیادہ ہوں گی۔ کچھ جلدیں میں نے کتابخانۂ سرخس میں دیکھی ہیں اور کچھ کتابخانۂ مہد عراق میں اور چند ہر شخص کے ہاتھوں میں، مگر مکمل کتاب نہیں دیکھی"۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کے اہم حصے بہت جلد نابود ہو گئے اور ابوالحسن بیہقی کے زمانے میں بھی دستیاب نہ ہو سکے۔ بعض حصے محمد عوفی، منہاج الدین بن سراج الدین اور محمد بن علی شبانکارہی کے زمانے، یعنی آٹھویں صدی ہجری تک مروج و متداول تھے۔ کتاب مقامات ابو نصر مشکان نویں صدی ہجری تک عقیلی، مؤلف آثار الوزراء کے زمانے میں موجود تھی اور زینة الکتاب یا زینة الکتاب ابوالحسن بیہقی، مؤلف تاریخ بیہق، کے زمانے تک دستیاب تھی۔ [بیہقی کو شعر گوئی کا شوق بھی تھا]۔

مآخذ: (۱) تاریخ بیہقی، طبع W. H. Morley، Bib. Ind، کلکتہ ۱۸۶۲ء؛ (۲) تاریخ بیہقی، تہران ۱۳۰۵ - ۱۳۰۷ ھ ش؛ (۳) تاریخ بیہقی، خواجہ ابوالفضل محمد بن حسین بیہقی دبیر، طبع ڈاکٹر غنی و ڈاکٹر فیاض، تہران ۱۳۲۴ ھ ش؛ (۴) تاریخ مسعودی، معروف بتاریخ بیہقی، از مؤلف مذکور، طبع، مقابلہ و تصحیح و تحشیہ و تعلیق از سعید نفیسی، ۳ جلد، تہران ۱۳۱۹ - ۱۳۳۲ ھ ش؛

(۵) سعید نفیسی: آثار گمشدۂ ابوالفضل بیہقی، تہران ۱۳۱۹ ش؛ (۶) مقالۂ دکتر رضازادہ شفق، در مجلۂ ارمغان، شمارہ ۲، سال ۱۱، و شمارہ ۱، ۲، سال ۱۲؛ (۷) مقالۂ عباس اقبال، در مجلۂ ارمغان، شمارہ ۱، سال ۱۳؛ (۸) ابوالحسن علی بن زید بیہقی، معروف بہ ابن فُندُق: تاریخ بیہق، تہران ۱۳۱۷ ش (ص ۱۷۵، ۲۰۲)؛ (۹) بارتولڈ: *Turkestan*، بسلسلۂ یادگار گب، ۲: ۲۲، و در وؤ، لائڈن، بار اول، ۱: ۵۹۳؛ [(۱۰) الزرکلی: الاعلام، ۶: ۲۴۲-۲۴۳؛ (۱۱) الصفدی: الوافی بالوفیات، ۳: ۲۰].

(سعید نفیسی)

• **البَیْہَقی**: ابراہیم بن محمد، ایک عرب مصنّف، جس کی بابت اس کے سوا کوئی علم نہیں کہ وہ ابن المعتزّ کے حلقے میں شامل تھا اور اس نے ادب کی ایک کتاب المحاسن و المساوی (طبع F. Schwally، Giesen ۱۹۰۲ء، بار دوم، قاہرہ ۱۹۰۶ء) خلیفہ المقتدر کے عہد (۲۹۵ھ / ۹۰۸ء تا ۳۲۰ھ / ۹۳۲ء) میں لکھی۔

(C. BROCKELMANN)

• **البَیْہَقی**: ابوبکر احمد بن الحسین بن علی (بن عبداللہ) بن موسی الخُسْرَوْجِرْدی، محدث اور شافعی فقیہ۔ انہوں نے حدیث ابوالحسن محمد بن الحسین العلوی، الحاکم ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ اور دیگر اساتذہ سے پڑھی اور اس علم کی تحصیل کے لیے بہت سے ملکوں کا سفر کیا اور ایک سو شیوخ سے استفادہ کا شرف حاصل کیا۔ عقائد میں امام اشعری کے پیرو تھے۔ وہ قناعت شعار، متقی اور طالب علم کے دلدادہ تھے۔ اواخر عمر میں نیشاپور چلے گئے اور وہاں تدریس حدیث اور اپنی کتابوں کی نقل کرانے میں مشغول ہوئے۔ بہت پارسا تھے اور کہا جاتا ہے کہ آپ کے نوشتوں کی تعداد ایک ہزار اجزا تک پہنچتی ہے۔ ممتاز محدث ہونے کے باوجود مشہور یہ ہے کہ وہ الترمذی، النسائی اور ابن ماجہ کی تالیفات سے ناواقف تھے۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ انہوں نے مسند احمد بن حنبل نہیں دیکھی تھی، البتہ حاکم کی المستدرک کا آزادی سے استعمال کیا۔ الذہبی نے لکھا ہے کہ حدیث میں البیہقی کا دائرۂ علم بہت زیادہ وسیع نہ تھا، لیکن اس کے مختلف فنون اور علم الرجال والاسانید سے خوب واقف ہونے کی وجہ سے وہ حدیث پر بحث کرنے میں خوب مہارت رکھتے تھے۔ ان کی تالیفات میں کتاب السُّنَن الکبریٰ (۱۰ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۴۴-۱۳۵۵ھ) شاید سب سے زیادہ مشہور اور مقبول ہے۔ اس کی بڑی قدر و منزلت ہوتی رہی ہے، مثلاً السبکی نے کہا ہے کہ تناسب، ترتیب اور عمدگی میں کوئی بھی اس کی مثال نہیں ہے [اس کی اکثر احادیث احکام پر حاوی ہیں]۔ اس کتاب میں مصنف نے بکثرت حواشی بڑھائے ہیں، جن میں احادیث اور محدثین کی ثقاہت اور عدم ثقاہت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اکثر اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ خاص خاص حدیثیں فلاں فلاں مسلم الثبوت مجموعوں میں بھی موجود ہیں۔ حیدرآباد (دکن) کے مطبوعہ نسخے میں ہر جلد کے ساتھ قرون ثلاثہ کے راویوں اور ان کی مرویات کا ایک قابل قدر اشاریہ لگا دیا گیا ہے اور ساتھ ہی روایت کی نوعیت بھی بیان کر دی گئی ہے۔ البیہقی کی دوسری قابل قدر کتاب المبسوط فی نصوص الشافعی ہے۔ الذہبی نے کہا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے امام شافعی کے اصول فقہ جمع کیے، مگر السبکی کی رائے میں بیہقی سب سے آخری ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے پیشرو مصنفوں کی اکثر معلومات کو جمع کر کے اس دروازے کو بند کر دیا، پھر اس کے بعد اس موضوع پر کسی اور نے قلم نہیں اٹھایا [السبکی، ۳: ۴]۔ امام الحرمین الجوینی البیہقی کی کتابوں کی، جو شافعی مذہب کی

حافظ کی حیثیت سے معروف کرتے تھے۔ البیہقی شعبان ۳۸۴ھ/۹۹۴ء میں پیدا ہوئے اور [۱۰ جمادی الاولٰی] ۴۵۸ھ/[۹ اپریل] ۱۰۶۶ء میں نیشاپور میں وفات پائی۔ (ان کا تابوت بیہق لایا گیا اور خسروجرد میں مدفون ہوئے۔ [السنن الکبرٰی پر قاضی القضاۃ شیخ علاء الدین علی بن فخرالدین عثمان بن ابراہیم الماردینی الحنفی المعروف بابن الترکمانی (م ۷۵۰ھ) نے ایک ضخیم حاشیہ موسومہ الجوہر النقی فی الرد علی البیہقی لکھا، جس میں معترضانہ اور مناقشانہ انداز اختیار کیا۔ اس حاشیے کی تلخیص زین الدین قاسم بن قطلوبغا الحنفی (م ۸۷۹ھ) نے ترصیع الجوہر النقی کے نام سے لکھی۔

[امام بیہقی کی تصانیف بکثرت بتائی جاتی ہیں، جن میں کتاب الاعتقاد، دلائل النبوۃ، شعب الایمان، مناقب الشافعی، الدعوات الکبیرۃ، کتاب الاسماء والصفات، کتاب الخلافیات، کتاب معرفۃ السنن و الآثار، کتاب المدخل الی السنن الکبرٰی، کتاب البعث و النشور اور کتاب الزہد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ السبکی کے نزدیک ان میں سے بعض تصانیف بے نظیر ہیں]۔

مآخذ: (۱) الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۳: ۳۰۹ تا ۳۱۱؛ (۲) السبکی: طبقات الشافعیۃ الکبرٰی، ۳: ۳ تا ۵؛ (۳) ابن خلکان، عدد ۲۹؛ (۴) السمعانی: کتاب الانساب، ورق ۱۹۵ الف؛ [(۵) حیدر آباد دکن [illegible]؛ (۶) الیافعی: مرآۃ الجنان، ۳: [illegible]؛ (۷) ابن العماد: شذرات الذہب، ۳: [illegible]؛ (۸) [illegible] بعید و [illegible]؛ (۹) سرکیس: معجم المطبوعات العربیۃ، عمود [illegible]؛ (۱۰) محمد بن جعفر الکتانی: الرسالۃ المستطرفۃ، [illegible]؛ (۱۱) یاقوت: معجم البلدان، [illegible] طبع مصر)؛ (۱۲) ابن الجوزی: المنتظم، [illegible] حیدر آباد [illegible]؛ (۱۳) ابن الاثیر: اللباب فی تہذیب الانساب، ۱: [illegible]، مصر ۱۳۵۷ھ].

([ادارہ] و J. Robson)

البیہقی: ظہیرالدین ابوالحسن علی بن زید ابن فندق، ایرانی مصنف، سبزوار میں پیدا ہوا، جو [نیشاپور کے مغرب میں خراسان میں] ضلع بیہق کا انتظامی مرکز (قصبہ) تھا۔ تاریخ پیدائش ۴۹۳ھ/۱۱۰۰ء ہے۔ یاقوت (ارشاد، ۵: ۲۰۸) نے اس کی تاریخ پیدائش البیہقی کی خود نوشت سوانح عمری سے ۴۹۹ھ/۱۱۰۶ء دی ہے (دیکھیے سطور آئندہ)، لیکن محمد القزوینی نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ اس کی کثیرالتعداد تصانیف (یاقوت نے ستر سے زیادہ تصانیف کے نام گنوائے ہیں جو قاموسی قسم کے ہمہ گیر موضوعات پر لکھی گئی ہیں) میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں: فارسی میں اپنی پیدائش کے ضلع کی تاریخ بیہق (یہ ابوالفضل بیہقی کی تاریخ بیہقی سے جداگانہ کتاب ہے (دیکھیے مقالۂ سابقہ)؛ ابوسلیمان السجستانی کے تذکرے صوان الحکمۃ کا تتمہ عربی میں۔ اس تتمۃ صوان الحکمۃ کا ترجمہ فارسی میں غالباً ۷۰۰ھ/۱۳۰۰ء کے قریب کیا گیا تھا۔ پروفیسر محمد شفیع (لاہور ۱۹۳۵ء) نے عربی متن مع ترجمۂ فارسی، بعد تصحیح و تنقیح اور اس کے بعد کرد علی (دمشق ۱۹۴۶ء) نے تاریخ حکماء الاسلام کے نام سے اسے چھپوایا۔ تاریخ بیہق میں بالکل ہی معلومات مشکل سے ملیں گی (خود مؤلف کا بیان ہے کہ یہ کتاب ایک قسم تاریخ بیہقی [illegible] نیز الحاکم محمد بن عبداللہ کی بارہ جلدوں والی تاریخ نیشاپور پر مبنی ہے جو اب ناپید ہو چکی ہے۔ یہ کتاب بہت دلچسپ ہے۔ ریو Rieu نے اس کے مندرجات کی شرح کی ہے (*Supplement to the Catalogue of Persian MSS. in the British Museum*، ص ۶۰)، اور ایک نسخہ بہمنیار کا طبع کردہ (تہران ۱۳۱۷ ہ ش/۱۹۳۸ء) ہے، جس پر محمد القزوینی نے فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے۔

البیہقی کا خاندان اس کے زمانے سے بھی چند پشت پہلے سے ممتاز و معزز چلا آتا تھا۔ اس خاندان کے افراد الحاکمی کا لقب اختیار کرتے تھے، کیونکہ ان کے اجداد میں سے ایک الحاکم تنفذ تھا (تاریخ بیہق، ص ۱۰۲) اور اپنے نسب کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے ایک صحابی خزیمۃ بن ثابتؓ (الانصاری) ذوالشہادتین سے ملاتے تھے۔ البیہقی کا یہ بھی دعوٰی تھا کہ وہ مؤرخ الطبری کا رشتے دار ہے (تاریخ بیہق، ص ۹۱)۔ اس کی اپنی خودنوشت سوانح عمری ہے، جو اس کی گمشدہ تاریخی تصنیف مشارب التجارب و غوارب الغرائب (یا مشارب التجارب فی التواریخ) میں دی ہوئی ہے اور جسے یاقوت نے بجنسہ نقل کر دیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اعلی تعلیم نشاپور اور مرو میں حاصل کی اور زندگی زیادہ تر خراسان میں گزاری۔ تھوڑی مدت کے لیے (۵۲۶ھ / ۱۱۳۲ء) وہ بیہق کا قاضی ہو گیا تھا، غالبًا اپنے خسر محمد بن مسعود کے رسوخ کی بدولت، جو ری کا ایک سابق گورنر تھا، پھر مشرف المملکۃ ہو گیا، مگر اس عہدے کے فرائض البیہقی کو سخت اور محنت طلب نظر آئے اور وہ جلد ہی مستعفی ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد ہم اسے رے میں الجبرا اور علم نجوم کا مطالعہ کرتے ہوئے پاتے ہیں (ارشاد، ۵ : ۲۱۰)۔ خودنوشت سوانح عمری میں ۵۴۹ھ/۱۱۵۴-۱۱۵۵ء تک کے واقعات ہیں جبکہ البیہقی نیشاپور میں تھا، مگر اس میں اس کا کچھ ذکر نہیں کہ ۵۰۷ھ/۱۱۱۳-۱۱۱۴ء میں وہ اپنے والد کے ساتھ عمر خیام سے ملاقات کرنے کے لیے گیا تھا (تتمۃ صوان الحکمۃ، ص ۱۱۶)، نہ اس واقعے کا کچھ ذکر ہے جو ۵۳۳ھ/۱۱۳۸ء میں پیش آیا۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ خراسان میں سلطان سنجر کے دربار میں گرجستان (Georgia) کے عیسائی بادشاہ Demetrins کی طرف سے ایک قاصد کچھ سوالات لے کر پہنچا جو عربی اور سریانی (تازی و سریانی) میں لکھے ہوئے تھے۔ بظاہر یہ سوالات دینی مباحث سے متعلق ہوں گے۔ سنجر کے ایما سے ان سوالات کے جوابات البیہقی نے انھیں دونوں زبانوں میں لکھے۔ یہ واقعہ اس نے خود بیان کیا ہے (تاریخ بیہق، ص ۱۶۳)۔ اس کی کتاب مشارب التجارب کا موضوع، معلوم ہوتا ہے کہ ایران کی تاریخ ۴۱۰ھ / ۱۰۲۰ء تا ۵۶۰ھ / ۱۱۶۵ء تھا (محمد قزوینی)۔ غرض یہ تھی کہ یہ العتبی کی تاریخ یمینی کا تکملہ ہو (تاریخ بیہق، ص ۲۰)۔ یاقوت نے اور جگہ اس کے اقتباسات دیے ہیں، مثلاً ارشاد، ۵ : ۲۳۴۔ ابن الاثیر نے بھی (۱۱ : ۲۳۷ تا ۲۳۹، قب ص ۳۵۳) خوارزم کے سلطان شاہ کے حالات زندگی کے لیے اس سے نقل کیا ہے اور جوینی نے (تاریخ جہان گشای، ۲ : ۱ = J.A. Boyle، *The History of the World-Conqueror*، ص ۲۷۷) خوارزم شاہیوں کی اصل و ابتدا کے بارے میں صراحۃ اسی سے نقل کیا ہے (جوینی نے اس موقع پر لکھا ہے کہ مشارب التجارب ابن مسکویہ کی تجارب الامم کا سلسلۂ مابعد ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے)، لیکن غالبًا دیگر مواقع پر اس نے بلا تصریح بھی البیہقی کی عبارت نقل کی ہے (قب تاریخ جہان گشای، ۲ : ۲۲ ببعد = Boyle، ص ۲۹۳ ببعد)۔ ابن الاثیر کی اس عبارت کے ساتھ جس کا ذکر اوپر ہوا البیہقی نے خود اپنے ہمعصر شاعر رشیدالدین وطواط کے حالات میں مشارب التجارب کا حوالہ دیا ہے (تتمہ، ص ۱۶۸) اور ابن ابی اصیبعہ نے بھی جالینوس کا زمانہ متعین کرنے میں اسی (مشارب) کو سند کیا ہے (طبقات الاطباء، ۱ : ۷۲)۔ کچھ اور مصنفوں نے بھی اس سے نقل کیا ہے، جن میں حمداللہ المستوفی (آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی) سب سے بعد کا معلوم ہوتا ہے۔ خود البیہقی کی وفات یاقوت کے قول کے مطابق ۵۶۵ھ / ۱۱۶۹-۱۱۷۰ء میں ہوئی۔

البیہقی کے انتخاب اشعار وشاح الدمیۃ کے کچھ حصوں کا پتا چلا ہے، جسے باخرزی کی دمیۃ القصر کا تکملہ کہنا چاہیے، جس میں اس کے اپنے عربی اشعار کے نمونے بھی درج ہیں (دیکھیے براکلمان اور H. Ritter: *Philologika XIII*، عدد ۱۳ و *Oriens*، ۳ (۱۹۵۰ء): ۷۷)۔ اس کا ایک ضمیمہ بھی تھا، جس کا نام درۃ الوشاح تھا (ارشاد، ۵ : ۲۱۲)۔

فقہی علوم نجوم پر فارسی میں البیہقی کا ایک رسالہ جوامع الاحکام کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے (E.G. Browne: *Handlist of Muhammadan Manuscripts*، ص ۲۰۵)۔ ایک زمانے میں اس کا خلاصہ بھی موجود تھا (حوالۂ مذکور، ص ۳۰۲)۔

مآخذ: (۱) یاقوت: ارشاد، ۵ : ۲۰۸ تا ۲۱۸؛ (۲) محمد قزوینی: مقدمۂ تاریخ بیہق (*Mukaddima to Tarikh-i-Bayhaq*)، طبع بہمنیار، تہران ۱۳۱۷ھ/ ۱۹۳۸ء؛ (۳) Storey، ص ۳۵۳ تا ۳۵۵، ۱۱۰۰، ۱۱۰۶ تا ۱۲۹۶، ۱۳۰۰؛ (۴) براکلمان، ۱ : ۳۲۴ اور تکملہ، ۱ : ۵۵۷ تا ۵۵۸؛ (۵) محمد شفیع: *The author of the oldest biographical notice of 'Umar Khayyām and the notice in question*، در *Islamic Culture*، ۶ (۱۹۳۲ء): ۵۸۶ تا ۶۲۳؛ [(۶) محمد خان طہرانی، میرزا: ترجمۂ ابی الحسن البیہقی؛ (۷) محمد محسن: الذریعہ، ۳ : ۲۳۹، النجف ۱۹۳۶ء؛ (۸) اسمٰعیل پاشا البغدادی: ہدیۃ العارفین، ۱ : ۶۹۹، استانبول ۱۹۵۱ء؛ (۹) الزرکلی: الاعلام، ۵ : ۱۰۰۱، بار دوم]۔

(D.M. DUNLOP)

٭ **بیّاسۃ:** (ہسپانوی میں بیزا Baeza)، صوبۂ جیان میں، دارالحکومت سے اڑتالیس کیلومیٹر کے فاصلے پر، ایک شہر۔ اس کی موجودہ آبادی تقریباً سترہ ہزار ہے۔ یہ ایک پہاڑی پر واقع ہے، جس کی ڈھلانیں الکبیر اور الجوز کی وادیوں میں اترتی ہیں۔ بطلیموس کے خیال میں اسے عبرانی الاصل ہونے کی وجہ سے بیاترہ کہتے تھے۔ پلینی Pliny اس کے باشندوں کو ونشنی (Vincienses) کہتا ہے۔ قوطوں (Goths) نے اسے اسقف کا تعلقہ بنا دیا۔ جب یہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو اس کا نام بیّاسہ ہو گیا۔ الادریسی کے قول کے مطابق اس کی مکئی اور باجرہ بہت مشہور تھا لیکن اس نے زیتون کے ان جھنڈوں کا ذکر نہیں کیا جو اس کے نصف علاقے کو گھیرے ہوئے ہیں [بیاسہ میں نہایت عمدہ زعفران پیدا ہوتی تھی اور دوسرے ملکوں کو بھی بھیجی جاتی تھی]۔

خلافت بنو امیہ کے دوران میں ابن حفصون [رک بآں] نے اسے فتح کیا، لیکن عبدالرحمٰن سوم نے ۲۹۷ھ/ ۹۱۰ء میں اسے واپس لے لیا۔ ۴۱۳ھ/ ۱۰۲۲ء میں یہ شہر، جیان اور قلعۂ رباح سمیت، زہیر فتی عامری کی جاگیر میں شامل تھا۔ بعد میں اس پر المرابطون نے قبضہ کر لیا، لیکن اندلس میں ان کے آخری بطل ابن غانیہ نے ۵۴۳ھ/ ۱۱۴۸ء میں اس شہر کو شہنشاہ الفانسو ہفتم کے حوالے کر دیا۔ مؤخرالذکر نے اسے اپنے قبضے میں رکھا یہاں تک کہ ۵۵۲ھ/ ۱۱۵۷ء میں اپنی موت سے ذرا پہلے اور المریہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ابذہ کے ساتھ ہی اسے بھی خالی کر دیا۔ تقریباً ایک صدی تک یہ شہر الموحدون کے قبضے میں رہا اور ۶۰۹ھ/ ۱۲۱۲ء میں الناصر نے Las Navas de Tolosa جاتے ہوئے اپنی چھاؤنی کو جیان سے بیزا میں منتقل کر دیا۔ شکست فاش کھانے کے بعد بیزا کے باشندے ابذہ کی طرف بھاگ گئے اور ۱۰ صفر ۶۰۹ھ/ ۱۲ جولائی ۱۲۱۲ء کو فاتحین خالی شہر میں داخل ہوئے اور اسے نذر آتش کر دیا۔ جب عیسائی واپس چلے گئے تو اس کی از سر نو تعمیر کی گئی اور یہ دوبارہ آباد ہوا۔ اگلے ہی سال الفانسو ہشتم نے ۱۲۱۳ تا ۱۲۱۴ء کی سردیوں میں اسے دقت کے ساتھ محاصرے میں لے لیا، لیکن اسے ناکام لوٹنا پڑا۔ عبدالمؤمن

ابوعبداللہ کا ایک بھتیجا، جو بجایہ (Bougie)، جزائر شرق الاندلس (the Balearics) اور بلنسیہ (Valencia) کا حاکم تھا، بیاسہ میں یقیناً بہت مدت رہا ہوگا، کیونکہ اس کے دس لڑکوں کا لقب البیاسی تھا اور ان میں سے سب سے بڑے لڑکے عبداللہ نے بیاسہ ہی میں العادل اور المامون کے خلاف بغاوت کی تھی۔ وہ فرڈیننڈ سوم کا حلیف بن گیا اور بیاسہ کے مقام پر اس کے پاس قشتالہ کی ایک محافظ فوج پہنچ گئی۔ جب ۶۲۳ھ / ۱۲۲۶ء میں وہ قرطبیوں کے ہاتھوں مارا گیا تو بیاسہ کے باشندوں نے پھر یہ شہر چھوڑ دیا اور انجام کار فرڈیننڈ سوم نے ذوالحجہ ۶۲۴ھ / ۳۰ نومبر ۱۲۲۷ء کو اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں بیاسہ بڑی حربی اہمیت کا قلعہ تھا اور قشتالہ اور غرناطہ کی مملکت کے درمیان سرحد پر واقع ہونے کے باعث اس نے نصریوں اور مرینیوں کے مابین تسخیر مکرر کی لڑائیوں میں اہم کردار ادا کیا۔

مآخذ: (۱) الادریسی: Desc.، متن ص ۲۰۴، ترجمہ ص ۲۴۹؛ (۲) عبدالمنعم الحمیری: الروض المعطار، متن ص ۵۷، ترجمہ ص ۷۲؛ (۳) G. Cirot: *Chronique Latine des rois de Castille*، ص ۱۱۵؛ (۴) Fernando de Cózar: *Noticias y documentos para la historia de Baeza*، ۱۸۸۴ء؛ (۵) E. Lévi-Provençal: *Hist. Esp. Mus.*، بمدد اشاریہ؛ (۶) A. Huici Miranda: *Historia del imperio almohade*، ۲ : ۴۲۲ تا ۴۴۶؛ [(۷) محمد عنایت اللہ: اندلس کا تاریخی جغرافیہ، ص ۱۷۴ تا ۱۷۵؛ (۸) یاقوت، ۱ : ۷۷۴].

(A. HUICI MIRANDA)

• **بَیّانہ:** ہسپانوی میں بَیَنہ Baena، قرطبہ کے صوبے میں ایک چھوٹا سا شہر، جو دارالحکومت سے انتیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں یہ ضلع قبرہ میں تھا۔ اس کے علاوہ الزہراء، استجہ، بیانہ اور قرطبہ کو ملا کر القنبانیہ (La Campina) کی اقلیم بنتی تھی۔ یہ قرطبہ کے صوبے میں ایک پہاڑی پر واقع ہے اور اسے وادی الجوز کا ایک معاون دریا برتلہ سیراب کرتا ہے۔ آج کی طرح یہ ہمیشہ سے باغوں، تاکستانوں اور زیتون کے جھنڈوں سے گھرا ہوا تھا اور بنی امیہ کے عہد میں اس نے بڑی خوشحالی کا زمانہ دیکھا ہے۔ اس شہر میں دریا کے روبرو ایک ڈھلان پر ایک چھوٹا سا مضبوط قلعہ اور ایک جامع مسجد، جو عبدالرحمن دوم کے حکم سے تعمیر کی گئی تھی، اور اس کے علاوہ بازار اور حمام بھی تھے۔ ابن حفصون [رک باں] نے امیر عبداللہ کے عہد میں بیانہ کو تسخیر کیا، لیکن خلافت کے خاتمے اور اس کے بعد بدامنی کے برپا ہونے سے شہر کی پرسکون زندگی برباد ہو گئی۔ اس کے موجودہ محل وقوع کی تاریخ عہد اسلامی سے شروع ہوتی ہے کیونکہ وہاں اہل روما کے آثار نہیں ملتے، بلکہ یہ آثار اس کے قریب کی راس انطقوہ کے متعدد نواحی علاقوں تک بھی کہیں نہیں ملتے۔ جنگجو الفانسو (= الفونشو [رک باں]) اندلس میں اپنی مشہور مہم پر جاتے ہوئے ارنیسول کی لڑائی (صفر ۵۲۰ھ / مارچ ۱۱۲۶ء) سے ذرا پہلے بیانہ سے ہو کر گزرا تھا، گو اس نے اسے تسخیر نہیں کیا تھا۔ جب یہ شہر ۱۲۴۰ء میں فرڈیننڈ سوم کے قبضے میں آیا تو اس وقت اس کی دہری شہر پناہ تھی، ایک اندرونی فصیل جو ”القرابہ“ اور ”مدینہ“ کے گرد تھی، اور دوسری بیرونی فصیل، جس کے احاطے میں وہ بیرونی مضافات تھے جن میں شہری لوگ آباد تھے۔ جو پناہ گزین بیانہ میں رہ گئے تھے انھیں ۱۵۷۰ء میں قشتالہ بھیج دیا گیا، لیکن ایک شاہی فرمان کے ذریعے انھیں اپنے آخری انخلا تک قرطبہ میں قیام کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس شہر کی سب سے زیادہ نامور

شخصیت قاسم بن أَصْبَغ بن محمد بن یوسف بن ناصح ابن عطاء کی تھی جو محدث اور فاضل فقه اللغة تھا ۔ یه ۲۴۷ھ/۸۶۲ء میں بیانه میں پیدا اور ۳۴۰/۹۵۱ء میں قرطبه میں فوت ھوا.

مآخذ : (۱) الادریسی : *Desc.*، ص ۱۷۴، ۲۰۵ اور ترجمه ص ۲۰۹، ۲۵۲؛ (۲) یاقوت، ۱ : ۱۳؛ (۳) عبدالمنعم الحمیری : الروض المعطار، طبع Lévi-Provençal، متن ص ۴۰، ترجمه : ص ۴۶؛ [(۴) محمد عنایت الله : اندلس کا تاریخی جغرافیه، ص ۱۷۵]۔

(A. Huici Miranda)

⊗ **بَیِّنَة** : (ع) اس کے معنی ھیں واضح ثبوت اور روشن دلیل، خواہ اس دلیل کی دلالت عقل سے تعلق رکھتی ھو یا حواس سے، بیان بھی اسی مادے سے ھے، کلام کو بھی بیان اس لیے کہتے ھیں کہ اس کے ذریعے انسان اپنا ما فی الضمیر ظاھر کرتا ھے اور اس کے ذریعے مجمل اور مبہم بیان کی تشریح اور توضیح ھو جاتی ھے (المفردات)، لہٰذا علم بیان بھی وہ علم ھے جس میں مختلف پیرایه ھاے بیان کی به حیثیت دلالت معنوی و لفظی بحث ھے ۔

علم اصول میں بیان استقرائی کی پانچ اقسام بتائی گئی ھیں : بیان تقریر، بیان تفسیر، بیان تغییر، بیان تبدیل اور بیان ضرورت ۔ بہرحال بیّنه کے معنی ھیں : واضح ثبوت اور روشن دلیل ۔ قانونی اصطلاح میں گواھوں کی دلیل اور ان کی شہادت کو بیّنة کہا جاتا ھے، جیسے حدیث میں ھے : البیّنة علی المدعی و الیمین علی المدعٰی علیه (البخاری، کتاب الرھن؛ الترمذی، کتاب الاحکام ۔ حضرت ابن عباسؓ سے بیہقی کی روایت میں المدعٰی علیه کے بجاے مَن انکر کے الفاظ ھیں)، یعنی مقدمے میں مدعی کا فرض ھے کہ گواہ پیش کرے اور اگر وہ گواہ پیش نہ کر سکے تو مدعٰی علیه سے حلف اٹھوایا جائے ۔ زبانی شہادت یا تمسکات وغیرہ سے جو ثبوت متحقق ھو جائے اسے بھی بیّنة کہتے ھیں ۔ اسلام کے قانون شہادت میں زبانی شہادت کی حیثیت گر جاتی ھے جہاں تمسکات کی رجسٹری ضروری ھے جبکہ تمسکات کا استناد گواھوں کی موجودگی میں بڑھ جاتا ھے ۔ اس قانون میں حلفیه شہادت اور قسم کے درمیان واضح امتیاز کیا گیا ھے، چنانچه شہادت وغیرہ کے ذریعے بار ثبوت مدعی پر ھے اور قسم کا تعلق اس موقع پر ثبوت سے نہیں بلکه مدعی کی طرف سے ثبوت کی عدم موجودگی میں مدعٰی علیه کی صفائی کے لیے اس کے حلف کو کافی قرار دینے سے ھے اور یہ حلف کا حق مدعی کی طرف سے "بیّنة" کی عدم موجودگی کی صورت میں مدعٰی علیه کو ملتا ھے اور اس کے مقابلے میں مدعی کو، جس پر بار ثبوت ھے، بیّنة کے بجاے حلف کا حق حاصل نہیں اور وہ یه نہیں کر سکتا کہ بیّنة پیش کرنے کے بجاے حلف اٹھا لے ۔

شریعت میں حجة کی تین اقسام ھیں : (۱) بیّنة؛ (۲) اقرار (رک بآں)؛ (۳) نُکول (یعنی جب مدعی بیّنة پیش نه کر رھا ھو تو مدعٰی علیه کا حلف اٹھانے سے انکار) ۔ نکول کی آگے دو قسمیں ھیں : نکول حقیقی اور نکول حکمی (کشاف اصطلاحات الفنون) ۔ قاضی کا فرض ھے کہ بیّنة کی توثیق کی صورت میں اور جب کہ دوسری قانونی شرائط بھی پوری ھو رھی ھوں بیّنة کے مطابق فیصله کرے (ھدایة، باب التحالف) ۔

جب عدالت میں متضاد شہادتیں اور ثبوت پیش (تعارض البینات) ھو جائیں تو قانوناً "ترجیح البینة" کا سوال پیدا ھو جاتا ھے کہ دونوں طرف کے دلائل اور گواھوں میں سے کن دلائل اور گواھوں کو ترجیح دی جائے اور اسی سلسلے میں "استصحاب الحال"، "تحکیم الحال"، "قرائن" اور "تحالف" کی بحثیں اٹھ کھڑی ھوئی ھیں اور قاضی

کا فرض ہے کہ ان کی طرف بھی توجہ دے۔ اگر اس طرح بھی کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا ہو تو قرعہ اندازی یا تقسیم جائداد بھی کی جا سکتی ہے۔

بعض لوگ اقرار (زبانی بیان) کے مقابلے میں بیّنة کو اقوی نہیں سمجھتے، لیکن علامہ ابن حزم اس کے خلاف ہیں (المحلّی، ۹ : ۳۲۶)، کیونکہ یہ فرض کرنا درست نہیں کہ شاہد کے مقابلے میں مقر یقیناً سچا ہے، لیکن زیادہ درست یہ بات ہے کہ اقرار کرنے والے مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض وہ ہوتے ہیں جن کے اقرار سے ایک تیسرا فریق متأثر ہوتا ہے اور ان کا اقرار "فی حقّ غیرہ" ہوتا ہے اور بعض وہ ہوتے ہیں جن کا اقرار "علی نفسہ" ہوتا ہے اور اس سے اقرار کرنے والا خود پابند ہو جاتا ہے اس لیے ان کے اقراروں کی قانونی حیثیت ایک دوسرے سے مختلف قرار پائے گی۔

مآخذ: (۱) کتب تفسیر، مثلاً ابن جریر، الکشاف، بحر محیط، روح المعانی، بذیل آیت؛ (۲) کتب حدیث، مثلاً فتح الباری؛ القسطلانی: شرح البخاری، ابواب القضاء، کتاب الخصومات، کتاب الاحکام؛ مسلم، کتاب الایمان؛ ابو داؤد، کتاب الاقضیة، کتاب البیوع؛ الترمذی، کتاب البیوع، کتاب الاحکام؛ ابن ماجه، کتاب الاحکام؛ (۳) هدایة، کتاب الدعوی؛ (۴) تھانوی: کشاف اصطلاحات الفنون، بذیل بیّنات؛ (۵) عبدالرحیم: *Muhammadan Jurisprudence*، لاہور ۱۹۵۸ء، بذیل Evidence؛ (۶) وو، لائڈن، طبع اوّل و دوم، اور جو مآخذ وہاں درج ہیں۔

(ادارہ)

⊗ **اَلْبَیِّنَة:** قرآن مجید کی ایک سورت کا نام، عدد تلاوت ۹۸، عدد نزول ۱۰۰۔ جمہور مفسّرین کے نزدیک یہ سورت مدنی ہے اور سورة الطلاق کے بعد نازل ہوئی تھی، لیکن بعض ضعیف روایات میں اسے مکّی بھی کہا گیا ہے۔ اس کے اور نام بھی ہیں، مثلاً سُورة لَم یَکُن الَّذِینَ کَفَرُوا، سورة القیمة، سورة المُنفَکِّین، سورة البریّة۔ اس میں ایک رکوع، آٹھ آیات، چورانوے کلمات اور تین سو نوے حروف ہیں۔

البیّنة کے لفظی معنی ہیں عقلی اور حسّی طور پر کھلی دلیل اور واضح حجت۔ یہاں البیّنة سے مراد آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم ہیں۔ اس سورت کا نام البیّنة اسی لیے رکھا گیا کہ یہ سورت بتاتی ہے کہ آنحضرتؐ کی ذات گرامی ہی آپؐ کی نبوت کی دلیل ہے۔ پچھلی سورت، یعنی القدر میں نزول قرآن کا ذکر تھا اور بتایا تھا کہ کس طرح زمانۂ نزول قرآن میں دنیا خیر و برکت سے بھر جائے گی، مگر سُورة البَیِّنَة میں یہ خبر دی کہ اگر حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و سلّم ایسے عظیم المرتبت پیغمبر تشریف نہ لاتے تو اہل کتاب اور مشرکین، جو کفر و شرک کی گمراہیوں میں مبتلا تھے، اپنے کفر و شرک سے باز نہ آتے۔ اللہ تعالٰی نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم کو رحمت بنا کر بھیجا، آپؐ قرآن مجید (صُحُف مُطَهَّرَة) تلاوت فرماتے اور کافروں اور مشرکوں کو راہ ہدایت دکھاتے تھے۔ قرآن و سنت سے ہدایت ملتی ہے اور اللہ تعالٰی کی وحدانیت معلوم ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں آخرت کے معاملات میں بھی پوری رہنمائی موجود ہے۔ قرآن مجید پاکیزہ ہے، قرآنی تعلیمات پاکیزہ ہیں۔ ان سے روح و قلب اور اخلاق و اعمال کو طہارت اور پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ نیز قرآن مجید انسانی افترا، جناتی وساوس اور القاے شیطانی سے پاک و مبرّا ہے۔ قرآن مجید کی سورتوں میں شریعت کے محکم احکام مندرج ہیں، جو سابقہ کتب سماویہ کا خلاصہ ہیں۔ ایک طرف تو قرآن مجید احکام شرعیہ کا مجموعہ ہے اور دوسری طرف اصولی طور پر سابقہ کتب سماویہ، مثلاً تورات، زبور اور انجیل کی غیر منسوخ تعلیمات پر بھی حاوی ہے۔ نیز پہلی کتابوں کی اصولی تعلیم بالخصوص پیغام

توحید موجود ہے۔ قرآن مجید میں وہ تمام باتیں پیش کر دی گئی ہیں جو بنی نوع انسان کی معاش اور معاد کو درست کرنے والی ہیں۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالی نے لوگوں کو حکم دیا تھا کہ خالص اللہ ہی کی عبادت کریں، نماز کو جملہ شرائط کے ساتھ قائم رکھیں اور زکوۃ ادا کرتے رہیں، کیونکہ جو لوگ دین حق پر قائم ہیں ان سب کا دین و آئین یہی رہا ہے۔

سورت کے آخر میں کفّار کے لیے آتش دوزخ کی وعید سنائی اور انہیں بدترین خلائق ٹھیرایا۔ اس کے مقابلے پر عمل صالح کرنے والے اہل ایمان کو خیرالخلائق قرار دیتے ہوئے انہیں جنت کی خوشخبری دی۔ مقصد یہ کہ خدائے تعالی کے احکام سے سرتابی عذاب کا باعث ہے اور اس کی فرماں برداری سے انسان نعمتوں اور آسائشوں کا مستحق ٹھیرتا ہے۔

اس سورت کی سب سے پہلی آیت کے متعلق علامہ واحدی نے کتاب بسیط میں لکھا ہے کہ یہ آیت اپنی عبارت اور تفسیر کے لحاظ سے قرآن مجید کی مشکل‌ترین آیتوں میں سے ہے اور بڑے بڑے علما اس کی تفسیر میں حیران رہ گئے ہیں اور انہوں نے اس کے معنی کرنے میں مختلف راہیں اختیار کی ہیں (الرازی، ۸: ۴۴۹؛ تفسیر مواہب الرحمن، ۳۰: ۹۶۷)۔

مآخذ: (۱) الترمذی: الجامع، ابواب تفسیر القرآن: تفسیر سورۃ لم یکن؛ (۲) الزمخشری: الکشاف، ۴: ۲۲۶ ببعد، مصر ۱۳۵۴ھ؛ (۳) الرازی، مفاتیح الغیب، ۸: ۴۴۹ ببعد؛ (۴) الراغب: المفردات؛ (۵) السجستانی: غریب القرآن؛ (۵) علی المہائمی: تبصیر الرحمن، ۲: ۴۰۹، مصر ۱۲۹۵ھ؛ (۶) محمد جمال الدین القاسمی: تفسیر القاسمی، ۱۷: ۶۲۲۳ ببعد، مصر ۱۳۸۰ھ؛ (۷) امیر علی: تفسیر مواہب الرحمن، ۳۰: ۶۶۷ ببعد، لکھنؤ ۱۳۵۰ھ؛ (۸) محمد ابراہیم میر سیالکوٹی: تفسیر الدرالنظیم (النکات المہمة فی تفسیر سورۃ البینة)، ص ۹۰ تا ۱۱۰، امرتسر، نیز دیکھیے دیگر عربی اور اردو تفاسیر بذیل سورۃ البیّنة۔

(ادارہ)

بَیُّومِیَّة: ایک مصری طریقہ (سلسلۂ تصوف) جس کی بنیاد علی بن الحجازی بن محمد البیومی الشافعی نے رکھی تھی، جو ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء میں قاہرہ میں پیدا ہوے اور وہیں ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء میں وفات پائی۔ احمدیہ اور خلوتیہ (مؤخرالذکر بذریعۂ دمرداشیّة) طریقوں کو جمع کرنے کے بعد بیومی نے ایک ایسے "ذکر" کی بنیاد رکھی جس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اسے بلند آواز سے اور زور دے کر ادا کیا جاتا تھا۔ بیومی علیہ الرحمہ کے طریقے کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے حد سے زیادہ غریب طبقوں کو متاثر کیا اور رہزنوں کو راہ راست دکھانے میں خاص کردار ادا کیا ہے، چنانچہ رہزنوں کی ایک بہت بڑی جماعت بیومی کے ہاتھ پر تائب ہوئی اور پھر اس مسلح جماعت میں شامل ہو گئی جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی، جب وہ کبھی کبھار باہر نکلتے تھے، لیکن بیومی کے اثر و رسوخ کی ایک بڑی وجہ ان کے تہیج و جمود کی وہ شدتیں تھیں جو "ذکر" کے دوران میں ان پر وارد ہوتی تھیں۔ علما نے ان کی مجالس "ذکر" کو (جو حسینی مشہد میں ہر منگل کو منعقد ہوتی تھیں) ممنوع قرار دینے کی جو کوشش کی انہیں ناکام بنانے میں شیخ شبراوی شیخ الجامع الأزہر کے عزم نے بڑا کام کیا اور اس مسئلے پر ان کی ثابت قدمی ان کی عام کمزور روش کے برعکس تھی (تاریخ الجبرتی، ۱: ۱۹۵)۔ بیومی کی تصانیف میں دمرداشیّة اور بیومیّة پر اس کے رسالے اور جیلی کی الانسان الکامل کی شرح شامل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیومی کو "حدیث" میں بڑی دسترس حاصل تھی کیونکہ جب شبراوی نے انہیں جامع ازہر

کے مدرسۂ تیبرسیہ میں سکونت اختیار کی، تو انھوں نے حدیث کے موضوع پر خطبے دیے۔ جس مسجد میں وہ مدفون ہیں اسے مصطفی پاشا والی مصر نے (غالباً ۱۷۵۷ سے ۱۷۶۰ء کے درمیان) اس وقت تعمیر کرایا تھا جب بقول جبرتی وہ وزیر اعظم ہو گیا تھا (غالباً ۱۷۶۳-۱۷۶۵ء کے درمیان)۔ بیومی نے کوئی ممتاز خلیفہ نہیں چھوڑا، لیکن لین Lane کے زمانے تک آنحضرت ؐ کے یوم پیدائش کے موقع پر اس کا طریقۂ ذکر خاصا عام تھا۔

مآخذ : (۱) براکلمان، ۲ : ۳۶۳؛ تکملہ، ۲ : ۴۸۳؛ ۲ : ۹۹۳، ۳۷۸؛ (۲) رسالة التنزيه المطلق لمن له الوجود الكامل (مخطوطہ راقم الحروف کے پاس ہے)؛ (۳) سرکیس، عمود ۶۲۲؛ (۴) تاریخ الجبرتی، ۱ : ۲۲۹؛ (۵) Lane : *Modern Egyptians*، ص ۴۴۹، ۱۸۶۱ء۔

(W. A. S. KHALIDI)

⊗ **بہاٹیا :** ایک قلعہ بند شہر، جس کا ذکر چچ کے برہمن راجا کی معرکہ آرائیوں کے سلسلے میں پہلی مرتبہ چچنامہ میں آتا ہے۔ یہ برہمن زادہ الور (سندھ) کے مشہور راجا داہر کا باپ تھا، جسے مشہور اموی سپہ سالار محمد بن قاسم [رک باں] نے شکست دی تھی۔

ہنری ایلیٹ Sir Henry Elliot، محمد ناظم اور متعدد دیگر مصنفوں نے بہاٹیا کے نام کی صحت و عدم صحت کے متعلق ایک بے مقصد نزاع پیدا کر دی ہے اور اسے بھیرہ (پنجاب میں) اچہ اور بھٹنیر (بیکانیر میں) سے ملتبس کیا ہے (دیکھیے محمد ناظم : *The Life and Times of Mahmud of Ghazna*، ص ۱۹۷)، لیکن یہ تمام اختلافات چچنامہ کے ناقابل تردید ثبوت سے ختم ہو جاتے ہیں، جس میں کم از کم آٹھ بار واضح طور پر اس کا نام بہاٹیا آیا ہے اور اس کا محل وقوع بالعموم الور اور ملتان کے درمیان بتایا گیا ہے۔ تاریخ مبارک شاہی اور طبقات ناصری میں بھی یہ نام بہاٹیا ہی کی شکل میں مرقوم ہے۔

بھٹیوں کے وقائع اور ان کی نسلی تاریخ میں اس شہر کی بنیاد کو راجا بھٹی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جو سیالکوٹ کے راجا سالباہن Salbahan کا پوتا اور موجودہ بھٹی خیل کا مورث اعلی تھا۔ اسی راجا کے متعلق روایت ہے کہ اس نے اس شہر کی بنیاد بٹوں (موجودہ بھٹوں) کے علاقے میں رکھی تھی اور اس سے اس علاقے کے موجودہ نام بھٹا واھن Bhutta Wahan کی توجیہ ہوتی ہے، جو ایک مترادف نام کے طور پر ہمیشہ لوگوں کی زبان پر رہا۔ اس کی تاریخ اساس دوسری صدی عیسوی خیال کی جاتی ہے اور اس کا قلعہ اس تاریخ سے مسلسل بھٹی نسل کے صدر مقام کے قریب رہا، جو پہلے لودروا Lodarva میں اور بعد ازاں جیسلمیر میں تھا۔

چچنامہ میں بہاٹیا [= باتیہ، بھاسیہ، بھاطیہ] کا ذکر تین اہم واقعات کے سلسلے میں آتا ہے : اولاً، الور کے چچوں کی شمالی مہم (تقریباً قبل ۱۲ھ / ۶۰۹ء) کے سلسلے میں، جس نے بہاٹیا کا قلعہ فتح کیا اور اس جگہ کے گورنر کو، جو سہاسیوں کا طرفدار تھا، مؤخرالذکر کے ایک ماتحت افسر کے ذریعے اسکلندا Asklanda (موجودہ اچ) میں مروا ڈالا، جہاں اس نے پناہ لے رکھی تھی۔ ثانیاً، بہاٹیا کا ذکر ایک واقعے کے ضمن میں آتا ہے جو محمد بن قاسم کے راوڑ Rawar فتح کرنے کے بعد ظہور پذیر ہوا (۹۳ھ/۷۱۲ء)، جب راجا داہر کا بیٹا ججسیا Jaisia [= جسیسہ یا جیسیہ] بھاگ کر برہمن آباد چلا گیا تھا اور وہاں سے اس نے اپنے جاگیرداروں اور رشتے داروں کو اپنی امداد کے لیے خط لکھے، جن میں دھرسیا کا بیٹا چچ دوم بھی تھا، جو بہاٹیا میں متعین تھا۔ ثالثاً، بہاٹیا کا ذکر محمد بن قاسم کے سندھ میں ورود و سفر (۹۵ھ / ۷۱۳ء) کے واقعے سے تعلق رکھتا ہے، جب وہ فتح کے قدم بڑھاتا ہوا ملتان کی طرف جا رہا تھا، اس نے الور کو چھوڑ دیا اور بہاٹیا پر حملہ کیا، جو

اسکلندا (موجودہ اچ) اور ملتان کو جاتے ہوئے حج کی دھلیز پر واقع اس کی راہ میں پہلا قلعہ تھا۔ قلعے کی محافظ فوج نے معاہدۂ اطاعت اور Kuksa کی شرائط پر ہتھیار ڈال دیے۔ وہاں کا ایک متبحر عالم، جو قلعے کا گورنر اور راجہ داھر کا چچازاد بھائی تھا، محمد ابن قاسم کا اس کی مزید فتوحات میں ایک وفادار حلیف بن گیا۔

مسلمانوں کی اس فتح کے بعد امن و سلامتی اور خوشحالی کا دور آیا، جس میں بڑے بڑے ممتاز مسلمان سیاحوں، جغرافیہ نویسوں اور ملکوں کا سراغ لگانے والوں کے گروہ مسلسل سندھ اور پنجاب میں آتے رہے۔ ان تمام لوگوں نے ملتان کے احوال واضح طور پر لکھے ہیں، لیکن وہ بھاٹیا اور الور اور اچ کے مابین دیگر شہروں کے متعلق خاموش ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ ان کا مقصد نئے علاقوں کا دریافت کرنا تھا اور اپنے اس مقصد میں مخلص بھی تھے لہٰذا انھوں نے ان بستیوں میں جو یقیناً ان کے راستے میں پڑی تھیں کوئی قابل ذکر چیز نہیں دیکھی۔

ابو زید الحسن السیرافی (۲۶۴ھ / ۸۷۷ء) اس عہد کے شہر ملتان کا حال بڑی وضاحت سے لکھتا ہے، لیکن اسکلندا ایسے مشہور مضافاتی شہر کا ذکر نہیں کرتا۔ البلاذری (۲۷۹ھ / ۸۹۲ء) بھی محمد ابن قاسم کے اس راستے کا حال جو اس نے الور اور ملتان کے درمیان اختیار کیا تھا بیان کرتے ہوئے بھاٹیا سے صرف نظر کر لیتا ہے، لیکن الاسکا Alaska نامی ایک قصبے کا ذکر کرتا ہے، جو ظاہر ہے عصر حاضر کا اسکلندا یا اچ ہے۔ ابن خرداذبہ (۳۰۰ھ / ۹۱۲ء) مسعر بن مہلہل، ابن حوقل (۳۳۹ تا ۹۶۸ء)، الاصطخری (۹۰۰-۹۵۰ء) اور المقدسی وغیرہ (۹۵۰ / ۹۹۰ء) یہ سب ملتان کا حال بیان کرتے ہیں، لیکن الور اور ملتان کے درمیان کسی قصبے کا ذکر نہیں کرتے، شاید بحر بسمد کے، جو پنج ند اور دشاب معلوم ہوتا ہے اور دریاے سندھ (سہران) کے دوسرے دریاؤں کے ساتھ اتصال کا مقام ہے۔

بھاٹیا کا شہر اور قلعہ دونوں البیرونی (تقریباً ۱۰۰۰ء) کے عہد تک پر رونق تھے، کیونکہ وہ اس کا ذکر ملتان، الور اور اس وقت کے دریاے سندھ کی دو شاخوں کے وسط میں ایک اہم منزل کے طور پر کرتا ہے۔

بھاٹیا [بھاطیۃ] کا ایک اور ذکر العتبی کی تاریخ یمینی میں سلطان محمود غزنوی کی (۳۹۵ھ/۱۰۰۴-۱۰۰۵ء) کی مہم کے سلسلے میں ملتا ہے۔ العتبی بھاٹیا کا مقام دریاے سندھ کے مشرق میں ملتان کے نزدیک بتاتا ہے۔ سلطان نے اس قلعے پر دھاوا بول کر اسے قبضے میں کر لیا۔ راجا [بجے راے] چپکے سے فرار ہو گیا، لیکن جب اسے گرفتار کرنے لگے تو اس نے اپنا کام تمام کر لیا [سلطان محمود جب سیستان کے معاملات کا تصفیہ کر چکا تو اس نے بھاٹیا فتح کرنے کے منصوبے کی تکمیل کا فیصلہ کیا، چنانچہ وہ دریاے سیحون (= دریاے سندھ) اور صوبۂ ملتان کو عبور کر کے بھاٹیا کے سامنے لشکر لے آیا۔ شہر کی فصیل بہت اونچی تھی۔ . . . اس کے ارد گرد خندق تھی، جو بہت گہری اور چوڑی تھی، اور اس کے چاروں طرف ایک وسیع حصار بنا ہوا تھا، جس میں علاقے کے دفاع کے لیے بڑے طاقتور سپاہی اور جنگجو ہاتھی متعین تھے۔ اس کا راجا، جسے اپنے سپاہیوں کی بہادری پر بڑا اعتماد تھا، مقابلے کے لیے قلعے سے باہر نکل آیا۔ تین دن گھمسان کا رن پڑا، اور آخرکار مسلمانوں کو فتح ہوئی اور انھوں نے قلعہ سر کر لیا۔ راجا بجے راے Bijai Rāy نے بھاگ کر قریبی جنگل میں پناہ لی، لیکن جب گرفتار ہونے لگا تو خوف سے اپنے ہی خنجر سے خودکشی کر لی (العتبی: تاریخ یمینی،

ص ۲۲۳ تا ۲۲۴).

عنصری، جو سلطان محمود کا درباری شاعر تھا، بھاٹیا کے متعلق اپنے ایک قصیدے میں لکھتا ہے :

ور از بھاطیه (؟) گویم عجب فرومانی
که شاه ایران آنجا چگونه شد بسفر
رہے که خاک درشتش چو تودهای خشک
بسان عالم و منزلگه اندرو کشور
برون گزشت برو شاه شهریار چو باد
بزور دین و بازار مذهب آزر
گرفت ملک بجیرا و گنج خانهٔ او
ز خون لشکر او کرد دشت خشک شمر
چنانش کرد خداوند خسروان زمین
که نام او بجهان گم شد است طول و قصر

(محمد ناظم : وہی کتاب، ص ۹۷ تا ۹۸)]

گردیزی اپنی کتاب زین الاخبار میں اس واقعے کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ بھاٹیا [بھاطیه] دریاے سندھ پر واقع تھا۔ دریا کے کنارے گھنے جنگلات نے بھاٹیا کے مقامی راجا بجے راے کے لیے روپوشی کا کام دیا، لیکن جب لشکر نے اسے تلاش کر لیا تو اس سے پہلے کہ وہ ان کے قابو میں آ جاتا اس نے اپنے آپ کو خنجر مار کر ھلاک کر لیا۔ گردیزی نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان براستۂ والشتان (بلوچستان) اور حصار (قلعۂ سیف اللہ) یہاں پہنچا تھا اور اسے آتے اور جاتے ہوے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اس اعتبار سے بھاٹیا کا قلعہ قُصدار (= قزدار) Qusdar کی عین سرحد پر واقع تھا، جسے سلطان نے قریب ھی میں فتح کیا تھا؛ اصلی سرحد کی تعیین اس وقت کا دریاے سندھ کرتا تھا اور اس طرح راجا بجے راے کو سلطان کی سرحد پر تاخت و تاز کرنے کی سہولت پیدا ھو گئی، نتیجۃً سلطان کو میدان میں نکلنا پڑا۔

یہی مصنف بھاٹیا کا ذکر سلطان محمود کی آخری مہم کے ضمن میں کرتا ہے، جو اس نے سندھ کے جاٹوں کو کچلنے کے لیے اختیار کی تھی اور لکھتا ہے کہ سلطان کو ملتان اور بھاٹیا کے جاٹوں سے، جو دریاے سندھ کے دونوں کناروں پر آباد تھے، شکایت تھی۔ وجہ یہ تھی کہ انھوں نے بادشاہ کے لشکر کو، جب وہ سومنات سے واپس جا رہا تھا، بہت ھراساں کیا تھا۔ ملتان کے مقام پر سلطان نے آھنی سلاخوں کے ساتھ کشتیوں کا ایک بیڑا تیار کرایا اور دریاے سندھ کے اُتر کی طرف جاتے ہوے جاٹوں کی نسبۃً زیادہ ھلکی کشتیوں کو تباہ کر دیا، جبکہ بری افواج نے ان تمام فوجیوں کا خاتمہ کر دیا جنھوں نے بھاگ کر کناروں پر جانے کی کوشش کی۔ سلطان ان کے ٹھکانوں پر پہنچا اور ان کے مال و املاک اور ساز و سامان پر قبضہ کر لیا۔ بھاٹیا کے جاٹوں کے مختلف قبائل تھے، مثلاً بھٹی، بھٹہ، مانی، دھر اور بلوچ، جو اس علاقے میں آباد تھے اور فوقیت حاصل کرنے کی خاطر ھمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے۔

تاریخ مبارک شاھی میں مرقوم ہے کہ سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۷۱ھ/ ۱۱۷۵ء میں اُچ اور بھاٹیا کے خلاف ایک مہم کی قیادت کی تھی تاکہ وہ شورش پسند بھاٹیا قبیلے کو سزا دے۔ اس مہم میں وہ کامیاب رہا اور اس نے اپنے سپہ سالار علی کرماخ کو اُچ اور ملتان کا گورنر مقرّر کیا۔

طبقات ناصری اور طبقات اکبری کا بیان بھی اس سے ملتا جلتا ہے، چنانچہ بھٹی اس وقت تک وھاں قابض تھے۔

بھاٹیا کی ایک اور سراغ تیمور کے پوتے مرزا پیر محمد کے حملے کے سلسلے میں تاریخ معصومی میں ملتا ہے، جس نے بھاٹیا پر، جو اس زمانے میں بھاٹی واہن کہلاتا تھا، حملہ کیا اور [illegible]

شہر کو مسمار کر دیا (تقریباً ۱۳۹۰ء)، تاکہ اس جگہ کے حد سے زیادہ شورش پسند لوگوں کی قوت کو کچل ڈالے، یہ بھی غالباً ''بھاٹی'' تھے۔

لیکن ایسا دکھائی دیتا ہے کہ بھاٹیا اس آفت سے بھی بچ نکلا تھا۔ تاریخ معصومی میں لکھا ہے کہ واھنوں کے نسبۃً زیادہ شورش پسند قبیلے نے، جو اس وقت قابض تھا، پھر علم بغاوت بلند کیا، لیکن اس دفعہ یہ بغاوت سندھ کے حکمران شاہ حسن ارغون کے خلاف (۹۳۸ھ / ۱۵۳۲ء) تھی۔ انھیں بالآخر حسن شاہ کے سپہ سالار بابا احمد نے کچل ڈالا، لیکن اسے اس معرکے میں اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

اس واقعہ کے بعد بھاٹیا ایک اور تغیر سے دوچار ہوا اور طاقتور بھٹا قبیلے کے ایک بار پھر عروج کے سبب اس کا نام بھٹا واھن پڑ گیا، اور اس وقت سے آج تک اسی نام سے معروف ہے۔ مقامی روایت کی رو سے اس شہر کے ناموں کی ترتیب وار فہرست یہ ہے۔ لتی واھن (قدیم لتا قبیلے کے نام پر) بھاٹیا، بھاٹی واھن اور بھٹا واھن، لیکن لوگ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ قدیم زمانے میں یہ تمام نام بیک وقت مروج تھے۔

آج کل بھٹا واھن صادق آباد ریلوے سٹیشن کے شمال میں تقریباً نو میل کے فاصلے پر جمال دین والی کو جانے والی پکی سڑک پر واقع ہے اور صادق آباد مغربی پاکستان کی قسمت بہاولپور میں ہے۔ یہ جگہ وسیع کھنڈروں سے پٹی پڑی ہے، جو قصبے کے دو میل سے زائد دائرے میں پھیلے ہوئے ہیں اور قصبے پر موجودہ گاؤں آباد ہے۔ یہ امر ایک بڑے شہر کی نشان دہی کرتا ہے جو قدیم دریائے سندھ کی تہ کی ایک خشک شاخ پر واقع تھا، جو پنجاب کے پانچوں دریاؤں کے ساتھ آج کے مقام پر مل جانے کے فوراً بعد ہی دو شاخوں میں منقسم ہو جاتا تھا، یعنی لوھاروانی اور بیج سی، اور یہ دونوں شاخیں پھر بھٹا واھن سے ذرا نیچے باہم مل جاتی تھیں اور پھر یہاں پھیل کر ایک جھیل کی شکل اختیار کر لیتی تھیں۔ یہ شمالی یا لوھاروانی شاخ کا بایاں کنارا تھا جہاں بھاٹیا کا موجودہ گاؤں واقع ہے۔

تقریباً ۱۲۰۰ء میں دریائے سندھ نے مذکورۂ بالا راستہ تبدیل کر کے موجودہ راستہ اختیار کیا اور یہ مقام اپنی مرکزی اور عسکری اہمیت سے محروم ہو گیا اور بعد میں اس کی حالت جاں بلب مریض کی سی ہو گئی۔

اس جگہ کی روایاتی تاریخ اسے سسّی کا مولد و منشا بتاتی ہے، جو پاکستان کی مشہور عوامی عشقیہ کہانی ''سسّی پنّوں'' کی ہیروئن ہے۔ اس جگہ کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ دربار اکبری کے دو مشہور شخصیتوں ابو لفضل اور فیضی کی جاے پیدائش ہے۔

مآخذ: (۱) Elliot و Dowson: *History of India as told by its own Historians*، لنڈن ۱۸۶۷ء، ج ۲، تکملہ، بذیل مادّۂ بھاٹیا؛ (۲) علی بن حامد بن ابی بکر الکوفی: فتح نامۂ سندھ، المعروف بہ چچنامہ، طبع داؤد پوتہ، دہلی ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء، ص ۱۵، ۳۳، ۳۴، ۴۳، ۱۹۷، ۲۰۲، ۲۳۵، ۲۵۷؛ (۳) گردیزی: زین الاخبار، طبع محمد ناظم، ص ۶۶؛ (۴) Guy Le Strange: *Lands of the Eastern Caliphate*، بار سوم، لنڈن ۱۹۶۶ء، نقشہ ۷؛ (۵) البیرونی: *Indica*، ترجمۂ Sachau، لنڈن، ۱: ۲۰۵؛ (۶) محمد ناظم: *The Life and Times of Sultan Mahmūd of Ghazna*، کیمبرج ۱۹۳۱ء، ص ۱۹۷، ۲۰۲؛ (۷) Elliot: *Muslim Historians*، ج ۱، بذیل مادّۂ رشید الدین؛ (۸) Alexander Cunningham: *The Ancient Geography of India*، لنڈن ۱۸۷۱ء، ص ۲۴۱، ۲۴۲؛ (۹) *Bahawalpur State Gazetteer*، حصّۂ الف، ۱۹۰۴ء،

ص ۶، ۷، ۵۷، ۳۵۹؛ (۱۰) Abbott : *Reorientation of an Unhappy Valley*، ص ۱۰۵؛ (۱۱) میر معصوم بکری : تاریخ سندھ، المعروف بہ تاریخ معصومی، طبع داؤد پوتہ، ص ۶۹، ۱۳۳، ۱۶۳، ۲۲۳؛ (۱۲) سلطان احمد : *Ghost Cities of Pakistan*، بذیل مادۂ بھاٹیا؛ (۱۳) محمد حسن سیالکوٹی : *History of Gujars alias Aasab Gujron*، بذیل مادۂ بھٹی، ص ۲۰۱، ۲۰۳؛ (۱۴) Ibbetson : *Tribes and Castes in the Punjab*، ج ۱، بذیل مادۂ بھٹی؛ (۱۵) *Epigraphia Indika*، ج ۱۱؛ (۱۶) العتبی : تاریخ یمینی، ترجمۂ James Reynolds، لنڈن ۱۸۵۸ء، ص ۲۲۲ ببعد؛ (۱۷) تاریخ مبارک شاہی، کلکتہ ۱۹۳۱ء، ص ۵، ۶؛ (۱۸) طبقات ناصری، ص ۱۱۶ (بذیل مادۂ سلطان محمد بن سام شہاب الدین غوری)، کلکتہ ۱۸۶۴ء؛ (۱۹) James Tod : *Annals and Antiquities of Rajasthan*، طبع W. Crooke، لنڈن - بمبئی ۱۹۲۰ء، ۲ : ۱۱۶۹ تا ۱۱۹۷؛ (۲۰) طبقات اکبری (۱ : ۱۶)، کلکتہ ۱۹۲۷ء - ۱۹۳۵ء۔

(سلطان احمد)

⊗ **بھارت** : رک بہ ہندوستان۔

⊗• **بھٹائی** : شاہ عبداللطیفؒ (۱۱۰۱ھ / ۱۶۸۹ء تا ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۲ء) ایک سندھی صوفی شاعر اور پیشوائے دین، جو مٹیاری [کے قریب ہالہ حویلی نام گاؤں] میں پیدا ہوئے۔ یہ مٹیاری سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ بھٹ (= ریت کا ٹیلہ) میں گزارا، جو ہالہ ضلع حیدرآباد سندھ میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ ان کی شاعری صوفیانہ رنگ کی ہے۔ ان پر جلال الدین رومی کے متصوفانہ افکار کا بہت گہرا اثر پڑا تھا اور یہ اثر ان کی بہت سی نظموں میں نمایاں ہے۔ یہ نظمیں ان کی وفات کے بعد اکٹھی کی گئیں، جنھیں ان کے مریدوں نے جمع کر کے اس کا نام رسالو [= رسالہ، دیوان] رکھا۔ یہ نظمیں اٹھارھویں صدی عیسوی کی سندھی میں لکھی گئی ہیں اور اپنی اس طرز خاص کے لیے ممتاز ہیں جس میں حضرت بھٹائی نے سندھ کی لوک کہانیوں کو عارفانہ رنگ میں پیش کیا ہے۔

یہ نظمیں ان جذبات سے بحث کرتی ہیں جو ہجر و فراق کے عالم میں پیدا ہوتے ہیں اور اللہ عزوجل کی قدرت، حکمت اور رحمت پر تکیہ کرنے کی ضرورت جتاتی ہیں۔ ان کی گہری صوفیانہ نوعیت نے انھیں عام و خاص سب میں نہایت مقبول بنا دیا ہے۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے لیے بھی وہی دل کشی رکھتی ہیں جو مسلمانوں کے لیے۔۔۔ شاہ لطیفؒ کے رسالو کی نظمیں غنائی ہیں اور مشہور ہندوستانی راگوں میں گائی جاتی ہیں، اور ان میں سے بہت سی، مثلاً سُرآسا اور سُر بلاول کی ارفع صورتیں ظاہر ہوتی ہیں، دوسری طرف عوامی کہانیاں جذب و حال کی کیفیت لیے ہوئے جو عام قاری اور مخاطب پر، جس میں سادہ دیہاتی بھی شامل ہیں، براہ راست اثر کرتی ہیں۔ 'سسّی پنّوں'، 'سوھنی مہینوال' اور 'لیلا چنیسر'، 'مومل رانو'، 'عمر ماروی'، 'نوری جام تماچی' اور 'سورٹھ رائے ڈیاچ' کی محبت کی کہانیاں آج بھی سندھی بچوں کو ہنگورے میں سنائی جاتی ہیں۔ ان وجوہ سے سندھی زبان میں حضرت بھٹائیؒ کے بارے میں وسیع ادب پیدا ہو گیا ہے اور روضۂ عبداللطیفؒ پر ان کے معتقدین آج بھی دور دور سے زیارت کے لیے آتے ہیں اور ان کی نظموں کو پڑھتے اور گاتے ہوئے سنتے ہیں۔ شاہ عبداللطیفؒ کی تصنیفات اور زندگی کا مطالعہ تین ممتاز سندھی اہل علم نے کیا ہے، یعنی شمس العلما میرزا قلیچ بیگ، پروفیسر ایچ۔ ایم۔ گربخشانی اور شمس العلما عمر بن محمد داؤد پوتہ۔

(H.T. SORLEY)

[سندھ کے مشہور بزرگ اور صوفی شاعر سید

عبدالکریم بلڑی والے شاہ عبداللطیف کے جد امجد تھے۔ ان کا شجرۂ نسب اس طرح بیان کیا جاتا ہے: سید عبداللطف بن سید حبیب بن سید عبدالقدوس بن سید عبدالکریم بلڑی والا۔

شاہ عبداللطیف کا بچپن اپنے گاؤں ہالہ حویلی میں اور شباب کا زمانہ کوٹری میں گزرا، لیکن اس کے بعد انھوں نے بھٹ کے ویران مقام کو اپنی مستقل سکونت کے لیے منتخب کیا، جہاں ان کا مزار ہے۔ بچپن ہی سے ان کا رجحان دین اور تصوّف کی طرف تھا۔ بڑے ہوئے تو فقیروں اور صوفی منش بزرگوں میں بیٹھنا اور ذکر و فکر کرنا ان کا محبوب مشغلہ ٹھیرا۔ وہ طبعاً سادگی‌پسند تھے، ان کی گفتگو سادہ، مگر شیریں و پُرسوز ہوتی تھی، عجز و انکسار ان کی سیرت کی امتیازی خوبی تھی۔ شعر سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔

ہر سال صفر کی چودہ تاریخ کو شاہ لطیفؒ کے مقبرے پر بڑی دھوم دھام سے عرس منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر لوگ اپنی اپنی ٹولیاں بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ہر ٹولی شاہ بھٹائی کا کلام اپنی مخصوص طرز میں ترنم سے پڑھتی ہے۔ ابھی تک کچھ ٹولیاں ایسی بھی ہیں جو اُن کے کلام کو اُس طرز میں گاتی ہیں جس میں آج سے دو سو سال پہلے لوگ خود شاہ بھٹائی کے زمانے میں گاتے تھے۔ ہر سو وجد و حال کے نظارے دیکھنے میں آتے ہیں۔ حکومت مغربی پاکستان نے شاہ لطیفؒ کے مقبرے کے سامنے، جسے سندھ کے امیر غلام شاہ کلہوڑو نے تعمیر کرایا تھا، مرکزِ ثقافت قائم کیا ہے، جس کا مقصد شاہ بھٹائی کی تعلیمات کی نشر و اشاعت ہے۔

شاہ بھٹائی کا مزاج قلندرانہ اور دل عشقِ الٰہی سے معمور تھا۔ ان کی طبیعت میں موزونیت اور دل میں سوز و گداز بدرجۂ اتم موجود تھا، چونکہ ان کی ساری زندگی صحرائی ماحول میں اور عوام کے درمیان گزری تھی اس لیے انھیں صحرائی ماحول اور عوامی زندگی سے بےحد محبت تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ بیک وقت شاعرِ ادبیات بھی ہیں اور عوام کے شاعر بھی۔ ان کے کلام کی مقبولیت اور شہرت کے تین اہم اسباب ہیں: اوّلاً اس میں بےحد سوز و گداز پایا جاتا ہے، جو صوفیانہ رنگ سے مزین ہے، ثانیاً اس میں شعریت و موسیقیت غایت درجہ موجود ہے اور ثالثاً وہ اپنے علاقے کی رومانی داستانوں پر مشتمل ہے، جو نہایت دلچسپ، مشہور اور مقبولِ عام ہیں۔ ان کا دیوان شاہ جو رسالو (یعنی شاہ جی کا دیوان) سندھ کے گوشے گوشے میں عقیدت اور شوق سے پڑھا جاتا ہے اور اس سے یقیناً سندھی ادبیات کی ثروت میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ اس دیوان کو سب سے پہلے ۱۸۶۶ء میں شائع کرنے کا سہرا ایک جرمن مستشرق ڈاکٹر ٹرمپ کے سر ہے، بعدازاں یہ متعدد بار شائع ہوا؛ مشہور مؤلفین کے نام یہ ہیں: محمد صدیق میمن؛ مرزا قلیج بیگ؛ ڈاکٹر گوربخشانی؛ غلام محمّد شہوانی؛ محمد عثمان ڈیپلائی؛ مولوی غلام مصطفٰی قاسمی؛ آئی۔ آئی۔ قاضی اور کلیان اڈوانی۔ علاوہ ازیں حکومت سندھ نے بھی اس دیوان کا ایک اڈیشن شائع کیا تھا۔

شاہ بھٹائی کے ہمعصر شعرا میں مندرجۂ ذیل نام قابلِ ذکر ہیں:-

پنجابی شعرا: بلّھے شاہ (۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء تا ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء)، شاہ شرف بٹالوی (۱۰۶۳ھ/۱۶۵۳ء تا ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء)، سیّد علی حیدر ملتانی (۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء تا ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء)، میاں اشرف لاہوری (م ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء)، غلام قادر بٹالوی (م ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲-۱۷۶۳ء)۔

پشتو شعرا: خوشحال خاں خٹک (ولادت ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء)، عبدالرحمٰن المعروف بہ رحمان بابا (۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲-۱۶۲۳ء تا ۱۱۱۸ھ/

۱۷۰۶ء).

اردو شعرا: ولی دکنی (۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء تا ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء)؛ شاہ مبارک آبرو (م ۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء)؛ سراج الدین خان آرزو (۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء تا ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۶ء)؛ ظہور الدین حاتم (۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء تا ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ء)؛ مرزا مظہر جان جاناں (۱۱۱۰ھ/۱۶۹۸ء تا ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) - ان تمام شعرا کے کلام کے تقابلی مطالعے سے اس دور کے ذہنی رجحانات اور ثقافتی زندگی کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے].

مآخذ: (۱) آئی - آئی - قاضی: Shah Abdul Latif-An Introduction to His Art، سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد - کراچی ۱۹۶۱ء؛ (۲) H. T. Sorley: Shah Abdul Latif of Bhit، لندن ۱۹۴۰ء؛ (۳) Ernest Trumpp: The Risalo، ۱۸۶۶ء؛ (۴) تاراچند سوکی رام: The Risalo، ۱۹۰۰ء؛ (۵) گوربخشانی H.M. Gurbuxani: The Risalo، کراچی ۱۹۲۳ء؛ (۶) مرزا قلیچ بیگ: لغت لطیفی، ۱۹۱۳ء؛ (۷) قدیم سندھ، ۱۹۲۵ء؛ (۸) وہی مصنف: شاہ عبداللطیف بھٹائی، ۱۹۱۰ء؛ (۹) ایم - ایم - گدوانی: Shah Abdul Latif، لندن ۱۹۲۲ء؛ (۱۰) جیٹھا مل پرس رام: Sind and its Sufis، ۱۹۲۴ء؛ (۱۱) وہی مصنف: Shah Jo Akhano، ۱۹۲۳ء؛ (۱۲) N. N. Bilimoria: Bibliography of publications on Sind and Baluchistan، ۱۹۳۰ء؛ (۱۳) جیٹھامل پرس رام: Interesting New Ballads، ۱۲ جلد، ۱۹۲۷ء؛ (۱۴) ایچ - ایچ - لال وانی و آر - ایم - خیمانی: تواریخ سندھ، ۱۹۲۷ء؛ (۱۵) جیٹھامل پرس رام: قدیم سندھ؛ (۱۶) وہی مصنف: Saints of Sind، ۱۹۲۳ء؛ (۱۷) وہی مصنف: India and Sind and its Sufis، حیدر آباد ۱۹۲۳ء - بمحکمۂ اطلاعات حکومت مغربی پاکستان، حیدر آباد کی مطبوعات: (۱۸) گلستان لطیف؛ (۱۹) ثمر لطیف (اردو)، کراچی ۱۹۵۳ء؛ (۲۰) یادِ لطیف (سندھی)، کراچی ۱۹۵۷ء؛ (۲۱) تحفۂ لطیف (اردو)، کراچی ۱۹۵۳ء؛ (۲۲) بہارِ لطیف (سندھی)؛ (۲۳) نغماتِ لطیف (اردو)، کراچی ۱۹۶۰ء؛ (۲۴) Shah Abdul Latif of Bhit، ۱۹۵۳ء؛ (۲۵) Ernest Trumpp: The Risalo، لائپزگ ۱۸۶۶ء؛ (۲۶) قاضی ابراہیم: The Risalo، بمبئی ۱۸۹۷ء؛ (۲۷) مرزا قلیچ بیگ: شاہ جو رسالو، سکھر ۱۹۱۳ء؛ (۲۸) آئی - آئی - قاضی: The Risalo، حیدر آباد ۱۹۶۱ء؛ (۲۹) E. H. Aitken: Sind Gazetteer، جلد ۱، بمبئی ۱۹۰۷ء؛ (۳۰) G. Allana: Presenting Pakistani Poetry، کراچی ۱۹۶۱ء؛ (۳۱) اے - کے - بروہی: An Adventure in Self-Expression، کراچی ۱۹۵۵ء؛ (۳۲) Burton H. Richard: History of Sind، لندن ۱۸۵۱ء؛ (۳۳) کریم بخش خالد: Poet-Laureate of Sindhi، حیدرآباد ۱۹۶۱ء؛ (۳۴) S. A. Kincaid: Tales of Old Sind، ۱۹۲۲ء؛ (۳۵) لیلا رام رتن مل: The Life, Religion and Poetry of Shah Abdul Latif، ۱۸۹۰ء؛ (۳۶) مرزا قلیچ بیگ: Life of Shah Abdul Latif Bhitai، ۱۸۸۷ء؛ (۳۷) W. Southey: Life of Shah Aubdul Latif، کراچی ۱۸۷۰ء؛ (۳۸) Tirithdas Hotchand: Shah Abdul Latif-An Introdction to His Seven Singing Stories، حیدرآباد ۱۹۶۲ء؛ (۳۹) آغا تاج محمد: عکسِ لطیف، حیدر آباد ۱۹۵۱ء؛ (۴۰) رشید احمد لاشاری: روحِ لطیف، حیدر آباد ۱۹۵۳ء؛ (۴۱) نذر علی بلوچ: مرغوب الاحباب، ۱۸۳۵ء؛ (۴۲) عبدالرحیم بیدل آبرو: Barsati Boondoon (سندھی)، ہالہ ۱۹۴۲ء؛ (۴۳) بھیرومل مہرچند اڈوانی: Latifi Sair (سندھی)، ۱۹۲۸ء؛ (۴۴) وہی مصنف: لغتِ غریب (سندھی)، حیدر آباد ۱۹۱۰ء؛ (۴۵) وہی مصنف: Choond Kalam، حیدر آباد؛ (۴۶) تلیان اڈوانی: شاہ (سندھی)، بمبئی ۱۹۵۱ء؛ (۴۷) لطف اللہ بدوی: تذکرۂ لطفی (سندھی)، حیدر آباد؛ (۴۸) مرزا قلیچ بیگ: شاہ

جے رسالے جی گنجی (سندھی)، ۱۹۱۸ء؛ (۹) حاجی موسیٰ خان: بادشاہ بھٹائی، حیدر آباد ۱۹۶۱ء.

([H.T. Sorley] و ادارہ)

بھٹنڈہ: سابق ریاست پٹیالہ کی، جو آج کل بھارت کے صوبۂ پنجاب میں مدغم ہو گئی ہے، تحصیل گووند گڑھ کا صدر مقام، ۳۰ درجے ۱۲ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۵ درجے طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے۔ اس کی آبادی (۱۹۰۱ء میں) ۳۴۹۹۱ تھی۔ یہ قدیم شہر بھاٹیا راجپوتوں کا مسکن تھا اور جنگی اہمیت کے وہ راستے اس کی زد میں تھے جو ملتان سے راجستھان اور وادی گنگ کی طرف جاتے تھے، جن میں کئی تاریخی مقامات مانند پانی پت، اور آگے بڑھ کر اندرا پت (دہلی) شامل ہیں۔ انہیں راستوں سے شمال مغرب کے حملہ آوروں نے ہندوستان پر حملے کیے۔ قدیم زمانے میں یہ شہر گھگر ندی کے، جو آج کل بھی انبالہ [رک بآں] کے پاس سے گزرتی ہے، ایک معاون نالے پر واقع تھا اور اس کے گرد کی زمین عملاً غیر آباد تھی۔ مسلمانوں کے زمانے سے پہلے یہ وِکرم گڑھ کے نام سے مشہور تھا۔ مسلم ہند کے ابتدائی وقائع، مثلاً طبقاتِ ناصری اور حسن نظامی کی تاج المآثر (پنجاب یونیورسٹی لائبریری مخطوطہ) میں اسے تبرہندہ لکھا ہے، جو اس کے صحیح نام بتَرندہ (بھتَرندہ) کی بدلی ہوئی شکل ہے اور اس تبدیلی کی وجہ ب اور ت کے نقطوں کا جگہ سے بدل جانا ہے۔ مرتضی الزَّبیدی اصابت کے زیادہ قریب ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ البَتَرندہ ہندوستان میں ایک شہر ہے (تاج العروس، ۹: ۲۱۲)۔ ''بھٹرندہ'' لفظ بھٹی اور رِندہ (= جنگل، گزرگاہ) سے مرکب ہے اور اس کے معنی ہیں وہ مقام جہاں بھٹی لوگ بکثرت ہیں، اسی طرح ''سہرند'' سیلہ (porcupine) اور رِند (جنگل) سے مرکب ہے اور اسے بھی غیر ہندی مسلم مؤرخوں نے بدل کر سرہند کر دیا ہے۔ تمام قدیم تر فارسی وقائع اور صوفیوں کے تذکروں میں اس جگہ کا نام عموماً سہرند ہی لکھا ہے (مثلاً بابر نامہ، انگریزی ترجمہ از A. S. Beveridge، ۱: ۳۸۳)۔ طبقاتِ ناصری (طبع عبدالحیّ حبیبی، کوئٹہ ۱۹۴۹ء، ۱: ۵۳۷) میں بھٹنڈہ کو غلطی سے سرہند لکھا ہے، اس لیے کہ اس شہر کے قرب و جوار میں کہیں پہاڑیاں نہیں۔ ہاں بھٹنڈہ سے تیس میل دور سرہند کے راستے میں ایک گھنے جنگل کا وجود ملفوظاتِ تیموری کے بیان سے ثابت ہوتا ہے (Elliot و Dowson، ۳: ۴۲۷)۔ یہ جنگل چیتے کے شکار کے لیے اکبر کی پسندیدہ شکارگاہ تھا (آئینِ اکبری، انگریزی ترجمہ Blochmann، ۱: ۲۸۶)۔ بھٹنڈہ اور اس کے گرد و نواح میں بھٹیوں کی کثرت کی بابت وافر شہادت موجود ہے (*Imp. Gazetteer of India*، طبع جدید، ۸: ۹۱)۔ کننگھم Cunningham نے بھٹنڈہ کے اشتقاق کی بابت محض قیاس کی بنا پر جو رائے ظاہر کی ہے وہ صحیح نہیں اور حقیقت سے دور ہے۔

بھٹنڈہ کو محمود غزنوی نے ۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء میں فتح کیا۔ بھٹنڈہ (بھاطیہ) کا راجا بجے رائے محاصرہ کرنے والوں کی تاب مقاومت نہ لا سکا، قلعے سے نکل بھاگا اور خودکشی کر لی۔ جس ''بھاطیہ'' (بھاٹیا) [رک بآں] کا العُتبی (تاریخ یمینی، لاہور ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء، ص ۲۰۹ ببعد) نے ذکر کیا ہے اس کی شناخت میں کسی قدر اختلاف رائے ہے۔ محمد ناظم (*The Life and Times of Sultan Mahmud of Ghazna*، کیمبرج ۱۹۳۱ء، ص ۱۹۷ - ۲۰۳) وثوق سے کہتا ہے کہ وہ اور کوئی شہر نہیں بھٹنڈہ ہی تھا، لیکن ایک غیر معروف مقام ھاطیہ اب بھی راولپنڈی کے اطراف میں موجود ہے اور اس پر بھی کسی حد تک العُتبی کا بیان صادق آتا ہے۔ بہرحال جب تک زیادہ قطعی شہادت نہ ملے محمد ناظم کا قول ماننا پڑے گا۔ العُتبی

(ص ۹ - ۲) بھٹنڈہ کی بلند فصیل اور اس کے استحکامات کی، جو محمود کے زمانے میں موجود تھے، بڑی جیتی جاگتی کیفیت بیان کرتا ہے۔ سلطان محمود کی یہی فتح بالواسطہ ہندوستان کے سامانہ، انبالہ اور حصار کے خطے میں اسلام کے تعارف کا نشان آغاز ہے۔ معزالدین سام شہاب الدین محمد غوری نے ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء میں بھٹنڈہ فتح کیا۔ جب محمد غوری غزنہ واپس چلا گیا تو ملک ضیاءالدین تولکی پر، جو بھٹنڈہ میں اس کا نائب حکمران تھا، راے پتھورا (پرتھوی راجا) نے حملہ کر دیا اور قلعے کا محاصرہ تیرہ مہینے جاری رکھا۔ انجام کار قلعہ‌دار نے دشمن سے صلح کر لی اور قلعہ اس کے حوالے کر دیا۔ ۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء میں قطب‌الدین ایبک کی وفات کے بعد ناصرالدین قُباچہ نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد یہ خاندانِ غلامان کے بادشاھوں کے قبضے میں رہا۔ ۶۳۷ھ / ۱۲۳۹ء میں ملک اختیارالدین اَلتونیہ نے، جو بھٹنڈے کا حاکم تھا، بغاوت کر دی۔ یاقوت حبشی کو قتل کر دیا اور رضیہ سلطانہ [رَكَ بآں] کو قید کر کے قلعے میں رکھا اور وھیں اس سے شادی بھی کر لی۔ مگر وہ دونوں بھٹنڈے سے دہلی جاتے وقت ہندوؤں کے ھاتھوں مارے گئے۔ ۶۵۱ھ / ۱۲۵۳ء میں ناصرالدین محمود نے قلعے پر قبضہ کر لیا اور ملک شیر خاں کو وھاں کا حاکم مقرر کر دیا۔

اس کے بعد اس شہر کا ذکر بہت کم سننے میں آتا ہے۔ اگرچہ اس کا قلعہ اپنی مضبوطی اور ناقابل تسخیر ہونے کے باعث ہر زمانے میں مشہور رہا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ بابرنامہ میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ یہ ذکر پہلے آ چکا ہے کہ اکبر پرگنۂ بھٹنڈہ میں شکار کھیلا کرتا تھا۔ اس کے اتالیق بیرم خاں [رَكَ بآں] نے معتوب ہونے کے بعد جلندر [رَكَ بہ دوآب] جانے سے پہلے اپنے اہل و عیال کو اس قلعے میں ٹھیرایا تھا۔ جلندر پر اس کی تباھی لشکر سے ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں وہ بری طرح ھارا۔ اس کے بعد بھٹنڈے کا نام تاریخ سے غائب ہو جاتا ہے اور فقط ۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۴ء میں اس کا پھر نام آتا ہے جب اسے پٹیالہ کے راجہ آلا سنگھ نے فتح کیا۔ اس کے بعد یہ اس کی اولاد کے قبضے میں رہتا چلا آیا یہاں تک کہ ۱۹۵۶ء میں اس سارے علاقے کو بھارت میں مدغم کر لیا گیا۔ موجودہ قلعہ ایک سو اٹھارہ فٹ بلند ہے اور اس کے چھتیس برج ہیں۔ قلعہ شہر پر، جو لین دین اور تجارت کی بارونق منڈی ہے، حاوی ہے، اور ارد گرد کئی میل سے نظر آتا ہے۔ سلطان محمود کے زمانے میں اس کے گرد ایک چوڑی اور گہری خندق تھی، جسے اس کے حکم سے درختوں اور پتھروں سے پاٹا گیا تب قلعہ فتح ہوا۔ یہ خندق آج کل بھی موجود ہے، مگر جگہ جگہ کوڑے کرکٹ اور شہر کے ملبے سے اٹ گئی ہے، جو اس میں لا کر ڈالا جاتا رہا ہے۔ یہ قلعہ اب تیزی کے ساتھ خستہ و شکستہ ہوتا جا رہا ہے اور اس کے سب سے بڑے دروازے کی محرابوں تک میں بڑی بڑی درزیں پڑ گئی ہیں۔ اس کے دو بھاری مینار ۱۹۵۸ء میں گر چکے ہیں۔ بابا حاجی رتن ہندی [رَكَ بہ رتن] کی بابت مشہور ہے کہ وہ اس شہر کے باشندے تھے۔

مآخذ: (۱) العُتبی: تاریخ یمینی، (کتاب الیمینی) لاہور ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء، ص ۲۰۹ ببعد اور انگریزی ترجمہ از J. Reynolds، لنڈن ۱۸۵۸ء، ص ۲۲۲ تا ۲۲۶؛ (۲) طبقات ناصری (طبع عبدالحی حبیبی) ۲ جلد، ج ۱، کوئٹہ ۱۹۴۹ء، ج ۲، لاہور ۱۹۵۰ء، بمدد اشاریہ؛ (۳) فرشتہ: گلشن ابراہیمی، لکھنؤ ۱۸۷۴ء، ص ۴۰؛ (۴) گردیزی: زین الاخبار، طبع محمد ناظم، کیمبرج ۱۹۲۹ء، ص ۶۷؛ (۵) H. G. Raverty: انگریزی ترجمۂ طبقات ناصری، لنڈن ۱۸۸۱ء، ۱: ۷۹ تا ۸۰، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۴۵؛ ۲: ۱۰۴۷؛ (۶) P. W. Powlett: *Gazetteer of Bikaner State*،

(۱۸۷۳ء)، ص ۲۲۱ ببعد؛ (۷) سُجان رائے: خُلاصۃ التواریخ، طبع ظفر حسن، دہلی ۱۹۱۸ء، بمدد اشاریہ؛ (۸) نظام الدین احمد: انگریزی ترجمۂ طبقات اکبری، کلکتہ ۱۹۲۷ء، ۱: ۵ ببعد؛ (۹) البداؤنی: منتخب التواریخ، انگریزی ترجمہ، کلکتہ ۱۸۹۸ء، جلد ۱، بمدد اشاریہ؛ (۱۰) *Imp. Gazetteer of India*، آوکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ۸: ۸۹ تا ۹۰؛ (۱۱) محمد ناظم: *The Life and Times of Sultan Mahmud of Ghazna*، کیمبرج ۱۹۳۱ء، ص ۱۹۶ تا ۲۰۳ اور بمدد اشاریہ؛ (۱۲) A. Cunningham: *Archaeological Survey of India*، (سالانہ اطلاعات) ۲۳: ۲ تا ۸؛ (۱۳) *Journal of the Punjab Historical Society*، ۲: ۱۰۹؛ ۳: ۳۰؛ (۱۴) *Cambridge History of India*، ۳: ۱۳؛ (۱۵) اکبر نامہ (Bib. Ind.) انگریزی ترجمہ، ۲: ۱۹۹؛ (۱۶) آئین اکبری، (انگریزی ترجمہ از Jarret) کلکتہ ۱۸۹۱ء، ۲: ۱۹۵، ۳۶۰ تا ۳۶۱؛ (۱۷) Elliot و Dowson، ۲: ۴۳۸ تا ۴۴۰؛ (۱۸) مقالہ رتن، در وۃ، لائڈن، طبع اول، تکملہ؛ (۱۹) المیزان، حیدر آباد ۱۳۳۰ھ، ۲: ۵۰۰۔

(بزمی انصاری)

بھٹی: راجستانی لفظ بھاٹی کی پنجابی شکل، ایک دور دور تک پھیلے ہوئے راجپوت قبیلے کا نام، جس کا تعلق اس علاقے سے ہے جو جیسلمیر سے مغربی پنجاب کے فتح آباد اور بھٹنیر کے درمیان کے قطعے تک پھیلا ہوا ہے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد نے، جو پنجاب میں بس گئی تھی، اسلام قبول کر لیا۔ ان کی روایتوں میں سے ایک روایت کے مطابق جیسلمیر کے جادون Jadons، زابلستان سے پنجاب اور راجپوتانے کی طرف نکال دیے گئے تھے۔ ان کی وہ شاخ جو راجپوتانے میں جا بسی بھاٹی کہلاتی۔ چچ نامہ میں صحرائے تھر Thar کے مقام رَمَل کے بھٹی راجا کے جو حالات دیے گئے ہیں وہ ان قصوں کی تصدیق کرتے ہیں جو Tod: *Annals and antiquities of Rajasthan*، مدراس ۱۸۷۳ء میں محفوظ کیے گئے ہیں۔ ان کا ذکر عفیف کی تاریخ فیروز شاہی (Bib. Indica، ص ۹۳ تا ۹۴) میں بھی آیا ہے، ان کی بستیوں کی وسیع نوعیت کا ذکر آئین اکبری میں آیا ہے، جہاں ابوالفضل "بھٹی" کی اصطلاح ان لوگوں کے لیے مخصوص کرتا ہے جو سرھند، ملتان اور پنجاب میں آباد تھے [نیز رک بہ بھاٹیا]۔

مآخذ: مخطوطہ عدد Eur. D. 164، انڈیا آفس لائبریری: *History of the Rathors and Bhattis of Rajputana*۔

(C. COLLIN DAVIES)

بھرتپور: بھارت کی ایک سابق ریاست؛ آج کل راجستھان کا ایک حصہ، ۲۶ درجے ۴۳ دقیقے اور ۲۷ درجے ۵۰ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۶ درجے ۵۳ دقیقے اور ۷۷ درجے ۴۶ دقیقے طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے۔ ریاست کا صدر مقام بھرتپور شہر ہے، جو ۲۷ درجے ۱۳ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۷ درجے ۳۰ دقیقے طول بلد مشرقی پر، آگرے سے چونتیس میل کے فاصلے پر ہے۔ اس شہر کی آبادی ۱۹۰۱ء میں ۲۷۳۲۱ تھی۔ بہرسر کو، جو بھرتپور سے چودہ میل ہے، پانچویں صدی ہجری / گیارھویں عیسوی میں محمود غزنوی کی فوجوں نے سید بھائیوں جلال الدین اور علاء الدین کے زیر قیادت، جو اپنے آپ کو امام جعفرالصّادقؑ کی اولاد بتاتے تھے، فتح کیا۔ یہاں کی ایک مقامی روایت کے مطابق اس کے فتح کرنے میں تین گھنٹے کے قریب لگے تھے اور اس وجہ سے اس کا نام بہر (۳ گھنٹے) سر (فتح کیا ہوا) پڑ گیا۔ چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ معزالدین بن سام شہاب الدین محمد غوری کے قبضے میں آ گیا۔ اس کے بعد مختلف خانوادوں کے زیر حکومت رہتا چلا آیا، یہاں تک

کہ بابر نے اسے فتح کیا۔ بابر نے بیانہ (بھرتپور سے چونتیس میل) کے رئیس کو ایک منظوم اعلان جنگ بھیجا تھا، جس کے شروع کا مصرعہ تھا:

با تُرک ستیزہ مکن اے میر بیانہ

[اور باقی مصرعے حسب ذیل تھے:

مردانگی و چستی اتراک عیان است
گر زود نیائی و اطاعت نکنی پیش
آنرا کہ عیا نست چہ حاجت بہ بیانست]

اس کے بعد یہ مغلوں ہی کی حکومت میں رہا۔ اورنگ زیب کے آخری ایام میں بیرج، نے جو ریاست بھرتپور کا بانی تھا، کوشش کی کہ خودمختاری حاصل کرلے، لیکن شاہی فوج نے اس کی کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا اور بیرج لڑائی میں مارا گیا۔ فرّخ سیر کے زمانۂ سلطنت (۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء تا ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء) میں چورامن جاٹ نے اس علاقے میں لوٹ مار کی، اور دہلی اور آگرے کے راستے بند کر دیے۔ ۱۱۳۲ھ/۱۷۱۹ء میں ایک بڑی مہم جے پور کے راجا سوائی جے سنگھ کے زیر قیادت چورامن کی گوشمالی کے لیے بھیجی گئی، لیکن بادشاہ گر سیدوں نے، جو محمد شاہ شہنشاہ دہلی کے خلاف تھے، جاٹوں سے ازخود صلح کر لی۔ ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء میں شہنشاہ کو خراج دینے کی شرط پر چورامن کے جانشین بدن سنگھ کے پورے بھرتپور کے راجا ہونے کا اعلان کیا گیا۔ ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء میں اس کے بیٹے سورج مل نے اتنی قوت بہم پہنچا لی کہ شاہی صدر مقام (دہلی) پر حملہ بول دیا اور لوٹ کھسوٹ مچائی۔ شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی [رک باں] نے اپنے چند خطوط میں ان مظالم کا نوحہ کیا ہے جو جاٹوں کے ہاتھوں باشندگان دہلی پر ہوے۔

موجودہ شہر بھرتپور اور اس کے کچے قلعے کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۱۳۶ھ/۱۷۳۳ء میں تعمیر ہوے تھے۔ انگریزوں نے لارڈ لیک کی قیادت میں اس قلعے پر ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں حملہ کیا جو ناکام رہا۔ آخر لارڈ کومبرمیر Combermere نے ۱۲۳۳ھ/۱۸۲۹ء میں اسے فتح کیا۔

مآخذ: (۱) سید علی رضا: تاریخ بیانہ (مخطوطہ)؛ (۲) محمد ظہیر الحسن: تاریخ سادات بھرتپور، کراچی ۱۹۵۰ء؛ (۳) C. K. M. Walter: *Gazetteer of Bharatpore State*، آگرہ ۱۸۶۸ء؛ (۴) *Imp. Gaz. of India*، ۸، آوکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ۸: ۷۳ تا ۸۲؛ (۵) J.N. Creighton: *Narrative of the Seige and Capture of Bhuratpore*، لنڈن ۱۸۳۰ء؛ (۶) Storey، ۱/۱: ۵۸۸ تا ۵۹۰، ۱/۲: ۱۳۲۹؛ (۷) J.N. Sarkar: *Fall of the Moghal Empire*، بار دوم، کلکتہ ۱۹۴۹ء، ۱: ۱۴۲ تا ۱۴۳؛ ۲ (۱۹۵۰ء): ۳۱۰ تا ۳۰۱؛ (۸) J. Tod: *Annals and Antiquities of Rajasthan*، لنڈن ۱۹۱۴ء، بمدد اشاریہ؛ (۹) *History of the Freedom Movement*، ج ۱، کراچی ۱۹۵۷ء، بمدد اشاریہ۔

(بزمی انصاری)

بھڑوچ: گجرات [رک باں] کا ایک ضلع، جو آج کل صوبۂ بمبئی (بھارت) میں شامل ہے اور جس کا رقبہ تقریباً چودہ سو پچاس مربع میل اور آبادی تین لاکھ ہے۔ مسلمانوں کی آبادی ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند سے پہلے کل آبادی کا بیس فیصد تھی، لیکن اس کا ایک بڑا حصہ اس کے بعد سے پاکستان چلا آیا ہے۔ مسلمانوں کی بڑی جماعت وہ تھی جو بوہرہ [رک باں] کہلاتی ہے۔ اس ضلع کے صدر مقام کا نام بھی بھڑوچ ہے، عرض بلد شمالی ۲۱ درجے ۴۲ دقیقے، طول بلد شرقی ۷۳ درجے ۲ دقیقے ہے۔ اس کا ذکر سب سے پہلے موریا سلطنت کے ایک شہر کی حیثیت سے آتا ہے۔ بعد میں (تقریباً ۴۰۰ء) یہ پارتھی ساکھوں (Sābas) کے قبضے میں رہا۔ وسط ہند کی بولی میں اس کے نام کی شکل بھڑوچھ bharugaccha تھی جو سنسکرت بھڑگک شیتر bhrgukṣetre سے بنی

تھی۔ اس سے یونانیوں میں یہ Βαρυγαζα کے نام سے مشہور تھا اور یہاں ایک بندرگاہ تھی جہاں سے بحر احمر کی تجارت ہوا کرتی تھی (Ptolemy : Geog.، VII ۱ : ۶۳؛ VIII ۳۶ : ۱۲)، اور اندرون ہندوستان کی ایک اہم تجارتی شاہراہ کے سرے پر واقع تھا (Periplus، فصل ۴۷ تا ۴۸)۔ یہ راجپوتوں اور گوجروں (گورجروں) (Gurdjaras) کے قبضے میں تھا جو غالباً چالوکیہ راجاؤں کے باج گزاروں کی حیثیت رکھتے تھے، جب اسے ۱۵ھ / ۶۳۶ء، ۹۹ھ/ ۷۱۷ء اور ۱۰۴ھ/ ۷۲۲ء میں عربوں کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی اور چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں راشٹرکولوں Rastrakulas کے قبضے میں رہا۔ پھر چالوکیہ راجاؤں نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ۶۹۸ھ / ۱۲۹۸ء میں اسے سلطان علاءالدین خلجی کے بھائی الغ خان نے فتح کر لیا ۔ ۔ ۔ (فرشتہ، طبع Briggs، ۱ : ۳۲۷)۔ اس کے بعد یہ مسلسل مسلمان والیوں کے تحت رہا جو سلاطین دہلی کے نائب ہوتے تھے، یہاں تک کہ ۷۹۸ھ / ۱۳۹۵-۱۳۹۶ء میں محمد ظفر خان (جو ۷۹۳ھ/ ۱۳۹۱ء سے یہاں کا والی تھا) خود مختار حاکم بن بیٹھا۔ اس وقت سے یہ احمد شاہی [رک بآں] بادشاہوں کے تحت رہا یہاں تک کہ اکبر نے ۹۸۰ھ/ ۱۵۷۳ء میں اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۱۱۴۹ھ / ۱۷۳۶ء میں عبداللہ بیگ کو نظام الملک سے (جو ۱۰۳۵ھ / ۱۷۲۲ء سے دکن کا خود مختار حکمران بن گیا تھا اور جس نے اس وقت جب گجرات کا صوبےدار تھا بھڑوچ کو اپنی ذاتی جائداد میں شامل کر لیا تھا) نیک عالم خاں کا خطاب مل گیا اور اس نے بھڑوچ کے نوابی خاندان کی بنیاد رکھی۔ انگریزوں نے اسے ۱۱۸۶ھ / ۱۷۷۲ء میں فتح کر لیا تھا اور تب اس کا اینگلو انڈین نام بروچ Broach ہو گیا تھا۔

عمارات: بہادر شاہ (۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء تا ۹۴۳ھ / ۱۵۳۷ء) نے قدیم استحکامات کو دوبارہ تعمیر کیا۔ ۱۰۷۱ھ / ۱۶۶۰ء میں اورنگزیب نے انہیں کہیں کہیں سے منہدم کرا دیا مگر ۱۰۹۷ھ / ۱۶۸۵ء میں اسی کے حکم سے انہیں دوبارہ تعمیر کیا گیا تاکہ بھڑوچ مرہٹوں کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہے۔ آج کل وہ بہت خراب و خستہ حالت میں ہیں۔ یہاں کی جامع مسجد (تقریباً ۷۰۱ھ/ ۱۳۰۱-۱۳۰۲ء) گجرات میں مسلمانوں کے فن تعمیر کا ارتقا ظاہر کرنے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ شروع میں پٹن میں جو عمارتیں بنیں وہ جین اور ہندو عمارتوں کی نقلیں تھیں، لیکن اس کے برعکس یہاں مسلمانوں نے خود اپنے روایتی نقشے کے مطابق مسجد تعمیر کی، جس میں پرانی عمارتوں کا ملبہ کام میں لایا گیا اور چار دیواری میں مستعمل پتھروں کو نئے سرے سے تراش کر لگایا گیا۔ اس طرح یہ مسجد گجرات میں مسلمانوں کے فن تعمیر کا سب سے پہلا نمونہ ہے۔ مسجد کا صدر دالان دونوں طرف سے کھلے ستونوں کی قطار کی شکل میں ہے ۔ ۔ ۔

. . . .

دالان کے اڑتالیس ستون ہیں جن پر کثرت سے باریک نقش و نگار کھدے ہوئے ہیں۔ اس کی تین محرابیں اب تک موجود ہیں جن کی سردلوں کے نیچے نوکدار قوسیں قائم کی گئی ہیں۔ لیوان کی چھت پر تین بڑے اور دس چھوٹے گنبد ہیں اور نیچے کی طرف پرانی عمارتوں سے نکالی ہوئی چھتیں بڑی محنت سے اندر بٹھائی گئی ہیں۔ ان کے نقش و نگار اگرچہ ہندوانی تھے لیکن ان کی نوعیت رسمی تھی اور وہی بعد میں مسلمانوں کی گجرات کی عمارتوں میں برابر مروج رہے۔ معلوم ہوتا ہے اس پوری عمارت کا کام مقامی معماروں ہی کے ہاتھ سے مسلمان

نگران کاروں کے تحت انجام پایا۔ جس کے تین حصے تین منڈھپ Mandpas کی طرح ہیں، جنھیں از سر نو جوں کا توں کھڑا کر دیا گیا ہے۔

مآخذ: (۱) تاریخ کے لیے رک بہ گجرات؛ (۲) Bombay Gazetteer، ۲ : ۱۸۷۷ء؛ ۳۳۷ تا ۵۹۹؛ (۳) جامع مسجد کے پورے حالات کے لیے دیکھیے: J. Burgess: On the Mohammadan architecture of Bharoch... in Gujarat، ASWI، ج ۶ (=ASI، NIS، ج ۲۳) لنڈن ۱۸۹۶ء۔

(J. BURTON-PAGE)

بھکر: رک بہ بکر۔

مآخذ: بکر کے تحت جو مآخذ وہاں موجود ہیں ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل: (۱) Gaz. of Sind، B III، ص ۵۳ تا ۶۰؛ (۲) Imp. Gaz. of India، ۹ : ۳۷؛ (۳) Henry Cousens: Antiquities of Sind، کلکتہ ۱۹۲۹ء، ص ۱۴۴ تا ۱۴۹؛ (۴) J. Abbot: Sind، آوکسفرڈ ۱۹۲۴ء، ص ۹۴ تا ۹۹؛ (۵) طبقات ناصری، طبع عبدالحی حبیبی، کوئٹہ ۱۹۴۹ء، ج ۱، بمدد اشاریہ؛ (۶) سیف بن محمد الہروی: تاریخ نامۂ ہرات، کلکتہ ۱۹۴۴ء، ص ۲۰۰ تا ۲۰۲، ۲۰۵، ۲۰۹؛ (۷) جوہر آفتابچی: تذکرۃ الواقعات، اردو ترجمہ از معین الحق، کراچی ۱۹۵۵ء، ص ۵۶ تا ۵۹ و بمدد اشاریہ؛ (۸) گلبدن بیگم: ہمایوں نامہ، لنڈن ۱۹۰۲ء، بمدد اشاریہ؛ (۹) میر محمد معصوم بکری: تاریخ سندھ، طبع عمر بن محمد داؤد پوتہ [دہلی ۱۹۳۹ء]، بمدد اشاریہ؛ (۱۰) Journal of the Sind Hist. Society، ۳/۳؛ (۱۱) Goldsmid: The Syeds of Roree and Bukkur، Bombay Govt. Selections، ۱۸۵۵ء؛ (۱۲) محبّ اللہ: بہار سندھ (مخطوطہ فارسی) بذیل مادۂ بھکر؛ (۱۳) Nicolao Manucci: Storia do Mogor، ترجمہ W. Irvine، لنڈن ۱۹۰۷ - ۱۹۰۸ء، ص ۱۱۹ تا ۱۲۸؛ (۱۴) ابن بطوطہ، طبع Defrémery و Sanguinetti، پیرس ۱۸۵۸ء، ۳ : ۱۱۵؛ (۱۵) T. H. Sorley: Shah Abdul Latif of Bhit، آوکسفرڈ ۱۹۴۰ء، ص ۷۷ تا ۸۰ نیز بمدد اشاریہ؛ (۱۶) Alexander Burnes: Travel into Bokhara، لنڈن ۱۸۳۵ء، ص ۲۵۹؛ (۱۷) G. E. Westmacott، در JRAS، ۲/۹ (۱۸۴۰ء): ۱۱۸۷ بعد؛ (۱۸) ابو الفضل: آئین اکبری، ترجمہ Gladwin، ۲ : ۱۱۲؛ (۱۹) فریدون بیگ قلیچ بیگ: History of Sind، کراچی ۱۹۰۰ - ۱۹۰۱ء، ۲ : ۸۷؛ (۲۰) G. H. Raverty: Mihran of Sind (JASB)، ۱۸۹۲ء، ص ۳۹۳ حاشیہ، ۵۹۳ حاشیہ؛ (۲۱) Indian Antiquary، ۳۳ : ۱۳۳؛ (۲۲) Jour. Bombay Br. RAS، (۱۸۴۳ء)، ۱ : ۲۰۳؛ (۲۳) J. N. Sarkar: History of Aurangzeb، ۱ : ۱۱۹ تا ۱۲۰؛ (۲۴) James Todd: The Antiquities and annals of Rajasthan، لنڈن/نیویارک ۱۹۱۴ء، ص ۲۰۰؛ (۲۵) مجمل الاسکنۃ، حیدر آباد [دکن] ۱۳۰۲ھ، ص ۱۳؛ (۲۶) عبدالحمید خان: The Towns of Pakistan، کراچی ۱۹۵۰ء، ص ۶۵ تا ۷۵؛ (۲۷) چچ نامہ (سندھی ایڈیشن) کراچی ۱۹۵۴ء، ص ۲۸۷، ۲۸۹، ۳۲۰، ۳۹۷؛ (۲۸) اورینٹل کالج میگزین، لاہور ۱۹۳۷ء، ص ۳۷ تا ۶۷؛ (۲۹) جوینی ۲ : ۱۳۶؛ (۳۰) Storey ۱/۲ : ۹۳۸ تا ۹۳۹۔

(بزمی انصاری)

بھمبر: بھنبر ایک چھوٹا سا شہر، جو گجرات (مغربی پاکستان) سے نو میل کے فاصلے پر شمال کی سمت اسی نام کی ایک ندی کے کنارے کشمیر کے قدیم مغل راستے پر واقع ہے۔ قدیم زمانے میں یہ کانگڑا اور جالندھر کے سوم ونشی راجاؤں کی شاخ چبھ Chibh یا چبھن Chibhan کی مملکت کا ایک حصہ تھا۔ چنانچہ پہلے اس کا ذکر چبھون کے نام سے ہوتا آیا ہے، جیسے ظفر نامہ میں جبھول لکھا ہے۔ یہ شہر زیادہ تر پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ ایک زمانے میں بھمبر اور راجوڑی دونوں ذرواب حصارا Darva Hisāra کے علاقے میں شامل تھے۔ اس پر خود مختار

راجا اور فرمانروا حکومت کرتے رہے، جن میں سے آخری سلطان خان تھا، جس نے کشمیر پر سکھوں کے منصوبوں کی مزاحمت کی۔ راجا گلاب سنگھ نے، جو کشمیر میں ڈوگرا راج کا بانی اور سلطان خان کا سابق ملازم تھا، اسے گرفتار کر کے رنجیت سنگھ کے پاس بھیج دیا۔ یہاں مغلوں کے آثار میں باولی سرائے اور ایک خوبصورت مسجد ہے۔

مآخذ: (۱) ابوالفضل: آئینِ اکبری، ترجمہ H. Blochmann؛ (۲) تُوزُکِ جہانگیری، طبع سیّد احمد خان، علیگڑھ ۱۸۶۴ء؛ (۳) عبدالحمید لاہوری، پادشاہنامہ، Bibl. Indica، کلکتہ ۱۸۶۶ - ۱۸۶۸ء؛ (۴) جی - ایم - ڈی صوفی: Kashir، ج ۱، ۱۹۴۸ء، ج ۲، ۱۹۴۹ء؛ (۵) Stein: *Ancient Geography of Kashmir*، لنڈن ۱۸۹۹ء؛ (۶) A. Cunningham: *Archaeological Survey of India*، کلکتہ ۱۸۸۲ء؛ (۷) *The Kashmir Archaeological Report*، ۱۹۰۲ء؛ (۸) Arthur Neve: *Picturesque Kashmir*، ۱۹۰۰ء؛ (۹) *The Jammu and Kashmir Territories*، لنڈن ۱۸۷۵ء؛ (۱۰) راج ترنگنی، انگریزی ترجمہ از Stein، ج ۱ و ۲، لنڈن ۱۹۰۰ء؛ (۱۱) Richard Temple: *Journals kept in Hyderabad, Kashmir, Sikkim and Nepal*، ج ۲، لنڈن ۱۸۸۷ء؛ (۱۲) Ram Chandra Kak: *Memoirs of the Archaeological Survey of India*، عدد ۳۱، کلکتہ ۱۹۳۳ء؛ (۱۳) Carl Frehr Hugel: *Kashmir und das Reich der Siek*، ۱۸۴۰ - ۱۸۴۲ء، ترجمہ انگریزی از J.B. Jervis: *Travels in Kashmir and the Panjab*، لنڈن ۱۸۴۵ء۔

(یار محمد)

⊛ **بَھنْبھور:** بھنبھور کا نام مشہور عشقیہ داستان سسی (= سسّئی) پنوں سے وابستہ ہے۔ سندھ اور بلوچستان کی اس قدیم اور مشہور داستان کا جغرافیائی پس منظر سندھ اور بلوچستان کا وہ خطہ ہے جو دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں کی اسلامی حکومت کے قیام کے بعد سندھ سے عراق تک تجارتی شاہراہ ہونے کی وجہ سے عروج پر تھا۔ تخمیناً پانچویں صدی کے نصف میں جب سندھ میں عرب اقتدار کا خاتمہ ہونے لگا تو تجارتی اور تمدنی شاہراہ جو سندھ، مکران اور ایران سے گذر کر عراق و شام تک پہنچتی تھی، وہ اور اس کی یاد ایک افسانہ بن گئی۔ داستان سسی پنوں، اسی یاد کا شاخسانہ ہے جسے عوام کا ذہن معرض وجود میں لایا۔ روایت ہے کہ سسی کے پیدا ہوتے ہی اس کے والدین نے اسے ایک صندوقچے میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا۔ یہ صندوقچہ بھنبھور کے گھاٹ پر محمد نامی رنگریز نے دریا سے نکالا اور نوزائیدہ سسی کو اپنے گھر لے گیا۔ بھنبھور ہی میں محمد رنگریز کے گھر سسی کی پرورش ہوئی۔ جب وہ جوان ہوئی تو اس کے حسن و جمال کی شہرت مکران کے بلوچ سردار عالی خان کے فرزند پنوں تک پہنچی۔ وہ غائبانہ طور پر سسی کی محبت میں گرفتار ہو کر ایک تاجر کے بھیس میں قافلہ لے کر بھنبھور پہنچا۔ شدہ شدہ اس کی شادی سسی سے ہو گئی، اور وہ میاں بیوی بھنبھور ہی میں رہنے لگے۔ پنوں کے بھائی اس کی تلاش میں بھنبھور پہنچے اور پنوں سے واپس چلنے کے لیے کہا، لیکن جب وہ کسی طرح نہ مانا تو آدھی رات کو اسے خواب کی حالت میں اٹھا کر تیز رفتار اونٹوں پر لاد کر مکران کی طرف چل دیے۔ سسی جب صبح کو بیدار ہوئی تو پنوں کو پاس نہ پایا۔ بہت بے چینی کی حالت میں وہ پنوں کی تلاش میں نکل پڑی۔ پہاڑوں کی گھاٹی میں ایک چرواہے نے جب سسی کو بری نظر سے دیکھا تو سسی نے خدائے عزوجل سے پناہ مانگی۔ اس کی دعا قبول ہوئی زمین پھٹ گئی اور وہ خود اس میں سما گئی۔

بھنبھور نامی شہر کی شہرت سسی پنوں کی

داستان سے ھوئی ۔ اس داستان کی داغ بیل غالبًا سندھ کی تاریخ کے رومانوی دور یعنی سومرہ خاندان کی حکمرانی (۱۰۵۰ تا ۱۳۵۰ء) میں پڑی، اور بعد میں سمہ خاندان (۱۳۵۰ تا ۱۵۲۰ء) کے منگنہاروں اور بھاٹوں (= چارنوں اور بھاٹوں) ھی نے غالبًا اسے پروان چڑھایا ۔ علما و فضلا میں سے میر محمد معصوم بکری (م ۱۰۱۵ھ) نے غالبًا پہلی بار قبل از سال ۱۰۰۲ھ اس داستان کو فارسی میں بعنوان مثنوی حسن و ناز منظوم کیا ۔ اسی فارسی مثنوی میں شہر بھنبھور کا ذکر پہلی بار ملتا ھے ۔ سندھی شاعری میں حضرت شاہ عبداللطیفؒ کے جدِ اعلٰی حضرت شاہ عبدالکریم (م ذوالقعدہ ۱۰۳۲ھ / ۱۶۲۰-۱۶۲۱ء) کے صوفیانہ سندھی ابیات میں سے چند ابیات اسی داستان کی تلمیحات پر مبنی ھیں ۔ ان میں سے دو ابیات میں بھنبھور شہر کا نام آیا ھے ۔ سندھی میں یہ پہلا ماخذ ھے جس میں شہر بھنبھور کا نام ملتا ھے، مثلاً ایک بیت ھے :

جي مون سڏ ڪَنا 'ڀنڀورا' ڀهارتي ،
جي سي ٻري سڄڻ، ته هندوڻانه نڪري

(سسی کہتی ھے کہ بھنبھور سے باہر نکل کر میں نے جو (زور سے) آوازیں دیں وہ اگر میرے محبوب نے سنی ھوتیں تو (مجھے چھوڑ کر) چلے نہ جاتے) ۔

شاہ عبدالکریم کے بعد، میاں شاہ عنایت، (م ۱۱۲۰-۱۱۲۵/ ۱۷۱۵-۱۷۱۹ء) اور شاہ عبداللطیف (م ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۲ء) کے ''رسالوں'' میں سسی پنوں کی داستان کے تحت اس شہر کا نام بار بار آیا ھے اور بھنبھور اور بَنْبھور، دونوں صورتوں میں ملتا ھے ۔ آج تک سندھ کے عوام میں یہ دونوں تلفظ مروج ھیں۔

فی الوقت تاریخی لحاظ سے ایسا کوئی حوالہ موجود نہیں جس کی بنا پر یقینی طور پر یہ کہا جا سکے کہ کسی زمانے میں بھنبھور نامی کوئی شہر سندھ میں واقعی تھا یا محض سسی پنوں کی داستان میں یہ ایک فرضی شہر کا نام ھے؟ تاریخی ماخذوں میں تاریخی واقعات کے سلسلے میں شہر بھنبھور کا نام کہیں نہیں ملتا ۔ ھو سکتا ھے کہ کسی زمانے میں اس نام کا کوئی شہر موجود ھو جسے بعد میں سسی پنوں کی عوامی داستان نے اپنایا، لیکن یہ محض ایک گمان ھی ھو سکتا ھے ۔

قدیم سندھی روایت کی رو سے سسی پنوں داستان کا پس منظر وہ خطہ ھے جو مکران میں وادی کیچ سے لے کر جنوبی سندھ تک پھیلا ھوا ھے ۔ عوامی ذہن نے فطری طور پر اس داستان میں مذکورہ مقامات کو اسی خطے میں سے گذرتی ھوئی قدیم تجارتی اور تمدنی شاہراہ کے خطوط پر متعین کیا ۔ چنانچہ شہر تربت کے نزدیک نہر کیچ کی وادی میں واقع آثار کو پنوں کے والد سردار عالی خان کی ''میری'' (محل اور قلعہ) مانا گیا اور کراچی سے انتالیس میل جنوب مشرق میں واقع آثار کو شہر بھنبھور کے کھنڈروں سے متعین کیا گیا ۔ اول تو یہ کھنڈر دریاے سندھ کی ایک قدیم گذرگاہ پر واقع ھیں ۔ دوسرے یہ کہ مقامی طور پر لوگوں نے ان کھنڈروں کے شمال مغربی اطراف میں رنگریزوں کی رنگ آمیزیوں کے آثار دیکھے ۔ اور تیسرے یہ کہ کھنڈر اسی قدیم شاہراہ کے خطوط پر واقع ھیں جو کراچی کے شمال سے گذر کر لس بیلہ کی حدود میں سے پھر مکران کی طرف جاتی ھے ۔ سسی بھی بھنبھور سے نکل کر اسی شاہراہ کے خطوط پر پنوں کی تلاش میں روانہ ھوئی تھی، اور وہ مقام جہاں وہ زمین کے اندر داخل ھوئی عوام نے اسے کراچی سے شمال مغرب کو پہاڑ پب کی گذرگاہ سے آگے ''سانگھوڑ'' کی وادی میں قرار دیا اور وہاں سسی کی قبر کا نشان قائم کر دیا جو اب تک موجود ھے ۔

سسی پنوں لوک کہانی سے قطع نظر اگر ان کھنڈروں کا کھوج لگایا جائے جنھیں عوامی تخیل نے بھنبھور قرار دیا ہے تو تاریخی شواھد کی روشنی میں یہ کھنڈر یقینی طور پر دیبل بندر کے معلوم ہوتے ھیں۔ جسے محمد بن قاسم نے ۷۱۱ء میں فتح کیا۔ دیبل عربی دور حکومت میں سندھ کی اہم بندرگاہ رہا اور کہیں تیرھویں صدی میں غالبًا میٹھے پانی کی قلت کی وجہ سے ویرانہ ہو گیا۔ گزشتہ پندرہ سال میں محکمۂ آثار قدیمہ کی جانب سے ان کھنڈروں کی کھدائی سے جو آثار برآمد ہوے ھیں وہ اس نظریّے کی مزید تائید کرتے ھیں کہ جن کھنڈروں کو عوام نے بھنبھور سمجھا ہے وہ درحقیقت مشہور بندر دیبل کے کھنڈر ھیں۔

مآخذ : (۱) میر محمد معصوم بکری: مثنوی حسن و ناز (مخطوطہ)؛ (۲) رسالۂ کریمی (ملفوظات شاہ عبدالکریم) حیدرآباد / بمبئی، ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء؛ (۳) میین شاہ عنات جو کلام (میاں شاہ عنایت کا کلام) سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد ۱۹۶۳ء؛ (۴) شاہ عبداللطیف جو رسالو (شاہ عبداللطیف کا مجموعۂ کلام)، مطبوعۂ بمبئی، کراچی، حیدرآباد؛ (۵) مشہور تاریخی شہر دیبل بندر کا محل وقوع (انگریزی میں مقالہ از ڈاکٹر بلوچ: *The Most probable site of Debal, the famous Historical Port of Sind*)، در اسلامک کلچر، حیدرآباد دکن، جولائی ۱۹۵۲ء؛ (۶) فتحنامۂ سندھ عرف چچنامہ (طبع نبی بخش خان بلوچ)، اردو ترجمہ، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد ۱۹۶۳ء؛ (۷) انگریزی کتابچہ بھنبھور (*Bhambhore*) مطبوعۂ محکمۂ آثار قدیمۂ حکومت پاکستان، کراچی۔

(نبی بخش بلوچ)

• **بھوپال**: بھارت کی ایک سابقہ نوابی ریاست، ۲۲ درجے ۲۹ دقیقے اور ۲۳ درجے ۵۴ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۶ درجے ۲۸ دقیقے اور ۷۸ درجے ۵۱ دقیقے طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۶۸۷۸ مربع میل ہے اور آبادی ۱۹۵۱ء میں ۸۳۸،۴۷۳ تھی۔ ہندوستان میں حیدرآباد [دکن] [رک بآں] کے بعد یہ سب سے اہم مسلم ریاست تھی۔

ریاست بھوپال کی بنیاد ایک سپاہی پیشہ بخت آزما دوست محمد خان نے رکھی تھی جو تیراہ (جو آج کل پاکستان کے قبائلی علاقے میں ہے) کا باشندہ اور آفریدی پٹھانوں کے قبیلۂ میرزی خیل سے تھا۔ چوبیس سال کی عمر میں ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء میں وہ ملازمت کی تلاش میں دہلی گیا۔ شہنشاہ دہلی بہادر شاہ اوّل [رک بآں] سے کچھ تو اپنی فوجی خدمات کے صلے میں اور کچھ خود اپنی کوششوں کی طفیل بیراسیہ پرگنہ کا پٹہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ [بھوپال کی مشہور تاریخ تاج الاقبال مؤلفۂ سلطان شاہ جہاں بیگم میں اس مقام کو بیرسیہ لکھا گیا ہے جو ایک مقامی جاگیردار نے دوست محمد خان کو اجارۃً دیا تھا، دفتر اول، طبع کانپور، ص ۱۲۰]۔ دوست محمد غیر معمولی شجاعت کا آدمی تھا اور فن جنگ میں نمایاں مہارت رکھنے کی بدولت اس نے بہت جلد ایک بہت بڑے علاقے پر تسلّط جما لیا اور شہر بھوپال اور اس کے قلعے کی، جس کا نام فتح گڑھ رکھا، بنا ڈالی۔ مغلوں کی مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوے اس نے اس علاقے پر قبضہ کرکے نوّاب کا لقب اختیار کیا۔ ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں اس نے وفات پائی اور اس کا نابالغ بیٹا محمد خان جانشین ہوا، مگر اسے بہت جلد یار محمد خان نے نکال باہر کیا جو دوست محمد کا ایک دوسرا بیٹا تھا۔ یار محمد خان کا ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء میں انتقال ہو گیا اور وہ کبھی رسمی طور پر نواب کی حیثیت سے مسند نشین نہیں ہوا۔ اس کے بعد فیض محمد خان اس کا جانشین ہوا۔ یہ ایک متقی اور زیادہ تر عزلت نشین شخص تھا۔ بحیثیت حاکم اس کی کمزوری

اور دوسرے اس کے ہندو وزیر کی حیلہ گری کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھوپال کی ریاست کا آدھا علاقہ ہاتھ سے نکل کر مرہٹہ پیشوا باجی راؤ اول کے قبضے میں چلا گیا۔ فیض محمد خان کی وفات ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۷-۱۷۷۸ء میں ہوئی اور اس کا بھائی حیات محمد خان اس کا جانشین ہوا۔ عجیب بات ہے کہ اس نے چار ہندو لڑکے پال کر انھیں اپنا چیلا بنا لیا تھا، جن میں سے دو، یعنی فولاد خان اور چھوٹے خان بعد میں اس کے وزیر ہوئے۔ اس کے ایک عمزاد بھائی وزیر محمد خان اور ریاست کے وزیر مرید محمد خان کے درمیان رقابت کا برا نتیجہ یہ ہوا کہ فتح گڑھ کا قلعہ امیر خان پنڈاری کے قبضے میں چلا گیا، (یہ امیر خان سابق ریاست ٹونک [رک بآں] کا بانی ہے) جو اس وقت گوالیار کے سندھیا کا ملازم تھا۔ وزیر محمد خان کو بھوپال چھوڑنا پڑا، مگر جب سندھیا واپس گوالیار گیا، جہاں فسادات برپا ہو گئے تھے، تو وزیر محمد ایک معقول لشکر لے کر لوٹ آیا اور اس نے مرہٹوں کو، جو امیر خان کی قیادت میں تھے، قلعے سے نکال دیا اور تھوڑے دن کے بعد پنڈاریوں کو بھی نکال باہر کیا۔ ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۷ء میں حیات محمد خان کی وفات ہوئی اور اس کے بعد وزیر محمد خان، جو اپنے آپ کو حاکم بننے کا اہل ثابت کر چکا تھا، ریاست کا حاکم بنا اور اس نے متوفی حکمران کے لڑکے غوث محمد خان کا دعوی نہ چلنے دیا۔ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء میں ناگپور اور گوالیار کی فوجوں نے باہم مل کر بھوپال پر حملہ کر دیا، مگر بھوپال نے آٹھ ماہ کی طویل مدت تک بہادری سے حملہ آوروں کی مزاحمت کی، محاصرہ ناکام رہا اور ناچار اٹھانا پڑا۔

جب ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶ء میں وزیر محمد خان کا انتقال ہو گیا تو اس کا بیٹا نذر محمد، جو غوث محمد خان کا داماد بھی تھا، اس کا جانشین ہوا۔ اس نے انگریزوں سے ایک معاہدہ کر لیا اور اس معاہدے کی شرائط کی پوری پابندی کی۔ اس معاہدے کی رو سے انگریزوں نے ذمہ لیا کہ ریاست بھوپال کا علاقہ اس کے اور اس کی اولاد کے لیے محفوظ رہے گا، اور ریاست بھوپال کی طرف سے اقرار کیا گیا کہ ریاست کی فوجیں پنڈاروں کے استیصال میں انگریزوں کی مدد کریں گی۔ پنڈاری اس وقت وسط ہند میں چھائے جا رہے تھے۔ ان کی حیثیت منظم ڈاکوؤں سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ نذر محمد کی شادی غوث محمد کی بیٹی قدسیہ بیگم سے ہوئی تھی۔ اس نے اپنے خاوند نذر محمد کے انتقال کے بعد ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء میں اپنی نابالغ بیٹی سکندر بیگم کے نگران کی حیثیت سے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پچیس سال بعد ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں سکندر بیگم باقاعدہ طور پر مسندنشین ہوئی، اور اس خاتون سے ایک طویل اور نامور سلسلہ بھوپال کی بیگموں کا چلا جو اس وقت جا کر ختم ہوا جب سلطان جہاں بیگم نے ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء میں برضا و رغبت ریاست سے دست بردار ہو کر اپنے بیٹے حمیداللہ خاں کو اپنی جگہ مسندنشین کر دیا۔ سلطان جہاں بیگم نے ۱۳۴۸ھ/۱۹۳۰ء میں وفات پائی (یہی نواب حمیداللہ ریاست بھوپال کے آخری سربراہ تھے)۔

سکندر بیگم کی والدہ اقتدار اپنے قبضے میں رکھنا چاہتی تھی۔ اس کی [illegible] کی خاطر سے سکندر بیگم کی شادی نذر محمد خان کے بھتیجے جہانگیر محمد خان سے چھبیس ذوالحجہ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء میں جا کر ہوئی۔ [شادی کے وقت سکندر بیگم کی عمر سترہ سال کے قریب اور جہانگیر محمد خان چودہ سال کے تھے (تاج الاقبال، دفتر اول)۔] اس کی شادی ہو جانے کے بعد بھی قدسیہ بیگم (سکندر بیگم کی والدہ) کسی طرح راضی نہ ہوتی تھی کہ اس کے ہاتھ سے حکومت نکل جائے۔ اس لیے اس نے آپس میں جنگ کرا دی۔ اس جنگ میں

[جہانگیر محمد خان] کو اس کی اپنی بیوی اور بڑی بیگم (قدسیہ بیگم) کی متحدہ فوج نے شکست دے دی۔ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام نے مداخلت کی اور ریاست کا انتظام حکومت جہانگیر محمد خان کو واپس دلا دیا۔ قدسیہ بیگم کو وظیفہ لے کر الگ ہونا پڑا۔ اس کے بعد وہ بہت عرصے تک زندہ رہی، لیکن اس کے جانشینوں، یعنی سکندر بیگم اور اس کی بیٹی شاہجہان بیگم نے اسے پورے حزم و احتیاط سے معاملات ریاست سے دور ہی رکھا۔ شاہجہان بیگم کے شوہر نواب صدیق حسن خان نے تو کچھ ذاتی اور کچھ سرکاری وجوہ کی بنا پر اتنی بھی اجازت نہ دی کہ یہ بوڑھی بیگم حکمران خاندان کی مجلسی تقریبات میں بھی شرکت کرے۔ قدسیہ بیگم کی وفات ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء میں ہوئی۔ ریاست سے سبکدوش کیے جانے کے بعد مرتے دم تک وہ ۹۸۶۸۴ روپے کی جاگیر کی مالک رہی۔ سکندر بیگم کی حکومت کا زمانہ متعدد فوجی اصلاحات کی وجہ سے نادر ہے، جن کی بدولت بھوپال کی بے قاعدہ فوجیں منظم ہو کر ایک عمدہ اور متحدہ سپاہ بن گئیں۔ ۱۸۵۷ء کی ہل چل میں ریاست بھوپال بالادست انگریزی حکومت کی وفادار رہی، اگرچہ ریاست کے معدودے چند امرا نے انگریز دشمنی کی روش اختیار کی تھی۔ اس بیگم نے زرعی، اقتصادی، انتظامی اور قانونی اصلاحات بھی نافذ کیں۔ ایک اسلامی ریاست کی سربراہ ہونے کے باوجود اس نے اپنی دلیری کی کہ پردے کو خیرباد کہا اور فوجی لباس میں ہتھیاروں سے مسلح ہو کر سب کے سامنے آنے لگی۔ پھر بھی اس کا دلی رجحان دین کی طرف تھا اور ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں اس نے فریضۂ حج ادا کیا۔ بیس سال کی حکومت کے بعد ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور اس کی نابالغ لڑکی شاہجہان بیگم اس کی جانشین قرار پائی۔ [یہ سارا بیان سخت ابہام پیدا کرنے والا ہے۔ شاہجہان بیگم اپنے باپ جہانگیر محمد خان کے انتقال کے بعد ہی وارث ریاست تسلیم کر لی گئی تھی (۱۲۶۰ھ)۔ ان کی ماں سکندر بیگم محض مختار ریاست کی حیثیت سے اپنی وفات تک ریاست کا کام کرتی رہیں]۔ سکندر بیگم کا ایک چچا فوجدار محمد خان اس کا نگران اور نائب ریاست بنا، مگر ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں اسے استعفا دینا پڑا۔ اس میں زیادہ تر قدسیہ بیگم کی تدابیر کارگر تھیں۔ اس کے بعد سکندر بیگم اس کی جگہ نگران اور نائب سلطنت کے عہدے پر مقرر کی گئی۔ ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۵ء میں شاہجہان بیگم کی بخشی باقی محمد خان کے ساتھ شادی ہو گئی، مگر وہ حکمران خاندان سے نہ تھا، اس وجہ سے اسے اور اس کے بعد بھوپال کی تمام بیگمات کے شوہروں کو صرف یہ امتیاز حاصل ہوتا تھا کہ وہ نواب دولہا کا مرتبہ حاصل کریں۔ ریاست کے انتظام میں عملاً ان کا کوئی دخل نہ ہوتا تھا۔ ریاست کے انتظامی اختیارات سارے کے سارے سکندر بیگم کے ہاتھ میں چلے گئے، جو اپنے مرتبے اور شان و شوکت میں کسی کی شرکت گوارا نہ کرتی تھی۔ جب اس کی نابالغ لڑکی شاہجہان بیگم کو ریاست کا حکمران تسلیم کر لیا گیا تو وہ ناراض ہو گئی۔ اور صرف اس وقت غصہ دور ہوا جب شاہجہان بیگم بطیب خاطر اپنی ماں کی زندگی میں حکومت سے دست کش ہو گئی۔ شاہجہان بیگم کا یہ فعل وقتی مصلحت یا سیاسی دانش مندی کے بجائے دخترانہ محبت پر زیادہ مبنی تھا۔

شاہجہان بیگم کے شوہر کا انتقال ہو گیا اور اس کے ایک سال بعد ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں وہ مسند حکومت پر باقاعدہ متمکن ہوئی۔ اس کے تین سال بعد اس نے دوبارہ شادی کر لی؛ اس دفعہ اس نے قنوج کے [مفسر عالم دین] سید صدیق حسن [رک بآں]

سے نکاح کیا جو پہلے ریاست کے ایک سلحدار تھے۔ بیگم کی کوششوں سے انہیں نواب کا خطاب اور حکومت کے دوسرے مراتب و اعزازات عطا ہو گئے، محض اس بنا پر کہ وہ رئیسہ کے شوہر تھے۔ اپنے پہلے شوہر کی وفات کے بعد سلطان شاہجہان بیگم نے پردہ چھوڑ دیا تھا، لیکن جب سید صدیق حسن خان سے شادی ہو گئی تو وہ پھر پردہ کرنے لگیں۔ وہ ان کی قابلیت اور فضیلت علمی سے ہمیشہ مرعوب رہیں۔ نواب صدیق حسن خان کی وفات ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء میں ہوئی اور ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء میں شاہجہان بیگم کا مرض سرطان سے انتقال ہو گیا۔ اور سند کی رو سے، جو ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء میں ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے لکھ دی تھی، سلطان جہان بیگم، جو شاہجہان بیگم کے پہلے خاوند سے اکلوتی بیٹی تھیں، جانشین ہوئیں۔ شاہجہان بیگم کی نواب صدیق حسن خان سے کوئی اولاد نہ تھی۔ سلطان جہان بیگم نے اپنی پچیس سالہ حکومت میں ریاست کا انتظام خود چلایا اور اس میں متعدد اصلاحات کیں۔ وہ دو مرتبہ انگلستان گئیں، ایک دفعہ ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء میں شاہ جارج پنجم (۱۹۱۱ء تا ۱۹۳۶ء) کی رسم تاجپوشی میں شریک ہونے کے لیے اور دوسری مرتبہ ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۵ء میں اس غرض سے کہ حکومت برطانیہ سے اپنے چھوٹے بیٹے الحاج حمید اللہ خان کی ولیعہدی منظور کرا لیں، کیونکہ ان کی اولاد میں سے یہی لڑکا سلامت رہا تھا۔ دو اور لڑکے محمد نصراللہ خان (ولادت ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء) اور حافظ عُبَید اللہ خان (ولادت ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء) دونوں یکے بعد دیگرے بہت قلیل وقفے سے ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۴ء میں فوت ہو گئے تھے۔ شبہہ کیا جاتا تھا کہ ان دونوں کو زہر دیا گیا ہے، لیکن سلطان جہان بیگم کی سیاسی دانائی نے کوئی خطرناک نتیجہ نہ پیدا ہونے دی۔ آغا خان نے بھی حمید اللہ خان کے لیے سلطان جہان بیگم کی بہت مدد کی؛ اور وہ اپنے دو متوفی بھائیوں کی اولاد کو برطرف کر کے خود وارث ریاست ہو گئے۔ حمید اللہ خان ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ علیگڑھ میں تعلیم پائی اور سیاسیات میں، جہاں تک ملکی والیان ریاست کا تعلق تھا، سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ دو مرتبہ وہ چیمبر آف پرنسز (= مجلس والیانِ ریاست) کے صدر منتخب ہوئے (۱۹۳۱ تا ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۴ تا ۱۹۴۷ء) اور اس حیثیت سے انہوں نے اپنے ساتھی والیان ریاست کی بڑی بڑی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۶ء میں انہوں نے سیاست ہند میں ایک یادگار کام یہ کیا کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس اور محمد علی جناح [رک بآں] کی زیر قیادت مسلم لیگ کے درمیان واسطہ بنے اور کچھ ایسی تدبیر کی کہ کانگریس سے مسلم لیگ کے حق میں ایک carte blanche [= "سادہ کاغذ"] یعنی لیگ کی شرائط قبول کرنے کا اقرار حاصل کر لیا۔ لیکن بعد میں ایم۔ کے۔ گاندھی نے، جو کانگریس کے مسلمہ رہنما تھے، اس قول و قرار کو مسترد کر دیا۔

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان پر انگریزی اقتدار ختم ہوا اور بھارت اور پاکستان دو خود مختار حکومتیں بن گئیں تو بھوپال ابتدا میں تو مرکزی حکومت کے زیر انتظام رہا، لیکن ۱۹۴۹ء میں بھارت میں مدغم کر دیا گیا۔ اس میں ایک انتخاب کردہ قانون ساز مجلس نیز وزرا کی جماعت تھی، جس کا آئینی صدر چیف کمشنر ہوتا تھا۔ سابق نواب کو، جو اب ایک معمولی شہری سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے، پنشن دے دی گئی۔ ان کے جیب خرچ (privy purse) کے لیے گیارہ لاکھ سالانہ کی رقم منظور کی گئی جس میں سے ایک لاکھ روپے ان کی ولیعہد گوہر تاج عابدہ سلطان کو دیا گیا، جو اس وقت سے پاکستان چلی آئی ہیں اور انہوں نے سر

مستقل طور پر بود و باش اختیار کر لی ہے [نواب حمیداللہ خان کا ۱۳۷۹ھ / فروری ۱۹۶۰ء میں انتقال ہو گیا اور ان کی دوسری صاحبزادی ساجدہ سلطان بیگم کو ان کا جانشین تسلیم کیا گیا].

مآخذ: (۱) نواب شاهجہان بیگم شیریں: تاج الاقبال تاریخ ریاست بھوپال، کانپور ۱۲۸۹ تا ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء (نیز اردو ترجمہ، کانپور ۱۸۷۳ء، انگریزی ترجمہ از H. C. Barstow، کلکتہ ۱۸۷۶ء)؛ (۲) نواب سلطان جہان بیگم: حیات شاهجہانی (انگریزی ترجمہ از B. Ghosal)، بمبئی ۱۹۲۶ء؛ (۳) وهی مصنف: An Account of My Life (انگریزی ترجمہ از C. H. Payne)، لنڈن ۱۹۱۰ - ۱۹۱۲ء؛ (۴) ایم - علی حسن خان: مآثر صدیقی، ۴ جلد، لکھنؤ ۱۹۲۴ء؛ (۵) سرجان میلکم: A Memoir of Central India، لنڈن ۱۸۲۳ء؛ (۶) G. B. Malleson: An Historical Sketch of the Native States of India، لنڈن ۱۸۷۵ء؛ (۷) L. Rousselet: L' Inde des Rajahs، پیرس ۱۸۷۷ء، (انگریزی ترجمہ India and its native Rulers، لنڈن ۱۸۸۲ء)؛ (۸) C. U. Aitchison: A Collection of Treaties, Engagements and Sanads relating to India، ج ۴، کلکتہ ۱۹۰۹ء؛ (۹) Imperial Gazetteer of India، جلد ۸، آکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ص ۱۲۸ تا ۱۳۴؛ (۱۰) A Pilgrimage to Macca by the Nawāb Sikandar Begam of Bhopal (انگریزی ترجمہ از Mrs. Willoughby-Osborne)، لنڈن ۱۸۷۰ء؛ (۱۱) ج - ڈ - صاحبہ (ملقب بیگم): بیگمات بھوپال، لاهور ۱۹۱۰ء؛ (۱۲) A Memorandum on the Indian States (طبع سابق حکومت هندوستان)، کلکتہ ۱۹۳۰ء، بذیل مادّہ؛ (۱۳) محمد امین زبیری: تاریخ بیگمات بھوپال، بھوپال ۱۹۱۹ء (؟)؛ (۱۴) محمد سعید احمد: مقالہ در مخزن (اردو ماهنامہ) لاهور، جنوری ۱۹۰۸ء؛ (۱۵) Storey، ۱/۱: ۷۷۳ - ۷۷۴؛ ۱/۲: ۱۳۲۹؛ (۱۶) V. P. Menon: The Story of the Integration of the Indian States، کلکتہ ۱۹۵۶ء، ص ۳۰۳ تا ۳۰۶ اور اشاریہ؛ (۱۷) Statesman's Year Book، ۱۹۵۷ء، بمدد اشاریہ؛ (۱۸) H. W. Bellew: The Races of Afghanistan، کلکتہ ۱۸۸۰ء، ص ۷۹؛ (۱۹) William Hagg: A History of Bhūpāl؛ (۲۰) جگل کشور: فسانۂ رنگین بھوپال، (مخطوطہ).

(بزمی انصاری)

بھوپال: (شہر)، هندوستان کے صوبۂ مدهیا پردیش کا صدر مقام، ۲۳ درجے ۱۶ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۷ درجے ۲۵ دقیقے طول بلد مشرقی میں، ایک ریتلے پتھر کی پہاڑی پر دو خوش‌نما جھیلوں "پختہ پل تلاؤ" اور "بڑے تلاؤ" کے کنارے واقع ہے - یہ شہر هندوستان بھر میں اپنی طبعی دل‌کشی اور اپنے نظر فریب گرد و پیش کی وجہ سے مشہور ہے، اسے دوست محمد خان نے، جو ایک اورک‌زئی [میرزئی؟] آفریدی تھا، ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۸ء میں بسایا - اس سے پہلے وہ یہاں قلعۂ فتح گڑھ تعمیر کر چکا تھا، جس کا نام اس نے اپنی هندوستانی بیوی فتح بی بی کے نام پر رکھا تھا اور ایک دیوار کے ذریعے اسے وهاں کے پرانے شکستہ‌حال قلعے سے ملا دیا تھا جسے افسانوی روایات راجا بھوج سے منسوب کرتی هیں - اسی راجا بھوج کے نام پر شہر کا ایک محلہ آج تک بھوج‌پورہ کہلاتا ہے - شہر کی آبادی ۱۹۰۱ء میں ۱۲۰،۳۳۳ تھی - اس کے دو حصے هیں: (۱) شہر خاص، جس کے گرد ایک فصیل ہے، جو خود دوست محمد خان نے بنوائی تھی، (۲) جہانگیر آباد اور احمد آباد کے جدید محلّے اور مضافات، جو بعد کے حکمرانوں جہانگیر محمد خان شوهر سکندر بیگم اور احمد علی خان شوهر سلطان جہان بیگم کی یادگار قائم رکھنے کے لیے اضافہ کیے گئے - اس شہر کو ریاست کا صدر مقام نواب فیض محمد خان (۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۴ء تا ۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۷ء) نے مقرر کیا - اس سے

پہلے نوابوں کا صدر مقام اسلام نگر تھا (۲۳ درجے ۲۲ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۷ درجے ۲۵ دقیقے طول بلد مشرقی)۔

۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ - ۱۸۱۳ء میں ناگپور اور گوالیار کی متحدہ افواج نے بھوپال پر حملہ کر کے فصیل کے باہر کے شہر کو تاراج کر دیا تھا۔ نذر محمد خاں نے اپنے مختصر زمانۂ حکومت (۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۶ء تا ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء) میں شہر کو دوبارہ بحال کرانا شروع کیا اور اس کے بعد یہ کام بیسیوں سال تک جاری رہا۔ شہری آسائش کے بہت سے کام، مثلاً سڑکوں کی تعمیر، بازاروں اور گلیوں میں روشنی، سکندر بیگم نے شروع کر دیے تھے۔ سلطان شاہجہاں بیگم اور سلطان جہاں بیگم بھی ایسا ہی کرتی رہیں۔ سلطان شاہجہاں بیگم نے خاص طور پر بعض شاندار عمارتوں کا اضافہ کیا جن میں سے قصر تاج محل اور تاج المساجد قابل ذکر ہیں۔ [نیز اسلامی علوم کی سرپرستی فرمائی اور لاکھوں روپوں کے صرف سے تفسیر و حدیث کی اہم مگر نایاب و نادر کتب کی طباعت و اشاعت کر کے اہل علم کے لیے دین فہمی کے مواقع میسر کر دیے۔ سلطان شاہجہاں بیگم کے عہد میں صحاح ستہ کے اردو تراجم بھی تیار کیے گئے]۔

دونوں جھیلیں، جن کے کناروں پر تقریباً سبھی سربراہوں نے محلات کی ایک قطار کھڑی کر دی ہے، آب رسانی کی ایک نہر کے ذریعے ملا دی گئی ہیں اور شہریوں کے لیے پینے کا پانی مہیا کرتی ہیں۔ انہیں جھیلوں کے اوپر شہر کے بے قاعدہ مکانات طبق بر طبق بنے ہوئے ہیں جن کے ساتھ کہیں کہیں وسیع باغات ہیں۔ ان سب پر قدسیہ بیگم کی جامع مسجد چھائی ہوئی ہے جو رنگلے سنگ سرخ سے تعمیر کی گئی ہے۔ اس کے دو بلند مینار ہیں جن پر ماہ رمضان میں سحر اور افطار دونوں وقت نقارہ [رک بان] بجایا جاتا تھا۔

مآخذ: دیکھیے مقالۂ بھوپال اور *Imperial Gazetteer of India*، آکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ۸: ۱۳۲ تا ۱۳۵۔

(بزمی انصاری)

⊗ **بھیرہ**: [مغربی پاکستان کا] ایک قدیم شہر جو دریائے جہلم کے مغربی کنارے پر برّاری کی پہاڑیوں (جو کئی میل تک پھیلی ہوئی ہیں) کے دامن میں واقع ہے۔ یہاں تین ٹیلے ہیں جنھیں مجموعی طور پر بھیراری، یا بھیرہ دہ، یا ''بھیرے کا ٹیلہ'' کہتے ہیں۔ شروع میں اس کا نام راجا بھدراسین کے نام پر بھدروی نگر [بھدراوتی نگری، کننگھم: *Archaeological Reports*، ۱۴: ۳۰] تھا۔ العُتبی نے اس کا ذکر بتیہ یا بھدیہ کے نام سے کیا ہے۔ اس کا ذکر Bheda کے نام سے چینی زائر Fa-Hian کے ہاں بھی ملتا ہے جو یہاں تقریباً ۴۰۰ء میں آیا تھا [(Beal کا ترجمہ، باب ۱۵) اور اس جگہ سے اس نے جہلم کو عبور کیا تھا]۔ بقول کننگھم Cunningham یہ Sopeithes کا مرکز حکومت تھا جو اسکندر اعظم کا ہم عصر ایک مقامی حکمران تھا۔ [اسکندر جب ۳۲۶ قبل مسیح میں پنجاب پر حملہ آور ہوا تو بھیرہ دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر تقریباً اس جگہ آباد تھا جہاں آج کل احمد آباد کی بستی ہے۔ اس کے گیارہ سو سال بعد جب بابر اس جگہ پہنچا ہے تو اس کی تُزک بتاتی ہے کہ اس وقت بھی یہ شہر پہلے کی طرح مشرقی کنارے ہی پر تھا اور یہی وہ انتہائی جگہ ہے جہاں تک بابر اپنی ابتدائی فتوحات کے سلسلے میں پہنچا تھا۔ اس نواح سے Graeco-Bactrian اور Indo-Scythic عہد کے سکے بھی برآمد ہوئے ہیں۔

سیکنڈ پنجاب کیولری 2nd Punjab Cavalry کے میجر نارمن W. W. Norman نے موقع پر پہنچ

کر بڑی محنت اور احتیاط سے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسکندر اور پورس کی مشہور عالم لڑائی دریاے جہلم کے کنارے کس جگہ لڑی گئی تھی - جتنے لوگوں نے اس سلسلے میں تحقیقات کی ہے ان کے بیانات کے مطابق یہ جگہ جہلم شہر سے چند میل شمال سے لے کر موجودہ احمد آباد کے درمیان کا علاقہ ہے - نارمن کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسکندر کے شہر Bukephala کی جاے وقوع برارّی کی پہاڑیاں ہیں (*Punjab Distt. Gazetteer*، ۱۹۰۳ء، ص ۳۸، ۵۸) - انڈین سول سروس کے M.L. Dames نے بھی اس تحقیق کی تائید کی ہے اور کچھ مزید ثبوت فراہم کیے ہیں (بحوالۂ سابق)، گویا ان کی راے میں اس جنگ کے لیے اسکندر نے اپنا فوجی پڑاؤ نواح قدیم بھیرہ میں کیا اور اصل جنگ دریا کے بائیں کنارے پر موجودہ بھیرے کے نواح میں لڑی گئی] - موجودہ شہر مغربی پاکستان کے ضلع شاہ پور کی ایک تحصیل ہے (محل وقوع ۳۱ درجے، ۴۵ دقیقے، ۵۰ ثانیے اور ۳۲ درجے، ۳۵ دقیقے، ۴۵ ثانیے عرض بلد اور ۷۲ درجے، ۴۵ دقیقے، ۴۵ ثانیے اور ۷۳ درجے، ۲۵ دقیقے، ۱۵ ثانیے طول بلد کے درمیان) - موجودہ بھیرہ، شیر شاہ سوری نے ۱۵۴۰ء میں، دریا کے بائیں کنارے پر ایک مسجد اور ایک ولی اللہ کے مزار کے گرد تعمیر کیا تھا - العتبی نے لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے اسے انند پال کے ایک ماتحت راجا بجے راے سے چھینا تھا - ۱۲۲۱ء میں اسے چنگیز خان کے ایک سپہ سالار تورتای Turti نے اس وقت فتح کیا جب وہ جلال الدین خوارزم شاہ کا تعاقب کر رہا تھا - ۱۳۹۸ء میں جود پہاڑیوں کے راجے، جن میں بھیرے کا راجا بھی شامل تھا، تحائف لے کر امیر تیمور کی خدمت میں حاضر ہوئے - ۱۵۱۹ء میں بابر نے ہندوستان پر اپنے پہلے حملے کے دوران میں بھیرے کے باشندوں پر چار لاکھ شاہرخی کا تاوان عائد کیا - اس نے اپنی توزک میں اس کے قلعے کا نام "جہان نما" لکھا ہے - اکبر کے زمانے میں یہاں تانبے کے سکوں کی ٹکسال تھی - ۱۷۵۷ء میں اس پر احمد شاہ ابدالی کے سپہ سالار نورالدین نے حملہ کیا - بھنگی مسل کے سکھوں نے اسے دوبارہ آباد کیا - یہاں سے کندہ کاری کی چوبی تراشیدہ لکڑی، پیتل کے برتن اور لوہے کی تلواریں وغیرہ برآمد ہوتی ہیں اور پتھر کی کھدائی کا عمدہ کام ہوتا ہے.

مآخذ: (۱) عطا ملک جوینی: تاریخ جہان گشای؛ (۲) العتبی: تاریخ یمینی، نیز فارسی، اردو اور انگریزی تراجم؛ (۳) امیر تیمور: تزوک تیموری؛ (۴) شرف الدین علی یزدی: ظفر نامہ؛ (۵) عباس خان سروانی: تاریخ شیر شاہی؛ (۶) ابوالفضل: آئین اکبری، طبع H. Blochmann، کلکتہ؛ (۷) Cunningham: *The Ancient Geography of India*، ج ۱، لنڈن ۱۸۷۱ء؛ (۸) W.W. Hunter: *Imperial Gazetteer of India*، ج ۲، لنڈن ۱۸۸۵ء؛ (۹) Cunningham: *Archaeological Survey of India*، ج ۲، کلکتہ ۱۸۷۲ء (رپورٹ براے ۱۸۶۳ - ۱۸۶۴ء)؛ (۱۰) *Punjab District Gazetteer*، ج ۲۷ (؟) - ضلع جہلم (۱۹۰۳ء)، لاہور ۱۹۰۷ء؛ [(۱۱) *Encyclopaedia Britannica*، ۱۹۱۰ء، بذیل Bhera].

(یار محمد خان [و ادارہ])

پ

پ: (پے؛ فا) بائے فارسی یا بائے عجمی؛ (اسم مؤنث) وہ ب جس کے نیچے تین نقطے ہیں۔ عربی باء کی صورت مخفف کا تکملہ فارسی کے لیے، جو سخت شفوی آواز کو ظاہر کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ [فارسی و اردو حروف ہجا کا تیسرا اور ہندی حروف صحیح کا اکیسواں حرف]۔ بعض اوقات اس کا تبادلہ ب سے ہوتا ہے، جیسے اسپ اور اسب، دبیر اور دبیر [بونگا اور پونگا]، اور بسا اوقات، ف سے، جیسے [پیل اور فیل]، سپید اور سفید، پارس اور فارس۔ [اردو میں اس کا تبادلہ ت سے، جیسے پتی اور تلی اور ج سے، جیسے کُپی اور کُجی اور چ سے، جیسے پھلانگنا اور چھلانگنا اور ک سے، جیسے پھوپلا اور کھوکھلا اور م سے، جیسے پت مار اور مت مار سے بھی ہوتا ہے]۔ مخطوطات میں اس حرف کا باقاعدہ استعمال نسبۃً نیا ہے۔ تاہم ساتویں سے تیرھویں صدی تک کے بعض نسخ مخطوطات میں اس حرف کا استعمال ملتا ہے۔ اگرچہ بہت بعد کے مخطوطات میں سے اکثر چھوڑ دیا گیا ہے (GIPh، ۱/۲: ۳۷)۔ [حساب جُمّل میں اس کے بھی ب کے برابر دو عدد ہی شمار کیے جاتے ہیں۔ اردو اور ہندی میں جب الف کے ساتھ کسی صفت کے آخر میں آتا ہے تو اسے اسم بنا دیتا ہے یا نسبت کے معنی دیتا ہے، جیسے موٹاپا، چھٹاپا، جلاپا]۔

(R. LEVY و [ادارہ])

پائی: (ہندی)، انگریزی: Pie؛ برطانوی ہند کا ۱/۱۲ آنے [اور ۱/۹۲ روپے] کے مساوی تانبے کا سب سے چھوٹا سکہ۔ ابتداءً جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجربۃً تانبے کا سکہ چلایا تو پائی، جیسا کہ اس کے نام سے مترشح ہے، ایک آنے کی چوتھائی یا ایک پیسے کے برابر تھی (قب پیسہ)، مگر ایکٹ ۱۸۳۵ء، ۱۸۴۴ء اور ۱۸۷۰ء کے مطابق، پائی ایک پیسے کی تہائی رہ گئی۔

(J. ALLAN)

پادری: پرتگالی لفظ ہے۔ اسم مذکر، بمعنی عیسائی پیشوا، عیسائی واعظ۔ ایک قول کے مطابق یہ لفظ اصل میں فارسی پدر یا انگریزی فادر father سے بنایا گیا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے وو لائٹن، بار اول، بذیل مادۂ Padre)۔

[ادارہ]

پاد زہر: رک بہ بازہر۔

پادشاہ: مسلمان سلطان، ملک، خصوصاً عثمانی شہنشاہوں کا لقب (بقول M. Bittner، در F. Oberhummer: *Die Türken und das Osmanische Reich*، لائپزگ ۱۹۱۷ء، ص ۱۰۵)۔ فارسی اصطلاح "پادشاہ" کے معنی سردار تاجدار کے ہیں۔ اس میں مادہ "پاد" سنسکرت Patis (پتی)، سردار، شوہر (اس کی تانیث پتنی) اور یونانی πότνια δεσ-πότης اور لاطینی Potens سے تعلق رکھتا ہے (G. Curtius: *Griech. Etymol.*، ص ۲۷۷)۔ یہ لقب دراصل بادشاہ اور فرمانروا کے لیے مخصوص تھا، جو سرور اعظم ہے، نیز اس لیے کہ ترکوں کے دُوَلِ یورپ کے ساتھ دیر تک تعلقات رہے، بعض یورپی حکمرانوں کے لیے بھی

پسند کیا جانے لگا تھا۔ باب عالی اور یورپی سلطنتوں کی خط و کتابت میں غالباً صدر اعظم قویوجی مراد پاشا (۱۰ اگست ۱۶۰۶ء) نے سب سے پہلے پادشاہ کا خطاب شہنشاہ آسٹریا، رڈولف Rudolf دوم کے لیے استعمال کیا۔ Nemirow کانفرنس (۱۷۳۷ء) میں روس نے اپنے زار کے لیے اس لقب کا مطالبہ کیا تھا (قب J. v. Hammer، در *GOR*، ۷: ۸۸م) اور دوبارہ بخارسٹ کانفرنس (۱۷۷۳ء) کے مذاکرات میں اس کا دعوی کیا (قب کتاب مذکور، ۸ : ۱۲م)۔ یہ صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ سلطان روم کو کب سے ''پادشاہ آل عثمان'' کہا جانے لگا۔ بہرحال ہمیں یہ لقب اُن ترکی دستاویزوں میں طرح طرح کے ہم قافیہ الفاظ کے ساتھ ملتا ہے جو سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں لکھی گئیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ پندرھویں صدی کے خاتمے پر یہ لقب استعمال میں آنے لگا ہو اور بظاہر اس نے ''خنکار'' (از خداوندگار) کی جگہ لے لی ہو، جو متروک ہو گیا تھا (قب F.v.، سلسلہ ۲، ۱۵ : ۲۷۶، ۲۷۵)۔ یہی حال سلطان کے لقب کا ہے جسے پہلے صوفی درویشوں نے استعمال کیا اور پھر آخر تک سلاطین آل عثمان کے ناموں کے ساتھ استعمال ہوتا رہا (قب *Isl.*، ۱۱ : ۷۰)۔ سلطان کی رعایا اور فوج زمانۂ حال تک ''پادشاہ بز چوق'' یا ''بک یاشا'' [ہمارا بادشاہ تا دیر، یا تا ہزار سال زندہ رہے] کہہ کر خیرمقدم کرتی تھی۔

مآخذ: (۱) St. Kekulé: *Ueber Titel Aemter Rangstufen und Anreden in der offiziellen osmanischen Sprache*، Halle ۱۸۹۲ء، ص ۳ ؛ (۲) P. Horn: *Grundriss der neupersischen Etymologie*، Strassburg ۱۸۹۳ء، ص ۶۱، عدد ۲۶۶ (اس کتاب میں ایک دوسرا اشتقاق بھی لکھا ہے۔ پرانا فارسی لفظ پد، بمعنی محافظ اور شاہ، یعنی حکمران، اس باب میں قب Horn، در *GIPh*، ۱/ ۱، ص ۷۲، ۳۰۱، اور ۱/ ۲، ص ۸۸، ۹۷ و ۹۹، جہاں قدیم فارسی اور پہلوی وغیرہ میں اس کلمے کی مختلف صورتیں درج ہیں [آصفیہ کا بیان یہ ہے کہ یہ لفظ پاد، بمعنی تخت اور شاہ، بمعنی مالک سے مرکب ہے، یعنی مالک تخت۔ کسی اچھے یا بڑے فن کے ماہر کو بھی مجازاً بادشاہ کہتے ہیں، مثلاً جھوٹوں کا بادشاہ (فرہنگ آصفیہ)]۔

(FRANZ BABINGER)

پاراچنار: پاکستان کے شمال مغربی سلسلۂ کوہ میں، دریاے کرم کی بالائی وادی میں، کرم ایجنسی کا اداری مرکز، فوجی چھاؤنی اور صحت افزا مقام، جو ۳۳° ۵۰' عرض بلد شمالی اور ۷۰° ۶' طول بلد پر واقع ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی ۶۰۷۰ فٹ ہے، یہ درۂ کرم کی پاسبانی کرتا ہے اور اس میں خوبصورت مناظر بکثرت ہیں۔

گردونواح میں گندم، چاول اور مکئی کی کاشت ہوتی ہے۔ پھلوں میں خاص طور پر سیب اور ناشپاتی قابل ذکر ہیں۔ قصبے کی آبادی خٹک قبیلے کے پٹھانوں پر مشتمل ہے۔ قصبے کی وجہ تسمیہ کے لیے اس روایت کو پیش کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں پارا نامی ایک قبیلہ یہاں ایک بڑے چنار کے درخت کے زیر سایہ مقیم تھا۔ [دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس وادی میں چنار کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں]۔ یہاں سے افغانستان کو ایک راستہ درۂ پایےوار سے ہوتا ہوا جاتا ہے جس کے ذریعے اون، پھل، شالوں اور قراقلی وغیرہ کی تجارت ہوتی ہے۔ [۱۸۹۲ء میں اس کا الحاق برطانوی ہند سے ہوا تھا۔ اب پاکستان کا حصہ ہے]۔

مآخذ: (۱) *Gazetteer of the Kurram Agency*، پشاور ۱۹۰۸ء؛ (۲) Sir James David: *North West Frontier Province and Kashmir*، کیمبرج ۱۹۶۹ء، ص ۳۱۰ ببعد۔

(سعیدالدین احمد)

پارتھیا: بحیرۂ خزر کے جنوب مشرقی پہاڑی علاقے کا نام، جو کوہ البرز سے مشرق کی طرف ہرات تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایران کا شمال مشرقی صوبہ ہے اور اب خراسان کہلاتا ہے۔ اس علاقے کے شمالی سرے پر ایک زرخیز میدان صحرائے توران واقع ہے۔ جنوب کی طرف صحرائے لوط اور مغربی جانب دشت کویر ہے۔ اس خطے کی غیر معتدل آب و ہوا اور سطح کا قدرتی طور پر کٹا پھٹا ہونا یہاں کے لوگوں کو جفاکش اور محنتی بنانے میں بہت ممدّ ثابت ہوا ہے۔ پرانے زمانے میں یہاں پارتھوا نام کا ایک ایرانی قبیلہ آباد تھا، جس کی بنا پر پارتھیا نام پڑا۔ دامغان کے قریب اس زمانے کے کھنڈر بھی دریافت ہوئے ہیں۔ یہ علاقہ عرصۂ دراز تک قدیم یونانی تہذیب سے بھی وابستہ رہ چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایران کے پہلوی خاندان کی اصل بھی پارتھیا ہی سے ہے۔ اس کی سرحد شمال کی جانب روس سے ملحق ہے۔ یہاں کے قبائلی باشندے نہایت جنگجو اور بہادر ہیں۔ یہ لوگ تیراندازی میں بہت مشّاق ہیں۔ اس کے شمالی حصے میں شہر مشہد واقع ہے، جسے اہل تشیّع حضرت امام علی الرّضا علیہ السلام کے مزار کی وجہ سے نہایت مقدس مانتے ہیں۔ یہ علاقہ قدیم پہلوی تہذیب کا مرکز رہ چکا ہے۔

(قاضی سعیدالدّین احمد)

پارچہ بافی: رک بہ فن، پارچہ بافی (اسلامی)۔

پارسی: ابتدائے تاریخ سے پارسیوں کے آبا و اجداد کا اصل مسکن ایران تھا اور وہ مشرقی ایران میں پیشدادیوں اور کیانیوں کے دور میں ایرانی کہلاتے تھے۔

جب سائرس (Cyrus) نے ہخامنشی خاندان کی بنیاد ڈالی اس وقت سے یونانیوں سے ایران کے تعلقات قریب تر ہو گئے۔ دارائے اعظم نے ڈھائی ہزار سال قبل اپنی تاریخ کوہ بہستون نزد کرمان شاہ پر کندہ کرائی تھی۔ اس زمانے میں اس کی سلطنت دنیا بھر میں وسیع ترین سلطنت تھی۔ اس کی تئیس ولایتیں اور نوآبادیات ایشیا، افریقہ اور یورپ کی جنوبی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ صوبۂ فارس میں شیراز کے قریب اصطخر کے مقام پر اس دور کے کتبوں اور محلات کے آثار پائے جاتے ہیں۔ فارس کے باشندے اب پارسی کہلانے لگے۔ وہ ایران یا فارس میں ساسانی دور کے اختتام تک رہے تاآنکہ عربوں نے ساتویں صدی میں آخری تاجدار یزدگرد (= یزد جرد) کو شکست دی۔

گزشتہ بارہ صدیوں میں بے شمار پارسیوں نے اسلام قبول کیا۔ معدودے چند جو ہندوستان بھاگ آئے اور جو لوگ اب بھی فارس میں رہتے ہیں دونوں مل کر ایک لاکھ پچیس ہزار افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا فرقہ بن گیا ہے۔ جب تھوڑے سے پارسی پہلی بار ہندوستان آئے تو کھیتی باڑی کرنے لگے۔ ان کی خوشحالی کا دور پندرھویں صدی سے شروع ہوا اور ان کے ہم مذہب لوگ کثیر تعداد میں ہندوستان آنے لگے۔ ان میں سے بہت سے دکاندار بن گئے۔ ان کی سب سے بڑی تعداد سورت میں رہتی تھی۔

جب انگریز آئے اور انہوں نے سورت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد ڈالی تو اس وقت اس کے گماشتے دو پارسی بھائی تھے۔ جب انگریزوں نے ہانگ کانگ، شنگھائی اور کانٹن کو فتح کیا تو پارسی کثیر تعداد میں بحیثیت سوداگر وہاں پہنچے۔ انہوں نے بے شمار دولت جمع کر لی، جسے انہوں نے بڑی فراخدلی سے قومی فلاح اور رفاہ عامّہ کے کاموں، مثلاً مدرسے و شفاخانے اور دوسرے اداروں کے قائم کرنے میں صرف کیا۔ اس طرح یہ فرقہ رفاہ عامّہ کے کاموں کے لیے اب تک سولہ کروڑ سے زائد روپیہ خیرات کر چکا ہے۔ گزشتہ صدیوں کے

اختتام تک پارسی لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کی اوسط شرح فی صد انگلستان اور امریکہ کے برابر ہوگئی۔

پارسی گزشتہ صدی میں کارخانہ داری کی صنعت کے پہلے علمبردار تھے۔ مشہور ٹاٹا کمپنی، جو جمشید پور میں کلکتے (بھارت) کے قریب واقع ہے، فولاد سازی میں ایک مشہور صنعت گاہ ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ میں تین ہندوستانی آج تک منتخب ہوئے، وہ تینوں پارسی تھے۔ دادا بھائی نوروجی جو بابائے ہند کے نام سے مشہور ہیں لبرل Liberal پارٹی کے رکن تھے۔ سر منچرجی بھاؤنگری قدامت پسند (Conservative) پارٹی کے رکن تھے اور مسٹر شاہ پورجی سکلتوالا مزدور (Labour) پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ جس وقت کرکٹ کا کھیل شروع ہوا تو پارسی سب سے پہلی مرتبہ انگریزوں کے مقابلے میں کھیلے۔ ان لوگوں نے اپنی ٹیم لنڈن بھیجی۔ لارڈ ھاک Hawk، آوکسفرڈ اتھنٹک اور وارنر Warner اپنی تین ٹیمیں پارسیوں سے میچ کھیلنے کے لیے ھندوستان لائے تھے۔

(M.N. Dhalla)

پارہ: ایک ترکی سکّہ، جو ابتداءً ۳ آقچہ کے برابر چاندی کا سکّہ ہوتا تھا۔ یہ سکّہ سترھویں صدی کے شروع میں جاری ہوا، اور بہت جلد آقچہ کی جگہ سکّۂ رائجہ کے طور پر چلنے لگا۔ اس کا وزن، جو ابتدا میں ۱۶ گرین (۱۰۰ء۱ گرام) تھا، اٹھارھویں صدی کے آغاز میں گھٹ کر اس وزن کا ایک چوتھائی رہ گیا۔ اور چاندی کا حصّہ بھی کم ہو گیا۔ چاندی کے پارہ کے اضعاف یہ تھے: ۵ (بشلک)؛ ۱۰ (اونلق)؛ ۲۰ (اویشلک)؛ ۲۰ (یگرمی پارہ لک)؛ ۳۰ (وولنہ)؛ ۴۰ (غروش یا پیاسٹر)۔ کبھی کبھی زیادہ بڑے اضعاف: ۶۰ (التمشلک)؛ ۸۰ (الگیلک) اور ۱۰۰ (یوزلک) بھی جاری ہوئے۔ ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء میں نئے مجیدی سکّوں کے رواج کے وقت پارہ تانبے کا چھوٹا سکّہ قرار دیا گیا اور اس کے اضعاف یہ تھے: ۵ (بش پارہ لک)؛ ۱۰ (اون پارہ لک)؛ ۲۰ (یگرمی پارہ لک)؛ ۴۰ (غروش یا پیاسٹر)۔ ترکی سلطنت کے آخری دور میں زیادہ قیمت کے سکّے تانبے کے بجائے نِکل کے بننے لگے۔ جمہوری حکومت میں پارہ صرف زرِحسابی رہ گیا ہے، اور ایلومینیم و کانسی کا ۲ ½ پیاسٹر کا سکّہ سب سے چھوٹے سکّے کے طور پر مضروب ہوتا ہے۔

جب سربیا آزاد ہوا تو اس نے اپنے سب سے چھوٹے سکّے کے لیے پارہ کا نام باقی رہنے دیا اور جبل اسود (مانٹی نیگرو) نے بھی یہی کیا۔ اسی طرح یوگوسلاویا میں بھی یہ نام باقی ہے۔ وہاں سب سے چھوٹا سکّہ، جو نکل کا ہوتا ہے، ۵۰ پارہ کے مساوی ہے۔ ۱۷۷۱ سے ۱۷۷۴ء تک، جب مولدیویا اور افلاق (Wallachia) [رک باں] میں روس کا قبضہ رہا تو، وہاں ایسے تانبے کے سکّے جاری کیے گئے جن کی قیمت پارہ اور کوپک [Kopeck، روسی سکّہ] میں ہوتی تھی۔

مآخذ: (۱) Lane-Poole: *Catalogue of Oriental Coins in the British Museum*، ج ۸، لنڈن ۱۸۸۱ء؛ (۲) Belin، در *JA*، سلسلہ ۶، ج ۳: ص ۴۲۲ تا ۴۵۰۔

(J. Allan)

بازہر: رک بہ بازدر۔

پاسبان اوغلو: (= پاسبان اوغلی)، (قب قاموس الاعلام، ۲: ۱۳۶۷) یا بازوانند اوغلو (عبدالرحمٰن شرف: تاریخ، ۲: ۲۸۰) یا جدید املاء کے مطابق Pazvant-Oghlu (حامد و معسن: ترکیہ تاریخی، ص ۳۲۴)، لیکن خود اس کی مہر پر ''بازواندزادہ عثمان'' (در Oreškov، دیکھیے مآخذ)، کندہ تھا۔ ودین کا باغی پاشا (۱۷۵۸ تا

۱۸۰۷ء) اس کے خاندان کا اصلی وطن بوسنہ میں طوزلہ تھا، لیکن اس کے دادا پاسبان آغا کو، آسٹریا کے خلاف جنگی خدمات کے صلے میں ۱۷۳۹ء کے قریب بلغاریا میں ودین کے آس پاس دو گاؤں عطا ہوے تھے۔ عثمان کا باپ عمر آغا پاسبان اوغلو نہ صرف ان دو گاؤوں کا موروثی زمیندار تھا بلکہ "بیرق‌دار" [رک بآں] وغیرہ ہونے کی وجہ سے دولت‌مند اور سرکردہ لوگوں (اعیان) میں سے تھا، مگر اس کی سرکشی کی وجہ سے مقامی گورنر نے اسے قتل کر دیا تھا۔

خود عثمان نے بھی اپنی جان صرف البانیا بھاگ کر بچائی، لیکن ۱۷۸۷ تا ۱۷۸۹ء کی لڑائی میں رضاکار کی حیثیت سے حصہ لینے کے بعد وہ وطن واپس آ گیا۔ بہت تھوڑی مدت بعد وہ دوبارہ میدان جنگ میں گیا اور داد شجاعت دے کر ۱۷۹۱ء میں ودین کی طرف پلٹا۔ یہاں سے اس نے ساتھیوں کے ہمراہ افلاق (Wallachia) اور سربیا پر حملے شروع کیے۔ جب سلطان نے اس حرکت پر اس کو سزا دینا چاہی تو ۱۷۹۳ء میں اس نے ترک اطاعت کرکے پہاڑوں میں پناہ لی اور ۱۷۹۴ء کے اخیر میں اپنی رہزن جماعت کی مدد سے ودین کو فتح کر لیا اور اس پاشالیق [صوبے] کا حقیقی حاکم بن گیا۔ ودین، جس کی اس نے پھر سے قلعہ بندی کر لی، اب رہزنوں اور ان ینی چری سپاہیوں کا مرکز بن گیا جو ۱۷۹۴ء میں سربیا سے نکال دیے گئے تھے، اور عثمان ان سب لوگوں کا ہر دل عزیز سرغنہ بن گیا جو سلیم ثالث کی اصلاحات کے مخالف تھے۔

پاسبان اوغلو نے ۱۷۹۵ء میں خود بلغراد کے والی حاجی مصطفی پاشا پر فوج کشی کی، جو اصلاحات کا حامی تھا اور پاسبان اوغلو کے قلع قمع کرنے کا کام بھی اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ باب عالی نے خاصی بڑی فوجیں پاسبان اوغلو کے مقابلے کو بھیجیں، لیکن وہ ناکام رہیں۔ نتیجے کے طور پر ۱۷۹۵ء کے آخر میں صلح کی بات چیت شروع ہوئی، لیکن پاسبان اوغلو عملاً پورے بالائی بلغاریا پر بدستور قابض رہا۔

چونکہ باب عالی نے پاسبان اوغلو کی حکومت کو باضابطہ تسلیم نہیں کیا تھا لہٰذا اس نے ودین کے سرکاری حاکم کو شہر بدر کر دیا اور ۱۷۹۷ء میں آس پاس کے علاقوں (پاشالیقوں) پر حملہ آور ہوا۔ مشرق میں اس کی فوجیں بلغاریا کے کئی شہروں پر یا تو قابض ہو گئیں یا ان کے لیے خطرے کا باعث بن گئیں تھیں (البتہ وارنہ Varna میں انھوں نے شکست کھائی)۔ جنوب میں انھوں نے نش Nish [رک بآں] پر حملہ کیا لیکن ناکام رہیں۔ مغرب میں وہ بلغراد [رک بآں] تک پہنچیں اور یہ شہر فتح کر لیا، لیکن ترکوں اور سربیوں نے، جنھیں حاجی مصطفی نے مسلح کر دیا تھا، قلعے کی مدافعت کی اور حملہ آوروں کو پسپا کر دیا۔ اس حملے کے باعث، نیز پاسبان اوغلو کے فرانس اور روس سے نامہ و پیام کرنے پر، باب عالی نے ۱۷۹۸ء میں امیر البحر کوچک حسین پاشا کے زیر قیادت لاکھو سپاہیوں کی ایک فوج پاسبان کے مقابلے کو بھیجی۔ اس فوج نے اکتوبر کے مہینے تک شہر کو گھیرے رکھا مگر فتح نہ کر سکی اور اسے بھاری نقصانات اٹھا کر واپس ہونا پڑا۔ اس شکست اور نپولین کے حملۂ مصر سے مجبور ہو کر باب عالی نے پاسبان اوغلو سے کم از کم برائے نام صلح کر لی اور ۱۷۹۹ء میں اسے پاشائے سہ دم اسپ [اوچ طوغ پاشا] کا منصب دے دیا۔

بایں ہمہ پاسبان اوغلو نے علی الاعلان اصلاحات، مرکزی حکومت اور خود سلیم ثالث، سب کی مخالفت کی۔ اس نے متعدد بار (۱۸۰۰ء اور ۱۸۰۱ء) افلاق

کو تاخت و تاراج کیا اور ینی چری فوج کو، جو (۱۸۰۰ء کے موسم گرما میں) بلغراد واپس آ گئی تھی قلعے پر قبضہ کر لینے اور (سال کے آخر میں) حاجی مصطفٰی پاشا کے قتل پر ابھارا۔

اسی زمانے میں پاسبان اوغلو نے کئی بار زار سے خواہش کی کہ وہ اسے اپنی مخلص رعایا میں شمار کرے اور فرانس کو بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ باب عالی نے کچھ ہی عرصے پہلے پاسبان اوغلو کے سارے قصور معاف کر دیے تھے، لیکن ۱۸۰۳ء سے اس کے خلاف پھر اعلان جنگ کر دیا، مگر ۱۸۰۴ء میں سربیا والوں نے بغاوت کر دی، جس سے ترکوں کی توجہ اس کی جانب ہٹ گئی۔ پاسبان اوغلو کو خود اپنے مقبوضات کے مغربی حصے میں ۱۸۰۵ء میں پنتزو Pintzo کی شورش دبانے کے لیے لڑنا پڑا۔ ۱۸۰۶ء میں جب روسی فوجیں ڈینیوب کے بائیں کنارے پر نمودار ہوئیں تو پاسبان کو مصلحت یہی نظر آئی کہ باب عالی کو اپنی خدمات پیش کرے۔ لیکن باب عالی نے روسچق کے سپہ سالار کو قیادت اعلٰی عطا کر دی۔ اس سے پاسبان بہت تلخ کام ہوا اور اس نے ارادہ کر لیا کہ روس اور سربیا کے متحدہ حملوں کے خلاف صرف اپنے ملک کی حفاظت کرے گا، لیکن بعد ازاں وہ جلد ہی یعنی ۲۷ جنوری ۱۸۰۷ء کو اس دنیا سے چل بسا۔

پاسبان کو اتنے عرصے تک ثابت قدم رہنے میں جن چیزوں نے مدد دی وہ اس زمانے میں سلطنت عثمانیہ کی گری ہوئی حالت اور اس کی اپنی ذاتی قابلیت اور دوربینی تھی (وہ کبھی ودین چھوڑ کر نہ نکلا)، مگر سب سے بڑی وجہ تقدیر کی یاوری تھی۔ اپنے علاقے کے اندر وہ تجارتی اور دوسرے محاصل وصول کرتا اور سختی اور استبداد کے ساتھ حکومت کرتا تھا، مگر یہ مطلق العنانی انصاف اور نرمی سے خالی نہ تھی۔ دماغی پریشانیوں کی وجہ سے اس کی صحت کچھ اچھی نہ رہنے کے باوجود اس کی اولوالعزمی کا منتہا آزادی تھا، جس کا ثبوت وہ سکے ہیں جو اس نے مضروب کرائے اور جو بازوانچہ Pazvančeta کے نام سے معروف تھے۔

مآخذ: پاسبان اوغلو پر مختلف اطلاعات G. A. Oliver (۱۸۰۱ء) اور L. Pouqueville (۱۸۰۵ء) کے معاصر سفرناموں میں ملتی ہیں؛ لیکن اس کی مکمل تصویر (۱) *Notes sur Passvan-Oglu 1758-1807 par l'adjudant-commandant Mériage* میں نظر آتی ہے، جو ودین کے فرانسیسی ایجنٹ (۱۸۰۷ و ۱۸۰۸ء) نے مرتب کیے تھے۔ اس کے وقائع حیات سے متعلق اس سے بہتر تصنیف اب تک شائع نہیں ہوئی۔ انہیں Grgur Jakšić نے مرتب کر کے *Le Revue Slave* (ج ۱، پیرس ۱۹۰۶ء: ص ۲۶۱ تا ۲۷۹ اور ۴۱۸ تا ۴۲۹؛ ج ۲، ۱۹۰۶ء: ص ۱۳۹ تا ۱۴۴ اور ۴۳۹ تا ۴۴۸؛ ج ۳، ۱۹۰۷ء: ص ۱۲۸ تا ۱۴۴ اور ص ۲۷۸ تا ۲۸۸) میں چھاپا۔ ان کا ترجمہ سربوکروٹی زبان میں ہوا: *Glasnik zemaljskog muzeja* (ج ۱۷، سراجیو ۱۹۰۶ء: ص ۱۷۳ تا ۲۱۶)؛ نیز دیکھیے: (۲) J. W. Zinkeisen: *G. O. R. in Europa*، ۷، گوتھا ۱۸۶۳ء: ۲۳۰ تا ۲۳۱؛ (۳) C. Jireček: *Geschichte der Bulgaren*، پراگ ۱۸۷۶ء، ص ۴۸۶ تا ۵۰۳؛ (۴) Iv. Pavlović: *Ispisi iz francuskih arhiva*، بلغراد ۱۸۹۰ء، بالخصوص ص ۱۰۳ تا ۱۲۸، یہ پاسبان اوغلو کے متعلق سفارتی اطلاعات ہیں (۱۷۹۵ تا ۱۸۰۷ء)؛ (۵) M. Gavrilović، در *La Grande Encyclopédie*، ۲۶: ۶۸، پیرس بدون تاریخ؛ (۶) St. Novaković: *Tursko carstvo pred srpski ustanak 1780-1804*، بلغراد ۱۹۰۶ء، ص ۲۲۲ تا ۲۸۹؛ (۷) M. Vukićević: *Karađorđe*، ۱، بلغراد ۱۹۰۷ء؛ ۱۶۶ تا ۱۷۶ اور ۱۸۵ تا ۲۰۸؛ (۸) P. Orěškov: *Několko dokumenta za pazvantoglu i Sofroni*

Vrčanski (1800-1812) [از روسی وزارت خارجہ]، در مجلّۂ سائنس اکیڈیمی، بلغاریا: *Sbornik*، جلد ۳، صوفیا ۱۹۱۳ء، مادہ ۳، ص ۱ تا ۵۰؛ (۹) V. Ćorović، در *Narodna enciklopedija*، ج ۳: Zagreb ۱۹۲۸ء، ص ۲۷۲۔

(FEHIM BAJRAKTAREVIC)

پاسے: (Pasé) سماترا میں آچے (رک آچے) کے شمالی ساحل پر ایک ضلع، جو وہاں کے عام خیال کے مطابق مشرق میں دریاے جمبو آچے (Djambo-Ajé) سے شروع ہو کر مغرب میں دریاے پاسے کے دوسرے کنارے تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ تمام علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا ہے، جن میں سے ہر ایک میں ایک اولی‌بلانگ uleëbalang یا سردار ہوتا ہے۔

پاسے کسی زمانے میں مشرقی ایشیا میں ایک مشہور مملکت تھی۔ آچے کا شمالی ساحل قرون وسطٰی میں اس بحری تجارتی راستے پر واقع تھا جو ہندوستان سے چین کو جاتا ہے۔ اسلام اسی راستے سے آیا اور اس نے ہندوستان سے نکل کر اس ساحل پر مضبوط قدم جما لیے۔ جزائر شرق الہند میں یہ پہلا مقام تھا جہاں اسلام پہنچا۔ ہم جانتے ہیں کہ تیرھویں صدی عیسوی میں وہاں پہلے سے مسلمان حکومت کر رہے تھے ان میں سے ایک الملک الصّالح (م ۱۲۹۷ء) مقامی روایت کے مطابق سلطنت کا بانی تھا۔ اسی نے اس ملک میں دین اسلام پھیلایا۔ اس کی قبر، جو کھنبایت (ہندوستان) سے لائے ہوئے پتھروں سے بنی ہوئی ہے، بعض دوسری قبروں کے تعویذوں کے ساتھ دریاے پاسے کے بائیں کنارے پر سمندر کے قریب ہی دریافت ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہیں سلطنت کا پاے تخت واقع تھا۔ ایک اور پاے تخت، جو قدرے مغرب میں ہے، سُمُدرا تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں جب چین کو جاتے اور وہاں سے واپس آتے ہوئے ابن بطّوطہ دو دفعہ یہاں آیا تو بادشاہ کی سکونت سمدرا ہی میں تھی۔ سماترا کے جزیرے کا موجودہ نام، جس سے وہ یورپ میں مشہور ہے، اسی سُمّدرا سے بنا ہے۔ ابن بطوطہ اسے ”سمطرہ“ لکھتا ہے۔ پاسے اس زمانے میں ایک خوش حال ساحلی خطہ تھا، وہاں کا حکمران بندرگاہ کا بادشاہ تھا، جس کے بہت سے تجارتی جہاز چلتے تھے؛ چنانچہ ابن بطوطہ نے اس کا ایک جہاز جنوبی چین کے بندر چوئن‌چاؤ ch'üanchou (فوکین Fukien) میں دیکھا تھا۔ یہاں کی درباری زندگی بالکل ہندوستان کے بادشاہوں کے درباروں کے نمونے پر ڈھالی گئی تھی۔ اس وقت کا بادشاہ بڑا پرجوش مسلمان تھا۔ اسے علوم کا بے حد شوق تھا۔ اس نے ساحل کے عقبی علاقے میں کئی فتوحات حاصل کیں۔ پاسے میں لین دین کے لیے سیسے کے سکے [ابن بطّوطہ: قطعِ قصدیر] اور چین کا خام سونا استعمال ہوتا تھا۔ خوراک زیادہ‌تر چاول تھی۔

ابن بطّوطہ کی اس ملک سے روانگی کے کچھ ہی عرصے بعد (۱۳۶۵ء سے قبل) بادشاہ کو جاوا کی ہندو سلطنت مجاپاہت Madjapait کی سیادت تسلیم کرنا پڑی۔ لوہ سُوکُوْن Lho-Sukon کے قریب کسی ملکہ یا شہزادی کی قبر ملی ہے جس کی لوح کے اوپر کی طرف ۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء کا ایک عربی کتبہ ہے اور زیریں حصے پر قدیم جاوی رسم‌الخط میں ایک بہت ہی بوسیدہ کتبہ ہے۔ یہ اب تک پڑھا نہیں جا سکا۔ چینی سفیر تشنگ ہو (Cheng Ho) نے ۱۴۱۶ء میں بیان کیا ہے کہ یہ حکومت ناگو (پیڈی Pidië =) سے مسلسل لڑائیوں میں الجھی رہی۔ وہ یہاں کی پیداوار میں چاول، سیاہ مرچ اور کرمِ ابریشم کا تذکرہ کرتا ہے۔ سیاہ مرچ نے پرتگالیوں کو یہاں کھینچ بلایا۔ انھوں نے ۱۵۲۱ء سے پاسے میں ایک قلعہ‌بند بستی بنائی، لیکن آچے کے سلطان

نے، جس کی سلطنت روزافزوں ترقی پر تھی، ۱۵۲۴ء میں ان کو نکال دیا ۔ اس کے بعد سے پاسے سلطنت آچے کا ماتحت صوبہ ہو گیا ۔ قدیم حکومت کے سلاطین کی قبریں بہت بعد کے زمانے، یعنی ۱۰۴۸ھ / ۱۶۳۸-۱۶۳۹ء تک آچیے کے مشہور ترین سلطان سکندر ثانی کی زیارت گاہ تھیں، لیکن اب اس قدیم سلطنت کی یاد بھی محو ہو گئی ہے ۔ دریاے پاسے کا دہانہ گاد سے اَٹ گیا ہے اور وہ مقام جہاں پاسے تخت واقع تھا قابل شناخت نہیں رہا ۔

پاسے نے مسلمان علما اور مبلغین کے ذریعے سالہاے دراز تک مجمع الجزائر ملایا پر کافی اثر ڈالے رکھا ۔ اُن کی یاد جاوی اور ملائی روایات میں باقی ہے ۔

مآخذ: (۱) C. Snouck-Hurgronje: *Verspreide Geschriften*، ۴/۱: ۴۰۲ بعد؛ ۴/۲: ۱۰۱ بعد؛ (۲) C. Defrémery و B. R. Sanguinetti: *Voyages d'Ibn Batoutah*، ۴: ۲۲۸ بعد؛ (۳) W.P. Groene-veldt: *Notes on the Malay Archipelago and Malacca*، در *Miscellaneous Papers relating to Indo-China and the Indian Archipelago*، سلسلہ ۲، ج ۱، لنڈن ۱۸۸۷ء، ص ۱۷۱، ۲۰۸ بعد؛ (۴) J.P. Moquette: *De eerste vorsten van Samoedra-Pasè (Noord-Sumatra)*، در *Rapporten Oudheidk. Dienst Nederlandsch-Indië*، ۱۹۱۳ء، ص ۱ بعد؛ (۵) *Oudheidk. Verslag*، در کتاب مذکور، ۱۹۱۵ء، ص ۱۲۷ بعد ۔

(R. A. Kern)

پاشا: (ترکی، فارسی لفظ بادشاہ سے ماخوذ، غالباً ترکی لفظ "بشقق" سے متأثر)، سب سے بڑا اعزازی لقب یا عنوان، جو ترکی میں قریبی عہد تک مستعمل رہا اور جو اب تک ان اسلامی ممالک میں باقی ہے جو سلطنت عثمانیہ کے اجزا رہ چکے ہیں (مثلاً مصر، عراق اور شام) ۔ پاشا، یورپ کے امرا کے القاب کی طرح ہمیشہ اسم عَلَم کے ساتھ استعمال ہوتا تھا، لیکن فرق یہ تھا کہ یہ نام کے بعد آتا تھا (یہی حال بے اور افندی کا ہے، جو پاشا سے کمتر درجے کے خطاب ہیں) ۔ مزید یہ کہ نوعیت کے لحاظ سے جاگیرداری کی بہ نسبت یہ زیادہ تر فوجی لقب تھا، کیونکہ یہ نہ تو وراثۃً آگے چلتا تھا، نہ اس سے بیویوں کو کوئی درجہ ملتا تھا اور نہ جاگیروں سے اس کا تعلق تھا؛ تاہم یہ لقب صرف اہلِ فوج کے لیے مخصوص نہ تھا، بلکہ (مذہبی عہدوں کو چھوڑ کر) بعض غیر عسکری یا دیوانی حکام کو بھی دیا جاتا تھا ۔

پاشا کا لقب پہلی بار تیرھویں صدی عیسوی میں دیکھنے میں آتا ہے ۔ اس کے ابتدائی استعمال کی صحیح تعیین مشکل ہے؛ لیکن کچھ بھی ہو، یہ لقب بہت پہلے آقا یا صاحب کے مبہم معنی میں استعمال ہوا اور پھر یہ معنی متروک ہو گئے (قب دیوانِ ترکی سلطان ولد، ص ۴۱، متن مؤرخہ ۷۱۲ھ / ۱۳۱۲ء، جہاں خود خدا کو "اے پاشا" کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے) ۔ اسی زمانے میں پاشا کا لقب، سلطان کے لقب کی طرح، بعض اوقات عورتوں کو بھی دیا گیا (قب اسمٰعیل حقی: کتابه‌لر، ۱۹۲۷ء، بمدد اشاریہ، بذیل مادۂ قادم پاشا، سلجوق پاشا) ۔ یہ دستور اُنیسویں صدی میں صرف ایک بار اور دیکھنے میں آیا ہے اور وہ بھی بطور استثناء، یعنی خدیو کی والدہ کے لیے (قب والدہ سلطان) ۔

سلاجقۂ روم کے زمانے میں پاشا کا لقب (لفظ پادشاہ کا اختصار اور ہمیشہ لفظ سلطان کا مماثل ہونے کی حیثیت سے) وقتاً فوقتاً بعض ایسے مذہبی افراد کو بھی دیا گیا جو ضرور سپاہی بھی ہوں گے اور جن کی تاریخ سے اب تک ہم اچھی طرح واقف نہیں ۔ عاشق پاشازادہ نے جو اپنا سلسلۂ نسب بیان کیا ہے اگر اس سے استدلال کریں تو یہ لقب تیرھویں صدی

کے نصف اول ہی میں مستعمل تھا۔ مخلص الدّین موسی بابا، عرف شیخ مخلص یا مخلص پاشا، علی افندی کی روایت کے مطابق، ۱۲۴۳ء میں سلجوقی سلطان غیاث الدین کیخسرو ثانی کی شکست کے بعد قرہمان اوغلو سے پہلے اس علاقے میں حکومت پر قابض ہو گیا تھا (قب Gibb: *A History of the Ottoman Poetry*، ۱: ۱۷۷).

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی صدی کے آخر میں پاشا کا لقب ان خاندانی رئیسوں کے خاص خاص افراد کے ناموں کے ساتھ بڑھایا گیا، جن کی تعداد محدود تھی اور جنہوں نے ایشیاے کوچک میں چھوٹی چھوٹی ترک اور ترکمانی موروثی ریاستیں قائم کر لی تھیں۔ یہ خطاب پانے والے بعض اوقات حکمران اور بعض اوقات حکمران خاندان کے ارکان تھے۔ یہی حال ریاستہاے تکّہ، آیدین، دنزلی اور قزیل احمدلی کا تھا (قب مادّۂ ترک) اور غالباً آناطولی کی چھوٹی ریاستوں کا بھی (قب صاروخان کے لیے علی پاشا، بروایت شہاب الدین ابن العُمَری: التعریف وغیرہ، جس کا حوالہ قلقشندی: صبح الأعشٰی، ۸: ۱۶، س ۱۴، میں دیا ہے).

آلِ عثمان میں دو شخص پاشا کے لقب سے ملقب بتائے گئے ہیں: علاء الدّین، جو عثمان کا بیٹا تھا اور سلیمان، جو اورخان کا لڑکا تھا.

علاء الدین کا معاملہ بہت مبہم ہے۔ اس نام کے دو آدمی یکساں ممتاز ہیں: ایک تو علاء الدین بے، جو عثمان کا بیٹا تھا اور دوسرا علاء الدین پاشا، جو عثمان کا وزیر تھا اور ممکن ہے ان دونوں کو ملتبس کر دیا گیا ہو (قب حسین حُسام الدین: علاء الدین بے، در *TTEM*، سال ۱۳ و ۱۴، ۴ مقالے)۔ مزید برآں ہو سکتا ہے یہی شخص یا ان دو میں سے کوئی ایک علاء الدین ”بیلربے“ بھی ہو (قب اوروج: *Chronicle*، طبع بابنگر Babinger، ص ۱۵، س ۵۱)۔ اس مسئلے کی، جو حل نہیں ہوا، جو بھی حقیقت ہو، یہ یقینی ہے کہ پاشا کا لقب شروع زمانے ہی سے ارباب سیاست کو دیا جاتا تھا (قب سنان پاشا، تحت اورخان، ترک).

بہرحال پاشا کا لقب بہت جلد ارباب مناصب میں سے دو طبقوں کا خصوصی امتیاز بن گیا: (۱) صوبوں کے بیلربی (امیرالامرا) اور (۲) پاے تخت کے وزرا؛ مگر کچھ مدت بعد اسی قسم کی خدمات انجام دینے والے دوسرے عہدے داروں کو بھی یہ خطاب دیا جانے لگا.

چودھویں صدی عیسوی کے نصف دوم (۱۳۵۹ء یا ۱۳۶۲ء ؟) میں ترک مؤرخوں کے قول کے مطابق لالہ شاہین کو، جو عثمانلی ترکوں کا سب سے پہلا (؟) ”بیلربی“ تھا، اس منصب کے ساتھ ہی پاشا کا لقب دیا گیا۔ پھر یہی لقب آناطولی کے بیلر بی کو عطا کیا گیا (اس طرح [سلطنت کے] دائیں اور بائیں بازو دونوں میں ایک ایک بیلربی رکھنے کا خیال ملحوظ رکھا گیا)۔ بعد میں جب وسعت پذیر سلطنت میں نئی اسامیاں بنائی گئیں تو دوسرے بیلربیوں یا والیوں (گورنر جنرلوں) کو بھی یہ لقب دیا جانے لگا.

وزرا کے معاملے میں بھی یہی صورت ہوئی۔ ان میں پہلا (؟) عثمانلی مؤرخین کے بقول، چندرلی [رَكْ بآں] خلیل الملقب بہ خیرالدین پاشا تھا (۷۷۰ھ/ ۱۳۶۸-۱۳۶۹ء میں)۔ جو وزیر (قب مادّۂ وزیر) سلطان احمد ثالث کے زمانے تک ”قبّہ وزیرلری“ کہلاتے تھے ان کی تعداد پہلے تین اور پھر نو کی گئی اور وزیر کا لقب دوسرے بڑے عہدے داروں، مثلاً ”قپودان پاشا“، ”نشانجی“، ”دفتردار“ کو بھی دیا جانے لگا۔ اس طرح وزیر کا لقب بھی زیادہ تر اعزازی ہوتا گیا، جس کے ساتھ پاشا کا خطاب بھی ضم ہوتا تھا؛ لیکن چونکہ ابتدا میں اور آئندہ بہت زمانے تک پاے تخت

میں ایک ہی وزیر رہتا تھا، لہٰذا باشا کے لقب کا اطلاق خصوصیت سے اور بلا کسی اضافت کے، بڑے وزیر پر کیا جانے لگا. جو آگے چل کر ''اولو وزیر'' یا ''صدر اعظم'' کہلایا۔ یہیں سے باشا نپوسی کی اصطلاح بنی، جس کو بعد میں بدل کر باب عالی، یعنی ''بڑے وزیر کی ڈیوڑھی'' کہنے لگے.

باشاؤں کی تعداد ابتداءً تیزی سے نہیں بڑھی - M. d' Aramon نے صرف چار پانچ باشاؤں یا وزیر باشاؤں کا ذکر کیا ہے اور جس زمانے میں (۱۵۴۷ء میں) اس نے اپنی کتاب لکھی اس وقت صرف تین باشا تھے (ایاز، گوزلجہ قاسم اور ابراھیم؛ یہ تینوں نصرانی الاصل تھے)؛ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ یہاں اس نے صرف پایۂ تخت کے باشاؤں کا ذکر کیا ہے.

صوبوں میں باشاؤں کی تعداد زیادہ تھی اور یہ بڑھتی گئی۔ ان میں دو قسمیں ممتاز تھیں: (۱) سہ دُم اسپ (طوغ) کا نشان پانے والے باشا یا وزیر، یہ منصب روز بروز اعزازی ہوتا گیا اور صوبوں میں پہنچ کر بتدریج رتبۂ بیلربی اسی میں ضم ہو گیا، (۲) دو دُم اسپ والے باشا، یا ''میر میران'' - یہ فارسی اصطلاح ترکی لفظ بیلربی اور عربی لفظ امیر الامرا کے مرادف تھی، لیکن بتدریج یہ منصب ادنٰی درجے کا رہ گیا - علاوہ بریں سابق سنجاق بے، یعنی حاکمان ضلع، جو اصولاً صرف ایک طوغ کے نشان کا حق رکھتے تھے، رتبۂ ''میر میران'' پر فائز کر دیے گئے اور یوں وہ بھی اپنی نوبت پر باشا ہو گئے.

قانون ''تنظیمات'' [رَكَ بآں] کے بعد باشا کا لقب نو قسم کے دیوانی اعلٰی حکام میں سے پہلے چار (۱ - وزیر، ۲ - بالا، ۳ - اولٰی، ۴ - ثانیہ صنف اولٰی، اور فوج میں (۱ - مشیر، ۲ - برنجی فریق، ۳ - فریق، ۴ - لوا کو دیا گیا، اور نامور اشخاص (۳ - روم ایلی بیلربی اور ۴ - میر میران بھی اس کے مستحق قرار پائے) باشا کے لقب سے عملاً اگرچہ بلااستحقاق معزول شدہ ''امیر الامرا'' بھی سرفراز کیے جاتے تھے اور اس حالت میں یہ محض ایک چھوٹے درجے کا اعزازی لقب ہوتا تھا.

سلطنت عثمانیہ کے خاتمے پر مناصب کی یہ ترتیب اڑا دی گئی اور جمہوریۂ ترکیہ نے باشا کا لقب صرف اہل فوج کے لیے رہنے دیا۔ اسے بھی حال میں انقرہ کی مجلس ملّی کبیر نے (۲۹ نومبر ۱۹۳۴ء کو) موقوف کر دیا - اب باشا کی جگہ جنرل اور مشیر کے بجائے ''مارشل'' بولا جاتا ہے.

یورپ میں ابتداءً اس لفظ کا تلفظ ''باشا'' تھا (چنانچہ سترھویں صدی سے قبل ''پاشا'' کے تلفظ سے کوئی واقف نہ تھا): اطالوی میں bascia، ازمنۂ وسطٰی یا عہد متأخر کی لاطینی میں bassa، فرانسیسی میں bacha یا bassa، انگریزی میں bashaw - رسم الخط کا اختلاف اس کے علاوہ ہے - یونانی میں اس کے برعکس پاشا کی شکل سب سے قدیم (چودھویں صدی عیسوی) ہے، لیکن غالباً یورپ کے اثر سے (سولھویں صدی میں) باشا بھی ملتا ہے، قب Ducange: *Glossarium mediae et infimae Graecitatis*، بذیل مادۂ μπασιάς - اس لفظ کا تلفظ باشا جو یورپ والوں نے کیا ہے وہ یا تو اس لیے ہے کہ مصر میں ان پر عربی زبان کا اثر پڑا یا باشا اور عرب کے ترکی لقب باشا کو انھوں نے گڈ مڈ کر دیا ہے (دیکھیے مقالے کا آخری حصہ).

لفظ باشا کا اشتقاق: اس لفظ کے مختلف اشتقاق بیان کیے گئے ہیں۔ اب ہم ان پر غور کریں گے: (۱) یہ فارسی ''پاے شاہ'' (= بادشاہ کا قدم) سے ماخوذ ہے۔ یہ تشریح، جو اس بنیاد پر ہے کہ ایران قدیم میں چند عہدے دار ''بادشاہ کی آنکھ'' کہلاتے تھے، پہلے تریوو (Trévoux) نے اپنی لغت (بذیل مادّہ) میں

درج کی، پھر G. v. Hammer نے ازسرِ نو اسے اٹھایا۔ [بہرحال] یہ قابل قبول نہیں۔ (۲) ترکی ''باش'' (سر یا سردار) سے۔ بہ قیاس Antoine Geuffroy: *Briesve description de la Court du Grand Turc*، ۱۵۴۲ء، اور Leunclavius (Löwenklau): *Pandectes Historiae Turcicae* اپنے وقائع کے تتمے (۱۵۸۸ء) میں پیش کر چکے ہیں، دیکھیے نیز تریوو Trévoux: *Dict.* اور Barbier de Meynard: *Suppl.* - یہ بھی قابل قبول نہیں۔ قب ذیل کا لفظ۔ (۳) ترکی ''باش آغا'' سے، جس کے معنے (تائید کی غرض سے) ''بڑا بھائی'' بتائے جاتے ہیں۔ اشتقاق کی اس صورت کو زمانۂ حال تک ترکی میں تسلیم کیا گیا ہے (محمد ثریا: سجلِ عثمانی، ۴: ۷۳۸؛ شمس الدین سامی: قاموس ترکی، بذیل مادۂ پاشا) اور اس کی بنیاد یہ واقعہ ہے کہ سلیمان پاشا اور علاء الدین پاشا، بالترتیب، اُورخان اور عثمان کے بڑے بھائی تھے۔ علی آفندی: کُنہ الاخبار (۵: ۴۹، س ۲۳)، تاریخ تصنیف ۱۵۹۴، تا ۱۵۹۹ء، اور عثمان زادہ احمد تائب (۱۷۲۳ء) نے ترکمانوں کے ہاں لفظ پاشا کے اس استعمال کی طرف توجہ دلائی (حدیقۃ الوزراء، استانبول ۱۲۷۱ھ، ص ۴، س ۱۶) - Heidborn: *Manuel de Droit Public et Administratif Ottoman*، وی آنا ۱۹۰۸ء، ص ۱۸۶، حاشیہ a) نے بھی لکھا ہے کہ قرہ مانیا کے یونانیوں کے نزدیک پاشا کے معنے ''بڑا بھائی'' ہیں، لیکن ان متفرق بیانات کی تائید کہیں سے نہیں ہوتی۔ چند ترک لغت نویس، مثلاً احمد وفیق (بذیل باشہ) اور صلاحی نے اس اشتقاق کو قبول کر لیا ہے، مگر دو مرحلوں میں: پاشا ترکی لقب ''باشہ'' سے بنا ہے جو خود ''باش آغا'' سے ماخوذ ہے۔ ''باشہ'' کا لقب، جس پر ہم آگے گفتگو کریں گے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ''باش آغا'' سے بنا ہے، لیکن برعکس اس کے جو مقالہ نگار پہلے سمجھتا تھا اس کا پاشا سے کچھ تعلق نہیں۔

(۴) فارسی پادشاہ (فرمانروا) سے۔ یہ اشتقاق Boudagov کی ترکی۔ روسی لغت (تصنیف ۱۸۶۹ء) میں درج ہے، جس کی تائید آگے چل کر روسی دائرۃ المعارف مؤلفۂ Brockhaus اور افرون Efron نے کی ہے۔ صرف یہی اشتقاق قابل تسلیم ہے (گو جس اثر کی آئندہ نمبر ۵ میں تشریح کی گئی ہے اس کا امکان بھی موجود ہے۔ d'Herbelot نے ان لوگوں سے پہلے بھی اشتقاق پیش کیا تھا (تحت pascha، آخر میں 'ہ' کے ساتھ املا کے سلسلے میں) یہ تشریح اس پر مبنی ہے کہ اکابرِ مذہب (درویشوں) کے ناموں کے بعد جو القاب استعمال کیے جاتے ہیں ان میں سلطان اور پادشاہ کے لفظ سب سے زیادہ مستعمل ہیں (قب Giese، در ترکیات مجموعہ سی، ۱، ۱۹۲۵ء: ۱۶۳ - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُورخان نے علاء الدین پاشا سے اس کے مستعفی ہونے سے پہلے جو مبہم الفاظ کہے تھے اور جنھیں عاشق پاشازادہ (طبع Giese، ص ۳۳ تا ۳۵) نے نقل کیا ہے، اُن کی تشریح بھی پادشاہ سے ہو سکتی ہے۔ (قب بالا)۔ اُورخان کہتا ہے: ''تم میرے لیے پاشا ہو گے''۔ اور اس سے چند سطر اوپر اُورخان اس سے ''چوبان پادشاہ''، یعنی اپنی قوم کا راعی ہونے کو کہہ چکا تھا۔

دوسری طرف یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ پاشا کا لقب اکثر نہ صرف ''پادشاہ'' بلکہ ''شاہ'' کے بدل کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے، چند مثالیں پیش ہیں:-

قزل احمد لی خاندان کے شجاع الدین سلیمان کو ابن بطوطہ [: رحلۃ] (طبع Defrémery و Sanguinetti، ۲: ۳۴۳) نے سلیمان بادشاہ اور شہاب الدین بن

العمری : التعریف بالمصطلح الشریف، قاہرہ [illegible]، ص ۵ نے (عربی رسم الخط کے مطابق) باشا [بے نقطہ] لکھا ہے اور منجم باشی [کی تصنیف] (۳ : ۵۰۰) میں سلیمان باشا کہا گیا ہے۔ اس حکمران کے بڑے اور جانشین ابراہیم کو ابن العمری نے "شاہ" اور منجم باشی نے "پاشا" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ دستور نامۂ انوری، طبع مکرمین خلیل، ص ۳۸ تا ۴۸، میں سلیمان پاشا بن اورخان کو شاعرانہ ترکیب مقلوب کے ساتھ شاہ سلیمان کہا گیا ہے۔ ابن العمری نے بغداد کے ایلخانی گورنر علی بن چیچک Čečäk (م ۱۳۳۶ء) کا ذکر علی باشا کے نام سے کیا ہے، بقول نظمی زادہ (گلشن خلفا، قسطنطنیہ ۱۱۴۳ھ) بعض مخطوطات میں اسے علی شاہ لکھا ہے۔ اس کا ذکر علی بادشاہ کے نام سے بھی آیا ہے (Histoire de Bagdad : Cl. Huart ص ۱۰)۔ مشرقی [ترکی] بولیوں میں چھوٹے والیانِ ریاست کو بھی پادشاہ کہا گیا ہے۔ وہاں اس لفظ کی شکل پاشا میں تبدیل نہیں ہوئی، بلکہ "پاتشا" (قرغیز) اور "پوتشو" (ازبک) ہو گئی ہے۔

۵ ۔ ترکی لفظ "باسقاق" (متبادل شکلیں: باسکاک ؟، باشکن ؟) ہے، جس کے معنے "[illegible]" (یا صدر کوتوالی پولیس) ہیں (در لغت از Pavet de Courteille اور Boudagov کی لغت میں "باسمق" کے تحت)۔ خوارزمی زبان کا یہ لفظ بقول Vellers ایران میں (بعہد سلطنت ایلخانیہ) رائج ہوا۔ مغول میں اس کا اطلاق ان گماشتوں یا ناظروں اور صدر ناظروں پر ہوتا تھا جو مفتوحہ صوبوں (بطرف صوبوں کے ؟)، خصوصاً روس میں بھیجے جاتے تھے۔ مسلمہ اشتقاق کی رو سے یہ لفظ فعل "باسمق" (= باصمق) سے بنا ہے، جس کے معنے ہیں "دبانا، هجوم یا ازدحام کرنا، تنگ کرنا، نقش کرنا"؛ اور یہ قابل لحاظ ہے کہ یہی لفظ "باسقاق" کے معنی خانم (یا) جبراً حاصل کرنے والا قرار پائے، یعنی ایک عہدے دار (قب روسی اور پولش دوائر معارف) جس کا خاص کام محصول اور خراج وصول کرنا تھا۔ کسی عہدے کے نام کی یہ تشریح کتنی ہی انوکھی کیوں نہ ہو اس کی تائید اس مشابہت سے ہوتی ہے جو باسقاق اور اس کے مرادف مغولی زبان کے لفظ "داروغہ" darugha یا darogha [زبان] کے درمیان موجود ہے، چنانچہ لفظ داروغہ کا موازنہ ہم مغل زبان کے فعل "داروخو" سے کرسکتے ہیں، جس کے معنی "اندر کو دبانا یا نقش کرنا" ہیں، اور وہ اس مفہوم میں باسمق کا ہم معنی ہے، مگر ہو سکتا ہے کہ یہ محض عوامی اشتقاقات ہوں۔

شیفر Schefer نے کتاب Voyage de M. d'Aramon کے اپنے طبع کردہ نسخے (ص ۲۲۸، حاشیہ ۳) میں لکھا ہے کہ لفظ پاشا Pacha کا اشتقاق (ترکی باش bach سے)، جو Geuffroy نے بتایا ہے، غلط ہے۔ یہ لفظ باشقاق bachqaq یا باسقاق pachqaq کی مختلف صورت ہے، جس کے معنے فوجی حاکم کے ہیں۔ Carpini نے مغل لفظ باسقاق کا ترجمہ baschati کیا ہے (مخطوطات میں مختلف املا : باسجاتی bascati اور باساجی bastaci) (قب *The texts and versions of John de Pl. Carpini..*، لنڈن Hakluyt Soc، ۱۹۰۳ء، ص ۶۷ و ۱۶۲ حواشی) ۔ ۱۵۹۸ء کی طبع (Hakluyt) میں حاشیے پر یہ تشریح ہے : "باشا تاتاری لفظ ہے جسے ترک استعمال کرتے ہیں"۔ اس تشریح سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ لفظ باسقاق اور basha کو ملتبس کر دیا گیا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ فی الواقع خود ترکوں نے لفظ "بادشاہ" (بت) اور باسقاق کو، جو مغل داروغہ کا تقریباً ہم معنی ہے، ملتبس کر دیا ہو۔ شیفر اور ہکلیوت کے حواشی دیکھنے سے قبل بھی

ہمارا یہ خیال تھا۔ واضح رہے کہ باشا کا لقب (جو فارسی مآخذ میں کہیں نہیں آیا، جیسا کہ [میرزا] محمد قزوینی از راہِ عنایت ہمیں اطلاع دیتا ہے) یا تو آناطولی کے اُن امرا کے لیے استعمال ہوتا تھا جو فی الواقع یا برائے نام مغول کی رعایا تھے یا ایلخانی مغول کے حکام کے لیے (مثلاً بغداد کا سابق الذکر والی؛ قبّ نیز بسر علی باشا مذکور کا حال، در بزم و رزم مصنفۂ عزیز بن اردشیر استرآبادی [طبع کوپرولو، ص ۲۳۹، س ۸]) ۔ اس التباس کی توضیح اس لیے زیادہ آسان ہے کہ ''باشقاق'' کا لفظ (گو شاذ و نادر) ملتا ہے (الجوینی: تاریخ جہان کشای، ۱۲۶۰ء، طبع [میرزا] محمد قزوینی، ۲ : ۸۳، حاشیہ ۹؛ اس بیان میں ایک خوارزمی عہدے دار کا ذکر ہے، جو ۶۰۹ھ میں، یعنی مغلوں کی فتح سے پہلے موجود تھا).

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر باشقاق اور باشا کے لقبوں میں یہ التباس نہ ہوتا تو باشا کے لقب کو ہرگز اتنی اہمیت حاصل نہ ہوتی۔

ترکی لقب باشہ : یہ لقب بھی، جیسے مقدم الذکر لقب سے ملتبس نہ کرنا چاہیے اور نہ پاشا کے عربی یا قدیم مشرقی تلفظوں سے، اسم علم کے بعد استعمال ہوتا تھا، لیکن اس کا اطلاق صرف فوجیوں اور نیچے درجے کے افسروں (خصوصاً ینی چریوں) پر ہوتا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ صوبوں کے ممتاز اشخاص پر بھی [Meninski : *Thesaurus*، ج ۱ : عمود ۶۶۲ و ۲۹۳، س ۱۸؛ *Onomasticon*، عمود ۳۲۷؛ d'Herbelot، بذیل مادّۂ pascha؛ Viguier : *Elémens de la langue turque*، ۱۷۹۰ء، ص ۲۱۸، ۳۰۹، ۳۲۷؛ Zenker، ص ۱۶۳، عمود ۲ (غالباً Meninski کے تتبع میں)؛ De La Moltraye : *Voyages*، ۱۷۲۷ء، ۱ : ۱۸۰، حاشیہ ۵؛ قبّ اولیا چلبی، ۵ : ۱۷۰، ۱، ص ۲، ۲، س ۱۸؛ نعیما، ۵ : ۱۷، س ۱۱؛ اسمٰعیل حقی: کتابلر (سفر بشہ، ص ۳۱ و ۸) ـ De La Boulaye Le-Gouz (*Voyages*)، ۱۶۵۳ء، ص ۵۹ و ۵۳۵) بھی اس لقب اور باشا میں امتیاز کرتا ہے اور اس کا ترجمہ لفظ موسیو Monsieur سے کرتا ہے۔ Meninski نے (محلِّ مذکور) تلفظ بشی [باشی] (bashi) بھی قلمبند کیا ہے، جسے بش [باش] (bash) نہیں سمجھنا چاہیے، جس کے آخر میں اضافی ضمیر غائب کی ''ی'' لگ دی گئی ہو۔ Meninski ترکی اتنی جانتا تھا کہ وہ ایسی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ Chloros نے جو تلفظ بِشہ beshe (بذیل باشا) درج کیا ہے وہ املا بشہ سے مأخوذ ہے (قبّ مثلاً احمد وفیق: زوراکی طبیب، باب (act) ۱، منظر ۲، جہاں یہ طنزاً ایک عورت کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن Meninski اس املا کے باوجود بھی بشہ (basha) تلفظ کرتا ہے۔

چونکہ لغت نویسوں نے بشہ اور باشا میں التباس کر دیا تھا لہٰذا بعض لوگوں نے سمجھ لیا کہ باشہ کے معنے بھی ''بڑا بھائی'' ہیں (محمد صلاحی: قاموس عثمانی، ۲ : ۲۹۱ ببعد؛ Chloros نے اس کا تتبع کیا ہے)۔ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ دو جداگانہ مسئلے ہیں اور یہ کہ (بشہ یا) باشا دراصل ''باش آغا'' کی جگہ استعمال ہوتا ہے، لیکن اس کے معنے ''agha'' (فوجی لقب) ''in chief'' یعنی صدر آغا کے ہیں۔ قواس کو (جو ینی چری یا یاساقچی بھی کہلاتے تھے) بقول Roehrig ''بش [باش] آغا'' کہا جاتا تھا۔ باش آغا کے دوسرے معانی اور عام طور سے بعض ان نکات پر جن سے یہاں بحث کی گئی ہے مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: Deny : *Sommaire des Archives turques du Caire*.

تلفظ کے متعلق یادداشت : لفظ باشا میں زور آخری جزو کلمہ پر ہے (پشا pashá) اور لفظ باشہ میں پہلے جز پر (باشہ básha) جو لفظ باشی (báshi) کے تلفظ میں آخری حرف علت کی تخفیف سے ظاہر

ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے.

(J. Deny)

[دونوں ترکی لقب آغا اور باش آغا، بلاد الجزائر میں برابر استعمال ہوے۔ ان کا اطلاق وہاں بڑے یا متحد قبائل کے بعض رؤسا پر ہوتا ہے۔ فرانسیسی حکومت نے انہیں باضابطہ مان لیا ہے۔ پاشا کا لقب معلوم نہیں کب تک شرفاے مراکش میں مستعمل رہا۔ یہ لقب ان میں سولھویں صدی عیسوی میں رائج ہوا جب کہ حکومت بنی سعد ترکی اثرات سے کسی قدر متأثر ہوئی تھی۔ فرانسیسی نگرانی کی ابتدا ہی میں مراکش سے پاشا کا لقب نابود ہو گیا۔ اس کا اطلاق صرف بعض زعماے قبائل پر ہوتا تھا، مثلاً قبیلۂ شراجہ، جو شمالی فارس میں تھا اور قبیلۂ العبدالاحمر، جو سمندر کے ساحل پر بود و باش رکھتا تھا۔ نگران حکومت نے اس لقب کو بلا مقصد رہنے دیا اور یہ دیہات میں باضابطہ طور پر "قائد" کا قائم مقام ہو گیا۔ اہل مقدمہ قاضی کو قائد کہتے ہیں۔ فرانسیسی اور ہسپانوی زیر اثر علاقوں میں وہ تمام شہر جن میں میونسپلٹیاں قائم ہیں پاشاؤں سے خالی نہیں۔ یہ لوگ پاشا کہلاتے ہیں اور جمع پاشاوات آتی ہے (وَ، م)].

• **پاشالیق**: (ترکی)، اس کے معنے ہیں: (۱) کسی پاشا [رَكَ بآن]، کا منصب یا لقب؛ (۲) (صوبوں کا) وہ علاقہ جو کسی پاشا کے زیر اختیار ہو.

جب بعض والیوں کو جو "سنجاق بے" (یا "میرِ لِوا") کہلاتے تھے، ترقی دے کر "پاشا" کے مرتبے تک پہنچا دیا جاتا تھا، تو ان کے علاقے (سنجاق یا لِوا [رَكَ بآن] بھی پاشالیق کہلانے لگتے تھے.

انیسویں صدی کے آغاز میں ۱۰۸ سنجاقوں میں سے ستر پاشالیق تھیں۔ ان میں سے پچیس پاشا سنجاسی تھیں، یعنی وہ سنجاقیں جن میں "ایالت" کا مستقر صوبے کے والی یا گورنر جنرل کے رہنے کا مقام ہوتا تھا۔ مزید تفصیلات کے لیے قب Mouradgea d' Ohsson : *Tableau général de l' Empire Othoman*، ۷ : ۷-۳۰.

(J. Deny)

⊗ **پاشغرد**: رَكَ بہ باشقرت.

⊗ **پاک پٹن**: (= پاک پٹن، ساھی وال، مغربی پاکستان) کا مشہور قصبہ، جسے قدیم زمانے سے تاریخی حیثیت حاصل رہی ہے۔ "زمانۂ سلف میں اس کا نام اجودھن تھا، جو چالوکیا خاندان کی راجدھانی تھا۔ بابا فریدالدین گنج شکر کی خانقاہ کے سبب اسے اکبر بادشاہ کے حکم سے پاک پٹن کہنے لگے" (بشیرالدین احمد: واقعات دارالحکومت، ص ۱۵، ۱۹).

۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے ملتان فتح کرنے کے بعد پاک پٹن پر لشکرکشی کی۔ اس نے بابا فرید الدین گنج شکر کی مقدس یاد میں اہل شہر پر کسی قسم کی زیادتی نہ کی (*Gazetteer of the Montgomery District (898-99)*، ص ۳۲)۔ پاک پٹن دریاے ستلج کے دائیں کنارے سے آٹھ میل دور ۳۰°۲۱ شمالی عرض بلد اور ۷۳°۲۵ مشرقی عرض بلد پر واقع ہے۔ قدیم زمانے میں اسے دستکاریوں کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ مسٹر لاک وڈ کپلنگ سابق پرنسپل لاھور سکول آف آرٹ نے لکھا تھا کہ "منٹگمری میں لاکھ بنانے کی صنعت بہت مشہور ہے جو پاک پٹن میں قائم ہے۔ اس قصبے میں صنعت کاروں کے بعض خاندان کھلونے، صندوق، چرخے اور چارپائیوں کے پائے بہت عمدہ بناتے ہیں جو پنجاب کے اکثر شہروں میں بھیجے جاتے ہیں۔ یہاں کے کاریگر بہت عمدہ کپڑا بنتے ہیں۔ ان کے بنے ہوے خانہ‌دار کھیس، لنگیاں اور چوتہیاں وغیرہ بہت مضبوط اور صاف ہوتی ہیں" (*Gazetteer of the Montgomery District*، ص ۱۷۵).

پاک پٹن کو حقیقی شہرت حضرت بابا فریدالدین

گنج شکر کے نام نامی کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے، جو اپنی وفات (۱۲۶۵ء) تک یہیں اقامت گزیں رہے اور جن کے وعظ و ارشاد سے مغربی پنجاب کے بڑے بڑے قبیلے، مثلاً سیال، راجپوت، وٹو اور دوسرے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ ان کا مزار ایک عظیم زیارت گاہ ہے، جس کا اہتمام چند سال سے محکمۂ اوقاف، مغربی پاکستان نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ یہاں کی ایک اور قابل ذکر قدیمی جگہ گنج شہیداں ہے، جو مزار مذکور کے قریب واقع ہے.

پاک پٹن کو کسی زمانے میں تجارتی منڈی کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ اس کے اردگرد دیہاتی آبادی ہے۔ یہاں میونسپلٹی بھی ہے، جس کا قیام ۱۸۶۸ء میں عمل میں آیا تھا۔ مشرقی جانب تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تحصیل، تھانہ اور عدالتیں ہیں۔ قصبے کی گلیاں عموماً کشادہ اور شمالاً جنوباً ہیں۔ کچھ گلیاں تنگ اور گنجان بھی ہیں۔ یہاں ریلوے سٹیشن بھی ہے، جو ساہیوال سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر ہے.

(مقبول بیگ بدخشانی)

⊗ **پاک دامن بیبیاں**: (بی بی پاکدامناں)، لاہور کے مزارات و مقابر میں سے قبرستان بی بی پاکدامناں بھی زمانۂ دراز سے مشہور و متبرک چلا آتا ہے، لیکن تاریخی طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس قبرستان کا آغاز کب ہوا۔ صاحب حدیقۃ الاولیاء نے بحوالۂ تذکرۂ حمیدیہ لکھا ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں کرمان سے ایک عابد و زاہد بزرگ سید احمد توختہ (م ۶۰۲ھ) لاہور میں آ کر قیام پذیر ہوے۔ ان کی چھے بیٹیاں تھیں: بی بی حاج (رقیہ)، بی بی تاج، بی بی نور، بی بی حور، بی بی گوھر اور بی بی شہباز۔ یہ سب بڑی عابدہ زاہدہ تھیں۔ اپنے والد کی وفات کے بعد، جن کا مزار محلۂ چہل بیبیاں لاہور میں موجود ہے، یہ صاحبزادیاں فصیل سے گھرے ہوے لاہور کو چھوڑ کر اس علاقے میں قیام پذیر ہو گئیں جہاں اب یہ قبرستان واقع ہے۔ ان کا سال وفات ۶۱۵ھ کے بعد ہوگا کیونکہ جب چنگیز خان ۶۱۸ھ میں جلال الدین خوارزم کا تعاقب کر رہا تھا تو اس وقت ان بیبیوں کی لاہور میں موجودگی کا ثبوت ملتا ہے (کنہیا لال: تاریخ لاہور، ص ۳۰۸)۔ یہ سب بیبیاں اس جگہ مدفون ہیں اور ان کے مزار دو احاطوں میں ہیں۔ پہلے احاطے میں بی بی حاج، بی بی تاج اور بی بی نور کی قبریں ہیں اور دوسرے احاطے میں بی بی حور، بی بی گوھر اور بی بی شہباز کی۔ یہ سب قبریں پختہ چونہ گچ سے بنی ہوئی ہیں۔ پہلے احاطے میں ایک مقبرہ پختہ گنبددار بنا ہوا ہے جس کا سن تعمیر ۱۰۱۶ھ ہے اور جو میراں محمد شاہ موج دریا بخاری (م ۱۰۱۳ھ) کے بھائی سید جلال الدین حیدر بخاری، کا مزار ہے۔ اس قبرستان کے مجاور ان خواتین کے متعلق جو قصے سناتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ بیبیاں حضرت عقیلؓ بن ابی طالب کی صاحبزادیاں تھیں اور واقعۂ کربلا کے موقع پر لاہور میں تشریف لائیں اور تحقیقات چشتی میں ہے کہ ان میں سے ایک (بی بی حاج) حضرت علیؓ کی بہن ہیں اور بقیہ پانچ حضرت عقیلؓ کی صاحبزادیاں اور ان کے ہمراہ قرآن مجید کے سات سو چار حافظ تھے؛ واللہ اعلم۔ عبداللہ (یا محمد جمال) المعروف بہ بابا خاکی کی اولاد ان خواتین کے مزاروں کی مجاور ہے۔ ان مزاروں کے ساتھ سلاطین وقت نے کچھ اراضی وقف کر دی تھی.

مآخذ: (۱) نور احمد چشتی: تحقیقات چشتی، لاہور؛ (۲) کنہیا لال: تاریخ لاہور، لاہور ۱۸۸۲ء؛ (۳) غلام سرور: حدیقۃ الاولیاء؛ (۴) غلام دستگیر نامی: بی بی پاکدامناں، لاہور؛ (۵) محمد باقر: *Lahore*، لاہور ۱۹۵۲ء.

(ادارہ)

پاکِستان : جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان، آبادی کے لحاظ سے دنیا کی ساتویں بڑی مملکت (اسلامی ممالک میں صرف انڈونیشیا کی آبادی اس سے زیادہ ہے)، جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آئی۔ انگریزی دور ختم ہونے پر ہندوستان کو دو آزاد ریاستوں، بھارت اور پاکستان، میں تقسیم کیا گیا۔ پاکستان کے حصے میں برطانوی ہند کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقے آئے، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ مغربی حصے میں صوبۂ مغربی پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، صوبۂ سندھ، صوبۂ بلوچستان، ریاستہاے بہاولپور، خیرپور، نیز بلوچستان اور صوبۂ سرحد کی ریاستیں شامل ہوئیں اور مشرقی حصے میں مشرقی بنگال اور سلہٹ کا ضلع۔ ریاست جموں و کشمیر کے الحاق کے متعلق ابھی تک فیصلہ کن صورت پیدا نہیں ہوئی۔ کاٹھیاواڑ کی چند ریاستوں، یعنی جوناگڑھ، مانا ودر اور مانگرول نے پاکستان سے الحاق کر لیا تھا، لیکن اسے عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا، چنانچہ یہ ابھی تک ہندوستان کے قبضے میں ہیں۔

۱۔ طبعی حالات

(الف) محل وقوع، حدود اربعہ اور رقبہ

پاکستان دو حصوں پر مشتمل ہے: مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان۔ ان دونوں کے درمیان بھارت کا علاقہ حائل ہے اور ان کا باہمی فاصلہ تقریباً ایک ہزار میل ہے۔ مشرقی پاکستان ۲۰ درجے، ۳۰ دقیقے و ۲۶ درجے، ۴۰ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۸۸ درجے و ۹۲ درجے، ۵۰ دقیقے طول بلد شرقی کے درمیان واقع ہے اور مغربی پاکستان ۲۳ درجے، ۳۰ دقیقے و ۳۶ درجے، ۴۰ دقیقے عرض بلد شمالی اور ٦۱ درجے و ۷۵ درجے، ۳۰ دقیقے طول بلد شرقی کے درمیان۔

مشرقی پاکستان کے شمال، مشرق اور مغرب میں بھارت ہے اور جنوب میں خلیج بنگال، جنوب مشرق میں اس کی سرحد کا کچھ حصہ برما سے بھی ملتا ہے۔ مغربی پاکستان کے مشرق اور جنوب مشرق میں بھارت ہے، شمال اور شمال مغرب میں افغانستان، مغرب میں ایران اور جنوب میں بحیرۂ عرب ہے؛ گلگت ایجنسی میں اس کی سرحد چین سے ملتی ہے؛ روس اور پاکستان کی سرحدوں کے درمیان افغانستان کے علاقۂ دخان کی تنگ سی پٹی واقع ہے۔ گویا پاکستان اپنے محل وقوع کے لحاظ سے نہ صرف ایشیا کی تین بڑی طاقتوں — روس، چین اور بھارت — کا ہمسایہ ہے، بلکہ اس اعتبار سے بھی ایک منفرد ملک ہے کہ اس کا شمار بیک وقت مشرق اوسط اور مشرق بعید میں کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کا مجموعی رقبہ ۳٦۵،۵۲۹ مربع میل ہے (مشرقی پاکستان: ۵۵،۱۲٦ مربع میل اور مغربی پاکستان: ۳۱۰،۴۰۳ مربع میل)۔

(ب) سطح زمین

مشرقی پاکستان کا نوے فی صد حصہ ایک وسیع، ہموار اور کم بلند میدان پر مشتمل ہے، جسے اصطلاحاً گنگا کی زیریں وادی کہا جاتا ہے۔ اس کی تشکیل دریاے گنگا (= پدما)، برہم پتر (= جمنا)، میگھنا اور ان کے بیسیوں معاونین کی لائی ہوئی سیلابی مٹی سے ہوئی ہے۔ کئی ایک مقامات کی سطح سمندر سے بلندی صرف تیس فٹ ہے۔ میدان کی ڈھلان پانچ انچ فی میل سے بھی کم ہے اور اس پر دریاؤں اور ندی نالوں کا جال سا بچھا ہوا ہے۔ ان کی بدولت میدان کئی دوآبوں میں تقسیم ہو گیا ہے، جو زرخیزی کے اعتبار سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ پدما، جمنا اور میگھنا یہاں دنیا کا سب سے بڑا ڈیلٹا بناتے ہیں، جس کا علاقہ موسم برسات میں اکثر زیرآب رہتا ہے۔ کثرت باراں سے متعدد علاقے دلدلی

بن گئے ہیں ۔ ڈیلٹا کے زیریں حصے میں سندربن کے مشہور عالم جنگلات ہیں ۔ علم طبقات الارض کی رو سے اس میدان کو جدیدترین، یعنی بلائی‌ستوسین Pleistocene طبقہ قرار دے سکتے ہیں.

مشرقی پاکستان میں میدانی یکسانی ہے، مگر جنوب مشرق میں چاٹگام کی پہاڑیاں بھی ہیں، جو آسام کے پہاڑوں اور اراکان برما کی شاخیں ہیں اور ساحل کے قریب ایک دوسرے کے متوازی پھیلتی چلی گئی ہیں ۔ یہ پہاڑیاں زیادہ بلند نہیں اور اپنی چوٹی پر عموماً ۲،۰۰۰ فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں ہوتیں ۔ بلندترین چوٹی کوکراڈونگ ۴،۰۳۴ فٹ اونچی ہے ۔ ان کی ڈھلانوں پر خوب بارش ہوتی ہے، اس لیے یہ جنگلات سے ڈھکی رہتی ہیں ۔ اس علاقے کا سب سے مشہور دریا کرنافلی ہے، جو ان پہاڑیوں کے درمیان بہتا ہے ۔ مجموعی حیثیت سے مشرقی پاکستان کی زمینی سطح کا شمار مرطوب منطقے میں ہوتا ہے .

علم طبقات الارض کی رو سے مشرقی اور مغربی پاکستان کا بڑا حصہ ”جزیرہ نما“ سے باہر (Extra-Peninsula) ہے، جس میں ہمالیہ کا مشرقی اور مغربی پھیلاؤ، نیز سندھ اور گنگا کا وسیع میدان شامل ہے، جو کوہ ہمالیہ اور سطح مرتفع دکن کے درمیان واقع ہے؛ البتہ پنجاب کے دریا برآمد (alluvial) میدان کا بڑا حصہ جزیرہ نمائی خطّے (Peninsular Block) کا جز سمجھا جاتا ہے .

مغربی پاکستان کا یہ منطقہ کوہ ہمالیہ کے شمال مغربی علاقے پر مشتمل، ایک قوس کی شکل میں پھیلا ہوا ہے ۔ کیمبری (Cambrian) زمانے سے ابتدائی عہد ثالث (Early Tertiary Times) تک یہ علاقہ ایک بہت بڑے سمندر ٹیتھس Tethys کا حصہ تھا ۔ یہ سمندر جنوبی تبت سے موجودہ افغانستان، بلوچستان اور ایران سے ہوتا ہوا جزیرہ نمائے عمان تک پھیلا ہوا تھا ۔ اس کا جنوبی ساحل اس علاقے سے گزرتا تھا جہاں اب کوہستان نمک ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں آج بھی سمندری حجائر پائی جاتی ہیں ۔ بحر ٹیتھس کے شمال میں انگارا لینڈ اور جنوب میں گونڈوانا لینڈ کے دو براعظم تھے ۔ آہستہ آہستہ اس میں سمندری تلچھٹ کی موٹی موٹی تہیں جمع ہوتی گئیں ۔ آخری عہد ثالث میں یہاں ایک ارضی ہلچل پیدا ہونا شروع ہوئی، جسے ”حرکت تکوین جبال ہمالیہ“ (Himalayan Orogeny) کہتے ہیں اور وسیع سمندری علاقے ٹوٹ پھوٹ کر شمال اور مغرب میں سربفلک پہاڑ بن گئے ۔ یوں ہمالیہ کا سلسلۂ کوہ وجود میں آیا ۔ اس سلسلے کا بیشتر حصہ شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے، لیکن مغربی حصے کا رخ شمالاً جنوباً ہو گیا ہے ۔ یہ شمالاً جنوباً قوس تین وحدتوں، یعنی ہزارہ، سلیمان اور کیرتھر کے سلسلہ‌ہائے کوہ پر مشتمل ہے ۔ رُخ کی اس تبدیلی کا باعث وہ فانے (wedges) ہیں جو دریائی مٹی سے تشکیل شدہ (alluvial) میدان کے نیچے چھپے ہوئے ہیں ۔ اسی ارضی ہلچل کے دوران میں گونڈوانالینڈ شمال مشرق میں انگارالینڈ کی طرف کھسکنے لگا، جس سے ٹیتھس کے درمیان سمندری تلچھٹ میں بڑی بڑی شکنیں پیدا ہو گئیں، جنہوں نے بڑے بڑے پہاڑوں کی شکل اختیار کر لی ۔ شمالی علاقے میں کالا چٹا پہاڑ، کوہستان نمک اور کوہاٹ و بنوں کی پہاڑیاں ”ہمالیائی نظام تکوین جبال“ سب سے آگے کی شکنیں (advance folds) سمجھی جاتی ہیں اور جنوبی علاقے میں سلسلۂ زندہ پیر اور روھڑی کے جنوب میں خیرپور، نیز سندھ اور بلوچستان کے سرحدی علاقے کی پہاڑیاں کوہ سلیمان کی ۔ اس شکن‌دار پہاڑی منطقے اور دکن کی سطح مرتفع کے درمیان تلچھٹ سے بنی ہوئی چٹانوں کے دب جانے سے قشرۃ الارض میں ایک بہت بڑا گڑھا پیدا ہو گیا،

جو بعدازاں پہاڑی دریاؤں سے لائے ہوئے مادّے سے رفتہ رفتہ پر ہو کر ایک وسیع میدان کی شکل میں تبدیل ہوتا گیا۔ یہی گنگا اور سندھ کا میدان ہے۔ اس کے مغربی حصے، یعنی دریاے سندھ کے میدان، کی تشکیل میں ہواؤں سے لائی ہوئی مٹی اور ریت کا بھی بہت کچھ دخل ہے۔ عموماً اس میدان کی ساخت میں ریت کے مہین ذرّے اور مٹی شامل ہے، لیکن پہاڑوں کے قرب و جوار میں کنکر، پتھر ملتے ہیں۔ اس میدان کے مادّوں کی گہرائی کا اندازہ اب تک نہیں لگایا جا سکا.

اس ارضیاتی تجزیے کی روشنی میں مغربی پاکستان کو سطح کے اعتبار سے تین خطّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) پہاڑی علاقہ: یہ مغربی پاکستان کے شمال اور مغرب میں پھیلا ہوا ہے: (الف) شمالی پہاڑ کوہستان ہمالیہ کی مغربی شاخیں ہیں، جن کی کئی کئی قطاریں برابر برابر فصیل کی طرح کھڑی ہیں۔ ان میں اصل ہمالیہ کے علاوہ چترال اور مری کی پہاڑیاں اور وادی کاغان اور قبائلی علاقے کے پہاڑ شامل ہیں۔ اصل ہمالیہ کی اوسط بلندی بیس ہزار فٹ ہے اور اس کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ گلگت میں نانگا پربت کی چوٹی ۲۶،۱۸۳ فٹ اور قراقرم میں کے ٹو (K2) ۲۸،۲۵۰ فٹ بلند ہے۔ شمال مغربی سرحد پر کوہ ہندو کش پھیلا ہوا ہے، جس کی بلندترین چوٹی تیرچ میر (۲۵،۳۵۳ فٹ) ہے۔ برفانی پہاڑوں سے نکلنے والے دریا سارا سال خشک نہیں ہوتے۔ زیادہ بلند مقامات پر گلیشیر موجود ہیں۔ سارا علاقہ ناہموار ہے۔ درّے بہت کم ہیں اور بہت بلندی پر واقع ہیں، جن کے ذریعے صرف موسم گرما ہی میں برف پگھل جانے پر آمد و رفت ہو سکتی ہے، مثلاً بابوسر، زوجیلا، لواری، قراقرم وغیرہ؛ (ب) مغربی پہاڑی سلسلہ وادی سندھ کے مغرب کی طرف بحیرۂ عرب تک شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے۔ اس میں کوہ سفید، کوہ سلیمان اور کوہ کیرتھر شامل ہیں: جو ہمالیہ کے مقابلے میں بہت کم بلند اور بارش کی کمی کے باعث بنجر اور خشک ہیں۔ کوہ سلیمان کی سب سے اونچی چوٹی تخت سلیمان تقریباً گیارہ ہزار فٹ بلند ہے۔ ان پہاڑوں میں متعدد درّے زمانۂ قدیم سے آمدورفت کا ذریعہ بنے رہے ہیں، مثلاً خیبر، کرم، گومل، ٹوچی، بولان.

(۲) میدانی علاقہ: مغربی پاکستان کا نصف مشرقی حصہ قریب قریب میدانی ہے۔ اسے میدان سندھ کہتے ہیں کیونکہ اس میں دریاے سندھ اور اس کے معاونین — ستلج، راوی، چناب اور جہلم — بہتے ہیں (سندھ کے مغربی معاونین میں دریاے کابل مشہور ہے)۔ دریاے سندھ کا طاس ایک وسیع میدان ہے، جو کشمیر سے بحیرۂ عرب تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں: (الف) سندھ کا بالائی میدان: اس میں پنجاب اور بہاول پور کے علاقے شامل ہیں اور یہاں کی زمین کا بڑا حصہ بےحد زرخیز ہے۔ دریاؤں کے درمیان دوآبوں (یعنی باری دوآب، رچنا دوآب، چج دوآب اور سندھ ساگر دوآب) میں نہروں کا جال بچھا ہے۔ بہاول پور کے قریب یہ میدان خشک اور ریگستان کی صورت اختیار کر گیا ہے، جسے چولستان کہتے ہیں۔ دریاے جہلم کے مغرب میں سندھ ساگر دوآب کا خاصا حصہ خشک اور ریگستانی ہے اور تھل کہلاتا ہے؛ (ب) سندھ کا زیریں میدان: اس حصے میں دریاے سندھ مٹھن کوٹ کے قریب اپنے معاونوں کا پانی لے کر بہتا ہے. اور بہت زیادہ چوڑا ہو گیا ہے۔ زمین کی ڈھلان کم ہونے کی وجہ سے رفتار بھی سست ہو گئی ہے اور یہ بڑی مقدار میں ریت مٹی وغیرہ بچھاتا چلا جاتا ہے، چنانچہ اس کی گزرگاہ بعض علاقوں میں دونوں طرف کی زمین سے اونچی ہو گئی ہے، جیسے

سیلاب سے بچانے کے لیے اس کے کناروں پر متعدد بند باندھے گئے ہیں۔ بارش کی کمی کی وجہ سے سندھ کی زیریں وادی ریگستان بن گئی ہے، جسے زیر کاشت لانے کے لیے سکھر، کوٹری، گدو اور تونسہ سے کئی نہریں نکالی گئی ہیں۔ حیدرآباد کے پاس سندھ کا ڈیلٹا شروع ہو جاتا ہے۔

(۳) سطح مرتفع کا علاقہ : اس کے بھی دو حصے ہیں : (الف) پوٹھوہار: میدان کے شمال میں، دریاے جہلم کے کنارے، تقریباً دو ہزار فٹ اونچا کوہستان نمک کا چھوٹا سا پہاڑی سلسلہ مغرب کی طرف چلا گیا ہے، جس میں جگہ جگہ نمک کی چٹانیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے شمال میں پوٹھوہار کی سطح مرتفع ہے، جس میں راولپنڈی، کیمبل پور اور جہلم کے علاقے شامل ہیں۔ اس کی بلندی ایک سے دو ہزار فٹ تک ہے۔ زمین ناہموار ہے اور کٹاؤ کے باعث ہر طرف کھڈ، گڑھے اور ٹیلے نظر آتے ہیں۔ گلیشی دور کے برف کے ذریعے لائے ہوے پتھر بھی جگہ جگہ پڑے ہیں۔ یہ سارا علاقہ بارانی ہے۔ اس میں مٹی کا تیل، کوئلہ اور دوسری معدنیات پائی جاتی ہیں؛ (ب) بلوچستان : کوہ سلیمان اور کوہ کیرتھر کے مغرب میں بلوچستان کی وسیع سطح مرتفع ہے، جو ایک سے تین ہزار فٹ تک بلند ہے۔ آب و ہوا نہایت خشک ہونے کے باعث اس کا بہت سا حصہ بنجر اور ریگستانی ہے۔ خشک پہاڑیاں شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف پھیلی ہوئی ہیں، جن کو چاروں طرف سے پانچ سے سات ہزار فٹ تک اونچے پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ وسط میں نمکین پانی کی جھیل ہے، جس میں تمام ندی نالے آ کر گرتے ہیں۔ شمال مشرقی حصے میں کرومیم اور دیگر معدنیات ملتی ہیں۔ ایران کی سرحد کے قریب کوہ سلطان اور کوہ تفتان آتش فشاں پہاڑ ہیں۔

(ج) آب و ہوا

مشرقی پاکستان کے جنوب مشرقی حصے سے قطع نظر، جو منطقۂ حارّہ میں واقع ہے، پاکستان کا پورا علاقہ منطقۂ معتدلہ میں آتا ہے، لیکن ایک ہی منطقے میں اور خط استوا سے تقریباً یکساں فاصلے پر واقع ہونے کے باوجود اس کے دونوں حصوں کی آب و ہوا میں بڑا اختلاف ہے۔ مغربی پاکستان کا بیشتر علاقہ سمندر سے کافی فاصلے پر ہے اور اس کے شمال اور مغرب میں بہت اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی آب و ہوا مجموعی طور پر شدید خشک، یعنی برّی قسم کی ہے۔ اس کے مقابلے میں مشرقی پاکستان کی آب و ہوا بارش کی کثرت، سمندر سے قرب اور اردگرد بلند پہاڑ نہ ہونے کے باعث مرطوب اور معتدل ہے۔ وہاں نہ زیادہ گرمی ہوتی ہے، نہ سردی؛ چنانچہ کم از کم درجۂ حرارت جنوری میں ۴۹ سے ٦۰° ف اور جولائی میں ۷۹ سے ۸۰° ف رہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت جنوری میں ۷۰ سے ۸۷° ف اور جولائی میں ۸٦ سے ۸۹° ف۔ زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت وہاں ۱۰۰° ف ریکارڈ کیا گیا ہے۔ سالانہ اوسط درجۂ حرارت ۷۰ سے ۸۰° ف ہے۔

مشرقی پاکستان کی بہ نسبت مغربی پاکستان کے طبعی حالات میں اس قدر تنوع ہے کہ اس کے ہر خطے کی آب و ہوا دوسرے سے مختلف ہے۔ میدانوں میں کم از کم درجۂ حرارت جنوری میں ۳۰ سے ۷۰° ف اور جولائی میں ۷۹ سے ۸۷° ف رہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت جنوری میں ٦۳ سے ۸۷° ف اور جون میں ۹۰ سے ۱۱۳° ف۔ جیکب آباد میں درجۂ حرارت ۱۲٦° ف تک پہنچ جاتا ہے اور وہ دنیا کا سب سے زیادہ گرم مقام ہے۔ مغربی پاکستان کے بیشتر علاقے میں موسم گرما کا زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت ۱۱۰ سے ۱۱۲° ف اور

موسم سرما کا کم سے کم درجۂ حرارت ۳۰ سے ۵۰° ف رہتا ہے، بلکہ بعض اوقات اس سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔ شمالی پہاڑوں اور بلوچستان کے بعض حصوں میں کم از کم درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی خاصا کم ہوتا ہے۔

مشرقی پاکستان میں بارش کی سالانہ اوسط مغربی حصے میں ۵۰" سے جنوب مشرق میں ۱۰۰" تک ہے اور شمال مشرقی سلہٹ کے کوہ دامنی علاقے میں تقریباً ۲۰۰"۔ کم سے کم بارش لال پور (راجشاہی) میں ۴ء۰۹" اور زیادہ سے زیادہ بارش للہ کھیل (سلہٹ) میں ۲۲۰ء۸" ریکارڈ ہوئی ہے۔ دو تہائی بارش جون سے ستمبر تک، یعنی مون سون کے موسم میں، ہوتی ہے، لیکن بعض اوقات استوائی طوفان باد بھی اس کا موجب بنتے ہیں۔ خلیج بنگال میں اٹھنے والے طوفانوں سے برسات کا موسم کبھی کبھی اکتوبر بلکہ نومبر تک بھی جاری رہتا ہے۔ دسمبر اور جنوری خشک مہینے ہیں اور ان میں کہیں بھی انچ، ڈیڑھ انچ سے زیادہ بارش نہیں ہوتی۔ مون سون شروع ہونے سے قبل اپریل اور مئی میں شمال مغربی طوفانی ہواؤں کے باعث برسات کا ایک اور مختصر موسم آتا ہے اور اس میں ۲ سے ۱۵" تک بارش ہو جاتی ہے۔ اس زمانے میں گاہے بگاہے باد و باراں کے زبردست طوفان بھی آتے ہیں، جو بعض اوقات بے حد نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔

مغربی پاکستان میں بالعموم بارش کی کمی رہتی ہے۔ میدانوں میں بارش کی سالانہ اوسط سندھ کے زیریں میدان میں ۵" سے ہمالیہ کی ترائی کے علاقوں میں ۴۰" تک ہے۔ بارش زیادہ‌تر مون سون ہواؤں کی مرہون منت ہے، جو وسط گرما میں یہاں پہنچنے لگتی ہیں۔ بعض اوقات موسم گرما کے آغاز میں جو آندھیاں چلتی ہیں ان کے بعد بھی ہلکی سی بارش ہو جاتی ہے۔ بلوچستان خشک ترین علاقہ ہے، جہاں بارش کا سالانہ اوسط ۸" ہے اور صحرائے خاران میں صرف ۲" رہ جاتا ہے۔ ہمالیہ کی جنوبی شاخوں پر بارش ۵۰" تک، لیکن گلگت اور بلتستان جیسے پہاڑوں میں گھرے ہوئے علاقوں میں بمشکل ۴" تک ہوتی ہے۔

بحیرۂ روم اور خلیج فارس سے اٹھنے والے طوفان اور گردباد بھی بارش لاتے ہیں۔ ان کے باعث موسم سرما میں مغربی پہاڑوں اور شمالی بلوچستان اور علاقۂ سرحد میں ۱۰ سے ۳۰" تک سالانہ بارش ہو جاتی ہے۔

بارش کی اس قدرتی تقسیم کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مشرقی پاکستان میں سارا سال ہوا میں بہت زیادہ نمی رہتی ہے، جو موسم گرما میں اکثر ۸۰ فی صد سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ ادھر مغربی پاکستان میں بارش کی کمی اور درجۂ حرارت میں زیادہ تفاوت کے باعث ہوا میں رطوبت کم ہوتی ہے؛ صرف ساحلی علاقے میں زیادہ نمی پائی جاتی ہے۔

(د) جنگلات

پاکستان میں جنگلات کا رقبہ ایک کروڑ ایکڑ سے زائد ہے، جو ملک کے کل رقبے کا تقریباً ۳ء۵ فی صد ہے۔

مشرقی پاکستان اپنی معتدل آب و ہوا، کثرت باراں اور زرخیز زمین کی بدولت بے انتہا سرسبز ہے اور اس کا ۱۶ فی صد علاقہ جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس اعتبار سے تین علاقے بہت اہم ہیں: (۱) چاٹگام اور چاٹگام کا پہاڑی علاقہ: یہاں استوائی جنگلات ملتے ہیں، جن میں سو سو فٹ سے اونچے درختوں سے لے کر جھاڑیوں تک ہر قسم کی نباتی انواع ملتی ہیں۔ درختوں پر چڑھنے والی بیلوں کی متعدد قسمیں بھی پائی جاتی ہیں، جو بڑی تیزی

سے بڑھتی ہیں۔ اس سلسلے میں بطور مثال بید کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان جنگلوں میں عام طور پر ساگوان اور گرجن کے درخت ہیں۔ علاوہ ازیں کئی قسم کا بانس بھی ہوتا ہے؛ (۲) سندربن، جس کا شمار ڈیلٹائی جنگلات میں ہوتا ہے۔ سندری یہاں کا اہم‌ترین درخت ہے۔ اس کے بعد گیوہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ دلدلی علاقوں میں گرنا پھیلا ہوا ہے۔ علاوہ بریں ناریل بھی عام ہے؛ (۳) بھادھوپور کا جنگل، جو دریاے میگھنا اور جمنا کے درمیان واقع ہے، یہاں کا مشہور درخت سال ہے۔

مشرقی پاکستان میں ناریل، بانس، ساگوان، مہاگنی، سنبل، کیلا، چمپا اور کنیر کی کئی اقسام ملتی ہیں۔ چراگاہیں بہت کم ہیں اور شمال میں کومیلا سے جنوب میں سلہٹ اور میمن سنگھ تک کے علاقوں میں ملتی ہیں۔ دریاؤں کے کنارے گھاس کے میدان نظر آتے ہیں۔

مغربی پاکستان کا ایک بہت بڑا علاقہ بالکل خشک اور بنجر ہے۔ صرف ۲.۵ فی صد رقبے پر جنگل ہیں۔ زیادہ‌تر جنگلات شمالی اور مغربی پہاڑی علاقوں میں ملتے ہیں۔ میدانی جنگلوں میں چھانگا مانگا اور چیچا وطنی (ضلع ساہی‌وال) اور وان بھیراں (علاقۂ تھل) کے جنگلات قابل ذکر ہیں۔ اکثر دریاؤں کے کنارے بیلے کے جنگل ہیں۔ ان کے علاوہ نہری باغات کو بھی اس ضمن میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ میدانی علاقے میں عام طور پر شیشم، شہتوت، ببول، اور جنڈ کے درخت ملتے ہیں۔ سندھ اور پنجاب کے علاقے میں آم، کیلا، امرود اور سنگترے، مالٹے وغیرہ کے اور شمال مشرقی بلوچستان اور سرحدی علاقے میں بادام، سیب، خوبانی، انگور وغیرہ کے باغات ہیں۔

پہاڑی علاقوں میں مختلف النوع نباتات ملتی ہیں اور ان کی نوعیت علاقے کی بلندی کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہے، مثلاً تین ہزار فٹ سے کم بلندی پر پھلاہ، کاؤ، چنار اور جنگلی زیتون کے درخت ہیں؛ تین ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر چیڑ اور دیودار جیسے سدا بہار درختوں کے جنگلات ہیں، سات ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر عموماً صنوبر ملتا ہے اور دس گیارہ ہزار فٹ پر صرف برچ کے درخت رہ جاتے ہیں۔ ان جنگلات میں متعدد قسم کی جڑی بوٹیاں اور پھول بھی ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں سوات کی پہاڑیاں بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

(ہ) حیوانات

پاکستان میں طرح طرح کے حیوانات پائے جاتے ہیں۔ دودھ پلانے والے جانوروں میں شیر (سندربن میں)، چیتا (سارے پاکستان، بالخصوص کشمیر، سندھ اور بلوچستان میں)، برفانی چیتا (ہمالیہ کی پہاڑیوں اور چترال کی بالائی وادی میں)، چیتا نما بلی (مشرقی پاکستان میں)، صحرائی بلی (مغربی پاکستان کے صحرائی علاقے میں)، بن بلاؤ (بالائی وادی سندھ، گلگت، لداخ اور چترال میں)، سیاہ گوش (سندھ اور پنجاب کے خشک علاقوں میں)، مشک بلاؤ (مغربی پاکستان میں)، ٹوڈی بلی (مشرقی پاکستان میں)، نیولے کی متعدد قسمیں (تقریباً ہر جگہ)، دھاری‌دار لگڑ بگڑ (پہاڑی اور ایسے خشک علاقے میں جہاں بھیڑیا نہیں ہوتا)، بھیڑیا (اکثر علاقوں میں)، لومڑی (تقریباً ہر جگہ)، سرخ لومڑی (کشمیر، لداخ، سندھ اور بلوچستان میں)، جنگلی کتے (کشمیر، وادی گنگا اور گلگت میں)، کالا ریچھ (کشمیر، بلوچستان اور جھاڑیوں، جنگلوں اور پہاڑی علاقے میں)، بھورا ریچھ (سرحدی علاقے، بالخصوص وزیرستان اور بلوچستان میں)، مختلف انواع کے بندر (ملک کے دونوں حصوں میں؛ چھوٹی دم والے بندر: مشرقی پاکستان اور چترال میں؛ سفید پیشانی اور چوٹی والے لنگور: چاٹگام کے پہاڑی علاقے میں؛

ساسی بندر: سندر بن میں)، اود بلاؤ (پہاڑی ندیوں اور دریاؤں میں) اور بجو (صحرائی علاقے میں دریاؤں کے کنارے) ملتے ہیں۔ سم‌دار جانوروں میں قابل ذکر یہ ہیں: جاوا کا گینڈا اور ایک سینگ والا چھوٹا گینڈا (سلہٹ اور چاٹگام کے پہاڑی علاقے میں)، ہاتھی (مشرقی پاکستان، خصوصاً کاکس بازار میں)، جنگلی بھینسا (مشرقی پاکستان میں برہم‌پتر کے آس پاس لمبی گھاس کے جنگلوں میں)، جنگلی گدھا (سندھ کے صحرائی علاقے میں)، جنگلی بھیڑ بکریوں کی کئی اقسام (ہڑیال: پنجاب کی بنجر یا جھاڑی‌دار پہاڑیوں، سندھ اور بلوچستان میں؛ بھرل: ہمالیہ کی اونچی پہاڑیوں میں؛ مارخور: بلوچستان، چترال اور سوات میں؛ غورال: سوات میں؛ جنگلی بکرا: سندھ میں)، ہرن کی مختلف قسمیں (کالا ہرن: سندھ، بہاولپور، پنجاب اور مشرقی پاکستان میں؛ چکارا: مغربی پاکستان کے صحرائی اور پہاڑی علاقے اور چاٹگام کی پہاڑیوں میں؛ نیل گائے: پنجاب اور مشرقی بنگال کے کھلے جنگل میں؛ بارہ سنگھا: کشمیر میں؛ دلدلی ہرن: سندر بن اور ڈیلٹا کے علاقے میں؛ چیتل: ہمالیہ کی ترائی کے جنگلات میں؛ مشک آہو: گلگت کے نواح میں؛ سانبھر: چاٹگام کے پہاڑی علاقے میں) اور جنگلی سور (ہر جگہ) کے علاوہ چمگادڑوں اور چوہوں کی کئی اقسام، جھاؤ چوہے، سیہ وغیرہ (ملک کے دونوں حصوں میں)۔ پالتو جانوروں میں بھیڑ، بکری، گائے، بھینس، گھوڑا اور اونٹ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دودھ دینے والے آبی حیوانات میں کراچی کے قریب ساحل سمندر اور دریائے گنگا کے دہانے پر ڈالفن مچھلی اور خلیج بنگال اور بحیرۂ عرب میں وھیل ملتی ہے۔

پاکستانی پرندوں میں سے حسب ذیل عام طور پر ملتے ہیں: تیتر، تلیر، بٹیر، چکور، بگلے، حواصل، بطخیں، مرغابیاں، بلبل، گلدم، مینا، کوئل، ھدھد، بئے، طوطے، کبوتر، فاختہ، مور، کوے، گھریلو چڑیاں اور مرغیاں، جنگلی مرغ، نیلکنٹھ، ابابیل وغیرہ اور شکاری پرندوں میں باز، عقاب، شکرے، چیل اور گدھ وغیرہ۔

رینگنے والے جانوروں میں گھڑیال، مگرمچھ، برّی اور بحری کچھوے، چھپکلیاں، سانڈے، گرگٹ، مختلف قسم کے زہریلے اور بے ضرر سانپ ملتے ہیں اور آبی جانوروں میں ہر طرح کی مچھلیاں، جن میں روہو، مہاشیر، ملّی، سنگھاڑا، سول، بلّہ، ٹراؤٹ، ھلسہ، میکریل، پومفرٹ، وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ سمندر میں شارک بھی ہوتی ہے۔ بغیر ریڑھ کی ھڈی کے جانوروں میں اسفنج، جیلی فش، مونگے، گھونگھے، سیپیاں، کیکڑے اور جھینگے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ پرداروں اور دیگر حشرات میں طرح طرح کی تتلیاں، بحری و برّی بھونڈیاں، مکھیاں، کھٹمل، بھڑیں، چیونٹیاں، لال بیگ، شہد کی مکھیاں، ریشم کے کیڑے، بچھو، ہزار پائے، کن کھجورے، وغیرہ ملک کے تقریباً ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔

(و) قدرتی وسائل

(۱) معدنی وسائل: مغربی پاکستان میں کوہستان نمک، سطح مرتفع پوٹھوہار، وزیرستان، بلوچستان اور شمالی پہاڑی علاقے اپنی معدنی پیداوار کے لیے مشہور ہیں۔ مشرقی پاکستان میں بھی بعض علاقوں، خصوصاً سلہٹ، میں معدنی ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ پاکستان میں ملنے والی معدنیات میں سے مندرجۂ ذیل قابل ذکر ہیں:

کوئلہ (مغربی پاکستان: کوہستان نمک میں ڈنڈوت، پڈھ اور مکڑوال، شمالی مشرقی بلوچستان میں ہرنائی، خوست، شارغ، سار پہاڑ، ڈگاری اور مچ اور وادی سندھ میں جھمپیر [ضلع ٹھٹھہ]؛ مشرقی پاکستان: سنام گنج [ضلع سلہٹ] اور سمب گنج [ضلع راجشاہی]۔ دلدلی کوئلہ فریدپور، سلہٹ اور

کومیلا میں ملتا ہے)؛

معدنی تیل (مغربی پاکستان: ضلع کیمبل پور میں کھوڑ، کوٹ سارنگ اور ڈھلیاں اور ضلع جہلم میں جویا میر، بلکسر، چکوال اور کرسال کے مقامات پر؛ مشرقی پاکستان: پتھاریا اور پاتیا کے علاقے)؛

قدرتی گیس (مغربی پاکستان: بلوچستان میں بمقام سوئی؛ مشرقی پاکستان: علاقۂ سلہٹ)؛

کرومائیٹ (مغربی پاکستان: ہندو باغ، چاغی، خاران اور وزیرستان)؛

نمک (مغربی پاکستان: کھیوڑہ [ضلع جہلم]، وڑچھا اور کالا باغ؛ کراچی کے قریب ماری پور میں، نیز مشرقی پاکستان میں سمندری پانی خشک کر کے نمک حاصل کیا جاتا ہے)؛

جپسم (مغربی پاکستان: ضلع لورالائی اور کوہستان نمک)؛

گندھک (مغربی پاکستان: بلوچستان میں کوہ سلطان)؛

چونے کا پتھر (مغربی پاکستان: مغربی پہاڑ؛ مشرقی پاکستان: بھولا گنج [ضلع سلہٹ])؛

لوہا (مغربی پاکستان: کالا باغ، چترال خاران اور چاغی میں کچے لوہے کے ذخیرے ہیں)؛

علاوہ ازیں مغربی پاکستان میں سنگ مرمر (مردان، سوات، چاغی اور کالا چٹا پہاڑ [ضلع کیمبل پور] میں)، سرمہ (چترال) اور خام جست (ہزارہ، چترال، لس بیلہ اور چاغی میں) بھی دستیاب ہوتا ہے۔

پاکستان میں صنعتوں کے لیے لوہے، کوئلے اور معدنی تیل جیسی خام اشیا ابھی تک درآمد کی جاتی ہیں۔ ملک میں وسیع علاقے ایسے پڑے ہیں جہاں معدنی ذخائر موجود ہیں، مگر ان کا کھوج نہیں لگایا گیا۔ اب کچھ عرصے سے اس سلسلے میں بڑی سرگرمی کا ثبوت دیا جا رہا ہے اور غیر ملکی ماہرین کی خدمات بھی حاصل کی گئی ہیں۔

(۲) طاقت کے وسائل: کوئلے اور معدنی تیل کی کمی کی صورت میں زراعت اور صنعت کو ترقی دینے کے لیے بن بجلی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ مغربی پاکستان میں کچھ ایسے مقامات موجود ہیں جہاں دریاؤں اور نہروں کی آبشاروں سے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ گزشتہ سالوں میں برقی قوت پیدا کرنے کے کئی منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے، مثلاً منصوبۂ بن بجلی مالاکنڈ و درگئی، منصوبۂ بن بجلی رسول، کثیر المقاصد منصوبۂ وارسک ڈیم، منصوبۂ منگلا ڈیم۔ پنجاب میں کئی نہروں پر آبشاریں بنا کر بھی بجلی پیدا کی گئی ہے، مثلاً شادیوال (گجرات)، نندی پور (گوجرانوالہ) اور چیچوکی ملیاں اور جوبانوالہ (شیخوپورہ)۔ مشرقی پاکستان کا اہم ترین منصوبہ کرنافلی کا ہے، جس کا بجلی گھر کپتائی کے مقام پر واقع ہے۔

(ز) باشندے، آبادی اور زبانیں

زمانۂ قبل از تاریخ ہی سے برصغیر پاکستان و ہند کی شمال مشرقی اور شمال مغربی سرحدیں پار کر کے مختلف قوموں اور نسلوں کے لوگ یہاں آ کر آباد ہوتے رہے ہیں۔ یہ تارکین وطن زیادہ تر وسطی اور مغربی ایشیا سے آئے۔ مقامی باشندوں کے ساتھ ان کے اختلاط کے باعث دراوڑی نسل وجود میں آئی۔ دراوڑوں کے بعد بھی غیر ملکی اقوام کی آمد کا سلسلہ جاری رہا، چنانچہ یہاں یکے بعد دیگرے، آریا، یونانی، ایرانی، عرب، ترک اور منگول پہنچے اور آباد ہوگئے۔ رفتہ رفتہ باہمی اختلاط و ازدواج سے ان کی نسلیں بھی مخلوط ہوتی گئیں۔ بہرحال آج پاکستان کے باشندوں کی بہت بڑی تعداد کا تعلق اس نسل سے ہے جسے ہندی آریا کہا جاتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے مشرقی اضلاع میں منگول

نسل کے لوگ بھی ملتے ہیں اسی طرح مغربی پاکستان کے علاقۂ قلات میں دراوڑی نسل کے افراد آج بھی موجود ہیں۔ بلوچوں اور پٹھانوں میں زیادہ‌تر ترکوں اور ایرانیوں، یعنی آریاؤں کی دو اہم شاخوں کے خون کی آمیزش ہے۔ جن باشندوں کے آبا و اجداد عرب سے آئے تھے وہ نسلی اعتبار سے سامی ہیں۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رو سے پاکستان کی کل آبادی ۹٬۳۷٬۲۰٬۶۱۳ تھی، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

	مرد	عورتیں	میزان
مشرقی پاکستان	۲٬۶۳٬۴۸٬۸۴۳	۲٬۴۴٬۹۱٬۳۹۲	۵٬۰۸٬۴۰٬۲۳۵
مغربی پاکستان	۲٬۲۹٬۵۹٬۸۰۲	۱٬۹۹٬۲۰٬۵۷۶	۴٬۲۸٬۸۰٬۳۷۸
پاکستان	۴٬۹۳٬۰۸٬۶۴۵	۴٬۴۴٬۱۱٬۹۶۸	۹٬۳۷٬۲۰٬۶۱۳

۱۹۶۱ء کے بعد بعض اداروں نے آبادی کا از سر نو جائزہ لیا ہے۔ مرکزی دفتر اعداد و شمار (Central Statistical Office) اور ادارۂ ترقیاتی معاشیات پاکستان (Pakistan Institute of Development Economics) کے مشترکہ جائزے کی رو سے ۱۹۶۲ء میں افزائش آبادی کی شرح دونوں صوبوں میں ۲٫۶ فی صد تھی۔ موجودہ شرح کا اندازہ ۲٫۷ فی صد ہے۔ کئی ماہرین کا خیال ہے کہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں آبادی کا اندراج بھی کچھ کم کیا گیا تھا۔ منصوبہ بندی کمیشن نے مختلف سالوں کے لیے آبادی کے حسب ذیل تخمینے پیش نظر رکھے ہیں:

۱۹۵۹ - ۱۹۶۰ء	۹٬۸۸٬۸۰٬۰۰۰
۱۹۶۰ - ۱۹۶۱ء	۱۰٬۱۳٬۰۵٬۰۰۰
۱۹۶۱ - ۱۹۶۲ء	۱۰٬۳۰٬۹۰٬۰۰۰
۱۹۶۲ - ۱۹۶۳ء	۱۰٬۶۷٬۹۰٬۰۰۰
۱۹۶۳ - ۱۹۶۴ء	۱۰٬۹۵٬۴۰٬۰۰۰
۱۹۶۴ - ۱۹۶۵ء	۱۱٬۲۴٬۱۰٬۰۰۰
۱۹۶۵ - ۱۹۶۶ء	۱۱٬۵۵٬۴۰٬۰۰۰
۱۹۶۶ - ۱۹۶۷ء	۱۲٬۱۷٬۶۰٬۰۰۰
۱۹۶۷ - ۱۹۶۸ء	۱۲٬۱۷٬۶۰٬۰۰۰
۱۹۶۸ - ۱۹۶۹ء	۱۲٬۲۵٬۰۰٬۰۰۰

اہل پاکستان کی غالب اکثریت اسلام کی پیرو ہے، لیکن یہاں دوسرے مذاہب کے لوگ بھی آباد ہیں۔ مذہبی اعتبار سے ہندو سب سے بڑی اقلیت ہیں اور زیادہ‌تر مشرقی پاکستان میں ہیں۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور اچھوتوں کی مجموعی تعداد نوے لاکھ کے قریب ہے۔ بدھ بھی زیادہ‌تر مشرقی پاکستان ہی میں ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً تین لاکھ ستر ہزار ہے۔ دونوں صوبوں میں عیسائیوں کی بھی خاصی تعداد ہے۔ پارسی صرف مغربی پاکستان میں آباد ہیں۔ ان کی تعداد زیادہ نہیں (صرف پانچ ہزار)، لیکن اقتصادی اعتبار سے وہ یہاں کی آبادی کا اہم عنصر ہیں۔ مذہبی اعتبار سے اہل پاکستان کی فی صد تعداد مندرجۂ ذیل گوشوارے سے واضح ہوگی:

مذہب	مشرقی پاکستان	مغربی پاکستان	پاکستان
مسلمان	۸۰٫۴۳	۹۷٫۱۷	۸۸٫۸۰
اعلیٰ ذات کے ہندو	۸٫۹۳	۰٫۳۸	۳٫۵۵
ہندو اچھوت	۹٫۸۲	۰٫۹۷	۵٫۳۰
عیسائی	۰٫۲۹	۱٫۳۶	۰٫۸۳
بدھ	۰٫۷۴	۰٫۰۱	۰٫۳۸
دیگر مذاہب	۰٫۰۹	۰٫۰۱	۰٫۰۵

پاکستان میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مشرقی پاکستان کی عام زبان بنگلہ ہے، البتہ بھارت سے آئے ہوئے مہاجرین (بہاری وغیرہ) اردو بولتے ہیں۔ مغربی پاکستان میں کئی علاقائی زبانیں ہیں،

مثلاً پنجابی (جس میں سرائیکی اور پوٹھوہاری بھی شامل ہیں۔ بعض کی رائے میں ہندکو بھی اسی میں شامل ہے)، سندھی، پشتو، بلوچی، اور براہوئی؛ لیکن اردو ایک طرح کی ''لنگوافرانکا'' (Lingua Franca) ہے، جو بڑے پیمانے پر لکھی اور پڑھی جاتی ہے اور رابطے کی زبان کے طور پر تقریباً ہر جگہ بولی جاتی ہے۔ اردو اور بنگلہ دونوں قومی زبانیں ہیں، مگر دفتری زبان ابھی تک انگریزی ہے۔ مختلف اہم زبانوں کا آبادی کے اعتبار سے فی صد تناسب حسب ذیل ہے (اعداد و شمار ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہیں):

زبان	مشرقی پاکستان	مغربی پاکستان	پاکستان (اوسط)
بنگلہ	۹۸٫۳۲	۰٫۱۲	۳۹٫۲۷
*پنجابی	۰٫۰۲	۶۶٫۳۹	۲۳٫۲۱
سندھی	۰٫۰۱	۱۲٫۵۹	۶٫۳۰
پشتو	۰٫۰۱	۸٫۳۷	۳٫۲۳
**اردو (مادری)	۰٫۶۱	۷٫۵۷	۳٫۰۹
بلوچی	—	۲٫۳۹	۱٫۲۳
براہوئی	—	۰٫۹۳	۰٫۳۶
انگریزی	۰٫۰۱	۰٫۰۳	۰٫۰۲
فارسی	—	۰٫۰۷	۰٫۰۳
عربی	—	۰٫۰۱	۰٫۰۱
***دیگر زبانیں	۰٫۹۲	۱٫۳۲	۱٫۱۲

۲ - تاریخ

(الف) قبل از اسلام

پاکستان ایک علیحدہ مملکت کی حیثیت سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آیا، لیکن جن علاقوں پر یہ مشتمل ہے ان کی تاریخ بہت پرانی ہے اور یہ علاقے بعض قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ رہے ہیں۔

(۱) مغربی پاکستان :

قدیم تہذیبیں: اگرچہ مغربی پاکستان میں قدیم ایام ہی سے متعدد قوموں اور نسلوں کے قبیلے، تاجر اور حملہ آور مغربی دروں کے راستے آ آ کر آباد ہوتے رہے ہیں، تاہم ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ یہاں انسانی معاشرے کی بنیاد کب پڑی۔ راولپنڈی کے نواح میں پتھر کے بعض ایسے اوزار زمین سے نکلے ہیں جنھیں ماہرین دو سے چار لاکھ سال پیشتر کا بتاتے ہیں، لیکن ایک منظم تہذیب اور آبادی کے قدیم ترین آثار موہنجوڈارو (ضلع لاڑکانہ، سندھ) اور ہڑپا (ضلع ساہیوال، پنجاب) میں پائے گئے ہیں۔ اس تہذیب کو وادی سندھ کی تہذیب کا نام دیا گیا ہے اور اس کا زمانہ تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ وادی سندھ کی تہذیب سے تقریباً دو ہزار سال پیشتر کچھ دیہاتی آبادیوں کے نشانات بلوچستان کے پہاڑی علاقوں میں بھی ملے ہیں، لیکن برعظیم پاک و ہند میں منظم شہری تہذیب کا اولین گہوارہ سندھ کی وادی ہی ہے۔ وادی سندھ کے قدیم باشندے شہر آباد کرنے میں ماہر اور اعلٰی درجے کے معمار تھے۔ موہن جوڈارو کی سڑکیں وسیع اور کشادہ ہونے کے علاوہ بالکل سیدھی ہیں اور ان سے عمودی زاویے پر گلیاں نکلتی نظر آتی ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف پانی کے نکاس کا انتظام ہے۔ مکانات پکی اینٹوں کے بنے ہیں۔ ہر مکان میں صحن ہے اور پانی نکلنے کی پکی نالیاں بنی ہوئی ہیں۔ تعمیری اعتبار سے سب سے نمایاں چیز غسل کا بڑا تالاب ہے، جس میں اینٹ کو اینٹ

---

* ان اعداد و شمار میں ہندکو (بشمول تنولی)، سرائیکی اور پوٹھوہاری بھی شامل ہیں۔

** بین العلاقائی رابطے کے اعتبار سے اردو ملک کی زبانوں میں سب سے زیادہ سمجھی جاتی ہے۔

*** جو کشمیر، لداخ اور گلگت وغیرہ سے متعلق ہیں۔

پر ایسے مسالے سے جمایا گیا ہے کہ اب تک بالکل برابر، فرق نہیں آیا ہے۔ دشمن کے حملے اور موسمی طغیانی سے شہر کو محفوظ رکھنے کے عمدہ انتظامات ہیں۔ ہڑپا کی بناوٹ اور طرز تعمیر بھی یہی ہے۔ ان لوگوں کی سکونت، ضروریات اور آرائش کی بے شمار چیزیں برآمد ہوئی ہیں، جو موہن جو ڈارو، ہڑپا، لاہور اور کراچی کے عجائب گھروں میں رکھی ہوئی ہیں۔ ان سے ان کی اعلیٰ تہذیب اور ہنرمندی کا پتا چلتا ہے۔ ان کے زیورات سونے، چاندی، ہاتھی دانت، ہیرے، عقیق، لاجورد اور دوسرے قیمتی پتھروں کے ہوتے تھے۔ وہ نقاشی اور بت تراشی سے بخوبی واقف تھے، سوتی اور اونی کپڑے پہنتے تھے اور مٹی، چینی اور دھاتوں کے برتن استعمال کرتے تھے۔ بچوں کے کھلونوں میں ایک گاڑی نکلی ہے، جس کی شکل سندھ کی بیل گاڑیوں سے ملتی جلتی ہے۔ ان کی رسم تحریر کے نمونے بھی ملے ہیں، لیکن ہنوز پڑھے نہیں جا سکے، لہٰذا یہ بتانا ممکن نہیں کہ وہ کونسی زبان بولتے تھے۔ ان شہروں کی کھدائی میں مختلف قسم کی مہریں بڑی تعداد میں ملی ہیں، جو غالباً تجارتی اور دفتری کاموں میں استعمال ہوتی ہوں گی۔ اسی قسم کی مہریں عراق میں سمیری تہذیب کے آثار سے بھی نکلی ہیں، جس کی بنا پر قیاس کیا جاتا ہے کہ وادی سندھ اور وادی دجلہ و فرات میں اس قدیم عہد ماقبل تاریخ میں تجارتی تعلقات ہوں گے اور آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہوگا۔ مغربی پاکستان کے قریب قریب سارے علاقے میں (شمال مغربی سرحد کو چھوڑ کر) اس قسم کے چھوٹے بڑے شہر آباد تھے۔ سندھ اور بہاول پور میں ان کے آثار کئی جگہ ملے ہیں۔ قیاس ہے کہ اس زمانے کے لوگ دراوڑی نسل کے تھے۔ اس قیاس کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ بلوچستان میں بروہی قبیلے کے لوگ اب بھی ایک ایسی زبان (براہوئی، رنگ بانی) بولتے ہیں، جو دراوڑی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ تہذیب آریاؤں کے ہاتھوں تباہ ہو گئی اور یہاں کے جو باشندے قتل و غارت سے بچے وہ جنوب کی جانب بھاگ گئے۔

ہندوؤں کا زمانہ: ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ مختلف آریا قبیلوں نے یکے بعد دیگرے مغربی دروں سے داخل ہو کر مغربی پاکستان میں آباد ہونا شروع کیا۔ ان کی ابتدائی آبادیاں گاؤں یا چھوٹے قصبوں کے طرز پر تھیں اور بیشتر دریا کے کنارے تھیں۔ ان کی سب سے پہلی مذہبی کتاب رگ وید اس زمانے سے تعلق رکھتی ہے جب وہ پہلے پہل آ کر پنجاب میں آباد ہوئے تھے اور یہاں سے موجودہ اتر پردیش (بھارت) کے مغربی علاقے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ یہ لوگ ابھی تک فن تحریر سے ناآشنا تھے اور ان کا جتنا علم تھا وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا تھا۔ رگ وید میں دریائے کابل اور سوات سے لے کر گنگا اور جمنا تک سب دریاؤں کا ذکر آتا ہے، جس سے آریاؤں کے ابتدائی پھیلاؤ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں میں مردوں کو دفن کرنے اور جلانے دونوں کا دستور تھا۔ وہ عموماً سبزی، دودھ اور گوشت استعمال کرتے تھے۔ شکار، بیل گاڑیوں کی دوڑ، موسیقی اور رقص کا انہیں خاص طور سے شوق تھا۔ ان کی اجتماعی زندگی کی تنظیم بڑی سادہ تھی۔ وہ گاؤں میں رہتے تھے اور قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ رگ وید کے بعد کے زمانے میں ان کی سماجی اور سیاسی زندگی میں کافی اہم تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ ذات پات کی تفریق ابتدائی شکل میں ظاہر ہوئی۔ قبائلی ریاستوں کی جگہ بڑی بڑی سلطنتوں نے لے لی۔ پھر قصبات کے ساتھ ساتھ شہر بھی آباد ہونا شروع ہوئے۔ انہیں بڑے شہروں میں ٹیکسلا بھی تھا، جو تجارت کی ایک اہم منڈی

ہونے کے علاوہ علم کا بھی مشہور مرکز تھا۔

چھٹی صدی ق۔ م کے نصف آخر میں مغربی پاکستان کے بیشتر علاقے ایرانی سلطنت میں شامل کر لیے گئے۔ یہ علاقہ ایران کی وسیع سلطنت کا سب سے بڑا اور زرخیز صوبہ تھا۔ چوتھی صدی کے وسط کے قریب جب ایران کا تسلط کمزور ہو گیا تو یہ علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا۔ ۳۳۱ ق۔ م میں جب سکندر نے ایران فتح کیا تو ان علاقوں کی طوائف الملوکی نے اس کے فاتحانہ عزائم کو شہ دی۔ شمال میں گورداسپور اور جنوب میں سندھ تک کا علاقہ فتح کر کے سکندر مکران کے راستے واپس چلا گیا۔ چوتھی صدی ق۔ م کے ختم ہونے سے پہلے ہی مغربی پاکستان کے یونانی صوبے موریا سلطنت کا حصہ بن چکے تھے، لیکن یونانی حملے نے ان علاقوں کی تہذیب و تمدن پر گہرا اثر ڈالا۔ بیرونی دنیا سے مغربی پاکستان کا رابطہ ازسر نو شروع ہو گیا۔ یونانی خیالات کا اثر گندھارا سنگتراشی میں اور ٹیکسلا کی مورتیوں کے لباس، چہرے کے خطوط اور بالوں کی آرائش میں صاف نظر آتا ہے۔

موریا خاندان کا نامور فرمانروا اشوک اپنی ولی عہدی کے زمانے میں پنجاب کا وائسرائے رہا تھا۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے بدھ مت قبول کر لیا اور اس کی تبلیغ کی زبردست کوشش کی۔ پنجاب، شمال مغربی سرحد، کشمیر، سندھ، یہ سارے کے سارے علاقے بدھ مت سے متاثر ہوئے۔ ٹیکسلا بدھ مت کے مذہبی علوم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ اشوک کی اس عظیم الشان کوشش کے آثار اور اثرات بدھ مت کی خانقاہوں اور بدھ کی مورتیوں میں نظر آتے ہیں، جو ٹیکسلا، پشاور، تخت بائی (ضلع پشاور) وغیرہ میں بکثرت ملتی ہیں۔ یہ تمام آثار خاص اشوک کے زمانے ہی کے نہیں ہیں، لیکن ان کا منبع اشوک کا دور ہے۔

خاندان موریا کے زوال پر ملک ایک بار پھر طوائف الملوکی اور بعدازاں ایران کی جانب سے بیرونی حملوں کا شکار ہو گیا۔ ان حملوں کے ساتھ ایرانی اور یونانی تہذیبی اثرات ان علاقوں میں دوبارہ داخل ہوئے جنہیں اب مغربی پاکستان کہا جاتا ہے۔ پہلی صدی عیسوی کے اختتام کے قریب وسط ایشیا سے آئی ہوئی کشان قوم نے شمال مغرب سے حملہ کیا اور پنجاب اور سرحدی علاقوں میں اپنی سلطنت قائم کی، جس کا صدر مقام پشاور تھا۔

ٹیکسلا ان تمام بیرونی اثرات کی لہروں کو جو یکے بعد دیگرے آتی رہیں جذب کرتا رہا۔ دہلی کی طرح یہ شہر کئی بار آباد ہوا۔ کھدائی کرنے پر بعض جگہ ایک ہی مقام پر اوپر تلے پانچ چھ آبادیوں کے نشانات ملتے ہیں۔ یونانی ستون، یونانی چہروں اور رومی لباس والے بت، خروشتی طرز تحریر (جو دائیں سے بائیں طرف لکھی جاتی ہے) کے نمونے اور بدھ مت کی بے شمار باقیات ٹیکسلا کے آثار میں موجود ہیں۔

گپتا راجاؤں کا مغربی پاکستان کے علاقوں میں کچھ زیادہ عمل دخل نہ تھا۔ سیالکوٹ ان کے زیر اثر ضرور تھا، لیکن جب پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں ہنوں کے حملے شروع ہوئے تو مغربی صوبے بہت جلد ان کے زیر تسلط آ گئے۔ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ Hiuen Tsang ۶۴۱ء میں سندھ آیا تو یہاں جو راجا حکمران تھا وہ بدھ مت کا پیرو تھا اور ایک شودر خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ محمد بن قاسمؒ کے حملے کے وقت سندھ میں ایک برہمن خاندان حکمران تھا، لیکن وہاں اس وقت بھی بدھوں کی کافی آبادی تھی۔ محمود غزنویؒ کے حملوں کے زمانے میں پنجاب اور سرحدی علاقے ہندو شاہی خاندان کے زیرنگیں تھے اور ملتان فرقۂ باطنیہ کے

مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔

۲۔ مشرقی پاکستان:

مشرقی پاکستان کی قدیم تاریخ کے نقوش اتنے واضح نہیں جتنے مغربی پاکستان کے ہیں۔ وہاں کی قدیم آبادی بنگ قوم پر مشتمل تھی اور انہیں کے نام پر اس ملک کا نام بنگال پڑا۔ آریاؤں کی آمد سے پیشتر کے حالات اور تاریخ تو ماضی کے دھندلکے میں گم ہے۔ خود آریاؤں کے آنے کی کوئی واضح تاریخ متعین نہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ ایک ہزار سال ق۔م یا اس سے کچھ پیشتر یہ لوگ یہاں آنا شروع ہوئے۔ آریاؤں کی آبادی کے بھی کئی صدیوں بعد تک کی تاریخ کے ماخذ نہایت محدود اور غیر اطمینان بخش ہیں۔ شمالی حصے میں ''پنڈر'' آباد تھے، جو بہت جنگجو تھے۔ ان کے حالات مہستان (ضلع بوگرہ) کے کھنڈروں سے معلوم ہوئے ہیں۔ یہاں سے برآمد شدہ ایک کتبے سے پتا چلتا ہے کہ یہ علاقہ مگدھ کے موریا راجاؤں کے ماتحت تھا۔ گپتا سلطنت کے عروج کے زمانے میں بنگال بھی اس میں شامل ہوا۔ چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں اس سلطنت پر زوال آیا تو بنگال میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ آٹھویں صدی کے وسط میں گوپال نامی ایک سردار نے پال سلطنت کی بنیاد ڈالی، جو اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے پورے بنگال اور بہار پر حاوی ہو گئی۔ پال راجے بدھ مت کے پیرو تھے اور ان کے عہد میں اہل بنگال کی ایک بڑی تعداد اس مذہب کی پیرو ہوگئی۔ پال حکمرانوں نے بدھ مت کے کئی شاندار معبد بنوائے، جن کے آثار آج بھی باقی ہیں، مثلاً راجشاہی کے نزدیک پنڈرنگر میں (۸۰۰ء) اور کومیلا کی پہاڑیوں مینامتی اور لال مائی میں (گیارھویں بارھویں صدی)۔ تین سو سال کے بعد ان کی سلطنت ختم ہوئی تو سین خاندان برسر اقتدار آیا، جو کٹر ہندو تھا۔ بنگال کے لیے یہ زوال کا دور تھا۔ راجے نکمے، بزدل اور بےخبر تھے اور اپنی سلطنت کی بیرونی حفاظت سے بالکل لاپروا تھے۔ لوگوں میں کوئی قومی جذبہ تھا، نہ صحیح مذہبی احساس۔ بدھ مت رفتہ رفتہ کمزور ہوتا جا رہا تھا، لیکن زوال آمادہ بدھ مت کے اثرات دنیا سے بےتعلقی اور جنگ سے بیزاری کی شکل میں سارے بنگال میں سرایت کر چکے تھے۔ یہی سبب ہے کہ لکشمن سین کے عہد میں جنگجو اور دلیر ترکوں کی ایک نہایت مختصر جماعت نے ایک ہی دھاوے میں اتنی بڑی سلطنت کا تختہ الٹ دیا۔

(ب) عہد اسلامی

مسلمانوں کی آمد: عربوں کا مغربی سواحل ہند سے دیرینہ تعلق تھا (سلیمان ندوی: عربوں کا فن جہازرانی)، چنانچہ ظہور اسلام کے بعد بھی مسلمانوں کا برصغیر میں بسلسلۂ تجارت آنا جاری رہا (دیکھیے سلیمان ندوی: عرب و ہند کے تعلقات)، لیکن سیاسی طور سے مسلمانوں کا اس سرزمین سے تعلق محمد بن قاسم کے حملے (۹۳ھ/۷۱۲ء) سے شروع ہوتا ہے، جس نے دو ڈھائی سال کے قلیل عرصے میں سندھ اور ملتان کو فتح کر کے موجودہ مغربی پاکستان کے جنوبی اور وسطی علاقوں میں اسلامی اقتدار کی بنیاد ڈالی۔ محمد بن قاسم نے سندھ کے لوگوں سے رواداری اور شفقت کا سلوک کیا۔ انہیں مندر بنانے اور اپنی مذہبی رسوم ادا کرنے کی پوری آزادی دی۔ ان پر ہندو افسر مقرر کیے اور ہندوؤں کو اپنا مشیر اور وزیر بنایا۔ محمد بن قاسم کی واپسی کے بعد سندھ میں تقریباً دو سو سال تک عربوں کی حکومت قائم رہی۔ اس کے بعد اگرچہ سندھ کا خلافت بغداد سے تعلق منقطع ہو گیا، تاہم بعض عرب سردار اس کے کچھ علاقوں پر حکومت کرتے رہے۔

اسلامی فتوحات کا دوسرا بڑا ریلا غزنویوں کے

حملے کے ساتھ آیا۔ سبکتگین کے بعد اس کے نامور فرزند محمود غزنوی (رَكَ بآں) نے پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ان شمالی علاقوں پر جو اب پاکستان کہلاتے ہیں، متعدد حملے کیے اور موجودہ مغربی پاکستان کا بیشتر حصہ اس کے زیر نگیں آ گیا۔ ملتان میں اس وقت قرامطہ (رَكَ بآں) کا زور تھا۔ یہ ایک فرقہ تھا جو اکثر اسلامی اصولوں سے منحرف اور خلافت اسلامی کا دشمن تھا۔ محمود نے ملتان پر دو حملے کیے اور انھیں شکست دے کر تبدیلِ عقائد پر مجبور کیا۔

سلطنتِ دہلی کا قیام: چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں شہاب الدین (معزالدین بن سام) محمد غوری کی قیادت میں ترکوں اور افغانوں نے مغربی سرحدوں پر حملہ شروع کیا اور اس تیزی سے آگے بڑھے کہ تیرھویں صدی کے آغاز میں پشاور اور دیبل سے موجودہ مشرقی پاکستان کے علاقے تک ان کے جھنڈے لہرانے لگے۔

محمد غوری کی وفات (۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء) کے بعد اس کے سپہ سالار قطب الدین ایبک (رَكَ بآں) نے سلطنت دہلی اور خاندان غلاماں کی بنیاد رکھی، جو تقریبًا اسی سال تک (۶۰۲ھ / ۱۲۰۶ء تا ۶۸۶ھ / ۱۲۸۷ء) برسراقتدار رہا۔ التتمش (رَكَ بآں) کے زمانے میں مغربی پاکستان پر چنگیزی مغولوں کا حملہ ہوا، لیکن وہ جلال الدین منکبرتی (رَكَ بآں) کے تعاقب میں ملتان ہی سے واپس ہو گئے۔ التتمش نے پنجاب اور سندھ میں مرکزی اقتدار قائم کیا۔ مغولوں کے پیہم حملوں سے لاہور پر بری طرح تباہی آئی تھی۔ بلبن (رَكَ بآں) نے لاہور کی قلعہ بندی کی اور پنجاب اور سندھ کو مغولوں کی تباہ‌کاری سے نجات دلائی۔ اس نے ملتان میں اپنے ولی عہد کو وائسرائے مقرر کیا اور اپنے مغربی سرحدوں کی حفاظت کا ذمے دار بنایا۔

بنگال کی فتح: ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے شروع میں سلطان ایبک کے زمانے میں محمد بن بختیار خلجی کے ہاتھوں ہوئی۔ اس وقت سے خلجی بنگال پر قابض ہو گئے۔ التتمش نے بڑی کوشش سے وہاں نظم و ضبط قائم کیا، مگر اس کے بعد پھر حالات خراب ہو گئے اور صوبیداروں نے خودسری اختیار کر لی، تاآنکہ بلبن نے ازسرِ نو بنگال میں مرکزی اقتدار قائم کیا۔

خلجی اور تغلق: ۶۸۹ھ / ۱۲۹۰ء میں دہلی میں خلجیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ ان کے دور میں بنگال مرکزی اقتدار سے آزاد رہا اور وہاں کی خودمختار حکومت بلبن کے خاندان میں رہی (رَكَ بہ بنگالہ)۔ بلبن کے عہد میں مغربی پاکستان کے علاقوں میں مغول حملہ‌آوروں اور دہلی کی افواج میں زبردست معرکے ہوئے۔

عہد غلاماں کے بعد خلجیوں کا دور آیا۔ علاء الدین خلجی (۶۹۵ھ / ۱۲۹۶ء تا ۷۱۵ھ / ۱۳۱۶ء) بڑا مدبر سلطان تھا۔ اس نے ایک نیا اقتصادی نظام قائم کیا، جس کے تحت تمام ضروری اشیا کی قیمتیں سرکاری طور پر مقرر ہوئیں۔ اس نے ایک فوج دکن کی فتح کے لیے منظم کی اور اس کے سپہ سالار ملک کافور نے دکن اور جنوبی ہند پر فوج کشی کر کے وہاں کے تمام راجاؤں کو سلطنت دہلی کا مطیع اور باج گزار بنایا۔ علاء الدین نے ایک اور فوج صرف مغولوں کی مدافعت کے لیے تیار کی۔ اس نے پنجاب اور سندھ کی مغربی سرحدوں سے مغولوں کو بالکل نکال دیا اور ان علاقوں میں مکمل امن و امان اور نظم و ضبط قائم کیا۔ سندھ کی مقامی سیاست میں اس زمانے میں سومرہ نام کا ایک قبیلہ نمایاں تھا۔

خلجیوں کے بعد تغلق برسراقتدار آئے۔ اس خاندان کا بانی غیاث الدین تغلق (۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء

تا ۷۲۵ھ / ۱۳۲۴ - ۱۳۲۵ء) خلجی عہد میں دیبال پور (ضلع ساہیوال، پنجاب) کا صوبیدار تھا اور اس نے مغربی سرحدوں پر مغولوں کو بارہا شکست دی تھی۔ اب وہ تخت نشین ہوا۔ اس نے ملک بھر میں نظم و نسق اچھی طرح قائم کیا، بنگال پر چڑھائی کی اور مشرقی صوبوں کو از سرِ نو سلطنت میں شامل کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد بن تغلق (۷۲۵ھ/ ۱۳۲۴-۱۳۲۵ء تا ۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء) تخت نشین ہوا۔ وہ خود عالم فاضل تھا اور اہل علم و ہنر کی دل کھول کر قدردانی کرتا تھا۔ وہ ایک سخت گیر، مگر مستعد حکمران تھا، چنانچہ اس کے زمانے میں ملک کی آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ اس کی بلند خیالی اور عالی ہمتی میں کوئی شبہہ نہ تھا، مگر بدقسمتی سے وہ اپنے زمانے سے بہت آگے تھا اور لوگ اس کا ساتھ نہ دے سکے، اسی لیے اس کے کئی عظیم منصوبے ناکامی پر منتج ہوے (اس کے حالات کے لیے دیکھیے ضیا برنی کی تاریخ؛ ابن بطوطہ کا سفرنامہ عجائب الاسفار اور دوسری معاصر کتابیں)۔ بہرحال اس نے مغول لشکر کو پسپا کیا اور شمالی سرحدوں کے استحکام کی خاطر غزنہ تک یلغار کی۔ ممالک دکن پر قبضہ قائم رکھنے کے لیے اس نے دولت آباد میں دارالحکومت منتقل کیا، جس کی بدولت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مستقل طور پر دکن میں بس گئی۔ سرحدِ چین کی فتح کا مہلک منصوبہ، تانبے کے سکے کا اجرا اور پھر اس کی تنسیخ، شمالی علاقوں میں قحط، وغیرہ، ایسے واقعات تھے جن کے باعث اس کا آخری عہد بڑی ابتری میں گزرا۔ بنگال میں بغاوت ہوئی اور یہ خطہ دو سو سال کے لیے دہلی کے تسلط سے نکل گیا۔ پنجاب اور سندھ میں بھی محمد بن تغلق کے زمانے میں کئی بغاوتیں ہوئیں۔ ۱۳۵۱ء میں محمد بن تغلق نے ایک باغی کا تعاقب کرتے ہوے ٹھٹھہ (سندھ) کے قریب جان دی۔ اس کے جانشین فیروز شاہ (۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء تا ۷۹۰ھ/۱۳۸۸-۱۳۸۹ء) نے دو بار بنگال پر فوج کشی کی، لیکن وہاں کے خودمختار سلاطین سے تسلیم و اطاعت کے رسمی دعوے سے زیادہ کچھ حاصل نہ کر سکا اور بنگال بدستور دہلی کے تسلط سے آزاد رہا۔ سندھ میں بھی فیروز شاہ نے ایک طویل مہم سر کی۔ محمد بن تغلق کے اواخر عہد میں سندھ کی مقامی سیاست میں سمہ قبیلہ سومروں پر غالب آیا۔ سمہ قبیلے کے جاموں نے دہلی سے سرکشی کا رویہ اختیار کیا۔ فیروز شاہ کو اس مہم میں کامیابی ہوئی۔ وہ باغی جاموں کو اپنے ساتھ دہلی لے گیا اور ان کی جگہ اسی خاندان کے دیگر افراد کو مقرر کیا۔ فیروز شاہ کے زمانے میں مغربی سرحدوں پر مغولوں نے پھر چھیڑ چھاڑ شروع کی، لیکن کوئی بڑا حملہ نہ کر سکے۔ فیروز شاہ بڑا نیک دل بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے نظم و نسق میں بہت سی اصلاحات کیں۔ اس کے زمانے کے حالات شمس سراج عفیف (تاریخ فیروز شاہی) اور دوسرے مؤرخوں نے اپنی اپنی تاریخوں میں لکھے ہیں (نیز دیکھیے القلقشندی: صبح الاعشی)۔

سید اور افغان: فیروز شاہ کے بعد سلطنت دہلی پر زوال آ گیا۔ اس کے جانشین نااہل ثابت ہوے اور سندھ اور پنجاب پر ان کا اقتدار برائے نام رہ گیا۔ ۸۰۱ھ/۱۳۹۸ء میں تیمور کا حملہ ہوا اور وہ اُچ اور ملتان ہوتا ہوا دہلی تک جا پہنچا۔ کئی شہروں کی فاتحانہ تاراج کے بعد پنجاب سے ہوتا ہوا وہ ۱۳۹۹ء میں واپس چلا گیا۔ واپسی کے وقت اس نے لاہور، دیبال پور اور ملتان کی حکومت سید خضر خان کے سپرد کر دی۔ تیمور کے حملے سے پنجاب اور سندھ کے علاقے خاصے تباہ ہوے؛ اس کے جانے کے بعد خضر خان نے اس کے نائب السلطنت کی حیثیت سے پنجاب پر حکمرانی کی۔ ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء میں وہ دہلی پر قابض

ہو گیا اور خاندان سادات کی بنیاد ڈالی۔ سادات کا عہد حکومت زیادہ‌تر بغاوتوں سے نمٹنے میں گزرا۔ پنجاب میں سرکش عناصر نے سر اٹھایا اور وہ انھیں دبانے میں ناکام رہے۔ بہلول لودھی نے پنجاب میں اپنا اقتدار قائم کر لیا اور بالآخر ۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء میں وہ تخت دہلی پر بھی قابض ہو گیا۔

لودھی عہد میں مرکزی سلطنت کا اقتدار قدرے بحال ہو گیا، تاہم ان افغان سلاطین کا بیشتر وقت بغاوتیں فرو کرنے میں گزرا۔ ان میں سے سکندر لودھی بڑا باخبر، مدبر اور متقی بادشاہ تھا، مگر اس کا بیٹا ابراہیم لودھی اس کا اچھا جانشین ثابت نہ ہوا۔ اس کی بےجا سختی سے امرا بھڑک اٹھے، جنھوں نے خفیہ طور پر بابر [رک بآں] کو، جو شیبانی اُزبکوں کے ہاتھوں اپنی آبائی ریاست فرغانہ سے محروم ہو کر اس وقت کابل (افغانستان) پر قابض تھا، حملے کی دعوت دی اور پانی پت کے تاریخی معرکے (۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء) میں ہندوستان کا تخت و تاج مغلوں کے ہاتھ آ گیا۔

سلطنت بنگالہ: چودھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں دہلی کا نظم و ضبط بنگال سے اٹھ گیا تھا اور وہاں سلطان شمس‌الدین حاجی الیاس نے ایک صوبائی خودمختار سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان کے کئی بادشاہ بڑے بیدار مغز تھے اور ان کے عہد میں بنگال نے نمایاں ترقی کی۔ اس خاندان کا ایک حکمران سلطان غیاث‌الدین (۷۹۲ھ / ۱۳۸۹ء تا ۷۹۹ھ / ۱۳۹۶ء) بڑی شان و شوکت کا بادشاہ تھا اور شعر و سخن کا دلدادہ تھا۔ اس کے عہد میں چین کے بادشاہ کی طرف سے ایک سفارت آئی اور غیاث‌الدین نے بھی ایک جوابی سفارت بھیجی۔ روایت ہے کہ اس کی خواجہ حافظ شیرازی سے بھی خط و کتابت تھی۔ کچھ عرصے کے بعد الیاس کے خاندان سے تخت و تاج چھن گیا، لیکن پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں وہ پھر تخت و تاج کے مالک ہو گئے۔ پندرھویں صدی کے آخری ربع میں حبشی امرا نے بڑی گڑبڑ مچائی۔ بالآخر ۸۹۹ھ / ۱۴۹۳ء میں سید علاءالدین حسین شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ خاندان شیر شاہ سوری کے عروج تک بنگال میں حکمران رہا۔ سوریوں کے زوال کے بعد بھی بنگالہ کافی عرصے تک پٹھانوں کے ہاتھ میں رہا، لیکن ۹۸۴ھ / ۱۵۷۵-۱۵۷۶ء میں یہ پورے طور پر مغلوں کے تسلط میں آ گیا۔

بنگالہ میں یہ دو ڈھائی سو سال کا زمانہ آسودگی اور ترقی کا دور تھا۔ ملایا اور جنوبی افریقہ سے بھی تھوڑے بہت تجارتی تعلقات تھے اور بحری جہازوں کے ذریعے مال کی آمدورفت تھی۔ بنگالہ کے خودمختار سلاطین نے کئی عالیشان عمارتیں بنوائیں، جن میں ادینہ مسجد (پانڈوہ)، ساٹھ گنبد مسجد (بگرہاٹ)، چھوٹا سونا مسجد (گوڑ)، دخیل دروازہ (گوڑ)، بڑا سونا مسجد (گوڑ)، قدم رسول مسجد (گوڑ) اور فیروز مینار خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس زمانے میں بنگالی زبان کو بھی نمایاں ترقی ہوئی اور مہابھارت کا بنگلہ میں ترجمہ ہوا (مزید تفصیل کے لیے رک بہ بنگالہ؛ بنگلہ)۔

مغل بادشاہی کا آغاز: دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے بعد بابر کو اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اسے سب سے پہلے راجپوتوں سے نبردآزما ہونا پڑا۔ ادھر مشرقی صوبوں میں افغان جمع ہو رہے تھے اور تخت دہلی واپس لینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ بابر نے دونوں کو شکست دی، لیکن اس کے جانشین ہمایوں کی غفلت سے افغانوں کو پھر منظم ہونے کا موقع ملا اور شیر شاہ سوری کی قیادت میں وہ بہار اور بنگالہ پر قابض ہو گئے۔ شیر شاہ نے پانچ چھے سال (۹۴۶ھ / ۱۵۴۰ء تا ۹۵۲ھ / ۱۵۴۵ء) کے مختصر عرصے میں سارا شمالی

ہندوستان زیرنگیں کر لیا اور نظم و نسق کے ہر شعبے میں اہم اور مفید اصلاحات کیں۔ پنجاب پر قبضہ کر کے شہنشاہ نے امن و امان قائم کیا اور گکھڑوں کی گوشمالی کی۔ جہلم سے بارہ میل کے فاصلے پر اس نے قلعۂ رہتاس تعمیر کیا تاکہ سرحد کی حفاظت ہو اور گکھڑ قبیلے پر بھی نگرانی رکھی جاسکے۔ بنگال میں بغاوت کا فتنہ کھڑا ہوا تو شیرشاہ نے اسے محض کچلنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ ایسی انتظامی تبدیلیاں کیں کہ پھر وہاں بغاوت کرنا محال ہو گیا۔ اسی بادشاہ نے وہ شاہراہ اعظم (گرانڈ ٹرنک روڈ) تعمیر کرائی جو سنار گاؤں (مشرقی بنگال) کو جہلم (مغربی پنجاب) سے ملاتی تھی۔ پندرہ سال کی جلاوطنی کے بعد ہمایوں ہندوستان لوٹ کر آیا تو شیرشاہ کے نااہل جانشینوں سے عنان حکومت چھیننے میں اسے کوئی دقت پیش نہ آئی (۹۶۲ھ/۱۵۵۵ء)۔ دو سال بعد ہمایوں کا انتقال ہوا تو اکبر تیرہ سال کی عمر میں کلانور (ضلع گورداسپور) میں تخت نشین ہوا۔

اکبر کا پچاس سالہ دور حکومت (۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) پاکستان و ہند کی تاریخ کے ممتاز ترین ادوار میں ہے۔ افغانستان سے بنگال تک اور کشمیر سے اسیر گڑھ تک اکبر نے ایک مضبوط، منظم اور خوشحال سلطنت قائم کی (تفصیل کے لیے رک بہ اکبر)۔

مغربی پاکستان، مغلوں کے دور میں:

اکبر کے عہد میں شمال مغربی سرحد کافی عرصہ تک خطرے میں رہی۔ اکبر کا بھائی مرزا حکیم کابل کا خودمختار فرمانروا تھا۔ ہندوستان میں اکبر کے مخالفین کے اکسانے پر وہ پنجاب پر حملہ کر کے دہلی کے تخت پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ ماوراء النہر میں ازبک زور پکڑتے جا رہے تھے اور ان کا سردار عبداللہ خاں ہندوستان پر حملہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ایران میں صفویوں کی طاقت شباب پر تھی اور ان سے بھی خطرہ لگا رہتا تھا۔ سرحد کے جنگجو قبائل بھی ہر وقت شرارت اور بغاوت کے لیے تیار رہتے تھے۔ اکبر خود ۹۷۴ھ/۱۵۶۷ء اور ۹۸۵ھ/۱۵۷۷-۱۵۷۸ء میں پنجاب آیا اور بلوچ اور افغان قبیلوں کی گوشمالی کی گئی۔ ۱۵۷۹ء میں مرزا حکیم نے پنجاب پر باقاعدہ حملہ کیا، لیکن شکست کھائی۔ سرحد کے گوناگوں خطرات کے پیش نظر ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء میں اکبر خود لاہور آیا۔ یہیں سے وہ کابل گیا اور مرزا حکیم کو معاف کر کے اسے دوبارہ وہاں کا حاکم مقرر کیا۔

۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء میں مرزا حکیم کی وفات سے سرحد کے معاملات اور پیچیدہ ہو گئے۔ اکبر پنجاب روانہ ہوا اور ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۸ء تک لاہور میں مقیم رہ کر سرحدی قبائل میں روشنیہ تحریک [رک بہ بایزید انصاری] کو دبایا، کشمیر اور سندھ فتح ہو کر مغلیہ سلطنت میں شامل ہوے۔ قندہار پر حملہ کرنے کے حوصلے پست ہو گئے۔ لاہور میں بادشاہ کے دوران قیام میں یہاں کی رونق، آبادی، عمارات اور صنعت و حرفت میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ اسی زمانے میں عیسائیوں کے دو مشن آئے۔ اکبر ان کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آیا اور انھیں گرجا تعمیر کرنے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کی اجازت دی۔ اکبر نے پنجاب کے نظم و نسق کی اصلاح کی طرف بھی توجہ دی۔ ستی کی روک تھام اور ہندو بیواؤں کو دوبارہ شادی کی اجازت کے سلسلے میں احکام جاری کیے۔

جہانگیر (۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء تا ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) نے تخت نشینی کے بعد چند مناسب اور مقبول عام اصلاحات کا اعلان کیا۔ اس نے عموماً اکبر کی پالیسی اور اس کے نظام حکومت کو قائم رکھا۔ اس کے سب سے بڑے بیٹے خسرو نے بغاوت کی اور لاہور کا رخ کیا، لیکن بالآخر شکست کھا کر

گرفتار ہوا۔ خسرو کو مالی امداد دینے کی پاداش میں سکھوں کے مذہبی پیشوا گورو ارجن دیو کو سزائے موت دی گئی۔ ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء میں جہانگیر راولپنڈی ہوتا ہوا کابل گیا اور وہاں سے واپسی پر لاہور میں قیام کیا۔ جہانگیر کو کشمیر بےحد پسند تھا اور وہ کئی بار وہاں گیا۔ جہانگیر کا نظم و نسق شروع میں بہت اچھا تھا اور وہ خود ملکی معاملات میں دلچسپی لیتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ اس نے سلطنت کا کاروبار نورجہاں پر چھوڑ دیا۔ نورجہاں نے اپنی لیاقت سے تمام کام سنبھال لیے، لیکن کچھ عرصے بعد جہانگیر کے سب سے لائق اور اولوالعزم بیٹے خرم (شاہجہاں) سے اس کی ٹھن گئی۔ سلطنت کے ممتازترین سپہ سالار مہابت خاں سے بھی اس کی نہ بن سکی۔ اس باہمی کشمکش کا انجام یہ ہوا کہ ایران نے قندہار پر قبضہ کر لیا اور جہانگیر کے عہد میں مغل اسے واپس نہ لے سکے اور خود جہانگیر کو مہابت خاں نے جہلم پر حراست میں لے لیا، مگر نورجہاں نے اپنی فراست اور سیاست سے جہانگیر کو چھڑا لیا۔ جہانگیر کا انتقال پنجاب میں ہوا اور وہ لاہور میں مدفون ہے۔ اس کے عہد میں لاہور کی رونق اور خوبصورتی میں نمایاں اضافہ ہوا۔ نورجہاں کی مدد سے شاہزادۂ شہریار نے لاہور میں بادشاہت حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن شاہجہاں کا خسر (ممتاز محل کا باپ) آصف خاں بھی لاہور میں موجود تھا۔ اس نے حالات پر پوری طرح قابو پا لیا اور تاج و تخت کو شاہجہاں کے لیے محفوظ کر دیا۔ جہانگیر کے زمانے میں نظم و نسق میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، شاہجہاں نے ان کو دور کیا۔ منصب‌داری نظام کی ازسر نو تنظیم کر کے فوج کی قوت اور استعداد میں اضافہ کیا۔ شاہجہاں لاہور اور کشمیر کئی بار آیا۔ لاہور کی کئی مشہور عمارات شاہجہاں اور اس کے وائسرائے وزیر خاں کے ایما سے تعمیر ہوئیں۔ اسی عہد میں راوی سے ایک نہر نکالی گئی جس کے پانی سے شالامار باغ وغیرہ سیراب ہوتے تھے۔ شاہجہاں کو اپنے آبائی وطن ماوراءالنہر سے بڑی محبت تھی اور وہاں کی ابتری سے فائدہ اٹھا کر وہ ان علاقوں کو دوبارہ فتح کرنے کا خواہش‌مند تھا۔ اس نے کئی بڑی بڑی مہمیں بھیجیں، لیکن ان کا اس کے سوا کوئی نتیجہ نہ نکلا کہ قندہار پر قبضہ ہو گیا۔ تاہم چند ہی سال میں ایرانیوں نے قندہار پھر واپس لے لیا۔ مغل پھر کبھی اسے حاصل نہ کر سکے اور شاہجہاں کی تمام کوششیں اور مہمیں ناکام رہیں۔

شاہجہاں کی بیماری (۱۶۵۷ء) میں اس کے بیٹوں میں تاج و تخت کے لیے جنگ چھڑی تو پنجاب بھی اس کی زد میں آیا۔ داراشکوہ دہلی سے فرار ہو کر پنجاب آیا۔ سکھوں کے گورو ہررائے نے اسے امداد دی، لیکن اورنگ‌زیب کے سپہ‌سالار اس کے تعاقب میں تھے۔ اورنگ‌زیب خود اس کے تعاقب میں لاہور اور ملتان آیا۔ داراشکوہ لاہور، ملتان، بھکر اور مختلف مقامات میں بھاگا بھاگا پھرا، بالآخر سرحدی علاقے میں پکڑا گیا۔

اورنگ‌زیب (۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء تا ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء) کے تقریباً پچاس سالہ عہد میں دکن اور شمال مشرق میں مغل سرحد میں توسیع ہوئی۔ ۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء میں سرحدی علاقے میں بڑی زور کی بغاوت ہوئی۔ اس بغاوت کے قائدین میں خوشحال خاں خٹک بھی شامل تھا، جو تلوار کا دھنی ہونے کے علاوہ پشتو کا مشہور شاعر بھی تھا۔ اورنگ زیب کو خود اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے جانا پڑا۔ جب بغاوت کچل دی گئی تو اورنگ زیب نے قبائلیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا۔

اورنگ زیب کے عہد میں سکھوں کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء میں گورو تیغ بہادر نے

بغاوت اور سرکشی کے الزام میں سزائے موت دی گئی۔ سکھوں میں اس اقدام سے بہت اضطراب پھیلا اور مغل حکومت سے نفرت ان کے دل میں جاگزیں ہو گئی۔ تیغ بہادر کے جانشین گورو گوبند نے سکھوں کو امتیازی نشان دے کر ان میں زبردست عصبیت پیدا کی اور ان میں عسکری روح پھونک دی۔ سکھوں کی مذہبیت پر عسکریت غالب آ گئی۔ گورو گوبند نے اب باقاعدہ فوج رکھنا شروع کر دی اور چند قلعے بھی تعمیر کرائے۔ اورنگ زیب اس زمانے میں دکن میں مصروف تھا۔ اس کی غیرحاضری اور مصروفیت سے گورو نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے قرب و جوار کی ہندو ریاستوں پر حملے کرنے شروع کیے اور مغل افواج کو بھی زک پہنچائی۔ ان راجاؤں نے دربار دہلی سے امداد کی درخواست کی۔ اس بار سکھوں کے خلاف باقاعدہ فوج کشی کی گئی۔ سکھ افواج کو شکست ہوئی اور گورو گوبند بھیس بدل کر روپوش ہو گیا۔ اس شکست سے سکھوں کی طاقت کچھ دنوں کے لیے دب گئی، لیکن ان کے فوجی اور قومی جذبے میں کوئی کمی نہیں آئی۔

اورنگ زیب کے بعد: ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب نے وفات پائی۔ اپنی زندگی کے آخری چھبیس سال اس نے دکن میں گزارے تھے۔ اس طویل غیرحاضری کے باعث برِصغیر کے شمالی علاقوں کے نظم و نسق میں بڑی کمزوری پیدا ہو گئی تھی اور بغاوت پسند عناصر کو ابھرنے کا موقع مل گیا، پھر بھی اورنگ زیب کے نام کی دھاک قائم تھی اور مخالفین کھلم کھلا میدان میں آنے سے دبکتے تھے۔ اس کی وفات کے بعد سارے ملک میں انتشار پھیل گیا۔ انتشارپسند عناصر میں دو گروہ سب سے قوی ثابت ہوئے: اولاً سکھ، جنھوں نے پنجاب اور سرحد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا؛ ثانیاً مرہٹے، جنھوں نے مہاراشٹر سے نکل کر شمال میں پنجاب اور مشرق میں بنگال تک لوٹ مار مچا دی۔

۱۱۱۹ھ/۱۷۰۸ء میں بندا بیراگی کی قیادت میں سکھوں نے لاہور کے مضافات میں قتل و غارت شروع کر دی۔ آٹھ نو ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا، لیکن بہادر شاہ نے ان حالات کی اصلاح کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ چار سال بعد اس کا انتقال ہوا تو رہی سہی آن بھی ختم ہو گئی۔ شاہی دربار امرا کے عزائم کی بازی گاہ بن گیا۔ وہ جسے چاہتے تخت پر بٹھاتے اور جب چاہتے اتار دیتے۔ فرخ سیر کے عہد میں سکھوں کی طاقت اور تنظیم بہت بڑھ گئی۔ مسلمان اور مسلمانوں کی مساجد اور مقابر ان کی توجہ کا خاص مرکز تھے۔ لاہور سے سرہند تک کوئی مقام محفوظ نہ تھا اور سکھ جو چاہتے تھے، کرتے تھے۔ ۱۱۲۷ھ/۱۷۱۵ء میں پنجاب کے صوبیدار عبدالصمد خاں نے سکھوں کو زبردست شکست دی۔ بندا گرفتار ہو کر مارا گیا اور سکھ کچھ عرصے کے لیے دب گئے۔

بیرونی حملے: اس افراتفری میں، جو ملک میں پھیل رہی تھی، سرحد کی حفاظت کی فکر کون کرتا۔ کابل کا صوبیدار آرام سے پشاور رہتا تھا۔ نادر نے حملہ کیا تو اس نے سارے راستے کھلے پائے۔ وہ لاہور آیا اور وہاں کے صوبیدار زکریا خاں کی اطاعت قبول کر کے دہلی جا پہنچا۔ بادشاہ دہلی محمد شاہ نے سندھ پار کے تمام علاقے، یعنی سندھ، کابل اور مغربی پنجاب، نادر کے حوالے کر دیے۔ نادر کے حملے سے سارے ملک میں بےاطمینانی پھیل گئی۔ ان حالات میں سکھوں نے پھر لوٹ مار شروع کر دی اور راوی اور بیاس کے درمیانی علاقے کو کھنگال ڈالا۔ زکریا خاں نے بڑی کوشش اور سختی سے انھیں کچلا اور ان کے قلعے مسمار کیے۔ ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں احمد شاہ ابدالی (رک بآں) نے ہندوستان پر پہلا

حملہ کیا ۔ اسے اس حملے پر اکسانے میں جالندھر کے صوبیدار آدینہ بیگ (رک بآں) کا ہاتھ تھا ۔ ابدالی نے لاہور فتح کر کے وہاں اپنا صوبیدار مقرر کیا اور وہاں سے تیس لاکھ روپے اور بےشمار مال غنیمت لیتا ہوا دہلی چلا گیا ۔ سرھند کے پاس وزیر قمرالدین کے بیٹے میر منو نے جم کر مقابلہ کیا اور درانی فوج کو پسپا کر دیا ۔ بادشاہ نے خوش ہو کر میر منو کو پنجاب کا صوبیدار مقرر کیا ۔ اس کے بعد احمد شاہ نے پنجاب پر سات حملے اور کیے ۔ اس کے حملوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ پنجاب میں حکومت کا وقار بالکل ختم ہو گیا ۔ پنجاب کی دولت سمٹ سمٹ کر افغان حملہ آوروں کے ساتھ چلی گئی اور سکھوں کو اپنی قوت بڑھانے اور لوٹ مار کرنے کا نادر موقع ہاتھ آیا ۔ کئی بار انھوں نے لاہور پر یورش کی ۔ بعض مغل حکام نے بھی ابدالی کے راستے میں دقتیں پیدا کرنے کے لیے کئی بار سکھوں کو اکسایا ۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ابدالی اور اس کے سپہ سالاروں نے سکھوں کی سرکوبی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، لیکن ابدالی کے متواتر حملوں سے سکھوں کی طاقت کو فروغ بھی ہوا، اس لیے کہ ان حملوں سے جو افراتفری اور بے اطمینانی پھیلی وہ سکھوں کو راس آئی ۔ روہیلوں اور مالیر کوٹلہ کے افغانوں نے بھی خوب لوٹ مار مچائی۔

پنجاب میں یونہی بدامنی اور انتشار کی کمی نہ تھی کہ اب ایک نیا خطرہ نمودار ہوا ۔ آدینہ بیگ کے اشارے پر مرھٹوں نے پنجاب پر حملہ کیا اور ابدالی کے حکام کو شکست دے کر لاہور پر قابض ہو گئے ۔ انھوں نے سارے صوبے سے ابدالی کے حکام کو مار بھگایا، لیکن کچھ عرصے بعد واپس چلے گئے۔

۱۷۶۵ - ۱۷۶۶ء میں سکھوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور جہلم سے ستلج تک کے سارے علاقے پر قابض ہو گئے ۔ انھوں نے امن و امان قائم کیا اور مضبوطی سے حکومت کی ۔ اگلے سال ابدالی نے اپنا آخری حملہ کیا ۔ سکھ وقتی طور سے پسپا ہو گئے، لیکن اس کے جاتے ہی پھر نکل پڑے اور چند ہی سال میں وہ کانگڑہ اور جموں سے اٹک اور ملتان تک کے سارے علاقے پر غالب آ گئے ۔ اس طرح پنجاب میں مغلوں اور افغانوں کی جنگ سکھوں کی فتح پر منتج ہوئی۔

مغلیہ عہد میں پنجاب کے عام حالات :

مغلوں کے عروج کا زمانہ پنجاب کے لیے بڑا اچھا گزرا ۔ زراعت کا فروغ ہوا ۔ تجارت اور صنعت کو ترقی ہوئی ۔ لاہور اور ملتان شاہراہوں کے اتصال پر واقع تھے ۔ ان دونوں شہروں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور یہ تجارت کی بڑی منڈی تھے ۔ امن و امان اور عام خوشحالی کے باعث زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی رونما ہوئی ۔ مغل بادشاہ ۔ اور ان کی متابعت میں مغل امرا ۔ علم و ادب اور فنون لطیفہ کے سرپرست تھے ۔ شاہی دربار کی طرح ہر صوبیدار بلکہ ہر بڑے امیر کی بارگاہ کے ساتھ اہل علم، شعرا اور فن کار ضرور وابستہ ہوتے تھے ۔ مصوری کو شاہی سرپرستی میں بڑا فروغ حاصل ہوا ۔ مغل مصوری کے بعض اچھے نمونے لاہور کے عجائب گھر میں موجود ہیں ۔ علما میں ملا عبداللہ سلطان پوری اور مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی اور صوفیہ میں شیخ میاں میرؒ اور ملا شاہ قادری کے نام ممتاز ہیں ۔ مہابھارت، جوگ وششٹ، راماین اور نل دمن کے فارسی تراجم کی تیاری میں پنجاب کے کئی فضلا نے حصہ لیا ۔ پنجابی زبان کی سب سے بلند پایہ نظم وارث شاہ کی ہیر بھی مغلوں کے آخری دور کی تخلیق ہے ۔ لاہور اور ٹھٹھہ بڑے علمی مرکز تھے ۔ ایک یورپی سیاح کا بیان ہے کہ ٹھٹھہ میں چار سو سے زیادہ دارالعلوم تھے (تفصیل کے لیے رک بہ پنجاب؛ پنجابی؛ سندھ؛

[illegible]

بنگال عہد مغلیہ میں : مغلوں کا اقتدار قائم ہونے سے بنگال پر کئی اہم اثرات پڑے۔ ہندوستان سے بنگال کی علیحدگی کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور ہندوستان کی شاہراہوں کے واسطے سے وسطی اور مغربی ایشیا سے بھی بنگال کے تجارتی اور تمدنی تعلقات ازسر نو استوار ہوگئے۔ اسی زمانے میں مغربی اقوام نے بنگال اور دوسرے ساحلی علاقوں میں اپنے تجارتی کارخانے قائم کرنا شروع کیے۔ شروع شروع میں جب پرتگالیوں نے خلیج بنگال کو اپنی بحری قزاقی کا اڈا بنایا تو بنگال کی بحری تجارت یکسر ختم ہو گئی، لیکن ۱۶۶۶ء میں مغلوں نے چٹاگانگ فتح کر کے ان کا زور توڑا تو بنگال کی بحری تجارت بڑے پیمانے پر پھر شروع ہو گئی، اگرچہ یہ تمام تر مغربی اقوام کے ہاتھ میں تھی۔ اس بیرونی تجارت کی بدولت صوبے کی دولت میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور صوبے کی صنعت میں بھی بہت ترقی اور توسیع ہوئی۔ مغلوں کے زمانے میں بنگال میں نظم و نسق کے استحکام اور عام امن و امان کے باعث وہاں کی خوشحالی میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور زراعت اور صنعت میں ترقی ہوئی۔ جہانگیر کے زمانے سے صوبۂ بنگال سے ایک بھاری رقم بطور سالانہ خراج کے ہر سال مرکزی خزانے میں جاتی رہی اور جب اورنگ‌زیب کے آخری زمانے میں دوسرے صوبوں سے روپیہ آنا کم و بیش بند ہو چکا تھا تو بنگال کا سالانہ خراج شاہی کیمپ کے اخراجات کا ضامن تھا۔

اکبر نے بنگال فتح کیا اور وہاں کی بغاوتوں کو دبایا، لیکن بنگال کے نظم و نسق کو جہانگیر ہی کے زمانے میں استحکام حاصل ہوا۔ صوبیدار اسلام خان کے زمانے میں مشرقی بنگال کے بیشتر علاقے فتح ہو کر صوبۂ بنگال کا حصہ بنے۔ اس صوبیدار کے زمانے میں ڈھاکہ جہانگیر آباد کے نام سے بنگال کا صدر مقام بنا۔ اس کی ترقی اسی زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ یہ بہت جلد ایک نمایاں تجارتی اور صنعتی مرکز بن گیا۔ یہاں کی باریک ململ کی بیرونی ممالک میں زبردست مانگ تھی۔

جہانگیر کے بیٹے شاہجہان نے بغاوت کا علم اٹھایا تو وہ دکن سے آ کر صوبۂ بنگال پر قابض ہو گیا؛ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے شاہی فوج سے شکست کھائی اور دکن واپس چلا گیا۔ شاہجہان کے عہد میں پرتگالیوں کی دست درازیوں اور شرارتوں میں اضافہ ہوا تو انہیں شکست دے کر ان سے ہگلی چھین لیا گیا۔ شاہجہان کی علالت پر اس کے بیٹوں میں جو خانہ‌جنگی ہوئی اس میں بنگال کے صوبیدار شاہ شجاع نے بھی صوبے کی دولت اور سپاہ کو تخت پر چڑھنے کا زینہ بنانا چاہا، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کو خوش قسمتی سے شائستہ خان اور مرشد قلی خان جیسے لائق صوبیدار ملے۔ شائستہ خان کے زمانے میں انگریزوں سے جنگ ہوئی۔ بالآخر معاملات گفت و شنید سے سلجھ گئے۔ شائستہ خان نے بحری دفاع کے لیے ایک بیڑا بھی تیار کیا۔

مرشد قلی کے زمانے میں بنگال میں غیر معمولی ترقی رونما ہوئی۔ اس نے بنگال کے مالیاتی نظام کی ازسر نو تنظیم کی اور وہاں کی مالی آمدنی میں زبردست اضافہ کیا۔ مرشد قلی خود ایرانی تھا۔ اس زمانے میں ایران میں خلفشار پھیلا ہوا تھا، چنانچہ بہت سے ایرانی علما اور فضلا اور ممتاز لوگ ترک وطن کر کے بنگال آ گئے۔ ایک اور اعتبار سے بھی مرشد قلی کا عہد تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے بنگالی ہندوؤں کو دفاتر میں کثرت سے ملازم رکھا اور انہیں بڑی اسامیوں پر مامور کیا۔ بنگال کی سیاسی زندگی میں مقامی ہندوؤں کے داخلے کی یہ گویا ابتدا تھی۔

اس کے بعد کے نوابوں نے ہندوؤں کو اور بھی زیادہ اسامیاں دیں اور حکومت میں ان کا حصہ اور اقتدار برابر بڑھتا رہا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد بیس سال تک مرشد قلی بنگال کا نواب، یعنی خود مختار صوبیدار، رہا۔ اس عرصے میں جب کہ سارے ملک میں ابتری پھیلتی جا رہی تھی، مرشد قلی نے صوبے کو پوری طرح قابو میں رکھا اور اندرونی امن و امان کے ساتھ صوبے کو مرہٹوں کی دست درازیوں سے بھی محفوظ رکھا۔ مرشد قلی نے اپنا صدر مقام مرشد آباد متعین کیا اور ڈھاکے میں ایک نائب ناظم مقرر کیا۔ اس کے بعد ڈھاکے میں ایک نائب ناظم مستقلاً رہنے لگا۔ مرشد قلی کے بعد اس کے خاندان کے دو افراد یکے بعد دیگرے صوبیدار بنے، لیکن ان کے زمانے میں حالات خراب ہو چلے۔

۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں علی وردی خاں نے بنگال کی نوابی حاصل کی۔ علی وردی ہوشیار اور مستعد حاکم تھا، لیکن مرہٹوں کے مسلسل حملوں اور خود اس کے افغان فوجیوں کی بغاوت نے اسے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ مرہٹوں کی غارتگری نے بنگال کی خوشحالی کو زبردست صدمہ پہنچایا۔ علی وردی نے اپنی فراست اور سیاست سے یورپی تجار کو صوبے کے معاملات میں دخیل نہیں ہونے دیا۔ اس نے ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدوں پر جگہ دی۔ علی وردی نے اپنے بڑے داماد کو ڈھاکے میں نائب ناظم مقرر کیا۔ اس کے بعد ڈھاکے میں کئی اور نائب ناظم علی وردی کے خاندان سے ہوے، لیکن آخر میں ان کی حیثیت برائے نام رہ گئی تھی۔ ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء کے بعد کوئی نائب ناظم مقرر نہ ہوا۔

علی وردی کے بعد بنگال کی نوابی اس کے نواسے سراج الدولہ کو ملی۔ سراج الدولہ نے انگریزوں کی تجارتی بدعنوانیوں اور دیگر دست درازیوں کے خلاف کارروائی شروع کی اور ابتدا میں اسے کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن پلاسی کی تاریخی جنگ (۱۱۷۰ھ/۱۷۵۷ء) کے بعد انگریزوں کا بنگال پر غلبہ ہو گیا۔

عام حالات اور رجحانات: مغل دور میں بنگال کے عام حالات اطمینان بخش تھے۔ برطانوی عہد سے قطع نظر بنگال نے شاید اپنی پوری تاریخ میں امن و امان اور خوش نظمی کا اتنا طویل دور کبھی نہیں دیکھا جتنا کہ اکبر کی فتح سے مرشد قلی کی وفات تک کا زمانہ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ زراعت کو ترقی ہوئی اور غلہ سستا ملنے لگا؛ صنعت نے ترقی ہوئی اور اس کے باعث بیرونی تجارت کو بے حد فروغ ہوا؛ نتیجۃً بیرونی ممالک سے سونا چاندی کثیر مقدار میں بنگال آیا۔ ایک پرتگالی پادری نے، جو ۱۶۴۰ء میں ڈھاکے آیا تھا، لکھا ہے کہ "ڈھاکے میں روپے کی اتنی بہتات ہے کہ اسے گنا نہیں جاتا بلکہ تولا جاتا ہے۔ اس کے بے شمار بازاروں میں کھانے کی چیزیں اور دیگر اشیا افراط سے ملتی ہیں۔ اس شہر کی دولت دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے"۔ شائستہ خاں کے زمانے میں ڈھاکے کی عمارات اور رونق میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اس کی عمارات ایک خاص طرز کی حامل ہیں، جسے شائستہ خانی طرز کہا جاتا ہے۔ غالباً اس کے عہد میں جنم اشٹمی جلوس کی رسم شروع ہوئی، جو ڈھاکے کے ہندو نداف اور دستکار نکالتے تھے۔ یہ جلوس دو روز مسلسل نکلتا تھا اور اس میں علاوہ اور باتوں کے ڈھاکے کے فنون کی بڑی اچھی نمائش ہوتی تھی۔ مرشد قلی کے زمانے میں علوم و فنون کو بھی بڑی ترقی ہوئی۔ مغل عہد میں وشنویت کو بہت فروغ ہوا اور یہ امر بنگال میں ہندوؤں کے مذہبی احیا کا پیش خیمہ ثابت ہوا (مزید تفصیلات کے لیے رک بہ بنگالہ؛ بنگلہ)۔

پنجاب اور سرحد میں سکھوں کا دور

اور کمپنی کی حکومت: سکھوں نے جب لاہور اور پنجاب پر قبضہ کیا تو وہ متعدد مثلوں میں بٹے ہوئے تھے اور ان میں باہمی رقابتیں اور مناقشے چلتے رہتے تھے۔ ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء میں ابدالی کے پوتے شاہ زمان نے پنجاب پر حملہ کیا اور لاہور کو رنجیت سنگھ کے سپرد کر کے وہ واپس چلا گیا۔ رنجیت سنگھ نے اپنی انتظامی اور فوجی لیاقت کا سکہ جمایا اور سکھ سرداروں میں اسے ایک نمایاں حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس نے رفتہ رفتہ چھوٹی موٹی سکھ ریاستوں کو شامل کر کے اپنا علاقہ خاصا وسیع کر لیا، لیکن ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اعلان کر دیا کہ ستلج کے بائیں جانب جتنا علاقہ ہے (علاوہ اس کے جس پر رنجیت سنگھ کا قبضہ ہو چکا تھا) وہ اس کے زیر حفاظت ہے۔ اس طرح رنجیت سنگھ کے لیے جنوب مشرق میں مزید توسیع کا راستہ بند ہو گیا۔ اب اس نے اپنی پوری توجہ مغرب کی سمت لگا دی۔ ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء تک ملتان، پشاور، ڈیرہ جات اور کشمیر فتح ہو کر اس کی ریاست میں داخل ہو چکے تھے۔ سکھوں نے پنجاب اور سرحد میں مسلمانوں پر جو مظالم کیے ان کے رد عمل میں حضرت سیّد احمدؒ شہید اور حضرت شاہ اسمٰعیلؒ شہید کی قیادت میں مسلمان مجاہدوں نے ایک منظم مہم شروع کی اور سکھوں سے پشاور چھین لیا؛ لیکن بالاکوٹ کی لڑائی (۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) میں ان کی شہادت کے بعد یہ تحریک ختم ہو گئی۔

۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کے مرتے ہی سکھ سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اس کے جانشین نالائق نکلے۔ سکھ فوج خودسر ہو گئی اور ستلج پار کر کے انگریزوں سے جا ٹکرائی۔ سکھوں کا یہ اقدام خودکشی کے مترادف تھا۔ ۱۸۴۹ء میں سکھ راج یکسر ختم ہوگیا اور پنجاب میں انگریزی حکومت قائم ہوگئی (مزید تفصیلات کے لیے رکّ بہ پنجاب)۔

سندھ کی خود مختار سلطنتیں:

فیروز شاہ تغلق کے انتقال (۷۹۰ھ/۱۳۸۹ء) کے بعد سندھ بہت جلد سلطنت دہلی سے آزاد ہوگیا اور وہاں سمہ قبیلے نے ایک خودمختار سلطنت قائم کر لی، جو ۱۵۲۰ھ تک قائم رہی۔ اس کے فرمانروا جام کہلاتے تھے اور ان کی تعداد پندرہ سے انیس تک بیان کی جاتی ہے۔ ان میں جام سنجر اور جام نظام الدین نندا زیادہ مشہور ہے۔ نندا کا زمانہ بڑی خوشحالی کا تھا۔ جام نندا کا مقبرہ مکلی پہاڑی کی عمارتوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ملتان میں ان دنوں لنگاہ خاندان کی حکومت تھی۔ ۹۲۷ھ/۱۵۲۰ء میں شاہ بیگ ارغون نے سندھ پر حملہ کیا اور دو تین سال کے اندر پورے سندھ پر قابض ہو گیا۔ ہمایوں جب شیر شاہ سے شکست کھا کر سندھ آیا تو مرزا شاہ حسن ارغون حکمران تھا اور اس نے شکست خوردہ بادشاہ کی طرف کوئی التفات نہ کیا۔ مغلوں کے ارغون قبیلے کے علاوہ سندھ میں اس وقت ایک اور بڑا اہم قبیلہ ترخان تھا۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے وسط کے کچھ بعد سندھ کی عنان حکومت ترخانوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ انہیں کے دور میں پرتگالیوں نے ٹھٹھہ کو تاراج کیا (۹۶۲ھ/۱۵۵۵ء)۔ اکبر نے جب سندھ کو پوری طرح زیر تسلط لانے کی ٹھانی تو وہاں کا حاکم مرزا جانی بیگ ترخان تھا۔ ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱-۱۵۹۲ء میں سندھ مغلیہ سلطنت کا حصہ بن گیا۔ سترھویں صدی کے اوائل میں داؤد پوتہ خاندان نے شمالی سندھ میں زور پکڑا۔ اٹھارھویں صدی میں کلہوڑا خاندان کے امیروں نے سر اٹھایا اور اورنگ زیب نے ان کی نیم خودمختار حیثیت تسلیم کر لی۔ ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶-۱۷۳۷ء میں کلہوڑا پورے سندھ پر حاوی ہو چکے تھے، لیکن اس کے بعد مغربی سرحدوں سے حملے

شروع ہو گئے اور نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی، تیمور شاہ اور ان کے فوجی سرداروں کے حملوں نے سندھ کو تباہ کر دیا۔ ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۳ء میں تالپور خاندان برسراقتدار آیا، لیکن یہ دور خانہ جنگیوں کا شکار رہا۔ ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں انگریزوں نے امیران سندھ سے دوستی کا معاہدہ کیا، لیکن چند ہی سال بعد انہوں نے اس کی خلاف ورزی شروع کر دی اور بالآخر ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں سندھ پر قبضہ کر لیا (مزید تفصیلات کے لیے رک بہ سندھ؛ سندھی)۔

عہد اسلامی پر ایک نظر: برصغیر میں سلمانوں کی پہلی حکومت سندھ میں قائم ہوئی ہی، لیکن ایک مستقل اسلامی سلطنت کی بنیاد طب الدین ایبک نے ڈالی اور اس کا دارالحکومت ہلی قرار پایا۔ حکومت کی نوعیت شخصی بادشاہت تھی، جس میں اکثر عسکریت کا رنگ غالب ہا۔ مسلمانوں نے نہ صرف ملک میں لامرکزیت کا اتمہ کیا بلکہ نظم و نسق حکومت اور بندوبست اضی کا ایک باقاعدہ اور مستقل نظام بھی قائم کیا۔ ں دور میں کئی ایسے بادشاہ ہوئے ہیں جنہوں بڑے تدبر اور جانفشانی سے سلطنت کو استحکام، ایا کو خوشحالی اور ملک کو امن و امان بخشا؛ نی ہندوؤں کے ساتھ انتہائی شفقت اور رواداری سلوک روا رکھا اور انہیں ہر طرح کے تحفظات ے۔ برصغیر کے مسلمان بادشاہوں نے علوم و فنون جیسی سرپرستی کی، اس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ ان کی قدردانی کا اس قدر شہرہ تھا تمام اسلامی ممالک کے اہل کمال یہاں کھچے آتے تھے۔ علم و فن کی سرپرستی ایک ایسی روایت ہ جسے عہد زوال کے فرمانروا بھی نباہتے رہے، نچہ بہادر شاہ ظفر تک، لال قلعے کا لٹا لٹا دربار و شعر کا گہوارہ اور علما و شعرا کا مامن بنا ۔ عہد اسلامی میں ابتدا ہی سے تعلیم کو خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا گیا۔ بڑے بڑے شہروں کے علاوہ قصبات و دیہات میں بھی مدرسے قائم کیے گئے، علما و معلّمین کو فکر معیشت سے آزاد کیا، طلبہ کے لیے وظائف جاری کیے اور ملک کے کونے کونے میں علم کی روشنی پھیلائی۔ سرکاری مدارس کے علاوہ ارباب خیر اور علمائے دین نے بھی لاتعداد مدرسے قائم کر رکھے تھے۔ یہاں کے بعض ادارے اپنی تعلیم و تدریس کے لیے بلاد اسلامیہ میں مشہور تھے (مثلاً لاہور میں ملّا جمال، ملّا یوسف اور ملّا عبدالسلام کے مدارس، سیالکوٹ میں ملّا کمال اور ان کے نامور فرزند ملّا عبدالحکیم کا مدرسہ، دہلی میں شاہ عبدالرحیم کا قائم کردہ مدرسہ اور لکھنؤ میں فرنگی محل کا مدرسۂ نظامیہ) اور تحصیل علم کے لیے یہاں کثیر التعداد غیر ملکی طالب علم آتے تھے۔ اس دور میں فنون لطیفہ، بالخصوص مصوری، خطاطی اور فن تعمیر کی بے حد حوصلہ افزائی ہوئی۔ عہد اسلامی کی لاتعداد یادگاریں آج بھی مسلمان فنکاروں کے کمال کا ثبوت پیش کر رہی ہیں۔ اکثر سلاطین کی یہ کوشش رہی کہ وہ یہاں ایک فلاحی مملکت قائم کریں۔ زراعت اور کاشتکاروں کی بہبود پر ان کی خاص نظر تھی۔ زراعت کو ترقی دینے کے لیے ایک خاص محکمہ (دیوان کوہی) قائم تھا، جس کے سپرد بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے اور کم پانی والے علاقے میں کنویں اور نہریں اور بند تعمیر کرانے کا کام تھا۔ قحط کے زمانے میں کاشتکاروں کو خاص طور پر مدد دی جاتی تھی۔ ان فرمانرواؤں نے عوام کے اخلاق کی نگرانی کے لیے محکمۂ احتساب قائم کیا، جس نے شراب خوری، قماربازی اور چوربازاری کا سدباب کرنے کی بڑی کوشش کی۔ لاتعداد سڑکیں، پل، تالاب، کنویں، سرائیں، مسجدیں، شفاخانے اور مدرسے بنوائے گئے۔ درویشوں، بیواؤں، یتیموں اور محتاجوں

کی اعانت وسیع پیمانے پر حکومت کی طرف سے بھی ہوتی تھی اور صاحب استطاعت افراد بھی کرتے تھے۔ تاریخ میں سلاطین اور ان کے امرا کی فیاضی اور غریب پروری کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ محکمۂ خیرات و حسنات کی طرف سے علما و طلبہ میں سرکاری وظائف تقسیم ہوتے اور لوگوں کو مدد معاش کے لیے عطیات دیے جاتے تھے۔ مجموعی طور پر ملک دولت‌مند اور خوشحال تھا۔ لوگوں کی یہ آسودگی زراعت و تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کی مرہون منت تھی اور اس میں فرمانرواؤں کے حسن انتظام اور رعایا پروری کا بڑا حصہ تھا۔

اسلامی سلطنت کا زوال؛ عہد عالمگیری میں سلطنت مغلیہ کی حدود برصغیر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل چکی تھیں، لیکن اورنگ‌زیب کی وفات کے بعد اس کا شیرازہ بکھرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اس زوال کا ایک بنیادی سبب مسلمانوں کا علمی انحطاط تھا۔ تاتاریوں کے حملوں سے اسلامی ممالک کو جو سب سے بڑا نقصان پہنچا وہ یہ تھا کہ کتب خانے ضائع ہو گئے، درسگاہیں اجڑ گئیں، علما کا کوئی پرسان حال نہ رہا، تعلیم کا معیار حد درجے پست اور تحقیق و تجسس کا مادہ مفقود ہو گیا اور جدید علوم و فنون سیکھنے کا ذوق جاتا رہا۔ اس ذہنی اور فکری زوال کا اثر ان کی عسکری قوت پر بھی پڑا۔ بابر کے بعد طریق جنگ میں کوئی ترقی نہ ہو سکی۔ یورپ میں فنون جنگ میں انقلابی تبدیلیاں لائی جا رہی تھیں، لیکن برصغیر کے مسلمان حکمران پرانی لکیر کو پیٹتے چلے جا رہے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی بے خبری اور بے نیازی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ ایک طرف تو بحریہ قائم کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہ سمجھی گئی اور دوسری طرف توپ خانے کا استعمال معدودے چند لوگوں تک محدود رکھا گیا، چنانچہ اکثر انہیں اس کے لیے فرنگیوں کو ملازم رکھنا پڑا۔

اسلامی زوال کا ایک اور بڑا سبب وہ اخلاقی کمزوریاں تھیں جو اجتماعی اور انفرادی طور پر پوری قوم میں در آئی تھیں۔ امن و امان کے طویل ادوار، سلطنت کے استحکام اور معاشی خوشحالی نے رفتہ رفتہ بادشاہ اور امرا ہی کو نہیں، عوام کو بھی سہل‌انگار اور عیش کوش بنا دیا۔ اسی چیز نے بدنظمی کو راہ دی۔ عمال حکومت کے لیے فرائض منصبی سے گریز معمول بن گیا اور اپنے معیار زندگی کو بلندتر کرنے کے لیے وہ ہر طرح کی بدعنوانیوں کے مرتکب ہونے لگے، یہاں تک کہ ملک و ملت سے غداری بھی ان کے نزدیک کوئی جرم یا گناہ نہ رہا۔

شخصی بادشاہتوں میں ملک کا امن و استحکام فی‌الحقیقت بادشاہ کے ذاتی کردار، حسن تدبیر، شجاعت اور تدبّر پر منحصر ہوتا ہے اور کمزور اور نااہل شخص برسر حکومت آتے ہی ملک اور اہل ملک انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ برصغیر میں تخت نشینی کا کوئی مسلمہ اصول نہ ہونے کے باعث بادشاہ کی وفات پر شہزادوں اور امرا میں اکثر ٹھن جاتی تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد یہ صورت‌حال بد سے بدتر ہوتی گئی اور باہمی ناچاقیوں اور خانہ‌جنگیوں نے نظم و نسق کی بربادی کے علاوہ مرکزی حکومت کی عسکری قوت اس حد تک تباہ کر دی کہ شورش پسندوں کی معمولی ہنگامہ آرائیوں کو فرو کرنا بھی اس کے بس میں نہ رہا اور مغلوں کی عظیم الشان سلطنت پارہ پارہ ہو گئی۔

(ج) برطانوی دور

انگریزوں کی آمد؛ ہندوستان میں یورپی اقوام پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں بسلسلۂ تجارت آئیں۔ رفتہ رفتہ ان کی تجارتی کوٹھیاں جنوبی ہند کے مغربی اور مشرقی ساحلوں پر اور خلیج

بنگال کی بندرگاہوں میں قائم ہو گئیں اور انھوں نے تجارت کے ساتھ ساتھ اپنی سیاست کا جال بھی پھیلانا شروع کیا ۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد مغلیہ سلطنت پر تیزی سے زوال آیا اور صوبوں میں طوائف الملوکی اور افراتفری پھیلی تو مغربی اقوام میں ملک گیری کا حوصلہ پیدا ہوا اور وہ مختلف ملکی قوتوں کے ہنگامۂ مسابقت میں مدعیانِ حکومت کی معاون بن کر میدان میں اتر آئیں ۔ پرتگیز تو اپنے تشدد اور بےتدبیری کے باعث جلد ہی یہاں سے نکل گئے ۔ ولندیزی بھی کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہ کر سکے ۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں ایک عرصے تک آویزش جاری رہی، جس میں انگریز غالب آئے ۔ شمال میں نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خان، جنوب میں حیدر علی اور سلطان ٹیپو اور مشرق میں علی وردی اور سراج الدولہ، وغیرہ نے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کی کوشش کی، لیکن انگریزوں کو بہتر اسلحہ، بہتر فوجی نظم، اعلیٰ درجے کی بحری طاقت، ایک منظم اور مضبوط سلطنت کی سرپرستی اور متعدد بےضمیر مقامی ریاستوں کی تائید کی بدولت غیر معمولی تفوق حاصل تھا؛ چنانچہ انیسویں صدی کے وسط تک پورا ملک انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی: ۱۶۰۰ء میں ملکۂ انگلستان کی اجازت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ وجود میں آیا، جسے برصغیر سے تجارت کا اجارہ دے دیا گیا ۔ اسی زمانے میں فرانسیسیوں نے بھی اپنی ایسٹ انڈیا کمپنی بنا کر برصغیر سے تجارت شروع کر دی ۔ چونکہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ملک میں لاتعداد چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں قائم ہو چکی تھیں اور ان میں ہمیشہ جنگ جاری رہتی تھی، اس لیے بیرونی تاجروں کو ان کے باہمی جھگڑوں میں دخل دے کر اپنی طاقت بڑھانے کا آسانی سے موقع مل گیا ۔ اٹھارھویں صدی کا نصف آخر جنوبی ہند میں ان کی باہمی آویزشوں اور ریشہ دوانیوں کا زمانہ ہے، اس میں انگریز کامیاب رہے اور فرانسیسی ان کے لیے میدان خالی کر گئے۔

بنگال: دکن کے بعد بنگال کی باری آئی ۔ یہ صوبہ اورنگ زیب کی وفات کے کچھ عرصہ بعد خودمختار ہو گیا تھا ۔ اس کے مدبر حکمران علی وردی خان نے جیتے جی انگریزوں کو ان کی حدود سے باہر قدم نہ رکھنے دیا ۔ اس کے بعد اس کا نواسہ سراج الدولہ مسند نشین ہوا ۔ وہ ایک محب وطن فرمانروا تھا ۔ انگریزوں نے اس کے مخالفین اور باغیوں کو پناہ دے کر اور کلکتے میں قلعہ بندی کر کے ملکی قوانین کی صریحاً خلاف ورزی کی ۔ جب نواب نے کلکتے پر چڑھائی کر کے انھیں ذلت آمیز شکست دی تو وہ حکومت کا تختہ الٹنے کی تیاریاں کرنے لگے ۔ فوجی سازوسامان اکٹھا کرنے اور دکن سے فوج منگوانے کے علاوہ انھوں نے نواب کے وزیر میر جعفر اور بعض دوسرے عمال کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ جون ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے مقام پر جنگ ہوئی ۔ میر جعفر کی غداری کے باعث نواب کی فوج کو شکست ہوئی ۔ میر جعفر کو گدی پر بٹھا دیا گیا اور یوں بالواسطہ طور پر بنگال انگریزوں کے قبضے میں آ گیا ۔ میر جعفر کی معزولی کے بعد نواب میر قاسم نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کی ایک آخری کوشش کی، لیکن جنگ بکسر میں میر قاسم، شجاع الدولہ اور شاہ عالم کی متحدہ فوج کو شکست دے کر ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی عسکری فوقیت کا سکہ جما دیا ۔ نوابوں اور انگریزوں کی اس کشمکش میں، بقول کے ۔ کے ۔ دت، ہندو امرا اور عمائدین نے انگریزوں کا ساتھ دیا ۔ نوابی برائے نام اب بھی قائم رکھی گئی، لیکن اصل

اقتدار کمپنی بہادر کے ہاتھ میں تھا۔ جنگ بکسر کے ایک سال بعد مغل بادشاہ نے بنگال کی دیوانی بھی باضابطہ طور پر انگریزوں کے حوالے کر دی۔ انہوں نے اپنی تجارت کو پھیلانے میں من مانی کارروائیاں کیں اور دونوں ہاتھوں سے بنگال کی دولت سمیٹی، لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا، انگلستان سے درآمدہ مال کی کھپت کے لیے یہاں کی صنعتیں پوری طرح تباہ کر دیں اور اہل حرفہ کو قلاش بنا دیا۔

دکن: دکن میں تین اہم طاقتیں تھیں: حیدرآباد، مرہٹے اور میسور۔ حیدرآباد پوری طرح انگریزوں کا وفادار تھا۔ مرہٹے اپنی باہمی ناچاقی کے باوجود اسلامی ریاستوں کو یکسر ختم کر کے برصغیر میں اپنا راج قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ میسور میں حیدر علی نے ایک مستحکم ریاست قائم کر کے حیدرآباد اور مرہٹوں کے علاوہ انگریزوں کو بھی میدان جنگ میں مات دی۔ اس کے بعد ٹیپو سلطان نے برصغیر کو فرنگیوں کے وجود سے پاک کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس سلسلے میں اس نے کابل، ترکیہ اور فرانس کے بادشاہوں سے بھی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ انگریزوں کے خلاف ایک مضبوط محاذ بنایا جا سکے، مگر اس میں اسے کامیابی نہ ہوئی۔ حیدرآباد اور مرہٹے دونوں اسے اپنی راہ کا کانٹا سمجھتے تھے، چنانچہ انہوں نے انگریزوں کی ہر ممکن مدد کی۔ ادھر خود سلطان کے اپنے متعدد عمائدین غداری کر کے انگریزوں سے مل گئے۔ بالآخر سلطان جوانمردی سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا اور مسلمانوں کی آخری آزاد سلطنت بھی مٹ گئی۔ میسور کو ختم کرنے کے بعد مرہٹوں سے نمٹنا بھی انگریزوں کے لیے مشکل نہ رہا۔ انہوں نے ایک ایک کر کے تمام ریاستوں پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ امداد باہمی کے نام پر انہوں نے مقامی حکمرانوں سے ایسے معاہدے کیے جن کی رو سے وہ ان کے دشمنوں کے خلاف ان کی حمایت کرنے کا وعدہ کرتے اور اس سلسلے میں وہ نہ صرف اپنے خارجہ تعلقات انگریزوں پر چھوڑ دیتے بلکہ اپنے ہاں انگریزی فوج کو اپنے خرچ پر رکھنے پر مجبور ہوتے تھے۔ مقامی حکمرانوں کو اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری ہو گیا۔ ان کے محل سازشوں کے اڈے بن گئے، رعایا کی فلاح و بہبود کے بجائے ذاتی تعیش ان کا مطمح نظر ٹھیرا اور ان کے درباروں میں کمپنی کی طرف سے مقرر کردہ مشیر (ریزیڈنٹ) اتنے بااختیار ہو گئے کہ حکمران ان کے اشارۂ ابرو کے پابند ہو کر رہ گئے۔

فتح دہلی: ۱۸۰۳ء میں مرہٹوں سے جنگ ختم ہوئی تو کامیاب و کامران انگریزوں نے دوآب اور دہلی پر بھی قبضہ کر لیا۔ دارالسلطنت ہاتھ میں آ جانے کے بعد انگریزوں کا وقار اور بھی بڑھ گیا۔ مغل بادشاہ انگریزوں کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے صرف لال قلعے کا مالک رہ گیا۔ ۱۸۵۷ء تک یہی حالت رہی۔

سندھ: سندھ میں کلھوڑہ خاندان کے زوال کے بعد تالپور قبیلہ برسراقتدار آیا (۱۱۹۸ھ تا ۱۷۸۳ء) اور اس کے تین سرداروں نے حیدرآباد (سندھ)، میرپور خاص اور خیرپور میں اپنی ریاستیں قائم کر لیں۔ ان حکمرانوں کو میرانِ سندھ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انگریزوں کی نظر ایک مدت سے اس علاقے پر تھی۔ ۱۸۰۹ء میں انہوں نے میروں سے ایک معاہدہ کیا، جس کی رو سے انہیں دریاے سندھ کے راستے اپنا مال تجارت گزارنے کی اجازت مل گئی اور انگریزوں نے وعدہ کیا کہ وہ نہ تو سندھ میں فوجی سازوسامان لائیں گے، نہ یہاں کوئی فوجی کارروائی کریں گے۔ ۱۸۳۸ء میں انگریزوں نے اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی فوج سندھ کے راستے

افغانستان بھیجی۔ امیران سندھ نے جنگ افغانستان کے دوران میں نہ صرف ان کی فوجی نقل و حرکت میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی بلکہ مالی اعانت بھی کی۔ اس احسان کا بدلہ انھیں یہ ملا کہ ۱۸۴۳ء میں چند ناواجب مطالبات کی آڑ میں چارلس نیپئر نے زبردستی سندھ پر چڑھائی کر دی۔ رئیس خیرپور نے اپنے بھائی بندوں کو چھوڑ کر انگریزوں کی معاونت کی تھی، چنانچہ اسے ایک مختصر سے علاقے کی دیسی ریاست کا حکمران بنا دیا گیا اور باقی سارا سندھ کمپنی کی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ انگریزوں نے ملک گیری کے سلسلے میں شاید اس سے زیادہ مذموم اور مجرمانہ حرکت کبھی نہ کی ہو اور اس کا اعتراف وہ خود بھی کرتے ہیں۔ ۱۸۴۷ء میں یہ علاقہ صوبۂ بمبئی سے ملحق کر دیا گیا۔

پنجاب: دہلی کی فتح کے بعد انگریزوں نے دریائے جمنا اور ستلج کے درمیانی علاقے کو زیر تصرف لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ان دنوں پنجاب پر رنجیت سنگھ حکومت کر رہا تھا اور کشمیر، بہاول پور، ڈیرہ جات، ہزارہ اور پشاور کے علاقے اس کے قبضے میں آ چکے تھے۔ ۱۸۰۹ء میں عہد نامۂ امرتسر کی رو سے دریائے ستلج انگریزوں اور سکھوں کی درمیانی سرحد قرار پایا۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کے مرتے ہی سکھ فوج بے قابو ہو گئی۔ چند سال کے اندر اندر اس نے چار حکمرانوں کو گدی پر بٹھایا۔ چوتھا راجا رنجیت سنگھ کا نابالغ بیٹا دلیپ سنگھ تھا، جس کی سرپرست اس کی ماں جنداں اور وزیر لال سنگھ نے فوج کا زور توڑنے کے لیے انگریزوں سے لڑائی چھیڑ دی۔ مدکی، سبراؤں اور فیروز شاہ کے مقامات پر یکے بعد دیگرے شکستیں کھانے کے بعد ۱۸۴۶ء میں سکھوں کو معاہدۂ لاہور پر دستخط کرنے پڑے، جس کی رو سے انھوں نے ستلج اور بیاس کا درمیانی علاقہ (جالندھر دوآب) انگریزوں کے حوالے کر دیا اور بھاری تاوان دینے کا وعدہ کیا۔ یہ تاوان جموں اور کشمیر کا صوبہ گلاب سنگھ ڈوگرا کے ہاتھ فروخت کر کے ادا کیا گیا۔ لڑائی کے بعد سکھوں میں انتقام لینے کا جوش پیدا ہوا۔ ادھر دربار لاہور میں جو انگریز مشیر مقرر ہوا تھا اس نے کاروبار حکومت میں بے جا دخل دے کر اس جوش کو اور بھڑکا دیا۔ ملتان کے صوبیدار مول راج نے دو انگریزوں کو قتل کر کے بغاوت کا آغاز کیا اور پھر یہ آگ پورے صوبے میں پھیل گئی۔ گجرات اور چیلیانوالہ کی خونریز لڑائیوں نے سکھوں کی فوجی قوت ختم کر کے رکھ دی اور ۱۸۴۹ء میں پنجاب اور ملحقہ سرحدی علاقے انگریزوں کی عملداری میں آ گئے۔

برصغیر پر انگریزوں کا تسلط: اس طرح ایک ایک قوت مجروح ہو کر میدان سے ہٹتی گئی، تاآنکہ انیسویں صدی کے وسط تک انگریز اپنے سیاسی جوڑ توڑ اور اعلیٰ و منظم حربی قوت کے سہارے اور مقامی ریاستوں کی کمزوری اور نااتفاقی اور ان کے حکام کی خود غرضی، عیش کوشی اور ہوس جاہ و زر کی بدولت پورے برصغیر پر مسلط ہو گئے۔ جو ملکی گدیاں برائے نام باقی رہ گئیں وہ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلیوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ آخری مغل فرمانروا بھی انہیں میں شامل تھے۔ جن قوتوں نے انگریزوں کو سہارا دے کر آگے بڑھایا تھا، وہ بھی ان کی زد سے نہ بچیں، مثلاً نظام اور مرہٹے، چنانچہ یہ لوگ یا تو بالکل مٹ گئے، یا انگریزوں کے اجیر ہو کر رہ گئے۔

مسلمانوں کے ہاتھ سے سلطنت، تفوق، قیادت، خوشحالی، سب کچھ جاتا رہا۔ نئی حکومت سے بیزاری ان کے لیے فطری تھی۔ اسلامیت اور سلطنت کے احیا کے لیے ارباب تخت و عساکر سے کچھ کرنے کی امید باقی نہیں رہی تھی، اس لیے کہ تمام امرا و

ہوئے انگریزوں سے وابستہ ہو چکے تھے؛ لہٰذا اب عوام کو براہ راست یہ فرض ادا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ۔

فرائضی تحریک: اس سلسلے کی سب سے پہلی تحریک، جو بنگال سے شروع ہوئی، فرائضی تحریک کے نام سے مشہور ہے ۔ ابتدا میں یہ صرف اصلاح عقائد و عمل تک محدود تھی اور اس کے بانی حاجی شریعت اللہ عمر بھر ان مشرکانہ عقیدوں اور غیر اسلامی رسموں کی مذمت کرتے رہے جنہوں نے اسلامی معاشرے میں راہ پا کر اسے کھوکھلا کر دیا تھا ۔ ان کے بیٹے مولوی محمد محسن (دودھو میاں) کے زمانے میں اس تحریک نے سیاسی رنگ اختیار کیا ۔ دودھو میاں نے چھوٹے چھوٹے مسلمان کاشتکاروں کو ہندو زمینداروں کے مظالم سے چھٹکارا دلانے کے لیے انہیں منظم کیا اور بنگال کے مختلف اضلاع میں ایک گونہ متوازی حکومت کی داغ بیل ڈال دی ۔ بدقسمتی سے غرض پرستوں کی دراندازیوں کے باعث یہ تحریک پروان نہ چڑھ سکی (تفصیل کے لیے رک بہ فرائضی تحریک) ۔

سیّد احمد شہید کی تحریک: اصلاح و جہاد کی دوسری نمایاں تحریک وہ تھی جس کا علم سیّد احمد بریلوی نے بلند کیا ۔ مسلمانوں میں مشرکانہ رسوم و عقائد اور بدعات کا قلع قمع اور برصغیر میں آزاد اسلامی حکومت کا قیام ان کا مطمح نظر تھا ۔ انہوں نے تھوڑی ہی مدت میں شاہ عبدالحیؒ اور شاہ اسمٰعیلؒ جیسے مجاہدین اسلام و علمبرداران حریت کی ایک ایسی جماعت پیدا کر لی جو اپنے نصب العین کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کو اپنا دینی فرض جانتی تھی ۔ افسوس کہ یہ تحریک بھی خاص موانع کے باعث مطلوبہ نتائج پیدا نہ کر سکی (رک بہ احمد شہید، سیّد؛ اسمٰعیل شہید، شاہ) ۔ سیّد صاحب اور ان کے رفقا ۱۸۳۱ء میں سکھوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے ۔ ان کی جماعت کے بقیۃ السیف افراد سرحد آزاد ہی میں مقیم رہے اور غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے مسلمانان ہند کو برابر یاد دلاتے رہے کہ مسلمان کا نصب العین آزاد اسلامی حکومت کی بحالی کے سوا کچھ نہیں ۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ خونیں: سید احمد بریلویؒ کی شہادت کے بعد ہندوستان میں مختلف کارکن انگریزی حکومت کے خلاف خفیہ خفیہ ایک منظم انقلاب کا سروسامان کر رہے تھے کہ اچانک کمپنی کی فوج میں وہ واقعہ پیش آ گیا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ عظیم کی شکل اختیار کر لی اور قومی کارکنوں کو اپنی تیاری کی تکمیل کا انتظار کیے بغیر جنگ آزادی میں شریک ہونا پڑا ۔ ڈھونڈو پنتھ عرف نانا صاحب اور جھانسی کی رانی لکشمی بائی جیسے غیر مسلم زعما بھی اس میں شامل تھے، لیکن انہیں اپنی سلطنتیں چھن جانے کا رنج تھا ۔ مسلمان کارکنوں کے سامنے اسلامی حکومت کی بحالی اور ملک میں اسلامیت کے احیا کے سوا کوئی ذاتی غرض نہ تھی ۔ ان میں ممتاز ترین مولانا احمد اللہ مدراسی اور مولوی عظیم اللہ خان تھے ۔ اول الذکر نے ایک دوست نما تعلقہ دار کے ہاتھوں شہادت پائی اور آخر الذکر نے ہنگامے کے بعد روپوشی اختیار کر لی اور غالباً ۱۸۵۹ء میں وفات پائی ۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اگرچہ فوجی سپاہی پیش پیش تھے، لیکن عام شہریوں (بالخصوص مسلمانوں) نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ بحیثیت مجموعی یہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی طرف سے نئے حکمرانوں کو ملک سے نکال دینے کی مشترکہ اور بھرپور کوشش تھی ۔ اس کی ایک وجہ تو سیاسی تھی ۔ لارڈ ڈلہوزی نے انگریزی مقبوضات میں

اندماد هند اضافہ کر کے سینہ زوری اور بے آئینی کا ثبوت دیا تھا، جس سے ہر طرف بدگمانی اور نفرت پھیل گئی۔ اودھ، ستارہ، جھانسی وغیرہ کا الحاق انگریزی سلطنت میں اسی نے کیا تھا۔ علاوہ ازیں اس نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ بہادر شاہ ظفر کی وفات کے بعد مغل بادشاہت ختم کر دی جائے گی اور اس کے جانشین لال قلعہ خالی کر کے مہرولی چلے جائیں گے۔ اپنے سیاسی اقتدار کی آخری علامت نابید ہوتے دیکھ کر مسلمانوں کو بہت رنج ہوا۔ دوسری وجہ اقتصادی اور معاشرتی تھی۔ انگریزوں نے ایک طرف تو جاگیریں ضبط کر کے ملک کے خوشحال طبقے کو معاشی بحران میں مبتلا کر دیا اور دوسری طرف اپنی درآمدات میں اضافہ کرنے کی غرض سے مقامی صنعتوں کو تباہ اور مفلوج کر کے رکھ دیا۔ تیسرا سبب یہ تھا کہ عیسائی مبلغوں نے حکومت کی پشت پناہی میں تمام مذاہب کی تضحیک کرنا شروع کر دی اور عیسائیت کو فروغ دینے کے لیے ترغیب، تحریص اور ترہیب کے حربے استعمال کیے۔ چوتھے انتظامی اصلاحات کی وجہ سے قدیم طرز زندگی میں تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں جو لوگوں کو قبول نہ تھیں۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ لارڈ کیننگ کے General Services Enlistment Act نے فوج میں بے چینی پھیلا دی۔ ان سے بیرون ملک خدمات کا حلف لیا جانے لگا اور اس کے عوض فالتو عوضانہ دینے سے انکار کر دیا۔ جن فوجیوں نے صدائے احتجاج بلند کی، ان پر انتہائی سختی کی گئی اور بعض مقامات پر انہیں گولی سے اڑا دیا گیا۔ فوجی بغاوت کا فوری سبب یہ تھا کہ فوج کو ایسے کارتوسوں کے استعمال کا حکم دیا گیا، جن پر چربی چڑھی ہوتی تھی اور انہیں چلانے سے قبل چربی کی جھلی کو دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا۔ ۹ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے کچھ سپاہیوں کو یہ کارتوس استعمال نہ کرنے کی پاداش میں دس دس سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ ان کے ساتھیوں نے اگلی صبح بغاوت کر کے جو انگریز افسر ہاتھ آیا اسے قتل کر دیا۔ تقریباً پانچ ہزار سپاہی دہلی پہنچ گئے اور ۱۱ مئی کو بہادر شاہ ظفر کی شہنشاہی کا اعلان کر دیا۔ کئی مسلمان سردار، جن میں بریلی کا نامور سالار بخت خان (زکۃ بان) ممتاز ترین تھا، بہادر شاہ کے ساتھ مل گئے۔ ۲۰ ستمبر کو انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور بادشاہ کو، جو ہمایوں کے مقبرے میں پناہ گزیں تھا، گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا۔ لکھنؤ میں مجاہدین کی قیادت مولوی احمد اللہ نے کی۔ ۲۱ مارچ ۱۸۵۸ء کو انگریز دوبارہ علاقۂ اودھ پر قابض ہو گئے۔ نانا صاحب نے مولوی عظیم اللہ خان اور تانتیا ٹوپی کی معیت میں کانپور سے مقابلے کا علم بلند کیا، مگر ہیولاک نے انہیں شکست دی۔ اسی طرح ہندوستان کے شمالی اور وسطی علاقوں میں جو شورشیں ہوئیں وہ ۱۸۵۸ء کے آخر تک فرو ہو گئیں۔

تحریک انقلاب کی ناکامی کے کئی اسباب تھے: ہندوستانیوں میں تنظیم، اتحاد اور منصوبہ بندی کا فقدان تھا۔ ان کے پاس اسلحہ بھی مقابلۃً ناقص تھے۔ ڈاک اور تار جیسے اہم وسائل اطلاعات انگریزوں کے قبضے میں تھے، جن کی وجہ سے وہ ہر محاذ کے بارے میں باخبر رہتے تھے۔ انقلابیوں کو اعلیٰ درجے کے جرنیل بھی میسر نہ تھے۔ وہ ہر جگہ لوگوں کو اپنے ساتھ نہ ملا سکے، بلکہ اکثر مقامات پر خود مقامی رؤسا نے انگریزوں کی حمایت کی۔ اکثر ہندوستانی ریاستوں، مثلاً گوالیار، حیدر آباد، نیپال اور پنجاب کے سکھوں نے ان کی پوری مدد کی اور افغانستان کے امیر دوست محمد نے بھی اس موقع پر انہیں تنگ کرنے سے اجتناب کیا۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ خونیں اپنی ناکامی کے

باوجود بہت اہم ہے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ کمپنی کی گرفت ملک پر کمزور ہے اور حکمرانوں کو اپنے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۸۵۸ء نے کمپنی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ہندوستان براہ راست ملکۂ انگلستان کی عملداری میں شامل کر لیا گیا۔ لارڈ کیننگ پہلا وائسرائے مقرر ہوا؛ برطانوی مجلس وزرا میں وزیر مملکت برائے ہندوستان کا تقرر عمل میں آیا، جو پندرہ ارکان کی مجلس مشاورت کا سربراہ تھا اور ملکہ کے اعلان میں مقامی باشندوں کے جان و مال اور حقوق کی پوری نگہداشت کا یقین دلایا گیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کو بالخصوص انگریزوں کے عتاب کا شکار ہونا پڑا۔ ان کی املاک ضبط ہوئیں اور اوقاف چھین لیے گئے۔ انہیں ملازمتوں سے علیحدہ رکھا گیا۔ معاشی ترقی کی تمام راہیں ان پر بند کر دی گئیں۔ ہزاروں نے پھانسیاں پائیں، میدان جنگ میں ہلاک ہو گئے اور سینکڑوں کو کالے پانی بھیج دیا گیا۔ مسلمانوں کی برتری کا زمانہ ختم ہوا۔ ان میں خوف، بددلی اور مایوسی پھیل گئی۔ ان کے مقابلے میں ہندوؤں نے بہت جلد حالات سے سمجھوتا کر لیا اور وہ تعلیم، تجارت اور ملازمتوں میں ترقی کرنے لگے۔

مسلمانان ہند کے احیا کی تحریکیں: حالات کی انتہائی ناسازگاری کے باوجود مسلمان رہنما اس کوشش میں لگے رہے کہ عوام کو بہتر مسلمان بنا کر منظم کر دیں تاکہ وہ اپنی زائل شدہ حیثیت دوبارہ حاصل کر لیں۔ اس سلسلے میں مختلف نوعیت کی متعدد تحریکیں جاری ہوئیں، مثلاً (۱) تبلیغی، جس کے علم بردار مولوی کرامت علی جونپوری تھے۔ انہوں نے مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی مذہبی بیداری کے لیے ان تھک کوششیں کیں (رک بہ کرامت علی)؛ (۲) دینی تعلیم، جس کی داغ بیل دارالعلوم دیوبند کی شکل میں پڑی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی اس کے قائد تھے؛ (۳) سیاسی، جسے عام طور پر وہابی تحریک کہا جاتا ہے۔ یہ تحریک سید احمد بریلویؒ کے خلفا و مریدین نے منظم کی۔ اس کی غرض یہ تھی کہ ہندوستان میں دعوت و جہاد کا سلسلہ جاری رہے تاکہ یہاں سے روپیہ اور مجاہدین برابر سرحد آزاد میں ستھانہ کے مقام پر ان کے مرکز میں پہنچتے رہیں۔ سب سے زیادہ قربانیاں اسی جماعت کو دینا پڑیں۔

سر سید کی تعلیمی تحریک: مسلمانوں کے سامنے ملکی و ملی مقاصد کے لیے غیر مسلموں سے اتحاد اور ان کے ساتھ مل کر سعی و جد و جہد کی صورت اس لیے باقی نہ رہی تھی کہ ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ انگریزوں کے آغاز تسلط ہی میں ان کے ساتھ ہو گیا تھا۔ سکھوں اور مرہٹوں نے اپنی اغراض کے لیے فرقہ پرستی کی جو آگ بھڑکائی تھی وہ ملک میں شدید تفرقے کا باعث بن گئی، جس سے انگریزوں کے لیے قیام و استحکام حکومت میں بہت سہولت پیدا ہو گئی۔ جنگ آزادی کے بعد انگریزی حکومت کا مسلمانوں پر خصوصی عتاب اور مسلمانوں کا حکومت سے عدم تعاون اور اس کے مقابلے میں حکومت اور غیر مسلم عناصر کا باہمی تعاون روز روشن کی طرح آشکارا ہو چکا تھا۔ مسلمان نہ اپنے آپ کو بدلنے پر تیار تھے، نہ حالات کو بدلنے پر قادر تھے۔ ان کا مستقبل روز بروز تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ انگریزوں کے ماتحت نظم و نسق، تجارت اور انتفاع کے دوسرے وسائل پر غیر مسلم قابض ہو چکے تھے۔ اس نازک موقع پر سر سید (رک بہ احمد خان) آگے بڑھے۔ انہوں نے حکومت وقت کے ساتھ مصالحت کا رویہ اختیار کر کے مسلمانوں کی

سیاسی و معاشی بحالی کی کوشش کی۔ سر سید نے مغربی تعلیم اور خصوصاً سائنس کی اہمیت کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی، جس کے بغیر وہ نظم و نسق ملک میں اپنی جگہ لینے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے اہل نہ بن سکتے تھے۔ ان کے رفقائے کار میں محسن الملک، وقارالملک، مولوی چراغ علی، شبلی نعمانی، مولوی نذیر احمد اور خواجہ الطاف حسین حالی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان مصلحین کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی، علمی، ادبی اور سیاسی احیا کی وہ ہمہ گیر تحریک وابستہ ہے جسے علی گڑھ تحریک کہتے ہیں۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں ایک سکول جاری کیا گیا، جو دو سال بعد کالج میں (اور ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی میں) تبدیل ہو گیا۔ سر سید نے ایک طرف تو انگریزوں کے دل سے مسلمانوں کے خلاف بدگمانی دور کرنے کی کوشش کی (دیکھیے رسالۂ اسباب بغاوت ہند) اور دوسری طرف مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ انگریزوں سے مغایرت چھوڑ کر ان کے طرز فکر و معاشرت کا مطالعہ کریں (دیکھیے احکام طعام اہل کتاب، وغیرہ)۔ انہوں نے ایک نئے علم الکلام کی بنیاد رکھی اور اسلام کو علوم جدیدہ سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی۔ بعض لوگوں کی مخالفت کے باوجود علی گڑھ کالج کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور جلد ہی یہ بر صغیر کے مسلمانوں کا مرکزی ادارہ بن گیا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس: سر سید کی خواہش تھی کہ مسلمان سیاسی بحثوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی تعلیمی ترقی میں کوشش کریں، چنانچہ ۱۸۸۶ء میں انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی، جسے جلد ہی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا نام دیا گیا۔ اس کے سالانہ اجلاس بڑے بڑے شہروں میں ہوتے اور مسلمانوں کے رہنما جمع ہو کر قومی اور تعلیمی ترقی کے مسائل پر غور و خوض کرتے۔ مسلم لیگ کے قیام سے پہلے یہ کانفرنس مسلمانوں کے سیاسی خیالات کے اظہار کا واحد ذریعہ تھی۔

سر سید کی تعلیمی تحریک کے اثرات بہت دور دور تک پھیلے۔ شبلی نعمانی نے، جو پہلے علی گڑھ تحریک ہی میں شامل رہے تھے، لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی اور اس کے نصاب میں مذہبی اور مغربی علوم کو سمونے کی کوشش کی۔ بنگال میں نواب عبداللطیف کی مساعی سے مسلمانوں میں مغربی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔ انگریزی تعلیم کے زیر اثر مذہب سے جو بے رخی پیدا ہونے لگی تھی اس کی اصلاح میں سید امیر علی نے بڑا کام کیا۔ ان کی نگارشات نے انگریزوں اور انگریزی زدہ لوگوں کی نگاہ میں اسلام اور اسلامی تاریخ و ثقافت کی توقیر بڑھائی۔ ۱۸۸۴ء میں انجمن حمایت اسلام، لاہور، قائم ہوئی جو اغراض و مقاصد کے اعتبار سے علی گڑھ تحریک ہی کی ایک شاخ تھی۔

ہندو تحریکیں: ہنود، خصوصاً بنگالی ہندوؤں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں سبقت کی اور دوسروں سے پہلے مغربی خیالات اور تہذیب کے زیر اثر آئے۔ انہوں نے انگریزوں کے ساتھ تعاون کیا۔ کارنوالس کے دوامی بندوبست نے ایک طرف مسلمانوں کو تباہ کیا تو دوسری طرف ہندو زمینداروں کا ایک خوشحال طبقہ پیدا کیا جو انگریزی حکومت کا حامی اور مددگار تھا۔ رفتہ رفتہ ہندوؤں پر انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کا اثر مترتب ہونے لگا۔ ان کے یہاں خیالات کا ایک نیا دھارا بہنے لگا، جس میں مغرب کی وسیع المشربی کے ساتھ مذہبی احیا کا جذبہ ملا ہوا تھا۔ اس تحریک کے بانی راجہ رام موہن رائے (۱۷۷۴ تا ۱۸۳۳ء) تھے۔ وہ سنسکرت کے

ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے بھی عالم تھے اور ان کے خیالات میں اسلام کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ وہ ایک خدا کے قائل تھے اور بت پرستی اور ذات پات کی تفریق کے خلاف تھے۔ وہ ہندوؤں میں مذہبی اور سماجی اصلاح کے حامی تھے اور دوسرے مذاہب کو بھی احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس تحریک نے آگے چل کر برہمو سماج کی شکل اختیار کی۔ کیشب چندر سین کی قیادت میں یہ تحریک خالص خدا پرستی کی تحریک ہو گئی۔ اس کی رو سے تمام مذاہب کی کتابیں یکساں طور پر مقدس تھیں۔ کیشب چندر تعلیمی اور سماجی اصلاح کے پر زور حامی تھے۔ اس کی چند شاخیں پنجاب اور سرحد میں بھی قائم ہوئیں۔ پنجاب میں سردار دیال سنگھ مجیٹھیا اس کے سرگرم حامی تھے۔ ان کی روشن خیالی اور وسیع المشربی کی یادگار دیال سنگھ کالج لاہور کی صورت میں اب بھی قائم ہے۔ اس کے بالکل برعکس جارحانہ رد عمل کے طور پر آریا سماج تحریک شروع ہوئی۔ اس کا بانی دیانند سرسوتی (۱۸۲۴ تا ۱۸۸۳ء) تھا۔ اس نے ویدوں کو ہندو دھرم کی بنیاد قرار دیا اور ہنود کو ویدوں کی پیروی کی تلقین کی۔ وہ توحید کا قائل تھا اور اسے ویدوں سے ثابت کرتا تھا اور ذات پات کے خلاف تھا۔ اس کی تعلیمات نے ہندوؤں میں ایک جارحیت پسندانہ عصبیت کی پرورش کی۔ آریا سماج تحریک ۱۸۷۵ء میں قائم ہوئی اور بہت جلد شمالی ہندوستان میں پھیل گئی۔ لالہ ہنس راج اور لالہ لاجپت رائے اس کے زبردست کارکنوں میں تھے۔ لاہور کا ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج اس تحریک کے زیر اثر قائم کیا گیا تھا۔ آریہ سماج کے بعد جنوبی ہند میں تھیاسوفیکل سوسائٹی قائم ہوئی، جس کا مقصد ہندو فلسفے اور ویدک تعلیمات کا پرچار تھا۔ اس کا اثر پڑھے لکھے ہندوؤں نے سب سے زیادہ قبول کیا اور ان کے ذہن میں ایک ایسے ہندوستان کا خاکہ بس گیا جس میں ہندوؤں کے سوا کسی اور قوم کی گنجائش نہ تھی۔ ہندو عصبیت کی اس بیداری کا برصغیر کی سیاست پر، خصوصاً ان علاقوں پر جو پر پاکستان اب مشتمل ہے، دور رس اور دیرپا اثر پڑا۔ انیسویں صدی میں ہندی اردو کا مناقشہ اسی کا شاخسانہ تھا۔ یہی طرز فکر تھا جو بعد میں ایک طرف بال گنگا دھر تلک جیسے تشدد پسند اور دوسری طرف مدن موہن مالویہ جیسے اعتدال پسند ہندو رہنماؤں کے افکار میں نمودار ہوا اور جس نے برصغیر میں صحیح قومی اتحاد کا قیام ناممکن بنا دیا۔

پاکستان کے واضح تصور سے پہلے کے واقعات:

سیاسی بیداری: مغربی تعلیم کی ترویج کے ساتھ ساتھ برصغیر میں رفتہ رفتہ سیاسی بیداری پھیلنا شروع ہوئی۔ اس کا آغاز ایک محدود اور مختصر طبقے سے ہوا، جو انگریزی تعلیم سے فیض یاب ہو کر مغربی سیاسی نظریات سے آگاہ اور متأثر تھا، عموماً خوشحال بھی تھا اور اعلیٰ ملازمتوں میں اور ملکی معاملات میں اپنے حصے کا طلبگار تھا۔ بہر حال ان لوگوں کی دولتِ برطانیہ سے وفاداری پوری طرح مستحکم تھی۔

حکومت برطانیہ نے برصغیر میں اپنی بنیادیں مضبوط کر لینے کے بعد جہاں آئینی اصلاحات جاری کرنے کا بندوبست کیا، جن کا آغاز لارڈ کیننگ کے عہد ہی میں ہو گیا تھا۔ اکثر انگریز افسر نسل و رنگ کے تعصب کی بنا پر ہندوستانیوں کو اپنے برابر اور نظم و نسق کا اہل نہیں سمجھتے تھے، تاہم ان میں بعض ایسے آزاد خیال افراد بھی موجود تھے جو ہندوستانیوں کو تھوڑے بہت آئینی حقوق دینے کے حق میں تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کا دل ہی دل میں کڑھنا

ٹھیک نہیں، لہذا ان کے لیے جی کی بھڑاس نکالنے کا انتظام ہونا چاہیے؛ چنانچہ ان کی سرپرستی میں چند ممتاز ہندو لیڈروں نے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی۔ ابتدا میں پارسی اور مسلمان عمائد بھی اس میں شامل تھے، لیکن مسلمانوں کے سب سے بڑے رہنما سر سید احمد خاں نے اپنی دور رس سیاسی بصیرت سے دیکھ لیا کہ سیاسی حقوق کے مطالبے میں یہ ہندو مسلم اشتراک مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت نہ ہو گا اس لیے کہ جو حقوق اور فوائد بھی ملیں گے ان پر ہندو اپنی کثرت تعداد، بہتر تعلیم اور قومی تنظیم کے باعث قابض ہو جائیں گے۔ سر سید کی مخالفت کا اثر یہ ہوا کہ مسلمان عموماً کانگرس سے الگ رہے اور اس زمانے میں سیاسی اعتبار سے بھی ان کی ترجمانی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہی کرتی رہی۔ ۱۸۸۰ء میں میونسپل کمیٹیوں کی تشکیل کے لیے اور ۱۸۹۲ء میں صوبائی کونسلوں کے لیے انتخاب کا طریقہ جاری ہوا تو چونکہ انتخابات مخلوط تھے اس لیے مسلمان اقلیت والے علاقوں ہی میں نہیں اکثریت والے علاقوں میں بھی بالکل بے بس ہو گئے۔ نہ حکومت ان کی حفاظت پر متوجہ ہوئی، نہ کانگرس نے ان کے حقوق کی نگہداشت کا کچھ خیال کیا، حالانکہ وہ پورے ملک کی نمائندگی کی دعویدار تھی۔ بعض مسلمان رہنماؤں نے کانگرس کے کارفرماؤں سے تلافی کی درخواستیں کیں، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا اور مسلمان اپنے تحفظ کی تدبیروں پر سرگرمی سے غور کرنے لگے۔

تقسیم بنگال، پس منظر و پیش منظر:

لارڈ کرزن کے عہد میں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر صوبۂ بنگال کی تقسیم عمل میں آئی (۱۹۰۵ء) کیونکہ صوبے کی وسعت کے باعث انتظامی حالت بہت خراب تھی، خصوصاً مشرقی بنگال میں نظم و نسق ناگفتہ بہ تھا۔ وہاں جرائم کا ارتکاب آزادی سے ہو رہا تھا، رسل و رسائل کے وسائل بری حالت میں تھے، رعایا کی تعلیم اور اقتصادی ترقی نظر انداز کی جا رہی تھی اور یہاں کی آمدنی مغربی بنگال کی ترقی پر خرچ ہو رہی تھی۔ اس تقسیم سے مشرقی بنگال اور آسام کو ملا کر ایک الگ صوبہ بنا دیا گیا، جس میں مسلمان اکثریت میں تھے۔

کمپنی کی حکومت کے زمانے ہی سے بنگالی مسلمان طرح طرح کی ناانصافیوں کا ہدف بنتے چلے آ رہے تھے۔ حکومت کے ساتھ ہی ان کی خوشحالی بھی مفقود ہو گئی۔ صنعت و تجارت کے میدان سے تو انہیں پہلے ہی نکال دیا گیا تھا، اب آہستہ آہستہ زراعت پیشہ مسلمانوں کو بھی معاشی اعتبار سے تباہ کیا جانے لگا۔ ۱۷۹۳ء کے بندوبست دوامی نے مسلمان زمینداریاں ختم کر کے رکھ دیں، مالگزاری جمع کرنے والے ہندو سرکاری ملازمین اراضی کے مالک قرار پائے اور مسلمانوں کی حیثیت مزارعین کی ہو کر رہ گئی۔ اسلامی مدارس کے لیے عہد اسلامی میں جو جاگیریں وقف تھیں، انہیں ضبط کر کے مسلمانوں کے لیے حصول تعلیم کو ناممکن بنا دیا گیا کیونکہ وہ اپنے بچوں کو سرکاری مدارس میں اپنے مذہبی رجحانات یا معاشی حالات کی بنا پر داخل نہیں کرا سکتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ۱۸۳۰ء میں فارسی کے بجائے انگریزی کو دفتری زبان بنا کر مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں کے لیے بھی نااہل بنا دیا۔ حکومت کے خاتمے پر تقریباً ایک لاکھ سپاہی بیکار ہو کر کاشتکاری پر مجبور ہوئے تھے، اب سرکاری ملازمتوں سے برطرف ہونے والے ہزاروں افراد اپنے کنبوں سمیت زمینوں پر آباد ہونے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تقسیم در تقسیم کے باعث زمین چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی اور مزارعین کے لیے اس سے پیٹ بھر اناج حاصل

کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ ہندو زمیندار اکثر شہروں میں رہتے اور ان کے گماشتے لگان اور کئی دوسرے ناواجب ٹیکس وصول کرنے کے لیے کسانوں کے ساتھ انتہائی بے رحمی سے پیش آتے۔ ان ناجائز مطالبات کو پورا کرنے کے لیے انھیں اکثر پچاس سے ساٹھ فی صد شرح سود پر ہندو مہاجنوں سے قرض لینا پڑتا تھا، جس سے وہ پوری طرح ان کے شکنجے میں جکڑے چلے گئے۔ یہی سلوک خود انگریزوں نے ان کسانوں سے روا رکھا جو ان کے لیے نیل کاشت کرتے تھے۔ اول تو انھیں اجرت ہی اتنی کم ملتی تھی جو ان کے معمولی اخراجات کی بھی متحمل نہ ہو سکتی تھی، اس پر طرہ یہ کہ اگر کوئی کاشتکار نیل کی مقررہ مقدار مہیا نہ کر سکتا تو نہ صرف اسے کوڑے لگوائے جاتے بلکہ اس کے مکان اور فصل کو بھی آگ دکھا دی جاتی۔ اسی طرح کپڑے کی تجارت کو اپنے ہاتھ میں لے کر انگریزوں نے نہایت معمولی اجرت پر مسلمان جولاہوں سے کام لینا شروع کیا اور انکار کرنے والوں کو ایسی خوفناک سزائیں دیں کہ کئی کاریگروں نے اپنے انگوٹھے کاٹ ڈالے تاکہ کام کرنے کے قابل نہ رہیں۔ بقول ولیم ہنٹر مسلمان تباہی کے کنارے پر پہنچ گئے تھے۔ اس کے برعکس ہندوؤں کو اس صوبے میں اتنی اقتصادی اور تعلیمی برتری حاصل ہو چکی تھی جسے ایک سو سال میں بھی مٹانا ممکن نہ تھا۔

تقسیم بنگال سے ہندوؤں کو نئے صوبے میں اپنی برتری اور اجارہ داری ہاتھ سے نکلتی نظر آئی تو انھوں نے اسے اپنے قومی اتحاد پر ضرب کاری قرار دیتے ہوئے سخت ناراضی کا اظہار کیا اور اس کے خلاف ایک ہندوستان گیر تحریک چلا دی۔ کانگرس نے جگہ جگہ احتجاجی جلسے کیے اور بنگالی ہندو تشدد اور دہشت پسندی پر اتر آئے۔ انھوں نے برطانوی مال کا بائیکاٹ کیا اور ایک طرف تو انگریز افسروں کو گولی کا نشانہ بنانے لگے اور دوسری طرف مسلمانوں کے ساتھ فساد پر اتر آئے۔ اس سے ہندو مسلم تعلقات بگڑنے لگے۔ مسلمانوں کا قصور صرف اتنا تھا کہ تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو قدرے نفع پہنچ رہا تھا۔ ان حالات میں مسلمانوں کو اپنی سیاسی زبوں حالی کا شدت سے احساس ہوا اور انھوں نے اپنے تحفظ کے لیے نمائندہ اداروں میں جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے عبداللہ ملک: تحریک آزادی بنگال).

مسلم لیگ کا قیام: ۱۹۰۶ء میں آغا خان کے زیر قیادت مسلمان لیڈروں کا ایک وفد شملے میں وائسرائے سے ملا اور اپنے سیاسی مطالبات پیش کیے۔ اسی سال ڈھاکے میں مسلمانان ہند کے حقوق کی حفاظت کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بانیوں میں ڈھاکے کے نواب سلیم اللہ کے علاوہ سر سید کے دو رفقا محسن الملک اور وقارالملک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس طرح ۱۸۵۷ء میں مستقل اسلامی حکومت کی بحالی کا جو خواب پریشان ہوا تھا اس کی تعبیر نو کا واضح آغاز ہو گیا۔ ۱۹۰۹ء میں مسلمانوں کو پہلی کامیابی یہ نصیب ہوئی کہ ان کی یکجہتی اور متفقہ مطالبے کے سامنے جھک کر حکومت کو تسلیم کرنا پڑا کہ کونسلوں میں مسلمانوں کے نمائندے جداگانہ انتخاب کے ذریعے چنے جائیں (منٹو۔مورلے سکیم)۔ اس وقت مسلم لیگ میں زیادہ تعداد اعتدال پسند مسلمانوں کی تھی اور ان کی مساعی اس امر پر مرکوز تھیں کہ برادران وطن سے ایسا سمجھوتا ہو جائے جو مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کے تحفظ پر مبنی ہو، تاکہ سب متحد ہو کر آزادی ملک کے لیے جد و جہد کر سکیں۔

مسلمانوں میں ہمہ گیر بیداری: اس کا

آغاز ۱۹۱۲ء سے ہوا، جس کے متعدد اسباب تھے، مثلاً (۱) تقسیم بنگال کی تنسیخ: بنگالی ہندوؤں کی خوشنودی کی خاطر ۱۹۱۲ء میں حکومت نے بنگال کی تقسیم منسوخ کر دی۔ اس سے جہاں مسلمانوں کے اندر ایک بار پھر اپنی حق تلفی اور بے چارگی کا احساس پیدا ہوا وہاں ان کی سیاست میں جوش اور سرگرمی کا عنصر بھی بڑھ گیا اور مسلم لیگ میں ان قدامت پسند لیڈروں کی جگہ جو ہمیشہ میانہ روی کی تلقین کرتے رہتے تھے، آزاد خیال رہنماؤں کو اقتدار حاصل ہو گیا۔ (۲) دنیاے اسلام کے دگرگوں حالات: یہی وہ زمانہ تھا جب اسلامی ملکیں بڑی تیزی سے اپنی آزادی اور خود مختاری سے محروم ہو رہی تھیں، (الف) ایران: انگریز اور روسی مل کر ایران کے حصے بخرے کر رہے تھے۔ ان دونوں ملکوں نے ۱۹۰۷ء میں ایک معاہدہ طے کیا، جس کے ذریعے شمالی ایران پر روس کی اور جنوبی ایران پر انگلستان کی سیادت تسلیم کی گئی۔ اس کے بعد روس نے مشہد مقدس پر گولہ باری کی، جس سے مسلمانان ہند میں بڑا اضطراب پیدا ہوا۔ (ب) طرابلس: ۱۹۱۲ء ہی میں اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا، جو سلطنت عثمانیہ کا ایک دور افتادہ علاقہ تھا۔ اطالویوں نے اہل طرابلس کو وحشیانہ مظالم کا نشانہ بنایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس حملے میں برطانیہ کا ایما بھی شامل تھا، اسی لیے انھوں نے ترکیہ کو مصر کے راستے اپنی فوجیں طرابلس بھیجنے کی اجازت نہ دی۔ انور پاشا چند رفقا سمیت بمشکل طرابلس پہنچے اور سنوسی قبائل کو منظم کر کے جنگ شروع کر دی، لیکن وسائل کی کمی کے باعث مزاحمت زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکی اور اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ کے دوران میں مسلمانان ہند سخت مضطرب رہے۔ عربوں کی مظلومی، اطالویوں کی ستمگری اور انور پاشا کی شجاعت کی کہانیاں ہر جگہ سنی جا سکتی تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال (کلکتہ)، مولانا محمد علی کے کامریڈ (کلکتہ) اور مولانا ظفر علی خان کے روزنامے زمیندار (لاہور) نے مسلمانوں کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا۔ مجاہدینِ طرابلس کے لیے چندے ہونے لگے، اٹلی کے مال کا بائیکاٹ کیا گیا اور عام مسلمانوں میں انگریزی حکومت کے خلاف جذبات شدید تر ہو گئے۔ (ج) بلقان: ابھی طرابلس کی جنگ جاری تھی کہ دولِ یورپ کے اشارے پر بلقان کی ریاستوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی اور متحد ہو کر ترکیہ پر حملہ کر دیا۔ اس پر ہندوستانی مسلمانوں نے برافروختہ ہو کر ایسے مظاہرے کیے کہ انگریزی حکومت کو بھی یہ اجازت دینی پڑی کہ وہ ترکوں کی مالی مدد کر سکتے ہیں، چنانچہ لاکھوں روپیہ جمع کر کے بھیجا گیا۔ اس کے علاوہ مولانا محمد علی نے ایک طبی وفد کا انتظام کیا جو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں زخمی ترکوں کی مرہم پٹی کرنے کے لیے بلقان گیا۔ ان دونوں جنگوں کے باعث برصغیر کے مسلمانوں کے قومی جذبے کو بڑی تقویت پہنچی اور ان میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں جنگ بلقان کا خاتمہ ہو گیا اور ریاست ہاے بلقان سے ترکیہ کا اقتدار ہمیشہ کے لیے اٹھ گیا۔ ترکوں کی اس شکست میں چونکہ برطانیہ کا بھی ہاتھ تھا اس لیے مسلمانوں میں انگریزوں کے لیے نفرت اور بھی بڑھ گئی۔ (د) مسجد مچھلی بازار (کانپور) کا واقعہ: اگست ۱۹۱۳ء میں کانپور کے عمالِ حکومت نے سڑک سیدھی کرنے کے لیے مسجد مچھلی بازار کا ایک حصہ منہدم کر دیا اور جب مسلمانوں نے احتجاج کیا تو ان پر گولی چلا دی، جس سے کئی مسلمان شہید ہو گئے۔ تمام ملک میں اس پر غم و غصہ کا اظہار ہوا۔ آخرکار لارڈ ہارڈنگ

نے اس جھگڑے کا تصفیہ کیا، لیکن مسلمان پوری طرح مطمئن نہیں ہوئے اور حکومت کے خلاف ان کی شکایات میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔

(ہ) **پہلی جنگ عظیم :** اگست ۱۹۱۴ء میں سارا یورپ جنگ عظیم کی لپیٹ میں آ گیا۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں سلطان ترکیہ نے، جو خلیفۃ المسلمین بھی تھے، جرمنی کی حمایت میں برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس سے برصغیر کے مسلمان ایک عجیب مشکل سے دو چار ہو گئے۔ ان کی ہمدردیاں ترکوں کے ساتھ تھیں اور انہیں اندیشہ تھا کہ اگر عرب و فلسطین کے مقامات مقدسہ ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر اتحادیوں کے قبضے میں آ گئے تو ان کی حرمت باقی نہ رہے گی۔ دوسری طرف وہ انگریزوں کے محکوم تھے اور ان کی جنگی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر مجبور۔ انہیں دنوں میں لندن ٹائمز نے "ترکوں کی پسند" (*The Choice of the Turks*) کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا اور اس میں ترکوں کی بڑی توہین و تذلیل کی۔ مولانا محمد علی نے اسی عنوان سے اس کا فاضلانہ جواب اپنے اخبار کامریڈ میں دیا اور ترکوں کو حق بجانب ٹھیرایا۔ حکومت نے کامریڈ کی اشاعت بند کر دی اور مولانا محمد علی اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ اگرچہ برطانوی حکومت اور اس کی تحریک پر فرانس اور روس نے دوران جنگ میں مسلمانوں کے اماکن مقدسہ کے تحفظ کا یقین دلایا تھا، لیکن اس کے باوجود ہندوستانی مسلمان سخت مضطرب تھے، کیونکہ مسلمان سپاہی ترکوں کے مقابلے میں بلا تکلف بھیجے جا رہے تھے۔ انگریزی افواج نے عراق و فلسطین پر حملہ آور ہو کر بیت المقدس فتح کر لیا اور اسے صلیبی جنگوں کا انتقام قرار دیا۔ پھر شریف مکہ کو اکسا کر ترکوں کے خلاف بغاوت کرا دی اور اس باغیانہ جنگ میں کوئی مقدس مقام محفوظ نہ رہا۔ مسلمانان ہند کی طرف سے شریف مکہ کی مذمت میں اور ترکوں کے حق میں جو آواز بھی بلند ہوتی اسے حکومت کی طرف سے بغاوت کا نام دیا جاتا۔ حکومت کا تشدد اور مسلمانوں کا دینی و قومی جذبہ بڑھتا گیا۔ علی برادران کے علاوہ کئی اور مسلمان رہنما، مثلاً مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خان قید کر دیے گئے اور اخبارات پر کڑی پابندیاں لگا دی گئیں۔ ان حالات میں کئی پرجوش مسلمان اور طلبہ ترکوں کے ساتھ مل کر جنگ کرنے کے لیے چوری چھپے ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔ مولانا محمود الحسن اور مولانا عبیداللہ سندھی کابل پہنچ کر انقلاب کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس سلسلے میں "ریشمی رومال" کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ جنگ عظیم کے دوران میں مسلمانوں کی توجہ داخلی سیاست سے ہٹ گئی تھی، لیکن اس کے باوجود چند واقعات ایسے پیش آئے جو ان کی آئینی جدو جہد کی تاریخ میں بہت ممتاز ہیں۔

(قائداعظم) محمد علی جناح کی مسلم لیگ میں شمولیت : منٹو مورلے سکیم میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ملنے کے باعث ہندو بہت برافروختہ تھے۔ ۱۹۱۰ء میں کانگرس کا سالانہ اجلاس الٰہ آباد میں ہوا تو باہمی کشیدگی دور کرنے کے لیے ہندو مسلم رہنماؤں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ مقصد یہ تھا کہ دونوں قومیں ایک مطمح نظر پر متحد ہو جائیں۔ اس سلسلے میں (قائداعظم) مسٹر جناح نے بڑی سرگرمی دکھائی، لیکن ہندو لیڈروں کی ضد کے باعث کانفرنس ناکام ہو گئی۔

مسلمان اب حوصلہ مندی کے ساتھ سیاست میں حصہ لینا چاہتے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ

کے اجلاس لکھنؤ میں (قائداعظم) مسٹر جناح کو خاص طور سے مدعو کیا گیا اور غور و خوض کے بعد مسلم لیگ نے اپنے دستور اساسی میں یہ تبدیلی کی کہ اس کا مطمح نظر ''زیر سایۂ تاج برطانیہ آئینی وسائل سے ایسا طرز حکومت خود اختیاری حاصل کرنا جو ہندوستان کے لیے موزوں'' ہو قرار پایا۔ (قائداعظم) مسٹر جناح جلد ہی مسلم لیگ کی صف اول کے رہنما بن گئے اور مسلم لیگ اور کانگرس کے مابین اہم آئینی مسائل پر مفاہمت کی کوشش کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ دسمبر ۱۹۱۶ء میں ''میثاق لکھنؤ'' کی صورت میں برآمد ہوا اور چونکہ اس معاہدے کے روح و رواں (قائداعظم) مسٹر جناح تھے، اس لیے انہیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا گیا۔ اس معاہدے کی رو سے کانگرس نے مسلمانوں کا جداگانہ حق نیابت تسلیم کر لیا، صوبائی کونسلوں اور امپیریل کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب طے پایا اور متفقہ طور پر فیصلہ ہوا کہ کسی فرقے پر اثر انداز ہونے والے کسی مسودۂ قانون یا قرار داد پر اس صورت میں کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی جب کہ فرقۂ متاثرہ کے نمائندوں کی تین چوتھائی تعداد اس کی مخالفت کرے۔ معاہدۂ لکھنؤ سے بڑی روشن امیدیں وابستہ کی گئیں اور دونوں قوموں میں صلح و تعاون کی فضا پیدا ہو گئی اور وہ متحد ہو کر ''ہوم رول'' کی تحریک میں حصہ لینے لگے۔

مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات: ملک میں سیاسی بیداری کی شدت دیکھ کر حکومت نے ۱۹۱۸ء میں مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات شائع کیں۔ ان میں لیگ اور کانگرس کا منصوبہ مسترد کر کے حکومت نے ایک دو پہلو سکیم پیش کی تھی، جس میں کچھ اختیارات عوامی نمائندوں کو تفویض کرنے کے ساتھ باقی تمام اختیارات گورنر اور اس کی انتظامی کونسل کے ہاتھ میں دے دیے گئے، نیز گورنر کو قانون ساز اسمبلی سے مشورہ کیے بغیر کوئی قانون نافذ کرنے کا بھی اختیار دے دیا گیا۔ ملک میں عام بے اطمینانی اور سیاسی تناؤ نقطۂ عروج پر جا پہنچا۔ اصلاحات عملی طور پر ناکام ہو گئیں اور حکومت نے جبر و تشدد شروع کر دیا۔

رولٹ ایکٹ: حکومت کی رائے کے مطابق ملک میں دہشت انگیزی کی تحریک ازسر نو تقویت پکڑنے لگی تھی۔ اس کے سد باب کے لیے جسٹس رولٹ کے زیر سرکردگی ایک کمیشن بنایا گیا، جس کی رپورٹ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مارچ ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ پیش ہوا۔ اس کی رو سے کسی شخص کو بغیر وارنٹ گرفتار کیا جا سکتا تھا، بغیر سماعت کے جیل بھیجا جا سکتا تھا اور صفائی پیش کیے بغیر خفیہ طور پر مقدمہ چلایا جا سکتا تھا۔ (قائداعظم) مسٹر جناح نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں اس کی شدید مخالفت کی اور جب یہ قانون منظور ہو گیا تو بطور احتجاج کونسل سے استعفا دے دیا۔ یہ تو آئینی احتجاج تھا۔ اس کے مقابلے میں گاندھی جی نے ایک منظم احتجاج کا منصوبہ بنایا اور ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو یوم ستیا گرہ مقرر کیا۔ اس دن ہڑتالیں ہوئیں، جلوس نکلے، جلسے ہوئے؛ ان میں پرجوش تقریریں کی گئیں؛ لیکن بعض مقامات پر جوشیلے مظاہرین نے لوٹ مار اور آتش زنی بھی شروع کر دی اور گاندھی جی نے گھبرا کر ۱۸ اپریل کو ستیا گرہ ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس تحریک میں جہاں ہندو مسلم اتحاد کی بے نظیر مثالیں دیکھنے میں آئیں وہاں انگریزی حکومت نے بھی اپنے جبر و استبداد کا انتہائی خوفناک نمونہ پیش کیا۔ بریگیڈیر جنرل ڈائر نے، جو امرتسر میں متعین تھا، جلسے جلوسوں پر پابندی لگا دی، لیکن عوام نے جلیانوالہ باغ میں عظیم الشان جلسہ کیا۔ باغ کے تین طرف فصیل تھی۔ ڈائر نے واحد کھلے راستے کو

بند کر کے فوج کو نہتے مجمع پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ ۳۷۹ آدمی ہلاک اور ۱۱۳۷ مجروح ہوئے۔ پنجاب کے کئی شہر فوج کے حوالے کر دیے گئے۔ چھپانے کے باوجود یہ خبر ملک بھر میں پھیل گئی، جس سے لوگوں میں حکومت کے خلاف جوش و جنون کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات:

جلیانوالہ باغ کے سانحے کا صدمہ ابھی تازہ ہی تھا کہ پہلی جنگ عظیم میں کامیابی کے بعد اتحادیوں نے ترکیہ کے ساتھ انتہائی بےدردانہ سلوک روا رکھا۔ اس سے مسلمانوں میں غیظ و غضب کی لہر دوڑ گئی۔ برطانیہ اور فرانس عربوں کے وسیع علاقوں پر قابض ہو گئے۔ سمرنا میں یونانی فوجوں کو اتار کر مسلمان آبادی کا قتل عام کیا گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سلطنت عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں نے اپنی بے بسی کے باوجود علی برادران کے زیر قیادت تحریک خلافت شروع کر دی، جس کے مطالبات یہ تھے کہ خلافت عثمانیہ برقرار رہے، مقامات مقدسہ ترکوں کی حفاظت میں رہیں اور انتقامی کارروائی کے بجائے ترکوں کی سلطنت کی حدود وہی رکھی جائیں جو قبل از جنگ تھیں۔ جب ہندوستان کے انگریز حکمرانوں نے ان مطالبات کو درخور اعتنا نہ سمجھا تو مولانا محمد علی، سید سلیمان ندوی اور سید حسین پر مشتمل ایک وفد خلافت کمیٹی کی طرف سے انگلستان بھیجا گیا تاکہ اتحادیوں پر یہ واضح کر دیا جائے کہ عرب علاقوں کو برطانیہ اور فرانس کی نگرانی میں دینے کی تجویز کو مسلمانان ہند کبھی قبول نہ کریں گے۔ وفد نے انگلستان کے علاوہ فرانس، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کا دورہ بھی کیا اور ان حکومتوں کے سربراہوں کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا، لیکن اس کا کوئی سود مند نتیجہ نہ نکلا۔ مئی ۱۹۲۰ء میں صلح نامے کا اعلان ہوا، جس کی شرائط ترکوں کے لیے مہلک تھیں، لیکن انہیں اس پر دستخط کرنا پڑے۔ ان کے تمام بیرونی مقبوضات چھن گئے، استنبول بین الاقوامی شہر قرار پایا، بحری جہاز ضبط کر لیے گئے، فضائیہ قائم کرنے پر پابندی لگانے کے علاوہ بری فوج میں بھی کمی کر دی گئی اور فوجی سکول بند کر دیے گئے۔

خلافت کمیٹی کا وفد یورپ سے ناکام لوٹا، لیکن ہندوستان میں اس کی تنظیم بڑی وسیع اور مستحکم ہو چکی تھی۔ اس کی تائید میں رائے عامہ اس قدر طاقتور اور پرزور تھی کہ جلسوں یا اخبارات میں اس کی مخالفت کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، حتیٰ کہ مسٹر گاندھی اور دوسرے ہندو لیڈروں نے بھی مسئلۂ خلافت میں اشتراکِ عمل کا ثبوت دیا اور یوں تحریکِ خلافت نے تحریکِ آزادی ہند کی بھی صورت اختیار کر لی۔

ستمبر ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے کلکتے میں کانگرس کے ایک غیر معمولی اجلاس میں ترکِ موالات یا عدم تعاون کی تجویز پیش کی، جس میں کہا گیا کہ لوگ سرکاری خطابات واپس کر دیں اور کونسلوں، عدالتوں، سرکاری کالجوں، نیز عراق میں فوجی خدمات کا مقاطعہ کر دیں۔ دسمبر میں ناگپور کے اجلاس میں اس تجویز کی توثیق کر دی گئی، لیکن (قائداعظم) مسٹر جناح نے ہمہ گیر عدم تعاون کو وقتی حالات میں ناممکن العمل ٹھہراتے ہوئے آئینی ذرائع اختیار کرنے پر زور دیا اور کانگرس سے علیحدہ ہو گئے۔ ناگپور کے فیصلوں پر عمل شروع ہو گیا۔ گاندھی جی اور علی برادران میں سمجھوتے کے بعد دونوں تحریکیں متحد ہو گئیں۔ ہندو مسلم تعاون نقطۂ عروج پر جا پہنچا۔ مسلمانوں نے عیدالاضحیٰ پر گائے کی قربانی بھی بند

کر دی، حتیٰ کہ ہندو رہنما گاندھی جی سے جامع مسجد دہلی میں خطاب کرایا گیا۔ اوائل جولائی ۱۹۲۱ء میں خلافت کمیٹی کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا، جس میں سلطان ترکیہ کو مسلمانانِ ہند کی وفاداری کا یقین دلایا گیا اور مسلمانوں پر انگریزی فوج میں ملازمت حرام قرار دی گئی، مصطفیٰ کمال پاشا کو، جس نے حریت پسند ترکوں کی مدد سے انقرہ میں حکومت قائم کر لی تھی، مبارک باد دی گئی اور انگریزوں کو متنبہ کیا گیا کہ اگر انہوں نے اس کے خلاف کوئی کارروائی کی تو مسلمان سول نافرمانی کریں گے اور ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر کے جمہوری حکومت قائم کر لیں گے۔ اس اجلاس کے بعد علی برادران پھر گرفتار کر لیے گئے، لیکن انگریزی حکومت کے خلاف تحریک جاری رہی۔ یہاں تک کہ ۱۷ نومبر ۱۹۲۱ء میں پرنس آف ویلز دورے کی غرض سے ہندوستان پہنچا تو پورے ملک نے ہڑتال کی صورت میں اس کا خیر مقدم کیا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قوت نے حکومت کو متزلزل کر دیا اور قریب تھا کہ انگریز اپنا رویّہ تبدیل کر لیں کہ گاندھی جی نے اپنے بعض پیروؤں کی متشددانہ کارروائیوں کے پیش نظر ۴ فروری ۱۹۲۲ء کو تحریک کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اس کا اثر تحریک خلافت پر بھی پڑا اور جب ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو ترکیہ کی نئی حکومت نے خلافت کو ختم کر دیا تو تحریک خلافت بھی خود بخود ختم ہو گئی۔

تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات میں مسلمانوں نے بڑی شاندار قربانیاں دیں۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں قید ہوئے۔ ان کی عالی شان درسگاہوں پر سخت ضرب لگی۔ سینکڑوں نے وکالت اور سرکاری ملازمت سے دستبرداری اختیار کی۔ کروڑوں روپے کی جائدادیں ترک کر دی گئیں۔ لاکھوں روپے چندے کے طور پر دیے گئے۔ پنجاب، سندھ اور سرحد کے تقریباً اٹھارہ ہزار مسلمان اپنا مال و متاع کوڑیوں کے مول بیچ کر افغانستان کو ہجرت کر گئے اور انہیں وہاں طرح طرح کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ سب قربانیاں دراصل ہندوستان کی آزادی، اسلامی سلطنتوں کی بقا اور اپنی قومی حیثیت کے تحفظ کے لیے تھیں۔

ہندو مسلم اختلاف: خلافت اور ترک موالات کی گرم جوشیاں ذرا مدھم پڑیں تو متعدد غیر مسلم عناصر تفرقہ انگیزی کے لیے بروئے کار آ گئے اور فتنہ و فساد کے دروازے کھل گئے۔ مالا بار میں موپلوں کی بغاوت کو، جو انگریزوں کے خلاف تھی، ہندوؤں نے فرقہ وارانہ حملہ قرار دیا اور مسلمانوں کے مقابلے میں جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ۱۹۲۱ء میں پنڈت مدن موہن مالویہ نے آل انڈیا ہندو مہاسبھا قائم کی، جس کا موقف یہ تھا کہ مسلمان باہر سے آئے ہیں، لہٰذا انہیں یہاں رہنا ہے تو ہندوؤں کے مطیع بن کر رہنا ہوگا؛ ہندوؤں کو چاہیے کہ اپنے آپ کو مضبوط بنائیں، سارے مسلمانوں کو ہندو بنا لیں یا انہیں ملک سے خارج کر دیں۔ مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لیے ۱۹۲۲ء میں سوامی شردھانند نے ‘‘شدھی’’ کی تحریک چلائی اور غریب اور پسماندہ مسلمانوں کی بستیوں کو اپنی سرگرمیوں کے لیے منتخب کیا۔ اس کے کارکن ایک طرف تو روپے پیسے کا لالچ دیتے اور دوسری طرف مشاہیر اسلام کی شان میں نازیبا کلمات استعمال کرتے۔ ہندوؤں کو مضبوط اور مسلمانوں کے مقابلے کے لیے تیار کرنے کے لیے لالہ لاجپت رائے نے ‘‘ہندو سنگھٹن’’ کی تحریک شروع کی۔ ان سب تحریکوں سے ہندو مسلم اتحاد ایک افسانہ ہو کر رہ گیا؛ جگہ جگہ فسادات ہونے لگے۔ پہلا بلوہ

۱۹۲۲ء میں محرم کے موقع پر ملتان میں ہوا۔ پھر دہلی، الٰہ آباد، لکھنؤ، ناگپور، جبلپور، گلبرگہ، شاہجہانپور اور کوہاٹ میں بڑے بڑے ہنگامے ہوئے۔ پھر سوامی شردھانند کے قتل کے بعد ان کی تعداد اور بڑھی اور بمبئی، پنجاب، سی پی، بنگال، بہار، یوپی، سبھی صوبے ان کی لپیٹ میں آ گئے۔ ان کی روک تھام کے لیے باہم سمجھوتے کی متعدد کوششیں کی گئیں، لیکن ہندو مہاسبھا اور منفی ذہن رکھنے والے کانگرسی رہنماؤں کے باعث کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ کانگرس کی طرف سے پھر یہ مطالبہ ہونے لگا کہ مسلمان جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہو جائیں تاکہ مخلوط انتخاب کی صورت میں وہ اپنی مرضی کے تابع مسلمان نمائندے اسمبلیوں میں بھیج سکیں۔ اسی زمانے میں مسلمانوں پر ایک نئی افتاد یہ پڑی کہ حجاز میں سلطان ابن سعود کی بادشاہت قائم ہونے کے بعد خلافت کمیٹی میں افتراق پیدا ہو گیا اور مسلمان مختلف چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں بٹ گئے۔ اس سے ہندو رہنماؤں نے خوب فائدہ اٹھایا۔

مسلم اکثریت کے علاقے: سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی حالت یوں تو سارے ملک میں زبوں تھی، لیکن جن علاقوں میں وہ اکثریت میں تھے وہاں بھی وہ انگریزی حکومت اور غیر مسلم عناصر کی ریشہ دوانیوں کے باعث اپنے جائز حقوق اور ترقی کے وسائل سے محروم ہو چکے تھے۔ بنگال کی کیفیت قبل ازیں بیان کی جا چکی ہے کہ وہاں کس طرح مسلمانوں کو معاشی اور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ رکھ کر انہیں سیاسی اعتبار سے ہندوؤں کا مطیع بنا دیا گیا تھا۔ شمال مغربی ہند کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔

پنجاب میں انگریزی دور آیا تو حکومت نے سکھوں اور ہندوؤں کی ہر طرح دلجوئی کی اور انہیں بہت سی مراعات عطا کیں۔ اس کے برعکس مسلمان، جو مدت سے سکھاشاہی کا ہدف بنتے چلے آ رہے تھے، حکومت کی بے اعتنائی کا خاص طور پر نشانہ بنے اور انہیں سرکاری ملازمتوں سے بے دخل کیا جانے لگا۔ پنجاب میں پورے برطانوی عہد میں کوئی قابل ذکر صنعت قائم نہیں ہوئی، دفتروں پر غیر مسلم چھائے رہے اور تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں رہی۔ مسلمان زیادہ تر دیہاتی اور زراعت پیشہ تھے۔ مسلمان کسان شدید محنت کے باوجود ہندو مہاجنوں کے قرض کے بوجھ تلے پسا جا رہا تھا۔ انگریزوں کی آمد سے قبل مہاجن بسا اوقات لوگوں کے بیچ بچاؤ کرنے پر شرح سود میں کمی کر دیتے اور قرضدار سے مصالحت کر لیتے تھے، لیکن ۱۸۶۶ء میں چیف کورٹ کے قیام کے بعد قرضے کے تمام مقدمات کی سماعت دیوانی عدالتوں میں ہونے لگی اور اب کسان پر عدالتی کارروائی کے اخراجات بھی آ پڑے۔ نئے قانون کی رو سے قرضدار کسان کی زمین حتیٰ کہ اس کا گھریلو سامان بھی قرق کرا سکتا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ساہوکار جھوٹے سچے بہی کھاتوں اور ناقابل برداشت شرح سود کی مدد سے کسانوں کو بے دخل کر کے ان کی اراضی کے مالک بنتے چلے گئے۔ ۱۸۹۸ء میں پنجاب میں مجلس قانون ساز قائم ہوئی، جس کے اختیارات بہت محدود تھے اور اس میں مسلمانوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ۱۹۰۹ء میں انتخاب کا طریق جاری ہوا تو مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نیابت نہ ملی اور مخلوط انتخاب کی وجہ سے کونسل میں وہ ایک بے آواز اقلیت ہو کر رہ گئے۔ جداگانہ انتخاب کا طریق منظور ہونے اور میثاق لکھنؤ میں مسلمانوں کو کونسل میں پچاس فی صد نیابت دینے کی شرط ہندوؤں پر بہت گراں گزری، چنانچہ ۱۹۲۰ء میں جب

سکھوں میں اپنی علیحدہ قومی ہستی کا شعور پیدا ہوا تو ہندوؤں نے ان کی ہر طرح تائید کی اور مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ ہندو سکھ محاذ بن گیا، جس کی خوشنودی حاصل کیے بغیر کوئی مسلمان جماعت برسر اقتدار نہ آ سکتی تھی۔

سندھ اپنی آزادی سے محروم ہونے کے بعد صوبۂ بمبئی کا حصہ چلا آ رہا تھا۔ سندھی مسلمانوں کو بھی انگریزی حکومت کا خصوصی عتاب برداشت کرنا پڑا۔ بمبئی کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں سندھ کی تعلیمی اور معاشی ترقی کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی، چنانچہ ۱۹۰۰ء تک یہاں صرف تین سرکاری ہائی سکول تھے۔ مسلمانانِ سندھ کو یہ نظر آ رہا تھا کہ اگر وہ صوبۂ بمبئی کے ساتھ ملحق رہے تو اپنی پسماندگی سے کبھی چھٹکارا نہ پا سکیں گے۔ ۱۹۱۶ء میں جب ہندو مسلم اتحاد کی لہر چلی تھی تو خود ہندوؤں نے سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کی تجویز پیش کی تھی، مگر اب انہوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی اور یہ حیلہ تراشا کہ اگر سندھ کو علیحدہ صوبہ بنایا گیا تو اس کی حکومت نظم و نسق کے اخراجات کی متحمل نہ ہو سکے گی۔

۱۹۰۱ء میں سندھ پار کے چھے اضلاع کو پنجاب سے علیحدہ کر کے شمال مغربی سرحدی صوبہ بنایا گیا، لیکن اس نئے صوبے کا نظم و نسق مرکزی حکومت کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نیا صوبہ ایسی بہت سی مراعات سے محروم ہو گیا جو یہاں کے لوگوں کو قبل ازیں حاصل تھیں۔ تحریر و تقریر کی آزادی واپس لے لی گئی اور کوشش یہ رہی کہ یہاں کے باشندے دوسرے صوبوں کے لوگوں سے الگ تھلگ رہیں۔ قبائلی علاقوں میں پولیٹکل ایجنٹوں کے ذریعے سازشوں کا جال بچھا دیا گیا اور مختلف قبائل کو ایک دوسرے سے لڑانے کا کھیل شروع ہو گیا۔ حریت پسند قبیلوں کو دبانے کے لیے انتہائی سختی اور بربریت سے کام لیا جانے لگا اور غازی ایکٹ جیسے کئی ظالمانہ قوانین نافذ کر دیے گئے۔ ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۹ء کی آئینی اصلاحات کو تمام صوبوں میں نافذ کیا گیا، لیکن صوبۂ سرحد ان سے بھی محروم رہا۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ یہاں آئینی اور نمائندہ اداروں کا قیام امن عامہ کے منافی ہے اور ہندوؤں نے اس کی پر زور تائید کی۔ ۱۹۲۲ء میں صوبے کو آئینی اصلاحات دینے کے مسئلے کی چھان بین کرنے کے لیے ایک سرکاری کمیٹی مقرر ہوئی۔ اس کی رپورٹ صوبۂ سرحد کے حق میں تھی، لیکن اسے یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا گیا کہ صوبے کی سات فی صد ہندو سکھ اقلیت اصلاحات کے خلاف ہے۔ بلوچستان کی حالت بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی اور وہ بھی ہر طرح کی آئینی اصلاحات سے محروم چلا آ رہا تھا۔

الغرض جن علاقوں میں ہندو اکثریت تھی وہاں تو ہندو رہنماؤں کا اصرار یہ تھا کہ کونسلوں کو زیادہ سے زیادہ اختیار ملیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ حکومت کے کاروبار میں شریک ہو سکیں، لیکن جہاں وہ اقلیت میں تھے وہاں وہ یا تو کونسلوں کے قیام کی مخالفت کرتے تھے، یا ان کے اختیارات پر پابندیاں عائد کرنے پر مصر ہوتے تھے اور انگریزی حکومت اکثر ان کی رائے کو مسلمانوں کے مقابلے میں ترجیح دیتی تھی۔

مسلمانوں کے مطالبات اور ہندوؤں کا سمجھوتے سے گریز: ۱۹۲۳ء کے انتخابات کے بعد مرکزی اسمبلی میں مسٹر رنگا چاریہ نے یہ قرار داد پیش کی کہ ملک کا آئینی نظام فوراً تبدیل کر دیا جائے۔ پنڈت موتی لال نہرو نے ترمیم پیش کی کہ ایک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس بلائی جائے جو ہندوستان

کے لیے کامل ذمے دار حکومت کی سفارش کرے۔ (قائداعظم) مسٹر محمد علی جناح نے اس کی تائید کی۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں آئینی سرگرمیاں اور مختلف رہنماؤں سے گفتگو شروع ہو گئی۔ مئی ۱۹۲۴ء میں مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا تو (قائداعظم) مسٹر محمد علی جناح نے بتایا کہ جس دن ہندو اور مسلمان متحد ہو جائیں گے، ملک کو نوآبادی کے درجے کی حکومت مل جائے گی۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دیں، لیکن ہندو رہنما جداگانہ انتخاب سے مسلمانوں کی دستبرداری پر اتحاد کو موقوف سمجھتے تھے۔ (قائد اعظم) مسٹر جناح نے ان کے اس حیلے کو بھی رفع کرنے کے لیے ۱۹۲۷ء میں مسلمانوں کے زعما کی ایک کانفرنس دہلی میں بلوائی اور طویل بحث کے بعد مندرجۂ ذیل شرائط وضع کیں، جن کی بنا پر مسلمان جداگانہ انتخاب ترک کرنے پر آمادہ ہو سکتے تھے: (۱) سندھ کو بمبئی سے جدا کر کے علیحدہ صوبہ بنایا جائے تاکہ یہاں کی حکومت اپنے نوے فی صد مسلمان باشندوں کے مفاد کی طرف توجہ کر سکے؛ (۲) صوبۂ سرحد اور بلوچستان میں اسی سطح اور معیار کی اصلاحات نافذ کی جائیں جو دوسرے صوبوں میں ہیں تاکہ ان علاقوں کے باشندوں سے جو ناانصافی ہوتی ہے اس کی تلافی کی جا سکے؛ (۳) پنجاب اور بنگال میں نیابت کا تناسب آبادی کے تناسب کے مطابق ہو تاکہ بنگال میں چالیس فی صد اور پنجاب میں پچاس فی صد نشستوں کے بجائے ان صوبوں کی اسمبلیوں میں مسلمانوں کو علی الترتیب چون اور چھپن فی صد نشستیں دی جائیں تاکہ انھیں وہاں واضح اکثریت حاصل ہو جائے؛ (۴) سندھ، بلوچستان اور صوبۂ سرحد میں ہندو اقلیتوں کو وہی مراعات دی جائیں جو ہندو اپنی اکثریت کے صوبوں میں مسلمان اقلیتوں کو دینے پر رضامند ہوں؛ (۵) مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نیابت ایک تہائی سے کم نہ ہو؛ (۶) طرزِ حکومت وفاقی ہو۔

یہ تجاویز انتہائی منصفانہ تھیں، لیکن ہندو جماعتیں مسلمانوں کے جداگانہ حقوق کے بارے میں کچھ کھونے مٹنے کے لیے تیار نہ تھیں، لہٰذا کانگرس کمیٹی کی طرف سے منظوری کے باوجود ہندوؤں نے مہاسبھائی لیڈر پنڈت مالویہ کے زیر قیادت ان کی سخت مخالفت کی اور مسلمانوں کے خلاف بلوے شروع کر دیے۔

سائمن کمیشن: نومبر ۱۹۲۷ء میں حکومت برطانیہ نے سر جان سائمن کی سرکردگی میں ایک کمیشن مقرر کیا، جس کی غایت یہ تھی کہ وہ ہندوستان جا کر اس امر کا جائزہ لے کہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کا کیا اثر ہوا ہے اور اس امر کی سفارش کرے کہ ہندوستان میں کس حد تک ذمے دار حکومت قائم کی جا سکتی ہے۔ اس کمیشن کے تقرر پر پورے ملک میں غم و غصہ کا اظہار کیا گیا اور اکثر جماعتوں نے اس کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مولانا محمد علی اور (قائد اعظم) مسٹر جناح بائیکاٹ کی تائید میں تھے، لیکن ہندوؤں کے رویّے کی وجہ سے مسلمانوں میں اس قدر تلخی پیدا ہو گئی تھی کہ ان کا ایک گروہ کمیشن کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو گیا۔ اس سے مسلم لیگ دو دھڑوں میں بٹ گئی: "شفیع لیگ" تعاون کے حق میں تھی اور "جناح لیگ" مقاطعے کے حق میں۔ ملک گیر مقاطعے کے باعث سائمن کمیشن اپنے مقصد میں ناکام رہا تو لارڈ برکن ہیڈ، وزیر ہند، نے جھنجھلا کر ہندوستانیوں کو چیلنج کیا کہ وہ حکومت پر تخریبی نکتہ چینی کرنے کے بجائے اپنی طرف سے دستور کی کوئی متحدہ سکیم پیش کریں۔

نہرو رپورٹ: اس چیلنج کا جواب دینے

کے لیے فروری ۱۹۲۸ء میں پہلی آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی، جس میں ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری ہندوستانی اقوام کے نمائندے شریک ہوئے۔ طے پایا کہ آئندہ دستور کا بنیادی تصور یہ ہونا چاہیے کہ ہندوستان میں کامل ذمے دار حکومت قائم ہو اور اس مسئلے کو حل کیا جائے کہ فرقہ وارانہ تناسب اور تعلقات کیا ہوں۔ دو مہینے کے اندر کانفرنس کے پچیس اجلاس ہوئے، لیکن ہندو رہنماؤں کی کٹ‌حجتی کے باعث کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، آخر گاندھی جی کی تجویز اور مولانا شوکت علی کی تائید سے ہندوستان کا دستوری خاکہ تیار کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں تشکیل دی گئی۔ نہرو کمیٹی کی رپورٹ، جس میں اس کے مسلمان رکن محمد شعیب قریشی کا اختلافی نوٹ موجود تھا، اگست ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں پیش کی گئی۔ مسلمان نمائندوں نے اس کی سخت مخالفت کی، کیونکہ اس میں ان کے تمام مطالبات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور کامل آزادی کے بجائے ہندوستان کا مطمح نظر نو آبادیاتی درجے کی حکومت قرار دینے کے علاوہ نشستوں کا تعین کیے بغیر مخلوط انتخاب اور وحدانی طرز حکومت کی سفارش کی گئی تھی۔ مولانا شوکت علی اور دوسرے مسلمان رہنماؤں کی مخالفت کے باوجود کانفرنس میں شریک ہندوؤں نے اپنی اکثریت کے بل بوتے پر یہ رپورٹ منظور کر لی۔ اس سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں بعد اور بھی بڑھ گیا اور اکثر مسلمان رہنما کانگرس سے علیحدہ ہو گئے۔

اسی سال کانگرس کے اجلاس کے ساتھ کلکتے میں آل پارٹیز کنونشن منعقد ہوا تاکہ ہندوستان کی تمام پارٹیوں کی طرف سے نہرو رپورٹ پر مہر تصدیق ثبت کی جائے۔ مولانا محمد علی اور (قائداعظم) مسٹر جناح نے اس کی سخت مخالفت کی۔ مولانا محمد علی ڈومینین سٹیٹس کے سوال پر کنونشن کو چھوڑ کر چلے گئے۔ (قائداعظم) مسٹر جناح نے مسلم لیگ کی طرف سے اس میں ترمیمات پیش کیں، جن میں اہم ترین یہ تھیں کہ مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نیابت دی جائے، پنجاب اور بنگال میں انہیں دس سال کے لیے آبادی کے تناسب سے نمائندگی حاصل رہے اور بعدازاں اگر ضرورت محسوس ہو تو اس پر نظرثانی کر لی جائے اور مرکز کے بجائے صوبوں کو اختیارات دیے جائیں تاکہ مسلمان اپنی اکثریت کے صوبوں میں حکومت خود مختاری سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ تمام ترمیمات مسترد کر دی گئیں اور رپورٹ منظور ہو گئی۔ کانگرس نے اعلان کیا کہ اگر دسمبر ۱۹۲۹ء تک اسے آئندہ دستور کی بنیاد قرار نہ دیا گیا تو آزادی کامل کے لیے سول نافرمانی شروع کر دی جائے گی۔

مسلم آل پارٹیز کانفرنس: کانگرس اور ہندوؤں سے مایوس ہو جانے کے بعد یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو مولانا محمد علی نے تمام مسلمان جماعتوں کی ایک کانفرنس دہلی میں طلب کی تاکہ مسلمانوں کے حقوق کے تعین اور تحفظ کے بارے میں تمام جماعتوں میں اتفاق رائے ہو جائے۔ کانفرنس نے نہرو رپورٹ کی پوری قوت سے مذمت کی اور تجاویز دہلی کی بنیادوں پر، لیکن مخلوط انتخاب کے ذکر کو محو کر کے، ایک طویل قرار داد مرتب کی، جس میں مسلمانوں کے شہری اور سیاسی حقوق کا احاطہ کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کے دستور اساسی میں ان کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔

مارچ ۱۹۲۹ء میں (قائداعظم) مسٹر جناح کے زیر صدارت مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ اس

میں مسلم لیگ کے رہنماؤں کا اختلاف دور ہو گیا اور شفیع کی جماعت نے اس میں شرکت کی۔ اس اجلاس میں (قائد اعظم) مسٹر جناح نے مستقبل کے ہندوستان میں مسلم انفرادیت کے تحفظ کے لیے وہ تجویز پیش کی جو "چودہ نکات" کے نام سے مشہور ہوئی اور جسے آزادی کے حصول تک مسلمانوں کے قومی مطالبات کی حیثیت حاصل رہی۔ اس میں ملک کے لیے وفاقی دستور، صوبوں کی کامل خودمختاری، صوبائی مجالس قانون ساز میں اقلیتوں کی کافی اور مؤثر نیابت اور مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی جائز نیابت کے تحفظ، مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی ایک تہائی نیابت، ہر صوبے کی کابینۂ وزارت میں مسلمانوں کی ایک تہائی نیابت، سرحد اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات کے نفاذ، سندھ کی صوبۂ بمبئی سے علیحدگی، سرکاری ملازمتوں اور ذمے دار عہدوں پر تقرر کے وقت مسلمانوں کے مناسب حصے کا لحاظ، تمام ملتوں کے لیے ضمیر و مذہب کی آزادی اور اسلامی تہذیب و تمدن اور تعلیم و زبان وغیرہ کی حفاظت و ترقی کا مطالبہ کیا گیا۔

پہلی گول میز کانفرنس: کانگرس نے مسلمانوں کے مطالبات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اپنے سابقہ اعلان پر قائم رہی۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو کانگرس نے یوم آزادی منایا اور مارچ میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ اس سلسلے میں گاندھی جی نے ۶ اپریل کو ڈانڈی کے مقام پر نمک بنا کر قانون کی خلاف ورزی کی اور مئی میں انہیں اور دوسرے بڑے بڑے کانگرسی لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسی دوران میں سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ برطانوی حکومت کے سامنے پیش کر دی۔ اس پر غور کرنے کے لیے لندن میں ہندوستان کی تمام جماعتوں اور ریاستوں کے نمائندے مدعو کیے گئے۔ کانگرس نے اس میں شرکت سے انکار کر دیا، لیکن باقی جماعتوں نے دعوت قبول کر لی۔ اس میں صرف اتنا طے ہو سکا کہ ہندوستان کی آئندہ حکومت وفاقی ہو گی، لیکن مسلمانوں کے حقوق کا مسئلہ جوں کا توں رہ گیا۔

دوسری گول میز کانفرنس: کانگرسی لیڈروں کی گرفتاری کے بعد بھی سول نافرمانی جاری رہی۔ اس دوران میں بنگال اور پنجاب میں دہشت انگیزوں کی سرگرمیاں زور پکڑ گئیں۔ حکومت نے اس تحریک کو دبانے میں خاصی سختی سے کام لیا۔ بالآخر مارچ ۱۹۳۱ء میں وائسرائے لارڈ اروِن اور گاندھی جی کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا۔ سول نافرمانی کی تحریک واپس لے لی گئی، تمام متہم گرفتار رہا کر دیے گئے اور کانگرس موسم سرما میں ہونے والی دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے پر رضامند ہو گئی۔

دوسری گول میز کانفرنس میں ہندوؤں کی ہٹ دھرمی کے باعث فرقہ وار مسئلہ پھر لاینحل ہی رہا اور عاجز آ کر مسلمان، پست اقوام، ہندوستانی عیسائی، اینگلوانڈین اور برطانوی مفاد کے نمائندوں نے مشترکہ طور پر اپنے مطالبات اور دعاوی پیش کیے، جس پر ہندو نمائندوں نے وزیر اعظم انگلستان کو فرقہ دار مسئلہ حل کرنے کا اختیار دے دیا۔

کمیونل ایوارڈ اور یونٹی کانفرنس: ہندوستانی نمائندے واپس پہنچے تو ملک میں ہر طرف بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ خصوصاً پنجاب اور بنگال میں بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی دیے جانے کے بعد سے حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ نئے وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے قانون شکن سرگرمیوں کے سدباب کے لیے متعدد آرڈی ننسوں کے ذریعے شہری آزادی پر پابندیاں عائد کر دی تھیں،

کانگرسی رہنما ٹیکس کی عدم ادائی کی تحریک شروع کر چکے تھے اور ان میں سے اکثر گرفتار کر لیے گئے تھے، مثلاً یو۔ پی میں جواہرلال نہرو اور سرحد میں عبدالغفار خان۔ گاندھی جی نے آرڈی ننسوں کی تنسیخ کا مطالبہ کیا، جسے وائسرائے نے مسترد کر دیا، چنانچہ کانگرس نے دوبارہ سول نافرمانی کا اعلان کر دیا اور ۴ جنوری ۱۹۳۲ء کو گاندھی جی اور ولبھ بھائی پٹیل وغیرہ جیل میں نظربند کر دیے گئے۔

۱۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو وزیر اعظم نے کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا، جس میں صوبائی مجالس کی حد تک نہ صرف مسلمانوں بلکہ یورپین، سکھ، اینگلوانڈین، ہندوستانی عیسائی اور پست اقوام کو بھی اپنے اپنے نمائندے جداگانہ انتخاب کے ذریعے چننے کا حق دیا گیا اور ہر قوم اور طبقے کے لیے نشستیں متعین کر دی گئیں۔

پست اقوام کی جداگانہ نیابت ہندوؤں کے لیے کسی طرح بھی قابل قبول نہ تھی، کیونکہ اس سے ان کی فیصلہ کن حیثیت پر کاری ضرب لگتی تھی؛ چنانچہ گاندھی جی نے اس کے خلاف ۲ ستمبر کو مرن برت رکھ لیا۔ اس سے اتنی ہلچل مچی اور ہندو رہنماؤں نے پست اقوام کے نمائندے ڈاکٹر امبیدکر پر اس قدر زور دیا کہ وہ اپنے مطالبے سے دستبردار ہو گئے اور حکومت نے پست اقوام کی حد تک اپنے ایوارڈ میں ترمیم کر لی۔ کمیونل ایوارڈ میں مسلمانوں کے مطالبے کو پورا نہیں کیا گیا تھا اور اس کی رو سے اگرچہ سرحد کو اصلاحات مل گئیں، لیکن انھیں بنگال میں صرف ۴۷٫۵ فی صد اور پنجاب میں ۴۹ فی صد نیابت دی گئی۔ اس کے باوجود ہندوؤں کی ہر جماعت اس کی مخالفت میں پیش پیش تھی۔ مسلمان ان کے ساتھ معقول اور منصفانہ شرائط پر سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار تھے، چنانچہ ۱۹۳۲ء کے آخر میں اختلافی مسائل کو حل کرنے کے لیے الٰہ آباد میں ایک "یونٹی کانفرنس" بلائی گئی۔ ہندو بڑی مشکل سے مسلمانوں کو مرکزی اسمبلی میں ۳۲ فی صد نشستیں دینے پر آمادہ ہوئے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ زائد نشستیں ہندوؤں کے ساتھ عیسائی اور یورپین نشستوں کو بھی کم کر کے پوری کی جائیں۔ اس پر بات چیت ٹوٹ گئی اور حکومت نے مرکز میں مسلمانوں کے لیے ۳۳⅓ فی صد نشستوں اور بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کا اعلان کر دیا۔

تیسری گول میز کانفرنس، قرطاس ابیض اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ: دسمبر ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس منعقد ہوئی، لیکن اس میں نہ صرف کانگرس بلکہ بیشتر مسلمان رہنماؤں نے بھی شرکت نہیں کی۔ بہرحال کانفرنس نے اپنا کام جاری رکھا۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں تینوں کانفرنسوں کی رودادوں پر مشتمل قرطاس ابیض شائع کیا گیا اور برطانیہ کے دونوں ایوانوں کی طرف سے منتخبہ کمیٹی نے اس کی تجاویز کے مطابق آئندہ دستور کے بارے میں غور کرنا شروع کیا۔ کمیٹی کی رپورٹ دسمبر ۱۹۳۴ء میں پارلیمنٹ کے سامنے ایک مسودۂ قانون کی شکل میں پیش ہوئی اور ۴ اگست ۱۹۳۵ء کو وہ دستور منظور ہو گیا جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نام سے مشہور ہے۔

اس قانون کی رو سے ملک کے لیے وفاقی طرز حکومت منظور کیا گیا اور مرکزی حکومت کے اقتدار کو کم کر کے صوبوں کو وسیع اختیارات دیے گئے، البتہ گورنروں کو یہ حق دیا گیا کہ اگر کسی صوبے میں اقلیتوں کی حق تلفی کی جائے تو وہ صوبائی وزرا کے احکام منسوخ کر سکتا ہے۔ کانگرس اس شرط کے خلاف تھی، کیونکہ اس طرح اسے اپنے اکثریتی صوبوں میں من مانی کارروائی کرنے کی مکمل آزادی نہیں رہتی تھی۔ مسلمانوں کو

اس قانون کے بارے میں یہ شکایت تھی کہ ان کے حقوق و مقاصد کی حفاظت کے لیے واجب التعمیل دفعات نہیں رکھی گئی تھیں بلکہ اس مسئلے کو گورنروں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ بحیثیت مجموعی اس قانون کو کسی نے پسند نہیں کیا۔ اس کا دوسرا حصہ پورے ملک میں وفاق پیدا کرنے کے بارے میں تھا، لیکن اس کا نفاذ کبھی نہ ہو سکا کیونکہ والیان ملک نے وفاق میں شامل ہونا منظور نہ کیا؛ لہٰذا مرکز اسی طرح رہا جس طرح کہ پہلے تھا۔ بہرحال کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے اس قانون کے تحت انتخابات میں حصہ لینے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

مسلمانوں کی تنظیم نو: مسلم لیگ نے اپنے اجلاس منعقدہ بمبئی (۱۹۳۶ء) میں یہ رائے ظاہر کی کہ نیا دستور اگرچہ برطانوی ہند اور ریاستوں دونوں کے لیے مضر ہے اور اس کا مقصد محض یہ ہے کہ ملک کو کبھی ذمے دار حکومت نہ ملے، تاہم حالات کا تقاضا یہ ہے کہ صوبائی خود مختار حکومتوں کے قیام کے لیے انتخابات میں حصہ لیا جائے، چنانچہ اس سلسلے میں (قائداعظم) مسٹر جناح کے زیر قیادت ایک مرکزی پارلیمنٹری بورڈ قائم کر دیا گیا۔

انتخابی مہم میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنا بڑا مشکل کام تھا، خصوصاً اس لیے کہ ان میں نہ کوئی تنظیم تھی اور نہ وہ کسی مرکز پر متحد تھے۔ اس انتشار اور لامرکزیت کا باعث دراصل وہ چھوٹی چھوٹی مسلم جماعتیں تھیں جو وقتی حالات کے تحت وجود میں آئیں اور اپنی انفرادی حیثیت سے دستبردار ہونے پر تیار نہ تھیں۔ ان میں وہ جماعتیں مسلمانوں کی تنظیم میں خاص طور پر رکاوٹ کا باعث بن رہی تھیں جو کانگرس سے منسلک تھیں۔ اس سلسلے میں وہ مسلمان رہنما بالخصوص قابل ذکر ہیں جو کانگرس کے مہاسبھائی طرز عمل کا متعدد بار تجربہ کرنے کے باوجود اس جماعت کے وفادار چلے آرہے تھے اور اپنے آپ کو ''نیشنلسٹ مسلمان'' کہتے تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ پہلے انگریز سے آزادی حاصل کر لیں پھر مسلمانوں کے حقوق کے لیے ہندوؤں سے تصفیہ ہو جائے گا۔ ان کی جماعت کی باقاعدہ تشکیل جنوری ۱۹۲۹ء میں ہوئی تھی۔ اس نے نہرو رپورٹ کی حمایت کی اور ۱۹۳۱ء کے بعد ختم ہو گئی؛ تاہم اس کے رہنما، مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، تصدق احمد شروانی، وغیرہ بدستور کانگرس کے ساتھ رہے۔

اسی زمانے میں چند اور اسلامی جماعتیں بھی وجود میں آئیں۔ پنجاب خلافت کمیٹی کے ارکان پر مشتمل ایک جماعت مجلس احرار اسلام کے نام سے قائم ہوئی اور اس نے سول نافرمانی کے زمانے میں انگریزوں کے خلاف کانگرس کا ساتھ دیا۔ ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی ختم ہوئی تو اس نے اپنی توجہ کشمیر کی طرف پھیر دی۔ ان دنوں ریاست کے خلاف وہاں کے باشندوں کا ایجی ٹیشن شروع تھا اور وہ حکومت میں حصہ لینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ احرار نے پنجاب میں اس تحریک کی قیادت سنبھال لی اور کشمیر میں جتھے بھیج بھیج کر ہزاروں کی تعداد میں اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ بالآخر ریاستی حکومت تحریک کے رہنماؤں سے بات چیت پر مجبور ہو گئی اور اس کامیابی نے احرار کو پنجاب میں بہت مقبول بنا دیا۔ اس کے بعد احرار نے تحریک ختم نبوت کا آغاز کیا اور جو جتھے کشمیر سے رہائی پا کر آئے انھیں قادیان بھیجنا شروع کر دیا۔ گورنر نے احرار کا داخلہ قادیان میں بند کر دیا تو یہ تحریک قدرے دب گئی، تاہم

اس سے عام مسلمانوں میں اس کی مقبولیت بڑھ گئی۔ اب احرار نے پنجاب میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی جد و جہد شروع کر دی، لیکن سر فضل حسین نے ان کی ہر کوشش ناکام بنا دی۔ ان کے بعد سر سکندر حیات نے ہندوؤں اور سکھوں کی مدد سے یونینسٹ پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کر لی تو احرار نے پھر جد و جہد کا آغاز کر دیا اور سکھوں کو اپنے ساتھ شریک کر کے نئے انتخابات میں حصہ لینے کا عزم کیا۔ احرار سکھ اتحاد کا قرینہ پیدا ہو رہا تھا کہ مسجد شہید گنج کا واقعہ پیش آ گیا۔ لاہور کی اس مسجد پر سکھوں کا قبضہ چلا آ رہا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے اسے اپنے گوردوارے میں شامل کرنے کے لیے حکومت سے اس کے انہدام کی اجازت چاہی، جو انہیں دے دی گئی۔ اس پر مسلمانوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور وہ مسجد پر قبضہ کرنے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں شہر سے باہر جمع ہونے لگے۔ سکھوں نے یہ صورت دیکھی تو حکومت کی مدد سے مسجد کو فوراً ڈھا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں نے بڑے وسیع پیمانے پر ایجی ٹیشن شروع کر دی اور جتھے بنا بنا کر مسجد شہید گنج کی طرف جانے لگے۔ بہت سے مسلمان فوج کی گولیوں کا نشانہ بنے اور ہزاروں قید کر لیے گئے۔ پنجاب میں جا بجا ہندو سکھ فسادات ہونے لگے۔ آخر (قائداعظم) مسٹر جناح نے لاہور آ کر ایک طرف تو ایجی ٹیشن بند کرا دی اور دوسری طرف حکومت اور سکھوں سے مسجد کی واپسی کے متعلق گفتگو شروع کی۔ آخر طے پایا کہ مسلمان آئینی طریقہ اختیار کریں اور مسجد کی بازیافت کے لیے عدالت سے رجوع کریں۔ اس دوران میں احرار بالکل الگ تھلگ رہے اگرچہ اس جماعت کی تاریخ میں مظاہروں کو ہمیشہ اہمیت رہی تھی۔ اس موقع پر جب قوم نے ان سے محاسبہ کیا تو انہوں نے اعتدال و میانہ روی پر اصرار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجلس احرار اپنی مقبولیت کھو بیٹھی اور بحیثیت جماعت اس کا رسوخ باقی نہ رہا، تاہم اس کے بعض رہنما حصول آزادی کی بڑے جوش سے حمایت کرتے رہے۔

تیسری اہم جماعت خدائی خدمت‌گاروں کی تھی، جو صوبۂ سرحد میں خان عبدالغفار خان نے ۱۹۲۹ء میں قائم کی۔ یہ جماعت ہمیشہ پوری طرح کانگرس کی ہم نوا رہی۔

۱۹۲۹ء ہی میں جمعیۃ العلمائے ہند قائم ہوئی اور نہرو رپورٹ کی منظوری کے بعد دوسری مسلم جماعتوں کے ساتھ کانگرس سے ناراض ہو گئی، مگر جب کانگرس نے آزادی کامل کی قرارداد پیش کی تو برطانوی حکومت کے خلاف تحریک کی تائید کی۔

مسلم لیگ نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا تو ان مسلم نیشنلسٹ (قوم پرست) جماعتوں کے علاوہ ایک بڑی دشواری یہ پیش آئی کہ اکثریتی صوبوں میں بھی مسلمانوں کی عنان قیادت ایسے رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی جو پارلیمنٹری بورڈ کے فیصلوں کے پابند ہونے پر رضامند نہ تھے، مثلاً پنجاب میں یونینسٹ پارٹی تھی اور بنگال میں مسٹر فضل الحق کی کرشک پرجا پارٹی۔ ان کی نظر صرف صوبائی معاملات تک محدود تھی اور وہ نئے آئین کے تحت صوبائی اختیار برتنے کے لیے بے قرار تھے۔ ان سب جماعتوں کی موجودگی میں مسلمانوں کی مرکزیت کا قائم ہونا بہت مشکل تھا، تاہم (قائد اعظم) مسٹر جناح نے پورے ملک کا دورہ کر کے جگہ جگہ مسلم لیگ کی شاخیں قائم کیں، مسلمانوں میں سرگرمی عمل پیدا کی اور انہیں بے معنی جوش و خروش کو چھوڑ کر قومی تعمیر کے لیے ٹھوس کام کرنے پر آمادہ کیا۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات: کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا، تاہم دونوں جماعتیں نئے دستور کو غیر اطمینان بخش اور ناقابل قبول ٹھیراتی رہیں۔ مسلم لیگ نے اپنا نصب العین یہ متعین کیا کہ موجودہ صوبائی خود اختیاری اور وفاقی نظام کو بدل کر جمہوری حکومتِ خود اختیاری (Democratic Self Government) قائم کی جائے اور جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو مسلم لیگ مختلف مجالس قانون ساز کے ذریعے وہ مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرے جو اہل ملک کی قومی زندگی اور ان کی فلاح و ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ دوسری طرف کانگرس نے یہ طے کیا کہ دستورِ جدید کے ماتحت انتخاب میں ضرور حصہ لیا جائے، لیکن کونسلوں میں پہنچ کر اس کے نفاذ کو بے اثر بنا دیا جائے۔ انتخابات سے پہلے مسلم لیگ اور کانگرس نے اپنے اپنے منشور شائع کیے۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے مذہبی حقوق اور اردو زبان و رسم الخط کی نگہداشت پر خاص زور دیا۔ اس منشور میں کانگرس کے ساتھ تعاون کی خاصی گنجائش موجود تھی اور (قائد اعظم) مسٹر جناح نے اپنی انتخابی تقریروں میں بھی مصالحتی لب و لہجہ برقرار رکھا البتہ تلخ تجربے کی بنا پر انھوں نے کانگرس پر یہ واضح کر دیا کہ تعاون اسی صورت میں ممکن ہوگا جب کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد جماعت تسلیم کر لیا جائے۔

انتخابات ہوے تو ہندو اکثریت کے تمام صوبوں میں کانگرس کو اس قدر کامیابی ہوئی کہ وہ ان میں کسی دوسری جماعت کی مدد کے بغیر وزارتیں بنا سکتی تھی، تاہم اس سے قبل کانگرسی رہنماؤں نے حکومت سے اس امر کی یقین دہانی چاہی کہ دستور میں اقلیتوں کے تحفظ کے لیے گورنروں کو جو اختیارات حاصل ہیں وہ برتے نہیں جائیں گے۔ شروع میں یہ مطالبہ مسترد کر دیا گیا اور ان صوبوں میں عارضی طور پر غیر کانگرسی حکومتیں قائم کر دی گئیں، لیکن جلد ہی اس اندیشے کے پیش نظر کہ کانگرس کے عدم تعاون سے ملک میں پھر سول نافرمانی نہ شروع ہو جائے، وائسرائے نے گاندھی جی کو یہ یقین دلایا کہ یہ اختیارات استعمال نہیں کیے جائیں گے؛ چنانچہ بنگال اور پنجاب کے سوا تمام صوبوں میں کانگرسی وزارتیں قائم ہو گئیں۔

صوبوں میں کانگرس راج: مسلم لیگ کی عوامی تنظیم کا آغاز دراصل اسی انتخاب سے ہوا تھا۔ تنظیم اور سرمائے کی کمی کے باعث وہ ہر نشست سے اپنا امیدوار کھڑا نہیں کر سکتی تھی، خصوصاً مسلم اکثریت کے صوبوں میں صوبائی نوعیت کی مضبوط اور منظم جماعتوں کے مقابلے میں اس کی حیثیت بہت کمزور تھی۔ اس کے باوجود ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلمان نشستوں سے مسلم لیگ کے امیدوار بھاری تعداد میں کامیاب ہوے۔ دستور کے مطابق وزارتوں میں اہم اقلیتوں کے نمائندوں کو شامل کرنا لازم تھا، لیکن اس سلسلے میں کانگرس نے مسلم لیگ کو یا تو قطعاً نظر انداز کر دیا یا اس قسم کی ناقابل قبول شرائط پیش کیں جن سے اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کا وجود ہی ختم ہو جاتا تھا؛ لہٰذا مسلم لیگ نے اکثر صوبائی مجالس میں حزب اختلاف کی نشستیں سنبھالیں۔ اسی زمانے میں جواہر لال نہرو نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں: کانگرس اور حکومت برطانیہ۔ یہ صرف مسلم لیگ ہی کے نہیں بلکہ مسلمانان ہند کے جداگانہ قومی وجود سے انکار تھا، لہٰذا (قائد اعظم) مسٹر جناح نے جواب دیا کہ نہیں، تیسری پارٹی مسلمان ہیں اور مسلم لیگ ہے اور کانگرس کو یو۔ پی میں مسلمانوں کی پانچ

نشستوں پر ہونے والے ضمنی انتخابات میں مقابلہ کرنے کا چیلنج دیا۔ انتخابات ہوئے تو کانگرس کی انتہائی کوششوں کے باوجود ہر نشست سے مسلم لیگی امیدوار کامیاب ہوا۔ اس کے بعد کانگرس نے مسلمانوں میں رابطۂ عوام (Mass Contact) کی مہم چلائی اور اس پر بڑی فراخدلی سے روپیہ صرف ہوا، لیکن مسلمان عوام میں اسے کوئی مقبولیت حاصل نہ ہوئی اور اس کے بعد جہاں بھی ضمنی انتخاب ہوئے، مسلم لیگ کامیاب رہی۔

کانگرسی وزارتیں قائم ہوتے ہی اور تلخی شروع ہو گئی اور یو۔ پی، بہار اور دوسرے ہندو اکثریتی صوبوں میں اذان پر، نماز پر، قربانی پر، محرم کے جلوس پر روک ٹوک اور مسلح غلبے کے مظاہرے کے لیے ضروری ہے ہو گئے یہاں تک کہ پولیس نے ان ہنگاموں میں لاپروائی کا ثبوت دیا اور اگر کہیں حرکت میں آئی بھی تو مسلمانوں کے خلاف۔ کانگرسی حکومت نے سرکاری عمارتوں پر کانگرس کے جھنڈے لہرائے؛ بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دیا؛ تعلیم کے میدان میں واردھا سکیم اور ودیامندر سکیم نافذ کرنے کی کوشش کی؛ اردو کو ہر شعبے سے بے دخل کیا جانے لگا؛ مختصر یہ کہ اس نے بڑے اہتمام سے مسلمانوں کو یہ محسوس کرایا کہ ان کی رائے اور مرضی کی کوئی قیمت نہیں اور انہیں اس ملک میں اکثریت کے تابع ہو کر رہنا پڑے گا۔ اس طرز عمل کا جواب ایک ہی ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو نہایت تیزی اور سرگرمی سے منظم کیا جائے، چنانچہ مسلم لیگ نے تنظیم کا کام پوری تندہی سے شروع کر دیا۔ جگہ جگہ مسلم لیگ کی شاخیں قائم ہوئیں، جلسے ہونے لگے، جلوس نکلنے لگے اور جب اپریل ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں کانگرس کی صوبائی حکومتوں کے خلاف مسلمانوں کی شکایات کی باقاعدہ تحقیقات کرنے کے لیے پیرپور کمیٹی بنائی گئی تو لیگ اور کانگرس میں پوری طرح ٹھن گئی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ جب منظر عام پر آئی اور ان مظالم اور ناانصافیوں کی تفصیل معلوم ہوئی جو کانگرسی حکومتوں نے مسلمانوں سے روا رکھی تھیں تو یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ بطور اقلیت آزاد ملک میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں۔

دوسری جنگ عظیم کا آغاز اور کانگرسی وزارتوں کا استعفا: مسلم لیگ کی تنظیمی سرگرمیاں جاری تھیں، مسلم اکثریتی صوبوں کی اسمبلیوں کے اکثر مسلمان ارکان مسلم لیگ کے رکن بن چکے تھے اور پنجاب اور بنگال کے مسلمان وزرا نے کل ہند معاملات میں مسلم لیگ کی قیادت کو تسلیم کر لیا تھا۔ مسٹر محمد علی جناح اپنے خلوص و تدبر اور اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں کی بنا پر قائد اعظم کے نام سے یاد کیے جانے لگے تھے اور مسلم لیگ کا یہ دعویٰ پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا تھا کہ مسلم لیگ ہی وہ جماعت ہے جو مسلمانان ہند کی نیابت کرتی ہے اور کانگرس کو صرف ہندوؤں کی طرف سے بولنا چاہیے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ کا آغاز ہو گیا۔ کانگرس نے حکومت برطانیہ سے مقاصد جنگ کی وضاحت چاہی اور اس میں حمایت کرنے کے لیے یہ شرط عائد کی کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزادی دی جائے گی۔ مسلم لیگ نے ایک طویل قرارداد میں اسلامی ممالک میں برطانوی پالیسی کے نقائص اور ہندوستان میں نئے آئین کے ماتحت کانگرسی حکومتوں کے قیام کے دوران میں مسلمانوں کی شکایات کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ جب تک حکومت برطانیہ اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں

کی شکایات کو دور کرنے کا وعدہ نہ کرے، مسلم لیگ جنگ یورپ میں برطانیہ کی حمایت نہیں کر سکتی ۔ اس قرار داد کی منظوری سے قبل بنگال کے وزیر اعظم مولوی فضل الحق، اور پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات برطانیہ کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کر چکے تھے، لیکن انہوں نے اپنے اعلانات کو انفرادی قرار دیتے ہوئے لیگ کے فیصلے کو تسلیم کر لیا، جس سے مسلم لیگ کا وقار بہت بڑھ گیا۔

حکومت ہند نے ملک کی مدافعت کے لیے جو سکیم تیار کی تھی وہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی تھی کہ مسلم لیگ اور کانگرس کے باہمی اختلافات دور ہو جائیں، دونوں جماعتیں صوبائی حکومتوں میں شریک کار ہوں، مرکزی ایگزکٹو کونسل میں ان کے نمائندے شامل کر لیے جائیں اور مرکز اور صوبوں کے درمیان ہم آہنگی قائم ہو جائے؛ چنانچہ وائسرائے نے ان جماعتوں کے رہنماؤں سے متعدد ملاقاتیں کیں ۔ ۱۱ ستمبر کو شاہ انگلستان کے اعلان کی رو سے وفاق کی سکیم ملتوی کر دی گئی تاکہ مسلم لیگ اور والیانِ ریاست کے لیے تعاون کی ترغیب پیدا ہو جائے ۔ مسلم لیگ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ التوا کے بجائے وفاق کو یکسر ترک کر دیا جائے ، کیونکہ اس کا نتیجہ محض یہ ہوگا کہ جمہوری اور پارلیمانی حکومت کے بھیس میں فرقۂ اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی، لہٰذا ضروری ہے کہ آئندہ آئین کے مسئلے پر از سر نو غور کیا جائے اور کوئی ایسا دستور نافذ نہ کیا جائے جسے مسلمان منظور نہ کریں ۔ ادھر کانگرس کا مطالبہ تھا کہ حکومت کی طرف سے مقاصد جنگ کی وضاحت کی جائے ، اختتام جنگ کے بعد آزادی مطلق دینے کا غیر مبہم اعلان کیا جائے ، ملک کا آئندہ دستور وضع کرنے کے لیے ایک دستور ساز اسمبلی قائم ہو، جس میں حکومت کا کوئی عمل دخل نہ ہو، اور مرکزی حکومت کے اختیارات میں ہندوستانیوں کو حصہ دیا جائے ۔ قائد اعظم نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ ایسی دستور ساز اسمبلی کے ذریعے صرف اس فرقے کی رائے سے دستور وضع کیا جائے گا جس کی ملک میں عظیم اکثریت ہے ۔ ۱۸ اکتوبر کو وائسرائے نے حکومت کی پالیسی کا اعلان کیا، جس میں بتایا گیا کہ اختتام جنگ پر ملک معظم کی حکومت ہندوستانیوں کی رائے کی روشنی میں اور ہندوستانیوں کی مختلف پارٹیوں، فرقوں اور مفاد کے نمائندوں اور والیان ملک کے مشورے اور تعاون سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی سکیم میں ترمیم کے لیے تیار ہوگی ۔ اس طرح حکومت نے کانگرس کا یہ دعوی عملی طور پر رد کر دیا کہ وہ تمام ہندوستان کی نیابت کرتی ہے ۔ کانگرس کی مجلس عاملہ نے اس بیان کی مذمت کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ وہ برطانیہ کی جنگی مساعی میں مدد نہیں دے سکتی اور وزارتوں کو حکم دیا کہ وہ مستعفی ہو جائیں۔

۱۴ نومبر ۱۹۳۹ء تک کانگرس کی تمام صوبائی حکومتوں نے استعفا دے دیا ۔ آسام میں کانگرس کی مخلوط وزارت کی جگہ سر محمد سعد اللہ کی وزارت قائم ہوئی، جس نے مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کیا ۔ سندھ میں پہلے ہی سے مسلم لیگی وزارت قائم ہو چکی تھی ۔ پنجاب اور بنگال میں غیر کانگرسی حکومتیں موجود تھیں، جن کی کابینہ کے مسلمان وزرا مسلم لیگ کے رکن تھے ۔ باقی صوبوں میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ ۹۳ کے تحت گورنروں نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

چار پانچ ماہ تک کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کی آپس میں اور وائسرائے کے ساتھ

مصالحت کے لیے گفت و شنید جاری رہی، لیکن اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ ہندو مسلم اختلافات کھل کر سامنے آ گئے ۔ کانگرس کو اپنی کل ہند نمائندہ حیثیت پر اصرار تھا ۔ وہ مسلمانوں کے سیاسی، آئینی اور اقتصادی حقوق کو جداگانہ طور پر تسلیم کرنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ تھی ۔ اس کی تمام مساعی اس نقطے پر مرکوز تھیں کہ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ ہندو اکثریت کے ہاتھ میں دے دیا جائے، یہاں تک کہ رام گڑھ کے سالانہ اجلاس میں اعلان کیا گیا کہ ہندو مسلم مسئلے کا فیصلہ صرف دستور ساز اسمبلی کرے گی ۔ دوسری طرف قائد اعظم اپنی کوشش اور تدبیر سے حکومت برطانیہ کو اس مقام تک لے آئے کہ اس نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اور اس کی سکیم پر نظر ثانی کی تجویز مان لی اور ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کو اہم اور لازمی فریق تسلیم کر لیا ۔

یوم نجات : اب کانگرس نے بڑی شد و مد سے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ مسلم لیگ فرقہ دارانہ مسئلے کو ابھار کر ملک کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے ۔ اس کے جواب میں قائد اعظم نے اعلان کیا کہ ”برطانیہ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے اور مسٹر گاندھی ہندوستان اور مسلمانوں دونوں پر ۔ ہم نہ برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے، نہ مسٹر گاندھی کو ۔ ہم ان دونوں کے اثر سے آزاد ہونا چاہتے ہیں“ ۔

۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو قائد اعظم کے زیر ہدایت مسلمانوں نے کانگرسی حکومتوں کے خاتمے پر پورے ملک میں یوم نجات منایا اور چھوٹے چھوٹے دیہات سے بڑے بڑے شہروں تک ایسے وسیع پیمانے پر اور اتنے امن و ضبط کے ساتھ مظاہرے کیے کہ یہ ثابت ہو گیا کہ ہندوستان کے مسلمان مسلم لیگ کے پرچم تلے منظم اور متحد ہو چکے ہیں اور کانگرس پر سے ان کا اعتماد اٹھ چکا ہے ۔

۱۸ ستمبر ۱۹۳۹ء کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے اپنا مطمح نظر ان الفاظ میں پوری طرح واضح کر دیا تھا : ”آزاد ہندوستان میں آزاد و خود مختار اسلام، جس میں اپنے مذہبی، سیاسی، ثقافتی، معاشرتی اور اقتصادی حقوق و مفاد کی کامل حفاظت کے اطمینان کے ساتھ فرقۂ اکثریت کے دوش بدوش مسلمان زندگی کی سرگرمیوں میں مساویانہ شرکت کریں“! لیکن کانگرس نے مسلمانوں کے جائز حقوق اور مطالبات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور ہندو مسلم تصفیے کو دستور ساز اسمبلی پر موقوف کر کے گفت و شنید کا دروازہ بند کر دیا ۔

۱۹۴۰ء کے آغاز میں قائد اعظم کا ایک بیان انگلستان کے اخبار *Time & Tide* میں شائع ہوا ۔ اس میں انھوں نے ہندوستان کی سیاسی الجھن کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ جمہوری طرز حکومت جو ایسے عناصر قوم کے تصور پر مبنی ہو جیسے انگلستان کے لوگ ہیں، ہندوستان جیسے ملکوں کے لیے بالکل مناسب نہیں ہو سکتا جن کی آبادی مختلف قوموں پر مشتمل ہو اور یہی سادہ واقعہ ہندوستان کی تمام آئینی بیماریوں کی جڑ ہے ۔ انھوں نے انگریزوں پر یہ واضح کیا کہ ہندو دھرم اور اسلام دو مختلف تہذیبوں کی نیابت کرتے ہیں اور اپنے بنیادی عقائد اور طرز زندگی میں ایک سے دوسرا اس قدر مختلف ہے جتنی کہ یورپ کی اقوام ہیں ؛ واقعہ یہ ہے کہ یہ دو مختلف قومیں ہیں ؛ لہٰذا اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستان میں ایک بڑی قوم ہے اور ایک چھوٹی قوم ہے تو جو پارلیمانی طرز حکومت اکثریت کے اصول پر مبنی ہوگا، لازماً اس کے معنی کثیرالتعداد قوم کی

حکومت کے ہوں گے ۔ یہی بات انہوں نے گاندھی جی کے ایک خط کے جواب میں لکھی : ''مجھے اس معاملے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے اور مجھے پھر کہنے دیجیے کہ ہندوستان ایک قوم نہیں اور نہ ایک ملک ہے ۔ یہ بر صغیر ہے، جس میں بہت سی قومیں ہیں اور ہندو اور مسلمان ان میں دو بڑی قومیں ہیں''۔

دو قومی نظریے کا تاریخی پس منظر :

مسلمان ہندوؤں سے قطعاً علیحدہ قوم ہیں، یہ کوئی نیا احساس نہ تھا ۔ اس دو قومی نظریے کا ایک تاریخی پس منظر ہے ۔ قائد اعظم نے ایک بار کہا تھا : ''جب ہندوستان کا پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہ رہا ۔ وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آ گئی''۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں بلکہ درحقیقت دو مختلف معاشرتی نظام ہیں ۔ زبان و ادب، فنون لطیفہ، فن تعمیر، نام و نسب، شعور اقدار و تناسب، قانون و اخلاق، رسم و رواج و روایات اور رجحانات و مقاصد، ہر لحاظ سے مسلمانوں کا اپنا انفرادی زاویۂ نگاہ اور فلسفۂ حیات ہے، جس کا سر چشمہ خدا کی کتاب قرآن مجید ہے ۔ اس کے مقابلے میں ہندو دھرم ایک بے حد لچکدار مذہب ہے ۔ اس کے پیروؤں کے عقائد میں بعد المشرقین نظر آتا ہے، لیکن اس کے معاشرتی نظام نے، جس کا تار و پود منو جی کے زمانے سے تیار ہوتا چلا آیا ہے، مختلف العقائد افراد اور گروہوں کو ہر ایسے نظام کے مقابلے میں متفق و متحد ہونے پر آمادہ کیا ہے جو اپنی جداگانہ حیثیت کو برقرار رکھنے پر تلا ہو ۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قدیم آریاؤں کی آمد کے بعد سر زمین ہند پر جس قوم نے بھی یلغار کی وہ کچھ عرصے بعد اپنی انفرادیت کھو بیٹھی ۔ صرف مسلمانوں ہی کی ایک ایسی قوم تھی، جس نے ہر زمانے میں اپنی جداگانہ قومیت کو برقرار رکھا ۔ ان کی اس انفرادیت کو مٹانے اور انہیں اپنے اندر ضم کرنے کی غرض سے ہندوؤں نے ان پر مختلف محاذوں سے حملہ کیا ۔ ایک محاذ تو میدان جنگ تھا کہ وقت آنے پر وہ اپنی تمام عسکری قوتوں کو متحد و مجتمع کر کے مسلمانوں کے مقابلے میں لے آتے تھے اور ''دھرم رکھشا'' کی خاطر باہمی عناد و مخاصمت کو یکسر نظر انداز کر دیتے تھے ۔ محمد بن قاسم، محمود غزنوی محمد غوری، بابر، اکبر، ابدالی، غرض جس نے بھی ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا آغاز یا احیا کیا، اسے اسی صورت احوال کا سامنا کرنا پڑا۔

دوسرا محاذ سیاسی تھا ۔ اسلامی ہند کی تاریخ شاہد ہے کہ بسا اوقات شکست خوردہ ہندو راجا کو مطیع کرنے کے بعد نہ صرف اسے اپنی ریاست پر قریب قریب خودمختارانہ حیثیت سے قابض رہنے دیا جاتا بلکہ مرکزی حکومت میں بھی اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا جاتا ۔ جب تک مرکزی سلطنت مستحکم رہتی، یہ راجا دائرۂ اطاعت سے قدم باہر نہ نکالتے، لیکن اسے زوال آمادہ دیکھتے ہی علم بغاوت بلند کر دیتے اور اگر کچھ عرصے کے لیے انہیں کھل کھیلنے کی مہلت مل جاتی تو مسلمان رعایا کی شامت آ جاتی ۔ ایسے حالات میں ان کی جان محفوظ رہتی، نہ ناموس اور نہ عبادت گاہوں اور مقدس کتابوں کا احترام ملحوظ رکھا جاتا؛ جان و مال کے تحفظ کی ضمانت صرف انہیں کو ملتی جو ہندو دھرم سے ناتا جوڑنے پر آمادہ ہو جاتے ۔ مغلیہ دور میں ایسی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔

اپنی سلطنت کی بقا اور استحکام کی خاطر مسلمان بادشاہ ہندوؤں کی مستقل حمایت حاصل کرنے پر مجبور تھے ۔ دور مغلیہ میں ہندوؤں کی دل دہی رفتہ

رفتہ نازبرداری کی شکل اختیار کر گئی۔ اگر یہ نازبرداری صرف حکومت کی سطح تک محدود رہتی تو شاید اتنی مہلک ثابت نہ ہوتی، لیکن ایسا نہ ہوا کہ اسے زندگی کی ہر سطح پر روا رکھا گیا۔ دینِ الٰہی اس کا نقطۂ عروج تھا۔ اکبر اپنی شخصی حکومت کو مستحکم کرنے کی غرض سے ہندو منصب داروں کی خوشنودی کی خاطر اپنے عقائد سے بھی دست بردار ہو گیا۔ حرام چیزیں حلال ہو گئیں اور حلال حرام قرار پائیں۔ ایک دوسرے کی مذہبی تقریبات میں شرکت بھائی چارے کا ثبوت سمجھی جانے لگیں۔ باہمی ازدواج نے اس اختلاط کو انتہا تک پہنچا دیا (رک بہ دین الٰہی)۔ فرق صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کی تالیف قلوب مقصود تھی اور ہندوؤں کو قرب شاہی مطلوب تھا۔ ریاست اور امیرِ ریاست کے بارے میں اس اسلامی تصور سے سر زمینِ ہند شاید کسی زمانے میں بھی آشنا نہ ہوئی تھی جو عہدِ خلفائے راشدین کے حوالے سے قائم ہوتا ہے۔ اب دین الٰہی کی بدولت سرکاری سطح پر اسلامی تعلیمات و اقدار نشانۂ تضحیک بنیں تو مسلمانوں کے مجموعی مفاد کا جو خیال ابتدائی فاتحین کے ہاں موجود تھا وہ بھی باقی نہ رہا اور دارالاسلام اور دارالحرب کے تصورات مسخ ہو گئے۔ اس میں قصور کچھ مغلوں کے منصبداری نظام کا بھی تھا، جس کا ڈھانچا ہی کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا تھا کہ عوام کی وفاداری کا مرکز اگرچہ شہنشاہ کی ذات تھی، مگر اپنے راجا یا صوبیدار کے واسطے سے؛ چنانچہ جب کسی علاقے کے حاکم کی مرکز سے ٹھن جاتی تو وہاں کی رعایا اسے ٹوکنے کے بجائے اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جاتی اور اس کے دل میں یہ خیال کبھی نہ آتا کہ وہ سیادت اعلٰی کے خلاف ہتھیار اٹھا کر بغاوت اور ملت سے غداری کی مرتکب ہو رہی ہے۔ مزید براں مسلمانوں میں مغل۔ پٹھان، ایرانی۔ تورانی اور سنی۔ شیعہ آویزشوں کے باعث اکثر بادشاہ کو مسلمان صوبیداروں کی شورشیں فرو کرنے کے لیے راجپوت راجاؤں اور ان کی فوجوں پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا؛ اسی لیے عام مسلمانوں کو ہندو آقاؤں کی ملازمت کرنے اور پھر نمک حلالی کی خاطر اپنے ہی بھائیوں پر تلوار اٹھانے میں کوئی قباحت محسوس نہ ہوتی۔ غرض ان سیاسی عوامل کے باعث ہندوستان کے عام مسلمانوں میں اپنی جداگانہ قومیت کا شعور مضمحل ہوتا جا رہا تھا اور ہندوؤں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا، چنانچہ معاشرتی اور مذہبی محاذ پر وہ بالخصوص بے حد کامیاب رہے۔

ہندوؤں کے مذہبی عقائد بڑی حد تک ان کی معاشرتی رسوم سے عبارت رہے ہیں، چنانچہ مسلمانوں کے ہزار سالہ دور حکومت میں انہوں نے حاکم قوم کے دل میں یہ بات راسخ کرنے کی پے بہ پے کوشش کی اس کی سلطنت کا استحکام اور ملک کا امن و امان اس میں مضمر ہے کہ مقامی رسوم اختیار کر کے رعایا کے دل جیت لیے جائیں۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان رفتہ رفتہ ان کی رسوم یا دوسرے الفاظ میں ان کے عقائد کو پہلے برداشت، پھر اختیار کر کے ان کے سانچے میں ڈھلتے چلے جائیں تاآنکہ حکمران اقلیت، محکوم اکثریت میں اس طرح جذب ہو جائے کہ ان میں کوئی تمیز باقی نہ رہے۔ یہ رجحان بھگتی تحریک کی شکل میں پوری طرح نمایاں ہوا۔ اگر اس سے مقصود محض اس قدر ہوتا کہ سیاسی اور معاشرتی سطح پر حاکم و محکوم میں محبت پیدا ہو اور ان کی باہمی مغایرت جاتی رہے تو غنیمت تھا، لیکن اس کے پردے میں کرشن اور کریم اور رام و رحیم کے ایک ہونے کا پرچار اس زور شور سے کیا گیا کہ عوام و خواص اور علما و صوفیہ کی ایک بڑی تعداد اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔

یہ اسلامی عقائد پر ایک کاری ضرب تھی، جس نے مسلم قومیت کی قرآنی اساس کو متزلزل کر دیا۔

اکبر اور اس کے بعد جہانگیر کے ابتدائی دورِ سلطنت میں ہندوؤں کو اس محاذ پر اتنی کامیابی نصیب ہو چکی تھی کہ کفار دار الاسلام میں احکام کفر کا برملا اجرا کرتے تھے۔ اور مسلمان احکام اسلام کا اظہار تک نہ کر سکتے تھے۔ اسلام کی بے چارگی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ کفار علی الاعلان اسلام پر طعن کرتے اور مسلمانوں کو برا کہتے۔ احکام شرعی معطل ہو چکے تھے اور مسلمان احکام اسلامی پر عمل کرنے سے عاجز تھے (تفصیل کے لیے دیکھیے مکتوبات امام ربانیؒ)۔ اس کے خلاف اولین آواز شیخ احمد سرہندیؒ (حضرت مجدد الف ثانی) نے بلند کی۔ آپ نے فرمایا: "رام کرشن وغیرہ، جو ہندوؤں کے معبود ہیں، پروردگار کی معمولی مخلوقات میں سے ہیں اور ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں۔ رام و رحمٰن کو ایک جاننا بڑی بے وقوفی ہے۔ خالق و مخلوق ایک نہیں ہوتا اور چوں بےچوں کے ساتھ متحد نہیں ہوتا"۔ آپ نے ایک طرف تو مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح کی اور ایک ایسے طریقۂ تصوف کی اشاعت پر زور دیا جس کی پیروی شرع اسلام کی پیروی تھی، دوسری طرف آپ نے خان اعظم، خان جہاں، صدر جہاں اور دوسرے اکابر سلطنت کو ہدایت دی کہ ملک میں جو خلاف شریعت احکام نافذ ہو چکے ہیں انہیں منسوخ کر کے اتباع شریعت اور ترویج سنت کا انتظام کیا جائے۔ اگرچہ جہانگیر کے اواخر عہد ہی میں بعض شرعی احکام دوبارہ نافذ ہونے لگے تھے، لیکن ان کا کامل طور پر اجرا و نفاذ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں عمل میں آیا جو حضرت مجددؒ کے فرزند شیخ محمد معصومؒ کا ارادت مند تھا۔

عالمگیر کی وفات کے بعد سلطنت اور رعایا میں جو انتشار پھیلا اس سے ہندوؤں نے ایک بار پھر فائدہ اٹھایا اور سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی اعتبار سے مسلمانوں پر چھا گئے۔ اس کا ثبوت اس خط سے ملتا ہے جو شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو لکھا تھا: "جماعت مسلمین قابل رحم ہے۔ اس وقت جو عمل و دخل سرکار پادشاہی میں باقی ہے وہ ہنود کے ہاتھ میں ہے۔ . . . اگر غلبۂ کفر معاذاللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا زمانہ نہ گزرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ ہو سکے گی۔ یہ بھی ایک بلائے عظیم ہے جس کے دفع کرنے کی قدرت بفضل خداوندی جناب کے علاوہ کسی کو میسر نہیں"۔ احمد شاہ درانی نے اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ہندوستان کا رخ کیا اور پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دی۔ اگر اس وقت مغل سلطنت کو سنبھالا دینے کے بجائے یہ فاتح افغان ہندوستان کی زمام حکومت خود تھام لیتا تو شاید اسلامی ہند کی تاریخ کا رخ بدل جاتا، لیکن ہوا یہ کہ درانی کے رخصت ہوتے ہی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا۔

اسلامی دور حکومت میں ہندو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں سے مرعوب نہ تھے بلکہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے وہ بعض اوقات ان کے مذہبی احساسات کو بھی مجروح کرنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ وہ مسلمان لشکروں کی سرداری کرتے، افغانستان جیسے خالص اسلامی صوبوں کی صوبیداری پر فائز ہوتے، بادشاہ کے مقرب ترین امیر کا درجہ حاصل کرتے، تجارت، صنعت و حرفت، زراعت اور ملازمت، غرض ہر میدان میں مسلمانوں کے دوش بدوش اپنا حصہ پاتے اور ترقی کے وسائل

سے یکساں متمتع ہوتے۔ انگریزی حکومت کے زمانۂ آغاز میں وہ بڑی بڑی ریاستوں کے خود مختار حاکم اور اسلامی ریاستوں کے بعض کلیدی عہدوں پر قابض تھے۔ مسلمانوں کی قوت کو ختم کرنے کے لیے انھوں نے بیشتر مواقع پر انگریزوں کا ساتھ دیا، چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہوئی تو نئے حاکموں نے ان سے ترجیحی سلوک روا رکھا اور زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھنے کا موقع بہم پہنچایا۔ ان کے مقابلے میں وہ مسلمانوں سے ہمیشہ بدگمان اور انھیں اپنا حریف اور رقیب سمجھتے رہے۔ مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے کچلنے کا سبب محض یہ نہ تھا کہ وہ یہاں کے سابق حاکم تھے، بلکہ یہ بھی کہ وہ دوسرے اسلامی ممالک کے ساتھ اخوت دینی کے مضبوط رشتے سے بندھے ہوئے تھے، جو کسی وقت بھی ان کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا؛ چنانچہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ برصغیر میں اسلام کو ایک فعال قوت نہ رہنے دیں۔

اس مقصد کے حصول کے لیے ایک طرف تو مسلمانوں کے لیے معاشی ترقی کی تمام راہیں بند کر دی گئیں اور دوسری طرف سرکاری ملازمین سے لے کر عیسائی مبلغین تک ہر انگریز مسلمانوں کی دل آزاری پر تل گیا۔ عربی اور فارسی کے بعد اردو کی بیخ کنی، مقدس مقامات کی بے حرمتی، اسلامی تعلیمات کی تضحیک اور اکابر دین کی توہین کے لاتعداد واقعات اس سلسلے میں بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ادھر سرکاری مدارس میں جو کتابیں داخل نصاب کی گئیں ان میں مذہبی قومیت کو تعصب اور تنگ نظری قرار دے کر وطنی قومیت کے تصور کو ابھارا گیا اور عہد اسلامی کی تاریخ کو مسخ کر کے ہندوؤں کو یہ باور کرایا کہ مسلمانوں کا عہد حکومت ان کے لیے ظلم و تشدد سے عبارت تھا اور انگریزوں کا دور رحمت و برکت کا باعث ہے۔ اس سے اکثر و بیشتر ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور بغض و عناد کے ایسے جذبات پیدا ہوئے کہ وہ انھیں اپنی انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنانے لگے۔ انگریزوں کی یہ حکمت عملی اتنی کامیاب ہوئی کہ تھوڑے ہی عرصے میں مسلمان اپنی ساری سعی و قوت محض کسب معاش یا ہندوؤں کے حملوں کی مدافعت میں صرف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس سے مسلمانوں میں نہایت شدید احساس محرومی پیدا ہوا اور حکومت کو اپنا مخالف اور اس کے ہر اقدام کو اپنے لیے مہلک سمجھنے لگے۔ حکومت اور مسلمانوں کے درمیان یہ خلیج ۱۸۵۷ء کے واقعات نے اور بھی وسیع کر دی اور جب انگریزوں نے اس ہنگامۂ خونیں کی ذمے داری مسلمانوں کے سر ڈال کر انھیں شہری حقوق تک سے محروم کرنے کی ٹھانی تو ان کی بےبسی اور بےچارگی انتہا تک پہنچ گئی۔ ایسے حالات میں انگریزی تعلیم پانے اور انگریزی معاشرت اختیار کرنے والے مسلمانوں کو اگر علما نے موردِ طعن و ہدفِ ملامت بنایا، تو اسے تعصب اور تنگ نظری قرار دینا درست نہ ہو گا۔ انگریز اور انگریز سے متعلق ہر شے سے مقاطعے کی تحریک در حقیقت ان کے جذبۂ حریت اور ”خود حفاظتی“ کی دلیل تھی یا یوں کہیے کہ انگریزی حکومت کی حکمت عملی کے خلاف اس کے سوا احتجاج کی اور کوئی صورت انھیں نظر نہ آتی تھی۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں حالت یہ تھی کہ بقول ہنٹر: ”یہ نظر آ رہا تھا کہ مستقبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کا مقام لکڑہاروں اور سقاؤں سے زیادہ نہ ہو گا“۔ اس زمانے میں سرسید نے قومی احیا کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے ایک طرف تو حکمرانوں

کر دل سے مسلمانوں کے متعلق بدگمانی پیدا کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ اپنے حالات کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں، تعلیم حاصل کریں، تجارت سنبھالیں اور درس اثنا انگریزوں سے دوستانہ تعلقات استوار کریں تاکہ حکومت کے نظم و نسق میں حصہ لینے کے اہل بن جائیں۔ ابتدا میں وہ ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے اور "دونوں قوموں کو اپنی دو آنکھوں کے مثل" سمجھتے تھے، لیکن ہندوؤں کے طرز عمل سے وہ جلد ہی دل برداشتہ ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ دو قومیں دل سے کسی کام میں شریک نہ ہوں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا، دیکھے گا"۔ ۱۸۸۳ء میں جب وائسرائے کی کونسل میں بلدیاتی حکومت کے متعلق مسودہ پیش ہوا تو سر سید نے اصرار کیا کہ مسلمانوں کی نامزدگی علیحدہ کی جائے اور اس کا سبب یہ بیان کیا کہ "ہند جیسے ملک میں جہاں مختلف نسلوں میں کوئی یکجہتی نہیں ...، جہاں جدید تعلیم نے تمام لوگوں میں مساوی ترقی نہیں کی ...، جہاں سیاسی و معاشی زندگی میں نسل و عقیدہ کے فرق اور ذات کے امتیازات کو اہمیت حاصل ہے اور یہ عناصر نظم و نسق اور ملکی فلاح سے متعلق مسائل پر اثر انداز ہوتے ہیں، عام انتخابات کے طریقے کو اختیار کرنا قرین مصلحت نہ ہو گا۔ اکثریت کامل طور پر اقلیت کے مفادات پر حاوی ہو جائے گی"۔ ۱۸۸۵ء میں آل انڈیا نیشنل کانگرس قائم ہوئی اور اس نے حکومت پر زور دیا کہ سرکاری نظم و نسق میں ہندوستانیوں کو عام امتحان کے ذریعے زیادہ سے زیادہ نمائندگی دی جائے۔ سر سید نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اس قسم کی تجاویز ایسے ممالک میں قابل عمل ہو سکتی ہیں جہاں ایک قوم آباد ہو، لیکن ہند میں جہاں دو قومیں ہندو اور مسلمان آباد ہیں، اس قسم کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کا مطلب ہندوؤں کو مسلمانوں پر مسلط کرنا ہے اور مسلمانوں کو ہدایت دی کہ انہیں ہرگز ہندوؤں کے ایسے مطالبات کی تائید نہ کرنی چاہیے، کیونکہ نیشنل کانگرس جو اس قسم کے مطالبات کرتی ہے وہ ہرگز ہند کی تمام اقوام بالخصوص مسلمانوں کی نمائندہ نہیں ہے۔ سر سید کا یہ موقف ان کی عظیم سیاسی بصیرت پر شاہد ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے قومی تشخص کے تصور کا احیا کیا۔ یہ تصور، جو دراصل مسلمانوں کے کے عقائد کا جزو تھا، لیکن جسے وہ اپنے ہزار سالہ دور حکومت میں اپنی رعایا پروری اور رواداری کے باعث نظر سے اوجھل کر چکے تھے اور جسے انگریزوں نے ہندوؤں کے تعاون سے ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی کوشش کی تھی، ایک بار پھر ابھرا۔ مسلم لیگ کا قیام اور مسلمانوں کی جداگانہ حقوق کے لیے طویل جد و جہد اسی تصور کی مرہون منت ہے۔

سر سید کی طرح مولانا محمد علی کا بھی مدت تک یہی نظریہ رہا کہ ہندوستان کی آزادی ہندوؤں اور مسلمانوں کی متفقہ جد و جہد سے حاصل ہو سکتی ہے، لیکن اس اتحاد کو شروع ہی سے انہوں نے اتحاد بربنائے ضرورت ("marriage of convenience") قرار دیا تھا، جس کی کامیابی کے لیے حب الوطنی کا پرجوش جذبہ اور آزادی کی بے پناہ تڑپ ایک ضروری شرط تھی۔ اس جذبے کے زیر اثر وہ اتنی دور نکل گئے کہ تحریک خلافت جیسی خالص اسلامی بلکہ بین المِلّی تحریک کی قیادت ایک

غیر مسلم گاندھی جی کے حوالے کر دی۔ بایں ہمہ ہندوؤں کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ ان کے منافرت انگیز رویے نے کبھی اردو کی مخالفت کا روپ دھارا اور کبھی گئو رکھشا کا۔ کسی نے مسلمانوں کو غیر ملکی حملہ آور قرار دے کر عرب لوٹ جانے کی تلقین کی اور کسی نے اس بات پر زور دیا کہ وہ اپنے مذہب، تاریخ، روایات، ثقافت، ہر شے کو ترک کر کے پراچین بھارت کے کلچر، یعنی ہندو دھرم، کو صدق دل سے اپنا لیں۔ عملاً مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم تسلیم کرنے کے باوجود ہندو ان کی جداگانہ حیثیت کو ماننے پر تیار نہ تھے۔ سیاسی پلیٹ فارم پر ہمیشہ ”ہندو مسلم بھائی بھائی“ کا نعرہ گونجا اور دونوں کو ایک ہی قوم ٹھیرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا۔ مقصد صرف ایک تھا کہ اکثریت کے بل بوتے پر حکومت کے اختیارات ہندوؤں کے ہاتھ میں رہیں اور مسلمان ان کے غلام بن کر رہیں۔ نہرو رپورٹ میں ان کے دل کی بات کھل کر سامنے آ گئی تو مولانا محمد علی جیسے کٹر کانگرسی کے سامنے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اس جماعت سے علیحدہ ہو جائیں جسے نمائندہ حیثیت دلوانے میں ان کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ ۱۹۲۸ء میں کانگرس سے علیحدگی کا اعلان کرتے ہوئے انہوں نے واشگاف الفاظ میں دو قومی نظریے کا اعلان کیا۔ آپ نے کہا: ”نسل اور مرزبوم وہی لفظ ہے جس کو بھومی اور جاتی کہتے ہیں۔ یہ دو چیزیں جانوروں کی پہچان کی ہیں، انسان کی پہچان کے لیے نہیں۔ . . . اسلام نے تیرہ سو برس ہوئے کہ رسول اللہؐ کی معرفت تمام دنیا کو بتا دیا تھا کہ دنیا کے دو ٹکڑے ہیں: ایک اسلام اور دوسرا کفر۔ . . . کفر ایک ملت ہے اور اسلام ایک ملت . . .“۔

مسلم قومیت کی بنیاد نسل و وطن پر نہیں بلکہ دین پر ہے۔ یہی بات ۱۹۱۰ء میں علامہ اقبال نے علی گڑھ کے سٹریچی ہال میں کہی تھی: ”مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری قوم کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول اشتراک زبان ہے، نہ اشتراک وطن، نہ اشتراک اغراض اقتصادی، بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکے میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے۔ . . . اسلام کا جوہر ذاتی بلا کسی آمیزش کے خاص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے، لہٰذا کیونکر ممکن ہے کہ وہ قومیت کو بھی کسی خارجی یا حسی اصول، مثلاً وطن، پر مبنی قرار دینا جائز تصور کرے . . . ۔ میں سمجھتا ہوں کہ وطن پرستی کا خیال، جو قومیت کے تصور سے پیدا ہوتا ہے، ایک طرح سے مادی شے کے تابع ہے، جو سراسر اصول اسلام کے خلاف ہے، اس لیے کہ اسلام دنیا میں ہر طرح کے شرک خفی و جلی کا قلع قمع کرنے کے لیے نمودار ہوا تھا“ (ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر)۔ اقبال کا سارا کلام ان کے اسی نظریے کا آئینہ دار ہے۔

۱۹۳۰ء میں کانگرس کی سول نافرمانی سے ڈر کر حکومت برطانیہ نے گول میز کانفرنس بلائی تو اقبال نے خبردار کیا کہ ”ہر وہ دستور جو اس تصور پر مبنی ہو گا کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم بستی ہے یا جس کا مقصد یہ ہو کہ یہاں ان اصولوں کا نفاذ کیا جائے جو برطانیہ کے جذبات جمہوریت پسندی کا نتیجہ ہیں، اس کا مطلب

صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کو نادانستہ طور پر خانہ جنگی کے لیے تیار کیا جائے۔ جہاں تک میری سمجھ کام کرتی ہے اس وقت تک امن و سکون قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس امر کو تسلیم نہ کر لیا جائے کہ ہندوستان کی ہر ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کیے بغیر جدید اصولوں پر آزادی کے ساتھ ترقی کرے''۔

اسی سال الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت میں اقبال نے اپنے نظریے کی مزید وضاحت کی۔ انھوں نے بتایا کہ اہل مغرب کے سیاسی نظام نے جذبۂ قومیت کے ماتحت پرورش پائی ہے اور ان کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی ذات تک محدود ہے، اسے دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں؛ لیکن مذہب اسلام کی رو سے خدا اور کائنات، کلیسا اور ریاست، روح اور مادّہ ایک ہی کُل کے مختلف اجزا ہیں اور اس کے پیش نظر ایک ایسا عالمگیر نظام سیاست ہے جس کی اساس وحی الٰہی پر ہے؛ لہٰذا اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے الگ نہیں، بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور کوئی مسلمان ایک لمحے کے لیے بھی کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر مبنی نظام سیاست پر غور کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا جو اسلام کے بنیادی اصول کے منافی ہو۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے اقبال نے کہا: ''اب تک ہم نے باہمی تعاون و اشتراک کی جس قدر کوششیں کی ہیں، سب ناکام ثابت ہوئی ہیں . . . . شاید ہمیں ایک دوسرے کی نیّتوں پر اعتماد نہیں اور باطناً ہم سب تغلب و اقتدار کے خواہش مند ہیں . . . . ہم اتنا ایثار بھی نہیں کر سکتے کہ جو اختیارات ہمیں کسی نہ کسی طرح حاصل ہو چکے ہیں ان سے دست بردار ہو جائیں۔ اگرچہ ظاہری طور پر ہمیں ایک نہایت روادارانہ حب الوطنی کا ادّعا ہے، لیکن دلوں میں ذات پات کی تنگی اور فرقہ آرائی کی ہوس بدستور کام کر رہی ہے . . . اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائدار تصفیے کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانانِ ہند کو اپنی روایات و تمدّن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشو و نما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کریں گے''۔

اسی خطبے میں اقبال نے دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔

اقبال کی تمنا اور آرزو کو چودھری رحمت علی نے لفظ پاکستان کا جامہ پہنایا۔ ۱۹۳۲ء میں انھوں نے لنڈن میں پاکستان نیشنل موومنٹ کے نام سے ایک جماعت تشکیل کی اور *The Millet of Islam and the Menace of Indianism* اور دوسرے پمفلٹوں کی اشاعت اور انگلستان میں عام جلسوں کے انعقاد سے پڑھے لکھے مسلمانوں میں یہ تڑپ پیدا کی کہ ہندوستان کے مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک اسلامی ریاست قائم کی جائے اور اس کا نام ان صوبوں کے ناموں کے ابتدائی یا آخری حروف کو لے کر پاکستان تجویز کیا (پ = پنجاب، ا = افغانی یا سرحدی صوبہ، ک = کشمیر، ستان = بلوچستان)۔

الٰہ آباد کے اجلاس ۱۹۳۰ء میں اقبال کے خطبۂ صدارت سے قطع نظر مسلم لیگ کی طرف سے کسی اسلامی ریاست کے فوری قیام کا مطالبہ پیش نہیں ہوا تھا بلکہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرار داد کی تعمیل ہی پر زور دیا گیا جس کا منشا

یہ تھا کہ ایک ایسا وفاق تشکیل دیا جائے جس میں وحدتیں (= units، یعنی صوبے) کلّی طور پر بااختیار ہوں اور مرکز ڈھیلا ڈھالا ہو اور اختیارات کے لیے وحدتوں کا محتاج۔ اس صورت میں ہندوستان متحد رہتا اور مسلم اکثریتی علاقوں کو داخلی اختیارات کے حقوق مل جاتے، لیکن ہندوؤں نے اس کی شدید مخالفت کی اور کوئی ایسا طرز حکومت نہ بننے دیا جس میں ایک دوسرے کے جائز حقوق کے تحفظ کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی۔ ۱۹۳۵ء کا دستور مسلمانوں کے لیے تباہ کن تھا اور جب اس کے تحت صوبائی حکومتیں قائم ہوئیں تو کانگرس کے طرز عمل کی بنا پر مسلمانوں کے سامنے صرف دو راہیں کھلی رہ گئیں کہ یا تو وہ مسلم قومیت کے تصور سے کنارہ کش ہو کر ہندوستانی قومیت اختیار کر لیں اور ہندو معاشرے میں جذب ہو جائیں یا اپنے لیے ملک میں ایک علٰیحدہ ریاست قائم کرنے کی کوشش کریں۔ پہلی راہ ہلاکت کی طرف لے جاتی تھی، لہٰذا سیاسی شعور اور بصیرت رکھنے والے مسلمان دوسری صورت پر غور کرنے لگے۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال اور قائد اعظم میں عرصے تک گفتگو اور مراسلت ہوتی رہی۔ ۱۹۳۶ء ہی میں علامہ اقبال نے اس پر اصرار شروع کر دیا تھا کہ مسلمانوں کی جداگانہ ریاست کا برملا مطالبہ کیا جائے۔ عوامی پیمانے پر مسلم لیگ کی تنظیم کے باعث یہ مطالبہ خواص کی مجلسوں سے نکل کر عوام کی نوک زبان پر آنے لگا اور ۱۹۴۰ء میں مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کی طرف سے باقاعدہ پیش کر دیا گیا۔

قرارداد پاکستان: مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ ۲۲ مارچ کو قائد اعظم نے دو قومی نظریے کی مکمل وضاحت کی اور اس کی روشنی میں ملک کے آئینی مسئلے کا حل تجویز کیا۔ انھوں نے کہا:

"یہ مسئلہ، جو ہندوستان میں ہے، (دو) فرقوں کے درمیان نہیں بلکہ (دو) قوموں کے مابین ہے اور اسے بین الاقوامی ہی مان کر حل کیا جائے۔ . . . اس کی صرف یہی صورت ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے (دو) بڑی اقوام کے لیے جداگانہ قومی وطن منظور کیے جائیں، جن میں وہ خود اختیاری کے ساتھ قومی ریاستیں قائم کریں . . . ۔ تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ برصغیر ہند کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹے چھوٹے جغرافیائی رقبے، جو یکجا رہنے کی صورت میں ایک ملک کہے جاتے تھے، اتنی ہی ریاستوں میں تقسیم کر دیے گئے جتنی ان میں قومیں آباد تھیں۔ جزیرہ نمائے بلقان میں سات یا آٹھ خود مختار ریاستیں ہیں . . .، مگر ہندوستان کے اتحاد کے لیے اور ایک قوم کی بنیاد پر، جس کا کوئی وجود نہیں، یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ ایک مرکزی حکومت ہونی چاہیے . . . ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اگر کسی ایسے جمہوری نظام کے تحت یکجا کیا جائے گا جو اقلیتوں پر مسلط کیا گیا ہو تو اس کے معنی صرف ہندو راج ہوں گے . . .۔ مسلمان اقلیت نہیں ہیں . . . ۔ قومیت کی ہر تعریف کی رو سے مسلمان ایک قوم ہیں اور چاہیے کہ ان کے پاس قومی وطن ہو، ان کا اپنا ملک ہو اور اپنی ریاست و دولت ہو"۔

۲۳ مارچ کو عام اجلاس میں یہ قرار داد منظور ہوئی کہ کوئی آئینی منصوبہ اس کے بغیر اس ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ ہو گا کہ وہ مندرجۂ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی ہو: حد بندی کر کے اور ملکی تقسیم کے اعتبار سے حسب ضرورت رد و بدل کر کے متصل وحدتوں کو ایسے منطقے بنا دیا جائے کہ وہ علاقے جن میں مسلمان باعتبار تعداد اکثریت

میں ہیں (جیسے ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی منطقوں میں) یک جا ہو کر خود مختار ریاستیں بن جائیں اور ان میں اقلیتوں کے لیے ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کے تحفظ کی خاطر ان کے مشورے سے بقدر ضرورت مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات معین طور پر دستور کے اندر مہیا کیے جائیں؛ اسی طرح کے تحفظات ہندوستان کے دوسرے حصوں میں، جہاں ہندو اکثریت میں ہیں، وہاں کی اقلیتوں کے مشورے سے معین طور پر دستور کے اندر رکھے جائیں۔

خطبۂ صدارت یا قرار داد میں پاکستان کا لفظ نہیں آیا تھا۔ اسے محض تقسیم ہند کا ریزولیوشن کہا گیا، البتہ بیگم محمد علی نے اپنی تقریر میں اسے پاکستان کا ریزولیوشن کہا۔ پھر ہندو اخبارات نے طعن و طنز کے طور پر اس نام کو ایسا اچھالا کہ زبان زد عام ہو گیا اور بالآخر مسلم لیگ نے بھی اسے قبول کر لیا اور اس مملکت کا نام پاکستان ہی قرار دے دیا جس کے حصول کے لیے وہ کوشاں تھی۔

اس قرار داد کے منظور ہوتے ہی کانگرس اور اس کی ہم‌نوا جماعتوں کی طرف سے مخالفت کا آغاز ہو گیا۔ مخالفین کا کہنا تھا کہ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے، اس لیے وہ تقسیم نہیں ہو سکتا؛ اکثر ہندوستانی مسلمانوں کے اجداد ہندو تھے اور تبدیل مذہب سے ان کی قومیت نہیں بدل سکتی؛ پاکستان کے معاشی وسائل اس کی کفالت کے متحمل نہیں ہو سکتے، وغیرہ وغیرہ۔ مسلم لیگ کی طرف سے ان اعتراضات کے بڑے مدلل جوابات دیے گئے اور زبردست مخالفانہ پروپیگنڈے کے باوجود مسلمانان ہند میں یہ مطالبہ مقبول ہوتا چلا گیا۔

اگست کی پیشکش: جون ۱۹۴۰ء میں قائداعظم نے وائسرائے سے ملاقات میں اس بات پر زور دیا کہ حکومت مسلمانوں کی مرضی کے خلاف کوئی آئینی تجاویز پیش نہیں کرے گی؛ چنانچہ حکومت برطانیہ نے ”اگست کی پیشکش“ میں اعلان کیا کہ وہ کوئی ایسا نظام حکومت منظور نہیں کرے گی جسے ہندوستان کی قومی زندگی کے بڑے اور طاقتور عناصر قبول نہ کریں۔ حکومت جنگ کے بعد باأثر اور مقامی جماعتوں پر مشتمل دستور ساز اسمبلی بھی بنانے پر راضی ہو گئی تاکہ نیا آئین تیار ہو سکے۔ فی‌الحال تمام جماعتوں سے جنگی مساعی میں امداد کی درخواست کی گئی۔ چونکہ مسلم لیگ کو وائسرائے کی انتظامی کونسل میں صرف دو نشستوں کی پیشکش کی گئی تھی اس لیے مسلم لیگ نے اسے مسترد کر دیا۔ کانگرس نے بھی یہ پیشکش ٹھکرا دی اور گاندھی جی نے ۱۹۴۰ء میں ستیہ گرہ شروع کیا، جو زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کا مقصد حکومت کو مجبور کرنا تھا کہ وہ اقتدار کانگرس کو منتقل کر دے۔ مسلم لیگ نے اس بنا پر اس کی مذمت کی کہ اس کا مطلب دس کروڑ مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بنانا تھا۔ مسلمان اس تحریک سے الگ رہے اور مسلم لیگ کی ہدایت پر تین مسلمان صوبائی وزرائے اعلیٰ سر سکندر حیات (پنجاب)، فضل الحق (بنگال) اور سر سعد اللہ (آسام) قومی دفاعی کونسل سے مستعفی ہو گئے۔ سر سلطان احمد اور بیگم شاہنواز کو ایسا نہ کرنے پر مسلم لیگ سے نکال دیا گیا؛ بعد میں فضل الحق کو بھی اسی باعث جماعت سے خارج کر دیا گیا۔

اس زمانے میں اتحادیوں کو جرمنی کے مقابلے میں پے در پے پسپائی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور برطانوی حکومت ہندوستان سے ہر ممکن امداد کی خواہاں تھی۔ ادھر جاپان بھی جنگ میں شریک ہو گیا اور جب اس کی فوجیں فلپائن، ملایا

اور برما کو فتح کرتی ہوئی ہندوستان کی سرحد پر پہنچ گئیں تو ۱۹۴۲ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے ''منصفانہ اور مکمل حل'' کے لیے سر سٹیفورڈ کرپس کو خاص تجاویز دے کر بھیجا، جو دو حصوں پر مشتمل تھیں: پہلے حصے کا مطلب تھا کہ ہندوستان میں فوراً ایسی حکومت قائم کر دی جائے جس کے تمام ارکان ہندوستانی ہوں، صرف امور جنگ کی ذمے داری تا اختتام جنگ حکومت برطانیہ کے ہاتھ رہے اور کمانڈر انچیف قومی حکومت میں وزیر جنگ ہو؛ دوسرے حصے کا مفہوم یہ تھا کہ جنگ کے خاتمے پر انتخابات ہوں اور مختلف صوبوں کی قانون ساز مجالس سے ان کے دس فی صد ارکان مجلس دستور ساز کے لیے چنے جائیں۔ یہ بھی یقین دلایا گیا کہ اس مجلس کا بنایا ہوا دستور حکومت برطانیہ منظور کر لے گی؛ مرکزی حکومت وفاقی ہوگی؛ اگر کوئی صوبہ ہند یونین سے الگ رہنا چاہے گا تو اسے اجازت ہوگی اور مذہبی اور نسلی اقلیتوں کی حفاظت کا پورا انتظام کیا جائے گا۔ یہ تجاویز کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے رد کر دیں۔ تاریخ پاکستان کے نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں پہلی بار برطانوی حکومت نے برصغیر کے بعض حصوں کی خود مختاری اور علیحدگی کے حق کو تسلیم کیا اور یہ مطالبۂ پاکستان کی روزافزوں مقبولیت کا ثبوت تھا۔

''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک :

جنگ عظیم کی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو کانگرس نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی قرارداد منظور کر کے اقتدار پر قبضہ کرنے کی غرض سے ملک گیر تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ بہت جلد اس نے ایک جارحانہ اور متشددانہ شکل اختیار کر لی۔ حکومت نے انتہائی سختی سے اسے دبا دیا۔ بہت سے ممتاز کانگرسی رہنما بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے اور کئی ماہ بعد امن قائم ہوا۔ مسلمان من حیث المجموع اس تحریک سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ مسلم لیگ نے اس تحریک کی مخالفت کی، مگر حکومت کے تشدد کی بھی مذمت کی۔

اسی دوران میں مسلم لیگ نے مسلم اکثریت کے صوبوں — بنگال، آسام، سندھ اور سرحدی صوبے — میں وزارتیں بنا کر مسلمان عوام پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ پنجاب میں سر خضر حیات ٹوانہ نے، جو سر سکندر کی وفات (۱۹۴۲ء) کے بعد پنجاب کی یونینسٹ حکومت کے سربراہ بنے تھے، قائد اعظم کی ہدایت کے باوجود اپنی پارٹی کا نام بدلنے سے انکار کر دیا، لہٰذا انہیں اور ان کے ہمنواؤں کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کو ختم کر کے وہاں مسلم لیگی وزارت قائم کرنے کی مہم شروع کر دی۔

''اچاریہ فارمولا'' اور گاندھی - جناح مذاکرات : مئی ۱۹۴۴ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد گاندھی جی کو احساس ہوا کہ مسلم لیگ کے تعاون کے بغیر انگریزوں کے خلاف کوئی کارروائی مؤثر ثابت نہیں ہوسکتی، چنانچہ وہ راجگوپال اچاریہ کی تجویز کی بنیاد پر مسلم لیگ سے سمجھوتا کرنے کے لیے قائد اعظم سے ملنے پر تیار ہوگئے۔ ''اچاریہ فارمولا'' میں مطالبۂ پاکستان کو اصولی طور پر تسلیم کرنے کے علاوہ یہ تجویز کیا گیا تھا کہ جنگ کے بعد ایک کمیشن مقرر ہوگا جو مسلم اکثریت کے علاقوں کی حد بندی کرے گا اور بالغ رائے دہی کے اصول پر ان علاقوں کے عوام یہ فیصلہ کریں گے کہ وہ ہندوستان سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں یا نہیں؛ اگر اکثریت نے علیحدگی کے حق میں فیصلہ دے دیا تو اس صورت میں دونوں

مملکتیں دفاع، تجارت، رسل و رسائل اور دوسرے ضروری امور میں تعاون کے لیے باہمی معاہدہ کریں گی۔ اس فارمولے میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ مسلم لیگ عبوری حکومت میں شرکت، کانگرس سے تعاون اور مسلم مملکت کے قیام اور حد بندی کے سلسلے میں اکثریت پر مکمل اعتماد کرے۔

دونوں رہنماؤں کے درمیان اٹھارہ روز تک مذاکرات جاری رہے، لیکن کوئی سمجھوتا نہ ہو سکا، کیونکہ ایک تو ہندو اکثریت والی عبوری حکومت پر مکمل اعتماد مسلم لیگ کے لیے گزشتہ تجربات کی بنا پر قابل قبول نہ تھا، دوسرے یہ کہ ایک طرف گاندھی جی نے دونوں ریاستوں کے باہمی معاہدۂ تعاون میں امور خارجہ اور مالیات کو بھی شامل کرنے پر زور دیا اور دوسری طرف وہ اس بات پر کسی طرح آمادہ نہ ہوے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو قومیں اور مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر لیں۔ بہر حال اس کا یہ نتیجہ ضرور برآمد ہوا کہ دنیا کی نظر میں گاندھی جی نے تقسیم ہند کا اصول تسلیم کر لیا۔

ویول منصوبہ: ۱۹۴۵ء میں جنگ عظیم کے خاتمے پر ایک بار پھر ملک کی آئینی گتھی سلجھانے کے لیے نئے وائسرائے لارڈ ویول نے ایک منصوبہ پیش کیا، جس کی رو سے مرکز کی ایگزکٹو کونسل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے مساوی نمائندگی تجویز کی تھی۔ اس سلسلے میں وائسرائے نے ہندوستانی رہنماؤں کی ایک کانفرنس شملے میں طلب کی، جو ناکام رہی۔ ناکامی کا بڑا سبب یہ تھا کہ کانگرس کو بر صغیر کی جملہ اقوام کی نمائندگی کا دعوی تھا اور وہ تمام ہندو نشستوں کے علاوہ مسلم نشستوں میں بھی اپنا حصہ چاہتی تھی۔ قائد اعظم اسے تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے اور ان کا مطالبہ تھا کہ مسلمان نمائندوں کی نامزدگی کا حق صرف مسلم لیگ کو حاصل ہے۔ کانفرنس کی ناکامی کے باوجود یہ بات واضح ہو گئی کہ دونوں جماعتوں کے دعوے انتخابات ہی کے ذریعے پرکھے جا سکتے ہیں۔

۱۹۴۶ء کے عام انتخابات: ۱۹۴۶ء کے اوائل میں انتخابات ہوے۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے کل ووٹوں کا ۷۵ فی صد حاصل کیا اور صوبائی اسمبلیوں میں ۴۹۲ مسلم نشستوں میں سے ۴۲۵ اور مرکزی اسمبلی کی پوری ۳۰ نشستیں جیت کر ثابت کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔

صوبائی حکومتوں کی تشکیل کے وقت کانگرس نے اپنے سابقہ طرز عمل کو برقرار رکھتے ہوے ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی اور وہاں خالص کانگرسی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اس کے برعکس مسلم اکثریتی صوبوں میں اس نے حتی المقدور کوشش کی کہ وہاں تمام غیر مسلم اور معدودے چند غیر لیگی مسلمان ارکان مل کر مخلوط وزارت بنا لیں تا کہ مسلم لیگ اقتدار سے محروم رہے؛ چنانچہ پنجاب میں اگرچہ مسلم لیگ مسلمانوں کی ۸۶ میں سے ۷۳ نشستوں پر قابض تھی، لیکن کانگرس کی زیر سرپرستی خضر حیات ٹوانہ نے ہندو اور سکھ ارکان کے ساتھ مل کر وزارت بنا لی اور اس سلسلے میں صوبے کے انگریز گورنر نے بھی اس گٹھ جوڑ کا ساتھ دیا۔ اسی طرح صوبۂ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب نے غیر مسلم ارکان کے تعاون سے کانگرسی وزارت بنائی؛ البتہ سندھ اور بنگال میں یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی اور وہاں علی الترتیب سر غلام حسین ہدایت اللہ اور حسین شہید سہروردی کی قیادت میں مسلم لیگی حکومتیں قائم ہو گئیں۔

۹ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیگ کے

منتخب ارکان اسمبلی کا ایک کنونشن منعقد ہوا جس میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ "شمال مشرقی علاقے میں بنگال اور آسام اور شمال مغرب میں پنجاب، سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک خود مختار مملکت قائم کی جائے" اور اعلان کیا گیا کہ متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر اگر کوئی دستور مسلط کرنے یا مرکز میں مسلم‌لیگ کے مطالبے کے خلاف جبراً عبوری انتظام کرنے کی کوشش کی گئی تو مسلمان اپنی بقا اور قومی تحفظ کے لیے تمام ممکن طریقوں سے اس کی مخالفت کریں گے۔

کیبنٹ مشن: برطانیہ میں لیبر پارٹی برسر اقتدار آ چکی تھی، جو بوجوہ ہندوستان کو جلد از جلد آزادی دینے کی خواہاں تھی، چنانچہ انتقال اقتدار کے طریق کار کے بارے میں ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے کے لیے ایک وزارتی مشن بھیجا گیا۔ اس وفد نے، جو لارڈ پیتھک لارنس (وزیر ہند)، سرسٹیفورڈ کرپس اور سر اے۔ وی۔ ایگزنڈر پر مشتمل تھا، ۲۴ اپریل ۱۹۴۶ء کو ہندوستان پہنچ کر سیاسی مذاکرات شروع کر دیے۔ طویل مشاورت کے بعد ۱۶ مئی کو وزارتی وفد نے نئے منصوبے کا اعلان کیا، جس میں یہ امور شامل تھے: (الف) برطانوی ہند اور ریاستوں پر مشتمل وحدتِ ہندوستان کے قیام کے لیے ایک نمائندہ ادارے کی تشکیل؛ (ب) مرکز میں عبوری حکومت کا قیام اور (ج) صوبوں کی گروہ بندی۔ وحدت (یونین) کے لیے تجویز ہوا کہ امور خارجہ، دفاع اور مواصلات اس کے دائرۂ اختیار میں ہوں گے اور تمام دوسرے اختیارات صوبوں کو ملیں گے۔ صوبے مندرجۂ ذیل تین گروہوں میں تقسیم ہوں گے اور ہر ایک کی اپنی انتظامیہ اور مقننہ ہو گی: (الف) شمال مغرب کے مسلم اکثریتی صوبے، یعنی پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان؛ (ب) شمال مشرق کے مسلم اکثریتی صوبے، یعنی بنگال اور آسام؛ (ج) باقی تمام صوبے۔ نئے آئین کے بعد صوبوں کو مقننہ میں کثرت رائے کی بنا پر اپنا گروہ تبدیل کرنے کی اجازت ہو گی۔ عبوری حکومت کے قیام کے سلسلے میں یہ تجویز ہوا کہ وائسرائے کا حق تنسیخ اور برطانوی حکومت کی بالا دستی نئی حکومت کو منتقل نہیں ہو گی، البتہ ایگزکٹو کونسل کے تمام ارکان ہندوستانی ہوں گے اور چودہ ارکان میں سے پانچ پانچ کانگرس اور مسلم لیگ کے اور باقی چار اقلیتوں کے نمائندے لیے جائیں گے۔ آئین ساز ادارے کے لیے تمام صوبوں کو آبادی کے تناسب سے اس طرح نمائندگی دی جائے گی کہ بڑی اقلیتوں کو ان کی آبادی کے اعتبار سے نیابت مل جائے، نیز کسی صوبے میں ہر فرقے کے لیے جتنے نمائندے معین کیے گئے ہیں ان کا انتخاب اس صوبے کی مجلس قانون ساز کے وہی ارکان کریں جو اس فرقے کے ہوں۔ اس سلسلے میں صرف تین فرقے تسلیم کیے گئے: عام، مسلمان اور سکھ۔ تجویز کیا گیا تھا کہ صوبوں اور دیسی ریاستوں کے نمائندے نئی دہلی میں جمع ہو کر چیرمین کا انتخاب کریں گے اور تین فریقوں میں بٹ جائیں گے: (الف) مدراس، بمبئی، صوبجات متحدہ، بہار، صوبۂ متوسط اور اڑیسہ؛ (ب) پنجاب صوبۂ سرحد اور سندھ؛ (ج) بنگال، اور آسام۔ یہ تینوں فریق نہ صرف اپنے مجموعے کے صوبوں کے لیے دستور کا فیصلہ کریں گے بلکہ اس بات کا بھی کہ مجموعے کا بھی کوئی دستور قائم یا وضع کرنا ہے اور اگر کرنا ہے تو کونسے شعبے مجموعے کے مرکز کی تحویل میں ہوں گے اور کونسے صوبوں میں۔ مجموعوں کے دستوروں کا فیصلہ ہونے کے بعد تینوں فریق پھر یکجا ہو کر اور ریاستوں کے اشتراک سے مکمل مجلس دستور ساز بنا کر کل ہند یونین

کا دستور وضع کریں گے، جس کے بعد حکومت برطانیہ اور مجلس دستور ساز کے درمیان ان امور کے بارے میں گفت و شنید ہوگی جو انتقال اختیارات سے پیدا ہوں گے۔

مسلم لیگ اس منصوبے سے غیر مطمئن تھی، پھر بھی ۶ جون کو اسے اس بنا پر منظور کر لیا گیا کہ اس میں قیام پاکستان کی بنیاد موجود تھی۔ کانگرس مرکزی حکومت کے محدود اختیارات پر خوش نہ تھی، لیکن اس نے آئین ساز اسمبلی میں شمولیت پر آمادگی ظاہر کی۔ دونوں جماعتوں کا خیال تھا کہ نئے حالات اسی کے حق میں جائیں گے۔ ۱۶ جون کو وزارتی وفد نے چھے کانگرسیوں (جن میں ایک کا تعلق پس ماندہ اقوام سے ہوگا) پانچ مسلم لیگیوں، ایک سکھ، ایک عیسائی اور ایک پارسی کو نئی ایگزکٹو کونسل میں نمائندگی کے لیے چنا۔ مسلم لیگ نے یہ فیصلہ قبول کر لیا، لیکن کانگرس نے اس میں قوم پرست مسلمان کا نام نہ پا کر شمولیت سے انکار کر دیا۔ ۱۶ جون کے اعلان میں وائسرائے نے یہ واضح کر دیا تھا کہ اگر ایک جماعت شرکت نہ کرے تو وائسرائے دوسری تعاون کرنے والی جماعتوں پر مشتمل عبوری حکومت بنا لے گا! لیکن کانگرس کے انکار کے بعد وہ اپنے وعدے سے پھر گیا، جس سے مسلم لیگ کو سخت مایوسی ہوئی۔

۱۰ جولائی کو کانگرس کے نئے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی پریس کانفرنس میں وزارتی مشن کے منصوبے کی منظوری کے بارے میں کانگرس کا موقف بالکل تبدیل کر دیا۔ انھوں نے صوبوں کی گروپ بندی کے اصول کو ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے اعلان کیا کہ ہم بغیر کسی شرط اور سمجھوتے کے دستور ساز اسمبلی میں جانے پر رضامند ہوئے ہیں؛ اس میں ہم کیا کریں گے، یہ طے کرنے کے لیے ہم بالکل آزاد ہیں۔

مسلم لیگ کا رد عمل اور راست اقدام :

اس اعلان سے یہ عیاں ہو گیا کہ کانگرس نے وزارتی وفد کے منصوبے کو مسمار کرنے کے لیے اسے منظور کیا ہے۔ قائد اعظم نے کانگرس اور حکومت برطانیہ پر کڑے اعتراضات کیے اور شواہد سے ثابت کیا کہ برطانوی حکومت کانگرس کی خوشنودی کے لیے مسلمانوں کے حقوق پامال اور اپنے وعدوں سے روگردانی کر رہی ہے۔ ایک طرف کانگرس مشروط شمولیت کی پیشکش کر رہی تھی اور منصوبے کو من مانے معنی پہنا رہی تھی، دوسری طرف آئین ساز اسمبلی پر خلاف اصول فیصلے کرنے کی صورت میں کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔ چونکہ یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی اس لیے جولائی کے آخری ہفتے میں مسلم لیگ کی کونسل نے وزارتی منصوبے کی منظوری واپس لیتے ہوئے اعلان کیا کہ مسلمان پاکستان کی خود مختار مملکت حاصل کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے اور ایسی ہر کوشش کی مخالفت اور اس کا ہر ممکن طریق سے مقابلہ کرنے کی کوشش کریں گے جو ان کی رضامندی کے بغیر دستور وضع کرنے کی غرض سے کوئی نظام قائم کرنے، یا کوئی دستور مسلط کرنے، یا مرکز میں کوئی عبوری حکومت قائم کرنے کے لیے ہو۔ کونسل نے یہ بھی اعلان کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لیے اور موجودہ برطانوی غلامی اور مستقبل کے اس ہندو تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے جس کے منصوبے بن رہے ہیں راست اقدام کیا جائے۔ اس سلسلے میں قوم سے اپیل کی گئی کہ وہ مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد اور منظم ہو کر ہر قربانی کے لیے تیار رہے اور حکومت کے طرز عمل کے

خلاف احتجاج کے طور پر تمام سرکاری خطابات واپس کر دیے جائیں۔

اب کانگرس کو احساس ہوا کہ اس کے صدر کے بیان کے کیا نتائج برآمد ہوے ہیں۔ ۱۰ جولائی کو اس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا، جس میں پنڈت نہرو کے بیان کی تردید تو نہیں کی گئی البتہ یہ اعلان ضرور کر دیا گیا کہ کانگرس نے وزارتی سکیم پوری کی پوری منظور کی ہے۔

دستور ساز اسمبلی اور عبوری حکومت:

اس اثنا میں دستور ساز اسمبلی منتخب ہو گئی۔ مسلم لیگ نے اٹھہتر میں سے تہتر مسلم نشستوں پر قبضہ کیا اور کانگرس نے نو کے علاوہ تمام غیرمسلم نشستوں پر۔ عارضی حکومت بنانے کی تجویز از سر نو زندہ ہوئی۔ کانگرس اگرچہ صوبوں کی مجموعہ‌بندی کی تنسیخ اور دستور ساز اسمبلی کو خود مختاری دینے کا مطالبہ کر رہی تھی، تاہم اسے عبوری حکومت قائم کرنے کی دعوت دے دی گئی، جسے صدر کانگرس نے قبول کر لیا۔ اس کے بعد قائداعظم کو کہا گیا کہ وہ بھی اس میں شرکت کر لیں، جسے انہوں نے اس بنا پر نامنظور کر دیا کہ صرف ہندو قوم کی جماعت کو وزارت بنانے کی دعوت دے کر وائسرائے نے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی توہین کی ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس نے وزارتی بیان کی شرائط قبول نہیں کیں۔

۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کی طرف سے یوم راست اقدام منایا گیا تاکہ حکومت کی غلط اور غیر منصفانہ پالیسی کے خلاف اظہار احتجاج کرتے ہوے کامل ہڑتال کی جائے، جلسے کیے جائیں اور مسلم لیگ کے موقف کی تشریح کی جائے۔ ہندوؤں نے اس سادہ پروگرام کو اپنے خلاف قرار دیا۔ کلکتے میں مسلمانوں کے جلسوں اور جلوسوں پر حملے ہوے تو شہر میں فساد برپا ہو گیا، جس میں پانچ ہزار ہلاک اور پندرہ ہزار زخمی ہوے۔

۲۴ اگست کو سرکاری اعلان میں شاہ انگلستان کی منظوری سے عارضی حکومت کے لیے ارکان کے ناموں کا اعلان کر دیا گیا۔ اور طے پایا کہ نئی حکومت ۲ ستمبر کو قائم ہو گی۔ اس اعلان کے بعد وائسرائے نے کلکتے کا دورہ کیا، جس کے دوران میں اسے احساس ہوا کہ اگر دونوں قوموں میں سمجھوتا نہ ہوا تو سارے ملک میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ لارڈ ویول نے چاہا کہ کانگرس واضح الفاظ میں یہ اعلان کر دے کہ نئے دستور کے تحت نئے انتخابات تک صوبے انہیں مجموعوں میں رہیں گے جن میں وزارتی وفد نے انہیں رکھا ہے، لیکن ادھر تو کانگرس نے مطالبہ کیا کہ مجموعہ‌بندی کے مسئلے کے بارے میں فیڈرل کورٹ سے رجوع کیا جائے اور ادھر برطانیہ کی لیبر حکومت نے وائسرائے کو ہدایت دی کہ وہ کوئی ایسی کارروائی نہ کریں جس سے کانگرس اور حکومت کے درمیان تعلقات منقطع ہو جائیں؛ چنانچہ ۲ ستمبر کو عبوری حکومت قائم ہو گئی۔

اب لارڈ ویول نے ایک بار پھر مفاہمت پیدا کرنے کے لیے گاندھی جی، پنڈت نہرو اور قائد اعظم سے ملاقاتیں کیں۔ نواب بھوپال کی وساطت سے قائد اعظم اور گاندھی جی بھی باہم ملے اور اس فارمولے پر ان کا اتفاق رائے ہو گیا کہ جمہوری اصولوں کے مطابق مسلم لیگ ہی مسلمانان ہند کی نیابت کا حق رکھتی ہے، لیکن کانگرس بھی اس امر میں آزاد ہے کہ اپنے ارکان میں سے جسے چاہے اپنا نمائندہ منتخب کر سکتی ہے۔ بایں ہمہ پنڈت نہرو نے اس پر اصرار کیا کہ کانگرس غیر مسلموں کے علاوہ ان مسلمانوں کی بھی نمائندگی کرتی ہے جو کانگرس کے ساتھ ہیں، چنانچہ اس گفت و شنید کا

کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

مسلم لیگ کے لیے بڑا نازک مقام آ گیا تھا۔ ہندو مسلم منافرت اس درجہ پھیل چکی تھی کہ جگہ جگہ خونیں فسادات شروع ہو گئے تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے یہ بات انتہائی مہلک تھی کہ مرکزی حکومت کے انتظام کا پورا میدان کانگرس کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے، چنانچہ قائد اعظم نے اس شرط پر حکومت میں شرکت منظور کر لی کہ اگر کانگرس کو اس کے حصے کے ارکان میں ایک مسلمان کو نامزد کرنے کا حق دیا جا رہا ہے تو مسلم لیگ کو بھی یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ اپنے حصے میں سے پس‌ماندہ اقوام یا دوسری اقلیتوں کے کسی شخص کو نامزد کرے۔ ۱۲ اکتوبر کو وائسرائے نے اس شرط کی توثیق کر دی اور ۲۵ اکتوبر کو مسلم لیگ کی شرکت سے عبوری حکومت مکمل ہو گئی۔

مخلوط حکومت بن جانے کے بعد بھی مسلم لیگ اور کانگرس کی آویزش جاری رہی۔ ایک تو شعبوں کی تقسیم میں انصاف سے کام نہیں لیا گیا تھا، دوسرے کانگرس کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ پنڈت نہرو نے ایسا رویّہ اختیار کیا گویا وہ وزیراعظم ہیں اور امور داخلہ و نشریات کے وزیر سردار پٹیل نے اپنے محکموں میں ایسی جابرانہ پالیسی پر عمل شروع کر دیا کہ مسلمانوں کو محسوس ہونے لگا کہ وہ ایک غیر اور حریف حکومت کے زیر تسلط آ گئے ہیں۔ مسلم لیگ کے نزدیک عبوری حکومت وائسرائے کی مخلوط ایگزکٹو کونسل تھی اور کانگرس کے نزدیک آزاد نیشنل گورنمنٹ۔ اب کانگرس چاہتی تھی کہ مسلم لیگ مجلس دستور ساز میں بھی شریک ہو جائے تاکہ اس کا اجلاس منعقد کر کے وزارتی سکیم کے اُس حصے کو کثرت رائے سے منسوخ کر دیا جائے جو مسلم اکثریت کے صوبوں کی مجموعہ بندی اور مجموعوں اور صوبوں کے وضع دستور سے متعلق تھا اور ملک میں ایک مرکزی وحدانی حکومت قائم کرنے کے منصوبے کو عملی جامہ پہنائے جاتے۔ اسی دوران میں بہار میں کانگرسی حکومت کے زیر سایہ مسلمانوں کے خلاف منظم فسادات برپا ہوئے۔ ۲۵ اکتوبر سے ۱۰ نومبر تک مسلم بستیوں پر ہزاروں کی تعداد میں مسلح ہندو حملہ آور ہوتے رہے۔ تیس ہزار مسلمان قتل ہو گئے اور ڈیڑھ لاکھ پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہوئے۔ اس کے فوراً بعد گڑھ مکتیشر میں گنگا اشنان کے میلے میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ اس طرح بدامنی صوبجات متحدہ کے شمالی اور مغربی اضلاع تک پھیل گئی۔ ان حالات میں قائد اعظم نے وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ دستور ساز اسمبلی کو غیر معین مدت کے لیے ملتوی کر دیا جائے اور حکومت اپنے تمام وسائل اور پوری توجہ امن و انتظام پر صرف کرے۔ اس مطالبے کو ماننے کے بجائے مجلس دستور ساز کے انعقاد کے لیے ۹ دسمبر کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ مسلم لیگ نے اس مجلس میں شریک نہ ہونے کا فیصلہ کیا اور کانگرس نے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ یا تو مسلم لیگ مجلس دستور ساز میں آئے یا عبوری حکومت سے استعفٰی دے دے۔ مسلم لیگ کی طرف سے لیاقت علی خان نے وائسرائے پر واضح کیا کہ وہ مستعفی ہونے کے لیے تیار ہیں، لیکن ان کی جماعت وزارتی وفد کا منصوبہ اس وقت تک منظور نہیں کرے گی جب تک ملک معظم کی حکومت یہ یقین نہ دلا دے کہ صوبے فریقوں میں مجتمع ہوں گے اور یہ فریق اور ان کے مجموعے کثرت رائے سے اپنا دستور وضع کرنے میں مختار ہوں گے اور مزید یہ کہ ملک معظم کی حکومت کو یہ ذمہ لینا چاہیے کہ جب تک اس ضابطے کی پابندی نہ ہو وہ نتائج کا نفاذ نہیں کرے گی۔

اس گتھی کو سلجھانے کے لیے قائد اعظم، خان لیاقت علی خان، پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ وائسرائے کے ہمراہ لنڈن پہنچے، لیکن ملک معظم کی حکومت کے ساتھ گفت و شنید سے بھی دونوں جماعتوں میں اتفاق رائے نہ ہو سکا! تاہم حکومت برطانیہ صوبوں کی فریق بندی کے اصول پر مصر رہی اور ۶ دسمبر کو اپنے اعلان میں اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر مجلس دستور ساز میں ہندوستانی آبادی کے ایک بڑے حصے کے نمائندے شامل نہیں ہوں گے تو اس کا بنایا ہوا آئین نارضامند طبقوں پر نہیں ٹھونسا جائے گا۔ اس طرح کانگرس کی بالادستی کا خواب ادھورا رہ گیا اور پنڈت نہرو فوراً واپس روانہ ہوگئے۔

آئین ساز اسمبلی نے ۲۰ جنوری ۱۹۴۷ء کو اپنا کام شروع کر دیا اور پنڈت نہرو کے ایما پر ایک قابل اعتراض قرارداد مقاصد منظور کرلی۔ مسلم لیگ نے اصرار کیا کہ چونکہ کانگرس، اچھوتوں اور سکھوں نے وزارتی سکیم کی برطانوی تشریح قبول نہیں کی، اس لیے آئین ساز اسمبلی کے لیے انتخابات اور اس کے اجلاس غیر قانونی اور بے بنیاد ہیں۔ ادھر کانگرس نے وائسرائے پر زور دیا کہ مسلم لیگ کے نمائندوں سے استعفے طلب کیے جائیں۔ ۶ فروری کو وائسرائے نے لیاقت علی خان کو بلا کر اس مطالبے سے آگاہ کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر حکومت کے نزدیک کانگرس نے وزارتی منصوبہ قبول کر لیا ہے تو مسلم لیگ اپنے طرزِ عمل پر غور کرنے کے لیے تیار ہے، لیکن یہ حکومت کی ذمے داری ہو گی کہ کانگرس کو مجلس دستور ساز میں ان حدود کے اندر رکھے جو وزارتی وفد نے معین کر دی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وزارتی منصوبہ صحیح معنوں میں کسی نے بھی قبول نہیں کیا، لہٰذا کسی کو بھی اس بنا پر مسلم لیگ سے استعفا طلب کرنے کا حق نہیں ہے۔ ۱۰ فروری کو سردار پٹیل نے دھمکی دی کہ دریں حالات اگر مسلم لیگ عبوری حکومت میں رہی تو کانگرس اس سے الگ ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی گاندھی جی اور پنڈت نہرو نے وزیر اعظم ایٹلی اور لیبر پارٹی کے دوست ممبروں کو لارڈ ویول کے خلاف خطوط لکھے اور یہ مہم شروع کی کہ اس کی جگہ کوئی زیادہ اہل وائسرائے بھیجا جائے۔

انخلا کا اعلان: لیبر گورنمنٹ کے لیے اب سخت دشواری کا سامنا تھا۔ ایک طرف تو وہ اس پر کسی طور بھی آمادہ نہیں تھی کہ کانگرس عبوری حکومت سے الگ ہو کر کوئی مخالفانہ تحریک شروع کر دے، دوسری طرف وہ مسلم لیگ سے استعفے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ اس سے اندیشہ تھا کہ نہ صرف ہندوستان کے مسلمان راست اقدام کی قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں گے، بلکہ دوسرے مسلم ممالک میں بھی اس کے خطرناک اثرات ہوں گے؛ چنانچہ وزیر اعظم نے ۲ فروری کو اعلان کیا کہ جون ۱۹۴۸ء تک حکومت برطانیہ تمام اختیارات ایک ایسی ہندوستانی حکومت کے حوالے کر دے گی جسے عوام کی حمایت حاصل ہو، جو امن قائم رکھ سکے اور عدل و صلاحیت سے نظم و نسق چلا سکے، نیز اگر اقوام ہند متفقہ دستور نہ بنا سکیں تو ملک کا انتظام کسی بھی مرکزی حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا، یا بعض صوبوں کا انتظام صوبائی حکومتوں کو سونپ دیا جائے گا۔ اسی بیان میں یہ بھی اعلان کیا گیا کہ انتقال اختیار کے لیے لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے مقرر کیا گیا ہے اور وہ مارچ ۱۹۴۷ء میں اپنا عہدہ سنبھال لیں گے۔

مسلم اکثریت کے صوبوں کی حالت:

اس اثنا میں کانگرس مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہندوؤں اور سکھوں کو اس پر اکسا رہی تھی کہ وہ مجموعوں کی مجلس دستور ساز میں ہرگز شریک نہ ہوں۔ بنگال میں مغربی بنگال کا ایک علیحدہ صوبہ قائم کرنے کی تحریک شروع ہو گئی تھی۔ آسام کی کانگرس پارٹی نے اپنے صوبے کی مجلس آئین ساز کے تمام ارکان کو حکم دے دیا تھا کہ وہ وزارتی سکیم کے تحت بنگال کے ساتھ ایک مجموعے میں شریک نہ ہوں۔ سندھ میں مسلم لیگی حکومت کو متزلزل کرنے کی کوششیں برابر جاری تھیں۔ صوبۂ سرحد میں پہلے سے کانگرسی وزارت قائم تھی۔ پنجاب میں گورنر کی حمایت سے مسلم لیگ کو وزارت بنانے سے محروم رکھا گیا تھا۔ یہ صورت حال بڑی خطرناک تھی کہ جن صوبوں میں پاکستان قائم ہونا تھا وہاں بھی مسلم لیگ پوری طرح برسر اقتدار نہیں تھی؛ چنانچہ مسلم لیگ نے پنجاب میں دوبارہ انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا۔ اس پر چڑ کر یونینسٹ حکومت نے جبر و تشدد سے کام لیا اور مسلم لیگ نیشنل گارڈز کو خلاف قانون قرار دے کر کئی رہنما گرفتار کر لیے۔ اس کے بعد مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جو پورے صوبے میں پھیل گئی اور چونتیس روز تک جاری رہی۔ ہزاروں عورتیں اور مرد گرفتار ہوئے، جگہ جگہ لاٹھی چارج کیا گیا، پُرامن مظاہرین پر گولیاں چلائی گئیں، لیکن تحریک کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ ادھر مسٹر ایٹلی کے اعلان کے بعد سکھوں کے رہنما ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کیا۔ سکھوں نے اکالی جتھے بھرتی کرنے شروع کیے اور ہندوؤں میں راشٹریہ سیوک سنگھ سرگرم عمل ہو گئی تاکہ ضرورت پیش آنے پر مسلمانوں کے خلاف گوریلا جنگ کی جا سکے۔ مسلم لیگ کی تحریک سے یونینسٹ حکومت متزلزل ہو گئی اور فروری کے آخر میں مسلم لیگی رہنماؤں کو رہا کر دیا گیا۔ مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ ۳ مارچ کو صوبائی اسمبلی کے ہونے والے اجلاس میں مخلوط وزارت کو توڑنے کی پوری کوشش کی جائے۔ خضر حیات ٹوانہ نے پہلے تو ہندوؤں اور سکھوں کی مدد سے مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا، مگر مسلمانان پنجاب کے تیور دیکھ کر ۲ مارچ کو انہوں نے اپنی وزارت کا استعفا پیش کر دیا۔ اگلے روز نواب ممدوٹ نے نئی وزارت بنانے کے لیے یونینسٹ پارٹی کے ہندو سکھ ارکان کو جمع کر کے تعاون کی دعوت دی، لیکن انہوں نے تشدد اور بدامنی کی دھمکی دی اور ۳ مارچ کو ماسٹر تارا سنگھ نے اسمبلی ہال کے باہر تلوار لہرا کر ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اسی دن ہندوؤں اور سکھوں نے تمام پنجاب میں مسلمانوں پر حملے شروع کیے اور طرح طرح سے انہیں اشتعال دلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شہروں، قصبوں اور دیہات میں جگہ جگہ خونریز بلوے ہونے لگے۔ پنجاب کے گورنر نے ایک بار پھر جانب داری کا ثبوت دیا اور مسلم لیگ کو وزارت کی دعوت دینے کے بجائے صوبے میں گورنری راج قائم کر دیا۔

اس اثنا میں مسلم لیگ کی طرف سے صوبۂ سرحد میں بھی پرامن اور منظم مظاہرے ہو رہے تھے؛ حکومت بڑی کثرت سے مظاہرین کو گرفتار کر رہی تھی اور مسلم لیگ کی تحریک کے اثرات آزاد قبائل تک پہنچ چکے تھے۔

ماؤنٹ بیٹن منصوبہ: لارڈ ماؤنٹ بیٹن Mountbatten نے ۲۲ مارچ کو اپنے عہدے کا حلف اٹھا کر کانگرس اور لیگ کے قائدین سے گفتگو شروع کی اور ابتدا ہی میں ظاہر ہو گیا

کہ اس کے میلانات ہندوؤں کے حق میں ہیں۔ یہ مذاکرات کئی ہفتوں تک جاری رہے۔ اب یہ پوری طرح واضح ہو چکا تھا کہ وزارتی سکیم کے منصوبے کے مطابق پورا ہندوستان ایک مرکزی حکومت کے ماتحت نہیں رہ سکتا اور کانگرس کا یہ مطالبہ شدت اختیار کر گیا تھا کہ تقسیم ملک کی صورت میں پنجاب، بنگال اور آسام کے ان حصوں کو تقسیم کر کے ہندو یونین میں شامل کیا جائے جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے ملک اور صوبوں کی اس تقسیم کے مطالبات کی روشنی میں ایک منصوبہ تیار کیا جسے حکومت برطانیہ نے منظور کر لیا، لیکن جب اسے پنڈت نہرو کو دکھایا گیا تو انہوں نے اسے ناقابلِ قبول ٹھہرایا؛ چنانچہ ترمیمات کے ساتھ نیا منصوبہ تیار ہوا اور اس کی منظوری حاصل کرنے کے لیے وائسرائے خود لنڈن روانہ ہو گیا اور ۳۱ مئی کو واپس آ کر اعلان کیا کہ اسے ۲ جون کو ہندوستانی رہنماؤں کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔

اس منصوبے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ (الف) پنجاب اور بنگال کی آئین ساز مجالس اپنے اجلاس دو حصوں میں کریں گی: ایک حصے میں مسلمان اضلاع کے نمائندے اور دوسرے میں باقی اضلاع کے نمائندے شریک ہوں گے اور یہ فیصلہ کریں گے کہ ان صوبوں کو تقسیم کرنا چاہیے یا نہیں۔ اگر ایک حصے کے ارکان سادہ اکثریت سے یہ فیصلہ کر لیں کہ صوبے کو تقسیم ہونا چاہیے تو ایسا ہی ہوگا۔ تقسیم کی صورت میں دونوں حصے یہ فیصلہ کریں گے کہ وہ پہلی مجلس آئین ساز میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا نئی میں۔ علاوہ ازیں پنجاب اور بنگال میں مسلم اور غیر مسلم اکثریت کے علاقوں کی حدبندی کے لیے ایک حدبندی کمیشن مقرر کیا جائے گا؛ (ب) صوبۂ سندھ کی قانون ساز اسمبلی سے پوچھا جائے گا کہ وہ پرانی مجلس دستور ساز میں شریک ہوگی یا نئی میں؛ (ج) صوبۂ سرحد کی شمولیت کا عام رائے شماری سے فیصلہ ہوگا؛ اسی طرح (د) آسام کے واحد مسلم اکثریتی ضلع سلہٹ کا بھی عام رائے شماری ہی سے فیصلہ ہوگا کہ وہ مشرقی بنگال میں شامل ہوگا یا آسام ہی میں رہے گا؛ (ہ) اس کے بعد دونوں مجالس دستور ساز (برائے بھارت و پاکستان) کے لیے نئے انتخابات ہوں گے؛ (و) ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو برطانوی حکومت اقتدار منتقل کر دے گی۔

اس منصوبے کی منظوری کانگرس نے اس شرط پر دی کہ مسلم لیگ بھی ایسا ہی کرے۔ قائد اعظم نے لیگ کونسل کا اجلاس بلانے کے لیے مہلت طلب کی تو وائسرائے نے دھمکی دی کہ اس صورت میں کانگرس اور سکھ دوسری صبح کے اجلاس میں اسے نامنظور کر دیں گے اور پھر پاکستان شاید کبھی نہ بن سکے۔ وائسرائے کی اس ہٹ دھرمی اور ملک کی نازک صورت حال کے پیش نظر قائد اعظم کو باامر مجبوری اس پر رضامند ہونا پڑا۔ ۳ جون کو آل انڈیا ریڈیو سے قائد اعظم، پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ نے اپنی اپنی قوم کی طرف سے منصوبے کی منظوری کے اعلانات نشر کیے، جس کی توثیق ۱۰ جون کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور ۱۴ جون کو آل انڈیا نیشنل کانگرس کمیٹی نے کر دی۔

صوبوں کی تقسیم اور استصواب رائے عامہ: ۲۰ جون کو بنگال کی قانون ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا، جس میں فیصلہ کیا گیا کہ بنگال تقسیم کر دیا جائے اور مغربی بنگال ہندوستان کی مجلس دستور ساز میں اور مشرقی بنگال اور سلہٹ مل کر نئی مجلس دستور ساز میں شریک ہوں۔ یہ فیصلہ امن و انتظام کے ساتھ ہو گیا۔

پنجاب میں ان دنوں انتہائی بدامنی پھیلی ہوئی تھی ۔ پولیس کے زیر انتظام صوبائی اسمبلی کے ارکان نے فیصلہ کیا کہ صوبے کی تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب کے ان اضلاع کے نمائندے جہاں غیر مسلم اکثریت میں ہیں ہندوستان کی مجلس دستور ساز میں شریک ہوں گے ۔

۲۶ جون کو سندھ کی اسمبلی نے کثرت رائے سے نئی مجلس دستور ساز میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا ۔

یہی فیصلہ بلوچستان کی طرف سے شاہی جرگے اور کوئٹے کی بلدیہ کے غیر سرکاری ارکان کے جلسے میں متفقہ طور پر کیا گیا ۔

جولائی کی ابتدا میں سلہٹ کے لیے استصواب رائے عامہ ہوا اور ۱۸۴۰۴۱ کے مقابلے میں ۲۳۹۶۱۹ رائوں کی تعداد سے سلہٹ کو آسام سے الگ کر کے مشرقی بنگال میں شامل کرنا طے پایا ۔

صوبۂ سرحد میں عرصے سے کانگرسی حکومت قائم تھی ۔ وہاں خان عبدالغفار خاں نے مطالبہ کیا کہ پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ خود مختار پٹھانستان (پختونستان) کے لیے بھی رائے لی جائے، لیکن قائداعظم نے اس کی شدید مخالفت کی اور وائسرائے نے بھی اسے تسلیم نہ کیا؛ چنانچہ خان برادران نے استصواب رائے کے مقاطعے کا اعلان کر دیا ۔ بایں ہمہ صوبے کے لوگوں کی بڑی اکثریت نے پاکستان کے حق میں رائے دی ۔

اس کے بعد پاکستان کی مجلس دستور ساز میں نمائندگی کے لیے سلہٹ، مشرقی بنگال اور مغربی پنجاب میں نئے انتخابات ہوئے ۔ سندھ، بلوچستان اور صوبۂ سرحد میں اس کی ضرورت یوں پیش نہ آئی کہ یہ علاقے تقسیم نہیں ہوئے تھے ۔

قانون آزادی ہند : ۱۰ جولائی کو برطانوی پارلیمنٹ نے آزادی ہند کا قانون منظور کیا ۔ ۱۸ جولائی کو بادشاہ نے اس کی منظوری دے دی اور عارضی دستور کے طور پر کام دینے کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں ضروری ترمیم کر کے اسے انڈیا آرڈر ۱۹۴۷ء کے نام سے نافذ کر دیا گیا ۔

انتقال اختیار سے قبل عبوری دور کے لیے دونوں مملکتوں کے لیے گورنر جنرل کے تقرر کا مسئلہ بھی طے ہونا تھا ۔ کانگرس ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا گورنر جنرل بننے کی دعوت دے چکی تھی ۔ قائد اعظم کی تجویز تھی کہ دونوں مملکتوں کے لیے علیحدہ علیحدہ گورنر جنرل ہوں اور اختلافی مسائل کو طے کرنے کے لیے ایک بالائی گورنر جنرل مقرر کیا جائے، لیکن اسے ماؤنٹ بیٹن نے قبول نہ کیا ۔ ۲ جولائی کو مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ پاکستان کے گورنر جنرل قائد اعظم ہوں گے ۔ اس فیصلے سے ماؤنٹ بیٹن کو سخت صدمہ ہوا اور اس کے بعد وہ ہر معاملے میں ہندوؤں کی حمایت پر تل گیا (دیکھیے *Jinnah, Creator of Pakistan*، ص ۱۹۳)؛ چنانچہ اس کا ثبوت دفاتر، افواج، اسلحہ اور املاک کی تقسیم کے سلسلے میں قدم قدم پر ملتا رہا ۔

دونوں مملکتوں کی سرحد کی تعین کے لیے دو حد بندی کمیشن قائم کیے گئے جن کا صدر سر سرل ریڈ کلف Cyril Radcliffe کو مقرر کیا گیا ۔ کمیشن کے ارکان ہائی کورٹ کے جج تھے ۔ بنگال کمیشن جسٹس ابوصالح محمد اکرم، جسٹس ایس ۔ اے ۔ رحمٰن، جسٹس سی ۔ سی ۔ بسواس اور جسٹس بی ۔ کے ۔ مکرجی پر اور پنجاب کمیشن جسٹس شیخ دین محمد، جسٹس محمد منیر، جسٹس مہر چند مہاجن اور جسٹس تیجا سنگھ پر مشتمل تھا ۔ ان کے درمیان اتنا شدید اختلاف پیدا ہوا کہ فیصلہ دینے کا حق کمیشن کے صدر کو سونپ دیا گیا ۔ اس نے جو فیصلہ دیا وہ کتنا جانبدارانہ تھا

اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پنجاب میں گورداسپور اور بٹالہ کی تحصیلیں، جن میں مسلمان اکثریت میں تھے، ہندوستان میں شامل کر دی گئیں بلکہ سرحدی خط دیہات وار کھینچا گیا اور ساٹھ فی صد مسلم اکثریت کی تحصیل اجنالہ (ضلع امرتسر) اور اسی طرح زیرہ اور فیروز پور کی تحصیلیں بھی پاکستان میں شامل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ بقول قائد اعظم “اس عظیم اور خود مختار مسلم مملکت کی تعمیر میں ہم سے سخت ناانصافیاں کی گئیں۔ جہاں تک ممکن تھا ہم کو دبایا گیا اور ہمارے رقبے کو کم کیا گیا۔ جو آخری ضرب ہم پر لگائی گئی ہے وہ حد بندی کمیشن کا فیصلہ ہے۔ یہ ایک غیر منصفانہ، ناقابل فہم، بلکہ مکروہ فیصلہ ہے . . .۔ بہر حال ہم اس کی پابندی کا وعدہ کر چکے ہیں، لہٰذا . . . ایک آبرو مند قوم کی طرح ہمیں یہ قبول کر لینا چاہیے”۔ در اصل انگریز اور ہندو کی ابتدا ہی سے یہ کوشش رہی تھی کہ ہندوستان متحد رہے اور جب تقسیم ناگزیر نظر آئی تو انہوں نے پاکستان کو ہر ممکن طریق سے اتنا کمزور کر دینا چاہا کہ وہ زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکے۔

قیام پاکستان: ۷ اگست کو قائد اعظم کراچی پہنچ گئے، جہاں ۱۱ اگست کو پاکستان کی مجلس دستور ساز کا پہلا اجلاس ہوا۔ ۱۳ اگست کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بر صغیر کے وائسرائے اور گورنر جنرل کی حیثیت سے کراچی آ کر ۱۴ اگست کو دولت مشترکہ کی نئی مملکت پاکستان کے اختیارات اس کے گورنر جنرل کے حوالے کر دیے اور ۱۵ اگست کو قائد اعظم نے بحیثیت گورنر جنرل پاکستان حلف اٹھایا۔ پاکستان باضابطہ وجود میں آ گیا۔

(د) قیام پاکستان کے بعد

(۱) اہم سیاسی واقعات

(الف) اگست ۱۹۴۷ء سے اکتوبر ۱۹۵۸ء تک

ابتدائی مشکلات اور مہاجروں کا مسئلہ: پاکستان کو ابتدا ہی سے بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ نئے ملک کی نہ تو کوئی اپنی منظم فوج تھی، نہ کوئی انتظامیہ تھی۔ ۲۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو مجلس تقسیم ملک (Partition Council) کے اعلان عافیت و آزادی کی رو سے مسلم لیگ کے علاوہ کانگرس اور سکھوں کے رہنما بھی اس امر پر متفق ہو چکے تھے کہ انتقال اختیار کے بعد اقلیتوں کے ساتھ خوش معاملگی اور انصاف کا برتاؤ کیا جائے گا۔ تمام شہریوں کو جان و مال کا تحفظ دیا جائے گا اور کسی حالت میں تشدّد گوارا نہیں کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں پنجاب میں امن قائم کرنے کے لیے اضلاع سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لائل پور، منٹگمری، لاہور، امرتسر، گورداسپور، ہوشیار پور، جالندھر، فیروز پور اور لدھیانہ میں فوجی کمان قائم کر دی گئی تھی، جس کا کمانڈر میجر جنرل ریس اور اس کے مشیروں کے طور پر ہندوستان کی طرف سے بریگیڈیر دگمبر سنگھ اور پاکستان کی طرف سے کرنل محمد ایوب خان مقرر کیے گئے تھے۔ حصولِ آزادی سے قبل فسادات دوطرفہ تھے، لیکن آزادی ملنے کے بعد حکومت پاکستان نے فتنہ و فساد کو دبانے کی پرزور کوشش کی جو بڑی حد تک کامیاب بھی رہی۔ اس کے برعکس سکھوں اور فرقہ پرست ہندوؤں نے مشرقی پنجاب اور دوسرے بھارتی علاقوں میں قتل و غارت کا سلسلہ جاری رکھا اور حکومت کی سرپرستی میں مسلح اور منظم دستوں نے، جن میں سکھ ریاستوں کے فوجی بھی شامل تھے، مشرقی پنجاب، دہلی اور شمالی

یو۔ پی کو مسلمانوں سے خالی کرانا شروع کر دیا۔ لاکھوں مسلمان مارے گئے۔ ہزاروں عورتیں اغوا کر لی گئیں اور لاکھوں کی تعداد میں زخمی اور لٹے پٹے لوگ پاکستان میں داخل ہونے پر مجبور کر دیے گئے۔ ہندوستانی لیڈر نئے ملک کو ختم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ان کا مقصد تھا کہ پاکستان کی طرف پناہ گزینوں کا ایک بے پناہ سیلاب جاری کر دیا جائے تاکہ اس کی حکومت قائم ہی نہ ہو سکے اور اگر ہو بھی جائے تو انتہائی کمزور اور بودی۔ اسی پروگرام کے تحت مغربی پاکستان کے ہندوؤں کو پاکستان سے چلے آنے کی ہدایت کی گئی جو وہاں کی تمامتر تجارت، صنعت اور بینکنگ پر قابض اور بیشتر کلیدی ملازمتوں پر فائز تھے تاکہ نیا ملک اقتصادی، تجارتی اور انتظامی بحران کا شکار ہو جائے، چنانچہ ان علاقوں کے بھی ہندو اور سکھ ترک وطن کر گئے جہاں بدامنی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا اور جاتے جاتے اپنا مال و متاع، سرکاری دفاتر کا سامان، کارخانوں کی مشینوں کے ضروری پرزے اور ہسپتالوں کے آلات بھی یا تو اپنے ساتھ لے گئے یا تباہ کر گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکانیں، بینک، منڈیاں، کارخانے، شفاخانے، سب کچھ عرصے کے لیے بند ہو گئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ پاکستان کو اس کے حصے کا فوجی سامان اور روپیہ بھی نہیں دیا گیا تھا۔ اس موقع پر اہل پاکستان نے حب الوطنی، حوصلہ مندی اور ایثار کا ثبوت دیا اور وزارت مہاجرین نے عوامی کارکنوں کی مدد سے مہاجرین کو ہنگامی طور پر ملک کے مختلف علاقوں میں آباد کر کے ان کی ضروریات کا انتظام کیا اور انہوں نے ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی اراضی، مکانات، دکانیں اور کارخانے وغیرہ ''الاٹ'' کر کے زراعت، تجارت اور صنعت کا تعطل دور کرنے کے علاوہ لاکھوں نفوس کی بحالی اور آبادکاری کا اہتمام کیا۔ اسی طرح سرکاری دفاتر سے ملازمین نے انتہائی دشوار حالات میں کام سنبھالا اور حکومت کے نظم و نسق کو کامیابی سے چلانا شروع کر دیا۔ یوں قائد اعظم کی قیادت میں مسلمانوں نے پورے اعتماد اور جوش کے ساتھ ہر مشکل کا مقابلہ کر کے اپنی حکومت کی بنیادیں استوار کر دیں۔

قائد اعظم (رک بہ محمد علی جناح) پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے اور لیاقت علی خان وزیر اعظم۔ کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت بنایا گیا۔ ملک کے لیے مؤثر انتظامی ڈھانچے کی تشکیل کی گئی اور آئین ساز مجلس بنائی گئی، جس کے پہلے صدر خود قائد اعظم تھے۔

نیا ملک زیادہ تر ان حصوں پر مشتمل تھا جنہیں انگریز حکمرانوں نے صنعتی طور پر پس ماندہ رکھا ہوا تھا۔ اس علاقے سے صرف فوجی سپاہی بھرتی کیے جاتے تھے اور خام مال انگلستان بھیجا جاتا تھا۔ تقسیم کے وقت ریڈکلف نے، جو حد بندی کمیشن کا صدر تھا، سیاسی فیصلے کر کے مسلم اکثریت کے بعض اہم علاقے بھارت کو دے دیے۔ بھارت کی کشمیر پر بالا دستی قائم کرنے کے لیے ملحقہ ضلع گورداسپور اس کے حوالے کر دیا۔ اس کے علاوہ اہم نہری ہیڈ ورکس (Head Works) بھی، جو فیروز پور اور مادھو پور میں واقع تھے اور جہاں سے پاکستانی علاقوں کو نہری پانی فراہم ہوتا تھا، بھارت کو دیے گئے۔ یہ ایک صریح ناانصافی تھی لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود پاکستان آگے بڑھتا رہا۔

صوبۂ سرحد کا مسئلہ: صوبۂ سرحد میں ۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر خان صاحب کے زیر قیادت کانگرسی حکومت قائم ہوئی تھی، جسے معمولی اکثریت حاصل تھی، لیکن صوبۂ سرحد کے مسلمان

اس حکومت کے خلاف ہو گئے اور ۱۹۴۷ء کے ایکٹ کے مطابق یہاں عام رائے شماری ہوئی تو بھاری اکثریت نے صوبے کے پاکستان سے الحاق کے حق میں ووٹ دیے؛ چنانچہ قائد اعظم کے حکم سے صوبے کے گورنر نے ۲۲ اگست ۱۹۴۷ء کو کانگرسی وزارت برطرف کر دی۔ انگریز تو فوجی طاقت، سیاسی چالوں اور رشوت کے ذریعے سرحدی قبائل کو قابو میں رکھتے تھے، مگر پاکستان بننے کے بعد یہ طریق کار ترک کر دیا گیا اور قبائلی پٹھانوں نے محسوس کر لیا کہ وہ پاکستان کے دوسرے حصوں کے مسلمانوں کے شریک کار ہیں۔ جب نئی نئی سڑکیں بنائی گئیں اور سکول کھولے گئے تو صوبۂ سرحد اور دوسرے علاقوں کے باشندوں کے درمیان گہرا رابطہ پیدا ہو گیا اور دُوری کا احساس ختم ہو گیا۔

مسئلۂ کشمیر: انگریزوں نے جموں اور کشمیر کی ریاست ۷۵ لاکھ روپے کے عوض ۱۸۴۶ء میں ایک ڈوگرہ سردار گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ ڈالی تھی۔ مسلمان اکثریت کی اس ریاست پر نئے حکمران نے تشدد کے ساتھ حکومت کرنا شروع کی اور اس کے جانشینوں نے بھی کشمیری پنڈتوں کی مدد سے مسلمان عوام پر ظالمانہ تسلط قائم رکھا۔

جموں و کشمیر کے باشندوں کی ۸۰ فی صد آبادی مسلمان ہے۔ جغرافیائی، اقتصادی، مذہبی اور تمدنی اعتبار سے اس ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ قانون آزادی، مجریۂ ۱۹۴۷ء، کی رو سے ریاستوں کو پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کا حق دیا گیا تھا، البتہ ماؤنٹ بیٹن نے ریاستی حکمرانوں کو انتباہ کیا تھا کہ وہ جغرافیائی تقاضوں کو مدِّ نظر رکھیں۔

برصغیر کی آزادی کے موقع پر ہی کانگرسی لیڈروں نے کشمیر کو بھارت کے ساتھ ملانے کی کوششیں شروع کر رکھی تھیں، چنانچہ گاندھی جی نے ۱۹۴۷ء کے موسم گرما میں کشمیر کا دورہ کیا۔ مہاراجا ہری سنگھ کو معلوم تھا کہ ریاست کے مسلمان لازماً پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں۔ انھیں دھوکا دینے کے لیے اگست ۱۹۴۷ء میں اس نے بظاہر تو پاکستان کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ فی الحال جو حالات و تعلقات ہیں وہ بحال رہیں (Stand Still Agreement)، لیکن جب مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہونے لگا تو اس کے اشارے پر ریاست کے مسلح ہندوؤں اور فوج نے جموں اور کشمیر کے مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے ان پر منظم حملے شروع کر دیے۔ ان حالات سے مجبور ہو کر پونچھ کے مسلمانوں نے راجا کے خلاف بغاوت کر دی اور ریاست کی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ پاکستان کے بہت سے مسلمان بھی اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کے لیے چل پڑے اور ان کی آزادی کی جنگ میں شریک ہو گئے۔ لڑائی کی آگ ریاست کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ ہر طرف ریاستی فوجوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور مہاراجا اور اس کے ارکان حکومت بھاگ کر دہلی جا پہنچے۔ مہاراجا نے بھارتی حکومت سے الحاق کی درخواست کی اور فوجی امداد طلب کی، جسے فوراً منظور کر لیا گیا۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو الحاق کی دستاویز پر دستخط ہو گئے۔ بھارتی فوجیں ہوائی جہازوں کے ذریعے سری نگر میں اتاری گئیں اور مجاہدین کے خلاف صف آرا ہو گئیں۔ اسی اثنا میں کانگرسی لیڈروں نے ممتاز کشمیری رہنما شیخ محمد عبداللہ کو جیل سے نکال کر ریاست جموں و کشمیر کا وزیر اعلیٰ بنا دیا۔

ریاست کا بھارت کے ساتھ الحاق ریڈ کلف ایوارڈ کی ناانصافی کی وجہ سے ممکن ہوا، کیونکہ گورداسپور کا مسلم اکثریتی علاقہ بھارت کو دے دیا

گیا تھا۔ اس طرح بھارت کو کشمیر میں داخل ہونے کے لیے راستہ مل گیا۔ دوسرے الحاق کا یہ معاہدہ جلد بازی میں کیا گیا تھا اور چونکہ اس میں عوام کی مرضی شامل نہیں تھی اس لیے اس کی کوئی اخلاقی اور قانونی وقعت نہ تھی۔ قائد اعظم نے بھارتی حکومت پر زور دیا کہ وہ ریاست میں غیر جانب دار حکومت قائم کر کے عام رائے شماری کے لیے حالات سازگار بنانے میں مدد دے، لیکن بھارتی حکومت نے ایسا نہ کیا۔ جنگ شدید ہوتی گئی اور قبائلی مجاہدوں اور دیگر رضاکار جماعتوں کے کچھ دستے بھی کشمیری مسلمانوں کی مدد کو پہنچ گئے۔ بے بسی کے عالم میں بھارتی حکومت نے جنوری ۱۹۴۸ء میں سلامتی کونسل کا دروازہ کھٹکھٹایا اور فائر بندی ہو گئی۔ اس عرصے میں جو علاقے آزاد کرا لیے گئے تھے وہاں کشمیریوں نے آزاد جموں و کشمیر حکومت قائم کر لی۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں نے سلامتی کونسل کی یہ قرارداد منظور کر لی کہ کشمیری عوام کو حق خود ارادیت کے تحت اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا؛ لیکن بعد میں بھارتی حکومت نے تعاون نہ کیا۔

نہری پانی کا جھگڑا: ریڈکلف نے پاکستانی علاقوں کو سیراب کرنے والی نہروں کے ہیڈ ورکس، جو فیروز پور اور مادھو پور کے مقامات پر واقع تھے، بھارت کو دے دیے۔ بعد میں بھارتی حکومت نے ستلج، بیاس اور راوی کے پانی پر اپنا مکمل حق جتانا شروع کر دیا۔ ابتدا میں چند عارضی معاہدے ہوئے جن کی رو سے پاکستان نہری پانی کی فراہمی کے عوض نقد روپیہ ادا کرتا رہا، لیکن بھارتی حکام اکثر ضرورت کے وقت پانی بند کر دیتے تھے جس سے پاکستان کی فصلوں کو نقصان پہنچتا؛ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں یہ معاملہ بین الاقوامی سطح پر پیش کیا گیا۔

قائد اعظم کی وفات: کام کی زیادتی اور ذمے داریوں کے بوجھ کی وجہ سے قائد اعظم کی صحت بہت خراب ہو گئی۔ اس کے باوجود وہ سرکاری کاموں کو بدستور انجام دیتے رہے۔ آخر ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

قائد اعظم کی وفات کے بعد: قائد اعظم محمد علی جناح کی وفات کے بعد مشرقی بنگال (مشرقی پاکستان) کے سابق وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین نئے گورنر جنرل مقرر ہوئے اور لیاقت علی خان بدستور وزیر اعظم رہے۔ خواجہ ناظم الدین کے دور میں وزیر اعظم کے اختیارات اور ذمے داریوں میں وسعت پیدا ہو گئی۔

قرارداد مقاصد: نئی دستور ساز اسمبلی کے فرائض میں دستور سازی اور مرکزی قانون ساز اسمبلی کی ذمے داریاں شامل تھیں۔ ابتدا میں اس کے ارکان کی تعداد ۶۹ تھی، جو بعد میں ریاستوں کے نمائندے ملا کر ۷۹ ہو گئی، لیکن تارکین وطن کی بحالی اور اقتصادی و انتظامی امور کی تنظیم نو جیسے مسائل کی وجہ سے دستور سازی پر پوری توجہ نہ دی جا سکی۔ دستور سازی کی ابتدا قرارداد مقاصد سے ہوئی، جو ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو پیش ہوئی اور مختصر بحث کے بعد منظور کر لی گئی۔ اس میں پاکستان کا دستور قرآن و سنت کے مطابق بنانے کا عہد کیا گیا (دیکھیے تفصیل بذیل ''آئین کی تاریخ'')۔ اس کے بعد ''بنیادی اصولوں کی کمیٹی'' مقرر ہوئی، جس نے دستور کا مسودہ تیار کیا۔ ستمبر ۱۹۵۰ء میں جو رپورٹ پیش کی گئی اس میں پارلیمانی طرز حکومت، دو قانون ساز اداروں (ایوان بالا و ایوان زیریں) اور وزرا پر پارلیمان کی بالا دستی کی سفارشات شامل تھیں۔ مشرقی پاکستان نے مرکز کے وسیع اختیارات کے خلاف احتجاج کیا اور یہ

معطل ہو گئی۔

چونکہ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کی مکمل بالا دستی تھی اور حزب اختلاف ابھی وجود میں نہ آئی تھی اس لیے پارلیمنٹ میں پیش ہونے والے قوانین پر شاذ ہی بحث ہوتی۔ اس دور میں ایک اہم دستوری ترمیم دفعہ ۹۲ الف میں ہوئی، جس کی رو سے آئینی حکومت ناکام ہونے کی صورت میں صوبے کا انتظام براہ راست گورنر جنرل اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا۔ پنجاب میں وزرا کے باہمی اختلافات نازک صورت اختیار کر گئے تو ۱۹۴۹ء کے آغاز میں وزارت بر طرف کر کے صوبے کا انتظام گورنر کے سپرد کر دیا گیا۔ دوسرے صوبوں کی حالت بھی کم و بیش یہی رہی۔

لیاقت علی خان کے عہد میں بالغ رائے دہی کا نظام بہ ترمیم رائج کیا گیا اور پنجاب اور صوبۂ سرحد میں ۱۹۵۱ء کے انتخاب کے بعد نئی منتخب حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اگرچہ مسلم لیگ کی بالا دستی قائم رہی، لیکن عوام سے رابطہ کٹ جانے کی وجہ سے جماعت کمزور ہوگئی تھی۔ لیاقت علی خان کے ایما پر لیگ کے دستور کی وہ شق ختم کر دی گئی جس کی رو سے وزرا کوئی جماعتی عہدہ نہیں سنبھال سکتے تھے۔ وہ خود مسلم لیگ کے صدر بن گئے اور ان کی پیروی میں تمام صوبائی وزرائے اعلیٰ نے صوبائی شاخوں کی صدارت سنبھال لی۔ اس سے یہ نقصان ہوا کہ جماعت اور حکومت میں کوئی فرق نہ رہا۔

بھارت سے تعلقات: تقسیم ملک کے بعد بھی بھارتی حکومت نے کشمیر، نہری پانی اور متروکہ جائداد کے مسائل حل نہ کیے، جس کے باعث پاکستان کے لیے گوناگوں مشکلات پیدا ہو گئیں۔ دہشت‌پسند غیر مسلم جماعتوں نے مسلم کش فسادات برپا کر کے بے شمار مسلمانوں کو پاکستان میں دھکیل دیا۔ اس صورت حال کو ختم کرنے کے لیے لیاقت علی خان نے خود ۱۹۵۰ء میں دہلی جا کر بھارتی وزیر اعظم پنڈت نہرو سے "اقلیتوں کا معاہدہ" طے کیا، جس کی رو سے دونوں حکومتوں نے اقلیتوں کے لیے الگ وزارتیں قائم کرنے اور ان کی حفاظت کرنے کی ذمے داری قبول کی۔

ہندوؤں کے چلے جانے سے پاکستان کو صنعتی، تجارتی اور مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان امور پر ہندوؤں ہی کی اجارہ‌داری تھی۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے حکومت نے منصوبہ‌بندی کمیشن قائم کیا۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں اہم زرعی اصلاحات نافذ کر کے جاگیرداری پر مؤثر پابندیاں عائد کی گئیں اور کاشت کاروں کو اہم سہولتیں دی گئیں۔ ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خان نے امریکہ کا دورہ کیا اور پاکستان کے بارے میں متعدد تقریریں کیں۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں حکومت کے خلاف ایک بغاوت (راولپنڈی سازش) کا انکشاف ہوا، جس میں چند اعلیٰ فوجی افسر بھی شامل تھے۔ اسی سال ۱۷ اکتوبر کو لیاقت علی خان کو ایک جلسۂ عام میں ایک آدمی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

خواجہ ناظم الدین بطور وزیراعظم (۱۷ اکتوبر ۱۹۵۱ تا ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء): لیاقت علی خان کی وفات کے بعد گورنر جنرل پاکستان خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم مقرر ہوئے اور وزیر مالیات غلام محمد ان کی جگہ گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ خواجہ ناظم الدین ایک نیک دل مسلمان تھے، لیکن اپنی نرم مزاجی کی وجہ سے بطور سربراہِ حکومت زیادہ کامیاب نہ رہے۔ ان کے عہد میں غلے کی کمی پیدا ہو گئی، سرکاری ملازمین سیاست میں دخل دینے لگے اور آئین‌سازی

کی رفتار بہت سست پڑ گئی۔ بھارت نے پاکستان کے حصے کا نہری پانی ضرورت کے وقت اور بند کرنا شروع کر دیا، جس سے فصلوں کو بہت نقصان پہنچا۔

۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو خواجہ ناظم الدین نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پیش کی، جس میں سفارش کی گئی تھی کہ مرکز میں دو ایوانی مقننہ قائم کی جائے؛ علما کا ایک بورڈ بنایا جائے، جو یہ دیکھے کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے بنائے ہوئے قوانین قرآن و سنت کے مطابق ہیں یا نہیں اور کابینہ صرف ایوان نمائندگان کے سامنے جوابدہ ہو۔

۱۹۵۳ء کے اوائل میں مجلس احرار نے قادیانی فرقے کے خلاف ایک تحریک چلائی، جس نے پنجاب کے علاقے میں نظم و نسق کی صورت حال بہت خراب کر دی۔ آخر فوج نے حالات پر قابو پایا۔ صوبائی حکومت برطرف ہو گئی اور فیروز خان نون کو نیا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ ۱۷ اپریل کو گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو بھی جبراً برطرف کر دیا حالانکہ انہیں مجلس قانون ساز کے ارکان کی حمایت حاصل تھی۔ یہ عمل پارلمانی جمہوریت کے معروف اصولوں کے منافی سمجھا گیا۔

محمد علی بوگرا بطور وزیر اعظم (۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء تا ۱۱ اگست ۱۹۵۵ء): ملک غلام محمد نے محمد علی بوگرا کو، جو اس وقت واشنگٹن (امریکہ) میں پاکستان کے سفیر تھے، نئی حکومت بنانے کی دعوت دی اور خود ہی وزارتی کونسل کی فہرست تیار کر دی۔ محمد علی بوگرا ملکی حالات پر قابو نہ پاسکے۔ بھارت سے نہری پانی کا تنازع نیا رخ اختیار کر گیا۔ عالمی بنک نے تجویز پیش کی کہ تین مشرقی دریاؤں (ستلج، بیاس اور راوی) پر بھارت کا حق تسلیم کر لیا جائے اور پاکستان میں رابطے کی نہریں بنا کر پانی کی کمی کو پورا کیا جائے۔ پاکستان کے لیے یہ تجویز ناقابل قبول تھی۔ اسی زمانے میں بھارت نے اعلان کر دیا کہ کشمیر کا الحاق بھارت کے ساتھ مکمل طور پر ہو چکا ہے۔ یہ سلامتی کونسل کی قراردادوں سے کھلا انحراف تھا۔ شیخ عبداللہ نے بھی اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، چنانچہ بھارتی حکومت نے شیخ عبداللہ کو وزارت عظمیٰ سے برطرف کر کے جیل میں ڈال دیا۔

محمد علی بوگرا کے زمانۂ وزارت میں پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کے خدوخال پوری طرح ابھر آئے۔ مسلمان ممالک کے ساتھ مراسم مزید گہرے ہو گئے اور پاکستان نے اقوام متحدہ میں مسلمان ملکوں کی ہر طرح امداد کی۔ بوگرا نے بھارت جا کر دونوں ملکوں کے تعلقات بہتر بنانے کی بھی کوشش کی۔ اسی دور میں امریکہ سے فوجی اور اقتصادی معاہدے ہوئے، جن میں CENTO (معاہدۂ بغداد) اور SEATO (جنوب مشرقی ایشیا کا دفاعی معاہدہ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی رو سے کمیونسٹ بلاک کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کرنا رکن ممالک پر لازم تھا۔

۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں انتخابات ہوئے اور مسلم لیگ کو متحدہ محاذ کے ہاتھوں، جس کے سربراہ فضل الحق تھے، بری طرح شکست ہوئی۔ مشرقی پاکستان میں ان انتخابات نے مسلم لیگ کا اثر ختم کر دیا اور عوامی لیگ ایک طاقتور سیاسی قوت کے طور پر سامنے آئی، جس کے قائد حسین شہید سہروردی تھے۔ اس جماعت نے صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے بنانے اور بگاڑنے میں اہم حصہ لیا۔ ان انتخابات کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ آئین ساز اسمبلی کی نمائندہ حیثیت پر بھی شک کا اظہار کیا جانے لگا۔ گورنر جنرل

کی مداخلت سے بچنے کے لیے وزیر قانون مسٹر بروہی نے ۴ اگست ۱۹۵۴ء کو ایک مسودۂ قانون پیش کیا، جسے منظور کر لیا گیا۔ علاوہ ازیں آئین ساز اسمبلی نے ایک اور قرار داد بھی منظور کی، جس کی رو سے گورنر جنرل کے اختیارات میں کمی کر دی گئی۔ اس کے بعد بنیادی اصولوں کی ترمیم شدہ رپورٹ منظور کی گئی اور اسے مسودۂ آئین کی شکل دینے کے لیے ماہرین کے پاس بھیج دیا گیا۔ طے پایا کہ یہ مسودہ ۲۷ اکتوبر کو آئین ساز اسمبلی کے ہاتھوں میں آ جائے۔ عین اس وقت جب اسمبلی دستور سازی کا کام ختم کر چکی تھی ۲۴ اکتوبر کو گورنر جنرل نے اپنے خصوصی اختیارات کے تحت اسے برطرف کر دیا اور اعلان کیا کہ یہ اسمبلی عوام کا اعتماد کھو چکی ہے۔ مولوی تمیز الدین خان نے، جو اس کے سپیکر تھے، گورنر جنرل کے حکم کے خلاف سندھ ہائی کورٹ میں دعوی دائر کر دیا، جس نے ان کے حق میں فیصلہ دیا، لیکن بعد میں فیڈرل کورٹ نے گورنر جنرل کے حکم ہی کو بحال رکھا۔

محمد علی بوگرا نے گورنر جنرل کی دعوت پر نئی وزارت تشکیل کی، جس میں اسکندر مرزا، سہروردی، ڈاکٹر خان صاحب اور جنرل ایوب خان کمانڈرانچیف کو بھی شامل کر لیا۔ اسی زمانے میں وحدت مغربی پاکستان کا منصوبہ تیار کیا گیا، اناج کی کمی کو بیرونی ملکوں سے غلہ منگوا کر پورا کیا گیا، حکومت نے سمگلنگ کی روک تھام اور قیمتوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی مگر اس میں کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔

جولائی ۱۹۵۵ء میں دستور ساز اسمبلی کے نئے انتخابات ہوئے، جن کے بعد محمد علی بوگرا پارٹی کے سربراہ نہ بن سکے اور سفیر بن کر واپس واشنگٹن چلے گئے۔ خیال تھا کہ اب سہروردی کو حکومت تشکیل کرنے کا موقع دیا جائے گا، لیکن اس اثنا میں غلام محمد، جو انہیں کابینہ میں لائے تھے، بیمار ہو کر رخصت پر چلے گئے اور ان کی جگہ اسکندر مرزا قائم مقام گورنر جنرل بن گئے۔ انہوں نے مولوی فضل الحق سے رشتہ استوار کیا اور سابق وزیر مالیات چودھری محمد علی کو، جو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر منتخب ہوئے تھے اور جنہیں متحدہ محاذ کی حمایت حاصل تھی، وزارت بنانے کی دعوت دی۔ اس طرح مسلم لیگ اور متحدہ محاذ کی مخلوط وزارت قائم ہو گئی۔

چودھری محمد علی کا دور وزارت :

(۱۱ اگست ۱۹۵۵ تا ۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء) : ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو مغربی پاکستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں کو ملا دیا گیا اور یوں وحدت مغربی پاکستان وجود میں آئی۔ فروری ۱۹۵۶ء میں پاکستان کا دستور منظور ہوا، جو ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو نافذ کر دیا گیا۔ یہ دستور جمہوری اور پارلیمانی طرز کا تھا اور اس میں ملک کو جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان کا نام دیا گیا (تفصیل کے لیے دیکھیے بذیل ''آئین کی تاریخ'')۔

چودھری محمد علی نے اپنے دور وزارت میں کوشش کی کہ ''سیٹو'' اور ''سنٹو'' کے معاہدات کا اطلاق صرف اشتراکی جارحیت ہی کے خلاف نہیں بلکہ ہر قسم کی جارحیت کے خلاف کیا جائے، لیکن ان معاہدات میں شامل بڑے ممالک، یعنی امریکہ اور برطانیہ، اس موقف کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے اور اس سلسلے میں پاکستان کو صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ ''سیٹو'' کے ارکان نے اعلان کر دیا کہ پاکستان کا اقتدار ''ڈیورنڈ لائن'' تک وسیع ہے۔

۱۹۵۶ء تک پاکستان صنعتی میدان میں خاصی ترقی کر چکا تھا، لیکن افراط زر کے باعث ملک،

کا معاملہ پھر متنازع ہو رہا تھا، چنانچہ پاکستانی [illegible] کی قیمت [illegible] دی گئی۔

نئے آئین کے نفاذ کے بعد میجر جنرل اسکندر مرزا کو صدر منتخب کیا گیا تھا۔ پاکستان کے پہلے صدر کی زندگی انگریزی عہد میں فوج اور محکمۂ خارجہ کی ملازمت میں گزری تھی اور انہیں نوآبادیاتی طرز کے نظم و نسق کا بڑا تجربہ تھا۔ ذاتی طور پر وہ صدارتی نظام حکومت کے حق میں تھے اور مرکز کے اختیارات کا دائرہ وسیع کرنا چاہتے تھے۔ وزیر اعظم نے بھی عمر بھر سرکاری ملازمت ہی کی تھی اور عوام سے ان کا کوئی براہ راست رابطہ نہیں رہا تھا۔ انہوں نے مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ کے عہدے کے لیے ڈاکٹر خان صاحب کی حمایت کی، جو آزادی سے قبل مشہور کانگریسی رہنما رہ چکے تھے۔ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے ارکان نے سردار بہادر خان کو اپنا قائد منتخب کر کے گویا چودھری محمد علی کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کر دیا۔ ادھر وزیر اعظم کی حمایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر خان صاحب نے ریپبلکن کے نام سے اپنی الگ پارٹی بنا لی، جس میں مرکز اور مغربی پاکستان کی اسمبلیوں کے کئی ارکان شامل ہو گئے۔ مزید برآں پاکستان مسلم لیگ کی صدارت کا عہدہ لیاقت علی خان کے زمانے سے وزیر اعظم ہی کے پاس رہتا آیا تھا، لیکن چودھری محمد علی نے اس روایت کو توڑ دیا۔ لیگ کے نئے صدر عبدالرب نشتر ہو گئے اور چودھری محمد علی کے تمام مخالفین ان کے پرچم تلے متحد ہو گئے۔ اختلافات بڑھتے گئے، تاآنکہ مسلم لیگ نے ان کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے۔ مرکزی اسمبلی میں اگرچہ وزیر اعظم کو اکثریت کی حمایت حاصل تھی، تاہم انہوں نے اپنے عہدے سے چمٹا رہنا گوارا نہ کیا اور مستعفی ہو گئے۔

[illegible] سہروردی (۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء تا ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء): اسکندر مرزا کی دعوت پر عوامی لیگ کے رہنما سہروردی نے ریپبلکن پارٹی کے اشتراک سے وزارت بنا لی۔ ان کے عہد میں پناہ گزینوں کی آبادکاری پر خاصی توجہ دی گئی، سرکاری ملازمین کو سیاست میں حصہ لینے سے منع کیا گیا اور خوراک کی کمی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے دس لاکھ ٹن غلہ درآمد ہوا۔ اسی زمانے میں اسمبلی نے مخلوط انتخاب کے حق میں رائے دی۔

سہروردی مغربی بلاک کے ساتھ رہنے کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک فوجی معاہدوں میں شمولیت پاکستان کی بقا کے لیے ضروری تھی اور غیر جانب دار رہنے میں جارحیت کا شکار ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اسی لیے انہوں نے ذاتی مقبولیت کی پروا کیے بغیر ہنگری اور اس کے بعد مشرق اوسط کے مسائل میں، خصوصاً سویز کے بحران کے موقع پر، مغربی ممالک کا ساتھ دیا۔ اس موقف کی وجہ سے عرب پاکستان کے خلاف ہو گئے۔ بایں ہمہ وہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم تھے جنہوں نے چین کا دورہ کر کے باہمی تعلقات کی بنیاد رکھی۔

سہروردی کی وزارت بڑی حد تک ری پبلکن پارٹی کی حمایت پر قائم تھی، لیکن دونوں کی پالیسی میں بہت زیادہ فرق تھا، چنانچہ کچھ عرصے کے بعد دونوں میں اختلافات پیدا ہو گئے، جو اتنے بڑھے کہ صدر اسکندر مرزا نے سہروردی کو قانونی تکلفات پورے کیے بغیر برطرف کر دیا۔

آئی۔آئی۔چندریگر (۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ تا ۱۶ دسمبر ۱۹۵۷ء): سہروردی کے بعد صدر نے اسمٰعیل چندریگر کو وزیر اعظم بنایا، جو مسلم لیگ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ، ری پبلکن، کرشک سرمک اور نظام اسلام پارٹیوں کی

حمایت سے وزارت بنائی، مگر ان چار سیاسی جماعتوں کا اشتراک عمل ممکن نہ تھا، چنانچہ چھ ہفتے بعد انہیں وزارت عظمٰی سے الگ ہونا پڑا۔

فیروز خان نون (۱۶ دسمبر ۱۹۵۷ء تا ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء) : ری پبلکن پارٹی کی حمایت سے یکے بعد دیگرے تین وزرائے اعظم (چودھری محمد علی، سہروردی اور چندریگر) برسر حکومت آ چکے تھے۔ اب اس کے اپنے رہنما فیروز خان نون کو وزارت بنانے کا موقع دیا گیا۔

نئے وزیر اعظم نے مشرقی پاکستان میں زرعی اصلاحات کی تعریف کی، لیکن مغربی پاکستان میں اس کی مخالفت کی۔ ان کے زمانے میں گوادر کا علاقہ، جو کسی زمانے میں سلطان مسقط کو اجارے پر دیا گیا تھا، پاکستان کو واپس مل گیا۔ مشرقی پاکستان میں بیروباری کا علاقہ مدت سے بھارت اور پاکستان کے درمیان متنازع فیہ چلا آ رہا تھا۔ فیروز خان نون نے دہلی جا کر اس سلسلے میں گفت و شنید کی اور معاہدے کی رو سے بھارت نے اسے پاکستان کا حصہ تسلیم کر لیا (لیکن اس کا قبضہ ابھی تک نہیں مل سکا)۔ اسی زمانے میں کشمیری مہاجرین نے کشمیر لبریشن فرنٹ کے نام سے ایک جماعت بنائی تاکہ خط متارکہ پار کر کے مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی جنگ لڑی جائے، مگر اس پر عمل نہ ہو سکا۔

بحیثیت مجموعی فیروز خان نون کا مختصر دور وزارت بے یقینی، جوڑ توڑ اور انتشار کا دور تھا۔ مغربی پاکستان میں ریپبلکن پارٹی اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ برسر اقتدار تھیں، لیکن اصل طاقت صدر اسکندر مرزا کے ہاتھ میں تھی۔ مشرقی پاکستان کے گورنر اے۔ کے۔ فضل الحق نے جب عطاء الرحمٰن کی وزارت کو برطرف کیا تو عوامی لیگ کے دباؤ کے باعث نون حکومت نے فضل الحق کو ان کے عہدے سے الگ کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں سمگلنگ کا زور تھا۔ اس کی روک تھام کے لیے فوج طلب کی گئی، لیکن یہ مہم جلد ختم ہو گئی۔ افراط زر، غلے کی کمی اور زر مبادلہ کے ضیاع ایسے مسائل نے خطرناک صورت حال پیدا کر دی تھی۔ اسی زمانے میں مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب کو کسی مخبوط الحواس نوجوان نے ہلاک کر دیا۔ بعض لوگوں نے اسے سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی۔ ادھر عوامی لیگ، جو اب تک مرکزی حکومت میں عہدے قبول کرنے سے گریزاں رہی تھی، وزارت میں حصہ لینے کا مطالبہ کرنے لگی، جو مان لیا گیا۔ اس کے خلاف مسلم لیگ نے جگہ جگہ مظاہرے کیے اور لوگوں میں حکومت کے خلاف بے چینی پھیل گئی۔

مارشل لا کا نفاذ : حالات اب قابو سے باہر ہوتے جا رہے تھے، چنانچہ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات کو صدارتی فرمان کے ذریعے دستور کو معطل کر کے ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا اور ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ وزارتیں برطرف کر دی گئیں، قانون ساز اسمبلیاں توڑ دی گئیں اور سیاسی جماعتوں پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ صدر اسکندر مرزا نے بری فوج کے کمانڈر ان چیف جنرل محمد ایوب خان کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ بعد میں انہیں اپنے منصب سے علیحدہ ہونا پڑا اور جنرل ایوب خان نے صدارت کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔

(ب) صدر محمد ایوب خان کا دور (۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء تا ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء)۔

نئی کابینہ فوجی جرنیلوں اور شہری اکابر پر مشتمل تھی۔ وزیر اعظم کا عہدہ ختم کر دیا گیا اور صدر ایوب خان کے وزرا نے صدارتی کابینہ کے طور پر کام کرنا شروع کیا۔

ابتدائی اقدامات: نئی حکومت نے معاشرتی اور معاشی برائیوں کے استیصال کے لیے فوری اقدامات کیے، جن کے نتیجے کے طور پر سمگلنگ، جس کے باعث کروڑوں روپے کا ناجائز کاروبار ہوتا تھا، تقریباً ختم ہو گئی اور چور بازاری، قیمتوں میں بے جا اضافے، رشوت ستانی، عہدوں کے ناجائز استعمال اور سرکاری واجبات کی عدم ادائی کے خلاف کامیاب کارروائیوں سے عام فضا بہت بہتر ہو گئی اور حکومت پر لوگوں کا اعتماد بحال ہو گیا۔ حکومت نے مہاجرین کی بحالی اور انہیں بھارت میں چھوڑی ہوئی جائدادوں کا معاوضہ دینے کے لیے مؤثر کارروائی کی اور مختصر عرصے میں ان کی بحالی اور آبادکاری کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس کے علاوہ زر مبادلہ کی صورت حال بہتر بنانے کے لیے بیرونی تجارت کو فروغ دیا گیا اور ناجائز تجارت کی روک تھام کی گئی۔ ان اقدامات سے سرکاری اخراجات میں بھی معتدبہ کمی واقع ہوئی اور تعمیری منصوبوں کے لیے کافی روپیہ بچ رہا۔

سیاست دانوں اور سرکاری ملازمین کی تطہیر: سیاسی انتشار کے دور میں انتظامیہ میں بہت سی برائیاں پیدا ہو گئی تھیں بلکہ سابقہ حکومتوں کی غلط روی کی بھی بڑی حد تک یہی ذمے دار تھی؛ چنانچہ نااہلی، خود غرضی اور رشوت کا خاتمہ کرنے کے لیے سرکاری ملازمین کی بڑے وسیع پیمانے پر تطہیر کی گئی اور ہر درجے کے سینکڑوں ملازمین برخاست کر دیے گئے۔

۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے اعلان کی رو سے تمام سیاسی جماعتیں خلاف قانون قرار دے کر ان کی املاک ضبط اور دفاتر سربمہر کر دیے گئے تھے۔ سابق سیاست دانوں کا اثر و رسوخ ختم کرنے اور سیاست میں ان کے دوبارہ داخلے پر پابندی لگانے کے لیے ''ایبڈو'' (Elective Bodies Disqualification Ordinance) نافذ کیا گیا اور سابق وزرا اور دوسرے عہدیداروں کی دھاندلیوں کی تفتیش اور سماعت کے لیے خصوصی عدالتیں قائم کی گئیں۔ جن افراد پر اپنے عہدوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے اور طاقت کے غلط استعمال وغیرہ کے الزامات ثابت ہو گئے انہیں چھ سال کے لیے سیاسی زندگی میں حصہ لینے سے محروم کر دیا گیا۔

دارالحکومت کی تبدیلی: جغرافیائی محل وقوع اور صنعتی و تجارتی مرکز ہونے کے باعث انتظامی اور دفاعی نقطۂ نظر سے کراچی موزوں دارالحکومت نہ تھا اور کسی نئے دارالحکومت کی تلاش عرصے سے کی جا رہی تھی۔ چودھری محمد علی کے دور وزارت میں گڈاپ کو صدر مقام بنانے کی تجویز کسی حد تک منظور ہو گئی تھی، لیکن بعد میں اس پر کوئی عملدرآمد نہ ہو سکا۔ نئی حکومت نے اس مسئلے پر بڑی سرگرمی دکھائی۔ راولپنڈی کے قریب ایک موزوں مقام ملک کے آئندہ دارالحکومت کے لیے پسند کیا گیا۔ اس کا نام اسلام آباد رکھا گیا، شہر کا نہایت خوبصورت نقشہ تیار ہوا اور بڑی تیزی سے اس کی تعمیر کا کام ہونے لگا۔ اس وقت یہ شہر بہت حد تک مکمل ہو چکا ہے اور بیشتر مرکزی دفاتر اور سفارت خانے یہاں منتقل ہو چکے ہیں۔

طویل المیعاد اصلاحات: نئی حکومت نے تیس کے قریب کمیشن مقرر کیے تاکہ وہ قومی زندگی کے ہر اہم پہلو کی اصلاح کے لیے رپورٹیں مرتب کریں؛ چنانچہ زراعت، صنعت، تعلیم، عائلی قوانین، مزدوروں کے مسائل اور مالی حکمت عملی وغیرہ کے سلسلے میں اہم اصلاحات نے قومی زندگی پر بڑا صحت مند اثر ڈالا۔

زراعت: سابقہ حکومتوں نے صنعتی ترقی کی طرف توجہ کرتے وقت زراعت کو، جسے پاکستان کی اقتصادیات میں بنیادی حیثیت حاصل ہے، نظر انداز

کر دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فالتو اناج پیدا کرنے والے ملک کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے باہر سے اناج درآمد کرنا پڑا۔ نئی حکومت نے زرعی اصلاحات نافذ کیں، جن کی رو سے صوبۂ مغربی پاکستان میں ملکیت کی حد مقرر کر دی گئی (زیادہ سے زیادہ پانچ سو ایکڑ زیر کاشت یا ایک ہزار ایکڑ بنجر اراضی)، غیر قانونی طور پر حاصل کی ہوئی اراضی اور جاگیریں ضبط اور حد ملکیت سے زیادہ زمین مالکان اراضی کو مناسب معاوضہ دے کر حاصل کی گئی۔ اس طرح تقریباً سوا بائیس لاکھ ایکڑ رقبہ حاصل کر کے اسے ڈیڑھ لاکھ کسانوں میں تقسیم کر دیا گیا، جن کے پاس چپہ بھر زمین بھی اپنی نہیں تھی۔ علاوہ ازیں موروثی مزارعین کو حقوق ملکیت دے دیے گئے۔ اس سے صوبے کی تقریباً پانچ لاکھ زراعت پیشہ آبادی مستفید ہوئی۔ مزید برآں پانی کی تقسیم کا نظام بہتر بنایا اور بہتر بیج، کھاد اور کھیتی باڑی میں مشینوں کے استعمال کو رواج دے کر ملک کو غلے کے معاملے میں خود کفیل بنانے کی کامیاب کوشش کی۔

صنعت: تقسیم برصغیر کے وقت پاکستانی علاقوں میں کوئی قابل ذکر صنعت نہ تھی اگرچہ یہاں وافر مقدار میں خام مال پیدا ہوتا تھا۔ صنعتی ترقی کے ایکٹ مجریہ ۱۹۴۹ء کی رو سے ملک میں صنعتوں کے قیام کے لیے مرکزی حکومت کی منظوری لازم قرار دی گئی۔ پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن (PIDC) کا قیام ۱۹۵۱ء میں عمل میں لایا گیا۔ اس ادارے کا کام یہ تھا کہ بہتر منصوبہ‌بندی کے ذریعے بھاری صنعتیں قائم کر کے بعد میں نجی سرمایہ کاروں کے ہاتھ منتقل کر دے۔ اس ادارے کی کارکردگی شروع ہی سے اچھی رہی ہے، لیکن انقلابی حکومت نے اصلاح احوال کے لیے متعدد اقدامات کر کے ملک میں صنعتی ترقی کی رفتار کو کافی تیز کر دیا اور پارچہ بافی، کاغذسازی، سگرٹ‌سازی، دواسازی اور پٹ سن کی صنعت وغیرہ میں ملک نہ صرف خود کفیل ہو گیا بلکہ تیار شدہ مال بیرونی ممالک میں بھی جانے لگا۔ سوئی گیس کے استعمال اور نئے بجلی گھروں کے قیام نے صنعتی پیداوار کی صلاحیت کو کافی بڑھا دیا ہے۔

تعلیم: اگست ۱۹۵۹ء میں صدر کے مقرر کردہ تعلیمی کمیشن نے اپنی ضخیم رپورٹ پیش کی اور اس میں نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کے بارے میں متعدد بنیادی تبدیلیاں تجویز کی گئیں، جنھیں عملی جامہ پہنانے میں کثیر رقم صرف ہوئی، تاہم اس سے متوقع نتائج برآمد نہ ہو سکے۔

سندھ طاس کا معاہدہ: نہری پانی کا جھگڑا ہندوستان سے بدستور چلا آ رہا تھا اور اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا۔ اسے ختم کرنے کے لیے عالمی بنک کے توسط سے ستمبر ۱۹۶۰ء میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا، جس کی رو سے مغربی پاکستان کے تین مشرقی دریاؤں، یعنی ستلج، بیاس اور راوی، پر ہندوستان کا اور تین مغربی دریاؤں، یعنی چناب، جہلم اور سندھ، پر پاکستان کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا اور طے پایا کہ دس سال تک ہندوستان پاکستان کو بدستور پانی مہیا کرتا رہے گا، مقبوضہ کشمیر کے علاقے میں مغربی دریاؤں کا رخ بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کرے گا، ۱۹۷۰ء تک پاکستان دو بند تعمیر کرے گا اور چار سو میل لمبی نہریں کھودے گا تاکہ مستقبل میں وہ ان کی مدد سے اپنی ضروریات پوری کر سکے۔ یہ بھی طے ہوا کہ اس منصوبے کے اخراجات سندھ طاس ترقیاتی فنڈ سے پورے کیے جائیں گے، جسے آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ، برطانیہ، مغربی جرمنی، امریکہ اور ہندوستان کے

تعاون سے قائم کیا جائے گا۔ مسئلے کا یہ حل کشمیر، جموں سے پاکستان کے لیے خوشگوار نہ تھا، لیکن موجودہ حالات میں اس کے سوا کوئی اور چارہ نظر نہ آتا تھا۔

آئین اور نئے انتخابات : صدر ایوب نے زمام اقتدار سنبھالتے وقت اعلان کیا تھا کہ جمہوری زندگی بحال کر دی جائے گی۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں بنیادی جمہوریتوں کا حکم جاری کیا گیا، جس کے تحت بالغ رائے دہی کے اصول پر دونوں صوبوں سے دس هزار ارکان منتخب ہوئے۔ اگلے سال صدر نے ان سے اعتماد کا ووٹ لے کر اپنی نمائندہ حیثیت مضبوط کر لی۔ ملک کا نیا آئین مرتب کرنے کی غرض سے سپریم کورٹ کے ایک جج کی سربراہی میں آئین کمیشن کا تقرر عمل میں لایا گیا، جس کی رپورٹ میں بہت سی ترمیمات کرنے کے بعد صدر نے یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو نئے آئین کا اعلان کر دیا۔ یہ ایک جمہوری، وفاقی، یک ایوانی اور صدارتی طرز حکومت کا دستور تھا، جس میں ملک کے دونوں صوبوں کو مساوی نمائندگی دی گئی تھی، مرکز کو بہت مضبوط رکھا گیا تھا اور صدر مملکت کو انتظامیہ اور قانون سازی کے وسیع اختیارات دیے گئے تھے (تفصیل کے لیے دیکھیے بذیل ''آئین کی تاریخ'')۔ اس کے بعد بنیادی جمہوریتوں کے ارکان نے اپریل میں قومی اسمبلی اور مئی میں صوبائی اسمبلیوں کے رکن چنے۔ ۸ جون ۱۹۶۲ء کو راولپنڈی میں نئی قومی اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ اسی روز صدر ایوب خاں نے نئے آئین کے تحت حلف اٹھایا، مارشل لا ختم کر دیا گیا اور حکومت کا کاروبار عام ملکی قانون کے تحت چلنے لگا۔

نئے آئین کے بعد : مارشل لا کے زمانے میں سیاسی جماعتوں پر پابندیاں لگ جانے کے باعث ملک میں تمام سیاسی سرگرمیاں ختم ہوگئی تھیں اور اکثر سیاسی رہنما ''ایبڈو'' کے تحت سیاست میں حصہ لینے سے روک دیے گئے تھے۔ اس کے باوجود بنیادی جمہوریتوں اور بعد ازاں اسمبلیوں کے انتخابات کے دوران میں یہ بات واضح ہوگئی کہ ابھی تک ملک میں ایک بڑا طبقہ صدارتی طرز حکومت کا مخالف اور پارلیمانی جمہوریت کے حق میں ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں بحال کی جائیں اور بنیادی جمہوریتوں کے بجائے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر اسمبلیوں کے انتخابات عمل میں آئیں۔ قومی اسمبلی نے سیاسی جماعتوں کی بحالی کا قانون تو منظور کر لیا، لیکن ۱۹۶۵ء میں ہونے والے عام انتخابات کے لیے بنیادی جمہوریتوں کی انتخابی ادارے کی حیثیت برقرار رکھی۔

حزب مخالف کا ایک گروہ سیاسی جماعتوں کی بحالی اور انتخابات کا قائل نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ ایک متحدہ کمان کے تحت آئین کو جمہوری بنانے کی مہم شروع کی جائے، لیکن بیشتر سیاست دانوں نے اپنی اپنی جماعتوں کو بحال اور منظم کرنے کا فیصلہ کیا اور یوں ایک اچھی خاصی حزب اختلاف اسمبلی کے اندر اور باہر وجود میں آ گئی۔ اسی زمانے میں پاکستان مسلم لیگ کی تنظیم نو ہوئی اور اس کی صدارت صدر محمد ایوب خاں نے سنبھال لی۔

۱۹۶۴ء میں سیاسی سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔ حزب اختلاف کی تقریباً تمام اہم جماعتوں نے ایک نو نکاتی پروگرام کے تحت متحدہ محاذ بنایا اور صدارتی انتخاب کے لیے اپنے امیدوار کی حیثیت سے قائد اعظم کی ہمشیرۂ محترمہ فاطمہ جناح کو چنا۔ نومبر ۱۹۶۴ء میں بنیادی جمہوریتوں کے انتخابی نتائج کا اعلان ہوا۔ جنوری ۱۹۶۵ء کو صدارتی انتخاب ہوا اور صدر محمد ایوب خاں ایک بار پھر منتخب ہو گئے۔ ان انتخابات کا ایک

اہم پہلو، جس کے بہت دور رس نتائج برآمد ہوئے، یہ تھا کہ انتخابی مہم کے دوران میں سرکاری جماعت کو اپنی کارکردگی ظاہر کرنے کا اور مخالف سیاسی رہنماؤں کو حکومت کی غلطیاں اور نظم و نسق کی خرابیاں عوام کے سامنے پیش کرنے کا پورا موقع مل گیا اور وہ تصویر کے دونوں رُخوں سے واقف ہو گئے۔ عین ممکن تھا کہ ملک میں پارلیمانی جمہوریت کے لیے کوئی تحریک شروع ہو جاتی، لیکن بھارت کی روز افزوں معاندانہ سرگرمیوں سے قوم کی پوری توجہ دفاعِ مملکت کی طرف مبذول ہو گئی۔

بھارت سے جنگ: ۱۹۶۵ء کے اوائل میں بھارتی فوج نے رن کچھ میں پاکستان کے کچھ علاقے پر فوجی قبضہ کر لیا تو پاکستانی افواج بھی حرکت میں آ گئیں اور انہوں نے حملہ آوروں کو مار بھگایا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارت نے اعلانِ جنگ کیے بغیر مغربی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ یہ لڑائی سترہ روز تک جاری رہی۔ اس کے دوران میں پاکستانی افواج نے شجاعت، استقلال اور جوانمردی کا اور عوام نے اتحاد، تنظیم اور یقینِ محکم کا فقید المثال مظاہرہ کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابتدائی حملے میں بھارتی افواج پاکستانی علاقے کے جس محدود رقبے پر قابض ہو گئی تھیں، وہاں سے نہ صرف یہ کہ وہ ایک قدم آگے نہ بڑھ سکیں بلکہ پاکستانی فوجوں نے پیش قدمی کر کے ان کے وسیع علاقے پر قبضہ کر لیا۔

۲۳ ستمبر کی صبح کو سلامتی کونسل کی ہدایت پر جنگ بند ہو گئی۔ ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو روسی وزیر اعظم مسٹر کوسیجن کی وساطت سے تاشقند کے مقام پر دونوں ملکوں کے سربراہوں نے اس امر پر رضامندی ظاہر کر دی کہ فوجیں ۵ اگست ۱۹۶۵ء کی پرانی سرحدوں پر واپس چلی جائیں گی اور باہمی تنازعات گفت و شنید کے ذریعے حل کیے جائیں گے۔

اعلان تاشقند کے بعد: جنگ کے دوران میں کشمیر کی گتھی کچھ سلجھتی دکھائی دی تھی۔ اعلانِ تاشقند سے یہ مسئلہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا اور مقبوضہ کشمیر کے جو علاقے فتح کر لیے گئے تھے وہ واپس دینے پڑے۔ اس سے عوام میں بڑی مایوسی اور بےدلی پھیلی اور جگہ جگہ اعلانِ تاشقند کے خلاف مظاہرے ہوئے، جنھیں بڑی سختی سے دبا دیا گیا۔

۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد ملک کی تمام خرابیوں کا ذمےدار سیاستدانوں کو ٹھیرایا گیا تھا، اگرچہ اس دوران میں زیادہ عرصہ ایسا گزرا تھا جب سربراہ مملکت کے عہدے پر دو ریٹائرڈ سرکاری ملازم، یعنی ملک غلام محمد اور میجر جنرل اسکندر مرزا، فائز رہے تھے اور انہوں نے وقتاً فوقتاً مرکزی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ کر، بار بار وزارتیں بدل کر، عام انتخابات کو التوا میں ڈال کر، سرکاری ملازمین کو سیاست میں دخیل بنا کر، کبھی ایک اور کبھی دوسری جماعت کو برسرِ اقتدار لا کر، حتی الامکان اس امر کی کوشش کی تھی کہ وہ اقتدارِ اعلیٰ پر قابض رہیں۔ انقلابی حکومت کے ابتدائی اقدامات کو تہ دل سے سراہا گیا اور کچھ عرصے کے لیے یوں نظر آنے لگا کہ اب سابقہ حکومتوں کی بدعنوانیوں کا اعادہ کبھی نہ ہوگا؛ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا حکومت پر صدر مملکت کی گرفت مضبوط ہوتی گئی اور عوامی نمائندوں کی جگہ نوکرشاہی لیتی گئی۔ تمام اختیارات مرکز میں مرکوز کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوگوں کو اپنی معمولی سے معمولی تکلیف کے ازالے میں طرح طرح کی مشکلات پیش آنے لگیں۔ ۱۹۶۴ء کے عام انتخابات ہوئے تو انتخابی جلسوں

میں حزب اختلاف نے تصویر کا دوسرا رُخ پیش کیا اور لوگوں کو احساس ہونے لگا کہ شخصی حکومت کے ذریعے انہیں جمہوری حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے، برسر اقتدار طبقہ اپنے مناصب سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ملکی وسائل کو محدود مفادات کے تحت استعمال کرنے لگا ہے، انتظامیہ میں زراندوزی اور رشوت ستانی زوروں پر ہے اور ملک کی دولت کا ارتکاز معدودے چند گھرانوں میں ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے عوام میں بے چینی روز بروز بڑھنے لگی۔ اعلان تاشقند نے ایک تازیانے کا کام دیا اور حکومت کے خلاف کھلم کھلا مظاہرے ہونے لگے۔ ان کے خلاف حکومت نے امن و ضبط کے نام پر جس رد عمل کا اظہار کیا اس سے عوام ایک بار پھر سیاست دانوں سے توقعات وابستہ کرنے لگے۔

۱۹۶۷ء میں پانچ سیاسی جماعتوں (کونسل مسلم لیگ، قومی جمہوری محاذ، نظام اسلام پارٹی، جماعت اسلامی اور عوامی لیگ) نے مندرجۂ ذیل آٹھ نکاتی پروگرام کے تحت تحریک جمہوریت پاکستان کا آغاز کیا: (۱) وفاقی پارلیمانی طرز حکومت کا قیام اور بالغ رائے دہی کے اصول پر براہ راست انتخابات؛ (۲) مکمل علاقائی خود مختاری؛ (۳) وفاقی حکومت کے پاس صرف دفاع، خارجہ امور، کرنسی، وفاقی مالیات، بین الصوبائی مواصلات اور تجارت کے امور رہنے چاہییں؛ (۴) دس سال کے اندر دونوں صوبوں میں عدم مساوات کا خاتمہ؛ (۵) کرنسی، زرمبادلہ، مرکزی بینکاری، بیرونی تجارت، بین الصوبائی مواصلات اور تجارت کا انتظام کرنے کے لیے دونوں صوبائی اور قومی اسمبلی کے ارکان کے منتخبہ بورڈ کا قیام؛ (۶) دس سال کے اندر ملازمتوں میں مساوات؛ (۷) دفاعی معاملات میں مساوات؛ (۸) ۱۹۵۶ء کے آئین کی رو سے سات شقوں کا نفاذ۔ عوامی لیگ آگے چل کر دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ اس کے مشرقی پاکستان کے اکثر ارکان نے شیخ مجیب الرحمن (جو اس وقت جیل میں تھے) کی قیادت میں اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے چھے نکاتی مطالبات پیش کر دیے۔ تحریک جمہوریت پاکستان کے رہنماؤں نے وسیع پیمانے پر دورے کر کے ملک کے دونوں حصوں کے عوام سے رابطہ پیدا کیا اور یوں یہ تحریک آگے بڑھتی گئی۔ ۱۹۶۸ء کی آخری سہ ماہی میں حکومت نے صدر ایوب خاں کی حکومت کے دس سال پورے ہونے پر بڑے جوش و خروش سے عشرۂ ترقی و اصلاحات منایا اور اس سلسلے میں سرکاری محکموں اور ملازمین نے انتہائی دلچسپی اور سرگرمی دکھائی۔ اسی زمانے میں بنیادی جمہوریت کے بعض اداروں میں یہ قرار داد منظور ہوئی کہ صدر ایوب کو تاحیات صدر پاکستان بنا دیا جائے۔ اس کا عوام میں شدید رد عمل ہوا اور مختلف عنوانات سے ملک بھر میں مظاہرے ہونے لگے اور برسر اقتدار جماعت کنونشن مسلم لیگ کے سوا باقی تمام جماعتوں نے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست انتخابات، خود مختار پارلیمنٹ اور اسلامی جمہوری حکومت کی بحالی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ان مظاہروں میں طلبہ اور صنعتی مزدور بھی شامل ہو گئے۔ کئی مقامات پر پر امن مظاہروں کو تشدد سے فرو کرنے کی کوشش کی گئی اور بعض مقامات پر خود مظاہرین نے بھی تشدد کا ثبوت دیا۔ ۱۹۶۹ء کے اوائل میں تین اور جماعتیں (نیشنل عوامی پارٹی کا ولی خان گروپ، جمعیۃ العلماے اسلام کا ہزاروی گروپ اور چھے نکاتی عوامی لیگ) بھی تحریک جمہوریت پاکستان میں شامل ہو گئیں۔ ۸ جنوری کو ان سب جماعتوں کے نمائندوں نے بحالی جمہوریت کی مشترکہ جد و جہد کے لیے جمہوری مجلس عمل

قائم کی اور اعلان کیا کہ جب تک ان کی آٹھ شرائط پوری نہیں کی جاتیں وہ انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے۔

صدر ایوب خان نے [illegible] شروع میں ان مطالبات کو کوئی اہمیت نہ دی، لیکن جب مظاہروں کی شدت سے حکومت کا نظم و نسق معطل ہونے لگا تو انہوں نے یکم فروری کو اعلان کیا کہ وہ آئینی اور سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے حزب اختلاف سے گفتگو کریں گے۔ مجلس عمل نے گول میز کانفرنس کے انعقاد کے لیے یہ شرائط پیش کیں: (۱) ہنگامی حالت فوراً ختم کر کے ڈیفنس آف پاکستان رولز منسوخ کیے جائیں؛ (۲) تمام سیاسی لیڈروں اور طلبہ کو رہا کیا جائے؛ (۳) پورے ملک سے دفعہ ۱۴۴ ہٹا لی جائے؛ (۴) تحفظ امن عامہ اور پریس کے قوانین کے تحت اخبارات اور سیاسی کارکنوں کے خلاف کارروائیاں کالعدم قرار دی جائیں اور (۵) طلبہ پر لاٹھی چارج کا سلسلہ ختم کیا جائے۔ ۲۱ فروری کو مجلس عمل کی اپیل پر ملک بھر میں مکمل ہڑتال ہوئی اور دو روز بعد شیخ مجیب الرحمٰن کے سوا، جو ان دنوں اگرتلہ سازش کیس میں ماخوذ تھے، تمام رہنماؤں (مثلاً ذوالفقار علی بھٹو، عبدالولی خان، وغیرہ) کی رہائی اور ہنگامی حالت کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ ۲۱ فروری کو صدر ایوب نے ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ وہ آئندہ صدارتی انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے۔ اگلے روز اگرتلہ کیس واپس لے کر شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی رہا کر دیا گیا۔ ۲۶ فروری کو راولپنڈی میں گول میز کانفرنس کا پہلا اجلاس ہوا، جس میں تمام مخالف جماعتوں کے نمائندوں کے علاوہ آزاد رہنما ایر مارشل اصغر خان اور جسٹس محبوب مرشد نے بھی شرکت کی۔ ذوالفقار علی بھٹو (پیپلز پارٹی) اور عبدالحمید خان بھاشانی (نیشنل عوامی پارٹی) نے کانفرنس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ ۱۰ مارچ کو عبدالاصغر کی مصالحات کے بعد کانفرنس کا دوسرا اجلاس ہوا۔ صدر نے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات اور پارلیمانی نظام کی بحالی کے مطالبات تسلیم کر لیے اور کانفرنس ختم ہو گئی۔ اسی روز شیخ مجیب الرحمٰن جمہوری مجلس عمل سے الگ ہو گئے کیونکہ ان کے خیال میں ''چھ نکات'' کی حمایت نہ کر کے مجلس نے مشرقی پاکستان کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ ۱۷ مارچ کو بھاشانی نے اعلان کیا کہ انتخابات نہیں ہونے دیے جائیں گے اور ''گھیراؤ اور جلاؤ'' پر عمل کیا جائے گا کیونکہ ہماری منزل پارلیمانی جمہوریت نہیں بلکہ عوامی انقلاب ہے۔ اگلے روز ذوالفقار علی بھٹو نے بھی بائیں بازو کی تمام جماعتوں کو متحد ہو کر موجودہ نظام کو تبدیل کرنے کی تلقین کی۔ اس انتشار کا نتیجہ یہ نکلا کہ انتخابات کے ذریعے پر امن انتقال اقتدار کی صورت باقی نہ رہی اور ملک بھر میں خصوصاً مشرقی پاکستان میں ہنگاموں اور بلووں کی ایک رو چل نکلی۔ ہڑتالوں کے علاوہ آتش زنی، لوٹ مار اور قتل و غارت کی بھی وارداتیں ہوئیں، جن کی روک تھام کے لیے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو پورے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ صدر ایوب خان مستعفی ہو گئے اور افواج پاکستان کے سربراہ جنرل آغا محمد یحییٰ خان نے عنان حکومت سنبھال لی۔

(ج) دوسرا مارشل لا اور جنرل یحییٰ خان کا دور صدارت (از ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء).

نئی فوجی حکومت کے سامنے پہلا مسئلہ قدرتی طور پر امن کی بحالی اور نظم و نسق کی درستی کا تھا، تاہم جنرل یحییٰ خان نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی اعلان کر دیا کہ پاکستان میں جلد از جلد عوام

کی امنگوں کے مطابق آئینی حکومت قائم کی جائے گی اور اقتدار ان کے منتخب نمائندوں کو سونپ دیا جائے گا۔

صدر ایوب کی حکومت کے خاتمے کے بعد تین نئے نزاعی مسئلے ابھرے: (۱) وحدت مغربی پاکستان کو ختم کر کے سابقہ صوبوں کی بحالی؛ (۲) مشرقی اور مغربی پاکستان کو ان کی آبادی کی اساس پر نمائندگی؛ (۳) صوبائی یا علاقائی خود مختاری۔

مارشل لا حکومت نے شروع شروع میں ان اختلافات میں پڑنے کے بجائے نظم و نسق کی اصلاح، ضروری اشیا کی گرانی، پاکستان کی غذائی صورت حال، ملک کے معاشی عدم استحکام، سرمایہ داروں اور مزدوروں کے باہمی تعلقات اور تعلیم و زراعت جیسے اہم مسائل پر پوری توجہ صرف کی؛ عوامی مطالبات کے پیش نظر سوات، دیر اور چترال کی ریاستیں پاکستان میں مدغم کر کے ان پر مشتمل مالاکنڈ ڈویژن تشکیل کی گئی؛ الیکشن کمیشن کا تقرر عمل میں لایا گیا اور انتخابی فہرستوں کی تیاری شروع ہو گئی۔

۲۸ نومبر ۱۹۶۹ء کو صدر یحیٰی خان نے ایک نشری تقریر میں اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کے انتخابات ''ایک فرد، ایک ووٹ'' کی بنیاد پر ۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو منعقد ہونگے؛ قومی اسمبلی ۱۲۰ دنوں کے اندر دستور تیار کرے گی، جس کی منظوری کے بعد آئینی حکومت قائم کر دی جائے گی؛ یکم جنوری ۱۹۷۰ء سے مکمل سیاسی سرگرمیوں کی اجازت مل جائے گی اور انتخابات سے پہلے مغربی پاکستان کی وحدت توڑ دی جائے گی (تفصیل کے لیے دیکھیے بذیل ''آئین کی تاریخ'')۔

یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو تمام سیاسی جماعتیں انتخابی مہم پر میدان میں نکل آئیں اور ملک میں سیاسی سرگرمیوں کا پورے جوش و خروش سے آغاز ہو گیا۔ ۲۸ مارچ کو صدر نے دستور کے بنیادی اصولوں کا اعلان کیا اور ۳۱ مارچ کو انتخابات اور آئین ساز اسمبلی کے سلسلے میں قانونی ڈھانچے کا حکم جاری ہوا (تفصیل کے لیے دیکھیے بذیل ''آئین کی تاریخ'')۔ اعلان کے مطابق دستور کے بنیادی اصول یہ ہیں: (۱) اسلامی جمہوریۂ پاکستان ایک وفاقی جمہوریہ ہوگا؛ (۲) اسلامی نظریے کا، جو قیام پاکستان کی اساس ہے، تحفظ لازمی ہوگا؛ (۳) جمہوریت کے بنیادی اصولوں پر عمل کیا جائے گا؛ (۴) شہریوں کے بنیادی حقوق متعین کیے جائیں گے؛ (۵) صوبوں کو انتظامی، مالیاتی اور آئین سازی کے امور میں زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے جائیں گے، لیکن وفاقی حکومت کے پاس اتنے اختیارات ضرور رہیں گے کہ وہ داخلی اور خارجی امور سے متعلق اپنی ذمے داریاں پوری کر سکے اور ملک کی آزادی اور سالمیت کا تحفظ کر سکے؛ (۶) پاکستان کے ہر علاقے کو قومی امور میں پورا حصہ لینے کا موقع دیا جائے گا اور ان میں عدم مساوات کو ختم کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں دستور میں مملکت کی پالیسی کے حسب ذیل رہنما اصول بھی تجویز کیے گئے: (۱) اسلامی نظام کا فروغ؛ (۲) اسلام کی اخلاقی اقدار کی پابندی؛ (۳) پاکستانی مسلمانوں کو قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم کی سہولت فراہم کرنا؛ (۴) اس بات کی ہدایت کہ کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء سے شروع ہونگے؛ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس دستور کے نفاذ کے بعد ہو سکیں گے؛ قومی اسمبلی ۱۲۰ دن کے اندر اندر دستور بنائے گی اور اس میں ناکام رہی تو توڑ دی جائے گی۔ قومی اسمبلی اپنا

تیار کیا ہوا دستور توثیق کے لیے صدر کے سامنے پیش کرے گی اور اگر صدر اس کی توثیق نہ کریں تو اسمبلی ٹوٹ جائے گی اور اگر توثیق کر دیں گے تو دستور نافذ ہو جائے گا اور اقتدار قومی اسمبلی کو سونپ دیا جائے گا۔ اب ان اصولوں کی روشنی میں انتخابات کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

(۲) خارجی تعلقات کی سرگزشت

پاکستان کی خارجہ پالیسی کو تشکیل دیتے وقت دو بنیادی مقاصد ہر دور میں پیش نظر رہے ہیں: ملک کی سلامتی اور ترقی۔ سلامتی میں ملک اور نظریۂ حیات (ideology) دونوں کا دفاع شامل ہے۔ اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ملک دو حصوں میں بٹا ہوا ہے اور دونوں کے درمیان ایک ایسے ملک کا ایک ہزار میل لمبا علاقہ حائل ہے جس کا طرزِ عمل دوستانہ نہیں۔ اس جغرافیائی علیحدگی اور دوری کے پیش نظر پوری قوم کو متحد رکھنے کے لیے ایک مشترک نظریۂ حیات اور نصب العین کا ہونا لابدی ہے، جس کی بقا اور تحفظ ہی پر قوم کی بقا کا انحصار ہے۔

جغرافیائی اعتبار سے پاکستان ایشیا کا واحد ملک ہے جس کا ایک حصہ مشرق بعید اور دوسرا حصہ مشرق اوسط کے ممالک میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے اسے زبردست جنگی اہمیت حاصل ہے۔ ایک طرف تو اس کی سرحدیں برما، بھارت، افغانستان اور ایران کے علاوہ روس اور چین سے ملتی ہیں اور دوسری طرف یہ ایک ایسے علاقے سے تعلق رکھتا ہے جس کے ساتھ امریکہ کے اقتصادی اور سیاسی مفاد وابستہ ہیں۔ اس طرح پاکستان دنیا کی تینوں بڑی طاقتوں کے متضاد مفادات کی راہ میں کھڑا ہے اور اپنی سلامتی اور ترقی کے لیے ان تینوں کے ساتھ متوازن روابط قائم رکھنا اس کے لیے ناگزیر ہو گیا ہے۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی کا ایک بنیادی نکتہ یہ بھی رہا ہے کہ تمام قومیں برابر ہیں اور ہر قوم کو آزاد رہنے اور اپنے نصب العین کے مطابق اپنی حکومت کا نظام قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان نے ہمیشہ دنیا کے ہر محکوم ملک، بالخصوص یورپی استعمار کے شکار افریشیائی ممالک کے حق خوداختیاری اور مطالبۂ آزادی کی بھرپور حمایت کی ہے۔ علاوہ ازیں نظریاتی مماثلت کی بنا پر اسلامی ممالک سے اہل پاکستان کو جو قلبی تعلق رہا ہے اس کی جھلک بھی ملک کی خارجہ پالیسی میں شروع دن سے نظر آتی رہی ہے۔

قائد اعظم نے قیام پاکستان کے وقت فرمایا تھا کہ ہم دنیا کے تمام ملکوں سے دوستی کے خواہاں ہیں اور کسی سے دشمنی رکھنا نہیں چاہتے۔ یہ اصول پاکستان کی خارجہ پالیسی کی اساس ہے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔ دنیا بھر میں صرف بھارت ہی ایک ایسا ملک ہے جس کے ساتھ ابھی تک خوشگوار تعلقات قائم نہیں ہو سکے۔

بھارت: بھارت سے مراسم کی جو کیفیت رہی ہے اس کی وجہ سے پاکستان کے لیے نت نئے مسائل پیدا ہوئے۔

دونوں ملکوں کے درمیان ایک بڑا اختلافی مسئلہ مغربی پاکستان کے دریاؤں کے پانی کی تقسیم کا تھا۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں بھارت نے ان دریاؤں سے جن کے طاس اس کے قبضے میں تھے پاکستانی نہروں میں پانی دینا بند کر دیا۔ کئی برس تک گفت و شنید ہوتی رہی۔ ۱۹۵۲ء میں عالمی بینک نے اس مسئلے کو حل کرنے کی ذمے داری لی اور بالآخر ۱۹۶۰ء میں سندھ طاس کا بین الاقوامی معاہدہ

طے پایا (تفصیل پہلے آ چکی ہے)۔

اعلانِ آزادی کی رو سے ہندوستان کو ہندو اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں تقسیم ہونا تھا اور ریاستوں کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ دونوں ملکوں میں سے کسی میں شامل ہو جائیں، البتہ اس کا فیصلہ کرتے وقت ریاستی عوام کی خواہشات اور جغرافیائی محلِ وقوع کا خیال رکھیں۔ اس بات پر بھی اتفاق ہو چکا تھا کہ جہاں اس معاملے میں حکمران اور رعایا کے درمیان اختلاف پیدا ہو وہاں فیصلہ رعایا کی مرضی کے مطابق کیا جائے۔ یہ اختلاف برطانوی ہند کی صرف تین ریاستوں — حیدر آباد، جونا گڑھ اور جموں و کشمیر — میں رونما ہوا اور تینوں ریاستوں میں بھارتی حکومت نے حق و انصاف کے تقاضوں کو پورا نہ کیا اور فوجی کارروائی کے ذریعے حیدر آباد اور جونا گڑھ کا الحاق کر لیا۔ ریاست جموں و کشمیر اور پاکستان کے درمیان ایک سال کے لیے حالات و تعلقات جوں کے توں رکھنے کا معاہدہ (Stand-still Agreement) ہو چکا تھا، لیکن مہاراجا کشمیر بھارت کے ساتھ الحاق پر تلا ہوا تھا۔ آزادی کا اعلان ہوا تو کشمیر میں ریاستی افواج اور حریت پسندوں کی جنگ جاری تھی۔ عوام آزاد کشمیر حکومت کے قیام کا اعلان کر چکے تھے اور پونچھ کا علاقہ آزاد کرا کے اب وادی میں پیش‌قدمی کر رہے تھے۔ ان کی فوجی کامیابیوں سے خائف ہو کر ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجا فرار ہو کر دہلی جا پہنچا اور وہاں سے فوجی امداد حاصل کرنے کی غرض سے بھارت میں ریاست کی مشروط شمولیت کی دستاویز پر دستخط کر دیے۔ شرط یہ تھی کہ ریاست کے مستقبل کا آخری فیصلہ وہاں کے عوام کی رائے کے مطابق کیا جائے گا۔ ۲۷ اکتوبر کو ماؤنٹ بیٹن نے الحاق منظور کر لیا اور اسی روز بھارتی فوجیں ہوائی جہازوں کے ذریعے سری نگر میں اتار دی گئیں، جس سے جنگ میں اور بھی شدت پیدا ہو گئی۔ پاکستان نے اس نام نہاد الحاق کو ماننے سے انکار کر دیا اور سلامتی کونسل کو مطلع کیا کہ یہ پاکستان کے خلاف مہاراجا اور بھارتی حکومت کی سازش ہے اور چونکہ کشمیری عوام مہاراجا کے خلاف ہتھیار اٹھا کر اور اس کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دے کر اس پر عدم اعتماد کا واضح طور پر اظہار کر چکے ہیں، لہٰذا اسے ان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

یکم نومبر کو پاکستان اور بھارت کے گورنر جنرلوں کی ملاقات ہوئی اور ماؤنٹ بیٹن اقوام متحدہ کے زیر نگرانی کشمیر میں استصواب رائے عامہ پر رضامند ہو گیا، لیکن آگے چل کر پنڈت نہرو نے یہ موقف اختیار کیا کہ بھارتی فوجیں بدستور کشمیر میں رہیں گی، استصواب بھارتی حکومت کرائے گی اور اقوام متحدہ کے نمائندوں کی حیثیت مشیر کی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات پاکستان کے لیے ناقابل تسلیم تھی۔

اس دوران میں مشہور کشمیری رہنما شیخ عبداللہ کو، جن کے کانگرسی رہنماؤں سے بہت اچھے تعلقات رہے تھے، جیل سے رہا کر کے کشمیر کا وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا۔ شیخ عبداللہ کی خواہش تھی کہ ریاست داخلی طور پر خود مختار رہے اور صرف امور خارجہ، دفاع اور رسل و رسائل کے محکمے بھارتی حکومت کے زیر اختیار ہوں۔ بھارتی رہنماؤں کی طرف سے انہیں یقین دلایا گیا تھا کہ ریاست کے مستقبل کا مسئلہ عوام کی رائے معلوم کر کے ہی طے کیا جائے گا۔

اسی زمانے میں گلگت کا علاقہ بھی آزاد کرا لیا گیا اور بھارتی حکومت کو نظر آنے لگا کہ وہ کشمیر پر طاقت کے ذریعے قبضہ نہ جما سکے گا۔

اس نے پاکستان پر یہ الزام لگایا کہ وہ کشمیر میں قبائلی پٹھان اور فوجی دستے بھیج کر بھارت کے داخلی امور میں مداخلت اور جارحیت کا ثبوت دے رہا ہے اور ٣١ دسمبر کو اس نے یہی شکایت سلامتی کونسل کے سامنے بھی پیش کر دی۔

سلامتی کونسل نے قرارداد منظور کی کہ جنگ بند کر دی جائے، دونوں ملک اپنی اپنی فوجیں ریاست سے نکال لیں اور اقوام متحدہ کے زیرنگرانی ریاستی عوام کی رائے معلوم کی جائے۔ یہ قرارداد بھارت اور پاکستان دونوں نے قبول کر لی۔ یکم جنوری ١٩٤٩ء کو جنگ بندی ہو گئی، خط متارکۂ جنگ کے دونوں طرف جنگ بندی کی نگرانی کے لیے اقوام متحدہ کے مبصر مقرر کر دیے گئے۔ اس کے بعد اقوام متحدہ کا ایک کمیشن (UNCIP) استصواب کے ضروری انتظامات کرنے کے لیے برصغیر بھیجا گیا، لیکن اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ پاکستان اور بھارت کے موقف اس معاملے میں مختلف ہیں۔ سلامتی کونسل نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کئی بار کوشش کی، مگر مذکورۂ بالا وجوہ سے ہر بار ناکامی ہوئی۔

١٩٥٣ء میں بھارتی نائب وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ بھارت استصواب رائےعامہ کا پابند نہیں اور اس کے ساتھ ہی کشمیر کو بھارت کا ایک صوبہ بنانے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ اس پر شیخ عبداللہ نے احتجاج کیا تو انہیں برطرف کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ ١٩٥٥ء میں بھارتی وزیر اعظم نے استصواب کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے کہا کہ اب اس کا وقت گزر چکا ہے اور حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ دسمبر ١٩٦٣ء میں درگاہ حضرت بل، سری نگر، سے موئے مبارک چوری ہو گیا تو پوری وادی میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں کے پر امن مظاہروں کو حکومت نے بڑی سختی سے دبایا، مگر اس میں ناکامی ہوئی۔ عوام کو مطمئن کرنے کے لیے شیخ عبداللہ کو رہا کر دیا گیا، جنہوں نے جیل سے نکلتے ہی رائے شماری کا مطالبہ کیا۔ وہ دہلی میں پنڈت نہرو سے ملاقات کرنے کے بعد صدر پاکستان سے ملنے کے لیے راولپنڈی پہنچے۔ اس اثنا میں پنڈت نہرو کا انتقال ہو گیا (مئی ١٩٦٤ء) اور گفت و شنید کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مقبوضہ کشمیر کے علاقے میں بھارتی غیر مسلموں کی آباد کاری اور مسلمانوں کے اخراج کی رفتار تیز ہو گئی اور پاکستان اور بھارت کے تعلقات بگڑتے چلے گئے۔

١٩٥٦ء میں بھارتی فوجوں نے رن کچھ میں پاکستان کے علاقۂ چھاڈ بیٹ پر قبضہ کر لیا، لیکن پاکستان نے قیام امن کی خاطر کوئی جوابی کارروائی نہ کی۔ اپریل ١٩٥٨ء میں بھارتی دستوں نے مشرقی پاکستان میں کچھار۔سلہٹ سرحد کے پار سے فائرنگ شروع کر دی۔ ١٩٦٢ء میں چین سے شکست فاش کھانے کے بعد کچھ دنوں تک بھارت نے امن پسندی کا اظہار کیا، لیکن جلد ہی حالات پھر بگڑ گئے۔

١٩٦٥ء میں بھارتی فوج نے چھاڈ بیٹ سے پاکستانی علاقے میں مزید پیش قدمی کا آغاز کیا تو اس کا جواب دینا ضروری سمجھا گیا۔ بالآخر وزیراعظم برطانیہ کی مداخلت پر جنگ بند ہو گئی اور اس علاقے کی ملکیت کا تنازع طے کرنے کے لیے ایک بین الاقوامی ٹریبونل (tribunal) مقرر کیا گیا، جس نے ١٩٦٨ء میں فیصلہ کیا کہ چھاڈ بیٹ اور کنجر کوٹ کے علاقوں پر پاکستان کا حق ہے۔

مارچ ١٩٦٥ء میں کشمیر کو بھارت میں باضابطہ طور پر مدغم کر کے اسے ایک صوبے کی حیثیت دے دی گئی۔ اس پر عوام بھڑک اٹھے۔ شیخ عبداللہ اور رائے شماری محاذ کے مقتدر رہنماؤں

کو گرفتار کر کے ریاست میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا۔ عوامی جلسوں، جلوسوں، مظاہروں اور ہڑتالوں کو تشدد سے دبانے کی کوشش کی گئی۔ ۷ اگست ۱۹۶۵ء کو حریت پسندوں نے ایک انقلابی کونسل قائم کر کے بھارت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور بھارتی فوج کو شدید نقصان پہنچایا۔ بھارت نے حسب معمول پاکستان کو اس کارروائی کا ذمے دار ٹھیرایا اور تمام بین الاقوامی معاہدوں کو نظر انداز کرتے ہوئے نہ صرف کشمیر میں کرگل، ٹیٹوال اور درۂ حاجی پیر پر قبضہ کر لیا بلکہ پاکستان کے علاقے میں ضلع گجرات کے ایک گاؤں اعوان شریف پر گولہ باری کر کے وہاں کی شہری آبادی کو نقصان پہنچایا۔ اس پر آزاد کشمیر اور پاکستان کی افواج نے مشترکہ طور پر جوابی کارروائی کر کے علاقۂ جموں میں چھمب، دیوا اور جوڑیاں پر قبضہ کر لیا اور قریب تھا کہ جموں بھی فتح ہو جاتا کہ بھارت نے ۶ ستمبر کی صبح کو اعلان جنگ کیے بغیر لاہور پر تین طرف سے حملہ کر دیا؛ لیکن انھیں بھاری جانی نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ پاکستانی افواج نے مقابلۃً قلیل التعداد ہونے کے باوجود انتہائی پامردی اور شجاعت کا ثبوت دیا اور وہ قصور کی طرف سے پیش قدمی کر کے مشہور بھارتی قصبے کھیم کرن پر قابض ہو گئیں۔ اسی طرح سلیمانکی ہیڈ کے علاقے میں بھی کچھ بھارتی علاقے پر قبضہ کر لیا گیا۔ اس جنگ کی شدید ترین لڑائیاں سیالکوٹ اور چونڈہ میں لڑی گئیں۔ یہاں بھاری تعداد میں بھارتی ٹینک، بکتربند گاڑیاں اور دوسرا فوجی ساز و سامان تباہ ہوا اور ہزاروں فوجی کام آئے۔ پاکستانی فضائیہ نے بھارت کی ہوائی فوج کو مفلوج کر کے رکھ دیا اور پٹھانکوٹ، آدم پور، ہلواڑہ، انبالہ، جام نگر اور جے پور کے ہوائی اڈوں کو بے حد نقصان پہنچایا۔ بھارت کے ۱۱۳ جنگی طیارے تباہ ہوئے۔ پاکستانی بحریہ نے دوارکا کے بحری اڈے پر حملہ کر کے اسے بالکل برباد کر دیا اور اس کی آبدوز نے دو بھارتی جہاز غرق کر دیے۔

۲۳ ستمبر کی صبح کو سلامتی کونسل نے جنگ بند کرا دی۔ جنوری ۱۹۶۶ء میں روسی وزیر اعظم مسٹر کوسیجن نے صدر ایوب خاں اور وزیر اعظم شاستری کے درمیان تاشقند میں مذاکرات کا انتظام کیا، جنھوں نے ۱۰ جنوری کو اعلان تاشقند پر دستخط کر دیے۔ طے پایا کہ فوجیں ۵ اگست ۱۹۶۵ء کی ''پوزیشنوں'' پر واپس چلی جائیں گی، دونوں ملک تعاون سے کام لیں گے اور اپنے تمام جھگڑے پر امن طور پر طے کریں گے۔ فوجیں تو محاذ جنگ سے واپس آ چکی ہیں، لیکن تنازعات جوں کے توں قائم ہیں اور بھارت کے طرز عمل میں کسی تبدیلی کے آثار نظر نہیں آتے۔

بھارت کی مسلم اقلیت کا مسئلہ بھی مسلسل وجہ تشویش رہا ہے۔ حصول آزادی کے بعد اب تک وہاں بڑی شدید نوعیت کے پانچ سو سے زیادہ مسلم کش فسادات ہو چکے ہیں۔

فرخا بند کا تنازع بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مشرقی پاکستان کی سرحد سے گیارہ میل دور فرخا کے مقام پر بھارت دریائے گنگا پر ایک عظیم الشان بند تعمیر کر رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مشرقی پاکستان کی زرعی اراضی کا ایک بہت بڑا رقبہ پانی کی کمی کا شکار ہو جائے گا اور تقریباً ایک کروڑ تیس لاکھ افراد اس سے متأثر ہوں گے۔ پاکستان کے مسلسل احتجاج کا ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور سرکاری سطح پر چند کانفرنسوں کے باوجود نہ صرف اس منصوبے کو تیزی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا رہا ہے

بلکہ دریائے گنگا کے بڑے بڑے معاونوں پر اسی قسم کے بند بنانے کے کچھ اور منصوبے بھی بھارتی حکومت کے زیرِ غور ہیں۔

افغانستان: شروع شروع میں افغانستان کا رویہ بھی پاکستان کے بارے میں غیر دوستانہ رہا۔ یہ واحد ملک تھا جس نے اقوام متحدہ میں پاکستان کی رکنیت کی مخالفت کی تھی۔ اس کی طرف سے ایک عرصے تک پختونستان کا نعرہ بلند ہوتا رہا، حتیٰ کہ دونوں ملکوں کے سفارتی تعلقات بھی منقطع ہو گئے۔ مئی ۱۹۶۳ء میں شاہنشاہ ایران کی مساعی سے یہ تعلقات دوبارہ استوار ہو گئے اور دونوں طرف سے خیر سگالی اور باہمی تعاون کا اظہار ہونے لگا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران میں اہل افغانستان نے بھارتی جارحیت کی مذمت کی اور اپنے گھروں میں پاکستان کے تحفظ کے لیے دعائیں مانگیں۔ اب دونوں ملکوں کے درمیان فضائی اور بری مواصلات کا سلسلہ قائم ہے۔ افغانستان کی تقریباً ساری بیرونی تجارت پاکستان کے راستے ہوتی ہے اور اس سلسلے میں پاکستان کی طرف سے اسے ہر ممکن معاونت اور سہولت مہیا کی جاتی ہے۔ مئی ۱۹۷۰ء میں پاکستان کے ایک سرکاری وفد کا دورۂ افغانستان بہت کامیاب رہا اور اب کئی مشترکہ صنعتی اور تحقیقاتی منصوبے دونوں ملکوں کے زیر غور ہیں۔

چین: عوامی جمہوریۂ چین کا قیام ۱۹۴۹ء میں عمل میں آیا تو جن ممالک نے اسے سب سے پہلے تسلیم کیا ان میں پاکستان بھی شامل تھا۔ پاکستان کا یہ اہم ترین ہمسایہ ہے اور شروع ہی سے ان دونوں میں اچھے تعلقات چلے آ رہے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں بھارت نے اپنے سکے میں کمی کا اعلان کرکے پاکستانی روپے کو نئی شرح کے مطابق قبول کرنے سے انکار کر دیا تو باہمی تجارت منقطع ہو گئی۔ پاکستان میں کوئلے کی ساری ضرورت بھارت ہی پورا کرتا تھا اور وہی اس کی پٹ سن اور روئی کا سب سے بڑا خریدار تھا۔ اس موقع پر چین نے پٹ سن اور روئی کے بدلے میں کوئلہ دینے کی پیشکش کی اور پاکستان کو ایک بڑے معاشی بحران سے بچا لیا۔ یہ خوشگوار تعلقات کے قیام کی ابتدا تھی۔ جنگ کوریا میں پاکستان کے اس طرز عمل سے چین کو مزید تقویت ملی کہ اول الذکر نے اقوام متحدہ کی فوج میں اپنے فوجی دستے کوریا اور چین کے خلاف لڑنے کے لیے بھیجنے سے انکار کر دیا اور اقوام متحدہ میں چین کے خلاف تجارتی پابندیاں عائد کرنے اور اسے جارح قرار دینے کی امریکی قرارداد کے حق میں رائے دینے سے احتراز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے اشتراکی ممالک کے برعکس چین نے کبھی پاکستان کی "سینٹو" اور "سیٹو" معاہدات کی رکنیت پر اعتراض نہیں کیا اور اسے چین دشمنی کے مترادف قرار نہیں دیا۔ اقوام متحدہ میں پاکستان نے چین کی رکنیت کی ہمیشہ پرزور حمایت کی ہے اور اس سلسلے میں پیش ہونے والی تمام قراردادوں کے مجوزین میں پیش پیش رہا ہے۔ چین نے بھی تنازع کشمیر کے سلسلے میں کبھی بھارت کی حمایت نہیں کی اور اس کا موقف یہ رہا ہے کہ تنازع فی الواقع موجود ہے اور اسے باہمی گفت و شنید سے پرامن طور پر حل کرنا چاہیے۔ ۱۹۶۰ء میں جب بھارت نے سنکیانگ اور کشمیر کی سرحد متعین کرنے کا مسئلہ اٹھایا تو چین نے اعلان کیا کہ یہ علاقہ فی الوقت پاکستان کے قبضے میں ہے، لہٰذا بھارت سے اس کے بارے میں گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن ۱۹۶۱ء میں پاکستان نے یہی تجویز پیش کی تو چین بخوشی رضامند ہو گیا، چنانچہ چار ماہ کی گفت و شنید سے تمام تفصیلات طے کر لی گئیں اور

معاہدۂ حد بندی پر دستخط ہو گئے۔ اس کی رو سے پاکستان کو ۷۵۰ مربع میل کا ایسا علاقہ مل گیا جو قبل ازیں چین کے قبضے میں تھا۔ ۱۹۶۵ء میں بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو چین نے اس جارحیت کی علانیہ مذمت کی اور پاکستان کو ہر قسم کی امداد پیش کی۔ دنیا کی تیسری بڑی طاقت کی علانیہ حمایت پاکستان کے لیے بڑی حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔ بعد ازاں چین کے صدر اور وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ اگر آئندہ پاکستان کے خلاف کسی نے جارحیت سے کام لیا تو چین پاکستان کے دوش بدوش نظر آئے گا۔

دونوں مملکوں کے درمیان تجارت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں پہلا باقاعدہ تجارتی معاہدہ ہوا اور طے پایا کہ تجارت اور بار برداری کے سلسلے میں ایک دوسرے کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جائے گا۔ پاکستان دھاتیں، فولادی مصنوعات، کوئلہ، سیمنٹ، مشینیں، کیمیاوی خام اشیا اور دالیں درآمد کرے گا اور چین پٹ سن، روئی، سوتی مصنوعات، کھیلوں کا سامان، چمڑا اور کھالیں۔ اسی سال براہ راست فضائی سروس قائم کرنے کا معاہدہ ہوا، جس پر اپریل ۱۹۶۴ء سے عملدرآمد شروع ہو گیا۔ ۱۹۶۵ء میں چین نے ۶ کروڑ ڈالر کا بلا سود قرضہ دیا تاکہ پاکستان میں اس کی مدد اور تعاون سے ٹیکسلا کے مقام پر مشینیں بنانے کا ایک عظیم الشان کارخانہ قائم کیا جائے اور اس معاملے میں ملک خود کفیل ہو سکے۔ ۱۹۶۷ء میں سیلابوں کے باعث مشرقی پاکستان میں خوراک کی کمی واقع ہوئی تو چین نے ایک لاکھ ٹن چاول فراہم کیا۔ اسی سال گلگت اور سنکیانگ کے درمیان مشہور تاریخی راستے ''شاہراہِ ریشم'' کو دوبارہ جاری کرنے کا معاہدہ ہوا۔ جون ۱۹۶۸ء میں چین کے تعاون سے مشرقی پاکستان میں اسلحہ سازی کا کارخانہ قائم کرنے کے بارے میں اعلان ہوا۔

پاکستان اور چین کے درمیان ثقافتی روابط استوار کرنے میں بھی سرگرمی کا اظہار ہوا ہے اور دونوں طرف سے مختلف وفود آتے جاتے رہتے ہیں۔

روس: چین کے بعد روس دوسری بڑی عالمی طاقت ہے جس کا شمار پاکستان کے قریبی ہمسایوں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں دونوں کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔ ابتدا میں پاکستان پورے طور پر مغربی بلاک میں شامل تھا، جس کے باعث سیاسی تعلقات میں کوئی استحکام پیدا نہ ہو سکا۔ روس ''سیٹو'' اور ''سنٹو'' میں پاکستان کی شمولیت پر ناراض تھا اور پاکستان کو شکایت تھی کہ روس پختونستان کے معاملے میں افغانستان کی اور مسئلۂ کشمیر میں بھارت کی بے جا حمایت کر رہا ہے۔ بہر حال دونوں ممالک میں اقتصادی اور تجارتی تعلقات قائم رہے۔ ۱۹۵۲ء میں روسی گندم کے بدلے میں پاکستانی پٹ سن برآمد کرنے کا معاہدہ ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں ایک اور تجارتی معاہدہ ہوا۔ ۱۹۵۷ء میں روس کا ایک تجارتی نمائندہ کراچی میں متعین کیا گیا اور پاکستان میں روس سے لوہا، کوئلہ اور اخباری کاغذ درآمد ہونے لگا۔

گزشتہ چند سال سے باہمی تعلقات میں ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی ہے اور باہمی غلط فہمیاں دور ہو رہی ہیں۔ مارچ ۱۹۶۱ء میں روس نے پاکستان کو تیل کی تلاش کے سلسلے میں فنی امداد کے علاوہ تین کروڑ ڈالر کا قرضہ دیا۔ اسی سال دونوں ملکوں کی فضائی کمپنیوں کو سفر کی سہولتیں دی گئیں۔ اپریل ۱۹۶۵ء میں صدر محمد ایوب خان نے روس کا دورہ کیا تو دونوں حکومتوں کو ایک دوسرے کے مسائل اور مشکلات سمجھنے میں مدد ملی اور سربراہوں نے بہت سے عالمی امور پر اظہار اتفاق کیا۔ اس کے بعد ایک نیا تجارتی معاہدہ

ہوا اور روس نے تین کروڑ ڈالر کا مزید قرضہ دیا ۔ پاکستان اور بھارت کے تنازعات میں بھی روس نے اپنا جانب دارانہ رویہ ترک کر دیا ہے ۔ رن کچھ کی جھڑپ اور بعد ازاں پاکستان پر بھارت کے حملے کے وقت روس نے کامل غیر جانبداری کا ثبوت دیا اور باہمی تنازعات کو دور کرنے کے لیے تاشقند میں مذاکرات کا اہتمام کیا ۔

۱۹۶۷ء میں صدر محمد ایوب خان نے دوبارہ روس کا دورہ کیا اور اپریل ۱۹۶۸ء میں مسٹر کوسیجن نے پاکستان کا ۔ جنگ عرب و اسرائیل میں دونوں ملکوں نے ایک ہی موقف اختیار کیا ۔ ویت نام کی لڑائی کے بارے میں بھی پاکستان نے امریکی اقدامات کی مذمت کی ہے ۔

پاکستان کی معاشی ترقی میں روس خاصی دلچسپی لے رہا ہے ۔ فروری ۱۹۶۸ء میں ایک سہ سالہ تجارتی معاہدے پر دستخط ہوئے، جس کے تحت روس پاکستان کی پچاس فی صد برآمدی مصنوعات خریدنے پر رضامند ہو گیا، چنانچہ اب روس کے ساتھ برآمدی تجارت ۱۹۵۶ء کے مقابلے میں دس گنی ہو جائے گی ۔ ارضیاتی تحقیقات، خصوصاً تیل اور گیس کی تلاش کے سلسلے میں روس کا تعاون بہت مفید اور نتیجہ‌خیز ثابت ہوا ہے ۔ پاکستان کے کئی اہم منصوبوں کو تکمیل کے لیے روس فنی اور مالی امداد دے رہا ہے، چنانچہ تیرہ کروڑ ڈالر کی لاگت سے ٹیکسلا کے مقام پر برقی سامان اور مشینیں تیار کرنے کا ایک عظیم‌الشان کارخانہ قائم کیا جا رہا ہے ۔ اسی طرح روس ہی کے تعاون سے کالا باغ میں فولاد سازی کا اور روپ پور میں ایٹمی طاقت کا کارخانہ (Nuclear Power Plant) قائم کرنے کا منصوبہ تیار ہو رہا ہے ۔ دوسرے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں پاکستان کو روس سے تقریباً ساڑھے سترہ کروڑ ڈالر کی امداد ملی ہے ۔ جون ۱۹۷۰ء میں صدر آغا یحییٰ خان کے دورۂ روس سے تعلقات میں مزید خوشگواری اور استواری کی امید ہے ۔

برما : پاکستان کی سرحد برما سے بھی ملتی ہے اور دونوں کے تعلقات دوستانہ ہیں ۔ ۱۹۴۹ء میں برما کو دولت مشترکہ کی طرف سے ساٹھ لاکھ پونڈ کی مدد دی گئی اور اس میں پاکستان کا حصہ پانچ لاکھ پونڈ تھا ۔ ۱۹۵۲ء میں باہمی دوستی کا معاہدہ ہوا ۔ ۱۹۵۳ء میں برما کی درخواست پر پاکستان سے ماہرین مالیات کی ایک جماعت بھیجی گئی ۔ دونوں ملک کولمبو منصوبے میں شامل ہیں ۔ ۱۹۵۹ء میں برما کے وزیر اعظم نے پاکستان کا دورہ کیا اور دونوں ملکوں کی باہمی سرحد متعین کرنے کے لیے ایک کمیشن کا قیام عمل میں آیا ۔ تمام تنازعات باہمی رضامندی سے طے ہو گئے اور ۱۹۶۰ء میں اس کا کام مکمل ہو گیا ۔ ۱۹۶۱ء میں صدر پاکستان نے برما کا دورہ کیا اور ایک مالی معاہدہ طے کرنے کے علاوہ اقتصادی تعاون اور اراکانی مسلمانوں کے مسئلے پر گفتگو کی ۔ جب برما میں تمام کاروبار قومیا لیا گیا تو برما کے پاکستانی شہریوں کو اپنے وطن واپس آنے میں حکومت پاکستان نے پوری مدد دی ۔ ان کو معاوضہ دیے جانے کا مسئلہ حکومت برما سے جزوی طور پر طے کیا جا چکا ہے ۔ پاکستان برما کے فوجی ملازمین کو تربیت دینے کی پیشکش کرتا رہا ہے ۔ ثقافتی وظیفوں کے منصوبے کے تحت کئی برمی طلبہ پاکستانی اداروں میں اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں ۔ باہمی تجارت زیادہ‌تر برمی چاول اور پاکستانی روئی پر مشتمل ہے ۔ دونوں ملک طبعی آفات، مثلاً سیلاب وغیرہ آنے پر ایک دوسرے کی فراخ دلی سے مدد کرتے رہتے ہیں ۔

نیپال : مشترکہ سرحد نہ ہونے کے باوجود

نیپال پاکستان کی قریبی ھمسایہ ریاست ھے اور پچھلے چند برسوں سے اس کے ساتھ انتہائی دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات قائم ھوگئے ھیں۔ نیپالی انجینیروں اور ھوا بازوں کی تربیت کے لیے پاکستان فنی امداد دے رھا ھے اور پاکستانی اداروں میں اعلٰی تعلیم حاصل کرنے کے لیے نیپالی طلبہ کو وظائف دیے جاتے ھیں۔ کچھ عرصہ ھوا پاکستانی ماھرین نے نیپال میں ٹیوب ویل لگانے کے منصوبے کا جائزہ لیا تھا۔ باھمی تجارت میں بھی اضافہ ھو رھا ھے۔

سیلون: پاکستان سے ڈیڑھ ھزار میل دور واقع ھونے کے باوجود سیلون اس کے ھمسایہ ممالک میں شمار ھوتا ھے۔ تقسیم برصغیر کے وقت پاکستان کے حصے میں بحیرۂ عرب یا خلیج بنگال کا کوئی جزیرہ نہیں آیا، لہذا مغربی اور مشرقی پاکستان کے مابین بحری سفر سیلون ھی کے راستے ہوتا ھے۔ دونوں ملک کولمبو منصوبے کے رکن ھیں اور باھمی تجارت میں اضافہ ھو رھا ھے۔ سیلون کو چاول، سوتی مصنوعات، گندم اور پٹ سن کی جتنی ضرورت ھے وہ پاکستان پوری کرتا ھے۔ بھارت سے جنگ کے زمانے میں سیلون نے پاکستان کو فضائی سفر کی تمام سہولتیں مہیا کی تھیں۔ وہ سلامتی کونسل کی قرارداد کی روشنی میں تنازع کشمیر کے حل کا پر زور حامی ھے۔

اسلامی ممالک: پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ ھے اور اس کی خارجہ پالیسی میں اسلامی ممالک سے برادرانہ تعلقات کو خصوصی اھمیت حاصل رھی ھے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد قائد اعظم نے اپنا ایک خاص نمائندہ اسلامی ممالک میں خیرسگالی کے دورے پر بھیجا تھا۔ پاکستان تمام اسلامی ملکوں کی آزادی اور کامل خود مختاری کا علمبردار اور ان کے حقوق کی حفاظت میں پیش پیش رھا ھے۔ ان کے درمیان اقتصادی تعلقات کو فروغ دینے کے لیے ۱۹۴۹ء میں پاکستان نے کراچی میں ایک کانفرنس کا اھتمام کیا اور تہذیبی اور دینی رشتے مضبوط کرنے کے لیے مؤتمر اسلامی کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی جذبے کے تحت ۱۹۶۴ء میں ترکیہ اور ایران کے ساتھ مل کر علاقائی تعاون برائے ترقی کی تنظیم (RCD) قائم ھوئی، جس کے مقاصد یہ ھیں: باھمی تجارت کا فروغ؛ مشترکہ ایوان تجارت و صنعت؛ مشترکہ صنعتی منصوبوں، مشترکہ انشورنس کمپنی، مشترکہ بین الاقوامی فضائی کمپنی اور مشترکہ جہازران کمپنی کا قیام؛ تینوں ملکوں کو ریل کے ذریعے ملانا؛ ویزا کی پابندیاں ختم کرنا؛ محصول ڈاک میں تخفیف؛ پٹرول اور قدرتی گیس کی تلاش، وغیرہ۔ ان مقاصد کو عملی صورت دینے کے لیے تہران میں ایک سیکرٹریٹ قائم ھے اور کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے وقتاً فوقتاً تینوں ممالک کے سربراھوں اور ان کے متعلقہ وزرا کے اجلاس ھوتے رھتے ھیں۔

ایران اور ترکیہ کے درمیان مشترک دینی، تہذیبی اور تاریخی رشتے موجود ھیں اور ان کے باھمی تعلقات ھمیشہ سے انتہائی مخلصانہ چلے آ رھے ھیں اور انھوں نے ھر موقع پر باھمی تعاون اور دوستی کا ثبوت دیا ھے۔ جب ایران میں تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لیا گیا اور اس کے تعلقات برطانیہ سے منقطع ھو گئے تو پاکستان نے ایران کے موقف کی حمایت کی۔ اسی طرح تنازع کشمیر میں اور بھارتی جارحیت کے موقع پر ایران کی حکومت اور عوام نے پاکستان کو اخلاقی اور مادی امداد دینے میں تأمل سے کام نہیں لیا۔ برطانوی دور حکومت میں ھندوستان اور ایران کے درمیان سرحد پوری طرح متعین نہیں ھو سکی تھی، لیکن اب یہ مسئلہ باھمی رضامندی سے خوش اسلوبی کے ساتھ

طے کر لیا گیا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں شاہنشاہ ایران نے ذاتی طور پر دلچسپی لے کر افغانستان اور پاکستان اور ۱۹۶۶ء میں پاکستان اور ملیشیا کے منقطع تعلقات دوبارہ استوار کرائے۔

ترکیہ سے برصغیر کے مسلمانوں کا ایک جذباتی تعلق رہا ہے، جس کا مظاہرہ جنگ طرابلس، جنگ بلقان اور پہلی جنگ عظیم کے دوران میں بڑے پیمانے پر ہوا۔ پاکستان کے قیام کے بعد ترکیہ سے تعلقات قائم کرنے میں کسی غیر معمولی کوشش کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ۱۹۵۱ء میں دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کا معاہدہ ہوا، ۱۹۵۳ء میں ثقافتی تعاون کا، ۱۹۵۴ء میں دوستانہ تعاون کا اور ۱۹۶۳ء میں باہمی تجارت کا۔ قبرص کے مسئلے میں ترکیہ کو پاکستان کی اور تنازع کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کو ترکیہ کی غیر مشروط حمایت حاصل رہی ہے اور دونوں ممالک اقوام متحدہ میں ایک دوسرے کے حق میں آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ترکیہ نے ہر سطح پر پاکستان کی مدد کی۔

پاکستان، ایران اور ترکی، تینوں ملک "سنٹو" معاہدے کے تحت ایک دوسرے کے حلیف ہیں اور اب علاقائی تعاون برائے ترقی کی تنظیم (RCD) کے تحت ان کے درمیان سیاسی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

عرب ممالک کے حقوق کی حفاظت میں پاکستان نے اقوام متحدہ اور دوسرے عالمی اجتماعات میں جس شدت اور تسلسل سے آواز بلند کی ہے وہ اس کی اسلام دوستی اور عرب دوستی کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ اس نے لیبیا، مراکش، تونس اور الجزائر کی جد و جہد آزادی کی اتنی پر زور حمایت کی کہ اسے اقوام متحدہ میں عربوں کا وکیل سمجھا جانے لگا اور اس سلسلے میں بڑی طاقتوں کی خفگی اور دھمکی بھی اسے اپنی سرگرمیوں سے باز نہ رکھ سکی۔ اس نے نہ صرف اسرائیل کی تشکیل کی سخت مخالفت کی، بلکہ آج تک اسے تسلیم نہیں کیا۔ حال ہی میں عرب اسرائیل جنگ اور بیت المقدس پر اسرائیلی قبضے کے بعد پاکستان نے جس بے باکی اور دردمندی سے ہر محاذ پر عربوں کے موقف کی حمایت کی ہے اس کا بہت اچھا اثر پڑا ہے اور وہ عرب ممالک بھی اسے اپنا قابل فخر اور قابل اعتماد دوست سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں جن کے رویّے سے قبل ازیں سردمہری کا اظہار ہوتا تھا۔ ان ممالک میں جمہورية المتحدة العربية (مصر) ممتاز ترین ہے۔ اب بشمول مصر تمام عرب ممالک — عراق، شام، لبنان، یمن، اردن، سعودی عرب، کویت، سوڈان، لیبیا، تونس، مراکش اور الجزائر — سے پاکستان کے انتہائی خوشگوار تعلقات ہیں اور تجارتی معاہدات اور بین الاقوامی اداروں میں باہمی تعاون سے باہمی روابط روز بروز گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔

مشرق بعید کے اسلامی ممالک میں انڈونیشیا سے پاکستان کے بڑے قریبی تعلقات ہیں۔ دونوں ملک ایک دوسرے کے سچے حلیف ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے درمیان جو معاہدات طے پا چکے ہیں، ان میں انڈونیشیا اور پاکستان میں اقتصادی اور ثقافتی تعلقات کا معاہدہ (IPECC) بالخصوص قابل ذکر ہے۔

مشرق بعید کے دوسرے ممتاز مسلمان ملک ملیشیا سے بھی پاکستان کے روابط خوشگوار ہیں۔ پاک بھارت جنگ کے دوران میں ملیشیا کے ہندو نمائندے نے سلامتی کونسل میں مخالفانہ رویّہ اختیار کیا تھا، جس پر سفارتی تعلقات منقطع ہو گئے تھے، لیکن شاہنشاہ ایران کی سعی سے یہ تعلقات دوبارہ قائم ہو گئے اور اب دونوں ملک

مختلف سطحوں پر تعاون سے کام لے رہے ہیں۔

یورپ میں جو مغربی بلاک کے تمام یورپی ممالک سے پاکستان کے سفارتی اور تجارتی تعلقات قائم ہیں، لیکن ان میں برطانیہ، فرانس اور جرمنی خاص طور سے ممتاز ہیں۔

پاکستان اور برطانیہ کے باہمی روابط شروع ہی سے بالعموم خوشگوار رہے ہیں اور انہیں دولت مشترکہ کے وجود سے بڑی تقویت ملی ہے۔ اس کی جھلک سیاسی، اقتصادی، تجارتی، فنی، تعلیمی، غرض ہر دائرۂ کار میں نظر آتی ہے۔ برطانیہ میں نہ صرف پاکستانی طلبہ کی کثیر تعداد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے مقیم ہے، بلکہ ہزاروں پاکستانی باشندے وہاں مستقل طور پر آباد ہوچکے ہیں۔ اقتصادی اعتبار سے دونوں ملکوں کے تعلقات اطمینان بخش رہے ہیں۔

مغربی بلاک کے اہم ممالک میں سے فرانس، مغربی جرمنی، اٹلی، نیدرلینڈ، بلجیم اور جاپان وغیرہ سے پاکستان کے تعلقات خوشگوار ہیں اور ان سے مفید تجارتی تعلقات استوار ہوچکے ہیں۔ ریاست ہائے متحدۂ امریکہ سے پاکستان کے تعلقات بہت گہرے رہ چکے ہیں، لیکن اب کچھ عرصے سے پاکستان کو اس سے شکایت ہے۔ بہرحال علی العموم پاکستان سب ممالک سے خیرسگالی کا رویہ رکھتا ہے، چنانچہ جہاں مغربی بلاک سے تعاون کی صورتیں موجود ہیں وہاں اشتراکی ممالک سے بھی تعلقات بڑھائے جا رہے ہیں۔

افریقی ممالک کے مطالبۂ آزادی کے حق میں پاکستان کی سرگرمیوں کو ہمیشہ سراہا گیا ہے۔ نسلی منافرت کے مسئلے پر پاکستان ہمیشہ جنوبی افریقہ کی مذمت کرتا رہا ہے اور اس نے جنوبی رھوڈیشیا کی سفید فام اقلیتی حکومت کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا۔

اقوام متحدہ اور بین الاقوامی مسائل :

پاکستان کا شمار اقوام متحدہ کے ان ارکان میں ہوتا ہے جنہوں نے اقوام متحدہ کے اصول و مقاصد سے ہمیشہ اتفاق کیا ہے اور اپنے قول اور فعل کو تضاد کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اس نے ہر موقع پر عالمی امن، آزاد ملکوں کی سالمیت اور خود مختاری اور بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کے حق میں آواز بلند کی۔ افریقہ اور ایشیا کی تمام ترقی پذیر ریاستوں خصوصاً مسلمان اور عرب ممالک کی مشکلات کو اقوام متحدہ کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کی، نسلی منافرت اور نوآبادیاتی نظام کی ہر صورت کی شدید مخالفت کی، اور قیام امن کی خاطر ان تمام قراردادوں کو صدق دل سے قبول کیا جو اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل نے کشمیر اور بھارت کے ساتھ پاکستان کے دوسرے تنازعات کے بارے میں منظور کیں۔ پاکستان نے اقوام متحدہ کے تحت قائم شدہ اداروں، کمیٹیوں اور کمیشنوں کے ساتھ بھی کھلے دل سے تعاون کیا اور مفوضہ فرائض دیانت‌داری اور خوش‌اسلوبی سے انجام دیے۔ کانگو میں مصالحت کے لیے جو کمیشن قائم ہوا تھا، پاکستان اس کا رکن منتخب ہوا تو اس نے نہ صرف اس کے عملے کے لیے اپنے حصے کی مالی امداد دی، بلکہ اس کی فوج کے لیے اپنے سپاہی اور ڈاکٹر بھی بھیجے۔ اسی مغربی ایریان میں اقوام متحدہ کے تحت پاکستانی فوج کے دستے قیام امن کے لیے متعین ہوئے اور انہوں نے قابل تعریف خدمات سر انجام دیں۔

بڑے بڑے عالمی مسائل، مثلاً فلسطین، قبرص، نوآبادیاتی نظام کے شکار افریشیائی ممالک کی آزادی، کوریا اور ویت نام میں جنگ، اقوام متحدہ میں چین کی رکنیت، جنوبی افریقہ اور رھوڈیشیا کی نسلی منافرت پر مبنی پالیسی، ایٹمی ہتیاروں پر

پابندی اور ان کی توسیع پذیری کی روک تھام (non-proliferation)، وغیرہ کے بارے میں پاکستان کا طرز عمل ہمیشہ حق و انصاف کی حمایت رہا ہے۔ اس سلسلے میں اقوام متحدہ اور دوسرے بین الاقوامی اداروں میں اس کے کردار کو ہمیشہ سراہا گیا ہے، چنانچہ پاکستانی مندوب کو ۱۹۶۲ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا صدر چنا گیا۔ پاکستان دوبار سلامتی کونسل کا رکن بھی منتخب ہو چکا ہے۔

(۲) آئین کی تاریخ

حکومت برطانیہ کا تیار کردہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو ان ترمیمات کے ساتھ جو قیام پاکستان کے ساتھ عمل میں لائی گئیں پاکستان کا پہلا آئین قرار دیا گیا اور اس کی پہلی آئین ساز اسمبلی اس طرح وجود میں آ گئی کہ ۱۹۴۷ء کے پاک و ہند کی آزادی کے قانون کے مطابق غیر منقسم ہندوستان میں جو آئین ساز اسمبلی قائم تھی اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور وہ ارکان جو پاکستان کے حصے میں آنے والے علاقوں کی نمائندگی کرتے تھے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے ارکان قرار دیدیے گئے۔ اس طرح یہ اسمبلی انہتر ارکان پر مشتمل تھی۔ ان ریاستوں کے دس نمائندے شامل کر کے جنھوں نے پاکستان سے الحاق کر لیا تھا ان کی تعداد اناسی ہو گئی اور قائد اعظم محمد علی جناح کو پاکستان کا پہلا گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء بنیادی طور پر ایک خود مختار جمہوری مملکت کا آئین نہیں تھا، بلکہ اسے برطانوی حکومت نے اپنے ماتحت ایک علاقے پر حکومت کرنے کے لیے وضع کیا تھا۔ اس میں ملکی باشندوں کو محدود سے اختیارات دیے گئے تھے، غیر ملکی حکومت کے مفادات کی خاطر بہت سے تحفظات رکھے گئے تھے اور گورنر جنرل غیر معمولی اختیارات کا مالک تھا۔ اس میں محدود حق راے دہی کی بنیاد پر نمائندگی دی گئی تھی اور آبادی کے کوئی چودہ فی صد افراد کو ووٹ کا حق حاصل تھا۔ یہ آئین وحدانی نہیں بلکہ وفاقی تھا، لیکن اس حصے کو کبھی زیر عمل نہیں لایا گیا۔ برطانوی پارلیمنٹ میں جب آزادیِ ہند کا ایکٹ ۱۹۴۷ء منظور ہوا تو اس کے ساتھ ہی ۱۹۳۵ء کے آئین میں کچھ ترمیمات کر دی گئیں اور وہ پابندیاں ختم کر دی گئیں جن کے ماتحت غیر منقسم ہندوستان کی مجلس قانون ساز معاملات خارجہ کے متعلق کوئی قانون منظور نہیں کر سکتی تھی اور فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ سے برطانوی پارلیمنٹ کو پاکستان کے متعلق قانون بنانے کا کوئی اختیار نہ ہوگا اور یہ کہ پاکستان کا بنایا ہوا کوئی قانون اس وجہ سے ناجائز نہیں قرار دیا جائے گا کہ یہ برطانوی پارلیمنٹ کے کسی قانون سے ٹکراتا ہے اور یہ کہ پاکستان خود مختار ہوگا اور کسی دوسری طاقت کے ماتحت نہیں ہوگا۔ پھر قیام پاکستان کے اعلان سے چند دن پہلے Pakistan (Provisional Constitutional) Order، ۱۹۴۷ء اور گورنر جنرل کا آرڈیننس، عدد ۲۲، ۱۹۴۷ء، جاری کیا گیا۔

پاکستان کی اس پہلی آئین ساز اسمبلی کے سپرد دو کام کیے گئے: اول پاکستان کے لیے جدید آئین کی تیاری؛ دوم اس مملکت کے انتظام و انصرام کے لیے قانون سازی۔ یہ اسمبلی سات برس تک قائم رہی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو پاکستان کے آئندہ آئین کے متعلق اس اسمبلی نے قرارداد مقاصد منظور کی۔ اس میں پاکستان کا دستور قرآن اور سنت کے مطابق بنانے کا عہد کیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا کہ ساری کائنات کی حاکمیت اللہ تعالٰی کے لیے ہے، اور اس کی

مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے اہل پاکستان اقتدار کا استعمال کریں گے؛ پاکستان ایک جمہوری مملکت ہوگی، جس میں ریاست اپنے اختیارات عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی؛ سب لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی؛ مساوات، رواداری اور معاشرتی عدل کے اسلامی تصورات پیش نظر رکھے جائیں گے اور پاکستان کے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے اپنی زندگی کتاب و سنت کی تعلیمات کے مطابق ڈھال سکیں؛ اقلیتوں کو اپنے مذہب و تہذیب کے فروغ اور اس پر عمل درآمد کی معقول ضمانت دی جائے گی؛ پاکستان ایک وفاقی مملکت ہوگی، جس میں صوبے متعین حدود کے اندر خود مختار ہوں گے؛ بنیادی حقوق کا تحفظ کیا جائے گا؛ عدلیہ کی آزادی محفوظ رہے گی اور ملک کی سالمیت اور آزادی کا پورا تحفظ کیا جائے گا۔

اس کے بعد ''بنیادی اصولوں کی کمیٹی (Basic Principles Committee) مقرر کی گئی'، جس نے دستور کا مسودہ تیار کیا۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۵۰ء کو اس کمیٹی نے اپنی عبوری رپورٹ پیش کی، جس میں پارلیمانی طرز حکومت کے علاوہ دو قانون ساز اسمبلیوں کی سفارش کی گئی اور کہا گیا کہ ملک کے سربراہ کا انتخاب مرکزی مقننہ کے دونوں ایوان مشترکہ اجلاس میں کریں گے؛ کابینہ، مقننہ کے سامنے جواب دہ ہوگی؛ ملک کے سربراہ کو آئین کے مکمل یا جزوی طور پر معطل کرنے کا اختیار ہوگا۔ قومی اسمبلی نے اس پر غور کرنا غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیا اور کمیٹی کو ہدایت کی کہ وہ مناسب غور کے بعد دوبارہ اپنی رپورٹ پیش کرے، البتہ ٦ اکتوبر ۱۹۵۰ء کی اس کمیٹی کی ایک سب کمیٹی یعنی اہل پاکستان کے بنیادی حقوق کی کمیٹی (Committee on Fundamental Rights of the Citizens of Pakistan) کی عبوری رپورٹ پیش ہوئی، جسے منظور کر لیا گیا۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی مکمل رپورٹ پیش کی گئی، لیکن اس پر بھی غور و خوض کو غیر معین عرصے کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ آخر بعض اہم ترمیمات کے بعد ۲۱ ستمبر ۱۹۵۴ء کو اس کمیٹی کی سفارشات منظور کر لی گئیں۔ وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ آئین کے مسودے پر ۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء تک بحث ختم ہو جائے گی اور نیا آئین قائد اعظم کے یوم پیدائش پر نافذ کر دیا جائے گا۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کو ۱٦ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو آئینی ماہرین کے پاس مسودے تیار کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ اب نئے آئین کی تیاری کے لیے راہ ہموار ہو چکی تھی، لیکن اس کے جلد بعد ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو ملک کی اس سب سے پہلی آئین و قانون ساز اسمبلی کو گورنر جنرل نے توڑ دیا۔ اس وقت اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین خان تھے۔ سندھ کی چیف کورٹ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء (جو اب تک ملک کا آئین تھا) کی دفعہ ۲۲۳ الف کی روشنی میں مقدمہ دائر کر دیا اور عدلیہ سے گورنر جنرل کے اس فیصلے کے خلاف پروانۂ عدالت (writ) جاری کرنے کی درخواست کی۔ عدالت نے مولوی تمیزالدین خان کے حق میں فیصلہ دیا، لیکن حکومت کی اپیل پر پاکستان کی فیڈرل کورٹ نے سندھ چیف کورٹ کے فیصلے کو منسوخ کر دیا۔ اس صورت حال نے بعض آئینی پیچیدگیاں پیدا کر دیں، جنہیں سلجھانے کے لیے پھر فیڈرل کورٹ کی طرف رجوع کیا گیا؛ چنانچہ ۱۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو ایک نئی آئین ساز اسمبلی کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ اس دوسری آئین ساز اسمبلی نے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو متحد کرکے ''ون یونٹ'' یعنی وحدت مغربی پاکستان کا ایکٹ

۱۹۵۵ء منظور کیا اور اسلامی جمہوریۂ پاکستان کا پہلا آئین تیار کیا، جس کی ۲۲ مارچ ۱۹۵۶ء کو گورنر جنرل نے منظوری دے دی۔ یہ دستور جمہوری اور پارلیمانی طرز کا تھا۔ اس میں اعلان کیا گیا تھا کہ ارض پاکستان پر اللہ کی کی حکومت ہے اور عوام کا اقتدار اللہ کی طرف سے مقدس امانت ہے، جس کا استعمال وہ اللہ کی بتائی ہوئی حدود کے اندر رہ کر کریں گے؛ اسلامی اصولوں کے مطابق شہریوں کو آزادی، مساوات، رواداری، معاشرتی انصاف اور جملہ بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی؛ گورنر جنرل کی جگہ منتخب صدر نے لے لی؛ پاکستان کے دونوں حصوں کو مساوی درجہ دیا گیا؛ پاکستان کے علاقے میں اضافے کی گنجائش رکھی گئی، لیکن کسی علاقے کو علیحدگی کی اجازت نہیں دی گئی؛ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اختیارات کی توضیح کی گئی؛ مقننہ یک ایوانی مقرر کی گئی؛ پاکستان کو ایک وحدانی حکومت بنایا گیا؛ پاکستان کے صدر کو وزرا کے مشورے کے مطابق فرائض انجام دینا تھے، لیکن اسے ہنگامی حالات میں خصوصی اختیارات استعمال کرنے کا بھی حق دیا گیا؛ صدر کے لیے مسلمان پاکستانی ہونا لازمی قرار دیا گیا؛ عدلیہ کو متحد اور قوانین کو یکساں بنایا گیا؛ عدالتوں کو خاص حقوق دیے گئے؛ اقتصادی پالیسی وضع کرنے کے لیے قومی اقتصادی کونسل اور صوبوں اور مرکز کے درمیان ٹیکسوں کی تقسیم کا فیصلہ کرنے کے لیے مالی کمیشن قائم کرنے کی گنجائش رکھی گئی اور ملک کا نام 'جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان قرار پایا۔ ہر صوبے کا انتظامی سربراہ گورنر تھا، جس کی نامزدگی صدر مملکت کے ہاتھ میں تھی اور گورنر وزیر اعلیٰ کا انتخاب کرتا تھا۔ قومی اسمبلی ۲۰۰ ارکان پر مشتمل تھی اور ان میں دس نشستیں خواتین کی نامزدگی کے لیے مخصوص تھیں۔ اس طرح ہر صوبائی اسمبلی کے ارکان کی تعداد بھی ۱۵۰ ہی تھی۔ اسمبلی کی مدت پانچ سال مقرر کی گئی اور ملک کے تمام بالغوں کو حق رائے دہی دیا گیا۔

۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو صدر نے آئین کی تنسیخ کا اعلان کر کے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا اور ۲۷ اکتوبر کو جنرل محمد ایوب خان نے صدر کو ملک بدر کر کے تمام اختیارات خود سنبھال لیے اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اعلان کیا کہ ملک کے عوام کو اختیارات جلد از جلد لوٹا دیے جائیں گے اور ملک کو جدید آئین دیا جائے گا۔

۱۹۶۰ء میں سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس شہاب الدین کی سرکردگی میں آٹھ ارکان پر مشتمل ایک آئین‌ساز کمیٹی قائم کی گئی۔ ۱۹۶۱ء کے اواخر میں اس کمیٹی کی طرف سے ایک مسودۂ آئین پیش کیا گیا، جس میں کئی ترمیمات کی گئیں۔ اس ترمیم شدہ مسودے کی یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو صدر مملکت نے منظوری دے دی اور ۸ جون ۱۹۶۲ء کو نیا آئین نافذ کر دیا گیا۔

اس میں کہا گیا تھا کہ (۱) صدر مملکت کا انتخاب پانچ سال کے لیے عمل میں آئے گا۔ انتخابی ادارہ دونوں صوبوں کی بنیادی جمہوریتوں کے اسّی ہزار ارکان پر مشتمل ہوگا۔ صدر کو ایک بار پھر انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت ہوگی اور قومی اسمبلی کے تین چوتھائی ارکان کی تائید سے صدر کو اس کے عہدے سے علیحدہ کیا جا سکے گا؛ (۲) صوبائی گورنروں سپریم کورٹ اور صوبائی ہائی کورٹوں کے ججوں، صدارتی کابینہ کے ارکان، اٹارنی جنرل، مرکزی پبلک سروس کمیشن کے صدر اور متعدد قومی اداروں (Corporation) کے سربراہوں کا تقرر صدر کرے گا؛ (۳) صدر کسی بھی

پاکستانی کو اپنا وزیر مقرر کر سکے گا، لیکن اسے قومی اسمبلی کا رکن ہونے کی صورت میں اپنی نشست سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ صدر کے نامزد وزرا قومی اسمبلی کے سامنے حکومت کی پالیسی کی وضاحت کریں گے اور ارکان اسمبلی کے سوالات کا جواب دیں گے، لیکن مملکت کے نظم و نسق اور حکومت کی ذمے داری کامل طور پر صدر کی ہوگی؛ (۳) قومی اسمبلی یک ایوانی ہوگی، جس میں ۷۵ ارکان مشرقی پاکستان اور ۷۵ ہی مغربی پاکستان سے منتخب ہوں گے۔ ان کے علاوہ ہر صوبے سے تین تین نشستیں خواتین کے لیے مخصوص ہوں گی۔ قومی اسمبلی معمولاً پانچ سال تک قائم رہے گی؛ (۵) اسمبلی کے منظور کردہ بل کو قانونی حیثیت صدر کی توثیق کے بعد ہی مل سکے گی۔ اس سلسلے میں صدر کو حق تنسیخ حاصل ہوگا۔ قومی اسمبلی کے ارکان کی دو تہائی اکثریت صدارتی حق تنسیخ کو کالعدم قرار دے سکے گی، لیکن اس صورت میں یہ بل پورے انتخابی ادارے میں استصواب رائے کے لیے مشتہر کرنا ہوگا۔ اسمبلی بنیادی اصولوں کے منافی کوئی قانون نہیں بنا سکے گی۔ صدر کو بھی قانون سازی کے اختیارات حاصل ہوں گے اور ان کا استعمال وہ ہنگامی حالات میں یا اس وقت کرے گا جب قومی اسمبلی کا اجلاس نہ ہو رہا ہو، لیکن ایسے قوانین اسمبلی کے سامنے برائے توثیق پیش کیے جائیں گے؛ (۶) صدر اسمبلی کو معینہ مدت ختم ہونے سے قبل برخاست کر سکتا ہے، لیکن بدیں صورت خود اسے بھی ۱۲۰ دن کے اندر اپنے عہدے کے لیے دوبارہ منتخب ہونا لازم ہوگا؛ (۷) ہر صوبے میں ۱۵۵ ارکان پر مشتمل ایک صوبائی اسمبلی ہوگی، جن میں پانچ پانچ نشستیں خواتین کے لیے مخصوص ہوں گی۔ گورنر اپنے فرائض ادا کرنے میں صدر سے ہدایات وصول کرے گا اور وزرا کی کونسل مقرر کر سکے گا؛ (۸) قومی زبانیں اردو اور بنگلہ ہوں گی، لیکن فی الحال سرکاری مقاصد کے لیے انگریزی استعمال ہوتی رہے گی۔ ۱۹۷۲ء میں صدر ایک کمیشن مقرر کرے گا، جو سرکاری مقاصد کے لیے انگریزی کو تبدیل کرنے کے مسئلے کا جائزہ لے گا؛ (۹) اسلامی مشاورتی کونسل، سپریم جوڈیشل کونسل اور قومی مالیاتی کمیشن کا تقرر عمل میں لایا جائے گا؛ (۱۰) ریاست پاکستان ایک جمہوریہ ہوگی اور یہاں وفاقی حکومت قائم ہوگی۔ مرکزی حکومت کے دائرۂ کار میں حتی الامکان دونوں صوبوں میں برابری قائم رکھی جائے گی۔ صوبوں کو اسی قدر داخلی خود مختاری دی جائے گی جو مجموعی طور پر پاکستان کی وحدت اور مفاد کے مطابق ہو۔

نومبر ۱۹۶۸ء کو صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے خلاف ملک میں ہنگامے برپا ہو گئے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو مارشل لا نافذ کر دیا گیا اور جنرل محمد یحییٰ خان پہلے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور پھر صدر مملکت مقرر ہوئے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ وہ عوام کو اختیارات لوٹا دینے کے جلد از جلد انتظامات کریں گے۔ ۲۸ نومبر ۱۹۶۹ء کو انھوں نے ملک کے آئندہ آئین کے متعلق ایک تقریر کی، جس کا خلاصہ یہ ہے: (۱) انتخابات سے پہلے وحدت مغربی پاکستان ختم کر دی جائے گی؛ (۲) انتخابات ایک فرد، ایک ووٹ، کی بنیاد پر منعقد ہوں گے؛ (۳) انتخابات کے لیے ۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء کی تاریخ مقرر کی گئی ہے؛ (۴) عام انتخابات قومی اسمبلی کے لیے ہوں گے، جو ۱۲۰ دنوں میں دستور تیار کرے گی اور اس کے بعد آئینی حکومت قائم کرے گی؛ (۵) دستور سازی کے وقت رائے دہی کے طریق کار کا فیصلہ قومی اسمبلی خود کرے گی، مگر ایسے ہر علاقے کے لیے

منصفانہ ہونا چاہیے؛ (۶) اگر اسمبلی معینہ مدت میں دستور نہ بنا سکی تو از خود ختم ہو جائے گی اور قومی اسمبلی کے لیے انتخابات دوبارہ ہوں گے؛ (۷) مرکز اور صوبوں کے درمیان مالیات کی تقسیم اس طرح ہو گی کہ دونوں علاقوں کو اپنے وسائل پر پورا اختیار حاصل ہو گا بشرطیکہ اس کا مرکزی حکومت کی کارکردگی پر برا اثر نہ پڑے؛ (۸) مشرقی پاکستان کی پس ماندگی کو دور کیا جائے گا؛ (۹) ملک کے دونوں بازوؤں کو اس حد تک مکمل خود مختاری دی جائے گی جو قومی سالمیت اور استحکام کی راہ میں رکاوٹ نہ ہو؛ (۱۰) پارلیمانی وفاقی طرز حکومت، براہ راست بالغ رائے دہی، شہریوں کے بنیادی حقوق اور ایک آزاد عدلیہ کے ذریعے ان کا نفاذ، دستور کا اسلامی مزاج، جس میں اس ''آئیڈیالوجی'' کو محفوظ کیا گیا ہو جس کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا، ایسے امور ہیں جنہیں طے شدہ سمجھا جانا چاہیے؛ (۱۱) قومی اسمبلی کے بنائے ہوئے دستور کو صدر کی باقاعدہ منظوری حاصل کرنا ہو گی؛ (۱۲) یکم جنوری سے مکمل سیاسی سرگرمیوں کی اجازت مل جائے گی اور سیاسی جماعتوں کے لیے ایک لائحہ عمل مہیا کیا جائے گا؛ اس کے علاوہ (۱۳) جمہوریت کا راستہ روکنے والوں اور تشدّد پھیلانے والوں کو سخت الفاظ میں متنبہ کیا گیا۔

صدر مملکت کی طرف سے ۲۸ مارچ ۱۹۷۰ء کو دستور کے بنیادی اصول اور ۳۱ مارچ ۱۹۷۰ء کو انتخابات اور آئین ساز اسمبلی کے سلسلے میں قانونی ڈھانچے کا اعلان کیا گیا۔ اہم نکات مندرجۂ ذیل ہیں:

(الف) دستور کے بنیادی اصول: (۱) پاکستان ایک وفاقی جمہوریہ ہو گا، جس کا نام اسلامی جمہوریۂ پاکستان ہو گا۔ اس وفاق میں شریک وہ صوبے اور علاقے جو پاکستان کا حصہ ہیں یا بعد میں شامل ہوں، اس طرح متحد ہوں گے کہ پاکستان کی آزادی، علاقائی سالمیت اور قومی استحکام کا تحفظ ہو سکے۔ وفاق کے اتحاد کو کسی طرح بھی نقصان نہیں پہنچنے دیا جائے گا؛ (۲) اسلامی نظریہ قیام پاکستان کی اساس ہے۔ اس کا تحفظ لازمی ہو گا۔ مملکت کا سربراہ مسلمان ہو گا؛ (۳) جمہوریت کے بنیادی اصولوں پر عمل کیا جائے گا؛ (۴) شہریوں کے بنیادی حقوق متعین کیے جائیں گے اور انصاف کے حصول کے لیے عدلیہ کو پوری آزادی دی جائے گی؛ (۵) اختیارات کی تقسیم اس طرح کی جائے گی کہ صوبوں کو قانون سازی، انتظامی اور مالیاتی امور میں زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے جائیں، لیکن وفاقی حکومت کو اس ضمن میں اتنے کافی اختیارات حاصل رہیں کہ وہ داخلی اور خارجی امور سے متعلق اپنی ذمے داریاں پوری کر سکے اور ملک کی آزادی اور علاقائی سالمیت کا تحفظ کر سکے؛ (۶) پاکستان کے تمام علاقوں کو جملہ قومی امور میں حصہ لینے کا موقع ملے گا اور مختلف علاقوں میں عدم مساوات ختم کی جائے گی؛ (۷) دستور کے دیباچے میں پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اس قابل بنانے کا عہد کیا جائے گا کہ وہ اپنی زندگی قرآن و سنت کے مطابق گزار سکیں، نیز یہ کہ اقلیتوں کو مکمل مذہبی آزادی دی جائے گی اور انہیں پاکستان کے شہریوں کی حیثیت سے جملہ حقوق، مراعات اور تحفظات حاصل ہوں گے۔

(ب) رہنما اصول: دستور میں مملکت کی پالیسی کے رہنما اصول پیش کیے جائیں گے، جن کے ذریعے مملکت کی ان امور میں رہنمائی کی جائے گی: (۱) اسلامی نظام کا فروغ؛ (۲) اسلام کے اخلاقی معیار کی پابندی؛ (۳) پاکستان کے مسلمانوں کو

قرآن مجید اور اسلامیات کی تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنا؛ (۴) اس بات کی ہدایت کہ کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔

(ج) قانونی ڈھانچا: (۱) قومی اسمبلی کے ارکان کی تعداد بہ تفصیل ذیل ۳۱۳ ہو گی:

صوبہ	عام نشستیں	خواتین
مشرقی پاکستان	۱۶۲	۷
پنجاب	۸۲	۳
سندھ	۲۷	۱
بلوچستان	۴	۱
صوبۂ سرحد	۱۸	۱
قبائلی علاقے	۷	
	۳۰۰	۱۳

عام نشستوں پر ارکان کو بالغ رائے دہی اور براہ راست انتخاب کی بنا پر منتخب کیا جائے گا جب کہ خواتین کا انتخاب متعلقہ صوبے کے ارکان قومی اسمبلی کریں گے؛ (۲) ہر صوبے کے لیے الگ صوبائی اسمبلی ہو گی، جس میں خواتین کی مخصوص نشستوں کا انتخاب متعلقہ علاقوں کے ارکان اسمبلی کریں گے۔ نشستوں کی تفصیل یہ ہے:

صوبہ	عام نشستیں	خواتین
مشرقی پاکستان	۳۰۰	۱۰
پنجاب	۱۸۰	۶
سندھ	۶۰	۲
بلوچستان	۲۰	۱
صوبۂ سرحد	۳۰	۲

صوبائی اسمبلی کا اجلاس آئین کے نفاذ کے بعد ہی ہو سکے گا؛ (۳) قومی اسمبلی کے لیے پولنگ ۵ اکتوبر کو اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے ۲۲ اکتوبر کو ہوں گے؛ (۴) قومی اسمبلی کا اجلاس بلا کسی معقول وجہ التوا کے روزانہ ہو گا؛ (۵) قومی اسمبلی مسودۂ آئین کی صورت میں ۱۲۰ دن کے اندر اندر دستور بنائے گی۔ اگر وہ اس مدت میں آئین تیار نہ کر سکی تو اسے توڑ دیا جائے گا؛ (۶) مسودۂ آئین، جسے قومی اسمبلی منظور کرے گی، توثیق کے لیے صدر کو پیش کیا جائے گا۔ اگر صدر اس کی توثیق نہ کریں تو قومی اسمبلی ٹوٹ جائے گی؛ (۷) اسمبلی کا اجلاس، قومی اسمبلی کی حیثیت سے، آئین کے نفاذ کے بعد ہوگا؛ (۸) قانونی ڈھانچے کی توضیح اور اس میں ترمیم کا اختیار صرف صدر کو حاصل ہے اور ان کے فیصلے کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

۳۱ مارچ ۱۹۷۰ء ہی کو صدر مملکت نے اپنی پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ صدر کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ میں کسی ایسے آئین کی منظوری نہ دوں جو نظریۂ پاکستان اور ملکی سالمیت کے منافی ہو۔ اگر آئین بنانے تک مشتہرہ قانونی ڈھانچے کا خیال رکھا گیا تو میں اس آئین کی منظوری دے دوں گا۔ اگر قومی اسمبلی مقررہ مدت یعنی ایک سو بیس دن میں آئین نہ بنا سکی تو چیف الیکشن کمشنر، جس قدر جلد انتظام کر سکیں گے، نئی اسمبلی کے لیے انتخابات کرائیں گے۔

بوقت تحریر سب سیاسی پارٹیاں، انتخابات کے سلسلے میں اپنے اپنے حق میں رائے عامّہ کو تیار کر رہی ہیں۔

۴۔ نظام قانون

پاکستان کا نظام قانون ضابطۂ دیوانی، ضابطۂ فوجداری اور تعزیرات پاکستان جیسے مجموعہ ہائے قوانین (Codes) کے علاوہ ان قوانین (Statutes) پر مشتمل ہے جو برصغیر کی تقسیم سے قبل یا قیام پاکستان کے بعد مرکزی اور صوبائی مقننہ کے وضع کردہ ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل یا بعد ہائی کورٹ، فیڈرل کورٹ، سپریم کورٹ اور دوسری

عدالتوں (Tribunals) نے جو فیصلے صادر کیے وہ فی نفسہ قانون نہیں بلکہ قانون کی تعبیر یا تفسیر پر مشتمل ہیں، البتہ عدالت‌ہائے عالیہ کے فیصلوں میں جو بات قانون قرار دے دی جائے اسے از روے دستور بطور قانون قبول کرنا ماتحت عدالتوں اور تمام دیگر اداروں یا افراد کا فرض ہے۔

قانون دیوانی: چند مستثنیات سے قطع نظر پاکستان میں ضابطۂ دیوانی (۱۹۰۸ء) مع ترمیمات نافذ ہے۔ اس کا اطلاق تمام دیوانی مقدمات اور ان کی عدالتی کارروائی پر ہوتا ہے، مثلاً مقدمات دائر کرنے اور ان کی سماعت کا طریق کار، فریقین اور شہادتوں کی طلبی، احکام امتناعی اور ڈگری کا اجراء وغیرہ۔ قانون دیوانی میں محض ضابطۂ دیوانی ہی نہیں، اور قوانین بھی شامل ہیں، مثلاً قانون معاہدات، قانون انتقال املاک، قانون فروخت اشیاء، قانون تکمیل معاہدۂ مختص، وغیرہ۔ اصل قوانین یہی ہیں۔ ضابطۂ دیوانی، جیسا کہ ظاہر ہے، محض مقدمات کے ضوابط و قواعد کا قانون ہے، یعنی اضافی قانون ہے۔ ان کے علاوہ کسی حد تک رواج بھی قانون کا حصہ ہے، جو زراعتی قبیلوں یا علاقوں پر عائد ہوتا ہے۔ وراثت، نکاح و طلاق اور ہبہ وغیرہ کے سلسلے میں فریقین پر باعتبار مذہب ان کے شخصی قانون کا اطلاق ہوتا ہے، مثلاً مسلمان شریعت کے پابند ہوں گے اور ہندو مغربی پاکستان میں ''متاک سترا'' اور مشرقی پاکستان میں ''دیا بھاگ'' دبستان قانون ہنود کے؛ تاہم مجلس آئین‌ساز شخصی قوانین میں ترمیم کرنے کی مجاز ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی عائلی قوانین کا ضابطہ (۱۹۶۰ء) بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے، جس کی رو سے نکاح کی رجسٹری اور طلاق کے مقررہ ضابطۂ کار کی پابندی لازم قرار دی گئی ہے۔

قانون فوجداری: پاکستان کا فوجداری قانون دو حصوں پر مشتمل ہے: تعزیرات پاکستان اور ضابطۂ فوجداری۔ اول الذکر قانون موجبہ (Substantive Law) ہے اور آخر الذکر قانون اضافی (Adjective Law) ہے۔ ان کا نفاذ علی الترتیب ۱۸۶۰ اور ۱۸۹۸ء میں کیا گیا اور انہوں نے ان قوانین ''شریعت'' کی جگہ لے لی جن پر مغلیہ عہد کے آغاز سے عملدرآمد ہو رہا تھا۔ ان قوانین میں وقتاً فوقتاً ترمیمات بھی ہوتی رہی ہیں۔

ان کے علاوہ قانون شہادت (۱۸۷۲ء) کی رو سے، جو بڑی حد تک انگریزی قانون کے اصولوں پر مبنی ہے، مقدمے کی سماعت کے دوران میں صرف متعلقہ شہادتوں کو پیش کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور اس امر کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں کہ عدالت اپنی ذاتی رائے، شکوک اور تعصبات کی بنا پر فیصلہ صادر کرے یا ملزم استغاثے کے بے جا جوش و خروش کا شکار ہو جائے۔

قانون کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ ایک شخص اس وقت تک بے گناہ تصور کیا جاتا ہے جب تک وہ مجرم ثابت نہ ہو جائے اور اس کے ارتکاب جرم میں کسی قسم کا شک و شبہہ نہ رہے۔

مغربی پاکستان میں بعض مخصوص حالات کے تحت مقدمات جرگے کے سامنے بھی پیش کیے جا سکتے ہیں، جو معزز اور ممتاز شہریوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ڈویژن کے کمشنر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی صوابدید سے بعض شدید نوعیت کے جرائم کے ملزموں کو جرگہ سپرد کر دے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔

قوانین اور اسلامی نظریہ: دستور کی رو سے یہ لازم ہے کہ کوئی قانون اسلامی تعلیمات کے منافی نہ ہو، موجودہ قوانین کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کیا جائے اور مسلمانوں کو اپنی زندگی اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق بسر

کرنے کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ اسلامی مجلس مشاورت (Advisory Council of Islamic Ideology) اس سلسلے میں ضروری سفارشات پیش کرتی ہے۔ مجلس متعدد مجوزہ قوانین کے بارے میں قرآن و سنت کے پیش نظر اپنی رائے دیتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ مروجہ قوانین میں ضروری ترمیمات کی بھی وہ سفارش کرتی ہے، مثلاً اس کی طرف سے خوراک میں ملاوٹ، بچوں کے اغوا اور سمگلنگ کے مجرمین کے لیے کڑی سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ ضابطۂ دیوانی، ضابطۂ فوجداری، تعزیرات پاکستان اور دیگر قوانین کے بارے میں مجلس کا تحقیقاتی کام پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اور اس ضمن میں سفارشات عنقریب پیش کر دی جائیں گی۔

قوانین کا ترجمہ: اہم اور ضروری قوانین کا اردو اور بنگلہ میں ترجمہ کرنے کے لیے وزارت قانون کے ماتحت دو شعبے کام کر رہے ہیں اور بہت سے قوانین کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں، مثلاً قانون دفاع پاکستان، اسلامی عائلی قوانین، وغیرہ۔

(٥) حکومت

اس وقت (جون ۱۹۷۰ء) میں پاکستان میں عسکری آئین (مارشل لا) نافذ ہے، لیکن حکومت کا نظم و نسق عملاً سول حکام ہی کے سپرد ہے۔ سربراہ مملکت صدر آغا محمد یحیی خاں ہیں، جو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی ہیں۔ ان کی اعانت وزرا کی ایک کابینہ کرتی ہے، جس کے ارکان کو خود صدر پاکستان نے نامزد کیا ہے۔ صدر مملکت کابینۂ وزراء، گورنروں کی کانفرنس (جس میں صوبائی گورنروں اور مرکزی وزرا کے علاوہ اہم وزارتوں کے سیکرٹری بھی شریک ہوتے ہیں) اور قومی اقتصادی کمیشن کے جلسوں کی صدارت کرتے ہیں۔

مرکزی حکومت کے دفاتر، صدر کے فیصلوں اور پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے کی ذمے داری مرکزی سیکرٹریٹ Secretariat پر ہے۔ ہر وزارت مختلف ڈویژنوں میں منقسم ہے اور ہر ڈویژن کا سربراہ سیکرٹری یا جائنٹ سیکرٹری ہوتا ہے۔ یہ تمام سیکرٹری براہ راست صدر کے ماتحت ہوتے ہیں، البتہ منصوبہ بندی اور اقتصادی امور کی ڈویژن کا سیکرٹری منصوبہ‌بندی کمیشن کے ڈپٹی چیرمین کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ ڈویژن میں جو انتظامی پالیسی طے ہوتی ہے اس پر ملحقہ محکموں اور ماتحت دفاتر میں عملدرآمد ہوتا ہے۔ ملحقہ محکموں کے سربراہوں کو عموماً ڈائرکٹر جنرل یا چیف ایڈمنسٹریٹر کہا جاتا ہے اور ان کا منصب سیکرٹری یا ڈپٹی سیکرٹری کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔

صدارتی سیکرٹریٹ (Presidential Secretariat) تین ڈویژنوں پر مشتمل ہے، یعنی (۱) منصوبہ بندی ڈویژن، جو ملک کے مادی وسائل اور افرادی قوت کے پیش نظر قومی منصوبے تیار کرتا ہے؛ (۲) اقتصادی امور کا ڈویژن، جس کا تعلق ملک کی اقتصادی ضروریات اور غیر ممالک اور بین‌الاقوامی اداروں سے فنی اور مالی امداد لینے سے ہے۔ اسی ڈویژن کے تحت مرکزی دفتر اعداد و شمار کام کرتا ہے اور (۳) ریاستوں اور سرحدی علاقوں کا ڈویژن، جو پاکستان کے شمال مغربی علاقے کے سیاسی و فوجی نظم و نسق کا ذمے دار ہے۔

وزارتی سیکرٹریٹ (Cabinet Secretariat) کے دو ڈویژن ہیں: (۱) وزارتی ڈویژن، جس کے سپرد کابینہ، اس کی کمیٹیوں اور گورنروں کی کانفرنس کے دفتری امور اور ان کے فیصلوں پر عملدرآمد کی نگرانی ہے۔ مرکزی محکمۂ خفیہ پولیس (Central Intelligence Bureau) بھی اسی کے ماتحت ہے؛ (۲) امور عملہ کا ڈویژن (Establishment Division)، جس کا تعلق سرکاری ملازمین کی بھرتی، تقرر،

ترقی اور تبادلے، قومی اور مرکزی دفاتر کے نظم و نسق، سرکاری ملازمین کی تربیت، عملے کی بہبود وغیرہ سے ہے۔

مرکزی حکومت کی وزارتیں مندرجۂ ذیل ہیں: (۱) وزارت دفاع: پاکستان کی دفاعی پالیسی بنانے کی ذمے دار ہے، جس میں عملۂ افواج، فوجی سامان، ذخائر اسلحہ، وغیرہ کے امور شامل ہیں۔ شہری ہوا بازی (Aviation)، سیر و سیاحت (Tourism)، اصفار (Cyphers) اور موسمیات (Meteorology) کے شعبوں کے علاوہ دفاعی سامان تیار کرنے کے ادارے بھی اسی وزارت کے ماتحت ہیں؛ (۲) وزارت امور خارجہ؛ (۳) وزارت مالیات: حکومت کے جملہ مالی امور اسی کے زیر اختیار ہیں۔ یہ ملک کا سالانہ میزانیہ تیار کرتی اور اسے عملی جامہ پہناتی ہے۔ مرکزی محکمۂ مال (Board of Revenue) اس کا ملحقہ محکمہ ہے۔ علاوہ بریں بینک دولت پاکستان، نیز پاکستان نیشنل بینک، پاکستان پرنٹنگ کارپوریشن، ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن اور پی۔ آئی۔ سی۔ آئی۔ سی (PICIC) جیسے خوداختیار مالیاتی ادارے اسی وزارت کے ماتحت ہیں؛ (۴) وزارت داخلہ میں امور داخلہ کی ڈویژن اندرون ملک کے نظم و نسق اور جان و مال کے تحفظ کی ذمے دار ہے اور امور کشمیر کی ڈویژن مشیر اعلیٰ حکومت آزاد کشمیر (جو گلگت اور بلتستان کا ریزیڈنٹ بھی ہوتا ہے) کے توسط سے امور کشمیر کی نگراں ہے۔ شہری دفاع اور توطن و پاسپورٹ کی نظامتیں (Directorates) بھی اسی وزارت کے ماتحت ہیں؛ (۵) وزارت صنعت و قدرتی وسائل؛ (۶) وزارت خوراک و زراعت و بحالیات و تعمیرات؛ (۷) وزارت تجارت، جس میں سائنسی و تکنیکی ڈویژن شامل کر دی گئی ہے؛ (۸) وزارت تعلیم و سائنسی تحقیق، جس کے ماتحت محکمۂ آثار قدیمہ، پاکستان سپورٹس کنٹرول بورڈ، اقبال اکیڈمی، قومی کتاب مرکز، اردو و بنگلہ کی ترقی کے مرکزی بورڈ وغیرہ بھی ہیں؛ (۹) وزارت اطلاعات و نشریات و قومی امور؛ (۱۰) وزارت مواصلات؛ (۱۱) وزارت قانون و پارلیمانی امور؛ (۱۲) وزارت صحت و محنت و سماجی بہبود۔

سول سروس: حکومت برطانیہ نے برصغیر پاک و ہند کی انتظامیہ کو مؤثر طریق سے چلانے کے لیے اعلیٰ ملازمت کا ایک نظام قائم کیا، جسے انڈین سول سروس (ICS) کہتے تھے۔ حکومت پاکستان نے بھی اسی نمونے پر پاکستان سپیریئر سروسز Pakistan Superior Services کا نظام قائم کیا۔ اس کی دو جمعیتیں (cadres) ہیں: (۱) کل پاکستان ملازمتیں (All-Pakistan Services)، جس کے ملازمین مرکزی اور صوبائی دونوں حکومتوں کے ماتحت فرائض ادا کرتے ہیں اور (۲) مرکزی ملازمتیں (Central Services)، جس کے افراد کا تعلق صرف مرکزی حکومت سے ہوتا ہے۔ پاکستان سول سروس (CSP) اور پولیس سروس پاکستان (PSP) کل پاکستان ملازمتیں ہیں۔ پاکستان فارن سروس (PFS) کے افراد سول سروس کے ساتھ ہی بھرتی ہوتے ہیں، لیکن ان کی جمعیت (cadre) بالکل علیحدہ ہے۔ سول سروس اور فارن سروس پاکستان کی اعلیٰ ترین ملازمتیں ہیں۔ دوسری مرکزی اعلیٰ ملازمتیں یہ ہیں: پاکستان آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس، پاکستان اکسائز اینڈ کسٹمز سروس، پاکستان پوسٹل سروس، سنٹرل انفرمیشن سروس؛ ان کے علاوہ صوبائی سطح پر بھی اعلیٰ ملازمتیں ہیں، جو کلیۃً صوبائی حکومتوں کے ماتحت ہوتی ہیں۔

حکومت پاکستان کے ملازمین کے چار درجے (classes) ہیں: درجۂ اول کے افسر انتہائی ذمے دار عہدوں پر فائز ہوتے ہیں اور وہ حکومت

کی نیابت کرتے ہیں۔ ان کے بعد درجۂ دوم کے افسر آتے ہیں۔ درجۂ اول اور درجۂ دوم کے ملازمین کا تقرر، ترقی اور تبادلے کے احکام حکومت کے گزٹ میں شائع ہوتے ہیں، لہذا انھیں گزیٹڈ افسر کہتے ہیں۔ درجۂ سوم کے ملازمین عموماً دفتری فرائض انجام دیتے ہیں اور درجۂ چہارم دفتریوں، چپراسیوں وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

سی۔ ایس۔ پی افسروں کو بالعموم سیکرٹریٹ یا انتظامی ڈویژنوں اور اضلاع میں انتظامیہ کے اعلی عہدوں پر متعین کیا جاتا ہے اور وہ اپنے حلقۂ اختیار کے حاکم ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ عدلیہ کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں، لیکن اب انتظامیہ اور عدلیہ کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ کیا جا رہا ہے۔

مرکزی اور صوبائی گزیٹڈ افسروں کو مرکزی اور صوبائی پبلک سروس کمیشن منتخب کرتے ہیں۔ صوبوں کے لیے مرکزی ملازمتوں کا "کوٹا" مقرر ہے، لیکن ۲۰ فی صد اسامیاں خالص اہلیت کی بنا پر پر کی جاتی ہیں۔ سبکدوشی کی عمر پچپن برس مقرر ہے۔ تکمیل ملازمت پر پنشن ملتی ہے۔ ملازمین کی تربیت کے لیے متعدد ادارے قائم کیے گئے ہیں، مثلاً ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن (NIPA)، سول سروس اکیڈمی، فنانس سروس اکیڈمی، دیہی ترقیات کے ادارے (Academies of Rural Development)، سیکرٹریٹ کا تربیتی ادارہ (Secretariat Training Institute)، وغیرہ۔

مشرقی پاکستان (صدر مقام: ڈھاکہ) چار انتظامی ڈویژنوں پر مشتمل ہے (قوسین میں ڈویژنوں کے اضلاع درج کیے جاتے ہیں): (۱) راج شاہی: (دیناج پور، رنگ پور، بوگرا، راج شاہی، پبنہ)؛ (۲) کھلنا: (کشتیا، جیسور، کھلنا، باقر گنج)؛ (۳) ڈھاکہ: (میمن سنگھ، ڈھاکہ، فریدپور)؛ (۴) چاٹگانگ: (سلہٹ، کومیلا، نواکھلی، چاٹگانگ، چاٹگانگ کے پہاڑی خطے)

مغربی پاکستان (صدر مقام: لاہور) کی ڈویژنیں (مع اضلاع) مندرجۂ ذیل ہیں: (۱) پشاور: (ہزارہ، مردان، پشاور، کوہاٹ، نیز خیبر، مہمند اور کرّم کی ایجنسیاں)؛ (۲) ڈیرہ اسمٰعیل خاں: (ڈیرہ اسمٰعیل خاں، بنوں، نیز شمالی و جنوبی وزیرستان)؛ (۳) مالاکنڈ: (مالاکنڈ ایجنسی، دیر، سوات، چترال)؛ (۴) راولپنڈی: (کیمبل پور، راولپنڈی، جہلم، گجرات)؛ (۵) سرگودھا: (سرگودھا، میانوالی، لائل پور، جھنگ)؛ (٦) لاہور: (لاہور، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، سیالکوٹ)؛ (۷) ملتان: (ڈیرہ غازی خاں، مظفر گڑھ، ملتان، ساہی وال)؛ (۸) بہاول پور: (بہاول پور، بہاول نگر، رحیم یار خاں)؛ (۹) خیرپور: (جیکب آباد، سکھر، لاڑکانہ، نواب شاہ، خیرپور)؛ (۱۰) حیدرآباد: (حیدرآباد، دادو، تھرپارکر، سانگھڑ، ٹھٹھہ)؛ (۱۱) کوئٹہ: (کوئٹہ، سبی، ژوب، چاغی، لورالائی)؛ (۱۲) قلات (قلات، مکران، خاران)؛ (۱۳) کراچی (کراچی، لس بیلہ)۔

یکم جولائی ۱۹۷۰ء سے مغربی پاکستان چار صوبوں میں منقسم ہو رہا ہے: (۱) صوبۂ پنجاب (صدر مقام: لاہور)، راولپنڈی، سرگودھا، لاہور، ملتان اور بہاولپور ڈویژنوں پر، (۲) صوبۂ سرحد (صدر مقام: پشاور)، پشاور، ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور مالاکنڈ ڈویژنوں پر، (۳) صوبۂ سندھ (صدر مقام: کراچی) خیرپور اور حیدرآباد ڈویژنوں پر اور (۴) صوبۂ بلوچستان (صدر مقام: کوئٹہ) کوئٹہ اور قلات ڈویژنوں پر مشتمل ہوگا۔ کراچی ڈویژن کا ضلع کراچی صوبۂ سندھ میں اور ضلع لس بیلہ صوبۂ بلوچستان میں شامل ہوگا۔ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کی جگہ

لاهور هائی کورٹ (برائے صوبۂ پنجاب و اسلام آباد)، پشاور هائی کورٹ (برائے صوبۂ سرحد) اور کراچی هائی کورٹ (برائے صوبۂ سندھ و صوبۂ بلوچستان لے لیں گے۔ وفاقی دارالحکومت اسلام آباد مرکزی حکومت کے ماتحت رہے گا۔

پنجاب میں انتظامی محکموں کی تعداد چودہ ہوگی: (۱) محکمۂ مال (Board of Revenue)؛ (۲) عمومی انتظامیہ و اطلاعات (General Administration and Information Services and)؛ (۳) منصوبہ‌بندی و ترقیات؛ (۴) قانون؛ (۵) صحت؛ (۶) صنعت، تجارت و معدنیات؛ (۷) آب پاشی و برقیات؛ (۸) تعلیم؛ (۹) مالیات؛ (۱۰) داخلہ؛ (۱۱) زراعت و امداد باہمی؛ (۱۲) خوراک؛ (۱۳) محنت؛ (۱۴) مواصلات و تعمیرات۔ مغربی پاکستان کے دوسرے صوبوں میں بعض محکمے ایک دوسرے میں مدغم کر دیے جائیں گے اور یوں صوبۂ سندھ میں ان کی کل تعداد تیرہ، صوبۂ سرحد میں دس اور صوبۂ بلوچستان میں چھے ہوگی۔

صوبائی حکومتوں کے اکثر انتظامی اختیارات ضلعی انتظامیہ کو حاصل ہیں۔ مرکزی اور صوبائی دفاتر حکومت (Secretariats) میں جو لائحۂ عمل تیار ہوتا ہے اس پر عمل‌درآمد اسی کے ذریعے کرایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں شہری اور دیہی علاقوں میں "لوکل سیلف گورنمنٹ" Local Self Government کے اصول پر ڈویژن کونسلیں، ڈسٹرکٹ کونسلیں، نیز تھانہ کونسلیں (مشرقی پاکستان میں) اور تحصیل کونسلیں (مغربی پاکستان میں) اور میونسپل کمیٹیاں، ٹاؤن کمیٹیاں، یونین کمیٹیاں اور یونین کونسلیں بنائی گئی ہیں، جو اپنے اپنے منصب کے مطابق ضلعی انتظامیہ کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ صدر ایوب خان نے ملک میں بنیادی جمہوریتوں کی جو طرح ڈالی تھی ان کے منتخب نمائندوں کا سیاسی اور بنیادی مقصد صدرِ مملکت اور قومی و صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کو منتخب کرنا تھا۔ علاوہ ازیں بنیادی جمہوریتوں کے ارکان مل کر اپنے اپنے علاقوں میں ایک تنظیمی وحدت تشکیل کرتے تھے جسے گاؤں میں یونین کونسل، قصبے میں ٹاؤن کمیٹی اور بلدیاتی علاقے میں یونین کمیٹی کہتے ہیں۔ بالغ رائے دہی اور "ایک فرد، ایک ووٹ" کی بنا پر براہِ راست انتخاب کا اصول طے ہو جانے کے بعد بنیادی جمہوریتیں انتخابی ادارے نہیں رہیں، لیکن مقامی حکومت کے نظام کے طور پر ان کی حیثیت ابھی تک قائم ہے۔

(۶) ترقیاتی منصوبہ بندی

۱۹۴۷ء میں جب پاکستان ایک جداگانہ آزاد ریاست کے طور پر معرضِ وجود میں آیا تو اس کے مشمولہ صوبے برِصغیر میں سب سے زیادہ پس ماندہ تھے۔ مشرقی پاکستان میں، جہاں دنیا میں سب سے زیادہ پٹ سن پیدا ہوتا ہے، پٹ سن کے کارخانوں کا فقدان تھا۔ روئی کی گانٹھیں بنانے کی مشینیں اتنی کم تھیں کہ مغربی پاکستان کی کل پیداوار کا دسواں حصہ ہی استعمال ہو سکتا تھا۔ ان علاقوں کا کوئلے، لوہے، فولاد، تمباکو، شکر، نباتاتی روغن وغیرہ کی تمام مصنوعات کے لیے اس خطے پر انحصار تھا جسے اب بھارت کہتے ہیں۔ تمام ملک میں ایک لاکھ کیلوواٹ سے کم بجلی پیدا ہوتی تھی۔ ریلوں کے دو نظام تھے: (۱) مغربی پاکستان میں نارتھ ویسٹرن ریلوے، جہاں ریل پٹڑی چوڑی تھی اور (۲) مشرقی پاکستان میں ایسٹ بنگال ریلوے، جہاں پٹڑی کم چوڑی تھی۔ ان ریلوں کی مجموعی لمبائی ۶۱۴ میل تھی۔ اوّل الذکر ریلوے تجارتی مقاصد سے زیادہ فوجی مقاصد کے لیے بنائی گئی تھی، اور وہ خود کفیل

نہ تھی ۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں ریلوں کے انجن اور ڈبے خستہ حال ہو چکے تھے، جنھیں تبدیل کرنے کی ضرورت تھی ۔ مزید برآں آزادی کے وقت کوئلے کی قلت کی وجہ سے ریل گاڑیوں کی آمد و رفت تقریباً بند ہو گئی تھی ۔ پاکستان کے دونوں خطوں کا درمیانی فاصلہ بارہ سو فضائی میل اور تین ہزار بحری میل ہے، لیکن پاکستان کے پاس نہ تجارتی بیڑہ تھا، نہ ہوائی سروس ۔ کراچی تو نہایت عمدہ بندرگاہ تھی، لیکن مشرقی پاکستان میں چاٹگانگ کی بندرگاہ پر کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی ۔ زراعت پر ملک کی اسّی فیصد آبادی کی روزی کا انحصار ہے، لیکن اس میں میکانکی طریقۂ کاشت کا آغاز تک نہ ہوا تھا اور وہی قدیم دقیانوسی طریقے رائج تھے ۔ ملک میں صرف ایک ریڈیو سٹیشن تھا ۔ ابتدا ہی سے پاکستان کو بہت سے مسائل کا سامنا تھا اور تقریباً ڈیڑھ کروڑ مہاجرین کے آنے سے ان مسائل میں اضافہ اور پیچیدگی پیدا ہو گئی ۔ یہ مہاجرین زیادہ تر مفلوک الحال کاشتکار اور اہل حرفہ تھے، جنھیں بہر حال دوبارہ بسانا اور روزگار مہیا کرنا ضروری تھا ۔ ہندو اور سکھ، جو یہاں سے گئے تھے، عموماً تاجر، صنعت کار اور سرکاری دفتروں اور نجی اداروں میں کام کرنے والے تھے، جن کی جگہ پُر کرنا فوری طور پر مطلوب تھا ۔ سکولوں، ہسپتالوں، بینکوں اور دیگر اداروں کو عموماً غیرمسلم چلاتے تھے ۔ اب ان کی دیکھ بھال کرنے والا عملہ نہ رہا تھا۔

حکومت کا کُل کاروبار چلانے کے لیے انڈین سول سروس کے تقریباً ایک سو افسر پاکستان کے حصے میں آئے تھے ۔ عملہ بھی ناکافی تھا ۔ دفاتر کے لیے کوئی موزوں جگہ تھی، نہ ضروری سامان۔

ملک کے یہ حالات تھے جن میں قومی ترقی کی منصوبہ‌بندی کا آغاز کرنا پڑا ۔ اگرچہ ملک کو قائم ہوئے تیئیس برس ہونے کو آئے ہیں، لیکن ترقیات کا مسئلہ ابھی تک حل طلب ہے ۔ آبادی اب تقریباً بارہ کروڑ ہے اور تیس لاکھ سالانہ شرح سے بڑھ رہی ہے ۔ پاکستان دنیا کے سب سے زیادہ گنجان آباد ممالک میں سے ہے، چنانچہ گزشتہ چند برس میں اقتصادی ترقی کی شرح خاصی بلند رہنے کے باوجود فی کس سالانہ آمدنی ابھی تک ۳۶۵ روپے پر قائم ہے۔

پاکستان میں منصوبہ‌بندی کا نظام ہنوز انقلابی دور سے گزر رہا ہے ۔ اس کی ترقی کے تین واضح دور ہیں: (۱) ۱۹۴۷ تا ۱۹۵۳ء؛ (۲) ۱۹۵۳ تا ۱۹۵۸ء؛ (۳) ۱۹۵۸ء کے بعد۔

۱۹۴۸ء کے اوائل میں حکومت نے ایک ترقیاتی بورڈ (Development Board) قائم کیا، جس کے فرائض میں صوبائی حکومتوں کی تیار کردہ ترقیاتی تجاویز میں ربط و ضبط پیدا کرنا، تقدّمات (priorities) کی سفارشات کرنا، ترقیاتی منصوبوں کی رفتار ترقی پر نگاہ رکھنا اور اس ترقی سے متعلق کابینہ کو باقاعدہ رپورٹ پیش کرنا شامل تھا ۔ علاوہ ازیں سرکاری افسروں اور عوام کے نمائندوں پر مشتمل منصوبہ‌بندی کا ایک مشاورتی بورڈ (Planning Advisory Board) بھی قائم کیا گیا، جس کے فرائض میں منصوبہ‌بندی اور ترقیاتی امور سے متعلق حکومت کو مشورہ دینا، منصوبوں پر عمل درآمد کرنے کی رفتار ترقی کا جائزہ لینا اور ترقیاتی کوششوں میں عوام کی حمایت حاصل کرنا شامل تھا ۔ اس مشاورتی بورڈ کو مختلف صنعتی بورڈوں اور کمیٹیوں کی اعانت حاصل رہی، جو مرکز اور صوبوں میں قائم کی گئیں۔

کولمبو منصوبے کی مجلس مشاورت (Colombo Plan Consultative Committee) کی سفارشات پر ۱۹۵۰ء میں ترقیاتی بورڈ نے بہت جلد ملک کے لیے

ایک چھے سالہ ترقیاتی منصوبہ (۱۹۵۱ تا ۱۹۵۷ء) تیار کیا۔

۱۹۵۱ء کے اوائل میں چھے سالہ ترقیاتی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک نئی منصوبہ بندی کی گئی۔ منصوبہ بندی کا مشاورتی بورڈ توڑ دیا گیا اور ترقیاتی بورڈ کی جگہ منصوبہ بندی کمیشن (Planning Commission) نے لے لی، جس کے بیس ارکان تھے اور اس کا صدر وزیر امور اقتصادیات تھا، نیز اعلیٰ اختیارات کی حامل ایک اقتصادی کونسل (Economic Council) بھی قائم کی گئی، جس کا صدر وزیر اعظم اور ارکان ترقیاتی وزارتوں کے سربراہ وزرا تھے۔ یہ کونسل چھے سالہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے، اس منصوبے کے تحت آئندہ منصوبوں کی منظوری دینے اور ان کی رفتار ترقی کی باقاعدہ روداد پیش کرنے کی ذمے دار تھی۔

پہلے ترقیاتی دور میں سنجیدہ کوششوں کے باوجود یہ منصوبہ بندی نظام زیادہ مؤثر ثابت نہ ہوا۔

منصوبہ بندی بورڈ (Planning Board): چھے سالہ منصوبے پر عمل درآمد کے دوران میں ایک ایسے مربوط و ہم آہنگ ترقیاتی منصوبے کی ضرورت محسوس ہونے لگی، جس کی بنیاد مالیاتی وسائل کے صحیح اندازے اور تقدمات کے منظم قاعدے پر استوار ہو۔ نتیجۃً جولائی ۱۹۵۳ء میں حکومت نے ایک منصوبہ بندی بورڈ کی تشکیل کی اور اسے اپریل ۱۹۵۵ تا مارچ ۱۹۶۰ء کی مدت کے لیے منصوبہ بنانے کی ذمے داری تفویض کر دی گئی تھی۔ منصوبہ بندی بورڈ کو شروع میں معلومات اور عملے کے فقدان کے باعث بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن بیرونی مشیروں کی مدد سے ان پر کسی حد تک قابو پا لیا گیا اور منصوبہ بندی بورڈ ۱۹۵۶ء تک پہلا پنج سالہ منصوبہ بنانے کے قابل ہو گیا، گو اسے ۱۹۵۸ء تک حکومت کی منظوری حاصل نہ ہو سکی۔

منصوبہ بندی کمیشن (Planning Commission): منصوبہ بندی تنظیم کے ارتقاء کا تیسرا دور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں صدر ایوب خان کے بر سر حکومت آنے کے بعد شروع ہوا۔ منصوبہ بندی بورڈ کا درجہ بلند کر کے اسے منصوبہ بندی کمیشن کے درجے تک پہنچا دیا اور بعد ازاں کمیشن کا مرتبہ اور بھی اونچا کر کے اسے صدارتی سیکریٹریٹ میں باقاعدہ ڈویژن بنا دیا گیا۔ صدر پاکستان نے اس کمیشن کی صدارت خود سنبھال لی اور منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وزیر بحیثیت عہدہ کے منصب کا ایک ڈپٹی چیئرمین مقرر کیا گیا۔ یہ کمیشن چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین کے علاوہ منصوبہ بندی ڈویژن کے سیکرٹری اور دونوں صوبوں کے ایک ایک نمائندے پر مشتمل ہے۔

اس کمیشن کے مفوضہ امور میں زیادہ اہم یہ ہیں: (۱) قومی منصوبوں کو میعادی وقفوں پر تیار کرنا؛ (۲) قومی منصوبے کی حدود کے اندر سالانہ ترقیاتی دستور العمل تیار کرنا اور وسائل کی تخصیص کی تجاویز پیش کرنا؛ (۳) منظور شدہ ترقیاتی منصوبوں اور بیرونی امداد حاصل کرنے والے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی تجویز پیش کرنا؛ (۴) ان منصوبوں کی ترقی کی روداد پیش کرنا؛ (۵) بلحاظ وعدہ کارکردگی کا اندازہ لگانا؛ (۶) ان منصوبوں پر عمل درآمد کرنے میں تاخیر کے اسباب کی تشخیص کرنا؛ (۷) قومی منصوبے پر سرکاری طور پر عمل درآمد کرانے کے لیے تنظیم کی نوعیت پر مشورہ دینا؛ (۸) ملک کے افرادی اور مادی وسائل کی وقتاً فوقتاً تعین کرنا؛ (۹) اہم اقتصادی حکمت عملیوں اور پروگراموں کا تجزیہ کر کے سفارشات پیش کرنا؛ (۱۰) امداد دینے والے ممالک کے لیے

اقتصادی تخمینے اور قدر و قیمت کی تعیین کے لیے اعداد و شمار فراہم کرنا ۔ یہ کمیشن اپنی بہت سی ذمے داریوں کو تکنیکی شعبوں کے ذریعے پورا کرتا ہے ۔ ہر شعبے میں ایک باقاعدہ تحقیقی عملہ ہوتا ہے ۔ یہ شعبے مختلف اقتصادی دائروں (sectors) میں کام کرتے ہیں، مثلاً خوراک و زراعت، بجلی اور پانی، صنعت و حرفت، تجارت، رسل و رسائل اور نقل و حمل؛ تعلیم، صحت، سماجی بہبود، رہائشی تعمیرات اور افرادی قوت ۔ ان کے علاوہ چند اور بھی شعبے ہیں، جن کا تعلق مالگزاری، مالیات، بین الاقوامی اقتصادیات اور سماجی تحقیقات وغیرہ سے ہے ۔

حکومت کی تمام ایسی کمیٹیوں میں جو مختلف پالیسیوں کو طے کرتی ہیں منصوبہ‌بندی کمیشن کا نمائندہ ہوتا ہے ۔ کمیشن کا ڈپٹی چیئرمین قومی اقتصادی کونسل (National Economic Council) کا رکن ہے، جو اقتصادی امور کا فیصلہ کرنے والی سب سے بڑی جماعت ہے ۔ مرکزی ترقیاتی مجلس عمل (The Central Development Working Party) کی صدارت منصوبہ‌بندی ڈویژن کا سیکرٹری کرتا ہے، لیکن ایک خاص حد سے تجاوز کرنے والی تجاویز کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین کی صدارت میں پیش ہوتی ہیں ۔ کمیشن کو نجی سرمایہ کاری کی تجاویز کی منظوری دینے والی کمیٹی کے علاوہ بیرونی زر مبادلہ کے کنٹرول کمیشن (Foreign Exchange Controls Commission) میں بھی نمائندگی دی جاتی ہے ۔

قومی اقتصادی کونسل اقتصادی امور پر فیصلہ دینے والی اعلیٰ ترین مجلس ہے ۔ اس کے مندرجۂ ذیل فرائض ہیں: (۱) ملک کے اقتصادی حالات کا مجموعی طور پر جائزہ لینا؛ (۲) مالیاتی، تجارتی اور اقتصادی حکمت عملی اور ملک کی اقتصادی ترقی کے لحاظ سے منصوبے وضع کرنا؛ (۳) پنج سالہ منصوبوں، سالانہ ترقیاتی پروگراموں، خاص حد سے اوپر کی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی تجاویز نجی حلقے کی تجاویز اور تمام غیر منصوبہ‌بندی تجاویز کی منظوری دینا؛ (۴) صوبوں کے درمیان اور ایک ہی صوبے کے مختلف علاقوں کے درمیان اقتصادی اور فی کس آمدنی میں عدم توافق کو دور کرنے کے لیے اقدامات کرنا ۔ آخری ذمے داری سے متعلق کونسل کو ہر سال مرکزی مجلس قانون ساز کو اپنی رپورٹ پیش کرنا پڑتی ہے ۔ صدر مملکت اس کونسل کا چیئرمین ہے ۔ اس کے ارکان میں دونوں گورنر، مرکزی وزرا (بجز قانون، امور خارجہ، امور داخلہ اور امور کشمیر کے وزرا کے)، منصوبہ بندی کمیشن کا ڈپٹی چیئرمین اور وہ صوبائی وزرا جو مالیات، منصوبہ‌بندی و ترقیاتی محکموں کے سربراہ ہیں شامل ہیں۔

منصوبہ بندی کی دیگر تنظیمات:

منصوبہ بندی کی دیگر تنظیمات یہ ہیں: مرکز اور صوبوں میں ترقیاتی مجالس عاملہ (Development Working Parties) اور صوبوں میں منصوبہ بندی ترقیاتی محکمے (Planning Development Departments)۔

ابتدائی منصوبہ بندی: ۱۹۴۸ء میں ترقیاتی بورڈ قائم کرنے کے بعد حکومت نے کچھ اور اقدامات بھی کیے، مثلاً صنعت کی رفتار ترقی کو تیز تر کرنے کے لیے بنیادی صنعتوں کو صوبوں کے دائرۂ اختیار سے نکال کر مرکز کی تحویل میں دیا گیا، وغیرہ وغیرہ۔

چھے سالہ منصوبہ: مئی ۱۹۵۰ء میں کولمبو منصوبے (Plan) کے تحت پاکستان نے چھے سالہ ترقیاتی منصوبہ تیار کیا، جو جولائی ۱۹۵۱ تا جون ۱۹۵۷ء کے عرصے پر حاوی تھا ۔ اس میں لچک رکھی گئی تھی، چنانچہ اس کے آخری دور میں اس کے اندر خاصی ترمیم و توسیع کی

گئی - سرکاری شعبے میں دو ارب ساٹھ کروڑ روپے صرف کرنے کا منصوبہ تھا، لیکن پہلے پانچ سال ہی میں تین ارب روپے صرف ہو چکے تھے۔

کوریا کی جنگ بند ہو جانے سے ایک طرف تو پاکستان کی برآمدات میں کمی واقع ہو گئی، دوسری طرف درآمدات، مثلاً کارخانوں کے لیے مشینوں اور دیگر سامان کی قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا - نتیجۃً اس چھے سالہ منصوبے اور اس کے ضمنی دو سالہ منصوبے پر پوری طرح سے عمل درآمد نہ ہو سکا - بہرحال اس کے بعض اچھے نتائج بھی نکلے اور پہلے پانچ سالوں میں قومی پیداوار میں مجموعی طور پر ۱۴ فیصد سے زائد اضافہ ہوا۔

پہلا پنج سالہ منصوبہ (۱۹۵۵ تا ۱۹۶۰ء): ان تجربات کے بعد حکومت نے پہلا پنج سالہ منصوبہ تیار کیا - اصل یہ ہے کہ پاکستان کی ترقیاتی منصوبہ بندی کی یہ پہلی مربوط اور بھرپور کوشش تھی - اس منصوبے کے اہم مقاصد یہ تھے: (۱) قومی آمدنی میں ۱۵ فیصد اور فی کس آمدنی میں ۷ فیصد اضافہ کرنا؛ (۲) بیس لاکھ نئی اسامیاں پیدا کرنا؛ (۳) غذائی پیداوار میں ۹ فیصد اور دوسری زرعی پیداوار میں ۱۵ سے ۳۳ فیصد تک اضافہ کرنا؛ (۴) صنعتی پیداوار میں ۶۰ فیصد اضافہ کرنا - علاوہ ازیں، برآمدات اور آبپاشی کی سہولتوں میں اضافے، دیہی ترقی، بجلی، ذرائع رسل و رسائل اور سماجی بہبود کے امور کی ترقی کے لیے بھی حدود قائم کی گئیں۔

اس منصوبے کے دوران میں سرکاری شعبے میں تقریباً دس ارب روپے صرف ہونے تھے، جن میں سے ۳ ارب ۲۰ لاکھ مشرقی پاکستان، ۳ ارب ۵۰ کروڑ ۲۰ لاکھ مغربی پاکستان اور ۲ ارب ۳۷ کروڑ ۱۰ لاکھ مرکزی حکومت کے لیے مخصوص کیے گئے تھے - مشرقی پاکستان کی ترقیاتی سکیموں کے لیے مزید ایک ارب روپے کی گنجائش رکھی گئی تھی - دسمبر ۱۹۵۷ء میں اس منصوبے پر نظر ثانی کی گئی جس کی رو سے کل رقم ۱۰ ارب ۸۰ کروڑ منظور کی گئی (ساڑھے سات ارب سرکاری شعبے کے لیے اور باقی رقم نجی شعبے کے لیے) - ۶ ارب ۶۰ کروڑ روپے ملکی وسائل سے اور ۴ ارب ۲۰ کروڑ روپے بیرونی ممالک سے حاصل کرنا تھے۔

اس میں شک نہیں کہ اس پنج سالہ منصوبے پر بہت اچھے طریقے سے عمل درآمد کیا گیا اور اس کے نتائج بھی اچھے نکلے، لیکن منصوبہ بندی کا تصوّر چونکہ ابھی تک ملک کے لیے نیا تھا، اس لیے طویل مدت کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ابھی مؤثر تنظیمی اداروں کو قائم کرنا باقی تھا - دوسرے اس عرصے میں ملک کے سیاسی حالات چونکہ مستحکم نہ تھے، اس لیے حکومت اپنی ان ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے دلجمعی سے کوشش نہ کر سکی - اسی قسم کے عوامل کے باعث اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کچھ فروگزاشتیں بھی ہوئیں - بہرحال ان کوششوں کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ دوسرے پنج سالہ منصوبے کے لیے ایک سازگار ماحول پیدا ہو گیا۔

دوسرا پنج سالہ منصوبہ (۱۹۶۰ تا ۱۹۶۵ء): اس کے اہم مقاصد یہ تھے: (۱) قومی آمدنی میں ۲۴ فی صد اضافہ؛ (۲) اس مدت میں آبادی میں اضافے کا لحاظ رکھتے ہوئے فی کس آمدنی میں ۱۲ فیصد کا اضافہ؛ (۳) زراعت کی تقدیم (priority) اور زرعی پیداوار میں ۲۱ فیصد اضافہ کر کے اناج میں خود کفالت؛ (۴) صنعتی پیداوار میں ۶۰ فیصد اضافہ؛ (۵) زر مبادلہ کی آمدنی میں ۳ فیصد سالانہ کی شرح سے اضافہ۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے ۲۳ ارب روپے

کی رقم تجویز کی گئی (۱۴ ارب ۶۲ کروڑ روپیہ سرکاری و نیم سرکاری شعبے اور ۸ ارب ۳۸ کروڑ نجی شعبے کے لیے؛ سرکاری شعبے کی رقم میں سے ۶ ارب ۳۸ کروڑ روپیہ مشرقی پاکستان کے لیے اور ۸ ارب ۲۵ کروڑ روپیہ مغربی پاکستان کے لیے مخصوص کیا گیا) ۔ علاوہ ازیں دوسرے پنج سالہ منصوبے کے عرصے میں وہ بنیادی انتظامی اصلاحات کی گئیں جو پہلے پنج سالہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری سمجھی گئی تھیں، لیکن ان پر عمل درآمد نہ ہو سکا تھا.

دوسرا پنج سالہ منصوبہ بہت کامیاب ثابت ہوا؛ بعض مقاصد میں تو توقع سے بھی زیادہ کامیابی ہوئی: (۱) مجموعی قومی آمدنی پانچ برس میں ۳۰.۳ فی صد زیادہ ہوئی حالانکہ منصوبے میں اس کی حد ۲۴ فیصد تھی؛ (۲) فی کس آمدنی ۱۳.۸ فی صد بڑھی، جبکہ منصوبے میں میں اس کی حد ۱۲ فی صد رکھی گئی تھی؛ (۳) اناج کی پیداوار میں ۲۷ فیصد کا اضافہ ہوا، بمقابل ۲۱ فیصد کی مطلوبہ حد کے؛ (۴) صنعتی پیداور میں ۶۱.۳ فی صد کا اضافہ ہوا، بمقابل ۶۰ فی صد کی مطلوبہ حد کے؛ (۵) بیرونی زر مبادلہ کی آمدنی میں ۷ فی صد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہوا، بمقابل ۳ فی صد کی مطلوبہ حد کے.

زراعت، صنعت و حرفت، پانی اور بجلی، معدنیات و سوختنیات، ذرائع رسل و رسائل و حمل و نقل، عائلی منصوبہ‌بندی اور سکونتی تعمیرات، تعلیم و تربیت، صحت، سماجی و دیہی بہبود کے اور کے منصوبوں میں بھی خاطر خواہ کامیابی ہوئی.

بیس سالہ تناظری منصوبہ (Perspective Plan) (۱۹۶۵ تا ۱۹۸۵ء): پہلی اور دوسری پنج سالہ منصوبہ‌بندی کی احسن کارکردگی، کامیاب تجربات اور حوصلہ‌افزا نتائج کی بنا پر حکومت نے ۱۹۶۵ء میں بیس سالہ تناظری منصوبہ تیار کیا، جس کے اقتصادی مقاصد یہ ہیں: (۱) قومی آمدنی کو چار گنا بڑھانا، جس سے فی کس آمدنی دگنی سے زیادہ ہو جائے؛ (۲) کل محنت کاروں کے لیے ملازمتیں فراہم کرنا؛ (۳) مشرقی اور مغربی پاکستان کی فی کس آمدنی میں مساوات پیدا کرنا؛ (۴) ملک گیر خواندگی کا حصول اور (۵) ملک کو بیرونی امداد کی ضرورت سے کلیۃً آزاد و بے نیاز کرنا ۔ یہ مقاصد تیسرے پنج سالہ منصوبے سے شروع ہو کر آئندہ پنج سالہ منصوبوں کے ذریعے حاصل کیے جائیں گے.

تیسرا پنج سالہ منصوبہ ۱۹۶۵ تا ۱۹۷۰ء: تیسرا پنج سالہ منصوبہ بیس سالہ تناظری منصوبے کی حدود کے اندر تیار کیا گیا ۔ اس کے لیے ۵۲ ارب روپے کی رقم منظور کی گئی (۳۰ ارب سرکاری شعبے اور ۲۲ ارب نجی شعبے کے لیے؛ سرکاری شعبے کی رقم میں سے ۱۶ ارب مشرقی پاکستان کے لیے اور ۱۴ ارب مغربی پاکستان کے لیے مخصوص کیے گئے ۔ نجی سرمائے کی رقم دونوں صوبوں میں مساوی تقسیم کی گئی) : اس منصوبے کے مقاصد مختصراً یہ تھے: (۱) قومی معیشت کی تیز تر ترقی کا حصول؛ (۲) دونوں صوبوں میں اور ہر صوبے کے اندر مختلف علاقوں میں فی کس آمدنی کا تفاوت دور کرنا؛ (۳) روزگار کی منڈی میں توسیع؛ (۴) ادائی کی صورت حال کے توازن میں استحکام؛ (۵) مصنوعات تیار کرنے کے لیے بنیادی صنعتوں کی ترقی؛ (۶) زرعی ترقی کی رفتار میں اضافہ؛ (۷) افزائش آبادی کو روکنا؛ (۸) بہتر سکونت گاہیں، نیز علاج و معالجہ اور تعلیم کی زیادہ سہولتیں مہیا کرنا؛ (۹) دولت، مواقع اور دیگر مفادات کی زیادہ بہتر تقسیم کو یقینی بنانا؛ (۱۰) بعض مخصوص سماجی مقاصد کی طرف تیزی سے آگے بڑھنا.

اس منصوبے پر بڑی حد تک خوش اسلوبی سے عمل ہو رہا ہے اور اس کے نتائج خاصے حوصلہ افزا نکل رہے ہیں۔

چوتھا پنج سالہ منصوبہ (۱۹۷۱ تا ۱۹۷۵ء): ۲ جون ۱۹۷۰ء کو قومی اقتصادی کونسل نے چوتھے پنج سالہ منصوبے کی قطعی اور آخری منظوری دے دی ہے۔ اس پر یکم جولائی ۱۹۷۰ء سے عمل شروع ہوگا اور اسے ۳۰ جون ۱۹۷۵ء تک مکمل کیا جائے گا۔ اس منصوبے پر ۷۵ ارب (نجی شعبے میں ۲۶ ارب اور سرکاری شعبے میں ۴۹ ارب) روپے کے اخراجات کی منظوری دی گئی ہے، جس میں سے ۲۹ ارب ۴۰ کروڑ روپے مشرقی پاکستان میں اور ۳۵ ارب ۶۰ کروڑ روپے مغربی پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں پر صرف کیے جائیں گے۔ منصوبے پر عملدرآمد سے مشرقی پاکستان کی قومی پیداوار میں ساڑھے سات فی صد اور مغربی پاکستان میں ساڑھے پانچ فی صد اضافہ ہوگا۔ مشرقی پاکستان میں سیلابوں کی روک تھام اور مغربی پاکستان میں سندھ طاس کے پروگرام کے لیے منصوبے کے دائرے سے الگ رقم مختص کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ سر دست ان پروگراموں کے لیے ۱۰ ارب روپے رکھے گئے ہیں۔ سرکاری شعبے کی رقم کا ۶۰ فی صد (۲۹ ارب ۴۰ کروڑ روپیہ) مشرقی پاکستان میں خرچ کیا جائے گا، جس سے ملک کے دونوں حصوں میں فی کس آمدنی کا فرق بڑی حد تک کم ہو جائے گا۔ اسی طرح مغربی پاکستان کے نسبتاً پسماندہ علاقوں کی ترقی پر بھی خصوصی توجہ دی جائے گی۔

امید کی جاتی ہے کہ چوتھے پنج سالہ منصوبے کی قطعی منظوری کے بعد تذبذب کی وہ حالت ختم ہو جائے گی جو ملک کے ترقیاتی پروگرام کے بارے میں پائی جاتی تھی اور ترقیاتی منصوبے کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ملکی و بیرونی وسائل کو بروئے کار لانے کی سخت جد و جہد کی جائے گی۔ منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین نے اس اندیشے کا اظہار کیا ہے کہ منصوبے کے دوران میں تقریباً ساڑھے تین ارب روپے کا مالیاتی خسارہ ہوگا، چنانچہ اسے پورا کرنے کے لیے ایک ٹیکسیشن کمیشن قائم کیا جائے گا، جو تمام وسائل کو یکجا کرنے کے طریقوں پر غور کرے گا، ملک میں ٹیکسیشن کے پورے نظام کا جائزہ لے گا اور منصوبے پر عملدرآمد کے لیے ٹیکسوں کی موجودہ شرح میں اضافے، نیز اضافی ٹیکسوں کے بارے میں بھی اپنی سفارشات پیش کرے گا۔ چوتھے منصوبے کے دوران میں براہ راست ٹیکسوں پر زیادہ انحصار کیا جائے گا، ارتکاز زر کو روکنے کے لیے نئی صنعتی پالیسی نافذ کی جائے گی، اہم صنعتیں سرکاری شعبے کی تحویل میں دے دی جائیں گی اور تجارتی بینکوں کی قرضے دینے کی موجودہ پالیسی کو بدلنے کے لیے مثبت اقدامات کیے جائیں گے تاکہ چھوٹے تاجروں کو فائدہ ہو اور ملک میں ایک درمیانی طبقہ وجود میں آ جائے۔

۷۔ زراعت

پاکستان کی معیشت میں زراعت کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ اس میں کاشتکاری اور باغبانی کے علاوہ حیوانات پروری، ماہی پروری اور جنگل کاری بھی شامل ہے۔ ملک کی ۸۰ فی صد آبادی دیہی علاقوں میں آباد ہے، جس کی گزراوقات کا یہی ذریعہ ہے۔ قومی پیداوار کا نصف اور برآمدات کا تین چوتھائی حصہ زراعت کا مرہون منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں دفاع کے بعد زراعت ہی کو سب شعبوں پر مقدم سمجھا گیا اور اس کی ترقی کے لیے ۴ ارب ۱۱ کروڑ ۵۲ لاکھ ۶۰ ہزار روپے کی رقم منظور کی گئی

(مختلف شعبوں پر خرچ ہونے والی رقوم کے لیے دیکھیے گوشوارہ ، ، در Pakistan Year Book 1969، ص ۱۹۲، ۱۹۳) ۔ اس منصوبے میں مندرجۂ ذیل مقاصد پیش نظر رکھے گئے : (۱) ایک کسان کی حقیقی آمدنی میں اضافے کی شرح ملک کے دوسرے طبقات کی فی کس آمدنی میں اضافے کے مطابق ہو جائے؛ (۲) خوراک کے اعتبار سے ملک کو خود کفیل بنا دیا جائے؛ (۴) زراعت کو منظم کر کے مستحکم بنیادوں پر ترقی دی جائے۔

پاکستان کا کل رقبہ ۲۳ کروڑ ۴۰ لاکھ (مغربی پاکستان: ۱۹ کروڑ ۸۷ لاکھ؛ مشرقی پاکستان: ۳ کروڑ ۵۳ لاکھ) ایکڑ ہے اور اس میں زیر کاشت رقبہ ۱۹۶۶-۱۹۶۷ء میں تقریباً ۶ کروڑ ۳۱ لاکھ (مغربی پاکستان: ۴ کروڑ ۱۴ لاکھ؛ مشرقی پاکستان: ۲ کروڑ ۱۷ لاکھ) ایکڑ تھا۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ زیر کاشت رقبے میں ہر ممکن طریق سے اضافہ کیا جائے۔

مغربی پاکستان میں سیم اور تھور سے اور مشرقی پاکستان میں آئے دن آنے والے سیلابوں سے زمین ناکارہ ہو رہی ہے۔ ان آفتوں کا سد باب کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر بڑی منظم جد و جہد جاری ہے اور اس میں خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ پہلے پنج سالہ منصوبے کے ختم ہونے پر کل زیر کاشت رقبہ ۶ کروڑ ۸ لاکھ ایکڑ تھا۔ دوسرے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں علی الترتیب ۱۸ لاکھ اور ۵۸ لاکھ کا اضافہ ہوا۔ امید ہے کہ تیسرا منصوبہ ختم ہونے پر یہ رقبہ ۱۱ کروڑ ۸۴ لاکھ ایکڑ ہو جائے گا۔

زرعی ترقیات کے لیے حکومت کے کئی ادارے کام کر رہے ہیں۔ زراعت کا شعبہ دراصل صوبائی حکومتوں کی ذمے داری ہے، لیکن منصوبہ بندی، اعداد و شمار کی فراہمی اور بیرونی ممالک سے گفت و شنید مرکزی وزارت زراعت کے سپرد ہے۔ ہر صوبے میں محکمۂ زراعت قائم ہے، جس کا سربراہ حکومت کا سیکرٹری ہوتا ہے اور اس کے ماتحت زراعت کے مختلف شعبوں کے ماہرین کام کرتے ہیں۔ ہر صوبے میں ایک زرعی ترقیاتی کارپوریشن (ADC = Agricultural Development Corporation) بھی قائم کی گئی ہے، جس کا کام یہ ہے کہ کاشتکاروں کو بیج اور کھاد مہیا کرے، ان کی مشکلات کو حل کرنے میں فنی مشورے اور اعانت بہم پہنچائے، زرعی آلات اور مشینیں مستعار دے اور یوں زرعی ترقی کی رفتار کو تیزتر کر دے۔ ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء میں میکسی پاک گندم اور اِرّی چاول کے بیج مہیا کیے گئے، جن کے استعمال سے پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور ۱۹۷۰ء میں ملک اناج کے اعتبار سے خود کفیل ہو گیا۔

مجموعی پیداوار: پاکستان کی بڑی بڑی فصلیں یہ ہیں: چاول، گندم، مکئی، جوار، باجرہ، چنا، گنّا، تیل کے بیج، کپاس، پٹ سن، تمباکو اور چاے۔ بڑی بڑی فصلوں کا زیر کاشت رقبہ، ان کی مجموعی پیداوار اور اس میں بتدریج ترقی مندرجۂ ذیل گوشوارے سے واضح ہوتی ہے:

فصل	زیر کاشت رقبہ (ہزار ایکڑ میں)		سالانہ پیداوار (ہزار ٹن میں)	
	۱۹۵۵-۱۹۶۰ء	۱۹۶۷-۱۹۶۸ء	۱۹۵۵-۱۹۶۰ء	۱۹۶۷-۱۹۶۸ء
چاول	۲۲۷۶۷	۲۷۹۴۵	۸۴۰۹	۱۲۴۷۰
گندم	۱۱۷۴۱	۱۵۳۷۰	۳۶۴۴	۶۲۵۷
باجرہ	۲۰۶۶	۲۲۵۸	۳۲۲	۴۰۷
جوار	۱۱۷۳	۱۴۴۶	۲۲۶	۲۸۶
مکئی	۱۱۰۹	۱۵۱۱	۴۶۴	۷۸۲
جو	۵۵۷	۵۳۴	۱۵۳	۹۹
چنا	۳۱۹۸	۲۹۱۱	۶۷۴	۵۴۶

گنا	۱۱۶۱	۱۶۵۷	۱۳۹۰۵	۲۵۹۵۴
توریا و سرسوں	۱۹۱۹	۱۷۱۳	۳۲۵	۲۸۸
تل	۲۰۶	۱۲۴	۲۲	۳۳
پٹ سن	۱۴۶۶	۲۳۵۴	۱۰۶۳	۱۲۰۰
کپاس	۳۴۹۴	۴۲۸۱	۲۹۴	۴۹۴
چائے	۷۷	۱۰۱	۲۳	۲۹
تمباکو	۱۹۵	۲۷۲	۹۰	۱۰۰
میزان	۵۱۱۲۹	۹۲۴۷۷	۲۹۶۹۵	۴۹۰۵۰

ترقیاتی منصوبے: حکومت کی منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانے میں ملک کے کاشتکار طبقے نے جس جوش سے کام کیا اس سے بڑے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوے ہیں۔ زرعی پیداوار کو بڑھانے کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے جو اقدامات کیے جا رہے ہیں ان میں قابل ذکر یہ ہیں: زراعت کے ترقی یافتہ طریقوں پر عمل اور مشینی زراعت کا آغاز؛ کیمیاوی کھاد کا زیادہ سے زیادہ استعمال؛ زمین کی بحالی؛ بہتر قسم کے بیجوں کی تقسیم؛ پودوں کی حفاظت؛ پودوں کی نگہداشت؛ تربیتی و تحقیقی اداروں کا قیام (تفصیلات کے لیے دیکھیے گوشوارہ ۶، در *Pakistan Year Book 1969*، ص ۲۰۰، ۲۰۱)۔

زراعت کے ترقیاتی منصوبوں پر عملدرآمد کے لیے ماہرین کی بے حد ضرورت ہے، لہٰذا تعلیمی و تربیتی سہولتوں کی اصلاح و توسیع پر بھی زور دیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں تین زرعی کالج اور دو زرعی یونیورسٹیاں ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد تربیتی ادارے بھی قائم ہو چکے ہیں، جہاں زرعی کارکنوں کو تربیت حاصل کرنے کے بعد اسناد ملتی ہیں۔ دوسرے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں زرعی تحقیق پر بھی بہت توجہ دی گئی ہے۔ اس وقت تین مرکزی ادارے موجود ہیں، یعنی زرعی تحقیقاتی کونسل (Agricultural Research Council)، مرکزی کپاس کمیٹی (Pakistan Central Cotton Committee) اور مرکزی پٹسن کمیٹی (Pakistan Central Jute Committee)۔ مؤخرالذکر دونوں کمیٹیاں علی الترتیب کپاس اور پٹسن سے متعلقہ صنعتوں کے سلسلے میں بھی تحقیق کر رہی ہیں۔ صوبائی سطح پر چار تحقیقی ادارے ہیں، جن کے مراکز متعدد مقامات پر قائم ہیں۔ ان کے علاوہ دو (زرعی) ایٹمی تحقیقاتی مرکز بھی کام کر رہے ہیں۔ ان سب اداروں میں کاشت کے جدید ترین طریقوں اور زیادہ سے زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں پر مسلسل تحقیق ہو رہی ہے۔

اراضی کی اصلاح اور پیداوار میں اضافے کی خاطر مشینی زراعت کو مروج کرنے کے لیے بھی حکومت کی مساعی قابل ذکر ہیں۔ کاشتکاروں کو ٹریکٹر، بل ڈوزر، اور دوسری مشینیں اور آلات کرائے پر مہیا کیے جاتے ہیں۔ ۱۹۶۶-۱۹۶۷ء میں مشرقی پاکستان زرعی ترقیاتی کارپوریشن (EPADC) کی طرف سے ۳۹۹۰ نل لگائے گئے، جس سے سوا دو لاکھ ایکڑ اراضی میراب ہوئی اور چودہ ہزار ایکڑ رقبے کو بحال کرنے کے لیے ۹۳ ٹریکٹر استعمال کیے گئے؛ مغربی پاکستان زرعی ترقیاتی کارپوریشن (WPADC) نے ۷۶۰ بل ڈوزر اور ۸۰ ٹریکٹر مہیا کیے، جن کی مدد سے پونے دو لاکھ ایکڑ رقبہ بحال ہوا اور ۶۰ ہزار ایکڑ اراضی میں کاشت ہوئی۔ مغربی پاکستان میں دوسرے پنج سالہ منصوبے کے پہلے دو سالوں میں ۵ ہزار ٹیوب ویل لگائے گئے۔

کاشتکاروں کو اپنی پیداوار کی اچھی قیمت وصول ہو، اس غرض سے مرکزی وزارت زراعت کے ماتحت ایک نظامت Directorate of Marketing and

Agricultural Statistics کام کر رہی ہے۔ صوبائی حکومتوں کے ماتحت بھی اسی قسم کی تنظیمیں قائم ہیں جو منڈیوں کا جائزہ لے کر اجناس کے مناسب نرخ شائع کرتی ہیں اور منڈیوں کے لیے قواعد و ضوابط وضع کر کے نافذ کرتی ہیں۔

ماہی پروری : پاکستان میں ماہی پروری کے وافر وسائل موجود ہیں۔ خلیج بنگال اور بحیرۂ عرب کو بین الاقوامی معیار کے مطابق ماہی گیری کے بہترین علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اندرون ملک میں دریاؤں، جھیلوں اور تالابوں وغیرہ میں بھی ماہی گیری اور ماہی پروری بخوبی ہو سکتی ہے۔ مچھلی ایک اچھی اور متوازن خوراک ہونے کے علاوہ زر مبادلہ حاصل کرنے کا بھی اہم ذریعہ ہے۔ ۱۹۶۶ء میں کل ۴ لاکھ ۱۲ ہزار (سمندر سے ایک لاکھ ۷۰ ہزار اور اندرون ملک سے ۲ لاکھ ۷۲ ہزار) میٹرک ٹن مچھلی حاصل کی گئی (مشرقی پاکستان سے ۲ لاکھ ۹۰ ہزار اور مغربی پاکستان سے ایک لاکھ ۳۰ ہزار میٹرک ٹن)۔ اندازہ ہے کہ تیسرے پنج سالہ منصوبے کے خاتمے پر اس سے ۲۰ کروڑ روپے کا زر مبادلہ کمایا جا سکے گا۔ دونوں صوبائی حکومتوں کے ماتحت ماہی پروری کے محکمے قائم ہیں، جہاں ترقی و توسیع کے پروگرام پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ کارکنوں کو فنی تربیت بھی دی جاتی ہے۔

حیوانات پروری : زراعت کے میدان میں وصول ہونے والی مجموعی رقم کا ۲۰ فی صد حیوانات اور ان سے حاصل کردہ اشیا سے کمایا جاتا ہے۔ ۱۹۶۰ء کی حیوانات شماری کے مطابق ان کی کل تعداد مندرجۂ ذیل تھی :- گائیں : ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ؛ بھینسیں : ۸۴ لاکھ؛ بکریاں : ایک کروڑ ۹۲ لاکھ؛ بھیڑیں : ایک کروڑ ۲ لاکھ؛ مرغیاں : ۳ کروڑ ایک لاکھ؛ گھوڑے : ۴ لاکھ ۹۷ ہزار؛ گدھے : ۹ لاکھ ۲۵ ہزار؛ خچر : ۴۱ ہزار؛ اونٹ : ۹ لاکھ۔ ۱۹۶۶-۱۹۶۷ء میں ۲ کروڑ ۶۰ لاکھ پونڈ اون، ۸۰ لاکھ پونڈ پشم اور ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ کھالیں حاصل ہوئیں اور اون سے ۳ کروڑ ۱۵ لاکھ روپے، پشم سے ایک کروڑ ۲ لاکھ روپے اور کھالوں سے ایک کروڑ روپے کا زر مبادلہ کمایا گیا۔ صوبوں میں پرورش و معالجۂ حیوانات کے محکمے قائم ہیں، جن کی نگرانی میں مویشیوں کی صحت کی دیکھ بھال اور ان کی نسل کی اصلاح و افزائش کے سلسلے میں قابل تعریف کام ہو رہا ہے۔

جنگل کاری : پاکستان میں جنگلات کا رقبہ ایک کروڑ ایکڑ سے بھی کم ہے۔ یہ مجموعی رقبے کا صرف ساڑھے چار فی صد ہے اور اس میں بھی صرف نصف رقبے سے تعمیراتی یا سوختنی لکڑی حاصل ہوتی ہے اور باقی حصہ بے کار جھاڑیوں اور بوٹیوں سے اٹا پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں جنگلات کی پیداوار ناکافی ہے اور لکڑی غیر ممالک سے منگوانا پڑتی ہے۔ ۱۹۶۶-۱۹۶۷ء میں ساڑھے چار کروڑ روپے کی لکڑی درآمد کی گئی۔ حکومت اب اس شعبے کی ترقی پر بھی توجہ مبذول کر رہی ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ جدید ترین طریقوں کو کام میں لا کر نہ صرف جنگلات کے موجودہ رقبے کو ترقی دی جائے بلکہ اس میں توسیع بھی کی جائے۔ محکمۂ جنگلات کی طرف سے ملک کے دونوں حصوں میں فنی تربیت اور تحقیقات کا انتظام کیا گیا ہے۔

زرعی قرضے : قبل ازیں کاشتکار اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے عموماً مہاجنوں سے قرض لیتے اور سود در سود کے چکر میں پھنس کر اپنی املاک سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ اب نہ صرف تجارتی بینکوں سے انھیں مناسب اور آسان شرائط پر قرضے حاصل

کرنے کی سہولتیں میسر ہیں، بلکہ حکومت نے بھی اس سلسلے میں مفید اقدامات کیے ہیں، مثلاً (۱) تقاوی قرضے، جو براہ راست صوبائی حکومت کی طرف سے ضلعی انتظامیہ کے ذریعے کاشتکاروں کو دیے جاتے ہیں۔ ۱۹۶۶-۱۹۶۷ء میں مشرقی پاکستان میں ایک کروڑ ۹۰ لاکھ اور مغربی پاکستان میں ۹۶ لاکھ روپے کے تقاوی قرضے دیے گئے؛ (۲) تحریک امداد باہمی کے ماتحت جگہ جگہ امداد باہمی کی انجمنیں قائم کی گئی ہیں، جو اپنے ارکان کو بوقت ضرورت قرض دیتی ہیں؛ (۳) زرعی ترقیاتی بینک: ۱۹۶۱ء میں زرعی ترقیاتی مالیاتی کارپوریشن (Agricultural Development Financial Corporation) اور ۱۹۶۷ء میں پاکستان زرعی ترقیاتی بینک (Agricultural Development Bank of Pakistan=ADBP) کا قیام عمل میں آیا۔ اس بینک کی ۱۲۱ شاخیں ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۷ء میں ان سے کل ۲ کروڑ ۷۵ لاکھ روپے کے قرضے دیے گئے۔

۸۔ صنعت و حرفت

آزادی کے وقت پاکستان کی آبادی برصغیر کی کل آبادی کا ۲۰ فی صد تھی، لیکن اسے صنعت میں صرف ۷ فی صد حصہ ملا، یعنی صرف ۳۴ کارخانے۔ صنعت کے میدان میں اس کی محرومی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان پٹ سن کا گھر ہے، لیکن یہاں پٹ سن کا ایک کارخانہ بھی موجود نہ تھا۔ جو کارخانے اس کے حصے میں آئے وہ نسبۃً چھوٹے تھے اور معمولی قسم کی ضروریات پوری کرتے تھے، مثلاً شکر سازی کے چند چھوٹے چھوٹے کارخانے، پھلوں کا رس بنانے اور پھلوں کو ٹین میں بند کرنے کا ایک چھوٹا کارخانہ، دھان اور آٹے کی چند چکیاں، دو بسکٹ فیکٹریاں، دو شراب سازی کے کارخانے، بناسپتی گھی بنانے کا ایک کارخانہ، کھیوڑے میں نمک کی کانیں، سلہٹ میں چائے کی صنعت، اٹک میں تیل کا ایک چھوٹا سا زمین دوز ذخیرہ اور اسے صاف کرنے کا کارخانہ، پانچ سیمنٹ کے کارخانے، نصف درجن کے قریب انجینئری کے ورکشاپ، چند ایک فولاد سے چیزیں بنانے کے چھوٹے کارخانے، ایک دیا سلائی کا کارخانہ، چند ایک شیشہ سازی کے چھوٹے کارخانے۔

آزادی کے فوراً بعد صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے لیے حکومت نے واضح اصول مرتب کیے، مثلاً (۱) ایسی صنعتوں کو مقدم سمجھا جائے جن میں اپنے ہی ملک میں پیدا ہونے والا خام مال استعمال ہوتا ہے، یعنی پٹ سن، کپاس، کھالیں وغیرہ؛ (۲) بعض شرائط کے ماتحت نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی جائے؛ (۳) بنیادی ضروریات عامہ سے تعلق رکھنے والی صنعتوں کی سرکاری ملکیت؛ (۴) درآمدات میں کمی کرنے کی غرض سے اشیاے صارفین کی صنعتوں کی ترقی؛ (۵) طویل المیعاد مقاصد کے تحت بھاری صنعتوں کی منصوبہ بندی؛ (۶) مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی ذمے داریوں کی تقسیم و تعیین۔ ان اصولوں پر عمل کرتے ہوے چند اہم اقدامات کیے گئے، مثلاً ترقیاتی بورڈ Development Board (۱۹۴۸ء)، پاکستان صنعتی مالیاتی کارپوریشن (Pakistan Industrial Financial Corporation)، جس کی جگہ آگے چل کر صنعتی ترقیاتی بینک پاکستان (Industrial Development Bank of Pakistan) نے لے لی؛ صنعتی سرمایہ کاری و اعتباری کارپوریشن Industrial Investment and Credit Corporation (۱۹۴۹ء)؛ ٹیرف کمیشن Tariff Commission (۱۹۵۰ء)؛ چھ سالہ منصوبہ (۱۹۵۱ء)؛ صنعتی ترقیاتی کارپوریشن Industrial Development Corporation؛ گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کی نظامت (Directorate of Cottage (and Small Industries اور بحالیات مہاجرین مالیاتی کارپوریشن Refugees Rehabilitation Finance Corporation (۱۹۵۰ء) اور پہلا پنج سالہ منصوبہ (۱۹۵۵-۱۹۶۰ء)۔ صنعتی پالیسی کو وضع کرتے وقت جو اہم ترین مقاصد پیش نظر رکھے گئے وہ یہ تھے: (۱) نجی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی جائے؛ (۲) بیرونی سرمایہ داروں کو پاکستان میں سرمایہ لگانے کی ترغیب دی جائے؛ (۳) فنی تربیت کا اہتمام کیا جائے؛ (۴) ملکی خام مال کی زیادہ سے زیادہ کھپت کی خاطر زرعی پیداوار پر مبنی صنعتوں پر زور دیا جائے؛ (۵) پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لیے نئی صنعتیں وہاں لگائی جائیں؛ (۶) گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کو ترقی دی جائے۔

ان مقاصد کے حصول کی خاطر مقامی سرمایہ کاروں کو ٹیکس میں کئی مراعات دی گئیں، جن میں ایک مدت کے لیے چھوٹ بھی شامل تھی۔ بیرونی سرمایہ کاروں کو متعدد مراعات اور تحفظات دیے گئے۔ تجارتی پالیسی صنعتی ترقی کو ملحوظ رکھتے ہوئے وضع کی گئی۔ بیرونی ممالک سے امداد اور قرضوں کا اہتمام کیا گیا۔ ملک کے مختلف حصوں میں صنعتی رقبے (Industrial Estates) مخصوص کیے گئے۔ برآمدات میں اضافہ کرنے کے لیے سر توڑ کوششیں کی گئیں اور صنعتی کارکنوں کے لیے فنی تربیت اور تحقیق کے انتظامات میں توسیع و ترقی کی گئی۔ اس کے نہایت حوصلہ افزا نتائج دوسرے پنج سالہ منصوبے (۱۹۶۰ تا ۱۹۶۵ء) کے دوران میں برآمد ہوئے۔ صنعتی استعداد میں بہت وسعت پیدا ہوئی، صنعتی پیداوار میں ساٹھ فی صد کا اضافہ ہوا، اور اشیاے صارفین کی بہت بڑی تعداد میں ملک خود کفیل ہو گیا۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں بھی دوسرے پنج سالہ منصوبے کی حکمت عملی اور اصولوں پر عمل ہوتا رہا۔ نجی شعبے کے لیے ۸ ارب ۴۰ کروڑ روپے اور سرکاری شعبے میں ۳ ارب ۱۵ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ اشیاے صارفین کے بجاے اشیاے سرمایہ (capital goods) پر زیادہ زور دیا گیا اور صنعتیں زیادہ تر برآمدات کے لیے قائم کی گئیں۔ صنعتی خام مواد کی درآمد کے لیے ہر سال زر مبادلہ کی بڑی مقدار مخصوص کی جاتی ہے۔ برآمدی بونس سکیم اور برآمدات کی بنا پر درآمدی لائسنس جاری کرنے کی سکیم سے صنعت کاروں کو بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں ٹیرف کمیشن کی رپورٹ کے مطابق بعض صنعتوں کو ضروری تحفظات دیے گئے ہیں، جن میں پنسلین، فولاد اور شیشے کی صنعتیں قابل ذکر ہیں۔ نرخوں میں استحکام کے لیے بھی ایک بورڈ (The Price Stabilization Board) کام کر رہا ہے۔ مخصوص صنعتی علاقوں کو حمل و نقل، رسل و رسائل اور پانی اور بجلی کی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء تک دو بڑے اور ۱۲ چھوٹے صنعتی علاقے قائم ہو چکے تھے اور ۱۶ بڑے اور ۲۲ چھوٹے صنعتی علاقے دونوں صوبوں میں موزوں مقامات پر قائم کیے جا رہے تھے۔ ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پندرہ برس کے عرصے میں مجموعی قومی پیداوار میں صنعتوں کا حصہ تقریباً تین گنا زیادہ ہو گیا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اگلے بیس سالوں میں اس میں پھر اتنا ہی اضافہ ہو گا۔ پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن (PIDC) کے قیام کی غرض و غایت یہ تھی کہ ان بڑی بڑی صنعتوں کو ترقی دی جائے جنھیں عام سرمایہ کار یا تو چلانے کے قابل نہ تھے یا ان کے چلانے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس مقصد کی خاطر پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی۔ ایکٹ ۱۹۵۰ء کی جدول میں پندرہ صنعتوں کا نام لیا گیا۔ اس کارپوریشن کا مقصد نجی سرمایہ کاری کی جگہ لینا نہیں تھا بلکہ

اس میں اضافہ کرتا تھا اور یہ ملکیت پر نہیں، ترقی پر زور دیتی تھی۔

جون ۱۹۶۲ء تک پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی پچپن صنعتی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا چکی تھی۔ اس کے بعد اسے تقسیم کر دیا گیا اور دونوں صوبوں میں علیحدہ علیحدہ کارپوریشنیں کام کرنے لگیں۔ مشرقی پاکستان کی کارپوریشن (EPIDC) صوبے کی عام صنعتی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کر رہی ہے، کیونکہ وہاں نجی سرمایہ کاری بہت محدود ہے۔ ۱۹۶۲ سے ۱۹۶۷ء تک اس نے تیس صنعتوں میں ساڑھے تراسی کروڑ کا سرمایہ لگایا۔ ۱۹۶۶-۱۹۶۷ء میں چوالیس صنعتی منصوبے زیر تکمیل تھے، جن میں چٹاگانگ کے اولاد کے کارخانے میں توسیع، کیمیائی کھاد تیار کرنے کے چار کارخانوں اور مشینی پرزے بنانے کے ایک کارخانے کا قیام شامل تھا۔ علاوہ ازیں تیسرے منصوبے میں یہ بھی طے کیا گیا تھا کہ پٹ سن کے پچیس کارخانے لگائے جائیں گے۔ مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن نوے کروڑ روپے کی لاگت سے انچاس منصوبے مکمل کر چکی ہے اور ایک ارب سے زیادہ کی مالیت کے انیس منصوبے زیر تکمیل ہیں۔ تقریباً تین ارب روپے کے انتیس منصوبوں کی تجویز پیش کی جا چکی ہے۔ لانڈھی میں پرزے بنانے کا کارخانہ اور ٹیکسلا میں بھاری مشینیں تیار کرنے کا عظیم الشان کارخانہ تیزی سے مکمل ہو رہا ہے۔ مکمل منصوبوں میں سے انیس کو صنعتکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ تیس کارخانے کارپوریشن چلا رہی ہے، جن میں پچیس ہزار سے زیادہ افراد کام کر رہے ہیں اور ان سے پینتیس کروڑ روپے کا مال سالانہ تیار ہوتا ہے۔ زیر تکمیل کارخانوں میں تقریباً چالیس کروڑ روپیہ کا مال تیار ہو گا۔ مغربی پاکستان کی وحدت ٹوٹ جانے کے بعد بھی ڈبلیو۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی ایک خود اختیار ادارے کی حیثیت سے بدستور کام کرتی رہے گی اور اس کی انتظامیہ نئے صوبوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو گی۔

چوتھے پنج سالہ منصوبے میں بھی صنعت و حرفت کی ترقی پر خاصا زور دیا گیا ہے اور توقع ہے کہ ملکی وسائل اور بیرونی امداد سے کئی ضروری منصوبے مکمل ہو جائیں گے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ صدر پاکستان نے جون ۱۹۷۰ء میں روس کا دورہ کیا اور حکومت روس اس امر پر آمادہ ہو گئی ہے کہ چوتھے پنج سالہ منصوبے کے تحت کراچی میں فولاد کا کارخانہ قائم کرنے کے لیے بیس کروڑ ڈالر کا قرضہ دے گی۔

صنعت و حرفت کے فروغ کے لیے سرمایہ مہیا کرنے کے لیے ملک میں بڑے ادارے یہ ہیں: صنعتی ترقیاتی بینک (IDBP)، صنعتی اعتباری و سرمایہ کاری کارپوریشن (PICIC)؛ چھوٹی صنعتوں کی کارپوریشن، مغربی پاکستان (West Pakistan Small Industries Corporation = WPSIC) اور چھوٹی صنعتوں کی کارپوریشن مشرقی پاکستان (East Pakistan Small Industries Corporation = EPSIC)۔

پی۔ آئی۔ سی۔ آئی۔ سی (قائم شدہ ۱۹۵۷ء) بڑی صنعتوں کو غیر ملکی کرنسی میں قرضے دیتی ہے۔ قرضے کی حد مشرقی پاکستان میں دس لاکھ اور مغربی پاکستان میں پندرہ لاکھ روپے تک ہے۔ ۱۹۶۸ء تک اس نے ۵۹۲ منصوبوں کے لیے ایک ارب ۳۷ کروڑ ۱۷ لاکھ روپے کے قرضے جاری کیے؛ تیرہ منصوبوں کے لیے تقریباً اٹھائیس کروڑ روپے کے غیر ملکی سرمائے کا بندوبست کیا؛ اشتراک کی بنیاد پر بائیس منصوبے مکمل ہوئے، جن میں ۸ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کا غیر ملکی نجی سرمایہ لگایا گیا؛ علاوہ ازیں اس نے مختلف صورتوں میں

۸ کروڑ روپے سے اعانت کی۔ ۳۰ مارچ ۱۹۶۸ء تک اس نے ایک ارب ۸۲ کروڑ ۷۳ لاکھ روپیہ دیا۔

آئی۔ ڈی۔ بی۔ پی (قائم شدہ ۱۹۶۱ء) درمیانے درجے کی اور چھوٹی صنعتوں کے لیے لمبی اور درمیانی مدت کے لیے قرضے مہیا کرتی ہے۔ قرضے کی حد پچیس لاکھ روپے تک ہے۔ زر مبادلہ کی حد حال ہی میں پندرہ سے بڑھا کر بیس لاکھ روپے کر دی گئی ہے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۶۸ء تک اس بینک سے ایک ارب ۵۰ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے کے قرضے جاری ہوئے (مشرقی پاکستان کے لیے ۷۱ کروڑ ۳۲ لاکھ)۔ ان میں سے ایک ارب ۱۷ کروڑ کے قرضے غیر ملکی کرنسی میں تھے۔

ڈبلیو۔ پی۔ ایس۔ آئی۔ سی (قائم شدہ ۱۹۶۰ء) اور ای۔ پی۔ ایس۔ آئی۔ سی۔ (قائم شدہ ۱۹۵۷ء) نجی شعبے میں چھوٹی صنعتوں کی مالی اعانت کرتی ہیں۔

۱۹۶۲ء میں قومی سرمایہ کاری ٹرسٹ (NIT = National Investment Trust) اور ۱۹۶۶ء میں ادارۂ سرمایہ کاری، پاکستان (ICP = The Investment Corporation of Pakistan) کے قیام سے عوام کو اپنی بچت کا روپیہ قومی صنعت میں لگانے کا موقع مل گیا ہے۔

محکمۂ ترقی سرمایہ کاری (Investment Promotion Department) مرکزی وزارت صنعت سے ملحق ہے۔ یہ لوگوں کو صنعتی سرمایہ کاری کے سلسلے مستند معلومات اور مفید مشورے بہم پہنچاتا ہے اور نئی صنعتوں کے قیام، ان کے لیے حکومت کی منظوری اور غیر ملکی سرمائے کی فراہمی، اراضی، حمل و نقل اور پانی اور بجلی کی سہولتوں، نیز خام مواد، فنی امداد اور درآمدی لائسنسوں، کے حصول میں مدد دیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ محکمہ صنعت کاروں کی رہنمائی کے لیے صنعتوں اور ملکی و غیر ملکی سرمایہ کاری کے گوشوارے بھی تیار کرتا ہے۔ اس کے ایک جامع گوشوارے میں دو سو صنعتوں کی فہرست دی گئی ہے، جن پر تیسرے پنج سالہ منصوبے کے لیے تخمیناً ۱۰ ارب ۸۸ کروڑ پچاس لاکھ روپے کا سرمایہ لگایا گیا۔

دوسرے قابل ذکر ادارے حسب ذیل ہیں: سرمایہ کاری مشاورتی مرکز (Investment Advisory Centre of Pakistan)، پاکستان سائنسی و صنعتی تحقیقاتی کونسل (Pakistan Council of Scientific and Industrial Research)، مرکزی آزمائشی تجربہ گاہیں (Central Testing Laboratories)، پیٹنٹ آفس Patent Office، صنعتی تکنیکی امداد کا مرکز (PITAC = Pakistan Technical Assistance Centre)، سویڈش۔ پاکستانی انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی Swedish - Pakistan Institute of Technology.

صنعتی پیداوار: پاکستان میں صنعت و حرفت نے گزشتہ چند برس میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ قیام پاکستان کے وقت یہ بالکل ابتدائی حالت میں تھی، لیکن اس نے پہلے پندرہ برس میں قومی پیداوار میں ساڑھے گیارہ فی صد کا اضافہ کیا۔ ۱۹۵۵ء کے بعد اس کی ترقی کی رفتار بہت بڑھ گئی ہے اور قومی پیداوار میں ساٹھ فی صد سے زائد اضافہ ہوا ہے اور ملک متعدد اشیائے صرف اور اشیائے سرمایہ میں خود کفیل ہو گیا ہے۔

پاکستان کی اس ترقی کا سرسری جائزہ لینے کے لیے اس کی موجودہ بڑی بڑی صنعتوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

سوتی کپڑے کی صنعت: یہ پاکستان کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ مجموعی قومی پیداوار کا تیس فی صد اس سے حاصل ہوتا ہے۔ دو لاکھ افراد کا روزگار اس سے وابستہ ہے۔ علاوہ ازیں اس سے بھاری مقدار میں زر مبادلہ بھی کمایا جاتا ہے۔ ۱۹۶۳-

۱۹۶۵ء میں کھڈیوں کی تعداد پینتیس ہزار اور تکلوں کی ۲۵ لاکھ ۶۰ ہزار تھی ۔ ۱۹۷۰ء کے آخر تک ان میں معتدبہ اضافہ ہو جائے گا (۷۰ ہزار کھڈیاں اور ۴۰ لاکھ تکلے) ۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں پچاس کروڑ پونڈ دھاگا تیار ہوا ۔ ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء میں اس کی مقدار تقریباً پچپن کروڑ پونڈ تک پہنچ گئی اور ۲۸ کروڑ ۲۸ لاکھ ۵۰ ہزار روپے کا کپڑا اور دھاگا برآمد ہوا۔

پٹ سن کی صنعت : پٹ سن ایک نہایت ہی کارآمد چیز ہے اور اپنی مضبوطی اور گوناگوں فوائد کے باوجود ارزاں ترین اشیا میں سے ہے ۔ اس کا بدل پیدا کرنے کی کوشش ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکی اور دنیا میں اس کی مانگ بدستور بڑھ رہی ہے ۔ پاکستان اگرچہ دنیا میں سب سے زیادہ پٹ سن پیدا کرنے والا ملک ہے، لیکن آزادی کے وقت ملک میں ایک کارخانہ بھی نہ تھا؛ تاہم اب مشرقی پاکستان میں پٹ سن کے بائیس کارخانے ہیں اور مزید گیارہ زیر تعمیر ہیں ۔ ۱۹۷۰ء کے آخر تک کھڈیوں کی کل تعداد ۲۳۶۱۹ ہو جائے گی، جن سے آٹھ لاکھ ٹن سال تیار ہوگا ۔ یہ پاکستان کی اہم ترین برآمد ہے ۔ ۱۹۶۹-۱۹۷۰ء میں ۶۳ کروڑ ۲۹ لاکھ روپے کی برآمد ہوئی۔

جنگلات سے متعلق صنعتیں : جہاں تک جنگلات کا تعلق ہے، ملک کے وسائل، خصوصاً مغربی پاکستان میں محدود ہیں، لیکن جو وسائل بھی ہیں ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے؛ چنانچہ عمارتی لکڑی کے رتباؤ (seasoning) اور تحفظ، نیز آرہ کشی کی مشینیں، پلائی وڈ، گتہ اور کاغذ سازی کی صنعتیں قائم کی جا رہی ہیں ۔ اس وقت اٹھاون ہزار ٹن لکڑی تیار کرنے (processing)، پندرہ لاکھ مربع فٹ پلائی وڈ اور چائے کی سات لاکھ پیٹیاں بنانے کا انتظام ہے۔ مغربی پاکستان میں حویلیاں کے مقام پر پندرہ لاکھ مکعب فٹ اور پیرانوالہ میں چالیس ہزار مکعب فٹ شیشم کی لکڑی کا رتباؤ اور تیاری کا اہتمام ہوتا ہے ۔ کاک سازی کی صنعت کا بھی آغاز ہو چکا ہے اور بید اور بانس پر منحصر صنعتوں کو بھی ترقی دی جا رہی ہے ۔ ۱۹۴۴ء میں بر صغیر میں ایک لاکھ ٹن کاغذ مشین سے تیار کیا جاتا ہے، لیکن آزادی کے وقت پاکستانی علاقے (جہلم اور سیالکوٹ) میں کاغذ فقط ہاتھ سے تیار ہوتا تھا ۔ سات برس کے اندر ملک نے مشین سے کاغذ بنانا شروع کر دیا اور ۱۹۴۷ء کے صفر کے مقابلے میں موجودہ کاغذ سازی کی صلاحیت ۱۹۶۴-۱۹۶۵ء تک ایک لاکھ تین ہزار ٹن سالانہ تک ترقی کر چکی تھی، جو امید ہے تیسرے پنج سالہ منصوبے کے اختتام پر تین لاکھ ٹن ہو جائے گی ۔ کاغذ اب ملیشیا، ہانگ کانگ، ویتنام، سنگا پور، سیلون، برما، تھائی لینڈ اور بعض دوسرے ملکوں کو برآمد کیا جاتا ہے، جس سے ۱۹۶۵ء میں پچھتر لاکھ روپے کا زر مبادلہ حاصل ہوا تھا ۔ ملک میں کاغذ سازی کے مندرجۂ ذیل کارخانے ہیں : کرنافلی پیپر مل، جو ۱۹۵۳ء میں قائم ہوئی، مختلف قسم کا کاغذ تینتیس ہزار ٹن سالانہ پیدا کرتی ہے ۔ ۱۹۵۹ء میں کھلنا میں اخباری کاغذ کا کارخانہ قائم ہوا ۔ اس میں گتہ سازی کی کلیں بھی لگائی گئی ہیں ۔ اس کی پیداواری صلاحیت پچپن ہزار ٹن تک بڑھا دی گئی ہے ۔ نارتھ بنگال پیپر ملز، جو ساڑھے سولہ ہزار ٹن اعلیٰ قسم کا کاغذ تیار کرے گی ۔ مغربی پاکستان میں نوشہرے کے مقام پر اعلیٰ درجے کا گتہ بنانے کا ایک کارخانہ قائم کیا گیا ہے اور اس کی پیداواری صلاحیت ساڑھے سات ہزار ٹن سالانہ ہے ۔ راہوالی (ضلع گوجرانوالہ) کے کارخانے میں یومیہ تیس ٹن گتہ اور کاغذ تیار کرنے کی صلاحیت ہے ۔ حال ہی

میں لاہور میں بھی اعلیٰ قسم کا کاغذ بنانے کا کارخانہ قائم کیا گیا ہے۔

سیمنٹ: سیمنٹ ان صنعتوں میں سے ہے جن کا خام مواد پاکستان میں پایا جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اس کی پیداوار تین لاکھ ٹن سالانہ تھی۔ ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء میں ملک میں سیمنٹ کے نو کارخانے تھے، جن کی سالانہ پیداوار چوبیس لاکھ ٹن تھی۔ حیدرآباد کی زیل پاک فیکٹری کی مزید دو بھٹیاں چلنے کے بعد اس کی پیداوار ۱۹۷۰ء میں ۴ لاکھ ۸۰ ہزار سے بڑھ کر ۱۰ لاکھ ۸۰ ہزار تک پہنچ رہی ہے۔ ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء میں داؤد خیل کی سفید سیمنٹ کی فیکٹری قائم ہوئی اور پندرہ ہزار ٹن سالانہ سیمنٹ تیار ہونے لگا۔ روہڑی اور واہ کے کارخانوں میں توسیع کے بعد یہاں کی پیداوار علی الترتیب ۴ لاکھ ۷۰ ہزار ٹن اور ۳ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن تک پہنچ گئی ہے۔ چاٹگانگ کی کھنکور (clink) پینٹ کی فیکٹری کی پیداواری صلاحیت تین لاکھ ٹن اور آسام بنگال سیمنٹ فیکٹری کی ڈھائی لاکھ ٹن ہے۔

چمڑا اور چمڑے کی مصنوعات: پاکستان میں کھالوں کی سالانہ پیداوار تخمیناً ایک کروڑ ۶۰ لاکھ ہے، جن کی قیمت ساڑھے تیرہ کروڑ روپے ہوتی ہے۔ ان میں سے تقریباً ساٹھ لاکھ کھالوں کی پاکستان میں دباغت کی جاتی ہے اور بقیہ کھالوں کو خام مال کے طور پر برآمد کیا جاتا ہے اور اس سے زر مبادلہ کی اچھی خاصی رقم حاصل ہوتی ہے۔ اس وقت دباغت کے چھوٹے بڑے اسی سے زائد کارخانے ہیں اور گھریلو کارخانے تو ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ جوتوں کا بالائی چمڑا پیدا کرنے کی صلاحیت چار کروڑ مربع فٹ اور تلے کا چمڑا پیدا کرنے کی صلاحیت تین کروڑ مربع فٹ ہے۔ اس سے ملک کی مانگ پوری ہو جاتی ہے۔ ۱۹۶۴-۱۹۶۵ء میں ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کا چمڑا اور چمڑے کی مصنوعات برآمد کی گئی تھیں۔ توقع ہے کہ ۱۹۷۰ء کے آخر تک برآمدی چمڑے کی مالیت چھے کروڑ روپے ہو جائے گی۔

کیمیائی اشیا اور ادویات: کالا شاہ کاکو (پنجاب) اور چندرگونا (مشرقی پاکستان) میں کیمیائی اشیا تیار کرنے کے عظیم الشان کارخانے قائم ہو چکے ہیں۔ اول الذکر میں کیڑے مارنے کی دوائیں، کاسٹک سوڈا، ریان کا تاگا، اور بنولے کا تیل اور آخر الذکر میں ریان کا تاگا اور سامان باندھنے کا شفاف کاغذ تیار ہوتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے آخر تک ایک لاکھ ۲۷ ہزار ٹن سجی اور نوے ہزار ٹن سوڈا کاسٹک تیار ہونے کی امید ہے۔

۱۹۶۰ء تک تقریباً ساٹھ لاکھ روپے سالانہ کی ادویات درآمد کی جاتی تھیں اور ملک میں پنسلین تیار کرنے کے کارخانے سے قطع نظر دوا سازی کی صنعت کا فقدان تھا؛ لیکن اب دوا سازی کی صنعت کو فروغ دیا جا رہا ہے اور مختلف کارخانے لگائے جا رہے ہیں۔ ملیریا کش دوائیاں تیار کرنے کا ایک بہت بڑا کارخانہ ایک برطانوی فرم کی شراکت میں قائم کیا جا رہا ہے۔ ڈھاکے میں سٹرپٹومائی سین کی فیکٹری کی سالانہ پیداواری صلاحیت بیس ٹن ہے۔ چاٹگانگ میں ڈی۔ ڈی۔ ٹی کی دو فیکٹریاں کام کر رہی ہیں۔ کراچی دواسازی کی صنعت کا مرکز بن رہا ہے اور یہاں مزید کارخانے قائم کرنے کا منصوبہ زیر تکمیل ہے۔

کیمیائی کھاد: پاکستان ان ممالک میں سے ہے جہاں پیداوار فی ایکڑ سب سے کم ہے، اس لیے اسے کیمیائی کھاد کی بہت زیادہ ضرورت ہے؛ چنانچہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی نے کیمیائی کھاد کے دو کارخانے قائم کیے: ایک داؤد خیل میں اور دوسرا لائل پور میں؛

ان کے علاوہ گھوڑا شال (Ghorashal ؟)، چٹاگانگ، فنچوگنج، ملتان، ڈاھرکی (Daharki)، اور کراچی کے کارخانوں میں بھی مختلف قسم کی لاکھوں ٹن کھادیں تیار ہو رہی ہیں ۔ امید ہے چوتھے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں ملک اس شعبے میں خود کفیل ہو جائے گا۔

ٹیلی ویژن سیٹ: ٹیلی ویژن سیٹ کے پرزے تیار کرنے اور جوڑنے کے لیے ملک کے دونوں حصوں میں نو فیکٹریاں قائم ہو رہی ہیں، جو شروع میں ۳۰ فی صد اجزا تیار کریں گی اور تین سال کے اندر اندر ۷۰ فی صد اجزا تیار ہونے لگیں گے۔

شکر: آزادی کے وقت پاکستان میں شکر سازی کے کل سات کارخانے تھے، جن میں سے دو مغربی پاکستان میں اور پانچ مشرقی پاکستان میں تھے ۔ ان میں ساڑھے سات کروڑ کی آبادی کے لیے صرف تیس ہزار ٹن چینی تیار ہوتی تھی، لہٰذا اسے بھاری مقدار میں درآمد کیا جاتا تھا ۔ پی ۔ آئی ۔ ڈی ۔ سی نے شروع میں شکر سازی کے پانچ کارخانے قائم کیے: جوہر آباد اور چارسدہ شوگر ملز مغربی پاکستان میں اور رنگپور، ٹھاکر گاؤں اور زیل ۔ پاک شوگر ملز مشرقی پاکستان میں ۔ ۱۹۷۰ء میں شکر کے کارخانوں کی تعداد تینتیس ہو چکی ہے ۔ مشرقی پاکستان میں نو مزید کارخانے لگائے جا رہے ہیں ۔ مغربی پاکستان میں ایک کارخانہ بنوں اور دوسرا چشتیاں میں زیر تکمیل ہے مشرقی پاکستان میں ایک لاکھ ۸۷ ہزار ٹن اور مغربی پاکستان میں ۳ لاکھ ۹۵ ہزار ٹن، یعنی مجموعی طور پر ۵ لاکھ ۸۲ ہزار ٹن شکر تیار ہو رہی ہے ۔

پھل اور سبزیوں کے ذخائر کو محفوظ رکھنے کی صنعت: اس وقت دو سو سے زائد کارخانے زیادہ تر چھوٹے پیمانے پر کام کر رہے ہیں، جن میں مجموعی طور پر ۱۰۲۹۸ ٹن ذخیرہ کیا جا سکتا ہے ۔ امید ہے کہ ۱۹۷۰ء میں ان کی برآمد سے حاصل ہونے والا زرمبادلہ چالیس لاکھ سے بڑھ کر ایک کروڑ روپے ہو جائے گا۔

مچھلیوں کو ڈبوں میں بند کرنے کی صنعت: یہ ایک فروغ پذیر صنعت ہے ۔ مچھلی کی برآمدات سے ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء میں آٹھ کروڑ روپے کا زرمبادلہ حاصل ہوا تھا ۔ مچھلی کا تیل بھی اب تجارتی پیمانے پر تیار ہو رہا ہے ۔ اس صنعت کو مزید ترقی دینے کے لیے چٹاگانگ کے علاوہ کراچی اور گوادر میں ماہی گیری کی بندرگاہیں بنائی جا رہی ہیں ۔

(ج) تمباکو: سگرٹ سازی میں ملک خود کفیل ہو چکا ہے ۔ ۱۹۶۴-۱۹۶۵ء میں تقریباً بیس ارب سگرٹ تیار ہوتے تھے ۔ ۱۹۷۰ء کے آخر میں یہ تعداد دگنی ہو جائے گی۔

(ہ) آلات جرّاحی و دیگر سامان: آلات جرّاحی اور مصنوعی اعضا تیار کرنے کا مرکز سیالکوٹ (پنجاب) ہے، جہاں اس کی تنظیم گھریلو دستکاری کے طور پر کی گئی ہے ۔ ۱۹۶۳-۱۹۶۴ء میں ایک کروڑ روپے کا سامان تیار ہوا اور اس سے پچیس لاکھ روپے کا زرمبادلہ کمایا گیا ۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں اس صنعت کو مزید فروغ ہوا ۔ اب چار کروڑ روپے کا سامان تیار ہوتا ہے اور زر مبادلہ کی رقم ڈھائی کروڑ روپے ہو گئی ہے ۔

کھیلوں کا سامان: اس صنعت کا مرکز بھی سیالکوٹ ہے اور ہزاروں لوگوں کے روزگار کا سبب ہے ۔ ۱۹۶۴-۱۹۶۵ء میں برآمدات کی مالیت تقریباً دو کروڑ روپے تھی، جو ۱۹۷۰ء کے آخر تک تین کروڑ روپے ہو جائے گی ۔

جہاز سازی اور انجینئری کی صنعت: یہ بڑی اہم صنعت خیال کی جاتی ہے اور دیگر فوائد کے علاوہ یہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان

مؤثر وسل و رسائل کا سلسلہ قائم رکھنے میں بڑی مفید ثابت ہو رہی ہے ۔ یہ صنعت بی ۔ آئی ۔ ڈی ۔ سی کے تحت بڑی ترقی کر رہی ہے ۔ کراچی شپ یارڈ اینڈ انجینئرنگ ورکس (KSEW) حکومت کے عظیم ترین منصوبوں میں سے ایک ہے، جس میں تیرہ ہزار ٹن تک کے جہاز بن سکتے ہیں ۔ یہاں سے ۱۲۸۶۰ ٹن کا جہاز ''العباس'' تیار ہوا ہے ۔ جاپان سے قطع نظر کسی ایشیائی ملک نے اتنا بڑا جہاز ابھی تک نہیں بنایا ۔ ۱۹۶۴ء تک اس کارخانے میں کئی قسم کے چھوٹے چھوٹے بہتر جہاز بن چکے تھے ۔ یہاں کراچی کی بندرگاہ میں آنے والے ہر قسم کے جہاز کی مرمت کی جا سکتی ہے ۔ علاوہ ازیں جیبور ہاٹ شوگر ملز کے لیے تقریباً بچیس فیصد مشینری اس کارخانے میں تیار ہوتی ہے، نیز پاکستان کے شکر کے تقریباً تمام کارخانوں کے لیے مختلف قسم کے آلات اور پرزے مہیا کیے جاتے ہیں اور اس سے معتدبہ زر مبادلہ کی بچت ہوتی ہے ۔

مشرقی پاکستان میں بھی جہازسازی اور جہازوں کی مرمت اور دیگر سہولتوں کے لیے اس وقت نرائن گنج، کھلنا اور چٹاگانگ میں تین کارخانے کام کر رہے ہیں، جن کے نام یہ ہیں: نرائن گنج ڈیک یارڈ، کھلنا شپ یارڈ اور چٹاگانگ ڈرائی ڈیک (خشک گودی) ۔

بھاری صنعتیں : چٹاگانگ (مشرقی پاکستان) میں لوہے اور فولاد کا کارخانہ ستائیس کروڑ روپے کی لاگت سے تیار ہوا ہے اور ملک میں اپنی نوعیت کا پہلا کارخانہ ہے ۔ ۱۹۶۷ء میں اسے آزمائشی طور پر چلایا گیا تھا ۔ اس کی صلاحیت پیداوار ڈیڑھ لاکھ ٹن فولادی ڈلے سالانہ ہے ۔ اور اس میں توسیع کے بعد ۱۹۷۰ء تک ڈھائی لاکھ ٹن تک فولادی ڈلے تیار ہونے لگیں گے ۔

مغربی پاکستان میں بھی کالاباغ (ضلع میانوالی، پنجاب) کے مقام پر ڈبلیو ۔ پی ۔ آئی ۔ ڈی ۔ سی نے مقامی لوہے سے دس لاکھ ٹن سالانہ فولاد تیار کرنے کا ایک کارخانہ قائم کرنے کا منصوبہ تیار کیا ہے ۔ حال ہی میں روس نے اس کے لیے مالی اعانت دینے پر رضامندی ظاہر کی ہے ۔ کراچی کا مجوزہ کارخانۂ فولاد بھی چوتھے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں مکمل ہو جائے گا، جس میں درآمد شدہ لوہے سے ۴ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن سالانہ فولاد تیار ہو سکے گا ۔ ڈھاکے میں مشینیں بنانے کی ایک فیکٹری زیر تکمیل ہے ۔ اس کی پیداوار تقریباً بارہ ہزار ٹن سالانہ ہو گی ۔ ۱۹۶۸ - ۱۹۶۹ء میں بجلی کے تار بنانے کا ایک کارخانہ چٹاگانگ میں مکمل ہوا ۔ اس کی پیداواری صلاحیت چھے ہزار ٹن سالانہ ہے ۔ یہاں حکومت روس کے اشتراک سے بجلی کا سامان تیار کرنے کا بھاری کارخانہ لگانے کا منصوبہ بھی زیر غور ہے ۔ مشرقی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن موجودہ منصوبے کے دوران میں مشرقی پاکستان میں پٹسن کی ملوں کے لیے مشینیں تیار کرنے کا ایک کارخانہ لگانے کا منصوبہ بنا رہی ہے ۔ دسمبر ۱۹۶۸ء سے لانڈھی (کراچی) میں مشینیں بنانے کے کارخانے نے جزوی طور پر اپنا کام شروع کر دیا ہے ۔ چین کی امداد سے بھاری مشینیں تیار کرنے کا ایک بہت بڑا کارخانہ ٹیکسلا میں قائم کیا جا رہا ہے، جس پر بارہ کروڑ روپے سے زائد لاگت آئے گی ۔ اسی طرح ٹیکسلا ہی میں حکومت روس کی اعانت سے بجلی کی بھاری مشینیں تیار کرنے کا بھی ایک کارخانہ قائم کیا جائے گا، جس پر تقریباً دس کروڑ روپے لاگت آئے گی ۔ ان کے علاوہ مشینیں اور پرزے بنانے کا ایک کارخانہ اور ایک ڈیزل انجن بنانے کا کارخانہ بھی لگایا جا رہا ہے ۔

چھوٹی اور گھریلو صنعتیں : چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کے لیے حکومت نے وزارت کے تحت ایک نظامت قائم کی ہے اور انہیں

مالی امداد دینے کے لیے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقیاتی کارپوریشن کی شاخوں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ گھریلو دستکاریاں شہری بھی ہو سکتی ہیں اور دیہی بھی۔ دیہی گھریلو دستکاریوں میں یہ شامل ہیں: مرغیاں، شہد کی مکھیاں اور ریشم کے کیڑے پالنا پارچہ بافی، قالین بافی، گڑ بنانا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً تین کروڑ زراعت پیشہ افراد ان صنعتوں میں مصروف ہیں۔ شہروں میں اہم گھریلو صنعتیں یہ ہیں: دستکاریاں، مثلاً ہاتھی دانت کا کام، بید کا کام، طلائی و نقرئی زیورات بنانا اور سوزن کاری، دباغت، چمڑے کا ساز و سامان، جفت سازی، قالین بافی، مزامیر سازی، کھیلوں کا سامان بنانا، پلاسٹک کا سامان بنانا، کوزہ گری، کانچ کی چوڑیاں بنانا وغیرہ۔ دستی کھڈی سے کپڑا بننا اہم ترین گھریلو صنعت ہے، جس میں تقریباً چار لاکھ اشخاص کام کرتے ہیں۔ چھوٹی صنعتوں کی ترقی کے کاموں کے لیے حکومت نے تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ۴۶ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے وقف کیے ہیں۔ ۱۹۶۸-۱۹۶۹ء میں مشرقی پاکستان میں پینتالیس اور مغربی پاکستان میں سینتالیس منصوبے زیر تکمیل تھے۔

مٹی کا تیل صاف کرنا: کراچی میں تیل صاف کرنے کے کارخانے کی صلاحیت پچیس لاکھ ٹن سالانہ تک اور نیشنل آئل کی ۷۱ لاکھ سے ۸۰ لاکھ ٹن تک بڑھائی جا چکی ہے۔ چٹاگانگ کی Eastern Refinery میں پندرہ لاکھ ٹن سالانہ تیل صاف کیا جا رہا ہے۔

بناسپتی گھی: قیام پاکستان کے وقت صرف دو کارخانے تھے جن میں نو ہزار ٹن بناسپتی گھی تیار ہوتا تھا اور ۱۹۶۰ء میں دس کارخانوں سے پینتیس ہزار ٹن سالانہ۔ اس وقت مشرقی پاکستان کی پیداوار ساڑھے اٹھائیس ہزار ٹن اور مغربی پاکستان کی ایک لاکھ ۶۲ ہزار ٹن ہے۔

صنعتی پیداوار کے مکمل گوشوارے کے لیے دیکھیے *Pakistan Year Book 1969*، ص ۲۲۶، ۲۲۷

۹ - سوختنیات و معدنیات

برصغیر کی تقسیم کے وقت عمدہ کوئلہ، خام لوہا، باکسائیٹ اور دوسری فلزاتی معدنیات بھارت کے حصے میں آئیں۔ پاکستان کے معدنی وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان کی معدنیات کی کیفیت یہ تھی: خام تیل: ایک کروڑ ۷۰ لاکھ گیلن؛ پٹرولیم: ایک کروڑ ۱۵ لاکھ گیلن؛ کوئلہ: ۲ لاکھ ۴۱ ہزار ٹن؛ نمک: ۳ لاکھ ۱۸ ہزار ٹن؛ کرومائیٹ: ۱۸ ہزار ٹن؛ چونے کا پتھر: ۳ لاکھ ۴۷ ہزار ٹن؛ جپسم: ۱۰ ہزار ٹن۔

سوختنیات و معدنیات کی یہ مقدار ملکی ضروریات کے لیے ناکافی تھی، اس لیے پاکستان کو ان کی درآمد پر بہت سرمایہ صرف کرنا پڑا ہے۔ گزشتہ آٹھ دس برس میں معدنیات کی تلاش اور پیداوار کی ترقی کے سلسلے میں جو اقدامات کیے گئے ہیں ان کا خاطر خواہ نتیجہ نکل رہا ہے، چنانچہ جہاں ۱۹۴۹-۱۹۵۰ء میں معدنی پیداوار کی کل مالیت ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے تھی وہاں ۱۹۶۷ - ۱۹۶۸ء میں ساڑھے چودہ کروڑ ہو گئی۔ سوختنیات و معدنیات کو ترقی دینے کے لیے مختلف تنظیمیں قائم کی گئی ہیں۔ مرکزی حکومت کا شعبۂ قومی وسائل (Natural Resources Division) متعلقہ پالیسی طے کرتا ہے۔ اس کے ماتحت ارضیاتی سروے کی نظامت اعلٰی (Directorate General of Geological Survey) اور تیل و گیس کی ترقیاتی کارپوریشن (Oil & Gas Development Corporation — OGDC) کام کر رہی ہیں۔ تیل کے سوا تمام سوختنیات و معدنیات کی ترقیات صوبائی حکومتوں کی ذمے داری ہے۔ صوبائی نظامتیں The Directorates of Minerals

Development) کا تعلق نجی شعبے سے ہے ۔ سرکاری شعبے میں معدنیاتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا کام صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کی صوبائی شاخیں (WPIDC و EPIDC) انجام دیتی ہیں ۔ حکومت کی پالیسی ہے کہ نجی شعبے کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی جائے ۔

معدنیات کی تلاش اور ان کے نکالنے کا انحصار بہت حد تک اس بات پر ہے کہ ملک میں فنی ماہرین کی خدمات میسر ہوں ۔ ۱۹۴۷ء میں ماہرینِ ارضیات صرف پانچ تھے، لیکن اب ارضیاتی سروے کی کارپوریشن میں تقریباً چار سو ماہرین کام کر رہے ہیں ۔ مرکزی حکومت کوئٹے میں ایک کالج (College of Mineral Technology) قائم کر رہی ہے، جس میں ارضیات اور کان کنی کے مختلف شعبوں کی تعلیم و تربیت دی جائے گی ۔ مغربی پاکستان انجینئرنگ یونیورسٹی میں کان کنی کا ایک چار سالہ نصاب جاری ہو چکا ہے ۔ او ۔ جی ۔ ڈی ۔ سی ۔ (OGDC) کے زیر اہتمام جولائی ۱۹۶۳ء سے پٹرولیم انسٹی ٹیوٹ نے کافی ترقی کی ہے ۔ کوئٹہ اور جمال گنج (مشرقی پاکستان) میں کاریگروں اور نگرانوں کو تربیت دینے کے لیے ادارے قائم کرنے کا منصوبہ تیار ہو چکا ہے ۔

تیل : ۱۹۶۷ء میں تیل کی پیداوار ساڑھے چار لاکھ ٹن تھی، جس سے ملک کی بارہ فی صد ضروریات پوری ہو سکتی تھیں ۔ پاکستان میں تیل کا پہلا کنواں ۱۸۶۶ء میں کنڈل (پنجاب) کے مقام پر کھودا گیا اور ۱۹۱۰ء میں علاقۂ پوٹھوہار میں تیل کا علاقہ (Oil field) دریافت ہوا ۔ ۱۹۳۵ء میں ڈھلیاں، ۱۹۴۴ء میں جویا اور ۱۹۴۶ء میں بالکسر کے مقامات پر مزید علاقے دریافت ہوئے ۔ آزادی کے بعد بھی تیل کی تلاش جاری رہی ۔ ۱۹۴۹ء میں چکوال کے مقام پر کامیابی ہوئی ۔ اسی سال مرکزی حکومت نے اس شعبے کو اپنی نگرانی میں لے لیا ۔ اس سلسلے میں دو غیر ملکی اداروں، اٹک آئل کمپنی اور پاکستان آئل فیلڈز، سے معاہدات ہوئے ۔ ۱۹۵۰ء میں برما آئل کمپنی کے اشتراک سے پاکستان پٹرولیم لمیٹڈ (PPL) کا قیام عمل میں آیا ۔ اسی کمپنی نے ۱۹۵۲ء میں سوئی کے مقام پر گیس دریافت کی ۔ اس وقت مذکورۂ بالا کمپنیوں کے علاوہ کئی اور کمپنیاں بھی غیر ملکی ماہرین کی اعانت سے تیل کی تلاش میں مصروف ہیں، مثلاً ۱۹۵۴ء سے Pak. Stanvac، ۱۹۵۵ء سے Pak. Hunt، ۱۹۵۷ء سے Pak Sun Oil اور ۱۹۵۸ء سے Pak. Tidewater ۔ ان کوششوں کا نتیجہ تیل کے تیرہ کنووں کی دریافت کی صورت میں نکلا ہے ۔ ۱۹۶۱ء میں مساعی کو تیزتر کرنے کے لیے تیل و گیس کی ترقیاتی کارپوریشن (OGDC) قائم ہوئی، جس کے لیے حکومت روس نے ماہرین مہیا کیے ۔ اس نے ساری (مغربی پاکستان) اور جلدی (مشرقی پاکستان) میں تیل کے علاقے دریافت کیے اور علاقۂ پوٹھوہار میں کوٹ سارنگ اور ٹٹ کے مقامات سے تیل برآمد کیا ۔ پاکستان شیل آئل کمپنی خلیج بنگال کا جائزہ لے رہی ہے اور وہاں تیل کی برآمدگی کے امکانات خاصے روشن ہیں ۔

اٹک آئل کمپنی (راولپنڈی) کا تیل صاف کرنے کا کارخانہ گزشتہ پینتالیس سال سے کام کر رہا ہے ۔ اس کی پیداواری صلاحیت پانچ لاکھ ٹن سالانہ ہے ۔ دوسرا کارخانہ The Pakistan Refinery ۱۹۶۲ء میں کراچی میں قائم ہوا ۔ ۱۹۶۴ء میں اس کی پیداوار چوبیس لاکھ ٹن تھی ۔ کراچی ہی میں ایک اور کارخانہ The National Refinery ۱۹۶۶ء میں قائم ہوا، جس کی صلاحیت ۱۹۷۱ء تک سترہ لاکھ ٹن تک پہنچ جائے گی ۔ تیل صاف

کرنے کا چوتھا کارخانہ چاٹگانگ میں ۱۹۶۸ء سے کام کر رہا ہے اور اس کی پیداوار پندرہ لاکھ ٹن کے قریب ہے۔

ملک میں چالیس لاکھ ٹن سالانہ سے زیادہ تیل کی کھپت ہوتی ہے، لہٰذا اسے کافی مقدار میں درآمد کرنا پڑتا ہے۔

قدرتی گیس: مغربی پاکستان میں سات اور مشرقی پاکستان میں چھے ذخائر دریافت ہو چکے ہیں، جن میں موجود گیس کی مجموعی مقدار دو ہزار ارب کیوبک فٹ ہے۔ اس وقت تقریباً بیاسی ارب کیوبک فٹ گیس سالانہ نکالی جا رہی ہے اور خیال ہے کہ یہ ذخائر ایک صدی تک ملکی ضروریات کے لیے کافی ثابت ہوں گے۔ گیس ملک کے مختلف حصوں میں پہنچائی جا رہی ہے۔ اس کا ۷۴ فی صد کیمیائی کھاد کی تیاری میں بطور خام مواد استعمال ہوتا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں ۹۸ فی صد گیس صنعتی اور ۲ فی صد گھریلو ضروریات میں استعمال ہو رہی تھی۔

کوئلا: کوئلا پاکستان کی اہم ترین معدنیات میں سے ہے، لیکن اس کی پیداوار ملکی ضروریات کے لیے کافی نہیں اور جو کوئلا نکلتا ہے وہ اعلیٰ درجے کا نہیں ہوتا۔ ۱۹۶۷ء میں کوئلے کی پیداوار پندرہ لاکھ ٹن کے قریب تھی اور ساڑھے چار کروڑ روپے کا کوئلا درآمد کیا گیا تھا۔ امید ہے ۱۹۷۰ء تک اڑتالیس لاکھ ٹن کوئلا نکلنے لگے گا۔ پاکستان میں کوئلے کے ذخائر مندرجۂ ذیل علاقوں میں ہیں: کوہستان نمک اور مکڑوال (پنجاب)، علاقۂ خوست۔ شارغ۔ ہرنائی اور مچ (بلوچستان)، لکھڑا اور جھم پیر (سندھ) اور علاقۂ راجشاہی۔ بوگرا، سلہٹ اور کھلنا (مشرقی پاکستان) میں دلدلی کوئلا پایا جاتا ہے۔

خام لوہا: اندازہ لگایا گیا ہے کہ پاکستان میں چالیس لاکھ ٹن سے زیادہ خام لوہے کے ذخائر ہیں۔ ان میں فلزاتی لوہا ۳۰ فی صد کے قریب ہے۔ سب سے بڑا ذخیرہ (تیس لاکھ ٹن) کالاباغ اور مکڑ وال کے علاقے میں واقع ہے۔ اس کے علاوہ ہزارہ اور چترال میں بھی ذخائر دریافت ہوئے ہیں اور چاغی (بلوچستان) کے قریب بھی عمدہ قسم کا لوہا ملا ہے۔ کالا باغ میں لوہا نکالنے اور کارخانہ لگانے کا ایک بہت بڑا منصوبہ تیار کیا گیا ہے، جس پر ایک ارب ۴۰ کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔ چاٹگانگ میں فولاد کا کارخانہ کام کر رہا ہے اور کراچی میں جلد ہی قائم ہونے والا ہے۔

نمک: مغربی پاکستان میں نہایت اعلیٰ درجے کے نمک کے ذخائر پائے جاتے ہیں اور سمندر کے پانی سے بھی نمک تیار کیا جاتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں صرف سمندر کے پانی سے نمک حاصل کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں ۲ لاکھ ۶۶ ہزار ٹن معدنی نمک اور بیس ہزار ٹن سے زیادہ سمندری نمک پیدا ہوا۔ مغربی پاکستان میں نمک کی چھے کانیں ہیں، جن میں سب سے بڑی کان کھیوڑا (ضلع جہلم) میں واقع ہے۔

تقریباً ڈھائی کروڑ پیپے نمکاب (Brine) کا ایک بڑا ذخیرہ ضلع جہلم میں دھریالہ کے مقام پر دریافت ہوا ہے۔ اس میں پوٹاشیم، سوڈیم، میگنیشیم اور کیلشیم کے قیمتی نمکیات پائے جاتے ہیں، جنھیں برآمد کیا جا سکتا ہے۔

جپسم: یہ بھی پاکستان کی ایک قیمتی معدنی پیداوار ہے۔ اس کے ذخائر مغربی پاکستان کے مختلف خطوں، مثلاً شمال مغربی سرحد کے قبائلی علاقوں، کوہستان نمک (پنجاب) اور لورالائی (بلوچستان) میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی خاصی مقدار برآمد کی جاتی ہے۔ ۱۹۶۷ء کی آخری ششماہی میں اکسٹھ ہزار

ٹن جپسم نکالی گئی تھی۔

کرومائٹ: ہندوباغ، ژوب اور خاران (بلوچستان) کے علاوہ وزیرستان کے علاقے میں پائی جاتی ہے اور اس سے کافی زر مبادلہ کمایا جاتا ہے۔ ۱۹۶۷ء کی دوسری ششماہی میں اس کی پیداوار انیس ہزار ٹن تھی۔

سنگ مرمر: پشاور، کوئٹہ اور قلات ڈویژنوں میں مختلف اقسام اور رنگوں کے سنگ مرمر کے بڑے ذخیرے دریافت ہوئے ہیں۔ حیدرآباد ڈویژن کے ضلع دادو میں بھی کچھ ذخیرے دریافت ہوئے ہیں۔ اسے نکالنے اور صاف کرنے کے لیے جدید ترین طریقوں پر عمل کیا جا رہا ہے۔ سنگ مرمر اٹلی سے درآمد بھی کیا جاتا ہے۔

چونے کا پتھر: مغربی پاکستان میں عمدہ قسم کے چونے کے پتھر کے کبھی نہ ختم ہونے والے ذخیرے پائے جاتے ہیں۔ حال ہی میں دو کروڑ ٹن کا ایک ذخیرہ مشرقی پاکستان میں دریافت ہوا ہے، جس کا استعمال سیمنٹ کے علاوہ سجّی، شکر، کاغذ اور فولاد کی صنعتوں میں ہو سکتا ہے۔

چکنی مٹی: مشرقی پاکستان میں سفید چکنی مٹی کے ذخائر کا اندازہ دو لاکھ ٹن لگایا گیا ہے۔ مغربی پاکستان کی جنوب مشرقی سرحد کے قریب تین لاکھ ٹن چینی مٹی کے ذخیرے دریافت ہوئے ہیں۔ سوات میں شاہ ڈھیری کے قریب عمدہ قسم کی چینی مٹی کے ذخیروں کے آثار ملے ہیں اور وہاں مزید جستجو جاری ہے۔

شیشہ ریت (Glass Sand): فتحو گنج کے جنوب مغرب میں بھٹرہ پہاڑی کے دامن میں شیشہ ریت کے عدسی ذخیروں کا انکشاف ہوا ہے۔ ضلع چٹاگانگ میں مرزا پور کے گاؤں میں عمدہ قسم کی سلیکا ریت (Silica Sand) کا ایک ذخیرہ دریافت ہوا ہے۔ مغربی پاکستان میں زیارت کے قریب کچھ کے مقام پر شیشہ ریت پائی جاتی ہے۔ جنگشاہی سے ٹھٹھہ سڑک پر تقریباً پچیس ہزار ٹن شیشہ ریت دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ذخیرے دادو اور ڈیرہ اسماعیل خان کے اضلاع میں بھی موجود ہیں۔ ضلع ہزارہ میں مثلاً کچھا کے مقام پر ایک ذخیرے کا پتا چلا ہے۔

تابکاری ریت (Radio-Active Sand): چٹاگانگ سے برما کی سرحد تک پھیلے ہوئے ساحل اور اس کے قریبی جزائر میں پائی جاتی ہے۔ کاکس بازار کے ذخائر میں ایک اندازے کے مطابق ۴ لاکھ ۸۷ ہزار ٹن ریت میں ۱۰ فی صد، اور ایک لاکھ ۶۳ ہزار ٹن ریت میں ۲۰ فی صد اور تریسٹھ ہزار ٹن ریت میں ۳۰ فی صد بھاری معدنیات پائی جاتی ہیں۔ تابکاری ریت کا پتا ڈیرہ غازی خاں (پنجاب) میں بھی چلا ہے۔

بیرائٹ (Barytes): ضلع ڈیرہ غازی خاں میں سنگ سیاہ میں یورینیم پائی گئی ہے، لیکن ابھی تک اس کے کارآمد ذخیرے دریافت نہیں ہوئے۔ گلگت میں کڑے سنگ خارا کی دریافت ہوئی ہے۔ بیرائٹ کا ایک بڑا ذخیرہ خزدار کے نزدیک گنگوا میں ملا ہے۔ ضلع ہزارہ میں کوھالہ کے مقام پر بھی بیرائٹ کا ایک ذخیرہ دریافت ہوا ہے۔

۱۹۶۶-۱۹۶۷ء میں جو معدنیات و سوختنیات نکالی گئیں، ان کی تفصیل مندرجۂ ذیل ہے: بارا (۹۲۴ ٹن)، اراگونائٹ (۵۲۳۴ ٹن)، سلسائٹ (۵۲۴ ٹن)، کرومائٹ (۳۸ ہزار ٹن)، کوئلہ (۱۴ لاکھ ۱۸ ہزار ٹن)، ڈولومائٹ (۵۱۵ ٹن)، آتشی مٹی (۲۰ ہزار ٹن)، فلر مٹی (۲۰ ہزار ٹن)، جپسم (ایک لاکھ ۲۲ ہزار ٹن)، خام لوہا (۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں ۱۲ ہزار ٹن)، چونے کا پتھر (۲۲ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن)، کچا سیسہ (۱۹۶۴-۱۹۶۵ء

میں ۱۵ ٹن)، میکسانٹ (۰۸۷ ٹن)، مینگنیز (۵۹۹ ٹن)، پہاڑی نمک (۲ لاکھ ۳۱ ہزار ٹن)، سلیکا ریت (۷۸ ہزار ٹن)، سنگ صابون (۲۸۷۰ ٹن)، بیرائٹ (۶ ہزار ٹن)، خام تیل (۱۲ کروڑ ۸۰ لاکھ گیلن)، قدرتی گیس (۷۹ ارب ۹۸ کروڑ کیوبک فٹ)۔

۱۰ - پانی اور بجلی

پانی اور بجلی کی اہمیت پاکستان کی معاشیات میں سب سے زیادہ ہے، کیونکہ ان قدرتی وسائل کی ترقی ہی پر زراعت اور صنعت کا دارومدار ہے۔ حکومت نے اس کی بہم رسانی اور ترقی کے لیے ملک کے دونوں حصوں میں ''واپڈا'' (Water and Power Development Authority = WAPDA) کے نام سے ایک خوداختیار ادارہ قائم کیا ہے۔ مغربی پاکستان واپڈا نے ۱۹۵۸ء میں اور مشرقی پاکستان واپڈا نے ۱۹۵۹ء میں کام شروع کیا تھا۔ اس کے فرائض میں صوبے کی روزافزوں زرعی، صنعتی اور گھریلو ضروریات کے لیے پانی اور بجلی کی مناسب اور باضابطہ بہم رسانی، ترقیاتی منصوبوں کی تیاری اور ان پر عملدرآمد اور سیم، تھور، سیلابوں اور زمین کے کٹاؤ سے تباہ شدہ اراضی کو دوبارہ قابل کاشت بنانا شامل ہے۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں ساڑھے بیس لاکھ ایکڑ نئی اراضی زیر کاشت لائی گئی (۲ لاکھ ۲۰ ہزار ایکڑ مشرقی پاکستان میں اور ۱۸ لاکھ ۳۰ ہزار ایکڑ مغربی پاکستان میں)۔ علاوہ ازیں آبپاشی، پانی کے نکاس اور سیلاب کی روک تھام کے جدید طریقوں کو کام میں لا کر ساڑھے پچاسی لاکھ ایکڑ رقبہ دوبارہ کاشت کے قابل بنایا گیا (ساڑھے بائیس لاکھ ایکڑ مشرقی پاکستان اور تریسٹھ لاکھ ایکڑ مغربی پاکستان میں)۔ اسی طرح زیادہ سے زیادہ بجلی پیدا کرنے اور اسے ملک کے ہر حصے میں فراہم کرنے میں بڑی کامیابی ہوئی ہے۔

(الف) پانی

پانی ایک بیش بہا نعمت ہے، لیکن اس کی افراط اور تفریط سے بڑے کٹھن مسائل پیدا ہوتے ہیں، جن سے ملک کی معاشیات پر برا اثر پڑتا ہے۔ پاکستان میں بھی ان مسائل نے ہماری زراعت کو بہت متاثر کیا ہے، چنانچہ حکومت ملک کے دونوں حصوں میں ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

مشرقی پاکستان: یہ دنیا کے بڑے گنجان آباد علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ مزید برآں یہاں فی کس ملکیت اراضی کا رقبہ ضرورت سے کم اور آبادی میں اضافے کی سالانہ شرح حد سے زیادہ ہے، چنانچہ غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے سال میں ایک سے زیادہ فصلیں اگانا ضروری ہے۔ مشرقی پاکستان میں بارش زیادہ تر مون سون کے موسم میں ہو جاتی ہے اور سال کے باقی حصے میں پانی کی کمی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسے دور کرنے کے لیے حکومت نے جو اقدامات کیے ہیں ان میں سے زیادہ اہم یہ ہیں: پن بجلی تیار کرنے کا منصوبہ، دریاؤں اور ندی نالوں کے پانی سے آبپاشی کا منصوبہ، نلوں اور پمپوں کے ذریعے زیر زمین پانی حاصل کرنے کا منصوبہ۔

ان میں سے گنگا کباڈک کا کثیرالمقاصد منصوبہ سب سے بڑا ہے، جس سے سیلاب کی روک تھام اور آب پاشی میں بڑی مدد ملے گی۔ اس کا پہلا مرحلہ مکمل ہو چکا ہے اور دوسرا ۱۹۷۰ء میں پورا ہو جائے گا۔ منصوبے کی تکمیل پر کل ۵۰ کروڑ ۹۰ لاکھ روپیہ خرچ ہوگا اور کشتیا، جیسور اور کھلنا کا تقریباً ۲۵ لاکھ ۸۰ ہزار ایکڑ رقبہ سیراب ہونے لگے گا اور سال میں دو دو تین تین

فصلیں پیدا ہو سکیں گی۔

تیستا بیراج (Teesta Barrage): اس کا مقصد یہ ہے کہ دریائے تیستا پر بند تعمیر کر کے اضلاع رنگ پور، دیناج پور و بوگرا میں نہریں نکالی جائیں، جن سے ۱۱ لاکھ ۱۲ ہزار ایکڑ رقبہ سیراب ہوگا۔ اس پر کل ۳۷ کروڑ ۱۸ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ جتنا حصہ مکمل ہو چکا ہے اس سے ۳۳ ہزار ایکڑ اراضی سیراب ہونے لگی ہے۔

زیر زمین پانی کے استعمال سے رنگ پور، دیناج پور اور راجشاہی جیسے اضلاع کی اراضی سیراب کی جا سکتی ہے، جہاں کی سطح زمین نسبۃً بلند ہونے کی وجہ سے نہریں نکالنا مشکل ہے۔ یہاں ٹیوب ویل اور پمپوں (low-lift pumps) کے ذریعے پانی کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۶۷ء کے آخر تک ۱۲ کروڑ ۶۸ لاکھ روپے کی لاگت سے ۶۳۲ ٹیوب ویل اور ۸۶۰ پمپ لگائے جا چکے ہیں۔ منصوبہ مکمل ہونے پر ۱۸ لاکھ ۶۸ ہزار ایکڑ رقبے میں آب پاشی ممکن ہو جائے گی۔ منصوبۂ کرنافلی بھی زیر تکمیل ہے۔ اس کے تحت پمپوں کے ذریعے دس لاکھ ایکڑ زمین کی آب پاشی ہو سکے گی۔

مشرقی پاکستان کی معیشت کو سب سے زیادہ نقصان آئے دن آنے والے طوفانوں اور سیلابوں سے پہنچتا ہے۔ چٹاگانگ، نواکھلی، کھلنا اور باقر گنج کے ساحلی اضلاع کو سمندر کے مد و جزری سیلاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس سے تقریباً چھے ہزار مربع میل کا علاقہ بری طرح متأثر ہوتا ہے۔ اسی طرح برسات کے موسم میں بڑے بڑے دریاؤں، پدما، برہم پتر اور میگھنا، میں سیلاب آتے ہیں اور دوسرے اضلاع کی زرعی زندگی مفلوج کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں ایک سیلاب کمیشن (Flood Commission) قائم کیا گیا۔ ۱۹۵۶ - ۱۹۵۷ء میں اقوام متحدہ کے ایک وفد نے دورہ کر کے پانی اور بجلی کی ترقیات کے منصوبوں کے ساتھ ساتھ اس مسئلے کا بھی جائزہ لیا۔ ۱۹۶۲ء میں اس پر مزید غور و خوض ہوا اور واپڈا نے آبی وسائل کو ترقی دینے کا ایک بڑا منصوبہ بنایا، جس میں سیلابوں کی روک تھام کے بارے میں بھی تجاویز شامل تھیں۔ اس پر حکومت مشرقی پاکستان اور عالمی بینک کے ماہرین نے نظر ثانی کے بعد یہ منصوبہ تیار کیا کہ متأثرہ علاقوں میں ساحلِ سمندر اور دریا کے کناروں پر پشتے بنائے جائیں اور پانی کے نکاس کے لیے پمپ لگائے جائیں۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں اس مد کے لیے ۷ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی۔ کنارہ بندی اور پشتے تعمیر کرنے کا کام تیزی سے ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں تپرہ۔ چٹاگانگ منصوبہ بھی قابلِ ذکر ہے، جس کے ذریعے ایک لاکھ ۸۶ ہزار ۷ سو مربع میل اراضی کی سیلاب سے حفاظت اور ڈیڑھ لاکھ ایکڑ رقبے میں آب پاشی ہو سکے گی۔ اس کا ایک حصہ (چاند پور سکیم) مکمل ہو چکا ہے۔

تیسرے پنج سالہ منصوبے کے ختم ہونے پر ۱۷ لاکھ ۶۰ ہزار ایکڑ نئی اراضی اور ۲۷ لاکھ ۲۰ ہزار ایکڑ تباہ شدہ اراضی زیر کاشت آ جائے گی۔

مغربی پاکستان: یہاں ۱۹ کروڑ ۹۰ لاکھ ایکڑ رقبے میں سے صرف ۶ کروڑ ۶۰ لاکھ ایکڑ اراضی ایسی ہے جہاں آب پاشی کی سہولتیں میسر ہونے پر کاشت کی جا سکتی ہے۔ اس وقت تقریباً ڈھائی کروڑ ایکڑ رقبہ نہروں سے سیراب ہو رہا ہے۔

پہلے اور دوسرے پنج سالہ منصوبوں کے دوران میں آب پاشی کے متعدد منصوبوں کا آغاز ہوا، مثلاً غلام محمد بیراج، وارسک ڈیم، گدو بیراج، کرم گڑھی پروجیکٹ، تونسہ بیراج، راول ڈیم اور ٹنڈا ڈیم۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں طے پایا کہ ۲ کروڑ ۱۵ لاکھ ۹۰ ہزار ایکڑ اراضی کو

نہری پانی مہیا کیا جائے گا اور اس میں ۳۹ لاکھ ۸۰ ہزار رقبہ پہلی بار زیر کاشت آئے گا۔ واپڈا نے آغاز کار سے اب تک اڑتالیس میں سے تیئیس منصوبوں کو مکمل کر لیا ہے، جن میں سے مندرجۂ ذیل بہت اہم ہیں: کوہاٹ کے قریب ۶ کروڑ ۶۸ لاکھ روپے کی لاگت سے ۱۱۶ فٹ اونچا اور ۲۲۰۰ فٹ لمبا بند تعمیر کیا گیا ہے، جو تنڈا ڈیم کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے باعث ۷۸۴۰۰ ایکڑ فٹ پانی ذخیرہ کیا جا سکے گا جس سے بتیس ہزار ایکڑ اراضی میں آب پاشی ہو گی۔ جنوبی وزیرستان میں دریاے گومل پر بند بنانے کا کام جاری ہے۔ ۲۸ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے سے تعمیر ہونے والے گومل ڈیم سے ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان میں ایک لاکھ ۱۰ ہزار ایکڑ رقبہ سیراب ہوگا اور ۸۳ ہزار کیلوواٹ سے زیادہ بجلی پیدا ہو گی۔ ضلع ہزارہ میں دریاے ہرو پر ۱۰ کروڑ ۷۲ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر ہونے والا خان پور ڈیم مکمل ہونے والا ہے۔ یہاں چونسٹھ ہزار ایکڑ فٹ ذخیرۂ آب سے ایک لاکھ ۱۳ ہزار ایکڑ اراضی کو فائدہ پہنچے گا۔ کراچی اور اس کے مضافات کو سیراب کرنے کے لیے دریاے حب پر ۱۴۶ فٹ اونچے کچے پشتے کی تعمیر جاری ہے۔

سندھ طاس معاہدے (۱۹۶۰ء) کے ماتحت واپڈا نے دو عظیم الشان بندوں کی تعمیر شروع کی۔ ان میں سے دریاے جہلم پر منگلا ڈیم ۱۹۶۷ - ۱۹۶۸ء میں مکمل ہو چکا ہے۔ یہ ایک کثیر المقاصد منصوبہ ہے۔ اس کی جھیل میں ساڑھے پچپن لاکھ ایکڑ فٹ پانی ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کے بجلی گھر سے دس لاکھ کیلوواٹ بجلی پیدا کی جا سکے گی جسے ضرورت پڑنے پر تیس لاکھ تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس وقت یہاں سے دو لاکھ کیلوواٹ بجلی مہیا کی جا رہی ہے۔ منگلا ڈیم کے علاوہ ترمو۔ سدھنائی۔ سیلسی، میلسی۔ بہلوال اور بلوکی۔ قادر آباد کی رابطہ نہریں (link canals)، نیز سدھنائی بیراج، قادرآباد بیراج اور میلسی سائفن بھی مکمل ہو چکے ہیں۔ سارے منصوبے پر پانچ ارب روپیہ صرف ہوا ہے، جس میں سے ۲ ارب ۳۵ لاکھ روپیہ صرف منگلا ڈیم کی تعمیر پر خرچ ہوا۔

سندھ طاس کا دوسرا بڑا منصوبہ تربیلا ڈیم ہے، جس کے مکمل ہونے پر دریاے سندھ کا ایک کروڑ ۱۱ لاکھ ایکڑ فٹ پانی ذخیرہ کیا جا سکے گا اور اس سے ساڑھے تین لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب ہو سکے گا۔ اس کی تعمیر ۱۹۶۸ء سے شروع ہو چکی ہے۔

مغربی پاکستان کا بیشتر علاقہ دوامی نہروں سے سیراب ہوتا ہے، جن میں سے مشہور یہ ہیں: دریاے راوی سے اپر باری دوآب اور لوئر باری دوآب؛ دریاے چناب سے اپر چناب اور لوئر چناب؛ دریاے جہلم سے اپر جہلم اور لوئر جہلم؛ دریاے ستلج سے فیروز پور، سلیمانکی، اسلام آباد اور پنج ند کے مقامات سے گیارہ نہریں نکالی گئی ہیں۔ دریاے سندھ پر متعدد بیراج بنا کر ان سے کئی اہم دوامی نہریں نکالی گئی ہیں: (۱) کالا باغ کے قریب جناح بیراج سے نہریں نکال کر تھل کے ریگستان کو آباد و شاداب کیا گیا ہے؛ (۲) تونسہ بیراج سے نکلنے والی نہروں سے ڈیرہ غازی خان اور مظفر گڑھ کے اضلاع کا چودہ لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب ہو رہا ہے؛ (۳) گدو بیراج کی تکمیل کے بعد سکھر، میرپور، روھڑی اور جیکب آباد کا اکتیس لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب ہوگا؛ (۴) سکھر کے قریب سکھر یا لائڈ بیراج دنیا کے بڑے بیراجوں میں سے ہے۔ اس سے نکلنے والی سات نہروں سے پچاس لاکھ ایکڑ اراضی سیراب ہوتی ہے؛ (۵) کوٹری کے قریب غلام محمد بیراج مکمل ہونے پر کل اٹھائیس لاکھ

ایکڑ رقبہ سیراب ہونے لگے گا اور اس سے نکلنے والی نہر کواری سے کراچی کو پانی ملے گا؛ (۶) راولپنڈی اور اسلام آباد کو پانی کی بہم رسانی کے لیے دریائے کورنگ پر راول ڈیم بنایا گیا ہے۔ اس سے دس ہزار ایکڑ اراضی بھی سیراب ہو سکے گی۔

دریائے سندھ کے میدان میں پانی کے نکاس کا مناسب بندوبست نہ ہونے کے باعث سیم اور تھور سے اراضی بری طرح متاثر ہو رہی ہے، چنانچہ پنجاب میں جزوی طور پر پچاس لاکھ ایکڑ رقبہ متاثر ہو چکا ہے، دس لاکھ ایکڑ کو شدید نقصان پہنچا ہے اور پندرہ لاکھ ایکڑ رقبہ کاشت کے قابل نہیں رہا۔ اس رقبے میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، جس کی سالانہ شرح پنجاب میں ستر ہزار ایکڑ اور پورے مغربی پاکستان میں ایک لاکھ ایکڑ ہے۔ اراضی کو سیم اور تھور سے نجات دلانے کے لیے واپڈا نے تقریباً سات سال پیشتر ایک وسیع منصوبہ بنایا اور وسطی رچنا دوآب میں ۱۸۰۰ ٹیوب ویل لگائے۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں ۲۱۰۰ اور ۱۹۶۶ء میں مزید ۱۴۰۰ ٹیوب ویل لگائے گئے۔ اس سلسلے میں متعدد تجاویز پر عمل کیا جا رہا ہے۔ چج دوآب سکیم کے تحت اضلاع جھنگ، سرگودھا و گجرات کی ۲۲ لاکھ ۷۰ ہزار ایکڑ زمین بحال کرنے کے لیے ڈھائی ہزار ٹیوب ویل لگائے جائیں گے، پانی کے نکاس کے لیے ساڑھے چار سو میل لمبی نالیاں کھودی جائیں گی اور تین سو میل لمبی پرانی نالیوں کی مرمت کی جائے گی۔ لوئر تھل سکیم کے تحت رنگ پور اور مظفر گڑھ کے نہری علاقے میں ۱۳ لاکھ ۸۰ ہزار ایکڑ زمین کی بحالی کے لیے ۱۵۵۰ ٹیوب ویل لگائے جائیں گے اور ڈیڑھ سو میل لمبی نالیاں بنائی جائیں گی۔ اپر رچنا سکیم کے تحت اضلاع شیخوپورہ، سیالکوٹ و گوجرانوالہ کا ۱۳ لاکھ ۴۰ ہزار ایکڑ رقبہ آتا ہے۔ یہاں امریکہ اور یوگوسلاویہ کی اعانت سے ۱۹۳۲ ٹیوب ویل لگائے جا رہے ہیں۔ خیرپور سکیم کے تحت تمام ٹیوب ویل لگائے جا چکے ہیں اور ۴ لاکھ ۱۸ ہزار ایکڑ رقبہ سیم سے محفوظ ہو رہا ہے۔ لاڑکانہ۔ شکارپور سکیم کے تحت ۱۲۶ میل لمبی نکاسی نالیاں کھودی جا رہی ہیں۔

مغربی پاکستان کی اراضی کا ایک بڑا رقبہ ہر سال سیلاب یا بارش کے پانی سے کٹاؤ کی نذر ہو جاتا ہے اور سیلابی پانی اپنے ساتھ جو ریت وغیرہ لاتا ہے اس کی تہیں قابل کاشت اراضی پر جم کر اسے ناکارہ بنا دیتی ہیں۔ راولپنڈی، کیمبل پور، گجرات، میانوالی، شاہ پور اور جہلم کے اضلاع میں، جو صوبے کی زیر کاشت اراضی کے نصف سے زیادہ رقبے پر مشتمل ہیں، زمین کے کٹاؤ سے سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ حکومت اس سلسلے میں مناسب حفاظتی تدابیر اختیار کر رہی ہے۔ واپڈا کے ماتحت متعدد سکیموں پر عمل ہو رہا ہے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے میں بحالی اراضیات کے لیے ایک ارب ۱۲ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی تھی۔

(ب) بجلی

پاکستان میں سوختنیات کی کمی ہے؛ لہٰذا زراعت و صنعت کے ترقیاتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ بجلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت پاکستان میں کل ۱۱۰۳۰۰ کیلوواٹ بجلی پیدا ہوتی تھی۔ پاکستان کے حصے میں آنے والے بیشتر حرارتی بجلی گھر (Thermal Plants) چھوٹے اور ناکافی تھے اور مہنگی درآمد شدہ سوختنیات سے چلائے جاتے تھے۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں بجلی کی ضروریات کا تخمینہ لگانے کے بعد پانچ لاکھ کیلوواٹ (ایک لاکھ مشرقی پاکستان کے لیے اور باقی مغربی پاکستان کے لیے) بجلی ۱،۱۰ فرینے کا

منصوبہ بنایا گیا۔ ۱۹۵۵ء تک ۳ لاکھ ۴۰ ہزار کیلوواٹ سے زیادہ بجلی پیدا ہونے لگی۔ اگلے پانچ سالوں میں یہ مقدار تقریباً سہ چند، یعنی ۹ لاکھ ۱۰ ہزار کیلوواٹ ہوگئی۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے کے آخر (۱۹۶۵ء) تک یہ پندرہ لاکھ کیلوواٹ تک جا پہنچی۔

مشرقی پاکستان: ۱۹۶۵ء تک مشرقی پاکستان میں بجلی کی پیداوار ۱۹۴۷ء کے مقابلے میں ستائیس گنا ہوگئی۔ یہ ترقی زیادہ تر بڑے بڑے منصوبوں کی بدولت ہوئی ہے، مثلاً کپتائی میں کرنافلی ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ (اسی ہزار کیلوواٹ)، سدھیر گنج میں بھاپ (تیس ہزار کیلوواٹ) اور ڈیزل (اٹھارہ ہزار کیلوواٹ) کے منصوبے، چٹاگانگ ڈیزل پراجیکٹ (دس ہزار کیلوواٹ) وغیرہ۔

بجلی کی ترسیل اور تقسیم پہلے پہل شہری علاقوں سے قصباتی علاقوں میں کی گئی اور اب دور دراز کے دیہات تک کی جا رہی ہے۔ اس وقت ۲۳۰۰ میل لمبے ایک سلسلۂ ترسیل و تقسیم کے ذریعے سے بجلی گھروں سے ضرورت کے اہم مراکز تک بجلی پہنچائی جاتی ہے۔ ۱۹۷۰ء تک تقریباً ۱۵۰۰ دیہات کو بجلی فراہم کی جائے گی۔

۱۹۶۵ء کے وسط تک مشرقی پاکستان واپڈا نے بجلی کی پیداوار اور تقسیم کے چودہ منصوبے مکمل کیے۔ تیسرے پنجسالہ منصوبے میں ایک درجن سے زیادہ منصوبے بنائے گئے، جن میں کرنافلی کے بجلی گھر کی توسیع اور روپ پور میں ایک لاکھ چالیس ہزار کیلوواٹ کے ایک ایٹمی بجلی گھر (= nuclear power plant) کا قیام شامل تھا۔ توقع کی جاتی ہے کہ نئے اور پرانے منصوبوں سے ۱۹۷۰ء تک بجلی کی پیداوار تین لاکھ کیلوواٹ سے بڑھ کر ۸ لاکھ ۲۰ ہزار کیلوواٹ ہو جائے گی۔ ان تمام منصوبوں کے پیش نظر تیسرے پنجسالہ منصوبے میں اس مد کے لیے ایک ارب ۴۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی جبکہ دوسرے پنجسالہ منصوبے میں پینتیس کروڑ روپے خرچ کیے گئے تھے۔

بجلی کے بعض موجودہ منصوبوں کی کیفیت درج ذیل ہے: (۱) سدھیر گنج پراجیکٹ: سدھیر گنج کے مقام پر امریکہ کی مالی اعانت سے پچاس ہزار کیلوواٹ کا ایک حری نصبیہ ۱۹۶۲ء میں مکمل ہوا؛ (۲) گھوراشال بجلی گھر (Ghorashal Power Station): ایک لاکھ دس ہزار کیلوواٹ کا یہ تھرمل بجلی گھر ۱۹۶۶ء میں مکمل ہوا۔ اس کے لیے فنی امداد روس نے مہیا کی تھی؛ (۳) کرنافلی پراجیکٹ: مشرقی پاکستان میں پن بجلی کا سب سے بڑا منصوبہ ہے۔ اس کا تیسرا یونٹ ۱۹۶۷ء میں مکمل ہوا؛ (۴) اشور گنج تھرمل پلانٹ: بارہ لاکھ کیلوواٹ کے اس حری نصبیے کی تعمیر ۱۹۶۷ء میں شروع ہوئی۔ ۱۹۷۰ء تک اس کے دونوں یونٹ کام کرنے لگیں گے؛ (۵) ایمرجنسی پاور جنریشن سکیم Emergency Power Generation Scheme: اس کے تحت سینتیس ہزار کیلوواٹ کے گیس ٹربائن یونٹ Gas Turbine Units قائم کیے جائیں گے، جن سے سینتیس ہزار کیلوواٹ بجلی پیدا ہو سکے گی۔ ایک یونٹ (تیرہ ہزار کیلوواٹ) دریائے برہم پتر کے مشرق میں اور دوسرا (چوبیس ہزار کیلوواٹ) اس کے مغرب میں کھلنا میں قائم کیا جا رہا ہے؛ (۶) گیس ٹربائن پاور سٹیشن Gas Turbine Power Station: ضلع سلہٹ میں شاہجی بازار میں چھیانوے ہزار کیلوواٹ کا ایک گیس ٹربائن بجلی گھر قائم کیا گیا ہے۔ یہ ۱۹۶۸ء میں مکمل ہوا۔

علاوہ ازیں ترسیل کے متعدد منصوبے، مثلاً گول پاڑہ-بھیرامرہ-اشوردی، سدھیر گنج-سلہٹ، ٹھاکر گنج-سید پور اور سدھیر گنج-اشوردی، مکمل کیے جا رہے ہیں تاکہ صوبے کے ہر حصے

میں زرعی، صنعتی اور گھریلو ضروریات کے لیے بجلی فراہم کی جا سکے ۔ ۱۹۶۷ء تک ۵۷۸ میل لمبی لائنیں لگائی جا چکی تھیں اور مزید ۲۸۵ میل لمبی لائنوں پر کام مکمل ہو رہا تھا ۔

مغربی پاکستان : بجلی کی پیداوار اور بہم رسانی کی غرض سے مغربی پاکستان کو شمالی اور جنوبی منطقوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ شمالی منطقے میں پنجاب، شمالی مغربی سرحد اور بہاولپور کے علاقے شامل ہیں، ان سب کو ایک گرڈ (grid) میں ملا دیا گیا ہے، جس سے بجلی گھر مربوط ہیں: وارسک، مالاکنڈ، درگئی، کرم گڑھی، رسول، شادی وال، چیچوکی ملیاں، گوجرانوالہ اور رینالہ کے ہائیڈل بجلی گھر؛ لائلپور، ساہیوال اور ملتان کے سٹیم بجلی گھر؛ اور لائلپور کا ڈیزل بجلی گھر ۔ جنوبی منطقہ بالائی سندھ، کوئٹہ اور قلات کے علاقوں پر مشتمل ہے ۔ مغربی پاکستان میں بجلی کی کل کھپت کا تقریباً ۷۵ فی صد واپڈا مہیا کرتی ہے اور ۱۸ فی صد کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن؛ باقی سات فی صد بجلی راولپنڈی اور ملتان کی نجی خود اختیار کمپنیوں اور واپڈا کے الگ تھلگ بجلی گھر (جیسے کوئٹے میں) سے فراہم ہوتی ہے ۔

وسائل : مغربی پاکستان کے جنوبی میدانوں میں قدرتی گیس کے بڑے ذخیرے موجود ہیں جو کم خرچ حری بجلی پیدا کرنے کے لیے بہت موزوں ہیں ۔ ایک جائزے کے مطابق دریاے سندھ اور اس کے بڑے معاونین سے تقریباً تین کروڑ کیلوواٹ کی برقابی قوت حاصل کی جا سکتی ہے ۔ علاوہ ازیں دریاے جہلم اور اس کے معاونین میں بھی اس کی خاصی مقدار موجود ہے ۔ برقی قوت کو ترقی دینے کے لیے مغربی پاکستان میں بنائے ہوئے منصوبوں میں سے کچھ یہ ہیں: تربیلا (اکیس لاکھ کیلو واٹ)، پنجو (پندرہ لاکھ)، سکردو (چودہ لاکھ)، ڈھوک پٹھان (ساڑھے بارہ لاکھ)، کالا باغ (بارہ لاکھ)، کنہار (دس لاکھ)، منگلا (دس لاکھ)، مندر (آٹھ لاکھ)، مکھڈ (سات لاکھ)، کلنجی (Kalangai ؟) (سات لاکھ)، خان پور (چھے لاکھ)، چشمہ (پانچ لاکھ)، خزانہ (تین لاکھ)، دریاے گومل (ایک لاکھ تیس ہزار) ۔

اگر سوختنیات اسی طرح گراں قیمت رہیں تو تھرمل بجلی گھروں کے مقابلے میں برقابی بجلی گھر قائم کرنے پر خرچ کم ہوگا ۔ ترقیاتی منصوبے کے مطابق ۲۶۷۸۰۰ کیلو واٹ ہائیڈ برقابی قوت کی موجودہ پیداوار ۱۹۷۵ء تک سہ چند ہو جائے گی ۔

مغربی پاکستان کے اہم بجلی گھر مندرجۂ ذیل ہیں : (۱) ملتان بجلی گھر : ملتان میں پیران غیب کے مقام پر ۱۹۶۰ء میں ایک بجلی گھر مکمل ہوا، جہاں سوئی گیس سے ایک لاکھ تیس ہزار کیلو واٹ بجلی پیدا کی جاتی ہے ۔ اس میں توسیع کا کام ۱۹۶۳ء میں مکمل ہوا جب دو اور ٹربائنیں (Turbines) لگائی گئیں، جن میں سے ہر ایک کی استعداد پینسٹھ ہزار کیلوواٹ کی ہے؛ (۲) موبائل گیس ٹربائنز Mobile Gas turbines : منگلا بجلی گھر مکمل ہونے سے قبل لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اگست ۱۹۶۶ء میں شاہدرہ (لاہور) میں دو mobile gas-fired یونٹ قائم کیے گئے، جن سے کل چھبیس ہزار کیلوواٹ بجلی پیدا ہو سکتی ہے؛ (۳) کوئٹہ تھرمل پاور اسٹیشن : یہ بجلی گھر، جو کوئٹہ اور قلات ڈویژنوں کو پندرہ ہزار کیلوواٹ بجلی فراہم کرتا ہے، دو سٹیم ۔ ٹربو یونٹوں (steam-turbo units) پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر ایک ۷۵۰۰ کیلوواٹ بجلی پیدا کرتا ہے ۔ ان میں گھٹیا درجے کا دیسی کوئلا استعمال کیا جاتا ہے، جو کوئٹے میں پایا جاتا ہے ۔ اس بجلی گھر کی ساخت کی ایک خصوصیت تبرید کا

خاص طریقہ ہے جسے Dry Cooling کہتے ہیں۔ اس میں ٹھنڈا کرنے والا پانی ایک بند چکر میں بار بار استعمال کیا جاتا ہے تاکہ پانی زیادہ خرچ نہ ہو، جس کی بلوچستان میں کمی ہے۔ یہاں سے کوئلے کی کانوں، آبپاشی کے ٹیوب ویلوں اور کوئٹہ شہر کے صنعتی اور گھریلو استعمال کے لیے بجلی فراہم کی جاتی ہے۔ یہ بجلی گھر ۱۳ ستمبر ۱۹۶۴ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچا؛ (۴) حیدر آباد تھرمل پاور سٹیشن: یہ بجلی گھر، جو ساڑھے سات سات ہزار کیلوواٹ کے دو سٹیم یونٹوں اور ۵۷۰۰ کیلوواٹ کی ایک گیس ٹربائن پر مشتمل ہے، ۱۹۶۱ء کے نصف اول میں مکمل ہوا۔ اس منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ زیریں سندھ کے علاقے میں بجلی کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بیس ہزار کیلوواٹ کا ایک تھرمل بجلی گھر مع سلسلہ ہائے ترسیل و تقسیم، قائم کیا جائے۔ ذیلی بجلی گھر ٹنڈو آدم، میرپور خاص، ٹنڈو محمد خان، ٹنڈو اللہ یار، نواب شاہ، بدین اور ٹنڈو غلام علی وغیرہ میں قائم کیے گئے ہیں۔ ان بجلی گھروں سے زیریں سندھ کے علاقے کے بیس قصبوں میں بجلی مہیا کی جا رہی ہے۔ یہ منصوبہ جون ۱۹۶۴ء میں مکمل ہوا۔ اس کے توسیعی منصوبے میں پندرہ ہزار کیلوواٹ کے ایک سٹیم پلانٹ اور آٹھ ہزار کیلوواٹ کے ایک اضافی یونٹ کا قیام شامل ہے۔ اس طرح اس بجلی گھر کی کل گنجائش ۴۳۷۰۰ کیلوواٹ ہو گئی ہے؛ (۵) سکھر تھرمل پاور پراجیکٹ: یہ منصوبہ ۱۹۶۵ء میں مکمل ہوا۔ مرکزی تھرمل بجلی گھر کی ابتدائی استعداد پچیس ہزار کیلوواٹ ہے۔ اس سے شمالی سندھ کو، جس میں شکارپور، جیکب آباد، لاڑکانہ، ہری پور، گمبٹ اور نرنارہ کا علاقہ شامل ہے، بجلی مہیا ہوتی ہے۔ سیم و تھور کی روک تھام کے سلسلے میں بجلی کی روز افزوں ضرورت کے پیش نظر اس میں توسیع کی گئی ہے؛ (۶) لائل پور سٹیم پاور اسٹیشن: یہ زیر تکمیل بجلی گھر دو سٹیم ٹربائن یونٹوں پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر ایک چھیاسٹھ ہزار کیلو واٹ کا ہے۔ اس بجلی گھر میں بھی سوئی گیس استعمال کی جاتی ہے؛ (۷) گوجرانوالہ ہائیڈل سٹیشن: یہ بجلی گھر نندی پور کے قریب نہر اپر چناب پر واقع ہے اور مارچ ۱۹۶۳ء میں مکمل ہوا۔ اس کی کل استعداد تیرہ ہزار کیلو واٹ ہے۔ ابتدا میں اس سے مقصود SCARP کے ٹیوب ویلوں کو بجلی فراہم کرنا تھا، لیکن بعد میں اسے نیشنل گرڈ سے مربوط کر دیا گیا؛ (۸) شادی وال ہائیڈل سٹیشن: اس بجلی گھر میں نہر اپر جہلم پر تئیس فٹ کی ایک مصنوعی آبشار کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس بجلی گھر میں دو جنریٹر (generator) ہیں، جن میں سے ہر ایک ۷۶۵۰ کیلو واٹ کی استعداد رکھتا ہے۔ اسے گجرات میں واقع نیشنل گرڈ سے مربوط کیا گیا ہے؛ (۹) چیچو کی ملیاں ہائیڈل سٹیشن: یہاں بجلی پیدا کرنے کے لیے نہر اپر چناب پر بائیس فٹ کی ایک مصنوعی آبشار کو استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لاہور سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ بوقت ضرورت یہاں سے لاہور کو بجلی مہیا کی جا سکتی ہے؛ (۱۰) وارسک پاور سٹیشن: اس بجلی گھر میں، جو ۱۹۶۰ء میں مکمل ہوا، چالیس چالیس ہزار کیلو واٹ کے چار جنریٹر لگے ہیں۔ یہ پشاور کے شمال مغرب میں بیس میل کے فاصلے پر دریائے کابل پر تعمیر ہونے والے کثیر المقاصد پراجیکٹ کا ایک حصہ ہے۔ بڑا بند تقریباً ۷۵۰ فٹ لمبا، ۲۳۵ فٹ اونچا اور بنیاد میں ۲۱۰ فٹ چوڑا ہے۔ مزید جنریٹر لگنے سے اس کی استعداد ساٹھ ہزار کیلو واٹ سے بڑھ کر دو لاکھ چالیس ہزار کیلوواٹ ہو جائے گی۔

۱۱ - نقل و حمل اور رسل و رسائل

پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے، جس کے دو حصوں کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ حائل ہے، نقل و حمل اور رسل و رسائل کا ایک اچھا نظام بہت مشکل بھی ہے اور اشد ضروری بھی؛ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد اس نظام کو بہتر بنانے اور اس میں توسیع کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس وقت کوئی ۶ لاکھ ۷۷ ہزار اشخاص اس نظام سے وابستہ ہیں اور مجموعی قومی پیداوار کا ۶ فی صد اس سے حاصل ہوتا ہے۔ تیسرے پنج سالہ منصوبہ میں اس کی ترقی کو صنعتوں اور برقیات و معدنیات کے بعد سب سے زیادہ اہمیت دی گئی اور اس کے لیے کل رقم کا ۱۸٫۲ فی صد مخصوص کیا گیا۔

(الف) نقل و حمل

ملک میں نقل و حمل کے پانچ اہم ذرائع ہیں: ریلوے، سڑکیں، سمندر، دریا اور ہوا۔ ہوائی ذریعۂ سفر ملک کے دونوں حصوں کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کے لیے خاص طور پر اہم ہے۔

(۱) ریلوے: ریلوے نقل و حمل کا سب سے بڑا ذریعہ ہے کیونکہ اس کا جال بہت وسیع ہے، اس کے ذریعے لمبا سفر سستا رہتا ہے، وقت کم صرف ہوتا ہے اور بھاری باربرداری بآسانی کی جاسکتی ہے۔ ریلوے کی اقتصادی اہمیت بھی بہت ہے۔ یہ غلے کو ملک میں دوبارہ تقسیم کرنے، خام مال کو صنعتی مراکز تک لے جانے اور مصنوعات کو ملک کے مختلف حصوں تک پہنچانے کے لیے بہت مفید و ممد ہے۔

مغربی پاکستان میں ۱۰۵ میل لمبی پہلی پٹڑی مئی ۱۸۶۱ء میں اور مشرقی پاکستان میں تینتیس میل لمبی پٹڑی اس کے ڈیڑھ سال بعد بچھائی گئی۔ بر صغیر کی تقسیم پر پاکستان کے حصے میں ۴۹۹۹ میل راستہ مغربی پاکستان میں اور ۱۶۱۸ میل راستہ مشرقی پاکستان میں آیا۔ ۱۹۴۷ء میں ان ریلوے پٹڑیوں کے نام نارتھ ویسٹرن ریلوے اور ایسٹرن بنگال ریلوے سے بدل کر بالترتیب پاکستان ویسٹرن ریلوے (PWR) اور پاکستان ایسٹرن ریلوے (PER) رکھ دیے گئے۔ پاکستان میں ریلوے میلانہ ۱۰۹ میل فی سو مربع میل ہے، جو بہت کم ہے۔

تنظیم: ریلوے کی ملکیت از انتظام حکومت کے پاس ہے۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں ریلوے کا شعبہ مرکز نے صوبوں کے سپرد کر کے دونوں صوبوں میں ایک ایک ریلوے بورڈ قائم کر دیا، جو تمام انتظامی معاملات میں خود مختار ہے۔ بورڈ کا چیئرمین ریلوے انتظامیہ کا سربراہ ہے۔ عملی مقاصد کے لیے ریلوے کو آٹھ ڈویژنوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے: دو ڈویژنیں مشرقی پاکستان میں اور چھے مغربی پاکستان میں۔

۱۹۶۵ - ۱۹۶۶ء کے مالی سال کے آخر تک ریلوے پر ۲ ارب ۲۷ کروڑ ۲۶ لاکھ روپیہ صرف کیا گیا (مرکزی حکومت نے ایک ارب ۸۸ کروڑ ۴۸ لاکھ اور صوبائی حکومتوں نے ۳۸ کروڑ ۸۷ لاکھ روپیہ)۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اپنی سرمایہ کاری پر مقررہ رقوم واپس وصول کرتی ہیں۔ ریلوے اپنے بجٹ خود تیار کرتی ہیں، جو صوبائی حکومتوں کے عام بجٹوں کا حصہ نہیں ہوتے۔ صوبائی حکومتوں کے پاس آنے سے پہلے ریلوے کے شعبے منافع پر چل رہے تھے۔ اس کے بعد یکم جولائی ۱۹۶۲ء تا ۳۰ جون ۱۹۶۶ء کی مدت کے دوران میں پاکستان ویسٹرن ریلوے نے کل ۱۸ کروڑ ۲ لاکھ روپے کی بچت دکھائی اور پاکستان ایسٹرن ریلوے نے ۴ کروڑ ۲۲ لاکھ روپے کا

خسارہ دکھایا؛ تاہم ۱۹۶۶-۱۹۶۷ء میں پاکستان ایسٹرن ریلوے سے ۲۴ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی اور ۲۲ کروڑ ۸۲ لاکھ روپیہ خرچ ہوا اور پاکستان ویسٹرن ریلوے سے ۶۳ کروڑ ایک لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی اور ۵۵ کروڑ ۱۱ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔

قیامِ پاکستان کے وقت پاکستان ریلوے کی حالت نہایت خستہ تھی، پٹڑیاں بہت پرانی ہونے، نیز دوسری جنگ عظیم میں زیادہ استعمال ہونے کی وجہ سے خراب ہو چکی تھیں؛ چنانچہ پہلے اور دوسرے پنج سالہ منصوبوں میں ریلوے کو بہتر بنانے کی طرف بہت توجہ کی گئی۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ریلوے کے لیے ۲ ارب ۱۴ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ (پاکستان ویسٹرن ریلوے کےلیے ڈیڑھ ارب اور پاکستان ایسٹرن ریلوے کے لیے ساڑھے اکانوے کروڑ) مخصوص کیا گیا۔ ریلوے کی اصلاح و ترقی کے لیے جو اقدامات کیے گئے ہیں ان میں مندرجۂ ذیل قابل ذکر ہیں: نئی پٹڑیاں بچھانا اور پرانی پٹڑیوں کی مرمت؛ نئے انجنوں، مسافر گاڑیوں اور مال گاڑیوں کی خرید؛ سگنلوں کا جدید نظام؛ پلوں کی مرمت اور استحکام؛ ریلوے سٹیشنوں کی پرانی عمارتوں کی جگہ نئی عمارتوں، نیز جدید طرز کے پلیٹ فارموں اور آرام گاہوں کی تعمیر؛ ٹھنڈے پانی اور پنکھوں کا انتظام وغیرہ۔ ریلوے کی پٹڑیاں زیادہ تر میدانی علاقوں کے زیادہ گنجان آباد حصوں میں بچھائی گئی ہیں۔ پاکستان ایسٹرن ریلوے کے بڑے راستے یہ ہیں: ڈھاکہ ↔ چٹاگانگ (۱۹۸ میل)؛ اکھوڑا ↔ سلہٹ (۱۰۶ء۲۵ میل)؛ ڈھاکہ ↔ درسنہ (۹۳ میل، جس میں سٹیمر سروس کا میلانہ بھی شامل ہے)؛ پاکستان ویسٹرن ریلوے کے بڑے راستے یہ ہیں: پشاور ↔ کراچی (۱۰۴۵ میل)؛ کراچی ↔ کوئٹہ (۵۲۳ میل)؛ روہڑی ↔ چمن (۳۲۷ میل) اور لاہور ↔ ماری انڈس (۲۳۰ میل)۔

ریلوے ملازمین کی کل تعداد ایک لاکھ ۹۰ ہزار ہے، جن میں ۸۶ فی صد مغربی پاکستان میں اور ۳۲ فی صد مشرقی پاکستان میں ہیں۔ ۶۰ فی صد ملازمین کا تعلق شعبۂ انجینئرنگ سے ہے اور ۳۶ فی صد کا ٹریفک سے ہے۔ نئے ملازمین کی تربیت اور پرانے ملازمین کے ریفریشر کورسز کے لیے دونوں حصوں میں تربیت گاہیں قائم کی گئی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں لالمنیرہاٹ سکول سے آٹھ سو اور مغربی پاکستان میں لاہور والٹن ٹریننگ سکول سے دو ہزار دو سو افراد سالانہ ریلوے کے مختلف شعبوں کے لیے تربیت پاتے ہیں۔ والٹن سکول میں پاکستان کے علاوہ مشرق اوسط، مشرق بعید اور جنوب مشرقی ایشیا کے لوگ بھی تربیت پانے آتے ہیں۔ ریلوے ملازمین کو رہائش کے علاوہ طبی اور تعلیمی سہولتیں بھی فراہم کی جاتی ہیں۔

(۲) سڑکیں: مسافروں اور سامان دونوں کی نقل و حمل کے لیے ریلوے کی طرح شارعی نقل و حمل بھی بہت اہم ہے اور کئی اعتبار سے ریلوے کی بہ نسبت زیادہ سستی اور آرام دہ بھی ہے۔ دیہات سے منڈیوں تک زرعی پیداوار، کارخانوں تک خام مال اور تمام شہروں اور دیہاتی علاقوں میں مصنوعات زیادہ‌تر اسی ذریعے سے لے جائی جاتی ہیں۔

ابتدا میں پاکستان میں بیشتر سڑکیں کچی تھیں اور بارش کے موسم میں استعمال نہیں کی جا سکتی تھیں۔ اس وقت مشرقی پاکستان میں تارکول والی پختہ سڑکیں تقریباً بالکل نہیں تھیں۔ ہمہ موسمی سڑکوں کی کل لمبائی بمشکل ۲۳۰ میل تھی اور اس سے صوبے کی اقتصادی حالت بہت بری طرح متاثر ہوتی تھی؛ چنانچہ اس صوبے میں

سڑکوں کی ترقی کا کام از سر نو شروع کیا گیا ۔ پہلے پنج سالہ منصوبے میں اس صوبے میں سڑکوں کی تعمیر و ترقی کے لیے ساڑھے سولہ کروڑ روپے مخصوص کیے گئے اور ۵۷۰ میل لمبی ہمہ موسمی سڑکیں تعمیر کی گئیں ۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں ۹۶۸ میل لمبی ہمہ موسمی سڑکیں تعمیر کی گئیں ۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ۱۲۸۳ میل لمبی نئی سڑکوں کی تعمیر اور ۳۰۰ میل لمبی سڑکوں کی مرمت شامل تھی اور اس کے لیے ایک ارب دس کروڑ روپے مخصوص کیے گئے - ۱۹۶۵ - ۱۹۶۷ء میں ۲۱۷ میل لمبی سڑکیں مزید تعمیر ہوئیں اور یوں ۱۹۶۷ء کے آخر تک سڑکوں کی کل لمبائی دو ہزار میل ہو گئی ۔ مشرقی پاکستان میں پانچ بڑی شاہراہیں بھی مکمل کی جا چکی ہیں ۔ اصل میں مشکل یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کو دریاؤں نے کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر رکھا ہے، جس کی وجہ سے مسلسل لمبی سڑکیں تعمیر کرنا بہت دشوار ہے ۔ مشرقی پاکستان میں سڑکوں کے کم ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہاں آبی نقل و حمل کا ذریعہ بھی استعمال کیا جاتا ہے جبکہ مغربی پاکستان میں ریلوے کے علاوہ صرف سڑکیں ہی ذریعۂ نقل و حمل ہیں ۔ مغربی پاکستان میں سے برِ صغیر کی قدیم ترین سڑک شارع عظیم (Grand Trunk Road) گزرتی ہے، جسے سولھویں صدی عیسوی میں شیر شاہ سوری نے تعمیر کرایا تھا ۔ بدیسی حکمرانوں نے مغربی پاکستان میں سڑکوں کی تعمیر سے دانستہ طور پر بے توجہی برتی اور محض اپنے فوجی یا تجارتی مقاصد کے تحت بعض حصوں میں سڑکیں تعمیر کرائیں ۔ قیام پاکستان کے وقت مغربی پاکستان میں سڑکوں کی کل لمبائی ۱۳۷۸۱ میل تھی (۵۰۵۰ میل ہمہ موسمی اور ۸۷۳۱ میل کمتر قسم کی) ۔ ان میں سے بیشتر سڑکیں صوبۂ پنجاب اور صوبۂ سرحد میں تھیں ۔ یہ سڑکیں کم چوڑی تھیں اور دوسری جنگ عظیم میں زیادہ استعمال ہونے کی وجہ سے بہت خراب حالت میں تھیں؛ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد ایک طرف تو نئی سڑکیں تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی اور دوسری طرف موجودہ سڑکوں کی مرمت کی طرف توجہ کی گئی ۔ پہلے پنج سالہ منصوبے کے آخر تک ۱۹۱۷۶ میل لمبی سڑکیں بن چکی تھیں، جن میں ۸۷۷۲ میل لمبی سڑکیں ہمہ موسمی تھیں ۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں پونے تین کروڑ روپیہ سڑکوں کی تعمیر کے لیے مخصوص کیا گیا اور اس کے ختم ہونے پر سڑکوں کی لمبائی مجموعی طور پر ۲۱۷۵۸ ہو گئی (۹۹۷۱ میل ہمہ موسمی اور ۱۱۷۸۷ میل کمتر قسم کی) ۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں مغربی پاکستان میں ۱۳۲۵ میل لمبی سڑکوں کی تعمیر اور ۱۱۰۰ میل لمبی سڑکوں کی مرمت (جس میں ۹۰۰ میل لمبی کراچی سے کوئٹہ سے زاہدان سڑک بھی شامل ہے) کے لیے نوّے کروڑ روپے مخصوص کیے گئے ۔ زمانۂ حال کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام اہم سڑکوں کی اصلاح کی جا رہی ہے ۔ کراچی اور حیدر آباد کے درمیان نئی شاہراہ بن جانے سے ان دونوں شہروں کا درمیانی فاصلہ تیس میل کم ہو گیا ہے ۔ لاہور اور ملتان، لاہور اور لائل پور اور شیخوپورہ اور سرگودھا کے درمیان بھی اسی قسم کی شاہراہیں تعمیر ہو رہی ہیں۔

۱۹۳۹ء میں ایک سنٹرل روڈ فنڈ قائم کیا گیا، جس کا ۸۵ فی صد سڑکوں اور پلوں کی تعمیر پر اور ۱۵ فی صد تحقیقی کاموں پر صرف ہوتا ہے ۔

ملکی آبی راستے : ملکی آبی راستے مشرقی پاکستان میں نقل و حمل کا ایک بڑا ذریعہ ہیں اور بعض حصوں میں خصوصاً سیلاب کے موسم میں

یہ آمد و رفت کا واحد ذریعہ ہیں۔ یہاں کے دریاؤں پر میکانکی نقل و حمل ۲۲۰۰ سٹیمروں، موٹر کشتیوں اور لانچوں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ تقریباً تین لاکھ دیسی کشتیاں بھی کام کر رہی ہیں۔

۱۹۵۸ء کے بعد سے اندرون ملک آبی نقل و حمل کا شعبہ مکمل طور پر صوبائی حکومت کے ماتحت ہے۔ اس سال ایک خود مختار ادارہ Inland Water Transport Authority (IWTA=) قائم کیا گیا۔ پانچ ارکان پر مشتمل ایک بورڈ اس کا ذمے دار ہے۔ یہ ادارہ سات مختلف شعبوں پر مشتمل ہے اور اس کے قیام کے بعد آبی نقل و حمل میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے۔ ڈھاکہ، نرائن گنج، چاند پور، باریسال اور کھلنا کے مقامات پر پانچ بڑی دریائی بندرگاہیں ہیں۔ مذکورۂ بالا ادارے نے ان بندرگاہوں کو جدید طرز کی بندرگاہوں کے مطابق بنایا ہے۔ ان کے علاوہ لانچوں کے لیے ۱۳۰۷ گھاٹ ہیں۔ ہر سال دو کروڑ مسافر سفر کرتے ہیں اور چوبیس لاکھ ٹن سامان لایا اور لے جایا جاتا ہے۔ ۱۹۶۵ - ۱۹۶۶ء میں IWTA کی کل آمدنی ۹۰ لاکھ ۲۰ ہزار روپے تھی۔

ایسٹ پاکستان شپنگ کارپوریشن (EPSC) کا قیام مشرقی پاکستان کی آبی نقل و حمل کو بہتر بنانے کے لیے ایک اہم اقدام تھا۔ اندرون ملک میں اس کے چھوٹے جہاز (ferries) چٹاگانگ اور کاکس بازار، نیز چٹاگانگ اور کھلنا کے درمیان چلتے ہیں۔ ان کی بدولت مشرقی پاکستان کے بعض علاقوں کو پہلی بار حمل و نقل کی سہولت میسر آئی ہے۔

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان بحری راستے سے ہونے والی جملہ تجارت اور پاکستانی حاجیوں کی آمد و رفت بھی پاکستانی بحری جہازوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں پاکستانی بحری جہازوں کی ترسیل کے راستے یہ ہیں: پاکستان تا برطانیہ، پاکستان تا امریکہ، پاکستان تا مشرقی افریقہ، پاکستان تا بحیرۂ بالٹک، پاکستان تا سنگاپور، ہانگ کانگ، چین، جاپان، پاکستان تا خلیج فارس، پاکستان (مشرقی) تا برما اور پاکستان سے بحیرۂ احمر کی بندرگاہوں تک۔

بحری جہاز سازی: کراچی شپ یارڈ اینڈ انجینئرنگ ورکس، پاکستان اور ہمسایہ ممالک کے لیے جہازوں کی مرمت اور چھوٹے جہازوں کی تعمیر کرتا ہے۔ اب اس نے بڑے بحری جہاز بھی تعمیر کرنا شروع کر دیے ہیں۔ کھلنا اور نرائن گنج کے جہاز سازی کے کارخانوں میں بھی جہازوں کی مرمت کی سہولتیں موجود ہیں (نیز دیکھیے بذیل "صنعت و حرفت")۔

بندرگاہیں: اس وقت پاکستان میں کراچی، چٹاگانگ اور چلنا کے مقامات پر تین بڑی بندرگاہیں ہیں۔ مغربی پاکستان کی واحد اور پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ کراچی ہے۔ اس کی لنگرگاہ کا رقبہ ۲۳۷۳ ایکڑ ہے۔ پوری بندرگاہ کے انتظامی اختیارات کراچی پورٹ ٹرسٹ کے پاس ہیں، جس کے گیارہ ارکان ہیں۔ اس میں ایک اعلیٰ اور ترقی یافتہ بندرگاہ کی تمام سہولتیں موجود ہیں۔ ۱۹۶۶ - ۱۹۶۷ء میں ۹۷۷۶۸ مسافروں نے کراچی سے سفر کیا۔ ۱۹۶۷ - ۱۹۶۸ء میں ۸۶ لاکھ ۶۳ ہزار ٹن سامان یہاں اتارا اور لادا گیا۔ مشرقی پاکستان کی بندرگاہ چٹاگانگ دریاے کرنا فلی کے دہانے سے ۹ میل دور خلیج بنگال کے شمال مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ اس بندرگاہ کے انتظامی اختیارات بھی ایک پورٹ ٹرسٹ کے سپرد ہیں۔ ۱۹۶۶ - ۱۹۶۷ء میں یہاں سے گزرنے والے مسافروں کی کل تعداد ۶۹۱۰۲ تھی اور یہاں ساڑھے چالیس لاکھ ٹن سامان اتارا یا چڑھایا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں چٹاگانگ

کی بندرگاہ کا بوجھ کم کرنے کے لیے چلنا سے نو میل جنوب میں ایک لنگرگاہ قائم کی گئی اور تب سے یہ لنگرگاہ تسلی بخش طور پر کام کر رہی ہے۔ اب اس میں ترقی و توسیع کی جا رہی ہے اور ۱۹۷۰ء کے آخر تک یہ ایک مکمل بندرگاہ بن جائے گی۔

شہری ہوا بازی: قیام پاکستان کے وقت کراچی کا ہوائی اڈا پاکستان کا واحد بین الاقوامی ہوائی اڈا تھا اور ''رن وے'' اور عملے سے لے کر ہوائی جہاز تک سب کی حالت ناگفتہ بہ تھی، لیکن اس کے بعد پاکستان نے ملکی ہوابازی میں بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔

پاکستان انٹر نیشنل ایئر لائنز (PIA)، جو ۱۹۵۶ء میں قائم ہوئی، ہوائی نقل و حمل کے لیے پاکستان کی واحد ایجنسی ہے۔ پی آئی اے کے قیام کے ایک سال بعد اورینٹ ایئرویز Orient Airways کو، جس کا دفتر قیام پاکستان سے قبل کلکتے میں تھا اور بعد ازاں کراچی میں منتقل کر لیا گیا تھا، اس میں مدغم کر دیا گیا۔ پی۔ آئی۔ اے ایک خود اختیار عوامی کارپوریشن ہے، جس کا انتظام ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کے سپرد ہے۔ پی۔ آئی۔ اے کا صدر ملکی ہوابازی کے شعبوں اور محکمۂ سیر و سیاحت کا بھی ناظم اعلی ہے۔

اندرون ملک کی تمام پروازوں، نیز پاکستان سے شروع ہونے والی تمام بین الاقوامی ہوائی پروازوں کی ذمے دار پی۔ آئی۔ اے ہے۔ یہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے تمام اہم شہروں کو آپس میں ملاتی ہے، جن میں گلگت، چترال اور سکردو جیسے دور افتادہ اور دشوار گزار راستوں پر واقع مقامات بھی شامل ہیں۔ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان اس کی پروازیں روزانہ ہوتی ہیں اور اس طرح یہ راولپنڈی، لاہور اور کراچی کو ڈھاکے سے ملاتی ہیں۔ بین الاقوامی راستوں پر اس کی پرواز کے تحت ایشیا، افریقہ اور یورپ کے بر اعظم آتے ہیں۔ لندن کے لیے پرواز اب براستہ کابل، ماسکو اور فرانکفرٹ بھی ہوتی ہے۔ ایک سروس ڈھاکے کو کینٹن اور شنگھائی سے ملاتی ہے۔ اب پی آئی اے کی جٹ سروسز Jet Services مغرب میں تہران، دہران، بغداد، کویت، دوبئی، دوحہ، بیروت، استانبول، روما، جنیوا، ماسکو، فرانکفرٹ، لنڈن، نیروبی اور قاہرہ اور مشرق میں کینٹن، شنگھائی، رنگون اور بنکاک تک ہوتی ہیں۔ ڈھاکے سے نیپال اور برما جانے والے جہاز ''فوکر'' قسم کے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں تیز اور ارزاں نقل و حمل کے لیے پی۔ آئی۔ اے نے ایئر بس سروسز شروع کی ہیں۔ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے بھی سفر کی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ہوائی سروس کے ذریعے ان مقامات کو ملا دیا گیا ہے: ڈھاکہ، کھلنا، فریدپور، چاندپور، بیگم گنج، باریسال، بھولا، ہتیہ، سندویپ، چٹاگانگ، سراج گنج، بوگرہ، رنگپور، دیناج پور، اشوروی، سلہٹ، کاکس بازار، جیسور، کومیلا، کشتیا اور راجشاہی۔ اس طرح مغربی پاکستان میں Feeder Services شروع کی گئی ہیں، جو دور دراز کے علاقوں کو بڑے شہروں سے ملاتی ہیں۔

پاکستان وارسا کنونشن Warsaw Convention (۱۹۲۹ء) اور ہیگ پروٹوکول Hague Protocol (۱۹۵۵ء) کے علاوہ مانٹریال کی بین الاقوامی تنظیم برائے شہری ہوا بازی International Civil Aviation) (Organization اور لنڈن کی دولت مشترکہ ایئر ٹرانسپورٹ کونسل Common Wealth Air Transport) (Council کا رکن ہے۔ جن ممالک سے پاکستان نے ہوابازی کی بابت معاہدے کیے ہیں ان کے نام یہ ہیں: افغانستان، آسٹریلیا، بلجیم، کینیڈا، سیلون، چین، گینیا، تنزانیا، یوگنڈا، حبشہ، فرانس، مغربی جرمنی،

بھارت، انڈونیشیا، ایران، عراق، اٹلی، جاپان، کویت، لبنان، نیدر لینڈ، فلپائن، پولینڈ، پرتگال، ناروے، سویڈن، ڈنمارک، سوئٹزر لینڈ، شام، ترکی، مصر، برطانیہ، امریکہ اور روس۔

ہوائی اڈوں کی ترقی : قیام پاکستان کے وقت پاکستان میں کراچی کا صرف ایک ہی بڑا ہوائی اڈا تھا، لیکن اب متعدد ہوائی اڈے تعمیر ہو چکے ہیں۔ ڈھاکے میں ایک نیا بین الاقوامی جٹ ہوائی اڈا زیر تعمیر ہے۔ لاہور، راولپنڈی اور چٹاگانگ کے مقامات پر جٹ ہوائی اڈے تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ حیدر آباد میں ایک طیارہ گاہ کام کر رہی ہے۔ پی آئی اے کی فیڈر سروسز کے لیے سکھر، رحیم یار خان، پسنی، گوادر وغیرہ کی طیارہ گاہوں کی تعمیر زیر تجویز ہے۔ مشرقی پاکستان میں پی آئی اے کی ہیلی کاپٹر سروسز کے لیے heliports تعمیر کی گئی ہیں۔ لائلپور، چترال، کومیلا، چٹاگانگ اور گلگت کے مقامات پر موجودہ سہولتوں کو بہتر بنایا گیا ہے۔ کومیلا، سلہٹ اور اشوروی کی طیارہ گاہوں کے رن ویز کی تجدید کی گئی ہے۔ چک لالہ کا ہوائی اڈا بھی بہتر بنایا گیا ہے۔

مواصلات : نظام مواصلات، نیز اعانات ہوا نوردی کی فراہمی میں ترقی ہوابازی کی ترقی کے لیے اشد ضروری ہے۔ پچھلے چند سالوں میں اس طرف بڑی توجہ دی گئی ہے اور ایک اعلی درجے کا نظام مواصلات قائم کیا گیا ہے۔ ریڈیو مواصلات کی بدولت پاکستان ہوابازی کے دوسرے مراکز، یعنی لنڈن، قاہرہ، دمشق، بیروت، تہران، بحرین، قندھار، کابل، بمبئی، کولمبو، دہلی، کلکتہ، رنگون، اکیاب اور ماسکو سے بلا واسطہ مربوط ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کی تمام طیارہ گاہوں میں Inter-Tower مواصلات کا سلسلہ فراہم کیا گیا ہے۔ ۱۹۶۴ - ۱۹۶۵ء میں پی۔ آئی۔ اے کو تقریباً پانچ کروڑ روپے کا منافع ہوا تھا۔

(ب) رسل و رسائل

شعبۂ رسل و رسائل وزارت مواصلات کے ماتحت ہیں، جس کے ساتھ ڈاک، ٹیلیفون اور تار کی نظامتیں (Directorates) ملحق ہیں۔ ہر نظامت کا سربراہ ڈائریکٹر جنرل ہے۔ ان محکموں میں چالیس ہزار اشخاص کل وقتی اور سولہ ہزار اشخاص جز وقتی ملازم ہیں۔

محکمۂ ڈاک : ڈاک کی عام سروسز کے علاوہ یہ محکمہ مندرجۂ ذیل خدمات بھی سر انجام دیتا ہے : بینک کاری کی سہولتیں، بیمۂ زندگی، آبکاری کی ٹکٹوں کی فروخت کے ذریعے محاصل آبکاری وصول کرنا، ریڈیو لائسنس جاری کرنا، سبکدوش فوجیوں میں پنشنوں کی تقسیم، ملیریا کُش دواؤں کی فروخت، وغیرہ۔

انتظامی مقاصد کے لیے ملک کو ڈاک کے چار حلقوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن میں سے مشرقی اور مغربی حلقے مشرقی پاکستان میں اور شمالی اور جنوبی حلقے مغربی پاکستان میں ہیں۔ حلقوں کے صدر دفاتر مشرقی پاکستان میں ڈھاکے اور کھلنا میں ہیں اور مغربی پاکستان میں لاہور اور کراچی میں۔ ان چار حلقوں کو متعدد ڈویژنوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن میں سے ہر ایک کا سربراہ ایک سپرنٹنڈنٹ ہے۔ محکمۂ ڈاک میں ایک تنظیم بیمۂ زندگی کے لیے بھی قائم کی گئی ہے، جس کا سربراہ Director, Life Insurance Organization ہے۔ ایک تنظیم ٹکٹوں سے متعلق ہے جس کا سربراہ Controller of Stamps ہے۔ اسی طرح ایک نظامت تربیت و تحقیق (Directorate of Postal Training and Research) بھی موجود ہے۔

جس کے سات علاقائی تربیتی مراکز ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ڈاک کے نظام میں ہر اعتبار سے توسیع و ترقی ہوئی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان میں ۳۷۳۶ ڈاک خانے کام کر رہے تھے۔ اب ان کی تعداد دگنی ہو چکی ہے (اضافے کی رفتار ایک نیا ڈاک خانہ یومیہ ہے۔ اس رفتار کی وجہ سے اب ہر ڈیڑھ ہزار نفوس کے حصے میں ایک ڈاک خانہ آتا ہے)۔ ڈاک کی ہر قسم کی آمد و رفت ۱۹۴۸ - ۱۹۴۹ء کے مقابلے میں ۱۲۵ فی صد بڑھ چکی ہے۔ اندرون ملک اور بیرون ملک ڈاک کی ترسیل کا کام اب ہوائی جہازوں سے بھی لیا جاتا ہے اور دنیا کے تقریباً تمام ممالک سے رابطہ قائم ہے۔ مشینوں کے بتدریج استعمال سے ڈاک کی ترسیل کی رفتار کو تیز کیا جا رہا ہے، مثلاً بعض بڑے ڈاک خانوں میں مہر ثبت کرنے اور خطوط چھانٹنے کے لیے خود کار اور بجلی سے چلنے والی مشینیں مہیا کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں عوام کو مزید سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے محکمۂ ڈاک نے بہت سے اقدامات کیے ہیں، مثلاً صنعتی اور تجارتی اہمیت کے اہم قصبوں میں ۱۹۵۱ء سے شبینہ سروس شروع کی گئی ہے (اب تقریباً ایک سو شبینہ ڈاک خانے کام کر رہے ہیں) اور دیہاتی علاقوں میں سفری ڈاک خانوں کا سلسلہ شروع کیا جا چکا ہے۔

پوسٹل لائف انشورنس ملک کی سب سے بڑی بیمہ تنظیم ہے۔ یہ تنظیم کوئی اسی برس پہلے شروع کی گئی تھی۔ ابتدا میں صرف ڈاک خانے کے ملازمین ہی اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، لیکن اب ہر شخص اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔

ڈاک خانے کی بینکاری سے مقصود زیادہ تر ان دیہاتی علاقوں کے لوگوں کو بینکاری کی سہولتیں بہم پہنچانا ہے جہاں دوسرے نجی بینک موجود نہیں ہیں۔ ڈاک خانے میں شرح منافع نسبۃً زیادہ ہے۔ مزید براں ڈاک خانہ انعامی بانڈ فروخت کرتا ہے اور ان کے انعامات کی ادائی بھی کرتا ہے۔

محکمۂ پیغام رسانی: ملک کے سلسلۂ پیغام رسانی کے انتظامی اختیارات کراچی میں قائم نظامت تار و ٹیلی فون (Directorate of Telegraph and Telephone) کے پاس ہیں؛ جس کے علاقائی دفاتر کراچی، لاہور اور ڈھاکے میں ہیں۔

قیام پاکستان کے وقت پاکستان میں سلسلۂ پیغام رسانی نہ ہونے کے برابر تھا، لیکن اس کے بعد پاکستان نے اس شعبے میں بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ اب تار، ٹیلیفون اور ٹیلی پرنٹر teleprinter کے نظام کے ذریعے پاکستان کا رابطہ دنیا کے بڑے بڑے شہروں سے قائم ہے۔ سلسلۂ پیغام رسانی کی ترقی و توسیع ان دو مقاصد کے تحت ہو رہی ہے: دیہاتی اور نسبۃً دور دراز علاقوں کو بڑے شہروں سے مربوط کرنا؛ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان حتی الامکان قریب ترین رابطہ قائم کرنا۔

ٹیلیگراف سروس: ۱۹۴۷ء میں کوئی الگ تار گھر نہ تھا۔ اب پاکستان میں تقریباً ۱۳۵۰ تار گھر موجود ہیں، اور ان کی تعداد میں برابر اضافہ کیا جا رہا ہے۔ سروس کو بہتر اور خود کار بنانے کے لیے ڈھاکے، کشتیا، کراچی، لاہور، راولپنڈی اور سکھر میں خود کار نظام قائم کیا جا رہا ہے۔ کراچی سے راولپنڈی؛ ڈھاکہ سے کھلنا اور ڈھاکہ سے کشتیا کے درمیان جدید مائکرو ویو microwave رابطے قائم کیے جا رہے ہیں۔ اب بین الاقوامی ریڈیو ٹیلیگراف سرکٹ Radio Telegraph Circuits کے ذریعے کراچی کا تہران، پیکنگ، ماسکو، پیرس، لندن، نیویارک، ایمسٹرڈم، ہمبرگ اور جدے کے غیر ملکی شہروں سے اور ڈھاکے کا لندن اور منیلا سے رابطہ قائم کیا گیا ہے۔ جدید مواصلات میں ٹیلی پرنٹر

ایکسچینج سروس ایک عظیم ترقی ہے۔ کراچی لاہور، ڈھاکہ، چٹاگانگ، راولپنڈی اور کھلنا میں Telex Exchanges قائم کیے گئے ہیں۔ کوئٹے اور قندھار کے درمیان بہتر سرکٹ فراہم کیے گئے ہیں۔ پشاور اور کابل، نیز چٹاگانگ اور رنگون کے مابین سرکٹوں کو بھی بہتر بنایا جا رہا ہے۔

پاکستان میں ٹیلیفونوں کی کل تعداد ڈیڑھ لاکھ سے زائد ہے، جبکہ شروع میں یہ تعداد صرف پندرہ ہزار تھی۔ اندرون ملک تمام شہروں اور قصبوں کے درمیان اور بیرون ملک مشرق اور مغرب کے تمام بڑے بڑے شہروں کے ساتھ ٹرنک سروس موجود ہے۔ اب ملک کے اہم شہروں کے درمیان براہ راست گفتگو ہو سکتی ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان مواصلات high frequency radio telephone circuits کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس وقت اس ذریعے سے کراچی اور راولپنڈی کا ڈھاکے سے، نیز پاکستان کا کئی بیرونی ممالک سے رابطہ قائم ہے۔ کراچی تا انقرہ براستۂ تہران ایک microwave radio relay system جون ۱۹۶۵ء میں مکمل ہوا۔ یہ sight radio relay System کی پہلی لائن تھی جس نے عمدہ قسم کی ٹیلیفون لائنز پر پاکستان کا ہمسایہ ممالک سے رابطہ قائم کیا۔ اس رابطے پر لنڈی کوتل کو ٹیلیفون کا ایک بلا واسطہ سلسلہ بھی مہیا کیا گیا ہے۔

اخراجات: تیسرے پنج سالہ منصوبے میں حمل و نقل اور رسل و رسائل کے لیے ۱۰ ارب ۶۱ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی تھی (۶ ارب ۷۱ کروڑ ۱۰ لاکھ روپیہ سرکاری شعبے کے لیے)۔ ۱۹۶۸-۱۹۶۹ء کے سالانہ ترقیاتی پروگرام میں اس شعبے پر جو رقم صرف ہوئی اس کی تفصیل یہ ہے:

مشرقی پاکستان:

ریلوے	۱۰ کروڑ ۳۰ لاکھ
سڑکیں	۱۴ کروڑ ۹۶ لاکھ
IWTA	۳ کروڑ ۸۴ لاکھ
EPSC، وغیرہ	۱ کروڑ ۷۸ لاکھ
میزان	۳۰ کروڑ ۸۸ لاکھ

مغربی پاکستان:

ریلوے	۳۰ کروڑ ۳۰ لاکھ
سڑکیں	۱۸ کروڑ ۴۷ لاکھ
میزان	۴۸ کروڑ ۷۷ لاکھ

مرکزی شعبے

بندرگاہیں و جہازسازی	۵ کروڑ
شہری ہوابازی	۹ کروڑ ۹۰ لاکھ
سڑکیں	۶ کروڑ ۹ لاکھ
تار، ٹیلی فون وغیرہ	۱۸ کروڑ ۵۰ لاکھ
نشریات، ڈاک وغیرہ	۶ کروڑ ۲۳ لاکھ
میزان	۴۵ کروڑ ۷۲ لاکھ

کل میزان: ایک ارب ۲۰ کروڑ ۳۷ لاکھ

۱۲۔ تجارت

بیرونی تجارت: قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی بیرونی تجارت زیادہ تر بھارت سے ہوتی تھی۔ صنعتی کارخانے اور معدنیات کے تمام معلومہ وسائل بھارت کے حصے میں چلے گئے تھے، اس لیے پاکستان مصنوعات اور معدنیات بھارت سے درآمد کرتا تھا اور بھارت کو خام مال — پٹسن اور روئی — برآمد کرتا تھا؛ لیکن ساڑھے سات ماہ کے بعد جب حالات جوں کے توں برقرار رکھنے کا معاہدہ (stand-still agreement) ختم ہوا تو بھارت نے پاکستان کے مال پر بہت زیادہ محاصل برآمد عائد کر دیے اور پاکستان کی کرنسی کو مقررہ شرح پر قبول کرنے

سے انکار کر دیا؛ چنانچہ پاکستان نے برطانیہ، مغربی یورپ، امریکہ، جاپان اور پھر اشتراکی ممالک، لاطینی امریکہ اور افریقہ کے کئی ملکوں سے تجارتی تعلقات قائم کر لیے۔ شروع کے کچھ سالوں میں پاکستان کی درآمدی پالیسی آزاد رہی، لیکن پھر اس کی تحدید کر دی گئی۔ جون ۱۹۵۰ء میں پھر آزاد پالیسی اختیار کر لی گئی اور بہت سی اشیا کو کھلے عام لائسنس (Open General Lincense = OGL) کے تحت رکھ دیا گیا۔ ۱۹۵۲ء کے آخر میں او۔جی۔ایل کو ختم کر دیا گیا۔ جولائی ۱۹۵۵ء میں فیصلہ کیا گیا کہ روپے کی قیمت میں تخفیف کر دی جائے تاکہ خام مال اور ملکی مصنوعات کی برآمد کو بڑھایا جا سکے؛ چنانچہ اگلے بارہ ماہ میں برآمدات میں ۵۲ فی صد کا اضافہ ہوا، لیکن پھر ۱۹۶۰ء تک ان میں کمی ہوتی چلی گئی۔ اشیائے سرمایہ، فاضل پرزوں اور صنعتی خام مال کی درآمد کے لیے حکومت کی آزاد حکمت عملی کی وجہ سے درآمدات ہمیشہ برآمدات سے زیادہ رہی ہیں۔ ملکی ضروریات کو پورا کرنے اور افراط زر کے دباؤ کو روکنے کے لیے اشیائے صرف بھی درآمد کی جاتی ہیں۔ ۱۹۶۱ء سے لے کر برآمدات میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔

درآمدات: اب اشیائے صرف کی جگہ اشیائے سرمایہ اور صنعتی خام مال نے لے لی ہے۔ ۱۹۵۲ء کے بعد سے غلہ بھی درآمدات کی فہرست میں شامل ہو گیا، تاہم ۱۹۶۰ تا ۱۹۷۰ء میں غیر ضروری اشیا کو نظر انداز کر کے اشیائے ترقی کی درآمد میں اضافہ کیا گیا ہے۔ درآمدات کی کیفیت یہ ہے: درآمدات پر صرف ہونے والے کل سرمائے کا پانچواں حصہ مشینری کی درآمد پر صرف کیا جاتا ہے؛ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں لوہے، فولاد اور غیر آہنی دھاتوں اور مصنوعات کی درآمد پر کل کا ۱۵ فی صد صرف کیا گیا (اس سلسلے میں ملکی ضروریات برابر بڑھ رہی ہیں؛ ۱۹۷۰ء تک ۱۵ لاکھ ٹن فولاد کی ضرورت ہو گی، جس کا بہت تھوڑا حصہ چٹاگانگ میں فولاد کے نئے قائم شدہ کارخانے سے پورا ہو سکے گا اور باقی درآمد کیا جائے گا)۔ تقریباً ۱۰ فی صد نقل و حمل کے سامان پر صرف کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں آلات اور بجلی کے سامان پر کل ۷ فی صد خرچ کیا گیا۔ سوختنیات — کوئلا، پٹرولیم — کی درآمد پر بھی بہت روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ ۱۹۵۷ء کے بعد غلّے کی درآمد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں غلّے کی درآمد پر کل کا ۷ فی صد صرف ہوا۔ اب ملک غلّے کی حد تک خود کفیل ہو رہا ہے۔

برآمدات: پاکستان کی بڑی برآمدات دو قسم کی ہیں: زرعی پیداوار اور مصنوعات۔ اول الذکر کی برآمد اب بھی کل کے نصف سے کہیں زیادہ ہے اور اس کا تین چوتھائی حصّہ پٹ سن اور کپاس پر مشتمل ہے۔ پاکستان کی برآمدات کی یہ کیفیت ہے:

پٹ سن: شروع کے سالوں میں تمام پٹ سن برآمد کر دی جاتی تھی، لیکن اب کل پیداوار کا ۴۰ فی صد گھریلو مصنوعات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں کل ۶۳ لاکھ ۶۰ ہزار گانٹھ پٹ سن پیدا ہوئی اور اس کی برآمد سے ۸۶ کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ کمایا گیا۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں کل ۲۳ لاکھ ۷۴ ہزار گانٹھ کپاس پیدا ہوئی اور ۲۸ کروڑ ۶۳ لاکھ روپے کی مالیت کی کپاس برآمد کی گئی، لیکن یہ مقدار گھریلو صنعت میں کپاس کے استعمال اور امریکہ میں اس کی وافر پیداوار کی وجہ سے سابقہ سال کی مقدار کی بہ نسبت کم ہے؛ خام اون کی سالانہ پیداوار تقریباً ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ پونڈ ہے اور اس کی برآمد سے ہونے والی اوسط سالانہ آمدنی چھے اور سات کروڑ کے

درمیان ہے؛ چمڑے اور کھالوں کی برآمد سے بھی تقریباً اتنی ہی آمدنی ہوتی ہے جتنی کہ خام اون کی برآمد سے۔ ۱۹۶۵ - ۱۹۶۶ء میں چھ کروڑ پونڈ چائے پیدا ہوئی اور نوے فی صد برطانیہ کو برآمد کی گئی۔ ملک میں چائے کا استعمال بڑھ جانے کی وجہ سے اب اس کی برآمد کم ہو رہی ہے۔ پچھلے سالوں میں مچھلی کی برآمد میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ توقع ہے کہ ۱۹۷۰ء میں ڈیڑھ کروڑ روپے کی مچھلی برآمد کی جائے گی۔ ۱۹۶۵ - ۱۹۶۶ء میں چاول کی برآمد سے ۱۳ کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ کمایا گیا۔ برآمد کی جانے والی مصنوعات میں اہم‌ترین پٹ سن اور کپاس کی مصنوعات ہیں۔ توقع ہے کہ ۱۹۷۰ء میں ان کی برآمد سے ۸۰ کروڑ روپیہ کمایا جائے گا۔ ۱۹۶۵ - ۱۹۶۶ء میں برآمدات سے کل ۲ ارب ۱۷ کروڑ ۷۷ لاکھ روپیہ کمایا گیا۔

تجارت کو فروغ دینے کے لیے حکومت کے اقدامات : پاکستان میں تجارت ایک نجی کاروبار ہے اور حکومت صرف ایسے اقدامات کرتی ہے جن سے تجارت کو صحت‌مند بنیادوں پر فروغ حاصل ہو۔ درآمدات کے لیے حکومت ہر سال اپنی لائسنس پالیسی کا اعلان کرتی ہے اور مختلف قسم کی مراعات دے کر برآمدات کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ بین الاقوامی طور پر دو طرفہ تجارت کی راہیں دریافت کرنے کی برابر کوشش کی جاتی ہے۔ حکومت کی درآمدی حکمت عملی کے پیش نظر یہ مقاصد رہے ہیں : صنعتی استعداد سے مکمل استفادہ؛ برآمدی صنعتوں کی توسیع اور استحکام؛ درآمدات کو رفتہ رفتہ ملکی مصنوعات سے بدلنا؛ ایسی اشیاے صرف و صنعت کی فراہمی کو بہتر بنانا جو ملک میں پیدا نہیں ہوتیں یا کم پیدا ہوتی ہیں، وغیرہ۔ ان مقاصد کو ۱۹۵۹ء کے بعد سے درآمدات کی بتدریج آزاد حکمت عملی کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس کی وجہ سے درآمدات کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا؛ چنانچہ ۱۹۶۶ - ۱۹۶۷ء کی درآمدی حکمت عملی میں چھیاسٹھ اشیا کو آزاد فہرست (Free List) کے تحت، چھیانوے اشیا کو قابل اجازہ فہرست (Lincensable List) کے تحت اور بعض اشیا کو بونس درآمدی فہرست (Bonus Import List) کے تحت رکھا گیا۔

حکومت نے ملکی صنعتوں کو تحفظ دینے کی ضرورت کو بھی تسلیم کیا ہے، لیکن ٹیرف کمیشن Tariff Commission تحفظ کے دعاوی کی اچھی طرح چھان بین کرتا ہے اور جب ایک مقررہ مدت کے لیے کسی صنعت کو تحفظ دیا جاتا ہے تو اس کی کارکردگی کی نگرانی کی جاتی ہے۔ حکومت نے برآمدات کو فروغ دینے کے لیے یہ اقدامات کیے ہیں : (۱) برآمدی بونس سکیم (Export Bonus Scheme) جنوری ۱۹۵۹ء میں شروع کی گئی۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ برآمد سے کمائے ہوے زر مبادلہ پر بونس دینے سے ملکی برآمدات کو فروغ دیا جائے۔ اس سکیم میں بنیادی برآمدات، یعنی خام پٹ سن، روئی، خام اون، چمڑا، کھالیں، چائے اور چاول کی بعض اقسام پہلے شامل نہ تھیں (اب ان اشیا کو بھی شامل کر دیا گیا ہے)۔ اس طرح حاصل شدہ بونس ووچروں کو مقررہ درآمدی اشیا (جن میں اشیاے صرف، صنعتی خام مال اور اشیاے سرمایہ شامل ہیں) میں سے کسی ایک یا زیادہ اشیا کو درآمد کرنے کے لائسنس میں تبدیل کیا جا سکتا ہے؛ (۲) برآمدی کریڈٹ گارنٹی سکیم (Export Credit Guarantee Scheme) مارچ ۱۹۶۲ء میں شروع کی گئی۔ اس کا مقصد برآمد کنندگان کو بعض ایسے مالی خطرات کے خلاف تحفظ دینا تھا جو عام طور پر بیمے کے تحت نہیں آتے۔ اس مقصد کے لیے پاکستان انشورنس

کارپوریشن Pakistan Insurance Corporation قائم کی گئی؛ تاہم یہ کارپوریشن تجارتی خطرات کے لیے صرف ۷۵ فی صد نقصان اور سیاسی خطرات کے لیے ۸۵ فی صد نقصان کو پورا کرتی ہے اور باقی خطرہ برآمد کنندہ کو خود برداشت کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ خریدار کے انتخاب میں پوری احتیاط سے کام لے؛ (۳) ادارۂ ترقی برآمدات (The Export Promotion Bureau) ۱۹۶۳ء میں قائم کیا گیا۔ اس کے فرائض یہ ہیں: یہ دیکھنا کہ آیا برآمد ہونے والی اشیا مقررہ معیار کے مطابق ہیں؛ مختلف اشیا کی معینہ عرصے میں زیادہ سے زیادہ برآمد کی حد متعین کرنا اور اسے حاصل کرنے کے لیے اقدامات کرنا؛ موجودہ صنعتوں کی برآمدی استعداد کو بڑھانے کے لیے سفارشات پیش کرنا؛ بیرونی تجارت کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے سفارشات پیش کرنا؛ بین الاقوامی تجارتی معاہدوں کے لیے گفت و شنید میں مدد دینا؛ تاجروں کو تجارتی مشورے دینا؛ بین الاقوامی تجارتی میلوں میں شرکت کرنا، وغیرہ؛ (۴) مجلس ترقی برآمدات (Export Promotion Council) مارچ ۱۹۶۴ء میں قائم کی گئی۔ اس کا کام ادارۂ ترقی برآمدات کو مشورے دینا اور اس سے تعاون کرنا ہے؛ (۵) برآمدی منڈیوں کا ترقیاتی فنڈ (Export Market Development Fund) جنوری ۱۹۶۶ء میں قائم کیا گیا، جس کا کام بیرونی منڈیوں کا جائزہ لینا ہے؛ (۶) پاکستان ہاؤس انٹرنیشنل لمیٹڈ Pakistan House International Ltd. اس کا مقصد پاکستان کے خواہش مند تاجروں کو ایک عام سروس ایجنسی مہیا کرنا ہے؛ (۷) لازمی درجہ بندی (Compulsory Grading): اس کا مقصد صنعت کاروں کو اس امر پر مجبور کرنا ہے کہ وہ برآمدی مصنوعات کو مقررہ معیار کے مطابق بنائیں؛ (۸) ڈیزائن کے مراکز (Design Centres): صنعت کاروں کو مصنوعات کے ڈیزائن اور معیار وغیرہ کے مطابق مشورے دینے کے لیے متعدد ڈیزائن سنٹر قائم کیے گئے ہیں؛ (۵) بعض اشیا کی برآمد میں اضافہ کرنے کے لیے خاص برآمدی کارپوریشنیں (Export Corporations) قائم کی گئی ہیں۔

بین الاقوامی تعلقات: بین الاقوامی تجارت میں پاکستان عام طور پر تجارت کی تحدیدی حکمت عملی اور بالخصوص ترقی پذیر ممالک کے خلاف ترقی یافتہ ممالک کی تحفظ کی حکمت عملیوں کی مخالفت کرتا رہا ہے اور اس سلسلے میں اس نے واضح اور قطعی موقف اختیار کیا ہے (مثلاً یورپی مشترکہ منڈی سے متعلق)۔

محصول اور تجارت کا معاہدۂ عمومی (General Agreement on Tariffs and Trade — GATT): پاکستان اس معاہدے میں شریک ہے۔ یہ تجارت کا ایک کثیرالاطراف معاہدہ ہے، جس کا مقصد رکن ممالک کے مابین اشیا کی پیداوار میں اضافے اور مبادلے میں توسیع کرنا ہے۔ کم ترقی یافتہ ممالک کی تجارت کو بڑھانے کے لیے اس معاہدے کے متن میں تجارت اور ترقی پر ایک نئے باب کو شامل کیا گیا ہے۔

ترجیحات دولت مشترکہ (Common Wealth Preferences): ۱۹۵۱ء میں پاکستان اور برطانیہ کے درمیان ایک مالیاتی معاہدہ طے پایا، جس کی رو سے تیس برطانوی اشیا پر محصول کی مراعات ختم کر دی گئیں اور بیشتر دیگر اشیا پر ترجیح کو کم کر دیا گیا۔ پاکستان نے پہلی مرتبہ ترجیحی فہرست میں چند اشیا شامل کیں۔ یہ معاہدہ پاکستان کی نئی مصنوعات کے لیے ایک اہم ترین منڈی قائم کرنے کے لیے ممد و مفید ثابت ہوا۔

یورپی مشترکہ منڈی: پاکستان نے معقول شرائط پر برطانیہ کی اس منڈی میں شمولیت کی

حمایت کی ہے ۔ پاکستان نے مجوزہ عام بیرونی محصول (Common External Tariff) کو کم کرنے اور دولت مشترکہ کے مختلف ممالک کے لیے درآمدی اشیا کے مقرر ہونے والے حصوں کو بڑھانے کا مطالبہ کیا ہے.

علاقائی تعاون برائے ترقی (RCD): ۱۹۶۴ء میں ایران، ترکی اور پاکستان کے درمیان علاقائی تعاون برائے ترقی کے لیے ایک معاہدہ ہوا، جس میں تجارت کے شعبے میں تعاون کرنا بھی شامل تھا ۔ اس سلسلے میں بہت سے ٹھوس اقدامات کیے گئے ہیں: (۱) پاکستان اور ترکی کے درمیان دسمبر ۱۹۶۴ء میں ایک دو طرفہ تجارتی معاہدہ ہوا ۔ توقع ہے کہ اس کی بدولت ان دو ملکوں کے درمیان تجارت کی ترقی کے لیے بین الاقوامی ڈھانچا مضبوط ہو گا؛ (۲) ہر رکن ملک میں پیدا ہونے والی ایسی اشیا کی فہرستیں بنائی گئی ہیں جن کی دوسرے رکن ممالک کو ضرورت ہے ۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ رکن ممالک میں ایسی اشیا کے مبادلے کو بڑھانے کی کوشش کی جائے؛ (۳) ترکی اور پاکستان نے ایک دوسرے سے درآمدات کو بڑھانے کے لیے مخصوص اشیا کے لیے ایک ہی ملک کو اجازہ دینے (Single Country Licensing) کو بطور اصول تسلیم کر لیا گیا ہے؛ (۴) تجارت کے متعلق معلومات کا آپس میں تبادلہ کیا جاتا ہے؛ (۵) آر ۔ سی ۔ ڈی کی وزارتی مجلس کے ایک فیصلے کی رو سے تینوں ملکوں کا ایک مشترکہ ایوان تجارت قائم کیا گیا ہے، جس کا مقصد بین العلاقائی تجارت کو فروغ دینا، رکن ممالک میں روپیہ لگانے کے مواقع کو بڑھانا اور تجارتی میلے منعقد کرنا ہے.

اندرونی تجارت اور تنظیم: پاکستان کی اندرونی تجارت (مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان) زیادہ تر بحری راستے سے ہوتی ہے ۔ مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کو برآمدات تیزی سے بڑھ رہی ہیں، کیونکہ مشرقی پاکستان کی معیشت مغربی پاکستان کی معیشت کی بہ نسبت زیادہ تیزی سے ترقی کر رہی ہے ۔ مغربی پاکستان مشرقی پاکستان سے زیادہ تر چھالیا، گرم مسالے، عمارتی لکڑی، پھل، سبزیاں، چائے، پٹ سن کی مصنوعات، کاغذ، ماچس اور چمڑا درآمد کرتا ہے اور اسے زیادہ تر چاول، گندم اور دیگر غذائی اشیا، روئی، تیل کے بیج، تمباکو، مشینری، سوت، ادویات، تمباکو کی مصنوعات اور تلزاتی مصنوعات وغیرہ برآمد کرتا ہے.

ملک میں ستر سے زیادہ تجارتی تنظیمیں قائم ہیں، جن میں پندرہ ایوان تجارت و صنعت بھی شامل ہیں ۔ سب سے بڑی تنظیم وفاق ایوان ہائے تجارت و صنعت (Federation of Chambers of Commerce and Industry) ہے، جو ملک میں اور ملک سے باہر تاجروں کی نمائندگی اور ان کے مفادات کی حفاظت کرتی ہے.

۳۰ جون ۱۹۶۶ء کو ختم ہونے والے مالی سال کے دوران میں ۲ ارب ۸۱ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کی اشیا برآمد کی گئیں اور ۳ ارب ۲ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کا سامان درآمد ہوا ۔ اہم درآمدی اور برآمدی سامان کی مالیت مندرجۂ ذیل تھی:-

درآمدات:

خوراک: ۴۲ کروڑ ۸ لاکھ
کیمیائی اشیا: ۳۰ کروڑ

برآمدات:

خام پٹ سن: ۸۲ کروڑ
پٹ سن کی مصنوعات: ۷۲ کروڑ ۷۰ لاکھ
کپاس: ۱۹ کروڑ ۷۳ لاکھ
کپاس کی مصنوعات: ۱۹ کروڑ ۳۱ لاکھ

۳۰ ـ مالیات

گزشتہ عشروں میں مالیات کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے ۔ ایک ترقی پذیر ملک میں حکومت کا صرف یہی فرض نہیں کہ وہ ملک کی مدافعت و محافظت کرے اور اندرون ملک میں امن و امان اور نظم و نسق قائم رکھے ، بلکہ معاشرتی اور اقتصادی ترقی کی ذمے داری بھی اب اس کے فرائض میں شامل ہے ۔ ملکی ترقی کے لیے طویل مدت کی منصوبہ بندی اور اس کو بروئے کار لانے کے لیے تمام ذرائع استعمال کرنا حکومت کے لیے نا گزیر امر ہے ۔ پچھلے بیس بائیس برسوں میں حکومت کے اخراجات میں جو بیش بہا اضافہ ہوا ہے اس سے رونما ہونے والی تبدیلی کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ ۱۹۴۸ - ۱۹۴۹ء میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے ڈیڑھ ارب روپے خرچ کیے ۔ اس کے مقابلے پر ۱۹۶۶ - ۱۹۶۷ء میں ۱۱ ارب ۷۱ کروڑ ۴ لاکھ روپے خرچ ہوئے ۔ اسی سال محض ترقیاتی منصوبوں پر ۹ ارب ۴۱ کروڑ روپے صرف ہوئے ۔ پچھلے عشرے میں اخراجات میں گرانقدر اضافے کی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے اقتصادی ترقی کو سب سے زیادہ اہمیت دی ۔

پاکستان کا مالی سال یکم جولائی سے شروع ہو کر ۳۰ جون کو ختم ہوتا ہے ۔ حکومت کے میزانیے کی تیاری کئی ماہ پہلے شروع ہو جاتی ہے ۔ آئندہ سال کے لیے ہر وزارت اپنا اپنا میزانیہ تیار کرتی ہے اور اسے جانچ پڑتال کے بعد وزارت مالیات کو بھیج دیتی ہے ۔ میزانیہ مکمل صورت میں پہلے کابینہ کے سامنے پیش ہوتا ہے ، پھر منظوری کے لیے اسمبلی میں (قومی اسمبلی کی عدم موجودگی میں کابینہ کے منظور شدہ میزانیے کی توثیق صدر مملکت کرتا ہے) ۔ وزارت مالیات منظور شدہ میزانیے کی شعبہ وار تفصیلات کو تمام متعلقہ وزارتوں کے علم میں لاتی ہے ۔ آمد و خرچ کا فرق میزانیے میں خسارہ یا بچت ظاہر کرتا ہے ۔ ترقیاتی منصوبوں کے لیے وزارت مالیات اور قومی منصوبہ بندی کمیشن کے درمیان گہرا رابطہ اور تعاون ضروری سمجھا جاتا ہے ۔

آئین کی رو سے ایک کمپٹرولر اور آڈیٹر جنرل کا تقرر عمل میں آتا ہے ۔ یہ عہدے دار بحیثیت کمپٹرولر قومی آمد و خرچ کی نگرانی کرتا ہے اور بحیثیت آڈیٹر جنرل تمام حسابات کی پڑتال اور محاسبے کا ذمے دار ہے ۔ اس کے فرائض میں اس امر کا خیال رکھنا بھی شامل ہے کہ تمام اخراجات درست اور جائز ہوں اور کوئی رقم منظور شدہ رقم سے تجاوز نہ کرنے پائے ، نیز وہ یہ بھی دیکھے کہ خرچ کے لیے ضروری اجازت حاصل ہو چکی ہے ۔ آڈیٹر جنرل کو مجلس قانون ساز کے سامنے اپنی رپورٹ بھی پیش کرنا ہوتی ہے ، جہاں پہلے مجلس حسابات عامہ (Public Accounts Committee) اس کا جائزہ لیتی ہے ۔ معمولاً ہر مالی سال کا تخمینہ قومی اسمبلی میں بحث و تمحیص اور منظوری کے لیے پیش کیا جاتا ہے ۔ قومی اسمبلی کو یہ اختیار ہے کہ وہ زر مطالبہ کی منظوری دینے سے انکار کر دے یا اس رقم میں تخفیف کر دے ۔ نئے ٹیکس قومی اسمبلی کی منظوری کے بغیر عائد نہیں کیے جا سکتے ۔ میزانیہ ایک طرف تو حکومت کے آمد و خرچ میں توازن کا آئینہ دار ہوتا ہے اور دوسری طرف معاشرتی اور اقتصادی اہمیت کے امور کی نشان دہی کرتا ہے ۔ طویل المدت منصوبوں کے لیے قومی اسمبلی کی پہلی مرتبہ کی منظوری کافی ہوتی ہے ۔

حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ محاصل (ٹیکس) کی وصولی ہے ۔ مرکزی حکومت میں ٹیکس کے معاملے میں سب سے با اختیار ادارہ مرکزی ریونیو بورڈ (Central Revenue Board) ہے ۔ آب کاری اور

کسٹم کے محاصل کے ضمن میں مرکزی حکومت کو قانون سازی کے خصوصی اختیارات حاصل ہیں اور یہ محاصل حکومت کی آمدنی کی اہم مدات میں شمار ہوتے ہیں۔ ٹیکسوں میں سیلز ٹیکس بھی قابل ذکر ہے۔ یہ ٹیکس پہلی مرتبہ ۱۹۴۸ء میں عائد کیا گیا اور ۱۹۵۱ء میں اسے موجودہ شکل دی گئی۔ حکومت کی کل آمدنی کا ۲۴۰۴ فیصد کسٹم سے، ۲۴۰۲۴ فیصد آبکاری سے، ۳۰۳۸ فیصد انکم ٹیکس سے اور ۱۲۰۰۲ فیصد سیلز ٹیکس سے وصول ہوتا ہے۔ مرکزی حکومت کی آمدنی میں اضافے کے ساتھ اخراجات میں اسی تناسب سے اضافہ ہو گیا ہے۔ اس اضافے کے اسباب میں قومی دفاع، انتظام مملکت اور قومی قرضوں پر سود خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قیام پاکستان سے قبل مرکز کے ہاتھ میں جو محاصل تھے ان میں درآمد، آمدنی، کارپوریشن، ریلوے، ڈاک اور تار کے محاصل قابل ذکر ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کی بکثرت آمد اور قومی دفاع کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر کچھ تبدیلیاں معرض ظہور میں آئیں۔ مرکزی حکومت کے ۱۹۴۸-۱۹۴۹ء اور ۱۹۴۹-۱۹۵۰ء کے میزانیوں میں تھوڑا بہت رد و بدل کیا گیا: ریلوے کے مالیات کو عام میزانیہ میں شامل کر لیا گیا؛ وصول شدہ محاصل کے ذریعے آمدنی میں صوبائی حکومتوں کی شرکت کو عارضی طور پر ختم کر دیا گیا؛ فروخت پر محاصل کو، جو صوبائی حکومتوں کی آمدنی کا ذریعہ تھا، مرکزی حکومت کے سپرد کر دیا گیا، البتہ یہ شرط عائد کر دی گئی کہ اس آمدنی کا ۵۰ فی صد صوبائی حکومتوں کو دیا جائے گا۔

۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں کو ایک صوبے میں مدغم کر دینے سے سیاسی حالات کے ساتھ مالی حالات میں بھی تبدیلی ناگزیر تھی، اس لیے دسمبر ۱۹۶۱ء میں مالی حالات کا جائزہ لینے اور نئی تجاویز پیش کرنے کے لیے ایک مالیات کمیشن (Finance Commission) مقرر کیا گیا، جس کی سفارشات پر ۵ جون ۱۹۶۲ء کو مغربی اور مشرقی دونوں صوبوں کے میزانیے کے لیے مرکزی حکومت کی مختلف مدات میں سے مختلف فیصد تناسب مقرر کیے گئے۔ مارچ ۱۹۶۴ء میں آئین کی دفعہ ۱۴۴ کے تحت مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان آمدنی کی مناسب تقسیم کے لیے ایک اور مالیات کمیشن مقرر کیا گیا۔ اس کمیشن نے ترقیاتی منصوبوں اور اقتصادی ضرورتوں کے پیش نظر تیسرے منصوبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے مرکز اور دونوں صوبوں کے لیے آمدنی کے حصوں سے متعلق جو سفارشات پیش کیں انھیں منظور کر لیا گیا؛ چنانچہ آمدنی، فروخت، آبکاری (بشمول چائے، تمباکو اور چھالیا) اور پٹ سن اور روئی کی برآمد سے وصول ہونے والے محاصل کا ۶۵ فیصد دونوں صوبوں کے لیے اور ۳۵ فیصد مرکز کے لیے مقرر ہوا۔

قیام پاکستان کے بعد بینک کاری میں بڑا انقلاب رونما ہوا۔ ۹۲۱ بینکوں میں سے صرف ۱۹۵ بینک رہ گئے، باقی تمام بینک بھارت کو اٹھ گئے۔ ریزرو بینک آف انڈیا ۱۹۴۸ء تک پاک و ہند دونوں ملکوں کے لیے کام کرتا رہا۔ بینک دولت پاکستان (State Bank of Pakistan) جولائی ۱۹۴۸ء میں معرض وجود میں آیا۔ کاروبار اور تجارت اور بینک کاری کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ۱۹۴۹ء میں نیشنل بینک آف پاکستان قائم کیا گیا، جس میں ایک چوتھائی سرمایہ حکومت پاکستان نے لگایا۔ نیشنل بینک نے [illegible] کے سلسلے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ زراعت اور

صنعت و حرفت کی ترقی اور رہائشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کئی خاص بینک اور مالیاتی ادارے بھی قائم کیے گئے۔ زراعت کی ترقی کے پیش نظر دیہاتی قرضوں کے سلسلے میں کوآپریٹو (بہ امداد باہمی) بینکوں نے بھی بڑی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے ذریعے کم سے کم شرح پر روپیہ مہیا کیا گیا اور روپے کی واپسی کے لیے بڑی سہولتیں فراہم کی گئیں۔

بینکاری کی طرح بیمہ کمپنیوں نے بھی قیام پاکستان کے بعد بڑی ترقی کی۔ اس سلسلے میں ملکی اور غیر ملکی بیمہ کمپنیوں نے ہر طرح کی سہولتیں مہیا کر کے بیمے کے ہر میدان میں خدمت کی۔

مالیاتی نظام کے سلسلے میں کئی ایک ادارے قائم کیے گئے، جن میں صنعتی ترقی، صنعتی قرضہ اور زراعتی ترقی کے لیے الگ الگ بینک اور کارپوریشن برائے تعمیر مکانات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۹۴۹ء میں کراچی صرافہ (Stock Exchange) قائم ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں ایک صرافہ ڈھاکے میں بھی قائم کر دیا گیا۔ ۱۹۶۰ء میں صرافے کی سرگرمیاں وسیع ہو گئیں۔ بونس سکیم کی وجہ سے بونس واؤچر بھی صرافے میں باقاعدہ شامل کر لیا گیا۔

بین الاقوامی حالات بالخصوص پاؤنڈ سٹرلنگ اور ہندوستانی سکے کی قیمت گر جانے کی وجہ سے پاکستان کی مالیات کو کئی بار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جب ۱۹۴۹ء میں حکومت پاکستان نے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستانی سکے کی قیمت کو گرایا نہیں جائے گا تو درآمدی عوامل کی افواہوں اور سٹہ بازی کے رجحانات نے کئی ایک مشکلات کا خطرہ پیدا کر دیا، لیکن غیر ملکی زر مبادلہ کے سلسلے میں سٹیٹ بینک کی دانشمندانہ روش آڑے آئی اور حالات مخدوش ہونے سے بچ گئے۔ ۱۹۵۳ء سے سرکاری اخراجات میں معتدبہ اضافہ ہونے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر سال خسارے کا میزانیہ چلنے لگا۔ ۱۹۵۵ء میں سکے کی قیمت گر جانے سے اور مابعد کے اثرات نے مزید مشکلات پیدا کر دیں۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں حکومت خسارے کا میزانیہ ترک کر کے نئی راہ پر گامزن ہوئی۔ پاکستان میں سٹیٹ بینک کے قیام کے بعد پہلی مرتبہ شرح تین فیصد سے چار فیصد ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی تجارتی بینکوں اور قرضہ دینے والے اداروں کی شرح میں اضافہ ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نجی قرضوں کی رفتار سست پڑ گئی، لیکن اس کے بالمقابل سرکاری قرضوں میں نجی اداروں اور افراد نے بکثرت سرمایہ لگانا شروع کر دیا، جس کی وجہ سے حکومت کو نجی قرضے حاصل کرنے میں نمایاں کامیابی ہوئی۔

۱۹۷۰-۱۹۷۱ء کے بجٹ میں آمدنی، اخراجات اور سرمایہ کاری کے مصارف کا اندازہ لگانے کے بعد کوئی ۳۹ کروڑ ۸۹ لاکھ روپے کے خسارے کا تخمینہ لگایا گیا تھا، جسے پورا کرنے کے لیے ۴۰ کروڑ ۳ لاکھ روپے کے نئے ٹیکس لگائے گئے ہیں۔ اس طرح سال رواں (۱۹۷۰-۱۹۷۱ء) کے میزانیے میں ۱۴ لاکھ روپے کی معمولی بچت دکھائی گئی ہے۔ بیشتر رقم ترقیاتی کاموں پر صرف کی جائے گی۔ دفاع کے لیے تین ارب روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ مغربی پاکستان کے چاروں نئے صوبوں کو ایک ارب ۴۵ کروڑ ۳۶ لاکھ روپے کی رقم دی جا رہی ہے (یہ رقم آمدنی میں شامل نہیں کی گئی)۔ مشرقی پاکستان کی ترقی کے لیے ۲ ارب ۹۲ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں اور مغربی پاکستان کو اس مقصد کے لیے ۵۰ کروڑ روپے ملیں گے۔ اس کے علاوہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں مرکزی

منصوبوں کی تکمیل کے لیے ایک ارب روپے صرف کیے جائیں گے۔ توقع ہے کہ ۱۹۷۰-۱۹۷۱ء میں پاکستان کو ۳ ارب ۴ کروڑ ۲۲ لاکھ روپے کی غیر ملکی امداد ملے گی جبکہ ۱۹۶۹-۱۹۷۰ء میں یہ امدادی رقم ۳ ارب ۷۷ کروڑ ۳ لاکھ تھی۔

۱۴ - بین الاقوامی اقتصادی تعاون

دیگر ترقی پذیر ممالک کی طرح پاکستان نے بھی دوست ممالک اور زیادہ خوش‌حال اقوام سے خاصی اقتصادی امداد حاصل کی ہے۔ ۱۹۴۹-۱۹۵۰ء میں یہ امداد معمولی تھی، لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد اس کے اعداد و شمار بکثرت بڑھ گئے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بیرونی ممالک سے ملنے والی امداد کو بہترین مصرف میں لایا گیا اور دوسری وجہ یہ ہوئی کہ اپنی مساعی اور کوششوں کو برابر جاری رکھا گیا۔ ۱۹۶۰ء سے شروع ہونے والے عشرے کو اقوام متحدہ نے ترقی کا عشرہ قرار دیا اور سرمایہ دار اور خوش‌حال ممالک سے پرزور درخواست کی کہ وہ اپنی کل آمدنی کا ایک فیصد سرمایہ ایسی معاونت میں صرف کریں۔

پاکستان کو ہر شعبۂ زندگی میں اس لیے بھی بین الاقوامی امداد کی زیادہ ضرورت تھی کہ یہاں ترقی کا کام بالکل ناپید تھا اور آغاز کار بالکل ابتدائی مراحل سے کرنا پڑا۔ ضروری اور اہم اشیا کے علاوہ اشیاے صرف کی درآمد کے لیے بھی زر مبادلہ کی ضرورت تھی اور زر مبادلہ اپنے ملک کی پٹ سن اور روئی کی برآمد ہی سے حاصل ہوسکتا تھا، لیکن وہ اتنا نہ تھا کہ تمام ضرورتوں کو پورا کر سکے۔

گزشتہ چند برسوں میں غیر ملکی امداد کی ضرورت بوجوہ شدید ہو گئی ہے، لیکن یہ عزم مصمم بھی کارفرما نظر آتا ہے کہ بیرونی امداد پر کم سے کم انحصار کیا جائے۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے (۱۹۶۰-۱۹۶۵ء) میں زر مبادلہ کا ۳۹ فیصد بیرونی ذرائع سے قرضے، فنی امداد اور غیر ملکی نجی سرمایہ کاری کی صورت میں حاصل کیا گیا۔ پاکستان نے اپنی برآمدات سے زر مبادلہ تخمینے سے زیادہ کمایا، اس لیے بیرونی امداد کی شرح فیصد کم رہی۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں یہ شرح ۲۲ فیصد رہ گئی۔

ابتدائی برسوں میں غیر ملکی امداد فنی نوعیت کی تھی اور منصوبوں کی ضروریات تک محدود تھی، لیکن ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۳ء میں خراب فصلوں کی وجہ سے غلے کی قلت کے زمانے میں امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا سے گندم کے جہاز آئے۔ ۱۹۵۴-۱۹۵۵ء میں امریکہ نے پہلی مرتبہ فالتو غلے کی پیشکش کی۔ اب غیر ملکی امداد کی مندرجۂ ذیل پانچ صورتیں ہیں:

(الف) فنی امداد: پاکستانیوں کی فنی تربیت، غیر ملکی ماہرین اور مشیروں کی خدمات، تربیتی اور تحقیقی اداروں کے لیے سامان کی فراہمی؛ (ب) منصوبوں کی امداد بصورت اشیاے ضروریہ اور ماہرین کی خدمات، جو منصوبوں کے لیے کارآمد ہوں؛ (ج) خام مال، سوختنی اشیا، زائد پرزے، اور دیگر ضروری سامان رسد؛ (د) غلہ؛ (ھ) فوری ضرورت اور ہنگامی حالت میں امداد، مثلاً طوفان زدہ علاقے کی امداد۔ پہلی دو تو خالص سرمایہ کارانہ نوعیت رکھتی ہیں، تیسری میں لوہا اور فولاد شامل ہیں اور وہ ترقیاتی مقاصد پورے کرتی ہے؛ غلے کی فراہمی بھی بیشتر یہی مقصد لیے ہوئے ہے۔ ریاستہاے متحدۂ امریکہ اور کینیڈا سے درآمد شدہ اجناس کی فروخت سے آمدنی بینک دولت پاکستان میں جمع کرا دی جاتی ہے اور معطی حکومتوں کے مشورے سے پاکستان میں ترقیاتی منصوبوں پر

صرف کی جاتی ہے۔ اس طرح بیرونی امداد کا معتدبہ حصہ اقتصادی ترقی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

امداد کی جانب سب سے پہلے اقوام متحدہ نے قدم اٹھایا اور ۱۹۴۸ء کے اجلاس عام میں رکن ممالک کو خطیر رقوم دینے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ ہر ملک کی حکومت اپنا معیار معیشت بلند کر سکے اور مسئلۂ بے روزگاری کا موزوں حل تلاش کر کے اپنے اقتصادی و معاشرتی حالات کو بہتر بنا سکے۔ اس میں یہ بھی سفارش کی گئی کہ اقتصادی اور معاشرتی امور کی مجلس (UNESCO) اور دوسرے عالمی ادارے ترقی پذیر ممالک کے تمام اقتصادی پہلوؤں کو ترقی دینے کے لیے مزید غور و خوض کریں۔ جہالت، افلاس اور بھوک کے خلاف جہاد کرنے کے لیے ۱۹۵۰ء میں فنی امداد کا ایک وسیع تر پروگرام بھی پیش کیا گیا۔ یہ پروگرام اقوام متحدہ کے مخصوص اداروں کے ذریعے پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔ پاکستان ان اداروں سے سامان کی فراہمی، فنی مہارت اور تربیت کی سہولتوں کی صورت میں امداد حاصل کرتا ہے۔ بیرونی ممالک کے ماہرین کے تعاون سے جامع قسم کے اقتصادی اور معاشرتی جائزے لیے جاتے ہیں، نیز ایسی ماہرانہ تحقیقات بھی کی جاتی ہیں جن سے ملک کے اہم اقتصادی پہلو متاثر ہوتے ہیں۔ "یونسکو" کا ایک مستقل نمائندہ ہمارے ملک میں مقیم ہے، فوری اور اہم ضروریات کو اولیت دی جاتی ہے اور اس کے لیے فنڈ مہیا کیے جاتے ہیں؛ دیگر ضروریات کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے اور مالی حالات کے سازگار ہونے کی صورت ہی میں ان کی باری آتی ہے۔

ترقی پذیر ممالک کی امداد کے لیے کولمبو پلان تیار کیا گیا۔ اس منصوبے کے تحت کینیڈا، انگلستان، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جاپان سے پاکستان کو امداد ملی۔ انگلستان اور جاپان نے تربیتی سہولتیں مہیا کیں اور دوسرے ممالک بالخصوص کینیڈا نے اس کے علاوہ سرمایہ بھی فراہم کیا۔

ریاستہائے متحدۂ امریکہ نے ترقی پذیر ممالک کی امداد کے لیے چار نکاتی پروگرام کے تحت پاکستان سے بھرپور تعاون کیا۔ ترقیاتی منصوبوں کے لیے عطیات اور قرضے دیے اور خام مال، صنعتی مشینیں، ہوائی جہازوں کے پرزے، ادویات وغیرہ کی شکل میں دست تعاون بڑھایا۔ امریکہ کا زائد از ضرورت غلہ بھی امدادی اشیا کی فہرست میں شامل ہے۔

اسی طرح سینٹو CENTO اور سیٹو SEATO کے ذریعے بھی پاکستان مختلف النوع امداد لیتا رہا۔ امریکہ کے مختلف بینکاری اور رفاہی اداروں کا تعاون بھی حاصل رہا، جس میں برآمد و درآمد کے بینک اور فورڈ فاونڈیشن کی خدمات قابل قدر ہیں۔ عالمی بینک نے بھی بڑی نمایاں خدمات انجام دیں، بالخصوص مالی اور فنی معاونت میں پاکستان سے بڑا تعاون کیا۔ ۱۹۶۰ء میں عالمی بینک نے ان ممالک کی ایک مجلس کا انعقاد کیا، جو پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں میں دست تعاون بڑھانے کے خواہش مند تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اکیلے اکیلے امداد دینے کے بجائے سب مل کر پاکستان کی مجموعی ضروریات کو پنجسالہ منصوبہ کے تحت پایۂ تکمیل کو پہنچائیں۔ ان ممالک میں کینیڈا، جرمنی، جاپان، انگلستان اور ریاستہائے متحدۂ امریکہ نے مشترکہ طور پر دوسرے اور تیسرے پنجسالہ منصوبوں کے لیے بیرونی نوعیت کی امداد کے سلسلے میں کفالت کی۔ چند ملکوں نے مشترکہ اور الگ الگ بھی تعاون کیا۔

اشتراکی ممالک میں سے چین، چیکوسلواکیہ، پولینڈ، روس اور یوگوسلاویہ نے پاکستان کی امداد میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ ان ممالک کی شرائط

نسبۃً آسان تھیں اور قرضے کی ادائی پاکستانی اجناس کی صورت میں اور بیس سال کے طویل عرصے میں بہت ہی خوش آئند اور خوش گوار نظر آتی۔

سیٹو اور سینٹو کا قیام ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۵ء میں علی الترتیب عمل میں آیا۔ اگرچہ یہ دونوں بنیادی طور پر دفاعی معاہدے کی حیثیت رکھتے ہیں، پھر بھی وہ اقتصادی امور میں تعاون کرتے ہیں۔ ایران، ترکی، پاکستان، انگلستان اور امریکہ سینٹو کے ارکان ہیں۔ اس ادارے کے ذریعے فنی تعاون کی صورت میں اقتصادی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ انگلستان اور امریکہ نے ذرائع آمد و رفت کی ترقی میں معاونت کی ہے۔ سیٹو کے ارکان کی تعداد آٹھ ہے، یعنی آسٹریلیا، فرانس، نیوزی لینڈ، پاکستان، فلپائن، تھائی لینڈ، انگلستان اور امریکہ۔ یہ ادارہ زیادہ تر توجہ اس بات پر مرکوز کرتا ہے کہ ادارے کے رکن ممالک میں ماہرین کی کمی کو کس طرح دور کیا جائے۔

بیرونی ممالک سے ملنے والی امداد پر کچھ قدغن بھی لگائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے ترقیاتی قرضے زیادہ افادیت کھو دیتے ہیں، مثلاً قرضہ دینے والے بعض ممالک یہ شرط عائد کر دیتے ہیں کہ انہیں کے ملک کے ماہرین کو منصوبوں کی تکمیل کے لیے ملازم رکھا جائے اور انہیں کے ملک سے سامان وغیرہ خریدا جائے۔ ایسی شرائط کی موجودگی میں اکثر اوقات اشیا خاصی مہنگی پڑتی ہیں اور بھاری قیمتیں ادا کرنا پڑتی ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے قرضوں کی شرح سود بھی ۶ فیصد تک ہوتی ہے، جو خاصی زیادہ ہے۔ پھر قرضے کی ادائی کے لیے بھی یہ شرط عائد کر دی جاتی ہے کہ ایسے غیر ملکی سکے میں ادا کیا جائے۔ پاکستان نے ہمیشہ ان کڑی اور غیر موافق شرائط کے خلاف احتجاج کیا، لیکن اس معاملے میں کامیابی نہیں ہو سکی۔

ایران، پاکستان اور ترکی نے مل کر ایک ترقیاتی ادارہ آر۔ سی۔ ڈی RCD کے نام سے ۲۱ جولائی ۱۹۶۴ء کو قائم کیا۔ تینوں ملکوں کے سربراہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ قومی ترقی کی رفتار کو تیز تر کرنے نیز امن و استحکام کے لیے علاقائی تعاون نہایت ضروری ہے۔ چونکہ ان ملکوں کے تاریخی اور ثقافتی روابط بڑے قدیم اور مضبوط ہیں، اس لیے وہاں کے عوام کے لیے بنیادی طور پر یہ ادارہ بڑا کار آمد ثابت ہوگا۔ اس ادارے کا مقصد یہ ہے کہ باہمی تعاون سے آمد و رفت کے وسائل کو ترقی دی جائے، تینوں ملکوں کے تجارتی اداروں کے درمیان گہرے روابط پیدا کیے جائیں، ان ممالک کے درمیان ہوائی جہازوں کی پروازوں میں اضافہ اور انہیں سستا کیا جائے، ڈاکخانے کی شرح کم کی جائے اور تینوں ملک ایک دوسرے کو فنی امداد کے سلسلے میں ماہرین مہیا کریں اور تربیتی سہولتیں بہم پہنچائیں۔

پاکستان بھی کولمبو منصوبے کے تحت بہت سے ایشیائی اور افریقی ممالک کو مختلف قسم کی فنی تربیت دے رہا ہے اور اپنے ماہرین فن کے ذریعے ان ملکوں کی فنی اور اقتصادی امداد بھی کر رہا ہے۔ پاکستان نے آر۔ سی۔ ڈی کے انداز کا ایک معاہدہ ۱۹۶۴ء میں انڈونیشیا سے کیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان اقتصادی اور ثقافتی تعاون پیدا کیا جائے۔ اس ادارے کو IPECC (Indonesia-Pakistan Economic Cultural Co-operation — انڈونیشیا اور پاکستان کے درمیان اقتصادی اور ثقافتی تعاون کی مجلس) کا نام دیا گیا اور اس کا صدر دفتر جکارتا میں تجویز کیا گیا۔ اس کے تحت پاکستان نے انڈونیشیا کو کپاس اور پٹ سن کی مصنوعات خریدنے کے لیے قرضہ دیا۔

۱۵ - تعلیم

پاکستان میں خواندگی کا تناسب بہت کم ہے، گو اب اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے - ۱۹۶۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق صرف ۱۵٫۹ فی صد لوگ خواندہ تھے - ۱۹۶۹ء تک خواندگی کا تناسب ۲۱ فی صد ہو گیا۔ گویا ساڑھے دس کروڑ کی آبادی میں صرف ڈیڑھ کروڑ افراد خواندہ ہیں اور ان خواندہ افراد میں سے بھی پچاس فی صد لوگ ایسے ہیں جن کی تعلیم پانچویں جماعت تک ہے۔

خواندگی کا یہ تناسب دیہات میں اور بھی کم ہے - ۱۹۶۱ء میں جب کہ شہری آبادی میں ۳۴٫۲ فیصد لوگ خواندہ تھے دیہات میں صرف ۱۳٫۶ فی صد لکھ پڑھ سکتے تھے - اسی طرح خواتین میں ناخواندگی کی شرح مردوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے - ہر سو خواندہ مردوں کے مقابلے میں صرف ۲۹ خواتین خواندہ ہیں - خواندہ آبادی کا ۱۳٫۱ فی صد ایسے افراد پر مشتمل ہے جنھوں نے باقاعدہ مدارس میں تعلیم نہیں پائی، ۵۳٫۷ فی صد نے ابتدائی درجے تک تعلیم حاصل کی ہے اور ۲۱٫۵ فی صد نے وسطانی درجے (جماعت ہشتم) تک تعلیم پائی ہے - ثانوی درجے تک پہنچنے والوں کا تناسب ۱۰٫۵ فی صد ہے اور یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کرنے والے خواندہ آبادی کا صرف ۰٫۶ فی صد ہے۔

اس وقت پاکستان میں تعلیم کے مسئلے کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ خواندگی کی شرح کو بڑھایا جائے اور ابتدائی سطح پر بچوں کے لیے وافر تعلیمی سہولتیں مہیا کی جائیں - دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خواندگی کے فروغ کے ساتھ ساتھ معیار تعلیم کو بہتر بنایا جائے تاکہ پاکستانی معاشرے کے جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے زندگی کے تمام شعبوں میں تربیت یافتہ افرادی طاقت مناسب تعداد میں موجود رہے - پاکستان کے ماہرین تعلیم اور ترقیاتی منصوبہ بندی کے ادارے ان دونوں پہلوؤں کی طرف مناسب توجہ دیتے رہے ہیں۔ افرادی طاقت اور تعلیم کے جو کمیشن قائم کیے گئے ان کی غرض و غایت بھی یہی ہے۔

انتظامی ساخت : تعلیم کا انتظام و انصرام صوبائی حکومتوں کے ذمے ہے - صوبوں میں صوبائی سطح پر تعلیمی سیکرٹریٹ قائم ہیں، جن میں عمومی اور فنی تعلیم کے الگ الگ شعبے ہیں - مشرقی پاکستان میں تعلیم کی صرف دو نظامتیں (directorates) ہیں : ایک عمومی تعلیم کے لیے اور دوسری فنی تعلیم کے لیے - اس کے مقابلے میں مغربی پاکستان میں اس کے وسیع تر رقبے کے پیش نظر آٹھ نظامتیں ہیں، جن میں سے دو فنی تعلیم کے لیے مخصوص ہیں۔ ہر حلقے کی نظامت تعلیم کا سربراہ ناظم تعلیمات (Director) ہوتا ہے - ہر نظامت مزید انتظامی وحدتوں میں بٹی ہوئی تھی - ہر قسمت (division) میں مردانے اور زنانے مدارس کے انتظام کے لیے جدا جدا ناظر (Inspector)/ناظرہ (Inspectress) ہوتے ہیں - ابتدائی تعلیم کا انتظام البتہ ضلعی سطح پر کیا گیا ہے اور یہ ذمے داری ضلعی ناظر/ ناظرۂ مدارس کے سپرد ہے۔

وسطانی مدارس تک نصاب کی تدوین اور امتحانات لینے کی تمام تر ذمے داری مختلف نظامتہائے تعلیم کے سپرد ہے، لیکن ثانوی اور اعلیٰ ثانوی (انٹرمیڈیٹ) مدارج میں یہ کام سکینڈری و انٹرمیڈیٹ بورڈوں کو سونپا گیا ہے - مغربی پاکستان میں ایسے چھے تعلیمی بورڈ قائم ہیں اور مشرقی پاکستان میں چار - اس کے علاوہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں فنی تعلیم کے لیے الگ الگ بورڈ کام کر رہے ہیں - تعلیمی اور فنی بورڈ اپنے اپنے حلقوں کے ثانوی، اعلیٰ ثانوی اور فنی تعلیم کے اداروں کو الحاق کی

منظوری دیتے ہیں اور نصاب کی تشکیل، امتحانات کے انعقاد اور اسناد کی تقسیم کا کام سر انجام دیتے ہیں۔ یہ بورڈ اپنی ملحقہ تعلیمی اور فنی درسگاہوں میں اساتذہ کی تعلیمی اور پیشہ ورانہ قابلیت کا تعیّن بھی کرتے ہیں۔ یہ بورڈ براہ راست صوبائی معتمد تعلیم کے ماتحت ہیں اور اپنی کارکردگی کے لیے اسی کو جواب دہ ہیں۔ اعلی ثانوی درجے کے بعد کی تعلیم کا انتظام یونیورسٹیوں کے سپرد ہے۔ یہ یونیورسٹیاں اگرچہ زیادہ تر سرکاری امداد سے چلتی ہیں، لیکن اپنے داخلی معاملات میں یہ بہت حد تک خود مختار ہیں۔ صوبے کا گورنر تمام صوبائی یونیورسٹیوں کا چانسلر ہوتا ہے اور ہر یونیورسٹی کے نظام کو چلانے کے لیے ایک وائس چانسلر مقرر کرتا ہے۔ ہر یونیورسٹی اپنے مخصوص علاقے میں قائم کالجوں کا الحاق کرتی ہے اور ان کالجوں اور اپنے تدریسی شعبوں کے لیے نصاب کا تعیّن، اساتذہ کے تقرر کی منظوری، امتحانات کا انعقاد، اسناد کی تقسیم وغیرہ کے فرائض سر انجام دیتی ہے۔ اس وقت (۱۹۶۹ء تک) مغربی پاکستان میں سات اور مشرقی پاکستان میں پانچ یونیورسٹیاں قائم ہیں۔

تعلیم کا انتظام و انصرام اگرچہ صوبائی حکومتوں کی تحویل میں ہے تاہم مرکزی حکومت تعلیم کے فروغ میں صوبائی حکومتوں کا بہت ہاتھ بٹاتی ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی دارالحکومت میں بھی وہی تعلیمی سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ اس مقصد کے لیے مرکز میں ایک الگ نظامت تعلیم قائم ہے، البتہ امتحانات اور نصاب وغیرہ کے معاملے میں مرکزی حکومت کے مدارس اور کالج اپنے اپنے علاقے کے تعلیمی بورڈوں اور یونیورسٹیوں سے ملحق ہیں۔ مرکزی حکومت میں وزارت تعلیم بھی موجود ہے، جس میں وزیر، معتمد، شریک معتمد، کئی نائب معتمد اور نائب مشیر اور معاون مشیر تعلیم مقرر ہیں۔ وزارت تعلیم قومی سطح پر وسیع تر قومی مفاد کے پیش نظر تعلیمی پالیسی بناتی ہے اور صوبائی محکمہ ہائے تعلیم کی رہنمائی کے لیے خطوط و اشارات مرتب کرتی ہے تاکہ ملک بھر میں ایک ایسا نظام تعلیم نافذ کیا جا سکے جو پاکستان کے نظریاتی، قومی، مذہبی، ثقافتی، اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، صنعتی اور زرعی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو؛ چنانچہ دونوں صوبوں میں تعلیمی ہم آہنگی پیدا کرنا، تعلیمی ترقیاتی منصوبے بنانا اور قومی سطح پر عمومی اور فنی تعلیم کا ایک متوازن نظام رائج کرنا اسی وزارت کی ذمے داری ہے۔ مرکزی وزارت تعلیم نے مندرجۂ ذیل تین ادارے قومی سطح پر قائم کر رکھے ہیں: (۱) بین الجامعی بورڈ؛ (۲) مرکزی کونسل برائے فنی تعلیم؛ (۳) مرکزی کونسل برائے اعلٰی تعلیم۔

مصارف تعلیم: قیام پاکستان کے وقت تعلیم کے مصارف مجموعی قومی پیداوار (GNP) کے ایک فی صد سے بھی کم تھے۔ اب یہ شرح بڑھتے بڑھتے ۲٫۳ فی صد ہو گئی ہے۔ حکومت اسے ۳٫۶ فی صد تک لے جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی ایک بین الاقوامی کانفرنس (منعقدۂ کراچی ۱۹۶۰ء) نے یہی سفارش کی تھی کہ تعلیمی مصارف پر حکومتیں مجموعی پیداوار کا کم از کم ۳٫۶ فی صد خرچ کریں۔ ۱۹۶۳-۱۹۶۵ء میں پاکستان میں تعلیم پر تہتّر کروڑ کی رقم خرچ کی گئی۔ قومی سطح پر منصوبہ بندی کرتے وقت تعلیمی ترقیات کے لیے کثیر رقوم مخصوص کی جاتی رہی ہیں؛ چنانچہ پہلے پنج سالہ منصوبے میں تعلیم کے لیے چھیالیس کروڑ، دوسرے منصوبے میں ایک ارب پانچ کروڑ اور تیسرے منصوبے میں ۲ ارب ۳۷ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے کی

رقم مخصوص کی گئی ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق تعلیم پر دس روپے فی طالب علم کے حساب سے رقم خرچ ہوئی۔

مدارج تعلیم : پاکستان میں مدارج تعلیم دیگر ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کے مدارج تعلیم سے بہت حد تک ہم آہنگ ہیں۔

ابتدائی تعلیم : پاکستان کے آئین کی رو سے مفت ابتدائی تعلیم ہر پاکستانی بچے کا حق ہے، لیکن مالی مشکلات اور دیگر عوامل کے باعث پاکستان کے سب بچے ابتدائی تعلیم حاصل نہیں کر رہے ہیں۔ اس وقت کل ستر لاکھ بچے ابتدائی مدارس میں زیر تعلیم ہیں، یعنی پانچ سے نو برس کی عمر کے بچوں کی کل آبادی کا تقریباً ۵۰ فی صد۔ ملک میں ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق ۶۰۹۷۲ ابتدائی مدارس تھے۔ اس تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور ہر سال چار ہزار نئے مدارس کھولے جا رہے ہیں۔ گویا ہر سال تقریباً چار لاکھ بچوں کے لیے تعلیمی سہولتیں مہیا کر دی جاتی ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ ۱۹۷۰ء تک پانچ سے نو سال کی عمر کے بچوں کا ۷۰ فی صد ابتدائی تعلیم سے مستفیض ہو سکے گا، ۱۹۷۵ء تک پانچویں جماعت تک تعلیم کی سہولت اس عمر کے سو فی صد بچوں کے لیے حاصل ہوگی، اور ۱۹۸۵ء تک آٹھویں جماعت کی تعلیم سب کے لیے لازم ہو گی۔

ابتدائی مدارس میں تعلیم پانے والے کل بچوں کا ۹۰ فی صد سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کرتا ہے اور ان بچوں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ باقی ۱۰ فی صد بچے ایسے نجی اداروں میں پڑھتے ہیں جنھیں فلاحی انجمنیں اور سماجی یا مذہبی تنظیمیں چلاتی ہیں؛ ان میں سے اکثر کو سرکاری امداد ملتی ہے۔ بعض ادارے بچوں سے فیس لیتے ہیں اور انھیں حکومت کی طرف سے گرانٹ نہیں ملتی۔

مشرقی پاکستان ابتدائی تعلیم کی سہولتوں کے اعتبار سے مغربی پاکستان سے کچھ آگے ہے۔ ۱۹۶۰ء میں مغربی پاکستان کے پانچ سے نو برس کی عمر کے بچوں کا ۳۰ فی صد زیر تعلیم تھا جبکہ مشرقی پاکستان میں یہ تناسب ۴۸ فی صد تھا۔ ابتدائی سطح پر تعلیم حاصل کرنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد میں بھی بڑا تفاوت ہے۔ لڑکیوں کا تناسب کل بچوں کی تعداد کا صرف ۲۰٫۵ فی صد ہے۔ اسی طرح شہروں کی بہ نسبت دیہات میں تعلیمی سہولتوں کی کمی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے مسائل میں ایک بڑا مسئلہ ضیاع کو روکنے کا ہے۔ مدرسے میں داخل ہونے والے بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد افلاس، بیماری، حالات کی ناموافقت اور دیگر متعدد وجوہ کی بنا پر تعلیم کو مکمل کرنے سے پہلے ہی مدرسے کو خیرباد کہہ دیتی ہے۔ بعض علاقوں میں تو پہلی جماعت میں داخل ہونے والے بچوں کا صرف ۱۵ فی صد پانچویں جماعت تک پہنچ پاتا ہے۔ حکومت کی کوشش ہے کہ تیسرے منصوبے کے آخر تک کم از کم ۵۰ فی صد بچے پانچویں جماعت تک ضرور پہنچ جایا کریں۔

نصاب : ابتدائی تعلیم کا مقصد بچوں کو ایسی بنیادی مہارتوں سے لیس کرنا ہے جو کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے از بس ضروری ہیں۔ اس سطح پر طلبہ اور طالبات کا ایک طبقہ تو ایسا ہے جو صرف پانچویں جماعت تک حاصل کرتا ہے اور دوسرا طبقہ ایسا ہے جو اس کے بعد تعلیم جاری رکھتا ہے، چنانچہ نصاب میں ان دونوں طبقوں کی ضروریات کا خیال رکھا گیا ہے۔ نصاب میں پڑھنے، لکھنے اور روزمرہ کے حساب کتاب کے

علاوہ اسلامیات، معاشرتی علوم، ابتدائی سائنس، آرٹ اور عملی فنون ایسے مفید مضامین بھی شامل ہیں اور ایسی سرگرمیوں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے جن سے بچوں کی متوازن اور بھرپور نشو و نما ممکن ہو اور ان کی سیرت کی مناسب تشکیل ہو سکے۔ دینی تعلیم کو پورے نصاب میں مرکزی حیثیت حاصل ہے کہ اسی کے ذریعے بچے اسلامی تہذیب و تمدن سے روشناس ہوتے ہیں اور یہی وہ فعّال قوت ہے جو ہمارے اندر ہمدردی، بردباری، خدمت اور ایثار ایسی صفاتِ حسنہ کو جنم دیتی ہے اور نسل و رنگ، امارت و افلاس اور بندہ و آقا کے امتیاز کو ختم کرتی ہے۔

ثانوی تعلیم: ثانوی تعلیم ابتدائی اور اعلیٰ مدارج تعلیم کی درمیانی کڑی ہے۔ ایک طرف تو یہ اعلیٰ تعلیم کے لیے زینے کا کام دیتی ہے اور دوسری طرف اس کی حیثیت اختتامی بھی ہے کیونکہ طلبہ کی ایک کثیر تعداد اس کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیتی ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق دس سے پندرہ برس کی عمر کے بچوں کا ۱۲ فی صد ثانوی مدارس میں تعلیم پا رہا تھا۔ دوسرے منصوبے کے اختتام پر ۱۹۶۵ء میں یہ تناسب ۱۶ فی صد تک پہنچ گیا۔ اس وقت ابتدائی سطح پر تعلیم پانے والے بچوں کا تقریباً ۲۰ فی صد ثانوی مدارس میں داخلہ لے رہا ہے جبکہ ۱۹۴۷ - ۱۹۴۸ء میں یہ شرح صرف ۱۰ فی صد تھی۔ ۱۹۶۰ اور ۱۹۶۵ء کے درمیان ثانوی درجے پر طلبہ کی تعداد میں ۱۰۸ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ موجودہ دور میں ثانوی مدرسوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور ملک میں اوسطاً ہر روز ایک نیا ثانوی مدرسہ کھول رہا ہے۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں ۴۴۶۲ وسطانی مدارس اور ۴۰۸۹ ثانوی مدارس ہیں۔ طالبات کے وسطانی اور ثانوی مدارس کی تعداد علی الترتیب ۹۲۴ اور ۵۷۴ ہے۔ وسطانی مدرسوں میں طلبہ و طالبات کی تعداد تقریباً آٹھ لاکھ اور ثانوی مدرسوں میں سولہ لاکھ ہے۔ گویا چھٹی سے دسویں جماعت میں کل چوبیس لاکھ طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں۔ اس سطح پر ۸۸۸۹۹ استاد کام کر رہے ہیں، جن میں خواتین کی تعداد ۱۴۲۹۵ ہے۔

ثانوی مدارس میں سے بعض سرکاری ہیں، بعض کو نجی تنظیمیں اور فلاحی انجمنیں چلا رہی ہیں اور بعض مدارس بلدیاتی اداروں، یعنی میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں نے کھول رکھے ہیں۔ آٹھویں جماعت تک تعلیم پانے والے کل طلبہ کا ۷۰ فی صد سرکاری اور بلدیاتی مدارس میں زیر تعلیم ہے البتہ نہم اور دہم کے کل طلبہ کا ۲۵ فی صد منظور شدہ نجی مدارس میں پڑھتا ہے۔ یوں تو ملک کے تمام ثانوی مدارس کے نصاب، مدت تعلیم اور تدریسی ڈھانچے میں ایک ہم آہنگی پائی جاتی ہے، تاہم بعض مدارس اپنی ہیئتِ ترکیب کے اعتبار سے دوسروں سے خاصے مختلف ہیں۔

رہنما ثانوی مدارس (Pilot High School): ان مدارس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں روایتی نصاب کے ساتھ ساتھ دیگر متنوع فنی اور تکنیکی مضامین کی تدریس کی سہولتیں بھی موجود ہیں اور تدریس کا معیار عام ثانوی مدارس کی بہ نسبت بلند ہے۔ ”استاد۔ شاگرد تناسب“ کم ہے۔ اساتذہ کو جدید سمعی بصری اعانتیں مہیا ہیں اور انھیں نئے تدریسی تجربے کرنے کے لیے زیادہ سازگار ماحول اور آسائشیں میسر ہیں۔

پبلک سکول: یہ ادارے اقامتی ہیں اور انھیں انگلستان کے پبلک سکولوں کے نمونے پر چلایا جاتا ہے۔ ان مدرسوں میں ذریعۂ تعلیم

انگریزی ہے۔ یہاں داخلہ مقابلے کے امتحان کے ذریعے ہوتا ہے۔ ان ہمہ وقتی درس گاہوں میں کھیلوں اور جسمانی ورزش کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی ہے اور طلبہ کی سیرت کی بھرپور نشو و نما کے لیے ادبی اور معاشرتی سرگرمیوں پر زور دیا جاتا ہے۔ ان اداروں میں عام مدرسوں کے مقابلے میں بہت زیادہ سہولتیں میسر ہیں اور اسی لیے اخراجات بھی زیادہ ہیں۔

یورپی طرز کے مدارس: یہ مدرسے ملک کے بڑے بڑے شہروں اور پہاڑی مقامات، مثلاً مری اور کوئٹے وغیرہ میں کام کر رہے ہیں۔ ان میں ثانوی تعلیمی بورڈ کے امتحانات کے علاوہ سینئر کیمبرج اور جونیئر کیمبرج کے امتحانات کی تیاری کے انتظامات بھی موجود ہیں۔ ان میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے اور عام ثانوی مدرسوں کے مقابلے میں فیسیں بہت زیادہ ہیں۔

جامع مدارس (Comprehensive Schools): تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ثانوی تعلیم کو معیاری اور جامع بنانے کے لیے ایک نیا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ جامع مدارس کے قیام کا مقصد ایک ہمہ گیر اور جامع نصاب کا نفاذ اور تعلیم و تدریس میں نئے تجربات کے لیے سازگار ماحول اور مناسب سہولتیں مہیا کرنا ہے۔ جامع مدارس میں داخلے کا معیار قابلیت ہے اور طلبہ کے لیے بورڈنگ ہاؤس کا انتظام بھی ہے۔ مغربی پاکستان میں ۱۹۷۰ء تک ان مدرسوں کی تعداد چالیس ہو جائے گی۔

ثانوی مدارس کا نصاب: ۱۹۶۰ء سے قبل ثانوی مدارس کے نصاب میں ملک کے فنی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں تھی اور نہ یہ ہماری قومی امنگوں ہی کا آئینہ دار تھا۔ اس نصاب سے بالخصوص وہ طلبہ جو ثانوی درجے پر ہی تعلیم کو خیرباد کہہ دیتے تھے مستفیض نہیں ہو رہے تھے؛ چنانچہ قومی تعلیمی کمیشن (۱۹۶۰ء) کی رپورٹ کے ماتحت اصلاح نصاب کی جو مہم چلی اس میں نصاب کو ان نقائص سے پاک کرنے کی کوشش کی گئی، سائنس کی تعلیم کو لازم قرار دیا گیا، انتخابی مضامین کی فہرست میں زراعت، کامرس، فنی اور تکنیکی مضامین، گھریلو اقتصادیات وغیرہ ایسے مضامین شامل کر دیے گئے تاکہ طلبہ اپنے رجحانات اور ذہنی صلاحیتوں کے مطابق مضامین کا انتخاب کر سکیں، پاکستان کی مذہبی اور نظریاتی اقدار کے پیش نظر اسلامیات کی تدریس لازمی قرار پائی اور قومی زبانوں کی تعلیم کو زیادہ مؤثر بنانے پر زور دیا گیا۔ مزید برآں حال ہی میں ریاضی، کیمیا، اور طبیعیات کے نصاب میں جدید تحقیقات کی روشنی میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں کی گئی ہیں اور ان مضامین کے فرسودہ تصورات کو نصاب سے خارج کر کے ان کی جگہ جدید نظریات اور حقائق کو شامل کر دیا گیا ہے۔

کالج کی تعلیم: پاکستان میں دو طرح کے کالج ہیں: ایک اعلیٰ ثانوی مدرسے یا انٹرمیڈیٹ کالج اور دوسرے ڈگری کالج۔ انٹرمیڈیٹ کالج، ثانوی مدارس اور ڈگری کالجوں کے درمیان عبوری حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں دو سال تک تعلیم دی جاتی ہے اور طلبہ اور طالبات کو یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ طب، کامرس اور انجینئرنگ کے پیشہ ورانہ کالجوں میں داخلے سے قبل متعلقہ بنیادی مضامین کی تعلیم بھی یہیں ہوتی ہے۔ ملک میں اس وقت ۱۲۰ سے زائد انٹرمیڈیٹ کالج ہیں، جن میں تقریباً پچاس ہزار طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں اور دو ہزار سے زائد اساتذہ پڑھا رہے ہیں۔ ان میں چونتیس کالج صرف طالبات کے لیے مخصوص ہیں، جن میں کوئی ساڑھے پانچ ہزار طالبات تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

اس تعداد میں وہ طلبہ اور طالبات شامل نہیں جو ڈگری کالجوں کی انٹرمیڈیٹ جماعتوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ انٹرمیڈیٹ کے نصاب کی تدوین و تعیین، امتحانات کی تنظیم، کالجوں کی منظوری اور الحاق اور ان جماعتوں سے متعلقہ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کی تشکیل کی تمام تر ذمے داری ثانوی تعلیمی بورڈوں پر ہے۔ ثانوی مدارس کی طرح اس سطح پر بھی نصاب میں بڑی دور رس تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ قومی زبانوں کی تدریس کو لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔ انتخابی مضامین کی فہرست کو وسیع کر دیا گیا ہے اور ریاضی، کیمیا اور طبیعیات کے نصاب کو جدید تحقیقات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مسلسل کوششیں جاری ہیں۔

ڈگری کالج: ان کالجوں کے قیام کا مقصد طلبہ اور طالبات کو بی۔ اے/ بی۔ ایس سی کی ڈگری کے لیے تیار کرنا ہے، لیکن بالعموم ان کالجوں میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کا انتظام بھی ہوتا ہے اور یوں ڈگری کالج میں تعلیم کا عرصہ چار سال پر پھیلا ہوتا ہے۔ بعض ڈگری کالج ایسے بھی ہیں جن میں بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے/ایم۔ ایس سی کی تعلیم کے انتظامات بھی موجود ہیں۔ ان کالجوں کی انٹرمیڈیٹ جماعتوں کا الحاق ثانوی تعلیمی بورڈوں سے ہوتا ہے اور بی۔ اے/ بی۔ ایس سی اور ایم۔ اے/ ایم۔ ایس سی کی جماعتوں کا الحاق اپنے علاقے کی یونیورسٹی سے ہوتا ہے۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد کی جماعتوں کے لیے نصاب اور کتابوں کی تعیین، امتحانات کا اہتمام، اسناد کی تقسیم اور دیگر قواعد و ضوابط کی تشکیل کی تمام تر ذمے داری یونیورسٹی ہی کی ہوتی ہے۔ ملک میں اس وقت تقریباً ۴۴۰ ڈگری کالج ہیں اور ان میں کل سوا دو لاکھ طلبہ اور طالبات زیر تعلیم ہیں۔ پاکستان کے ۹۰ فی صد گریجویٹ انہیں کالجوں سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ ۱۹۶۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق ملک میں بیاسی ہزار گریجویٹ تھے، یعنی کل آبادی کا ۶۶ء فی صد۔ ان میں سے ساڑھے اکتیس ہزار افراد کے پاس پوسٹ گریجویٹ ڈگریاں ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کی سہولتوں میں اضافے کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۶ء کے دوران میں ۲۱۳۳۲ افراد نے ڈگری حاصل کی۔ ۵۰ فی صد سے زیادہ ڈگری کالجوں کا انتظام نجی تنظیموں کے ہاتھ میں ہے۔ انہیں حکومت کی طرف سے معقول مالی امداد ملتی ہے اور یہ یونیورسٹی کے مقرر کردہ قوانین و ضوابط کے پابند ہوتے ہیں۔

یونیورسٹیاں: قیام پاکستان کے وقت ملک میں صرف دو یونیورسٹیاں کام کر رہی تھیں اور تیسری یونیورسٹی انہیں دنوں معرض وجود میں آ رہی تھی۔ اس وقت یہاں بارہ یونیورسٹیاں کام کر رہی ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے: (۱) پنجاب (۱۸۸۲ء)؛ (۲) ڈھاکہ (۱۹۲۱ء)؛ (۳) سندھ (۱۹۴۷ء)؛ (۴) پشاور (۱۹۵۰ء)؛ (۵) کراچی (۱۹۵۱ء)؛ (۶) راجشاہی (۱۹۵۳ء)؛ (۷) زرعی یونیورسٹی، لائل پور (۱۹۶۱ء)؛ (۸) زرعی یونیورسٹی، میمن سنگھ (۱۹۶۱ء)؛ (۹) یونیورسٹی آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور (۱۹۶۱ء)؛ (۱۰) یونیورسٹی آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، ڈھاکہ (۱۹۶۱ء)؛ (۱۱) اسلام آباد (۱۹۶۶ء)؛ (۱۲) چٹاگانگ (۱۹۶۶ء)۔ تیرھویں یونیورسٹی جہانگیر نگر (ڈھاکہ) میں اور چودھویں کوئٹے میں قائم ہونے والی ہے۔ ان یونیورسٹیوں میں تقریباً پچیس ہزار طلبہ اور طالبات زیر تعلیم ہیں۔ ان میں سے ۲۳۱۱ طلبہ زرعی یونیورسٹیوں میں اور ۳۴۳۱ انجینیرنگ یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں۔ زرعی اور فنی یونیورسٹیوں کے قیام سے

سائنسوں میں ڈگری پانے والے طلبہ کی تعداد میں معقول اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۶۵ء میں ۹۶۵۵ طلبہ نے پوسٹ گریجویٹ ڈگریاں حاصل کیں اور ان میں سے ۳۶۳ نے سائنس کے مضامین میں یہ اعزاز حاصل کیا۔

ان تمام یونیورسٹیوں میں اپنے تدریسی شعبے ہیں اور ملحقہ کالج ہیں۔ ان سب اداروں میں نصاب کی تدوین و تعیین، درسی کتابوں کا تقرر، اساتذہ کے تقرر کی منظوری، امتحانات کا نظم و نسق ان یونیورسٹیوں کے ذمے ہے۔

نئی یونیورسٹیوں کے قیام سے پرانی یونیورسٹیوں کی وسیع تر ذمے داریاں اور بوجھ قدرے ہلکا ہو گیا ہے اور اس سے انھیں معیار تعلیم کو اونچا کرنے اور تحقیق کی طرف مزید توجہ دینے کا موقع مل گیا ہے۔

تمام یونیورسٹیوں کے انتظامی ڈھانچے میں خاصی یکسانی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ہر یونیورسٹی کا منتظم اعلیٰ وائس چانسلر کہلاتا ہے، جس کا تقرر چار سال کے لیے ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کے انتظام و انصرام کے بہت سے اختیارات اس کی سنڈیکیٹ کو تفویض ہوتے ہیں۔ سنڈیکیٹ کی امداد کے لیے ہر یونیورسٹی میں اکادمک کونسل، مالیاتی کمیٹی، منصوبہ‌بندی و ترقیاتی پروگرام کی کمیٹی، اعلیٰ تعلیم و تحقیق کی کمیٹی اور اسی قسم کی چند دوسری کمیٹیاں مقرر ہیں۔ یونیورسٹیوں کے پروگراموں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ایک بین الجامعی بورڈ (Inter-Versity Board) قائم ہے۔ ہر یونیورسٹی کے اخراجات کا ۷۰ فی صد حصہ حکومت کے خزانے سے پورا ہوتا ہے۔ ۱۹۶۳ - ۱۹۶۵ء میں حکومت نے ۱۲ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کی رقم بطور مالی امداد یونیورسٹیوں کو دی۔ قریب قریب ہر یونیورسٹی اپنا نیا کیمپس بنانے پر بہت سا روپیہ خرچ کر رہی ہے۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں حکومت نے بیس کروڑ روپے کی رقم آٹھ یونیورسٹیوں کے تعمیراتی پروگراموں کے لیے مختص کی۔

ہر یونیورسٹی کے تعلیمی پروگرام میں نئے مضامین کو شامل کیا جا رہا ہے۔ عمومی یونیورسٹیوں میں سے ہر ایک میں تقریباً سات فیکلٹیاں اور پچیس تدریسی شعبے موجود ہیں۔ بہت سے مضامین میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی جا رہی ہے اور تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیق کی سہولتوں میں خاطر خواہ اضافہ کیا جا رہا ہے۔ عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق سائنسی مضامین کی تدریس اور تحقیق میں ہر یونیورسٹی نے اپنی سرگرمیاں تیزتر کر دی ہیں۔

پیشہ ورانہ تعلیم : پاکستان میں پیشہ‌ورانہ تعلیم کے لیے مناسب سہولتیں اور انتظامات موجود ہیں اور ان سہولتوں سے ملکی اور غیر ملکی طلبہ و طالبات دونوں مستفید ہو رہے ہیں۔ زراعت، انجینئرنگ، طب، تعلیم، قانون، کامرس، سماجی بہبود اور انتظامیات ایسے مضامین کی تعلیم کے لیے ملک میں بہت سے معیاری ادارے قائم ہیں۔

زراعت : ملک میں چار زرعی سکول، پانچ زرعی کالج اور دو زرعی یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ یونیورسٹیوں میں زراعت اور علم حیوانات کے تمام ضروری شعبے موجود ہیں اور مختصر توسیعی کورسوں کے ذریعے ہر شعبے کے متعلق ضروری معلومات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائی جا رہی ہیں۔ زرعی یونیورسٹی لائل پور میں چوبیس مضامین میں ایم۔ ایس سی اور بیس مضامین میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے انتظامات موجود ہیں۔

انجینئرنگ : پاکستان میں فنی تعلیم کے فروغ کے لیے پانچ انجینئرنگ کالج، دو انجینئرنگ یونیورسٹیاں اور بائیس پولی ٹکنیک ادارے قائم ہیں۔

۱۹۷۰ء تک تیرہ مزید پولی تکنیک ادارے قائم ہو جائیں گے، توقع ہے (ان میں سے دو ادارے محض خواتین کے لیے مخصوص ہوں گے) اور یہ سب ادارے چودہ ہزار تربیت یافتہ افراد سالانہ مہیا کر سکیں گے۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں ان یونیورسٹیوں میں ۲۸۱۴، فنی کالجوں میں ۳۱۲۳ اور پولی تکنیک اداروں میں ۸۳۱۴ طلبہ اور طالبات زیر تعلیم تھے۔

مندرجۂ بالا فنی اداروں کے علاوہ ایک سو سے زائد ایسے فنی مدرسے موجود ہیں جو ملک کے صنعتی اداروں کے لیے تربیت یافتہ کاریگر مہیا کرتے ہیں۔ ان مدرسوں میں آٹھویں جماعت پاس طلبہ داخلہ لے سکتے ہیں۔ اس وقت ان درس گاہوں میں کل چھے ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ ان اداروں میں سے بعض کا درجہ بلند کر کے انھیں پولی تکنیک بنایا جا رہا ہے۔

طب: قیام پاکستان کے وقت ملک میں صرف چار میڈیکل کالج تھے؛ اب ان کی تعداد بارہ ہے، جن میں ہر سال ایک ہزار سے زائد ڈاکٹر فارغ التحصیل ہوتے ہیں؛ تیسرے منصوبے کے آخر یعنی ۱۹۷۰ء تک ملک کے ڈاکٹروں کی مجموعی تعداد بیس ہزار تک پہنچ جائے گی جب کہ ۱۹۶۵ء میں یہاں صرف تیرہ ہزار ڈاکٹر تھے۔ کراچی میں طب کی پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے انتظامات بھی موجود ہیں۔ اسلام آباد میں قومی صحت کی تجربہ گاہ قائم کی جا رہی ہے۔ لاہور اور ڈھاکے میں طبی تحقیق کی جدید ترین سہولتیں مہیا کی جا رہی ہیں۔ پاکستان میڈیکل ریسرچ کونسل نے طبی تحقیق کے پچاس منصوبے تیار کیے ہیں۔ ایلوپیتھی کی تعلیم کے علاوہ ہومیوپیتھی کی تعلیم کے لیے دس کالج اور طب یونانی کے لیے چار طبیہ کالج قائم ہیں۔ کراچی میں یونانی طب کی تحقیق کے لیے ایک بہت بڑا ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ملک میں دندان سازی اور علاج دندان کے لیے دو جدید طرز کے کالج موجود ہیں۔ نرسنگ کی تعلیم کے لیے ملک میں تیس تربیتی ادارے کام کر رہے ہیں، جو پاکستان کے بڑے بڑے ہسپتالوں سے ملحق ہیں۔ نرسنگ کے ابتدائی تین سالہ کورس کے علاوہ اس پیشے کی اعلیٰ تربیت کے انتظامات بھی موجود ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت یہاں صرف چار سو نرسیں موجود تھیں، لیکن ان کی موجودہ تعداد چار ہزار سے زائد ہے۔

کامرس: کامرس کی تعلیم کا آغاز ثانوی مدارس ہی سے ہو جاتا ہے۔ جو طلبہ ثانوی مدرسوں سے فارغ ہونے کے بعد اس مضمون میں مزید دسترس بہم پہنچانا چاہتے ہیں ان کے لیے ملک میں اکتیس کمرشل ادارے موجود ہیں، جن میں اس وقت ۳۲۶۶ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ ان اداروں میں ایک سال کی تعلیم کے بعد سرٹیفکیٹ اور دو سال کی تعلیم کے بعد ڈپلوما دیا جاتا ہے۔ کامرس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے آٹھ کامرس کالج موجود ہیں، جہاں طلبہ کو بی۔ کام اور ایم۔ کام کے امتحانات کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ ان کالجوں میں ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں ۴۳۱۸ طلبہ زیر تعلیم تھے۔ کامرس کی پوسٹ گریجویٹ تربیت کے لیے کراچی اور ڈھاکے میں بزنس ایڈمنسٹریشن Business Administration کے دو معیاری ادارے قائم ہیں، جو امریکی یونیورسٹیوں کے تعاون سے کام کر رہے ہیں۔

قانون: ملک میں قانون کی دو سالہ تعلیم کے لیے سترہ کالج قائم ہیں، جن میں تقریباً پانچ ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ ان میں سے دس کالج مغربی پاکستان میں، اور چھے مشرقی پاکستان میں ہیں۔

تربیت اساتذہ: تربیت اساتذہ کے لیے دو طرح کے ادارے موجود ہیں، پہلی قسم کے ادارے ابتدائی اور وسطانی مدارس کے لیے استاد تیار کرتے

ہیں اور دوسری قسم کے کالج ثانوی مدارس کے لیے ۔ اول الذکر اداروں کی تعداد ۱۰۲ ہے اور ان میں [illegible] طلبہ اور طالبات زیر تربیت ہیں؛ مؤخرالذکر کالجوں کی تعداد [illegible] ان میں ۳۷۶۲ اساتذہ زیر تعلیم ہیں ۔ ثانوی مدارس میں فنی تعلیم کے اساتذہ مہیا کرنے کے لیے دو تربیتی ادارے الگ موجود ہیں ۔ اساتذہ کی پوسٹ گریجویٹ پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے لاہور اور ڈھاکے میں ایک ایک ادارۂ تحقیق و تعلیم موجود ہے، جہاں تعلیم کے مضمون میں ایم۔ ایڈ، اور پی ایچ۔ ڈی کی تیاری اور جدید طریقہ ہائے تعلیم اور تدریسی مسائل پر تحقیق کی سہولتیں موجود ہیں۔ ابتدائی مدارس کے ناظروں اور تربیت جسمانی کے اساتذہ کی تربیت کے لیے دو، دو کالج ان کے علاوہ ہیں ۔

پاکستان میں دوران ملازمت تربیت کے لیے بھی معقول انتظامات موجود ہیں ۔ ابتدائی اور ثانوی مدارس کے اساتذہ کے لیے الگ الگ توسیع کے مراکز کام کر رہے ہیں ۔ ان مراکز کے علاوہ اساتذہ کے تربیتی ادارے بھی موسم گرما کی تعطیلات میں دوران ملازمت تربیتی کورس منعقد کرتے ہیں ۔ یونیورسٹیاں اپنے ملحقہ کالجوں کے اساتذہ کی دوران ملازمت تربیت کے لیے تعطیلات میں تعلیمی سیمینار منعقد کرتی ہیں تاکہ اساتذہ اپنے اپنے مضمون میں جدید ترین دریافتوں اور طریقہ ہائے تعلیم سے باخبر ہو سکیں ۔

۱۹۶۳-۱۹۶۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق ملک کے مختلف مدارس میں تدریس کے لیے مندرجۂ ذیل تعداد میں اساتذہ موجود ہیں: ابتدائی مدارس: ۱۷۱۹۷۳؛ ثانوی مدارس: ۸۵۵۵۵؛ عمومی کالج: ۸۳۳۹؛ پیشہ ورانہ خصوصی کالج: ۱۷۱۶؛ تربیتی ادارے: ۱,۳۰۹؛ یونیورسٹیاں: ۱,۸۷۷ ۔

اساتذہ کی تعداد میں معقول اضافہ ہو رہا ہے ۔ پچھلے دس برس میں یہ تعداد ابتدائی تعلیم کے تربیتی مدارس کی نو ہزار سالانہ سے سولہ ہزار سالانہ تک پہنچ گئی ہے اور ثانوی تعلیم کے تربیتی کالجوں کی ایک ہزار سے چھے ہزار ہو گئی ہے ۔

اسلامیات اور علوم شرقیہ کی تعلیم: مشرقی پاکستان میں دینی تعلیم کے لیے مدرسے موجود ہیں ۔ یہ مدرسے فارسی اور عربی زبانوں کی تعلیم کے علاوہ حساب، تاریخ، جغرافیہ، ابتدائی سائنس، اردو اور بنگلہ کی تعلیم بھی دیتے ہیں ۔ ان مدرسوں کے نصاب، امتحانات اور دیگر امور کی دیکھ بھال کے لیے ثانوی تعلیمی بورڈ کی طرز پر مدرسہ تعلیمی بورڈ قائم ہے ۔ اسی طرح مغربی پاکستان میں دینی تعلیم کے لیے نجی مکاتب اور دارالعلوم موجود ہیں، جو مساجد کے لیے امام اور خطیب اور دینی مدارس کے لیے استاد مہیا کرتے ہیں ۔ ۱۹۶۵ء میں ان مدرسوں اور مکاتب کی تعداد پانچ ہزار سے زائد تھی اور ان میں ۴۵۸۳۰۰ طلبہ زیر تعلیم تھے ۔

تعلیم بالغان: خواندگی کی شرح کو بڑھانے کے لیے ملک میں تعلیم بالغان کے پروگرام پر عمل درآمد جاری ہے ۔ ۱۹۶۰ء میں ملک میں بالغوں کی تعلیم کے لیے ۵۳۳ مراکز قائم تھے، جن میں ۱۲۶۰۰ بالغ مرد اور عورتیں زیر تعلیم تھے ۔ ان اداروں میں تعلیم مفت ہے اور مقامی بلدیاتی ادارے اور مخیّر حضرات ان کے مصارف کی کفالت کرتے ہیں ۔

تعلیم نسواں: قیام پاکستان سے لے کر اب تک طالبات کے لیے تعلیمی سہولتوں میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے ۔ ۱۹۶۵ء میں اٹھارہ لاکھ بچیاں ابتدائی مدرسوں میں تعلیم پا رہی تھیں اور ثانوی مدارس میں طالبات کی تعداد تقریباً پانچ لاکھ تھی ۔ ابتدائی اور ثانوی درجے کی طالبات کی یہ تعداد طلبہ کی تعداد کا بالترتیب ۴۰ اور

۵۰ فی صد ہے۔ ۱۹۶۵ء میں لڑکیوں کے ابتدائی مدارس کی تعداد ۹۹۳۳ اور ثانوی مدارس کی تعداد ۱۳۹۸ تھی۔ لڑکیوں کے لیے چونتیس انٹرمیڈیٹ کالج، ترپن ڈگری کالج، ایک میڈیکل کالج، سائنس تعلیم کے تربیتی ادارے، چار ہوم اکنامکس کالج، ایک پولی ٹکنیک ادارہ، تیس نرسنگ انسٹی ٹیوٹ اور پچیس ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ کام کر رہے ہیں۔ ان اداروں کے علاوہ بعض درس گاہوں میں اور تمام میڈیکل کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طالبات طلبہ کے دوش بدوش تعلیم حاصل کرتی ہیں۔

تعلیمی وظائف: پاکستان میں کل تعلیمی مصارف کا پانچ فی صد تعلیمی وظائف کے لیے مخصوص ہے، جو قابلیت کے لحاظ سے طلبہ اور طالبات کو اندرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں جا کر تعلیم حاصل کرنے کے لیے خصوصی وظائف مقرر ہیں۔ اور اسی طرح بیرون ملک تعلیم پانے کے لیے بھی وظائف کی سہولت موجود ہے۔ ملک سے باہر جانے کے لیے وظائف پاکستان کے دوست ممالک اور قومی اور بین الاقوامی فلاحی انجمنوں کی طرف سے بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں ۱۲۳ پاکستانی طلبہ کو بیرون ملک تعلیم کے لیے وظیفے دیے گئے۔ اسی طرح پاکستان بھی دوست ممالک کے طلبہ اور طالبات کو اپنے ہاں وظائف دے کر تعلیمی سہولتیں مہیا کرتا ہے۔ ہماری یونیورسٹیاں ”مرکزی سمندر پار تربیتی سکیم“ کے تحت اپنے قابل اساتذہ کو دوسرے ممالک میں تعلیم کے لیے بھیجتی ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں اس سکیم کے تحت ایسے ترپن افراد غیر ممالک میں زیر تعلیم تھے۔ ۱۹۶۳ - ۱۹۶۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق دو ہزار طلبہ اور طالبات محض لندن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اس کے علاوہ دو ہزار مزید طلبہ و طالبات امریکہ، یورپ اور جاپان میں زیر تعلیم تھے۔

نئی تعلیمی پالیسی کا اعلان ہو چکا ہے لیکن اس کی جزئیات منظر عام پر نہیں آئیں۔

۱۶ - سائنسی تحقیقات

ملک کی تعلیمی، غذائی، طبی، رہائشی اور دفاعی ضروریات پوری کرنے کے لیے حکومت پاکستان نے سائنسی تحقیقات کی طرف بھی توجہ دی ہے۔ مملکت پاکستان کو اس امر کا احساس تھا کہ سائنسی تحقیقات کے میدان میں وہ پس ماندہ ہے۔ پاکستان کے حصے میں جو علاقے آئے تھے ان میں ایک بھی قابل ذکر سائنسی شعبہ موجود نہ تھا۔ اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ یہ چیزیں اس کے حصے میں آئیں: لاہور میں آب پاشی کی ایک تحقیقاتی تجربہ گاہ (Irrigation Research Laboratory)، ڈھاکے میں پٹسن کا ایک تحقیقاتی مرکز اور تین یونیورسٹیاں، جن میں سے ایک کو قائم ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے؛ لیکن اس صورت حال نے اہل پاکستان کے حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیا کیونکہ مسلمانوں کا شاندار ماضی اور سائنس کے میدان میں اسلاف کی بلند روایات ان کے پیش نظر تھیں (*The Making of Humanity* : Robert Briffault)۔

پاکستان میں سائنسی تحقیقات کے سلسلے میں مندرجۂ ذیل اداروں میں کام ہوا:

(۱) مجلس تحقیقات سائنس و صنعت پاکستان (Pakistan Council of Scientific and Industrial Research = PCSIR): جب دوسری عالمگیر جنگ ہو رہی تھی تو متحدہ ہندوستان کی حکومت نے کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (CSIR) کے نام سے ایک سائنسی تحقیقاتی ادارہ قائم کیا تھا۔ تقسیم ملک کے وقت وہ کونسل اور اس کی تجربہ گاہیں بھارت ہی میں رہ گئیں۔ بٹوارے کے چھ سال بعد

۱۹۵۵ء میں از سر نو اس ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ۱۹۶۳ء میں اس کے انتظامی ڈھانچے میں تبدیلی کر کے اسے مزید ترقی دی گئی۔ اس ادارے نے مندرجۂ ذیل پانچ لیبارٹریاں قائم کر رکھی ہیں: ۱۔ سنٹرل لیبارٹریز، اسلام آباد؛ ۲۔ ویسٹ ریجنل لیبارٹریز، لاہور؛ ۳۔ ایسٹ ریجنل لیبارٹریز، ڈھاکہ؛ ۴۔ نارتھ ریجنل لیبارٹریز، پشاور؛ ۵۔ نارتھ ایسٹ لیبارٹریز، راجشاہی۔ ان تجربہ گاہوں میں تحقیقاتی شعبے کام کر رہے ہیں اور ان میں پارچہ بافی، ایندھن، غذا، چمڑا، شیشہ، چینی کے برتن، فلزکاری، تعمیرات کا مسالا تیار کرنا، مہندسی، پھلوں کے تحفظ و بقا، بجلی، تیل، موم، معدنیات اور ادویہ وغیرہ بہت سے امور کے متعلق تحقیقات ہو رہی ہے۔ اس ادارے کی طرف سے متعدد تحقیقاتی مقالے شائع ہو چکے ہیں اور بہت سے زیر تکمیل ہیں۔ ۱۹۶۸ء تک ۱۱۳ پیٹنٹ حاصل کر لیے گئے تھے، جن میں سے بعض بین الاقوامی سطح پر تھے اور تقریباً چار درجن ایجادات کے کاغذات داخل ہو چکے تھے۔ اس کے حاصل کردہ بعض پیٹنٹ بڑی عظمت رکھتے ہیں، مثلاً پارچہ بافی میں ڈابی doby کی ایک بالکل جدید قسم، جس سے اس صنعت میں انقلاب کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ۱۹۶۸ء تک دو درجن سے اوپر عملی طریقوں (Processes) کی اجارہ داری دی جا چکی ہے، جن میں سے متعدد صنعتی میدان میں پہنچ چکے ہیں۔

۲۔ جوہری توانائی کا کمیشن (Pakistan Atomic Energy Commission = PAEC): جوہری توانائی کی دریافت نے انسانی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ دنیا نے اس کا سب سے پہلا مظاہرہ ہلاکت آفرینی کی شکل میں دیکھا تھا، لیکن پاکستان اس کے پرامن استعمال کا علمبردار ہے۔ پاکستان اٹامک انرجی کونسل Pakistan Atomic Energy Council کے نام سے ایک ادارہ اس غرض سے قائم ہوا تھا؛ اگلے ہی سال اس کی حیثیت بڑھا کر اس کا نام اٹامک انرجی کمیشن کر دیا گیا۔ پاکستان کے پہلے پنج سالہ منصوبے کی تیاری کے وقت یہ ادارہ قائم ہو چکا تھا، لیکن منصوبہ بندی کمیشن میں اس ادارے سے متعلق سفارشات شامل نہ کی جا سکیں کیونکہ اس کی رپورٹ تیار نہ ہو سکی تھی، تاہم یہ مدنظر رکھ لیا گیا کہ پنج سالہ منصوبہ جب سالانہ منصوبوں میں منقسم ہو گا تو جوہری کمیشن کے اخراجات کو بھی شامل کر لیا جائے گا۔ یہ بھی ایک نیم خود مختار ادارہ ہے اور حکومت کے سامنے سائنٹفک اینڈ ٹیکنالوجیکل ریسرچ کے محکمے کی وساطت سے جواب دہ ہے۔ یہ ادارہ بنیادی طور پر دو حصوں میں منقسم ہے: اول، تحقیقاتی اور ترقیاتی مراکز؛ دوم، جوہری توانائی حاصل کرنے کے عملی مراکز۔ اول الذکر کے ماتحت مندرجۂ ذیل مراکز ہیں: ۱۔ ادارۂ جوہری سائنس و ٹیکنالوجی، پاکستان (Pakistan Institute of Nuclear Science and Technology = PINSTECH)، اسلام آباد: یہاں دسمبر ۱۹۶۵ء میں ۵ میگاواٹ کا ایک جوہری ری ایکٹر (atomic reactor) نصب کیا گیا تھا اور اس میں جوہری طبیعیات، جوہری مہندسی، جوہری کیمیا، حیاتی تابکاری، فلزکاری، طبی طبیعیات اور برقیات پر کام ہو رہا ہے؛ ۲۔ جوہری توانائی کا مرکز (Atomic Energy Centre)، لاہور: یہ ۱۹۶۱ء میں قائم ہوا؛ ۳۔ جوہری توانائی کا مرکز، ڈھاکہ: یہ ۱۹۶۵ء میں مکمل ہوا؛ ۴۔ جوہری توانائی کا زرعی تحقیقاتی مرکز (Atomic Energy Agricultural Research Centre)، ڈھاکہ: یہ مرکز ۱۹۶۰ء میں قائم ہوا؛ ۵۔ جوہری توانائی کا زرعی تحقیقاتی مرکز، ٹنڈو جام (سندھ):

یہ ۱۹۶۵ء میں قائم ہوا؛ ۵ - مرکز طبی ریڈیو اسوٹوپ (Medical Radio Isotope Centre)، ٹنڈو جام - علاوہ ازیں طبی اور زرعی تحقیقات کے لیے چھوٹے مراکز کراچی، جام شیرو، ملتان، لاہور، ڈھاکہ، چاٹگانگ اور راجشاہی میں کھولے گئے ہیں - ترناب (پشاور) میں ایک زرعی ترقیاتی تحقیقاتی فارم موجود ہے۔

جوہری توانائی سے بجلی پیدا کرنے کے دو مرکز قائم کیے گئے ہیں: ایک ڈھاکے میں، جو ۱۴۰ میگاواٹ کا ہو گا اور دوسرا کراچی میں، جو ۱۳۷ میگاواٹ بجلی پیدا کرے گا۔

پاکستان میں نیلور کے مقام پر ایٹم کو توڑنے کا سب سے پہلا تجربہ ۱۹۶۵ء میں کیا گیا - اس کے بعد سے ریڈیائی ہم جانی (Radio Isotope) اور جوہری توانائی سے زراعت، طب اور صنعت کے میدانوں میں فائدہ اٹھانے کے لیے کوشش کی جا رہی ہے اور تغذیۂ نباتات، ارضی کیمیا، کرم کش ذرائع، طبی طبیعیات، غذاؤں کے ابقا و تحفظ اور برقیات کے سلسلے میں کچھ قدم اٹھائے گئے ہیں۔

اٹامک انرجی کمیشن نے جناح سنٹرل ہسپتال کراچی اور میوہسپتال لاہور اور ڈھاکہ میڈیکل ہسپتال میں طبی ریڈیو اسوٹوپ (Medical Radio Isotope) کے مراکز قائم کر رکھے ہیں - کمیشن اعلیٰ توانائی طبیعیات (High Energy Physics) کے مسائل پر بھی مصروف تحقیقات ہے - ان کا کام بین الاقوامی معیار کے مطابق ہے - غیر ملکی معیاری مجلّوں میں اس کے سائنسدانوں کے مقالے طبع ہوتے رہتے ہیں - اس کے مراکز اپنے اساسی کاموں کے علاوہ زرعی ماہروں، ڈاکٹروں اور محکمۂ صحت میں کام کرنے والوں کے لیے بھی تربیت کا انتظام کرتے ہیں اور ان کے ذریعے یونیورسٹیوں اور کالجوں کی اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ کی تعلیمی رنگ میں راہ نمائی کا فریضہ بھی سرانجام دیتے ہیں - جوہری توانائی کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالسلام، مشیر سائنسی امور اور ڈاکٹر آئی - ایچ عثمانی، صدر اٹامک انرجی کمیشن، سرگرم کار ہیں - جوہری توانائی کے لیے بھاری پانی کی ضرورت ہوتی ہے - قدرتی گیس سے کھاد تیار کرنے کے کارخانوں سے ذیلی صنعت کے طور پر یہ پانی حاصل کرنے پر کام کیا گیا ہے - پاکستان میں بجلی کا فی کس استعمال صرف پچاس یونٹ ہے جبکہ کینیڈا میں ساڑھے چھے ہزار یونٹ اور امریکہ میں ساڑھے پانچ ہزار یونٹ ہے - اس سے ظاہر ہے کہ پاکستان کو جوہری توانائی کی طرف توجہ دینے کی کس قدر ضرورت ہے - ایٹمی توانائی کے بارے میں ابھی حال ہی میں پاکستان نے روس سے معاہدے پر دستخط کیے ہیں۔

۳ - مجلس تحقیقات طب (Medical Research Council): ڈھاکے میں ایک ادارۂ صحت عامّہ (Public Health Research Institute) قائم ہے - اس میں صحت عامّہ، تغذیہ، ملیریا کے علاج، دیسی جڑی بوٹیوں، نیز یونانی، آیورویدک اور ہومیوپیتھک علاج کے اجزا پر کام ہو رہا ہے - میری لینڈ یونیورسٹی (امریکہ) کے اشتراک سے صحت عامّہ کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک تحقیقاتی مرکز بھی اس سے متعلق ہے - اسی طرح سیٹو (SEATO) کی امداد سے وبائی ہیضے پر تحقیقات کے لیے ایک تجربہ گاہ (Cholera Research Laboratory) بھی قائم ہے - کراچی میں خاندانی منصوبہ بندی کے لیے قومی سطح پر ایک نیشنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کی گئی ہے - اس کے علاوہ اس کے پانچ ذیلی مراکز ہیں - ایک اہم تحقیقاتی ادارہ Jinnah Post Graduate Medical Centre کے نام سے کراچی میں

ہے۔ اس میں دل و دماغ کے امراض، وجع المفاصل، فالج، اور تغذیہ پر تحقیقات کا کام ہو رہا ہے

۴۔ مجلس زرعی تحقیقات (Agricultural Research Council): پاکستان میں زراعت کی اہمیت مسلمہ ہے۔ ملک کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے، غلے کی پیداوار کو بڑھانے، نئی اقسام کی دریافت، جراثیم کش ادویہ کی تحقیق اور زراعت کے جدید ذرائع معلوم کرنا اس کونسل کے ذمے ہے۔ پٹ سن، گندم، کپاس، چاول، نیشکر اور جوار کی جدید اقسام معلوم کی گئی ہیں۔ کھادوں پر بھی کام ہوا ہے۔ حیوانات کی افزائش نسل، جنگلات اور ماہی پروری کا تعلق بھی اس کونسل سے ہے۔ پاکستان کے زیر کاشت رقبے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا اور زمین کو سیم، تھور اور کٹاؤ سے بچانا بھی اس کونسل کا کام ہے۔ ۱۹۶۴ء سے قبل اس کا نام مجلس تحقیقات خوراک و زراعت (Food & Agricultural Research Council) تھا۔

۵۔ مجلس برائے آب پاشی، نکاس آب و سیم (Pakistan Irrigation, Drainage and Water Logging Council = P.I.W.C.)۔

۶۔ مجلس برائے مکانات و تعمیرات (Council for Housing and Works): اس کا کام مندرجۂ بالا اداروں میں روابط قائم کرنا اور مشورے دینا ہے۔

۷۔ قومی مجلس علوم (National Science Council) پاکستان میں سائنس کے مختلف میدانوں میں تحقیقات کے یہ سات ممتاز ترین ادارے ہیں۔ ان کی امداد حکومت کرتی ہے اور داخلی طور پر یہ اپنے کاموں میں خود مختار ہیں۔

(ب) مندرجۂ بالا کمیشنوں اور کونسلوں کے علاوہ کچھ سوسائٹیاں بھی سائنسی تحقیقات میں مصروف ہیں، مثلاً (۱) انجمن ترقی علوم پاکستان (Pakistan Association for the Advancement of Sciences P.A.A.Sc.): اس کا قیام دسمبر ۱۹۴۷ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس کے زیر اہتمام ہر سال سائنس کانفرنس منعقد ہوتی ہے، جس میں ملکی اور غیر ملکی ماہروں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اس کی طرف سے سائنسی تحقیقات کے لیے وظائف بھی دیے جاتے ہیں۔

۲۔ پاکستان اکادمی برائے علوم (P.A.Sc. = Pakistan Academy of Sciences): اس کا آغاز فروری ۱۹۵۴ء میں ہوا۔ یہ بھی ایک قومی سطح کا ادارہ ہے اور سائنس کے متعدد شعبوں پر تحقیق کا کام کراتا ہے۔ فنی مجلے شائع کرنا، سائنس سے متعلق کتب خانے قائم کرنا اور تمغے، وظائف اور انعامات تقسیم کرنا بھی اس سے متعلق ہے۔ اسے حکومت بھی امداد دیتی ہے اور رفاہ عامہ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ بھی عطیے دیتے ہیں۔

۳۔ جمعیت علوم، پاکستان (Scientific Society of Pakistan)۔

۴۔ انجمن علوم و مشاغل علمی، پاکستان (Pakistan Association of Sciences and Scientific Professions): اس کا قیام ۱۹۶۲ء میں ہوا۔

(ج) یونیورسٹیاں اور کالج: ملک میں سائنسی تحقیقات کے اہم مراکز میں سے اس کی یونیورسٹیاں اور کالج بھی ہیں۔ پاکستان میں اعلیٰ تعلیم کا فروغ تیزی سے ہو رہا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ تھی، جو اب تین لاکھ سے بڑھ چکی ہے۔ ۷۰ فی صد سے زائد ڈگری کالج غیر سرکاری ہیں، لیکن ان میں سے اکثر کو سرکاری امداد ملتی ہے۔ پہلے پنج سالہ منصوبے میں تعلیم کے لیے تینتیس کروڑ کی رقم رکھی گئی تھی، دوسرے میں ایک ارب دس کروڑ اور تیسرے میں دو ارب انیس کروڑ۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے کی بنیاد یہ تھی کہ اعلیٰ تعلیم اور

سائنس کے لیے مضبوط بنیادیں قائم کی جائیں ۔ پاکستان میں اس وقت تیرہ یونیورسٹیاں ہیں، جن میں دو انجینئرنگ اور دو زرعی یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں ۔ ابھی تک کوئی علیحدہ طبی یونیورسٹی (Medical University) قائم نہیں ہوئی، لیکن اعلی درجے کے بارہ کالج موجود ہیں، جن میں سالانہ ایک ہزار کے قریب ڈاکٹر اور سرجن فارغ التحصیل ہوتے ہیں ۔ ابھی حال ہی میں برٹش رائل کالج کے خطوط پر College of Surgery and Hygien قائم ہوا ہے ۔ اس طرح ایک ادارۂ صحت و تحقیقات طبی Institute of Health and Medical Research بھی کراچی میں قائم کیا گیا ہے ۔ ایک بین الجامعی ادارہ (Inter-Versity Board) ان تمام تحقیقات میں رابطہ قائم رکھتا ہے جو مختلف یونیورسٹیوں میں ہو رہی ہیں۔

(د) حکومت کے بعض ادارے بھی ریسرچ کا کام کرتے یا اس میں مدد دیتے ہیں ۔ مرکزی حکومت نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحقیقات کا ایک علیحدہ شعبہ Scientific and Technology Research Division قائم کر رکھا ہے ۔ اسلام آباد میں نیشنل ہیلتھ لیبارٹریز دو کروڑ سے زیادہ کی لاگت سے تیار ہوئی ہے ۔ لاہور میں تجزیۂ خوراک اور تحقیق تغذیہ کے لیے ایک تجربہ گاہ Food Analysis and National Research Laboratories کے نام سے قائم ہے ۔ اسی طرح کی دو تجربہ گاہیں کوئٹے میں بھی ہیں ۔ مرکزی حکومت نے ماہی پروری کا ایک محکمہ قائم کر رکھا ہے ۔ اس پر تحقیق کا کام بھی اس کے سپرد ہے ۔ تقسیم ملک کے وقت پرورش حیوانات اور ڈیری فارم پر تحقیق کے تمام شعبے بھارت میں رہ گئے تھے ۔ ۱۹۶۹ء میں حکومت پاکستان نے افزائش نسل حیوانات پر تحقیقات کے دو ادارے قائم کیے : ایک پشاور اور دوسرا کومیلا میں ۔ اسی طرح صوبوں میں بھی نظامتہاے پرورش و معالجۂ حیوانات (Directorates of Animal Husbandry) قائم ہیں ۔ ملک میں معالجۂ حیوانات کے دو کالج بھی ہیں : ایک لاہور میں اور دوسرا میمن سنگھ میں ۔ ڈھاکے میں وزارت صحت نے ایک علیحدہ نظامت غذائی مسائل کے لیے قائم کی ہوئی ہے ۔ اس نے اپنی تحقیقات کا پہلا مرحلہ ۱۹۶۳ء میں مکمل کر لیا تھا ۔ مغربی پاکستان کے لیے ایسی ہی ایک نظامت لاہور میں قائم ہے ۔ ادارۂ تحقیقات آبپاشی (Irrigation Research Institute) تقسیم ملک سے پہلے سے لاہور میں قائم ہے، لیکن اس کی حیثیت بہت معمولی سی تھی ۔ ۱۹۶۰ء میں اسے توسیع دی گئی ۔ محکمۂ موسمیات کے مرکز کراچی اور کوئٹے میں ہیں اور ماتحت محکمے کراچی، لاہور، چٹاگانگ اور پشاور میں ۔ اس سلسلے میں محکمۂ دفاع کا اپنا انتظام بھی ہے ۔ قیام پاکستان کے وقت اس خطۂ ملک میں طبعی جغرافیے کی لیبارٹریاں نہ تھیں ۔ حکومت نے سب سے پہلی بلندپایہ رصدگاہ ۱۹۵۲ء میں کوئٹے میں قائم کی ۔ یہ رصدگاہ دنیا کی چوٹی کی سترہ رصدگاہوں میں سے سمجھی جاتی ہے ۔ موسمی پیشگوئیوں کے دفتروں کی تعداد ۱۹۴۷ء میں چھے تھی، جو ۱۹۶۷ء میں بائیس ہو گئی ۔ سرگودھا، جزاٹ، کراچی، چٹاگانگ اور ڈھاکے میں موسم کے متعلق اطلاعات دینے والے راڈر Radar نصب ہیں ۔ ضرورت کے مطابق خاص انتظامات کرنے کے ذرائع بھی موجود ہیں، مثلاً ۱۹۶۵ء میں جاپان اور پاکستان کی کوہ پیمائی مہموں کے لیے خاص انتظامات کیے گئے ۔ ایک الیکٹرونک مشین (Weather Facsemile) بھی موجود ہے، جو موسمی اطلاعات کے نقشوں کو وصول کرنے اور انھیں نشر کرنے کے کام کرتی ہے ۔ حکومت نے ۱۹۶۱ء میں طبعی جغرافیے اور موسمیات

کا ایک ادارہ قائم کیا، جس کے لیے عالمی تنظیم موسمیات (World Meteorological Organization) نے ماہر مہیا کیے تھے۔ اس ادارے کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے۔

(ہ) جنگلات کے سلسلے میں ریسرچ کا کام چٹاگانگ اور پشاور کی تحقیقاتی تجربہ گاہوں (Forest Research Laboratories) میں ہوتا ہے۔ ماہی پروری کی طرف ایک مرکزی محکمۂ ماہی گیری اس طرف توجہ دے رہا ہے۔ چار اقسام کی مچھلیوں پر حیاتیاتی تحقیقات کی جا رہی ہے۔ مچھلیوں کے ذریعے مچھروں کے انسداد، شارک مچھلی کے جگر کی گاد سے چھاپے خانے کی روشنائی تیار کرنے اور کچھوے سے چکناہٹ کے حصول وغیرہ پر چاند پور (مشرقی پاکستان) اور کراچی کی لیبارٹریوں میں کام ہو رہا ہے۔ مرکز میں ماہی پروری کا ایک مستقل محکمہ موجود ہے۔

پاکستان برطانوی دولت مشترکہ کی سائنسی تنظیم British Commonwealth Scientific Organization) BCSO) کا رکن بھی ہے۔ اس وجہ سے اسے دولت مشترکہ کے رکن ممالک سے سائنس کے میدان میں روابط کا موقع بھی ملتا رہتا ہے۔

(ھ) مجلّے: سائنسی تحقیقات میں علمی مجلّوں اور رسالوں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ اس وقت پاکستان سے بعض بلند پایہ مجلّے شائع ہو رہے ہیں، مثلاً پاکستان کونسل آف سائنس اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کی طرف سے چھے مجلّے شائع ہوتے ہیں: (۱) *Pakistan Journal of Scientific and Industrial Research* (مغربی پاکستان سے)؛ (۲) *Scientific Research* (مشرقی پاکستان سے)؛ (۳) *Science and Industry*؛ (۴) کاروانِ سائنس (اردو)؛ (۵) *Science Chronicle*؛ (۶) پورگمّی بگّن (بنگلہ)۔ علاوہ ازیں اٹامک انرجی کمیشن کی طرف سے ایک ماہانہ مجلہ *Nucleus* شائع ہوتا ہے۔ پاکستان اکیڈیمی آف سائنسز کی طرف سے بھی بعض مجلّے شائع ہوتے ہیں۔ سائنسی تحقیقات کے سلسلے میں جو مجلّے پاکستان سے شائع ہوتے ہیں ان کے مبادلے میں کوئی تین سو مجلّے غیر ممالک سے آتے ہیں۔

(و) کتاب خانے: سائنسی تحقیقات کے بنیادی ماخذ کتاب خانے ہیں۔ چند قابل ذکر کتاب خانوں کے نام درج ذیل ہیں (کتابوں کی تعداد قوسین میں درج کی گئی ہے): ۱ ۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (۲ لاکھ)؛ ۲ ۔ پنجاب پبلک لائبریری لاہور (سوا لاکھ)؛ ۳ ۔ ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری (ایک لاکھ اسّی ہزار)؛ ۴ ۔ کراچی یونیورسٹی لائبریری (ایک لاکھ دس ہزار)؛ ۵ ۔ Directorate of Archives and Libraries میں حکومت کی اور بعض دوسری تاریخی دستاویزات محفوظ رکھی جاتی ہیں۔ اس کے ماتحت تین کتب خانے ہیں، یعنی لیاقت نیشنل لائبریری (ڈیڑھ لاکھ)، سنٹرل سیکرٹریٹ لائبریری (ایک لاکھ ساٹھ ہزار) اور نیشنل آرکائیوز لائبریری (ساڑھے سات ہزار)۔ تجویز ہے کہ حکومت کے ماتحت اس انتظام میں ڈھاکے اور اسلام آباد میں بھی اسی قسم کے دو مزید کتاب خانے قائم کیے جائیں۔ اس انتظام کے تحت کتابیات کا ایک شعبہ National Bibliographical Unit بھی کام کر رہا ہے، جس میں پاکستان سے شائع ہونے والی کتابوں، مجلّوں اور اخباروں کی فہرستیں اور ان سے متعلقہ مواد تیار کرتا رہتا ہے۔ اس طرح کتابوں کے بین الاقوامی مبادلے کا ایک مرکز International Book Exchange Centre بھی ہے، جو دوسرے ممالک سے کتب کا تبادلہ کرتا رہتا ہے؛ ۹ ۔ کتاب خانۂ سٹیٹ بنک آف پاکستان (۳۰ ہزار)؛ ۱۰ ۔ کتاب خانۂ محکمۂ آثار قدیمہ (۲۵ ہزار)؛ ۱۱ ۔ کتاب خانۂ اٹامک انرجی کونسل (۲۰ ہزار)، وغیرہ۔

۱۷ - صحت

آئین پاکستان کی رُو سے فرد کی صحت کا تحفظ حکومت کے فرائض میں شامل ہے اور مملکت پاکستان اپنے موجودہ وسائل کے مطابق وہ تمام احتیاطی، انسدادی اور معالجاتی تدابیر اختیار کرتی ہے جن سے انسانی صحت کی بقا ممکن ہے۔ پاکستان کے تیسرے پنج سالہ منصوبے کے مطابق حکومت نے یہ عزم کر رکھا ہے کہ ۱۹۸۵ء تک ملک کی تمام آبادی کے لیے اچھی صحت کے بنیادی لوازمات مہیا ہوجائیں اور کوئی شخص طبی مراعات سے محروم نہ رہے۔

طبی سہولتوں کی فراہمی صوبائی محکمۂ صحت کے ذمے ہے۔ صوبائی حکومت کی سرپرستی میں مقامی سطح پر میونسپل کمیٹیاں اور ڈسٹرکٹ کونسلیں شفاخانے بناتی اور بحالی صحت کے لیے ضروری حفاظتی اقدامات کرتی ہیں۔ مرکزی حکومت کا کام صوبائی حکومتوں کے صحت کے پروگراموں کی رہنمائی کرنا اور ان میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ مرکز کے ذمے ایسے اداروں کا قیام بھی ہے جن سے قومی صحت کے معیار کو بلند کیا جا سکے، وبائی اور متعدی بیماریوں کا انسداد ممکن ہو اور مناسب غذائی ضروریات مہیا کی جا سکیں۔ مرکزی ملازمین اور مرکزی علاقے میں بسنے والے شہریوں کے علاج معالجے کی ذمےداری بھی مرکز ہی پر ہے۔ صوبائی اور مرکزی حکومتوں کی مساعی کے ساتھ ساتھ نجی، سماجی اور مذہبی فلاحی ادارے اور پرائیویٹ پریکٹس کرنے والے اطبّا اور ڈاکٹر طبی سہولتوں کی فراہمی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس وقت ساڑھے سولہ ہزار ڈاکٹروں میں سے پینتیس فی صد ڈاکٹر پرائیویٹ پریکٹس کرتے ہیں اور وہ کسی ادارے کے ملازم نہیں۔

قیام پاکستان کے وقت اس ملک میں صحت کا قومی معیار بہت پست تھا۔ طبی اور غذائی سہولتیں ناکافی تھیں۔ عام اور وبائی امراض کا دور دورہ تھا۔ ترقی‌یافتہ ممالک کے مقابلے میں اموات کی شرح دگنی تھی اور بچوں کی اموات کی شرح تو پانچ گنی کے قریب تھی۔ آزادی وطن کے وقت یہاں صرف بارہ سو سند یافتہ ڈاکٹر تھے، ایک میڈیکل کالج تھا، ہسپتالوں میں بستروں کی مجموعی تعداد پندرہ ہزار تھی، ملک میں دوا سازی کے کارخانے مفقود تھے اور وبائی بیماریوں کی روک تھام کرنے والی ادویات بھی باہر سے منگوانی پڑتی تھیں۔ پچھلے بیس سال میں طبی سہولتوں کی فراہمی اور حفظ صحت کے انتظامات میں خاطرخواہ اضافہ ہوا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس وقت پاکستان میں ڈاکٹروں کی تعداد ۱۹۸۰۰ ہے (۶۶۰۰ افراد کے لیے ایک ڈاکٹر) اور نرسوں کی ۱۰۳۰۰، ہسپتالوں میں ۳۸۴۰۰ بستروں کا انتظام ہے، ملک میں بارہ میڈیکل کالج قائم ہیں، ۸۶۰ دیہی مراکز صحت ہیں، ۲۷۵۰ معالج خصوصی برائے زچہ و بچہ (Lady Health Visitor) ہیں اور ۱۸۰ تپ دق کے معالجاتی مراکز ہیں، جن میں ۳۳۰۰ بستر مہیا کیے جا سکتے ہیں۔ اس وقت شہری اور دیہی آبادی میں علاج کی سہولتوں میں بڑا تفاوت ہے۔ شہری آبادی میں ہر سات سو افراد کے لیے ایک سند یافتہ ڈاکٹر مہیا ہے اور دیہات میں دس سے بیس ہزار افراد کے لیے۔ اس وقت ملک میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی سالانہ پیداوار علی‌الترتیب ایک ہزار اور تین سو پچاس ہے۔

دیہی آبادی کی بہبود کے لیے ۱۹۶۰ء سے ملک میں دیہی مراکز صحت کے قیام کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک مرکز تقریباً پچاس ہزار افراد کو طبی

سہولتیں مہیا کرتا ہے ۔ مرکز میں ایک مرد اور ایک خاتون ڈاکٹر، ایک خصوصی معالج برائے بچہ و زچہ اور دیگر ضروری عملہ ہوتا ہے ۔ اس مرکز صحت کی تین شاخیں ہوتی ہیں اور ہر شاخ میں ایک کمپاؤنڈر، ایک مرہم پٹی کرنے والا، ایک دایہ اور ایک معاون (Health Assistant) کام کرتا ہے ۔

ملک کے بڑے شہروں اور گنجان آباد علاقوں میں تقریباً ہر پچاس ہزار نفوس کی آبادی کے لیے ایک شفاخانہ قائم ہے ۔ ان شفاخانوں میں ماہر ڈاکٹر مقرّر ہیں اور ادویات اور محدود پیمانے پر طبّی امداد مفت مہیّا کی جاتی ہے ۔

ہر ضلع کے صدر مقام پر بڑے بڑے ہسپتال قائم ہیں، جہاں مریضوں کو قیام خوراک اور علاج کی سہولتیں میسر ہیں ۔ ہر سرکاری ہسپتال میں کم از کم چھے ہمہ وقتی ڈاکٹر ہوتے ہیں ۔ مختلف امراض کے علاج کے لیے خصوصی ماہرین بھی مقرّر ہیں ۔ مرکزی اور صوبائی صدر مقامات پر قائم ہسپتالوں میں علاج کی سہولتیں اور بھی زیادہ ہیں ۔ ان ہسپتالوں کے عام وارڈوں میں علاج کے تمام مصارف حکومت برداشت کرتی ہے ۔ ان سرکاری ہسپتالوں اور شفاخانوں کے علاوہ فلاحی انجمنوں کے قائم کردہ شفاخانے اور ہسپتال بھی معقول تعداد میں موجود ہیں ۔ اسی طرح ڈاکٹروں کے اپنے پرائیویٹ مطب بھی کثرت سے موجود ہیں ۔

عام امراض اور ان کا علاج : ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں کوئی دو کروڑ افراد ہر سال ملیریا کا شکار ہوتے ہیں اور اس سے انسانی اموات کا اندازہ ڈھائی لاکھ سالانہ ہے ۔ ۱۹۶۱ء سے ملیریا کے انسداد کی ملک گیر مہم جاری ہے اور ۱۹۷۵ء تک اس مرض کے مکمل انسداد کا منصوبہ بن چکا ہے ۔ ریاستہائے متحدهٔ امریکہ اور عالمی ادارۂ صحت (WHO) اس کے فنی پہلوؤں میں امداد کر رہے ہیں اور ضروری غیر ملکی زر مبادلہ بھی مہیا کر رہے ہیں ۔ ۱۹۷۰ء تک دو کروڑ افراد کلی طور پر اس سے محفوظ ہو جائیں گے ۔

ایک جائزے کے مطابق اس وقت ایک لاکھ سے زائد افراد تپ دق میں مبتلا ہیں ۔ ۱۹۴۹ء سے بی سی جی (BCG) کے ٹیکے لگوانے کی مہم جاری ہے اور اب تک ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ افراد کو تپ دق کے حفاظتی ٹیکے لگائے جا چکے ہیں ۔ ملک میں تپ دق کے چھوٹے بڑے سب ملا کر ایک سو شفاخانے ہیں اور ۱۹۷۰ء تک ان کی تعداد ۱۸۱ ہو جائے گی ۔ ڈھاکے اور راولپنڈی میں تپ دق کی تحقیق کے لیے سو سو بستر کے جدید طرز کے ہسپتال قائم کیے جا رہے ہیں ۔

۱۹۶۰ء میں سیٹو SEATO کے تعاون سے ڈھاکے میں ہیضے کی تحقیق کے لیے ایک تجربہ گاہ قائم ہوئی، جس کی کاوشوں سے ہیضے سے مرنے والوں کی شرح ۵۰ فی صد سے گھٹ کر ۲ فی صد رہ گئی ہے ۔

۱۹۶۰ء میں چیچک کے انسداد کے لیے کومیلا اور فریدپور کے اضلاع میں ایک رہبر منصوبہ (Pilot Project) بنایا گیا، جس کی بدولت اب اس خوفناک مرض سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد میں بہت کمی واقع ہو چکی ہے ۔

اس وقت ملک میں کوئی ایک لاکھ افراد جذام میں مبتلا ہیں اور ان کی اکثریت بھی مشرقی پاکستان ہی میں ہے ۔ انسداد جذام کے منصوبے کا آغاز ہو چکا ہے اور عالمی ادارۂ صحت (WHO) کے ایک ماہر خصوصی اس پر کام کر رہے ہیں ۔ مشرقی پاکستان میں چار گشتی شفاخانے

ایک سو ننانوے مختلف مقامات پر کوڑھیوں کے علاج کے لیے قائم ہیں۔ ڈھاکے اور Nilphamari میں دو مستقل ہسپتال موجود ہیں۔ مشنری ہسپتال اور نجی شفاخانے ان کے علاوہ ہیں اور ان میں کل چار سو بستر کی سہولت موجود ہے۔ مغربی پاکستان میں کراچی کے مقام پر دو سو بستر کا ایک ہسپتال قائم ہے، جسے مرکزی حکومت کی امداد سے میونسپل کارپوریشن چلا رہی ہے۔ ضلع بالا کوٹ میں پچاس بستر کا ایک شفاخانہ ہے۔ علاوہ ازیں خیراتی شفاخانوں میں بھی ۲۲۱ بستر مہیا ہیں۔

ملک میں دماغی عارضے میں مبتلا افراد کی صحیح تعداد کا کوئی اندازہ نہیں لگایا گیا، لیکن خیال ہے کہ صنعت کاری کے فروغ، شہروں میں بسنے کے بڑھتے ہوئے رجحان، تمدن کی پیچیدگیوں اور روز افزوں تکلفات کی وجہ سے ذہنی عوارض میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وقت دماغی امراض کے کل پانچ ہسپتال ہیں، جن میں دو ہزار مریضوں کے رکھنے کی گنجائش ہے۔ عام ہسپتالوں میں بھی معمولی درجے کے دماغی مریضوں کے علاج کے انتظامات موجود ہیں۔

انسدادی اقدامات اور حفظ صحت: امراض کے تدارک اور ان کی روک تھام کے لیے ملک میں حفاظتی اور انسدادی اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ صفائی کے معیار کو بہتر بنایا جا رہا ہے۔ غلاظت کے نکاس کے معقول انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ صاف پانی کی فراہمی کے کئی منصوبوں پر عمل درآمد جاری ہے۔ عوام میں اچھی اور متوازن غذا کا شعور پیدا کیا جا رہا ہے۔ حفاظتی ٹیکوں کی سہولتوں میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے اور اس وقت صحت کے منصوبوں پر خرچ ہونے والی کل رقم کا ۶۰ فی صد محض انسدادی تدابیر کے لیے وقف ہے۔

امراض پیدا کرنے میں سب سے بڑا دخل ماحول سے صفائی کے فقدان کو ہے۔ مشرقی پاکستان میں ۵۰ فی صد امراض کا آغاز معدے اور انتڑیوں کی خرابی (gastro-intestinal disorders) سے ہوتا ہے اور معدے کی تمام بیماریاں غلاظت اور ناصاف پانی سے جنم لیتی ہیں؛ چنانچہ نئے مکان بناتے وقت اور نئی مضافاتی بستیاں بساتے وقت صاف پانی کی فراہمی اور غلاظت کے نکاس کی طرف اب خاص توجہ دی جاتی ہے۔

تغذیہ: پاکستان کے اکثر علاقوں میں غذائیت کی مقدار اور اس کا معیار عالمی ادارۂ خوراک و زراعت (FAO) کے مقرر کردہ معیار سے کم ہے۔ متوازن اور توانائی بخش غذا میسر نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں میں قوت مدافعت گھٹ جاتی ہے۔ وزارت صحت نے ملک بھر میں غذا کی صحیح کیفیت معلوم کرنے کے لیے ایک نظامت قائم کی ہے۔ ڈھاکے میں غذائی تحقیق کی تجربہ گاہ قائم ہے؛ کوئٹے اور سکھر میں بھی ایسی تجربہ گاہیں قائم کی جا رہی ہیں۔

صفائی: ۱۹۶۶ء سے صفائی کی ایک وسیع اور ملک گیر مہم جاری ہے۔ صفائی کے پرچار کے لیے اظہار و ابلاغ کے تمام ذرائع سے کام لیا جا رہا ہے۔ عوام الناس کو صفائی، تازہ ہوا، صاف پانی اور پاکیزہ اور متوازن غذا کی اہمیت سے روشناس کرایا جا رہا ہے۔ محکمۂ صفائی کے اہلکار ہوٹلوں اور منڈیوں میں جا کر اجناس خوردنی کا معائنہ کرتے ہیں اور ملاوٹ کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔

تعلیم و تربیت: مشرقی پاکستان میں نظامت تعلیم صحت (Directorate of Health Education) اور مغربی پاکستان میں ادارۂ تعلیم صحت قائم ہیں،

جن کا مقصد لوگوں کو اچھی صحت اور اس کے بنیادی لوازمات کا شعور دلانا اور وبائی امراض کے انسداد کے طریقے بتانا ہے ۔ اس سلسلے میں سماجی رضاکار تنظیمیں بھی حکومت کا ہاتھ بٹاتی ہیں ۔

آغاز پاکستان کے وقت ملک میں صرف ایک میڈیکل کالج تھا ۔ اب بارہ کالج کام کر رہے ہیں ، جن سے مجموعی طور پر ہر سال ایک ہزار سے زائد ڈاکٹر فارغ التحصیل ہوتے ہیں ۔ ان کالجوں میں غیر ملکی طلبہ بھی زیر تعلیم ہیں ۔ ان سب کے ساتھ ملحقہ ہسپتال ہیں ۔ تعلیمی کورس کی مدت پانچ سال ہے ۔ طب اور جراحت کے شعبوں میں مزید خصوصی تربیت کے انتظامات کراچی، ڈھاکے اور لاہور میں موجود ہیں ۔ گرم ممالک سے تعلق رکھنے والی بیماریوں کی تحقیق اور مطالعے کے لیے ڈھاکے میں ایک کالج قائم کیا جا رہا ہے ۔ لاہور میں انسدادی طب اور حفظ صحت کا ایک ادارہ بھی قائم ہے ۔

بڑے بڑے ہسپتالوں میں نرسنگ کے چھبیس تربیتی ادارے موجود ہیں ۔ ان کا کورس تین سال کا ہے ۔ حال ہی میں راولپنڈی میں نرسنگ کی اعلیٰ تعلیم کا ایک کالج قائم ہوا ہے ، جہاں تین سالہ کورس کے علاوہ دایہ گری کا ایک سالہ تربیتی کورس بھی شامل نصاب ہے ۔

طبی تجربہ گاہوں میں فنی صلاحیتوں سے بہرہ ور کارکن مہیا کرنے کے لیے کراچی میں ایک تربیتی ادارہ قائم کیا گیا ہے ۔ اسی طرح ڈھاکے، بہاولپور اور کوئٹے میں صحت اور صفائی کے محکمے کے لیے کارکن تیار کرنے کے ادارے ہیں ۔ اسلام آباد میں بھی میڈیکل ٹکنالوجی Medical Technology کا ایک سکول قائم ہوا ہے، جہاں اس فن میں اعلیٰ تربیت کے انتظامات موجود ہیں ۔

۱۹۵۳ء میں پاکستان میڈیکل ریسرچ کونسل Pakistan Medical Research Council کا قیام عمل میں لایا گیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ طب اور صحت کے مختلف شعبوں میں کی جانے والی تحقیقات کی اس طرح تنظیم ہو کہ ان میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکے، ان کی افادیت عام ہو اور اس سے علم طب کو فروغ حاصل ہو ۔ اس کونسل کی زیر سرپرستی اس وقت پچاس سے زائد منصوبوں پر عمل ہو رہا ہے ۔ اس کے علاوہ کالرا انسٹی ٹیوٹ Cholera Institute، ڈھاکہ جناح پوسٹ گریجوایٹ میڈیکل سنٹر Jinnah Post Graduate Medical Center، کراچی اور انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ہیلتھ Institute of Puplic Health، ڈھاکہ، طبی تحقیق میں گراں قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں ۔ اسلام آباد میں نیشنل ہیلتھ لیبارٹریز National Health Laboratories کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، جہاں تغذیہ، صحت، ادویات اور دیسی جڑی بوٹیوں کی تحقیق کا کام جاری ہے ۔

قومی قرابادین (National Pharmacopia) : اب تک پاکستان میں ایسی کوئی کتاب مرتب نہیں ہوئی جس میں طب جدید و قدیم کے تمام نسخے درج ہوں ۔ اب ملکی ضروریات اور قومی تقاضوں کے پیش نظر ایک ایسی کتاب الادویہ زیر ترتیب ہے جو جدید طب کے ساتھ ساتھ یہاں کی دیسی ادویات، مرکبات، ان کی تیاری، ترکیب استعمال اور فوائد پر مشتمل ہوگی ۔ اپنی سر زمین میں پیدا ہونے والی جڑی بوٹیاں یہاں کے لوگوں کے مزاج سے زیادہ مطابقت رکھتی ہیں اور تاثیر کے اعتبار سے غیر ملکی ادویات سے بہتر اور ارزاں بھی ہیں ۔

دیسی طب کا نظام : آیورویدک، یونانی اور ہومیوپیتھی طریقہ ہائے علاج سے ملک کی کثیر آبادی فیضیاب ہو رہی ہے ۔ دیہات میں

بالخصوص یہ زیادہ کامیاب اور مقبول ہیں۔ حکومت نے ان تمام طریقہ ہائے علاج کو منظور کر لیا ہے اور ۱۹۶۰ء کے ایکٹ کی رو سے ان تینوں طریقوں میں پریکٹس کرنے والے اطبا کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنا نام اپنے اپنے طبی بورڈ کے پاس رجسٹر کرائیں۔ نجی طور پر بعض اداروں نے صحت اور طبی تحقیق کے شعبے قائم کر رکھے ہیں، جن کا مقصد ملک میں دیسی طریقۂ علاج کو فروغ دے کر اسے جدید طبی علوم کے شانہ بشانہ کھڑا کرنا ہے۔

۱۸۔ خاندانی منصوبہ بندی

پاکستان کی بڑھتی ہوئی آبادی ایک مسئلہ بن چکی ہے۔ ۱۹۶۷ء کے وسط میں آبادی گیارہ کروڑ سے زیادہ تھی۔ پیدائش کی شرح بڑھ رہی ہے اور صحت کی جانب زیادہ توجہ مبذول کرنے کے نتیجے میں اموات کی شرح میں کمی پیدا ہو گئی ہے۔ بے روزگاری، افلاس، جہالت کی فراوانی اور زرعی پیداوار کی قلت، یہ سب چیزیں اس بات کی متقاضی ہیں کہ آبادی کے بے تحاشا بڑھنے پر کوئی قدغن لگائی جائے۔

ماہرین اقتصادیات کے نزدیک اقتصادی ترقی کے پہلو بہ پہلو آبادی کے مسئلے پر غور کرنا بھی کچھ کم اہم نہیں۔ تیز رفتاری سے بڑھتی ہوئی شرح پیدائش کو روکنا بھی اقتصادی خوش حالی اور ترقی کا ایک حصہ ہے، چنانچہ خاندانی منصوبہ بندی کے نام سے ایک مہم کا آغاز کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کی آبادی کے درمیان عمر کی ناہمواری کو رفع کیا جائے، ۱۹۷۰ء تک خوراک کے معاملے میں ملک کو خود کفیل بننے کے قابل بنا دیا جائے، نیز موجودہ فی کس آمدنی کو برقرار رکھا جائے بلکہ منصوبہ بندی کے تحت آمدنی میں اضافہ کیا جائے۔ ان اغراض و مقاصد کے پیش نظر ۱۹۷۰ء تک دو کروڑ شادی شدہ جوڑوں کو خاندانی منصوبہ بندی میں شامل کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔

اسی طرح یہ بھی تجویز کیا گیا کہ پیش نظر عرصۂ منصوبہ بندی (۱۹۶۵ تا ۱۹۸۵ء) کے دوران میں علاوہ دیگر فوائد کے فی کس سالانہ آمدنی کو تین گنا بڑھا دیا جائے اور تعلیم عام کر دی جائے، نیز یہ کہ شرح پیدائش کو ۵۵ فی ہزار سے کم کر کے ۳۳ فی ہزار کر دیا جائے۔

پاکستان کے روایتی ماحول میں خاندانی منصوبہ بندی کی شدید مخالفت ناگزیر ہے۔ غیر اخلاقی قرار دینے کے علاوہ مندرجۂ ذیل دلائل بھی اس کے خلاف پیش کیے جاتے ہیں: اولاد اقتصادی سہارا ہے؛ لڑکے جتنے زیادہ ہوں گے اتنا ہی بڑھاپے میں بے فکری اور استحکام حاصل ہوگا؛ اولاد والدین کے درمیان خوشگوار اور مضبوط تعلقات کی ضامن ہوتی ہے، وغیرہ۔ خاندانی منصوبہ بندی کی راہ میں ایک بڑی دشواری یہ بھی ہے کہ عوام تعلقات زناشوئی کے بارے میں گفتگو کرتے شرم محسوس کرتے ہیں۔

بایں ہمہ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ شہروں اور دیہات میں لوگ آہستہ آہستہ خاندانی منصوبہ بندی کی ضرورت و اہمیت کے قائل ہوتے جا رہے ہیں۔ اس منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے پورا نظم و نسق مصروف عمل ہے، چنانچہ پہلے پنج سالہ منصوبے میں اس کے لیے پچاس لاکھ روپے، دوسرے پنج سالہ منصوبے میں ۳ کروڑ ۵ لاکھ روپے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ۲۸ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے رکھے گئے۔ وزارت صحت کے ماتحت خاندانی منصوبہ بندی کا ایک پورا محکمہ کام

کر رہا ہے اور اس کے مراکز ملک کے کونے کونے میں قائم کیے گئے ہیں۔ اندازہ ہے کہ اس پروگرام پر عمل کرنے سے مشرقی پاکستان میں ۸ لاکھ ۵۶ ہزار اور مغربی پاکستان میں ۷ لاکھ ۱۶ ہزار بچے کم پیدا ہوئے۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے Pakistan Year Book 1969، ص ۳۷۳ تا ۳۷۵۔

۱۹۔ محنت

۱۹۶۱ء کی سر شماری کی رو سے ملک کی غیر فوجی افرادی قوت ۳ کروڑ ۲ لاکھ افراد (۲ کروڑ ۶۳ لاکھ مرد اور ۳۸ لاکھ عورتیں)، یعنی آبادی کے ایک تہائی حصے پر مشتمل تھی اور ان میں برسر روزگار اور روزگار کے خواہاں دونوں شامل تھے۔

۱۹۵۱ اور ۱۹۶۰ء کے درمیان دس سال میں آبادی ۲۳٫۹ فی صد کے حساب سے اور افرادی قوت ۲۱٫۳ فی صد شرح سے بڑھی۔ منصوبہ بندی کمیشن کے تخمینے کے مطابق ۱۹۶۰ سے ۱۹۶۵ء تک ۷ لاکھ ۲۰ ہزار افراد سالانہ اور ۱۹۶۵ سے ۱۹۷۰ء تک ۸ لاکھ ۴۰ ہزار افراد سالانہ کی شرح سے اضافہ ہوا اور یوں ۱۹۷۰ء تک نوے لاکھ افراد کا اضافہ ہوا۔

۱۹۶۱ء میں محنت کشوں کی تین چوتھائی تعداد کا پیشہ زراعت تھا (مغربی پاکستان میں ۵۴٫۰۷ فی صد اور مشرقی پاکستان میں ۶٫۱۹ فی صد)۔ عورتوں کا تناسب بھی زراعتی پیشوں میں سب سے زیادہ ہے۔

صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ محنت کشوں کی تقسیم کار میں نمایاں تبدیلی وقوع پذیر ہو رہی ہے۔ اب صنعت و حرفت میں محنت کشوں کی زیادہ کھپت ہو رہی ہے اور زراعت پر جو بہت زیادہ انحصار کرنا پڑ رہا تھا اس میں بتدریج کمی واقع ہو رہی ہے۔

۱۹۶۱ء کی سر شماری کی رو سے بے روزگار محنت کشوں کی تعداد تقریباً تین لاکھ ۶ ہزار تھی، لیکن یہ اعداد و شمار روزگار کی صحیح صورت حال کی عکاسی نہیں کرتے۔ تیسرے منصوبے کا تخمینہ ہے کہ ملک کی ۲۰ فی صد افرادی قوت ضائع ہو رہی ہے۔ آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو جانے اور بھارت سے لگاتار ہجرت کر کے آنے والوں کی وجہ سے بے روزگاری بڑھ گئی ہے۔ محنت کاروں کے شہری مرکزوں کی طرف نقل مکانی کرنے کے رجحان کے باعث دیہی علاقوں میں تو بے روزگاری کم ہو رہی ہے لیکن شہری علاقوں میں بڑھ رہی ہے۔

افرادی قوت میں اضافے کے مد نظر دوسرے منصوبے میں چھتیس لاکھ اور تیسرے منصوبے میں پچپن لاکھ نئی ملازمتوں کے مواقع فراہم کیے گئے، لیکن اس سے بے روزگاری کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ اب چوتھے پنج سالہ منصوبے (۱۹۷۰ تا ۱۹۷۵ء) میں ایک جامع لائحۂ عمل تیار کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ زیریں سطح پر ملازمتوں کی اور اعلیٰ سطح پر مناسب اور موزوں افراد کی کمی ہے، خصوصاً تربیت یافتہ ہنرمندوں اور اعلیٰ تربیت یافتہ افراد کی بے حد ضرورت ہے۔ محنت پہلے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کا مشترکہ مسئلہ تھا، لیکن ۱۹۶۲ء کے ایک نئے قانون کی رو سے یہ صوبائی مسئلہ بن گیا۔ لہٰذا اب اس شعبے میں آئین سازی صوبائی حکومتوں کی ذمے داری ہے؛ تاہم مرکزی حکومت توافق و ہم آہنگی پیدا کرنے، نظم و ضبط قائم رکھنے اور بین الاقوامی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ملک میں محنت کی صورت حال پر نظر رکھتی ہے۔

۱۹۵۹ء میں مرکزی حکومت نے محنت کے طریق کار پر نظرثانی کی، جس کے چند بنیادی مقاصد یہ تھے: (۱) آجر اور اجیر کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانا؛ (۲) ہر طبقے کے محنت کشوں کو معاشرتی سہولتیں بہم پہنچانا؛ (۳) صنعتی میدان میں امن و امان قائم رکھنا؛ (۴) ٹریڈ یونینوں کی صحت مند سرگرمیوں کا فروغ؛ (۵) بے روزگاری میں تخفیف؛ (۶) محنت کشوں کی کارخانوں اور گھروں میں گزر بسر کے متعلق معلومات جمع کرنا؛ (۷) امداد باہمی کے خطوط پر ان کی سماجی بہبود؛ (۸) دوست ممالک سے تکنیکی امداد کا حصول؛ (۹) بین الاقوامی تنظیم محنت (ILO = International Labour Organization) کی سفارشات اور قراردادوں کے مطابق پالیسی وضع کرنا۔

محنت کے متعلق اس حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے متعدد قوانین وضع کیے گئے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد حکومت نے ملک کے لیے نئی لیبر پالیسی طے کی ہے، جس سے مزدوروں کو مزید مراعات اور تحفظات مل گئے ہیں۔

آزادی کے حصول کے فوراً بعد پاکستان ILO کا رکن بن گیا اور وہ اب تک اس کے انیس معاہدوں کی توثیق کر چکا ہے۔ مزدوروں، مالکوں اور حکومت کے نمائندوں کی ہر سال ایک کانفرنس ہوتی ہے، جس میں مزدوروں اور انتظامیہ کے مختلف مسائل اور حکومت کی پالیسی زیر بحث آتی ہے۔

دوسرے پنج سالہ منصوبے کی سفارشات پر عمل درآمد کرتے ہوئے قومی افرادی قوت کی مجلس (National Manpower Council) کا قیام عمل میں آیا، جس کا سربراہ وزیر صحت و محنت و معاشرتی بہبود ہے اور اس کے ارکان منصوبہ بندی ڈویژن، جملہ اہم مرکزی وزارتوں، صوبائی حکومتوں اور ریلوے بورڈوں سے لیے گئے ہیں۔ اس کونسل کے متعدد وظائف میں سے دو یہ ہیں: اولاً انسانی وسائل کی ترقی اور ان سے استفادے کے لیے لائحۂ عمل تیار کرنا اور ثانیاً ایک طرف تو صنعتی ضروریات کے مطابق محنت کشوں کی تربیت کا لائحۂ عمل تیار کرنا اور دوسری جانب تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ محنت کشوں کے لیے مناسب روزگار مہیا کرنے کا منصوبہ تیار کرنا۔

اس کونسل کی معاونت کے لیے کچھ مخصوص شعبے بھی قائم کیے گئے ہیں، مثلاً اعلٰی سطح کی مجلس عملہ (High-Level-Personnel Committee)، قومی تربیتی بورڈ (National Training Board) اور ترقی روزگار کا دفتر (Employment Promotion Board یا Civil Works Board)۔

دفاتر روزگار و تربیت (Employment And Training Services): اعلٰی درجے کی خالی اسامیوں کو بذریعۂ اخبارات مشتہر کیا جاتا ہے، لیکن جہاں تک ادنٰی درجے کی ملازمتوں کا تعلق ہے حکومت شہری علاقوں میں تیئیس سے زائد دفاتر روزگار (Employment Exchanges) چلا رہی ہے۔ ان دفاتر کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ان کی وساطت سے پانچ ہزار سے کچھ کم اشخاص کو روزگار ملا تھا۔ اب یہ تعداد ستر سے اسی ہزار سالانہ تک پہنچ گئی ہے۔ قومی افرادی قوت کی مجلس بھی ایک قومی دفتر روزگار (National Employment Bureau) چلاتی ہے، جس کا کام ہنرمند (Technical) اشخاص کو ملک کے اندر اور باہر روزگار کے حصول میں مدد دینا ہے۔ اسی مجلس کے زیر اہتمام نوجوانوں کو ان کی افتاد طبع کے مطابق پیشوں کے انتخاب اور روزگار مہیا کرنے کے لیے ۱۹۶۳ء سے صیغۂ روزگار نوجوانان (Youth Employment

(Services) کام کر رہا ہے۔

برصغیر میں ٹریڈ یونین تحریک کا آغاز ۱۸۹۰ء میں ہوا، لیکن اسے پہلی عالمگیر جنگ کے بعد فروغ حاصل ہوا۔ آزادی کے وقت پاکستان صنعت و حرفت میں بے حد پس ماندہ تھا، اس لیے ۱۹۴۷ء میں منظور شدہ مزدور انجمنوں (Registered Trade Unions) کی تعداد صرف پچھتر تھی اور وہ بھی اچھی طرح منظم نہ تھیں۔ صنعت و حرفت میں ترقی اور انجمن سازی کی حوصلہ افزائی کے سبب مئی ۱۹۶۶ء میں ان کی تعداد ۹۸۷ اور ان کے ارکان کی تعداد ۵۱۷۶۵۹ تک پہنچ گئی۔ یہ انجمنیں زیادہ تر بڑے بڑے صنعتی مرکزوں، مثلاً ڈھاکے، چاٹگانگ، کراچی اور لاہور میں، قائم ہیں۔ یہ عموماً مقامی ہوتی ہیں، لیکن بیشتر کا الحاق کسی نہ کسی مرکزی وفاقیہ (Federation) سے ہوتا ہے، مثلاً آل پاکستان کنفیڈریشن آف لیبر All Pakistan Confederation of Labour، آل پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز All Pakistan Federation of Trade Unions، پاکستان مزدور فیڈریشن Pakistan Mazdoor Federation، پاکستان کے بحری کارکنوں کی فیڈریشن (Pakistan Sea Farers Federation) اور یونائیٹڈ ٹریڈ یونین فیڈریشن United Trade Union Federation۔ ان میں سب سے بڑی آل پاکستان کنفیڈریشن لیبر ہے، جس سے ۱۹۶۵ء تک پچیس مختلف صنعتوں کی ۲۹۵ جمعیتیں ملحق تھیں، جن کے ارکان کی تعداد تقریباً چار لاکھ تھی۔

پاکستان میں بہت عرصے تک ۱۹۲۹ء کا صنعتی تنازعات کا قانون نافذ رہا، جس میں آزادی کے بعد وقتاً فوقتاً ترمیمیں ہوتی رہیں، لیکن حکومت پاکستان کو آخرکار اس قانون کو منسوخ کرکے اس کی جگہ ایک نیا قانون نافذ کرنا پڑا، جسے صنعتی تنازعات کا ضابطہ (Industrial Dispute Ordinance) کہتے ہیں۔ اس ضابطے سے تنازعات کے تصفیے کا طریق کار پہلے سے کہیں زیادہ سہل اور بہتر ہو گیا اور صنعتی عدالت بننے سے انصاف کے تقاضے بھی پورے ہوگئے ہیں۔

۲۰۔ سماجی بہبود

پاکستان ایک فلاحی مملکت ہے۔ ۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۲ء کے دستوروں میں حکومت کا فرض قرار دیا گیا تھا کہ وہ بلا امتیاز مذہب و ملت اور رنگ و نسل ہر شہری کے معیار زندگی کو ترقی دے، دولت کے ارتکاز کو روکے، ملک کے سب طبقوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرے، ہر شخص کے لیے روٹی، کپڑا، مکان، علاج اور تعلیم کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرے اور جو لوگ جسمانی نقص یا کسی اور وجہ سے اپنی روزی نہ کما سکیں ان کی کفالت کرے۔ دراصل خود اسلام نے، جس پر پاکستان کی بنیاد ہے، حکومت پر یہ پابندیاں عائد کی ہیں۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے وقت جس وسیع پیمانے پر نقل آبادی ہوئی اسے حکومت سنبھال نہیں سکتی تھی۔ لوگوں نے کچھ اپنی سعی و کوشش سے اور کچھ محکمۂ بحالیات کی امداد سے سر چھپانے کی جگہیں اور بعض کاروبار حاصل کیے۔ کچھ کام محکمۂ تعلیم، صحت عامہ، محنت، عدلیہ، زراعت، امداد باہمی اور عوامی انجمنوں کے ذریعے بھی سر انجام دیا گیا؛ لیکن اس سلسلے میں حکومت کے سامنے مسائل و مشکلات کا انبار تھا۔ حکومت نے اپنے انتظامی ڈھانچے میں سماجی بہبود کا کام وزارت صحت و محنت و سماجی بہبود کے سپرد کر رکھا ہے۔ ۱۹۶۲ء کے آئین کی رو سے اسے صوبجاتی ذمے داری قرار دیا گیا؛ چنانچہ اس کے بعد سے سماجی بہبود کے تمام کام اور منصوبے اور ادارے

صوبائی حکومتوں کو منتقل کر دیے گئے، البتہ بالائی نگرانی اور بین الاقوامی سطح کے کام بدستور مرکز کے سپرد رہے ۔

حکومت کے سماجی بہبود کے محکمے کے دو بنیادی کام ہیں: (۱) صنعت و زراعت اور ملازمتوں وغیرہ کے سلسلے میں ایسا معتدل معاشرتی نظام قائم کرنے کی کوشش کی جائے کہ ملک میں دولت کا ارتکاز نہ ہو سکے، کوئی طبقہ پس ماندہ نہ رہ جائے اور سب کے لیے کھانے، پینے، رہنے سہنے، لباس، علاج اور تعلیم کی سہولتیں پیدا ہو جائیں؛ (۲) اگر پھر بھی سماج میں سے کچھ لوگ پس ماندہ رہ جائیں تو ان کی عملی امداد کی جائے ۔

اس محکمے نے محسوس کیا کہ ٹھوس بنیادوں پر کام کرنے کے لیے سب سے زیادہ کمی تربیت یافتہ عملے کی ہے ۔ تقسیم ملک کے وقت چھوٹے پیمانے پر محنت مزدوری کرنے والوں کی بہبود کے لیے حکومت کے ڈھانچے میں ایک شعبہ موجود تھا، جس میں افسران سماجی بہبود (Labour Welfare Officers) بھرتی کیے جاتے تھے ۔ ۱۹۵۲ء میں اقوام متحدہ اور بعض دوسرے اداروں کے تعاون سے سماجی بہبود کے لیے کارکنوں کی تربیت کا اہتمام کیا گیا، جس کے ذریعے پہلے پنج سالہ منصوبے کے آغاز سے پہلے ۱۲۴ کارکن تیار ہو چکے تھے اور پنجاب یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ کورس Post Graduate Course کا بندوبست کر لیا گیا تھا اور عملی امداد کے سلسلے میں دیہات کی زرعی و صنعتی ترقی (V.A.I.D. = Village Agricultural and Industrial Development)، قومی ترقی، زچہ و بچہ کے امدادی مراکز کا پروگرام شروع ہو چکا تھا ۔ اسی طرح گونگوں، بہروں، اندھوں اور یتامی کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی توجہ دی گئی ۔

پہلے پنج سالہ منصوبے (۱۹۵۵ - ۱۹۶۰ء) میں تین چیزوں کی طرف خصوصی توجہ دی گئی تھی: سماجی منصوبہ بندی، سماجی تحقیقات اور سماجی کام ۔ اس طرح حکومت کے ڈھانچے میں Social Welfare اور Housing and Settlement کے دو جدید محکمے قائم کیے گئے اور سماجی بہبود کے لیے منصوبے میں تین کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ۔ جنوری ۱۹۵۶ء میں مرکزی حکومت نے سرکاری اور غیر سرکاری ارکان پر مشتمل سماجی بہبود کی ایک قومی مجلس (National Council of Welfare) قائم کی ۔ اس کونسل کا ایک اہم کام یہ تھا کہ رضاکارانہ طور پر کام کرنے والے نجی اداروں کی ضروریات اور ان کی کارکردگی کا اندازہ کرے، ان کی راہنمائی کرے اور انھیں مالی اور فنی امداد دے ۔ بعد میں ایسی کونسلیں صوبوں میں بھی قائم کر دی گئیں ۔ ان کونسلوں کی حیثیت مشیر حکومت کی تھی ۔ اس منصوبے میں عملاً زیادہ زور اس پر دیا گیا کہ کارکنوں کی تربیت کی جائے؛ چنانچہ پانچ سو کارکن تیار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا، لاہور کے علاوہ ایک مرکز ڈھاکے میں اور تیسرا کسی اور جگہ کھولنے کی تجویز کی گئی (ڈھاکے کا مرکز ۱۹۵۹ء میں قائم ہوا) اور مشورہ دیا گیا کہ ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں سوشل ورکس Social Works کا شعبہ قائم کیا جائے اور اسی طرح بعض دوسرے ذرائع سے تربیت یافتہ عملہ مہیا کیا جائے؛ لہٰذا پہلے پنج سالہ منصوبے کی بیشتر رقم تربیت کی ان تنظیموں، عمارات، موٹر گاڑیوں اور دفتری ساز و سامان پر لگ گئی، جس میں ستر لاکھ کا غیر ملکی زر مبادلہ بھی شامل تھا، نیز اس رقم سے سماجی بہبود کے دو سو نجی ادارے امداد لیتے رہے ۔ اس منصوبے میں حکومت کو اس طرف بھی توجہ دلائی

گئی کہ زکوٰۃ و اوقاف کے روپے کو سماجی بہبود کے لیے صرف کرنے کے لیے قوانین بنائے جائیں۔ اس منصوبے میں جو رقم رکھی گئی تھی اس کی نسبت ۲۵ فی صد کے قریب نتائج برآمد ہوے۔

دوسرے پنج سالہ منصوبے میں کوئی ۸ کروڑ ۴۷ لاکھ روپیہ رکھا گیا تھا۔ اس میں سماجی بہبود کے نجی اداروں کی طرف توجہ دی گئی۔ جو کارکن تیار ہو چکے تھے انھیں بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت کام پر لگایا گیا۔ زکوٰۃ، صدقات اور اوقاف کی رقوم کو سماجی بہبود پر صرف کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ صوبائی حکومتوں میں سماجی بہبود کی نظامتیں قائم کی گئیں اور تجویز کی گئی کہ ہر صوبے میں سوشل ورک کا ایک ایک سکول کھولا جائے اور چار سو یونیورسٹی گریجویٹ اور سات سو دوسرے تربیت یافتہ کارکن تیار کیے جائیں؛ دس کالجوں میں سوشل ورک کے شعبے قائم کیے جائیں؛ شہری حلقوں میں اٹھانوے سکیمیں جاری کی جائیں؛ سینتالیس طبی امداد کے مراکز کھولے جائیں اور تین سو نجی رضاکارانہ کام کرنے والے اداروں کی مالی امداد کی جائے۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ۱۷ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے رکھے گئے تھے۔

اس وقت ملک کے بیس کالج سوشل ورک میں گریجویٹ تیار کر رہے ہیں اور ان کی تعداد کو مزید بڑھایا جا رہا ہے۔ مندرجۂ ذیل یونیورسٹیوں میں اس کے مستقل شعبے قائم ہیں: پنجاب، کراچی، ڈھاکہ، راجشاہی اور پشاور۔ اندازہ ہے کہ تیسرے پنج سالہ منصوبے کے اختتام تک دو ہزار تربیت یافتہ کارکن تیار ہو جائیں گے۔ ۱۹۵۵ء میں ان نجی اداروں کی تعداد دو سو تھی جو سماجی بہبود کا کام کر رہے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں ان کی تعداد چار ہزار تھی، جن میں بعض بڑے اہم ہیں، جیسے عورتوں کے لیے کل پاکستان انجمن خواتین (APWA)، مجلس بہبود اطفال (Pakistan Council for Child-Welfare)، عوام بہبود کے لیے Pakistan Conference for Social Work، اندھوں کی بہبود کے لیے National Federation for the Welfare of the Blind، تپ دق کے مریضوں کی بہبود کے لیے Pakistan T. B. Welfare Association، جذامیوں کی بہبود کے لیے Pakistan Leprosy Association، ابتدائی طبی امداد کے لیے انجمن صلیب احمر Red Cross Society اور St. John Ambulance Association۔ کراچی میں رضاکارانہ طور پر ایک مجلس رابطہ Social Services Co-ordinating Council سماجی بہبود کے سات سے اوپر اداروں میں رابطے کا کام کر رہی ہے۔ ۱۹۶۱ء میں سوشل ویلفیئر ایجنسیز (رجسٹریشن اینڈ کنٹرول) آرڈیننس جاری کیا گیا تاکہ نجی اداروں کی کارکردگی کو بڑھایا جائے اور اداروں کی نگرانی کی جائے اور دیکھا جائے کہ چندہ دینے والوں نے جن مصارف کے لیے روپیہ دیا ہے ان کا صرف صحیح ہو رہا ہے۔ مستحق امداد عورتوں کے تین مراکز (ڈھاکہ، کراچی، پشاور) اور بچوں کی امداد کے لیے حکومت کے پندرہ مراکز ملک میں کام کر رہے ہیں۔ حکومت کی طرف سے بنگلہ، اردو اور انگریزی میں اچھے مضامین لکھنے والے بچوں کے لیے تین، اچھے فنکاروں کے لیے دو اور خدمت اور جرأت کا ایک انعام ہر سال دیا جاتا ہے۔ ہر سال ماہ اکتوبر کے پہلے دو شنبے کو بچوں کا دن منایا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے UNICEF کی طرف سے ملنے والی امداد سے ایک لاکھ عورتیں اور بچے مستفید ہو رہے ہیں۔ اس ادارے کی طرف سے بچوں کی بہبود کے دو تربیتی مراکز (ڈھاکہ اور لاہور) قائم ہیں۔ مشرقی پاکستان میں حکومت کے قائم کردہ سترہ یتیم خانے ہیں اور ایسے یتیم خانے جنھیں حکومت

امداد دے رہی ہے چوبیس ہیں۔ مغربی پاکستان میں حکومت کا اپنا قائم کردہ کوئی یتیم خانہ نہیں؛ امداد سے چلنے والے یتیم خانوں کی تعداد انیس ہے۔ نجی یتیم خانوں کی کل تعداد کوئی پانچ سو ہوگی۔ کراچی میں ۱۹۶۳ء سے کس مپرس بچوں کی نگہداشت کا ایک مرکز کام کر رہا ہے۔ نوجوانوں کی امداد کے لیے بھی ملک میں بعض ادارے قائم ہیں؛ گرلز گائیڈ اور بوائے سکاؤٹس کے علاوہ ڈھاکے میں ایک ورکس کیمپ ایسوسی ایشن اور لاہور میں یوتھ ہوسٹل ایسوسی ایشن قائم ہے۔ کراچی کے ثانوی تعلیمی بورڈ نے نیشنل یوتھ سنٹر قائم کیا ہے۔ مشرقی پاکستان میں ایسے سولہ مراکز موجود ہیں۔

حکومت کی طرف سے ایسے قواعد بھی موجود ہیں جن کے مطابق ملازم رکھنے والوں کا فرض ہے کہ ان حادثات کا معاوضہ ادا کریں جو کام کرنے کے دوران میں کسی ملازم کو پیش آ جائیں، مثلاً دیکھیے Workmen's Compensation Act, 1923 و Employee's Social Insurance Ordinance, 1962۔ اسی طرح زچگی کی رخصتیں بھی دی جاتی ہیں۔

گداگری بہت بڑی لعنت ہے۔ اسلام نے اسے سختی کے ساتھ روکا ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ بے وسیلہ لوگوں کی حفاظت و امداد کا بندوبست کیا جائے۔ حکومت اس طرف توجہ دے رہی ہے اور ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانا چاہتی ہے جو سماجی برائیوں کے انسداد کے کمیشن نے اس بارے میں پیش کی ہیں۔ حکومت مشرقی پاکستان نے ڈھاکے اور میمن سنگھ میں گداگروں کی بحالی کے لیے دو مرکز کھول رکھے ہیں۔ اس طرح اپنی امداد آپ کے اصول پر کھلنا، بوگرا، رنگپور، کومیلا اور فریدپور میں مراکز قائم ہیں۔ پاکستان میں ۱۹۶۲ء سے مجرموں کو قبل از وقت رہائی کی سہولتیں دے کر ان کی اصلاح و نگرانی کا محکمہ بھی قائم ہے۔ جسمانی اور دماغی لحاظ سے پسماندہ طبقوں کی بحالی کے بھی کچھ انتظامات ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ پاکستان میں تقریباً پانچ لاکھ افراد نابینا ہیں۔ حکومت نے ان کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی مراکز کھول رکھے ہیں۔ نجی ادارے، مثلاً Association for the Prevention of Blindness اور Adult Blind Centre بھی اس سلسلے میں مفید کام کر رہے ہیں۔ ایک درجن سے اوپر مراکز بہروں اور گونگوں کی تربیت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ دماغی لحاظ سے معذوروں کے متعلق Pakistan Institute of Mental Hygiene اور Pakistan Association of Mental Health مفصل جائزہ لے رہے ہیں۔

افلاس، جہالت، امراض، عصمت فروشی، گداگری، بے روزگاری، غذائی قلت، سیلاب اور طوفان، مکانوں کی قلت، مجرموں کی بحالی اور جنگ سے پیدا شدہ برے اثرات کے سلسلے میں ملک جس پسماندگی میں مبتلا ہے اس سے بہت سی سماجی برائیاں بھی جنم لے رہی ہیں۔ انہیں دور کرنے کے لیے حکومت نے اینکٹ کمیشن (for the Eradication of Social Evils Commission) بھی قائم کیا ہے۔ ریٹائرڈ فوجیوں اور شہدا کے پسماندگان کی بہبود کے لیے بھی حکومت نے متعدد شعبے قائم کر رکھے ہیں؛ تاہم سماجی بہبود کے سلسلے میں بہت سا کام کرنا ابھی باقی ہے۔

۲۱ - رہائشی منصوبے اور تعمیرات

شہری ضروریات کی تکمیل کے لیے میونسپل اور ٹاؤن کمیٹیاں تو تقسیم ملک سے پہلے سے موجود تھیں لیکن یہ ذمے داری روز بروز اتنی بڑھ رہی تھی کہ بڑے شہروں کے لیے امپروومنٹ ٹرسٹ قائم کیے گئے۔ پاکستان کے حصے میں جو علاقے آئے تھے ان میں

پہلا ٹرسٹ ۱۹۳۳ء میں قائم کیا گیا۔ دسمبر ۱۹۶۳ء میں ملک میں ایسے بائیس ٹرسٹ اور ۱۰۹ میونسپل کمیٹیاں موجود تھیں۔ دیہات کی رہائشی ضروریات کا کام ضلعی کونسلوں کے سپرد ہے۔ حکومت کی طرف سے محکمۂ تعمیرات عامہ (Public Works Department = PWD) اور محکمۂ منصوبہ بندی (Planning Department) شہروں کے قیام اور تعمیرات کے سلسلے میں حکومت کی ذمے داریوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ حکومت کے دارالحکومتوں کی تعمیر کا کام کیپٹل ڈیویلپمنٹ اتھارٹی (Capital Develpment Authorty = C.D.A) کے سپرد ہے اور ریلوے، ڈاک و تار اور آب‌پاشی وغیرہ کے محکمے اپنے ملازمین کی سکونتی ضروریات کی طرف خود توجہ کرتے ہیں۔ منصوبہ‌بندی کمیشن وسیع پیمانے کی سکیموں کی طرف توجہ دیتا ہے۔

پاکستان کی آبادی میں سالانہ تیس لاکھ نفوس سے بھی زیادہ کا اضافہ ہو رہا ہے۔ صنعت و تجارت کی ترقی سے شہری آبادی میں اضافے کی مقدار بہت زیادہ ہے، پھر ہندوستان سے بھی مسلمانوں کی نقل آبادی ہوتی رہتی ہے۔ ان وجوہ سے پاکستان میں رہائش کا مسئلہ نازک سے نازک تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور سالانہ کوئی ساٹھ ہزار مکانوں کی کمی محسوس ہو رہی ہے؛ چنانچہ دوسرے پنجسالہ منصوبے کے شروع کرتے وقت صرف شہری آبادی میں چھے لاکھ مکانوں کی کمی تھی اور تیسرے منصوبے کے شروع کرتے وقت یہ کمی دس لاکھ تک پہنچ گئی۔ حکومت کو اس کا احساس ہے۔ اس سلسلے میں حکومت نے تعمیر مکانات کے لیے تحقیقات کا کام بھی شروع کروایا تھا تاکہ دیکھا جائے کہ کس طرح کم خرچ مکانات تعمیر ہو سکتے ہیں اور مقامی مسالے سے انھیں تیار کیا جا سکتا ہے۔ پینے کے پانی کی بہم رسانی اور گندے پانی کے نکاس اور قومی اجتماعوں کے مراکز کی تعمیر، نیز شہروں اور مکانات کے نقشوں کی تیاری اور نئے مکانات کے بنوانے کے مسائل بڑے اہم ہیں؛ چنانچہ پہلے پنج سالہ منصوبے کے مطابق شہروں کی منصوبہ‌بندی (Town Planning) اور تعمیرات کے دو مراکز کھولے (ایک ڈھاکے میں اور دوسرا لاہور میں)، نیز انھیں مقامات پر عمارتی تحقیقات کے ادارے (Building Research Institutes) قائم کیے گئے اور پورے منصوبے کے لیے ۸۶ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی۔ دوسرے منصوبے میں یہ رقم ۸۹ کروڑ ۵۰ لاکھ تھی، لیکن اس میں اسلام آباد اور ڈھاکے میں دارالحکومتوں کی تعمیر کے اخراجات بھی شامل تھے جو اس رقم کا کوئی چوتھا حصہ تھے۔ تیسرے منصوبے کی رقم ۳ ارب ۲ کروڑ ۶۱ لاکھ تھی۔

۱۹۶۰ء کے اعداد و شمار کی رو سے ملک میں ۲۹۱ شہر اور ایک لاکھ دیہات تھے اور کوئی ساڑھے پانچ فی صد سالانہ کی شرح سے شہری آبادی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں شہری آبادی ایک کروڑ ۲۶ لاکھ ۱۰ ہزار تھی، جو ۱۹۶۵ء میں ایک کروڑ ۶۳ لاکھ ۸۰ ہزار ہو گئی اور ۱۹۷۰ء میں اندازہ ہے کہ یہ تعداد ۲ کروڑ ۱۸ لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ اس وقت ملک میں مکانات بنانے کی چار سو سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں۔ امپروومنٹ ٹرسٹ ایسی اراضی مہیا کرتے ہیں جہاں پانی، بجلی اور سڑکوں وغیرہ کے انتظامات موجود ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت امداد باہمی کی انجمنوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ کرایوں کو اعتدال پر رکھنے کے لیے ملک میں رینٹ کنٹرول ایکٹ (Rent Control Act) بھی نافذ ہے۔ بیالیس ذیلی شہر بسائے گئے ہیں۔ حکومت نے مکان بنانے کے لیے قرضے دینے کے لیے مالیاتی کارپوریشن برائے تعمیر مکانات (House Building Finance Corporation) بنائی

ہوتی ہے، جس کے چار ریجنل اور بارہ سب ریجنل دفاتر کام کر رہے ہیں۔ اس کارپوریشن کا ابتدائی سرمایہ پانچ کروڑ روپے ہے، جو حکومت نے مہیا کیا۔ اس کے علاوہ جون ۱۹۶۰ء تک اس نے حکومت سے چھے کروڑ روپیہ بطور قرض بھی لیا اور مزید ۱۲ کروڑ روپیہ دوسرے ذرائع سے حاصل کیا۔ ۱۹۶۷ء تک اس کارپوریشن کی امداد سے صرف چوبیس ہزار مکانات تعمیر ہو سکے۔ بینک اور انشورنس کمپنیاں عموماً تعمیر مکان کے لیے قرضے نہیں دیتیں۔

۲۲۔ نشریات

ریڈیو: پاکستان میں ریڈیو نشریات کا انتظام وزارت اطلاعات کے توسط سے کلیۃً حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ اس وقت ملک میں بارہ ریڈیو سٹیشن کام کر رہے ہیں: مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ، چٹاگانگ، راجشاہی، سلہٹ اور رنگپور اور مغربی پاکستان میں لاہور، پشاور، کراچی، راولپنڈی، اسلام آباد، حیدر آباد اور کوئٹہ۔ ان سے اٹھارہ زبانوں میں نشریات ہوتی ہیں۔ ریڈیو کے محکمے کا اعلیٰ افسر ڈائرکٹر جنرل کہلاتا ہے۔

قیام پاکستان کے وقت ملک میں صرف تین ریڈیو سٹیشن تھے: لاہور (۵ کیلوواٹ، میڈیم ویو)، ڈھاکہ (۵ کیلوواٹ، میڈیم ویو) اور پشاور (۱۰ کیلوواٹ، میڈیم ویو)۔ قیام پاکستان کے بعد سب سے پہلے ۱۹۴۸ء میں کراچی کا ریڈیو سٹیشن قائم کیا گیا، جس میں میڈیم ویو اور شارٹ ویو کا ایک ایک ٹرانسمٹر Transmitter نصب کیا گیا۔ ایک سال بعد اس میں دس کیلوواٹ کے ایک میڈیم ویو ٹرانسمٹر کا اضافہ ہوگیا۔ اسی سال ۷.۵ کیلوواٹ (شارٹ ویو) کا ایک ٹرانسمٹر ڈھاکے میں اور پچاس پچاس کیلوواٹ (شارٹ ویو) کے دو ٹرانسمٹر کراچی میں لگائے گئے۔ ۱۹۵۰ء میں راولپنڈی سٹیشن قائم کیا گیا اور اس میں ۷.۵ کیلوواٹ (شارٹ ویو) کا ٹرانسمٹر لگا۔ اس سال پاکستان کے ان مراکز سے سترہ زبانوں میں نشریات ہوتی تھیں۔

پہلے پنج سالہ منصوبے میں نشریات کے لیے ڈھائی کروڑ، دوسرے میں چار کروڑ اور تیسرے میں نو کروڑ روپیہ رکھا گیا تھا۔ تیسرے منصوبے میں یہ بھی مدنظر تھا کہ ملتان میں ۱۰۰ کیلوواٹ کا اور کھلنا اور خیر پور میں دس دس کیلوواٹ کے بالواسطہ نشریات کے ”ریلے سٹیشن“ قائم کیے جائیں اور اسلام آباد اور ڈھاکے میں ایک ایک ہزار کیلوواٹ (میڈیم) کا اور اسلام آباد میں ڈھائی سو کیلوواٹ (شارٹ ویو) کا ٹرانسمٹر لگایا جائے۔

۱۹۵۸ء میں ملک کے سب سٹیشنوں سے نشریات مجموعی طور پر ۲۹۳۱۵ گھنٹے ہوئی تھیں (میڈیم ویو: ۲۳۸۹۸ اور شارٹ ویو: ۲۳۰۳۷ گھنٹے) اور ۱۹۶۸ء میں ۹۳۱۸۰ گھنٹے (میڈیم ویو: ۳۲۹۳۶ اور شارٹ ویو: ۵۰۰۸۲ گھنٹے)۔ اندرون ملک کے علاوہ دس غیر ملکی سروسیں بھی ہیں: برطانیہ، مشرقی افریقہ، جنوب مشرقی افریقہ، برما، افغانستان، عرب، جنوب مشرقی ایشیا، جنوبی ایشیا، انڈونیشیا، ایران اور ترکی۔ ان میں کل تیرہ زبانیں استعمال ہوتی ہیں۔

اندرون ملک کے پروگراموں میں کوئی پچاس فی صد وقت گانے بجانے کو دیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل پروگرام ہوتے ہیں: تلاوت قرآن مجید مع ترجمہ (مغربی پاکستان کے لیے اردو میں اور مشرقی پاکستان کے لیے بنگلہ میں)، خبریں (اردو، بنگلہ اور انگریزی میں)، تقریریں، مقالے، مشاعرے، مباحثے، مکالمے، مذاکرے، فیچر، بچوں، عورتوں، دیہاتیوں اور فوجیوں کے لیے خاص پروگرام، زراعتی پروگرام،

مشرقی پنجاب کے سننے والوں کے لیے پروگرام (یہ صرف لاہور سے نشر ہوتا ہے)۔ سکول براڈکاسٹ، اور یونیورسٹی میگزین۔ نومبر ۱۹۶۱ء کراچی، لاہور اور ڈھاکہ سٹیشنوں سے کمرشل سروس بھی جاری ہے۔ تمام بیرونی سٹیشنوں سے نشر ہونے والی خبریں اور ان پر تبصرے سننے کا انتظام موجود ہے اور اس طرح جمع ہونے والی معلومات حکومت پاکستان کو مہیا کی جاتی ہیں۔

ریڈیو پاکستان میں ۴۴۴ گانے والوں کی آوازوں کے ریکارڈ محفوظ ہیں۔ پروگراموں کی پندرہ روزہ ماہانہ اشاعت، اردو، بنگلہ، انگریزی، عربی، ایرانی اور برمی زبانوں میں کی جاتی ہے۔ نشریات سے حکومت کو ۱۹۶۰ء میں ستائیس لاکھ روپے آمد ہوئی، جو پانچ سال میں بڑھ کر ستر لاکھ روپے تک پہنچ گئی۔

ٹیلیویژن: پاکستان میں ٹیلیویژن سٹیشن قائم کرنے کا فیصلہ حکومت نے ۱۹۶۴ء میں کیا تھا۔ اس سلسلے میں جاپان کی نوپن الیکٹرک کمپنی Noppon Electric Co. سے معاہدہ کیا گیا کہ وہ بطور تجربہ چھوٹے سے پیمانے پر دو سٹیشن قائم کرے، چنانچہ ۲۶ نومبر ۱۹۶۴ء کو لاہور میں اور دسمبر ۱۹۶۴ء میں ڈھاکے میں ابتدائی ٹیلیویژن سٹیشن قائم کیے گئے۔ فروری ۱۹۶۵ء میں پانچ کروڑ روپے کے سرمائے سے ایک ٹیلیویژن کارپوریشن (Television Promoters Co.) قائم کی گئی، جس میں نصف سے زیادہ سرمایہ حکومت پاکستان نے لگایا اور نصف نوپن الیکٹرک کمپنی جاپان اور انگلستان کی کمپنی (Thomson Television (International) Ltd.) نے مہیا کیا۔ ۱۹۶۷ء میں کراچی سٹیشن نے کام شروع کیا۔ اس کا ٹرانسمٹر چھے کیلوواٹ کا ہے اور لاہور اور ڈھاکے کی بہ نسبت بڑا بھی ہے اور مکمل بھی۔ ۱۴ جنوری ۱۹۶۷ء کو راولپنڈی۔ اسلام آباد میں بھی ایک سٹیشن قائم کیا گیا۔ لاہور اور ڈھاکہ سٹیشنوں کو ترقی دی گئی۔ چاٹگانگ اور پشاور میں اور اس کے بعد راجشاہی، ملتان، کھلنا، لائلپور، کومیلا اور حیدر آباد (سندھ) میں بھی سٹیشن قائم کرنے کا پروگرام ہے۔ ۱۹۶۷ء ہی میں مغربی جرمنی کے اشتراک سے ٹیلیویژن کے کام کی تربیت کے لیے راولپنڈی میں ایک مرکز بھی کھولا گیا ہے۔ لاہور اور ڈھاکے میں تین تین سو واٹ کا ٹرانسمٹر نصب کیا گیا ہے۔

ملک میں ۱۹۶۷ء تک پندرہ ہزار سے زائد ٹیلیویژن سیٹ درآمد ہو چکے تھے۔ نو کمپنیوں کو درآمدی پرزے جوڑ کر سیٹ تیار کرنے کے لائسنس جاری ہو چکے ہیں، جن میں سے بعض نے عملاً کام شروع کر دیا ہے۔ ریڈیو کی طرح ٹیلیویژن میں بھی کمرشل سروس کا اہتمام ہے۔ تیسرے پنجسالہ منصوبے میں ٹیلیویژن کے لیے ساڑھے پانچ کروڑ روپیہ رکھا گیا تھا۔

فلم: قیام پاکستان کے وقت صرف لاہور میں نو سٹوڈیو تھے اور وہ بھی نامکمل، چنانچہ یہاں فلم سازی کا بالکل نئے سرے سے آغاز ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں صرف ایک فلم بنی۔ ۱۹۴۹ء میں سات اور ۱۹۵۰ء میں نو فلمیں مکمل ہوئیں۔ اس وقت ملک میں گیارہ فلم سٹوڈیو ہیں؛ تقریباً چھے سو سینما ہال ہیں اور ہر سال دو سو کے لگ بھگ فلمیں تیار ہوتی ہیں۔ چھے فلم سٹوڈیو لاہور میں ہیں، دو کراچی میں اور تین ڈھاکے میں۔ ان میں سے بعض سٹوڈیو سازو سامان کے اعتبار سے خاصے معیاری ہیں۔ زیادہ تر فلمیں اردو، بنگلہ اور پنجابی زبان میں ہوتی ہیں۔ چند ایک فلمیں سندھی میں بھی تیار ہوتی ہیں اور اب پشتو فلمیں بھی بننے لگی ہیں۔ ایک فلم پر دو سے سات لاکھ روپے تک خرچ آتا ہے اور اسے مکمل ہونے میں چھے ماہ سے

ایک سال تک کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ فلم کا سارا خام مواد باہر سے درآمد کیا جاتا ہے۔

پاکستان نے برلن، کینس Cannes، وینس، ماسکو، کولمبو، ایڈنبرا اور دوسرے مقامات پر ہونے والے بین الاقوامی فلمی میلوں میں شرکت کی ہے اور متعدد انعامات بھی حاصل کیے ہیں۔

سنسر بورڈ کی منظوری حاصل کیے بغیر کوئی فلم نمائش کے لیے پیش نہیں کی جا سکتی۔ فلمیں سنسر کرتے وقت خاصی آزاد خیالی سے کام لیا جاتا ہے، لیکن ایسی فلموں کی نمائش کی اجازت نہیں دی جاتی جن سے ملک کا امن و امان متاثر ہو، قومی سالمیت اور تحفظ پر آنچ آتی ہو، اخلاقی اقدار مجروح ہوتی ہوں، جرائم کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو یا کسی ملکی یا غیر ملکی فلم کا چربہ ہوں۔

فلمی صنعت سے ملک کی آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہوتا ہے اور اس مد سے حکومت کو تقریباً ڈھائی کروڑ روپیہ وصول ہوتا ہے۔

ڈاکومنٹری فلمیں (documentries) زیادہ تر حکومت کا شعبۂ فلم و مطبوعات (Department = DFP of Film and Publication) تیار کرتا ہے۔ ان میں خبر نامے (news-reels) اور پاکستانی ثقافت سے متعلق فلمیں شامل ہیں۔ ۱۹۶۸-۱۹۶۹ء تک اس شعبے میں ڈھائی سو نیوزریل اور دو سو ڈاکومنٹری فلمیں تیار ہوئی تھیں۔ اس شعبے کی بہترین ڈاکومنٹری فلم "پاکستان کی کہانی" (*Pakistan Story*) ہے، جو ۱۹۶۶ء میں پیش کی گئی۔ یہ سب فلمیں مقامی سینماؤں کے علاوہ آٹھ سے زیادہ بیرونی ممالک میں بھی باقاعدگی سے دکھائی جاتی ہیں۔ شعبۂ فلم و مطبوعات میں اقوام متحدہ اور یونسکو جیسے اداروں کی تیار کردہ فلمیں پاکستان کی علاقائی زبانوں میں "ڈب" کرنے کے بعد عوام کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔

فلمی صنعت کے فروغ کے لیے حکومت کی طرف سے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں فلم ڈیویلپمنٹ کارپوریشن Film Development Corporation، ڈھاکہ، کا قیام بھی قابل ذکر ہے، جہاں ہدایت کاروں، مصنفوں، فن کاروں اور فنی کارکنوں کو اعلٰی درجے کی تربیت دی جاتی ہے۔ دوسرے ممالک میں پاکستانی فلمیں برآمد کرنے کے لیے بھی ایک کارپوریشن قائم کی گئی ہے۔ اس کی ایک شاخ لنڈن میں بھی کھل چکی ہے۔ ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں فلموں کی برآمد سے تقریباً چھے لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی۔ اب پاکستان میں رنگین فلمیں بھی بڑی تعداد میں تیار ہونے لگی ہیں، جس سے امید ہے کہ برآمدات میں بہت اضافہ ہو جائے گا۔ انڈونیشیا، افغانستان، مشرقی افریقہ، سوڈان، عدن، برما، بحرین، سیلون، چین، ایران، ہانگ کانگ اور برطانیہ پاکستانی فلموں کے لیے اچھی منڈیاں ثابت ہو سکتی ہیں۔ پاکستان میں فلمی صنعت کو تحفظ دینے کے لیے بھارتی فلموں کی درآمد پر پابندی عائد ہے، البتہ امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، اٹلی، جاپان، مصر، ایران وغیرہ سے فلمیں درآمد ہوتی اور نمائش کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔

۲۳۔ صحافت

صحافت نے پاکستان کے قیام اور پھر اس کے استحکام میں قابل قدر کردار ادا کیا ہے۔ آج وہ نہ صرف قوم کو ہر لحظہ بدلتے ہوئے قومی اور بین الاقوامی منظر سے آگاہ رکھتی ہے بلکہ معیار زندگی کو بہتر بنانے اور شہری آزادیوں کی حفاظت کرنے میں بھی مؤثر امداد دیتی ہے۔ صنعتی ترقی اور معاشرتی نشو و نما کے ساتھ تعلیم کی توسیع سے پاکستانی صحافت کی قوت اور تاثیر میں خاصا اضافہ

ہوا ہے۔

پاکستانی صحافت زمانۂ قبل از آزادی کے برصغیر کے مسلم پریس کی وارث ہے۔ متحدہ ہندوستان میں جب مسلمانوں نے اخبارات نکالے تو ہندوؤں اور سکھوں کے اخبارات پوری طرح اپنے قدم جما چکے تھے۔

بیسویں صدی کے ربع اول میں الہلال (کلکتہ)، کامریڈ، ہمدرد اور الجمعیت (دھلی)، زمیندار (لاہور) اور وکیل (امرتسر) مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کرتے رہے اور اسلامیان ہند میں مقبول رہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کے بعد مسلمانوں کے اخبارات کی اہمیت میں اضافہ ہوا اور ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان منظور ہو چکی تو بیشتر اخبارات تحریک پاکستان کے طاقتور اور باثر ترجمان بن گئے۔ برصغیر کے مسلمان اپنی منزل مقصود کا تعین کر چکے تھے، جسکی تبلیغ و اشاعت کے لیے زیادہ سے زیادہ اخبارات کی ضرورت تھی! چنانچہ ۱۹۳۶ء میں کلکتے سے بنگالی روزنامہ آزاد جاری ہوا۔ اگلے سال شام کا انگریزی اخبار سٹار The Star اور ۱۹۴۲ء میں انگریزی روزنامہ مارننگ نیوز The Morning News نکالے گئے۔ اسی سال دھلی سے انگریزی ہفت روزہ ڈان The Dawn جاری ہوا، جو اگلے ہی سال روزنامہ بن گیا۔ پھر ۱۹۴۷ء میں لاہور سے پاکستان ٹائمز The Pakistan Times اور نوائے وقت نکلے۔ یہ تمام اخبارات مسلمانوں کے مفادات کی نگہداشت کرتے تھے، لیکن ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔

آزادی کا سورج طلوع ہونے پر مسلمانوں کے قابل ذکر اخبارات میں سے پاکستان ٹائمز اور نوائے وقت پاکستان کے حصے میں آئے۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ The Civil & Military Gazette (لاہور) اور سندھ آبزرور The Sind Observer (کراچی) کے سوا باقی غیر مسلم اخبار نقل وطن کر گئے، تاہم مسلمانوں کے بعض موثر اخبارات ہندوستان سے پاکستان میں منتقل ہوئے۔ کراچی سے ڈان کا اجرا ٹھیک یوم استقلال پر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد جنگ اور انجام بھی دھلی سے کراچی منتقل ہو گئے۔ غیرمسلم اخبارات کے ترک وطن پر لاہور کی صحافت میں جو خلا پیدا ہوا اسے پورا کرنے کے لئے پاکستان ٹائمز اور نوائے وقت کی صوری اور معنوی خصوصیات میں اضافہ کیا گیا۔ جلد ہی امروز اور کچھ اور نئے اخبارات بھی نکل آئے۔ مشرقی پاکستان میں صحافت کی ضرورت کلکتے سے ڈھاکے منتقل ہونے والے اخبارات نے پوری کی۔ مارننگ نیوز ہفت روزہ کی حیثیت سے اپریل ۱۹۴۸ء میں ڈھاکے سے نکلا اور دسمبر ۱۹۴۹ء میں روزنامہ بن گیا۔ آزاد بھی کلکتے سے ڈھاکے آ گیا۔ ڈھاکے سے ایک انگریزی روزنامہ پاکستان آبزرور The Pakistan Observer بھی شائع ہونے لگا۔

نوزائیدہ مملکت کے ساتھ نوخیز پاکستانی صحافت کو بھی گوناگوں مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان جن علاقوں پر مشتمل ہے وہ صنعتی اعتبار سے نہایت پس ماندہ تھے۔ طباعت کی سہولتیں نہایت محدود تھیں۔ چھاپہ خانے کی مشینری کے فالتو پرزے اس علاقے میں نہیں بنتے تھے۔ ایک ایک مطبع میں کئی کئی اخبار طبع ہوتے تھے۔ ہندوستان سے مسلمان صحافیوں اور چھاپہ خانوں کے کارکنوں کی آمد سے اخبارات کی تدوین و اشاعت کا سلسلہ تو جاری ہو گیا لیکن ایک آزاد مملکت کی ضرورت اور عظمت کے لیے صحافت کا جو معیار درکار تھا اس تک پہنچنے کے لیے موزوں اخبارنویسوں کی کمی ایک عرصے تک محسوس ہوتی رہی۔ عام معاشرتی اور اقتصادی عوامل بھی صحافت کی ترقی میں حائل ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں خواندگی

کی شرح ۱۳٫۸ فیصد تھی اور شہری آبادی کا تناسب ۱۰ فیصد سمجھا جاتا تھا۔ ایک اور اندازے کے مطابق ۷ کروڑ ۶۰ لاکھ کی آبادی میں سے صرف دو لاکھ افراد صنعتی میدان سے متعلق تھے۔ ان حالات میں اخبارات کا حلقۂ اشاعت محدود اور آمدنی قلیل رہی۔ اشتہارات اخبارات کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں، لیکن وہ بھی صنعتی ترقی کا ثمر ہوتے ہیں۔ مصائب و مشکلات کے خلاف صحافت کی جدوجہد جاری رہی اور اس دوران میں دو مشہور اخبارات لقمۂ اجل بن گئے۔ یہ دونوں انگریزی اخبارات تھے۔ سندھ آبزرور کے مالک ترک وطن کرتے ہوئے اسے فروخت کر گئے اور وہ چھے سال تک مالی مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد ۱۹۵۳ء میں بند ہوگیا۔ قیام پاکستان کے بعد سول اینڈ ملٹری گزٹ، جو کراچی سے بھی شائع ہونے لگا تھا، ۱۹۵۰ء میں فروخت ہوا۔ دو سال کے بعد کراچی ایڈیشن بند کر دیا گیا اور ایک سال بعد لاہور ایڈیشن بھی بحران کا شکار ہو گیا۔ اسے زندہ رکھنے کی جرأت مندانہ کوشش کی گئی، مگر وہ کامیاب نہ ہوئی اور اس طرح برطانوی ہندوستان کا ایک قدیم اخبار جسے نامور انگریز مصنف رڈیارڈ کپلنگ Rudyard Kipling کی ادارت کا فخر بھی حاصل رہا تھا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میدان سے نکل گیا۔ دوسری جانب ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان تین نئے انگریزی اخبار نکلے: مارننگ نیوز ڈھاکے کے بعد کراچی سے بھی شائع ہونے لگا، کراچی کے ایک شام کے اخبار ایوننگ ٹائمز The Evening Times کو ٹائمز آف کراچی The Times of Karachi کے نام سے صبح کا اخبار بنا دیا گیا؛ پاکستان سٹینڈرڈ The Pakistan Standard مسلم لیگ کے جماعتی ترجمان کی حیثیت سے نکلا۔ مؤخرالذکر دو اخبار کامیاب نہ ہوئے۔ پاکستان سٹینڈرڈ تو ایک ہی سال کے اندر ختم ہو گیا، لیکن ٹائمز آف کراچی، جس کا آغاز خاصا زوردار تھا، کوئی آٹھ سال تک لشتم پشتم چلتا رہا۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کے بعد جو حکومت برسراقتدار آئی اسکے تقریباً گیارہ سالہ دور میں صحافت پر مثبت اور منفی دونوں قسم کے اثرات مترتب ہوئے۔ حکومت نے براہ راست اور بالواسطہ اخبارات پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے۔ سب سے پہلے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ The Progressive Papers Ltd. کو سرکاری تحویل میں لیا گیا اور کچھ عرصے کے بعد بذریعۂ نیلام فروخت کر دیا گیا۔ کمپنی مزید دو بار فروخت ہوئی اور بالآخر نیشنل پریس ٹرسٹ National Press Trust معرض وجود میں آیا۔ پروگریسو پیپرز کے اخبارات پاکستان ٹائمز (لاہور و راولپنڈی) اور امروز (ملتان و لاہور) اور ہفت روزہ سپورٹائمز The Sportimes (لاہور) کے علاوہ مشرق (لاہور، کراچی و پشاور)، انجام (کراچی)، مارننگ نیوز (ڈھاکہ و کراچی) اور بنگالی روزنامہ دینک پاکستان (ڈھاکہ) یکے بعد دیگرے ٹرسٹ کی تحویل میں آ گئے۔

پہلے اور دوسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں بالخصوص صنعت اور تعلیم کو جو فروغ حاصل ہوا اس کی بدولت اخبارات کے دائرہ ہائے اشاعت میں توسیع اور آمدنی (بالخصوص اشتہارات کی آمدنی) میں خاصا اضافہ ہوا۔ کارکن صحافیوں کی شرائط کار اطمینان بخش نہ تھیں: تنخواہیں معمولی، سہولتیں برائے نام اور ملازمت کا تحفظ مفقود تھا۔ حکومت نے ۱۹۶۰ء میں پاکستان پریس کمیشن قائم کیا اور اسی سال ۲۷ اپریل کو کارکن صحافیوں کی شرائط ملازمت کا ہنگامی قانون جاری کیا۔ اس قانون کی رو سے صحافیوں کو ملازمت کا تحفظ دیا گیا، پراویڈنٹ فنڈ لازمی قرار دیا گیا؛ کام کا ہفتہ

۲۴ گھنٹے کا قرار پایا؛ صحافیوں کو ایک سال میں ایک ماہ کی استحقاقی رخصت، بیماری کی رخصت اور اتفاقیہ چھٹیوں کا حقدار قرار دیا گیا؛ تین سال یا زیادہ مدت کی ملازمت والے صحافی کی ملازمت ختم کرنے سے پہلے مالک کے لیے یہ لازم قرار پایا کہ وہ اسے دو ماہ کا نوٹس یا اس کے عوض دو ماہ کی تنخواہ ادا کرے؛ علاوہ ازیں صنعتی عدالتوں کو صحافیوں اور منتظمین کے تنازعات پر فیصلہ دینے کا اختیار دیا گیا۔

ہنگامی قانون کے تقاضوں کے مطابق مرکزی حکومت نے ۳۰ مئی ۱۹۶۰ء کو ایک ویج بورڈ Wage Board قائم کیا، جس نے کارکن صحافیوں کی شرائط ملازمت، صحافتی اداروں کے مالی وسائل، قیمتوں اور اجرتوں کے مروجہ ڈھانچے اور دوسرے متعلقہ امور کا جائزہ لینے کے بعد ۳۱ جنوری ۱۹۶۱ء کو اپنا ایوارڈ دیا اور اس میں کارکن صحافیوں کے مختلف طبقوں کی تنخواہ کے سکیل scales مقرر کر دیے۔ ویج بورڈ نے کارکن صحافی کی جو تعریف کی اس میں خوش‌نویس اور پروف‌ریڈر بھی شامل کر لیے گئے تھے۔ اس سے اخباری کارکنوں کے ان دو بڑے طبقوں کو بھی ایوارڈ کا فائدہ پہنچا۔ ویج بورڈ نے مراعات کی تفویض کے لیے صحافتی اداروں کو ان کے مالی وسائل کے اعتبار سے مختلف زمروں میں تقسیم کیا: روزانہ اخبارات کو تین زمروں میں، ہفتہ وار یا وقفوں سے شائع ہونے والے جرائد کو دو زمروں میں اور خبررساں ایجنسیوں کو تین زمروں میں۔ ویج بورڈ ایوارڈ کے اساسی نکات یہ تھے: اجرتوں کے معاملے میں اردو اور انگریزی اخبارات کے کارکنوں کا امتیاز ختم کر دیا گیا؛ ہنگامی الاؤنس، سواری الاؤنس، ذمے داری الاؤنس، رات میں کام کرنے کا خاص الاؤنس، مہمانداری الاؤنس اور بڑے اخبارات کے رپورٹروں کے لیے وضع داری الاؤنس منظور ہوا؛ شاگرد پیشہ کارکنوں کے لیے اجرت مقرر ہوئی؛ انتظامیہ کو صلۂ خدمت (gratuity) کی ادائی کا پابند کیا گیا؛ کارکن صحافیوں کی شرائط ملازمت کے ہنگامی قانون مجریہ ۱۹۶۰ء کی رو سے منتظمین کارکن صحافیوں کے علاج معالجے کے اخراجات کا کفیل قرار دیا گیا تھا۔ قانون میں ۱۹۶۷ء کی ایک ترمیم کے ذریعے کارکن صحافیوں کے اہل و عیال کے لیے بھی یہ سہولت منظور کی گئی؛ ویج بورڈ کے ایوارڈ کی آخری شق یہ تھی کہ کوئی ایسی ہیئت حاکمہ جسے مرکزی حکومت قائم کرے پانچ سال بعد اس فیصلے پر نظرثانی کرے گی۔ کارکن صحافیوں نے ۱۹۶۵ء کے بعد اس پر نظرثانی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ بالآخر ۱۹۶۹ء میں نئی فوجی حکومت نے اس مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے دوسرا ویج بورڈ قائم کیا، جس میں کارکن صحافیوں کی وفاقی تنظیم (PFUJ) اور مالکان جرائد کی انجمن (APNS) کے نمائندے برابر تعداد میں لیے گئے۔ بورڈ نے ۷ جنوری ۱۹۷۰ء کو ایک عبوری فیصلہ دیا، جس کا تقاضا تھا کہ کارکن صحافیوں کی اجرتوں میں اضافہ کیا جائے، لیکن اے۔ پی۔ این۔ ایس نے اس فیصلے کی تعمیل سے معذوری ظاہر کی۔ اس پر پی۔ ایف۔ یو۔ جے نے ۱۵ اپریل سے ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ ہڑتال کا نوٹس ان چار مطالبات پر مبنی تھا: کارکن صحافیوں کو دوسرے ویج بورڈ کے عبوری فیصلے کے مطابق مالی امداد دی جائے؛ (۲) اخباری صنعت سے متعلق دوسرے کارکنوں کو بھی اسی شرح سے عبوری امداد دی جائے؛ (۳) اے۔ پی۔ پی کو حسب سابق زمرۂ الف کی خبر رساں ایجنسی قرار دیا جائے اور (۴) پی۔ پی۔ آئی کو حسب سابق زمرۂ بی کی خبر رساں ایجنسی قرار دیا جائے۔ اکثر صحافتی اداروں نے کارکنوں کو "عبوری امداد" دینا منظور کر لیا، لہٰذا ۲۴ اپریل

کو ہڑتال ختم ہو گئی اور تمام اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں نے دوبارہ کام کرنا شروع کر دیا۔

پاکستان (کنونشن) لیگ نے، جو ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تک برسراقتدار رہی، معرض وجود میں آنے کے ساتھ ہی ایک جماعتی اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا اور روزنامۂ کوہستان خرید لیا، لیکن جب یہ جماعت برسراقتدار نہ رہی تو اخبار مالی اور انتظامی بحران کا شکار ہو گیا اور اس کی اشاعت جاری نہ رہ سکی۔ اخبار کے کارکنوں نے اپنے واجبات کی وصولی اور اخبار کی زندگی کے لیے طویل جدوجہد کی، جو بالآخر بارآور ہوئی اور نئی حکومت نے ایک ایڈمنسٹریٹر کا تقرر کر کے اخبار ایک ایسے ادارے کو منتقل کرنے کے اقدامات کیے جو اخبار کو چلتا رکھنے کا ضامن بنا۔ بہرحال تسنیم، پاکستان سٹینڈرڈ اور کوہستان (دور دوم) کے خاتمے کی کہانیاں ظاہر کرتی ہیں کہ پاکستان میں کسی سیاسی جماعت کے لیے اپنے ترجمان کے طور پر کوئی اخبار نکالنا بہت دشوار رہا ہے۔

مارچ ۱۹۶۹ء میں برسراقتدار آنے والی فوجی حکومت نے شہری آزادیاں، بالخصوص اخبار نکالنے کی سہولتیں بحال کر کے جو فضا پیدا کی اس سے ہفتہ وار صحافت کو خاص طور سے تازہ ولولہ ملا اور چند ماہ کے اندر متعدد ہفت روزہ جرائد منظر عام پر آئے اور بعض پرانے جرائد نے نئی اہمیت حاصل کر لی۔ چونکہ سیاسی سرگرمیوں کی بحالی سے ملک میں سیاسی گہما گہمی پیدا ہوئی، قومی مسائل پر سوچ بچار کا شوق بیدار ہوا اور ہفتہ وار جرائد نے سیاسی معاملات اور رجحانات پر مفصل اور غیر مبہم انداز میں اظہار خیال شروع کر دیا، جس سے ان کے حلقۂ اشاعت میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا۔ ایسے جرائد میں مندرجۂ ذیل قابل ذکر ہیں: (الف) اردو: لاہور سے چٹان، نصرت، جہاں نما، زندگی، ایشیا، قندیل اور کہانی اور کراچی سے اخبار جہاں اور لیل و نہار؛ (ب) انگریزی: مشرقی پاکستان سے *The Eastern Herald*، *The People*، *The Forum*، *The Holiday* اور *The Wave* اور مغربی پاکستان سے *The Sunday Post*، *The Citizen*، *The Punjab Times*، *The Inter-Wing*، *The Combdte* اور *The Pakistan Monitor*۔

نئی حکومت نے ایک عبوری یا محافظ حکومت کا کردار اختیار کیا اور ملک میں بالغ رائے دہی کے اصول پر براہ راست عام انتخابات کرانے کے لیے قانونی اقدامات کیے۔ عبوری حکومت نے رائے عامہ کی بنیاد پر ملک میں سیاسی اداروں کے مستقبل کی بھی تعیین کر دی اور یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ نظام حکومت پارلیمانی اور وفاقی ہوگا۔ حکومت نے یکم جنوری ۱۹۷۰ء سے ملک میں سیاسی سرگرمیوں کی عام اجازت دے دی اور اس طرح صحافت کو بھی ایک نئی تب و تاب میسر آئی۔ حکومت چونکہ خود کوئی سیاسی عزائم نہیں رکھتی اور ملکی سیاسیات میں غیر جانبداری کی دعویدار ہے، اس لیے اس نے نہ صرف پرانے اخبارات کے معاملات میں مداخلت سے احتراز کیا بلکہ نئے اخبارات کے لیے بھی فراخدلی سے اجازت نامے جاری کیے؛ چنانچہ سازگار حالات میں فوری طور پر چند نئے اخبارات شائع ہونے لگے: وسط ۱۹۶۹ء میں لاہور سے اردو کا ندائے ملت اور آغاز ۱۹۷۰ء میں راولپنڈی سے انگریزی کا نیو ٹائمز *The New Times* نکلا۔ پھر ڈھاکے سے بنگلہ روزنامہ سنگرام، ملتان سے اردو کا جسارت اور لاہور سے مساوات جاری ہوا۔ مئی ۱۹۷۰ء میں کوہستان بھی ایک نئی انتظامیہ کے تحت دوبارہ شائع ہونے لگا۔ اب ملک کے ممتاز اخبارات یہ ہیں: (الف) اردو: جنگ، امروز، مشرق، نوائے وقت، حریت، ندائے ملت، کوہستان، جسارت اور مساوات؛ (ب) انگریزی: پاکستان ٹائمز،

مارننگ نیوز، ڈان اور پاکستان آبزرور؛ (ج) بنگلہ : دینک پاکستان، آزاد، اتفاق، اور سنگرام؛ (د) علاقائی اخبارات : انڈس ٹائمز The Indus Times (حیدرآباد)؛ خیبر میل The Khyber Mail (پشاور)؛ زمانہ (کوئٹہ)؛ یونٹی The Unity (چٹاگانگ)؛ مغربی پاکستان (لاہور، بہاول پور و سکھر)؛ نیو ٹائمز (راولپنڈی)؛ وفاق (لاہور و سرگودھا)؛ کائنات (بہاول پور)؛ ڈیلی بزنس، عوام اور غریب (لائل پور).

پاکستان کی معیشت بنیادی طور پر زرعی ہے، لیکن وہ زراعتی بنیاد پر صنعتی ترقی کے لیے کوشاں ہے اور جوں جوں یہ کوشش آگے بڑھتی ہے صنعتی، تجارتی اور مالی معاملات کے مطالعے کی ضرورت اور اہمیت بڑھتی جاتی ہے ۔ اس ضرورت کو پورا کرنے میں صحافت نے بھی کچھ حصہ لیا ہے اور اس سلسلے میں ہفتہ وار جرائد The Business Recorder اور The Business Post کے علاوہ اردو میں ایک روزنامہ اخبار ڈیلی بزنس بھی شائع ہوتا ہے ۔ برصغیر کے مسلمانوں کے ہاں خواتین کے جرائد کی ایک عمدہ روایت سرسید کی تعلیمی تحریک کے ثمرات کا آغاز ہوتے ہی قائم ہو گئی تھی، چنانچہ ان جرائد میں تہذیب نسواں اور حور وغیرہ کئی سال تک خواتین کی دلچسپی کا مواد مہیا کرتے رہے، لیکن ان جرائد پر ادبی رنگ غالب تھا ۔ قیام پاکستان کے بعد تعلیم نسواں عام ہونے کے ساتھ جب عملی زندگی کے میدانوں میں خواتین کی سرگرمیاں بڑھیں تو اردو اور انگریزی روزناموں نے بطور خاص ان سرگرمیوں کی رودادیں شائع کرنی شروع کر دیں ۔ اب وہ نہ صرف اخبارات خواتین کی سرگرمیوں اور ان کے معاملات کو خاطر خواہ اہمیت دیتے ہیں بلکہ، اخبار خواتین، مرر The Mirror، شی She اور ویمن ورلڈ The Women World خواتین کے مکمل جریدے ہیں ۔ ادبی روایت نکلنے والے ماہوار رسالے الگ ہیں اور ان میں عصمت، حور، خاتون، زیب النساء، بتول اور چلمن شامل ہیں ۔ پاکستان کی ادبی صحافت کو جو مضبوط روایت ورثے میں ملی اس میں بھی قابل قدر اضافہ ہوا ہے ۔ ماہوار، دو ماہی اور سہ ماہی رسالے بڑی تعداد میں موجود ہیں، جو اہل قلم کی ادبی تخلیقات اہل ذوق تک پہنچاتے ہیں ۔ ان جرائد میں نقوش، ادبی دنیا، ادب لطیف، سویرا، افکار، ساقی، اردو زبان، قومی زبان، فنون، سیپ، نیا دور، اوراق، اردو ڈائجسٹ اور سیارہ ڈائجسٹ نمایاں ہیں ۔ بعض سرکاری اور نیم سرکاری علمی، فنی اور تحقیقاتی اداروں کے اپنے جریدے ہیں، جو بیش قیمت علمی اور ٹیکنیکل مواد مہیا کرتے ہیں، مثلاً صحیفہ، اردو، المعارف، اقبال ریویو، ملۃ، فکر و نظر ۔ کالجوں کے جرائد میں اورینٹل کالج میگزین، راوی، کریسنٹ، خیابان اور مہران قابل ذکر ہیں ۔ دینی رسالوں میں ترجمان القرآن، ترجمان الحدیث، طلوع اسلام، الرحیم اور البلاغ ممتاز ہیں ۔ ملک کے اندر ایک طاقتور فلمی پریس بھی موجود ہے ۔ روزنامہ اخبارات کے فلمی ایڈیشنوں اور فلمی صفحات کے علاوہ کراچی، ڈھاکے اور لاہور سے متعدد ہفتہ وار اور ماہوار فلمی رسالے شائع ہوتے ہیں۔

طرز ملکیت : پاکستان کے تمام اخبارات اور جرائد افراد یا جائنٹ سٹاک کمپنیوں کی ملکیت ہیں ۔ ۱۹۶۳ء میں نیشنل پریس ٹرسٹ کے قیام سے ایک نئی طرز ملکیت پیدا ہوئی ۔ حکومت کے ایما پر بعض ممتاز صنعت کار یکجا ہوئے اور انہوں نے ٹرسٹ کی بنیاد رکھی ۔ وقف نامے میں ٹرسٹ کو ایک غیر سیاسی اوز غیر کاروباری ادارہ ظاہر کیا گیا اور صحت مند خطوط پر قومی صحافت کے نشو و نما کو مقصود ٹھہرایا گیا ۔ نیشنل پریس ٹرسٹ کا چیئرمین کل وقتی ہے اور اس کے بورڈ آف ٹرسٹیز

میں Board of Trustees میں تعلیمات، مالیات اور تجارت کے شعبوں سے تعلق رکھنے والے ممتاز اصحاب شامل ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں واقفوں نے وقف نامے میں ترمیم کی اور نظریۂ پاکستان کی حفاظت اور معاشرتی عدل کے اسلامی احکامات پر مبنی ایک نظام معیشت کو ترقی دینا ٹرسٹ کے اخبارات کی ذمے داریوں میں شامل کیا۔ ٹرسٹ کے زیر اہتمام مغربی اور مشرقی پاکستان کے اہم شہروں سے انگریزی، اردو اور بنگلہ میں یہ اخبارات اور جرائد شائع ہوتے ہیں: مارننگ نیوز The Morning News (کراچی و ڈھاکہ)؛ پاکستان ٹائمز The Pakistan Times (لاہور و راولپنڈی)؛ امروز (لاہور و ملتان)؛ مشرق (لاہور، پشاور و کراچی)؛ دینک پاکستان (ڈھاکہ)؛ اخبار خواتین (کراچی)؛ سپورٹائمز The Sportimes (لاہور)۔ ٹرسٹ کے علاوہ مندرجۂ ذیل ادارے بھی ایک سے زیادہ اخبارات و جرائد شائع کر رہے ہیں: (۱) پاکستان ہیرلڈ پبلیکیشنز لمیٹڈ (کراچی): ڈان The Dawn (انگریزی)؛ ڈان (گجراتی)؛ ایوننگ سٹار The Evening Star؛ السٹریٹڈ ویکلی آف پاکستان The Illustrated Weekly of Pakistan؛ ایسٹرن فلم The Eastern Film اور حریت (ڈان گجراتی اور ایوننگ سٹار شام کے اخبارات ہیں)؛ (۲) نوائے وقت پبلیکیشنز لمیٹڈ (لاہور): نوائے وقت اور قندیل؛ (۳) ملت گروپ، کراچی: ملت (گجراتی) اور شام کو شائع ہونے والا انگریزی روزنامہ لیڈر The Leader؛ (۴) جنگ گروپ: جنگ؛ شام کو شائع ہونے والا ڈیلی نیوز The Daily News اور اخبار جہاں؛ (۵) پاکستان آبزرور گروپ (ڈھاکہ): پاکستان آبزرور The Pakistan Observer؛ ہفتہ وار فلمی جریدہ چترالی (بنگلہ، اردو)؛ ہفت روزہ پوربودیش؛ (۶) یونٹی پبلیکیشنز لمیٹڈ (چٹاگانگ): انگریزی روزنامہ یونٹی The Unity؛ روزنامہ انصاف (بنگلہ) اور پندرہ روزہ مشرق (اردو)؛ (۷) کرانیکل گروپ (چٹاگانگ): انگریزی روزنامہ کرانیکل The Chronicle اور بنگلہ روزنامہ بنیاد۔

کردار: پاکستانی صحافت کا کردار روایتی اور جبلّی طور پر سیاسی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے قیام پاکستان کی جنگ جن وسائل سے جیتی ان میں تحریر اور تقریر سرفہرست تھے۔ مسلمانوں کے اخبارات نے اپنی بے سروسامانی اور ناتوانی کے باوجود نہایت کامیابی کے ساتھ برطانوی صحافت اور ہندو صحافت کا مقابلہ کیا اور تحریک پاکستان کو مخالفت کے شدید طوفانوں میں آگے بڑھاتے رہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب ریڈیو اور دوسرے وسائل نشرو اشاعت مخالفوں کے قبضے میں تھے، برصغیر کے مسلمانوں میں آزادی اور علیحدہ قومیت کا شعور پیدا کرنے اور انھیں اتحاد و تنظیم کی لڑی میں پرو کر پاکستان کی راہ پر ڈالنے کا زیادہ‌تر کام اخبارات ہی نے کیا۔ ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کے بعد جب ملک بھر میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی تو صحافیوں نے اخبارات کے کالم بھرنے کے لیے رفتہ رفتہ ترقیاتی منصوبوں، ثقافتی سرگرمیوں اور عالمی امور میں زیادہ دلچسپی لینی شروع کی۔ جرائم کی خبروں کو زیادہ تفصیلات اور تصاویر کے ساتھ شائع کرنے اور نسوانی حلقوں کی سرگرمیوں کو زیادہ جگہ دینے کا رواج بھی اسی زمانے میں ہوا۔ انگریزی اخبارات کا حلقۂ اشاعت گو اردو اخبارات کے مقابلے میں نہایت محدود ہے لیکن یہ سرکاری امور میں انگریزی کی بالا دستی اور اس زبان کی عالمی اہمیت کی وجہ سے زیادہ باا‌ثر شمار ہوتے ہیں۔ صبح کو شائع ہونے والے انگریزی اخبارات کا اندازِ نظر عام طور پر معروضی اور عالمگیر ہے۔ وہ قومی معاملات کے علاوہ بین‌الاقوامی امور کی خبریں بھی صحت اور اہتمام سے شائع کرتے ہیں۔ اکثر انگریزی اخبارات نے غیر ملکی اخبارات کے خاص

کالم اور فیچر حاصل کرنے کے انتظامات کر رکھے ہیں اور اس طرح انہیں عالمی واقعات اور رجحانات پر عالمی شہرت کے اخبار نویسوں کی تحریریں مل جاتی ہیں ۔ بیشتر اردو اور بنگلہ اخبارات زیادہ توجہ ملکی حالات پر مرکوز کرتے ہیں ۔ شام کو نکلنے والے اخبارات، خواہ وہ اردو میں ہوں یا انگریزی میں، عام طور پر سنسنی خیز خبروں پر تکیہ کرتے ہیں ۔ پاکستان کے بعض انگریزی اخبارات آبزرور *The Observer* (لنڈن) اور نیویارک ہیرلڈ ٹریبون *The New York Herald Tribune* کی فیچر سروس کے خریدار ہیں اور اس طرح انہیں ان دو اہم اخبارات کے نامہ‌نگاروں کے لکھے ہوئے خاص فیچر اور خصوصی رپورٹیں سستے داموں مل جاتی ہیں ۔ کئی ممتاز بین الاقوامی خبررساں ایجنسیوں کے اپنے نامہ‌نگار پاکستان میں موجود ہیں.

ملک میں اہل صحافت کی بڑی تنظیمیں یہ ہیں : آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی (APNS)، اخبارات کے مالکان کی انجمن ہے؛ کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز (CPNE)، مدیران اخبارات و جرائد کی تنظیم ہے؛ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (PFUJ) کارکن صحافیوں کی تنظیموں (Trade Unions) کا وفاق ہے ۔ [حالیہ ہڑتال کے بعد صحافیوں کی خاصی تعداد نے پی ۔ ایف ۔ یو ۔ جے سے مستعفی ہو کر نیشنل یونین آف جرنلسٹس (NUJ) کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم کر لی ہے] ۔ کارکن صحافیوں نے کراچی، ڈھاکہ، لاہور، ملتان، بہاولپور، کوئٹہ اور کئی دوسرے صحافتی مرکزوں میں پریس کلب قائم کر رکھے ہیں۔

خبر رساں ادارے : پاکستانی اخبارات کو تین تسلیم شدہ خبر رساں ادارے خبریں مہیا کرتے ہیں : (۱) ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان (APP)؛ (۲) پاکستان پریس انٹرنیشنل (PPI) اور (۳)؛ یونائیٹڈ پریس آف پاکستان (UPP) ۔ اول الذکر دو اداروں نے اخبارات کو ٹیلی پرنٹر مہیا کر رکھے ہیں جبکہ تیسرا ادارہ اپنی خبریں دستی مہیا کرتا ہے ۔

اے ۔ پی ۔ پی تقریباً چون اخبارات، ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن کارپوریشن کے تمام ٹیلیویژن سٹیشنوں کو خبریں مہیا کرتا ہے ۔ یہ ادارہ چوبیس تجارتی اداروں اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مختلف دفتروں کو بھی خبریں دیتا ہے ۔ ادارے کا مرکزی دفتر کراچی میں ہے اور ذیلی دفاتر راولپنڈی، لاہور، ڈھاکہ، چٹاگانگ، پشاور، لائلپور، ملتان، بہاولپور، سکھر، حیدرآباد، اور کوئٹے میں واقع ہیں ۔ ادارے نے دوسرے اہم شہروں میں بھی اپنے جز وقتی نامہ‌نگار رکھے ہوئے ہیں ۔ حکومت پاکستان کے ایک فیصلے کی رو سے غیر ملکی خبررساں اداروں کو پاکستانی اخبارات اور جرائد کو براہ راست خبریں مہیا کرنے کی اجازت نہیں، اس لیے بہت سی غیر ملکی خبررساں ایجنسیوں نے پاکستانی خبررساں اداروں سے خبروں کے تبادلے کی بنیاد پر معاہدے کر لیے ہیں اور وہ پاکستانی اداروں کے توسط سے پاکستانی اخبارات کو خبریں، فیچر اور تصویریں مہیا کرتی ہیں۔ اے ۔ پی ۔ پی نے غیرملکی خبروں کی فراہمی اور ترسیل کے لیے مندرجۂ ذیل غیرملکی خبررساں ایجنسیوں سے معاہدے کر رکھے ہیں : رائٹر (لنڈن)؛ ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ (نیویارک)؛ نیو چائنا نیوز ایجنسی (پیکنگ)؛ تاس (ماسکو)؛ اے ۔ پی ۔ این (ماسکو)؛ انتارا (جکارتا)؛ پارس (تہران)؛ اناطولیا (انقرہ)؛ کیودو (ٹوکیو)؛ مینا (قاہرہ) .

پاکستان پریس انٹر نیشنل، جو ۱۹۵۸ء کے لگ بھگ قائم ہوئی تھی اور ۱۹۶۸ء تک پاکستان پریس ایسوسی ایشن (پی ۔ پی ۔ اے) کہلاتی تھی، ایک نجی جائنٹ سٹاک کمپنی ہے ۔ پاکستان میں غیرملکی خبررساں ایجنسیوں پر پابندی کے بعد

۱۹۶۸ء میں فرانس، مغربی جرمنی، چیکوسلواکیا، یوگوسلاویا، بلغاریا، رومانیا، اٹلی، پولینڈ، ہنگری، مصر، ملیشیا اور جاپان کے کوئی ایک درجن غیر ملکی اداروں نے پی - پی - اے سے الحاق کیا اور یوں اس کا نام پی - پی - آئی ہو گیا۔

ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان (APP) غیر ملکی خبروں کی فراہمی کے لیے لنڈن، نیویارک، کھٹمنڈو، وغیرہ میں اپنے مستقل نمائندے بھی رکھتی ہے۔ اے - پی - پی اور بعض اخبارات کے مستقل نمائندے شروع ہی سے نئی دہلی میں متعین تھے، لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد یہ نمائندے واپس بلا لیے گئے اور پاکستان میں مقیم بھارتی اخبار نویس بھی واپس چلے گئے۔

اے - پی - پی خبروں کی صورت میں اوسطاً پچاس ہزار الفاظ روزانہ اپنے ٹیلی پرنٹروں پر تقسیم کرتی ہے۔ ساٹھ سے زیادہ صحافی خبروں کی فراہمی اور تدوین پر مامور ہیں اور تقریباً ایک سو ٹیلی پرنٹر آپریٹر اور مکینک خبروں کی وصولی اور تقسیم کے کام میں حصہ لیتے ہیں۔ اے - پی - پی اپنے غیر ملکی حلیفوں کو روزانہ پانچ ہزار سے زیادہ الفاظ میں خبریں مہیا کرتی ہے۔ ۱۹۶۳ء تک اے - پی - پی میں صرف دو بین الاقوامی خبر رساں ایجنسیوں (رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ) کے نمائندے کام کرتے تھے؛ اب بارہ صحافی غیر ملکی خبر رساں اداروں کی نمائندگی کے لیے اس ادارے سے منسلک ہیں اور ان میں چار پاکستانی ہیں۔

پی - پی - آئی خبروں کی صورت میں اوسطاً چالیس ہزار الفاظ روزانہ دو سرکٹوں پر تقسیم کرتی ہے۔ ان میں سے ایک ملکی اور دوسرا غیر ملکی مواد کے لیے مخصوص ہے۔ تقریباً تمام اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سرکاری دفاتر اور کاروباری ادارے پی - پی - آئی سے خبریں خریدتے ہیں۔ ملک کے تمام بڑے شہروں میں ایجنسی کے دفاتر ہیں اور نسبۃً چھوٹے شہروں میں کل وقتی یا جز وقتی نامہ نگار متعین ہیں۔ پی - پی - آئی کے دائرۂ عمل میں توسیع اور اے - پی - پی سے اس کے صحت مند مقابلے کی بدولت اخبارات کو زیادہ مواد زیادہ تیزی کے ساتھ ملنے لگا ہے۔ پی - پی - آئی نے ایک فیچر سنڈیکیٹ بھی قائم کیا ہے، جو ملکی اور غیر ملکی اخبارات کو عام دلچسپی کے خاص مضامین مہیا کرتا ہے۔ اے - پی - پی نے اہم واقعات اور تقریبات کے لیے فوٹو سروس بھی شروع کر دی ہے۔

یونائیٹڈ پریس آف پاکستان United Press of Pakistan ۱۹۴۹ء میں قائم ہوئی۔ ایجنسی بالعموم ملک کے ایک حصے کے اہم اخبارات میں شائع ہونے والی خاص خبریں دوسرے حصوں کے اخبارات کو مہیا کرتی ہے۔ ایجنسی کے بیشتر خبر نامے اردو میں تیار کیے جاتے ہیں اور ان کی نقول دستی مہیا کر دی جاتی ہیں۔ یو - پی - پی (UPP) کے دفاتر کراچی، لاہور اور راولپنڈی میں ہیں۔

اگرچہ پاکستان میں آزادی صحافت کو دوسری شہری آزادیوں کی طرح شروع ہی سے محترم سمجھا جاتا ہے اور اہل صحافت نے اس آزادی کے حصول اور تحفظ کی خاطر طویل جدوجہد بھی کی ہے، تاہم پاکستانی صحافت ملک کے تمام قوانین کی پابند ہے۔ ۱۹۶۳ء میں دونوں صوبوں کی حکومتوں نے مطبوعات و مطابع سے متعلق مروجہ قوانین کو یک جا کر کے ایک نیا ہنگامی قانون جاری کیا، جس کی رو سے اخبار نکالنے اور اخبار چلانے میں خاصی دشواریاں پیدا ہوئیں۔ صحافیوں نے اس قانون کی بعض دفعات کے خلاف احتجاج کیا اور صحافتی ادارے بھی اس احتجاج میں شریک ہوئے؛ چنانچہ حکومت نے اہل صحافت کو یہ پیش کش کی کہ اگر وہ اپنے لیے خود کوئی ضابطۂ اخلاق مرتب

کر لیں تو ہنگامی قانون کی تعزیری دفعات پر عملدرآمد معطل کیا جا سکتا ہے۔ بالآخر سرکاری نمائندوں اور مدیران جرائد کے درمیان [illegible] بھر کی گفت و شنید کے بعد ۳ جولائی ۱۹۶۳ء کو مدیران اخبارات کی تنظیم (CPNE) نے ایک ضابطۂ اخلاق مرتب کیا اور اس کی رو سے ایک اخلاقی عدالت بھی قائم کی گئی جو ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی کی شکایات کی سماعت اور تصور وار کی مذمت کرنے کی مختار ہے۔ یہ ضابطۂ اخلاق فی الحقیقت عام اخلاقی اصولوں پر مبنی ہے، جس کی رو سے مدیران جرائد توہین آمیز، شر انگیز، امن و امان کے منافی، فحش اور نجی زندگیوں کے بارے میں رسوا کن مواد کی اشاعت سے اجتناب کرتے ہیں۔

ضابطۂ اخلاق کی رو سے خبروں کے ذرائع کو حسب منشا صیغۂ راز میں رکھنا چاہیے؛ اگر خبروں کے ذرائع کسی مواد کو اخبار نویس تک رکھنے کی درخواست کریں یا کسی مواد کی اشاعت کی تاریخ اور وقت مقرر کریں تو ان کی خواہش کا احترام ہونا چاہیے؛ معروضیت خبر نویسی کا معیار ہونا چاہیے؛ سرخیاں لازمی طور پر مواد سے ہم آہنگ ہونی چاہییں؛ علاوہ ازیں افراد، اداروں یا معاصرین کے خلاف جھوٹے الزامات شائع کرنے سے منع کیا گیا ہے؛ کسی شخص کے بیان کو توڑ مروڑ کر یا اصل مدعا کے خلاف شائع کرنا بھی معیوب ہے؛ اخبارات کو معاشرے کے مختلف طبقات میں منافرت کی آگ بھڑکانے کی اجازت نہیں، البتہ وہ علاقوں یا طبقوں کے مابین عدم مساوات پر بصائر و نظائر پیش کرنے میں آزاد ہیں؛ دوسرے ملکوں کے سربراہوں کے بارے میں توہین آمیز مواد اور ایسے امور کا شائع کرنا ممنوع ہے جن سے دوست ملکوں کے ساتھ پاکستان کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو؛ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی کارگزاری کی رپورٹ کا اصول یہ ہے کہ سپیکر جس بات کا تذکرہ ایوان کی کسی روداد سے حذف کرنے کا حکم دے، اخبارات بھی اس کی اشاعت سے احتراز کرتے ہیں، [illegible] ایوان کے تمام ارکان کے ساتھ یکساں سلوک کے پابند ہیں؛ عدالتوں کی کارروائی کی رپورٹ میں یہ اصول ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ کسی بھی فریق کے موقف کو بڑھا کر یا گھٹا کر پیش نہ کیا جائے اور انصاف گستری کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے؛ محنت کشوں کی خبریں اس طرح شائع کی جانی چاہییں کہ محنت کشوں کے حقوق اور مسائل کی ترجمانی ہو جائے، مگر انہیں ہڑتال، تشدد یا پیداوار میں کمی پر اکسانے سے احتراز کیا جائے؛ طالب علموں کے ضمن میں بھی یہی اصول قائم کیا گیا ہے؛ ضابطۂ اخلاق کی رو سے اخبارات یا دوسرے اشاعتی اداروں کو کسی بیرونی ملک سے کوئی مالی امداد قبول کرنے یا اس سے کوئی اور فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں؛ البتہ غیر ممالک کے نمائندے اپنے اشتہارات شائع کرا سکتے ہیں۔

مسلم صحافت شروع ہی سے خداداد صلاحیتوں کے مالک اہل قلم کی مرہون منت رہی ہے۔ قیام پاکستان تک صحافت، بالخصوص اردو صحافت، میں تبصروں کو خبروں پر ترجیح دی جاتی تھی کیونکہ پوری قوم کے ساتھ مسلمانوں کے بیشتر اخبارات بھی ایک نظریاتی مملکت کے قیام کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اردو صحافت نے فنی اعتبار سے ترقی کی اور نئے معیاروں کو برقرار رکھنے اور انہیں مزید آگے لے جانے کے لیے تربیت یافتہ کارکن صحافیوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ پنجاب یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں صحافت میں ایم-اے کے کورس جاری ہیں اور ان کورسوں میں عملی تربیت پر خاصا زور دیا جاتا ہے۔ کارکن صحافیوں کی تنخواہوں

کے مکمل مقرر ہونے کے بعد اخبارات کے مالک، نئی بھرتی کے معاملے میں تربیت یافتہ نوجوانوں کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ اس طرح یونیورسٹیوں سے ایم۔ اے صحافت کی ڈگری لے کر نکلنے والے نوجوان نہ صرف اخباری صنعت میں جگہ پاتے ہیں بلکہ اطلاعات، تعلقات عامّہ اور نشرواشاعت کے سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں بھی قبول کیے جاتے ہیں۔

۲۴ - ادب اور فنونِ لطیفہ

پاکستان کی قومی اور علاقائی زبانوں کے ادب پر علیحدہ علیحدہ مقالات شامل کیے جا رہے ہیں؛ رک بہ اردو، بلوچی، براہوئی، بنگلہ، پشتو، پنجابی، پوٹھوہاری، سندھی اور ہندکو۔

پاکستان میں فنونِ لطیفہ سے متعلق سرگرمیوں کی تفصیلات کے لیے رک بہ فن، فنون۔

۲۵ - کھیل

آزادی سے قبل ان علاقوں کے مسلمان جو اب پاکستان میں شامل ہیں کھیل کے میدان میں اپنی اعلیٰ مہارت کا ثبوت دیا کرتے تھے، خصوصاً ہاکی اور پہلوانی میں تو برصغیر کی شہرت کا دارومدار زیادہ تر انھیں پر تھا۔ قیام پاکستان کے وقت ملک بھر میں مختلف کھیلوں کی مقامی انجمنیں اور کلب موجود تھے۔ انھیں منظم کرنے کے لیے ایک سپورٹس کنٹرول بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا اور حکومت کی سرپرستی کے باعث پاکستانی کھلاڑی بہت جلد بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ لینے کے قابل ہوگئے۔

کرکٹ کا شمار پاکستان کے مقبول ترین کھیلوں میں ہوتا ہے۔ پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ (BCCP—Board of Control for Cricket in Pakistan) اعلیٰ ترین سرکاری ادارہ ہے، جس کے زیر اہتمام ہر سال دو بڑے علاقائی ٹورنامنٹ (قائداعظم ٹرافی اور ایوب ٹرافی) ہوتے ہیں، نیز کھلاڑیوں کی تربیت کا بندوبست اور غیرممالک میں پاکستانی ٹیم کے دوروں اور پاکستان میں غیرملکی ٹیموں کے دوروں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ پاکستانی ٹیم نے کرکٹ کی دنیا میں اپنا ایک اہم مقام پیدا کیا ہے اور اسکے بعض کھلاڑی، مثلاً فضل محمود، کاردار، امتیاز، حنیف، مشتاق، آصف، انتخاب اور ماجد وغیرہ عالمی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ حنیف محمد نے ٹسٹ میچوں کی طویل ترین اننگ (۱۶ گھنٹوں میں ۳۳۷ رنز) کھیل کر اور آصف اقبال اور انتخاب عالم نے نویں وکٹ پر ۱۹۰ رنز بنا کر عالمی ریکارڈ قائم کیے۔ اب تک پاکستانی ٹیم برطانیہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، ویسٹ انڈیز اور بھارت کا دورہ کر چکی ہے اور ان تمام ملکوں کی ٹیمیں پاکستان آ چکی ہیں۔

ہاکی کو اب پاکستان کے قومی کھیل کا درجہ مل چکا ہے۔ برصغیر گزشتہ چالیس سال سے اس کھیل میں اپنی برتری تسلیم کراتا چلا آ رہا ہے، چنانچہ اب تک تمام اولمپک ٹورنامنٹ یا تو بھارت نے جیتے ہیں یا پاکستان نے۔ پاکستانی ٹیم کی کامیابیوں کا آغاز ۱۹۵۸ء سے ہوتا ہے جب اس نے ٹوکیو میں ایشیائی کھیلوں کا فائنل میچ جیتا۔ ۱۹۶۰ء میں روم میں منعقد ہونے والے اولمپک کھیلوں میں پاکستان نے ہاکی کے عالمی چمپین کا اعزاز حاصل کیا۔ یہ اعزاز جکارتا کے ایشیائی کھیلوں میں بھی برقرار رکھا گیا۔ ۱۹۶۲ء کے بعد پاکستان میں اس کھیل پر زوال آنے لگا کیونکہ اس کے اکثر کھلاڑی میدان سے نکل گئے تھے، چنانچہ ۱۹۶۴ء میں بھارت کو اولمپک کھیلوں میں فتح حاصل ہوئی؛ تاہم ۱۹۶۸ء میں پاکستان نے ایک بار پھر اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا ثبوت دیا اور میکسکو میں ہونے والے اولمپک کھیلوں میں

کھویا ہوا اعزاز دوبارہ حاصل کر لیا ۔ اس وقت پاکستان کی ٹیم کو دنیا کی بہترین ہاکی ٹیم تسلیم کیا جاتا ہے ۔ پاکستان ہاکی فیڈریشن (PHF) اس کھیل کا اعلیٰ ترین تنظیمی ادارہ ہے، جس کے زیر اہتمام ہر سال نیشنل ہاکی چیمپین شپ اور آغا خان گولڈ کپ ٹورنامنٹ منعقد ہوتے ہیں اور کھلاڑیوں کے لیے تربیتی کیمپ لگائے جاتے ہیں۔

سکواش (Squash) ایک اور کھیل ہے جس میں پاکستانی کھلاڑیوں، خصوصاً ''خان برادران'' نے اپنے ملک کا نام بلند کیا ۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۶ء تک ہاشم خان نے، ۱۹۵۷ء میں اسکے چچازاد بھائی روشن خان نے، ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۰ء تک ہاشم خان کے چھوٹے بھائی اعظم خان نے اور ۱۹۶۲ء میں اسکے بھتیجے محب اللہ خان نے یکے بعد دیگرے British Open Title جیتا ۔ ۱۹۶۳ء میں یہ اعزاز مصری کھلاڑی ابو طالب نے چھین لیا، لیکن اسی سال اور پھر ۱۹۶۴ء میں آفتاب جاوید نے شوقیہ کھیلنے والوں کا عالمی اعزاز جیت کر اس شکست کا ازالہ کر دیا۔

تقسیم برصغیر سے قبل لاہور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، اور امرتسر پہلوانی کے بڑے مرکز تھے ۔ حصول آزادی کے بعد امرتسر کے نامور پہلوان بھی پاکستان چلے آئے ۔ اس میدان میں پاکستان کی شہرت رستم زمان گاماں پہلوان اور اسکے خاندان کی عدیم المثال کامیابیوں کی مرہون منت ہے ۔ اس وقت گاماں پہلوان کے بھتیجے بھولو پہلوان کو عالمی چیمپین کا اعزاز حاصل ہے اور گزشتہ کئی سال سے دنیا کا کوئی پہلوان اس کے مقابلے میں اترنے پر آمادہ نہیں ہو سکا ۔ ''شوقیہ کشتی'' میں بھی پاکستان نے کئی میڈل جیتے ہیں جن میں ۱۹۶۲ء کے ایشیائی کھیلوں میں سونے کا اور ۱۹۶۴ء کے اولمپک میں کانسی کا میڈل بالخصوص قابل ذکر ہے ۔ ۱۹۷۰ء میں دولت مشترکہ کے کھیلوں کے مقابلے میں پاکستانی پہلوانوں نے متعدد اعزاز حاصل کیے ہیں ۔ اسی طرح مکہ بازی کے میدان میں بھی پاکستان اپنی جگہ پیدا کر رہا ہے۔

فٹ بال بھی ایک مقبول عام کھیل ہے، لیکن اس میں پاکستانی کھلاڑی ابھی اولمپک کھیلوں کے معیار پر نہیں پہنچ سکے؛ تاہم پاکستان فٹ بال فیڈریشن (PFF) کوشش کر رہی ہے کہ غیر ملکی اتالیقوں کی خدمات حاصل کر کے ان کا کھیل بہتر بنایا جائے ۔ اس سلسلے میں تربیتی مرکز قائم کیے جا رہے ہیں، اور ملک میں غیر ملکی ٹیموں کے دوروں کی حوصلہ افزائی بھی کی جا رہی ہے۔

لان ٹینس، ٹیبل ٹینس اور بیڈمنٹن میں بھی بین الاقوامی معیار حاصل نہیں ہو سکا، تاہم ہارون رحیم نے انگلستان میں چند چھوٹے درجے کے لان ٹینس ٹورنامنٹوں میں خاصی کامیابی حاصل کی ہے ۔ پاکستان ٹیبل ٹینس فیڈریشن بھی عالمی مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے ٹیمیں بھیجتی رہتی ہے۔

گھڑ دوڑ کراچی، لاہور اور راولپنڈی میں ہوتی ہے ۔ پاکستان کی جاکی کلب Jockey Club کا الحاق لنڈن کی جاکی کلب سے ہے ۔ سب سے بڑی دوڑیں قائداعظم گولڈ کپ اور پاکستان ڈربی ہیں، جن میں جیتنے والے کو اسی ہزار روپیہ انعام ملتا ہے ۔ ''ریس'' کے گھوڑے زیادہ تر رینالہ اور ساہی وال میں پالے جاتے ہیں۔

تیراکی کے بین الاقوامی مقابلوں کے لیے تربیت دینے کا ملک میں کوئی انتظام نہیں، چنانچہ ابھی تک کوئی پاکستانی تیراک اولمپک کھیلوں میں حصہ نہیں لے سکا ۔ اس کے باوجود بروجن داس اور عبدالمالک نے آبنائے انگلستان کو عبور کر کے تیراکی کی تاریخ میں پاکستان کا نام شامل کر دیا ہے ۔ بروجن داس نے آبنائے انگلستان چھے بار

عبور کی ہے ۔ وہ پہلا ایشیائی ہے جس نے اپنی پہلی ہی کوشش میں یہ کامیابی حاصل کی ۔ اس نے فرانس سے انگلستان تک آبنائے کو ۱۰ گھنٹے ۳۵ منٹ میں پار کر کے عالمی ریکارڈ بھی قائم کیا ہے ۔

۲۶ ۔ اکتشافات و تحفظ آثار قدیمہ

برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے مسلم حکمرانوں نے آثار قدیمہ کو محفوظ کرنے میں دلچسپی لی ۔ ان میں فیروز شاہ تغلق کا نام بالخصوص قابل ذکر ہے ۔ سر ولیم جونز Sir William Jones نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال Asiatic Society of Bengal کی بنیاد رکھی، جس سے برصغیر میں جدید اثریات کا آغاز ہوتا ہے ؛ تاہم شروع میں اس سوسائٹی کا کام زیادہ تر مسکوکاتی اور لسانیاتی تحقیقات تک محدود رہا ۔ ۱۸٦۱ء میں صحیح اور باقاعدہ اثریاتی تحقیق کے لیے شمالی ہندوستان کا اثریاتی جائزہ شروع کیا گیا ۔ سب سے پہلا ناظم آثارِ قدیمہ (Director of Archaeology) سر الیگزانڈر کننگھم Sir Alexander Cunningham تھا، جس کا تقرر ۱۸۷۱ء میں ہوا ۔ اس کا دائرۂ عمل پہلے صرف شمالی ہندوستان تک محدود تھا، لیکن ۱۸۷۴ء میں جنوبی ہندوستان بھی اس میں شامل کر دیا گیا ۔ اس نے وسطی اور شمالی ہندوستان میں تیئیس سال سیاحت کی اور پھر اپنے تجربات کو تیئیس جلدوں پر مشتمل اپنی کتاب *Archaeological Survey of India Reports* میں پیش کیا ۔ ۱۸۸۱ء میں میجر کول A.H. Cole کو قدیم یادگاروں کا محافظ (Curator) مقرر کیا گیا ۔ کننگھم کے بعد ڈاکٹر جیمز برجس Dr. James Burgess ڈائرکٹر جنرل بنا ۔ مشہور جرائد *Indian Antiquary* اور *Epigraphia Indica* کی اشاعت میں اس کا بہت دخل تھا ۔ ۱۸۸۹ء میں اس کی سبکدوشی کے بعد وائسرائے لارڈ کرزن نے اس شعبے میں ذاتی دلچسپی لے کر اسے مستحکم اور مستقل بنیادوں پر از سر نو منظم کیا اور ایک نوجوان برطانوی ماہر اثریات جان مارشل John Marshall کو اس کا ناظم مقرر کیا ۔ مارشل ۱۹۰۲ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک اس عہدے پر فائز رہا اور برصغیر میں کھدائی اور آثار قدیمہ کی حفاظت وغیرہ کا کام بہت حد تک اسی کا مرہون منت ہے ۔ سر جان مارشل کے بعد مسٹر ہارگریوز Mr. Hargreaves، رائے بہادر دیا رام ساہنی، میجر بلیکسٹن Blakistan، راؤ بہادر کے ۔ این ۔ ڈکشٹ اور سر مارٹیمر وھیلر Sir Mortimer Wheeler اس شعبے کے سربراہ بنے ۔ تقسیم کے بعد پاکستان کے حصے میں قدیم یادگاروں، مقامات، فنون لطیفہ اور ثقافت سے متعلق جو چیزیں آئی ہیں وہ انھیں ممتاز افسروں کی کوششوں کا ثمرہ ہیں ۔

۱۹۴۷ء میں اثریات کے بڑے مقامات مغربی پاکستان میں موھنجوڈارو (= موئن جودڑو) اور ہڑپا (وادی سندھ کی تہذیب کے دو بڑے مقامات)، ٹیکسلا اور گندھارا، اور مشرقی پاکستان میں پہاڑپور Paharpur تھے ۔ ان مقامات میں سے بیشتر کی کھدائی سر جان مارشل کے زیر ہدایت ہوئی ۔ قدیم تاریخ کے میدان میں اس کی سب سے بڑی خدمت وادی سندھ کی تہذیب کی دریافت ہے ۔

اس ملک میں عہد حجری کے باقیات کا مطالعہ سب سے پہلے de Terra نے ۱۹۳۵ء میں وادی سوان (راولپنڈی) میں کیا ۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء تک مزید کوئی نمایاں کام نہ ہو سکا ۔

وادی سندھ کی تہذیب، جیسے سر جان مارشل نے دریافت کیا، صرف "پیتل کے زمانے" (Chalcolithic Period) کے دور عروج کی حالت کو پیش کرتی ہے اور اس کی ابتدائی حالتوں کے متعلق بہت کم معلوم تھا ۔ پانچویں صدی عیسوی میں جب

ھنوں کے حملے اور آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی آمد کے درمیانی زمانے میں پاکستان کے علاقوں کی سیاسی تاریخ حکایات اور لوک گیتوں میں ملتی ھے۔ ابتدائی اسلامی دور سے متعلق دو طرح کے مسائل درپیش تھے: (۱) ایسا اثریاتی مواد بالکل ناپید تھا جس سے تقابلی مطالعے میں استفادہ کیا جا سکے، اس لیے اس فن کے علما کو زیادہ تر تحریری ماخذ پر ھی اعتماد کرنا پڑتا تھا؛ (۲) برصغیر میں قدیم مسلمانوں کے فنون لطیفہ اور فن تعمیر کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ تھا۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں بھی اثریات سے متعلق کئی مسائل درپیش تھے، مثلاً یہ کہ سیلابوں، گھنے جنگلات اور دلدلی زمین کی وجہ سے رسل و رسائل میں دشواری کے سبب صحیح اثریاتی تحقیق محال تھی۔

قیام پاکستان کے بعد محکمۂ آثار قدیمہ نے راولپنڈی کے قریب پوٹھوھار کے علاقے اور سندھ میں روہڑی کے مقام پر عہد حجری کے باقیات کو دریافت کرنے کے لیے کوشش کی۔ نتائج حوصلہ افزا رہے اور قدیم حجری (Palaeolithic) ثقافت کے نئے مقامات بھی دریافت ہوے۔ اب محکمۂ آثار قدیمہ غیر ملکی ماھرین کی مدد سے بلوچستان کے علاوہ پنجاب اور سندھ کے علاقوں کا جائزہ لے رھا ھے۔ ۱۹۵۵ء میں کوٹ ڈیجی Kot Diji کے مقام پر کھدائیوں سے وادی سندھ کی تہذیب کے ابتدائی ادوار پر نئی روشنی پڑی ھے اور یہ بات ثابت ھو گئی ھے کہ کوٹ ڈیجی کی ثقافت وادی سندھ کی ثقافت کی ابتدائی حالت ھے۔ یہ دریافت واقعی پاکستان کی اثریات کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ھے، کیونکہ اس نے تحقیق کے لیے نئی راھیں کھول دی ھیں۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں مہاستھان گڑھ اور مینامتی کے مقامات پر کھدائیوں سے وھاں کی ساتویں سے دسویں صدی عیسوی کی ثقافتی، سیاسی اور معاشرتی تاریخ کو از سر نو مرتب کرنے میں مدد ملی ھے۔

بھنبھور میں پہلی بار کھدائیاں کی گئی ھیں اور یہاں سے ابتدائی اسلامی عہد کی جو چیزیں برآمد ھوئی ھیں ان سے تقابلی مطالعے کے لیے بڑا اھم مواد فراھم ھو گیا ھے۔ ان کھدائیوں سے ایک قلعہ بند شہر کا منصوبہ اور کثیر تعداد میں ابتدائی اسلامی سکے، برتن، کتبات اور دوسری اشیا دریافت ھوئی ھیں، جن کی مدد سے اس علاقے کی معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی تاریخ کی ترتیب نو میں مدد ملتی ھے۔

ایک کروڑ گیارہ لاکھ روپے کی لاگت سے اسلام آباد میں پاکستان کا ایک قومی عجائب گھر قائم کرنے کے منصوبے کی قومی اقتصادی کونسل (NEC) نے منظوری دے دی ھے۔ علاوہ ازیں قلعۂ لال باغ (ڈھاکہ) اور حیدر آباد میں نئے عجائب گھر قائم کیے جائیں گے۔ مشرقی پاکستان میں چٹاگانگ، مینا متی اور مہاستھان گڑھ میں اور مغربی پاکستان میں کراچی اور سوات کے عجائب گھروں میں توسیع کی جائے گی۔ ملک کے دونوں حصوں میں کل چالیس لاکھ روپیہ مساوی طور پر خرچ کیا جائے گا۔

نسلیات سے متعلق (Ethnological) چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں اور سندھ اور بلوچستان میں آباد قبائل سے جو مفید معلومات دستیاب ھوئی ھیں ان سے چٹاگانگ کے نسلیاتی عجائب گھر (Ethnological Museum) میں فائدہ اٹھایا جائے گا۔

وادی سندھ کی تہذیب کے تقابلی مطالعے کے لیے ھڑپا کے اثریاتی عجائب گھر کو موھنجوڈارو (= موئن جودڑو)، کوٹ ڈیجی، امری اور روھڑی سے قدیم نوادر حاصل کر کے دوبارہ منظم کیا گیا ھے۔ حکومت پاکستان نے دوسرے پنجسالہ منصوبے کے

دوران میں موہنجوڈارو کے عجائب گھر کی ایک نئی عمارت تعمیر کرائی۔ محکمۂ آثار قدیمہ نے بھنبھور میں ایک نیا عجائب گھر تعمیر کرایا اور عمرکوٹ میں بھی ایک عجائب گھر ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء کے دوران میں مکمل ہوا۔

کراچی کے مرکزی عجائب گھر میں ایسی خاص تصویریں (dioramas) مکمل ہو چکی ہیں جن میں عہد حجری اور دورِ قبل از تاریخ کی زندگی، کافرستان اور چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں میں رہنے والے قدیم قبائل کی معاشرت، ایک بدھ سٹوپا، تخت بائی کی ایک خانقاہ اور محمد بن قاسم کے محاصرۂ دیبل کے مناظر کو پیش کیا گیا ہے۔

محکمۂ آثارِ قدیمہ کی مساعی سے ٹیکسلا کے قریب سرائے کالا میں ایک اہم قدیم مقام دریافت ہوا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ اس علاقے کی ثقافت ساڑھے تین ہزار سال پرانی ہے۔ دوسری قابلِ ذکر کھدائیاں وہ ہیں جو تلمبہ (ملتان) اور منصورہ (ضلع سنگھڑ) میں کی گئی ہیں۔ ۱۹۶۷ - ۱۹۶۸ء میں مغربی پاکستان میں تمر گڑھ، ہڑپا، نیموگرام اور پن ڈھیری کے مقامات پر اور مشرقی پاکستان میں مینامتی میں کھدائیاں کی گئیں۔

اسلامی دور کی یادگاروں کو محفوظ رکھنے کے لیے خاصا کام کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں حکومت پاکستان نے یونسکو UNESCO کا تعاون بھی حاصل کیا ہے۔ اسلامی دور کے آثار کے لیے رلٹ بہ فنِ تعمیر، باب، باغ، برج، قلعہ، مسجد اور منار۔

۲۷ - سیاحت

پاکستان کی سر زمین کا حسن اور یہاں کے باشندوں کا اخلاق دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے موجب کشش ہے، چنانچہ یہاں آنے والے غیر ملکی سیاحوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ یہاں جو رقم صرف کرتے ہیں وہ گزشتہ دس برس میں ۳ کروڑ ۷۴ لاکھ سے بڑھ کر ۱۱ کروڑ ۸۷ لاکھ روپے تک پہنچ گئی ہے۔

۱۹۶۵ء میں محکمۂ سیاحت نے ایک بیس سالہ منصوبہ تیار کیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ سیاحت کو اس حد تک ترقی دی جائے کہ ۱۹۷۰ء میں ایک کروڑ ۱۰ لاکھ کا اور ۱۹۸۵ء میں ۵ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کا زرمبادلہ کمایا جا سکے۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں سیاحت کی ترقی کے لیے حسب ذیل اقدامات شامل تھے: ملک کے مختلف حصوں، خصوصاً چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے، سندر بن، گلگت، ہنزہ اور چترال میں ریسٹ ہاؤسوں کی تعمیر اور حمل و نقل کی سہولتیں فراہم کرنا؛ کوہ پیمائی، سرمائی کھیلوں، ماہی گیری اور سیر و شکار کا اہتمام؛ تاریخی اہمیت کے مقامات اور آثار قدیمہ کی دیکھ بھال اور انھیں جاذب توجہ بنانا؛ اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں کا قیام؛ وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کا انتظام تاکہ ۱۹۷۰ء کے آخر تک پاکستان میں کم از کم دو لاکھ سیاح سالانہ آئیں اور یہاں تین سے چھے روز تک قیام کر سکیں۔

سیاحت کو ترقی دینے کے لیے ملک کے مختلف شہروں میں محکمے کے دفاتر موجود ہیں (مرکزی دفتر کراچی، لاہور اور ڈھاکے میں اور علاقائی دفاتر راولپنڈی، پشاور، مری، سوات، ایبٹ آباد، گلگت، چٹاگانگ، کپتائی، کاکس بازار، سلہٹ اور کھلنا میں)۔ ہوائی اڈوں پر مراکز اطلاعات اور بڑے بڑے شہروں میں ہوٹل کھولے گئے ہیں۔ بیرون ملک بھی ترقی سیاحت کے دفتر موجود ہیں (نیویارک، لنڈن، فرانکفرٹ اور سان فرانسسکو؛ بارہ مزید شہروں میں بھی ایسے دفتر کھولے جا رہے ہیں)۔ محکمے کے کارکنوں کی تربیت کا انتظام بھی کیا گیا ہے اور انھیں پاکستان

کی تاریخ، ثقافت، فنون لطیفہ اور جغرافیائی حالات کے بارے میں مفید معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ بعض کارکنوں کو اعلیٰ تربیت کے لیے دوسرے ممالک میں بھی بھیجا جاتا ہے۔

غیر ممالک میں نمائش کے لیے محکمۂ سیاحت پاکستان پر رنگین فلمیں بھی تیار کرتا ہے۔ اسی طرح مختلف زبانوں میں پاکستان سے متعلق کتابچے، راہنما اور نقشے وغیرہ شائع کیے جاتے ہیں۔

حکومت نے ملک میں غیر ملکی سیاحوں کے داخلے اور مختلف علاقوں میں سفر کے لیے بہت سی رعایتیں دی ہوئی ہیں اور متعدد سابقہ پابندیاں اٹھا لی ہیں، چنانچہ اب انہیں اپنی آمد اور رخصت کے لیے پولیس کے تھانوں میں اپنا نام درج کرانے کی ضرورت نہیں رہی اور وہ کئی قبائلی علاقوں میں بھی آسانی سے آ جا سکتے ہیں۔

۱۹٦٦ء میں، جو ''سیاحت کا سال'' قرار دیا گیا تھا، پاکستان نے لوزان Lausanne کے بین الاقوامی میلے میں شرکت کی، جہاں پانچ لاکھ سے زیادہ افراد نے پاکستانی سٹال دیکھا۔ علاوہ ازیں پراگ Prague کی نمائش میں پاکستان نے ملک کے خوبصورت مناظر کی بڑی بڑی تصاویر بھیجیں جو سیاحوں کے لیے بے حد پر کشش ثابت ہوئیں۔ جنوری ۱۹٦۷ء میں *Natural Graphic Magazine* نے *Pakistan Story* کے عنوان سے ایک طویل مصور مقالہ شائع کیا اور نیشنل گرافک سوسائٹی نے واشنگٹن میں پاکستانی نوادر پر ایک نمائش منعقد کی۔ دسمبر ۱۹٦۷ء میں جنگلی جانوروں کے تحفظ کی عالمی انجمن کے ایک وفد نے مشرقی اور مغربی پاکستان کا دورہ کیا اور یہاں کے جنگلات اور حیوانات پر ایک مختصر فلم تیار کی۔

محکمۂ سیاحت کی درخواست پر لاڑکانہ ایکسپریس کا نام موہنجوڈارو (= موئن جو دڑو) ایکسپریس رکھ دیا گیا ہے۔ ڈھائی لاکھ روپے کے خرچ سے موہنجوڈارو میں آنے والے سیاحوں کی سہولتوں کا انتظام کیا جا رہا ہے، مثلاً مرکز اطلاعات اور تفریحی مرکز کا قیام، پانی اور بجلی کی بہم رسانی، عجائب گھر کو ایرکنڈیشنڈ کرنا اور آثار قدیمہ میں روشنی کا انتظام وغیرہ۔ اسی طرح ٹیکسلا میں محکمے کی طرف سے ریسٹ ہاوس، پروجیکشن ہال اور کیفے ٹیریا کے علاوہ ہاتھ سے بنائی ہوئی چیزوں کی ایک دکان بھی تعمیر کی جا رہی ہے۔ کالام (سوات) میں بارہ خواب گاہوں پر مشتمل ''فلک سیر ہوٹل'' اگست ۱۹٦۷ء کھولا گیا۔ پشاور، ڈھاکے، اور چاٹگانگ میں بھی نئے ہوٹل کھولے جا رہے ہیں۔

اب سیاحوں کو خشکی اور پانی میں سفر کرنے کے لیے ہر قسم کے ذرائع حمل و نقل بڑی تعداد میں میسر آ چکے ہیں۔ محکمے کی طرف سے شہروں اور آثار قدیمہ کی سیر کے انتظامات کیے جاتے ہیں۔ پی۔ آئی۔ اے نے سیاحوں کی سہولت کے لیے موہنجوڈارو اور کاکس بازار تک اپنی پروازیں شروع کر دی ہیں۔ محکمۂ سیاحت نے چاٹگانگ کے پہاڑی علاقوں کے عوامی ناچ پیش کرنے کے لیے ایک طائفہ بھی تیار کیا ہے۔ کراچی کے ساحل پر سمندر میں ڈوبنے والوں کو بچانے کے لیے ایک حفاظتی دستہ منظم کیا گیا ہے۔ ایبٹ آباد میں گالف کے میدان تیار کیے گئے ہیں۔ گلگت میں پولو کے ٹورنامنٹ منعقد کیے جاتے ہیں۔ لاہور میں ہر سال گھوڑوں اور مویشیوں کی مشہور عالم نمائش کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

پاکستان کی سر زمین بڑے متنوع مناظر پیش کرتی ہے۔ اس میں بلند و بالا پہاڑ بھی ہیں اور وسیع و زرخیز میدان بھی، چٹیل صحرا بھی ہیں اور گھنے جنگلات بھی، گنجان آباد شہر بھی ہیں اور آثار قدیمہ بھی۔ سیاحت کے نقطۂ نظر سے اہم مقامات

میں سے مندرجۂ ذیل بالخصوص قابل ذکر ہیں:

ڈھاکہ: مشرقی پاکستان کا دارالحکومت، جو ۱۶۰۸ء میں بسایا گیا۔ یہ بنگال کے مغل صوبیداروں کا صدر مقام تھا۔ شہر کا رقبہ اٹھائیس مربع میل ہے اور آبادی پانچ لاکھ سے متجاوز ہے۔ کسی زمانے میں یہاں کی ململ کی دنیا بھر میں شہرت تھی اور یہاں تیار ہونے والے سوتی اور ریشمی کپڑے کی بڑی مانگ تھی۔ یہاں کی تاریخی عمارات میں قلعۂ لال باغ، مقبرۂ بی بی پری، بارہ کٹرہ، حسینی دالان، ستارا مسجد، سات گنبد مسجد اور ڈھکیشوری مندر اور جدید عمارتوں میں کرزن ہال، ہائی کورٹ، گورنمنٹ ہاؤس، ایگریکلچرل انسٹی ٹیوٹ، سیکرٹریٹ، پبلک لائبریری اور آرٹس انسٹی ٹیوٹ قابل ذکر ہیں۔ یہاں کے عجائب گھر میں قدیم زمانے کے اسلحہ، زیورات، بت، تصویریں، سکے، مخطوطات، پارچات اور دوسرے فنی نوادر موجود ہیں۔

چٹاگانگ: یہ خوبصورت شہر اور مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ دریائے کرنافلی کے کنارے واقع ہے۔ جامع مسجد، اندر قلعہ، مسجد قدم مبارک، اور روضۂ سلطان بایزید بسطامیؒ یہاں کی بعض قدیم یادگار عمارتیں ہیں۔

کپتائی: چٹاگانگ سے پچیس میل کے فاصلے پر واقع یہ چھوٹا سا گاؤں کرنافلی پن بجلی منصوبے کے باعث بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ یہاں برصغیر کی سب سے بڑی مصنوعی جھیل (۳۶۰ مربع میل) واقع ہے، جس میں سیر کے لیے موٹر لانچوں کا بہت عمدہ انتظام ہے۔ یہاں ہر قسم کا شکار بھی دستیاب ہے۔

رانگامائی: چٹاگانگ سے پینتالیس میل دور، دریائے کرنافلی کے کنارے، چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے کے ضلع کا صدر مقام ہے، جہاں کے اصل باشندے ابھی تک قدیم طرز کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہاں کے جنگل بے حد گھنے ہیں اور وہاں جنگلی درندوں کی کثرت ہے۔ موسم سرما میں یہاں ہاتھی پکڑے جاتے ہیں، جس کا سیاحوں کو نظارا کرانے کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔

کاکس بازار: چٹاگانگ سے چورانوے میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں دنیا کا طویل ترین قدرتی ساحل (۳۷۵ میل) ہے۔ اس علاقے میں موگھ قبیلہ آباد ہے، جس کے رسم و رواج منفرد ہیں۔

سندر بن: ضلع کھلنا کے یہ سدا بہار گھنے جنگلات، جن میں دریاؤں کا جال بچھا ہوا ہے، دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ شکار کی کشش دور دراز کے سیاحوں کو یہاں کھینچے لیے آتی ہے۔

سلہٹ: مشرقی پاکستان میں چائے کے باغات کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ ۸۰ ہزار ایکڑ رقبے میں تقریباً ایک سو باغات پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں شیر اور مرغابی کے شکار کے شائقین کے ذوق کی تسکین بھی ہو جاتی ہے۔

مہاستھان گڑھ: بنگال کا قدیم ترین دارالحکومت، جو بوگرہ ریلوے سٹیشن سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ محکمۂ آثار قدیمہ کی کوششوں سے یہاں بدھ، ہندو اور اسلامی ادوار کے آثار برآمد ہو چکے ہیں۔

مینامتی: یہاں کھدائیوں کے ذریعے قدیم بدھ ثقافت کے آثار منظر عام پر آئے ہیں۔ یہ مقام کومیلا سے پانچ میل مغرب کی جانب واقع ہے۔

پہاڑ پور: ضلع راجشاہی میں واقع ہے۔ یہاں ایشیا کی سب سے بڑی اور سب سے نفیس بدھ خانقاہ موجود ہے، جو اپنے طرز تعمیر کے اعتبار سے قابل دید ہے۔

کراچی: مغربی پاکستان کا سب سے بڑا اور اہم ترین شہر اور بندرگاہ ہے۔ اسلام آباد میں دارالحکومت منتقل ہونے سے قبل یہی ملک کا

صدر مقام تھا۔ یہ صنعت و تجارت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہاں کا قومی عجائب گھر، چڑیا گھر اور کلفٹن کا ساحل قابل دید مقامات ہیں۔

بھنبھور: کراچی سے چالیس میل شمال مشرق میں اس کے آثار نظر آتے ہیں۔ بعض علما کے نزدیک یہی دیبل تھا، جہاں سے محمد بن قاسم نے اپنی فوج کشی کا آغاز کیا۔

ٹھٹھہ: کراچی کے شمال میں تریسٹھ میل دور یہ شہر، تین صدیوں تک (۱۳۷۰ تا ۱۷۳۹ء) صوبۂ سندھ کا دارالحکومت رہا۔ اس سے دو میل شمال مغرب میں مکلی کی پہاڑیاں ہیں، جہاں چھ مربع میل رقبے پر ایک گورستان واقع ہے۔ یہاں کے بعض مقابر فنِ تعمیر کے نادر نمونے پیش کرتے ہیں۔ اس کے مضافات میں، خصوصاً جھیل کالری میں آبی پرندوں کا شکار بکثرت ہوتا ہے۔

حیدر آباد: اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں صوبۂ سندھ کا دارالحکومت، جو کراچی سے ۱۲۶ میل شمال مشرق میں واقع ہے۔ یہاں بعض آثارِ قدیمہ بھی ملتے ہیں۔ دریائے سندھ پر بنا ہوا غلام محمد بیراج جدید انجینیرنگ کا شاہکار ہے۔

سکھر: حیدرآباد سے ۲۱۲ میل شمال مشرق میں دریائے سندھ کے کنارے آباد ہے۔ سکھر بیراج بھی ہے، جس کا شمار دنیا کے عظیم ترین آب پاشی کے منصوبوں میں ہوتا ہے۔ یہاں سے سات نہریں نکالی گئی ہیں، جن سے سَتّر لاکھ ایکڑ اراضی سیراب کی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک نہر ایسی ہے جو نہر پانامہ اور نہر سویز سے بھی زیادہ طویل و عریض ہے۔

موہنجوڈارو (= موئن جودڑو): پاکستان کے مشہور ترین آثارِ قدیمہ، سکھر سے اسّی میل جنوب مغرب میں ملتے ہیں۔ یہاں پانچ ہزار سال پرانی وادی سندھ کی تہذیب کی باقیات دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ اسی قسم کے آثار ساہیوال (پنجاب) کے نزدیک ہڑپا کے مقام پر موجود ہیں۔

کوئٹہ: بلوچستان کا دارالحکومت اور صحت افزا مقام، سطح سمندر سے ساڑھے چار ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں سے باسٹھ میل دور، آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر، ایک اور تفریحی مقام زیارت ہے۔

لاہور: صوبۂ پنجاب کا دارالحکومت اور مغربی پاکستان کا ثقافتی مرکز، کراچی سے آٹھ سو میل شمال مشرق میں دریائے راوی کے کنارے واقع ہے۔ یہ ایک قدیم تاریخی شہر ہے جہاں قدم قدم پر باغات اور قدیم و جدید عمارات نظر آتی ہیں۔ ہندی اسلامی فن تعمیر کے بعض نادر نمونے عالمگیر کی بادشاہی مسجد، شاہجہان کا شالا مار باغ، جہانگیر کا مقبرہ اور اکبر کا شاہی قلعہ ہیں۔ جناح باغ کا شمار ایشیا کے بہترین تفریحی باغات میں ہوتا ہے۔ لاہور میں ہر سال گھوڑوں اور مویشیوں کا قومی میلا منعقد ہوتا ہے، جس میں طرح طرح کے کھیل تماشوں کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ اس میلے میں شرکت کے لیے سیاح خاصی تعداد میں آتے ہیں۔

راولپنڈی: قیام پاکستان سے قبل یہ شمالی ہند کی ایک اہم چھاؤنی کی حیثیت سے مشہور تھا، لیکن آزادی کے بعد، خصوصاً عبوری دارالحکومت بننے کے بعد، اس شہر نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ یہاں کا ایوب نیشنل پارک قابل دید ہے۔ اکثر صحت افزا پہاڑی مقامات کو یہیں سے راستے جاتے ہیں، مثلاً مری، نتھیا گلی، ایوبیہ، ایبٹ آباد، سوات اور کاغان۔

اسلام آباد: راولپنڈی سے سات میل شمال مشرق میں پاکستان کا نیا دارالحکومت۔ اگرچہ ابھی یہ شہر مکمل نہیں ہوا تاہم بہت سے سفارت

خانے اور سرکاری دفاتر یہاں منتقل ہو چکے ہیں۔ یہ شہر جدید ترین طرز پر بسایا گیا ہے۔

ٹیکسلا: راولپنڈی سے بیس میل کے فاصلے پر دورِ قدیم کا مشہور شہر اور گندھارا تہذیب کا مرکز، جس کے آثار قدیمہ ھخامنشی، موریا، ھند یونانی، سیتھین، پارتھین اور کشان حکمرانوں کی یادگار ہیں۔

مری: تقریباً ساڑھے سات ہزار فٹ کی بلندی پر راولپنڈی سے چالیس میل دور واقع ہے۔ اچھی آب و ھوا اور قیام کی بہترین سہولتوں کے باعث یہ موسم گرما میں پاکستان کا مقبول ترین پہاڑی مقام ہے۔ اس کے قریب کئی اور چھوٹے چھوٹے صحت افزا مقامات ہیں، مثلاً اپرٹوپہ، لوئرٹوپہ، گھوڑا گلی، چھانگلا گلی، ایوبیہ۔

نتھیا گلی اور ایبٹ آباد بھی اسی علاقے میں عمدہ پہاڑی مقامات ہیں۔

وادی کاغان: نوے میل لمبی اور بعض مقامات پر ساڑھے تیرہ ہزار فٹ تک بلند ہے۔ اس وادی کے حسین مناظر اور ٹراؤٹ مچھلی کا شکار سیاحوں کو دنیا کے ہر حصے سے کھینچ لاتا ہے۔

وادی سوات: ملک کے انتہائی خوبصورت علاقوں میں سے ہے، جہاں بعض قدیم آثار قدیمہ بھی دریافت ہوئے ہیں۔

پشاور: لاہور سے ۲۷۰ میل شمال مغرب میں ایک اور قدیم تاریخی شہر، جو وسط ایشیا کا تجارتی مرکز رہا ہے۔ یہاں کے عجائب گھر میں "رومی۔ بدھ" فن بت تراشی کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ یہاں سے گیارہ میل دور درۂ خیبر، اُنتیس میل کے فاصلے پر لنڈی کوتل اور اس سے ذرا آگے افغانستان کی سرحد پر تورخم واقع ہے۔

گلگت: سوات کی طرح قدرتی حسن سے مالا مال ہے۔ یہاں کی بعض چوٹیاں انیس ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہیں اور ایک چوٹی "کے۔ ٹو" تو ۲۸۲۵۰ فٹ اونچی ہے اور ماؤنٹ ایورسٹ کے بعد دنیا کی بلند ترین چوٹی سمجھی جاتی ہے۔ راولپنڈی سے گلگت تک فضائی سفر کریں تو بعض حسین ترین مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان میں دنیا کی خوبصورت ترین جھیل سیف الملوک کا نظارہ بالخصوص ناقابل فراموش ہے۔ سکردو میں بھی بعض بہت خوبصورت جھیلیں موجود ہیں، مثلاً ست پارہ اور کچھورہ۔ ان تمام مقامات پر سیاحوں کے آرام اور سہولت کا انتظام و اہتمام موجود ہے۔

۲۸۔ سکہ اور قومی نشان

سکہ: پاکستان کا سکہ روپیہ ہے، جو ایک سو پیسوں پر مشتمل ہے۔ اس کی بین الاقوامی شرح تبادلہ یہ ہے: ایک پاکستانی روپیہ = ۰.۱۰۲ ڈالر = ۰.۰۷۵ پونڈ یا ۱۸ پنس۔

قومی پھول: پاکستان کا قومی پھول یاسمین ہے۔

قومی پرچم: قومی پرچم مستطیل شکل کا ہے، جس کا ایک تہائی حصہ سفید اور دو تہائی گہرے سبز رنگ کا ہے۔ سفید حصہ اقلیتوں کی اور سبز حصہ (جس کے وسط میں سفید ھلال اور پانچ کونوں والا تارا بنا ہے) مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

قومی ترانہ: جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان کا مندرجۂ ذیل قومی ترانہ ابوالاثر حفیظ جالندھری کا لکھا ہوا ہے:

پاک سر زمین شاد باد　　کشور حسین شاد باد
تو نشانِ عزم عالی شان　　ارضِ پاکستان
مرکز یقین شاد باد

پاک سر زمین کا نظام　　قوت اخوت عوام
قوم، ملک، سلطنت　　پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزل مراد

پرچم ستارہ و ہلال　　　رہبر ترقی و کمال
ترجمان ماضی، شان حال　　　جان استقبال
سایۂ خدائے ذوالجلال

[مقالے کے آخری حصے میں جو اعداد و شمار دیے گئے ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق ۱۹٦۷-۱۹٦۸ء سے ہے اور یہ *Twenty Years of Pakistan 1947 - 1967* اور *Pakistan Years Book 1969* پر مبنی ہیں.

اس مقالے کی تحریر و ترتیب میں جن اصحاب کی اعانت شامل حال رہی ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں :

جغرافیہ : ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد؛ ارضیات : پروفیسر اسرار اللہ؛ نباتات، مغربی پاکستان : ڈاکٹر آر۔ آر۔ سٹیورٹ؛ نباتات، مشرقی پاکستان : ڈاکٹر مجید احمد؛ حیوانات : ڈاکٹر حامد خان بھٹی؛ تاریخ : ڈاکٹر ریاض الاسلام اور پروفیسر محمد اسمعیل بھٹی؛ ریلوے : جناب احمد ربانی.

"صحت" اور "تعلیم" سے متعلق حصے ڈاکٹر اصغر علی نے اور "صحافت" پر مضمون سید اکمل علیمی نے لکھا.

ادارہ ان سب اصحاب کا ممنون ہے اور بالخصوص ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن کا، جنھوں نے از راہ کرم "قانون" کے باب پر نظر ثانی فرمائی ہے — رئیس ادارہ].

مآخذ : (الف) جغرافیہ : (۱) Cunningham : *Ancient Geography of India*؛ (۲) F. C. Richards : *Geographical Factors in Indian Archaeology*، در *Indian Antiquary*، ج ٦۲، ۱۹۳۳ء؛ (۳) O. H. K. Spate : *India and Pakistan : a general regional geography*، لنڈن ۱۹۵۴ء؛ (۴) Jane Hill : *Pakistan, Land and People*، لاہور ۱۹۵۰ء؛ (۵) E. C. Stamp : *First Geography of Pakistan and India*، لاہور ۱۹٦۲ء؛ (٦) قاضی سعید الدین احمد : *A Geography of Pakistan*، کراچی ۱۹٦۴ء؛ (۷) A. Tayyeb : *Pakistan : A Political Geography*، لنڈن ۱۹٦٦ء؛ (۸) ابن الحسن : *Pakistan*، کراچی ۱۹٦۷ء؛ (۹) مشتاق الرحمٰن : *Bibliography of Pakistan Geography*، جامعۂ کراچی ۱۹٦۸ء؛ (۱۰) میاں محمد اسلم : ہمارا ملک اور اس کے لوگ، در معاشرتی علوم، لاہور ۱۹٦۹ء؛ نیز دیکھیے (۱۱) *Imperial Gazetteer of India*، ج ۱ تا ۲٦.

(ب) تاریخ : (۱۲) *The Cambridge History of India*؛ (۱۳) Dowson و Elliot : *The History of India as told by its own Historians*، ۱۸٦۷ تا ۱۸۷۷ء؛ (۱۴) H. Rahman و M. Arshad : *History of Indo-Pakistan*، ڈھاکہ ۱۹٦٦ء؛ (۱۵) آر۔ سی۔ موجمدار، وغیرہ : *An Advanced History of India*، نیو یارک ۱۹٦۷ء؛ (۱٦) *A Short History of Pakistan*، مرتبۂ اشتیاق حسین قریشی، مطبوعۂ جامعۂ کراچی ۱۹٦۷ء؛ (۱۷) علی کوثر : *New History of Indo-Pakistan*، بار دوم، ڈھاکہ ۱۹٦۸ء؛ (۱۸) ہاشمی فرید آبادی : تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، ۲ جلد، کراچی ۱۹۵۲ء؛ نیز خصوصی مطالعے کے لیے دیکھیے :

عہد قبل از اسلام : (۱۹) F. E. Pargiter : *Ancient Indian Historical Tradition*، لنڈن ۱۹۲۲ء؛ (۲۰) H. C. Raychaudhuri : *Political History of Ancient India*، بار ششم، کلکتہ ۱۹۵۳ء؛ (۲۱) وہی مصنف : *Studies in Indian Antiquities*؛ (۲۲) Stuart Pigott : *Prehistoric India*؛ (۲۳) سری نواس آئینگر : *Life in Ancient India*؛ (۲۴) V. A. Smith : *The Early History of India*، آکسفرڈ ۱۹۱۴ء؛ (۲۵) Pusalkar و Majumdar : *History and Culture of the Indian People : Vedic Age*، لنڈن ۱۹۵۱ء؛ (۲٦) بدھ پرکاش : *Political and Social*

Movement in Ancient Panjab، دہلی ۱۹۶۳ء؛ (۲۷)
McCrindle : Invasion of India by Alexander the
Great؛ (۲۸) A. T. Olmstead : History of Persion
Empire، شکاگو ۱۹۳۹ء؛ (۲۹) J. W. Crindle :
Ancient India as described by Magasthenese...،
کلکتہ ۱۸۷۷ء؛ (۳۰) R.C. Mookerji : Chandragupta
Maurya and His Times، مدراس ۱۹۴۳ء؛ (۳۱)
D.R. Bhandarkar : Ashoka، کلکتہ ۱۹۲۶ء؛ (۳۲)
رومیلا تھاپر : Asoka and the Decline of Mauryas،
آوکسفرڈ ۱۹۶۱ء؛ (۳۳) A. K. Narain : The Indo-
Greeks، آوکسفرڈ ۱۹۵۷ء؛ (۳۴) S. Beal : Travels
of Hiuen Tsang، کلکتہ ۱۹۵۸ء؛ (۳۵) Rhys
Davids : Buddhist India؛ (۳۶) V. S. Agrawala :
Indian as Known to Panini، لکھنؤ یونیورسٹی
۱۹۵۳ء؛ (۳۷) Majumdar و Altekar : Gupta -
Vakataka Age، لاہور ۱۹۴۶ء؛ (۳۸) A. Cunningham
: Later Indo - Scythians، بنارس ۱۹۲۶ء؛
(۳۹) موجمدار : History of Bengal، ج ۱ ڈھاکہ
یونیورسٹی، ۱۹۴۳ء؛ (۴۰) A. A. Macdonell :
A History of Sanskrit Literature، لنڈن ۱۹۰۰ء؛
(۴۱) Al-Biruni's India، انگریزی ترجمہ از E. C.
Sachau، لاہور ۱۹۶۲ء۔

عہد اسلامی : (۴۲) S. Lane - Pool :
The Mohammadan Dynasties، لنڈن ۱۸۹۳ء؛ (۴۳)
C. Mabel - Duff : Chronology of India، ۱۸۹۹ء؛
(۴۴) Ikram و Spear : The Cultural Heritage
of Pakistan، لنڈن ۱۹۵۵ء؛ (۴۵) شیخ محمد اکرام :
History of Muslim Civilization in India and
Pakistan، لاہور ۱۹۶۱ء؛ (۴۶) A. Rahim : Social
and Cultural History of Bengal، کراچی ۱۹۶۳ء؛ (۴۷)
افضل اقبال : The Culture of Islam : an analysis of its
earliest pattern، لاہور ۱۹۶۷ء؛ (۴۸) S. Lane-Pool :
Mediaeval India under Mohammedan Rule، لنڈن
۱۹۰۳ء؛ (۴۹) A.B.M. Habibullah : The Foundation
of Muslim Rule in India، الہ آباد ۱۹۶۱ء؛
(۵۰) M. Nazim : Mahmud of Ghazna؛ (۵۱)
عزیز احمد : Political History and Institutions of the
Early Turkish Empire of Delhi، لاہور ۱۹۴۹ء؛ (۵۲)
اشتیاق حسین قریشی : The Administration of the Sultanate
of Delhi، کراچی ۱۹۵۹ء؛ (۵۳) K.A. Nizami :
Some Aspects of Religion and Politics in India
during the Thirteenth Century، علی گڑھ ۱۹۶۱ء؛ (۵۴)
مہدی حسین : Tughluq Dynasty، کلکتہ ۱۹۶۳ء؛ (۵۵)
S.M.H. Haq : Barani's History of the Tughluqs،
کراچی ۱۹۵۹ء؛ (۵۶) عبدالحلیم : History of the
Lodi Sultans، ڈھاکہ یونیورسٹی، ۱۹۶۱ء؛ (۵۷) N.K.
Bhattasali : Coins and Chronology of the Early
Independent Sultans of Bengal، کیمبرج ۱۹۲۲ء؛
(۵۸) J.N. Sarkar : History of Bengal، ج ۲ ڈھاکہ
یونیورسٹی، ۱۹۴۸ء؛ (۵۹) A. Karim : Social History
of the Muslims of Bengal، ۱۹۵۹ء؛ (۶۰) M. Hasan :
Kashmir under the Sultans، علی گڑھ ۱۹۵۹ء؛ (۶۱)
S. Lane-Pool : Babur، ۱۸۹۹ء؛ (۶۲) W. Erskine :
History of India under Babur and Humayun،
۱۸۵۴ء؛ (۶۳) K. Qanungo : Sher Shah، کلکتہ
۱۹۲۱ء؛ (۶۴) V. Smith : Akbar, the Great Moghul،
دہلی ۱۹۵۸ء؛ (۶۵) D.H. Moreland : India at the
death of Akbar، ۱۹۶۲ء؛ (۶۶) بینی پرشاد : History
of Jahangir، الہ آباد ۱۹۴۰ء؛ (۶۷) بنارسی پرشاد سکسینہ :
History of Shah Jahan of Dehli، الہ آباد ۱۹۴۰ء؛
(۶۸) جادو ناتھ سرکار : History of Aurangzeb، کلکتہ
۱۹۲۱ء؛ (۶۹) W. Irvine : Later Mughals، کلکتہ
۱۹۲۱ء؛ (۷۰) عبدالعزیز : The Mansabdari System
of the Mughal Army، لاہور ۱۹۴۵ء؛ (۷۱)

The Administration of the : اشتیاق حسین قریشی
۱۹۶۲ء کراچی ،Mughal Empire
Chronology of : J. Burgess (۶۲) ؛ برطانوی دور
: Peter Auber (۶۳)؛ ۱۹۱۳ء ایڈنبرا ،Modern India
،Rise and Progress of the British Power in India
History : Edward Thornton (۶۴)؛ ۱۸۳۷ء جلد ۲
؛۱۸۴۱ء جلد ۶ ،of the British Empire in India
Rise and Ful- : G. T. Garrat و E. Thompson (۶۵)
:H. Beveridge (۶۶)؛ filment of British Rule in India
A Comprehensive History of India—Civil, Military
: لارڈ کرزن (۶۷)؛ ۱۸۶۲ء جلد ۳ ،and Social
(۶۸)؛ ۱۹۲۵ء جلد ۲ ،British Government in India
Early Annals of the English in : C. R. Wilson
(۶۹)؛ ۱۸۹۵ء - ۱۹۱۷ء کلکتہ جلد ۳ ،Bengal
(۸۰)؛ Aliverdi and His Times : K. K. Datt
Economic History of India under Early : R. C. Datt
British Policy : A. R. Mallick (۸۱)؛ British Empire
: R. Burton (۸۲)؛ and the Muslims in Bengal
(۸۳)؛ ۱۸۵۱ء جلد ۲ ،Sindh, the unhappy valley
لاہور ،History of the Sikhs : J. D. Cunningham
The Sikhs and the : Innes و Gough (۸۴)؛ ۱۹۱۸ء
Sikh Wars : the rise, conquest and annexation of
؛ William Barton (۸۵)؛ ۱۸۹۶ء ،the Punjab States
؛۱۹۳۹ء لنڈن ،India's North-West Frontier
History of the Sepoy War : Malleson و Kay (۸۶)
: سید محمود (۸۷)؛ ۱۸۸۰ء تا ۱۸۶۴ء جلد ۸ ،in India
،History of English Education in India 1781-1893
Indian : پی ۔ مکرجی (۸۸)؛ ۱۸۹۵ء علیگڑھ
؛۱۹۱۸ء کلکتہ جلد ۲ ،Constitutional Documents
Outlines of Indian : W. A. J. Archibold (۸۹)
(۹۰)؛ ۱۹۲۶ء لنڈن ،Constitutional History
The Constitution of : Lord Meston و C. Ilbert

و Maurice Gwyer (۹۱)؛ ۱۹۳۹ء لنڈن ،India
Speeches and Documents on the : A Appadorai
بمبئی جلد ۲ ،Indian Constitution, 1921-1947
Political India, 1832- : J. Cumming (۹۲)؛ ۱۹۵۷ء
Indian Politics ; چیٹ منی (۹۳)؛ ۱۹۳۲ء لنڈن ،1932
A History of : V. Lovett (۹۴) ؛since the Mutiny
لنڈن ،the Indian Nationalist Movement, 1900-1910
The Indian Problem : R. Coupland (۹۵)؛ ۱۹۲۲ء
Indian ; وہی مصنف (۹۶)؛ ۱۹۴۳ء لنڈن ،1833-1938
؛ وہی مصنف (۹۷)؛ ۱۹۴۳ء لنڈن ،Politics 1936-1942
وہی (۹۸)؛ ۱۹۴۲ء جولائی ،The Cripps Mission
(۹۹)؛ ۱۹۴۵ء لنڈن ،India : A Restatement ؛ مصنف
،India, its administration : John Strachey
،India in Transition : آغا خان (۱۰۰)؛ ۱۹۱۱ء
The : J. Ramsey Macdonald (۱۰۱)؛ ۱۹۱۸ء
؛ وہی مصنف (۱۰۲)؛ ۱۹۱۰ء ،Awakening of India
(۱۰۳)؛ ۱۹۲۰ء ،The Government of India
Years of Destiny : India 1926- : John Coatman
The : R. Craddock (۱۰۴)؛ ۱۹۳۲ء لنڈن ،1932
Mirza B. M. (۱۰۵)؛ ۱۹۲۹ء ،Dilemma in India
،The Nehru Report and Muslim Rights : Ahmad
The Political Future : لاجپت رائے (۱۰۶)؛ ۱۹۲۰ء
The New : لارڈ زٹلینڈ (۱۰۷)؛ ۱۹۳۰ء ،of India
Cabinet Mission : محمد اشرف (۱۰۸)؛ ۱۹۴۶ء ،India
The ؛ سبھاش چندر بوس (۱۰۹)؛ ۱۹۴۶ء لاہور ،and After
؛ پٹابھی سیتا رامیا (۱۱۰)؛ ۱۹۳۸ء ،Indian Struggle
(۱۱۱)؛ History of Indian National Congress
؛The History of Hindu Mahasabha ؛ اندر پرکاش
؛۱۹۳۶ء ،An Autobiography ؛ جواہر لال نہرو (۱۱۲)
؛۱۹۴۶ء ،Discovery of India ؛ وہی مصنف (۱۱۳)
My Experiments with : ایم ۔ کے ۔ گاندھی (۱۱۴)
،India Today ؛ پام دت (۱۱۵)؛ ۱۹۴۰ء ،Truth

۱۹۵۷ء؛ (۱۱۶) مجمدار : *History of Freedom*
Movement in India، ۳ جلد، کلکتہ ۱۹۶۲ - ۱۹۶۳ء؛
(۱۱۷) R. G. Cassey : *An Australian in India*،
۱۹۵۷ء؛ (۱۱۸) Sir F. Tucker : *While Memory*
Serves، لنڈن ۱۹۵۰ء؛ (۱۱۹) لارڈ ماؤنٹ بیٹن :
Time Only to Look Forward، لنڈن ۱۹۴۹ء؛
(۱۲۰) Alan Campbell Johnson : *Mission with*
Mountbatten، لنڈن ۱۹۵۲ء؛ (۱۲۱) L. Mosley :
The Last Days of the British Raj، نیویارک ۱۹۶۲ء؛
(۱۲۲) E. W. R. Dumby : *The Transfer of Power*
in India، لنڈن ۱۹۵۴ء؛ (۱۲۳) وی ۔ پی ۔ مینن :
The Story of the Integration of the Indian States،
نیویارک ۱۹۵۶ء؛ (۱۲۴) وہی مصنف : *The Transfer*
of Power in India، کلکتہ ۱۹۵۷ء؛ (۱۲۵) P. Moon :
Divide and Quit، برکلے ۱۹۵۷ء؛ (۱۲۶)
ابوالکلام آزاد : *India Wins Freedom*، کلکتہ ۱۹۵۹ء؛
(۱۲۷) عبدالوحید خان : *India Wins Freedom : The*
Other Side، کراچی ۱۹۶۱ء؛ (۱۲۸) H. V.
Hodson : *Great Divide*، لنڈن ۱۹۶۹ء؛ (۱۲۹)
C. H. Philips : *The Evolution of India and Pakistan*
1858-1947، منتخب دستاویزات، لنڈن ۱۹۶۲ء۔

تحریک پاکستان اور اس کا تاریخی پس منظر،
قیام پاکستان اور اس کے بعد : (۱۳۰) W. W. Hunter :
Indian Mussalmans، لنڈن ۱۸۷۱ء؛ (۱۳۱) خالدہ
ادیب خانم : *Inside India*، ۱۹۳۷ء؛ (۱۳۲) رام گوپال :
Indian Muslims—A Political Study، بمبئی ۱۹۵۹ء؛
(۱۳۳) C. Smith : *Modern Islam in India*؛ (۱۳۴)
کے ۔ کے ۔ عزیز : *Britain and Muslim India*، لنڈن
۱۹۶۳ء؛ (۱۳۵) عبدالحمید : *Muslim Separatism in*
India, a brief survey, 1858-1947، لاہور ۱۹۶۷ء؛
(۱۳۶) محمد نعمان : *Muslim India : Rise and Growth*
of All India Muslim League، الہ آباد ۱۹۴۲ء؛ (۱۳۷)
عبدالوحید خان : *History of the Muslim League*؛ (۱۳۸)
وہی مصنف : *Presidential Addresses of All India*
Muslim League، مطبوعہ دہلی؛ (۱۳۹) وہی مصنف :
Resolutions of All India Muslim League, from
1936 to October 1946، مطبوعہ دہلی؛ (۱۴۰) اے ۔ بی ۔
راجپوت : *Muslim League—Yesterday and Today*،
لاہور ۱۹۴۸ء؛ (۱۴۱) پاکستان ہسٹری بورڈ : *History of*
the Freedom Movement، کراچی ۱۹۵۷ - ۱۹۶۳ء؛
(۱۴۲) فضل الحق : *Muslim Suffering under the*
Congress Rule، کلکتہ ۱۹۳۹ء؛ (۱۴۳) آر ۔ ایم ۔
اگروال : *The Hindu Muslim Riots*، لکھنؤ ۱۹۴۳ء؛
(۱۴۴) راجندر پرشاد : *India Divided*؛ (۱۴۵)
سی ۔ راجگوپال اچاریہ : *The Way Out*، لاہور ۱۹۴۳ء؛
(۱۴۶) ایم ۔ اے ۔ سوتر : *Whys of the Great Indian*
Conflict، لاہور ۱۹۴۷ء؛ (۱۴۷) سید عبدالعزیز :
Reflections on Other Tragedy، دہلی ۱۹۴۷ء؛ (۱۴۸)
میر لائق علی : *Tragedy of Hyderabad*، کراچی ۱۹۶۲ء؛
نیز دیکھیے :

(۱۴۹) چودھری رحمت علی : *Now or Never*،
کیمبرج ۱۹۳۳ء؛ (۱۵۰) وہی مصنف : *The Millat and*
the Menace of Indianism، کیمبرج ۱۹۴۰ء؛ (۱۵۱)
وہی مصنف : *Pakistan....*، لنڈن ۱۹۴۷ء؛ (۱۵۲)
سید عبداللطیف : *The Cultural Problem of India*، بمبئی
۱۹۳۸ء؛ (۱۵۳) وہی مصنف : *The Muslim Problem*
in India، بمبئی ۱۹۳۹ء؛ (۱۵۴) سکندر حیات خان :
Outlines of a Scheme of Indian Federation، لاہور
۱۹۳۹ء؛ (۱۵۵) آغا خان : *The Memoirs of*
Aga Khan، لنڈن ۱۹۵۴ء؛ (۱۵۶) مولانا محمد علی :
My Life—a fragment، طبع افضل اقبال؛ (۱۵۷) وہی
مصنف : *Select Writings and Speeches*، طبع افضل اقبال،
لاہور ۱۹۶۳ء؛ (۱۵۸) علامہ اقبال : *Presidential*
Address, Allahabad Session, 1930، دہلی ۱۹۴۰ء؛
(۱۵۹) وہی مصنف : *Speeches and Statements of*

Iqbal، شیخ Shamloo، لاہور ۱۹۴۸ء؛ (۱۶۰) وہی مصنف: Letters to Jinnah، لاہور ۱۹۵۶ء؛ (۱۶۱) سروجنی نائیڈو: Mohammad Ali Jinnah: An Ambassador of Unity، مدراس ۱۹۱۸ء؛ (۱۶۲) Correspondence between Mr. Gandhi and Mr. Jinnah, Pandit Nehru and Mr. Jinnah and Mr. S. Bose and Mr. Jinnah، مطبوعہ مسلم لیگ، دہلی؛ (۱۶۳) جمیل الدین احمد: Speeches and Writings of Mr. Jinnah، ۲ جلد، لاہور ۱۹۶۰ - ۱۹۶۴ء؛ (۱۶۴) سید شریف الدین پیرزادہ: Quaid-e-Azam Jinnah's Correspondence، کراچی ۱۹۶۶ء؛ (۱۶۵) رفیق افضل: Selected Speeches and Statements of the Quaid-e-Azam: 1911-1948، لاہور ۱۹۶۶ء؛ (۱۶۶) Thus spoke the father: a code of political conduct as prescribed by the Quaid-e-Azam، مطبوعہ شعبۂ نظم و مطبوعات، کراچی ۱۹۶۶ء؛ (۱۶۷) Some Recent Speeches and Writings of Mr. Jinnah، ۲ جلد، مطبوعہ لاہور؛ (۱۶۸) عبدالرؤف: Meet Mr. Jinnah، لاہور ۱۹۴۵ء؛ (۱۶۹) مطلوب حسن سید: Mohammad Ali Jinnah: A Political Study، لاہور ۱۹۵۳ء؛ (۱۷۰) Hector Bolitho: Jinnah, Creator of Pakistan، لنڈن ۱۹۵۴ء؛ (۱۷۱) جمیل الدین احمد: Quaid-e-Azam as seen by his contemporaries، لاہور ۱۹۶۶ء؛ (۱۷۲) مرزا ابوالحسن اصفہانی: Quaid-e-Azam Jinnah, as I knew him، بار دوم، کراچی ۱۹۶۷ء؛ (۱۷۳) جی - الانہ: Quaid-e-Azam Jinnah — The Story of A Nation، لاہور ۱۹۶۷ء؛ نیز دیکھیے: (۱۷۴) چودھری افضل حق: Pakistan and Untouchability، لاہور ۱۹۴۱ء؛ (۱۷۵) M.R.T.: Nationalism in Conflict in India، بمبئی ۱۹۴۳ء؛ (۱۷۶) وہی مصنف: Pakistan and Muslim India، دہلی ۱۹۴۴ء؛ (۱۷۷) Beverley Nicholes: Verdict on India؛ (۱۷۸) El-Hamza: Pakistan: A Nation، لاہور ۱۹۴۴ء؛ (۱۷۹) شوکت اللہ انصاری: Pakistan — The Problem of India، لاہور ۱۹۴۴ء؛ (۱۸۰) فضل کریم خان درانی: The Meaning of Pakistan، لاہور ۱۹۴۴ء؛ (۱۸۱) جمیل الدین احمد: Some Aspects of Pakistan، لاہور ۱۹۴۵ء؛ (۱۸۲) زیڈ - اے - سلہری: The Road to Peace and Pakistan، لنڈن ۱۹۴۵ء؛ (۱۸۳) سعید الدین احمد: The Communal Pattern of India، لاہور ۱۹۴۵ء؛ (۱۸۴) بی - آر - امبیڈکر: Pakistan or the Partition of India، بمبئی ۱۹۴۶ء؛ (۱۸۵) Patrick Lacy: Fascist India، لنڈن ۱۹۴۶ء؛ (۱۸۶) فرید ایس - جعفری: The Spirit of Pakistan، کراچی ۱۹۵۰ء؛ (۱۸۷) اے - ایچ - البیرونی: Makers of Pakistan and Modern India، لاہور ۱۹۵۰ء؛ (۱۸۸) Richard Symond: The Making of Pakistan، لنڈن ۱۹۵۰ء؛ (۱۸۹) حسن محمود: A Nation Is Born، لاہور ۱۹۵۸ء؛ (۱۹۰) چودھری خلیق الزمان: Pathway to Pakistan، لاہور ۱۹۶۱ء؛ (۱۹۱) حفیظ ملک: Muslim Nationalism in India and Pakistan، واشنگٹن ۱۹۶۳ء؛ (۱۹۲) جمیل الدین احمد: Muslim Political Movement (Early Phase)، کراچی ۱۹۶۳ء؛ (۱۹۳) وہی مصنف: Final Phase of Struggle for Pakistan، کراچی ۱۹۶۴ء؛ (۱۹۴) عبدالعزیز: Discovery of Pakistan، لاہور ۱۹۶۳ء؛ (۱۹۵) وحیدالزمان: Towards Pakistan، لاہور ۱۹۶۴ء؛ (۱۹۶) اشتیاق حسین قریشی: The Struggle for Pakistan، کراچی ۱۹۶۵ء؛ (۱۹۷) چودھری محمد علی: The Emergence of Pakistan، لنڈن ۱۹۶۷ء؛ (۱۹۸) کے - کے - عزیز: The Making of Pakistan، لنڈن ۱۹۶۷ء؛ (۱۹۹) جی - الانہ: Pakistan Movement: Historic Documents، کراچی ۱۹۶۷ء؛ نیز دیکھیے: (۲۰۰) اشتیاق حسین قریشی: Pakistan, An

Islamic Democracy، کراچی ۱۹۵۱ء؛ (۲۰۱)
لیاقت علی خان : Pakistan : Heart of Asia، کیمبرج
(میسا چوسٹس) ۱۹۵۱ء؛ (۲۰۲) Speeches and
Statements of Quaid-e-Millat Liaquat Ali Khan
1941-1951، طبع رفیق افضل، لاہور ۱۹۶۷ء؛ (۲۰۳)
Pakistan as an Islamic State : W.C. Smith، لاہور
۱۹۵۱ء؛ (۲۰۴) Pakistan : Politi : Keith B. Callard
cal Study، لنڈن ۱۹۵۷ء؛ (۲۰۵) وہی مصنف :
Political Forces in Pakistan 1947-59، نیویارک
۱۹۵۹ء؛ (۲۰۶) اسلم صدیقی : Pakistan Seeks
Security، لاہور ۱۹۶۰ء؛ (۲۰۷) کے - سرور حسن :
Pakistan and the United Nations، نیویارک ۱۹۶۰ء؛
(۲۰۸) محمد ایوب خان : Towards a New Pakistan،
کراچی ۱۹۶۱ء؛ (۲۰۹) وہی مصنف : Speeches since
October 1958، مطبوعہ کراچی؛ (۲۱۰) وہی مصنف :
Friends Not Masters، لاہور ۱۹۶۷ء؛ (۲۱۱)
عزیز بیگ : Before and After Revolution، کراچی
۱۹۶۲ء؛ (۲۱۲) سید شریف الدین پیرزادہ : Evolution of
Pakistan، لاہور ۱۹۶۳ء؛ (۲۱۳) جی - ڈبلیو - چودھری :
Democracy in Pakistan، ڈھاکہ ۱۹۶۳ء؛ (۲۱۴)
Religion and Politics in : Leonard Binder،
Pakistan، برکلے و لاس اینجلز ۱۹۶۳ء؛ (۲۱۵)
Pakistan : the Consolidation of a : W. A. Wilcox
Nation، نیو یارک و لنڈن ۱۹۶۳ء؛ (۲۱۶) Pakistan,
its people, its society, its culture، طبع D.N. Wilber،
نیوہیون ۱۹۶۴ء؛ (۲۱۷) Political : Karl Von Vorys
Development in Pakistan، پرنسٹن ۱۹۶۴ء؛ (۲۱۸)
Pakistan, Old Country/New Nation : Ian Stephens،
لنڈن ۱۹۶۳ء؛ (۲۱۹) سید عابد حسین : The Destiny of
Indian Muslims، لنڈن ۱۹۶۵ء؛ (۲۲۰) Lord Birdwood :
Two Nations and Kashmir؛ (۲۲۱) شیخ محمد عبداللہ :
Kashmir, India and Pakistan، در Foreign Affairs،
اپریل ۱۹۶۵ء؛ (۲۲۲) Crisis in : Alstair Lamb
Kashmir 1947-1966، لنڈن ۱۹۶۶ء؛ (۲۲۳) Pakistan
Repels Aggression، مطبوعۂ حکومت پاکستان، راولپنڈی
۱۹۶۶؛ (۲۲۴) Pakistan—Documents on the
Foreign Relations of Pakistan، کراچی ۱۹۶۶ء؛ (۲۲۵)
منظور الدین احمد : Pakistan, the Emerging Islamic
State، کراچی ۱۹۶۶ء؛ (۲۲۶) مشتاق احمد :
Government and Politics in Pakistan؛ (۲۲۷)
خالد بن سعید : Pakistan a Formative Phase، کراچی
۱۹۶۰ء؛ (۲۲۸) وہی مصنف : The Political System
of Pakistan، بوسٹن ۱۹۶۷ء۔

عہد اسلامی کے لیے ہم عصر مؤرخین کی مندرجۂ ذیل کتابوں کا مطالعہ بھی مفید ہوگا : (۲۲۹) ابن خُرداذبہ : کتاب المسالک، طبع ڈخویہ، لائڈن ۱۸۸۹ء؛ (۲۳۰) المسعودی : مروج الذہب، پیرس ۱۸۶۱-۱۸۷۷ء؛ (۲۳۱) البلاذری : فتوح البلدان، لائڈن ۱۸۶۶ء؛ (۲۳۲) ابن بطوطہ : تحفۃ النظار، پیرس ۱۸۵۳-۱۸۵۸ء؛ (۲۳۳) القلقشندی : صبح الاعشٰی، قاہرہ ۱۹۱۳-۱۹۱۹ء؛ (۲۳۴) العمری : مسالک الابصار، مصر ۱۹۲۴ء؛ (۲۳۵) حمد اللہ مستوفی : تاریخ گزیدہ، طبع براؤن؛ (۲۳۶) میر خواند : روضۃ الصفا، بمبئی ۱۸۴۹ء؛ (۲۳۷) خواندامیر : حبیب السیر، بمبئی ۱۸۵۷ء؛ (۲۳۸) ابن عرب شاہ : عجائب المقدور، کلکتہ ۱۸۱۸ء؛ (۲۳۹) الکوفی : چچ نامہ؛ (۲۴۰) میر معصوم بھکری : تاریخ معصومی، بمبئی ۱۹۳۸ء؛ (۲۴۱) میر علی شیر قانع تتوی : تحفۃ الکرام؛ (۲۴۲) العتبی : کتاب الیمینی؛ (۲۴۳) ابو الفضل بیہقی : تاریخ مسعودی؛ (۲۴۴) منہاج سراج : طبقات ناصری، لاہور ۱۹۵۴ء؛ (۲۴۵) امیر خسرو : خزائن الفتوح؛ (۲۴۶) السہرندی : تاریخ مبارک شاہی، کلکتہ ۱۹۳۱ء؛ (۲۴۷) عصامی : فتوح السلاطین، مدراس ۱۹۴۸ء؛ (۲۴۸) شمس سراج عفیف : تاریخ فیروز شاہی،

(۲۴۹) یزدی : ظفرنامہ، مطبوعۂ کلکتہ؛ (۲۵۰)
عبدالرزاق سمرقندی : مطلع سعدین، طبع محمد شفیع، لاہور
۱۹۴۱ء؛ (۲۵۱) غلام حسین سلیم : ریاض السلاطین،
بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، ۱۸۹۰ء؛ (۲۵۲) حسن النظامی :
تاج المآثر؛ (۲۵۳) احمد یادگار : تاریخ سلاطین
افاغنہ؛ (۲۵۴) بابرنامہ (= توزک بابری)، طبع Beveridge،
لائڈن و لنڈن ۱۹۰۵ء و انگریزی ترجمہ، لنڈن ۱۹۲۱ء؛
(۲۵۵) میرزا حیدر دوغلات : تاریخ رشیدی، انگریزی
ترجمہ از ڈینی سن راس، لنڈن ۱۸۹۵ء؛ (۲۵۶) گلبدن بیگم :
ہمایون نامہ، لنڈن ۱۹۰۲ء؛ (۲۵۷) جوہر آفتابچی :
تذکرۃ الواقعات؛ (۲۵۸) نظام الدین احمد : طبقات اکبری،
کلکتہ ۱۹۳۱ء؛ (۲۵۹) ابوالفضل : اکبر نامہ، لکھنؤ
۱۸۷۷ء؛ (۲۶۰) وہی مصنف : آئین اکبری، لکھنؤ
۱۸۶۹ء؛ (۲۶۱) بداؤنی : منتخب التواریخ، لکھنؤ
۱۸۸۳ء؛ (۲۶۲) محمد عبدالباقی : مآثر رحیمی؛ (۲۶۳)
توزک جہانگیری، طبع سید احمد خان، غازی پور
۱۸۶۳ء؛ (۲۶۴) معتمد خان : اقبال نامۂ جہانگیری،
کلکتہ ۱۸۶۵ء؛ (۲۶۵) عبدالحمید لاہوری : بادشاہ نامہ،
کلکتہ ۱۸۶۷ء؛ (۲۶۶) محمد صالح کنبوہ : عمل صالح؛
(۲۶۷) سجان راے : خلاصۃ التواریخ، دہلی ۱۹۱۸ء؛
(۲۶۸) محمد ساقی مستعد خان : مآثر عالمگیری، کلکتہ
۱۸۷۱ء؛ (۲۶۹) عاقل خان رازی : ظفر نامۂ عالمگیری؛
(۲۷۰) مرزا محمد کاظم : عالمگیر نامہ، کلکتہ ۱۸۶۸ء؛
(۲۷۱) خافی خان : منتخب اللباب، کلکتہ ۱۸۶۹-
۱۸۷۳ء؛ (۲۷۲) شاہ نواز خان : مآثر الامراء،
انگریزی ترجمہ از Beveridge؛ (۲۷۳) نعمت خان عالی :
بہادر شاہ نامہ؛ (۲۷۴) وقائع نعمت خان عالی،
کانپور ۱۸۷۰ء؛ (۲۷۵) فرشتہ : تاریخ فرشتہ، مطبع
نولکشور، لکھنؤ؛ (۲۷۶) آزاد بلگرامی : خزانۂ عامرہ؛
(۲۷۷) اسکندر منشی : تاریخ عالم آرای عباسی، تہران
۱۸۹۶ء؛ (۲۷۸) غلام حسین طباطبائی : سیر المتأخرین؛
(۲۷۹) سید احمد خان : آثار الصنادید، بار دوم ۱۸۵۳ء؛
(۲۸۰) وہی مصنف : اسباب بغاوت ہند، ۱۸۵۹ء؛

نیز دیکھیے :

(۲۸۱) ذکاءاللہ : تاریخ ہندوستان، علی گڑھ
۱۹۱۵ء؛ (۲۸۲) انتظام اللہ شہابی : تاریخ ملت،
ج ۱۰ و ۱۱، دہلی ۱۹۵۵ - ۱۹۵۷ء؛ (۲۸۳)
ریاست علی ندوی : عہد اسلامی کا ہندوستان، پٹنہ
۱۹۵۰ء؛ (۲۸۴) باری علیگ : کمپنی کی حکومت،
مطبوعۂ لاہور؛ (۲۸۵) سر سید کے لیکچروں کا مجموعہ،
لاہور ۱۸۹۰ء؛ (۲۸۶) الطاف حسین حالی : حیات جاوید،
لاہور ۱۹۵۷ء؛ (۲۸۷) مناظر احسن گیلانی :
سوانح قاسمی، دیوبند ۱۳۷۳ھ؛ (۲۸۸) محمد امین
زبیری : تذکرۂ وقار، مطبوعۂ علی گڑھ؛ (۲۸۹) وہی
مصنف : محسن الملک، مطبوعۂ علی گڑھ؛ (۲۹۰)
رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی، دہلی ۱۹۳۲ء؛
(۲۹۱) وہی مصنف : مقالات محمد علی، حیدر آباد دکن
۱۹۴۳ء؛ (۲۹۲) عبدالماجد دریابادی :
محمد علی کی ڈائری، ۱۹۵۲ء؛ (۲۹۳) محمد میاں :
علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ۲ جلد،
مراد آباد ۱۹۳۶-۱۹۳۸ء؛ (۲۹۴) طفیل احمد منگلوری :
مسلمانوں کا روشن مستقبل، بدایوں ۱۹۳۹ء؛ (۲۹۵)
محمد مرزا دہلوی : مسلمانان ہند کی حیات سیاسی، دہلی
۱۹۳۰ء؛ (۲۹۶) حمید انور : پاکستان (پس منظر و
پیش منظر)، لاہور ۱۹۳۹ء؛ (۲۹۷) ابوالاعلی مودودی :
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، ۳ جلد، مطبوعۂ لاہور؛
(۲۹۸) قائد اعظم : تصورات پاکستان، ترجمۂ شاہین فاروقی،
حیدر آباد دکن ۱۹۳۶ء؛ (۲۹۹) عبدالقدوس ہاشمی :
تشریحات پاکستان، حیدر آباد دکن ۱۹۳۶ء؛
(۳۰۰) سکھ منصوبہ، لاہور ۱۹۴۷ء؛ (۳۰۱)
راشٹریہ سیوک سنگھ پنجاب میں، لاہور ۱۹۴۷ء؛ (۳۰۲)
محمد اسمٰعیل اے۔ بیگ : جوناگڑھ، حیدر آباد (سندھ)
۱۹۶۰ء؛ (۳۰۳) عبدالوحید خان : تأثرات و تصورات، لاہور
۱۹۶۰ء؛ (۳۰۴) سید حسن ریاض : پاکستان ناگزیر تھا،

کراچی ۱۹۶۷ء.

(ج) ترقیات: (۲۰۵) *World Muslim Gazetteer*، طبع مؤتمر عالم اسلامی، کراچی ۱۹۶۵ء؛ (۲۰۶) *World Almanac 1965*؛ (۲۰۷) *Whitqkar Almanac 1968*؛ (۲۰۸) *The Statesman's Year Book 1968-1969*؛ (۲۰۹) *Twenty Years of Pakistan, 1947-1967*، مطبوعۂ پاکستان پبلی کیشنز، کراچی؛ (۲۱۰) *Pakistan Year Book, 1969*، کراچی ۱۹۶۹ء (پاکستان کے مختلف شعبوں میں ترقی کے بارے میں مفصل مآخذ کے لیے دیکھیے ص ۵۸۳ تا ۵۱۰).

(ادارہ)

پالاھَنگ: (= پالہنگ؛ ف)، لفظی معنی ڈوری، رسا، کمند، طناب، وہ ڈوری جو درویشوں کے گلے میں پڑی ہوتی ہے اور جس کے سرے پر عقیق کا ایک کئی نوکوں والا ستارہ لٹکا ہوتا ہے۔ اس ستارے کو ''تسلیم طاش'' کہتے ہیں اور یہ نوجوان درویشوں کو تکمیلِ سلوک کر لینے پر دیا جاتا ہے۔ بعض درویش، خصوصاً بکتاشی (رَکّ بہ بکتاشیہ)، اس ڈوری میں بہت سے زیتونی شکل کے سفیدی مائل خاکستری رنگ کے شفاف پتھر پرو لیتے ہیں۔ یہ پتھر عراق میں ملتے ہیں اور دُرِ نجف (= نجف کے موتی) کہلاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ یشب (Jasper، ترکی: یشم) جس سے تسلیم طاش بنتے ہیں حاجی بکتاش کے مقبرے کے آس پاس پایا جاتا ہے۔ [لغوی معنی: کوتل گھوڑے کو کھینچنے والی رسی؛ نیز باعث، تعلق، سبب، رشتہ، دیکھیے فرہنگ آنند راج، بذیل مادہ].

مآخذ: (۱) Th. Ippen: *Skutari und die nordalbanische Küstenebene*، سراجیوو ۱۹۰۷ء، ص ۷۸ (کرویہ Kruja (البانیا) کے بکتاشی کے ذکر میں)؛ (۲) John Porter Brown: *The Dervishes or Oriental Spiritualism*، بار دوم، طبع H. A. Rose، لندن ۱۹۲۷ء، ص ۲۱۴.

(FRANZ BABINGER)

پالمائرا: (Palmyra)، تَدمُر، اب تَدمُر [بضمتین]، قدیم تدمر۔ یونانی اس کو پالمیرا کہتے ہیں (غالباً کسی زیادہ پرانے نام کی ایک عوامی اشتقاق کے ذریعے تصحیف؛ قب Hommel، در *ZDMG*، ۴۴: ۵۴۷؛ M. Hartmann، در *ZDPV*، ۲۰/۲: ۱۲۸ ببعد)، دمشق سے شمال مشرقی جانب صحرائے عرب کے ایک ایسے نخلستان میں واقع ہے جو دو چشموں سے سیراب ہوتا ہے۔ پانی گندھک آمیز ہے، لیکن جب وہ تہ میں بیٹھ جائے تو پینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ آب و ہوا ناموافق ہے، کیونکہ دن اور رات میں درجۂ حرارت بہت مختلف ہو جاتا ہے۔ گرمی میں ناقابلِ برداشت حد تک گرمی اور جاڑے میں بعض اوقات برف پڑتی ہے۔ آب و ہوا کے اس نقص کی تلافی جائے وقوع سے ہو جاتی ہے، جس نے تدمر کو ان کاروانی راستوں میں ایک اہم مقامِ اتصال بنا دیا جو مشرق سے مغرب، بالخصوص فرات سے دمشق کو جاتے تھے۔ اس قدرتی قیاس کی کہ یہ مقام پہلے سے اہم تھا اور بہت ہی قدیم زمانے میں آباد ہوا ہوگا اب بارھویں صدی ق۔ م کے تجلات پلسر Tiglat-Pileser اول کے متعدد کتبات سے تصدیق ہو گئی ہے کیونکہ ''سرزمینِ اَموُرّو Amurru کا شہرِ تدمر''، جس کا آشوری بادشاہ تذکرہ کر رہا ہے، یہاں کے سوا مشکل سے کہیں اور ہو سکتا تھا (R. Meissner، در *OLZ*، ۱۹۲۳ء، ص ۱۷۵؛ Dhorme، در *RB*، ۱۹۲۴ء، ص ۱۰۶)۔ اس کتبے کے سوا اس کا نام نہیں ملتا ہے تو سن عیسوی کے آغاز سے کچھ ہی پہلے اور عہدنامۂ عتیق میں اور وہ بھی ایک عجیب ملتبس صورت میں، یعنی یوں کہ تورات

کے مسلّمہ متن (الملوک الاول، ۹ : ۱۸) میں کہا گیا ہے کہ سلیمانؑ نے "تمر" (جنوبی فلسطین میں) اور شہروں کے ساتھ آباد کیا، لیکن الایام الثانی، ۸ : ۴ میں اس کی جگہ تدمر Tadmor تحریر کرتا ہے، جس کا تتبع دوسروں کے علاوہ Josephus : *Archaeology*، ۸ : ۶، ص ۱ میں بھی کیا گیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مؤخرالذکر کے زمانے میں یہ شہر ضرور کچھ شہرت اور وسعت رکھتا تھا، نیز یہ کہ بعد کی یہ مشہور عام روایت پہلے سے موجود تھی کہ حضرت سلیمانؑ نے یہ عجیب شہر آباد کیا۔ یہ قصّہ ایک زمانے کے بعد اہل عرب کو معلوم ہوا اور حضرت سلیمانؑ کے جو مفصّل خیالی افسانے بن گئے تھے، انہیں کی ہم آہنگی میں عربوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ اس شہر کی تعمیر میں جنات نے بادشاہ (سلیمانؑ) کی مدد کی تھی (قبّ النابغۃ، [الذّبیانی]، شعر ۲۲ ببعد؛ البَکْری، طبع وسٹنفلٹ، ص ۳۱۰ اور مذکورۂ ذیل متعدد عرب جغرافیہ نویس؛ بقول ابن الاثیر، طبع ٹورن برگ، ۱ : ۱۶۶، ملکۂ بلقیس نے [حضرت] سلیمانؑ سے تدمر میں ملاقات کی تھی اور وہیں دفن ہوئی)۔

تدمر کا سلطنت روم میں شمول اس کے لیے سب سے بڑی اہمیت کا باعث ہوا۔ شہر میں پہلے ہی سے خوب تجارت ہوتی تھی؛ اب اس میں بے حد ترقی ہوئی اور سنسان صحرا سے گھری ہوئی اس بستی میں روپے کی ریل پیل ہونے لگی (ان سڑکوں کے لیے جو پالمائرا کو بیرونی دنیا سے ملاتی تھیں دیکھیے Dussaud : *Topographie historique de la Syrie antique et médiévale*، ۱۹۲۷ء، ص ۲۴۸ تا ۲۷۰)۔ اسی زمانے میں پلیناس (Pliny) نے اس کا مختصر مگر صحیح حال تحریر کیا ہے (*Hist. Nat.*، ۵ : ۲۰)۔ یہاں کے سوداگر ایسے ہشیار تھے کہ وہ روم اور پارتھیا کی عداوت سے فائدہ حاصل کرنا جانتے تھے اور ان حالات سے جو ہدریان Hadrian کی اس عقل مندانہ حکمت عملی سے پیدا ہو گئے کہ اس نے آشوریا اور عراق کو پارتھیا والوں کے حوالے کر کے امن کے ایک طویل دور کا آغاز کیا، جس سے تدمر کی خوش حالی میں بہت مدد ملی۔ ۱۳۶ء کا محصول نامہ، جو آرامی اور یونانی میں لکھا ہوا ہے، جمہوریۂ تدمر کی اس عہد کی کاروباری زندگی کی ایک بہت واضح تصویر پیش کرتا ہے۔ دوسری طرف سورج کا مندر اور متعدد دوسری نفیس عمارتوں کے شاندار کھنڈر ظاہر کرتے ہیں کہ یونانی اثر سے یہاں کے باشندوں کا ذوقِ فنونِ لطیفہ کس قدر ترقی کر گیا تھا۔ تیسری صدی میں بعض اور ایسے مواقع پیدا ہوے کہ کچھ دن تک اہلِ تدمر مشرق میں ایک نئی سلطنت کا خواب دیکھنے لگے، جس کا دارالحکومت وہ تدمر کو بنانا چاہتے تھے۔ اسی صدی کے آغاز میں ایران میں ساسانیوں کا خاندان ابھرا، جس نے رومیوں سے [ایران کی] دیرینہ عداوت تازہ کر دی۔ اہلِ تدمر کو پھر اپنے سیاسی تدبر سے کام لینے کا موقع ہاتھ آیا، اور ان کے امیر اذینہ (Odenathus) ثانی نے پہلے شاپور (۲۴۱ تا ۲۷۲ء) کے عہد میں ایرانیوں سے مل جانے کی خواہش کی، لیکن جب اس کی پیشکش مسترد کر دی گئی تو وہ ایشیاے کوچک کے رومی سپہ سالار بالسٹا Ballista سے مل گیا اور پسپا ہونے والے ایرانیوں کو بھاری شکست دی۔ قیصر جالینوس Gallienus کے عہد میں وہ روما کے تمام مشرقی مقبوضات کا حقیقی فرمانروا ہو گیا اور قیصر نے اس کو "اغسطس" Augustus کا خطاب عطا کیا۔ جب ۲۶۶-۲۶۷ء میں وہ مار ڈالا گیا، تو اس کا منصب اس کے بیٹے وہبلّاتوس Vabailathus کو ملا، لیکن اصلی طاقت مقتول امیر کی بیوہ زنوبیا (زینب) کے ہاتھوں میں

تھی جو بہت ہی قابل خاتون گزری ہے۔ اس نے اپنی سلطنت کو خاص طور پر مصر فتح کر کے وسیع کیا۔ یہ سب قیصر اورلیان Aurelian کی منظوری سے ہوا تھا، لیکن تھوڑے ہی دن میں تدمر نے رومیوں کے خلاف بغاوت کر دی اور ۲۷۰ء میں ایک جنگ ہوئی، جس میں زنوبیا نے شکست کھائی اور اس پر تدمر نے ہتیار ڈال دیے، لیکن جب اس نے دوبارہ بغاوت کی تو اورلیان Aurelian نے شہر کو مع اس کی نفیس عمارتوں کے مسمار کرا دیا۔ زنوبیا بھاگی، گرفتار ہوئی اور روم بھیجی گئی۔ اس ملکہ نے جو حسن اور ذہانت دونوں میں ممتاز تھی، اپنے معاصرین پر گہرا نقش چھوڑا اور اُس کی یاد عربوں میں ''الزبّاء'' کے نام سے بہت دن تک تازہ رہی، گو وہ ایسے خارق عادت افسانوں کی شکل میں رہی جن میں تاریخی حصّہ بہت ہی تھوڑا رہ گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے عرب بادشاہ جُذَیمة الأبرش [رَكَ بآں، نیز رَكَ به حِیرة] کو ورغلایا اور پھر اس کی شریانوں میں فصد دے کر اسے مار ڈالا۔ جذیمة کے بھانجے عَمرو بن عَدی نے چاہا تھا کہ خون کا انتقام لینے کا فرض ٹل جائے، لیکن عیار قُصَیر نے زور دے کر اسے انتقام پر آمادہ کر لیا۔ اور جب اُس نے ایک چال سے مکّار ملکہ کو اپنی گرفت میں لے لیا، تو ملکہ نے غیرت میں آ کر کہ عَمرو کے ہاتھ سے ماری نہ جائے زہر کھا لیا۔ یہ زہر ایک انگوٹھی میں تھا، جسے وہ اسی خیال سے ہمیشہ پہنے رہتی تھی۔

زنوبیا کے خاتمے کے ساتھ تدمُر کی عظمت بھی رخصت ہو گئی۔ شہر پناہ از سر نو تعمیر کر لی گئی، گو یہ سابقہ پیمانے پر نہ تھی۔ تجارت بھی، جو اس شہر کی وجہ معاش تھی، کم ہونا شروع ہو گئی۔ اسی زمانے میں عیسائیت نے اس شہر میں پھیلنا شروع کیا، [کئی] اسقفوں کا ذکر آتا ہے اور منجملہ اوروں کے قیصر جستینین Justinian نے بھی یہاں ایک کلیسا تعمیر کیا۔ تدمر رومی حکومت میں تقریباً ۲½ صدی تک رہا۔ اس حکومت کا خاتمہ عرب فتوحات نے کیا۔ جب حضرت خالدؓ بن الولید اپنی مشہور مہم پر اس شہر میں پہنچے تو باشندوں نے اُن کے مقابل ہو کر مدافعت کا ارادہ کیا، لیکن پھر یہ خیال چھوڑ دیا اور اپنی خوشی سے اس شرط پر ہتیار ڈال دیے کہ ذمّیوں [رَكَ به ذِمّه] کے حقوق انھیں دیے جائیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے دوبارہ بغاوت کی، کیونکہ یزید نے دمشق کو فتح کرنے کے بعد دِحْیَہ کو ان کے مقابلے کے لیے بھیجا تھا، تب کہیں جا کر یہ علاقہ قطعی طور پر مطیع ہوا۔

انقلابات کے باعث اسے سابقہ خوش حالی کبھی حاصل نہ ہوئی۔ یہاں زیادہ تر بنو کلب کی آبادی تھی، اور یہ ان شہروں میں سے ایک تھا جو مروان ثانی سے منحرف ہو گئے تھے، جس نے اس پر فوج کشی کی، لیکن صلح صفائی کی صورت نکل آئی۔ تاہم بقول ابن الفقیہ [۲۹۰ھ/۹۰۳ء (تاریخ تدوین کتاب)] مروان نے شہر پناہ کا ایک حصّہ گروا دیا۔ مشہور ہے کہ اس نے شہر کے مکمل انہدام کا منصوبہ اس وقت ترک کیا جب وہاں ایک عورت کی لاش برآمد ہوئی، جو قیمتی کپڑے پہنے ہوئے تھی اور اُس کی پیشانی پر سونے کی ایک تختی تھی، جس پر یہ تنبیہ کندہ تھی کہ وہ شہر کو مسمار نہ کرے۔

مختلف عرب جغرافیہ نویسوں نے تدمر کا تذکرہ کیا ہے، لیکن بہت ہی مختصر۔ اُن میں سے چند اس کی حیرت انگیز عمارتوں اور کھنڈروں کا ذکر کرتے ہیں، اور عام طور پر وہ پرانی روایت دہراتے ہیں کہ یہ شہر حضرت سلیمانؑ نے جنات کی مدد سے تعمیر کرایا تھا۔ اس ضمن میں یاقوت

نے یہ دانشمندانہ نکتہ بیان کیا ہے کہ لوگوں کا عام میلان یہ ہے کہ وہ بڑی عمارتوں کو حضرت سلیمانؑ سے منسوب کر دیتے ہیں۔ ۱۱۵۷ء کے ہولناک زلزلے کا پالمائرا پر اثر پڑا۔ تطیلہ Tudela کے بنیامین Benyamin (۱۱۷۳ء) کا یہ بیان خاصا قابل ذکر ہے کہ شہر میں اکھٹے دو ہزار ایسے یہودی آباد تھے جو لڑنے کے قابل تھے۔ الدمشقی وہاں کے بےمثال کھنڈروں کے ساتھ جامع مسجد کا ذکر بھی کرتا ہے، جس کی چھت پندرہ پتھروں سے تیار ہوئی تھی۔ یہاں کے باشندے مضبوط قلعۃ المعن کو، جو شہر کے شمالی جانب ہے مشہور دروزی بادشاہ فخر الدین [قرقماس] [زک بان] سے منسوب کرتے ہیں، لیکن یہ مشکوک ہے۔ جب ممالک مشرق میں عظیم زوال آیا تو تدمر نظر سے بالکل اوجھل ہو گیا۔ اس کے باشندے بالآخر ایک فلاکت‌زدہ گاؤں میں رہنے لگے، جو سورج کے مندر کے احاطے میں آباد تھا اور مغرب والے اسے بالکل بھول گئے تھے۔ اس شہر کا، جو کسی زمانے میں ایسا مشہور تھا، کہیں ۱۶۷۸ء میں جا کر حلب کے انگریزی کارخانے کے ارکان نے دوبارہ پتا لگایا اور ۱۷۵۱ء میں رابرٹ وڈ Robert Wood نے زیادہ غور سے تحقیق و تفتیش کی اور ایک دیدہ‌زیب جلد میں اس کی کیفیت لکھی۔ آمد و رفت نے پھر سے رواج پایا تو پالمائرا بھی دوبارہ کاروانی راستوں کی ایک مشہور منزل بن گیا اور بالکل قریب زمانے میں موٹروں کی وجہ سے اسے نئی زندگی مل گئی ہے، جو ریگستان میں نقل و حمل کا نیا ذریعہ ہیں۔ ان کی بدولت پالمائرا اور مشرق و مغرب کے شہروں کے درمیان بہت سرعت اور آرام سے آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو گیا ہے۔

مآخذ : (۱) Partsch: *Palmyra, eine historisch-klimatische Studie* (*Berichte d. sächs. Ges. d. Wiss*، ج ۶۳)؛ (۲) E. Honigmann، در *Z.D.P.V.*، ۴۶ : ۲۷ ببعد؛ شرح نام گرک پر : (۳) Beckendorf، در *Z.D.M.G.*، ۴۲ : ۳۷۰ تا ۴۱۰؛ زنوبیا پر : (۴) الطبری، طبع ڈخویہ، ۱ : ۷۵۷ تا ۷۶۶؛ (۵) ابن الأثیر، طبع Tornberg، ۱ : ۱۶۶، ۳۰۷؛ (۶) Caussin de Perceval: *Essai sur l'histoire des Arabes*، ۲ : ۲۸، ۳۶، ۱۹۶ تا ۱۹۸؛ (۷) المیدانی : الامثال، طبع Freytag، ۱ : ۳۴۳ ببعد؛ (۸) A. v. Sallet: *Die Fürsten von Palmyre*، ۱۸۶۶ء؛ (۹) L. Double: *Les Césars de Palmyre*، ۱۸۷۷ء؛ (۱۰) Grimme: *Palmyrae sive Tadmur urbis fata quae fuerint tempore muslimico*، ۱۸۶۶ء؛ (۱۱) البلاذری : فتوح، طبع ڈخویہ، ص ۳؛ (۱۲) الطبری، ۱ : ۲۱۰۹، ۲۱۵۳، ۲۴۴۷؛ ۲ : ۵۲ ببعد؛ (۱۳) ابن الأثیر، ۲ : ۳۰۹ ببعد، ۳۳۳؛ ۶ : ۷۹، ۸ : ۳۳۸، ۱۰ : ۴۱۳، ۱۱ : ۱۲۲۳؛ (۱۴) الیعقوبی، در *B.G.A.*، ۷ : ۳۲۴؛ (۱۵) الإصطخری، وہی کتاب، ۱ : ۱۳؛ (۱۶) المقدسی : وہی کتاب، ۳ : ۱۵۶، ۱۸۶؛ (۱۷) ابن الفقیہ : وہی کتاب، ۵ : ۱۱۰، ۱۹۵؛ (۱۸) ابن خرداذبہ : وہی کتاب، ج ۶؛ (۱۹) یاقوت : معجم، طبع ووسٹنفلٹ، ۱ : ۸۲۸ تا ۸۳۱؛ (۲۰) الدمشقی، طبع Mehren، ص ۲۹؛ (۲۱) *The Itinerary of Benjamin of Tudela transl. and ed. by Asher*، ۱۸۴۳ء، ص ۸۷؛ (۲۲) Wood و Dawkins: *Les Ruines de Palmyre*، ۱۸۱۲ء؛ (۲۳) v. Oppenheim: *Vom Mittelmeer bis zum Persischen Golf*، ۱۸۹۹ء، ص ۲۷۸ تا ۳۲۷؛ (۲۴) W. Wright: *An Account of Palmyra and Zenobia*، ۱۸۹۵ء؛ (۲۵) Cumont: *Fouilles de Doura-Europos*، سن ۱۹۲۶ء، ص xlvii تا lxiv؛ [(۲۶) البستانی : دائرة المعارف، بذیل مادۂ تدمر]]۔

(Fr. Buhl)

پالم بانگ: رک بہ انڈونیشیا۔

پالن پور: غیر منقسم ہندوستان کی ایک مسلم ریاست، جو بعد ازاں ریاستہائے مغربی ہندوستان کی ایجنسی میں شامل کر دی گئی [اور اب بھارت کے صوبۂ بمبئی میں شامل ہے]۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں جب یہ ایجنسی قائم ہوئی، تو حکومت صوبۂ بمبئی کی نگرانی ختم ہو گئی اور براہ راست حکومت ہند سے تعلقات قائم ہو گئے۔ ۹ جون ۱۹۴۸ء تک پالن پور کا شمار ہندوستان کے صوبۂ بمبئی میں گجرات کی ان سترہ با اختیار ریاستوں میں تھا جو شمالاً ۲۳° ۲۵' اور ۲۴° ۴۱' عرض بلد، اور شرقاً ۷۱° ۱۶' اور ۷۲° ۴۶' طول بلد کے درمیان واقع تھیں۔ اس ایجنسی کا حدود اربعہ حسب ذیل تھا: شمالی جانب راجپوتانے کی دو ریاستیں اودے پور اور سروھی، مشرقی سمت مہی کانٹھا ایجنسی، جنوبی سمت ریاست بڑودہ اور کاٹھیاوار اور مغرب کی طرف رن کچھ۔

ریاست پالن پور کو سولھویں صدی عیسوی کے خاتمے پر لوھانی پٹھانوں نے فتح کیا، جو بعد میں جھالوری کہلانے لگے۔ مغل شہنشاھوں کے زمانے میں ریاست کی مختصر تاریخ *Gazetteer of the Bombay Presidency*، ۵: ۳۱۸ تا ۳۲۴ اور "مرآۃ احمدی" (Ethé، عدد ۳۵۹۹، ورق ۱۴۷) میں ملے گی۔ انگریزوں کے تعلقات اس ریاست سے ۱۸۰۹ء سے شروع ہوتے ہیں، جب ان کے اثر سے یہ طے ہوا کہ ریاست بڑودہ کے گائکواڑ کو خراج ادا کرے (Aitchison، ۶: ۸۹)۔ ۲۸ نومبر ۱۸۱۷ء کو ایک معاھدے پر دستخط ہوے، جس سے یہ انتظام اور پختہ ہو گیا (کتاب مذکور، ص ۹۱)۔ ۱۸۴۸ء میں مہاراجا گائکواڑ کی طرف سے ایجنٹ کا تقرر منسوخ ہوا اور ریاست کے مالیات برطانوی نگرانی میں رہے، یہاں تک کہ ۱۸۷۴ء میں مالیات کا انتظام خود رئیس پالن پور کے سپرد ہوا۔

[۱۰ جون ۱۹۴۸ء کو یہ ریاست انڈین یونین (موجودہ بھارت) کی ریاست بمبئی میں مدغم کر دی گئی۔ مدغم ہوتے وقت پالن پور کا رقبہ ۱۷۹۴ مربع میل تھا اور مجموعی آبادی ۳۱۵۸۵۵، ان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی، لیکن غالب اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اس وقت اس کی سالانہ آمد کی اوسط تقریباً ۲۵۲۴۵۰۰ (ہندوستانی) روپے تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ کچھ جینی بھی رہتے تھے۔ باشندوں میں اکثر و بیشتر لوگ گجراتی زبان بولتے ہیں]۔

مآخذ: (۱) C. U. Aitchison: *Treaties, Engagements and Sanads*، ج ۶، ۱۹۰۹ء؛ (۲) *Census of India*، ج ۱۰، ایجنسی ریاستہائے غربی؛ (۳) *Gazetteer of the Bombay Presidency*، ج ۵، ۱۸۸۰ء؛ (۴) *Imperial Gazetteer of India*، بذیل مادۂ پالن پور؛ (۵) علی محمد خان: مرآۃ احمدی (انڈیا آفس، Ethé، عدد ۳۵۹۷ تا ۳۵۹۹)؛ (۶) *Selections from the Records of the Bombay Government*، عدد ۲۵، ۱۸۵۶ء۔

(C. COLLIN DAVIES [و حمید الدین احمد])

پامیر: وسطی ایشیا کے ایک پہاڑی سلسلے کا نام۔ اس نام کا اشتقاق وجہ تسمیہ "پاے میر" سے بتایا جاتا ہے، جس کا لغوی معنی "پہاڑ کی چوٹی کا زیریں حصہ" ہے۔ پامیر کا کوھستانی مرکز تبت کی سطح سے مختلف ہے، پامیر میں گلیشی (glacial) ساخت کی بلند وادیاں ملتی ہیں۔ سطح سمندر سے انتہائی بلندی ۲۴ ہزار فٹ سے زیادہ ہے۔ پامیر کی سطح مرتفع صاری کول اور موستا آتا نامی پہاڑیوں کی موجودگی سے دو حصوں

میں بٹ گئی ہے ۔ مغربی حصّے کی ڈھلان مغرب کی طرف اور مشرقی حصّے کی مشرقی جانب ہے ۔ دونوں حصّے کافی مختلف ہیں ۔ پامیر کا اصل لفظ متذکرۂ بالا کاپشی وادیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ خاص خاص گھاٹیاں حسب ذیل ہیں:

(۱) پامیر کلاں، جس میں جھیل وکٹوریا واقع ہے؛ (۲) پامیر خورد، جسے نکولس کا پہاڑی سلسلہ اوّل الذکر سے جدا کرتا ہے؛ (۳) پامیر واخان، جو دریاے جیحون [= آمودریا] کے خاص معاون دریا واخان کی وادی سے متعلق ہے؛ (۴) پامیر کلاں کے شمال میں علی چوّر کی گھاٹی اور (۵) دریاے مرغاب کی وادی.

ان تمام وادیوں کے مابین بلند پہاڑی سلسلے ہیں، جو کوہ ہمالیہ سے متعلق ہیں اور جن کی چوٹیاں مستقل طور پر برف سے ڈھکی رہتی ہیں ۔ بالائی پامیر کی اوسط بلندی سطح سمندر سے تیرہ ہزار فٹ ہے ۔ اس کی اس بلندی کی وجہ سے اسے اکثر ”دنیا کی چھت“ بھی کہتے ہیں ۔ اس علاقے کا اہم ترین پہاڑی سلسلہ صاری کول ہے، جس کی ایک چوٹی ۲۴۳۸۸ فٹ بلند ہے ۔ اس علاقے میں پامیر نامی ایک دریا بھی بہتا ہے، جس کا کچھ حصّہ روسی اور کچھ افغانستانی علاقے میں ہے ۔

طاغ و نیش پامیر کا سلسلۂ اپنے جاے وقوع کی بنا پر سیاسی اہمیت بھی رکھتا ہے ۔ یہاں روس، افغانستان، کشمیر، پاکستان، چین، ترکستان اور تبت کی سرحدیں ملتی ہیں ۔ اس سلسلۂ کوہ کو پار کرنے کے بعد کسی بھی ملک میں داخل ہو سکتے ہیں ۔ گو یہاں کے پہاڑی راستے کافی دشوار گزار ہیں، تاہم مندرجۂ بالا ممالک کے درمیان بری تجارت انہیں کے ذریعے ہوتی ہے ۔

(سعید الدین احمد)

⊗ **پانچ پیر** : رک بہ پنج پیر.

پانی پت : غیر منقسم پنجاب [رک بآں] کے ضلع کرنال کی ایک تحصیل اور قصبہ [اب بھارت میں ہے] ۔ پانی پت کے میدان میں تین بار ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوا ہے : ۱۵۲۶ء میں، جب بابر [رک بآں] نے ابراہیم لودی [رک بآں] کو شکست دی؛ ۱۵۵۶ء میں، جب اکبر [رک بآں] نے ہیمو کی فوجوں کا قلع قمع کیا؛ اور آخری بار ۱۷۶۱ء میں، جب مرہٹوں کو احمد شاہ دُرّانی [رک بآں] نے شکست دی ۔ ان واقعات کا بڑا سبب جغرافیائی عوامل، اندرونی انتشار اور سرحدی نظام مدافعت کی کمزوری تھی ۔ ہندوستان کے شمال میں افغانستان کے جنگی مرکز سے جو راستہ حملہ آوروں کے لیے سب سے سہل ہے وہ خیبر، کرّم، ٹوچی اور گومل کے درّوں سے پنجاب کے میدانوں تک آتا ہے، اس لیے کہ دریاے سندھ کبھی کسی منچلے سپہ سالار کی راہ میں حائل نہیں ہوا ۔ چونکہ جنوب میں راجپوتانے کے ریگستان مزاحم ہوتے تھے، لہٰذا حملہ آور لشکر لامحالہ گنگا اور جمنا کی وادیوں میں اسی تنگ نالے سے داخل ہوتے تھے جو صحرا کے شمال مشرقی سرے اور ہمالیہ کے دامن کے مابین واقع ہے ۔

۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودی پر بابر کی فتح کا سبب عرصے تک یہ سمجھا جاتا رہا کہ اس نے توپوں سے وسیع پیمانے پر کام لیا تھا ۔ اس غلط فہمی کا سبب لفظ ”عرّبہ = (گاڑی)“ کا ناقص ترجمہ ہے ۔ یہ سچ ہے کہ بابر نے سات سو گاڑیوں سے کام لیا تھا، لیکن یہ درست نہیں کہ ان سے وہ گاڑیاں مراد لی جائیں جن پر توپیں چڑھی ہوتی ہیں، کیونکہ اس لفظ کے معنے محض ”گاڑیاں“ ہیں ۔ متون یا قرائن کی ایسی کوئی شہادت موجود نہیں جس سے یہ مانا جا سکے کہ بابر کے پاس اتنی توپیں تھیں جن کے کھینچنے کے لیے سات سو توپ گاڑیاں درکار ہوں ۔

واقعہ یہ ہے کہ بابر کی ''تُوزُک'' سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ اس کے پاس صرف دو توپیں تھیں، اور بابر خود اس فتح کو تیر اندازوں کی کامیابی قرار دیتا ہے۔ پانی پت کی پہلی لڑائی کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے لودی خاندان کا خاتمہ ہو گیا، اس سے کہیں زیادہ سخت مقابلہ راجپوتوں نے اگلے سال قہانواہ [مقامی تلفّظ : کان واہ یا کن واھہ، ابو الفضل نے خانواہ لکھا ہے] میں کیا.

پانی پت کی دوسری لڑائی ١٥٥٦ء میں ہوئی، جس میں اکبر نے ہیمو کو شکست دی۔ یہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ اکبر سے پہلے دراصل کوئی سلطنت مغلیہ نہ تھی بلکہ اسے قائم کرنے کا صرف اقدام کیا گیا تھا.

احمد شاہ دُرّانی نے ١٧٦١ء میں مرہٹوں پر فتح پا کر اپنے قدم ہندوستان میں نہیں جمائے بلکہ افغانستان واپس چلا گیا۔ مرہٹے عارضی طور سے مغلوب ہوے تھے، کیونکہ بہت جلد انہوں نے دوبارہ قوت حاصل کر کے ١٧٧١ء میں پھر ہندوستان کے امن کو خطرے میں ڈال دیا۔ اس لڑائی کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے برطانوی اقتدار کے بڑھنے میں سہولت پیدا کی.

مآخذ : (١) A. S. Beveridge : بابر نامہ، ج ٢؛ (٢) H. Beveridge : اکبر نامہ ٢ : ٥٨ ببعد؛ (٣) علی محمد خان : مرآۃ احمدی، (Ethé، عدد ٣٠٩٨، ورق ٥٨٣ ببعد)؛ (٤) نگارنامۂ ہند، Orme ١٨٩٦ء، (نیز دیکھیے *Asiatic Researches*، جلد ٣، اور Elliot و Dowson، ٨ : ٣٩٦ تا ٤٠٢)؛ (٥) *Selections from the Peshwa's Daftar, Letters and Dispatches relating to the Battle of Panipat*، *1747-1761*، ١٩٣٠ء.

(C. COLLIN DAVIES)

پاہنگ : (= پاہانگ) رک بہ ملایا، جزیرہ نما.

پٹرونہ : (Patrona) رک بہ رسالہ.

پٹنی : (= پٹنی)، تھائی لینڈ (سابق سیام) کا ایک ضلع، جو اس ملک کے انتہائی جنوب میں جزیرہ نماے [ملایا] کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ جنوب کی طرف اس کی حدود [ملیشیا] کی دو ریاستوں کیلان تان Kĕlantan اور کیدا Kĕda سے ملتی ہیں۔ اس کے صدر مقام کا نام بھی یہی (پٹنی) ہے.

مقامی باشندے زیادہ‌تر مسلمان ہیں۔ جامع مسجدیں دیگر مساجد سے ممیز ہیں؛ مؤخر الذکر مسجدوں کو ''سوراؤ'' (surau) کہتے ہیں اور ان کا اپنا عملہ ہوتا ہے۔ اس ضلع میں قانون خاندانی سے متعلّق امور میں شریعت اور دوسرے معاملات میں سیامی قانون کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں.

پٹنی تمام تر کوہستانی علاقہ ہے۔ صرف ساحل پر ایک میدانی پٹی چھٹی ہوئی ہے۔ ضلع کا رقبہ ١٣ ہزار مربع کیلومیٹر ہے اور آبادی [١٩٣٦ء میں] تقریباً ساڑھے تین لاکھ تھی۔ اس میں بڑی اکثریت ملایا والوں کی ہے، باقی سیامی اور چینی ہیں۔ زراعت بہت ہی کم ہے۔ صرف پٹنی اور ناؤنگ۔ چِک Nawng-Chik کے نواح میں، چاول کی کاشت ہوتی ہے۔ آبادی کا بڑا حصہ مچھلی کے شکار پر گزر کرتا ہے۔ جو مچھلی پکڑی جاتی ہے اس پر نمک لگا لیتے ہیں، جو وہیں نکلتا ہے۔ ٹین کی کان کنی ترقی پر ہے۔ اشیاے برآمد خشک کی ہوئی مچھلی، نمک، مویشی، ہاتھی اور ٹین ہیں.

پٹنی کا نام یقینی طور پر سولھویں صدی میں اُس وقت سنا ہے جب پرتگیزوں نے تجارت کی غرض سے یہاں آنا شروع کیا۔ یہ مقام صدیوں سے سیام کے ماتحت تھا۔ جنوبی جانب بڑھتے ہوے ١٢٨٣ء کے قریب تھائی لیگور Ligor پہنچے (بہ ساحل

نر: پٹنی سے کسی قدر شمال مغرب میں واقع ہے؛ سوکھوتائی Sukhotai کتبہ) ۔ ۱۳۵۰ء میں پورا جزیرہ نمائے ملایا سیامی حکومت کے تابع تھا۔ پٹنی کی فتح انھیں تاریخوں کے درمیان ہوئی ہوگی۔ ناگرا۔ کرتا گما Nagarakrtagama میں آیا ہے کہ ۱۳۶۵ء میں جاوا کی مجاپہت سلطنت نے جیرہ Djĕre، موجودہ جیرنگ Djéring فتح کر لیا، جو ضلع کی سات ریاستوں میں سے ایک ہے اور جس کا صدر مقام سمندر کے کنارے شہر پٹنی سے کسی قدر مشرق میں واقع تھا۔ پرتگیزوں نے ۱۵۱۱ء میں شہر ملکّا فتح کرنے کے بعد جلد ہی پٹنی میں بھی تجارت شروع کر دی۔ ان کی ایک بڑی تعداد یہاں رہنے لگی۔ ۱۶۰۰ء کے قریب ولندیزی اور انگریز نمودار ہوے۔ اس وقت پٹنی تجارت کا بارونق مرکز اور ملکّا اور چین کے درمیان ایک مستقر تھا، جہاں ایک طرف چین کا اور دوسری طرف مجمع الجزائر شرق الہند کی سب سے اہم بندرگاہوں کا مال مبادلے کے لیے ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ ۱۶۲۰ء میں جب یہ آخری کاروبار رو بہ تنزل ہوا تو یہ مقام اپنی اہمیت کھو بیٹھا اور یورپ والوں نے یہاں کی سکونت ترک کر دی۔

یہ یقینی طور پر معلوم نہیں کہ پٹنی والوں نے کب اسلام قبول کیا؛ ۱۵۰۰ء کے حدود میں یہ ایک اسلامی ملک ہو گیا تھا۔ اس وقت جو ملکہ حکومت کر رہی تھی، وہ پندرہ برس پیشتر اپنے خاوند کی جانشین ہوئی تھی۔ غالباً یہ ملک مینڈز پنٹو Mendez Pinto (۱۵۳۴ تا ۱۵۴۰ء) کے یہاں آنے سے پہلے مسلمان ہو چکا تھا۔ ملکی روایات کے مطابق، اس سر زمین کا فاتح چاؤسری بنگسا Chaw Sri Bangsa، شاہ سیام کا ایک بیٹا تھا، جو پہلے خود مسلمان ہوا اور اپنا نام و لقب سلطان احمد شاہ رکھا۔ پھر اس نے سارے ملک کو مسلمان بنایا۔ کہتے ہیں کہ اس نے ملکّا Malacca کی سیادت تسلیم کر لی تھی، جو پندرھویں صدی میں جزیرہ‌نمائے ملایا کی بالا دست طاقت تھی۔

مآخذ: (۱) G. P. Rouffaer: *Onlste ontdekkingstochten tot 1497*، در *Encyclopaedie van Nederlandsch-Indië*، بذیل مادّہ Tochten، ۳: ۲۸۰؛ (۲) P.A. Tiele: *De Europeërs in den Maleischen Archipel*، در *Bijdragen Kon. Instituut*، سلسلہ ۴، ۳: ۳۵، ۶۶؛ ۴: ۱۰۳؛ ۶: ۱۷۸ ببعد؛ ۸: ۷۷؛ سلسلہ ۵، ۱: ۲۶۴ ببعد، ۲: ۱۰۳ ببعد؛ (۳) *Begin ende Voortgangh van de Oost-Indische Compagnie*، ایمسٹرڈم ۱۶۴۶ء، ۱: ۷۴؛ (۴) *Peter Floris*، طبع Moreland (*Hakluyt Society*، سلسلۂ ثانی، ج ۷۴)، لنڈن ۱۹۳۴ء؛ (۵) T.J. Newbold: *British Settlements in Malacca*، لنڈن ۱۸۳۹ء، ۲: ۶۷ ببعد؛ (۶) Krom، طبع *Nagara-kṛtāgama*، Hague ۱۹۱۹ء، ص ۱۰۵؛ (۷) F. Mendez Pinto: *Wonderlijke reize*، ایمسٹرڈم ۱۶۵۳ء؛ (۸) W. A. Graham: *Siam*، لنڈن ۱۹۱۲ء۔

(R.A. KERN)

پٹروواراڈین: (Petrovaradin)، ہنگری Pétervárad، ترکی وارادین [سامی بک: قاموس الاعلام، پتروواردین]، ضلع سیرمیہ Sirmia (یوگوسلاویا) کا ایک مشہور فوجی قلعہ اور شہر، جو بلغراد (← پٹروواراڈین) ← نووی سد ← سبوتیکا ← بوڈاپسٹ کی بڑی ریلوے لائن پر ڈینیوب کے دائیں کنارے پر نووی سد (Neusatz) کے مقابل واقع ہے، نووی سد ضلع (banate) ڈینیوب کا صدر مقام اور بڑا شہر ہے جس سے وارادین دو پلوں کے ذریعے ملا دیا گیا ہے، اور ۱۹۲۹ء سے انتظاماً بھی اس شہر میں شامل ہے۔ یہاں دو فوجی قلعے ہیں: ایک بالائی، جو ڈینیوب سے ۱۰۰ فٹ بلند چٹکیرے (serpentine)

پتھر کی پہاڑی پر تین طرف سے دریا سے گھرا ہوا ہے (کوہ Fruška Gora کی ۴ سو فٹ اونچی سب سے زیادہ شمالی سمت میں واقع چوٹی بھی قلعہ ہے) اور ایک زیرین قلعہ ہے، جو شمال میں ڈھلوان پہاڑیوں کے دامن میں بنا ہوا ہے۔ بالائی قلعے میں لوگوں کے ذاتی مکانات نہیں ہیں، بلکہ صرف فوجی عمارتیں ہیں۔ انہیں میں وہ نامی اسلحہ‌خانہ بھی ہے جس میں ترکی لڑائیوں کے بہت سے غنائم رکھے ہیں؛ لیکن دوسرے قلعے میں ایک عمدہ بازار، ایک بڑی اور دو پتلی سڑکیں ہیں۔ دونوں قلعوں کے رقبے کے اندر متعدد خندقیں ہیں، جن میں دس سے بارہ ہزار آدمیوں تک کی گنجائش ہے۔ قصبہ خود نصف ڈینیوب کے کنارے آباد ہے اور نووی سد سے اتصال سے پہلے اس کی آبادی ۵ ہزار سے زائد تھی (۱۹۲۱ء)۔ اس کے آس پاس بہت سے تاکستان ہیں۔

اس جگہ رومی عہد میں بھی ایک بستی تھی، جسے Cusum کہتے تھے اور جس میں روشنی کے دیوتا متھرا Mithra کی پرستش کے واضح آثار پائے گئے ہیں۔ ایک افسانے کے مطابق اس آبادی کا بعد کا نام Petricum اس "پیٹر دی ھرمٹ" Peter the Hermit سے منسوب تھا جس نے پہلی صلیبی جنگ کے لیے یہاں فوجیں جمع کی تھیں۔ بہر کیف اتنا ضرور ہے کہ یہ قصبہ ان لڑائیوں کے زمانے میں پٹریکن (Petrikon) کے نام سے موسوم تھا جو بوزنطی شہنشاہ مونوئل کمنینوس Manuel Comnenos (۱۱۴۳ تا ۱۱۸۰ء) اور ھنگری کے درمیان ہوئی تھیں۔ ایک مختصر زمانے تک بوزنطی سلطنت میں شامل رہنے کے بعد پٹرو وارادین شاھان ھنگری کے پاس واپس آیا، اور بیلا Bela چہارم نے ۱۲۳۷ء میں یہ بستی اور اس کا شاھی محل وہاں کی سسٹرکی B.M.V. Belefontis de monte خانقاہ (Cistercian) Varadinipetri کی نذر کر دیا۔ یہ خانقاہ قرون وسطٰی میں ۱۵۲۱ء تک برابر باقی رہی؛ لیکن ۱۲۳۹ء سے یہ اور پٹروواردین کا شہر دونوں کچھ عرصے کے لیے Mačva کے حاکم کے تسلط میں بھی رہے۔

ھنگری کے خلاف سلیمان اوّل کی دوسری جنگ میں پہلی ضرب پٹروواردین پر لگی: سلطان کے وزیر اعظم اور برادر نسبتی ابراھیم پاشا نے (قب سجلِ عثمانی، ۱: ۹۲ تا ۹۳) دھاوا کر کے شہر پر ۱۵ کو اور قلعے پر بہادرانہ مقاومت کے بعد ۲۷ جولائی کو قبضہ کر لیا۔ ترک پٹرو وارادین پر ۱۶۸۷ء تک قابض رہے۔ پھر سقوطِ اوفن Ofen کے بعد انھوں نے بتدریج پیچھے ھٹنا شروع کیا اور زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ اس شہر پر آسٹریا کا قبضہ ہو گیا (قطعی طور پر ۱۶۹۱ء میں)؛ سورملی [= سورمہ لی] علی پاشا نے (۲۹ اگست سے) ۱۶۹۴ء میں اس کا تئیس دن تک ناکام محاصرہ کیا، پھر ۱۶۹۹ء کے معاھدۂ کارلوبی (Carlowitz) کی رو سے اسے باقاعدہ آسٹریا ھی کے حوالے کر دیا گیا؛ لیکن پٹروواردین کی زیادہ شہرت ۱۷۱۶ تا ۱۷۱۸ء کی جنگ سے ہوئی۔ وزیر اعظم شہید علی پاشا کا (اس کے بارے میں قب عبدالرّحمان شرف، ۲: ۱۳۸، اور سجلِ عثمانی، ۳: ۵۲۸ تا ۵۲۹) اپنی ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ اس شہر کے قریب سیوائے Savoy کے شہزادۂ یوجین (Eugene) سے مقابلہ ہوا اور شہید علی نے اس کے باقاعدہ محاصرے کی کوشش کی، مگر آسٹروی سپہ سالار نے یہ تدبیر چلنے نہ دی بلکہ اپنی ۶۴ ھزار فوج لے کے پانچ گھنٹے جم کر لڑا، جس کا خاتمہ ترکوں کی شکست پر ہوا (۵ اگست ۱۷۱۶ء)۔ اس لڑائی سے، جس میں تیمسور اور بلغراد کے سقوط (۱۷۱۷ء)

کے ساتھ ہی، علی پاشا خود بھی میدان جنگ میں کام آیا۔ جنگ کا فیصلہ ہو گیا اور نتیجے میں صلح نامۂ پشاروتز Požarevac (رک باں) مرتب ہوا، جس سے ترکی سرحد پتروواراد ین سے بہت دور جنوب میں فی الواقع صاوہ (= ساوہ Save ندی پر) قائم ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد ملکۂ ماریا تھریسیا Maria Theresia نے یہاں کا نیا قلعہ بنوایا۔ ہنگری کی جنگ آزادی (۱۸۴۸ء تا ۱۸۴۹ء) میں پتروواراد ین نو ماہ سے زیادہ ہنگریوں کے ہاتھ میں رہا، تاآنکہ ۶ ستمبر ۱۸۴۹ء کو اس نے آسٹریا کی اطاعت قبول کر لی۔ جب ۱۹۱۸ء میں آسٹریا۔ ہنگری کی بادشاہت ختم ہو گئی تو یہ قصبہ یوگوسلاویا کے پاس چلا گیا۔

مآخذ : (مقالے میں مذکور حوالوں کے علاوہ) : (۱) اولیا چلبی : سیاحت نامہ، ج ۷ (استانبول ۱۹۲۸ء)، ص ۱۳۰ تا ۱۷۳ (وہ ترکی قبضے کی بہت مکمل روداد دیتا ہے؛ دوسرے بیانات کسی قدر مبہم ہیں کیونکہ بہت سے اعداد و شمار غائب ہیں)؛ (۲) Hammer : G.O.R.، بار دوم، ۲ : ۵۰ ؛ ۳ : ۸۶۶ و ۴ : ۱۳۰ ؛ (۳) Zinkeisen : G.O.R.، ۴ : ۶۰۲ اور ۵ : ۲۳ تا ۳۴ ؛ (۴) سامی بک : قاموس الاعلام، ۲ : ۱۳۸۹ (وہ غلطی سے خیال کرتا ہے کہ پتروواراد ین سلطان احمد ثالث کے عہد (۱۷۰۳ء تا ۱۷۳۰ء) کے بعد تک ترکوں کے پاس رہا)؛ (۵) عبدالرحمٰن شرف : تاریخ دولت عثمانیہ، ۲ : ۱۴۳ ؛ (۶) Meyers Reisebücher : Türkei، وغیرہ، بار پنجم لائپزگ ـ ویانا ۱۸۹۸ء، ص ۳۲ ؛ (۷) J. Modestin در Narodna enciklopedija، ج ۳ (Zagreb ۱۹۲۸ء)، ص ۳۳۶ تا ۳۳۷ (جہاں اس موضوع پر کچھ مزید کتابوں کے نام مذکور ہیں)؛ (۸) Almanah kraljevine Jugoslavije، Zagreb ۱۹۳۱ء، ص ۱۰۳۱ ؛ (۹) Glasnik Istoriskog društva u Novom Sadu، ج ۶، حصہ ۱ تا ۲، Sremski Karlovci ۱۹۳۳ء (نووی سد اور پتروواراد ین پر خاص شمارہ، اہم مضامین اور مؤخرالذکر شہر کے متعدد قدیم (۱۶۸۸ء سے) نقشوں کے ساتھ)۔

(Fehim Bajraktarević)

پٹنہ : بھارت کے صوبۂ بہار کا سب سے بڑا شہر اور صدر مقام؛ یہ دریاے گنگا کے دائیں کنارے پر آباد ہے اور اس کی آبادی ۲۸۲۰۵۷ ہے۔ ۱۹۱۲ء میں برطانوی ہند کا صوبۂ بہار و اڑیسہ دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، ۱۹۱۶ء میں پٹنہ ھائی کورٹ قائم ہوا اور ایک سال بعد پٹنہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ خاص شہر دریا کے کنارے نو میل تک پھیلا ہوا ہے؛ صنعتی اور تجارتی نقطۂ نظر سے اس شہر کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں، البتہ صوبے کا مرکز ہونے کی وجہ سے یہ شہر خاصا وسیع اور خوبصورت ہے۔ پرانے شہر کے مغرب میں بانکی پور [رک باں] ہے، جو نئی طرز میں تعمیر کیا گیا ہے۔

یوں تو تاریخی اعتبار سے پٹنہ بہت پرانا شہر ہے، لیکن اسے خاص اہمیت سب سے پہلے ۱۵۴۱ء میں حاصل ہوئی جب شیر شاہ سوری نے اسے پہلی بار بہار کا دارالحکومت قرار دیا۔ سلطنت مغلیہ کے زمانے میں بھی یہ بہار کا دارالحکومت اور ایک تجارتی مرکز تھا۔ یہ شہر قدیم تاریخی مقام پاٹلی پتر کی جگہ پر آباد ہوا۔ پاٹلی پتر کے کھنڈر شہر کے جنوب مغربی حصے میں دریافت ہوے ہیں اور ان میں سو ستونوں کا وہ ایوان (hall) بھی شامل ہے جو مہاراجا اشوک نے بنوایا تھا۔ قدیم ترین تاریخی عمارت، جو اب تک صحیح و سالم ہے، ایک مسجد ہے، جس کا صحن سنگ مرمر کا ہے؛ یہ ۱۴۹۹ء میں بنگال کے فرمانروا حسین شاہ نے تعمیر کرائی تھی۔ اس کے علاوہ شیر شاہ سوری کی مسجد اور جہانگیر کے بیٹے شاہزادۂ پرویز کی مسجد بھی

قابل دید ہیں۔ سکھوں کا ایک گوردوارہ بھی عین اس جگہ واقع ہے جہاں ۱۶۷۵ء میں گورو گوبند سنگھ کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس گوردوارے میں گرنتھ صاحب کا ایک نسخہ بھی محفوظ ہے، جو روایت کے مطابق خود گورو گوبند سنگھ کا عطیہ تھا۔ قدیم اینٹ کی خاص عمارت ''گولہ'' بھی محفوظ ہے، جو ۱۷۸۶ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ یہ تقریباً ایک سو فٹ بلند ہے اور شہد کی مکھیوں کے چھتے کی مانند ہے۔ روایت کے مطابق یہ چھت اس مقصد سے تعمیر کی گئی تھی کہ قحط کے زمانے میں اس میں چاول کا ذخیرہ محفوظ کیا جا سکے۔ یہاں ''خدا بخش'' کتب خانہ ہے، جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایشیا کے بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کتب خانے میں آنحضرت ؐ کے زمانے سے لے کر موجودہ زمانے تک کی اسلامی تصنیفات موجود ہیں۔ ضلع کا رقبہ ۲۰۶۸ مربع میل ہے اور قریب قریب سارا ضلع ایک ہموار میدان ہے، صرف جنوب کی جانب سے راج گیر کی پہاڑیاں اس میں کچھ دور تک داخل ہو گئی ہیں۔ یہ پہاڑیاں تقریباً تیس میل تک پٹنے کو گیا کے ضلع سے الگ کرتی ہیں۔ زمین زرخیز ہے اور زرعی پیداوار کے لیے نہایت موزوں۔ زمین کی ڈھلان مغرب سے مشرق کی جانب ہے، خاص پیداوار چاول ہے، اس کے علاوہ گیہوں، جو، مکئی اور دالوں کی کاشت بھی ہوتی ہے۔ نہر سون ضلع کے شمال مغربی حصے میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ ایکڑ زمین کو سیراب کرتی ہے، اس کے علاوہ متعدد مقامی نہروں اور کنووں سے آبپاشی ہوتی ہے۔

پٹنہ ڈویژن میں پٹنہ، گیا اور شاہ آباد کے اضلاع شامل ہیں، جن کا مجموعی رقبہ ۱۱۳۴۸ مربع میل اور آبادی ۸۳ لاکھ ہے۔ یہ پورا ڈویژن دریاے گنگا کے جنوبی کنارے پر ہے۔

(سعید الدین احمد)

⊗ **پٹیالہ**: برصغیر پاک و ہند کی تقسیم سے پہلے صوبۂ پنجاب میں سکھوں کی سب سے بڑی ریاست تھی۔ بعد ازاں یہ ریاست نئی ریاستی یونین ''پیپسو'' PEPSU میں شامل ہو گئی، جس کا افتتاح ۱۵ جولائی ۱۹۴۸ء کو سردار پٹیل نے پٹیالے کے مقام پر کیا تھا۔ جب بھارت نے ریاستوں کے نظام کو ختم کر دیا تو پٹیالے کو پنجاب میں مدغم کر دیا گیا (۱۹۵۶ء)۔ [۱۹۶۶ء میں جب لسانی اعتبار سے پنجاب کی تقسیم عمل میں آئی تو پٹیالہ پنجابی صوبے میں شامل کیا گیا]۔ مقامی زبان پنجابی ہے اور بیشتر آبادی جاٹ قوم کے لوگوں کی ہے، جو برصغیر پاک و ہند کے بہترین کاشتکاروں میں شمار ہوتے ہیں؛ کاشتکار ہونے کے علاوہ یہ اچھے سپاہی بھی ہیں۔

پٹیالے کا علاقہ مشرقی پنجاب کے وسط میں دریاے جمنا اور ستلج کے درمیان واقع ہے۔ اس کی لمبائی شرقاً غرباً ۱۴۰ میل کے قریب اور چوڑائی شمالاً جنوباً ۱۲۵ میل ہے۔ جنوب کی طرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا دریاے گھاگھرا کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔ پٹیالہ ندی کے علاوہ ریاست میں بعض موسمی ندیاں بھی ہیں۔ اس ریاست کو مشرقی پنجاب کی شکارگاہ کہہ سکتے ہیں۔ چیتل، چرخ، مشکی ہرن اور تیندوے بکثرت ہیں۔ بارہ سنگھے اور نیل گائیں بھی ملتی ہیں۔

قدیم ریاست کا رقبہ ۵۹۴۲ مربع میل ہے اور ۱۹۴۱ء میں اس کی آبادی ۲۰ لاکھ کے قریب تھی۔ یہ ریاست ایک سکھ سردار [آلا] نے ۱۷۶۳ء میں قائم کی تھی۔ صدر مقام پٹیالہ مشرقی پنجاب ریلوے کی راجپورہ ۔ بھٹنڈہ شاخ پر پٹیالہ ندی کے مغربی کنارے پر آباد ہے۔ انبالہ چھاؤنی یہاں سے چونتیس میل مشرق کی طرف واقع ہے۔ [۱۹۶۰ء میں یہاں پنجابی یونیورسٹی قائم ہوئی۔ ۱۹۶۱ء

کی مردم شماری کی رُو سے پٹیالہ شہر کی آبادی سوا لاکھ کے قریب تھی]۔

(سعیدالدین احمد [و ادارہ])

⊗ پٹھان: رک بہ افغان، افغانستان، نیز پشتو۔

• پَچِنَک: Pečenegs، قرونِ وسطٰی کی ایک ترکی النسل قوم۔ ان کا نام بہت سی مختلف شکلوں میں آتا ہے (بجنک، بجناک، پچنک، Πατζινακῖται، Πατζινάκοι، Patzinacitae، Patzinacae، Pincinigi، Pincenakiti، Pecenaci وغیرہ؛ اسی طرح Bysseni، Bessi، ہنگری کی زبان میں Besenyök وغیرہ)۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ یہ لوگ ترک قوم کی ایک شاخ تھے۔ رشیدالدین (تیرھویں صدی؛ رک بہ غازان) اور محمود کاشغری (۱۰۷۳ء) انھیں غز [رک بآں] قبائل میں شمار کرتے ہیں، مؤخرالذکر (دیوانُ لغات التُرک، ۱: ۲۷؛ قب K.Cs.A.، ۱: ۲۶) انھیں ترک قوم کے شمالی گروہ میں رکھتا ہے، جس سے قپچاق [قفچاق]، اُغوز (اَغز)، وغیرہ متعلق ہیں اور لکھتا ہے کہ وہ رومیوں (Rhomaeans)، یعنی سب سے زیادہ مغربی ترک قبیلے کے بعد آتے ہیں۔

غالبًا پچنک بہت پہلے اپنے بھائیوں سے ترکستان ہی میں، جو ترکوں کا اصلی وطن تھا، جدا ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شروع میں وہ اِیا۔ یُورال۔ والگا کے خطّے میں آباد ہوے۔ البکری اور گردیزی کے بیان کے مطابق یہ علاقہ طول و عرض میں تیس دن کی مسافت تھا۔ وہاں وہ غالبًا ایک معتدبہ وقت تک رہے، ان کے ہمسایے جنوب مغرب میں خزر اور جنوب مشرق میں اُغوز تھے اور وہ ایران اور خوارزم سے تجارت کرتے تھے۔

۸۶۰ء سے اُغوز نے مغربی سمت بڑھنا اور پچنک کو یورال کے خطّے سے نکالنا شروع کیا۔ نویں صدی عیسوی کے خاتمے کے قریب اُغز (اُوْزْ، Uzon، Οὖζοι) نے خزر سے معاملہ کر لیا اور پچنک کی بڑی جماعت کو ان کے پرانے وطن سے نکال باہر کیا؛ چنانچہ ۹۲۲ء میں ابن فضلان نے وہاں پچنک کی محض چھوٹی چھوٹی باقی ماندہ جماعتیں دیکھیں؛ *De administrando imperio*، ص ۱۶۶، کے مطابق مؤخرالذکر وہاں اپنی مرضی سے رہ گئے تھے۔

پناہ گزین پچنک مغرب میں مجاروں (Magyars) سے آبھڑے اور انھیں ہنگری میں دھکیل کر ان کے ملک پر قابض ہو گئے، یعنی اوّلًا اس علاقے پر جو طونہ Don اور ڈنیپر Dnieper کے درمیان ہے اور پھر ڈینیوب تک Constantine Porphyrogennētos (نواح ۹۵۰ء) کہتا ہے کہ یہ واقعہ "پچاس برس پہلے" ہوا۔ تاریخی وقائع نویس Regino (م ۹۱۵ء) اس کی تاریخ ٹھیک ۸۸۹ء میں متعین کرتا ہے۔ پچنک کی قوت آخر میں جنوبی روس سے بسربیا [رک بہ بجاق] اور مولداویہ Moldavia میں مشرقی قارپات Carpathians کے پہاڑوں تک پھیل گئی تھی۔

جنگجو اور زور آور ہونے کے باعث پچنک اپنے ہمسایوں کے لیے ایک مستقل خطرہ تھے، لیکن یہاں ہم صرف مختصرًا اُن کے ہنگری، روس اور بوزنطہ سے تعلقات کا تذکرہ کر سکتے ہیں۔ دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی میں انھوں نے بار بار ہنگری پر مشرقی قارپات کی طرف سے حملے کیے، یا صلح و آشتی سے ہنگری کے مختلف اضلاع میں سکونت پذیر ہو گئے (قب اُن کی نو آبادیوں کا نقشہ، در Németh: *Die Inschriften des Schatzes von Nagy-Szent-Miklós*، ضمیمہ ۱)۔ تیرھویں صدی عیسوی تک پچنک کی نوآبادیاں ہنگری میں بعض سیاسی حقوق و امتیازات سے بہرہ اندوز تھیں، آخرکار یہ قومانوں (Komans) میں ضم ہو گئیں۔

روسیوں سے، پچنک کے مراسم پہلے دوستانہ رہے (بموجب .De adm. Imp، ص ۹۹، وہ روسیوں کے ہاتھ مویشی، گھوڑے اور بھیڑیں بیچتے تھے)، بعض اوقات وہ بوزنطہ اور بلغاریا کے خلاف روسیوں کے حلیف تھے (Igor کے زمانے ۹۴۴ء میں)، لیکن زیادہ تر ہم انہیں روسیوں پر حملے کرتے دیکھتے ہیں۔ اُنھوں نے کیف Kiev کا محاصرہ کیا، ۹۷۲ء میں اُنھوں نے گرینڈڈیوک سویاتوسلاف Sviatoslav کو، جب کہ وہ بلغاریا سے واپس آ رہا تھا، قتل کر ڈالا۔ روسیوں کو ان کی روک تھام کے لیے بہت سے قلعے بنانے پڑے۔ ان کا آخری حملہ (۱۰۳۶ء) کامل طور پر پسپا کر دیا گیا۔ تھوڑے وقفے کے بعد (۱۰۶۰ء) خود اُن پر اُزِن (Uzen) قوم کا سخت دباؤ پڑا، جو بڑھتی چلی آتی تھی؛ لہٰذا پچنک کو پہلے ڈینیوب کی طرف اور زیادہ ہٹنا پڑا اور بعد میں وہ پلٹ کر جزیرہ نمائے بلقان کی طرف ہٹ آئے۔

بوزنطی شاہی مؤرخ .De. adm. Imp (ص ۶۸) میں پچنک کے ساتھ مصالحانہ تعلقات کے قیام کی سفارش کرتا ہے، اور فی الواقع ان سے مصالحت بھی ہو گئی تھی، لیکن ۹۷۰ء سے ہم انہیں روسیوں کے ساتھ مل کر بوزنطہ کے خلاف لڑتے ہوئے پاتے ہیں۔ اس کے بعد سے پچنک مسلسل بوزنطیوں سے لڑتے رہے، یہاں تک کہ شہنشاہ Alexius اول نے ۱۰۹۱ء میں انہیں مرتزہ Maritza کے دہانے پر شکست فاش دی اور ۱۱۲۲ء میں جان John ثانی نے انہیں ایک اور بھاری زک پہنچائی۔ باقی ماندہ پچنک میں سے کچھ بوزنطیوں کی فوجی خدمت میں لے لیے گئے اور کچھ بلقان میں، خصوصاً بلغاریا میں، آباد ہو گئے۔ کاگوز Gagauz [رک بآں] قبیلے کو بعض اوقات انہیں کی باقیات شمار کیا گیا ہے، لیکن ان کی موجودہ زبان سے اس کی بہت کم شہادت ملتی ہے (قب ۳ : ۹۹۲)؛ تاہم بلقانی مقامات کے بہت سے نام اب بھی اس واقعے کو یاد دلاتے ہیں کہ پچنک کبھی وہاں رہے تھے۔

پچنک کے اس طرح خانہ بدوش پھرتے رہنے سے ان میں لازماً قبائلی تنظیم کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔ C. Prophyrogennētos کے قول کے مطابق پچنک آٹھ قبائل میں منقسم تھے (چار ڈنیپر کے اُس طرف اور چار اس طرف)۔ ہر ایک کا ایک بڑا سردار تھا۔ پھر چالیس کنبے تھے، جن میں سے ہر ایک کا ایک ایک چھوٹا سردار تھا۔ بقول Nemeth قبائل کے نام زیادہ تر گھوڑوں کے ناموں اور سب سے بڑے سردار کے القاب پر رکھے جاتے تھے، مثلاً Σοpouxαλπέn = سورو کول پے، یعنی سفید گھوڑوں والے کول پے کے قبائل۔ تین قبیلے شجاعت اور فضیلت میں ممتاز تھے۔ اُن کا نام Porphyrogennētos نے ”کنگر“ (Kάγγαp) لکھا ہے۔ سرداروں کے ناموں میں سے قبیلۂ جولہ (Γύλα) کے سردار کا نام، یعنی قورقود Kor Kut [رک بآں] غالباً سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ Kedrenos (۲ : ۵۸۱ تا ۵۸۲) کے زمانے میں تیرہ پچنک قبائل تھے اور ”ہر ایک کو اس کا نام اس کے مورث اور سردار سے وراثۃً ملا تھا“۔

پچنک کے مذہب کے متعلق ہمیں بہت کم علم ہے۔ البکری کے مطابق وہ گزشتہ زمانے میں آتش پرست (مجوسی) تھے، لیکن دوسرے مآخذ کے مطابق دسویں صدی عیسوی کے آغاز کے قریب بھی ان میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔

جہاں تک پچنک زبان کا تعلق ہے، Anna Comnena (بارھویں صدی عیسوی) بہت پہلے اسے قومانوں (دیکھیے قپچاق) کی زبان بتا چکا ہے۔ قریب کے زمانے تک اس زبان کے ہجے کچھے

آثار بیشتر صرف پچنک قبائل، رؤسا اور فوجی تلموں کے ناموں پر مشتمل تھے، جن کی فہرست C. Porphyrogennētos نے تحریر کی ہے، لیکن جب ۱۹۳۱ء میں Németh خزانۂ Nagy. Szent Miklos کے کتبات کو حل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اسے یہ پتا چلا کہ سونے اور چاندی کے جو برتن خزانے میں رکھے تھے وہ پچنک سردار بوتاؤل چبان Bota-ul Čaban (تقریباً ۹۰۰ تا ۹۲۰ء) کی ملک تھے اور یہ کہ یہاں پچنک زبان کے مزید نمونے موجود ہیں۔ ان سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ پچنک کی زبان ہنگری کی قومانی زبان اور قومانی نقوش Codex Cumanicus سے قریبی تعلق رکھتی تھی۔ ان کتبات کے حروف کو پچنک حروف (runes) کہہ سکتے ہیں، جو گوک ترک Kök türk رسم الخط کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ہنگری کی تحریر کی علامتوں سے ان کا قریبی رشتہ ہے۔

آخر میں اس واقعے سے کہ خزانۂ Nagy-Szent-Miklos میں بپتسمے کے دو برتن موجود ہیں یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ کئی پچنک سرداروں نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ پچنک کی نسبت مزید معلومات بہت ہی کم ملتی ہیں؛ تاہم قب K. Dieterich کا اشاریہ (دیکھیے مآخذ)۔

مآخذ: پچنک سے متعلق قدیم ترین عربی (ابن رستہ اور البکری) اور فارسی (گردیزی) مصادر الجیہانی (دسویں صدی) پر اور نویں صدی کے نصف اول کے ایک مآخذ پر مبنی ہیں اور ان میں پچنک کے صرف ابتدائی وطن کا حوالہ ملتا ہے، البتہ المسعودی کے بیان میں ان لوگوں کے والگا کے خطے سے نکل جانے کے بعد کا زمانہ بھی شامل ہے۔ مآخذ کی دونوں صنفیں [عربی و فارسی] J. Marquart اور W. Barthold کے استعمال میں رہی ہیں۔ دیکھیے نیز: (۱) Constantine Porphyrogennētos، مطبوعۂ بون، ج ۳، (۱۸۴۰ء)، دیکھیے تاریخی اشاریہ (پورا باب سینتیس پچنک سے بحث کرتا ہے)؛ (۲) P. Golubovskiy: *Pečenegi, torki i polovcī do nashestviya tatar*، کیف ۱۸۸۴ء؛ (۳) سامی: قاموس الاعلام، ۲: ۱۳۹۰؛ (۴) K. Krumbacher: *Geschichte der byzantinischen Litteratur*، بار دوم ۱۸۹۷ء، ص ۱۱۰۰؛ O (۵) *Brokgaus-Efron 'Enciklopedičeski Slovar'*، ج ۲۲، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۸ء، ص ۵۲۴ ببعد؛ (۶) J. Marquart: *Osteuropäische und ostasiatische Streifzüge*، لائپزگ ۱۹۰۳ء، دیکھیے اشاریہ؛ (۷) *Révai Nagy Lexikona*، ج ۳، بوڈاپسٹ ۱۹۱۱ء، بذیل Besenyök؛ (۸) K. Dieterich: *Byzantinische Quellen zur Länder- und Völkerkunde*، ۱۹۱۲ء، جز ۲، خصوصاً ص ۱۵ تا ۵۸، ۱۳۷ اور ۱۸۶؛ (۹) ن۔ عاصم و م۔ عارف: عثمانلی تاریخی، ج ۱، قسطنطنیہ ۱۳۳۵ھ، ص ۵۷ ببعد؛ (۱۰) E. Oberhummer: *Die Türken und das Osmanische Reich*، لائپزگ و برلن ۱۹۱۷ء، دیکھیے اشاریہ؛ (۱۱) Z. Gombocz: *Über den Volksnamen besenyő*، در *Turán*، بوڈاپسٹ ۱۹۱۸ء، ص ۲۰۹ تا ۲۱۵؛ (۱۲) W. Bang: *Über den Volksnamen besenyő*، در مجلۂ مذکور، ص ۴۳۶ تا ۴۳۷؛ (۱۳) G. Fehér: *Die Petschenegen und die ungarischen Hunnensagen*، در *K. Cs. A.*، ۱: ۱۲۳ تا ۱۴۰ (من جملہ اور باتوں کے یہ فرض کرتا ہے کہ اباؤں کا شاہی خاندان سبا Csaba یا قبیلۂ پچنک Tζonóv کی نسل سے ہے)؛ (۱۴) Gy. Czebe: *Turco-byzantinische Miszellen (I)*، در *K. Cs. A.*، ۱: ۲۰۹ تا ۲۱۱ (Fehér کے مفروضے کی تردید کرتا ہے، Németh کے لسانی نتائج کی تصدیق اور باب پچنک در Porphyrogennētos کا مکرر تجزیہ کرتا ہے)؛ (۱۵) W. Barthold: *Orta Asya Türk Ta'rikhine* hakkında Dersler، استانبول ۱۹۲۷ء، ص ۲۳ و ۲۹ ببعد؛ (۱۶) J. Németh : Zur Kenntnis der Petschenegen، در K. Cs. A.، ۱ : ۲۱۹ تا ۲۲۵؛ (۱۷) وهی مصنف : Die petschenegischen Stammesnamen، در Ungarische Jahrbücher، ج ۱۰، ۱۹۳۰ء، ص ۲۷ تا ۳۴؛ (۱۸) وهی مصنف : Die Inschriften des Schatzes von Nagy-Szent-Miklós، بوڈاپسٹ - لائپزگ ۱۹۳۲ء، خصوصاً ص ۳۶، ۴۵ تا ۵۹؛ (۱۹) حسین نامق، پچنکلر (ترکی)، استانبول ۱۹۳۳ء۔

(FEHIM BAJRAKTAREVIĆ)

پچوی : ابراهیم [افندی]، ترک مؤرخ جو ۹۸۲ھ/ ۱۵۷۴ء میں فونفکیرخن Fünfkirchen (هنگری، هنگری زبان میں : Pécs، ترکی میں پچوی Pečewi، یعنی پچویلی Pečewili) میں پیدا هوا، اور اسی سے اس کی نسبت پچوی هے (قب پچوی : تاریخ، ۱ : ۲۸۶ اور ۲ : ۴۳۳؛ نیز J. v. Hammer : GOR، ۴ : ۵، حاشیه) - اس کے اجداد بوسنه اور هنگری میں جاگیردار تھے - پچوی نے اپنے باپ کا نام نہیں لکھا (قب تاریخ، ۱ : ۸۷)؛ بہر حال اس نے پہلے سے فونفکیرخن میں بودوباش اختیار کر لی تھی - اس کی ماں مشہور خاندان صوقللی (Sokolović) سے تھی - پچوی کے اوائل عمر کی بابت هم یه جانتے هیں که چوده برس کی عمر میں جب وه یتیم هو چکا تھا، اس کے چچا فرهاد پاشا، حاکم اوفن Ofen نے اسے اپنے هاں رکھ لیا، اور کچھ عرصے بعد وه ایک دوسرے رشته دار لالا محمد پاشا کے پاس چلا گیا (قب اس کی تاریخ، ۲ : ۳۲۳)؛ اس نے پندره برس مؤخرالذکر کے متوسلین میں بسر کیے - ۱۰۰۲ھ/ ۱۵۹۳ء میں وه فوج میں داخل هوا، سنان پاشا کے هنگروی معرکوں میں حصه لیا اور محاصرۂ غران Gran (قب تاریخ، ۲ : ۱۳۶ تا ۱۸۰)، معرکۂ ارلاؤ Erlau اور محاصرۂ پشتروواراڈین [رک بآں] کا عینی شاهد تھا - بعد کے چند سال اس نے زیاده تر لالا محمد پاشا کے عملے میں بسر کیے، جو ۱۰۱۳ھ/ ۱۶۰۴ء سے وزیر اعظم هو گیا تھا - اس نے ان مختلف عہدوں کی، جن پر وه کام کرتا رها تھا، مفصل کیفیت اپنی تاریخ میں لکھی هے - اپنے مربی محمد پاشا کی وفات (۱۰۲۴ھ/ ۱۶۱۵ء) کے بعد وه اس کے جانشین کی طرف سے آناطولی بھیجا گیا تاکه وهاں کی کئی سنجاقوں کے احوال مرتب کرے - اس کے بعد وه تھوڑے عرصے کے لیے توقات [= توقاد] کا "دفتر دار" هو گیا، اسی منصب پر روم ایلی گیا، اور بالآخر محض رعایةً دفتر آناطولی کا عہده دے دیا گیا - اس نے بقیه زندگی اپنے پیدائشی ضلع میں بسر کی - وه شتول وائسن برگ Stuhlweissenburg کا متصرف اور پھر تمسوار Temesvar کا "دفتر دار" رها - ۱۰۵۱ھ/ ۱۶۴۱ء میں اس نے سرکاری خدمت سے کناره کشی کی اور اوفن چلا گیا - اس نے اپنے آخری ایام بھی اپنے مولد هی میں اپنی تاریخ لکھنے میں صرف کیے - اس کی تاریخ وفات ٹھیک معلوم نہیں، لیکن اس کا انتقال ضرور حدود ۱۰۶۰ھ/ ۱۶۵۰ء میں هوا هوگا۔

ابراهیم پچوی، جو عنفوان شباب سے برابر تاریخ کا شوقین نظر آتا هے ایک ایسی کتاب کا مصنف هے جو سنین ۹۲۶/ ۱۵۲۰ء تا ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۳۹ء کے لیے بہترین ترکی مآخذ میں سے هے - اگرچه قدیم واقعات کے ذکر میں وه اپنے ترک پیشروؤں کے بیانات پر اعتماد کرتا هے اور جیسا که K. Heltai اور N. v. Istvánffy نے دکھایا هے، هنگری مآخذ سے بھی مدد لیتا هے، تاهم بعد کے زمانے کا حال اس نے خود مشاهدے یا معلومات کی بنا پر لکھا هے - اس کی تصنیف صاف اور سلیس زبان

میں لکھی گئی ہے اور اس کے قلمی نسخے بکثرت موجود ہیں۔ (ان مخطوطوں میں جن کی تفصیل Babinger: *GOW*، ص ۱۹۳، نے دی ہے اب دو کا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے، جو اوپسالا یونیورسٹی کے کتاب خانے میں موجود ہیں، قب Zettersteen: *Katalog*، ص ۲۲، اور ایک روڈس Rhodes میں، جو حافظ احمد کی ملکیت ہے، عدد ۳۴۳)، لیکن اب تک اس کا کوئی ناقدانہ نسخہ شائع نہیں ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے کئی ابتدائی مسودے بھی لوگوں کے پاس موجود ہیں، جن میں زیر تحریر زمانوں کا کافی فرق پایا جاتا ہے اور قیاس یہ ہے کہ بعد میں ان میں اضافے کیے گئے ہوں گے۔ استانبول کی مطبوعہ تاریخ پچوی دو حصوں میں شائع ہوئی ہے (۱۰ + ۵۰۳ اور ۷ + ۴۸۷ صفحات، طبع ۱۲۸۳ھ، قب *JA*، ۱۸۶۸ء، ۱: ۳۷۱ و ۳۸۳؛ اور Kraelitz، در *Isl.*، ۸: ۲۵۹)، اس میں سلطان سلیمان اعظم کی تخت نشینی سے ۱۰۴۹ھ میں مراد چہارم کی وفات تک کے زمانے کا حال آیا ہے۔

مآخذ: F.v. Kraelitz، در *Isl.* ج ۸ (۱۹۱۸ء)؛ ص ۲۵۲ ببعد؛ اور وہ مآخذ جو Babinger: *GOW*، ص ۱۹۲ میں درج ہیں۔

(FRANZ BABINGER)

* **برتو پاشا**: دو عثمانی سیاستدانوں کا نام۔

۱۔ برتو محمد پاشا، عثمانی امیر البحر اور وزیر۔ سرکاری ملازمت کا آغاز شاہی حرم سرا کے عملے میں تقرر سے ہوا، پھر قپوجی باشی [رک بآں] اور کچھ مدت بعد ینی چری کا آغاز ہوا۔ ۹۶۲ھ / ۱۵۵۵ء میں وزیر کے درجے تک ترقی ملی۔ ۹۶۸ھ / ۱۵۶۱ء میں وزیر سوم مقرر ہوا، ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء میں وزیر دوم اور بالآخر قپودان پاشا [= امیر البحر] مؤذّن زادہ علی پاشا کی جانشینی میں شاہی بیڑے کا کمانڈر بنا دیا گیا۔ وہ بعد میں مورد عتاب ہوا، اور استانبول میں وفات پائی، جہاں وہ قبرستان ایوب میں اپنی خاص تربہ [مقبرے] میں مدفون ہوا۔

مآخذ: (۱) J.v. Hammer: *GOR*، ۳: ۳۸۲، ۳۲۸؛ (۲) محمد ثریا: سجلِ عثمانی، ۲: ۱۲ ببعد۔

۲۔ برتو محمد سعید پاشا، ترک منصب دار اور شاعر۔ یہ تاتاری النسل تھا اور اوربہ کے قریب قریۂ داریجہ میں پیدا ہوا۔ عنفوانِ شباب میں وہ دارالخلافہ استانبول آیا اور سرکاری ملازمت میں داخل ہوا۔ محرم ۱۲۴۰ھ / ستمبر ۱۸۲۴ء میں وہ بیلک جی افندی صدر محکمۂ مراسلات (referendary) بنایا گیا، اور شعبان ۱۲۴۳ھ / مارچ ۱۸۲۷ء میں "رئیس الکتاب"۔ دو برس کے بعد وہ رئیس (chancellor) کا عہدہ لیے بیٹھا اور ایک خاص کام پر مصر گیا۔ واپسی کے بعد ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء میں وہ وزیر اعظم کا نائب (کیا یہ)[= کہیا، مخفف کتخدا] مقرر ہو گیا۔ ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۵۱ھ / ۱۲ مارچ ۱۸۳۶ء کو وہ دیوانی امور کا وزیر (ملکیہ ناظری) مقرر ہوا اور مارشل (مشیر) کا خطاب ملا۔ ۱۸۳۶ء کے موسم بہار میں اسے پاشا کا خطاب ملا، لیکن اسی سال موسم خزاں میں ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ ستمبر ۱۸۳۶ء کے آغاز میں سلطان محمود ثانی نے اسے سقوطری (البانیا) میں جلا وطن کر دیا۔ حکم جلا وطنی کے چند ہفتے بعد برتو پاشا جلا وطنی کے مقام کی طرف روانہ ہوا، لیکن وہاں نہ پہنچ پایا، کیونکہ ادرنہ میں وہاں کے والی مصطفی پاشا (بقول گب: *HOP*، ۴: ۳۳۳، امین پاشا) نے اس کے اعزاز میں دعوت دی؛ اس کے تین گھنٹے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس میں کسی کو شک نہ تھا کہ یہ اچانک موت زہر خورانی کا نتیجہ تھی اور عام رائے نے اس جرم کا

مرتکب خود سلطان محمود کو قرار دیا۔ اس کے خاندانی حالات کے لیے دیکھیے سجل عثمانی، ۲: ۸۳؛ اس کا داماد وصّاف بے، جو اپنے خسر کا ہم خیال، اور سلطان محمود کا سازشی ذاتی دبیر (پرائیویٹ سیکرٹری) تھا، اعلٰی تعلیم یافتہ تھا، لیکن کردار سے محروم اور رشوت کی دسترس کے اندر تھا۔ وہ بھی برتو پاشا کی طرح اسی زمانے میں اپنا عہدہ کھو بیٹھا اور توقات [= توقاد]، (آناطولی) میں جلا وطن کر دیا گیا؛ قب Geschichte : G. Rosen der Türke، ج ۱، لائپزگ ۱۸۶۶ء، ص ۲۵۵ ببعد۔ برتو پاشا کا جانشین اس کا سیاسی بد مقابل عاکف پاشا ہوا، قب GOW : Babinger، ص ۳۵۷ ببعد۔ بحیثیت مدبّر برتو پاشا کی روش علانیہ روس کے خلاف رہی اور عیسائیوں کے ساتھ بھی کم معاندانہ نہ تھی۔

شاعر کی حیثیت سے برتو پاشا نے ایک دیوان اپنی یادگار چھوڑا ہے، جس کے متعلق یہ رائے ہے کہ وہ سلطان محمود کے عہد کے فن شاعری کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔ اس کی دو اشاعتیں ہیں: بولاق ۱۲۵۳ھ (۹۱ صفحات) اور استانبول ۱۲۵۶ھ (۱۳۰ صفحات)۔ برتو پاشا کی دوسری تصنیفات کے لیے دیکھیے بروسلی محمد طاہر: عثمانلی مؤلفلری، ۲: ۱۱۳ ببعد۔ اس کا گرانقدر کتب خانہ، جو مخطوطات سے مالا مال ہے اب سقوطری (= سقطری) میں وہاں ہے جہاں پہلے خانقاہ سلیمیہ تھی۔

مآخذ: (۱) Geshichte der Türkei : G. Rosen، ج ۱، لائپزگ ۱۸۶۶ء بمواضع کثیرہ، خصوصاً ص ۲۵۵ ببعد؛ (۲) گب: HOP، ۴: ۳۲۲ ببعد، جہاں ادرنہ میں برتو پاشا کے انتقال کے ذکر میں Jouannin اور Turquie : J. van Gaver، پیرس ۱۸۴۳ء کے حوالے دیے گئے ہیں؛ (۴) محمد ثریا: سجل عثمانی، ۲: ۲۸؛ (۵) سامی: قاموس الاعلام، ۲: ۱۳۹۴ ببعد؛ (۶) بروسلی محمد طاہر: عثمانلی مؤلفلری، ۲: ۱۱۳۔

اس برتو پاشا کو سیاستدان اور شاعر برتو ادہم پاشا سے ملتبس نہیں کرنا چاہیے، جس کا انتقال ۷ ذوالقعدہ ۱۲۸۹ھ/ ۶ جنوری ۱۸۷۳ء کو بحیثیت گورنر قسطمونی (رک بآن) ہوا اور جس کی کئی نظمیں شائع ہو چکی ہیں، مثلاً ایک "شاعنامہ" اور "لاحقہ" دیکھیے جلد ۱ (استانبول)، بدون تاریخ، اور "اطلاق الافکار فی عقد الابکار، استانبول ۱۳۰۳ھ۔ اس برتو پاشا پر قب محمد طاہر: کتاب مذکورہ ۲: ۱۱۳ ببعد۔

(FRANZ BABINGER)

پرشیا: رک بہ ایران۔

پرگنہ: دیہات کے ایک مجموعے کا ہندوستانی نام۔ سلطنت دہلی کی تواریخ میں یہ اصطلاح سب سے پہلے بظاہر شمس سراج عفیف: تاریخ فیروز شاہی (Bibliotheca Indica، ۱۸۹۱ء، ص ۹۹) میں ملتی ہے، کیونکہ حسن نظامی نے اپنی کتاب تاج المآثر یا منہاج سراج نے اپنی کتاب طبقات ناصری میں اسے استعمال نہیں کیا ہے۔ اگرچہ یہ اصطلاح پہلے چودھویں صدی عیسوی میں نمایاں ہوئی اور اس نے جزوی طور پر "قصبہ" کی جگہ لے لی، تاہم غالبًا یہ اور زیادہ قدیم تقسیموں پر مبنی ہے، جو مسلم فتوحات سے پہلے موجود تھیں؛ لہٰذا اس کی ابتدا کی ٹھیک تاریخ غیر یقینی ہے۔

پرگنے کے اندرونی نظم و نسق کا حال شیر شاہ کے عہد کی تاریخوں میں ملتا ہے، جس نے انتظامِ مالیات کی تفصیلات اپنے والد کے دو پرگنوں کے انتظام میں سیکھی تھیں، جو سہسرام (بہار) میں واقع تھے۔ جب وہ ہندوستان کا حکمران ہوا تو اس نے اپنی سلطنت کو انتظامی وحدتوں میں منظم کیا، جو "سرکاریں" کہلاتی تھیں، اور انہیں دیہات کے مجموعوں میں تقسیم کر دیا گیا، جو پرگنوں کے نام سے موسوم ہوئے۔ ہر پرگنہ ایک

"شقدار" یا فوجی پولیس افسر کی نگرانی میں تھا، جو "امین" یعنی دیوانی حاکم پرگنہ کو مدد دیتا تھا۔ امین کے دیوانی ماتحت ایک "فوطہ دار" یا خزانچی اور دو "کارکن" یا منشی ہوتے تھے، ایک ہندی اور دوسرا فارسی خط و کتابت کے لیے [یہ عہدے اگرچہ شیر شاہ سے پہلے بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود تھے لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کی تنظیم باقاعدہ طور پر شیر شاہ ہی نے کی]۔ بہر حال یہ انتظام چلتا رہا یہاں تک کہ اکبر نے سلطنتِ مغلیہ کو صوبوں میں منظم کیا، جو سرکاروں میں منقسم تھے۔ اکبر کے عہد میں سب سے چھوٹی مالی اکائی پرگنہ یا "محلّ" تھی۔ مثال کے طور پر، اودھ کا صوبہ پانچ "سرکاروں" اور اڑتیس پرگنوں میں منقسم تھا (آئین اکبری، در *Bibliotheca Indica*، ۲ : ۱۷۰ تا ۱۷۷ [مترجمۂ Jarrett، ۱۸۹۱ء).

مغل شاہنشاہوں کے ماتحت پرگنے کے بڑے عمّال قانون گو، امین، اور شقدار تھے، جو پرگنے کے حسابات، تشخیصِ مالگذاری، زمینوں کی پیمایش، اور کسانوں کے حقوق کی حفاظت کے ذمے دار ہوتے تھے۔ اسی طرح ہر گاؤں میں ایک پٹواری یا محاسبِ دِہ مقرر کیا جاتا تھا، جس کے فرائض گاؤں میں اسی قسم کے ہوتے تھے جیسے پرگنے میں قانون گو کے۔ یہ ہرگز خیال نہ کرنا چاہیے کہ پرگنہ کوئی مستقل اور یکساں اکائی تھا، بلکہ نہ صرف یہ کہ وہ ملک کے مختلف حصوں میں رقبے کے لحاظ سے گھٹتا بڑھتا رہتا تھا بلکہ اکثر زمین کے نئے بندوبست کے بعد ان مالی اکائیوں کی نئی تقسیم اور حد بندی کر دی جاتی تھی۔ ایک ہی پرگنے کا کسی ایک ہی خاندان یا قبیلے کے زیرِ تصرف دیکھ کر یہ قیاس بھی پیدا ہوتا ہے، کہ وہ نہ صرف ادائے مالگذاری کے لیے ایک معین رقبہ تھا، بلکہ اپنی تخلیق کے وقت جائداد کی تقسیم پر مبنی تھا۔

چوبیس پرگنہ: بنگال کا ایک ضلع، جو ۲۱° ۳۱′ اور ۲۲° ۵۷′ عرض بلد شمالی اور ۸۸° ۲۰′ اور ۸۹° ۶′ طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے۔ اس کا نام ان پرگنوں کی تعداد پر مبنی ہے جو اس زمینداری میں شامل تھے جسے ۱۷۵۷ء میں میر جعفر، بنگال کے نواب ناظم نے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا تھا۔ اس کی توثیق مغل شہنشاہ نے ۱۷۵۹ء میں کی، جب اُس نے کمپنی کو اس رقبے پر دوامی حقوق مالکانہ عنایت کر دیے۔ اسی سال لارڈ کلائو Clive کو، ان خدمات کے صلے میں جو اس نے میر جعفر کے لیے انجام دی تھیں، اس ضلع کے محاصل دے دیے گئے۔ اس عطیّے نے، جس کی میزان ۳۰،۰۰۰ پونڈ سالانہ تھی، کلائو کو کمپنی کا نوکر ہونے کے علاوہ کمپنی کا زمیندار بھی بنا دیا۔ یہ رقم اسے اس کی وفات کے وقت تک، جو ۱۷۷۴ء میں ہوئی، برابر ملتی رہی، جس کے بعد شہنشاہ کی منظور کردہ ایک دستاویز کی رُو سے، زمین اور محاصل کا پورا مالکانہ حق کمپنی کی طرف منتقل ہو گیا۔

مآخذ: متن میں دے دیے گئے ہیں [نیز Moreland : *Agrarian System of the Mughals*، اور جو مآخذ اس میں ہیں]۔

(C. COLLIN DAVIES)

پرَنگ سبِیل: Prang Sabil (= پرانگ سابل)، مجمع الجزائر ہند شرقی میں جہاد (رَنگ باَن) کے معنوں میں مستعمل ہے۔ Prang "پرنگ" انڈونیشی زبان میں جنگ کو کہتے ہیں۔

مآخذ: (۱) C. Snouck Hurgronje : *De Atjèhers*، بٹاویا ۱۸۹۳ تا ۱۸۹۴ء، ۱ : ۱۸۲ ببعد؛ (۲) وہی مصنف : *Verspreide Geschriften*، ۲ : ۱۲۲؛ (۳) H. T. Damsté : *Atjehsche* ... ۲/۴ : ۲۲۲ ببعد؛

oorlogspapieren، در Indische Gids، ۱۹۰۲ء، ۱ : ۶۱۷ ببعد، ۷۷۶ ببعد؛ (۴) وہی مصنف : *Hikajat Prang Sabil*، (متن و ترجمہ)، در BTLV، ۸۳ : ۵۴۵ ببعد.

(R. A. KERN)

- **پروانہ** : رَکّ بہ معین الدین سلیمان.

- **پریم** : (= پیرم Perim) بحر احمر کے دہانے پر ایک جزیرہ، جس کا عرض بلد شمالی ۱۲ درجے ۴۰ دقیقے ۳۰ ثانیے اور طول بلد شرقی ۴۳ درجے ۲ دقیقے ہے۔ عرب اسے مایون کہتے ہیں۔ اس پر انگریزوں کا تسلّط رہا ہے۔ یہ جزیرہ عدن کے ملحقات میں سے ہے اور عدن سے مغرب کی طرف چھیانوے میل دور اور ساحل عرب سے دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

اس جزیرے کو سرزمین عرب سے جدا کرنے والی تنگ آبنائے باب المَنْہلی کہلاتی ہے۔ اس طرح پریم کے ذریعے بحر احمر کے دہانے کی نگرانی کی جا سکتی ہے اور خود پریم کی نگرانی جبل المنہلی سے ہو سکتی ہے، جو بندرگاہ شیخ سعید کی ایک پہاڑی ہے، بشرطیکہ اس کی قلعہ بندی اسی طرح کر دی جائے، جیسے پہلی جنگ میں ترکوں نے کی تھی۔

جزیرے کا طول چار میل ہے اور عرض ڈیڑھ میل۔ شکل نعل اسپ کے مشابہ ہے اور رقبہ پانچ مربع میل ہے۔ جنوب کی راس اَلْبرٹ (Cape Albert) اور ساؤتھ پوائنٹ South Point کے درمیان دو بندرگاہیں ہیں، جن میں سے بڑی بندرگاہ یعنی "براؤن بے" Brown Bay کا زیادہ سے زیادہ عرض ڈیڑھ میل اور کم سے کم نصف میل ہے۔ یہاں جہاز بحفاظت تمام لنگر انداز ہو سکتے ہیں، کیونکہ اس کی گہرائی تین سے لے کر آٹھ مسمار (fathom) تک ہے۔ جزیرے کے مشرقی سرے پر روشنی کا وہ مینار ہے جو انگریزوں نے ۱۸۶۱ء میں تعمیر کیا تھا۔ یہ جزیرہ اس برکانی چٹان سے بنا ہے جو بحر احمر کو جانے والے اتھلے دہانے پر واقع ہے۔ جزیرے کا زیادہ تر حصہ برکانی طبقۂ ارضی سے ڈھکا ہوا ہے جس کے اوپر برکانی مادے کی ایک سیاہی مائل سخت نہ جمی ہوئی ہے۔ کہیں کہیں پہاڑیاں بھی ہیں، جن میں سب سے اونچی دو سو پچاس فٹ ہے اور جو ساحل کی طرف رفتہ رفتہ ڈھلوان ہوتی چلی گئی ہیں۔ جزیرے پر نباتی سواد بہت کم ہے اور پینے کا پانی نہ ملنے کی وجہ سے عدن سے لانا پڑتا ہے۔ اس طرح بڑے پیمانے پر کاشت اور گنجان آبادی کاری کے ذرائع بالکل مفقود ہیں۔ آب و ہوا کے لحاظ سے پریم کا موسم مغربی اور جنوبی تہامہ کے موسم کے بین بین ہے۔ اس کا انتہائی درجۂ حرارت مغربی تہامہ کے انتہائی اوسط درجۂ حرارت سے بھی زیادہ ہے (جولائی میں ۳۷۰۸ سنٹی گریڈ)۔ موسم گرما کی آمد پر درجۂ حرارت بڑھنا شروع ہوتا ہے، پھر جولائی سے ستمبر تک خاصا یکساں رہتا ہے، یعنی ان میں سے کوئی مہینا بھی دوسروں سے نمایاں طور پر زیادہ گرم نہیں ہوتا۔ بارش کا انحصار موسمی ہواؤں پر ہے۔ اپریل کے آخر میں طوفان برق و باد کے ساتھ تیز بارش ہوتی ہے۔ آج کل پریم کی اہمیت یہ ہے کہ یہاں بحر احمر میں جانے والے جہازوں کے لیے کوئلا اور سامان خور و نوش جمع رکھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ایسٹرن ٹیلیگراف کمپنی (Eastern Telegraph Co.) نے یہاں اپنا سٹیشن بھی بنا رکھا ہے، جو تار کے ذریعے، عدن، شیخ سعید اور الحدیدۃ کی بندرگاہوں سے مربوط ہے۔

قدیم جغرافیہ نگار پریم کو Διοδώρου νῆσος کے نام سے جانتے تھے (*Periplus maris Erythraei*، فصل ۲۵)؛ Pliny (*Nat. Hist.*، ۶ : ۱۷۵) نے اسے اَیڈنُو Adanu [= عدن] کا جزیرہ کہا ہے۔ پرتگیز اس سے میہو Meho کے نام سے واقف تھے۔ البوکرک

Albuquerque نے ۱۵۱۳ء میں اسے ویرا کروز Veracruz کا نام دیا تھا۔

ایک بے آب و گیاہ جزیرہ ہونے کی وجہ سے غالباً اس کی کبھی کوئی اہمیت نہیں رہی، اس کے سوا کہ بحری ڈاکوؤں نے اسے ایک زمانے میں اپنا اڈا بنا لیا تھا اور یہاں سے وہ بحر احمر اور بحرِ ہند کے جہازوں پر دھاوے بولا کرتے تھے؛ لیکن یہاں ضروری اشیا کی فراہمی کی دقت کی وجہ سے انھوں نے بعد میں اس کے بجائے مدغاسکر کے ساحل پر سینٹ ماری St. Marie کو اپنا مرکز بنا لیا۔ جس زمانے میں فرانس نے مصر پر حملہ کیا تھا (۱۷۹۹ تا ۱۸۰۱ء) تو اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی نے عارضی طور پر پریم کو اپنے تصرف میں لے لیا تاکہ فرانسیسی لوگ اس راہ سے نہ آ سکیں، جیسا کہ نپولین کا منصوبہ تھا، اور اپنی کچھ فوج یہاں بھیج دی اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہاں سے افریقی ساحل پر آنے جانے والے جہازوں پر گولہ باری نہیں کی جا سکتی تو یہ فوج واپس بلا لی گئی۔ اس کے بعد انگلستان نے ۱۸۵۷ء میں پریم پر دوبارہ قبضہ کر کے جزیرے کی قلعہ بندی کر دی اور براؤن بے Brown Bay پر بارکیں بنوا دیں۔

مآخذ: (۱) C. Niebuhr: *Reisebeschreibung nach Arabien und anderen umliegenden Ländern*، کوپن ہیگن ۱۷۷۴ء، ۱: ۳۳۸ ببعد؛ (۲) C. Ritter: *Die Erdkunde von Asien*، برلن ۱۸۴۶ء، ۸/۱: ۶۶۶ تا ۶۶۸؛ (۳) J. S. King: *Description and History of the British outpost of Perim*، ۱۸۷۷ء؛ (۴) M. Hunter: *Statistical Account of Aden*، ۱۸۷۷ء، ص ۱۷۱ ببعد؛ (۵) A. Spalding: *Historical Sketch of the Coaling Station at Perim-Island*، لیورپول ۱۸۹۰ء؛ (۶) E. Glaser: *Skizze der Geschichte und Geographie Arabiens*، برلن ۱۸۹۰ء، ۲: ۱۶۹؛ (۷) W. Schmidt: *Das südwestliche Arabien*، فرانکفرٹ Frankfurt ۱۹۱۳ء، ص ۳۴، [illegible] ۳۵؛ (۸) *Handbooks prepared under the direction of the Foreign Office*، شمارہ ۶۱ *Arabia*، لنڈن ۱۹۲۰ء، ص ۱۲، ۵۳، ۶۳، ۱۱۶؛ (۹) *Die Insel Perim und die Eingänge in das Rothe Meer*، در *Peterm. Mitt.*، ۱۸۵۸ء: ۱۶۳ ببعد۔

(A. GROHMANN)

پریم چند: اردو اور ہندی کے مشہور اور ہردلعزیز افسانہ نگار اور ناول نویس۔ اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ گھر میں انھیں پیار سے نواب رائے کہا جاتا تھا اور اسی نام سے انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا، لیکن آگے چل کر وہ پریم چند کے نام سے لکھنے لگے۔

منشی پریم چند کے والد منشی عجائب لال بنارس سے پانچ چھے میل دور لمہی نام کے ایک گاؤں کے رہنے والے کائستھ تھے۔ یہیں "دھنپت رائے" ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کی تھوڑی سی زمین تھی۔ اس کے علاوہ وہ ڈاک خانے میں پندرہ بیس روپے ماہوار کے منشی تھے۔ زندگی بڑی تنگی ترشی سے بسر ہوتی تھی۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق پہلے پریم چند نے گاؤں کے مولوی صاحب سے مکتب میں پڑھا اور جب ان کے والد کا تبادلہ گاؤں سے گورکھ پور ہو گیا تو انھیں شہر کے سکول میں داخل کر دیا گیا۔ اس دوران میں پریم چند کی زندگی میں کئی واقعات ایسے ہوئے جنھوں نے ان کی خارجی اور داخلی زندگی پر بہت اثر ڈالا۔ سات سال کی عمر میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد والد نے دوسری شادی کر لی اور اس طرح گھر کی فضا پہلے سے زیادہ تلخ ہو گئی۔ گورکھ پور میں قیام کے زمانے میں انھوں نے ایک کتب فروش سے لے کر سرشار،

شرر، رسوا، محمد علی کے ناول، رینالڈز Reynolds کے ناولوں کے ترجمے اور طلسم ہوش ربا کے کئی حصے پڑھے ۔ کچھ عرصے بعد منشی عجائب لال تبدیل ہو کر پھر اپنے گاؤں کے ڈاکخانے میں آ گئے اور یہاں آ کر پندرہ سال کی عمر میں پریم چند کی مرضی کے خلاف ان کی شادی کر دی ۔ تھوڑے دن بعد منشی عجائب لال کا انتقال ہو گیا اور بیوی، سوتیلی ماں اور دو سوتیلے بھائیوں کی ذمے داری پریم چند کے سر پر آ گئی ۔ انھوں نے ابھی انٹرنس پاس نہیں کیا تھا ۔ وہ روزانہ ننگے پیر دس میل چل کر بنارس آتے جاتے، ٹیوشن کرتے اور رات کو گھر لوٹ کر کپی کی روشنی میں پڑھتے ۔ اس طرح ۱۸۸۹ء میں انٹرنس پاس کیا ۔ حساب میں کمزور ہونے کی وجہ سے کالج میں داخلہ نہ مل سکا، چنانچہ ایک سکول میں اٹھارہ روپے مہینے پر ملازم ہو گئے اور مدتوں فاقہ مستی میں زندگی بسر کی ۔ ۱۹۰۴ء میں الہ آباد ٹریننگ کالج سے تدریس کی سند حاصل کی اور ۱۹۰۵ء میں سرکاری ملازم ہو کر کانپور چلے گئے ۔ یہاں منشی دیا نرائن نگم، مدیر زمانہ، سے مراسم بڑھے ۔ ۱۹۰۸ء میں ان کا تبادلہ ہمیر پور ہو گیا، لیکن وہاں صحت خراب رہنے لگی، چنانچہ ۱۹۱۴ء میں بستی میں تبادلہ کروا لیا ۔ ۱۹۱۵ء میں انھوں نے پرائیویٹ طور پر انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا اور کامیاب ہو گئے ۔ ۱۹۱۸ء میں وہ تبادل ہو کر گورکھپور آ گئے ۔ اگلے سال وہ بی ۔ اے ہو گئے ۔ ۱۹۲۰ء میں جبکہ تحریک عدم تعاون پورے شباب پر تھی اور جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے، گاندھی جی گورکھپور آئے ۔ ان کی ایک تقریر کا پریم چند نے یہ اثر لیا کہ بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا ۔ اب تک زندگی صحت کی خرابی اور شدید ذہنی اضطراب کا شکار رہی تھی، اب انہیں معاشی بد حالی کا پہلے سے کہیں زیادہ مقابلہ کرنا پڑا ۔ ۱۹۲۲ء میں انھوں نے چرخوں کی دکان کھولی، لیکن وہ نہ چلی؛ کانپور کے ایک پرائیویٹ سکول میں ملازمت کی، لیکن نہ نبھی؛ بالآخر بنارس میں سرسوتی پریس قائم کیا اور اس میں بھی نقصان اٹھایا ۔ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۹ء میں دو مرتبہ نولکشور پریس لکھنؤ میں ملازمت کی ۔ وہاں درسی کتابیں لکھیں اور ایک ہندی رسالے مادھوری کی ادارت کی ۔ بیچ کا عرصہ بنارس میں گزارا اور ۱۹۲۹ء میں وہاں سے اردو اور ہندی میں ایک رسالہ ہنس جاری کیا ۔ حکومت نے کئی بار اس کی ضمانت ضبط کی، لیکن پریم چند آخر دم تک اسے کسی نہ کسی طرح چلاتے رہے ۔ ۱۹۳۳ء میں وہ ایک فلم کمپنی کے بلاوے پر بمبئی گئے، جہاں ان کی ایک کہانی پر مبنی فلم مل مزدور تیار ہوئی، لیکن حکومت نے اس کی نمائش پر پابندیاں عائد کر دیں ۔ دوسری فلموں کے سلسلے میں فلم کمپنیوں کے مالکوں اور ان کے خیالات میں ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکی اور وہ دل برداشتہ ہو کر بنارس لوٹ آئے ۔ یہاں پہنچ کر ان کی زندگی کے آخری ایام تنگدستی اور مسلسل علالت کے باعث بہت تکلیف میں گزرے ۔ ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو انھوں نے وفات پائی ۔ ان کا اپنی پہلی بیوی سے نباہ نہ ہو سکا تھا، چنانچہ دونوں میں جلد ہی علیحدگی ہو گئی تھی ۔ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے اپنے خاندان کی مرضی اور رواج کے خلاف ایک نو عمر بیوہ شیورانی دیوی سے شادی کر لی، جو صحیح معنوں میں ان کی رفیقۂ حیات ثابت ہوئیں ۔ منشی پریم چند نے ایک بیٹی کملا اور دو بیٹے شری پت رائے اور امرت رائے اپنے پیچھے چھوڑے ۔

پریم چند کی پہلی تخلیق ایک مزاحیہ ڈراما

تھا، جو انھوں نے چودہ سال کی عمر میں اپنے ایک بد اطوار ماموں کی اصلاح کے لیے لکھا تھا۔ [اگلے سال انھوں نے ایک اور ڈراما ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات لکھا۔ یہ دونوں ڈرامے طبع نہیں ہوئے اور ان کے مسودے بھی ضائع ہو چکے ہیں۔ باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز پانچ چھے سال بعد ہوا]۔

پریم چند اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ایک بڑے افسانہ نگار اور اس سے بھی بڑے ناول نگار سمجھے جاتے ہیں۔ اپنی تقریباً پینتیس سال کی ادبی زندگی میں انھوں نے جو کچھ لکھا اس پر ایک بلند قومی نصب العین کی مہر لگی ہوئی ہے۔ ان کی تمام تحریروں میں ایک شدید قسم کا جذبۂ وطنیت جھلکتا ہے، قومی آزادی کی تڑپ پائی جاتی ہے اور بیسویں صدی کے ابتدائی تیس پینتیس برسوں کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کا صحیح عکس ملتا ہے۔

[عام طور پر کہا جاتا ہے کہ منشی پریم چند کی ادبی تخلیقات کا آغاز ایک مختصر ناول اسرار محبت سے ہوا، جو ۱۸۹۸ء میں بنارس کے ہفتہ وار آوازۂ خلق میں بالاقساط شائع ہوتا رہا؛ لیکن تازہ ترین تحقیقات سے پتا چلتا ہے کہ اس ناول کا نام دراصل اسرار معابد تھا اور یہ ۱۹۰۳ اور ۱۹۰۴ء کے درمیان سلسلہ وار آوازۂ خلق میں نکلتا رہا (عبداللہ خاں، ص ۲۵۲۰ ببعد)۔ پریم چند کے ایک قریبی دوست منشی پتاب بریلوی کا بیان ہے کہ ان کا پہلا ناول پرتاب چندرا تھا (زمانہ، پریم چند نمبر، ص ۵۴)، جو ۱۹۰۱ء میں لکھا گیا، لیکن شائع نہیں ہو سکا اور کچھ عرصے بعد جلوۂ ایثار کی شکل میں منظر عام پر آیا (مدن گوپال، ص ۶۱)۔ ان کا تیسرا ناول کشنا ۱۹۰۴ء کے آخر میں شائع ہوا، لیکن اب نایاب ہے۔ چوتھا ناول ہم خرما وہم ثواب غالباً ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ یہی ناول ۱۹۰۵ء میں پریما (نیز پرتگیا اور وبھو) کے نام سے ہندی میں چھپ چکا تھا (مدن گوپال، ص ۶۰)۔ اسی کے پلاٹ کو انھوں نے بعد ازاں اپنے ایک اور ناول بیوہ (بنارس ۱۹۰۹ء) میں پیش کیا۔ ۱۹۱۲ء میں جلوۂ ایثار نمودار ہوا (جو بعد ازاں ہندی میں وردان کے نام سے نکلا)۔ ۱۹۱۶ء میں منشی پریم چند نے اپنا ضخیم ناول بازار حسن ختم کیا، لیکن اس کے لیے کوئی ناشر نہ مل سکا، چنانچہ یہ کہیں ۱۹۲۲ء میں طبع ہو سکا حالانکہ اس کا ہندی ترجمہ سیوا سدن اس سے بہت قبل شائع ہو کر مقبول و معروف ہو چکا تھا۔ اس کے بعد جو ناول لکھے گئے ان کی اشاعت کے سلسلے میں بھی یہی کیفیت برقرار رہی۔ گوشۂ عافیت ۱۹۲۲ء میں ختم ہوا اور ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا، لیکن اس کا ہندی ایڈیشن پریم آشرم ۱۹۲۲ء ہی میں چھپ گیا تھا۔ ہندی میں نرملا ۱۹۲۳ء میں چھپا اور اردو میں ۱۹۲۹ء میں۔ چوگان ہستی ۱۹۲۴ء میں لکھا گیا۔ اس کا ہندی ایڈیشن رنگ بھومی اسی سال شائع ہو گیا اور ہندوستانی اکیڈمی نے اسے سال کی بہترین تصنیف قرار دیا، لیکن اردو ایڈیشن ۱۹۲۷ء میں چھپ سکا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند آہستہ آہستہ ہندی ہی کے ہو رہے تھے، کیونکہ ہندی ناشرین کتب سے انھیں بہتر معاوضہ مل جاتا تھا۔ اردو میں ناولوں کو بعد میں منتقل کیا جاتا اور اس کام میں سحر ہنگامی ان کا ہاتھ بٹاتے تھے (عبداللہ خاں، ص ۳۶۲)۔ ۱۹۲۸ء میں منشی پریم چند نے اپنا ہندی ناول کایا کلپ اپنے ہی پریس میں چھاپا۔ اس کا اردو ایڈیشن پردۂ مجاز ۱۹۳۱ - ۱۹۳۲ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ غبن ہندی میں ۱۹۳۱ء میں اور اردو ترجمہ ۱۹۳۲/ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ میدان عمل ان کا ممتاز ترین ناول ہے۔ یہ بھی پہلے ہندی میں لکھا اور چھاپا گیا (کرم بھومی،

سرسوتی پریس بنارس ۱۹۳۲ء) اور اردو ترجمہ ان کی وفات سے کچھ پہلے ۱۹۳۶ء میں مکتبۂ جامعہ، دہلی نے شائع کیا ۔ یہ ناول پچھلے پندرہ سال کی تمام تحریکوں کا نفسیاتی اور حقیقت پسندانہ مطالعہ تھا ۔ گؤدان (ہندی) پریم چند کا آخری ناول ہے، جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا ۔ سحر ہنگامی نے ان کی وفات کے بعد اس کا اردو میں ترجمہ کیا، جسے مکتبۂ جامعہ نے شائع کیا ۔ بعض نقادوں کے نزدیک یہ ان کی بہترین تخلیق ہے اور ”جیسی مکمل، جیتی جاگتی اور سچی تصویر دیہاتی زندگی کی انہوں نے اس ناول میں کھینچی ہے، ادب اردو میں ایسی دوسری چیز میسر نہیں (کشن پرشاد کول، ص ۱۷۸، ۱۹۴۷ء) ۔ اپنے آخری ایام میں پریم چند نے منگل سوتر لکھنا شروع کیا تھا، مگر صرف چار باب لکھ سکے ۔ یہ نامکمل ناول ہندی میں شائع ہو چکا ہے]۔

ناولوں کے علاوہ پریم چند کے افسانوں کے گیارہ مجموعے شائع ہوے ہیں ۔ [ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۰۷ء میں ہوا جب زمانہ میں ان کی پہلی کہانی دنیا کا سب سے انمول رتن شائع ہوئی ۔ ۱۹۳۶ء تک انہوں نے کئی سو کہانیاں لکھیں، لیکن اردو کہانیوں کی تعداد تقریباً دو سو ہے، کیونکہ بہت سی ہندی کہانیاں اردو میں منتقل نہیں ہو سکیں] ۔ پہلا مجموعہ سوز وطن ۱۹۰۷ء میں نواب رائے کے قلمی نام سے زمانہ پریس کانپور میں چھپا ۔ اس کی اشاعت پر ان سے سرکاری طور پر باز پرس ہوئی اور اس کے نسخے نذر آتش کر دیے گئے ۔ اس کے بعد انہوں نے پریم چند کے نام سے لکھنا شروع کیا ۔ دوسرے مجموعوں کے نام یہ ہیں : پریم پچیسی، ۲ حصے (دارالاشاعت پنجاب، لاہور ۱۹۱۳ء)؛ پریم بتیسی، ۲ حصے (دارالاشاعت پنجاب، لاہور ۱۹۲۰ء)؛ پریم چالیسی، ۲ حصے (گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور، بدون تاریخ)؛ فردوس خیال (انڈین پریس، الہ آباد ۱۹۲۹ء)؛ خاک پروانہ اور خواب و خیال (مطبوعۂ لاجپت رائے اینڈ سنز، لاہور، بدون تاریخ)؛ آخری تحفہ اور زادراہ (حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۳۶ء)؛ دودھ کی قیمت (عصمت بکڈپو، دہلی ۱۹۳۷ء)؛ واردات (مکتبۂ جامعہ، دہلی ۱۹۳۷ء) ۔

دیگر تصانیف میں باکمالوں کے درشن (سوانحی مضامین کا مجموعہ)، کربلا (تاریخی ڈراما) اور رام چرچا (حالات رام چندر جی) قابل ذکر ہیں۔

[اردو کا افسانوی ادب جتنا پریم چند سے متأثر ہوا ہے اتنا کسی اور مصنف سے نہیں ہوا ۔ ان کی متعدد تخلیقات کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے ۔ جہاں تک تحقیق و تنقید کا تعلق ہے]۔ پریم چند کے بارے میں اردو اور انگریزی میں کم اور ہندی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔

مآخذ : انگریزی میں : (۱) مدن گوپال : *Prem Chand*، مطبوعۂ لاہور؛ (۲) اندر ناتھ مدان : *Prem Chand*، لاہور ۱۹۴۶ء؛ [(۳) رام بابو سکسینہ : *History of Urdu Literature* (اردو ترجمہ از مرزا محمد عسکری، ص ۱۲۸)؛ (۴) شائستہ اکرام اللہ : *A Critical Survey of the Development of Urdu Novel and Short-Story*]؛ ہندی میں : (۵) رام بلاس شرما : پریم چند، مطبوعۂ سرسوتی پریس، بنارس؛ (۶) رام رتن بھٹناگر : پریم چند، الہ آباد ۱۹۴۲ء؛ (۷) جنار دھن جھا : پریم چند کی اپنیاس کلا، ودیا مندر ۱۹۴۳ء؛ (۸) پریم نرائن ٹنڈن : پریم چند، الہ آباد ۱۹۴۲ء؛ (۹) رام بلاس شرما : پریم چند اور ان کا یگ، دہلی ۱۹۵۲ء؛ (۱۰) اندر ناتھ مدان : پریم چند، مطبوعۂ دہلی؛ (۱۱) شیو رانی دیوی : پریم چند گھر میں، مطبوعۂ سرسوتی پریس، بنارس؛ [(۱۲) ہنس، آتم کتھا نمبر]؛ اردو میں : (۱۳) ہنس راج رہبر :

پریم چند، دہلی ۱۹۵۰ء؛ (۱۳) زمانہ، پریم چند نمبر، کانپور ۱۹۳۷ء؛ [(۱۴) کشن پرشاد کول: نیا ادب، مطبوعۂ انجمن ترقی اردو، دہلی؛ (۱۵) عبید اللہ خان: پریم چند، ان کا عہد اور فن، مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی، در کتاب خانۂ جامعۂ پنجاب، لاہور۔ اس میں مزید مآخذ بھی درج ہیں]۔

(سید وقار عظیم [و ادارہ])

* **پِزِنْتَرن**: رک بہ بِسْتِرن۔

* **پِسارو وِتز**: رک بہ پشاروتز Požarevac۔

* **پِسْت**: (ف)، غذا کی ایک قسم، جیسے غزالوں کی کلیجی اور باداموں وغیرہ کو ملا کر بناتے ہیں۔ وہ درویش اور دوسرے لوگ جو طویل روزہ رکھتے ہیں، مثلاً چلّہ یا چالیس دن کا روزہ، اس کی ایک بستے کے برابر خوراک روزانہ کھاتے ہیں اور وہ آدمی کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ [فرہنگ آنند راج میں پست کے معنی ہر قسم کا آٹا عموماً اور بھنا ہوا آٹا (ستو) خصوصاً لکھے ہیں۔ سند میں یہ دو شعر پیش کیے ہیں:

منم روی از جہان در گوشہ کردہ
کفی پستِ جوین را توشہ کردہ
(نظامی)

اشک چشمم در دہان افتد گہ افطار از آنک
جز باب گرم پستی نگزرد در نای من
(خاقانی)]۔

مآخذ: (۱) Vullers: *Lexicon Persico-Latinum*، بذیل مادۂ پست؛ چلّہ؛ [(۲) فرہنگ آنند راج، بذیل مادّہ]۔

(R. Levy)

* **پَسِر**: سلطنت پَسِر جنوب مشرقی بورنیو میں واقع اور دریائے پسر یا کندلو کی وادی پر مشتمل تھی۔ یہ دریا شمال میں کوتی Kutei کی سرحدوں سے نکل کر جنوب مشرق کا رخ کرتا ہے اور براتس Beratos کے مشرقی کنارے کے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ جاتا ہے، پھر مشرق کی طرف مڑتا ہے اور ایک دلدلی علاقے سے گزر کر آخر کار آبنائے ملکّا میں جا گرتا ہے۔ یہ ملک رقبے میں تقریباً ۱۱۲۵ مربع کیلومیٹر تھا۔ [۱۹۳۶ء] تک یہاں اس تمام اراضی پر پرانے جنگل پھیلے ہوئے ہیں، جنھیں یہاں کی قلیل آبادی نے دھان کی کھیتی کے لیے درختوں سے صاف نہیں کیا۔ یہ آبادی زیادہ تر پسر میں، جہاں سلطان رہتا تھا یا تنہ گروگوٹ Tanah Grogot میں جہاں سرکاری دفاتر تھے، پائی جاتی تھی۔ باوجودیکہ کچھ سونا، پٹرولیم اور معدنی کوئلا پسر میں پائے جاتے ہیں، اہل یورپ نے انھیں نکال کر فائدہ نہیں اٹھایا؛ انھوں نے زراعت کی طرف اور بھی کم توجہ دی۔ ایک یورپی انتظامی اہلکار سب سے اوّل ۱۹۰۱ء میں تنہ گروگوٹ میں دریائے کندلو کے دہانے پر متعین ہوا تھا۔ اس لحاظ سے سواحل بورنیو پر یہ ریاست اس بات کی ایک اچھی مثال ہے کہ یورپی اثر سے آزاد رہ کر یہاں اسلام نے کیا ترقی کی۔ ریاست کی آبادی [۱۹۳۶ء میں] تقریباً سترہ ہزار تھی اور یہ تین گروہوں پر مشتمل ہے: (۱) ڈیک (Dayak)، جو دھان کی کاشت سے زندگی بسر کرتے ہیں؛ (۲) جزائر ملاویسی Celebes کے تارک الوطن بنجاری Bandjarese اور بگنی Buginese، جن کے ہاتھ میں تجارت ہے: یہ لوگ خاص طور پر دریا کے دہانے پر میدانی قطعات میں پائے جاتے ہیں؛ (۳) ساحل پر ماہی گیروں کی ایک نسل باجو (Badjos) اپنے دیہات میں رہتی ہے، جو سمندر میں لکڑیاں گاڑ کر بنائے جاتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء سے پہلے قبیلۂ ڈیک کے نو ہزار افراد میں سے تقریباً چار ہزار نے اسلام قبول کر لیا، باقی پانچ ہزار پہاڑیوں میں رہنے لگے۔ ان کا کوئی

دین مذہب نہیں۔ پانچ ہزار بُگنی اپنی بڑی تعداد اور خوش‌حالی کے باعث غالب اثر رکھتے ہیں۔ بارہ سو بنجاریوں کو کم اہمیت حاصل ہے۔ پسر میں گنتی کے چند ہی یورپین ہیں اور معدودے چند چینی اور عرب۔ اس حساب سے نصف آبادی بدیشی ہے؛ لیکن دیک کی طرح یہ باہر والے بھی ملائی نسل کے ہیں اور ایک دوسرے سے میل جول رکھتے ہیں۔

پسر پر سلطان اور اُس کے ارکان خاندان کی مطلق العنان حکومت تھی، جس میں رعایا کی کوئی آواز نہیں تھی۔ سلطان اور اس کے ولی عہد کے ساتھ پانچ عمائد کی ایک مجلس تھی، جس سے سلطان اہم مواقع پر مشورہ کرتا تھا۔ یہ ملک کی سب سے بڑی عدالت بھی تھی۔ یہ ممتاز اشخاص اور شاہی خاندان کے دیگر متعدد افراد جاگیروں کے طور پر جائدادیں رکھتے تھے۔ ۱۸۴۴ء سے ہر سلطان تخت نشینی کے وقت شرق الہند ولندیزی حکومت سے عہد نامہ کرتا رہا۔ ۱۹۰۸ء میں انہوں نے اس حکومت کے خراج گزار بن جانے کا اعلان کیا۔ ۱۹۰۰ء میں اشیاے درآمد و برآمد کے محاصل اور اسی کے ساتھ افیون اور نمک کا اجارہ نقد رقم کے معاوضے میں ولندیزی حکومت کو تفویض کر دیا۔ معاوضے کی سالانہ مقدار ۱۶۸۰۰ گلڈن gulden تھی، جس میں سے ۱۱۲۰۰ سلطان کو جاتے تھے اور ۵۶۰۰ دوسرے عمائد کو۔

سلطان حسب ذیل محاصل بھی وصول کرتا تھا: جزیہ بالغ مردوں سے؛ دسواں حصہ دھان کے کھیتوں کی فصلوں اور جنگل کی پیداوار سے اور دو ناریل ہر بارآور درخت سے؛ فوجی خدمت اس کے علاوہ تھی۔

[پسر اب جمہوریۂ انڈونیشیا کے صوبۂ کالی منتان کا حصہ ہے]۔

اس ملک کی افسانوی تاریخ سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مطلق العنان حکومت، جو دیک کے لیے بدیشی تھی، مشرقی جاوا سے یہاں داخل ہوئی۔ حکمران جماعت سے نیچے چھوٹے درجے کے سردار، مذہبی پیشوا، زمیندار اور آزاد لوگ یہاں کا متوسط طبقہ تھے۔ اس صدی کے آغاز تک پسر میں غلام اور قرضدار غلام پست طبقے کے طور پر تھے، اگرچہ غلامی بہت پہلے ولندیزی اثر کے ماتحت جزائر شرق الہند کی دوسری ریاستوں میں موقوف کر دی گئی تھی۔ جیسا کہ دیگر دیک قبائل میں معمول ہے یہاں بھی غلام آزاد آدمیوں کی طرح رہتے سہتے تھے، ہر قسم کے کھیلوں اور تہواروں میں حصہ لیتے تھے، جائداد کے مالک ہو سکتے تھے اور ان کے لباس میں بھی کوئی خاص فرق نہیں ہوتا تھا۔ اگر ان کا قرض ان کے آقا کو کوئی دوسرا ادا کر دیتا تو وہ پہلے کو چھوڑ کر اس دوسرے کے پاس آ جاتے۔ غلام بیچے نہیں جاتے تھے۔

چونکہ مسلم بُگیوں، بنجاریوں اور باجوں کی معاشرتی حالت پہلے اور جگہ بیان کی جا چکی ہے، لہٰذا ذیل کے ملاحظات بے دین دیکوں اور ان کے مسلمان ہم قوم پسریوں تک محدود ہیں۔

روایت کے بموجب ایک عرب مسمّی توان سید نے پسر کو اسلام سے روشناس کیا۔ یہاں کے حاکم وقت کی لڑکی سے اُس کی شادی نے اس ملک میں اسلام کی ترقی کو بہت تقویت پہنچائی۔

پسریوں کا جہاں تک تعلق ہے ان کی معاشرتی زندگی صرف سطحی طور پر اسلام سے متاثر ہوئی تھی۔ ان کی روز مرّہ کی زندگی میں بت‌پرستی اور عالمِ ارواح کی پرستش کا مشرکانہ عقیدہ عام رہا، مثلاً انسان کی قسمت پر روحوں کے خاص اثر کا پرانا عقیدہ اور ان کی نشانیوں پر یقین۔ یہ واقعہ بھی معنی خیز ہے

کہ پسر بھر میں صرف ایک مسجد (Missigit) اور چند چھوٹی عبادت گاہیں ہیں ۔ مسلمان مولویوں اور حاجیوں کی تعداد بھی کم ہے اور مکّے کے سفر حج کا زیادہ شوق بھی نہیں پایا جاتا ۔ اہم موقعوں پر روحوں کی اعانت طلب کی جاتی ہے، اور ایسا خاص کر اس موقع پر کیا جاتا ہے جب پسریوں میں کوئی بیمار پڑ جاتا ہے؛ چنانچہ وہ مشرکوں کی طرح بلیان blian ضیافتیں کرتے ہیں اور ایسی تقریبات جنوبی بورنیو میں بھی منعقد کی جاتی ہیں ۔ اس میں گھنٹیوں اور ڈھولکوں کے بڑے شور اور غل غپاڑے کے درمیان جو دور سے سنا جا سکتا ہے کفّار کے پروہت یا بالیان balian پر روح مسلّط ہو جاتی ہے اور اسی حال میں بیماری کی دوا اسے اِلقا کرتی ہے ۔ پاے تخت پسر میں بھی جو مختص طور پر مسلمانوں سے آباد ہے، ان بالیان عاملوں سے مشورہ کیا جاتا ہے؛ صرف ماہ رمضان کے اندر سلطان اس کی ممانعت کر دیتا ہے ۔

پسر کے اعلٰی طبقات میں اب تک خرافی اور مظاہر پرستانہ عقائد کی مقبولیت اس اساطیری افسانے سے عیاں ہے جو ابھی تک لوگوں میں زبان زد ہے اور وہ یہ ہے کہ گزشتہ صدی کے وسط میں یہاں کے سلطان آدم کی عادت تھی کہ سال کے چند دنوں میں روحوں کے پہاڑ ''گُنُنگ ملکت'' Gunung Melikat پر تنہا رہتا تھا ۔ کہا جاتا تھا کہ وہاں اس نے کسی جنّیہ سے شادی کر رکھی تھی، جس سے ایک لڑکا تیندک نامی پیدا ہوا جو آپ اپنے کو غائب کرنے کا ملکہ رکھتا تھا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ لڑکا جزیرۂ مادورا میں رہتا تھا، جہاں اس نے ایک جن شہزادی سے شادی کر لی تھی ۔ وہ وقتاً فوقتاً پسر میں نمودار ہوتا اور اس کے نام کی قربانی چڑھا کر بڑی ضیافت دی جاتی (قدیم زمانے میں انسان کی قربانی بھی چڑھاتے تھے) ۔ یہ ضیافتیں اب بھی کبھی کبھی دی جاتی ہیں، خصوصاً اس غرض سے کہ ملک کو کسی مصیبت یا بیماری سے نجات دلائی جائے ۔ موضع بسونی میں تندنگ کے لیے ایک مکان بنایا گیا ہے، جس کی چھت کے تین حصے ہیں اور ایک لمبی بلّی پر قائم کی گئی ہے اور اس طرح کبوتر خانے سے مشابہ ہو گئی ہے ۔

مذہبی پیشواؤں کی آمدنیاں اس رقم پر مشتمل ہوتی ہیں جو وہ ماہ صیام کے آخر میں زکوٰۃ اور ''پطرہ'' (=فطرہ) کی شکل میں وصول کر لیتے ہیں ؛ ہر شخص حسب استطاعت دیتا ہے ۔ رؤسا اس میں کوئی دباؤ نہیں ڈالتے ۔ مولوی ملّا کو شادی یا طلاق کے موقع پر تھوڑا سا نذرانہ بھی ملتا ہے ۔

تقویم، جو ریاست میں آج کل عام طور پر رائج ہے، اسلامی ہے ۔ دوسرے مقامات کے دیکوں کی طرح یہاں بھی کھیتوں کی جُتائی اس وقت شروع ہوتی ہے جب ایک خاص جھمکا (مجمع نجوم) آسمانوں میں دکھائی دیتا ہے ۔

پسریوں کی عائلی زندگی کسی حد تک اسلامی رسوم کے مطابق مرتّب ہو گئی ہے ۔ اسلام کے ماننے والوں میں شادی کسی مذہبی پیشوا کے توسط سے اور باپ یا کسی ولی کے ذریعے انجام پاتی ہے، لیکن پہلے بہت معقول مہر کے متعلق کوئی اقرار نامہ ہو جاتا ہے ۔ یہ دلہن کے والدین کو دیا جاتا ہے ۔ وہ خود اس کا صرف تھوڑا سا حصّہ پاتی ہے ۔ ڈیک رواج کے مطابق نوجوانوں کو شادی سے قبل بہت آزادی سے ملنے کی اجازت ہے ۔ اپنا گھر بنانے سے پیشتر دولہا کم از کم ایک سال اپنی سسرال میں رہتا ہے ۔ طلاقوں کی کثرت ہے کیونکہ نکاح کی بات چیت کے وقت فقط والدین کی مرضی چلتی ہے اور عورت کی خواہشات پر شاذ و نادر توجہ کی جاتی ہے ۔ مرد اور عورت شادی

کے بعد اپنی اپنی جائداد پر بدستور قابض رہتے ہیں؛ طلاق کے بعد یہ خاندان کو واپس کر دی جاتی ہے۔ شادی کے درمیان حاصل کی ہوئی جائداد دو برابر حصوں میں شوہر اور بیوی کے درمیان تقسیم کر دی جاتی ہے۔ ایک یا دوسرے کی موت کے بعد پسماندہ تمام کا وارث ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کی تجہیز و تکفین اسلامی رسوم کے مطابق ہوتی ہے۔

مآخذ: (۱) A.H.F.J. Nusselein : *Beschrijving van het landschap Pasir*، در BTLV، ۱۹۰۵ء۔

(A.W. Nieuwenhuis)

⊗ **پَسْرُوْر**: ضلع سیالکوٹ (مغربی پاکستان) کا پرانا شہر، جو سیالکوٹ سے سولہ میل جنوب میں ناروال سے ہوتی ہوئی امرتسر (بھارت) کو جانے والی شاہراہ پر واقع ہے۔ کہا جاتا ہے اسے شاہنشاہ بابر کے زمانے میں ایک باجوہ جاٹ سنگھ پسر ہندو نے آباد کیا تھا، جس نے بالآخر مرتے وقت اسے ایک برہمن پروہت پرس رام کو دے دیا۔ اس کے نام کی مناسبت سے یہ پرسرور کہلایا، جو بعد میں پسرور ہو گیا (*Gazetteer of the Sialkot District*، ص ۱۷۳ و ۱۳، ۲۷)۔ ایک زمانے میں اس شہر کی بڑی اہمیت تھی۔ اس کی پرانی اور پر رونق آبادی کے آثار شہر اور نواح میں اب بھی باقی ہیں۔ ان میں ایک تالاب بھی ہے، جو شاہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں بنا تھا۔ اس میں نالہ ڈیک کا پانی ڈالا جاتا ہے۔ اسی غرض سے داراشکوہ نے ایک نہر بھی بنوائی تھی۔ نہر اور اس کے پل کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ پسرور میں ایک مشہور صوفی میاں برخوردار کا مزار ہے، جس کی زیارت کے لیے اکثر لوگ ماہ محرم میں آتے ہیں۔ یہ مزار حضرت امام علی الحقؒ نے بنوایا تھا، جن کا اپنا مزار سیالکوٹ میں مرجع عوام ہے۔ شمالی جانب ٹیلے کے اوپر کسی بزرگ کی قبر ہے، جو ''مہر منگا کی ماڑی'' کہلاتی ہے۔

قدیمی شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ پسرور کا پانی کھاری ہے؛ بقول دلشاد:

شورِ ملاحتش ہمہ پنجاب را گرفت
دلشاد پرسرورِ تو دارد نمک در آب

(دیوانِ دلشاد پسروری، مخطوطہ، ۱۳۶۳ / ۳۱۵۴، دانشگاہ پنجاب لاہور، ص ۹۲ ب) اور اب بھی یہی حالت ہے۔ اس دیوان میں (ص ۳۷ ب) مدح پسرور پر ایک نظم بھی موجود ہے، جس کا مطلع ہے:

شہر ما پُرسرور می گویند
کانِ علم و شعور می گویند

اکثر مقامات کو جانے والی سڑکیں یہاں سے گزرتی تھیں۔ اس لیے پرانے زمانے میں اسے تجارتی منڈی کی حیثیت بھی حاصل رہی ہے۔ یہاں کی میونسپل کمیٹی ۱۸۶۷ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس وقت یہ ضلع میں دوسرے درجے کا شہر ہے۔

(مقبول بیگ بدخشانی)

پَسَنْتْرِن: (= پزنترن)، جاوی زبان میں بمعنی ''سنتری کی جگہ''، جاوا اور مادورا کے جزیروں میں دینیات کے طلبہ کی تربیت گاہ (سنتری)، مادوری زبان میں ''پَنجَنتَرِن''، سُوندا کی زبان میں عموماً ''پَنَدُک'' یعنی مدرسے کے طلاب کی قیام گاہیں (پندک جانا = پسنترن میں حاضری دینا)۔ مجمع جزائر شرق الہند کے تمام مسلمانوں کو ابتدائی تعلیم (یعنی قرآن مجید پڑھنا اور فرائض دین کا علم) ایسے مدرسین دیتے ہیں جو اپنے کو انھیں مضامین تک محدود رکھتے ہیں۔ جاوا اور مادورا کے زیادہ بڑے دیہات اور شہروں میں ایسے معلّم بھی ہیں جو شاگردوں کو کسی مسجد میں یا اپنے گھر میں یا کسی خاص عمارت میں جمع کر لیتے ہیں۔ اگر ان کی شہرت زیادہ ہو جاتی ہے تو ایسا

اکثر ہوتا ہے کہ طلبہ دُور دُور سے آنے لگتے ہیں، اور کچھ مدّت تک وہیں رہ کر اُن کی تعلیم سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔

لیکن پسنترن اعلٰی دینی تعلیم و تربیت کے ادارے ہیں۔ یہ کئی عمارتوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور جب گاؤں کے باہر الگ نہیں بنائے جاتے تو بھی گاؤں کا کم از کم علیحدہ محلہ بن جاتے ہیں۔ جاوی والیانِ ملک وقتاً فوقتاً ایسے فرامین جاری کرتے رہے ہیں جن میں بعض دیہات کو "معافی" قرار دیا گیا ہے، یعنی وہ لگان اور خدمات جو سرکار اُن سے لیتی وہ دائماً ان معلّموں کا حق ہو جاتی ہیں جنھوں نے وہاں پسنترن قائم کر رکھے ہیں۔ کئی دیندار افراد نے بھی ایسے مدرسوں کے لیے اوقاف قائم کر دیے ہیں۔ دوسرے پسنترن ایسے بھی ادارے ہیں جن کی ابتدا کسی عالم شخص کے اقدام کی رہینِ منت ہے جو خود تعلیم دینے لگا ہو۔ اسی لیے ان کا قیام اور ترقی و تنزل اس معلّم کی شخصیت اور اس کے مبلغِ علم کے بارے میں لوگوں کی رائے سے وابستہ ہوتی ہے، بلکہ وہ پسنترن بھی جن کے لیے باضابطہ طور پر وقف موجود ہیں ان عوامل سے متأثر ہوتے ہیں۔

پسنترن میں پہلے تو معلّم اور اُس کے معاونوں کے مکانات ہوتے ہیں، پھر درس کے کمرے، ایک مسجد، شاذ و نادر ایک جامع مسجد، طلبہ کے حجرے (پندک pondok) اور چاول رکھنے کی کوٹھیاں۔ یہ سب مل کر خاصی بڑی جگہ گھیرتے ہیں۔ صرف اقامت خانے کی ایک مخصوص طرز تعمیر ہوتی ہے، جو اور عمارتوں میں نہیں پائی جاتی۔ یہ ایک چوکور عمارت عام مسالوں سے بنی ہوتی ہے۔ اندرونی حصّے کو دو دیواروں کے ذریعے تین لمبے اور تقریباً برابر عرض کے حصّوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ان میں بیچ کا حصّہ راستے کا کام دیتا ہے اور عمارت کے ایک سرے سے دوسرے تک چلا جاتا ہے۔ بازووں کے دونوں حصّوں میں رہنے کے کمرے ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو اوٹوں کی مدد سے یکساں ناپ کے حجروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ پُندک کا دروازہ باہر کی چھوٹی دیواروں میں سے ایک کے وسط میں ہوتا ہے اور راستے کے اندر کُھلتا ہے۔ جب کوئی اندر جاتا ہے تو دائیں اور بائیں صرف سادہ دیواریں دکھائی دیتی ہیں، بعد ازاں یہ پتا چلتا ہے کہ ان دیواروں میں بہت نیچے اور چھوٹے چھوٹے دروازے رکھے گئے ہیں، جو اسی مسالے کے بنے ہوتے ہیں جس کی یہ دیواریں ہیں، ان سے حجروں کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے دروازے دونوں دیواروں میں یکساں فاصلے پر ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر دو ایک دوسرے کے بالمقابل ہوتے ہیں۔ حجروں میں باہر کی طرف سے روشنی چھوٹی کھڑکیوں سے آتی ہے جو دیوار میں ہوتی ہیں۔ حجروں کی چھتیں اس قدر نیچی ہوتی ہیں کہ مکین صرف بیٹھ سکتا یا فرش پر لیٹ سکتا ہے، کیونکہ طالب علم [عموماً] لیٹ کر مطالعہ کرتے ہیں۔ ایک حجرے میں کئی طلبہ رہتے ہیں۔ بہت مقبول پسنترنوں میں دارالاقامۃ دو منزلہ بھی ہو سکتے ہیں۔ طلبہ کی تعداد چند سو تک ہو سکتی ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے بہت تھوڑی ہو۔ ایسے سینکڑوں پسنترن موجود ہیں۔ ہر دارالاقامۃ میں کوئی پرانا طالب علم یا چھوٹے درجے کا معلّم ضبط و نظم قائم رکھتا ہے۔ صدر اقامت خانہ اتالیق کا کام بھی کرتا ہے اور اپنے زیر نگرانی طلاب کا ہر طرح ہاتھ بٹاتا ہے۔ بعض پسنترنوں میں عورتیں بھی تعلیم حاصل کرتی نظر آتی ہیں، لیکن یہ بہت شاذ و نادر ہوتا ہے کہ وہ ان میں رہیں بھی۔

پسنترنوں کی اپنی خاص طرز زندگی ہے۔ صبح ہونے سے پہلے ہی بڑی گہما گہمی ہونے لگتی ہے۔ فجر کی نماز معلم خود پڑھاتا ہے۔ نماز کے بعد ''ذکر'' ہوتا ہے۔ پھر درس شروع ہو جاتے ہیں۔ معلّم مبتدیوں کو ایک ایک کر کے پڑھاتا ہے اور سبق کے بعد وہ اقامت خانے کو واپس چلے جاتے ہیں۔ یہاں وہ پڑھا ہوا سبق خود یا اونچے درجے کے کسی طالب علم یا صدر پہندک کی مدد سے دوپہر تک دہراتے ہیں۔ پھر طلبہ دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں۔ ہر اقامت خانے کے ''سنتری'' کا ایک جگہ کھانا ہوتا ہے۔ عملاً بھی ایک وقت کا کھانا ان کی خوراک ہے۔ پھر سب مسجد کو ظہر کی نماز کے لیے چلے جاتے ہیں۔ وہ دن بھر میں تین اور نمازوں کے لیے بلائے جاتے ہیں۔ ان کے درمیان کے وقفے درس اور مطالعے میں صرف ہوتے ہیں۔ زیادہ اونچے درجے کے طالب علموں کو معلّم اکھٹا پڑھاتا ہے۔ وہ خود عربی متن پڑھتا ہے، اس کا ترجمہ کرتا ہے اور ضروری تشریح کرتا جاتا ہے۔ عشا کی نماز کے بعد دن کا کام ختم ہو جاتا ہے اور طلبہ سونے کے لیے چلے جاتے ہیں۔ بعض طلبہ (سنتری) اب بھی چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف رہتے ہیں، جس سے انہیں کچھ آمدنی ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں یہ کام بھی رک جاتے ہیں اور سارے میں سکوت چھا جاتا ہے۔ جمعے کے روز اس یکساں معمول میں کچھ تبدیلی ہو جاتی ہے۔ سب کے سب قریب ترین مسجد جامع میں صلاۃ الجمعۃ ادا کرنے جاتے ہیں۔ فصل کاٹنے کا زمانہ بھی طلبہ کے لیے مصروفیت کا وقت ہوتا ہے۔ وہ دھان کے کھیتوں میں کام کرتے ہیں یا زکوٰۃ جمع کرنے چلے جاتے ہیں۔ بہت سے طلبہ رمضان المبارک کے مہینے میں گھر چلے جاتے ہیں۔

پسنترنوں میں مطالعے کا مقدّم مضمون فقہ ہے۔ یہاں وہی عربی کتابیں استعمال ہوتی ہیں جو اور شافعی ملکوں میں رائج ہیں۔ ان کے علاوہ جاوی تصنیفات کی بھی ایک بڑی تعداد متداول ہے۔ وہ کتابیں جو عربی مآخذ پر یا عربی سے لی گئی دینی تصنیفات پر مبنی ہیں، ''کتاب'' کہلاتی ہیں۔ پسنترنوں میں جاوی زبان بولی جاتی ہے۔ سوندانی بولنے والے اضلاع (مغربی جاوا) میں جاوی تصانیف کی جگہ سوندانی تصنیفات روز بروز زیادہ لے رہی ہیں۔ فقہ کے علاوہ اصول دین کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے اور اس معاملے میں کسی خاص مذہب کی پیروی نہیں کی جاتی اور نہ رائج تصنیفات صرف شافعیوں کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ راسخ العقیدہ نوع کے تصوّف کا مطالعہ کم کیا جاتا ہے، اگرچہ یہ سچ ہے کہ تصوّف کی ایک مقبول عام شکل ''ھمہ اوست'' کی ہلکی سی جھلک لیے ہوئے موجود ہے، لیکن پسنترنوں میں اس کی تعلیم بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے۔ طالب علم فقہ کی بڑی کتاب کو، جو اس کے مطالعے میں رہی ہو، کتاب پیکہ Pĕkih [= فقہ] کہتا ہے اور اس کی مزید صراحت نہیں کرتا (وہ مشکل سے اس کا نام جانتا ہے) اور اصول دین کی کتاب کو ''کتاب اصول'' کہنے پر اکتفا کرتا ہے۔ فرائض مذہبی اور اصول دین پر ابتدائی تعلیم کی کتابیں بھی ''کتاب اصول'' کہلاتی ہیں۔

طریق درس بھی پسنترن کے ساتھ مخصوص ہے۔ جب طالب علم ابتدائی درسی کتابیں ختم کر لیتا ہے تو اس کو زیادہ اہم عربی متون سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ وہ انہیں اس معلّم کی نگرانی میں جملہ بجملہ پڑھتا ہے جس نے خود بھی شاید عربی کا کبھی اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا ہوتا اور جو اعراب کے معاملے میں صرف اپنے

حافظے پر اعتماد کرتا ہے ۔ معلم جملے کا جاوی زبان میں ترجمہ اور مطلب بیان کرتا جاتا ہے ۔ آخرکار طالب علم اس حد تک ترقی کر جاتا ہے کہ آسان متون کا عربی سے جاوی میں ترجمہ کر لے (TBGKW، ۳۱ (۱۸۸۶ء) : ۵۱۸ ببعد، میں ایک فہرست ان کتابوں کی دی ہوئی ہے جو اس وقت سب سے زیادہ رائج تھیں) ۔ اس میں بڑا وقت لگتا ہے؛ تاہم یہ دیکھ کر کہ طالب علم کا علم بالاستقلال بڑھ رہا ہے اسے خوشی حاصل ہوتی ہے، نیز یہ پر لطف احساس کہ وہ متون کو ان کی اصلی زبان میں پڑھنے کے قابل ہو گیا ہے طالب علم کے سمند شوق کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے ۔ لیکن مکّۂ معظّمہ اور حضرموت کے زیر اثر اس طریقے کی جگہ رفتہ رفتہ ایک دوسرا طریقہ لیتا جا رہا ہے جو عربی صرف و نحو سے شروع ہوتا ہے ۔ یہ یقیناً زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے، لیکن دشواری یہ ہے کہ عربی کا سیکھنا کسی انڈونیشیا والے کے لیے اتنی مشکلات پیدا کر دیتا ہے کہ بہت سے طلبہ عربی کتابیں پڑھنے کے قابل ہونے سے پہلے ہی ہمت ہار بیٹھتے ہیں ۔

پسنترنوں میں مطالعہ بالکل مفت ہے ۔ سندیں نہ تو طلب کی جاتی ہیں اور نہ دی جاتی ہیں ۔ طالب علم اپنی مرضی سے آتا اور چلا جاتا ہے ۔ اکثر طلاب کی ابتدائی تعلیم پسنترن میں داخل ہونے سے پہلے گھر پر ہو چکتی ہے ۔ علم دین کے حصول کا ذوق و شوق، دولتمند اور سرکردہ خاندانوں میں یہ خواہش کہ اپنے کسی بیٹے کو دین کے مطالعے میں منہمک دیکھیں اور بعض دوسروں کی یہ امید کہ اس طرح وہ وجہ معاش حاصل کر سکیں گے، نوجوانوں کو پسنترن میں لے آتی ہے ۔ طلبہ کوشش کرتے ہیں کہ کئی معلموں کے درس میں شرکت کریں ۔ ہر معلّم اپنے مخصوص موضوع پر درس دیتا ہے، اسی لیے طلبہ ایک مدرسے سے دوسرے مدرسے میں جاتے رہتے ہیں حتّٰی کہ بعض تو واقعی تمام عمر طلب علم کے لیے سفر کرتے رہتے ہیں ۔ بعض جب یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ انہوں نے خاصا علم حاصل کر لیا ہے تو کہیں (لیکن اپنے ضلعوں میں نہیں) بحیثیت معلّم سکونت پذیر ہو جاتے ہیں، یا کسی پسنترن میں نائب معلّم بن جاتے ہیں اور یا ''آزاد اہلِ علم'' رہنے کو ترجیح دیتے ہیں ۔ کوئی ایسا محکمہ نہیں جس کے لیے کسی پسنترن کی تعلیم ملازمت کی شرطِ اوّل ہو ۔ علمائے دین عموماً ہر اس چیز سے بیزار ہیں جو سرکاری ہو یا حکومت سے تعلق رکھتی ہو، لیکن مسجد کے بڑے اہلِ خدمت معمولاً کسی نہ کسی پسنترن میں کچھ مدت تک تعلیم پا چکے ہوتے ہیں ۔

یہ بہت برا سمجھا جاتا ہے کہ مذہبی تعلیم دینے کی کوئی مقررہ یا طے شدہ اجرت لی جائے، تاہم اکثر معلّم خوش حال ہیں ۔ اس خیال سے کہ وہ باعثِ برکت ہیں، خوش عقیدہ لوگ ان کو بڑے بڑے نذرانے دیتے رہتے ہیں ۔ مذہبی تقریبات میں، جو جاوی زندگی میں بکثرت ہوتی ہیں، معلم بہت ہی بابرکت مہمان ہوتا ہے ۔ سب لوگ سب موقعوں پر اس کی علمیت کی طرف رجوع کرتے یا اس کی شفاعت کے آرزومند ہوتے ہیں اور ان درخواستوں کے ساتھ نذرانے پیش کیے جاتے ہیں ۔ طلبہ اگر مستطیع ہیں تو داخلے کے وقت اپنی طرف سے نذر دیتے ہیں ۔ خوش حال والدین کے بچے جب گھر جاتے ہیں تو واپسی میں تحائف لاتے ہیں اور نادار طلبہ معلّم کے کھیتوں میں کام کرتے ہیں ۔

بیشتر طلبہ نادار ہوتے ہیں اور در اصل خیرات و صدقات پر بسر کرتے ہیں ۔ خاص خاص ایام میں وہ ضلع کے چاروں طرف نکل جاتے ہیں ۔ ان کا

آنا وبال جان نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان کی اعانت بلا تامل کی جاتی ہے، کیونکہ وہ مقدس تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور انہیں دینا باعث برکت ہوتا ہے۔ کھیت میں کام کرنے اور قرآن حکیم کے نسخوں کی کتابت وغیرہ کی طرح کے کاموں سے بھی انہیں کچھ تھوڑا بہت مل جاتا ہے، جو ان کی کم خرچ زندگی کے لیے کفایت کرتا ہے۔ مستعمراتی حکومت کو [مراد ولندیزی حکومت سے ہے، جو اب ختم ہو چکی ہے] پسنترنوں سے صرف اتنا سروکار تھا کہ وہ ان پر عام نگرانی رکھتی تھی۔ نئے پسنترنوں کے قیام کی اطلاع حکام کو دی جاتی ہے اور صدر مدرسہ کو ایک رجسٹر رکھنا پڑتا ہے، جس میں طالب علموں اور درسی کتابوں کے نام لکھے ہوتے ہیں۔

یورپی طرز کے مدارس کی کثرت نے زمانۂ حال میں پسنترنوں پر ایک کاری ضرب لگائی ہے۔ مذہبی تعلیم صرف پسنترن دے سکتے ہیں، کیونکہ [ولندیزی حکومت کے زمانے سے جو] پبلک سکول قائم کیے گئے وہ یہ تعلیم بالکل نہیں دیتے۔ اس کے برعکس وہ لوگوں کو روز مرہ زندگی کے لیے تیار کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایسے نجی مدارس کو ترقی ہو رہی ہے جو یہ دونوں کام انجام دیں۔ یہ "مدرسے" کہلاتے ہیں اور ان کا مقصد سب طرح کے لوگوں کو تعلیم دینا ہوتا ہے۔ ان مدرسوں کے ساتھ اعلٰی تعلیم کے سکول منسلک ہیں، جن میں مذہبی تعلیم کو نمایاں حصہ دیا جاتا ہے۔ ان سکولوں کی بنیاد اس طبقے کے لوگوں کی بدولت پڑی جن پر جدید خیالات کا اثر پڑ چکا ہے؛ لہٰذا ان کا طریق تعلیم یورپی نمونوں سے لیا گیا ہے، لیکن ان کی وسعتِ نظر کسی طرح قدیم پسنترنوں سے زیادہ نہیں ہے۔ "مدرسہ" کا لفظ مصر یا شاید عرب سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ مذہبی تعلیم کے ماسوا مدارس کی تنظیم بالکل سرکاری سکولوں کے نمونے پر کی گئی ہے۔

منگ کباؤ Minangkabau ملائیوں کے ملک (یعنی وسطی سماترا) میں ایسی دینی درس گاہیں ہیں جو بحیثیت مجموعی پسنترن سے مشابہ ہیں۔ انہیں سوراؤ Surau کہتے ہیں۔ یہ نام ابتدائی سکولوں، عبادت گاہوں، مردانے مکانوں کو بھی دیا جاتا ہے، اور ادارے کی الگ الگ عمارتیں بھی "سوراؤ" کہلاتی ہیں۔ طلبہ کے مکانات حجروں میں منقسم نہیں ہوتے بلکہ ان میں مقیم طلبہ کے درس اور سونے کا کمرہ مشترک ہوتا ہے۔

اچے [رک بآں] میں بھی ایسی درس گاہیں ہیں جو جاوی درسگاہوں کی ہم پلہ ہیں، البتہ یہاں صرف وہ طریق تعلیم رائج ہے جسے جاوا میں جدید کہا جا سکتا ہے۔ وہاں ملائی زبان جاوی کی جگہ لے لیتی ہے؛ اسی لیے اچے میں اس زبان کا جاننا طلبہ کے لیے لابدی ہے۔ طلبہ کی قیام گاہیں (رنگ کنگ rang kang) بالکل اسی نقشے پر بنی ہوتی ہیں جو جاوا کے دارالاقامۃ (پندوک pondok) کا ہوتا ہے؛ جس طرح پورے پسنترن کو پندوک بھی کہا جاتا ہے، بالکل اسی طرح اچے میں رنگ کنگ کے نام کا اطلاق تمام ادارے پر بھی ہوتا ہے۔ [اس مقالے میں جو معلومات ہیں وہ ۱۹۳۶ء تک کی ہیں]۔

مآخذ: (۱) C. Snouck Hurgronje: De Atjehers، بٹاویا ۱۸۹۳ء، ۲: ۱ ببعد؛ (۲) وہی مصنف: Der Islam in Nederlandsch-Indië، در Gesammelte Schriften، ۴ / ۲: ۳۷۷ ببعد؛ (۳) De masdjids in inlandsche godsdienstscholen in de Padangsche bovenlanden، در TG، ۱ (۱۸۸۸ء): ۳۱۸ ببعد۔

(R. A. Kern)

پشاروتز: Požarevac (تلفظ Pesharevatz؛ فرانسیسی املا Pojarévatz، Passarovitz؛ ترکی پساروفچہ کی طرح ایک تصحیف ہے)، یوگوسلاویا میں ضلع (بے بانات) ڈینیوب کا ایک ترقی پذیر تجارتی قصبہ۔ یہ اسی نام کے ضلع کا صدر مقام ہے اور موراوہ Morava اور ملاوہ Mlava کے درمیان کے زرخیز ہموار خطّے میں دبراویکا Dubravica کی ڈینیوبی بندرگاہ سے صرف دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۱۹۳۰ء میں اس کی آبادی ۱۳۷۲۱ تھی۔ اس قصبے کا ذکر، جس کا نام عام طور پر سربی کرواتی Serbo-Croat لفظ požar (= آگ) سے متعلق بتایا جاتا ہے (*Kneževina Srbija* : M.D. Milićević، بلغراد ۱۸۷٦ء، ص ۱۷۲ و ۱۰۵۸)، سب سے پہلے پندرھویں صدی عیسوی کے خاتمے کے قریب آتا ہے، مگر یہ یقیناً پہلے سے موجود ھوگا اور ۱۴۵۹ء میں گردو پیش کے علاقے کی طرح ترکی کے زیر نگیں ھو گیا ھوگا۔ ترکی خزانے کے دفاتر متعلقہ ھنگری، بابت ۱۵٦۵ء، کے مطابق (A. Velics : *Magyarországi török kincstári defterek*، بوڈاپسٹ ۱۸۹۰ء، ص ۷۳۴) یہ بستی سمندرہ (Semendria، Smederevo) کی ترکی سنجاق میں داخل تھی اور سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں حاجی خلیفہ اسے ایک قاضی کا مستقر (قاضی لق) بیان کرتا ہے (قب *Spomenik*، ج ۱۸، بلغراد ۱۸۹۲ء، عمود ۲٦)۔ اس صدی کے خاتمے کے قریب بہت سے سربیوں نے پشاروتز سے ھجرت کی۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں بعض اوقات اس کا ذکر ایک گاؤں کے طور پر ملتا ہے۔

پشاروتز کی شہرت اس صلح نامے کی مرہون منت ہے جس کی وجہ سے ۱۷۱٦ تا ۱۷۱۸ء کی جنگِ ترکیہ و آسٹریا کا خاتمہ ہوا۔ ۱۷۱۴ء کے اختتام پر ترکی وینس کے خلاف اس وجہ سے اعلانِ جنگ کر چکا تھا کہ صلح نامۂ کارلووتز Carlovitz کی پابندی نہیں کی جا رہی تھی اور ۱۷۱۵ء میں اس نے موراا اور چند جزائر اَرخبیل (Ionian Islands) پر قبضہ کر لیا۔ آسٹریا، جو ابتدا میں وینس کے ایک حلیف کی حیثیت سے مصالحت کے لیے بیچ میں پڑا تھا، ۱۷۱٦ء میں خود بھی میدان میں آ گیا اور اس کی فوج نے شہزادۂ یوجین کی قیادت میں پٹرو وارادین، تمسوار اور بلغراد میں تین بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ اس پر انگلستان صلح کرانے کی غرض سے بیچ میں پڑا۔ طویل تیاریوں کے بعد (قب von Hammer : *GOR*، بار دوم، ۴ : ۱۵۹ تا ۱٦۴) مؤتمر پشاروتز منعقد کی گئی۔ گفت و شنید، جس میں ترکی، آسٹریا، وینس کے وکلاے مختار نے حصہ لیا اور جس میں انگلستان اور ھالینڈ ثالث تھے، ۵ جون ۱۷۱۸ء کو شروع ھوئی اور ۲۱ جولائی کو صلح نامے پر دستخط ھو گئے۔

صلح نامہ اس بنیاد پر طے ھوا کہ جو علاقہ اس وقت دونوں حریفوں کے ھاتھ میں تھا وہ انھی کے حوالے کر دیا جائے؛ چنانچہ مشرقی حصۂ سیرمیہ، تیمسوار اور اس کا پورا ضلع (بانات Banate)، تمام شمال مشرقی سربیا مع بلغراد، پشاروتز وغیرہ اور افلاق کوچک آسٹریا کے پاس رہے، وینس کے پاس بھی دلماتی اور البانی ساحلوں کے وہ چند مقامات باقی رہے جو اس نے لے لیے تھے۔ اسے چند تجارتی رعایتیں اور جزیرۂ چوقہ (Cerigo) بھی مل گیا، لیکن اسے تمام جزیرہ نماے موراا اور ھرسک (Hercegovina) کے جنوب مشرقی اضلاع ترکی کو واپس کرنا پڑے۔ ایک تجارتی معاھدے کی رو سے، جو ۲۷ جولائی کو پشاروتز ھی میں طے پایا، آسٹریا کو دولت عثمانیہ میں بعض تجارتی اور دوسری مراعات حاصل ھو گئیں۔

کسی معاہدۂ صلح کے طے ہونے کے بعد جو مراسم ادا کیے جاتے ہیں، ان کے مطابق پہلا ترکی وکیل مختار ابراہیم پاشا مع اپنے خدم و حشم کے ویانا گیا اور گفت و شنید میں آسٹریا کا وکیل کاؤنٹ ورمونٹ Wirmont قسطنطینیہ آیا۔ ترکی سفارت کے ایک رکن نے ۱۷۲۶ء میں ایک دلچسپ روداد لکھی تھی، جسے Fr. van Kraelitz نے متن اور ترجمے کے ساتھ شائع کیا ہے (*Bericht über der Zug des Gross-Botschafters Ibrahim Pascha nach Wien im Jahre 1719*، در *SBAk. Wien*، ج ۱۵۸ (۱۹۰۸ء)؛ در *TOEM*، ۷ (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳-۱۹۱۴ء) : ۲۱۱ تا ۲۲۷، اس اشاعت کا ترکی متن اے۔ رفیق نے دوبارہ طبع کیا)۔

آسٹروی قبضے (۱۷۱۸ تا ۱۷۳۹ء) کے دوران میں پشاروتز اس علاقے کا سب سے اہم مقام تھا۔ ترکی کے خلاف سربیا کی جنگ آزادی میں اس کا عرصے تک محاصرہ رہا اور بالآخر اسے سربیوں کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے (۱۸۰۳ء)۔ ۱۸۱۳ء میں یہ شہر دوبارہ ترکوں کے ہاتھ آ گیا، لیکن ۱۸۱۵ء میں پھر سربیوں کے قبضے میں چلا گیا۔

اس کے بعد جو اس کا دور آیا (۱۸۱۵ تا ۱۹۱۵ء) اس میں پشاروتز ترقی کرتا گیا۔ شہزادہ میلوس Milos نے ۱۸۲۰ء میں اسے اپنا دوسرا مستقر بنایا اور وہاں دو قصر (تو‌ناق) بنوائے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ایک پروشیائی Prussian افسر اس شہر میں آیا، اور اس نے وہاں کے حالات پر ایک دلچسپ یادداشت چھوڑی (Otto. v. Pirch : *Reise in Serbein im Spätherbst 1829*، برلن ۱۸۳۰ء، ۱ : ۱۱۹ تا ۱۲۱)۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں آبادی برابر بڑھتی رہی، لیکن اور کسی لحاظ سے "یہاں کوئی دلچسپی کی بات نہیں تھی" (F. Kanitz : *Serbien*، لائپزگ ۱۸۶۸ء، ص ۱۳)۔

بیسویں صدی کے آغاز میں پشاروتز سربیا کے اہم ترین قصبوں میں شمار ہوتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں جرمنوں نے ۱۹۱۵ء میں اس پر قبضہ کر لیا اور پھر یہ (اکتوبر ۱۹۱۶ء سے) بلغاریوں کے قبضے میں رہا، لیکن ۱۹۱۸ء کے جاڑوں میں اس پر پھر سربیوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس وقت سے یہ یوگوسلاویا میں شامل ہے۔

مآخذ: (متن میں درج حوالوں کے علاوہ): (۱) V. Bianchi (صلح کی گفت و شنید میں وینس کا وکیل مختار): *Istorica relazione della pace di Posaroviz*، پدوا Padua ۱۷۱۹ء؛ (۲) عبدالرحمٰن شرف: تاریخ دولت عثمانیہ، ۲ (۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء): ۱۳۰ تا ۱۳۷؛ (۳) G. Noradounghian : *Recueil d'actes internationaux de l'empire ottoman*، پیرس ۱۸۹۷ء، ص ۶۱ تا ۶۲ (عدد ۲۰۸ و ۲۰۹)، ۲۰۸ تا ۲۱۶ (آسٹریا کے ساتھ صلح نامہ کا لاطینی متن)، ۲۱۶ تا ۲۲۰ (فرانسیسی میں اس کا خلاصہ)؛ (۴) Drag. M. Pavlović : *Požarevački mir (1718. g)*، در *Letopis matice srpske*، Novi Sad ۱۹۰۱ء، ۲۰۷ : ۲۶ تا ۴۷ و ۲۰۸ : ۴۵ تا ۸۰ (معاہدۂ پشاروتز کا ایک اچھا تاریخی مطالعہ)؛ (۵) V. Popović، در *Noronda enciklopedija*، ۳ (زغرب ۱۹۲۸ء) : ۵۲۸؛ (۶) *Almanah Kraljevine Jugoslavije*، زغرب ۱۹۳۰ء، ۱ : ۵۶۱؛ (۷) M. A. Purković : *Požarevac*، پشاروتز ۱۹۳۴ء (اس شہر اور اس کی تاریخ پر ایک مخصوص تصنیف کی پہلی کوشش)۔

(FEHIM BAJRAKTAREVIĆ)

پشاور: تاریخ: تاریخ میں وادی پشاور کا ذکر پہلے پہل وہاں ملتا ہے جہاں اسے ریاست گندھارا کا ایک حصہ بتایا گیا ہے، لیکن قدیم دور کی تاریخ ابھی تک تاریکی میں ہے۔ سکندر

کے حملے کے بعد اس کے حالات سے تاریکی چھٹنے لگتی ہے۔ ۳۲۶ ق م میں سکندر کی فوجیں دو الگ الگ راستوں سے دریاے سندھ تک پہنچی تھیں: ایک درۂ خیبر سے ہو کر اور دوسری خود سکندر کی رہبری و سرکردگی میں کنڑ سے باجوڑ سے سوات سے بنیر ہوتی ہوئی گئی۔ یونانیوں کے اس پہلے حملے نے بھی پشاور پر اپنے اثرات قائم نہیں کیے، نہ کچھ آثار چھوڑے، البتہ سکندر کی واپسی کے بعد یہ وادی چندرگپت کی فرمانروائی میں شامل ہوگئی (۳۲۱ تا ۲۹۷ ق م)۔ پھر چندرگپت کے پوتے اشوک کے عہد میں بدھ مت پھیلتے پھیلتے کشمیر، پشاور اور کابل تک پہنچ گیا۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے یونانیوں، برہمنوں، ساسانیوں اور آخر میں پھر ہندووں کا تسلّط قائم ہوتا رہا، جو ساتویں صدی عیسوی تک چلا۔

ساتویں صدی عیسوی کے اختتام سے کچھ پہلے، پشتون [یا پختون] (افغان یا پٹھان) اس وادی میں نمودار ہوے۔ انھوں نے آتے ہی حاکمان لاہور (پنجاب) سے دریاے سندھ کے قریب کا میدانی علاقہ چھین لیا اور بعد میں گھکھڑوں کی امداد و اعانت سے دریاے سندھ اور دریاے جہلم کے درمیانی علاقے پر مسلّط ہو گئے۔ اس کے بعد پشتونوں نے لاہور کے حاکموں کو مجبور کیا کہ وہ دریاے سندھ کے مغرب اور دریاے کابل کے جنوب کا درمیانی پہاڑی علاقہ بھی ان کے تصرف میں دے دیں۔

دسویں صدی عیسوی میں پشاور پھر بیرونی طاقت کے زیر تسلط آ گیا، جب کہ سُبکتگین نے لاہور کے حکمران راجہ جے پال کو شکست دی۔ سبکتگین کے بعد اس کے بیٹے سلطان محمود غزنوی نے گیارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں بیس پچیس سال تک، ہندوستان پر حملوں کے لیے پشاور کو مستقر بلکہ ایک طرح کی چھاؤنی بنائے رکھا۔ سلطان محمود کے بعد بھی تقریباً سو سال تک پشاور غزنہ کا صوبہ شمار کیا جاتا رہا۔ آخر پندرھویں صدی عیسوی میں غوریوں کے ہاتھوں، غزنوی دور حکومت کا خاتمہ ہوا اور ۱۵۰۵ء تک یہاں مختلف حکمرانوں کی حکومت چلتی رہی۔ آخر سال مذکور میں بابر درۂ خیبر کے راستے حملہ آور ہوا۔ بابر اپنی حکومت کے دسویں سال افغانوں کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے باجوڑ اور سوات کو مطیع کیا۔ ہمایوں کے زمانے میں یہاں خلیل، مہمند، داؤد زئی اور دلازاک قوموں کی آپس میں خانہ جنگیاں ہوتی رہیں۔ اکبر نے ان شورشوں کو رفع کرنے کی خاطر میدانی علاقوں میں جگہ جگہ فوجی قلعے تعمیر کر کے ان لوگوں پر قابو پا لیا، مگر اس علاقے پر قبضہ و اقتدار کا مقصد شاہراہِ کابل کی حفاظت اور اس راستے پر نقل و حمل اور رسل و رسائل کی سہولت اور مقامی قبائل میں قیامِ امن کے سوا کچھ نہ تھا۔

اسی زمانے میں یوسف زئی، مندنڑ اور خٹکوں کی شورشیں اور اختلافات رونما ہوے۔ یہ علاقہ ان دو شاخوں میں تقسیم کیا گیا جنھوں نے اپنے آپ کو یہاں کا اصلی حاکم قرار دیا، مگر دہلی کے تخت سے براے نام الحاق بھی قائم رکھا۔ یہ حالات جہانگیر اور شاہجہان کے عہد تک قائم رہے۔ ۱۸۶۸ء میں پشتونوں نے بھاری جمعیت کے ساتھ دریاے سندھ کی حدود سے نکل کر علاقۂ چھچھ پر قبضہ کر لیا، اور اس طرح دہلی اور کابل کا راستہ منقطع کر دیا اور یوں ایک عرصے تک پشاور کے پورے میدانی علاقے پر اپنا قبضہ جمائے رکھا۔ اس عرصے میں مسلسل جنگوں کی بنا پر اورنگ زیب خود اپنی سرکردگی میں فوج لے کر آیا تاکہ ان قبائل پر دوبارہ اپنا تسلّط قائم کرے۔ یہ جد و جہد اور کشمکش تقریباً دو سال (۱۶۷۳ء

سے ۱۶۷۵ء) تک جاری رہی۔ ان مہمات میں پشتو کے نامور شاعر خوشحال خان خٹک نے بڑا حصّہ لیا۔ یہ واقعات اس کی نظموں اور دیگر تاریخی دستاویزات میں بڑے نمایاں طریقے سے قلمبند ہوئے ہیں۔

اورنگزیب کے جانشینوں نے بعد میں پشاور پر اپنا قبضہ قائم رکھا، مگر سلطنت مغلیہ کے زوال پذیر ہونے کی وجہ سے ۱۷۳۸ء میں پشاور نادر شاہ افشار کے قبضے میں آ گیا، جس کے باعث مغلوں نے دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا سارا علاقہ بھی نادر شاہ کے حوالے کر دیا۔ اس دوران میں نادر شاہ کی خراسان میں مصروفیات کے باعث یوسف زئی، خٹک، اور کوہستانی قبائل تو بالکل آزاد اور خود مختار رہے، البتہ خلیل، مہمند، داؤد زئی، محمد زئی اور گگیانڑی قبائل سے جبرًا خراج لیا جاتا رہا۔ نادر شاہ کی وفات کے بعد سدوزئی درانیوں نے احمد شاہ آبدالی کے زیر تسلّط قندھار میں اپنی حکومت قائم کر لی، جس کے عہد میں وادی پشاور پر ان کا مکمل قبضہ و اقتدار قائم ہو گیا۔ ۱۷۹۳ء میں سدوزئیوں کے آخری مدعی شاہ شجاع نے پشاور میں اپنی بادشاہی کا اعلان کیا۔ بالآخر بڑے انقلابات و تغیرات کے بعد شاہ شجاع نے ۱۸۱۰ء میں دستبردار ہو کر انگریزوں کے زیر حفاظت لدھیانے میں سکونت اختیار کر لی، اور یہ سارا علاقہ سکھوں کے قبضے میں چلا گیا۔

رنجیت سنگھ نے ۱۸۱۸ء میں پشاور پر اپنا تسلط قائم کیا اور ہری سنگھ نلوا کو یہاں کی زمام حکومت سونپ دی۔ ہری سنگھ ظالم و جابر سردار تھا اور یوں بھی سکھ حکومت نے اندرون ملک میں تدبر سے نظم و نسق قائم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی، اس لیے سکھ اپنے زمانۂ حکومت میں یہاں امن اور چین سے نہ رہ سکے۔ ہری سنگھ پشتونوں سے ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے بعد سکھوں کی طرف سے ایک فرنگی جرنیل General Avitabile (جسے لوگ ابو طبیلہ کہتے تھے) آیا اور یہاں ۱۸۳۸ سے ۱۸۴۲ء تک رہا۔ آخر اسے بھی ۱۸۴۲ء میں فارغ کیا گیا۔ ۱۸۴۶ء میں سکھوں کی پہلی بڑی لڑائی کے کچھ عرصے بعد یعنی اوائل ۱۸۴۷ء میں جب دربار (سکھوں کی مرکزی حکومت) نے سردار گلاب سنگھ کو پشاور کا گورنر بنا کر بھیجا تو اسکے ساتھ ہی ریزیڈنٹ لاہور کے نمائندے کی حیثیت سے میجر جنرل لارنس کو بھی پشاور بھیجا۔ پشاور ڈسٹرکٹ گیزیٹیر میں لکھا ہے: General Avitabile was relieved in 1842۔ چنانچہ اس جرنیل کی پوری تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے خود سکھوں نے ہٹایا، کیونکہ ابو طبیلہ کے ہٹتے ہی یہاں سردار تیج سنگھ گورنر پشاور کی حیثیت سے آیا اور چار سال تک رہا۔ یہی تیج سنگھ اس جرنیل کا کسی قدر مخالف تھا۔ ۱۸۴۹ء میں سکھوں کو آخری شکست ہوئی اور وادی پشاور انگریزوں کی مملکت میں شامل ہو گئی۔ میجر لارنس کو پشاور کا ڈپٹی کمشنر مقرر کیا گیا اور اس تاریخ سے پشاور، پنجاب گورنمنٹ کا ایک انتظامی ضلع قرار دے دیا گیا۔ جب نومبر ۱۹۰۱ء میں، ایک چیف کمشنر کے ماتحت شمال مغربی سرحدی صوبے کے نام سے یہ ایک علیحدہ صوبہ بنایا گیا تو پشاور ہی کو نئی صوبائی حکومت کا صدر مقام بنایا گیا (بحوالۂ امپیریل گیزیٹیر آف انڈیا، نیو ایڈیشن، جلد ۹، ۱۹۰۸ء، ص ۱۸۸)۔ یہاں کا پہلا چیف کمشنر لفٹننٹ کرنل سر ایچ اے ڈین Lieut. Col. Sir H. A. Deane تھا۔ ۱۹۳۷ء تک تحصیل مردان اور تحصیل صوابی، پشاور ضلع میں شامل رہیں (بحوالۂ مردم شماری رپورٹ، ضلع پشاور، ۱۹۶۱ء، ص ۱ تا ۸)،

لیکن مردان کے ضلع بن جانے کے بعد وہ پشاور سے علیحدہ کر دی گئی۔ اب پشاور میں یہ تین تحصیلیں شامل ہیں: تحصیل پشاور، تحصیل چارسدہ اور تحصیل نوشہرہ۔ ان میں سے ہر ایک، ایک اسسٹنٹ کمشنر کے ماتحت الگ الگ سب ڈویژن ہے۔

وحدت مغربی پاکستان میں پشاور ریجن:

۱۹۵۵ء کے وسط تک مغربی پاکستان چار صوبوں پر مشتمل تھا، جن میں پنجاب، سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ شامل تھے۔ چنانچہ بعض اہم سیاسی و انتظامی وجوہ کی بنا پر یہ ضروری قرار دیا گیا کہ ان صوبوں اور ملحقہ و متعلقہ ریاستوں کو ایک کر دیا جائے؛ لہٰذا اگست ۱۹۵۵ء میں، آئین ساز اسمبلی میں ایک بل پیش کیا گیا، جسے قیام صوبۂ مغربی پاکستان (Establishment of West Pakistan Bill) کا نام دیا گیا۔ بل میں چاروں مذکورہ صوبوں اور ریاستوں کو مدغم کر کے پورے مغربی پاکستان کا ایک صوبہ بنانے کی تجویز تھی۔ چنانچہ یہ بل منظور کر لیا گیا اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو وحدت مغربی پاکستان کے نام سے ایک صوبہ وجود میں آ گیا۔ اس طرح پاکستان دو یونٹوں (Units) یا وحدتوں میں منقسم ہو کر ایک مغربی یا پچھمی پاکستان اور دوسرا مشرقی یا پوربو پاکستان کہلایا۔ ساتھ ہی انتظام و انصرام کے لحاظ سے نیا صوبہ مغربی پاکستان تین بڑے علاقوں (Regions) اور بارہ بڑی قسمتوں (Divisions) میں منقسم کر دیا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں ایک ریجن اور ایک ڈویژن اور بڑھا دیا گیا ہے۔ وہ مالا کنڈ ریجن اور مالا کنڈ ڈویژن ہے جو مالا کنڈ ایجنسی اور اضلاع سوات، دیر اور چترال پر مشتمل ہے۔ منجملہ تین بڑے علاقوں اور بارہ بڑے حصوں کے پہلا پشاور ریجن اور پشاور ڈویژن ہے جو پشاور، ہزارہ، مردان، کوہاٹ اور قبائلی علاقوں پر مشتمل ہے۔ قبائلی علاقوں میں مالا کنڈ ایجنسی، مہمند ایجنسی، خیبر ایجنسی اور کُرّم ایجنسی کے ساتھ ساتھ پشاور، ہزارہ، مردان اور کوہاٹ کے کچھ ملحقہ علاقے شامل ہیں۔

پشاور کا نام: مختلف مؤرخوں اور سیاحوں نے اسے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔ ہیروڈوٹس (۵۰۰ ق م) نے اسے "پسکا پورس"؛ چینی بدھ سیاح فاھیان Fa-hien (۳۹۹ تا ۴۱۳ء) نے "فولیوشا" اور دوسرے چینی سیاح ھیون سانگ (Hiuen Tsang) [۶۲۹ تا ۶۴۵ء] نے اسے "پولوشا پولو" بتایا ہے۔ ان کے بعد المسعودی (۱۰۰۰ء) اور ابو ریحان البیرونی (۱۱۰۰ء) نے اس کا نام "پرشاور" لکھا ہے۔ بعد میں مغل بادشاہ بابر اور اس کے بعد اکبر نے اسے فارسی میں "پیش آور" اور "پیشہ ور" کر دیا۔ اس کے بعد سے یہ نام باقاعدہ پشاور ہو کر رہ گیا۔ بعض کتابوں میں اس کا قدیم نام پرشور، پشہ ور، پرشپور اور باگرام بھی لکھا ہے۔ باگرام کا نام خوشحال خان خٹک اور عبدالرحمٰن بابا نے بھی اپنی نظموں اور غزلوں میں استعمال کیا ہے۔

جغرافیہ: نقشے میں پشاور ۷۱ درجے ۵۲ دقیقے اور ۷۲ درجے ۱۵ دقیقے طول بلد مشرق میں اور ۳۳ درجے ۴۰ دقیقے اور ۳۴ درجے ۵۲ دقیقے عرض بلد شمال میں واقع ہے۔ بہ لحاظ حدود اربعہ مشرق میں ضلع مردان اور تقریباً تیس میل نیچے دریائے سندھ ضلع اٹک سے اسے جدا کرتا ہے، اور جنوب مشرقی گوشے میں کوہ نیلاب شاشے اسے ضلع کوہاٹ سے علیحدہ کرتا ہے۔ جنوب میں حسن خیل آفریدی اور درے کے آدم خیل آفریدی، مغرب میں خیبر کے آفریدی اور ملاگوری واقع ہیں۔

آگے شمال میں اور دریائے کابل کے اس پار مہمند قبائل جو ایک کوہستانی سلسلے میں آباد ہیں، جن کی حدود دریائے سوات کے کناروں تک پہنچتی ہیں، نیز مالا کنڈ ایجنسی اور شمال مشرق میں مردان ہے ۔ یہ ضلع قدرتی طور پر چاروں طرف سے مسلسل پہاڑوں اور پہاڑیوں کے ایک مدور حلقے کے اندر گھرا ہوا ہے ۔ صرف مشرق کی جانب اٹک کے سامنے کچھ کھلا ہوا ہے ۔ اس کے وسط میں دریائے کابل ہے، جو جنوب مشرق کی سمت بہتا ہے ۔ وادی کی زمین شمال اور جنوب دونوں جانب سے دریا کی طرف جھکتی ہے، جس کے باعث علاقے کے پانی کے نکاس کا رخ دریائے کابل کی جانب ہے ۔

اس وادی کا عمومی منظر خوشنما اور دلکش ہے ۔ اس میں جگہ جگہ چشمے، نہریں، نالے، ندیاں اور دریا بہتے ہیں ۔ بعض علاقوں کی زمین ہر موسم میں سبزے سے ڈھکی رہتی ہے ۔ بعض مقامات پر پورے کے پورے گاؤں پر ہرے بھرے اونچے اونچے جھنڈ چھائے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ کہیں پھل دار درختوں کے بڑے بڑے باغ اور کہیں مکئی اور نیشکر کے دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت یا گیہوں اور جو یا دھان کی لہلہاتی فصلیں ہوتی ہیں ۔ ہشتنگر اور یوسفزئی کی میدانی زرعی زمینوں میں آب پاشی نہروں کے ذریعے ہوتی ہے ۔ مشرق کی جانب خٹکوں کی کچھ زمینیں رہٹ کے کنوؤں کے ذریعے سیراب ہوتی ہیں اور خٹکوں کا جنوبی علاقہ خشک اور بارانی زمینوں پر مشتمل ہے ۔

رقبہ: ضلع پشاور کا کل رقبہ ۱۶۶۳ مربع میل ہے ۔ اور پشاور شہر اور چھاؤنی دونوں کا مجموعی رقبہ تقریباً ۹ مربع میل ہے ۔

آب و ہوا اور موسمی کوائف: پشاور ایک ایسا مقام ہے جہاں تقریباً آٹھ نو مہینے آب و ہوا خوشگوار، فرحت بخش اور صحت افزا رہتی ہے ۔ البتہ گرمیوں کے تین مہینے گرمی منطقۂ حارہ کے بعض مقامات سے بھی بڑھ جاتی ہے ۔ وسط مئی سے وسط جولائی تک درجۂ حرارت میدانی علاقوں کی طرح بہت بڑھ جاتا ہے ۔ خشک گرمی پڑتی ہے ۔ تیز و تند لوئیں چلنے لگتی ہیں اور یہ گرمی مضر صحت ہوتی ہے ۔ پھر وسط جولائی سے ستمبر تک گرمی کسی قدر کم مگر زیادہ مرطوب ہو جاتی ہے ۔ گرمیوں میں درجۂ حرارت عموماً ۱۱۶ فارن ہائیٹ تک پہنچ جاتا ہے اور جنوری میں کم و بیش ۲۶ تک گر جاتا ہے ۔ بارشوں کا اوسط ۱۶.۰۰ انچ ہے ۔ بارشیں زیادہ تر موسم سرما میں ہوتی ہیں ۔ گرمیوں کے موسم میں اور کبھی سردیوں میں بھی تند و تیز آندھیاں چلتی ہیں، جن سے کبھی کبھی نقصان پہنچتا ہے ۔

زلزلے: پنجاب کے شمال مغرب میں پہاڑوں کا سلسلہ زلزلوں کے لیے مخصوص مانا گیا ہے اور پشاور کا محلِ وقوع اس منطقے میں ہے، اس لیے راولپنڈی، اٹک اور پشاور کے گرد و نواح کا علاقہ ہمیشہ زلزلوں سے متاثر ہوتا رہتا تھا ۔ کبھی کبھی پشاور میں شدید جھٹکے بھی محسوس ہو جاتے ہیں، جن سے مکانات کو نقصان پہنچتا ہے ۔ زلزلے ہر موسم میں آتے رہتے ہیں ۔

سیلاب: یہاں سیلاب بھی آتے ہیں اور عموماً ان دنوں میں آتے ہیں جب سرحد اور کشمیر کے پہاڑوں پر زیادہ بارش ہوتی ہے، ساتھ ہی کوہستان ہمالیہ سے برف پگھل کر آنے لگتی ہے اور ہوا میں نمی کی زیادتی کے باعث عمل تبخیر بہت کم ہو جاتا ہے، اس وقت دریا غیر معمولی طور پر بھرپور ہو کر ابلنے لگتے ہیں ۔ کبھی کبھی دریائے اٹک کی بالائی گزرگاہوں میں کسی گلیشیر (تودۂ برف) کے باعث پانی رک کر جمع ہو جاتا ہے تو

گلیشیئر کے پگھلنے یا اس کے سرک جانے سے ایک دم تباہی خیز سیلاب آ جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے اٹک کے مقام پر دریا میں پانی کی سطح بہت اونچی ہو جاتی ہے۔ اور اس میں دریائے کابل کا پانی نہیں سما سکتا، اس لیے وہ واپس جانے لگتا ہے۔ یوں دریائے کابل کے سیلاب سے آس پاس کے علاقے میں تباہی آ جاتی ہے۔ اس قسم کے زبردست سیلاب ۱۸۳۰ء، ۱۸۴۶ء، ۱۸۵۸ء اور ۱۹۲۹ء میں آ چکے ہیں۔ ان دو آخری سیلابوں میں اٹک کے مقام پر دریائے سندھ کے پانی کی سطح ریلوے پل کے بالائی کناروں تک پہنچ گئی تھی۔

دریا: دریائے کابل، افغانستان سے چل کر مہمندوں کے پہاڑی علاقے سے ہوتا ہوا ورسک کے مقام پر وادی پشاور میں داخل ہوتا ہے۔ یہاں سے کسی قدر آگے جا کر میچنی کے مقام پر تین شاخوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے بالائی شاخ ادے زئی، وسطی ناگمان اور زیریں شاہ عالم کہلاتی ہے۔ یہ تینوں دریا تقریباً بارہ میل آگے جا کر موضع نیستہ کے قریب پھر آپس میں مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اسی جگہ شمالی علاقے سے ہوتا ہوا دریائے سوات اور آفریدیوں کے علاقۂ تیراہ سے نکل کر دریائے باڑا بھی وادی کے جنوبی علاقے سے ہوتا ہوا اس سے مل جاتا ہے۔ یہاں سے دریائے کابل، ”لنڈے سیند“ یا ”دریائے لنڈا“ کہلاتا ہے۔ یہ ضلع کے وسط سے گزرتا ہوا تیس میل آگے جا کر اٹک کے مقام پر ”اباسین“ یعنی دریائے سندھ میں شامل ہو جاتا ہے۔

نہریں: (۱) نہر لوئر سوات، دریائے سوات سے آبازئی کے مقام پر نکالی گئی ہے۔ اس سے تحصیل چارسدہ کی زمینیں سیراب ہوتی ہیں؛ (۲) نہر کابل: یہ نہر دریائے کابل سے میچنی کے قریب نکالی گئی ہے، جس سے تحصیل پشاور کا اکثر حصہ سیراب ہوتا ہے؛ (۳) نہر ورسک: یہ نئی نہر ہے، جو ورسک میں دریائے کابل سے نکالی گئی ہے۔ اس سے کھجوری، خلیل اور زیریں مہمندوں کا علاقہ سیراب ہوتا ہے۔

پہاڑ: ضلع کی حدود کے اندر اونچے پہاڑ خٹکوں کے علاقے میں واقع ہیں۔ ان میں چراٹ اور نیلاب غاشے کی بلندی ۳۰۰۰ سے ۵۰۰۰ فٹ تک ہے۔ سب سے اونچی چوٹی جلالاسر کی ہے، جس کی بلندی ۵۰۳۶ فٹ اور ”توروسر“ کی بلندی ۴۷۳۶ فٹ ہے۔

زمین: وادی کی زمین کے بہت بڑے حصے میں اعلیٰ قسم کی خالص مٹی پائی جاتی ہے، جو ہلکے گیروا رنگ کی ہے۔ کہیں کہیں ہلکی سیاہی مائل اور کہیں سفیدی مائل بھی ملتی ہے، مگر ہر جگہ کی مٹی زرعی پیداوار کے لیے بہت سازگار ہے۔ ضلع پشاور کی آباد زیر کاشت زمین کا کل رقبہ ۳۱۱۰۰۰ ایکڑ ہے۔

قدرتی پیداوار: پشاور کے پہاڑ زیادہ تر خشک ہیں۔ کہیں کہیں ان میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں پائی جاتی ہیں، جو تنور کے ایندھن کے کام آتی ہیں۔ خٹکوں کے جنوبی علاقے کے پہاڑوں میں بعض مقامات پر کارآمد لکڑی کے پیڑ پائے جاتے ہیں، جیسے زیتون اور ببول جن سے کوئلا بھی تیار کیا جاتا ہے۔ انہیں پہاڑوں میں پھٹکری اور پتھر کا کوئلا پایا جاتا ہے مگر بہت کم مقدار میں۔ میدانی خشک علاقے میں غز (گج، مائیں)، بیری، اور کیکر کے درخت اور مرطوب علاقے میں شیشم، توت اور بکائن کے درخت زیادہ ہوتے ہیں۔ ضلع میں جنگلات کا کل رقبہ ۱۹۶۸۶ ایکڑ ہے، جس کی حفاظت اور انتظام محکمۂ جنگلات کے سپرد ہے۔ اس کے علاوہ ایک منصوبے کے تحت ورسک کے پہاڑوں میں

تقریباً دو ہزار ایکڑ کے رقبے کا ایک نیا جنگل لگایا گیا ہے۔

آب پاشی: آب پاشی کے لیے دریائے کابل کی نہر، دریائے سوات کی نہر اور ورسک کی نہر کے علاوہ نوشہرہ اور اٹک کے درمیان ٹیوب ویلز اور ٹگی، کنڈر مرداره اور خویشگی، تین مقامات پر لفٹ اری گیشن (Lift Irrigation Scheme) کے ذریعے آب پاشی کی جاتی ہے۔

برقابی: پشاور میں ورسک کا پن بجلی گھر ۲ لاکھ ۴۰ ہزار کیلوواٹ بجلی مہیا کرتا ہے، جس سے ضلع بھر کی بجلی کی ضرورت پوری کرنے کے علاوہ پنجاب کو بھی بہم پہنچائی جاتی ہے۔

زرعی پیداوار: فصلوں میں بالخصوص گیہوں، مکئی اور گنا اور بالعموم چاول، دالیں، سرسوں، مرچ، تمباکو اور کپاس پیدا ہوتی ہے۔ نیشکر زیادہ تر تحصیل چارسدہ میں پیدا ہوتا ہے، جس سے شکر کے علاوہ گڑ بھی بنتا ہے، جو پشاوری گڑ کے نام سے دور دور بھیجا جاتا ہے۔

آبادی: (۱) مجموعی آبادی: ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع پشاور کی مجموعی آبادی ۱۲۱۳۳۶۸ تھی۔ اس میں ۶۵۱۵۵۸ مرد اور ۵۶۱۹۱۰ عورتیں تھیں۔ گزشتہ دس سال، یعنی ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے بعد آبادی میں اضافے کی شرح ۳۰.۰۷ فیصد رہی؛ (۲) شہری آبادی ۲۸۲۳۱۸ نفوس پر مشتمل تھی اور (۳) دیہاتی آبادی ۸۳۱۰۵۰ تھی اور (۴) صرف پشاور شہر اور چھاؤنی دونوں کی مجموعی آبادی ۲۱۸۶۹۱ تھی، جس میں ۱۲۶۰۲۰ مرد اور ۹۲۶۷۱ عورتیں تھیں۔ ضلع بھر میں تقریباً چھے سو گاؤں ہیں۔

مہاجرین: ۱۹۴۸ء میں سابق صوبۂ سرحد میں مہاجرین کی آمد شروع ہوئی، چنانچہ ایک سال کے اندر اندر مجموعی حیثیت سے یہاں ۶۵۶۰۸ مہاجرین آئے۔ ان میں سے ۳۲۱۰۳، یعنی تقریباً آدھے مہاجروں کو صرف ضلع پشاور میں بسایا گیا اور بقیہ مہاجرین باقی پانچ ضلعوں میں آباد کیے گئے۔

زبان: ضلع پشاور میں خصوصاً دیہاتی آبادی کے نوے فیصد لوگوں کی مادری زبان پشتو ہے۔ باقی دس فیصد میں، جس میں زیادہ تر شہری آبادی شامل ہے، ہندکو یا پشاوری بولی، پنجابی، لہندا، اردو اور فارسی بولی جاتی ہے۔ شہری آبادی میں پشاور میونسپلٹی، پشاور چھاؤنی، نوشہرہ کلاں میونسپلٹی، نوشہرہ چھاؤنی، چارسدہ میونسپلٹی، قصبۂ تنگی، قصبۂ اتمان زئی، امان گڑھ صنعتی علاقہ، رسالپور چھاؤنی، قصبۂ شبقدر، قصبۂ اکوڑہ خٹک، قصبۂ پبی، پشاور یونیورسٹی ٹاؤن، جہانگیرہ صنعتی علاقہ، چراٹ چھاؤنی، اور "نشاط مل" کا علاقہ شامل ہیں۔

تعلیم: تعلیم کے لحاظ سے پشاور شہر اور چھاؤنی، شمال مغربی صوبۂ سرحد کے تمام شہروں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ رہا ہے۔ (بوقت تحریر مقالہ) پشاور شہر اور چھاؤنی میں تیس پرائمری، آٹھ لوئر مڈل، تین مڈل اور لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے ملا کر نو ہائی سکول ہیں، تین کالج لڑکوں کے لیے اور ہوم اکنامکس سمیت تین کالج لڑکیوں کے لیے ہیں۔ پشاور اور ضلع پشاور کے لیے منظور شدہ تعلیمی ادارے حسب ذیل ہیں:

(۱) یونیورسٹی	۱۰
(۲) آرٹس اینڈ سائنس کالج	۵
(۳) لاء کالج	۱
(۴) ایجوکیشن (بی ایڈ) کالج	۱
(۵) خیبر میڈیکل کالج	۱
(۶) انجینیئرنگ کالج	۱
(۷) ایگریکلچرل کالج	۱
(۸) کامرس کالج	۱

(۹) فارسٹ انسٹیٹیوٹ	۱
(۱۰) انٹرمیڈیٹ کالج	۲
(۱۱) ہوم اکنامکس کالج	۱
(۱۲) ہائی سکول	۳۵
(۱۳) مڈل سکول	۵۸
(۱۴) پرائمری سکول	۳۱۰
(۱۵) نارمل ٹریننگ سکول	۱
(۱۶) ٹیکنیکل سکول	۱
(۱۷) پالی ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ	۲
(۱۸) کمرشل انسٹیٹیوٹ	۱

تعلیم یافتہ افراد: ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق خواندہ افراد ۱۰۲۹۵۷ تھے۔ ان میں مرد ۱۲۹۷۴۸ اور عورتیں ۲۳۲۰۹ تھیں۔ یعنی مجموعی آبادی کا ۱۳٫۰۷ فیصد۔

وسائل حمل و نقل: پشاور میں تانگوں کا رواج بہت پرانا ہے، جو ابھی تک چل رہا ہے۔ چند سال سے چھاؤنی میں ٹیکسی کاریں اور موٹر رکشائیں عام ہو گئی ہیں؛ البتہ دور افتادہ دیہات میں، جہاں سڑکیں ابھی نہیں پہنچیں، پیدل آمد و رفت کی جاتی ہے، یا بائیسکلوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ۱۹۵۲ء سے گورنمنٹ ٹرانسپورٹ بس سروس شروع ہوئی ہے؛ شہر اور چھاؤنی میں اومنی بس سروس کے علاوہ یہ گرد و نواح کے تمام ضروری مقامات تک آتی جاتی ہیں۔ بار برداری کے لیے اگرچہ موٹر ٹرک عام ہو گئے ہیں، پھر بھی قدیم بیل گاڑیاں ابھی عام طور پر سامان ڈھوتی نظر آتی ہیں۔

سڑکیں: ضلع پشاور میں پکی سڑکیں ۲۸۲ میل اور کچی ۱۷۲ میل لمبی ہیں۔ ضلع بھر میں اچھی سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ان کے علاوہ شاہراہ کا تعلق پشاور سے راولپنڈی، لاہور نوشہرہ، چراٹ، صوابی، مردان، بنیر، سوات، دیر، چارسدہ، ورسک، باڑا، لنڈی کوتل، کابل، کوہاٹ بنوں اور بارہ چنار سے براہ راست قائم ہے، جن پر یہی گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس باقاعدہ کام کر رہی ہے۔

ریلوے: پشاور، لاہور اور کراچی وغیرہ سے بذریعۂ پاکستان ویسٹرن ریلوے براہ راست منسلک ہے۔ اٹک سے پشاور تک خیر آباد، کنڈ، جہانگیرہ روڈ، اکوڑہ خٹک، نوشہرہ جنکشن، خوشحال کوٹ، پیر پیائی، پبی، تاروجبہ، ناصر پور، پشاور شہر اور پھر پشاور چھاؤنی ریلوے سٹیشن آتے ہیں۔

برانچ لائن: (۱) پشاور چھاؤنی سے جمرود، شاہگئی اور لنڈی کوتل؛ (۲) نوشہرہ جنکشن سے کابل ریور، رسالپور چھاؤنی، رشکئی، مردان جنکشن، گوجر گڑھی، کلپانی، تخت بھائی، پرخو ڈھیری، ہاتھیاں، سخا کوٹ، درگئی؛ (۳) مردان جنکشن سے قدرت، منگا، تلات ناصر، سر ڈھیری، چارسدہ ریلوے سٹیشن پڑتے ہیں۔

ہوائی سفر: پشاور سے پاکستان انٹرنیشنل ایر لائنز (PIA) سروس کے ذریعے چترال، کابل، راولپنڈی، لاہور اور کراچی کا سفر کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، افغانستان کے آریانا ایر لائنز نے پشاور سے اپنی سروس شروع کی ہے اور اب یہ سروس براستۂ لاہور، امرتسر اور دہلی تک بڑھا دی گئی ہے۔

ہسپتال: شہر اور چھاؤنی میں کئی زنانے، مردانے، سول اور فوجی ہسپتال موجود ہیں۔ شہر میں لیڈی ریڈنگ ہسپتال، افغان مشن ہسپتال، زنانہ ہسپتال، زچہ و بچہ کا (میٹرنٹی) ہسپتال، کینٹونمنٹ جنرل ہسپتال اور کمبائنڈ ملٹری ہسپتال CMH ہے۔ ان کے علاوہ ٹی بی کلینک، کئی زچہ خانے، صحت اطفال کے ادارے اور ڈسپنسریاں کام کر رہی ہیں۔ [بوقت تحریر] پشاور شہر اور ضلع میں ہسپتالوں کی مجموعی تعداد سولہ ہے اور

ڈسپنسریوں کی مجموعی تعداد تین ہے۔

صنعت و حرفت: قیام پاکستان سے پہلے ضلع پشاور میں صنعت و حرفت برائے نام تھی، لیکن قیام پاکستان کے بعد ضلع بھر میں بڑی تیزی سے صنعتی ترقی رونما ہوئی۔ اب ضلع بھر میں اٹھارہ صنعتی ادارے اور کارخانے قائم ہیں، جن میں زیادہ اہم سوتی کپڑا بننے، سگریٹ بنانے، آٹا پیسنے، پھلوں کو محفوظ کرنے، شکر سازی، کاغذ اور گتا بنانے، سوڈا کاسٹک (صابن کا تیزاب) نشاستہ، گلوکوز اور دیگر ادویہ تیار کرنے کے کارخانے ہیں۔ لوہا ڈھالنے، سنگ مرمر کی گھڑائی اور اسلحہ سازی کا کام بھی قابل ذکر ہے۔

گھریلو دستکاریاں: اس میں شک نہیں کہ گزشتہ بیس پچیس سال سے ترقیاتی منصوبوں کے تحت کارخانوں کے قیام کے باعث گھریلو دستکاریوں کو خاصا نقصان پہنچا ہے، پھر بھی یہاں کے جلاہے بہت اعلٰی قسم کی لنگیاں، چادریں اور کمبل بناتے ہیں۔ یہاں کلاہ اور جوتوں پر کلابتوں کا کام بہت اعلٰی ہوتا ہے۔ چپلیاں، بوٹ، جوتے، لباس اور دوسرے خانگی ضروریات کے پارچہ جات، دریاں اور قالین وغیرہ تیار ہوتے ہیں۔ پشاور کچے چمڑے اور کھالوں کی تجارت کا مرکز ہے۔ تانبے کے مختلف قسم کے سادہ اور گلدار برتن بھی شہر میں بڑے پیمانے پر تیار کیے جاتے ہیں۔ مٹی کے سادہ برتن ضلع بھر میں بنائے جاتے ہیں، مگر مٹی کے پختہ روغنی گلدار و رنگدار برتن صرف شہر میں بنائے جاتے ہیں۔ سونگھنے اور منہ میں ڈالنے کی نسوار (ناس) اور کپڑا دھونے کا صابن بھی بڑے پیمانے پر شہر میں بنایا جاتا ہے۔

انتظامیہ: پشاور ڈویژن کے لیے ایک ڈویژنل کمشنر مقرر ہے، اور عمومی طور پر ضلع پشاور کا نظم و نسق ایک ڈپٹی کمشنر کے ماتحت ہے، جسے ضلع مجسٹریٹ اور کلکٹر کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ ساتھ ہی ضلع کے تمام قومی ترقیاتی اور تعمیراتی محکموں کے ساتھ رابطہ رکھنا بھی اس کے ذمے ہے۔ عدلیہ کو سنبھالنے کے لیے بھی مناسب انتظامات ہیں۔ صوبۂ مغربی پاکستان میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کا ایک بنچ پشاور میں کام کرتا تھا۔ [اب شمال مغربی سرحدی صوبے کا دوبارہ قیام عمل میں آنے کے بعد علٰحدہ ہائی کورٹ قائم ہو گیا ہے]۔ مالیاتی انتظام کے لیے ضلع تین سب ڈویژنوں اور تین تحصیلوں، یعنی پشاور، چارسدہ اور نوشہرہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تحصیل کا صدر مقام تینوں مقامات پر الگ الگ قائم ہے۔ [یکم جولائی ۱۹۷۰ء سے پشاور شمال مغربی سرحدی صوبے کا دارالحکومت ہے]۔

دیگر شعبے: محکمۂ زراعت اور اس میں تحقیقاتی شعبہ، محکمۂ افزائش نسل حیوانات، محکمۂ امداد باہمی، محکمۂ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی (تعمیرات اور آب پاشی)، محکمۂ پولیس، محکمۂ صحت عامّہ، محکمۂ صنعت و حرفت، محکمۂ جنگلات، محکمۂ تعلیمات، محکمۂ غذا، محکمۂ پرورش ماہی، محکمۂ آبکاری، محکمۂ انکم ٹیکس، محکمۂ ڈاک و تار وغیرہ ہیں۔

پشاور شہر: کچھ عرصہ پیشتر تک یہ شہر پرانی اینٹوں کی بنی ہوئی بھاری فصیل کے اندر محصور تھا، جس میں چاروں طرف باہر جانے کے لیے بارہ بڑے اور چار چھوٹے دروازے تھے، لیکن گزشتہ برسوں میں شہر کی آبادی میں بہت توسیع و ترقی ہوئی۔ گرد و پیش میں شہر سے ملحق بہت سی نوآبادیاں بن گئیں، جن میں بالکل جدید طرز و وضع میں نئے سے نئے نمونے کے مکانات بنائے جا رہے ہیں، اس لیے ان کو ملانے کے لیے چاروں طرف سے فصیل جگہ جگہ سے توڑ دی گئی،

اور کئی حفاظتی دروازے بالکل مٹا دیے گئے، جیسے باجوڑی، کابلی، کچہری اور ہشتنگری دروازے۔ اندرون شہر کا منظر قدیم ساخت کے شہروں کا سا ہے۔ مکانات اکثر دو منزلہ، سہ منزلہ اور چہار منزلہ، اکثر پکی اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں۔ اوپر کی منزلوں کی دیواریں لکڑی کے کٹہروں اور چوکھٹوں کے اندر ایک ایک اینٹ کی چنائی کی ہیں۔ گلیاں تنگ اور ٹیڑھی میڑھی ہیں، مگر ان کے فرش پختہ ہیں۔ اکثر مکانوں میں تہ خانے اور کہیں کہیں کنویں بھی ہیں۔ گرمیوں میں لوگ ان تہ خانوں میں دن گزارتے ہیں۔ اب بجلی کے آ جانے سے ان کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ دکانیں مکانات کے زیریں حصوں میں بنی ہیں، جو بہت آباد و بارونق ہیں اور ضروریات زندگی کی جملہ اشیا سے بھرپور رہتی ہیں، جن میں کثرت تنوری روٹی، کباب اور چائے کی دکانوں کی ہے اور عموماً خشک و تر میوے، سبزی ترکاری، گوشت، مچھلی، انڈے، بنیادی اور روزمرہ ضروریات کی اشیا، کپڑا، لوہے کا سامان اور تانبے کے گلدار اور سادہ برتن بھاری مقدار و تعداد میں مہیا رہتے ہیں۔ بڑے بازاروں کی دکانوں میں ہر قسم کی زندگی کے لوازم بھی وافر دستیاب ہو سکتے ہیں۔ پشاور شہر میں مسجدیں بھی بہت سی ہیں، ان میں شاہجہاں کے زمانے کی چند مسجدیں بہت مشہور ہیں۔ سب سے بڑی مسجد مہابت خان (اندرونِ شہر) ہے، دوسری مسجد گنج علی خان (بازار پاپڑ گراں)، تیسری مسجد دلاور خان (محلۂ قاضی خیلان)، چوتھی مسجد خواجہ معروف (محلۂ گنج) اور مسجد قاسم خان (بازار قصہ خوانی) ہے۔

شہر میں قصہ خوانی اور چھاؤنی میں صدر بازار سب سے بڑے اور با رونق بازار ہیں، جن میں ہر وقت بڑی گہما گہمی اور چہل پہل رہتی ہے، شہر کے بازار قصہ خوانی میں چونکہ پہلے داستان گو لوگوں کو منظوم قصے سنایا کرتے تھے، اس لیے اس بازار کا یہی نام پڑ گیا۔ اس کے علاوہ بازار کلاں، گھنٹہ گھر، مینا بازار، موچی لڑا، کنرا ابریشم گراں، بازارِ صرافاں، بازار اندر شہر، بزاز ہٹہ، لنگی فروشاں، بٹیر بازاں، دال گراں، غلہ منڈی، سبزی منڈی، پیپل منڈی، نمک منڈی، میوہ منڈی، لکڑ منڈی، بازار ڈھکری، رامداس بازار، جہانگیر پورہ، کریم پورہ بھی مشہور بازار ہیں، اب بیرون کابلی دروازہ نئی آبادی میں خیبر بازار اور چوک سوکارنو بھی قابل دید بازار ہیں۔ شہر میں پرانی طرز کی سرائیں، مسافر خانے اور جدید طرز کے ہوٹل اور رستوران بھی بکثرت ہیں۔

قابل دید اور اہم مقامات: ضلع پشاور میں بہت سے قابل دید مقامات ہیں: قلعۂ بالا حصار، مسجد مہابت خان، شاہی باغ، وزیر باغ، اور چھاؤنی میں کمپنی باغ، عجائب گھر، اسمبلی ہال، میونسپل ہال اور بیرون شہر اسلامیہ کالج کی خوبصورت اور عظیم الشان عمارت (جو خیبر کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے اور جو اپنے زمانے کے چیف کمشنر سر جارج روس کیپل اور نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی مساعی سے قائم کیا گیا تھا۔ اب یہیں پشاور یونیورسٹی بھی بنی ہے)۔ ورسک بن بجلی گھر، درۂ خیبر، درۂ کوہاٹ، اور آثار قدیمہ کے مقامات پنج تیرتھی، شاہ جی کی ڈھیری، اور گور کٹھری قابل دید ہیں۔

باشندگان پشاور: ضلع پشاور میں زیادہ تر مہمند، محمد زئی، خلیل، داؤد زئی اور خٹک آباد ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ سب پشتون متناسب قد و قامت کے مالک، کھلتے ہوئے گندمی رنگ، لمبوترے چہرے اور کھڑے نقشے والے تنومند، شکیل اور وجیہ لوگ ہیں۔ مردوں کا ڈھیلا ڈھالا

سفید لباس، جو زیادہ تر ڈھیلی اور لمبی آستینوں کے لمبے کرتے یا خلقے، ڈھیلے اور چوڑے پائینچوں کے گھیردار بھاری پاجامے (تنبا)، سر پر اکثر بغیر کلاہ کے سادہ پگڑی، یا کلاہ لنگی، ایک چادر اور پیروں میں چپلی یا جوتے پر مشتمل ہوتا ہے۔ غذا سادہ ہوتی ہے۔ گوشت روٹی بہت مرغوب غذا ہے۔ گرمیوں میں گیہوں کی خمیری تنوری روٹی اور سردیوں میں مکئی کی روٹی کھائی جاتی ہے۔

دیہات کے مکانات اکثر سادے نظر آتے ہیں، جو ایک یا دو کوٹھوں اور صحن پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے محلّوں کا ایک حجرہ ہوتا ہے؛ یہ ایک طرح کا مشترک ڈیرہ یا نشست گاہ ہوتی ہے جو کسی ملک، نمبردار یا ذی حیثیت شخص کے نام پر مشہور ہوتا ہے۔ اس میں صحن کے علاوہ ایک یا دو کوٹھے ہوتے ہیں۔ حجرے میں چارپائیاں، پینے کا پانی، حقہ اور تمباکو اور اکثر سرسوں کے تیل کا چراغ بالالتزام رکھا جاتا ہے۔ اس میں ہر قسم کے اجتماعات، جرگے، مشورے، شادی و غمی کی تقریبات اور مہمانداری سب کچھ مشترکہ طور پر کیا جاتا ہے۔ بعض جگہ غیر شادی شدہ نوجوان بھی رات کو حجرے ہی میں سوتے ہیں، ورنہ ویسے بھی رات کو بات چیت ہوتی ہے، منظوم رومانی داستانیں سنائی جاتی ہیں؛ یا رباب اور مٹکے کے ساتھ راگ رنگ کی محفلیں جمتی ہیں۔

پشتونوں کی اکثریت عقائد کے لحاظ سے راسخ العقیدہ اہل السنت والجماعت ہے۔ البتہ پشاور شہر میں زیادہ اور علاقے میں کہیں کہیں شیعہ بھی ہیں۔ پشتونوں کی بیاہ شادی اور موت، خیرات صدقات وغیرہ سب مذہب اسلام کے مطابق ہے۔ لوگ عقیدۃً سادات، پیروں، درویشوں اور اولیاے کرام کی دل و جان سے تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ بزرگانِ دین اور اولیاے کرام کے مزاروں پر دور دور سے بڑی عقیدت کے ساتھ آتے ہیں اور نذرانے چڑھاتے ہیں۔ علاقے میں بعض بزرگوں کے مزار پر عرس کے سلسلے میں ہر سال بڑے بھاری اجتماعات ہوتے ہیں، جسے عوام میلا کہتے ہیں۔ پشاور میں دو میلے بہت مشہور ہیں۔ ایک، شہر میں، حضرت سخی سرورؒ کے نام پر جھنڈوں کا میلا اور دوسرا حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ کا میلا، موضع زیارت کاکا صاحبؒ (تحصیل نوشہرہ) میں ہر سال ماہ رجب کی اٹھارھویں سے چوبیسویں تک منعقد ہوتا ہے۔ ان دونوں میلوں میں گرد و نواح کے علاقوں سے لوگ جوق در جوق بڑی عقیدت اور شوق سے آ کر شامل ہوتے ہیں۔

ساتھ ہی پشتون، اپنی قدیمی روایتی پشتون ولی کے آئین و دستور کا بھی بہت لحاظ رکھتے ہیں، جس میں غیرت، ننگ و ناموس، حمیت، پت، انتقام، تربورولی، مہمانداری، جرگہ، ننواتی وغیرہ جیسی کچھ باتیں ایسی ہیں؛ جن کی پابندی اور پاسداری وہ جان و مال سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔

دیہاتی زندگی میں نوجوان الگ الگ موسم کے لحاظ سے مختلف مردانہ کھیلوں میں بڑے شوق سے حصہ لیتے ہیں، جیسے کبڈی، تپی اور الڈوخر وغیرہ۔ موسیقی اور راگ رنگ کے بھی بڑے دلدادہ ہیں، لیکن باقاعدہ آلات موسیقی کے استعمال کو اپنے لیے عار سمجھتے ہیں۔ بہت ہوا تو بڑوں کی نظریں بچا کر، کہیں گھر سے باہر رباب بجانا سیکھ لیتے ہیں، جس کے ساتھ ڈھولکی یا طبلے کی جگہ مٹکا (گھڑا) بجا لیتے ہیں۔ البتہ قومی ناچوں میں بلا تکلف شامل ہو جاتے ہیں، جو بنگڑہ (بھنگڑا) اتنڑ، شادولہ یا بلبلہ کہلاتے ہیں اور عام خٹک ناچ کے بہت مشابہ ہوتے ہیں۔

مآخذ: (۱) تاریخ ضلع پشاور (اردو، مصور)

۱۸۹۸ء، جلد اول؛ (۲) گزیٹیر آف دی پشاور ڈسٹرکٹ، ۱۸۹۷–۱۸۹۸ء؛ (۳) این، ڈبلیو ایف پراونس گزیٹیر، پشاور ڈسٹرکٹ، جلد اے، ۱۹۰۵ء؛ (۴) پاپولیشن سنسس آف پاکستان، ڈسٹرکٹ سنسس رپورٹ، پشاور ۱۹۶۱ء؛ (۵) دی نارتھ ویسٹ فرنٹیر پراونس ایگریکلچر ۱۹۶۰ء؛ (۶) ویسٹ پاکستان ایگریکلچرل سٹٹسٹکس ۱۹۶۳ - ۱۹۶۵ء؛ (۷) امپیریل گزیٹیر آف انڈیا، ۱۹۰۸ء؛ [دیگر ماخذ قدیمہ کے لیے دیکھیے Ellis: *A Descriptive Catalogue of Persian MSS.*، بمدد اشاریہ، بذیل مادۂ پشاور].

(سیّد انوارالحق)

⊛ **پشتو**: (= پختو)، پشتو ادب کا جائزہ لینے سے پہلے، مختصر طور پر، پشتو زبان اور اس کے بولنے والوں کا تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے.

پشتو، پشتونوں کی زبان ہے، یہ پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے کے ضلعوں، ایجنسیوں اور ریاستوں، بلوچستان کے ایک حصے میں اور تقریباً نصف افغانستان میں بولی جاتی ہے.

چونکہ پشتون، آریوں کی آمد سے بہت پہلے، اپنے پرانے وطن پشتونخوا (پکتی ایکا) میں رہتے تھے، اس لحاظ سے ان کی بولی بھی یقیناً بہت پرانی ہے - پشتو ایک قدیم زبان ہے جو بعض کے نزدیک باختر قلہم کی مختلف اقوام میں بولی جاتی تھی - پشتو سے ایک انوکھی خصوصیت وابستہ ہے اور وہ یہ کہ پشتو بولی کا نام بھی ہے اور پشتو بولنے والوں کے معاشی اور معاشرتی آئین و دستور یا ضابطۂ اخلاق کا نام بھی - گویا پشتون پشتو بولتے بھی ہیں اور ''پشتو کرتے اور برتتے'' بھی ہیں، یعنی پشتو کے قاعدوں اور ضابطوں پر عمل پیرا بھی ہیں (دیکھیے عبد القادر: پشتو فلسفہ، پشتو اکیڈیمی، پشاور یونیورسٹی).

مشرق و مغرب کے قریب قریب تمام مؤرخین و محققین اس امر پر متفق ہیں کہ انسانی تمدن کی نشو و نما و ارتقا کا گہوارہ وسط ایشیا کا خطّہ ہے، جہاں کم از کم پچیس ہزار سال ق - م انسان نے تمدّن کی بنیاد رکھی، نشو و نما پائی (مرتضی احمد خان: تاریخ اقوام عالم، ۱: ۶۹ تا ۷۲) - اسی سر زمین پر اس نے ترقی کی اور اطراف عالم میں پھیل گیا.

باختر جو اب صرف ''بلخ'' کہلاتا ہے، گو وہ آج کل افغانستان کا ایک ضلع بھی ہے، در حقیقت وہ قدیم و شکستہ حال فصیل اور گرد و پیش کے بے شمار کھنڈروں کے درمیان گھرا ہوا، لگ بھگ پانچ چھے سو گھروں کا ایک قصبہ ہو کر رہ گیا ہے، مگر زمانۂ قدیم کا باختر (بلخ) ایک وسیع علاقہ بھی تھا اور ایک آباد و با رونق شہر بھی، جو بقول بعض مؤرخین کے بابل و نینوا کا ہمسر تھا (کرنل سر تھامس ہالڈچ: ''دی گیٹس آف انڈیا''، ۱۹۱۰ء، ص ۱۷) - اس کا حدود اربعہ یوں تھا کہ شمال میں آمو دریا، مشرق میں بدخشان، جنوب میں سلسلۂ کوہِ ہندو کُش اور مغرب میں صحرا یا ریگستان، اور اس کا رقبہ شمالاً جنوباً دریاے آمو سے لے کر کوہ ہندو کش تک تقریباً ایک سو بیس میل چوڑا، اور شرقاً غرباً مزار شریف تک تقریباً اڑھائی سو میل لمبا، یعنی تیس ہزار مربع میل تھا - اس کا بالائی حصّہ خشک، بے برگ و گیاہ اور بنجر ریگستان تھا، مگر اس سے نیچے کا علاقہ بہت سر سبز و شاداب تھا، جو اس وقت اونچے اونچے جھنڈوں والا ملک یا سر زمین کہلاتا تھا (لغت نامۂ دھخدا، ایران، حصہ ب ۱، ص ۱۸۶) - یونانی اور عرب مؤرخوں نے اسے اُمّ البلاد، امّ القُرٰی یعنی مادر شہرہا اور جنت ارضی کے ناموں سے یاد کیا ہے (ڈبلیو ڈبلیو ٹارن: دی گریکس ان بیکٹریا اینڈ انڈیا، ۱۹۵۱ء، ۲: ۱۱۳) - وہاں کی سرسبزی،

شادابی اور زرخیزی بڑی پر کشش تھی، وہاں کے پھل خصوصاً انگور اور سیب خاصے بڑے اور رسیلے ہوتے تھے - حیوانات خصوصاً دو کوہانوں والے اونٹ، گھوڑے، گدھے اور دنبے تو حد سے آج تک مشہور چلے آرہے ہیں، بلکہ آج بھی لغت کی کتابوں میں وہی قدیم نام بختی (فیروز اللغات، ص ۱۹۱؛ نسیم اللغات، ص ۳۴۱؛ فرہنگ کاروان، ص ۴۰۱)، بڑے اور تیز رفتار اونٹ کے لیے پایا جاتا ہے - غرض یہ سر زمین اپنی آبادی اور زرخیزی کے باعث بڑی اہم رہی ہے (Heeren : Asiatic Nations، ۱ : ۴۲۴).

آریا قبائل جو پانچ چھے ہزار سال پہلے، شمالی میدان اعظم کی چراگاہوں میں مقیم تھے، تقریباً دو ہزار سال ق م میں (تاریخ اقوام عالم، ص ۰۷۱)، جب کہ قدرتی موسمی کوائف کی تبدیلی کی وجہ سے وہاں اچانک سردی پڑنے لگی، سب کچھ برف سے ڈھک گیا، چراگاہیں ختم ہونے لگیں، زندگی گزارنا محال ہو گیا تو انہوں نے مجبوراً اپنی قدیم زاد بوم سے، جسے وہ اپنی آریک زبان میں "آریانیم وایجو" (آریانہ ویجہ) کہتے تھے، اٹھ کر جنوب کی طرف کوچ کرنا شروع کیا - ان قافلوں نے پہلے پہل سکودا اور مورا (یعنی سغدیانہ، مرو اور بدخشان) میں آ کر قیام کیا - کچھ عرصہ وہاں رہے، مگر مغول کے حملوں سے تنگ آ کر وہاں سے اٹھ آئے اور جنوب مشرق کی طرف، باختر (بلخ) میں آ ٹھیرے - یہ ان کا دوسرا پڑاؤ تھا - یہ جگہ سکھدا (سغدیانہ) سے بہت زیادہ اچھی تھی - یہاں ان نوواردوں (آریوں) نے دیکھا کہ اس علاقے کے لوگ متمدن اور زراعت پیشہ ہیں اور ہر قبیلے نے اپنے امتیازی نشان کے طور پر اونچے اونچے جھنڈے نصب کر رکھے تھے تاکہ پہچانے جائیں - یہ زمین چونکہ بہت اچھی اور آباد تھی، اس لیے آریوں کو بہت پسند آئی اور اسے ایک مستقل مستقر بنا لیا - اب آریوں کے یہ کوچی قبیلے سیدھے یہاں آتے، کچھ عرصہ گزارتے اور پھر آگے کوچ کرتے (انوارالحق : پشتون، پشتو اور پشتونخوا (قلمی)، باب اول؛ Edward Balfour : *The Cyclopaedia of India and of Eastern and Southern Asia*، بار دوم، ۱ : ۳۸).

آریوں نے رگ وید میں باختر قدیم کا پکھت یا پکھتہ، بلہیہ (بلخ) اور بلہکا کے ناموں سے ذکر کیا ہے - سنسکرت ڈکشنری میں رگ وید کے حوالے سے "پکتھہ" ایک گروہ یا طبقے کا نام لکھا ہے اور پکتھی اس کے ایک فرد کا نام بتایا ہے؛ (Sir Monier-Williams : *Sanskrit-English Dictionary*، ص ۵۷۵)، ایسے ہی ژند آوستا میں اسے بخدے اور بخت وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے (عبدالحی حبیبی : د پشتو ادبیاتو تاریخ، کابل، ص ۲۹ تا ۳۰) اور مشہور یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس نے اپنی تاریخ میں بکھت کے باشندوں کے لیے پکتو، پکتویس اور پکتوان نام لکھے ہیں اور پکتوان کو بہت جری، قد آور، تنومند، جنگجو، پوستین پہننے والے اور خاص قسم کے خنجر اور جنگی اسلحہ رکھنے والے بتایا ہے - ساتھ ہی رگ وید اور ہیروڈوٹس کی تاریخ میں اس شمال مغربی سرحدی علاقے کے تین چار قبائل کے نام آتے ہیں (رگ وید : گندھرو، گندھارا اور گندھاری؛ ہیروڈوٹس: گنداریوے، ستاگودائے، آپارتیوے اور دادیکائے) - ان قبائل کے لیے یہ کسی نے نہیں لکھا کہ یہ آریا تھے، بلکہ ہیروڈوٹس نے ان چاروں قبیلوں کے علاقے کو اکٹھی ایک اقلیم شمار کیا ہے اور انہیں ہندی باشندہ اور تمام دیگر آریا قبائل سے ممیز و مختلف گردانا ہے اور پکتوان وغیرہ سے جو پکتی ایکا (پختونخوا) میں

رہتے تھے بہت مشابہ قرار دیا ہے (The Pathans، اردو ترجمہ، پشتو اکیڈیمی، ص ٥، مقدمہ مصنف، ص ٥ تا ١٧)۔

مؤرخین نے رگ وید کے لکھے جانے کا عرصہ زیادہ سے زیادہ ١٥٠٠ ق م، ژند آوستا کا ١٠٠٠ ق م اور ہیروڈوٹس کا ٥٠٠ ق م تک مقرر کیا ہے۔ ان تینوں حوالوں میں سے پہلے دو تو خود آریوں کی مذہبی کتابیں ہیں جن کی تاریخی حیثیت مانی جا چکی ہے۔ وید علی الخصوص سب سے پہلا یعنی رگ وید جس کے ذریعے آریوں کے تاریخی حالات معلوم کیے جا سکتے ہیں (A : Arthur A. Macdonell، *History of Sanskrit Literature*، ١٩٢٨ء، ص ٨، ٩؛ گستاو لیبان: تاریخ تمدن ہند، ص ٢٠٨)۔ شمال مغربی سرزمین پاک و ہند میں لکھے گئے ہیں، اور ژند (زرتشت کی مذہبی کتاب) خاص باختر (بلخ) میں لکھی گئی ہے، اور تیسرا حوالہ مشہور ایرانی بادشاہ داریوش کبیر (٥٢١ سے ٤٨٥ ق م) کے یونانی مؤرخ و سوانح نگار اور جغرافیہ دان ہیروڈوٹس (٤٢٥ سے ٤٨٤ ق م) کی تاریخ کا ہے جس میں اس نے داریوس کی مملکت میں باجگزار اقالیم کی فہرست بھی دی ہے اور اس کی سلطنت کی وسعت اور فوجی طاقت و سطوت کی تفصیل بیان کی ہے۔ چنانچہ پکھت، پکھتہ، پکھتین، بخدی، بختی، بخت، پکتو اور پکتوان وغیرہ کا ذکر کرنے والے خود وہی قدیم ہندی اور پھر ایرانی آریا ہیں اور ان کے بعد یونانی مؤرخ ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے اور تیسرے کئی یونانی، چینی اور عرب مؤرخوں اور سیاحوں کا نام بھی لیا جاتا ہے، مگر وہ سب ان مذکورہ بالا مآخذ کے بہت بعد کے ہیں۔

علاوہ ازیں سائبیریا کی چراگاہوں کے رہنے والے آریاؤں نے اپنے قدیم مسکن یعنی میدان اعظم کا نام "آریانم وائجو" "ایرین ویجہ" یا "آردانہ ویجہ" رکھا تھا۔ ایران میں مقیم ہو کر اس کا نام "ایران ویج" رکھا اور آخری پڑاؤ میں جب وہ شمالی ہند کے کوہ دامانوں میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے تو وہاں کا نام انہوں نے "آریا ورش" رکھا اور زندگی گزارنے کے طور طریقوں اور ضابطوں کو "آریا ورت" کا نام دیا، لیکن باختر قدیم کا نام انہوں نے نہیں بدلا اور نہ اپنے نام سے، کسی شکل میں منسوب و موسوم کیا (عبدالحی حبیبی: تاریخ ادبیات پشتو، کابل، ص ٥١؛ مانک جی نسروان جی ڈھلا: زور وسٹرین تھیالوجی، ١٩١٤ء، ص ٢٤٣؛ عبدالحی حبیبی: پشتو ادبیاتو تاریخ، ص ٢٣) بلکہ وید میں پکھت، پکھتہ، بلہہ، بلہہ، بلہکا اور باشندوں کا پکھتین یا پکھتین اور ژند آوستا میں بخدی، بختی، بخت اور ہیروڈوٹس نے پکتویس، پکتو اور پکتوان اور جگہ کا نام پکتی ایکا صاف صاف بیان کیا ہے۔

بعض کا خیال ہے (J : Sir Percy Sykes، *History of Persia*، ص ٩٨) کہ آریا شمالی باختر میں ہولے پہلے ٣٠٠٠ سال ق م سے بھی بہت پہلے آئے ہیں۔ پشتو ادبیاتو تاریخ کے صفحہ ٥١ سے جناب عبدالحی حبیبی نے بحوالہ ایران قدیم "صفحہ ٩ اور" تمدن ایرانیان خاوری "صفحہ ٣٧ تا ٤٠" آریوں کے ترک سکونت کر کے باختر آنے کا زمانہ ٣٠٠٠ سال ق م لکھا ہے، اس بیان سے باختر کے متمدن اور زراعت پیشہ باشندوں کی قدامت اور بھی زیادہ ثابت ہوتی ہے۔

بعض مؤرخوں (احمد علی کہزاد: تاریخ افغانستان، کابل؛ عبدالحی حبیبی: د پشتو ادبیاتو تاریخ، ص ٢٠) نے آریوں کے لیے لکھا ہے کہ وہ زراعت پیشہ اور کاشتکار تھے، کیونکہ "آریا" نام مرکب ہے آر اور یا سے، [illegible] آر کہتے ہیں

نوکدار چیز کو، جس سے مراد هل کی پھال ہے، مگر یہ توجیہ اور تشریح غلط معلوم ہوتی ہے۔ آر اور آریا دونوں مفرد نام ہیں، آر نوک کو اور ہر نوکدار چیز کو کہتے ہیں، جیسے نیزے کی انی، تیر کی نوک، میخ (کیل) کا نوکدار سرا، بیلوں کو ہانکنے کی چھڑی یا لکڑی، جس کے سرے میں لوہے کی چھوٹی سی میخ لگی ہوتی ہے، اور آریا کے معنی ہیں شریف، نجیب، معزز، بلند مرتبہ۔ سنسکرت کی کسی لغت میں آریا کے معنی زراعت پیشہ کے اب تک نظر سے نہیں گزرے۔ قیاس کہتا ہے کہ آریوں نے زراعت اور کاشتکاری پہلی بار باختر میں آن کر دیکھی، اگر سیکھی بھی تو یہیں پکتھینوں سے سیکھی ہوگی، جو ان کی آمد سے ہزاروں سال پہلے متمدن ہو چکے تھے۔

آریوں کی ان محولۂ بالا تحریروں اور حوالوں سے ثابت ہوگیا کہ پکھت (پخت، پشت)، بخدی اور پکتی ایکا (پختیخا، پختونخوا، پشتونخوا) میں رہنے والے پکھتین (پختین، پشتین) اور ہیروڈوٹس کے پکتوان، جو باقاعدہ متمدن اور کاشت کاری کی زندگی گذارتے آ رہے تھے، یہی پشتون یا پختون ہیں۔

پشتو: اس میں شک نہیں کہ ایسی بیّن تاریخی شہادت اب تک دستیاب نہیں ہوئی جس کی بنا پر یہ یقین سے کہا جا سکتا کہ قدیم پشتونوں کی بولی کا نام پشتو تھا اور وہ شروع سے یہی پشتو بولتے آ رہے ہیں، لیکن یہ ثابت ہو گیا ہے کہ پشتون آریوں کی آمد سے بہت پہلے اپنے قدیمی وطن پشتونخوا میں رہتے تھے، لہٰذا ان کی بولی بھی یقینًا بہت پرانی ہوئی۔ ایسے ہی یہ بھی قیاس غالب ہے کہ پشتونوں کی بولی پشتو ہی ہو۔

یورپی محققین اس ایک خیال میں بالکل متفق ہیں کہ ہندی۔ یورپی زبانیں ایک ایسی زبان سے نکلی ہیں، جو ان سب زبانوں کی ماں تھی (میکس مولر: علم الالسنہ، جلد اول، صفحہ ۳۰۳؛ ڈاکٹر گستاو لیبان: تمدن ہند، بار دوم، صفحہ ۲۱۰ اور صفحہ ۲۳۳؛ چیمبرز انسائیکلوپیڈیا، جلد اول، صفحہ ۲۷۳ تا ۲۷۴؛ انسائیکلو پیڈیا امریکانا، جلد دوم صفحہ ۲۷۳؛ انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسیز، جلد دوم، صفحہ ۳۶۲؛ مسٹر کول بروک: ایشیاٹک ریسرچز، جلد ہفتم، صفحہ ۲۰۰؛ وانس کینیڈی: دی پرنسپل لینگویجز آف ایشیا اینڈ یورپ، باب سیزدہم، صفحہ ۳۱۲)۔ مگر وہ زبان کیا تھی؟ کہاں تھی؟ اور کیا ہوئی؟ اس عقدے کو حل کرنے سے وہ سب قاصر رہے۔ انھوں نے عالم تصوّر میں ایک زبان کو امّ الالسنہ فرض تو کر لیا، لیکن وہ اسے متعین نہ کر سکے، بلکہ اکثر مؤرخوں نے لکھ دیا کہ وہ زبان اب ناپید و معدوم ہے بعینہٖ جیسے ویدی، اوستائی اور یونانی مؤرخ کی صریح شہادتوں کے باوجود پشتون قوم کی قدامت کو نظر انداز کر دیا گیا۔ کسی نے اسے آریا یا بنی اسرائیل بتایا، اور کسی نے میدی یا پارتھی۔ ایسے ہی پشتون زبان کے بارے میں بھی تحقیق کا حق ادا نہیں ہوا۔ ورنہ اکثر قرائن اس بات کے حق میں ہیں کہ باختر قدیم کے قبائل میں پانچ ہزار سال ق۔ م۔ بلکہ اس سے بھی پہلے بولی جانے والی زبان پشتو ہی تھی، جس کا بہر حال اعتراف مناسب تھا۔ علم الالسنہ کے ماہروں نے ہندی۔ یورپی زبانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) ہندی یا ہندوستانی: سنسکرت، پراکرت، قدیم کتبوں کی زبانیں، پالی اور تعلیمات بدھ کی زبان، جین مت کی آردھ ماگھدی، پاک و ہند کی علاقائی زبانیں (پراکرتیں): جیسے مراٹھی، گجراتی، بنگالی، سندھی پنجابی، بلوچی کشمیری، تبتی، اوڑی اور براہی وغیرہ بہت سی زبانیں؛ (۲) ایرانی: ژند۔ پاژند کی

زبان اوستا، ہخامنشیوں کی زبان، قدیم فارسی، پہلوی، فارسی جدید، دری، ارمنی، میدی اور پارتھی وغیرہ؛ (۳) یورپی: کلتی، ہیلینک، اتالک، تیوتانک، سلیوانک اور لتھوانک وغیرہ۔ چنانچہ ان تینوں گروہوں کی زبانوں میں قدیم پشتو کسی اور زبان سے کم قدیم معلوم نہیں ہوتی۔

تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ ان تمام مذکورۂ بالا ہندی۔ یورپی زبانوں کے کلمات اور لغات، جن کی بنا پر ان زبانوں کا آپس میں رشتہ و تعلق ثابت ہوتا ہے وہ سب پشتو میں موجود ہیں، بلکہ آج بھی رائج ہیں، حتی کہ آریوں کی قدیم زبان "اریک" کا بھی پشتو سے گہرا تعلق ہے (Monier Monier-William : Sanskrit-English Dictionary، ص ۱۲؛ The Origin of the Aryan Family of Languages (۱۸۶۱ء)، بحوالۂ دبستان (انگریزی ترجمہ)، جلد اول، صفحہ ۲۲۲، حاشیہ ۱؛ سید انوار الحق: پشتون، پشتو اور پشتون خوا، (قلمی)، پشتو اکیڈمی، پشاور یونیورسٹی)۔ پشتو اور پشتون کے مابین ربط و تعلق کی قدامت اس امر سے ثابت ہوتی ہے کہ پشتو، پشتونوں کی صرف بولی یا زبان ہی کا نام نہیں بلکہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے پشتونوں کے دستور و آئین حیات اور ان کی تہذیب و تمدّن کا نام بھی شروع سے پشتو یا پختو چلا آ رہا ہے، اسی لیے پشتو شروع ہی سے پشتون سے وابستہ ہے۔

دنیا میں کسی بھی پرانی قوم اور زبان کے بارے میں یہ دعوٰی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خالص ہے، اسی طرح پشتونوں میں بھی آریا، میدی، ہخامنشی، منگول، ھن، تاتاری، عرب، اور جانے کون کون سی قومیں آ آ کر ملتی اور مدغم ہوتی رہی ہیں اور آہستہ آہستہ سب پر پشتونوں اور پشتو کا رنگ چڑھتا گیا اور ایک وقت میں ان کے ساتھ مل کر سب پشتون ہو گئے۔

بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس قدامت کے پشتو زبان میں نسبۃً کچھ زیادہ فرق و اختلاف رونما نہیں ہوا۔ آج بھی اس کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ، اکثر بجنسہٖ و بعینہٖ یا معمولی سے فرق کے ساتھ، سنسکرت، پراکرت، اوستا، پہلوی، فارسی، یونانی، جرمنی، اور فرانسیسی زبانوں میں پائے جاتے ہیں، حتی کہ پشتو میں شین اور سین، ژے اور گ، جیم یا زے کا اختلاف بھی شروع سے چلا آ رہا ہے، جس کی وضاحت اپنے موقع پر کی جائے گی۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک تو پشتون خود اپنی زاد بوم سے اٹھ اٹھ کر گرد و پیش میں جہاں انھیں سازگار مقامات ملتے گئے وہاں گئے اور بسے، دوسرے خود ان میں بھی اطراف و اکناف کی بہت سی قومیں آ آ کر گھلتی ملتی رہیں، جن میں سب سے مقدم آریا ہیں اور پھر ان کے بعد اور چار پانچ مذکورۂ بالا بڑی بڑی قومیں ہیں۔ اس آمد و رفت اور تفرّق و اتصال کا اثر قدرۃً زبان پر بہت زیادہ پڑنا چاہیے۔ بہت سے الفاظ آنے والی قومیں اپنے ساتھ لائی ہوں گی اور کتنے ہی الفاظ پشتونوں سے اخذ کیے گئے ہوں گے۔ ایک دوسرے کے ساتھ زبانوں کے خلا ملا اور اختلاط و آمیزش کا یہ سلسلہ دنیا میں یونہی چلتا رہے گا۔ اس کے ثبوت میں انگریزی زبان کی مثال پیش کی جا سکتی ہے، جس میں دخیل الفاظ کی حیران کن کثرت ہے (English Oxford Dictionary بڑی تقطیع کی تیرہ جلدیں اور امریکہ کی Webster's Zino International English Dictionary پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو سکتی ہے)۔ یہی حال اردو، ہندی، فارسی، عربی اور پشتو وغیرہ کا ہے، کیونکہ ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ یہ بات نہ تو قابل فخر و مسرت

ہے اور نہ لائق تأسف و نفرت، بلکہ یہ تو ایک قدرتی امر ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پشتو کی بنیاد و اساس وہی زبان ہے جو تقریباً پانچ ہزار سال ق م وسط ایشیا اور باختر قدیم میں بولی جاتی تھی، بالخصوص وہ بولی جو پکھتین، بختدی، یا بکتوان (پشتون یا پختون) بولتے تھے اور اس میں آمیزش دوسری تیسری زبانوں کی پائی جاتی ہے، جو بعد میں ہوئی، ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔

پشتو رسم الخط:

جب ہم پشتو کے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ قدیم ترین زبانوں میں سے ہے، تو قدرۃً دوسرا سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا تحریری ثبوت کیا ہے اور کب سے ملتا ہے؟ افسوس ہے کہ اس سلسلے میں معلومات بہت محدود ہیں۔ حقیقت پر ابھی تاریکی کی دبیز تہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ جہاں دنیا کے اور ہزاروں واقعات ابھی نظروں سے اوجھل ہیں، وہاں یہ چیزیں بھی مستور و پوشیدہ ہیں۔ اب تک صرف اس قدر علم حاصل ہو سکا ہے کہ پہلے یہاں خط میخی کا رواج رہا ہے، پھر خروشتی کا، اس کے بعد یونانی، براھمی، دیوناگری، اور آوستا وغیرہ کا، اور بالآخر عربی رسم الخط نے آکر دیوناگری کے سوا اور سب کو ختم کر دیا! اس لیے وہ پرانے خطوط و نقوش، جو یوں بھی کوئی زیادہ نشو و نما یافتہ نہیں تھے، آہستہ آہستہ مٹتے گئے۔ صرف یادداشت کے طور پر، تاریخ کی بعض بہت اہم کڑیاں ملانے کی غرض سے تھوڑے تھوڑے اور ادھورے سے نمونے کچھ لوگوں کے گھروں میں، اور کچھ عجائب گھروں میں محفوظ ہیں، جن میں بہت سے خط اب بھی ایسے ہیں جو پڑھے نہیں جا سکتے۔

قیاس کہتا ہے کہ پشتو جس جس دور سے گزری اور جیسے جیسے رنگ میں رہی ہے، یقیناً وقت وقت کے مختلف لہجوں میں بولی گئی ہوگی اور وقت وقت کے مختلف خطوں میں لکھی گئی ہوگی۔ اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ داریوس کبیر (۵۰۶ ق م) کے سنگی کتبوں میں جو میخی خط میں کندہ کیے گئے ہیں، تین جملے پشتو سے اس قدر مشابہ ہیں کہ خالص پشتو معلوم ہوتے ہیں۔ وہ جملے لہجے کے تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ یوں ہیں:

نے اَرَیکہ آھم۔ نے دِرَوغنہ آھم۔ نے زُورکَرَہ آھم
(قدیم سنگی کتبہ)

نہ اڑیکے یم۔ نہ دروغژن یم۔ نہ زور ور یم
(پشتو صورت)

(نہ اڑیل ہوں، نہ دروغ گو ہوں، نہ جابر ہوں)
(اردو ترجمہ)

(رضا زادہ شفق: تاریخ ادبیات ایران، اردو ترجمہ از سید مبارزالدین رفعت، حیدرآباد دکن، صفحہ ۲۹)۔ ایسے ہی سنگی کتبوں کا، جو خروشتی یا کسی دوسرے براھمی خط میں کندہ ہیں اور پشتونوں کے علاقے میں پائے گئے ہیں، اگر بغور و بدقت نظر مطالعہ کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ ان میں بھی کسی نہ کسی شکل میں پشتو نکل آئے۔ کیونکہ جیسا کہ شروع میں بیان کیا جا چکا ہے ادھر آوستا، پہلوی اور فارسی میں اور ادھر سنسکرت، ہندی اور دیگر ملحقہ علاقوں کی پراکرتوں میں، پشتو کے سیکڑوں الفاظ آج بھی پائے جاتے ہیں۔ بہر کیف باقاعدہ تحریری شکل میں پشتو ادب صرف عربی رسم الخط ہی میں سامنے آیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی ابتدا چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی، کے اواخر میں سلطان محمود غزنوی کے ایک وزیر احمد بن حسن میمندی نے کی تھی، مگر پشتو چونکہ ہندی-یورپی زبانوں کی ماں ہے، اس لیے لب و لہجہ اور صوتیات میں عربی اور عبرانی

یعنی سامی زبانوں سے مختلف ہے، پشتو کے لیے عربی حروف تہجی (الفبا) کافی نہیں تھے، اس لیے بزرگوں نے عربی حروف تہجی ہی میں حسب ضرورت کچھ حروف بڑھا لیے، مگر بجائے نئے حروف وضع کرنے کے انھیں مقررہ سابقہ حروف میں سے چند ایک میں کچھ علامات و نشانات کو گھٹا بڑھا کر اور الٹ پلٹ کر کے استعمال کے لیے مفید بنا لیا، جو آج تک چل رہے ہیں۔ پشتو زبان کے الفبا:

ا ب پ ت ټ ث ج ځ چ څ ح خ د ډ ذ ر ړ ز ژ
ږ س ش ښ ص ض ط ظ ع غ ف ق ک ګ ل م
ن ڼ و ء ہ ی ے۔

ان میں سے ا، و، ہ اور ی چار حروف علت (vowels) ہیں، اس طرح کہ الف سے مراد عام زبر (فتحہ) اور "ہ" سے مراد خاص زبر (فتحہ)، "و" پیش (ضمہ) کے لیے اور "ی" زیر (کسرہ) کے لیے استعمال ہوتی ہے اور باقی حروف صحیح (consonants) ہیں۔

ان حروف صحیحہ (یا صامتہ) میں پ، چ اور ژ ایسے حروف ہیں جن میں سے پہلے دو صوتی لحاظ سے ہندی اور سنسکرت میں شامل ہیں اور ویسے تینوں حروف فارسی، ترکی، روسی اور چینی زبانوں میں شامل ہیں۔

ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ اور ع عربی کے خصوصی حروف ہیں۔ جس لفظ میں ان میں سے ایک حرف بھی آ جائے تو اسے عربی کا سمجھنا چاہیے۔ بعض علما نے ف اور ق کو بھی عربی کے خصوصی حروف شمار کیا ہے، لیکن یہ حروف فارسی اور ترکی میں عام ہیں، اس لیے انھیں عربی کے مخصوص حروف میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

ټ ځ څ ډ ړ ږ ښ ګ اور ڼ پشتو کے نو خصوصی حروف مانے جاتے ہیں۔ ان میں سے ټ (ٹ)، ډ (ڈ)، ړ (ڑ)، ګ (گ) اور ڼ (نڑ) صرف صوری اختلاف رکھتے ہیں، ورنہ آواز کے لحاظ سے ان میں اور ٹ ڈ ڑ گ اور نڑ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ ځ څ ږ اور ښ صرف چار حروف ایسے ہیں جو صوتی اختلاف کی بنا پر ج چ ژ اور ش کے بدلے رکھے گئے ہیں۔ جہاں ہندی لہجوں میں ج کی آواز ز، چ کی آواز س، ژ کی آواز گ یا ج اور ش کی خ سے بدلتی ہے، ان آوازوں کے اظہار کے لیے ج کا نقطہ ہٹا کر اس کے سرے پر ہمزہ لگا دیا، یعنی "ج" سے ځ (دزیم = زیم)، جس کی آواز دز = ز ہو گئی (جیسے جناور = ځناور = دزناور = زناور؛ جاے = ځاے = دزاے = زاے؛ جان = ځان = ڈزان = زان)؛ "چ" کے تین نقطے نیچے سے ہٹا کر اس کے اوپر لگا دیے، یعنی "چ" سے څ (تسے = سے) بنا دی (جیسے چبچا = څڅه = تستسہ = سسہ؛ چار پاے = څاروے = تساروے = ساروے؛ چادر = څادر = تسادر = سادر)؛ ژ سے تین نقطے ہٹا کر ایک نقطہ اوپر اور ایک نقطہ نیچے لگا کر ژ سے ږ (گے) کر دیا، جیسے ژلئی (ژالہ = اولے) سے ږلئی یا ږلئے = گلئی یا گلئے؛ ژیرہ (داڑھی) سے ږیرہ (گیرہ)؛ کہیں ژ کی آواز ج سے بدلتی ہے، جیسے ژاولہ (موم) کو جاولہ؛ وریژہ (چاول) کو وریجہ؛ ژامہ (ڈاڑھ) کو جامہ؛ ژبہ (زبان) کو جبہ]؛ "ش" کے تین نقطے ہٹا کر ایک نقطہ اوپر اور ایک نیچے لگا کر اسے ش سے ښ (خین) بنا دیا جیسے شاخ سے ښاخ (خاخ)؛ پیش (ضمہ) سے پیښ (پیخ) اور شیشہ سے ښیښہ (خیخہ)؛ وغیرہ۔

ج کی جگہ ځ (دز) اور چ کی جگہ څ (تس) تو پنجاب کے بعض علاقوں، مارواڑ، میواڑ اور بنگال کے بعض حصوں میں بھی بولا جاتا ہے۔ چینی اور روسی میں بھی سننے میں آتا ہے اور یہ اختلاف بھی قدیمی معلوم ہوتا ہے۔ ایسے ہی جو لوگ "ژ" کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتے وہ قدرۃً اسے

کی جگہ ی کی آواز نکالیں گے جیسے پلیژر Pleasure پلیِر اور میژر Measure کو میِر بولتے ہیں۔ ایسے ہی پشتونوں میں بھی جن کے لہجے میں شروع سے ژ شامل نہیں، وہ قدرۃً ژ کی جگہ ی، ج، گ یا ز کی آواز نکالتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ش کا دو مختلف لہجوں میں بولا جانا بھی زمانۂ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ ش کی اختلافی آواز کے لیے دیوناگری میں ایک حرف ہے جو یہی آواز دیتا ہے وہ ښ ہے۔ اس حرف کی صحیح آواز ش اور خ کے بین بین ہے جو ذرا بھی اِدھر اُدھر ہو جائے تو کھ، ھہ، خہ یا شہ بن جائے گی۔ ورنہ اس کی آواز میں ش، خ اور ہ کی آوازیں ملی ہوئی ہیں، اسی لیے ہندی لفظ بانبا، باکھا (بپا بانا) پڑھا جاتا ہے، جس کا غلط تلفظ باشا ہے۔ آدمی اپنی مادری زبانوں کی یہ باتیں بچپن ہی سے از خود سیکھتا ہے۔ ښ اور ږ کا صحیح تلفظ قندہار کے باشندے ادا کرتے ہیں، کیونکہ وہاں کی پشتو میں یہ دونوں حروف اپنی اصلی آواز کے ساتھ شامل ہیں، بعینہٖ جیسے عربی میں ث، ذ اور ض یا سندھی میں پ، ج، ڈ اور گ کا صحیح تلفظ غیر اہل زبان کے لیے بہت مشکل ہے۔

چنانچہ پشتو بولنے والے شروع سے دو طبقوں میں منقسم ہیں۔ ایک وہ جو ''ژ'' اور ''ش'' اپنی اسی آواز کے ساتھ بولتے ہیں جو فارسی میں بھی پائی جاتی ہے۔ دوسرے وہ جو ''ژ'' کی جگہ گ، ج، یا ز بولتے ہیں اور ''ش'' کی جگہ خ۔ ان میں امتیاز کے لیے عام طور پر ژ اور ش بولنے والے خٹک لہجے کے پشتون اور گ، ج اور خ بولنے والے یوسف زئی لہجے والے کہلاتے ہیں۔

پشتونوں میں لہجے کے اختلاف کی یہ امتیازی لکیر اٹک سے لے کر افغانستان میں دور تک کھنچی چلی گئی ہے جو سر اولف کیرو : (The Pathans) نے بالوضاحت بتلائی ہے کہ شمال مشرقی قبیلے، پښتو (پختو) اور جنوب مغربی قبیلے پشتو بولتے ہیں۔ دونوں کے درمیان حد فاصل تقریب قریب شرقاً غرباً اٹک کے جنوب میں دریائے سندھ سے کوہاٹ اور وادی میران‌زئی ہوتی ہوئی ٹل تک اور وہاں سے دریائے کرم کے جنوب میں ہریوب اور درۂ شترگردن تک جاتی ہے، اس حد کے شمال مشرق میں پښتو (پختو) بولی جاتی ہے اور یہ پشاور کے تمام قبائل، دیر، سوات، بنیر اور باجوڑ کی زبان ہے۔ اس حد کے جنوب مغرب میں جو قبائل پشتو بولتے ہیں، ان میں سب خٹک، درانی، تقریب قریب تمام غلجی (جلال آباد کے قریب کے کچھ لوگوں کو چھوڑ کر)، خوست، وزیرستان کے سارے قبائل، بنوں اور ڈیرہ جات کے قبائل، ژوب اور بلوچستان کے ان دوسرے علاقوں کے پشتون بھی جو قندھار کے قریب واقع ہیں، پشتو بولتے ہیں۔

مگر تحریر میں عرصۂ دراز سے یکسانیت تسلیم کر لی گئی ہے، یعنی لہجہ چاہے خٹکوں کا ہو، چاہے یوسف زئی کا، اختلافی ژ کو ږ اور ش کو ښ لکھا جائے گا۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو پشتو کے اور فارسی، اردو رسم الخط میں فرق صرف ان چار حروف ځ څ ږ اور ښ کا رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی اختلاف نہیں۔ رہا لہجے کا اختلاف یا رسم الخط میں نسخ اور نستعلیق کا سوال، تو وہ ان دوسری پڑوسی زبانوں کے ساتھ مشترک ہے، جیسے خود اردو، پنجابی اور بنگلہ میں لہجوں کا اختلاف پایا جاتا ہے، یا اردو اور فارسی زبانوں کے ملکوں میں نسخ اور نستعلیق کے لیے پسند و ناپسند کا اختلاف چلا آ رہا ہے، ایسے ہی پشتو میں ایک طبقہ نستعلیق رسم الخط پسند کرتا ہے تو دوسرا نسخ کا خواہش‌مند ہے۔ اس معاملے کا تعلق

کثرت رائے پر رہے گا، یا حکومت وقت کی سر پرستی پر؛ جدھر کا پلہ بھاری رہا، وہی غلبہ حاصل کر لے گا؛ ورنہ یہ اختلاف یونہیں چلتا رہے گا۔

پشتو ادب:

پشتون اور پشتو زبان کی قدامت تسلیم کر لینے کے بعد پشتو ادب کی قدامت بھی لازماً ماننی پڑتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ پشتو کی قدامت کے باوجود قدیم زمانے کا کوئی واضح اور قطعی نمونہ اب تک دستیاب نہیں ہوا جو پیش کیا جا سکے۔ یہ صحیح ہے کہ پانچویں صدی ق م کے مذکورہ تین جملوں کا پتا چلتا ہے جو داریوش کے سنگی کتبے میں شامل ہیں اور جنہیں ہمارے بعض تذکرہ نگاروں نے بحر خفیف میں تین مصرعے قرار دیا ہے، لیکن یہ ان کی خوش فہمی ہے۔ چونکہ افغانستان کے مؤرخوں نے پشتونوں کو اپنی طرف سے آریا ثابت کر رکھا ہے اور پشتو کو آریوں کی زبان، اس لیے پشتو ادب کا آغاز ویدوں کے اشعار سے کرتے ہیں، حالانکہ پشتو ٹپے بھی قدامت میں ویدوں سے زیادہ پرانے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ پشتو ٹپہ: سپوږمي سروهه راخېژه ۔ یارم دگلو لوکوی، گتے دیبی نه! (= چاند! سر اٹھا کے جلدی سے نکل آ۔ محبوب میرا، پھولوں کی کٹائی (درو) کر رہا ہے، (اندھیرے میں) اپنی انگلیاں کاٹے لے رہا ہے)، (پشتنیے سندرے، پشتو ٹولنہ، کابل، ص ۱۹۴)، بالکل رگ وید زمانے کا ہے (جو پہلا وید ہے اور تخمیناً ۱۵۰۰ سال ق م میں سرزمین پاک و ہند کے اسی شمال مغربی علاقوں میں مرتب کیا گیا تھا)۔ اس کی وضاحت آگے کی جائے گی۔ ٹپوں میں چونکہ شاعر اور وقت کا ذکر نہیں ہوتا، اس لیے صحیح طور پر تعین زمان و مکان نہیں کیا جا سکتا، البتہ نظم میں جو قدیم ترین نمونۂ کلام ہاتھ آیا ہے وہ بقول تذکرہ نگار محمد ہوتک (۱۱۳۱ھ / ۱۷۲۸ء): پٹہ خزانہ مطبوعۂ پشتو ٹولنہ، کابل، ص ۳۰ تا ۳۵، امیر پولاد سوری کے بیٹے امیر کروڑ پہلوان بادشاہِ غور (۱۳۹ / ۷۵۶ء) کی رجزیہ نظم ہے، جس کا پہلا شعر یا بند یوں ہے:

زویم زمرے، پردے نړئی، لہ ما اتل نشته
میں ہوں شیر اس آبادی پر، مجھ سا بے مثال کوئی نہیں
په هند و سند و پرتخار او پر کابل نشته
ہند و سندھ اور طخارستان و کابل میں نہیں
بل په زابل نشته ۔ لہ ما اتل نشته
دوسرے زابلستان میں نہیں! مجھ سا بے نظیر اور کوئی نہیں۔

اگرچہ امیر کروڑ کی نظم اپنی صنعت و ساخت، سلاست و روانی اور باقاعدگی کے لحاظ سے کافی ترقی یافتہ نظر آتی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پشتو ادب کا آغاز اس سے کافی مدت قبل ہو چکا ہو گا۔ تاہم اس بیّن تاریخی شہادت کے سبب، پشتو ادب کی ابتدا دوسری صدی ہجری یعنی ساتویں صدی عیسوی کے وسط سے لینا پڑتی ہے اور اس مناسبت سے تاریخی پشتو ادب کو عموماً چار ادوار میں منقسم کیا جا سکتا ہے: (۱) ۲۰۰ تا ۱۰۰۰ھ؛ (۲) ۱۰۰۰ تا ۱۲۰۰ھ؛ (۳) ۱۲۰۰ تا ۱۳۰۰ھ؛ (۴) ۱۳۰۰ تا عہد حاضر۔

پشتو ادب کی تاریخی تفصیل میں جانے سے پہلے، یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ پشتو ادب دو* اصناف پر مشتمل ہے، ایک عوامی، جس کے لیے تاریخ کا تعین نہیں کیا جا سکتا؛ دوسرا علمی اور کتابی، یعنی تاریخی۔ ان میں سے عوام (لوک = Folk) سے جو ادب منسوب ہے، وہ شروع سے زبانی چلا آ رہا ہے۔ نہ ان میں کہنے والوں کا پتا چل سکتا ہے، نہ مقام اور وقت کا سراغ مل سکتا ہے۔ اس

نظم و نثر میں یہ چیزیں، ہر علاقے میں تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ، یونہیں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ بعض قسمیں جیسے چار بیتے، لوبے اور بدلے وغیرہ، اگر کسی دور کے خواندہ شائقین ادب نے لکھ کر محفوظ کر لیں تو وہ گئیں، ورنہ کہنے والے آہستہ آہستہ اپنے ساتھ لے جاتے رہتے ہیں اور نئے آنے والے نئی نئی وضع کرتے رہتے ہیں۔ صرف انیسویں صدی عیسوی کے اواخر کے کچھ تحریری مجموعے، کچھ مطبوعہ، کچھ غیر مطبوعہ، کچھ مقامی ادیبوں کے ہاتھ کے اور کچھ یورپی مستشرقین کے مطبوعہ دستیاب ہوتے ہیں، باقی بھاری قدیم ذخیرہ اپنے اپنے وقت کے کہنے والوں کے ساتھ ساتھ مدفون و معدوم ہوتا رہا ہے۔

عوامی ادب میں پہلے قصے کہانیاں، کہاوتیں، پہیلیاں، مقولے، لوریاں اور مرثیے ہیں، اور پھر ٹپہ، چاربیتہ، لوبہ، نیمکئی، بدلہ، رباعی، غاڑے، نارے (نعرے)، غزونہ، بابولالہ، شاڈولہ اور بلبلہ وغیرہ کے سندرے (گیت) ہیں جن کا مختصر بیان یہاں مناسب رہے گا:

کیسئی (قیصئی): یعنی قصے کہانیاں، جو عموماً نثر میں زبانی چلی آ رہی ہیں۔ ان چھوٹی بڑی کہانیوں میں بڑا حصہ بچوں کے لیے فرضی کہانیوں کا ہے، جو سادہ بھی ہوتی ہیں اور رنگین بھی۔ یعنی ان میں کہیں کہیں دلچسپی بڑھانے کی خاطر رنگ آمیزی بھی کی جاتی ہے، جس میں کچھ منظوم مکالمے ہیں، جو کہانی سناتے وقت ترنم سے یا سادہ طریقے پر مگر نظم کی شکل میں بولے جاتے ہیں۔ (حسن و عشق کی طویل رومانی داستانوں میں یہی منظوم مکالمے ''نارے'' یا ''غزونہ'' کہلاتے ہیں)۔

اَڑ: (پہیلی، بجھارت یا چیستان)، یہ بڑی دلچسپ صنف ہے۔ اور زیادہ تر بچوں کے لیے بطور ذہنی اور علمی مشغلے کے وضع کی جاتی ہے۔

متل (مثل یا کہاوت): متل درحقیقت عوامی ادب کا ایک بیش بہا اور اہم جز ہے۔ اپنی ساخت اور ترکیب میں انفرادیت لیے ہوئے ہے۔ متل نظم میں بھی شامل ہے اور نثر میں بھی، مگر چونکہ متل میں کہنے والے کا نام، مقام اور وقت کا ذکر نہیں ہوتا، اس واسطے اس کی قدامت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن ان کے ذریعے ایک قوم کے فطری خاصوں، ان کے ماحول اور روزمرہ کے پیش آئند واقعات و حالات کا بڑا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پشتو زبان خواہ وہ علمی اور کتابی ہو یا عامیانہ، کہاوتوں سے مالا مال ہے۔ بعض محققوں کا خیال ہے کہ ضرب الامثال کی کثرت کے لحاظ سے پشتو بڑی فوقیت رکھتی ہے۔

ٹپہ: پشتو ادب کی یہ مخصوص و منفرد صنف، بڑی عالمگیر خصوصیات کی حامل ہے۔ عام و خاص ہر دو طبقوں کے ادب میں یکساں شامل ہے۔ اگرچہ اس کے کہنے والے زیادہ تر خواندہ عوام ہوتے ہیں۔ یہ ڈیڑھ مصرع کا ایک شعر، اپنی ترکیب اور ساخت میں مخصوص و منفرد، کہاوت سے بھی زیادہ جامع و مانع، پوری زندگی پر حاوی، ہر قسم کے فطری جذبات و حسیات سے پر، خارجی و داخلی، ذہنی و قلبی تاثرات و کوائف کا مکمل آئینہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے سیکڑوں ٹپے بطور ضرب المثل بھی زبان زد ہیں۔ ٹپے میں حسن و عشق، فرحت و انبساط، غم و الم، نفرت و حقارت، انس و محبت، طعن و تشنیع، تحسین و آفرین، مدحت و منقبت، ہجو و مذمت، ترغیب و تحریص، صبر و قناعت، شجاعت و بسالت، بے جگری و سر فروشی، ملک و قوم کی حفاظت، ننگ و غیرت،

مروت و حمیت، خود داری و عزتِ نفس، غمخواری، غربا پروری، مہمان نوازی، غرض کہ معاش و معاد، دین و دنیا اور رزم و بزم میں کیا بچ رہتا ہے جو ٹپے میں بیان نہیں کیا جاتا۔ ٹپے ہر دور میں کہے جاتے ہیں۔ عورت و مرد، خواندہ و ناخواندہ، عالم و جاہل سب ٹپہ کہتے اور وضع کرتے رہتے ہیں۔ کہاوتوں کی طرح ان میں بھی کہنے والے کا نام، وقت اور مقام کا ذکر نہیں ہوتا۔ وہ تو سدا بہار پھول بوٹے کی طرح ہمیشہ ترو تازہ ہی رہتا ہے، یعنی اس کا اطلاق اپنے مناسب موقع و محل پر ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ عام خیال یہی ہے کہ ٹپہ پشتو کا مخصوص ادبی ورثہ ہے، جو قدامت میں اسی زمانے تک پہنچتا ہے، جہاں سے خود زبان چلتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ پشتو عوامی ادب کا دو تہائی سرمایہ صرف اسی صنعت میں ہے، کیونکہ مرکب شکل میں بدلہ اور ٹپہ ساخت میں تو ہر جگہ ایک سا ہوتا ہے مگر بحر اور سر کے لحاظ سے ہر علاقے میں الگ الگ گایا جاتا ہے، یہی ٹپے بعض جگہ مصرے (مصرع)، کہیں لنڈئی اور کہیں ٹکئی بھی کہلاتے ہیں۔

چار بیتہ: قدامت اور مقبولیت کے لحاظ سے ٹپے کے بعد چار بیتہ دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ پشتو شاعری میں چار بیتہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، چار بیتہ جب گایا جاتا ہے تو اکثر اس کے ساتھ رباب اور گھڑا (منگا) بطور ساز ضرور بجایا جاتا ہے اور اس قسم کے گانے بجانے کو ''ٹنگ ٹکور'' بھی کہتے ہیں۔ اس کے گانے کی مخصوص دھنیں ہیں۔ عرصۂ دراز سے یہ چار بیتے زبانی چلے آرہے تھے اور ان کے کہنے والے شاعر بھی اکثر و بیشتر ان پڑھ ہوتے ہیں۔ چار بیتہ میں موضوع و مضمون کے لحاظ سے بڑی ہمہ گیری ہوتی ہے۔ ہر قسم کا مضمون بڑی روانی کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے، اکثر ملکی و ملّی لڑائیاں، مشہور حادثات اور سانحے، بعض افراد کے اہم کارنامے، قصے، افسانے اور رومانی داستانیں، مذہبی اور اخلاقی پند و نصیحت جیسے مضامین ہوتے ہیں۔ چار بیتہ محض اسی طرز کا نام ہے۔ ممکن ہے کہ اس صنف کا آغاز چار شعروں کے بندوں سے ہوا ہو، لیکن اس میں چار بیتوں یا شعروں کی کوئی خصوصیت نہیں۔ مربع، مخمس، مسدس، مسبع اور مثمن بھی شامل ہیں۔ بلکہ ترکیب بند اور ترجیع بند کے لحاظ سے تو اس کی بہت مختلف قسمیں ہیں۔ بعض میں بڑے بڑے بند غزل کی طرح متحد القوافی ہوتے ہیں۔ کسی میں صرف بند کا پہلا اور آخری مصرع، کسی میں مطلع کے اول مصرع سے پورے بند کے اول مصرع اور مطلع کا دوسرا مصرع، باقی دوسرے مصرعوں کے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ کسی میں شعر کی ترکیب ہی مقفی ارکان سے ہوتی ہے۔ اس قسم کے چار بیتے کو زنحیڑی (زنزیرئی، زنجیری) کہتے ہیں۔ مضامین کے لحاظ سے چار بیتے کی دو قسمیں ہیں: ایک حقیقی، جس میں تخلیق کائنات، پیغمبروں کی داستانیں، شہدا کے مرثیے، اولیا کے مناقب اور آبا و اجداد کے شاندار کارنامے بیان کیے گئے ہیں؛ دوسری مجازی، جس میں آدم خانؒ درخانئی، موسیٰ خان گلمکئی، فتح خان رابیا (رابعہ) اور جلات محبوبا جیسے پشتونوں کے مشہور و معروف رومان اور دیگر حسن و عشق کی داستانیں، جہاد و غزا، جدال و قتال کے واقعات، حملے، ڈاکہ زنی، جلاوطنی، بہادروں کے معرکوں کے تذکرے ولولہ انگیز طریقے سے بیان کیے گئے ہیں۔ چار بیتے کہنے والے عوامی شعرا میں مشہور نوردین (نورالدین)، احمد دین طالب، اربد جان استاد، غلام سرور کوہالی، رحمت، حافظ عبداللطیف، بیدل، سیّد ابوعلی شاہ، سید عمر، حسین، محمود جان، علی حیدر، عبدالغفار، احمد گل، دلاسہ خان، یسین

اخون، ملا مقصود، عبدالرحیم، محمد جی، عبدالوهاب، عبدالعلی، صاحبزادہ غلام قادر، حبیب گل میاں کاکا خیل، توکل، میرا، نوروز اور توسم وغیرہ اور موجودہ شعرا میں عبدالواحد ٹھیکیدار اور راحت اخون، محمد فیاض، میاں غلام صدیق، عبدالاکبر خان، محمد نواز طائر، برهان الدین کاکا خیل، قلندر مطہر وغیرہ جیسے اور بھی بہت سے شعرا ہیں۔ مذکورۂ بالا شاعروں میں دیر، باجوڑ، سوات، ایجنسیوں، ڈیرہ، بنوں، کوہاٹ، پشاور، مردان، هزارہ، کوئٹہ، قندھار، جلال آباد اور کابل کے شاعر یکساں شامل ہیں.

لـوبـہ یـا لـیـبـہ : لوبہ اور نیمکئی ساخت اور ترکیب میں ملتی جلتی سی ہیں۔ لوبہ کی بندش مستزاد جیسی ہوتی ہے۔ لوبہ کے بند کو کڑئی کہتے ہیں، البتہ لوبہ کی بہ حقیقت نیمکئی سے مختلف ہے کہ لوبہ میں عموماً عاشق و معشوق کا آپس میں سوال و جواب ہوا کرتا ہے۔ پہلے بند میں عاشق کی طرف سے اظہار عشق و محبت اور درخواست، دوسرے میں معشوقہ کی طرف سے انکار، دھمکی اور ڈراوا ہوتا ہے۔ تیسرے بند میں عاشق پھر اپنی جاں‌نثاری، وفاداری اور فداکاری کا اظہار کرتا ہے۔ بالآخر چوتھے یا پانچویں بند میں معشوقہ راضی ہو جاتی ہے۔ شاید اسی کار و بار عشق و معاشقہ کے باعث اسے لوبہ یعنی کھیل [عربی: لُعْبَة] کہتے ہیں.

نیمکئی : یہ چاربیتہ سے ملتی جلتی سی ایک صنف ہے، اس میں بھی لوبے کی طرح عموماً عشقیہ جذبات و تأثرات کا اظہار ہوتا ہے، مگر یہ چاربیتہ کی طرح طویل نہیں ہوتی۔ کبھی یہ ٹپوں سے بنائی جاتی ہے اور کبھی الگ طرز میں کہی جاتی ہے۔ اس میں ”سَر“ (ابتدا) یعنی پہلے شعر کا پہلا مصرع بڑا اور دوسرا چھوٹا ہوتا ہے۔ غالباً مصرع ثانی کے آدھا ہونے کی وجہ سے ہی نیمکئی یعنی آدھی کہا جاتا ہے اس کے ہر بند کے آخر میں اس چھوٹے مصرع کی تکرار ہوتی ہے۔ بند، جسے ٹکئی کہتے ہیں: کبھی بڑے اور کبھی چھوٹے تین تین اور چار چار مصرعوں کا ہوتا ہے.

رباعی : یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ پشتون عوام میں غزل رباعی کہلاتی ہے۔ یہ نام کب اور کیونکر اختیار کیا گیا تحقیق طلب ہے۔ عوام کی رباعی اور حقیقی غزل میں صرف اتنا فرق ہے کہ رباعی کہلانے والی غزلوں میں مذہبی اور اخلاقی مضامین ہوتے ہیں، جیسے پند و نصائح، دنیا کی بے ثباتی یا علم و حکمت کی باتیں اور جن غزلوں میں حسن و عشق کی باتیں ہوتی ہیں وہ غزلیں ہی کہلاتی ہیں.

اللّٰهو : (پشتو لوری)، یہ عموماً دودھ پیتے بچوں کو سلانے کے لیے، پالنے میں لٹا کر جھونٹے دیتے وقت یا گود میں لے کر تھپک کر کہی جاتی ہے۔ اس کی ایک مخصوص لَے ہے۔ چھوٹے مصرع نما اور مقفّی جملوں کے ساتھ اَللّٰهو، لَلی لَلئی، لَلی لَلو، اَللّٰهو، کی تکرار ہوتی ہے۔ ان مصرعوں میں بچے کے لیے ماںتا کے نیک جذبات اور اچھی خواهشات کا اظہار ہوتا ہے۔ بچے کی تعریف، تسلّی تشفی اور دعائیں ہوتی ہیں۔ بعض جگہ شاعروں نے اللّٰهو میں بھی طبع آزمائی کر کے باقاعدہ نظمیں شامل کر رکھی ہیں۔ مگر دیہات میں جو عام لوریاں رائج ہیں وہ بہت سیدھی سادی ہوتی ہیں.

سـانـدے : (بین، ماتم)، اس میں مردے کی تعریف و توصیف سادہ بیانی سے کی جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس کی وساطت سے پہلے گزرے ہوئے رشتہ‌دار مُردوں کو پیغامات بھی بھیجے جاتے ہیں، (اگرچہ اس قسم کی باتیں عقیدت کی رو سے نہیں بلکہ محض جذباتی اور خیالی

ہوتی ہیں) ۔ عموماً عورتیں مردے کی چارپائی کے اردگرد بیٹھے بیٹھیں یا الگ ایک دائرے میں کھڑی ہو جاتی ہیں، ایک اُن میں اگوا بن کے ساندے شروع کرتی ہے، جس کے جملے ایک خاص لے میں ادا کرتی ہے اور یونہیں ساندوں کے جملے ختم ہوتے ہیں، وہ خود اور باقی تمام عورتیں اونچی آواز سے روتی ہیں اور دو تین بار ہو ہو کر کے رو لینے کے فوراً بعد پھر ساندے شروع ہو جاتے ہیں ۔ اور جب تک مردے کو کفن کے لیے لے جایا نہیں جاتا اسی طرح ٹھہر ٹھہر کر ساندے کہے جاتے ہیں ۔ بعض قبائل میں روتے وقت سینہ، منہ اور سر بھی پیٹا جاتا ہے اور ایک ساتھ ہائے کرتی ہیں ۔ اگر رونے یا آہ و گریہ کی آواز ساتھ شامل نہ ہو تو ساندے دور سے بالکل گیت معلوم ہوتے ہیں۔ اس کام کے لیے ماہر عورتیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہر عورت ایسی روانی اور خوش آوازی سے ساندے نہیں کہہ سکتی۔

کتابی ادب : اس میں شک نہیں کہ محمد ہوتک: پٹہ خزانہ (گنج مخفی)، ۱۱۴۱ھ / ۱۷۲۸ء کی فراہم کردہ معلومات سے پہلے تاریخ پشتو ادب کا آغاز بمشکل تمام دسویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی تک پہنچتا تھا، لیکن اس بیش بہا خزانے کے ظاہر ہو جانے سے تاریکی کے کئی پردے ہٹ گئے، اب پشتو ادب کی تاریخ ۱۳۹ھ / ۷۵۶ء سے شروع ہوتی ہے، یعنی اس کا پہلا دور دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی سے دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی تک لیا جانے لگا ہے، لیکن آٹھ سو سال کے اس طویل دور کے متعلق چونکہ معلومات کا سارا ذریعہ لے دے کر یہ ایک مذکورہ کتاب ہی ہے، اور یہ معلومات محدود ہیں، اس لیے زیادہ تفصیل میں جانا مشکل ہے، ورنہ قیاس کہتا ہے کہ پہلے دور میں بھی شاعروں اور عالموں فاضلوں کی کمی نہیں رہی ہوگی۔

اس عرصے کی نمایاں شخصیتیں دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی کے امیر کروڑ سوری [رکّ بآں]، تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے ابو محمد ہاشم سروانی، چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی کے بیٹ بابا، شیخ اسمعیل سڑبنی اور شیخ رضی لودی، پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی کے خرشبون، شیخ اسعد سوری اور شیخ عیسی مشوانڑی، چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی کے شکارندوئے، شیخ تایمنی، سلیمان ماکو، ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے بابا ہوتک، شیخ متی، حضرت شیخ بختیار کاکیؒ، احمد بن سعید لودی، آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی کے شیخ ملکیار غرشین، شیخ ملی یوسف زئی، شیخ کتہ متیزی، اکبر زمینداوری، نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے سلطان بہلول لودی، خلیل خان نیازی، شیخ محمد صالح، بی بی رابعہ قندھاری، دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے پیر روشن (بایزید انصاری [رکّ بآں])، خواجو ملیزی (مؤرخ تاریخ خان کجو)، بی بی زرغونہ خاتون دختر ملا دین محمد کاکڑ، شیخ تیمن، شیخ بستان بڑیچ، زرغون خان، دوست محمد کاکڑ، شیخ ارزانی، اخون چالاک خٹک، مولانا عبدالوہاب (اخون پنجو باباؒ)، نعمت اللہ ہروی اور اللہ یار الکوزی ہیں۔

مذکورۂ بالا افراد میں بایزید انصاری زیادہ نمایاں اور اہم شخصیت کے مالک ہو گزرے ہیں۔ یہ کانی گرام (گرم) (وزیرستان) میں قبیلہ اُرمڑ کے عبداللہ کے بیٹے بایزید انصاری (المعروف بہ میاں روشن یا پیر روشن) طبقۂ روشنیاں کے بانی، اپنے وقت کے بڑے صوفی اور پیر تھے۔ انھوں نے تصوف اور طریقت میں

کئی کتابیں لکھی ہیں، جن میں سب سے اہم اور مشہور کتاب خیرالبیان ہے جو ایک ساتھ علی الترتیب چار زبانوں، یعنی عربی، فارسی، ہندوستانی اور پشتو میں لکھی گئی ہے۔ اس میں انہوں نے یہ دعوی بھی کیا ہے کہ پشتو رسم خط میں خصوصی حروف تہجی انہوں نے وضع کر کے اس کتاب میں بیان کر دیے ہیں تاکہ لوگ انہیں سیکھ کر خیرالبیان کی پشتو عبارت باسانی صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ سکیں۔ اس کے علاوہ ان کی اور بھی کئی کتابیں پائی گئی ہیں جیسے مقصود المومنین اور صراط التوحید وغیرہ، مگر وہ عربی میں ہیں۔

پہلے دور کے ادب کا عمومی جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے امیر کروڑ کے عہد کی پشتو میں عربی اور فارسی کا اثر و نفوذ زیادہ نہیں ہوا تھا، اس کے کلام میں پشتو زیادہ تر اپنے قدیمی رنگ میں نظر آتی ہے، بلکہ چوتھی صدی ہجری کے شیخ اسعد سوری کے المیہ قصیدے اور چھٹی صدی کے شکارندوئے کے مدحیہ قصیدے کی زبان بھی بہت حد تک عربی فارسی الفاظ سے معرا ہے، حالانکہ ان کے درمیانی عرصے کے دیگر شعرا کے کلام میں معاملہ اس کے برعکس پایا جاتا ہے۔ بظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ جن لوگوں نے علوم و فنون باقاعدہ عربی و فارسی میں پڑھے تھے ان کی زبان قدرۃً بدل گئی تھی اور جنہوں نے عربی علوم مروجہ سے اکتساب نہیں کیا ان کی زبان بچی رہی۔ مگر چھٹی صدی ہجری میں جب عربی فارسی کی تعلیم عام ہو گئی تو اس کے بعد پشتو زبان یکسر بدل گئی۔ اس امر کی تائید عوامی ادب سے بھی ہوتی ہے۔ جو ملی ادب بےعلم و ناخواندہ پشتون عوام سے منسوب ہے وہ آج بھی ایک حد تک عربی الفاظ سے خالی ملتا ہے۔

غرض کہ پہلے دور کے پشتو ادب میں موضوع سخن کے لحاظ سے حمد و مناجات، نعت و منقبت، دینیات و اخلاقیات، تصوف، سلوک، حماسیات و سیاست، حسن و عشق، اور صنف سخن کے لحاظ سے قطعہ، مثنوی، غزل، قصیدہ، اور مرثیہ آ چکا تھا۔ ساتھ ہی چوتھی و پانچویں صدی ہجری سے فارسی اور عربی الفاظ، اصطلاحات، بندشیں اور ترکیبیں وغیرہ بھی شامل ہو گئی تھیں، ترجمے، تصنیفات، تالیفات، دیوان، تذکرے، تاریخ اور دینیات میں بھی کئی کئی کتابیں لکھی گئی تھیں۔ یہاں نثر و نظم دونوں میں ان چند کتابوں کا نام دیا جا رہا ہے جن کا علم بعض تحریروں سے ہو سکا، چنانچہ دسویں صدی ہجری تک کی لکھی ہوئی کتابیں حسب ذیل ہیں:

نظم: ابو محمد ہاشم: رسالو ورسہ؛ شیخ بستان بڑیچ: بستان الاولیا؛ شیخ متی: دخدائے مینہ؛ بابڑ خان: غورغشت نامہ۔ نثر: محمد بن علی: تاریخ سوری؛ سلیمان ماکو: تذکرۃ الاولیا؛ شیخ کتہ متیزی: لرغونی پشتانہ؛ خان کجو: تواریخ افاغنہ؛ شیخ ملی: دفتر شیخ ملی؛ خان جہان لودی: مرآۃ الافاغنہ؛ اللہ یار الکوزی: تحفۂ صالح؛ بایزید انصاری: خیرالبیان۔

ان کتابوں کے اقتباسات کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کی نظم و نثر دونوں ہی اچھی، صاف اور عالمانہ طرز کی ہیں، بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان پر ارتقا کی صدیاں گزر چکی ہوں۔

ان کے علاوہ چند دواوین بھی ہیں، جیسے دیوانِ ارزانی، دیوانِ علی محمد مخلص وغیرہ۔

پشتونوں میں فطرۃً شعر و سخن کا ذوق و شوق عام اور استعداد ذہنی بہت ہے، یعنی اللہ تعالی نے انہیں اس کمال سے خوب نوازا ہے، لیکن خیال

ہوتا ہے کہ پہلا دور کا یہ طویل عرصہ یا تو بے نتہا سیاسی بےچینی، بےاطمینانی اور کشمکش میں گزرا ہے۔ ایسے پر آشوب اور پر انقلاب زمانے میں خود قوم کو سکون و آرام میسر نہیں آیا ہو گا، نہ دلجمعی اور آسودگیِ خاطر انہیں نصیب ہوئی ہو گی کہ ان باتوں کی جانب خاصی توجہ مبذول کرتے۔ حالانکہ تذکرہ نگاروں اور مؤرخوں نے یہ بات زور دے کر لکھی ہے کہ پشتون سلاطین اپنے اپنے عہد کے پشتون اہلِ قلم اور اہلِ علم و کمال کی پرورش اور سرپرستی کرتے رہے ہیں، مگر یہ بھی دیکھنا ہے کہ خود پشتون حاکموں کی زندگی، کب خاطر خواہ عرصے تک کہیں امن و سکون سے گزری ہے! بہر کیف پہلے دور کے متعلق اس سے زیادہ معلومات ابھی تک دستیاب نہیں ہوئی ہیں۔

دوسرا دور: (۱۰۰۰ھ/۱۶۰۰ء سے ۱۲۰۰ھ/ ۱۸۰۰ء تک)۔

یہ دور پہلے کے مقابلے میں زیادہ شاندار گزرا ہے، کیونکہ کم و بیش دو سو سال کے اس عرصے میں پشتو ادب میں نمایاں ترقی نظر آتی ہے۔ یہ دور اخوند درویزہ [رکہ باں] پسر اخوند گدائی (۹۴۰ھ/ ۱۵۳۳ء تا ۱۰۴۸ھ / ۱۶۳۸ء) سے شروع ہوتا ہے ان کے آبا و اجداد، ننگرہار سے علاقۂ یوسف زئی کے ملیزی قبائل میں آ کر مقیم ہوئے تھے۔ اخوند موصوف حضرت سید علی ترمذی (پیر باباؒ) کے مرید و ماذون، عالم دین اور متشرع بزرگ تھے۔ عمر کا بیشتر حصہ وعظ و تبلیغ میں گزرا۔ شریعت و طریقت اور فقہ و حدیث میں درسی طرز پر فارسی اور مسجع و مقفی قسم کی پشتو نثر میں کئی کتابیں لکھیں جن میں مخزن الاسلام، تذکرۃ الابرار و الاشرار اور ارشاد الطالبین زیادہ مشہور ہیں۔ مخزن میں پشتونوں کی مختصر تاریخ اور کچھ نسب نامے بھی دیے ہیں۔ اخوند درویزہ کے بعد ان کا بھائی ملا اصغر، بڑا بیٹا عبدالکریم (عرف کریم داد)، پوتا عبدالحلیم (رحیم داد) پرپوتا مصطفی محمد اور شاگردوں میں عمر خان، میر خان، شیر محمد، عبدالرحیم اور احمد وغیرہ کئی پشتون تک عالم اور شاعر گزرے ہیں۔

ملا الف ہوتک: علاقۂ قلات میں کسی جگہ گزرا ہے، اس کا ادبی کارنامہ (۱۰۱۹ھ/ ۱۶۱۰ء) بحر خفیف کی پشتو مثنوی میں، دینی اور اخلاقی تعلیم کی دو کتابیں بحر الایمان اور نصیحت نامہ ہیں۔

ارزانی: پیر روشن کا ہم خیال ساتھی، صوفی شاعر، بقول اخوند درویزہ، ایک تیز فہم اور فصیح شاعر جو عربی، فارسی، ہندی اور پشتو میں شعر کہتا تھا۔ دیوان کے علاوہ ایک کتاب چار رسالہ (= چار زبان) بھی لکھی ہے۔

علی محمد مخلص: پیر روشن کا مرید اور خلیفہ، بقول اخوند درویزہ، ارزانی کا بھائی تھا۔ دیوان مخلص (قلمی) میں بجائے عالم مجاز کی عام غزلوں اور نظموں کے علمِ تصوف اور علمِ طریقت کی شرح و تعریف ہے یا عشق حقیقی۔

مرزا خان انصاری: پیر روشن کا مرید، ملا ارزانی و مخلص کا ہم پایہ، دولت اللہ کا استاد، اونچے پائے کا صوفی منش شاعر تھا، جس کا کلام اپنے دوسرے ہم‌عصر عالموں اور شاعروں کے مقابلے میں زیادہ صاف اور شستہ ہے اور اس میں عشق حقیقی کا رنگ غالب ہے۔ ۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۰ء میں شاہ جہاں بادشاہ کی طرف سے دکن کی ایک جنگ میں کام آیا۔

دولت اللہ لوانڑی (نوحانی) ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۵ء: مرزا خان انصاری کی وساطت سے بایزید انصاری کا مرید تھا۔ مجموعۂ کلام میں اکثر اصناف سخن پائی جاتی ہیں جیسے قطعہ، رباعی، غزل اور

قصیدہ وغیرہ

واصل: خوشحال خان خٹک کا معاصر، دولت اللہ وغیرہ کا ہم مسلک، صاحب دیوان شاعر گزرا ہے۔

اسیر: بڑا ضخیم دیوان مرتب کیا اور ۱۰۰۳ھ / ۱۶۱۳ء میں ایک مثنوی علم تجوید میں لکھی ہے۔

اخون قاسم پاپین خیل: پشتو نثر میں فوائد شریعت کے نام سے شرعی مسائل کی ایک کتاب کا مصنف ۱۰۷۲ھ / ۱۶۶۱ء تک زندہ رہا۔ مذکورہ کتاب کی پشتو نثر بالکل اخوند درویزہ کی طرز پر ہے، مگر مقابلۃً صاف۔

بابو جان لغمانی: ۱۰۵۰ھ / ۱۶۴۰ء اچھا عالم و شاعر تھا۔ ایک دیوان، دعائے سریانی کا منظوم پشتو ترجمہ اور ایک کتاب دینی مسائل کی چھوڑی ہے۔ نظم و نثر دونوں خیر البیان اور مخزن الاسلام کی طرز پر ہیں۔

خوشحال خان خٹک: (۱۰۲۲ھ / ۱۶۱۳ء تا ۱۱۰۰ھ / ۱۶۸۸ء)، خوشحال خان یوں تو صرف ایک شاعر کا نام ہے، لیکن پشتو ادب میں تنہا خوشحال ایک پورے دور اور ایک مکتب فکر کا نام ہے۔ اللہ تعالی نے اس ایک ہستی میں بہت سی صفات جمع کر رکھی تھیں۔ وہ ایک مدبر سردار، تجربہ‌کار جرنیل، جری سپاہی و تیغ‌زن، نشانہ باز شکاری اور نڈر شاہسوار تھا، اور ساتھ ہی ایک عالم فاضل نازک‌خیال شاعر، باریک‌بین نقاد و مبصر، مشفق ناصح، مہمان نواز، غریب پرور، ہمدرد، غیرتمند اور ننگ و ناموس کا محافظ بھی تھا۔ وہ بیک وقت صاحب سیف بھی تھا اور صاحب قلم بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں کمال جامعیت، بڑا تنوع اور بلا کا زور ہے۔ اس کی شاعری میں ہر موضوع پر ہر صنف سخن کے وافر نمونے پائے جاتے ہیں، مثلاً غزلوں، رباعیوں اور قصیدوں کے علاوہ فرد سے لے کر طویل ترکیب بند اور ترجیع بند بھی موجود ہیں۔ اس نے بھاری دیوان کے علاوہ چھ سات کتابیں نظم و نثر میں اور بھی لکھی ہیں۔ ان میں سے دستارنامہ پشتو نثر میں ہے اور دوسری کتابیں باز نامہ، فراق نامہ، سوات نامہ، فضل نامہ، اخلاق نامہ، اور طب میں صحت‌البدن منظوم ہیں۔

خوشحال خان نے پشتو انشا و املا دونوں میں بڑی اصلاح کی ہے۔ پشتو نثر کو بھی مقابلۃً بہت سادہ، رواں اور سلیس بنایا۔ پشتو نظم کو بھی اپنے پیشروؤں اور ہم‌عصروں کے مقابلے میں ہر قسم کے صنائع و بدائع سے مالا مال کیا۔ پھر مفہوم کے لحاظ سے سیاست و حماست، دینیات اور اخلاقیات، جنسیات، نفسیات، فلسفہ و تصوف، طنز و مزاح، تقریظ و تنقید، ہجو و مدح، تاریخ گوئی، عشق مجازی و عشق حقیقی، غرض کہ کوئی نفسی مضمون ایسا نہیں جس میں بہت کچھ اور کئی کئی طریقے سے نہ کہا ہو۔ علامہ اقبال نے بھی خوشحال خان کی تعریف کی ہے۔ پانچ چھ پشتوں تک خوشحال خان کی اولاد و احفاد میں بڑے نامی گرامی عالم، شاعر، مترجم اور مؤلف و مصنف گزرے ہیں جن کا مختصر ذکر آگے اپنے اپنے موقع پر آئے گا۔

اشرف خان ہجری: (۱۰۴۴ھ / ۱۶۳۴ء تا ۱۱۰۵ھ / ۱۶۹۳ء)، خوشحال خان خٹک کا سب سے بڑا بیٹا، اچھا عالم فاضل اور شاعر تھا۔ ادبی آثار میں ایک دیوان چھوڑا ہے۔

عبدالقادر خان خٹک: (۱۰۶۱ھ / ۱۶۵۰ء)، بلند پایہ عالم، ادیب اور شاعر۔ حدیقۂ خٹک کے نام سے ایک دیوان کے علاوہ گلدستہ (پشتو ترجمۂ گلستان سعدی)، منظوم ترجمۂ یوسف زلیخا۔ چہل حدیث کا پشتو منظوم ترجمہ، آدم خان درخانئی (مشہور رومان منظوم) اور نصیحت نامہ، ادبی

آثار هیں۔

صدر خان خٹک: خوشحال خان کا بیٹا، چھوٹی بحر کی مثنوی میں پشتو ادب کے تین مشہور رومانی افسانے لکھے هیں: (۱) آدم خان درخانئی؛ (۲) دلے شہئی اور (۳) نظامی کے خسرو و شیریں کا منظوم پشتو ترجمہ۔

سکندر خان: خوشحال خان کا بیٹا، علاوہ دیوان کے ایک منظوم کتاب بنام مہر و مشتری بھی لکھی ہے۔

گوہر خان: خوشحال خان کا بیٹا، ایک دیوان چھوڑا ہے۔

بہرام خان: خوشحال خان کا بیٹا، اچھا شاعر تھا۔

بی بی حلیمہ: خوشحال خان کی بیٹی، چند اشعار کے سوا اور کوئی ادبی آثار دستیاب نہیں، لیکن اشعار سے پتا چلتا ہے کہ کلام بڑا پختہ ہے اور عشق حقیقی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔

خواجہ محمد بنگش: خوشحال خان کا معاصر، اچھے پائے کا شاعر گزرا ہے۔ اس کا دیوان جو اب تک ناپید تھا پشتو اکیڈیمی (پشاور یونیورسٹی) نے ابھی شائع کیا ہے۔

رحمن بابا (عبدالرحمن مہمند غوریا خیل: (۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء تا ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶م)، والد کا نام عبدالستار تھا۔ نواح پشاور کا ایک مشہور صوفی شاعر، ایک عارف باللہ، ہمدرد و مشفق بزرگ، جس کی شخصیت ہر دلعزیز، کلام عام فہم، سادہ و شیریں، اور بے حد مقبول خاص و عام ہے۔ ہر طبقے کے پشتون رحمن بابا کو بڑی عقیدت و عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ پشتون خواتین تک ان کے دیوان کو متبرک جان کر جزدانوں میں لپیٹ کر رکھتی ہیں۔ لوگ دیوان سے فال نکالتے ہیں اور اس کے بہت سے اشعار بطور ضرب المثل زبان زد ہیں۔

عبدالحمید مہمند: (۱۰۷۷ھ/۱۶۶۶ء تا ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء)، تخلص حمید، رحمن بابا کے بعد حمید لوگوں میں زیادہ مشہور ہے۔ نازک خیالی میں "موشگاف" کہلایا۔ اس لیے مجموعۂ کلام یا دیوان دُر و مرجان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کلام بہت پختہ ہے اور زیادہ تر مجازی حسن و عشق کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ دیوان کے علاوہ قصۂ شاہ و گدا اور نیرنگ عشق کے نام سے دو کتابیں اور بھی لکھی ہیں۔ یہ دونوں پشتو مثنویاں، فارسی مثنوی شاہ و گدا (ہلالی) اور نیرنگ عشق (مولانا غنیمت) کا پشتو منظوم ترجمہ ہے۔

محمد افضل خان خٹک: (۱۰۷۵ھ/۱۶۶۴ء تا ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء)، اشرف خان ہجری کا بیٹا اور خوشحال خان خٹک کا پوتا، اپنے دور میں سب سے بڑا اور اچھا نثر نگار، ادیب اور عالم تھا۔ اس نے پشتو میں تاریخ مرصع کے نام سے ایک ضخیم تاریخ لکھی ہے۔ علم خانۂ دانش کے نام سے انوار سہیلی کا ترجمہ اور اعثم کوفی کی تاریخ کا ترجمہ کیا ہے۔ شعر بھی کہے ہیں، لیکن دیوان کہیں نہیں ملتا۔

معزاللہ مہمند: (۱۰۸۰ھ/۱۶۶۷ء تا ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۹ء)، کوللہ محسن خان (پشاور) کے ملک عبداللہ کا بیٹا تھا۔ دیوان تین زبانوں میں کلام پر مشتمل ہے، پشتو، فارسی اور اردو۔ اردو ولی دکنی کی سی ہے۔ فارسی کلام بمقابلہ پشتو زیادہ زور دار ہے۔

کامگار خان خٹک: (۱۰۸۰ھ تا ۱۱۷۰ھ)، اشرف خان ہجری کا پوتا، اچھے پائے کا شاعر گزرا ہے۔ دیوان چھپ چکا ہے جس میں مختلف اصناف سخن پائی جاتی ہیں۔

علی خان: (۱۱۸۰ء)، هشتنغر (= هشت نگر، چارسدہ) کا ایک مشہور و معروف عالم فاضل شاعر جس کے کلام میں سادہ سے سادہ اور مشکل سے مشکل بندشوں اور ترکیبوں کے نمونے موجود ہیں۔ نزاکت تخیل کے ساتھ ساتھ عربی فارسی اصطلاحات بھی زیادہ پائی جاتی ہیں۔ دیوان زیادہ ضخیم نہیں۔

کاظم خان شیدا: (۱۱۳۰ تا ۱۱۹۳ھ)، افضل خان خٹک کا بیٹا، سرائے اکوڑہ خٹک میں پیدا ہوا، مگر لڑکپن ہی میں بڑے بھائی کے ڈر سے وطن عزیز کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر کشمیر، پھر وہاں سے سرہند ہوتا ہوا رام پور جا بسا۔ ساری عمر وہاں گزاری اور وہیں فوت ہوا۔ ادبی آثار میں صرف دیوان باقی رہا ہے۔ فاضل شہیر امیر مینائی نے اپنے تذکرے انتخاب یادگار (۱۸۷۳ء) جلد دوم میں اور حافظ احمد علی شوق نے اپنے تذکرے کاملانِ رامپور میں کاظم خان کی شخصیت اور اس کے پشتو اور فارسی کلام کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مضمون آفرینی، لطافت بیان اور ندرتِ تخیل میں بیدل اور صائب کا ہم سر تھا۔

ان کے علاوہ حضرت شیخ محمد قاسمؒ، ملا نور محمد، مولانا احمد شاہ، پیر مباق، محمد یوسف (رحمن بابا کے استاد)، مبین، اللہ داد، میاں داد اور مصری خان گگیانی وغیرہ کئی نام اور بھی تذکروں میں پائے جاتے ہیں، جنھوں نے علاوہ شعر و سخن کے کچھ تاریخ کی کتابیں بھی لکھی ہیں، جو اب نایاب ہیں۔

دوسرے دور پر عمومی ڈالنے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دینی علوم و فنون کی درس تدریس عام ہو جانے کے باعث، پشتو ادب میں عربی اور فارسی کا دخل و تصرف بہت زیادہ ہو گیا۔ شعر میں حمد و ثنا، مناجات و منقبت، مدحیہ قصائد اور حسن و عشق کے علاوہ بہت سے دوسرے موضوعات و مضامین داخل ہو گئے، رجزیہ و رزمیہ، بزمیہ و طربیہ، منظر کشی و فطرت نگاری، تصوف، معرفت، جذب، سلوک، شریعت اور طریقت کے سلسلے میں بہت سی عربی اور فارسی اصطلاحات و الفاظ کا ذخیرہ شامل ہو گیا۔ دوسری تحریک، پشتونوں اور شاہانِ وقت کی مخالفتوں اور چپقلشوں کے سبب سے ہوئی، کیونکہ پیر روشن کئی سال مسلسل، شہنشاہ اکبر کے خلاف نبرد آزما رہے۔ خوشحال خان، اورنگ زیب سے بر سرِ پیکار رہے اور اخوند درویزہ، اختلافِ عقائد کی بنا پر پیر روشن کی مخالفت میں سر گرم رہے۔ اس طرح ان مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کو خوب دل کھول کر لکھنے کی تحریک ہوئی۔ ہر ایک نے اپنے اپنے افکار و نظریات کی تبلیغ میں سعی بلیغ سے کام لیا۔ پھر ان کے ساتھ ساتھ مولانا عبدالوہابؒ اور اخون سالاک جیسے کئی دیگر پیشواؤں اور ان کی اولاد، متبعین، مریدین اور تلامذہ نے بھی اپنے اپنے حالات کے مطابق بہت سی چھوٹی موٹی کتابیں لکھیں۔ اس طرح پشتو نظم کے ساتھ ساتھ پشتو نثر نے بھی کافی ترقی کرلی۔

تیسرا دور: (۱۲۰۰ھ/۱۸۰۰ء سے ۱۳۰۰ھ/ ۱۹۰۰ء تک)۔

یہ تیسرا دور جو ایک صدی کے لگ بھگ قرار پاتا ہے، احمد شاہ ابدالی (۱۱۳۵ تا ۱۱۸۶ھ) سے شروع ہوتا ہے۔ احمد شاہ درانی، سدوزئی، خود شاعر تھا (کیونکہ تقریباً تین ہزار پشتو اور فارسی اشعار پر مشتمل ایک دیوان بطور اس کی یادگار کے چلا آ رہا ہے)، اس لیے یقیناً علم دوست اور علما و شعرا کا قدردان بھی رہا ہو گا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ بھی، جو اپنے باپ کا جانشین ہوا، اپنے باپ کی طرح شاعر نکلا۔

حضرت میاں عمرؒ (چمکنی، پشاور):

احمد شاہ ابدالی کے ہمعصر، مشہور عالم اور روحانی پیشوا ہونے کے علاوہ بلند پایہ اہلِ قلم بھی تھے۔ پشتونوں کا منظوم نسب نامہ ان کے ادبی آثار میں سے ہے، جس کا نمونہ حیات خان نے اپنی تاریخ حیات افغانی میں درج کیا ہے۔ ان کی دوسری کتاب توضیح المعانی ہے۔ ان کے صاحبزادے میاں محمدی[۲]، دوسرے صاحبزادے عبید اللہ میاں (جنھوں نے عبرت نامہ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے) اور مرید مسعود گل بھی اچھے عالم اور شاعر گزرے ہیں۔ ان سب کے دیوان بھی موجود ہیں۔ مسعود گل کی لکھی ہوئی دو مثنویاں بھی کتاب خانۂ موزۂ بریطانیہ میں محفوظ ہیں، ایک میں اپنے مرشد کی منقبت اور ان کے حسب نسب اور دوسری میں احمد شاہ ابدالی کی جنگوں کا ذکر ہے۔

ملا عبدالرشید پسر سلطان حسین: اس نے ۱۱۶۹ھ میں ایک منظوم کتاب رشید البیان لکھی، جس میں اسلامی عقائد اور ضروری شرعی احکام درج ہیں۔ یہ کتاب اب بھی نورنامہ اور شمائل نامہ (پشتو) کے ساتھ پشتون خواتین کو لازماً پڑھائی جاتی ہے۔ ایسے ہی پیر محمد کاکڑ اور رحمت داوی قندھاری ہیں۔

آخون گدا: معاصر احمد شاہ ابدالی، اس نے نافع المسلمین کے نام سے ایک کتاب نظم کی ہے۔ ان کا دیوان بھی تھا، لیکن اب نہیں ملتا۔

سعادت خان: بہار (ہند) کی پیدائش، بیشتر عمر ننگرہار میں گزاری۔ ۱۱۵۰ھ میں کیمیاے سعادت کے نام سے منظوم کتاب لکھی ہے، جس میں کچھ دینی مسائل اور کچھ علم طب سے متعلق باتیں ہیں۔

قاسم علی افریدی (۱۱۸۳ھ-): اس نے ایک ضخیم دیوان چھوڑا ہے، جس میں اردو، پشتو اور فارسی میں اشعار ہیں، زیادہ‌تر غزلیں ہیں، آخر میں چار زبانوں میں ایک مختصر لغت بھی دی ہے۔

نواب حافظ رحمت خان: پسر شاہ عالم خان بڑیچ، (م ۱۱۸۸ھ)، احمد شاہ ابدالی کا معاصر، حاکم روہیلکھنڈ، اعلیٰ پائے کا ادیب اور شاعر تھا۔ ادبی آثار میں ایک دیوان، تواریخ حافظ رحمت خانی، خلاصۃ الانساب اور ریاض المحبت (ایک لغت) یادگار ہیں۔ اس کے بیٹے اللہ یار خان نے ۱۲۲۸ھ میں عجائب اللغات کے نام سے ایک پشتو لغت لکھی ہے، جس کے پہلے نصف میں پشتو زبان کی قواعد ہے۔ دوسرا بیٹا، نواب مستجاب خان بھی عربی، فارسی، اردو اور پشتو کا اچھا عالم تھا، جس نے نثر میں گلستانِ رحمت کے نام سے اپنے خاندان اور ہند میں رہنے والے دیگر پشتونوں کی ایک تاریخ لکھی ہے۔ سعادت یار، پسر محمد یار پسر حافظ رحمت خان نے بھی گلِ رحمت کے نام سے، تاریخ قبیلۂ بڑیچ، ہندوستانی پشتونوں کے حالات میں لکھی ہے، نیاز احمد ہوشی، حافظ رحمت خان کے پرپوتوں میں گزرا ہے اور اس نے بھی روہیلکھنڈ کی تاریخ لکھی ہے۔ یہ تمام کتابیں کتاب خانۂ موزۂ بریطانیہ، لندن میں موجود ہیں۔ نواب علی محمد خان، حافظ رحمت خان کا معاصر شاعر تھا۔

امیر محمد انصاری (۱۲۰۰ھ): کلکتے میں رہتا تھا، ۱۲۲۸ھ میں اس نے گلستان سعدی کا پشتو ترجمہ کیا۔

حافظ الپوری: (۱۲۰۰ھ)، موضع الپوری (سوات) کا باشندہ، بڑا عالم اور شاعر گزرا ہے۔ دیوان حافظ الپوری کے نام سے مجموعۂ کلام چھپ چکا ہے۔ کلام میں عربی اور فارسی الفاظ و اصطلاحات بہت زیادہ ہیں۔

عبدالعظیم رانڑی زئی، حضرت عبید اللہ میاں گل، خوشحال شہید، نواز خٹک، بیدل، مرزا خان

صدیق اخون زادہ، بابا سبد گل، میاں نعیم، احمد کلاچوی، محمد رفیق، نجیب، سید علی صاحبزادہ (جس نے ۱۲۸۲ھ میں پشتو میں تفسیر یسیر لکھی جو متعدد بار طبع ہو چکی ہے)۔ دوست محمد خٹک (۱۲۹۰ھ)، جس نے واعظ کاشفی کی مشہور تفسیر حسینی (فارسی) کا تفسیر بدر منیر کے نام سے پشتو ترجمہ کیا اور نظم میں بحر العلوم اور اخلاق احمدی کے نام سے، دو پشتو مثنویاں لکھیں۔ رسول داد نے چھوٹی بحر کی پشتو مثنوی میں اخلاقیات پر ایک کتاب دُرّ البیان لکھی ہے۔ عبدالکریم کاکڑ نے ۱۲۳۳ھ میں دو منظوم کتابیں عین العلم اور زین العلم کے نام سے لکھیں۔ محمود رفیق نے فارسی، پشتو اور اُردو میں کلام کہا ہے اور علمِ تجوید کے بیان میں ایک پشتو مثنوی جو اُردو کا ترجمہ ہے، لکھی ہے۔ مُلّا فرخ الدین قندھاری نے تعداد الکبائر کے نام سے اخلاق و تصوّف کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے۔ ایسے ہی خواجہ رزق اللہ، امام الدین، مُلّا حسن (چارسدہ، پشاور)، معین الدین (جس نے رومانی افسانہ عذرا وامق کا پشتو میں منظوم ترجمہ کیا ہے)۔ مطیع اللہ، سپینہ خاتون، بی بی گلہ خاتون، سیّد حسین، معزالدین خٹک (جس نے کئی کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے دینیات میں ایک کتاب ربقۃ الاسلام، دوسری علمِ طب میں دلیل العلیل دستیاب ہوئی ہیں)۔ میاں محمد فہیم کاکا خیل، ابراہیم (سوات)، حافظ عبدالکبیر (تہکال، پشاور) نے دُرِ مجالس اور معجزات پشتو مثنوی میں لکھی ہیں۔ بیاض، محمد یوسف، حافظ محمد (جس نے مستخلص الحقائق شرح کنز الدقائق لکھی ہے)۔ حافظ دلاور خان، فیض اللہ اخونزادہ (جس نے ذخیرۃ القراء کے نام سے ایک منظوم کتاب علمِ تجوید میں لکھی)۔ صالح محمد تخلص غریب، میر عالم خان، عبدالرحیم (امان کوٹ، مردان)، جس نے پنج گوہر اور ہفت ہیکل لکھی ہے۔ خان زمان (نے فقہ کی مشہور کتاب خلاصۂ کیدانی کا پشتو میں منظوم ترجمہ کیا ہے)۔ دوستم، ارباب عبدالرحیم خلیل اور تخلص ارباب وغیرہ سب اسی دور کے شاعر اور اہلِ قلم گزرے ہیں۔ اختصار کی خاطر بہت سے وہ نام چھوڑ دیے گئے جو صرف شاعر گزرے ہیں اور ان کا تھوڑا بہت کلام کسی نے اپنے مجموعے میں دے رکھا ہے۔

علمی ترقی کے لحاظ سے اس صد سالہ دَور کا پلّہ گزشتہ دو سو سال کے دَور سے بھاری رہتا ہے، کیونکہ اس تیسرے دَور میں مذکورۂ بالا افراد سے کہیں زیادہ اہلِ قلم پاک و ہند اور افغانستان میں گزرے ہیں، جن کے ہاتھوں پشتو ادب کو ترقی نصیب ہوئی ہے، حالانکہ زیر نظر دَور میں شاہان و حاکمانِ وقت کی جانب سے کوئی خاص حمایت و سرپرستی بھی نہیں ہوئی؛ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ملک و ملّت میں علمی ترقی کا طبعی رجحان بہت زیادہ رہا۔ اس دَور کی لکھی ہوئی کتابوں میں بلحاظ موضوع و نفس مضمون، دینیات اور اخلاقیات کا غلبہ نظر آتا ہے، دوسرے نمبر پر تواریخ و سِیَر اور تذکرے ہیں، اس کے بعد اور مختلف عنوانات ہیں، لیکن بہت کم۔ پشتو نظم پر عربی اور فارسی کا رنگ بہت غالب معلوم ہوتا ہے۔ نثر دوسرے دَور کے مقابلے میں کسی قدر اور بھی سُدھر گئی ہے اور اس کی عبارت کی پیچیدگی اور اشکال میں ایک حد تک کمی آ گئی ہے۔

چوتھا دور (۱۳۰۰ھ/۱۹۰۰ء سے تا عصر حاضر):

اس دور کے مشاہیر اہل قلم، اہلِ علم اور اہلِ ادب میں ہر قسم کی ہستیاں نمایاں ہیں، ان میں عوامی ادب کے سرپرست ہیں، جن کا تعارف عوامی ادب کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔ ان کے

فہرست یوں تو بڑی طویل ہے، مگر چند بہت مشہور نام گنوا دیے ہیں۔ یہاں اتنی وضاحت اور کر دی جائے کہ عوامی شعرا کی کئی قسمیں ہیں، ان میں کوئی ”غزلچی“ کہلاتے ہیں اور کوئی ”چار بیت مار“ یعنی چار بیتہ کہنے والے، اور کوئی مترجم شاعر ہیں، جیسے سید بو علی شاہ، ملا نعمت اللہ، طالب احمد دین اور مولوی احمد وغیرہ، جنھوں نے ملکی و غیر ملکی عشقیہ افسانے، قصے، جنگ نامے، شاہنامہ، الف لیلہ، انوار سہیلی، داستان امیر حمزہؓ، اور یوسف زلیخا، وغیرہ جیسی کتابیں ترجمہ کی ہیں۔

چوتھے دور کے پہلے تہائی زمانے میں یہاں انگریزی اقتدار کا آغاز تھا، ہر طرف حملے اور یورشیں تھیں، ہر جگہ میدان جدال و قتال گرم تھا، ہنگامہ و فساد تھا، بے چینی اور بدامنی تھی؛ اس لیے وہ پینتیس چالیس سال کا عرصہ کسی قدر جمود کا گزرا ہے۔ البتہ ان دنوں میں چار بیتے اور بدلے بہت کہے گئے۔ اور اس دور کے چار بیتے اکثر سیاسی نوعیت کے ہیں، جن میں انگریزوں کی، یہاں کی اور افغانستان کی لڑائیوں کا مفصل تاریخی حال منضبط ہے۔ ان دنوں یہاں کے باشندے دو گونہ مصیبت میں مبتلا تھے اور وہی اس جمود و تعطّل کے دو بڑے اسباب تھے، ایک تو انگریز جن علاقوں پر قبضہ کرتے گئے، انھیں لوٹتے رہے۔ اس ہنگامۂ داروگیر میں اگر انھیں ایک دو ورقی کتاب بھی ہاتھ آ جاتی، ہتیا لیتے۔ اس طرح انھوں نے علاقے سے کافی ذخیرہ ان قلمی آثار کا جمع کیا۔ بعد میں انتخاب کر کے اپنے خیال کے مطابق مفید مطلب ساری کتابیں یورپ بھجوا دیں اور باقی تلف کر دیں۔ دوسرے یہاں کے باشندوں کو کشمکش میں ایسا مبتلا و مصروف رکھا کہ کسی کو لکھنے کی فرصت ہی نہ دی۔

بہر کیف، جب انگریز یہاں پورے طور پر مسلّط ہو گئے تو آہستہ آہستہ نئے سرے سے پھر ادھر متوجہ ہوے۔ مگر حالات بدل گئے تھے۔ انگریزی دور کے مقتضیات کے زیرِ اثر یہاں کا طریقۂ تعلیم و تعلّم بدل گیا۔ ساتھ ہی مغربی تعلیم پھیلنا شروع ہوئی، یوں بوڑھے اور جوان ذہن ان جدید تقاضوں اور نئے ماحول سے متاثر ہوے اور قوم نے علم و ادب کے نئے میدان میں قدم رکھا اور کچھ نہ کچھ کام کیا۔ چنانچہ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر کے مشاہیر عنوان الدین میاں کاکا خیل اور ان کے خاندان کے کئی اور علما، میاں حسیب گُل کاکا خیل، غلام محمد خان پوپلزئی جیسے اہلِ قلم نے نمایاں کردار ادا کیا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں جب حالات نے پلٹا کھایا، قوم میں آزادی و بیداری کی لہر دوڑی تو اہل قلم زیادہ تندہی سے ادھر متوجہ ہوے، اب قوم کے نوجوان مغربی علوم و فنون سے بھی بہرہ یاب ہو چکے تھے، از سر نو پشتو زبان کا کاروانِ ادب ترقی کی منزل کی طرف گامزن ہوا، گویا پشتو ادب کی یہ نشأۃ ثانیہ ہے۔

ادب کے اس دور جدید میں فکر و نظر کے زاویے بدلے ہوے نظر آتے ہیں۔ علوم جدیدہ سے بہرہ‌ور شاعر و ادیب، گل و مل اور نغمہ و بلبل کے طلسمات اور کاکل پیچاں کے ظلمات سے نکل کر زندگی کے دیگر حقائق و مقتضیات کو سمجھنے لگے۔ خواب و خیال کی فرضی دنیا سے نکل کر جیتی جاگتی دنیا میں زندگی کی نئی راہوں پر گامزن ہونے لگے، اب ان میں نئے افکار و خیالات نے جنم لینا شروع کیا۔ چنانچہ ماضی و حال کی آمیزش نے پشتو شعر و سخن میں رنگینی و تنوع پیدا کر دیا؛ نثر میں بھی بڑی صفائی، سادگی اور روانی آ گئی۔

پشتو کے فروغ و ترقی، بلکہ نشأۃ ثانیہ میں

نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے غیر معمولی حصہ لیا ۔ ان کے بارے میں بحیثیت مغربی پاکستان (One Unit) سے پہلے کے آخری گورنر سر اولف کیرو اپنی کتاب (The Pathans ص ۴۴۴ میں کہتے ہیں : ’’ . . . صاحبزادہ عبدالقیوم بڑی محترم اور با وقار شخصیت کے مالک تھے، وہ پشاور اور دہلی میں اور پھر گول میز کانفرنس کے دوران میں لنڈن میں اپنے تمام ساتھیوں سے بلند رہے ۔ وہ دیکھنے میں بڑے شاندار تھے ان کا انداز پر وقار، خد و خال واضح، مونچھیں گھنی اور آنکھیں عقابی تھیں ۔ ان کی شخصیت قابلِ احترام تھی، لیکن ان کے انداز و اطوار بڑے دلکش تھے ۔ وسیع النظری اور مستقل مزاجی میں پورے ہندوستان میں گنتی کے لوگ ان کے ہمسر تھے ۔ یہ صاحبزادے ہی تھے جنھوں نے انگریزوں کی حکومت سے مختصر عرصے میں اصلاحات کی دو قسطیں وصول کر لیں‘‘ ۔

صاحبزادہ صاحب کے قائم کیے ہوے اسلامیہ کالج (پشاور) کے متعلق کیرو لکھتے ہیں: ’’ . . . اسلامیہ کالج کے وجود سے پٹھان قومیت کا جو احساس بیدار ہوا، اسے اس وسیع النظری نے متوازن کر دیا، جو ان جماعتوں میں سکھائی جاتی تھی (The Pathans، ص ۴۴۳) ۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامیہ کالج نے قوم کے نوجوان طبقے میں بیداری پیدا کر کے نئی زندگی کی روح پھونکی ۔

اس نئے دور میں پشتو ادب میں بہت سی نئی چیزیں شامل ہو گئیں، جیسے سیاست، صحافت ناول، افسانہ، ڈراما (سٹیج کا، ریڈیائی اور محض کتابی)، تنقید و تبصرہ، مقالہ نگاری، ادب لطیف کے نام سے اپنے لطیف رومانی جذبات کے اظہار کا انداز اور فن لغت نویسی وغیرہ ۔ اس کے علاوہ پشتو نصاب تعلیم کے لیے درسی کتابیں (پشتو قاعدہ سے لے کر بارھویں تک)، السنہ شرقیہ کے امتحانات میں پشتو کی علیحدہ درجہ بندی اور اس کے نصاب کی کتابیں ۔ پشتو اکیڈیمی کا قیام، جس میں پشتونوں اور پشتو زبان کی تاریخ اور اس کے ارتقا کی تحقیق کے سلسلے میں کام ہو رہا ہے ۔ پشتو میں ایم ۔ اے کی جماعتیں کھل گئیں، اس کے علاوہ بے شمار ادبی انجمنوں کا قیام، پشتو ٹائپ رائیٹر، پشتو ٹائپوگرافی، ’’پشتو اکیڈیمی میں مشترک ٹائپ رائیٹر مشین کے لیے ایک ایسے کیبورڈ (Key - board) کی ایجاد جس کے ذریعے اردو، پشتو، عربی، فارسی اور سندھی وغیرہ ایک ہی مشین سے چھاپی جا سکیں گی ۔ اس میں راقم الحروف نے بھی خدمت کی ہے ۔ ایک سہ لسانی پشتو جامع اللغات کا کام، رومن رسم الخط میں پشتو لکھنے (ٹرانس لٹریشن) کے واسطے خصوصی رومن حروف وضع کرنا‘‘ (جو بین الاقوامی مسلمہ حروف کے علاوہ ہیں) ۔

ایسے ہی پشتو شعر میں نظم اور آزاد نظم وغیرہ کے نمونے شامل ہو گئے ۔ ترجمے، تصنیف اور تالیف کا رنگ بدل گیا ۔ اب پشتو میں دینیات اور اخلاقیات کے علاوہ سائنسی، تحقیقاتی اور فنی مضامین شامل ہو گئے ہیں ۔ آج کل کتابیں بالکل جدید طرز پر لکھی جانے لگی ہیں ۔ ان میں سے اکثر و بیشتر کام آزادی کے حصول، یعنی پاکستان کے قیام کے بعد شروع ہوے ہیں ۔

دور جدید کے مشاہیر کی فہرست بھی بہت طویل ہے، لیکن ان میں دو قسم کی وہ شخصیتیں شامل ہیں جو اس نئے دور کی تعمیر ادب میں بمنزلہ سنگ بنیاد شمار کی جاتی ہیں، اس لیے تیمناً و تبرکاً ان کا ذکر ضروری ہے ۔ ان میں سے اکثر اصحاب نے پشتو زبان اور اردو ادب میں ہر جہت سے، ہر نوع کی خدمت کی ہے ۔ بالفاظ دیگر پشتو ادب کی موجودہ ترقی بیش از بیش انھیں کی رہین منت ہے ۔

انیسوی صدی عیسوی کے اوائل میں، میدانِ ادب کے اس کاروان میں کئی طرح کے رہ نوردانِ شوق و ذوق شامل رہے ہیں۔ ان میں پہلی جماعت روس، جرمنی، انگلستان، فرانس اور ناروے کے فاضل مستشرقین، پشتو ٹولنہ، کابل (افغانستان) کے گرامی قدر حبیبی، خادم، بینوا، مجروح، الفت اور رښتین، بلوچستان کے نامور علما، فضلا اور شعرا کی قابل قدر مساعی کے علاوہ علاقۂ پشاور کے پیشرووں میں پیرزادہ سید عبداللہ شاہ، مولوی میر احمد شاہ رضوانی، میاں محمد یوسف (مرغ ڈھیری)، میاں حسیب گل کاکا خیل، مولوی عبدالمجید افغانی، منشی احمد جان، قاضی رحیم اللہ، سید راحت اللہ زاخیلی، میاں آزاد گل کاکا خیل، حافظ محمد ادریس، میجر ایس۔ اے۔ رحمٰن، نصراللہ خان نصر، مولانا عبدالقادر (مرحومین)، پھر امیر حمزہ شینواری، عبدالحلیم اثر، سمندر خان، میاں سید رسول رسا، دوست محمد خان کامل، فضل حق شیدا وغیرہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ دوسری جماعت ان ناقابل فراموش اہم ہستیوں پر مشتمل ہے جنھوں نے تحریک ''خدائی خدمتگار'' اور انگریزی تسلط سے استخلاص کی خاطر جنگ آزادی کی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس صف میں خان عبدالغفار خان، محمد اکبر خادم، میاں احمد شاہ، عبدالاکبر خان، عبدالخالق خلیق، صنوبر حسین، حاجی خانمیر ہلالی، عبدالکریم مظلوم، عبدالغنی خان اور ماسٹر عبدالکریم وغیرہ شامل ہیں۔ تعلیم یافتہ نوجوان اور تعلیم یافتہ خواتین بھی پشتو ادب کی ترقی میں عملی حصہ لے رہی ہیں۔

مآخذ: پشتو: (۱) سید بہادر شاہ ظفر کاکا خیل: پښتانه د تاریخ په رڼا کښې، پشاور ۱۹۶۵ء؛ (۲) قاضی عطاء اللہ خان: د پښتو تاریخ، بار اول، جلد اول، پشاور؛ (۳) افغانستان، در آریانا دائرة المعارف، کابل ۱۹۵۵ء؛ (۴) عبدالحی حبیبی: د پښتو ادبیاتو تاریخ، کابل ۱۹۴۶ء؛ (۵) وہی مصنف: پښتانه شعراء لومړے ټوک، کابل؛ (۶) صدیق اللہ رښتین: د پښتو د ادب تاریخ، کابل ۱۹۴۶ء؛ (۷) عبدالحلیم اثر افغانی: تیرے ہیر شاعران، پشاور یونیورسٹی ۱۹۶۳ء؛ فارسی: (۸) احمد علی کہزاد: تاریخ افغانستان، جلد اول، کابل؛ (۹) علی اکبر دھخدا: لغت نامۂ دھخدا، ایران ۱۳۳۵ شمسی؛ (۱۰) محمد حسین برہان تبریزی: برہان قاطع، (شرح برہان قاطع از ڈاکٹر معین)، تہران ۱۳۴۲ھ؛ اردو: (۱۱) لیبان: تمدن ہند، اردو ترجمہ از سیّد بلگرامی، بار دوم، لاہور ۱۹۶۲ء؛ (۱۲) مرتضٰی احمد خان: تاریخ اقوام عالم: حصّۂ اوّل، بار اوّل، لاہور؛ (۱۳) تاریخ ادبیات پشتو، شعبۂ تاریخ ادبیات، پنجاب یونیورسٹی، لاہور (زیر طبع)؛ (۱۴) سر اولف کیرو: دی پٹھانز، اردو ترجمہ پٹھان (از سیّد محبوب علی)، پشاور یونیورسٹی ۱۹۶۸ء؛ (۱۵) محمد عبدالسلام خان: نسب الافاغنہ، رامپور ۱۹۱۳ء؛ انگریزی: (۱۶) Edward Balfour: *Cyclopaedia of India and of Eastern and Southern Asia*، جلد اول، بار دوم، ۱۸۷۱ء؛ (۱۷) *Gazetteer of the Peshawar District*، ۱۸۹۷-۱۸۹۸ء (پنجاب گورنمنٹ)؛ (۱۸) *Pathans*، نئی دہلی ۱۹۲۸ء؛ (۱۹) Kennedy: *Researches into the Origin and Affinity of the Principal Languages of Asia and Europe*، لنڈن ۱۸۲۸ء؛ (۲۰) Seshagiri Shastri: *Aryan and Dravidian Philology*، جلد اول، ۱۸۸۴ء؛ (۲۱) Percy Sykes: *A History of Persia*، جلد اول، لنڈن ۱۹۱۵ء؛ (۲۲) Denzil Ibbetson: *A Glossary of the Tribes and Casts of the Punjab and N.W.F.P.*، جلد ۲، ۱۹۱۳ء؛ (۲۳) *Encyclopaedia Britannica*، جلد ۱ و ۳، ۱۹۰۲ء؛ (۲۴) *Encyclopaedia Americana*، جلد ۱ و ۳؛ (۲۵) Monier Williams: *Sanskrit - English*

Dictionary، تعارف، ص xii، آوکسفرڈ ۱۹۰۲ء؛ (۲۶) *Zoroastrian Theology*: Maneckji Nusseruanji Dhalla، انڈیا ۱۹۱۳ء؛ (۲۷) Arthur A. Macdonell: *A History of Sanskrit Literature*، بار ۶، ۱۹۲۸ء.

(سیّد انوارالحق)

تعلیقہ : [مندرجۂ ذیل عبارت مرحوم مولانا عبدالقادر سابق ڈائرکٹر پشتو اکیڈیمی، پشاور یونیورسٹی، کے قلم سے ہے ۔ پشتو کے بارے میں ان کی یہ رائے عام مسلمات سے کچھ مختلف ہے مگر بہر حال قابل توجّہ ہے] :

پشتونوں کی تاریخ آج تک پردۂ خفا میں رہی ۔ اس لیے جس مؤرّخ یا محقق کے خیال میں جو کچھ آیا وہ لکھ گیا ۔ کسی نے انہیں فرعون کی قوم قبطیوں میں شامل کیا ۔ کسی نے ضحاک کی نسل سے وابستہ کیا ۔ کسی نے انہیں اس لیے افغان سے منسوب کیا کہ شور و فغان اور غوغا ان کا خاصّہ تصوّر کیا گیا اور بہتوں نے انہیں بنی اسرائیل، یعنی سامی النسل گردانا.

مغربی مؤرخین اور مستشرقین نے انہیں کئی ایک نسلوں مثلاً آرین، یونانی، سیتھین سے وابستہ کیا اور آخر میں ایک مخلوط النسل قوم بنا کر چھوڑا، مگر پشتون کو اپنا حسبی اور نسلی نام پشتون کبھی نہیں دیا گیا ۔ نہ کسی نے اس نام سے ان کا ذکر کیا ہے ۔ البتہ لغت نامۂ دھخدا میں پشوتن، یا پشوتنو نامی ایک شجاع پہلوان کا ذکر اوستا کے حوالے سے ضرور ملتا ہے ۔ کئی اور قدیمی ایرانی کتابوں مثلاً بندھشن، دنیکرد، بہمن یشت وغیرہ اور دقیقی اور فردوسی کے شاھناموں میں پشوتن پسر گیگشتاسپ کا خاصا ذکر ملتا ہے، جو تحقیق طلب نکتہ ہے ۔ صدیوں کے اس طرزِ عمل کا جو افسوسناک اثر ہونا چاہیے تھا، وہ ہوتا رہا اور آج تک اس میں کمی واقع نہیں ہوئی.

پشتو اکیڈیمی، پشاور یونیورسٹی کی تاسیس کے بعد اس مسئلے کا محققانہ مطالعہ شروع ہوا ۔ گزشتہ دس سال میں، جو قلمی کتابیں اور دیگر دستاویزات دستیاب ہو سکیں ان کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ علماء محقّقین اور مؤرّخین کے اپنے نوشتوں سے یہ ثابت ہوا ہے کہ پشتون قوم زمانۂ قبل التاریخ سے پشتون ہی ہے ۔ نہ وہ آریا ہے، نہ قبطی، نہ سامی وغیرہ وغیرہ ۔ وہ بنی نوع انسان کا وھی قدیم ترین طبقہ ہے جس نے سب سے پہلے غلّہ دریافت کیا ۔ خود اسے استعمال کیا اور دوسروں کے لیے تمدّن کی ابتدا کی.

آریا اقوام نے اپنی مذھبی کتابوں (ویدوں) اور ژند اوستا میں دو ہزار سال ق م میں ان کی تہذیب کا ذکر کیا ہے اور ان کا نام پکتورن (پختون) بیان کیا ہے ۔ اسی طرح دوسرے محقّقین اور مؤرّخین نے مختلف ادوار میں پشتون قبائل کا ذکر کیا ہے ۔ پختون یا پشتون ہی ہے دوسرا کچھ نہیں بن سکا ۔ اسکی زبان بھی وھی پشتو ہے جسکی قدامت مسلّم ہے ۔ بلکہ قوی شواھد کی رو سے ھندی یورپی اور ھندی ایرانی اور کئی دیگر زبانیں اس کے ساتھ اصل اور فرع کا تعلّق رکھتی ہیں.

(عبدالقادر)

⊗ پَشِیْن : صوبۂ باوچستان کے ضلع کوئٹہ کی تحصیل جو ضلع کے وسط میں واقع ہے ۔ اس کا علاقہ زیادہ تر طوبی کی پہاڑیوں کی جنوبی ڈھلانوں پر مشتمل ہے؛ باقی علاقہ موسمی ندی پشین لورا کی بالائی وادی میں واقع ہے ۔ تحصیل کا رقبہ ۲۷۱۵ مربع میل ہے اور بیشتر حصہ سمندر سے تقریبا پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے ۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۷۹۳۵۹ ہے ۔

آب پاشی کے دو خاص ذریعے ہیں : ایک نہر شبو، اور دوسرا حوض خوشی دل خان۔ یہ دونوں

دریاے پشین لورا سے پانی حاصل کرتے ہیں۔ یہ ندی تقریباً ۲۵۰ میل لمبی ہے۔ گندم، جوار اور باجرے کی کاشت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ پھلوں کی بھی کاشت ہوتی ہے جن میں انگور اور انار خاص طور پر مشہور ہیں۔ گھریلو صنعتوں میں قالین سازی اور اونی دھاگہ بافی خاص ہیں۔ معدنیات میں کرومائٹ Chromite قابل ذکر ہے۔ تحصیل کا صدر مقام پشین ہے، جو سندھ پشین ریلوے لائن سے چھے میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ایک مربع میل اور آبادی ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۳۱۰۶ ہے۔

(سعدالدین احمد)

⊗ **پکتھال**: (Marmaduke William Pickthall)، (اسلامی نام محمد مارماڈیوک)، ۷ اپریل ۱۸۷۵ء کو لندن میں پیدا ہوے اور ۱۸ مئی ۱۹۳۶ء کو کارنوال Cornwall میں انتقال کر گئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم لندن میں پائی۔ انھیں اپنی عمر سے زیادہ ذہین سمجھا جاتا تھا۔ جغرافیے اور لسانیات سے انھیں بہت لگاؤ تھا اور لکھنے کا بھی انھیں بہت شوق تھا، جو انھیں اپنے دادا اوبرائن O'Brien سے ورثے میں ملا تھا۔ انھوں نے اپنی مادری زبان کے علاوہ فرانسیسی، اطالوی، جرمن، ہسپانوی اور عربی زبانیں بھی سیکھیں۔

پکتھال کو یورپ کی فضا پسند نہ تھی اور وہ طبعاً مشرقی ممالک کی آب و ہوا میں زندگی گزارنے کی آرزو رکھتے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں انھیں شام اور مصر میں زندگی گزارنے اور مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور دینی تعلیمات کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور ان سے وہ اتنا متأثر ہوے کہ انھوں نے اپنے ان تأثرات کو اپنی تصنیف *Oriental Encounters* میں بیان کیا۔ وہ رفتہ رفتہ اسلامی طرز زندگی کے دلدادہ بنتے چلے گئے اور انھوں نے اس موضوع پر ایک نہایت عمدہ ناول بعنوان ''ماہی گیر سعید'' *Said the Fisherman* لکھا، جس کا یورپ کی کئی زبانوں، مثلاً فرانسیسی، جرمن اور ڈینش Danish میں ترجمہ ہوا۔ کچھ عرصے انھیں بطور معلّم سوئٹزرلینڈ وغیرہ میں رہنا پڑا۔ اس کے بعد ۱۹۰۷ء میں وہ لارڈ کرومر Lord Cromer کی دعوت پر مصر گئے اور اس طرح انھیں پھر مسلمانوں کے رہن سہن اور اسلامی تعلیمات کے مطالعے کا موقع ملا۔ انھوں نے اپنے مشاہدات کو اپنی ان دو کتابوں میں بیان کیا ہے: (۱) *The Children of the Nile* اور (۲) *Veiled Women* (برقع پوش خواتین)۔ پکتھال کچھ مدت بیروت میں بھی رہے، جہاں انھوں نے ایک دیہاتی مدرس کی مدد سے عربی بولنے کی مشق کی۔

۱۹۱۳ء میں پکتھال ترکی کی سیاسی و معاشرتی زندگی کے مطالعے کے لیے وہاں گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی کو ''مرد بیمار'' سمجھ کر یورپ کی تمام طاقتیں (بشمول روس) اسے ہڑپ کرنے کی کوشش میں تھیں اور ترکی کے اندر اور باہر سازشوں کے جال بچھے ہوے تھے۔ پکتھال کو ترکی سے بڑی ہمدردی تھی اور وہاں سے واپس آنے پر انھوں نے اپنے مشاہدات کو مقالوں کی صورت میں قلمبند کیا، جو *New Age* میں مسلسل شائع ہوتے رہے۔ پھر ان مشاہدات و تأثرات کو اپنے ناول *With the Turk in Wartime* (جنگ میں ترکوں کے ساتھ) میں بیان کیا۔ اب پکتھال کے دل میں اسلام کی صداقت و حقانیت گھر کر چکی تھی، چنانچہ انھوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا اور پھر عمر بھر اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں کوشاں رہے۔

جنگ عظیم کے دوران میں ان کی یہ کتابیں شائع ہوئیں: (۱) *Tales from five Chimneys*

(۱۹۱۵)؛ (۲) The House of War (۱۹۱٦)؛ (۳) Knights of Araby (۱۹۱۷ء) ۔ جنگ عظیم کے بعد وہ کچھ عرصے لنڈن میں ادارۂ معلومات اسلامی Islamic Information Bureau سے منسلک رہے ۔ ۱۹۲۰ء کے اواخر میں پکتھال بمبئی کے ایک صاحب دل انسان عمر سبحانی کی دعوت پر بمبئی گئے اور بمبے کرانیکل Bombay Chronicle کے مدیر مقرر ہوے، اور ستمبر ۱۹۲۳ء تک ادارت کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے رہے ۔ ڈاکٹر سر راس مسعود اور سر اکبر حیدری کی دعوت پر وہ نظام دکن کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے اور انھیں چدرا گھاٹ ھائی سکول کا پرنسپل مقرر کیا گیا ۔ ۱۹۲۷ء میں انہوں نے ایک بورڈ کی زیر سر پرستی، جس کے صدر سر اکبر حیدری اور سیکرٹری نواب یاور جنگ تھے، اسلامک کلچر Islamic Culture ایک سہ ماھی رسالہ نکالا ۔ اس رسالے کی اشاعت کا مقصد غیر اسلامی دنیا کو اسلامی ثقافت اور علوم و فنون سے روشناس کرانا تھا ۔ پکتھال کی مساعی جمیلہ اور ذوق و شوق کی وجہ سے اس رسالے نے علمی دنیا میں بہت جلد اپنا مقام حاصل کر لیا ۔ وہ اس کی ادارت کے فرائض دس برس تک بڑے ھی خلوص و محبت سے انجام دیتے رہے۔

۱۹۲۷ء میں پکتھال نے مدراس میں سالانہ اسلامی خطبات کے سلسلے میں، جس کی بنیاد جمال محمد نامی ایک نیک دل تاجر نے رکھی تھی، "اسلام کا ثقافتی پہلو" کے موضوع پر خطبے دیے، جو بعد میں The Cultural Side of Islam کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوے۔

اکتوبر ۱۹۲۸ء میں نظام دکن نے پکتھال کو دو برس کی رخصت دی تاکہ وہ قرآن مجید کے انگریزی ترجمے کی تکمیل کریں، جسے انہوں نے چند برس پہلے شروع کیا تھا، چنانچہ جب انہوں نے یہ ترجمہ ختم کر لیا تو اسے لے کر قاھرہ گئے، جہاں انہوں نے احمد بے الغمراوی، جامعۃ الازھر کے شیخ (Rector) مصطفی المراغی کے صلاح و مشورے سے اپنے مسودے پر نظر ثانی کی ۔ علاوہ بریں انہوں نے دوسرے عرب علما سے بھی مشورہ کیا ۔ قرآن حکیم کا یہ انگریزی ترجمہ (The Glorious Quran) ۱۹۳۰ء میں لنڈن اور نیو یارک میں شائع ہوا، بعد ازاں کئی مرتبہ مع متن اور بغیر متن شائع ہو چکا ہے ۔ یہ ترجمہ صحت، سلاست اور فصاحت کے لحاظ سے مقبول ترین تراجم میں شمار ہوتا ہے۔

پکتھال نے اپنی زندگی کے آخری سال اسلامک کلچر کی ادارت، چدرا گھاٹ ھائی سکول کی پرنسپل شپ، اور آخر میں نظام دکن کے چھوٹے بھائی صاحبزادۂ بسالت جنگ کے کنٹرولر کے دفتر میں گذارے ۔ اس دوران میں وہ پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں حیدر آبادی مندوبین کے سیکرٹری اور پھر نظام دکن کے بچوں کے اتالیق کی حیثیت سے لنڈن گئے۔

جنوری ۱۹۳۵ء میں وہ حیدر آباد ایجوکیشن سروس سے مستعفی ہو گئے اور اسی سال اپریل میں لنڈن چلے گئے ۔ وہ اب بھی اسلامک کلچر کی ادارت کے فرائض انجام دیتے تھے، اس کے علاوہ وہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں سرگرم عمل رہے ۔ آخری موسم سرما انہوں نے کارنوال Cornwall میں گزارا، جہاں وہ اپنی بعض تصانیف پر نظرثانی کر رہے تھے کہ بروز منگل ۱۸ مئی ۱۹۳٦ء کو ایک گھنٹے کی مختصر علالت کے بعد اپنے خالق سے جا ملے ۔ انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

پروفیسر Krenkow نے پکتھال کے متعلق ان

کی وفات پر اپنے خط میں لکھا ہے: "حیدرآباد کی ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد وہ مغرب میں اسلام کی اشاعت کے لیے کام کرتے رہے اور اس سلسلے میں انھوں نے ایک انجمن کی بنیاد بھی رکھی۔ وہ ایک قابل اعتماد دوست اور پکے مسلمان تھے" (قب اسلامک کلچر، جولائی ۱۹۳۷ء، جلد ۱۰، ص ۷)۔ پکتھال طومار نویس مصنف تھے۔ ان کی تصانیف مفصلۂ ذیل ہیں: (۱) All Fools (۱۹۰۰ء)؛ (۲) Said the Fisherman (۱۹۰۳ء)؛ (۳) Enid (۱۹۰۴ء)؛ (۴) Brendle (۱۹۰۵ء)؛ (۵) The House of Islam (۱۹۰۶ء)؛ (۶) The Myopes (۱۹۰۷ء)؛ (۷) The Children of the Nile (۱۹۰۸ء)؛ (۸) The Valley of the Kings (۱۹۰۹ء)؛ (۹) Pot-au-feu (۱۹۱۱ء)؛ (۱۰) Larkmeadow (۱۹۱۲ء)؛ (۱۱) Veiled Women (۱۹۱۳ء)؛ (۱۲) With the Turk in War-Time (۱۹۱۴ء)؛ (۱۳) Tales from five Chimneys (۱۹۱۵ء)؛ (۱۴) The House of War (۱۹۱۶ء)؛ (۱۵) Knights of Araby (۱۹۱۷ء)؛ (۱۶) Oriental Encounters (۱۹۱۸ء)؛ (۱۷) Sir Limpidus (۱۹۱۹ء)؛ (۱۸) The Early Hours (۱۹۲۱ء)؛ (۱۹) As Others see Us (۱۹۲۲ء)؛ (۲۰) The Meaning of the Glorious Koran (۱۹۳۰ء)؛ (۲۱) Quranic Advices، لاہور (بدون تاریخ)؛ (۲۲) Cultural Side of Islam، تریتولی Trinnevelly، ۱۹۲۷ء (= Islamic Culture، لاہور بدون تاریخ)؛ (۲۳) Al-Amin, Life of the Holy Prophet، کراچی ۱۹۵۹ء۔

مآخذ: (۱) *The New Century Cyclopedia of Names*، نیو یارک ۱۹۵۴ء، بذیل مادّہ Pickthall؛ (۲) E. E. Speight: "*Marmaduke Pickthall*" در *Islamic Culture*، حیدر آباد (دکن)، جولائی ۱۹۳۷ء، ۱۱ : ۳ تا ۴؛ (۳) نظامت جنگ: "محمد پکتھال" (نظم)، در اسلامک کلچر، حیدر آباد (دکن)، جولائی ۱۹۳۷ء؛ (۴) نجیب العقیقی: المستشرقون، ۲ : ۱۴ء؛ (۵) Harold Bowen: *British Contributions to Turkish Studies*، لنڈن ۱۹۴۵ء، ص ۴۹ تا ۵۰؛ (۶) *Webster's Biographical Dictionary*، بذیل مادّہ *Loyal Enemy*۔

[ادارہ]

پُل: Pul فُلَبہ، مغربی افریقہ کا ایک قبیلہ، ابتدا میں یہ لوگ خانہ بدوش گلہ بان تھے، اب بڑی حد تک اقامت پذیر ہو گئے ہیں اور زراعت کرتے ہیں۔ فُلبہ Fulbe، خود کے لیے ان کا اپنا نام، پُلو Pulo کی جمع ہے، الحوصہ Hausa انھیں فُلنی Fulani کہتے ہیں، کنوری Kanuri فلتہ Felata اور فرنچ مصنفین Peuel؛ ان کی زبان کا نام خود اُن کے ہاں فُلفُلدہ Fulfulde ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ شمال مشرق سے اور شاید اصل میں فزّان Fezzan سے اس علاقے میں آئے تھے، لیکن زیادہ زمانۂ حال میں ان کی سمت مغرب سے مشرق کو، نہ کہ مشرق سے مغرب کو رہی ہے۔ Migeod نے ۱۹۲۳ء میں انھیں اس علاقے میں پایا جو اب برطانوی تولیت میں علاقۂ کیمرون Cameroons ہے اور یہاں وہ ان لوگوں کی زندگی میں داخل ہوئے تھے جن سے یہ مصنّف خود ملا۔ ان کی تقسیم کے بڑے مرکز فرانسیسی گنی Guinea میں فوتہ جالون Futadjallon اور Haut-Sénégal-Niger (بالائی سینی گال) میں ماسینہ Massina ہیں۔

جہاں تک ان کی نسل کا تعلق ہے، اگرچہ متعدد نظریات پیش کیے جاتے رہے ہیں، لیکن اب انھیں حامی النسل تسلیم کیا جاتا ہے۔ Meek (۱ : ۹۳) کا خیال ہے کہ یہ لوگ قدیم مصریوں سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ ڈیلافوس Delafosse کے نزدیک وہ ایک دوغلی نسل سے تھے جو کسی پر اسرار بنی اسرائیل (جن کی اب تک معقول طور سے توضیح نہیں ہو سکی) اور اس

قبیلے یا قبیلوں سے مل کر بنی تھی جنھیں انھوں نے پہلے سے یہاں قابض و متصرف پایا تھا۔ ایک بیان کے مطابق یہ تکرور [رک بآن] تھے جو اب توکولیور Toucouleur کہلاتے ہیں۔ فرابی نیوس Frobenius (کتاب مذکور، ص ۱۶۰) کہتا ہے کہ انھوں نے فزان سے جنوب مغرب کو اس غرض سے ہجرت کی کہ گارا Gara کے ظلم سے بچکر نکل جائیں اور گارا کو خود یہ مصنف اور دوسرے لوگ بھی ہیروڈوٹس کے Garamantes قرار دیتے ہیں۔ سننکہ Soninke روایت میں اسے ان کا ذکر برورو Bororo کے نام سے ملتا ہے (آدماوہ Adamawa کے خانہ بدوش فلیوں کا ۱۸۹۳ء میں پاسارج Passarge کی آمد تک یہی نام باقی تھا)، یا بروجوگو Borojogo کے نام سے بحیثیت ایک ذلیل محکوم قبیلے کے۔ ایسے ان قصص و روایات میں کوئی جدت نظر نہیں آتی جو ان کے گویوں (Mabube) سے جمع کیے گئے ہیں، بلکہ اس کا قول ہے کہ آزاد ہوتے ہی انھوں نے اپنے سابقہ حکمرانوں کی روایات اختیار کر لی تھیں۔ ضمناً یہ جتا دینا مناسب ہوگا کہ فرابی نیوس Frobenius کا یہ کہنا صریحاً غلط ہے (وہی کتاب) کہ بارتھ Schon Barth انھیں قدیم حبشی (Leucaethiopen) کا مرادف قرار دے چکا ہے، لیکن میں انھیں قدیم حبشی Leucaethiopen قرار دینا پسند نہیں کرونگا۔ بارتھ کی ذاتی راے ہے کہ یہ لوگ ایک مخلوط عرب و بربر اور ایک خالص حبشی نسل کے درمیان ہیں۔ اسی عبارت میں وہ ان کی زبان اور کافر جنوبی افریقہ (Kaffer Südafrika) کی زبان میں تعلق ہونے کی علامت کا ذکر کرتا ہے اور یہ تعلق دونوں زبانوں میں مختلف قسم کے اسما کی موجودگی پر مبنی ہوگا۔ اس بارے میں ہم آئندہ سطور میں بحث کریں گے۔

میک Meek متعدد مفروضات پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے (۱ : ۹۹) کہ "فلنی غالباً ایک بہت قدیم لیبیائی قبیلہ ہے، جس کا اصلی وطن مصر یا ایشیا تھا"۔ غالباً وہ خانہ بدوش فلیوں کو نائجیریا Nigeria میں حامی نسل کے خالص ترین نمائندے سمجھتا ہے (۱ : ۲۶)۔

ان کی جسمانی خصوصیات کا شاید بہترین خلاصہ میک نے ذیل کے الفاظ میں کیا ہے (۱ : ۲۶)، جو مجموعی طور پر منگو پارک Mungo Park، بارتھ Barth، نختیگل Nachtigal، پاسارج Passarge اور دوسرے سیاحوں کے بیان سے مطابقت رکھتا ہے: "اُن کا رنگ کھلے ہوے گندمی سے لے کر سرخی مائل گندمی تک ہوتا ہے اور بقول پاسارج "hellrötlich gelb" [= "ہلکا سرخی مائل زرد"]؛ ان کی جسمانی ساخت چھریری اور مضبوط رگ پٹھے کی ہوتی ہے اور بعض اوقات نسوانی بھی؛ چہرہ بیضوی، ہونٹ پتلے، کھوپری لمبوتری، پیشانی قدرے کنپٹی کی طرف ڈھلوان، ناک سیدھی، نیز عقابی اور نوک کے پاس اکثر ذرا سی گولائی لیے ہوے؛ جبڑا قدرے آگے کو نکلا ہوا یا بالکل ہی نکلا ہوا نہیں ہوتا۔ بال گھونگریالے اور اکثر سیدھے ہیں؛ . . . مردوں کی ٹھوڑی پر چگی سی ڈاڑھی کا ایک گچھا ہوتا ہے؛ آنکھیں بادامی اور ان پر لمبی سیاہ اور ریشمین پلکیں سایہ کیے ہوے ہوتی ہیں۔ فلنی عورتوں کے چہرے کا حسن اور دلربا چال مشہور ہے۔ سیرت میں فلا شکی اور شرمیلا، سیانا اور چالباز ہوتا ہے۔ افریقہ کا کوئی مقامی باشندہ زمانہ سازی اور عیاری میں اس کی برابری نہیں کر سکتا۔"

یہ تخمینہ مجموعی طور پر ان مبصرین کی راے کے مطابق ہے جن کا اوپر ذکر آیا ہے۔ پاسارج انھیں ایک بہادر اور سورما قوم ("eine ritterliche "nation") کہتا ہے، اس معنی میں کہ وہ محنت مزدوری اور تجارت دونوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور صرف جنگ، شکار اور چوپانی ہی کو مرد کے شایانِ شان کام سمجھتے ہیں۔ یہ حبشیوں کی بہ نسبت زیادہ خودداری اور اعلیٰ کردار کے حامل ہوتے ہیں۔

پاسارج ان کو "مذہب میں متعصب" بیان کرتا ہے، لیکن چونکہ خانہ بدوش فُلبی اب تک کسی حد تک تو ضرور بے دین ہیں (بیک، ۱: ۲۰۰ و بمواضع کثیرہ)، لہذا اس کی مراد اقامت پذیر فلبیوں سے ہوگی، جنھیں حوصہ Housa فُلَن گِدّہ Fulania Gidda کہتے ہیں اور جو معلوم ہوتا ہے کہ نائجیریا کے اور قبائل کی طرح گیارھویں صدی عیسوی میں مسلمان ہو گئے تھے (بیک ۲ : ۱ تا ۱۱)۔ یہ آباد شدہ فُلبی "ان قوموں کے ساتھ جنھیں انھوں نے مغلوب کیا تھا آزادانہ شادی بیاہ کرنے اور نیز کنیزیں رکھنے کی وجہ سے تیزی کے ساتھ حبشیوں میں مدغم ہو رہے ہیں۔ اب ان کی ناکیں چوڑی اور لب موٹے ہوتے جاتے رہے ہیں۔ اُن کے بال گھونگر والے ہو رہے ہیں۔ ان کے جسم کی ساخت بھدی ہو رہی ہے اور حبشی ساخت کا منہ آگے کو نکلتا جا رہا ہے۔ اگرچہ انھوں نے ان لوگوں کی حبشی شکل و صورت میں بہت تغیر پیدا کر دیا ہے جن کے ساتھ وہ مقیم ہوگئے ہیں، تاہم فُلبی خون کی تازہ آمیزش نہ ہونے کی وجہ سے یہ تبدیلی تیزی سے غائب ہونے کا میلان رکھتی ہے۔ وہ خود اپنی نسل کے خانہ بدوش بے دین فلبیوں کے ساتھ اب شادی بیاہ بھی نہیں کرتے" (بیک ۱ : ۲۸)۔

لَبورِہ Labouret کے (بیان کے) مطابق خانہ بدوش فلبی ملک میں چھوٹی چھوٹی بستیوں میں منتشر ہیں "اور بالعموم اقامت پذیر گانوں کے پہلوؤں میں گلّوں اور ریوڑوں کی حفاظت کے لیے رہتے (sédentaires pour en garder les troupeaux généralement installées à côté des villages) ہیں"۔ یہ لوگ حضری آبادی کو دودھ، مکھن وغیرہ مہیا کرتے ہیں۔ دودھ اور مکھن فروخت کرتی ہوئی فلبی عورتیں سیاحوں کے لیے ایک مانوس منظر ہیں۔

فلبی بالائی سینیگال Senegal کے علاقے میں تقریباً ۱۳۰۰ء میں پہنچے، جب کہ سلطنتِ غانہ اپنی قوت کے اوج پر تھی۔ حدود ۱۴۰۰ء میں قبیلے کا ایک حصہ تیرمِس Termes سے آ کر جالو Djallo خاندان کے رئیسوں کے ماتحت شمال مغرب میں ماسینہ میں قیام پذیر ہو گیا۔ اس سلطنت کو سنغائی Songhai سردار اسکیا عمر نے ۱۴۹۴ء میں فتح کیا۔ تقریباً اسی زمانے میں یا تھوڑے ہی دن بعد ایک فُلبی رئیس (ardo) مسمّی تِنگِلا Tengella نے عمر کے خلاف بغاوت کی، لیکن ۱۵۱۲ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بیٹے کولی Koli نے ایک آزاد کافر حکومت بادیار Badiar میں قائم کی، جو بالائی گیمبیا میں ہے۔ اس کے جانشین، جو خاندان دِینیَانکہ Denianke کہلاتے ہیں، ۱۵۵۹ء سے ۱۷۷۶ء تک یہاں حکومت کرتے رہے۔

فُلبی لوگ برنو Bornu میں سولھویں صدی عیسوی میں داخل ہوے جیسا کہ انھوں نے دوسری جگہ بھی کیا تھا اور ملک میں بے ضرر گڈریوں کے بھیس میں پھیلتے گئے۔ وہ موقع کی تاک میں تھے، یہاں تک کہ "ایک ناگہانی بھرپور وار کے ذریعے انھوں نے اپنے کو ملک کا مالک بنا لیا" (بیک)۔ اٹھارھویں صدی کے اختتام کے قریب شیحو عثمان دان فودیو Shehu Usuman dan Fodio (ولادت ۱۷۵۴ء) نے ایک احیاے دین کی بنا ڈالی اور آخر میں نائجیریا کے شمالی حصے کو فتح کر لیا۔ عثمان نے اپنا پایۂ تخت سکوٹو Sokoto میں رکھا

(جیسے اس کے بیٹے بِلّو Bello نے ۱۸۱۰ء میں تعمیر کیا تھا) اور اپنی وفات سے پہلے، جو ۱۸۱۷ء میں ہوئی، وہ اپنی سلطنت میں مسلمانوں کا مذہبی پیشوا (Sarkin Musulmi) تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا بِلّو تخت نشین ہوا۔ یہ وہی "سلطان بِلّو" ہے جس سے ۱۸۲۱ء میں ڈِنہم Denham، کَلَیپرٹن Clapperton اور اوڈنی Oudney نے ملاقات کی تھی۔ اس کا پایۂ تخت سکوٹو تھا اور بعد کو وُرنو Worno ہوا، جب کہ اس کا چچا عبداللہ Abdulahi گنڈو Gando میں حکومت کرتا تھا۔

اس اثنا میں، مغرب میں، ایک فُلبی سردار (marabout)، مسمّی شیخ حمدو Seku Hamadu نے ماسینہ کے فلبیوں کو حدود ۱۸۱۰ء میں مشرف باسلام کیا، اور جِنّہ (Djenne) پر قابض ہو گیا، بلکہ ۱۸۲۶ء میں ٹمبکٹو کا بھی مالک و متصرف ہو گیا؛ لیکن جس حکومت کی اس نے بنیاد ڈالی وہ تھوڑے ہی عرصے تک قائم رہی اور اس کے پوتے کو الحاجّ عمر نے ۱۸۶۲ء میں مغلوب کر لیا۔ اس سے پیشتر ۱۷۷۶ء میں مسلمان تکرور Tekror نے فوتہ تورو Futa Toro میں فلبی دِینِیآنکہ Deniaoke کے خلاف بغاوت کی تھی، اور ایک "دینی انتخابی بادشاہی" (Delafosse) کی بنیاد ڈالی تھی، جو ۱۸۸۱ء میں فرانسیسی الحاق تک قائم رہی۔ تکرور کے ایک اور گروہ کے سردار کی حیثیت سے عمر نے مقامی فُلبی لوگوں کو مطیع کر لیا تھا اور اپنی وفات تک، جو ۱۸۶۴ء میں واقع ہوئی، برابر فرانسیسی حکام کو پریشان کرتا رہا (ڈیلا فوس)۔

اقامت پذیر فُلبی اپنے رسم و رواج میں دوسرے نو مُسلم قبائل سے زیادہ مختلف نہیں ہیں، اگرچہ ان قبائل نے بھی بظاہر اپنے کافر آبا و اجداد کے کچھ آثار قائم رکھے ہیں؛ چنانچہ بعض مسلمان خاندانوں میں کچھ حیوانات کی ممانعت کی پابندی کی جاتی ہے، خواہ اس کا تعلّق قدیم حیوان پرستی (totemism) سے ہو یا نہ ہو (میک ۱ : ۳۷)؛ بظاہر اس کی مراد حوصلہ سے ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بیان میں کم از کم ایک "فلبی مسلم قبیلے کی شاخ" کو شامل کرنا مقصود ہے۔ مزید برآن جب محمد التونسی کہتا ہے (میک، ۱ : ۹۹) کہ "سوڈان میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک گرگٹ کی نسل سے ہیں" تو یہ خیال کرنا صحت سے بعید ہو گا کہ یہ بیان محض ایک افسانہ ہے، جو از راہ تحقیر گھڑا گیا ہے"، بلکہ ممکن ہے کہ اس میں ایک حقیقی حیوان پرست عقیدے (totemism) کی جھلک پائی جاتی ہو۔

ذات پات کا نظام، جو حبشی اور بنتو افریقہ میں کہیں اور نہیں پایا جاتا، فُلبہ، وُلوف Wolof، مالِنکہ Malinke، مر کہ Marka اور بامنہ Bamanna قبائل میں عام ہے، اس فرق کے ساتھ کہ فلبہ کے ہاں "ذاتوں" کی ابتدا قبائلی امتیازات سے ہوئی (فرابی نیوس Frobenius، ص ۱۶۶) اور اسی لیے ان میں زیادہ سختی ہے، درآن حالیکہ ماندہ Mande قوم میں ذات پات کا اتنا تعصب اور سختی نہیں ہے۔ فلبہ کی ذاتیں یہ ہیں:۔

امرا و اشراف	رمبے Rimbe (Dimu کی جمع)
غلام (نوکر چاکر)	رمیبے Rimaibe
تاجر اور گلّہ بان	دیاوَمبے Diawambe
گوّیے اور جُلاہے	مابُوبے Mabube
چمڑے کا کام کرنے والے	سکیبہ Sakebe (اور بعض جگہ گرگسابہ Gargassabe)
لکڑی کا کام کرنے والے	لَوبے Laobe (اور بعض جگہ سکیبہ Sekaebe)

دباغت کا کام کرنے والے   وَبلبے Wailbe
(Bailu کی جمع)

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ فلبہ نے دیگر قبائل مذکورہ کے برخلاف غلاموں کا کوئی جداگانہ طبقہ تسلیم نہیں کیا۔ کمینے (جن کو Frobenius : "Hörige" کہتا ہے) رمیبے کے وہ اخلاف ہیں جو اسیر عورتوں کے بطن سے پیدا ہوے۔ لکڑی کا کام کرنے والے اور تجار کی ذاتیں فلبہ کے ساتھ مخصوص ہیں؛ بقیہ تمام دوسرے قبائل میں عام ہیں۔

گلاّ، سومالی اور حامی نسل کے دوسرے گلّہ بان قبائل کے برعکس فلبہ میں وہ رسوم اور ارکان عبادت نظر نہیں آتے جن کا تعلق دودھ سے ہے۔ ان کے پاس دو خصوصی نسلوں کے مویشی ہیں، جن میں سے ایک نسل کے یا دونوں کے متعلق یقین کیا جاتا ہے کہ وہ اُن کی جانب جنوب ہجرت میں ساتھ آئے تھے۔ اُن کے مویشیوں سے متعلق بعض تفصیلات میک نے دی ہیں (۱: ۱۱۵ تا ۱۱۸)۔

فُلبہ کی "فُلفُلدہ" زبان عرصے تک کلیۃً منفرد سمجھی جاتی رہی۔ اگر Barth نے اسے جنوبی افریقہ کی کافر زبان کے خاندان سے تصور کیا ہے تو اس کے ذہن میں ضرور اصناف اسم (noun-classes) کا نظام رہا ہوگا، جو بعض حیثیتوں سے بنتو بولیوں کے خاندان کے نظام سے مشابہ ہے، اگرچہ بنتو سے یہ زیادہ مکمل اور زیادہ معقول ہے۔ موّلر F. Müller نے اس زبان کو بجاے خود ایک الگ قسم قرار دیا، جو "نوبا - فُلہ گروہ" کی ایسی شاخ ہے جس کی وہ کوئی اور قرابت معلوم نہ کرسکا۔ A.W. Schleicher (۱۸۹۱ء) نے کوشش کی کہ سُومالی سے اس کا تعلق ثابت کرے۔ اس میں اُس نے زیادہ تر الفاظ کی اتفاقی مشابہتوں کا سہارا لیا اور اصناف اسمی سے بالکل اعراض کیا، اگرچہ وہ تسلیم کرتا ہے کہ فُلفلدہ صرف و نحو کی ایک اہم خصوصیت سومالی میں نہیں پائی جاتی۔ اس لحاظ سے کہ وہ اس زبان کو حامی کی ایک شاخ بتاتا ہے، وہ کسی حد تک Meinhof سے متفق ہے، جو کچھ آگے چل کر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ ایک حامی طبقے سے قبل کی نمائندہ ہے جس سے ایک طرف تو وہ حامی زبانیں بنیں جن سے ہم آج واقف ہیں (شِلّہہ، ساہو، گلاّ، وغیرہ) اور دوسری طرف بنتو زبانوں کا خاندان بنا۔

اصناف اسمی کے نظام کے سوا جس کا اُوپر ذکر ہوا (جس میں جمع بنتو کی طرح حرف سابق کی تبدیلی سے نہیں بنتی بلکہ حرف لاحق کے تغیّر سے) فُلفلدہ میں ایک اور عجیب ذیلی تقسیم نظر آتی ہے: (ا) انسانی اور غیر انسانی؛ (ب) بڑی اور چھوٹی چیزیں۔ یہاں شروع کے حرف صحیح کے تغیّر سے جمعیں بنائی جاتی ہیں جس کے لیے خاص قواعد مقرر ہیں، جنھیں Meinhof نے قانون قطبیت (Law of Polarity) کے نام سے بیان کیا ہے۔ اس مؤخرالذکر تقسیم سے اس نحوی تذکیر و تانیث (gender) کے آغاز کا ایک مفروضہ تیار کیا، جو بہت حد تک قابل قبول ہے اور جسے اس نے اپنی کتاب *Sprochen der Hamiten* (۱۹۱۲ء) میں پیش کیا ہے؛ تاہم زمانۂ قریب میں اس نے بنتو مادّوں کی نسبت اپنی راے میں ترمیم کی ضرورت محسوس کی اور اب وہ کم از کم یہ سمجھتا ہے کہ نظامِ اصناف اسمی فُلفلدہ کی کوئی قدیم خصوصیت نہیں ہے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ کسی بنتو یا "نیم بنتو" زبان سے لی گئی ہو۔ Westermann مؤخرالذکر کے لیے اصطلاح قبائلی بولی "Klassensprachen" کو ترجیح دیتا ہے اور اسے وسیع کر کے اس میں اُن زبانوں کے علاوہ جو H.H. Johnston کی *Compartive Study* میں شمار کی

گئی ہیں، دوسری زبانوں کو بھی شامل کر لیتا ہے۔ یہ بھی اب ظاہر ہوتا جا رہا ہے کہ فُلفلدہ زبان سب سے اتنی الگ اور انوکھی نہیں جیسی کہ شروع میں معلوم ہوئی تھی، بلکہ اس میں سیرر Serer اور دوسری ملحقہ زبانوں کے ساتھ اور خصوصًا پرتگیزی گنی کی غیر معروف بیافدہ Biafada کے ساتھ، جس کا مطالعہ G.A. Krause نے بہت پہلے یعنی ۱۸۹۵ء میں کیا تھا، کئی باتیں مشترک ہیں۔ A. Klingenheben کے دو اہم مقالوں سے، جو Ztsch. r. f. Eingeborenensprachen، ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئے تھے، امید ہے کہ اس پیچیدہ مسئلے پر نئی روشنی پڑے گی۔ فُلفلدہ بھی حوصہ کی طرح ایک تحریری ادب کی مالک ہے، جس کے لیے عربی خط، جو مقامی طور پر اجمی (عجمی) کہلاتا ہے، غالبًا ترویج اسلام کے وقت سے مستعمل ہے۔ اس خط کی کچھ خصوصیات ہیں جن کی بدولت وہ نمایاں طور پر اس خط سے مختلف ہے جسے سواحلی Swahili استعمال کرتے ہیں۔

اس کی بعض نفیس عکسی نقلیں کیپٹن ایف۔ ڈبلیو۔ ٹیلر Taylor کی *Fulani-Hausa Readings* میں موجود ہیں۔

مآخذ: (۱) عبدالرحمٰن السَّعدی: تاریخ السودان، مترجمہ Houdas، پیرس ۱۹۰۰ء؛ (۲) H. Barth: *Reisen und Entdeckungen in Nord- und Central-Afrika in den Jahren 1849 bis 1855*، ۵ جلد، گوتھا ۱۸۵۷ء؛ (۳) Abbé P. D. Boilat: *Esquisse Sénégalaise, physionomie du pays, peuplade, commerce, religion, passé, avenir, récits et légendes*، پیرس ۱۸۵۳ء؛ (۴) R. N. Cust: *A Sketch of the Modern Languages of Africa*، ۲ جلد، لنڈن ۱۸۸۳ء؛ (۵) Denham، Clapperton و Oudney: *Narrative of Travels and Discoveries in Northern and Central Africa in the years 1822, 1823 and 1824*، لنڈن ۱۸۲۶ء؛ (۶) L. Desplagnes: *Le Plateau Central Nigérien*، پیرس ۱۹۰۷ء؛ (۷) Maurice Delafosse: *Haut-Sénégal-Niger*، ۳ جلد، پیرس ۱۹۱۲ء؛ (۸) وہی مصنّف: *Traditions historiques et légendaires du Soudan occidental traduit d'un manuscrit arabe inédit*، پیرس ۱۹۱۳ء؛ (۹) وہی مصنّف و H. Gaden: *Chroniques du Fouta sénégalais*، پیرس ۱۹۱۳ء؛ (۱۰) وہی مصنّف: *Les Noirs de l' Afrique*، (مجموعۂ Payot، عدد ۱۵)، پیرس ۱۹۲۲ء (اس میں مآخذ کے متعلق نہایت مکمل تعلیقات ہیں)؛ (۱۱) C. Faidherbe: *Essai sur la Langue Poul*، پیرس ۱۸۷۵ء؛ (۱۲) Leo Frobenius: *Atlantis*، ج ۶، Jena ۱۹۲۱ء؛ (۱۳) Henri Gaden: *Le Poular, dialecte Peul du Fouta Sénegalais*، پیرس ۱۹۱۲ء؛ (۱۴) وہی مصنّف: *Proverbes et maximes peuls et toucouleurs traduits, expliqués et annotés*، پیرس ۱۹۳۱ء؛ (۱۵) T. G. de. Guiraudon: *Manuel de la langue Foule*، پیرس و لائپزگ ۱۸۹۴ء؛ (۱۶) A. Klingenheben: *Die Präfixklassen des Ful*، در *Ztschr. für Eingeb.-Spr.*، ج ۱۴، ۱۹۲۳ تا ۱۹۲۴ء، ص ۱۸۹ تا ۲۲۲، ۲۹۰ تا ۳۱۰؛ (۱۷) وہی مصنّف: *Die Permutation des Biafada und des Ful*، در مجلّۂ مذکور، ج ۱۵، ۱۹۲۴ تا ۱۹۲۵ء، ص ۱۸۰ تا ۲۱۳، ۲۶۶ تا ۲۷۲؛ (۱۸) H. Labouret: *La situation linguistique en Afrique Orientale Française*، در *Africa*، ج ۴، ۱۹۳۱ء، ص ۵۶؛ (۱۹) وہی مصنّف: *La parenté à plaisanteries en Afrique Occidentale*، در *Africa*، ج ۲، ۱۹۲۹ء، ص ۲۴۴؛ (۲۰) Meinhof: *Die Sprachen der Hamiten*، ہیمبرگ ۱۹۱۲ء؛ (۲۱) وہی مصنّف: *Das Ful in seiner Bedeutung für die Sprachen der Hamiten, Semiten und Bantu*، در *ZDMG*،

۱۹۱۱ء؛ (۲۲) C. K. Meek : The Northern Tribes of Nigeria، ج ۱ (خصوصاً ص ۲۳، ۲۸، ۹۴ ببعد) و ۲، آکسفرڈ ۱۹۲۵ء؛ (۲۳) F. W. H Migeod : Through British Cameroons، لنڈن ۱۹۲۵ء؛ (۲۴) وہی مصنّف : A View of Sierra Leone، لنڈن ۱۹۲۶ء؛ (۲۵) C. Monteil : Une Cité Soudanaise—Djenné، پیرس ۱۹۳۲ء؛ (۲۶) Gustav Nachtigal : Sahara und Sudan : Ergebnisse sechsjähriger Reisen in Afrika، تین حصّے، برلن ـ لائپزگ ۱۸۷۹ تا ۱۸۸۹ء؛ (۲۷) Mungo Park : Travels in the Interior Districts of Africa، ۱۷۹۵ تا ۱۷۹۷ء، ۲ جلد، لنڈن ۱۷۹۹ء؛ (۲۸) Siegfried Passarge : Adamaua, Bericht über die Expedition des Deutschen Kamerun - Komitees in den Jahren 1893-1804، برلن ۱۸۹۵ء؛ (۲۹) L. N. Reed : Notes on some Fulani Tribes and Customs، در Africa، ج ۵، ۱۹۳۲ء، ص ۴۲۲ ببعد؛ (۳۰) H. Reeve : The Gambia، لنڈن ۱۹۱۰ء؛ (۳۱) Ch. A.L. Reichardt : Grammar of the Fulde Language، لنڈن ۱۸۷۶ء؛ (۳۲) A. W. Schleicher : Afrikanische Petrefakten، برلن ۱۸۹۱ء؛ (۳۳) Flora. L. Shaw (Lady Lugard) : A Tropical Dependency، لنڈن ۱۹۰۵ء؛ (۳۴) F. W. Taylor : Fulani-Hausa Readings in the Native Scripts. With Transliterations and Translations (ایلر کے Fulani-Hausa سلسلے کی ج ۵)، آکسفرڈ ۱۹۲۹ء؛ (۳۵) وہی مصنّف : Fulani-English Dictionary، آکسفرڈ ۱۹۳۲ء؛ (۳۶) R. Thurnwald : Social Systems of Africa، در Africa، ج ۲، ۱۹۲۹ء، ص ۲۲۱ تا ۲۲۳؛ (۳۷) D. Westermann : Handbuch der Ful-Sprache، لنڈن ۱۹۰۹ء؛ (۳۸) J. R. Wilson-Haffenden : The Red Men of Nigeria، لنڈن ۱۹۳۰ء۔

(A. WERNER)

پُلای: (پولی Polei) جس کا املا عرب مصنفین نے پُلّای (بلائی) کیا ہے، جنوبی ہسپانیہ میں ایک قلعے کا قدیم نام، جس کی جگہ زمانۂ حال کا چھوٹا سا قصبہ اگوئی لار د لا فرونتیرا Aguilar de la Frontera آباد ہے۔ اس کی آبادی تقریبًا تیرہ ہزار ہے۔ یہ قرطبہ کے صوبے میں قبرہ Cabra اور الیسانہ Lucena سے بارہ میل شمال مغرب میں ہے۔ ۱۲۵۸ء کے ایک فرمان کی بنا پر اگوئی لارکو ڈوزی نے شناخت کیا کہ یہی سابقہ بلای تھا۔ شہرۂ آفاق عمر بن حفصون [رک بآن] نے قرطبہ کے اموی امرا کے خلاف خروج کیا تو اس شہر نے اس کی بغاوت میں خاصا حصہ لیا۔ پھر اس کا ذکر بارھویں صدی عیسوی میں جغرافیہ نویس الادریسی کے ہاں بھی آتا ہے۔ یہاں ایک قلعے کے آثار، جو مسلمانوں کے زمانے میں بنا تھا، ابھی تک دیکھے جا سکتے ہیں۔

مآخذ: (۱) الادریسی: Description de l'Espagne، طبع و ترجمۂ ڈوزی Dozy و ڈخویہ de Goeje، متن ص ۲۰۵؛ ترجمہ ص ۲۵۳؛ (۲) ابن حیان: المقتبس، مخطوطۂ بوڈلین، بمواضع کثیرہ؛ (۳) ڈوزی: Histoire des Musulmans d' Espagne، طبع جدید، لائڈن ۱۹۳۲ء، ۲: ۹۲ ببعد؛ (۴) وہی مصنّف: Recherches، بار سوم، ۱: ۳۰۷؛ [(۵) محمد عنایت اللہ: اندلس کا تاریخی جغرافیہ، بذیل مادۂ بلائی]۔

(E. LEVI-PROVENÇAL)

پلونہ: (Plevna و Plewna؛ ترکی: پلونہ) شمالی بلغاریا [رک بآں] کا ایک اہم شہر، سطح سمندر سے ۳۵۰ فٹ بلند، توچنیچہ Tučenica ندی کی گہری وادی میں واقع ہے، جو شہر کے دائیں جانب قریب ہی سے بہتی ہوئی دریاے وِید سے جا ملی ہے جو ڈینیوب کا معاون ہے۔ پہاڑیوں سے گھرا ہوا اور ودین، نِقیہ (نیکیا۔ ازنیق)، صوفیا اور کوہ بلقان کے دَرّوں کو جانے والی شاہراہوں کے نقطۂ تقاطع پر ہونے کے

باعث پلونہ مدت سے جنگی اہمیت کا مقام رہا ہے۔ وہاں سے اب ایک بڑی ریلوے لائن (صوفیا۔ پلونہ۔شمن۔ورنہ) بھی گزرتی ہے۔ یہ شہر، جس میں تجارت کی گرم بازاری ہے، ایک حلقے (circle) کا صدر مقام ہے۔ یہاں بڑا کاروبار مویشی اور شراب کا ہے اور وہ عجائب خانے ہیں جن سے جنگ روس و ترکی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ پلونہ تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔

اگرچہ پلونہ کے قرب و جوار میں رومن بستیوں کے کھنڈر موجود ہیں، تاہم یہ شہر دراصل ترکوں کے عہد ہی میں وجود میں آیا؛ پھر بھی اس ابتدائی دور کی تاریخ کے بارے میں صحیح معلومات بہت کم ہیں۔ اولیا چلبی کا یہ بیان کہ پلونہ کی بنیاد افلاق (ولاشیہ) کے بان [= حاکم] لادقہ؟ نے رکھی تھی قبول کرنے میں یقیناً تامل سے کام لینا چاہیے۔ دوسری طرف اس کا یہ دعوٰی کہ "۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء میں غازی خداوند گار (سلطان مراد اوّل) کے عہد میں اسے میخال بیگ نے فتح کیا" ترتیب زمانی کی بنا پر اعتراضات سے خالی نہیں ہے [اس لیے کہ مراد اوّل کا عہد حکومت ۱۳۶۰ تا ۱۳۸۹ء تھا]۔ اس مصنف کے قول کے مطابق پلونہ فتح ہونے کے بعد میخال بیگ کے بیٹوں کی آرپہ لیق [= جو کا کھیت، ایک مخصوص قسم کی جاگیر] تھا اور آگے چل کر بھی میخال اوغلو [رك بآں] کے معزز خاندان کے حلقۂ اثر میں رہا جنھوں نے وہاں متعدد عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ اولیا چلبی اور دوسرے ترک ماخذ کے مطابق (قب ۳ : ۹۰۵ ۳ (الف) اور *Glasnik Skopskog naučnog društva*، ۱۳ : ۳۷ و ۸۱) پلونہ میں کوسہ میخال کا ایک بیٹا محمد بیگ (م ۸۲۵ھ / ۱۴۲۱ - ۱۴۲۲ء) اور مشہور علی بیگ میخال اوغلو، جو کہا جاتا ہے کہ ۱۵۰۷ء کے بعد فوت ہوا، مدفون ہیں۔ بقول اولیا چلبی علی بیگ اس مسجد میں دفن ہوا جو اس نے بنوائی تھی۔ ہمیں یہ بات نہ صرف اولیا چلبی بلکہ حاجی خلیفہ سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ پلونہ نیقیہ کی سنجاق میں ایک ضلع کا صدر مقام تھا (*Rumeli und Bosna*، ترجمہ از v. Hammer : *Spomenik*، ۱۸ : ۲۳)۔ سترھویں صدی میں جب اولیا چلبی اس شہر میں آیا تو یہاں دو ہزار مکانات، ایک ویران جنگی قلعہ، مذکورۂ بالا [غازی] علی بیگ کا قائم کردہ ایک بڑا دارالعلوم، سات مدرسے، چھے تکیے اور چھے سرائیں وغیرہ تھیں۔ ترکی حکومت کے آخری دنوں میں پلونہ میں، بقول سامی بک (قاموس الاعلام، ۲ : ۱۵۳۲ تا ۱۵۳۳) سترہ ہزار باشندے اور اٹھارہ مسجدیں تھیں، لیکن چونکہ بہت سے مسلمان جنگ روس و ترکی کے بعد ہجرت کر گئے، لہٰذا آبادی گھٹ کر چودہ ہزار رہ گئی اور ۱۸۸۹ء میں اکثر مسجدیں خستہ و شکستہ بتائی جاتی تھیں۔

پلونہ کو عالمگیر شہرت ۱۸۷۷ تا ۱۸۷۸ء کی جنگ روس و ترکی ہی کے سلسلے میں حاصل ہوئی، جب روسی ڈینیوب کو پار کر کے ۱۹ جولائی ۱۸۷۷ء کو پلونہ کے سامنے نمودار ہوے اور انھیں عثمان پاشا کی غیر متوقع مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، جو ودین سے آگے بڑھ کر یہاں پہنچ گیا تھا۔ انھوں نے ۲۰ اور ۳۰ جولائی کو ناکام حملے کیے اور بھاری نقصان اٹھایا۔ چونکہ پلونہ میں جنگی استحکامات نہ تھے، لہٰذا عثمان پاشا نے اس کے چاروں طرف اب مستحکم اور وسیع مٹی کی دیواریں بنوائیں۔ ۱۱ اور ۱۲ ستمبر کو روسیوں نے رومانویوں کی مدد سے، جنھیں انھوں نے اپنی اعانت کے لیے بلایا تھا، پلونہ کے لینے کی تیسری کوشش کی۔ انھوں نے پیدل فوج سے یورش کی، لیکن پھر بڑے نقصانات کے ساتھ پسپا کیے گئے۔ ان سب ہزیمتوں اور (۱۸ ستمبر اور ۹ ،

اکتوبر کی) مزید ناکامیوں کے بعد اتحادیوں نے فیصلہ کر کے شہر کا باقاعدہ محاصرہ شروع کیا، جس کی قیادت سباستو پول Sebastopol کا محافظ روسی سپہ سالار Totleben خود کر رہا تھا۔

بایں ہمہ عثمان پاشا اب تک مغربی سمت سے گھرا ہوا نہ تھا اور اُدھر سے اسے سامان جنگ اور رسد ۱۰ اکتوبر تک پہنچتی رہی، مگر نومبر کے وسط میں محاصرہ مکمل کر لیا گیا اور ۱۰ دسمبر کی صبح کو عثمان پاشا نے ٹھان لی کہ آخری بار جان کی بازی لگائے، اور قلعے سے نکل کر محاصرہ کرنے والی [اپنے سے سہ گنی یعنی] ایک لاکھ بیس ہزار فوج پر (جس میں زار بھی شامل تھا) حملہ کرے اور ممکن ہو تو اس کی مغربی صف بندی کو توڑ کر نکل جائے۔ یہ بہادرانہ کوشش چند گھنٹوں تک کامیاب رہی، لیکن اس اثنا میں بہادر عثمان پاشا ("شیر پلونہ") خود زخمی ہو گیا اور اس نے اس کے سوا چارہ نہ دیکھا کہ اسی دن دوپہر تک تقریباً چالیس ہزار فوج کے ساتھ ہتیار ڈال دے۔ روسی فوج پہلے ہی پلونہ میں داخل ہو چکی تھی، جس کے لیے پانچ ماہ کے محاصرے کے دوران میں انھیں اور رومانویوں کو چالیس ہزار آدمیوں سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

سقوط پلونہ نے روسیوں کے لیے اِدرنہ اور آگے سان سٹیفانو San Stefano تک کا راستہ کھول دیا، جہاں صلح نامہ مرتّب ہوا اور انھوں نے من مانی شرطیں لکھوائیں۔

مآخذ: (متن مقالہ میں حوالوں کے علاوہ) (۱) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، استانبول ۱۳۱۸ھ، ۶: ۱۶۳ تا ۱۶۵؛ (۲) F. Kanitz: *Donau-Bulgarien und der Balkan*، بار دوم، لائپزگ ۱۸۸۲ء، ۲: بالخصوص ص ۲۰۲ ببعد؛ (۳) C. Jireček: *Das Fürstenthum Bulgarien*، ویانا ۱۸۹۱ء، ص ۱۸۹، ۲۸۶، ۵۳۵؛ (۴) Meyers Reisebücher: *Türkie ....*، بار پنجم، لائپزگ و ویانا ۱۸۹۸ء، ص ۲۰۰ تا ۲۱۳؛ (۵) S. Lane-Poole: *Türkey*، بار ہفتم، لنڈن ۱۹۰۸ء، ص ۳۶۱؛ (۶) N. Jorga، در *GOR*، ج ۵، گوتھا ۱۹۱۲ء، ص ۵۲۵ تا ۵۷۷؛ (۷) A. Ischirkoff: *Bulgarien, Land und Leute*، لائپزگ ۱۹۱۷ء، ۲: ۹۹ و ۱۰۸؛ (۸) کمال الدین تکری: *Plevne* (استانبول ۱۹۳۳ء) - اس چھوٹی سی کتاب میں صرف ۱۸۷۷ء کے محاصرے کا مشہور عوام بیان ملتا ہے؛ (۹) Jordan Trifonov: *Istoria na grada Pleven do osvoboditelnata voina* (اس شہر کی جنگ آزادی تک کی تاریخ بلغاری زبان میں) صوفیا ۱۹۳۳ء (باتصویر)؛ (۱۰) *Bibliographie Géographique Internationale*، ۱۹۳۳ء، ص ۲۱۹۔

[FEHIM BAJRAKTAREVIĆ]

⊗ **پنجاب**: (= پانچ دریاؤں کی سرزمین) - اس نام کا اطلاق برصغیر پاک و ہند کے اس علاقے پر ہوتا ہے جو دریاے ستلج، بیاس، راوی، چناب، جہلم اور سندھ کے درمیان واقع ہے۔ اس کی حدود مختلف زمانوں میں مختلف رہی ہیں (تفصیل آگے دیکھیے) - آج کل اس کا مغربی حصہ مغربی پاکستان کے موجودہ صوبۂ پنجاب پر مشتمل ہے اور مشرقی حصہ بھارت کے تین صوبوں ہماچل پردیش، پنجابی صوبہ اور صوبۂ ہریانہ میں منقسم ہو چکا ہے۔

وجہ تسمیہ اور حدود: یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس علاقے کے لیے پنجاب کا نام دور مغلیہ سے قبل قدیم مآخذ میں کہاں کہاں آیا ہے۔ عطا ملک جوینی: تاریخ جہان گشای (۲: ۱۰۸) میں جس پنجاب کا ذکر آیا ہے وہ حدود بلخ و ترمذ میں دریاے جیحون کے کنارے ایک مقام ہے۔ اسی طرح منہاج سراج: طبقات ناصری (طبع عبدالحی

حبیبی) میں پنجاب سے مراد دریاے سندھ کے پانچ معاون (''با سلطان قطب الدین ایبک او را بحدود پنج آب سند مخاف افتاد''، ۱ : ۴۸۴) اور دریاے پنج ندیا خود دریاے سندھ مراد ہے (''و در ہمیں ماہ ملک ناصر الدین قباچہ از حصار بھکر خود را در پنجاب غرق کرد''، ۱ : ۵۲۳) ۔ تاریخ بیہقی، کتاب الہند، تاریخ فیروز شاہی، وغیرہ میں اس صوبے کے مختلف علاقے اپنے مرکزی شہروں، مثلاً سرھند (= سہرند)، جالندھر، لاھور، دیپالپور اور ملتان سے منسوب کیے گئے ھیں ۔ عہد مغلیہ میں اور اس سے پہلے پنجاب کے مشمولہ علاقوں کو صوبۂ ملتان اور صوبۂ لاھور کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، البتہ اکبر کے زمانے سے پنجاب کا نام بکثرت اور بالعموم استعمال ہونے لگا ۔ ابوالفضل نے آئین اکبری اور اکبر نامہ میں، نیز اپنے مکاتیب میں متعدد موقعوں پر پنجاب کا ذکر کیا ہے اور کشمیر کو اس سے الگ قرار دیا ہے ۔ اس کے بیان سے کچھ ایسا ظاھر ھوتا ہے کہ صوبۂ لاھور ھی اصل پنجاب ہے ۔ منشی سجان راے نے خلاصة التواریخ میں پنجاب کی جو تفصیل دی ہے وہ مغلیہ دور کے نصف ثانی کے احوال کی نمائندگی کرتی ہے ۔ منوچی، جو شاھجہان اور اورنگ زیب کے زمانے میں موجود تھا، پنجاب کو عمل‌داری لاھور کا قائم مقام قرار دے کر لکھتا ہے: ''بھکر کے نزدیک سات دریا ملتے ھیں ان میں سے پانچ عمل‌داری لاھور کے علاقوں سے نکلتے ھیں ۔ ان کا منبع سری نگر اور کشمیر کے پہاڑوں میں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ عمل‌داری لاھور کو پنجاب (= پانچ دریاؤں کی زمین) کہا جاتا ہے'' (*Storia*، ۱ : ۳۲۲)؛ لیکن یہ بیان پنجاب کی حدود کو تنگ کر دیتا ہے ۔ اکبر نے پنجاب کو پانچ دوآبوں کا ملک قرار دے کر ان دوآبوں کے نام خود رکھے تھے: (۱) بست (= بست) جالندھر دوآب: بیاہ (بیاس) اور ستلج کے درمیان؛ (۲) باری دوآب: بیاس اور راوی کے درمیان؛ (۳) رچنا دوآب: راوی اور چناب کے درمیان؛ (۴) چنہت (= چج) دوآب: چناب اور بہت (= جہلم) کے درمیان اور (۵) سندھ ساگر دوآب: جہلم اور سندھ کے درمیان (آئین اکبری، اردو ترجمہ، ۲ : ۱۰۱۹) ۔ چہار گلشن نے ان پر علاقۂ کانگڑہ کا اضافہ کیا ہے، جو دوآبوں سے باھر ہے اور پہاڑی علاقہ ہے ۔ غرض یہ ہے کہ پنجاب کی حدود کے بارے میں قدیم مصنفوں نے اپنی اپنی حدبندی کی ہے ۔ خود برطانوی عہد کے بعض مصنف کمی بیشی کے مرتکب ھیں، چنانچہ مفتی غلام سرور لاھوری نے تاریخ مخزن پنجاب میں لکھا ہے: ''یہ ایک فراخ احاطہ شمال مغرب کی طرف ھندوستان کے ہے''۔ ان کا بیان ہے کہ یہ نام سندھ کو چھوڑ کر باقی پانچ دریاؤں کی وجہ سے ہے ۔ انھوں نے انگریز مصنفوں کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ ان پانچ دریاؤں میں سندھ تو شامل ہے، مگر بیاس شامل نہیں ۔ بہر حال ان کے نزدیک بھی یہ نام اکبر کا دیا ھوا ہے اور اس کی پرانی حدود یہ ھیں: مشرق اور جنوب مشرق میں دریاے ستلج اور سندھ، مغرب اور شمال مغرب میں دریاے سندھ، شمال میں کوہ کشمیر و کوہ جموں، شمال مشرق میں کوہ کانگڑہ، جنوب میں دریاے ستلج اور جنوب مغرب میں ملتان ۔ مغلوں کے زمانے میں یہی عمل داری لاھور (= پنجاب) کی حدود تھیں، چنانچہ ابوالفضل نے تقسیم ملک کی جو تفصیل دی ہے اس کی رو سے برطانوی دور کے صوبۂ پنجاب کے باقی ماندہ علاقے اس زمانے میں صوبۂ دھلی اور صوبۂ ملتان میں شامل تھے ۔ مفتی غلام سرور نے یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ پہلے اس کا نام ''پنج دوآب'' تھا، بعد میں ''دو'' کا لفظ زبان سے حذف ھو گیا اور صرف ''پنج آب''

(.. پنجاب) رہ گیا (ص ۱۴۹ ببعد) ۔ سکھوں کے زمانے میں جہاں جہاں ان کی حکومت قائم ہوئی وہ علاقے پنجاب میں شامل سمجھے گئے، چنانچہ ان کے اقتدار کی بدولت پنجاب کا دائرہ پشاور، ڈیرہ جات، ہزارہ، کشمیر، تبت، لداخ، جموں، کانگڑہ، منڈی، سکیت، کلّو، بہاول پور اور کوہ سلیمان تک پھیل گیا (اس فرق کے ساتھ کہ ایک میدانی پنجاب اور دوسرا کوہی پنجاب سمجھا گیا) ۔ انگریزوں کے زمانے میں پنجاب کی حدود میں قسمت دہلی، حصار و انبالہ کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا۔

قیام پاکستان سے پہلے صوبۂ پنجاب مندرجۂ ذیل قسمتوں (اور اضلاع) پر مشتمل تھا: (۱) انبالہ (انبالہ، شملہ، حصار، رہتک، کرنال، گوڑگانوہ)؛ (۲) جالندھر (جالندھر، ہوشیار پور، کانگڑہ، فیروز پور، لدھیانہ)؛ (۳) لاہور (لاہور، شیخوپورہ، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، گورداسپور)؛ (۴) ملتان (ملتان، منٹگمری [= موجودہ ساہیوال]، لائل پور، جھنگ، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خان)؛ (۵) راولپنڈی (راولپنڈی، جہلم، گجرات، سرگودھا، اٹک، میانوالی)۔

قیام پاکستان کے وقت انبالہ اور جالندھر کی قسمتوں کے علاوہ تحصیل شکر گڑھ کو چھوڑ کر پورا ضلع گورداسپور اور ضلع لاہور کی تحصیل چونیاں کا تقریباً نصف حصہ بھارت میں چلا گیا اور مشرقی پنجاب کہلایا۔ باقی ماندہ علاقہ پاکستان کا صوبۂ مغربی پنجاب بنا۔ ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو مدغم کر کے صوبۂ مغربی پاکستان کی تشکیل ہوئی۔ یکم جولائی ۱۹۷۰ء میں وحدت مغربی پاکستان ختم کر دی گئی اور صوبے بحال ہو گئے۔ موجودہ صوبۂ پنجاب سابقہ صوبۂ مغربی پنجاب اور ریاست بہاول پور پر مشتمل ہے۔

زمانۂ قبل از اسلام: پنجاب کی تاریخ کا ابتدائی دور تاریکی میں چھپا ہوا ہے، البتہ محکمۂ آثار قدیمہ کی کوششوں سے جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس علاقے میں انسانی آبادی قدیم ترین عہد ہی میں موجود تھی۔ راولپنڈی کے قریب وادی سوان میں قدیم حجری (Palaeolithic) ثقافت کے آثار ملے ہیں، جو ماہرین کے اندازے کے مطابق دو سے چار لاکھ سال پرانی ہے۔ ہڑپا (ضلع ساہیوال) کی کھدائی سے تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح کے آثار دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ مثل جودڑو (= موہنجوڈارو، سندھ) کے آثار سے مشابہ اور پیتل کے زمانے (Chalcolithic Period) کے عروج کی حالت پیش کرتے ہیں۔ ان سے اس زمانے میں ایک منظم تہذیب اور آبادی کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ یہ لوگ سات آٹھ ہزار سال قبل عراق عرب سے آئے تھے اور انہیں دراودی (= دراوڑی) نسل سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہمیں جو نیم تاریخی روایات ملتی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانۂ قبل از تاریخ میں اس علاقے کی زرخیزی اور خوشحالی غیر ملکی حملہ آوروں کے لیے باعث کشش رہی، چنانچہ اس سلسلے میں مصر کے نامور فرمانروا اوسیرس Osiris اور سیسوترس Sesotris کے نام قابل ذکر ہیں۔

تقریباً ۲۵۰۰ ق م میں وسط ایشیا کے آریاؤں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور پنجاب کے اصلی باشندوں کو یا تو تہ تیغ کر دیا یا غلام بنا لیا؛ جو بچے وہ جنوب کی طرف بھاگ گئے یا شمالی پہاڑوں میں جا چھپے۔ یہاں کی قدیم تہذیب تباہ کر دی گئی اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ آریاؤں کے مختلف گروہ دریاے سندھ اور اس کے معاونین کے کنارے آباد ہو گئے۔ اس زمانے میں ان کی معاشرت کا عکس ہمیں رگ وید میں ملتا ہے۔ ۱۵۰۰ ق م کے قریب آریا دریاے گنگا کی وادی تک پہنچ چکے تھے۔ رامائن اور مہابھارت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ’’دور شجاعت‘‘ میں پنجاب کے

مختلف دریاؤں کے کنارے خود مختار آریا راجاؤں کی ریاستیں قائم تھیں۔ ان میں سے ایک بڑی ریاست گندھارا تھی، جس کا دارالحکومت تکشیلا (= ٹیکسلا) تھا اور یہ مغربی پنجاب، صوبۂ سرحد اور آزاد قبائل کے علاقے پر مشتمل تھی۔ فریدون پہلا ایرانی فرمانروا تھا جس نے تقریباً ۷۵۰ ق م میں ہندوستان پر حملہ کیا اور پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد روایات کی رو سے سائرس، افراسیاب اور دارا نے بھی اس علاقے پر فوج کشی کی۔ دارا کے زمانے میں لاہور، ملتان اور غالباً گجرات کے صوبے ایرانیوں کے زیرنگین تھے۔ یہاں کے راجا افریدوں کے زمانے ہی سے ایرانی بادشاہوں کو خراج دینے لگے تھے۔ انوشیرواں کے عہد میں بھی ہندوستان کے مختلف حکمران اس کی سیادت تسلیم کرتے تھے کیونکہ اس کا ایک لقب ایران و ہندوستان بھی تھا۔

داریوش اول (۵۲۱ تا ۴۸۵ ق م) نے کشمیر سے جنوب میں سمندر کے ساحل تک اور مشرق میں ستلج اور بیاس تک سارا علاقہ (موجودہ مغربی پاکستان) اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور اسے اپنے کتبے میں "ولایت ہند" کا نام دیا۔ سکندر یونانی نے جب ایران فتح کیا تو یہ علاقے دولت ایران سے الگ ہو کر خود مختار ریاستوں میں بٹ چکے تھے، جن میں سخت رقابت پائی جاتی تھی۔ سکندر کی فوج کشی کی خبر سنتے ہی ریاست تکشیلا (ٹیکسلا) نے اقرار اطاعت کے ساتھ امداد و تعاون کی پیشکش کی اور ۳۲۶ ق م میں یونانی فوجیں سندھ عبور کر کے پنجاب میں داخل ہو گئیں۔ جہلم کے پار راجا پورس کی ریاست تھی۔ اس نے مقابلے کی ٹھانی، لیکن اپنی کثیر فوج، جنگی ہاتھیوں اور ذاتی شجاعت کے باوجود شکست کھائی۔ سکندر نے اس کا علاقہ واگزاشت کر کے اسے اپنا حلیف بنا لیا۔ اگلے سال سکندر واپس چلا گیا تو اسکے ہندی مقبوضات میں شورشیں ہونے لگیں اور شمالی صوبے کا یونانی حاکم مارا گیا۔ ۳۲۳ ق م میں سکندر کی وفات کے بعد باختر (= بلخ) کی نیم یونانی ریاست مغربی پاکستان کے علاقے کی وراثت کی مدعی ہوئی؛ لیکن اس کے والی سلیوکس نے چندر گپت موریا سے شکست کھا کر یہ علاقہ اس کے حوالے کر دیا۔ چندر گپت کے پوتے اشوک (۲۷۲ تا ۲۳۶ ق م) نے بدھ مت قبول کر لیا اور اس کی بدولت پنجاب میں جگہ جگہ اس نئے مذہب کی عبادت گاہیں اور خانقاہیں تعمیر ہو گئیں۔ یوں پنجاب میں ایک نئی تہذیب نے جنم لیا، جس کا سب سے بڑا مرکز تکشیلا تھا۔ موریا خاندان کے زوال کے بعد باختر کے یونانی حکمرانوں نے کابل و قندھار فتح کرنے کے بعد مغربی پاکستان کا رخ کیا، مناندر (۱۵۰ ق م) نے تقریباً سارے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ یہاں سے دستیاب ہونے والے قدیم سکّوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری اور پہلی صدی قبل مسیح میں کئی نیم یونانی خود مختار ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔ ان کا خاتمہ یوچیوں نے کیا، جن کی ایک شاخ کشان نے پہلی صدی عیسوی میں ایک زبردست سلطنت قائم کی۔ اس میں ترکستان، افغانستان، مغربی پاکستان اور بنارس تک شمالی ہند کا علاقہ شامل تھا اور دارالحکومت پرش پور (= پشاور) تھا۔ ۱۲۲ء میں کنشک کی موت کے بعد یہ سلطنت کئی ریاستوں میں بٹ گئی اور چوتھی صدی عیسوی تک پنجاب اور کابل پر "شاہی" خاندان حکومت کرتا رہا۔ چھٹی صدی عیسوی میں پنجاب ہونوں اور ان کے حلیف گورجروں کی تاخت کا نشانہ بنا۔ راج ترنگنی سے پتا چلتا ہے کہ کشمیر کے راجا للتا دیتا نے آٹھویں صدی عیسوی میں پنجاب فتح

کر لیا۔ دسویں صدی میں شمالی پنجاب اور صوبۂ سرحد میں ایک مضبوط ریاست قائم ہو چکی تھی۔ اسی کے حکمرانوں کا مقابلہ سلاطین غزنی سے ہوا۔

عہد اسلامی : پنجاب میں مسلمانوں کے دور حکومت کا آغاز آٹھویں صدی کے اوائل ہی میں محمد بن قاسم [رک بآں] کی فوج کشی سے ہو گیا تھا، لیکن عربوں کی فتوحات مشرق میں ملتان اور شمال میں پنج ند سے آگے نہیں بڑھیں۔ پنجاب میں مسلمانوں کا داخلہ صحیح معنوں میں غزنویوں کے زمانے میں ہوا۔ ان دنوں ملتان میں قریشی امیروں کی ریاست قائم تھی جو مذھباً باطنی تھے۔

سبکتگین [رک بآں] کے حملے بھی پشاور سے آگے نہ بڑھے۔ ۳۸۰ھ / ۹۹۰ء میں شہر پشاور میں غزنی کی دو ہزار فوج متعیّن کی گئی اور یہاں پہلا مسلمان حاکم مقرر ہوا (سید ہاشمی : تاریخ مسلمان پاکستان و بھارت، ۱ : ۱۰۶)۔ ۳۹۲ھ/ ۱۰۰۱ء میں محمود غزنوی [رک بآں] نے پشاور میں جے پال کو شکست دے کر دریاے جہلم کے کنارے نندنہ (= نندونہ) کے مضبوط پہاڑی قلعے پر بھی قبضہ کر لیا اور یوں ”ملک پنجاب کی پہلی گھاٹی اس معرکے میں سر ہو گئی“ (کتاب مذکور، ۱ : ۱۱۸)۔ اس کے بعد محمود غزنوی کی فتوحات کبھی جنوب اور کبھی مشرق کی طرف بڑھتی گئیں۔ ان میں سومنات، نگر کوٹ (= کانگڑہ) اور قنوج کی کشور کشائیوں کو بڑی اھمیت حاصل ہے۔ بہر حال ۴۱۳ھ / ۱۰۲۲ء میں سلطان محمود نے پنجاب کا الحاق کر لیا اور لوھور (یا لہاوور = لاھور) میں ایاز کو اپنا نمائندہ (صوبہ دار) مقرر کیا۔ اس کے بعد غزنوی حکومت کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا اور جالندھر، جہلم، ملتان، سندھ، وغیرہ مختلف اضلاع قرار دیے گئے۔ پھر کشور کشائی کا یہ سلسلہ تھانیسر، میرٹھ اور بنارس تک جا پہنچا۔

اس زمانے میں لاھور مسلمانوں کا ایک اھم مرکز بن گیا۔ اس عہد میں فارسی کے بعض اھم شعرا غزنویوں کے ھندی مقبوضات میں ملتے ھیں، مثلاً مسعود سعد سلمان، نکتی لاھوری اور ابوالفرج رونی۔ شیخ اسمٰعیل، حضرت ھجویری (داتا گنج بخش) اور شیخ حسین زنجانی جیسے نامور عالم اور صوفی بزرگ کا تعلق بھی اسی زمانے سے ہے۔ اس دور میں پنجاب میں وارد ھونے والوں میں البیرونی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ علاوہ ازیں فرخی اور عنصری کے قصائد فتوحات ھند پر روشنی ڈالتے ھیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مسعود سعد سلمان نے اس زمانے میں جو تین دیوان مرتب کیے، ان میں ایک فارسی آمیز ھندی میں تھا، جسے اردو کا نقش اول سمجھا جا سکتا ہے۔ دارالحکومت غزنہ میں ھندی اور ھندو کثیر تعداد میں موجود تھے۔ یہ لوگ پنجاب سے محمودی افواج کے ھمراہ گئے تھے۔ ان میں تلک بن جے سین بھی تھا، جو فارسی سے خوب واقفیت رکھتا تھا۔ گویا سندھ کے بعد پنجاب اس باثروت مخلوط تمدّن کا پہلا گہوارہ تھا، جسے بعد میں ھم مسلم ھندی تمدّن کے نام سے تعبیر کرتے ھیں (دیکھیے محمود شیرانی : پنجاب میں اردو؛ سید عبداللہ : ادبیات فارسی میں ھندوؤں کا حصہ؛ شیخ محمد اکرام : موج کوثر)۔

۵۸۲ھ / ۱۱۸۶ء میں سلطان معزالدین بن سام (شہاب الدین محمد غوری) نے لاھور فتح کیا تو پنجاب کی حکومت غزنویوں کے ھاتھ سے نکل کر غوریوں کے قبضے میں آ گئی۔ ایبک (رک بآں) کی تخت نشینی (۶۰۲ھ / ۱۲۰۶ء) کے بعد اسلامی سلطنت کا مرکز دہلی میں منتقل ھو گیا، لیکن پنجاب اور سرحد کو اپنے حریفوں کی دست برد سے بچانے کے لیے سلطان کا قیام زیادہ تر لاھور ھی میں رھا اور یہیں اس نے وفات پائی (۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء)۔

اس زمانے میں پنجاب کے لاکھوں افراد نقل مکانی کر کے دہلی چلے گئے (پنجاب میں اردو، ص ۷۵، ۷۶) - ان میں پنجابی فوجیوں کی بھی بڑی تعداد تھی - ملتانی سوداگر بھی بکثرت دہلی میں منتقل ہو گئے - علاء الدین خلجی کے عہد میں ان کی ایک تعداد بڑے بڑے عہدوں پر بھی فائز نظر آتی ہے، مثلاً الپ خان امیر ملتانی، خواجہ حمید الدین ملک التجار ملتانی وغیرہ - ان میں مشاہیر علما کے نام بھی آتے ہیں (کتاب مذکور، ص ۷۸) - اسی طرح بعض مقامی شعرائے فارسی کا بھی پتا چلتا ہے، مثلاً التمش [رک باں] کے زمانے میں تاج الدین سنگریزہ.

شمسی غلاموں اور خلجیوں کے عہد میں سیاسی حالات کے تحت پنجاب کو بڑی سیاسی اہمیت نصیب ہوئی - اس کی ایک وجہ شمال سے مغول کے پے بہ پے حملے بھی تھے، جن کا مقابلہ کرنے کے لیے ان سلاطین کو لاہور، دیپال پور اور ملتان وغیرہ میں خاص استحکامات کرنا پڑتے تھے - ان حملوں میں لاہور اور ملتان مغول کی خاص زد میں رہے اور لاہور کو کئی بار سخت بربادی کا سامنا کرنا پڑا، اس لیے التمش نے اپنے فرزند رکن الدین فیروز شاہ کو اور ناصرالدین محمود نے مشہور جنگ آزما شیر خان کو لاہور کا اور بلبن نے اپنے شہزادے سلطان محمد شہید کو اور جلال الدین خلجی نے اپنے ولی عہد ارکلی خان کو لاہور اور ملتان کا صوبیدار بنایا - اس اقدام سے پنجاب کو سلطنت دہلی کے معاملات میں بڑا اثر و رسوخ حاصل ہوا اور خاندان غلاماں اور خاندان خلجی کے اکثر سلاطین اپنی آزمائش کے زمانے میں پنجاب ہی سے تقویت حاصل کرتے رہے - یہی صورت حال تغلقوں کے عہد میں پیش آئی اور مختلف سیاسی انقلابات میں دہلی کی سیاسیات میں پنجاب کی تائید حاصل کی گئی.

خاندان تغلق کے بانی غازی ملک کو پنجاب کے ساتھ گہرا تعلق ہے - اس کا باپ بلبن کا ترک غلام تھا اور ماں ایک مقامی راجا کی بیٹی تھی - اس کا تمام وقت پنجاب میں گزرا - والی دیپال پور کی حیثیت سے اس نے مغل حملہ آوروں کا بیس بار مقابلہ کیا اور انہیں شکست دی - جب خسرو ملک نے خلجی خاندان کے تمام افراد کو موت کے گھاٹ اتار کر تخت دہلی پر قبضہ کیا تو غازی ملک پنجابی لشکر کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھا اور خسرو کو ہلاک کرنے کے بعد عوام کی خواہش سے تخت نشین ہو گیا - پنجاب نے ایک مرتبہ اور سید خضرخان کی صورت میں حملہ کیا، جو ملتان کا حاکم تھا - اس نے ۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء میں دہلی پر قبضہ کیا - پنجاب کی اہمیت کا یہ سلسلہ لودھیوں کے زمانے میں بھی قائم رہا.

سلطنت دہلی کے اس دور میں پنجاب سے متعلق کئی مقتدر اشخاص، مشائخ اور مشاہیر اہل علم کے نام ملتے ہیں، مثلاً ملک عین الدین علیشہ کوہ جودی، ملک تاج الدین کہرامی؛ ملک نصیرالدین کہرامی؛ سامانہ سے سید عزیز، سید معین الدین، قاضی رکن الدین اور مولانا ضیاءالدین؛ لاہور سے مولانا علاءالدین؛ قصور سے مولانا سراج الدین اور مشائخ عظام میں شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی اور شیخ فرید الدین مسعود شکر گنج.

اکبر [رک باں] کی تخت نشینی کے وقت پنجاب سیاسی اعتبار سے دو حصوں میں منقسم تھا - ایک حصہ براہ راست مغلوں کی عملداری میں تھا، لیکن یہاں کی صورت حال بھی تسلی بخش نہ تھی؛ دوسرا حصہ زیادہ شمالی جانب تھا، جو خودمختار کوہستانی راجاؤں اور سرداروں کی چھوٹی بڑی ریاستوں میں منقسم تھا - ان میں کانگڑہ، جموں، کشمیر، مظفر آباد، راجوری، پونچھ، بھمبر اور کوٹلی

وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اکبر کے زمانے میں یہ علاقہ پوری طرح مغلیہ حکومت کے زیر نگین آ گیا۔ اس عہد میں پنجاب کے مختلف حصے دہلی، لاہور، ملتان اور کابل کے صوبوں میں شامل تھے۔ مغل عہد میں یہاں جو شورشیں ہوئیں انھیں آسانی سے دبا دیا گیا۔ اس خاندان کے شہنشاہ اکثر لاہور میں طویل عرصے تک قیام کرتے تھے، چنانچہ ان کے عہد میں دہلی کی طرح لاہور بھی ایک علمی و ثقافتی مرکز بنا رہا۔ دورِ مغلیہ کے دوسرے حصے میں بالخصوص یہاں علوم و فنون کو بڑی ترقی ہوئی اور اس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی شریک تھے۔ علوم اسلامی کے علاوہ فارسی شعر و انشا میں بھی پنجاب والوں کا بڑا حصہ نظر آتا ہے۔ عہد عالمگیر میں اور اس کے بعد ہریانہ کے علاقے میں اردو (ہریانوی) میں نظم و نثر کی بہت سی تصانیف وجود میں آئیں (ہریانوی ادب کے بارے میں دیکھیے پنجاب میں اردو اور مقالات شیرانی)۔ فارسی شعرا اور ادبا میں ابوالبرکات منیر لاہوری، ملا محمد صالح کنبوہ، ملا عبدالحمید لاہوری، عنایت اللہ کنبوہ، سعد اللہ چنیوٹی، چندر بھان برہمن، انند رام مخلص، وارستہ سیالکوٹی، غنیمت کنجاہی، محمد علی راسخ سیالکوٹی، واقف بٹالوی، آفرین لاہوری، عبدالحکیم حاکم لاہوری وغیرہ بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ مغلوں کے زمانے میں پنجاب میں علم و ادب کے کئی اہم مراکز نظر آتے ہیں۔ لاہور کے علاوہ سیالکوٹ، ملتان، بٹالہ، قصور، سوہدرہ، پسرور، جالندھر، امین آباد، گھڑتل وغیرہ بعض مصنفوں کے مولد و منشا ہونے کے اعتبار سے مشہور ہوئے۔ اس عہد کے بزرگ علمائے دین میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، شیخ احمدؒ سرہندی (حضرت مجدد الف ثانی)، ملا محمد یوسف، ملا جمال لاہوری اور محمد اکرم لاہوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

پنجاب میں عہدِ مغلیہ کا ایک نہایت اہم واقعہ سکھوں کا عروج [رک بہ سکھ] ہے۔ ابتدا میں یہ ایک صلح جو مذہبی فرقہ تھا، جس کی بنیاد گورونانک (۱۴۶۹ تا ۱۵۳۸ء) نے بھگتی تحریک کے زیر اثر رکھی تھی، لیکن رفتہ رفتہ یہ ایک جنگجو۔ اسی جماعت کی شکل اختیار کر گیا۔ مغل شہنشاہوں نے اس جماعت کے گوروؤں کو وقتاً فوقتاً جاگیروں اور انعامات سے نوازا، جس سے ان کی مالی حالت بڑی مستحکم ہو گئی، حتّٰی کہ جہانگیر کے عہد میں پانچویں گورو ارجن دیو نے فقیرانہ زندگی ترک کر کے امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے رہنا شروع کر دیا اور اپنی سپاہ بھرتی کر لی۔ سکھوں کی تعداد اور طاقت میں اضافہ ہوا تو وہ سیاست میں بھی دخل انداز ہونے لگے۔ لاہور کے ہندو دیوان چندو شاہ کی دشمنی کے باعث اگرچہ گورو ارجن کو شاہی عتاب کا نشانہ بننا پڑا، لیکن اس کے جانشین گورو ہرگوبند سے جہانگیر حسن سلوک سے پیش آیا اور شاہی سرپرستی سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنے پیرووں کو مسلح اور منظم کرنا شروع کر دیا۔ یہ سرپرستی شاہجہان کے عہد میں بھی جاری رہی اور یوں سکھ پنجاب کی ایک مؤثر اور مستحکم طاقت بن گئے۔ جنگ تخت نشینی کے دوران میں گورو ہر رائے نے دارا شکوہ کا ساتھ دیا، تاہم اورنگ زیب نے چشم پوشی سے کام لیا اور اس کے بیٹے رام رائے کو اپنے دربار میں جگہ دی۔ کچھ عرصے بعد جب گورو تیغ بہادر کو، جسے رام رائے کے بجائے نیا گورو چنا گیا تھا، حکم عدولی کی پاداش میں موت کی سزا دی گئی تو حکومت اور مسلمانوں کے خلاف سکھوں میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ گورو تیغ بہادر کے بیٹے گورو گوبند سنگھ نے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے کی ٹھانی اور سکھوں کی ایک مضبوط فوج تیار کر لی۔ اس کے بعد وہ

مشرقی پنجاب کی پہاڑیوں میں واقع چھوٹی چھوٹی ہندو ریاستوں میں تاخت و تاراج کرنے لگا۔ ناہن اور نالہ گڑھ کے راجاؤں نے شہنشاہ سے فریاد کی تو لاہور کے صوبیدار زبردست خان اور سرہند کے صوبیدار شمس الدین خان کو حکم ملا کہ اسے قرار واقعی سزا دی جائے۔ مالھووال کے مقام پر گوبند سنگھ کو شکست فاش ہوئی اور وہ فرار ہو گیا۔ مدت تک وہ ایک مقام سے دوسرے مقام میں چھپتا پھرا۔ آخر ایک منظوم عریضہ لکھ کر بادشاہ سے معافی کا خواستگار ہوا اور وعدہ کیا کہ آئندہ فقیرانہ طور پر زندگی بسر کرے گا۔ بادشاہ نے اس کی یہ درخواست قبول کر لی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد سکھوں کا پنجاب میں زور ہو گیا اور بندا بیراگی نے مسلح سکھوں کے جتھے منظم کر کے لوٹ مار شروع کر دی۔ پہلے اس نے لدھیانے سے کرنال تک تمام علاقہ مسلمانوں سے صاف کر دیا۔ ہزاروں مسلمان قتل ہوے، ان کے گھر بار لوٹ لیے گئے اور مسجدیں اور خانقاہیں مسمار کر دی گئیں۔ پھر اس نے لاہور کا رخ کیا۔ وہ شہر کو تو فتح نہ کر سکا لیکن اس نے قرب و جوار کے دیہات کو خوب لوٹا۔ بہادر شاہ اس وقت دکن میں تھا۔ یہ حالات سن کر وہ پنجاب کی طرف روانہ ہوا۔ سرہند میں شاہی فوج کے اجتماع کی خبر سن کر بندا لوہ گڑھ کے قلعے میں محصور ہو گیا۔ تین ماہ کے محاصرے کے بعد قلعہ فتح ہوا، لیکن بندا فرار ہو گیا۔ بہادر شاہ سکھوں کو ہمیشہ کے لیے کچل دینا چاہتا تھا، لیکن موت نے اسے مہلت نہ دی۔ اس کی وفات کے بعد سلطنت میں ابتری پھیلی تو بندا نے پھر سر اٹھایا اور قتل و غارت کا بازار گرم کرنے لگا۔ سرہند اور بٹالہ خاص طور پر اس کی سفاکی کا نشانہ بنے۔ اس وقت اس کی فوج پینتیس ہزار کے قریب تھی۔ آخر فرخ سیر کے عہد میں نواب عبدالصمد خان، صوبیدار لاہور نے اس کے خلاف فوج کشی کی اور اسے شکست پر شکست دی۔ انجام کار اس کی جمعیت منتشر ہو گئی اور وہ خود گرفتار ہو کر دہلی بھیجا گیا، جہاں اسے قتل کر دیا گیا۔ عبدالصمد خان اور اس کے بعد یحیی خان اور میر منو نے پنجاب میں سکھوں کے مقابلے میں اقدامات کیے اور وہ کچھ عرصے کے لیے سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔

سکھوں کا زمانہ: احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے پنجاب میں جو انتشار پھیلا اسے غنیمت جان کر پہاڑوں میں چھپے ہوے سکھ پھر نکل آئے۔ ۱۷۵۸ء میں انھوں نے جسا کلال کی زیر قیادت کثیر تعداد میں لاہور پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا، لیکن جلد ہی آدینہ بیگ [رک باں] مرہٹہ افواج کو لاہور پر چڑھا لایا اور سکھ شہر خالی کر گئے۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری جنگ نے مرہٹوں کی کمر توڑ دی اور وہ شمالی ہند سے نکل گئے۔ ابدالی واپس چلا گیا تو سکھوں نے پھر سر اٹھایا اور جا بجا قلعے بنا کر دوسری قوموں کا استیصال کرنے لگے۔ ۱۷۶۲ء میں انھیں کچلنے کے لیے ابدالی نے یلغار کی۔ لدھیانے کے قریب سخت جنگ ہوئی اور تقریباً بیس ہزار سکھ تہ تیغ ہوے۔ اس مقام کو سکھ گھلوگھارہ (= قتل عام کی جگہ) کہتے ہیں۔ بایں ہمہ ابدالی کے رخصت ہوتے ہی سکھوں نے مجتمع ہو کر لاہور میں اس کے ہندو صوبیدار کابلی مل کو نکال باہر کیا اور جہلم سے ہانسی تک کا علاقہ اس کے سرداروں نے باہم تقسیم کر لیا۔ ان سرداروں کے بارہ بڑے گروہ تھے، جنھیں مثلیں کہا جاتا ہے۔ ان میں سے سب سے طاقتور بھنگی مثل تھی، جو لاہور اور امرتسر سے جہلم تک کے علاقے پر متصرف تھی۔ اسی مثل میں رنجیت سنگھ پیدا ہوا۔ ۱۷۹۸ء میں شاہ زمان، والی کابل،

نے پنجاب پر حملہ کر کے لاہور فتح کر لیا، لیکن اگلے ہی سال اسے واپس جانا پڑا۔ واپسی کے وقت اس کی چند توپیں دریائے جہلم میں گر گئیں۔ رنجیت سنگھ نے انھیں دریا سے نکلوا کر شاہ زمان کی خدمت میں پیش کیا اور اس سے لاہور کی حکومت کا پروانہ حاصل کر لیا اور یوں ایک مسلمان بادشاہ کی عنایت سے پنجاب میں سکھوں کی باقاعدہ سلطنت قائم ہو گئی۔

لاہور پر قابض ہونے کے بعد رنجیت سنگھ نے پاؤں پھیلائے اور تمام حریف سرداروں کو یکے بعد دیگرے مغلوب کرتے ہوئے کانگڑے سے ملتان تک کے علاقے پر مسلط ہو گیا اور ستلج کے جنوب میں بھی دھاوے کرنے لگا۔ ۱۸۰۹ء میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان عہدنامۂ امرتسر طے ہوا، جس کی رو سے رنجیت سنگھ نے دریائے ستلج کو اپنی سرحد تسلیم کر لیا۔ ۱۸۱۳ء اور ۱۸۲۰ء کے درمیان اٹک، پشاور، ہزارہ، کشمیر اور ڈیرہ جات بھی اس کی قلمرو میں شامل ہو گئے۔ اسی زمانے میں ہندوستانی مسلمان مجاہدین سندھ کے راستے سے سرحد میں پہنچے اور سید احمد شہیدؒ کے زیر سرکردگی سکھوں سے ٹکرا گئے۔ اس جہاد نے سکھ حکومت کی بنیادیں متزلزل کر دیں اور سندھ سے مغرب میں تمام علاقہ آزاد ہو گیا، لیکن ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء میں بعض خوانین کی سازش سے مجاہدین کی تنظیم درہم برہم ہو گئی اور حضرت سید احمدؒ اور مولانا شاہ اسمٰعیلؒ کی شہادت کے بعد خیبر تک دوبارہ سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔

۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد پنجاب میں لاقانونیت اور بدنظمی کا دور شروع ہو گیا اور انگریزوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔ ۱۸۴۵ء میں انھوں نے پنجاب پر چڑھائی کر کے سکھوں کو شکست پر شکست دی اور صلح پر مجبور کر دیا۔ عہد نامۂ لاہور کی رو سے جالندھر دوآب کا علاقہ انگریزوں کے سپرد ہوا اور تاوان جنگ ادا کرنے کے لیے سکھ حکومت نے جموں اور کشمیر کا صوبہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ چند روز بعد سکھوں کے دل میں جوش انتقام ابھرا۔ سکھ دربار میں جو انگریز مشیر مقرر ہوا تھا اس کی دخل اندازیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا، چنانچہ جگہ جگہ بغاوت برپا ہو گئی اور ۱۸۴۸ء میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ چیلیانوالہ اور گجرات کی لڑائیوں نے پنجاب کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور ۲ اپریل ۱۸۴۹ء کو انگریزوں نے پنجاب کا اپنی حکومت کے ساتھ الحاق کر لیا۔

رنجیت سنگھ اور دوسرے سکھ حکمرانوں کی داخلی حکمت عملی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اصول و قواعد سے بے نیاز تھی۔ ان کا کوئی آئین تھا نہ قانون۔ حکمران مطلق العنان تھے اور عدلیہ و انتظامیہ کے جملہ امور ان کے اشارۂ ابرو پر منحصر تھے۔ ان کے عہد میں مسلمان خاص طور پر ان کے ظلم و تشدد کا شکار ہوئے۔ ان کی تاریخی یادگاروں، دینی مدرسوں، عبادت گاہوں اور مقبروں کو سخت نقصان پہنچا اور ان کی دینی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی زندگی بری طرح متاثر ہوئی۔ قانون اور عدل و انصاف کے فقدان اور سکھ گردی کے باعث پنجاب میں مسلمان برابر خوف و ہراس کا شکار رہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں کے مسلمانوں کی زندگی میں ابتری پھیل گئی۔

برطانوی عہد: ابتداءً نئے مفتوحہ علاقے ایک مجلس نظم و نسق (Bord of Administration) کے ماتحت رکھے گئے۔ ۱۸۵۳ء میں اسے توڑ کر اس کے اختیارات اور فرائض ایک چیف کمشنر کو تفویض ہوئے۔ ۱۸۵۹ء میں صوبۂ شمال مغربی سے دہلی کی منتقلی کے بعد، پنجاب اور ملحقہ اضلاع ایک لفٹننٹ گورنر کا صوبہ بنا دیے گئے۔

پنجاب کے الحاق نے برطانوی علاقے کو دریاے سندھ کے پار تک بڑھا دیا اور حکومتِ ہند کا شمال مغربی سرحد کے پٹھان قبائل اور امیر افغانستان [رک بآن] سے قریبی واسطہ پیدا ہو گیا۔ یہ سرحد اتنی لمبی اور ایسی کوہستانی تھی کہ اس کی محافظت تنہا فوج سے نہ ہو سکتی تھی، بلکہ اس کا مدار بہت کچھ قبائل کو سیاسی قابو میں رکھنے پر تھا۔ ابتداءً وہاں کوئی خاص ایجنسی قبائلی علاقوں سے معاملہ کرنے کے لیے نہ تھی اور اہل قبیلہ سے تعلقات رکھنے کا کام اضلاع ہزارہ، پشاور، کوہاٹ، بنوں، ڈیرہ اسمٰعیل خان اور ڈیرہ غازی خان کے ڈپٹی کمشنر انجام دیتے تھے۔ ۱۸۷۶ء میں تین شمالی اضلاع سے پشاور کی کمشنری اور تین جنوبی اضلاع سے ڈیرہ جات کی کمشنری بنی۔ اس کے بعد پولیٹیکل ایجنسیوں کا نظام قائم ہوا اور یہ ایجنسیاں پنجاب گورنمنٹ کے تحت رہیں۔ ۱۹۰۱ء میں شمال مغربی سرحد کا الگ صوبہ بن گیا۔ پنجاب کی حدود ۱۹۱۱ء میں پھر متعین ہوئیں جب کہ دہلی ایک علیحدہ صوبہ ہو گیا۔ ۱۹۲۱ء میں پنجاب کو گورنری صوبے کے درجے پر ترقی دی گئی۔

نظم و نسق کے لحاظ سے یہ صوبہ دو حصوں میں منقسم تھا: برطانوی قلمرو اور دیسی ریاستیں۔ برطانوی علاقے کا رقبہ ۹۹۲۶۵ مربع میل تھا اور ریاستوں کا ۳۶۷۹۹ مربع میل۔ دجانہ، پٹودی، کلسیہ اور شملہ پہاڑی کی ستائیس ریاستوں میں سیاسی امور کی انجام دہی پنجاب کی گورنمنٹ کرتی تھی: بقیہ ریاستیں لوہارو، سرمور، بلاسپور، منڈی، سکیت، کپورتھلہ، مالیر کوٹلہ، فرید کوٹ، چمبہ، بہاولپور اور پھلکیاں ریاستیں (یعنی پٹیالہ، [illegible] اور نابھہ) براہ راست سرکار ہند کے ماتحت تھیں۔

۱۸۴۹ء میں سکھ حکومت کا خاتمہ ہوا تو پنجاب کے مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ سکھوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ انھیں اذان دینے اور باجماعت نماز ادا کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی اور ان کی مسجدیں اصطبل اور بارود خانے بن چکی تھیں، تاہم انگریزی عملداری قائم ہونے کے بعد بھی عرصے تک مسلمانوں کی حالت نہ سدھر سکی۔ قبائلی علاقوں میں مجاہدین کی سرگرمیوں کے باعث انگریز ان سے سخت بدگمان تھے، چنانچہ مدت تک ان پر سرکاری ملازمت کے دروازے بند رہے۔ تعلیم و تدریس کے میدان سے بھی انھیں بے دخل کر دیا گیا۔ تجارت اور صنعت پہلے ہی سے ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ زراعت پیشہ مسلمانوں کا بال بال ہندو مہاجنوں کے قرض میں بندھا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثریت میں ہونے کے باوجود وہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی اپنی آواز بلند نہ کر سکتے تھے۔ ۱۸۹۸ء میں پنجاب میں مجلس قانون ساز قائم ہوئی تو اس میں مسلمانوں کو بہت کم نمائندگی دی گئی۔ ۱۹۰۹ء میں جداگانہ انتخابات کا طریق رائج ہوا۔ تو بھی کچھ زیادہ فرق نہ پڑا کیونکہ خالص مسلمان نشستیں اقلیت میں تھیں اور کسی ہندو یا مخلوط حلقے سے کسی مسلمان کا منتخب ہونا نا ممکن تھا۔ دراصل ہندوؤں اور سکھوں کا مسلمانوں کے خلاف ایک خاموش سمجھوتا ہو چکا تھا، جس کی رُو سے وہ کسی نمائندہ ادارے میں مسلمانوں کی اکثریت قائم نہیں ہونے دیتے تھے۔

۱۹۱۳ء میں سر مائیکل اوڈوائر کا تقرر بطور لفٹننٹ گورنر ہوا۔ وہ مقامی باشندوں کو آئینی اصلاحات دینے کا سخت مخالف تھا۔ اپنے شش سالہ دور میں اس نے کسی قومی اور سیاسی تحریک کو سر نہ اٹھانے دیا۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے پنجاب کی دیہاتی آبادی کی کثرت اور جہالت سے فائدہ

اٹھا کر اسے نہ صرف شہری آبادی کا حریف بنانے کی کوشش کی بلکہ ''ہوم رول'' کی تحریک چلی تو اس نے جاگیرداروں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا اور ان سے بار بار یہ اعلان کرایا کہ پنجاب بالکل مطمئن اور خوشحال ہے اور اسے شورش پسند شہری سیاستدانوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ دیہاتی اور شہری باشندوں میں اس نے تفرقے کا جو بیج بویا تھا وہ آگے چل کر خوب رنگ لایا اور پنجابی مسلمانوں نے متحد و منظم ہونے کے بجائے اپنی برادریوں کی تنظیمیں قائم کر لیں۔ یہ جماعت بندی آج تک پنجاب کی معاشرتی زندگی کو متاثر کر رہی ہے۔

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ غیر معمولی حالات سے فائدہ اٹھا کر اوڈوائر نے قانون تحفظ ہند کی آڑ میں رائے عامہ کو بری طرح کچلا۔ فوجی بھرتی میں پنجاب کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ ۱۹۱۸ء تک تقریباً سات لاکھ جوان فوج میں بھرتی ہوئے! ان میں پنجابیوں کی تعداد تین لاکھ چالیس ہزار تھی۔ بھرتی کے لیے حکومت نے جو جابرانہ اور متشددانہ طرز عمل اختیار کیا اس کے باعث جابجا فساد برپا ہوئے، جنھیں بڑی سختی سے کچلا گیا۔ اتحادیوں کے خلاف جنگ میں ترکیہ کے شریک ہو جانے سے مسلمان خاص طور پر جبر و تشدد کا نشانہ بنے۔ ان کے اخبار ضبط ہوئے اور رہنما جیل میں ڈال دیے گئے۔

۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ کے ماتحت کانگرس اور مسلم لیگ میں سیاسی اصلاحات کے بارے میں سمجھوتا ہو گیا۔ اس سے پنجاب کے مسلمان یوں متاثر ہوئے کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو مزید تحفظات دینے کی خاطر انھیں اسمبلی میں اپنی ۵۵ فی صد اکثریت سے دستبردار ہو کر ۵۰ فی صد پر قناعت کرنا پڑی۔ ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہو گئی اور اسی سال ہندوستانی ارکان کی مخالفت کے باوجود ہندوستان کی مجلس قانون ساز نے رولٹ ایکٹ منظور کر لیا، جس کے خلاف عوام میں اتنا جوش اور ہیجان برپا ہوا کہ ۱۹۱۹ء میں جب برطانوی پارلیمنٹ میں مانٹگو چیمسفورڈ تجاویز کی بنیاد پر جدید آئینی اصلاحات کا قانون منظور ہوا تو مقتدر سیاسی جماعتوں نے انھیں مسترد کر دیا۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی نے ستیا گرہ کا اعلان کر دیا۔ اسی سلسلے میں ۱۳ اپریل کو امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا خونیں سانحہ پیش آیا۔ نہتے شہریوں پر فوج کی بے تحاشا فائرنگ کے بعد پنجاب کے متعدد اضلاع میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا اور عوام پر ایسے مظالم ڈھائے گئے جن کی مثال ۱۸۵۷ء کے بعد دیکھنے میں نہ آئی تھی۔

۱۹۱۹ء کے آخر میں امرتسر ہی کے مقام پر کانگرس اور لیگ دونوں کے اجلاس منعقد ہوئے اور ہندو مسلم اتحاد کی بے نظیر فضا قائم ہو گئی۔ اسی جلسے میں خلافت کے حفظ و بقا کے لیے خلافت کمیٹی قائم کی گئی۔ آئندہ دو تین سال تک پنجاب میں تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت کا بڑا زور رہا اور ان میں ہندو مسلمان مل کر حصہ لیتے رہے، لیکن ان تحریکوں کی ناکامی کے بعد ہندو مسلم منافرت کی آگ، جو عارضی طور پر دب گئی تھی، بہت تیزی سے بھڑک اٹھی اور جا بجا فرقہ دار فسادات ہونے لگے۔ اس ضمن میں شردھانند نے شدھی کی اور پنڈت مالویہ نے سنگھٹن کی تحریکیں جاری کر دیں۔ رہی سہی کسر آل انڈیا ہندو مہاسبھا کے قیام سے پوری ہو گئی۔ پنجابی ہندوؤں نے، جو آریا سماج سے بہت متاثر تھے، ان تحریکوں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ اس سے دونوں قوموں میں نفرت اور عداوت کی خلیج گہری ہوتی گئی۔ ۱۹۲۰ء میں

سکھوں نے اپنی جداگانہ قومی حیثیت منوانے کا مطالبہ پیش کیا اور اپنے لیے مبالغہ آمیز رعایتیں طلب کیں ۔ ہندوؤں نے ان کی پوری تائید کی اور اسطرح مسلمانوں کے خلاف ہندو سکھ متحدہ محاذ قائم ہو گیا، جس نے مسلمانوں کے ہر جائز مطالبے کی ہمیشہ مخالفت کی۔

۱۹۲۱ء میں جدید اصلاحات کے تحت نئی اسمبلی قائم ہوئی تو اس کے بیشتر ارکان دیہاتی حلقوں سے منتخب ہو کر آئے ۔ ان میں سے اکثر سیاسی اور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ، انگریزی اقتدار کے حامی اور شہری آبادی سے خائف اور متنفر تھے ۔ مسلمانوں کی طرف سے میاں فضل حسین کو وزیر نامزد کیا گیا ۔ انھوں نے سرکاری ملازمتوں اور سرکاری کالجوں میں مسلمانوں کے تقرر اور داخلے کا تناسب مقرر کرایا، جس سے ہندو ان کے سخت مخالف ہو گئے ۔ ۱۹۲۳ء میں دوسری لیجسلیٹو کونسل کا انتخاب ہوا تو اس میں سیاسی جماعتوں نے بھی حصہ لیا ۔ میاں فضل حسین دوبارہ وزیر مقرر ہو گئے ۔ ہندوؤں نے جو زیادہ‌تر غیر زراعت پیشہ تھے، ایک طاقتور حزب اختلاف قائم کر لی ۔ میاں فضل حسین نے تیس دیہاتی مسلمان ارکان اور چودھری لال چند (بعد ازاں چودھری چھوٹو رام) کے چھے زراعت پیشہ ہندو رفقا پر مشتمل نیشنل یونینسٹ پارٹی قائم کر لی، جو ۱۹۴۷ء تک صوبے میں بر سر اقتدار رہی۔

یونینسٹ پارٹی نے میاں سر فضل حسین اور اس کے بعد سر سکندر حیات کے زیر قیادت مسلمانوں، بالخصوص دیہاتی مسلمانوں، کے حقوق کے تحفظ کے لیے قابل قدر کام کیا، لیکن اس جماعت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ پنجابی مسلمان کسی عوامی تحریک میں حصہ نہ لیں اور حکومت سے کسی صورت متصادم نہ ہونے پائیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی دیہاتی آبادی سیاسی تحریکوں میں سرگرم تھی، پنجاب میں زیادہ‌تر شہری عوام ہی نے ان میں حصہ لیا ۔ اس دوران میں اگر کوئی عوامی تحریک اٹھی تو اسے سختی سے کچل دیا گیا (مسجد شہید گنج کا مسئلہ، خاکسار تحریک، وغیرہ)۔

پنجاب میں ہندوؤں کے برعکس شہری اور دیہاتی مسلمانوں کے مفاد میں کوئی تصادم نہ تھا، لہٰذا شہری حلقوں کے اکثر نمائندے بھی یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے ۔ ۱۹۳۵ء کے بعد جب قائداعظم کی کوششوں سے مسلم لیگ کا احیا ہوا تو پنجاب اسمبلی میں باقاعدہ مسلم لیگ پارٹی قائم نہ ہو سکی ۔ انفرادی طور پر بیشتر مسلمان ارکان مسلم لیگ کے رکن تھے، لیکن اسمبلی کے اندر ان کی وفاداری کا مرکز یونینسٹ پارٹی ہی رہی ۔ سر سکندر حیات نے اپنے دور وزارت میں دونوں جماعتوں کے درمیان تصادم کا موقع پیدا نہ ہونے دیا اور وہ کل ہند مسائل میں قائد اعظم کی پیروی کرتے رہے۔

اسی زمانے میں پنجاب کو یہ فخر حاصل ہوا کہ اس کے دارالحکومت لاہور میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔

۱۹۴۲ء میں سر سکندر حیات کی وفات کے بعد سر خضر حیات ٹوانہ پنجاب کے وزیر اعظم بنے تو یہ صورت حال برقرار نہ رہ سکی ۔ اس وقت سیاسی حالات کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستان کے تمام مسلمان ایک پلیٹ فارم پر مجتمع ہو کر حصول پاکستان کی تحریک متحد اور منظم ہو کر چلائیں ۔ سر خضر حیات نے اس سلسلے میں صوبائی مفادات کی آڑ لی اور قائداعظم کی ہدایت کے باوجود اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم کرنے سے انکار کر دیا، چنانچہ انہیں اور ان کے رفقا کو جماعت سے خارج

کر دیا گیا اور پنجاب میں یونینسٹ حکومت ختم کر کے مسلم لیگی وزارت قائم کرنے کی مہم شروع ہو گئی۔

۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ اسے پنجاب سے مرکزی اسمبلی کی سو فی صد مسلمان نشستیں اور صوبائی اسمبلی کی چھیاسی میں سے پچھتر مسلمان نشستیں ملیں۔ بعد ازاں چار اور ارکان بھی اس میں شریک ہو گئے۔ اس کے باوجود اسے وزارت بنانے کی دعوت نہ دی گئی اور گورنر کے ایما سے سر خضر حیات کے زیر قیادت یونینسٹ۔ کانگرس۔ اکالی مخلوط وزارت قائم ہو گئی، جو عملاً غیر مسلم تھی۔ مسلم لیگ نے پنجاب میں دوبارہ انتخابات کا مطالبہ کیا اور جب صوبائی حکومت نے جبر و تشدد سے کام لیا تو سول نافرمانی کا آغاز کر دیا۔ یہ تحریک ایک ماہ سے زیادہ عرصے تک بڑی کامیابی سے پورے صوبے میں چلائی گئی اور بالآخر ۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو سر خضر حیات نے اپنی وزارت کا استعفا پیش کر دیا۔ مسلم لیگ پارٹی کے قائد خان ممدوٹ نے غیر مسلم ارکان اسمبلی سے تعاون کی درخواست کی، جس کے جواب میں ماسٹر تارا سنگھ نے اسمبلی ہال کے باہر تلوار لہرا کر گویا مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اسی دن پورے صوبے میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر جگہ خونریز بلوے ہونے لگے۔ گورنر نے مسلم لیگ کو وزارت کی دعوت دینے کے بجائے ''گورنری راج'' کا اعلان کر دیا۔ قیام پاکستان تک یہی صورت حال قائم رہی (مزید تفصیلات کے لیے رک بہ پاکستان)۔

آزادی کے بعد: (۱) پاکستانی پنجاب: قیام پاکستان کے بعد اس صوبے میں پیش آنے والے اہم واقعات کا ذکر مقالۂ پاکستان میں آ چکا ہے۔ یہاں اس صوبے کے گورنروں اور وزرائے اعلیٰ کے نام دیے جاتے ہیں:۔

(الف) گورنر: (۱) سر فرانسس موڈی (۱۹۴۷ تا ۱۹۴۹ء)، جن کے آخری ایام میں گورنری راج نافذ رہا؛ (۲) سردار عبدالرب نشتر (۱۹۴۹ تا ۱۹۵۱ء)؛ (۳) مسٹر اسمعیل چندریگر (۱۹۵۱ تا ۱۹۵۳ء)؛ (۴) میاں امین الدین (۱۹۵۳ تا ۱۹۵۴ء)؛ (۵) مسٹر حبیب ابراہیم رحمت اللہ (۱۹۵۴ء)؛ (۶) میاں مشتاق احمد گورمانی (۱۹۵۴ تا ۱۹۵۵ء)، پھر وحدت مغربی پاکستان کی تشکیل کے بعد ۱۹۵۷ء تک صوبۂ مغربی پاکستان کے گورنر رہے؛ (۷) مسٹر اختر حسین (۱۹۵۷ تا ۱۹۵۹ء)، انہیں کے عہد میں ایوب خان کی فوجی حکومت قائم ہوئی؛ (۸) نواب امیر محمد خان آف کالا باغ (۱۹۵۹ تا ۱۹۶۶ء)؛ (۹) جنرل محمد موسیٰ (۱۹۶۶ء تا ۱۹۶۹ء)؛ (۱۰) ایر مارشل نور خان (۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۰ء)؛ (۱۱) لفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمن (۱۹۷۰ء) اور جب یکم جولائی ۱۹۷۰ء کو وحدت مغربی پاکستان ٹوٹ گئی تو صوبۂ پنجاب کے گورنر لفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمن مقرر ہوئے۔

(ب) وزرائے اعلیٰ: (۱) خان افتخار حسین خان ممدوٹ (۱۹۴۷ تا ۱۹۴۹ء)؛ (۲) میاں ممتاز محمد خان دولتانہ (۱۹۵۱ تا ۱۹۵۳ء)؛ (۳) ملک فیروز خان نون (۱۹۵۳ تا ۱۹۵۵ء)؛ (۴) عبدالحمید خان دستی (۱۹۵۵ء)۔ اسی سال صوبۂ مغربی پاکستان کی تشکیل ہوئی اور (۵) ڈاکٹر خان صاحب کو اس کا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا (۱۹۵۵ تا ۱۹۵۷ء)۔ اس طرح صوبے میں مسلم لیگ کے بجائے ری پبلکن پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی۔ ۱۹۵۷ء میں ری پبلکن پارٹی کو اکثریت حاصل نہ رہی تو گورنری راج نافذ ہو گیا، لیکن دو ماہ بعد پھر یہی جماعت بر سر اقتدار آ گئی اور (۶) سردار عبدالرشید اور ان کے بعد (۷) نواب مظفر علی قزلباش وزیر اعلیٰ مقرر

ہوئے۔ فوجی حکومت (۱۹۵۸ء) کے بعد وزیر اعلیٰ کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔

صوبۂ پنجاب کی مختلف قسمتوں کا رقبہ اور ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رو سے اس کی آبادی حسب ذیل ہے:-

قسمت	رقبہ (مربع میل)	آبادی
راولپنڈی	۱۱۲۰۶	۳۹۷۹۱۳۹
سرگودھا	۱۷۰۹۵	۵۹۷۶۹۳۹
لاہور	۸۹۰۷	۶۴۳۸۵۷۵
ملتان	۲۳۸۲۶	۶۶۰۲۹۴۳
بہاول پور	۱۷۵۰۸	۲۵۷۳۰۶۶
میزان	۷۹۵۳۲	۲۵۵۱۱۶۴۳

مہاجر آبادی کا تناسب ۲۵ سے ۲۰ فی صد ہے۔ عام زبان پنجابی ہے (جس میں پوٹھوھاری اور سرائیکی بھی شامل ہے)، لیکن اردو پورے صوبے میں سمجھی اور لکھی جاتی ہے اور یہی عام اجتماعی امور کے علاوہ خط و کتابت اور کاروبار کی زبان ہے۔

پنجاب کا صوبہ پاکستان کے لیے قلب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر ملک کی اقتصادی ترقی اور عسکری برتری کا بہت کچھ دارومدار ہے۔ یہاں کے لوگ طاقتور، بہادر اور اپنی عسکری روایات کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اس کا بیشتر حصہ میدانی ہے۔ شمال مغربی گوشے میں پوٹھوھار کی سطح مرتفع ہے، جس کی جنوبی حد پر کوھستان نمک واقع ہے۔ جنوب مغربی سرحد پر کوہ سلیمان کا سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے۔ یہ پہاڑ بالکل خشک اور بنجر ہیں۔ کوھستان کے جنوب میں سارا علاقہ میدانی ہے۔ اس میں دریائے سندھ اور اس کے معاونین ستلج، راوی، چناب اور جہلم بہتے ہیں۔ شمال مشرقی حصہ چھے سو سے ایک ہزار فٹ کے درمیان بلند ہے، لیکن لائلپور سے جنوب مغرب کی طرف اس کی اونچائی چھے سو فٹ سے کم ہے۔ یہ میدان دریاؤں کی لائی ہوئی مٹی سے بنا ہے اور عام طور پر زرخیز اور ہموار ہے۔ دریاؤں اور نہروں کے کناروں کے علاوہ کوئی اونچی زمین مشکل سے نظر آتی ہے، البتہ کہیں کہیں (مثلاً سانگلا ھل اور چنیوٹ کے قریب) پرانی چٹانوں کی چھوٹی چھوٹی اور کم بلند پہاڑیاں ملتی ہیں، جو بالکل خشک ہیں۔

یہ میدان کئی دوآبوں میں منقسم ہے، جن کی تفصیل مقالے کی ابتدا میں دی جا چکی ہے۔ سندھ ساگر دوآب کا بڑا حصہ ریگستان ہے، جسے تھل کہتے ہیں۔ سندھ پار کا علاقہ ڈیرہ جات کہلاتا ہے۔ جنوبی حصہ پہلے بنجر یا ریگستان تھا اور آبادی بھی بہت کم تھی، لیکن موجودہ صدی میں نہری آب پاشی نے اسے سرسبز اور شاداب بنا دیا ہے اور یہاں بہت سی نئی بستیاں اور شہر آباد ہو گئے ہیں۔ تھل کے ریگستان کو بھی اب نہروں اور ٹل دار کنوؤں کے ذریعے زیر کاشت لایا جا رہا ہے۔

آب و ہوا سخت گرم، سخت سرد اور خشک ہے۔ جون میں درجۂ حرارت ۱۱۰ اور ۱۲۰ درجے فارن ھائیٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ دن میں گرم لو چلتی ہے، جس کی تپش سے گھاس تک جھلس جاتی ہے۔ جنوب مغرب میں ملتان اور تھل میں لیّہ کے آس پاس کا علاقہ خاص طور پر گرم رہتا ہے۔ موسم سرما میں خوب سردی ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ سردی پوٹھوھار اور اس کے آس پاس کے پہاڑی علاقے میں پڑتی ہے۔ شمال مشرقی کوھستانی علاقے کو چھوڑ کر بارش کی عام طور پر قلت رہتی ہے۔ کوہ ھمالیہ کی تلہٹی میں اس کا سالانہ اوسط ۲۰ سے ۳۰ انچ تک ہے، لیکن جنوب مغرب میں ۱۰ انچ سے بھی کم

ہے ۔ بارش زیادہ تر موسم گرما کے آخر میں جولائی سے ستمبر تک کے مہینوں میں مون سون ہواؤں سے ہوتی ہے ۔ کچھ بارش موسم سرما میں مغربی طوفانوں سے بھی ہو جاتی ہے ۔

بحیثیت مجموعی پنجاب کا صوبہ ملک کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقہ سمجھا جاتا ہے ۔ پاکستان کے قیام کے بعد زرعی، صنعتی، تجارتی اور دوسرے میدانوں میں جو ترقی ہوئی ہے اس کی تفصیل مقالۂ پاکستان میں آ چکی ہے ۔ لاہور، سیالکوٹ، ساہیوال، لائل پور، ملتان، بہاولپور، گوجرانوالہ، گجرات، سرگودھا، جہلم، راولپنڈی اس صوبے کے اہم شہر ہیں ۔ راولپنڈی میں مری اور اس کے مضافات ملک کے بہترین صحت افزا پہاڑی مقامات میں شمار ہوتے ہیں ۔ پاکستان کا دارالحکومت اسلام آباد بھی راولپنڈی کے قریب واقع ہے ۔ مزید معلومات کے لیے رک بہ پاکستان.

(۲) بھارتی پنجاب: حصول آزادی کے بعد سابقہ صوبۂ پنجاب کا مشرقی حصہ ریڈ کلف ایوارڈ کے تحت بھارت کے حوالے کر دیا گیا تھا، جس پر مشتمل صوبۂ مشرقی پنجاب وجود میں آیا ۔ بعد ازآں اس کا نام پنجاب رکھ دیا گیا ۔ ۱۹۴۸ء میں یہاں کی پہاڑی ریاستوں پر مشتمل ہماچل پردیش کا علیحدہ صوبہ تشکیل دیا گیا اور مہاسو، سرسور، منڈی، چمبہ، بلاس پور اور کنور اس کے اضلاع بنائے گئے ۔ ۱۹۵۶ء میں مشرقی پنجاب کی ریاستوں کی یونین (PEPSU) پنجاب میں مدغم کر دی گئی ۔ ۱۹۶۶ء میں اس صوبے کی تقسیم لسانی بنیادوں پر عمل میں آئی: (ا) پنجاب: جہاں پنجابی بولی جاتی ہے ۔ یہ اضلاع گورداسپور، امرتسر، کپورتھلہ، جالندھر، فیروزپور، بٹھنڈا، پٹیالہ اور لدھیانہ کے علاوہ اضلاع سنگرور، ہوشیارپور اور انبالے کی تحصیل کھرڑ کے کچھ حصوں پر مشتمل ہے ۔ اس کا رقبہ ۳۷۲۰۵ مربع میل اور آبادی ۲۰۳۵۶۸۱۲ (۱۹۶۱ء) ہے؛ (ب) ہریانہ، جہاں ہندی بولی جاتی ہے ۔ یہ اضلاع حصار، مہندرگڑھ، گوڑگاؤں، رہتک اور کرنال کے علاوہ اضلاع سنگرور اور انبالہ کی تحصیل کھرڑ کے کچھ حصوں پر مشتمل ہے ۔ اس کا رقبہ ۱۷۶۰۰ مربع میل اور آبادی تقریباً ستر لاکھ (۱۹۶۶ء) ہے ۔ پنجاب اور ہریانہ دونوں صوبوں کا دارالحکومت چنڈی گڑھ ہے؛ (ج) ہماچل پردیش: اسی تقسیم کے ذریعے سابقہ پنجاب کے اضلاع شملہ، کلو، کانگڑہ، لہاؤل Lahaul اور سپیتی Spiti کے علاوہ اضلاع ہوشیار پور و انبالہ کے کچھ حصے بھی ہماچل پردیش میں شامل کر دیے گئے ۔ اس صوبے کا دارالحکومت شملہ ہے، جو پنجاب میں واقع ہے ۔ اس کا رقبہ ۱۰۸۸۵ مربع میل ہے اور آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رو سے ۱۳۵۱۱۴۴ تھی ۔ مزید تفصیلات کے لیے رک بہ ہندوستان.

مآخذ: (۱) ابن حوقل: صورة الارض، لائڈن ۱۹۳۸ء؛ (۲) ابن خرداذبہ: المسالک و الممالک، لائڈن ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء؛ (۳) الاصطخری: المسالک و الممالک، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۴) ابن بطوطہ: عجائب الاسفار، پیرس ۱۸۵۳-۱۸۵۸ء و اردو ترجمہ از محمد حسین (سفر نامہ ابن بطوطہ)، کراچی ۱۹۶۱ء؛ (۵) البیرونی: کتاب الہند، اردو ترجمہ از اصغر علی، مطبوعۂ انجمن ترقی اردو ۱۹۴۱ء؛ (۶) تاریخ بیہقی، طبع سعید نفیسی، تہران ۱۳۳۲ھ ش؛ (۷) طبقات ناصری، طبع عبدالحی حبیبی، کوئٹہ ۱۹۴۹-۱۹۵۳ء؛ (۸) عوفی: لباب الالباب، لائڈن ۱۹۰۶ء؛ (۹) برنی: تاریخ فیروز شاہی، طبع سید احمد خان، ۱۸۶۲ء؛ (۱۰) جوینی: تاریخ جہانگشای، لائڈن ۱۹۱۶ء؛ (۱۱) بداؤنی: منتخب التواریخ، کلکتہ ۱۸۶۵ء؛ (۱۲) انشاے ابو الفضل، مطبع نولکشور؛ (۱۳) ابو الفضل: آئین اکبری، انگریزی ترجمہ از بلاخمن و جیرٹ، مطبوعۂ

کلکتہ و اردو ترجمہ از فدا علی خان، جامعۂ عثمانیہ، حیدر آباد (دکن) ۱۹۳۹ء؛ (۱۴) انتظام اللہ شہابی : تاریخ ملت، ج ۱۰ و ۱۱، دہلی ۱۹۵۵ء؛ (۱۵) کنہیا لال : تاریخ پنجاب، لاہور ۱۲۹۸ھ؛ (۱٦) مفتی غلام سرور : تاریخ مخزن پنجاب، مطبع نولکشور ۱۸۷۷ء؛ (۱۷) سیّد محمد لطیف : تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور، لاہور ۱۸۸۸ء؛ (۱۸) نور احمد : تحقیقات چشتی، لاہور ۱۹٦۳ء؛ (۱۹) عباد اللہ گیانی : سکھ عہد اسلامی میں، لاہور ۱۹۳۸ء؛ (۲۰) عبد اللہ چغتائی : لاہور سکھوں کے عہد میں، لاہور ۱۹٦۳ء؛ (۲۱) ٹھاکر سنگھ : پنجاب اور انگریز، مطبوعۂ امرتسر؛ (۲۲) محمود شیرانی : پنجاب میں اردو؛ (۲۳) ہاشمی فرید آبادی : تاریخ پاکستان و بھارت، کراچی ۱۹۵۳ء؛ (۲۴) عاشق حسین بٹالوی : اقبال کے آخری دو سال، کراچی ۱۹٦۱ء؛ (۲۵) محمد ایوب خان : جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی، مطبوعۂ لاہور؛ (۲٦) حسن ریاض : پاکستان ناگزیر تھا، کراچی ۱۹٦۷ء؛ (۲۷) A. Cunningham : *The Ancient Geography of India*، لنڈن ۱۸۷۱ء؛ (۲۸) John Marshall : *Mohenjo-Daro and the Indus Civilisation*، لنڈن ۱۹۳۱ء؛ (۲۹) M.S. Vats : *Excavations at Harappa*، کلکتہ ۱۹۴۰ء؛ (۳۰) Dowson و Elliot : *The History of India as told by its own Historians*، ۱۸٦۷ - ۱۸۷۷ء؛ (۳۱) *The Cambridge History of India*؛ (۳۲) Smith : *Early History of India*، اوکسفرڈ ۱۹۲۴ء؛ (۳۳) Mortimer Wheeler : *Early India and Pakistan*، لنڈن ۱۹۵۹ء؛ (۳۴) بدھ پرکاش : *Political and Social movements in Ancient Punjab*، دہلی ۱۹٦۴ء؛ (۳۵) *A short History of Pakistan*، طبع اشتیاق حسین قریشی، کراچی ۱۹٦۷ء؛ (۳٦) مجمدار : *An Advanced History of India*، نیویارک ۱۹٦۷ء؛ (۳۷) Steinbach : *The Punjaub*، لنڈن ۱۸۴٦ء؛ (۳۸) *History of the Punjab*، مطبوعۂ ایلن اینڈ کمپنی، لنڈن ۱۸۴٦ء؛ (۳۹) سید محمد لطیف : *History of the Punjab*، مطبوعۂ پیپلز پبلشنگ ہاؤس، لاہور و لنڈن؛ (۴۰) Travaskis : *The Land of the Five Rivers*، آوکسفرڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۲۸ء؛ (۴۱) ہری رام گپتا : *Studies in the later Mughal History of the Punjab 1707-1793*؛ (۴۲) محمد اکبر : *Punjab under the Mughals*، لاہور ۱۹۴۸ء؛ (۴۳) گلشن لال چوپڑہ : *The Punjab as a Sovereign State (1799-1839)*؛ (۴۴) J.D. Cunningham : *A History of the Sikhs*، آوکسفرڈ ۱۹۱۸ء؛ (۴۵) Bell : *Annexation of the Punjab*، ۱۸۸۲ء؛ (۴٦) Griffen و Massy : *Chiefs and Families of note in the Punjab*، ۳ جلد، ۱۹۰۹-۱۹۱۱ء؛ (۴۷) *The Punjab : a review of the first six years (August 1947-August 1953)*، مطبوعۂ حکومت پنجاب؛ (۴۸) محمد باقر : *Lahore*، لاہور ۱۹۵۲ء؛ (۴۹) *Statesman's year book 1964-65*؛ (۵۰) *Statesman's year Book 1968-69*؛ (۵۱) *Pakistan year Book 1969*؛ (۵۲) Encyclopaedia *Britannica*، ج ۱۸، مطبوعۂ ۱۹٦۹ء؛ (۵۳) وؤ، لائڈن، بار اول، ج ۳، بذیل پنجاب۔

مزید ماخذ کے لیے رک بہ پاکستان۔

(ادارہ)

پنجابی : برصغیر پاک و ہند کے اس خطے کی زبان جس کی حدود دہلی (بھارت) سے لے کر خیرپور (سندھ) تک اور پشاور و درۂ کاغان (صوبۂ سرحد) سے لے کر جموں و سری نگر (مقبوضہ کشمیر) تک پھیلی ہوئی ہیں۔ [اگرچہ مقامی طور پر ہر علاقے میں اس زبان کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے تاہم ادبی اظہار کے لیے ایک ہی ٹکسالی زبان کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ بابا فرید شکر گنج (ساہیوال)، شاہ حسین اور بلھے شاہ (لاہور)،

سلطان باھو (جھنگ)، خواجہ فرید (بہاولپور)، سچل سر مست (خیر پور)، میاں محمد بخش (میر پور)، احمد علی سائیاں (راولپنڈی)، بردا پشاوری (پشاور)، مولوی غلام رسول (ھوشیارپور) وغیرہ نے جغرافیائی یا بدلتی ھوئی انتظامی حدود کی پابندی نہیں کی ھے بلکہ اسی ٹکسالی زبان کو وسیلۂ اظہار بنایا ھے جسے عرف عام میں پنجابی کہا جاتا ھے].

تحقیقات سے پتا چلتا ھے کہ اس زبان کے لیے یہ نام بہت بعد میں استعمال کیا گیا۔ دسویں صدی عیسوی کے مؤرخ المسعودی اور جغرافیہ‌نگار ابن حوقل نے اسے ملتانی لکھا ھے۔ البیرونی نے اپنی کتاب الصیدنۃ (یا الصیدلۃ) میں پنجاب اور اس کے نواح کی زبان کو "الہندیہ" لکھا ھے۔ مقامی زبان میں مسعود سعد سلمان (۴۴۰ تا ۵۱۵ھ) کے دیوان کو ھندوی بتایا گیا ھے (لباب الالباب، ۲ : ۲۴۶)۔ بعد کے پنجابی مصنفین بھی اس زبان کو ھندوی یا ھندی ھی کہتے ھیں، مثلاً عبدالکریم نجات المؤمنین (۱۶۷۵ء) میں، احمد یار (۱۱۸۲ تا ۱۲۶۲ھ) کام روپ کام لتا میں، [نیز حافظ معز الدین (۱۰۸۹ھ)، شاہ مراد (۱۱۴۴ھ)، حمل فقیر (۱۲۳۰ تا ۱۲۹۲ھ)، مولوی محمد مسلم (۱۲۵۰ھ)، میاں محمد بخش (۱۳۲۴ھ)، مولوی محمد اللہ جوایا جیاورتانی (۱۲۸۰ھ) وغیرہ]، جبکہ دبستان مذاھب (ص ۱۸۸) میں گورو نانک کی زبان کو "زبان جٹان پنجاب" کہا گیا ھے۔ حامد نے ھیر رانجھا میں اپنی زبان کے لیے "جٹکی" کا نام استعمال کیا ھے۔ امیر خسرو (م ۷۲۵ھ) کے ھاں ایک لاھوری زبان کا ذکر ملتا ھے اور ابوالفضل نے آئین اکبری میں اسے ملتانی لکھا ھے.

[سوال پیدا ھوتا ھے کہ اس زبان کے لیے پنجابی کا لفظ کب اختیار کیا گیا؟ حافظ برخوردار پہلا مصنف ھے جس نے مفتاح الفقہ (۱۰۸۰ھ) پنجابی کا لفظ استعمال کیا اور اس کے بعد مولوی کمال الدین نے انتخاب الکتب (۱۲۱۳ھ) میں اور سندر داس آرام نے قصۂ سسی پنوں (۱۲۲۷ھ) میں].

پنجابی زبان کی ابتدا اور تعمیر کے بارے میں مختلف مصنفین میں کافی اختلاف پایا جاتا ھے۔ باوا بدھ سنگھ کی رائے میں "پنجابی کا جسم سنسکرتی ھے، لیکن اس کا لباس بدلتا رھا ھے۔ جب سنسکرت بگڑی تو پراکرت بنی اور پراکرت سے اپرانس (= آپ ونش، اپ بھرنش) اور اس سے پنجابی" (ہریم کہانی ص ۵۲).

بنارسی داس جین نے پنجابی کو قدیم سنسکرت کی وارث قرار دیا ھے۔ انھوں نے لکھا ھے کہ چار ھزار سال قبل آریا یہاں وارد ھوے۔ ان کے ساتھ ھی آریا تہذیب اور سنسکرت زبان بھی یہاں پھیلتی چلی گئی اور مقامی زبانیں دراوڑی وغیرہ بنتی چلی گئیں۔ آخرکار ۶۰۰ ق م اور ۱۰۰۰ء کے درمیانی عرصے میں سنسکرت زبان پراکرت میں بدل گئی اور اس کے بعد پنجابی زبان کی موجودہ شکل وجود میں آئی (پنجابی زبان تے اوھدا لٹریچر، ص ۱۸).

[سنت اندر سنگھ چکرورتی نے اپنے مضمون سنسکرت تے پنجابی (در ماھنامہ پنجابی ادب، لاھور، جون ۱۹۶۱ء) میں ھندی زبان کے مشہور عالموں پنڈت مہاں ویر پرشاد، وجے چندر موجمدار اور بھگوتی شرن اپادھیاے کے حوالے سے ثابت کیا ھے کہ سنسکرت کے قواعد نویسوں نے یہاں کی مقامی زبان کو پراکرت کا نام دیا تھا، جس کے معنی ھیں : خود رو اور فطری، یعنی جو عام لوگوں کی زبان ھو۔ اسی پراکرت کا جدید نام پنجابی زبان ھے۔ انھوں نے لکھا ھے کہ جہاں تک سنسکرت کا تعلق ھے وہ اسی قدیم پراکرت ھی کا ادبی روپ ھے کیونکہ سنسکرت کے معنی ھیں : سنواری اور

تراشی ہوئی زبان]۔

ہیرا لال کا خیال ہے کہ پنجابی بگڑی ہوئی بولیوں (اپ بھرنش) سے نکلی ہے اور مخلوط زبان ہے۔

گریرسن Grierson پنجابی کو مستقل زبان مانتا ہے اور اس کے لیے بعض لسانی شواہد پیش کرتا ہے۔

موہن سنگھ دیوانہ نے اپنے ایک مضمون میں سنسکرت کو پنجابی کا ماخذ قرار دینے پر اصرار کیا ہے اور متعدد مثالیں دے کر پنجابی اور سنسکرت میں کم از کم فرق ثابت کیا ہے، مثلاً:-

پنجابی	سنسکرت	پنجابی	سنسکرت
سر	شر	پیر	پاؤ
اکھ	اکھشی	نک/ناس	ناسکا
ککڑ	ککت	گھوڑا/ گھوڑی/ گھوڑولی	گھٹ
متھا	مستکا	کن	کرنڈ
کنک	کنک	کپڑا	کرپٹ
ہتھ	ہت	پٹ	پٹ
دُدھ	دگدم	ترکالاں	ترکال
جیوں	یو	جنگھ/جانگھیا	جانگھ

[اس سلسلے میں صحیح نظریہ یہ ہے کہ اس زبان کا تعلق اس قدیم زبان سے ہے جو آریاؤں کی آمد سے قبل یہاں پر مستعمل تھی۔ جب مستشرقین نے پنجابی کی لسانی حیثیت کے متعلق اپنے نقطہ ہائے نظر پیش کیے تھے تو اس وقت ہڑپا، روپڑ، چنڈی گڑھ، موئن جودڑو، کوٹ ڈیجی وغیرہ سے آریاؤں سے قبل کی تہذیبوں کے مظاہر دریافت نہ ہوئے تھے۔ ان ماہرین لسانیات کا علم صرف آریاؤں اور ان کی زبان سنسکرت تک ہی محدود تھا۔ اسی لیے انہوں نے اپنے نظریے کی بنیاد پنجابی زبان میں سنسکرت الفاظ ('تتسم' اور 'تدبھو' روپ) کی وافر مقدار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قائم کی تھی اور بعد میں دوسرے مقامی ماہرین لسانیات نے بھی انھیں نظریات کو اپنا لیا۔ اس سے انکار نہیں کہ پنجابی زبان میں سنسکرت الفاظ ان گنت اور بے شمار ہیں۔ اس کے علاوہ پنجابی گرامر پر بھی سنسکرت کا تھوڑا بہت اثر مل سکے گا، لیکن یہ عوامل پنجابی زبان کو سنسکرت سے ماخوذ یا اس کی بگڑی ہوئی شکل ثابت کرنے کے لیے قطعاً ناکافی ہیں۔ تقابلی لسانیات کی رُو سے کسی زبان کا لسانی تجزیہ کرتے وقت اس کے ذخیرۂ الفاظ کے بجائے اس کی اندرونی اور بیرونی ساخت کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر عربی نے فارسی اور ہسپانوی زبانوں پر واضح اثرات مرتسم کیے ہیں، لیکن ان زبانوں کو کبھی سامی خاندان سے متعلق تسلیم نہیں کیا گیا۔

کسی زبان کا لسانی تجزیہ کرتے وقت تاریخی شواہد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ رادھا کمود مکرجی نے اپنی کتاب *Indus Civilization* میں ہڑپا، موئن جودڑو وغیرہ کے کھنڈرات سے دستیاب شدہ انسانی کھوپڑیوں کا تجزیہ کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس علاقے میں سب سے پہلے حبشی (Negrites)، پھر آسٹرک، دراوڑ اور آریا آئے تھے۔ اس کے بعد کی تاریخ تاریکی میں پنہاں نہیں اور ہمیں واضح ثبوت ملتے ہیں کہ آریاؤں کے بعد سیتھین، پہلوی، یونانی، عرب، ایرانی، ترک اور انگریز اس خطّے میں وارد ہوئے، اس لیے ظاہر ہے کہ یہاں کی مقامی زبان نے یکے بعد دیگرے ان سب اقوام کی زبانوں کے اثرات قبول کیے۔ سنیتی کمار چیٹرجی نے اپنی کتاب ***Origin and Development of Bengali Language*** میں ویدوں میں استعمال کیے گئے الفاظ پھل، نیلا، وِل، شام وغیرہ کو مقامی

زبان سے مستعار بتایا ہے ۔

اس سلسلے میں محمد آصف خان : پنجابی زبان کے اجزائے ترکیبی (در روزنامۂ امروز، لاہور، ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء) اور عین الحق فرید کوٹی : پنجابی زبان دیاں جڑھاں (در پنجابی ادب، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۰ء) کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا ۔ ان مضامین میں متعدد مثالیں دے کر پنجابی اور دراوڑی زبانوں کے مشترک الفاظ کی نشان دہی کی گئی ہے، مثلاً :-

دراوڑی	پنجابی	اردو
پنو	پنا	سونا
ولا	ولنا	گھیرنا
ولگ	ول	ٹھیک، بہتر
کُو	کُونا	بولنا
پیٹی	پیٹی	صندوق
آنو	آھنا	کہنا
سڑنکو	سونگڑنا	سکڑنا
کنڈ	کنڈ	کمر
کچھ	کچھ	بغل
پٹو	پٹ	ریشم
اٹی	اٹی	دھاگہ
چاٹی	چاٹی	گھڑا
لون	لون	نمک

سندھی زبان کی لسانی ساخت کے متعلق لکھتے ہوئے ارنسٹ ٹرمپ (*Sindhi Grammar*) اور سراج (سندھی بولی) نے بھی دراوڑی اثرات کی نشان دہی کی ہے ۔

مختصر یہ کہ پنجابی زبان سنسکرت سے بھی قدیم ہے اور مختلف ادوار میں مختلف زبانیں اس کے ذخیرۂ الفاظ کے سرمائے کو بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہوئی ہیں ۔ سنسکرت کے بارے میں مزید اتنا اضافہ کرنا کافی ہو گا کہ آریا اپنے ساتھ ویدک سنسکرت لائے تھے، یعنی وہ سنسکرت جس میں رگ وید، اتھر وید، یجر وید اور سام وید لکھے گئے ۔ جب آریاؤں کو یہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا تو وہ مقامی زبان سے متأثر ہونے لگی ۔ ان مقامی اثرات سے بچانے کے لیے یاسک (۷۰۰ ق م)، پانٹی (۵۰۰ ق م) اور پتنجلی (۱۵۰ ق م) نے سنسکرت کی گرامریں لکھیں ۔ ان قواعد کے سانچے میں جو زبان ڈھالی گئی اسے کلاسیکی سنسکرت یا صرف سنسکرت کہا جاتا ہے ۔

جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے پنجابی زبان ایک وسیع و عریض خطّے کی زبان ہے اور انتظامی حد بندیوں کی پابند نہیں، اس لیے لازمی امر ہے کہ جو زبان جتنی جغرافیائی وسعت کی حامل ہو گی اس کے محاورے اور لہجے میں اتنا ہی اختلاف بھی ہو گا ۔ اگرچہ آج کل ان الگ الگ محاوروں کو الگ الگ زبانوں کا درجہ دینے کی کوشش ہو رہی ہے، مگر اس کے اسباب سیاسی زیادہ اور علمی و لسانی کم ہیں ۔

اس ضمن میں سب سے پہلے ۱۸۸۱ء میں ہورنیل Hornell نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ آریائی زبانیں اندرونی اور بیرونی شاخوں میں منقسم ہیں ۔ اس کے بعد ٹسڈل Tisdall نے اپنی کتاب *Punjabi Grammar* (۱۸۸۹ء) میں اسی مفروضے کو آگے بڑھایا ۔ اس نے پنجابی اور لہندی (ملتانی) کو دو علیحدہ علیحدہ زبانیں قرار دیا ۔ گریرسن نے *Linguistic Survey of India* میں لہندا (ملتانی) کا رشتہ نہ صرف پنجابی سے توڑ دیا بلکہ لہندا کو کشمیری زبان سے ملا دیا ۔ اگرچہ سنیتی کمار چیٹرجی اور گراھم بیلی وغیرہ نے انہیں دنوں اس مفروضے کو بے بنیاد اور غلط ثابت کر دیا تھا اور بعد میں پنجابی ماہرین لسانیات نے بھی اس پر تفصیلی طور پر لکھا ہے، اس کے باوجود سیاسی مقاصد کے لیے انہیں آج تک استعمال کیا جا رہا ہے ۔ محمود

شیرانی بھی اس تقسیم کو غلط قرار دے چکے ہیں ۔ ان کی رائے میں مشرقی اور مغربی بولیوں میں جو فرق ہے وہ اصولی نہیں بلکہ تدریجی اور ضلع ضلع کی مقامی خصوصیات کی بنا پر ہوتا چلا گیا ہے (پنجاب میں اردو : ص ۹۱) ۔

پنجابی زبان کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ یہ بارہ کوس پر بدل جاتی ہے اور اس پر خاص طور سے زور دیا جاتا ہے؛ لیکن یہی بات ہر زبان پر صادق آتی ہے ۔ سندھی زبان میں کہاوت ہے : سندھ میں چپے چپے تے بولی بٹی (= سندھ میں چپے چپے پر دوسری بولی ملتی ہے ، دیکھیے اڈوانی : سندھی بولی) ۔ اسی طرح گجراتی زبان کی کہاوت ہے : بار گاوں بولی بدلے، تروور بدلے شاکھا (= بارہ کوس پر زبان اسی طرح بدل جاتی ہے جس طرح درخت اپنی شاخیں بدلتا ہے) ۔

آب و ہوا اور جغرافیائی، معاشرتی، سیاسی عناصر ایسے عوامل ہیں جو کسی بھی علاقے کی زبان کو متاثر کرتے ہیں ۔ یہی عناصر آگے چل کر زبان کو بولیوں میں منقسم کر دیتے ہیں ، تاہم ان سے زبان کی بنیادی لسانی ساخت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، وہ ہر جگہ ایک ہی رہتی ہے ۔

پنجابی زبان کی بولیوں کو تین بڑے گروہوں، یعنی مشرقی، مغربی اور مرکزی میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

مشرقی :

۱ ۔ بھٹیانی : حصار، گوڑگاؤں، بیکانیر وغیرہ میں۔

۲ ۔ پوادھی : انبالہ، پٹیالہ، جیند وغیرہ میں۔

۳ ۔ دوآبی : لدھیانہ، جالندھر، ہوشیار پور وغیرہ میں۔

۴ ۔ مالوئی : مالیر کوٹلہ، فرید کوٹ، فیروز پور وغیرہ میں ۔

۵ ۔ پہاڑی : کانگڑہ، شملہ، جموں وغیرہ میں ۔

مغربی :

۱ ۔ سرائیکی : خیر پور ڈویژن (سندھ) میں۔

۲ ۔ ریاستی : رحیم یارخاں، بہاولپور وغیرہ میں۔

۳ ۔ ملتانی : ملتان، ڈیرہ غازی خاں وغیرہ میں۔

۴ ۔ ہندکو : پشاور، ایبٹ آباد وغیرہ (صوبۂ سرحد) میں ۔

۵ ۔ چھاچھی : کیمبل پور وغیرہ میں۔

۶ ۔ پوٹھوھاری : راولپنڈی وغیرہ میں۔

۷ ۔ دھنی : جہلم، میر پور (آزاد کشمیر) وغیرہ میں۔

۸ ۔ شاہ پور : سرگودھا، جھنگ وغیرہ میں۔

مرکزی :

۱ ۔ ماجھی : لاھور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، گورداسپور، امرتسر وغیرہ میں۔

یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ ادبی اور ٹکسالی زبان ماجھی اور ملتانی بولیوں کی حسین آمیزش سے مرتب ہوئی ہے اور قدما سے لے کر موجودہ دور تک کے مسلمان، سکھ اور ہندو شاعروں اور ادیبوں نے اپنی علمی و ادبی تخلیقات کے لیے اسی کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے ۔

سکھی پنجابی اور گورمکھی رسم الخط : اس سے پہلے کہ پنجابی زبان کے متعلق بات ختم کی جائے بہتر یہ ہوگا کہ سکھی پنجابی کی مروج اصطلاح کے متعلق بھی کچھ اظہار خیال کیا جائے ۔ یہ اصطلاح گورمکھی رسم الخط اور اس میں استعمال کی جانے والی زبان کے لیے استعمال کی جاتی ہے ۔

برصغیر پاک و ہند کے مشہور بادشاہ اشوک (۲۷۳ ق م - ۲۳۲ ق م) سے قبل یہاں ایک رسم الخط رائج تھا جسے ”برھمی لپی“ کہا جاتا ہے ۔ اشوک کے کتبے اسی رسم الخط میں

لکھے گئے تھے۔ ۵۰۰ ق م سے لے کر ۲۳۶ء تک پنجاب باقی ہندوستان سے کٹا رہا تھا اور یہ ایرانی، یونانی، پارتوی، شاکا اور کشان حکومتوں کے زیرِ نگین رہا تھا۔ ان اقوام نے اپنے اپنے دورِ حکومت میں خروشتی، یونانی وغیرہ رسم الخط رائج کیے تھے، اس لیے برھمی لپی یہاں پر رائج نہ ہو سکی۔ جب ۳۲۰ء میں ملک کی باگ ڈور گپتا خاندان کے ہاتھ میں آئی تو یہاں برھمی لپی رواج پذیر ہوئی۔ اسی دور میں یہ دو خطوں میں بٹ گئی: ایک وہ جو شمالی ہندوستان میں اور دوسرا وہ جو جنوبی ہندوستان کی زبانوں کے لیے استعمال میں لایا گیا۔ شمالی ہندوستان میں اپنائے گئے خط سے ''کٹیل لپی'' وجود میں آئی۔ یہ تقریباً ۵۰۰ء سے لے کر ۹۰۰ء تک مستعمل رہی اور اس کے بعد اس نے دیوناگری، شاردا، ٹاکری، گورمکھی، لنڈے وغیرہ کی شکل اختیار کی۔ مندرجۂ ذیل خاکہ گورمکھی اور مذکورۂ بالا خطوں کے باہمی تعلّق کی وضاحت کر دے گا:

	ٹاکری	شاردا	دیوناگری
گورمکھی میں ایک جیسے حروف	۰	۷	۲
گورمکھی میں مماثلت رکھنے والے حروف	۰	۱۲	۵
گورمکھی میں قدرے مماثل حروف	۶	-	۱۳
گورمکھی میں بالکل مختلف حروف	۸	۱۵	۱۴

موجودہ دور میں سکھ عالموں نے اس نظریے کو بالکل باطل قرار دیا ہے کہ گورمکھی کو دوسرے گورو انگد دیو (۱۵۰۴ تا ۱۵۵۲ء) نے اختراع کیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ یہ رسم الخط بہت پہلے رائج ہو چکا تھا؛ گورو صاحبان نے صرف اتنا کیا کہ اسے اپنی بانی کے لیے منتخب کیا۔

سکھ مذہب کے بانی گورو نانک (۱۴۶۹ تا ۱۵۳۹ء) کی زبان موجودہ پنجابی کے کافی حد تک قریب ہے اور اس میں چالیس فیصد الفاظ عربی، فارسی اور ترکی سے لیے گئے ہیں (سیّد عبداللہ: ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصّہ، ضمیمہ)۔ گورو انگد دیو سے لے کر نویں گورو تیغ بہادر (۱۶۲۱ تا ۱۶۷۵ء) تک تمام گوروؤں کے کلام میں بھگتی لہر کے شاعروں، مثلاً راما نند، رامانج، آچاریہ ولبھ، تلسی داس وغیرہ کی زبان کے اثرات واضح صورت میں ملتے ہیں۔ دسویں گورو گوبند سنگھ (۱۶۶۶ تا ۱۷۰۸ء) پٹنہ (بہار) میں پیدا ہوئے تھے اور تقریباً تمام عمر پنجاب سے باہر رہے؛ اس لیے ان کے کلام پر برج بھاشا، پوربی ہندی، بنگالی اور بھگتی لہر کی زبان کا آمیزہ ہے۔ کسی حد تک چنڈی دی وار اور ان کے چند ایک شبدوں کو پنجابی کی اس شکل کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے جس میں دوسرے گورو صاحبان نے اپنا کلام لکھا تھا۔

گورو صاحبان نے جس قسم کی مخلوط زبان میں اظہارِ خیال کیا تھا بعد کے پنجابی شاعروں، ادیبوں اور افسانہ نگاروں نے اسے نہیں اپنایا بلکہ وہ اپنی تخلیقات اسی زبان میں پیش کرتے رہے جو مسلمان کلاسیکی شعرا کی تھی۔ بھائی ویر سنگھ، دھنی رام چاترک، نانک سنگ ناولسٹ، موہن سنگھ ماہر، امرتا پریتم، سنت سنگھ سکھوں، وغیرہ نے اپنا تمام شعری سرمایہ اور افسانے، ڈرامے وغیرہ اسی زبان میں پیش کیے ہیں اور نئی نسل بھی پیش کر رہی ہے۔

بایں ہمہ تقسیم پنجاب (۱۹۴۷ء) کے بعد مشرقی پنجاب کی پنجابی زبان میں ایک اہم تبدیلی ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اگرچہ افسانوی ادب کی زبان میں زیادہ تبدیلی نظر نہیں آتی، لیکن غیر افسانوی ادب کی زبان ہندی سنسکرت زدہ ہوتی جا رہی ہے۔ اکثر اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ ان تحریروں میں ہندی

سنسکرت الفاظ کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ پنجابی زبان کا عالم فاضل بھی اس تحریر کا مطلب اخذ کرنے میں قاصر رہتا ہے بلکہ سکھوں کے لیے بھی یہ کچھ اجنبی ہی ہے، اس لیے کہ ان کے تمام مقدّس مقامات پاکستانی پنجاب میں ہیں اور سکھ دانشور مسلمان صوفی شعرا کے ادبی خزانوں سے بھی تعصب نہیں رکھتے - بہرحال سیاسی حکمت عملی کے تحت پنجابی زبان و ادب کی ترقی کے نام پر تالیف و تصنیف کا شعبہ قائم کیا گیا، جس نے چند ہی برسوں میں زبان کی کایا کلپ کر دی - اب صورت حال یہ ہے کہ غیر افسانوی نثر میں اس قسم کی زبان استعمال کی جاتی ہے کہ ہندی سنسکرت کا کوئی عالم سمجھے تو سمجھے، ایک عام پنجابی اسے سمجھنے سے معذور ہے۔

[مشرقی پنجاب میں ہندی - سنسکرت زدہ پنجابی کے خلاف ایک بہت بڑی تحریک شروع ہو گئی ہے - اس کی بنیاد ۱۹۶۷ء میں جالندھر میں رکھی گئی تھی - اب تک اس کی چار کانفرنسیں ہو چکی ہیں اور آئے دن اس کے حق میں اور خلاف مشرقی پنجاب کے مختلف اخباروں اور رسالوں میں مضمون شائع ہوتے رہتے ہیں]۔

یہاں اس امر کا بھی لحاظ رہے کہ گرنتھ صاحب گورمکھی میں مرتب ہوا تھا اور بعد ازاں سکھوں کا سارا لٹریچر اسی میں لکھا گیا، چنانچہ سکھوں کے ہاں اسے مذہبی تقدس کا درجہ حاصل ہو گیا اور رفتہ رفتہ اس نے ان کی ایک قومی علامت کی صورت اختیار کر لی - یہیں سے ”سکھی“ پنجابی اور ”مسلمانی“ پنجابی میں، جس کا رسم الخط ہمیشہ فارسی رہا، امتیاز پیدا ہونے لگا - سکھوں کی زبان اسلامی (فارسی، ترکی، اردو) اثرات سے دور ہوتی گئی اور تقسیم بر صغیر کے بعد رسم الخط کے اختلاف کے باعث مشرقی (بھارتی) اور مغربی (پاکستانی) پنجاب کی زبانیں ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گئیں۔

زبان کے یہ دو رنگ ادب میں بھی نمودار ہوئے - مسلمان صوفیوں اور عالموں نے عوام میں تبلیغ اسلام کی خاطر پنجابی کو اپنایا تھا - یہ سلسلہ رفتہ رفتہ خالص دینی اور صوفیانہ تصنیف سے نکل کر ادبی کتابوں تک جا پہنچا، چنانچہ پرانے پنجابی ادب کا ایک بڑا حصّہ اسلامی صوفیانہ روایات کا حامل ہے - انگریزی عہد میں مغربی اثرات کے تحت دوسری اصناف بھی وجود میں آئیں جن کی روح سیکولر (secular) ہے، یا کم از کم ادب کی اسلامی روایات سے ہٹی ہوئی ہے۔

پنجابی ادب کی خصوصیات: پنجابی زبان و ادب کے ادوار قائم کرنے سے پہلے اس کی ممتاز خصوصیات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا:

پنجابی ادب پر علمائے دین اور اولیا و مشائخ کی تعلیمات اور مقامی ماحول کا بڑا گہرا اثر ملتا ہے - شاعری پر تصوف کا رنگ غالب ہے، لیکن اس کی بعض منفرد خصوصیات بھی ہیں - اول تو اردو اور فارسی کے برعکس اس میں اظہار عشق ہمیشہ عورت کی طرف سے ہوتا ہے؛ دوسرے اس میں مجاز اور حقیقت متصادم نہیں ہوتے - صوفی شعرا نے اپنے افکار و تاثرات کو صوفیانہ شاعری اور عارفانہ کلام ہی میں بیان کرتے ہیں اور ان کا مطلوب ہمیشہ معشوق حقیقی ہوتا ہے - رومانی قصوں کے کردار ان کے ہاں بطور علامت استعمال ہوتے ہیں، مثلاً وہ اکثر اپنی ذات اور روح کو ہیر، سوہنی اور سسی اور اپنے خدا کو (نیز مرشد کو، جو وصال الٰہی کا وسیلہ ہے) رانجھا، مہینوال اور پنوں کے نام سے مخاطب کرتے ہیں - اسی طرح سلطان باھو کے ہاں کھیڑے اور رانجھے کو شر اور خیر کی علامتوں کے طور پر لیا گیا ہے - اس سے بحیثیت مجموعی مذہبی اور اخلاقی بے راہ روی شاعری میں

بار نہیں پا سکی۔

پنجابی ادب کی ایک بنیادی خصوصیت ایک مربوط معاشرے کی عکاسی ہے۔ تمام تشبیہات اور استعارات مقامی زندگی اور مشاغل سے مستعار ہیں۔ مجموعی اعتبار سے ادب عوام کے ذہنی تقاضوں سے ہم آہنگ رہا ہے۔ وارث شاہ، بلھے شاہ، حامد شاہ اور نجابت کوی اپنے اپنے معاشرے کی جامع تصویر پیش کرتے ہیں۔

پنجابی میں جن اصناف سخن کا بکثرت استعمال ہوا ہے وہ مندرجۂ ذیل ہیں:

(۱) سی حرفی: پرانے شاعروں کا اکثر کلام اسی صنف میں ملتا ہے۔ اس میں الف سے ی تک ایک ایک حرف سے شروع کر کے مصرعے یا بند لکھے جاتے ہیں، جو عموماً بحر طویل میں ہوتے ہیں۔ سی حرفیوں میں عشقیہ اور متصوفانہ دونوں قسم کے مضامین بیان کیے جاتے ہیں۔ علی حیدر، غلام رسول، ہدایت اللہ اور عشق لہر کی سی حرفیاں قابل ذکر ہیں۔

(۲) کافی: یہ تین تین چار چار مصرعوں کے بندوں پر مشتمل ہوتی ہے اور آخری مصرع بار بار آتا ہے۔ یہ گانے کے لیے لکھی جاتی ہے اور عارفانہ شاعری کے لیے مخصوص ہے۔ شاہ حسین اور بلھے شاہ کی کافیاں بہت مشہور ہیں۔

(۳) طویل رومانوی نظمیں: یہ صنف مثنوی سے مختلف ہے اور اس کی بحر بھی مختلف ہوتی ہے۔ اس میں محض ایک واقعے یا داستان کا بیان نہیں ہوتا بلکہ اپنے دور کے معاشرتی اور تمدنی حالات کی بھی مکمل ترجمانی کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پیلو اور حافظ برخوردار کی مرزا صاحباں؛ مقبل اور وارث شاہ کی ہیر؛ ہاشم کی سسی پنوں؛ [عبدالحکیم بہاولپوری اور] مولوی غلام رسول کی احسن القصص؛ فضل شاہ کی سوہنی مہینوال اور لیلی مجنوں [اور مولوی لطف علی بہاولپوری] اور میاں محمد بخش کی سیف الملوک کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔

(۴) جنگ نامہ: وہ نظم جس میں لڑائی کے واقعات درج ہوں، خاص طور پر جس کا موضوع واقعۂ کربلا ہو۔ [اس سلسلے میں جنگ نامۂ مقبل؛ جنگ نامۂ حامد؛ مولوی محمد اعظم؛ جنگ نامۂ حضرت علیؓ اور احمد یار: جنگ بدر وغیرہ مشہور ہیں]۔

(۵) وار: ایک رزمیہ نظم، جس میں اہل پنجاب کی بہادری کے واقعات اور جنگ کے حالات بڑے ولولہ انگیز ڈرامائی انداز میں پیش کیے جاتے ہیں، مثلاً نجابت: نادر شاہ دی وار؛ پیر محمد: چٹھیاں دی وار اور شاہ محمد: سکھاں دی وار۔

(۶) گلزار: اس میں جنگ ناموں کی طرز پر انبیاے کرام کے حالات بیان کیے جاتے ہیں۔ محمد مسلم اور عبدالستار کی گلزاریں مشہور ہیں۔

(۷) بارہ ماھے، اٹھوارے، ست وارے: اس میں عاشق اپنے محبوب کے فراق میں سال کے بارہ مہینوں یا ہفتے کے آٹھ یا سات دنوں کی کیفیت ہر مہینے یا ہر دن کا نام لے لے کر بیان کرتا ہے اس صنف کے مشہور شاعر بلھے شاہ، فرد فقیر، میاں ہدایت اللہ اور غلام حسین کیلیانوالہ ہیں۔

(۸) نور نامہ: اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت با سعادت یا حضورؐ سے متعلق مسائل کا ذکر ہوتا ہے۔ الٰہی بخش اور دولت علی کے نورنامے مشہور ہیں۔

(۹) شلوک: ہیئت کے اعتبار سے یہ بیت یا شعر ہیں، جن میں درویشانہ خیالات بیان کیے جاتے ہیں، مثلاً بابا نانک اور فرید ثانی کے شلوک۔

(۱۰) چرخہ نامہ: اس میں شاعر تصوف کے رنگ میں اپنی مثال چرخے سے دیتا ہے اور کاتے ہوئے سوت کو اعمال حسنہ سے تشبیہ دیتا ہے۔

عبدالستار، مولوی اکبر اور عبدالعزیز واحد کے چرخہ نامے اہم ہیں۔

(۱۱) اشتر نامہ : اس میں شاعر اپنے آپ کو اونٹ کی طرح بردبار تصوّر کر کے عشق کی تکالیف کا ذکر کرتا ہے۔ سلطان باھو، [شاہ مراد] اور شاہ شرف بٹالوی کے اشتر نامے قابل مطالعہ ہیں۔

ان کے علاوہ ''جوھڑی نامہ'' میں شاعر اپنے آپ کو بھنگن اور ''جوگی نامہ'' میں جوگن یا جوگی تصوّر کر کے عجز و انکسار کے ساتھ محبوب حقیقی سے وصال کی درخواست کرتا ہے۔ ''معراج نامہ'' کا موضوع حضور پاکؐ کا واقعۂ معراج ہوتا ہے۔ ''جندڑی'' میں شاعر اپنی جان کو ایک اجنبی مسافر قرار دیتے ہوے اسے اعمال حسنہ کی ترغیب دیتا ہے۔

پنجابی ادب کے ادوار : موھن سنگھ دیوانہ نے *A History of Panjabi Literature* میں پنجابی ادب کے پانچ ادوار متعین کیے ہیں : (۱) دورِ قبل از نانک؛ (۲) دورِ نانک؛ (۳) دورِ مغلیہ؛ (۴) دورِ رنجیت سنگھ اور (۵) برطانوی دور۔ اپنی ایک اور کتاب *An Introduction to Panjabi Literature* میں پہلے دور کو گورکھ ناتھ یا کن پاٹے جوگیوں کا عہد یا عہد فرید؛ مغلوں کے دور کو عہد وارث شاہ؛ رنجیت سنگھ کے دور کو عہد ھاشم اور برطانوی دور کو عہد فقیر لکھا ہے۔ انھوں نے یہ بھی خیال پیش کیا ہے کہ اگر ادوار کا تعیّن ھیئت کے اعتبار سے کیا جائے تو یہ تین ادوار بنتے ہیں : (۱) راگ اور راگنی میں لکھے ہوے پد اور اشلوک کا دور؛ (۲) بیت اور مثنوی کا دور اور (۳) متفرق نظم کا دور۔

۱۹۲۶ء سے پہلے کا پنجابی ادب : موھن سنگھ نے پنجابی ادب کا آغاز ناتھ جوگیوں کے عہد (۸۵۰ تا ۱۴۰۰ء) سے کیا ہے۔ ان کی رائے میں قدیم پنجابی وہی اپ بھرنش ہے جو پشاچی کے نام سے مشہور ہے اور جس میں آگے چل کر عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کا اضافہ ہو گیا۔ اس زمانے میں پنجابی ادب کی ترقی میں کچھ حصّہ تو ''کن پاٹے'' جوگیوں کا ہے اور کچھ مسلمان صوفیہ کا۔

جوگی شعرا میں چرپٹ ناتھ (۸۹۰ تا ۹۹۰ء)، گورکھ ناتھ (۹۳۰ تا ۱۰۳۱ء)، چورنگی ناتھ یا پورن بھگت (۹۷۰ تا ۱۰۷۰ء) اور رتن ناتھ یا حاجی بابا رتن (۱۰۰۰ تا ۱۱۲۰ء) مشہور ہیں اور ان کے بعض شبد اور شلوک دستیاب ہیں۔

مسعود سعد سلمان (م ۱۰۲۱ یا ۱۰۳۱ء) : روایت ہے کہ اس نے پنجابی میں بھی ایک دیوان مرتب کیا تھا، جس میں بارہ ماہے اور ست وارے بھی شامل تھے۔

شیخ مسعود فرید الدین یا بابا فرید شکر گنجؒ (۱۱۷۳ تا ۱۲۶۵ء) : آپ کا کچھ کلام ھندی قلمی نسخوں (بانی سنگلاناں) میں ملتا ہے اور بعض شلوک گرنتھ صاحب میں بھی موجود ہیں۔ [چند سال قبل مقبول الٰہی نے ان شلوکوں کا انگریزی نظم میں ترجمہ کیا تھا (مطبوعۂ مجلس شاہ حسین، لاھور)۔ حال ھی میں عبدالمجید بھٹی نے ان کا اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے]۔

خواجہ امیر خسروؒ (۱۲۵۳ تا ۱۳۲۵) : فارسی کے مشہور شاعر، جنھوں نے بقول سجان رائے (خلاصۃ التواریخ) ایک پنجابی وار غازی الملک تغلق شاہ اور ناصرالدین خسرو خاں کی جنگ کے بارے میں لکھی تھی۔ ان کی پنجابی پہیلیاں بھی ملتی ہیں (پنجابی ادب دی مختصر تاریخ، ص ۲۲ تا ۲۸)۔

بابا فرید کے ایک ہم عصر نے سسی پنوں کا قصہ نظم کیا تھا۔ ڈبلن یونیورسٹی میں قصۂ

یوسف زلیخا کا ایک پندرھویں صدی کا مخطوطہ موجود ہے۔

گورو نانک صاحب (۱۴۶۹ تا ۱۵۳۸ء): ان کے کلام کو پنجابی کا اولین مستند کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے، جو گرنتھ صاحب میں ملتا ہے۔ بابا نانک سکھ مت کے بانی تھے۔ انھوں نے لوگوں کو ہدایت اور نیکی کی باتیں بتائیں اور انھیں پنجابی نظم کی صورت میں ڈھالا۔ اسی ”گوروبانی“ کو جمع کرکے آد گرنتھ مرتب کیا گیا۔ بعد ازاں سکھوں کے دوسرے گوروؤں [کے علاوہ ہندو سادھو سنتوں اور مسلمان صوفیوں] کا کلام بھی اس میں شامل کیا گیا۔ آخری گورو کا کلام دسم گرنتھ کے نام سے علیحدہ مرتب ہوا۔

گورو نانک کے ایک ہمعصر شیخ فریدالدین ابراہیم المعروف بہ فرید ثانی (۱۴۵۰ تا ۱۵۷۵ء) پنجابی کے صوفی شاعر تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گرنتھ صاحب میں دراصل انھیں کا کلام موجود ہے۔

پنجابی ادب ۱۵۲۶ سے ۱۷۰۷ء تک: اس دور میں پنجابی کے بہت سے مقتدر شعرا ملتے ہیں، مگر نثر کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہوا۔

شاہ حسین (۱۵۳۹ تا ۱۵۹۳ء): بلند پایہ صوفی شاعر تھے۔ مست الست رہتے تھے اور طریقۂ ملامتیہ اختیار کر رکھا تھا۔ آپ کے خلفا میں سے مادھو لال سب سے مشہور ہوا۔ ہر سال باغبان پورہ (لاہور) میں ان کے مزار پر چراغاں کا میلہ منعقد ہوتا ہے، جس میں قوال ان کا کلام سناتے ہیں۔ شاہ حسین پہلے شاعر تھے جنھوں نے کافیاں لکھیں اور مختلف راگ راگنیوں کے اوزان پر انھیں ڈھالا۔ انھیں الفاظ کے انتخاب پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ کلام سادہ اور پاکیزہ ہے، جس میں بڑی تاثیر اور لطافت پائی جاتی ہے۔ مقامی تلمیحات کا استعمال نمایاں ہے، چنانچہ انھوں نے ہیر رانجھے کو بطور علامت استعمال کیا ہے۔ جدید دور میں نقادوں نے ان کے کلام سے بہت دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ کافیاں کئی بار شائع ہو چکی ہیں (طبع موہن سنگھ دیوانہ؛ طبع محمد افضل مع شرح؛ طبع مجلس شاہ حسین)۔ [عبدالمجید بھٹی نے اردو نظم میں اور] غلام یعقوب انور نے ان کا انگریزی نظم میں ترجمہ کیا ہے۔

دمودر (۱۵۵۶ تا ۱۶۰۵ء): بعض نقاد اسے ہیر رانجھے کا ہم عصر مانتے ہیں۔ ان کا قصہ پہلی بار اسی نے پنجابی میں نظم کیا۔ اس کی کہانی مقبل، وارث شاہ اور فضل شاہ سے مختلف، لیکن واقعیت سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ [تمام استعارات و تشبیہات مقامی زندگی سے مستعار ہیں اور ایک مربوط اور مکمل معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے]۔ زبان سادہ ہے اور انداز بیان راست اور بے تکلف ہے۔

پیلو (۱۵۵۶ تا ۱۶۰۵ء): اس کے مذہب کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض اسے ماجھے کا مسلمان زمیندار بتاتے ہیں، جو گورو ارجن دیو کا ہم عصر تھا اور بعض اسے ہندو لکھتے ہیں۔ مرزا صاحباں کا قصہ سب سے پہلے اسی نے لکھا۔ اس کا انداز بیان ڈرامائی ہے۔ آنے والے شعرا (مثلاً حافظ برخوردار اور احمد یار) نے اسے استاد تسلیم کیا ہے۔

سلطان باہو (۱۶۳۱ تا ۱۶۹۱ء) ان کا شمار صوفیۂ عظام میں ہوتا ہے۔ تصانیف کی تعداد چالیس سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ کلام نہایت عمدہ اور شستہ ہے اور اس سے عشق حقیقی، حق گوئی اور راست کرداری جھلکتی ہے۔ افکار و خیالات مولانا روم سے مشابہ ہیں۔ زبان پر علاقۂ جھنگ کا اثر غالب ہے۔ ہر مصرع لفظ ”ھُو“ پر ختم ہوتا

ہے، جو خاص ان کی ایجاد ہے ۔ بدت دوہڑی مجموعۂ ابیات کشمیری بازار لاہور سے شائع ہوا تھا ۔ زمانۂ حال میں باھو اکیڈیمی نے آپ کے کلام اور تعلیمات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے ۔ [مقبول الٰہی نے ان کی ابیات کا انگریزی میں منظوم ترجمہ کیا ہے]۔

حافظ برخوردار (۱۶۶۹ء): عالم فاضل تھے ۔ انھوں نے عوامی قصے نظم کرنے کے علاوہ فقہ و تفسیر میں کئی کتابیں لکھیں ۔ ان کے نام سے جو کتابیں ملتی ہیں ان میں مرزا صاحباں، یوسف زلیخا، سسّی پنّوں، فرائض ونّہ، جنگ نامۂ امام حسین رضؓ، قصیدۂ غوثیہ اور قصیدۂ بانت سعاد کے ترجمے، چرخہ نامہ اور انیس رسائل پر مشتمل انواع برخوردار قابل ذکر ہیں ۔ ان تصانیف کی روح مذہبی ہے ۔ حافظ برخوردار کو سولھویں صدی کے نصف آخر کا نمائندہ شاعر کہا جا سکتا ہے ۔ انھوں نے فارسی اوزان کے علاوہ عربی اور فارسی الفاظ بھی بکثرت استعمال کیے ہیں۔

احمد گوجر: ۱۶۹۲ء میں قصۂ ہیر رانجھا لمبے بیتوں میں منظوم کیا ۔ خیال ہے کہ وارث شاہ نے اس سے اثر قبول کیا۔

اس عہد کے دیگر شعرا میں چھجو بھگت لاہوری (م ۱۶۹۶ء) نے شبد کہنے کے علاوہ بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ کیا اور ستھرا شاہ (۱۶۱۵ء) نے شلوک لکھے ۔ فقہی مسائل پر متعدد رسالے منظر عام پر آئے، مثلاً عبداللہ لاہوری: باراں انواع (بارہ رسائل پر مشتمل ہے جو ۱۶۱۶ء اور ۱۶۵۴ء کے مابین لکھے گئے)؛ ان کے مقلد درویش محمد: فرائض درویش محمد؛ دولت علی: نور نامہ (۱۶۳۳ء)؛ مولوی عبدالکریم: نجات المؤمنین (۱۶۷۵ء) اور نجات الایمان؛ عبدی (م ۱۷۰۷ء): رسالۂ مہتدی؛ کمال الدین بھٹو کی فقہی مسائل پر مشتمل ایک کتاب (۱۷۰۰ء) اور عبدالرحمٰن منہاس: بحر المسائل (۱۷۰۲ء)؛ حکیم درویش نے رسالہ پران سکھ میں طب ہندی کی رو سے اہم امراض کا علاج بیان کیا (۱۶۵۵ء)؛ شاہ ظریف (۱۶۲۴ تا ۱۶۹۸ء) کی حضرت علیؓ کی مدح میں سی حرفی مشہور ہے؛ پیر محمد کاہمی نے جنگ نامۂ امام حسینؓ لکھا (۱۶۸۱ء) اور حافظ معز الدین نے قصیدۂ امالی کا منظوم ترجمہ کیا (۱۶۸۶ء)۔

پنجابی ادب ۱۷۰۷ سے ۱۸۴۹ء تک: اس دور میں پنجابی ادب کے اندر مزید وسعت پیدا ہوئی اور نثر کا بھی آغاز ہوا، اگرچہ اس کی حیثیت ابتدائی ہے ۔ انگریزوں نے جس طرح ہندوستان کی دوسری زبانوں میں دلچسپی لی، پنجابی کی بھی گرامریں لکھیں ۔ ان میں ایک W. Carey : A *Grammar of the Panjabi Language*، ۱۸۱۲ء ہے اور دوسری C.B. Leach : *Panjabi Grammar*، ۱۸۳۸ء ۔ [علاوہ ازیں انجیل مقدس کے تراجم بھی ہوئے]۔ مسلمان علمائے دین نے متعدد رسائل تصنیف کیے، جن میں حضور پاک صلّی اللہ علیہ و سلّم کی سوانح عمریاں بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

اس دور کی شاعری کے اہم کارنامے یا تو مذہبی اور دینی نوعیت کے ہیں، یا رزمیہ نظمیں ہیں جنھیں ”وار“ کہا جاتا ہے ۔ مؤخر الذکر نظموں میں ان تمام لڑائیوں کا ذکر ہے جو اس دور میں لڑی گئیں ۔ اس کے علاوہ جنگ نامے اور بعض بلند پایہ منظوم عوامی قصے بھی لکھے گئے۔

اس عہد کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ شعرا حسن بیان اور غنائیت کی طرف خاص توجہ دینے لگے ۔ فارسی کا اثر پنجابی شاعری پر گہرا ہوتا گیا اور فارسی محاورہ زبان کا جزو بن گیا ۔ مختلف مقامات کے شعرا کے کلام میں اگرچہ مقامی لب و لہجہ بھی ملتا ہے، تاہم بحیثیت مجموعی ایک باقاعدہ، یکساں اور یکرنگ اسلوب بیان ترقی کرتا

دکھائی دیتا ہے۔

یہ دور وارث شاہ کا دور ہے، جس میں پنجابی کے عظیم‌ترین شاعر وارث شاہ کے علاوہ، جنہیں علی‌الاطلاق بھی عظیم کہا جا سکتا ہے، بلّھے شاہ، علی حیدر، خواجہ فرد فقیر، ہاشم شاہ، مقبل، قادر یار، احمد یار، حامد، نجابت کوی اور [پیر محمد] وغیرہ جیسے اہم نظم گو ہو گزرے ہیں۔

سیّد بلّھے شاہ (١٦٨٠ تا ١٧٥٨ء) : پنجابی کے سب سے بڑے صوفی شاعر ہیں۔ حصول تعلیم کے بعد انہوں نے قادری سلسلے کے ایک بزرگ عنایت شاہ شطاری کی بیعت کر کے آزادانہ روش اختیار کر لی۔ ان کے کلام میں صوفیانہ شاعری کے مختلف انداز ملتے ہیں۔ اس میں شدت احساس بھی ہے اور فکری عنصر بھی۔ حق گوئی، بےباکی اور راست کرداری کا دامن وہ کہیں نہیں چھوڑتے۔ عالمانہ اصطلاحات کے بجائے ان کے ہاں مخصوص پنجابی تشبیہات و استعارات کا استعمال نظر آتا ہے۔ اخلاقی رنگ ہر جگہ غالب ہے اور کلام میں جوش و تاثیر پائی جاتی ہے۔ ان کی کافیاں متعدد بار شائع ہو چکی ہیں۔ پنجابی ادبی اکادمی نے کلیات بلّھے شاہ حال ہی میں شائع کی ہے [مزید تفصیلات کے لیے رکّ بہ بلّھے شاہ]۔

علی حیدر (١٦٩٠ تا ١٧٨٠) : ان کی سی‌حرفیاں مشہور ہیں۔ اسلوب بیان مرصع ہے۔ کلام میں موسیقیت پائی جاتی ہے۔ ملتانی الفاظ کی کثرت ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ و محاورات بھی خوش اسلوبی سے استعمال ہوے ہیں۔ بیشتر کلام صوفیانہ ہے۔ ١٣٢٥ء میں مکمل مجموعۂ ابیات علی حیدر لاہور سے شائع ہوا تھا۔

نجابت کوی (اٹھارھویں صدی کے اوائل میں) : ان کی تصنیف نادر شاہ دی وار کا شمار اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ موضوع نادر شاہ کا ہندوستان پر حملہ (١٧٣٩ء) ہے۔ قلم میں زور ہے اور بیان میں روانی۔ [جزئیات نگاری اپنے کمال پر ہے۔] اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوانہ روایات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

مقبل (١٧١٨ تا ١٧٣٨ء) : تصانیف میں ہیر رانجھا، سی‌حرفی در مدح پیران پیر اور جنگ نامۂ امام حسینؓ مشہور ہیں۔ ہیر رانجھا ٹھیٹھ پنجابی میں ہے۔ وارث شاہ کی ہیر اس سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے۔ جنگ نامہ میں پنجابی معاشرت کی جھلک ملتی ہے۔

خواجہ فرد فقیر (١٧٢٠ تا ١٧٩٠ء) : مجموعۂ کلام دریاے معرفت کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جس میں نسب نامۂ بافندگان خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس نظم میں ایک بافندے کی صورت میں مسائل تصوف بیان کیے گئے ہیں اور ضمناً اپنے دور کی سیاست اور معاشرت کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ فرد فقیر کی سی حرفیوں اور بارہ ماہوں کا رنگ بھی جداگانہ ہے۔ ان کی ایک اور کتاب روشن دل میں اسلامی مسائل بیان کیے گئے ہیں [اور یہ پنجابی نصاب میں ایک مدت تک شامل رہی ہے]۔

وارث شاہ : ہیر ان کی زندۂ جاوید تصنیف ہے، جو ١٧٦٦ء میں مکمل ہوئی۔ یہ قصہ شاعر کے عہد کے معاشرتی اور سیاسی حالات کا آئینہ دار ہے کیونکہ اس نے اپنے مشاہدات و تأثرات کو کہانی کے پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وارث شاہ کی سی قادرالکلامی پنجابی زبان کے کسی شاعر میں نظر نہیں آتی۔ ان کے پاس الفاظ کا بےپایاں ذخیرہ ہے، جسے وہ انتہائی خوش اسلوبی اور چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں۔ بیان میں واقعیت، سوز و گداز اور جذبات کا خلوص جھلکتا ہے۔ یہ نظم موقع نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ ہیر وارث شاہ کو شائع کرتے وقت مرتبین کئی مقامات پر ترمیم و تنسیخ سے کام لیتے

اور بہت سے اشعار کا اضافہ کرتے رہے ہیں ۔ پنجابی ادبی اکادمی کے مطبوعہ نسخے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ اصل کے مطابق ہے ۔ [یہی دعوی جیت سنگھ سیتل نے اپنی ہیر وارث شاہ کے دیباچے میں کیا ہے، جو انھوں نے متعدد قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے تقابلی جائزے کے بعد مرتب کی ہے] ۔ مزید تفصیلات کے لیے رک بہ وارث شاہ.

حامد شاہ (پیدائش ۱۷۴۸ء) : ان کا جنگ نامہ مشہور ہے ۔ زبان پر فارسیت غالب ہے اور واقعات میں صحت اور ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا.

احمد یار (۱۷۶۸ تا ۱۸۴۸ء) : انھوں نے ہیر رانجھا، سسی پنوں، [شاہنجی نامہ، سیف الملوک، [illegible] احمد یار، وغیرہ وغیرہ چالیس سے زائد کتابیں تصنیف کیں] ۔ ان میں تصویر کشی اور منظر نگاری کے بعض اچھے نمونے ملتے ہیں ۔ [علاوہ ازیں احمد یار پنجابی کے پہلے نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں].

قادر یار (۱۸۰۲ تا ۱۸۵۰ء) : مصنف پورن بھگت، ہری سنگھ نلوا، راجہ رسالو، سی حرفیاں، معراج نامہ؛ اول الذکر کتاب کا شمار پنجابی کی اہم منظومات میں ہوتا ہے.

ہاشم شاہ ([illegible] تا ۱۸۴۳ء) : عہد سکھاں کے سب سے بڑے شاعر تھے ۔ بہت سے عوامی قصے نظم کیے، جن میں سسی پنوں اور سوہنی مہینوال ممتاز ہیں ۔ قصوں میں جزئیات نگاری سے گریز کرتے ہیں ۔ ان کے متصوفانہ دوہڑے بہت مشہور ہیں ۔ کلام میں جذبات کی شدت اور خیالات کی رفعت ہے ۔ اسلوب بہت مؤثر ہے .

عبدالحکیم بہاولپوری : ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں یوسف زلیخا لکھی ۔ [فارسی کے جید عالم تھے، چنانچہ اس زبان سے بہت استفادہ کیا ہے].

[میاں لطف علی : مولوی عبدالحکیم کے ہم عصر تھے ۔ انھوں نے سیفل نامہ (۱۲۰۶ھ) تصنیف کیا، جو شگفتگی اور زور بیان کا نادر نمونہ ہے].

شاہ محمد (۱۷۹۹ تا ۱۸۶۲ء) : مصنف سکھاں دی وار کو پنجاب کا پہلا حماسی شاعر کہا جا سکتا ہے، جس نے حب الوطنی کو اپنا موضوع سخن بنایا اور انگریزوں کی مخالفت میں قلم اٹھایا ۔ اندازِ بیان پُر زور ہے اور الفاظ کے صوتی اثرات سے خوب کام لیا ہے .

مولوی محمد مسلم (۱۸۰۵ تا ۱۸۸۰ء) : فقہی مسائل کے علاوہ ایک کتاب عجائب القصص لکھی جس میں انبیاے کرام کے حالات درج ہیں.

پنجابی ادب ۱۸۴۹ء کے بعد : انگریزوں نے جب ۱۸۴۹ء میں صوبۂ پنجاب کا الحاق کر لیا تو اس کے زیرِ اثر سیاسی اور معاشرتی حالات میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں ۔ آہستہ آہستہ انگریزی زبان و ادب کو قبولِ عام حاصل ہوتا گیا ۔ ادھر انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی عدالتی، دفتری اور تعلیمی زبان بنا دیا گیا ۔ اس دور میں آریا سماج کے زیرِ اثر ہندوؤں نے اردو کی سخت مخالفت شروع کر دی ۔ ردعمل کے طور پر مسلمانوں نے اردو کو اس حد تک اپنا لیا کہ اسے اپنی قومی و ملی زبان کا درجہ دے دیا اور مقامی زبان سے ان کی دلچسپی کم سے کم ہوتی گئی ۔ ادھر سکھوں نے، جو اس صوبے کی سیاسیات میں ہندوؤں کی ہم نوائی کرتے تھے، [سنگھ سبھا تحریک کے تحت] پنجابی کے حق میں شدت اختیار کی ۔ اس فضا میں اردو کے اخبارات و رسائل کثرت سے نکلے اور مسلمانانِ پنجاب کی جملہ تخلیقی صلاحیتیں اردو کے لیے وقف ہو گئیں ۔ بایں ہمہ ایک سطح پر پنجابی کے لیے بھی کام ہوتا رہا ۔ اردو مشاعروں کے طریق پر پنجابی کوی دربار منعقد ہوتے رہے اور انگریزی اور اردو ادب کے اثرات سے پنجابی بھی مستفید ہوتی رہی؛ ترجمے

بھی ہوے، نئی اصناف کی سرپرستی بھی ہوئی، نثر کی طرف بھی توجہ کی گئی اور سیاسی و مذہبی (مناظرانہ) موضوعات پر بھی لکھا گیا۔

تقسیم پنجاب (۱۹۴۷ء) کے بعد مشرقی پنجاب پنجابی زبان و ادب کا سرکاری طور پر اہم مرکز بن گیا؛ مگر وہ سارا ادب گورمکھی رسم الخط میں ہے، جس سے مغربی پنجاب بہت کم مستفید ہے؛ تاہم مغربی پاکستان میں پنجابی زبان اور ادب کے لیے کام ہو رہا ہے۔ پنجابی کی ترقی کے لیے حکومت کی طرف سے بعض اداروں کو امداد ملتی ہے۔ پنجابی ادبی اکیڈمی اور مجلس شاہ حسین، لاہور، پنجابی ادب کی اشاعت میں خاصی سرگرم ہے۔ ۱۹۷۰-۱۹۷۱ء سے پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔ اے، پنجابی، کی جماعتیں شروع ہو چکی ہیں۔

اس دور میں دو الگ الگ روایتیں نظر آتی ہیں: شعر و شاعری کی پرانی روایت اور انگریزی اور اردو ادب کے زیر اثر ادب کی جدید روایت۔

(الف) قدیم روایت: اس کے ممتاز نمائندوں میں مندرجۂ ذیل بہت ممتاز ہیں:

سید فضل شاہ (۱۸۲۷ تا ۱۸۹۰ء): مصنف سوہنی مہینوال، الفاظ کی صنعت گری میں کمال رکھتے تھے۔ صنعت تجنیس اور ایہام سے بہت کام لیتے تھے اور ایک ہی لفظ کو مختلف معنوں میں نہایت خوبی سے استعمال کرتے تھے۔ سوہنی مہینوال کے علاوہ انھوں نے دوسرے رومانی قصے بھی نظم کیے۔ اخلاقی اشعار کا ایک مجموعہ بھی تحفۂ فضل کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

میاں محمد بخش (۱۸۲۸ تا ۱۹۰۶ء): عربی فارسی کے عالم تھے۔ پہلے پہل سی حرفیاں اور دوہڑے لکھے۔ پھر کئی قصے نظم کیے، جن میں سیف الملوک کو شہرت دوام حاصل ہوئی۔ ان کے کلام میں غیر معمولی تاثیر اور سوز و گداز کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

ہدایت اللہ (۱۸۳۸ء تا ۱۹۲۹ء): دوہڑے، چو مصرعے، سی حرفیاں اور باراں ماہے لکھے اور ہیر وارث شاہ میں متعدد اشعار کا اضافہ کیا۔ کلام میں پختگی، روانی اور سوز ہے اور اس پر تصوف اور مجاز کا رنگ چھایا ہوا ہے۔

خواجہ غلام فرید (۱۸۴۱ تا ۱۹۰۱ء): پنجابی کی صوفیانہ شاعری میں بلھے شاہ کے بعد انھیں کا نام آتا ہے۔ خواجہ ظاہری و باطنی علوم سے مالا مال اور عربی، فارسی، اردو، ہندی اور مارواڑی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ تصوف کے حقائق کو کافیوں میں ڈھالتے تھے۔ ان کی کافیوں میں بڑی غنائیت ہے، عام لوگوں کی زندگی سے گہرا تعلق بھی جھلکتا ہے اور عشق مجازی اور عشق حقیقی کے ڈانڈے ملتے نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں درد و فراق کے مضامین اکثر ملتے ہیں اور وہ صوفی کیفیات کو الفاظ کے قالب میں بڑی خوبی سے منتقل کرتے ہیں۔ ان کا دیوان دستیاب ہے۔

مولوی غلام رسول (۱۸۴۲ تا ۱۹۰۳ء): مصنف احسن القصص (قصۂ یوسف زلیخا) کی زبان پرزور اور اسلوب پرکشش ہے۔ ان کی ایک اور قابل ذکر تصنیف داستان امیر حمزہ ہے۔ علاوہ ازیں ان کی ''چٹھیاں'' (خصوصاً سید روشن علی کے نام) بہت درد انگیز اور رقت آمیز ہیں۔

محمد بوٹا گجراتی (۱۸۵۱ تا ۱۹۳۰ء): بہت پرگو شاعر تھے۔ تصانیف میں سے قصۂ مرزا صاحباں اور سی حرفی پنج گنج کو بہت مقبولیت نصیب ہوئی۔ کلام سادہ اور پرسوز ہے اور بلند خیالی بھی پائی جاتی ہے۔

سر شہاب الدین (۱۸۶۵ تا ۱۹۴۹ء): تقسیم ملک سے پہلے کے ایک دور میں پنجاب اسمبلی کے سپیکر اور پنجابی کے مستند شاعر

تھے ۔ دیگر منظومات کے علاوہ ان کا خاص کارنامہ مسدس حالی کا پنجابی ترجمہ ہے ۔

فیروز دین شرف (۱۸۹۸ تا ۱۹۵۳ء) : مصنف سنہری کلیاں، نورانی کرناں، شرف نشانی وغیرہ ۔ [انھوں نے قومی اور سماجی مسائل پر بہت سی نظمیں لکھنے کے علاوہ] دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی بڑی خوبی سے پیش کیا ہے ۔

بابو کرم امرتسری (۱۸۵۳ تا ۱۹۰۹ء) : کلام کا مجموعہ گلستۂ کرم چھپ چکا ہے ۔ شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا ۔ [ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو اس دور کے مقبولِ عوام شاعروں میں پائی جاتی تھیں] ۔

استاد گام (۱۸۶۰ تا ۱۹۳۸ء) : چو مصرعے اور نعتیں خوب لکھتے تھے ۔

سائیں مولا بخش (پیدائش ۱۸۶۷ء) : بہت سی کافیوں کے علاوہ کئی قصے نظم کیے، جن میں سے ہیر رانجھا کو موہن سنگھ دیوانہ نے ہیر وارث شاہ کے برابر قرار دیا ہے ۔

عشق لہر (۱۸۶۹ تا ۱۹۴۸ء) : اصل نام چراغ دین؛ بارہ ماہ، سی حرفی، سسی پنوں اور بہت سی نظمیں ان کی یادگار ہیں ۔ کلام میں روانی، بلند خیالی اور شعریت ملتی ہے ۔ [پچھلے دنوں ان کا مجموعۂ کلام عشق دی لہر کے نام سے مشتاق بٹ نے مرتب کر کے شائع کیا ہے] ۔

سوختہ امرتسری (۱۸۷۶ تا ۱۹۴۴ء) : پنجابی کے اچھے شاعر تھے ۔ ہیر وارث شاہ میں چھے سو اشعار کا اضافہ کیا ۔

مولا بخش کشتہ (۱۸۷۶ تا ۱۹۵۵ء) : مصنف دیوان کشتہ، ہیر کشتہ، وغیرہ ۔ ان کے علاوہ پنجاب دے ہیرے اور پنجابی شاعراں دا تذکرہ، نام کی دو کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، [ان میں پنجابی شعرا کا تعارف اور نمونۂ کلام دیا گیا ہے] ۔ کشتہ کے کلام میں شوخی اور رنگینی کے ساتھ سوز اور تڑپ بھی ہے ۔

عبدالغنی وفا (پیدائش ۱۸۸۷ء) : بلند پایہ نعت گو ہیں ۔

لال دین قیصر (۱۸۹۹ تا ۱۹۵۶ء) : لاہور کے مقبول شاعر اور سیاسی کارکن تھے ۔ [سیاسی نظمیں لکھنے کی پاداش میں کئی بار جیل گئے ۔ ۱۹۲۰ء میں] اخبار امام جاری کیا ۔ کئی کتابیں مطبوعہ ہیں ۔

فیروز سائیں عارف (۱۹۰۲ تا ۱۹۶۳ء) : مجموعۂ کلام ہاڑے شائع ہو چکا ہے ۔

جوشو الفضل الدین (۱۹۰۳ء . . .) : نظم و نثر پر یکساں عبور حاصل ہے ۔ کلام میں شیرینی اور بلند خیالی ہے ۔ [۱۹۳۵ء میں ادبی ماہنامہ پنجابی دربار جاری کیا ۔ حال ہی میں انجیل شریف کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے] ۔

استاد دامن (۱۹۰۷ء . . .) : موجودہ زمانے میں پنجابی کے نامور شاعر اور ہیر کے علاوہ بہت سی منظومات اور گیتوں کے مصنف ہیں ۔ بعض سیاسی نظمیں بھی خوب لکھی ہیں ۔

اس دور میں قدیم روایت پر کاربند پنجابی کے ہندو سکھ شعرا میں بھائی ویر سنگھ، ملکھی رام، موہن سنگھ دیوانہ، کشن سنگھ عارف، سوہن سنگھ سیتل، [دیوان سنگھ اور پورن سنگھ] ممتاز ہیں ۔

(ب) پنجابی ادب کی جدید روایت پر انگریزی، روسی، فرانسیسی اور اردو وغیرہ کا اثر نمایاں ہے ۔ جدید خیالات اور نظریات کے پیش نظر انداز فکر میں نمایاں تبدیلی ہوئی ۔ تحریک آزادی، تحریک حصول پاکستان اور جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے علاوہ عوام کے روز افزوں سیاسی و معاشی شعور کی بدولت پرانی قصہ گوئی، بیت بازی اور چومصرعہ نگاری کی جگہ قومی، ملی اور اصلاحی

ری نے لے لی، غزل کو فروغ ہوا، ہیئت میں نت نئے تجربے ہوے اور آزاد طرز کی نظمیں لکھی جانے لگیں۔ جدید دور کے اکثر پنجابی شعرا تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں اردو کے کئی مستند شعرا بھی پنجابی کی طرف متوجہ ہوے؛ چنانچہ پنجابی شاعری میں وہ تمام خصوصیات پیدا ہوگئیں جو عالمی ادب میں مختلف ادبی تحریکوں کی بدولت وجود میں آ رہی تھیں۔ اس سے [illegible] طرف تو حقیقت پسندی سے کام لیا جانے لگا ہے اور دوسری طرف پنجابی شاعری کی دیہاتی فضا میں ایک نیا شہری رنگ بھی پیدا ہو چلا ہے۔ ان جدید شعرا میں معمر لوگ بھی شامل ہیں اور نوجوان بھی۔ ان میں سے بعض نے قدیم خیالات کو جدید اسلوب میں ادا کرنے پر اکتفا کیا ہے اور بعض کے ہاں خیالات بھی جدید ہیں اور اسلوب بھی نیا ہے، مثلاً:

پیر فضل حسین گجراتی (۱۸۹۷ء...): پنجابی کے بہترین غزل گوؤں میں شمار ہوتے اور پنجابی کے حافظ کہلاتے ہیں۔ ڈونگھے پینڈے اور لکوراں ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

صوفی غلام مصطفی تبسم (۱۸۹۹ء...): فارسی، اردو اور پنجابی کے نغزگو شاعر ہیں۔ تینوں زبانوں میں ان کے کلام کا مجموعہ انجمن کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جنگ ستمبر کے دوران میں انھوں نے بعض نہایت مقبول گیت لکھے۔

فقیر محمد فقیر (۱۹۰۰ء...): متعدد پنجابی کتب [صدائے فقیر، رباعیات فقیر، ہیر رانجھا، وغیرہ] کے مصنف ہیں۔ مہکدے پھل کلاسیکی شعرا پر تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کے علاوہ وہ پنجابی ادبی اکادمی کے لیے [illegible] کتابیں مرتب کر چکے ہیں۔

عبدالمجید بھٹی (۱۹۰۲ء...): اردو اور پنجابی کے ممتاز شاعر ہیں۔ دل دریا ان کے گیتوں کا مجموعہ ہے اور اتارہ میں نظمیں بھی ہیں اور گیت اور غزلیں بھی۔ ان کا ایک ناول ٹھیڈا اور افسانوں کا مجموعہ دل دیاں بریاں شائع ہو چکا ہے۔

حکیم شیر احمد ناصر (۱۹۰۸ء...): مصنف سجرا سورج، ناصر دا خمسہ، زندگی دے چار حصے، وغیرہ۔ کلام میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔

محمد علی فائق (۱۹۱۲ء...): قرآن مجید کا منظوم پنجابی ترجمہ نورانی شعلے ختم کر چکے ہیں، لیکن ابھی ایک سیپارہ طبع ہوا ہے۔ دوسری تصانیف میں سراپائے حبیبؐ (حلیۂ مبارک) اور پنجابی قواعد قابل ذکر ہیں۔

غلام یعقوب انور (۱۹۱۵ء...): انگریزی، اردو اور پنجابی میں لکھتے ہیں۔ سلطان باھو کی ابیات اور شاہ حسین اور بلھے شاہ کی کافیوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ [ان میں سے شاہ حسین کی کافیوں کا ترجمہ شائع ہو گیا ہے]۔

شریف کنجاہی (۱۹۱۵ء...): [جگراتے کے نام سے مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے۔ اکثر نظموں کا موضوع موجودہ معاشرے کی بے انصافیاں اور چیرہ‌دستیاں ہیں۔ پنجابی میں تنقید بھی کرتے ہیں۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ جھاتیاں چھپ گیا ہے۔

کیپٹن محمد رمضان تبسم: اردو، فارسی اور پنجابی کے صاحب دیوان ہیں۔ علامۂ اقبال کی پیام مشرق کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے۔

صفدر میر (۱۹۲۲ء...): اردو میں بھی لکھا، لیکن اب اکثر پنجابی ہی میں لکھتے ہیں۔ [نیلے دا اسوار ایک ڈرامائی نظم ہے، جس نے پنجابی شاعری کو ایک نیا اسلوب دیا ہے۔ کلام

میں زندگی کے آفاقی دکھ اور ازلی مجبوری کا احساس ملتا ہے]۔

احمد راہی (۱۹۲۳ء ۔ ۔ ۔) : موجودہ دور میں پنجابی کے ممتاز ترین شعرا میں سے ہیں ۔ پنجابی لوک گیتوں سے بہت متأثر ہیں اور ان کے جانے پہچانے استعاروں کی مدد سے جدید موضوعات پیش کرتے ہیں ۔ ترنجن ان کا مجموعۂ کلام ہے ۔ پنجابی فلموں کے لیے کئی مقبول گیتوں کے علاوہ کہانیاں اور مکالمے بھی لکھے ہیں ۔

منیر نیازی (۱۹۲۸ء ۔ ۔ ۔) : اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں ۔ اردو میں متعدد مجموعوں کے علاوہ پنجابی میں بھی دو مجموعے سفر دی رات اور چار چپ چیزاں شائع ہو چکے ہیں ۔ جدید شعرا میں ان کا ایک خاص مقام ہے ۔ کلام میں شدت احساس بدرجۂ اتم ملتی ہے ۔

[انجم حسن سید (۱۹۳۴ ۔ ۔ ۔) : کافیاں اور چندن رکھ دا ویہڑا دو مجموعے شائع ہوئے ہیں ۔ ان کے علاوہ دو طویل نظمیں بار دی وار اور ملتان شہر دی وار بھی لکھے ہیں، جن میں اپنے ثقافتی ورثے سے عدم توجہی اور معاشرتی اقدار کی پامالی کو موضوع بنایا گیا ہے ۔

دوسرے جدید شعرا میں عبدالقدیر اشک (من ترنگ)، احمد ظفر (بیلے بیلے)، باقی صدیقی (کچے گھڑے)، اسمعیل متوالا (ہلارے)، افضل احسن (شیشہ اک لشکارے دو)، رؤف شیخ (کرناں اور واٹاں)، سلیم کاشر (تتیاں چھاواں)، ڈاکٹر رشید انور (منزلاں)، بشیر منظر (کلا رکھ)، ماجد صدیقی (وتھاں ناپدے ہتھ اور سوہاں لیندی اکھ)، نذیر چودھری (چانن دا کھڑکار)، الطاف قریشی (اکھیاں دے پرچھانویں)، سلیم الرحمن (آون والے)، مشتاق باسط (سپنی دا ڈنگیا)، وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ جن شعرا کا کلام ادبی جرائد میں اکثر شائع ہوتا رہتا ہے ان میں قیوم نظر، اکبر لاہوری، جانباز جتوئی، رضا ہمدانی، جوہر میر، طالب جالندھری، افضل پرویز، منو بھائی، ظفر اقبال، نور کاشمیری، شفقت تنویر مرزا، عبدالحمید امر، سلطان محمود آشفتہ، سعید جعفری، احمد سلیم، سعیدہ تصدق ہاشمی، رضیہ ناہید، نجمہ اقبال، رشیدہ سلیم سیمیں اور ام لیلٰی سیما کے نام لیے جا سکتے ہیں]۔

مشرقی پنجاب کے شعرا میں دیوان سنگھ (۱۸۹۴ تا ۱۹۴۴ء) نے پنجابی میں آزاد شاعری کو رواج دینے میں بڑا حصہ لیا ۔ مجموعۂ کلام وگدے پانی ہے ۔ امرتا پریتم (۱۹۱۵ء ۔ ۔ ۔) مشرقی پنجاب کے جدید شعرا میں بہت مقبول و ممتاز ہیں ۔ لہراں (۱۹۳۵ء) کے بعد ان کی کئی اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں ۔ گوپال سنگھ دردی (۱۹۱۷ء ۔ ۔ ۔) کے کلام میں فلسفیانہ حقائق ملتے ہیں]۔

پنجابی شاعری کے بعض نقاد پوٹھوہاری اور سرائیکی (یا ملتانی یا بہاول پوری) کو پنجابی سے علیحدہ زبانیں قرار دینے پر زور دیتے ہیں، لیکن جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے بنیادی طور پر ان میں صرف مقامی لب و لہجے کا فرق ہے ورنہ بنیادی طور پر یہ ایک ہی زبان ہے ۔

سرائیکی کے ممتاز ترین شاعر خواجہ فرید اور یوسف زلیخا کے مصنف عبدالحکیم کا ذکر اوپر آ چکا ہے ۔ الٰہی بخش کا نورنامہ پنجاب یونیورسٹی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے ۔ میاں نوروز اور لطف اللہ بہاول پور کے اور میاں بخش ملتان کے صوفی شاعر تھے ۔ استاد گلوں خاں بہاولپوری (۱۸۶۰ تا ۱۹۱۹ء) نے پنجابی غزل کی ابتدا کی ۔ جدید شعرا میں شیر افضل جعفری قابل ذکر ہیں ۔

پوٹھوہاری میں، جو ضلع راولپنڈی اور اس کے

نواحی علاقے میں بولی جاتی ہے، سر فہرست پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی (م ۱۹۳۷ء) کا نام آتا ہے، جن کی نہایت درد بھری نعتوں کا مجموعہ پنج گنج عرفان چھپ چکا ہے۔ ان کے علاوہ مسلمانوں میں احمد علی سائیاں (م ۱۹۲۹ء)، میاں قائم دین، سائیں بھارث اور محمد حسین آور غیر مسلم شعرا میں ہیرا سنگھ درد، اپشر سنگھ، ودھاوا سنگھ تیر اور موہن سنگھ ماہر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جدید دور میں اکرم حیدری، افضل پرویز اور باقی صدیقی کا شمار پنجابی کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے.

نثری ادب: اس دور میں پنجابی نثر کو بھی ترقی ہوئی۔ سب سے زیادہ توجہ افسانہ، ناول اور ڈراما کی طرف ہوئی.

پنجابی ناول کا آغاز بھائی ویر سنگھ (۱۸۷۲ تا ۱۹۵۷ء) نے کیا۔ ان کے ناول مذہبی اور تاریخی نوعیت کے بھی ہیں اور اصلاحی بھی۔ چرن سنگھ شہید (۱۸۹۳ تا ۱۹۳۵ء) نے نیم تاریخی اور معاشرتی ناول لکھے۔ ماسٹر تارا سنگھ اور نرندر سنگھ نے اپنے ناولوں میں سکھوں کو قومی بیداری کا سبق دیا۔ نانک سنگھ نے صرف سکھ معاشرے ہی کو نہیں بلکہ پوری سماج کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ جوشوا فضل دین اس دور کے ناول نگاروں میں سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ پربھا، پر کتے اور منڈے دا مل ان کے مقبول ناول ہیں۔ میراں بخش منہاس کو پنجابی کا پہلا مسلمان ناول نویس کہا جا سکتا ہے، جن کے ناول جٹ دی کرتوت عرف نواب خاں میں دیہاتی زندگی کی جھلک ملتی ہے۔ سنت سنگھ سکھوں (لہو مٹی) کے ہاں حقیقت نگاری کے بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ سریندر سنگھ نرولا (پیو پتر، لو دے دشمن) اور کرتار سنگھ دگل (آندراں، نونہہ تے ماس) کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ جدید ترین دور میں جسونت سنگھ کنول (پالی، پورن ماشی)، نریندر پال سنگھ (سلاح، امن دے راہ) اور امرتا پریتم (اعلنا، پلاوا) قابل ذکر ہیں۔ پاکستان کے پنجابی ناول نگاروں میں عبدالمجید بھٹی کا ٹھیڈا شہری زندگی کی اور افضل احسن کا دیوانے دریا دیہاتی زندگی کی عمدہ اور دلکش تصویر پیش کرتا ہے۔ سلیم خان گمی کا ساھنجھ اور منظور انور قریشی کا بولدے پتھر بھی معیاری ناول ہیں.

پنجابی ڈرامے کی ابتدا مذہبی ناٹکوں (رام لیلا، کرشن لیلا وغیرہ) سے ہوئی۔ بھائی ویر سنگھ کے راجا لکھ داتا کو پہلا ڈراما کہا جا سکتا ہے۔ جدید ڈرامے کا آغاز ایشور چندر نندا نے کیا؛ سبھدرا ان کا ممتاز ڈراما ہے۔ ڈراموں کے قابل ذکر مجموعے مندرجۂ ذیل ہیں: بھارتی پنجاب سے: سنت سنگھ سکھوں: چھ گھر؛ سردار گور بخش سنگھ: پریم مکٹ اور پورب پچھم؛ [بلونت گارگی: لوہا کٹ؛] چرن سنگھ: جیون لیلا اور پریتم سنگھ سفیر: پنج ناٹک [اور مغربی پاکستان سے: صوفی تبسم: دو ناٹک؛ اکرم بٹ: سجاول۔ آج کل ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے تقاضوں کے تحت زیادہ تر ایکانکی ڈرامے لکھے جا رہے ہیں۔ مندرجۂ ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں: سجاد حیدر: ہوا دے ہوکے؛ اشفاق احمد: ٹاہلی دے تھلے؛ آغا اشرف: نمھا نمھا دیوا بلے اور دھرتی دیاں ریکھاں؛ فخر زمان، چڑیاں دا چنبہ]۔ ان کے علاوہ بانو قدسیہ، کشور نعیم، انور سجاد، سلیم خان گمی، شفقت تنویر مرزا، شیخ اقبال اور سلطان علی کھوسٹ وغیرہ کے ڈرامے ریڈیو، سٹیج اور ٹیلی ویژن پر اکثر پیش کیے جاتے ہیں.

مختصر افسانے کو سکھ ادیبوں نے ناول اور ناٹک کے بعد اپنایا۔ پنجابی زبان کا ادب و تاریخ کے مصنف کے نزدیک رشید احمد پنجابی کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ مشرقی پنجاب کے ممتاز

افسانہ نگاروں میں بلونت گارگی، کرتار سنگھ دگل، دیوندر ستیارتھی، سنت سنگھ سکھوں، گور بخش سنگھ، گوردیال سنگھ، اوپندر ناتھ اشک، امرتا پریتم، سریندر سنگھ نرولا اور گورمکھ سنگھ مسافر، وغیرہ کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

[ماہنامۂ سارنگ اور پنجابی دربار کی اشاعت کے ساتھ ساتھ جوشوا فضل الدین، اظہر حیدر اور فضل شاہ وغیرہ نے فارسی رسم الخط میں پنجابی افسانے لکھنے کا آغاز کیا۔ ان میں سے جوشوا فضل الدین کا مجموعہ ادبی افسانے شائع ہو کر بہت مقبول ہوا۔ تقسیم پنجاب (١٩٤٧ء) کے بعد پنجابی کے متعدد ماہنامے جاری ہوے، مثلاً پنج دریا، پنجابی ادب، لہراں، حق اللہ، وغیرہ اور بعض روزناموں (مثلاً امروز) اور اکثر کالجوں کے رسائل میں چند صفحات پنجابی کے لیے مخصوص رکھے جانے لگے تو پاکستان میں افسانہ نگاروں کی ایک نئی کھیپ سامنے آئی۔ اب تک جو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان میں مندرجۂ ذیل قابل ذکر ہیں: نواز : ڈونگھیاں شاماں؛ آغا اشرف : وا ورولے؛ رفعت : اک اوپری کڑی؛ نسیمہ اشرف علی : سکے پتر؛ حنیف چودھری : کچ دی گڈی؛ انور علی : کالیاں اٹاں کالے روڑ۔ ان کے علاوہ جن افسانہ نگاروں نے اس صنف کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے، لیکن ان کے مجموعے تاحال شائع نہیں ہو سکے، ان کے نام یہ ہیں : سجاد حیدر، انور سجاد، سلیم خاں گمی، ستنام محمود، رشیدہ سلیم سیمیں، شفقت تنویر مرزا افضل احسن، راحت نسیم ملک، محمد آصف خاں، شمس نعمان، فوزیہ نقوی، حنیف باوا، حسین شاہد، وغیرہ۔ منتخب افسانوں کے دو مجموعے بھی شائع ہوے ہیں، یعنی دل دیاں باریاں، مرتبۂ عبدالمجید بھٹی اور اجوکی کہانی، مرتبۂ محمد آصف خاں، خالد لاہوری و شہباز ملک]۔

جہاں تک ادب کی تاریخ و تنقید کا تعلق ہے بعض پرانے شاعروں مثلاً احمد یار (ہیر رانجھا) اور میاں محمد بخش (سیف الملوک) نے اپنے کلام میں قدیم اور معاصر شعرا کا ناقدانہ انداز میں ذکر کیا ہے، لیکن مستقل تصنیف و تالیف کا سلسلہ باوا بدھ سنگھ سے شروع ہوا۔ ان کی گورمکھی رسم الخط میں کتابوں [ھنس جوگ (١٩١٣ء)، کوئل کو (١٩١٦ء)، بمبیہا بول] سے قطع نظر پریم کہانی فارسی رسم الخط میں شایع ہوئی۔ [اس کے بعد مولا بخش کشتہ نے پنجاب دے ہیرے (١٩٣٢ء) شائع کی، جس میں بعد ازاں اضافے اور ترمیم کر کے پنجابی شاعراں دا تذکرہ (١٩٦٠ء) میں شائع کیا گیا۔ اس تذکرے سے پہلے عبدالغفور قریشی کی کتاب پنجابی زبان دا ادب تے تاریخ چھپ چکی تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر فقیر محمد فقیر : مہکدے پھل؛ شریف کنجاہی : جھاتیاں؛ قریشی احمد حسین : پنجابی تذکریاں نے اک جھات؛ نجم حسین سید : سیدھاں اور حال ہی میں حافظ عبدالحمید سرشار کی ادبی رشماں شائع ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ مجلس شاہ حسین نے بنارسی داس جین کی کتاب پنجابی زبان تے اوھدا لٹریچر دوبارہ شائع کی ہے اور لاجونتی راما کرشنا کی انگریزی کتاب کا پنجابی ترجمہ بھی چھاپا ہے]۔

پنجابی اخبار و جرائد کے اجرا کے ساتھ علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی مقالات لکھنے کی ابتدا ہوئی۔ ابتدائی دور میں قاضی فضل حق، موہن سنگھ دیوانہ وغیرہ لکھا کرتے تھے۔ پاکستان بننے پر فقیر محمد فقیر، مولانا عبدالمجید سالک، چودھری محمد افضل خاں وغیرہ نے لکھنا شروع کیا۔ اب عبدالسلام خورشید، محمد باقر، وحید قریشی، صوفی تبسم، عین الحق فرید کوٹی، غلام یعقوب انور، نجم حسین سید، شفقت تنویر مرزا،

محمد آصف خاں، راجه رسالو وغیره کے مضامین اور مقالات شائع هوتے رهتے هیں

مشرقی پنجاب میں تاریخ ادب کے علاوه دوسری اصناف پر بھی سینکڑوں کتابیں شائع هو چکی هیں ۔ لکھنے والوں میں هرنام سنگھ شان، جیت سنگھ سیتل، سریندر سنگھ کوهلی، هربھجن سنگھ، گوپال سنگھ دردی، سربندر سنگھ نرولا، سرجیت سنگھ سیٹھی، ایس ۔ ایس ۔ امول، شمشیر سنگھ اشوک، وغیره کے نام لیے جا سکتے هیں ۔

گرامر اور لغت نگاری پر همارے ادیبوں نے خاص توجه نہیں کی [اور جنھوں نے کچھ کام کیا هے (مثلاً بشیر احمد ظامی، ایس ۔ خانم، ارشاد پنجابی، الطاف رانا) وه ابھی تک کسی ناشر کے منتظر هیں]؛ البته اس سلسلے میں انگریزوں [اور غیر مسلموں] نے قابل قدر کام کیا هے، مثلاً لغات میں مندرجهٔ ذیل کتابوں کا ذکر کیا جاسکتا هے: (١) Captain Starkey: *Dictionary of English and Punjabi*، ١٨٠٣ء؛ (٢) *A Dictionary of the Punjabi Language*، طبع لدهیانه مشن، ١٨٥٤ء؛ [(٣) بھائی میا سنگھ : پنجابی کوش، ١٨٩٥ء؛ (٤) T.G. Bailey : *English Punjabi Dictionary*، ١٩١٩ء؛ (٥) بھائی بشن داس : پنجابی شبد بھنڈار، ١٩٢٢ء؛ (٦) منشی جواهر سنگھ : *Anglo-Punjabi Vocabulary*، ١٩٢٢ء؛ (٧) سالک رام : *Anglo-Punjabi Dictionary*، ١٩٢٢ء؛ (٨) پادری هیرز Hares : *English Punjabi Dictionary*، ١٩٢٦ء؛ (٩) اردو پنجابی کوش، طبع شعبهٔ لسانیات، پٹیاله یونیورسٹی، ١٩٦٠ء؛ (١٠) پنجابی ۔ پنجابی کوش، طبع شعبهٔ لسانیات، پٹیاله یونیورسٹی، ١٩٦٠ء] ۔ صرف و نحو کی کتابوں میں *Punjabi Grammar* کے نام سے کئی انگریزوں کی تالیفات ملتی هیں (مثلاً کیری W. Carey (سیرام پور ١٨١٢ء)، لیچ C. B. Leach (١٨٣٨ء)، نیوٹن J. Newton (لدهیانه ١٨٥١ء)، ٹسڈل Tisdall (لنڈن ١٨٨٩ء) اور گراهم بیلی (وزیر آباد ١٩٠٤ء) ۔ ان کے علاوه بهاری لال (پنجابی ویا کرن، ١٨٦٩ء)، موهن سنگھ (پنجابی ویا کرن بودھ) اور دنی چندر (پنجابی بھاشا دا ویا کرن، مطبوعهٔ چنڈی گڑھ یونیورسٹی، ١٩٦٤ء) کے نام بھی لیے جا سکتے هیں ۔ مقامی مصنفین میں بھی فیروز الدین فیروز ڈسکوی : قواعد پنجابی؛ محمد علی فائق : قواعد پنجابی اور بشیر احمد ظامی : نخلستان قواعد شائع هو چکی هیں]۔

پنجابی زبان میں ابھی تک سائنسی ادب کی طرف توجه نہیں کی گئی، البته لوک ادب پر خاصا کام هوا هے ۔ پنجابی لوک گیتوں پر کئی کتابیں شائع هو چکی هیں جن میں رام سرن : پنجاب دے گیت؛ [ساجد علوی : من دی موج؛ پنجابی لوک گیت، طبع پنجابی ادبی لیگ؛ نازش کاشمیری و راجه رسالو : پنجابی دے لوک گیت؛ مهر عبدالحق : سرائیکی لوک گیت اور کرم حیدری : پوٹھوهاری لوک گیت] سر فهرست هیں ۔ پنجابی ضرب الامثال کے بارے میں بهت مدت پهلے کینن W. Cannon [و پادری هیرز Hares] : *A Collection of Punjabi Proverbs* شائع هوئی تھی ۔ اس کے بعد مرزا سلطان بیگ : پنجابی دے اکھان [اور شہباز ملک : سو سیانا اِکو مت] شائع هو چکی هیں ۔ اسی طرح برطانوی دور میں پهیلیوں کی ایک کتاب پنجابی بجھارتاں، مطبوعهٔ سیٹھ آدم جی عبدالله، بمبئی، دستیاب تھی ۔ [اب اسی سلسلے میں ارشد میر کی کتاب بجھ میرا بجھکا چھپ گئی هے]۔

قدیم پنجابی ادب پر مذهبی خصوصاً اسلامی رنگ غالب رها، لیکن جدید دور میں بھی شرعیات پر کچھ کم توجه نہیں دی گئی ۔ اس سلسلے میں حافظ محمد لکھوی (م ١٨٩٢ء) کا نام سب سے پهلے آتا هے، جنھوں نے تفسیر محمدی کے نام سے قرآن مجید

کا منظوم پنجابی ترجمہ مع تفسیر پیش کیا ۔ ان کی دوسری تصانیف انواع مولوی بارک اللہ، انواع محمدی، احوال الآخرت، زینت اسلام اور سیف السنۃ ہیں ۔ ان کے بعد مولوی حبیب اللہ (۱۹۱۳ء) اور فیروز الدین ڈسکوی نے تفسیر قرآن لکھی ۔ میاں جان نے تیسویں پارے اور مولوی نور محمد نے سورۃ الملک، غلام کبریا اور ظہور الدین اکمل نے سورۃ الرحمٰن، عبدالکریم قریشی نے سورۃ الفاتحۃ اور مولوی محمد عالم قلعداری نے سورۃ الاخلاص، سورۃ الفیل، سورۃ الکہف، سورۃ الضحی اور سورۃ الکوثر کی تفسیریں لکھیں ۔ حیات محمد واعظ (۱۸۴۳ تا ۱۹۲۳ء) نے نویں پارے تک تفسیر مکمل کی تھی کہ موت نے آلیا ۔ ان کے بعد ان کے بھتیجے محمد علی فائق نے اسے تکمیل تک پہنچایا ۔ دیگر ممتاز تصنیفات یہ ہیں : ظہور الدین اکمل : شرح کافیہ؛ مولوی محبوب عالم : ستر المومنات، ترتیب الصلوٰۃ، شرح قصیدۂ مالی، شرح خلاصۂ کیدانی، ہدایت نامہ و عقد نامہ اور آداب الفقرا؛ نجم الدین فائز : کتاب المناقبات؛ عبدالکریم قریشی : روح المیلاد فی ذکر المیلاد، صلح نامۂ حدیبیہ اور تاریخ فتح مکّہ؛ محمد اعظم قریشی : نماز اعظم (۱۹۰۴ء)؛ نورالحسن خادم : ستر النساء (۱۹۳۶ء)؛ غلام رسول عادل گڑھی : ترجمۂ قصیدۂ غوثیہ؛ مولوی دلپذیر بھیروی : قصص المحسنین، وعظ دلپذیر، گلزار چہار یار، گلزار موسٰی، انواع دلپذیر اور ترجمۂ دیوان حافظ، وغیرہ؛ میاں محی الدین مہدی : ترجمۂ فقہ اکبر، ردّ تقلید، شرح نجات المؤمنین اور پند نامہ؛ خواجہ قمر الدین : رسالۂ روایت؛ امام الدین واعظ : حقوق الزوجین؛ محمد امین : اظہار السنن، احوال الآخرۃ، معجزۂ محمدی اور شرح اسماء الحسنٰی؛ جان محمد : وفات نامہ؛ نوری : سفر نامۂ حج؛ خان محمد : نعتیہ دیوان اور علی اکبر : چرخۂ رسولی ۔ ان کے علاوہ اکبر علی قانونگو، حاتم علی ڈسکوی، میاں مصطفٰی، کریم بخش اور امیر علی کے جنگ نامے اور خادم حسین ہاشمی، اشرف فاروقی، عارف گجراتی، نذیر احمد اختر اور منظور احمد بٹ کے معراج نامے بھی قابل ذکر ہیں.

نثر میں ”سکھی ادب“ بہت لکھا گیا ۔ ابتدائی تحریروں میں سکھ گوروں کی جنم ساکھیاں، گوشٹاں (گفتگوئیں) اور پرچیاں نیکے (گرنتھ صاحب کے شبدوں کی تشریح) آتے ہیں ۔ گراہم بیلی نے انجیل کا اور امام دین شہباز نے زبور کا پنجابی میں ترجمہ کیا ۔ حال ہی میں جوشوا فضل الدین نے بائبل کا منظوم ترجمہ شائع کیا ہے ۔ عیسائی پادریوں نے پنجابی میں خاصا تبلیغی لٹریچر تیار کیا ۔ فقیر نور حسین سیالکوٹی نے بھگوت گیتا کے فارسی ترجمے کو پنجابی میں منتقل کیا ۔ اسلامی ادب میں حافظ برخوردار کی بوھل نماز پہلی نثری تصنیف ملتی ہے ۔ ان کے دوسرے رسالے پکی روٹی، مکھی روٹی اور مٹھی روٹی تعلیم اطفال کے لیے لکھے گئے ۔ سوال و جواب کے انداز میں فقہی مسائل پر متعدد کتابیں لکھی جاتی رہیں ۔ عبدالکریم بگھیانوی کی تصنیف نجات المؤمنین کی مبسوط شرح میر سید مخدوم نے لکھی ۔ ان سے قطع نظر قرآن مجید کے نثر میں ترجمے بھی ہوئے، جن میں سے [الٰہی بخش حلوائی]، عبداللہ چکڑالوی اور میاں محمد جٹو کے ترجمے مشہور ہیں ۔ [حال ہی میں پنجابی ادبی لیگ، لاہور نے میاں ہدایت اللہ کا ترجمہ مع متن شائع کیا ہے]۔

مآخذ : (۱) Grierson : *Linguistic Survey of India*، ج ۸ و ۹؛ (۲) R.V. Jahagirdar : *An Introduction to the Comparative Philology of Indo-Aryan Languages*، پونا ۱۹۳۲ء؛ (۳) بنارسی داس جین : *A Phonology of Panjabi and Phonetic Reader*؛ (۴) انور شبنم دل : *Studies in Pakistani Linguistics*،

لاہور ۱۹۶۵ء؛ (۵) سیّد محمد لطیف: *History of the Punjab*، لاہور ۱۸۸۸ء؛ (۶) تارا چند: *Influence of Islam on Indian Culture*؛ (۷) لاجونتی راما کرشنا: *Panjabi Sufi Poets*، مطبوعۂ مجلس شاہ حسین، لاہور؛ (۸) موہن سنگھ: *A History of Panjabi Literature*، مطبوعۂ لاہور؛ (۹) وہی مصنف: *An Introduction to Panjabi Literature*، لاہور ۱۹۵۰ء؛ (۱۰) وحید قریشی: *A Survey of Panjabi Language and Literature*، در *Journal of the Pakistani Historical Society*، اپریل ۱۹۶۷ء؛ (۱۱) نجم حسین سیّد: *Recurrent Patterns in Punjabi Poetry*، لاہور ۱۹۶۸ء؛ (۱۲) I. Sereleryakev: *Panjabi Literature*، ماسکو ۱۹۶۸ء؛ (۱۳) *Pakistan Year Book 1960*، کراچی ۱۹۶۹ء؛ (۱۴) بدھ سنگھ: پریم کہانی، مطبوعۂ لاہور؛ (۱۵) موہن سنگھ: پنجابی ادب دی مختصر تاریخ، مطبوعۂ لاہور؛ (۱۶) مولا بخش کشتہ: پنجابی شاعراں دا تذکرہ، مطبوعۂ لاہور؛ (۱۷) عبدالغفور قریشی: پنجابی زبان دا ادب تے تاریخ، مطبوعۂ لاہور؛ (۱۸) بنارسی داس جین: پنجابی زبان تے اوہدا لٹریچر، لاہور ۱۹۶۱ء؛ (۱۹) اعجاز الحق قدوسی: تذکرۂ صوفیائے پنجاب، کراچی ۱۹۶۲ء؛ (۲۰) محمود شیرانی: پنجاب میں اردو، طبع وحید قریشی، لاہور ۱۹۶۳ء۔ دیگر مآخذ کے لیے دیکھیے متن مقالہ۔

(ادارہ [و محمد آصف خان])

⊗ پنج پیر: (ـ پانچ پیر)۔

۱ ـ تمہید: برصغیر پاک و ہند (شمالی) میں پانچ پیروں کا عقیدہ عام ہے۔ اسی سے وہ کیش بنا جسے ’’پانچ پیریہ‘‘ کہتے ہیں اور جس کی نہ صحیح اسلام میں کوئی جگہ ہے نہ ٹھیٹھ ہندو مت میں۔ بایں ہمہ ان دونوں مذاہب کے پیرو اس کیش میں شامل ہیں۔ اور یہ عقیدہ خاصے وسیع پیمانے پر مروّج ہے۔ ان پڑھ مسلمانوں کو ان سے بڑی ارادت ہے اور نیچ ذات ہندوؤں میں بھی ان کی عبادت کا مخفی طریق رائج ہے۔

’’پانچ پیری‘‘ کیش یا عقیدۂ پنج پیریہ اس پنجکڑی کے کسی ایک پیر سے ارادت پر مبنی نہیں، بلکہ بحیثیت مجموعی سب پر اعتقاد سے عبارت ہے۔ اگرچہ اس پنجکڑی کے ہر پیر کی اپنی اپنی مخفی روحانی قوتیں ہیں، لیکن اسے معین طور پر پنجکڑی کے ارکان میں شامل کرتے ہی اس کی یہ قوتیں سلب ہو جاتی ہیں، کیونکہ پنجکڑی سے متعدّد قوتیں مخصوص تصور کی جاتی ہیں؛ ان میں سے اکثر کسی انفرادی نوعیت کی حامل نہیں بلکہ مل کر یہ قوتیں حاصل ہوتی ہیں۔

۲ ـ تشریح مصطلحات: بنگال، بہار اور صوبجات متحدہ (موجودہ اتر پردیش) میں تو یہ پنجکڑی ’’پانچ پیر‘‘ کے نام سے مشہور ہے اور پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے (مغربی پاکستان) میں ’’پنج پیر‘‘ سے۔ یہ ترکیب دو لفظوں سے بنی ہے۔ پہلا لفظ ’’پانچ‘‘ یا ’’پنج‘‘ ہے اور دوسرا ’’پیر‘‘۔ اوّل الذکر تو صاف ظاہر ہے کہ آریائی لفظ ’’پنچ‘‘ کی صوتی تصریف ہے۔ ’’پنچ‘‘ آج بھی سنسکرت زبان میں محفوظ ہے، جو آریاؤں کی زبان کی ہندی شاخ ہے۔ پھر اگر ’’پنج‘‘ کو فارسی ہی کا لفظ قرار دیا جائے تو اس کا اصل آریائی زبان کی ہندی شاخ سے مشتق ہونا خارج از امکان نہیں سمجھا جا سکتا۔

’’پانچ پیر‘‘ یا ’’پنج پیر‘‘ کی ترکیب غالباً ہندی مسلمانوں ہی کی وضع کردہ ہے تاکہ ’’پنج تن‘‘ کے عقیدے کے مماثل، جو ایران اور ہندوستان میں رائج ہے، اپنی ایک پنجکڑی قائم کر سکیں؛ چنانچہ انہوں نے لفظ ’’تن‘‘ کو ’’پیر‘‘ سے بدل دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے (مغربی پاکستان) نے چونکہ ایرانی اسلامی ثقافت کے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ

قوی اثرات خاصے طویل عرصے تک قبول کیے، لہٰذا ان کے یہاں اصوات کا نشو و نما جس طرح ہوا اس میں انھوں نے آریائی پانچ یا پنج کی ایرانی شکل کو برقرار رکھا۔ یہی بات بعینہ ہمیں لفظ پنجاب میں نظر آتی ہے، جو الفاظ ”پنج“ (پانچ) اور ”آب“ (پانی) کا مجموعہ ہے اور جس کے معنی ہیں پانچ دریاؤں کی سر زمین۔

دوسرا لفظ ”پیر“ فارسی ہے اور ”پنج پیر“ اور ”پانچ پیر“ دونوں تراکیب میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کے اولین معنی اگرچہ ”بوڑھے“ یا ”بوڑھے آدمی“ کے ہیں، تاہم ثانوی طور پر اس سے ”مقدّس انسان“ یا ”ولی اللہ“ بھی مراد لے لیا جاتا ہے؛ چنانچہ ہم اس کا مقابلہ پالی لفظ ”تھیرا“، بمعنی ”بوڑھا آدمی“، سے کریں تو غیر مناسب نہ ہوگا، اس لیے کہ یہ پالی لفظ سنسکرت لفظ ”ستھویر“ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ”بوڑھا“، ”معمر آدمی“؛ لہٰذا ممکن ہے فارسی لفظ ”پیر“ اصل میں سنسکرت لفظ ستھویر ہی سے ماخوذ ہو، پھر اصل سنسکرت لفظ میں صوتی تغیر کے باعث اس کے معنی بھی بدل گئے ہوں، کیونکہ پرانے لوگوں کا یہ عام خیال تھا کہ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ انسان کی دانائی میں بھی اضافہ ہوتا ہے اس لیے اس قسم کے انسان کے جسم کو حنوط کر کے مقبرے میں محفوظ کر لینا ضروری ہے، تا کہ موقع پڑنے پر ان سے مشورہ اور برکت حاصل کی جا سکے۔ اس طرح ان بدھ یادگاروں کی ابتدا ہوئی جنھیں ”چیتیہ“ کہا جاتا ہے اور جو ”تھیروں“ کے مقبروں پر بنائی گئیں اور یونہیں مسلمانوں کے یہاں پیروں کے مزاروں پر مقبرہ سازی کا آغاز ہوا۔

۳۔ پنج پیریہ کے ارکان خمسہ: پنج پیری کیش کے ارکان خمسہ کی ٹھیک تعیین دشوار سی بات ہے، اس لیے کہ ان پیروں کی فہرست اپنے معتقدین کے مختلف حلقوں میں مختلف ملتی ہے؛ یہی حال ان مقامات کا ہے جہاں انھیں مقبولیت حاصل ہے اور ان کے پیرو رہتے بستے ہیں۔

پنجاب میں بعض اوقات یہ پنجکڑی خواجہ قطب الدینؒ (۱۱۳۲ - ۱۲۳۶ء)؛ خواجہ معین الدینؒ چشتی اجمیری (۱۱۴۲ - ۱۲۳۵ء)، شیخ نظام الدینؒ اولیا دہلوی (۱۲۳۶ - ۱۳۲۵ء)، نصیر الدینؒ ابوالخیر (م ۱۳۵۶ء) اور سلطان ناصر الدین محمود (۱۲۴۶ - ۱۲۶۶ء) پر مشتمل تصور کی جاتی ہے، لیکن ان کی ایک اور فہرست بھی ملتی ہے جو حسب ذیل ہے: بہاء الدین زکریاؒ ملتانی (۱۱۶۹ - ۱۲۶۶ء)، شاہ رقعۂ عالمؒ حضرت لکھنوی، شاہ شمس تبریزؒ ملتانی (م ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء)، اُچ کے شیخ جلال مخدومؒ جہانیاں جہاں گشت (۱۳۰۷ - ۱۳۸۳ء) اور پاکپٹن کے بابا شیخ فرید الدینؒ شکر گنج (۱۱۷۶ - ۱۲۶۹ء) (*ERE*، طبع J. Hastings، ۱۹۱۷ء، ۹: ۶۰۰)۔

ان دو فہرستوں کے علاوہ پنجاب میں پانچ پیروں کی اور بھی فہرستیں ہیں، جن میں نہ صرف ایسے مشہور مشائخ کے نام ملتے ہیں جن کی شخصیت تاریخی ہے اور جن کا مثلاً اوپر ذکر آ چکا ہے، بلکہ سخی سرور سلطان اوز غازی میاں وغیرہ جیسی ہستیاں بھی شامل ہیں۔

سخی سرور کی شخصیت کے متعلق ایسی حکایتیں مشہور ہیں جو افسانوی معلوم ہوتی ہیں۔ وادی سندھ میں پیر مذکور کو جس مقام سے نسبت دی جاتی ہے اس کا نام بھی اس کے نام پر سخی سرور رکھا گیا ہے، جو گویا اس سر زمین کے قدیم مذہب اور اس کی زرخیزی کا مرکز ہے، اور

فرقۂ سلطانی کے لیے ایک زیارت گاہ ہے (دیکھیے H. A. Rose کا مقالہ پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے بارے میں، در ERE، ۹، ۱۹۱۷ء: ۶۰۳ ببعد).

البتّہ غازی میاں کی شخصیّت، جو زیادہ تر سالار مسعود غازی کے نام سے مشہور ہیں اور جنھوں نے شمالی ہند میں تقریبًا ایک افسانوی حیثیت اختیار کر رکھی ہے، ایک تاریخی ہستی ہیں۔ ہندوستان میں ان کے کارناموں کا بیان مرآۃ المسعودی میں ملے گا، اس میں لکھا ہے کہ محمود غزنوی (۹۹۸ تا ۱۰۳۰ء) نے اپنے بھتیجے سالار مسعود غازی کو مشرقی علاقوں کی تسخیر کے لیے بھیجا، جہاں سے ہندو کثیر تعداد میں پنجاب میں غزنوی عساکر پر حملہ کرنے کے لیے بڑھے آ رہے تھے۔ مسعود غازی نے ہندوؤں کے خلاف بڑے زور کی لڑائی جاری رکھی اور گنگا کا سارا میدان فتح کر لیا، گو آگے چل کر ۱۰۳۳ء میں وہ اودھ میں بھڑائچ کے قریب شہید ہو گئے (بحوالۂ اقتباس مندرجہ در Dowson and Elliot: *History of India*، لنڈن ۱۸۶۹ء، ۲: ۵۱۳ ببعد)۔ کہا جاتا ہے کہ غازی موصوف نے اودھ کے ضلع بارہ بنکی میں سَتْرکھ کے مقام پر شہادت پائی (نیز دیکھیے ابن بطوطہ: عجائب الاسفار (اردو ترجمۂ خلیفہ محمد حسین، بذیل حواشی)، جہاں ہر سال مارچ کے مہینے میں ان کی عقیدت میں ایک بڑا میلا لگتا ہے اور بعض دوسرے مقامات پر بھی اسی قسم کی تقریبات منائی جاتی ہیں، مثلاً صوبجات متحدہ کے مقامات گورکھ پور اور بھادوہی ضلع میرزا پور، جہاں سنگ یادگار بھی نصب کیے ہوے ہیں (ERE، طبع Hastings، ۹، ۱۹۱۷ء: ۶۰۱).

شمال مغربی سرحدی صوبے (مغربی پاکستان) کے علاقۂ یوسف زئی میں ایک پہاڑی ہے، جسے "پنج پیر" کہتے ہیں۔ یہ پہاڑی سطح سمندر سے تقریبًا ۲،۳۰ فٹ بلند ہے اور اس کی چوٹی اس کے دامن سے کوئی ۹۳۰ فٹ اونچی ہے۔ اس چوٹی پر پنج پیر کی زیارت ہے، جو ایک معمولی سے مکان پر مشتمل ہے۔ پنج پیر کی اس زیارت ہی کی وجہ سے اس پہاڑی کا نام بھی پنج پیر رکھا گیا تھا۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے مرجع عقیدت ہے۔ ان پانچ پیروں میں بہاءالدین زکریا ملتانی (۱۱۶۹ تا ۱۲۶۰ء) کا نام سر فہرست ہے، لیکن مقامی ہندوؤں کا خیال یہ ہے کہ اس پہاڑی کا پرانا نام "پنج پانڈو" ہے، اس لیے کہ اسے زمانۂ قدیم ہی سے پانچ پانڈوؤں سے نسبت چلی آ رہی ہے۔ اسلامی فتح کے بعد اس پہاڑی کو پانچ پیروں کا مسکن ٹھیرایا گیا اور یوں اس کا نام پنج پیر ہوا (وشو کوش، مطبوعۂ کلکتہ، ۱۰: ۵۹۹)۔ ضلع ہزارہ (مغربی پاکستان) کے شہر ایبٹ آباد میں بھی ایک تکیہ "پنج پیر" کے نام سے منسوب ہے.

"صوبجات متحدہ (= یو۔ پی، بھارت) میں مجموعۂ (پنج پیر) کے ارکان میں نسبۃً بہت کم درجے کی ہستیاں شامل ہیں۔ ایک فہرست غازی میاں، امینہ ستی، ہیروں، بڈھنا اور بندے کے ناموں پر مشتمل ہے۔ امینہ ستی ہو گئی تھی یعنی وفا شعار بیوی تھی، جو اپنے خاوند کی چتا پر جل کر مر گئی۔ آخری وہ تین ارواح بد ہیں، جن میں خدائی صفات پیدا کر لی گئی ہیں اور جنھیں نیچ جاتیاں ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہیں (ERE، طبع Hastings، ۹، ۱۹۱۷ء: ۶۰۰)۔ ان فہرستوں کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ان سب میں سر فہرست غازی میاں" یا سالار مسعود" کا نام ہوتا ہے اور ان کے بعد چار دوسرے مقامی پیروں کا، خواہ ان کی شخصیت تاریخی ہو یا غیر تاریخی، مثلاً مکن پور کے شاہ مدار، گیا کے

سلطان شہیدؒ، اور شیخ سدّوؒ وغیرہ۔ شاہ مدارؒ کوئی افسانوی بزرگ نہیں ہیں، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ ان کا پورا نام ہے بدیع الدین شاہ مدارؒ (م ۱۴۳۶ء) اور گجرات، اجمیر، قنوج، کالپی، جونپور، لکھنؤ، کنتور اور بنگال میں ان کی تبلیغ اسلام کی روداد بھی ملتی ہے (مرآۃ المداری، تذکرۂ صوفیہ کا ایک مخطوطہ، عدد ۸۸، بوہار **Buhar** لائبریری، کلکتہ)۔

بہار، مغربی بنگال اور بالخصوص بیر بھوم، بنکورا اور بردوان کے ضلعوں میں، جو بہار سے ملحق ہیں، پانچ پیری فہرستوں کی تقریباً یہی کیفیت ہے۔ یہاں اس پنجکڑی میں بڑے معروف پیر اور بعض افسانوی شخصیتیں بھی شامل ہیں، مثلاً غازی میاں، پیر بدر، زندہ غازی، شیخ فرید اور خواجہ خضر بلکہ شیخ سدو بھی۔ گو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانیے تو یہ نام بھی بدل جائیں گے، بایں ہمہ پانچ پیروں سے نہ صرف بعض مسلمانوں بلکہ ہندوؤں میں سے کلوروں، حلوائیوں، تیلیوں اور بھوئیوں اور بہار کی متعدد جاتیوں کو عقیدت ہے (*Census of India*، ۱۹۰۱ء، ج ۶، باب ۴: ص ۱۸۰، طبع E.A. Gait)۔

جہاں تک مغربی اور شمالی بنگال کا تعلق ہے پانچ پیروں کی ان فہرستوں میں اسمٰعیل غازی کے نام کا اضافہ قابل ذکر ہے۔ انہوں نے شمالی بنگال اور کامروپ کے ہندو راجاؤں سے جنگ کی، ان پر فتح پائی اور پھر اس سارے علاقے میں اسلام کی تبلیغ کی۔ انہیں سلطان باربک شاہ (۱۴۵۹ تا ۱۴۷۴ء) نے ۱۴۷۴ء میں قتل کر دیا تھا۔ ضلع رنگ پور میں کانتا دوار کے مقام پر ان کی درگاہ مشہور ہے، اور اسے ہندو اور مسلمان دونوں احترام اور عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں (دیکھیے *Notes on Shah Ismail Ghazi*، در *JSAB*، ۴۳، ۱۸۷۴ء: ۲۱۵ ببعد)۔

مشرقی پاکستان میں تقریباً نصف صدی پہلے تک غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں اور نیچ ذات کے ہندوؤں پر پانچ پیروں کا اثر نہایت گہرا تھا، جس کا ثبوت ملک میں جگہ جگہ پانچ پیری درگاہوں سے ملتا ہے۔ لوگ اب بھی ان درگاہوں کی زیارت کرتے اور منت پوری ہونے پر شیرینی چڑھاتے ہیں۔ ایسی دو درگاہیں بالخصوص اہم ہیں۔ ایک ڈھاکے کے قریب ستار گاؤں میں ہے اور دوسری تالورا میں، جو (ضلع) بوگرا میں ایک ریلوے سٹیشن ہے۔ قبل ازیں تالورا میں پانچ پیروں کے اعزاز میں ہر سال ایک مداری میلا لگتا تھا، اب اس نے ایک سالانہ عرس کی شکل اختیار کر لی ہے (قاضی محمد مست: *Bagndār Itikāhini*، ۱۹۵۷ء، ص ۳۸۵)۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ پانچ پیروں کی اس جماعت کی سربراہی شاہ مدار کے حصے میں آئی تھی۔

مشرقی پاکستان میں چونکہ دریاؤں اور پانی کی فراوانی ہے، لہٰذا قدرتی امر ہے کہ اس صوبے کے ملاح اور کشتی ران اس پیر سے برکت کے جویا ہوں جس کا تعلق پانی سے ہے، چنانچہ بدر کو بھی جنھیں چاٹ گام اور اس کے نواحی ضلعوں کے ملاحوں اور کشتی رانوں کے محافظ ولی کی حیثیت حاصل ہے، ’’پانچ پیری‘‘ فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ جب کبھی کسی بڑے دریا کو عبور کرنا ہو یا سمندر کا کوئی سفر درپیش ہو تو اس علاقے کے مسلمان کشتی ران اب بھی ایک عوامی دعا مانگتے ہیں جو حسب ذیل ہے:

’’اللہ، نبی، پنج پیر، بدر بدر، بدر‘‘، جس کا مطلب یہ ہے کہ ’’اے اللہ، ہم تجھے پکارتے ہیں کہ تو ہم پر رحم کرے اور تیرے رسول کو کہ ہمیں برکت دے اور اے پانچ پیرو ہم آپ سب کو پکارتے، بالخصوص آپ کے سردار بدر ہیں

دو کہ ہماری حفاظت کریں"

مشرقی پاکستان کے مسلمان کشتی رانوں کے یہاں اس پنجکڑی کی متعدّد فہرستیں ہیں۔ ایک فہرست یوں ہے: شاہ بدر، شاہ سلطان، شاہ جلال، شاہ محسن اور شیخ فرید۔ بعض اوقات شاہ محسن کی جگہ شاہ پیر کو دے دی جاتی ہے۔ یہ سب پیر تاریخی شخصیتیں ہیں اور مشرقی پاکستان میں ان کی درگاہیں یا ''استھان'' موجود ہیں: بدر شاہ کی (جو ۱۲۳۶ - ۱۳۵۲ء میں زندہ تھے) درگاہ بخشی بازار، چاٹ گام شہر میں واقع ہے؛ شاہ سلطان، یا سلطان بایزید بسطامی (م ۸۷۴ء) کا فرضی مقبرہ نصیر آباد چاٹ گام میں ہے؛ شاہ جلال (م ۱۳۴۶ء) کی درگاہ سلہٹ میں؛ شاہ محسن (م ۱۳۹۷ء) کی درگاہ بٹ تالی Bat-tali تھانہ انورا، چاٹ گام میں؛ شیخ فرید (۱۱۷۶ - ۱۲۶۹ء) کی ''چشمہ'' سلوک بحر (جو اب بدل کر شولا شہر ہو گیا ہے) چاٹ گام میں اور ان کا فرضی مقبرہ فرید پور میں ہے۔ شاہ پیر کی مشہور درگاہ ست کنیا، چاٹ گام میں ہے (ایم۔ ای۔ حق: بنگے صوفی پربھواء، کلکتہ ۱۹۵۵ء، ص ۱۴۴ ببعد)۔

ایسے ہی جب کبھی دریا یا سمندر کے راستے کوئی خطرناک یا طویل سفر درپیش ہو تو میمن سنگھ اور ڈھاکے کے ہندو اور مسلمان کشتی ران اب بھی غازی میاں اور پانچ پیروں سے اظہار ارادت کے لیے ایک عوامی وظیفہ پڑھتے ہیں جو ذیل میں درج ہے، تاکہ اس سفر میں آنے والی مصیبت کا سدّباب ہو جائے:

امرا اچھی پولا بین
غازی آچھے نگہبان
نی رہے گنگا دریا
پنچ پیر! بدر، بدر، بدر؛
ہم تو بچے ہیں،
لیکن غازی (پیر) ہمارے نگہبان ہیں،
ہمارے سامنے گنگا دریا ہے،
پانچ پیرو! ہم آپ سب کو پکارتے ہیں،
بالخصوص آپ کے سردار (پیروں کے پیر) بدر کو۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس پنجکڑی میں، جس میں پیر بدر کا نام سر فہرست ہے، غازی میاں کا نام ایک افسانہ ہے، گو انھیں از راہ ادب اس سے الگ رکھا گیا ہے، اس لیے کہ وہ کشتی رانوں کے محافظ ہیں اور انہیں وہ اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔

سنار گاؤں میں (جہاں کبھی مشرقی بنگال کا پرانا دارالسلطنت آباد تھا)، جو ایک موضع ہے اور جو نرائن گنج اور ڈھاکے سے کچھ زیادہ دور نہیں، ایک درگاہ ہے، جس کی قریب و دور کے دیہات کے رہنے والے کشتی ران بڑی تعظیم و تکریم کرتے ہیں؛ یہاں پانچ پیروں کی ایک نئی فہرست ملتی ہے۔ یہ درگاہ پہلو بہ پہلو بنے ہوئے پانچ ٹوٹے پھوٹے لمبے قبروں پر مشتمل ہے، جن میں کہا جاتا ہے کہ پانچ پیر یعنی شاہ سکندر، شمس الدین، غیاث الدین، غازی میاں اور غازی کالو عبادت گزاری کرتے تھے (وشو کوش *Viswakos*، ۱۱، کلکتہ: ۱۰۹)۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس فہرست کے پہلے تین پیر وہ ہیں جو بنگال کے پہلے تین خود مختار سلطان تھے، جنھوں نے یکے بعد دیگرے یہاں حکومت کی، صراحت حسب ذیل ہے:

۱۔ شمس الدین الیاس شاہ (۱۳۴۳ تا ۱۳۵۷ء)۔
۲۔ سکندر شاہ (۱۳۵۷ تا ۱۳۹۳ء)۔
۳۔ غیاث الدین اعظم شاہ (۱۳۹۳ تا ۱۴۷۰ء)۔

ان تینوں بادشاہوں میں پہلے دو کی شہرت کا انحصار محض ان کی شجاعت پر نہیں تھا کہ انہوں نے سلاطین دہلی کا مقابلہ بڑی جوانمردی اور بہادری

سے کیا اور انہیں شکست دی بلکہ اس امر پر بھی کہ انھوں نے بہار، اڑیسہ، نیپال اور مشرقی بنگال کے ہمسایہ ہندو راجاؤں اور سرداروں سے جنگ کی اور ان کے علاقوں کو جزوی یا کُلّی طور پر اپنی حکومت میں شامل کر لیا ۔ تیسرا بھی بڑا صاحبِ سطوت اور روشن خیال حکمران تھا اور رعایا سے اپنے عدل و انصاف میں ضرب المثل ۔

غازی کالو یا کالو غازی اسلامی بنگالی ادب کے متاخّر متوسط دور کی ایک روحانی شخصیّت ہے ۔ مورخینِ اسلام کے نزدیک تو وہ افغانی الاصل تھا، لیکن ہندو روایات کی رو سے نو مسلم، جس کا خطاب تھا، ''کالا پہاڑ (Kālāpahad)'' اور جو غالباً ہندوؤں نے اسے بنگال، بہار، اڑیسہ اور آسام کی بادشاہتوں کو تباہ کر دینے کی بنا پر دیا تھا ۔ وہ بنگال کے کرانی حکمرانوں کا ایک سپہ سالار تھا اور ۱۵۸۰ء میں اکبر سے لڑتا ہوا مارا گیا ۔ (ایس مترا: سرل بنگلا ابھی دان، بار ششم، کلکتہ ۱۹۲۸ء، ص ۳۳۹؛ R.C. Majumdar and others: *An advanced History of India*، لنڈن، ص ۳۸۶).

۴ - پنج پیری عقائد و اعمال: ''پانچ پیری'' فہرست کی طرح اس کیش کے عقائد اور اعمال بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ بایں ہمہ، کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس بنیادی اور عام عقیدے کا ایک لازمی نتیجہ ہیں کہ یہ پیر اگرچہ جسمانی طور پر مردہ ہیں لیکن روحانی طور پر زندہ، اور انہیں مافوق الفطرت قوتیں حاصل ہیں، جن کی بدولت وہ اپنے ماننے والوں کے کام آتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں ۔

پھر وہ مقامات بھی، جو پانچ پیروں سے ارادت کے سلسلے میں قائم ہوئے، باہم مختلف ہیں؛ نہ ان میں کوئی ایک تصوّر کام کر رہا ہے، نہ طرزِ تعمیر میں وہ ایک سے ہیں، نہ تسمیہ ہی ایک سا ہے ۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں انہیں ''زیارت'' کہا جاتا ہے، یعنی وہ مقام جہاں لوگ زیارت کے لیے جاتے ہیں، اور پنجاب میں درگاہ ۔ صوبجات متحدہ، بہار اور بنگال کے مسلمان بھی انہیں درگاہ کہتے ہیں یا آستانہ ۔ ہندوؤں کے یہاں ان کے نام ہیں: ڈھیری (ٹیلے)، آسن (نشستیں) ویدی (چبوترہ) ۔ وہ عام طور پر چھوٹے چھوٹے پانچ گنبدی مقبروں پر یا کسی پیپل (اسوتھا) Asvattha یا برگد (وٹا Vata) کے پیڑ تلے بنے ہوئے سادے ٹیلوں پر مشتمل ہوتے ہیں، یا پھر ان ٹیلوں پر پھوس کی معمولی چھتیں بنی ہوتی ہیں، یا یہ مسکونہ مکانات کے کمروں میں بنے ہوئے چبوتروں سے عبارت ہیں، جہاں حصولِ اولاد یا کسی ناقابلِ علاج بیماری سے نجات یا کاروبار میں کامیابی وغیرہ کے لیے بکروں، مرغوں، مٹھائیوں اور پھولوں وغیرہ کے چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں.

مغربی بنگال اور بہار میں پانچ پیروں کے مرید اپنے مکان میں کوئی کمرہ اس لیے الگ کر دیتے ہیں کہ وہاں وہ ان پیروں کی بحیثیت خاندانی دیوتاؤں کے عبادت کر سکیں ۔ عام طور پر کمرے کے شمال مغربی گوشے میں سے اٹھائی ہوئی چوکی پر چھوٹا سا چبوترہ ان کی نمائندگی کرتا ہے ۔ چبوترے کے قریب چوکی پر انسانی ہاتھ سے مشابہ لوہے کا ایک پنجہ رکھ دیا جاتا ہے، جس کی کلائی پر ایک زرد پارچہ لپٹا رہتا ہے؛ پانچ پیروں کی علامت کے طور پر پنجے کی پانچوں انگلیوں کے ارد گرد کپڑے کے ٹکڑے لپیٹ دیے جاتے ہیں ۔ ہر چہار شنبے کو یہ چبوترہ دھویا جاتا ہے (چوکی پر کھریا مٹی سے لپائی کی جاتی ہے)، کوئی خوشبودار چیز جلائی جاتی ہے اور پھلوں کا چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے ۔ خاص خاص موقعوں پر (کوئی منت پوری ہونے یا پوری ہونے کی توقع پر) بکروں یا مرغوں کی قربانی بھی کی جاتی ہے ۔ اگر مرید ہندو ہے تو وہ بالعموم

کسی مسلمان دفلی فقیر (ڈھول بجانے والے مسلمان فقیر) سے کہے گا کہ اس تقریب کو اس کی طرف سے ادا کر دے ۔ ہندو پنج پیری مسلمان قصائیوں کا ان کی شریعت کے مطابق ذبح کردہ بکریوں کا گوشت کھا لیتے ہیں، لیکن ایسے جانور کے گوشت کو ہاتھ نہیں لگائیں گے جو کسی ہندو دیوتا کی بھینٹ چڑھایا گیا ہو؛ تاہم ہندو دیوتاؤں کی پوجا پاٹ میں کوئی کمی نہیں کرتے (Sensus of India، ۱۹۰۱ء، E.A. Gait، ج ۶، Bengal Report، حصہ ۱، ص ۱۸۵ ببعد)۔

مغربی بنگال کے ضلع چوبیس پرگنہ میں البتہ پانچ پیروں کی خوشنودی جس طرح حاصل کی جاتی ہے اس کا طریقہ اس صوبے کے دوسرے ضلعوں سے بالکل مختلف ہے ۔ زیادہ تر مسلمان ہی ان کے ارادت مند ہیں ۔ وہ پانچ پیروں کے لیے شیرینی کا چڑھاوا چڑھاتے ہیں، جو زیادہ تر دودھ، ناریل، شکر اور چاول پر مشتمل ہوتا ہے ۔ پھر چند مقررہ الفاظ کا ورد بطور دعا کر لینے کے بعد یہ شیرینی محلے کے بچوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے ۔ بڑی عمر کے آدمی شیرینی لینے سے اجتناب کرتے ہیں ۔ یہ پانچ پیری تقریب عام طور پر ملاؤں کی وساطت سے ادا کی جاتی ہے ۔ جو رقم شیرینی کے خرچ کے لیے ضروری ہے وہ آنے ہوں یا روپے، اسے مریدوں کی مالی استطاعت کے مطابق ہمیشہ پانچ یا پانچ کا حاصل ضرب ہونا چاہیے ۔

مشرقی بنگال میں بھی شیرینی کی نذر چوبیس پرگنہ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی ۔ علاوہ دودھ، ناریل، چاول، شکر وغیرہ کے خاص خاص موقعوں پر بکروں اور مرغوں کی قربانی بھی دی جاتی ہے اور شیرینی، جو گویا ہر قسم کی قربانی کے لیے ایک عام اصطلاح ہے، تمام حاضرینِ مجلس میں تقسیم کر دی جاتی ہے ۔

پانچ پیروں کے مریدوں کا اعتقاد ہے کہ اس پنجکڑی سے اگر دلی عقیدت اور مقررہ طریق پر اظہارِ ارادت کیا جائے تو اس کا نتیجہ لازماً ہمہ گیر خوش حالی کی صورت میں برآمد ہو گا؛ چنانچہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر وباؤں، مثلاً ہیضہ، چیچک، ملیریا، زرد بخار، تپ محرقہ اور امراضِ مویشیاں سے محفوظ رہنے کے لیے اس پنجکڑی ہی سے رجوع کرتے ہیں ۔ ارواحِ بد کے دفعیے یا زیرِ سماعت مقدمات اور اپنے موجودہ کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے وہ پانچ پیروں ہی سے مدد طلب کرتے ہیں ۔ وہ منت مانتے ہیں کہ اگر انہیں ناقابلِ علاج بیماریوں سے شفا ہوئی، یا ان کی فصلیں برباد نہ ہوئیں، یا جس گائے کا دودھ سوکھ گیا ہے وہ پھر سے دودھ دینے لگی، یا جو درخت پھل نہیں لاتا وہ ثمردار ہو گیا، یا بانجھ عورت حاملہ ہو گئی تو وہ ان کی خدمت میں ''شیرینی'' چڑھائیں گے ۔ علاوہ ازیں، دریا یا سمندر کے راستے صحیح سلامت مسافرت کے لیے بھی وہ پنج پیر کی ارواح سے دعا مانگ کر استمداد کرتے ہیں (ایم ۔ ای ۔ حق : Bange Sufi Prabhava، ۱۹۳۵ء، ص ۲۴۴ ببعد)۔

۵ ۔ پانچ پیر کی اصل : صوفیہ کی روحانی اور فوق الفطرت قوتوں پر اعتقاد رکھتے ہوئے پیروں کو الوہی مرتبہ دینا اس ملک میں نیا عقیدہ نہیں، لیکن پانچ پیروں کا یہ مجموعہ برصغیر پاک و ہند کی سرزمین میں یقیناً بڑا انوکھا نظر آتا ہے؛ چنانچہ اسے دیکھتے ہوئے ای ۔ اے ۔ گیٹ E.A. Gait یہ کہنے پر مجبور ہو گیا : ''ایک ایسے ملک میں بھی، جہاں مذہب نے غیر معمولی شکلیں اختیار کر رکھی ہیں، پنج پیریہ کو انتہائی عجیبہ و غریب عقائد میں شمار کرنا

چاہیے۔ اگرچہ اس فرقے کی اصل و ابتدا کا صحیح سراغ لگانا ناممکن ہے، تاہم اتنا واضح ہے کہ یہ ان مفاہمت پسند کلٹوں میں سے ایک ہے جن کا ظہور اس دور میں ہوا جب یہاں مسلمانوں کا غلبہ تھا اور اکثر لوگ اس ملک کے حکمران طبقے اور محکوموں کے درمیان مذہبی اختلافات میں مفاہمت پیدا کرنے کی راہ نکالنے پر غور کرنے لگے تھے“ (*Sensus of India*، ۱۹۰۱ء، ج ۶، بنگال، حصۂ اول: ص ۱۸۵)۔ اب اس پیچیدہ عبارت کا غور سے جائزہ لیا جائے گا تاکہ ہمیں پانچ پیری کی اصل معلوم ہو سکے۔

ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ پانچ پیروں کی فہرست اور ان کے متعلق عقائد و اعمال میں طرح طرح کے اختلافات پائے جاتے ہیں، لہٰذا اس کلٹ کی ابتدا کسی ایک پیر سے منسوب نہیں کی جا سکتی۔ پانچ پیروں کے ارادت مند بھی یہ نہیں مانتے۔ پھر ان میں اگرچہ ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی لیکن نہ تو ٹھیٹھ ہندومت نے پانچ پیروں یا ان کے کلٹ سے کسی گہرے تعلق کا دعوٰی کیا ہے اور نہ راسخ العقیدہ مسلمانوں نے؛ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ پانچ پیریہ ایک مفاہمت پسند کلٹ ہے، جو اسلام اور ہندو دونوں مذاہب کی حدود سے باہر وجود میں آیا۔ رہی یہ بات کہ کہاں، کب اور کیسے پاک و ہند میں اس مفاہمت پسندیّت کا آغاز ہوا، سو یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو کسی قابل قبول حل کا محتاج ہے۔

پانچ پیری فہرستوں میں کیسا ہی اختلاف پایا جائے ان کا بغور مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ بجز خواجہ خضر کے ان میں کسی کا تعلق بھی بیرون ملک سے نہیں ہے؛ لہٰذا بعض فہرستوں میں جو خضر کا نام آ گیا ہے اسے ایک مسلّمہ امر نہیں بلکہ محض اتفاق سمجھنا چاہیے۔ اسلامی دنیا اور بالخصوص اسلامی ہند میں (M. T. Titus: *Indian Islam*، سلسلہ *Religins Quest of India*، ۱۹۳۰ء، لنڈن، ص ۱۳۹ ببعد) خضر کا پانی سے تعلق مانا جاتا ہے، لہٰذا اگر کسی پنجکڑی میں یہ نام آ گیا ہے تو وہ ایک قدرتی بات ہے کیونکہ اس کے ماننے والوں کی بہت بڑی تعداد ملاحوں یا کشتی رانوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح یہ بات بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ مشرقی پاکستان کے کشتی ران اس فہرست میں چاٹگام کے پیر بدر کا نام کیوں شامل کرتے ہیں۔ پیر بدر چاٹگام کے محافظ پیر ہی نہیں بلکہ اس سارے علاقے کے ملّاحوں اور کشتی رانوں کے سرپرست پیر بھی مانے جاتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے ملّاحوں اور کشتی رانوں کو پیر بدر سے جو تعلق ہے اس کی بنا پر غلطی سے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ اور خواجہ خضر ایک ہی شخصیت ہیں (دیکھیے *Census of India*، ۱۹۰۱ء، ج ۶، حصۂ اول: ص ۱۵۸؛ W. Crooke: *Popular Religion and Folklore of North India*، ۱۸۹۶ء، ۱: ۱۳۴)۔ حقیقت یہ ہے کہ خضر کا پیر بدر سے کوئی تعلق نہیں، جو کہ ۱۳۳۹، اور ۱۳۵۲ء کے مابین ستار گاؤں کے فخر الدین مبارک شاہ کے عہد حکومت میں بقید حیات تھے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے بعض اوقات ایک غلط استدلال کی بنا پر بعض لوگ پانچ پیر کی اصل کو “پنج تن” کی شیعی پنجکڑی سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں اور پنج تن سے مراد ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم، آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ، آپؐ کے داماد حضرت علیؓ، آپؐ کے نواسے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ۔ ہو سکتا ہے کہ دیگر ثقافتی تصوّرات کی طرح “پنجتنی” کا خیال بھی اس کے ارکان کے

ناموں سمیت ایران سے ھندوستان میں آیا ھو اور یہی وجہ ھو کہ بلا تغیرِ ارکان وہ ھندوستان میں ھر کہیں پھیل گیا۔ یہ بھی واقعہ ھے کہ ''پنجتن پاک'' اور ''پانچ پیر'' کے عقائد ھندوستان میں پہلو بہ پہلو قائم تھے، جن میں کوئی ایک دوسرے کے رواج کو روک سکا نہ اسے میدان سے بے دخل کرنے میں کامیاب ھوا، دریں صورت قرینِ قیاس یہی ھے کہ 'پنج پیریہ' کیش اصلاً ھندی پاکستانی ھے۔

ڈاکٹر وائز J. Wise نے اپنے دلائل کی بنا اس بات پر رکھتے ھوے کہ پنج پیری فرقہ کے ''گورو'' کی اس میں وھی حیثیت ھے جو نانک شاھی سلسلے میں ''مہنت'' کی، یہ دکھلانے کی کوشش کی ھے کہ پنج پیری عقیدے کی اصل پنجاب کے گورونانک (۱۴۶۹ تا ۱۵۳۸ء) تک پہنچتی ھے (دیکھیے J. Wise: *Notes on the Races, Castes and Trades of East Bangal*، لنڈن، ۱۸۸۳ء، ص ۱۷ ببعد)؛ لیکن ڈاکٹر موصوف کی یہ راے صحیح نہیں، کیونکہ ان کا خیال واقعات پر مبنی نہیں ھے۔ بنگال کے بول فرقے کے اپنے گورو ھوتے ھیں، لیکن اس کے برعکس پانچ پیروں کے پیشوا ھوتے ھیں، جنھیں وہ ''فقیر'' کہتے ھیں۔ بول گورو تو ''اکھڈ'' (سنسکرت اکشوت سے ماخوذ)، یعنی باقاعدہ اجتماعات، کے لیے ایک مجلس بول کی تنظیم کرتے ھیں۔ انھیں ''مہنت'' نہیں کہا جاتا، جو کہ ایک ھندی لفظ ھے (سنسکرت مہنت سے ماخوذ)، اور اس کی اس صوتی شکل سے مشرقی بنگال سرے سے ناآشنا ھے۔ معلوم ھوتا ھے کہ بول اصطلاح ''نلکھ سنی'' کو، جو الکھ سنی (ماخوذ از سنسکرت: نرلکشیہ سوامی اور الکشیہ سوامی) کے طور پر بھی مستعمل ھے (ان دونوں کے معنی ھیں ''نظر نہ آنے والا خدا'') غلطی سے سکھ مت کی اصطلاح ''نانک شاھی'' سے خلط ملط کر دیا گیا تاکہ مشرقی بنگال کے پنج پیروں کے ساتھ، جہاں سکھ پنتھ کو کوئی جانتا بھی نہیں، گورو نانک کا ایک خیالی رشتہ جوڑ دیا جائے۔

مزید برآں اس ھندی ۔ پاکستانی کیش کی فہرستوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ھے کہ یہ تیرھویں سے سولھویں صدی عیسوی تک کے اولیا یا ایسے انسان تھے جنھیں الوھیت کا درجہ دیتے ھوے مریدوں نے اپنی فہرست میں شامل کر لیا۔ ان کی ''درگاھوں'' پر بھی، جو مختلف مقامات میں واقع ھیں، مصیبت زدہ لوگ ھی زیارت کے لیے جاتے ھیں، کیونکہ ان کا اعتقاد ھے کہ یہاں پر مدفون پیر اس قسم کی کرامتوں کے حامل ھیں جو دوسروں کو حاصل نہیں؛ علیٰ ھذا یہ کہ ان کی برکت سے ھر آفت دور ھوسکتی ھے۔ لہٰذا ھم یہ راے رکھنے میں از روے قیاس حق بجانب ھونگے کہ ''پنج پیری'' کے فرقے کی ابتدا کسی خاص زمانے میں، کسی خاص شخص کے ھاتھوں، کسی خاص مقام پر نہیں، بلکہ بتدریج ایک دوسرے سے بے تعلق مختلف مقامات اور مختلف موقعوں پر ذاتی یا جماعتی اعتقاد کی خاطر بطور ایک مخفی طریق کے ھوئی۔ ھماری ثقافتی تاریخ میں یہ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی ایک ایسا زمانہ ھے جب ھندی اور اسلامی ثقافت کا امتزاج ذھنی سرگرمیوں کے مختلف گوشوں میں ھوا۔ معلوم ھوتا ھے کہ دو صدیوں کا یہی دور ھے جس میں پانچ پیری عقائد نے ایک باقاعدہ کیش کی شکل اختیار کی ھوگی۔

پھر یہ بھی غیر ممکن نہیں کہ پانچ پیروں کا خیال سب سے پہلے مغربی پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے اور پنجاب میں پیدا ھوا، وھیں یہ ایک مسئلہ بنا اور وھیں اس نے ایک معین شکل اختیار کی، اور پھر جیسے جیسے اسلام کو ھندوستان میں غلبہ حاصل ھوتا گیا یہ خیال

صوبجات متحدہ (اتّر پردیش، بھارت)، بہار اور بنگال میں پہنچا۔ یہی مفروضہ ہے جس کی بنا پر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی پانچ پیری فہرستوں میں پنجاب اور صوبجات متحدہ کے بعض نام کیوں شامل ہیں۔

بطور ایک پنجکڑی یا ارکانِ خمسہ کے پانچ پیری مجموعہ ہمیشہ ایک عجیب و غریب چیز رہا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں، جہاں پیروں یا ان کی درگاہوں اور آستانوں کی کوئی کمی نہیں، انہیں اکٹھا کیا گیا تو پانچ ہی کے مجموعے میں، نہ اس سے زیادہ نہ کم؛ لہٰذا یہ عدد بڑا معنی خیز ہے، جس کی اربابِ علم نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس موضوع کی گہرائی میں اتر کر توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اگرچہ تعلیم یافتہ مسلمان شرفا کی طرح اونچی جاتیوں کے نیز پڑھے لکھے ہندو بھی پانچ پیروں کی پوجا نہیں کرتے، بایں ہمہ ان کا خیال ہے کہ ان پیروں کے آستانوں یا تھانوں (دونوں الفاظ سنسکرت کے ''ستھان'' بمعنی مقام سے ماخوذ ہیں) کا تعلق مہابھارت کے پانچ پانڈووں سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بارہ برس کا طویل بن باس پورا کرنے کے بعد پانچوں پانڈووں نے گمنامی کی حالت میں سال بھر ہندوستان کے جن مختلف مقامات میں تھوڑا تھوڑا عرصہ قیام کیا انہیں متبرّک خیال کیا جاتا ہے اور وہ بالآخر ہندوؤں کے متبرک مقامات بن گئے۔ اسلامی فتوحات کے بعد ان میں سے کئی ایک مقام پانچ پیروں کی درگاہ یا آستانہ بن گئے۔ یوں پانچ پیروں کی درگاہیں یا آستانے پاکستان و ہند کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے مشترک مقامات اجتماع بن گئے۔ اس کے باوجود کوئی ہندو بھی یقین کے ساتھ یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کون کون سے مقامات ہیں جنھیں ہم پانڈووں سے منسوب کریں گے، بالخصوص مشرقی بنگال، جسے تحریری شہادت کی بنا پر پانڈو ''ورجیت دیس'' کہتے ہیں، یعنی ایک ایسا ملک جس سے پانڈو قطع تعلق کر چکے تھے'' (ایس۔ سی مترا : سرل بنگلہ ابھی دھان، بار ششم، کلکتہ ۱۹۲۸ء، ص ۶۹۲)، جہاں ''پانچ پیریہ آستانے'' بڑی تعداد میں موجود ہیں؛ لہٰذا ''پانڈو استھان'' کا ''پانچ پیریہ آستانے'' میں تبدیل ہو جانے کا سوال کم از کم مشرقی بنگال میں تو پیدا ہی نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں اسلامی ہند کی تاریخ میں کسی پانڈو استھان کو پانچ پیریہ آستانے میں تبدیل کرنے کی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔

پانچ پیری فہرستوں میں ایک بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ (ا) افسانوی پیروں، (ب) تاریخی شخصیّت کے حامل اولیا، (ج) سلاطین اور (د) ہنود کے خلاف جہاد کرنے والے غازیوں کے ناموں پر مشتمل ہیں۔ ان فہرستوں میں افسانوی یا تاریخی شخصیتوں کے حامل مقامی، غیر مقامی اور پیروں کے ناموں کی شمولیت قابل فہم ہے؛ کیونکہ ''ہندوستانی مسلمانوں کا پیروں پر اعتقاد یا ان کی درگاہوں اور مقبروں سے عقیدت کوئی ایسی بات نہیں جو ہندی مسلمانوں ہی سے مخصوص ہو۔ یہ چیز باہر سے ان لوگوں کے توسط سے یہاں پہنچی جنھوں نے افغانستان، ایران اور عراق کے مذہبی سلسلوں کو یہاں رواج دیا۔ پھر ''گورو، چیلا'' کا رواج ہندوؤں میں قدیم سے رائج تھا اور مسلمانوں کی غالب تعداد نے بھی مقامی دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کا عالمگیر عقیدہ اپنے ہندو آبا و اجداد سے ورثے میں پایا تھا، اس لیے پیرپرستی مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا بڑی آسانی سے ایک حصہ بن گئی، (Murray T. Titus : Indian Islam، بسلسلۂ The Religious Quest of India،

۱۹۹۰ء، لنڈن، ص ۱۳۱).

پھر اس بات کا سمجھنا بھی مشکل نہیں کہ دہلی کے تاجدار ناصر الدین محمود (۱۲۴۶ تا ۱۲۶۶ء) اور بنگال کے شمس الدین الیاس شاہ (۱۳۴۳ تا ۱۳۵۷ء)، سکندر شاہ (۱۳۵۷ تا ۱۳۹۳ء) اور غیاث الدین اعظم شاہ (۱۳۹۳ تا ۱۴۱۰ء) ایسے سلاطین کے اسما شامل فہرست ہیں تو از روے احترام، اس لیے کہ ان کی ہندو اور مسلمان رعایا نے ان کے بے داغ کردار اور ان کی دینداری، دادرسی اور غیر معمولی شجاعت کے پیش نظر انھیں بزرگ اور مقدّس ٹھیرایا تھا.

لیکن بعض اوقات اس امر کو سمجھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ غازی میاں (سالار مسعود)، اسمٰعیل غازی اور کالو غازی، (کالا پَہَد) وغیرہ ایسے کفر و شرک کے دشمنوں اور بت شکنوں کے نام ہندوؤں اور مسلمانوں کی پانچ پیری فہرستوں میں کیسے شامل ہو گئے ۔ سرسری نظر سے دیکھیے تو یہ عقدہ لاینحل نظر آتا ہے، لیکن فی الواقع وہ ایسا نہیں ۔ مسلمانوں کے نزدیک غازی کی ہستی بڑی مقدس ہے، لہٰذا ممکن ہے کہ اس لڑنے کے مسلمانوں نے انھیں بلند روحانی درجہ دیتے ہوے اپنی فہرستوں میں شامل کر لیا ہو اور یہ اس وقت جب پانچ پیری عقائد رفتہ رفتہ ایک ایسے کیش کی شکل اختیار کر رہے تھے جو نیچ ذات ہندوؤں کے لیے قابل قبول تھا؛ وجہ یہ کہ وہ اپنی ضعیف الاعتقادی کے باعث اس امر کے لیے تیار تھے کہ غازیوں کو پیر مان لیں، جن کے متعلق خیال تھا کہ انھیں کرامتیں دکھلانے کی مافوق الفطرت طاقت حاصل ہے ۔ لہٰذا وہ اپنے خانگی دیوتاؤں یا اپنی دیو مالا کے کسی دوسرے دیوتا کی طرح حصول انعام کی خاطر یا ان کے غضب سے محفوظ رہنے کے لیے ان کی پرستش کرنے لگے!

چنانچہ آج بھی وہ اس خیال کے تحت فطرت کے کسی غیر معمولی مظہر کو خراج عقیدت پیش کرنے اور کسی سادھو یا فقیر کو پوجنے پر آمادہ رہتے ہیں کہ وہ قدرت الٰہی کے تجسیمی مظاہر ہیں.

۶ - پنجکڑی کی تشریح : پانچ پیری کیش کی اصل کچھ بھی ہو، اس کی ابتدا ایران کے پنجتن سے ہوئی ہو یا ہندوؤں کے پانچ پانڈووں سے، پیروں کے اس مجموعے میں پانچ کا عدد بڑا غور طلب ہے؛ لہٰذا پنجکڑی کی بنیادی حقیقت سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کے پیچھے پانچ کے عدد کا طلسماتی تصور موجود ہے اور یہ معلوم ہے کہ دنیاے قدیم میں ہر کہیں پانچ کے عدد کو مقدس اور روحانی طور پر پر اسرار تصور کیا جاتا تھا ۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے ژؤ، لانڈاؤ، بار دوم، جس میں ہندوؤں مسلمانوں، اور دوسری اقوام میں اعداد کے بارے میں عقائد کا مفصل ذکر آیا ہے] ۔ یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ گزشتہ ایک صدی میں، جس کی ابتدا ۱۸۵۰ء سے ہوتی ہے، مسلمانانِ ہند کی زندگی میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور ان کی وجہ سے مختلف قسم کی اصلاحی تحریکیں، مثلاً شاہ عبدالعزیز دہلوی (م ۱۸۲۳ء)، سیّد احمد بریلوی (۱۷۸۶ تا ۱۸۳۱ء)، تیٹو میر حیدر پوری (۱۷۸۲ تا ۱۸۳۱ء)، مولانا کرامت علی جونپوری (۱۸۰۰ تا ۱۸۷۳ء)، حاجی شریعت اللہ اور ان کے صاحبزادے دودھو میاں فرید پوری (۱۸۱۹ تا ۱۸۶۲ء) ایسی متشرع ہستیوں کی مذہبی تحریکیں شروع ہوئیں، نیز وہ تحریکیں جن کی ابتدا ان سے ذرا کم تر ہستیوں نے کی ۔ یہ ایک وجہ تھی جس کی بدولت پاکستان و ہند کے عام مسلمانوں میں راسخ العقیدہ مذہبی شعور کا احیا ہوا.

بہر حال مذہبی اصلاح کا عمل، جس کی ابتدا

آج سے بہت پہلے ہوئی، بدستور جاری ہے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ پاکستان و ہند کے عام مسلمانوں میں اب پانچ پیروں کا عقیدہ بھی کمزور پڑتا جا رہا ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اب اس کے خاتمے کے دن قریب ہیں، حتی کہ جو لوگ ابھی اس کیش سے وابستہ ہیں انھیں بھی یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں؛ پھر بھی ان اصلاحی تحریکوں اور جدید تعلیم کی توسیع و اشاعت کے باوجود پانچ پیری عقیدہ، جو پیر پرستی کا ضروری نتیجہ ہے، ہندوستان و پاکستان میں تزلزل کی حالت ہی میں سہی، لیکن قائم ضرور ہے۔

(محمد انعام الحق)

⊗ **پنج تن** : عام رائے یہ ہے کہ اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے قریبی اہل بیت ہیں، یعنی حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی ذات گرامی۔ پنج تن کے بارے میں عوام میں مختلف خیالات ہیں۔ اس کے لیے نیز رک بہ پنج پیر۔

[ادارہ]

• **پنج دہ** : سوویٹ روس (USSR) کی جمہوریۂ ترکمان [رک بآں] میں ایک قریہ، جو رود کشک کے مشرق میں پل کشتی، یعنی کشک اور مرغاب کے سنگم کے قریب واقع ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس رقبے کے باشندے، یعنی قبیلۂ سریک (= سرق، سریق) ترکمان، پانچ فرقوں : سکتی، ہرزگی، خراسانی، بیرچ، اور علی شاہ میں تقسیم تھے اور پنج دہ کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے؛ لیکن اس میں کوئی وزن نہیں، کیونکہ سریک محض انیسویں صدی میں یہاں آ کر بسے، حالانکہ یہ نام پندرھویں صدی میں بھی مستعمل تھا۔

یہ سرسبز قطعہ غیر معروف ہے، لیکن ۱۸۸۵ء کے حادثۂ ”پنج دہ“ نے اسے ایک ملال انگیز سی شہرت بخش دی، جب کہ افغانی فوج نے روسی لشکر سے ایک معرکے میں بھاری نقصانات اٹھائے۔ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ ایک غلط حد بندی لڑائی کا بڑا اہم سبب ہوتی ہے، چنانچہ اسی باعث، نیز روس کا ۱۸۸۴ء میں مرو پر قبضہ ہو جانے سے روس و برطانیہ میں گفت و شنید کا سرگرمی سے آغاز ہوا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ افغانستان کی شمالی حد کے تعین کے لیے ایک اینگلو روسی سرحد کمیشن مقرر کر دیا گیا۔ اس وقت ایک فوری قضیہ پنج دہ میں یہ پیدا ہوا کہ روسی یہ دعوی کرتے تھے کہ پنج دہ کے باشندے آزاد ہیں، مگر انگریزوں کی رائے یہ تھی کہ وہ امیر افغانستان کی رعایا ہیں۔ انگریز کہتے تھے کہ پنج دہ کا ضلع، کشک اور مرغاب دریاؤں کے درمیان بند نادر سے آق تپہ تک، مع بقیہ حصۂ باد غیس، پر مشتمل ہے اور افغانستان کے صوبۂ ہرات کا حصہ ہے۔ انیسویں صدی کے ربع اول میں پنج دہ میں جمشید اور ہزارہ قبائل سکونت رکھتے تھے۔ اس دور کے خاتمے کے قریب قبیلۂ ارساری کے بعض ترکمان، جن کی بستیاں دریاے جیحون کے کنارے کنارے چرجوی اور بلخ کے درمیان منتشر تھیں، پنج دہ کی طرف چلے اور وہاں سکونت پذیر ہونے کی اجازت حاصل کی۔ سلر ترکمان بھی اسی رقبے میں آباد تھے۔ ۱۸۰۷ء کے قریب ارساریوں نے پنج دہ سے نقل وطن کیا اور تھوڑے دن بعد ہی سریک ترکمانوں پر ان کے زیادہ طاقتور ہمسایوں، تکہ کا دباؤ پڑا اور وہ مجبوراً جنوب میں یلتن اور پنج دہ چلے آئے اور انھوں نے سلر خاندانوں کو وہاں سے نقل مکانی پر مجبور کیا۔ غرض یہ تو درست ہے کہ پنج دہ وقتاً فوقتاً مختلف قبائل کے قبضے میں رہا، لیکن وہ سب، خواہ جمشیدی، ہزارہ، ارساری اور سلر

ہوں یا سرک، تسلیم کرتے تھے کہ وہ افغانی علاقے میں تھے اور ہرات کے افغان حاکم کے نائب کو خراج دیتے تھے۔ سرک ترکمان امیر کابل کی فوج میں بھرتی بھی ہوتے تھے، لہذا انگریزوں کا استدلال یہ تھا کہ بادغیس کا ضلع، جس کا پنج دہ ایک حصہ ہے، عرصے تک افغانی عملداری میں رہا ہے (دفتر امور خارجہ کے مخطوطات، ۶۵، ۱۲۰۵)۔

دوسری طرف روسی دعوی کرتے تھے کہ اس نخلستان کے باشندے ہمیشہ آزادی سے لطف اندوز رہے ہیں۔ Lessar ایک روسی انجنیئر، جو پنج دہ میں مارچ ۱۸۸۳ء میں آیا تھا، افغانی اقتدار کا کوئی نشان دریافت نہ کر سکا، لیکن ایک روسی ڈاکٹر Regel نامی نے، جو یہاں اسی سال جون میں آیا تھا، ایک افغان فوجی دستے کی موجودگی کی اطلاع دی۔ لہذا ان لوگوں کی رائے تھی کہ پنج دہ صرف حال میں افغانی فوجی قبضے میں آیا ہے۔

یہ واقعہ کہ افغانوں نے مستقل طور سے محافظ فوج اس رقبے میں نہیں رکھی، اس کی آزادی کا ثبوت نہ تھا۔ اس کے برعکس یہ قدرتی امر تھا کہ مرو اور پلِ خشتی پر روسی قبضے کے بعد، امیر عبدالرحمن خان اس رقبے پر اپنے شاہانہ حقوق جتانے کا اقدام کرے؛ لہذا جب افغان محافظ فوج نے پنج دہ پر قبضہ کیا تو روسی حکومت نے فوراً احتجاج کیا اور اس علاقے کی نسبت امیر کے دعوے پر رد و قدح کی۔ اس ثنا میں، جبکہ لنڈن اور سنٹ پیٹرز برگ کے درمیان گفت و شنید ہو رہی تھی، افغانستان کی سرحدوں پر سرعت سے کئی طرح کے واقعات پیش آئے۔ ۲۹ مارچ ۱۸۸۵ء کو جینرل کوماروف Comarov نے ایک حتمی جنگی پیام (الٹی میٹم) بھیجا، جس میں افغان محافظ فوج کے وہاں سے ہٹا لینے کا مطالبہ تھا۔ افغانوں نے ہٹ جانے سے قطعی انکار کیا، جس پر روسیوں نے ان پر حملہ کر کے پل کشتی کے پار تک، ان کو دھکیل دیا اور تقریباً نو سو جانوں کا نقصان پہنچایا۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ افغان فوج کی پنج دہ میں تعیناتی، اور مرغاب کے کنارے پلتن پر اور ہری رود کے کنارے پل خشتی پر روسی پیش قدمی افسوس ناک اقدام تھے، جن کا یہ نتیجہ تقریباً یقینی تھا کہ فوراً جنگ چھڑ جائے۔ اس تمام کارروائی کو روکنا چاہیے تھا، لیکن برطانوی کمشنر لمسڈن Lumsden کی دفتر خارجہ کو مبہم و پریشان کن اطلاعوں نے اور روسی کمشنر زیلینوئی Zelenoi کی سرخس پہنچنے میں تاخیر نے مسائل کو اور زیادہ پیچیدہ کر دیا۔

اس وقت ایسا نظر آتا تھا کہ یہ واقعہ غالباً روس و برطانیہ کو جنگ میں مبتلا کر دے گا، لیکن خوش قسمتی سے امیر کے فہم سلیم نے، جو اس نازک زمانے میں وائسرائے سے ملاقات کے لیے آیا ہوا تھا، اور لارڈ ڈفرن کے حسن تدبر نے اس خطرے کو ٹال دیا، حالانکہ امن پسند مسٹر گلیڈ سٹون نے بھی پارلیمنٹ میں تحریک پیش کر دی تھی کہ ایک کروڑ دس لاکھ پونڈ لڑائی کی تیاری پر خرچ کرنا چاہیے۔

آخر کار یہ طے کیا گیا کہ روس کو پنج دہ دے کر اس کے بدلے میں ذوالفقار لے لیا جائے۔ ۱۸۸۶ء سے افغانستان کی شمالی حد ذوالفقار سے دُکچی کے بالائی سرے تک مقرر کی گئی، جو دریائے جیحون سے چالیس میل کے اندر واقع ہے۔ اس بات پر بھی جھگڑا پیدا ہوا کہ وہ ٹھیک نقطہ کون سا ہو جہاں حد بندی کا خط جیحون سے آملے، لیکن یہ بھی بالآخر رفع دفع ہو گیا اور ۱۸۸۸ء میں حد بندی کا کام مکمل ہو گیا۔ روس اور افغانستان کے درمیان ایک معین سرحد تسلیم کر لی گئی تو

وسطی ایشیا کے مسئلے کی پیچیدگی بھی یقیناً کسی حد تک سلجھ گئی۔

مآخذ: (۱) Délimitation Afghane. Négociations entre la Russie et la Grande-Bretagne ۱۸۷۲ تا ۱۸۸۵ء، ۱۸۸۶ء؛ (۲) Parliamentary Papers, Central Asia، ۱۸۸۳ تا ۱۸۸۵ء، جلد ۸۷، عمود ۳۳۸۷ تا ۳۳۸۹، ۳۳۱۸؛ (۳) Public Record Office، لنڈن، دفتر امور خارجہ کے مخطوطات، عدد ۶۵، ۱۲۰۰ و ۱۲۳۸ تا ۱۲۴۰؛ (۴) C. E. Yate: Northern Afghanistan، ۱۸۸۸ء۔

(C. COLLIN DAVIES)

⊗ **پَنْج نَد:** پانچ دریا، یعنی جہلم، چناب، راوی، بیاس اور ستلج۔ یہ سب دریاے سندھ کے معاون ہیں اور مغربی پاکستان کو سیراب کرتے ہیں۔ اس بڑے دریا میں گرنے سے پہلے یہ پانچوں دریا پنجاب (پاکستان) میں بہاولپور (اب پنج ند) کے مقام پر باہم مل جاتے ہیں۔ یہاں سے اس دریا کو "پنج ند" کہا جاتا ہے (یعنی پانچ دریاؤں کا ایک دریا)۔ پنج ند مٹھن کوٹ کے مقام پر دریاے سندھ سے مل جاتا ہے۔ پنجند کے مقام پر "پنج ند ہیڈ ورکس" ہے؛ وہاں سے متعدد نہریں نکالی گئی ہیں، جو مغربی پاکستان کے جنوب مغربی علاقے کو سیراب کرتی ہیں۔

(قاضی سعدالدین احمد و ادارہ)

⊗ **پَنْگُلُو:** رک بہ پَنگُولُو۔

پَنْگُولُو: یا (پَنگُلُو (جاوی)، پنگھولو panghulu (سنڈنی)، پنگولو pangulo (مادوری)؛ لغوی معنی: سربراہ، مکھیا، کارفرما؛ سابق [ولندیزی] مجمع الجزائر شرق الہند میں دینی و غیر دینی امور کے ناظم اعلٰی کو کہتے تھے، مگر جزائر جاوا اور مادورا میں مسجد کے ایک عہدے دار، یعنی اپنے علاقے میں حاکم کا نام تھا۔ مذہب کے سرکاری نمائندوں کی وہاں اسی قاعدے کے مطابق تنظیم کی جاتی تھی جس طرح مقامی انتظامیہ کے عملے کی۔ نائب حکومت (regent) سب سے اعلٰی انتظامی حاکم ہوتا تھا، جس کے پہلو بہ پہلو اس نیابت (regency) کا پنگولو ہوتا؛ حاکم ضلع کے پہلو بہ پہلو ضلع کا پنگولو تھا، جو "پنگولو نائب" یا مختصراً "نائب" کہلاتا تھا، وقس علٰی ھذا۔ مسجد کے عمال کی درجہ وار طبقہ بندی کی گئی تھی: ولایت کے صدر مقام کا پنگولو سارے علاقے کی مساجد کے تمام عملے کا صدر تھا، لیکن دیہات میں نماز کا انتظام کرنے والا بالکل دوسری قسم کا کارکن ہوتا تھا۔ وہ گاؤں کی حکومت کا ایک رکن ہوتا تھا اور گاؤں کی مذہبی ضروریات کی خبر گیری اس کا فرض تھا؛ مگر مسجد کے عملے سے اس کا تعلق نہیں تھا۔ یہ شخص بانتن (مغربی جاوا) میں مستثنٰی طور پر پنگلو کہلاتا تھا اور اس کے علاوہ ہر جگہ اس کے دوسرے نام ہوتے تھے۔ پنگولو مسجد کا ناظم اور اس کے عملے کا سردار ہوتا تھا۔ قانون "آدت" کے مطابق مسجد کے اور اہلکاروں کی طرح اس کا تقرر بھی قائم مقام حکمران کرتا تھا۔ معمولاً یہ اسی یا کسی دوسری مسجد کے عملے میں سے منتخب کر لیا جاتا تھا۔ اس طریق تقرر میں یہ بھی لازمی نہیں ہوتا تھا کہ وہ شخص خاص طور پر اس کام کی قابلیت رکھتا ہو (دیکھیے ذیل میں)۔

دینیات کی تعلیم خاص شرائط کی پابند نہ تھی۔ علم دین کا طالب، چاہے اس کا ارادہ کوئی سرکاری عہدہ اختیار کرنے کا ہو، یا ذاتی طور پر مطالعہ کرتے رہنے کا، مدارس میں تحصیل علم کرتا (یہ سب مدرسے لوگوں نے بطور خود بنا رکھے تھے اور ملک میں بہت سے تھے)۔ پھر ہر طالب علم جو مضمون چاہتا پڑھتا

اور چھوٹی بڑی جتنی مدت تک چاہتا تعلیم حاصل کرتا ۔ اس کی یہ بھی کوشش ہوتی تھی کہ کئی مدرسوں میں شریکِ درس ہو ۔

پنگولو کے فرائض منصبی گوناگوں تھے، لیکن سارے علاقے میں یکساں نہیں تھے ۔ مسجد کے ناظم کا فرضِ منصبی پہلے مذ دور ہو چکا ہے ۔ زیادہ بڑے مواضع، خصوصاً ملک کے صدر مقام میں بڑا عملہ ہوتا ۔ وہاں پنگولو بذاتِ خود کام میں حصہ نہیں لیتا تھا ۔ پنگولو کے ذمے نکاح کا بھی انتظام تھا، جو اس کی موجودگی میں ہوتا ۔ وہ ''طلاق'' اور ''رجوع'' کا فیصلہ صادر کرتا اور نکاحوں کو رجسٹر میں درج کرتا تھا ۔ جب بہت ممتاز خاندانوں کا معاملہ ہوتا تو فقط ملک کا صدر پنگولو ہی یہ فرض ادا کرتا ۔ اس صورت میں دستور یہ تھا کہ نکاح خوانی اس خاندان کے مکان میں ہوتی ۔ پنگولو اس وقت بھی نکاح کی رسم انجام دیتا تھا جب دلہن کا ''والی'' (=ولی) اسے ''وکیل'' نامزد کرتا؛ عام رسم یہی تھی، جس پر اکثریت عمل کرتی تھی، اگرچہ اس کا کوئی سبب صاف طور پر نہیں جانتی ۔ عوام کے خیال میں پنگولو ہی وہ شخص تھا جو عقد نکاح میں فریقین کو منسلک کرتا تھا؛ اسی لیے یہ بہت پرانی رسم تھی کہ نکاح مسجد میں پنگولو سے پڑھوایا جائے ۔ اس بن لکھے دستور کو، جو ۱۸۹۵ء سے جاری تھا، ایک قانون کی حمایت حاصل ہو گئی، جو ۱۹۲۹ء میں نافذ ہوا ۔ اس قانون کی رو سے وہ اجرتیں (فیسیں) بھی منضبط ہو گئیں جو نکاح، طلاق اور رجوع کے اعلان کے وقت ادا کی جاتی تھیں ۔ ان قاعدوں میں پرانے دستور کو ملحوظ رکھا گیا ۔ یہ اجرتیں پنگولو اور اس کے عملے کی آمدنی کا سب سے بڑا حصہ ہوتی تھیں ۔ مؤخر الذکر کو بھی ان کا حصہ ملتا تھا ۔ جو لوگ بخوبی اہل ہوتے تھے وہ شادیوں میں اکثر پنگولو کے نائب کی حیثیت سے کام کرتے ۔ جو عورتیں ''والی'' (ولی) نہ رکھتیں ان کی شادیاں پنگولو ''والی حاکم'' کی حیثیت سے کرا دیتا ۔ اس لیاقت اور استعداد کے حامل پنگولوؤں کی تعداد ان اہلکاروں کی تعداد سے ہمیشہ کم ہوتی تھی جو نکاح خوانی کے لیے مقرر کیے جاتے ۔ بعض اضلاع میں قائم مقام حکمران خود اپنے کو ''والی حاکم'' مقرر کرتا تھا، لیکن عملاً سارے اختیارات پنگولو کو دے دیتا تھا۔

''جکات'' (عربی: زکوٰۃ) جاوا اور مادورا میں حکام وصول نہیں کرتے تھے ۔ اگر یہ کبھی وصول بھی کی جاتی تو بالکل اختیاری نذرانہ اور بہت سے مقامات میں نہایت معمولی رقم ہوتی تھی ۔ صرف مغربی جاوا میں تحصیل زکوٰۃ کسی زمانے میں باقاعدہ ہوتی تھی اور مسجد کے کارکنوں کے ہاتھ میں تھی ۔ محاصل بھی وہی رکھ لیتے تھے ۔ زکوٰۃ پنگولوں کی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ تھی، خصوصاً مغربی جاوا میں۔

صرف صدر مقام کا پنگولو قاضی بھی ہوتا تھا، لیکن اس کا دائرۂ اختیار عائلی قانون اور ''وقپ'' (عربی: وقف) جائدادوں تک محدود تھا ۔ قاضی کا عہدہ اس کا خاص دائرۂ کار ہوتا تھا ۔ پنگولو کے ان عدالتی فرائض کی تاریخ عجیب سی ہے ۔ نوآبادیاتی حکام نے مسجد کے ملازموں کی سرکاری حیثیت سے یہ خیال کیا کہ وہ سب مولوی بلکہ ایک جماعت افتا کے رکن ہیں، کیونکہ پنگولو عدالتی اجلاس کے وقت اپنی مدد کے لیے چند ماتحتوں کو ساتھ بٹھا لیتا تھا؛ چنانچہ اس غلط فہمی کو نو آبادیاتی قانون میں مستقل صورت دی گئی ۔ پنگولو کو منصفوں کی ایک جماعت

کا صدر بنا دیا گیا۔ اس کے پنچ حکّام کی طرف سے نامزد اور پنگولو کے ماتحتوں اور غیر سرکاری ماہرینِ قانون سے منتخب ہوتے تھے۔ اس طریقے سے ایک ادنٰی درجے کا پنگولو جماعت علما کا رکن ہو سکتا تھا۔ پھر یہ قانون وضع کیا گیا کہ قدیم طریق کار کو بحال کیا جائے، جماعت افتا موقوف کی جائے اور اس کی جگہ پنگولو کی عدالت قائم کی جائے، جس میں وہ اپنے معاونوں کے ساتھ اجلاس کرے اور بلا شرکت غیرے فیصلے صادر کرے۔ جماعت افتا کے جلسے مسجد کے ایک کمرے میں ہوتے تھے۔ سب سے زیادہ مقدمات عورتیں دائر کرتی تھیں۔ مغربی اور مرکزی جاوا میں شوہر کے لیے یہ مقررہ دستور تھا کہ شادی کے فوراً بعد اس سے ''تعلیق'' کا بجبر اقرار کرایا جاتا، جو [ظاہر ہے کہ] قانونی سقم سے خالی نہیں تھا۔ اگر وہ ان ذمے داریوں کو پورا نہ کرتا جو اس نے ''تعلیق'' کے اقرار میں اپنے اوپر لی تھیں اور بیوی مطمئن نہ ہوتی تو وہ اپنے معاملے کو جماعت کے سامنے لے جاتی، جو طلاق واقع ہو جانے کا اعلان کر دیتی۔ یہ مقدمات عام تھے۔ مشرقی جاوا اور مادورا میں ''فسخ'' کی ایک آسان شکل اس ''تعلیق'' کی جگہ لے لیتی تھی۔ ہمیں ایسے واقعات بھی جاوا کے باقی حصوں میں ملتے تھے جہاں جماعت افتا فسخ کے مسائل طے کرتی تھی۔ جو عورتیں ''نفقہ'' سے محروم ہوتیں وہ بھی جماعت افتا سے رجوع کرتی تھیں۔ اگر طلاق کے بعد شادی کے زمانے کی جائداد کی تقسیم کے متعلق مشکلات پیدا ہوتیں، یا ایک جائداد کے وارث کسی عام پنگولو کے فیصلوں پر مطمئن نہ ہوتے تو مقدمہ فیصلے کے لیے جماعت میں بھیجا جاتا۔ کارروائی کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ جماعت فیصلہ کرتی کہ کس طرح جائداد کو شریعت کے مطابق تقسیم ہونا چاہیے۔ اگر فریقین یا متعلقہ افراد اس کی تعمیل پر تیار نہ ہوتے تو تجویز صرف اس صورت میں نافذ ہو سکتی تھی کہ سرکاری عدالت اس کی توثیق کر دیتی۔ اگر جماعت افتا کا فیصلہ قاعدے کے مطابق صحیح ہوتا تو عدالت ہمیشہ توثیق کر دیتی تھی اور اس کی مادّی صحت کو نہیں جانچا جاتا تھا۔ فیسیں اسی وقت ادا کرنی ہوتی تھیں جب عرضی جماعت کو پیش کی جائے۔ ایک معقول آمدنی جائدادوں کی تقسیم سے ہوتی تھی، کیونکہ ایسے مقدموں میں ''جماعت'' کو مابہ النزاع املاک کا اکثر دس فی صد ملتا تھا۔ اس سے وہ ''اُشُر'' (عربی: عُشر) کہلانے لگا۔ عائلی قانون کے دوسرے معاملات میں بھی جماعتِ افتا سے رجوع کیا جاتا، لیکن وہ چنداں اہم نہیں ہیں۔ آخر میں ''وقپ'' (= وقف) کے ادارے تھے، جن کے بانیوں نے ان کی آمدنی مسجدوں، مذہبی مدرسوں یا قبرستانوں کے لیے مخصوص کی تھی۔ جماعت افتا کا یہ فرض منصبی تھا کہ جب ایسے جھگڑے کھڑے ہوں تو وہ انھیں شریعت کے مطابق طے کرے اور عام طور سے اوقاف کی دیکھ بھال کرتی رہے۔

بنگولوؤں کا تقرّر مقامی ریاستوں میں والیانِ ریاست کرتے تھے؛ ان کا میدان عمل یہاں بھی وہی ہوتا تھا۔ جب کبھی کسی نئے پنگولو کو مقرر کیا جاتا تو بہ حیثیت ''قاضی'' اس کا تقرر ایک فرمان کے ذریعے ''میرے زبانی حکم کی تصدیق میں'' ہوتا تھا؛ یہ جملہ ''شریعت'' کے مصالح کی تکمیل کے لیے لکھتے تھے اور خود فرمان کی عبارت سے بھی مترشح ہوتا تھا کہ والیِ ریاست اپنا عدالتی اختیار پنگولو کو سونپ رہا ہے۔

سابق جزائر شرق الہند کے ولندیزی مقبوضات

کے قانون کی رو سے پنگولو کی حاضری اس وقت ضروری ہوتی تھی جب مسلمان دیوانی یا فوجداری مقدموں میں بطور ملزم سرکاری عدالتوں میں حاضر ہوتے تھے ۔ ایسے امدادی پنگولوؤں کی ایک تعداد ہر عدالت سے اس کی ضرورتوں کے مطابق منسلک رہتی تھی۔ یہ لوگ حکومت کی طرف سے مقرر اور مسجدوں کے عملے میں سے منتخب ہوتے تھے ۔ یہ بات پہلے سے طے تھی کہ مسجد کا ناظم لازماً پنچ (assessor) کا فرض ادا کرے گا ۔ اس طرح پنگولوؤں کے تقرر کا حق قائم مقام حکمرانوں کے ہاتھوں سے نکل کر نو آبادیاتی انتظامیہ کے حکام کے ہاتھ میں چلا گیا ۔ چونکہ پنگولو عموماً نیچے درجے کے اہلکاروں میں سے منتخب ہوتا تھا، لہذا حکومت اپنا اثر ان چھوٹے افسروں کے تقرر پر اس حد تک ڈال سکتی تھی کہ وہ پنگولو بنائے جانے کے اہل ضرور ہوں ۔ مقصد یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو لائق لوگ چنے جائیں ۔ ولندیزی حکومت کا منشا یہ تھا کہ عدالت کو "ادت" (رواجی) قانون کی بابت مشورہ دیا جائے۔ اس کام کے لیے پنگولو کا انتخاب کرنا غلطی تھی کیونکہ مؤخر الذکر فقہ کی کتابوں پر چلتا تھا.

لفظ پنگولو مسجد کے عہدے دار کے معنی میں جزائر جاوا و مادورا کے باہر نامعلوم نہیں۔ بعض مقامات میں ایسے پنگولو موجود تھے جن کا کام جاوا، مثلاً پالم بانگ (سماترا) کی سابقہ سلطنت کے مرکز کے پنگولوؤں سے مشابہ ہے ۔ نوآبادیاتی حکام نے یہ نام قائم رکھا، بلکہ عدالت کے پنچوں کا بھی یہی نام رکھ دیا، جنھیں وہ ایسے اضلاع میں مقرر کرتے تھے جہاں یہ نام پہلے مستعمل نہ تھا.

مآخذ: (۱) C. Snouck Hurgronje: *Verspreide Geschriften*، ۴/۱: ۲۷۹ ببعد، ۸۹ ببعد و ۴/۲: ۳۶۹ ببعد؛ (۲) C. van Vollenhoven: *Het Adatrecht van Nederlandsch-Indië*، ۲ : ۱۶۰ ببعد.

(R.A. Kern)

پواسا : (ـ پوسہ؛ سنسکرت : اُپواسا upawasa) مجمع الجزائر شرق الہند میں ماہ رمضان کا نام؛ اس مہینے میں یا دیگر ایام میں روزہ رکھنے کو بھی پواسا کہتے ہیں، مگر عربی نام بھی غیرمعروف نہیں ۔ روزہ رکھنا انڈونیشیا میں ایک پسندیدہ عبادت سمجھی جاتی ہے، نہ صرف ان دنوں میں جو شریعت کی طرف سے فرض یا مستحب کیے گئے ہیں، بلکہ کسی مراد کے حصول کے لیے لوگ نفلی روزہ بھی رکھتے ہیں۔ رمضان میں روزے کی پابندی دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی نہایت ضروری ارکانِ اسلام میں شمار کی جاتی ہے ۔ یہاں کے لوگوں میں یہ عقیدہ بھی مقبول ہے کہ روزہ سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہوسکتا ہے ۔ جو لوگ بیماری یا کسی اور وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتے وہ اس کا وہی احترام ضرور کرتے ہیں جو سب کے دلوں میں بھرا ہوا ہے اور جو سب مہینوں سے بڑھ کر رمضان کو خاص اسلامی مہینے کی حیثیت سے ممتاز کرتا ہے ۔ طلبہ، تجّار اور ایسے تمام لوگ جن کا کاروبار انھیں گھر سے دور لے جاتا ہے کوشش کرتے ہیں کہ کم از کم یہ مہینا اہلِ خاندان میں بسر کریں ۔ متعدد اضلاع میں پواسا کی آمد اس لیے بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس سے پہلے کے مہینے کے آخری دنوں میں مویشی زیادہ ذبح کیے جاتے ہیں اور گوشت استعمال کے لیے محفوظ کر کے رکھ لیا جاتا ہے ۔ پواسا میں لوگوں کی خوراک معمول کی بہ نسبت قدرے بڑھ جاتی ہے تاکہ روزوں کی تکان برداشت کرنے کی قوت آ جائے ۔ بازاروں میں بھی اس ماہ کے آخری دنوں میں گہما گہمی پیدا ہو جاتی ہے

اور یہ دیکھ کر کہ رمضان قریب الاختتام ہے یہ خریداریوں کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس مہینے کے آغاز کا عام اعلان کیا جاتا ہے، مثلاً خاص انداز سے نوبت بجائی جاتی ہے، جو عموماً اسی غرض سے مسجدوں میں رکھی جاتی ہے۔ نوبت بجانے کا کام مہینا بھر مخصوص اوقات میں جاری رہتا ہے، یعنی افطار کے وقت تاکہ مسلمان روزہ کھول لیں اور سحری کے وقت تاکہ وہ سحری تیار کریں، نوبت بجائی جاتی ہے۔ جب ماہ رمضان ختم ہو جاتا ہے تو عید کے اعلان کے طور پر نوبت زیادہ زور زور سے بجائی جاتی ہے۔ رمضان کے آغاز و انجام کی تحقیق میں عموماً ہر سال نزاع کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو لوگ مذہبی معاملات میں آزاد خیال ہیں وہ تقویم کو استعمال کرتے ہیں اور قبل از وقت مہینے کے خاتمے کا اعلان کرنے میں تامّل نہیں کرتے؛ مگر وہ سب لوگ جن کو اصرار ہے کہ شرع کی سختی سے پابندی کی جائے اور ان میں نئی روشنی والے بھی شامل ہیں رؤیتِ ہلال پر سختی سے پابند ہیں۔ ''تروح'' (عربی: تراویح) کی نماز عام مسجدوں میں عشا کے فوراً بعد پڑھی جاتی ہے؛ اس میں وہ لوگ بھی شوق سے شریک ہوتے ہیں جو اور مواقع پر مذہب کے احکام کی پابندی نہیں کرتے۔ اس مہینے کی آخری پانچ طاق راتوں کو لیلۃ القدر سے تعلق کی بنا پر عوماً سب سے بڑھ کر اہمیت دی جاتی ہے اور ان میں خوب عبادت کی جاتی ہے۔ لوگ اس پر متفق نہیں کہ ان راتوں میں سے کون سی رات بظنِ غالب اصلی شبِ قدر ہے، تاہم اکیسویں اور ستائیسویں کو ترجیح دی جاتی ہے، لیکن مختلف مقامات میں صورتِ حال مختلف ہے۔ ان راتوں کی رسوم میں سے ایک رسم یہ بھی ہے کہ مکاناتِ مسکونہ کے سامنے کے رُخ پر چراغاں کیا جاتا ہے۔ جاوا میں خاص زور اس پر دیا جاتا ہے کہ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا جائے۔ ہر شخص، جو ذرا بھی استطاعت رکھتا ہے، ہر شام عقیدۃً ضیافت دیتا ہے۔ پھر لوگ دوستوں کے گھر ملنے جاتے ہیں۔ گھر عام طور سے کھلے رکھتے ہیں اور رات گئے تک خوشی مناتے ہیں۔ [ولندیزیوں کے عہد حکومت میں] یہاں سرکاری قسم کی ضیافتیں بھی ہوتی تھیں۔ دیہات کے لوگ اپنے مکھیا کے گھر ضیافت کی تقریب مناتے تھے اور ہر شخص اپنا حصہ لے کر آتا تھا۔ اعلیٰ حکّام خصوصاً انتظامی محکمے کے حاکم اپنے ماتحتوں کو دعوت دیتے تھے۔ ان پانچ راتوں کو جاوا کے والیانِ ریاست کے محلات میں بہت شاندار طریق سے منایا جاتا تھا اور قدیم دستور کے مطابق یہ دعوتیں مغرب کے بعد بڑی شان و شوکت کے ساتھ دی جاتی تھیں۔ محلوں کے وسیع صحن ان کے لیے بہت ہی موزوں ہوتے تھے۔ ان دعوتوں کو ملے مان (Malĕ Mao) کہتے تھے، جن کے ساتھ بہت سی حکایات وابستہ تھیں۔ یہ درجہ وار ترتیب و تسلسل سے ہوتی تھیں۔ پہلے اکیسویں تاریخ کو حکمران دعوت دیتا تھا؛ اس کے بعد ولی عہد، شاہی خاندان کے ارکان، اعلیٰ حکّام اور وزیروں کی باری آتی تھی۔ یہ کھانے میزبان کے ماتحتوں کو کھلانے مقصود ہوتے تھے۔ قریبی زمانے میں یہ دعوتیں محدود ہو گئیں؛ چنانچہ صرف پہلی دعوت کی سرکاری حیثیت قائم رہ گئی۔ ''چھوٹی'' دعوت کا دن خوشی منانے میں ''بڑی'' دعوت سے بھی کہیں بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ ''فطرہ'' ادا کرنے (جو رمضان کے آخری دن یا اس سے پہلے بھی دیا جاتا ہے) اور خاص احتیاط کے ساتھ غسل وغیرہ کرنے کے بعد (جس میں اہل جاوا اپنے مویشیوں کو بھی شریک کرتے ہیں) گھر میں کھانے پکوائے جاتے ہیں اور افطار کے بعد شام

کو ضیافت کی جاتی ہے۔ زیادہ دیندار لوگ اس سے پہلے بھی ماہ صیام میں سیدھا سادا کھانا کھلاتے ہیں اور مردوں کی ان روحوں کو ایصال ثواب کر کے رخصت کرتے ہیں جو (ان کے عقیدے کے مطابق) رمضان کے دوران میں ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی ہیں اور اب اپنے مسکن کو واپس جاتی ہیں۔ یکم شوّال کو آچیے میں عید کی ''صلوٰۃ'' کی زیادہ پابندی نہیں کی جاتی، لیکن اور مقامات میں یہ ایک بڑی مذہبی تقریب ہے۔ تمام سال میں ایک نماز بھی ایسی نہیں جس میں اتنی حاضری ہوتی ہو۔ وہ لوگ بھی جو بصورتِ دیگر کبھی مسجد میں نہیں آتے، یہ نماز پڑھنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ ولندیزی عہد میں بھی جاوا میں اعلٰی ترین مقامی حکام یعنی ریجنٹ اپنے دفتر کے تمام عملے کے ساتھ پورے سرکاری لباس میں صبح کو طلوع آفتاب سے قبل نماز پڑھنے کے لیے مسجد کو جاتے اور نماز پڑھنے کے بعد اسی طریقے سے واپس آتے۔ پھر ریجنٹ کی خدمت میں آداب عقیدت بجا لاتے۔ یہی دستور جنوبی سلیبس (Celebes) میں عام تھا، اس کے سوا کہ ریجنٹوں کی جگہ یہاں مقامی رئیس ہوتے تھے۔ اس دن نوجوان آتش بازیاں چھوڑتے ہیں۔ عید کی ''صلوٰۃ'' کے بعد لوگ عید کے نئے کپڑے زیب تن کیے عزیزوں اور دوستوں سے ملنے جاتے ہیں، مبارکبادیاں دی جاتی ہیں کہ روزے بخیر و خوبی پورے ہوے اور گزشتہ سال کے دانستہ و نادانستہ گناہوں کے لیے استغفار کیا جاتا ہے۔ یہ بھی اکثر جگہ دستور ہے کہ لوگ اس دن بزرگوں کی قبروں کی زیارت کرتے ہیں، جن کی پہلے سے صفائی کی جاتی ہے اور وہاں کچھ دیر تک از رو عقیدت پھول چڑھاتے اور بخورات سلگاتے ہیں۔ جاوا میں مزید برآں بڑے عہدے داروں کا یہ دستور بھی رہا ہے کہ اپنے ماتحتوں کو اس دعوت میں بلاتے ہیں، جس کا نام ہے ''کھانے کے پہاڑ'' (یعنی خوان جن میں تمام اقسام کی قابیں خوشنما طریقوں سے چنی ہوئی ہوتی ہیں)۔ دیسی ریاستوں میں ماہِ رمضان کے اختتام پر تین عام تعطیلات میں سے ایک تعطیل یہی ہوتی تھی۔ اس کی اصلی خصوصیّت یہ ہے کہ حکمران کی ذات میں ریاست کی وحدت نمایاں کی جاتی تھی۔ تینوں جشن مجموعی طور پر ایک ہی طرز پر منائے جاتے تھے۔ حکمران مشرقی شان و شوکت سے نمودار ہوتا اور لوگوں کے مجمع کو محل کے بیرونی صحن سے اپنا دیدار کراتا۔ کھانے بہت بڑی مقدار میں پہلے سے شاہی مطبخوں میں تیار رہتے اور نہایت باقاعدگی سے بڑے بڑے خوان (کھانے کے پہاڑوں) میں ٹھیک مقررہ ترکیب اور صورتوں میں لگائے جاتے۔ یہ ''پہاڑ''، جو اتنے بڑے ہوتے تھے کہ ایک کو لے جانے کے لیے کئی آدمی درکار ہوتے تھے، رئیس کے اپنی نشست پر بیٹھتے ہی اس کے سامنے لائے جاتے اور پھر اس کے حکم سے مسجد تک پہنچائے جاتے۔ یہاں جب مسجد کا متولی حکمران اور ملک کے لیے دعا کر چکتا تو یہ کھانا تقسیم کر دیا جاتا۔ چونکہ یہ کھانا ''تبرک'' سمجھا جاتا تھا، لہٰذا اس میں سے حصہ مل جانے کو خوش نصیبی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

شوال میں چھے دن کے روزے، جو شرع کی رو سے مستحب ہیں بعض متقی لوگ رکھتے ہیں۔ اس مہینے کی آٹھویں کو ان روزوں کے ختم ہونے کی نشانی کے طور پر ایک معمولی تقریب منائی جاتی ہے۔

مآخذ: (۱) C. Snouck Hurgronje: *De Atjehers*، بٹاویا ۱۸۹۳ء، ۱: ۲۴۴ ببعد؛ (۲) وہی مصنف: *Verspreide Geschriften*، ۴/۱: ۳۶۹ ببعد؛ (۳) R. Soedjono Tirtokoesoemo: *De Garĕbĕg's in het Sultanaat Jogjakarta*، یوگ یکرتا ۱۹۳۱ء؛

(۴) B. F. Matthes: Ethnologie van Zuid-Celebes، 's-Gravenhage گرافنہاگ ۱۸۷۵ء، ص ۸۰ ببعد؛ (۵) C. Poensen: Brieven over den Islām uit de binnenlanden van Java، لائڈن ۱۸۸۶ء، ص ۱۲ ببعد، ۱۰ ببعد؛ (۶) L. Th. Mayer و J.F.A.C. van Mill: De sĕdĕkah's en slamĕtan's in de desa Semarang، ۱۹۰۹ء۔

(R.A. Kern)

⊗ **پوپ**: آرتھر اپہم پوپ Arthur Upham Pope، جس کا سن پیدائش ۱۸۸۱ء ہے، امریکہ میں اسلامی ملکوں اور خصوصاً ایران کے آرٹ کا بہت بڑا ماہر خصوصی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے کورنل اور ہارورڈ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی تھی اور بعد ازاں پہلی جنگ عظیم کے دوران میں خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد اس نے اپنے آپ کو مشرقی آرٹ کے مطالعے کے لیے وقف کر دیا اور امریکہ میں ایرانی آرٹ میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے مختلف وسائل اختیار کیے؛ ایرانی آرٹ کے عمدہ اور نادر نمونے جمع کیے، عجائب خانوں کی ترتیب و تنظیم میں مدد دی، مختلف صنائع و حرف کے متعلق مختلف یونیورسٹیوں اور علمی مجلسوں میں لیکچر دیے اور علمی رسائل میں فنون جمیلہ پر مقالات لکھے۔ ۱۹۳۰ء میں لنڈن میں ایرانی آرٹ کی جو بین الاقوامی نمائش ہوئی تھی اس کی تنظیم میں بھی اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ وہ چند سال تک سان فرانسسکو کے عجائب خانے کا مدبر رہا اور امریکہ میں متعدد علمی اداروں کی بنیاد ڈالی، جن میں Iranian Institute خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس نے اپنی تحقیقات کے سلسلے میں مشرقی ملکوں اور خصوصاً ایران کی سیر و سیاحت کی ہے اور وہاں کے آثار کا مشاہدہ کیا ہے۔

جہاں تک تالیف و تصنیف کا تعلق ہے پروفیسر پوپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایرانی آرٹ کے متعلق ایک جامع کتاب *A Survey of Persian Art* کے نام سے فضلا کی ایک کثیر جماعت کے تعاون سے مدوّن کی، جو ۱۹۳۸ء میں چھے ضخیم جلدوں میں آکسفرڈ یونیورسٹی پریس کی طرف سے شائع ہوئی۔ اس میں اپنے اپنے فن کے بیشتر متخصص حضرات نے مختلف ابواب لکھے اور ان میں ایران کے مختلف صنائع و حرف، مثلاً فن تعمیر، سنگ تراشی، مصوری، کوزہ گری، پارچہ بافی، قالین سازی، فلز کاری وغیرہ فنون پر سیر حاصل بحث کی اور اپنے مفہوم و مطلب کی وضاحت کے لیے بہت سی تصاویر بھی شامل کی ہیں، جن کی تعداد پندرہ سو تک پہنچتی ہے۔ ان کے علاوہ ان مجلدات میں ۴۰۰ نقشے بھی ہیں۔ الغرض یہ مجموعہ عہد حاضر میں اپنے باب میں ایک فقید المثال علمی اور فنی تحفے کی حیثیت رکھتا ہے، جس نے تمام اہلِ نظر سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔

مآخذ: (۱) ابوالقاسم سحاب: فرہنگ خاور شناسان، تہران، ص ۲۹۳؛ (۲) نجیب العقیقی: المستشرقون، قاہرہ ۱۹۶۵ء، ۳: ۱۰۰۹۔

(شیخ عنایت اللہ)

⊗ **پوپر**: ولیم پوپر William Popper، ریاست ہاے متحدہ امریکہ کے عربی دان مستشرقین میں ایک بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ وہ سینٹ لوئی (مسوری) میں ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوا اور نیویارک کی جامعۂ کولمبیا میں اس نے پروفیسر گوٹہائل (Gottheil) سے اکتساب فیض کیا اور بعد ازاں شٹراسبورگ کی یونیورسٹی میں پروفیسر نولدکہ کا بھی شرف تلمّذ حاصل کیا۔ مشرقی ملکوں کی سیر و سیاحت کے بعد جب وہ وطن واپس آیا تو

۱۹۰۵ء میں کیلیفورنیا یونیورسٹی میں درس و تدریس پر مقرر ہوا اور بعد ازاں ۱۹۲۲ء میں سامی زبانوں کا پروفیسر ہو گیا۔

پروفیسر پوپر کو مصر کے مملوکی عہد سے خاص دلچسپی رہی ہے؛ چنانچہ اس نے اسی ضمن میں مشہور مصری مؤرخ ابن تغری بردی [رک بآں] کی دو تاریخی کتابوں کو کمال استقلال اور جانفشانی سے شائع کیا اور انہیں تاریخوں کی محققانہ اشاعت اس کا سب سے بڑا علمی کارنامہ تصور ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ولندیزی مستشرق یوئن بول (Juyn boll) نے ابن تغری بردی کی کتاب النجوم الزاهرة فی ملوک مصر و القاهرة کی اشاعت شروع کی تھی، لیکن وہ اس کی ایک دو جلدوں سے زیادہ مرتب نہ کر سکا تھا۔ پوپر نے اس ناتمام کام کو ہاتھ میں لیا اور ۱۹۰۹ء میں اس کی تصحیح و تدوین کی ابتدا کر دی۔ بیس سال تک یہ کتاب متواتر بریل Brill (لائڈن) کے مطبع سے بالانضباط شائع ہوتی رہی، یہاں تک کہ ۱۹۲۹ء میں اس کی طباعت پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس کے بعد مصر میں دارالکتب المصریہ کے اہتمام سے اس کتاب کا جو اڈیشن شائع ہوا وہ بیشتر اسی مغربی اڈیشن پر مبنی ہے، لیکن اس کے باوجود اس پر مصری ناشرین کی طرف سے "الطبعة الاولٰی" (بار اول) کے الفاظ لکھ دیے گئے ہیں۔

پروفیسر پوپر نے النجوم الزاهرة کی اشاعت سے فراغت پانے کے بعد ابن تغری بردی کی ایک اور تصنیف یعنی حوادث الدهور فی مدی الایام والشهور کی تصحیح و ترتیب کا بیڑا اٹھایا اور دس بارہ سال کے عرصے میں اسے چار اجزا میں مکمل کر دیا (مطبوعۂ لائڈن ۱۹۳۰ تا ۱۹۴۲ء)۔

پروفیسر پوپر کے علم و فضل کی بنا پر اس کے ہمعصر فضلا اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، چنانچہ ۱۹۵۱ء میں اس کے احباب نے اس کے اعزاز میں علمی مقالات کا ایک یادگار مجموعہ بعنوان *Semitic and Oriental Studies* شائع کر کے پروفیسر پوپر کی خدمت میں پیش کیا (کیلیفورنیا یونیورسٹی پریس، برکلے ۱۹۵۱ء)۔

مآخذ: (۱) نجیب العقیقی: المستشرقون، قاہرہ ۱۹۶۵ء، ۳: ۱۰۱۵؛ (۲) مقالہ نگار کی ذاتی معلومات۔

(شیخ عنایت اللہ)

پوٹھوہار: رک بہ پاکستان؛ پنجاب۔

پوٹھوہاری: رک بہ پنجابی۔

پورٹ سعید: (ع: بور سعید)، بحیرۂ روم پر مصر کی ایک بندرگاہ، جو نہر سویز کے دہانے پر اس کے مغربی کنارے ۳۱ درجے ۱۵ دقیقے ۵۰ ثانیے عرض بلد شمالی، ۳۲ درجے ۱۸ دقیقے ۳۲ ثانیے طول بلد مشرقی پر واقع ہے۔ قاہرہ سے ریل کے ذریعے براہِ زقازیق و اسمٰعیلیہ ۱۴۵ میل اور براہِ ساحل دمیاط سے چونتیس اور اسکندریہ سے ۱۲۵ میل کا فاصلہ ہے۔ جب مصر کے نائب السلطنت (وائسرائے) سعید پاشا (رک بآں) کے عہدِ حکومت میں نہر سویز بنانے کا فیصلہ کیا گیا تو اسی وقت ۱۸۵۹ء میں سعید پاشا کے نام پر پورٹ سعید کی بنیاد رکھی گئی۔ ریگستانی زمین کی ایک پٹی جو کم و بیش دو سو سے تین سو گز تک چوڑی ہے، جھیل منزلہ اور بحرِ روم کے درمیان حائل تھی۔ موجودہ شہر کا مقام تہِ آب رہتا تھا۔ یہ مقام انجینئروں کی ایک جماعت نے، جو لاروش Laroche اور دلسپس de Lesseps کے زیر قیادت تھی، انتخاب کیا۔ اس کا سبب یہ نہ تھا کہ یہ خاکنائے کے پار سویز تک قریب ترین جگہ تھی، بلکہ یہ تھا کہ یہاں پانی کی گہرائی تجویز کردہ نہر کی ضرورت کے عین مطابق نظر آئی۔ جونہی نہر پر

کام شروع ہوا، لکڑی کے پانچ مکانات پانی پر تیار کر دیے گئے، جن کو بڑے بڑے بھاری کھمبوں پر اٹھایا گیا تھا اور ان میں ایک جدید قسم کا تنور (بیکری) اور ایک تقطیر آب کا کارخانہ بھی تھا کہ ان اوّلیں کام کرنے والوں کے کام آئے۔ ایک سال بعد سمندر کی تہ سے کیچڑ نکالنے والے آلات نے نئی بندرگاہ کے پانی کو گہرا کرنا شروع کیا اور جو کیچڑ نکالی جاتی تھی وہ ساتھ کے ساتھ مزید عمارتوں کے لیے کام میں لائی جاتی تھی، چنانچہ تھوڑی سی مدّت میں ۱۵۰ مکانات اور ۱۵۰ بنگلے تعمیر ہوگئے؛ انھیں کے ساتھ ایک ہسپتال، ایک کیتھولک اور ایک آرتھوڈکس Orthodox فرقے کا گرجا اور ایک مسجد بنائی گئی۔ ان کے علاوہ مرمّت کے کارخانے بنائے گئے، جو سب ملا کر تیس ہزار مربع میٹر پر پھیلے تھے؛ لیکن یہ بھی روز افزوں آبادی کے لیے کافی نہ تھے، کیونکہ نہر پر اسمٰعیلیہ کی طرف کام بڑھ رہا تھا۔ اس وقتی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اور پورٹ سعید سے مناسب حال فاصلے پر پتھر کی کانیں نہ ہونے کی وجہ سے ایسے مصنوعی پتھر تیار کیے گئے جن پر سمندر کا پانی اثر نہ کر سکے۔ یہ کام دسو Dussaud کمپنی نے ۱۸۶۵ء میں شروع کیا۔ پتھر بنانے کی تفصیلات علی پاشا مبارک کی خطط (۱۰ : ۳۸ تا ۴۰) میں تحریر ہیں۔ مصنوعی پتھروں میں ہر ایک کا وزن تقریباً بائیس ٹن تھا اور یہ بیرونی بندرگاہ کے دو بہت بڑے بحری پشتے بنانے کے علاوہ مزید عمارتی زمین تیار کرنے میں استعمال ہوتے تھے۔ اسی سال نہر پر ڈاک کی دُخانی کشتیاں اسمٰعیلیہ تک چلنے لگیں اور دساور کا مال بھی ان کشتیوں میں پورٹ سعید آنے لگا۔ ۱۸۶۸ء میں یہ بحری پشتے تیار ہو گئے اور ۱۸۶۹ء میں نہر مکمل ہو گئی۔ پھر تو پورٹ سعید مختلف قوموں کے نمائندوں اور قنصلوں سے معمور ہو گئی اور آبادی دس ہزار تک پہنچ گئی۔

اس زمانے میں عالمِ مشرق کی اکثر نئی بستیوں کی طرح پورٹ سعید میں بھی ابتدا سے مصری اور یورپی محلّے الگ الگ بنے۔ مصری بستی مغرب اور جنوب مغرب میں مسجد کے ارد گرد پھیلی ہوئی ہے۔ سرکاری طور پر اس کا افتتاح بروز جمعہ، ۱۴ شعبان ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۴ء کو ہوا۔ اہل یورپ کا محلّہ نہر کے دہانے اور ساحل کے قریب شمال مشرق کی طرف واقع ہے۔ آب رسانی کا باقاعدہ انتظام کر دیا گیا، یعنی نہر اسمٰعیلیہ کے ذریعے اور نلوں کی وساطت سے نیل کا پانی ایک بڑے ذخیرۂ آب تک پہنچایا گیا، جس میں متعدد دنوں تک کے لیے آب رسانی کی گنجائش تھی۔ پورٹ سعید کی سرعت سے ترقی کا ثبوت اس کی آبادی میں روز افزوں اضافے سے مل سکتا ہے۔ ۱۹۰۷ء میں یہ آبادی ۴۹،۸۸۴ تھی۔ [۱۹۴۷ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی ۱۷۸۴۳۰ تھی، جو ۱۹۶۵ء میں اڑھائی لاکھ کے قریب ہوگئی، لیکن ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اس میں بہت کمی آ چکی ہے].

شہر نے اس لیے اور بھی جلد اہمیت حاصل کرلی کہ مصر کے دساور مال کی بڑی منڈی بن گیا، چنانچہ اسکندریہ کے بعد ملک میں دوسرا درجہ اس کا ہے۔ علاوہ ازیں یہ مشرق و مغرب کے درمیان بحری آمد و رفت کے لیے بہت ہی اہم مقامات میں سے ایک ہو گیا ہے۔ نہر سویز کی راہ چلنے والے جہازوں کے لیے کوئلا لینے کا یہ اہم مقام اور اعلٰی درجے کی تجارتی منڈی ہے۔ اس کی بیرونی لنگر گاہ ۵۷۰ ایکڑ رقبے پر مشتمل ہے، اس کے دو بندوں یا پشتوں میں، جو اس طرح بنائے گئے ہیں کہ نہر کو سمندر کے پانی اور ریت کی رَو کے مسلسل حملے سے محفوظ رکھ سکیں، نیز مغربی کنارے پر اس کی

گودیوں میں، جو ابتدا میں تین تھیں، ان سب میں توسیع کی گئی۔ ایک بڑی تیرتی گودی (۲۰۹ فٹ لمبی، پچاسی فٹ چوڑی اور اٹھارہ فٹ گہری، جو ساڑھے تین ہزار ٹن وزن اٹھا سکتی ہے) تیار کی گئی اور ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۹ء کے مابین مشرقی کنارے پر نئی گودیاں تعمیر کی گئیں۔ ان گودیوں میں کام کرنے والوں کے رہنے کے لیے مشرق کی جانب پورٹ فؤاد نام کا ایک نیا قصبہ بسایا گیا، جس کا نام مصر کے بادشاہ فؤاد اوّل کے نام پر رکھا گیا۔

ان جہازوں کی حفاظت کے لیے جو رات کے وقت نہر کی طرف آتے ہیں خدیو اسماعیل نے حکومتِ مصر کے خرچ پر رشید Rosetta، برلّس Burullus، دمیاط کے قریب برج العزبہ، اور پورٹ سعید کے مقامات پر چار منارے تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ مؤخّر الذکر ۱۷۴ فٹ بلند ہے۔ اس کی روشنی کی شعاع باقی تینوں کی روشنی سے ممتاز ہے اور بیس میل کے فاصلے سے نظر آتی ہے۔ یہ مغربی پشتے کی بنیاد پر قائم ہے۔ اسی پشتے کی بحری سمت کے سرے پر فرمییہ E. Fermiet کا بنایا ہوا فرڈیننڈ د لسپس Ferdinand de Lesseps کا دیو پیکر مجسمہ استادہ ہے جس کی ۱۸۹۹ء میں نقاب کشائی کی گئی۔

پورٹ سعید کی ممتاز عمارتوں میں سوئز کینال کمپنی کے دفاتر ہیں۔ شہر میں کثرت سے ملک ملک کے لوگ رہتے ہیں، مگر یہاں کی کوئی صنعت مشہور نہیں۔ چھوٹے دکان دار مشرق یا مغرب کی طرف سیاحت کرنے والوں کے ہاتھ مشرقی سامان یا نادرات بیچ کر بسر اوقات کرتے ہیں۔

مآخذ: بڑا معاصر مآخذ ہے (۱) علی پاشا مبارک: الخطط [illegible]، ۲۰ جلد، قاہرہ (بولاق) ۱۳۰۵-۱۳۰۶ھ؛ نیز دیکھیے (۲) نہر سویز اور اس کی تاریخ پر تالیفات؛ (۳) [illegible] تقاویم، اعداد و شمار اور تجارتی گوشوارے شائع کردۂ حکومت مصر و سویز کینال کمپنی؛ (۴) مصر کی بابت رہنما کتابیں، مثلاً از بدکر Baedeker، از مرّے Murray (طبع Mary Brodrick) و از کُک Cook (طبع Sir E. A. Wallis Budge)۔

(A.S. ATIYA)

پورٹو نووو : Porto-Novo، جنوب مغربی افریقہ میں گھانا اور نائیجیریا کے درمیان لاگوس Lagus کے مغرب میں، ساحل سمندر سے کچھ ہٹ کر کوئی ساٹھ میل کے فاصلے پر جمہوریۂ دہومی Dahomey [رک بآں] کا دارالحکومت، جو ۶ درجے ۲۸ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۲ درجے ۴۴ دقیقے طول بلد مشرقی پر واقع ہے۔ پورٹو نووو ریلوے سٹیشن بھی ہے اور اس طرح اندرون ملک سے اس کا رابطہ قائم ہے؛ لاگوس اور دوسرے شہروں کے ساتھ بھی اس کے ذرائع رسل و رسائل موجود ہیں۔ دہومی کے جنوبی حصے میں ساحل سمندر کے قریب جھیلوں کا ایک سلسلہ ہے، جن میں چھوٹے جہاز چل سکتے ہیں۔ یہ جھیلیں باہم ملی ہوئی ہیں اور دو مقامات پر سمندر کے ساتھ بھی مربوط ہیں۔ ان میں سے ایک جھیل کا نام پورٹو نووو ہے (پورٹو = جھیل)، جس کے شمالی سرے پر پورٹو نووو شہر آباد ہے [آبادی: تقریباً ۹۰ ہزار]۔ عہد قدیم میں اس قصبے کے متعدد نام رہے ہیں۔ اسے پورٹو نووو کا نام پرتگیزوں نے سترھویں صدی میں دیا تھا [مزید تاریخی تفصیلات کے لیے رک بہ دہومی]۔

مآخذ: (۱) World Muslim Gazetteer، طبع مؤتمر عالم اسلامی، کراچی ۱۹۶۴ء، ص ۹۹ تا ۱۰۵؛ (۲) Melville J. Herskovitz : Dahomey, ancient West African Kingdom، ۱۹۳۸ء؛ (۳) Dahomey، انگلستان کے محکمۂ خارجہ کی ایک یادداشت، ۱۹۲۰ء؛ (۴) P. Bouche : The Ewe-Speaking Peoples of the Slave Coast، ۱۸۹۰ء؛ (۵) Encyclopaedia of

Britannica، بذیل مادّۂ Dahomey.

(۲) پورٹو نووو کے نام سے بھارت میں پانڈی چری کے قریب جنوبی جانب بھی ایک ساحلی شہر ۱۱ درجے ۳۲ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۹ درجے ۴۵ دقیقے طول بلد مشرقی پر مدراس کے ضلع ارکاٹ کے جنوب میں مدراس سے ایک سو چوالیس میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ یہاں سلطان حیدر علی سے انگریزوں کی ۱۷۸۱ء میں جنگ ہوئی تھی۔

(عبدالمنان عمر)

* **پوست**: فارسی: کھال؛ ترکی: پوستکی؛ کمایا ہوا بھیڑ کا چمڑا، جو درویش فرقے کے کسی پیر یا شیخ کے لیے رسمی سجادے یا تخت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے سرا دونوں پہلوؤں اور پائیں سے بھی روحانی اسرار منسوب کیے جاتے تھے۔ یہ عربی ''بساط'' کا مترادف ہے۔ بقول اولیا چلبی (استانبول، ۱: ۴۹۵)، مرید اپنے مرشد کی آزمائش میں پورا اترنے کے بعد ''صاحب پوست'' کہلاتا ہے۔ بکتاشی فرقے کی رسمی تقریبات میں صدر دالان یا خانقاہ کو بارہ اماموں کی یاد میں سفید بھیڑ کی بارہ پوستوں سے آراستہ کیا جاتا تھا۔

مآخذ: (۱) J.P. Brown: *The Darvishes*، آکسفرڈ ۱۹۲۷ء؛ (۲) G. Jacob، در *Türkische Bibliothek*، ج ۹، برلن ۱۹۰۸ء؛ (۳) H. Thorning، وہی کتاب، ج ۱۶، ۱۹۱۳ء۔

(R. Levy)

⊗ **پوکاک**: ایڈورڈ پوکاک (پوکوک) Edward Pococke، انگلستان کا ایک مشہور عربی دان مستشرق، جو بلاد مغرب میں سترھویں صدی کے مستشرقین میں ایک بلند مرتبہ رکھتا تھا۔ وہ ایک پادری کا بیٹا تھا، جو ۱۶۰۴ء میں پیدا ہوا۔ اس نے آکسفرڈ یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ پوکاک نے اوائل عمر ہی میں عربی کی تحصیل شروع کر دی تھی اور اس سلسلے میں ولیم بیڈویل جیسے فاضل سے اکتساب فیض کیا تھا۔ ۱۶۳۰ء میں اس نے بلاد مشرق کا سفر اختیار کیا اور حلب (شام) کے شہر میں پانچ برس گزارے، جہاں اس نے بہت سے علما سے دوستی پیدا کر لی تھی۔ ان علما میں شیخ فتح اللہ قابل ذکر ہیں، جن سے پوکاک نے عربی پڑھی اور جن سے پوکاک کے دوستانہ مراسم تمام عمر قائم رہے۔

جب ۱۶۳۶ء میں پوکاک انگلستان واپس آیا تو انھیں ایام میں لنڈن کے اسقف اعظم ولیم لاڈ W. Loud نے، جو آکسفرڈ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے، آکسفرڈ میں عربی کی ایک مسند (Chair) قائم کی اور پوکاک کو اسے قبول کرنے کی دعوت دی؛ چنانچہ پوکاک نے اگست ۱۶۳۶ء میں اپنے فرائض منصبی سنبھالے اور اپنے افتتاحی خطبے میں عربی زبان و ادب کی اہمیت اور ان کے مطالعے کی ضرورت بیان کی۔ ۱۶۳۶ء میں پوکاک نے دوبارہ بلاد مشرق کا رخ کیا، استانبول میں تقریباً تین برس گزارے اور وہاں نئی معلومات کے علاوہ بہت سی قلمی کتابیں حاصل کیں۔ ۱۶۴۱ء میں پوکاک واپس آکسفرڈ آیا اور باقی عمر وہیں علمی کاموں میں صرف کر دی۔ پوکاک نے بہت سی کتابیں لکھیں، جن میں سے چند ایک کے نام ذیل میں درج ہیں:

(۱) *Specimen Histtoriae Arabum*، آکسفرڈ ۱۶۴۹ء، جس میں پوکاک نے ابوالفرج کی تاریخ سے بہت سے اقتباسات لیے ہیں اور ان پر لسانی، ادبی اور تاریخی حواشی لکھے ہیں۔

(۲) لامیۃ العجم، جو طغرائی کی ایک مشہور نظم ہے؛ پوکاک نے اسے ترجمے اور تبصرے کے ساتھ شائع کیا (آکسفرڈ ۱۶۶۱ء)۔

(۳) المختصر فی الدول، ابوالفرج ابن العبری

کی تاریخ کا متن مع ترجمہ، مطبوعۂ ۱۶۶۳ء.

پوکاک کے علمی کارناموں نے یورپ میں عربی علوم کی تحقیقات کے لیے ایک نیا باب کھول دیا اور یورپ کے دور دراز ملکوں کے طلبہ اس کی شہرت سن کر اس سے فیض حاصل کرنے کے لیے آوکسفرڈ میں آنے لگے، کیونکہ یورپ میں ولندیزی مستشرق گولیس (Golius) کے سوا اور کوئی دوسرا عالم اس کا ہم پایہ نہ تھا۔ پوکاک کی وفات (۱۶۹۱ء) کے بعد اس کی عربی کتابوں کا تمام ذخیرہ آوکسفرڈ کی بوڈلین لائبریری نے حاصل کر لیا.

پوکاک نے اپنے بعد چھ بیٹے چھوڑے۔ اس کے سب سے بڑے لڑکے کا نام بھی ایڈورڈ پوکاک (۱۶۳۸ تا ۱۷۲۷ء) تھا، جس نے اپنے نامور باپ کے نقش قدم پر چل کر عربی علوم میں اختصاص پیدا کیا اور منجملہ دیگر کتابوں کے مشہور اندلسی فلسفی ابن طفیل (م ۵۸۱ھ) کا رسالہ حی بن یقظان، مع لاطینی ترجمہ، بعنوان *Philosophus Autodidactus* شائع کیا۔ اس رسالے میں ابن طفیل نے ایک دورافتادہ شخص کا فرضی قصہ لکھا ہے، جس نے محض اپنی خداداد عقل کی روشنی میں مادّی اور روحانی زندگی کے بہت سے مراحل طے کر لیے تھے۔ اس رسالے کی اشاعت علمی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ بہت سے علما کی رائے ہے کہ مغرب میں رابنسن کروسو *Robinson Crusoe* کی طرز کے قصے لکھنے کی تحریک ابن طفیل کے اسی رسالے سے ہوئی تھی.

مآخذ : (۱) نجیب العقیقی : اَلْمُسْتَشْرِقُوْن، قاہرہ ۱۹۶۰ء، ۲ : ۴۶۷؛ (۲) *Encyclopaedia Britannica*، بذیل مادّۂ Pococke, W.؛ (۳) *Dictionary of National Biography*، آوکسفرڈ یونیورسٹی پریس؛ (۴) B. Lewis : *British Contributions to Arabic Studies*، ص ۱۲ تا ۱۵، لنڈن ۱۹۴۱ء؛ (۵) J. Fück, *Die Arabischen Studien in Europa*، ص ۸۵، لائپزگ ۱۹۵۵ء.

(شیخ عنایت اللہ)

پولا : مغل شہنشاہ اکبر کے نظام زر میں ۱/۴ دام (۱/۴ پیسہ) کا نام تھا.

(J. Allan)

پولینڈ : [اس مقالے میں پولینڈ کی عمومی تاریخ اور دیگر جغرافیائی کوائف نہیں۔ ان کے لیے دیکھیے *Encyclopedia Britannica* طبع آخری، موجودہ مقالے میں پولینڈ میں اسلام کا ذکر ہے].

یہاں جو قوم بستی ہے، اسے لہ (Leh) کہتے ہیں، اس لیے یہ ملک لہستان بھی کہلاتا ہے۔ چونکہ صدیوں تک یہ ملک اور لتوانیا متحد تھے، خاص کر اس منطقے کے مسلمانوں کی تاریخ میں پولینڈ اور لتوانیا غیر منفک طور پر ملے ہوئے ہیں، اس لیے یہاں دونوں کا ذکر مشترک طور پر کیا جاتا ہے.

یہاں اسلام کی آمد کا ذکر کرنے سے پہلے کچھ اہم واقعات پس منظر کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ یہاں کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ۱۳۸۶ء میں لتوانیا کی گرینڈڈچ حکومت میں اس کا ادغام ہے۔ اس زمانے میں اگر پولینڈ اتنا وسیع تھا کہ اس کے حدود میں صوبۂ گالیسیا بھی شامل تھا تو خود لتوانیا بھی سیاسی وسعت کے نقطۂ عروج پر تھا اور اس وقت اس کے خاص رقبے کے علاوہ ''روس سفید'' اور یوکرین کی ریاستیں بھی شامل تھیں۔ ۱۳۸۶ تا ۱۵۶۹ء، پولینڈ اور لتوانیا کے اس اتحاد کی نوعیت یہ تھی کہ دونوں مملکتوں کا حکمران مشترک تھا، جو لتوانیا کے خانوادۂ یاگویلو (Jaguello) سے نسلاً بعد نسلٍ چلا آ رہا تھا۔ یاگویلو (۱۳۷۷ تا ۱۴۳۴ء) لتوانیا کا ایک گرینڈ ڈیوک تھا، جو ۱۳۸۶ء میں پولینڈ سے وقتی اتحاد کا باعث بنا۔ یہ گیدیمین (Guédimine)

۱۳۱۵ تا ۱۳۵۱ء) کی نسل سے تھا، جو لتوانیا کا ایک ممتاز مدبر اور اس کی عظمت کا بانی گزرا ہے۔ یاگوینلو کی نسل کے آخری فرد Sigismonde August (۱۵۴۸ تا ۱۵۷۲ء) نے ۱۵۶۹ء میں اس وقتی اتحاد کو دائمی اتحاد سے بدل دیا اور لتوانیا مع اپنے روسی صوبوں کے پولینڈ میں مدغم ہو گیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب جنگ عظیم کے بعد علاقوں کی تقسیم کے خاکستر سے پولینڈ نے دوبارہ جنم لیا تو ۱۹۲۱ء کے معاہدۂ ریگا کے مطابق اسے اس کے چند قدیمی روسی صوبے بھی واپس دلائے گئے، مگر لتوانیا کو مناسب معلوم نہ ہوا کہ قدیم اتحاد کی تجدید کرے، بلکہ اس نے مکمل آزادی کو ترجیح دی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد پولینڈ اپنے تمام روسی صوبوں سے تو محروم ہو گیا، لیکن اسے اس کے اکثر مغربی (جرمن) صوبے واپس مل گئے۔

مسلمان یا اُردوے مُطَلّا (آلتون اردو) کے تاتاری، جو چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں لتوانیا میں بسنے کے لیے آنے لگے تھے۔ ان کے ساتھ شروع ہی سے بہی خواہانہ برتاؤ رہا، جو اسلام اور عیسائیت کی شدید کشمکش کے اس دور کو دیکھتے ہوئے غیر متوقع تھا؛ چنانچہ انہیں نہ صرف مکمل مذہبی آزادی ملی بلکہ مراعات بھی دی گئیں۔ ان کے بلند تر طبقات کو بیگار میں عیسائی کسان (Serf) حاصل کرنے کا حق تھا۔ چونکہ ان تاتاریوں کی پوری تاریخ مذکورۂ بالا زمانے سے لے کر اٹھارھویں صدی کے نصف آخر تک، جب کہ پولینڈ کا بٹوارا عمل میں آیا، لتوانیا کے ساتھ وابستہ رہی ہے، اس لیے ان کا مشہور تر نام لتوانیائی تاتاری ہے۔ عثمانی ترک بھی انہیں ”لپکہ تاتار“ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ”لپکہ“ اصل میں ”لتوا“ کا ترکی تلفظ ہے، اور یہ ۱۹۲۰ء میں ہوا جب کہ وہ تین مملکتوں میں بٹ گئے، یعنی پولینڈ میں ۵۳۲۵ افراد لتوانیا میں تقریباً ایک ہزار افراد اور اشتراکی روس کے علاقۂ منسک Minsk میں ۳۶۱۵ افراد۔ چونکہ ان کی اکثریت پولینڈ میں تھی اس لیے وہ پولستانی تاتاری کہلانے لگے۔ پھر بھی ۱۹۳۸ء میں ان کے حالات پر پولینڈ میں جو اہم کتاب شائع ہوئی اس میں انہیں لتوانی تاتاری ہی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

ان کے لتوانیا میں آ بسنے کے بعد سے ان کی تاریخ اچھی طرح معلوم ہے، لیکن ان کے خود وہاں آنے اور ان سے وہاں اچھا برتاؤ ہونے کے اسباب پر کم توجہ ہوئی ہے۔ آ لائڈن، طبع اول، میں مادۂ تاتار کے تحت ان کا جو مختصر تذکرہ ہے وہ محض غلط ہے۔

۱۔ اصل و آغاز:

تاتاریوں کا لتوانیا ہجرت کر جانا نہ تو کوئی اتفاقی بات تھی اور نہ اس علاقے کے حکمرانوں کی رواداری کو اس میں کوئی دخل تھا، بلکہ وہ محض سیاسی صورت حال کا نتیجہ تھا؛ چنانچہ تاتاری یہ جان کر وہاں جاتے تھے کہ ان سے اچھا برتاؤ ہونے والا ہے۔ اصل میں لتوانیا اور آلتون اُردو کی ایک شاخ، یعنی جوچی کے اولوس، آپس میں ایک دوسرے کے حلیف بن گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں لتوانیوں نے قبیلہ واریت کی جگہ ایک مرکزی حکومت کی تدریجی تشکیل شروع کی، جو ایک گرینڈ ڈیوک کی ریاست بنی۔ اس مرکزی نظام کی ضرورت اس بنا پر پیدا ہوئی تھی کہ ایک طرف پولینڈ کے دباؤ کا مقابلہ کیا جائے اور دوسری طرف جرمن راہبوں کے فوجی جتھوں کا، جو ان کو جبراً کیتھولک بنا لینا چاہتے تھے، حالانکہ لتوانی اپنے آبائی مذہب بت پرستی کے شیدا تھے۔ اسے انہوں

نے اس وقت تک ترک نہ کیا جب تک وہ ۱۳۸۶ء میں پولینڈ میں مدغم نہ ہو گئے۔ اس دہرے دباؤ کے تحت ان کے لیے سلامتی کا ایک ہی راستہ کھلا ہوا تھا اور وہ روس کا تھا، جو اس زمانے میں طوائف الملوکی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا؛ چنانچہ مغول نے ۱۲۲۳ء میں جب پہلی مرتبہ یورپ پر حملہ کیا تو اس وقت وہاں ستّر چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں اور یہ سب ایک دوسری سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ اس سلسلے میں قپچاق رضا کاروں کو بخوشی بھرتی کیا جاتا تھا، جو بحرِ اسود کے شمالی ساحل سے متصل صحرا میں بڑی تعداد میں بس گئے تھے۔ بظاہر لتوانیوں کا روس میں پھیلاؤ پہلے منگول حملے کے زمانے میں بہت زیادہ کامیاب نہ رہا، لیکن پہلے اور دوسرے حملے کے مابین وہ اس بات میں کامیاب ہو گئے کہ روسِ سیاہ کے علاقے میں (جو دریاے نیمن کی گزرگاہ کے درمیانی علاقے کا نام ہے) پھیل جائیں۔ جب باتو خان ۱۲۴۲ء میں ہنگری سے واپس آیا تو نہ صرف اس نے یہ کوشش غیر ضروری خیال کی کہ لتوانیوں کو روسِ سیاہ سے نکال باہر کرے، بلکہ خود پولوتسک Polotsk کی ریاست بھی، جس کے بعض اضلاع جرمن سرداروں (Knights) کے قبضے میں آ چکے تھے، لتوانیوں ہی کے زیرِ اثر رہنے دی۔ غرض تاتاروں کا جوا ان دونوں روسی صوبوں کی گردن پر کبھی نہ رکھا گیا، بلکہ وہ وہاں شروع ہی سے لتوانیوں کے اقتدار کے ساتھ دخیل رہے۔ باتو خان کے اس طرزِ عمل کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ وہ جرمن سرداروں کے پھیلاؤ سے واقف تھا، پھر بھی اس نے اس بات کو ترجیح دی کہ اپنے روسی مقبوضات اور ان جرمنوں کے مابین ایک حاجز سلطنت قائم کرے۔ یہی طرزِ عمل اس نے ریاست گالیسیا کے متعلق بھی اختیار کیا، جو براے نام آلتون اردو کے ماتحت تھی۔ اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ اس نے تاتاریوں کو کبھی خراج دیا ہو۔

لیکن لتوانی اس قدر اولوالعزم اور سرگرم تھے کہ محض دو روسی صوبوں پر قناعت نہ کر سکے، بلکہ تیرھویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں انھوں نے آلتون اردو کے روسی مقبوضات پر چھاپا مارنے کی بھی کئی بار کوشش کی، خاص کر اس لیے کہ ان علاقوں میں تاتار کہیں نہیں ملتے تھے۔ وہ اس پر اکتفا کرتے تھے کہ ماتحت روسی رئیسوں پر اپنے قائم مقاموں کی وساطت سے اقتدار قائم کر لیں۔ چونکہ لتوانیوں کی ایسی ہر کوشش ناکام رہی تھی، اس لیے گرینڈ ڈیوک گیدیمین (۱۳۱۵ تا ۱۳۴۱ء) کے برسرِ اقتدار آنے پر یہ سیاست بدل دی گئی۔

گیدیمین نے خان ازبک کی، جس کے دورِ حکومت (۱۳۱۲ تا ۱۳۴۱ء) میں آلتون اردو کے اجزاے ترکیبی کی اکثریت نے اسلام قبول کیا، ہمدردیاں حاصل کر لیں اور دونوں میں بہت گہری دوستی اور اتحاد ہو گیا۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر گیدیمین اور خان ازبک کے جانشین بھی اسی حکمت عملی پر قائم رہے۔ ابتداءً یہ فوجی اتحاد تھا جو شروع میں ٹیوٹانی (جرمن) جنگجو سرداروں (Kinghts) کے خلاف (۱۳۲۹ء میں) اور بعد ازاں پولینڈ کے خلاف عمل میں آیا۔ پھر جب چودھویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں آلتون اردو کمزور ہونا شروع ہوا تو ریاست ماسکو کے خلاف، جو روز بروز قوی تر ہوتی جا رہی تھی، یہ اتحاد عمل میں آیا۔ جب تک لتوانی اور آلتون اردو پولینڈ کے خلاف متحد رہے، کاسیمیر اعظم Casimir (۱۳۳۳ تا ۱۳۷۰ء) کی کوششیں گالیسیا پر تسلط حاصل کرنے کے متعلق ناکام رہیں۔ ۱۳۷۰ء کے آغاز

میں آلتون اُردو کی غیر جانبداری معلوم کرنے کے بعد البتہ وہ وہاں اپنا اقتدار جما سکا۔

لتوانیا اور آلتون اُردو کا سیاسی اتحاد صرف جنگی مسائل کی حد تک محدود نہ رہا، بلکہ سارے روس کو زیرِ اثر لا کر اسے آپس میں بانٹ لینا ان کا مقصد اُبھرا۔ جب آلتون اُردو نے پولینڈ کے خلاف لتوانیا سے حلف کا تعلق منقطع کر دیا تو اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد لتوانیا نے مغربی روس کی متعدد ریاستوں (خصوصاً چرنیگوف Tchernigov اور طوروبو پنسک Tourovo-Pinsk) پر قبضہ کر لیا اور آلتون اردو اس کے خلاف احتجاج نہ کر سکا۔

۱۳۶۰ء اور ۱۳۸۰ء کے مابین آلتون اُردو (اردوے معلا) کے اضمحلال کا پہلا دَور شروع ہوا۔ لتوانیا نے اس سے فائدہ اٹھا کر بو ذرین اور روس سفید کی متعدد ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ خروشیف سکی Hrovchevsky اور لوبافسکی Lubavsky جیسے مؤلفوں نے اس مسئلے کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس بات پر متفق ہیں کہ لتوانیا کے روس میں ان فتوحات کا باعث آلتون اردو کا غیر جانبدارانہ طرزِ عمل ہے۔ بہر حال یہ یقینی ہے کہ آلتون اردو کی جب خان تقتمیش [ترك نان] (تختمیش) (۱۳۷۸ء تا ۱۳۹۵ء) کے باعث حالت سنبھلی تو خان مذکور نے ۱۳۰۰ء کے قبل کی سرحدوں کا بالکل مطالبہ نہ کیا، بلکہ لتوانیوں کے ساتھ ہی حلف کی تجدید کی، جیسا کہ اس کے مکتوب (یارلک) بنام یاگوبلّو، مؤرخۂ ۱۳۹۲ تا ۱۳۹۳ء سے صاف نظر آتا ہے۔ مزید برآں ایسے سکّے دستیاب ہوے ہیں جن پر لتوانی حکمران کے نام کے ساتھ تاتاری تمغہ بھی ثبت ہے، جو اس حکمران کے آلتون اردو کے ماتحت ہونے کی علامت ہے۔ مذکورۂ صدر مؤلّفین اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ۱۳۰۰ء کے بعد سے لتوانیا اور آلتون اردو ان ریاستوں پر جن کا تاریخ مذکور کے بعد لتوانیا سے الحاق ہوا ایک طرح کی مشترک حکمرانی کرتے تھے۔

روس کے اندر لتوانیا کا اس طرح پھیل جانا دراصل اس کی اندرونی سیاست کے باعث ممکن ہوا۔ خود گیدیمین کے زمانے میں لتوانیا ایک سیاسی وحدت بن چکا تھا، جس کے باعث اسے فتوحات میں مدد ملی۔ جب ۱۳۸۶ء میں پولینڈ اور لتوانیا کا باہم ادغام ہو گیا تو اس کی عظمت کو چار چاند لگ گئے۔ یہ ایک جاگیردارانہ وفاق تھا، جس کے اجزاے ترکیبی لتوانی گرینڈ ڈیوک کے تحت، علاوہ مکمل مذہبی آزادی کے، انتظامی اور معاشی خود مختاری سے بھی بڑی حد تک متمتع تھے۔ اس سے اس بات کی توجیہ ہوتی ہے کہ کیوں روسی مؤرخوں کے مطابق روسی ریاستیں لتوانیا کی جانب ایک کشش رکھتی تھیں، یعنی لتوانیا کا روس میں پھیلاؤ بغیر کسی مقابلے یا لڑائی کے عمل میں آیا تھا۔ یہ ریاستیں لتوانیا کو آلتون اُردو پر ترجیح دیتی تھیں، کیونکہ مؤخر الذکر (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) خراج کا مطالبہ کیا کرتا تھا۔ یہ روسی لتوانیا کو ماسکو کی بڑی روسی ریاست پر بھی ترجیح دیتی تھیں، جو ۱۳۱۷ء کے بعد سے روسی ریاستوں میں ممتاز حیثیت اختیار کر چکی تھی، مگر جس کی سیاسی حکمت عملی یہ تھی کہ تمام ماتحت ریاستیں مرکزی قوت کی بے چون و چرا اطاعت کریں۔

۱۳۶۰ تا ۱۳۸۰ء میں آلتون اُردو میں جو ضعف پیدا ہوا اس سے فائدہ اٹھانے میں ریاست ماسکو نے مطلق دریغ نہ کیا۔ وہ آس پاس کی روسی ریاستوں کو ماتحت بنا کر اپنے رقبے میں اضافہ کرتی رہی، خاص کر ریاست طویر Tver پر اس نے قبضہ جمایا، جو اس کی حریف تھی اور ازدواجی تعلقات کے

باعث لتوانیا کے حلف اور پشت پناہی سے مستفید بھی ہو رہی تھی۔ لتوانیا نے کئی بار کوشش کی کہ طویر کی گلو خلاصی کے لیے فوجی امداد کرے، مگر ہر دفعہ اسے ناکامی کا سامنا ہوا، کیونکہ اس کی مغربی سرحد پر (غالباً ماسکو کے اشارے سے) ٹھیک اسی وقت دباؤ پڑنے لگتا تھا۔

یہ بات مشہور ہے کہ آلتون اُردو کے شاہ گرد ممای سے یاگویلو نے ۱۳۷۰ء میں حلیفانہ تعلق پیدا کر لیا تھا، مگر ممای کو روسیوں نے ۱۳۸۰ء میں ماسکو کے حکمران دمتیری کی قیادت میں مشہور جنگ کولیکوفو Koulikovo میں شکست دی تھی اور لتوانی فوجیں اس کی مدد کو بروقت نہ پہنچ سکی تھیں۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ اس جنگ کے چند ماہ بعد آلتون اُردو کے تخت کا جائز حق دار خان تقتمیش (امیر تیمور کی مدد سے) تخت نشین ہوا اور ممای کو شکست دے کر پورے آلتون اُردو کو دوبارہ اپنے ماتحت متحد کر لیا۔ عام طور پر جنگِ کولیکوفو کے سیاسی پہلو پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی ہے۔ تاتاریوں سے ایک بڑی جنگ کی پہلی سوتبہ [illegible] کرتے ہوئے ماسکو کے اربابِ اقتدار نے خاص طور پر یہ چاہا تھا کہ خان تقتمیش سے عذر خواہی کریں اور اسے اس کے دشمن ممای کی شکست میں مدد دیں، گویا اس بات کا جائز حق جتانا تھا کہ ۱۳۶۰ تا ۱۳۸۰ء میں انھوں نے اپنی آزادی کے لیے جو لڑائی کی تھی اسے معاف کر دیا جائے۔ اس میں وہ کامیاب ہو گئے، چنانچہ تقتمیش نے اس پر قناعت کی کہ ۱۳۸۲ء میں ماسکو کے خلاف ایک مہم بھیج کر اس کا مزاج تو درست کر دے، لیکن وہاں کی زمامِ حکومت دمیتری ہی کے ہاتھوں میں رہنے دے۔

آلتون اُردو کا تقتمیش کی سرداری میں دوبارہ متحد ہو جانا مشرقی ہمسایوں سے تعلقات کے سلسلے میں یاگویلو کے لیے بھی مفید ثابت ہوا اور اسے اطمینان ہو گیا کہ اگر ماسکو نے ریاست طویر پر (جو یاگویلو کی ماں شہزادی یولیانا Juliana کا علاقہ تھا) حملہ کیا تو اس کا تاتاری حلیف آڑے آئے گا۔ اس طرح یاگویلو اپنی پوری توجہ مغربی سرحد پر مرتکز کرسکا، جو پہلے سے زیادہ پولینڈ اور جرمن جنگجو سرداروں کا دباؤ محسوس کر رہی تھی۔ اس بارے میں اس نے صرف اپنی قوت بازو پر اکتفا کی، کیونکہ تقتمیش کو مغرب کے مسائل سے دلچسپی نہ تھی۔ اس کی تو ساری توجہ اس پر مبذول تھی کہ اپنے سابق محسن امیر تیمور کو کسی نہ کسی طرح ماتحت بنائے۔

اس زمانے میں لتوانیا ایک بڑی ریاست تھی، جو گالیشیا کو چھوڑ کر سارے مغربی روس میں پھیلی ہوئی تھی۔ دوسرے الفاظ میں لتوانیوں کی مختصر سی قوم روسی عنصر میں جذب ہو گئی (کیونکہ روسیوں کا معیارِ ثقافت بہت بلند تھا) اور خاص کر یاگویلو کے کئی بھائیوں نے آرتھوڈکس عیسائی مذہب اختیار کر لیا، لیکن لتوانیوں کے روسیت اختیار کرنے کے معنی یہ تھے کہ روسی مذہب (آرتھوڈکس عیسائیت) اختیار کریں اور اس کے نتیجے کے طور پر ماسکو کے کسی حد تک ماتحت بھی بن جائیں، کیونکہ اس مذہب کے مطران پادری کا مستقر بھی ماسکو تھا۔ لیکن لتوانیوں کے اس مذہب کو اختیار کر لینے سے جرمن راہبوں کے فوجی جتھوں کا دباؤ کسی طرح نہ گھٹتا، کیونکہ وہ کیتھولک مذہب پھیلانا چاہتے تھے اور اُن کی نظر میں بدعقیدہ عیسائی (آرتھوڈکس)، بت پرست اور مسلمان سب برابر تھے۔ ان تمام وجوہ، نیز جرمن دباؤ سے نکل جانے، اور ساتھ ہی اپنی ریاست میں روسی عناصر کے ساتھ توازن پیدا کرنے اور اپنی

قوم کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے سبب لتوانیا نے اس بات کو ترجیح دی کہ پولینڈ میں مدغم ہو جائے؛ اس بنا پر سارے لتوانیوں نے کیتھولک مذہب قبول کرلیا۔ تاتاری نوواردوں سے لتوانیا کے حسن سلوک کی توجیہ بھی اسی سیاسی صورت حال کے اندر نکل آتی ہے.

یہ عجیب بات ہے کہ لتوانیا میں تاتاریوں کی موجودگی کا سب سے پہلا تذکرہ لتوانیا اور پولینڈ کے ادغام سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ یاگویلو کا ۱۲ فروری ۱۳۸۶ء کو کراکوف Krakaw آ کر پولینڈ کے بادشاہ کی حیثیت سے تاج پہننے اور ملکہ یدویگا (Hedvige ،Jadviga) سے مناکحت کا ذکر کرتے ہوئے پولستانی مؤرخ واکونسکی Wakowski بیان کرتا ہے کہ لتوانیا کے گرینڈ ڈیوک کے جلو میں اس کے ذاتی محافظ فوجی سپاہیوں کے طور پر ایک تاتاری دستہ (سکواڈرن) بھی تھا؛ لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آیا تاتاری اس سے پہلے ھی لتوانیا میں آ بسے تھے یا یہ کہ یاگویلو نے یہ محافظ دستہ آلتون اُردو والوں میں سے بھرتی کیا تھا.

۱۳۹۳ء میں ایک اور اہم واقعہ پیش آیا، جس نے لتوانیا کی قسمت پر بڑا اثر ڈالا۔ یاگویلو نے اپنے برادر عم زاد ویتولد Witold سے ایک معاھدہ کیا، جس کی رُو سے ویتولد کو لتوانیا کا گورنر جنرل بنایا گیا؛ نیز اسے گرینڈ ڈیوک کا لقب عطا ھوا، اور مشرقی ھمسایوں سے تعلقات کے متعلق غیرمحدود آزادی بھی دے دی گئی۔ اس عظیم مدبّر کے زمانے میں، جو گیدیمین کی اولاد میں غالباً سب سے زیادہ قابل گزرا ھے، لتوانیا اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ یہ بتانا کافی ھے کہ جب ۱۴۳۰ء میں وہ فوت ھوا تو اُس زمانے میں سارا روس اور ماسکو کی بڑی ریاست بہر حال اس کے زیر نگین اور باجگزار ھو چکی تھی۔ آلتون اردو کے متعلق اس نے گیدیمین کی بہترین روایتوں کی پیروی کی، لیکن بد قسمتی سے اس کے برابر کے رفیق آلتون اردو میں نہ مل سکے؛ چنانچہ اس کے بر سر اقتدار آنے کے دو ھی سال بعد آلتون اردو کا دوبارہ زوال شروع ھوا، جو غیر منقطع طور پر جاری رھا۔ ویتولد پوری کوشش کے باوجود اسے روک نہ سکا۔ اس نے تاتاری نو آبادکاروں سے جو برتاؤ کیا وہ اصل میں آلتون اردو کے متعلق اس کی عام سیاسی حکمت عملی ھی کا ایک جُز تھا.

جب ۱۳۹۰ء میں تقتمیش نے امیر تیمور کے ھاتھوں آخری شکست کھائی تو وہ اپنے ساتھیوں کے ھمراہ لتوانیا آ کر پناہ گزین ھوا۔ یہ تاتاریوں کے لتوانیا میں بسنے کا پہلا بڑا تاریخی واقعہ ھے جو ھمیں معلوم ھے۔ ویتولد نے ان سے بہترین سلوک کیا۔ آلتون اُردو کے متعلق اس کی عظیم الشان سیاست کا اسی سے آغاز ھوا۔ ۱۳۹۷ء اور ۱۳۹۹ء میں اس نے صحرائے وسط ایشیا کی طرف متعدد مہمیں بھیجیں تاکہ تاتاریوں کو لتوانیا آنے اور تقتمیش کے رفقا کی تعداد بڑھانے کا موقع ملے اور ایک بڑی مہم کے لیے راستہ صاف ھو۔ ۱۳۹۹ء میں اس نے تقتمیش سے ایک معاھدہ کیا، جس کے مطابق مؤخرالذکر نے اس کے نام اپنی ساری روسی باجگزار ریاستوں کا حق منتقل کر دیا۔ پھر دونوں مل کر خان تیمور قتلغ سے لڑنے کے لیے روانہ ھوئے۔ یہ شاہ گرد اصل میں ایدیگہ Edyguée کا، جو (آلتون اُردو کے متعلق امیر تیمور کا آلۂ کار تھا)، ساختہ پرداختہ تھا۔ اگرچہ یہ مہم ھوشیاری کے ساتھ تیار ھوئی تھی (اور سارے مغرب نے، جس میں پوپ بھی شامل تھا، اسے فوجی اور مالی مدد دی تھی)، لیکن تاتاریوں اور لتوانیوں کی مخالف فوجوں

کو فورکسلا (Vorksla) کی مشہور لڑائی میں شکست ہوئی۔ چونکہ یہ مہم بالواسطہ امیر تیمور کے خلاف تھی (جو عثمانی ترکوں کا دشمن تھا)، اس لیے ترکوں اور پولینڈ اور لتوانیا میں ہمدردی اور دوستی پیدا کرنے کا بھی باعث بنی۔

ویتولد نے اس شکست سے ہمت نہ ہاری وہ مرتے دم تک آلتون اُردو کے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا، اور وقتاً فوقتاً تقتمیش کے تخت پر اس کے بیٹوں کو متمکن بھی کراتا رہا، لیکن بُعدِ مسافت کے باعث اس کی کوششوں کا کوئی پائدار اثر ظاہر نہ ہوا۔ اس کا کارگر اثر آلتون اُردو میں اس کی مغربی سرحدوں خاص کر قریم (کریمیا) ہی تک محدود رہا، جیسے شوالئے دَلانوا (Chevalier de Lanoy) نے اچھی طرح واضح کیا ہے۔ ساتھ ہی وہ اس کی بھی پوری کوشش کرتا رہا کہ تاتار زیادہ سے زیادہ تعداد میں لتوانیا میں آ بسیں، تاکہ نہ صرف آلتون اُردو کے متعلق انہیں اپنے نظریوں کا آلۂ کار بنائے، بلکہ اپنی ریاست میں لتوانیوں کے اثر کو بھی یوں مستحکم کرے؛ لہذا یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کہ پہلی تاتاری بستیاں جو لتوانیا میں بسیں پایۂ تخت کے مضافات میں تھیں۔ جہاں تک خود تاتاروں کا تعلق ہے، یہ قدرتی بات ہے کہ ان کے خاص وطن میں جو بدنظمی تھی اس کے باعث وہ بارہا جلا وطنی پر مجبور ہوئے، خاص کر وہ لوگ جو کسی شکست خوردہ خان کے ملازم ہوتے تھے۔ ہمعصر ماخذ اس بات کا اکثر ذکر کرتے ہیں کہ ویتولد کے زمانے میں جوجی کی نسل کے بہت سے آدمی لتوانیا میں رہتے تھے۔ ان میں سب سے مشہور خان حاجی گرای تھا، جو لتوانیا میں پیدا ہوا۔ اسی کی مدد سے بعد کو وہ قریم (کریمیا) پر قابض ہو گیا۔

ویتولد کی اس سیاسی حکمت عملی پر اس کے جانشین بھی برابر قائم رہے، زیادہ صحیح میں یا گوبلو کی اولاد، کیونکہ ویتولد نے کوئی اولاد نرینہ نہیں چھوڑی تھی۔

۲ ۔ تاریخ :

ویتولد کی وفات پر لتوانیا میں اندرونی خلفشار شروع ہو گیا، جس کے باعث آلتون اُردو اور اس کے باقی ماندہ اجزاے ترکیبی کے متعلق بھی اس کی سیاست معطل ہو گئی۔ جیسا کہ مشہور ہے آلتون اُردو کا یورپی حصہ پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں مزید کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا، اور قازان، قریم، استراخان اور اُردوے کبیر پر الگ الگ خان حکومت کرنے لگے۔ لتوانیا نے جو واحد کامیابی حاصل کی وہ یہ تھی کہ اس کی کوشش سے ۱۴۴۹ء میں قریم (کریمیا) میں حاجی گرای نے اقتدار حاصل کیا اور اپنی وفات (۱۴۶۶ء) تک وہ اپنے آپ کو لتوانیا کا، جو اس کا پیدائشی وطن بھی تھا، وفادار متوسل (Vassal) سمجھتا رہا۔ قریم (کریمیا) میں صورتِ حال مستحکم ہونے تک وہاں سے تارکینِ وطن لتوانیا جاتے رہے، لیکن لتوانیا کی اندرونی صورت حال درست ہو جانے کے بعد وہاں تاتاریوں سے بڑے سیاسی اغراض کے لیے دوبارہ کام نہیں لیا گیا، اگرچہ سولھویں صدی کے اواخر تک لتوانیا کی صفوں میں جوجی کی اولاد اور احفاد موجود نظر آتے ہیں۔ لتوانیا نے تاتاریوں سے اب صرف درمیانی اغراض، مثلاً ترجمانی کا کام لینا شروع کیا، یعنی آلتون اردو کے اجزاے ترکیبی، اور بعد میں عثمانی ترکوں سے بات چیت میں یہ لوگ سفیر یا ایلچی ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک لتوانی تاتاری کیرئی (Cuirei) قابل ذکر ہے، جس نے ۱۴۷۰ء میں اُردوے کبیر کے خان احمد اور لتوانیا کے مابین ماسکو کے خلاف حلف کا تعلق قائم کیا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی

کے اواخر کے بعد سے ترجمانی اغراض کے لیے بھی تاتاریوں سے بہت کم کام لیا گیا، کیونکہ وہ اپنی مادری (چغتائی) زبان بھی بھول چلے تھے۔ آخری تاتاری سفیر ۱۷۱۶ء میں خان قریم (کریمیا) کے پاس بھیجا گیا تھا۔

اس کے برخلاف ماسکو نے ویتولد کے طرزِ سیاست سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ فائدہ اٹھایا اور تقریباً ۱۴۵۲ء میں اپنی سر زمین کے اندر ریازان (Riazan) کے علاقے میں قاسموف کی خانیہ ریاست قائم کی، جس سے اُردوے کبیر کے باقی ماندہ اجزا، خاص کر قازان کی خانیہ کے خلاف خوب کام لیا۔ مزید برآں اس تاریخ کے بعد سے دربارِ ماسکو جوجی کی نسل کے لوگوں سے معمور ہو گیا، جن سے وہ چالاکی کے ساتھ لتوانیا کے خلاف کام لیتا رہا، مثلاً وہ جنگیں جو منگلی ابن حاجی گرای نے لتوانیا کے خلاف لڑیں۔ منگلی کے بھائی اور حریف نور دولت اور آیدر (یا حیدر) بھی ماسکو آ گئے تھے اور ان کو لتوانیا بدقسمتی سے اپنے ہاں رکھ نہ سکا تھا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے لتوانی تاتاریوں کی اہمیت یہ ہے کہ وہ آلتون اُردو کی یادگار ہیں، لیکن پندرھویں صدی عیسوی کے مآخذ کمیاب ہونے کے باعث ان میں اور ان کی اصلی آلتون اُردو میں ربط محض اٹکل ہی سے قائم کیا جا سکتا ہے، خصوصاً اس بات کا بہت ہی کم علم ہے کہ ان کے خاندانوں نے وہاں کیا کارہائے نمایاں انجام دیے۔

لتوانیا میں تاتاری سولھویں صدی کے اواخر تک جس حسنِ سلوک سے مستفید ہوتے رہے وہ سیاسی اور انسانی دونوں نقطہ ہائے نظر سے عقلمندانہ تھا۔ انہیں کامل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ان کی مسجدوں کے لیے امام اسلامی ممالک خاص کر قریم (کریمیا) سے بلائے جا سکتے تھے۔ ان کو حج کرنے کی اجازت تھی۔ مؤخرالذکر کا ثبوت ایک اہم عثمانی دستاویز سے ملتا ہے، جو ترکی زبان میں موجود ہے، یعنی ''رسالہ تاتارلہ'' (لہستان، یعنی پولینڈ کے تاتاریوں کے حالات؛ اسے سلطان سلیمان قانونی کے وزیر رستم پاشا کے حکم سے ۱۵۵۸ء میں ایک لتوانی تاتاری نے، جو حج کو جا رہا تھا، استانبول کے زمانۂ قیام میں مرتب کیا تھا؛ یہ رسالہ شائع ہو چکا ہے)۔

قانونی نقطۂ نظر سے لتوانی تاتاری براہِ راست گرینڈ ڈیوک کے متوسّل سمجھے جاتے تھے۔ ترکِ وطن کر کے آ بسنے پر ان میں سے ہر ایک کو آلتون اُردو میں اس کی جو حیثیت رہ چکی تھی، اس کے مطابق زمینیں عطا ہوئیں۔ امیر بیگ یا مرزا اوغلان میں سے ہر ایک کو، نیز جوجی کے خاندان کے لوگوں کو، جو پندرھویں صدی عیسوی کے بعد سے زیادہ تعداد میں نہیں رہے، جاگیریں عطا ہوئیں تو عام سپاہی بھی دیہات میں گروہ در گروہ بسائے گئے۔ یہ زمینیں جاگیردارانہ اصول پر عطا ہوئیں۔ تاتاری ان سے متمتع تو ہو سکتے تھے، لیکن کسی اور کے نام منتقل نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے معاوضے میں گرینڈڈیوک کی پہلی ہی طلبی پر فوجی خدمت کے لیے انہیں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ اس میں گرینڈڈیوک کا یہ فائدہ تھا کہ عیسائی جاگیرداروں کے برخلاف ان تاتاریوں کے طلب کرنے میں اسے اپنی مجلس پارلیمان سے اجازت لینے کی حاجت نہ تھی۔ ہر امیر اپنی جاگیر کے مطابق ایک معیّن تعداد میں سوار مہیا کرنے کا پابند تھا اور عام سپاہی بھی بذاتِ خود حاضر ہوتے تھے۔ تاتاری امیروں کی عطا شدہ جاگیریں زیادہ بڑی نہ تھیں۔ بڑے سے بڑا تاتاری آٹھ سوار پیش کر سکتا تھا، حالانکہ طاقتور لتوانی جاگیردار طلبی پر پانچ پانچ سو سوار

تک پیش کرتے تھے ۔ بہرحال تاتاریوں پر فوجی خدمت کا یہ التزام اس امتیاز کا حامل تھا کہ وہ اپنی مستقل فوجی جمعیتیں قائم کرتے اور خود اپنے آدمیوں کو افسری پر مامور کرتے تھے ۔ ان جمعیتوں کے ناموں میں آلتون اردو کے اثرات نظر آتے ہیں ۔ زیادہ صحیح الفاظ میں ان قبائل کے نام، جن سے ان کے مختلف گروہ تعلق رکھتے تھے، یہ چھے تھے: اویشون (Ouchoune)، نیمان (Naiman)، جلائر (Djalair)، کونگرات (Koungrate)، برین (Barine) اور اوغلان (Uhlān) ۔ اول الذکر پانچ قبائلی نام ہیں، جو ترکوں اور منگولوں کے درمیان وسطی ایشیا اور قریم (کریمیا) میں ہمیشہ رائج رہے ہیں ۔ آخری لفظ اوغلان، جس کے لفظی معنے بچے کے ہیں، ایک افسرانہ رتبہ تھا، جو آلتون اردو میں عطا ہوتا تھا ۔ بلند درجے کے تاتاریوں کو یہ حق بھی تھا کہ بیگار کے عیسائی کسانوں کے مالک بنیں ۔ ایک تیسرا طبقہ عوام (پرولتاری) کا بھی تھا، جو شہروں میں رہتا اور دباغت، حمل و نقل، باغبانی اور ڈاک رسانی کا کام انجام دیتا ۔ یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ ان قیدیوں کی اولاد تھے جو پندرھویں صدی کے اواخر کے بعد سے قریم (کریمیا) سے جنگوں میں گرفتار کرکے لائے گئے تھے ۔ رفتہ رفتہ یہ سہ گانہ طبقاتی امتیاز جاتا رہا اور صرف تونگری اور علم کا فرق باقی رہ گیا ۔

اندرونی معاملات میں لتوانی تاتاریوں کو قانون شریعت پر عمل کرنے کا حق تھا ۔ ایسے مقدمات ان کے قاضی سنتے، جو عام طور پر مسجدوں کے امام ہوتے تھے ۔ ۱۵۹۳ء کی ایک دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کے اوپر لتوانیا کے گرینڈ ڈیوک کے علاقے کے سارے تاتاریوں کا قاضی تھا، جس کے نام کے ساتھ درویش حاجی کے القاب شامل تھے ۔ تاتاری اپنی مرضی سے اسلامی عدالتوں کے بجائے ملک کی عام عدالتوں سے بھی رجوع کر سکتے تھے، جہاں لتوانی قوانین کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا ۔

لتوانیا کے گرینڈ ڈیوک ان تاتاریوں پر جس قدر اعتماد کرتے تھے، اس کا پتا یوں بھی چلتا ہے کہ یہ اکثر ان کے جلو میں محافظ دستے کے طور پر رہتے تھے ۔ سولھویں صدی کے وسط کے بعد سے لتوانیا میں تنخواہ دار سپاہی رکھے جانے لگے ۔ اس بارے میں تاتاریوں کا حق دوسرے ملکیوں کے برابر تھا، البتہ انھیں اٹھارھویں صدی کے اواخر تک سیاسی حقوق عطا نہیں ہوئے تھے؛ وہ نہ تو مرکزی یا صوبائی مجالس شوری کے رکن بن سکتے تھے، نہ عام ملکی نظم و نسق کے محکموں میں ملازمت کر سکتے تھے ۔

سولھویں صدی کے اواخر سے پہلے بھی بعض وقت صوبائی افسر تاتاریوں کے حقوق میں دست اندازی کرتے تھے، لیکن باگیلو خانوادہ ہمیشہ ان کی مدد کو آتا اور انصاف کرتا ۔ یاگیلو خانوادے کے آخری حکمران نے تو ۱۵۶۸ء میں ایک فرمان جاری کیا تھا کہ ان کے اور عیسائی امرا کے حقوق مساوی ہیں، لیکن اٹھارھویں صدی کے اواخر تک اس پر عمل نہ ہوا ۔

سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب یاگیلو خانوادہ ختم ہوا تو تاتاریوں پر مذہبی مظالم بھی شروع ہو گئے ۔ چند عورتوں کو اس بہانے زندہ جلا دیا گیا کہ وہ جادوگر ہیں ۔ مساجد کی تعمیر بلکہ مرمت تک ممنوع قرار دی گئی ۔ ان کا عیسائی عورتوں سے نکاح ممنوع ہوا ۔ ایک روایت، جس کا تحریری ثبوت نہیں ملتا، یہ چلی آتی ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر تک عیسائی ماؤں کے بچے باپ کے مذہب پر مسلمان سمجھے جاتے

تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ اسی مخلوط نکاح کے باعث وہ اپنی اصلی (تُرکی) زبان بھول گئے۔ ان کے متعدد خانوادوں کے نام بھی صقلبی (slav) ہیں، جو ننھیال کے نام ہیں۔ عیسائی عورتوں سے نکاح کا حق پولینڈ میں اس کے زمانۂ احیا (۱۹۱۹ء) تک ان کے لیے ممنوع رہا۔ ان تاتاریوں میں تعدّد ازدواج کا بھی پتا نہیں چلتا۔ ان کی عورتیں زندگی کی عام روش میں عام عیسائی عورتوں سے مختلف نہ تھیں۔ پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر سے ان میں خاندانی نام رائج ہونے لگے، ورنہ اس سے پہلے شخصی نام ہوتے تھے۔ مذکورۂ بالا مذہبی مظالم زیادہ دنوں تک جاری نہ رہے، کیونکہ ایک تو تاتاری بہت منتشر طور پر بسے ہوئے تھے، دوسرے ان کی تعداد بہت کم تھی (اس زمانے میں وہ دس ہزار سے زیادہ نہ تھے)، تیسرے یہ کہ بادشاہ کو ان کے سواروں کی ضرورت تھی اور عام عیسائی امرا بھی ان کو اپنے ذاتی محافظ دستے میں بھرتی کرنے کے شائق تھے۔

لیکن ان کی تاریخ کا سب سے مشکل دَور ۱۶۵۵ تا ۱۶۶۰ء تھا جب کہ علاقۂ ولنو پر ماسکو کی فوجوں نے قبضہ کر لیا اور پولینڈ والوں پر سویڈن کے لوگوں نے حملہ کر دیا۔ بہت سے تاتاری بھاگ کر ترکیہ چلے گئے، لیکن راستے میں لٹیروں اور سویڈن کے حامیوں نے ان میں سے بہتوں کو مار ڈالا۔ اسی زمانے میں تاتاریوں کے فوجی دستے یوکرین کے قازقوں سے جنگ میں مشغول تھے، لیکن چونکہ سرکاری خزانہ خالی تھا اور کئی سال سے ان تاتاریوں کو تنخواہ نہیں ملی تھی، اس لیے ان میں سے کچھ ترکیہ چلے گئے۔ پولینڈ کی صورت حال بحال ہونے پر ان میں سے کچھ واپس بھی گئے اور بادشاہ یان سولیسکی Jansovieski (۱۶۷۴ تا ۱۶۹۶ء) کی سفارش پر، جو انھیں بہت پسند کرتا تھا، ان کا قصور معاف کر دیا گیا۔ قتل اور خلفشار کے اس دَور میں تاتاریوں کی تعداد خاصی گھٹ گئی۔

۱۷۰۳ تا ۱۷۰۹ء کی خانہ جنگی میں بھی ان کا یہی حال ہوا، مگر کسی قدر چھوٹے پیمانے پر، جب کہ روس کا پیٹر اعظم اور سویڈن کا چارلس دوازدھم دخل انداز ہوے اور تاتاری مجبور ہو گئے کہ کسی نہ کسی فریق کا ساتھ دیں۔ اس زمانے میں بھی ترکیہ کی طرف تاتاریوں کی نقل مکانی کا پتا چلتا ہے، جہاں حالت امن میں بھی ان کے لیے ایک کشش تھی اور اب پولینڈ کی حالت جنگ میں تو یہ اور بھی بڑھ گئی۔

اوغلان (ہلکے سواروں) کا، جن کے لیے یورپ کی ساری زبانوں میں لفظ بگاڑ کر اولان Uhlan مستعمل ہے، دراصل انھیں لتوانی تاتاریوں سے آغاز ہوا۔ بادشاہ آگسٹ دوم (۱۶۹۷ تا ۱۷۳۳ء)، جو ساکسنی کا بھی بادشاہ تھا، کرنل علی اوغلان کی تاتاری جمعیّت کا اتنا شیدا تھا کہ ان کو ۱۷۱۷ء میں ڈریسڈن (جرمنی) لے گیا۔ یہاں ان تاتاری سواروں نے ایسی ہردلعزیزی حاصل کی کہ کرنل کی طرح سارے سوار اولان Uhlan کہلانے لگے اور دوسرے جرمن حکمرانوں نے بھی مماثل جمعیتیں قائم کیں۔ انھیں اسی قسم کے ہتھیار دیے اور اسی قسم کے جنگی گر سکھائے اور ان کو اولان ہی سے موسوم کرنے لگے۔ یورپ کی اُولان سوار جمعیتوں میں سر پر جو خود استعمال ہوتے ہیں وہ بھی تاتاری نمونے کے ہیں۔

جب اٹھارھویں صدی عیسوی میں پولینڈ میں باقاعدہ فوج رکھی گئی تو تاتاریوں نے بھی اس میں بڑی تعداد میں حصہ لیا، اور اس صدی کے وسط میں تو ان کا ایک فرد جرنیل بھی بن گیا۔ پولینڈ کا آخری بادشاہ سٹینسلاس آگسٹ Stanislas)

August ۱۷۶۳ء تا ۱۷۹۴ء) ان کے ساتھ خاص طور پر اچھا برتاؤ کرتا رہا، چنانچہ اس نے ان کے پرانے امتیازات بحال کر دیے۔ اظہار شکر گزاری کے طور پر انہوں نے ۱۷۹۲ء تا ۱۷۹۴ء کی جنگ آزادی میں اس کے تخت کی حفاظت کے لیے سواروں کی چھے رجمنٹیں قائم کیں۔

جب ۱۷۹۴ء میں پولینڈ کی آخری بار تقسیم عمل میں آئی تو یہ تاتاری روس کے ماتحت ہو گئے۔ روس کی ملکہ کیتھرائن دوم (۱۷۶۲ء تا ۱۷۹۶ء) کو سیاست خارجہ میں کبھی شکست نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنی مسلمان رعایا کی بغاوتوں کے استیصال اور ان کی حالت سدھارنے کے لیے بھی وسیع مذہبی رواداری کا ثبوت دیا تھا۔ اب اس نے تاتاریوں کو پولینڈ کا ساتھ نہ دینے پر مائل کرنا شروع کیا، چنانچہ ۱۷۹۴ء کے ایک فرمان میں اس نے اپنی سلطنت کی ملکی اور فوجی تمام ملازمتوں کے دروازے ان پر کھول دیے۔ اس کے بیٹے پال اول (۱۷۹۶ء تا ۱۸۰۱ء) نے ۱۷۹۷ء میں سواروں کا ایک دستہ قائم کیا، جو صرف تاتاریوں پر مشتمل تھا۔ اس کے جانشینوں نے تاتاری امرا کو روسی امرا کے ساتھ مساوات عطا کی۔ مذہبی مسائل میں انہیں قریم (کریمیا) کے محکمۂ افتا کے ماتحت کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ۱۸۱۲ء میں نپولین اول نے روس پر حملہ کیا اور چاہا کہ ایک پوری تاتاری رجمنٹ تیار کرے تو اسے ایک دستے سے زیادہ کے لیے رضاکار نہ مل سکے۔ اس دستے نے ۱۸۱۳ء کے معرکۂ فرانس میں پورا حصہ لیا۔ انہی اسباب سے ۱۸۳۱ء تا ۱۸۶۳ء کی پولستانی بغاوتوں میں تاتاری زیادہ حصہ نہ لے سکے۔

اگر پولینڈ کی تقسیم تک ان تاتاریوں میں مغربی انداز کی تعلیم بہت ہی پست درجے کی تھی تو روسی قبضے کے بعد اس کی حالت اور بھی بدتر ہو گئی، خصوصاً ان لوگوں میں جو فوج میں ملازم ہو گئے تھے، جہاں اور پیشوں کے مقابلے میں ان کے لیے زیادہ کشش تھی۔ اس کی بہترین مثال پہلی عالمگیر جنگ میں ملتی ہے، جب روسی فوج میں بیس تاتاری جرنیل تھے؛ چھوٹے افسروں اور سپاہیوں کا تو شمار نہیں۔ ان جرنیلوں میں سب سے مشہور یعقوب یوسفووچ تھا، جو شروع میں قفقازی ڈویژن موسوم بہ ''وحشی'' کا چیف آف سٹاف تھا۔ اس ڈویژن کا کمانڈر زار روس کا بھائی مائیکل تھا۔ یعقوب جنگ کے آخری زمانے میں جرمن محاذ پر ایک پوری فوج کا کمانڈر بن گیا تھا۔

۱۸۶۳ء کی پولستانی بغاوت تک ان تاتاریوں میں پولستانی تہذیب غالب تھی۔ اس کے بعد سے انہوں نے روسی اثرات قبول کیے اور اب تو ان کی اکثریت دو زبانیں (پولستانی اور روسی) بولتی ہے۔ ان کی پولینڈ سے وابستگی کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ حکومت پولینڈ کے صدر مارشل پلسودسکی Pilsudski کے قریب ترین رفقاے کار میں ایک تاتاری Alexander Sulkiewicz بھی تھا۔

ہمارے ماخذ میں اس کا ذکر نہیں ملتا کہ پندرھویں صدی عیسوی میں ان تاتاریوں کا معیار تہذیب کیا تھا؛ سولھویں صدی عیسوی میں البتہ اسلامی ممالک، خصوصاً عرب، میں تعلیم پائے ہوئے افراد کے باعث وہ خاصا بلند ہو گیا۔ اس کا پتا اس مذہبی لٹریچر سے چلتا ہے جو انہوں نے سفید روسی اور پولستانی زبانوں میں (جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھیں) پیدا کیا، مثلاً عربی زبان و خط سکھانے کی کتابیں، قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر، سیرۃ النبی ؐ، کتب تاریخ و دینیات، کتب حمائل (جن میں قرآن مجید کی ضروری سورتوں کے علاوہ عبادات کی بہت سی دعائیں بھی ہوتی

نہیں) - بعض کتابیں ان لوگوں نے چغتائی زبان میں بھی لکھیں، مگر یہ کتابیں بہت نادر ہیں - روسی مستشرق کراچ کوفسکی Kratch Kovski نے افسوس ظاہر کیا تھا کہ تاتاریوں کے اس مذہبی لٹریچر پر تحقیقی کام اب تک نہیں ہوا - قرآن مجید کے کئی مکمل یا نامکمل ترجمے پولستانی میں (بخطِ لاطینی) ملتے ہیں - ان میں سے ایک، جو سوبولیفسکی (Sobolewski) کی طرف منسوب اور بظاہر ناتمام ہے، ۱۸۲۸ء میں طبع ہوا - مکمل ترجمہ ایک تاتاری مسلمان مرزا طارق بوچاتسکی Jan Murza Tarak Buczacki نے دو جلدوں میں ۱۸۵۸ء میں وارسا میں طبع کیا - منتخب سورتیں (عربی مع ترجمہ) پولینڈ کے مفتی یعقوب شنکئے وچ (J. Szynkiewicz) نے ۱۹۳۵ء میں شائع کیں - قدیم عربی رسم الخط کے تراجم کو، جو بین السطور ہیں، محض نمونے کے طور پر ایک آدھ ورق فوٹو لے کر شائع کیا گیا ہے۔

سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں جو ہنگامے ہوئے ان کے بعد سے بیسویں صدی کے آغاز تک مسلمانوں کا معیارِ تہذیب گرتا ہی چلا گیا - اسی دورِ انحطاط میں اُن کے امام غریب ترین اور کم تعلیم یافتہ طبقے سے چُنے جاتے تھے - ان کا مبلغ علم بس یہ تھا کہ عربی خط لکھ پڑھ سکیں اور نماز پڑھادیں - روس کے پہلے انقلاب (۱۹۰۵ء) کے بعد نوجوان مسلمانوں میں بھی نشأۃ ثانیہ کی تحریک شروع ہوئی - ۱۹۰۷ء میں مسلمان طلبہ نے سینٹ پیٹرز برگ (لینن گراڈ) میں ایک انجمن بنائی، جس سے ان کے مستقبل کے رہنما پیدا ہوئے - اسی بناء پر ۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب میں وہ غافل نہیں رہے، بلکہ روسی ہم وطنوں کے ساتھ انقلابی سرگرمیوں میں خاصا حصہ لیا؛ چنانچہ قریم (کریمیا) کی حکومت میں ۱۹۱۸ء میں مسلمان وزیر اعظم جنرل ماتیوش سلکئے وچ (M. Sulkiewicz) کے علاوہ تین اور وزیر تاتاری تھے - آذر بیجان [رک بآں] کی حکومت میں ایک نائب وزیر اور متعدد اعلیٰ عہدہ دار بھی تاتاری تھے۔

پولینڈ کے ۱۹۱۹ء کے احیا نے ان کا معیار تہذیب بلند کرنے میں خوب حصہ لیا - رواداری کی قدیم عمدہ روایات پر دوبارہ عمل کرتے ہوئے حکومت نے انہیں مکمل مذہبی اور تمدنی آزادی دی - ۱۹۲۵ء میں یہاں کے مفتی یعقوب شنکئے وچ (Szynkiewicz) کو مسلمانانِ ملک کا صدر مقرر کر کے کامل اندرونی خود مختاری عطا کر دی گئی - انہیں ملکی و فوجی ہر محکمے میں پوری مساوات کے ساتھ قبول کیا جاتا تھا - یہ تاتاری محکمۂ عدالت میں زیادہ تھے - پہلی عالمگیر جنگ کی خونریزی میں ان کی تعداد فوج میں بہت گھٹ گئی تھی۔

محکمۂ افتا کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ اماموں کا معیار بلند کرے؛ چنانچہ ان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا اور دینیات کی کئی درسی کتابیں شائع کی گئیں - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی سترہ مسجدوں میں جو قرآنی مکتب تھے ان کا معیار تعلیم بھی خود بخود بلند ہو گیا - دو نوجوان جامعۂ ازہر میں تعلیم پانے کے لیے مصر بھیجے گئے - ۱۹۳۹ء کی دوسری عالمگیر جنگ سے کچھ ہی پہلے کئی طالب علم مصر جانے کی تیاری کر رہے تھے اور پولینڈ کی جامعات میں مشرقی زبانیں سیکھ رہے تھے۔

یہاں کی تمدنی تحریک نے جو صورت اختیار کی وہ یہ تھی کہ اپنے مذہب، اپنی تاریخ اور علم تاریخ اسلام کے عمیق تر مطالعے کا خیال پیدا ہوا - اس غرض کے لیے ارسلان کری چنسکی (A. Kryczynski) اور اولگرد کری چنسکی (Olgerd Kryczynski) دو

بھائیوں نے ایک انجمن بنائی اور ۱۹۲۹ء میں سلسلۂ نشریات کا آغاز اس طرح ہوا کہ تاتاری امرا کے قومی مانوگرام (Armoriai) پر ایک کتاب شائع کی گئی۔ اس کے کچھ ہی بعد انہوں نے پولستانی زبان میں ایک سالنامہ تاتار (*Roczink Tarski*) شائع کرنا شروع کیا۔ اس میں عام اسلامی معلومات کے علاوہ دینیات پر عمدہ مضامین بھی ہوتے تھے۔ اس انجمن میں ایک غیر مسلم شخص سٹینسلاس کریچنسکی (Stanislas Kryczynski) نے بڑا حصہ لیا (یہ تاتاری نسل کا تھا اور اس کے اجداد میں سے کسی نے کیتھولک مذہب قبول کر لیا تھا)۔ اس مؤرخ، ادیب اور شاعر نے تاتاریوں کی تاریخ پر کئی عمدہ کتابیں لکھیں، بالخصوص وہ طویل مقالہ جو ۱۹۳۸ء میں ''سالنامۂ سوم'' کے طور پر شائع ہوا۔ اسلام کی جانب اس کا ہمدردانہ رجحان اس کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے؛ اچھے سے اچھا مسلمان بھی اس سے زیادہ نہ لکھ سکے گا۔ یہ تینوں کریچنسکی دوسری عالمگیر جنگ میں افسوس ناک طور پر مارے گئے خصوصاً گڈینیا Gdynia کی عدالت کا نائب صدر مجلس تھا، جرمنوں نے گولی مار دی۔ شہر وارسا میں ایک سہ ماہی رسالہ پولستانی زبان میں *Przegeadislouski* نکلتا تھا اور ولنا میں محکمۂ افتا کا ماہنامہ *Zyciatarski* (یعنی حیاتِ تاتار) شائع ہوتا تھا۔ ۱۹۳۹ء کی جنگ سے کچھ پہلے عربی میں بھی چند کتابیں پولستانی اسلام کے حالات پر شائع کی گئیں اور لاہور کے *Islamic Review* میں بھی ۱۹۳۵ء میں ایک طویل مقالہ شائع ہوا۔ یہاں کے مسلمان کثرت سے اسلامی ممالک کی سیاحت کرنے لگے، خاص کر مفتی شنکیے وچ نے تو بین الاسلامی مؤتمروں میں بھی حصہ لیا۔

۱۹۳۹ء کے بعد کے حالات موجودہ سیاسی معرکہ آرائی کا حصہ ہیں۔ وارسا کی جدید اشتراکی حکومت نے روس سے ایک معاہدہ کیا، جس کے تحت ان تاتاری مسلمانوں کو پولینڈ کی رعایا بن جانے کا حق مل گیا۔ کچھ لوگ ساڑھے پانچ سو برس کے بعد بصد حسرت ملک سے ہجرت بھی کر گئے۔

۳۔ پولینڈ کے تعلقات اسلامی ممالک سے:

پولینڈ اور لتوانیا کی سلطنتِ متحدہ نے امیر تیمور کے خلاف اقدام کر کے عثمانی ترکوں کے دلوں میں اپنے متعلق ہمدردی کے جو جذبات پیدا کر لیے تھے ان میں آگے چل کر مفادات کے اشتراک نے مزید استحکام پیدا کر دیا۔ بابِ عالی (ترکیہ) نے ہمیشہ اپنے اصول کو نباہا اور کبھی پولینڈ کے خلاف پیش قدمی نہیں کی، بلکہ اس کی تاریخ کے اندوہناک لمحات میں ترکیہ ہی اس کا واحد مددگار رہا البتہ پولینڈ کا برتاؤ ترکیہ کے ساتھ ہر زمانے میں یکساں نہیں رہا؛ چنانچہ تیسرا لادسلاس Ladis Las (۱۴۳۴ تا ۱۴۴۴ء) ابن یاگوبلو جب ۱۴۴۰ء میں ہنگری کا بھی بادشاہ بن گیا تو اس جدید حیثیت میں آ کر اس نے ترکی سے جنگ چھیڑ دی۔ ۱۴۴۳ء میں دس سال کے لیے ایک صلح کی گئی، لیکن دوسرے ہی سال لادسلاس نے پوپ کے ورغلانے سے عہد شکنی کی اور وارنا کی لڑائی میں شکست کھائی اور جان سے بھی مارا گیا، لیکن ان جنگوں کے باوجود ترکیہ کے دل میں میل نہیں آیا۔ ۱۴۹۷ء میں پولینڈ کے بادشاہ یان آلبریشت (Jan Albrecht) نے مولڈیویا Moldavie پر (جو ترکی، ہنگری اور پولینڈ سب کا باجگزار تھا) دھاوا بول دیا تا کہ اپنے چھوٹے بھائی کو وہاں کا تخت دلائے۔ مولڈیویا کے حکمران نے ترکوں کی مدد سے آلبریشت کو شکست دی، لیکن جلد ہی بلا کسی دقت کے بابِ عالی نے پولینڈ سے دوستانہ تعلقات بحال کر لیے۔ اس تاریخ کے بعد سے خاندانِ یاگوبلو کے اختتام تک

دونوں ملکوں کے تعلقات بہت خوشگوار رہے۔ اس خانوادے کے جانشینوں نے بھی اس پر عمل جاری رکھا، لیکن زیگیسمونڈ Sigismund سوم نے طرزِ سیاست میں تبدیلی کی۔ اس زمانے میں ترکیہ کے خلاف یورپی محاذ قائم ہو رہا تھا، اس میں شرکت کی تجویزیں شروع ہوئیں، تاکہ مولدیویا پر قبضے کا خواب پورا ہو؛ لیکن اس کے زمانے میں زیادہ تر یہ ہوا کہ یوکرین کے قزاق اکثر ترکیہ پر دھاوے بولتے، بلکہ بعض اوقات خود استنبول کو دھمکی دیتے رہے۔ چونکہ پولینڈ ان پر قابو رکھنے کے ناقابل تھا اس لیے یہ ۱۶۲۰ء اور ۱۶۲۱ء کی جنگوں کا باعث بنے۔ کچھ عرصے بعد پولینڈ نے یوکرینیوں پر مذہبی سختیاں شروع کیں تو انہوں نے بغاوت کر دی۔ اب انہیں قریم (کریمیا) اور ترکیہ دونوں نے مدد دی، کیونکہ انہیں خوف تھا کہ کہیں ہم مذہب ہونے کی بنا پر ماسکو یوکرین کا اپنے ساتھ الحاق نہ کر لے؛ مگر یہ ہو کر رہا۔ اور ۱۶۵۴ء میں مشرقی یوکرین نے حکومت ماسکو کی حمایت قبول کر لی۔ اس کے باعث ایک طرف پولینڈ اور ماسکو میں اور دوسری طرف پولینڈ اور ترکیہ میں جنگیں چھڑیں۔ چونکہ یوکرینی ماسکو کی حکومت میں خوش نہ رہ سکے اور پولینڈ سے بھی ان کا نباہ نہ ہو سکا، جو ان کے پرانے امتیازات بحال کرنے پر آمادہ نہ تھا، اس لیے انہوں نے ۱۶۶۷ء اور ۱۶۷۱ء میں ترکیہ کے سامنے مدد کے لیے ہاتھ پھیلایا۔ ترکیہ نے دخل دیا اور ۱۶۷۲ء کے معاہدے کے مطابق کامینیتس پودولسک Kemeniets Podolsk کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ پولینڈ اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکا اور ترکیہ کے مخالف محاذ میں شریک ہو گیا، جس کے باعث ترکیہ کو ۱۶۸۳ء کی شکست اٹھانا پڑی۔ ۱۶۹۹ء میں معاہدۂ کارلووتس Karlovitz کے مطابق ترکیہ نے کامینیتس پودولسک کا مفتوحہ علاقہ خالی کر دیا۔ ترکیہ نے اس پر بھی نہ صرف یہ کہ پولینڈ کے خلاف سیاست میں شدت اختیار نہیں کی بلکہ ۱۷۱۱ء میں جب ترکیہ نے روس کے پیٹر اعظم کو پروت Pruth کی لڑائی میں شکست دی تو اسے اس پر مجبور کیا کہ پولینڈ کا تخلیہ کرے اور آئندہ اس کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دے۔ پولینڈ نے سویڈن سے حلف کا تعلق قائم کیا تو روسیوں نے مشرقی پولینڈ پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۷۶۴ء میں پولینڈ کا آخری بادشاہ سٹینسلاس آگسٹ پونیاٹوفسکی Stanislas-August Poniatowski روس کی ملکہ کیتھرائن دوم کے دباؤ کے سبب تخت پر بٹھایا گیا، اور اس طرح پولینڈ عملاً روس کا متوسّل بن گیا۔ ترکیہ نے دوبارہ الٹی میٹم دیا کہ روس کی فوجیں پولینڈ خالی کریں اور وہاں کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیں۔ روس نے انکار کیا تو ۱۷۶۸ تا ۱۷۷۴ء روس اور ترکیہ میں جنگ ہوئی، مگر خود پولینڈ نے اس میں عملاً کوئی حصہ نہیں لیا (وہاں کے دو ہزار باغیوں سے بحث نہیں)۔ ترکوں کو شکست ہوئی تو پولینڈ کے بھی حصے بخرے ہوئے، مگر ترکیہ ہی دنیا کی وہ واحد سلطنت ہے جس نے پولینڈ کی اس تقسیم کو کبھی تسلیم نہیں کیا، لیکن پولینڈ والوں کو اپنے ذاتی مفاد کی سمجھ انیسویں صدی تک نہ آئی۔ انہوں نے روس کے خلاف بغاوت کی، مگر اس وقت نہیں جب وہ ترکیہ سے ۱۸۲۸ تا ۱۸۲۹ء برسرِ پیکار تھا، بلکہ ایک سال بعد جب کہ ان کا کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ اس بغاوت کے بعد پولینڈ کے کئی ہزار آدمی ترکیہ میں پناہ گزین ہوئے، جہاں ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ ان میں سے بہت سے ترکی فوج میں بھرتی ہو گئے اور دس اعلیٰ افسر، جو مسلمان ہو گئے تھے، جنرل کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ ترکیہ میں ایسے فوجی

دستے بھی بھرتی ہوے جن میں صرف پولینڈ والے تھے۔ ان دستوں نے قریم (کریمیا) کی جنگ (۱۸۵۴ تا ۱۸۵۵ء) میں روس کے خلاف ترکی فوج کا ساتھ دیا، مگر خود پولینڈ اس زمانے میں بھی خاموش رہا، بلکہ اس کے پورے آٹھ سال بعد روس کے خلاف تن تنہا ایک بغاوت شروع کی۔ اس نے مغربی یورپ سے آس لگائی، مگر مایوسی ہوئی۔ جب ۱۹۱۹ء میں پولینڈ کا احیا ہوا تو ترکیہ سے دوستانہ تعلقات دوبارہ قائم ہوے۔ اس دوستی کی یادگار ایک گاؤں ہے، جو استانبول کے محاذی ساحل باسفورس پر آباد ہے۔ ترکیہ میں اس کا نام پولنیز کوی ہے۔ پولینڈ والے اسے آدم پول Adam Pol کہتے ہیں، کیونکہ شہزادہ آدم تسار توریسکی Adam Czartoryski نے زمین خرید کر یہ گاؤں بسایا تھا۔ اسی شہزادے نے قائد بن کر ۱۸۳۱ء کے بعد یہ تحریک چلائی تھی کہ پولینڈ والے ترکیہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔

زمانۂ حال میں پولینڈ کے سفارتی تعلقات دوسرے اسلامی ممالک سے بھی رہے ہیں، لیکن بعض مصنوعات کی برآمد کے سوا کوئی خاص امر قابلِ ذکر نہیں۔

آخر میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پولستانی غیر مسلم مستشرقوں نے بھی اور ممالک کے مستشرقین کی طرح اسلامیات پر معتدبہ لٹریچر پیدا کیا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے وقت یہاں پانچ جامعات تھیں، جن میں سے ہر ایک میں اس موضوع کی کرسیاں قائم تھیں؛ خاص کر جامعۂ کراکوف، جو ملک کی سب سے قدیم درسگاہ ہے، اسلامیات پر اپنے سلسلۂ نشریات کے باعث خاص امتیاز رکھتی ہے۔ اس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

مآخذ: (۱) علی نوروزوفتش و محمد سیدالعموی: الاسلام فی بولونیا، قاہرہ ۱۹۳۶ء؛ (۲) مصطفی الکسندروفیتش: یوسف بیلیئسکی، قاہرہ ۱۹۳۶ء؛ (۳) رسالۂ تاتارلہ (ترکی میں؛ تالیف ۱۵۵۸ء)، مع پولستانی ترجمہ و حواشی از اے۔ مخلشکی، ولنا ۱۸۵۸ء؛ (۴) ایس۔ کریچنسکی: ''تاتارِ لتوانیا'' پر مقالہ، بزبان پولستانی، در ''سالنامۂ تار''، ج ۳؛ (۵) اے۔ مخلشکی: ''لتوانی تاتاریوں کی تاریخ اور موجودہ حالت'' (روسی میں)، ۱۸۵۷ء؛ (۶) ''روسی تواریخ کا مکمل مجموعہ'' (روسی میں)، ۳۲ جلد؛ (۷) لیونتوویچ: ''روسی لتوانی قوانین کا خاکہ'' (روسی میں)، ۱۸۹۳ء؛ (۸) لیوبانسکی: ''روسی لتوانی مملکت کی حالت لتوانیا کے اتحاد تک'' (روسی میں)، ۱۹۱۰ء؛ (۹) ہروشفسکی: ''تاریخ یوکرین'' (یوکرینی میں)، ۱۹۰۳ - ۱۹۰۸ء۔

(ARSLAN BOHDANOWIEZ)

پوماق: بلغاری زبان بولنے والے مسلمانوں کو بلغاریا اور تراکیا (Thrace) میں ''پوماق'' کہتے ہیں۔ عام طور پر ان کے عیسائی ہم وطن مسلمانوں کو اس نام سے یاد کرتے ہیں، لیکن بعض اوقات بلغاریا والے ان مسلمانوں کو بھی پوماق کہہ دیا کرتے تھے جو مغربی مقدونیا میں سربی زبان بولتے ہیں، لیکن سربی مسلمان اپنے عیسائی اہلِ وطن میں عموماً توربسی Torbeši (واحد توربس Torbeš) اور بعض اوقات پتوری Poturi اور شاذ و نادر طور پر کرکی Kurki وغیرہ کہلاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا آج کل بھی سربی مسلمانوں کو ''پوماق'' موسوم کرنا زیادہ تر بلغاری دبستان اور بلغاری ادب کے اثر پر مبنی ہے اور یہ تسمیہ صرف اس حد تک صحیح ہوگا جب ان مسلمانوں کے لیے استعمال کیا جائے جو فی الواقع بلغاریا سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے؛ مثلاً ۱۸۷۷ تا ۱۸۷۸ء میں (قب J. H. Vasiljević: *Južna Stara Srbija*، ۱: ۱۸۷ تا ۱۸۸، ۲۰۷ اور ۳۳۶)۔ کوہستانی رودوپس Rhodopes میں بلغاری مسلمان اخریانی Achrjani، یا

'گربانی Agarjani بھی کہلاتے ہیں (Ischirkoff، ۲ : ۱۰) ۔ جنوبی سربیا اور بلغاریا کے بعض حصوں میں کبھی کبھی یہ نام چتاک Čitak (جمع چتاچی Čitaci) سنا جاتا ہے ۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا تھا (جیسا کہ بالکل حال میں A. Urosevic نے، در *Glasnik Skopskog naučnog društva*، ج ۵، ۱۹۲۹ء، ص ۳۱۹ تا ۳۲۰، ثابت کیا ہے) کہ یہ نام صرف ان سربیوں کو دیا گیا تھا جو مسلمان ہوگئے تھے، مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ بلغاریا [رک بآں] اور سربیا [رک بآں] کے ترکوں تک محدود ہے (قب Vasiljević : *Muslimani*...، ص ۳۳، اور Elezović، در *Srpski Književni glasnik*، ۲۸، ۱۹۲۹ء : ۶۱۰ تا ۶۱۳ اور در *Rečnik Kosovskometohiskog dijalekta*، ۲ : ۴۴۹) ۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ apovci وہ نام ہے جو سربی مسلمانوں کو جنوبی سربیا میں دیا گیا ہے؛ کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ صرف البانیوں میں قریبی رشتہ داروں (بھائیوں اور چچیرے بھائیوں) کے لیے بولا جاتا ہے (بقول H. Vasiljević : *Muslimani* ...، ص ۳۴).

ان ناموں کی اصل و اشتقاق کم و بیش مبہم اور نہیں کہیں من گھڑت ہے ۔ عام طور پر یہ تشریح کی جاتی تھی کہ 'پوماق' کا لفظ فعل ''پوموچی'' ''Pomoći'' (بمعنی مدد کرنا) سے ہے اور اس کے معنی پوماغاچی Pomagači (مددگار) کے ہیں، یعنی ترکوں کی امدادی افواج ۔ یہ تشریح سب سے پہلے کانتز F. Kanitz (*Donau-Bulgarien und der Balkan*، ج ۲، لائپزگ ۱۸۸۲ء، ص ۱۸۲) نے کی تھی، لیکن تھوڑے عرصے بعد (۱۸۹۱ء میں) ییریچک Jireček (دیکھیے مآخذ) نے بتایا کہ یہ تسلی بخش نہیں ہے ۔ ایک اور ایسی ہی بعید از قیاس، مگر عام توجیہ وہ ہے جس کی رو سے ''پوماق'' بلغاری لفظ ماق mǎk، بمعنی ''اذیت، جبر'' سے مشتق ہے اور جس میں یہ کہہ کر اسے صحیح ثابت کرنے کی غلط کوشش کی گئی ہے کہ بلغاریوں کا قبول اسلام خاصے بڑے پیمانے پر جبر و اکراہ سے عمل میں آیا تھا (Ischirkoff، ۲ : ۱۰) ۔ اس کے بعد لیکوف Lekov (دیکھیے مآخذ) نے پوماق کی تشریح لفظ پوتورنیاک poturnjak (لفظی معنی : ''وہ شخص جو ترک بنایا جائے'') سے کی ہے ۔ آیا لفظ چوماق Čomak، جس کے معنی ترکی میں ڈنڈا سونٹا اور ایگوریہ (Uigur) زبان میں ''مسلم'' اور جنوبی روس میں ''بساطی'' کے ہیں (قب بارٹولڈ Barthold : *Orta Asia* ...، ص ۸۲ تا ۸۳) 'پوماق' کے ساتھ کوئی علاقہ رکھتا ہے، یا یہ کہ بلغاری لفظ پورتورنیاک poturnjak سے متأثر ہوا، یا اس کے ساتھ گڈ مڈ ہو گیا ہے؟ یہ سب باتیں ابھی تک تحقیق طلب ہیں.

بوماق یا توربسی Torbeši کے تبدیل مذہب کی تاریخ تفصیل سے بہت کم معلوم ہے ۔ بہرکیف قبول اسلام ہر جگہ دفعةً وقوع پذیر نہیں ہوا، بلکہ تدریجاً اور مختلف زمانوں میں ہوا ۔ جنگ ماریکا Marica (۱۳۷۱ء) کے بعد ہی اور پھر ترنوفو Trnovo کے سقوط (۱۳۹۳ء) کے بعد اس کا آغاز ہوا ۔ اس زمانے کے سربیوں اور بلغاریوں کی بڑی تعداد، بالخصوص (جیسا کہ ییریچک Jireček خیال کرتا ہے) امرا اور بگومیل Bogomils نے اسلام قبول کیا ۔ یہ ابتدائی تبدیلی مذہب بایزید ثانی کے زمانے میں ہوئی ۔ اس کے بعد ملکی روایت کی رو سے سلیم اول (۱۵۱۲ تا ۱۵۲۰ء) کے عہد حکومت میں خاصی بڑی تعداد اسلام لائی ۔ اس مقصد کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے ''منظور نظر سنان پاشا'' کو جبال السار šar-mountains کے علاقے میں بھیجا تھا ۔ رودوپی Rhodopes میں چپینو Cepino کے کوہستانی

خطّے کے لوگ مقامی تواریخ کے مطابق سترھویں صدی کے آغاز میں مسلمان ہو گئے تھے، مگر بقول ییریچک Jireček (*Fürstenthum*، ص ۱۰۰) یہ واقعہ وسطِ صدی کے بعد سلطان محمد چہارم (۱۶۴۸ تا ۱۶۸۷ء) کے عہد میں ہوا۔ وزیر اعظم محمد کوپرولو کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس نے اس کام میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ علاقۂ ڈینیوب کا قبولِ اسلام (Loveč وغیرہ) اسی زمانے کا واقعہ ہے۔ اسی (سترھویں) صدی کے خاتمے کے قریب خطۂ دیبر Debar میں بہت سے سربیوں نے دینِ اسلام اختیار کیا۔ بعض اضلاع میں اسلام کو بڑے پیمانے پر قدم جمانے کا موقع صرف اٹھارھویں صدی کے دوران میں میسّر آیا، بلکہ بعض اوقات تو انیسویں صدی کے آغاز سے پہلے ایسا نہ ہو سکا (مثلاً پرزرن Prizren کے جنوب گورہ Gora میں)۔

قریبی زمانے تک یہ میلان موجود تھا کہ عثمانیوں کا یہ اسلام لانا جبری بلکہ تلوار کے زور سے تھا، لیکن اب یہ خیال عام ہو چلا ہے کہ مسلمان حکّام نے کبھی اپنی عیسائی رعایا کو مسلمان بنانے کے لیے کوئی قدم براہِ راست نہیں اٹھایا۔ اس کے بر خلاف قبولِ اسلام کا یہ عمل بطیبِ خاطر اور بالکل دوسرے اسباب (یعنی اسلام کی حقانیت، عقیدۂ توحید وغیرہ) کی بنا پر ہوا (قب مثلاً H. Vasiljević: *Muslimani*، خصوصاً ص ۵۳ تا ۹۱)۔

انیسویں صدی کے خاتمے کے قریب، جب کہ اشاعتِ اسلام کا کام ہر جگہ سالہا سال سے رُکا ہوا تھا، سلافی مسلمانوں (بلغاری اور سربی) کی بڑی اکثریت رودوپس اور مغربی مقدونیہ کے پہاڑوں میں پائی جاتی تھی۔ مقدونیہ کے شمال جنوب میں بھی البانیا کی سرحد تک جگہ جگہ ان کی خاصی معقول تعداد کے گروہ پائے جاتے تھے۔ یہ وسیع رقبہ شمال میں پلوودیف Plovdiv (فلپّو پولیس) سے لے کر جنوب میں سالونیکا تک پھیلا ہوا تھا؛ مشرق میں دریائے آردا Arda کے وسط سے وردار Vardar کے اوپر تک بلکہ کرنی درم Crni Drim کے پار تک چلا گیا ہے، یعنی اضلاع آھرید Ohrid، دیبر Debar، گستیوار Gostivar اور پرزرن Prizren سے گزرتا ہوا مغرب میں پھیلتا چلا گیا ہے۔ مذکورۂ بالا زمانے میں اس خطّے کا ایک چھوٹا سا حصہ، جس میں جابجا عیسائی اقطاع تھے، بلغاریا کی ریاست میں داخل تھا۔ زیادہ بڑا حصہ اس وقت تک ترکیہ کے زیرِ نگین تھا، اور صرف جنگِ بلقان کے بعد سربیا کو یا عالمی جنگ کے بعد یوگوسلاویا کو ملا۔ کوھستان رودوپس میں مسلم بلغاریوں کے سوادِ اعظم کے علاوہ ان کی متفرق بستیاں کوھستان بلقان کے شمال میں علاقۂ ڈینیوب کے اندر بھی موجود تھیں۔ یہ لوفچ Loveč پلونہ Plevna اور آرہووو Orehovo کے حلقوں میں بستی تھیں۔

بہر حال، اس زمانے سے لے کر اب تک "پوماقوں" کی سرحدیں خاصی گھٹ گئی ہیں۔ پلونہ کے محاصرے کے دوران میں تقریباً تمام بلغاری مسلمان اضلاع ڈینیوب سے مقدونیہ چلے گئے۔ گو وہ ۱۸۸۰ء میں واپس آ گئے، لیکن پھر جلد ہی ترکیہ کو ہجرت کر گئے۔ ۱۸۸۵ء میں مشرقی روم ایلی اور بلغاریا کے اتحاد کے بعد رودوپس کے پوماق بھی نقل مکان کرنے لگے۔ اسی طرح توربسی Torbeši کی سرحدیں بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں۔ جنگِ بلقان اور عالمگیر جنگ کی وجہ سے بعض تغیرات ہوئے اور نتیجۃً سربی مسلمانوں کی بعض جماعتیں جنوبی سربیا سے ہجرت کر گئیں۔

مختلف محاربات اور ان کے عواقب میں ملکی حدود میں جو ردّ و بدل ہوئے ان کی وجہ سے مسلمان سلاویوں کی بلغاریا، مقدونیہ (یا جنوبی

سربیا اور تراکیا میں تعداد، نیز مجموعی تعداد کی نسبت بیانات بہت مختلف اور اکثر ناقابل اعتماد ہیں۔ مثال کے طور پر ییریچک Jireček (۱۸۷۶ء) نے کل تعداد کا اندازہ پانچ لاکھ لگایا، جس میں لوواچ Loveč اور پلوونہ Plevna کے ایک لاکھ نفوس شامل ہیں (دیکھیے مآخذ)۔ بیسویں صدی کے آغاز میں گوریلوفچ Gavrilović (دیکھیے مآخذ) نے صرف چار لاکھ تخمینہ کیا اور اشیرکوف Ischirkoff نے ۱۹۱۷ء میں قریب قریب یہی تعداد بتائی۔

جہاں تک ان مسلمان سلاویوں کی تقسیم باعتبار ممالک کا تعلق ہے ذیل کے اعداد و شمار نقل کیے جا سکتے ہیں۔ ییریچک Jireček نے (۱۸۹۱ء) سابقہ ریاست بلغاریا کے مسلمانوں کا زیادہ سے زیادہ اندازہ اٹھائیس ہزار نفوس کیا؛ اور جو جنگ بلقان سے پہلے وہاں بلغاریا کی قدیم سرحدوں کے اندر تھے (۱۹۱۰ء کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق) وہ ۲۱۱۴۳ (آبادی کا ۰ء۴۹ فی صد) تھے۔ جنگ بلقان میں جو نئے اضلاع ہاتھ آئے ان کی وجہ سے جنوبی بلغاریا میں پوماقوں کی تعداد بڑھ گئی؛ یہ زیادہ تر اردا Arda، مستا Mesta اور سٹروما Struma دریاؤں کے علاقوں میں تھے، چنانچہ ۱۹۲۰ء کی سرکاری سر شماری ان کی تعداد ۸۸۳۹۹ (پوری آبادی کا ۸۲۰۱ فی صد) بتاتی ہے۔ ۱۹۲۹ء کے مجلّے *Annuaire du Monde Musulman* (ص ۲۰۵) میں یہ تعداد کچھ زیادہ ہے، یعنی سولہ ہزار پوماق بلغاریا خاص میں اور ۷۵۲۳۷ تراکیا میں، کل ۹۱۳۳۷۔ ۱۹۲۶ء کی سر شماری کے اعداد و شمار یہ ہیں: ۱۰۲۳۵۱ بلغاری بولنے والے مسلمان بلغاریا میں، یعنی آبادی کا ۸۷۰۱ فی صد؛ لیکن بلغاریا میں مسلمانوں کی کل تعداد بلا امتیاز السنہ ۷۸۹۲۹۶ یا آبادی کا ۴۱۰۱۴ فی صد تھی۔ ان ۱۰۲۳۵۱ بلغاری بولنے والے مسلمانوں میں سے صرف ۵۷۹۹ شہروں میں رہتے تھے؛ اور بقیہ ۹۶۵۵۲ دیہات میں؛ مردوں اور عورتوں کا تناسب ایک ہزار بمقابل ۱۰۲۵ تھا۔ خواندہ پوماق تمام بلغاریا میں ۱۹۲۶ء میں صرف ۲۶۰۵ تھے (جن میں ۵۵۳۲ مرد تھے)۔

مقدونیہ میں پوماقوں کی (یعنی درحقیقت مسلمان سلاویوں کی) تعداد، بقول فرکوفچ S. Verković (۱۸۸۹ء؛ دیکھیے مآخذ)، ۱۳۳۰۵۱ مرد تھی (اس لیے یہ ہندسہ دگنا کر دیا گیا ہے) در *Données statistiques sur l'ethnographie de la Macédoine*، شائع کردۂ Comité national de l'Union des organisations des émigrés macédoniens en Bulgarie، صوفیہ ۱۹۲۸ء، اور مجموعی آبادی ۲۸۸۰۹۲ بتاتی ہے [اس میں دس نفوس کم کی غلطی ہے]؛ G. Weigand (*Die nationalen Bestrebungen der Balkanvölker*، لائپزگ ۱۸۹۸ء) نے ایک لاکھ مرد، اور کانچوف V. Kănčov (۱۹۰۰ء؛ دیکھیے مآخذ) نے ۱۴۸۸۰۰ اور سیس Vl. Sis (*Mazedonien*، زیورخ ۱۹۱۸ء) نے ۱۰۵۰۰۳۰ نفوس کا تخمینہ دیا ہے۔

جہاں تک جنوبی سربیا میں سربی بولنے والے مسلمانوں کی آبادی کا تعلق ہے اس کا اندازہ H. Vasiljević (*Muslimani...*، ص ۱۱ ببعد) نے ایک لاکھ نفوس لگایا تھا، جو اگرچہ کسی حد تک جنگ بلقان کے پہلے کے حالات پر مبنی تھا، اور ۱۹۳۵ء میں یہ تعداد ساٹھ ہزار بتائی گئی۔ سربی۔ کروٹی زبان بولنے والے مسلمانوں کی تعداد تمام یوگوسلاویا میں تقریباً نو لاکھ تھی (صحیح اعداد نہیں دیے جا سکتے، کیونکہ مذاہب کے مطابق اعداد و شمار شائع نہیں کیے گئے ہیں)۔

تراکیا کے لیے ۷۵۳۲ مسلمان بلغاریوں کی

تعداد Amantri سے ہم اوپر نقل کر چکے ہیں؛ صرف مغربی تراکیا میں مارچ ۱۹۲۰ء کی بین الحلفاء (inter-allied) مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد ۱۱۷۳۹ تھی (قب *La question de la Thrace*، مطبوعۂ Comite suprême des réfugiés de Thrace، صوفیہ ۱۹۲۷ء)۔

ان اعداد و شمار پر ملاحظات ذیل پیش کرنے مناسب ہیں:

اہلِ بلغاریا (مثلاً Kănčov) "پوماقوں" میں عموماً تمام مقدونی سلاویوں کو، جو مسلمان ہوں، شامل کر لیتے ہیں؛ چنانچہ جنوبی سربیا کے سربی باشندے بھی ان کی تخمین میں پوماق ہیں۔ دوسری طرف یہ سلاوی مسلمان مذہب کی بنا پر بعض اوقات بے پروائی سے ترکوں میں شمار کر لیے گئے ہیں۔ مزید برآں، بعض اعداد و شمار جذبۂ وطنیت اور سیاسی تعصّب سے بھی قطعۂ آزاد نہیں ہیں۔ رہے اہلِ یورپ کے تخمینے، تو وہ اندازے پر مبنی ہیں یا محض ذاتی رائے سے لکھ دیے گئے ہیں۔

اس واقعے کے باوجود کہ پوماق اور تورپیش کبھی کبھی ترکوں میں شمار کیے گئے ہیں اور بعض اوقات اپنے کو ترک کہتے ہیں وہ پھر بھی قدیم بلغاری یا سربی آبادی کا خالص ترین طبقہ ہیں، جنھوں نے سلاوی خال و خد اور سلاوی زبان (خصوصاً متروک الفاظ) کو بہت اچھی طرح محفوظ رکھا ہے؛ چونکہ وہ عیسائیوں سے منقطع ہو گئے اور دور افتادہ اضلاع میں رہے اور اس کے مقابلے میں ان کے ہم قوم عیسائی باشندے اکثر دوسرے نسلی عناصر کی آمیزش سے محفوظ نہ رہ سکے لہٰذا ان مسلمانوں میں بعض نسلی خصوصیات عیسائیوں سے بھی زیادہ اچھی حالت میں سلامت رہیں۔ وہ ترکوں سے، جن کی زبان وہ نہیں سمجھتے، قدرے اجتناب کرتے ہیں۔ صرف شہروں میں یہ ہوا کہ ان سلاویوں میں سے بعض نے مرور ایام سے ترکی زبان اختیار کر لی، مگر جس چیز نے انھیں عثمانیوں سے وابستہ کیا وہ زبان نہ تھی بلکہ زیادہ تر ایک مشترک مذہب، یعنی اسلام، بشمول احکام و رسوم نیا (مثلاً عورتوں کا پردہ)؛ اسلام اور ترکوں کی حکومت کی وجہ سے قدرتی طور پر ان میں بہت سے عربی اور ترکی الفاظ رواج پا گئے۔ باوجود اس کے ان کے اندر بہت سی قبل اسلام رسوم اور عیسائیت کی یادگاریں (جیسے بعض عیسائی تیوہار مثلاً وغیرہ) باقی رہیں۔

بلغاری مسلمان خاص طور پر کبھی کبھی (خصوصاً ۱۸۷۶ء تا ۱۸۷۸ء میں) ترکوں کے ساتھ مل کر عیسائی بلغاریوں کے خلاف لڑے۔ سو اس کی وجہ یہ قرار دی جا سکتی ہے کہ ایک تو وہ مذہب کو وطنیت پر ترجیح دیتے تھے، دوسرے یہ کہ ان کے عیسائی ہم وطن بھی انھیں ترک سمجھ کر غیروں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ وہ چونکہ انھیں اپنی برادری سے نہیں سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے جنگ بلقان میں مسلمانوں کے ساتھ غیروں بلکہ دشمنوں کا سا سلوک کیا؛ چنانچہ فاتح بلغاری فوجوں اور انتہا پسند پادریوں نے پوماقوں کو رودوپی اور دوسرے اضلاع میں دباؤ اور تلوار کے زور سے عیسائی بنایا، لیکن معاہدۂ صلح طے ہوا تو وہ دوبارہ اسلام کے دائرے میں آ گئے۔ اسے صاف گوئی کے ساتھ بلغاری جغرافیہ نویس اشیر کوف Ischir Koff اور بلغاری مصنف کرہ ایفانوف Iv. Karaivanov نے (اپنے بلغاری رسالے *National Education*، Küstendil، ۱۹۳۰ء) بقول Čamalović [دیکھیے مآخذ] تسلیم کیا ہے۔ اسّی یا نوّے برس پہلے "پوماقوں" کے گیت اور چار بیت بہت کچھ محلِ نزاع رہے۔ بوسنہ کا سابق پادری Stefan Verković (۱۸۲۱ تا ۱۸۹۳ء) نے، جو شہر سیرس Seres میں

نوادر قدیمہ کی دکان کرتا تھا، Veda Slovena (یعنی "سلاویوں کا وید" بلغراد ۱۸۷۴ء، ج ۱) کے نام سے گیتوں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ اس کا بیان تھا کہ یہ گیت زیادہ تر "پوماقوں" سے جمع کیے گئے ہیں، اور ان میں "قبل مسیح اور قبل تاریخ" موضوعات (ترکِ وطن کرکے اس ملک میں اس قوم کی آمد، غلّہ، شراب، فن تحریر کی دریافت اور ہندو ناموں کے دیوتاؤں اور اورفیوس Orpheus وغیرہ کی اساطیری کہانیوں) کی یاد تازہ کی گئی تھی۔ A. Chodzko و A. Dozon (*Chansons populaires bulgares inédites*، پیرس ۱۸۷۵ء؛ قب نیز *Revue de littérature comparée*، ج ۱۳، ۱۹۳۳ء، ص ۱۰۰ ببعد) اور L. Geitler (*Poetické tradice Thráků i Bulharů*، پراگ ۱۸۷۸ء) نے بھی اس "سلاوی وید" کو صحیح ماننے کی پر زور حمایت کی: یہ بھی فرض کر لیا گیا تھا کہ پوماق تراکیا کی قدیم نسل سے ہیں، جن پر پہلے سلاوی تہذیب کا اثر پڑا اور پھر اسلام کا۔

بایں ہمہ موضوعاتِ مذکورہ پر کسی جاریت کا پتا نہ تو مسلمانوں سے چلا نہ عیسائی بلغاریوں سے؛ ییرچیک Jireček نے موقع پر اس سوال کی چھان بین کی اور اس "سلاوی وید" کو صاف صاف بعض بلغاری معلّموں کی جعل سازی بتایا (*Fürstenthum*، ص ۱۰۷ الف)۔ ہمیں اب معلوم ہے کہ پادری ترنوفتش Verković کا خاص شریک کار مقدونی معلّم گولوگانوف Iv. Gologanov تھا (قب Pentscho Slawejkoff : *Bulgarische Volkslieder*، لائپزگ ۱۹۱۹ء، ص ۱۵)۔

اس واقعے کو دیکھتے ہوئے کہ زیر بحث مسلمان زیادہ تر پہاڑوں اور دیہات میں بود و باش رکھنے والے قدامت پسند ہیں، جو نہایت محنتی، متدیّن اور امن پسند، مگر لکیر کے فقیر اور بیشتر ناخواندہ ہیں، ان میں کسی ادبی سرگرمی کا امکان نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے فقط "خوجے" لکھنا جانتے ہیں اور اکثر لکھتے وقت ترکی زبان عربی حروف میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ اکثر عربی حروفِ ہجی اس وقت بھی استعمال کرتے ہیں جب اپنی مادری زبان لکھتے ہیں۔ بلغاری مسلمانوں کی اگلی نسلوں میں بہتیروں نے ترکی فوج یا بصورت دیگر ترکی ملازمت میں امتیاز حاصل کیا۔ جدید نسل، جس نے سرکاری سکولوں میں تعلیم پائی ہے، قومیت کا زیادہ احساس رکھتی اور زیادہ ترقی پذیر ہے، لیکن یہ لوگ گنتی میں اتنے تھوڑے ہیں کہ سیاست یا دیگر امور میں اپنا اثر و نفوذ نہیں رکھتے۔

مآخذ: (متن میں مذکورہ تصنیفات کے علاوہ): (۱) C. Jireček : *Geschichte der Bulgaren*، پراگ ۱۸۷۶ء، ص ۳۵۶، ۵۰۴، ۵۲۰، ۵۶۸ اور ۵۷۸؛ (۲) وہی مصنف: *Das Fürstenthum Bulgarien*، پراگ - وی انا - لائپزگ ۱۸۹۱ء، ص ۱۰۳ تا ۱۰۸ (اہم ترین حصہ)، ص ۱۱۰، ۳۳۶، ۳۵۳ اور ۳۵۴ تا ۳۵۶؛ (۳) S. I. Verković : *Topografičesko etnografičeskij očerk Makedonij*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۹ء (بعض اضلاع نیز دیہات کے پوماقوں کے تعداد کی مکمل جدولیں دیتا ہے)؛ (۴) V. Kančov : *Makedonija etnografija i statistika*، صوفیا ۱۹۰۰ء، ص ۴۰ تا ۴۵ (جہاں قدیم ادب کا ایک حصّہ دیا ہوا ہے، خصوصاً ص ۴۲)، مع بلغاریا کے علم الاقوامی نقشے کے جس میں "مسلم بلغار" آبادیاں خصوصیت سے دکھائی گئی ہیں؛ (۵) J. Cvijić : *Osnove za geografiju i geologiju Makedonije i Stare Srbije*، ۱، بلغراد ۱۹۰۶ء؛ ۱۸۲؛ (۶) Vl. R. Dordević : *U Srednjim Rodopima, putopisne beleške od Plovdiva do Čepelara*، در *Nova iskra*، سال ۸، بلغراد ۱۹۰۶ء، ص ۱۷۲ تا ۱۷۶؛ اور ص ۱۹۸ تا ۲۰۰ (۱۹۰۵ء) میں پوماقوں کی زندگی

اور رسوم پر ایک عربی سفر کا دلچسپ بیان]؛ (۷) M. Gavrilović، در Grande Encyclopédie، بذیل مادّہ؛ (۸) A. Ischirkoff : *Bulgarien, Land und Leute*، ۲: لائپزگ ۱۹۱۷ء، ص ۱۶ تا ۶۴؛ (۹) J. Hadži Vasiljević : *Muslimani naše krvi u Južnoj Srbiji*، بار دوم، بلغراد ۱۹۲۴ء؛ (۱۰) وہی مصنّف: *Skoplje i njegova okolina*، بلغراد ۱۹۳۰ء، ص ۲۰۲؛ (۱۱) J. M. Pavlović : *Maleševo i Maleševic*، بلغراد ۱۹۲۹ء، ص ۵۳ و ۱۴۴ تا ۲۵۰ اور ۲۵۰؛ (۱۲) S. Čemalović : *Muslimani u Bugarskoj*، در *Gajret*، سال ۱۳، Sarajevo ۱۹۳۲ء؛ ص ۵۴۴ ببعد، ۳۹۳ ببعد اور ۲/۵ ببعد (نیز در *La Nation Arabe* برائے ۱۹۳۲ء، عدد ۱ تا ۲؛ ۱۹۳۳ء کے اسی رسالے عدد ۱ تا ۳ میں A. Girard نے مسلمانوں کی صورت حال کو موضوع بحث بنایا؛ Čamalović کے دعوے کے ردّ میں الفتح، قاہرہ میں ضیاء الدین الازہری کا وہ مقالہ مجھے دستیاب نہ ہو سکا جس کا ذکر مؤخّر الذّکر جریدے میں ہے)؛ (۱۳) A. Bonamy : *Les musulmans de Pologne, Roumanie et Bulgarie*، در *R. E. Isl.* برائے ۱۹۳۰ء (پوماقوں کے متعلق (ص ۸۸) مختصر بحث کرتا ہے)؛ (۱۴) G. Lekov : *Kum vapros za imeto pomak* ("پوماق" نام کے سوال پر)، در *Sbornik balgarska Akademija*، صوفیا ۱۹۳۳ء، ص ۳۸ تا ۱۰۱ (نیز ب *Bibliographie Géographique Internationale* ۱۹۳۳ء، ص ۲۱۷ جو Loveč-Pomaks کی تاریخ پر G. Ivanov کے ایک مختصر مقالے کا حوالہ بھی دیتا ہے: *Za minaloto na Lovečanskite pomaci*، در *Loveč i Lovčansko*، ج ۵، صوفیا ۱۹۳۴ء)؛ (۱۵) *Annuaire statistique du royaume de Bulgarie*، صوفیا ۱۹۳۳ء، ص ۲۳، ۲۵، ۲۸۔

(FEHIM BAJRAKTAREVIĆ)

* **پُونا**: ایک شہر اور ضلع، بھارت کے صوبۂ مہاراشٹر میں واقع ہے۔ اس ضلع کا رقبہ ۵۳۲۲ مربع میل اور ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رو سے آبادی ۱۱۶۹۷۹۸ تھی، جس میں ۴۹۹۴۵ مسلمان تھے (*Census Report*، ۱۹۳۱ء)۔ یہ ضلع کبھی طاقت ور آندھرا حکومت میں شامل تھا، جو تقریباً تیسری صدی عیسوی کے وسط میں ختم ہوئی۔ جو شواہد دستیاب ہوئے وہ اس واقعے کی طرف بھی دلالت کرتے ہیں کہ بعد کو مغربی چالوکیوں، راشٹرکوٹوں، اور دیوگیری کے یادو راجاؤں نے اس رقبے پر حکومت کی۔ دکن کے خلجی اور تغلق [دیکھیے محمد تغلق] حملوں سے یہ مسلم تسلّط کے اندر آیا۔ پونا کی ایک دلچسپ روئداد، جب کہ یہ بہمنی سلطنت کا ایک حصہ تھا، ضبط تحریر میں آئی ہے۔ یہ ایک روسی سیاح اثناسیوس نکیتن Athanasius Nikitin (۱۴۶۸ تا ۱۴۷۴ء) کا بیان ہے؛ معلوم ہوتا ہے چینی سیاح فاہیان Fa-hien کے بعد وہ پہلا غیر ملکی سیاح تھا جس کے تأثرات ہمارے لیے محفوظ رہے۔ فاہیان کی سیاحت پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہوئی تھی (R. H. Major : *India in the fifteenth century*، ہکلوٹ Hakluyt سوسائٹی)۔ پونا مسلمانوں کی عملداری میں رہا، یہاں تک کہ مرہٹہ قوت کو اورنگ زیب کے عہد حکومت کے نصف آخر میں نشو و نما ہوئی؛ اسی لیے یہ ضلع مرہٹہ تاریخ کے آغاز ہی سے تعلق رکھتا ہے اور شیواجی کی سوانح کے سبب اسے قریبی نسبت ہے۔ پیشواؤں [رک بہ پیشوا] کے دور میں یہ برطانوی فتح تک مرہٹہ طاقت کا مرکز رہا۔ یہ برطانوی فتح انیسویں صدی کی ابتدا میں حاصل ہوئی۔

پونا شہر، مٹھا اور مولا ندیوں کے سنگھم پر واقع ہے۔ اس کی کل آبادی (بوقت تحریر مقالہ) ۲۵۰۱۸۷ تھی، جس میں ۲۸۹۳۵ مسلمان تھے (*Census Report*، ۱۹۳۱ء)۔ [۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رو سے اس کی آبادی ۵۹۷۵۶۲ ہے (*Census of*

India, 1951 and 1961)]۔ جب وہ صرف ایک موضع تھا، یہ سانو جی بھونسلا، شیواجی کے نانا کی جاگیر میں تھا۔ بعد کو شیواجی نے پونا کو غیر محفوظ دیکھ کر اپنا دارالحکومت راے گڑھ منتقل کیا، جہاں اس کی تخت نشینی کی رسم عمل میں آئی۔ پونا ہی وہ مقام تھا جہاں اس نے شائستہ خاں پر حملہ کیا۔ پیشواؤں کی طاقت کی ترقی کے ساتھ پونا ایک بار پھر مرہٹہ حکومت کا صدر مقام اور مرکز ہو گیا۔ پیشواؤں کا مستحکم قصر، جو شانواری کہلاتا تھا، ۱۸۲۷ء میں آگ سے جل کر تباہ ہو گیا۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کا پہلا اجلاس پونا ہی میں منعقد ہوا تھا۔

مآخذ: (۱) *Administration Reports of the Bombay Presidency* (سالانہ مطبوعات)؛ (۲) J. M. Campbell: *Gazetteer of the Bombay Presidency*، پونا، ج ۱۸، ۱۸۸۵ء؛ (۳) *Imperial Gazetteer of India*، بذیل مادۂ پونا؛ (۴) D. B. Parasnis: *Poona in Bygone Days*، ۱۹۲۱ء؛ (۵) J. Sarkar: *Shivaji and his Times*، ۱۹۱۹ء؛ (۶) S. Sen: شیوا چھتر پتی، ۱۹۲۰ء؛ (۷) L. W. Shakespear: *A Local History of Poona and its Battlefields*، ۱۹۱۶ء؛ [(۸) *The Statesman's Year-Book 1966-67*، لندن ۱۹۶۶ء، ص ۲۸۶، ۳۹۱، ۴۲۲؛ (۹) *Census of India, 1951 and 1961: Reports and Papers, Decennial series* (مطبوعات حکومت ہند)؛ (۱۰) اگروال S. N. Agarwala: *India's population*، لندن ۱۹۶۰ء؛ (۱۱) گیان چند: *Some Aspects of the Population Problem in India*، پٹنہ، ۱۹۵۶ء]۔

(C. COLLIN DAVIES)

* **پونتیانک**: انڈونیشی بورنیو کی ایک سابق ولندیزی ریزیڈنسی، ویسٹر افڈیلنج Wester-Afdeeling، کے ایک حصے کا اور دریاے کپواس کے ڈیلٹے کی ایک ریاست [جس کا موروثی حاکم سلطان کہلاتا ہے] اور اس کے صدر مقام کا نام؛ [صدر مقام قریب خطِ استوا پر واقع ہے]۔

پونتیانک کی سلطانی ریاست ولندیزیوں کے زیرِ سیادت خود مختار تھی۔ اس کا رقبہ ۵۳۵۳ مربع کیلومیٹر ہے۔ ۱۹۳۰ء میں آبادی ایک لاکھ ملاوی اور ڈیاک، ۲۶۵ فرنگی، ۲۶۳۲۵ چینی اور ۲۳۷۸ دوسرے مشرقی باشندوں پر مشتمل تھی۔ اصطلاح ملاوی تمام مقامی مسلمانوں پر حاوی ہے، جن میں بیشتر عربی النسل، جاوی، بوگی اور ڈیاک ہیں، جو مسلمان ہو گئے ہیں۔ اندرونِ ملک کے ڈیاک اب تک کافر ہیں۔ رومن کیتھولک مبلّغ ان کافر لوگوں میں اور چینیوں میں (تبلیغی) کام کر رہے ہیں۔ آبادی کے اس طرح مخلوط و مرکب ہونے کی وجہ پونتیانک کی بنا اور نشو و نما کے حالات سے عیاں ہوتی ہے۔

شہر کی بنیاد ۱۷۷۲ء میں شریف عبدالرحمٰن نے رکھی، جو شریف حسین بن احمد القادری کا بیٹا تھا۔ حسین ایک عرب تھا، جس نے ۱۷۳۵ء میں بمقام متّن توطّن اختیار کیا اور ۱۷۷۱ء میں جب اس کا مپاوا میں انتقال ہوا تو وہ وزیر ہو گیا تھا اور اس کے تقوے کی وجہ سے لوگ اس کا احترام کرتے تھے۔ ۱۷۴۲ء میں عبدالرحمٰن پیدا ہوا، جو ایک ڈیاک حرم کا بیٹا تھا اور بالکل شروع سے اپنے عزم و ہمت کی بدولت ممتاز ہو گیا تھا۔ اس نے حاکمانہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی، پہلے مپاوا، پھر پلیم بنگ، پھر بنجرماسین میں، جہاں کئی مقامی اور فرنگی جہاز چھین لینے کے بعد اسے اپنے بحری فوج کے جتھے کے ساتھ، باوجودیکہ سلطان اس کا مربی تھا، یہ مقام چھوڑ دینا پڑا۔ اس وقت تک اس نے مپاوا اور بنجرماسین کی ایک

شہزادی سے شادی کی تھی، اور اس طرح وہ بڑا دولت مند بن گیا تھا۔ میاوا کو واپسی سے تھوڑی مدت پہلے اس کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ چونکہ اسے اس جگہ کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی لہذا اس نے طے کیا کہ اپنا ایک شہر بنانا چاہیے۔ لنڈک اور کپواس کے سنگھم کے دہانے پر ایک غیر آباد رقبہ، جو بھوتوں کا خطرناک گھر مشہور تھا، اسے موزوں نظر آیا۔ کئی گھنٹے کی گولہ باری کے بعد جب بھوت بھگا دیے گئے، تو وہ پہلا شخص تھا جو چھلانگ لگا کر کنارے پر اترا؛ جنگل کٹوا ڈالا گیا اور اس نے وہاں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے بھدّے سے مکانات بنوائے۔

یہ بہت موقع کی جگہ تھی۔ یہاں تاجروں کی خاطرخواہ حفاظت کی جاتی تھی۔ ان اسباب نے تھوڑے ہی دنوں میں بوگنی، ملاوی اور چینی تاجروں کو اس کی طرف کھینچا؛ چنانچہ پونتیانک نے تیزی سے ترقی کی اور شریف عبدالرحمن اپنی پیش بینی اور مستعدی کی بدولت ماتان، سکاداتہ، میاوا، اور سنگاؤ کی ہمسایہ ریاستوں کے مقابلے میں اپنی جگہ پر جما رہا۔

اس نے رعایا کے مختلف گروہوں میں سے ہر ایک پر سردار مقرر کیے اور تجارت کو مناسب محصولوں کے ذریعے باضابطہ بنایا۔ بٹاویا میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندوں کو اس نے اتنا متاثر کیا کہ جب کمپنی بنتن سے مغربی بورنیو تک کے علاقے پر تمام حقوق خرید چکی تو پونتیانک اور سنگاؤ کی ریاستیں اسے جاگیر کے طور پر دے دیں۔ بوگیوں کے سلطان راجہ حاجی نے اسے بہت پہلے یعنی ۱۷۷۲ء ہی میں سلطان کا خطاب دے دیا تھا۔ عبدالرحمن کی وفات کے بعد ۱۸۰۸ء میں اس کا بیٹا شریف قاسم جانشین ہوا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے دربار کے عربی آداب و رسوم کو جدیدتر طریقوں سے بدلا۔

اس عہدنامے کے مطابق جو ۱۸۵۵ء میں شرق الہند کی ولندیزی حکومت سے طے ہوا تھا سلطان کو ولندیزیوں سے ایک مقررہ رقم ملتی تھی اور وہ ریاست کی عدالت اور پولیس کا انتظام کرتے تھے؛ شرق الہند کی ولندیزی حکومت کے ساتھ ۱۹۱۲ء کے طویل اقرار نامے میں باہمی روابط کا مزید تعین کیا گیا، جس سے عدالت اور محاصل کے انتظام کا بھی تصفیہ ہو گیا۔ مقامی خزانے سے، جس کی اس وقت تشکیل ہوئی تھی، سلطان کو ماہانہ ۶۸۰۰ ولندیزی اشرفیاں (gulden) ملنے لگیں؛ نیز زراعت اور معادن پر پچاس فی صد مالیہ اسے ملنے لگا۔

پونتیانک کی جس طرح بنیاد پڑی اس کے مطابق وہ اپنی نوعیت میں بدرجۂ غالب مسلمانوں کا شہر ہے اور اسی نسبت سے یہاں کے لوگوں کی بڑی تعداد حج مکّہ میں شریک ہوتی ہے۔ سلطان نے جب ۱۸۸۰ اور ۱۸۹۰ء کے درمیان حج ادا کیا تو ان حاجیوں کے لیے جنھیں ''جاوا فتیانا'' کہا جاتا ہے مکّۂ معظمہ میں اس نے متعدد وقف مسافرخانے تعمیر کرائے۔

تمام آبادی کی بڑی وجہِ معاش زراعت اور اس کے ساتھ جنگلات کی پیداوار کی تجارت ہے۔ اشیاے برآمد کھوپرا، سیاہ مرچ، گم بیر (ایک قسم کا رنگ)، سابو (ساگو) دانہ، ربڑ اور روٹن (بید rotan) ہیں، جو دستور، خاص طور پر سنگاپور اور جاوا کو بھیجی جاتی ہیں۔ چاول، پارچہ جات اور دوسری اشیا، جن کی یورپی اور زیادہ خوشحال چینی اور عرب باشندوں کو ضرورت ہوتی ہے، باہر سے درآمد کی جاتی ہیں۔ درآمد اور برآمد کی تجارت زیادہ تر چینیوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ لوگ چینیوں کے محلّے میں اکٹھے رہ

ہیں، جو پونتیانک کے نصف یورپی حصے میں بائیں کنارے پر آباد ہے۔ وہاں دوسرے غیر ملکی مشرقی لوگ بھی آباد ہو گئے ہیں؛ اسی لیے یہ شہر کپواس کی وادی میں تجارت اور کاروبار کا مرکز ہے۔

پونتیانک کی دلدل والی زمینوں میں بیرونی دنیا کے ساتھ آمد و رفت کا تعلق تقریباً تمام و کمال بحری راستے سے ہے۔ ماضی قریب میں موٹر کی سڑکیں مرتفع زمینوں پر پونتیانک سے مپاوا اور سمبس تک، سنگی کا ٹپ تک اور مندور سے لنڈک تک نکالی گئی ہیں۔

یہ خاص طور سے بیان کرنا مناسب ہے کہ پونتیانک ایک صحت بخش مقام ہے، کیونکہ شہر میں اکثر پانی آ جاتا ہے اور وہ سمندر سے اتنی دور ہے کہ وہاں موسمی بخار (ملیریا) نہیں ہوتا۔

مآخذ: (۱) P. J. Veth: *Borneo's Wester-Afdeeling*؛ (۲) J. J. K. Enthoven: *Bijdragen tot de geographie van Borneo's Wester-Afdeeling*، (*Tijdschrift Kon.*) *Aardrijkskundig Genootschap*، ۱۹۱۲ء، ص ۲۰۳ تا ۲۱۰۔

(A.W. NIEUWENHUIS)

پہلوان: محمد بن ایلدگیز، شمس الدین، آذربیجان کا اتابک [روضۃ الصفا، ۳ : ۱۰۲ میں اس کا پورا نام نصرۃ الدین محمد اور خطاب "جہان پہلوان" تحریر ہے]۔ اس کا باپ ایلدگیز [رک بآں] ترقی کرتا ہوا سلطنت سلجوقیہ میں حقیقی فرمانروا ہو گیا تھا۔ سلطان طغرل [رک باں] کی بیوہ پہلوان کی ماں تھی اور ارسلان بن طغرل [رک باں] اس کا سوتیلا بھائی تھا۔ ایلدگیز اور حاکم مراغہ، ابن آق سنقرالاحمدیلی کی جنگ میں پہلوان نے نمایاں حصہ لیا [رک بہ مراغہ]۔ اپنے باپ سے اسے ۵۶۸ھ / ۱۱۷۲ - ۱۱۷۳ء میں اران، آذربیجان، الجبال، ہمدان، اصفہان اور الرّی مع اپنے ماتحت علاقوں کے ورثے میں ملے، اور چند سال کے بعد اس نے تبریز بھی لے لیا، جو اپنے بھائی قزل ارسلان [رک باں] کو دے دیا۔ ایلدگیز کی طرح پہلوان بھی حقیقی حکمران ہو گیا۔ سلطان ارسلان بن طغرل کامل طور سے اس کے قابو میں تھا، اسی طرح اس کا نوجوان لڑکا طغرل [رک باں] بھی رہا، جسے پہلوان نے ارسلان کا زہر کے ذریعے خاتمہ ہونے کے بعد سلجوقی تخت پر بٹھایا تھا [زہر خورانی کا ذکر روضۃ الصفا کی ایک ضعیف روایت میں آیا ہے، ابن الأثیر اور حمد اللہ المستوفی اس کا ذکر بالکل نہیں کرتے]۔ پہلوان کی وفات ذوالحجہ ۵۸۱ھ / فروری - مارچ ۱۱۸۶ء یا آغاز ۵۸۲ھ / ۱۱۸۶ء میں ہوئی اور اس کا بھائی قزل اس کا جانشین ہوا۔

ابن الأثیر (۱۱ : ۳۴۶، ۵۲۵) نے پہلوان کی مدبرانہ خوبیوں کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔ اس کی عہدے داری کے زمانے میں اس کی ولایت میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ رہا، مگر اس کی وفات کے بعد خونریزی اور بے چینی پھیل گئی۔ اصفہان میں شافعیہ اور حنفیہ ایک دوسرے سے لڑ پڑے اور الرّی میں سنّی اور شیعی، تاآنکہ تدریجاً امن و امان دوبارہ قائم ہوا۔

مآخذ: (۱) ابن الأثیر: الکامل (طبع Tornberg)، ج ۱۱ و ۱۲، بمدد اشاریہ؛ (۲) حمد اللہ المستوفی قزوینی: تاریخ گزیدہ (طبع براؤن)، ۱ : ۴۶۶، ۴۷۰، ۴۷۳ تا ۴۷۵؛ (۳) Defrémery: *Histoire des Seldjoukides* در *JA*، سلسلہ ۴، ۱۳ : ۵۰ ببعد؛ (۴) میر خواند: *Historia Seldschukidarum* (طبع فولرز Vullers)، باب ۳۲؛ (۵) *Recueil de textes relatifs à l'histoire des Seldjoucides* (طبع ہوتسما Houtsma)؛ (۶) ہوتسما:

، *Some Remarks on the History of the Saldjuks* در *AO*، ۳ : ۲۳٦ ببعد.

(K. V. ZETTERSTÉEN)

- **پیاسٹر** : رَكّ بہ غُروُش.

- **پیالہ پاشا** : عثمانی امیرالبحر کبیر، بقول St. Gerlach : *Tage-Buch* (فرانکفرٹ M/a، ۱٦۷۴ء، ص ۴۴۸) ٹولنا Tolna (ہنگری) کا باشندہ تھا اور کہا جاتا ہے کہ غالباً کروٹ نسل سے ایک موچی کا لڑکا تھا ۔ تقریباً تمام معاصر تحریریں اس کے کروٹ نسل ہونے کا تذکرہ کرتی ہیں (قب *Relazioni degli ambasciatori Veneti al Senato* کا تیسرا سلسلہ، طبع E. Albèri، فلارنس ۱۸۴۴ - ۱۸۵۵ء، خصوصاً ۳/۲ : ۲۴۳ : *di nazione croato, vicino ai confini d'Ungheria*؛ ص ۲۰۷ : *di natione croato*؛ ۳/۳ : ۲۹۴ : *di nazione unghero*؛ ص ۴۱۸) - اس زمانے کے دستور کے مطابق اس کے باپ کا نام عبدالرحمٰن رکھا گیا اور اسے مسلمان بنایا گیا (قب F. Babinger، در *Litteraturdenkmäler aus Ungarns Türkenzeit*، برلن اور لائپزگ ۱۹۲۷ء، ص ۳۰، حاشیہ ۱)۔ پیالہ لڑکپن میں استانبول کی سرائے میں خدمتگار کی حیثیت سے آیا اور قپوجی باشی [رَكّ باں] تک ترقی کر کے وہاں سے گیا ۔ ۹٦۱ھ/ ۱۵۵۴ء میں اسے امیر البحر (قپودان پاشا، [رَكّ باں] کا عہدہ اور ''سنجق بے'' کا رتبہ ملا اور چار برس بعد اسے بیلر بای [= بیگلر بیگی، [رَكّ باں] کا درجہ دیا گیا (J.v. Hammer : *GOR*، ۳ : ۴۰٦) - وہ وزیر اعظم رستم پاشا [رَكّ باں] کے بھائی سنان پاشا کا اس عہدے پر جانشین ہوا، جہاں وہ ۹۵۵ھ/۱۵۴۸ء تا ۹٦۱ھ/۱۵۵۴ء رہا تھا ۔ تسخیر جربہ اور دوسری دلیرانہ بحری فتوحات کے بعد اسے خیال آیا کہ اب وہ منصب وزارت اور اوچ طوغ ویر لمک [نشان، جو کسی پاشا کو بلند ترین طبقے تک ترقی دینے کے لیے گھوڑے کے تین دم چھلوں کے طور پر دیا جاتا تھا] کا استحقاق رکھتا ہے تو سلطان سلیمٰن نے ایسی ترقی کو بہت قبل از وقت اور توقیرِ وزارت کی کسرشان کے اندیشے سے (قب حاجی خلیفہ : تحفۃ الکبار، طبع اول، ورق ۳٦ اور J.v. Hammer : *GOR*، ۳ : ۴۱٦) پہلے اس کی شادی اپنی پوتی جوہر سلطان بنت سلیم ثانی کے ساتھ کر دی (قب J.v. Hammer : *GOR*، ۳ : ۲۹۲ : ۱۵٦۲ء کا موسم گرما)، پھر کہیں پانچ برس کے بعد اسے داماد وزیر کی حیثیت سے محمد صوقللی پاشا کی طرح اوچ طوغ ویرلمک کا نشان عطا ہوا ۔ اس اثنا میں وہ سمندر میں بہت سے معرکے کے کام کرچکا تھا اور وہ عثمانی حکومت کے عظیم ترین امراء البحر میں سے ایک کے طور پر مشہور ہو چکا تھا ۔ طورغود رئیس کی معیت میں فرانسیسی سفیر دارامون d'Aramon کی شہ سے اس نے نیپلز کے گرد ساحل پر چھاپے مارے؛ رجیو Reggio کو محاصرہ کر کے لے لیا اور اس کے باشندوں کو غلام بنا کے لے گیا ۔ ۹۸۲ھ/ ۱۵۷۴ء میں اس نے البہ Elba اور پیومبینو Piombino کے محاصرے کی ناکام کوشش کی (قب J. v. Hammer : *GOR*، ۲ : ۴۱۸)۔ آخر میں الجزائر کی مستحکم بندرگاہ وہران (Oran) کو پینتالیس بادبانی جہازوں سے فتح کر لیا ۔ آئندہ سال ساٹھ جنگی جہازوں سے اس نے بزرتا Bizerta (= بنزرت) کی بندرگاہ پر قبضہ کیا ۔ ایک سال بعد ایک سو پچاس بادبانی جہازوں سے جزیرۂ میورقہ (Majorca) کو تاراج کر ڈالا اور نیپلز کے قریب سورنٹو Sorrento کو جلا دیا ۔ ۹٦۵ھ/ ۱۵۵۸ء میں وہ نوّے جنگی جہازوں کے بیڑے کے ساتھ البانیا میں والونا (= فالونا) Valona کے سامنے خاموش پڑا رہا؛ غرض یہ تھی کہ وہاں دشمن کے بیڑوں کی تاک لگائے، جو جربہ اور طرابلس پر ہاتھ

بیڑے کی تیاری کر رہے تھے ۔ ۱۳ جولائی ۱۵۶۰ء اس کے سب سے بڑے بحری کارنامے یعنی تسخیر جربہ [رک بآں] کی تاریخ ہے، جسے تھوڑی ہی پہلے ہسپانویوں نے لے لیا تھا ۔ یہ کام اس نے ایک سو بیس جہازوں سے انجام دیا، جو مُدُن (Modon) سے روانہ ہوئے تھے ۔ ۲۷ ستمبر ۱۵۶۰ء کو فتح کے پھریرے اُڑاتا ہوا استانبول میں داخل ہوا، جہاں اپنی کامیابی کی خبر ایک بادبانی جہاز کے ذریعے پہلے سے بھیج دی تھی (قب J. v. Hammer : GOR، ۳ : ۴۲۱ ببعد) ۔ یہ امیرالبحر کبیر بعد کے چار برس تک سمندر میں نہیں نکلا۔ لیکن پھر اگست ۱۵۶۴ء میں اُس نے چھوٹا سا چٹانی جزیرہ نما Peñon de Vélez de la Gomera، ہسپانویوں سے لے لیا؛ مقصد یہ تھا کہ تسخیر مالٹا کی تیاری کی جائے، جس کا انتظام سلطان کی چہیتی بیٹی ''مہر ماہ'' (رک بہ رستم پاشا) اپنے تمام وسائل سے کر رہی تھی؛ لیکن اس موقع پر تقدیر نے یاوری نہ کی، کیونکہ مالٹا کا محاصرہ جون - جولائی ۱۵۶۵ء میں عیسائی محافظین کی مدافعت کے آگے ناکام ہو گیا، جنھوں نے عسکری قوت کا زبردست مظاہرہ کیا اور عثمانیوں کو بھاری نقصانات پہنچائے ۔ سلطان سلیمان نے ہنگری پر ۱۵۶۶ء کی فصل بہار میں لشکر کشی کی تو اس وقت پیالہ پاشا استانبول کی بندرگاہ اور سلاح خانے کا نگران مقرر ہوا (قب J.v. Hammer : GOR، ۳ : ۴۳۸) ۔ اس سے پہلے وہ جزیرۂ خیوس Chios اور ساحل اپولی (Apulia) پر ایک کامیاب حملہ کر چکا تھا (وہی کتاب، ۳ : ۵۰۶ ببعد)، جس میں جزیرۂ خیوس اور اس کی بندرگاہ پیالہ پاشا کے ہاتھ آ گئی (عیدالفصح Easter Sunday ۱۵۶۶ء) ۔ اپنے خسر سلیم ثانی کے عہد حکومت میں پیالہ موردِ عتاب ہوا اور امیر البحر کبیر کے عہدے سے معزول کیا گیا، کیونکہ اسے یہ الزام دیا جاتا تھا کہ اس نے جزیرۂ خیوس کے مالِ غنیمت کا بڑا حصہ خود رکھ لیا تھا (Albrecht de Wys کے سفارت خانے کے اطلاع نامے مؤرخۂ مئی ۱۵۶۸ء، در J.v. Hammer : GOR، ۳ : ۷۸۲ کے مطابق) اور اس کی جگہ مؤذّن زادہ علی پاشا کا تقرر ہوا ۔ پیالہ پاشا نے فوراً تگ و دو شروع کی کہ سمندر میں نئے کارہائے نمایاں کے ذریعے دوبارہ شاہی خوشنودی حاصل کرے ۔ اپریل ۱۵۷۰ء میں وہ پچھتر بادبانی جہاز اور تیس جنگی کشتیاں لے کر روانہ ہوا اور سب سے پہلے جزیرۂ تینہ Tine کے ساحل پر اُترا، جسے اس نے فتح کر لیا اور قبرص (Cyprus) کی فتح میں حصہ لیا ۔ ۲۰ جنوری ۱۵۷۸ء کو اور عثمانی مآخذ کے مطابق ۱۲ ذوالقعدہ ۹۸۵ھ / ۲۱ جنوری ۱۵۷۸ء کو اس نے بقول جرلاخ Stephan Gerlach استانبول میں وفات پائی (قب اس کی Tage-Buch، فرینکفرٹ a/M. ۱۶۷۴ء، ص ۴۴۸) ۔ اس کے نہایت وسیع املاک کچھ شاہی خزانے میں گئے اور کچھ اس کی بیوہ اور بچوں کو ملے ۔ اس کی بیوہ نے آگے چل کر محمد پاشا وزیر سوم سے شادی کی اور اس کا دوسرا بیٹا ۱۵۵۴ء میں کلیس Clissa کا سنجاق بک ہو گیا، جو دالماچیا Dalmatia میں سپلیت (Spalato) کے اوپر واقع ہے (قب اطالوی اطلاع محولہ در J. v. Hammer : GOR، ۴ : ۴۰۱، حاشیہ ۱ : *La Sultana fo moglie di Piale ora di Mohammedbassa terzo vezir, ha ottenuto dal Sign. il Sangiaco di Clissa per il secondo suo figlio con Piale*) ۔ پیالہ پاشا کی تدفین استانبول کے محلّۂ قاسم پاشا کی اس مسجد میں ہوئی جسے اس نے تعمیر کیا تھا (قب حافظ حسین : حدیقۃ الجوامع، ۲ : ۲۵ ببعد).

مآخذ : متن میں محولہ تصنیفات کے علاوہ (۱)

Zinkeisen اور Iorga کی تاریخیں؛ اور (۲) رمز پاشا زادہ محمد افندی: حدیقۃ الوزراء، استانبول ۱۲۷۱ھ؛ نیز (۳) حافظ حسین: حدیقۃ الجوامع، ۱: ۶۰ ببعد؛ اور (۴) محمد ثریا: سجل عثمانی، ۲: ۴۸ ببعد.

(FRANZ BABINGER)

• **پِیر**: (ف) معنی عمر رسیدہ؛ تصوف میں "مرشد" یا "روحانی ہادی" کو کہتے ہیں۔ وہ یہ دعوی کرتا ہے کہ وہ بذریعۂ طریقت آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی تعلیمات سکھانے والوں کے براہِ راست سلسلے میں ہے اور اسی سے اسے مریدوں کو طریقت میں رہنمائی کرنے کی سند حاصل ہوتی ہے؛ لیکن اسے خود قابل اتباع ہونا چاہیے۔ صوفیانہ زندگی کے تین مدارج سے اسے نظری اور عملی دونوں طرح کی کامل معرفت ہونی چاہیے اور جسمانی علائق سے بری ہونا چاہیے۔ جب ایک مرید کو اس کا ثبوت مل جاتا ہے، خواہ اپنے بلا واسطہ علم سے یا اپنی روحانی طاقت (ولایت) سے کہ مرید دوسرے صوفیوں کے ساتھ رفاقت کا اہل ہے تو وہ اپنا ہاتھ مرید کے سر پر رکھتا ہے اور اسے خرقہ عطا کرتا ہے۔ مرید کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اسی پیر سے خلافت حاصل کرے جس نے اسے تعلیم دی ہے اور جو "پیر صحبت" کہلاتا ہے۔ پیر وہ لقب ہے جو درویشی طریقوں کے بانیوں کو دیا جاتا ہے۔

مآخذ: (۱) R.A. Nicholson: *Studies in Islamic Mysticism*، کیمبرج ۱۹۲۱ء اور اس موضوع کی کتابیں جن کا وہاں حوالہ دیا گیا ہے؛ (۲) J.P. Brown: *The Darwishes*، آکسفرڈ ۱۹۲۷ء.

(R. LEVY)

• **پیرا**: (= بیرہ) رک بہ استانبول.

• **پیراک**: رک بہ ملایا، جزیرہ نما.

⊙ **پیر پنجال (سلسلۂ کوہ)**: پیر پنجال سلسلۂ کوہ ان سات مشہور سلسلہ ہائے کوہ میں سے ہے جن سے مل کر سلسلۂ ہمالیہ خورد بنا ہے۔ یہ ہمالیہ کے عظیم سلسلۂ کوہ سے دریاے ستلج پر جدا ہوتا ہے اور ایک طرف دریاے چناب اور دوسری طرف بیاس اور راوی کے درمیان فاصل آب بن گیا ہے۔ راوی کے منبع کے قریب پیر پنجال دھولدار سلسلۂ کوہ کی جانب مڑتا ہے اور پھر ان دونوں سلسلوں کے اتصال سے بنگھل کے بنیادی خط کی کوہستانی گرہ بنتی ہے۔

یہ سلسلۂ کوہ ہزارے کی سرحد پر دریاے اٹک کے کنارے ختم ہوتا ہے۔ خاتمے پر اس کی مشہور چوٹی مہابن ہے، گو سوات کے سلسلۂ کوہ کو شاید ہم اسی کا ماوراے اٹک توسیعی سلسلہ کہہ سکتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی اس سلسلے کا رخ جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف ہے اور بڑے بڑے دریا، جو اس سلسلے کو چیر کر بہتے ہیں، اسے چند حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اس کی چوٹیوں کی اوسط بلندی انیس ہزار فٹ، دروں کی بلندی ۱۲،۰۰۰ اور پورے سلسلے کی اوسط بلندی سترہ ہزار فٹ ہے۔

پیر پنجال میں بڑے بڑے یخ تودے (گلیشیر glaciers) نہیں ہیں، پھر بھی اکثر مقامات پر سال کے معتد بہ حصے میں برف جمی پڑی رہتی ہے۔ ہمالیہ کا سلسلۂ کلاں شمالی جانب ہے اور پیر پنجال جنوب میں، اور ان دونوں کے درمیان بیضوی شکل کی وادیِ کشمیر واقع ہے، جو اپنی خوبصورتی اور دلفریب منظر کی وجہ سے مشہور ہے۔

(سعید الدین احمد)

پیری محمد پاشا: ایک عثمانی وزیر اعظم، اماسیہ کا باشندہ اور مشہور جلال الدین اقسرائی کی اولاد میں سے تھا؛ لہٰذا اس کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکرؓ تک پہنچتا تھا۔ اس نے پہلے قانون کا

پیشہ اختیار کیا اور نوبت بہ نوبت صوفیہ، سلوری اور غلطہ کا قاضی ہوا؛ استانبول میں محمد ثانی کے لنگر خانے (عمارت) کا مہتمم ہوا اور بایزید ثانی کے عہد حکومت کے آغاز میں "باش دفتر دار" کا رتبہ حاصل کیا۔ سلیم اول کے عہد میں اس نے ایرانی جنگوں میں اپنے حکیمانہ مشورے سے امتیاز پایا (قب J.v. Hammer : *GOR*، ۲ : ۴۱۲ و ۴۱۷ ببعد)، وہ مقدمۃ الجیش کے طور پر تبریز بھیجا گیا تھا تاکہ سلطان کے نام سے اس شہر پر قبضہ کر لے۔ ستمبر ۱۵۱۴ء کے آخر میں مصطفی پاشا کی جگہ، جسے برخاست کیا گیا تھا، وزیر سوم مقرر ہوا (قب J.v. Hammer، ۲ : ۴۲۰)۔ کچھ عرصہ استانبول میں "قائم مقام" کی خدمت انجام دی، پھر مصری مہم کے اختتام پر یونس پاشا کی جگہ، جسے مصر سے پسپائی پر ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء میں سزائے موت دی گئی تھی، وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ اپنی اس حیثیت میں اس نے ۱۵۲۱ء میں فتح بلغراد میں حصہ لیا۔ ردوس Rhodes پر قبضے کے بعد جلد ہی پیری پاشا سلطان کی عنایات سے محروم ہو گیا، یہ حاسد احمد پاشا کی افترا پردازیوں کا نتیجہ تھا، جسے اس کے عہدے کی طمع تھی۔ پیری پاشا دو لاکھ اسپر Aspers (چاندی کا چھوٹا ترکی سکہ تقریباً ۱/۳ درہم کے برابر) کا وظیفہ دے کر ۱۳ شعبان ۹۲۹ھ/۲۷ جون ۱۵۲۳ء کو سبکدوش کیا گیا۔ اس کا جانشین ابراہیم پاشا [رک بآں] ہوا، جو اصلاً پرغہ Praga کا یونانی تھا۔ پیری محمد دس برس اور زندہ رہا اور ۹۳۹ھ/۱۵۳۲ء یا ۹۴۰ھ/۱۵۳۳ء میں بمقام سلوری وفات پائی، جہاں اپنی تعمیر کردہ مسجد میں دفن کیا گیا۔ اس کا ایک بیٹا محمد بیگ حاکم ایچ ایل ۹۳۲ھ میں باپ سے پہلے فوت ہو چکا تھا۔ پیری محمد پاشا نے بہت سے اوقاف خیر کی بنیاد ڈالی، جن میں سے استانبول کی ایک مسجد اس کے نام سے منسوب ہے (قب حافظ حسین : حدیقۃ الجوامع، ۱ : ۴۰۸)۔ ایک مدرسہ اور ایک دارالمساکین اور ایک وقف، جو "تاب خانہ" کے نام سے مشہور تھا، اس نے جاری کیے۔ اگرچہ اس کا لقب پیری تھا مگر شعر میں رمزی "مخلص" (تخلص) کرتا تھا۔ اس کی نظمیں متوسط درجے کی ہیں (قب J. v. Hammer : *Geschichte der Osmanischen Dichtkunst*، ۲ : ۳۲۷ ببعد، جہاں غلط سال وفات درج ہے؛ نیز ۱ : ۱۸۷، بذیل "پیری" جہاں یہ نہیں سمجھا گیا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص ہیں؛ قب مزید لطیفی : تذکرہ، ص ۱۶۸ بذیل "رمزی")۔

مآخذ : (۱) محمد ثریا : سجل عثمانی، ۲ : ۳۳؛ (۲) زیادہ تفصیل کے ساتھ، در عثمان زادہ محمد تائب : حدیقۃ الوزراء، استانبول ۱۲۷۱ھ، ص ۲۲ ببعد؛ اور (۳) سولھویں صدی کے عثمانی واقعہ نگار؛ (۴) بروسہ لی محمد طاہر : عثمانلی مؤلفلری، ۲ : ۱۱۱ ببعد؛ پیری محمد پاشا سے بحیثیت ایک انشا پرداز کے بحث کرتا ہے۔ اس کے بقول اس نے نظموں کا ایک چھوٹا مجموعہ (دیوانچہ) تصنیف کیا اور مثنوی کے ایک حصے کی ایک شرح اور شاہدی کی شرح، جس کا نام تحفۂ میر ہے۔ لیکن دونوں کتابیں تاحال مخطوطات میں بیان کی گئی ہیں۔

(FRANZ BABINGER)

* **پیری محی الدین رئیس** : عثمانی جہازران اور ماہر نقشہ کشی، غالباً یونانی الاصل تھا اور مشہور جہازران کمال رئیس کا بھتیجا بیان کیا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر پر دیکھیے مقالہ Hans-Albrecht von Burski : *Kemal Re'is. ein Beitrag zur Geschichte der türkischen Flotte*، بون ۱۹۲۸ء اور بالخصوص J. H. Mordtmann : *Zur Lebensgeschichte des Kemal Re'is*، در *MSOS*، جلد ۳۲، حصہ ۲، برلن ۱۹۲۹ء، ص ۳۹ تا ۴۰ اور

ص ۲۲۴ ببعد)۔ کہا جاتا ہے کہ پیری کا باپ کوئی شخص حاجی محمد نامی تھا، مگر خود پیری اپنی جہازرانی کی کتاب کے دیباچے میں اپنے کو حاجی حقیری کا لڑکا کہتا ہے۔ اگرچہ یہ خیال کرنا ممکن ہے کہ "حقیری" محض پیری سے قافیہ ملانے کے لیے انتخاب کیا گیا ہو (قب سنان بن عبدالمنان یا داؤد بن عبدالودود، اور تارکانِ مسیحیت کے آباء و اجداد کے اسی طرح کے ہم قافیہ نام، جو عموماً "عبد" لگا کر بنائے جاتے ہیں)۔ چونکہ حقیری اسمِ علم نہیں ہو سکتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک "مخلص" ہے، اس لیے پیری کا خالص ترکی النسل ہونا اور بھی زیادہ مشتبہ ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ خالی حقیری محمد کے نام سے نہیں پکارا جاتا تھا بلکہ اس کا دوسرا نام تھا، جس کی شہادت موجود ہے، گو یہ سچ ہے کہ یہ شہادت زمانۂ ما بعد کی کتاب مجلّی عثمانی، ۲ : ۲۳۹ میں آتی ہے۔ یہ ماخذ (۲ : ۴۴) بتاتا ہے کہ اس بحر نورد کا پورا نام پیری محی الدین رئیس تھا۔ بہر حال یہ بلا خدشہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ پیری تخلص کے طور پر اختیار کیا گیا تھا، جب کہ اصلی نام (عَلَم) غالباً محمد بے۔ سولھویں صدی میں پیری محمد کی ترکیب بالکل عام تھی اور محمد کے ساتھ محی الدین "لقب" کے طور شامل تھا (قب *Isl*، جلد ۱۱، ۱۹۲۱ء، ص ۲۰، تعلیقہ ۳)۔ پیری رئیس کی زندگی کے متعلق جس نے اپنے چچا کمال رئیس (م ۱۶ شوال ۹۱۶ھ / ۱۶ جنوری ۱۵۱۱ء) کی زیر قیادت متعدد بحری سفر کیے اور بعد کو خیرالدین بربروسہ (م ۴ جولائی ۱۵۴۶ء) [رک بآں] کی ماتحتی میں امتیاز پایا۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ ان مہموں میں اس نے بحر روم کے ملکوں کے متعلق لاجواب واقفیت حاصل کر لی تھی۔ بعد میں مصر کا "قپودان" ہوا، اور اس حیثیت میں اس نے سویز سے خلیج فارس اور بحر عرب تک جہازی سفر کیے۔ [۹۵۵ھ] / ۱۵۴۸ء میں اس نے عدن کو قبضہ کیا (قب *Die osmansiche Chronik des Rustem Pascha*، طبع Ludwig Forrer، [*Türk. Bibl.*، جلد ۲۱، لائپزگ ۱۹۲۳ء]، ص ۱۲۷ ببعد۔ پوری شرح کے ساتھ)۔ ۹۵۹ھ / ۱۵۵۱ - ۱۵۵۲ء میں ساحل عرب پر اس کے تیس جہازوں میں سے کئی ضائع ہو گئے، پھر بھی مسقط کی بندرگاہ فتح کی اور وہاں کے بہت سے باشندوں کو جنگی قیدی بنا کر لے گیا۔ پھر اس نے ہرمز کا محاصرہ کیا، لیکن اٹھا لیا اور بصرے لوٹ گیا۔ اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے رشوتیں لے لی تھیں (بقول پچوی، عالی، حاجی خلیفہ: تحفۃ الکبار، بار اول، ورق ۲۸، مطابق J.v. Hammer: *GOR*، ۳ : ۵۱۴)۔ یہ سن کر کہ دشمن کے جنگی جہازوں کا ایک بیڑا قریب آ رہا ہے اس نے وطن لوٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے پاس صرف تین بادبانی جہاز رہ گئے تھے، لیکن تمام مال و متاع جو اکٹھا کیا تھا، ساتھ تھا۔ اس کا جہاز جزیرۂ بحرین میں ٹوٹ کر تباہ ہو گیا، لیکن وہ دو جہازوں کے ساتھ سویز، اور پھر قاہرہ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ادھر قباد پاشا، والی بصرہ اس اثنا میں باب عالی کو اطلاع بھیج چکا تھا کہ مہم ناکام رہی۔ اس پر پیری رئیس کی گردن مارنے کا حکم قاہرہ بھیج دیا گیا تھا؛ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ۹۶۲ھ / ۱۵۵۴ - ۱۵۵۵ء میں، لیکن غالباً زیادہ صحیح یہ ہے کہ ۹۵۹ھ یا ۹۶۰ھ میں اس کا وہاں سر قلم کیا گیا اور اس کے املاک استانبول بھیج دیے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی موت کے بعد ہرمز کے قاصد استانبول پہنچے جو لٹے ہوئے باشندوں کی وکالت میں مطالبہ کرتے تھے کہ جو مال و زر وہ لوٹ کر لے گیا وہ

واپس لے لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ قپودان مصر کا عہدہ ایک دوسرے شخص مراد نام کو دیا گیا، جو قطیف کا معزول سنجاق بے (والی) تھا (غالباً وہی جو اس مثل میں "اس طرح جیسے مراد کپتان" بقول H.F.v. Diez: *Denkwürdigkeiten von Asien*، حصۂ اول، برلن ۱۸۱۱ء: ص ۵۵ زندہ ہے۔

پیری رئیس بحر ایجہ اور بحیرۂ روم پر ایک کتاب جہازرانی کا مصنف ہونے کی حیثیت سے عام طور پر معروف ہے۔ اس کتاب کا نام بحریہ ہے؛ اس میں تمام سواحل کی، جن کا اس نے بحری سفر کیا، کیفیت لکھی ہے اور پایاب اور لنگر ڈالنے کے مقامات، روؤں اور خلیجوں، آبناؤں اور بندرگاہوں کی تفصیل دی ہے۔ پیری رئیس اس تصنیف کا آغاز سلیم اول (م ستمبر ۱۵۲۰ء) کے عہد ہی میں کر چکا تھا، اگرچہ وہ دیباچے میں کہتا ہے کہ اس نے اس کی ابتدا ۹۲۷ھ/ ۱۵۲۰-۱۵۲۱ء کے خاتمے تک نہیں کی تھی، مقصد یہ کہ سلطان سلیمان قانونی کے نام کتاب کا انتساب زیادہ دلنشین بنایا جائے۔ اس نے موخرالذکر کو اپنا مکمل اطلس ۹۳۰ھ/ ۱۵۲۳-۱۵۲۴ء میں پیش کیا۔ پال کالہ Paul Kahle نے متن اور ترجمے کے ساتھ، جو مشہور قلمی نسخوں پر مبنی ہے، اسے شائع کیا۔ کتاب کا نام پیری رئیس بحریہ ہے - *Das türkische Segelhandbuch für das Mittelländische Meer vom Jahre 1521*، جس کے ۱۹۲۵ء کے وسط تک جلد اول کے متن کا حصۂ اول اور جلد دوم، حصۂ پنجاہم فصل ۱ تا ۲۸ لائپزگ اور برلن میں ۱۹۲۶ء میں چھپے۔ علحدہ فصلیں پہلے شائع ہو چکی ہیں، مثلاً H.F.v. Diez، کتاب مذکور؛ زنطاو: E. Sachau: *Sizilien*، در *Centenario delle Nascita di Michele Amari*، ۱، Palermo ۱۹۱۰ء؛ [illegible] R. Herzog: *Ein türkisches Werk über das Ägäische Meer aus dem Jahr 1520*، در *Mitteilungen des Kaiserl. Deutschen Archäolog. Instituts, Athenische Abteilung*، ۲۷، ۱۹۰۲ء: ۳۱۷ ببعد؛ E. Oberhummer: فصل *Zypern*، در *Die Insel Zypern*، میونخ ۱۹۰۳ء، ص ۳۲۷ تا ۳۳۳ - دیگر فصول، در Carlier de Pinon، طبع E. Blochet (مع تصاویر) اور K. Foy، در *MSOS*، حصہ ۲، ۱۱، ۱۹۰۸ء: ص ۳۳۲ ببعد؛ قب براں F. Taeschner، در *ZDMG*، ۷۷ (۱۹۲۳ء): ۳۲، دوسرے حوالوں کے ساتھ۔

سبتہ "کولمبس کا نقشہ" اکتوبر ۱۹۲۹ء میں خلیل ادہم بے کو کتاب خانۂ سرای استانبول میں دستیاب ہوا، اس پر پیری رئیس کے ۱۵۱۳ء کے دستخط ثبت ہیں اور اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ پیری رئیس ہی کے وقت میں تیار ہوا۔ یہ ترکی زبان میں جھلّی پر شوخ رنگوں میں ہے، ۶۰×۸۵ سنٹی میٹر، اور دنیا کے نقشے کا مغربی حصّہ پیش کرتا ہے۔ یہ نقشہ بحر اوقیانوس مع امریکہ اور پرانی دنیا کے مغربی کنارے پر مشتمل ہے۔ دُنیا کے دوسرے حصّوں کا نقشہ ضائع ہو گیا۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ یہ وہی نقشہ ہوگا جسے پیری نے بحریہ میں اپنے ایک بیان کے مطابق سلطان سلیم کو ۱۵۱۷ء میں پیش کیا تھا؛ چنانچہ شاہی کتاب خانے میں اس کے محفوظ ہونے کی یہی توجیہ ہے؛ اس پر قب Paul Kahle: *Impronte Colombiane in una Carta Turca del 1513*، در *La Cultura*، سال دہم، ج ۱، حصہ ۱۰، بلاق (روم)، ۱۹۳۱ء؛ وہی مصنف: *Una mapa de América hecho por el turco Piri Re'is, en el ano 1513, basándose en una mapa de Colón y en mapas portugueses*، در *Investigación y Progreso*، ۵: ۱۲، میڈرڈ ۱۹۳۱ء، ص ۱۶۹ ببعد؛ "C" در *The Illustrated London News*، ج ۱۸۰، عدد ۴۸۵۵،

۲۷ فروری ۱۹۳۲ء: ص ۲۰۷؛ *A Columbus Controversy and two Atlantic charts* (مع نقول)؛ P. Kahle: *Die verschollene Columbus-Karte von 1498 in einer türkischen Weltkarte von 1513* (مع ۹ نقشے، ۵۲ صفحات، برلن اور لائپزگ ۱۹۳۳ء)؛ نیز Bugen Oberhummer: *Eine türkische Karte zur Entdeckung Amerikas*، در *Anzeiger der Akademie der Wissenschaften in Wien*، phil.-hist. Kl.، ۱۹۳۱ء، ص ۹۹ تا ۱۱۲؛ وہی مصنف: *Eine Karte des Columbus in türkischer Überlieferung*، در *Mitteilungen der Geographischen Ges. in Wien*، ۷۷، ۱۹۳۴ء: ۱۰۵ ببعد؛ اور آخر میں P. Kahle، در *Geographical Review*، ۱۹۳۳ء، ص ۶۲۱ تا ۶۳۸۔

مآخذ: (۱) حاجی خلیفہ: جہان نما، استانبول ۱۱۴۵ھ، ص ۱۱؛ (۲) وہی مصنف: تحفۃ الکبار فی اسفار البحار، استانبول ۱۱۴۱ھ، ص ۲۸ الف؛ (۳) وہی مصنف: کشف الظنون، طبع فلوگل، ۲: ۲۲ ببعد (عدد ۱۹۸۶)؛ (۴) محمد ثریا: سجل عثمانی، ۲: ۳۴۳؛ (۵) کتاب مذکور، مقدمہ؛ (۶) Hans v. Mžik: P. Kahle: *Piri Re'is und seine Bahrije*، در *Beiträge zur historischen Geographie* وغیرہ، طبع Hans v. Mžik، لائپزگ اور ویانا ۱۹۲۹ء، ص ۶۰ تا ۷۶۔

(FRANZ BABINGER)

پیسا: [برصغیر پاکستان و ہند میں] انگریزی pice؛ تین پائی یا چوتھائی آنے کے برابر برطانوی ہند میں مروج تانبے کا ایک سکہ؛ مغلوں کے زمانے میں اس نام (پیسا) کا اطلاق قدیم سکے ''دام'' پر ہوا جسے شیر شاہ نے جاری کیا تھا اور ایسے چالیس پیسے، تانبے کے ایک سکہ روپے کے برابر تھے؛ مگر ان سکوں پر معمولاً صرف ''فلوس'' یا ''روائی'' کا نام کندہ ملتا ہے۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں سلطنت مغلیہ کے بجائے ملک میں بہت سی آزاد ریاستیں قائم ہوئیں اور ان میں بکثرت تانبے کے سکے مضروب ہوئے؛ یہ سب عام طور پر پیسا کہلاتے تھے (قب J. Prinsep: *Useful Tables*، طبع E. Thomas، لندن ۱۸۵۸ء، ص ۶۲ ببعد)۔ [برصغیر کی آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان دونوں میں سکے کا نظام اعشاریہ رائج ہوا تو پیسے کی قیمت $\frac{1}{64}$ کے بجائے $\frac{1}{100}$ روپیہ مقرر ہوئی]۔

(J. ALLAN)

پیش گوئی: آئندہ کی خبر دینا (رک بہ کہانت، نیز جفر، فال، رمل، تعبیر)۔

پیشوا: (۱) ایک لقب جو دکن کے بہمنی سلاطین کے وزرا میں سے ایک کو دیا گیا؛ (۲) شیواجی کا وزیر اعظم؛ (۳) مرہٹہ جمعیت کا سردار [فارسی، رہنما، پہلوی ''پیشوبی''، ارمنی، پشیی؛ زیادہ قدیم شکلوں کے لیے دیکھیے Hübschmann: *Armenische Grammatik*، ۱: ۲۳۰]۔

شیواجی دکن میں مرہٹہ حکومت کا بانی تھا، جس کی معاون وزیروں کی ایک مجلس تھی، یہ اشٹ پردھان کہلاتے تھے اور اس جماعت میں سے ایک پیشوا یا مکھیا پردھان ہوتا تھا۔ پیشوا کا منصب موروثی نہ تھا اور شیواجی کی استبدادی حکومت کی نوعیت کا اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے وزرا کو یہ اجازت بھی نہ تھی کہ اپنے نائب انتخاب کریں۔ ان کا تقرر خود شیواجی کرتا تھا۔ شیواجی کے بعد پیشوا دیوانی اور فوجی دونوں قسم کے انتظامات کا اعلی حاکم ہوتا تھا اور تمام دفتری مراسلات و دستاویزات پر اپنی مہر ثبت کرتا تھا۔ راجہ رام کے عہد حکومت میں پیشوا کا اقتدار پنت پرتی ندھی کے اقتدار کے سامنے ماند پڑ گیا۔ بالاجی وشواناتھ (۱۷۱۳ تا ۱۷۲۰ء) کو معمولاً پہلا پیشوا شمار کیا جاتا ہے،

کیونکہ وہ ان مرہٹہ حکمرانوں کے سلسلے کا حقیقی بانی تھا جو بتدریج ستارا کے راجاؤں کو نکھٹو کر خود مرہٹہ جمعیت کے سرخیل بن گئے، لیکن دراصل بالاجی سے پہلے چھے پیشوا گزر چکے تھے، یعنی شام راج، نیل کنٹھ رنگدیو، مورو تریمبک پنگلے، نیل کنٹھ موریشور پنگلے، بہرن رام تریمبک (پرتی نیدھی)، بہیرو موریشور پنگلے اور بال کرشنا واسدیو۔

بالاجی وشواناتھ بھٹ (۱۷۱۳ تا ۱۷۲۰ء) پیشواؤں کے خاندان کا ایک قابل چتپاون یا کنکستھ برہمن تھا، جسے شاہو (۱۷۰۸ تا ۱۷۴۹ء) نے وزیر اعلیٰ مقرر کیا۔ شاہو کی مشکلات، جو اسے پیش آئیں، مہاراشٹر میں سیاسی ابتری اور ستارا کے متأخر راجاؤں کی کمزوری، یہ سب پیشواؤں کی طاقت بڑھنے کے اسباب ہو گئے۔ پرتی نیدھی داداوبا (جگ جیون راؤ) کی شاہو کی وفات کے وقت اسیری نے ایک اور روک ان کی ترقی کے راستے سے ہٹا دی، اور یہ واقعہ دکن میں دشستھ برہمنوں کے سیاسی اثر ختم ہونے کا نشان تھا۔ بالاجی وشواناتھ نے ملک کو خانہ جنگی کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے پایا، لیکن جب مرا تو اسے پرامن اور خوشحال چھوڑا۔ مال گزاری کے حسابات کو پیچیدہ بنا کر اس نے ریاست کے مالیات پر برہمنوں کا اختیار بڑھا دیا۔ اس کے منصب کے زمانے میں مغل شہنشاہ محمّد شاہ نے تسلیم کیا کہ شاہو کو پورے دکن سے چوتھ (مال گزاری کا $\frac{1}{4}$) کی تحصیل کا حق ہے اور اس تحصیل کے تکملے کے لیے اسے ایک زائد محصول “سردیس مکھی” (مال گزاری کا $\frac{1}{10}$) لگانے کی اجازت دی۔ اس کے بیٹے باجی راؤ اول (۱۷۲۰ تا ۱۷۴۰ء) نے مزید علاقے دبا لینے کی حکمت عملی اختیار کی۔ اس کی موت سے ایک سال قبل زیادہ تر تجارتی قسم کا ایک معاہدہ بمبئی کے انگریز گورنر Law کے ساتھ کیا گیا (Aitchison، ج ۶، عدد ۱)۔ تیسرے پیشوا بالاجی راؤ (۱۷۴۰ تا ۱۷۶۱ء) نے حکومت اپنے چچا زاد سداشیوراؤ بھاؤ کو اور اپنی فوجوں کی سپہ سالاری اپنے بھائی رگھوناتھ راؤ کو تفویض کی، جو رگھوبا کے نام سے زیادہ معروف ہے۔ اس کے اقتدار کا زمانہ مرہٹہ قوت کی تیز رفتار وسعت کے لحاظ سے ممتاز ہوا؛ اس کی فوجیں ملک کو کرناٹک سے پنجاب تک تاراج کرتی رہیں، یہاں تک کہ ۱۷۶۱ء میں پانی پت [رک باں] میں عبرتناک شکست کھائی۔ اس سے پہلے ۱۷۵۵ء میں ایک قرار داد کی بنا پر ایک انگریز مرہٹہ مہم نے بحری قزاقوں کے سردار انگریا کا قلع قمع کیا، جس کی غارت گری سے ساحل کونکن کی جہازرانی برابر خطرے میں رہتی تھی۔ اس مہم کے خاتمے پر ایک معاہدہ (Aitchison، ج ۶، عدد ۳) پیشوا کے ساتھ ہوا، جس میں مرہٹہ عملداری سے ولندیزی سوداگروں کو نکال دینے کی بھی شرط تھی۔ اس پیشوا کی موت کے بعد جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے مرہٹوں کی طاقت کو بہت کمزور کر دیا۔ اب اقتدار چند مرہٹہ سپہ سالاروں، یعنی گوالیار کے سندھیا، ناگپور کے بھونسلا، اندور کے ھُلکر، اور بڑودہ کے گائکوار کے پاس منتقل ہو گیا۔

مادھو راؤ کی حکومت کے دوران میں (۱۷۶۱ تا ۱۷۷۲ء) سندھیا نے ۱۷۷۱ء میں ایک بار اور مرہٹہ اثر شمالی ہندوستان میں قائم کر دیا، اور شاہ عالم مغل شہنشاہ، جس نے انگریزوں سے منہ موڑ لیا تھا، مرہٹوں کے ھاتھ میں کٹھ پتلی بن کے رہ گیا۔ مادھوراؤ کا جانشین اس کا بھائی نرائن راؤ (۱۷۷۲ تا ۱۷۷۳ء) ہوا، جو اپنے چچا رگھوبا کی شہ سے قتل کیا گیا۔ ایک زمانے تک مرہٹے دو معاندانہ صفوں میں بٹے رہے۔ ایک طرف رگھوبا کے حامی تھے، جو پیشوائی کا مدعی تھا۔ دوسری طرف نانا فرنویس کی سربراہی میں دربار پونا کا فریق تھا،

جو مادھو راؤ نرائن (۱۷۷۴ تا ۱۷۹۵ء) کے حق وراثت کا مؤید تھا۔ جو نرائن راؤ کا بیٹا تھا اور اس کی وفات کے بعد پیدا ہوا تھا۔ حکومت بمبئی نے رگھوبا کے دعووں کی حمایت میں جو اقدامات کیے ان کی بنا پر انگریزوں اور مرہٹوں میں جنگ چھڑ گئی، جس کا خاتمہ وارن ہیسٹنگز کی کد و کاوش کی بدولت ۱۷۸۲ء میں صلحنامۂ سالبئی پر ہوا۔ یہ صلح، جس نے واقعۃً سندھیا کی آزادی کو تسلیم کر لیا تھا، بیس برس کے لیے انگریزوں اور مرہٹوں کے درمیان امن و امان کی ضامن رہی۔ مرہٹہ تاریخ اب نانا فرنویس اور سندھیا کے درمیان ایک کشمکش بن کے رہ جاتی ہے، چنانچہ نانا فرنویس (بالاجی جنادھن) تو پیشوا کی گرتی ہوئی طاقت کو سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا اور مادھاجی سندھیا پیشوا پر قابو پانے کی تگ و دو میں لگا تھا، تاکہ اسے اپنی دست درازی کی آڑ کے طور پر استعمال کرے۔

ساتواں اور آخری پیشوا باجی راؤ دوم (۱۷۹۶ تا ۱۸۱۸ء) تھا۔ گورنر جنرل ولزلی Marquis Wellesley کے زمانے میں جب نانا فرنویس ۱۸۰۰ء میں فوت ہوا تو ہلکر اور دولت راؤ سندھیا کے درمیان پونا میں اقتدار اعلٰی کے لیے کشمکش شروع ہو گئی۔ دولت راؤ ۱۷۹۴ء میں ماھادجی سندھیا کا جانشین ہوا تھا۔ اس کشمکش کے دوران پیشوا بسین بھاگ گیا، جہاں اس نے اپنے کو انگریزوں کی حفاظت میں دے دیا۔ ۱۸۰۲ء میں عہدنامۂ بسین (Aitcheson، جلد ۶، عدد ۳۰) کی رو سے ولزلی نے اپنے کو پیشوا کا محافظ قرار دیا، جو ایک امدادی "فوج رکھنے اور انگریزوں کو اپنے اور دوسرے ہندوستانی راجاؤں کے ساتھ تنازعات میں ثالث بنانے پر راضی ہو گیا تھا۔ یہ چیز لازمی طور پر مرہٹوں کے دوسرے سرداروں کے لیے قابل قبول نہ ہوئی۔ بد قسمتی سے باجی راؤ ایک بے اصول مرہٹے ترمبک جی کے زیر اثر آ گیا۔ ترمبک گائکواڑ کے ایلچی کو قتل کرانے میں خفیہ طور پر شریک تھا، جو انگریزوں کی طرف سے ذاتی حفاظت کی ضمانت پر پونا بلایا گیا تھا۔ جب ریزیڈنٹ الفنسٹن Elphinstone نے اطلاع دی کہ پیشوا انگریزوں کے خلاف مرہٹہ طاقت کو منظم کرنے کے لیے ساز باز کر رہا ہے تو پیشوا سے جبراً صلحنامۂ پونا (۱۸۱۷ء) پر دستخط کرا لیے گئے، جس نے بسین کے عہدنامے کی تکمیل کر دی، لیکن باجی راؤ کے وعدے نقش بر آب تھے؛ کیونکہ جب لارڈ ہیسٹنگز نے مرہٹوں کے کچلنے کے لیے قدم بڑھایا تو پیشوا نے بغاوت کر دی اور برطانوی ریزیڈنسی کو تاخت و تاراج کر دیا۔ آخر کار اس کی فوجوں نے شکست کھائی اور پیشوائی ختم کر دی گئی۔ تاہم باجی راؤ کو وظیفہ دے کر بٹھور [ضلع کانپور] میں رہنے کی اجازت دی گئی، جہاں وہ ۱۸۵۱ء میں مر گیا۔ اس کا متبنّٰی نانا صاحب ۱۸۵۸ء میں روپوش ہو گیا۔

مآخذ: (۱) C.U. Aitchison: Treaties, Engagements, and Sanads وغیرہ، ج ۶، ۱۹۰۹ء؛ (۲) Cambridge History of India، ج ۵، باب ۱۳ و ۲۲ اور ۲۳؛ (۳) T.E. Colebrooke: Life of Mountstuart Elphinstone، ۲ جلد، ۱۸۸۴ء؛ (۴) M. Elphinstone: Report on the Territories Conquered from the Paishwa، ۱۸۳۸ء؛ (۵) G.W. Forrest: Selections from the letters etc. preserved in the Bombay Secretariat، Maratha Series، ۱۸۸۵ء، Home Series، ۱۸۸۷ء؛ (۶) J.H. Gense و D.R. Banerji: The Third English Embassy to Poona، ۱۹۳۴ء؛ (۷) J.C. Grant Duff: A History of the Mahrattas، ۲ جلد، ۱۹۲۱ء؛ (۸) V.V. Khare: Aitihasik Lekha Sangraha (اَیتہاسک لیکھا سنگرہا)، ۱۲ جلد؛ (۹) A. Macdonald: Memoir of the Life of

the late Nana Furnavces، ۱۸۰۰ء؛ (۱۰) ایم - ایس مہتہ : Lord Hastings and the Indian States، ۱۹۳۰ء؛ (۱۱) D.B. Parasnis : اِتہاس سنگرھا، (Itihās Sangraha)، ۷ جلد، مطبوعات بھارت اتہاس سنشودھک منڈل، پونا؛ (۱۲) V.K. Rajwade : Marathanchya Itihāsānchi Sādhanen، ۲۲ جلد؛ (۱۳) G.S. Sardesai : مرھٹی ریاست، ۸ جلد؛ (۱۴) Selections from the Peshwa's Daftar، طبع (G.S. Sardesai)، ۴۵ جلد؛ (۱۵) S. Sen : The Administrative System of the Marathas، ۱۹۲۳ء۔

(C. COLLIN DAVIES)

⊗ **پیلا** : شارل پیلا Charles Pellat، بیسویں صدی کا ایک معروف فرانسیسی عربی‌دان مستشرق، جو ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۶۹ء میں پچپن سال کی عمر میں فوت ہوا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ پیرس کے مدرسۃ السنۃ شرقیہ میں عربی کا استاد مقرر ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں پیرس یونیورسٹی میں عربی زبان اور حضارت کا پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں جب پروفیسر لیوی پرووانسال Levi-Provençal نے پیرس میں رسالہ Arabica کی بنیاد ڈالی تو شارل پیلا اس کی مجلس ادارت کا رکن قرار پایا۔ اس نے اس رسالے میں عربی ادب پر بہت سے قابل قدر مقالے لکھے اور بہت سی کتابوں پر تبصرے کیے۔ جب ۱۹۵۶ء میں پروفیسر لیوی پرووانسال نے وفات پائی تو پروفیسر پیلا اس کی جگہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے فرانسیسی ایڈیشن کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا اور وہ اپنی وفات تک اپنے فرائض کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتا رہا۔ پروفیسر پیلا نے الجاحظ [رک باں]، اس کی مؤلفات اور اس کے عہد کے علمی حالات کو اپنی تحقیقات کا خاص موضوع بنایا تھا۔ چند سال سے وہ المسعودی کی مروج الذھب کا ایک جدید ایڈیشن تیار کرنے میں مصروف تھا، لیکن موت نے اسے اس علمی منصوبے کی تکمیل کی مہلت نہ دی اور وہ اس کی ایک جلد سے زیادہ شائع نہ کر سکا۔ اس کے علاوہ پروفیسر موصوف کی حسب ذیل تالیفات قابل ذکر ہیں :-

(۱) الجاحظ : کتاب التربیع و التدویر، بتحقیق و مقدمہ، دمشق ۱۹۵۶ء؛ (۲) Langue et Litterature arabes، پیرس ۱۹۵۲ء، جس کا موضوع عربی زبان اور اس کا ادب ہے؛ (۳) La Milieu Basrien et la Formation de Gahiz، پیرس ۱۹۵۳ء، جس میں الجاحظ کے زمانے کے بصرے کا ایک دلچسپ علمی اور معاشرتی مرقع پیش کیا گیا ہے؛ (۴) Le Livre de la Couronne، پیرس ۱۹۵۴ء، جو الجاحظ کی کتاب التاج کا فرانسیسی ترجمہ ہے۔

مآخذ : (۱) نجیب العقیقی : المستشرقون، ۱ : ۲۲۹، قاہرہ ۱۹۶۴ء؛ (۲) مقالہ نگار کی ذاتی معلومات۔

(شیخ عنایت اللہ)

پینانگ : (یا پلاوپینانگ)، ملیشیا فیڈریشن کا ایک جزیرہ، عرض بلد ۵°، ۲۴′ شمالی اور طول بلد ۱۰۰°، ۲۱′ مشرقی پر واقع ہے، رقبہ ۲۷۶ کیلومیٹر مربع ہے۔ اندرونِ ملک سے اسے ایک آبنائے جدا کرتی ہے، جو تین سے سولہ کیلومیٹر تک چوڑی ہے۔ پینانگ کا شہر شمال مشرقی راس پر تعمیر ہوا ہے، جہاں سے ملیشیا کا ساحل چار کیلومیٹر دور ہے؛ سرکاری نام جزیرۂ پرنس آف ویلز اور جارج ٹاؤن کبھی مقبول عام نہیں ہوئے اور صرف سرکاری دستاویزات میں مرقوم ہیں۔ یہ جزیرہ ۱۷۸۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے کیدہ Kedah کے سلطان سے ایک سالانہ رقم کے عوض کپتان لائٹ Light نے بروے معاہدہ حاصل کیا اور اسی سال نوآبادی کی بنیاد رکھی۔ اسے امید تھی کہ یہ مقام مشرقی سمندروں کی منڈی بن جائے گا۔ یہ اس وقت تک

قریباً غیر آباد تھا اور تھوڑے دنوں کے بعد ایک تجارتی بستی بنا دیا گیا۔ یہ ۱۸۵۷ء تک ہندوستان کا حصہ باقی رہا۔ ۱۸۰۵ء میں اسے جداگانہ پریذیڈنسی (صوبہ) بنا دیا گیا۔ ۱۸۲۶ء میں جب سنگاپور اور ملاکا اس کے ساتھ ملائے گئے تو پینانگ ہی دارالحکومت رہا۔ ۱۸۳۷ء میں سنگاپور صدر مقام قرار دیا گیا۔ ۱۸۶۷ء میں ایک نئی شاہی نو آبادی (Strait Settlement) بنائی گئی تو پینانگ کو ایک ریذیڈنٹ کے زیر انتظام کر دیا گیا۔ ۱۹۶۰ء میں ملیشیا کو آزادی ملنے کے بعد پینانگ کی نو آبادی فیڈریشن میں شامل ہو گئی۔ پینانگ کی بندرگاہ بہت عمدہ ہے اور جہازوں کی آمد و رفت کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے۔ اس جزیرے میں اب ہر جگہ آمد و رفت کے راستے بن گئے ہیں۔ آبادی نے تیزی سے ترقی کی ہے۔ اس میں زیادہ تر چینی اور تامل ہیں، گو ملاویوں کی خاصی نمائندگی ہے، ان میں سے اکثر سابق جزیرہ نمائے ملایا اور سماٹرا سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ یہ سب شافعی المذہب مسلمان ہیں۔ صوبۂ ولزلی Wellesley کا قطعہ کو سنک کے بڑے خطّے کے سامنے واقع ہے مگر پینانگ کی نو آبادی کا ایک حصہ ہے۔ یہ قطعہ ۱۸۰۰ء میں کیدہ کے سلطان سے ایک سالانہ رقم کے عوض حاصل کیا گیا؛ اس میں ایک اور ضلع بھی شامل ہے، جو ۱۸۷۴ء میں پیراک کے سلطان سے خریدا گیا تھا۔ پینانگ میں زمین کی کاشت خوب ہوتی ہے۔ یورپی اور چینی لوگ بڑی بڑی املاک کے مالک ہیں۔ قریبی زمانے تک ایک دوسرا قطعۂ زمین جو ملک کے بڑے حصے میں ہے اور اس سے ملحق جزائر جو ڈنڈنگس کے نام سے مشہور ہیں، پینانگ کے علاقے میں داخل تھے۔ یہ قطعہ ریاست پیراک کے حوالے کیا تھا اور اب اسی کو واگذار کر دیا گیا ہے۔ پینانگ ملیشیا فیڈریشن میں شامل ہونے کے بعد زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کر رہا ہے۔

مآخذ: (۱) *Memoir of Captain Francis Light*، در *Journal Straits Branch R.A.S.*، عدد ۲۸، ص ۱ ببعد؛ (۲) F.A. Thomas: *A school geography and history of Penang*، سنگاپور ۱۹۰۹ء؛ (۳) *Malaya*، طبع R.O. Winstedt، لندن ۱۹۲۳ء؛ [(۴) *World Muslim Gazetteer*، طبع مؤتمر عالم اسلامی، کراچی، تاریخ ندارد].

(R. A. KERN)

زیادات و تصحیحات

زیادات

جلد ۵

صفحہ	عمود	سطر	زیادات
۲۳	۱	۲۷ کے بعد	بائنڈر: رکّ بہ بینڈر

تصحیحات

جلد ۱

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۸۳۲	۱	۲۱	۲۵ مارچ	۲۶ مارچ
۹۹۹	۲	۷	(م ۵ رجب ۲۱۳ھ / ۹ ستمبر ۸۲۹ء)	(ولادت: رجب ۲۱۴ھ / ستمبر ۸۲۹ء؛ وفات: ۲۵۴ھ / ۸۶۸ء)

جلد ۲

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۲۳۸	۲	۱۰	۳ ذوالحجۃ	۸ ذوالحجۃ
۶۸۹	۲	۳	معانعت	ممانعت

جلد ۴

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۹۹۱	۲	۲۵	چاٹ	چھت

جلد ۵

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۱۷	۱	۸	ہُرزِک	ہِرزِک
۶۳	۲	۲۰	نحِی	نحی
۹۳	۱	۱۱	بِہیۃ	بہیۃ

صفحہ	عمود	سطر	غلط	صواب
۹۹	۲	۱۵	Device	Devise
۱۲۹	۱	۳۱	عمرِ	عمر ہے
۱۸۰	۲	۱۹	شبہ	شبہ
۱۹۶	۲	۳۰	نمازا	نماز
۲۱۳	۲	۲۸	مفقض	منقض
۲۲۳	۱	۲۷	درِ مکنون	درِ مکنون
۲۹۵	۲	۴ بعد	اس کے خاص معیّن معنی اس وقت واضح ہو سکتے ہیں جب استعمال کرنے والوں کے معاشرتی اور اداری حالات اور اصطلاحات کا علم ہو۔ زیادہ تر ایک مرکب لفظ کے آخری حصے کے طور پر (یون بیگی "دس کا افسر" دفعدار، آلتون اردو (Golden Horde) عثمانی اصطلاح سنجاق بے (بائی) وغیرہ یا بطور لقب جب کسی خاص نام کے ساتھ استعمال کیا جائے اس وقت یہ آخر میں بڑھایا جاتا ہے۔ برس بیگ، محمد بیگ، مؤنث خطاب بیگم [ترک بان] بیگ کے مرکب ضمائر واحد متکلم کی ایک سادہ شکل ہے (بیگ ام "میرے آقا" اور اس کے بعد "بیوی، محترمہ" قب خان ام (خانم) جو اسی طرح کی ایک اضافی ترکیب ہے جو آگے چل کر مؤنث کے لیے مخصوص ہو گئی)۔	اس کے معنی اس وقت متعین ہوتے ہیں جب یہ لفظ کسی معاشرتی یا اداری اصطلاح میں، بالخصوص بطور لاحقہ، استعمال کیا جاتا ہے (مثلاً آلتون اردو کا اون بیگی = دس کا افسر، دفعدار یا کارپورل Corporal، یا سلطنت عثمانیہ کا سنجاق بے یا سنجاق بای، وغیرہ) یا جب یہ کسی شخص کے نام کے ساتھ بطور لقب آتا ہے، مثلاً برس بیگ، محمد بیگ؛ لفظ بیگم دراصل بیگ کا مؤنث واحد متکلم ہے (بیگ ام = میرے آقا، لہٰذا بیگ ام = میری آقا؛ قب خانم = خان ام بھی اسی طرح [خان کا] مؤنث واحد متکلم ہے)۔
۳۰۳	۱	۱۵	موہنجوڈارو	موہنجوڈارو (= مُئن جو ڈڑو)
۳۰۰	۲	۸	بند کر دیے کے گئے	بند کر دیے گئے
۳۰۱	۱	۱	گاندھی جی	سوامی شردھانند
۳۳۷	۲	۲۲	کر دیا گیا	کر دیا
۳۳۹	۱	۱۷	مرحد	مرحلہ
۳۷۰	۱	۹	اختیارت	اختیارات

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۴۷۵	۲	۵	ساڑے	ساڑھے
۴۷۹	۱	۹	انخمنین	انجمنیں
۵۴۰	۲	۹	انجن	انجمن
۶۲۳	۲	۲	ارو	اور
۶۶۳	۲	۲۴	حضّے	خطّے
۶۷۹	۲	۱۹	ملتانی با بہاول پوری	ملتانی یا بہاول پوری
۷۳۸	۲	۱۰	خبر	خبر

علامات و رموز و إعراب

۱

علامات

* مقالہ، ترجمہ از وو، لائڈن

⊗ جدید مقالہ، برائے اردو دائرۂ معارف اسلامیہ

[ ] اضافہ، از ادارۂ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ

۲

رموز

ترجمہ کرتے وقت انگریزی رموز کے مندرجۂ ذیل اردو متبادل اختیار کیے گئے :

= f., ff., sq., sqq.	بعد	= op. cit.	کتابِ مذکور
= s. v.	بذیل مادّہ (یا کلمہ)	= cf.	قب (قارب یا قابل)
= see ; s.	دیکھیے : کسی کتاب کے حوالے کے لیے)	= B. C.	ق م (قبل مسیح)
		= d.	م (متوفّی)
= q. v.	رک بہ (رجوع کنید بہ) یا رک باں (رجوع کنید باں) : وو کے کسی مقالے کے حوالے کے لیے	= loc. cit.	محلِ مذکور
		= ibid.	وہی کتاب
		= idem.	وہی مصنف
		= A. H.	ھ (سنہ ہجری)
= passim.	بمواضعِ کثیرہ	= A. D.	ع (سنہ عیسوی)

۳

إعراب

(الف)

Vowels

فتحہ (ـَ) a =

کسرہ (ـِ) i =

ضمّہ (ـُ) u =

(ب)

Long Vowels

ا، آ ā = (آج کل : āj kal)

ی ī = (سِیم : Sīm)

و ū = (ہارون الرشید : Hārūn al-Rashīd)

اے ai = (سیر : Sair)

(ج)

ـے = e کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (پین : pen)

ـو = o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (مول : mole)

ـُ = ü کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (گُل : Gül)

وٗ = ö کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (کول : Köl)

ـ = ä کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (اَرجب : ärädjäb
رجب : rädjäb)

ـْ = علامت سکون یا جزم (بِسْمِل : bismil)

جملہ حقوق بحق پنجاب یونیورسٹی محفوظ ہیں

طبع ----- اول

سال طباعت ----- ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۱ء

مقام اشاعت ----- لاہور

ناشر ----- سید شمشاد حیدر، ایم اے، رجسٹرار، دانش گاہ پنجاب، لاہور

طابع ----- مسٹر امجد رشید منہاس، ایم پی ڈی (لیڈز)، ناظم مطبع

مطبع ----- پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور

صفحات ----- ۷۳۲

بار دوم

سال طباعت ----- ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء

مطبع ----- ادبستان۔ ۴۳ ریٹی گن روڈ، لاہور

زیر نگرانی: پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن عارف (نگران صدر شعبہ)

Urdu

Encyclopaedia of Islam

Under the Auspices

of

THE UNIVERSITY OF THE PUNJAB LAHORE

Vol. V

Bozantiya -- Pinang

1390/1971

Reprint: 1425/2004